عالم اسلام کے اکابر علمائے کرام کے جدید فقہی مسائل پر مقالہ جات اور مناقشات کا مجموعہ نئی ترتیب کے ساتھ

سلسلہ

جدید فقہی مباحث

مع تقاریظ عُلمائے کرام

۱۲

- شریعت کے دائرہ میں انشورنس (تکافل) کی صورت
- میڈیکل انشورنس فقہ اسلامی کی روشنی میں
- شیئرز و کمپنیز کی شرعی حیثیت
- خواتین کی ملازمت سے متعلق شرعی احکام

تحقیقات اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا

زیر سرپرستی

حضرت مولانا مجاہد الاسلام قاسمی

حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی دامت برکاتہم

تاثرات

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

مفتی اعظم پاکستان جناب مولانا محمد رفیع عثمانی صاحب دامت برکاتہم

شیخ الاسلام جناب حضرت مولانا مفتی محمد تقی صاحب دامت برکاتہم

دَارُالاشاعت

اُردو بازار ○ ایم اے جناح روڈ ○ کراچی پاکستان

عالم اسلام کے اکابر علمائے کرام کے جدید فقہی مسائل پر مقالہ جات اور مناقشات کا مجموعہ نئی ترتیب کے ساتھ

سلسلہ

جدید فقہی مباحث

مع تقاریظ علمائے کرام

جلد 12

شریعت کے دائرہ میں انشورنس (تکافل) کی صورت
میڈیکل انشورنس/شیئرز وکمپنیز کی شرعی حیثیت
خواتین کی ملازمت سے متعلق شرعی احکام

تحقیقات اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا

زیر سرپرستی
حضرت مولانا مجاہد الاسلام قاسمی
حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی دامت برکاتہم

تاثرات
مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ
مفتی اعظم پاکستان جناب مولانا محمد رفیع عثمانی صاحب دامت برکاتہم
شیخ الاسلام جناب حضرت مولانا مفتی محمد تقی صاحب دامت برکاتہم

دار الاشاعت
اردو بازار ○ ایم اے جناح روڈ ○ کراچی پاکستان

ہمارے اس ایڈیشن میں 80 میں سے تقریباً 58 مباحث پہلی مرتبہ صرف پاکستان میں طبع ہوئے ہیں۔ ہم اسلامی فقہ اکیڈمی کے شکر گزار ہیں کہ انہوں نے تمام مسودات وکمپوزنگ بذریعہ ای میل مرحمت فرمائے۔ جزاك اللہ

باہتمام: خلیل اشرف عثمانی

طبع اول: نومبر 2017ء

تعداد: 500

طباعت: عابد پرنٹنگ پریس غریب آباد کراچی

ملنے کے پتے.........

ادارۃ المعارف جامعہ دارالعلوم کراچی
مکتبہ معارف القرآن جامعہ دارالعلوم کراچی
بیت القرآن اردو بازار کراچی
بیت القلم اردو بازار کراچی
مکتبہ اسلامیہ امین پور بازار۔ فیصل آباد

ادارۃ اسلامیات ۱۹۰۔ انار کلی لاہور و اردو بازار کراچی
مسٹر بکس جناح سپر مارکیٹ اسلام آباد
دارالاخلاص صدف پلازہ محلہ جنگی پشاور
مکتبہ سید احمد شہیدؒ اردو بازار لاہور
کتب خانہ رشیدیہ۔ مدینہ مارکیٹ راجہ بازار راولپنڈی

انگلینڈ میں ملنے کے پتے

AZHAR ACADEMY LTD.
54-68 LITTLE ILFORD LANE
MANOR PARK, LONDON E12 5QA

ISLAMIC BOOKS CENTRE
119-121, HALLI WELL ROAD
BOLTON BL 3NE, U.K.

امریکہ میں ملنے کے پتے

MADRASAH ISLAMIAH BOOK STORE
6665 BINTLIFF, HOUSTON,
TX-77074, U.S.A.

DARUL-ULOOM AL-MADANIA
182 SOBIESKI STREET,
BUFFALO, NY 14212, U.S.A

فہرست مضامین سلسلہ جدید فقہی مباحث

شریعت کے دائرہ میں انشورنس (تکافل) کی صورت

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

عرض ناشر

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم

اللہ تبارک وتعالیٰ کا جتنا بھی شکر ادا کیا جائے کم ہے دارالاشاعت کراچی کو پاکستان میں 1949ء سے تمام موضوعات پر اسلامی کتب کی طباعت اور اشاعت کی سعادت حاصل رہی ہے، یہ محض اللہ تعالیٰ کے فضل، تمام بزرگوں کی دعاؤں اور اکابر کی خدمات کا ثمرہ ہے، اسی محنت ولگن اور جذبے سے یہ خدمت تیسری نسل یعنی موجودہ ذمہ داران بھی کر رہی ہے اور اب چوتھی نسل کے نمائندے بھی ماشاء اللہ اس کام میں شریک ہو گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس کام کو مکمل اخلاص کے ساتھ جاری رکھنے کی توفیق عطا فرمائے اور اپنی بارگاہ میں شرف قبولیت عطا فرمائے جو کمی کوتاہی اس میں رہ جاتی ہے اس پر معاف فرمائے۔ (آمین)

تمام قارئین جو ماشاء اللہ ذی علم حضرات ہیں ان کے تعاون اور دعاؤں سے ہی یہ کام انجام پاسکا ان سب حضرات سے بھی دونوں جہاں میں کامیابی کی دعا کی درخواست ہے۔

زیر نظر مجموعہ ''سلسلہ جدید فقہی مباحث'' کا موجودہ ایڈیشن جو بڑے سائز کی 26 جلدوں میں طبع ہوئی ہے اس میں تقریباً 70 مختلف مستقل موضوعات پر کتب جو ہندوستان میں قائم ادارہ ''اسلامی فقہ اکیڈمی'' کی طویل کوششوں سے وجود میں آئیں، فقہ اکیڈمی کے سرپرست حضرات مدظلہم کی بصیرت اور کوششوں سے بڑے بڑے نامور اکابر علماء کے مقالے ان جدید فقہی موضوعات پر جمع ہو کر علمی تحقیقات کرنے والوں کے لیے بڑا زبردست ذخیرہ جمع کر دیا ہے، جسے نامور اکابر ملت نے بڑی خدمت قرار دیا ہے، آئندہ صفحات میں ان بزرگوں کی تقاریظ شامل ہیں۔

ہمارے اس ایڈیشن سے قبل اس کتاب کا تقریباً چوتھائی سے بھی کم حصہ طبع ہوا تھا، جس کا معیار بھی مناسب نہ تھا اور اس کی دستیابی بھی مستقل نہ ہونے کی وجہ سے اہل علم پریشان رہتے تھے، ضرورت تھی کہ نہ صرف معیار بہتر ہو اور مستقل فراہمی بھی رہے۔ ''منتظمین اسلامی فقہ اکیڈمی دہلی انڈیا'' کی خواہش تھی کہ پاکستان میں کوئی ایسا ادارہ ہو جو ان کے مقاصد کو بھی پورا کرتا ہو اور مکمل اشاعت بھی کر سکتا ہو، تاکہ اس علمی ذخیرہ کی پاکستان میں اشاعت کی ذمہ داری اس کے سپرد کی جائے۔

اس مقصد کے لیے تقریباً اب سے سات سال قبل انہوں نے دارالاشاعت کراچی کو تحریری اجازت مرحمت فرمادی تھی، ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اگر ہماری طرف سے اس میں تساہل یا کوتاہی کی گئی تو وہ کسی اور ناشر کو خدمات سونپ دیں گے۔ ارادے کے باوجود بعض مصالح اور حکمتوں کے سبب اسلامی فقہ اکیڈمی سے اپنے عذر کو واضح کر دیا گیا اور اس کی اشاعت کا ارادہ ترک کر دیا گیا۔

2015ء میں اسلامی فقہ اکیڈمی انڈیا کے سابقہ داعیہ کے ایک صاحب علم نے پیغام دیا کہ پاکستان میں اس کتاب کی مکمل اور مستقل اشاعت نہ ہونے کے سبب وہ پھر چاہتے ہیں کہ اس کا کوئی مستقل انتظام ان کے مطلوبہ معیار و مقاصد کے مطابق ہو جائے بہرحال! پھر دوبارہ ایک مفصل تحریری اجازت نامہ ان حضرات نے پاکستان کے لیے ہمیں جاری فرمایا اور تمام مطبوعہ وغیر مطبوعہ کمپیوٹر کمپوزنگ یا جس شکل میں بھی یہ ذخیرہ تھا انہوں نے مذکورہ صاحب علم صاحب کے ذریعے ہمیں فراہم کیا، ان دو سالوں میں طویل محنت واخراجات کر کے اب اسے طبع کرنے کے لیے تیار کر لیا گیا ہے۔ اب پاکستان میں اس ذخیرہ کی اشاعت کے حقوق

قانونی طور پر بھی دارالاشاعت کراچی ہی کے پاس ہیں، تقریباً 22 کتب اس میں سے پہلے شائع ہوئی تھیں، ان کے علاوہ تمام ذخیرہ پہلی مرتبہ طبع ہو کر آپ کے ہاتھوں میں ہے، یہ ذخیرہ پہلے انڈیا میں شائع نہیں ہوا تھا۔

ہم نے اپنے اس جدید ایڈیشن میں ترتیب یا جن دیگر خصوصیات سے اسے مزین کیا ہے وہ درج ذیل ہیں:

۱..... اسلامی فقہ اکیڈمی کی طرف سے پرانے شائع شدہ نسخوں میں کسی بھی بحث کے نتیجے میں جمع ہونے والے مقالے شائع کر دیے جاتے تھے، پھر بعد میں ان میں یہ اضافہ کیا گیا کافی جگہ اکیڈمی نے ان بحثوں کے نتیجے میں جو فیصلہ کیا اس کا اضافہ اس موجودہ نسخے میں شامل ہے۔

۲..... پورے علمی ذخیرے کو از سر نو بڑے سائز میں کمپوز و سیٹنگ سے آراستہ کیا گیا ہے بعض مقامات پر ایسا محسوس ہوتا ہے بات ادھوری رہ گئی ہے تو قدیم نسخوں اور اصل مسودے میں بھی اسی طرح نامکمل ہے۔

۳..... پورے علمی ذخیرے کی نئی ترتیب یا جلد بندی اس طریقہ پر کی گئی ہے کہ ممکنہ طور پر ایک جیسے موضوعات پر مباحث ایک جلد میں آجائیں، پہلے طبع شدہ نسخے میں یہ صورت نہ تھی۔ مثلاً اسلامی بینکنگ کے عنوان سے ایک موضوع چوتھی جلد میں ہے تو اسی عنوان سے دوسرا موضوع ۱۳ رنمبر جلد میں ہے، اب یہ کوشش کی گئی ہے کہ ایک جیسے موضوع ایک ہی جلد میں آجائیں۔

۴..... ممکن ہے کہ استفادہ کرنے والے حضرات کو ایسا محسوس ہو کہ کمپوزنگ بہت جلی نہیں ہے اسے ذرا بڑا بھی رکھا جا سکتا تھا لیکن اس سے مجموعہ کے صفحات اور جلدوں میں بہت اضافہ ہو رہا تھا اور اس کی قیمت بھی قارئین پر ایک بوجھ ہوتی۔ مزید یہ کہ گزشتہ طبع شدہ نسخوں کا قلم بھی تقریباً اس جیسا ہی تھا۔

۵..... بحمد للہ! اب ''سلسلۂ جدید فقہی مباحث'' کا سائز بھی دیگر فقہی کتب کی طرز پر ہو گیا، کاغذ، طباعت اور جلد سازی کا معیار بھی بہت نمایاں اور بہتر ہو گیا۔

۶..... اس ذخیرہ کی قیمت بھی بازار میں دستیاب کتب کے مقابلے میں معیار وغیرہ کو دیکھتے ہوئے بہت مناسب رکھی گئی ہے۔

امید ہے کہ اہل علم حضرات، یونیورسٹیاں، لائبریریاں، اس علمی ذخیرے کی پذیرائی کریں گی اللہ تعالیٰ سے عاجزانہ درخواست اور دعا ہے کہ ہماری اس کوشش کو اپنی بارگاہ میں شرف قبول عطا فرمائیں اور دنیا و آخرت دونوں کے لیے نافع بنا دیں (آمین)

والسلام

خلیل اشرف عثمانی

مدیر کتب خانہ دارالاشاعت

اردو بازار کراچی

8/7/2017

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

چند تاثرات برائے اسلامی فقہ اکیڈمی ہند

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی صاحب مدظلہ العالی

صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ

''اسلامک فقہ اکیڈمی ہند'' ایک ایسا ادارہ اور تنظیم ہے جس پر ہندوستانی مسلمانوں...... بالخصوص علماء اور دینی غیرت وفکر رکھنے والے ہندوستانی مسلمانوں کو فخر اور فخر سے زیادہ خدا کا شکر کرنے کا حق حاصل ہے، یہ ایک خالص تعمیری وفکری، علمی اور فقہی تنظیم اور اجتماعیت ہے جس میں ملک کے ممتاز، صحیح العقیدہ وصحیح الفکر اور وسیع العلم علماء اور کارکن شامل ہیں۔

مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب مدظلہ العالی

صدر دار العلوم کراچی پاکستان

''مجھے بے انتہا مسرت بھی اور کسی قدر حسرت بھی، مسرت اس بات کی کہ ہندوستان کے علمائے کرام نے وہ عظیم الشان کام شروع کیا ہے جس کی پورے عالم کو اور اقلیت والے ملکوں کو شدید ضرورت ہے اور حسرت یہ ہے کہ ہم پاکستان میں ہونے کے باوجود منظم اور بڑے پیمانے پر یہ کام شروع نہ کر سکے۔......فقہ اکیڈمی نے بڑا اہل قدم اٹھایا ہے، مدت سے اس کا انتظار تھا۔

تقدیم

شیخ الاسلام جسٹس مولانا محمد تقی عثمانی مدظلہ العالی

نائب رئیس مجمع الفقہ الاسلامی جدہ۔

بمناسبت خطبہ صدارت چوتھے فقہی سیمینار منعقدہ ۱۹۹۲ء حیدرآباد (دکن)

الحمد لله وكفى وسلام على عباده الذين اصطفى: اما بعد!

میرے لیے یہ بات بہت بڑے اعزاز اور خوشی و مسرت اور یادگار کی حیثیت رکھتی ہے کہ اللہ جل جلالہ کے فضل و کرم سے مجھے اس عظیم الشان علمی ادارے کے چوتھے فقہی مذاکرہ میں شرکت کی سعادت حاصل ہوئی۔ میں اپنے محترم بزرگ جناب مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی دامت برکاتہم کا اور اس اسلامک فقہ اکیڈمی کے تمام منتظمین کا تہ دل سے شکر گزار ہوں کہ انہوں نے مجھے اس محفل میں شرکت کا موقع عنایت فرمایا اور نہ صرف ایک سامع اور شریک کی حیثیت میں بلکہ اس افتتاحی اجلاس کی صدارت کی ذمہ داری بھی مجھ ناچیز کو سونپی۔ اس سے پہلے اگرچہ اکیڈمی کی طرف سے ہر سال مجھے دعوت موصول ہوتی رہی لیکن میں اپنے بعض مشاغل کی وجہ سے حاضر خدمت نہ ہو سکا۔ مولانا مجاہد الاسلام قاسمی دامت برکاتہم سے میرا غائبانہ تعارف ایک طویل مدت سے ہے، لیکن میں ان کو ایک فقیہ، ایک عالم کی حیثیت سے جانتا تھا، مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے اندر ایک مخفی جوہر، مسلمانوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنے کا بھی ودیعت کر رکھا ہے۔ آج اس محفل میں شرکت کرنے کے بعد ہندوستان کے علماء اور علم و فضل کے پیکر حضرات سے ملاقات کر کے اس بات کا اندازہ ہو رہا ہے کہ انہوں نے اس اکیڈمی کو قائم کر کے کتنا بڑا کارنامہ انجام دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے ان کے اس کارنامے کو قبول فرمائے اور اس کے اغراض و مقاصد کو اپنی رضا کے مطابق پورا کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

اس موقع پر اس اکیڈمی کے اغراض و مقاصد کو مدنظر رکھتے ہوئے مجھے یہ محسوس ہو رہا ہے کہ اس اکیڈمی کا قیام جناب نبی کریم ﷺ کے ایک ارشاد کی تعمیل ہے۔ وہ ارشاد معجم طبرانی میں ایک روایت میں ہے جسے علامہ ہیثمیؒ نے مجمع الزوائد میں بھی ذکر کیا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے نبی کریم ﷺ سے پوچھا کہ یارسول اللہ!

''اذا جاء نا امر ليس فيه أمر و لا نهى فما ذا تأمرنا فيه''

یارسول اللہ! اگر ہمارے سامنے کوئی ایسا سوال آجائے، ایسا قضیہ سامنے آجائے جس کے بارے میں کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ میں کوئی صریح حکم موجود نہ ہو تو اس صورت حال میں آپ ہمیں کس بات کا حکم دیتے ہیں، ایسے موقع پر مجھے کیا کرنا چاہیے۔ حضرت نبی کریم سرور دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''شاوروا الفقهاء العابدين ولا تمضوا فيه براى خاص''

کہ ایسے موقع پر فقہاء عابدین سے مشورہ کرو اور اس میں انفرادی رائے کو نافذ نہ کرو، محض انفرادی فتویٰ کو، محض انفادی رائے کو لوگوں پر مسلط کرنے کی بجائے فقہاء عابدین سے مشورہ کرو، اور اس مشورہ کے نتیجہ میں جس مقام پر پہنچو اس کو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کا حکم سمجھو۔

یہ ہے وہ ارشاد جس کے ذریعہ نبی کریم سرور عالم ﷺ نے قیام قیامت تک پیدا ہونے والے تمام نت نئے مسائل کا حل ہمارے لیے تجویز فرمایا اور وہ یہ کہ آخری وقت میں جب کہ اجتہاد مطلق کا تصور تقریباً مفقود ہو گیا ہے، اس دور میں نئے مسائل کو حل کرنے کا راستہ یہ ہے کہ فقہاء عابدین

کو جمع کیا جائے۔ مگر اس میں نبی کریم ﷺ نے دو صفتیں بیان فرمائی: ایک یہ کہ جن لوگوں کو جمع کیا جائے وہ تفقہ فی الدین رکھنے والے ہوں، دین کی صحیح سمجھ رکھنے والے ہوں۔ دین کے مزاج ومذاق کو اچھی طرح محفوظ کرنے والے ہوں، اور دوسری قید یہ لگادی کہ وہ فقہاء محض فلسفی قسم کے نہ ہوں، جو نظریاتی طور پر فقیہ ہوں، نظریاتی طور پر اسلام کے احکام کو جانتے ہوں، جو محض علم رکھتے ہوں، لیکن اس علم پر خود عمل پیرا نہ ہوں۔ اس علم کو اپنی زندگی میں اپنائے ہوئے نہ ہوں، اور اس علم کو اپنی زندگی کا منتہائے مقصود نہ بنایا ہو، تو ایسے فقہاء سے مشورہ کرنے کا کوئی حاصل نہیں، اس لیے کہ دین، یہ محض ایک نظریہ اور فلسفہ نہیں کہ ایک شخص محض فلسفہ کے طور پر اس کو اپنالے، اس کے حکم بیان کردے اور پھر بھی اس کا ماہر کہلائے، بلکہ یہ ایک عمل ہے۔ ایک پیغام ہے، ایک دعوت ہے۔ جب تک اس پر عمل صحیح طور پر نہیں ہوگا، اس وقت تک دین کی صحیح سمجھ حاصل نہیں ہوسکتی۔ میرے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس اللہ سرہ یہ بات فرمایا کرتے تھے:

”کہ اگر میرا علم بمعنی جان لینا کوئی کمال کی بات ہوتی تو شاید ابلیس سے بڑا صاحب کمال اس کائنات میں کوئی نہ ہوتا“

اس لیے کہ جہاں تک جاننے کا تعلق ہے صرف جان لینے کا، علم حاصل کر لینے کا، تو ابلیس کو علم بہت بڑا حاصل تھا، بہت کچھ علم اس کو اللہ تعالیٰ نے عطا فرمایا تھا، اور عقل کے اعتبار سے بھی آپ دیکھیں تو عقل، خالص عقل، جو وحی کی رہنمائی سے آزاد ہو، اس عقل کے اعتبار سے اس نے جو دلیل پیش کی، سجدہ نہ کرنے کی، کہ اے اللہ! تو نے آدم کو مٹی سے پیدا کیا اور مجھ کو آگ سے پیدا کیا، تو میں افضل ہوں، اس لیے کہ آگ افضل ہے مٹی کے مقابلے میں، تو اگر عقل کو وحی کی رہنمائی سے آزاد کردیا جائے تو خالص عقل کی بنیاد پر اس کی دلیل کا توڑ پیش نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن اس سارے عقل اور اس سارے علم کے باوجود وہ راندۂ درگاہ ہوا۔ اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ سے نکالا گیا، اس لیے کہ وہ علم نرا علم تھا، دانستن کے معنی میں اس پر عمل نہیں تھا۔ اس کو اپنی زندگی میں اپنائے ہوئے نہیں تھا، آپ کو معلوم ہے کہ آج ہمارے اس دور میں جتنے مستشرقین ہیں، اگر آپ ان کی لکھی ہوئی کتابیں دیکھیں تو ان میں اسلامی کتابوں کے ڈھیر ملیں گے۔ اتنی کتابوں کے حوالے ملیں گے کہ بسا اوقات ہمارے عالم دین اتنی کتابوں کا مطالعہ نہیں کرتے ہیں۔ لیکن سارا علم اور ساری معلومات حاصل کرنے کے بعد اس علم کا اتنا فائدہ نہیں اٹھا سکے کہ ایمان کی دولت حاصل کر لیتے۔ یہودی کے یہودی، عیسائی کے عیسائی رہے۔ تو معلوم ہوا کہ صرف فقہ کا عالم ہوجانا کافی نہیں، اور صرف فقہ کے عالم ہوجانے سے وہ مقام حاصل نہیں ہوجاتا جو نبی کریم ﷺ نے نئے مسائل کو حل کرنے کے لیے تجویز فرمایا بلکہ قید لگادی کہ فقہاء کے ساتھ عابدین ہونے چاہیے، عبادت گزار ہونے چاہیے۔ یہ حدیث میں نے اس وجہ سے سنائی کہ آج کثرت سے یہ آوازہ بلند ہوتا رہتا ہے، مختلف حلقوں کی طرف سے کہ صاحب دین کی تفہیم اور دین کی تعبیر کا حق صرف علماء ہی کو کیوں حاصل ہے۔ ہر مسلمان بہ حیثیت ایک مسلمان وہ دین کی تفہیم وتشریح کیوں نہیں کرسکتا۔ ہر آدمی کھڑا ہو کر یہ آواز بلند کہتا ہے کہ میں قرآن کریم سے احکام شرعیہ کا استنباط کرسکتا ہوں۔ یہ دین کی تفہیم وتعبیر کا سارا حق اٹھا کر علماء کی جھولی میں کیوں ڈال دیا گیا۔ علماء کی اجارہ داری کیوں قائم کردی گئی۔

تو جواب دیا نبی کریم ﷺ نے کہ یہ تشریح وتعبیر کا حق صرف فقہاء عابدین کو حاصل ہے، صرف فقہاء کو بھی نہیں بلکہ فقہاء عابدین کو، اس کے سوا کوئی قرآن وسنت کے احکام کی صحیح تفسیر وتشریح نہیں کرسکتا۔

یہ عجیب واقعہ ہے کہ دنیا کے ہر علم وفن میں کوئی ذمہ دارانہ بات کہنے کے لیے ساری دنیا میں یہ شرط عائد کی جاتی ہے کہ اس فن کا اس نے علم حاصل کیا ہو، اس کی ڈگری حاصل کی ہو، کوئی شخص آج تک ایسا پیدا نہیں ہوا جو کہتا ہو کہ انگریزی جانتا ہوں، میڈیکل سائنس کی کتابیں مطالعہ کر کے میں علاج کرسکتا ہوں، اگر میڈیکل سائنس کی کتابیں پڑھ کر، محض مطالعہ کر کے ڈکشنریوں کے ذریعہ اس کے ترجمے دیکھ کر آدمی علاج کرنا شروع کردے تو سوائے قبرستان آباد کرنے کے اور کوئی خدمت انسانیت کی وہ انجام نہیں دے سکتا۔ تو اللہ تعالیٰ نے دین کے اندر بھی یہ راستہ رکھا ہے کہ جب کتاب بھیجی تو نبی کریم ﷺ کو ساتھ بھیجا تاکہ آپ اس کی تعلیم دیں، اس کی تربیت دیں، اس کے معانی سکھائیں اور صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین نے سالہا سال کی محنت کر کے قرآن کریم کی ایک سورۃ سرکار دو عالم ﷺ سے پڑھی۔ اس لیے یہ نعرہ جو لگایا جاتا ہے کہ ہر شخص قرآن وسنت کے بارے میں جو چاہے کہہ سکتا ہے اس کا جواب اس مکمل حدیث کے اندر موجود ہے۔ اور جیسا کہ میں نے عرض کیا مجمع الفقہ الاسلامی اسی حدیث کی

تعلیم معلوم ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ اس حدیث پر عمل کرنے کا صحیح نور، اس کی صحیح برکت اور اس کا صحیح فائدہ مجمع کو عطا فرمائے۔

جیسا کہ مجھ سے پہلے کئی حضرات اس پر روشنی ڈال چکے ہیں کہ اس مجمع (اکیڈمی) کے قیام کا اصل مقصد ان نئے مسائل کا حل تلاش کرنا ہے جو اس امت مسلمہ کو درپیش ہیں اور کوئی شک نہیں کہ علماء کے نقطۂ نظر سے یہ وقت کا اہم ترین تقاضہ ہے کہ علماء باہم سر جوڑ کر ان مسائل کا حل امت مسلمہ کے سامنے پیش کریں جو آج امت مسلمہ کے لیے چیلنج بنے ہوئے ہیں۔ لیکن جب میں یہ کہتا ہوں کہ وقت کا بہت بڑا تقاضہ ہے کہ علماء یہ کام کریں تو مجھے چند وہ جملے بھی یاد آتے ہیں جو بسا اوقات مختلف حلقوں کی طرف سے بار بار اٹھائے جاتے ہیں کہ علماء کو وقت کے تقاضے کے پیچھے چلنا چاہیے۔ علماء کو وقت کے تقاضوں کے مطابق کام کرنا چاہیے۔ اور وقت کے تقاضوں کو سمجھنا چاہیے۔ یہ جملہ جس اجمال کے ساتھ بولا جاتا ہے اس کا صحیح مطلب بھی ہوسکتا ہے اور غلط مطلب بھی ہوسکتا ہے وقت کے تقاضہ کا مفہوم بسا اوقات لوگ یہ بیان کرتے ہیں کہ مغرب میں جو ہوا چل کر آوے، مغرب سے جو فکر، جو فلسفہ جو نظریہ، جو طرز عمل ہمارے ملکوں میں درآمد ہوگیا، بجائے اس کے کہ اس کو بدلا جائے، اس کے بجائے اسلام کو بدل کر اس کے مطابق کیا جائے، اسے وقت کا تقاضہ قرار دیا جاتا ہے۔

ایک زمانہ تھا کہ سود، ربوا کا چلن ہوا تو لوگوں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ صاحب اس وقت کا تقاضہ یہ ہے کہ مسلمان سود کو جوں کا توں قبول کرلیں...... ایک زمانہ آیا کہ اشتراکیت اور سوشلزم کا ڈنکا بجا، اور انہوں نے دنیا کے اندر اپنے نظریات کو پھیلانا شروع کیا، دنیا کے مختلف ملکوں اور سلطنتوں میں ان کا نظام رائج ہوا۔ اس کا شور شرابہ ہوا تو اس کے نتیجہ میں ایک جماعت نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ اس وقت کا تقاضہ یہ ہے کہ سوشلزم کو، اشتراکیت کو اسلام کے مطابق ڈھال دیا جائے وقت کا تقاضہ یہ ہے۔ غرض جو نئی وبا مغرب سے درآمد ہوا اسلام کو اس کے مطابق بنانے اور اس کو اسلام کے اندر داخل کرنے کے لیے وقت کے تقاضہ کا عنوان استعمال کرلیا جاتا ہے۔

لیکن یہ مجمع الفقہ الاسلامی درحقیقت ایسے وقت کے نام نہاد تقاضوں کے پیچھے نہ ہے اور نہ ہوگی انشاء اللہ تعالیٰ...... یہاں وقت کے تقاضوں سے مراد یہ ہے کہ بے شمار مسائل آپ کی زندگی کے اندر سے پیش آگئے ہیں کہ ہمیں ان کا صریح حکم کتاب اللہ میں یا سنت رسول اللہ ﷺ میں یا فقہاء کرام کے کلام میں نہیں ملتا، جسے آپ اصلاحی اعتبار سے اجتہاد فی المسائل کہہ سکتے ہیں۔ تو اجتہاد فی المسائل کے ذریعہ ان مسائل کا حل تلاش کیا جائے اور وسعتِ نظر کے ساتھ کیا جائے۔ پورے اسلامی مزاج کے ساتھ کیا جائے، اس کے اندر کسی اجنبی نظریہ اور فلسفہ سے مرعوب ہو کر نہیں، بلکہ حقیقی اسلامی ضروریات کو مدنظر رکھتے ہوئے اس کا حل اسلامی اصولوں کے دائرہ میں رہ کر تلاش کیا جائے اس سے باہر نہ جایا جائے، یہ ہے اس مجمع (اکیڈمی) کا اصل مقصد اور اسی لیے اس میں الحمدللہ مختلف الخیال، مختلف اداروں سے تعلق رکھنے والے موجود ہیں اور پچھلے دنوں جو تحقیقات سامنے آئی ہیں اللہ کے فضل وکرم سے ان میں ان بنیادی اصولوں کا لحاظ نظر آتا ہے۔ امید ہے کہ یہ اکیڈمی ان راستوں پر چلے گی، تو انشاء اللہ اس امت کے لیے بہترین مسائل کا حل پیش کرے گی...... لیکن میں آخر میں اس سلسلہ کے ایک اہم نکتہ کی طرف آپ حضرات کو توجہ دلانا چاہتا ہوں، بلکہ توجہ دلانا تو بے ادبی کی بات ہوگی۔ سارے حضرات اکابر علماء ہیں۔ محض تذکیر اور تکرار کے طور پر عرض کرنا چاہتا ہوں، وہ یہ کہ چوں کہ ہم ایک ایسے معاشرہ میں جی رہے ہیں جس میں مغرب کا سیاسی اور فکری تسلط قائم ہے۔ سیاسی اور فکری سیاسی اعتبار سے پوری دنیا کے اوپر مغرب مسلط ہے۔ فکری اعتبار سے بھی مغرب کے افکار اور ان کے نظریات وفلسفے مسلط ہیں۔ اور یہ قاعدہ ہوتا ہے کہ "جس کی لاٹھی اس کی بھینس" جس کے پاس ہتھیار، جس کے پاس قوت ہو تو لوگوں کو بات بھی اسی کی سمجھ میں آتی ہے اور جلدی سے سینے میں اتر جاتی ہے۔ تو اس واسطے مغرب نے جو افکار ہمارے یہاں پھیلا دیئے اور صدیوں کی محنت کے بعد پھیلائے۔ ہمارے نظام تعلیم کے اندر وہ افکار پھیلا دیئے۔ ان کی موجودگی میں اس بات کا بڑا قوی اندیشہ ہے کہ بعض ایسی چیزوں کو وقت کی ضرورت قرار دیا جائے جو درحقیقت وقت کی ضرورت نہیں ہے۔ محض مغرب کے پروپیگنڈہ نے اسے وقت کی ضرورت قرار دے دیا۔ یہ وقت کی ضرورت ایک ایسا مجمل لفظ ہے جس کے اندر بہت کچھ سما سکتا ہے اس لیے وقت کی ضرورت کے ہتھیار کو استعمال کرتے ہوئے ان کی دو دھاریں اپنے ذہن میں رکھنی ضروری ہے۔ یہ دو دھاریں ہتھیار ہیں، اس سے امت مسلمہ کے مسائل بھی حل ہوسکتے ہیں اور اس سے امت مسلمہ کا کام

بھی تمام ہو سکتا ہے۔ اس لیے ہم جب وقت کی ضرورت کا لفظ استعمال کریں تو یہ بات ہمارے ذہن میں ہونی چاہیے کہ محض پروپیگنڈہ کے شور و شغب سے مرعوب ہو کر ہم یہ نہ کہہ بیٹھیں کہ یہ بھی وقت کی ضرورت ہے۔ بلکہ ہم یہ دیکھیں کہ ہمارے اپنے اصول، ہمارے اپنے قواعد کے لحاظ سے یہ ضرورت ہے یا نہیں؟

اسی ضمن میں یہ سوال بہ کثرت اٹھتا ہے کہ کیا ان مسائل کو طے کرتے وقت کسی ایک فقہی مذہب کی پیروی کرنی چاہیے یا مختلف فقہی مذاہب کو سامنے رکھ کر اور اس میں جو ضرورت کے مطابق معلوم ہو اس کو اختیار کر لینا چاہیے۔

میں خاص طور پر آپ حضرات سے باادب عرض کرنا چاہتا ہوں کہ خاص طور پر اس دور میں معاملات کے شعبہ میں چوں کہ معاملات پیچیدہ ہوتے ہیں، بے شمار مسائل سامنے آ گئے ہیں، لہٰذا اگر یہ شخص حنفی مذہب کا پیروکار ہے اور وہ کسی ضرورت کی وجہ سے، عموم بلویٰ کی خاطر، وہ مسائل وقت کو حل کرنے کی خاطر دوسرے کسی امام کے قول کو اختیار کر لے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ یہ جائز ہے اور نہ صرف جائز ہے بلکہ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کو باضابطہ یہ وصیت فرمائی تھی کہ اس دور میں جب کہ معاملات پیچیدہ ہو گئے ہیں، اگر آئمہ اربعہ کے دائرہ میں رہتے ہوئے کسی بھی فقہی مذہب میں کوئی گنجائش مل جائے تو اس دور کے لوگوں کے لیے آسانی پیدا کرنی چاہیے۔

لیکن اس میں ادق ترین جو نکتہ ہے جو بسا اوقات افراط و تفریط کا شکار ہو کر فراموش ہو جاتا ہے وہ یہ کہ مختلف مذاہب میں سے علوم بلویٰ کی خاطر کوئی قول اختیار کر لینا اور بات ہے اور اپنی خواہشات نفسانی کو پورا کرنے کی خاطر مذاہب کو گڈمڈ کرنا بالکل جدا شئے ہے یعنی اگر کوئی شخص محض اس بنیاد پر کہ میری خواہش نفسانی میرے مفاد ایک مذہب سے پورے ہو رہے ہیں دوسرے سے پورے نہیں ہو رہے ہیں تو اس بنیاد پر اگر وہ ایک مذہب کو چھوڑ کر دوسرا مذہب اختیار کرتا ہے اپنے ذاتی مفاد کی خاطر تو اس کی کسی کے نزدیک اجازت نہیں، یہ اتباعِ ہویٰ ہے۔ یہ خواہشات نفسانی کی اتباع ہے۔ اس کو تشہی کہا گیا ہے، یہ شہوت پرستی ہے، یہ خواہش پرستی ہے، محض اپنے ذاتی فائدہ یا ذاتی سہولت کی خاطر ایک مذہب کو چھوڑ کر دوسرا مذہب اختیار کر لیتا ہے اس کی مثال آپ حضرات کے سامنے پیش کرتا ہوں۔

آج جب کہ ان مسائل کو حل کرنے کے لیے یہ عام رجحان پیدا ہوا۔ پورے عالم اسلام میں خاص طور پر عرب ممالک میں یہ رجحان بہت پیدا ہوا کہ ان معاملات کو حل کرنے کے لیے مختلف مذاہب سے رہنمائی حاصل کی جائے اور کسی ایک مذہب کی اتباع نہ کی جائے۔ جب یہ لے آگے بڑھی تو اس نے بعض اوقات یہ صورت اختیار کر لی کہ محض ضرورت کی خاطر نہیں، بلکہ محض ذاتی مفاد، ذاتی سہولت کی خاطر "جمع بین المذاہب" اور تلفیق بین المذاہب کا راستہ اختیار کر لیا...... اتباعِ ہویٰ کے بارے میں علامہ ابن تیمیہ فتاویٰ کے اندر لکھتے ہیں:

"اگر کوئی شخص ذاتی خواہش کی خاطر دوسرے مذہب کو اختیار کرتا ہے تو یہ کسی کے نزدیک جائز نہیں بلکہ حرام ہے۔"

حالانکہ علامہ ابن تیمیہ تقلید کے سخت مخالف ہیں۔ اتباعِ ہویٰ کو وہ بھی حرام قرار دیتے ہیں۔ اس کی چھوٹی سی مثال پیش کرتا ہوں۔

ایک صاحب سے میری ایک بار ملاقات ہوئی میں اور وہ دونوں سفر پر تھے اور دونوں سفر کے عالم میں مقیم تھے۔ ہفتہ دس دن ایک جگہ ٹھہرنا تھا تو میں نے دیکھا کہ وہ "جمع بین الصلوٰتین" کر رہے ہیں۔ دو نمازوں کو جمع کر رہے ہیں۔ حضرت امام شافعیؒ کے نزدیک جائز ہے، امام احمد بن حنبلؒ کے نزدیک جائز ہے، امام مالکؒ کے نزدیک جائز ہے، امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک جمع حقیقی جائز نہیں ہے۔ جمع صوری کو جائز کہتے ہیں۔ تو وہ جمع کر رہے تھے، انہوں نے امام شافعیؒ کے قول پر عمل کیا ہوگا۔ مگر میں نے دیکھا کہ وہ ہفتہ بھر مقیم رہے اور جمع بین الصلوٰتین کرتے رہے، تو میں نے ان سے پوچھا کہ کیا آپ نے شافعی مسلک کو لے لیا تاکہ دو نمازوں کو جمع کرنے کی گنجائش مل جائے، میں نے عرض کیا کہ شافعی مسلک یہ بھی ہے کہ چار دن سے زیادہ ان کے یہاں قصر نہیں ہو سکتی۔ ان کے نزدیک مدتِ قصر صرف چار دن ہے۔ تو چار دن سے زیادہ مدتِ سفر نہیں ہوتی اور آپ تو ہفتہ بھر سے مقیم ہیں۔ تو کہنے لگے کہ میں نے اس معاملہ میں حنفی مسلک کو لے لیا۔ تو میں نے پوچھا کہ کیا آپ دلائل کے نقطۂ نظر سے یہ سمجھتے ہیں کہ اس مسئلہ میں حنفیہ کا مسلک زیادہ قوی ہے اور اس معاملہ میں شافعیہ کا مسلک زیادہ قوی ہے۔ کہنے لگے کہ دلیل کے اعتبار سے تو میں نہیں سمجھتا لیکن میں نے دیکھا کہ یہ

میرے لیے زیادہ سوٹ کرتا ہے تو اس واسطے میں نے اس میں حنفی کا مسلک لے لیا اور اس میں شافعی کا مسلک لے لیا...... تو میری گزارش یہ ہے کہ محض ذاتی سہولت اور ذاتی مفاد، ذاتی راحت کے پیش نظر ایک مسئلہ میں ایک قول کو لے لینا اور دوسرے مسئلہ میں دوسرے قول کو لے لینا، یہ کسی کے نزدیک جائز نہیں ہے۔ یہ طریقہ اختیار کیا گیا تو اس سے دین کا حلیہ بگڑنے کا اندیشہ ہے۔ اس واسطے کہ ہر مذہب میں جو قول اختیار کیا گیا اس کے کچھ شرائط ہیں اس کے کچھ حدود ہیں۔ آپ نے ان شرائط کو مدنظر نہیں رکھا چھوڑ دیا اور ان شرائط کو مدنظر رکھے بغیر اور اس طرح سے "تلفیق بین المذاھب" کا سلسلہ شروع کر دیا تو اس کا نتیجہ سوائے اتباع ہویٰ کے اور کچھ نہیں ہوسکتا، اس لیے میری گزارش یہ ہے کہ بے شک دوسرے مذاہب خاص طور پر معاملات کے اندر دوسرے مذاہب سے لے لینے کی گنجائش ہے لیکن یہ اس وقت جب کہ واقعی کوئی ضرورت داعی ہو اور واقعۃً اس سے مسلمانوں کے کسی اجتماعی مسئلہ کا حل نکالنا مقصود ہو اور اس کا مقصد اتباع ہویٰ، تشہی اور ذاتی منفعت کو حاصل کرنا نہ ہو، اس صورت میں اس کی گنجائش ہے۔ یہ بات ظاہر ہے کہ یہ علماء کا مجمع ہے، ان کے سامنے کہنے کی ضرورت نہیں تھی، لیکن یہ اس لیے میں نے تذکیراور تکراراً عرض کردی کہ جب ہم کسی ایک جانب جھکیں تو ایسا نہ ہو کہ دوسری جانب کا خیال ہمارے دل سے اوجھل ہو...... یہ کام بڑا نازک ہے، یہ پل صراط ہے۔ تلوار سے زیادہ تیز اور بال سے زیادہ باریک ہے۔ اس میں اس کا خیال رکھنا ہے کہ وقت کی ضروریات پوری ہوں، مسلمانوں کے مسائل حل ہوں اور دوسری طرف اس بات کا لحاظ رکھنا ہے کہ آپ مغرب کے اس جھوٹے پروپیگنڈے سے مرعوب نہ ہوں جو ہرنئی وبا کو وقت کی ضرورت کہہ کر ہمارے سامنے پیش کرتا ہے۔ اس واسطے اس کا لحاظ رکھتے ہوئے ہم اس کام کو انجام دیں گے تو ان شاء اللہ تعالیٰ اس شریعت کے اندر اللہ تعالیٰ نے یہ صلاحیت رکھی ہے کہ یہ آنے والے ہر بڑے سے بڑے مسئلہ کا حل رکھتی ہے اور جب یہ تصور آپ کے سامنے رکھتے ہوئے جواب دیں گے تو ان شاء اللہ امت کے مسائل حل ہوں گے ...... جیسا کہ مجھ سے پہلے حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی مدظلہم نے فرمایا کہ عالم کا کام صرف یہ نہیں ہے کہ وہ یہ کہہ دے کہ یہ حرام ہے بلکہ اس کا کام یہ بھی ہے کہ اگر کسی چیز کو حرام کہا ہے اور لوگوں کو اس کی ضرورت ہے تو اس کا متبادل حلال طریقہ بھی بتائے۔

حضرت یوسف علیہ السلام کے واقعہ میں جب حضرت یوسف علیہ السلام سے خواب کی تعبیر پوچھی گئی کہ بادشاہ نے خواب دیکھا ہے کہ:

"انی اری سبع بقرات سمان یا کلھن سبع عجاف..."

جب یہ پوچھا تو یوسف علیہ السلام نے خواب کی تعبیر بعد میں بتائی کہ قحط آنے والا ہے لیکن اس قحط سے بچنے کا راستہ پہلے بتا دیا:

"تزرعون سبع سنین دابا... فما حصدتم فذروه فی سنبله..."

تعبیر تو بعد میں بتائی کہ قحط آنے والا ہے اور پہلے قحط سے بچنے کا یہ راستہ بتایا کہ سات سال تک خوب جم کر زراعت کرو، اور خوشہ کے اندر گیہوں کو چھوڑ دو۔ تو بچنے کا طریقہ پہلے بتا دیا اور خواب کی تعبیر بعد میں بتائی...... تو عالم کا کام محض حرام قرار دے کر ختم نہیں ہو جاتا، بلکہ متبادل راستہ بتانا بھی اس کی ذمہ داری ہے۔ اور یہ اکیڈمی درحقیقت اسی لیے قائم کی گئی ہے۔ اس کے لیے میں سمجھتا ہوں کہ دوسرے علوم وفنون کے ماہرین کی بھی ضرورت ہوگی۔ متبادل طریقوں کے سمجھنے اور اس کے تعین کے لیے وہ طریقے تجویز کیے جاسکیں جو قابل عمل ہیں۔

الحمدللہ! دیکھتا ہوں کہ مجمع الفقہ الاسلامی نے اس اصول کو مدنظر رکھتے ہوئے دیگر علوم وفنون کے ماہرین سے بھی استفادہ کا سلسلہ جاری کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے اپنی رحمت سے اس اکیڈمی کو اپنے مقاصد حسنہ میں کامیابی عطا فرمائے، قدم قدم پر اس کی نصرت ودستگیری فرمائے، اس کے راستے کی دشواریوں کو دور فرمائے اور دین کی صحیح خدمت کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

میں اخیر میں ایک بار پھر اس کانفرنس کے منتظمین کا اور تمام حاضرین کا تہِ دل سے شکر گزار ہوں کہ انہوں نے اس ناچیز کی گزارشات کو غور وتوجہ کے ساتھ سنا۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ان باتوں پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

وآخر دعوانا ان الحمدللہ رب العالمین

عالم اسلام کے اکابر علمائے کرام کے جدید فقہی مسائل پر مقالہ جات اور مناقشات کا مجموعہ نئی ترتیب کے ساتھ

سلسلہ
جدید فقہی مباحث

شریعت کے دائرہ میں انشورنس (تکافل) کی صورت

اسلامک فقہ اکیڈمی (انڈیا) کے اکیسویں فقہی سمینار منعقدہ مورخہ ۳ تا ۵ رمارچ ۲۰۱۲ء کو جامعہ اسلامیہ بنجاری اندور، مدھیہ پردیش میں پیش کیے گئے علمی، فقہی اور تحقیقی مقالات کا مجموعہ

پہلا باب: تمہیدی امور ⊂⊃ دوسرا باب: تفصیلی مقالات
تیسرا باب: مختصر تحریریں

تحقیقاتِ اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا

زیر سرپرستی

حضرت مولانا مجاہد الاسلام قاسمی
حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی دامت برکاتہم

دارالاشاعت
اردو بازار ○ ایم اے جناح روڈ ○ کراچی پاکستان

پیش لفظ

انسان جوں جوں صنعتی ترقی کے راستہ میں اپنا قدم بڑھاتا جاتا ہے، خطرات بھی بڑھتے جاتے ہیں، یہ بات انسان کی فطرت میں داخل ہے کہ وہ خطرات سے تحفظ چاہتا ہے اور اگر خطرہ سے بچنا اس کے ہاتھ میں نہ ہو تو اس کی خواہش ہوتی ہے کہ کم سے کم نقصانات کی تلافی اس کے لئے ممکن رہے، اس تقاضا کو سامنے رکھتے ہوئے انشورنس کا نظام وجود میں آیا، اگر یہ نظام باہمی تعاون کے جذبہ پر مبنی ہوتا تو یہ بہتر بات ہوتی؛ چنانچہ کتاب وسنت میں اس موضوع پر متعدد صورتیں ملتی ہیں، جن کی بنیاد تعاون باہمی پر ہے۔

یہ بدقسمتی ہے کہ سود کو تمام مذاہب میں حرام قرار دیا گیا ہے اور تورات میں بھی اس کے نادرست ہونے کی صراحت موجود ہے، مگر یہود کی سرشت میں مال کی بے حد حرص، اس سلسلہ میں حرام وحلال سے لاپرواہی اور خاص کر سود اور جوئے کے ذریعہ زیادہ سے زیادہ مال حاصل کرنے کی ہوس نے ان کو اس حکم سے دور کر رکھا ہے؛ چنانچہ آج مغربی ممالک کے بڑے بڑے بینک اور جوئے بازی کے مراکز ان ہی کے زیر سایہ چل رہے ہیں اور پوری دنیا میں انہوں نے سود اور جوئے کو فروغ دینے میں بنیادی کردار ادا کیا ہے۔

اسی کا ایک پہلو یہ ہے کہ جن کاموں کی بنیادی روح تعاون، انسانی مدد اور ہمدردی تھی، ان کو بھی انہوں نے سود اور قمار کی آلائش سے ناپاک کر کے چھوڑا ہے، ایسے ہی اداروں میں ایک انشورنس بھی ہے، انشورنس کے مروجہ نظام میں سود، قمار اور بعض دوسری اخلاقی خرابیاں پائی جاتی ہیں؛ اس لئے شرعاً وہ قابل قبول نہیں ہیں؛ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ موجودہ دور کی مشینی زندگی میں ایسے ادارے ایک ضرورت کا درجہ اختیار کر گئے ہیں، ان حالات میں ہمارا یہ کہہ دینا کافی نہیں کہ یہ انشورنس حرام اور ناجائز ہے؛ بلکہ اس کا متبادل پیش کرنا بھی ہماری ذمہ داری ہے۔

اللہ تعالی کا شکر ہے کہ علماء اسلام شروع سے اس بات کے لئے کوشاں ہیں کہ بینک اور انشورنس کمپنی جیسے اداروں کا اسلامی متبادل پیش کیا جائے؛ تاکہ مسلمان حرام سے بچ سکیں اور حلال طریقہ پر اپنی ضرورت پوری کر سکیں، انشورنس کے ایسے اسلامی متبادل کو علماء نے ''تکافل'' سے تعبیر کیا ہے؛ کیوں کہ انشورنس، یعنی تیقن دینا مخلوق کے ہاتھ میں نہیں ہے، انسان کا حادثات سے دوچار ہونا اور خطرات سے گزرنا خالق کے فیصلہ سے ہوتا ہے، نہ کہ مخلوق کے فیصلہ سے؛ لیکن ہاں یہ بات ممکن بھی ہے اور انسان سے مطلوب بھی ہے کہ وہ اجتماعی نظام کے تحت باہمی کفالت کا طریقہ اختیار کرے اور مصیبت کی گھڑی میں ایک دوسرے کے کام آئے، اسی لئے اس کو ''تکافل'' سے موسوم کیا گیا ہے۔

تکافل کے اس نظام کو علماء نے ''ہبہ'' یا ''وقف'' کے اصولوں پر مرتب کیا ہے اور اس بات کا بھی راستہ نکالا ہے کہ جمع شدہ رقم کے کچھ حصہ کی سرمایہ کاری کی جائے اور اس کو معطیان کے لئے نفع کا ذریعہ بنایا جائے، ہندوستان کے موجودہ قانون میں بمقابلہ بینکنگ کے انشورنس کو روبعمل لانے کی گنجائش زیادہ ہے، دوسری طرف یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ہندوستان کے علماء اس نظام کی عملی تشکیل کے طریقۂ کار سے زیادہ باخبر نہیں ہیں، ہوسکتا ہے کہ مستقبل قریب میں حکومت ہند اسلامک انشورنس کے فارمولہ کو قبول

کرلے، جیسا کہ "جنرل کارپوریشن آف انڈیا" نے مسلم ممالک میں ری انشورنس کو اسلامی اصولوں کے مطابق شروع کیا ہے اور یہ حقیر بھی اس کے شرعی اڈوائزری بورڈ کا ممبر ہے، پس کیا عجب ہے کہ مستقبل میں انشورنس کمپنیاں مسلمانوں کے جذبات کو دیکھتے ہوئے یا سرمایہ حاصل کرنے کی غرض سے اسلامی طریقۂ تکافل کو قبول کرلیں اور اپنے ادارہ میں اس کے لئے جگہ نکالیں، ایسے وقت میں بہت سے ایسے افراد کی ضرورت پڑے گی، جو اس اہم کام کو شریعت کی روح کے مطابق انجام دے سکیں۔

ان امور کو سامنے رکھتے ہوئے اسلامک فقہ اکیڈمی نے اسلام کے نظام تکافل کو اپنے اکیسویں سمینار کا موضوع بنایا اور مقام مسرت ہے کہ اس نئے اہم اور ہندوستان کے ارباب افتاء کے لئے نامانوس موضع پر اہل علم نے توقع سے زیادہ قلم اٹھایا اور گہرائی وگیرائی کے حامل بیش قیمت مقالات رقم فرمائے۔

اکیڈمی کے مجلّات کے منہج کے مطابق محب عزیز مفتی احمد نادر القاسمی (رفیق شعبۂ علمی) نے خوش اسلوبی کے ساتھ اسے مرتب کیا ہے، جو قارئین کے سامنے پیش ہے، امید ہے کہ یہ مجموعہ اس موضوع پر اردو زبان میں ایک منفرد لٹریچر کی حیثیت سے پڑھا جائے گا، فقہاء اور ارباب افتاء اور اسلامی معاشیات کے ماہرین دونوں اس سے استفادہ کرسکیں گے، دعا ہے کہ اللہ تعالی اکیڈمی کے دوسرے مجلّات کی طرح اس کو بھی قبول عام عطا فرمائیں اور اہل علم کو زیادہ سے زیادہ استفادہ کی توفیق میسر ہو۔

واللہ ولی التوفیق وہو المستعان۔

خالد سیف اللہ رحمانی

(جنرل سکریٹری اسلامک فقہ اکیڈمی، انڈیا)

۱۸ ربیع الاول ۱۴۳۴ھ / ۳۰ جنوری ۲۰۱۳ء

☆☆☆

جدید فقہی تحقیقات

پہلا باب تمہیدی امور

سوالنامہ:

شریعت کے دائرہ میں انشورنس (تکافل) کی صورت

انسان قدم قدم پر خطرات سے گھرا ہوا ہے، سترہویں صدی کے بعد دنیا میں جو صنعتی انقلاب آیا اور معاشی ترقی کے وسیع تر مواقع پیدا ہوئے، ان کی وجہ سے جہاں انسان کے لئے آسانیاں بڑھی ہیں، وہیں مشینی انقلاب نے خطرات میں بھی اضافہ کیا ہے، اگر ایک آدمی پیدل چل رہا ہو تو حادثہ کا خطرہ کم ہوتا ہے، اور اگر اسکوٹر سے چل رہا ہو تو اس سے زیادہ اور تیز رفتار سواری ہو تو حادثہ کا خطرہ اس سے بھی بڑھ جاتا ہے اور نقصان کا دائرہ بھی وسیع ہو جاتا ہے، یہی حال زندگی کے مختلف شعبوں میں ہے۔

انسان چاہتا ہے کہ ایسے خطرات سے اس کا تحفظ ہو اور اگر کوئی حادثہ پیش آئے تو معاشی اعتبار سے وہ قابل برداشت ہو، شریعت میں اس کی مثال ''قانون دیت'' ہے کہ سب سے بڑا مالی تاوان جو کسی انسان پر واجب ہو سکتا ہے، قتل کا خون بہا ہے، تنہا ایک شخص کے لئے اس کو برداشت کرنا آسان نہیں، اسی لئے شریعت نے خون بہا کی ذمہ داری میں اس کے رشتہ داروں کو بھی شریک رکھا ہے، موجودہ دور میں جان، مال، صحت اور مختلف ضرورتوں سے متعلق انشورنس کا آغاز دراصل اسی مقصد کے لئے ہوا ہے کہ جو خطرات انسان کے لئے تنہا قابل برداشت نہ ہو، اسے بہت سے لوگوں پر تقسیم کر دیا جائے؛ تاکہ ان میں سے کوئی بھی اگر اس صورت حال سے دوچار ہو تو اس کے لئے وہ ناقابل برداشت نہ ہو جائے۔

مگر افسوس کہ اس اچھے مقصد کو حاصل کرنے کے لئے اہل مغرب نے ایسا طریقہ کار وضع کیا، جس میں قمار وغیرہ تو پایا ہی جاتا ہے، بہت سی صورتوں میں ربا بھی شامل ہوتا ہے، اس لئے ضروری ہے کہ اس کا ایسا اسلامی متبادل پیش کیا جائے، جو ان مفاسد سے خالی بھی ہو اور اس اہم مقصد کو پورا بھی کرتا ہو، اس پس منظر میں آپ سے عرض ہے کہ اس اصول کے مطابق انشورنس یا عالم اسلام کی مروجہ تعبیر میں ''تکافل'' کی شرعی صورت کیا ہوگی، اس پر تفصیل سے روشنی ڈالیں، نیز ہندوستان میں قابل عمل صورت کی نشاندہی بھی کریں تو بہتر ہوگا۔

☆☆☆

اکیڈمی کا فیصلہ:

اسلامی تکافل

اسلامک فقہ اکیڈمی کے اکیسویں فقہی سمینار (۳-۵ / مارچ ۲۰۱۲ء) منعقدہ جامعہ اسلامیہ بنجاری اندور مدھیہ پردیش میں غور وخوض اور تبادلہ خیال کے بعد درج ذیل امور باتفاق رائے طے ہوئے:

انسانی زندگی خطرات سے گھری ہوئی ہے، خاص طور سے صنعتی انقلاب کے بعد جہاں معاشی ترقی کے وسیع تر مواقع پیدا ہوئے اور انسان کے لئے آسانیاں بڑھیں وہیں مشینی انقلاب نے خطرات میں بھی اضافہ کیا۔ انسان فطری طور پر چاہتا ہے کہ ممکنہ تدابیر واسباب کے ذریعہ ایسی پیش بندی کی جائے کہ خطرات سے ممکن حد تک اس کا تحفظ ہو، اور اگر کوئی حادثہ پیش ہی آجائے تو وہ اس کے لئے مالی طور پر ناقابل برداشت نہ رہے۔

شریعت اسلامیہ انسان کی اس فطری خواہش کو نظر انداز نہیں کرتی، بلکہ اسلام میں مستقبل کی پیش بندی اور ممکنہ خطرات سے تحفظ کی تدابیر کرنے کی پوری گنجائش موجود ہے۔ قرآن وحدیث میں اجتماعی تعاون، امداد باہم، اور تبرع وایثار کی واضح ہدایات موجود ہیں، شریعت میں خطرات کی تقسیم وتخفیف کا تصور بھی ملتا ہے، جس سے ایک فرد کا نقصان پوری جماعت میں تقسیم ہوجائے اور فرد کے لئے اس کو برداشت کرنا آسان ہوجائے۔

اسلامی تکافل کی بنیاد دراصل انہی تصورات پر قائم ہے، جس میں ہر شریک کے لئے بہتر مستقبل کی پیش بندی کی جاتی ہے، اور ممکنہ خطرات سے تحفظ کا سامان کیا جاتا ہے، اس بنا پر یہ سمینار محسوس کرتا ہے کہ تکافل کو مفاسد سے بچاتے ہوئے مضبوط شرعی بنیادوں پر مستحکم کرنے کی ضرورت ہے، تاکہ جو لوگ ان مقاصد کے حصول کے لئے مروجہ غیر اسلامی انشورنس کمپنیوں اور سود وقمار پر مبنی اداروں کی طرف رجوع کرتے ہیں، ان کو صحیح اسلامی متبادل فراہم کیا جائے۔

۱- تکافل کی سب سے بہتر اور شریعت کے اصول ومقاصد سے ہم آہنگ صورت یہ ہے کہ اس کی بنیاد خالصتاً تعاون پر ہو، اور ممبروں کے لئے سرمایہ کاری کے ذریعہ نفع حاصل کرنے کو اس کے ساتھ جوڑا نہ جائے۔

۲- اسلامی تکافل کی تشکیل کے لئے تین شرعی اساس موجود ہیں: ہبہ بالعوض، التزام بالتبرع یا وعدۂ ہبہ، اور وقف۔ مختلف قانونی احوال وظروف میں ان میں سے کسی کو اختیار کیا جاسکتا ہے۔

۳- تکافل کی مختلف صورتوں کے مروجہ طریقۂ کار کا جائزہ لینے اور اس سلسلہ میں تفصیلی ہدایات مرتب کرنے کے لئے اکیڈمی عنقریب ایک کمیٹی تشکیل کرے گی جس میں کم از کم پانچ علماء، نیز انشورنس، مالیات اور قانون سے متعلق تین ماہرین شامل ہوں، جو عمومی طور پر اس مسئلہ میں غور کریں اور ہندوستان کے قانون کے پس منظر میں بھی قابل عمل صورت کی نشاندہی کریں۔

۴- تکافل کی جو بھی صورت اختیار کی جائے یہ ضروری ہے کہ تمام امور کی نگرانی کے لئے انتظامی کمیٹی کے علاوہ ایک شرعی نگراں بورڈ بھی قائم کیا جائے جس کو تمام معاملات کے دیکھنے کا پورا اختیار ہو اور اس کا فیصلہ کمپنی کے لئے ہر حال میں واجب العمل ہو۔

۵- یہ سمینار اپیل کرتا ہے کہ مسلمانوں کو چاہئے کہ وہ مصیبت زدہ افراد کی اعانت کے لئے اوقاف قائم کریں، امداد باہمی کی انجمنوں کو وجود میں لائیں، اور مختلف اداروں، کمپنیوں اور پیشوں سے مربوط افراد باہمی تعاون کے ایسے نظام کو فروغ دیں کہ حادثات سے دوچار ہونے والے ساتھیوں کے نقصانات کی تلافی ہوسکے، اور معاونین اجر وثواب کے لئے اس کام کو انجام دیں۔

۶- اسلامک فقہ اکیڈمی حکومت ہند سے مطالبہ کرتی ہے کہ ربا وقمار سے پاک تکافل کمپنی اور مالیاتی ادارے کے قیام میں تعاون فراہم کرے اور قانونی رکاوٹوں کو دور کرے۔

☆☆☆

عرض مسئلہ :

اسلامی تکافل کے مسئلہ پر علماء کی آراء- تنقیح وتجزیہ

مولانا اختر امام عادل قاسمی [1]

اسلامی تکافل (یا اسلامی انشورنس) کے مسئلے پر عرض مسئلہ کی ذمہ داری حقیر کو دی گئی ہے، اس موضوع پر فقہ اکیڈمی کے توسط سے احقر کو کل ۲۶ علماء کرام اور مقالہ نگاروں کے مقالات موصول ہوئے، جن کے اسماء گرامی درج ذیل ہیں:

۱۔ مفتی محمد شاہجہاں ندوی (کیرالا) ۲۔ مولانا کلیم اللہ عمری مدنی (عمرآباد) ۳۔ مفتی محمد مقصود فرقانی (رامپور) ۴۔ مفتی محبوب علی وجیہی (رامپور) ۵۔ مولانا عبدالباسط پالنپوری (پٹن، گجرات) ۶۔ مفتی عبدالرحیم قاسمی (بھوپال) ۷۔ مفتی عبدالطیف پالنپوری (کاکوسی، گجرات) ۸۔ مولانا نثار احمد گودھراوی (گودھرا) ۹۔ مولانا ولی اللہ مجید قاسمی (بلیریا گنج) ۱۰۔ مفتی شیر علی (ترکیسر) ۱۱۔ مولانا محمد فرقان فلاحی (بھروچ) ۱۲۔ مولانا ابوجندل قاسمی (مظفرنگر) ۱۳۔ مولانا ابوسفیان مفتاحی (مئو) ۱۴۔ مولانا محمد نفیس خان ندوی (رائے بریلی) ۱۵۔ مولانا محمد عنایت اللہ رحیمی (کشمیر) ۱۶۔ مولانا عبدالرحمن خالیدوی (چھاپی) ۱۷۔ مولانا عبدالقیوم پالنپوری (کاکوسی، گجرات) ۱۸۔ مولانا سید اللہ ندوی (بھروچ) ۱۹۔ مفتی راشد حسین ندوی (رائے بریلی) ۲۰۔ قاضی ذکاء اللہ شبلی (اندور) ۲۱۔ مولانا عطاء اللہ قاسمی (مئو) ۲۲۔ مفتی عارف باللہ قاسمی (حیدرآباد) ۲۳۔ مولانا ظہیر احمد جامع العلوم کانپور ۲۴۔ مولانا عبدالعظیم اصلاحی (جدہ) ۲۵۔ ڈاکٹر محی الدین غازی (دبئی) ۲۶۔ اور راقم الحروف اختر امام عادل۔

اسلامی تکافل کے مسئلے کا تجزیہ کیا جائے تو یہاں کل چار مسئلے ہیں جن پر بحث کی ضرورت ہے، ان میں دو بنیادی ہیں اور دو ذیلی، بنیادی مسئلے یہ ہیں:

(۱) آج متبادل اسلامی تکافل کی ضرورت ہے یا نہیں؟

(۲) اگر ضرورت ہے تو اس کا صحیح طریقہ کار کیا ہوگا؟......

(۳) ضمنی مسئلہ ایک یہ ہے کہ اسلامی تکافل کے نام پر آج دنیا میں جو کمپنیاں کام کر رہی ہیں کیا وہ حقیقت میں شرعی خطوط پر چل رہی ہیں؟ سروے اور جائزہ......

(۴) اور دوسرا مسئلہ ہے: موجودہ ہندوستان میں اسلامی تکافل کمپنی کے امکانات کس حد تک ہیں؟ اور اس کے لئے کیا صورت اختیار کی جائے؟

۱۔ متبادل اسلامی انشورنس کی ضرورت:

اکثر مقالہ نگاروں کی رائے میں متبادل اسلامی انشورنس کی ضرورت ہے، جبکہ دو (۲) حضرات "مولانا عطاء اللہ قاسمی (اعظم گڑھ)، مولانا نثار احمد (گودھرا، گجرات)" کے نزدیک اس کی کوئی واقعی ضرورت نہیں ہے۔

مفتی شیر علی (ترکیسر، گجرات)، مولانا ابوسفیان مفتاحی (مئو)، قاضی ذکاء اللہ شبلی (اندور) کے نزدیک ہندوستان جیسے ملکوں میں مروجہ انشورنس کی اجازت ہے، اور مسلمانوں کے مسائل ومشکلات کا مداوا اس کے ذریعہ ہو سکتا ہے......

مفتی شیر علی صاحب نے اس کی چند بنیادوں کی طرف اشارہ کیا ہے:

۱۔ حکومت اور پبلک کے مابین سود کا تحقق نہیں ہوتا اور انشورنس کمپنیاں نیم سرکاری ہوتی ہیں۔

۲۔ اسی طرح غیر اسلامی ملکوں میں مسلم وغیر مسلم کے درمیان ربا نہیں ہوتا، اور اکثر کمپنیاں غیر اسلامی ہیں۔

[1] مہتمم جامعہ ربانی، منورا شریف، سمستی پور، بہار۔

۳۔ دو شریکوں کے مابین ربا نہیں ہے۔

۴۔ اس کا رواج ہو چلا ہے۔

۵۔ لوگوں کے لئے مجبوری ہے۔

مفتی ابوسفیان مفتاحی اور قاضی ذکاء اللہ شبلی صاحبان صرف بدرجۂ مجبوری اس کی اجازت دیتے ہیں۔ (البتہ یہ واضح نہیں کہ یہ تینوں اصحاب آج کے دور میں اسلامی تکافل کی ضرورت محسوس کرتے ہیں یا نہیں؟)

بہر حال یہ گفتگو ہمارے لئے خارج از بحث ہے، اس لئے کہ جمہور علماء نے عام حالات میں مروجہ تجارتی انشورنس کے عدم جواز پر اتفاق کیا ہے اور اس کے عدم جواز کی بنا پر ہی کسی جائز متبادل کی جستجو زیر بحث آئی ہے۔

مولانا عطاء اللہ قاسمی اور مولانا نثار احمد گودھراوی مروجہ انشورنس کو ناجائز سمجھتے ہیں، مگر اسلامی تکافل کے نام پر چلنے والی کمپنیوں کے بارے میں ان کو تشویش ہے، ان کے خیال میں دونوں کی زمین اور طریقۂ کار میں نام کے علاوہ کوئی خاص فرق نہیں ہے، نیز اسلامی تکافل کی بنیاد بالعموم نقود اور رقومات کے وقف پر رکھی گئی ہے، جبکہ صحیح قول کے مطابق جمہور علماء کے نزدیک نقود اور ایسی چیزوں کا وقف درست نہیں جس کی اصل کو باقی رکھتے ہوئے اس سے انتفاع ممکن نہ ہو (بدائع الصنائع ۵/۳۲۹، فتح القدیر ۵/۴۳۱)۔

مقالہ نگاروں نے عموماً ان اعتراضات کی طرف توجہ نہیں دی ہے، لیکن میرے نزدیک ان میں سے کوئی بھی بنیاد مضبوط نہیں ہے، جہاں تک زمین کی یکسانیت کا مسئلہ ہے تو مروجہ انشورنس کی حرمت کے قائلین بھی اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں کہ انشورنس کا آغاز پاک جذبہ کے تحت اور بہت سادہ صورت میں ہوا تھا، استحصالی اثرات بعد میں شامل ہوئے، اس لئے زمین کی یکسانیت سے کوئی فرق نہیں پڑتا،...... البتہ طریقۂ کار ضرور قابل بحث ہے، اگر کسی ایک یا چند کمپنیوں کے طریقۂ کار میں خامی ہو تو اس کی اصلاح کی جائے گی اور ہمارا یہ اجتماع اسی مقصد کے لئے بلایا گیا ہے، لیکن کسی ایک طریقۂ کار کے نقص کی وجہ سے سرے سے اصل شئی کی ضرورت وافادیت کا انکار کیا جاسکتا ہے اور نہ کسی صحیح طریقۂ کار کی یافت کا۔

نقود کا وقف:

رہ گیا نقود اور رقومات کے وقف کا مسئلہ تو فقہ حنفی میں اصل مذہب تو عدم جواز ہی کا ہے، اس لئے کہ وقف میں تابید اصل ہے، حضرت امام ابو یوسفؒ کا مشہور قول یہی ہے، شافعیہ اور حنابلہ کی بھی یہی رائے ہے، لیکن فقہاء حنفیہ میں حضرت امام محمدؒ نے اس کو عرف وتعامل پر محمول کیا ہے، یعنی اگر کسی شیء منقول کے وقف کا رواج ہو جائے تو اس کا وقف درست ہوگا، مثلاً قرآن کریم، ہتھیار اور جانور وغیرہ کا وقف معروف ہے اور بلاد روم میں دراہم ودنانیر کے وقف کا رواج تھا...... اور فتویٰ امام محمدؒ ہی کے قول پر ہے، امام زفرؒ کی بھی یہی رائے ہے اور ایک قول حضرت امام ابو یوسفؒ کا بھی یہی ہے (رد المحتار ۳/ ۳۷۴، ۳۷۵، فتح القدیر ۶/۲۱۹)۔

☆ مالکیہ کا مسلک بھی یہی ہے (الشرح الکبیر مع حاشیۃ الدسوقی ۴/۷۷، الخرشی ۷/۸)۔

☆ حنابلہ اور شافعیہ کا بھی ایک ایک قول اسی طرح کا ملتا ہے (مغنی المحتاج ۲/ ۳۷۷، المہذب ۱/ ۴۴۷، المغنی ۵/ ۶۴۰ بحوالہ الموسوعۃ الفقہیۃ کویت)۔

علامہ ابن عابدین شامیؒ نے اس موضوع پر اچھی گفتگو کی ہے اور تفصیلات کا احاطہ کرنے کی کوشش کی ہے، شامیؒ کے بقول یہی صحیح مسلک ہے اور اکثر مشائخ اور فقہاء حنفیہ نے اسی کو اختیار کیا ہے، دراہم ودنانیر کا انہوں نے خاص طور پر ذکر کیا ہے اور اس سلسلے میں ہونے والے شبہات کا دفاع کیا ہے، انہوں نے لکھا ہے کہ نقود متعین نہیں ہوتے، اس لئے اس کے کچھ حصہ کو سرمایہ کاری کے لئے استعمال کیا جاسکتا ہے، اس طرح اصل کو حکماً قائم رکھتے ہوئے اس سے نفع اٹھانا ممکن ہے......

ابن عابدینؒ نے اس غلط فہمی سے بھی پردہ اٹھایا ہے کہ دراہم ودنانیر کے وقف کے جواز کی رائے امام زفرؒ یا ان کے شاگرد انصاریؒ کی طرف منسوب ہے، ...... حقیقت یہ ہے کہ امام محمدؒ نے تعامل پر مسئلہ کی بنیاد رکھی اور چند چیزوں کا بطور مثال ذکر کیا، بعد کے لوگوں نے اس ضمن میں بعض دوسری چیزوں کو شامل کیا جن کے وقف کے رواج کا انہوں نے مشاہدہ کیا، امام زفرؒ نے اس میں دراہم ودنانیر کو شامل کیا، اس لئے یہ بات ان کی طرف منسوب ہوگئی، ورنہ امام محمدؒ کے تعامل کے ضمن میں ہر دور کی ہر وہ چیز شامل ہے جس کے وقف کا رواج ہو جائے اور حقیقۃً یا حکماً اصل کو باقی رکھتے ہوئے اس سے استفادہ ممکن ہو، صاحب ''البحر الرائق'' نے دراہم ودنانیر کے وقف کے جواز کا فتویٰ دیا ہے اور اس پر کسی کا اختلاف نقل نہیں کیا (حاشیۃ ابن عابدین ۳/ ۳۷۴، ۳۷۵)۔

مولانا عطاء اللہ صاحب تکافل کے بجائے غیر سودی مالی نظام کے استحکام کی سفارش کرتے ہیں، لیکن غالباً ان کو خبر ہوگی کہ جب پہلی بار سودی نظام کے مقابلہ میں غیر سودی مالیاتی نظام کا تصور پیش کیا گیا تھا تو اس وقت بھی علماء کرام کو یہی پریشانی پیش آئی تھی جو آج اسلامی تکافل کے لئے درپیش ہے۔

تکافل کی شرعی بنیادیں:

اکثر مقالہ نگاروں نے آج کے دور میں متبادل اسلامی تکافل کی ضرورت وافادیت کو تسلیم کیا ہے، جس کی وجوہات درج ذیل ہیں:

☆ اس کی بنیاد تعاون، امداد باہم اور ایک دوسرے کے کام آنے کے نیک جذبات پر ہے (اکثر مقالہ نگاروں نے اس بنیاد کو اجاگر کیا ہے)۔

☆ میثاق مدینہ کی متعدد دفعات میں جماعتی تکافل کی نظیریں موجود ہیں جس میں دیت کی ادائیگی، قیدیوں کی رہائی، قرض یا کمر توڑ اخراجات کے بوجھ سے دبے کچلے انسانوں کی امداد، ظلم وفساد کا دفاع وغیرہ مختلف مشکل مراحل کے لئے اجتماعی تعاون وتکافل کی بنیادیں ملتی ہیں، اسی طرح یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ اس کے لئے مذہب، خطہ، زبان یا پیشہ کسی بھی چیز کو شرکت کی اساس بنایا جاسکتا ہے (اختر امام عادل، مفتی عارف باللہ قاسمی)۔

☆ انشورنس کے تین بنیادی مقاصد، ۱۔ خطرات سے تحفظ اور ذہنی اطمینان، ۲۔ مصیبت کے وقت ایک دوسرے کا تعاون، ۳۔ مستقبل کے لئے احتیاطی تدابیر کی جڑیں شریعت اسلامیہ میں پہلے سے موجود ہیں (اکثر مقالہ نگار)۔

☆ نہد اسلامی تکافل کی بہترین نظیر ہے جو قبل از عہد نبوت سے جاری تھا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تحسین فرمائی ہے (اکثر مقالہ نگار)۔

☆ اسی طرح خود عہد نبوت میں ایک بار حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک سفر کے موقعہ پر اور ایک بار حضرت ابوعبیدہ ابن الجراح ؓ کے قصہ میں ایسی غیر معمولی نوبت آ گئی جس میں اجتماعی تکافل کی صورت اختیار کی گئی (مفتی عبدالرحیم قاسمی، اختر امام عادل بحوالہ بخاری شریف)۔

☆ ان کے علاوہ اور بھی کئی ذیلی بنیادیں موجود ہیں جن میں فی الجملہ خطرات کی تقسیم وتخفیف کا تصور ملتا ہے، مثلاً عاقلہ، قسامہ، عقد موالات، حلف، ولاء، عد وغیرہ (مفتی عبدالرحیم، اختر امام عادل وغیرہ)۔

☆ اسی طرح کسی عقد کے جواز کے لئے ضروری نہیں کہ وہ گذشتہ ادوار میں موجود رہا ہو، بلکہ صرف یہ کافی ہے کہ وہ مقاصد شریعت کے خلاف نہ ہو اور عام لوگوں کے لئے مفید ہو۔ (متعدد مقالہ نگار)۔

☆ اس عقد کی بنیاد تبرع پر ہے، اس لئے اس میں فی الجملہ جہالت اور غرر کی گنجائش ہے، (مولانا محمد نفیس خاں ندوی، اختر امام عادل) یوں بھی عقود میں صرف وہ جہالت مفسد عقد بنتی ہے جو باعث نزاع ہو (اختر امام عادل، بحوالہ بدائع الصنائع ۱۳/ ۹۵، تبیین الحقائق ۱۰/ ۲۳۸)، رہا یہ شبہ کہ جمع شدہ اقساط کے مقابلے میں کمپنی معاوضہ ادا کرتی ہے تو یہ عقد تبرع کہاں رہا؟..... تو یہ شبہ محض سطحی ہے، شریعت اسلامیہ میں متعدد ایسے عقود موجود ہیں جو اصلاً تبرع کے لئے ہونے کے باوجود معاوضہ کے معنی کی گنجائش رکھتے ہیں، مثلاً ہبہ اصلاً ایک تبرع ہے، لیکن اگر کوئی عوض کی شرط لگائے یا امید رکھے تو اس کی شرعاً گنجائش ہے، اسی طرح نہد بھی دراصل تبرعات کا اجتماعی تبادلہ ہے وغیرہ (اختر امام عادل)۔

☆ مروجہ تجارتی انشورنس اور تعاونی انشورنس میں بہت سے بنیادی فرق ہیں، اس لئے تجارتی انشورنس کے عدم جواز سے لازم نہیں آتا کہ تعاونی انشورنس بھی ناجائز ہو، کئی مقالہ نگاروں نے ان وجوہات فرق پر روشنی ڈالی ہے (مفتی محمد عنایت اللہ رحیمی کشمیری، اختر امام عادل، مولانا ولی اللہ مجید قاسمی، مولانا محمد فرقان فلاحی، مفتی محمد شاہجہاں ندوی، ڈاکٹر محی الدین غازی)۔

☆ اسی لئے بہت سے اسلامی اداروں اور اکیڈمیوں نے تعاونی انشورنس کے جواز کا فیصلہ کیا ہے، مثلاً: ''مجمع البحوث الاسلامیہ جامعہ ازہر'' بموقعہ اجلاس محرم ۱۳۸۵ھ، ''مجمع الفقہ الاسلامی مکہ مکرمہ'' بموقعہ اجلاس شعبان ۱۳۹۸ھ اور ''ہیئۃ کبار العلماء سعودی عرب'' بموقعہ اجلاس منعقدہ ریاض ربیع الثانی ۱۳۹۷ھ، ''دار العلوم کراچی'' بموقعہ اجتماع شوال ۱۴۲۳ھ وغیرہ (مولانا راشد حسین ندوی، مفتی عبدالرحیم قاسمی، ڈاکٹر محی الدین غازی، مولانا عبدالعظیم اصلاحی، اختر امام عادل وغیرہ)۔

۲۔ اسلامی انشورنس۔ ماہیت اور طریقۂ کار:

دوسرا مسئلہ اسلامی تکافل کی ماہیت اور طریقۂ کار کا ہے، (ا) ماہیت کا مطلب ہے تکافل کی بنیاد کس اصولی عقد پر رکھی جائے، مطلق تبرع، ہبہ بالعوض یا

وقف پر؟ (۲) اور طریقہ کار کا مطلب ہے کمپنی کا ڈھانچہ اور انتظامی اصول وضوابط۔

(۱) ماہیت:

پہلا مسئلہ یہ ہے کہ اسلامی تکافل کی نوعیت کیا ہے؟ اور اس کی تشکیل وتعمیر کس زمین پر کی جائے؟...... وقف یا ہبہ بالعوض پر؟...... ان میں سے کس کو اصل قرار دیا جائے؟...... یا اس کو مطلق تبرع پر مبنی عقد جدید مانا جائے؟

بہت سے مقالہ نگاروں نے اس پہلو سے تعرض نہیں کیا ہے، لیکن جن لوگوں نے اس کا اجمالی یا تفصیلی ذکر کیا ہے، ان میں سے زیادہ تر حضرات نے وقف کو بنیاد بنانے کی وکالت کی ہے، بعض مقالہ نگاروں نے تبرع کی ایک قسم ہبہ بالعوض پر بنیاد رکھی ہے، جبکہ کچھ نے مطلق تبرع کو اساس بنایا ہے اور اس کو عقد جدید قرار دیا ہے، بہت سے عرب علماء بھی اسی نقطۂ نظر کے حامل نظر آتے ہیں،...... میرے نزدیک تینوں بنیادیں اپنی جگہ درست ہیں اور ان تینوں کے مطابق تکافل کمپنی کی تشکیل کی جاسکتی ہے، لیکن نتائج اور مضمرات کے لحاظ سے تھوڑا فرق ہے، جس کی مختصر تفصیل یہ ہے:

وقف:

(۱) وقف کا مطلب یہ ہے کہ جمع شدہ سرمایہ کا ایک حصہ وقف قرار دیا جائے جو ہنگامی حالات اور حوادث وآفات کے لئے خاص ہو اور اس میں وقف کے قواعد وضوابط کے مطابق عمل کیا جائے،...... اس صورت میں وقف کے قانون کے مطابق زر اشتراک کی رقم پر شریک کا کوئی حق ملکیت نہیں رہے گا، تاہم اس سے حاصل شدہ منافع میں اس کا حصہ رہے گا...... دراصل وقف میں واقف کی تصریحات اور ارادوں کا خاص دخل ہوتا ہے، اسی طرح وقف سے خود استفادہ کی بھی پوری گنجائش ہوتی ہے، اس لئے ہر شخص کے لئے اپنے حصہ موقوفہ کی مالیت کے تناسب سے استفادہ کے دعویٰ کی گنجائش ہوگی،...... دعویٰ اس بات پر نہیں ہوگا کہ میں نے [illegible]ال وقف کیا ہے، اس لئے مجھے اس کا معاوضہ چاہئے (ورنہ شرعی اشکال پیش آئے گا)، بلکہ دعویٰ اس بات پر ہوگا کہ وقف اللہ پاک کی ملکیت ہے اور اس سے حسب دستور استفادہ کی شرعی اجازت ہے، اس لئے مجھے بھی استفادہ کا موقعہ ملنا چاہئے، بصورت دیگر وہ عدالت سے رجوع کرسکتا ہے کہ متولی حضرات اپنی ذمہ داری پوری نہیں کررہے ہیں، اس لئے عدالت ان سے بازپرس کرے۔

وقف ماننے میں سہولت یہ ہے کہ کئی مشکلات سے کمپنی محفوظ ہوجاتی ہے، اس لئے کہ تکافل فنڈ میں لوگوں کے نقصانات کی تلافی ان کے دیئے ہوئے تبرعات کی مقدار پر ہوتی ہے، کوئی بھی کمپنی یہ نہیں چاہتی کہ لوگ اپنے جمع کردہ سرمایہ سے زیادہ نفع اٹھائیں، اس لئے کہ اس صورت میں آمد وخرچ اور طلب ورسد کا توازن بگڑ سکتا ہے اور کمپنی کے دیوالیہ ہونے کا اندیشہ ہے، ...... اس صورت میں (جبکہ وقف کے بجائے محض تبرع پر عقد کی بنیاد رکھی جائے) یہ عقد تبرع کے بجائے عقد معاوضہ بن جائے گا اور پھر عقد معاوضہ کی ان تمام شرطوں کی تکمیل ضروری ہوگی، جن میں سے کسی ایک شرط کے فقدان سے بھی ربا، قمار، یا غرر وضرر لاحق ہوسکتا ہو...... لیکن وقف ماننے کے بعد اس طرح کی کوئی دشواری پیش نہیں آئے گی، اس لئے کہ وقف اللہ کی ملکیت ہے اور ہر مستحق کو اپنے نقصان کے تناسب سے استفادہ کا پورا حق ہے، دیگر تبرعات کے مقابلے میں وقف میں زیادہ توسع ہے۔

ہمارے جن مقالہ نگاروں نے وقف کے پہلو کو ترجیح دی ہے ان کے اسماء گرامی ہیں: (مفتی عبدالرحیم قاسمی، مفتی عنایت اللہ کشمیری، مولانا ولی اللہ مجید قاسمی، مولانا عبید اللہ ندوی، مولانا عبدالقیوم پالنپوری، مولانا محمد فرقان فلاحی، مولانا عبدالباسط پالنپوری، مولانا عبداللطیف پالنپوری) مولانا عبدالعظیم اصلاحی اور ڈاکٹر محی الدین غازی نے بھی اس کا بلا ترجیح ذکر کیا ہے۔

ان میں سے بیشتر حضرات نے حضرت مولانا مفتی تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم کے نقطۂ نظر سے استفادہ کیا ہے جو "فتاویٰ عثمانی، اسلام اور جدید معاشی مسائل"، یا عربی مقالہ "تأصیل التأمین التکافلی علی أساس الوقف" میں موجود ہے......

البتہ اس فنڈ کو مال وقف قرار دینے کی صورت میں ایک مشکل یہ پیش آئے گی کہ اگر کوئی شخص تکافل پالیسی میں شامل ہونے کے بعد اس سے علٰحدگی چاہے اور انشورنس ختم کرنا چاہے تو وقف فنڈ میں اس کی جمع کردہ رقم واپس نہیں ہوسکتی، گویا عمومی تکافل (یعنی املاک کے تکافل) کی صورت میں اسے کچھ بھی نہیں ملے گا اور زندگی کے تکافل میں صرف وہ رقم قابل واپسی ہوگی جو اس نے وقف کے علاوہ سرمایہ کاری کے لئے جمع کی ہوگی، کیونکہ کسی مال کے وقف کرنے کے بعد جمہور علماء کے نزدیک اس سے رجوع درست نہیں ہے، اگر کسی نے پالیسی لیتے وقت ہی بوقت ضرورت رجوع کی شرط لگادی تو اس صورت میں بھی

احناف، شوافع، حنابلہ و مالکیہ اکثر فقہاء کے نزدیک یہ شرط کالعدم ہوگی اور رجوع کا اختیار نہ ہوگا اور وقف درست ہو جائے گا، جبکہ بہت سے فقہاء کے نزدیک اس شرط کی وجہ سے وقف ہی درست نہ ہوگا (حاشیۃ ابن عابدین ۳/ ۳۶۰، فتح القدیر ۶/ ۲۲۹، ۲۳۰، الموسوعۃ الفقہیۃ ۴۴/ ۱۲۱)۔

اس اعتبار سے کمپنی کی قبولیت میں دشواری پیش آئے گی، اور عام آدمی واپسی کا دروازہ بند دیکھ کر اس میں سرمایہ لگانے سے کترائے گا، اس لئے کہ اس کو اپنا مال بظاہر ضائع ہوتا نظر آئے گا (سوائے ان لوگوں کے جو محض تعاون کے جذبہ سے شریک ہوں)......(مفتی عارف باللہ قاسمی)۔

ہبہ بالعوض:

(۲) اس کے بالمقابل دوسری رائے جس کا ذکر مقالہ نگاروں میں مفتی عارف باللہ قاسمی اور حقیر راقم الحروف نے کیا ہے اور شرق اوسط کے متعدد عرب علماء کے یہاں بھی اس کا ذکر ملتا ہے، وہ یہ کہ معاملہ کی بنیاد "ہبۂ مشروط" یا "ہبہ بالعوض" پر رکھی جائے اور فنڈ میں جمع شدہ تبرعات کو وقف کے بجائے مال موہوب قرار دیا جائے، جو اس شرط کے ساتھ مشروط ہو کہ ہبہ کنندہ کسی نقصان سے دوچار ہو یا جس مال کا انشورنس کرایا گیا ہے وہ خطرات سے دوچار ہو جائے تو اس کے خطرات کا تحمل کیا جائے گا اور اس کے سرمایہ کے تناسب سے نقصانات کی تلافی کی جائے گی،......اس صورت میں مناسب معاوضہ نہ ملنے کی صورت میں ہبہ کنندہ کو رجوع کا اختیار حاصل ہوگا۔

ہبہ بالعوض جمہور فقہاء (حنفیہ، مالکیہ، شافعیہ (قول اظہر کے مطابق) اور حنابلہ) کی رائے میں درست ہے اور اس کا ماٴخذ ایک حدیث پاک ہے:

"الرجل أحق بهبته ما لم يثب منها" (سنن دارقطنی ۷، ۲۷۷ حدیث نمبر ۳۰۱۴ ط وزارت اوقاف مصر)۔

(انسان اپنے ہبہ کا زیادہ حقدار ہے جب تک کہ اس کا معاوضہ نہ لے لے)۔

اس مضمون کی متعدد روایات کتب حدیث مثلاً: ابن ماجہ (۷/ ۳۱۰) مصنف ابن ابی شیبۃ (۶/ ۴۷۴)، مستدرک حاکم (۲/ ۵۲) اور سنن بیہقی (۶/ ۱۸۱) میں آئی ہیں۔

حضرت عمر فاروقؓ سے موقوفاً مروی ہے کہ: "من وهب هبة يرى أنه إنما أراد بها الثواب فهو على هبته يرجع فيها إذا لم يرض منها" (موطا امام مالک ۲، ۱۰۹۲ ط مؤسسة زائد بن سلطان، سنن بيهقی باب المكافأة في الهبة ۳۰، ۴۳۵ ط وزارة الاوقاف مصر، شرح مشکل الآثار للطحاوی ۲۲، ۱۳ ط مؤسسة الرسالة)۔ (جو شخص کسی کو کوئی چیز ہبہ کرے جس کا مقصد معاوضہ لینا ہو اور معاملہ اس کی مرضی کے مطابق نہ ہو تو وہ باہمی رضامندی کے ساتھ اپنا ہبہ واپس لے سکتا ہے)۔

رہا یہ کہ "ہبہ بالعوض" میں جمہور فقہاء کی رائے کے مطابق عوض کا معلوم ہونا ضروری ہے، اسلئے کہ ہبہ بالعوض نتیجہ کے اعتبار سے بیع ہے، البتہ امام احمدؒ کا ایک قول یہ ہے کہ عوض مجہول کی صورت میں بھی ہبہ درست ہے، یعنی عوض طے نہ ہو، لیکن بعد میں ملے ہوئے عوض پر اس کو اعتراض بھی نہ ہو، تو اس معاملہ کو درست قرار دیا جائے گا، اسی قول کو علامہ تقی الدینؒ نے نقل کیا ہے اور علامہ حارثیؒ نے اسی کو مذہب قرار دیا ہے (الانصاف ۷/ ۱۱۷، المغنی مع الشرح ۶/ ۲۹۹، ۳۰۲ بحوالہ الموسوعۃ الفقہیۃ ۴۲/ ۱۴۰)۔

جمہور کے مطابق اس مسئلہ کا حل یہ ہے کہ انشورنس کرانے والا ایک مخصوص مالیت پیش نظر رکھ کر ہی انشورنس کراتا ہے، جو اس کی جمع کردہ رقم کی روشنی میں تقریباً طے ہوتی ہے اور کمپنی اس کے نقصان کی تلافی اسی معیار کے مطابق کرتی ہے، یہ یک گونہ عوض کی تعیین ہے، اور اگر تھوڑی بہت جہالت ہو بھی تو اصلاً عقد تبرع ہونے کی بنیاد پر اس حد تک گنجائش نظر آتی ہے، جو کہ باعث نزاع نہ ہو...... یا پھر امام احمد بن حنبلؒ کے قول سے استفادہ کیا جائے، جس کو حارثی وغیرہ نے اصل مذہب قرار دیا ہے کہ موجودہ دور میں نظریۂ تکافل کی تشکیل کی بہرحال ضرورت ہے۔

☆ البتہ اس کا یہ حق رجوع اسی وقت تک قابل استعمال ہوگا جبتک کہ اس نے اپنی پالیسی سے استفادہ نہ کیا ہو، پالیسی سے استفادہ کا مطلب عوض پر قبضہ کرنا ہے اور عوض وصول کر لینے کے بعد حق واپسی ختم ہو جاتا ہے (مجلۃ الاحکام العدلیہ مادہ ۸۶۸)۔

☆ اسی طرح اگر خدانخواستہ کمپنی شدید خسارہ سے دوچار ہو جائے تو بھی وہ اپنی پالیسی ختم نہیں کر سکتا، اس لئے کہ مال پر کمپنی کا قبضہ قبضۂ امانت ہے اور تعدی کے بغیر امین پر ضمان واجب نہیں ہوتا، اس لئے یہ خسارہ سب کو ہی برداشت کرنا ہوگا (حوالہ بالا)۔

عقد جدید:

(۳) تیسری رائے جس کا ذکر ہمارے مقالہ نگاروں میں مولانا عبدالعظیم اصلاحی، ڈاکٹر محی الدین غازی اور راقم الحروف نے کیا ہے اور بہت سے عرب علماء نے اس کو اختیار کیا ہے اور عالم اسلام میں متعدد تکافل کمپنیاں اس تصور پر قائم ہیں: وہ یہ کہ تبرع کے اصول پر اس کو عقد جدید قرار دیا جائے، اس صورت میں معاملہ کی تصویر یہ ہوگی کہ وعدۂ ہبہ کی بنیاد پر تمام شرکاء زر اشتراک ادا کریں اور اس رقم سے انشورنس فنڈ تشکیل پائے، یعنی پالیسی خریدتے وقت پالیسی ہولڈر کی نیت یہ ہو کہ زر اشتراک اور اس کے منافع سے مستحق شرکاء کو زر تکافل ادا کرنے کے لئے جس قدر رقم کی ضرورت پڑے گی بس اتنی ہی ہبہ ہوگی باقی رقم اس کی اپنی ملک رہے گی......، گویا یہ معاملہ کئی عقود کا مجموعہ ہے اور تبرع، ہبہ، وعدۂ ہبہ اور مضاربت و شرکت) کی ترکیب سے ایک نئی صورت وجود میں آئی ہے، اور چونکہ یہ معاملہ شریعت کے کسی حکم یا اس کے مزاج و مذاق سے متصادم نہیں ہے، اس لئے اس کے جواز میں کسی کلام کی گنجائش نہیں ہے، (کیونکہ اشیاء میں اصل اباحت ہے، دیکھئے حقیر راقم الحروف کا مقالہ)۔

رہ گیا مطالبات اور ادائیگی کے توازن کا مسئلہ تو اس کا حل یہ ہے کہ انشورنس ہولڈر تبرع کی نیت سے سرمایہ جمع کرے گا اور تکافل کمپنی تبرع فنڈ کے قواعد وضوابط (جو تمام شرکاء کی مرضی سے بنائے جاتے ہیں) کے مطابق مطالبات کی تکمیل کرے گی......

بعض علماء اس تشریح سے مطمئن نہیں ہیں، دراصل وہ اس عقد جدید کو کلی طور پر کسی عقد قدیم کے معیار و اصول پر جانچتے ہیں، اس لئے ان کو کہیں نہ کہیں رکاوٹ پیش آتی ہے، لیکن اگر اس لحاظ سے دیکھا جائے کہ یہ ایک نیا معاملہ ہے جس کو عہد جدید نے نہد، ہبہ، اور دیگر تبرعات کے متوازی طور پر جنم دیا ہے اور نئے حالات میں اس کی ضرورت ہے، اس میں صرف اس قدر دیکھنا کافی ہے کہ معاملات کے بارے میں شریعت کا جو مزاج و مذاق ہے اس پر یہ اترتا ہے یا نہیں؟ اور قرآن وسنت اور اصول وکلیات سے اس کی کوئی بنیادی شق متصادم تو نہیں ہے؟ اور بس......، اس میں یہ دیکھنا کہ فلاں عقد کی شرائط پوری نہیں ہو رہی ہیں، ...... یہ کسی معاملہ کو جزئیہ کی روشنی میں دیکھنا ہے، جبکہ کسی بھی نئے معاملہ کو اصول وکلیات کی روشنی میں پرکھا جائے گا، نہ کہ جزئیات کی روشنی میں، فکر ونگاہ کے اسی فرق نے تشویش کی راہ بنائی ہے۔

البتہ اس صورت میں دشواری یہ ہے کہ وعدہ عام حالات میں جمہور فقہاء کے نزدیک لزوم کی بنیاد نہیں بنتا، فقہاء شافعیہ اور فقہاء حنابلہ کے نزدیک کبھی نہیں، فقہاء حنفیہ کے نزدیک صرف تعلیق کی صورت میں اور فقہاء مالکیہ کے نزدیک سبب سے مربوط ہونے کے وقت فی الجملہ یہ لزوم پیدا کرتا ہے، مسئلہ کتب فقہ میں معروف ہے (دیکھئے کشاف القناع ۶/ ۲۷۹، شرح منتہی الارادات ۳/ ۴۵۶، روضۃ الطالبین ۵/ ۳۹۰، الفتاوی البزازیۃ بہامش الہندیۃ ۶/ ۳، تحریر الکلام فی مسائل الالتزام للحطاب ۱۵۵ وغیرہ)۔

اگر شرکاء زر اشتراک جمع کرنے کے بعد اپنے وعدہ سے منحرف ہو جائیں اور تکافل فنڈ میں شرکت سے انکار کریں تو جمہور فقہاء (حنفیہ شافعیہ اور حنابلہ) کے مطابق محض وعدہ کی بنیاد پر اس کو مجبور نہیں کیا جاسکتا، اور نہ اس کی رقم بالجبر اس میں لگائی جاسکتی ہے، معاملہ خالص اخلاقی ہے، اس طرح کے اگر کئی کیس سامنے آجائیں تو کمپنی کے لئے دشواریاں کھڑی ہوسکتی ہیں، الا یہ کہ فقہ مالکی پر معاملہ کی بنیاد رکھی جائے، تو ایک قانونی خاکہ تیار ہوسکتا ہے۔

میری رائے میں تکافل کے لئے یہ تینوں بنیادیں شرعی طور پر درست ہیں، یعنی اس کو عقد جدید بھی مانا جاسکتا ہے اور عقود قدیمہ میں وقف یا ہبہ بالعوض کے تناظر میں بھی اس کو دیکھا جاسکتا ہے، لیکن ان تینوں صورتوں میں میرے نزدیک ہبہ بالعوض کو بنیاد بنانا زیادہ بہتر ہے، اور اس کی کئی وجوہ ہیں:

۱۔ یہ قدیم عربی طریقہ نہد سے زیادہ قریب ہے کہ دونوں میں تعاون کے تبادلہ کی روح کام کر رہی ہے۔

۲۔ کمپنی کی کامیابی، تحفظ اور قابل قبول ہونے کے امکانات اس صورت میں زیادہ ہیں۔

۳۔ مسئلہ کا شرعی حل ممکن ہے اور باہم معاملہ کے خطوط بھی متعین کئے جاسکتے ہیں۔

۴۔ یہ صورت اختلافات علماء سے بڑی حد تک محفوظ ہے وغیرہ۔

اسلامی تکافل کے انتظامی اصول وضوابط:

اس ضمن میں دوسری بحث کمپنی کے انتظامی ضوابط کی ہے،...... اکثر مقالہ نگاروں نے تکافل کو عقد تبرع قرار دیا ہے اور اس کے طریقۂ کار کو مروجہ تجارتی انشورنس سے مختلف بتایا ہے، اور ماہیت اور طریقۂ کار کا فرق ہی اس کو مروجہ انشورنس سے ممتاز کرتا ہے، متعدد مقالہ نگاروں نے عقد تبرع اور عقد معاوضہ کے فرق کو

بھی نمایاں کیا ہے، اکثر حضرات نے الفاظ کے فرق کے ساتھ کمپنی کی تشکیل کے لئے درج ذیل نکات کی نشاندہی کی ہے:

۱۔ معاملہ کی کوئی شق خلاف شرع نہ ہو۔

۲۔ فارم میں یہ صراحت کی جائے کہ یہ عقد تبرع ہے، اور میں یہ سرمایہ بطور تبرع جمع کر رہا ہوں جس کا مقصد مصیبت و پریشانی کے وقت پریشان حال ممبر کا تعاون کرنا ہے، جس میں وہ خود بھی شامل ہے (ہبہ بالعوض، وعدۂ ہبہ اور وقف کی صورتوں میں تعبیرات میں تھوڑا فرق ہوگا)۔

۳۔ فارم پر یہ بھی صراحت کی جائے کہ کمپنی جمع شدہ سرمایہ کی مالک نہیں ہوگی، بلکہ وہ بحیثیت وکیل باجرت یا بلا اجرت جملہ امور انجام دے گی، جس کے اخراجات کی ذمہ داری تمام شرکاء پر عائد ہوگی۔

۴۔ اجرت پر کام کرنے کی صورت میں اجرت کا متعین ہونا ضروری ہے، خواہ وہ تعین رقم کی صورت میں ہو یا حصۂ متناسبہ کی صورت میں، یہ اجرت فنڈ سے ادا کی جائے گی اور یہ بھی ضروری ہے کہ یہ اجرت اعمال مضاربت سے خارج کسی اور عمل پر ہو۔

۵۔ جمع شدہ سرمایہ ایسے بینکوں یا مالیاتی اداروں میں نہ رکھا جائے جہاں سودی یا غیر شرعی کاروبار ہوتا ہو۔

۶۔ جمع شدہ سرمایہ کا ایک حصہ وقف یا تبرع فنڈ میں محفوظ کیا جائے، جس سے حادثات اور خطرات کے وقت وقف، ہبہ یا فنڈ کے قواعد وضوابط کے مطابق اس کے سرمایے کے تناسب سے اس کے نقصان کی تلافی کی جائے۔

۷۔ باقی سرمایہ مضاربت کے شرعی ضوابط کے مطابق کسی جائز نفع بخش تجارت میں لگایا جائے، جس کے منافع اخراجات وضع کرنے کے بعد سالانہ یا ششماہی کے حساب سے تمام شرکاء پر ان کے سرمایے کے تناسب سے تقسیم کردیئے جائیں،

۸۔ وقف یا تبرع فنڈ کو بھی منجمد رکھنے کے بجائے کسی نفع بخش کاروبار میں لگایا جاسکتا ہے، تاکہ اس کے منافع سے نقصانات کی تلافی کی جاسکے۔

۹۔ مضاربت کی صورت میں کمپنی انتظامیہ سرمایہ کاری سے ہونے والے نفع کے متناسب متعین حصے کے بھی حقدار ہوسکتے ہیں، بشرطیکہ مضاربت اور اجارہ کی حدود علیحدہ علیحدہ واضح طور پر متعین ہوں، تاکہ اجارہ کے طور پر وہ صرف متعین اجرت کے حقدار ہوں اور مضاربت کے طور پر ہونے والے نفع میں سے متناسب حصہ کا حق رکھیں۔

۱۰۔ تبرع یا وقف فنڈ اور سرمایہ کاری کا الگ الگ اکاؤنٹ رکھا جائے۔

۱۱۔ کمپنی تمام معاملات میں دیانت وامانت کی پابند ہوگی، اور قدرتی آفات کے بغیر کسی کوتاہی یا زیادتی کی صورت میں خسارے کی ذمہ داری کمپنی کی انتظامیہ پر عائد ہوگی، جو اس کی تنخواہ یا منافع سے وصول کیا جائے گا، عام شرکاء اس کے ذمہ دار نہ ہوں گے، البتہ قدرتی آفات یا بلا تعدی خسارے کی صورت میں تمام شرکاء اپنے اپنے سرمایہ کے تناسب سے اس خسارے کو پورا کریں گے۔

۱۲۔ بہتر ہے کہ ایک احتیاطی کی مد بھی رکھی جائے، جو ہنگامی حالات میں کمپنی کے لئے معاون ثابت ہو۔

۱۳۔ پالیسی خریدنے کے بعد ہر شریک کو وقف یا تبرع فنڈ سے صرف اس وقت تک علٰحدگی کا حق ہوگا جب تک کہ اس نے کمپنی سے اپنے نقصان کا معاوضہ وصول نہ کیا ہو، البتہ سرمایہ کاری فنڈ سے واپسی حسب معاہدہ باہم رضامندی سے کسی بھی وقت درست ہوگی اور اس کا سرمایہ اس کے منافع کے ساتھ واپس کیا جائے گا۔

۱۴۔ شرکاء کو اس بات کی ضمانت دی جائے کہ حادثہ پیش آنے کی صورت میں لازمی کارروائی کے بعد بغیر ٹال مٹول کے معاوضہ ادا کیا جائے گا۔

۱۵۔ بعض حضرات نے رائے دی ہے کہ اس کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے، عمومی تکافل، اور فیملی تکافل:

الف۔ عمومی تکافل میں اثاثہ جات جیسے گاڑی، مکان ودکان، جہاز، کارخانہ وغیرہ کو ممکنہ خطرات سے نمٹنے کے لئے رکنیت فراہم کی جائے۔

ب۔ اور فیملی تکافل میں انسانی زندگی کو پیش آنے والے متوقع خطرات سے نمٹنے کے لئے تکافل کی رکنیت فراہم کی جائے (مولانا محمد فرقان فلاحی)۔

۱۶۔ بعض حضرات کی رائے ہے کہ کمپنی کا نام بھی بدل دینا چاہیے، تاکہ مروجہ غیر اسلامی انشورنس سے ابہام پیدا نہ ہو (مولانا عبید اللہ ندوی، مولانا فرقان فلاحی)۔

۱۷۔ کمپنی کے خسارے کی صورت میں کمپنی ایسے اداروں سے مدد یا قرض لے سکتی ہے جن کا کاروبار نا جائز اور حرام نہ ہو، حتی الامکان ایسے اداروں سے تعامل کرنے سے گریز کرے جہاں غیر شرعی کاروبار ہوتا ہے، جیسا کہ بالعموم مروجہ انشورنس کمپنیاں کرتی ہیں، مناسب ہے کہ ایسی اعادۃ التکافل کمپنیاں قائم کی جائیں جو ضرورت کے وقت ایک دوسرے کی مدد کریں۔

۱۸۔ تکافل سے جڑے جتنے مخصصات ہیں اور جو سابقہ بچت جمع ہوتی رہی ہے، کمپنی کو تحلیل کرتے وقت سب خیراتی مدوں میں تقسیم کردیا جائے (ڈاکٹر محی الدین غازی)۔

۱۹۔ تمام امور کی نگرانی کے لئے انتظامی کمیٹی کے علاوہ ایک شرعی نگراں بورڈ بھی مقرر کیا جائے، جس کو تمام معاملات کے دیکھنے کا پورا اختیار ہو اور اس کا فیصلہ کمپنی کے لئے ہر حال میں قابل قبول ہو۔

۲۰۔ قانونی ماہرین کی بھی ایک ٹیم ہو جو مختلف محاذوں پر کمپنی کو درپیش چیلنجوں کا مقابلہ کر سکے اور مسابقتی میدان میں آگے بڑھنے کی منصوبہ بندی کر سکے۔

۳۔ تکافل کمپنیوں کا سروے اور جائزہ:

موضوع سے متعلق علمی بحث یہیں پر ختم ہو جاتی ہے، لیکن ضمنی طور پر یہاں دو چیزیں اور بھی قابل بحث ہیں، ایک ہے اسلامی تکافل کے نام پر چلنے والی قومی یا بین الاقوامی کمپنیوں کا سروے اور ان کے طریقۂ کار کا جائزہ، یہ اسلامی تکافل کمپنی کی تشکیل و تعمیر میں رہنما خطوط کا کام دے گا، ہمارے کسی مقالہ نگار نے اس طرح کا کوئی سروے پیش نہیں کیا ہے، لیکن متعدد مقالہ نگاروں نے اسلامی تکافل کے نام پر چلنے والی کمپنیوں کے بارے میں اپنے عدم اطمینان کا اظہار کیا ہے، فقہ اکیڈمی کی طرف سے عرب علماء کے جو مقالات مندوبین کو ارسال کئے گئے تھے، ان میں بھی بعض علماء نے اپنی اس تشویش کا برملا اظہار کیا ہے،...... بعض مقالہ نگاروں کے انداز بیان سے جھلکتا ہے کہ وہ اسلامی تکافل کی مخالفت نہیں کرتے، بلکہ طریقۂ کار کی وضاحت و شفافیت چاہتے ہیں، اس لئے مناسب ہوگا کہ فقہ اکیڈمی اپنے ذرائع سے مطالعاتی سروے پر توجہ دے اور علماء اور ماہرین کے سامنے تفصیلی رپورٹ پیش کرے، یہ اسلامی تکافل کمپنی کے قیام کے لئے بہت مفید ثابت ہوگا۔ انشاء اللہ۔

۴۔ ہندوستان میں اسلامی تکافل کمپنی کے قیام کے امکانات:

دوسری چیز ہے ہندوستان میں اسلامی تکافل کے قیام کے امکانات، اکثر مقالہ نگار اس سلسلے میں خاموش ہیں، البتہ مولانا فرقان فلاحی نے اس تعلق سے خاموشی توڑی ہے، مولانا فلاحی نے ریڈیف میل کی ایک خبر (09_07_05) کے حوالہ سے لکھا ہے کہ اب ریزرو بینک آف انڈیا بھی ہندوستانی بینکوں میں اسلامک بینکنگ کی راہ ہموار کرنے کا مشتاق ہے، نیز L.I.C بھی تکافل سے متعلق تیاریاں کر رہی ہیں، چنانچہ L.I.C کا نیا انٹرنیشنل وینچر Saudi Insurance Company_Indo ہندوستان میں تکافل کی خدمات متعارف کروانے والا پہلا ادارہ ہوگا، اس کے بعد محترم موصوف نے مختلف ملکی، بین الاقوامی، حکومتی، تعلیمی اور عوامی سطح پر اسلامی تکافل کے امتیازات و خصوصیات کو مہم کے طور پر پیش کرنے کی تجویز دی ہے کہ اس سے مسئلہ کا تعارف ہوگا، کمپنی کے قیام میں مدد ملے گی اور لوگوں کے رجحانات میں استحکام پیدا ہوگا۔

☆ مولانا راشد حسین ندوی چھوٹی سطح سے کام شروع کرنے کو کہتے ہیں اور آہستہ آہستہ اس کی توسیع کی سفارش کرتے ہیں۔

☆ مفتی شاہجہاں ندوی بھی ہندوستان میں اس کام کے آغاز کے لئے پر امید ہیں اور اس کو مضاربت کے شرعی اصول پر فروغ دینے کے قائل ہیں۔

☆ مولانا عبدالعظیم اصلاحی نے تکافل کے ویب سائٹ اور اس موضوع پر مطبوعہ عربی و انگریزی مواد سے استفادہ کرنے کی رائے دی ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ جب ساری دنیا میں اسلامی مالیاتی ادارے اور بینک کامیابی کے ساتھ چل سکتے ہیں تو اسلامی تکافل کا قیام کیوں مشکل ہوگا؟ متعدد ملکوں میں اس کے تجربات ہو رہے ہیں، ہمیں یقین ہے کہ ہندوستان جیسے ملکوں میں بھی یہ تجربہ کامیاب ثابت ہوگا، انشاء اللہ، مناسب ہوگا کہ فقہ اکیڈمی کچھ مالیاتی اداروں کو اس کے لئے آمادہ کرے اور وہ علماء اور ماہرین کے مشورہ سے تکافل کمپنی کے قیام کی کوشش کریں، اللہ پاک آسان فرمائے آمین۔

☆☆☆

جدید فقہی تحقیقات

دوسرا باب تفصیلی مقالات

تکافل (اسلامی انشورنس) پس منظر، ضرورت، اسلامی طریقہ کار

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی

ناظم المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد، وجنرل سکریٹری اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا۔

انسان ایک عاجز مخلوق ہے، اسے بہت سے ایسے واقعات اور حادثات سے گزرنا پڑتا ہے، جو اس کے لئے تکلیف دہ اور ناگوار خاطر ہوا کرتے ہیں، وہ چاہتا ہے کہ ایسے خطرات اور اندیشوں سے اس کو امن حاصل ہو، یا کم سے کم اس کی تلافی کی صورت ہو، مثلاً اس کے گھر میں آگ لگ جائے، اس کا اسٹیمر ڈوب جائے، اس کی گاڑی کا ایکسیڈنٹ ہوجائے، وہ ایسے حادثہ سے دوچار ہوجائے، جس سے اس کے کام کرنے کی صلاحیتیں متاثر ہوجائیں، تو کوئی ایسی شکل موجود ہو کہ اس کی دشواریاں کم ہوجائیں اور اس کے نقصان کا مکافات ہوسکے، بعض دفعہ انسان کو اپنے متعلقین کی فکر دامن گیر ہوتی ہے، مثلاً یہ کہ اگر میری موت واقع ہوجائے تو میرے بچوں کی گزربسر کیسے ہوگی؟ انسان چاہتا ہے کہ وہ ایسے پرخطر اوقات کے لئے کوئی پیش بندی کرلے۔

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ صنعتی ترقی اور مشینی وسائل نے انسان کو سہولت تو بہت پہنچائی ہے؛ لیکن اس کے ساتھ ساتھ اسی نسبت سے خطرات میں بھی اضافہ کیا ہے، انسان اپنے ہاتھ سے جو کام کرتا ہے، اس کی رفتار اس کے قابو میں ہوتی ہے، مشین کے ذریعہ جو کام انجام پاتا ہے، اس کی نوعیت یہ نہیں ہوتی ہے، مثلاً ایک شخص تیز دوڑ رہا ہو اور آگے کوئی کھائی نظر آجائے تو وہ چشم زدن میں اپنے آپ کو روک سکتا ہے؛ لیکن اگر وہ تیز رفتار موٹر چلا رہا ہو اور اچانک ایک فرلانگ کے فاصلہ پر کھائی نظر آئی تو اتنی جلدی وہ اپنی گاڑی کو کنٹرول نہیں کرسکتا، یہ محض ایک مثال ہے، ورنہ تو زندگی کے تمام شعبوں میں انسانی عمل اور مشینی عمل کا یہ فرق بالکل واضح ہے، خطرات جس قدر بڑھتے ہیں، اسی قدر ان کے سدباب کی ضرورت بھی بڑھتی جاتی ہے۔

انشورنس کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ جو خطرات افراد واشخاص کے لئے قابل برداشت نہ ہوں، ان کو اس قدر تقسیم کردیا جائے کہ وہ لوگوں کے لئے قابل برداشت ہوجائے، مثلاً اگر گاڑی سے ایکسیڈنٹ ہوجائے اور ڈرائیور کو دس لاکھ روپے ہرجانہ ادا کرنے کو کہا جائے تو شاید وہ اسے زندگی بھر میں ادا نہ کرسکے؛ لیکن اگر ایک لاکھ افراد ڈرائیور کے پیشہ سے جڑے ہوئے ہوں اور ایک معاہدہ کے تحت ایسے موقع پر ہر ڈرائیور دس روپے ادا کردے تو اتنی رقم کا ادا کرنا کسی کے لئے بھی بار خاطر نہ ہوگا، انشورنس کا اصل مقصد یہی ہے۔

اسلام اور انشورنس کے بنیادی مقاصد:

غور کیا جائے تو اپنے بنیادی مقصد کے اعتبار سے انشورنس اسلام کے ''نظام تکافل'' کے عین مطابق ہے، اور کتاب وسنت میں اس کی مختلف نظیریں موجود ہیں، بعض کا ذکر یہاں مناسب ہوگا۔

۱۔ اسلام میں کسی شخص سے متعلق جتنے واجبات ہیں، ان میں سب سے گراں قدر دیت (خون بہا) ہے، شریعت میں دیت کا اصول یہ ہے کہ اس کی ادائیگی تنہا مجرم پر نہیں ہوگی؛ بلکہ اس کے عاقلہ رشتہ دار مل کر اسے ادا کریں گے، بظاہر اس کی دو مصلحتیں ہیں: ایک یہ کہ ایک بھاری ہرجانہ کی ادائیگی عام افراد کے بس سے باہر ہوتی ہے تو اس کے لئے تعاون کا ایک راستہ موجود رہے، دوسرے: جب دیت ادا کرنے میں تمام لوگ شریک ہوں گے تو سب لوگ مل کر جرم کو روکنے کی کوشش بھی کریں گے، دیت صرف قتل عمد پر ہی واجب نہیں ہوتی؛ بلکہ قتل خطا پر بھی واجب ہوتی ہے، اسی طرح ایک متوقع خطرہ کی تلافی کو

بہت سے ایسے افراد پر تقسیم کردیا گیا ہے کہ اس کی ادائیگی نا قابل تحمل باقی نہ رہے، انشورنس کا بھی بنیادی منشا یہی ہے، حضرت عمرؓ نے اس میں مزید وسعت برتتے ہوئے رشتہ داروں کی بجائے اسے ''اہل ارزاق'' اور ''اہل دیوان'' کے دوگروپ بنادیئے، اہل دیوان سرکاری اور فوجی ملازمین تھے، اور اہل ارزاق وہ فقراء تھے جن کو ان کی غربت کی وجہ سے وظیفہ دیا جاتا تھا؛ چنانچہ احناف نے اسی سے اخذ کرتے ہوئے کہا ہے کہ ایک پیشہ کے لوگ باہم ایک دوسرے کے ''عاقد'' ہوں گے:

''لو كان اليوم قوم تناصرهم بالحرف فعاقلتهم أهل الحرفة'' (هدايه ۴،۳۶۰)۔

اس میں مزید سہولت ہے؛ کیونکہ ایک پیشہ کے لوگ ایک طرح کے خطرہ سے دوچار ہوتے ہیں؛ اس لئے وہ زیادہ خوش دلی کے ساتھ اس میں حصہ لے سکتے ہیں۔

۲۔ رسول اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''من ترك دينا أو ضياعاً فليأتني فأنا مولاه'' (صحيح البخاري: كتاب الكفالة؛ باب الدين حدیث نمبر: ۲۱۷۶)۔ (جو دین یا قابل پرورش لوگوں کو چھوڑ جائے تو میرے پاس آئے، اس کی ذمہ داری مجھ پر ہے)۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات امیر وفرمانروا کی حیثیت سے فرمائی ہے، اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اسلامی مملکت کا بیت المال ایسی ضرورتوں کو پوری کرنے کا ذمہ دار ہوگا۔

ایک اور روایت میں یہ مضمون زیادہ وضاحت کے ساتھ منقول ہے: ''فأيما مؤمن مات وترك مالا فليرثه عصبته من كانوا، ومن ترك دينا أو ضياعاً فليأتني فأنا مولاه'' (صحيح البخاري: كتاب الاستقراض؛ باب الصلاة على من ترك دينا: ۲۲۶۹)۔ (لہذا جس مؤمن کا انتقال ہوجائے اور وہ ترکہ میں مال چھوڑے تو وہ اس کے عصبہ وارثین کے لئے ہے، اور جو قرض کو یا قابل پرورش لوگوں کو چھوڑ جائے تو میرے پاس آئے، میں ان کا ذمہ دار ہوں)۔

۳۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''أيما أهل عرصة أصبح فيهم امرؤ جائع فقد برئت منهم ذمة الله'' (مسند احمد عن ابن عمر ۲،۲۳، حدیث نمبر: ۲، ۴۳۳)۔ (جس آبادی کے لوگوں میں کسی شخص کی صبح اس طرح ہو کہ وہ (رات کو) بھوکا رہا ہو تو ان سے اللہ تعالیٰ کا ذمہ بری ہے)۔

۴۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یمن کے قبیلہ اشعر کی تحسین کرتے ہوئے ان کی اس خوبی کا ذکر فرمایا کہ سفر ہو یا حضر، جب ان کا کھانا کم پڑجاتا ہے تو سب لوگ اپنی غذائی اشیاء کو اکٹھا کرلیتے ہیں اور تمام لوگوں کی ضرورت اجتماعی طریقہ پر پوری کی جاتی ہے، روایت کے الفاظ اس طرح ہیں: ''إن الأشعريين من إذا أرملوا في الغزو، أو قل طعام عيالهم في المدينة، جمعوا ما كان عندهم في ثوب واحد، ثم اقتسموه بينهم في إناء واحد بالسوية، فهم مني، وأنا منهم'' (صحيح البخاري، كتاب الشركة، باب في الطعام والنهد والعروض، حدیث نمبر: ۲۳۵۴)۔ (اشعری لوگوں کا سفر میں جب توشہ ختم ہوجاتا ہے یا مدینہ میں انہیں کھانے کی تنگی ہوتی ہے تو وہ سب کے پاس کا غلہ ایک کپڑے میں جمع کرتے ہیں، پھر اسے ایک پیالہ سے برابر برابر تقسیم کرلیتے ہیں، وہ مجھ سے ہیں، میں ان سے ہوں)۔

اس میں بھی آپ نے جس طریقۂ کار کی تعریف کی، وہ یہی اجتماعی کفالت کا طریقہ ہے۔

۵۔ مشہور واقعہ ہے کہ حضرت ابوعبیدہؓ کی امارت میں ایک سریہ کسی مہم پر گیا ہوا تھا، ایک مرحلہ ایسا آیا کہ جس میں غذائی اشیاء نہایت قلیل مقدار میں باقی رہ گئیں، حضرت ابوعبیدہؓ نے اس موقع پر تمام لوگوں کے پاس موجود خوردنی اشیاء جمع کیں اور ان کے ذریعہ اجتماعی طور پر لوگوں کے کھانے کا نظم کیا گیا، یہاں تک کہ بعد میں ان حضرات کو ایک بڑی مچھلی مل گئی، جس کو اس زمانہ میں سمک عنبر سے تعبیر کیا جاتا تھا۔ عجب نہیں کہ وہ وہیل مچھلی رہی ہو۔ کافی دنوں تک مجاہدین اسی سے اپنی غذائی ضرورت پوری کرتے رہے، روایت کے الفاظ اس طرح ہیں:

''فأنزل أبو عبيدة بأزواد ذلك العيش، فجمع ذلك كله، فكان مزدوى تمر، فكان يقوتنا كل يوم قليلاً قليلاً حتى فني...'' (صحيح البخاري: باب غزوة سيف البحر: ۴۱۰۲)۔

ان دونوں واقعات میں اجتماعی کفالت کا طریقہ اختیار کیا گیا ہے اور یہی انشورنس کا بھی بنیادی مقصد ہے۔

۶۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''إن المسألة لا تحل إلا لأحد ثلاثة، رجل تحمل حمالة فحلت له المسألة حتى

يصيبها ثم يمسك، ورجل أصابته جائحة اجتاحت ماله فحلت له المسألة حتى يصيب قواماً من عيش، أو قال: سداداً من عيش. . . '' (مسلم: ۱۷۳؛ کتاب الزکوۃ باب من تحل له المسألة، حدیث نمبر: ۲۴۵۱، مسند احمد)۔ (سوال کرنا تین ہی آدمیوں کے لئے جائز ہے، ایک وہ شخص جس نے کوئی ذمہ داری قبول کی تو اس کے لئے اس ذمہ داری کو پوری کرنے کی حد تک سوال کرنا جائز ہے، پھر اس کے بعد وہ اس سے رک جائے، دوسرے وہ شخص جس کو کوئی آفت آ گئی ہو اور اس کا مال اس کا شکار ہو جائے، تو اس کے لئے سوال کرنا جائز ہے؛ تا آں کہ اسے زندگی باقی رہنے کے بقدر بقاء زندگی حاصل ہو جائے......)۔

اس حدیث میں بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اجتماعی کفالت کا تصور دیا ہے۔

۷۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ قرآن مجید نے زکوۃ کا ایک مصرف ''غارمین'' کو قرار دیا ہے، اور غارمین سے بعض اہل علم کے نزدیک وہ لوگ مراد ہیں جو آسمانی اور زمینی آفتوں سے دوچار ہوں؛ چنانچہ امام مجاہدؒ سے منقول ہے:

''ثلاثة من الغارمين: رجل ذهب السيل بماله، ورجل أصابه حريق فذهب بماله، ورجل ذهب له عيال وليس له مال فهو يدان وينفق على عياله'' (مصنف ابن ابی شیبہ ۲،۲۱۷، کتاب الزکوة، باب ما قالوا فی الغارمین؛ حدیث نمبر: ۱۰۶۶۰)۔ (غارمین میں تین لوگ شامل ہیں: ایک وہ شخص جس کا مال سیلاب میں بہہ گیا ہو، دوسرے: وہ شخص جس کا مال نذر آتش ہو گیا ہو، تیسرے: وہ شخص جس کے زیر پرورش کئی لوگ ہوں اور اس کے پاس مال نہ ہو تو اسے قرض دیا جائے گا اور اس کے زیر پرورش لوگوں پر خرچ کیا جائے گا)۔

یہ مختلف احادیث اس بات کو واضح کرتی ہیں کہ شریعت اسلامی اس بات کو پسند نہیں کرتی کہ پریشان حال شخص کو تنہا چھوڑ دیا جائے اور اس کی پریشانی کو دور کرنے کے لئے سماج اپنا کردار ادا نہ کرے؛ بلکہ اسلام انفرادی ملکیت کو تسلیم کرنے کے ساتھ ساتھ ایسے موقعوں پر اجتماعی کفالت کی بھی دعوت دیتا ہے؛ تاکہ غیر معمولی حالات کا مل جل کر مقابلہ کیا جائے، اسلامی حکومت میں چونکہ بیت المال اجتماعی کفالت کی ضرورت کو پورا کرتا تھا، مقررہ واجبات کے علاوہ وہ خصوصی ٹیکس بھی عائد کرنے کا مجاز تھا؛ اس لئے اس کے لئے کسی الگ ادارے کی ضرورت نہیں تھی؛ لیکن ایسا لگتا ہے کہ بعد کو چل کر لوگوں نے اس مقصد کے لئے گروپ اور ادارے قائم کرنے شروع کر دیئے، جس کو علامہ ابن عابدین شامی (متوفی: ۱۲۵۲ھ) کے زمانہ میں ''سوکرہ'' سے تعبیر کیا جاتا تھا، اس کی صورت یہ تھی کہ سمندری تجارت میں کشتی کے ڈوبنے، آگ لگنے، یا سمندری قزاقی کے واقعات پیش آنے کی نوبت آتی رہتی تھی؛ چنانچہ بحری تاجروں نے ایک طریقہ یہ اختیار کیا کہ جب کسی سے کشتی کرائے پر لیتے تو کرایہ کے علاوہ ''سوکرہ'' کے نام سے ایک اور رقم بھی اسے ادا کرتے، اس رقم کے بدلے کشتی کا مالک اس کی ذمہ داری قبول کرتا کہ اگر اس کشتی کا مال ضائع ہو جائے گا تو وہ اس کی تلافی کرے گا؛ چنانچہ کشتی والے کا نمائندہ اس شہر میں موجود ہوتا، جہاں کرایہ پر کشتی حاصل کی گئی تھی اور وہ اس رقم کو ادا کرتا تھا۔ علامہ شامی کی بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ اس صورت میں ربا پایا جاتا ہے؛ بلہذا اگر یہ اسلامی ملک میں ہو تو جائز نہیں اور اگر دار الحرب میں اس کا لین دین ہو تو چونکہ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک دار الحرب میں ربا اور عقود فاسدہ کے ذریعہ حربی کا مال لینا جائز ہے؛ اس لئے وہاں اس کی گنجائش ہو سکتی ہے (تفصیل کے لئے دیکھئے: رد المحتار، باب المستأمن)۔

مروجہ انشورنس کا حکم:

غرض کہ انشورنس اجتماعی کفالت کی ایک منظم صورت ہے، یہ اپنے مقصد کے اعتبار سے شریعت اسلامی کے مزاج کے عین مطابق ہے اور اپنے عہد کی ضرورت کے لحاظ سے عہد اسلامی میں اس کی مثالیں موجود ہیں؛ لیکن چونکہ اس وقت نظام معیشت بھی مغرب کے ہاتھ میں ہے اور مغربی نظام معیشت کا تصور یہ ہے کہ جب تک انسان میں خود غرضی نہ ہو، اس وقت تک معیشت ترقی نہیں کر سکتی؛ کیونکہ خود غرضی اور ذاتی مفاد ہی ایسا محرک ہے جو انسان کو جدوجہد اور تگ ودو پر آمادہ کرتا ہے، اسی لئے انہوں نے مختلف معاشی اداروں کی اس انداز پر تشکیل کی کہ اس میں سود اور قمار جیسی برائیوں کو داخل کر دیا؛ تاکہ سرمایہ کار کو نفع تو حاصل ہو؛ لیکن اس کو نہ دوسرے کا تعاون کرنا پڑے اور نہ اپنے سرمایہ کے سلسلہ میں کسی قسم کا رسک اور خطرہ پیدا ہو، ایسے ہی اداروں میں ایک 'انشورنس' بھی ہے۔

الف۔ مروجہ انشورنس میں شرعی نقطۂ نظر سے ربا نسا بھی ہے اور ربا فضل بھی، کیونکہ انشورنس کی بعض صورتوں میں جو رقم ادا کی جاتی ہے، وہ ایک مقررہ مدت کے بعد مع اضافہ کے واپس ملتی ہے تو اس میں 'ربا فضل' ہو گیا؛ کیونکہ زیادہ رقم واپس کی جاتی ہے اور 'ربا نسا' تو ہے ہی؛ کیونکہ ایک کی طرف سے نقد اور ایک کی طرف سے ادھار ادائیگی ہوتی ہے۔

ب۔ انشورنس کی موجودہ صورت میں ’غرر فاحش‘ کی کیفیت بھی پائی جاتی ہے اور رسول اللہ ﷺ نے ایسی خرید وفروخت کے معاملہ سے منع فرمایا ہے، جس میں غرر ہو: ’’نھی رسول اللہ ﷺ عن بیع الحصاۃ وعن بیع الغرر‘‘ (مسلم؛ کتاب البیوع باب بطلان بیع الحصاۃ والبیع الذی فیہ غرر، حدیث نمبر: ۳۸۸۱)۔

مروجہ انشورنس میں تین پہلوؤں سے غرر موجود ہے، اول یہ کہ جس خطرہ کے تدارک کے لئے انشورنس اسکیم لی گئی ہے، وہ خطرہ پیش بھی آئے گا یا نہیں، دوسرے: اسے کتنی قسطیں ادا کرنی پڑیں گی؟ ہوسکتا ہے کہ ایک ہی قسط ادا کرے اور خطرہ پیش آجائے اور ہوسکتا ہے کہ سال بھر کی قسط ادا کرے اور کوئی خطرہ پیش نہ آئے، تیسرے: یہ بات بھی متعین نہیں کہ اسے خطرہ پیش آنے کی صورت میں کتنی رقم ملے گی؛ کیونکہ نقصان کی مقدار کیا ہوگی؟ اس کا اندازہ نہیں ہے اور نقصان کے لحاظ سے ہی وہ معاوضہ کا حقدار ہوگا۔

ج۔ انشورنس کی مروجہ صورت میں قمار بھی ہے؛ کیونکہ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ تمام قسطیں ادا کردے اور اس کے مقابلہ میں کچھ حاصل نہ ہو اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ تھوڑی سی رقم جمع کرے اور بہت ساری رقم حاصل ہوجائے، اسی کو ’قمار‘ کہتے ہیں۔

د۔ غور کیا جائے تو اس میں ایک پہلو دین کی دین سے بیع کا بھی ہے، پالیسی لینے والوں کے ذمہ جو قسطیں باقی ہیں، وہ بھی دین ہے اور کمپنی نے جو ذمہ داری قبول کی ہے، وہ بھی دین ہے، گویا یہ ایسا معاملہ ہے جس میں دین کا عوض دین کی شکل میں طے پاتا ہے، جس سے رسول اللہ ﷺ نے صراحتاً منع فرمایا ہے۔

ہ۔ اس میں بعض اخلاقی مفاسد بھی ہیں، جو صرف وہمی نہیں ہیں؛ بلکہ ایسے واقعات پیش آتے رہتے ہیں، جیسے وارث کا مورث کے قتل کرنے کی تدبیر کرنا؛ تاکہ جلد سے جلد انشورنس کی رقم اس کے ہاتھ میں آجائے، خطرات سے مطمئن ہوکر بے احتیاطی سے کام لینا وغیرہ۔

ان اسباب ووجوہ کے تحت جمہور علماء کا نقطہ نظر یہی ہے کہ انشورنس کی مروجہ شکل حرام ہے، عالم عرب میں معروف عالم ومحقق شیخ ابوزہرہ، شیخ محمد بخیت مصری، سابق شیخ الازہر شیخ جاد الحق علی جاد الحق، شیخ محمد غزالی، شیخ عبدالعزیز بن باز، شیخ صالح العثیمین، شیخ یوسف قرضاوی، شیخ احمد سرباسی، ڈاکٹر محمد دسوقی وغیرہ کا نقطہ نظر یہی ہے، عالم اسلام میں غالباً شیخ مصطفی زرقا، سابق شیخ الازہر شیخ محمد سید طنطاوی، موجودہ مفتی عام مصر ڈاکٹر علی جمعہ کے علاوہ کوئی قابل ذکر شخصیت نہیں، جس نے اس کے جواز کا فتوی دیا ہو۔ اسی طرح برصغیر میں قریب قریب تمام ہی علماء اور ارباب افتاء انشورنس کی مروجہ صورت کے حرام ہونے پر متفق ہیں، میرے حقیر علم کے مطابق ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی کے علاوہ کوئی اور قابل ذکر صاحب علم نہیں جو اس کے جواز کا قائل ہو۔

اسلامی انشورنس کمپنیاں۔ مرحلہ بہ مرحلہ:

ایک طرف انشورنس کی ضرورت اور دوسری طرف مروجہ انشورنس کی شرعی قباحتوں کے پس منظر میں علماء نے ایسے متبادل انشورنس کی طرف توجہ دی ہے، جو انشورنس کے مقصد کو بھی پورا کرے، اور جو مفاسد اس میں شامل ہوگئے ہیں، وہ ان سے خالی بھی ہو؛ چنانچہ اس سلسلہ میں غالباً سب سے پہلے ۱۹۳۴ء میں شیخ محب الدین خطیب نے تجویز پیش کی تھی کہ مختلف پیشوں سے تعلق رکھنے والے لوگ اپنے اپنے پیشے سے متعلق اس قسم کے ادراہ کی تشکیل کریں، پھر ۱۹۵۴ء میں مصر کی وزارت اوقاف نے انشورنس کا ایک خصوصی فنڈ قائم کرنے کا پروجیکٹ تیار کیا، جس کو ’قانونی شخصیت‘ کا درجہ حاصل ہو، پھر ۱۹۷۹ء میں ’’فیصل اسلامی بینک سوڈان‘‘ نے باضابطہ انشورنس کمپنی شروع کی، جو اسلامی انشورنس کی پہلی مثال تھی، پھر خلیجی ریاستوں نے لائف انشورنس کے متبادل کے طور پر اسلامک انشورنس کی کمپنی قائم کی اور شارجہ کو اس کا مرکز بنایا گیا (بحوث فی فقہ المعاملات المالیۃ المعاصرۃ للدکتور قرہ داغی: ۲۹۶)، اللہ تعالی کا شکر ہے کہ اس شعبہ میں مسلسل ترقی ہو رہی ہے اور اس وقت تقریباً بیس اسلامک انشورنس کمپنیاں سوڈان، بحرین، عرب امارات، سعودی عرب، ترکی اور بعض مسلم اقلیتی ممالک جیسے جنوبی افریقہ وغیرہ میں موجود ہیں۔

تکافل کے بنیادی اصول:

اسلامی اصولوں پر جو انشورنس کمپنی قائم ہوگی، اس کی بنیاد ان اصولوں پر ہوگی:

ا۔ جو لوگ کمپنی کے ممبر بن گئے وہ اپنے اوپر ایک مقررہ مقدار ادا کرنے کو لازم کرلیں گے، مالکیہ کے مسلک کے مطابق انسان اپنے اوپر جس چیز کا التزام کرلے، وہ اس کے ذمہ لازم ہوجاتی ہے، موجودہ عہد کے ان فقہاء نے۔ جو اسلامی معاشیات میں بھی مہارت رکھتے ہیں۔ اسی رائے پر فتوی دیا ہے۔

۲۔ اگر انشورنس کمپنی اس اساس پر قائم ہو تو وہ اپنے ممبران کے نقصانات کی تلافی کرنے کے ساتھ ساتھ ان کو کچھ نفع بھی دیں گی تو کمپنی کے لئے ضروری ہوگا کہ دو الگ اکاؤنٹ رکھیں، ایک اکاؤنٹ تعاون سے متعلق رقوم کا ہو اور دوسرا اکاؤنٹ سرمایہ کاری کا ہو، سرمایہ کاری والے اکاؤنٹ میں ممبران کی جو رقم جمع ہو، اس کا نفع اسے دیا جائے اور تبرع والے اکاؤنٹ کی رقم نقصانات کی تلافی میں خرچ کی جائے۔

۳۔ جو رقم تبرع کے اکاؤنٹ میں جمع ہو، اگر وہ سال بھر ممبران کے مقررہ نقصانات کو پوری کرنے کے بعد بچ جائے تو وہ یا تو ممبران کو واپس کردی جائے گی یا ان کی اجازت سے آئندہ کی ضروریات کے لئے اسی اکاؤنٹ میں باقی رکھی جائے گی۔

۴۔ یہ ادارہ ربوا اور قمار، نیز ہر طرح کے غیر شرعی امور سے خالی رہے گا، اگرچہ ایسا ہوسکتا ہے کہ ایک شخص کو اس کی ادا کی ہوئی تبرع کی رقم سے زیادہ مل جائے اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ایک شخص اپنے تبرعات تو جمع کرے؛ لیکن اس کو اس کے مقابلے میں کچھ نہ ملے؛ کیونکہ اس کو وہ حادثہ ہی پیش نہیں آیا، جس کی وجہ سے وہ تعاون کا مستحق ہوتا؛ لیکن یہ ربا اور قمار کے دائرہ میں اس لئے نہیں آئے گا کہ ان دونوں کا تعلق عہد معاوضہ سے ہے، نہ کہ تبرعات سے، اور یہ صورت تبرع کے قبیل سے ہے، اس میں ایسا نہیں ہے کہ بچی ہوئی رقم کے مالک وہ لوگ بن جائیں، جنہوں نے کمپنی قائم کی ہے، اسی طرح اس میں جہالت وغرر پایا جاتا ہے، مگر یہ معاوضات میں باعث فساد ہوتا ہے، تبرعات میں نہیں؛ چنانچہ علامہ قرافی مالکی فرماتے ہیں:

”الفرق ... بين قاعدة ما تؤثر فيه الجهالات والغرر وقاعدة لا يؤثر فيه ذلك من التصرفات ... وانقسمت التصرفات عنده ثلاثة أقسام: طرفان وواسطة، فالطرفان أحدهما معاوضة صرفة فيجتنب فيها ذلك، إلا ما دعت الضرورة إليه عادة... وثانيهما ما هو إحسان صرف لا يقصد به تنمية المال كالصدقة والهبة والإبراء، فإن هذه التصرفات لا يقصد بها تنمية المال ... فلا ضرر فيه الخ“ (کتاب الفروق للقرافی ۱۵۱،۱-۱۵۲)۔

(کن چیزوں میں جہالت موثر ہوتی ہے اور کن تصرفات میں جہالت موثر نہیں ہوتی؟ اس کا بیان..... تصرفات تین قسم کے ہیں، دو انتہائی حدیں ہیں اور ایک درمیانی ہے، دونوں حدوں میں سے ایک صورت ان معاملات کی ہے، جو خالص عقد معاوضہ ہیں، ان کا جہالت سے محفوظ رہنا ضروری ہے، سوائے اس کے کہ عادت ورواج کی بنا پر ضرورت اس کے جائز ہونے کا تقاضا کرتی ہو..... دوسری صورت یہ ہے کہ وہ خالصتاً تبرع واحسان ہو، اس سے مال کی افزائش مقصود نہ ہو، جیسے: صدقہ، ہبہ، ابراء، کہ ان تصرفات سے مال کی افزائش مقصود نہیں ہوتی کہ اس میں کوئی حرج نہیں)۔

۵۔ ممبران جو رقم سرمایہ کاری کے لئے لگائیں گے، اس میں ان کی شرکت نفع ونقصان کی اساس پر ہوگی؛ کیونکہ شریعت میں سرمایہ کاری کا بنیادی اصول یہی ہے کہ سرمایہ کار اور محنت کار دونوں کو نفع ہونے کی صورت میں مقررہ تناسب کے مطابق نفع حاصل ہو اور اگر نقصان ہو تو اس کو سرمایہ کار برداشت کرے، یعنی سرمایہ کار سرمایہ کے نقصان کو گوارہ کرے اور محنت کار اپنی محنت کے نقصان کو گوارہ کرے۔

اس طرح مروجہ انشورنس اور اسلامی انشورنس کے درمیان بنیادی فرق ہے، جس کو درج ذیل نکات میں بیان کیا جاسکتا ہے:

مروجہ انشورنس اور تکافل کا فرق

(۱) مروجہ انشورنس عقد معاوضہ ہے، جس میں کمپنی کے شیئر ہولڈر نفع حاصل کرنے کے لئے اپنی رقم لگاتے ہیں اور کمپنی کے ممبروں کو پیش آنے والے نقصانات کی تلافی کے بعد جو کچھ رقم بچ جاتی ہے، وہ ان کی ملکیت بن جاتی ہے۔

(۱) اسلامی انشورنس عقد تبرع ہے، اس میں تعاون کی نیت سے رقم دی جاتی ہے، نہ کہ نفع کی نیت سے۔

(۲) مروجہ انشورنس میں کمپنی کے شیئر ہولڈرس اور کمپنی کے ممبروں کا الگ الگ اکاؤنٹ نہیں ہوگا؛ بلکہ تمام رقمیں ایک ہی جگہ جمع ہوں گی۔

(۲) اسلامی انشورنس کمپنی میں کمپنی کے ممبروں کی اعانتی قسط کا الگ اکاؤنٹ ہوگا، جو نقصانات کی بھرپائی میں استعمال ہوگا، اور سرمایہ کاری کے لئے جمع ہونے والی رقم کا اکاؤنٹ الگ ہوگا، جس کا نفع شرکاء کو حاصل ہوگا۔

(۳) مروجہ انشورنس کمپنی میں جمع شدہ رقم میں سے جو بچ جائے گی، اس سے پالیسی حاصل کرنے والے ممبروں کا کوئی تعلق نہیں ہوگا، بلکہ شیئر ہولڈر، یعنی کمپنی کے مالکان اس کے مالک ہوں گے۔

(۳) اسلامی انشورنس کمپنی میں تبرع کے طور پر جو رقم دی گئی ہے، اگر اس میں سے بچ جائے تو یا تو ممبروں کو واپس لوٹا دی جائے گی، یا تبرع کے فنڈ میں آئندہ کے لئے اسے محفوظ کرلیا جائے گا، یہ بچی ہوئی رقم کمپنی قائم کرنے والوں کی ملکیت نہیں بنے گی۔

(۴) مروجہ انشورنس کمپنی کی نگرانی کے لئے نہ کوئی 'شرعیہ بورڈ' ہوتا ہے اور نہ اس میں اسلام کے حلال وحرام سے متعلق احکام پیش نظر رکھے جاتے ہیں؛ چنانچہ اس میں ربا، قمار، اور غرر کا پایا جانا بالکل واضح ہے۔

(۴) اسلامی انشورنس کمپنی میں اس بات کی رعایت ہوگی کہ تمام کام شریعت کے دائرہ میں ہو اور اس کی نگرانی کے لئے ایک شرعیہ بورڈ بھی ہوگا۔

عملی تطبیق:......اسلامی انشورنس کی بنیادی طور پر دو صورتیں ہیں: ایک یہ کہ اس کا مقصد صرف ممکنہ خطرات میں نقصانات کی تلافی کرنا ہو، جو لوگ اس میں ممبر بنیں، ان کا مقصد سرمایہ کاری نہ ہو، دوسری صورت یہ ہے کہ نقصانات کی تلافی کے لئے تعاون بھی پیش نظر ہو اور حلال طریقہ پر سرمایہ کاری بھی۔

خالص تبرع کی صورت:

پہلی صورت میں انشورنس کی دو شکلیں ہوسکتی ہیں، ایک: ہبہ کی، دوسرے: وقف کی، اور یہ دونوں ہی تبرع کے قبیل سے ہیں، اگر ہبہ کی بنیاد پر تکافل کا نظام قائم ہو تو اس میں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایک تو یہ ہبہ مشروط ہے کہ اگر اس گروپ میں سے کسی شخص کو فلاں حادثہ پیش آئے تبھی اس کو رقم دی جائے گی تو کیا مشروط ہبہ درست ہوجائے گا؟ دوسرے: یہ کہ ہبہ کرنے والا کسی حادثے سے دو چار ہو تو وہ خود بھی اس سے فائدہ اٹھاتا ہے، یہ تو کیا یہ بات درست ہے کہ واہب اپنے ہبہ کے مقابلہ میں عوض کی شرط لگادے اور ایسی صورت میں کیا یہ ہبہ درست ہوگا؟

جہاں تک ہبہ میں شرط لگانے کی بات ہے، تو اول تو فقہاء کے اصول کے مطابق تبرعات کے منعقد ہونے کے لئے شرط لگانا مانع نہیں ہے، معاوضات میں شرط لگانا نقصاندہ ہے، معاوضات میں شرط لگادی جائے، اس کے باوجود ہبہ نافذ ہوجاتا ہے، چنانچہ علامہ بابرتی لکھتے ہیں: ''وأما الهبة والصدقة والنكاح والخلع والصلح عن دم العمد، فإنها لا تبطل بالشروط الفاسدة، لأن الفساد باعتبار إفضائه إلى الربا، وذلك لا يتحقق إلا في المعاوضات، وهذه تبرعات وإسقاط'' (العناية، كتاب البيوع، باب بيع الطريق وهبته ۹،۱۷۲، نیز دیکھئے: شرح فتح القدیر ۶،۴۴۹)۔

تاہم اگر غور کیا جائے تو یہاں نفس ہبہ میں شرط نہیں لگائی جارہی ہے، بلکہ تبرع جمع کرنے والا انشورنس کمپنی کو وکیل بنارہا ہے کہ وہ فلاں فلاں صورت حال سے دو چار لوگوں ہی کو اس میں سے رقم ادا کرے، گویا یہ 'وکالت مقیدہ' ہے؛ لیکن جب وکیل اپنے موکل کی طرف سے مستحق شخص کو رقم ادا کرتا ہے تو اس وقت موہوب لہ پر کوئی شرط نہیں لگائی جاتی؛ اس لئے درحقیقت یہ اشتراط فی الہبہ کے دائرہ میں آتا ہی نہیں ہے۔

دوسرا سوال یہ تھا کہ کیا خود ہبہ کرنے والے کے لئے یہ درست ہوگا کہ وہ جن لوگوں کو ہبہ کرچکا ہے، ان سے تعاون وصول کرے؟ تو اس سلسلہ میں فقہاء احناف اور مالکیہ کا تصور یہ ہے کہ ہبہ بالعوض بھی درست ہے؛ چنانچہ صاحب 'ہدایہ' علامہ مرغینانی 'رجوع عن الہبۃ' کا مسئلہ ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''...لأن المقصود بالعقد هو التعويض للعادة'' (هدايه مع العناية وفتح القدير ۹،۴۰)۔

فقہ مالکی کی معروف کتاب 'شرح خرشی' میں ہے: ''وهبة الثواب عطية قصد بها عوض مالي'' (شرح خرشی ۷،۱۰۲)۔

فقہاء شوافع کے یہاں اگرچہ راجح قول یہ ہے کہ ہبہ بالعوض میں اگر عوض معلوم ہو تو اس کا حکم بیع کا ہوگا نہ کہ ہبہ کا؛ لیکن ایک قول یہ بھی ہے کہ اس پر ہبہ کے احکام بھی جاری ہوں گے:

''...وقيل: هبة، فتثبت له أحكام الهبة'' (دیکھئے: روضة الطالبين ۵،۳۸۴)۔

احادیث سے ہبہ بالعوض کا جائز ہونا معلوم ہوتا ہے؛ چنانچہ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے: ''الرجل أحق بهبته ما لم يثب منها'' (سنن ابن ماجہ، کتاب الہبات، حدیث نمبر: ۲۳۸۷، وفی الزوائد: إسنادہ ابراہیم بن اسماعیل بن مجمع وہو ضعیف، مستدرک الحاکم، کتاب البیوع، حدیث نمبر: ۲۳۲۳'' قال الحاکم: ہذا حدیث صحیح علی شرط

الشحیین ولم یجز جاہ‘‘) یہ روایت متعدد کتب میں متعدد راویوں سے منقول ہے، غرض کہ ہبہ بالعوض جائز ہے، اگر انشورنس کی بنیاد ہبہ پر ہو تو اس کو ہبہ بالعوض مانا جاسکتا ہے۔

وقف کی صورت:

دوسری صورت یہ ہے کہ انشورنس کی بنیاد ’وقف‘ پر ہو، وقف کی صورت میں جو رقم تبرعاً جمع ہوگی، اس کی سرمایہ کاری کی جائے گی اور اصل رقم کو باقی رکھا جائے گا، اسی طرح کچھ اور لوگ بھی اس وقف کو متاثر لوگوں کی ضروریات پوری کرنے کے لئے تعاون دے سکتے ہیں، پھر سرمایہ کاری سے جو نفع حاصل ہو، نیز وقف میں جو تعاون کی رقم جمع کی جائے، اسے کمپنی کے اصول کے مطابق ممبروں کے مطالبات کی تکمیل میں خرچ کیا جائے گا۔

اس سلسلہ میں دو باتیں بنیادی اہمیت کی حامل ہیں: ایک یہ کہ وقف اور مملوکات وقف دونوں کے احکام الگ الگ ہیں، اصل وقف کو باقی رکھتے ہوئے اس سے استفادہ کیا جائے گا؛ لیکن جو مملوکات وقف ہیں، ان کو باقی رکھنا ضروری نہیں، جیسے کوئی مکان یا کھیت وقف کیا جائے تو مکان اور کھیت کو باقی رکھنا ضروری ہے؛ لیکن مکان سے جو کرایہ اور کھیت سے جو پیداوار حاصل ہو وہ بعینہ وقف نہیں؛ اس لئے ان کو مصارف وقف پر خرچ کیا جاسکتا ہے، دوسری قابل ذکر بات یہ ہے کہ ’وقف‘ ایسا تبرع ہے، جس سے خود متبرع بھی فائدہ اٹھا سکتا ہے؛ لہٰذا اس صورت میں خود تبرع کرنے والے کے اس سے فائدہ اٹھانے میں کوئی قباحت نہیں اور نہ اس میں کسی تاویل و توجیہ کی ضرورت پیش آتی ہے؛ اس لئے وقف کو ’تکافل‘ کی بنیاد پر بنانا زیادہ بہتر نظر آتا ہے، جس کا تصور غالباً سب سے پہلے حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ نے ’’مجلس تحقیقات شرعیہ‘‘ (ندوۃ العلماء لکھنؤ) کے استفتاء کا جواب دیتے ہوئے ۱۳۸۴ء میں پیش کیا، اس وقت پاکستان میں اسی بنیاد پر ’تکافل‘ کے نظام کا کامیاب تجربہ کیا جارہا ہے۔

سرمایہ کاری کے ساتھ تبرع:

تکافل کی دوسری بنیادی صورت یہ ہے کہ تبرع کے ساتھ ساتھ سرمایہ کاری بھی ہو، اب اس کی ایک صورت تو یہ ہے کہ متبرع پوری رقم انشورنس کمپنی کو سرمایہ کاری کے مقصد سے دے اور متعین کردے کہ اس پر حاصل ہونے والے نفع کا کچھ فیصد تبرع ہوگا اور کچھ فیصد اس کو بطور نفع واپس ملے گا، گویا متبرع کی اصل رقم ضرورت مندوں پر صرف نہیں ہوگی؛ بلکہ اس سے حاصل ہونے والا نفع ان پر صرف ہوگا، دوسری صورت یہ ہے کہ اصل رقم میں سے کچھ حصہ تبرع کے لئے کردیا جائے اور کچھ حصہ نفع کے لئے مختص ہو، جو رقم تبرع کے لئے ہے، اگر وہ بطور ہبہ کے ہو تو اصل رقم بھی مستحقین پر خرچ کی جاسکتی ہے اور اگر بطور وقف کے ہو تو اصل رقم کو باقی رکھتے ہوئے اس کا نفع مستحقین پر صرف کیا جائے گا اور جو رقم اس نے نفع حاصل کرنے کے لئے دی ہے، اس کا نفع اس کو واپس ملے گا۔

پھر جو تبرع کرنے والا اپنی رقم کے کچھ حصہ پر نفع حاصل کرنا چاہتا ہے، اس کے لئے دو صورتیں ہیں: ایک صورت یہ ہے کہ انشورنس کمپنی کو وہ رقم بطور مضاربت کے دے، اس رقم میں کمپنی کی حیثیت ’مضارب‘ کی ہے اور ممبران کی حیثیت ’رب المال‘ کی؛ چنانچہ مضاربت کے اصول کے مطابق رب المال اپنے حصہ کا نفع لے لے اور کمپنی اپنے حصہ کا نفع، جس کو وہ مستحقین پر خرچ کرے، دوسری صورت یہ ہے کہ ممبران کمپنی کو وکیل بالاستثمار بنادیں، کمپنی اپنی صوابدید سے اس سرمایہ کو لگائے اور بحیثیت وکیل ممبران سے اجرت وکالت حاصل کرے، ایسی صورت میں کمپنی کو نفع ونقصان سے تعلق نہیں ہوگا؛ بلکہ وہ بہر صورت اجرت کی مستحق ہوگی، غرض کہ یہ ایسی صورت ہے جس میں ممبروں کو بصورت استحقاق تعاون بھی حاصل ہوگا اور ان کو نفع بھی ملے گا۔

تکافل کی یہ ایسی صورتیں ہیں، جو انشورنس کی تمام ہی صورتوں میں قابل عمل ہیں۔ لائف انشورنس کی صورت میں ممبروں کی رقم کا ایک حصہ مضاربت پر لگایا جائے گا اور جب رقم ادا کرنے کی نوبت آئے تو اس کا اصل سرمایہ اور مضاربت کے ذریعہ حاصل ہونے والا نفع ادا کرنے کے بعد بقیہ رقم تبرع کی مدد سے پوری کی جائے گی؛ البتہ بنیادی اصول یہ ہے کہ انشورنس ان ہی چیزوں میں قبول کیا جائے گا، جن کی خرید و فروخت یا جن کو کرایہ پر لگانا جائز ہو، جو بات خود ناجائز ہو، یا جس پالیسی کے پیچھے انشورنس لینے کی غرض ظاہر ہو کہ وہ ایک حرام مقصد کے لئے انشورنس حاصل کررہا ہے تو ایسی چیز کا انشورنس جائز نہیں۔

انشورنس کی رقم، مالک کی وفات کے بعد:

انشورنس سے متعلق ایک اہم مسئلہ یہ ہے کہ اس سے حاصل ہونے والی آمدنی کی حیثیت کیا ہوگی؟ تو اگر اس نے انشورنس کے لئے کسی کو نامزد نہ کیا ہو تو اس کی حیثیت اس کی موت کے بعد ترکہ کی ہوگی اور تمام ورثہ کا حق اس سے متعلق ہوگا، اور اگر اس نے کسی شخص کو نامزد کیا ہو تو اس کی حیثیت وصیت کی ہوگی اور اس پر وصیت کے احکام جاری ہوں گے؛ چنانچہ ’معاییر شرعیہ‘ میں ہے:

''فی حالة التأمين التعاونی لحالة الموت (التكافل) توزع المستحقات طبقاً لأحكام الميراث على اعتبار أنها من تركة المشترك المتوفى، إلا إذا حددها لأشخاص أو أغراض بعد موته، وحينئذ تطبق عليها أحكام الوصية'' (معايير شرعیه، دفعه۲،۱۰)۔

تاہم اس حقیر کا خیال ہے کہ اسلامی انشورنس کمپنیوں کو ایسا فارم بنانا چاہئے، جس میں اس بات کی صراحت ہو کہ وہ جس کو نامزد کر رہا ہے، اس کو اپنی زندگی میں وہ رقم ہبہ کر رہا ہے، یا وہ اس کے لئے وصیت کر رہا ہے؛ بشرطیکہ اس کے حق میں وصیت جائز ہو، یا وہ اس کی موت کے بعد اس کا ترکہ ہوگا اور کمپنی تمام ورثہ کو ان کے حق کے مطابق ادا کرے گی، یا وہ اپنے ورثہ میں سے کسی کو اپنا وکیل بنائے گا، جو کمپنی سے رقم وصول کرے اور تمام ورثہ کو اس کے حقوق کے مطابق ادا کرے، فارم میں اس بات کی اچھی طرح وضاحت ہونی چاہئے۔

ری انشورنس (اعادۃ التأمین):

بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ مطالبات بڑھ جاتے ہیں اور کمپنی کے پاس موجود رقم کم پڑ جاتی ہے، ایسے مواقع کے لئے ری انشورنس کمپنیاں موجود ہیں، انشورنس کمپنیاں ری انشورنس کمپنیوں کو ممبر بناتی ہیں، جو ان حالات میں ان کو قرض فراہم کرتی ہیں، جو قرض دیتی ہیں، اس پر انٹرسٹ حاصل کرتی ہیں اور ری انشورنس کی ممبر بننے والی کمپنیاں جو رقم بطور فیس کے جمع کرتی ہیں، ان پر انٹرسٹ دیتی ہیں، ظاہر ہے کہ یہ صورت جائز نہیں؛ لیکن اگر اسلامی ری انشورنس کمپنیاں موجود نہ ہوں تو مجبوری کے درجہ میں ری انشورنس کمپنیوں سے استفادہ کرنے کی گنجائش ہے؛ لیکن یہ قدر ضرورت سے زیادہ نہ ہو، نیز تکافل کمپنی کو ری انشورنس کمپنی جو زائد رقم ادا کرے، اسے غرباء پر خرچ کر دینا ضروری ہے۔

نیز یہ بات بھی ضروری ہے کہ مسلم ممالک اور مسلمان تجار خود اسلامی ری انشورنس کمپنی قائم کریں؛ تاکہ اسلامی انشورنس کمپنیاں سود اور قمار پر مبنی ری انشورنس کمپنیوں کی بجائے تبرع پر مبنی ری انشورنس کمپنیوں کی ممبر بنیں، ری انشورنس کمپنیوں کا طریقۂ کار بھی وہی ہوگا، جو انشورنس کمپنیوں کا ہے، یعنی یہ ری انشورنس کمپنیوں کو اپنے جمع شدہ تبرعات کا کچھ حصہ بطور ممبری فیس کے دیں گی، ری انشورنس کمپنی جمع شدہ رقم کو نفع آور بنائے گی اور اپنی ممبر انشورنس کمپنیوں کے مطالبات ادارہ کے مقررہ قاعدہ کے مطابق بطور تعاون یا بطور قرض حسنہ پورا کریں گی، نیز اس کے بھی وہی قواعد ہوں گے، جو عام اسلامی انشورنس کمپنیوں کے ہیں۔

☆☆☆

اسلامی انشورنس کے بنیادی خطوط

مولانا اختر امام عادل قاسمی[۱]

اسلام ایک ہمہ گیر اور مستقل نظام حیات کا نام ہے، اس کے پاس زندگی کے ہر مرحلے کے لئے مکمل، اطمینان بخش اور قابل عمل ہدایات موجود ہیں، اس کو اپنی رہنمائی کے لئے کسی مصنوعی نظام حیات سے مدد لینے کی ضرورت نہیں ہے، بلکہ صدیوں کا مشاہدہ اور تجربہ یہ ہے کہ ہر دور میں مصنوعی نظام نے اپنی ساخت، استحکام اور معنویت کے لئے اسلامی اصول وکلیات کا سہارا لیا ہے۔

آج عالمی طور پر اس کی ضرورت محسوس کی جارہی ہے کہ ان بنیادوں کو دریافت کیا جائے جن پر اسلامی انشورنس کی تشکیل کی جاسکے، اور ایک بہتر تکافلی نظام کی تعمیر ہوسکے، کہ ایک ترقی یافتہ معاشرہ کے لئے اس کی بہت اہمیت ہے۔

اسلامی تعلیمات میں تکافل کی بنیادیں:...... اسلامی تعلیمات میں اس کی بنیادیں موجود ہیں:

تعاون باہم:

الف۔ اسلام تعاون باہم اور تبرع وایثار کا سب سے بڑا وکیل ہے، قرآن وحدیث کی بے شمار نصوص میں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون، ایثار اور محبت وخلوص کی تلقین کی گئی ہے، مثلاً:

* ''تعاونوا على البر والتقوىٰ ولا تعاونوا على الإثم والعدوان'' (مائدہ:۲)۔
(نیکی اور تقوی کے کاموں میں تعاون کرو، ظلم وگناہ کے کاموں میں تعاون مت کرو)۔

* ''إنما المؤمنون إخوة'' (حجرات:۱۰) (تمام مسلمان بھائی ہیں)۔

* ''ويسألونك ماذا ينفقون قل العفو'' (بقرۃ:۲۱۹)۔
(لوگ آپ سے پوچھتے ہیں کہ کیا خرچ کریں آپ فرمادیں کہ عفو (ضرورت سے زائد مال) میں سے خرچ کرو)۔

دولت کو دانت سے پکڑنے والوں کو قرآن متنبہ کرتا ہے:

* ''والذين يكنزون الذهب والفضة ولا ينفقونها في سبيل الله فبشرهم بعذاب أليم، يوم يحمى عليها في نار جهنم فتكوىٰ بها جباههم وجنوبهم وظهورهم هذا ما كنزتم لأنفسكم فذوقوا ما كنتم تكنزون'' (توبہ: ۳۴،۳۵)
(جو لوگ سونا اور چاندی جمع کرتے ہیں اور اسے اللہ کی راہ میں صرف نہیں کرتے، ان کو دردناک عذاب کی بشارت سنادیں، جس دن یہ مال جہنم کی آگ میں تپایا جائے گا، پھر اس سے ان کی پیشانیوں، پہلوؤں اور پیٹھوں کو داغا جائے گا، یہ وہی ہے جو تم نے اپنے لئے جمع کیا تھا، پس چکھو جمع کرنے کا مزہ)۔

دولت اللہ کی بڑی نعمت ہے، مگر اس سے زیادہ آزمائش بھی ہے، حدیث میں آتا ہے:

''لن تزول قدما عبد حتى يسأل عن أربع ... وعن ماله من أين اكتسبه وفيما أنفقه (المعجم الكبير للطبرانی ۲۰،۲۶۸ نت)۔

---

[۱] مہتمم جامعہ ربانی منورا شریف، سمستی پور بہار۔

(ابن آدم کے قدم کل روز قیامت رب العالمین کے سامنے سے ہٹ نہیں سکیں گے جب تک کہ وہ چار سوالات کے جوابات نہ دے لے.....(ان میں ایک سوال یہ ہوگا کہ)......مال تم نے کہاں سے کمایا اور کہاں خرچ کیا؟)۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''ما آمن بي من بات شبعان وجارہ جائع وھو یعلم (المجمع للھیثمی ۸،۱۶۷ بحوالہ طبرانی کبیر، مسند احمد ۸،۴۸۶، ط الرسالۃ، کنز العمال فی سنن الأقوال والأعمال ۹،۵۳ ط الرسالۃ)۔

(اس کا ایمان کامل نہیں جو رات میں آسودہ ہو کر سوئے اور اسے معلوم ہو کہ اس کا پڑوسی بھوکا ہے)۔

ایک موقعہ پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''من کانت لہ فضل أرض فلیزرعھا أو لیمنحھا أخاہ فإن أبیٰ فلیمسك أرضہ'' (صحیح مسلم باب کراء الارض ۱۹،۵ حدیث نمبر ۳۹۹۹ ط بیروت)۔(جس کے پاس زائد زمین ہو وہ کاشت کرے یا اپنے بھائی کو دے دے، اگر اس کی خلاف ورزی کرے تو اس کی زمین روک لی جائے۔

ارشاد نبوی ہے: ''من کان معہ فضل ظھر فلیعد بہ علیٰ من لا ظھر لہ ومن کان لہ فضل زاد، فلیعد بہ علی من لا زاد لہ'' (صحیح مسلم باب استحباب المواساۃ بفضول المال ۵،۱۳۸ حدیث نمبر ۳۲۵۸، صحیح ابن حبان ۲،۲۳۸ ط مؤسسۃ الرسالۃ)۔(جس کے پاس زائد سواری ہو وہ اس کو دے دے جس کے پاس سواری نہیں ہے اور جس کے پاس زائد کھانا ہو وہ اس کو کھانا حوالہ کردے جس کے پاس کھانا نہیں ہے)۔

مومن کی شان:

☆ ایک مؤمن کو دنیا میں اس طرح رہنا چاہئے کہ ساری کائنات اس سے مستفید ہو، امام الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''فلا یغرس المسلم غرساً فیأکل منہ إنسان و لا دابۃ ولا طیر إلا کان لہ صدقۃ یوم القیامۃ'' (صحیح مسلم باب فضل الغرس والزرع ۸،۱۷۹، حدیث نمبر ۲۹۰۳)۔(مسلمان کوئی پودا لگائے پھر اس سے کوئی انسان، جانور یا پرندہ کھائے تو وہ اس کے لئے کل روز قیامت صدقہ بنے گا)۔

عام انسانی بنیادوں پر امداد باہم:

ب- غریبوں، مسکینوں، یتیموں اور ضرورت مندوں کے شخصی امداد و تعاون پر تو نصوص بھری پڑی ہیں، لیکن عام انسانی ضرورت کے وقت امداد باہم کے سلسلے کی ہدایات بھی کم نہیں ہیں، بطور نمونہ میثاق مدینہ کی چند دفعات کی طرف ہم اشارہ کرتے ہیں جو ہجرت کے بعد سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے مسلمانوں اور یہودیوں کے لئے تیار کی گئی تھی،

* ''المھاجرون من قریش علی ربعتھم یتعاقلون بینھم وھم یفدون عانیھم بالمعروف والقسط بین المسلمین'' (سیرت ابن ھشام ۱،۵۰۱، الروض الانف للسھیلی ۲،۳۴۵، عیون الاثر لابن سیدالناس ۱،۲۶۰، النھایۃ فی غریب الاثر لابن محمد الجزری ۳،۵۳۴)(مہاجرین قریش اپنی سابقہ حالت پر برقرار رہیں گے اور آپس میں ایک دوسرے کی دیت ادا کریں گے اور اپنے قیدیوں کا فدیہ مسلمانوں کے درمیان معروف طریقے پر حق وانصاف کے ساتھ ادا کریں گے)۔

اس کے بعد اوس وخزرج اور انصار کے دیگر قبائل کا تذکرہ کیا گیا ہے اور ان کو باہم ایک دوسرے کا مددگار قرار دیا گیا ہے، اس کو ہم قبائلی تکافل کہہ سکتے ہیں۔

* ''إن المؤمنین لا یترکون مفرحاً بینھم أن یعطوہ بالمعروف فی فداء أو عقل'' (حوالہ بالا)۔
(مسلمانوں کو بوجھل اور مایوس نہیں چھوڑا جائے گا، بلکہ ان کا فدیہ اور دیت سب مل کر ادا کریں گے)۔
یہ مسلمانوں کے مابین تکافلی نظام کا قیام ہے،

* ''وإن المؤمنین المتقین علیٰ من بغیٰ منھم أو ابتغیٰ دسیعۃ ظلم أو إثم أو عدوان أو فساد بین المؤمنین وأن أیدیھم علیہ جمیعاً ولو کان ولد أحدھم'' (حوالہ جات سابقہ)۔

(متقی مسلمان باغیوں اور ظالموں کے ظلم و گناہ اور فساد و طغیان کے خلاف مضبوط دیوار ہوں گے، سب کی قوت ایک مانی جائے گی، چاہے ان میں سے کسی کا کوئی بچہ ہی کیوں نہ ہو)۔

یہ بھی اجتماعی تکافل کی ایک نظیر ہے کہ ظلم وعدوان کے خلاف تمام مسلمانوں کو صف واحد میں کھڑا کر دیا گیا۔

* ''وإن المؤمنين بعضهم موالي بعض دون الناس'' (حوالہ بالا)۔

(مسلمان دوسرے لوگوں کے مقابلے میں باہم ایک دوسرے کے مددگار ہوں گے)۔

یہ بھی مسلمانوں کے تکافل اجتماعی کا ایک نمونہ ہے۔

* ''وإنه من تبعنا من يهود، فإن له النصر والأسوة غير المظلومين ولا متناصرين عليهم'' (الروض الانف ۲،۳۴۵)۔

(جو یہود ہمارے حمایتی ہونگے ان کو یکساں طور پر امداد واستحقاق حاصل ہوگا، ان پر کوئی ظلم نہیں ہوگا، اور نہ ان کے خلاف کسی کی مدد کی جائے گی)۔

یہ خطہ کی بنیاد پر اجتماعی تکافل کی مثال ہے۔

* ''وإن كل غازية غزت معنا يعقب بعضهم بعضاً'' (حوالہ بالا)۔

(جو جماعت ہمارے ساتھ جہاد میں نکلنے کی خواہشمند ہے ان میں باہم ترتیب قائم ہوگی، اور وہ یکے بعد دیگرے نکلیں گے)۔

یہ حربی حالات میں اجتماعی تکافل کی صورت ہے، ظاہری بات ہے کہ ترتیب قائم ہوجانے کے بعد جو لوگ جنگ میں نہیں جائیں گے وہ ان لوگوں کے گھروں کی ضروریات کا خیال رکھیں گے جو جنگ میں جاچکے ہیں)۔

* ''وإن المؤمنين يبيء بعضهم على بعض بمانال دمائهم في سبيل الله'' (حوالہ بالا)۔

(راہ خدا میں شہادت کی صورت میں مسلمان ایک دوسرے کی مکافات برابر طور پر کریں گے)۔

یہ بھی جہاد کے حالات میں باہم تعاون کی صورت ہے۔

* ''وإنه من اغتبط مؤمناً قتلاً عن بينة، فإنه قود به، إلا أن يرضى ولي المقتول وإن المؤمنين عليه كافة ولا يحل لهم إلا قيام عليه'' (حوالہ بالا)۔

(جو کسی مومن کو بلا قصور قتل کردے، اور ثبوت قتل موجود ہو تو اس کا قصاص لیا جائے گا، الا یہ کہ مقتول کے اولیاء راضی ہوجائیں اور یہ ذمہ داری تمام مسلمانوں پر عائد ہوتی ہے اور ان کے لئے نظام قصاص کے قیام کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے)۔

مظلوموں کی امداد کے مسئلہ پر یہ اجتماعی تکافل کی بہترین نظیر ہے۔

* ''وإن اليهود ينفقون مع المؤمنين ما داموا محاربين'' (حوالہ سابقہ)۔

(جنگی حالات کے دوران یہود مسلمانوں کی مالی امداد جاری رکھیں گے)۔

* ''وإن بينهم -بين المسلمين واليهود- النصر على من حارب أهل هذه الصحيفة'' (حوالہ سابقہ)۔

(مسلمان اور یہودی باہم تعاون کے پابند ہوں گے ان لوگوں کے خلاف جو اس میثاق میں شامل فریقوں سے برسرپیکار ہوں)۔

* ''وإن بينهم النصح والنصيحة'' (حوالہ بالا)۔ (ان کے درمیان باہم ہمدردانہ اور خیر خواہانہ جذبات کارفرما رہیں گے)۔

* ''وإن بينهم النصر على من دهم يثرب'' (حوالہ بالا)۔

(مدینہ منورہ پر یلغار کرنے والوں کے خلاف یہ باہم ایک دوسرے کے تعاون کے پابند ہوں گے)۔

غرض اس میثاق میں تعاون باہم اور تکافل اجتماعی کیلئے پورا خاکہ موجود ہے، اس میں دیت کی ادائیگی، قیدیوں کی رہائی، قرض یا کمر توڑ اخراجات کے بوجھ سے دبے ہوئے انسانوں کی امداد، ظلم وفساد کا دفاع وغیرہ مختلف مشکل مراحل کے لئے اجتماعی تعاون وتکافل کی بنیادیں مہیا کی گئی ہیں، اسی طرح یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ اس کے لئے مذہب، خطہ، زبان یا پیشہ کسی بھی چیز کو اساس بنایا جاسکتا ہے۔

انشورنس کے مقاصد:

انشورنس کے بنیادی مقاصد تین ہیں: ا۔ خطرات سے تحفظ اور ذہنی اطمینان ۲۔ مصیبت کے وقت ایک دوسرے کا تعاون، ۳۔ مستقبل کے لئے احتیاطی تدابیر۔

شریعت اسلامیہ میں ان تینوں کے لئے پوری گنجائش موجود ہے بشرطیکہ ان میں ناجائز عناصر کی آمیزش نہ ہو:

تحفظ واطمینان:

انسان فطری طور پر امن پسند واقع ہوا ہے، ہر شخص کی یہ آرزو ہوتی ہے کہ اسے ایسی جگہ اور ایسا ماحول نصیب ہو جہاں وہ مکمل اطمینان وسکون کے ساتھ رہ سکے، جہاں اس کی جان ومال کو کوئی خطرہ نہ ہو، جس جگہ وہ پوری آزادی اور بے فکری کے ساتھ اپنی ترقی کی رفتار کو جاری رکھ سکے، اسلام نے انسان کی اس فطری خواہش کو رد نہیں کیا، بلکہ قرآن کریم میں اس کا ایک نعمت خداوندی کے طور پر ذکر کیا گیا ہے:

{فليعبدوا رب هذا البيت، الذى أطعمهم من جوع وآمنهم من خوف} (سورہ قریش)۔

(پس چاہئے کہ لوگ اس گھر کے پروردگار کی عبادت کریں جس نے ان کو کھانا دے کر بھوک سے اور امن عطا فرما کر خوف سے نجات عطا فرمائی)۔

حضرت ابراہیمؑ نے بلد حرام کے لئے امن کی دعا فرمائی: {وإذ قال إبراهيم رب اجعل هذا البلد آمنا} (سورہ ابراہیم: ۳۵)۔

(اس وقت کو یاد کریں جب حضرت ابراہیمؑ نے دعا مانگی، پروردگار! اس شہر کو امن والا شہر بنا دیجئے)۔

ایک حدیث پاک میں ارشاد ہے: ''من أصبح منكم معافاً فى جسده آمناً فى سربه وعنده قوت يومه فكأنما حيزت له الدنيا'' (سنن ابن ماجه كتاب الزهد باب القناعة ص ۱۳۸۷، حدیث نمبر ۴۱۴۱)۔ (جس کی صبح اس حال میں ہو کہ جسمانی تکلیف سے آزاد اور نجی زندگی میں پر امن ہو اور اس کے پاس اس دن کی رزق موجود ہو تو گویا اسے ساری دنیا حاصل ہوگئی)۔

☆ اسی طرح قرآن کریم کی متعدد نصوص میں بقائے امن اور خطرات سے تحفظ کے لئے احتیاطی تدابیر اختیار کرنے کی ہدایات دی گئی ہیں، ارشاد ہے:

{يا أيها الذين آمنوا خذوا حذركم فانفروا ثبات أو انفروا جميعاً} (سورہ نساء: ۷۱)۔

(اے ایمان والو! اپنے تحفظ کا سامان اختیار کرو، یا تو سب الگ الگ نکلو، یا ایک ساتھ نکلو)۔

{وأنفقوا فى سبيل الله ولا تلقوا بأيديكم إلى التهلكة وأحسنوا إن الله يحب المحسنين} (سورہ البقرہ: ۱۹۵)۔

(راہ خدا میں خرچ کرو اور اپنے ہاتھ تباہی کی طرف مت بڑھاؤ اور حسن عمل اختیار کرو، اللہ پاک نیکوکاروں کو پسند فرماتے ہیں)۔

علاوہ ازیں شریعت اسلامیہ کی بے شمار ہدایات موجود ہیں جن میں ایک محفوظ اور پر امن سوسائٹی کی تشکیل پر زور دیا گیا ہے، جس میں ہر شہری کو اپنے حقوق کے معاملے میں مکمل تحفظ حاصل ہو، خلافت الٰہی کی ضرورت اسی لئے ہے، خلیفۂ وقت ملک میں اسی نظام کو نافذ کرنے کا پابند ہے، جس میں شریعت کی روشنی میں امن وامان کا ماحول بنایا گیا ہو، انسانی سوسائٹی اور حیوانی سوسائٹی میں یہی چیز خط امتیاز بنتی ہے، اگر انسانی معاشرہ بھی امن وامان اور نجی تحفظات سے محروم ہو تو اس میں اور حیوان میں کیا فرق رہ جائے گا؟

خطرات سے تحفظ کے لئے تعاون باہم:

انسانی زندگی ہر وقت خطرات کے دہانے پر ہے، اور اس سے کوئی فرد مستثنیٰ نہیں ہے، اسی لئے تنظیمی زندگی کی بڑی اہمیت ہے، خطرات یا نقصانات کا مقابلہ

ایک فرد کے لئے مشکل ہے، لیکن یہی بوجھ پوری جماعت پر تقسیم کردیا جائے تو آسان ہوجاتا ہے، اسلام نے جائز مقاصد کے لئے ایک دوسرے کے تعاون کا حکم دیا ہے، قرآن کریم میں ہے { وتعاونوا على البر والتقوىٰ ولا تعاونوا على الإثم والعدوان } (سورہ المائدۃ:۲)۔ (نیکی اور تقویٰ میں ایک دوسرے کی مدد کرو، ظلم و گناہ میں تعاون مت کرو)۔

تعاون اپنے وسیع معنیٰ میں اسلامی سوسائٹی کی بنیاد ہے، اس میں مالی، بدنی، اخلاقی ہر قسم کا تعاون داخل ہے، اسلامی سوسائٹی میں جس طرح مصیبت کے وقت تعاون مطلوب ہے اسی طرح خطرات کی پیش بندی کے لئے بھی تعاون پسندیدہ چیز ہے، خطرہ فقر و فاقہ کا ہو، کساد بازاری کا ہو تجارتی نقصانات کا ہو، جان کو درپیش ہو یا مال کو، جسمانی صحت متاثر ہوتی ہو یا عزت و آبرو، کسی بھی قسم کا خطرہ ہو، اگر اس کی پیش بندی کے لئے جائز طریق اختیار کیا جاتا ہے تو ایک دوسرے کا تعاون کیا جانا چاہئے، کہ اس سے فرد کی زندگی اور جماعت کی ترقی وابستہ ہے، سنت نبوی میں اس کی بہترین مثال نہد والی روایت ہے جس کو امام بخاریؒ اور دیگر ائمۂ حدیث نے نقل کیا ہے:

''عن أبي موسى قال قال النبي ﷺ أن الأشعريين إذا أرملوا في الغزو أو قل طعام عيالهم بالمدينة جمعوا ماكان عندهم من ثوب واحد ثم اقتسموا بينهم في إناء واحد بالسوية فهم مني وأنا منهم'' (صحيح البخاری ۱،۳۳۸، کتاب الشرکة باب الشرکة في الطعام والنهد والعروض، حدیث نمبر ۲۴۸۶)۔

(حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ قبیلۂ اشعر کے لوگ جنگ کے مواقع پر غذائی اشیاء کی کمی محسوس کرتے تو جس کے پاس جو ہوتا ایک کپڑے میں جمع کرلیتے، پھر باہم ایک برتن سے برابر برابر تقسیم کرلیتے، پس وہ مجھ سے ہیں اور میں ان سے ہوں)۔

ایک دوسری روایت حضرت سلمہ بن اکوعؓ سے ہے وہ نقل کرتے ہیں:

خفت أزواد القوم وأملقوا، فأتوا النبي ﷺ في نحر إبلهم، فأذن لهم فلقيهم عمر فأخبروه، فقال ما بقاؤكم بعد إبلكم؟ فدخل على النبي ﷺ، فقال: يا رسول الله! ما بقاؤهم بعد إبلهم، فقال رسول الله ﷺ: ناد في الناس يأتون بفضل أزوادهم، فبسط لذلك نطع وجعلوه على النطع، فقام رسول الله ﷺ فدعا وبرك عليه، ثم دعاهم بأوعيتهم فاحتثى الناس حتى فرغوا، ثم قال رسول الله ﷺ: أشهد أن لا إله إلا الله وأني رسول الله'' (صحيح البخاری ۱،۳۳۸، کتاب الشرکة حدیث نمبر ۲۴۸۴)۔ (قوم کی غذائی اشیاء کم ہوگئیں اور فقر و فاقہ کی نوبت آپہنچی، تو وہ لوگ نبی کریم ﷺ کے پاس اپنے اونٹ ذبح کرنے کی اجازت کے لئے حاضر ہوئے، آپ ﷺ نے اجازت مرحمت فرمادی، راستے میں حضرت عمرؓ سے ملاقات ہوئی، تو لوگوں نے ان کو ساری روداد سنائی، حضرت عمرؓ نے کہا کہ اونٹوں کے بعد پھر تمہاری بقا کا مسئلہ کیا ہوگا؟ اس کے بعد حضرت عمرؓ رسول اللہ ﷺ کے پاس حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ اونٹوں کے ختم ہونے کے بعد ان کی زندگی کا کیا ہوگا؟ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: لوگوں میں اعلان کرو کہ سب لوگ اپنا بچا ہوا توشہ لیکر حاضر ہوجائیں، پھر چمڑے کا دسترخوان بچھایا گیا اور اسی پر پوری جماعت کا بچا کھچا کھانا رکھ دیا گیا، اس کے بعد سرکار دو عالم ﷺ نے کھڑے ہوکر برکت کی دعا فرمائی، پھر لوگوں سے کہا کہ اپنے برتن لیکر آئیں اور جی بھر کر کھانا لے جائیں، لوگوں نے ایسا ہی کیا، جب سب لوگ فارغ ہوگئے تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور میں اللہ کا رسول ہوں)۔

☆ حضرت جابر بن عبداللہؓ سے مروی ہے:

''بعث رسول الله ﷺ بعثاً قبل الساحل فأمر عليهم أباعبيدة بن الجراح ؓ وهم ثلاثمائة وأنافيهم، فخرجنا حتى إذا كنا ببعض الطريق فني الزاد، فأمر أبوعبيدة بأزواد ذلك الجيش فجمع ذلك كله فكان مزودي تمر، فكان يقوتنا كل يوم قليلا قليلا حتى فني فلم يكن يصيبنا إلا تمرة تمرة، الحديث (صحیح البخاری حوالہ بالا)۔

(رسول اللہ ﷺ نے ایک دستہ ساحل کی طرف روانہ فرمایا، اور اس کا امیر حضرت ابوعبیدہ ابن الجراحؓ کو مقرر فرمایا، دستہ میں تین سو (۳۰۰) آدمی تھے، میں بھی ان میں شامل تھا، راستے میں توشہ ختم ہوگیا، حضرت ابوعبیدہؓ نے تمام شرکاء سفر کو اپنے توشے ایک جگہ جمع کرنے کا حکم دیا، چنانچہ تمام توشے یکجا کئے گئے تو صرف دو تھیلے ہوئے، ہم لوگوں کو اسی جمع شدہ پونجی سے بہت تھوڑا تھوڑا دیا جاتا تھا، یہاں تک کہ صرف ایک ایک چھوارہ حصہ پڑنے لگا......)۔

یہ تینوں واقعات عہد نبوت کے ہیں جن میں پہلے واقعہ کا تعلق ایک خاص قبیلہ سے ہے اور دوسرے واقعہ میں معجزۂ نبوی کا اظہار ہے، اور تیسرے میں اللہ پاک کی خاص نصرت وعنایت کا بیان ہے، لیکن ان سب میں قدر مشترک جو چیز ہے وہ یہ کہ انفرادی خطرات کو اجتماعی تعاون کے ذریعہ دور یا کم کیا گیا، اور خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس میں شرکت فرمائی یا اس کی تحسین فرمائی، اس لئے کہ اگر اس طرح نہ کیا جاتا تو ممکن تھا کہ کئی لوگ تباہ ہوجاتے یا ناقابل تلافی نقصان کا شکار ہوتے۔

یہ دونوں واقعے اس بات کی بھی عملی مثال ہیں کہ خطرات سے تحفظ کے لئے جو اجتماعی تعاون کی راہ اختیار کی جائے گی اس میں اصل ملکیت کے لحاظ سے گو افراد متفاوت ہوں، لیکن باہم اشتراک کے بعد ہر شخص مساوی درجہ کا استحقاق رکھے گا اور اس کو غرر یا ربا نہیں، بلکہ تعاون قرار دیا جائے گا۔ یہ اجتماعی تکافل ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ افراد کی مصالح کو پروان چڑھایا جائے اور ان کے مضرات کو دور کیا جائے۔

☆ اس مضمون کی سب سے بلیغ تعبیر اس حدیث پاک میں آئی ہے:

''المؤمن للمؤمن کالبنیان یشد بعضہ بعضاً'' (صحیح البخاری ۱٫۹۹، کتاب الصلوٰۃ باب تشبیك الاصابع فی المسجد، حدیث نمبر ۴۸۱)۔ (مومن، مومن کے لئے ایک عمارت کی طرح ہے جس میں ایک حصہ دوسرے حصے کو تقویت پہنچاتا ہے)۔

مستقبل کے لئے احتیاطی تدابیر اور اسباب:

ہنگامی حالات سے بچنے اور مستقبل کے لئے احتیاطی تدابیر کرنا توکل کے خلاف نہیں ہے، یہ دنیا دار الاسباب ہے، یہاں اسباب سے بے نیاز ہوکر زندگی نہیں گذاری جاسکتی، اسی لئے اسلام نے اسباب کو اختیار کرنے کی ہدایت دی ہے، اور ترک اسباب سے روکا ہے، عہد نبوی میں ایک صاحب نے اللہ کے بھروسے اپنی اونٹنی کھلی چھوڑ دی، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر نکیر فرمائی اور ارشاد فرمایا:

''اعقلہا وتوکل'' (صحیح ابن حبان ۲٫۵۱۰ ط الرسالۃ، شعب الایمان للبیہقی ۲٫۸۰ بیروت، مستدرك للحاکم ۳٫۶۲۳)۔ (پہلے اونٹنی کو باندھو پھر توکل کرو)۔

خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم عام حالات میں (معجزات اور خوارق عادات کا استثناء کرکے) اسباب کو اختیار فرماتے تھے، اگر اسباب سے بے نیاز ہوکر محض توکل کی قوت سے تمام مسائل حیات حل کرنا ممکن ہوتا تو اسلام کی اشاعت کے لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو سخت ترین مجاہدوں، دعوتی اسفار، دفاعی اقدامات، اور جنگ وجہاد کی کوئی ضرورت نہ ہوتی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھکر کوئی صاحب توکل نہیں ہوسکتا تھا، ...... آپ نے فاقے کیے ...... قرض لئے ...... دوا علاج کرایا ...... دوران سفر سواریاں استعمال فرمائیں ...... ہتھیار رکھے ...... تکلیفیں اٹھائیں ...... وغیرہ اگر اس دنیا میں اسباب کے بغیر بھی عادۃً کام ہوسکتا تھا تو امام الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کو ان تکلیفوں کی ضرورت نہ ہوتی، تمام کام محض دعا اور اشارۂ غیبی سے انجام پاجاتے۔

اس لئے سبب کے درجے میں آئندہ کے لئے احتیاطی تدابیر توکل وایمان کے ہرگز منافی نہیں ہے، قرآن کریم میں حضرت یوسفؑ کی زبانی حکومت مصر کو بطور احتیاط مستقبل کی منصوبہ بندی کا جو مشورہ دیا گیا وہ اس باب میں بہترین نمونہ ہے، حضرت یوسفؑ نے آنے والے قحط کے نقصانات سے بچنے کے لئے حکومت مصر کو مشورہ دیا تھا:

{قال تزرعون سبع سنین داباً فما حصدتم فذروہ فی سنبلہ إلا قلیلاً مما تأکلون، ثم یأتی من بعد ذلك سبع شداد یأکلن ما قدمتم لہن إلا قلیلاً مما تحصنون، ثم یأتی من بعد ذلك عام فیہ یغاث الناس وفیہ یعصرون} (سورہ یوسف: ۴۷)۔ (آپ نے فرمایا تم سات سال تک جم کر کھیتی کرو پھر جو پیداوار ہو اس کو اس کی بالیوں ہی میں چھوڑ دو صرف تھوڑا سا کھانے کے بقدر نکال لو، پھر اس کے بعد قحط شدید کے سات سال آئینگے، جو تمہارے سارے ذخیرے کو ختم کردیں گے، صرف بیج کے بقدر جو تم نے بچا کر رکھا ہوگا وہ بچ جائے گا، پھر اس کے بعد جو سال آئے گا اس میں خوب بارش ہوگی اور لوگ خوب فائدہ اٹھائیں گے)۔

ایک نمونہ سنت نبویہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام سے بھی پیش ہے: حجۃ الوداع کے سال حضرت سعد بن ابی وقاصؓ بیمار تھے، سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم عیادت کو تشریف لے گئے، اس موقعہ پر حضرت سعد بن ابی وقاص کا بیان ہے: ''قلت: یا رسول اللہ أوصی بمالی کلہ؟ قال: لا، قلت: فالشطر، قال: لا، قلت: الثلث، قال: فالثلث والثلث کثیر إنك إن تدع ورثتك أغنیاء خیر من أن تدعہم عالۃ

یتکففون الناس فی أیدیھم'' (بخاری کتاب الوصایا باب ان یترك ورثة أغنیاء، حدیث نمبر ۲۷۴۲ ص ۴۸۲)۔

(میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! میں اپنے پورے مال کی وصیت کردوں؟ آپ نے فرمایا نہیں، میں نے عرض کیا نصف؟ آپ نے فرمایا نہیں، میں نے عرض کیا تہائی، تو آپ نے فرمایا ہاں، تہائی، اور یہ بہت زیادہ ہے، تم اپنے ورثہ کو اچھی مالی حالت میں چھوڑ کر جاؤ، یہ اس سے بہتر ہے کہ تم ان کو محتاج چھوڑ کر جاؤ اور وہ اپنے کفاف کے لئے لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلانے پر مجبور ہوں)۔

یہ وہ اساسی تصورات ہیں جن پر ایک بہتر اسلامی انشورنس کی تشکیل کی جاسکتی ہے، اور جن کی مدد سے عام لوگوں کو ہنگامی حالات میں آسانیاں فراہم کی جاسکتی ہیں۔

چند ذیلی بنیادیں: ...... اس ضمن میں بعض ذیلی افکار و نظریات کی طرف بھی اشارہ کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے، جن سے اسلامی انشورنس کی تشکیل میں مدد ملتی ہے۔ شریعت اسلامیہ میں کئی ایسی مثالیں موجود ہیں جن میں شدید ترین حالات میں فرد کے نقصان کو جماعت پر تقسیم کیا گیا ہے، تاکہ ناقابل برداشت کو قابل برداشت میں تبدیل کیا جائے۔

عاقلہ کا نظام:

☆ اسلام میں قتل خطا اور شبہ عمد کی صورت میں دیت کو عاقلہ سے وابستہ کیا گیا ہے، صحیح حدیث میں مروی ہے:

''أن رسول اللہ ﷺ قضی دیة المرأة علی عاقلتها'' (بخاری باب جنین المرأة وأن العقل علی الوالد ۲۱،۲۲۰ حدیث نمبر ۶۳۹۹، مسلم باب الجنین...... ۹/ ۴۰ حدیث نمبر ۳۱۸۵) (رسول اللہ ﷺ نے عورت کی دیت کا ذمہ دار عاقلہ کو قرار دیا)۔

ایک دوسری روایت کے الفاظ ہیں: ''قضی رسول اللہ ﷺ أن العقل علی عصبتها'' (بخاری باب میراث المرأة والزوج مع الولد ۲۰/ ۴۶۸ حدیث نمبر ۶۲۴۳)۔

عاقلہ کے حدود میں حنفیہ کے نزدیک خاندان کے علاوہ، ہم پیشہ، ہم فکر، ہم مسلک اور دیگر ہم رشتہ افراد بھی شامل ہیں (المبسوط ۳۰/ ۳۱۰ کتاب المعاقل، بدایة المجتہد ۲/ ۴۴۹)۔

ظاہر ہے کہ اس کا مقصد اس کے سوا کیا ہے کہ اس طرح کے جرائم میں جن میں انسان بلا وجہ اچانک بہت بڑے مالی تاوان کا جواب دہ قرار پاتا ہے، اور عام حالات میں انسان کے لئے یہ ناقابل برداشت ہوتا ہے، لیکن یہی بوجھ جب پوری جماعت پر تقسیم کردیا گیا تو یہ قابل برداشت ہوگیا، علامہ سرخسیؒ نے اس حکمت کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

''وکل أحد لا یأمن علی نفسه أن یبتلی بمثله وعند ذلك یحتاج إلی إعانة غیره، فینبغی أن یعین من ابتلی لیعینه غیره إذا ابتلی بمثله کما ہو العادة بین الناس فی التعاون والتواد فهذا ہو صورة أمة منتصرة وجبلة قوم قوامین بالقسط شهداء لله متعاونین علی البر والتقوی'' (المبسوط للسرخسی ۲۰،۲۰۵ نیٹ نسخہ)۔

(کوئی بھی انسان اس طرح کی غلطیوں میں مبتلا ہوسکتا ہے اور ایسے ہی موقعہ پر دوسرے کی مدد کی ضرورت پڑتی ہے، اس لئے چاہئے کہ اس طرح کی مصیبت میں دوسرے کی مدد کی جائے، تاکہ وقت آنے پر دوسرا بھی اس کی مدد کرے، تعاون کے معاملے میں لوگوں کی عادت یہی ہے، اور مددگار امت کی تصویر اور انصاف قائم کرنے والی قوم کی جبلت یہی ہے اور یہی شہداء الٰہی اور بر و تقویٰ کے علمبرداروں کی شان ہے)۔

عقد موالات:

☆ عقد موالات بھی بعض حالات میں دیت کی تقسیم اور ذمہ داریوں کی تخفیف کا سبب بنتا ہے، بہت سے فقہاء اس کو سبب تسلیم نہیں کرتے، لیکن فقہاء حنفیہ کے یہاں اصل وارثین کے نہ ہونے کی صورت میں یہ وراثت و دیت کی فی الجملہ بنیاد بنتا ہے...... (حاشیة ابن عابدین ۵/ ۷۸)۔

ظاہر ہے کہ اس نظریہ کی اساس بھی اسی جذبۂ تعاون پر ہے جس میں ایک اجنبی شخص کو بعض شرائط کے ساتھ محض معاہدہ کی وجہ سے شراکت مل جاتی ہے، یہ

تصور قرآن کریم کی اس آیت پاک سے ماخوذ ہے:

{والذین عقدت أیمانکم فاتوھم نصیبھم إن اللہ کان علی کل شیئ شھیداً} (سورۂ نساء: ۳۳)۔

(جن لوگوں نے تم سے عہد کیا ہے ان کو ان کا حصہ دے دو، بے شک اللہ پاک ہر چیز پر گواہ ہیں)۔

آیت کریمہ میں نصیب کی ایک تفسیر میراث سے کی گئی ہے (احکام القرآن للجصاص ۲/۱۸۵)۔

معروف کا التزام:

☆ فقہاء مالکیہ کے یہاں ایک جزئیہ ملتا ہے کہ اگر کوئی شخص کسی معروف چیز کا التزام کرلے جو اس پر پہلے سے لازم نہیں تھی، مثلاً کسی کو صدقہ، ہبہ یا عاریت پر کوئی چیز فراہم کرنے کا عہد کرنا، کسی کی خدمت یا رہائش کے انتظام کا التزام کرنا، کسی کی کفالت یا ضمان قبول کرنا وغیرہ تو فقہاء مالکیہ کے نزدیک التزام کی بنا پر وہ چیز ذمہ میں لازم ہوجاتی ہے، الا یہ کہ وہ شخص ہی مرجائے یا غربت وافلاس کا شکار ہوجائے، اس کی توجیہ امام مالکؒ نے یہ فرمائی:

''لأن ذلك معروف والمعروف من أوجبه علی نفسه لزمه'' (التاج والاکلیل للعبدری الشھیر بالمواق، الحمالة بالکتابة ۸،۱۷۰، نسخه المکتبة الشاملة نقلاً عن المدونة کتاب الحمالة، تھذیب المدونة ۳،۲۶۵ للقیروانی البرذاعی)۔ (اس لئے کہ یہ معروف ہے اور معروف کو جب انسان اپنے ذمہ لازم کرتا ہے تو وہ لازم ہوجاتا ہے)۔

ابن رشد نے اس کی تشریح اس طرح کی: ''فھذا أمر قد أوجبه علی نفسه والمعروف علی مذھب مالك وجمیع أصحابه لازم لمن أوجبه علی نفسه مالم یمت أو یفلس'' (البیان والتحصیل والشرح والتوجیه والتعلیل لابی الولید محمد بن احمد بن رشد القرطبی ۸،۴۳ ط بیروت)۔ (اس چیز کو اس نے اپنے ذمہ لازم کرلیا اور مذہب مالکی کے مطابق معروف کو جب آدمی اپنے ذمہ لازم کرلیتا ہے تو جب تک موت یا افلاس کا شکار نہ ہو وہ چیز اس کے ذمہ لازم رہتی ہے)۔

ظاہر ہے کہ التزام کی بنا پر جو ذمہ داریاں انسان پر عائد ہوتی ہیں وہ بھی دراصل دوسرے ایسے اشخاص کا تعاون ہے جو اپنے طور پر ان ذمہ داریوں کو ادا کرنے کی طاقت نہیں رکھتے، اس طرح فقہ مالکی کا یہ نظریہ ذمہ داریوں کی تقسیم کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

مشروط ہبہ:

☆ اسلام میں زکوۃ وصدقات کے علاوہ ہبہ کے ذریعہ بھی ضرورت مندوں کی امداد کی تلقین کی گئی ہے، اس کا فائدہ ثواب کے علاوہ کبھی دنیا ہی میں لوٹنے والے فائدے کی صورت میں بھی ظاہر ہوتا ہے، اسی لئے علماء میں یہ بھی زیر بحث آیا ہے کہ اگر کوئی شخص ہبہ کے ساتھ اپنے فائدے کی کوئی شرط لگادے تو کیا یہ مقتضائے عقد کے خلاف ہوگا؟ حضرت امام شافعیؒ کے ایک قول کو چھوڑ کر جمہور فقہاء کی رائے یہ ہے کہ یہ مقتضائے عقد کے خلاف نہیں ہے، اور اگر اس کی منشا پوری نہیں ہوئی تو وہ ہبہ کو فسخ کرسکتا ہے...... گویا یہ ایک طرح تعاون کا تبادلہ ہے جس کی ضرورت دنیا کی زندگی میں کسی کو بھی پڑسکتی ہے، علامہ بابرتیؒ شرح ''ہدایہ'' میں لکھتے ہیں:

''لأن العادة الظاھرة أن الإنسان یھدی إلی من فوقه لیصونه بجاھه وإلی من دونه لیخدمه وإلی من یساویه لیعوضه وإذا تطرق الخلل فیما ھو المقصود من العقد یتمکن العاقد من الفسخ کالمشتری إذا وجد بالمبیع عیباً فتثبت له ولایة الفسخ عند فوات المقصود إذا العقد یقبله'' (عنایه شرح الھدایه ۹،۴۰ ط مصطفی الحلبی)۔

(اس لئے کہ عام رواج یہی ہے کہ انسان اپنے سے اوپر والے کو ہدیہ اس لئے دیتا ہے کہ اس کی عزت وعظمت کی وجہ سے اس کا تحفظ ہو، اور اپنے سے نیچے والے کو اس لئے کہ اس کی خدمت کرے، اور اپنے برابر والے کو اس لئے کہ اسے اس کا بدلہ ملے، لیکن جب مقصد میں خلل پیدا ہوجائے تو عاقد کو فسخ عقد کا اختیار حاصل ہوگا جس طرح کہ مشتری کو اگر صحیح سالم مبیع نہ ملے تو اسے بیع کے فسخ کرنے کا اختیار ہوتا ہے اسلئے کہ عقد میں اس کی گنجائش موجود ہے)۔

اس کا ماخذ دراصل ایک حدیث پاک ہے: ''الرجل أحق بھبته ما لم یثب منھا'' (سنن دارقطنی ۷،۲۷۷ حدیث نمبر ۳۰۱۴ ط وزارت اوقاف مصر)۔ (انسان اپنے ہبہ کا زیادہ حقدار ہے جب تک کہ اس کا معاوضہ نہ لے)۔

اس مضمون کی متعدد روایات کتب حدیث مثلاً ابن ماجہ (۷/۳۱۰) مصنف ابن ابی شیبۃ (۶/۴۷۴)، مستدرک حاکم (۲/۵۲) اور سنن بیہقی (۶/۱۸۱) میں آئی ہیں ان روایات سے تعاون برائے تعاون کا نظریہ اخذ کیا گیا، جو اسلامی انشورنس کے لئے شاہ کلید بن سکتا ہے۔

عمری ورقبی:

☆ عمریٰ بھی ہبہ ہی کی ایک قسم ہے، مگر اس میں عمر بھر کی قید لگی ہوتی ہے، دینے والا اس طرح دیتا ہے کہ میرا یہ گھر (مثال کے طور پر) تاحیات تیرے لئے ہے، کبھی یہ شرط بھی لگادی جاتی ہے کہ تیرے مرنے کے بعد یہ جائداد واپس میری ہوگی، اس طرح کے مشروط ہبہ کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ اس میں فقہاء کے درمیان اختلاف ہے، جمہور علماء اس طرح کے مشروط معاملے کو درست نہیں سمجھتے، حنفیہ شرط کو باطل کہتے ہیں (ہدایہ مع شرح العنایہ ۹/۵۵)، شافعیہ عقد ہی کو ناجائز کہتے ہیں (روضۃ الطالبین للنووی ۵/۳۷۰)، مالکیہ کی رائے یہ ہے کہ اس طرح کا مشروط معاملہ درست ہے اور ہبہ پر دی ہوئی چیز اس شخص کے مرنے کے بعد اس کے قدیم مالک کو لوٹ جائے گی (المدونۃ الکبریٰ ط دار الباز ۶/۹۱)، حنابلہ حنفیہ کے ہم خیال ہیں، اور ایک روایت مالکیہ کے مطابق بھی ہے (المغنی لابن قدامۃ ۵/۶۸۸)۔

☆ اسی سے ملتی جلتی صورت رقبیٰ کی ہے جس کا تذکرہ قدیم کتب فقہ میں ملتا ہے، اس کی صورت یہ ہوتی تھی کہ ہبہ کرنے والا اس طرح کہتا کہ یہ چیز تیرے لئے ہے، اگر تو پہلے مرگیا تو یہ چیز میری ہوگی اور اگر پہلے میں مرگیا تو یہ تیری چیز رہے گی، اس میں بھی فقہاء کا اختلاف ہے، عام طور پر حنفیہ سرے سے اس طرح کے عقد ہی کو باطل قرار دیتے ہیں، جبکہ دوسرے فقہاء اس کو درست کہتے ہیں اور شرط کے مطابق سامان واہب کو واپس لوٹانے کے قائل ہیں، (حوالہ جات بالا)

ہبہ میں قبضہ کی اہمیت:

☆ ہبہ کے ذیل میں ایک بحث یہ آتی ہے کہ آیا ہبہ محض عقد سے مکمل ہوجاتا ہے، یا اس کے لئے قبضہ بھی ضروری ہے، جمہور فقہاء قبضہ کو ضروری قرار دیتے ہیں، اور قبضہ کے بغیر ہبہ کی کارروائی کو مکمل نہیں کہتے (حوالہ جات بالا)، جبکہ حضرت امام مالکؒ قبضہ کی شرط نہیں لگاتے ہیں، نہ اس کی صحت کے لئے اور نہ اس کی تکمیل کے لئے، ان کے نزدیک محض قبول کرلینا ہبہ کے لازم ہونے کے لئے کافی ہے، انہوں نے اس کو بیع پر قیاس کیا ہے (بدایۃ المجتہد ۲/۳۳۱ ط دار الجیل بیروت)۔

حنابلہ کے یہاں تھوڑی تفصیل ہے، وہ مکیلی اور موزونی چیزوں میں قبضہ کو ضروری قرار دیتے ہیں، لیکن ان کے علاوہ چیزوں میں ہبہ کے لزوم کے لئے محض عقد کو کافی کہتے ہیں (المغنی ۵/۶۵۳ ط الریاض)، یہ دراصل دونوں رجحانات کو جمع کرنے کی کوشش ہے، جمہور فقہاء کے پیش نظر یہ ہے کہ یہ عقد تبرع ہے، اگر قبضہ کے بغیر ہی یہ لازم اور واجب الاداء ہوجائے تو یہ عقد تبرع کے بجائے عقد ضمان ہوجائے گا جو کہ خلاف مفروض ہے، نیز اس سلسلے میں حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ اور دیگر صحابہؓ سے جو آثار منقول ہیں ان سے عام طور پر صحابہ کا موقف بھی یہی نظر آتا ہے کہ قبضہ کے بغیر ہبہ مکمل نہیں ہوتا (بدائع الصنائع ۱۳/۳۰۶ فصل فی شرائط رکن الہبۃ)۔

اور اگر اس کے ساتھ معاوضہ کی شرط لگ جائے تو بھی فی الجملہ اس کی حقیقت تبدیل نہیں ہوتی اور اس کے لزوم کے لئے قبضہ کی شرط برقرار رہتی ہے، البتہ معاوضہ کی قید آجانے کی بنا پر بیع کی تھوڑی مشابہت پیدا ہوجاتی ہے، مثلاً مناسب معاوضہ نہ ملنے کی صورت میں واہب اپنی چیز واپس لے سکتا ہے، حدیث میں ہے: "من وهب هبة يرى أنه إنما أراد بها الثواب فهو على هبته يرجع فيها إذا لم يرض منها" (موطأ امام مالك ۱۰۹۲، ط مؤسسة زائد بن سلطان، سنن بيهقي باب المكافاة في الهبة ۲۲۵، ۳۰ ط وزارة الاوقاف مصر، شرح مشكل الآثار للطحاوی ۱۳،۳۲ ط مؤسسة الرسالة)۔ (جو شخص کسی کو کوئی چیز ہبہ کرے جس کا مقصد معاوضہ لینا ہو اور معاملہ اس کی مرضی کے مطابق نہ ہو تو وہ اپنا ہبہ واپس لے سکتا ہے)۔

اسلام کے نظام تکافل کا اجمالی خاکہ:

مذکورہ بالا اصول ونظریات کی روشنی میں ایک ایسا تکافلی نظام مرتب کیا جاسکتا ہے، جو تعاون اور تبرع کے جذبہ پر مبنی ہو، مالی بنیادوں پر مستحکم اور خود کفیل ہو، ربا، قمار، مکر وفریب اور ظلم وعدوان کے فاسد عناصر سے پاک ہو، جو اپنے شرکاء کی امیدوں کے لئے موجودہ مروجہ انشورنس کمپنیوں سے کسی طرح کم نہ ہو،

☆ اس سلسلے میں پہلی بنیادی بات یہ ہے کہ کسی چیز کے جائز ہونے کے لئے یہ ضروری نہیں کہ وہ نظام یا معاملہ قرآن وحدیث یا خیر القرون میں صراحۃً موجود ہو، بلکہ صرف اس قدر کافی ہے کہ معاملہ کی صورت قرآن وحدیث اور شریعت اسلامیہ کے کسی حکم سے متصادم نہ ہو، مقاصد شریعت کے خلاف نہ ہو، شرعی مفاسد سے پاک ہو اور عام لوگوں کے لئے مفید ہو، ...... جمہور فقہاء کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ اشیاء (عبادات کو چھوڑ کر) میں اصل اباحت ہے، (ارشاد الفحول للشوکانی ۲۸۴، الوجیز فی ایضاح قواعد الفقہ الکلیۃ ۱۲۹) اکثر حنفیہ (تیسیر التحریر لمحمد امین امیر بادشاہ ۲/۱۶۸) شافعیہ (الاشباہ والنظائر للسیوطیؒ ۶۰) حنابلہ (التمہید للاسنویؒ ۴/۱۷۲ شرح الکوکب المنیر لابن

النجار ۱/۳۲۵،۳۲۶) مالکیہ میں ابوالفرج عمرو بن محمد اللیثی البغدادی المالکی (إحکام الفصول ۶۸۱ بحوالہ القواعد والضوابط الفقہیۃ المتضمنۃ للتیسیر لعبد الرحمن بن صالح عبد اللطیف) کی رائے یہی ہے۔

☆ دوسری بات یہ ہے کہ اگر معاملے کی شرائط فریقین میں باہم رضامندی سے طے پا جائیں اور بنیادی طور پر اس میں کوئی چیز خلاف شرع نہ ہو اور ان کی غرض بھی درست ہو تو وہ معاملہ درست ہوگا اور اس میں طے شدہ شرائط کی پابندی تمام فریقوں پر لازم ہوگی، اس لئے کہ اسلام میں عہد کی پابندی اور معاملات کی شفافیت کی بڑی تاکید آئی ہے، قرآن کریم میں ہے: یاأیھا الذین آمنوا أوفوا بالعقود} (سورہ المائدۃ:۱)۔ (اے ایمان والو! عقود کو پورا کرو)۔

{ وأوفوا بالعهد إن العهد كان مسئولاً } (سورہ الاسراء:۳۴)۔ (اور عہد کو پورا کرو بے شک عہد کے بارے میں باز پرس ہوگی)۔

حضرت عمرو بن عوف مزنی سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''الصلح جائز بين المسلمين إلا شرطاً حرم حلالاً أو أحل حراماً والمسلمون عند شروطهم إلا شرطاً حرم حلالاً أو أحل حراماً'' (سنن الترمذی کتاب الاحکام ۵،۳۴۱ حدیث نمبر ۱۴۰۲، سنن ابوداؤد باب الصلح ۳،۳۳۲ حدیث نمبر ۳۵۹۶)۔ (مسلمانوں کے درمیان ہونے والی مصالحت جائز ہے، سوائے اس شرط کے جو کسی حلال کو حرام یا حرام کو حلال کرے، اور مسلمان اپنی شرطوں کے پابند ہیں سوائے اس شرط کے جو کسی حلال کو حرام یا حرام کو حلال بنائے)۔

اس طرح کسی ایسے معاملے میں جو فریقین یا چند افراد کے درمیان طے پائے اور اس کی مقررہ شرائط شریعت کے خلاف نہ ہوں تو ان کی رعایت ضروری ہوگی، کوئی مباح چیز جب عقد کے دائرے میں آجاتی ہے تو وہ لازم ہو جاتی ہے۔

اسلامی انشورنس کے بنیادی نکات:...... مذکورہ بالا اصول ونظریات کی روشنی میں ایک ایسے تکافلی نظام کا خاکہ تیار ہو سکتا ہے، جس کو آپ اسلامی انشورنس کہہ سکتے ہیں، اس میں درج ذیل نکات کو جگہ دی جاسکتی ہے:

شرعی بورڈ کا قیام:

☆ ایک ایسی مالیاتی کمپنی بنائی جائے جس میں کوئی شرط یا معاملہ خلاف شریعت نہ ہو، جمع شدہ سرمایہ ایسے بینکوں میں نہ رکھا جائے جہاں سودی یا غیر شرعی کاروبار ہوتا ہو، اگرچہ وہ معاملہ بالکل جدید نوعیت کا ہو اور پچھلے زمانے میں اس طرح کا کوئی معاملہ پیش نہ آیا ہو۔

اس کے لئے مناسب ہے کہ کوئی شرعی نگراں بورڈ قائم کیا جائے جو کمپنی کے جملہ معاملات کی کڑی نگرانی رکھے اور اس کا فیصلہ ہر حال میں قابل قبول اور واجب التنفیذ ہو۔

عقد تبرع:

☆ کمپنی کے فارم میں یہ صراحت کی جائے کہ یہ عقد تبرع ہے اور میں یہ سرمایہ بطور تبرع جمع کر رہا ہوں، اور اس کا مقصد مصیبت و پریشانی کے وقت پریشان حال ممبر کا تعاون کرنا ہے، خواہ اس کی نوبت خود اسے پیش آئے یا کسی دوسرے ممبر کو، البتہ جمع شدہ سرمایہ کو منجمد رکھنے کے بجائے اس کو کسی جائز نفع بخش تجارت میں لگایا جائے اور اس کے منافع سے کمپنی کے انتظامی امور انجام دیئے جائیں، اور باقی ماندہ منافع ممبران پر ان کے سرمایہ کے تناسب سے تقسیم کر دیئے جائیں۔

عقد معاوضہ اور عقد تبرع میں فرق:

دراصل عقد معاوضہ اور عقد تبرع کے مزاج میں بڑا فرق ہے، عقد معاوضہ نتیجہ کے اعتبار سے عقد ضمان بنتا ہے، اور اس میں معاملات کی تمام شقوں کی مکمل وضاحت ضروری ہے، اگر اس میں کوئی بھی بنیادی شق مجہول رہ جائے جس سے کہ نزاع کا اندیشہ ہو تو سرے سے معاملہ ہی فاسد ہو جائے گا، اس کے بالمقابل عقد تبرع میں بڑی وسعت ہے، یہ یک طرفہ معاملہ ہوتا ہے اور ایثار وتعاون کے جذبہ پر اس کی تعمیر ہوتی ہے جس میں کسی سے کسی کا کوئی مطالبہ نہیں ہوتا، اور اسی لئے کسی بات کے غیر واضح رہ جانے کی صورت میں عموماً کسی نزاع کا بھی اندیشہ نہیں ہوتا۔

عقد معاوضہ کا مزاج قرآن کریم کی اس آیت سے سمجھ میں آتا ہے: { لا تأكلوا اموالكم بينكم بالباطل إلا أن تكون تجارة عن تراض منكم } (سورہ نساء:۲۹)۔

(اپنے مال ناجائز طور پر مت کھاؤ، مگر یہ کہ تجارت کے طور پر ہو اور باہمی رضامندی سے ہو)۔

یعنی معاملے کی تمام شقیں روشنی میں آئیں، اور باہم رضامندی سے ان کو طے کیا جائے، اگر کوئی بات بھی کسی ایک فریق پر غیر واضح رہ جاتی ہے، تو اس کی رضامندی بھی مشتبہ ہوجاتی ہے،...... اسی لئے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بیع حصاۃ، بیع غرر، بیع ملامسۃ، بیع منابذۃ، بیع حبل الحبلۃ اور بیع مجہول وغیرہ سے منع فرمایا جن میں معاملہ کی بنیادی شق مجہول اور قابل نزاع ہوتی تھی اور عہد جاہلیت میں ان کا رواج تھا (بخاری ۷ / ۳۴۹ حدیث نمبر ۳۴۹، مسلم ۸ / ۷ / ۳ باب بیع الحصاۃ حدیث نمبر ۲۷۸۳، مصنف عبدالرزاق باب بیع المجہول والغرر ۸ / ۱۰۸ احدیث نمبر ۱۴۵۰۶)۔

عقد تبرع کی مثال میں ہبہ، صدقہ، ابراء، خلع اور صلح وغیرہ کو پیش کیا جاسکتا ہے۔

علامہ قرافیؒ نے دونوں طرح کے معاملات کے اس فرق پر اچھی روشنی ڈالی ہے: ایک عنوان قائم کیا ہے: ''الفرق الرابع والعشرون بین قاعدة ما تؤثر فيه الجهالات والغرر وقاعدة ما لا يؤثر فيه ذلك من التصرفات''، اور اس کے تحت دونوں طرح کے معاملات کی مثالیں دے کر واضح کیا ہے کہ کن معاملات میں جہالت مؤثر ہوتی ہے اور کن میں نہیں؟ انہوں نے معاملات وتصرفات کی تین قسمیں کی ہیں:

(۱) خالص عقد معاوضہ، جیسے بیع وشراء وغیرہ (۲) خالص عقد احسان، جیسے ہبہ، صدقہ وغیرہ (۳) اور دونوں کے بین بین جیسے عقد نکاح۔

خالص عقد معاوضہ جہالت وغرر کی بنا پر فاسد ہوجاتا ہے، خالص عقد احسان پر جہالت سے فرق نہیں پڑتا، اور درمیانی عقد میں غرر قلیل اثر انداز نہیں ہوتا، لیکن غرر کثیر مؤثر ہوتا ہے، البتہ حضرت امام شافعیؒ کے نزدیک ہبہ وغیرہ میں بھی غرر وجہالت نقصان دہ ہے (انوار البروق فی انواع الفروق للقرانی ۱ / ۲۷۶ ط بیروت)۔

انشورنس کمپنی اگر تبرع وایثار کی بنیاد پر لوگوں سے سرمایہ جمع کرنے کی اپیل کرتی ہے اور آفات وبلیات کے مواقع پر اپنے شرکاء کا مالی تعاون کرتی ہے تو یہ عقد احسان کے زمرے میں داخل ہوگی اور فی الجملہ اس میں غرر وجہالت کی گنجائش ہوگی، اور یہ اس نہد کی نظیر بن جائے گی جس کی تحسین خود سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی ہے اور جس کے بارے میں امام بخاری کا بیان ہے: (لم یر المسلمون فی النہد باساً) قرون اولیٰ کے مسلمانوں کے نزدیک نہد میں کچھ حرج نہیں سمجھا جاتا تھا، (صحیح بخاری باب الشرکۃ فی الطعام والنہد ۲ / ۸۷۷)۔

اس طرح تبرع کی بنیاد پر قائم ہونے والے اسلامی انشورنس میں اگر نقصانات یا منافع کی شرح یقینی طور پر معلوم نہ ہو، اور فی الجملہ اس میں غرر وجہالت کا امکان موجود ہو جب بھی شرعی طور پر یہ معاملہ فاسد نہیں ہوگا، اور اس پر قمار، ظلم یا اکل حرام کا اطلاق نہیں ہوگا، اس لئے کہ یہ عقد معاوضہ نہیں، بلکہ عقد تبرع قرار پائے گا۔

علاوہ ازیں عقود ومعاملات میں صرف وہ جہالت مفسد عقد بنتی ہے جو باعث نزاع ہو، ہر جہالت نہیں، فقہاء نے اس کی صراحت کی ہے، علامہ فخر الدین زیلعی نے ایک مالی معاملے میں جہالت کو غیر مؤثر بتاتے ہوئے اصولی بات لکھی ہے:

''لأن هذه الجهالة لا تفضي إلى المنازعة وهي المانعة لا مجرد الجهالة'' (تبیین الحقائق کتاب البیوع ۱۰ / ۲۲۸ نسخہ شاملہ)۔ (اس لئے کہ یہ جہالت باعث نزاع نہیں ہے اور یہی (نزاع والی جہالت) مانع عقد بنتی ہے مطلق جہالت نہیں)۔

علامہ کاسانیؒ لکھتے ہیں: ''أن الجهالة لا تمنع جواز العقد لعينها بل لافضائها إلى المنازعة'' (بدائع الصنائع ۹۵ / ۱۳ کتاب الشرکۃ)۔

اس طرح کی عبارتیں (الفاظ کے تھوڑے فرق کے ساتھ) (البحر الرائق ۱۵ / ۱۴۶، المحیط البرہانی ۱۴ / ۱۸۴، المبسوط للسرخسی باب مکاتبۃ ام الولد ۹ / ۲۰۶، فتح القدیر کتاب العاریۃ ۱۹ / ۴۲۳، درر الحکام شرح غرر الاحکام لملاخسرو باب ما ینعقد بہ البیع ۶ / ۱۶۰، حاشیۃ ابن عابدین باب الشہادۃ علی الشہادۃ ۷ / ۲۲۳ ط دار الفکر) وغیرہ میں بھی موجود ہیں۔

ظاہر ہے جس عقد کی بنیاد تبرع پر ہو اس میں فی الجملہ عموماً جہالت باعث نزاع نہیں بنتی، اس لئے وہ مفسد عقد بھی نہیں بنے گی۔

ایک شبہ کا ازالہ:

البتہ اسلامی انشورنس کے عقد تبرع ہونے پر ایک شبہ یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس میں جمع شدہ اقساط کے مقابلے میں کمپنی بوقت مصیبت معاوضہ ادا کرتی ہے، پھر یہ عقد تبرع کہاں ہوا؟...... لیکن یہ شبہ محض سطحی ہے، شریعت اسلامیہ میں متعدد ایسے عقود ہیں جو اصلاً تبرع کے لئے ہونے کے باوجود معاوضہ کے معنیٰ کی گنجائش رکھتے ہیں، مثلاً ہبہ اصلاً ایک تبرع ہے، لیکن اگر کوئی عوض کی شرط لگائے یا امید رکھے تو اس کی شرعاً گنجائش ہے، (بحث گذر چکی ہے)، نہد جس کا رواج قرون اولیٰ میں تھا وہ بھی دراصل تبرع کا اجتماعی تبادلہ ہے،...... قرض خالص تبرع ہے، لیکن اس میں بھی معاوضہ کا معنیٰ لایا جاسکتا ہے، مثلاً کوئی شخص اس شرط پر

قرض دے کہ دوسرا شخص بھی اسے قرض دے، تو بعض فقہاء کے یہاں اس کی گنجائش نظر آتی ہے، فقہاء حنابلہ میں علامہ علاء الدین مرداوی دمشقی رقمطراز ہیں:

''ويجوز قرض المنافع مثل أن يحصد معه يوماً ويحصد معه الآخر يوماً أو يسكنه داراً ليسكنه الآخر بدلها'' (الانصاف فی معرفة الخلاف باب القرض ۵،۹٦ ط احیاء التراث بیروت)۔ (منافع کا قرض جائز ہے، مثلاً ایک دن وہ اس کے ساتھ کاشت کرے اور دوسرے دن دوسرا اس کے ساتھ کاشت کرے یا کسی کو اپنے گھر میں رہائش دے، تاکہ وہ بھی اسے اپنے گھر میں رہائش دے)۔

قتل خطا یا قتل شبہ عمد میں دیت عاقلہ کے ذمہ عائد کی گئی ہے، یہ اصلاً قاتل کا عاقلہ کی طرف سے تعاون ہے، لیکن اس میں بھی معاوضہ کا معنی موجود ہے، اس لئے کہ یہ نظام اسی بنیاد پر قائم کیا گیا ہے کہ آئندہ اگر عاقلہ میں سے کسی دوسرے شخص کو ایسی نوبت آئے تو یہ قاتل بھی اس میں مالی تعاون کرے گا، یہ تبرع کے بدلے تبرع ہے وغیرہ۔

انشورنس کمپنی سرمایہ کی مالک نہیں:

☆ انشورنس کمپنی جمع شدہ سرمائے کی مالک نہیں، بلکہ انتظامی معاملات میں جملہ شرکاء کی طرف سے وکیل ہوگی اور وکیل ہی کی حیثیت سے انتظامی اور ترقیاتی امور انجام دے گی اور نفع ونقصان میں سرمایہ کے تناسب سے تمام شرکاء برابر کے شریک ہوں گے، نفع ہوگا تو صرف کمپنی کا نہیں اور خسارہ بھی ہوگا تو صرف کمپنی کا نہیں، البتہ کمپنی اس کام پر ممبران سے مناسب شرح پر اجرت وصول کرسکتی ہے اور بلا اجرت بھی کام کرسکتی ہے، بلا اجرت کام کرنے کی صورت میں کمپنی کے انتظامی اخراجات کاروبار میں لگے سرمایہ سے وصول کئے جائیں گے، اطلاع کے مطابق تکافلی کمپنیاں دونوں طرح سے کام کررہی ہیں، مثلاً اردن کی کمپنی "شركة التأمين الإسلامية الاردنية" اجرت پر انتظامی کام انجام دیتی ہے، جبکہ قطر کی کمپنی "الشركة الإسلامية القطرية" انتظامی کام پر کوئی اجرت نہیں لیتی۔

وکالت پر اجرت:

شریعت اسلامیہ میں وکالت پر اجرت لینے کی گنجائش ہے: ''وشركة الأعمال جائزة بلاخلاف بين أصحابنا. لأن مبناها على الوكالة. والوكالة على هذا الوجه جائزة. بأن يوكل خياط أوقصار وكيلاً يتقبل له عمل الخياطة والقصارة. وكذا يجوز لكل صانع يعمل بأجر أن يوكل وكيلاً يتقبل العمل'' (بدائع الصنائع ۹۸،۱۳ کتاب الشرکۃ)۔

(اعمال میں شرکت بالاتفاق جائز ہے، اس لئے کہ اس کی بنیاد وکالت پر ہے، اور وکالت اس طریق پر جائز ہے کہ کسی درزی یا دھوبی کو وکیل بنایا جائے جو دھوبی یا درزی کے عمل کو قبول کرے، یہی حکم ہر صنعت کار کا ہے جو اجرت پر کام کرتا ہو اس کو ایسے عمل کا وکیل بنایا جاسکتا ہے جس کو وہ قبول کرلے)۔

اجرت پر وکالت کی بحث کے لئے درج ذیل کتابوں کی طرف مراجعت فرمائیں (حاشیۃ ابن عابدین ۵/ ۹۴۳، تبیین الحقائق ۲۵۴/۴، الشرح الکبیر للدردیر ۳/ ۷۷، مغنی المحتاج ۲/ ۲۱۷، المغنی لابن قدامہ ۷/ ۲۹۷، نیل الاوطار ۷/ ۱۰)۔

علاوہ ازیں عہد نبوت اور عہد خلافت راشدہ میں زکوۃ وصول کرنے کے لئے باقاعدہ عمال مقرر تھے اور اس پر ان کو اجرت بھی ملتی تھی مثلاً: طبقات ابن سعد میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم صدقہ وصول کرنے کے لئے چند افراد عرب کے مختلف علاقوں میں ۹ھ میں بلاد حرم میں روانہ فرمائے (تلخیص الحبیر للعسقلانی ۵٦/۲، ۳ ط دار الکتب العلمیہ)۔

ابوداؤد میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے لئے ابومسعود کو مقرر فرمایا (ابوداؤد ۱/ ۳۵ کتاب الخراج والامارۃ والفئی، باب فی غلول الصدقۃ حدیث نمبر ۲۹۴۷)۔

مسند احمد میں ابوجہم بن حذیفہؓ، عقبہ بن عامرؓ، ضحاک بن قیسؓ کے اسماء گرامی ملتے ہیں (مسند احمد ۱۴۰/۴، ۱۵۷، ۲/ ۷۲)۔

مستدرک حاکم میں حضرت قیس بن سعدؓ اور حضرت ولید بن عقبہؓ (قبیلہ بنی مصطلق کی طرف) کے نام ہیں (مستدرک حاکم ۱/ ۳۹۸)۔

عہد صدیقی اور عہد فاروقی میں بھی اس کام کے لئے افراد مقرر تھے (بخاری ۱۴/ ۹۲، مسلم ۶۷۶/۲، سنن بیہقی ۱۱۰/۴)۔

بعض روایتوں میں ابن اللتبیہ الازدی، ابن السعدی وغیرہ ناموں کی تصریح بھی ملتی ہے (بخاری کتاب الزکاۃ ۱۴/ ۶۳، کتاب الاحکام ۱۳/ ۵۰، ۵۱)۔

سرمایہ پر کمپنی کا قبضہ، قبضۂ ضمان:

اس صورت میں (جبکہ کمپنی اجرت پر کام انجام دے) سرمایہ پر کمپنی کا قبضہ، قبضۂ ضمان قرار پائے گا، اور کسی طرح کی کوتاہی یا لاپرواہی ثابت ہونے پر کمپنی ضامن قرار پائے گی، "ہدایہ" میں ہے:

''وعلیٰ ہذا سائر الوکالات والبیاع والسمسار یجبران علی التقاضي، لأنہما یعملان بأجرۃ عادۃً'' (ہدایہ فصل فی العزل والقسمۃ ۳،۲۰۹ط المکتبۃ الاسلامیۃ)۔ (وکالت کی تمام صورتوں کا یہی حکم ہے، خرید وفروخت کرانے والے اور دلال کو ادائیگی پر مجبور کیا جائے گا، اس لئے کہ وہ عموماً اجرت پر کام کرتے ہیں)۔

اس مضمون کی عبارت فتاوی ہندیہ ۳/ ۵۶۷، عقد الجواہر الثمینۃ ۲/ ۶۸۷، روضۃ الطالبین ۴/ ۳۵۴، کشف القناع ۳/ ۴۸۴ وغیرہ میں بھی موجود ہے۔

کمپنی کی اجازت کے بغیر فسخ عقد کی اجازت نہیں:

☆ دوسری طرف عقد وکالت اصولی طور پر اگر چیکہ عقد جائز ہے لازم نہیں ہے، لیکن اس کے باوجود عقد وکالت مکمل ہوجانے کے بعد ممبران (موکلین) کو اجازت نہ ہوگی کہ کمپنی (وکیل) سے اس کی مرضی اور اجازت کے بغیر یک طرفہ طور پر علحدگی اختیار کریں اور طے شدہ معاملہ کو منسوخ کریں، اس لئے کہ:

۱۔ اس سے دوسرے کا حق متعلق ہو چکا ہے فسخ عقد میں غرر اور ضرر دونوں کا اندیشہ ہے جس کی شریعت میں اجازت نہیں، حدیث پاک میں ہے:

''لا ضرر ولا ضرار'' (موطا امام مالک ص ۴۶۴، مسند احمد ۱،۳۱۳، ۵،۳۲۷، ابن ماجہ ۲،۷۸۴)۔

جمہور حنفیہ و مالکیہ کی رائے یہی ہے اور امام شافعیؒ و احمدؒ کا بھی ایک ایک قول یہی ہے (بدائع الصنائع ۱۲/ ۴۹۷ باب مایخرج بہ عن الوکالۃ، فتح القدیر لابن ہمام فصل فی الوکالۃ وفی الشراء ۸/ ۲۷، تبیین الحقائق ۴/ ۲۸۷، مواہب الجلیل ۵/ ۱۸۷، بدایۃ المجتہد ۲/ ۴۸۹، روضۃ الطالبین ۴/ ۳۳۰)۔

۲۔ اگر اس معاملہ کو وعدۂ ملزمہ یا ہبہ بالعوض پر قیاس کیا جائے تو بھی اس عقد کو طرفین کی رضامندی کے بغیر ختم نہیں کیا جاسکتا، اس لئے کہ ان صورتوں میں نتیجہ کے لحاظ سے یہ عقد معاوضہ بن جاتا ہے جیسا اس کی بحث گزشتہ صفحات میں آچکی ہے (الہدایہ مع شرح العنایہ ۹/ ۴۰ ط مصطفی الحلبی، شرح الخرشی ط بولاق مصر ۷/ ۱۰۲)۔

۳۔ اگر مالکیہ کے نقطۂ نظر التزام بالتبرع پر انشورنس کے مسئلے کو قیاس کیا جائے تو بھی تبرع واحسان کے التزام کے بعد اس سے مکرنے کی کوئی گنجائش نہیں رہتی، جیسا کہ اس کا حوالہ پیچھے گزر چکا ہے۔

بچی ہوئی آمدنی ممبران کی ملک:

☆ چونکہ یہ مکمل سرمایہ پالیسی خریدنے والوں کی ملک ہوگی، کمپنی اس کی مالک نہیں، بلکہ صرف وکیل ہوگی، اس لئے نفع ونقصان میں تمام ممبران شریک ہونگے اور انتظامی اخراجات اور آفات ونقصانات میں حسب شرائط معاوضات کی ادائیگی کے بعد بچا ہوا سرمایہ ممبران کو ان کے سرمایہ کے تناسب سے واپس کیا جائے گا اور اس کے بعد بھی کچھ رہ جائے تو جملہ شرکاء کی اجازت سے اس کو کسی کار خیر میں لگایا جاسکتا ہے یا اس کو ریزرو کوٹے میں رکھا جائے جو کبھی ہنگامی صورت میں کام آئے اس کو عربی میں احتیاطی کہا جاتا ہے۔

سرمایہ کاری شرعی مضاربت کے اصول پر کی جائے:......☆ جمع شدہ سرمایہ کو مضاربت کے شرعی ضوابط کے مطابق کاروبار میں لگایا جائے جو کتب فقہ میں معروف ہیں، اس میں کمپنی کی حیثیت مضارب کی اور پالیسی ہولڈرز کی حیثیت رب المال کی ہوگی اور مقررہ شرائط کے ساتھ مقررہ تناسب پر منافع کی تقسیم عمل میں آئے گی جس میں کسی طرح کی خیانت، لاپرواہی یا غرر وضرر کا معاملہ روا نہ رکھا جائے۔

اس تناظر میں اس کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ سرمایہ کو سرمایہ کاری کے لئے دینا اگر چیکہ ایک اختیاری عمل ہے، لیکن معاملہ شروع ہوجانے کے بعد یہ اختیاری نہیں رہتا، فقہاء مالکیہ کے نزدیک یہ عقد ملزم بن جاتا ہے، حنفیہ کے نزدیک جواز فسخ کے لئے دوسرے فریق کی رضامندی شرط ہے، اس لئے کہ اس سے دوسرے کا حق متعلق ہوجاتا ہے، اور دوسرے کو اس سے ضرر پہنچ سکتا ہے، اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ سرمایہ نقد کی صورت میں موجود ہو، اگر سرمایہ سامان وعروض میں تبدیل ہوجائے تو بھی مضاربت کو ختم کرنا ممکن نہ ہوگا (بدایۃ المجتہد ط بیروت دار الجبل ۲/ ۳۹۰، ۳۹۱، بدائع الصنائع ۱۳/ ۲۶۴) شافعیہ اور حنابلہ اس معاملے میں بہت

نرم ہیں (الشرح الصغیر ۳/۰۵، ۷۶، ۷۷، روضۃ الطالبین ۵/۱۴۱)۔

اقساط ومعاوضات میں یکسانیت ضروری نہیں:...... ☆اسلامی انشورنس کا یہ طریقہ چونکہ عربوں کے طریقۂ نہد سے قریب ہے جس کی سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے تحسین فرمائی ہے، اس کا تقاضا یہ ہے کہ اقساط ومعاوضات کی ادائیگی میں تناسب ویکسانیت ضروری نہیں ہے، اس لئے کہ اس کی بنیاد اصلاً معاوضہ پر نہیں، بلکہ تبرع واحسان پر ہے، اس لئے اس میں توسع کی گنجائش ہے اور اس کو نہ غرر کہا جائے گا، نہ ضرر، نہ ظلم وعدوان اور نہ ربا نہ قمار۔

نیز شرکت کے اکثر معاملات میں اس قدر تمایز عموماً آسان نہیں ہوتا، اخراجات اور جدوجہد میں تمام شرکاء کا برابر حصہ نہیں ہوتا، جو ایک واضح حقیقت ہے، مگر اس کے باوجود شریعت مطہرہ نے معاملات میں شرکت کی اجازت دی، اس کی علت بھی تعاون باہم ہی ہے، اس لئے کہ کئی ایسے معاملات ہیں جن کو تنہا شخص انجام نہیں دے سکتا ان میں کئی افراد کے تعاون کی ضرورت ہوتی ہے۔

حسابات میں شفافیت:...... ☆حسابات کا شفاف نظام رکھا جائے، جس میں کم از کم دو حسابات بنیادی ہیں، ایک میں کمپنی میں سرمایہ جمع کرنے اور آفات وبلیات کے وقت معاوضات کی ادائیگی کی مکمل تفصیلات ہوں اور دوسرے میں سرمایہ کاری اور تقسیم منافع کی تفصیلات ہوں، ان دونوں حسابات کے علاوہ اور بھی ضمنی حسابات کی ضرورت ہو تو وہ بھی پوری امانت داری کے ساتھ تیار کئے جائیں، اگر کسی مد میں وقتی طور پر سرمایہ کی کمی ہو تو دوسرے مد سے قرض لیا جاسکتا ہے بشرطیکہ لین دین کا سارا حساب شفافیت کے ساتھ رکھا جائے۔

معاملات ومسائل میں حقیقی اشتراک:...... ☆ نفع ونقصان اور ذمہ داری واستحقاق دونوں چیزوں میں کمپنی انتظامیہ اور سرمایہ جمع کرنے والے ممبران کا مکمل اور حقیقی اشتراک ہونا چاہئے، حالات کے تغیرات اور عالمی قدروں کی تبدیلیوں کی بنا پر جو مسائل پیدا ہوں ان کا مقابلہ بھی سب کو مساوی طور پر کرنا ہے، کوئی ذمہ داری کسی فریق پر یک طرفہ عائد نہیں ہوگی۔

☆ بہتر یہ ہے کہ کمپنی کے بنیادی مسائل میں ممبران کی بھی نمائندگی ہو، بایں طور کہ سرمایہ کے تناسب سے چند افراد کو منتخب کرلیا جائے جو کمپنی کی انتظامی کمیٹی کا تعاون کریں، اس سے دونوں طرف اعتماد بحال رہے گا، اور کمپنی کا نظام استحکام کے ساتھ جاری رہے گا۔

ریزرو فنڈ:...... ☆دنیا میں موجود بعض تکافلی کمپنیوں میں ریزرو فنڈ کا سسٹم رائج ہے، جس کو عربی میں احتیاطی کہا جاتا ہے یہ ہنگامی حالات میں کمپنی کو مالی بحران اور دیوالیہ پن سے بچانے کے لئے معاون ثابت ہوتا ہے، اس سسٹم کی افادیت کا جائزہ لیتے ہوئے اس سے استفادہ کیا جانا چاہئے۔

قانونی ماہرین کی ایک ٹیم:...... ☆کسی بھی مالی ادارے کو عام طور پر جن خطرات سے دوچار ہونا پڑتا ہے (مثلاً قدرتی آفات سیلاب، طوفان اور زلزلہ وغیرہ، جدید صنعتی خطرات الیکٹرک یا الیکٹرانک مسائل، ابلاغ وترسیل کے جدید وسائل کا بحران وغیرہ، ارضی یا فضائی درجۂ حرارت کے اتار چڑھاؤ سے پیدا شدہ ہنگامی صورت حال، کمپنی کے بیرون یا اندرون خیانت وبدعملی کی سازشیں، دوسری غیر اسلامی انشورنس کمپنیوں کے مقابلہ جاتی چیلنجز، اسلامی انشورنش کمپنیوں کے مضبوط پس منظر کا فقدان، حساب کتاب کی شفافیت کا فقدان، انتظامی معاملات یا سرمایہ کاری میں صحیح شرعی خطوط سے انحراف اور سود پر چلنے والے بینکوں سے مالی تعاون، عالمی یا وقتی قانونی رکاوٹیں، نفع ونقصان میں اعداد وشمار کا بحران وغیرہ) ان پر نگاہ رکھنے اور مشکلات کا حل نکالنے کے لئے ماہرین کی ایک ٹیم ہونی چاہئے جو اس محاذ پر کمپنی کو تعاون دے سکے۔

یہ چند بنیادی خطوط ہیں جن پر اسلامی انشورنس کمپنی کی تاسیس عمل میں آئے تو ایک مبارک اور جائز قدم ہوگا، عالم اسلام کے متعدد علمی وفقہی اداروں (مثلاً ہیئۃ کبار العلماء، مجمع الفقہ الاسلامی جدہ وغیرہ) نے تجارتی انشورنس کے مقابلے میں مذکورہ بالا شرطوں کے ساتھ تعاونی انشورنس کی اجازت دی ہے اور اس قسم کی کمپنی کی سفارش کی ہے، مگر ایسا نہ ہو کہ صرف نام اسلامی رکھ لیا جائے اور اس کو دوسری غیر اسلامی اداروں کی طرح شریعت کے تقاضوں سے قطع نظر محض سرمایہ اکٹھا کرنے کا ذریعہ بنا لیا جائے تو یہ عام تجارتی کمپنیوں سے بھی زیادہ خطرناک اور گمراہ کن ہوگا، بعض عرب محققین نے ایسی کئی کمپنیوں کی نشاندہی کی ہے، جو اسلام یا تعاون کا لیبل لگا کر اسی طریق کار پر عمل پیرا ہیں جو غیر اسلامی انشورنس کمپنیوں کا ہے، اس لئے اس کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔

مسلم ملکوں میں اس قسم کے متعدد تجربات شروع ہوئے ہیں، ضرورت ہے کہ ہندوستان جیسے سیکولر اور جمہوری ملکوں میں بھی اس طرف پیش رفت کی جائے اور قانونی ماہرین سے مشورہ کرکے کوئی مناسب اور متبادل لائحۂ عمل تیار کیا جائے، واللہ المستعان۔

☆☆☆

اسلامی امداد باہمی انشورنس کے شرعی اصول وضوابط

ڈاکٹر ومفتی محمد شاہجہاں ندوی[1]

اسلامی شریعت میں ہر چیز کا حل موجود ہے، بس ضرورت اس بات کی ہے کہ ماہرین شریعت سودی نظام کا ایسا غیر سودی اسلامی متبادل پیش کریں کہ انسانیت کے سارے پیچیدہ مسائل حل ہوں، اور پھر دنیا اسلامی نظام کی برکت سے مالا مال ہو۔ اس پس منظر میں زیر بحث مسئلہ میں ہم انشورنس یا ''تامین تکافلی'' یا ''تامین تعاونی'' کی شرعی صورت، نیز ہندوستان میں اس کی قابل عمل صورت کی نشان دہی کریں گے۔

''تامین'' کی لغوی تعریف:

''بیمہ'' یا ''انشورنس'' کو عربی میں ''تامین'' کہتے ہیں، یہ باب تفعیل کا مصدر ہے، ''امن'' سے مشتق وماخوذ ہے، جو فعل ثلاثی ''أمن'' کا مصدر ہے، جس کے معنی نفس کا مطمئن ہونا اور خوف کا زائل ہونا ہے، لہذا ''تامین'' کے معنی ہوئے ''مطمئن کرنا اور خوف کو زائل کرنا، بولا جاتا ہے، ''أمن البلد'': یعنی ملک کے باشندے امن واطمینان سے ہیں، اور ''أمنه علیه'' کے معنی ہیں: بھروسہ کرنا، ارشاد باری تعالی ہے: {هل ءامنكم عليه إلا كما أمنتكم على أخيه من قبل} (یوسف: ۶۴) (اس کے معاملے میں تم پر ویسا ہی اعتماد کروں، جیسا اس سے پہلے اس کے بھائی یوسف کے معاملہ میں کر چکا ہوں؟)۔ اور ''أمن'' میم کے ضمہ کے ساتھ، اس کے معنی ہیں: امانت دار وقابل اعتماد ہونا، اور ''آمن'' کے معنی ہیں: تصدیق کرنا، اور اسی سے قرآن پاک میں ہے: {وما أنت بمؤمن لنا} (یوسف: ۱۷) (اور آپ ہماری تصدیق کرنے والے نہیں ہیں)۔

اور اکیڈمی برائے عربی زبان مصر ودمشق نے کچھ نئے معانی کا اضافہ کیا ہے، جو اس طرح ہیں: ''أمن علی الشيء'' اور اس کے معنی ہیں: اس نے قسط وار کچھ رقم ادا کی، تاکہ وہ یا اس کے ورثہ متفق علیہ مقدار یا کھوئی ہوئی چیز کا معاوضہ حاصل کریں، اور اسی سے ہے: "أمن على حياته" (اس نے زندگی کا بیمہ کرایا)، "أمن على داره" (اس نے گھر کا انشورنس کرایا)، اور "أمن على سيارته" (اس نے گاڑی کا بیمہ کرایا)۔

خلاصہ کلام یہ کہ ''تامین'' کے معنی ہیں: امن واطمینان کو وجود میں لانا۔

''امن'' کی اہمیت:

اسلام میں امن کی بڑی اہمیت ہے، چنانچہ قرآن کریم میں تیس آیت کے اندر ''امن'' کے مختلف معانی وارد ہوئے ہیں، جو دنیا اور آخرت میں اس کی اہمیت پر دلالت کرتے ہیں۔ (ثنیان: سلیمان بن ابراہیم ''التأمین وأحکامہ'' ۵/۳ ط: دار ابن حزم، بیروت ۲۰۰۳ء)۔

امن واطمینان انسان کا فطری مطلوب ہے، جس کی بنا پر اللہ تعالی نے قریش پر احسان کا اظہار فرمایا ہے، ارشاد باری تعالی ہے: {لإيلاف قريش إيلافهم رحلة الشتاء والصيف فليعبدوا رب هذا البيت الذي أطعمهم من جوع وآمنهم من خوف} (قریش: ۱-۴) (اس وابستگی کے سبب جو قریش کو ہے، اس وابستگی کی وجہ سے جو سردی اور گرمی کے سفر کے ساتھ ان کو ہے، سو چاہیے کہ وہ اس گھر کے مالک کی عبادت کریں، جس نے انہیں قحط کے سبب سے کھلایا اور خوف کے سبب سے امن بخشا)۔

یعنی بھوک سے امن وامان کی نعمت اور خوف سے اطمینان کی دولت عطا کی۔ اسی بنا پر حضرت ابراہیم علیہ الصلاۃ والسلام نے مکہ کے لئے امن وامان کی دعا کی: {وإذ قال إبراهيم رب اجعل هذا البلد آمنا واجنبني وبني أن نعبد الأصنام} (ابراہیم: ۳۵) (اور یاد کرو جب ابراہیم نے دعا کی کہ اے

[1] استاذ حدیث وفقہ جامعہ اسلامیہ، شانتاپورم، پٹی کاد، مالاپورم، کیرالہ۔

میرے رب اس سرزمین کو پر امن بنا، اور مجھ کو اور میری اولاد کو اس بات سے محفوظ رکھ کہ ہم بتوں کو پوجیں)۔

اسی طرح اسلام کا مطالبہ ہے کہ آدمی احتیاط، چوکسی اور ہلاکت و بربادی کے اسباب سے نجات کے سارے ذرائع اختیار کرے، چنانچہ فرمان الٰہی ہے: {یا أیها الذین آمنوا خذوا حذرکم فانفروا ثبات وانفروا جمیعاً} (النساء:۷۱) (اے ایمان والو! اپنی تو احتیاط رکھو اور ٹکڑیوں کی صورت میں یا جماعتی شکل میں جہاد کے لئے نکلو)، اور ارشاد باری تعالیٰ ہے: {وأنفقوا فی سبیل اللہ ولا تلقوا بأیدیکم إلی التهلكة وأحسنوا إن اللہ یحب المحسنین} (البقرہ:۱۹۵) (اور اللہ کی راہ میں خرچ کرو، اور اپنے آپ کو تباہی میں نہ جھونکو، اور انفاق خوبی کے ساتھ کرو، بے شک اللہ خوبی کے ساتھ کام کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے)۔

اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''من أصبح منکم آمنا فی سربه معافا فی جسده، عنده قوت یومه، فكأنما حیزت له الدنیا بحذافیرها'' (سنن ترمذی، صحابی: عبید اللہ بن محصن انصاری حدیث نمبر:۲۳۴۶، سنن ابن ماجه حدیث نمبر:۴۱۴۱، بیهقی ''الاربعین الصغری''، حدیث نمبر:۵۷) (تم میں سے جو اپنی ذات میں امن کے ساتھ اور اپنے بدن میں صحت و سلامتی کے ساتھ صبح کرے، اور اس کے پاس اپنے اس دن کی خوراک ہو، تو پوری دنیا گویا اس کے لئے اکٹھی کردی گئی)۔

اور شریعت اسلامی نے وہ قواعد اور احکام جاری کئے ہیں، جو پر امن اور مطمئن معاشرہ کے ضامن ہیں، تاکہ انسان زمین میں اللہ عزوجل کے خلیفہ کی حیثیت سے اس کی تعمیر اور اس کے اندر تخلیق میں اپنا کردار ادا کر سکے۔

خلاصہ یہ کہ جائز وسیلہ کے ذریعہ امن طلب کرنے میں مشیت الٰہی کے چیلنج کا کوئی شبہ نہیں ہے۔

''تامین'' کی اصطلاحی تعریف:

انشورنس دو فریق کے درمیان ہونے والا ایسا عقد ہے جس کے تقاضے میں ایک فریق دوسرے فریق کو قسط وار یا یکبارگی مخصوص مالی رقم ادا کرے، تاکہ یہ دوسرا فریق اس کے مقابلہ میں عقد میں متعین کردہ حادثہ یا خطرہ پیش آنے کی وجہ سے لاحق ہونے والے ضرر کی تلافی کرے''۔

ڈاکٹر عبد الرزاق سنہوری تحریر کرتے ہیں: ''عملیة یحصل بمقتضاها أحد الأطراف، وهو المؤمن له نظیر دفع قسط، علی تعهد لصالحه، أو لصالح الغیر، من الطرف الآخر وهو المؤمن، یدفع بمقتضاه هذا الأخیر أداء معینا عند تحقق خطر معین، وذلك بأن یأخذ علی عاتقه مهمة مجموعة المخاطر، وإجراء المقاصة بینها وفقا لقوانین الإحصاء'' (د۔ عبد الرزاق السنهوری ''الوسیط فی شرح القانون المدنی'' ۷/۱۰۹۰، ط: دار النهضه العربیة ۱۹۶۴ء)۔

(انشورنس وہ کاروائی ہے، جس کے تقاضے میں، ایک فریق، اور وہ ''مؤمن لہ'' (گاہک یا انشورنس پالیسی ہولڈر) ہے، قسط کی ادائیگی کے لئے اپنے یا دوسرے کے مفاد میں دوسرے فریق کی جانب سے، اور وہ ''مؤمن'' (کمپنی) ہے، ایک معاہدہ حاصل ہوتا ہے، جس کے بموجب یہ دوسرا شخص متعین خطرہ کے وجود میں آنے کے وقت متعین ادائیگی کرے، اور وہ اس طرح کہ وہ اپنے کندھے پر کئی خطرات اور ان کے درمیان اعداد و شمار کے قوانین کے مطابق مقابلہ جاری کرنے کی ذمہ داری لے)۔

مصری سول لاء میں اس کی اس طرح تعریف کی گئی ہے: ''عقد یلتزم المؤمن بمقتضاه أن یؤدی إلی المؤمن له، أو إلی المستفید الذی اشترط التأمین لصالحه مبلغاً من المال، أو إیراداً مرتباً، أو أی عوض مالی آخر فی حالة وقوع الحادث، أو تحقق الخطر المبین بالعقد، وذلك فی نظیر قسط أو آیة دفعة مالیة أخری یؤدیها المؤمن له للمؤمن'' (القانون المدنی المصری، المادہ:۷۴۷)۔

(انشورنس ایسا عقد ہے جس کے تقاضے میں ''مؤمن'' (کمپنی یا فرم) اس بات کا التزام اور پابندی کرے، کہ وہ ''مؤمن لہ'' (انشورنس پالیسی ہولڈر) یا اس ''مستفید'' (تیسرے شخص) کو جس کے مفاد میں انشورنس کو مشروط کیا گیا ہے، مال کی ایک مقدار یا مقررہ تنخواہ یا دوسرا مالی عوض حادثہ کے واقع ہونے کی حالت یا عقد میں بیان کردہ خطرہ کے وجود میں آنے کے وقت ادا کرے، اور یہ اس قسط (Insurance Premium) یا کسی ایسی دوسری مالی ادائیگی کے مقابلہ

میں ہو، جسے ''مؤمن لہ'' (گاہک) ''مؤمن'' (کمپنی) کو ادا کرے گا)۔

یہ تعریف بہتر ہے، کیونکہ اس میں ''تامین'' کے ارکان وعناصر اجاگر ہو گئے ہیں، اور ''مؤمن'' (کمپنی یا فرم) اور ''مؤمن لہ'' (کسٹمر) کے درمیان معاوضہ کا تعلق بھی واضح ہو گیا ہے، اور نیز یہ بات بھی ظاہر ہو گئی ہے کہ بیمہ کی رقم بیمہ کی قسط کے مقابلہ میں ہے۔

''تامین تعاونی'' کی تعریف:

''تامین تعاونی'' یا ''تامین تکافلی'' یہ ہے کہ چند اشخاص متعین رقم ادا کرنے پر اتفاق کرلیں، تاکہ ان نقصانات کا بدل فراہم کیا جاسکے جو ان میں سے کسی کو پیش آئے، جبکہ متعین خطرہ وجود میں آئے۔

ڈاکٹر وہبہ زحیلی تحریر کرتے ہیں: ''التأمین التعاونی هو أن یتفق عدة أشخاص علی أن یدفع کل منهم اشتراکا معینا لتعویض الأضرار التی قد تصیب أحدهم إذا تحقق خطر معین'' (أ۔د۔ وهبه الزحیلی: الفقه الاسلامی وادلته ۵،۳۴۱۵، ط: ۴، دار الفکر دمشق ۱۴۱۸ھ۔۱۹۹۷ء) (امداد باہمی انشورنس یہ ہے کہ کئی اشخاص اس بات پر اتفاق کرلیں کہ ان میں سے ہر ایک متعین رقم ادا کرے گا، تاکہ ان میں سے کسی کو لاحق ہونے والے ضرر کی تلافی کی جاسکے، جبکہ متعین خطرہ وجود میں آئے)۔

امداد باہمی انشورنس کی قسمیں:

امداد باہمی انشورنس کی دو قسمیں ہیں: (۱) امداد باہمی انشورنس بسیط، (۲) امداد باہمی انشورنس مرکب۔

امداد باہمی انشورنس بسیط (operative insurance_Simple co) یہ ہے کہ اشخاص کا ایک گروپ متعین رقم بطور تبرع ادا کرنے میں شریک ہو، پھر حاصل شدہ رقم سے اس شخص کو بدل فراہم کیا جائے، جسے ضرر لاحق ہو۔

شیخ زرقا تحریر کرتے ہیں: ''وهو تعاون مجموعة من الأشخاص ممن یتعرضون لنوع من المخاطر علی تعویض الخسارة التی قد تصیب أحدهم؛ عن طریق اکتتابهم بمبالغ نقدیة لیؤدی منها التعویض لأی مکتتب منهم عند ما یقع الخطر المؤمن منه'' (الأستاذ الزرقا: نظام التأمین ۴۲۔۴۳، ط: مؤسسة الرساله بعمان) (انشورنس تعاونی چند افراد کے ایک گروپ کا جو کسی نوع کے خطرات سے دوچار ہو سکتے ہوں، اس نقصان کی تلافی پر تعاون کرنا جو ان میں سے کسی کو پیش آئے، نقدم رقم کے ذریعہ حصہ لے کر، تاکہ ان میں سے کسی حصہ لینے والے کو عوض دیا جاسکے، جبکہ وہ خطرہ پیش آئے جس سے..............لیا ہو)۔

جبکہ ''امداد باہمی انشورنس مرکب (operative insurance_Compound co) کی تعریف اس طرح ہے: ''جماعتی انشورنس کا ایسا عقد ''امداد باہمی انشورنس مرکب'' کہلاتا ہے، جس کے تقاضے میں ہر حصہ دار تبرع کے طور پر مال کی ایک متعین رقم ادا کرنے کا التزام کرے، تاکہ ان میں سے ضرر میں مبتلا ہونے والے شخص کو اس خطرہ کے پائے جانے کے وقت بدل فراہم کیا جائے، جس سے انشورنس کرایا گیا ہو، جس میں انشورنس اور اس کے مال کے سرمایہ کاری کی کاروائی خاص کمپنی کی جانب سے معلوم اجرت کے بدلہ یا بے اجرت وکالت کی بنیاد پر کی جائے۔

ڈاکٹر احمد سعید شرف الدین تحریر کرتے ہیں: ''عقد تأمین جماعی یلتزم بموجبه کل مشترك فیه بدفع مبلغ معین من المال علی سبیل التبرع، لتعویض المتضررین منهم علی أساس التکافل والتضامن، عند تحقق الخطر المؤمن منه، تدار فیه العملیات التأمینیة من قبل شرکة متخصصة علی أساس الوکالة بأجر معلوم'' (د۔احمد السعید شرف الدین ''عقود التأمین وعقود ضمان الاستثمار'' ۲۴۳۔۲۴۶) (جماعتی بیمہ کا ایسا عقد ہے جس کے تقاضے میں اس میں شریک ہونے والا ہر شخص تبرع کے طور پر مال کی ایک متعین رقم ادا کرنے کی پابندی کرے، تاکہ ان میں سے ضرر میں مبتلا ہونے والے شخص کو باہمی کفالت اور ضمانت کے طور پر اس خطرہ کے پائے جانے کے وقت عوض فراہم کیا جائے، جس سے بیمہ کرایا گیا ہو جس میں بیمہ کی کاروائی اسپیشل کمپنی کی طرف سے معلوم اجرت کے بدلہ وکالت کی بنیاد پر چلائی جائے)۔

امداد باہمی مرکب انشورنس کی قسمیں:

(۱) ''اضرار'' (Harms) کے خلاف انشورنس۔......اس کی بھی دو قسمیں ہیں: (۱) جائداد (Property) انشورنس: جیسے آگ، چوری کے خطرات کے سلسلہ میں انشورنس۔ (۲) ذمہ داری (Responsibility) انشورنس: اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی شخص اپنی ذات کو اس ضرر سے محفوظ کرے جو ضرر میں مبتلا شخص، اور اس کے اس کی طرف رجوع کرنے کی صورت میں، اس کی ذمہ داری ثابت ہونے کی حالت میں اس کے مالی ذمہ کو لاحق ہو، اور انشورنس کرانے کی صورت میں انشورنس کمپنی بیمہ پالیسی ہولڈر یا ضرر میں مبتلا شخص کو معاوضہ ادا کرے۔

اور ''ذمہ داری انشورنس'' کی بھی دو قسمیں ہیں:

(۱) شہری ذمہ داری کا انشورنس (Civil responsibility insurance):

جیسے سواریوں اور گاڑیوں کے مالکین کی دوسرے کے سلسلہ میں ذمہ داری کا انشورنس، اور کارخانے، ادارے اور کمپنیوں کے مالکین کی ذمہ داری کا انشورنس کہ وہ اپنی جائداد کے اندر دیگر اشخاص کے ہونے کی حالت میں ذمہ دار ہو سکتے ہیں، اسی طرح ٹھیکے داروں (Contractor) کی ذمہ داری کا انشورنس کہ وہ اپنی ذمہ داریوں اور فرائض کو بروئے کار لانے کے درمیان دوسرے کو لاحق ہونے والے اضرار کے سلسلہ میں ذمہ دار ہو سکتے ہیں۔

(۲) دوسری قسم ''پیشہ ورانہ ذمہ داری کا انشورنس'' (Professional responsibility insurance):

جیسے اطباء اور دواساز اپنے پیشے کو انجام دینے کے نتیجہ میں دوسرے کے سلسلہ میں قانونی طور پر ذمہ دار ہو سکتے ہیں۔

۳۔ افراد کا انشورنس (Indivisual insurance):

اس کا مطلب ان خطرات (Dangers) کا انشورنس ہے، جو آدمی کو اپنی زندگی یا جسم کی سلامتی یا عمل کی قدرت کے سلسلہ میں لاحق ہوں، چنانچہ اسی قسم سے شخصی حادثات کا بیمہ ہے، کسی شخص کو اپنے جسم میں ایسی مصیبت سے دوچار ہو جانے کا اندیشہ ہو جو اسے دائمی یا وقتی طور سے کام سے عاجز بنادے، اور ایسے ہی کام کے نقصان (Accident of Labor) کا انشورنس ہے، اور طبی علاج کے اخراجات کا انشورنس (Medical insurance) ہے۔

اسی طرح لائف انشورنس (Life Insurance) یا سماجی تکافل یا باہمی سماجی ضمانت ہے۔

۴۔ نقل وحمل (Transporting) کے خطرات (Risks) کا انشورنس:

اس کی بھی تین قسمیں ہیں:

(۱) سمندری انشورنس (Maritime Insurance) اس کا مقصد سمندر یا ندی کی راہ سے لے جانے کے خطرات کا انشورنس ہے، خواہ سامان کا انشورنس ہو یا کشتیوں کا۔

(۲) دوسری قسم بری (Land) انشورنس ہے، اس کا مقصد خشکی کی راہ (By Land) سے لے جانے کے خطرات سے سامانوں کا انشورنس کرانا ہے۔

(۳) تیسری قسم ''جوی'' (Air) انشورنس ہے، اس کا مقصد فضا کی راہ سے منتقل کرنے اور لے جانے کے خطرات سے سامانوں کا انشورنس کرانا ہے۔

۵۔ تعمیراتی انشورنس (Constructive Insurance):

اسی سے تعمیرات (Constructions)، تنصیبات، جڑائی اور فٹنگ (Setup) کے ٹھیکے داروں کے آلات وساز وسامان (Materials) اور مشینوں (Machines) کا انشورنس ہے، اسی طرح برقی آلات (Electronic Sets) اور کمپیوٹر (Computer) وغیرہ کا انشورنس ہے۔

امداد باہمی انشورنس کی نشوونما اور ارتقاء:

تجارتی انشورنس کا آغاز اپنے حقیقی مفہوم میں بحری انشورنس کی شکل میں اٹلی کے شہر ''لمبورڈیا'' میں چودہویں صدی عیسوی میں ہوا، اور سمندری انشورنس کی پہلی کمپنی انگلینڈ کے لندن شہر میں قائم کی گئی، لیکن امداد باہمی انشورنس اپنی ابتدائی شکل میں (۹۱۶ ق م) میں ''روڈس'' میں پایا گیا، جہاں مال بردار کشتی کا وزن کم

کرنے کے لئے مال کا ایک حصہ سمندر میں ڈال دیا گیا، اور اس ضرر کو اس کشتی میں لدے ہوئے مال کے مالکین پر تقسیم کر دیا گیا، نیز یہ بھی کہا جاتا ہے کہ امداد باہمی انشورنس اپنی سادہ شکل میں روم اور چین وغیرہ میں پانچ ہزار سال پہلے سے موجود تھا، جبکہ عرب جاہلیت کے یہاں بھی اس طرح کا انشورنس موجود تھا، چنانچہ اس کے تجار سردی اور گرمی کے سفر میں سفر سے پیدا ہونے والی تجارت کے نفع سے ہلاک ہونے والے اونٹ کا معاوضہ دیتے تھے، اور یہ ان میں سے ہر ایک پر اس کے اصل سرمایہ کی شرح کے مطابق آتا تھا، اور اسی طرح ان کا اس پر اتفاق تھا کہ جس کی تجارت ٹھپ ہو جائے یا بربادی کا شکار ہو جائے، اس کو معاوضہ دیا جائے (ابن خلدون: المقدمہ ر ۳۵۵، ط: دار الشعب)۔

موجودہ شکل میں امداد باہمی انشورنس کا آغاز کب ہوا اس سلسلہ میں محققین کے درمیان اختلاف ہے، چنانچہ بعض محققین کا خیال ہے کہ اس طرح کی انجمن پندرہویں یا سولہویں صدی عیسوی کے درمیان 'جرمنی' میں وجود میں آئی، جبکہ دوسرے محققین کا خیال ہے کہ اس طرح کی انجمن اٹھارہویں صدی کے شروع میں ۱۷۲۶ء میں جرمنی کے شہر روٹنبرگ میں قائم ہوئی، لیکن ایک تیسرے فریق کا خیال ہے کہ اس طرح کی انجمن تقریباً ۱۵۳۰ء سے ۱۵۴۵ء کے درمیان لندن اور پیرس میں قائم ہوئی۔

البتہ اسلامی مرکب امداد باہمی انشورنس کا آغاز تجارتی انشورنس کی حرمت ثابت ہونے کے بعد ۱۳۹۹ھ میں اس کے متبادل کے طور پر ہوا، اور اس مقصد کی پہلی کمپنی "شركة التأمين الاسلامية السودانية" ہے جو ۱۳۹۹ھ مطابق ۱۹۷۹ء میں بینک فیصل اسلامی سوڈانی کی طرف سے "خرطوم" میں قائم ہوئی، اس کے بعد "ایاك" "الشركة الإسلامية العربية للتأمين" ۱۳۹۹ھ مطابق ۱۹۷۹ء "دبی" میں اسلامی بینک دبئی کی جانب سے وجود میں آئی، پھر ۱۴۰۵ھ مطابق ۱۹۸۵ء میں سعودی عرب کے اندر شاہی فرمان کے سبب "الشركة الوطنية للتأمين التعاوني" وجود میں آئی، اور یہ مکمل حکومتی کمپنی ہے۔ پھر ۱۴۰۵ھ مطابق ۱۹۸۵ء میں "الشركة الإسلامية للتأمين وإعادة التأمين" بحرین میں قائم ہوئی، اسی طرح ۱۴۱۲ھ مطابق ۱۹۹۲ء میں "شركة التأمين الإسلامية العالمية" بحرین وجود میں آئی، خیال رہے کہ اسلامی بینک بحرین کا اس کی تاسیس اور اس کے مال کی سرمایہ کاری میں بڑا اہم کردار ہے، پھر ۱۴۱۶ھ مطابق ۱۹۹۶ء میں "شركة التأمين الإسلامية المساهمة العامة المحدودة" اردن میں اسلامی بینک اردن کی جانب سے وجود میں آئی (د۔ احمد سالم ملحم "اعادۃ التأمین وتطبیقاتہا فی شرکات التأمین الاسلامی" ر ۵۰۔ ۵۲، ط: ۱، دار النفائس الاردن ۱۴۲۵ھ۔ ۲۰۰۴ء)۔

پھر آہستہ آہستہ کئی ملکوں میں امداد باہمی انشورنس کمپنی قائم ہوئی، اور لوگوں میں اس کی بڑی پذیرائی ہوئی، کیونکہ وہ تجارتی انشورنس کمپنی کی نفع اندوزی، حرص اور استحصالی صفت سے بڑی حد تک مایوس ہو چکے تھے۔

تجارتی انشورنس اور اسلامی امداد باہمی انشورنس کے درمیان بنیادی فرق کا خلاصہ:...... ۱۔ نظام اور شکل کے اعتبار سے فرق: تجارتی انشورنس میں کمپنی اصل فریق ہوتی ہے، جو اپنے نام سے عقد کرتی ہے اور ساری قسطوں کی مالک بن جاتی ہے، اور انشورنس پالیسی ہولڈرس کا سامنا کرنے میں ساری ذمہ داری سنبھالتی ہے، جبکہ اسلامی انشورنس میں کمپنی انشورنس اکاؤنٹ یا حصہ لینے والوں کی سوسائٹی (Society of Contributors) کی وکیل ہوتی ہے، چنانچہ اصلاً اپنے نام سے عقد نہیں کرتی ہے، اور نہ ہی کل یا بعض قسطوں کی مالک بنتی ہے، اور نہ ہی اپنے مال سے کچھ ادا کرتی ہے، ہاں البتہ انشورنس اکاؤنٹ کو ضرورت پڑنے پر قرض حسن دیتی ہے جو بعد میں لوٹا لیتی ہے۔

۲۔ عقد کی شکل کے لحاظ سے فرق:

اسلامی انشورنس میں درحقیقت انشورنس کرنے والا "انشورنس اکاؤنٹ" ہوتا ہے، اور کمپنی اصلاً انشورنس کرنے والی نہیں ہوتی ہے، بلکہ انشورنس اکاؤنٹ کی وکیل ہوتی ہے، جبکہ تجارتی انشورنس میں صرف کمپنی ہی انشورنس کرنے والی ہوتی ہے۔

اس طرح اسلامی امداد باہمی انشورنس میں انشورنس ہولڈر ممبر کی حیثیت انشورنس کرنے اور کرانے والے دونوں کی ہوتی ہے، جبکہ تجارتی انشورنس میں انشورنس کرنے والی کمپنی کے مقابلہ میں وہ فریق ہوتے ہیں۔

۳۔ عقود کے اعتبار سے فرق:

اسلامی انشورنس میں تعلقات منظم کرنے والے عقود تین ہیں:

الف۔ کمپنی اور انشورنس اکاؤنٹ کے درمیان عقد وکالہ۔

ب۔ انشورنس اکاؤنٹ یا انشورنس پالیسی ہولڈر ممبران کے اموال کی سرمایہ کاری کے لئے عقد مضاربہ۔

ج۔ عوض کے ساتھ ہبہ کا عقد یا ''نہد'' (مخلوط کئے ہوئے زادِ سفر کی برابر تقسیم) کا عقد۔

اسی وجہ سے بہتر یہ ہے کہ اسلامی امداد باہمی انشورنس پالیسی ہولڈر ممبران کمپنی کے ساتھ انتظامیہ میں شریک ہوں، تاکہ انشورنس کو صحیح اسلامی طریقہ پر چلانے میں مدد ملے۔

یہ تو اسلامی انشورنس کی صورت حال تھی، جبکہ تجارتی انشورنس میں منظم عقد ایک ہی عقد ہے، جو انشورنس کرنے والی کمپنی اور انشورنس پالیسی ہولڈر (مستامن، یا مؤمن لہ) کے درمیان ہوتا ہے اور حقیقی معاوضہ پر قائم ہوتا ہے، کیونکہ ایک جانب سے قسطوں کی رقم ہوتی ہے تو دوسری جانب سے انشورنس کی رقم ہوتی ہے۔

۴۔ قسطوں اور اس کے منافع کی ملکیت کے اعتبار سے فرق:

تجارتی انشورنس میں قسط براہ راست کمپنی کی ملکیت میں داخل ہوجاتی ہے، اور چونکہ منافع تابع ہوتے ہیں، تو وہ بدرجہ اولی کمپنی کی ملکیت میں داخل ہوں گے، جبکہ اسلامی انشورنس میں کمپنی کبھی قسطوں کی مالک نہیں ہوتی ہیں، اور اس کے تمام منافع اسی اکاؤنٹ کی ملکیت ہوتے ہیں، البتہ کمپنی شرعی مضاربت کے طریقہ سے نفع کا اپنا تناسب یا شرح لیتی ہے۔

مستقبل کے لئے محفوظ کردہ رقم تو یہ بھی جدا رہتی ہے، چنانچہ اگر یہ رقم کمپنی کے شیئرز ہولڈر کے مال سے لی جاتی ہے، تو یہ ان کی ملکیت ہوتی ہے، اور اگر انشورنس پالیسی ہولڈر کے مال سے لی جاتی ہے، تو ان کے مفاد میں ہی باقی رہتی ہے، اور اگر کئی سال کی ایسی رقم جمع ہوجاتی ہے، جسے ''فائض تامینی متراکم'' (Accumulated surplus mony of insurance) کہتے ہیں، اور سارے انشورنس پالیسی ہولڈر ممبران تک اس رقم کو پہنچانا مشکل ہو تو انشورنس کمپنی کے نظام اساسی کی صراحت کے ساتھ انشورنس کرانے والے ممبران کے اتفاق کی بنا پر اسے مصارف خیر میں صرف کردیا جائے گا۔

۵۔ دو مستقل وجدا اکاؤنٹ کے وجود کے اعتبار سے فرق:

......اسلامی امداد باہمی انشورنس کی اہم خصوصیتوں میں سے ایک یہ ہے کہ اس میں دو جدا اکاؤنٹ ہوتے ہیں (۱) ایک انشورنس اکاؤنٹ ہے جس میں انشورنس سے متعلق سرگرمیوں کے لئے فنڈ ہے، یعنی جس میں قسط، اس کے منافع، معاوضے اور اخراجات سب کی رقم کا حساب شامل ہے۔ (۲) دوم حصہ داروں (Shareholders) کا اکاؤنٹ ہے یا کمپنی کا اکاؤنٹ ہے جو اس کے اموال، اس کے منافع، اور انشورنس اکاؤنٹ کے مال کی بطور مضاربت سرمایہ کاری سے حاصل نفع میں سے اس کے حصہ، اور اس کی ذمہ داریوں اور نفع اور نقصان کا فنڈ ہے۔ جبکہ یہ دو مستقل وجدا اکاؤنٹ تجارتی انشورنس میں موجود نہیں ہیں۔

۶۔ مقصد کے اعتبار سے فرق:

......تجارتی انشورنس میں انشورنس کی کارروائی سے نفع کو وجود میں لانا مقصود ہوتا ہے، اس طرح کہ اگر انشورنس کی قسطیں، اخراجات اور معاوضے سے زائد ہوں، تو یہ زائد رقم کمپنی کی ہوتی ہے اور وہ اسے نفع سمجھتی ہے، چنانچہ وہ قسطوں کا اندازہ بڑھا چڑھا کر کرتی ہیں کہ اسی میں اس کا مفاد ہے، جبکہ اسلامی انشورنس کا مقصد انشورنس ہولڈر ممبران کے درمیان تعاون کرنا ہے، اور انشورنس چلانے والی کمپنی کا مقصد خود انشورنس سے کوئی نفع وجود میں لانا نہیں ہے، اس لئے کہ قسطیں اس کی ملکیت میں کبھی داخل نہیں ہوتی ہیں، اور قسط کی بچی ہوئی رقم، خواہ کتنی ہی کیوں نہ ہو، اس سے کمپنی فائدہ نہیں اٹھاسکتی ہے، کیونکہ قسطیں انشورنس اکاؤنٹ کے ساتھ خاص رہتی ہیں، اور قسط کی بچی ہوئی رقم اسی کی ملکیت ہوتی ہے، اسی وجہ سے کمپنی قسطوں کا اندازہ بڑھا چڑھا کر نہیں لگاتی ہے۔

۷۔ بچی ہوئی رقم کے اعتبار سے فرق:

......قسطوں اور اس کی سرمایہ کاری کے منافع سے معاوضے، اخراجات، اور مستقبل کے لئے محفوظ کردہ رقم کے بعد بچنے والی رقم انشورنس پالیسی ہولڈر ممبران پر ''اسلامی امداد باہمی انشورنس'' میں خرچ ہوتی ہے، جبکہ تجارتی انشورنس میں یہ انشورنس سے حاصل نفع اور آمدنی ہے جو کمپنی کی خاص ملکیت ہوتی ہے۔

۸۔ تعدد عاقدین اور عقد کی تکمیل کے اعتبار سے فرق:

......تجارتی انشورنس حقیقی تعدد پر قائم ہوتا ہے، کیونکہ یہ دو عقد کا ارادہ کرنے والوں کے درمیان مکمل ہوتا ہے، جن میں سے ہر ایک اپنے مصالح کو وجود میں لانے کی کوشش کرتا ہے، اور دونوں میں سے ہر ایک کا ذمہ ملکیت اور ذمہ داری کے لحاظ سے

دوسرے کے ذمہ سے مختلف ہوتا ہے، اور وہ دونوں ''مؤمن'' (کمپنی) اور ''مؤمن لہ'' (گاہک) ہیں، اور دونوں کے باہم عقد کرنے سے عقد تکمیل پا جاتا ہے، اور صرف اس کی تنفیذ باقی رہتی ہے کہ گاہک کمپنی کو اپنی قسطیں ادا کرے، اور کمپنی انشورنس کی رقم اس کے وقت پر ادا کرنے کا التزام کرے، اور گاہک کا انشورنس کرنے والی کمپنی کی ذمہ داریوں، پابندیوں اور ادا کردہ قسطوں سے کوئی تعلق نہیں رہتا ہے، جبکہ اسلامی امداد باہمی انشورنس میں انشورنس کرنے والا اور انشورنس پالیسی ہولڈر ممبر درحقیقت دونوں ایک ہی شخص ہوتے ہیں، کیونکہ دونوں کی نمائندگی انشورنس اکاؤنٹ کرتا ہے، جس میں قسطیں داخل ہوتی ہیں، اور اس سے انشورنس کی رقم خرچ کی جاتی ہے، اور وہ دونوں کا اکاؤنٹ ہے، چنانچہ انشورنس پالیسی ہولڈر ممبران کی ذمہ داریاں، قسطوں کے ادا کرنے سے ختم نہیں ہوتی ہے، بلکہ بچی ہوئی رقم میں اس کا حصہ رہتا ہے، اور اگر قسطیں کافی نہ ہوں تو انشورنس اکاؤنٹ قرض لے گا، جسے انشورنس پالیسی ہولڈر ممبران اگلے سال لوٹا دیں گے۔

۹۔ مالی ذمہ داری اور سرمایہ کاری کو وجود میں لانے والے عناصر کے لحاظ سے فرق:

تجارتی انشورنس میں تمام سرگرمیوں سمیت پوری کمپنی کی ایک ہی مالی ذمہ داری ہوتی ہے جس کے عناصر مندرجہ ذیل امور سے مرکب ہوتے ہیں:

(۱) ادا کردہ اصل سرمایہ۔

(۲) اصل سرمایہ کے منافع اور انٹرسٹ۔

(۳) معاوضات ادا کرنے کے بعد قسطوں سے بچی رقم سے حاصل انشورنس نفع، اور یہی مالی ذمہ کمپنی کی ساری ذمہ داریوں کا ذمہ دار ہے، خواہ ان کا تعلق انشورنس کی سرگرمی سے ہو یا دیگر اخراجات اور معاوضے سے، جبکہ اسلامی امداد باہمی انشورنس میں دو مالی ذمہ ہیں:

الف۔ کمپنی کا ذمہ جو ذیل کے عناصر سے بنتا ہے:

(۱) ادا کردہ اصل سرمایہ، (۲) اس کے جائز منافع، (۳) مستقبل کے لئے محفوظ رقم جو صرف حصہ داروں (Shareholders) کے منافع سے لئے گئے ہوں، (۴) وہ اجرت جو کمپنی نے انشورنس اکاؤنٹ کو چلانے کے مقابلہ میں حاصل کیا، جبکہ اجرت کے ساتھ وکالت ہو، (۵) انشورنس اکاؤنٹ اور کمپنی کے درمیان عقد مضاربت کے ذریعہ سرمایہ کاری سے حاصل نفع سے اس کا حصہ۔

خیال رہے کہ کمپنی کا ذمہ اس کے ساتھ خاص ذمہ داریوں، پابندیوں اور اخراجات کا ذمہ دار ہے، لیکن معاوضہ ادا کرنے کا ذمہ دار نہیں ہے۔

ب۔ انشورنس اکاؤنٹ کا مالی ذمہ جس کے عناصر درج ذیل ہیں:

(۱) انشورنس اکاؤنٹ کی قسطیں، (۲) سرمایہ کاری سے اس کے منافع، (۳) انشورنس اکاؤنٹ سے اخذ کردہ احتیاطی رقم جو مستقبل کے لئے مخصوص کی گئی ہو۔

اور انشورنس اکاؤنٹ ہی انشورنس کی تمام سرگرمیوں سمیت اپنے مخصوص اخراجات اور عوض کی فراہمی کا ذمہ دار ہے، اور کمپنی کا ذمہ گذشتہ چیزوں کا ذمہ دار نہیں ہے، بلکہ وہ انشورنس اکاؤنٹ یا انشورنس پالیسی ہولڈر ممبران کی سوسائٹی کی وکیل ہے۔

۱۰۔ شریعت کے احکام کی پابندی کے اعتبار سے فرق:...... اسلامی امداد باہمی انشورنس میں کمپنی اپنی تمام سرگرمیوں میں اسلامی شریعت کے احکام کی پابندی کرتی ہے، اسی وجہ سے فتویٰ کمیٹی اور شرعی نگرانی بورڈ متعین کرتی ہے، جبکہ تجارتی انشورنس میں کمپنی اپنے عقود، انشورنس، سرمایہ کاری اور بینک سے معاملہ کرنے میں شریعت کی پابندی نہیں کرتی ہے۔

۱۱۔ ربا ہونے کے اعتبار سے فرق:

اسلامی امداد باہمی انشورنس میں سود نہیں پایا جاتا ہے، کیونکہ وہ معاوضہ پر مبنی نہیں ہے۔

بلاشبہ صحت و بطلان اور جواز و حرمت کے اعتبار سے حکم شرعی مرتب کرنے میں ان اساسی فرقوں کی بڑی تاثیر ہے۔

عقد اسلامی امداد باہمی انشورنس کے ارکان:

حنفی مسلک کے اعتبار سے ایجاب وقبول ہیں جو انشورنس کمپنی اور انشورنس پالیسی ہولڈر کے ذریعہ وجود میں آتے ہیں۔ جبکہ دیگر مسالک فقہیہ کے اعتبار

سے درج ذیل ہیں:

۱۔ انشورنس میں حصہ لینے والوں کی کمیٹی، یا انشورنس اکاؤنٹ یا انشورنس فنڈ جسے شریعت اسلامیہ سے متفق مقاصد تک پہنچنے کو آسان بنانے کے لئے قانونی شخصیت مان لیا گیا ہے۔

۲۔ شرکت کرنے والا یا انشورنس لینے والا جو اس کمیٹی میں داخل ہونے یا شرکت کرنے کی رغبت رکھتا ہے، کیونکہ وہ عقد پر دستخط کرتے ہی اس کا ممبر بن گیا، جس پر وہ ساری چیزیں لاگو ہوں گی جنہیں کمپنی کا اساسی نظام اور انشورنس پالیسی شامل ہوں۔

۳۔ اسلامی امداد باہمی انشورنس کا محل: اسلامی انشورنس میں معقود علیہ دو چیزیں ہیں:

الف۔ انشورنس میں حصہ لینے والے کی طرف سے بطور تبرع دی جانے والی قسط، جسے اسلامی انشورنس میں حصہ داری کی قیمت کہتے ہیں، جبکہ تجارتی انشورنس میں ''قسط'' کہتے ہیں۔

ب۔ انشورنس کی رقم، جو کمپنی انشورنس اکاؤنٹ کی نیابت میں انشورنس پالیسی ہولڈرز کو انشورنس کرائے ہوئے خطرہ کے پیش آنے کے وقت ادا کرتی ہے۔

صیغہ یعنی ایجاب وقبول اور انشورنس کے عرف میں یہ تحریری شکل میں ہوتے ہیں، اور شرعاً اس عرف سے کوئی ممانعت نہیں ہے۔ خیال رہے کہ تجارتی انشورنس میں کمپنی اساسی عاقد اور بنیادی رکن ہوتی ہے، جبکہ اسلامی انشورنس میں کمپنی رکن اور اصلی عاقد نہیں ہوتی ہے، بلکہ انشورنس پالیسی کے مطابق انشورنس اکاؤنٹ کی وکیل ہوتی ہے۔

عقد اسلامی امداد باہمی انشورنس کی نوعیت:

بعض حضرات نے اسے ہبہ بعوض کے مثل قرار دیا ہے، کیونکہ امام مالک کے نزدیک عقد ہبہ کے لازم اور صحیح ہونے کے لئے قبضہ شرط نہیں ہے، ابن رشد الحفید تحریر کرتے ہیں: ''أن العلماء اختلفوا، هل القبض شرط صحة فى صحة العقد أم لا؟ فاتفق الثورى والشافعى وأبوحنيفة على أنه من شرط صحة الهبة القبض، وأنه إذا لم يقبض الموهوب لم يلزم الواهب۔

وقال مالك: ''ينعقد بالقبول ويجبر على القبض كالبيع سواء... فمالك: القبض عنده فى الهبة من شروط التمام، لا من شروط الصحة، وهو عند الشافعى وأبى حنيفة من شروط الصحة'' (ابن رشد الحفيد أبي الوليد محمد بن احمد (ت:۵۹۵ھ) بداية المجتهد كتاب الهبات ۱۴۱/۴۔۱۴۲، ط:۲، دار المعرفة ۱۴۲۰ھ۔۲۰۰۰ء)۔

(اہل علم کا اختلاف ہے کہ کیا قبضہ عقد کے صحیح ہونے کے لئے صحت کی شرط ہے یا نہیں؟ تو ثوری، شافعی اور ابوحنیفہ کا اس پر اتفاق ہے کہ ہبہ کے صحیح ہونے کی شرط قبضہ ہے، اور اگر موہوب شیئ پر قبضہ نہ ہو تو واہب کو لازم نہ ہوگا، اور امام مالک کا قول ہے کہ ہبہ قبول سے منعقد ہو جاتا ہے، اور ٹھیک بیع کی طرح قبضہ پر مجبور کیا جائے گا، چنانچہ امام مالک کے نزدیک ہبہ میں قبضہ تکمیل کی شرائط میں سے ہے، نہ کہ صحت کے شرائط میں سے، اور وہ امام شافعی اور ابوحنیفہ کے نزدیک صحت کے شرائط میں سے ہے)۔

خلاصہ یہ کہ امداد باہمی انشورنس ''ہبہ بالثواب'' یا بشرط العوض'' میں داخل ہے کہ انشورنس لینے والا عملی طور سے انشورنس اکاؤنٹ کے لئے اپنی قسط اس طرح بطور تبرع دیتا ہے کہ اسے لوٹائے گا نہیں، بشرطیکہ انشورنس فنڈ حادثہ پیش آنے کے وقت نقصان کی تلافی کے لئے اس کے ساتھ نظام کے مطابق تعاون کرے، چنانچہ ان قسطوں میں بدلہ اور عوض کی شرط کے ساتھ تبرع کی حقیقت پائی جاتی ہے، بلکہ امداد باہمی انشورنس بدلہ کے ساتھ ہبہ کے مقابلہ میں تبرع اور تعاون سے زیادہ قریب ہے، اس لئے کہ بدلہ کے ساتھ ہبہ میں کبھی تعاون اور تبرع کا مفہوم نہیں پایا جاتا ہے، بلکہ اس کا مقصد بدلہ کا حصول ہوتا ہے، چنانچہ وہ بالکل بیع سے قریب ہو جاتا ہے، اسی وجہ سے فقہاء کی ایک جماعت نے اسے بیع کا حکم اخذ کرنے والا قرار دے کر اس پر اس کے احکام منطبق کئے ہیں، چنانچہ حنفیہ کے نزدیک اگر عقد میں عوض مشروط ہو تو یہ ابتداء ہبہ اور انتہاء بیع ہے، علامہ کاسانی تحریر کرتے ہیں:

''قال أصحابنا الثلاثة ۔رضى الله عنهم۔ أن عقده عقد هبة، وجوانه جواز بيع، وربما عبروا أنه هبة ابتداءً بيع انتهاءً'' (الامام علاء الدين ابوبكر بن مسعود الكاسانى الحنفى (ت:۵۸۷ھ) (البدائع كتاب الهبه، فصل وأما حكم الهبة ۱۳۲/۶، ط:۲،

دار الكتب العلمية بيروت ١٤٠٦هـ-١٩٨٦ء)۔ (ہمارے ائمہ ثلاثہ رضی اللہ عنہم نے کہا ہے کہ اس کا عقد ہبہ کا عقد ہے، اور اس کا جواز بیع کے جائز ہونے کی طرح ہے، اور بسا اوقات انہوں نے یہ تعبیر کی ہے کہ وہ ابتداءً ہبہ ہے اور انتہائی بیع ہے)۔

اور یہ بہتری اس وجہ سے ہے کہ امداد باہمی انشورنس میں قسطیں انشورنس رقم کے معاوضہ میں کمپنی کی ملکیت میں نہیں آتی ہیں، بلکہ انشورنس اکاؤنٹ کی ملکیت میں رہتی ہیں، جو تبرع کرنے والوں کی مصلحتوں کے لئے محفوظ رہتی ہیں، اور اگر معاوضے اور اخراجات کے بعد کچھ رقم بچ جاتی ہے تو انہیں ہی لوٹا دی جاتی ہے، یا کئی سالوں کی رقم اکٹھی ہونے کی صورت میں نیکی کے مصارف میں صرف ہوتی ہے۔

۲۔ بعض حضرات نے "امداد باہمی انشورنس" کو نظام "عاقلہ" کے مثل قرار دیا ہے کہ قتل شبہ عمد اور خطا میں خون بہا کی ذمہ داری میں اس کے رشتہ داروں کو بھی شریک رکھا گیا ہے (المبسوط کتاب المعاقل ۲۷/۱۳۱، ط: دار احیاء التراث العربی بیروت ۱۴۲۲ھ۔ ۲۰۰۲ء)۔

لیکن انشورنس کے لئے نظام "عاقلہ" کو اساس بنانا محل نظر ہے، چونکہ انشورنس اکاؤنٹ میں ممبر شپ کے بدلہ ہر فرد مال کا ایک حصہ ادا کرتا ہے، جبکہ کنبہ کے افراد کچھ بھی ادا نہیں کرتے ہیں، بلکہ مصیبت کے وقت دیت کی رقم جمع کرتے ہیں، ایسے ہی قتل خطا کی دیت عاقلہ پر لازم ہے، جبکہ انشورنس اکاؤنٹ کا ممبر بننا لازم نہیں ہے۔

۳۔ امداد باہمی انشورنس کے عقد کو بعض حضرات نے "عقد موالاۃ" کے مثل قرار دیا ہے، جو یہ ہے کہ "نامعلوم نسب والا شخص معروف النسب شخص سے کہے کہ تم میرے ولی ہو، اگر میں مرجاؤں تو تم میرے وارث ہوگے، اور اگر میں جرم کا ارتکاب کروں، تو تم دیت ادا کروگے، ارشاد الٰہی ہے: {والذين عقدت أيمانكم فآتوهم نصيبهم، إن الله كان على كل شيئ شهيداً} (النساء: ۳۳) (اور جن سے تم نے کوئی پیمان باندھ رکھا ہو تو ان کا حصہ دو، بے شک اللہ ہر چیز سے آگاہ ہے)۔

حصہ سے مراد میراث ہے، جصاص رازی تحریر کرتے ہیں: "ثبت مما قدمنا من قول السلف أن ذلك كان حكماً ثابتاً في الإسلام، وهو الميراث، بالمعاقدة والموالاة" (الجصاص الرازي ابوبكر احمد بن علي (ت: ۳۷۰ھ) احكام القرآن باب ولاء الموالاة الآية ۳۳ من سورة النساء ۲،۲۲۳ ط: ۲، دار الكتب العلميه بيروت ۲۰۰۳ء - ۱۴۲۴ھ)۔ (سلف کے اقوال سے جو میں نے پہلے پیش کیا یہ بات ثابت ہوگئی کہ یہ اسلام میں ثابت شدہ حکم تھا، اور وہ عقد و پیمان قائم کرکے وارث ہونا ہے)۔

لیکن امداد باہمی انشورنس کو اس پر قیاس کرنا صحیح نہیں ہے، اس لئے کہ حنفیہ کے علاوہ کوئی اسے میراث کا سبب نہیں قرار دیتا ہے (دیکھئے: المغنی فصل: وإن عاقد رجل رجلا ۶/۳۸۱، ط: عالم الکتب، بیروت)۔

اسی کے ساتھ حنفیہ کے نزدیک "مولی الموالاۃ" اسی صورت میں وارث ہوسکتا ہے، جبکہ ورثہ اور ذوالارحام میں سے کوئی وارث نہ ہو، جبکہ امداد باہمی انشورنس پالیسی ہولڈر ممبر کا حکم اس سے مختلف ہے۔

۴۔ بعض حضرات نے امداد باہمی انشورنس کو اپنے اوپر تبرع کو لازم قرار دینے پر قیاس کیا ہے کہ مالکی مسلک میں اپنی ذات پر لازم کی ہوئی بھلائی لازم ہے، جب تک مفلس نہ ہو جائے یا وفات نہ ہو جائے (علیش المالکی محمد بن احمد بن محمد (ت: ۱۲۹۹ھ) فتح العلی المالک فی الفتوی علی مذہب الامام مالک مسائل الالتزام ۲/۷ ۳۔ ۳۸، ط: الشاملۃ)۔

جبکہ بعض حضرات نے "امداد باہمی انشورنس" کو "نہد" کے مثل قرار دیا ہے، جس کے جواز اور صحت پر امام بخاری نے دلیلیں قائم کی ہیں، کیونکہ انہوں نے اپنی صحیح میں عنوان لگایا ہے "باب الشركة في الطعام والنهد والعروض" (کھانا، زادسفر اور سامان میں شرکت کا باب) اور تحریر فرمایا ہے:

"لم ير المسلمون في النهد بأساً أن يأكل هذا بعضاً، وهذا بعضاً" (البخاري مع الفتح، كتاب الشركة ۵،۱۲۸، ط: السلفية بالقاهرہ) (نہد کے سلسلہ میں مسلمانوں نے کوئی حرج نہیں سمجھا ہے کہ یہ کچھ کھائے اور یہ کچھ)، پھر "نہد" کے جائز ہونے پر دلالت کرنے والی حدیثیں ذکر کی ہیں۔

اور "نہد" کی وضاحت کرتے ہوئے ابن منظور افریقی تحریر کرتے ہیں: "النهد إخراج القوم نفقاتهم على قدر عدد الرفقة، والتناهد: إخراج كل واحد من الرفقة نفقة على قدر نفقة صاحبه، يقال: تناهدوا وناهدوا وناهد بعضهم بعضاً، والمخرج يقال

له: ''النهد'' بالكسر. قال: والعرب تقول: هات نهدك مكسورة النون. قال: وحكى عمرو بن عبيد عن الحسن أنه قال: ''أخرجوا نهدكم، فإنه أعظم للبركة، وأحسن لأخلاقكم وأطيب لنفوسكم'' (الامام العلامة ابو الفضل جمال الدين محمد بن مكرم بن منظور الافريقي، لسان العرب، ۱۴،۳۶۶، ط: ۱ دار صادر بيروت ۲۰۰۰ء)۔

(''نہد'' قوم کا سفر کے اخراجات ساتھیوں کی تعداد کے بقدر نکالنا ہے، اور ''تناہد'' ساتھیوں میں سے ہر ایک کا اپنے ساتھی کے نفقہ کے بقدر نفقہ نکالنا ہے، کہا جاتا ہے: "تناهدوا" اور "ناهدوا" اور: "ناهد بعضهم بعضاً" ہر ایک ساتھی نے سفر کا برابر برابر حصہ نکالا، اور نکالے ہوئے خرچ کو "نهد" نون کے کسرہ کے ساتھ کہتے ہیں: عرب بولتے ہیں ''ہات نہدک'' (اپنا خرچ لاؤ)، نون کے کسرہ کے ساتھ، اور عمرو بن عبید نے حسن بصری سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے کہا، اپنا سفر کا خرچ نکالو کہ اس میں زیادہ برکت ہے، اور تمہارے اخلاق کے لئے زیادہ بہتر ہے اور تمہارے دل کے لئے زیادہ عمدہ ہے)۔

حافظ ابن حجر تحریر کرتے ہیں: "النهد" بكسر النون وفتحها. إخراج القوم نفقاتهم على قدر عدد الرفقة" (الفتح ۵،۱۲۹) (النہد نون کے کسرہ اور فتحہ کے ساتھ قوم کا اپنے سفر کے اخراجات ساتھیوں کی تعداد کے بقدر نکالنا ہے)۔

واضح رہے کہ ''نہد'' کی صورت یہ ہے کہ ہر ایک ساتھی سفر کے اخراجات میں برابر حصہ دے، چنانچہ تمام ساتھی خرچ کی ادائیگی میں برابر برابر حصہ لینے والے ہیں، لیکن استعمال اور خرچ کرنے میں برابر اور یکساں نہیں ہیں، کیونکہ کوئی زیادہ کھا سکتا ہے اور کوئی کم، اور کوئی کسی وقت امکان ہے کہ نہ کھائے، اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ کوئی علاج کا محتاج ہوجائے، اور کسی کو علاج کی ضرورت نہ پڑے، اس سب کے باوجود ان فرقوں کو نہیں دیکھا جاتا ہے، کیونکہ یہ حضرات تعاون، نیکی اور تبرع پر متفق ہیں، پھر اخراجات کے بعد بچی ہوئی رقم ان پر تقسیم کردی جاتی ہے، اور اگر وہ اسے دوسرے سفر کے لئے ذخیرہ نہ کریں، اور یہی موجودہ اسلامی امداد باہمی انشورنس کی صورت حال ہے کہ بچی ہوئی رقم انشورنس میں حصہ لینے والے ممبران پر تقسیم کردی جاتی ہے، چنانچہ دونوں میں کوئی بنیادی فرق نہیں ہے، مگر یہ کہ اس ''نہد'' کو سفر کرنے والے گروپ کی بجائے کمپنی کی نگرانی میں منظم حساب کی طرف ترقی دے دی گئی ہے۔

میرے نزدیک ''نہد'' پر قیاس کرنا بھی صحیح نہیں ہے، کیونکہ اس میں ہر ساتھی کو کچھ نہ کچھ حصہ ملتا ہے، جبکہ اسلامی امداد باہمی انشورنس میں خسارہ کی تلافی صرف اس کے لئے کی جاتی ہے جو خطرہ سے دوچار ہوا ہو۔

امداد باہمی انشورنس کی اصل نوعیت:

میرے نزدیک اسلامی امداد باہمی انشورنس کی کوئی سابق اصل نہیں ہے، بلکہ تبرع کا ایک نیا عقد ہے جس کا فائدہ تبرع کرنے والے کو بھی ہوتا ہے۔

چونکہ ایسا تبرع کتاب وسنت کی کسی نص کے مخالف نہیں ہے، لہٰذا یہ مباح ہے، بلکہ تعاون کے جذبہ پر مشتمل ہونے کی وجہ سے مستحب ہے۔

اسلامی امداد باہمی انشورنس کے اصول ومبادی:...... اسلامی انشورنس کے بنیادی اصول درج ذیل ہیں:

۱۔ شریعت اسلامیہ کے احکام کی عدم مخالفت:

اسلامی امداد باہمی انشورنس کی کمپنی اپنے عقود وتصرفات میں شریعت اسلامیہ کے احکام کی مخالفت نہیں کرتی ہے، چنانچہ وہ قرآن کریم یا سنت صحیحہ کی نص کی مخالف شرطوں پر مشتمل عقد نہیں کرتی ہے، اور نہ ہی سودی بینک میں اپنا مال رکھتی ہے، اور نہ ہی شریعت کے مخالف تصرفات کرتی ہے۔ بلاشبہ نئے عقود میں یہ شرط نہیں ہے کہ فقہ اسلامی میں مقررہ عقود میں سے کسی سابق عقد کے موافق ہو، اور نہ ہی یہ شرط ہے کہ اس کی شرطیں کتاب وسنت میں ہوں، بلکہ معاملات کے باب میں اس بات پر اکتفا کیا جاتا ہے کہ وہ شریعت کے مخالف نہ ہوں، کیونکہ عقود وشروط میں اصل اباحت ہے، مگر یہ کہ اس کی حرمت پر کوئی دلیل دلالت کرے، اس طرح اسلامی شریعت میں معاملہ کرنے کی آزادی حاصل ہے، اور کتاب وسنت کی بہت سی شرعی نصوص سے اس اصل کی تائید ہوتی ہے، چنانچہ ارشاد الٰہی ہے: {يا أيها الذين آمنوا أوفوا بالعقود} (مائدہ:۱) (اے ایمان والو! اپنے عہد وپیمان پورے کرو)۔ اور دوسری جگہ ارشاد باری ہے: {وأوفوا بالعهد إن العهد كان مسئولاً} (اسراء: ۳۴) (اور عہد کو پورا کرو، کیونکہ عہد کی پرسش ہونی ہے)۔

اسی طرح وعدہ اور عہد کی مخالفت کی حرمت پر دلالت کرنے والی حدیثیں بہت زیادہ ہیں، اسی کے ساتھ وہ حدیث بھی ہے، جو عمرو بن عوف مزنی سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: "المسلمون عند شروطهم إلا شرطا حرم حلالا أو أحل حراماً" (سنن ترمذی حدیث نمبر: ۱۳۵۲) (مسلمانوں

کے درمیان صلح جائز ہے، مگر ایسی شرط جو حلال کو حرام ٹھہرادے یا حرام کو حلال قرار دے، اور مسلمانوں کو اپنی شرطوں کی پابندی کرنی ہے، مگر ایسی شرط جو حلال کو حرام یا حرام کو حلال ٹھہرائے)۔ اور شریعت کے مقاصد میں سے ہے کہ لوگوں کے حق میں نرمی کی جائے اور تنگی دور کی جائے، اور ان پر سختی نہ کی جائے لہذا معاملات میں اصل اباحت ہے، یہ شریعت کے مقاصد سے بھی ہم آہنگ ہے، اسی طرح فقہی قاعدہ سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے کہ ''الأصل فی غیر الشعائر الإباحة'' (السیوطی الشافعی الاشباہ والنظائر ۱۳۳/۱، ط: دار الکتب العلمیہ بیروت ۱۴۰۳ھ-۱۹۸۳ء) (عبادات کے علاوہ میں اصل اباحت ہے)۔

خلاصہ یہ کہ تمام ائمہ کے درمیان تقریباً متفق علیہ ہے کہ عقود اور شروط میں اصل اباحت ہے، چنانچہ امام رازی {ولا تفسدوا فی الأرض بعد إصلاحها} (اعراف:۵۶) (اور زمین میں اس کی اصلاح کے بعد فساد نہ برپا کرو) کی تفسیر میں رقمطراز ہیں: ''هذه الآية الكريمة دالة على أن كل عقد وقع التراضي عليه بين الخصمين، فإنه انعقد وصح ......؛ لأن رفعه بعد ثبوته يكون إفساداً بعد الإصلاح. والنص دال على أنه يجوز، وإذا ثبت هذا القول، فإن مدلول هذه الآية من هذا الوجه متأكد لعموم قوله تعالى: {---أوفوا بالعقود---} (مائدہ:۸)، وتحت سائر العمومات الواردة فی وجوب الوفاء بالعهود والعقود، إذا ثبت هذا فنقول: إن وجدنا نصاً دالاً على أن بعض العقود التي وقع التراضي به من الجانبين غير صحيح قضينا فيه بالبطلان تقديماً للخاص على العام، وإلا حكمنا فيه بالصحة رعاية لمدلول هذه العمومات'' (الفخر الرازی التفسیر الکبیر ۲۸۳/۵-۲۸۴، المسألة الثانیة الآیة ۵۶ من سورة الاعراف)۔

(یہ آیت کریمہ اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ ہر عقد جس پر دو فریق کے درمیان باہم رضامندی واقع ہو، تو وہ منعقد اور صحیح وثابت ہوگیا، اس لئے کہ اس کے ثبوت کے بعد اسے ختم کرنا اصلاح کے بعد فساد برپا کرنا ہوگا، اور نص اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ یہ جائز نہیں، اور جب یہ قول ثابت ہوگیا، تو اس آیت کا مفہوم اس طریقہ سے اللہ تعالیٰ کے فرمان ''عہد کو پورا کرو'' کے عموم سے مؤکد ہے، اور اللہ تعالیٰ کے ارشاد ''اور جو اپنی امانتوں اور اپنے عہد کا پاس رکھنے والے ہیں'' کے ذیل میں داخل ہے، اور عہد و پیمان کو پورا کرنے کے وجوب کے سلسلہ میں وارد سارے عمومات کے ذیل میں داخل ہیں، اور جب یہ ثابت ہوگیا تو ہم کہتے ہیں کہ اگر ہم کوئی ایسی نص پائیں جو اس بات پر دلالت کرنے والی ہو کہ بعض عقود جس پر فریقین کی طرف سے باہم رضامندی واقع ہوئی ہو، صحیح نہیں ہے، تو ہم اس کے باطل ہونے کا فیصلہ کریں گے، عام پر خاص کو مقدم کرتے ہوئے، ورنہ ہم ان عمومات کے مفہوم کی رعایت میں اس کے بارے میں صحت کا فیصلہ کریں گے)۔

محرمات پر انشورنس نہ ہو:...... اسلامی امداد باہمی انشورنس کے لئے جائز نہیں ہے کہ کسی ایسی چیز کا انشورنس کرے، جسے شریعت نے حرام قرار دیا ہو۔

فتوی اور شرعی نگرانی بورڈ کا موجود ہونا:...... اسلامی انشورنس کمپنی میں فتوی اور شرعی نگرانی کا ایک بورڈ ہو، جس کی ہدایات، اور نگرانی میں کمپنی اسلامی امداد باہمی انشورنس کی تنفیذ کرے، تاکہ کسی عقد یا تصرف میں شریعت کی خلاف ورزی نہ ہو۔

تبرع اور انشورنس میں حصہ لینے والوں کے درمیان تعاون کا فروغ:...... اصولی اعتبار سے اسلامی انشورنس کے عقود کو تبرع پر قائم ہونا لازمی ہے، یعنی عقد میں اس بات کی صراحت ہونی چاہئے کہ انشورنس پالیسی ہولڈر قسط اور اس کی سرمایہ کاری کے منافع انشورنس اکاؤنٹ یا انشورنس فنڈ کے لئے تبرع کرے گا، اور اس بات کی صراحت اس لئے لازم ہے کہ خالص معاوضے کے عقد میں جہالت فاحشہ اور ''غرر فاحش'' موثر ہوتے ہیں، جبکہ تبرعات میں موثر نہیں ہوتے ہیں، کیونکہ فقہ اسلامی میں ہر عقد کی ایک خاص میزان ہوتی ہے، چنانچہ خالص معاوضے کے عقود کی میزان خالص تبرعات کی میزان سے الگ اور جدا ہے، اسی وجہ سے پہلی قسم کی میزان تصور کے واضح ہونے اور معقود علیہ کے علم پر قائم ہے، کیونکہ عاقدین میں سے ہر ایک کچھ ادا کرتا ہے، جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: {...لا تأكلوا أموالكم بينكم بالباطل إلا أن تكون تجارة عن تراض منكم....} (نساء:۲۹) (اپنے مال آپس میں باطل ذریعے سے نہ کھاؤ، مگر یہ کہ کوئی مال باہمی رضامندانہ تجارت کی راہ سے حاصل ہو جائے)، اسی وجہ سے اس میں جہالت اور غرر موثر ہیں، اس لئے کہ ان دونوں کے پائے جانے کے ساتھ حقیقی باہمی رضامندی حاصل نہیں ہوئی اور نہ ہی وہ انصاف پایا گیا، جس پر شریعت اسلامی قائم ہے، جبکہ دوسری قسم، یعنی تبرعات کی میزان احسان، نیکی، اجر وثواب کی حرص اور تعاون و ہمدردی پر قائم ہے، اور بھاؤ تاؤ پر نہیں، بلکہ آسانی اور ہمدردی پر اس کا دارومدار ہے، اسی وجہ سے اس میں جہالت موثر نہیں ہے، لہذا اس صورت میں ''جہالت'' یا ''غرر'' باعث نزاع نہیں ہے، مثال کے طور پر اگر کوئی شخص کسی سے کہے کہ میں تجھے وہ مال ہبہ کرتا ہوں، جو میرے پاس [illegible]

موبائل دے دے، تو کوئی اشکال نہ ہوگا، کیونکہ احسان کرنے والے پر کوئی الزام نہیں ہے، اور شریعت نے معلوم ومجہول ہر طرح سے احسان کا دروازہ وا کیا ہے، تا کہ وہ بکثرت واقع ہو، لیکن اگر وہ شخص کہے کہ میں نے تجھ سے موبائل پانچ ہزار میں بیچا، اور دوسرے نے قبول کرلیا، تو یہ نزاع کا باعث ہوگا، اس لئے کہ خریدار اپنے دل میں خاص اوصاف کے ساتھ موبائل کا تصور کرے گا، اور بائع اپنی مصلحت کو دیکھے گا، لہذا شریعت نے شروع ہی سے فساد کے ذرائع کو بند کر دیا ہے، تا کہ اس جیسے عقد پر ایک مسلمان اقدام نہ کرے۔

۵۔ کمپنی امداد باہمی انشورنس کے کام چلانے میں وکیل ہو:...... امداد باہمی انشورنس کی غرض سے وجود میں آئی کمپنی، انشورنس کی ادا کردہ قسطوں کی مالک نہیں ہوتی ہے، لہذا وہ اجرت کے ساتھ یا بغیر اجرت کے انشورنس کے کام چلانے کی وکیل ہوگی اور کمپنی اپنی اجرت اعداد وشمار کے قانون اور اخراجات کے گہرے مطالعے کے نتیجہ میں متعین کرے گی، یعنی ملازمین، کارکنان، وکلاء، کاغذات، سی ڈی، کمپیوٹر اور دوسرے آلات پر کس قدر خرچ آئے گا، اس کی تعیین شماریات کے ضابطہ کی روشنی میں کرے گی۔

۶۔ بچی ہوئی رقم کی تقسیم:...... ''فائض تامینی'' یعنی اخراجات اور معاوضے کے بعد بچی ہوئی رقم ''انشورنس پالی ہولڈر ممبران کی طرف لوٹ جائے گی، انشورنس اکاؤنٹ مستقبل کے لئے کچھ رقم محفوظ کرسکتا ہے، اسی طرح اس کا ایک حصہ انشورنس پالیسی ہولڈر ممبران کے اتفاق سے کمپنی میں کام کرنے والوں کی حوصلہ افزائی کے لئے ان پر بھی تقسیم کی جاسکتی ہے۔

۷۔ سرمایہ کاری کے منافع کی تقسیم:...... یقیناً انشورنس پالیسی ہولڈر ممبران کے مال کی جائز سرمایہ کاری کی جائے گی، جس سے نفع بھی ہوسکتا ہے، اس صورت میں کمپنی مضارب اور انشورنس پالیسی ہولڈر ممبران رب المال ہوں گے لہذا دونوں کے درمیان نفع کی تقسیم کی شرح نسبت، یعنی تہائی، چوتھائی، اور نصف کے ساتھ یا فیصد یعنی ۲۰ فیصد، ۳۰ فیصد، ۴۰ فیصد، ۵۰ فیصد کے ساتھ متعین ہونا لازم ہے۔

۸۔ دو مستقل حساب رکھنا:...... اسلامی امداد باہمی انشورنس کی کمپنی چونکہ انشورنس کی قسطوں کی مالک نہیں بنتی ہے، لہذا اس پر لازم ہے کہ وہ کمپنی کے مال کو الگ خاص اکاؤنٹ میں رکھے، اور انشورنس پالیسی ہولڈر کے مال بھی الگ مستقل اکاؤنٹ میں رکھے، اور دونوں کو خلط ملط نہ کرے، تا کہ دونوں اکاؤنٹ کے حقوق، ذمہ داریاں، سرمایہ کاری اور منافع اپنے اپنے اکاؤنٹ سے ہی وابستہ رہیں۔

ذمہ داری اور ادائیگی میں حقیقی شرکت:...... امداد باہمی انشورنس میں انشورنس سوسائٹی کا ہر ایک ممبر منافع اور قربانیوں میں شریک ہوگا، کیونکہ ممبران میں سے ہر ایک انشورنس کرنے اور کرانے والا ہے، لہذا ممبر شپ کی رقم سے کسی ممبر کو پیش آنے والے خطرہ کے نقصان کی تلافی ہوگی، اور اگر رقم کم پڑ رہی ہو تو ان کی قسط میں اضافہ کیا جائے گا، اور اگر بچ رہی ہو تو ان پر لوٹا دی جائے گی۔

۱۔ اساسی نظام میں حقوق اور ذمہ داریوں کی مکمل وضاحت:...... اسلامی امداد باہمی انشورنس کے اساسی نظام میں اس بات کی صراحت لازم ہے کہ کمپنی شریعت اسلامیہ کی پابندی کرے گی، تبرع کی بنیاد پر چلائی جائے گی، اور اخراجات ومعاوضے سے بچی ہوئی رقم کی ایک مقدار انشورنس میں شرکت کرنے والے ممبران پر لوٹائی جائے گی، اور ایک مقدار مستقبل کے لئے محفوظ کر دی جائے گی، اور اگر کئی سال کی محفوظ کی ہوئی رقم باقی رہ گئی ہو اور سارے ممبران تک اسے پہنچانا دشوار ہو تو اسے نیکی کے مصارف میں صرف کر دیا جائے گا، اور اگر زیادہ خسارہ ہو، تو سارے انشورنس کرنے والے اس میں شرکت کریں گے، اور ہنگامی حالت میں کمپنی سے قرض لے کر آئندہ اسے لوٹا دیا جائے گا، اسی طرح نظام اساسی میں اس بات کی بھی صراحت ہو کہ کمپنی مضاربت کی بنیاد پر سرمایہ کاری کرے گا، اور انشورنس فنڈ اجرت کے ساتھ یا بغیر اجرت کے وکالت کی بنیاد پر چلائے گی۔

اسلامی امداد باہمی انشورنس کے شرعی ضوابط:

اسلامی امداد باہمی انشورنس کے شرعی ضوابط درج ذیل ہیں:

۱۔ امداد باہمی انشورنس تبرع اور تعاون پر قائم ہو۔

۲۔ اخراجات، نقصان کی تلافی اور احتیاطی رقم کے بعد بچی ہوئی رقم امداد باہمی انشورنس پالیسی ہولڈر ممبران پر تقسیم کی جائے۔

۳۔ کمپنی کی تحلیل (Dissolution) کے وقت انشورنس کرانے والے کے فولڈر (Folder) میں موجود رقم نیکی کے مصارف میں خرچ ہو۔

امداد باہمی انشورنس چلانے والی کمپنی اخراجات کو ایسی سمت دے کر انتظامی اخراجات میں کمی لائے کہ جس سے تبرع کی قسط اور ممبرشپ کی فیس بھی کم ہو، اور انشورنس میں شرکت کرنے والی سوسائٹی کے مفاد میں زیادہ سے زیادہ رقم بچے۔

۵۔ اخراجات کی تقسیم: کمپنی کو قانونی منظوری دلانا، اور کمپنی کے عمومی اخراجات، اور قانونی طور پر سے محفوظ رقم کی فراہمی سب کمپنی کے شیئر ہولڈرس کے ذمہ ہے۔ اور انشورنس سے متعلق اخراجات انشورنس اکاؤنٹ کے ذمہ ہے۔

۶۔ حرام اشیاء کا کاروبار کرنے والی کمپنی کے لئے انشورنس کا عقد نہ ہو۔

۷۔ جس حادثہ کے لئے انشورنس کرایا گیا ہو اس کے واقع ہونے کی صورت میں نقصان کی تلافی جلد از جلد ہو، کیونکہ یہ انشورنس تعاون اور تبرع پر مبنی ہے، لہٰذا مصیبت زدہ کی جلد امداد ہونی چاہئے۔

۸۔ عقد کے وقت ہی حصہ داری لکھنے والا افسر حصہ لینے والے کو بتادے کہ وہ اپنی جائداد یا گاڑی کی حقیقی قیمت پر انشورنس کرائے، تاکہ انشورنس کی کاروائی صحیح بنیاد پر ہو، پھر اگر انشورنس کرنے والے افسر اور گاہک کے درمیان کسی قیمت پر اتفاق ہوجائے، تو ٹھیک ہے، اور اگر اس کام کے لئے مخصوص افسر نے حقیقی قیمت کا تعین حاصل کرنے میں کوتاہی کی تو اگر مطلوبہ قسط سے زائد قسط کا اندازہ لگایا گیا ہو، تو ایسی صورت میں مطلوبہ قسط سے زائد قسط امداد باہمی انشورنس پالیسی ہولڈر ممبر کو لوٹانا لازم ہے، اور اگر کم قیمت پر انشورنس ہو تو حادثہ کے وقوع کے وقت عوض کی رقم میں تہائی یا چوتھائی کسی طرح کی تخفیف نہ کی جائے گی، اور اگر کوتاہی انشورنس لینے والے کی ہو کہ اس نے حقیقی قیمت سے کم قیمت پر انشورنس کرایا ہو اس کے باوجود کہ افسر نے حقیقی قیمت پر انشورنس کرانے کی تنبیہ کی ہو، تو انشورنس افسر عوض کی رقم کا ایک حصہ محفوظ کرلے اور حادثہ کے وقت اس حصہ کو ساقط کر کے نقصان کی تلافی کرے۔

اعادة التأمين. یعنی ری انشورنس (Reinsurane) اگر امداد باہمی ری انشورنس کمپنی موجود ہو تو اس کے ساتھ کرنا لازم ہے، اور اگر موجود نہ ہو اور بدرجہ مجبوری بزنس ری انشورنس کمپنی کے ساتھ کرنا پڑے تو درج ذیل امور کی پابندی لازم ہے:

۱۔ ممکنہ حد تک تجارتی ری انشورنس کمپنی کے پاس کم سے کم قسط کا انشورنس کرائے، کیونکہ فقہی قاعدہ ہے: "الحاجة تقدر بقدرها" (حاجت کا دائرہ اس کی حد تک محدود رہتا ہے)، اور کس قدر رقم کے ری انشورنس کی ضرورت ہے اس کا اندازہ ماہرین لگائیں گے۔

خیال رہے کہ ری انشورنس کا مطلب ہے کہ چھوٹی انشورنس کمپنی اپنے سے بڑی کمپنی کے پاس اپنے انشورنس کردہ مال کا انشورنس کرائے، تاکہ حادثات کی کثرت کے وقت اسے فنڈ کی کمی نہ رہے۔

۲۔ اسلامی امداد باہمی انشورنس، تجارتی ری انشورنس کمپنی کو دی گئی قسطوں پر کوئی کمیشن نہ لے۔

۳۔ موثر خطرات (Effective Risks) کے مقابلہ میں امداد باہمی انشورنس کمپنی کوئی رقم محفوظ نہ کرے، کیونکہ اس کو محفوظ کرنے کی صورت میں اسے ری انشورنس کمپنی کو سود دینا پڑے گا۔

۴۔ امداد باہمی انشورنس کمپنی اور ری انشورنس کمپنی کے درمیان حتی الامکان کم سے کم مدت کے لئے معاہدے ہوں، اور ان کو انجام دینے اور ان کی تجدید کے وقت انہیں شرعی نگرانی بورڈ کے سامنے پیش کئے جائیں۔

۵۔ امداد باہمی انشورنس ری انشورنس کمپنی کی ناجائز سرمایہ کاری کے نفع میں سے کسی حصہ کو حاصل نہ کرے۔

خیال رہے کہ کوشش یہ ہونی چاہئے کہ امداد باہمی انشورنس کمپنیاں مل کر خود ہی ری انشورنس کی بڑی کمپنی بنائیں، یا آپس میں اپنے تعلقات مضبوط کریں، تاکہ وہ روایتی ری انشورنس کمپنی کے ساتھ معاملہ کرنے سے بچ جائیں۔

امداد باہمی انشورنس کا حکم:...... شرعی نقطہ نظر سے امداد باہمی انشورنس کی ساری صورتوں اور قسموں کے جواز میں کوئی شک نہیں ہے، اس لئے کہ امداد باہمی انشورنس تبرعات کے عقود میں داخل ہے، اور نیکی پر تعاون کی قبیل سے ہے، کیونکہ ہر شرکت کرنے والا سوسائٹی کے ممبران میں سے کسی کو لاحق ہونے والے

خطرات کے اثرات کم کئے جائیں اور اضرار کا خواہ وہ کسی قسم کے ہوں، ازالہ کیا جاسکے۔

امداد باہمی لائف انشورنس:

تجارتی لائف انشورنس کے حرام ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہے، اس لئے کہ ربا الفضل اور ربا النساء کے ساتھ غرر وغیرہ دیگر محرمات پر مشتمل ہے، چنانچہ لائف انشورنس کے سلسلہ میں زبردست بحث ہوئی ہے، اور اس کی ساکھ اس کے نام کی وجہ سے بڑی متاثر ہوئی ہے، اور اس غلط فہمی کا سبب بنا ہے کہ وہ تقدیر کے خلاف انشورنس ہے، یا اللہ تعالیٰ پر بھروسہ نہ کرنے کا ذریعہ ہے، اس لئے اسلامی انشورنس کے باب میں کام کرنے والے مفکرین کی رائے یہ ہوئی ہے کہ اس کا نام تکافل یا امداد باہمی انشورنس (جو لائف انشورنس کا متبادل ہے)، یا ورثہ کی حمایت اور ضعف وکمزوری کے حالات کے لئے ''اسلامی تکافل'' رکھا جائے۔ چنانچہ امداد باہمی انشورنس یا ورثہ کی حمایت اور ضعف کے حالات کے لئے اسلامی تکافل کا مقصد انشورنس کرانے والے کی عاجزی کی حالت میں ایک قسم کی حمایت یا گارنٹی (ضمانت) کو وجود میں لانا ہے، اس طرح کہ اسے یکبارگی انشورنس کی رقم دے دی جائے، یا قسطوں کی شکل میں، یا جب تک زندہ رہے ماہانہ تنخواہ کی شکل میں اسے رقم فراہم کی جائے، یا موت کی حالت کے لئے انشورنس کی صورت میں اس کی موت کے بعد اس کے ورثہ یا تیسرے فرد کو جس کے مفاد میں انشورنس کرایا گیا، رقم دی جائے، یا رہن وگروی کے اثرات کے خلاف ورثہ کے مفاد میں انشورنس کی صورت میں اس کی جائداد کی فروخت کے خطرہ کو دور کیا جائے، یا اس کے قرضوں کو ادا کیا جائے، تاکہ اس سے اس کے ورثہ کو ضرر لاحق نہ ہو۔

چنانچہ ''امداد باہمی انشورنس'' خود انسان کے مفاد میں انشورنس ہے، یا موت کی حالت کی صورت میں، یا کلی عاجزی، یا رہن، یا اس سے ملتی جلتی صورت کی حالت میں دوسرے کے لئے انشورنس ہے۔

تجارتی لائف انشورنس کا حکم:...... تجارتی لائف انشورنس چونکہ معاوضہ پر قائم ہے کہ خطرہ کے پیش آنے کی صورت میں قسطوں کے بدلے میں انشورنس کی رقم دی جاتی ہے، یا خطرہ نہ واقع ہونے کی صورت میں قسطوں کو ان کے انٹرسٹ (Interest) کے ساتھ لوٹا دیا جاتا ہے، لہٰذا وہ شرعی طور سے ممنوع معاملات میں سے ہے، کیونکہ وہ، بہت زیادہ غرر، سود اور جہالت پر مشتمل ہے۔

امداد باہمی لائف انشورنس کا حکم:...... امداد باہمی لائف انشورنس چونکہ تعاون اور تبرع پر قائم ہے، لہٰذا یہ عین شریعت کے مقاصد کے مطابق ہے، کیونکہ شریعت اسلامیہ نیکی، تقویٰ، مصیبت زدہ کی امداد، تعاون اور مسلمانوں کے حقوق کی رعایت پر آمادہ کرتی ہے، اور امداد باہمی لائف انشورنس جس اصول پر قائم ہے، وہ شریعت کے نصوص اور اس کے عمومی قواعد سے متصادم نہیں ہے۔

امداد باہمی لائف انشورنس کی تنفیذ:...... ایک جماعت تعاون پر اتفاق کرے، اور کسی کے مرنے یا عاجز ہونے کی صورت میں یا فقر وفاقہ کی حالت میں تبرع کی بنیاد پر مدد کا نظام بنائے، جس میں اس بات کی وضاحت ہو کہ امداد باہمی لائف انشورنس سے فائدہ اٹھانے والے کو کتنی رقم دی جائے گی، اور انشورنس کرانے والے سے تبرعات کس مقدار میں لی جائے گی، پھر یہ جماعت اپنے معاہدہ کو کمپنی کی شکل دے، جو جمع شدہ رقم کی نگرانی کرے اور اس کی سرمایہ کاری کرے، اور لوگوں کے ساتھ عقد کی کاروائی انجام دے، اور امداد باہمی انشورنس کے ساتھ خاص اس اکاؤنٹ کے چلانے میں انشورنس میں حصہ لینے والے ممبران کی وکیل بنے۔

امداد باہمی انشورنس کی رقم کی بھرپائی (Covering) کا طریقہ:

امداد باہمی انشورنس کا مقصد چونکہ دوسرے کا حق مار کر نفع کمانا نہیں ہے، اور نہ ہی وہ دولت کمانے کا ذریعہ ہے، لہٰذا اس میں بھرپائی درج ذیل طریقے سے ہوگی:

۱۔ انشورنس کے وقت انشورنس کی جانے والی شئی کی بازاری قیمت کی تعیین کرلی جائے، اور ایجنٹ کے اندازہ کو نہ لیا جائے، اور ہر شئی کی بازاری قیمت کے مطابق قسط کی رقم کی تحدید کی جائے، اور حادثہ کے پیش آنے کے وقت حادثہ سے کچھ پہلے اس شئی کی جو بازار کی قیمت ہو، اس کا اعتبار کیا جائے، خواہ اس کی کوئی مقدار ہو اور اسی کے لحاظ سے عوض فراہم کیا جائے، اور بازاری قیمت یا فرضی قیمت میں سے کم کے اصول پر عمل نہ کیا جائے، خلاصہ یہ کہ اصلی قیمت کا اعتبار کیا جائے، نہ کہ فرضی قیمت کا۔

۲۔ امداد باہمی انشورنس کمپنی حتی الامکان ایسے خطرہ کا ہی انشورنس کرے جو ناقابل برداشت ہو، ہلکے پھلکے خسارہ کے سلسلہ میں انشورنس نہ کرے۔

ہندوستان میں امداد باہمی انشورنس کی قابل عمل صورتیں:...... ۱۔ امداد باہمی انشورنس کی کمپنی ''مضاربت'' کا طریقہ اختیار کرے، یعنی امداد باہمی

انشورنس کرانے والے سارے ممبران سے حاصل شدہ مال کی سرمایہ کاری ”مضاربت“ کے اصول پر کرے۔

چنانچہ اس صورت میں کمپنی ”مضارب“ ہوگی اور امداد باہمی انشورنس پالیسی ہولڈر ممبران ”رب المال“ ہوں گے، اور نفع کی تقسیم دونوں کے درمیان متعین شرح کے ساتھ ہوگی، اور مضاربت کے قواعد واحکام اس پر منطبق ہوں گے، اسی وجہ سے نسبت یا شرح یا فیصد کے ذریعہ فریقین کا حصہ نفع میں سے متعین ہونا چاہئے، اور کسی کے لئے کوئی متعین رقم نہ ہونی چاہئے، پھر نفع کی تقسیم کے بعد کمپنی کا حصہ شیئر ہولڈرس کے اکاؤنٹ میں ڈال دیا جائے، اور انشورنس پالیسی ہولڈر کا حصہ انشورنس اکاؤنٹ میں ڈالا جائے۔

خیال رہے کہ اس بات کا ذکر اس جگہ اس لئے کیا گیا کہ اسلامی امداد باہمی انشورنس کی رقم کی بطور مضاربت سرمایہ کاری میں بھی مضاربت کو فریقین جب چاہیں ختم نہیں کرسکتے ہیں، بلکہ اسی وقت ختم کرسکتے ہیں، جبکہ اس میں دوسرے فریق کا ضرر نہ ہو۔ حاصل کلام یہ کہ مضاربت کا طریقہ ایک عمدہ طریقہ ہے جس کے ساتھ اسلامی امداد باہمی انشورنس کی کمپنی خوبصورتی کے ساتھ چلائی جاسکتی ہے، بشرطیکہ اسلامک فقہ اکیڈمی یا مسلمانوں کا کوئی معتمد ادارہ اپنی نگرانی میں اس طرح کی کمپنی قائم کرے یا مسلمانوں کی کسی کمپنی سے اس طرح کی امداد باہمی انشورنس سوسائٹی تشکیل دینے کی درخواست کرے۔

اور اس طریقہ میں مسلمانوں کی رغبت زیادہ ہوگی، کیونکہ بطور تبرع جمع کردہ رقم کی سرمایہ کاری سے نفع کا قوی امکان ہے، اس کام کے لئے پہلے رقم جمع ہو، پھر شروع میں چھ ماہ پر تین ہزار کی قسط رکھی جائے، اور جب اتنی رقم جمع ہوجائے کہ اس سے تجارت کی جاسکے، تو کمپنی بطور مضاربت کام شروع کردے، اور نصف نفع خود لے اور نصف نفع انشورنس اکاؤنٹ میں ڈال دے، اگر نفع سے دوسری قسط کی رقم جمع ہوجائے تو ٹھیک ہے، ورنہ انشورنس میں حصہ لینے والے ممبران قسط کی باقی رقم ادا کریں اور اگر انشورنس کردہ شئی کو خطرہ پیش آئے، تو نقصان کی تلافی کی جائے، اور سالانہ حساب کا تصفیہ کیا جائے، اگر زیادہ رقم باقی بچ جائے تو سرمایہ کے حصہ کے تناسب سے انشورنس ممبران پر تقسیم کردی جائے اور ایک حصہ کے تناسب سے انشورنس ممبران پر تقسیم کردی جائے اور ایک حصہ مستقبل کے لئے محفوظ رکھا جائے، تا کہ حادثات کی کثرت کے وقت رقم کی کمی نہ پڑے۔

۲۔ وکالت کی بنیاد پر امداد باہمی انشورنس کا نمونہ:...... وکالت کی بنیاد پر اسلامی امداد باہمی انشورنس کا نمونہ اس طرح ہوگا کہ قسط کی سرمایہ کاری کی کمپنی اجرت یا بلا اجرت وکیل ہوگی، اور اگر اجرت کے ساتھ کمپنی وکیل ہے تو پھر انشورنس چلانے اور اس کے منافع انشورنس اکاؤنٹ میں ڈالے جائیں گے، جس سے انشورنس پالیسی ہولڈر ممبر کو خطرہ پیش آنے کی صورت میں اسے لاحق ہونے والے نقصان کی تلافی کی جائے گی اور مالی سال کے آخر میں امداد باہمی انشورنس کے اکاؤنٹ میں بچی ہوئی رقم انشورنس میں حصہ لینے والے کو لوٹا دی جائے گی۔

اس صورت میں بھی چونکہ اصل سرمایہ کی تجارت اور سرمایہ کاری ہوگی، لہذا منافع کا قوی امکان ہے، اس بنا پر لوگوں کی رغبت اس میں ہوگی، اور یہ صورت بھی ہندوستان میں قابل عمل ہے۔

۳۔ امداد باہمی انشورنس محض تبرع کی بنیاد پر:...... کچھ لوگ مل کر امداد باہمی انشورنس سوسائٹی تشکیل دیں، اور سوسائٹی کے ممبران کو لاحق ہونے والے خطرات کی تقسیم پر تعاون کریں، اور حادثات کے پیش آنے کے وقت ذمہ داری اٹھانے میں شرکت کریں، اس طریقہ سے کہ سارے ممبران قسط وار بطور عقد تبرع رقم جمع کریں، اور انشورنس ممبران میں سے جسے ضرر لاحق ہو اس کے نقصان کی تلافی کی جائے اور تبرع کی یہ رقم کسی بینک میں محفوظ رکھی جائے۔

گویا امداد باہمی انشورنس میں تجارت اور نفع مقصود نہیں ہے، بلکہ خطرات کی تقسیم اور ضرر کو برداشت کرنے میں تعاون کرنا مقصود ہے۔

اس صورت میں چونکہ اصل رقم کی سرمایہ کاری نہیں ہوگی، اس لئے اس میں لوگوں کی رغبت کم ہوسکتی ہے۔

نوٹ: عام امداد باہمی انشورنس اور اسلامک امداد باہمی انشورنس میں فرق یہ ہے کہ:

۱۔ عام امداد باہمی انشورنس میں سود ہوتا ہے، اگرچہ اس کی مقدار بہت تھوڑی ہوتی ہے۔ ۲۔ عام امداد باہمی انشورنس سوسائٹی شریعت کی پابندی نہیں کرتی ہے۔

خلاصہ بحث:...... ۱۔ اسلامی امداد باہمی انشورنس چونکہ ہر طرح کے شرعی ممنوعات سے خالی ہے، لہذا وہ جائز ہے۔ ۲۔ ہندوستان میں امداد باہمی انشورنس کی رقم کی سرمایہ کاری بطور مضاربت بہت مفید ہوگی۔ ۳۔ اسلامی امداد باہمی انشورنس کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ اخراجات اور مستقبل کے لئے محفوظ کردہ رقم کے بعد قسط یا اس کے جائز منافع سے جو رقم باقی رہ جاتی ہے وہ بطور تبرع انشورنس میں حصہ لینے والے ممبران کی ملکیت ہوتی ہے، کمپنی کی ملکیت نہیں ہوتی ہے۔ ☆

خطرات کو دفع کرنے کے لئے تکافل اور اسلامی انشورنس

مفتی عبدالرحیم قاسمی[1]

تامین تکافل کے مقاصد میں تین عناصر بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔

۱۔ طلب امن، ۲۔ خطروں کو دفع کرنے پر تعاون، ۳۔ مستقبل کے لئے احتیاط،

ان مقاصد کو حاصل کرنے کے لئے علماء مجوزین نے قرآن وحدیث سے مندرجہ ذیل دلائل پیش کئے ہیں۔ شیخ ناصر عبدالحمید نے تحریر فرمایا ہے:

۱۔ سورۂ قریش میں امن دینے کی نعمت کو بطور احسان ذکر فرمایا ہے: {وَآمَنَهُمْ مِنْ خَوْفٍ} (سورۃ القریش: ۴) (اور امن دیا ان کو خوف سے)۔

اور حضرت ابراہیم علیہ السلام نے امن کی دعا کی ہے: {وَإِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا آمِنًا} (سورہ البقرۃ: ۱۲۶) (اس شہر کو امن والا شہر بنا دیجئے)۔

اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ انسان ہلاکت اور ضائع ہونے سے حفاظت اور بچاؤ کے ہر ممکن اسباب اختیار کرے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: {يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوا خُذُوا حِذْرَكُمْ} (سورۃ النساء: ۷۱) (اے ایمان والوں اپنے بچاؤ حفاظت کے اسباب کو اختیار کرو)۔

{وَلَا تُلْقُوا بِأَيْدِيكُمْ إِلَى التَّهْلُكَةِ} (سورۃ البقرۃ: ۱۹۵) (اپنے آپ کو اپنے ہاتھوں سے ہلاکت میں نہ ڈالو)۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: "من أصبح منكم معافا في جسده آمناً في سربه عنده قوت يومه فكأنما حيزت له الدنيا" (سنن ابن ماجه، كتاب الزهد، باب القناعة، ص ۳۰۵) (جس نے اپنے جسم کی صحت اور تندرستی کے ساتھ صبح کی اپنے متعلق امن کی حالت میں اسکے پاس اس دن کی غذا موجود ہے تو اسکے لئے دنیا کی نعمتیں جمع ہو گئیں)۔

۲۔ دوسرا مقصد خطروں کو دفع کرنے پر تعاون ہے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: "تَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ" (سورۃ مائدہ: ۲) (نیکی اور تقویٰ پرہیز گاری پر ایک دوسرے کی مدد کرو گناہ اور زیادتی پر آپس میں مذمت کرو)۔

بخاری شریف میں ہے: "إن الأشعريين إذا أرملوا في الغزو أو قل طعام عيالهم بالمدينة جمعوا ما كان عندهم في ثوب واحد ثم اقتسموا بينهم في إناء واحد بالسوية" (صحیح بخاری کتاب الشرکۃ ۱، ۳۳۸) (اشعریوں کو غزوہ میں ضرورت پڑتی یا انکے عیال کا کھانا مدینہ میں کم پڑتا تو جو کچھ انکے پاس ہوتا اسکو جمع کرتے ایک کپڑے میں اپنے درمیان ایک برتن سے برابر تقسیم کر لیتے)۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اعلان کرو کے لوگ اپنے باقی توشوں کو لائیں تو دسترخوان بچھایا گیا توشوں کو دسترخوان پر ڈال دیا، پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے ہوئے اور اس پر برکت کی دعا کی پھر انکو برتنوں کے ساتھ بلایا تو لوگوں نے پسوں کے ساتھ برتن بھر لئے یہاں تک کہ فارغ ہو گئے: "ناد في الناس يأتون بفضل أزوادهم فبسط لذلك نطع وجعلوه على النطع فقام رسول الله ﷺ فدعا وبرك عليه ثم دعاهم بأوعيتهم فاحتثى الناس حتى فرغوا" (صحيح البخاري كتاب الشركة ۱، ۳۳۸)۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "المؤمن للمؤمن كالبنيان يشد بعضه بعضا" (صحیح بخاری کتاب الصلوٰۃ باب التشبیک ۱، ۶۹) (ایک مومن دوسرے مومن کے لئے ایک عمارت کی طرح ہے اس کا بعض حصہ بعض کو طاقت دیتا ہے)۔

۳۔ تیسرا مقصد مستقبل کے لئے احتیاط۔

---

[1] امیر مرکز دعوت وارشاد وافتاء، ناظم جامعہ خیر العلوم نور محل روڈ بھوپال۔

حضرت یوسف علیہ السلام نے ملک میں آنے والے قحط کی نشان دہی کرتے ہوئے مستقبل کے لئے احتیاط اور حفاظتی تدبیریں بتائیں تھیں کہ سات سال تک کھیتی کروگے اور ان دنوں جو کاٹو انہیں بال میں ہی چھوڑ دینا، مگر تھوڑا جو کھالو اتنا ہی نکالنا: { قال تزرعون سبع سنين دابا فما حصدتم فذروه في سنبله إلا قليلا مما تأكلون } (سورہ یوسف: ۴۷)۔

سعد ابن ابی وقاص کی مزاج پرسی کے لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے گئے وہ کہتے ہیں کہ میں نے کہا اے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں پورے مال کی وصیت کروں گا! حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا نہیں میں نے کہا آدھے مال کی وصیت کردوں! حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا نہیں میں نے کہا تہائی مال کی وصیت کردوں؟ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تہائی بہت ہے تو اپنے وارثوں کو مالدار چھوڑے یہ بہتر ہے اس سے کہ تو انکو فقیر چھوڑے کہ وہ لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلائیں۔ ''الثلث والثلث كثير إنك أن تدع ورثتك أغنياء خير من أن تدعهم عالة يتكففون الناس في أيديهم'' (صحيح البخاری كتاب الوصايا باب ان يترك ورثة الاغنياء ۱،۳۸۲)۔

حضرت مولانا تقی امینی نے تحریر فرمایا ہے۔ بیمہ کی ایجاد وابتداً عمومی حیثیت سے ان اغراض کے تحت ہوئی مثلاً (۱) امداد باہمی (۲) نقصان کی تلافی (۳) دوسرے کی کفالت ان اغراض کو محدود پیمانہ پر حاصل کرنے کے لئے مختلف ناموں سے ہر دور میں چھوٹی بڑی اور اعلیٰ وادنیٰ تنظیمیں وجود میں آتی رہی ہیں۔ چنانچہ زمانہ جاہلیت میں خاندان ونسب کے علاوہ درج ذیل تنظیمیں رائج تھیں جنکو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے برقرار رکھا تھا۔

(۱) عاقلہ، (۲) قسامہ، (۳) عقد موالاۃ، (۴) حلف، (۵) ولاء، (۶) عہد

ہر ایک کی بقدر ضرورت تفصیل یہ ہے:

ا۔ عاقلہ:

عاقلہ ایک تنظیم تھی جس میں خاندان وقبیلہ کے لوگ ملکر مشترک فنڈ قائم کرتے اور دیت (خون کی قیمت) کی ادائیگی میں قاتل کی مدد کرتے تھے۔

''والعاقلة الذين يعقلون يعني يؤدون العقل وهو الدية'' (ہدایہ کتاب المعاقل ۴،۶۴۵)۔

عاقلہ وہ لوگ جو دیت (خون کی قیمت) ادا کرتے ہیں۔ اس تنظیم کا نمایاں تعلق اگرچہ دیت سے تھا، لیکن دیگر نقصان کی تلافی کی بھی اس میں گنجائش تھی، جیسا کہ عالمگیری میں ہے: إن العبرة في هذا التناصر وقيام البعض بأمر البعض (فتاویٰ عالمگیری ۶،۸۳)۔

اس میں اعتبار باہمی امداد اور ایک دوسرے کو سہارا دینے کا ہے۔ سرخسی کہتے ہیں کہ کسی کو اطمنان نہیں ہوتا کہ وہ آزمائش میں مبتلا ہوکر دوسرے سے مدد نہ لے گا، جب ایسی حالت ہو تو آزمائش کے وقت ایک دوسرے کی مدد کرتے رہنا چاہئے۔ ''كل أحد لا يأمن على نفسه أن يبتلى بمثله وعند ذلك يحتاج إلى إعانة غيره. فينبغي أن يعين من ابتلى ليعينه غيره إذا ابتلى بمثله'' (المبسوط ۲۷،۱۲۵)۔

شامی کہتے ہیں کہ لوگوں کی یہ عادت ہے کہ جب چوری یا جل جانے کی وجہ سے کسی کو نقصان پہنچتا ہے تو اس کی تلافی کے لئے وہ مال جمع کرتے ہیں:

''إن العاقلة يتحملون باعتبار تقصيرهم وتركهم حفظه ومراقبته. لأنه إنما قصر لقوته بانصاره. فكانوا هم المقصرين'' (شامی ۵،۴۱۰) (عاقلہ چونکہ حفاظت ونگرانی میں اپنی ذمہ داری محسوس نہیں کرتے اور ان سے کوتاہی ہوتی ہے اس بناء پر وہ دیت کا بار برداشت کرتے ہیں)۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد جب حالات میں تبدیلی ہوئی تو حضرت عمرؓ نے اس تنظیم کا دائرہ وسیع کرکے ہم پیشہ وہم مشرب لوگوں کو اس میں شامل کیا۔

''والعاقلة أهل الديوان إن كان القاتل من أهل الديوان يؤخذ من عطاياهم في ثلث سنين'' (ہدایہ ۴،۶۴۵)۔

(اگر قاتل اہل دیوان سے ہے تو عاقلہ اہل دیوان ہوگا تین سال کی مدت میں ان کے وظیفہ سے دیت وصول کی جائے گی)۔

اہل دیوان ایک محکمہ یا شعبہ کے وہ لوگ جنکے نام ایک رجسٹر میں درج ہوتے تھے سرخسی نے اس تبدیلی پر یہ رائے ظاہر کی ہے۔ ''فلما كان في زمن عمر ودون الدواوين صار التناصر بينهم بالديوان'' (مبسوط ۲۷،۱۲۵) (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں چونکہ مدد خاندان و قبیلہ کے ذریعہ ہوتی تھی، اس لئے آپ نے دیت کی ذمہ داری ان پر ڈالی، لیکن حضرت عمرؓ نے جب دفاتر کا نظام قائم کیا تو یہ مدد اہل دفاتر سے متعلق ہوگئی۔ اس

بناء پر اب دیت کی ذمہ داری ان پر ہوگی)۔

یہ مدد اگر یونین انجمن یا کسی جدید تنظیم سے وابستہ کردی جائے تو عاقلہ میں ان سب کو شامل کرنے کی گنجائش ہوگی۔ ''ولو كانت عاقلة رجل أصحاب الرزق يقضىٰ بالدية في أرزاقهم في ثلاث سنين'' (شامی ۵،۴۱۱)۔

اگر کسی کے عاقلہ وفقراء ومساکین ہوں جن کے وظیفے مقرر ہیں تو تین سال میں انکے وظیفوں سے دیت وصول کی جائے۔ دوسری جگہ ہے: ''لو كان اليوم قوم تناصرهم بالحرف فعاقلتهم أهل الحرفة'' (هدايه كتاب المعاقل ۴،۶۴۶) (اگر آج ہم پیشہ لوگوں کے ذریعہ مدد ہو تو عاقلہ ہم پیشہ لوگ قرار پائیں گے)۔

۲۔ قسامہ:

قسامہ کی صورت یہ تھی کہ اگر محلہ یا گاؤں میں لاش پائی جاتی اور قاتل کا پتہ نہ چلتا تو منتخب پچاس آدمیوں (جن کے انتخاب میں مقتول کے ورثاء کی رائے کو دخل ہوتا تھا) کو بلا کر ان سے حلفیہ بیان لیا جاتا، کہ نہ ہم نے قتل کیا اور نہ قاتل کو ہم جانتے ہیں، اس طرح اگر قاتل کا پتہ چل جائے تو اسکے خلاف قانونی کارروائی کی جاتی، ورنہ محلہ یا گاؤں کے تمام لوگوں سے حصہ رسد مقتول کی دیت وصول کی جاتی جسکی شکل اجتماعی جرمانہ کی ہوتی تھی۔

چنانچہ سرخسی کہتے ہیں: قسامہ کا مقصد یہ ہے کہ اس طریق سے قاتل کا پتہ چل جائے اور اہل محلہ حفاظت کے معاملہ میں اپنی ذمہ داری محسوس کریں گویا یہ حادثہ ان کی کوتاہی سے پیش آیا ہے کیونکہ لوگوں کی حفاظت اور غنڈوں کی نگرانی ان کے ذمہ تھی (المبسوط ۲۶/۱۰۸)۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے افادیت کے پیش نظر اس کو برقرار رکھا تھا۔ ''إن رسول الله ﷺ أقر القسامة على ما كانت في الجاهلية وقضىٰ بها رسول الله بين ناس من الأنصار في قتيل ادعوه على اليهود'' (مسلم ۲،۵۷)۔

(رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قسامہ کو اسی طرح برقرار رکھا جس طرح زمانہ جاہلیت میں رائج تھا، چنانچہ انصاریوں نے ایک مقتول کے بارے میں جب یہودیوں پر دعویٰ کیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی کے مطابق فیصلہ فرمایا تھا)۔

۳۔ عقد موالات:

عقد موالات میں دو شخص آپس میں معاہدہ کرتے ہیں کہ خطرات وحادثات (دیت کی ادائیگی ودیگر نقصان کی تلافی) میں ایک دوسرے کی مدد کریں گے اور مرنے کے بعد وراثت کے مستحق ہوں گے۔ زمانہ جاہلیت کی اس صورت کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نو مسلموں میں رائج رکھا تھا، یعنی جو شخص جسکے ہاتھ پر اسلام قبول کرتا وہ زندگی اور موت میں عقد موالات کے ذریعہ اسکا مددگار ہوتا تھا، جیسا کہ تمیم داری کہتے ہیں: ''سألت رسول الله ﷺ عن الرجل يسلم على يدى الرجل ما السنة فيه قال: هو أولىٰ الناس بمحياه ومماته وأيد هذا قوله تعالىٰ: والذين عقدت أيمانكم فآتوهم نصيبهم'' (المبسوط ۸،۹۱) (میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ جو شخص کسی کے ہاتھ پر اسلام قبول کرے اسکے بارے میں کیا حکم ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا وہی زندگی وموت میں اس کا مددگار ہے، پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کی یہ آیت پڑھی: ''والذین عقدت الخ'' (اور جن لوگوں سے تمہارا معاہدہ ہوا ہے ان کو ان کا حصہ دو)۔ یہ صورت وقتی تھی عقد موالاۃ کی اصل شکل میں اسلام کی قید نہ تھی، چنانچہ سرخسی کہتے ہیں: ''والإسلام على يده ليس بشرط لعقد الموالاة وإنما ذكره على سبيل العادة'' (المبسوط ۸،۹۱)، (عقد موالاۃ میں کسی کے ہاتھ پر اسلام شرط نہیں، حدیث میں اس کا ذکر عادت کی بناء پر ہے)۔

۴۔ **حلف**:...... حلف کی وہی شکل ہے جو عقد موالاۃ کی مذکور ہو چکی ہے، جیسا کہ فقہ میں ہے۔ زمانہ جاہلیت میں لوگ چند طریقوں سے باہمی مدد کرتے تھے ان میں ایک طریقہ حلف، یعنی باہمی معاہدہ کے ذریعہ مدد کا تھا۔

۵۔ ولاء:

ولاء کا مطلب یہ ہے کہ غلام جس قبیلہ سے آزاد کیا جاتا وہ قبیلہ حادثات وخطرات میں غلام کی مدد کرتا تھا: ''وعاقلة المعتق قبيلة مولاة، لأن

النصرة بهم ويؤيد ذلك قوله عليه السلام: مولى القوم منهم'' (هدايه كتاب المعاقل ۴،۶۵۱)۔

(آزاد شدہ غلام کا عاقلہ اس کے آزاد کرنے والے آقا کا قبیلہ ہے، کیونکہ وہی اس کی مدد کرتا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قول سے بھی تائید ہوتی ہے کہ آپ نے فرمایا قوم کا آزاد شدہ غلام اسی قوم سے سمجھا جائے گا)۔

۶۔ عِد:

عِد کے معنیٰ کسی گروہ میں شامل ہونے کے ہیں، جیسا کہ کلام عرب میں کہا جاتا ہے: ''فلان عديد بني فلان أن يعد منهم'' (هدايه كتاب المعاقل حاشيه ۴،۶۴۶)۔

زمانہ جاہلیت میں مختلف قسم کے گروہ تھے جن میں شامل ہونے کے بعد حادثات وخطرات میں مدد کی ذمہ داری لی جاتی تھی۔

''وقد كانت (النصرة) بأنواع بالقرابة والحلف والولاء والعد'' (هدايه ۴،۶۴۵) (مدد کے چند ذریعہ تھے قرابت، حلف، ولاء، اور عد)۔

غرض رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے خطرات وحادثات میں مدد وضمانت حاصل کرنے کی مختلف شکلیں تھیں اور چھوٹی بڑی کئی تنظیمیں رائج تھیں، جن میں شہری ودیہاتی مسلم وغیر مسلم سب برابر تھے۔ لیکن دفاتر کا ترقی یافتہ نظام قائم ہونے کے بعد سب سے زیادہ اہمیت اسی کو حاصل ہوئی۔ حاصل یہ کہ دفاتر کے ذریعہ مدد حاصل کرنا زیادہ ظاہر تھا، اس کی موجودگی میں دوسرے ذرائع قرابت، نسب، ولاء، گھر کا قرب وغیرہ سے مدد حاصل کرنا ظاہر نہ تھا۔ اور اگر اتفاق سے کوئی شخص نہ دفتری نظام میں منسلک ہوتا اور نہ اسکی کسی قرابت کا علم ہوتا تو پوری جماعت (یا حکومت) اسکی مدد کی ذمہ دار ہوتی ہے۔ اگر کسی مسلمان کا نام دفتر میں درج نہ ہو اور نہ کسی سے اسکی قرابت معلوم ہو، مثلاً کوئی بچہ پڑا ہوا پایا گیا اور وہ جوان ہوا تو ایسی صورت میں پوری جماعت اسکی مددگاروں میں شمار ہوگی۔ بیمہ کے مذکورہ اغراض حاصل کرنے کے لئے الٰہی شریعت نے وسیع پیمانہ پر دو قسم کے انتظامات کئے ہیں۔ (۱) حکومت کو ذمہ دار ٹھہرایا ہے۔ (۲) تنظیمات قائم کرنے کا حکم دیا ہے (اسلام اور جدید دور کے مسائل ص ۲۲۶)۔

شریعت کی نظر میں حکومت رعایہ کی ذمہ دار ہے۔ حدیث پاک میں ہے: ''السلطان ولي من لا ولي له'' (رواه الترمذي)، اس کے علاوہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے زمانہ جاہلیت کی آزادانہ تنظیمات عاقلہ وغیرہ کو برقرار رکھا اور عوام کو بھی کفالت کا ذمہ دار ٹھہرایا جس سے جدید تنظیم قائم کرنے کی طرف اشارہ ملتا ہے۔ ایک موقع پر ارشاد فرمایا جس شخص کے پاس سواری وغیرہ زائد ہو وہ اس شخص کو دیدے جس کے پاس وہ سامان نہ ہو اور جس کے پاس کھانے پینے کی چیزیں ضرورت سے زائد ہوں وہ زائد چیزیں مفلس اور نادار کو دیدے۔ حضرت ابوسعید خدریؓ کا قول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسی طرح مال کی مختلف قسموں کا ذکر کر کے زائد مال دوسروں کو دینے کے لئے فرماتے رہے، یہاں تک کہ ہم نے گمان کیا زائد میں ہم لوگوں کا کوئی حق نہیں۔ مذکورہ تفصیلات سے ظاہر ہے کہ حکومت و عوام دونوں کو ہر دور میں بہتر تنظیم قائم کرنے اور مفید تر کو قبول کرنے کا اختیار ہے، بشرطیکہ ان میں درج ذیل اخلاقی مفاسد نہ پائے جائیں۔ خود غرضی، مفاد پرستی، اجارہ داری، ذخیرہ اندوزی، فریب دہی، طلب ورسد کے قدرتی تناسب میں خلل اندازی مستقبل کی سودا بازی، جہالت، منازعت، ناجائز استحصال، اجتماعی مفاد کی قربانی، باہمی تعاون کا فقدان، قمار، سٹہ، سود وغیرہ (اسلام اور جدید دور کے مسائل ص ۲۴۰)۔

مجوزین علماء کرام نے تعاون وتکافل کی بیمہ کمپنیوں کے معاملات کو عقد وکالت، عقد مضاربۃ عمریٰ، رقبیٰ کے دائرہ میں تصور کرتے ہوئے انکے جواز کی رائے دی ہے۔ جدید فقہی مسائل میں حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی نے تحریر فرمایا: ''انشورنس کی پہلی صورت جو باہمی تعاون پر مبنی ہے تمام ہی اہم اہل علم کے نزدیک جائز ہے، اس میں نفع کمانا مقصود نہیں ہوتا، بلکہ افراد واشخاص کا ایک گروہ طے شدہ خطرہ پیش آنے کی صورت میں مصیبت زدہ شخص کی مدد کرتا ہے، اس لئے اس کے ناجائز ہونے کی کوئی وجہ نہیں اس میں ایک گونہ غرر ضرور پایا جاتا ہے کہ نہ معلوم اس اعانت کا فائدہ کسے پہنچے گا، تاہم یہ اس لئے مضر نہیں کہ غرر ان معاملات میں ممنوع ہے جن میں دونوں طرف سے عوض کا تبادلہ ہو تبرعات میں غرر سے کوئی نقصان نہیں اور انشورنس کی یہ صورت اسی قبیل سے ہے'' (جدید فقہی مسائل ۴/۱۰۲)

۱۔ باہمی تعاون پر مبنی انشورنس جو بعض مسلم ممالک میں مروج ہیں جائز ہیں۔ ''مجمع البحوث الاسلامیہ جامعہ ازہر'' کے اجلاس محرم ۱۳۸۵ھ ''مجمع الفقہ الاسلامی مکہ مکرمہ'' کے اجلاس شعبان ۱۳۹۸ھ اور ''ہیئۃ کبار العلماء سعودی عربیہ'' کے اجلاس منعقدہ ریاض ربیع الثانی ۱۳۹۷ھ نے باتفاق رائے اس کے جواز کا فیصلہ کیا ہے۔

۲۔ حکومت اپنے ملازم اور کارکنوں کے لئے حادثات پیش آنے کی صورت میں تعاون کے لئے انشورنس کی جو اسکیم چلاتی ہے وہ بھی جائز ہے اور پرائیویڈنٹ فنڈ اسکیم سے قریب ہے یہاں مال بہ مقابلہ عمل ہے اور یہ تبادلہ مال از مال کی صورت ہی نہیں۔ اسکے جواز پر قریب قریب اتفاق ہے۔ شیخ ابوزہرہ بھی باوجودیکہ بڑی شدت سے انشورنس کی حرمت کے قائل ہیں، اس صورت کو جائز قرار دیتے ہیں۔

۳۔ بیمہ کی ایک صورت سندات اور کاغذات کے انشورنس کی ہے جن کا انتظام آج کل ڈاک کے نظام میں بھی ہے، یہ صورت بھی جائز ہے۔ فقہاء کا خیال ہے کہ اگر امین سامان کی حفاظت پر اجرت لے تو اب وہ اس سامان کا ضامن ہو جاتا ہے اور سامان ضائع ہو جائے تو اسکو تاوان ادا کرنا ہوتا ہے، یہ صورت بھی اسی زمرہ میں داخل ہے، چنانچہ مفتی محمد شفیع صاحب نے بھی اس کو جائز قرار دیا ہے (جواہر الفقہ)۔

۴۔ انشورنس کی وہ تمام صورتیں جن میں سرکاری قانون کے تحت انشورنس لازمی ہے، جائز ہوں گی، جیسے بین ملکی تجارت میں درآمد برآمد کے لئے اس میں انشورنس کرانے والے کے اختیار کو دخل نہیں۔

۵۔ ٹریفک حادثات اور اس طرح کے دوسرے حادثات کی بناء پر عائد ہونے والی ذمہ داریوں کے سلسلہ میں انشورنس بھی جائز ہے۔

۶۔ زندگی اور املاک کا انشورنس اصلاً جائز نہیں کہ اسمیں سود بھی ہے اور قمار بھی۔

۷۔ ہندوستان اور اس جیسے ممالک جہاں مسلمان اقلیت میں ہوں نقض امن سے دوچار ہوں اور قانون کی لگام انکے ہاتھ میں نہ ہو۔ میں مسلمانوں کے لئے جان واملاک کا انشورنس بھی جائز ہے۔

۸۔ جان ومال کے انشورنس کی صورت میں بیمہ کرانے والے کے لئے اسکی اصل رقم ہی جائز ہوگی اضافی رقم جائز نہ ہوگی اور ضروری ہوگا کہ بغیر نیت صدقہ رفاہی کاموں میں خرچ کردی جائے یا غرباء پر صرف کی جائے لیکن یہ حکم اس وقت ہے جب موت طبعی طور پر ہوئی ہو یا کاروبار کسی آفت ساوی کا شکار ہوا ہو، اگر ہندو مسلم فسادات میں ہلاکت واقع ہوئی یا کاروبار متاثر ہوا تو اب پوری رقم جائز ہوگی، اس لئے کہ انشورنس کمپنی نیم سرکاری کمپنی ہے اور مسلمان کا تحفظ بھی سرکاری ذمہ داری ہے، حکومت کی طرف سے مسلمانوں کی حفاظت میں غفلت، بلکہ ان کو نقصان پہنچانے کی سعی میں شرکت شب وروز کا مشاہدہ ہے، اس لئے یہ حکومت کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے تغافل کی قیمت ادا کرے (جدید فقہی مسائل ۴ر۲۵، ۲۴، ۱۲۳)۔

مروجہ بیمہ کے متبادل تعاونی بیمہ کے متعلق فتاوی عثمانی میں ہے، آج کل مختلف اشیاء کے بیمے کا کاروبار دنیا کے ہر خطے میں انشورنس کمپنیاں انجام دے رہی ہیں، معاصر علماء اسلام کی اکثریت نے اس کاروبار کو غرر یا قمار پر مشتمل ہونے کی بناء پر ناجائز قرار دیا ہے، اس لئے شرق اوسط کے مسلمانوں نے اپنے علاقے کے علماء کرام کے مشورے سے ایسی کمپنیاں ''شرکات التکافل'' کے نام سے قائم کی ہیں جو بیمہ کے مقاصد شرعی اصولوں کے ماتحت حاصل کرنے کی مدعی ہیں دونوں قسم کی کمپنیوں کے طریقہ کار میں فرق یہ ہے کہ وہ انشورنس کمپنیاں جو شرعی قواعد کی پابند نہیں (جنہیں آئندہ مروجہ انشورنس کمپنیاں کہا جائے گا) لوگوں سے باقاعدہ تجارتی معاہدہ کرتی ہیں جسکی بنیاد پر وہ بیمہ دار سے ماہانہ یا سالانہ ایک رقم پریمیم کے نام سے وصول کرتی ہیں اور اس کے مقابلے میں یہ التزام کرتی ہیں کہ جس چیز کا بیمہ کرایا گیا ہے اگر وہ ہلاک ہو جائے یا اسکو نقصان پہنچ جائے تو انشورنس کمپنی اس نقصان کی تلافی کریگی۔

یہ کمپنیاں پریمیم کا تعین ایک خاص حساب کے ذریعہ کرتی ہیں، جس کے لئے ایک مستقل فن ایکچوری کے نام سے مشہور ہے۔ اس حساب کے ذریعہ وہ یہ اندازہ لگاتی ہیں کہ انہیں سال بھر میں اوسطاً کتنے لوگوں کے نقصانات کی تلافی کرنی پڑے گی اور اس پر کتنا خرچ آنے کی توقع ہے، جتنا خرچ آنے کی توقع ہوتی ہے اس پر وہ اپنے منافع کی ایک مقدار کا اضافہ کر کے مختلف اشیاء کے پریمیم کا تعین کرتی ہے، اگر سال بھر میں انکے اخراجات توقع کے مطابق ہوں تو باقی ماندہ رقم ان کے منافع کا حصہ ہوتی ہے، لیکن اگر اخراجات توقع سے زیادہ بڑھ گئے تو چونکہ انہیں نقصان کا اندیشہ ہوتا ہے، اس لئے وہ کسی اور انشورنس کمپنی سے معاملہ کرتی ہیں کہ ایسے نقصان کی صورت میں وہ کمپنیاں انکے نقصان کی تلافی کریں، اس عمل کو انگریزی میں ری انشورنس اور عربی میں ''اعادۃ التامین'' کہا جاتا ہے مروجہ انشورنس کمپنیاں ''اعادۃ التامین'' کے لئے ری انشورنس کمپنیوں کو پریمیم ادا کرتی ہیں۔

دوسری طرف ''شرکات التکافل'' جو شرق اوسط میں قائم کی گئی ہیں وہ کسی تجارتی معاہدہ کے بجائے تبرع کے اصول پر قائم ہوتی ہیں ان کمپنیوں میں مختلف افراد جو رقمیں دیتے ہیں انکے بارے میں یہ طے ہوتا ہے کہ یہ دینے والوں کی طرف سے تبرع ہے، اس طرح رقمیں دینے والوں کو ''حملۃ الوثائق'' کہا جاتا ہے اور ان رقموں کو کاروبار میں بھی لگایا جاتا ہے اور اس طرح جو رقمیں جمع ہوتی ہیں وہ تمام چندہ دہندگان کے نقصانات کی تلافی میں خرچ کی جاتی ہیں، اگر سال میں جن

نقصانات کی تلافی کی گئی اسکے بعد کچھ رقم بچ رہی تو وہ کمپنی کا منافع نہیں ہوتا، بلکہ انہیں 'حملة الوثائق' میں تقسیم کر دیا جاتا ہے، جنہوں نے ابتداء میں تلافی نقصانات کے لئے رقمیں دی تھیں، ''شرکات التکافل'' کا بنیادی تصور تو یہی ہے جو اوپر ذکر کیا گیا ہے، لیکن عملاً اس تصور میں مندرجہ ذیل مسائل پیدا ہوتے ہیں:

۱۔ چونکہ تکافل کی کارروائی دنیا کے کسی بھی ملک کے قانون میں ایک کمپنی کے قائم کئے بغیر ممکن نہیں، اس لئے کچھ لوگوں کو اپنا ابتدائی سرمایہ لگا کر ایک کمپنی قائم کرنی پڑتی ہے۔ ان لوگوں کو شیئرز ہولڈر یا حامل حصص کہا جاتا ہے چونکہ مروجہ انشورنس کمپنیوں کی طرح یہ لوگ نقصانات کی تلافی سے بچی ہوئی رقم کے حقدار نہیں ہوتے، اس لئے ان کی آمدنی صرف ان کے لگائے ہوئے سرمایہ پر تجارتی نفع کی حد تک محدود ہے اور تکافل فنڈ سے انہیں کچھ نہیں ملتا، البتہ بعض ''شرکات التکافل'' ان کو تکافل فنڈ سے فنڈ کے انتظام اور انصرام کی اجرت ادا کرتی ہیں اور ملیشیا کی تکافل کمپنیاں انکو تکافل فنڈ کی بچی ہوئی رقم سے رقم کا ایک مخصوص فیصد حصہ ادا کرتی ہیں۔ غور طلب سوال یہ ہے کہ آیا کمپنی کے موسسین کو یہ ادائیگی جائز ہے یا نہیں؟ اگر ہے تو کس بنیاد پر!

۲۔ اگرچہ تکافل فنڈ تبرع کی بنیاد پر قائم کیا جاتا ہے، لیکن اس فنڈ سے خود متبرّع بھی نقصان کی صورت میں مستفید ہوتا ہے، بلکہ تکافل فنڈ میں لوگوں کے نقصانات کی تلافی انکے دئے ہوئے تبرع کی مقدار کی بنیاد پر ہوتی ہے، یعنی جسکا جتنا زیادہ تبرع ہوگا وہ اتنے ہی بڑے نقصان کی تلافی اس فنڈ سے کرا سکے گا۔ دوسرے الفاظ میں تبرع کی رقم کا تعین اس چیز کی قیمت کے لحاظ سے ہوتا ہے جسکے نقصان کی وہ تلافی چاہتا ہو، چنانچہ اگر کوئی شخص سوزوکی کار کے نقصان کی تلافی کا خواہشمند ہو تو اسے کم تبرع کرنا پڑے گا اور اگر مرسیڈیز کار کی تلافی کا خواہشمند ہو تو اسے زیادہ تبرع کرنا پڑے گا، سوال یہ ہے کہ کیا اس صورت میں جبکہ اس نقطہ نظر سے اور اس بنیاد پر رقم کی مقدار کا تعین کر رہا ہے کہ اسکو کس نقصان کی تلافی مقصود ہے تو کیا واقعتاً تبرع رہے گا؟ یا یہ بھی عقد معاوضہ میں داخل ہو جائے گا شرق اوسط کے جن حضرات نے اس کو تبرع قرار دے کر اس کی اجازت دی ہے ان کا کہنا یہ ہے کہ جو کچھ رقمیں جو کوئی شخص دیتا ہے وہ تکافل فنڈ کا حصہ بن جاتی ہیں اس تکافل فنڈ کے قواعد ضوابط خود اس فنڈ کے قائم کرنے والوں نے جن میں ہر متبرع داخل ہے یہ مقرر کئے ہیں کہ جس شخص نے جتنا چندہ دیا ہو گا اسی حساب سے وہ اس فنڈ سے اپنے نقصانات کی تلافی کرا سکے گا اور جو فنڈ باہمی تعاون اور تبرع کی بنیاد پر قائم کیا گیا ہو اس کے قواعد و ضوابط فنڈ کے تمام شرکاء باہمی رضامندی سے مقرر کر سکتے ہیں۔ لہٰذا اگر یہ قاعدہ مقرر کر لیا گیا ہے کہ لوگوں کے نقصانات کی تلافی ان کے تبرعات کی مقدار کے حساب سے کی جائے گی تو اس سے فنڈ کے تبرع پر مبنی ہونے پر کوئی فرق واقع نہیں ہوگا۔ سوال یہ ہے کہ کیا شرعاً یہ نقطہ نظر درست ہے؟

۳۔ جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا مروجہ انشورنس کمپنیاں نقصان کے خطرے کے پیش نظر ری انشورنس سے ''اعادۃ التامین'' کراتی ہیں، شرکات التکافل کو بھی یہ خطرہ در پیش رہتا ہے کہ تکافل فنڈ کی رقم نقصانات کی تلافی کے لئے ناکافی ہو جائے۔ اگرچہ ایک دو مقامات پر مسلمانوں نے اعادۃ التکافل کی کمپنیاں بھی قائم کی ہیں، مگر ان کی صلاحیت بہت محدود ہے، اس لئے عرب کے علماء نے اس بات کی اجازت دی ہے کہ جب تک شرعی بنیادوں پر اعادۃ التکافل کا نظام مستحکم نہ ہو اس وقت تک وہ بدرجہ مجبوری مروجہ ری انشورنس کمپنیوں سے اعادۃ التامین کرا سکتی ہیں۔ ان حضرات کا موقف یہ ہے کہ تامین کی حرمت ربا اور قمار کی وجہ سے نہیں، بلکہ اس وجہ سے ہے کہ یہ عقد غرر ہے چونکہ انشورنس کمپنی نقصان کی صورت میں نقصانات کی تلافی محض پیسے دینے کی شکل میں نہیں کرتی جس سے مبادلۃ النقود لازم آئے، بلکہ وہ نقصان کی تلافی کی ذمہ داری لیتی ہے، مثلاً کار تباہ ہوتی ہے تو اسکی جگہ دوسری کار فراہم کرنا، مکان تباہ ہو تو اس کی جگہ دوسرا مکان تیار کرنا وغیرہ، لہٰذا یہ عقد ربا یا قمار نہیں، بلکہ عقد غرر ہے اور غرر کو حاجت عامہ کی بناء پر گوارہ کیا جا سکتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا یہ موقف درست ہے؟ اور اگر نہیں تو اس صورت حال سے نمٹنے کے لئے کوئی دوسرا طریقہ کیا ہو سکتا ہے؟ ''جامعہ دار العلوم کراچی'' کے شعبہ ''مرکز الاقتصاد الاسلامی'' کی دعوت پر پاکستان بنگلہ دیش اور شام کے اہل علم اور اہل فتویٰ حضرات کا اہم اجتماع ۲۱ ر ۲۲ ر شوال ۱۴۲۳ھ بروز جمعرات جمعہ مطابق ۲۶ ر ۲۷ ر دسمبر ۲۰۰۲ء جامعہ دار العلوم کراچی کے دار الافتاء کے ہال میں بیمہ کے متبادل نظام تکافل پر غور کرنے کے لئے منعقد ہوا۔ مجلس کے علماء کرام نے مروجہ انشورنس کے متبادل نظام ''شرکۃ التکافل'' پر غور کیا جس کی عملی صورت بنگلہ دیش شرق اوسط اور ملیشیا کی بعض کمپنیوں نے اختیار کی ہے، اس متبادل طریقہ کار پر حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم نے ''شرکات التکافل'' پر چند اشکالات کے نام سے جو تحریر اہل علم کے مطالعہ کے لئے ارسال کی تھی اسے مجلس میں پڑھا گیا اور ان اشکالات کا جائزہ لیا گیا۔

مجلس کے آغاز میں مہمان عرب عالم دین اور متعدد مالیاتی اداروں کے شرعی امور کے نگراں جناب شیخ عبد الستار ابوغدہ نے مغربی بیمہ کمپنیوں کی تاریخ کا اجمالی جائزہ پیش کیا اور اب اسلامی ممالک میں جو تکافل کمپنیاں کام کر رہی ہیں ان کے طریقہ کار پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ بعد میں شرکائے مجلس کے بعض سوالات وشبہات کے جوابات دئے اس کے بعد متعدد اہل مجلس نے اپنی آراء بیان فرمائیں اور طویل بحث کے بعد مجلس نے یہ طے کیا کہ اس وقت اسلامک ممالک میں جو تکافل کمپنیاں اسلامی اصولوں کے مطابق کام کر رہی ہیں یا کام کرنا چاہتی ہیں ان سب کی بنیاد ''حملة الوثائق'' (پالیسی ہولڈر یا بالفاظ دیگر پریمیم

قسط ادا کنندگان) کی طرف سے تبرع پر رکھی گئی ہے اور اس تبرع کی بنیاد پر وہ اپنے متوقع مالی خطرات کا ازالہ کرتے ہیں۔

مجلس نے محسوس کیا کہ وقف کے بغیر تبرع کی بنیاد پر تکافل کمپنیوں کے قیام میں متعدد اشکالات ہیں۔شیخ عبدالستار ابوغدہ اور دوسرے عرب علماء نے اگر چہ ان اشکالات کے اپنے اپنے طور پر جوابات دئے ہیں، لیکن مجلس کو خیال ہوا کہ اس مسئلہ میں مزید تحقیق کی ضرورت ہوگی اگر فی الحال ترجیحاً ان کمپنیوں کی بنیاد تبرع کے بجائے وقف پر رکھی جائے تو اس قسم کے اشکالات سے حفاظت ہوسکتی ہے۔

اس سے بڑھکر بات یہ ہے کہ ۱۳۸۴ھ میں "مجلس تحقیق مسائلہ حاضرہ" نے حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ، حضرت مولانا محمد یوسف بنوریؒ، حضرت مولانا ولی حسنؒ اور دیگر اکابر کی سرپرستی میں بیمہ زندگی کے متبادل کے طور پر جو نظام تجویز کیا تھا اس کی بنیاد بھی وقف اور مضاربت پر رکھی تھی (دیکھئے بیمہ زندگی مولفہ حضرت مفتی محمد شفیع صاحب قدس سرہ، ص ۲۵)۔

ان جلیل القدر اکابر کی تجویز کردہ بنیاد وقف پر اگر تکافل کمپنی قائم کی جائے تو نسبتاً اشکالات کم پیش آئیں گے، لہٰذا مجلس نے تبرع کے مقابلہ میں وقف کی بنیاد وں پر قائم "شركة التكافل" کے قیام کی صورت کو ترجیح دی جس میں اولاً مساہمین (شیئر ہولڈرز، یعنی تکافل کمپنی کے حصہ داران) اپنے طور پر اصول ثابتہ (اموال غیر منقولہ) یا نقود یا دونوں کو شرعی اصول وضوابط کے مطابق وقف کریں گے جنہیں محفوظ رکھا جائے گا اور انکے لئے آخری جہت قربت، یعنی فقراء اور مساکین پر تصدق ہوگی پھر "حملة الوثائق" (پالیسی ہولڈرز) اس وقف میں جو رقوم دیں گے یا وقف کے جتنے منافع یا زوائد ہوں گے وہ سب وقف کے مملوک ہوں گے اور وقف کو وقف کے طے شدہ اصول وضوابط کے مطابق ان مملوکات ومنافع میں تصرف کا مکمل اختیار ہوگا اس اصول کے طے ہونے کے بعد حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم کے تین اشکالات پر غور کیا گیا، نمبروار اشکالات کے جوابات یہ طے کئے گئے:

۱:الف۔ مساہمین تکافل فنڈ سے فنڈ کے انتظام وانصرام کی اجرت درج ذیل شرائط کے ساتھ وصول کر سکتے ہیں:

۱۔ یہ اجرت فنڈ سے ادا کی جائے، کیونکہ یہ لوگ فنڈ کے اجیر ہیں نہ کہ حملة الوثائق کے۔

۲۔ اس اجرت کا متعین ہونا ضروری ہے۔خواہ وہ تعین رقم کی صورت میں ہو یا حصہ متناسبہ کی صورت میں۔

۳۔ یہ بھی ضروری ہے کہ یہ اجرت اعمال مضاربت سے خارج کسی اور عمل پر ہو۔

ب۔ اگر وقف کے متولیین (یعنی شركة التكافل) شرعی حدود میں وقف کے لئے مضاربت کی خدمت انجام دیں تو وہ مضاربت کے طور پر ہونے والے نفع کے متناسب متعین حصے کے بھی حقدار ہوسکتے ہیں، مگر اس کے لئے دو شرائط ہیں:

۱۔ مضاربت اور اجارہ کی حدود علیحدہ علیحدہ واضح طور پر متعین ہوں، تا کہ اجارہ کے طور پر وہ صرف متعین اجرت کے حقدار ہوں۔اور مضاربت کے طور پر ہونے والے نفع میں سے حصہ متناسبہ کا حق رکھیں۔

۲۔ "هيئة الرقابة الشرعية" سے مضاربت کی باقاعدہ اجازت لے لی جائے۔

۲۔ حملة الوثائق۔ جو کچھ تبرع کی بنیاد پر وقف کو دیں اس میں کمی یا زیادتی کی بنیاد پر کم یا زیادہ نقصان کی تلافی کا اگر حملة الوثائق کو قانونی حق نہ ہو، بلکہ وقف کی طرف سے محض وعدہ کی حیثیت ہو تو اس میں بظاہر شبہ کی کوئی بات نہیں، اگر تبرع کی کمی اور زیادتی کی بنیاد پر تلافی نقصان کی کمی اور زیادتی حملة الوثائق کا قانونی حق ہو تو اس میں مجلس کے بعض شرکاء کی رائے یہ تھی کہ یہ صورت جائز نہیں، کیونکہ یہ صورت عقد معاوضہ میں داخل ہوگی اور یہ بعینہ وہی صورت ہے جو بیمہ کمپنیوں میں فی الحال رائج ہے، لیکن مجلس کے اکثر شرکاء کی رائے یہ تھی کہ "حملة الوثائق" کے قانونی حق بننے کی دو صورتیں ہیں۔

پہلی صورت یہ ہے کہ حامل وثیقہ اس بنیاد پر اپنے قانونی حق کا دعویٰ کرے کہ اس نے فلاں وقت میں وقف فنڈ کو اتنی رقم دیکر اس سے نقصان کی تلافی کا معاہدہ کیا تھا، لہٰذا اب اس کے اتنے نقصان کی تلافی کرنا وقف کے ذمہ لازم ہے، یہ صورت تو یقیناً ناجائز ہے، کیونکہ یہ بات اسے عقود معاوضہ میں داخل کر کے اس میں ربا اور غرر کی خرابیاں پیدا کر دے گی۔

دوسری صورت یہ ہے کہ حامل وثیقہ اپنے سابقہ تبرع کی بنیاد پر اپنے نقصان کی تلافی کا دعویٰ نہ کرے، بلکہ وقف کے اپنے طے شدہ قواعد وضوابط کو بنیاد بنا کر اس بات کا دعویٰ کرے کہ میں ان قواعد وضوابط کی بنیاد پر وقف کی طرف سے تلافی نقصان کا حقدار ہوں، مجلس کے اکثر شرکاء کی رائے یہ ہے کہ

حامل وثیقہ شرعاً اپنا یہ حق استعمال کرسکتا ہے اور اس کا یہ قانونی حق اس صورت کو عقد معاوضہ میں داخل نہیں کرتا۔

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس سرہٗ کی کتاب ''اسلام کا نظام اراضی'' (صفحہ ۴۶، ۷ ۱۴) کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ عطا مستقل کے لئے سابقہ ضرر کو بنیاد بنایا جاسکتا ہے۔ اس پر بعض حضرات کو ایک اشکال ہے یہ اشکال اور اس کا جواب جو حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم نے تحریر فرمایا ہے آگے آرہا ہے:

۳۔ رائج الوقت ''اعادۃ التامین'' میں جہاں پورے پریمیم کے ڈوبنے کا خطرہ ہو وہاں غرر کے علاوہ قمار کی خرابی بھی پائی جاتی ہے اور جہاں پریمیم ڈوبنے کا ڈر نہ ہو وہاں غرر ہونا تو بہر حال طے ہے اور غرر بھی فاحش ہے، لہٰذا محض ''اعادۃ التامین'' کی خاطر اس کو جائز قرار نہیں دیا جاسکتا، البتہ درج ذیل متبادل صورتوں کو اختیار کیا جاسکتا ہے:

۱۔ ''اعادۃ التکافل'' کی کمپنیاں بھی شرعی بنیادوں پر قائم ہوں۔

۲۔ تبرع کرنے والوں سے مزید تبرع کی درخواست کی جائے۔

۳۔ تبرع کرنے والوں سے قرضہ لیکر فی الحال اس سے ادائیگیاں کی جائیں یا ان سے بطور مضاربت رقم لے کر سرمایہ کاری کی جائے اور حاصل ہونے والے نفع سے نقصانات کی تلافی کی جائے۔

۴۔ احتیاطیات میں رقم زیادہ رکھی جائے۔

۵۔ وقف پر تلافی نقصان کی ذمہ داری نسبتاً کم رکھی جائے۔

۶۔ اسلامی تکافل کمپنیاں آپس میں اعادۃ التکافل کی خدمات انجام دیں۔

ملحوظہ:

۱۔ مجلس میں شریک علماء کرام نے یہ بھی طے کیا کہ ہر تکافل کمپنی کے اندر مستند علماء کرام اور اہل فتویٰ حضرات پر مشتمل ایک "هيئة الرقابة الشرعية" (شریعہ بورڈ) لازمی ہے جو کمپنی کے تمام معاہدات اور جملہ قابل ذکر امور کے شریعت کے مطابق ہونے کی نگرانی کریگا۔

۲۔ مجلس نے یہ سفارش پیش کی کہ چونکہ مجلس کا طے شدہ تکافل کا نظام تبرع کے بجائے وقف پر قائم ہوا ہے، اس لئے بیمہ کمپنیوں کی قدیم اصطلاحات میں تبدیلی کر کے انہیں بھی فقہ اسلامی کے مطابق کرنا مناسب ہے۔

ایک اشکال اور اس کا جواب:

جب کوئی شخص پریمیم جمع کراتا ہے تو اس نیت سے کراتا ہے کہ بوقت نقصان زیادہ ملیگا اور اس زیادتی کے لئے وہ کمپنی کو مجبور بھی کرسکتا ہے، اس کی توجیہ حضرت مولانا مفتی تقی عثمانی صاحب نے یہ فرمائی کہ دینا محض تبرع ہے اور لینا صندوق کے قوانین کے تحت ہے۔

حضرت کی توجیہ سے یہ عقد صریح قمار سے تو نکل گیا، لیکن اس میں شبہ رہا ہے وہ اس طرح کہ دیتے وقت نیت یہ ہے کہ زیادہ ملے، چاہے کسی قانون سے ہو اور ارشاد ہے: { ولا تمنن تستكثر} (سورة المدثر:٦)، ''وقال ابن عباس: لا تعط عطية تلتمس بها أفضل منها'' اسی وجہ سے نیوتہ کو ناجائز کہا گیا ہے، حالانکہ اس میں بھی یہ کہا جاسکتا ہے کہ دینا ایک مستقل عطیہ ہے اور دوسرا جب دیتا ہے تو وہ ایک مستقل عطیہ ہے، لیکن چونکہ نیت لینے کی ہے اس لئے علامہ ابن عابدین نے اس کو قرض میں داخل فرمایا ہے۔ لہٰذا یہاں بھی جب دینا اس غرض سے ہے کہ واپس ملے گا اور وہ بھی زیادہ ملے گا تو ایک تو یہ اس آیت کی وعید میں داخل ہے اور کم از کم مکروہ ضرور ہوگا اور دوسرا علامہ ابن عابدین کی توجیہ کے مطابق قرض میں داخل ہو جائے گا اور زیادت سود سے مشابہ ہوگی اور سود کے بارے میں یہ حکم ہے: "فدعوا الربوٰ والريبة" (حدیث) تو یہ کہیں ربا میں تو داخل نہیں، لیکن حاضرین کی اکثریت نے اس اشکال کا جواب یہ دیا کہ اس بات پر تمام فقہاء کرام کا اتفاق ہے کہ واقف کوئی چیز وقف کرتے وقت اس سے خود نفع اٹھانے کی نیت کرے، بلکہ وقف نامے میں اپنے انتفاع کی باقاعدہ شرط لگائے تو اس کی اجازت ہے، جس کی دلیل حدیث معروف ہے: ''يكون دلوه

کدلاء المسلمین'' (صحیح البخاری کتاب المساقات، باب فی الشرب)۔

اس سے معلوم ہوا کہ وقف کے احکام انفرادی ہدایا سے مختلف ہیں اور اسکی وجہ واضح ہے کہ وقف کا موضوع لہ ہی موقوف علیہم کو فائدہ پہنچانا ہے۔ لہٰذا اگر واقف وقف سے فائدہ اٹھاتا ہے تو وہ وقف کے موضوع لہ میں داخل ہونے کی بناء پر اس سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ چنانچہ وقف کی صورت میں چندہ دینے والا اگر وقف سے فائدہ اٹھائے تو وقف کے قواعد وضوابط کے مطابق فائدہ اٹھائے گا۔ اگر وقف کے قواعد وضوابط کے مطابق وہ مستحق قرار نہ پائے تو وہ فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔ نیوتہ میں کوئی وقف نہیں ہوتا اس مہدی لہ کا موضوع لہ بھی یہ نہیں ہے کہ وہ دوسروں کو ہدیہ دے وہ دو افراد کا باہمی معاملہ ہے جس میں ہدیہ کا لوٹانا مشروط یا معروف ہو تو اس میں عقد معاوضہ ہونے کے سوا کوئی دوسرا احتمال نہیں ہے، جبکہ دوسری طرف وقف کو چندہ دینا ایک مستقل معاملہ ہے اور وقف کے قواعد کے مطابق چندہ دینے والے کا استحقاق انتفاع بالکل دوسرا معاملہ ہے، اس لئے وقف کے معاملہ کو نیوتہ پر قیاس نہیں کیا جا سکتا (فتاویٰ عثمانی ۳ر ۲۲-۳۱۵)۔

البتہ خاص طور پر یہ لحاظ رکھیں کہ تبرع کے بجائے وقف پر تکافل کمپنیوں کی بنیاد رکھی جائے اور حامل وثیقہ اپنے سابقہ تبرع کی بنیاد پر اپنے نقصان کی تلافی کا دعویٰ نہ کرے، بلکہ وقف کے اپنے طے شدہ قواعد وضوابط کو بنیاد بنا کر اس بات کا دعویٰ کرے کہ میں ان قواعد وضوابط کی بنیاد پر وقف کی طرف سے تلافی نقصان کا حقدار ہوں۔ حاملہ وثیقہ شرعا اپنا یہ حق استعمال کر سکتا ہے۔ اس کا یہ قانونی حق اس صورت کو عقد معاوضہ میں داخل نہیں کرتا، اس بات پر تمام فقہاء کا اتفاق ہے کہ واقف کوئی چیز وقف کرتے وقت اس سے خود نفع اٹھانے کی نیت کرے، بلکہ وقف نامہ میں اپنے انتفاع کی باقاعدہ شرط لگائے تو اسکی اجازت ہے (فتاویٰ عثمانی ۳ر ۲۲-۳۲۰)۔

☆☆☆

تکافل (انشورنس) کی شرعی صورت

مولانا محمد مصطفی عبدالقدوس ندوی [1]

انشورنس (تکافل):......انشورنس (Insurance) کو اردو میں بیمہ کہتے ہیں، لغوی معنی یقین دہانی کے ہیں، چونکہ کمپنی انشورنس کرانے والے کو اس کے بعض مستقبل کے خطرات سے حفاظت اور نقصانات کی تلافی کا پختہ وعدہ کرتی ہے، ظاہر ہے کہ کسی خطرہ سے حفاظت اور نقصان کے تدارک کی یقین دہانی سوائے اللہ کی ذات کے کوئی نہیں کرسکتا؛ اس لئے اس مقصد کے لئے "تکافل" کی اصطلاح زیادہ موزوں ہے، اس وقت عالم اسلام کی مروجہ ومقبول تعبیر یہی ہے، "تکافل" کے معنی بعض بعض کے ضامن ہونے کے ہیں۔

انشورنس کی قسمیں:...... بنیادی طور پر انشورنس کی دو قسمیں ہوتی ہیں، بقیہ ان ہی دونوں کی مختلف شکلیں نکلتی ہیں جن کو بعض لوگوں نے قسموں سے تعبیر کیا ہے، وہ دو قسمیں یہ ہیں: کمرشیل انشورنس اور باہمی تعاونی انشورنس جس کو آج کل تکافل سے تعبیر کیا جاتا ہے، اس وقت تکافل ہی کا موضوع زیر بحث ہے، یعنی "تکافل" کی شرعی صورت کیا ہوگی؟

اسلامی انشورنس (تکافل):......پہلی اسلامی انشورنس کمپنی آج سے ۳۶ رسال پہلے ۱۹۷۶ء میں قائم ہوئی (التأمین التکافلی بین دوافع النمو ومخاطر الجمود،) اور جناب زاہد حسین اعوان صاحب (جو اس وقت قطر انٹرنیشنل اسلامک بینک دوحہ سے وابستہ ہیں) کی تحقیق اس سلسلہ میں یہ ہے کہ بین الاقوامی سطح پر پہلی تکافل کمپنی ۱۹۷۹ء میں سوڈان میں قائم ہوئی اور اس کے بعد ملیشیا نے ۱۹۸۷ء میں تکافل کے قوانین کا اجراء کیا، پاکستان میں اسلامی بینکوں کے لئے اسلامی انشورنس کی ضرورت اور عدالت کے فیصلے کے مطابق ۲۰۰۵ء میں تکافل (اسلامی انشورنس) رولز کا اجرا ہوا۔ اس وقت سے اب تک پاک کویت تکافل، تکافل پاکستان لمیٹڈ، پاک قطر فیملی تکافل، پاک قطر جنرل تکافل اور فرسٹ داؤد تکافل وغیرہ جیسے ادارے قائم ہوچکے ہیں (مینارۂ نور، روزنامہ منصف حیدرآباد ۲۶ رمارچ ۲۰۱۰ء)۔

باہمی تعاون کے جذبہ پر مبنی انشورنس جس میں نفع کمانا مقصود نہ ہو، بلکہ خطرات ومصائب کی باہم تقسیم، خواہ یہ چند افراد واشخاص کے درمیان گروپ کی شکل میں ہو یا کمپنی کی صورت میں، اس میں حکومت کا تعاون ہو، یا نہ ہو، یا انشورنس در انشورنس ہو، تمام ہی شکلوں میں ربا اور قمار سے بالکل خالی ہو تو اس پر اسلامک انشورنس کا اطلاق ہوگا، گو اس میں غرر اور جہالت ایک گونہ موجود ہو، لیکن یہ مضر نہیں؛ کیونکہ فقہاء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ تبرعات میں غرر اور جہالت مضر نہیں ہیں (چنانچہ فقہاء نے قاعدہ وضع کیا ہے: "یغتفر فی التبرعات مالا یغتفر فی المعاوضات من الغرر والجهالة"۔ القواعد الفقهیه لعطیة عدلان ۲۰۰)۔

انشورنس کے بنیادی عناصر اور قرآن وسنت:......انشورنس کے نظریہ کے بنیادی عناصر تین ہیں: امن کی جستجو، دفع خطرات پر تعاون اور مستقبل کے لئے احتیاطی تدابیر، ان تینوں ہی عناصر کا ذکر قرآن وحدیث میں کثرت سے آیا ہے، جو اختصار کے ساتھ درج ذیل سطور میں پیش ہیں:

امن کی جستجو:

قرآن میں امن کا ذکر مختلف مواقع پر آیا ہے، مجموعی اعتبار سے اس طرح کے تیس مقامات ہیں، جس سے امن کی اہمیت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے، اور انسان کی دنیوی واخروی زندگی میں اس کی قدر وقیمت کیا ہے، وہ بھی معلوم ہوتا ہے، اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ امن جہاں انسان کی فطرت کی آواز ہے، وہیں زندگی کا لطف اور دل کا سکون اسی میں ہے، چنانچہ اللہ تعالی نے قبیلہ قریش پر اسی کا حوالہ دے کر احسان جتلایا ہے، ارشاد الہی ہے:

---

[1] استاذ المعہد العالی الاسلامی، حیدرآباد۔

{لإيلاف قريش، إيلافهم رحلة الشتاء والصيف، فليعبدوا رب هذا البيت الذى أطعمهم من جوع وآمنهم من خوف} (قریش: ۱-۴)۔(چونکہ قریش مانوس ہوئے (یعنی) جاڑے اور گرمی کے سفروں سے مانوس، لہذا ان کو چاہئے کہ اس گھر کے رب کی عبادت کریں جس نے انہیں بھوک سے بچا کر کھانے کو دیا اور خوف سے بچا کر امن عطا کیا)۔

یہاں اس سورہ میں بھوک سے حفاظت اور خوف سے امن کو بیش بہا نعمت قرار دیا ہے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف احادیث میں امن کی عظمت اور اس کی قدرو قیمت کو اجاگر کیا ہے (ان میں سے ایک حدیث یہ ہے: ''من بات آمنا فى سربه معافاً فى بدنه وعنده قوت يومه فقد حيزت له الدنيا بحذافيرها'' (ابن ماجه: كتاب الزهد، باب القناعة، حدیث نمبر: ۴۱۴۱)۔

دفع خطرات پر تعاون:

مسلم معاشرہ کی تشکیل باہم تعاون اور ایک دوسرے کی بہی خواہی پر قائم ہے، اسلام تمام مسلمانوں کو ایک دوسرے کا دینی بھائی قرار دیتا ہے، اور دکھ سکھ میں باہم شرکت کی ترغیب دیتا ہے، اور بھائی چارگی کی تعلیم دیتا ہے، اور قرآن نے اچھے کاموں پر ایک دوسرے کی مدد اور برے کاموں پر عدم تعاون کا حکم دیا ہے:

{وتعاونوا على البر والتقوى ولا تعاونوا على الإثم والعدوان واتقوا الله إن الله شديد العقاب} (مائدہ: ۲)۔

(اور نیکی اور پرہیز گاری میں ایک دوسرے کی مدد کیا کرو، گناہ اور زیادتی میں ایک دوسرے کی مدد نہیں کرو، اور اللہ سے ڈرتے رہو، بے شک اللہ سخت عذاب دینے والا ہے)۔

یہاں ''تعاون'' اپنے وسیع اور عمومی معنی میں آیا ہے، جس طرح ''بر'' کا لفظ، یقیناً باہمی تعاون اسلامی سماج کی اساس اور مسلم معاشرہ کی شاہ کلید ہے، باہمی تعاون سے بہت سے خطرات ٹل جاتے ہیں اور پہاڑ کے برابر مصیبتیں رائی کے مثل نظر آتی ہیں، اس کی چشم کشا مثالیں عہد رسالت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہؓ کے دور میں خوب ملتی ہیں، ان ہی میں ایک مثال یہ ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اشعری قبیلہ کے لوگوں کے پاس جب توشہ ختم ہوجاتا ہے درانحالیکہ وہ غزوہ میں ہیں، یا شہر میں رہتے ہوئے ان کے اہل وعیال کی خوردنی اشیاء کم ہوجاتیں تو جو کچھ ان کے پاس موجود ہوتے سب ایک کپڑا میں جمع کرتے، پھر آپس میں برابر ایک برتن سے تقسیم کر لیتے ہیں، تو وہ لوگ مجھ سے ہیں اور میں ان سے ہوں'' (بخاری: کتاب الشرکۃ (۴۷)، باب الشرکۃ فی الطعام والنہد والعروض (۱)، حدیث نمبر: ۲۴۸۶)۔

یہ حدیث تکافل کی عملی مثال ہے کہ تعاون کا عمل ان لوگوں کے درمیان ہورہا ہے جن میں سے بعض کا سرمایہ زیادہ ہے اور بعض کا کم اور بعض کا کچھ بھی نہیں، لیکن استفادہ میں سب برابر، جس کی وجہ سے جس نے کم جمع کیا اس کا استفادہ کرنا زیادہ لازم آرہا ہے، معلوم ہوا کہ معاملات کے مقابلہ میں تبرعات میں بعض اوقات وہ چیزیں معاف ہوتی ہیں جو معاملات میں معاف نہیں ہوتی ہیں، اسی وجہ سے جب تعاون اور بھلائی کا ارادہ ہو تو غرر، ربا اور قمار کا تحقق نہیں ہوتا ہے، وہیں جب نفع کا حصول مقصود ہو تو شرعاً ربا، قمار اور غرر کا تحقق ہوتا ہے اور معاملہ فاسد و ناجائز قرار پاتا ہے۔

مستقبل میں خطرات سے حفاظت کے لئے احتیاطی تدبیر:

مستقبل میں متوقع خطرات وحوادث سے تحفظ کی سوچ سے ہماری شریعت اسلامیہ انکار نہیں کرتی ہے، بلکہ قرآن وحدیث سے اس کی تائید ہوتی ہے، اور نتائج کو اسباب سے جوڑنا عین سنت کائنات کے مطابق ہے، کیونکہ خالق کائنات نے اس دنیا کو دار الاسباب بنایا ہے، جیسا کہ قرآن نے سورہ یوسف میں حضرت یوسف کا اسوہ حسنہ نقل کیا ہے، اور اللہ تعالی نے حضرت یوسف کی زبانی خوشحالی کے سالوں میں غلہ کو ذخیرہ اندوزی کرنے کی رہنمائی کی، تاکہ قحط سالی کے زمانے میں کام آئے، اس طرح مسلمانوں کو مستقبل کے خطرات سے نبرد آزما ہونے اور اس سے تحفظ کی احتیاطی تدابیر اختیار کرنے کی طرف اشارہ فرمایا، چنانچہ ارشاد ربانی ہوتا ہے:

{قال تزرعون سبع سنين دأباً فما حصدتم فذروه فى سنبله إلا قليلاً مما تأكلون، ثم يأتى من بعد ذلك سبع شداد يأكلن ما قدمتم لهن إلا قليلاً مما تحصنون} (یوسف: ۴۷-۴۸)۔

(یوسف نے کہا: سات برس تک لگاتار تم لوگ کھیتی باڑی کرتے رہو گے، اس دوران میں جو فصلیں کاٹو ان میں سے بس تھوڑا سا حصہ، جو تمہاری خوراک کے کام آئے نکالو اور باقی کو اس کی بالیوں ہی میں رہنے دو، پھر سات برس بہت سخت آئیں گے، اس زمانے میں وہ سب غلہ کھا لیا جائے گا جو تم اس وقت کے لئے جمع کرو گے، اگر کچھ بچے گا تو بس وہی جو تم نے محفوظ کر رکھا ہو)۔

ایک حدیث میں آیا ہے کہ نبی کریم ﷺ حجۃ الوداع کے سال جس وقت حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کے پاس ان کی عیادت کے لئے تشریف لائے تو حضرت سعد بن ابی وقاصؓ عرض کناں ہوئے یارسول اللہ! میں اپنا سارا مال وصیت کروں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: نہیں، حضرت سعدؓ کہتے ہیں: میں نے کہا: نصف وصیت کروں؟ پھر آپ ﷺ نے فرمایا: نہیں، میں نے کہا: تہائی حصہ؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: ہاں، تہائی حصہ، اور تہائی حصہ بہت ہے، تم اپنے (پسماندگان) ورثہ کو مالدار چھوڑو، یہ بہتر ہے اس سے کہ تم انہیں محتاج چھوڑو کہ وہ دوسرے لوگوں کے سامنے دست سوال پھیلائیں (بخاری: کتاب الوصایا (۵۵) باب أن یترک ورثۃ أغنیاء (۲)، حدیث نمبر: ۲۷۴۲)۔

اسلامی انشورنس (تکافل) کی مشروعیت:

اسلامی انشورنس (تکافل) کی مشروعیت پر بعض دلائل قرآن وحدیث کے حوالہ سے آچکی ہیں، ان کے علاوہ مزید وہ آیات اور احادیث تکافل کی مروجہ شکل کی مشروعیت وجواز پر مستدل بن سکتی ہیں جن میں تعاون علی البر والتقوی، باہمی امداد وتناصر، اخوت، بھائی چارگی اور بہی خواہی کا ذکر ہے، جہاں تک عقلی دلائل کی بات ہے تو حقیقت یہی ہے کہ اس میں عقلی اعتبار سے کوئی قباحت نہیں ہے، بلکہ عقل متقاضی ہے کہ انسان اپنے مستقبل کے متوقع خطرات سے تحفظ کا نظم کرے، انسانیت کی رو سے بعض بعض کی مدد کرنی چاہئے اور خطرات کو اپنے درمیان تقسیم کرنی چاہئے، اس سے مجموعی طور پر مسلم معاشرہ کی اقتصادی حالت اچھی ہوگی، اور وہ معیشت کے میدان میں ترقی کرے گا، اور دوسری ترقی یافتہ قوموں کے دوش بدوش فخر کے ساتھ چلنے کے لائق ہو سکے گا۔

نیز تکافل کے جواز کی تائید قواعد فقہیہ سے بھی ہوتی ہے، چنانچہ اسلامی قوانین کے ماہرین نے لکھا ہے: ''الحاجۃ تنزل منزلۃ الضرورۃ عامۃ کانت أو خاصۃ'' (الاشباہ والنظائر لابن نجیم ۱۲،۹۳)۔ ظاہر ہے کہ کوئی شخص بھی ممکنہ خطرات سے حفاظت کا دعوی نہیں کرسکتا، آج یہ کسی بری مصیبت سے دوچار ہوا تو کل فلاں شخص، آج اس کی باری ہے تو کل فلاں کی، یہ سلسلہ قیامت تک جاری رہے گا، معلوم ہوا تکافل ایک اجتماعی ضرورت بھی ہے، اس لئے بھی اسے مشروع ہونا چاہئے، اور جبکہ اس میں کوئی شرعی قباحت قمار، اور ربا وغیرہ بھی نہیں ہے۔

اگر تکافل کا نظام مسلم سماج میں قائم نہ ہو تو مصیبت زدہ مسلمان مزید پستی میں ہی جائے گا، اور مجموعی طور پر پورا مسلم سماج پستی کا شکار ہوگا، اس لئے قیاس کا تقاضا ہے کہ اس مسابقتی دور میں پستی کے نقصان، کو دور کیا جانا چاہئے، جیسا کہ اسلام کا اصول ہے: ''الضرر یزال'' (الاشباہ والنظائر لابن نجیم ۱،۸۶)۔ یعنی ضرر ونقصان کو حتی الامکان دور کیا جائے۔

یہ بھی ایک حقیقت اور انسانی طبیعت ومزاج سے قریب تر ہے کہ جب مصیبت تقسیم ہوجاتی ہے تو انسان کا سر ہلکا محسوس ہوتا ہے، غم میں جب ایک سے زیادہ لوگ شریک ہوتے ہیں تو غم کو برداشت کرنے میں تقویت ملتی ہے اور انسان کو بڑا حوصلہ ملتا ہے، پھر وہ بڑی سے بڑی مصیبت کو آسانی سے سامنا کرنے کے لئے تیار ہوجاتا ہے؛ اسی لئے فقہاء نے فطرت انسانی کے مزاج ومذاق کی ترجمانی کرتے ہوئے سچ لکھا ہے: ''ما عمت بلیتہ خفت قضیتہ'' (حوالہ سابق ۱،۸۵)۔ یعنی جس کی مصیبت عام ہوجاتی ہے، وہ مصیبت صرف ایک آدمی کی نہیں رہتی ہے، بلکہ بہت سے لوگ اس میں مبتلا ہوتے ہیں، اور سب کے درمیان وہ مصیبت مشترک ہوجاتی ہے تو مسئلہ آسان اور ہلکا ہوجاتا ہے، اور تکافل کا بنیادی نظریہ اور اس کی روح یہی ہے کہ خطرات ومصائب چند لوگوں کے درمیان منقسم ہوجائیں اور باہم تعاون اور انسانی اخوت اور ہمدردی کی صحیح تصویر نمایاں ہو۔

مقاصد شریعت میں سے مسلم سوسائٹی کی حفاظت اور اسلامی معاشرت کا تحفظ وفروغ، باہمی امداد وتناصر اور اخوت وہمدردی کی خوش گوار فضا بنانا ہے، اور یہی نظریہ تکافل کی بنیاد ہے (القواعد الفقہیہ المنظمۃ از عطیہ عدلان عطیہ رمضان ر ۲۲۰)۔

موجودہ دور میں عالم اسلام میں مروجہ اور مقبول تکافل کی تعبیر کی نظیریں شریعت اسلامیہ میں پہلے سے پائی جاتی ہیں، اس کی روح بہت پہلے سے چلی آرہی ہے، البتہ تکافل کے بجائے کسی اور نام سے، ان ہی میں سے یہ ہیں:

عاقلہ: قتل خطأ میں دیت لازم ہوتی ہے، جسے اردو میں ''خون بہا'' سے تعبیر کیا جاتا ہے، اس کی مالیت بڑی خطیر رقم ہوتی ہے، یعنی سو اونٹ یا اس کی قیمت، تنہا قاتل کے لئے برداشت کرنا دشواری کا باعث ہے، اس لئے اس کے عاقلہ (خاندان کے لوگ) پر دیت کی رقم کو تقسیم کردیا گیا، اس طرح کے ناقابل برداشت بوجھ کو اس کے اہل خاندان پر بانٹ دیا گیا، ایسا اس لئے کیا گیا کہ کوئی شخص خطأ سے محفوظ نہیں ہے، آج اس سے غلطی ہوئی اور یہ دوسرے افراد خاندان کی مدد کا محتاج ہوا، کل دوسرے سے غلطی ہوسکتی ہے اور وہ بھی دوسروں کی مدد کا محتاج ہوگا، اس لئے مناسب ہے کہ خاندان کے کسی فرد سے قتل خطأ صادر ہوجائے تو سب

مل کر اس کا تعاون کریں، تکافل میں بھی ایسا ہی ہوتا ہے کہ خطرات و مصائب گروپ کے تمام لوگوں پر تقسیم ہوجاتی ہیں اور باہمی تعاون کا مظہر سامنے آتا ہے۔

ضمان خطر الطریق: ایک شخص دوسرے کو راستہ میں رہبری کرتے ہوئے کہا: اس راستہ سے جاؤ یہ راستہ مامون اور قابل اطمینان ہے، اگر نقصان ہوا تو میں اس کا ذمہ دار ہوں، درانحالیکہ اس میں مالی معاوضہ کی شرط نہ ہو، ایسی صورت میں اگر اس مسافر کا مال لٹ گیا تو ضمانت قبول کرنے والا شخص مال کا ضامن ہوتا ہے (دیکھئے: ردالمحتار ۳؍۳۴۵)، اس طرح راہگیر ممکنہ مالی خطرہ سے محفوظ ہوجاتا ہے، تکافل میں ایسا ہی ہوتا ہے کہ گروپ کا ہر فرد ممکنہ خطرات سے اپنے کو محفوظ کرلیتا ہے۔

اس نظام تکافل جس کی بنیاد باہمی امداد اور تبرع پر ہے، کے جواز کے فیصلہ فقہی اکیڈمیاں نے مختلف سمیناروں میں کیا ہے، چنانچہ "مجمع البحوث الاسلامیہ جامع ازہر" کے اجلاس ۱۳۸۵ھ، "مجمع الفقہ الاسلامی مکہ مکرمہ" کے سمینار منعقدہ شعبان ۱۳۹۸ھ، اور "ہیئۃ کبار العلماء سعودی عرب" کے اجلاس منعقدہ ریاض ربیع الثانی ۱۳۹۷ھ نے بہ اتفاق رائے اس کے جواز کا فیصلہ کیا ہے (دیکھئے: عقود التامین للشیخ احمد محمد جمال ر ۱۰۴، مجلۃ الاقتصاد الاسلامی جمادی الاولی ۱۴۰۲ھ، التامین التعاونی للدکتور علی محی الدین القرہ داغی ر ۱۴)۔

اسلامی انشورنس (تکافل) کی عملی تطبیق: ...... موجودہ دور میں مروجہ انشورنس کو شرعی نقطہ نظر سے جائزہ لیتے ہوئے، اس کی شرعی صورت کیا ہوسکتی ہے؟ پر غور کرنے سے اندازہ ہوتا ہے، وقف ہبہ، وکالت، مضاربت اور نہد کی بنیاد پر تکافل کی عملی تطبیق اور اس کا طریقہ کار پیش کیا جاسکتا ہے، اور وہ یہ ہے:

۱۔ نظریاتی اعتبار سے:

اسلامی انشورنس (تکافل) کا معاملہ کرتے وقت ابتداءً ہی، بلکہ اگر فارم ہو اور اس کے شروع میں انتظامی نقطہ نظر سے کچھ ضروری قانونی دفعات جہاں درج ہوں وہیں بالکل فارم کے سرے پر یا سرورق پر سنہرے اور جلی حروف میں نظریاتی اعتبار سے چند ضروری امور لکھے ہونے چاہئیں، اور وہ یہ ہیں:

الف۔ تکافل کی بنیاد باہمی تعاون اور تبرع پر ہوگی۔ ب۔ تکافل کے پورے نظام میں شرعی احکام کی پابندی لازماً ہوگی۔

ج۔ تکافل کی تمام تر سرگرمیوں کی نگرانی اور اس کا برابر شرعی نقطہ نظر سے جائزہ لینے کے لئے ایک شرعیہ بورڈ ہے (واقعی میں شرعیہ بورڈ قائم ہونا چاہئے جس میں ماہرین علماء ہوں گے، اگر کمپنی کے پاس خود قائم نہ ہو تو معتبر کسی دینی ادارہ کے دارالافتاء سے خدمت حاصل کی جائے)۔

د۔ سود، قمار، غرر، جہالت فاحشہ اور دیگر ممنوعات شرع سے خالی ہو۔

۲۔ کمپنی کا قیام:

تکافل کے نظام کو بروئے کار لانے کے لئے اور اس نظام کو فعال بنانے کے لئے ضروری ہوگا کہ اس کو کمپنی کی شکل دی جائے، اس کی صورت یہ ہوگی کہ ابتداء میں کچھ لوگ مثلاً پانچ یا سات آدمی مل کر ایک معتد بہ مقدار رقم اس مقصد کے لئے وقف کریں۔ اس میں یہ شرط لگائی جاسکتی ہے کہ اگر خدانخواستہ کسی بھی وجہ سے کمپنی بھنگ ہوگئی تو یہ لوگ یا ان کے ورثہ موقوفہ سرمایہ واپس لیں گے، اسی طرح یہ بھی شرط لگائی جاسکتی ہے کہ اس کمپنی کا قیام اتنی مدت، مثلاً بیس سال کے لئے ہے۔

اس وقف سے ایک آفس قائم ہوگا جہاں لوگ آیا کریں گے، اس سے کسی کا تعاون نہیں ہوگا، تعاون کے لئے دوسری رقم بالاقساط لی جائے گی۔

ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ کمپنی کے قیام کے لئے ایک بورڈ کی تشکیل عمل میں آئے، اس بورڈ کے اساسی ممبران کے انتخاب کا معیار کثرت رقم ہو، یعنی جو لوگ زیادہ روپے جمع کریں، ان میں اول فالاول کی ترتیب سے پانچ یا سات افراد منتخب کئے جائیں، گویا کہ ان افراد پر مشتمل بورڈ ہوگا، یہ لوگ اساسی ارکان عاملہ کہلائیں گے، پھر ان میں سے کوئی صدر، نائب صدر اور سکریٹری وغیرہ کے عہدیدار منتخب ہوں گے، چاہے یہ حضرات از خود بلا تنخواہ کام کریں یا معاوضہ کی بنیاد پر کام کریں، یا دوسرے ملازمین رضا کارانہ یا اجرت کی بنیاد پر رکھ لئے جائیں، اور یہ حضرات اوپر سے نگرانی رکھیں، انتظامی امور باہمی مشورہ سے طے کیا کریں گے اور دیگر قانونی کاروائی وغیرہ اہم کام انجام دیں گے۔

یہ لوگ مرکزی آفس اور ذیلی آفسوں کے لئے زمین کی خریداری اور اس پر آفس کی تعمیر کے لئے اتنی رقم وقف کریں جس سے پورا کام ہوجائے، جیسا کہ اوپر ذکر کیا، یا پھر کرایہ کے مکان میں آفس کھولے جائیں، یا کوئی عاریت پر مکان دیدے جس میں آفس کھولا جائے، عاریت پر مکان ملنے کی صورت میں مدت کی تعیین کرلینا ضروری ہوگا، ورنہ آگے چل کر انتظامی اعتبار سے پریشانی ہوگی، یا کوئی صاحب صدقہ جاریہ کے طور پر آفس کی تمام تر ضروریات زمین سے لے کر تعمیر اور فرنیچرس وغیرہ

تک مہیا کردیں ایسی صورت میں یہ بھی وقف ہی کے حکم میں ہوگا، اور وقف صدقہ جاریہ ہی کی ایک شکل ہے جس میں عین شی کو باقی رکھتے ہوئے فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔

۲۔ اس کے بعد ایک عمومی ارکان کا بورڈ ہوگا جس میں دوسرے شرکاء و مساہمین ہوں گے، اگر تکافل کے مرکزی آفس کے علاوہ مختلف شہروں میں اس کی شاخیں (Branchs) قائم ہوں تو ان کے بورڈ کمیٹی میں سے ایک ایک فرد کو مرکزی عمومی ارکان بورڈ میں شامل کیا جائے، اور ہر شاخ (Branch) کے بورڈ کمیٹی آپس میں مشورہ یا انتخاب کے ذریعہ کسی ایک فرد کو مرکزی آفس بورڈ کے عمومی ارکان کے لئے نامزد کرے۔

۳۔ تکافل کمپنی جب ترقی پذیر ہو، اس کا دائرہ وسیع ہوجائے، اور لوگوں کا رجحان اس کی طرف زیادہ ہونے لگے، لوگوں کی طلب کو دیکھتے ہوئے مزید اس کی برانچیں مختلف مقامات پر قائم کرنے کی ضرورت محسوس ہو تو اس کا طریقہ کار یہ ہوگا ایک صدر مقام ہو جہاں اس کا مرکزی آفس قائم ہو، اس کے تحت جن شہروں میں برانچوں کے قیام کی ضرورت ہو وہاں اس کی ایک آفس کھول دیا جائے، اور تمام شاخوں کے اصل مرکزی آفس سے روابط ہونے چاہئیں، جیسا کہ اوپر ذکر آچکا ہے۔

۴۔ انتظامی نقطہ نظر سے ہر کام کے کاؤنٹر مستقل اور الگ ہونے چاہئیں، اس طور پر کہ مختلف پیشوں سے تعلق رکھنے والے لوگوں کے اعتبار سے ہر پیشہ کا کاؤنٹر علاحدہ ہو، مثلاً: کاروباری انشورنس، میڈیکل انشورنس، گاڑیوں کا انشورنس، دوکانوں کا انشورنس، سامانوں کا انشورنس وغیرہ۔

۵۔ اسلامی انشورنس ایک ایسا بھی ہونا چاہئے جو دوسرے اسلامی انشورنس کا صرف انشورنس کرے، ظاہر ہے کہ حکومت کے تعاون کے بغیر اس کا قیام مشکل ہے، اور یہ مسلم ممالک ہی میں عملاً ممکن ہے، غیر مسلم ممالک میں دشوار ہے، ہاں اگر بعض مخیر مسلم تجار اس مقصد کو عملی جامہ پہنانے کے لئے کمربستہ ہوجائیں تو کوئی مستبعد نہیں۔

۶۔ تنظیم کی ایک مجلس اعلی ہو جو طریقہ کار طے کرے اور وہ شرعی قواعد سے ہم آہنگی کے بعد نافذ العمل ہے۔

۷۔ اس مجلس اعلی کے ارکان میں سے کسی کو حکومت اپنا نمائندہ مقرر کرے، اور حصہ داروں کی طرف سے منتخب افراد ہی مجلس اعلی کے ارکان ہوں گے۔

۳۔ عقود اوران کے درمیان روابط کی نوعیت:

۱۔ ایک عقد بیمہ کمپنی اور بیمہ دار کے درمیان ہوگا، خواہ یہ عقد وکالہ بہ اجرت یا وکالت بغیر اجرت کی اساس پر ہو، اس صورت میں بیمہ کمپنی بیمہ داروں کی وکیل ہوگی، اور ان کی طرف سے بحیثیت وکیل پوری دفتری کاروائی انجام دے گی، حتی کہ دوسری انشورنس کمپنی۔ جو کہ ربا، قمار، غرر، جہالت اور دیگر موانع شریعت سے پاک ہو۔ سے انشورنس کرانے اور اس سے متعلق دفتری کاروائیاں بروئے کار لانے میں وکیل ہوگی۔

۲۔ دوسرا عقد مضاربت کا ہوگا جو کمپنی اور بیمہ داروں کے درمیان ہی ہوگا، بیمہ دار رب المال (سرمایہ کے مالک) ہوں گے، اور کمپنی مضارب ہوگی، البتہ بیمہ دار کے لئے ضروری ہوگا کہ وہ تکافل کے مد میں علاحدہ قسط جمع کرے اور سرمایہ کاری کے لئے علاحدہ سے رقم دے، تاکہ تکافل کا جو بنیادی مقصد باہمی امداد اور تبرع ہے وہ غالب رہے۔

عقد مضاربت کرتے وقت شرح نفع کمپنی اور بیمہ دار کے درمیان طے ہوجانا ضروری ہے، تاکہ آگے چل کر نزاع کا سبب نہ بنے۔

۳۔ عقد تبرع: یہ عبارت ہے خطرات کی تقسیم اور مصائب کو برداشت کرنے پر باہمی تعاون سے، اور وہ اس طرح سے ہوگا کہ چند لوگ بیک وقت یا بالاقساط روپے جمع کریں، تاکہ آئندہ ان ہی میں سے کوئی معاملہ میں صراحت کردہ خطرات وحادثات میں سے کسی حادثہ کا شکار ہوجائے تو اس کا تعاون ہوسکے، اس میں حصہ داروں کا مقصد تجارت اور دوسرے کے مالوں سے نفع کمانا نہیں ہوتا ہے، گو یہ عقد تبرع ایک طرفہ نہیں ہوتا ہے، بلکہ دوطرفہ ہوتا ہے، کیونکہ اس میں معاوضہ کی شرط ہوتی ہے، اسی وجہ سے یہ ہبہ بالعوض سے قریب ہوگا۔

ہبہ دو طرح کا ہوتا ہے، ایک ہبہ بلاعوض، دوسرا ہبہ بالعوض، پہلی قسم بالاتفاق درست ہے، دوسری قسم کے بارے میں اختلاف ہے، تاہم جمہور فقہاء (چنانچہ صاحب ہدایہ نے ہبہ کرنے والے کا ہبہ سے رجوع کے جواز کی تعلیل کرتے ہوئے لکھا ہے: "لأن المقصود بالعقد هو التعويض للعادة" علامہ بابرتی اس پر حاشیہ لکھتے ہیں: ''لأن العادة الظاهرة أن الإنسان يهدى إلى من فوقه ليصونه بجاهه وإلى من دونه ليخدمه وإلى من يساويه ليعوضه'' (هدايه مع شرح العناية وتكملة فتح القدير ۹،۴۰) ط: مصطفی حلبی شرح خرشی میں لکھا ہے: ''وهبة الثواب عطية قصد بها عوض مالی'' (۷،۱۰۲، ط: بولاق، مصر ۱۳۱۷ھ)۔ شوافع کے یہاں اختلاف ہے، تاہم اظہر قول کے مطابق اگر عوض معلوم ہو تو درست ہوگا، اور اگر عوض مجہول ہو تو صحیح مذہب کے مطابق درست ہے، اور جمہور شوافع نے اسی کو راجح قرار دیا ہے (دیکھئے: روضۃ الطالبین ۵ /۳۸۴-۳۸۷) نے جائز قرار دیا ہے، اسی طرح گو عوض کی شرط ہو پھر بھی جمہور فقہاء کے یہاں درست ہے، کیونکہ عوض کی شرط تقاضائے عقد ہبہ کے خلاف نہیں ہے (التأمين التعاوني ماهيته وضوابطه ومعوقاته

از ڈکتور علی محی الدین القرہ داغی ۴۶/۶)، اور چونکہ عقود میں اعتبار مقاصد و معانی کا ہوتا ہے نہ کہ الفاظ و عبارت کا (العبرۃ فی العقود بالمقاصد والمعانی دون الألفاظ والمبانی)۔

ہبہ بالعوض کے درست ہونے کی تائید احادیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور آثار صحابہ سے بھی ہوتی ہے، چنانچہ حضرت ابو ہریرہؓ، حضرت ابن عباسؓ، اور حضرت عبد اللہ بن عمرؓ سے مرفوعاً اور حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ، حضرت فضالہ بن عبیدؓ، اور حضرت ابوالدرداءؓ سے موقوفاً الفاظ میں معمولی اختلاف، لیکن معنی میں اتحاد کے ساتھ منقول ہے کہ جو ہبہ کرے وہ اپنے مال موہوب کا زیادہ حقدار ہے، تا آنکہ اس کو اس کا معاوضہ مل جائے" (مستدرک وبذیلہ تلخیص الذہبی ۵۲/۲، دار قطنی ۳۰۷/۷، السنن الکبریٰ للبیہقی ۱۸۱/۶، نیز دیکھئے: نصب الرایہ للزیلعی ۱۲۵/۴-۱۲۶، المحلی لابن حزم الظاہری ۸۹/۱۰، علامہ ابن حزم آثار صحابہ نقل کرنے کے بعد لکھا ہے: "ولا مخالف لہم" (المحلی ۸۹/۱۰-۹۸) اس پر بڑی لمبی گفتگو کی ہے)۔

اب دوسرا سوال یہ ہے کہ آیا عوض کی شرط کے ساتھ ہبہ دوسرے فریق کے لئے لازم ہوتا ہے یا نہیں، اس میں فقہاء کا اختلاف ہے، علامہ ابن رشد حفید اور علامہ ابن قدامہ نے لازم قرار دیا ہے (دیکھئے: المغنی ۶۴۹/۵، ۶۵۳، ط: ریاض، ڈاکٹر علی محی الدین قرہ داغی نے عقد ہبہ کے لزوم کو راجح قرار دیا ہے (التأمین التعاونی ماہیتہ وضوابطہ معوقاتہ ۵۱)۔

لہذا فقہاء کے اختلاف سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کہا جاسکتا ہے کہ ہبہ عوض کی شرط کے ساتھ لازم ہوگا، گو یہ قول جمہور فقہاء اسلام کا نہیں ہے، لیکن چونکہ لوگوں کو تعاونی انشورنس کی فی زمانہ سخت ضرورت ہے، خاص طور پر غیر مسلم ممالک میں جہاں مسلمانوں کے ساتھ حکومت کا تعاون برائے نام رہتا ہے، اس لئے یہ ایک اجتماعی حاجت ہے، اور شریعت مطہرہ میں حاجت کی رعایت رکھی گئی ہے (الحاجة تنزل منزلة الضرورة عامة كانت أو خاصة۔ الاشباہ والنظائر لابن نجیم ۹۳، ۱)، اور چونکہ قرآنی آیات واحادیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں ایفاء عہد کا ذکر ہے، مثلاً اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "اے وہ لوگو جو ایمان لاچکے ہو عہد پورے کیا کرو" (سورہ مائدہ: ۱)۔ صحیح بخاری کی روایت ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ...... منافق کی تین علامتیں ہیں: جب وہ گفتگو کرتا ہے تو جھوٹ بولتا ہے، جب وہ وعدہ کرتا ہے تو وہ وعدہ خلافی کرتا ہے، اور جب اس کے پاس امانت رکھی جاتی ہے تو وہ خیانت کرتا ہے (بخاری، ایمان، باب علامات المنافق، حدیث نمبر: ۳۳)۔ حضرت عبد اللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: کسی انسان کے لئے روا نہیں ہے کہ کسی کو عطیہ دے، یا ہبہ کرے پھر اس سے واپس لے (رواہ الترمذی، والنسائی، وابن ماجہ، وابوداؤد والحاکم وقال: صحیح الإسناد (۴۶/۲)، وابن حبان فی صحیحہ برقم: ۱۱۲۸) والدار قطنی دیکھئے: نصب الرایہ ۲۴/۴)۔ ایک دوسری حدیث میں ہبہ کرنے کے بعد واپس لینے کو قئی سے تشبیہ دی گئی (مسلم، حدیث نمبر: ۱۶۲، ۱۶۲۲)۔

غرضیکہ عوض کی شرط کے ساتھ ہبہ کا لزوم موجودہ تکافل کے لئے عمدہ اساس اور عملی تطبیق کے لئے بہترین نظیر ہے۔ مالکیہ کے یہاں تو تبرع واجب الایفاء ہوتا ہے، چنانچہ علامہ حطاب مالکی نے لکھا ہے کہ اگر کوئی شخص اپنے اوپر کچھ لازم کرتا ہے، اس لزوم کو کسی اور چیز پر معلق نہیں کرتا ہے، تو قضاءً اس پر اس کا پورا کرنا لازم ہے، یہاں تک کہ وہ مفلس ہوجائے، یا مرجائے، یا مرض الموت میں مبتلا ہوجائے، اس زمرہ میں ہبہ کو بھی شمار کیا ہے (وهو التزام الشخص نفسه شيئاً من المعروف من غير تعليق على شيئ فدخل فى ذلك الصدقة، والهبة... وهذا القسم يقضى به على الملتزم ما لم يفلس، أو يمت، أو يمرض مرض الموت إن كان الملتزم له معيناً، ولا أعلم فى القضاء به خلافاً، إلا على القول بأن الهبة لاتلزم بالقول، وهو خلاف المعروف من المذهب، بل نقل ابن رشد الاتفاق على لزوم الهبة بالقول، وإن كان الملتزم له غير معين" (تحرير الكلام فى مسائل الالتزام، والمنقول بنصه فى فتح العلى المالك ۱، ۲۱۷، ۲۱۸، ۲۱۹)۔

عقد تبرع کی نظیر حدیث پاک میں "نہد" کی ملتی ہے، جو کہ باہمی امداد وتعاون کی ایک شکل عہد رسالت میں رائج تھی، اس کا طریقہ یہ ہوتا تھا کہ سفر میں چند ساتھی مل کر اپنے اپنے اخراجات سفر جمع کرتے تھے، اس بات کا اہتمام ہوتا تھا کہ ہر ساتھی دوسرے ساتھی کے حصہ کے برابر جمع کرے، پھر وہ لوگ پورے سفر اس سے استفادہ کرتے تھے، اگر کچھ بچ جاتا تو باہم برابر تقسیم کرلیتے تھے۔ امام بخاریؒ نے اس کے جواز پر اور بھی دلائل نقل کئے ہیں (بخاری، کتاب الشرکۃ باب الشرکۃ فی الطعام والنہد والعروض)۔ حافظ ابن حجرؒ نے لکھا ہے کہ لوگ جمع کرنے میں برابر ہوتے تھے، لیکن استفادہ کرنے میں متفاوت، بلکہ بعض اوقات ان میں کوئی کچھ بھی استعمال نہیں کرتا تھا، یا بہت کم کھاتا تھا، لیکن وہ لوگ اس تفاوت کو نہیں دیکھتے تھے؛ کیونکہ ان لوگوں کا مقصود باہمی تعاون اور تبرع تھا، اسی وجہ سے بچ جانے پر آپس میں تقسیم کرلیتے تھے، دوسرے سفر کے لئے باقی نہیں رکھتے تھے (فتح الباری ۱۲۸/۵-۱۲۹)۔

یہ اسلامی انشورنس (تکافل) باہمی تعاون کا عین عکس ہے، دونوں کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے، سوائے اس کے کہ "نہد" کی قدیم صورت سفر میں پیش آتی تھی، آج موجودہ دور میں کمپنی کی شکل میں منظم انداز میں یہ کام انجام پاتا ہے۔

انشورنس بصورت تکافل۔ تحلیل وتجزیہ، شرعی حکم اور متبادل

مولانا عطاء اللہ قاسمی [1]

''تکافل'' انشورنس کا متبادل:

اسلامی ممالک نے تکافل کا نظام تجارتی بیمہ (کمرشیل انشورنس) کے متبادل کے طور پر اختیار کیا ہے۔ انشورنس کے خلاف فتوی کی بنیاد ایک تو یہ ہے کہ اس میں ''ربوا'' ہے جو حرام ہے، دوسرے یہ کہ ''قمار'' ہے، تیسرے یہ کہ اس میں ''غرر'' ہے۔ اسلامی معاشیات کے ماہرین کا خیال ہے کہ اگر ان بنیادی عناصر کو نکال دیا جائے تو انشورنس کے خلاف غالباً کوئی شرعی اعتراض باقی نہیں رہے گا، ان حضرات کا خیال ہے کہ تکافل میں نہ تو ''ربا'' ہے نہ ہی قمار اور غرر، اس لئے تکافل جائز ہونا چاہئے۔

بات بالکل صاف ہے کہ تکافل کی اصل زمین انشورنس ہے، اس لئے پہلے انشورنس کی ماہیت کا مختصراً ایک جائزہ لیا جائے، تاکہ اس زمین پر تعمیر ہونے والے ''تکافل'' کو اچھی طرح سمجھا جاسکے۔

انشورنس کی ماہیت:

محترم اوصاف احمد صاحب جو انشورنس کے تعلق سے نرم گوشہ رکھتے ہیں اس کے عناصر ترکیبی کی وضاحت اس طرح کرتے ہیں:

''واقعہ یہ ہے کہ انشورنس کی بنیاد ایک احصائی قانون پر ہے جسے بڑی تعداد کا قانون کہتے ہیں، نظریہ احتمال اسی احصائی قانون پر مبنی ہے جس کو انشورنس کے کاروبار میں استعمال کیا جاتا ہے۔ بڑی تعداد کا قانون بتاتا ہے کہ جیسے جیسے تعداد میں اضافہ ہوتا جاتا ہے کسی واقعہ کے ظہور پذیر ہونے کا احتمال کم ہوتا جاتا ہے۔

مثلاً کسی واقعہ کے امکانات صرف دو ہیں تو اس کا احتمال کہ وقوع پذیر ہو، پچاس فیصد ہے، لیکن اگر امکانات کی تعداد بڑھ کر دس ہوجائے تو اس واقعہ کے ہونے کا احتمال صرف دس فیصد رہ جائے گا، اسی طرح دو یا دو سے زائد واقعات کے ایک ساتھ ظہور پذیر ہونے کا مشترکہ احتمال اور بھی کم ہوگا، اگر ایک انشورنس کمپنی نے ہزار لوگوں کو آتش زنی کا بیمہ فروخت کیا تو اس کا احتمال صرف ہزار میں ایک ہے کہ کوئی شخص اپنے نقصان کی بھرپائی کا دعوی پیش کرے۔ اگر یہی کمپنی دس ہزار افراد کو یہی بیمہ فروخت کرے تو یہ احتمال گھٹ کر ہزار میں ایک رہ جائے گا۔

انشورنس کمپنیوں کو اس میں فائدے کا امکان نظر آتا ہے کہ بڑی تعداد کے قانون کی رو سے ان کے علم میں ہے کہ بیمہ کی رقم ادا کرنے والوں کی کل تعداد بیک وقت نقصان کا دعوی کرنے بھی نہیں آئے گی، چنانچہ اگر وصول کی گئی رقم ادا کی گئی رقم سے زائد ہوئی تو اس کو کمپنی کا فائدہ متصور کیا جائے گا'' (سہ روزہ دعوت خصوصی شمارہ اسلامی بینکاری ر۱۵۵، ۱۹ر۸ر۲۰۱۰ء)۔

یہ اقتباس ہمارے اس دعوی کی صریح دلیل ہے کہ انشورنس کا انسان کی حقیقی ضرورت سے کوئی تعلق نہیں، بلکہ یہ بلامحنت اکتساب زر کا بہترین ذریعہ ہے جس پر تحفظ اور امداد باہمی کا لیبل لگادیا گیا ہے۔

طریقہ کار میں مماثلت:...... تکافل ایک جدید کاروباری معاملہ ہے جس کی اصل زمین انشورنس ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دونوں کے طریقہ کار میں بڑی حد تک مماثلت اور مقاصد میں بھی اشتراک پایا جاتا ہے۔ انشورنس کے طریقہ کار پر شرعی اعتبار سے بہت مفصل طور پر بحث ہوچکی ہے۔ اس لئے وہ طریقہ کار جو دونوں میں مشترک ہیں ان پر از سرنو شرعی حیثیت سے بحث کرنا غیر ضروری ہے۔ تاہم مشترکہ طریقہ کار کو درج ذیل نکات میں اس طرح سمیٹا جاسکتا ہے استقصاء مقصود نہیں ہے صرف تعارف مقصود ہے۔

---

[1] مدرسہ ضیاء العلوم پورہ معروف۔

☆ تکافل میں کلیمز کی ادائیگی میں عموماً وہی شرائط ملحوظ رکھی جاتی ہیں جو سرمایہ دارانہ انشورنس میں ہیں، اگر دوران مدت وہ نقصان ہوجائے جس کی تلافی کے لئے پالیسی لی گئی ہے تو نقصان کی تلافی کردی جاتی ہے، بصورت دیگر پالیسی ہولڈر کو کچھ نہیں ملتا۔ البتہ تکافل کمپنی اپنی صوابدید پر کچھ بونس دے سکتی ہے۔

☆ انشورنس پالیسی حاصل کرنے کا ایک معیار اور پیمانہ ہے جس کو پورا کرنے کے بعد ہی کوئی شخص پالیسی حاصل کرنے کا مجاز ہوتا ہے، اسی طرح تکافل میں بھی ہوتا ہے کہ صرف وہی لوگ پالیسی حاصل کرنے کے ذریعہ اسپر اطمینان کرسکتے ہیں۔

☆ دونوں معاملات میں اگر کسی چیز کے متوقع نقصان کی تلافی کے لئے پالیسی لینی مقصود ہو تو اس چیز کی حیثیت اور حالت بھی دیکھی جاتی ہے۔

☆ بنیادی طور پر تکافل کی بھی وہی دو قسمیں کی گئی ہیں جو روایتی انشورنس کی ہیں:

۱۔ فیملی تکافل (لائف انشورنس کے متبادل)، ۲۔ جنرل تکافل (جنرل انشورنس کے متبادل)۔

☆ دونوں کے ممکنہ فوائد سے صرف اس کے پالیسی ہولڈر اور ممبران مستفید ہوسکتے ہیں، دوسرا؟ ہرگز نہیں،

☆ دونوں کی پالیسیاں حاصل کرنے والوں کے پیش نظر اپنے مخصوص اغراض ومقاصد ہوتے ہیں، دوسروں کا تعاون اور امداد باہمی کا دور دور تک پتہ نہیں ہوتا۔

تکافل کی انفرادیت:

تکافل کی وہ بنیاد جو اسے روایتی انشورنس سے ممتاز اور جدا کرتی ہے، نیز اس کے لئے شرعی جواز فراہم کرتی ہے، وہ یہ ہے کہ:

سب سے پہلے کچھ لوگ یا مالیاتی ادارے مل کر اپنے سرمایہ سے (نقد رقم) سے ایک کمپنی قائم کرتے ہیں جس کو "تکافل کمپنی" کہا جاتا ہے، اس کمپنی کے سرمایہ کا ایک حصہ وقف کرکے ایک پول بنادیا جاتا ہے، یہ پول کسی کی ملک نہیں ہوتا، بلکہ اپنا الگ قانونی وجود رکھتا ہے اور وقف پول کی یہ رقم ان متاثرین کے لئے ہوتی ہے جو تکافل پالیسیاں حاصل کرتے ہیں۔

تکافل کی یہ بنیادی شق ہی شرعی اعتبار سے محل نظر ہے کہ کیا نقد رقوم (دراہم ودنانیر، روپے پیسے) کا وقف جائز ہے، یا نہیں؟ چونکہ تکافل کی پوری عمارت اسی بنیاد پر قائم ہے، اس لئے اس پر تفصیل سے گفتگو کرنا ضروری ہے۔

نقد رقم وقف کرنے کے بارے میں امت میں دو رائیں ہیں: ایک جواز کی، دوسری رائے عدم جواز کی ہے۔

جواز کی رائے:

الف: "الفتاوی التاتارخانیہ" (شیخ فرید الدین عالم بن علاء م ۷۸۶ھ) میں امام زفر کے شاگرد محمد بن عبداللہ انصاری کی طرف جواز کا ایک فتوی منسوب ہے۔

۱۱۱۲۵۔ "وفی وقف الأنصاری وکان من أصحاب زفر قال: قلت: إذا وقف الرجل الدراهم والطعام أو ما یکال أو یوزن أتراه جائزا قال: نعم!" (۸٫۲۹ طبع دیوبند)۔

(سوال کیا گیا کہ ایک آدمی دراہم (نقد روپیہ) اور غلہ یا کوئی کیلی یا وزنی چیز وقف کرے تو کیا آپ اسے جائز کہیں گے؟ انہوں نے فرمایا: ہاں!)۔

مستفتی کا ذہن اس نکتہ کی چلا گیا کہ وقف میں شیٔ موقوفہ باقی رہتی ہے اور اس کا نفع صدقہ ہوتا ہے تو وقف دراہم وطعام میں یہ صورت کیسے ممکن ہوگی؟ چنانچہ اس نے سوال کردیا، فتح القدیر میں یہ سوال وجواب اس طرح مذکور ہے:

"قیل: وکیف؟ قال: یدفع الدراهم مضاربة ثم یتصدق بها فی الوجه الذی وقف علیه وما یکال ویوزن یباع ویدفع ثمنه مضاربة أو بضاعة" (فتح القدیر ....۳۲۲)۔ (دراہم کو بطور مضاربت تجارت میں لگائے اور اس کا نفع موقوف علیہم پر صدقہ کرے گا، اور غلہ وغیرہ اشیاء کو بیچ کر اس کی قیمت بطور مضاربت یا اصل سرمایہ کے طور پر دے گا)۔

ب۔ امام بخاری بھی جواز کے قائل ہیں، انہوں نے بخاری شریف "کتاب الوصایا" میں باقاعدہ ایک باب باندھا ہے جس میں انہوں نے سونے چاندی کے وقف کو گھوڑے اور سامانوں کے وقف کے زمرے میں رکھا ہے۔ لکھتے ہیں:

''باب وقف الدواب والكراع والعروض والصامت'' (جانوروں، گھوڑوں، سامانوں اور سونے چاندی کے وقف کا باب)۔

اس باب کے تحت انہوں نے حضرت عمرؓ کا ایک واقعہ ذکر فرمایا ہے:

''ان عمر حمل على فرس له فى سبيل الله أعطاها رسول الله ﷺ ليحمل عليها رجلاً، فأخبر عمر أنه قد وقفها يبيعها، فسأل رسول الله ﷺ أن يبتاعها فقال: لا تبتعها ولا ترجعن فى صدقتك''۔

(حضرت عمرؓ نے اپنا ایک گھوڑا راہ خدا میں دیدیا، انہوں نے وہ گھوڑا رسول اللہ ﷺ کو اس لئے دیا تا کہ آپ کسی آدمی کو سواری کے لئے دیدیں، پھر حضرت عمرؓ کو خبر ملی کہ اب وہ شخص اس گھوڑے کو بیچ رہا ہے، تو انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا کہ کیا وہ اس گھوڑے کو خرید لیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: اس کو مت خریدو اور اپنا صدقہ واپس نہ لو)۔

اس کے بعد امام بخاری نے اپنے اس موقف کی تائید میں امام زہری سے ایک اثر (فتوی) بھی نقل فرمایا ہے:

''قال الزهرى: فيمن جعل ألف دينار فى سبيل الله ودفعها إلى غلام تاجر له يتجر بها وجعل ربحها صدقة للمساكين والأقربين، هل للرجل أن يأكل من ربح ذلك الألف شيئاً إن لم يكن جعل ربحها صدقة للمساكين؟ قال: ليس له أن يأكل منها'' (بخاری شریف ۱/۳۸۹)۔

(امام زہری نے اس شخص کے بارے میں فرمایا جس نے ایک ہزار دینار راہ خدا میں دیئے اور اسے اپنے تاجر غلام کو اس غرض سے حوالہ کردیا کہ وہ اس سے تجارت کرے اور اس کا نفع مساکین اور رشتہ داروں پر صدقہ کردیا تو کیا وہ شخص اس نفع سے خود کھا سکتا ہے؟ خصوصاً جبکہ اس کا نفع مساکین کے لئے صدقہ نہ کیا ہو، تو امام زہری نے فرمایا کہ اس کے لئے جائز نہیں ہے کہ اس میں سے کچھ کھائے)۔

عدم جواز کی رائے:

دوسری رائے عدم جواز کی ہے، اکثر فقہاء اور اہل علم کی رائے میں نقد رقوم (روپے پیسے وغیرہ) کا وقف جائز نہیں ہے۔ علامہ ابن الہمام (م ۶۸۱ھ) تحریر فرماتے ہیں:

''وقال الشافعى: كل ما أمكن الانتفاع به مع بقاء أصله، ويجوز بيعه، يجوز وقفه، وہذا قول مالك وأحمد أيضاً، وأما وقف ما لا ينتفع به، إلا بالإتلاف كالذهب والفضة والمأكول والمشروب، فغير جائز فى قول عامة الفقهاء، والمراد بالذهب والفضة، الدراهم والدنانير، وما ليس بحلى'' (فتح القدیر ۵/۴۳۱ طبع کوئٹہ)۔

(امام شافعیؒ نے فرمایا کہ جس چیز کو باقی رکھ کر اس سے فائدہ اٹھانا ممکن ہو اس کی بیع جائز ہو تو اس چیز کو وقف کرنا درست ہے، یہ قول امام مالک اور امام احمد کا بھی ہے۔ بہرحال اس چیز کو وقف کرنا جسے خرچ کئے بغیر استفادہ ناممکن ہو، جیسے سونا، چاندی اور کھانے پینے کی چیزیں تو عام فقہاء کے نقطہ نظر سے ایسی چیز کا وقف کرنا جائز نہیں ہے، سونے چاندی سے مراد درہم ودنانیر ہیں اور وہ جو زیور کی شکل میں نہ ہو)۔

اس تشریح کے مطابق ائمہ مجتہدین نقد رقوم کے وقف کے ناجائز ہونے پر متفق ہیں۔

علامہ ابن قدامہ حنبلی لکھتے ہیں: ''وجملة ذلك أن الذى يجوز وقفه ما جاز بيعه وجاز الانتفاع به مع بقاء عينه وكان أصلاً يبقى بقاءً متصلاً كالعقار والحيوانات والسلاح والأثاث وأشباه ذلك'' (المغنی ۸/۲۲۱)۔

(خلاصہ کلام یہ کہ وقف اسی چیز کا جائز ہے جس کی بیع درست ہے اور اس کی ذات باقی رکھ اس سے فائدہ اٹھایا جاسکے اور وہ ایسی شئ ہو جو متصلاً باقی رہے، جیسے زمین، جانور، اسلحہ، اثاثہ یا اس طرح کی دوسری چیزیں)۔

دلائل جواز کا تجزیہ:

جواز کے حق میں جو دلائل منقول ہیں وہ جواز کے ثبوت کے لئے ناکافی ہیں، مثلاً:

قابل غور پہلو:

ہمارا ملک ہندوستان دینی معاملات میں بہت حساس واقع ہوا ہے۔ یہاں تکافل کمپنی اسلام اور علماء اسلام کے مزید بدنامی اور رسوائی کے علاوہ کچھ نہیں دے پائے گی، اس لئے تکافل کمپنی لانے کی کوشش نہ کی جائے۔

''تکافل'' انشورنس کا چربہ ہے جس کی اٹھان یہاں سے شروع ہوتی ہے کہ انسان حوادث وخطرات کی صورت میں نقصان کی تلافی کر سکے۔ غور کرنے کا مقام ہے کہ قدرتی حوادث وخطرات کی زد میں انسان کی جان ومال ہے، جبکہ انسان کی طرف سے اس کی جان ومال عزت وناموس، دین وشریعت، عقیدہ ومذہب، مساجد ومدارس تہذیب وثقافت بھی خطرات کی زد میں ہیں تو ان تمام خطرات سے تحفظ کے لئے کونسا انشورنس یا تکافل کارآمد ہوگا؟ اسی لئے کہا گیا ہے کہ انشورنس کا انسان کی حقیقی ضرورت سے کوئی تعلق نہیں، یہی وجہ ہے کہ برصغیر کے علماء نے انشورنس کا متبادل تلاش کرنے کی کبھی کوشش نہیں کی۔

قابل عمل متبادل:

اس کے برخلاف غیر سودی مالی نظام بنانے اور اسے چلانے کی کوششیں ہمارے علماء نے پورے طور پر کی ہیں، مسلم فنڈ وغیرہ کی شکل میں اس کے نمونے موجود ہیں۔ اصولی طور پر دیکھا جائے تو غیر سودی مالی نظام ہی ہندوستان میں بہترین متبادل اور قابل عمل صورت ہے۔ حضرت مولانا محمد تقی عثمانی مدظلہ تحریر فرماتے ہیں:

''اگر موجودہ بینکوں کا جائزہ لیا جائے تو ان کے بہت سے کام انسانی ضرورت بن چکے ہیں، آج ہر وہ شخص جس کے پاس بچت کی کوئی رقم ہے وہ اسے بینکوں میں رکھوانے پر تقریباً مجبور ہے، اگر یہ ضرورت نہ ہوتی تو کرنٹ اکاؤنٹ میں رقم رکھوانے کو جائز نہ کہا جاتا۔ اسی طرح بین الاقوامی تجارت میں بینکوں سے کوئی تاجر مستغنی نہیں ہوسکتا، رقوم کو ایک جگہ سے دوسری جگہ بھجوانے کے لئے بینکوں کے سوا کوئی محفوظ راستہ نہیں ہے، اس کے علاوہ لوگوں کی بچتیں ایک جگہ جمع کر کے ان کو ملک کی صنعت وتجارت میں استعمال کرنا بجائے خود ایک درست مقصد ہے۔

لیکن ان تمام جائز مقاصد کے لئے سود کا جو راستہ اختیار کیا گیا ہے وہ حرام اور مضر ہے، اس لئے ہم ایسا راستہ تلاش کرنے کے مکلف ہیں جس کے ذریعہ سود کی حرمت سے بچ کر وہ جائز مقاصد حاصل کئے جاسکیں جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے'' (غیر سودی بینکاری ۱۶)۔

شکر کا مقام ہے کہ ہندوستان میں بہت سے افراد اور ادارے حکومت کی سطح سے غیر سودی مالی نظام نافذ کرانے کے لئے سرگرم عمل ہیں اور الحمد للہ انہیں جزوی طور پر کامیابی بھی ملی ہے۔

جبکہ ملکی پیمانے پر اس کا نفاذ ملک کے مخصوص حالات کے پیش نظر طویل جدوجہد کا متقاضی ہے، ہمیں اس کے ساتھ ساتھ عوامی سطح پر قانون کے دائرہ میں رہتے ہوئے غیر سودی مالی نظام چلانے کی بھرپور کوشش کرنی چاہئے، واللہ الموفق وهو المستعان۔

☆☆☆

شرعی تکافل کا مروجہ ماڈل۔ ایک تعارف

ڈاکٹر محی الدین غازی[1]

اصطلاحات کا تعارف:

تکافل: (Insurance) اس سے مراد انشورنس کا وہ متبادل ماڈل ہے جس کے سلسلے میں یہ مانا جاتا ہے کہ یہ ماڈل شرعی اصول وضوابط کے مطابق ہے۔ زیر نظر مقالے میں جہاں تکافل کا لفظ استعمال ہوگا، اس سے مراد شرعی تکافل ہی ہوگا۔ اسلامی انشورنس کے الفاظ سے بھی یہی مراد ہوگا۔

تکافل کمپنی: (Insurance Compnay) یعنی وہ کمپنی جس کے قیام کا مقصد تکافل کی خدمات فراہم کرنا ہے۔

شریک افراد: (Subscriber,Policy Holder) وہ افراد جو متعین قسطیں تکافل فنڈ میں جمع کرتے ہیں۔

تکافل فنڈ: (Insurance Fund) وہ فنڈ جو شریک افراد کی ادا کی ہوئی قسطوں سے تشکیل پاتا ہے۔

زر اشتراک: (Premium) وہ متعین قسط جو شریک افراد جمع کرتے ہیں۔

زر تکافل: (Compensation) یعنی وہ رقم جو کسی متعینہ نقصان کی تلافی کے طور پر تکافل فنڈ سے دی جاتی ہے۔

مستحق: (Beneficiary) یعنی وہ فرد جس سے جڑے نقصان کی تلافی کے لئے زر تکافل دیا جاتا ہے۔

زیر نظر مقالے میں تکافل کے مروجہ ماڈل اور اس کے خدوخال کا تعارف کرایا جائے گا، تاہم اس کی جزئیات کا ذکر کرتے ہوئے ان سے متعلق فقہی اختلافات اور مناقشات سے خاص تعرض نہیں کیا جائے گا، جس کی اصل وجہ یہ ہے کہ متعدد علمی مجلسوں اور خاصے فقہی مباحثوں کے بعد تکافل کے اس ماڈل پر فقہاء زمانہ کی رائے بن چکی ہے، اور اس کی ضابطہ بندی کے لئے دو مستقل شرعی معیار، ''المعایير الشرعية'' (ازہیئۃ المحاسبۃ والمراجعۃ للمؤسسات المالیۃ الاسلامیۃ بحرین) میں شامل کئے جا چکے ہیں، ایک کا موضوع ''التامین الاسلامی'' ہے اور دوسرے کا موضوع ''اعادۃ التامین'' ہے، تاہم فقہاء زمانہ کے درمیان بعض جزئیات کے سلسلے میں موجود اختلاف کو ذکر کیا جائے گا۔

تکافل کی تعریف:

''المعایير الشرعية'' میں اسلامی انشورنس کی تعریف ان الفاظ میں کی گئی ہے:

''کچھ متعین خطرات کا اندیشہ رکھنے والے کچھ لوگوں کے درمیان ایک اتفاقیہ، جس کی رو سے ہبہ کردینے کے وعدہ کی بنیاد پر تمام شرکاء زر اشتراک ادا کریں گے۔ اس رقم سے انشورنس فنڈ تشکیل پائے، جس کی اپنی مستقل قانونی حیثیت ہو، اور اس کا مستقل ذمہ مالیہ ہو، اس فنڈ سے ان نقصانات کی تلافی کی جائے جو درج فہرست خطرات کے واقع ہوجانے سے کسی شریک کو پیش آئیں، یہ سب کچھ طے شدہ ضوابط اور دستاویزات کے مطابق ہو۔ اس فنڈ کا انتظام یا تو شرکاء کے درمیان سے منتخب ایک کمیٹی کے ذمہ ہو، یا متعین اجرت کے بالمقابل کسی مستقل کمپنی کے ذریعہ ہو، جس کا کام انشورنس سے متعلق کاموں کو انجام دینا ہو، اور فنڈ میں موجود رقومات کی سرمایہ کاری بھی ہو''۔

تکافل کے مراحل:

(ا) تکافل کمپنی کی تشکیل: ...... مشارکت کی بنیاد پر ایک تکافل کمپنی کی تشکیل ہوگی، اس کمپنی کے حصہ داروں کے درمیان شرکت کا تعلق ہوگا، شرکت

[1] دار الشریعہ برائے مالیاتی اور قانونی رہنمائی، دبئی، ممبر مجمع فقہاء الشریعۃ، امریکا۔

ومشارکت کے جملہ شرعی اصولوں کی اس کمپنی کے تشکیل نامے میں رعایت ضروری ہوگی۔ اس کمپنی کے اساسی نظام العمل میں اس بات کی صراحت ہوگی کہ یہ کمپنی جملہ امور میں شرعی احکام وضوابط کی پابند ہوگی، اس کو یقینی بنانے کے لئے، اس کمپنی کا ایک شریعہ بورڈ ہوگا جو ماہرین شریعت پر مشتمل ہوگا، اس کی قراردادیں اور فیصلے کمپنی کے لئے واجب العمل ہوں گے، نیز اسے کمپنی کے جملہ کاموں کی نگرانی کا موقعہ حاصل رہے گا۔

(۲) تکافل فنڈ کی تشکیل: ......زر اشتراک ادا کرنے والے شریک افراد کی رقومات سے تکافل فنڈ کی تشکیل ہوتی ہے، زر اشتراک کی نوعیت کلی طور پر ہبہ یا تبرع کی نہیں ہوتی ہے، بلکہ ان کی طرف سے اس بات کا وعدہ ہوتا ہے، کہ متاثر شریک افراد کو پہونچنے والے نقصان کی تلافی کے لئے فنڈ میں جمع شدہ مجموعی رقم اور اس رقم کی سرمایہ کاری سے حاصل منافع میں سے طے شدہ رقم بطور ہبہ دی جائے گی، باقی رقم ان افراد کی ملکیت رہے گی، اور اس کی سرمایہ کاری سے آنے والے منافع میں ان کا حسب اتفاق حصہ رہے گا۔ تکافل فنڈ میں شریک افراد کی طرف سے ہبہ کا وعدہ ہوتا ہے، وہیں تکافل فنڈ کے شرکاء اور تکافل کمپنی کے درمیان وکالت کا اقرارنامہ بھی ہوتا ہے، جس کی رو سے تکافل فنڈ کے انتظام سے جڑی ساری ذمہ داریاں متعین فیس کے عوض تکافل کمپنی کو انجام دینا ہوتی ہیں۔

(۳) تکافل فنڈ میں موجود رقم کی حیثیت:

تکافل فنڈ میں موجود رقم کی تین قسمیں ہوتی ہیں:

الف۔ زر اشتراک کی رقم

ب۔ زر اشتراک کی سرمایہ کاری سے حاصل ہونے والے منافع کی رقم

ج۔ احتیاطی مد میں جمع ہونے والی رقم

تکافل فنڈ میں رقومات کی موجودگی کو یقینی بنانے کے لئے سالانہ بچت میں سے ایک متعین رقم احتیاطی مد کے لئے وضع کر لی جاتی ہے، احتیاطی رقومات کے سلسلے میں عام رائے یہی ہے کہ وہ نہ تکافل کمپنی کی ملکیت ہوگی اور نہ تکافل فنڈ کے شرکاء کی، بلکہ وہ تکافل فنڈ میں بطور ہبہ رہے گی، اس سے تکافل فنڈ کی ضروریات اور تکافل سے جڑے مطالبات پورے کئے جاسکیں گے، تاہم تکافل فنڈ کے تحلیل ہوجانے کی صورت میں، وہ رقم خیرات کی مد میں خرچ کی جائے گی۔

پہلی دو مدوں کی رقومات کے سلسلے میں، میرے اندازہ کی حد تک تین تصورات پائے جاتے ہیں۔

پہلا تصور: زر اشتراک کی رقم کلیۃ طور پر تبرع ہے اور اس سے پیدا ہونے والا منافع بھی کلی طور پر تبرع ہے، گویا تکافل کمپنی کو بحیثیت وکیل اس کی فیس اور بحیثیت مضارب اس کا حصہ دینے کے بعد جو بھی صافی رقم بچتی ہے، وہ تکافل فنڈ کے شرکاء میں تقسیم نہیں ہوگی، بلکہ تکافل فنڈ میں رہے گی، اس سے تکافل فنڈ سے جڑے مطالبات کی ادائیگی ہوگی، اور فنڈ تحلیل کرتے وقت وہ پوری یا قیمانده رقم خیرات کردی جائے گی۔

دوسرا تصور: زر اشتراک کی رقم کی حیثیت وقف کی ہے، جس میں واقف نے وقف کی آمدنی سے خود مستفید ہونے کی شرط رکھی ہوئی ہے، چنانچہ زر اشتراک کی رقم پر تو شریک کا کوئی حق ملکیت نہیں رہ جاتا، تاہم اس سے پیدا ہونے والے منافع میں اس کا حصہ بنتا ہے۔

تیسرا تصور: زر اشتراک کی رقم اور اس سے حاصل ہونے والا منافع دونوں تکافل فنڈ کے شرکاء کی ملکیت ہیں، صرف وہ رقم ہبہ ہے جو زر تکافل ادا کرنے کے لئے دی جائے، باقی ہبہ نہیں ہے، گویا جس وقت شریک تکافل زر اشتراک جمع کرتا ہے، وہ ہبہ کے ارادے سے جمع نہیں کرتا، بلکہ اس کی نیت یہ ہوتی ہے، کہ اصل زر اشتراک اور اس کے منافع میں سے مستحق شرکاء کو زر تکافل ادا کرنے کے لئے جس قدر رقم کی ضرورت پڑے گی، بس وہی ہبہ ہوگی، باقی رقم اس کی اپنی رہے گی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے، کہ تکافل فنڈ سے جس قدر رقم مستحقین کے مطالبات، دیگر اخراجات، اور تکافل کمپنی کی فیس اور حصہ دینے کے بعد تکافل فنڈ میں باقی رہ جاتی ہے، اس میں سے احتیاطی مد کا حصہ نکالنے کے بعد باقیمانده پوری رقم کے حقدار تکافل فنڈ کے شرکاء ہوتے ہیں۔ معاییر شرعیہ میں اسی تیسرے تصور کو اختیار کیا گیا ہے۔

(۴) تکافل فنڈ کی سرمایہ کاری: ......گو کہ یہ تکافل کے عمل کا لازمی حصہ نہیں ہے، تاہم تکافل فنڈ کے مقاصد کو بہتر طریقے سے حاصل کرنے کے لئے یہ تجویز کیا گیا کہ تکافل فنڈ میں موجود رقم کی سرمایہ کاری کی جائے، اس کے لئے تکافل فنڈ کے شرکاء اور تکافل کمپنی کے درمیان مضاربت کا عقد انجام پاتا ہے، جس کی رو سے تکافل کمپنی تکافل فنڈ میں موجود رقومات کی سرمایہ کاری کرتی ہے، اور حاصل منافع دونوں کے درمیان متفقہ تناسب سے تقسیم ہوتا ہے، عقد مضاربت

کے علاوہ وکالت فی الاستثمار (ایجنسی برائے سرمایہ کاری) کا عقد بھی اختیار کیا جاسکتا ہے، جس کی رو سے تکافل کمپنی ایک متعین فیس کے عوض فنڈ میں موجود رقم کی سرمایہ کاری کرتی ہے، اور تمام تر منافع فنڈ کے شرکاء کو ملتا ہے، مروجہ انشورنس کمپنیاں اس مقصد کے لئے اپنے فنڈ میں موجود رقومات کو سودی قرضوں میں لگاتی ہیں، جبکہ تکافل کمپنی پابند ہوتی ہے کہ وہ تکافل فنڈ کی رقومات کی سرمایہ کاری صرف اور صرف انہیں طریقوں سے کرے جن کی شریعت میں اجازت دی گئی ہے۔

(۵) زرتکافل کی ادائیگی: ......تکافل فنڈ کے شرکاء کی جانب سے وعدہ ہوتا ہے کہ شرکاء میں سے کسی کو درج فہرست خطرات کے نتیجہ میں پیش آنے والے نقصانات کی تلافی کے لئے تکافل فنڈ سے رقم بطور ہبہ دی جائے گی، یہ رقم کبھی واقعی نقصان کے بقدر ہوتی ہے، اور کبھی واقعی نقصان اور اس پر ہونے والے واقعی صرفہ سے قطع نظر ایک متعین رقم کی صورت میں ہوتی ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ تکافل کبھی اشیاء سے متعلق ہوتا ہے، جیسے گاڑی کا تکافل، دوکان میں موجود سامان کا تکافل، مکان کا تکافل، بری بحری یا ہوائی راستوں سے بھیجے گئے سامان کا تکافل، علاج کا تکافل، اور کبھی انسان سے متعلق ہوتا ہے، جیسے موت یا کسی عضو کے بیکار ہوجانے کا تکافل۔ اشیاء کے تکافل کی صورت میں زرتکافل واقعی نقصان کے بقدر ہوتا ہے، مزید اس میں زرتکافل کی ایک اعلی حد بھی طے کی جاسکتی ہے، مثال کے طور پر ایک گاڑی کا تکافل اس شرط کے ساتھ کیا جائے کہ ایکسیڈنٹ کی صورت میں ہونے والے واقعی نقصان کی تلافی کی جائے گی، بشرطیکہ واقعی نقصان کی رقم ایک لاکھ روپے سے زیادہ نہ ہو، چنانچہ اگر واقعی نقصان پچاس ہزار روپے کا ہوا تو مستفید کو پچاس ہزار روپے ادا کئے جائیں گے، اور اگر دو لاکھ کا واقعی نقصان ہوا تو صرف ایک لاکھ روپے ہی ادا کئے جائیں گے۔ لیکن انسان سے جڑے تکافل میں واقعی نقصان کی تحقیق میں جائے بغیر موعودشدہ متعین رقم ادا کردی جائے گی، دونوں میں فرق کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے، کہ اصولی بات تو یہی ہے کہ نقصان کی صورت میں واقعی نقصان کی تلافی کی جائے اور اس سے زائد رقم اسے نہ دی جائے، لیکن چونکہ انسان کی زندگی یا اس کے کسی عضو کو پہونچنے والے نقصان کی کوئی قیمت متعین نہیں کی جاسکتی، اور جو بھی رقم بطور تلافی دی جائے وہ واقعی نقصان سے کم ہی ہوگی، اس لئے واقعی نقصان سے قطع نظر ایک متعین رقم دینے کی اجازت دی گئی۔

(۶) تکافل فنڈ کے ناکافی ہوجانے کی صورت:

ایسا ہوسکتا ہے کہ کسی خاص وقت میں تکافل کے تحت درج نقصانات اتنے زیادہ واقع ہوجائیں، کہ تکافل فنڈ میں موجود رقم سارے مطالبات کو پورا کرنے میں ناکافی ثابت ہو، اس صورت کے سلسلے میں درج ذیل تدابیر اختیار کی جاتی ہیں:

الف۔ تکافل کمپنی تکافل فنڈ کو اتنی رقم قرض دے دیتی ہے جس سے تکافل فنڈ میں موجود نقص کو دور کیا جاسکے، آئندہ سالوں میں جب تکافل فنڈ میں بچت ہوتو اس سے اس قرض کی ادائیگی ہوجاتی ہے۔

ب۔ تکافل فنڈ کے شرکاء سے مطالبہ کیا جاتا ہے کہ وہ اس کو زراشتراک مزید دیں، جس سے کہ نقص کو دور کیا جاسکے، یہ اسی صورت میں ہوسکتا ہے، جبکہ تکافل نامے میں اس التزام کو شریک تکافل نے قبول کیا ہو۔

(۶) تکافل فنڈ کے منافع کی تقسیم: ......تکافل فنڈ میں موجود رقم تکافل فنڈ کے شرکاء کی ملکیت ہوتی ہے، تکافل کمپنی کی حیثیت وکیل اور مضارب کی ہوتی ہے، تکافل کمپنی بحیثیت وکیل حسب اتفاق اپنی فیس کی حقدار ہوتی ہے قطع نظر اس سے کہ تکافل فنڈ کو نقصان ہوا یا فائدہ، البتہ بحیثیت مضارب وہ نفع میں شرکت کی حقدار اسی صورت میں ہوتی ہے، جبکہ تکافل فنڈ کو سرمایہ کاری کے نتیجہ میں نفع ہوا ہو، نفع کی صورت میں صافی نفع تکافل کمپنی اور تکافل فنڈ کے درمیان حسب اتفاق تقسیم ہوتا ہے۔

(۷) تکافل فنڈ کی صافی بچت

تکافل فنڈ کے شرکاء کے درمیان صافی بچت کی تقسیم ہوتی ہے، صافی بچت جاننے کا فارمولہ حسب ذیل ہے:

تکافل فنڈ میں موجود رقومات میں سے حسب ذیل رقومات ادا کردینے یا منہا کردینے کے بعد جو رقم بچتی ہے وہ صافی بچت ہے:

الف۔ تکافل فنڈ کے انتظام پر ہونے والا خرچ بشمول تکافل کمپنی کی فیس، اور تکافل کمپنی کا حصہ بحیثیت مضارب۔ ب۔ دوبرے تکافل یا ری انشورنس کی مد میں ادا کی گئی رقومات۔ ج۔ پیش آمدہ نقصانات کی تلافی پر ادا کی گئی رقومات۔ د۔ احتیاطی مد میں جمع کی جانے والی رقومات۔ ہ۔ تکافل کمپنی کی جانب سے تکافل فنڈ کو دیئے گئے قرض کی ادائیگی۔

(۸) تکافل فنڈ کے شرکاء کے درمیان بچت کی تقسیم:

منافع کے بجائے بچت کے لفظ کا استعمال اس لئے کیا گیا ہے، کیونکہ شرکاء میں ان کی اصل رقم اور اس سے پیدا ہونے والے منافع میں سے جو بھی مستحق شرکاء اور دیگر مدوں کے بعد بچ رہے گا وہ تقسیم ہوگا۔

چونکہ تکافل فنڈ کے بعض شرکاء نے پیش آمدہ نقصانات کی تلافی کے لئے رقومات لی ہوتی ہیں، کیا تکافل فنڈ کی بچت کی تقسیم میں اس امر کا لحاظ کیا جائے گا؟ اس سلسلے میں تین طریقے رائج ہیں:

پہلا طریقہ: اگر کسی شریک نے زر تکافل کے طور پر کوئی بھی رقم حاصل کرلی ہو تو وہ اس تقسیم میں شریک نہیں کیا جائے گا، زر تکافل کی مذکورہ رقم اس کے زر اشتراک سے زیادہ ہو یا کم ہو۔

دوسرا طریقہ: اگر کسی شریک نے زر تکافل کے طور پر کوئی رقم حاصل کی ہو تو بھی تقسیم پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑے گا اور سارے شرکاء کو ان کے زر اشتراک کی مقدار اور مدت کو پیش نظر رکھ کر برابر تقسیم کی جائے گی۔

تیسرا طریقہ: اس طریقہ میں حسب ذیل تفصیل ہے:

الف۔ اگر کسی شریک نے نقصان کی تلافی کے طور پر اتنی رقم حاصل کرلی ہے جو اس کے زر اشتراک ۔ کے برابر یا اس سے زیادہ ہو تو وہ تقسیم میں حصہ دار نہیں ہوگا۔

ب۔ اگر (الف) میں مذکورہ رقم اس کے زر اشتراک سے کم ہو تو باقی رقم کی بنیاد پر اس کو حسب تناسب تقسیم میں حقدار سمجھا جائے گا۔

تینوں مذکورہ طریقوں میں تیسرا طریقہ زیادہ عادلانہ معلوم ہوتا ہے۔

(۹) لائف تکافل سے متعلق وراثت کے مسائل:

زندگی سے جڑے تکافل میں یہ مسئلہ زیر بحث آتا ہے، فقہاء زمانہ کا موقف ہے کہ زر تکافل کو میت کے ترکہ میں شمار نہیں کیا جائے گا، اور وہ اس کو ملے گا جسے میت نے تکافل فنڈ میں شریک ہوتے وقت متعین کردیا ہو۔ اس کی فقہی توجیہ یہ ہے کہ مذکورہ رقم کا حقدار اگر میت کی زندگی میں متعین ہوگیا تو وہی اس کا مالک ہوگا، اور اس سے پہلے تکافل فنڈ اس رقم کا مالک ہوتا ہے، غرض میت اس کا مالک ہوتا ہی نہیں ہے کہ اسے اس کے ترکہ میں شمار کیا جائے، یہ عملی نکتہ بھی ملحوظ رکھنا ضروری ہے کہ لائف تکافل آدمی سے کبھی اس نیت سے کروایا جاتا ہے کہ اس کے مرنے کی صورت میں اس کے اوپر عائد مالی ذمہ داری کی اس رقم سے ادائیگی ہوسکے، اسی لئے زیادہ رقم کی تمویل کی صورت میں تمویلی ادارے اپنے کسٹمر پر لائف تکافل ضروری قرار دیتے ہیں، ساتھ ہی تکافل کی دستاویز میں (موت کی صورت میں) زر تکافل کا اولین حقدار متعلقہ مالی التزامات کی حد تک وہ تمویلی ادارہ ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں اگر کوئی مالی ذمہ داری تکافل میں شرکت کا سبب نہیں بنتی ہے تو عام طور سے تکافل کا شریک اپنے ورثہ کو زر تکافل کا مستفید متعین کرتا ہے، ایسی صورت میں راقم کی رائے یہ ہے کہ اس رقم کو وراثت کے اصولوں کے مطابق تقسیم کیا جائے۔

البتہ زر تکافل کے علاوہ اگر کوئی رقم بچت کی صورت میں میت کے حصہ میں آتی ہے، تو وہ میت کی ملکیت میں شمار ہوگی اور میت کے ترکہ کا حصہ بنے گی۔

مروجہ انشورنس اور شرعی تکافل میں فرق:

مذکورہ بالا تفصیلات کے بعد مروجہ انشورنس اور شرعی تکافل کے درمیان فرق واضح ہوجاتا ہے، جس کی تفصیل حسب ذیل ہے:

۱۔ مروجہ انشورنس میں انشورنس کمپنی اور بیمہ دار کے درمیان خرید وفروخت کا معاہدہ ہوتا ہے، انشورنس کمپنی متعین قسطیں لیتی ہے، اور ان کے عوض میں بیمہ دار کو متعینہ واقعات میں متعین معاوضہ دیتی ہے۔ جبکہ تکافل میں تکافل شرکاء کی رقمیں تکافل فنڈ میں جاتی ہیں، وہ رقمیں یا تو شرکاء کی ملکیت ہوتی ہیں یا تکافل فنڈ کی ملکیت ہوجاتی ہیں، تکافل کمپنی کی حیثیت وکیل کی یا اجیر کی ہوتی ہے، جو متعین فیس کے عوض اپنی انتظامی خدمات پیش کرتی ہے۔

۲۔ مروجہ انشورنس کی حرمت کی سب سے بڑی وجہ اس کا قمار (جوا) والا پہلو ہے، انشورنس کمپنی ایک طرح سے جوا کھیلتی ہے، اگر متعین واقعات پیش نہ آئے تو ساری رقومات انشورنس کمپنی کی جھولی میں چلی جاتی ہیں، اور اگر وہ واقعات بڑے پیمانے پر پیش آگئے تو انشورنس کمپنیوں کا نقصان اور بعض صورتوں میں دیوالیہ نکل جاتا ہے۔ جبکہ شرعی تکافل میں صورتحال مختلف ہوتی ہے، متعین واقعات پیش آئیں یا نہ آئیں، تکافل کمپنی کو اپنی متعینہ فیس مل جاتی ہے، واقعات نہ پیش آنے

کی صورت میں تکافل فنڈ کا فائدہ ہوتا ہے، اور زیادہ پیش آجانے کی صورت میں تکافل فنڈ کا نقصان ہوتا ہے، تکافل کمپنی کی حیثیت جواری کی نہیں ہوتی ہے۔

۳۔ مروجہ انشورنس میں انشورنس کمپنی کو بہر صورت معاوضہ دینا ہوتا ہے، خواہ بیمہ داروں کی جمع کی ہوئی رقم میں اس کی گنجائش ہو یا نہ ہو، تاہم شرعی تکافل میں متاثر شریک کو اسی وقت زر تکافل ملتا ہے، جبکہ تکافل فنڈ میں رقم موجود ہو۔ مزید یہ کہ زر تکافل کی حیثیت قطعاً زر اشتراک کے عوض کی نہیں ہوتی ہے، بلکہ یہ اس کو بقیہ شرکاء کی جانب سے بطور ہبہ ملتا ہے۔

۴۔ مروجہ انشورنس میں انشورنس کمپنیاں جمع شدہ رقومات کو طویل مدت سودی قرضوں پر دے کر زیادہ سے زیادہ سود حاصل کرتی ہیں، جبکہ شرعی تکافل میں تکافل فنڈ کی رقومات کی جائز طریقوں سے سرمایہ کاری کی جاتی ہے۔

۵۔ مروجہ انشورنس میں جو عقد معاوضہ پر مبنی ہوتا ہے، ایک رقم کے مقابلے میں اس سے کم یا زیادہ رقم ادا کی جاتی ہے، جو سود کے زمرے میں آتا ہے، جبکہ شرعی تکافل عقد معاوضہ نہیں ہے، اس میں شرکاء ہبہ کے وعدہ کے ساتھ رقومات جمع کرتے ہیں، اور نقصان سے متاثر فرد کو جو زر تکافل ملتا ہے اس کی حیثیت ہبہ کی ہوتی ہے، اور وہ بھی اس صورت میں، جبکہ تکافل فنڈ میں اس کی گنجائش ہو۔

۶۔ مروجہ انشورنس میں غرر کا پہلو حاوی ہوتا ہے، طرفین کو یہ معلوم نہیں ہوتا ہے کہ بیمہ دار کو نقصان کا معاوضہ حاصل کرنے کے عوض کتنی قسطیں ادا کرنی ہوں گی، جبکہ شرعی تکافل چونکہ ہبہ پر مبنی ہے، اس لئے غرر اور جہالت کا اس کی صحت پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔

۷۔ بیلنس شیٹ کو دیکھنے سے بھی دونوں طرح کی کمپنیوں کا فرق واضح ہوجاتا ہے، بیمہ داروں سے وصول کی گئی قسطیں عام انشورنس کمپنی کی بیلنس شیٹ میں کمپنی کے اثاثوں میں اور اس کی آمدنی میں دکھائی جاتی ہیں، جبکہ شرعی تکافل کی کمپنی اس رقم کو اپنی بیلنس شیٹ میں بطور آمدنی نہیں دکھا سکتی ہے، کیونکہ یہ رقم اس کی ملکیت نہیں، بلکہ تکافل فنڈ کی ملکیت ہوتی ہیں، اسی طرح زر تکافل کے طور پر مستحقین کو دی گئی رقم شرعی تکافل کمپنی کے خرچوں میں نہیں درج کی جاسکتی، جبکہ انشورنس کمپنیاں اس رقم کو کمپنی کے خرچوں میں دکھاتی ہیں۔

اسلامی انشورنس کے نو بنیادی ضابطے:

معاییر شرعیہ نے مذکورہ ذیل نو ضابطوں کے سلسلے میں تاکید کی ہے کہ وہ تکافل کمپنی کے اساسی نظام العمل میں اور تکافل پالیسی میں لازماً درج کئے جائیں:

۱۔ تبرع کا وعدہ: یہ صراحت کی جائے کہ شریک زر اشتراک اور اس کی آمدنی سے زر تکافل کی ادائیگی کے لئے تبرع کرے گا، اور اگر تکافل فنڈ میں کمی ہوجاتی ہے تو اس کمی کو دور کرنے کی ذمہ داری بھی حسب ضابطہ لے گا۔

۲۔ تکافل کا انتظام کرنے والی تکافل کمپنی دو الگ کھاتے قائم کرے گی، ایک کمپنی کا کھاتہ جس میں اس کے حقوق وواجبات درج ہوں گے، دوسرا تکافل فنڈ کے حقوق وواجبات کے لئے خاص ہوگا۔

۳۔ تکافل کمپنی تکافل فنڈ کے انتظام کے سلسلے میں وکیل ہوگی اور تکافل فنڈ میں موجود رقومات کی سرمایہ کاری کے سلسلے میں وکیل استثمار یا مضارب ہوگی۔

۴۔ تکافل فنڈ کا سرمایہ اور اس سے آنے والی آمدنی مزید اس سے جڑے التزامات صرف تکافل فنڈ کے کھاتے میں ریکارڈ ہوں گے۔

۵۔ ضوابط عمل میں یہ شامل کیا جاسکتا ہے کہ تکافل کمپنی کو تکافل فنڈ کی بچت کے سلسلے میں حسب ضابطہ اور مصالح کے حدود میں تصرف کی اجازت ہوگی، جیسے اس سے احتیاطی مد تشکیل دینا، زر اشتراک کو کم کرنا، یا خیراتی اداروں میں خیرات کرنا، یا اسے سارا یا کچھ شرکاء میں تقسیم کرنا، البتہ شرط یہ ہے کہ تکافل کمپنی کو اس بچت میں سے کچھ نہیں لینے کا حق ہوگا۔

۶۔ تکافل سے جڑے جتنے مخصصات ہیں اور جو سابقہ بچت جمع ہوتی رہی ہے، کمپنی کو تحلیل کرتے وقت سب خیراتی مدوں میں تقسیم کردیا جائے گا۔

۷۔ قابل ترجیح یہ ہے کہ تکافل کے شرکاء کو تکافل کے کاموں کو انجام دینے میں بھی شرکت کا موقعہ ملے، اس کے لئے مناسب قانونی صیغہ دریافت کیا جائے جس کے ذریعہ وہ نگرانی اور مفادات کے تحفظ کا اپنا حق استعمال کرسکیں، جیسے بورڈ آف ڈائریکٹرز میں ان کی بھی نمائندگی ہو۔

۸۔ تکافل کمپنی عہد کرے کہ وہ اپنی تمام تر سرگرمیوں اور سرمایہ کاریوں میں شریعت اسلامی کے احکام وضوابط کی پابند رہے گی، خاص طور سے حرام چیزوں یا

شرعاً حرام مقاصد کے لئے تکافل پالیسی نہ دے۔

۹۔ ایک شریعہ بورڈ کا تعین کیا جائے، جس کے فتوے کمپنی کے لئے لازمی حیثیت رکھیں، اس کے علاوہ اندرونی معاینہ اور جائزہ کے لئے ایک شعبہ یا انتظام بھی ہو۔

اعادہ تامین یا دوہرا تکافل:

چونکہ امکانات کی رو سے تمام نقصانات کے واقع ہوجانے کی صورت میں ان کی تلافی پر صرف ہونے والی پوری رقم زر اشتراک سے حاصل ہونے والی مکمل رقم سے بہت زیادہ ہوتی ہے، اور اس کا اندیشہ رہتا ہے کہ وسیع پیمانے پر ہونے والے نقصانات کی صورت میں تکافل کا پورا انتظام اپنے مقصد کی تکمیل میں ناکام ہوجائے، اس لئے عام انشورنس کمپنیوں کی طرح تکافل کمپنیاں بھی ان بڑی کمپنیوں کی پناہ تلاش کرتی ہیں، جو دوہرے انشورنس یا تکافل کی پیش کش رکھتی ہیں، تکافل کے جو ضابطے اور جو طریقہ کار عام تکافل کمپنی کے لئے ہے، وہی دوہرے تکافل والی کمپنی کے لئے بھی ہے، فرق اتنا ہے کہ تکافل کمپنی میں شریک عام فرد یا کمپنی ہوتی ہے، دوہرے تکافل کمپنی میں شریک تکافل کمپنی ہوتی ہے۔

ری انشورنس کمپنیاں چونکہ عام انشورنس کمپنیوں کی طرح عقد معاوضہ پر قائم ہیں اور وہ ساری قباحتیں جو انشورنس کمپنیوں میں پائی جاتی ہیں وہ سب ری انشورنس کمپنیوں میں بھی پائی جاتی ہیں، اس لئے ان سے تعامل اصولی طور پر حرام ہے۔

لیکن شرعی بنیادوں پر دوہرے تکافل کی خدمات پیش کرنے کے لئے جس سطح کی بڑی کمپنیاں مطلوب ہیں، ان کے نہ ہونے یا بہت کم ہونے کی وجہ سے، فقہاء زمانہ نے وقتی طور پر اور کچھ شرطوں کے ساتھ تکافل کمپنیوں کو اس کی اجازت دی ہے کہ وہ ایک وقتی تدبیر کے طور پر ری انشورنس کمپنیوں سے تعامل کریں اور ان کی پالیسی حاصل کریں۔ اجازت کی اساس مشہور فقہی قاعدہ ہے، "الحاجة العامة تنزل منزلة الضرورة" کہ عامۃ الناس کو درپیش حاجت ضرورت کا درجہ حاصل کرلیتی ہے، اور ضرورت کی موجودگی میں محذورات کی اجازت مل جاتی ہے۔

اس سلسلے میں اعادہ تامین کے لئے معاییر شرعیہ میں خاص شرعی معیار شامل کیا گیا ہے، جس میں مروجہ "ری انشورنس" کمپنیوں سے تعامل کے درج ذیل ضابطے بیان کئے گئے ہیں:

الف۔ آغاز اسلامی ری انشورنس کمپنیوں سے کیا جائے اور ضرورت باقی رہ جانے پر مروجہ ری انشورنس کمپنیوں سے تعامل کیا جائے۔

ب۔ تکافل کمپنیاں ری انشورنس کمپنیوں کی رقومات اپنے پاس اس طور سے نہ رکھیں کہ ان پر سود دینا پڑے۔ بلکہ ری انشورنس کمپنیوں کو اس پر راضی کیا جائے کہ ایسی رقومات تکافل کمپنیوں کے پاس وکالت یا مضاربت کی بنیاد پر رکھی جائیں۔

ج۔ طویل معاہدوں کے بجائے اسی قدر مدت کے معاہدے کئے جائیں جن کی ضرورت تقاضا کرے۔

د۔ تمام تر خطرات کو "ری انشورنس" کمپنیوں کی طرف منتقل کردینے کے بجائے کم سے کم مقدار کا "ری انشورنس" کرایا جائے۔

آخری نکتہ اس لحاظ سے خاص توجہ کا طالب ہے کہ ہوسکتا ہے سہولت پسند تکافل کمپنیاں اپنی فیس الگ کرکے اور تکافل فنڈ کی تمام تر رقومات "ری انشورنس" کمپنیوں کے حوالے کرکے اپنا کام آسان کرلیں، لیکن اگر تکافل فنڈ کی ساری رقم غیر اسلامی "ری انشورنس" کمپنیوں کے کھاتے میں چلی جائے تو پھر شرعی تکافل کا سارا نظام ہی بے معنی ہوکر رہ جاتا ہے، اس مقام پر تکافل کمپنی کے شریعہ بورڈ کی ذمہ داری بہت بڑھ جاتی ہے، کہ وہ صرف اسی حد تک "ری انشورنس" کمپنی سے تعامل کی اجازت دے جس حد تک ضروری ہو۔ دراصل یہ جاننے کے لئے کہ تکافل کمپنی واقعی کس حد تک واقعی شرعی تکافل کمپنی ہے، ایک پیمانہ یہ بھی ہے کہ وہ کس قدر خطرہ تکافل فنڈ کے اوپر ڈالتی ہے، اور کس قدر خطرات "ری انشورنس" کمپنیوں کی طرف منتقل کردیتی ہے، بہتر شرعی تکافل کمپنی وہ ہے جس کا کم سے کم انحصار مروجہ "ری انشورنس" کمپنی پر ہو۔

اسلامی بینکنگ اور اسلامی انشورنس: ...... اسلامی بینکنگ کا اسلامی انشورنس کمپنیوں کے فروغ میں قابل ذکر رول ہوتا ہے، اسلامی بینک کے تمویل اور استثمار کے وہ سارے صیغے جن میں اسلامی بینک اثاثوں کا مالک ہوتا ہے، جیسے اجارہ منتہیہ بالتملیک، مشارکہ اور شرکۃ الملک، اسلامی بینک کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ وہ ان اثاثوں کا انشورنس شرعی تکافل کمپنیوں کے ذریعہ کرائے، اسی طرح جب اسلامی بینک اپنے مفادات (جو اصلا رب المال، یعنی کھاتے داروں کے مفادات ہوتے ہیں) کے تحفظ کے لئے فائینانسنگ کے طالبین پر لائف انشورنس کو ضروری قرار دیتا ہے، اس صورت میں بھی شرعی تکافل کو اختیار کرنا ضروری ہوتا ہے۔ غرض جہاں اسلامی بینکنگ کو قبولیت حاصل ہوتی ہے، وہاں تکافل کمپنیوں کو بھی رواج ملتا ہے۔

☆☆☆

مروجہ سودی وقماری بیمہ کا متبادل شرعی انشورنس

مفتی کفایت اللہ[1]

بنیادی تصور اور اس کے چند تدریجی خاکے:

انسان اپنی زندگی کے مختلف مراحل ومواقع میں چھوٹی چھوٹی رکاوٹوں سے تو وہ کسی طرح نجات پالیتا ہے، لیکن کبھی بڑے بڑے ناگہانی مصائب کا شکار ہوکر بے بس ہوجاتا ہے، بالآخر اس کو بچنے کی امید تک باقی نہیں رہتی ہے، ایسے حالات میں مصیبت زدہ پر رحم کھانا انسانی فطرت کا تقاضا ہے، نیز عقل وشرع کا بھی تقاضا ہے، شریعت اسلامیہ میں اس کی کتنی تاکید اور کتنے فضائل وثواب کا بیان موجود ہے، ان کا شمار کرنا مشکل ہے، اس لئے دیکھا جاتا ہے کہ حادثہ کے شکار لوگوں کے تعاون اور جبر نقصان کے لئے کبھی عام طور پر کبھی کسی خاص علاقہ یا کسی خاص پیشہ کے لوگ آپس میں مل کر خصوصی طور پر چندہ دے کر ایک فنڈ تیار کرتے ہیں اور مصیبت زدہ کا تعاون کرتے ہیں، لیکن یہ امداد وتعاون عموماً حادثہ پیش آنے کے بعد ہی ہوا کرتا ہے، مگر اس میں مطالبہ کا حق نہ رہنے کی وجہ سے مصیبت زدہ کو شرم کے ساتھ لینا پڑتا ہے، نیز وہ باضابطہ اور یقینی نہیں ہوتا ہے، جس کی وجہ سے کبھی کبھی مصیبت زدہ کو سوال کا درپئے ہونا پڑتا ہے، اور کبھی یہ سوال بھی کچھ فائدہ نہیں دیتا ہے، اور اس کا حال ناگفتہ بہ ہوجاتا ہے اور وہ مصداق بن جاتا ہے۔

"گہ شاہ راچوں گدا ازبرائے نیم نانے دربدر حیراں کنی"

کا...... بہر حال مصیبت زدہ آدمیوں کو امداد کی اس غیر متیقن حالت اور سوال کی ذلت سے رہا کرنے کے لئے امداد باہمی کی ایک احسن صورت اس طرح نکالی جاسکتی ہے کہ خطرہ کا اندیشہ رکھنے والے لوگ آپس میں مل کر اپنے اپنے چندوں کے ذریعہ ایک امدادی فنڈ پہلے ہی سے قائم کرلیں، پھر فنڈ تیار کرنے والے ممبروں میں سے جو بھی کسی مصیبت یا حادثہ کا شکار ہوجائے اسی کو فنڈ سے قاعدہ وضابطہ کے مطابق امداد کی جائے، چونکہ یہ فنڈ حادثہ سے پہلے ہی قائم کرلیا جائے گا، اس لئے حادثہ کے بعد مصیبت زدہ کو امداد ملنے کا ایک طرح یقین واطمینان رہے گا۔

نیز چونکہ یہ فنڈ اپنے نجی چندوں سے تیار کیا ہوا ہوگا، اس لئے اس میں اگرچہ چندہ دینے والے ممبروں میں سے کسی کی خاص ملکیت باقی نہیں رہے گی، مگر ہر ایک کا اس میں مصیبت کے وقت امداد کے مطالبہ کا حق باقی رہے گا، جس کی وجہ سے حادثہ کے بعد اس فنڈ سے امداد کا مطالبہ کرنا اور امداد حاصل کرنا نہ سوال کے مشابہ ہوگا نہ شرم کی بات ہوگی، یہ فنڈ گویا کہ ایک چھوٹا سا بیت المال ہوگا، بیت المال جس طرح ملک کے لوگوں کے دیئے ہوئے مختلف اموال سے تیار ہوتا ہے، لیکن کسی کی خاص ملک اس کے مال میں باقی نہیں رہتی، البتہ قاعدہ وضابطہ کے مطابق مختلف قسم کے لوگوں کو مختلف حالات میں امداد کے مطالبہ کا حق باقی رہتا ہے، اسی طرح یہاں بھی فنڈ میں چندہ دینے کے بعد کسی کی ملک باقی نہیں رہے گی، لیکن صرف بوقت حادثہ مصیبت زدہ ممبر کو امداد کے مطالبہ کا حق باقی رہے گا۔

واضح رہے کہ خطرے سے پہلے اس طرح کے امدادی فنڈ قائم کرکے اطمینان حاصل کرنے کا تصور یا اس کی نظیر خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے پیارے صحابہ کرام کے عمل سے بھی ملتی ہے، چنانچہ صحیحین میں ایک حدیث نقل کی گئی ہے جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"إن الأشعريين إذا رملوا فی الغزو أو قل طعام عيالهم بالمدينة جمعوا ما كان عندهم فی ثوب واحد ثم اقتسموا بينهم فی إناء واحد بالسوية فهم منی وأنا منهم..." (صحیح مسلم ۲،۳۰۳، صحیح بخاری ۱،۳۳۸)۔

(اشعری لوگ جب لڑائی میں ان کے سامان ختم ہوجاتے یا اپنے شہر میں رہتے ہوئے ان کے کھانے کی قلت دکھائی دیتی ہے تو وہ ہر ایک کے پاس جو کھانا یا سامان ہوتا ہے اس کو اکٹھا کرلیتے ہیں، پھر ایک برتن کے ذریعہ برابر کرکے آپس میں تقسیم کرلیتے ہیں سو یہ لوگ مجھ سے ہیں اور میں ان سے ہوں)۔

---

[1] استاذ جامعہ اہلیہ دار العلوم معین الاسلام ہاٹہزاری، چاٹگام، بنگلہ دیش۔

اس طرح کے اور چند واقعات (خود حضور ﷺ نے حضرت ابوعبیدہؓ اور حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کے) امام بخاری نے اپنی کتاب میں ذکر کئے ہیں (دیکھئے بخاری ۱/ ۳۳۸)۔

ان واقعات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے یہ عمل اس وقت کیا، جبکہ مجاہدین میں یا قبیلہ میں سامان یا طعام ضرورت کی حد تک ہر ایک کے پاس باقی نہیں رہا، بلکہ کسی کے پاس بالکل ہی نہیں تھا یا ضرورت سے کم تھا، اور کسی کے پاس ضرورت کی مقدار یا اس سے زائد تھا، بہرحال جب ساتھیوں کے سامان سفر یا کھانے کی چیزوں میں ایک طرف کمی دیکھائی دی، دوسری طرف وہ سامان قلیل بھی کسی کے پاس کم اور کسی کے پاس بنسبت دوسرے کے زیادہ تھا اور خطرہ ہوا کہ قلیل سامان والوں کا سامان جب ختم ہوجائے گا تو وہ مشقت میں پڑجائیں گے، جبکہ دوسرے ساتھیوں کو جن کے پاس سامان ہے ان کو خبر نہ ہوگی، کیونکہ ہوسکتا ہے مشقت میں گھرے ہوئے ساتھی سوال کی ذلت سے بچنے کے لئے اپنی حالت دوسروں کے سامنے ظاہر نہ کریں، پھر اگر ان کو اطلاع کسی طرح مل بھی گئی ہو تب بھی یہ خطرہ ہے کہ اس وقت اس کا حل منظم طریقہ سے نہ کیا جاسکے، کیونکہ ہوسکتا ہے کہ زیادہ سامان رکھنے والے ساتھی اس سے پہلے ہی سے وسعت کے ساتھ خرچ کرکے اپنا سامان کافی تعداد میں خرچ کرچکے ہوں گے، حالانکہ اگر پہلے سے انتظام کرلیا جاتا تو سامان والے بقدر کفاف خرچ کرتے اور مابقیہ سے بے سروسامان والوں کی مدد کرسکتے، اس لئے مذکورہ بالا واقعات میں ہوشیاری سے کام لیا گیا اور خطرہ واقع ہونے سے پہلے ہی سامان اکٹھا کرلیا گیا، پھر سب میں برابر تقسیم کردیا گیا جس کے نتیجہ میں بے سامان یا کم سامان والوں کا خطرہ زائل ہوگیا اور راحت ومشقت میں سب یکساں شریک ہوگئے، کوئی مصیبت میں وقت گذارے اور کوئی چین وسکون وراحت کی زندگی بسر کرے یہ مذموم حالت پیش نہ آئی، واضح رہے کہ یہ واقعہ پیش کردہ امدادی فنڈ کے من وعن مشابہ نہیں ہے، صرف استیفاء کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔

نیز اس کی اور ایک مثال سیدنا حضرت یوسف علیہ السلام کے واقعہ سے بھی پیش کی جاسکتی ہے جس کو قرآن کریم میں ذکر کیا گیا ہے اور تصدیق کی گئی ہے کہ انہوں نے قحط سالی سے پہلے ملک کے پیداوار کو جمع کرلیا تھا، پھر قحط سالی جب شروع ہوئی تو حسب ضرورت اور حسب مناسب لوگوں کو اس سے دیتے رہے جس سے لوگ قحط سالی کے دوران ہلاکت کے خطرے سے بچ گئے، اگر ایسا نہ کیا جاتا تو بہت لوگ اس قحط سالی میں ہلاک ہوجاتے، جبکہ دوسرے بعض افراد عیش وعشرت میں زندگی بسر کرتے، جو کہ عقل وشرع میں مذموم ہے۔

بہرحال شریعت غراء کے مذکورہ بالا نظریہ کو سامنے رکھ کر اگر حادثہ کا خطرہ رکھنے والے لوگ آپس میں مل کر حادثہ پیش آنے سے پہلے ہی مشترکہ چندہ سے کوئی امدادی فنڈ تیار کرلیں، پھر حادثہ واقع ہونے کے بعد مصیبت زدہ ممبر کو حسب ضابطہ امداد فراہم کریں تو انشاء اللہ تعالی یہ کام اور انتظام شریعت مطہرہ کی نظر میں ناجائز نہ ہوگا، بلکہ یہ ایک مستحسن کام و نظام شمار کیا جائے گا، پھر جب اس کے ذریعہ لوگ مغربی بیمہ کے سود وقمار کی لعنت سے بھی بچ جائیں گے تو اس کی حسن وخوبی اور بھی بڑھ جائے گی اور اس کے جواز واستحسان میں کسی کا کوئی کلام باقی نہیں رہے گا۔

امید ہے کہ آپ حضرات بھی اس رائے میں ہمارے ساتھ متفق ہوں گے۔

مواسات اسلامیہ:

آگے ہم تقریب الی الذہن کی غرض سے مطلوبہ "مواسات اسلامیہ" کے چند تدریجی خاکے پیش کرتے ہیں جن کے نتیجہ میں اسلامی تامین کی ایک مکمل صورت اور خاکہ سامنے آجائے گا۔

الف۔ یہ فرض کرلیا جائے کہ ہم ایک ہزار آدمی ہیں اور ہر ایک، ایک ایک بس کا مالک ہے اور آئے دن ہماری بسیں مختلف خطرات کے درپے ہیں، اس لئے ہم سب مل کر ایک فنڈ قائم کرنا چاہتے ہیں جس سے ہمارا جبر نقصان ہوسکے، یہ فنڈ کتنے روپیہ سے قائم کیا جائے گا اور ہر ایک سے کتنی رقم لی جائے گی اس کی تعیین کے لئے پہلے حساب لگانا ہوگا کہ سال میں عموماً کتنی گاڑیاں حادثات کی شکار ہوتی ہیں، چنانچہ اندازہ لگایا گیا کہ ایک ہزار میں دو گاڑیاں حادثہ کی شکار ہوتی ہیں اس اعتبار سے ہماری ایک ہزار گاڑیوں میں دو گاڑی خطرہ کے درپے ہیں، دو گاڑی میں سے ہر ایک کی قیمت اگر بیس لاکھ روپیہ ہو تو کل دو گاڑیوں کی قیمت چالیس لاکھ روپے ہوگی، لہذا ہمیں تنظیم قائم کرنے سے پہلے کم سے کم چالیس لاکھ روپے جمع کرنے پڑیں گے، اس سے زائد اور بھی کچھ خرچے ہیں، آفس کا خرچہ اور افرو عملہ کی تنخواہ وغیرہ وغیرہ۔

نیز ہم نے حادثہ کا جو حساب لگایا ہے اتفاق سے حادثہ اس سے بھی زیادہ ہوسکتا ہے، اس لئے اس تنظیم کو قائم کرنے کے لئے اور اس کو مضبوط کرنے کے

لئے مثلاً پچاس لاکھ روپیہ کی ضرورت ہے، اب ہم نے تنظیم کے تمام شرکاء پر (جو ایک ہزار ہیں) پچاس لاکھ کو تقسیم کیا تو ہر ایک کے ذمہ پانچ ہزار روپے آئے، لہذا تنظیم کے ہر ممبر کے پانچ ہزار روپیہ وصول کر کے ہم ایک تبرع فنڈ قائم کر سکتے ہیں۔ امید ہے کہ اتنی تھوڑی مقدار چندہ دینے میں کسی کو دقت نہیں ہوگی، کیونکہ اس کے فوائد انہیں کی طرف واپس ہوں گے، چنانچہ شرکاء میں سے جب بھی کوئی حادثہ کا شکار ہوگا اس کو اس تبرع فنڈ سے جبر نقصان کیا جائے گا اور حوادث کے سامنا کرنے کا خطرہ واندیشہ ہر ایک کو ضرور ہے، لہذا یہ تھوڑا سا مال دینے کے لئے وہ کیوں تیار نہ ہوں گے؟

خلاصہ کلام یہ ہوا کہ ہم نے ایک ہزار افراد مل کر ہر ایک پانچ ہزار روپیہ دے کر کل پچاس لاکھ کا ایک تبرع فنڈ قائم کیا، غرض یہ ہے کہ ہم میں سے جب بھی کسی کی گاڑی حادثہ کی شکار ہوگی اس کو اس فنڈ سے حسب مناسب جو بیس لاکھ تک ہو سکتا ہے، جبر نقصان کیا جائے گا۔

لیکن اس تنظیم کے مقاصد کو حاصل کرنے کے لئے آگے ہم کو اور چند امور انجام دینے ہوں گے:

۱۔ تبرع فنڈ کی حفاظت کرنا۔

۲۔ تنظیم کے ممبروں میں جو بھی نقصان کا شکار ہوگا اس کے ساتھ تنظیم کی جانب سے رابطہ قائم کرنا۔

۳۔ ان کاموں کی انجام دہی کے لئے ایک آفس کا انتظام کرنا۔

۴۔ اور آفس کے تمام کاموں کو سنبھالنے اور انجام دینے کے لئے افسروں کا تقرر کرنا (جن کا کام ہوگا تنظیم کے شرکاء میں سے جب بھی کسی کی بس کا کوئی نقصان پیش آئے، ساتھ ساتھ اس کی تفتیش کے لئے حادثہ کے موقع پر آنے جانے کا خرچہ جو کہ تبرع فنڈ سے اٹھایا جائے گا۔ ہمارے تبرع فنڈ کی مقدار محدود ہے، اس طرح خرچ کرتے رہنے سے کچھ دنوں کے بعد یہ فنڈ خالی ہو جائے گا، اس لئے ہوشیاری کا کام ہوگا کہ اس کو کسی جائز اور حلال تجارت میں لگایا جائے، فائدہ یہ ہوگا کہ آفس کا خرچہ اور ملازموں کی تنخواہ وغیرہ اس تبرع فنڈ کے منافع سے پورا ہو جائے گا اس کے بعد اور جو بچ باقی رہ جائے گا وہ اصل فنڈ میں جمع ہوتا جائے گا، جس سے تامین کا تبرع فنڈ اور بھی مضبوط ہوتا رہے گا۔

ب۔ آیئے ہم آگے چلیں اور دیکھیں کہ اس تبرع فنڈ کو کس طرح تجارت میں لگایا جا سکتا ہے؟

اس تبرع فنڈ کے روپیہ کو کئی طریقوں سے تجارت میں لگایا جا سکتا ہے، ایک یہ کہ تامین کا یا جبر نقصان کا کام انجام دینے کے لئے جو تنخواہ دار افسروں کو ہم نے تقرر کیا تھا (الف میں) ان افسروں کے ذریعہ ہی تجارت کا کام انجام دیا جائے، یعنی تامین کی جانب اور جبر نقصان کی جانب نگرانی کے لئے جن افسروں کو آفس میں تقرر کیا جائے گا انہیں کے ذریعہ تجارت کا کام بھی انجام دیا جائے گا، یا تو تامین کا کام الگ رکھا جائے اور تجارت کا کام الگ رکھا جائے، اور تجارت کے لئے چند ایسے لوگ مقرر کئے جاویں جو دیانتدار باشرع اور سمجھدار ہوں اور تجارتی امور کو اچھی طرح انجام دے سکیں اور ان کے لئے تنخواہ متعین کی جائے، یعنی یہ لوگ بھی تنخواہ دار ہوں گے، یا تو کسی دیانتدار باشرع اور سمجھدار آدمی کے پاس اس فنڈ کے روپیہ کو مضاربہ یا مشارکہ کے طور پر اس طرح حوالہ کیا جائے کہ اس کے منافع کا ایک حصہ مثلاً نصف اس کو ملے گا اور ایک حصہ مثلاً نصف آخر فنڈ کو ملے گا اور اگر نقصان ہو جائے تو فنڈ اس کو تسلیم کرے گا۔

مذکورہ تمام صورتوں میں تجارت کے جو منافع تبرع فنڈ کو حاصل ہوں گے اس سے تنظیم کے افسر و کارکنوں کی تنخواہ کے ساتھ دیگر تمام خرچے اٹھائے جائیں گے، اس کے بعد منافع کا جو حصہ بچ جائے گا وہ تبرع فنڈ کے ساتھ ملتا جائے گا، اور تنظیم کے ممبروں میں سے جس کی بس نقصان کی شکار ہوگی قاعدے اور ضابطے کے مطابق اس کو جبر نقصان دیا جائے گا۔

ج۔ آگے ہم اور ایک صورت پیش کرتے ہیں، وہ یہ ہے کہ کوئی دیندار، معتمد علیہ آدمی جو تجارت میں بھی ماہر ہے اور بیمہ کی کارروائی میں بھی تبرع فنڈ کے ممبروں کو یہ تجویز پیش کرتا ہے کہ مجھے اپنا فنڈ مضاربہ یا مشارکہ کے طور پر دیدو، میں ایک ساتھ تجارت بھی کروں گا اور تمہاری تامین کی جانب کی تمام کارروائیاں بھی انجام دوں گا، مجھے دونوں جانب میں خوب مہارت حاصل ہے، تم مجھے یہ فنڈ حوالہ کر کے دونوں جانب میں بے فکر رہ سکتے ہو، میں تجارت کی جانب سے نفع کا نصف یا ثلث مثلاً میں مضارب کی حیثیت سے لے لوں گا اور بقیہ حصہ فنڈ کے لئے رأس المال کی حیثیت سے رہے گا اور تامین کی جانب کی نگرانی کے لئے مجھے اگر کوئی تنخواہ علاحدہ طور پر دو تو بہتر، اگر نہ دو تب بھی میں راضی ہوں، کیونکہ تجارت کی جانب سے جو نفع مجھے ملے گا وہ میرے لئے کافی ہے۔

امید ہے کہ پہلی صورتوں کی طرح یہ صورت بھی جائز ہوگی۔

د۔ کچھ دنوں کے بعد اس آدمی نے یہ بات سامنے لائی اور یہ عرضی پیش کی کہ میرا خیال وگمان غلط ثابت ہوا اور تجارت کا واقعی حال میری امید کے خلاف نمودار ہوا، کچھ دنوں کے تجربہ سے یہ بات سامنے آئی کہ پچاس لاکھ کا نفع نصف نصف تقسیم کے بعد نہ میرے لئے کافی ہوتا ہے نہ تمہارے اداری خرچہ کے لئے کافی ہوتا ہے، لہذا تمہارے ادارہ کو اگر قائم رکھنا ہو اور مجھے دونوں جانب کی کارروائی انجام دینا ہو تو تجارت سے اور زیادہ منافع حاصل کرنے پڑیں گے اور اس غرض سے سرمایہ کو اور بھی بڑھانا پڑے گا، لہذا فنڈ کے پچاس لاکھ روپیہ کے ساتھ اور بھی پچاس لاکھ روپے ملائے جائیں تب جاکر میں تجارت بھی کروں گا اور تامین کی جانب کی بھی نگرانی کروں گا، ورنہ میرے لئے یہ کام انجام دینا ممکن نہ ہوگا۔

اس کی اس تجویز کو پیش کرنے کے بعد دیانتدار ممبروں نے تحقیق وتفتیش کی اور اس کی بات صحیح نکلی، اس لئے انہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ اس کو مزید اور پچاس لاکھ روپے دے دیں گے، تاکہ وہ تامین کے اس کام کو حسن وخوبی کے ساتھ انجام دے سکے، لیکن یہ پچاس لاکھ روپے اس کے ہاتھ میں دوصورت میں دیئے جاسکتے ہیں:

۱۔ ایک یہ کہ امدادی فنڈ کے ساتھ اس کو بڑھا دیا جائے اور یہ زائد پچاس لاکھ بھی امدادی فنڈ میں شمار کیا جائے اس صورت میں ان کا امدادی فنڈ اب ایک کروڑ روپیہ کا ہوگا اور ہر فرد کے چندہ کی مقدار اب دس ہزار روپے ہوجائیں گے اور ہر ممبر اپنے چندہ، یعنی پورے دس ہزار کی ملکیت سے فارغ ہوجائے گا کوئی اس کو واپس نہیں لے سکتا، صرف نقصان کے شکار ممبر کو اس سے جبر نقصان کے طور پر دیا جائے گا کسی اور صورت میں وہ اس کا مستحق نہیں ہوگا، لیکن یہ صورت ممبروں کے لئے ذرا مشکل ہوگی اور اس میں ان کی رغبت زیادہ نہ ہوگی، کیونکہ وہ لوگ چاہیں گے تو تھوڑے چندہ سے جبر نقصان کے مقاصد کو پورا کرلیں، چندہ کی مقدار میں اضافہ ان کو زیادہ پسند نہ ہوگا، اس لئے وہ دوسری صورت کو ہی اختیار کریں گے یا کرنا چاہیں گے جس کو ہم سامنے پیش کرتے ہیں۔

۲۔ دوسری صورت یہ ہوسکتی ہے کہ زائد پچاس لاکھ روپے جو اس کو دیئے جائیں گے ان کو امدادی فنڈ میں شمار نہ کیا جائے، بلکہ ان روپیوں کے حسابات کو امدادی فنڈ سے علاحدہ رکھا جائے اور ان کے مالک وہ ممبران ہی رہیں گے اور اس حصہ کی تجارت کا نفع بھی ان ممبروں کو ہی ملے گا، یعنی امدادی فنڈ میں اس نفع کو شمار نہیں کیا جائے گا اور جب بھی ممبران چاہیں گے اس زائد حصہ کو واپس لے سکیں گے۔ اس صورت کا خلاصہ یہ ہوا کہ ممبروں نے اس آدمی کے پاس ایک ساتھ دو فنڈ حوالہ کئے، ایک امدادی فنڈ، دوسرا ممبروں کا ذاتی فنڈ، دونوں فنڈ کا حساب علاحدہ رہے گا، اور دونوں فنڈ کے مجموعہ سے وہ آدمی تجارت کرے گا جو نفع ہوگا آدھا یا ثلث وہ لے گا بقیہ نفع دو حصے میں تقسیم ہوگا، تبرع فنڈ کا حصہ تبرع فنڈ میں شمار ہوتا رہے گا اور وہ فنڈ مضبوط ہوتا رہے گا اور ذاتی فنڈ کا حصہ ممبروں کو مل جائے گا، پھر اگر کبھی ذاتی فنڈ کے سرمایہ کو واپس کرنا چاہیں تو ہر ممبر کو اپنا اپنا حصہ واپس بھی کیا جاسکے گا، کیونکہ اس سرمایہ میں ان کی ملک بدستور باقی رہے گی۔

واضح رہے کہ اس طریقہ کو اختیار کرنے میں ہر جانب کا نفع ہے تاجر آدمی کا نفع تو ظاہر ہے، تبرع فنڈ کا بھی اس میں نفع ہے اور وہ اس طرح کہ دیانتدار یہ معتمد علیہ ماہر تجارت اور ماہر تامین آدمی تبرع فنڈ کے اس چھوٹی مقدار سے تجارت کرنے پر تیار نہ تھا، جب اس فنڈ کو بڑا کردیا گیا (مزید ایک رقم اس کے ساتھ ملا کر) تو اب وہ اس کو تجارت کے لئے قبول کرنے اور تامین کی جانب کی نگرانی کے لئے تیار ہوگیا، اور یہی ہے امدادی فنڈ اور تامین کا فائدہ، اور ممبروں کا نفع یہ ہے کہ انہوں نے تھوڑے سے چندہ سے جو ایک امدادی فنڈ قائم کیا تھا اس میں مزید چندہ دینے کی ضرورت نہ پڑی، پھر اس کی تجارت اور تامین یا جبر نقصان کی دونوں جانب کو دیکھ بھال کرنے والا ایک ماہر معتمد علیہ، دیانتدار آدمی بھی مل گیا۔ البتہ اس چھوٹے فنڈ کو قبول کرنے کے لئے تجار کو کچھ روپیہ دینا پڑا، لیکن یہ روپیہ امدادی فنڈ کے روپیہ کی طرح ممبروں کی ملک سے نکل نہیں گئے، بلکہ اس میں ممبروں کی ملک بدستور باقی رہے گی اور ان کو اس کا نفع بھی ملتا رہے گا، پھر وہ جب مناسب سمجھیں گے اس کو واپس بھی لے سکیں گے، یہ ہے ممبروں کا نفع۔

اب اس تفصیل کے بعد حضرت علماء کرام فیصلہ فرمائیں کہ یہ صورت اور طریق کار فقہ اسلامی کی روشنی میں جائز ہوگا یا نہیں؟ اگر فیصلہ جواز کے حق میں آئے (اور ظاہر ہے کہ یہی ہوگا، کیونکہ اس میں عدم جواز کی کوئی دلیل وعلت موجود نہیں ہے) تو آگے ہم غیر اسلامی بیمہ کے حالیہ نظام کو اس کی ظاہری شکل اور امور انتظامیہ کو ترمیم کرکے اس کے اندر سے سود وقمار کے مادہ کو باہر پھینک کر اس کی جگہ میں {تعاونوا على البر والتقوى} (سورہ المائدہ:۲)، ''خير الناس أنفعهم للناس'' (شعب الایمان)، ''الخلق عيال الله، فأحب الخلق إلى الله من أحسن إلى عياله'' (مرقاۃ ۴۷،۷۳)، روح اسلامی داخل کرکے ملک ودولت کے سامنے دور حاضر کے تقاضوں کو پورا کرنے والا ایک منظم اور مجرب اسلامی بیمہ یا مواسات اسلامیہ پیش کرسکیں گے جس کی مثال اور نظیر یوں ہوگی، کہ ہم یورپ کا ایک گرجا خرید لیں گے اور اس کے اندر سے مورتیوں کو نکال دیں گے، اور پھر اس کے در ودیوار کو بحال رکھ کر یا کچھ ترمیم کے

بعد اس میں نمازیں با جماعت قائم کر کے اس کو مسجد بنا دیں، قالب تو وہی رہے گا، لیکن قلب کی حالت بدل جائے گی، پہلے ہوتی تھی اس میں مورتیوں کی پرستش اور اب ہوگی خدا کی عبادت۔

کیا اس طرح گرجوں کو مسجد بنانا درست ہوگا؟ اگر ہو تو ضرور غیر اسلامی بیمہ کے امور انتظامیہ اور نظام قالب وصورت کو بحال رکھ کر اس کے قلب سے سود وقمار کو نکال کر اس میں تعاون کی روح داخل کر کے اس کو اسلامی تامین کی شکل دینا درست ہوگا اور ان کے طریق کار اور نظام دفاتر سے جو حکمت علمیہ اختیار کریں گے وہ "كلمة الحكمة ضالة المؤمن فأينما وجدها فهو أحق بها" کا مصداق ہوگا جو شرعاً قبیح نہیں ہے اور ہم عملاً دوسرے فنون میں بھی ایسا کرتے ہیں، مثلاً علم ہندسہ، علم ذرہ، آلات حرب وغیرہ میں، بلکہ اگر صحیح معنی میں کہا جائے تو یہ ان کی اپنی چیز نہیں ہے، بلکہ خدا تعالیٰ برحق کی دی ہوئی چیز ہے (نعمت ہے) اللہ تعالیٰ نے اس کی طرف اشارہ بھی کیا ہے: {وعلم آدم الأسماء كلها} (سورہ بقرہ: ۳۲) پس اولاد آدم کو وہیں سے میراث ملتی ہے، البتہ اس کے لئے محنت اور غور وفکر کی ضرورت ہے، "من جد وجد" چاہے مسلمان ہو یا کافر۔

بہر حال اب آئیے ہم آگے اس "مواساۃ اسلامیہ" کی وہ آخری صورت پیش کرتے ہیں جو عصر حاضر کے موافق اور دور حاضر کے تقاضوں کو پورا کرنے والی ہو (ہ) مذکورہ بالا (د / ۲ کی) صورت سے معلوم ہو گیا کہ "مواساۃ اسلامیہ" کا یہ فنڈ اگرچہ بنیادی طور سے مصیبت زدوں کے تعاون اور جبر نقصان کے لئے ہے اور اس فنڈ میں شرکاء کا مقصد بھی وہی ہے، لیکن یہ فنڈ ایک اچھی خاصی تجارت کے لئے بہت بڑا سرمایہ ہے، پھر اگر اس پر ممبران اپنا اپنا ذاتی کچھ سرمایہ اضافہ کر دیں تو یہ اور بھی بڑا ایک سرمایہ تجارت کا ہو جائے گا، لہٰذا اس سرمایہ کی جانب تجارت اگر کسی کمپنی کی نظر کو اپنی طرف کھینچے اور اس سرمایہ سے تجارت کر کے سودمند ہونے کی دعوت دے تو کچھ بعید نہیں ہے، بلکہ یہ سرمایہ دودھاری تلوار کی طرح کام کرے گا، ایک طرف شرکائے اسلامی تامین کو فائدہ مند کرے گا جبر نقصان دے کر، دوسری طرف کمپنی کو فائدہ مند کرے گا تجارت کو نفع پہنچا کر۔

لہٰذا اگر کسی کمپنی نے مذکورہ فنڈ کی کشش سے متاثر ہو کر یہ کیا کہ پہلے اس نے اداری نظام قائم کرنے کے لئے پورے ملک میں آفسیں تیار کئے، پھر ان میں افسر اور کارکنوں کا تقرر کیا، پھر ان کے عمل کو دو جانب میں تقسیم کر دیا، جبر نقصان کی جانب کو دیکھ بھال کرنے اور سنبھالنے کے لئے ایک فریق کو ذمہ داری دی اور تجارت کی جانب میں کام کرنے کے لئے اور ایک فریق کو ذمہ داری دی یہ تمام خرچے وہ اپنی طرف سے کئے، پھر اس نے اعلان کیا کہ ہم نے اسلامی تامین کے لئے ایک منظم ادارہ قائم کیا ہے جس کے اندر دو فنڈ ہوں گے، ایک امدادی فنڈ، دوسرا تجارتی فنڈ (امدادی فنڈ کا حکم پہلے بیان کیا جا چکا کہ اس میں لوگ چندہ دے کر شریک ہوں گے اور اس میں ان کی ملکیت خاص باقی نہیں رہے گی، البتہ بوقت حادثہ صرف جبر نقصان کا حق باقی رہے گا، اس طرح تجارتی فنڈ کا حکم بھی پہلے بیان ہو چکا کہ اس میں جس ممبر کا جتنا روپیہ رہے گا اس کا مالک وہی رہے گا اور اس میں جو نفع ہوگا اس کا ایک حصہ رب المال کی حیثیت سے اس کو ملے گا اور ضابطے کے مطابق جب اس روپیہ کو واپس کرنے کا وقت آئے گا اگر تجارت میں کوئی نقصان نہیں آیا ہو، بلکہ نفع رہا ہو ہر ممبر کو اس کا راس المال مع منافع کے واپس کیا جائے گا اور اگر تجارت میں نقصان پیش آیا تو ہر ایک اپنے راس المال کی نسبت سے اس نقصان میں بھی شریک ہوگا)۔

واضح رہے کہ مواسات اسلامیہ کی اصل بنیاد امدادی فنڈ ہی ہے اور اسی سے صرف نقصان زدہ ممبروں کو جبر نقصان دیا جائے گا، البتہ اس کے ساتھ تجارتی فنڈ کو رکھا گیا اس کی تائید اور سپورٹ کے لئے، تاکہ دونوں فنڈ کے مجموعی سرمایہ سے ایک اچھی تجارت چل سکے، اور وہ تجارت نفع بخش ہو اور نفع بھی کافی مقدار میں ہو جس سے کمپنی سودمند ہو سکے اور اپنی کارروائی میں مسلسل جاری رہ سکے۔

بہر حال کمپنی مضارب کی حیثیت سے مثلاً نصف یا ثلث یا ثلثین کی شرط پر ان دونوں فنڈ کے روپیہ کو تجارت میں لگائے گی، اور نفع ہوگا اس کو شرط سابق کے مطابق دو حصہ میں تقسیم کر دے گی، ایک حصہ کمپنی خود لے گی مضارب کی حیثیت سے اور ایک حصہ راس المال کو ملے گا اور راس المال چونکہ امدادی اور تجارت دو فنڈ کا مجموعہ ہے، اس لئے اس کو پھر یہ دو فنڈ کے مطابق دو حصہ میں تقسیم کر دیا جائے گا، ایک حصہ ہوگا تجارتی فنڈ کا اور ایک حصہ امدادی فنڈ کا، پھر تجارتی فنڈ کے نفع کو اس فنڈ کے شرکاء کے مابین ہر ایک کے اپنے اپنے حصہ کے مطابق تقسیم کر دیا جائے گا، اور امدادی فنڈ کے منافع کو اس فنڈ میں چھوڑ دیا جائے گا، جس سے وہ فنڈ دن بدن مضبوط ہوتا جائے گا، اور ممبروں میں سے جو بھی کسی حادثہ کا شکار ہوگا اس کو اس فنڈ سے ضابطہ کے مطابق تعاون کیا جائے گا، اس طرح یہ کمپنی مسلسل چلتی رہے گی۔

اب بتائیے کہ اس کمپنی کے اعلان پر لوگوں کا اس کے دونوں فنڈ میں حسب ضابطہ روپیہ جمع کر کے اس سے تامین وتجارت کا فائدہ حاصل کرنا شرعاً جائز ہوگا یا نہیں؟ امید کہ جواز کے حق میں ہی آپ حضرات کا فیصلہ آئے گا، کیونکہ اس سے پہلے آپ حضرات نے (د۔ ۲ کی صورت) کو جائز قرار دیا ہے اور کمپنی کی پیش

کردہ صورت اور (د۔ ۲) کی صورت سابقہ کے مابین کچھ فرق نہیں ہے۔

سوائے اس کے کہ ایک میں (یعنی د۔ ۲ کی صورت میں) شرکاء مواسات اسلامی پہلے فنڈ تیار کر لیتے ہیں، پھر مضارب تلاش کر کے فنڈ اس کے حوالہ کرتے ہیں، اور یہاں کمپنی کی صورت میں پہلے مضارب تیار ہو جاتا ہے، پھر اس کے پاس متفرق افراد کی جانب سے روپیہ جمع ہو کر فنڈ تیار ہوتا ہے۔

واضح رہے کہ تامین اسلامی کے پیش کردہ (الف سے ہ تک پانچ) خاکوں اور صورتوں میں لوگوں کے لئے سب سے آسان ومفید اور قابل اعتماد واعتبار وہ آخری صورت ہی ہے یعنی نمبر ہ کمپنی کی صورت۔

لہٰذا اگر ہم پیش کردہ مواسات اسلامیہ کی کمپنی والی صورت کے جواز پر متفق ہیں تو آگے ہمیں اور چند کام انجام دینے پڑیں گے۔

ایک یہ کہ اصول شرع کو سامنے رکھ کر حالیہ کمپنیوں کے تجربہ کردہ اداری نظام وانتظام میں سے جن جن چیزوں کو لیا جا سکتا ہے، ان کو لے کر، نیز ملکی اور بین الاقوامی قوانین میں سے شرعی نقطہ نظر سے جن کی رعایت ولحاظ کیا جا سکتا ہے ان کا لحاظ رکھ کر کے اپنے خاص قانون وضابطہ کے ماتحت ایک مکمل منظم اسلامی کمپنی کی شکل دینا۔

پھر دوسرا کام یہ ہوگا کہ موجودہ سودی اور قماری بیمہ کی جتنی صورتیں ہیں اور انسانی زندگی کی جتنی جانب میں وہ کام کرتی ہیں اور لوگ از خود یا حکومت کے دباؤ کی وجہ سے اس میں ملوث ہوتے ہیں ان صورتوں کو سامنے لا کر ان میں سے جن جن جانب کے جن جن مقاصد کی تحصیل کو شریعت تسلیم کرتی ہے یا کم سے کم جائز حد تک گوارا کرتی ہے ان مقاصد کو حاصل کرنے کے لئے اسلامی تامین کی کمپنی کو اس طرف آہستہ آہستہ پھیلاتا جانا۔

شرعی بورڈ کا قیام:

آگے اس سے بڑھ کر تیسرا اور ایک کام ہے جو سب سے اہم اور روح کی حیثیت رکھتا ہے اور وہ یہ کہ مواسات اسلامیہ کے اس ادارہ کی ہر جانب کو شرعی نقطہ سے دیکھ بھال کرنے کے لئے ایک مضبوط شرعی بورڈ کی تشکیل دینا جس کے اعضاء ہوں گے ملک کے سب سے معتمد علیہ متدین بڑے بڑے علماء اور مفتیان کرام جن کی للّٰہیت، دیانت داری اور فقاہت پر ہر طبقہ کا اعتماد ہو (ان کے تعاون کے لئے حالیہ اقتصاد اور ملکی اور بین الاقوامی قوانین کے ماہرین کے کچھ افراد کو بھی اس بورڈ میں رکھا جا سکتا ہے) پھر اس بورڈ کو کمپنی کی تجارت وتامین کی ہر جانب اور ہر گوشہ میں رسائی کا قانونی اختیار دیا جائے اور کمپنی اپنی تمام کارروائیاں بورڈ کے سامنے پیش کرنے پر قانونی طور پر مجبور ہو اور بورڈ ان معاملات میں شرعی نقطہ نظر سے کسی چیز کے جواز یا عدم جواز کا جو بھی فیصلہ دے، کمپنی میں اسی کا اعتبار ہو اور کمپنی اس کو ماننے پر مجبور ہو، نیز بورڈ کے افراد بھی ایسے ہوں کہ وہ کمپنی کی رہنمائی اور نگرانی میں اپنے اوقات صرف کر سکتے ہوں اور پورے طور پر نگرانی کر سکتے ہوں، ایسا نہ ہو کہ صرف چائے پانی پی کر واہ واہ وشاباشی دیتے ہوئے ان کا وقت ختم ہو جائے، صحیح طور پر نگرانی کا وقت وموقع ان کے پاس نہ ہو، ورنہ اس بورڈ سے سوائے ضرر کے اور کچھ فائدہ نہ ہوگا۔

بہر حال بورڈ کی ذمہ داری ہوگی "کلکم راع وکلکم مسئول عن رعیتہ" کی ہدایت کو سامنے رکھ کر اپنے قیمتی اوقات صرف کر کے اس کی پوری نگرانی اور رہنمائی کرے۔

اس طریقے سے اگر کوئی کمپنی "مواسات اسلامیہ" کے نام سے کھڑی ہو جائے تو ضرور وہ مسلمانوں کو سود وقمار کی لعنت سے بچانے کے ساتھ ساتھ اندر وباہر سے ایسا نفع پہنچائے گی جس کی نظیر خود ہوگی اور غیر اسلامی بیمہ بھی اس کا مقابلہ نہیں کر سکے گا۔

چند سطحی شبہات اور ان کا ازالہ:

مواسات اسلامیہ کے پیش کردہ خاکہ پر کسی کو ایک سطحی شبہ یہ پیدا ہو سکتا ہے کہ اس میں بھی سود وقمار پائے جاتے ہیں۔

سود تو اس لئے کہ اس کے تبرع میں ہر ممبر کی رقم جمع رہتی ہے اور بوقت نقصان اس کو جبر نقصان کی جو رقم ملتی ہے وہ اس کی جمع شدہ رقم سے ضرور زیادہ ہوتی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ فنڈ میں جمع کیا کم، اور نقصان پیش آنے کے بعد فنڈ سے وصول کیا جا رہا ہے زیادہ۔

اور قمار سے اس لئے خالی نہیں ہے کہ تبرع فنڈ سے امداد لینے کا طریقہ ایک طرح کی قرعہ اندازی ہے جو قمار میں پایا جاتا ہے، قمار کی قرعہ اندازی میں جس کا نام آتا ہے وہ دوسروں کی رقم لے لیتا ہے، اسی طرح اس تامین میں بھی نقصان وحادثہ کے ذریعہ ایک قرعہ اندازی ہوتی ہے اور اس حادثہ کی قرعہ اندازی میں جس کا نام نکل آتا ہے، وہ اپنی دی ہوئی رقم کے ساتھ جبر نقصان کے نام سے دوسروں کی وہ رقم بھی لے لیتا ہے جو اس فنڈ میں جمع تھی اور یہی قمار ہے، لہٰذا پیش کردہ

مواسات اسلامیہ بھی سود وقمار سے پاک نہیں ہوئی، بنا بریں مواسات اسلامیہ اور مغربی طرز کے بیمہ میں سوائے نام کے اور کچھ فرق نہیں رہا۔

ازالہ شبہ: مذکورہ بالا سطحی نظر میں اگرچہ اسلامی تامین میں سود اور قمار کی مشابہت نظر آتی ہے، لیکن حقیقت میں اس میں نہ سود ہے نہ قمار، کیونکہ مذکورہ تعاونی فنڈ کی حیثیت اور سود وقمار کی حقیقت ایک دوسرے سے مختلف ہے، سود کہا جاتا ہے جانب مقابل کو دی ہوئی رقم سے اجل ومدت کے عوض میں شرط کر کے بدون کسی خطرہ کے زیادہ لینے کو، حالانکہ اس زیادتی کے عوض میں جانب مقابل کو کچھ معاوضہ نہیں دیا جاتا ہے۔

اور تامین کی حقیقت اس سے بالکل مختلف ہے، کیونکہ تامین کے امدادی فنڈ میں جو روپیہ جمع ہوتا ہے وہ تو ایک دوسرے کو دیتا نہیں ہے، چہ جائیکہ اس شرط پر دیوے کہ تم مجھ سے اتنا لیجاؤ اور اتنی مدت کے بعد مجھے اتنا زیادہ دو، بلکہ یہاں تو بطور چندہ ہر ایک اپنے حصہ کو چھوڑ دیتا ہے اور کوئی اس کا مالک نہیں رہتا ہے، نہ کل کا نہ جز کا، بلکہ اس کی حقیقت صرف یہی ہے کہ کسی ساتھی کے حادثہ کے بعد چندہ دے کر جو فنڈ تیار کرتے ہیں اس کو حادثہ سے پہلے تیار کر لیا گیا، نیز سود میں دینے والا دیتا ہے مدت کے بعد زیادہ لینے کے لئے، لیکن یہاں کوئی دینے والا یہ نہیں چاہتا ہے کہ اس کی بیس لاکھ کی گاڑی حادثہ میں گرے اور مختلف پریشانیاں اٹھائے، پھر اس کو اس فنڈ سے بیس لاکھ مل جائے، بلکہ ہر ایک چاہتا ہے کہ کسی کا کوئی حادثہ ہی پیش نہ آئے، نیز حادثہ آجانے کے بعد جب کسی کو فنڈ سے تعاون کیا جاتا ہے تو نہ وہ یہ تصور کرتا ہے کہ میں نے جو ایک ہزار روپیہ دیا تھا اس پر اتنی مدت گزرنے کے عوض میں (یہ بیس لاکھ لے رہا ہوں) مجھے یہ بیس لاکھ مل رہے ہیں اور نہ دوسرے شرکاء تصور کرتے ہیں کہ ہم نے اس سے جو ایک ہزار روپیہ ایک مدت کے لئے لیا تھا اس کے عوض میں ہم اس کو یہ بیس لاکھ روپیہ دے رہے ہیں، لہٰذا یہاں سود کی حقیقت کہاں سے متحقق ہوئی، لہٰذا شبہ جو پیدا ہوا وہ سطحی نظر میں سود کی ایک ادنی مشابہت کی وجہ سے ہوا، اس طرح کی مشابہت دوسرے معاملات میں بھی پائی جاتی ہے، اس کے باوجود معاملہ باتفاق سودی معاملہ نہیں ہے۔

اسی طرح ہم کہنا چاہتے ہیں کہ امدادی فنڈ کے چندہ میں ربائے فضل کے سطحی مشابہت کو دیکھ کر اس کو ربائے فضل میں داخل کر دینا بالکل صحیح نہیں ہوگا، بلکہ دونوں کی حقیقت مختلف ہے، جیسا کہ علماء کی تصریحات سے پتہ چلتا ہے، اور وہ واقعہ جس کا ذکر ماقبل میں گذرا اس میں بھی تمام افراد کے زاد سفر کو ایک ساتھ ملانے اور کسی کا کم اور کسی کا زیادہ ہونے کے باوجود برابر برابر تقسیم، جب اس میں ربا نہیں ہے تو اس میں بھی ربا نہیں ہوگا۔

چنانچہ علامہ نوویؒ فرماتے ہیں: ''وفی هذا الحديث فضيلة الأشعريين وفضيلة الإيثار والمواساة وفضيلة خلط الأزواد فی السفر وفضيلة جمعها فی شیئ عند قتلها فی الحضر ثم يقسم، وليس المراد بهذه القسمة المعروفة فی كتب الفقه بشروطها ومنعها فی الربويات واشتراط المساواة وغيرها، وإنما المراد هنا إباحة بعضهم بعضاً ومواساتهم بالموجود (صحیح مسلم ۲،۳۰۳)۔

وفی هذا الحديث فضل المواساة والسماحة، وإنما كانت خلقه ﷺ وخلق صدر هذه الأمة وأشراف الناس، قلت: وفيه جميع المسافرين أزوادهم إن كانت عن طيب نفسه منهم'' (اکمال المعلم شرح مسلم ۸،۴۲۵)۔

اب رہ گیا قمار کا مسئلہ سو یہ بھی ایک سطحی شبہ ہے جو سطحی مشابہت پر مبنی ہے، حقیقت میں یہاں قمار نہیں پایا جاتا ہے، کیونکہ قمار کا معاملہ سودی معاملہ کی طرح نفع اندوزی کے معاملات (کے قبیل) میں سے ہے جس میں پایا جاتا ہے مما کسہ مشاحہ اور قمار میں خصوصی طور پر مباغضہ بھی پایا جاتا ہے: {إنما يريد الشيطان أن يوقع بينكم العداوة والبغضاء فی الخمر والميسر} (سورہ مائدہ: ۹۱) اور اسلامی مواساۃ کے چندہ فنڈ میں یہ حقیقت نہیں پائی جاتی ہے، جیسا کہ پیچھے بیان ہوا کہ یہ حسن معاشرہ حسن سلوک برادری اور مدارات کے قبیل میں سے ہے جس میں پایا جاتا ہے تعاون ہمدردی اور خیر خواہی، لہٰذا دونوں معاملہ کی حقیقت نوعیت اور غرض وغایت الگ الگ ہیں، ہر ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ ہمارے متصور ''مواسات اسلامیہ'' کے امدادی فنڈ میں نہ سود ہے نہ قمار ہے اور نہ سود وقمار کا شبہ ہے، زیادہ سے زیادہ سطحی نظر میں سود وقمار کی ایک بے حقیقت مشابہت سی دیکھائی جاتی ہے اور وہ تحقیق سے ختم ہوگئی اور مواسات اسلامیہ کا امدادی فنڈ سود وقمار سے بالکل پاک وصاف ہو کر ہمارے سامنے ابھر آیا۔

لہٰذا امید کی جاسکتی ہے کہ ''مواسات اسلامیہ'' کی اس تجویز کو قبول کر کے اس کو فروغ دے کر مسلمانوں کو سود وقمار کے وبال سے بچایا جاسکتا ہے۔

☆☆☆

تکافل۔ طریقہ کار اور ہندوستان میں اس کی ضرورت

مولانا محمد فرقان فلاحی[1]

جسے ہم "تکافل" کے نام سے جانتے ہیں، بین الاقوامی سطح پر پہلی تکافل کمپنی ۱۹۷۹ء میں سوڈان میں قائم ہوئی، اس کے بعد ملیشیا نے ۱۹۸۷ء میں تکافل کے قوانین کا اجراء کیا، پاکستان میں اسلامی بینکوں کے لئے اسلامی انشورنس کی ضرورت اور عدالت کے فیصلے کے مطابق بالآخر ۲۰۰۵ء میں تکافل یا اسلامی انشورنس کا آغاز ہوا، تب سے وہاں پاک کویت، تکافل، تکافل پاکستان لمیٹڈ، پاک قطر فیملی تکافل، پاک قطر جنرل تکافل اور فرسٹ داؤد تکافل وغیرہ جیسے ادارے قائم کئے گئے۔

جب ہم انشورنس کے مسئلہ پر نظر ڈالتے ہیں تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ مال ومتاع کا حصول اور سامان زندگی کی خواہش جہاں فطرت انسانی کا تقاضا ہے، وہیں ان اثاثہ جات کا تحفظ کرنا اور خود انسانی زندگی کو لاحق خطرات سے نمٹنا بھی انسانی ضرورت ہے، یومیہ حادثات کے نتیجہ میں انسانی اموات ہوں یا بحری مال بردار جہازوں کا غرقاب ہوجانا، مکان ودکان کا جل کر خاکستر ہوجانا ہو یا قدرتی آفات کے نتیجہ میں اسباب زندگی کا تباہ وبرباد ہوجانا، بہرحال خطرات کا اندیشہ ہر وقت لگا رہتا ہے، جن کے ازالہ کے لئے مختلف ادوار میں مختلف طریقے رائج تھے، فی زمانہ ایک عام اور مشہور طریقہ انشورنس کا ہے، جس میں کچھ رقم (جسے پریمیم سے تعبیر کیا جاتا ہے) کے بدلے انسان ان خطرات کو انشورنس کرنے والی کمپنی کی طرف منتقل کرتا ہے، اس روایتی طریقہ کے ذریعہ کمپنیوں نے خطرات کو کسی حد تک کم ضرور کردیا ہے، لیکن بنیادی طور پر اس طریقہ میں موجود شرعی قباحتوں (جیسے غرر، قمار اور سود) کی بنا پر فقہاء کرام نے ہر دور کی طرح اس دور میں بھی اس کی مخالفت کی اور اس سے استفادہ کو نادرست قرار دیا، البتہ اس شکل کے متبادل کے طور پر علماء اسلام نے "تکافل" کا ماڈل پیش کیا، جس میں وہ تمام خرابیاں نکال دی گئیں جو شریعت کی نگاہ میں حرام تھیں، اور اس کی بنیاد غرر وقمار کی جگہ تبرع وباہمی تعاون پر رکھی گئی جو شریعت کی نگاہ میں مستحسن وپسندیدہ ہے۔

تکافل کی تعریف: ...... تکافل ایک ایسے عقد یا معاملہ کو کہتے ہیں جس میں کچھ افراد مل کر رقم متعین حصہ تبرع کی نیت سے جمع کریں (جنہیں مشارکین کہا جاسکتا ہے) اور پھر لوگوں کو اس میں حصہ داری کی دعوت دی جائے (جنہیں مساہمین کہہ سکتے ہیں) اور اس کا مقصد یہ ہو کہ اگر کسی پر کوئی مالی مشکل آپڑے تو اس جمع کردہ مال سے اس مشکل کو دور کیا جاسکے، پھر جو مال بچ جائے اسے تمام حصہ داروں میں تقسیم کردیا جائے۔

قرآن وحدیث میں تکافل کا تصور: ...... اس بات میں کسی کو شبہ نہیں ہونا چاہئے کہ تکافل کا تصور کوئی نیا ایجاد کردہ تصور نہیں ہے، بلکہ قرآن وحدیث میں نہایت وضاحت کے ساتھ اس کے اشارات موجود ہیں، باہمی امداد وتعاون کی ترغیب دینے والی آیات واحادیث بھی بکثرت موجود ہیں، چنانچہ ارشاد باری ہے: {وتعاونوا على البر والتقوى} (المائدہ: ۲) اور {إنما المؤمنون إخوة} (الحجرات: ۱۰) جس سے اس حقیقت پر کافی روشنی پڑتی ہے، اسی طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قبیلہ اشعر کی تعریف کرتے ہوئے ان کا امتیازی وصف بیان فرمایا: "إن الأشعريين إذا أرملوا في الغزو أو قل طعام عيالهم بالمدينة جمعوا ما كان عندهم من ثوب واحد، ثم اقتسموه بينهم في إناء واحد بالسوية، فهم مني وأنا منهم" (بخاري، كتاب الشركة باب الشركة في الطعام والنهد والعروض، برقم: ۲۴۸۶) آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کا یہ طرز عمل جو سراسر باہمی امداد پر مبنی تھا اتنا پسند آیا کہ انہیں اس بات کی خوشخبری دی کہ وہ مجھ سے ہیں اور میں ان سے ہوں، قرآن وحدیث سے باہمی تعاون کی اہمیت وافضلیت کچھ اس طرح واضح ہوجاتی ہے کہ مزید وضاحت کی ضرورت باقی نہیں رہتی ہے۔

تکافل کے اسباب وعلل:

---

[1] استاذ حدیث دار العلوم ماٹلی والا، بھروچ گجرات۔

اس کی وضاحت اس لئے ضروری نظر آتی ہے کہ بہت سے حضرات کو یہ غلط فہمی ہو چلی ہے کہ تکافل یا انشورنس اس توکل کے منافی وخلاف ہے، جو اسلام میں مطلوب ہے، جبکہ حقیقت کچھ اور ہے؛ کیونکہ اسباب کو بالکل ترک کر دینا توکل ہرگز نہیں ہے، بلکہ اسباب کو اختیار کرنے کے بعد فیصلہ مشیت الٰہی پر چھوڑ دینا توکل ہے، چنانچہ ایک صحابی نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ وہ اپنی سواری کو کھلا چھوڑ دیں یا باندھ کر رکھیں؟ تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اعقلها وتوکل'' (ترمذی؛ابواب صفة القيامة. باب برقم: ٦٠ الحديث: ٢٥١٧)، اسی طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا صحابہ کرام کو علاج کروانے اور دوا کے اختیار کرنے کا حکم دینا بھی توکل کے خلاف نہیں کہلائے گا (دیکھئے: ترمذی، ابواب الطب، باب ماجاء فی الدواء والحث علیہ، برقم: ۲۰۳۸)، نیز حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات کو بہتر قرار دیا کہ انسان اپنی اولاد کو مالدار چھوڑ کر جائے، تاکہ وہ کسی کے سامنے ہاتھ پھیلانے سے محفوظ رہیں (دیکھئے: بخاری؛ کتاب الجنائز باب رثاء النبی صلی اللہ علیہ وسلم سعد بن خولہ، برقم: ۱۲۹۵)، الغرض، ان باتوں سے اتنا تو واضح ہو ہی جاتا ہے کہ ممکنہ خطرات سے بچاؤ کی غرض سے شریعت کے دائرہ میں رہتے ہوئے مناسب تدبیر کا اختیار کرنا توکل کے اور اسلامی روح کے خلاف نہ ہوگا۔

رہی بات اسباب کی، تو تکافل کے لئے بیان کردہ اسباب کا خلاصہ کچھ یوں ہے:

۱۔ امن کا حصول:...... شریعت اسلامیہ میں حفظ امن یا خوف وخطر سے محفوظ زندگی کا حصول ایک اہم نعمت متصور کیا جاتا ہے، یہی وجہ ہے کہ قرآن میں اللہ تعالی نے بارہا قیام امن کی ترغیب دلائی ہے، نیز ایک موقع پر قبیلہ قریش پر یہ احسان جتلایا ہے کہ اللہ تعالی نے تمہیں حالت خوف سے نجات دے کر امن نصیب فرمایا ہے، اور جہاں تک ہمارا خیال ہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت مبارکہ کا اہم مقصد دنیا کو اس امن کی طرف لوٹانا بھی تھا جو کفر وشرک کے ماحول کی وجہ سے معدوم ہو گیا تھا، نظام تکافل کا مقصد بھی یہی ہے کہ مال ودیعت کی افراط وتفریط اور ناگہانی آفات کی وجہ سے پیدا ہونے والی بدامنی پر باہمی تعاون کے ذریعہ قابو پایا جاسکے اور امن کو باقی رکھنے کی کوشش کی جائے۔

۲۔ متوقعہ وممکنہ خطرات کی پیش بندی:...... ممکنہ خطرات کو دور کرنے یا اس کے اثرات کو کم کرنے کی غرض سے احتیاطی تدابیر کا اختیار کرنا (جسے آج کے دور میں Risk Management کہتے ہیں) تعلیمات اسلام کے مخالف نہیں ہے، حضرت یوسف علیہ السلام کا قحط سالی کے بھیانک اثرات سے بچنے کے لئے الہام کردہ تدبیر کا اختیار کرنا اس کی نایاب دلیل ہے، اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا حضرت سعدؓ کو ثلث مال میں وصیت کرنے کا حکم دینا، تاکہ ان کی اولاد خوشحال زندگی گزارے، اسی قبیل کا حکم تھا، نظام تکافل میں بھی اسی بات کو مدنظر رکھا جاتا ہے کہ مستقبل میں کسی تنگی یا مصیبت کی حالت میں اس کو دور کرنے کی صلاحیت موجود رہے، تاکہ مصیبت زدہ انسان یا اس کے اہل خانہ در در کی ٹھوکریں کھانے سے بچ جائیں۔

تکافل کے شرائط وضوابط:

عقد تکافل کی صحت کے لئے کچھ شرائط کا پایا جانا بنیادی طور پر ضروری ہے، جن کے فقدان کی صورت میں عقد تکافل یا تو صحیح ہی نہیں ہوگا یا ناقص کہلائے گا، ان شرائط کی تفصیل یوں ہے:

۱۔ ہر شریک وسہیم کے سامنے اس بات کی وضاحت کردی جائے کہ اس عقد کا اصل مقصد انسانی برادری کی آپسی امداد ہے، نہ کہ دولت کا حصول، نیز یہ بھی وضاحت ہو کہ پریمیم اور قسط کے اعتبار سے منافع کا متعین حصہ ادا نہیں کیا جائے گا، اس شرط کے لازمی طور پر دو مثبت اثرات مرتب ہوں گے:

الف۔ تبرع پر مبنی ہونے اور کسی مخصوص مالی منفعت کے ختم ہوجانے کی وجہ سے ربا کا پہلو ختم ہوجائے گا۔

ب۔ جمیع مشارکین ومساہمین مجموعہ مال کے نگراں سمجھے جائیں گے اور کمپنی ایک ایجنٹ کا کردار ادا کرے گی، جس کی وجہ سے سب کے مصالح ایک ہی ہوں گے، نہ کہ متعارض، لہذا اختلاف وانتشار کا عنصر ختم ہوجائے گا۔

۲۔ اس بات کی بھی وضاحت کردی جائے کہ شیئر ہولڈرس کو جمع شدہ رقم میں سے خرچ ہوجانے کے بعد بچنے والی رقم میں سے منافع ادا کئے جائیں گے، جسے بچت (Sur plus) کہتے ہیں، اور اس میں کوئی حرج نہیں، کیونکہ مروجہ انشورنس میں منافع کا حصول اصل مقصد ہوتا ہے، جبکہ تکافل میں منافع کا حصول اصل مقصد نہیں ہوتا ہے، بلکہ تعاون وتبرع اصل مقصد ہوتا ہے۔

۳۔ تکافل کمپنیوں کے لئے ضروری اور لازم ہے کہ وہ رقم کو شرعی طور پر درست مصرف میں استعمال کریں اور ذمہ داریوں کے بوجھ کو ہلکا رکھنے کی کوشش کریں،

اسی طرح رقم کی سرمایہ کاری میں اس بات کا التزام کریں کہ مساہمین کو حاصل ہونے والے منافع کی مقدار زیادہ ہوسکے۔

۴۔ شرعی طور پر حرام اشیاء کا انشورنس کرنا، خواہ وہ مسلمان کے قبضہ میں ہو یا غیر مسلم کے، بہر حال جائز نہیں ہوگا۔

۵۔ ایسی کمپنیوں کا یا اداروں کا انشورنس کرنا بھی جائز نہیں ہوگا جن کا مقصد حرام اشیاء کی تیاری یا حرام اشیاء کی خرید وفروخت ہو۔

۶۔ تکافل کسٹمرس کو اس بات کی ضمانت دی جائے کہ حادثہ پیش آنے کی صورت میں انہیں لازمی کارروائی کے بعد بغیر ٹال مٹول کے جلد از جلد معاوضہ ادا کردیا جائے گا۔

۷۔ تکافل کمپنی اس بات کو ملحوظ رکھے کہ دیگر معاملات کی طرح اپنے مالی معاملات میں بھی وہ احکام شریعت کی پابند رہے گی۔

۸۔ تکافل کمپنی میں ایک شرعی کمیٹی برائے نگرانی ہو جو کمپنی کے معاملات پر نگاہ رکھے، اور اس کی بنا پر لوگوں کو بھی کمپنی پر اعتماد رہے، اس کمیٹی کے ذمہ مندرجہ ذیل امور بھی رہیں گے:

الف۔ مسائل شرعیہ اور استفتاء کے شریعت کی روشنی میں جوابات دینا۔

ب۔ کمپنی کے تمام مالی معاملات (اندرونی ہو یا بیرونی، پھر بیرونی میں نیشنل ہوں یا انٹرنیشنل) کی شریعت کی رہنمائی میں نگرانی کرنا۔

ج۔ سود و قمار اور محرمات شرعیہ سے پاک مالی معاملات کے ماڈلس پیش کرنا تا کہ عوام الناس کا اکثر حصہ حرام سے بچ کر حلال طریق کو اختیار کرنے والا بن جائے۔

اس کے علاوہ شرعی کمیٹی کی ایک اہم حیثیت یہ بھی ہونا چاہئے کہ اس کو تنفیذی قوت بھی حاصل ہو، یعنی جو قرارداد وہ پیش کرے اس پر عمل کروانے کی قوت بھی اسے حاصل ہو اور اس قرارداد کی مخالفت کرنے پر مناسب کارروائی کی جائے، تا کہ کمپنی کی ساکھ بھی برقرار رہے اور مروجہ انشورنس و تکافل انشورنس کے درمیان موجود فرق عوام کے سامنے آئے۔

تکافل کی قسمیں:...... مروجہ انشورنس کی گرچہ بہت ساری قسمیں عام ہو چکی ہیں، لیکن تکافل کی دو ہی قسمیں موجود ہیں: (۱) جنرل تکافل، (۲) فیملی تکافل۔

جنرل تکافل:...... اس میں اثاثہ جات، جیسے گاڑی، مکان و دکان، جہاز و کارخانے وغیرہ کو ممکنہ خطرات سے نمٹنے کے لئے تکافل کی رکنیت فراہم کی جاتی ہے، جس کی رو سے اگر اس اثاثہ کو کوئی حادثہ لاحق ہو جائے تو اس کے نقصان کی تلافی تکافل کمپنی کرتی ہے۔

فیملی تکافل:

اس میں انسانی زندگی کو پیش آنے والے متوقعہ خطرات سے نمٹنے کے لئے تکافل کی رکنیت فراہم کی جاتی ہے، اس میں شرکاء کو تکافل تحفظ کے ساتھ ساتھ حلال سرمایہ کاری کی سہولت بھی مہیا رہتی ہے، چنانچہ جب کوئی شریک رکنیت حاصل کر لیتا ہے تو ایک مخصوص مدت کے لئے ماہانہ یا سالانہ بنیاد پر رقم کا متعین حصہ (Premium) ادا کرتا ہے، جس میں سے کچھ رقم وقف فنڈ میں جمع کردی جاتی ہے، جبکہ باقی ماندہ حصہ سرمایہ کاری میں لگایا جاتا ہے، گویا شریک تکافل کی رقم دو حصوں میں تقسیم کر کے ایک حصہ وقف فنڈ میں ڈال دیا جاتا ہے اور دوسرے حصہ کو سرمایہ کاری میں لگا دیا جاتا ہے۔

یہاں اس بات کا ذکر مناسب ہوگا کہ فی زمانہ تکافل کے دو ماڈل اور نمونے رائج ہیں: (۱) مضاربہ ماڈل، (۲) وکالہ ماڈل۔

مضاربہ ماڈل میں کمپنی مضارب کی حیثیت سے ذمہ داری انجام دیتی ہے اور وقف فنڈ کو رب المال کی حیثیت حاصل ہوتی ہے، اسی بنیاد پر حاصل ہونے والے منافع کمپنی اور وقف فنڈ کے درمیان تقسیم کردیے جاتے ہیں۔ جبکہ وکالہ ماڈل میں کمپنی کے منیجر کی حیثیت وکیل کی ہوتی ہے کہ دیگر تمام مساہمین اسے سرمایہ کاری کے لئے وکیل بناتے ہیں۔ اب وقت وحالات، نیز ملک اور مارکیٹ پر غور وفکر کرنے کے بعد منیجر کی شرعی واخلاقی ذمہ داری رہتی ہے کہ رقم کو ایسے مصرف میں استعمال کرے جہاں نقصان کا اندیشہ کم ہو اور شرکاء کا زیادہ فائدہ ہوسکے۔

ری تکافل:...... بسا اوقات تکافل کی خدمات مہیا کرنے والی کمپنی کو خود اس بات کا خطرہ رہتا ہے کہ کہیں اس کا سرمایہ نقصان کا شکار نہ ہو جائے، اس اندیشہ کو دور کرنے کے لئے تکافل کمپنی خود اپنے سرمائے کا کسی دوسری بڑی کمپنی سے تکافل کرواتی ہے، جیسے "ری تکافل" اور انگریزی میں Reinsurance کہتے ہیں۔

تکافل کا طریقہ کار:

نظام تکافل میں کمپنی کی حیثیت ایک وکیل یا منیجر کی ہوتی ہے، چنانچہ اولاً شیئر ہولڈرس کچھ رقم با قاعدہ طور پر وقف کردیتے ہیں، جس سے ایک وقف پول یا فنڈ (جسے Participant's Takaful Fund) قائم کیا جاتا ہے، اور اس فنڈ سے ممبران کا تعلق محض عقد تبرع کا ہوتا ہے، وقف کرنے کی بنا پر وقف کردہ اموال کی ملکیت وقف کنندہ سے ہٹ کر وقف فنڈ کی جانب منتقل ہوجاتی ہے، جیسا کہ شامی میں ہے: ''قوله: وللملك يزول: أى ملك الواقف فيصير الوقف لازماً للاتفاق على التلازم بين اللزوم والخروج عن ملكه'' (رد المحتار كتاب الوقف، مطلب شرائط الواقف معتبرة إذا لم تخالف الشرع ۴،۳۶۱، ط: مكتبه نعيميه ديوبند)۔ البتہ اس وقف کے منافع سے استفادہ کرنے کا وہ مجاز ہوگا جس کی شریعت میں گنجائش ہے، چنانچہ "شرط الواقف كنص الشارع" کی بنیاد پر واقف یہ شرط رکھتا ہے کہ وقف فنڈ کو جو بھی عطیہ وہ دے گا اس کے منافع سے شرائط وقف کے بموجب وہ استفادہ کرے گا، لہذا اس کی اس شرط کا احترام کرتے ہوئے اس کو فوائد ومنافع کا مستحق گردانا جائے گا، پھر لوگ اس فنڈ کی رکنیت حاصل کرلینے کے بعد ایک خاص مقدار میں با قاعدہ بطور تبرع وقف نامہ کی شرائط کے مطابق اس فنڈ کو عطیات دیتے ہیں، اور جس کسی شریک کو بھی کوئی نقصان پہنچے تو وہ اس فنڈ سے فوائد اور مالی معاوضہ حاصل کرتا ہے، یہاں یہ بات بھی ملحوظ رہے کہ اس فنڈ میں آنے والے تمام عطیات محض تبرعات ہوتے ہیں، بذات خود وقف نہیں ہوتے ہیں، بلکہ وقف کی ملکیت سمجھے جاتے ہیں، اور چونکہ یہ عطیات شرکاء کی ملکیت سے خارج ہوتے ہیں، اس لئے ان پر نہ ہی زکوۃ واجب ہوتی ہے اور نہ ہی میراث کے احکام جاری ہوتے ہیں، علامہ شامی لکھتے ہیں: ''واستحسن فى الفتح قول مالك أنه حبس العين على ملك الواقف فلا يزول عنه ملكه، لكن لا يباع ولا يورث ولا يوهب'' (رد المحتار: كتاب الوقف، مطلب لو وقف على الأغنياء وحدهم لم يجز ۲۵۸/۴)۔ اور نہ ہی اس کی بنیاد پر وہ سرپلس کے مستحق ہوتے ہیں، حتی کہ کمپنی کے مالکان بھی اس رقم کو اپنے تصرف میں نہیں لاسکتے ہیں، گویا یہ تبرعات مکمل طور پر وقف پول کی ملکیت میں چلے جاتے ہیں جہاں قواعد وضوابط کے تحت ان کا استعمال عمل میں آتا ہے، اور کسی کو نقصان پہنچنے کی صورت میں وہ وقف پول سے فوائد کا مستحق ہوتا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ اس فنڈ کو شرعی طریقہ کے مطابق کاروبار میں لگایا جاتا ہے، جس سے حاصل ہونے والے منافع بھی اسی فنڈ کی ملکیت ہوجاتے ہیں، او راس فنڈ سے حاصل ہونے والے منافع ان تبرعات کی بنا پر نہیں ہوتے جو انہوں نے دیئے ہیں، بلکہ یہ فوائد ان کے من وجہ موقوف علیہ ہونے کی بنا پر ان کو حاصل ہوتے ہیں۔

تیسری بات یہ کہ نظام تکافل میں کمپنی کی حیثیت وکیل یا منیجر کی ہوتی ہے، کمپنی وقف فنڈ کی دیکھ بھال کے لئے ''وکالہ فیس'' وصول کرتی ہے، جو فنڈ کو دیئے گئے عطیات سے وصول کی جاتی ہے، نیز کمپنی بسا اوقات فنڈ میں موجود رقم کو اسلامی طریقہ کے مطابق سرمایہ کاری میں لگاتی ہے، اس حیثیت سے کمپنی مضارب ہوتی ہے اور فنڈ رب المال ہوتا ہے، لہذا کمپنی مضاربت کے منافع میں سے متعین حصہ وصول کرنے کے بعد بقیہ رقم رب المال یعنی فنڈ کی ملکیت میں جمع کردیتی ہے۔

وقف فنڈ اور آمدنی کے ذرائع:

تکافل سسٹم میں موجود وقف فنڈ کی آمدنی کے ذرائع مختلف ہوسکتے ہیں، جن میں سے کچھ یہ ہیں:

۱۔ شرکاء تکافل، یعنی تکافل ممبرس سے حاصل ہونے والے عطیات۔

۲۔ ''ری تکافل'' آپریٹر سے حاصل شدہ کلیمز، یعنی وہ رقم جو تکافل کمپنی کو دوسری بڑی تکافل کمپنی کی جانب سے بھرپائی کی شکل میں حاصل ہوئی ہو۔

۳۔ اس فنڈ کے لئے تبرعاً دیا جانے والا کوئی بھی عطیہ۔

۴۔ وقف پول کے فنڈ میں خسارہ کی صورت میں وکیل (Share Holder) سے حاصل ہونے والا قرض حسنہ۔

وقف فنڈ کے اخراجات:

جس طرح وقف فنڈ کی آمدنی کے ذرائع مختلف ہیں اسی طرح اس کے اخراجات بھی مختلف ہیں، جیسے:

۱۔ تکافل ممبرس کے کلیمز کی ادائیگی، یعنی شرکاء تکافل میں سے کسی کو حادثہ پیش آنے کی صورت میں ادا کی جانے والی رقم۔

۲۔ ''ری تکافل'' آپریٹر کے اخراجات، یعنی تکافل کمپنی کو تکافل کی خدمات فراہم کرنے والی کمپنی کے اخراجات۔

۳۔ تکافل کی خدمات انجام دینے میں مدد کرنے والے افراد کی فیس۔

۴۔ فنڈز کی سرمایہ کاری کے بعد حاصل ہونے والے نفع میں سے تکافل آپریٹرز کے حصہ کی ادائیگی۔

۵۔ بقایا رقم (Surplus) کا وہ حصہ جو ممبران تکافل میں تقسیم کیا جاتا ہے۔

۶۔ قرض حسنہ کی واپسی۔

۷۔ عطیات و خیرات کی مد میں کمپنی کی جانب کی ادا کی گئی رقم۔

الغرض، تکافل کمپنی کے ذرائع آمدنی بھی متعدد ہوتے ہیں، اور اخراجات بھی متعدد قسم کے ہوا کرتے ہیں۔

روایتی انشورنس اور تکافل میں فرق:

شیخ علی محی الدین قرہ داغی کی تحقیق کے مطابق مروجہ انشورنس اور تکافل کے درمیان بہت سے فرق پائے جاتے ہیں، جن میں سے بنیادی فرق تو یہی ہے کہ تکافل باہمی تعاون پر مبنی عقد کا نام ہے جو احکام شرعیہ پر مبنی ہوتا ہے، جبکہ مغرب کا پیش کردہ روایتی انشورنس نہ ہی تبرع و تعاون پر مبنی ہوتا ہے اور نہ ہی احکام شرعیہ کا پابند ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ دیگر فروق میں سے یہ بھی ہیں:

۱۔ تکافل میں ربا، قمار یا جہالت کی گنجائش نہیں رہتی ہے، جبکہ مروجہ انشورنس میں یہ سب باتیں موجود ہوتی ہیں۔

۲۔ تکافل میں کمپنی مالکان و ممبران کا آپسی تعلق تبرع پر مبنی ہوتا ہے، جبکہ مروج انشورنس میں تعلق کی بنیاد معاوضہ پر ہوتی ہے کہ انشورنس کروانے والا اقساط ادا کرتا ہے جس کے بدلہ میں اسے تحفظ فراہم کیا جاتا ہے۔

۳۔ تکافل میں سرپلس کو تکافل ممبرس کے درمیان تقسیم کیا جاتا ہے، جبکہ انشورنس میں سرپلس کو کمپنی کی ملکیت سمجھا جاتا ہے جس میں سے ممبرس کو کچھ نہیں ملتا ہے۔

۴۔ تکافل میں مشارکین کی جانب سے ادا کی گئی قسطیں وقف فنڈ کی ملکیت ہوتی ہیں، نہ کہ کمپنی کی، جبکہ انشورنس میں قسطوں پر کمپنی کی ملکیت رہتی ہے۔

۵۔ تکافل میں فنڈ کی سرمایہ کاری سے حاصل شدہ منافع میں سے کمپنی کا (بحیثیت مضارب) حصہ نکالنے کے بعد بقیہ رقم دوبارہ فنڈ میں جمع کردی جاتی ہے، جبکہ انشورنس میں کمپنی اس مال کو تجارتی مقاصد ہی کے لئے استعمال کرتی ہے۔

۶۔ تکافل کا مقصد معاشرہ کے پریشان حال افراد کی مدد کرنا ہوتا ہے، جبکہ انشورنس میں زیادہ سے زیادہ مالی منفعت کا حصول مقصد ہوتا ہے۔

۷۔ تکافل میں کمپنی بحیثیت وکیل ذمہ داری انجام دیتی ہے، جبکہ انشورنس میں کمپنی وکیل نہیں، بلکہ اصیل کی حیثیت سے اپنے مفادات کو مدنظر رکھ کر اپنے نام سے معاملات طے کرتی ہے۔

۸۔ تکافل میں ہر ممبر اس بات کا متمنی ہوتا ہے کہ حوادث کا وقوع کم سے کم ہو، تاکہ کمپنی کے سرمایہ میں اور سرپلس میں اضافہ ہو، نیز سال کے آخر میں حاصل ہونے والے منافع کی مقدار زیادہ ہے، جبکہ انشورنس میں کسٹمر یا ممبر کو اس بات کی کوئی فکر نہیں رہتی ہے، کیونکہ وہ اقساط ادا کر کے مطمئن ہوجاتا ہے کہ چاہے حوادث ہوں یا نہ ہوں، بہر حال رقم ملنی ہی ملنی ہے، جس کی وجہ سے احساس غیر ذمہ داری کا رجحان پیدا ہوتا ہے، جو یقینا نقصان دہ ہے۔

۹۔ تکافل میں کمپنی کا ایک شرعی بورڈ ہوتا ہے جس کی نگرانی میں فنڈ کو شریعت کے مطابق جائز کاروبار میں لگایا جاتا ہے (پاکستان میں تکافل رولز ۲۰۰۵ء کے مطابق ہر کمپنی کا شریعہ بورڈ ہونا ضروری ہے جس میں کم از کم تین ممبر ہونے چاہئیں) جبکہ انشورنس کے روایتی نظام میں نہ اس طرح کی کوئی نگرانی ہوتی ہے اور نہ ہی کسی اخلاقی پابندی کا تصور ہوتا ہے، جہاں فائدہ ہو۔ قطع نظر اس سے کہ کاروبار حلال ہے یا حرام۔ وہاں سرمایہ کاری کی جاتی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ مروجہ انشورنس چونکہ عقد معاوضہ ہے، اس لئے اس میں غرر۔ چاہے قلیل ہو یا کثیر۔ بہر حال ممنوع ہوگا، اور تکافل عقد تبرع ہے، اس لئے اس میں مفاد عامہ کی غرض سے غرر کو کسی حد تک روا سمجھا گیا ہے؛ کیونکہ اس کی وجہ سے نفس عقد پر کوئی اثر نہیں پڑتا ہے۔ اس کی بنیاد وہ قاعدہ ہے جسے علماء اصولیین نے ذکر کیا ہے: "یغتفر فی التبرعات ما لا یغتفر فی المعاوضات"۔ نیز علامہ قرافی نے بھی اپنی کتاب ''الفروق'' میں اسی قاعدہ کی مناسب توضیح

پیش کی ہے، جس سے پتہ چلتا ہے کہ تبرعات میں غرر کی گنجائش ہوتی ہے (دیکھئے: الفروق، الفرق الرابع والعشر ون بین قاعدۃ ما تؤثر فیہ الجہالات والغرر وقاعدۃ ما لا یؤثر فیہ ذلک من التصرفات ۱/۱۵۰، ط: عالم الکتب بیروت)۔

ان تمام باتوں سے موجودہ انشورنس اور تکافل کے درمیان موجود فرق بھی ظاہر ہو جاتے ہیں اور مروجہ انشورنس کے اسباب حرمت بھی سامنے آجاتے ہیں۔

ہندوستان میں تکافل کی ابتداء کیسے ہو؟

اس مضمون کا سب سے مشکل مرحلہ ہے کہ ملک ہندوستان میں تکافل کی ابتداء کیسے ہو، کیونکہ ہندوستان ایک کثیر المذہبی ملک ہے جہاں کثیر الجماعتی نظام حکومت رائج ہے، جبکہ ہمارے اس ملک میں Mixed Economics کام کرتی ہے، سرمایہ دارانہ نظام اور Capitalism کا غلبہ ضرور ہے، پھر بھی بہت سارے میدانوں میں حکومت عوام کو اپنی مرضی کے مطابق تجارت کرنے کی چھوٹ بھی دیتی ہے، اس عنوان کے تحت مزید لکھنے سے پہلے کچھ حقائق کا ذکر کرنا ضروری ہے، پھر ہمارا طریقہ کار کیا ہو وہ بیان کیا جائے گا۔

۱۔ ملک کے مشہور روزنامہ Times of India میں شائع شدہ خبر (۲۸/۳/۲۰۱۰ء) کا خلاصہ یہ ہے کہ N.C.A.E.R (نیشنل کاؤنسل فار اپلائیڈ اکنامک ریسرچ) کے سروے کے مطابق ہر دس مسلمان افراد میں سے تین افراد سطح غربت کے نیچے زندگی گزار رہے ہیں، جن کی ماہانہ آمدنی ۵۵۰ روپے سے بھی کم ہے (۲۰۰۴-۲۰۰۵ کے مطابق) اس طرح کل ۳۱ فیصد مسلمان سطح غربت کے نیچے زندگی گزار رہے ہیں، جبکہ ۲۰۰۱ء کی مردم شماری کے مطابق ہندوستان میں مسلمانوں کی تعداد ۱۳-۸ کروڑ ہے، جو ہندوستان کی آبادی کا ۱۳-۴ حصہ ہے۔

۲۔ ۲۰۰۱ء کی جاریہ مردم شماری کے مطابق ہندوستان باعتبار آبادی چین کے بعد دوسرے نمبر پر ہے، جس کے مطابق ہندوستان کی آبادی ۱،۲۱۰،۱۹۳،۴۲۲ ہے، (دیکھئے: Wikipedia) جس میں مسلمانوں کا تناسب تقریباً سولہ سے اٹھارہ کروڑ ہے (دیکھئے: www.indian muslim obesarver com پر wikipedia کی رپورٹ)۔

۳۔ مشہور ویب سائٹ Rediff.com پر ۹/۷/۲۰۰۵ء کی خبر کا عنوان تھا:

Now Islamic Insurance from LIC

جس میں واضح کیا گیا تھا کہ اب ریزو بنک آف انڈیا بھی ہندوستانی بینکوں میں اسلامک بینکنگ کی راہ ہموار کرنے کا مشتاق ہے، نیز LIC بھی تکافل سے متعلق تیاریاں کررہی ہے، چنانچہ LIC کا نیا انٹرنیشنل وین چر Saudi Insurance Company_Indo ہندوستان میں تکافل کی خدمات متعارف کروانے والا پہلا ادارہ ہوگا۔

اس پس منظر میں دیکھیں کہ ہندوستان میں تکافل کی کتنی ضرورت ہے اور اس کے لئے کس قسم کی کوشش کی جانی چاہئے۔

اس سلسلہ میں عاجز کی رائے یہ ہے کہ تکافل کے تعلق سے ہونے والی کوششیں دو پیمانوں پر ہوں، ایک تو ملکی پیمانہ پر اور دوسرے بین الاقوامی پیمانہ پر، پھر ملکی پیمانہ پر تکافل کی ترغیب تین سطحوں پر ہو، (۱) حکومتی سطح پر، (۲) تعلیمی سطح پر، (۳) عوامی سطح پر۔

۱۔ حکومتی سطح کی کوششیں: گذشتہ سالوں، بلکہ گزشتہ دہائیوں کا معاشی خاکہ (بالخصوص انشورنس کے حوالہ سے) حکومت کے سامنے رپورٹ کی شکل میں پیش کیا جائے، جس میں اعداد و شمار کی روشنی میں انشورنس سے ہونے والے منافع بتائے جائیں، پھر نظام تکافل کی ترتیب کے مطابق ان منافع کو واضح کیا جائے کہ اگر روایتی انشورنس کی جگہ تکافل سسٹم ہوتا تو نتائج کیا ہوتے۔

۲۔ تعلیمی سطح پر کام کرنے کے دو میدان ہیں، پہلا تو یہ کہ یونیورسٹی اور تعلیمی اداروں سے وابستہ افراد اور بالخصوص معاشیات و اقتصادیات کے موضوع پر اتھارٹی رکھنے والے حضرات کو تکافل کی تفصیلات فراہم کرکے اس سے متعلق اظہار خیال کی دعوت دی جائے، نیز ان کی جوابی تحریروں کو یکجا کرکے شائع کروایا جائے، تاکہ دیگر حضرات ان کی رائے سے واقف ہو کر نئی جہت میں سوچنے کے قابل ہو سکیں، جبکہ دوسرا میدان طلبہ کا ہے، جس میں کالج و یونیورسٹی کے طلبہ کو دو حصوں میں تقسیم کرکے محنت کی جائے، ایک تو وہ طلبہ جو بلا واسطہ کامرس و اکونومکس سے جڑے ہیں، انہیں تطبیقی انداز میں سمجھا کر قابل قدر مواد فراہم کیا جائے، اور دوسرے وہ طلبہ جو کسی اور فن سے وابستہ ہیں، انہیں علمی مواد کی فراہمی کے علاوہ Dema اور Presentations کے ذریعہ سمجھایا جائے۔

۳۔ عوامی سطح کی کوششیں: عوام کو بھی تین زمروں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے، ایک تو وہ افراد ہیں جو تجارت پیشہ ہیں، دوسرے وہ ہیں جو سرکاری ملازم یا پرائیوٹ ملازم ہیں، اور تیسرے وہ ہیں جو Pension حاصل کرتے ہیں یا معذور ہیں۔ تجارت پیشہ افراد کو جنرل تکافل کی شکل اور منافع بتائے جائیں، جبکہ بقیہ دونوں قسم کے افراد کو فیملی تکافل کی جانب متوجہ کیا جائے، الغرض تکافل میں انضمام کی تمام ممکنہ صورتوں کو اختیار کرنے کی کوشش کی جائے۔

بین الاقوامی سطح پر کیے جانے والے اقدامات:

۱۔ دنیا بھر میں موجود کامیاب تکافل کمپنیوں کو اس بات کی دعوت دی جائے کہ وہ ملک ہند میں بھی اپنا کاروبار شروع کریں، رپورٹس، اعداد وشمار اور مسلمانوں کا تناسب بتا کر ان کو تکافل مارکیٹ کی وسعت سے متعلق بھی جانکاری دی جائے۔

۲۔ IBM اور IIM کے طلبہ، نیز ہندوستان کے معیاری اداروں کے طلبہ کے لئے تکافل سے متعلق ورکشاپ کا انعقاد کیا جائے، اور ان کی ذہن سازی کے لئے ملکی وغیر ملکی ماہرین کو بلا کر تکافل کا صحیح تعارف پیش کیا جائے۔

نیز چند اور اہم نکات یہ بھی ہیں:

☆ لفظ تکافل کی جگہ کوئی اور ہم معنی لفظ کا استعمال کیا جائے۔

☆ برادران وطن کو اس مہم میں بالخصوص قریب کرنے کی کوشش ہو، کیونکہ تکافل کا تعلق صرف اسلام ہی سے نہیں، بلکہ ساری انسانیت سے ہے۔

☆ تکافل کی پلاننگ منظم انداز میں ہو اور طویل المیعاد ہو، جو کم از کم پانچ سال کا ٹارگیٹ مقرر کر کے کام کرے، کیونکہ کم وقت میں بڑی تبدیلی لانا بہت ہی مشکل ہے۔

☆ عوامی بیداری پیدا کرنے کے لئے پمفلٹ، کارنر میٹنگس، ہورڈنگس کا استعمال ہو، نیز رضا کار افراد کی ایک جماعت ہو جو ملک بھر میں اس کاز کے لئے کام کرے۔

☆ ملک کی Mega Cities اور بڑے شہروں میں پروگرام منعقد کیے جائیں، جس میں جید علماء کرام شریعت کی روشنی میں تکافل کا مقصد بیان کریں اور ماہر اقتصادیات افراد اس کے فوائد ومنافع اور عصر حاضر میں اس کے طریقہ کار کو واضح کریں، تاکہ کہیں بھی دین اور دنیا بہر دو اعتبار کوئی کمی نہ رہے۔

☆ ایسے اداروں کی بنیاد رکھی جائے یا موجودہ اداروں میں کورسیز کی ابتداء کی جائے جس کا مقصد مروجہ انشورنس سے ہٹ کر تکافل کی افادیت ثابت کرنا ہو، اور کورس میں اس بات کو ملحوظ رکھا جائے کہ وہ تطبیقی انداز میں ہو، صرف کتابی یا تھیوری کے طرز پر نہ ہو۔

☆ ہندوستان کی انشورنس کمپنیوں میں سے مشہور کمپنیاں جیسے LIC, Relience اور Bajaj Allianz وغیرہ سے رابطہ کر کے ان کے ذمہ داروں سے تبادلہ خیال کیا جائے، جو غالباً کسی حد تک شروع ہو چکا ہے۔

خلاصہ تحریر یہ ہے کہ امت اسلامیہ کو اور سسکتی ہوئی انسانیت کو مغربی نظام سے اور اس کے شکنجہ سے آزاد کروانا، صلیبی وصہیونی پنجوں کو اپنے مفادات کے حصول سے روکنا، باہمی اخوت ومحبت اور آپسی اتحاد واتفاق کو قائم کرنے میں؛ نیز اسلامی بیداری کے لئے ہر شعبہ حیات میں ممکنہ کوشش کا کرنا اور اس کے ہر جائز وسیلہ کا اختیار کرنا ہر مسلمان کی اور ہر ''انسان'' کی شرعی واخلاقی ذمہ داری ہے، اور ایک عالم دین ہونے کی مناسبت سے ہماری یہ ذمہ داری کچھ اور بڑھ جاتی ہے کہ اس کے لئے ہمیں نہ صرف محنت کرنا ہے، بلکہ افراد سازی وکردار سازی بھی کرنا ہے، قرآن کی بشارت {ومن یتق اللہ یجعل لہ مخرجا} (سورہ الطلاق: ۲) کے مطابق ہر انسان پر اس حقیقت کو واضح کرنا ہے کہ برکت ورحمت کا رشتہ حلال سے ہے، نہ کہ حرام سے، اور قرآن ہی کے بیان کردہ اصول {وأحل اللہ البیع وحرم الربا} (سورہ البقرۃ: ۲۷۵) میں خالق کائنات نے آمدنی وتجارت کے حلال وحرام ذرائع کو تا قیامت آنے والی انسانیت کے لئے بیان فرمادیا ہے۔ السعی منا والإتمام من اللہ۔

عہد حاضر میں اسلامی انشورنس (تکافل) کی ضرورت

جناب ایچ عبدالرقیب [1]

تکافل کیا ہے؟

تکافل عربی زبان کا لفظ ہے جو کفالت سے نکلا ہے اور کفالت ضمانت اور دیکھ بھال کو کہتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں باہم ایک دوسرے کا ضامن بننا یا باہم ایک دوسرے کی دیکھ بھال کرنا مراد ہے۔

''تکافل'' کی بنیاد بھائی چارے، امداد باہمی، اور تبرع کے نظریے پر ہے جو شریعت کی نظر میں پسندیدہ ہے۔ دور جدید میں تکافل کو روایتی انشورنس کے متبادل کے طور پر بطور اسلامی انشورنس کے استعمال کیا جارہا ہے۔ اس نظام میں تمام شرکاء باہم رسک شیئر کرتے ہیں اور شرکاء باہمی امداد و بھائی چارے کے اس طریقے سے مقررہ اصول وضوابط کے تحت ممکنہ مالی اثرات سے محفوظ ہوجاتے ہیں۔ روایتی انشورنس کے مقابلے میں تکافل کا نظام ایک عقد تبرع ہے کہ جس میں شرکاء آپس میں ان خطرات کو تقسیم کرتے ہیں، تکافل نظام کے عقد تبرع کے نتیجے میں بالواسطہ یا بلاواسطہ کسی قسم کے سود کا عنصر موجود نہیں۔

قرآن وسنت میں تکافل کا تصور:

تکافل کا تصور کوئی نیا ایجاد کردہ تصور نہیں ہے، بلکہ واضح طور پر قرآن کریم اور احادیث مبارکہ میں یہ تصور موجود ہے، قرآن کریم اور احادیث مبارکہ میں باہمی امداد اور تعاون کی بڑی ترغیب دی گئی ہے اور یہی باہمی امداد ہی تکافل کی بنیاد ہے، قرآن کریم میں ارشاد باری ہے: {وتعاونوا علی البر والتقوی} (المائدہ:۲) (نیکی اور تقوی کے کاموں میں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرو)۔

{إنما المؤمنون إخوة} (الحجرات:۱۰) (مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں)۔

اس تعاون اور باہمی بھائی چارے کا تقاضا یہی ہے کہ مسلمان ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کریں اور ایک دوسرے کے لئے سہارا بن جائیں اور مصیبت میں کام آئیں، جیسا کہ بھائی آپس میں کرتے ہیں۔ انہی اسلامی تعلیمات پر عمل کرنے سے دنیا میں بھائی چارے، اخوت، ہمدردی، اور باہمی تعاون کی خوش گوار فضا قائم ہوسکتی ہے اور یہی نظریہ تکافل کی بنیاد ہے۔ یہ بات بھی ملحوظ خاطر رہے کہ تکافل صرف مسلمانوں کے لئے نہیں کوئی بھی فرد جو اس کا ممبر بنے گا وہ اس سے استفادہ کرسکے گا۔ ملیشیا میں مسلمان ہی نہیں، بلکہ غیر مسلم بھی اسلامی بنکوں اور تکافل کمپنیوں کے ساتھ معاملات کرتے ہیں، یہ معاہدہ باہمی تعاون وتناصر پر مبنی ہے، چنانچہ اس میں ایک دفعہ یہ بھی ہے کہ ''ہر گروہ کو عدل وانصاف کے ساتھ اپنی جماعت کا فدیہ دینا ہوگا'' اس قیدی کے چھڑانے کا فدیہ اسی قبیلے کے ذمہ ہوگا۔

بعض لوگوں کے نزدیک انشورنس یا تکافل اسلام کے تصور توکل کے خلاف ہے۔ یہ خیال غلط فہمی پر مبنی ہے اور درست نہیں، توکل کے معنی ترک اسباب کے نہیں۔ بلکہ اسباب کو اختیار کرتے ہوئے اس کے نتائج کو اللہ کے حوالے کرنے کا نام توکل ہے۔ لہذا اسباب کو اختیار کرنا اور اس کے نتائج وثمرات کو اللہ تعالی کے سپرد کرنا ہی توکل ہے۔ جیسا کہ حدیث شریف میں ہے کہ ایک بدوی نے اونٹ کو باندھے بغیر چھوڑا اور اس کو توکل سمجھا، چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو تنبیہ فرمائی۔

ایک صحابی نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں اپنے اونٹ کو باندھ کر اللہ پر توکل کروں یا اس کو چھوڑ دوں، پھر اللہ پر توکل کروں؟ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ایسا نہ کرو، بلکہ پہلے اونٹ کو باندھو اور پھر اللہ تعالی پر توکل کرو (ترمذی: ۲۷۷)۔

اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام نے اسباب اختیار فرمائے ہیں، بیماری میں علاج اختیار فرمایا ہے، جیسا کہ ایک روایت میں آتا ہے کہ حضرت اسامہ بن شریک سے روایت ہے کہ صحابہ کرامؓ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم (جب ہم بیمار ہوں تو) کیا ہم علاج

---

[1] جنرل سکریٹری انڈین سینٹر فار اسلامک فائنانس، نئی دہلی۔

کروائیں؟ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اے اللہ کے بندو! ہاں علاج کراؤ، کیونکہ اللہ تعالی نے بڑھاپے کے علاوہ تمام بیماریوں کا علاج پیدا کیا ہے (مشکوۃ ۲/۳۸۸، رواہ احمد وترمذی وابوداؤد)۔

اپنی اولاد کے لئے ورثے کے طور پر کچھ مال وغیرہ چھوڑنا، تاکہ وہ بعد میں دوسروں کے آگے ہاتھ نہ پھیلائیں اور ذلیل نہ ہوں اس کو شریعت نے افضل قرار دیا ہے، جیسا کہ حدیث شریف میں آتا ہے: ''آپ اپنی اولاد کو مالدار چھوڑیں یہ زیادہ بہتر ہے اس سے کہ آپ انہیں فقر و فاقے کی حالت میں چھوڑیں اور وہ لوگوں سے مانگتے پھریں'' (بخاری ۱/۳۸۳)۔

قرآن کریم اور حدیث مبارکہ کی روشنی میں یہ بات عیاں ہے کہ اس نظام کے جائز ہونے، بلکہ مستحسن ہونے میں کوئی شبہ نہیں بشرطیکہ یہ اپنے صحیح اصولوں کے مطابق ہو اور اخلاص کے ساتھ ہو۔

ممکنہ مالی خطرات کی پیش بندی:

ممکنہ خطرات سے بچاؤ کی تدابیر اختیار کرنا (یعنی رسک منیجمنٹ) اور مالی اثرات کو ختم یا کم کرنے کا خیال کوئی نیا تصور نہیں ہے، خود شریعت نے بھی اس کو تسلیم کیا ہے، اگر جائز طریقہ کار کے مطابق ایسی تدابیر اختیار کی جائیں تو یہ اسلام کے خلاف نہیں، چنانچہ اسلام میں بھی رسک منیجمنٹ کی مثالیں پائی جاتی ہیں اس کی سب سے خوب صورت مثال وہ ہے جو سورہ یوسف میں قحط سالی سے نمٹنے کے لئے سیدنا یوسفؑ کے اٹھائے گئے اقدامات کی صورت میں بیان ہوئی ہے۔ اس کے علاوہ قتل خطا کی صورت میں تاوان (دیت) کے ادا کرنے کی مثال دی جاسکتی ہے جسے اگر کوئی شخص قتل کردے، جس کے نتیجے میں دیت واجب ہوجائے تو بعض صورتوں میں دیت قاتل ادا نہیں کرتا، بلکہ اس کی برادری پر واجب ہوتی ہے اس کو عاقلہ کہتے ہیں۔ اس طرح نقصان پوری برادری پر تقسیم ہوجاتا ہے۔ اس نظام کو مدینہ کے اولین دستور ''میثاق مدینہ'' میں باقاعدہ قانونی (Legal) حیثیت دی گئی تھی۔

''هذا كتاب من محمد النبي رسول الله بين المؤمنين من قريش وأهل يثرب ومن تبعهم فلحق بهم فحل معهم وجاهد معهم أنهم أمة واحدة دون الناس للهاجرون من قريش على رباعتهم يتعاقلون بينهم معاقلهم الأولى وهم يفدون عانيهم بالمعروف والقسط بين المؤمنين والمسلمين'' (كتاب الاموال)۔

(یہ تحریر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے قریش کے مسلمانوں اور اہل یثرب اور ان کے متعلقین کے درمیان ایک معاہدہ ہے کہ یہ سب مل کر امت کی مانند ہوں گے۔ قریش کے مہاجر اپنی پچھلی دیتیں اپنے پچھلے طریقے کے مطابق ادا کرتے رہیں گے اور عدل وانصاف کے ساتھ اپنی ذمہ داریاں ادا کرتے رہیں گے)۔

موجودہ دور میں خصوصاً ''ممکنہ خطرات کی پیش بندی کرنا'' ایک اہم ضرورت بن گیا ہے، اسی بنا پر فقہاء امت نے غور وخوض کے بعد تکافل کے اس طریق کار کو جو غیر شرعی طریقوں اور خرابیوں سے پاک ہے، روایتی انشورنس کے متبادل کے طور پر استعمال کرنے کی اجازت دی ہے۔

تکافل کا طریقہ کار:

تکافل کے نظام میں کمپنی کی حیثیت وکیل یا منیجر کی ہوتی ہے، تکافل نظام میں سب سے پہلے کمپنی کے شیئر ہولڈر کچھ رقم باقاعدہ وقف کرتے ہیں اس رقم سے ایک وقف پول یا فنڈ (Participant's Takaful Fund) قائم کیا جاتا ہے جہاں ان شیئر ہولڈروں کی حیثیت وقف کنندہ کی ہوتی ہے۔ البتہ اس وقف کے منافع سے وہ استفادہ کرتے ہیں اس وقف فنڈ کو PTF کا نام دیا گیا ہے۔

فقہ کا مشہور اصول ہے کہ ''شرط الواقف کنص الشارع'' یعنی وقف کرنے والے کی شرط صاحب شریعت کے فرمان کی مانند ہے، اس اصول کو مدنظر رکھتے ہوئے واقف، وقف فنڈ میں کچھ شرائط عائد کرتے ہیں جس میں ایک شرط یہ بھی ہوتی ہے کہ جو شخص بھی اس وقف فنڈ کو عطیہ دے گا، اس وقف فنڈ سے وقف شرائط کے مطابق وہ فوائد کا مستحق ہوگا۔

وقف کے اندر چونکہ اس بات کی گنجائش ہے کہ وہ مخصوص طبقے یا افراد کے لئے ہو، مثلاً کوئی شخص اپنے باغ کو اس شرط کے ساتھ وقف کرے کہ اس کا پھل صرف فلاں شخص کو یا میری اولاد کو دیا جائے یا میری زندگی میں مجھے ملتا رہے، وغیرہ تو یہ شرائط لگانا نہ صرف جائز، بلکہ مندرجہ بالا اصول کی روشنی میں ان کی پابندی بھی لازمی ہے، اسی طرح تکافل سسٹم میں وقف کرنے والا وقف کے مصالح کے پیش نظر وقف کے دائرے کو مخصوص افراد تک محدود اور وقف فنڈ سے استفادہ

کرنے کی مخصوص شرائط مقرر کر سکتا ہے۔

لوگ اس فنڈ کی رکنیت حاصل کرنے کے بعد باقاعدہ اس فنڈ کو بطور تبرع ایک خاص مقدار میں حسب شرائط وقف نامہ عطیات دیتے ہیں اور جن شرائط کو بھی نقصان پہنچے تو وہ وقف فنڈ سے فوائد کے اصول کے مستحق ہوتے ہیں جو عطیات اس فنڈ میں آتے ہیں۔ وہ محض تبرعات ہوتے ہیں بذات خود وقف نہیں ہوتے، بلکہ مملوک وقف ہوتے ہیں، جیسا کہ کسی بھی وقف میں دیا گیا چندہ وقف نہیں ہوتا، بلکہ مملوک وقف ہوتا ہے، یہ عطیات چونکہ شرکاء کی ملکیت سے خارج ہوتے ہیں، اسی لئے ان پر نہ زکوۃ واجب ہوتی ہے اور نہ ان میں میراث کے احکام جاری ہوتے ہیں اور نہ اس کی بنیاد پر وہ سرپلس کے مستحق ہوتے ہیں (کمپنی مالکان اس رقم کو اپنے تصرف میں نہیں لاسکتے)۔ یہ تبرعات مکمل طور پر وقف پول کی ملکیت میں چلے جاتے ہیں اور وقف پول قواعد وضوابط کے مطابق ان تقویم کو استعمال کرتا ہے، پھر جب ان کو نقصان پہنچتا ہے تو پھر اس کے نتیجے میں وہ اس وقف پول سے فوائد کے حصول کے مستحق ٹھہرتے ہیں۔

مذکورہ وقف فنڈ کو شرعی طریقے کے مطابق کاروبار میں لگایا جاتا ہے اور اس سے حاصل شدہ نفع کا مالک یہی وقف فنڈ ہوتا ہے۔ اس فنڈ کو دیئے گئے تبرعات کی بنیاد پر نہیں ہوتے، بلکہ یہ فوائد عطائے مستقل ہوتے ہیں، یعنی اس لحاظ سے کہ عطیہ دینے والے بھی موقوف علیہ ہوتے ہیں، کیونکہ واقف میں وقف فنڈ سے استفادے کا حق اس کو دیا ہے جو اس کی رکنیت حاصل کرے، اس لحاظ سے ہر ممبر موقوف علیہ ہو گیا (موقوف علیہ: اس کو کہتے ہیں جس پر وقف کیا گیا ہو)۔

تکافل کے اقسام:

تکافل کی دو اقسام ہیں: ۱۔ جنرل تکافل، ۲۔ فیملی تکافل۔

عمومی (جنرل) تکافل: عمومی تکافل میں اثاثہ جات، یعنی جہاز، موٹر اور مکان وغیرہ کے ممکنہ خطرات سے نمٹنے کے لئے تکافل کی رکنیت فراہم کی جاتی ہے۔ اگر اس اثاثے کو جس کے لئے تکافل کی رکنیت حاصل کی گئی ہو کوئی حادثہ لاحق ہو جائے تو اس نقصان کی تلافی 'وقف فنڈ' (پی ٹی ایف) سے کی جاتی ہے۔ کمپنی اس وقف فنڈ کو منظم کرتی ہے اور وکالہ فیس وصول کرتی ہے۔ نیز اس فنڈ میں موجود رقم کو سرمایہ کاری میں لگاتی ہے، جس کی مختلف شرعی شکلیں اور صورتیں ہوتی ہیں۔ اس میں فنڈ رب المال ہوتا ہے۔ اور کمپنی مضارب ہوتی ہے، جبکہ نفع کا خاص تناسب طے ہوتا ہے۔ اس تناسب سے کمپنی کو بحیثیت مضارب اپنا حصہ ملتا ہے، اور باقی نفع وقف فنڈ میں جاتا ہے، جو فنڈ کی اپنی ملکیت ہوتا ہے۔

فیملی تکافل یا لائف تکافل: تکافل کی اس قسم میں انسانی زندگی کے ممکنہ خطرات سے نمٹنے کے لئے تکافل رکنیت فراہم کی جاتی ہے، اس میں شرکاء کو تکافل تحفظ کے ساتھ ساتھ حلال سرمایہ کاری کی سہولت بھی فراہم کی جاتی ہے۔ یہ شریک تکافل جب کسی تکافل کمپنی میں رکنیت حاصل کر لیتا ہے تو ایک مخصوص مدت کے لئے ایک خاص رقم (پریمیم) ماہانہ یا سالانہ بنیاد پر ادا کرتا ہے جس میں سے کچھ رقم فنڈ میں جمع کی جاتی ہے، اس میں وقف فنڈ کے علاوہ ایک اور فنڈ ہوتا ہے جس کا نام پی آئی اے (Participatn's Investment Account:PIA) ہے۔ یہ شریک تکافل کا سرمایہ کاری فنڈ ہوتا ہے، جبکہ جنرل تکافل میں شریک کا پی آئی اے اکاؤنٹ نہیں ہوتا۔

اس کا طریقہ کار یہ ہے: شریک کا تکافل کی جانب سے دی گئی رقم پہلے اس کے اکاؤنٹ میں آتی ہے، جہاں اس کی سرمایہ کاری اسلامک میوچل فنڈز کے طور پر کی جاتی ہے اور اس رقم سے شرکاء کے لئے فنڈ میں یونٹس خرید لیے جاتے ہیں۔ وہاں سے کچھ حصہ یونٹس کی منسوخی کے ذریعے وقف فنڈ پی ٹی ایف کے لیے نکال لیا جاتا ہے۔ پی آئی اے میں موجود رقم شریک کی ملکیت ہوتی ہے جس پر میراث اور زکوۃ کے احکام جاری ہوتے ہیں۔ وقف پول میں آنے والی رقم محض تبرع کی بنیاد پر ہوتی ہے۔ اور تبرع کی بنیاد پر یہ رقم شریک تکافل کی عمر، صحت، پیشہ، اس کے طور طریقے اور رکنیت پلان کے مطابق مختلف ہو سکتی ہے۔ پی آئی اے میں موجود رقم سے اخراجات نکالنے کے بعد کمپنی بطور وکیل اس رقم کی شریعہ بورڈ کی نگرانی میں سرمایہ کاری کرتی ہے۔ کمپنی سرمایہ کاری کے لئے اپنی وکالہ فیس وصول کرتی ہے جس کا نفع سے تعلق نہیں ہوتا، اور یہ وکالۃ الاستعمار کہلاتا ہے۔ سرمایہ کاری کے نتیجے میں حاصل شدہ منافع شریک تکافل کو فراہم کیا جاتا ہے۔ اگر شریک تکافل کو کبھی کوئی بھی حادثہ پیش آجائے تو وقف فنڈ سے اس کی تلافی کی جاتی ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ شریک تکافل کی جانب سے ادا کردہ زرتعاون دو مدات میں تقسیم ہوتا ہے۔ رقم کا کچھ حصہ بطور تبرع وقف فنڈ میں چلا جاتا ہے اور باقی ماندہ حصہ سرمایہ کاری میں لگایا جاتا ہے۔

تکافل تحفظ کے سلسلے میں تمام کلیمز کی ادائیگی وقف پول سے کی جاتی ہے۔ اسی طرح سال کے آخر میں کلیمز کی ادائیگی اور اخراجات مہیا کرنے کے بعد

شریعہ بورڈ سے منظوری لے کر سرپلس (بچ جانے والی رقم) کو شرکاء کے درمیان تقسیم کیا جاتا ہے۔ ہر سال کے اختتام پر تمام ادا کرنے کے بعد بچ جانے والی رقم کو 'سرپلس' کہتے ہیں۔ نقصان کی صورت میں تکافل آپریٹر اپنی وکالہ فیس میں کچھ اضافہ کے بغیر وقف فنڈ کو قرض حسنہ فراہم کرتا ہے۔

وقف فنڈ کی آمدنی:

۱۔ شرکاء تکافل سے وصول شدہ زر تعاون۔
۲۔ ری تکافل آپریٹر سے حاصل شدہ کلیمز۔
۳۔ فنڈز کی سرمایہ کاری سے حاصل شدہ نفع۔
۴۔ فنڈز کی سرمایہ کاری کے نتیجے میں تکافل آپریٹرز کا نفع میں حصہ۔
۵۔ سرپلس کا وہ حصہ جو ممبران میں تقسیم کیا جاتا ہے۔
۶۔ قرض حسنہ کی واپسی۔
۷۔ عطیات رخیرات کی مد میں ادا کی گئی رقم۔

تکافل نظام میں کمپنی کی حیثیت:

تکافل نظام میں کمپنی کی اصل حیثیت وکیل یا مینیجر کی ہوتی ہے۔ کمپنی وقف فنڈ کی دیکھ بھال کے لئے وکالہ فیس وصول کرتی ہے۔ یہ فیس وقف فنڈ کے لئے دیئے گئے عطیات سے وصول کی جاتی ہے، نیز کمپنی وقف فنڈ میں موجود رقم کو اسلامی اصولوں کے مطابق سرمایہ کاری میں لگاتی ہے۔ اس حیثیت سے کمپنی چونکہ مضارب ہوتی ہے اور فنڈ رب المال ہوتا ہے، لہذا کمپنی مضاربہ کے نفع میں سے متعین حصہ وصول کرتی ہے۔ نیز اس فنڈ میں موجود رقم کو انوسمنٹ کے لئے شرعی کاروبار میں لگاتی ہے، جس کی مختلف شرعی شکلیں اور صورتیں ہوتی ہیں۔ اس میں فنڈ رب المال ہوتا ہے، اور کمپنی مضارب ہوتی ہے، جبکہ نفع کا خاص تناسب طے ہوتا ہے۔ اس تناسب سے کمپنی کو بحیثیت مضارب اپنا حصہ ملتا ہے، اور باقی نفع وقف فنڈ میں جاتا ہے، جو فنڈ کی اپنی ملکیت میں جاتا ہے۔

تکافل اور روایتی انشورنس میں فرق:

تکافل	روایتی انشورنس
تکافل محض عقد تبرع ہے	مروجہ انشورنس عقدِ معاوضہ ہے اور شرعاً دونوں کے احکام بالکل الگ الگ ہیں
تکافل میں سرپلس میں سے ممبرز کو بھی حصہ مل سکتا ہے	انشورنس میں سرپلس کمپنی کا ہوتا ہے۔
تکافل میں دی جانے والی رقم (وقف فنڈ) کی ملکیت میں جاتی ہے، کمپنی اس کی مالک نہیں ہوتی۔	روایتی انشورنس میں رقم کی مالک کمپنی ہوتی ہے۔
تکافل میں جمع شدہ رقوم پر حاصل شدہ نفع فنڈ میں جاتا ہے۔ کمپنی اس کی مالک نہیں ہوتی	انشورنس میں اس نفع کی مالک بھی کمپنی ہوتی ہے۔
تکافل کا اصل مقصد "وتعاونوا علی البر والتقوی" ہے۔	انشورنس کا اصل مقصد پریمیم کے بدلے رسک خریدنا ہے۔
تکافل میں کمپنی کی حیثیت وکیل کی ہے۔	انشورنس میں کمپنی اصل اور مالک ہے۔
تکافل نظام میں باقاعدہ شرعی بورڈ ہوتا ہے۔ شریعہ بورڈ کی نگرانی میں فنڈ کو شریعت کے مطابق جائز کاروبار میں لگایا جاتا ہے۔	انشورنس میں اس طرح کی کسی بھی قسم کی کوئی نگرانی نہیں ہوتی اور نہ اس طرح کی کوئی پابندی ہی ہے۔ جہاں فائدہ نظر آتا ہے وہاں سرمایہ کاری ہوتی ہے، اس میں یہ نہیں دیکھا جاتا کہ کاروبار شرعاً جائز اور حلال بھی ہے یا نہیں۔

لہذا یہ واضح ہوا کہ روایتی انشورنس عقد معاوضہ ہونے کی وجہ سے سود، قمار اور غرر سے مرکب ہے، جبکہ تکافل کی بنیاد محض تبرع ہے۔ جس میں ربا کا تصور ہی نہیں اور غرر اگر ہے تو عقد تبرع میں موثر نہیں۔

شرعی نظام تکافل کا خاکہ (عالم اسلام کے تجربات کی روشنی میں):

تکافل کا شرعی نظام نہ صرف مسلم اکثریتی ممالک میں، بلکہ ان ممالک میں بھی جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں روبعمل ہے، فی الوقت ۱۸۰ انشورنس اور گیارہ ری انشورنس ادارے جو شریعہ کے اصولوں پر مبنی ہیں کام کررہے ہیں اور ۲۰۱۵ تک یہ پیشن گوئی کی جارہی ہے کہ دنیا بھر میں 10.7 بلین امریکی ڈالر کا تکافل پریمیم حاصل ہوسکے گا، جبکہ فی الوقت اس کی لاگت تین بلین ڈالر ہے، رسد اور طلب شریعہ پر مبنی انشورنس اور ری انشورنس دنیا بھر میں ابھرتے ہوئے اسلامی سرمایہ کاری اور بنکاری کے پس منظر میں یہ بات کہی جارہی ہے، اس وقت دنیا کی انشورنس مارکٹ کا صرف ایک فیصد تکافل مارکٹ پر مبنی ہے۔ یہ اس لئے بھی کہ دنیا کے مسلمان بغیر اسلامی انشورنس کے اپنی زندگی گزار رہے ہیں۔

تکافل کے جو ماڈلس دنیا میں مروج ہیں وہ وکالہ (Free Driven Islamic Contract) اور مضاربہ (Profit Sharing Islamic Contract) کے شرعی اصولوں پر مبنی ہیں، یا دونوں کے مجموعہ سے چل رہی ہیں۔

تکافل کا آغاز ۱۹۷۹ء میں سوڈان اور متحدہ عرب امارات کی دو کمپنیوں سے ہوا، لیکن اس کو ۱۹۸۴ء میں ملیشیا نے آگے بڑھایا اور قانونی شکل تکافل ایکٹ ۱۹۸۴ء میں پاس ہوا جس کے بعد تکافل کا فروغ ملیشیا میں ہوا اور دوسرے ملکوں میں بھی تیزی سے آگے بڑھا۔ دوسرے اہم مراکز میں سوڈان اور ایران کا نام لیا جاسکتا ہے، عرب دنیا میں سعودی عرب اور بحرین میں قانونی طور پر اس کی پیش رفت ہوئی ہے اور جنوبی افریقہ نے ۲۰۰۶ء میں تکافل ریگولیشن کا آغاز کیا ہے۔

سوڈان کو بھی تکافل کے میدان میں سرخیل کا درجہ حاصل ہے اور اس نے ۱۹۹۲ء میں قانون پاس کیا کہ ساری ہی کمپنیاں شریعت کے اصولوں پر مبنی ہوں اور انشورنس ایکٹ ۲۰۰۳ء کے تحت آج سوڈان میں کوئی بھی روایتی انشورنس نہیں ہے اور یہاں زیادہ تر Co_operative Principles پر چلائے جارہے ہیں جو کہ وکالہ اور مضاربہ ماڈل پر چل رہا ہے، عملی طور پر ملیشیا تکافل کے میدان میں آگے ہے اور پاکستان میں بھی ۲۰۰۵ء میں اس کا آغاز ہوا ہے۔ قطر نے بھی اپنے انشورنس قوانین میں ترمیم کرکے Additional Requirement for Takaful Entities under Chapter:6 کے تحت تکافل کے لئے باقاعدہ آغاز کیا ہے، غیر مسلم دنیا میں سنگاپور اور برطانیہ نے پیش رفت کی ہے، سنگاپور نے انشورنس کمپنیوں کے قوانین ہی میں اسلامی انشورنس کو اپنے Supervisory میں Accomodate کیا ہے، سنگاپور کے Monetary Authority نے انشورنس کمپنیوں میں Windows کھولنے کی اجازت دی ہے جو تکافل کا کاروبار کرسکے۔

برطانیہ نے بھی تکافل کی اجازت دی ہے اور اسلامی جنرل تکافل کی کمپنی کو پہلی بار Licence بھی عطا کیا ہے۔

ہندوستان میں تکافل کے اداروں کے قیام کے لئے لائحہ عمل:

ہندوستان جیسے کثیر مذہبی اور Piurai سوسائٹی میں صرف مذہبی بنیادوں کے بجائے اس کے اخلاقی پہلو اور تعاونی کردار کو اجاگر کرنا ہوگا اور سرپلس آمدنی میں حصہ داری اور شفافیت کے عنصر کو بھی نمایاں طور پر پیش کرنا ہوگا۔ مساجد کے ذریعہ اس کی مارکٹنگ اور اس کے فروغ کی شروعات ہونی چاہئے اور دوسرے مذہبی اداروں کی جانب سے بھی۔ سیکولر اور ماڈریٹ لوگوں کو بھی اخلاقی سرمایہ کاری اور تعاونی پہلو پر فوکس کرکے اس کی طرف متوجہ کرانے کی ضرورت ہے۔

تکافل کا کونسا ماڈل ملک کے لئے مناسب ہوگا اس پر بھی ہمیں غور کرنے کی ضرورت ہے جو کہ ہمارے علاقہ میں قبولیت اور پروڈکس (Products) کو ڈیزائن کرلے، مارکٹنگ اور قیمت کے تعین کو مدنظر رکھ کر کرنا ہوگا۔ تکافل میں وکالہ اور مضاربہ یا دونوں کے ملے جلے طریقہ کو اپنانا ہوگا۔

مضاربہ کا ماڈل پالیسی ہولڈرس کو نفع میں حصہ داری کی وجہ سے زیادہ پسندیدہ قرار دیا جاسکتا ہے، لیکن عرب ممالک اور پڑوس کے ملک کے علماء اس قسم کے ماڈل کی تائید نہیں کرتے۔

وکالہ ماڈل دنیا بھر میں قابل قبول ہے، لیکن بھاری بھرکم وکالہ فیس کی ادائیگی کی وجہ سے گاہکوں کے لئے قابل توجہ ہونے اور اس میں دلچسپی لینے سے روکتا ہے۔

اس لئے وکالہ اور مضاربہ دونوں پر مشتمل ماڈل شریعہ اسکالرس کی بڑی تعداد کے لئے قابل قبول ہے، وکالہ کو تکافل کے ذریعہ نقصان وخطر کے ازالہ کے لئے اور مضاربہ کو سرمایہ کاری کے لئے۔

تکافل کا ملیشیا ماڈل (Malaysia Takaful Model):

بعض ماہرین کے نزدیک ملیشیا نے جو حکمت عملی اختیار کی تھی وہ ہمارے ملک کے لئے بھی ایک مثال بن سکتی ہے۔ ملیشیا نے اپنے کام کو تین مرحلوں میں انجام دیا تھا:

پہلا مرحلہ (1984_1992): تکافل اور شریعہ پر مبنی انشورنس کو ۱۹۸۰ء سے مسلم عوام کے لئے مروجہ انشورنس کے متبادل کی حیثیت سے ابھار کر پیش کیا گیا اور اسی کے فوراً بعد ۱۹۸۳ء میں اسلامی بنکاری کی بنیاد رکھی گئی، اسی دوران ملیشیا کی فتوی کمیٹی نے ایک شرعی فتوی جاری کیا کہ روایتی انشورنس شرعی نقطۂ نظر سے قابل قبول نہیں ہے، جس میں ربا، غرر اور قمار پایا جاتا ہے، اس کے فوراً بعد ۱۹۸۴ء کے وسط میں تکافل کا آغاز ہوا اور تکافل ایکٹ پاس کیا گیا جس کے ذریعہ تکافل کے پورے عمل کو Rugulate کیا گیا اور وہاں کے سنٹرل بنک (بنک نگارا ملیشیا) کے گورنر کو تکافل کے ادارے کے لئے بھی ڈاکٹر جنرل نامزد کیا گیا۔

دوسرا مرحلہ (1993_2000): اس دوران تکافل کے مختلف اداروں کو مستحکم کیا گیا، ۱۹۹۵ء میں (ATGAsean Takaful Group) کا قیام عمل میں آیا جس میں برونی، انڈونیشیا، ملیشیا اور سنگاپور کے ادارے کو جمع کیا گیا، تاکہ ان کے درمیان بہتر تال میل وتبادلہ اور کارکردگی میں وسعت پیدا ہو۔

۱۹۹۷ء میں (ARIL Asean Retakaful International Ltd) کا قیام ایک Offshore کمپنی کی حیثیت سے Labuan میں ہوا جس سے Retakaful کی سہولیات فراہم ہوسکے اور ممبر ممالک کے اداروں کے درمیان اشتراک ہوسکے۔

تیسرا مرحلہ (2001_): ملیشیا سنٹرل بنک کا وژن۔

ملیشیا کے سنٹرل بنک، بنک نگارا ملیشیا نے ایک دستاویز بعنوان (Fanancial Sector Master Plan FSMP) کو ۲۰۰۰ء میں تیار کیا جس میں تکافل مارکٹ کے فروغ کے تعلق سے چھ نکاتی اہداف مقرر کئے گئے جنہیں ۲۰۱۰ء تک حاصل کرنا تھا، اس دستاویز میں اس چھ نکاتی اہداف کے حصول کے لئے تین اہم امور کی طرف اپنی توجہ اور توانائی کو مرکوز کرنے کا اعادہ کیا تھا۔

الف۔ اداروں کے Capacity میں درستگی اور فعالیت، افرادی قوت میں صلاحیتوں کے فروغ انتظامی امور اور اداروں کو چلانے والوں کے استعداد میں اضافہ۔

ب۔ فائنانشیل انفراسٹرکچر میں اضافہ اور بہتری، مارکٹ میں وسعت اور اسلامی فائنانس میں نئے پروڈکس کی تیاری اور ازالہ وتخفیف خطر کے نئے ضابطہ۔

ج۔ قانونی پہلوؤں میں نئے اور بہتر اضافے، تاکہ وہ اخلاقی کوڈ (Eltical Code) کی طرف اور بہتر طریقہ سے روبعمل ہوں۔

ملیشیا کے ایک چوتھائی صدی کے مرحلہ وار تجربات کی روشنی میں ملک عزیز میں جہاں مسلمانوں کی آبادی 15_20 کروڑ ہے اور جس کے لئے اسلامی انشورنس اور تکافل کی شدید ضرورت ہے۔ جس کے لئے ہم ایک جامع منصوبہ بنائیں اور کام کا آغاز کریں۔

اللہ کرے کہ ہم نظریاتی گفتگوؤں اور سمینار وسمپوزیم سے آگے بڑھ کر عملی اقدام کی طرف پیش قدمی کریں۔

رب جلیل وقدیر ہمیں توفیق دے کہ ہم اس کا آغاز کریں۔

نوٹ: (مضمون کی تیاری وترتیب میں ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی کی کتاب ''انشورنس اسلامی معیشت میں''، مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب کی کتاب ''اسلام اور جدید معیشت وتجارت''، جناب زاہد حسین اعوان کے مضمون ''تکافل۔ ایک تعارف'' اور مسٹر ٹوبیاص فرنس مدھوسر بانن سری دھرن اور یم کرشنا یس ایر کے مقالہ Risks and Challenges_Developing a Takaful Prodects in India سے استفادہ کیا گیا ہے)۔

غور وفکر اور عملی لائحہ عمل کے تعلق سے چند معروضات:

سب سے پہلے بات جس کی طرف ہمیں اپنی توجہ مرکوز کرنی ہے اس کو حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب نے اپنی معروف اور مشہور کتاب ''اسلام اور جدید معیشت وتجارت'' میں مضمون کے تعارف اور اس کی ضرورت کے عنوان سے تحریر کیا ہے وہ پیش ہے:

''جب کسی علاقے یا کسی معاشرے میں ناجائز کاروبار کی کثرت ہو تو چونکہ عالم اور مفتی صرف فتوی جاری کرنے والا نہیں ہوتا، بلکہ وہ ایک داعی بھی ہوتا

ہے، اس لئے اس کا کام اس حد پر جا کر ختم نہیں ہو جاتا کہ وہ صرف اتنا کہہ دے کہ فلاں کام ناجائز اور حرام ہے، بلکہ بحیثیت داعی اس کے فرائض میں یہ بھی داخل ہے کہ اس کام کو ناجائز اور حرام کہنے کے بعد یہ بھی بتائے کہ اس کا متبادل حلال طریقہ کیا ہے؟ وہ متبادل قابل عمل بھی ہونا چاہئے اور شریعت کے احکام کے مطابق بھی۔ حضرت یوسف علیہ السلام کا واقعہ قرآن کریم میں مذکور ہے کہ جب ان کے پاس قید خانے میں بادشاہ کا پیغام پہنچا اور خواب کی تعبیر ان سے پوچھی گئی تو حضرت یوسف علیہ السلام نے خواب کی تعبیر تو بعد میں بتلائی کہ سات سال کا قحط آنے والا ہے، لیکن اس قحط سے نجات حاصل کرنے کا راستہ پہلے بتا دیا، چنانچہ فرمایا کہ:

{فما حصدتم فذروه في سنبله إلا قليلاً مما تأكلون} (سورہ یوسف: ۴۷)۔

اس آیت سے یہ استنباط کیا گیا ہے کہ داعی حق صرف حرام کو حرام کہہ دینے پر اکتفا نہ کرے یا صرف کسی مصیبت کو بیان کرنے پر اکتفا نہ کرے کہ یہ مصیبت آنے والی ہے، بلکہ اپنے امکان کی حد تک اس سے نکلنے کا راستہ بھی بتائے، اور یہ راستہ اسی وقت بتایا جا سکتا ہے جب آدمی معاملات اور حقائق سے واقف ہو"۔

۲۔ ہندوستان کے مخصوص حالات، یہاں کی جمہوریت، سیکولرزم کی تشریح اور دستور میں مذہبی آزادی، کو پیش نظر رکھ کر فقہ الاقلیات اور مقاصد شریعت اور فقہ اسلامی میں اصول زمان ومکان (Space Time) کی روشنی میں مسائل حیات کے تجزیہ اور خاص طور پر معیشت ومالیات کے مسائل کا حل آج کے بحران اور کساد بازاری کے تناظر میں قابل عمل طریقہ کار کو اپنا کر اس کی طرف پیش قدمی کرنے کی ضرورت ہے۔

۳۔ ملک عزیز میں غیر مسلموں میں بھی ابوطالب جیسی شخصیتیں بہت بڑی تعداد میں موجود ہیں۔ مثال کے طور پر پلاننگ کمیشن نے ۲۰۰۸ء میں جب آئندہ آنے والے سالوں میں مالیاتی سیکٹر میں اصلاحات کے لئے ایک کمیٹی (CFSR Committee on Financial Reforms) کی تشکیل کی تو اس کے ایک ممبر ڈاکٹر وجے مہاجن جو ملک کے نامور میکرو فائنانس ادارے Basix کے سربراہ ہیں نے خود آگے بڑھ کر Islamic Finance Products کا ایک جامع Presentation ممبران کے سامنے پیش کیا اور اس کمیٹی کی سفارشات میں بلاسودی سرمایہ کاری کو بنکاری کے نظام میں شامل کرانے میں نمایاں کردار ادا کیا۔

اسی طرح ملک میں تکافل کی ترویج اور تطبیق پر ایک عمدہ اور جامع تحریر تین غیر مسلم ماہرین نے ترتیب دی ہے جن کے نام ہیں: Tobias Fienz، مدھوسودھنن سری دھر اور کرشنا ایس آیر۔ اس مقالہ کا عنوان ہے: Developing a Takaful Products in India: Risk and Challenge جسے انہوں نے دسویں گلوبل کانفرنس آف Actuaries میں پیش کیا۔

۴۔ سب سے اہم تجویز یہ ہے کہ ہم ایسے امور ومسائل کو زیر بحث وعمل لائیں جن کی ملت کو شدید ضرورت ہے اور جسے ملت اسلامیہ کے علماء اور دانشور مل کر فوری طور پر سرانجام دے سکتے ہیں۔ اس میں سرفہرست زکوۃ کا اجتماعی نظم ہے جس کے لئے ملک میں نہ کوئی قانونی رکاوٹ ہے اور نہ امت مسلمہ میں آمادگی کی کمی، صحیح تناظر اور واضح انداز میں اس کی اہمیت کو اجاگر کرکے اور قابل فہم اور قابل عمل Programme of Action کو ترتیب دے کر غریب اور مفلس طبقہ کی بنیادی ضرورتوں کو پورا کرنا ہمارا اولین اور ترجیحی کام ہونا چاہئے۔ غربت اور افلاس کی حالت زار کو واضح کرتی ہیں جس کا ازالہ زکوۃ کے اجتماعی نظام کے قیام کے بغیر ممکن نہیں ہے۔

اسی طرح میکرو فائنانس کے اداروں کے قیام میں سود کے بغیر اجراء کے تعلق سے اس کے اخراجات کے لئے متعین اور معقول آمدنی (سروس چارجز کے عائد کے بغیر) کے فروغ کے لئے معروف اسلامی اسکالر انس زرقا وغیرہ نے اس کے لئے اوقاف کے قیام کی ترغیب دی ہیں اس کی طرف بھی توجہ دینے کی ضرورت ہے اور فقہ اکیڈمی۔ علماء وزعماء کے ذریعہ اس کی بھرپور تائید کرکے اسے بروئے عمل لایا جا سکتا ہے۔

{ربنا آتنا من لدنك رحمة وهيئ لنا من أمرنا رشداً}۔

☆☆☆

تکافل (تعاونی انشورنس) شریعت اسلامیہ کی نگاہ میں

مفتی راشد حسین ندوی[1]

اسلام نے نیکی اور بھلائی کے کاموں میں تعاون کا بار بار حکم دیا ہے، اگر اس موضوع سے متعلق نصوص اکٹھا کی جائیں تو خاصہ بڑا ذخیرہ جمع ہوسکتا ہے، ہم اس مختصر تحریر میں بطور نمونہ صرف چند نصوص کا ذکر کرتے ہیں:

۱۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: {وتعاونوا على البر والتقوى ولا تعاونوا على الإثم والعدوان} (سورہ مائدہ: ۲) (اور آپس میں مدد کرو نیک کام پر اور پرہیزگاری پر، اور مدد نہ کرو گناہ پر اور ظلم پر)۔

۲۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''مثل المؤمنين في توادهم وتراحمهم وتعاطفهم كمثل الجسد، إذا اشتكى منه عضو تداعى له سائر الجسد بالسهر والحمى'' (مسلم رقم: ۲۵۸۶ كتاب البر والصلة باب تراحم المومنين وتعاطفهم)۔

(ایک دوسرے سے محبت کرنے، رحم کرنے اور مہربانی کرنے میں مسلمانوں کی مثال جسم کی طرح ہے، کہ جب اس کا کوئی عضو بیمار ہوتا ہے تو جگنے اور بخار آنے میں پورا جسم ساتھ دیتا ہے)۔

۳۔ ''عن أبي موسى الأشعري أن النبي ﷺ قال: ''إن المؤمن للمؤمن كالبنيان يشد بعضه بعضاً'' (بخاری: رقم الحديث: ۶۰۲۶ كتاب الادب باب تعاون المومنين، مسلم: رقم: ۲۵۸۵ كتاب البر والصلة باب تراحم المومنين وتعاطفهم)۔

(حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''مومن مومن کے لئے عمارت کی طرح ہے جس کے ایک حصہ کو دوسرے حصہ سے مضبوطی حاصل ہوتی ہے)۔

۴۔ عن أبي موسى الأشعري قال: قال رسول الله ﷺ: ''إن الأشعريين إذا أرملوا في الغزو، أو قل طعام عيالهم بالمدينة جمعوا ما كان عندهم في ثوب واحد، ثم اقتسموه بينهم في إناء واحد بالسوية، فهم مني وأنا منهم''

(بخاری: كتاب الشركة باب الشركة في الطعام رقم: ۲۴۸۶)، مسلم: كتاب فضائل الصحابة باب من فضائل الاشعريين (۲۵۰۰)۔

(حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ سے مروی ہے فرماتے ہیں: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اشعری قبیلہ کے لوگوں کا زادراہ جب غزوہ میں ختم ہوجاتا ہے، یا مدینہ میں ان کے گھر کا غلہ کم ہوجاتا ہے تو ان کے پاس جو کچھ ہوتا ہے اسے وہ ایک کپڑے میں جمع کرتے ہیں، پھر اپنے درمیان برابر برابر ایک برتن میں تقسیم کرلیتے ہیں تو وہ مجھ سے ہیں اور میں ان سے ہوں)۔

۵۔ اسلام کے اہم ارکان میں سے ایک اہم رکن زکوۃ اسی جذبہ تعاون پر مبنی ہے، {إنما الصدقات للفقراء} الآیۃ (سورہ توبہ: ۶۰) اور: ''تؤخذ من أغنيائهم وترد إلى فقرائهم'' (اس کی صریح دلیلیں ہیں، اس کے علاوہ بھی اسلام کے کئی احکام ہیں اس کی واضح جھلک موجود ہے، جیسے: صدقہ، ہبہ، وقف، صدقۂ فطر، قربانی، کفارہ کی تمام اقسام، معاقل اور دیات کا پورا نظام، معاملات کی کئی اقسام جیسے: شرکت، مضاربت، کفالت، وکالت، عاریت، ودیعت، اور قرض وغیرہ۔

۶۔ اسلام کی تمام تشریعات کا اہم مقصد ضروریات خمسہ کی حفاظت قرار دیا گیا ہے، اور ان ضروریات خمسہ میں دین، جان اور عقل کی حفاظت کے ساتھ عرض ومال کی حفاظت بھی شامل ہے۔

---

[1] مدرسہ ضیاء العلوم میدان پور، تکیہ کلاں، رائے بریلی۔

امداد باہمی مسلمانوں کا طرہ امتیاز ہے:

ان نصوص سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ باہمی تعاون اور امداد کرنا درحقیقت اسلام کے احکام میں سے ایک اہم حکم ہے، اور اس گئی گزری حالت میں اس میدان میں دوسری اقوام اور ملتیں مسلمانوں کا مقابلہ نہیں کرسکتیں، پورے برصغیر میں صرف مسلمانوں کے چندوں اور تبرعات سے اقامتی اور غیر اقامتی، نیز چھوٹے اور بڑے مکاتب اور مدارس کا جال پھیلا ہوا ہے جن میں تعلیم مفت ہوتی ہے اور ضرورت مندوں کے لئے رہائش اور کھانا بھی فری ہوتا ہے، اس کی مثال دوسری ملتوں میں ملنی مشکل ہے، پھر غریبوں اور لاچاروں کی امداد کا جو جذبہ ملت اسلامیہ میں نظر آتا ہے، وہ شاید ہی دوسری ملتوں میں نظر آئے۔

لیکن افسوس یہ ہے کہ ہمارا یہ جذبہ صرف چند میدانوں تک محدود ہے، رواں دواں زندگی کے کتنے ہی راستے اور میدان ایسے ہیں جن کو ہم نے بالکل نظر انداز کردیا ہے، ان راستوں اور میدانوں پر دوسری اقوام کا قبضہ ہوگیا ہے، پھر وہاں اسلام کے جذبہ تعاون کو ہم بھلا کہاں پاسکتے ہیں، ان میں تو انہیں اقوام کی چھاپ اور ذہنیت نظر آئے گی جن کا ان پر قبضہ ہے۔

اس کو اس طرح سمجھئے کہ آج جدید علوم اور سائنس وٹکنالوجی کے میدان میں، ہم مسلمان پسماندگی کی انتہا پر ہیں، لہذ نہ تو ہماری طرف سے نئی ایجادات سامنے آتی ہیں نہ جدید نظریات یا اکتشافات، اس میں ہم نے مغرب یا یہود ونصاری کے سامنے مکمل طور پر ہتیار ڈال دیئے ہیں اور ان کو اپنا امام مان لیا ہے، اب صورت حال یہ ہے کہ صنعت وحرفت اور تجارت وزراعت میں بھی ہم انہیں کی ریسرچ اور تحقیقات کے محتاج بنے ہوئے ہیں، اور شاید یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ برتن سے وہی چیز چھلکے گی جو اس کے اندر ہوگی، اور اہل مغرب یا یہود ونصاری کے باطن میں کیا ہے، اس کو قرآن کی معجزانہ تعبیر میں سنئے:

{فبظلم من الذين هادوا حرمنا عليهم طيبات أحلت لهم وبصدهم عن سبيل الله كثيرا وأخذهم الربوا وقد نهوا عنه وأكلهم أموال الناس بالباطل} (سورہ نساء: ۱۶۰۔۱۶۱) (سو یہود کے گناہوں کی وجہ سے ہم نے حرام کیں ان پر بہت سی پاک چیزیں جو ان پر حلال تھیں اور اس وجہ سے کہ روکتے تھے اللہ کی راہ سے بہت اور اس وجہ سے کہ سود لیتے تھے اور ان کو اس کی ممانعت ہوچکی تھی، اور اس وجہ سے کہ لوگوں کا مال کھاتے تھے ناحق)۔

آج بھی یہود میں یہ صفات پوری کی پوری موجود ہیں، بلکہ انہوں نے اپنی شاطرانہ چالوں کے ذریعہ نصاری، بلکہ کل دنیا کو انہیں صفات کا خوگر بنادیا ہے، لہذا آج خدمت خلق کے تمام شعبے تجارت بن چکے ہیں، جو امور خالصتاً امداد باہمی اور مخلوق خدا کی خدمت کے لئے تھے، وہ سودخوری اور ناجائز وناحق طور پر لوگوں کا مال اور خون پسینے کی کمائی ہڑپ کرجانے کا ذریعہ بن چکے ہیں، اس مقالہ میں ہم کو تعاونی انشورنس پر بحث کررہے ہیں، انشورنس کی تاریخ بتاتی ہے کہ اس پر یہود ونصاری کی چھاپ نہ پڑتی تو ہمیں اس بحث کی ضرورت ہی نہ پڑتی، اس لئے کہ انشورنس میں سود وجوا بعد میں داخل کئے گئے، ورنہ اس کی ابتداء ہی باہمی تعاون کے جذبہ سے ہوئی تھی۔

انشورنس کے اقسام:

موجودہ انشورنس کو ہم بنیادی طور پر تین قسموں میں کرسکتے ہیں:

۱۔ گروپ یا اجتماعی انشورنس، یہ قسم حکومت یا کمپنی اپنے ملازمین پر نافذ کرتی ہے اور جبری ہوتی ہے۔

۲۔ کمرشیل (تجارتی) انشورنس: جو مقررہ قسطیں باندھ کر ہوا کرتی ہے، اس کی تین قسمیں ہیں:

الف۔ لائف انشورنس (جیون بیمہ)۔

ب۔ املاک کا انشورنس، مثلاً: گاڑی مکان ودکان اور جانوروں کا انشورنس۔

ج۔ ذمہ داریوں کا انشورنس، مثلاً گاڑی کا مالک، اس لئے انشورنس کرائے کہ اگر اس کی گاڑی سے حادثہ ہوا اور اسے جرمانہ بھرنا پڑا تو اس کی ادائیگی انشورنس کمپنی کرے، اسی طرح ڈاکٹروں اور دوا فروشوں وغیرہ کا بھی معاملہ ہے (تفصیل کے لئے دیکھئے: (مجلة البحوث الفقهية المعاصرة العدد التاسع والتسعون ۱۴۲۶ھ ص ۱۶۔۱۸، اسلام اور جدید معیشت وتجارت ر ۱۵۹۔۱۶۲، قاموس الفقہ مقالہ تامین)۔

۳۔ انشورنس کی تیسری قسم: تعاونی انشورنس کی ہے، جس کے بارے میں اوپر نصوص کا حوالہ دے چکے ہیں۔

ان اقسام کا اجمالی حکم:

کمرشیل انشورنس کی تمام اقسام کو ایک قلیل جماعت کو چھوڑ کر تمام علماء نے ناجائز قرار دیا ہے، البتہ سرکاری انشورنس اور تعاونی انشورنس کو علماء کی اکثریت نے جائز قرار دیا ہے (جدید فقہی مسائل ۴/ ۱۰۲-۱۰۴، اور پہلے ذکر کردہ مصادر)۔

تعاونی انشورنس:

امداد باہمی انشورنس عالم اسلام کے کئی حصوں میں متعارف ہے، اس کو تقریباً تمام فقہ اکیڈمیوں اور جمہور علماء نے جائز قرار دیا ہے۔

تعاونی انشورنس کی تعریف: تعاونی انشورنس کی مختلف الفاظ سے تعریفیں کی جاتی ہیں، لیکن ان سب کا خلاصہ یہ کیا جاسکتا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ "لوگوں کی ایک ایک مخصوص جماعت، مثلاً کسی بازار والے کسی خاص نقصان کے نشانہ پر ہوں، تو وہ طے کرلیں کہ ہر شخص ایک خاص مقدار میں ریلیف بکس میں رقم جمع کرے گا، اور اگر اسی سے نقصان کی تلافی ہوجائے تو ٹھیک، اور اگر تلافی نہ ہوسکے تو یہ بھی طے کیا جاسکتا ہے کہ مزید اتنی رقم اکٹھا کی جائے گی، اور یہ بھی طے کیا جاسکتا ہے کہ صرف جمع شدہ سے مدد کرنے پر اکتفا کی جائیگی، اور اگر کچھ رقم بچ جائے تو یہ بھی طے کیا جاسکتا ہے کہ وہ تمام ممبروں کو واپس کردی جائے گی اور یہ بھی طے کیا جاسکتا ہے کہ آگے کی ضروریات کے لئے روک لے جائے گی (نظام التامین للدکتور زرقا مجلۃ البحوث الفقہیہ المعاصرۃ عدد ۶۹ ص ۱۹)۔

اس تعاونی انشورنس کے بارے میں دکتور وہبہ زحیلی کہتے ہیں:

"أما التأمين التعاوني بين فئة من الناس الخ" (جہاں تک تعلق ہے لوگوں کی کسی جماعت کے درمیان تعاونی انشورنس کا، تو وہ شرعاً جائز ہے، اس لئے کہ وہ عقود تبرع میں سے ایک ہے نیز نیکی اور خیر میں شرعاً مطلوب تعاون کی قبیل سے ہے، اس لئے کہ ہر شریک دوسرے شرکاء میں سے کسی کو لاحق ہونے والے نقصانات کے ازالہ اور خطرات کے آثار کم کرنے کے لئے خوش دلی سے اپنا حصہ دیتا ہے، خواہ نقصان کسی بھی قسم ہے ہو جیسے آگ لگنے، ڈوبنے چوری ہوجانے گاڑی کا ایکسیڈنٹ ہوجانے، جانور کے مرجانے، نیز اس کا مقصد نفع کمانا نہیں ہوتا ہے، جیسا کہ مقررہ قسط والی انشورنس کمپنیاں کرتی ہیں۔

شیخ ابوزہرہ کہتے ہیں: "ولا شك أن هذا النوع من التأمين هو من قبيل التعاون على البروالتقوى الذى ينطبق عليه قوله تعالى: {وتعاونوا على البر والتقوى ولا تعاونوا على الإثم والعدوان} ويستوى فى ذلك الحكم التعاون الاختيارى والتعاون الحكومى الإجبارى، لأنها شركة بين المشقفين به، والمؤمنون حكم المستامنون بشرط أن يكون الكسب حلالاً لاشبهة فيه" (نحو نظام تامينى اسلامى لغريب الاجمال ص۲، من كتابه "التأمين فى الشريعة الاسلامية والقانون" (مجلة البحوث ۶۹، ص۳۶)۔

ہندوستانی علماء میں سے مولانا خالد سیف اللہ رحمانی لکھتے ہیں: "انشورنس کی پہلی قسم جو باہمی تعاون پر مبنی ہے، تمام ہی اہل علم کے نزدیک جائز ہے، اس میں نفع کمانا مقصود نہیں ہوتا، بلکہ افراد واشخاص کا ایک گروہ طے شدہ خطرہ پیش آنے کی صورت میں مصیبت زدہ شخص کی مدد کرتا ہے، اس لئے اس کے ناجائز ہونے کی کوئی وجہ نہیں، اس میں ایک گونہ غرر ضرور پایا جاتا ہے کہ نہ معلوم اس اعانت کا فائدہ کسے پہنچے گا، تاہم یہ اس لئے مضر نہیں کہ غرر ان معاملات میں ممنوع ہے، جن میں دونوں طرف سے عرض کا تبادلہ ہو، تبرعات میں غرر سے کوئی نقصان نہیں، اور انشورنس کی یہ صورت اسی قبیل سے ہے" (جدید فقہی مسائل ۴/ ۱۰۲)۔

البتہ عالم اسلام کے مایہ ناز فقیہ اور عالم مولانا تقی عثمانی صاحب نے عالم اسلام میں موجود اس طرح کی کمپنیوں کے طریق کار سے لاعلمی کے سبب ان کا شرعی حکم بتانے سے گریز کیا ہے (اسلام اور جدید معیشت وتجارت ر ۱۶۲)۔

اس تعاونی انشورنس کو مندرجہ ذیل فقہ اکیڈمیوں نے جائز قرار دیا ہے:

۱۔ "مجمع البحوث الاسلامیۃ بالقاہرہ" (۱۳۸۵ھ مطابق ۱۹۶۵ء) قرارداد کے الفاظ مندرجہ ذیل ہیں: "التأمين الذى تقوم به جمعيات تعاونية يشترك فيها جميع المستأمنين لتودى لأعضائها ما يحتاجون إليه من معونات وخدمات أمر مشروع وهو من التعاون على البر" (مجلة البنوك الاسلاميه ۳۰، العدد الثانى ۱۳۹۸ء) مجلة البحوث الفقهية عدد ۶۹ ص۴۰)۔

۲۔ "الموتمر الاول للاقتصاد الاسلامى" المنعقد فى مكة المكرمة فى صفر ۱۳۹۶ھ ۱۹۷۶ء (مجلة البحوث ۴۰)۔

۳۔ ''مجلس هيئة كبار العلماء فى المملكة العربية السعودية'' ۱۳۹۷.۴.۴ھ (ابحاث ہیئۃ کبار العلماء ۴.۳۰۷، ۳۱۵ (مجلۃ ص ۲۱)۔

۴۔ ''مجلس الفقه الإسلامی لرابطة العالم الاسلامی فی مكة المكرمه''۔

اس مجلس نے جو قرارداد پاس کی اس سے اس تعاونی انشورنس کے خط وخال واضح ہوجاتے ہیں، اور ان میں سے ہم یہاں بھی فائدہ اٹھا سکتے ہیں، ان تجاویز کا خلاصہ حسب ذیل ہے:

۱۔ انشورنس کی اس نوع کا مقصد صرف امداد باہمی ہوتا ہے اس کی حیثیت عقود تبرع کی ہے، اس کا مقصد کسی قسم کی تجارت ہے نہ نفع کمانا۔

۲۔ اس میں سود کی دونوں قسمیں ربا الفضل اور ربا النسیئۃ نہیں ہوتیں، نہ ہی یہ درست ہوگا کہ جمع رقموں کو کسی قسم کے سود میں لگایا جائے۔

۳۔ اس میں اگرچہ جہالت ہوتی ہے کہ اس کے ممبران میں سے کس کو نفع ہوگا لیکن چونکہ سب کی نیت تبرع کی ہوتی ہے، لہذا اس میں نہ غرر ہوگا، نہ جوا (مجلۃ البحوث الفقہیۃ المعاصرۃ ۷/۴۰-۴۲)۔

تعاونی انشورنس کے امتیازی پہلو:

اوپر کی بحث سے واضح ہوگیا کہ تعاونی انشورنس کی مندرجہ ذیل خصوصیات وامتیازات ہیں:

الف۔ تعاونی انشورنس تبرع کی ایک ایسی قسم ہے جس کی نظیر اگرچہ فقہ اسلامی میں ہمیں کسی عقد تبرع میں نظر نہیں آتی لیکن جب تک کتاب وسنت اور قواعد فقہ کے مخالف نہ ہو، اس کے عدم جواز کا فیصلہ درست نہیں ہوگا۔

ب۔ اس کا مقصد کسی بھی گروپ کے ممبران کی حادثات پیش آنے کی صورت میں مدد ہے، اشعریین والی حدیث میں اس کی اصل موجود ہے، اور خود نبی کریم ﷺ نے اس کو پسند فرمایا ہے۔

ج۔ اس میں اگرچہ یہ جہالت ہوتی ہے کہ مشارکین میں سے کس کو کتنا فائدہ ہوگا لیکن اس جہالت سے شرعاً کوئی فرق نہیں واقع ہوگا، جیسا کہ رابطہ عالم اسلامی کی ''مجمع الفقہ الاسلامی'' کی تجویز میں گزر چکا ہے۔

د۔ تعاونی انشورنس کمپنی ممبران کی نیابت میں کام کرتی ہے، لہذا کلیم ہونے کی صورت میں نقصان کا اندازہ کرنا، جمع مال کی حفاظت کا بندوبست کرنا، نئے ممبران کا اضافہ کرنا، تمام حساب چست ودرست رکھنا، تمام ممبران کی نیابت میں ان کی ذمہ داری ہوگی، اور ظاہر ہے کہ اتنے امور کو انجام دینے والے بغیر معاوضہ کے نہیں مل سکیں گے۔ وکالت اجرت سے بھی جائز ہے، اور بغیر اجرت کے بھی جائز ہے، اس لئے کہ آنحضرت ﷺ عاملین زکوۃ کو اپنی نیابت میں روانہ فرماتے تھے، اور اس پر تمام فقہاء متفق ہیں کہ ان کو اس عمل کی اجرت دی جاسکتی ہے، اس لئے کہ خود قرآن مجید میں اس کا ذکر ہے {والعاملين عليها} الآیہ (سورۂ توبہ: ۶۰)، ابن قدامہ فرماتے ہیں:

''ويجوز التوكيل بجعل وبغير جعل. فإن النبى ﷺ وكل انيسا فى إقامة حد وعروة فى شراء شاة وعمرواً وأبا رافع فى قبول النكاح بغير جعل وكان يبعث عماله لقبض الصدقات ويجعل لهم عمالة'' (المغنى ۵.۲۱۰ كتاب الوكالة بعد تعليق الوكالة على شرط)۔ (توکیل جائز ہے انعام کے بدلہ بھی اور اس کے بغیر بھی، اس لئے کہ نبی کریم ﷺ نے حضرت انیس کو حد قائم کرنے کے لئے، حضرت عروہ کو بکری خریدنے کے لئے اور حضرت عمرو اور حضرت ابو رافع کو قبولیت نکاح کے لئے بغیر انعام کے وکیل بنایا، اور آپ اپنے عمال کو صدقات کی وصولی کے لئے بھیجتے تھے، اور ان کا معاوضہ مقرر کرتے تھے)۔

۵۔ عالم عرب میں تعاونی انشورنس میں کمپنیاں مضاربت وغیرہ میں جمع مال کو لگا کر بڑھانے کی کوشش کرتی ہیں، یہاں ہندوستان میں اسلامک بینکوں نے بھی اس طرح کی کوششیں کی تھیں، لیکن نتائج بہت تلخ رہے، ان سے سبق حاصل کر کے اگر یہاں اس طرح کے قدم نہ اٹھائے جائیں تو زیادہ بہتر ہوگا، جب پختگی اور مضبوطی حاصل ہوجائے تو اس طرح کے امور کے بارے میں سوچا جاسکتا ہے۔

ہندوستان کے لئے لائحہ عمل:

تعاونی انشورنس کی شکل اتنی آسان اور واضح ہے کہ کسی بھی طبقہ، شہر یا محلہ کے لوگ چٹ فنڈ کی شکل میں اس کی ابتداء بغیر با قاعدہ کمپنی قائم کئے ہوئے کر سکتے ہیں، سب ممبر کسی معتبر اور معتمد علیہ شخص کو ذمہ دار بنادیں، اس کے ممبران بنائے جائیں، جو ماہانہ یا سالانہ متعین رقم بطور تبرع جمع کریں، پھر جس مقصد کے تحت رقوم جمع کی ہیں اس میں ضرورت پڑنے پر لگائیں، مثلاً: اگر بیماری میں تعاون کے مقصد سے جمع کیا تھا تو کسی ممبر کے بیمار ہونے پر، اگر گاڑی یا دوکان وغیرہ میں حادثہ پیش آنے پر تعاون کے مقصد سے جمع کیا ہو تو متعین حادثہ پیش آنے پر جمع رقم کو لگائیں۔

اسی طرح مرکزی مدارس اپنے مرکزی اور ذیلی مدارس کی شاخوں کے اساتذہ کے مابین بھی اس طرح کا تعاونی منصوبہ شروع کر سکتے ہیں، پھر اگر دوسرے معتبر ممبران شامل ہونا چاہیں تو ان کو بھی حاصل کیا جا سکتا ہے، بہر حال ابتداء محدود انداز میں ہو اور اگر تجربہ کامیاب ہو تو بتدریج اسے آگے بڑھایا جائے۔

بڑے پیمانہ پر شروعات کرنے سے پہلے عالم عرب میں اس طرح کے کئے جانے والے تجربات سے فائدہ اٹھایا جائے، فقہ اکیڈمی انڈیا کے لئے یہ کام نسبتاً آسان ہوگا کہ اس کے متعلق وہاں سے لٹریچر منگائے، اور یہاں کے اقتصادی ماہرین سے اصول وضوابط کو منظم کرادے، اگر ضرورت ہو تو ان اصول وضوابط پر اسباب افتاء کی آراء حاصل کرلے، پھر کوئی بھی فعال شخصیت ان اصول وضوابط اور آراء کی روشنی میں منظم انداز میں اس میدان میں قدم اٹھا سکتی ہے، اور اس بڑے خلاء کو پر کر سکتی ہے، وما ذلك على الله بعزيز۔

☆☆☆
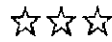
شریعت کے دائرہ میں موجودہ انشورنس کا متبادل

مفتی محمد عارف باللہ قاسمی [1]

تکافل اور اسلام:

انسان مختلف النوع خطرات کے درمیان گھرا ہوا ہے، اور بہت سی مرتبہ وہ جانی، یا مالی ایسے خطرات سے دوچار ہوتا ہے جن کا تحمل تنہا اس کے لئے ممکن نہیں ہوتا، اور ایسے مواقع پر دوسروں کی مدد اور اس کے نقصان میں دوسروں کا دست تعاون ضروری ہوتا ہے، تاکہ جس تکلیف کے بوجھ کا وہ تنہا تحمل نہیں کرسکتا اس میں دوسرے اس کے ساتھ تعاون اور نقصان کا تحمل کر کے اس کے لئے اس نقصان کو قابل تحمل بنا سکیں، اسی مقصد نے انشورنس کو وجود بخشا، جو تجارتی اداروں اور افراد کے لئے یقینا مفید ثابت ہوا اور ہو رہا ہے، کہ تجارتی اداروں کو اس کے ذریعہ رأس المال کی حفاظت مل جاتی ہے، اسی طرح افراد کو بھی یہ اطمینان نصیب ہوجاتا ہے کہ وہ مستقبل میں اگر کسی ناسازگار حالات سے دوچار ہوتا ہے تو اس وقت اس کو انشورنس کے ذریعہ تعاون مل جائے گا، اور پریشانی ومصیبت میں اس کو مدد مل جائے گی۔

ظاہری بات ہے کہ اسلام کسی ایسی چیز کے خلاف ہرگز نہیں ہوسکتا تھا جو انسانیت کے لئے مفید ہو، کیونکہ اسلام سراپا خیر ورحمت ہے، اور اس میں مصالح کی بھرپور رعایت بھی ہے اور لوگوں کی منفعت کا مکمل خیال بھی، اور وہ تعاون وتبرع اور مبتلائے مصیبت کی مدد اور اس کی مصیبت کو کم کرنے کی تعلیم دیتا ہے۔

تکافل عربی زبان کا لفظ ہے جو کہ کفالت سے نکلا ہے، کفالت ضمانت اور دیکھ بھال کو کہتے ہیں، یعنی ایک دوسرے کی دیکھ بھال کرنے اور ایک دوسرے کا ضامن بننے اور ایک دوسرے کی ذمہ داریوں کو اپنے سر لینے کا نام تکافل ہے (معجم لغۃ الفقہاء ۱/۱۴۲)۔

مروج تکافل (انشورنس) کی تعریف کرتے ہوئے عبدالستار ابوغدہ لکھتے ہیں:

"التأمين التكافلي هو قيام مجموعة من الأشخاص بالاشتراك في نظام يتيح لهم التعاون في تحمل الضرر الواقع على أحدهم بدفع تعويض مناسب للمتضرر من خلال ما يتبرعون به من أقساط" (التبرع والهبة وأهميتها كبدائل للتعويض في التكافل)۔ (تکافل انشورنس چند لوگوں کا ایسے نظام میں شریک ہونا ہے جس کے ذریعہ انہیں یہ موقع ملتا ہے کہ وہ اپنے میں سے کسی مبتلائے مصیبت کی مصیبت کا تحمل اقساط کے ذریعہ سے مناسب عوض دے کر کرسکیں)۔

شیخ ابوغدہ کی طرح دیگر ماہرین نے بھی انہیں الفاظ سے ملتے جلتے دیگر الفاظ میں تکافل انشورنس کی تعریف کی ہے، اس سے تکافل کی یہ حقیقت واضح ہوجاتی ہے کہ اس کی بنیاد امداد باہمی، تبرع، بھائی چارے اور دوسروں کی مصیبتوں کے تحمل کے نظریہ پر ہے، اور اس کو روایتی انشورنس کے متبادل کے طور پر استعمال کیا جارہا ہے، جس کے ذریعہ تمام شرکاء باہم خطر انگیزی برداشت کرتے ہیں اور شرکاء امداد باہمی کے اس طریقہ سے مقررہ اصول وضوابط کے تحت ممکنہ مالی خطرات سے محفوظ ہوجاتے ہیں، اور ایک دوسرے کے ساتھ مقررہ اصول کے مطابق تعاون کرنے کا معاہدہ کرتے ہیں، اور اس کے ذریعہ ممکنہ مالی خطرات سے بچاؤ یا اس کے اثرات کو کم کرنے کی تدبیر کی جاتی ہے۔

اس کی اس حقیقت کے اعتبار سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام میں اس کا تصور موجود ہے اور اسلام میں اس کو جواز حاصل ہے، کیونکہ قرآن واحادیث میں بکثرت باہمی امداد، مصیبتوں میں مصیبت زدہ کے ساتھ جانی، مالی تعاون اور دوسروں کے تکلیف وخطرات کے تحمل کی بڑی ترغیب بیان کی گئی ہے، جو کہ "عقد تکافل" (اسلامی انشورنس) کی روح اور بنیاد ہے۔ اللہ عزوجل کا ارشاد ہے:

{وتعاونوا على البر والتقوى} (المائدہ: ۲) (نیکی اور تقوی کے کاموں میں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرو)۔

---

[1] مدرسہ اسلامیہ دار العلوم الربانیہ، حیدرآباد۔

{ وأحسنوا إن الله يحب المحسنين } (البقرہ:۱۹۵)(اور نیکی کرو بے شک اللہ نیکی کرنے والوں سے محبت کرتا ہے)۔

اسی طرح قرآن کریم میں اللہ نے مؤمن کی شان یہ بتائی ہے کہ وہ دوسروں کے احوال سے بے خبر ہو کر زندگی نہیں گزارتے، بلکہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرتے ہیں اور اس کی خاطر خود اپنی ضرورتوں کو قربان کر کے دوسروں کے کام آتے ہیں، اللہ کا ارشاد ہے:

{ يؤثرون على أنفسهم و لو كان بهم خصاصة } (الحشر:۹)(اپنے اوپر دوسروں کو مقدم رکھتے ہیں اگر چہ اپنے اوپر فاقہ ہو)۔

نیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے: ''من فرج عن مسلم كربة من كرب الدنيا فرج الله عنه كربة من كرب الآخرة، ومن ستر أخاه المؤمن في الدنيا ستره الله في الآخرة، والله في عون العبد ما كان العبد في عون أخيه'' (السنن الكبرى للنسائي:۷۲۴۶)۔

(جو شخص کسی مسلمان کی دنیاوی پریشانیوں میں سے کسی پریشانی کو دور کرے گا اللہ اس کی اخروی پریشانیوں میں سے کسی پریشانی کو دور کرے گا، اور جو شخص دنیا میں کسی مؤمن کے ساتھ ستر کا معاملہ کرے گا اللہ اس کی برائیوں کو آخرت میں چھپا دے گا، اور اللہ اس وقت تک بندے کی مدد کرتے ہیں جب تک وہ اپنے بھائی کی مدد کرتا رہتا ہے)۔

نیز اپنی ضرورتوں کے ساتھ دوسروں کی ضرورتوں کا خیال رکھنے اور دوسروں کی مالی مدد کرنے کے سلسلہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے:

''من كان معه فضل ظهر فليعد به على من لا ظهر له، ومن كان له فضل زاد فليعد به على من لا زاد له، قال: فذكر من أصناف المال ما ذكر، حتى رأينا أنه لا حق لأحد منا في فضل'' (احمد:۱۱۳۱۲، مسلم:۴۵۳۸، ابوداؤد:۱۶۶۳)۔

(جس کے پاس زائد سواری ہو تو وہ اسے اس شخص کو دے دے جس کے پاس سواری نہ ہو، اور جس کے پاس زائد توشہ ہو تو وہ اسے اس شخص کو دے دے جس کے پاس توشہ نہیں ہے، راوی کہتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف قسم کے مالوں کا تذکرہ کیا، حتی کہ ہمیں یہ محسوس ہونے لگا کہ زائد مال میں ہمارا حق ہی نہیں ہے)۔

نیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''ليس للمؤمن الذي يشبع وجاره جائع إلى جنبه'' (الادب المفرد)(وہ شخص مومن نہیں جو کہ شکم سیر ہو اور اس کے بازو میں اس کا پڑوسی بھوکا ہو)۔

ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے: ''إن لله خلقاً خلقهم لحوائج الناس يفزع الناس إليهم في حوائجهم أولئك الآمنون من عذاب الله'' (معجم طبرانی کبیر:۱۳۳۳۴)۔(اللہ کے کچھ بندے ایسے ہیں جنہیں اللہ نے لوگوں کی حاجتوں کو پورا کرنے کے لئے پیدا کیا ہے، لوگ اپنی حاجتوں کے سلسلہ میں ان کے پاس جاتے ہیں، یہی لوگ اللہ کے عذاب سے مامون ہیں)۔

ان نصوص سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ ایک دوسرے کا تعاون اور دوسروں کی مصیبت میں مدد کی اسلام میں بڑی اہمیت ہے اور اسلام اپنے متبعین کو اس کی تعلیم دیتا ہے۔ قتل خطا کی صورت قانون دیت کو ہی لیا جائے تو اس کی روح بھی یہی ہے کہ یہ ایک بڑا مالی تاوان ہے جو یقیناً ایک انسان کے لئے تنہا بہت مشکل ہے تو اسلام میں اس کی ادائیگی کی ذمہ داری تنہا قاتل پر رکھنے کے بجائے اس کے عاقلہ (اہل نصرت) کو بھی اس کی ادائیگی میں شریک کر دیا، تا کہ اس کی ادائیگی ممکن ہو سکے اور مقتول کے ورثاء کو مالی مدد حاصل ہو سکے، اور اس طرح مقتول کے فوت کی وجہ سے ہونے والے نقصان کی تلافی ہو سکے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ منورہ میں یہودیوں سے معاہدہ کیا، جس میں ایک دفعہ یہ بھی تھی کہ ہر گروہ کو عدل وانصاف کے ساتھ اپنی جماعت کا فدیہ دینا ہوگا، یعنی جس قبیلے کا جو قیدی ہوگا اس قیدی کے چھڑانے کا فدیہ اسی قبیلے کے ذمہ ہوگا (السیرۃ النبویہ لابن ہشام ار۵۰۴)۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ معاہدہ بھی اجتماعی تکافل کی ایک مثال ہے اور اس سے بھی یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اسلام باہمی تعاون کی تعلیم دیتا ہے، اور ایسے مصائب وحالات میں جن میں ایک انسان تنہا اپنی پریشانی کے تحمل کی طاقت نہیں رکھتا، اسلام نے دوسروں کو اس کے تعاون پر آمادہ کیا ہے۔

اسلام میں عقد موالات جائز ہے، یعنی کوئی شخص کسی کے ہاتھ پر اسلام قبول کرے، اور اس کے ساتھ یا کسی تیسرے کے ساتھ یہ معاہدہ اور عقد کرے کہ میرے مرنے کے بعد میری میراث تمہاری ہوگی اور اگر میں نے کوئی جرم کیا تو اس کا ضمان تم پر ہوگا (تحفۃ الفقہاء ۲؍۲۸۹)۔

اس عقد کو اسلام نے جائز قرار دیا ہے اور حسب عقد جرم کی صورت میں ضمان کو اس شخص پر لازم کیا ہے، جس کے ساتھ اس نے یہ عقد کیا ہے، علامہ علاء

الدین سمرقندی لکھتے ہیں:

"وإذا انعقد عقد الموالاة يصير مولى له حتى لو مات ولم يترك وارثاً يكون ميراثه لمولاه، ولو جنى يكون عقله عليه" (تحفة الفقهاء ۲،۲۸۹)۔ (جب عقد موالات منعقد ہوگیا تو وہ اس کا مولی ہوجائے گا، اور اگر وہ بلا وارث مرجائے تو اس کا میراث اس کے مولی کے لئے ہوگا، اور جنایت کرنے کی صورت میں مولی پر اس کا ضمان ہوگا)۔

اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اسلام میں دوسروں کے خطرات ونقصانات کو اپنے ذمہ لینا درست ہے، اس لئے اس سے بھی تکافل کا جواز معلوم ہوتا ہے، کیونکہ تکافل میں شرکاء (شیئرز ہولڈرس) ایک دوسرے کے خطرات کو اپنے ذمہ لینے کا عہد کرتے ہیں، اور اسی کے لئے اپنی رقم وقف کرتے ہیں۔

نیز تکافل ممکنہ مالی خطرات کی پیش بندی کے طور پر کیا جاتا ہے، اور یہ مالی اثرات کو ختم کرنے یا کم کرنے کی ایک تدبیر ہے، اور بچاؤ کی تدبیر اختیار کرنے اور اپنی جان ومال کی حفاظت کے لئے جائز طریقہ پر تدبیر اختیار کرنے کی اسلام اجازت دیتا ہے، جس کی مثال عقد موالات ہے، اور اسی طرح ضمان الدرک بھی اس کی ایک مثال ہے، کہ ایک شخص کوئی چیز خریدنے میں ڈر محسوس کررہا ہو، تو دوسرا فرد اس کو اطمینان دلائے کہ تم اسے خریدلو اگر کوئی نقصان ہوا تو اس کا ذمہ دار میں ہوں۔ تو یہ ضمان الدرک ہے اور اسلام میں اس کی اجازت ہے۔ صاحب "ہدایہ" لکھتے ہیں:

"الإجماع منعقد على صحة ضمان الدرك" (ھدایہ ۳،۹۰، الاختیار لتعلیل المختار ۲،۱۷۱) (ضمان الدرک کے صحیح ہونے پر اجماع ہے)۔

اس تفصیل سے تکافل کے بارے میں اسلامی حکم معلوم ہوجاتا ہے کہ اسلام میں تکافل کا تصور موجود ہے اور یہ درست ہے، بشرطیکہ اس میں کوئی خلاف شرع امر شامل نہ ہو اور وہ سود وقمار سے پاک ہو۔

تکافل کے اقسام:

تکافل کی دو قسمیں ہیں: (۱) عمومی تکافل، (۲) لائف تکافل۔

۱۔ عمومی تکافل میں اثاثہ جات، جیسے جہاز، گاڑی، اور مکان وغیرہ کے ممکنہ خطرات کی تلافی کے لئے تکافل کی رکنیت فراہم کی جاتی ہے، رکنیت حاصل کرنے کے لئے پیش کردہ رقم تکافل کمپنی کے وقف فنڈ میں جمع ہوجاتی ہے اور رکنیت حاصل کرنے کے بعد اس اثاثے کو جس کے لئے تکافل کی رکنیت حاصل کی گئی ہے اگر کوئی حادثہ لاحق ہوجائے تو اس نقصان کی تلافی تکافل کمپنی کرتی ہے۔

۲۔ لائف تکافل، انسانی زندگی کے ممکنہ خطرات سے نمٹنے کے لئے تکافل کی رکنیت فراہم کی جاتی ہے، اس میں شرکاء کو تکافل تحفظ فراہم کیا جاتا ہے، تکافل کی اس صورت میں ممبر کو سالانہ یا ماہانہ بنیاد پر متعینہ رقم پریمیم کے نام پر جمع کرنا ہوتا ہے، جس میں سے کچھ رقم تکافل کمپنی کے وقف فنڈ میں جمع ہوتی ہے، اور بقیہ رقم ممبر کے پی آئی اے اکاؤنٹ میں جمع ہوتی ہے، یہ ممبر کا سرمایہ کاری کا فنڈ ہوتا ہے، اس فنڈ کی جمع رقم سے کمپنی حلال سرمایہ کاری کرتی ہے اور منافع ممبر کو دیتی ہے، اور چونکہ کمپنی اس کے مال کی سرمایہ کاری کرنے میں اس کی جانب سے وکیل ہوتی ہے، اس لئے وکیل ہونے کی حیثیت سے اپنی وکالت فیس وصول کرتی ہے، جسے وکالۃ الاستثمار کہا جاتا ہے، اور فقہاء کے نزدیک اجرۃ الوکالہ جائز ہے اور طے ہونے کی صورت میں وکیل اس کا مستحق ہوتا ہے۔

"وإذا اتفقا المؤكل والوكيل على الأجر وجب الأجر اتفاقا" (الموسوعة الفقهيه ۴۵،۹۱) (جب مؤکل اور وکیل کا اجرت پر اتفاق ہو تو بالاتفاق اجرت واجب ہوگی)۔

نیز اس میں شریک تکافل کی ایک سرمایہ کاری اکاؤنٹ (پی آئی اے اکاؤنٹ) بھی ہوتا ہے جو کہ عمومی تکافل میں نہیں ہوتا، اور اس میں شریک ہونے والے کو اس کے سرمایہ سے حاصل ہونے والا نفع دیا جاتا ہے، گویا کمپنی اس کی طرف سے وکالۃً کاروبار کرتی ہے اور اس کاروبار سے حاصل ہونے والے منافع شریک تکافل کو دیتی ہے جو یقیناً درست ہے۔

تکافل کی ان دونوں صورتوں میں انشورنس کے دعووں کی ادائیگی کمپنی اس فنڈ سے کرتی ہے، جو اس رقم سے قائم کی جاتی ہیں جو ممبرس کمپنی کو تبرع کے طور پر دیتے ہیں جسے PTF فنڈ کہا جاتا ہے، اس فنڈ میں جمع کیا جانے والا مال تبرع کے کس قبیل سے ہے، یہ پہلو فقہی نقطہ نظر سے قابل غور ہے، کہ یہ وقف ہے یا ہدیہ ہے؟

تکافل فنڈ کا قیام بصورت وقف فنڈ:

بعض حضرات اس فنڈ کو وقف فنڈ کے نام سے موسوم کرتے ہیں، چنانچہ اگر اس کو وقف مانا جاتا ہے تو اس صورت میں گویا تبرع کرنے والا اس کو ان تمام لوگوں کے لئے وقف کرتا ہے جو اس کمپنی کے عقد تکافل کے ممبرس ہیں، اور وہی شرکاء اور ممبرس اس کے موقوف علیہ ہیں، اور بحیثیت واقف اس کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ اپنے مال کے لئے مخصوص لوگوں کو موقوف علیہ قرار دے۔ علامہ شامی لکھتے ہیں:

''شرائط الواقف معتبرة إذا لم تخالف الشرع وهو مالك، فله أن يجعله ماله حيث شاء ما لم تكن معصية'' (رد المحتار علی الدر ۴/۳۴۳)۔ (واقف کی شرطیں اگر شریعت کے خلاف نہ ہوں تو معتبر ہیں اور وہ اس کا مالک ہے، اس لئے اسے یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ اپنے مال کو جس کے لئے چاہے متعین کرے، بشرطیکہ اس میں معصیت کا پہلو نہ ہو)۔

اور چونکہ وہ خود بھی اس کا ممبر ہوتا ہے تو اس اعتبار سے وہ بھی موقوف علیہ میں داخل ہوگا، اور حادثہ کی صورت میں موقوف علیہ ہونے کی وجہ سے وہ بھی اس وقف سے استفادہ کا حق رکھے گا۔ اور یہ ایسا ہی ہے، جیسے کہ کوئی شخص عام مسلمانوں کے لئے کوئی کنواں وقف کرے تو وہ بھی اس میں شامل ہوگا اور اس کا پانی وہ بھی پی سکتا ہے۔

''إذا وقف شيئاً للمسلمين، فإنه يدخل في جملتهم من غير شرط مثل أن يقف مسجداً فله أن يصلي فيه، أو مقبرة فله الدفن فيها، أو بئراً للمسلمين فله أن يستقي منها، أو شيئاً يعم المسلمين، فيكون كأحدهم وقد ورد عن عثمان بن عفان ﷺ أن سبل بئر رومة وكان دلوه فيها كدلاء المسلمين'' (الموسوعة الفقهيه ۴۴/۱۴۵)۔

(جب کسی شخص نے مسلمانوں کے لئے کوئی چیز وقف کی تو وہ بھی شرط لگائے بغیر موقوف علیہم میں داخل ہوگا، جیسے کہ کسی نے مسجد وقف کی تو وہ بھی اس میں نماز پڑھ سکتا ہے، یا قبرستان وقف کیا تو وہ بھی اس میں دفن ہوسکتا ہے، یا مسلمانوں کے لئے کنواں وقف کیا تو وہ بھی اس میں سے پانی پی سکتا ہے، یا کوئی ایسی چیز وقف کیا جو تمام مسلمانوں کے لئے ہے تو وہ بھی ایک مسلمان کی طرح اس سے استفادہ کا مستحق ہوگا، حضرت عثمانؓ کے بارے میں منقول ہے کہ انہوں نے بئر رومہ کو وقف کیا، اور عام مسلمانوں کے ڈول کی طرح ان کا ڈول بھی اس میں ہوتا تھا)۔

نیز فقہاء کے یہاں اس بات کی بھی گنجائش ہے کہ واقف اپنے مال سے اپنے استفادہ کو باقی رکھے اور اس سے استفادہ کرے، ''الموسوعۃ الفقہیہ'' میں ہے:

''يجوز أن يشترط الواقف الغلة لنفسه، وهذا ما ذهب إلى الحنابلة وأبو يوسف من الحنفية، وعليه الفتوى عندهم، من وقف شيئاً على غيره واستثنى غلته كلها أو استثنى بعضها له مدة حياته أو مدة معينة صح، أو استثنى غلته أو بعضها لولده كذلك صح، أو استثنى الأكل منه أو الانتفاع لنفسه أو لأهله أو اشترط أن يطعم صديقه منه مدة حياته أو مدة معينة صح الوقف والشرط'' (الموسوعة الفقهيه ۴۴/۱۴۴)۔

(واقف کا اپنے لئے موقوفہ مکان وزمین کی منفعت وماحصل کی شرط لگانا جائز ہے، حنابلہ اور حنفیہ میں سے ابو یوسف نے اسی کو اختیار کیا ہے، اور ان کے نزدیک اسی پر فتوی ہے...... جس نے اپنے غیر کے لئے کوئی چیز وقف کی اور اس کی کل یا جزء منفعت وماحصل کو اپنے لئے زندگی بھر کے لئے یا ایک خاص مدت کے لئے مستثنی کیا اور یا بعض کو اپنے اولاد کے لئے مستثنی کیا تو یہ صحیح ہے، یا یہ کہ موقوف شئ میں سے کھانے اور اپنے لئے اور اپنے اہل وعیال کے لئے انتفاع کا استثنا کیا، یا یہ شرط لگایا کہ اس کا دوست زندگی بھر یا متعینہ مدت تک اس سے کھائے گا تو وقف اور شرط درست ہے)۔

لائف تکافل کی صورت میں اگر ممبر کسی حادثہ کا شکار ہوکر لقمہ اجل ہوجائے تو اس کی اولاد کی اس فنڈ سے مدد کی جاتی ہے، اولاد کو حاصل ہونے والا مال دوسرے ممبران کا وقف کردہ مال ہونے کے ساتھ خود اس کے مورث کے وقف کردہ مال کا ایک حصہ ہوتا ہے، اور اس میں بھی کوئی حرج نہیں ہے، کیونکہ دوسروں کا مال اسی مقصد کے لئے وقف ہوتا ہے اور خود اس کے مورث کے مال کا ملنے والا حصہ بھی درست ہے، کیونکہ وہ بھی اسی مقصد کے لئے وقف ہے اور یہ وقف سے انتفاع ہے، اور وقف سے اپنے اہل کے استفادہ اور انتفاع کی شرط لگانا بھی درست ہے، جیسا کہ ماقبل کی عبارت میں یہ صراحت ہے اور یہ انتفاع ہی کی ایک صورت ہے۔

بہر حال واقف یا اس کی اولاد کا اس مال وقف سے استفادہ بحیثیت موقوف علیہ درست ہے، اور ان موقوف علیہم میں شامل ہونا شرعا درست ہے۔

البتہ اس فنڈ کو مال وقف قرار دینے میں جمہور فقہاء کی رائے کے مطابق ایک مشکل یہ ہے کہ اگر کوئی شخص اس تکافل پالیسی میں شریک ہونے کے بعد اس سے علاحدگی چاہے، اور انشورنس کو ختم کرنا چاہے، تو اس کی وقف فنڈ میں وقف کردہ رقم واپس نہیں دی جاسکتی اور اسے اس رقم کی واپسی کا اختیار نہیں ہوگا، گویا عمومی تکافل کی صورت میں اس کو کچھ بھی نہیں ملے گا، جبکہ لائف تکافل میں اسے صرف پی آئی اے میں اس کی جمع رقم مع منافع واپس ملے گی، اس اکاؤنٹ کے ساتھ اس نے پی ٹی ایف میں جو رقم جمع کی ہے وہ رقم ناقابل واپسی ہوگی؛ کیونکہ کسی مال کو وقف کرنے کے بعد اس سے رجوع درست نہیں ہے، ''الموسوعۃ الفقہیہ'' میں ہے:

''ذهب الفقهاء إلى أن الوقف متى أصبح لازماً، فلا يجوز الرجوع فيه'' (الموسوعة الفقهيه ۴۴،۱۲۱) (جمہور فقہاء کا مسلک ہے کہ وقف جب لازم ہوگیا تو اس میں رجوع درست نہیں ہے)۔

اور اگر کسی نے پالیسی لیتے وقت ہی اس سے رجوع کی صراحت کردی، اور رجوع کی شرط لگادی تو اس صورت میں بھی احناف، شوافع، حنابلہ اور مالکیہ کے اکثر فقہاء کے نزدیک یہ شرط کالعدم ہوگی اور رجوع کا اختیار نہ ہوگا اور وقف درست ہوجائے گا، جبکہ بہت سے فقہاء کے نزدیک اس شرط کی وجہ سے وقف ہی درست نہ ہوگا (الموسوعۃ الفقہیہ ۱۲۱/۴۴، حاشیہ ابن عابدین ۳/۳۶۰، فتح القدیر ۲۲۹/۶-۲۳۰، الاسعاف ۲۸)۔

البتہ علامہ دردیر اس بات کے قائل ہیں کہ رجوع کے مطالبہ کی صورت میں واقف کو مال موقوف واپس دیا جاسکتا ہے (الشرح الکبیر ۸۲/۴) لیکن یہ ایک قول ہے، جمہور فقہاء کے نزدیک اس کی گنجائش نہیں ہے، تو اس اعتبار سے اگر اس فنڈ کو وقف فنڈ کی شکل دی جائے گی تو اس کی مقبولیت میں یہ بڑی رکاوٹ بنے گی اور ہر آدمی اپنی واپسی کا دروازہ بند دیکھ کر اس شرعی انشورنس کو اختیار کرنے سے کترائے گا، گرچہ کہ جذبہ تعاون سے سرشار افراد اس کو ضرور اختیار کریں گے، لیکن عام آدمی اس سے دور ہی رہے گا، کیونکہ اس میں اس کو اپنا مال ضائع جاتا ہوا نظر آئے گا۔

تکافل فنڈ کا قیام بصورت ہبہ:

دوسری صورت یہ ہے کہ پی ٹی ایف فنڈ میں بطور تبرع پیش کردہ رقم کو وقف کے بجائے ہبہ کا درجہ دیا جائے اور اسے مال موہوب قرار دیا جائے، گویا تمام شرکاء اس فنڈ میں بطور ہبہ رقم جمع کریں کہ ہم شرکاء میں سے جو بھی کسی مشکل سے دوچار ہوجائے، اس فنڈ کے ذریعہ اس کا تعاون اور اس کی مصیبت کا تحمل کیا جائے۔

لیکن یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ یہاں پر کیا جانے والا ہبہ، ہبہ محض نہیں ہوگا، بلکہ یہ ہبہ، ہبہ بالعوض ہوگا، اس لئے کہ اس عقد ہبہ میں یہ شرط ہوتی ہے کہ اگر خود ہبہ کنندہ کسی نقصان سے دوچار ہوجائے یا اس کا وہ مالک جس کے لئے انشورنس حاصل کیا گیا ہے، خطرات سے دوچار ہوجائے، تو اس صورت میں اس کے نقصان کی تلافی کی جائے، اور اس کے خطرات کا تحمل کیا جائے، اسی طرح سال کے آخر میں دعووں کی ادائیگی اور دیگر اخراجات کو وضع کرنے کے بعد سرپلس (بچ جانے والی رقم) کو شرکاء کے درمیان تقسیم کرنے کی بھی شرط اس میں مذکور ہوتی ہے، ان دونوں شرطوں کی وجہ سے یہ ہبہ ہبہ بالعوض کے زمرہ میں آجاتا ہے، ہبہ محض نہیں رہ جاتا، اور ہبہ بالعوض کے سلسلہ میں بعض فقہاء کے علاوہ جمہور فقہاء کی رائے یہ ہے کہ یہ جائز ہے۔

''تصح الهبة بشرط عوض ويعتبر الشرط'' (مجلة الاحكام العدليه ماده: ۸۵۵) (عوض کی شرط کے ساتھ ہبہ درست ہے اور شرط کا اعتبار کیا جائے گا)۔

نیز الموسوعۃ الفقہیہ میں مذکور ہے: ''لو صدرت الهبة من الواهب مقترنة بشرط العوض مقابل الشئ الموهوب، كما لو قال الواهب: وهبتك هذا الشيئ على أن تثيبني أو تعوضني فهل يصح مثل هذا الشرط؟ للفقهاء فيه قولان: القول الأول: يصح هذا الشرط وهو قول جمهور الفقهاء من الحنفية والمالكية والحنابلة فى المذهب والشافعية فى الأظهر. وحجتهم ما روى عن النبى ﷺ أنه قال: الواهب أحق بهبته ما لم يثب منها (دارقطني. سنن كبرى بيهقى)، القوال الثاني: لا يصح هذا الشرط، وهو قول الشافعية فى مقابل الأظهر وقول للحنابلة. وحجتهم أن لفظ الهبة يفيد التبرع فمن التناقض أن يشترط فيها العوض'' (الموسوعة الفقهيه ۱۴۰،۴۲)۔

(اگر واہب نے موہوب چیز کے بدلے میں ہبہ کی شرط لگا کر ہبہ کیا، مثلاً ہبہ کنندہ نے یہ کہا: میں نے تمہیں یہ شئ ہبہ کی اس شرط پر کہ تم مجھے بدلہ دو، تو کیا اس طرح کی شرط صحیح ہوگی؟ اس سلسلہ میں فقہاء کے دو اقوال ہیں: پہلا قول یہ ہے کہ یہ شرط صحیح ہوگی، احناف، مالکیہ کے جمہور فقہاء کا یہی قول ہے اور حنابلہ کا مسلک اور شوافع کا قول ظاہر یہی ہے، ان حضرات کا مستدل وہ روایت ہے جو نبی ﷺ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ہبہ کنندہ اپنے ہبہ کا زیادہ مستحق ہے

جب تک کہ اس نے اس کا عوض نہ لیا ہو، دوسرا قول یہ ہے کہ یہ شرط صحیح نہیں ہے، یہ شوافع کا قول غیر ظاہر اور حنابلہ کا ایک قول ہے، ان کی دلیل یہ ہے کہ لفظ ہبہ تبرع کا معنی دیتا ہے، اور عوض کی شرط تبرع کی ضد ہے)۔

جمہور فقہاء نے جس روایت سے استدلال کیا ہے، اس کی سند میں اس کے راوی ابراہیم بن اسماعیل کی وجہ سے اگر چہ ضعیف ہے، لیکن دیگر متعدد ہم معنی روایتوں سے اس کی تائید ہوتی ہے، چنانچہ امام حاکم حضرت ابن عمرؓ سے نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''من وهب هبة، فهو أحق بها ما لم يثب منها'' (مستدرك الحاكم: ۲۳۲۳) (جس نے کوئی چیز ہبہ کی وہ اس کا زیادہ حقدار ہے جب تک کہ اس نے اس کا عوض نہ لیا ہو)۔

اس روایت کو امام حاکم نے صحیح علی شرط الشیخین کہا ہے، اور علامہ ذہبی نے ان کی تصحیح سے موافقت کی ہے، اسی طرح امام بیہقی، امام مالک، اور امام طحاوی نے اسی روایت کو بسند صحیح حضرت عمرؓ سے موقوفاً نقل کیا ہے:

''ومن وهب هبة يرى أنه إنما أراد بها الثواب فهو على هبته، يرجع فيها إذا لم يرض منها'' (مؤطا امام مالك: ۲۹۲۷، شرح معاني الآثار: ۵۸۱۹، السنن الكبرى: ۱۲۰۲۳)۔

(جس نے کوئی چیز ہبہ کی اور وہ اس کا عوض چاہتا ہو تو وہ اپنے ہبہ کا مالک ہے، اس کو واپس لے سکتا ہے، اگر وہ اس سے راضی نہ ہو)۔

ان روایات سے جمہور فقہاء کی رائے کی تائید ہوتی ہے اور اس سے یہ مسئلہ واضح ہوتا ہے کہ عوض کی شرط کے ساتھ ہبہ درست ہے، تو تکافل فنڈ میں مشروط ہبہ کے طور پر رقم جمع کرنا درست ہوگا اور اس سے استفادہ بھی درست ہوگا؛ کیونکہ جمہور فقہاء کے نزدیک ہبہ اور شرط دونوں ہی درست ہیں، البتہ جمہور فقہاء کے نزدیک اس صورت میں یہ ضروری ہے کہ عوض معلوم ہو، مجہول نہ ہو؛ کیونکہ ہبہ بالعوض ابتداءً ہبہ اور انتہاءً بیع ہے۔

''فإذا وقعت الهبة بشرط العوض المعين فهي هبة ابتداءً وبيع انتهاءً وعلى مذهب الجمهور يشترط أن يكون العوض معلوماً معيناً كما في البيع'' (الموسوعة الفقهيه ۴۲،۱۲۰)۔

(جب ہبہ عوض معین کی شرط کے ساتھ واقع ہو تو یہ ابتداء ہبہ ہے اور انتہاء بیع ہے، اور جمہور کے نزدیک عوض کا معلوم اور متعین ہونا شرط ہے، جیسا کہ بیع میں ہے)۔

تو اس کی صورت یہ ہوسکتی ہے کہ تکافل پالیسی میں ہونے والے کے لئے خطرات کی تلافی کی حد متعین کردی جائے۔ لیکن اگر عوض اور حاصل ہونے والی منفعت متعین نہ بھی ہو تو بھی بہت سے فقہاء کے نزدیک ہبہ درست ہوگا، اگر چہ حنابلہ اور شوافع کے نزدیک یہ ہبہ باطل ہوگا۔

''فإن كان العوض مجهولاً، فإن الأصح عند الحنابلة أن الهبة تفسد، أما الشافعية فيرون أن الهبة باطلة إذا كان العوض مجهولاً'' (الموسوعة الفقهيه ۴۲،۱۲۰)۔

(پس اگر عوض مجہول ہو تو حنابلہ کے نزدیک اصح قول یہ ہے کہ ہبہ فاسد ہوجائے گا، اور شوافع عوض کے مجہول ہونے کی صورت میں ہبہ کو باطل سمجھتے ہیں)۔

لیکن خود شوافع کے نزدیک ایک قول اس کے صحیح ہونے کا ہے۔

''يصح هبة بناء على أنها تقتضيه'' (مغني المحتاج ۲،۴۰۵، المغني مع الشرح) (یہ عقد بطور ہبہ درست ہے، اس بنا پر کہ ہبہ عوض کا تقاضا کرتا ہے)۔

اسی طرح امام احمد بن حنبل کی ایک روایت کے مطابق یہ ہبہ درست ہوگا۔

''وعن أحمد: أنه الهبة بشرط عوض مجهول صحيحة، فإذا أعطاه الموهوب له عوضاً رضيه، لزم العقد بذلك'' (الموسوعة الفقهيه ۴۲،۱۲۰)۔ (اور امام احمد سے مروی ہے کہ مجہول عوض کے بدلے ہبہ درست ہے، اور موہوب لہ نے اسے کوئی چیز دے دی اور وہ اس سے راضی ہوگیا تو اس کی وجہ سے یہ عقد لازم ہوجائے گا)۔

اور اسی کو علامہ تقی الدین نے نقل کیا ہے اور علامہ حارثی فرماتے ہیں: "هذا هو المذهب" (الانصاف ۷/۱۱۷، المغنی مع الشرح ۶/۲۹۹-۳۰۲)، جبکہ احناف کے نزدیک تو اس صورت میں بھی ہبہ درست ہے اور شرط کے مجہول ہونے کی وجہ سے شرط باطل ہوگی۔

''الهبة صحيحة والشرط باطل والهبة لا تبطل بالشروط الفاسدة'' (المحيط البرهاني ٦،٢٢٥، كذا في الاختيار ٣،٥٣، الدر المختار ٥١٩، ٢)۔ (ہبہ صحیح ہے اور شرط باطل ہے اور ہبہ فاسد شرطوں کی وجہ سے باطل نہیں ہوتا)۔

اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ ہبہ بشرط عوض کی حقیقت گرچہ ابتداءً ہبہ اور انتہاءً بیع ہے، لیکن اس پر بیع وشراء کے سارے احکام جاری نہیں ہوں گے، یہی وجہ ہے کہ عوض کے مجہول ہونے کی صورت میں بیع فاسد ہو جاتی ہے، جبکہ ہبہ درست ہو جاتا ہے۔

خلاصہ یہ کہ اس فنڈ کو ہبہ فنڈ کا درجہ بھی دیا جاسکتا ہے، اور اس صورت میں اس کے تمام شرکاء اس کے موہوب لہ ہوں گے، اور اس اعتبار سے وہ اس فنڈ سے تعاون کے مستحق ہوں گے، اور اس میں اس بات کی گنجائش بھی ہے کہ ہبہ کنندہ اس سے رجوع کر سکے اور اپنی پالیسی ختم کر سکے، جیسا کہ مذکورہ روایتوں میں اس کا جواز مذکور ہے۔ لیکن یہ رجوع کا اختیار صرف اسی وقت تک ہوگا، جبکہ اس نے اس پالیسی کو لینے کے بعد اس سے استفادہ نہ کیا ہو، اگر اس کو اس سے پالیسی کی شرط کے مطابق منفعت مل گئی، مثلاً اس کے کسی نقصان کی تلافی تکافل فنڈ کے ذریعہ ہوگئی اور اب اس کے بعد وہ اپنی پالیسی ختم کر کے اپنی ہبہ کردہ رقم کا مطالبہ کرتا ہے تو یہ مطالبہ درست نہ ہوگا اور اس کی جمع کردہ رقم واپس نہیں کی جائے گی۔

''إذا أعطى للهبة عوض وقبضه الواهب فهو مانع للرجوع، فعليه لو أعطى للواهب من جانب الموهوب له أو من آخر شئ، على كونه عوضاً عن هبته وقبضه، فليس له الرجوع عن هبته بعد ذلك'' (مجلة الاحكام العدليه ماده: ۸۷۸)۔

(جب ہبہ کا عوض دے دیا گیا اور واہب نے اس پر قبضہ کر لیا تو یہ رجوع سے مانع ہے، چنانچہ اسی پر یہ متفرع ہے کہ اگر واہب کو موہوب لہ کی جانب سے یا کسی اور کی جانب سے کوئی چیز عوض کے طور پر دی گئی اور واہب نے اس پر قبضہ کر لیا، تو اس کے بعد اس کو ہبہ سے رجوع کا حق نہ ہوگا)۔

''أن التعويض دليل على أن مقصود الواهب هو الوصول إلى العوض، فإذا وصل إليه فقد حصل مقصوده، فيمتنع الرجوع ولا فرق بين أن يكون العوض قليلاً أو كثيراً'' (الموسوعة الفقهيه ١٥٠، ٤٢)۔ (عوض کا مطالبہ اس بات کی دلیل ہے کہ واہب کا مقصود عوض حاصل کرنا ہے، پس جب اس تک عوض پہنچ گیا تو اسے اس کا مقصود حاصل ہو گیا، اس لئے یہ رجوع سے مانع ہوگا اور اس میں کوئی فرق نہیں کہ عوض کم ہو یا زیادہ)۔

اسی طرح تکافل فنڈ کسی خسارہ سے دوچار ہو گیا اور شرکاء کی جمع کردہ ساری رقم ضائع ہو گئی تو بھی، اس صورت میں اسے اپنی پالیسی ختم کر کے تکافل کمپنی سے اپنے ہبہ کے رجوع کا اختیار نہ ہوگا؛ کیونکہ تکافل کمپنی کی حیثیت امین کی ہے اور مال امانت کے (بغیر تعدی وزیادتی کے) ضائع ہونے کی صورت میں امین پر ضمان لازم نہیں ہوتا، البتہ اگر نقصان جزوی طور پر ہوا ہے تو اس فنڈ میں اپنی رقم کے بقیہ حصہ کا رجوع درست ہے۔

''أما إذا كان الهلاك جزئياً، فإنه لا يمنع الرجوع؛ لأن الرجوع حينئذ يكون رجوعاً في بعض الشيئ الموهوب، والأصل أن للواهب أن يرجع في بعض الموهوب وهو قائم، فكذلك إذا نقص، وليس على الموهوب له ضمان النقص؛ لأن القبض في الهبة ليس قبض ضمان'' (الموسوعة الفقهيه ١٥٠، ٤٢)۔

(جب کہ ہلاک جزئی ہو، تو یہ رجوع سے مانع نہیں ہے، اس لئے کہ اس صورت میں رجوع شئ موہوب کے بعض میں رجوع ہوگا، اور اصل یہ ہے کہ واہب کو یہ اختیار ہے کہ وہ بعض موہوب میں رجوع کر سکتا ہے، اور وہ موجود ہے، اور ایسا ہی، جبکہ کمی ہوگئی، اور موہوب لہ پر کمی کا تاوان نہیں ہوگا، اس لئے کہ ہبہ میں قبضہ قبض ضمان نہیں ہے)۔

نیز تکافل فنڈ میں بطور ہبہ بالعوض جمع کردہ رقم اور اس کے منافع سے ہبہ کنندگان حسب خطرات ہی استفادہ کرتے ہیں جس میں ان کے درمیان تفاوت ہوتا ہے، بلکہ بسا اوقات کئی ایک ہبہ کنندگان خطرات سے محفوظ رہنے کی وجہ سے اس سے استفادہ بھی نہیں کر پاتے، نیز دعووں کی ادائیگی اور دیگر اخراجات کی تکمیل کے بعد بچی ہوئی رقم (سرپلس) کو شرکاء کے درمیان تقسیم کیا جاتا ہے، اس طرح ہر ایک ہبہ کنندہ کو اس کے ہبہ کا کچھ حصہ یا اس کی منفعت واپس ملتی ہے، تو اس کی وجہ سے اس ہبہ فنڈ کے قیام میں کوئی رکاوٹ پیدا نہیں ہوتی؛ اس لئے کہ یہ فنڈ درحقیقت ہبہ بالعوض کی ایک مخصوص صورت ''نہد'' کی طرح ہے، اور اسی کے مشابہ ہے۔ نہد کے بارے میں علامہ عینی لکھتے ہیں:

''النهد إخراج الرفقاء النفقة في السفر وخلطها ويسمى بالمخارجة، وذلك جائز في جنس واحد، وفي الاجناس وإن تفاوتوا في الأكل، وليس هذا من الربا في شئ، وإنما هو من باب الإباحة'' (عمدة القاری ۴۰، ۱۳)۔

(رفقاء کا سفر میں نفقہ نکالنا اور آپس میں اس کو ملا دینا "نہد" ہے، اور اسی کا نام مخارجہ ہے، اور یہ ایک جنس میں اور مختلف اجناس میں جائز ہے، اگر چہ کہ کھانے میں ان رفقاء کے مابین تفاوت ہو، اور اس میں ربا کا حکم جاری نہیں ہوگا، اس لئے کہ یہ اباحت کے باب سے ہے)۔

اور علامہ ابن حجر عسقلانی لکھتے ہیں: ''هو ما تخرجه الرفقة عند المناهدة إلى الغزو وهو أن يقتسموا نفقتهم بينهم بالسوية، حتى لا يكون لأحدهم على الآخر فضل، وأنه لا يتقيد بالتسوية إلا في القسمة، وأما في الأكل، فلا تسوية لاختلاف حال الآكلين'' (فتح الباری ۱۲۹، ۵)۔

(نہد وہ ہے جو رفقاء غزوہ کے لئے کوچ کرنے کے وقت نکالتے ہیں، یعنی وہ اپنے نفقہ کو آپس میں برابر تقسیم کرتے ہیں، حتی کہ ان میں سے کسی پر کسی کو فضیلت نہیں ہوتی، اور اس میں برابری کی قید صرف تقسیم میں ہے، کھانے میں برابری کی قید نہیں ہوگی، کھانے والوں کی حالت کے مختلف ہونے کی وجہ سے)۔

ان دونوں حضرات نے نہد کے بارے میں جو تفصیل لکھی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں شرکاء مال کو جمع کرنے میں تو برابر کے شریک ہوتے ہیں، لیکن اس سے استفادہ میں برابری نہیں ہوتی، کوئی زیادہ اور کوئی کم اور بسا اوقات کوئی بالکل ہی استفادہ نہیں کرتا، اور اس کی زیادتی کو ہر ایک دوسرے کے لئے مباح کرتا ہے اور اس میں ہونے والی کمی زیادتی پر ربا کا حکم بھی جاری نہیں کیا جاتا، اور سفر کی تکمیل پر بچی ہوئی چیز کو آپس میں تقسیم کرلیا جاتا ہے۔

ٹھیک یہی حال تکافل فنڈ میں جمع کردہ رقم اور اس سے استفادہ کا بھی ہوتا ہے، تو جس طرح "نہد" کو جائز مانا گیا ہے، بقول امام بخاری: ''لم ير المسلمون في النهد بأساً'' (بخاری ۱۳۷، ۳)۔ تو اسی طرح اس کے بعینہ مشابہ تکافل فنڈ کو بصورت ہبہ قائم کرنا اور اس سے استفادہ میں شرعاً کوئی ممانعت نہیں ہوگی، اور ہبہ کنندگان کو اس سے حاصل ہونے والی منفعت اور استفادہ میں کمی زیادتی پر ربا کا حکم اسی طرح جاری نہ ہوگا جس طرح "نہد" میں نہیں ہوتا۔

تکافل کمپنی کی حیثیت:

تکافل کمپنی کی حیثیت اعتباری شخصیت اور فرد حکمی کی ہے، شرکاء کے جمع کردہ مال اور اقساط اسی کے ذمہ میں ہوتے ہیں، اور یہی کمپنی دعووں کی تحقیق کر کے ہبہ کنندگان کی طرف سے مستحق موہوب لہ کو مال دیتی ہے، گویا یہ بیت المال کی طرح ہے اور فقہاء نے بیت المال کو فرد اعتباری مانا ہے۔ اور فرد اعتباری میں بھی فقہاء نے ذمہ مالیہ کی صلاحیت کو مانند فرد حقیقی تسلیم کیا ہے، اور اس کی ذمہ داریوں کو سنبھالنے والے افراد کے علاوہ خود اس کو مستقل شخصیت قرار دیا ہے، اس اعتبار سے اس میں قانونی حیات موجود ہوتی ہے، اور اس کو حقوق حاصل ہوتے ہیں اور اس میں ذمہ مالیہ کی صلاحیت ہونے کی وجہ سے اس میں واجبات کے التزام کی صلاحیت ہوتی ہے (احکام المعاملات الشرعیہ: الشیخ علی الخفیف / ۲۸۵، صفات الشخصیۃ الاعتباریہ: دکتور عبدالحمید محمود البعلی)۔

عقد تکافل میں کمپنی اپنی اس حیثیت کی وجہ سے شرکاء تکافل کے جمع کردہ مال پر نگران اور امین ہوتی ہے، اس کی مالک نہیں ہوتی، اور نگراں ہو کر شرکاء کی اجازت سے نیابۃً ان کی طرف سے منفعت کے حصول کے لئے تصرف کرتی ہے، اس میں یہ تصرف بطور وکالت بھی ہو سکتی ہے، جس میں کمپنی صرف اجرۃ الوکالہ کی مستحق ہوگی، یا کمپنی اپنی شخصیت اعتباری کے طور پر اس میں حسب معاہدہ مضاربت بھی کر سکتی ہیں، جس میں احکام مضاربت کے مطابق منفعت کی مستحق ہوگی۔

☆☆☆

تکافل (اسلامی انشورنس) حقائق اور احکام

مفتی نثار احمد گودھروی[1]

کچھ عرصہ سے بعض مالیاتی ادارے اسلامی بینکوں کی طرز پر سود، غرر اور قمار پر مشتمل انشورنس کا متبادل نظام بڑے زور و شور سے متعارف کرا رہے ہیں، جس کو تکافل کا نام دیا گیا ہے۔ جو ادارہ اس کا انتظام وانصرام کرتا ہے اس کو تکافل کمپنی کہا جاتا ہے، جیسے ''پاک کویت جنرل تکافل کمپنی'' یا ''پاک قطر فیملی تکافل کمپنی'' وغیرہ۔ ان کمپنیوں کے بقول یہ نظام چونکہ ہر لحاظ سے شرعی اصولوں کے عین مطابق ہے، اس لئے اس کو اسلامی انشورنس بھی کہا جاتا ہے۔ چونکہ اس کام سے ان اداروں کی غرض نفع کمانا ہے، اس لئے ہم اس کو تجارتی تکافل بھی کہہ سکتے ہیں۔ تکافل کا مفہوم اور شرعی تصور کیا ہے، شرعی اور تجارتی تکافل میں بنیادی فرق کیا ہے، نیز تجارتی تکافل کی شرعی اساس اور حکم کیا ہے؟ ذیل میں ان سوالوں کے جوابات ملاحظہ فرمائیں:

تکافل کا معنی ومفہوم:

ہماری معلومات کے مطابق شرع میں ''تکافل'' کا مفہوم مندرجہ ذیل مواقع میں استعمال ہوا ہے، مثلاً قرآن حکیم میں حضرت مریمؑ کی کفالت اور تربیت کے حوالے سے ایک جگہ ارشاد باری ہے:

فتقبلها ربها بقبول حسن وأنبتها نباتاً حسناً وكفلها زكريا (آل عمران: ۳۷)۔

(پھر اس کے رب نے اسے قبول کیا قبول کرنا اچھا اور زکریا کو اس کا کفیل بنایا)۔

اور دوسری جگہ حضرت مریم سے ہی متعلق ارشاد ہے:

إذ يلقون أقلامهم أيهم يكفل مريم (آل عمران: ۴۴)۔

(جب وہ اپنے قلم ڈال رہے تھے کہ ان میں سے کون مریم کی کفالت کرے)۔

یعنی پہلی آیت میں لفظ ''کفل کفیل'' بنایا اور دوسری میں ''یکفل'' کفالت کرے، کا لفظ استعمال ہوا ہے۔

جب دو آدمی دیوار پھلانگ کر حضرت داؤدؑ کے کمرہ میں داخل ہوئے تو ان میں سے ایک نے کہا:

إن هذا أخي له تسع وتسعون نعجة ولي نعجة واحدة. فقال أكفلنيها وعزني في الخطاب (ص: ۲۱)۔

(بے شک یہ میرا بھائی ہے اس کے پاس ننانوے دنبیاں ہیں اور میرے پاس ایک ہی دنبی ہے تو یہ کہتا ہے وہ بھی میرے سپرد کردے اور گفتگو میں مجھ پر غالب آجاتا ہے)۔

یہاں ''أکفل'' سپرد کردے'' کا لفظ آیا ہے۔

اسی طرح حدیث میں بھی اس مادہ کے مختلف الفاظ آئے ہیں، مثلاً نبی ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: ''أنا وكافل اليتيم في الجنة هكذا'' (صحیح بخاری: کتاب الادب باب فضل من یعول)۔ (میں اور یتیم کی کفالت کرنے والا جنت میں اس طرح اکٹھے ہوں گے آپ نے انگشت شہادت اور درمیانی انگلی کی طرف اشارہ کرکے فرمایا، جیسے یہ دونوں اکٹھی ہیں)۔

البتہ لغت کی جدید کتب میں یہ لفظ زیر بحث آیا ہے۔ چنانچہ ''المورد'' میں تکافل کا معنی:

---

[1] دارالافتاء جامعہ رحمانیہ گودھرا۔

Joint liablity or responsibility; solidarity

(مشترکہ ذمہ داری یا جواب دہی؛ باہمی اتفاق؛ مقاصد اور عمل کا اتحاد) لکھا ہے۔

''معجم الطلاب'' میں ہے: ''تکافل یتکافل، تکافلاً: تضامن تبادل الضمانة مع غیره''۔ (دوسرے کے ساتھ گارنٹی کا تبادلہ کرنا)۔

''معجم لغۃ الفقہاء'' میں تکافل کا معنی ومفہوم یوں بیان ہوا ہے:

''تبادل الإعالة والنفقة والمعونة (Solidarity) الرعاية والتحمل، ومنه تكافل المسلمين رعاية بعضهم بعضاً بالنصح والنفقة وغير ذلك''۔ (کفالت، نفقہ اور اعانت کا تبادلہ (انگریزی میں سولیڈیرٹی) خیال رکھنا اور برداشت کرنا اور اسی سے تکافل المسلمین ہے۔ یعنی مسلمانوں کا ایک دوسرے کا خیر خواہی اور خرچ وغیرہ کر کے خیال رکھنا)۔

اسلام میں تکافل کی اہمیت:

اگرچہ قرآن وحدیث میں لفظ ''تکافل'' موجودہ پس منظر اور مفہوم میں ذکر نہیں ہوا، مگر ایک دوسرے کی ضرورتوں کا خیال رکھنا، خیر خواہی اور تعاون کرنا دین کا اہم مطالبہ ہے۔ سید قطب شہید لکھتے ہیں: ''إن التكافل الاجتماعي هو قاعدة المجتمع الإسلامي والجماعة المسلمة مكلفة أن ترعى مصالح الضعفاء فيها'' (فی ظلال القرآن ۱،۲۱۲)۔ (بلاشبہ اجتماعی تکافل ہی اسلامی معاشرہ کی بنیاد ہے اور مسلمانوں کی جماعت پابند ہے کہ وہ اپنے کمزوروں کے مفادات کا خیال رکھے)۔

دوسری جگہ لکھتے ہیں: ''کان النظام الإسلامي كله يقوم على أساس التكافل'' (۳،۴۴۳) (اسلام کا مکمل نظام تکافل کی بنیاد پر قائم ہے)۔

ذیل میں اس موضوع کی بعض آیات اور احادیث نبویہ صلی اللہ علیہ وسلم ملاحظہ ہوں:

{والمؤمنون والمؤمنات بعضهم أولياء بعض يأمرون بالمعروف وينهون عن المنكر ويقيمون الصلاة ويؤتون الزكاة ويطيعون الله ورسوله أولئك سيرحمهم الله إن الله عزيز حكيم} (التوبہ:۷۱)۔

(مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسرے کے دوست ہیں وہ نیکی کا حکم دیتے اور برے کام سے روکتے ہیں اور نماز قائم کرتے اور زکوۃ دیتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتے ہیں یہ وہ لوگ ہیں جن پر اللہ تعالیٰ ضرور رحم فرمائے گا بے شک اللہ تعالیٰ نہایت غالب خوب حکمت والا ہے)۔

یعنی اہل ایمان کا شعار یہ ہے کہ وہ ایک دوسرے کے معاون ومددگار ہیں۔ تکافل کی روح بھی یہی ہے۔

علامہ محمد رشید رضا لکھتے ہیں: ''ولاية المؤمنين والمؤمنات بعضهم لبعض في هذه الآية تعم ولاية النصرة، وولاية الأخوة والمودة'' (تفسیر المنار ۱۰،۴۷۰)۔

(اس آیت میں مومن مردوں اور مومن عورتوں کی جس دوستی کا ذکر ہے وہ نصرت، اخوت اور محبت سب دوستیوں کو شامل ہے)۔

حضرت ابو سعید خدریؓ بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ ہم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک سفر میں تھے اچانک ایک شخص اپنی سواری پر آیا اور دائیں بائیں دیکھنے لگا، یعنی اپنی ضرورت کی چیز تلاش کرنے لگا اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''من کان معه فضل ظهر فليعد به على من لا ظهر له، ومن كان له فضل من زاد فليعد به على من لا زاد له'' (صحیح مسلم: کتاب اللقطة باب استحباب المؤاساة بفضول المال)۔ (جس کے پاس زائد سواری ہے وہ اس کو دے دے جس کے پاس سواری نہیں ہے اور جس کے پاس زائد راشن ہو وہ اس کو دے دے جس کے پاس راشن نہیں ہے۔ راوی کہتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مال کی جو اصناف ذکر کی سو کی یہاں تک کہ ہم نے یہ سمجھا کہ زائد میں ہم میں سے کسی کا حق نہیں ہے)۔

اسلام کہتا ہے کہ اگر ایک مسلمان کو تکلیف ہو تو دنیا بھر کے مسلمان اس وقت تک بے چین رہیں جب تک اس کی تکلیف رفع نہ ہو جائے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بڑی عمدہ مثال بیان کر کے اس کو یوں سمجھایا:

''ترى المؤمنين في تراحمهم وتوادهم وتعاطفهم كمثل الجسد إذا اشتكى منه عضوا تداعى له سائر جسده بالسهر والحمى'' (صحيح بخاري: كتاب الادب، باب رحمة الناس والبهائم)۔ (تو مسلمانوں کو ایک دوسرے پر رحم کرنے، محبت رکھنے اور شفقت کرنے میں ایک جسم کی مانند دیکھے گا، اگر ایک عضو بیمار ہوجاتا ہے تو تمام اعضاء بخار اور بیداری میں اس کے شریک ہوتے ہیں)۔

ایک موقع پر حضرت عمرؓ نے فرمایا تھا اللہ کی قسم اگر اللہ تعالیٰ یہ قحط ختم نہ کرتے: ''ما تركت أهل بيت من المسلمين لهم سعة إلا أدخلت معهم أعدادهم من الفقراء'' (الادب المفرد: باب المواساة في السنة والمجاعة)۔ (میں ہر صاحب حیثیت مسلمان گھرانے میں اتنے ہی غرباء داخل کردیتا)۔

یعنی ایک خوشحال خاندان میں جتنے افراد ہوتے اتنے ہی غرباء کی کفالت ان پر لازم ہوتی۔

اسلامی تکافل کی ہمہ گیریت:

اسلام کا نظام تکافل اسلامی اخوت، معاشی احتیاج وضرورت اور تکریم انسانیت پر استوار ہے۔ اسلام اس سوچ کا قطعاً حامی نہیں کہ ہم پر صرف ان مستحقین کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے جو ہمارے ہم عقیدہ ہوں۔ قرآن حکیم میں ارشاد ہے:

{لا ينهاكم الله عن الذين لم يقاتلوكم في الدين ولم يخرجوكم من دياركم أن تبروهم وتقسطوا إليهم إن الله يحب المقسطين} (الممتحنہ:۸)۔ (اللہ تعالیٰ تمہیں ان لوگوں سے حسن سلوک کرنے اور ان کے حق میں انصاف کرنے سے نہیں روکتا جو تم سے دین کی بابت نہیں لڑے اور جنہوں نے تم کو تمہارے گھروں سے نہیں نکالا۔ بلاشبہ اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے)۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے: ''في كل ذات كبد رطبة أجر'' (صحيح بخاري: كتاب المظالم باب الآبار على الطرق إذا لم يتأذ بها)۔ (ہر جاندار میں ثواب ہے) یعنی ہر جاندار کے ساتھ احسان کرنا باعث ثواب ہے)۔

فقہاء اسلام کی رائے میں جو اہل ذمہ اپنے معاش کے حصول سے عاجز ہوجائیں ان کی ضرورت کے مطابق بیت المال سے وظیفہ جاری کیا جائے گا۔ چنانچہ امام ابن قیم رقمطراز ہیں: ''قد روى عنه وأنه أجرى على شيخ منهم من بيت المال، وذلك أنهم ربه وهو يسأل على الأبواب، وفعله عمر بن عبد العزيز'' (احكام اهل الذمه باب من لا يقدر من أهل الذمه أعطى من بيت المال)۔

(حضرت عمرؓ سے مروی ہے کہ انہوں نے ایک ذمی بوڑھے کو دروازوں پر مانگتے دیکھا تو بیت المال سے اس کا وظیفہ جاری کردیا اور عمر بن عبدالعزیز نے بھی ایسا کیا تھا)۔

حضرت خالدؓ نے اہل حیرہ سے کہا تھا تم میں سے جو بوڑھا ہوجائے گا یا جس پر کوئی آفت آجائے گی یا جو مالدار رہنے کے بعد غریب ہوجائے گا وہ جب تک دارالاسلام میں رہے گا اس کی اور اس کے بیوی بچوں کی کفالت بیت المال کرے گا (کتاب الخراج لقاضی ابو یوسف)۔

ثابت ہوا اسلام کے نظام تکافل کا فیض انتہائی وسیع ہے، جس سے اسلامی ریاست کا ہر مستحق شہری بلا تخصص عقیدہ بقدر ضرورت مستفید ہوتا ہے۔

تکافل کی مختلف صورتیں:

اسلامی نقطۂ نظر کے مطابق درجات معیشت میں تفاوت اپنی جگہ، مگر اس طرح سادہ زندگی گزارنے کا حق سب کو یکساں ہے کہ اس کی بنیادی ضرورتیں پوری ہوتی رہیں۔ اس امر کو یقینی بنانے کے لئے زکوۃ، عشر اور صدقہ فطر وغیرہ کا نظام دیا گیا ہے۔ اور معاشرہ میں دولت کو زیر گردش لانے اور غرباء کی بہبود میں زکوۃ کا کردار بڑا نمایاں ہے۔ سید قطب شہید لکھتے ہیں: ''إن الزكوة فرع من فروع نظام التكافل الاجتماعي في الإسلام'' (في ظلال القرآن ۴۱،۴)۔ (زکوۃ اسلام میں تکافل اجتماعی کی شاخوں میں سے ایک شاخ ہے)۔

رمضان المبارک کے اختتام پر صدقہ فطر بھی تکافل اجتماعی کی ایک شکل ہے، تاکہ چھوٹے سے لے کر بڑے تک ہر شخص فقراء ومساکین کی دیکھ بھال میں حصہ دار بنے، مالداروں کو فقراء اقرباء کے نان ونفقہ کا ذمہ دار ٹھہرانا بھی تکافل میں شامل ہے، جبکہ نفلی صدقات اور ہنگامی حالات میں انفاق کا حکم الگ ہے۔ اسی طرح غیر ارادی طور پر قتل ہوجانے کی صورت میں دیت تنہا قاتل پر ڈالنے کی بجائے عاقلہ (قاتل کے بھائی، چچا اور ان کی اولاد) کو بھی شریک کرنے کا حکم تکافل

کی ہی عکاسی کرتی ہے۔ چنانچہ علامہ ابن قدامہ حنبلی اس کی حکمت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

''والمعنى فى ذلك أن جنايات الخطأ تكثر، ودية الآدمي كثيرة، فإيجابها على الجاني في ماله يجحف به، فاقتضت الحكمة إيجابها على العاقلة، على سبيل المواساة للقاتل، والإعانة له، تخفيفاً عنه'' (المغنی ۱۲،۲۱)۔

(اس میں حکمت یہ ہے کہ غیر ارادی طور پر ہونے والے جرائم بکثرت ہوتے ہیں اور آدمی کی دیت بھی کافی زیادہ ہے۔ لہٰذا اس کو اکیلے خطا کار کے مال میں واجب قرار دینا اس پر اس کے مال میں ناقابل برداشت ذمہ داری ڈالنے کا باعث ہے۔ چنانچہ حکمت کا تقاضا یہ ہے کہ قاتل کا بوجھ ہلکا کرنے کے لئے بطور ہمدردی اور اعانت کے اس کی عاقلہ پر واجب قرار دی جائے)۔

بلکہ غیر ارادی قتل میں دیت کا حکم بذات خود تکافل کی ایک صورت ہے، وہ یوں کہ بعض دفعہ مقتول کے بچے کمسن ہوتے ہیں جن کی تعلیم و تربیت کے لئے پیسوں کی ضرورت ہوتی ہے، اسلام نے دیت مقرر کر کے ان کی کفالت کا انتظام کیا ہے۔

اس سے ثابت ہوا کہ اسلام نے تکافل کا ایک مضبوط نظام دیا ہے اگر اس پر عمل ہو جائے تو تمام محتاجوں کی معاشی ضرورتیں پوری ہو سکتی ہیں، لیکن بایں ہمہ اگر ضرورت پوری نہ ہو تو سرمایہ داروں پر مزید خرچ کرنا لازم ہو جاتا ہے۔

اسلامی تکافل کی خصوصیت: ...... اسلامی تکافل کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس کا بنیادی مقصد اپنے مستقبل کے خطرات کا تحفظ اور نقصانات کی تلافی ہرگز نہیں۔ اور نہ ہی اس کو بطور کاروبار اختیار کیا جانا چاہئے، اسلامی معاشرے کا یہ شعار ہونا چاہئے کہ اس کے تمام افراد باہم مددگار و معاون ہوں اور ضرورت مندوں اور مجبوروں کی مدد کریں، لیکن اگر کچھ ادارے تکافل کے نام سے یہ مطالبہ کریں کہ ہم آپ کے بیوی بچوں کی مدد تب کریں گے جب آپ اتنے سالوں تک ہر ماہ ایک متعین رقم ہمیں وکالہ یا مضاربہ کی بنیاد پر کاروبار اور وقف فنڈ میں بطور چندہ دیں گے تو اس سے اسلام کے تکافل اجتماعی کا مقصد حاصل نہیں ہوگا۔

مروجہ تکافل اور اس کا طریقہ کار:

ماضی قریب میں تکافل کی ایک نئی شکل سامنے آئی ہے جس کا مقصد دوسروں کے ساتھ تعاون کی بجائے دراصل اپنے نقصان کا ازالہ ہوتا ہے اور اس کے منتظم بھی یہ کام بطور کاروبار کرتے ہیں۔ اس کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ:

- ☆ سب سے پہلے کچھ لوگ یا مالیاتی ادارے مل کر ایک کمپنی قائم کرتے ہیں جس کو تکافل کمپنی کہا جاتا ہے کمپنی کے ادا شدہ سرمایہ کا ایک حصہ وقف کر کے ایک پول بنایا جاتا ہے، یہ پول کسی کی ملکیت نہیں ہوتا، بلکہ اپنا الگ قانونی وجود رکھتا ہے، کمپنی کی طرف سے پول میں ڈالی گئی رقم ان متاثرین کے لئے وقف ہوتی ہے جو پالیسی حاصل کرتے ہیں۔
- ☆ کمپنی مالک وقف کی اس رقم کو وقف کے ایجنٹ کی حیثیت سے یا مضاربہ کی بنیاد پر کاروبار میں لگاتے ہیں، نفع سے اپنی فیس یا حصہ الگ کر کے باقی دوبارہ وقف پول میں ہی جمع کر دیا جاتا ہے۔
- ☆ کمپنی لوگوں کو پالیسی حاصل کرنے کی ترغیب دیتی ہے جو لوگ پالیسی حاصل کرتے ہیں وہ اس کے ممبران شمار ہوتے ہیں۔
- ☆ پالیسی حاصل کرتے وقت خواہش مند اپنی اغراض پیش نظر رکھتے ہیں۔ کسی کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ میری موت کے بعد میرے بچوں کی کفالت کے لئے ان کے پاس بیس لاکھ ہونا چاہئے۔ کسی کے پیش نظر خاص قسم کے متوقع نقصان کا ازالہ کرنا ہوتا ہے۔
- ☆ صرف وہی لوگ پالیسی حاصل کرنے کے اہل شمار ہوتے ہیں جو عمر و صحت اور انکم کے لحاظ سے کمپنی کے معیار پر پورا اترتے ہیں۔ باقاعدہ طبی معائنہ کے ذریعہ ایک اندازہ کیا جاتا ہے۔ اگر کسی چیز کے متوقع نقصان کی تلافی مقصود ہو تو اس چیز کی حالت بھی دیکھی جاتی ہے۔
- ☆ پالیسی کی زیادہ سے زیادہ مالیت کیا ہوگی؟ یہ فیصلہ خواہشمند کو خود کرنا ہوتا ہے۔ کم از کم مالیت تکافل کمپنی طے کرتی ہے۔
- ☆ پالیسی کی زیادہ سے زیادہ مدت کمپنی طے کرتی ہے، البتہ کم سے کم مدت کا تعین وہ شخص خود بھی کر سکتا ہے۔ یاد رہے کمپنی کی جانب سے پالیسی ہولڈر کو دی جانے والی رقم کا انحصار انہی دو باتوں پر ہوتا ہے۔

☆ چونکہ تکافل فنڈ کا انتظام وانصرام کمپنی کے ذمہ ہوتا ہے کمپنی اس کی باقاعدہ فیس لیتی ہے جس کو وکالہ فیس کہا جاتا ہے۔

☆ پالیسی کی رقم عموماً سالانہ اقساط میں جمع کروائی جاتی ہے، جبکہ ششماہی یا سہ ماہی اقساط میں بھی کروائی جاسکتی ہے۔

☆ پالیسی ہولڈر کی قسط سے سب سے پہلے ایلوکیشن فیس منہا کی جاتی ہے، یہ فیس پالیسی مالیت اور مدت کو مدنظر رکھ کر لی جاتی ہے۔ پہلی قسط سے ایک خطیر رقم اس مد میں چلی جاتی ہے۔ مثلاً اگر پالیسی کی مدت ۲۰ سال یا اس سے زیادہ ہو اور قسط پندرہ سے پچیس ہزار تک ہو تو پاک قطر فیملی تکافل پہلی سالانہ قسط سے ۸۰ دوسری سے ۲۰ تیسری سے ۱۰ چوتھی سے ۷ پانچویں سے بھی ۷ چھٹی سے لے کر دسویں تک تین فیصد وصول کرتی ہے۔

☆ ایلوکیشن فیس کے بعد ہر قسط کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے ایک حصہ انوسمنٹ کے لئے اور دوسرا حصہ وقف پول کے لئے۔

☆ جو حصہ انوسمنٹ کے لئے ہوتا ہے اس سے دو قسم کی فیس کاٹی جاتی ہے:

۱۔ ایڈمن فیس: یہ ماہانہ اور پالیسی کی مالیت اور مدت کے اعتبار سے مختلف مگر فکسڈ ہوتی ہے۔

۲۔ مینجمنٹ انوسمنٹ فیس: پاک قطر فیملی تکافل کمپنی کی تقریباً ڈیڑھ فیصد ہے۔

☆ جنرل تکافل میں مکمل قسط وقف پول میں جمع ہوتی ہے۔ کمپنی وقف کو منظم کرنے اور اس کے سرمایہ سے کاروبار کرنے کی علاحدہ علاحدہ فیس لیتی ہے۔

☆ ہر تکافل کمپنی کا ایک دوسری کمپنی جس کو "ری تکافل" کہا جاتا ہے، سے معاہدہ ہوتا ہے، تکافل کمپنی پالیسی ہولڈر کی قسط کا کچھ حصہ "ری تکافل کمپنی" کو بھی دیتی ہے۔

☆ جو حصہ وقف پول میں جمع ہوتا ہے وہ پالیسی ہولڈرز کی ملکیت سے نکل کر وقف کی ملکیت میں چلا جاتا ہے تاہم تجارتی تکافل کے حامیوں کے مطابق وہ خود وقف نہیں ہوگا صرف وقف کی ملکیت ہوگا جو وقف کے مصالح اور ان لوگوں پر خرچ ہوگا، وقف کی مد میں شامل ہوں گے۔ ملاحظہ ہو مولانا محمد تقی عثمانی صاحب کا مقالہ "تأصیل التأمین التکافلی علی أساس الوقف والحاجة الداعیة إلیه" (ص ۱۸-۲۰)۔

☆ کمپنی ان دونوں کھاتوں میں جمع شدہ رقم سے پالیسی ہولڈرز اور وقف پول کے ایجنٹ کی حیثیت سے کاروبار کرتی ہے جو نفع ہو وہ وقف پول اور پالیسی ہولڈرز کے کھاتے میں جمع کر دیا جاتا ہے۔ وقف پول کا مکمل نفع وقف پول میں ہی جاتا ہے۔

☆ کلیمز کی ادائیگی میں عموماً سرمایہ دارانہ انشورنس کی شرطوں کو ہی ملحوظ رکھا جاتا ہے۔ اگر کلیمز زیادہ ہونے کی وجہ سے وقف پول میں رقم کم پڑ جائے تو قانوناً کمپنی اس بات کی پابند ہوتی ہے کہ وہ قرض حسنہ لے کر باقی کلیمز ادا کرے۔ یہ قرض خود کمپنی ہی وقف پول کو دیتی ہے جو اس نے آئندہ سرپلس سے وصول پانا ہوتا ہے۔

☆ اگر پالیسی ہولڈر بیماری یا حادثے کی وجہ سے قسط ادا کرنے کے قابل نہ رہے تو وہ کمپنی ادا کرتی ہے، بشرطیکہ شروع میں یہ فیصلہ کر لیا جائے، کیونکہ اس کے لئے اضافی رقم ادا کرنا لازم ہوتی ہے۔

مروجہ تکافل کی قسمیں: ...... اس کی بنیادی قسمیں دو ہیں: ۱۔ فیملی تکافل، ۲۔ جنرل تکافل۔

فیملی تکافل: ...... یہ اصطلاح لائف انشورنس کے متبادل کے طور پر استعمال ہوتی ہے۔ اس کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ پالیسی ہولڈر کی ہر قسط کا کچھ انوسمنٹ کھاتے میں جاتا ہے اور کچھ حصہ وقف پول میں۔

یہاں کمپنی دو قسم کی الگ الگ ایجنسی فیس وصول کرتی ہے، ایک وقف پول کا منتظم ہونے کی حیثیت سے یہ وقف پول سے لی جاتی ہے اور دوسری پالیسی ہولڈر کا ایجنٹ ہونے کی حیثیت سے یہ پالیسی ہولڈر کے کھاتے سے کاٹی جاتی ہے۔

اب اگر پالیسی ہولڈر متعینہ مدت سے پہلے فوت ہو جائے تو کمپنی اس کے ورثاء کو ایک تو انوسٹمنٹ میں سے پالیسی حاصل کرنے کی ابتداء سے لے کر فوت ہونے تک جمع کرائی گئی رقم مع اس نفع کے جو سرمایہ کاری سے حاصل ہوا ادا کرے گی۔ اور دوسرا فوت ہونے کی وجہ سے پالیسی ہولڈر کے ذمہ جو اقساط رہ گئیں ہیں وہ وقف پول سے ادا کرے گی اور اگر پالیسی ہولڈر متعینہ مدت تک زندہ رہے تو پھر اس کو حسب ذیل فوائد حاصل ہوں گے:

☆ انوسٹمنٹ کھاتے میں جمع شدہ رقم مع اس نفع کے جو اس دوران سرمایہ کاری سے حاصل ہوا۔

☆ وقف میں دیئے گئے عطیہ کے تناسب سے حصہ بشرطیکہ وقف پول میں سرپلس ہو۔

لیکن اگر کوئی شخص مدت مکمل ہونے سے قبل پالیسی سے نکلنا چاہے تو وہ صرف اپنی انوسٹمنٹ کھاتے میں موجود رقم اور اس سے حاصل ہونے والے نفع کا حق رکھتا ہے، وقف پول میں دی گئی رقم پر اس کا کوئی حق نہیں ہوتا۔

جنرل تکافل: ...... یہ اصطلاح جنرل انشورنس کی جگہ بولی جاتی ہے۔ یعنی ممکنہ خطرات سے تحفظ کی پالیسی اس میں قسط کی پوری رقم وقف پول میں جاتی ہے۔ اگر دوران مدت وہ نقصان ہوجائے جس کی تلافی کے لئے پالیسی لی گئی ہے تو ازالہ کردیا جاتا ہے۔ بصورت دیگر سرمایہ دارانہ نظام انشورنس کی طرح پالیسی ہولڈر کو کچھ نہیں ملتا۔ البتہ کمپنی اپنی صوابدید پر کچھ بونس دے سکتی ہے۔

کیا مروجہ تکافل سود اور غرر سے پاک ہے؟

کمرشیل انشورنس کو جن خرابیوں کی بنیاد پر حرام قرار دیا گیا ہے ان میں سرفہرست سود اور غرر (Uncertanty) ہے، بادیٔ النظر میں یہ دونوں خرابیاں یہاں بھی پائی جاتی ہیں۔ وہ یوں کہ اگر پالیسی ہولڈر مدت پوری ہونے سے پہلے فوت ہوجائے تو اس کی پالیسی کے تحت طے شدہ رقم دی جاتی ہے، جس کا ایک حصہ اس نے ادا ہی نہیں کیا ہوتا۔

اور کمپنی قانونی طور پر اس کی پابند بھی ہوتی ہے۔ جبکہ غرر میں اس طرح کہ دونوں احتمال ہیں ممکن ہے جس نقصان کے ازالہ کے لئے پالیسی لی گئی ہے وہ پیش نہ آئے اور ادا کی ہوئی رقم رائیگاں جائے اور یہ بھی احتمال ہے کہ وہ پیش آجائے اور کمپنی کے ذمہ ادائیگی لازم ہوجائے۔

کیا یہ عقد معاوضہ نہیں؟ ...... تجارتی تکافل کے حامی کہتے ہیں کہ اضافہ اور غرر تب ممنوع ہے جب عقد معاوضہ (لین دین کی وہ صورت جس میں ایک فریق دوسرے سے معاوضہ لینے کا حق رکھتا ہے) میں ہو، جبکہ یہ عقد تبرع (Donation) ہے۔ لیکن یہ توجیہ درست نہیں۔ کیونکہ پالیسی ہولڈر کو حاصل ہونے والے فوائد کا انحصار پالیسی مدت کی کمی بیشی پر ہوتا ہے، یعنی پریمیم کم تو فائدہ بھی کم پریمیم زیادہ تو فائدہ بھی زیادہ ہوتا ہے اور یہ سب کچھ باقاعدہ ایک معاہدے کے تحت ہوتا ہے جس کی پابندی فریقین کے لئے لازمی ہوتی ہے اور اس کو قانونی تحفظ بھی حاصل ہے، حتی کہ اگر کلیمز کی ادائیگی کے لئے رقم موجود نہ ہو تو (نام نہاد) وقف قرض لے کر یہ ادائیگی ممکن بناتا ہے، ایسی صورت میں اس کو عقد تبرع قرار دینا ناقابل فہم ہے۔ نیز اس پر تبرع کی تعریف بھی صادق نہیں آتی، کیونکہ تبرع کا معنی ہے کسی کو کوئی چیز اس طرح دی جائے کہ معاوضے کی خواہش نہ رکھی جائے، جبکہ یہاں تو محرک ہی یہ ہے کہ مجھے اس کے عوض یہ فوائد حاصل ہوں گے۔

ایک تاویل کا جواب:

مروجہ تکافل کے بعض حامی اس کی یہ تاویل کرتے ہیں کہ پالیسی ہولڈر یہ فوائد دیئے گئے عطیات کی بنیاد پر نہیں، بلکہ وقف کے قواعد وضوابط کے تحت حاصل کرتا ہے، یعنی وہ یہ نہیں کہتا چونکہ میں نے وقف کو اتنا چندہ دیا ہے، اس لئے میں ان فوائد کا حق رکھتا ہوں، بلکہ وہ یہ کہتا ہے کہ ان قواعد کی بنیاد پر مجھے یہ فوائد حاصل ہونے چاہئیں۔ یہ قانونی حق اس کو عقد معاوضہ میں داخل نہیں کرتا۔

مگر دو وجوہ کے باعث یہ تاویل بیت عنکبوت سے بھی زیادہ کمزور ہے:

۱۔ ایک تو اس لئے کہ پالیسی ہولڈر کو قواعد وضوابط کے تحت دعوی کرنے کا حق بھی دی گئی رقم کے بدلے ہی حاصل ہوا ہے، اب آپ قواعد وضوابط کا نام لیں یا پریمیم کی کمی بیشی کا اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

۲۔ دوسرا اس لئے کہ پالیسی ہولڈر کی نظر تو ان فوائد پر ہوتی ہے جو اس کو مستقبل میں اس کے بدلے میں حاصل ہونا ہوتے ہیں وہ قواعد وضوابط کے تحت حاصل ہوں یا دی گئی رقم کے عوض اس کو اس سے دلچسپی نہیں ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ لوگوں کی اکثریت پالیسی حاصل کرتے وقت فوائد کے متعلق تو پوچھتی ہے، مگر وقف کے قواعد وضوابط کے بارے میں سوال نہیں کرتی۔ ایک مجلس میں جب راقم نے ایک مشہور تکافل کمپنی کے سینئر کنسلٹنٹ سے پوچھا کہ کیا آپ پالیسی حاصل کرنے کے خواہش مندوں کو قواعد وضوابط سے آگاہ کرتے ہیں تو انہوں نے صاف کہا کہ لوگ ہم سے صرف یہ پوچھتے ہیں کہ ہمیں کیا ملے گا؟ قواعد وضوابط کے متعلق کبھی سوال نہیں ہوا۔

اس سے ثابت ہوا کہ جن خرابیوں کی بنا پر روایتی انشورنس حرام ہیں تکافل ان سے پاک نہیں۔

کیا نقدی کو وقف کیا جاسکتا ہے؟

یہاں یہ بحث بھی بڑی اہم ہے کہ روپیہ پیسہ وقف کیا جاسکتا ہے یا نہیں، کیونکہ تکافل کمپنی کی پوری عمارت اس پر استوار ہے، لہٰذا ہم اس مسئلہ کو قدرے تفصیل سے بیان کرتے ہیں۔

اکثر فقہاء اور اہل علم کی رائے میں روپے پیسے اور درہم و دینار کا وقف ہی درست و جائز نہیں، چنانچہ فقہ حنبلی کی مشہور کتاب "ہدایہ" کی شرح "فتح القدیر" میں ہے:

"وقال الشافعي: كل ما أمكن الانتفاع به مع بقاء أصله ويجوز بيعه يجوز وقفه، وهذا قول مالك وأحمد أيضاً، وأما وقف ما لا ينتفع به إلا بالإتلاف كالذهب والفضة والمأكول والمشروب، فغير جائز في قول عامة الفقهاء، والمراد بالذهب والفضة الدراهم والدنانير ومال ليس بحلى"۔

(امام شافعیؒ نے کہا ہے کہ ہر وہ چیز جس کو باقی رکھ کر اس سے فائدہ حاصل کرنا ممکن ہو اور اس کی بیع بھی جائز ہو تو اس کا وقف درست ہے، یہ امام مالکؒ اور امام احمدؒ کا بھی قول ہے۔ باقی اس چیز کا وقف جس کو صرف کیے بغیر اس سے استفادہ ممکن نہ ہو، جیسے سونا، چاندی اور کھانے پینے کی اشیاء ہیں تو عام فقہاء کے نقطہ نظر میں یہ جائز نہیں ہے۔ سونے اور چاندی سے مراد درہم، دینار اور وہ سونا ہے جو زیور کی شکل میں نہ ہو)۔

شارح بخاری علامہ ابن بطال لکھتے ہیں: "قال أبوحنيفة وأبو يوسف: لا يجوز وقف الحيوان والعروض والدنانير والدراهم" (شرح صحيح البخاري ۸،۱۹۸)۔ (امام ابوحنیفہؒ اور ابو یوسفؒ کا قول ہے کہ جانور، سامان اور درہم و دینار کا وقف جائز نہیں)۔

مشہور حنفی عالم علامہ انور شاہ کشمیریؒ لکھتے ہیں: "واعلم أن وقف المنقول لا يصح على أصل المذهب، وأجازه محمد فيما تعارفه الناس" (فيض الباری ۲،۴۱۶)۔ (جان لو اصل (حنفی) مذہب میں اشیاء منقولہ کا وقف صحیح نہیں ہے۔ مگر امام محمدؒ نے ان چیزوں میں اس کی اجازت دی ہے جن میں لوگوں کا عرف ہو جائے)۔

علامہ ابن قدامہ حنبلیؒ رقمطراز ہیں: "وجملته أن ما لا يمكن الانتفاع به مع بقاء عينه، كالدنانير والدراهم والمطعوم والمشروب والشمع وأشباهه، لا يصح وقفه، في قول عامة الفقهاء وأهل العلم، إلا شيئاً يحكى عن مالك والأوزاعي، في وقف الطعام أنه يجوز ولم يحكه أصحاب مالك وليس بصحيح؛ لأن الوقف تحبيس الأصل وتسبيل الثمرة، وما لا ينتفع به إلا بالإتلاف لا يصح فيه ذلك" (المغنی ۸،۲۲۹)۔

(اس کا مفہوم یہ ہے کہ جس چیز کو باقی رکھ کر اس سے فائدہ اٹھانا ممکن نہ ہو، جیسے درہم و دینار، کھانا، مشروب، شمع اور اس جیسی دوسری اشیاء عام فقہاء اور اہل علم کے نزدیک ان کا وقف درست نہیں ہے۔ البتہ امام مالکؒ اور امام اوزاعیؒ سے کھانے کے وقف کے متعلق مروی ہے کہ یہ جائز ہے (اس کو امام مالک کے شاگردوں نے بیان نہیں کیا) لیکن یہ درست نہیں، کیونکہ وقف کا مطلب ہے "اصل کو باقی رکھنا اور اس کے فائدہ کو اللہ کی راہ میں خیرات کرنا" اور جس کو تلف کیے بغیر اس سے فائدہ لینا ممکن نہ ہو اس میں وقف صحیح نہیں ہوتا)۔

مزید لکھتے ہیں: "وجملة ذلك أن الذي يجوز وقفه، ما جاز بيعه، وجاز الانتفاع به مع بقاء عينه، وكان أصلاً يبقى بقاء متصلاً، كالعقار والحيوانات، والسلاح، والأثاث، وأشباه ذلك" (المغنی ۸،۲۳۱)۔ (وقف اس کا جائز ہے جس کی بیع اور اس کو بعینہ باقی رکھ کر اس سے فائدہ اٹھایا جاسکے۔ اور وہ ایسی چیز ہو جو متصل باقی رہے، جیسے زمین، جانور، اسلحہ، اثاثہ اور اس قسم کی دوسری اشیاء ہیں)۔

علماء وفقہاء کا موقف تو آپ اوپر ملاحظہ کر چکے ہیں، البتہ بعض اہل علم وہ بھی ہیں جو رقم کو بھی وقف کرنا جائز سمجھتے ہیں۔ ان میں امام بخاریؒ بھی شامل ہیں۔ چنانچہ انہوں نے اس کے حق میں عنوان بھی قائم کیا ہے۔ "باب وقف الدواب والكراع والعروض والصامت" (صحيح البخاری، كتاب الوصايا) (جانوں، گھوڑوں، سامان اور سونے، چاندی کے وقف کا بیان)۔

اپنے موقف پر استدلال کے لئے انہوں نے اس باب کے تحت حضرت عمرؓ کا یہ واقعہ نقل کیا ہے: "أن عمر حمل على فرس له في سبيل الله أعطاها رسول اللهﷺ ليحمل عليها رجلاً، فأخبر عمر أنه قد وقفها يبيعها، فقال رسول

اللہ ﷺ أن يبتاعها، فقال: لا تبتعها، ولا ترجعن في صدقتك'' (أيضا)۔ (حضرت عمرؓ نے اپنا گھوڑا اللہ کی راہ میں دیا آپ نے وہ گھوڑا رسول اللہ کو دیا تا کہ کسی آدمی کو سواری کے لئے دے دیں۔ حضرت عمر کو اطلاع ملی کہ وہ شخص اس کو فروخت کر رہا ہے انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا کہ وہ اسے خرید لیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا اس کو مت خریدیں اور اپنا صدقہ واپس نہ لیں)۔

امام بخاریؒ نے اپنے موقف کی تائید میں امام زہری کا یہ اثر بھی ذکر کیا ہے: ''قال الزهري: فيمن جعل ألف دينار في سبيل الله، ودفعها إلى غلام له تاجر يتجر بها، وجعل ربحه صدقة للمساكين والأقربين، هل للرجل أن يأكل من ربح ذلك الألف شيئاً، وإن لم يكن جعل ربحها صدقة في المساكن، قال ليس له أن يأكل منها'' (صحیح بخاری: کتاب الوصایا باب وقف الدواب والكراع والعروض والصامت)۔

(امام زہری نے اس شخص کے متعلق فرمایا جس نے ہزار دینار اللہ کی راہ میں دیئے اور وہ اپنے تاجر غلام کو حوالے کر دیئے کہ وہ ان سے تجارت کرے اور اس کا نفع مساکین اور رشتہ داروں کے لئے صدقہ کر دیا، کیا وہ شخص اس ہزار کے نفع سے خود کھا سکتا ہے؟

خصوصاً اگر اس کا نفع مساکین کے لئے صدقہ نہ کیا ہو: امام زہری نے فرمایا اس کو (کسی صورت) یہ حق نہیں پہنچتا کہ اس سے کھائے''۔

صحیح موقف:

امام بخاریؒ کا تفقہ فی الدین اور مقام و مرتبہ شک وشبہ سے بالاتر ہے، لیکن اگر فریقین کے پیش کردہ دلائل کا باہم تقابل کیا جائے تو حسب ذیل وجوہ کے باعث ان حضرات کا موقف صائب معلوم ہوتا ہے جو روپے پیسے کے وقف کو جائز نہیں سمجھتے۔

☆ تمام فقہاء اس پر متفق ہیں کہ وقف میں اصل چیز کو باقی رکھ کر صرف اس کی منفعت خرچ کی جائے گی۔ اس کی بنیاد نبی ﷺ کا یہ فرمان ہے:

''إن شئت حبست أصلها وتصدقت بها'' (صحیح بخاری: کتاب الوصایا باب الوقف کیف یکتب) (اگر تو چاہے تو اس کا اصل روک لے اور اس کی منفعت (پیداوار) کو صدقہ کر دے)۔

یہ حدیث اس امر کی صریح دلیل ہے کہ وقف وہ چیز ہو سکتی ہے جس کو باقی رکھ کر فائدہ اٹھانا ممکن ہو، جبکہ روپیہ اپنی اصل حیثیت میں رہتے ہوئے کوئی فائدہ دینے کی صلاحیت نہیں رکھتا، نہ اس کو کھایا جا سکتا ہے نہ پہنا جا سکتا ہے، نہ اس میں رہائش رکھی جا سکتی ہے اور نہ ہی اس پر سواری کی جا سکتی ہے یہ تو حصول اشیاء کا ایک وسیلہ ہے، یعنی جب تک اس کو خرچ نہ کریں اس سے استفادہ ممکن نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ روپے، پیسے کو کرایہ پر دینا درست نہیں، کیونکہ کرایہ اسی چیز کا لیا جا سکتا ہے جسے صرف کے بغیر استعمال کیا جا سکتا ہو، جبکہ نقد میں یہ خوبی نہیں، اس لئے اس کا کرایہ لینا جائز نہیں۔ اسی بنا پر امام نووی اور علامہ ابن قدامہ نے درہم ودینار کے وقف کا جواز ان لوگوں کا مسلک بیان کیا ہے جو ان کا کرایہ لینا جائز سمجھتے ہیں ملاحظہ ہو: (روضۃ الطالبین ۲ / ۲۵۴، المغنی ۸ / ۲۲۹)۔

جب راجح مسلک کے مطابق ان کا کرایہ درست نہیں ہے، مروجہ تکافل کے حامی بھی اس سے متفق ہیں اور وجہ بھی وہی بیان کرتے ہیں جو فقہاء کرام نے وقف کے عدم جواز میں کی ہے کہ نقد کو استعمال کیے بغیر فائدہ اٹھانا ممکن نہیں (دیکھئے: ''اسلامی بینکاری کی بنیادیں'' / ۱۶۹ از مولانا تقی عثمانی)۔

جب موجودہ تکافل کے مؤیدین بھی یہ تسلیم کرتے ہیں کہ روپیہ پیسہ ایسی چیز نہیں جس کو باقی رکھ کر مستفید ہوا جا سکے تو پھر فقہاء کرام کی اس شرط کو کہ ''وقف وہی چیز ہو سکتی ہے جو باقی رہ کر قابل فائدہ ہو'' نظر انداز کر کے نقد کے وقف کے جواز کا فتویٰ سمجھ سے بالاتر ہے۔

ایک شبہ کا ازالہ:

جو حضرات نقد کے وقف کے قائل ہیں ان کے خیال میں روپے پیسے کو بھی باقی رکھ کر فائدہ حاصل کیا جا سکتا ہے وہ یوں کہ اس سے کاروبار کیا جائے، جو نفع ہو وہ خرچ کر دیا جائے۔ مگر یہ دو وجہ سے درست نہیں ہے۔

☆ ایک تو اس لئے کہ یہ صورت روپے پیسے کو اس کی اصل حیثیت میں باقی رکھ کر فائدہ حاصل کرنے کی نہیں اس طرح کا فائدہ تو روپے پیسے کو کرایہ پر بھی دے کر لیا جا سکتا ہے لیکن اس کے باوجود یہ شرعاً جائز نہیں کیوں؟ اس لئے کہ اس قسم کا فائدہ نقد کی تخلیق کا اصل مقصد نہیں ہے جیسا کہ علامہ ابن قدامہ حنبلی نے المغنی میں لکھا ہے۔

☆ دوسرا اس لئے کہ روپے پیسے کو کاروبار میں لگانے سے فائدہ کی بجائے نقصان کا بھی اندیشہ ہے اور ممکن ہے وقف ختم ہی ہوجائے، اس لئے یہ کہنا کہ وقف کی ہوئی رقم سے کاروبار کر کے اس کا نفع خرچ کیا جائے گا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کہ "اصل روک کر رکھو اور اس کی پیداوار خرچ کرو" کے خلاف ہے۔

۲۔ جو حضرات نقد کے وقف کو ناجائز کہتے ہیں ان کا موقف درست ہونے کی دوسری وجہ یہ ہے کہ قائلین نے اپنی تائید میں جو دلائل ذکر کئے ہیں وہ ثبوت کے لئے ناکافی ہیں، حضرت عمرؓ کے واقعہ سے ایسی منقولی اشیاء کا وقف تو ثابت ہوتا ہے جن کا اپنا ذاتی استعمال ہو، مثلاً گھوڑا اس کا اپنا ذاتی استعمال ہے وہ ہے سواری وغیرہ، لیکن نقد جس کا اپنا کوئی ذاتی استعمال نہیں کا وقف ثابت نہیں ہوتا۔ امام بخاری نے نقد کو گھوڑے پر قیاس کیا ہے جو درست نہیں، کیونکہ دونوں میں واضح فرق ہے۔

یہاں یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ بعض اہل علم کی رائے میں یہ وقف تھا ہی نہیں، بلکہ صدقہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمرؓ سے تو فرمایا کہ اپنا صدقہ مت خریدو، مگر بیچنے والے پر پابندی نہیں لگائی۔ اور نہ ہی حضرت عمر نے اس پر کوئی اعتراض کیا، اگر یہ وقف ہوتا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس کو بھی منع فرمادیتے، کیونکہ وقف کو فروخت کرنا جائز نہیں۔

۳۔ امام زہری کا اثر بھی دلیل نہیں بن سکتا، کیونکہ یہ وقف کے بارے میں نہیں، بلکہ عام صدقہ کے متعلق ہے، اس کا قرینہ یہ ہے کہ ان سے پوچھا گیا کیا وہ شخص اس کے نفع سے خود بھی کھا سکتا ہے؟ انہوں نے جواب دیا نہیں۔ اگر یہ وقف ہوتا تو یہ پابندی نہ لگاتے، کیونکہ وقف کنندہ کو شرعاً اپنے وقف سے فائدہ اٹھانے کی اجازت ہے۔

محدث اسماعیلیؒ فرماتے ہیں زہری کا اثر اس وقف کے خلاف ہے جس کی اجازت نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر کو دی تھی کہ "اصل کو روکے رکھو اور ثمرہ خرچ کرو" سونے چاندی سے تو تب ہی فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے جب اس کو بعینہ کسی دوسری چیز کی طرف نکالا جائے یہ اصل کو روکے رکھو اور ثمرہ خرچ کرو کی صورت نہیں بنتی (فتح الباری ۵/۴۹۵)۔

حافظ ابن حجر نے محدث اسماعیلی کے اعتراض کا جو جواب دیا ہے وہ صرف زیور جس کا ذاتی استعمال واضح ہے پر منطبق ہوتا ہے، درہم و دینار پر نہیں، اس لئے اس کو روپے پیسے کے وقف کی دلیل نہیں بنایا جاسکتا۔

موجودہ تکافل کے حامی "فتح القدیر" کے حوالے سے امام زفر کے شاگرد محمد بن عبداللہ انصاری کے فتوی کا ذکر بھی بڑی شدومد سے کرتے ہیں کہ انہوں نے درہم و دینار کے وقف کو جائز قرار دیا ہے، لیکن اگر غور کیا جائے تو یہ فتوی خود تکافل کمپنیوں کے خلاف جاتا ہے، کیونکہ اس میں یہ الفاظ بھی ہیں:

"وقیل: وکیف؟ قال: یدفع الدراهم مضاربة، ثم یتصدق بها فی الوجه الذی وقف علیه" (فتح القدیر)۔

(یہ کیسے ممکن ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ وہ دراہم مضاربہ کی بنیاد پر کاروبار کے لئے دے، پھر ان پر صدقہ کرے جن پر وقف کیا گیا ہے)۔

جبکہ تکافل کمپنیوں کے مالکان اپنے قائم کئے ہوئے وقف سے کسی کو بطور مضاربہ رقم نہیں دیتے، بلکہ خود ہی کاروبار کرتے ہیں اور اس کی باقاعدہ فیس وصول کرتے ہیں۔ امام زہری کے اثر میں بھی یہی ہے کہ اس نے غلام تاجر کو دیئے تھے، نہ کہ خود ہی تجارت میں لگا کر اس کے عوض فیس لینا شروع کردی۔

اس تفصیل سے واضح ہوتا ہے کہ جو حضرات نقد کے وقف کے قائل ہیں ان کا نقطہ نظر کمزور ہے، لہذا تکافل کمپنیوں کی بنیاد ہی ایسے موقف پر استوار ہے جو دلائل کی قوت سے محروم ہے۔

فائدہ: یہاں یہ وضاحت کردینا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ موجودہ تکافل کے حامیوں کی رائے میں پالیسی ہولڈرز کی اقساط سے جو حصہ وقف پول میں جاتا ہے وہ وقف کی بجائے وقف کی ملکیت ہوتا ہے جو وقف کے مصالح کے علاوہ ان لوگوں پر خرچ ہوگا جن کے لئے وقف قائم کیا گیا ہوگا، جیسا کہ ہم پیچھے بیان کرآئے ہیں سوڈان کے معروف عالم پروفیسر صدیق محمد امین ضریر کے نزدیک اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے، چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

"وما لم یأت الباحث بدلیل علی أن ما یتبرع للوقف یصرف للموقوف علیهم، فأن تأصیل التأمین التکافلی علی أساس الوقف ینهار من أساسه" (تعقیب عن بحث تأصیل التأمین التکافلی علی أساس الوقف والحاجة الداعیة إلیه)۔

(جب تک محقق (مولانا تقی عثمانی) صاحب اس بات کی دلیل پیش نہیں کرتے کہ جو عطیہ وقف کو دیا جاتا ہے وہ ان لوگوں پر خرچ کیا جاسکتا ہے جن پر وقف کیا گیا ہو تو وقف کی بنیاد پر تکافلی انشورنس کا اصول اپنی بنیاد سے اکھڑ جاتا ہے)۔

فائدہ: یہاں اس امر کا تذکرہ خالی از دلچسپی نہ ہوگا کہ دنیا میں مروجہ تکافل کی سب سے پہلی کمپنی سوڈان میں ۱۹۷۹ء میں صدیق محمد امین کے زیر نگرانی قائم ہوئی تھی، لیکن اس کی بنیاد وقف کی بجائے تبرع پر تھی۔ مگر اس کو وقف کی بنیاد پر قائم تکافل کمپنیوں کے مفتیان کرام جائز نہیں سمجھتے۔

بعض تحقیق طلب مسائل:......مروجہ اسلامی انشورنس میں ایلوکیشن اور ایڈمن فیس کے نام پر وصولی بھی غور طلب پہلو ہے، جیسا کہ ہم گذشتہ صفحات میں بیان کر آئے ہیں کہ پہلے سال قسط کی ستاسی (یہ زیادہ سے زیادہ ہے) دوسرے سال بیس، جبکہ تیسرے سال دس فیصد رقم ایلوکیشن فیس کے نام سے کاٹ لی جاتی ہے یہ ساری رقم کنسلٹنٹ جو کسٹمر گھیر کر لاتا ہے اور برانچ ذمہ داران کی جیبوں میں جاتی ہے۔ پالیسی ہولڈر کو اس کا علم نہیں ہوگا۔ یہ بالکل وہی طریقہ ہے جو روایتی انشورنس کا ہے کہ پہلی قسط کا معتد بہ حصہ انشورنس کمپنی کے ایجنٹ کو دے دیا جاتا ہے۔ جب نام نہاد اسلامی انشورنس نظریاتی مرحلہ میں تھی تب یہ کہا جاتا تھا کہ روایتی انشورنس نے بھی وہی راستہ اختیار کیا۔ ہمارے خیال میں یہ پالیسی ہولڈر کے ساتھ زیادتی ہے وہ اس طرح کہ اگر وہ ایک قسط ادا کرنے کے بعد تکافل کمپنی کو الوداع کہتا ہے تو قواعد وضوابط کے مطابق اس کو صرف وہ رقم ملتی ہے جو انوسٹمنٹ کھاتے میں جمع ہو یا پھر اس سے حاصل ہونے والا نفع۔ اب ستاسی فیصد تو ایلوکیشن فیس کے نام پر پہلے ہی الگ کیا جا چکا ہے باقی تیرہ فیصد بچا اس میں سے آدھا وقف میں چلا گیا جو شرعاً واپس نہیں لیا جاسکتا۔ جو باقی رہ گیا اس میں سے ڈیڑھ فیصد مینجمنٹ اور ۶۵ سے لیکر ایک سو دس روپے تک ماہانہ ایڈمن فیس بھی لی جاتی ہے۔ پالیسی ہولڈر کے ہاتھ کیا آیا؟ تکافل کمپنی کے تنخواہ دار شریعہ بورڈ کے مفتیان کرام کا ایک عدد فتوی اور اس کے نتیجہ میں اسلام کے نظام تکافل کے متعلق پیدا ہونے والی بدگمانی کہ یہ بھی استحصال پر مبنی نظام ہے (أعاذنا اللہ منہ) ایلوکیشن فیس کی اس کے علاوہ کوئی توجیہ نہیں کی جاسکتی کہ یہ باطل حربوں سے مال کھانے کی بدترین شکل ہے۔

ایک غیر معقول استدلال:......مروجہ تکافل کے حامی بڑی سادگی سے کہتے ہیں کہ ہم ہر بات پہلے بتادیتے ہیں۔ ناجائز تو تب ہو جب کوئی بات خفیہ رکھی جائے۔ یہ انتہائی لغو قسم کا استدلال ہے۔ کیا بتا کر باطل طریقے سے کسی کا مال ہڑپ کرنا جائز ہو جاتا ہے؟ ناجائز کاروبار میں ملوث لوگوں کی اکثریت بھی یہی کہتی ہے کہ ہم ہر بات پہلے طے کرتے ہیں، پھر یہ ناجائز کیسے؟ کیا تکافل کے حامی اس حقیقت سے بے خبر ہیں کہ اسلام نے بعض معاملات محض اس لئے ناجائز قرار دیئے ہیں کہ ان سے کسی ایک فریق کو نقصان پہنچ رہا ہوتا ہے۔

خلاصہ:......مذکورہ بالا تفصیل کا خلاصہ حسب ذیل ہے:

☆ مروجہ تکافل شرعی تکافل سے بالکل مختلف ہے۔

☆ روایتی انشورنس کی طرح رائج الوقت تکافل بھی سود اور غرر پر مشتمل ہے۔

☆ تکافل پالیسی عقد معاوضہ ہے، نہ کہ عقد تبرع، جیسا کہ تکافل کے حامی باور کراتے ہیں۔

☆ راجح نقطہ نظر کے مطابق نقدی کو وقف نہیں کیا جاسکتا۔ لہذا تکافل کمپنیوں کی بنیاد ہی غلط ہے۔

☆ ایلوکیشن فیس باطل طریقہ سے مال ہڑپ کرنے میں داخل ہے۔

☆☆☆

تکافل شرعی حل یا موجودہ انشورنس کا متبادل

مولانا عبید اللہ ندوی [1]

ہمارے زمانہ کے تمام تجار اس بات پر متفق ہیں کہ اشیاء کا انشورنس ایک حاجت شدیدہ بن گیا ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ پہلے تجارت اتنے بڑے پیمانہ پر نہیں ہوتی تھی جس میں ایک سودے پر کروڑوں، اربوں روپے خرچ ہوں اور بین الاقوامی تجارت میں بھی پہلے اتنی کثرت نہیں تھی جتنی آج ہوگئی ہے، اس لئے خطرات کی مقدار بھی بڑھ گئی ہے، اس واسطے کوئی ایسا طریقہ ہونا چاہئے کہ ایسے خطرات کو ایک ہی آدمی پر ڈالنے کے بجائے معاشرہ بحیثیت مجموعی اس کا تحمل کرے، بیمہ کا جو نظام ہے یہ اگر غرر، سود اور قمار پر مشتمل ہے، تو اس کا کوئی شرعی حل اور کوئی متبادل نظام ہونا چاہئے، جس میں غرر اور قمار بھی نہ ہو اور مقصد بھی حاصل ہو جائے اور حاجت بھی پوری ہو جائے۔

چنانچہ علماء نے اس کے کئی شرعی حل بیان کئے ہیں اور اس کے لئے ایک متبادل نظام تجویز کیا ہے، مثلاً:

۱۔ مروجہ بیمہ کا ایک شرعی حل یہ ہے کہ بیمہ پالیسی کی حاصل شدہ رقوم کو مضاربت کے شرعی اصول کے مطابق تجارت پر لگایا جائے اور معینہ سود کے بجائے تجارتی کمپنیوں کی طرح تجارتی نفع تقسیم کیا جائے، نقصان سے بچنے کے لئے لمیٹڈ کمپنیوں کی طرح اس کی پوری نگرانی کی جائے اور پھر اللہ پر توکل کیا جائے۔

۲۔ مروجہ انشورنس کا متبادل نظام جو علماء عصر نے تجویز کیا ہے وہ ہے "تعاونی بیمہ (Mutual Insurance) جس کو عربی میں 'التأمین التبادلی' یا 'التأمین التعاونی' کہا جاتا ہے، نیز اسی کو 'التکافل' بھی کہتے ہیں۔

تکافل کی لغوی تعریف:...... "تکافل" کا لفظ کفالہ سے بنا ہے جس کے معنی ہیں ضمان، چونکہ یہ اشتراک کے لئے آتا ہے، اس لئے اس کے معنی ہوں گے آپس میں ایک دوسرے کا ضامن ہونا۔

تکافل کی اصطلاحی تعریف:

تکافل کی اصطلاحی تعریف علماء نے مختلف انداز و الفاظ میں کی ہے، لیکن نتیجہ و مفہوم کے اعتبار سے سب ایک ہیں، چنانچہ میں یہاں استاذ مصطفی زرقاء کی تعریف نقل کرتا ہوں:

"هو تحويل الأضرار التي يقدرها الله عن ساحة الفرد المستأمن الذي قد يكون عاجزاً عن احتمالها إلى ساحة الجماعة لتخفيف وطأتها على الجماعة حتى تنتهي إلى درجة ضئيلة جداً بحيث لا يحس بها أحد منهم".

(نقصان اور حادثہ۔ جو اللہ نے مقدر کیا ہے۔ کے اثرات کو ایک فرد کے ذمہ ہے۔ جو اس نقصان کو تنہا برداشت کرنے سے عاجز ہے۔ ہٹا کر ایک جماعت کی طرف منتقل کرنا، تا کہ پوری جماعت پر اس کا بوجھ ہلکا ہو جائے اور کسی کو اس کا احساس بھی نہ ہو۔

تکافل کا طریقہ کار اور مقصد:

اس کا طریقہ کار یہ ہوتا ہے کہ کچھ لوگ باہم مل کر ایک فنڈ بنا لیتے ہیں اور اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اس فنڈ کے ممبران میں سے اگر کسی کو حادثہ پیش آگیا تو اس حادثہ کے اثرات کو دور کرنے کے لئے اس فنڈ سے اس کی امداد کی جائے گی، مثلاً سو آدمیوں نے مل کر ایک ایک لاکھ فنڈ جمع کیا تو ایک کروڑ روپیہ ہو گیا، اب سب نے مل کر یہ طے کر لیا کہ ہم سو افراد میں سے جس کسی کو بھی حادثہ پیش آگیا تو ہم اس فنڈ سے اس کی امداد کریں گے۔ چونکہ اس میں ربوا، قمار اور غرر نہیں پایا جاتا ہے اور نہ ہی تجارت

---

[1] استاذ حدیث و ادب دار العلوم ماٹلی والا، گجرات۔

مقصود ہوتی ہے، بلکہ تبرع اور امداد باہمی مقصود ہوتا ہے، اس لئے یہ صورت سب کے نزدیک جائز ہے، البتہ علماء نے اس کے لئے کچھ شرعی ضوابط بیان کئے ہیں، مثلاً:

۱۔ اس بات کی وضاحت ہو کہ "تکافل" کی بنیاد تبرع اور امداد باہمی پر ہے جس کا مقصود اصلی نقصانات کا خاتمہ اور حوادث کے مواقع پر ذمہ داری میں اشتراک ہے، اس کا مقصد نہ تجارت ہے اور نہ دوسروں کے مال سے حصول نفع۔

۲۔ تکافل شرعاً کسی حرام اشیاء پر مشتمل نہ ہو (چاہے وہ حرام مسلمان کے ساتھ خاص ہو یا غیر مسلم کے)۔

۳۔ تکافل کمپنی اپنے داخلی وخارجی تمام منافع میں احکام شریعت کی مکمل پابند ہو۔

۴۔ تکافل کمپنیوں کے لئے ایک شرعی نگراں کمیٹی ہو (علماء وفقہاء کی شکل میں) جو اس بات کی نگرانی کرے کہ کمپنی کے اعمال احکام شرع کے موافق ہیں یا نہیں، تاکہ ان معاملات مالیہ کے اللہ کی مرضی کے مطابق ہونے کا یقین واطمینان ہو جائے، خواہ وہ غالب گمان ہی کے درجہ میں ہو۔

۵۔ تکافلی نظام انتہائی سہل اور آسان ہو، پیچیدہ طریقوں سے بالکل دور ہو، تاکہ مقصود حاصل ہو سکے۔

۶۔ تکافل حصہ لینے والے افراد کے حساب اور حقوق، بیمہ کرانے والوں کے حساب اور حقوق سے الگ ہوں۔

۷۔ معاوضات کی ادائیگی کے بعد مابقی رقم مساہمین پر تقسیم کردی جائے ان کی قسط کے اعتبار سے۔ ۸۔ نظام تکافل وقف کی صورت میں ہونا چاہئے۔

نوٹ: راقم السطور کی ناقص رائے یہ ہے کہ تکافل کا نام بھی تبدیل کردیا جائے تو بہتر ہوگا، التأمین التعاونی أو التبادلی، یا شرکات التکافل کے بجائے اگر "منظمۃ خیریہ" یا "الجمعیۃ الخیریۃ" یا "رفاہ عام سوسائٹی وغیرہ جیسے نام رکھ دیئے جائیں، تاکہ اس میں اور تجارتی بیمہ میں کوئی مشابہت باقی نہ رہے، نیز اس میں مسلم غیر مسلم سب یکساں طور پر شریک ہوسکیں، غیر مسلم اسلامی نام سن کر کوئی تردد اور جھجک محسوس نہ کریں، دوسرے یہ کہ وہ کمپنیاں جو ربوا اور قمار پر قائم ہیں وہ اس سے ملتے جلتے نام سے لوگوں کو دھوکہ نہ دے سکیں، چنانچہ آج کل بہت سے ممالک میں "شرکات التکافل" یا "التأمین التعاونی" نام کے پس پردہ تجارتی بیمہ ہو رہا ہے اور عوام اس میں شریک بھی ہو رہے ہیں، محض اس بنیاد پر کہ علماء نے متبادل کے طور پر اس کو جائز قرار دیا ہے، حالانکہ اس میں وہ تمام حرمت کے اسباب پائے جاتے ہیں جو تجارتی بیمہ میں پائے جاتے ہیں۔

خلاصہ بحث:...... تجارتی بیمہ یا کمرشیل انشورنس (Comercial Insurance) اگر چہ ان وجوہات کی بنیاد پر۔ جن کا ذکر گذشتہ صفحات میں ہوا۔ اصلاً ناجائز اور حرام ہے، لیکن بعض شعبہائے زندگی میں اب بیمہ لازم ہو گیا ہے، مثلاً گاڑی، موٹر سائیکل اور کار وغیرہ میں، ان کا تھرڈ پارٹی انشورنس کرائے بغیر آپ سڑک پر نہیں لا سکتے ہیں، اور اگر کسی وقت آپ کی کار کا تھرڈ پارٹی انشورنس نہیں ہوا تو پولیس والا چالان کر کے کار ضبط کر لے گا۔ اور تقریباً یہ قانون ساری دنیا میں لازم ہے۔ دنیا کے کسی ملک میں بھی ایسا نہیں ہے کہ تھرڈ پارٹی انشورنس لازمی نہ ہو، اب جہاں قانون نے ہمیں مجبور کر دیا تو اگر چہ کار یا موٹر سائیکل چلانا کوئی ایسی ضرورت نہیں کہ اگر آدمی نہ چلائے تو مر جائے گا، لہذا وہ ضرورت اور اضطرار کی حد میں داخل نہیں ہوتا، لیکن حاجت ضرور ہے اور اس کے بغیر حرج شدید ہوگا، لہذا انشورنس کرانے کی گنجائش ہوگی، البتہ اگر کسی کو تھرڈ پارٹی انشورنس کی وجہ سے معاوضہ ملے تو اس کو صرف اتنا معاوضہ وصول اور استعمال کرنا جائز ہے جتنا اس نے قسط (Premium) ادا کیا ہے، اس سے زیادہ استعمال کی اجازت نہیں ہے۔

بعض جگہ صورت حال ایسی پیدا ہوگئی ہے کہ اگر چہ قانوناً انشورنس لازمی نہیں ہے، لیکن انشورنس کے بغیر زندگی انتہائی دشوار ہوگئی ہے، جیسا کہ آج کل بعض مغربی ممالک میں صحت کا بیمہ چلا ہے، کیونکہ امریکہ وغیرہ میں صورتحال ایسی ہے کہ اگر کسی شخص کو معمولی بیماری میں بھی ہسپتال میں داخل ہونا پڑا تو اس کا دیوالیہ نکل جائے گا، کیونکہ وہاں اسپتال کا بل بالکل ناقابل تحمل ہوتا ہے، ڈاکٹروں کی فیس ناقابل برداشت ہوتی ہے تو بیماری تو آئی، مگر اپنے ساتھ اتنا بڑا عذاب لے کر آئی، اب اگر چہ یہ قانونی پابندی نہیں ہے کہ آپ صحت کا بیمہ کرائیں، لیکن اس کے بغیر گزارا مشکل ہے۔

بعض ممالک میں قانون یہ ہے کہ اگر آپ کے گھر کے سامنے برف گری اور اس کی وجہ سے کوئی آدمی مر گیا تو یہ اس کے لئے بڑی زبردست خسارہ کی بات ہے، اگر کوئی شخص دعوی کرے تو لاکھوں ڈالر دینے پڑتے ہیں، اب ایک بیچارہ شخص جو بڑی مشکل سے مہینے میں ہزار ڈیڑھ ہزار ڈالر کماتا ہے اس کے اوپر اچانک لاکھوں ڈالر کا خرچہ آجائے تو وہ کہاں سے ادا کرے گا اور بعض اوقات اس میں کوئی جانی بوجھی غلطی بھی نہیں ہوتی، رات بھر برف پڑی صبح اس نے اٹھانے کی کوشش کی، لیکن اٹھانے میں آدھے گھنٹے کی تاخیر ہوگئی، اور اس پر سے کوئی شخص پھسل گیا اور اس کے نتیجہ میں اس پر لاکھوں ڈالر کا خرچہ آپڑا۔

اسی طرح مسجدوں میں بھی یہی ہورہا ہے کہ مسجد کے کنارے برف جم گئی اور کوئی شخص آکر اس میں گر گیا اور اس نے دعوی کردیا تو مسجد پر لاکھوں ڈالر کی مصیبت کھڑی ہوجاتی ہے، تو یہ وہ مواقع ہیں جہاں اگرچہ بیمہ قانوناً لازم تو نہیں ہے، لیکن اس کے بغیر زندگی بڑی دشوار ہوگئی ہے۔

دوسری اہم بات یہ ہے کہ ہندوستان کے موجودہ حالات میں ہندو مسلم فسادات کی کثرت اور ان فسادات کا اتفاقاً پیش نہ آنا، بلکہ بعض جماعتوں اور تحریکوں کی طرف سے مسلمانوں کی جان مال اور املاک کی ہلاکت و بربادی کی منصوبہ بند کوشش سے بھی سوال پیدا ہوتا ہے کہ بحالت موجودہ ہندوستانی مسلمانوں کے لئے کیا انشورنس کی گنجائش نکل سکتی ہے؟

اس سلسلہ میں علماء کی ایک جماعت تو جواز کا فتوی دے چکی ہے، نیز ''مجلس تحقیقات شرعیہ ندوۃ العلماء لکھنؤ'' نے انشورنس کے مسئلہ پر علماء کرام کے ان جوابات کی روشنی میں غور کیا جو مجلس کے سوالنامہ کے پیش نظر ان حضرات نے تحریر فرمائے تھے اور غور وخوض کے بعد جو فیصلہ کیا ہے یقیناوہ بڑا متوازن، بصیرت افروز اور حقیقت پسندانہ ہے، اسے ہم من وعن نقل کرتے ہیں:

''انشورنس کا مسئلہ شریعت کے شعبہ معاملات سے تعلق رکھتا ہے، معاملات میں ہمیشہ دو فریق ہوتے ہیں، اس لئے اس کی دو صورتیں ہوسکتی ہیں:

اول: دونوں فریق مسلمان ہوں، اس صورت میں معاملات کی جو شکلیں شریعت اسلامیہ نے مقرر کی ہیں، ان کے علاوہ کسی شکل کا اختیار کرنا کسی حال میں جائز نہیں۔

دوم: ایک فریق مسلمان ہو دوسرا غیر مسلم ہو، صورت دوم کی دو شکلیں نکلتی ہیں:

الف۔ معاملہ کی شکل مقرر کرنا مسلمان کے اختیار میں ہو اس کا حکم بھی وہی ہے جو صورت اولی کا ہے۔ ب۔ معاملہ کی شکل مقرر کرنا اس کے (مسلمان کے) اختیار میں نہ ہو۔

صورت ثانیہ کی شکل (ب) میں بوقت ضرورت اسلام کے بعض جلیل القدر ائمہ وفقہاء کے قول کی بنا پر شرعاً اس کی گنجائش نکلتی ہے کہ مسلمان کچھ قیود وشرائط کے ساتھ اس نوع کے معاملات میں حصہ لے سکے، انشورنس کا مسئلہ بھی مجلس کے نزدیک اسی شکل کے تحت داخل ہے۔

مجلس یہ رائے رکھتی ہے کہ اگرچہ انشورنس کی سب شکلوں کے لئے ''ربوا وقمار'' (سود اور جوا) لازم اور ایک کلمہ گو کے لئے ہر حال میں اصول پر قائم رہنے کی کوشش کرنا ہی واجب ہے، لیکن جان ومال کے تحفظ وبقاء کا جو مقام شریعت اسلامیہ میں ہے مجلس اسے بھی وزن دیتی ہے، نیز مجلس اس صورت حال سے بھی صرف نظر نہیں کرسکتی کہ موجودہ دور میں نہ صرف ملکی، بلکہ بین الاقوامی ریاستوں سے انشورنس انسانی زندگی میں اس طرح دخیل ہوگیا ہے کہ اس کے بغیر اجتماعی اور کاروباری زندگی میں طرح طرح کی دشواریاں پیش آتی ہیں اور جان ومال کے تحفظ کے لئے بھی بعض حالات میں اس سے مفر ممکن نہیں ہوتا، اس لئے ضرورت شدیدہ کے پیش نظر اگر کوئی شخص اپنی زندگی یا اپنے مال یا جائیداد کا بیمہ کرائے تو مذکورہ بالا ائمہ کرام (ائمہ کرام سے کیا مراد ہے؟ اس کا پتہ چلانے کے لئے یہاں مطبوعہ تجویز کے تمہیدی حصہ سے کچھ جملوں کو نقل کیا جارہا ہے: ''جن مقامات پر اقتدار اعلی مسلمانوں کو حاصل نہ ہو اور انہیں اس کا اختیار نہ ہو کہ وہ معاملات کی شکلیں شرعی اصول واحکام کے ماتحت مقرر کرسکیں اور معاملات غیر مسلمین کے ساتھ کرنے پڑیں...... تو...... بعض دوسرے ائمہ فقہ کی رائے یہ ہے کہ اسلامی احکام متعلقہ معاملات...... بعض صورتوں میں اس کی گنجائش کہ مسلمان صرف، غیر مسلمین کے ساتھ بعض معاملات میں ان کی مروجہ غیر اسلامی شکلیں اختیار کرسکیں'') کے قول کی بنا پر شرعاً اس کی گنجائش ہے۔

تنبیہ: اوپر کی عبارت میں لفظ ''ضرورت شدیدہ'' سے مراد یہ ہے کہ جان یا اہل وعیال یا مال کے ناقابل برداشت نقصان کا اندیشہ قوی ہو۔

''ضرورت شدیدہ'' موجود ہونے یا نہ ہونے کا فیصلہ مجلس کے نزدیک مبتلی بہ (جو شدید دشواریوں میں مبتلا ہوکر بیمہ کرانا چاہتا ہے) کی رائے پر منحصر ہے، جو خود کو عند اللہ جواب دہ سمجھ کر علماء کے مشورہ سے قائم کرے'' (بینک انشورنس اور سرکاری قرضے ر ۱۰۴-۱۰۶)۔

نوٹ: گنجائش کا مطلب یہ ہے کہ اگر شدید حالات میں اس پر عمل کرایا تو آخرت میں محاسبہ تو اس عمل پر بھی ہوگا اور حسب مجبوری واضطرار مواخذہ ومعاقبہ بھی ہوگا، مگر خدا تعالی کی رحیم وکریم ذات سے معافی تلافی کی امید ہے کہ معاف ہوکر عذاب سے بچ جائے۔

نیز ایسے شخص پر لازم ہے کہ ان توسعات پر عمل کرنے کے بعد مستقل توبہ واستغفار کرتا رہے اور دل سے خدا سے دعا کرتا رہے، اور یہ کہتا رہے کہ اے اللہ! آپ خوب جانتے ہیں، ہم اس عمل سے راضی نہیں ہیں صرف بوجہ مجبوری ومعذوری ایسا کرتے ہیں آپ قادر مطلق ہیں ہمارے یہ حالات بدل دیجئے اور دل میں یہ نیت بھی برابر رکھے کہ اگر واقعی جب یہ حالات بدل جائیں گے تو میں اس کے قریب بھی نہیں جاؤں گا۔

☆☆☆

تعاونی بیمہ کی شرعی بنیادیں

مولانا ولی اللہ مجید قاسمی [1]

باہمی تعاون، خیر خواہی، ہمدردی اور بھائی چارگی اسلام کے خمیر میں شامل ہے، اللہ تبارک وتعالی کا ارشاد ہے:

وتعاونوا علی البر والتقوی ولا تعاونوا علی الإثم والعدوان واتقوا اللہ إن اللہ شدید العقاب (سورہ مائدہ: ۲)۔ (نیکی اور پرہیزگاری کے کاموں میں ایک دوسرے کی مدد کرتے رہو، اور گناہ اور زیادتی میں کسی کے ساتھ تعاون مت کرو، اللہ سے ڈرتے رہو، بیشک اللہ سخت سزا دینے والا ہے)۔

اس آیت میں بر (نیکی) میں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرنے کا حکم دیا گیا ہے، اس لفظ کے مفہوم میں وہ تمام اچھائیاں اور نیکیاں شامل ہیں جو اللہ سے نزدیکی کا ذریعہ ہیں، خواہ ان کا تعلق عقیدہ وایمان سے ہو یا آداب واخلاق سے، یا عبادت وبندگی سے (دیکھئے: سورہ بقرہ: ۱۷۷)۔

نیز ارشاد ربانی ہے: {إنما المؤمنون إخوة} (سورہ حجرات: ۱۰) (مومن آپس میں بھائی بھائی ہیں)۔

اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''الدین النصیحة، قلنا لمن؟ قال للہ ولکتابه ولرسوله ولأئمة المسلمین وعامتهم'' (صحیح مسلم مع المنہاج، کتاب الایمان ۱۳۰، بیت الافکار الدولیہ)۔

(دین خیر خواہی کا نام ہے، صحابہ کرام نے دریافت کیا کہ کس کے ساتھ؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ، اس کی کتاب، اس کے رسول، مسلم حکمراں اور عام مسلمانوں کے ساتھ)۔

نیز آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''المؤمن للمؤمن کالبنیان یشد بعضه بعضاً وشبك بین أصابعه'' (صحیح بخاری، کتاب المظالم ۲۴۸۴، ط: دار السلام ریاض)۔ (ایک مومن دوسرے مومن کے لئے دیوار کی طرح ہے، جس کی اینٹ آپس میں ایک دوسرے سے بندھی ہوتی ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کیفیت کو بیان کرنے کے لئے اپنے ایک ہاتھ کی انگلیوں کو دوسرے میں پیوست کردیا)۔

ایک دوسری حدیث میں ہے: ''المسلم أخو المسلم لا یظلمه ولا یسلمه ومن کان فی حاجة أخیه کان اللہ فی حاجته، ومن فرج عن مسلم کربة فرج اللہ عنه کربة من کربات یوم القیامة'' (حوالہ مذکور)۔ (ایک مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے، نہ وہ اس پر ظلم کرتا ہے اور نہ اسے بے یار ومددگار چھوڑتا ہے، جو کوئی اپنے بھائی کی ضرورت میں لگا ہو اللہ اس کی ضرورت پوری کردیتے ہیں اور جو کوئی کسی مسلمان کو رنج والم سے نجات دلاتا ہے اللہ قیامت کے دن کے رنج والم سے اسے نجات دیں گے)۔

لوگوں کی حاجت روائی، اور ضرورت مندوں کی ضرورت کی تکمیل کے لئے صدقہ اور زکاۃ کا نظام قائم کیا گیا، اور اسے اسلام کا ایک رکن قرار دیا گیا، ناداروں اور بے کسوں پر خرچ کرنے کا ایک مسلمان کو پابند بنایا گیا، حضرت عبداللہ بن عمر سے روایت ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''وأیما أهل عرصة أصبح فیهم امرء جائع فقد برئت منه ذمه اللہ'' (مسند احمد بن حنبل ۲،۲۳) (جس آبادی میں رات بھر کوئی شخص بھوکا رہ جائے، تو وہ اللہ کی ذمہ داری سے بری ہے)۔

لہذا تعاون، ہمدردی اور امداد باہمی پر مشتمل بیمہ اسلام کا مطلوب اور مقصود ہے، بیمہ کرانے کی خواہش میں تین چیزیں بنیادی حیثیت رکھتی ہیں، سکون واطمینان کے ساتھ زندگی گذارنا، خطرات کو تقسیم کرنا، اور پیش آنے والے حادثات سے نمٹنے کی کوشش کرنا، ان میں سے کوئی بھی ایسی چیز نہیں ہے جو اسلام کے کسی عقیدہ کے خلاف ہو، دنیا میں امن وشانتی کے ساتھ رہنے کی خواہش ایک فطری چیز ہے، اللہ تبارک وتعالی نے خوف سے مامون معاشرہ کو اپنے احسانات میں سے

[1] استاذ جامعۃ الفلاح، بلریا گنج، اعظم گڈھ۔

شمار کیا ہے، {وآمنهم من خوف} (سورہ القریش:۴) اور حضرت ابراہیم علیہ السلام نے تعمیر کعبہ کے وقت جو دعا کی تھی اس میں ایک دعا یہ بھی تھی کہ اے رب اس شہر کو سکون واطمینان کا گہوارہ بنادے، {وإذ قال إبراهيم رب اجعل هذا البلد آمنا} (سورہ البقرہ:۱۲۶)۔

خطرات کو تقسیم کر لینا، اور پیش آمدہ مصیبت سے مل جل کر نجات پانے کی کوشش کرنا بھی ایک قابل تعریف عمل ہے، اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اشعری قبیلہ کے اس طرز عمل کی تعریف کی ہے کہ جب کبھی ان میں سے کچھ لوگوں کے یہاں کھانے، پینے کی چیزیں ختم ہونے لگتیں تو سب لوگ اپنے اپنے پاس موجود غلے کو لاکر ایک جگہ جمع کر دیتے، اور پھر ہر ایک کو برابر برابر تقسیم کر کے دے دیتے (صحیح بخاری کتاب الشرکہ)۔

مستقبل کے خطرات سے نمٹنے کے لئے پیش بندی بھی غیر شرعی نہیں ہے، حضرت یوسف علیہ السلام کا طرز عمل خود قرآن میں بیان کیا گیا ہے کہ انہوں نے سات سالہ آنے والی قحط سالی سے بچنے کے لئے شادابی کے زمانے کے غلے کو محفوظ رکھا۔

اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''ان تدع ورثتك أغنياء خير من أن تدعهم عالة يتكففون الناس في أيديهم'' (صحيح بخاري كتاب الوصايا)۔ (اپنے وارثوں کو مالدار چھوڑ جاؤ یہ اس سے بہتر ہے کہ انہیں نادار چھوڑ کر مرو اور وہ لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلاتے پھیریں)۔

تعاونی بیمہ کی موجودہ شکل:

بعض خلیجی ممالک میں تعاونی بیمہ کی جو شکل رائج ہے اس کا طریقہ کار یہ ہوتا ہے کہ کچھ افراد مل کر کے ایک شیئر کمپنی قائم کرتے ہیں، اور جمع شدہ رقم کی سرمایہ کاری کرتے ہیں، پھر دوسرے لوگوں کو دعوت دی جاتی ہے کہ وہ بیمہ کے مقصد سے ایک متعین رقم قسط وار یا ایک مشت جمع کریں، اس شرط کے ساتھ کہ جس مقصد کے لئے انہوں نے بیمہ کرایا ہے، اس میں اگر ان کو کچھ نقصان ہو جائے تو اس کی تلافی کر دی جائے گی۔

بیمہ کی یہ رقم بطور ''تبرع'' جمع ہوتی ہے، اور نا قابل واپسی ہوتی ہے، اور کمپنی بطور وکیل، اجرت لے کر یا اس کے بغیر بیمہ سے متعلق کاموں کو انجام دیتی ہے، اور بیمہ کرانے والوں کی طرف سے جمع شدہ رقم کو بطور مضارب تجارت میں لگا دیتی ہے، اس طرح سے کمپنی میں دو طرح کے اکاؤنٹ ہوتے ہیں، ایک کمپنی کے مالک اور شیئر ہولڈروں کے، اور دوسرا تعاونی بیمہ کے شرکاء کے، یہ دونوں حساب بالکل الگ الگ رکھے جاتے ہیں۔

اس میں کمپنی کو دو طرح سے فائدے حاصل ہوتے ہیں: ۱۔ شرکت کے سرمایہ سے حاصل شدہ نفع۔ ۲۔ بیمہ کے سرمایہ سے حاصل شدہ نفع کا ایک حصہ۔

کمپنی کے ذاتی سرمایہ سے بیمہ کرانے والوں کا کوئی تعلق نہیں ہوتا ہے، البتہ اگر بیمہ فنڈ میں کسی وجہ سے رقم کم پڑ جائے تو کمپنی اسے ''قرض حسن'' دیتی ہے، کمپنی کا ذاتی خرچہ خود کمپنی برداشت کرتی ہے۔ بیمہ فنڈ میں جمع شدہ اصل سرمایہ سے تجارت وغیرہ کے ذریعہ حاصل شدہ رقم کا ایک حصہ کمپنی لے لیتی ہے یہ حصہ پہلے سے متعین ہوتا ہے، اور بقیہ حصہ بیمہ فنڈ میں جمع ہوتا ہے، جمع شدہ رقم اور اس کے نفع سے، بیمہ کرانے والوں میں سے کسی کو حادثہ پیش آجانے کی صورت میں مدد کی جاتی ہے۔ اور اس کے نقصان کی تلافی کی جاتی ہے، اور بیمہ پالیسی کی متعین مدت ختم ہو جانے کے بعد اصل اور نفع دونوں کو بیمہ کرانے والوں کے درمیان تقسیم کر دیا جاتا ہے۔

تعاونی اور تجارتی بیمہ میں جوہری فرق:

۱۔ تجارتی بیمہ میں کمپنی ایک فریق ہوتی ہے، اور کمپنی کے نام سے تمام معلومات طے کئے جاتے ہیں، اور بیمہ کے نام پر جمع شدہ پوری رقم کمپنی کی ملکیت ہوتی ہے، اور اس کے بدلے میں وہ بیمہ کرانے والے کو پہنچنے والے تمام نقصانات کی تلافی کی ذمہ داری لیتی ہے۔

اس کے برخلاف تعاونی بیمہ میں کمپنی بیمہ کرانے والوں کی وکیل ہوتی ہے، نہ تو وہ اپنے نام سے معاملہ طے کرتی ہے اور نہ وہ جمع شدہ رقم کا کلی یا جزوی طور پر مالک ہوتی ہے، اور نہ ہی وہ بیمہ کرانے والے کو پہنچنے والے نقصانات کی تلافی کی ذمہ داری لیتی ہے، اگر بیمہ فنڈ میں اس کی گنجائش ہے تو دیتی ہے، ورنہ بیمہ کرانے والوں کو مزید رقم جمع کرنے کے لئے کہتی ہے، یا پھر اپنی طرف سے قرض حسن دیتی ہے۔

۲۔ تعاونی بیمہ میں کمپنی، بیمہ دینے والی نہیں ہوتی ہے، بلکہ بیمہ فنڈ کے شرکاء آپس میں ایک دوسرے کے لئے بیمہ دینے اور لینے والے ہوتے ہیں، اور کمپنی ان کی طرف سے بطور وکیل رقم کو جمع کرتی ہے اور بیمہ سے متعلق کام انجام دیتی ہے۔

جبکہ تجارتی بیمہ میں کمپنی خود بیمہ دیتی ہے، اور ایک فریق ہوتی ہے، اور رقم جمع کرنے والے دوسرے فریق اور بیمہ لینے والے ہوتے ہیں۔

۳۔ تعاونی بیمہ میں کل تین طرح کے معاملات طے پاتے ہیں:

(۱) کمپنی اور بیمہ کرانے والوں کے درمیان وکالت کا معاملہ۔

(۲) جمع شدہ رقم کو بطور مضارب تجارت وغیرہ میں لگانے کا معاملہ۔

(۳) بیمہ کرانے والوں کے درمیان باہم ہبہ بالعوض یا نہد کا معاملہ۔

اس کے بالمقابل تجارتی بیمہ میں صرف ایک معاملہ ہوتا ہے جو بیمہ کمپنی اور بیمہ ہولڈر کے درمیان طے پاتا ہے۔

۴۔ تجارتی بیمہ میں کمپنی جمع شدہ رقم کا مالک ہوتی ہے اور بیمہ ہولڈر کو اس رقم اور اس کے نفع ونقصان سے کوئی سروکار نہیں ہوتا ہے۔

اس کے برخلاف تعاونی بیمہ میں کمپنی اس رقم کا مالک نہیں ہوتی ہے، بلکہ وہ بیمہ فنڈ یا شرکاء کی ملکیت ہوتی ہے اور کمپنی کو حق مضاربت دینے کے بعد تمام منافع بیمہ فنڈ میں جمع ہو جاتے ہیں۔

۵۔ تجارتی بیمہ کا مقصد اپنے لئے نفع کمانا ہوتا ہے، اس کے لئے وہ ایسے طریقے اختیار کرتی ہے جس میں فائدہ کا موقع زیادہ ہو اور نقصان کم سے کم ہو، اور اگر کوئی حادثہ پیش آجائے تو مختلف حیلوں اور بہانوں سے رقم دینے سے فرار اختیار کرنے کی کوشش کرتی ہے۔

جبکہ تعاونی بیمہ کا مقصد تعاون اور امداد باہمی ہے۔

۶۔ تعاونی بیمہ کرانے والے کی کوشش ہوتی ہے کہ حادثہ پیش نہ آئے، کیونکہ اس صورت میں اس کے نقصان کی تلافی تو ہو جائے گی لیکن جمع شدہ رقم اور اس سے ملنے والے نفع سے وہ محروم ہو جائے گا، یا اس میں کمی واقع ہو جائے گی۔

اس کے بالمقابل تجارتی بیمہ میں بیمہ ہولڈر کو اس کی کوئی فکر نہیں ہوتی ہے، کیونکہ اسے جمع شدہ رقم اور اس کے نفع سے کچھ لینا دینا نہیں ہے، بلکہ کچھ لوگ تو زیادہ مال حاصل کرنے کے مقصد سے جان بوجھ کر خود کو یا اپنی دکان وغیرہ کو حادثات کے حوالے کر دیتے ہیں۔

۷۔ تعاونی بیمہ میں کمپنی اس بات کی پابند ہوتی ہے کہ وہ اپنی تمام سرگرمیوں میں اسلامی احکامات کا لحاظ رکھے گی، جبکہ تجارتی بیمہ میں اس طرح کی کوئی بندش نہیں ہوتی ہے۔

تعاونی بیمہ کے اس طریقے پر کچھ اعتراضات وارد ہوئے ہیں، اس لئے "تبرع" کے بجائے بہتر شکل وقف کی ہے جس کا طریقہ یہ ہوگا کہ شیئر ہولڈر یا کمپنی کے چلانے والے اموال غیر منقولہ یا نقود کو شرعی بنیادوں پر وقف کریں اور پھر بیمہ کرانے کے لئے لوگوں کو ممبر بنائیں، ہر ممبر ایک مخصوص مقدار میں وقف فنڈ کو عطیہ دینے کا پابند ہوگا، یہ عطیہ وقف نہیں ہوگا، بلکہ وقف کے منافع میں شمار ہوگا، جیسا کہ مسجد کی عمارت وقف ہوتی ہے اور اس کے لئے جو عطیہ وصول ہوتے ہیں وہ اس کے منافع ہوتے ہیں، اور مسجد کے مصالح پر خرچ کئے جاتے ہیں، یہ عطیات چونکہ شرکاء کی ملکیت سے خارج ہوتے ہیں، اس لئے نہ ان پر زکاۃ واجب ہوتی ہے، اور نہ وراثت کے احکام جاری ہوتے ہیں۔

اس وقف فنڈ کا ممبر حادثہ پیش آجانے کی صورت میں اس بنیاد پر تلافی کا دعوی کرے گا کہ وہ اس وقف فنڈ کے مقاصد کے مطابق اس کا مستحق ہے، اگر کمپنی یا وقف فنڈ کا متولی اس نقصان کی تلافی سے انکار کردے تو وہ عدالت سے اس بنیاد پر رجوع کر سکتا ہے کہ وقف فنڈ کا اصل مالک اللہ ہے اور اس کے متولی اس کو اس کے مقاصد کے مطابق چلانے کے ذمہ دار ہیں، لیکن وہ اس میں کوتاہی کر رہے ہیں، لہذا عدالت ان سے باز پرس کرے۔

وقف فنڈ کے منافع کا سالانہ حساب کیا جائے اور اصل وقف سے جو رقم زائد ہوگی وہ ممبران میں تقسیم کردی جائے گی۔

کمپنی چلانے والے یا وقف فنڈ کے متولیان جمع شدہ رقم سے سرمایہ کاری کریں گے۔ اور بطور مضارب یا اجیر اپنا متعین حصہ یا اجرت لیں گے، اسی طرح سے بیمہ سے متعلق کاموں کو انجام دینے کے لئے وہ حق تولیت یا وکالت کے طور پر وقف فنڈ سے اپنی اجرت وصول کریں گے، (دیکھئے: جواہر الفقہ ۲ / ۱۸۸، اسلام اور جدید معاشی مسائل ۶ / ۳۱ ۳، فتاوی عثمانی ۳ / ۳۱۴)۔

☆☆☆

قرآن وحدیث میں تکافل کا تصور

مولانا محمد مغفور باندوی[1]

یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ اسلام نے ہمیشہ اخوت وہمدردی کا درس دیا ہے، ایک دوسرے کے ساتھ مساوات اور ایک دوسرے کے کام آنے اور وقت پڑنے پر دوسرے انسان کی فریادرسی ومزاج پرسی کی تلقین فرمائی ہے۔ اسکی بہت سی مثالیں احادیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں اور احکام شرع میں موجود ہیں۔

مثلا دیت کے احکام میں دیت کی ادائیگی میں عاقلہ کو شریک کرنا۔ اسی طرح زکاۃ کی ادائیگی مالداروں پر فقراء کے لئے امداد باہمی کی کھلی ہوئی دلیل ہے۔

اسی طرح کفالت کے مسائل بھی امداد باہمی پر مبنی ہیں۔ نیز اللہ رب العزت کا ارشاد: {تعاونوا علی البر والتقوی} (المائدہ ۲) اور {إنما المومنون إخوۃ} (الحجرات ۱۰) جیسی آیات امداد باہمی کا درس دیتی ہیں۔

عہد رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں امداد باہمی کے تعلق سے قبیلہ اشعر کا واقعہ ملتا ہے جو اس باب میں بہت ہی واضح اور صریح ہے، بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ یہ واقعہ تکافل کے جواز اور اسکے مستحسن ہونے کی دلیل ہے تو بے وجہ نہ ہوگا۔ ''إن الأشعریین إذا أرملوا فی الغزو قل طعام عیالهم بالمدینة، جمعوا ما کان عندهم فی ثوب واحد ثم اقتسموه بینهم فی إناء واحد بالسویة فهم مني وأنا منهم (رواہ البخاری کتاب الشرکة رقم ۲۴۸۶)۔

وضاحت: قبیلہ اشعر کا یہ عمل جو خالصا امداد باہمی پر مبنی تھا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اتنا پسند آیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فخریہ فرمایا کہ اشعر مجھ سے ہیں اور میں ان سے ہوں اور یہ اس کے جائز اور مستحسن ہونے کی دلیل ہے۔

ممکنہ خطرہ کی پیش بندی کے تعلق سے ایک غلط فہمی اور اس کا ازالہ:

بعض حضرات کو یہ غلط فہمی دامن گیر ہے کہ انشورنس میں تمام تر خرابیوں کے ساتھ ساتھ اس میں سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ یہ توکل علی اللہ کے خلاف ہے، لہٰذا اگر کسی طرح انشورنس میں پائی جانے والی خرابیوں کو دور کر بھی دیا جائے تب بھی انشورنس جائز نہ ہوگا۔ نیز ممکنہ خطرہ اور حادثہ، خواہ جانی ہو یا مالی اسکی پیش بندی توکل علی اللہ کے خلاف ہوگی۔

اس غلط فہمی کا ازالہ اس بات سے ہوتا ہے کہ ان حضرات سے توکل کو سمجھنے میں غلطی ہوئی ہے، انہوں نے یہ سمجھا کہ توکل ترک اسباب کا نام ہے، جبکہ حقیقت میں ایسا نہیں ہے، یہ انکی کم علمی کی دلیل ہے، جبکہ حقیقت یہ ہے کہ اسباب کے اختیار کرنے اور نگاہ مسبب پر رکھنے کا نام توکل ہے، ترک اسباب کا نام تو توکل کبھی بھی نہیں ہوسکتا، کیونکہ یہ جگہ (دنیا) پوری کی پوری دار الاسباب ہے اور اس بات کی شہادت رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور اس دور میں پیش آمدہ واقعات سے ہوتی ہے۔

۱۔ ایک اعرابی صحابی کا واقعہ بہت مشہور ہے کہ وہ اونٹنی پر سوار ہو کر اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور اپنی سواری کے تعلق سے سوال کیا کہ اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! میں اپنی سواری کو کھلا چھوڑ دوں یا اس کو کھونٹے سے باندھ دو (توکل کس میں ہے) اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا کہ پہلے اس کو کھونٹے سے باندھ دو اور پھر اللہ پر بھروسہ کرو۔ یعنی اسباب کو تو اختیار کرو، مگر بھروسہ سبب پر مت کرو، بلکہ اللہ (مسبب) پر کرو۔ ''اعقلها وتوکلها'' (رواہ الترمذی ابواب صفة القیامة رقم ۲۵۱۷)

۲۔ اسی طرح اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا متعدد صحابہ کو علاج کی تلقین فرمانا، اس کا حکم دینا بھی اسباب کے اختیار کرنے کی اہمیت کو ظاہر کرتا ہے (ملاحظہ ہو: ترمذی ابواب الطب باب ماجاء فی الدواء رقم ۲۰۳۸)۔

---

[1] استاذ جامعہ عربیہ بیت العلوم جعفر آباد، دہلی۔

۳۔ نیز حضرت سعدؓ ابن خولہ کا واقعہ تو مستقبل میں پیش آمدہ ضرورت کا پہلے سے انتظام کرنے میں اور بھی زیادہ واضح ہے کہ حضرت سعد ابن خولہؓ ایک مرتبہ بہت زیادہ بیمار ہوئے تو اللہ کے رسول ﷺ انکی عیادت کو تشریف لے گئے، حضرت سعدؓ نے اللہ کے رسول ﷺ سے فرمایا کہ میرے کوئی اولاد نہیں ہے سوائے ایک بیٹی کے اور میں چاہتا ہوں کہ اپنا سارا مال اللہ کے راستہ میں صدقہ کردوں، اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا کہ تہائی مال صدقہ کردو اور بقیہ اولاد کے لئے چھوڑ دو، نیز اللہ کے رسول ﷺ نے ایک عمومی حکم کے طور پر فرمایا کہ تمہارا اپنی اولاد کے لئے مال چھوڑ جانا بہتر ہے اس بات سے کہ تم ان کو تنگ دست اور فقیر چھوڑ کر جاؤ اور وہ تمہارے بعد لوگوں کے سامنے دست سوال پھیلائیں (ملاحظہ ہو: بخاری کتاب الجنائز باب رثاء النبی ﷺ سعد ابن خولہ رقم ۱۲۹۵)۔

خلاصہ: ان تمام واقعات اور احادیث سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ مستقبل کی ضرورت کی وجہ سے مال کا جمع کرنا یا مستقبل میں پیش آنے والی پریشانی کے وقت کے لئے کوئی تدبیر کرنا توکل علی اللہ کے منافی ہرگز نہیں ہوسکتا۔

متوقع اور ممکنہ خطرہ کی پیش بندی:

ماقبل میں یہ بات واضح ہوگئی کہ مستقبل میں پیش آمدہ خطرات وحوادث کی پیش بندی نہ تو تعلیمات اسلامی کے منافی ہے اور نہ ہی توکل علی اللہ کے مغایر۔ یہاں اس بات کے دوبارہ ذکر کا مقصد قرآن میں مذکور ایک خاص واقعہ سے استدلال ہے۔ قرآن کریم نے حضرت یوسف علیہ السلام کا واقعہ بڑے ہی تفصیلی اور دلچسپ انداز میں بیان کیا ہے کہ اتنی تفصیل کے ساتھ موسیٰ علیہ السلام کے واقعہ کے ماسواء اور کسی نبی کا تذکرہ قرآن میں نہیں ہے، اور دوسری خوبی اس واقعہ کی یہ ہے کہ قرآن نے اس واقعہ کو ''احسن القصص'' کہا اور کسی واقعہ کی یہ صفت بیان نہیں کی ہے۔ اس پورے واقعہ میں ایک خاص واقعہ اس وقت کے عزیز مصر کے خواب اور اسکی تعبیر سے متعلق ہے، جس سے ہر اہل علم واقف ہے۔ محل استشہاد حضرت یوسف کا اس قحط کے زمانہ میں بھوک مری سے بچنے کی تدبیر بتلانا جو اس زمانہ کے اسباب ووسائل کے اعتبار سے بہترین کہی جاسکتی ہے اور یہی مقصد تو تکافل میں مقصود ہے کہ اس میں بھی پیش آمدہ خطرات وحوادث میں بچنے کی تدبیر کی جاتی ہے، نہ کہ اس مصیبت سے ٹکر لینے کی کوشش کی جاتی ہے، جیسا کہ بعض لوگوں نے سمجھ لیا ہے۔ آجکل اس کو risk management کہتے ہیں۔

مروجہ انشورنس اور اسلامی انشورنس (تکافل) میں فرق:

۱۔ مروجہ انشورنس اور تکافل میں بنیادی فرق ان دونوں کے ذاتی مقصد کا ہے۔ مروجہ انشورنس کا بنیادی مقصد تجارت اور نفع کمانا ہے، جبکہ اسلامی انشورنس (تکافل) کا بنیادی مقصد امداد باہمی اور مصیبت اور خطرات میں گھرے ہوئے لوگوں کی مدد کرنا ہے۔

۲۔ مروجہ انشورنس میں رباء، قمار، غرر وغیرہ کا عنصر غالب ہے، جبکہ تکافل خالص شریعت کے اصولوں پر قائم ایک امداد باہمی کا نام ہے جس میں حتی المقدور مذکورہ خرابیوں سے بچنے کی کوشش کی گئی ہے۔

۳۔ اسلامی انشورنس میں شرکاء کمپنی (share holders) (مالکان) اور مساہمین (policy holders) کا تعلق امداد باہمی اور تعاون باہمی کا ہوتا ہے۔ جبکہ مروجہ انشورنس میں اس قسم کا کوئی تعلق مالکان کمپنی اور پالیسی ہولڈرس کے درمیان نہیں ہوتا۔ بلکہ مروجہ انشورنس میں پالیسی ہولڈر اقساط ادا کر کے مطمئن اور بری ہوجاتا ہے اسے کمپنی کے نفع اور نقصان سے کوئی مطلب نہیں ہوتا اور کمپنی ان اقساط کے عوض اسے تحفظ فراہم کرتی ہے۔

۴۔ تکافل میں بچی ہوئی رقم (سرپلس) کو مساہمین اور کمپنی کے درمیان تقسیم کردیا جاتا ہے۔ جبکہ مروجہ انشورنس میں سرپلس کو کمپنی کی ملکیت تصور کیا جاتا ہے اور اس میں پالیسی ہولڈرس کو کچھ بھی نہیں ملتا۔

۵۔ تکافل میں مساہمین کی جانب سے ادا کی گئی رقم فنڈ کی ملکیت ہوتی ہے، جبکہ مروجہ انشورنس میں قسطوں پر کمپنی کی ملکیت ہوتی ہے۔

۶۔ تکافل میں فنڈ کی جمع شدہ رقم کو مضاربت کے طور پر سرمایہ کاری میں لگانے کے بعد حاصل شدہ منافع کو مضارب (کمپنی) کا حصہ نکالنے کے بعد دوبارہ فنڈ میں جمع کردیا جاتا ہے، جبکہ مروجہ انشورنس میں کمپنی اس مال کو تجارت میں لگانے کے بعد خود نفع کا استعمال کرتی ہے اور پالیسی ہولڈرس کو اس میں کچھ نہیں ملتا۔ مطلب صاف ہے سرمایہ پالیسی ہولڈرس کا اور نفع پورا کا پورا کمپنی کا۔

۷۔ تکافل میں کمپنی کی حیثیت مضارب یا وکیل اور یا تو متولی کی ہوتی ہے۔ جبکہ مروجہ انشورنس میں کمپنی کی حیثیت اصیل کی ہوتی ہے۔

۸۔ تکافل میں مشارکین (مالکان) اور مساہمین (پالیسی ہولڈرس) میں سے ہر ایک اس بات کی فکر کرتا ہے کہ حوادث کم سے کم ہوں، تاکہ کمپنی کا سرپلس اور

سرمایہ زیادہ سے زیادہ ہو، جبکہ مروجہ انشورنس میں اس بات کی کوئی فکر نہیں ہوتی نہ تو کمپنی اس بات کا خیال کرتی ہے اور نہ ہی پالسی ہولڈرس۔ بلکہ معاملہ بالکل برعکس ہوتا۔ کمپنی زیادہ سے زیادہ نفع کمانا چاہتی ہے اور پالسی ہولڈرس اقساط ادا کرکے بری ہونا چاہتے ہیں۔ اور اس کے نتیجہ میں ایک غیر ذمہ دارانہ رویہ پیدا ہوتا ہے جو کمپنی اور پالسی ہولڈرس دونوں کے لئے نقصان دہ ہوتا ہے۔

۹۔ تکافل کمپنی میں ایک شریعہ بورڈ ہوتا ہے جو کمپنی کے شرعی امور کا نگراں و ذمہ دار ہوتا ہے، خاص طور پر فنڈ کی رقم کی سرمایہ کاری میں کہ اس کا استعمال کسی حرام اور ناجائز جگہ نہ ہوسکے اور اس کی تفتیش اور جانچ بھی کرتا ہے۔ جیسا کہ پاکستان میں اسلامی بینکنگ رولس ۲۰۰۵ء کے دستور میں موجود ہے۔ جس کی رو سے ہر تکافل کمپنی کا ایک شریعہ بورڈ ہونا ضروری ہے جس میں کم از کم تین ممبرس کا ہونا ضروری ہے۔ جبکہ مروجہ انشورنس میں اس قسم کا کوئی بورڈ نہیں ہوتا ہے اور نہ ہی انشورنس کمپنی اس بات کا خیال کرتی ہے کہ پالسی ہولڈرس کی رقم کی سرمایہ کاری کسی حلال کاروبار میں یا حلال کاروبار کرنے والی کسی کمپنی میں ہو۔

۱۰۔ تکافل ایک قسم کا عقد تبرع ہے اور مروجہ انشورنس ایک عقد معاوضہ ہے اور قواعد فقہ کی رو سے تبرعات میں بعض مواقع پر غرر وغیرہ کی گنجائش ہوتی ہے، جبکہ عقد معاوضہ میں غرر کی بالکل بھی گنجائش نہیں ہوتی، خواہ وہ غرر قلیل ہو یا کثیر اس سلسلہ میں علمائے اصولیین کا وضع کردہ ایک قاعدہ: ''یغتفر فی التبرعات مالا یغتفر فی المعاوضات'' موجود ہے۔

تمہید:...... تکافل کو انجام دینے والے افراد دو طرح کے ہوتے ہیں (۱) مشارکین (share holders) (۲) مساہمین (Policy holder)۔ شیئر ہولڈر سرمایہ لگا کر تکافل کمپنی کو قائم کرتے ہیں، تاکہ مستقبل میں پیش آمدہ خطرات میں لوگوں کی امداد کرسکیں اور مساہمین مستقبل میں پیش آنے والے خطرات سے محفوظ رہ سکیں اور مصیبت میں ایک دوسرے کی امداد باہمی کرسکیں، اس لئے وہ تکافل کمپنی کی پالسی کی خریداری کے ذریعہ فنڈ میں جمع کرتے ہیں۔

تکافل کی تعریف: تکافل ایک ایسا عقد تبرع ہے جو مستقبل میں پیش آنے والے خطرات وحوادثات میں مساہمین کی امداد باہمی کرتا ہے۔

تکافل کی قسمیں:...... اسلامی انشورنس (تکافل) کی دو قسمیں ہیں۔ (۱) جنرل تکافل (۲) فیملی تکافل۔

۱۔ **جنرل تکافل:** اسکے تحت تمام اثاثہ جات مثلاً گاڑی، دکان، مکان، کارخانہ، جہاز، کمپنیاں، شاپنگ سینٹر وغیرہ کو ممکنہ خطرہ کے پیش نظر تحفظ فراہم کیا جاتا ہے۔ ان تمام اثاثہ جات کے مالکان کو ممکنہ خطرہ کے پیش نظر تکافل کی رکنیت فراہم کی جاتی ہے کہ اگر اثاثہ جات کو نقصان پہنچتا ہے تو تکافل کمپنی اس نقصان کی بھرپائی کرے گی اور کلیم کی شکل میں امداد فراہم کرے گی۔

۲۔ **فیملی تکافل:** اس دوسری قسم کا تعلق انسانی زندگی سے ہے، اس میں انسان کو بالذات پیش آنے والے خطرات سے تحفظ فراہم کیا جاتا ہے۔ اس قسم میں تحفظ کی فراہمی کے ساتھ ساتھ حلال طریقہ پر سرمایہ کاری کے مواقع بھی فراہم کئے جاتے ہیں۔ اس کا طریقہ کار یہ ہوتا ہے کہ مساہم رقم کا ایک مخصوص حصہ ماہانہ یا سالانہ قسط کے طور پر جمع کرتا ہے، تکافل کمپنی اس رقم کا کچھ حصہ تو فنڈ میں جمع کردیتی ہے اور بقیہ حصہ کو حلال اور جائز سرمایہ کاری میں لگا دیتی ہے۔ گویا تکافل کی رقم دو حصوں میں تقسیم ہوجاتی ہے۔ ایک حصہ فنڈ میں جمع ہوجاتا ہے، اور دوسرا حصہ سرمایہ کاری میں لگا دیا جاتا ہے۔

تکافل کا طریقہ کار: تکافل کے دو طریقہ کار آجکل بہت رائج ہیں (۱) مضاربہ ماڈل (۲) وکالہ ماڈل۔

مضاربہ ماڈل:...... یہ ایک ایسا ماڈل اور طریقہ ہے جو عقد مضاربہ کو سامنے رکھ کر تیار کیا گیا ہے، بلکہ اگر یہ کہا جائے تو زیادہ بہتر ہوگا کہ مضاربہ ماڈل عقد مضاربہ کی نئی شکل ہے کہ جس طرح عقد مضاربہ میں رب المال صرف مال دیتا ہے اور کوئی عمل نہیں کرتا اور مضارب صرف عمل کرتا ہے اور کوئی مال نہیں لگاتا۔ یعنی ایک آدمی کا عمل ہوتا ہے اور دوسرے آدمی کا مال ہوتا ہے۔ مال لگانے والے کو رب المال اور عمل والے کو مضارب اور اس مال کو مال مضاربت کہتے ہیں، بعینہ یہی عمل مضاربہ ماڈل میں بھی ہوتا ہے اور اصطلاحات بھی یہی استعمال کی جاتی ہیں۔ مثلاً پالسی ہولڈر مال لگاتا ہے اور کمپنی عمل کرتی ہے، چنانچہ کمپنی کی حیثیت مضارب کی ہوتی ہے اور پالیسی ہولڈر کی حیثیت رب المال کی ہوتی ہے اور اس فنڈ کا وہ حصہ جو سرمایہ کاری میں لگایا جاتا ہے اس کی حیثیت مال مضاربت کی ہوتی ہے، لہذا اس ماڈل میں ان تمام شرطوں کی رعایت ضروری ہے جن کا عقد مضاربہ میں پایا جانا ضروری ہے۔ جس کی تفصیل کتب فقہ میں موجود ہے۔

وکالہ ماڈل:

اس ماڈل میں کمپنی کی حیثیت وکیل کی ہوتی ہے جس کو پالیسی ہولڈرس سرمایہ کاری کیلئے وکیل مقرر کرتے ہیں، اور چونکہ کمپنی میں اصل کام کرنے والا مینیجر ہوتا ہے، اس لئے وکالت کا تعلق براہ راست مینیجر سے ہوتا ہے۔ اس وکیل کی شرعی واخلاقی ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ مارکٹ کے اتار چڑھاؤ کو مدنظر رکھتے ہوئے مساہمین کی رقم کی سرمایہ کاری کرے اور حتی المقدوران کی رقم کو نقصان سے بچائے۔ تاکہ نفع زیادہ سے زیادہ ہو۔

ان دونوں ماڈلس میں بنیادی فرق یہ ہوتا ہے کہ مضاربہ ماڈل میں کمپنی حاصل شدہ منافع میں حصہ دار اور شریک ہوتی ہے۔ جبکہ وکالہ ماڈل میں کمپنی کو وکالہ فیس ملتی ہے اور نفع ونقصان میں اسکی کوئی حصہ داری نہیں ہوتی۔

ایک بات جو غور کرنے کی ہے وہ یہ ہے کہ کمپنی اپنے پالسی ہولڈرس کے سامنے دونوں ماڈل پیش کردیتی ہے اور اس کو یہ اختیار دیتی ہے کہ چاہے تو وہ وکالہ ماڈل کے ذریعہ اپنا تکافل کرائے اور چاہے تو مضاربہ ماڈل کو پسند کرلے۔

وقف ماڈل:

حالیہ دنوں ایک اور ماڈل بہت رائج ہوا ہے اور اس کا نام ماہرین نے وقف ماڈل رکھا ہے، حالانکہ اس طریقہ کار کو وقف سے بہت زیادہ مناسبت نہیں ہے، البتہ ایک حد تک مناسبت ہے۔ اس ماڈل کے مطابق کمپنی کے مالکان رقم کا ایک حصہ باقاعدہ طور پر وقف کردیتے ہیں جس سے ایک وقف پول بنایا جاتا ہے، جسے participant's takaful fund بھی کہتے ہیں، قائم کیا جاتا ہے، اس فنڈ سے شیئر ہولڈرس (مالکان) کا تعلق محض عقد تبرع کا ہوتا ہے، اور چونکہ اس فنڈ کی حیثیت جائیداد موقوفہ کی ہوتی ہے، اس لئے اس فنڈ میں مالکان کی ملکیت باقی نہیں رہتی۔ جیسا کہ جائیداد موقوفہ کے تعلق سے علامہ شامی رقم طراز ہیں:

''قوله والملك يزول أى ملك الواقف فيصير الوقف لازما للاتفاق على التلازم بين اللزوم والخروج عن ملكه'' (رد المحتار مطلب شرائط الواقف معتبرة اذا لم تخالف الشرع ۲۲۲/۴) اور: ''شرط الواقف كنص الشارع'' (غمز عيون الابصار ۲۲۸٫۲) جیسی عبارات سے ظاہر ہوتا ہے۔

پھر پالیسی ہولڈرس کو اقساط کے ذریعہ اس فنڈ کی رکنیت حاصل کرنی ہوتی ہے اور ایک خاص مقدار باقاعدہ طور پر بطور تبرع اس فنڈ کو دیتے ہیں۔ اور کسی شریک یا مساہم کے نقصان اٹھانے کی صورت میں اس فنڈ سے اس متاثر شخص کو فوائد مالی حاصل ہوتی ہیں۔ ایک خاص اور اہم بات یہ ہے کہ مساہمین کی جانب سے بطور تبرع حاصل شدہ رقم بذات خود وقف نہیں ہوتی، بلکہ وقف پول کی ملکیت سمجھی جاتی ہے۔

اس کے وقف ہونے کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ اس میں نہ تو میراث جاری ہوتی ہے اور نہ اس پر زکاۃ فرض ہوتی ہے۔ جیسا کہ شامی میں ہے:

''واستحسن قول مالك أنه حبس العين على ملك الواقف فلا يزول عنه ملكه. لكن لا يباع ولا يورث ولا يوهب'' (رد المحتار كتاب الوقف ۲۵۸٫۴)، البتہ اس فنڈ کو بڑھانے کی غرض سے شرعی طریقہ پر کاروبار میں لگادیا جاتا ہے اور اس سے حاصل ہونے والا نفع وقف پول کی ملکیت ہوتا ہے۔ اس میں مالکان کمپنی یا پالیسی ہولڈرس کو کچھ نہیں ملتا۔ ان کو صرف حادثہ یا نقصان پیش آنے کی صورت میں فوائد مالی حاصل ہوتے ہیں۔ اس ماڈل میں کمپنی کی حیثیت متولی کی ہوتی ہے اور یہ جائز ہے کہ واقف متولی کے حق کو اپنے لئے خاص کرلے، جیسا کہ اس کا مال موقوفہ سے فائدہ اٹھانا جائز ہے۔ صاحب ''ہدایہ'' علامہ مرغینانی تحریر فرماتے ہیں: ''وإذا جعل الواقف غلة الوقف لنفسه أو جعل الولاية إليه جاز'' (هدايه كتاب الوقف ۶۴۲٫۲)۔

تینوں ماڈلس میں کمپنی کو حاصل ہونے والے منافع کی حیثیت مختلف ہے، مضاربہ ماڈل میں بحیثیت مضارب کے اس کو نفع ملتا ہے، جبکہ وکالہ ماڈل میں کمپنی وکیل ہونے کی حیثیت سے وکالہ فیس وصول کرتی ہے اور وقف ماڈل میں کمپنی کے اخراجات متولی ہونے کی حیثیت سے پورے کئے جاتے ہیں۔

وقف ماڈل میں آمدنی کے ذرائع:

۱۔ مساہمین کے عطیات ۲۔ شرعی طرز پر فنڈ کی رقم کا انوسمنٹ اور اسکا نفع ۳۔ ری تکافل کی صورت میں بڑی کمپنیوں سے حاصل ہونے والی کلیم کی رقم ۴۔ کسی دوسرے کی جانب سے حاصل ہونے والے عطیات ۵۔ قرض حسنہ کے طور پر حاصل ہونے والی رقم۔

جس طرح وقف ماڈل کی آمدنی کے ذرائع مختلف ہیں اسیطرح اسکے اخراجات بھی مختلف ہیں۔

وقف ماڈل کے اخراجات:

۱۔ تکافل ممبرس کے کلیم کی بھرپائی ۲۔ ری تکافل کے اخراجات ۳۔ کمپنی میں کام کرنے والے افراد کی تنخواہ ۴۔ سرمایہ کاری میں نفع حاصل ہونے کی صورت میں بروکر کے حصہ کی ادائیگی ۵۔ قرض حسنہ کی واپسی۔

ری تکافل: ......جس طرح مروجہ انشورنس میں چھوٹی کمپنیاں کسی بڑی کمپنی سے اپنا "ری انشورنس" کرواتی ہیں، تاکہ اگر کوئی اجتماعی آفت سماوی یا فسادات کا سانحہ پیش آجائے تو وہ اپنے سے بڑی کمپنی سے اس کا کلیم حاصل کرلے اور اپنے کسٹمرس کے کلیم کی ادائیگی باآسانی کرسکے اس کو "ری انشورنس" کہتے ہیں re insurence یہی عمل تکافل کمپنی بھی کرتی ہے۔ وہ اپنے سے بڑی تکافل کمپنی سے اپنا تکافل کرواتی ہے اس کو re takaful کہتے ہیں۔

ہندوستان میں تکافل کی ضرورت:

اس عنوان پر تبصرہ سے قبل ضرورت ہے کہ اس ملک کے حالات پر نظر ڈالی جائے۔

ہمارا ملک ہندوستان مذہبی اعتبار سے ایک ایسا ملک ہے جہاں ہر مذہب وملت کے پیروکار بودوباش اختیار کئے ہوئے ہیں۔ اور اس ملک میں دو سب سے بڑی اکثریت والی قومیں ہندو اور مسلمان ہیں اور موجودہ حالات پہلے کے بنسبت زیادہ خراب ہیں اور اسکی مثال گجرات اور بھاگلپور فسادات یا حالیہ راجستھان کے فساد ہیں۔ اور حالات روز بروز خراب ہوتے جارہے ہیں، ان فسادات میں سب سے زیادہ نقصان مسلمانوں کا ہوتا ہے اور یہ نقصان جانی سے زیادہ مالی ہوتا ہے، یہی وجہ ہے کہ ہندوستان کے مسلمان اپنی املاک کے تعلق سے عدم تحفظ کا شکار ہیں اور انتظامیہ بھی اس بربادی میں فرقہ پرستوں کے ساتھ ہے۔ ان حالات میں، جبکہ مروجہ انشورنس شریعت کی رو سے امور محرمہ پر مبنی ہے، تکافل کی ضرورت دوسرے ممالک کی بنسبت ہندوستان میں زیادہ محسوس کی جارہی ہے۔ لیکن غور طلب امر یہ ہیکہ اس میدان میں ہم اپنا پہلا قدم کس انداز میں رکھیں، چونکہ دشواریاں ابتدائی مراحل میں زیادہ ہوتی ہیں۔

راقم الحروف کی رائے ہے کہ ہماری کوشش دو سطحوں پر ہونی چاہئے ۱۔ ملکی سطح پر۔ ۲۔ بین الاقوامی سطح پر۔

پھر ملکی سطح کی ہماری کوشش تین الگ الگ میدانوں میں ہونی چاہئے (۱) حکومتی سطح پر، (۲) عوامی سطح پر، (۳) تعلیمی سطح پر، حکومتی سطح پر ہمیں سب سے پہلے اس بات کی کوشش کرنی ہوگی کہ ہم حکومت ہند سے مطالبہ کریں کہ وہ

R.B.I کے قوانین میں اس بات کی گنجائش پیدا کرے کہ ہم تکافل کے ہندوستان میں رائج ہونے اور اسکے ادارے قائم کرنے، نیز موجودہ انشورنس کمپنیوں کو تکافل پروڈکٹ نکالنے کے مواقع پیدا ہوسکیں، چونکہ R.B.I کے موجودہ قوانین کی رو سے مکمل اسلامی انشورنس کی گنجائش نہیں نکلتی۔ اس سطح پر ہماری دوسری کوشش یہ ہونی چاہئے کہ ہم حکومت ہند سے مطالبہ کریں کہ جس طرح وہ مروجہ انشورنس کو قبول کرتی ہے۔ وہ درجہ اسلامی انشورنس کو بھی دے۔ مثلا ہم سب اس بات سے بخوبی واقف ہیں کہ اگر ہمیں کوئی موٹر بائک یا اس انداز کی کوئی بھی گاڑی چلانی یا چلوانی ہو تو اس گاڑی کا انشورنس کرانا لازمی اور ضروری ہے، بغیر انشورنس کے اس کو آن روڈ اتارنا ناقابل معافی جرم تصور کیا جاتا ہے اور اس گاڑی کو ضبط کرلیا جاتا۔ ہم حکومت سے یہ مطالبہ کریں کہ اگر کوئی مسلمان اپنی گاڑی کا اسلامی انشورنس کراتا ہے تو اس کو بھی وہی اہمیت دی جائے جو مروجہ انشورنس کو حاصل ہے۔

عوامی سطح پر کوشش:

ہندوستانی معاشرے میں مسلمانوں کی تین طرح کی درجہ بندی کی جاسکتی ہے:

(۱) مزدور طبقہ، (۲) حکومتی یا پرائیوٹ نوکری کرنے والے، (۳) تجارت پیشہ حضرات۔

عام طور پر انشورنس یا ان جیسی چیزوں سے جڑے ہوئے لوگ زیادہ تر نوکری پیشہ حضرات ہوتے ہیں اور کچھ رجحان اس کی طرف تجارت پیشہ حضرات کا بھی ہے۔ ہمارا مزدور طبقہ ان چیزوں سے عام طور پر دور رہتا ہے۔ ہمارا ہدف نوکری پیشہ اور تجارت پیشہ حضرات ہوں۔

ان حضرات میں پہلی کوشش یہ کرنی ہوگی کہ ہم ان کو اسلامی انشورنس اور اسکے فوائد سے متعارف کرائیں اور مروجہ انشورنس کی خرابیوں اور اسکی شرعی حرمت

سے بھی واقفیت کرائیں۔ چونکہ علماء کی ذمہ داری محض حرام کو حرام کہہ دینا نہیں، بلکہ حلال طریقہ کا بتانا اور اسکی طرف صحیح رہنمائی کرنا بھی ہے۔ اس کے لئے ہم الکٹرانک میڈیا اور پرنٹ میڈیا کا سہارا لیں، نیز ائمہ مساجد وخطباء حضرات سے اس بات کی درخواست کریں کہ وہ امت کے اس نازک مسئلہ کو عوام تک پہنچائیں۔ نیز ہم رسائل، اشتہارات وپمفلیٹ وغیرہ کا بھی سہارا لیں۔

تعلیمی سطح کی کوشش:

یہ میدان سب سے مشکل اور وقت طلب ہے۔ چونکہ رجال کار کی تیاری اور پھر ان افراد کا صحیح استعمال آج کے اس بے وقعتی دور میں سب سے زیادہ نازک اور حساس مسئلہ ہے۔ اولاً تو ہمارے پاس اس کام کیلئے افراد نہیں ہیں اور جو کچھ تھوڑے ہیں ان کا صحیح استعمال نہیں ہو پا رہا ہے، نتیجہ صاف ظاہر ہے (ہماری ناکامی)

بڑے افسوس کے ساتھ راقم یہ کہنے کی جرات کر رہا ہے کہ اس اسلامی بینک کاری کی ابتداء ۱۹۷۵ء میں ہوئی جسکو ایک عرصہ ہو چکا ہے اور ۳۵ سال کا لمبا عرصہ گذر جانے کے بعد بھی ہمارا دامن تیار شدہ افراد سے خالی ہے۔

میں اکیڈمی کے تمام شرکاء اور سیمنار میں موجود اکابر دین اور اکیڈمی کے ذمہ داران سے درخواست کروں گا کہ معاشیات کے نصاب کے اس مسئلہ کو سنجیدگی سے حل کریں، تاکہ ناقص افراد تیار نہ ہوں، بلکہ رجال کار اور کامل اور مکمل افراد کی جماعت نکل کر آئے۔ کیونکہ اب تک کوئی بھی کتاب Tex Book کے انداز کی نہیں ہے اور جو کتابیں ہیں بھی وہ مطالعہ کے انداز کی ہیں۔

بین الاقوامی سطح پر کی جانے والی کوشش:

۱۔ عالم عرب اور برطانیہ اور اسکے ماسواء دوسرے ممالک میں پھیلی ہوئی کامیاب ترین تکافل کمپنیوں کو ہندوستان میں اپنے تکافل پروڈکٹ شروع کرنے اور سرمایا کاری کرنے کی دعوت دی جائے۔ اور مسلمانوں کی مالی حالت کے پیش نظر کم لاگت اور کم اقساط کے پروڈکٹ شروع کریں، تاکہ عوام اس کی جانب راغب ہو سکے۔

۲۔ I.B.M اور I.I.U.M جیسے عالمی اداروں کے طلبہ واساتذہ اور ہندوستان کے معیاری مدارس کے درجہ "تخصص فی الفقہ" کے طلبہ کے درمیان افہام وتفہیم کے مواقع پیدا کئے جائیں۔ اور غیر ملکی ماہرین خصوصاً عالم عرب کے مشہور ماہرین کے ذریعہ ورک شاپ کا انعقاد کیا جائے۔

۳۔ ہمارے بعض برادر وطن کو اسلام اور اس سے متعلقہ چیزوں سے پیدائشی دشمنی اور بیر ہے جسکی وجہ سے وہ ہر ایسے کام میں آڑ پیدا کرتے ہیں جو اسلام سے متعلق ہو۔ اس لئے مناسب ہوگا کہ معیشت اسلامی سے متعلق اصلاح میں ترمیم کی جائے، تاکہ اس میں کوئی رکاوٹ نہ ہو۔

۴۔ تکافل کی پلاننگ منظم اور مضبوط انداز میں طویل مدت ہوتی ہے۔ جو کم از کم پانچ سے چھ سال کا ہدف مقرر کرے۔

۵۔ عوامی بیداری کیلئے ہر ممکن تدبیر کرنا جو اس کے فروغ کا ذریعہ بن سکتی ہو۔ نیز رضا کاروں کی ایک جماعت ملک بھر میں دورہ کر کے عوامی بیداری پیدا کرے۔

۶۔ ماہرین معاشیات اور اکابر علماء عظام کے درمیان خلیج کو دور کرنے کی کوشش کی جائے اور دونوں قسم کے افراد کو ایک اسٹیج پر جمع کرنے کی کوشش کی جائے۔ علماء سود کی لعنت اور اس کی خرابیوں سے امت کو آگاہ کریں اور ماہرین تکنیکی خرابیوں اور مروجہ سودی نظام، خصوصاً مروجہ انشورنس کی خرابیوں اور ان کمپنیوں کے مقاصد کی نقاب کشائی کریں۔

۷۔ امت کا ہر فرد اس بات کا ذمہ دار ہے کہ خصوصاً مسلم معاشرے سے سودی نظام ختم ہو اور حتی المقدور اس سے تحفظ کی کوشش کی جانب صاحب استطاعت اور صاحب ثروت حضرات قرض حسنہ کے ادارے قائم کریں اور پریشان حال افراد کیلئے غیر سودی قرض کے مہیا کرانے میں حتی الامکان کوشش کریں۔

خلاصہ: آج امت نازک حالات اور کسمپرسی کے عالم میں ہے اور سامراجیت اور مغربیت کے فریب نے جس مضبوطی کے ساتھ اس کو چہار جانب سے اپنے دائرہ میں جکڑ رکھا ہے خصوصاً معیشت کے میدان میں کہ کوئی فرد بھی سود کی لعنت سے اپنے آپ کو محفوظ تصور نہیں کر رہا ہے۔ ضرورت اس بات کی متقاضی ہے کہ ہر بیدار مسلمان بیداری کا ثبوت دے اور امت کو سود کی لعنت سے بچانے میں اپنی سعی بھر پوری کوشش کرے۔

☆☆☆

شریعت کے دائرہ میں انشورنس کے متبادل (تکافل) کی تلاش

مولانا مفتی محمد عنایت اللہ رحیمی کشمیری [1]

انشورنس کے متبادل کی تلاش کیوں ہے؟...... متبادل تلاش کرنے کا محرک یہ ہے کہ اصل میں دیکھنا یہ ہے کہ انشورنس کا شرعی متبادل ضروری ہے یا نہیں، واضح رہے کہ ہر اس چیز کا متبادل ضروری ہے حالات وواقعات سے جس کی ضرورت محسوس کی جارہی ہو، انشورنس کے معاملات کو جب ہم نے بغور دیکھا تو یہ معلوم ہوا کہ انشورنس معاشرے کا ایک ضروری جزء بن چکا ہے، اسی وجہ سے اس کا متبادل تلاش کرنا نہ صرف درست، بلکہ ضروری ہے۔

متبادل کیا ہے؟

متبادل کی صورت بیان کرتے ہوئے آپ تحریر فرماتے ہیں کہ "متبادل کی چند صورتیں ہیں، ایک صورت یہ بھی ہے کہ اسلامی متبادل تجارتی (commercial) بنیادوں پر ہو، لیکن مروجہ انشورنس کی خرابیاں پیدا ہونے کا خطرہ ہے، تو ان خرابیوں کو دور کرنے کے لئے عقدِ بیمہ (insurance agreement) کے موجودہ ڈھانچے کے اندر تبدیلی لائی جائے۔

۱۔ پہلی تبدیلی یہ لائی جائے کہ تجارتی بنیادوں کے بدلے اس کو "تبرعات" (donations) کی بنیاد پر قائم کیا جائے تو متبادل آسانی سے حاصل ہوجائے گا۔

۲۔ یا یہ تبدیلی کی جائے کہ وقف کی بنیادوں پر بنایا جائے تو دوسرا متبادل قائم کرنا بھی ممکن ہوجائے گا۔

متبادلِ اول:

پہلے متبادل کی بنیاد تبرعات (donations) پر ہوگی اس صورت میں تکافل کرانے والا اپنی رقوم بطور عطیہ تکافل کمپنی کے پاس جمع کرائیگا جس کا مختصر طریقہ اس طرح ہوگا کہ جب عطیات جمع ہونگے تو عام انشورنس کی طرح ادارۂ تکافل (شرکۃ التکافل) خود بخود وجود میں آجائے گا جو اس تکافل کمپنی کے معاملات کو منظم کریگا اور لوگوں کو اس تکافل کمپنی کی تبرع پالیسی حاصل کرنے کی ترغیب دیگا اس سے کمپنی کا مقصد "نفع کمانا" اور تکافل حاصل کرنے والوں کا مقصد "ممکنہ نقصان سے تحفظ کا حاصل کرنا" ہوگا۔

مروجہ انشورنس کی مانند تکافل میں بھی مختلف خطرات والے لوگوں کو مختلف طبقوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

تکافل میں کتنے فریق ہیں:

تکافل اور مروجہ انشورنس کمپنیوں کے درمیان فرق یہ ہوگا کہ مروجہ انشورنس میں صرف دو فریق ہیں، جبکہ یہاں تین فریق ہوں گے جو ذیل میں ذکر کئے جارہے ہیں:

(۱) تکافل کمپنی یا ادارۂ تکافل یا شرکۃ التکافل (islamic insurance company)۔ (۲) پالیسی ہولڈر، قسط اداء کنندگان (policy holder)۔ (۳) پول (pool) فنڈ۔

۱۔ تکافل کمپنی کی حیثیت امین ٹرسٹی (trustee) اور منتظم (arranger) کی ہوگی۔ ۲۔ پالیسی ہولڈر، وہ شخص جو خطرہ کے ازالہ کے لئے پالیسی کریگا۔

۳۔ حوض، فنڈ، پول (pool) جو مختلف حضرات کے عطیوں سے مل کر بنے گا۔

تکافل کمپنی فنڈ کے امین اور منتظم ہونے کی حیثیت سے مختلف فرائض انجام دیگی۔

---

[1] دار العلوم بانڈی پورہ، کشمیر۔

(۱) پول کے لئے پریمیم (premium) رقم جمع کریگی لوگوں کو پول میں عطیات جمع کرانے کی ترغیب دیگی مختلف خطرات کی بنیاد پر مختلف اسکیمیں تیار کرے گی

(۲) پول تیار ہوتے ہی ادارہ تکافل اسے دو طریقوں سے چلائے گا۔

الف۔ اگر کسی پالیسی ہولڈر کو کوئی خطرہ پیش آئے تو اس سے اس خطرہ کا ثبوت وصول کر کے اس پول ،فنڈ سے رقوم ادا کریگا۔

ب۔ اگر اس کے اندر کوئی حصہ سرمایہ کاری (investment) کے لئے رکھا جائے مثلاً مضاربہ کے لئے تو وہ اس کی بنیاد پر سرمایہ کاری (investment) کرے گا، اس میں کمپنی کی حیثیت مضارب کی ہوگی۔

نوٹ: آج کل عام طور پر تکافل کے اندر سرمایہ کاری (investment) کے لئے کافی حصہ رکھا جاسکتا ہے، کیونکہ ان کمپنیوں میں سرمایہ کاری بھی ہوتی ہے۔

اس مرحلہ پر چار قسم کے معاملات ہوں گے (۱) امانت (۲) انتظام و انصرام کا معاملہ (۳) سرمایہ کاری والے حصہ میں مضاربت کا عقد (۴) شرکت کا عقد

گویا اسلامی انشورنس مختلف معاملات کا مجموعہ ہوگا جسکو واضح اور ظاہر بھی کیا جاسکتا ہے، جبکہ عام انشورنس میں اس مرحلہ پر صرف ایک عقد خرید وفروخت کا ہوتا ہے اسکے بعد کمپنی اسپر پردہ ڈال دیتی ہے۔ رقوم (premium) جمع کرنے والوں کو معلوم نہیں ہوسکے گا کہ رقوم کہاں خرچ ہوں گی، اس سے جائز سرمایہ کاری ہوگی یا سودی کاروبار ہوگا وغیرہ وغیرہ جبکہ تکافل کا ادارہ ہر مرحلہ کو واضح کریگا پہلے امین (trustee) کی حیثیت سے رقوم وصول کرے گا اسے فنڈ (pool) میں ڈالیگی، منتظم (manager) ہونے کی حیثیت سے اس کا انتظام کرے گا اور پالیسی ہولڈرز کے مضارب ہونے کی حیثیت سے سرمایہ کاری کریگا اور اپنے نفع کا متناسب حصہ لے کر فنڈ (pool) کے ذریعے واپس پالیسی ہولڈرز کے درمیان تقسیم کریگا۔

مروّجہ انشورنس اور تبرّع (donation) کی بنیاد پر چلنے والے ادارہ تکافل کے درمیان فرق:

یہ ہے کہ مروجہ انشورنس میں پالیسی ہولڈر کے مالی نقصان کو پورا کرنا کمپنی کی ذمہ داری ہوگی، لیکن اسلامی انشورنس میں کمپنی کی حیثیت امین (trustee) کی ہوگی پالیسی ہولڈر کے نقصان کو پورا کرنا اس کی ذمہ داری نہیں، بلکہ نقصان پورا کرنے کی ذمہ داری پالیسی ہولڈر کے تبرعات (donations) سے وجود میں آنے والے فنڈ (pool) پر ہوگی، کمپنی یہ کہے گی کہ یہ فنڈ (pool) تمہارا نقصان پورا کرے گا اگر اس کے اندر نقصان پورا کرنے کی گنجائش ہوئی تو آپ کے نقصان کی تلافی کردی جائے گی اور اگر فنڈ (pool) کے اندر گنجائش نہ ہوئی تو یہ نقصان پورا نہیں کیا جائے گا۔

دوسرا فرق یہ ہے کہ تکافل میں رقوم (premium) کمپنی کی ملکیت میں نہیں آتیں، جبکہ مروجہ انشورنس میں رقوم (premium) کمپنی کی ملکیت میں آجاتے ہیں۔

تیسرا فرق یہ ہے کہ تکافل میں پالیسی ہولڈرز ایک دوسرے کا رسک کور کررہے ہونگے جس کی وجہ سے یہ افراد ایک دوسرے کے لئے انشورنس کرنے والے (insurer) بھی ہوجائیں گے اور وہ جو انشورنس کراتا ہے (insured) بھی ہوں گے، جبکہ مروجہ انشورنس میں ایسا نہیں، اس لئے معلوم یہ ہوا کہ دونوں کے درمیان گہرا فرق ہے"۔

"تکافل کا دوسرا متبادل وقف کی بنیادوں پر ہوگا:۔ وقف کی بنیاد پر کام کرنے والی کمپنی کا طریقہ کار اس طرح ہوگا:

۱۔ کمپنی قائم کی جائے گی جو وقف کی بنیاد پر خدمات انجام دینے کا اعلان کرے گی۔

۲۔ کمپنی کے شراکت دار (کمپنی قائم کرنے والے) اس قدر سرمایہ فراہم کریں گے کہ جس کے ذریعے کمپنی تکافل کی خدمات انجام دینے کی اجازت حاصل کرسکے۔

۳۔ شراکت داروں کے مال کا ایک حصہ وقف کیا جائے گا جس کا مقصد یہ ہوگا کہ اس سے سرمایہ کاری کی جائے پھر نفع حاصل کر کے لوگوں کے نقصانات کی تلافی کی جائے۔

۴۔ کمپنی مختلف خطرات کا تحفظ چاہنے والے افراد کو اس بات کی ترغیب دے گی کہ وہ اس وجود میں آنے والے وقف کو ہدیہ (donation) کرے اور وقف کے مقررہ قوانین کے مطابق نقصانات کی تلافی کے حق دار بنے وقف کو دیا جانے والا ہدیہ وقف کی ملکیت میں آجائے گا اسے "تبرع علی الوقف" (donation for waqf) کہا جائے گا۔

۵۔ کمپنی، وقف فنڈ اور اس کے تبرعات (donations) کو بطور مضارب یا وکیل سرمایہ کاری میں لگائے گی اور اس سے مقررشدہ نفع یا اجرت لے گی۔

۶۔ اگر وقف کے نفع تبرع (donations) نقصان کی تلافی کے لئے کافی نہ ہوں تو کمپنی کی ذمہ داری نہ ہوگی، البتہ ایسی صورت میں کمپنی اپنی طرف سے وقف فنڈ کو ایسا قرض دے سکتی ہے جو آئندہ واپس مانگا، یا پھر وقف فنڈ کو ہبہ بھی کیا جاسکتا ہے، اس میں کمپنی کو اختیار ہوگا۔

ان اجمالی صورتوں سے یہ بات سمجھ میں آئی کہ ادارۂ تکافل (islamic insurance company) تین بنیادی فریق ہوئے (۱) شراکت دار (share holder)، (۲) وقف فنڈ (pool)، (۳) متبرعین (donaters)۔

(۱) کمپنی کی انتظامیہ شراکت داروں کے نمائندے کے طور پر کام کریں گے، (۲) وقف فنڈ اسکا الگ مستقل قانونی وجود ہوگا کمپنی کی انتظامیہ انکی امین متولی (trustee) ہوگی، (۳) متبرّعین (donators) وہ لوگ جو وقف پر تبرع (donate) کریں گے اور وقف کے اصولوں کی روشنی میں نقصانات کی بھرپائی کرانے کے حقدار ٹھہریں گے۔

اس متبادل میں بھی مروجہ انشورنس کے عقد سے مختلف وقف کو تبرع (donations) کی بنیاد پر ہوگی، اس لئے اس میں مروجہ انشورنس کی خرابیاں نہیں رہینگی جسطرح تبرع کی بنیاد پر قائم تکافل کمپنی میں نہیں رہیں تھیں"۔

تکافل کے طریقہ کا جائزہ اور اس کی بعض شقوں کی وضاحت:

فتاوی عثمانی میں مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہ العالی نے "تکافل ساؤتھ افریقہ" کے عنوان کے تحت ایک سوال وجواب درج فرمایا ہے جس کو موضوع کی مناسبت سے من وعن یہاں نقل کیا جارہا ہے۔

سوال: یہاں ساؤتھ افریقہ میں مروجہ انشورنس کے مقابلے میں یہاں کے چند مسلمانوں نے ایک ایسا ادارہ قائم کیا ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ شرعی وجائز طریقہ سے مروجہ انشورنس کے فوائد ومقاصد حاصل کئے جائیں اس ادارہ کو تکافل کا نام دیا ہے یہ لفظ بمعنی ضمانت نہیں ہے، بلکہ اس سے مراد تعاون وتناصر ہے، دنیا کے مختلف ممالک میں بھی اسی غرض سے اس نام سے ادارے قائم ہیں تکافل ساؤتھ افریقہ کا ڈھانچہ وماڈل اس طرح ہے:

۱۔ چند محدود افراد نے اس نیت سے محدود رقم وقف کر کے ایک فنڈ قائم کیا ہے کہ جو لوگ اس وقف فنڈ کے ممبر ہوں گے ان پر اگر کوئی حادثہ یا نقصان عارض ہوا تو طے شدہ قواعد وشرائط کے تحت اس ممبر کی اس وقف فنڈ کے منافع سے مدد کی جائے گی اور اس میں سے محدود نسبت کے ساتھ کچھ رقم فقراء میں بھی تقسیم کی جائے گی۔

۲۔ اس وقف فنڈ کو جائز اسلامی سرمایہ کاری کے ذریعے بڑھایا جائے گا، نیز جو اس وقف فنڈ کا ممبر بنے گا اس سے اس فنڈ کے لئے چندہ وصول کیا جائے گا، یہ چندہ وقف فنڈ کے منافع کے حکم میں ہوگا، یہ چندہ وقف کے حکم میں نہیں ہوگا، جیسا کہ مسجد کی عمارت وقف ہوتی ہے اور اس کے لئے جو چندہ حاصل ہوتا ہے وہ اس کے منافع ہوتے ہیں اور یہ منافع مسجد کے مصالح پر خرچ ہوتے ہیں (والتفصیل فی امداد الاحکام ۳/ ۲۲۰)۔

۳۔ جو شخص وقف فنڈ کو چندہ دے گا تو وہ وقف فنڈ کے مقاصد کو پورا کرنے کی نیت سے چندہ دے گا اور وہ اس چندہ کا مالک نہیں رہے گا، بلکہ یہ چندہ وقف فنڈ کی ملکیت ہوجائے گا۔

۴۔ اس وقف فنڈ کا ممبر حادثہ پیش آنے کی صورت میں اس بنیاد پر تلافی کا دعوی کرے گا کہ وہ اس وقف فنڈ کے مقاصد کے مطابق مستحق ہے، اگر وقف فنڈ کے متولی اس کے نقصان کی تلافی کرنے سے انکار کریں تو وہ عدالت سے اس بنیاد پر رجوع کرسکتا ہے کہ وقف فنڈ کا اصل مالک اللہ تعالی ہے اور اس کے متولی اس وقف فنڈ کو اس کے مقاصد کے مطابق چلانے کے ذمہ دار ہیں، لیکن وہ اس میں کوتاہی کر رہے ہیں، لہذا عدالت ان سے باز پرس کرے، گویا یہ حقوق اللہ میں سے ہوگیا، جیسا کہ مال غنیمت تقسیم سے پہلے کسی ایک مجاہد کی ذاتی ملکیت نہیں ہوتا اور ہر مجاہد کی ذمہ داری ہے کہ جو کچھ بھی مال کافروں سے حاصل ہو وہ لا کر امام کے پاس جمع کرے نہ خود چھپائے اور نہ کسی دوسرے کو چھپانے دے، اگر کسی مجاہد نے دوسرے کے غلول کو چھپایا تو وہ بھی گناہ گار ہوگا، رواہ ابوداؤد، (مشکوۃ ص ۳۵۱)۔

نیز جس طرح جہاد میں ہر مجاہد کی نیت ابتدا میں مال حاصل کرنے کی نہیں ہوتی حتی کہ بعض دفعہ امیر یہ بھی اعلان کرتا ہے کہ "من قتل قتیلاً فله سلبه" تاکہ قتال پر ابھارا جاوے اور سستی پیدا نہ ہو، اس کے بعد جب مال غنیمت تقسیم ہوتا ہے تو ہر مجاہد اپنے حصے کی غنیمت وانعام خصوصی کا جس کا اعلان کیا گیا ہو دعوی کرسکتا ہے، غزوہ حنین میں فتح ہونے کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلان فرمایا: "من قتل قتیلاً له علیه بینة فله سلبه" (مشکوۃ ص ۳۴۸)، تو ایک صحابی کھڑے ہوئے اور فرمایا: "من یشهد لی" لیکن کوئی گواہی دینے کے لئے کھڑا نہیں ہوا تو آپ بیٹھ گئے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دوبارہ اعلان فرمایا یہ صحابی

دوبارہ کھڑے ہوئے، لیکن انہیں کوئی گواہ نہ ملا تو بیٹھ گئے، تیسری دفعہ بھی اسی طرح ہوا اس کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوقتادہؓ سے پوچھا کہ کیا بات ہے؟ انہوں نے اپنا واقعہ بیان کیا کہ میں نے ایک کافر کو قتل کیا ہے، اس کے بعد ایک دوسرے صحابی نے (جن کے پاس اس مقتول کا سامان تھا) حضرت ابوقتادہؓ کی تصدیق کی اور یہ خواہش ظاہر کی کہ اس مقتول کا سامان مجھے دیدیا جائے اور ابوقتادہ کو راضی کردیا جائے، لیکن حضرت ابوقتادہؓ اس پر راضی نہیں ہوئے، لہذا انہیں مقتول کا سامان دیا گیا۔

اس حدیث شریف سے ثابت ہوا کہ تبرع کی نیت سے کچھ کرنے کے بعد (جہاد میں جانا اور اپنی جان ومال خرچ کرنا بھی تبرع ہے)، اگر کسی چیز کا استحقاق ہوجائے تو اس کے لئے دعوی کرنا جائز ہے، نیز یہ موقوف علیہ بھی ہے، لہذا مستحق ہونے کی وجہ سے دعوی کرسکتا ہے (درمختار ۳/ ۴۴۰-۴۴۱)۔

۵۔ یہ بھی طے ہوا ہے (متولیوں کی طرف سے) کہ اس وقف فنڈ کو شریعت کے مطابق چلانے اور اس کی نگرانی کرانے کے لئے ایک شریعہ بورڈ قائم ہوگا اور ان کی ہدایات کی روشنی میں اس فنڈ کو چلایا جائے گا، اگر یہ ثابت ہوجائے کہ اس فنڈ کو جاری رکھنا شریعت کے مطابق نہیں ہے اور ائمہ اربعہ میں سے کسی کے نزدیک بھی صحیح نہیں ہے، یا یہ فنڈ اپنے مقاصد کے مطابق چل نہ سکے تو اس فنڈ کی جتنی بھی رقم وجائداد وغیرہ ہوگی وہ سب فقراء وغیرہ میں تقسیم کرکے اس فنڈ کو ختم کردیا جائے گا۔

۶۔ وقف فنڈ کے سالانہ منافع کا حساب کیا جائے گا اور اصل وقف رقم سے زائد جو رقم ہوگی وہ ممبران میں تقسیم کی جائے گی۔

۷۔ جو رقم وقف کی گئی ہے اس میں کمی نہیں کی جائے گی، تقسیم منافع وقف کی ہوگی، اگر کسی وقت دعوے زیادہ ہوں اور منافع وقف سے اس کی تکمیل نہ ہوسکے تو وقف فنڈ کو غیر سودی قرض دیا جائے گا اور بعد میں اس کے منافع سے اس قرض کی ادائیگی کی جائے گی۔

۸۔ چونکہ تکافل ساؤتھ افریقہ ایک نئی کمپنی ادارہ ہے اور ان کے پاس کافی رقم نہیں ہے، جبکہ حکومتی قانون کے مطابق ایسی کمپنی کو جاری کرنے کے لئے لائسنس کی ضرورت ہے اور تکافل کمپنی کے پاس اس لائسنس کو حاصل کرنے کے لئے رقم نہیں ہے، نیز اس میدان کی انہیں تکنیکی اور پیشہ ورانہ مہارت بھی حاصل نہیں ہے، اس ضرورت کو پورا کرنے کے لئے تکافل ساؤتھ افریقہ نے مروجہ انشورنس کمپنی سے معاہدہ کیا کہ تکافل کمپنی ان کے لائسنس کو استعمال کرے گی اور ان سے پیشہ وارانہ مدد حاصل کرے گی، اس کے عوض تکافل کمپنی اس انشورنس کمپنی کو طے شدہ اجرت ادا کرے گی۔

۹۔ جن حضرات نے اس فنڈ کے لئے رقم وقف کی ہے وہ اس کے متولی ہیں وہ اس فنڈ کو چلانے اور اس کا انتظام کرنے کے لئے بحیثیت وکیل کام کریں گے اور اس کے لئے انہیں متعین اجرت دی جائے گی اس اجرت میں تمام ملازمین کی تنخواہ اور انتظامی اخراجات شامل ہوں گے۔

ا۔) تکافل ساؤتھ افریقہ نے "ری انشورنس" کا معاملہ نہیں کیا۔ فقط والسلام

جواب: آپ کا گرامی نامہ اور تکافل کے بارے میں آپ کی تحریر ملی اس میں نمبر ا سے نمبر ۷ تک کی تجاویز تقریباً وہی ہیں جو دار العلوم کے منعقدہ علماء کے اجتماع میں طے کی گئی تھیں، لہذا وہ شریعت کے مطابق ہیں صرف نمبر ۶ کے بارے میں عرض یہ ہے کہ زائد رقم کا ممبران پر تقسیم ہونا ضروری نہیں، چونکہ یہ رقم وقف کی ملکیت ہو چکی ہے، اس لئے وقف کے قوانین کے تحت اس کو وقف ہی میں محفوظ بھی رکھا جاسکتا ہے، تاکہ سال آئندہ کے نقصانات کی تلافی میں کام آئے اور یہ صورت بندے کو زیادہ بہتر معلوم ہوتی ہے۔

البتہ نمبر ۸ میں جو تجویز دی گئی ہے کہ "تکافل کمپنی کسی مروجہ انشورنس کمپنی کا لائسنس استعمال کرے گی اور ان سے پیشہ ورانہ مدد حاصل کرے گی" اس کے بارے میں اس وقت کہنا مشکل ہے جب تک مروجہ انشورنس کمپنی کے ساتھ تکافل کمپنی کا معاہدہ سامنے نہ ہو۔ والسلام

(مولانا مفتی) محمد تقی عثمانی (مدظلہ العالی)

خلاصہ:..... گذشتہ تفصیل کے بعد یہ نچوڑ سامنے آیا کہ انشورنس کے متبادل کا اختیار واستعمال ہی زیادہ بہتر، بلکہ احسن ہے، لہذا اس کے بعد بھی اگر مذکورہ بالا متبادلوں میں سے کوئی متبادل علماء کرام کی کسوٹی پر پورا نہیں اترتا اور حدِ جواز سے ورے ہے، یا ایسا ہوسکتا ہے کہ کچھ جگہوں پر کوئی عقد کہیں تفصیل اور وضاحت طلب ہو، لیکن کم از کم ایسا ضرور ہے کہ تکافل انشورنس کے حرام اور ناجائز ہونے کے مقابلے میں زیادہ سے زیادہ مکروہ ہو، نیز سمینار میں مزید تحقیق ومباحثہ اور نقد وتبصرہ کے بعد مسئلہ کو زیادہ منقح کیا جاسکتا ہے، بعد ازاں یہ بھی کہ سعودی عرب، کویت، قطر اور دبئی وغیرہ ممالک میں چل رہی "تکافل کمپنیوں، شرکات التکافل" کے طریقہ کار کو دیکھ کر اس پر نظر ثانی کرکے اگر وہ موافق ہو تو ہمارے ملک میں یہ قابل عمل نظام ہے۔

☆☆☆

ہندوستان میں انشورنس کی قابل عمل صورتوں کا جائزہ

مولانا محمد احسن عبد الحق ندوی [1]

یہودی قوم جن کی فطرت اور شرست ہی میں سود کھانا، غرباء اور محتاجوں کا خون چوسنا داخل ہے، انہوں نے اسلامی نظام معیشت میں سود وقمار کی نئی نئی صورتیں داخل کر کے یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ معاشی نظام سود وقمار کے بغیر چل ہی نہیں سکتا، اس مقصد کے تحت یہودی ایجنسیاں آئے دن اسکیمیں مرتب کر کے سامنے لاتی ہیں، جو عموماً سود وقمار پر مشتمل ہوتی ہیں، انشورنس کی نئی نئی شکلوں کی ترویج وتشہیر کرنا بھی اسی مقصد کی ایک کڑی ہے۔

زمانہ کے تغیرات کے سبب جو نئے نئے مسائل جنم لے رہے ہیں ان میں سے ایک اہم مسئلہ انشورنس کا بھی ہے، ظاہر بات ہے کہ عصر حاضر میں جن تعریفات اور تفصیلات کے ساتھ انشورنس معاشرہ میں پایا جاتا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم، حضرات صحابہ کرامؓ، بلکہ ائمہ کرام کے زمانہ میں بھی اس کا وجود نہیں تھا، مشہور یہ ہے کہ اس کا آغاز چودھویں صدی عیسوی میں ہوا، اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ انشورنس کا آغاز قرون وسطی میں تقریباً ۱۴۹۸ء میں لویڈز نامی لندن کے ایک مشہور قہوہ خانے میں ہوا، اور وہیں ایک کمپنی قائم ہوئی جو اس وقت دولت کے بازاروں میں کافی شہرت رکھتی ہے، بعض حضرات کا خیال ہے کہ ۱۹۱۶ء میں پہلی بار اس کی کچھ ابتدائی شکلیں سامنے آئیں، لیکن اس کی باضابطہ شروعات بتایا جاتا ہے کہ ۱۶۶۶ء سے ہوئی، جبکہ لندن میں آگ لگی جس کی زد میں تیرہ ہزار مکانات اور ایک سو گرجا گھر جل کر راکھ ہو گئے، پھر آہستہ آہستہ اس نے منظم شکل اختیار کی، اور جلد ہی پوری دنیا میں پھیل گیا۔

اس طرح غور کیا جائے تو انشورنس کا نظام اپنی اصل کے اعتبار سے تعاون علی الخیر کے زریں اصول پر مبنی ہے، اور اس کا مقصد یہ ہے کہ مصیبت اور حادثات کا شکار ہو جانے والے افراد کی مدد کی جائے، ان کی تکلیف دور کی جائے اور نقصان کی تلافی میں تمام انشورنس والوں کو شریک کیا جائے، تا کہ نقصان کا بار مصیبت زدہ کو تنہا نہ برداشت کرنا پڑے، اس طرح اصل کے اعتبار سے یہ نظام "تعاون علی البر والتقوی" کے اصول پر مبنی ہے جس کا حکم قرآن مجید میں دیتے ہوئے ارشاد ہے:

{ وتعاونوا علی البر والتقوی ولا تعاونوا علی الإثم والعدوان } (سورہ مائدہ:۲)۔

پھر نہ ہی انشورنس کا تعلق لہو ولعب سے ہے، نہ ہی اس کو کسی فاسد غرض کے لئے وجود میں لایا گیا ہے، بلکہ وہ تمدنی تجارتی اور معاشی ضرورتوں کے تحت ابھرا ہے، اس کو ختم کر دیا جائے تو اس میں کوئی شبہ نہیں کہ معیشت کے میدان میں بڑی رکاوٹیں کھڑی ہو جائیں، اور خاص طور سے بڑے تاجروں کو خاصی دقت پیش آئے۔

لیکن جب یہ ادارہ یہودی سرمایہ داروں کے ہاتھ میں گیا تو انہوں نے اپنی ہر معاشی اسکیم کی طرح اسے ایک ایسے یہودی نظام معیشت میں تبدیل کر دیا جس سے "تعاون علی البر والتقوی" کی روح رخصت ہو گئی اور وہ بھی سود وقمار، یعنی جوا کا مجموعہ ہو کر رہ گئی۔

اس نظام کی باگ ڈور بھی چونکہ یورپین اقوام خاص طور سے یہودیوں کے ہاتھ میں رہی، لہذا انہوں نے اس میں بہت سے فاسد اجزاء بھی شامل کر دیئے، اور اس پورے نظام کو سود اور جوے کا ملغوبہ بنا دیا جس کی ظاہر بات ہے کسی صورت سے بھی اجازت نہیں دی جا سکتی۔

انشورنس کی قسمیں:...... بنیادی طور پر انشورنس کی تین صورتیں ہیں: (۱) باہمی تعاون پر مبنی انشورنس، (۲) کمرشیل یا تجارتی انشورنس، (۳) سرکاری انشورنس۔

ا۔ باہمی تعاون پر مبنی انشورنس:...... ان میں سے پہلی قسم، یعنی باہمی تعاون پر مبنی انشورنس میں تعاون باہمی کی سوسائٹیاں (Operatives_Co) اپنے ارکان کو اتنا ہی معاوضہ ادا کرنے کو کہتی ہیں جس سے نقصان کا ازالہ ہو جائے۔ ان کے پیش نظر یہ ہوتا ہے کہ خطرات پیش آنے پر تلافی ہو سکے، اسی لئے کمرشیل انشورنس کی طرح اس کی قسطیں متعین نہیں ہوتی ہیں، بلکہ نقصان کے کم وبیش ہونے کے اعتبار سے اس کی مقدار بھی کم وبیش ہوتی رہتی ہے، اس انشورنس میں بعض دفعہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ نقصان پیش آنے کے بعد تمام ممبران سے نقصان کے بقدر پیسے لئے جاتے ہیں، یا شروع میں ایک مقررہ مقدار لی جاتی ہے، اور

---

[1] مرکز الامام ابی الحسن الندوی دار عرفات تکیہ کلاں، رائے بریلی۔

سال پورا ہونے پر مکمل حساب ہوتا ہے، اگر پیسے کم ہوئے تو ممبران ادا کرتے ہیں، بڑھ جائیں تو کمپنی ممبران کو لوٹا دیتی ہے۔

اس شکل میں نفع کمانا بالکل ہی مقصود نہیں ہوتا؛ لہذا تمام علماء اسے جائز قرار دیتے ہیں، اس میں تو مصیبت زدہ کی مدد کرنا ہے، لہذا ناجائز قرار دینے کی کوئی وجہ نہیں ہے، بس یہ شک ہوتا ہے کہ کہیں اس میں غرر نہ ہو، اس لئے کہ خطرات سے کون دو چار ہوگا، کون نہیں ہوگا، معلوم نہیں ہوتا، لیکن اس معاملہ کی حیثیت پر غور کیا جائے تو دراصل یہ تبرعات میں سے ہے، لہذا یہ غرر اس میں مضر نہیں ہوگا۔

یہ شکل میری معلومات کے مطابق ہندوستان میں رائج نہیں ہے، البتہ بعض مسلم ممالک میں یہ شکل مروج ہے اور اس کو "مجلس البحوث الاسلامیہ جامع ازہر مصر، مجمع الفقہ الاسلامی مکۃ المکرمہ اور ہیئۃ کبار العلماء سعودی عرب" نے باتفاق رائے جائز قرار دیا ہے۔

۲۔ تجارتی (کمرشیل) انشورنس:

بنیادی طور پر اس کی تین قسمیں ہیں: الف۔ جان کا انشورنس، (جیون بیمہ یا لائف انشورنس)۔ ب۔ مال و اسباب کا انشورنس۔ ج۔ ذمہ داریوں کا انشورنس۔

جان کے انشورنس میں اس وقت دو پالیسیاں زیادہ مروج ہیں:

ایک یہ کہ مدت کی پالیسی لی جائے اور کمپنی کی طرف سے مقررہ قسط (Prime Fix) ماہ بہ ماہ ادا کی جائے، اگر اس مخصوص مدت سے پہلے پہلے پالیسی ہولڈر مر گیا تو کمپنی پوری رقم ورثہ کو دے گی اور باقی قسطیں معاف ہوجائیں گی، اور اگر پالیسی ہولڈر اس مخصوص مدت تک زندہ رہا تو اسے تمام قسطیں ادا کرنی ہوں گی، پھر مدت پوری ہونے پر جمع شدہ رقم اسے بونس اور کافی اضافہ کے ساتھ ادا کردی جائے گی۔

دوسری صورت یہ ہے کہ موت کے بجائے ممکنہ ناگہانی حادثات کے لئے انشورنس کرائے، مثلاً اپاہج ہونے، یا کاموں سے معذوری کے لئے، اس میں کمپنی سے یا معینہ رقم دینے کا معاہدہ کیا جاتا ہے، یا علاج کے اخراجات کی ادائیگی کا۔

مال کے انشورنس میں، دکان، مویشی اور گاڑیوں وغیرہ کا بیمہ کرایا جاتا ہے کہ اگر اس کو نقصان پہنچے یا ضائع ہوجائے تو کمپنی مقررہ رقم ادا کرے گی، اور اگر کوئی حادثہ پیش نہ آیا تو پالیسی ہولڈر کو کچھ معاوضہ نہ ملے گا، اس انشورنس میں پالیسی ہولڈر کو مقررہ قسط ادا کرنی ہوتی ہے۔

ذمہ داریوں کے انشورنس کا مطلب یہ ہے کہ پالیسی ہولڈر کمپنی کو مقررہ قسط ادا کرے، تاکہ کمپنی مقررہ ذمہ داری کو پالیسی ہولڈر کی طرف سے ادا کرے، مثلاً ٹریفک حادثہ میں ہلاکت کے تاوان کی ذمہ داری، گاڑی کا مالک اس غرض سے انشورنس کراتا ہے کہ اگر اس کی گاڑی سے تصادم کے نتیجہ میں کسی کی ہلاکت واقع ہوجائے، یا کوئی زخمی ہوجائے، یا کسی کا مالی نقصان ہوجائے تو اس سلسلہ میں جو کچھ رقم ادا کرنی ہے وہ کمپنی ادا کرے، اس انشورنس میں بھی اگر حادثہ پیش نہ آئے تو اس کو کوئی رقم واپس نہیں ملے گی۔

تجارتی انشورنس کا حکم:

تجارتی انشورنس کی ان تمام قسموں کو علماء کی ایک بڑی جماعت نے ناجائز قرار دیا ہے، اور اس کی وجہ یہ بتائی ہے کہ اس میں سود اور جوا دونوں پائے جاتے ہیں، بہت معمولی تعداد نے اس کو جائز بھی قرار دیا ہے، لیکن ان کے دلائل بلاشبہ کمزور ہیں، جہاں سود اور جوے کا معاملہ ہو وہاں حد درجہ احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے، اس لئے کہ فرمایا گیا ہے کہ "سود سے بچو اور جہاں سود کا شبہہ ہو اس سے بھی بچو"۔

ہاں ہندوستان کے موجودہ حالات میں آئے دن ہونے والے فرقہ وارانہ فسادات کی وجہ سے یہ بات قابل غور ہے کہ کیا اس طرح کے حالات میں انشورنس (جان یا املاک کا) کرایا جاسکتا ہے؟ کافی پہلے مجلس تحقیقات شرعیہ نے اساطین امت کے دستخطوں کے ساتھ مندرجہ ذیل فیصلہ کیا تھا:

"مجلس یہ رائے رکھتی ہے کہ اگرچہ انشورنس کی سب شکلوں کے لئے "ربا و قمار" لازم ہے، اور ایک کلمہ گو کے لئے ہر حال میں اصول پر قائم رہنے کی کوشش کرنا ہی واجب ہے، لیکن جان و مال کے تحفظ و بقا کا جو مقام شریعت اسلامیہ میں ہے، مجلس اسے بھی وزن دیتی ہے، نیز مجلس اس صورت حال سے بھی صرف نظر نہیں کرسکتی کہ موجودہ دور میں نہ صرف ملکی، بلکہ بین الاقوامی ریاستوں نے انشورنس انسانی زندگی میں اس طرح دخیل ہوگیا ہے کہ اس کے بغیر اجتماعی اور کاروباری زندگی میں طرح طرح کی دشواریاں پیش آتی ہیں اور جان و مال کے تحفظ کے لئے بھی بعض حالات میں اس سے مفر ممکن نہیں ہوتا، اس لئے ضرورت شدیدہ کے

پیش نظر اگر کوئی شخص اپنی زندگی یا اپنے مال یا اپنی جائداد کا بیمہ کرائے تو شرعاً اس کی گنجائش ہے"۔

اصحاب فتاویٰ میں سے مفتی محمود صاحبؒ، مفتی عبدالرحیم صاحبؒ اور مفتی نظام الدین صاحب نے بھی اس طرح کے فتاوی دیئے ہیں، فقہ اکیڈمی نے بھی خاص حالات میں اس کی اجازت دی ہے، لیکن اجازت دینے والے تمام حضرات یہ بھی کہتے ہیں کہ انشورنس کی تمام رقم ہی انشورنس کرانے والوں کے لئے ہر حال میں جائز نہیں ہوگی، بلکہ اس میں تفصیل ہے اور وہ یہ کہ صرف فسادات کی صورت میں جان و مال کے نقصان کے بعد جو کچھ ملے گا اور ضوابط کے مطابق ہوگا وہ مال تو انشورنس کرانے والوں کے لئے جائز و درست ہوگا، اور بقیہ صورتوں میں صرف ملنے والی اسی رقم کا ذاتی استعمال جائز ہوگا جو اس نے جمع کی ہوگی، بقیہ رقم کا مستحقین پر صرف کرنا لازم ہوگا۔

البتہ ذمہ داریوں کے انشورنس کے بارے میں مشہور فقیہ مولانا خالد سیف اللہ رحمانی کا رجحان جواز کا ہے، یعنی اگر انشورنس اس مقصد سے کرایا کہ اگر اس کی گاڑی سے کسی کو نقصان ہو جائے تو معاوضہ کمپنی ادا کرے تو یہ انشورنس جائز ہوگا، اس لئے کہ یہ جرم قتل خطا کے زمرہ میں آتا ہے، شریعت اس کے لئے دیت (خوں بہا) لازم کرتی ہے، جو بڑی رقم ہوتی ہے، اسی لئے شریعت نے یہ رقم تنہا مجرم پر نہیں رکھی، بلکہ "عاقلہ" پر رکھی، یعنی یا تو یہ خوں بہا مجرم کا خاندان ادا کرے گا، یا "اہل دیوان"۔ بیت المال کے رجسٹر میں جن لوگوں کا فوجیوں کی حیثیت سے اندراج ہوتا تھا اور جن کو وظیفہ دیا جاتا تھا ان کو "اہل دیوان" کہا جاتا تھا، اب "معاقل" کا یہ نظام ظاہر ہے موجود نہیں ہے، اسی لئے مولانا فرماتے ہیں کہ "انشورنس کی اس صورت کو ہر اس سماج میں جائز ہونا چاہئے جہاں ایسے مواقع کے لئے نظام معاقل موجود نہ ہو، انشورنس کی اس صورت میں تو سود کا سوال ہی نہیں کہ بیمہ کرانے والے کو حادثہ پیش نہ آنے کی صورت میں کوئی رقم واپس نہیں ملتی...... اصل یہ ہے کہ انشورنس کی یہ صورت از قبیل تبرعات ہے، بیمہ کی قسط ادا کرنے والا اپنے ہم پیشہ لوگوں کے لئے تبرع پیش کرتا ہے، اور کبھی وہ خود اس میں مبتلا ہو جائے تو اپنے ہم پیشہ لوگوں کی مدد سے فائدہ اٹھاتا ہے" (جدید فقہی مسائل ۴؍۱۲۰-۱۲۱)۔

۳- سرکاری انشورنس:...... سرکاری انشورنس سے مراد وہ خصوصی سرکاری مراعات ہیں جو گورنمنٹ ملازمین کو دی جاتی ہیں، جیسے ملازمت ختم ہونے کے بعد پنشن، ملازمت کے دوران موت ہونے پر ملازم کی بیوہ کے لئے وظیفہ، حکومت اس مد میں تنخواہ کا ایک حصہ وضع کر لیتی ہے، اور عام طور سے انشورنس کی یہ شکل جبری ہوتی ہے، اس سرکاری اور جبری انشورنس کو علماء نے عام طور سے جائز قرار دیا ہے، اس کی جو رقم پراویڈنٹ فنڈ، پنشن، وظیفۂ معذوری، یا لائف انشورنس کے نام سے ملتی ہے، اس کے جواز کی دلیل دیتے ہوئے علماء کہتے ہیں کہ ایک تو ان تمام صورتوں میں حکومت جبراً تنخواہ کا ایک حصہ وضع کر لیتی ہے، دوسرے ان تمام صورتوں میں ملنے والی اضافی رقم حکومت کی طرف سے تبرع ہے، حکومت نے وضع شدہ رقم کے بعد جو تنخواہ دی ہے وہی اصل اجرت ہے، سود اور قمار میں ضروری ہے کہ دونوں طرف سے مال ہو، حالانکہ حکومت کی طرف سے ان تمام مراعات میں ایک طرف سے مال ہے اور دوسری طرف سے عمل؛ اس لئے انشورنس کی یہ صورتیں جائز ہیں۔

مروجہ انشورنس کا صحیح بدل:

اصول شرعیہ کے تحت مروجہ انشورنس کے ایسے بے خطر اور بے ضرر بدل موجود ہیں کہ اگر ان کو بروئے کار لایا جائے تو نہ صرف مروجہ بیمہ کا اچھا بدل بن سکیں، بلکہ قوم کے بے سہارا افراد کو اپنے پاؤں پر کھڑا کرنے کا بہترین ذریعہ بن سکتے ہیں، اور یہ اس وقت ہوگا جب قوم میں اسلامی حمیت اور قومی غیرت کا شعور بیدار ہو۔

لیکن مشکل یہ ہے کہ یہ معاملہ انفرادی نہیں اجتماعی ہے، اگر چند افراد اس مقصد کے لئے تیار بھی ہوں تو کام نہیں چل سکتا، جب تک کوئی جماعت اس کام کو مقصد زندگی بنا کر آگے نہ بڑھے، ذیل میں مروجہ انشورنس کے بدل کے طور پر دو اصول بیان کئے جاتے ہیں:

۱- مروجہ انشورنس کا سب سے اچھا اور صحیح بدل یہ ہے کہ انشورنس پالیسی کی حاصل شدہ رقوم کو مضاربت کے شرعی اصول کے مطابق تجارت پر لگایا جائے اور معینہ سود کے بجائے تجارتی کمپنیوں کی طرح تجارتی نفع تقسیم کیا جائے، اور نقصان سے بچنے کے لئے لمیٹڈ کمپنیوں کی طرح اس کی پوری نگرانی کی جائے اور پھر اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کیا جائے۔

۲- انشورنس کے کاروبار کو امداد باہمی کا کاروبار بنانے کے لئے بیمہ پالیسی خریدنے والے اپنی رضامندی سے اس معاہدہ کے پابند ہوں کہ اس کاروبار کے منافع کا ایک حصہ یا اس کا کچھ حصہ فنڈ کی صورت میں محفوظ رکھ کر وقف کر دیں گے، جو حوادث میں مبتلا ہونے والے افراد کی امداد پر خاص اصول و قواعد کے تحت خرچ کیا جائے گا۔

☆☆☆

جدید فقہی تحقیقات

تیسرا باب مختصر تحریریں

ضرورت کے پیش نظر بیمہ (انشورنس) کی گنجائش

مفتی شیر علی گجراتی[1]

سوال: شریعت کے دائرہ میں انشورنس (تکافل) کی صورت۔

جواب: تعریف انشورنس: اس کی صورت یہ ہے کہ کمپنی والے خریدار سے کچھ روپے لے لیتے ہیں اور کچھ مدت (ایک سال دوسال وغیرہ) تک اس کے نقصان کے ذمہ دار رہتے ہیں اس شرط پر کہ اگر نقصان ہوا تب اتنی مدت میں ہم اس نقصان کے ذمہ دار ہیں، لیکن اگر اتنی مدت میں کچھ نقصان نہیں ہوا تو پھر وہ رقم بیکار چلی جاتی ہے، تو شرعاً اس صورت کا کیا حکم ہوگا، یعنی کفالہ کا حکم رکھتا ہے یا نہیں؟

شرعاً تو کفالہ درست نہیں ہے، اس لئے کہ ضمانت تو قرض معین پر ہوتا ہے اور یہاں قرض معین پر نہیں ہوتا، بلکہ ایک مجہول چیز پر ہوتا ہے، اس لئے کہ کوئی یقینی بات نہیں ہے کہ وہ نقصان ہو کر ہی رہے گا، بلکہ دونوں احتمال ہیں کہ نقصان ہو اور نہ بھی ہو تو جب مجہول چیز ہے تو مجہول چیز پر کفالہ درست نہیں ہے، اب رہی بات امداد کی جو کمپنی کرتی ہے تو وہ بھی مجہول چیز کے بدلے میں ہے، لہذا یہ تو مجہول چیز کے بدلہ میں روپیہ لینا ہوا اور یہ ناجائز ہے، اس لئے کہ بلاعوض روپیہ لینا ہوا اور یہ سود ہے اور سود ناجائز ہے۔

سود کے عدم جواز کی علت:

عدم جواز کی علت یہ ہے کہ مالدار لوگ غریبوں کا خون چوستے ہیں اور ان کی مجبوری سے فائدہ اٹھاتے ہیں، مثلاً کسی غریب کے ہاں کوئی شخص بیمار ہوا اور ڈاکٹر کے پاس گئے تو ڈاکٹر نے کہا کہ اس کے لئے زیادہ رقم کی ضرورت ہوگی اور غریب کے پاس اتنی رقم ہے نہیں تو اب وہ بیچارہ کیا کرے گا مجبور ہو کر وہ مالدار کے پاس جائے گا اور اس سے وہ رقم طلب کرے گا تو مالدار اس کی مجبوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس شرط پر رقم دے گا کہ جب تم یہ رقم واپس کرو گے تو اتنے روپے زائد دینے پڑیں گے۔ تو یہ سود کے عدم جواز کی علت ہے، یعنی پبلک پبلک کے مابین سود ہے، حکومت اور پبلک کے مابین سود نہیں ہے۔

حکومت اور پبلک کے مابین سود کا معاملہ:

حکومت اور پبلک کے مابین سود نہیں ہے، اس لئے کہ حکومت تو پبلک کے فائدہ کے لئے پبلک سے لیتی بھی ہیں اور ان کو دیتی بھی ہیں۔

دلائل:

۱۔ روایت میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اونٹ کی ضرورت پڑی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جابرؓ سے اونٹ خرید لیا، اور جب ثمن دینے کا وقت آیا تو ثمن بھی زائد ادا کیا حتی کہ اونٹ بھی واپس کر دیا۔

---

[1] جامعہ فلاح دارین ترکیسر، گجرات۔

ابن قیم فرماتے ہیں: ''وقد اشتری منه بعیره، ثم وفاه الثمن وزاده ورد علیه البعیر'' (زاد المعاد ۳،۳۴)۔

تو اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جب ضرورت پڑتی تھی تو عوام سے وہ چیز لے لیتے تھے اور واپس کرنے کے وقت اس سے زائد رقم ادا کرتے تھے۔ یہ تو ایک واقعہ ہے۔ احادیث میں اس قسم کے اور بھی واقعات موجود ہیں۔

۲۔ "لا ربوا بین المسلم والحربی فی دار الحرب" (کوئی سود نہیں ہے مسلم اور غیر مسلم کے درمیان غیر اسلامی ملک میں)۔

اور غیر اسلامی ملک میں غیر مسلموں کا روپیہ مسلمانوں کے لئے جائز اور حلال ہے، لیکن شرط یہ ہے کہ ان کی رضامندی سے ہو دھوکہ سے نہ ہو، یہ بات تو ہماری تمام فقہ کی کتابوں میں موجود ہیں۔

نیز حکومت کے کچھ اصول وقوانین ہوتے ہیں اور ہم اس کے پورا کرنے کے پابند اور مکلف ہیں ہم اس کے خلاف نہیں کر سکتے ہیں، مثلاً حکومت کسان کو کھاد دیتی ہے اور کہتی ہے کہ اتنی قیمت میں ہم تمہیں کھاد دے رہے ہیں اور جب غلہ تیار ہو جائے تو اتنا غلہ کم قیمت میں دینا پڑے گا اور یہ کوئی شرعی قانون نہیں ہے، لیکن یہ چلا آرہا ہے اس میں حکومت اور پبلک دونوں کا فائدہ ہے، تو جب یہ جائز ہے تو اسی طرح بیمہ بھی جائز ہونا چاہئے۔

۳۔ "لا ربوا بین الشریکین" (دو شریکوں کے مابین کوئی ربا نہیں ہے)۔

ظاہری بات ہے کہ حکومت کے پاس کیا ہے، وہ تو ہم سے ہی ٹیکس وغیرہ وصول کرتی ہے تو جو رقم اس کے پاس ہوتی ہے وہ تو ہماری دی ہوئی ہے، تو گویا ہم اس میں اس کے شریک ہوئے اور دو شریکوں کے مابین سود نہیں ہوتا ہے۔

۴۔ اور لوگوں میں اس کا تعامل بھی چلا آرہا ہے، یہ بھی اس کے جواز کا مقتضی ہے۔

۵۔ "الضرورات تبیح المحظورات" لوگوں کو اس کی ضرورت پڑتی ہے، تو ضرورت بھی جائز ہونے کا مقتضی ہے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ ان وجوہات کے پیش نظر میرے خیال میں یہ بات آتی ہے کہ بیمہ جائز ہونا چاہئے۔

☆ سوال میں جو دیت کا مسئلہ مذکور ہے، ایکسڈنٹ وغیرہ نقصانات کو اس پر قیاس کرنا صحیح نہیں ہے، اس لئے کہ دیت تو شخص معین کا نقصان کرنے کی وجہ سے آتی ہے اور اس پر اس کے ورثاء مطالبہ کریں گے اور چونکہ دیت کا پورا کرنا اس کے بس میں نہیں ہے، اس لئے حکومت نے اس کو عصبات وغیرہ پر تقسیم کر دیا اور یہاں خود اسی کا نقصان ہوا ہے اور وہ خود مطالبہ کر رہا ہے، تو اس واقعہ کو دیت پر قیاس کرنا قیاس مع الفارق ہے۔

☆ چونکہ اس میں سود وغیرہ کے خطرات ہیں، اس لئے شریعت نے اس کی اجازت نہیں دی ہے، لیکن چونکہ انسان کو اس کی ضرورت پڑتی ہے تو اس کی بہتر صورت یہ ہے کہ کمپنی والا جو چیز فروخت کر رہا ہے اور اس پر جو زائد رقم لے رہا ہے تو اس کو چاہئے کہ وہ اس زائد رقم کو اصل قیمت، یعنی ثمن میں ملا دے اور اس چیز کو مہنگا کر کے بیچ دے، تا کہ جو ربا کا وہم ہو رہا ہے وہی ختم ہو جائے اور پھر وہ کمپنی والا بطور تبرع کہہ دے کہ ہم تمہارے نقصان کے ذمہ دار اتنی مدت تک رہیں گے۔

☆☆☆

تکافل کی شرعی صورت

ڈاکٹر عبدالعظیم اصلاحی [1]

اسلامی فقہ اکیڈمی کے چوتھے اجلاس منعقدہ حیدرآباد (۱۹۹۱ء) میں غالباً یہ تجویز پاس ہوئی تھی کہ بتلا یہ اپنے حالات کو دیکھتے ہوئے اور اللہ تعالی کے حضور جوابدہی کو ملحوظ رکھتے ہوئے جان ومال کی حفاظت کے لئے (جو کہ مقاصد شریعت میں داخل ہے) انشورنس کرا سکتا ہے۔ اس وقت کے حالات کو دیکھتے ہوئے یہ بہت مناسب فیصلہ تھا۔ یہ باعث اطمینان ہے کہ اکیڈمی انشورنس کے اسلامی نعم البدل کی تلاش سے غافل نہیں رہی اور اب برصغیر ہند میں تکافل کے مسئلہ کو زیر بحث لارہی ہے، یہ چیز اس بات کی غماز ہے کہ اکیڈمی کے اندر حالات حاضرہ اور عالم اسلام میں ہونے والے تغیرات سے آگہی اور فقہ وفتاوی کی دنیا میں ہونے والے تطورات پر نظر ہے۔

اقتصادی مصائب اور ناگہانی آفات میں ایک دوسرے کی دستگیری اور تعاون اسلامی روح کے عین مطابق ہے۔ خیر القرون میں ہمیں اس کے متعدد نمونے ملتے ہیں۔ مثلاً عاقلہ کا نظام، اشعریوں کا طرز عمل، بیت المال سے امداد، وضع جائحہ وغیرہ۔

اہل مغرب نے اس نیک کام کو ایک ادارہ کی شکل دے کر اس کو ایک منافع بخش ذریعہ بنالیا جس کو انشورنس یا بیمہ کے نام سے جانتے ہیں۔ عصر حاضر میں انشورنس کے ذریعہ جان ومال کے تحفظ اور تلافی مافات کے اس نظام میں غرر، قمار اور ربا شامل ہوتا ہے جو مسلمانوں کے لئے قابل قبول نہیں ہوسکتا، اسی وجہ سے اس کے اسلامی بدل کی تلاش گذشتہ صدی کے شروع سے رہی ہے۔ اس طرح کی سب سے پہلی کوشش نظام حیدرآباد کے عہد میں ہوئی جس کا ذکر ڈاکٹر محمد حمید اللہؒ نے اپنی کئی تحریروں میں کیا ہے

(حمید اللہ محمد: Hamidullah Muhammad (1951) "Islamic Insurance" Islamic Review, London: vol 39, Nos.3_4, pp.45_46. (1955) "Haidarabad's contribution to Islamic Economic Thought and practice" Die welt Des Islams, Leiden, vol.IV, pp.73_78)_

لیکن " آں قدح بشکست وآں ساقی نماند"۔ زمانہ کی الٹ پھیر کی وجہ سے وہ طریقہ نہ رواج پاسکا اور نہ باقی رہا۔

حیدرآباد میں رائج انشورنس امداد باہمی (Mutuality) کی بنیاد پر تھا جس کو آج کل تامین تبادلی بھی کہتے ہیں۔ یہ کمپنی تجارتی کمپنی کے تحت چلانے کے بجائے ممبران خود اپنے زر اشتراک سے اس کا انتظام کرتے ہیں، وہی اس سے مستفید ہوتے ہیں اور خود اس کے مالک ہوتے ہیں۔ اس طرح کے انشورنس کی مثالیں اب بھی بعض ملکوں میں پائی جاتی ہیں

(الجمل، محمود El_ Gamal, Mahmoud (2006) Islamic Finance: Law, Economics and Practice, Cambridge, Cambridge University Press, pp.160_174)_

یہ طریقہ کسی خاص گروپ میں یا کسی متعین جگہ کامیاب ہوسکتا ہے، لیکن اس وسیع پیمانے پر اس کو چلانے میں دشواری ہوتی ہے۔

انشورنس کے لئے عربی میں تامین کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں۔ کونشنل انشورنس یا تقلیدی ومغربی انداز کے تامین سے اسلامی انشورنس کو ممیز کرنے کے لئے بعض اہل قلم "تامین اسلامی" کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں، مگر زیادہ تر محققین اس کے لئے صرف "تکافل" کے استعمال کو ترجیح

[1] پروفیسر شعبہ اسلامی معاشیات، ملک عبدالعزیز یونیورسٹی جدہ، سعودی عرب۔

دیتے ہیں۔ اور اب اسلامی انشورنس کے لئے اس لفظ نے ایک مستقل اصطلاح کی جگہ لے لی ہے، گوکہ بعض حلقے اب بھی اس کو تامین تعاونی کہتے ہیں۔ ولا مشاحۃ فی الاصطلاح۔

علمی وعملی دنیا میں اس وقت تکافل کے دو نمونے رواج پذیر ہیں: (۱) تبرع پر مبنی تکافل، (۲) وقف پر مبنی تکافل۔

۱۔ تبرع پر مبنی تکافل:

تکافل کے اندر کسی نہ کسی درجہ میں غرر کے پائے جانے کا احتمال ہوتا ہے، اس لئے اس کے قیام کے لئے اکثر اہل علم نے تبرع (عطیہ: Donation) کا طریقہ تجویز کیا ہے، کیونکہ تبرع کے سلسلہ میں بعض مکاتب فقہ کے یہاں زیادہ وسعت ہے، بہ نسبت معاوضہ پر مبنی معاملات کے (السعد، احمد محمد (۲۰۱۱ء) "تطبیقات التصرف فی الفائض التأمینی" الاوراق والبحوث المقدمۃ فی الملتقی الثالث للتأمین التعاونی، المنعقد خلال المدۃ ۱۲۔ ۱۳/۱/۱۴۳۳ھ الموافق ۷۔ ۸/۱۲/۲۰۱۱ء الریاض صفحہ ۴۳)۔ اس کا طریقہ یہ ہوگا کہ کچھ صاحب خیر مل کر اپنے عطایا سے ایک تکافل فنڈ قائم کریں جو اس فنڈ کے موسس ممبران ہوں گے۔ تکافل کے خواہش مند دوسرے افراد بھی اس میں تبرعاً شریک ہوتے رہیں گے۔ یہ فنڈ کسی کی ملکیت نہیں ہوگا، بلکہ اس کی حیثیت "شخص اعتباری" یا انسان قانونی" کی ہوگی۔ اس فنڈ کے اصول کے مطابق جس ممبر کو بھی کوئی مالی یا حادثاتی ضرر لاحق ہوگا اس سے اسکی تلافی کی جائے گی۔ اس فنڈ میں جمع سرمایہ کو معطل رکھنے کے بجائے کسی نفع بخش حلال کاروبار میں لگایا جائے، تاکہ اس فنڈ میں اضافہ ہوتا رہے۔ اس فنڈ کے انتظام وانصرام کے لئے ممبران اپنے میں سے کچھ لوگوں کو منتخب کرلیں گے۔ چونکہ ممبران میں ایسے افراد کا ملنا ہمیشہ ممکن نہیں ہوگا جو کہ اس کو پیشہ ورانہ مہارت کے ساتھ چلاسکیں، اس لئے اس کا بہتر طریقہ یہ ہوگا کہ کسی کمپنی سے اس کا معاملہ ہوجائے کہ وہ ممبران کی طرف سے "وکالۃ" اس کا انتظام وسرمایہ کاری کرے گی جس کے لئے وہ طے شدہ معاوضہ کی مستحق ہوگی (ملاحظہ ہو: عبید اللہ، محمد: Obaidullah Mohammad (2005)) Islamic Financial Services Jeddah, Scientific Publishing Centre, KAU, pp.130-132)۔ وہ معاوضہ اس فنڈ اور اس کے نفع میں سے ادا کیا جائے گا۔ سال کے اختتام پر حساب ہوگا کہ کل جمع رقم اور نفع میں سے تکافل کے مستحقین (متضررین) اور مشترکہ منتظمہ کے معاوضہ کے بعد اگر کچھ سرپلس (فاضل رقم) بچ رہی تو وہ بقیہ ممبران کو لوٹادی جائے گی (یا بعض کی رائے کے مطابق تکافل فنڈ میں جمع رہے گی اور اگر خسارہ رہا، یعنی رقم کم پڑگئی تو ممبران اس کو اپنے مزید عطایا سے پورا کریں گے۔ یا مشترکہ منتظمہ فنڈ کے لئے قرض لے گی جو آئندہ تبرعات اور نفع سے ادا کیا جائے گا۔

یہ بھی ہوسکتا ہے کہ کوئی کمپنی تکافل فنڈ کی تاسیس قرض حسن سے کردے، پھر تکافل کے خواہاں ممبران کے تبرعات حاصل ہونے کے بعد وہ اپنا قرض حسن واپس لے لے۔ اور تکافل کا انتظام ممبران کی طرف سے وکالۃ بمعاوضہ کرتی رہے۔ اس طرح کمپنی کا قائم کردہ فنڈ کمپنی کی ملکیت نہیں ہوگا، بلکہ اس کا الگ قانونی وجود یا شخصیت اعتباری ہوگی۔ تکافل کے اس طریقہ کو تکافل بطریق وکالۃ کہہ سکتے ہیں۔ سعودی عرب میں اس کو بینک الجزیرہ خاص طور پر اور کچھ دوسرے ادارے اپنائے ہوئے ہیں۔

تبرعی تکافل کے فنڈ کی دیکھ ریکھ اور سرمایہ کاری کا ایک دوسرا طریقہ "مضاربت" کی بنیاد پر بھی ہوسکتا ہے جو خاص طور پر سوڈان، ملیشیا اور کچھ دوسرے ملکوں میں رائج ہے۔ شرکۃ منتظمہ (یا کوئی تقلیدی انشورنس کمپنی) تکافل فنڈ کو پیشہ ورانہ مہارت کے ساتھ مضاربت کے اصول پر سرمایہ کاری کرے گی (ایضاً صفحات: ۱۲۹۔ ۱۳۰)۔ اور انتظامی اخراجات کے وضع کرنے کے بعد نفع نکلتا ہے تو طے شدہ نسبت (یا فیصد) کے حساب سے منتظمہ کمیٹی (مضارب) اپنا نفع لے گی اور بقیہ نفع اور اصل تکافل فنڈ کو لوٹادیا جائے گا۔ سال کے آخر میں تکافل فنڈ سے متضررین (حادثہ کے شکار) لوگوں کی تلافی کے بعد اگر فاضل رقم (Surplus) بچتی ہے تو وہی فاضل رقم یا تو ممبران کو لوٹادی جائے گی یا تکافل فنڈ میں شامل کردی جائے گی اور نئے سال کے تبرع میں اسی حساب سے انہیں کم دینا پڑے گا۔ یہ فاضل رقم یا نفع جس کو عربی میں فائض تامینی (Takaful Surplus) کہتے ہیں اس کے ساتھ کیا معاملہ ہو یہ بجائے خود ایک بحث کا موضوع ہے (ریاض (سعودی عرب) میں رابطہ عالم اسلامی کی جانب سے قائم الھیئۃ الاسلامیۃ العالمیۃ للاقتصاد والتمویل نے اپنا تیسرا سیمینار صرف اسی مسئلہ پر غور وخوض کے لئے ۱۲۔ ۱۳ محرم ۱۴۳۳ھ مطابق ۷۔ ۸ دسمبر ۲۰۱۱ء منعقد کیا،

۷۷۶ صفحات پر مشتمل اس سمینار کے مقالے مطبوعہ شکل میں موجود ہیں)، مگر ہم نے سہولت اور اختصار کے پیش نظر ایک رائے یہاں تحریر کردی ہے۔

۲۔ وقف پر مبنی تکافل:

اس کے سرگرم داعی وحامی مفتی محمد تقی عثمانی صاحب ہیں (عثمانی، محمد تقی (۱۴۲۶) "تأصیل التأمین التکافلی علی أساس الوقف" بحث قدمه فی الندوة السادسة والعشرین من ندوات البرکة المنشور فی حولیة البرکة، العدد الثامن، رمضان ۱۴۲۷ھ)، اس طریقہ کے مطابق ساؤتھ افریقہ اور پاکستان میں بعض جگہ تکافل کا نظام قائم ہے۔ اس کے لئے کوئی ادارہ یا کوئی صاحب خیر وقف قائم کرے گا۔ جس میں مستفیدین بھی وقف فنڈ کے لئے رقوم دیں گے جو کہ وقف کی ملکیت ہوگا۔ چونکہ وقف میں یہ جائز ہے کہ واقف بھی من جملہ مستفیدین ہو، اس لئے وقف پر مبنی تکافل کے قائلین اس کو تبرع پر مبنی تکافل کے مقابلہ میں زیادہ صحیح سمجھتے ہیں، کیونکہ تبرع بمقابل تبرع یا ہبۃ الثواب کو بعض مدارس فقہ صحیح نہیں سمجھتے۔

''وقف برائے تکافل'' کے اوپر وقف کے احکام منطبق ہوں گے۔ وقف کرنے والی کمپنی، ادارہ یا اشخاص اس کے مالک نہیں ہوں گے۔ بلکہ اس وقف کی حیثیت ''شخص اعتباری'' کی ہوگی۔ وقف کے ذریعہ قائم تکافل فنڈ کے سرمایہ کو کسی نفع بخش کاروبار میں لگانے کے لئے وقف کے منتظمین کسی پیشہ ور ماہر کمپنی کی خدمات حاصل کریں گے، تاکہ اس فنڈ میں اضافہ ہوتا رہے۔ کمپنی وکالۃ اجرت پر یا علی وجہ المضاربۃ طے شدہ فی صد نفع میں شرکت کے اصول پر اس فنڈ کی سرمایہ کاری کرے گی۔ اخراجات کاروبار کے وضع کرنے کے بعد اگر نفع ہوتا ہے تو مضارب کمپنی اپنے حصہ کا نفع لے لے گی اور بقیہ نفع وقف کے تکافل فنڈ میں شامل کردیا جائے گا جو متضررین (نقصان یا حادثہ کے شکار) کی مدد کے لئے کام آئے گا۔ اس وقف کے شرائط کے مطابق تکافل کے خواہش منداس وقف فنڈ کو اپنے عطایا فراہم کریں گے جو وقف کی ملکیت ہوں گے، نہ کہ بذات خود وقف۔ اس فنڈ کے مصیب زدہ شرکاء کا استفادہ اس رقم کے بدلے میں نہیں ہوگا جو انہوں نے عطا کیا ہے، بلکہ وقف کے من جملہ مستفیدین میں ہونے کی وجہ سے ہوگا۔

خاتمہ کلام:

تکافل کے مذکورہ بالا مختلف طریقوں پر عمل وتجزیہ کے ساتھ ساتھ اب بھی ان کے متعدد پہلوؤں پر غور وخوض، بحث وتمحیص اور مناقشہ وتبادلہ افکار کا سلسلہ جاری ہے (ابو زید، عبد العظیم (۲۰۱۱) "البناء الشرعی الأسلم للتأمین الاسلامی (تکافل) بحث قدمه فی المؤتمر العالمی الثامن للاقتصاد الاسلامی والتمویل المنعقد فی دوحة (قطر) اثناء ۱۹-۲۱ دسمبر ۲۰۱۱ء صفحات: ۲۷)۔ تکافل کا کوئی ایسا طریقہ نہیں ہے جس کے تمام شقوں پر سب متفق ہوں۔ نئے معاملات کے سلسلہ میں اس طرح کی صورتحال کا پایا جانا کوئی تعجب خیز چیز نہیں ہے۔ ایک مسلمان اس کا مکلف ہے کہ جہاں تک ہو سکے منہیات سے بچتے ہوئے زندگی گذارے۔ {فاتقوا الله ما استطعتم} (سورہ التغابن: ۱۶)۔ ہندوستان میں تکافل کون سا نمونہ یا طریقہ قابل عمل ہے اس کا فیصلہ وہاں کے دینی واخلاقی حالت اور ملکی قوانین کو سامنے رکھ کر فیصلہ کیا جاسکتا ہے۔ اس تحریر میں تکافل کا ایک مختصر نظریاتی تعارف پیش کیا گیا ہے۔ اس کے عملی قیام کا عزم رکھنے والوں کو تکافل کے ہر نمونہ کا تفصیلی مطالعہ اور مختلف ملکوں میں ہونے والے تجربات سے واقفیت ضروری ہے جس پر اب کافی مواد عربی اور انگلش میں موجود ہے۔ اس سلسلہ میں ''تکافل'' کی ویب سائٹس سے بھی استفادہ کیا جاسکتا ہے۔

تامین یا تکافل (انشورنس) کا متبادل

مولانا ابوجندل قاسمی [1]

سترہویں صدی کے بعد دنیا میں جو انقلاب آیا اور اقتصادی ومعاشی ترقی کے وسیع تر مواقع پیدا ہوئے ان کی وجہ سے جہاں انسان کے لئے آسانیاں بڑھی ہیں وہاں مشینی انقلاب نے خطرات میں بھی اضافہ کیا ہے، انسان قدم قدم پر خطرات سے گھرا ہوا ہے، خطرات کے اس دور میں انسان چاہتا ہے کہ ایسے خطرات سے اس کا تحفظ ہو اور اگر حادثہ پیش آجائے تو معاشی اعتبار سے وہ نا قابل برداشت نہ ہو، موجودہ دور میں جان، مال، صحت اور مختلف ضرورتوں سے متعلق انشورنس کا آغاز دراصل اسی مقصد کے لئے ہوا ہے، کہ جو خطرات تنہا کسی انسان کے لئے قابل برداشت نہ ہوں اسے بہت سے لوگ مل کر برداشت کرلیں، اور آپس میں ترحم وتعاون کا جذبہ پیدا ہو۔

مگر نہایت افسوس کی بات ہے کہ اس اچھے مقصد کو حاصل کرنے کے لئے اہل مغرب خصوصاً یہودی ساہوکاروں نے ایسا طریقہ کار وضع کیا ہے جس سے ان کے لئے زراندوزی اور نفع خوری آسان ہوجائے، اور انشورنس، نیز تعاون وامداد کے دل فریب عنوان سے اپنا جال بچھایا اور اس زور وشور سے پروپیگنڈہ کیا کہ آج ہر شعبہ زندگی کی طرح تعاون وامداد کا یہ شعبہ بھی پوری طرح ان کی گرفت میں ہے، جبکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ انشورنس تعاون وامداد سے کوسوں دور ہے، ربا وقمار کا یہ معجون مرکب، مسلمانوں کے لئے نا قابل عمل اور نا قابل قبول ہے۔ اس یہودی نظام نے ہماری دنیا بھی خراب کر رکھی ہے اور آخرت بھی۔

اس میں شک نہیں کہ انشورنس کی مختلف صورتیں مروج ہیں جن کے کچھ دنیاوی فوائد ضرور ہیں، لیکن ان میں سے اکثر صورتیں قمار اور ربا پر مشتمل ہونے کی وجہ سے ناجائز وحرام ہیں، اس لئے ظاہر ہے کسی حیلہ سے اس کو جائز نہیں کیا جاسکتا، البتہ شریعت اسلامیہ جو آفاقی وہمہ گیر شریعت ہے، اس میں زندگی کے تمام مسائل کا حل موجود ہے، حیات انسانی کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جس میں شریعت رہنمائی ورہبری نہ کرتی ہو، قیامت تک پیش آمدہ مسائل ومشکلات اور نت نئے معاملات کا واضح، مفید اور قابل قبول حل صرف اور صرف اسلامی شریعت میں موجود ہے، اس لئے ضرورت ہے کہ انشورنس کا کوئی متبادل نظام پیش کیا جائے، تاکہ امت مسلمہ کے لئے نقصانات کی تلافی کا کوئی جائز حل نکل آئے۔

قابل مبارک باد ہیں ''اسلامک فقہ اکیڈمی'' کے منتظمین وارکان جنہوں نے اپنے ۲۱ ویں فقہی سمینار کے لئے اس اہم موضوع کو بحث وتحقیق کے لئے رکھا ہے۔

اس سلسلے میں چند تجاویز پیش خدمت ہیں:

۱۔ اسلام میں باہمی اخوت ومحبت، احسان وسلوک، رحم وکرم، اور تعاون وہمدردی پر کافی زور دیا گیا ہے، اور اس بات کی بطور خاص تاکید کی گئی ہے کہ انسان مشکل وقتوں میں دوسرے انسان کے کام آئے، ضرورت مندوں کی ضرورت کا خاطر خواہ خیال رکھے، دوسروں کے ساتھ احسان کا معاملہ کرے، بلکہ حدیث شریف میں خیر خواہی کو ہی دین قرار دیا گیا ہے، "الدین النصیحة" (صحیح بخاری ۱؍۱۳، صحیح مسلم ۱؍۵۵)۔

اسلام نے مسلم معاشرہ کو ایک ایسی عمارت سے تعبیر کیا ہے جس کی اینٹ پتھر وغیرہ ایک دوسرے سے جڑے ہوتے ہیں اور اسی وجہ سے ان کو قوت حاصل ہوتی ہے، ارشاد نبوی ﷺ ہے: ''المؤمن للمؤمن کالبنیان یشد بعضه بعضاً'' (صحیح بخاری ۱،۲۲۱، صحیح

[1] خادم تفسیر وحدیث مدرسہ قاسم العلوم تیوڑہ، مظفر نگر یوپی۔

مسلم ۲،۲۲۱) (مومن مومن کے لئے عمارت کی طرح ہے کہ بعض کو بعض کے ذریعہ قوت حاصل ہوتی ہے)۔

اور کبھی اہل اسلام کو باہم ایک دوسرے پر شفقت ومحبت اور رحمدلی کی ترغیب دیتے ہوئے انہیں ایک جسم سے تعبیر کیا گیا ہے، جس میں کسی ایک عضو کو تکلیف ہونے سے پورے جسم کو تکلیف ہوتی ہے:

''مثل المؤمنين فی توادهم وتراحمهم وتعاطفهم مثل الجسد إذا اشتكى منه عضو تداعى له سائر الجسد بالسهر والحمى'' (بخاری ۲،۹۸۸، مسلم ۲،۱۲۲)۔

ایک حدیث شریف میں فرمایا گیا: ''المسلم أخو المسلم لا يظلمه ولا يسلمه من كان فی حاجة أخيه كان الله فی حاجته، ومن فرج عن مسلم كربة فرج الله عنه بها كربة من كرب يوم القيامة'' (بخاری ۱،۳۳۰، مسلم ۲،۳۲۰)

(مسلمان مسلمان کا بھائی ہے، نہ وہ اس پر ظلم کرے اور نہ اس کی مدد کرنا ترک کرے، جو شخص اپنے بھائی کی ضرورت پوری کرتا ہے، اللہ تعالی اس کی ضرورت پوری کرتا ہے، اور جو شخص کسی مسلمان کی پریشانی دور کرے (یعنی دور کرنے کی کوشش کرے) تو اللہ تعالی اس کی وجہ سے اس کی آخرت کی پریشانی دور فرماتا ہے۔

ان گرانقدر تعلیمات کے تناظر میں دیکھا جائے تو ملت اسلامیہ کے تمام افراد کی ذمہ داری بنتی ہے کہ وہ معاشرہ میں باہمی تعاون کی فضا قائم کریں، اور ایسا ماحول بنائیں کہ ہر شخص حاجت مندوں کی حاجت کے تئیں فکرمند ہو، ان کی ناگہانی مشکلات کے حل کرنے میں کوشاں ہو، اس سلسلے میں ایسے فنڈ قائم کئے جائیں جس میں ہر صاحب استطاعت اپنی استطاعت کے مطابق یا ایک متعینہ رقم تبرع و بھائی چارگی کے طور پر جمع کرے اور بلا کسی متعینہ رقم کی شرط کے بوقت ضرورت کسی حادثہ یا پریشانی کے وقت میں معاشرہ کے کسی بھی فرد کا اس فنڈ سے تعاون کیا جائے، خود رقم جمع کرنے والے کو بھی کوئی ناگہانی مصیبت پہنچ جائے تو اس کا بھی تعاون کیا جائے، تو اس طرح انشاء اللہ بڑے سے بڑے حادثات وخطرات میں ایک دوسرے کے نقصان کی تلافی ہو جائے گی، اور لوگ عند اللہ اجر عظیم کے بھی مستحق ہوں گے۔

اے کاش کہ قوم مسلم خصوصاً ارباب مال خدمت خلق کے اس مخلصانہ جذبے کے حامل ہو جائیں اور اس طرح کے تشکیل دادہ فنڈ کے جو ذمہ دار بنائے جائیں، ان کی امانت و دیانت قابل صد رشک بھی ہو جائے تو ؎

مشکلے نیست کہ آسان نہ شود

۲۔ دوسری شکل ''تامین تعاونی'' کی ہے، اس کا حاصل یہ ہے کہ وہ لوگ جن کے خطرات ایک ہی نوعیت کے ہوتے ہیں وہ آپس میں مل کر ایک فنڈ بنا لیتے ہیں اور یہ طے کر لیتے ہیں کہ ہم میں سے کسی کو کوئی حادثہ پیش آیا تو اس فنڈ سے اس کے نقصان کی تلافی کی جائے گی، اس فنڈ میں صرف ممبران کی رقم ہوتی ہے اور نقصان کی تلافی بھی صرف ممبران کی حد تک ہوتی ہے، ایک سال کے بعد یا کسی بھی مدت متعینہ کے بعد حساب کر لیا جاتا ہے، اگر ادا کئے گئے معاوضات فنڈ کی رقم سے بڑھ جائیں تو اسی حساب سے ممبران سے مزید وصول کر لی جاتی ہے، اور اگر فنڈ میں رقم بچ جائے تو ممبران کو بحصۂ رسدی واپس کر دی جاتی ہے، یا ان کی طرف سے آئندہ سال کے لئے فنڈ میں حصے کے طور پر رکھ دی جاتی ہے، ابتداء ''بیمے'' کی یہی شکل چلی تھی اور شرعاً اس میں کوئی قباحت نہیں (اسلام اور جدید معیشت وتجارت ر ۱۹۶)۔

۳۔ تیسری شکل ''اجتماعی مضاربت'' کی ہوسکتی ہے کہ چند افراد مل کر ایک کمیٹی و کمپنی تشکیل دیں، اور اس کے جو ممبر مقرر ہوں وہ ہر ماہ معین رقم اس میں جمع کرتے رہیں اور مضاربت کے اصول کے مطابق اس جمع شدہ رقم سے تجارت کی جائے، یا کوئی ایسی کمپنی جو مضاربت کے شرعی اصولوں کی بنیاد پر تجارت کرتی ہو اس کے شیئرز خرید لئے جائیں اور جب کسی ممبر کو کوئی ناگہانی مصیبت وحادثہ لاحق ہو تو کمپنی ایک ریزرو فنڈ سے اس کے نقصان کی تلافی کرے، اور سال کے ختم پر سرمایہ کے فیصد کے حساب سے ہر ممبر کو نفع تقسیم کرے، اور اگر بالفرض کوئی ممبر کمپنی سے علاحدگی اختیار کرنا چاہے تو اس کی اصل رقم مع منافع واپس کر دی جائے (مستفاد جواہر الفقہ جلد دوم)۔ ☆☆☆

اسلامی انشورنس اور اس کی شکلیں

مفتی ظہیر احمد[1]

ناگہانی آفات ومصائب کے نقصانات کی تلافی اور اس کے ازالہ کے لئے مصیبت زدہ افراد کی امداد کی چند شکلیں ہوسکتی ہیں:

۱۔ چندلوگ مل کر ایک مشترکہ فنڈ مذکورہ بالا مقصد کے حصول کے لئے قائم کریں اور اس فنڈ سے صرف اور صرف ممبر حضرات ہی مستفید ہوں۔

۲۔ چند مخیر حضرات ایک عمومی فنڈ قائم کریں، تاکہ مصیبت کے وقت اس فنڈ سے مصیبت زدہ انسانوں کی مدد کی جائے۔

۳۔ ایک عمومی فنڈ تمام لوگوں کے تعاون سے قائم کیا جائے، جس سے تمام لوگ ناگہانی آفات ومصائب میں مبتلا ہونے پر مستفید ہوسکیں۔

ان تینوں شکلوں کو فقہ کی اصطلاح میں تامین تعاونی رتکافل تعاونی کہا جاسکتا ہے۔

حیث قال الشیخ وہبۃ الزحیلی فی کتابہ: "الفقہ الاسلامی وادلتہ":

"لا شك فى جواز التأمين التعاونى فى الإسلام، لأنه يدخل فى عقود التبرعات ومن قبيل التعاون على البر؛ لأن كل مشترك يدفع اشتراكه بطيب نفس لتخفيف آثار المخاطر وترميم الأضرار التى تصيب الحد المشتركين أيا كان نوع الضرر سواء فى التأمين على الحياة أو الحوادث الجسمانية أو على الأشياء (بسبب الطريق أو السرقة أو موت الحيوان) أو ضد المسؤولية من حوادث السير أو ......"۔

۴۔ حکومت اپنے ہر ہر ڈپارٹمنٹ کے ملازمین کے مشاہرہ سے ایک مخصوص رقم جبراً وضع کرے، اور وہ مصائب وآفات کے وقت اس فنڈ سے اس شعبہ کے ملازم کی مدد کرے۔

جیسے ہندوستان میں پنشن اور پراویڈنٹ فنڈ کے لئے حکومت جبراً رقم وضع کرتی ہے، اور پھر بعد میں اس فنڈ سے اس کی مدد کرتی ہے۔

۵۔ حکومت اپنی رعایا کی فلاح وبہبود کے لئے ایک مخصوص مقدار مقصد کے لئے ہر ہر فرد سے یا مختلف مقدار مختلف افراد سے سالانہ ماہانہ وصول کرے۔ پھر اسی تناسب سے ان افراد کی مدد کرے، جیسا کہ سعودیہ میں تامین صحی کے نام سے ہر فرد سے ایک رقم وصول کی جاتی ہے اور اس کی وصول شدہ رقم کے موافق اس کو علاج مہیا کرایا جاتا ہے۔

اسی طرح ناگہانی مصیبت کے وقت مدد کے لئے بھی اس طرح مخصوص مقدار مخصوص اشخاص سے وصول کر کے مصیبت کے وقت وصول شدہ رقم کے تناسب سے ان افراد کی مدد کی جاسکتی ہے، شرعاً اس میں کچھ بھی قباحت نہیں۔

۶۔ اسی طرح حکومت ہوائی سفر میں یا ریل کے سفر میں جو اضافی رقم برائے انشورنس وصول کرتی ہے اور ناگہانی حادثہ کے وقت حادثہ کے شکار افراد کی مدد اور دوا وعلاج کرتی ہے، یہ بھی شرعاً درست ہے۔

موخر الذکر تینوں شکلوں کو فقہ کی اصطلاح میں تامین اجباری کہا جاسکتا ہے۔ حیث قال الشیخ وہبۃ الزحیلی:

"ويجوز أيضاً للمؤمن له التأمين الإلزامى كالتأمين المقروض على السيارات ضد الغير وتجوز التامنات الاجتماعية ضد...... لأنه بمثابة دفع ضريبة للدولة كالتأمين المقروض على السيارات ضد الغير۔

---

[1] مدرسہ جامع العلوم پٹکاپور، کانپور یوپی۔

ولا مانع من جواز التأمين الاجتماعي ضد الطوارئ العجز والشيخوخة والمرض والبطالة والتعاعد عن العمل الوظيفي، لأن العولة مطالبة برعاية رعايا في مثل هذه الأحوال ولخلوه من الربا والغرر والمقامرة۔

وقد أجاز المؤتمر علماء المسلمين الثاني في القاهرة عام (۱۳۸۵ھ، ۱۹۶۵ء) ومؤتمر علماء المسلمين السابع عام (۱۳۹۲ھ، ۱۹۷۲ء) كلا من التأمين الاجتماعي والتعاوني وهو ما قرره مجمع الفقه الاسلامي في مكة المكرمة عام (۱۳۹۸ھ، ۱۹۷۸ء)، وكذا أجازه في نفس المرجع'' (الفقه الاسلامی وادلتہ ۵، ۳۴۲۰)۔

اور'' فتاوی محمودیہ'' میں ہے:

اگر مقصود یہ ہے کہ مالک کو اعتماد حاصل ہو اور کام کرنے والے کے نقصان کے وقت ضرورت سے تلافی کی جائے تو یہ بیمہ کے حکم میں نہیں، اگر چہ اس کا نام بھی بیمہ ہے، انگلی وغیرہ کٹ جانے سے جو رقم ملے اس کا لینا درست ہے (فتاوی محمودیہ ۲۴ / ۴۵۵)۔

۷۔ املاک کا بیمہ بھی شرعاً درست ہوگا اگر بیمہ حکومت کرے یا اس کی طرف سے مجاز کوئی کمپنی کرے، کیونکہ املاک کے بیمہ کی اقساط ایک طرح کا تعاون ہے، تاکہ اس فنڈ کے ذریعہ ناگہانی حادثہ پیش آنے پر متاثرہ افراد کی مدد کی جائے، گوکہ یہ اقساط اجباری طور پر وصول کی جاتی ہیں، اگر بیمہ کمپنی حکومت کی ہے تو پھر التزام مالا یلزم لازم نہیں آتا۔

لیکن اگر بیمہ کمپنی شخصی ہے تو وہ'' سوکرہ'' ہے جس کو التزام (مالا یلزم مانا جائے گا)۔

۸۔ نقل وحمل کا کام کرنے والی کمپنیوں کا بیمہ بھی شرعاً درست ہوگا، اگر بیمہ کمپنیاں حکومتی ہیں، ورنہ درست نہیں (دیکھئے: جدید تحقیقات فقہیہ ۴ / ۴۳۰، ۴۶۲، ۴۵۳، ۴۴۸، ۴۷۹، ۴۸۰-۴۸۳، ۴۸۳)۔ واللہ تعالی اعلم بالصواب۔

☆☆☆

نظام تکافل۔ایک شرعی جائزہ

مولانا عبداللطیف پالنپوری[1]

تکافل کے معنی ہیں باہم ایک دوسرے کا ضامن بننا، یا باہم ایک دوسرے کی دیکھ بھال کرنا، نظام تکافل میں تمام شرکاء امداد باہمی اور تبرع کی بنیاد پر ایک دوسرے پر پیش آنے والے خطرات کو برداشت کرتے ہیں، جو شریعت کی نظر میں پسندیدہ امر ہے، جیسا کہ آیت کریمہ: {وتعاونوا علی البر والتقوی} (مائدہ:۲) اور {إنما المؤمنون إخوة} (الحجرات:۱۰) کے پیش نظر ظاہر ہے، اور شریعت میں اس کی نظیر عاقلہ پر دیت کی صورت میں موجود ہے۔

اور ممکنہ خطرات سے بچاؤ کے لئے اگر جائز طریقہ کار کے مطابق تدابیر اختیار کی جائیں تو مزاج شریعت اور توکل کے خلاف نہیں ہے، جیسا کہ اس کی نظیر شریعت میں ضمان الدرک کی صورت میں موجود ہے۔

"ضمان الدرك" کی صورت یہ ہے کہ کوئی شخص ایک چیز خریدتے ہوئے ڈر رہا ہے، تو دوسرا شخص اس کو اطمینان دلائے کہ خرید لو اگر کوئی مسئلہ ہوا تو میں ذمہ دار ہوں، نقصان کی صورت میں خریدار کو اس بات کا اختیار ہوتا ہے کہ یا تو وہ فروخت کنندہ سے اصل قیمت اصول کرے، یا پھر ضمان سے وصول کرے۔

تکافل کا جائز طریقہ کار:

۱۔ نظام تکافل روایتی انشورنس کے متبادل کے طور پر ایک اسلامی انشورنس ہے، دونوں میں بنیادی فرق یہ ہے کہ نظام تکافل جس کو "التأمین التعاونی" بھی کہتے ہیں اس کا مدار عقد تبرع پر ہے، جس میں جہالت وغرر مضر نہیں ہے، نیز اس میں ربو کا ارتکاب بھی لازم نہیں آتا ہے، شریک تکافل جو رقم جمع کرواتا ہے وہ اس کی طرف سے تبرع ہے، اسی طرح حادثہ کی تلافی کے لئے شریک کو جو رقم نظام تکافل کی طرف سے دی جاتی ہے وہ بھی تبرع ہے، جبکہ روایتی انشورنس کی بنیاد عقد معاوضہ پر ہے، اور عقد معاوضہ میں جہالت اور غرر مضر ہے، اور ربوا حرام ہے۔

۲۔ نظام تکافل کی حیثیت ایک شخص قانونی کی ہوگی اور اس نظام میں شرکت کرنے والے (شیئر ہولڈر) حصہ دار کہلائیں گے، اور اس شخص قانونی کی نمائندگی کے لئے حصہ داروں میں سے ہی چند افراد پر مشتمل ایک مجلس بنائی جائے جو پورے تکافل نظام کو سنبھالے گی، اور اس کو مجلس الادارہ (بورڈ آف ڈائریکٹر) کہا جائے گا، اور اس نمائندہ مجلس کی حیثیت وکیل یا مضارب کی ہوگی، اور مجلس کا انتخاب حصہ داروں کی مرضی یا ان کے ووٹ کی بنیاد پر ہوگا۔

۳۔ نظام تکافل میں سب سے پہلے کمپنی کے شیئر ہولڈر کچھ رقم باقاعدہ وقف کریں، اور اس رقم سے ایک وقف فنڈ قائم کیا جائے، اور اس وقت فنڈ سے ممبران کا تعلق محض عقد تبرع کا ہوگا، اور وقف فنڈ پر ان ممبران کی کوئی ملکیت باقی نہیں رہے گی، بلکہ وقف جو ایک قانونی شخص کی حیثیت رکھتا ہے، وہ اس وقف فنڈ کا مالک ہوگا، البتہ وقف کنندگان نے خود اپنے لئے اور دیگر شرکاء تکافل کے لئے فائدہ حاصل کرنے کی شرط لگائی ہے تو شرط کے مطابق فائدہ حاصل کرنے کے مستحق ہوں گے، لہذا ہر ممبر رقم وقف کرتے وقت یہ شرط ضرور لگادے۔

"ولو قال أرضي موقوفة علی فلان ومن بعده علیّ وعلی فلان أو علی عبدي وعلی فلان المختار أنه يصح"

---

[1] دارالعلوم جامعہ نذیریہ کاکوسی، گجرات۔

(ھندیہ ۲؍۳۷۱)۔

نیز فقہ کا مشہور اصول ہے: ''شرط الواقف کنص الشارع''۔

لیکن یہ بات ملحوظ رہے کہ وقف کی حقیقت یہ ہے کہ اصل شیئ موقوف باقی رہے، اور اس کے منافع جو وقف کے مملوک ہیں خود وقف نہیں ہیں ان کو موقوف علیہم پر شرط کے مطابق خرچ کیا جائے، لہذا شریک تکافل کو اگر کوئی حادثہ پیش آیا تو وقف فنڈ کی اصل رقم سے اس کی تلافی نہ کی جائے، بلکہ وقف فنڈ کے منافع سے حوادث کی تلافی ہوگی، اور حوادث کی تلافی کے بعد باقی ماندہ منافع شرکاء تکافل پر تقسیم ہوں گے۔ اور وقف فنڈ کے منافع سے شرکاء تکافل کو جو فوائد حاصل ہوں گے وہ موقوف علیہم ہونے کی حیثیت سے ہوں گے، نہ کہ واقف ہونے کی حیثیت سے۔

۴۔ وقف فنڈ کے علاوہ شرکاء تکافل سے کچھ رقم بطور عطیات کے وصول کی جائے، یہ رقم وقف نہ ہوگی، بلکہ مملوکِ وقف ہوگی، اور معطین کی ملکیت سے نکل جائے گی، لہذا عطیات کی اس رقم کو کاروبار میں لگانے کے بعد جو منافعہ ہو اس سے اور عطیات کی اصل رقم دونوں سے حوادث کی تلافی کی جاسکتی ہے، کیونکہ یہ رقم وقف نہیں ہے کہ اس کا باقی رہنا ضروری ہو، حوادث کی تلافی کے بعد اگر منافع میں سے کچھ بچ گیا تو شرکاء تکافل کے درمیان تقسیم ہوگا، نفس عطیات کی رقم کو شرکاء تکافل کے درمیان تقسیم نہیں کیا جائے گا۔

۵۔ تکافل نظام کو سنبھالنے والی مجلس الادارہ کی حیثیت چونکہ وکیل یا مضارب کی ہے، اس لئے وقف فنڈ اور عطیات کے منافع میں سے کچھ فیصد حصہ ان کے لئے طے کیا جاسکتا ہے۔ نیز یہ مجلس الادارہ کا پورا انتظام وکاروبار شریعت کے دائرہ میں رہ کر ہو، شریعت کے دائرہ سے خارج نہ ہو اس کی نگرانی کے لئے ایک سہ رکنی شریعہ بورڈ تجویز کیا جائے جو پوری نگرانی رکھے۔

☆☆☆

انشورنس کا شرعی متبادل (تکافل) کی صورت

مولانا محمد ابرار خان ندوی[1]

انشورنس کا شرعی متبادل:

شریعت اسلامیہ جو آفاقی وہمہ گیر وابدی شریعت ہے، حیات انسانی کا کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے جس میں شریعت رہنمائی کرنے سے عاجز ہو، زندگی کے ہر مسئلہ کا حل، اور ہر معاملہ میں واضح رہبری موجود ہے، لہذا انشورنس کی ایسی صورتیں ممکن ہیں جو شریعت کے اصولوں کے مطابق اور لوگوں کی ضروریات کی تکمیل کرتی ہوں، ذیل میں اس کا تذکرہ اختصار کے ساتھ تحریر کیا جاتا ہے۔

انشورنس تکافلی:

انشورنس تکافلی یا تعاونی کی صورت یہ ہے کہ چند افراد مل کر قسط وار معینہ رقم جمع کریں اور درمیان سال کسی شریک کو نقصان یا ضرر لاحق ہو تو اس جمع شدہ رقم سے اس نقصان کی تلافی کردی جائے، تاکہ وہ اقتصادی بدحالی کا شکار نہ ہو، البتہ اس کے جائز ہونے کے لئے درج ذیل شرائط لازمی ہیں:

۱۔ کمپنی حرام کاروبار نہ کرتی ہو۔

۲۔ ربا وسود سے معاملہ خالی ہو۔

مذکورہ شرائط کے ساتھ انشورنس کا یہ طریقہ کار نہایت مستحسن وپسندیدہ عقد ہے، شریعت اسلامیہ میں اس طرح کے معاملات کی نہ صرف اجازت ہے، بلکہ اس نے اپنے ماننے والوں کو اس طرح کے تعاون پر ابھارا ہے۔

ارشاد خداوندی ہے:

{وتعاونوا على البر والتقوى ولا تعاونوا على الإثم والعدوان} (سورہ مائدہ:۲) (نیکی اور تقوی کے کاموں میں ایک دوسرے کا تعاون کرو، گناہ وسرکشی میں ایک دوسرے کا تعاون نہ کرو)۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

''المسلم للمسلم كالبنيان يشد بعضه بعضاً'' (صحيح بخارى كتاب الصلوة باب تشبيك الأصابع فى المسجد، رقم الحديث:۴۸۱)۔ (ایک مسلمان دوسرے مسلمان کے لئے عمارت کی مانند ہے، جس کا ایک حصہ دوسرے کو جوڑے رکھتا ہے)۔

عصر حاضر کے معروف فقیہ علامہ وہبہ الزحیلی نے اس پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے:

''وتجوز التأمينات الاجتماعية ضد العجز والشيخوخة والمرض والتقاعد'' (الفقه الاسلامى وادلته ۴،۴۴۲)۔

(عاجزی، بڑھاپہ، بیماری اور بے بسی کے مسائل حل کرنے کے لئے اجتماعی انشورنس جائز ہے)۔

انشورنس تعاونی (تکافل) میں شرکاء کا مقصد منافع کمانا و نفع اندوزی نہیں ہوتا ہے، بلکہ تبرعاً ضرورت کے وقت تعاون و ہمدردی مقصود ہوتی ہے۔

انشورنس تکافل کی واضح مثال دور نبوی کے اس واقعہ میں ملتی ہے، بخاری شریف کی روایت ہے:

---

[1] امام ربانی پبلک سیکنڈری اسکول روڈ ۳، جھنجھنوں، راجستھان۔

''أن الأشعريين إذا أرملوا في الغزو أو قل طعام عيالهم بالمدينة جمعوا ما كان عندهم في ثوب واحد، ثم اقتسموه بينهم في إناء واحد بالسوية فهم مني وأنا منهم'' (صحیح بخاری، کتاب الشرکۃ (۴۷) باب الشركة في الطعام والنهد والعروض، رقم الحديث ۲۴۸۶، ص ۴۲۸)۔

(قبیلہ اشعر کے لوگ جنگ میں چلے گئے اور مدینہ میں ان کے اہل وعیال کا غلہ کم ہوگیا تو ان کے پاس جو کچھ تھا اس کو ایک کپڑے میں جمع کیا، پھر اس کو برابر ایک برتن میں بانٹ لیا، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر فرمایا وہ مجھ سے ہیں اور میں ان سے ہوں)۔

تکافل میں عقد کی نوعیت:

تکافل میں شرکاء و کمپنی کے مابین ہونے والے عقد کی نوعیت دو طرح کی ہوگی:

۱۔ **عقد وکالت:** کمپنی شرکاء کی جانب سے وکیل ہے، اور یہ وکالت بالمعاوضہ وبلا معاوضہ دونوں ممکن ہے، اور فقہاء کرام نے وکالت کے جو احکام بیان کئے ہیں وہ سب لاگو ہوں گے۔

۲۔ **عقد مضاربت:** شرکاء کی حیثیت رب المال کی ہوگی اور کمپنی مضارب ہوگی، اور دونوں کا اصل مقصد تجارت نہیں ہوگا، بلکہ ضرورت کے وقت کسی شریک کو ضرر لاحق ہونے پر اس کا تعاون ہوگا، کمپنی اس میں مضاربت کرے گی، اور کمپنی کے سارے اخراجات اسے مالی مضاربت سے پورے کئے جائیں گے، اور سال مکمل ہونے پر باقی ماندہ مال شرکاء میں تقسیم کر دیا جائے گا۔

جمع شدہ اقساط کی حیثیت:

کمپنی میں جو بھی قسطیں ''تکافل'' کے نام سے جمع ہو رہی ہیں، وہ سارا کا سارا مال ''تبرع'' ہے، کمپنی سے معاہدہ اسی بات پر ہوتا ہے کہ یہ تبرع کا مال ہے، تبھی کمپنی اس کو رکنیت دیتی ہے، نیز کمپنی اس جمع شدہ مال کی مالک نہیں ہوتی ہے، بلکہ یہ تبرع وہبہ کا مال ہے، اللہ تعالی نے اس طرح کے حسن سلوک کا اہل ایمان کو حکم بھی دیا ہے: {أحسن كما أحسن الله إليك} (سورہ قصص: ۷۷)۔

☆☆☆

تکافل یعنی اسلامی انشورنس کا خاکہ

مولانا محمد عثمان بستوی [1]

تمہید:

اکیڈمی کے تین سوالات میں سے ایک سوال انشورنس کے شرعی متبادل سے متعلق ہے۔ جس میں عالم اسلام میں مروج تکافل کی شرعی صورت متعین کرنے اور ہندوستان میں قابل عمل صورت کی نشاندہی کرنے کے لئے کیا گیا ہے۔ لہذا ہم نے امتثالاً للامر، جواہر الفقہ، فتاوی عثمانی، انعام الباری، شامی وغیرہ کی مراجعت کرکے انشورنس کا شرعی خاکہ جو سود و قمار سے خالی ہو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ حادثات سے ہونے والے نقصان کی تلافی کے لئے اس وقت جو شکلیں مروج ہیں اس میں انشورنس والی شکل دنیا کے ہر ملک میں رائج ہے۔ شائد ہی کوئی ملک اس سے خالی ہو، لیکن اسلامی معاشیات کی طرف رجحان اور خدا ترسی وغیرہ کی بنا پر انشورنس کے علاوہ سود و قمار سے خالی کچھ شکلیں اسلامی ممالک اور امریکہ میں رواج پذیر ہیں، اللہ رب العزت ایسی کوششوں کو ثمر آور بنائے۔ آمین۔ آئندہ صفحات میں ہم نے اولاً رائج متبادل، یعنی امداد باہمی فنڈ اور اس کا حکم اور تکافل فنڈ کا ذکر کیا ہے۔ بعدہ اشکالات کو ذکر کیا گیا ہے۔

۱۔ التأمین التبادلی (امداد باہمی فنڈ):

چند لوگ مل کر باہم ایک فنڈ بنالیں۔ جس کا مقصد یہ ہو کہ اس فنڈ کے ممبران میں سے اگر کسی کو حادثہ پیش آگیا تو اس فنڈ سے اس حادثہ کے اثرات کو دور کرنے کے لئے مدد کی جائے گی۔ اور اگر فنڈ کی رقم حادثات کے معاوضہ سے کم پڑی تو رقم کے لحاظ سے مدد کی جائے گی۔ یا ممبران سے کہا جائے گا کہ تم اتنے پیسہ اور ڈالدو تاکہ پورا معاوضہ ادا ہو جائے۔ اور اگر فنڈ کی رقم معاوضہ دینے کے بعد بچ جائے تو اس کو ممبران ہی پر تقسیم کردیا جائے گا۔ یا آئندہ سال کے لئے بطور چندہ محفوظ رکھی جائے گی۔ اس فنڈ سے تجارت، وحصول نفع مقصود نہیں ہوتا، بلکہ صرف باہمی امداد و تعاون مقصود ہوتا ہے۔ حاصل یہ کہ تعاون کی نیت سے چند لوگ مل کر ایک فنڈ بنالیں پھر ممبر سازی کے ذریعہ اس کے لئے چندہ وصول کیا جائے۔ اور چندہ دینے کے بعد ممبران میں باہم جس کو نقصان ہو تو اس نقصان کی تلافی اس فنڈ سے کی جائے (انعام الباری ۲۸۰/۶ ملخصا)۔

امداد باہمی والے فنڈ کا حکم:

یہ صورت سب کے نزدیک جائز ہے اس کے عدم جواز کا کوئی بھی قائل نہیں (انعام الباری ۲۸۰/۶)۔ امداد باہمی کی یہ صورت بلا کراہت جائز ہے، بلکہ مستحب ہے، علماء کرام کی طرف سے انشورنس اور امداد باہمی کی جو صورتیں مختلف مراحل پر تجویز کی گئی ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے الخ (جواہر الفقہ ۱۵۷/۷۔۱۵۸ مکتبہ تھانوی دیوبند)۔

۲۔ شرکۃ التکافل (تکافل فنڈ کی صورت):

شرکات التکافل جو شرق اوسط میں قائم کی گئی ہیں کسی تجارتی معاہدے کے بجائے تبرع کے اصول پر قائم ہوتی ہیں، ان کمپنیوں میں مختلف افراد جو رقمیں دیتے ہیں ان کے بارے میں یہ طے ہوتا ہے کہ دینے والوں کی طرف سے تبرع ہے۔ اور ان کمپنیوں میں چندہ دینے والوں کو "حملۃ الوثائق" کہا جاتا ہے۔ چندہ لے کر ان رقموں کو کاروبار میں بھی لگایا جاتا ہے۔ اس طرح جو رقمیں جمع ہوتی ہیں وہ تمام چندہ دہندگان کے نقصان کی تلافی میں خرچ کی جاتی ہیں۔

اگر سال میں نقصانات کی تلافی کے بعد کچھ رقم بچ جاتی ہے تو کمپنی کا نفع نہیں ہوتا ہے، بلکہ انہیں "حملۃ الوثائق" میں تقسیم کردیا جاتا ہے، جنہوں نے

[1] ریاض العلوم گورینی جونپور، یوپی۔

تلافی نقصانات کے لئے رقمیں دی تھیں (فتاوی عثمانی ۳؍۳۱۵-۳۱۶، انعام الباری ۶؍۲۸۰-۲۸۶)۔

تکافل فنڈ پر پیش آنے والے چند شبہات:

۱۔ تکافل کی کاروائی دنیا کے کسی بھی ملک میں کمپنی قائم کئے بغیر ممکن نہیں۔ اس لئے کچھ لوگ اپنا ابتدائی سرمایہ لگا کر ایک کمپنی قائم کرتے ہیں، کمپنی قائم کرنے والوں کو نقصان سے بچی ہوئی رقم نہیں ملتی ہے، اس لئے ان کی آمدنی ان کے لگائے ہوئے سرمایہ کے نفع تک محدود رہتی ہے۔ اور تکافل فنڈ سے انہیں کچھ نہیں ملتا، اس لئے بعض کمپنیاں ان کو انتظام و انصرام کی اجرت دیتی ہیں اور ملیشیا کی تکافل کمپنیاں ان کو فنڈ کی بچی ہوئی رقم سے ایک مخصوص فیصد حصہ ادا کرتی ہیں، تو کیا کمپنی قائم کرنے والوں کو یہ اجرت لینا جائز ہے اور کس بنیاد پر جائز ہے؟

۲۔ تکافل فنڈ تبرع کی بنیاد پر قائم کیا جاتا ہے، لیکن اس فنڈ سے تبرع کرنے والا بھی نقصان کی صورت میں مستفید ہوتا ہے، تو کیا چندہ خود اس سے مستفید ہونے کی نیت سے دینا جائز ہے؟

۳۔ تکافل فنڈ میں نقصان کی تلافی ان کے چندہ کے مقدار کی بنیاد پر ہوتی ہے جس کا چندہ جتنا بڑا ہوگا اتنے ہی بڑے نقصان کی تلافی تکافل فنڈ سے کرا سکے گا، تو کیا یہ شرعی نقطہ نظر سے درست ہے؟

۴۔ انشورنس کمپنیوں کی طرح شرکات التکافل کو یہ خطرہ درپیش رہتا ہے کہ تکافل فنڈ کی رقم نقصانات کی تلافی کے لئے ناکافی ہوجائے تو جس طرح انشورنس کمپنی ایسی مجبوری سے بچنے کے لئے یہ انشورنس کمپنیوں سے اعادۃ التامین کراتی ہے، تو کیا تکافل فنڈ کے لئے بدرجہ مجبوری ری انشورنس کرانے کی اجازت ہے؟

تکافل کی بنا وقف پر:

اگر تکافل کمپنیوں کی بنیاد وقف پر رکھی جائے تو تکافل پر پیش آنے والے شبہات میں سے اکثر ختم ہوجاتے ہیں، لہذا اہم اولاً شرکۃ التکافل کی بنا وقف پر رکھنے کے طریقہ کار کو ذکر کرتے ہیں، بعدہ مذکورہ بالا شبہات کے جوابات عرض کردیے جائیں گے۔

تکافل کی بنا وقف پر رکھنے کا طریقہ:

۱۔ اولاً کمپنی قائم کرنے والے اپنے طور پر اصول ثابتہ (اموال غیر منقولہ یا نقود، یا دونوں کو شرعی اصول وضوابط کے مطابق وقف کریں، یعنی وقف فنڈ قائم کریں۔

۲۔ اموال موقوفہ، خواہ منقولہ ہوں یا غیر منقولہ یا دونوں، ان کو محفوظ رکھا جائے، یعنی اصل وقف رقم کو ختم نہ کیا جائے۔

۳۔ ان کی آخری جہت قربت، یعنی فقراء پر تصدق ہو۔

۴۔ اس وقف فنڈ کے لئے ممبر سازی کی جائے۔

۵۔ ممبروں سے چندہ وصول کیا جائے جس سے وقف فنڈ کے مقاصد کی تکمیل کی جائے۔

۶۔ چندہ دہندہ اپنے چندہ کا مالک نہیں رہے گا، چندہ دینے میں نیت فنڈ کے مقاصد کے تکمیل کی ہو۔

۷۔ ممبروں کے چندہ اور فنڈ کے منافع کو وقف نہیں، بلکہ وقف کی ملکیت بنایا جائے۔

۸۔ وقف والی رقم اور چندہ والی رقم دونوں کو کاروبار میں لگایا جائے۔

وقف فنڈ کے ضوابط کا خاکہ:

۱۔ فنڈ ممبران (چندہ دہندگان) کی مطلوبہ کفالت وضمانت کے لحاظ سے اس کی ممبری فیس (چندہ میں کمی وبیشی کا ضابطہ بنائے)۔

۲۔ فنڈ قائم کرنے والے (واقفین) اس وقف کے متولی و منتظم ہونے کا بھی ضابطہ بنالیں۔

۳۔ متولی اور منتظمین وقف کے لئے کام کرنے کی صورت میں اس سے تنخواہ لینے کا بھی ضابطہ رکھیں۔

۴۔ وقف فنڈ کے متولی و منتظم اگر وقف کے ضوابط متعینہ کی خلاف ورزی کریں یا ممبران ممبر بننے کے بعد اپنا تعاون بند کردیں تو اس پر قانونی کاروائی کا اختیار

رکھا جائے۔

۵۔ فنڈ کا سالانہ حساب کیا جائے، اصل وقف رقم سے جتنی بھی زائد رقم ہو اس کو آئندہ کے لئے محفوظ رکھے یا ممبران میں تقسیم کرنے کا ضابطہ رکھا جائے۔

۶۔ اس فنڈ کے معاملات کی نگرانی ماہر علماء کے بورڈ کے سپرد کی جائے۔

ایسے تکافل فنڈ کو چلانے کے لئے جس پر شرعی ضوابط کے لحاظ سے شبہات کم از کم کل چودہ ضابطے کتب فقہیہ مثلاً شامی، جواہر الفقہ، فتاوی عثمانی، انعام الباری وغیرہ سے اخذ کر کے لکھے گئے ہیں، یہ ابتدائی خاکہ ہے اس میں حسب ضرورت علماء کے مشورہ سے حذف و اضافہ ہوتا رہے گا۔ اور بظاہر اس خاکہ، یعنی وقف کے ضوابط کو ملحوظ رکھ کر وقف پر تکافل کی بنا ہندوستان جیسے ممالک میں بھی ممکن العمل معلوم ہوتی ہے، کیونکہ اوقاف کا ایک مستقل بورڈ ہے جس کے ضوابط وغیرہ معلوم کئے جاسکتے ہیں اور بعض کمپنیاں وقف کی جہت سے رفاہی کام بھی انجام دیتی ہیں۔

رفع شبہات:

اگر ضوابط متقدمہ کو ملحوظ رکھ کر تکافل فنڈ قائم کیا جائے تو تکافل کمپنی قائم کرنے والوں کے لئے ضابطہ کے مطابق اجرت لینا، اسی طرح سے متعینہ ضابطہ کے تحت چندہ دینے والوں کا کمپنی کے ضابطہ کے اعتبار سے، نہ کہ چندہ دینے کے اعتبار سے، نقصانات کے تلافی کا مستحق ہونا، اور تلافی کروانا، گرچہ اپنی جمع کردہ رقم سے زائد کی تلافی ہو جائز ہوگا، نیز خود بھی نفع اٹھانے کی نیت سے کمپنی قائم کرنا، اور چندہ دینا بھی جائز ہوگا، اور کمپنی کا چندہ دینے والے کی مطلوبہ ضمانت وکفالت کے لحاظ سے چندہ کی مقدار میں کمی وبیشی کرنا بھی جائز ہوگا، کمپنی قائم کرنے والوں کے لئے ضابطہ کے مطابق نفع لینا بھی جائز ہوگا، اس لئے کہ حضرات فقہاء نے دراہم وغیرہ کے وقف کو صحیح کہا ہے۔ اور واقف کا وقف کی آمدنی اور نفع سے خود اپنے انتفاع کی شرط لگانا بھی جائز ہے، نیز خود نفع اٹھانے کی نیت سے وقف کرنا بھی جائز ہے، بشرطیکہ جہت آخر عبادت (تصدق علی الفقراء ھو) اور موقوف علیہم کے لئے استحقاق کو شرط پر معلق کرنا بھی جائز ہے۔ حاصل یہ کہ واقف کی تمام جائز شرائط وضوابط معتبر وقابل عمل ہو کر لازم وضروری ہوں گی۔ حضرات فقہاء ''نص الواقف کنص الشارع'' کا ضابطہ لکھ کر فروعات کثیرہ متفرع کرتے ہیں۔ لہذا مزید بصیرت کے لئے (شامی کتاب الوقف فتاوی عثمانی ۲/۳، جواہر الفقہ/ ۶، انعام الباری) کا مطالعہ کر لینا چاہئے۔

☆☆☆

وقف کی بنیاد پر تکافل (اسلامی انشورنس)

مفتی احمد سلیمان[1]

وقف کی بنیاد پر اسلامی انشورنس کے لئے مندرجہ ذیل اصولوں کو سامنے رکھنا چاہئے:

۱۔ وقف صحیح ہو۔

فقہاء نے وقف صحیح ہونے کے لئے چند شرائط ذکر کی ہیں:

الف۔ مال موقوف صحیح ہو، جیسے زمین، عمارت، کنواں وغیرہ۔ متاخرین فقہاء نے دراہم ودنانیر کے وقف کو بھی صحیح قرار دیا ہے۔ ان کا وقف اس طرح ہوگا کہ دراہم کی معلوم مقدار کو وقف کیا جائے، اسے وقف کا رأس المال کہا جائے گا۔ اس راس المال سے تجارت کی جائے، جو نفع حاصل ہوگا وہ منافع وقف ہوگا اور وہ موقوف علیہم میں شرائط کے مطابق تقسیم کیا جائے گا۔ راس المال کی مقدار میں کمی نہیں کی جائے گی۔

آج کل رائج کرنسی، یعنی روپے وغیرہ دراہم کے حکم میں ہیں، لہذا روپیوں کی معلوم مقدار کو وقف کر کے ان سے تجارت کی جائے گی اور جو نفع حاصل ہوگا اس سے وقف کے مقاصد حاصل کئے جائیں گے۔

ب۔ **تابید:** اصل وقف ہمیشہ کے لئے ہو اور وہ ختم نہ ہو۔ روپیوں کو وقف کرنے کی صورت میں اس رقم کو سرمایہ کاری، یعنی مضاربت یا تجارت بذریعہ وکالت سے بڑھایا جائے۔

ج۔ آخری جہت فقراء ومساکین ہوں۔ وقف کے صحیح ہونے کے لئے ضروری ہے کہ اس کے آخری موقوف علیہم فقراء ومساکین ہوں، یعنی یہ وقف آخر میں واقف یا اس کے ورثاء کی طرف واپس نہ آئے۔ لہذا تکافل وقفی میں مخصوص موقوف علیہم کے علاوہ فقراء ومساکین کا بھی ضرور خیال رکھا جائے۔ مثلاً جب نفع تقسیم ہو تو فقراء کو بھی دیا جائے، یا ہر سال حساب کتاب کرنے کے بعد موقوف علیہم کو دینے کے بعد اگر نفع میں کچھ بچ جائے تو فقراء کو اس میں سے دیا جائے۔ اس مقصد کے لئے وقف نامہ میں شروع سے یہ شرط رکھی جائے۔

۲۔ وقف نامہ لکھا جائے اور اس میں درج ذیل امور کا لحاظ رکھا جائے:

الف۔ **مقصد وقف:** مقصد وقف کو بیان کیا جائے، جو یہ ہے کہ اس وقف کو جو شرائط کے مطابق چندہ دے گا وہ موقوف علیہ ہوگا۔ موقوف علیہ پر اگر کوئی مالی نقصان آئے گا تو شرائط کے مطابق وقف کے منافع سے اس کی تلافی کی جائے گی۔

ب۔ واقف کا نام اور اس کی ذمہ داریاں لکھی جائیں۔

ج۔ متولی کی تعیین کی جائے یا اس کا معیار بیان کیا جائے کہ کون اس وقف کا متولی ہوسکتا ہے۔ متولی کی ذمہ داریاں لکھی جائیں۔

د۔ وقف کے منافع کو موقوف علیہم پر خرچ کرنے کا معیار، اصول اور شرائط ذکر کی جائیں اور اس میں کوئی ابہام نہ رکھا جائے۔

ہ۔ موقوف علیہم کی تشریح کی جائے۔ مثلاً تکافل کے اس مقصد میں موقوف علیہ وہ ہوگا جو ہر ماہ وقف کو چندہ دے اور متولی اسے قبول کرے۔

چندہ اس نیت سے دیا جائے کہ وقف فنڈ کے مقاصد پورے ہوں۔ یہ چندہ وقف کی ملکیت ہوگا اور اس پر سے چندہ دینے والے کی ملکیت ختم

---

[1] جوہانسبرگ، ساؤتھ افریقہ۔

ہو جائے گی۔

و۔ یہ چندہ وقف کے منافع کے حکم میں ہوگا، خود وقف نہیں ہوگا۔ یعنی اسے موقوف علیہم پر خرچ کرنا جائز ہوگا۔ جیسے مسجد کی عمارت وقف ہوتی ہے اور اس کے لئے جو چندہ دیا جاتا ہے وہ مسجد کا مملوک ہوتا ہے اور اس چندہ کو مسجد کے مصالح پر خرچ کیا جاتا ہے (تفصیل فی امداد الاحکام ۲۴۰/۳)۔

ز۔ کون منتظم ہوگا اور اس کی کتنی تنخواہ ہوگی؟

ح۔ سرمایہ کاری (Investment) کون کرے گا اور اس کی کتنی تنخواہ ہوگی؟

ط۔ نفع اگر اخراجات سے زائد ہو تو اس زائد نفع کے لئے طے کیا جائے کہ اس کا کیا مصرف ہوگا؟ اسے آئندہ کے لئے محفوظ (Reserve) کیا جائے گا، یا فقراء میں تقسیم کیا جائے گا؟ یا چندہ دینے والوں میں تقسیم کیا جائے گا؟

ی۔ اگر نقصان زیادہ ہو یا مطالبہ زیادہ ہو اور نفع سے یہ مطالبے پورے نہیں ہو رہے ہیں تو اس نقصان کی تلافی کے لئے درجہ ذیل دو صورتیں ہیں:

(۱) غیر سودی قرض لیا جائے اور آئندہ کے منافع سے یہ قرض ادا کیا جائے۔

(۲) ری تکافل (Retakaful): بعض ایسے ادارے ہیں جو "ری تکافل" کرتے ہیں۔ یہ وقف فنڈ کسی جائز "ری تکافل" اسکیم کا ممبر بن سکتا ہے اور ضرورت کے وقت ان کے اصول وضوابط کے مطابق وقف فنڈ کے اخراجات کو پورا کرنے کے لئے رقم مل سکتی ہے۔

ک۔ دیوالیہ یا اختتام:

وقف فنڈ اگر دیوالیہ ہو گیا یا کسی شرعی بنیاد کی وجہ سے وقف فنڈ کو بند کرنے کی ضرورت ہے، تو اگر نفع ہے تو نفع سے تمام اخراجات منہا کرنے کے بعد جو نفع بچے وہ فقراء ومساکین کو دیا جائے، اور اصل رقم یا تو وہ بھی فقراء کو دیدی جائے یا کسی ایسے دوسرے ادارے کو دیدی جائے جو اسی طرح کے مقاصد کے لئے بنایا گیا ہے، جیسے کوئی دوسرا تکافل کا ادارہ۔

ل۔ شریعت کے مطابق وقف فنڈ کو چلایا جائے گا۔

وقف نامہ میں اس کی صراحت کی جائے کہ تکافل کمپنی اس وقف فنڈ اور تکافل کے کاروبار کو شریعت کے مطابق چلائے گی۔ اس کو یقینی بنانے کے لئے ضروری ہے کہ اسلامی معاملات کو اچھی طرح سمجھنے والے تین یا چار علماء حق پر مشتمل ایک شریعہ بورڈ بنایا جائے۔

اس بورڈ کی ذمہ داری ہوگی کہ وہ تکافل کمپنی کو شرعی رہنمائی کرے، ان کے کام کرنے کی نگرانی کرے، غلطیوں کی اصلاح کرے، اور Products کی منظوری دے۔

تکافل کمپنی کے متولی وذمہ دار شریعہ بورڈ کے فیصلوں کے پابند ہوں گے اور ان کی منظوری کے بغیر کوئی کام نہیں کریں گے۔ اسی طرح اگر متولی اور موقوف علیہ کے درمیان اختلاف ہوا کہ وہ مدد کا مستحق ہے یا نہیں؟ اس کا فیصلہ بھی شریعہ بورڈ کرے گا۔

☆☆☆

شریعت کی روشنی میں انشورنس (تکافل) کی صورت

مولانا عبدالباسط پالنپوری [1]

اصول شرعیہ کے ماتحت مروجہ بیمہ کے ایسے بے خطر اور بے ضرر بدل موجود ہیں کہ ان کو بروئے کار لایا جائے تو نہ صرف مروجہ بیمہ کا اچھا بدل بن سکیں۔ بلکہ قوم کے بے سہارا افراد کو اپنے پاؤں پر کھڑا کرنے کا بہترین ذریعہ بن سکتے ہیں۔ مگر یہ سب کچھ اسی وقت ہوسکتا ہے جب قوم میں اسلامی حمیت اور قومی غیرت کا شعور پیدا ہو، اور اپنی زندگی اسلامی سانچہ میں ڈھالنے کے لئے تھوڑی بہت محنت اور قربانی کے لئے تیار ہو۔

یہاں ایک مشکل یہ بھی ہے کہ معاملہ انفرادی نہیں اجتماعی ہے، مگر چند افراد اس مقصد کے لئے تیار بھی ہوں تو یہ کام نہیں چل سکتا، جب تک کوئی معتدبہ جماعت اس کام کو مقصد زندگی بنا کر آگے نہ بڑھے۔

بیمہ کا متبادل:

۱۔ بیمہ کا ایک متبادل ایک تعاون ہے جس میں شرکاء اپنی اپنی مرضی سے فنڈ میں رقمیں جمع کرائیں اور سال کے دوران جن لوگوں کو کوئی نقصان پہنچے اس فنڈ سے ان کی امداد کریں، پھر سال کے ختم پر اگر رقم جمع بچ گئی تو وہ شرکاء کو بحصہ رسدی واپس کردی جائے، یا ان کی طرف سے آئندہ سال کے لئے فنڈ کے لئے چندے کے طور پر رکھ دی جائے (اسلام اور جدید معاشی مسائل ۷/ ۲۹۲، جواہر الفقہ ۲/ ۱۸۹)۔

۲۔ بیمہ پالیسی کی حاصل شدہ رقوم کو مضاربت کے شرعی اصول کے مطابق تجارت پر لگایا جائے، اور معینہ سود کے بجائے تجارتی کمپنیوں کی طرح تجارتی نفع تقسیم کیا جائے، نقصان سے بچنے کے لئے لمیٹڈ کمپنیوں کی طرح اس کی نگرانی پوری کی جائے اور پھر اللہ تعالی پر توکل کیا جائے۔

۳۔ بصورت حوادث یہ امداد صرف ان حضرات کے ساتھ مخصوص ہوگی جو اس معاہدہ کے پابند اور اس کمپنی کے حصہ دار ہیں، اوقاف میں ایسی شخصیات میں کوئی مضائقہ نہیں، وقف علی الاولاد اس کی نظیر موجود ہے۔

۴۔ اصل رقم مع تجارتی نفع کے ہر فرد کو پوری پوری ملے گی اور وہ ہی اس کی ملک اور حقیقت سمجھی جائے گی امداد باہمی کا ریزرو فنڈ وقف ہوگا جس کا فائدہ وقوع حادثہ کی صورت میں اس وقف کرنے والے کو بھی پہنچے گا اور اپنے وقف سے خود فائدہ اٹھانا اصول وقف کے منافی نہیں، جیسے کوئی رفاہ عام کے لئے ہسپتال وقف کرے، پھر بوقت ضرورت اس سے خود بھی فائدہ اٹھائے۔ یا قبرستان وقف کرے، پھر خود اس کی اور اس کے اقرباء کی قبریں بھی اس میں بنائی جائیں۔

۵۔ حادثات پر امداد کے لئے مناسب قوانین بنائے جائیں جو صورتیں عام طور پر حوادث کہی اور سمجھی جاتی ہیں ان میں پسماندگان کی امداد کے لئے معتدبہ رقم مقرر کی جائے، اور جو صورتیں عادۃً حوادث میں داخل نہیں سمجھی جاتی، جیسے کسی بیماری کے ذریعہ موت واقع ہوجانا اس کے لئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ متوسط تندرستی والے افراد کے لئے ساٹھ سال کو عمر طبعی قرار دے کر اس سے پہلے موت واقع ہوجانے کی صورت میں بھی کچھ مختصر امداد دی جائے، متوسط تندرستی کو جانچنے کے لئے جو طریقہ ڈاکٹری معائنہ کا بیمہ کمپنی میں جاری ہے وہ استعمال کیا جائے، بیمار یا ضعیف آدمی کے لئے اسی پیمانہ سے عمر طبعی کا ایک اندازہ مقرر کیا جائے (جواہر الفقہ ۲/ ۱۹۰)۔

اگر کوئی جماعت اس کام کے لئے تیار ہوجائے تو لوگ ضرر عظیم سے بچ جائیں اور سود وقمار سے محفوظ رہیں، لیکن ہندوستان کے موجودہ حالات

---

[1] مدرسہ کنز مرغوب پٹن، گجرات۔

یہ ہیں کہ منصوبہ بند فرقہ پرستوں کی طرف سے مسلمانوں کی جان و مال مستقل خطرے میں ہے، آئے دن فسادات ہوتے رہتے ہیں اور حکومت کا عملہ کہیں تو مفسدین کی پست پناہی کرتا ہے اور کہیں خاموش تماشائی بن کر مسلمانوں کی تباہی و بربادی کے منظر سے اپنی آنکھیں ٹھنڈی کرتا ہے۔

ہماری جان و مال اور عزت وآبرو کا تحفظ حکومت کی ذمہ داری ہے اور اس سے پہلو تہی کے نتیجہ میں ہونے والے نقصانات کا تاوان حکومت پر عائد ہوتا ہے۔ اگر مظلوم اپنا حق سیدھی راہ سے حاصل نہ کر سکے اور کسی طور پر ظالم کی ایسی چیز اس کے پاس آجائے جس سے وہ اپنا حق وصول کر سکے تو یہ جائز ہے جس کو فقہاء ظفر بالحق سے تعبیر کرتے ہیں، پھر کتاب وسنت کی نصوص کی روشنی میں فقہاء کے یہاں یہ متفقہ اصول ہے کہ شدید ضرورت کی وجہ سے ناجائز چیزیں جائز ہو جاتی ہیں، "الضرورات تبیح المحظورات"، اور یہ صراحت بھی فقہاء نے فرمائی ہے کہ اجتماعی اور قومی سطح کی حاجت بھی ضرورت کے درجہ میں ہے، "الحاجة عمت کانت کالضرورة" لہٰذا اصول کو سامنے رکھتے ہوئے اگر پہلی والی تکافل کی صورتیں عمل میں لانا مشکل ہے تو بہ حالت موجودہ ہندوستانی مسلمانوں کے لئے چند شرائط کے ساتھ جان و مال کے انشورنس کی گنجائش نکلنی چاہئے:

۱۔ جو لوگ عملاً جان و مال کے خطرات سے دوچار نہ ہوں ان کے لئے بہتر یہی ہے کہ اس سے احتیاط کریں۔

۲۔ انشورنس کرانے کے بعد اگر واقعی فساد میں جان و مال کا نقصان ہوا تب تو کمپنی کی طرف سے حاصل ہونے والی پوری رقم اس کے لئے جائز ہوگی۔

۳۔ اور اگر نقصان نہ ہوا، یا ہوا، لیکن طبعی اسباب کے تحت ہوا تو ایسی صورت میں اتنی ہی رقم اس کے لئے حلال ہوگی جتنی اس نے جمع کی تھی، اضافی رقم کو غرباء پر یا رفاہی کاموں میں بلا نیت صدقہ خرچ کر دینا واجب ہوگا (جدید فقہی مسائل ۱/ ۴۳۳)۔

☆☆☆

فقہ اسلامی کی روشنی میں انشورنس کی صورت

مفتی محمد مقصود[1]

اکثر علماء کرام نے جانی ومالی انشورنس کو سود اور قمار میں شامل کیا ہے، جبکہ بعض علماء نے بیمہ کے جواز کی رائے ظاہر کی ہے، چنانچہ حادثات زمانہ اور اس کے خطرات کے پیش نظر انشورنس میں لوگوں کی بہت رغبت ہوئی اور مسلمانوں نے جان ومال کا بیمہ کرایا، مگر چونکہ اکثر علماء حالت زمانہ کو پیش نظر رکھتے ہوئے بھی اس کے عدم جواز کے قائل ہیں، لہٰذا اس اختلاف رائے سے بچنے اور علماء کے اقوال کو سامنے رکھتے ہوئے اس کا ایک بہتر طریقہ یہ ہے کہ امداد باہمی اور اجتماعی تعاون کی کوئی شکل نکالی جائے، جیسے کہ زمانہ جاہلیت میں عاقلہ قبائلی نظام میں حادثات وخطرات کے پیش نظر امداد باہمی اور اجتماعی تعاون کی شکل نکالی گئی تھی اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو اس کے حال پر برقرار رکھا اور خلفاء راشدین نے افادیت کے پیش نظر اسے مزید ترقی دی اور باقاعدہ اس کو تنظیمی شکل دی۔ یعنی ابتداء میں یہ نظام صرف خاندان وقبیلہ تک محدود تھا، مگر بعد میں ضرورت کے تحت اسے مزید ترقی دی دی گئی۔

عاقلہ کا نمایاں پہلو اگرچہ دیت سے متعلق ہے، لیکن فقہ کی کتابوں کے اندر جس انداز سے اس کو بیان کیا گیا ہے اس سے مختلف حادثات وخطرات کے وقت اس نظام کو بروئے کار لانے کی عمومیت ثابت ہوتی ہے (شامی سن اشاعت ۱۳۲۴ ج ۵ ص ۵۶۲ پر ہے): "وتوجد هذه العادة بين الناس، فإن من لحقه خسران من سرقة أو حرق يجمعون له مالاً لهذا المعنى" (یہ عادت لوگوں میں پائی جاتی ہے کہ چوری یا آگ لگنے سے جس شخص کا نقصان ہوتا ہے لوگ اس کی مدد کے لئے مال جمع کرتے ہیں۔

عالمگیری (۶/ ۸۳) پر ہے: "إن العبرة في هذا للتناصر وقيام البعض" (اس میں باہمی امداد اور ایک دوسرے کو سہارا دینے کا اعتبار ہے)۔

علامہ سرخسیؒ نے "المبسوط" (۲۷/ ۱۲۷) پر فرمایا کسی کو یہ بھروسہ نہیں ہے کہ وہ حادثات وآزمائش میں مبتلا ہو کر دوسروں کی مدد کا محتاج نہ ہوگا، جب صورت حال یہ ہے تو لوگوں کو ایک دوسرے کی مدد کرنا چاہئے، تاکہ بوقت ضرورت دوسرے لوگ اس کی مدد کریں۔ ہدایہ (۲۶۹/۴) پر ہے: "إن العاقلة يتحملون باعتبار تقصيرهم وتركهم حفظه ومراقبته" (عاقلہ اس لئے دیت کا بار برداشت کرتے ہیں کہ وہ دوسروں کی نگرانی میں اپنی پوری ذمہ داری محسوس نہیں کرتے اور ان سے کوتاہی ہوتی ہے)۔

حضرت عمرؓ کے زمانہ میں حالات کی تبدیلی سے جب معاشرتی زندگی کی نئی تنظیم وجود میں آئی تو آپ نے عاقلہ کے نظام کو وسعت دی اور یہ قانون مقرر کیا: "والعاقلة أهل الديون إن كان العاقل من أهل الديوان ويروى أن عمر أول من دون الدواوين أي رتب الجرائد للولاة والقضاة"۔

(اگر قاتل اہل دیوان سے ہے تو عاقلہ اہل دیوان ہوں گے اور روایت کیا جاتا ہے کہ حضرت عمرؓ اول وہ شخص ہیں جنہوں نے قاضیوں اور حاکموں کے لئے جرائد کو مرتب کیا)۔

اہل دیوان میں ایک دفتر یا محکمہ کے لوگ شامل ہوتے تھے جن کے نام ایک رجسٹر میں درج ہوتے تھے، چنانچہ علامہ سرخسیؒ نے اس پر اپنی رائے ظاہر فرمائی ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دیت کی ذمہ داری خاندان وقبیلہ پر اس لئے ڈالی تھی کہ اس وقت قوت ومدد انہیں کے ذریعہ حاصل ہوتی تھی۔ پھر حضرت عمرؓ نے جب دفاتر کا نظام قائم کیا تو یہ قوت ومدد اہل دفاتر سے وابستہ ہوگئی (المبسوط)۔

---

[1] نائب مفتی جامع العلوم فرقانیہ، رامپور یوپی۔

اگر ہم پیشہ وہم مشرب لوگوں سے یا یونین وانجمن کے ممبروں سے اور جماعت کے ارا کین وغیرہ سے باہمی قوت ومدد حاصل ہوتو ان سب کو دیت کا ذمہ دار بنانے کی اجازت حاصل ہے، ہدایہ (ج ۴) میں ہے: "لو کان الیوم تناصرهم بالحرف فعاقلتهم أهل الحرفة" (اگر آج باہمی مدد ہم پیشہ لوگوں سے ہوسکتی ہے تو عاقلہ ہم پیشہ لوگ قرار پائیں گے۔ شامی (۵/۵۶۷) پر ہے: ''وإن كان له متناصرون من أهل الديون والعشيرة والمحلة والسوق فالعاقلة أهل الديون ثم العشيرة ثم أهل المحلة، وبه قال الناطفي، قلت: المدار على التناصر كما ذكره فمتى وجد بطائفة فهم عاقلته وإلا فلا''۔

اس تمام تحریر کا خلاصہ یہ ہے کہ حالات زمانہ کی رعایت کرتے ہوئے حکومت کو چاہئے کہ وہ حادثات وخطرات کے وقت باہمی مدد کے لئے مختلف قسم کی تنظیمیں قائم کرے یا موجودہ تنظیموں پر اس قسم کی ذمہ داریاں عائد کرے، تاکہ ان کے ذریعہ مالی نقصان وحادثہ کی تلافی کا بندوبست ہوسکے جس میں قمار اور ربو کا دخل نہ ہو۔ لیکن چونکہ حکومت کی باگ ڈور مسلمانوں کے ہاتھوں میں نہیں ہے اور نہ مسلمانوں کی اکثریت حکومت میں داخل ہے، اس لئے حکومت پر نہ جبر کیا جاسکتا ہے اور نہ کوئی بات جبراً منوائی جاسکتی ہے، البتہ حکومت سے اپیل کی جاسکتی ہے، اگر حکومت ہماری اس اپیل کو منظور کرلے اور ایسے ادارے قائم کردے جو قمار اور سود سے خالی ہوں اور ان سے مسلمانوں کی مدد اور تقویت حاصل ہو تو بہت اچھا ہے اور اگر حکومت ایسے ادارے قائم نہ کرے اور ہماری تجویز کو منظور نہ کرے تو پھر علماء کرام اور مسلم قائدین کو یہ ادارے قائم کرنا چاہئے اور مسلمانوں کو قمار اور ربو جو گناہ عظیم ہیں، ان سے بچانا چاہئے۔ الحمد للہ اسلامک فقہ اکیڈمی ملک وبیرون ملک میں دینی وملی اور سماجی بہت سے کام انجام دے رہی ہے اور وہ ماشاء اللہ ایک مضبوط ادارے کی شکل میں ہے، اس لئے ہمیں امید ہے کہ یہ کام وہ بآسانی انجام دے سکتی ہے۔

☆☆☆

تکافل (اسلامی انشورنس) کی تنظیمی اور اداراتی صورت

مولانا عبدالقیوم پالنپوری[1]

بیمہ اور انشورنس غرر وقمار وغیرہ پر مشتمل ہونے کی وجہ سے شرعاً حرام ہے، اس لئے تجار کے لئے اشیاء واموال کا بیمہ کرانا جائز ہے، لیکن تجار کے لئے اموال کا بیمہ کرانا خطرات کے بڑھ جانے کی وجہ سے ایک حاجت شدیدہ ہے، اس لئے کوئی ایسا متبادل نظام ہونا چاہئے کہ ایسے خطرات کو ایک ہی پر ڈالنے کے بجائے معاشرہ بحیثیت مجموعی اس کا تحمل کرے اور اس میں غرر، قمار، اور سود نہ ہو، اور تجار کا مقصود حاصل ہوجائے، اور ان کی حاجت بھی پوری ہوجائے۔

اس کے لئے شرکات التکافل الاسلامیہ کا نظام قائم کرنا جس کی اساس و بنیاد عقد تبرع پر ہو نہ کہ عقد معاوضہ پر، کہ شیئرز ہولڈر کچھ رقم باقاعدہ وقف کریں اور اس سے ایک وقف فنڈ قائم کیا جائے، اور اس کی رقم مشارکہ یا مضاربہ کے اصول پر تجارت میں لگائی جائے، اس کے منافع سے شیئرز ہولڈروں کی ان کے مالی خسارہ کے موقع پر حسب شرائط مدد کی جائے اور اس فنڈ میں وقف کے مسائل واصول کے مطابق عمل کیا جائے تو یہ درست ہے، حضرت مولانا تقی صاحب عثمانی مدظلہ نے بھی فنڈ کے وقف ہونے کی صورت میں اس کو درست فرمایا ہے، چنانچہ تحریر فرماتے ہیں:

''دوسری بات یہ ہے کہ اس بات پر ہمارے زمانہ کے تجار متفق ہیں کہ اشیاء کا بیمہ ایک حاجت شدیدہ بن چکی ہے اور خطرات کی مقدار بھی بڑھ گئی ہے۔ اس واسطے کوئی ایسا طریقہ ہونا چاہئے کہ ایسے خطرات کو ایک ہی آدمی پر ڈالنے کے بجائے معاشرہ بحیثیت مجموعی اس کا تحمل کرے، بیمہ کا جو نظام ہے، یہ اگر غرر، قمار پر مشتمل ہے تو اس کے متبادل کوئی نظام ہونا چاہئے جس میں غرر اور قمار بھی نہ ہو اور یہ مقصد بھی حاصل ہوجائے اور حاجت بھی پوری ہوجائے، اس کے لئے علماء عصر نے جو نظام تجویز کیا ہے وہ تامین تعاونی کی ہی ایک ترقی یافتہ شکل بنادی گئی ہے، ''شرکات التکافل'' ہے۔

اس تامین تعاونی کے نظام کی اساس تبرع پر ہے، نہ کہ عقد معاوضہ پر جس کا طریقہ کار یہ ہوتا ہے کہ کچھ افراد نے ایک کمپنی قائم کی اور جو سرمایہ جمع ہوا وہ تجارت میں لگادیا، پھر بیمہ داروں کو دعوت دی کہ آپ بھی آکر اس میں پیسے لگائیں۔ انہوں نے پریمیم کے جو پیسے دیئے وہ بھی نفع بخش تجارت میں لگادیئے گئے اور ساتھ ہی ایک فنڈ بنادیا گیا جس کے پیسے تجارت میں لگے ہوئے ہیں اور یہ طے کیا گیا ہے کہ یہ فنڈ اسی کام کے لئے مخصوص رہے گا کہ جب کسی کے ساتھ کوئی حادثہ پیش آئے تو اس فنڈ سے اس کی امداد کی جائے گی، امداد کرنے کے بعد کچھ رقم بچ جائے تو وہ اس فنڈ کا نفع ہے وہ ان بیمہ داروں میں تقسیم کردیتے ہیں، تو بجائے اس کے نفع کہیں اور جاکر دوسرا آدمی اس کا مالک بنے تکافل شرعی کی کمپنیاں عوام ہی کے اندر یہ تقسیم کرتی ہیں، اس کو نظام تکافل کہتے ہیں۔ اور اس بنیاد پر مشرق وسطی خاص طور پر دبئی، بحرین اور ٹیونس وغیرہ میں کئی بیمہ کمپنیاں قائم ہوئی ہیں یہاں یہ شرکات التکافل الاسلامیہ کہلاتی ہیں، البتہ فقہی اعتبار سے اس کا صحیح طریقہ یہ ہونا چاہئے کہ تکافل فنڈ کو وقف کیا جائے'' (اسلام اور جدید معاشی مسائل ۳/۳۱۹)۔

☆☆☆

---

[1] جامعہ نذیریہ کاکوسی، شمالی گجرات۔

لائف انشورنس کی جائز شکلیں

مولانا محمد فیاض عالم قاسمی [1]

لائف انشورنس کی جائز شکلیں:

اگر "التامین التعاونی" (Mutual Insurance) کے فارمولے اور طریق کار سے استفادہ کرتے ہوئے اسلامی لائف انشورنس کی بنیاد ڈالی جائے تو مروجہ سودی وقماری لائف انشورنس سے امت کو بچایا جاسکتا ہے۔ اس کے لیے ذیل میں چند تجویزیں پیش کی جارہی ہیں:

۱۔ ایسی کمپنی قائم کی جائے جو لوگوں سے حسب استطاعت ومرضی ایک متعینہ مدت کے لیے روپے وصول کرے اور اس رقم کو مضاربت یا مشارکت کے اصول کے تحت تجارت میں لگائے اور منافع میں سے کچھ بھی پالیسی ہولڈر کو دیئے بغیر ایک متعینہ مقدار الگ فنڈ میں حسب وعدہ و اقرار جمع کرلی جائے، اور بقیہ کو دوبارہ تجارت میں لگایا جائے۔ اس صورت میں کمپنی کے پاس پالیسی ہولڈر کا ایک فنڈ ہمیشہ جمع رہے گا اور دوسرا تجارت میں لگا رہے گا۔ اس طرح کمپنی پالیسی ہولڈر کی طرف سے وکیل مجاز ہوگی۔ بہرحال اس کی موت پر کل رقم اسکے وارثین کے حوالہ کردی جائے۔ اس شکل کی طرف اس حدیث شریف میں اشارہ موجود ہے جس میں ہے کہ ایک صاحب نے مزدوری کی، متاجر نے حسب منشاء اجرت دینے سے انکار کیا، چنانچہ مزدور چلا گیا، لیکن وہ کچھ دنوں کے بعد واپس آیا اور اپنی اجرت کا مطالبہ کرنے لگا تو متاجر نے جانوروں کے ایک ریوڑ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ انھیں لے جاؤ تو وہ آدمی کہنے لگا کہ کیا مذاق کررہے ہو؟ تو متاجر نے جواب دیا کہ اصل میں میں نے تمہارے روپئے کو تجارت میں لگا دیا تھا، جس کے سبب یہ سب وجود میں آئے، اس لئے یہ منافع تمہارے ہیں، تم یہ سب لے کر جاؤ۔ تو وہ آدمی خوشی خوشی ان جانوروں کو لیکر چلا گیا (صحیح البخاری رقم: ۲۲۷۲)۔

۲۔ کمپنی لوگوں سے ایک متعینہ مقدار مثلاً دس ہزار روپئے بطور وقف وصول کرے اور اس کو تجارت میں لگائے، کل منافع میں سے حسب وعدہ و اقرار واقفین میں سے کسی کی حادثاتی موت پر ایک مقررہ مقدار مثلاً دو لاکھ روپئے میت کے وارثین کو دیئے جائیں۔ اس لیے کہ اپنی اولاد پر وقف کرنا صحیح ہے "درمختار" میں ہے: "جعل ريعه لنفسه أيام حياته ثم و ثم جاز عند الثاني، و به يفتي كجعله لولده"
(الدر المختار علی رد المحتار ۶/۶۹۵ زکریا، ۴۳۶/۳ بیروت، فصل فیما یتعلق بوقف الاولاد)۔

نیز دراہم ودنانیر کا وقف کرنا اور ان کو تجارت میں لگانا بھی جائز ہے: "وكما صح أيضا وقف كل منقول قصدا فيه تعامل للناس كفأس وقدوم، بل دراهم ودنانير...ومكيل وموزون فيباع ويدفع ثمنه مضاربة، فعلى هذا لو وقف على شرط أن يقرضه لمن لا بذرله ليزرعه لنفسه، فإذا أدرك أخذ مقاديره ثم اقرضه لغيره و هكذا جاز. خلاصه. قوله: (ويدفع ثمنه مضاربة أو بضاعة) وكذا يفعل في وقف الدراهم والدنانير وما خرج من الربح يتصدق به في جهة الوقف......وعن الأنصاري وكان من أصحاب زفر فيمن وقف الدراهم أو ما يكال و يوزن أيجوز ذالك؟ قال نعم، قيل: وكيف؟ قال: يدفع الدراهم مضاربة ثم يتصدق بها في الوجه الذي وقف عليها ..." (الدر المختار مع رد المحتار ۳/۳۷۴ (بیروت)، مطلب فی وقف الدراهم والدنانیر)۔

---

[1] آرگنائزر تحریک دار القضاء، آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ، نئی دہلی۔

۳۔ بہر صورت حسب وعدہ واقرار ایک مدت بھی متعین کی جاسکتی ہے، مثلا یہ پالیسی پالیسی ہولڈر کی ۷۰ رسال کی عمر تک لاگو ہوگی، اس کے بعد نہیں البتہ فنڈ کی طرف سے اس کے نام تاوفات ایک متعین وظیفہ جاری ہو۔

۴۔ چونکہ ان دونوں صورتوں کی بنیاد باہمی تعاون اور کمپنی پر مکمل اعتماد و بھروسہ پر ہے، جس کا ایک سچے مسلمان کو حکم دیا گیا ہے۔ اللہ تعالی کا ارشاد ہے: {وتعاونوا علی البر والتقوی ولا تعاونوا علی الإثم والعدوان} (المائدۃ:۲) اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: "حسن الظن من حسن العبادۃ" (ابو داؤد، رقم ۴۹۸۵)، اس لیے کمپنی یا ادارہ رجسٹرڈ اور حکومت ہند سے منظور شدہ ہو، تاکہ اس پر عوام کو مکمل اعتماد ہو سکے۔

۵۔ اس کے لئے امت کے بااثر وبارسوخ افراد کو اس کام میں سرگرم ہونے کی ضرورت ہے، نیز علماء کرام کی ایک کمیٹی تشکیل ہو جو مساجد و اجلاس، نیز میڈیا میں آکر موضوع کی اہمیت، موجودہ انشورنس کی قباحت و برائی بیان کرے اور اسلامی انشورنس کی طرف راغب کرے۔

چونکہ اسلامی انشورنس کی بنیاد باہمی تعاون پر ہے، اس لئے اس کو پوری دنیا میں اور بالخصوص ہندوستان میں نافذ کیا جاسکتا ہے۔

☆☆☆

موجودہ انشورنس کے شرعی متبادل (تکافل) کی صورت

مفتی محمد سرور ندیم قاسمی گڈاوی[1]

اس میں کوئی شک نہیں کہ موجودہ دور میں انشورنس کی جتنی شکلیں پائی جاتی ہیں کوئی بھی قمار اور ربا سے خالی نہیں ہے خواہ لائف انشورنس ہو یا املاک کا انشورنس یا ذمہ داریوں کا انشورنس سب کا سب ربوا اور قمار کا معجون مرکب ہے، جسے نہ تو شریعت اجازت دیتی ہے اور نہ مسلم معاشرہ اس کو قبول کرنے کو تیار ہے، اور آج کی دنیا میں اس کا کوئی مستحکم نظام بھی مسلمانوں کے لئے ناگزیر ہے۔

اس پس منظر میں اکیڈمی کی طرف سے جاری کردہ سوالنامہ میں یہ سوال کیا گیا ہے کہ ایسا اسلامی متبادل پیش کیا جائے جو ان مفاسد سے خالی ہو اور بیمہ کے فوائد بھی اس سے حاصل ہوں۔

اسلامی نقطہ نظر سے اصول شرعیہ کے ماتحت مروجہ انشورنس کے ایسے بے خطر اور بے ضرر بدل موجود ہیں، اگر ان کو بروئے کار لایا جائے تو نہ صرف یہ ہے کہ مروجہ انشورنس کا اچھا بدل بن سکیں، بلکہ اس کے ذریعہ قوم کے بے بس، مجبور اور بے سہارا افراد کو پیر پر کھڑا ہونے کا موقع ملے گا، اور انشورنس کے جتنے مقاصد ہیں (امداد باہمی، سرمایہ کی حفاظت، ناگہانی حادثات کی صورت میں تباہی و بربادی سے بچنا، ایک شخص کے انتقال کے بعد پسماندگان بال بچوں اور بیوی کو تکلیف اٹھانا نہ پڑے) ان کے حصول کا بہترین ذریعہ بنیں گے۔ ان مقاصد کا حل یہ ہے کہ غیر سودی بینک کا نظام قائم کیا جائے جس کی اساس شرکت اور مضاربت پر ہو، اس طرح سرمایہ بھی محفوظ رہے گا اور دولت میں جائز طریقہ سے اضافہ بھی ہوگا، یعنی انشورنس پالیسی کی حاصل شدہ رقوم کو شرکت اور مضاربت کے شرعی اصول کے مطابق تجارت پر لگایا جائے اور معینہ شرح سود کے بجائے تجارتی کمپنیوں کی طرح منافع اور نقصان دونوں میں بیمہ پالیسی خریدنے والے شریک ہوں، اور ناگہانی حادثات کی صورت میں بیمہ پالیسی خریدنے والے آپس میں یہ طے کریں کہ ہم آمدنی کا ایک حصہ (اپنی صوابدید کے مطابق) محفوظ رکھ کر وقف کریں گے۔ نیز یہ معاہدہ کرلیں کہ اس محفوظ رقم سے فائدہ اٹھانے کے حقدار صرف کمپنیوں کے حصہ دار ہوں گے۔ جیسا کہ موجودہ مروجہ انشورنس میں ہوتا ہے اور محفوظ رقم سے حادثہ کی صورت میں خود جمع کرنے والا بھی فائدہ اٹھانے کا مجاز ہوگا۔

حصہ دار کو حادثہ پیش آجانے کی صورت میں اس کے پسماندگان بیوی بال بچوں کے لئے محفوظ رقم میں سے ایک معتد بہ رقم کے ذریعہ مدد کی جائے اور اس کے لئے قوانین بنائے جائیں، اور طبعی موت آجانے کی صورت میں کچھ کم امداد کی جائے، مثلاً کسی بیماری کی وجہ سے موت آجائے یا عمر طبعی کو پہنچ کر موت آجائے۔ اور اس کے لئے ڈاکٹری معائنہ کے ذریعہ ایک عمر بھی متعین کی جاسکتی ہے۔ جیسے مروجہ انشورنس میں ہوتا ہے اور اس میں شرعی طور پر کوئی قباحت نہیں ہے، پھر نگرانی کی جائے اور اس کے لئے بڑی بڑی برانڈیڈ اور بین الاقوامی کمپنیوں کے قوانین سے شریعت کی روشنی میں فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے، تاکہ نقصانات کے امکانات کم ہوں۔

گذشتہ سطروں میں جو متبادل طریقہ پیش کیا گیا ہے اس راہ میں مشکلات ضرور ہیں، اور یہ نظریہ قابل عمل اسی وقت ہوسکتا ہے، جبکہ مسلمانوں میں اسلامی حمیت اور قومی ہمدردی کا شعور پیدا ہو، اور اپنی زندگی کو اسلامی خطوط پر استوار کرنے کے لئے تھوڑی جانی و مالی قربانی دینے کے لئے تیار ہوں، لیکن یہ یاد رہے کہ پہلے سوچ ابھرتی ہے، پھر وہ نظریہ بنتی ہے، تب وہ نظریہ عملی صورت میں سامنے آتا ہے، کسی نظریہ کا پیش کیا جانا اور اس پر غور وفکر کی دعوت دینا ہی اس بات کی دلیل ہے کہ یہ نظریہ قابل عمل ہے، اور سرمایہ دارانہ نظام سے پہلے صدیوں میں اسی نظریہ پر عمل ہوتا رہا، نیز ہم جو موجودہ زمانہ میں بینکنگ سسٹم اور انشورنس کا اتنا مستحکم نظام دیکھتے ہیں، کیا یہ ایک ہی سال کا نتیجہ ہے؟ بلکہ ایک صدی سے زیادہ غور وفکر اور تجربات کی بنیاد پر، ردوبدل کرنے کے بعد اس شکل میں سامنے آیا ہے، اولاً چند افراد ہی کسی نظریہ کو قابل عمل بناتے ہیں۔

---

[1] مدرسہ اصلاح المسلمین کریم گنج جھتکی، پوکھر، سیتامڑھی۔

اور ہندوستان جیسے ملک کے لئے بھی یہ قابل عمل صورت ہے۔ اسلئے کہ تقریبا نصف صدی پہلے حیدرآباد میں اسلامی بینکنگ کا نظام عمل میں آیا تھا اور بہت کامیاب رہا تھا۔ اور اب تو بہت سے صوبوں میں اس کا تجربہ کیا جارہا ہے اور کامیاب ہو رہا ہے۔ مگر حکومتی سطح پر کچھ رکاوٹیں ہیں اس کے لئے ضرورت ہے کہ علماء کا ایک وفد حکومت سے ملاقات کرے، اور اسلامی نظام معیشت کی خوبیاں اور سرمایہ دارانہ سسٹم کی تباہ کاریاں بتلائے اور جو رکاوٹیں ہیں انہیں دور کرانے کی کوشش کرائے۔

نیز امداد باہمی کے لئے مندرجہ ذیل طریقوں پر عمل کیا جائے:

۱۔ زکوۃ کا اجتماعی نظام قائم کیا جائے۔

۲۔ رفاہی تنظیمیں قائم کی جائیں۔

۳۔ بیت المال کا نظام پھر سے قائم کیا جائے، الحمد للہ امارت شرعیہ پھلواری شریف پٹنہ بہار، اڑیسہ و جھارکھنڈ کا اس پر عمل ہے، ایک شعبہ بیت المال کا بھی قائم ہے۔

۴۔ طبی خدمات کے لئے صدقات واجبہ ونافلہ کے مال سے ہسپتال اور شفاخانے قائم کئے جائیں۔

۵۔ معاقل کا نظام پھر سے زندہ کیا جائے۔

ملک کے مختلف علاقوں میں چھوٹے پیمانے پر ان میں سے بعض نظریہ پر عمل ہو رہا ہے، لیکن بڑے پیمانہ پر ملکی، صوبائی، ضلعی سطحوں پر عمل کرنے کی ضرورت ہے، اور اس کے لئے ضروری ہے کہ قوم کے معزز افراد علماء و مشائخ، خطباء و واعظین، اپنی اپنی حد تک تقریر و تحریر کے ذریعہ مجلس عام، اور نجی محفل میں اس کو موضوع گفتگو بنا کر لوگوں کے ذہن کو تیار کرے، اور قرآن وحدیث کی روشنی میں سوشل سروس سوشل ورک کی اہمیت مسلم قوم کے افراد کے دلوں میں بٹھائے۔

خدا کرے یہ خواب شرمندہ تعبیر ہو جائے اور سودی نظام کے چکر سے جلد سے جلد ہم لوگ نجات پائیں۔ آمین۔

☆☆☆

اسلامی انشورنس (تکافل) حالات اور ضرورت

قاضی محمد ذکاء اللہ شبلی [1]

موجودہ حالات میں صنعتی انقلابات کی بنا پر مالی ومعاملاتی سہولت وترقی کے ساتھ حوادثات کے جو واقعات رونما ہو رہے ہیں اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انسانی جان کس قدر بے قیمت ہو کر رہ گئی ہے۔ انسان چشم زدن میں لقمۂ اجل ہو جاتا ہے، گھر سے نکلنے کے بعد یہ یقین واطمینان نہیں رہتا کہ کس حال میں واپس ہوگا، بازاروں میں جس طرح انسانوں کی بھیڑ رہتی ہے اس سے زیادہ اب سڑکوں پر گاڑیوں کا سیلاب نظر آتا ہے، اور ہر شخص دوسرے سے آگے نکلنے کی فکر میں رہتا ہے، یہاں تک کہ پیدل چلنے والے بھی محفوظ و مامون نہیں۔

اسی طرح بڑے کارخانوں و فیکٹریوں میں جہاں سیکڑوں لوگ کام کرتے ہیں آئے دن کسی نہ کسی حادثہ کے شکار ہوتے ہیں، کسی کا ہاتھ ہی مشین میں آجاتا ہے، کسی کا چہرہ جھلس جاتا ہے، تو کوئی کرنٹ لگنے سے رخصت ہو جاتا ہے، اس میں اگر چھوٹا کارخانہ ہو تو اتنی بھی مدد نہیں ہو پاتی کہ آئندہ کے لئے وہ کچھ کرلے، نیز کارخانہ مالک بھی مالی اعتبار سے اس پوزیشن میں نہیں ہوتا کہ کاریگر کی اچھی مدد کر سکے۔

اسی طرح اچانک سڑک حادثہ کا شکار ہونے پر ایسے حالات سامنے آتے ہیں۔ ان صورتوں میں اگر انشورنس شدہ ہو تو بیمہ کمپنی پوری مدد کرتی ہے اور خاطر خواہ رقم ملتی ہے، اس سے حادثہ کا غم قدرے ہلکا ہونے کے ساتھ آئندہ فوری طور پر کسی کے محتاج نہیں رہتے۔ شریعت میں اس کی نظیر بیت المال کے ذریعہ مدد یا "قانون دیت" دخون بہا کی شکل میں ملتی ہے۔ مغربی تہذیب نے اسلامی تہذیب وقانون سے ازلی دشمنی کے تحت اس کی شکل ہی بدل ڈالی اور ایسے نظام کو قائم کیا جس میں کسی نہ کسی درجہ میں سود در باشامل ہے، لیکن ان حالات میں جانی و مالی نقصان کے سخت خسارہ سے بچنے اور نکلنے کے لئے انشورنس کی صورت ہی مناسب ہے، یہ کافی حد تک "تکافل" سے بے حد قریب ومماثل ہے اور دونوں کا مقصد قریب قریب ہے، اس کی یہاں اجازت ہونی چاہئے۔ فقط ☆☆☆

---

[1] دارالقضاء اندور۔

وقف فنڈ کے ذریعہ اسلامی انشورنس (تکافل) کی صورت

مفتی عبدالرحمن پالنپوری [۱]

فی زمانناروزمرہ حادثات میں ایک دوسرے کے مالی نقصان کو کم کرنے میں معین ومددگار بننے کی بہترین جائزشکل یہی سمجھ میں آتی ہے کہ ایک ''وقف فنڈ'' قائم کیا جائے، جس میں خواہشمند حضرات شرائط کے ساتھ رقوم وقف کردیں، اور وقف فنڈ کے ذمہ دار حضرات کو جمع شدہ رقوم کو نفع بخش کاروبار میں لگانے کی اجازت دے دی جائے اور جمع شدہ رقوم ومنافع سے خود کے اور دوسروں کے مستفید ہونے کے شرائط طے کردیئے جائیں، تو "شرائط الواقف کنص الشارع" کی بنیاد پر تکافل کی جائزشکل ہوگی، نیز ہندوستان میں قابل عمل ہونے میں بھی پریشانی نہ ہوگی، فقط واللہ اعلم بالصواب۔

☆☆☆

تعاون کے جذبہ سے انشورنس (تکافل)

ڈاکٹر بہاء الدین محمد ندوی [۲]

انشورنس کے بدلے میں تعاون علی البر کا طریقہ اختیار کرسکتے ہیں۔ یعنی انشورنس میں ربا شامل ہے، اس لئے وہ شریعت کی نظر میں جائز نہیں، مگر ہر ایک آدمی سے تعاون کی نیت سے رقم وصول کرکے ایک معین وقت پر معین لوگوں کی موصولہ رقم سے مدد دینا کافی ہے۔

☆☆☆

---

[۱] دارالافتاء دارالعلوم چھاپی۔
[۲] وائس چانسلر دارالہدیٰ اسلامک یونیورسٹی کیرالہ۔

التكييف الشرعي لعملية التكافل على أساس الوقف

شيخ محمد شعيب عمر[1]

١ـ المقدمة:

والظاهر أن بعض الباحثين الذين اقترحوا قيام التأمين على أساس التبرع والتعاون، يرون أن العلة المانعة من التأمين التجاري التقليدي (Conventional Insurance) هي الغرر فقط. وهو ما اعتمده قرار مجمع الفقه الإسلامي الدولي. وهذا نصه: ''أن عقد التأمين التجاري ذي القسط الثابت الذى تتعامل به شركات التأمين عقد فيه غرر كبير مفسد للعقد، ولذا فهو حرام شرعاً (قرار رقم: ٩ (٩،٢))۔

٢ـ الفروق الأساسية بين شركة التأمين التجارية وشركة التأمين التعاونية:

١ـ٢ ـ الفرق الأساسي، هو أن فى التأمين التجاري يسعى مؤسسوا الشركة إلى تحقيق ربح من الفائض (Surplus) الذي تحققه الشركة من قسط التأمين، أما في التأمين التعاوني، فإن هذا الفائض ليس حقاً للمؤسسين۔ وإنما هو حق للمشتركين جميعاً يحتفظ به كله أو بعضه كاحتياطي (Reserve) ويوزع ما زاد عن الاحتياطي على المشتركين۔

٢ـ٢ـ والصحيح أن الغرر موجود في التأمين الإسلامي، القائم على التعاون والتبرع، وليس على أساس المعاوضة. ولكن الغرر عند المالكية يفسد عقود المعاوضات وحدها، ولا يفسد عقود التبرعات، ولأن الحديث نهى عن بيع الغرر، لما قد يترتب عليه من أكل أحد المتعاقدين مال الآخر بالباطل. وهذا متحقق فى عقود المعاوضات، وغير متحقق فى عقود التبرعات، ولا يؤدي إلى النزاع والخصومات (يراجع: الشيخ الصديق الضرير: كتابه القيم عن الغرر وأثره في العقود: سلسلة صالح كامل للرسائل الجامعية: (ص: ٥٨٥ـ٥٨٦)، ولأن التبرعات يجوز فيها التعليق والتقييد بالشروط عند جمهور الفقهاء۔

٣ـ٢ ـ ومن الشواهد، للتعاون والتكافل، وهي تكافل الأشعريين في السفر والحضر: وواضح أن بعضهم يقدم القليل ويحصل على الكثير بالنسبة لما قدمه، فدل ذلك بوضوح أن قصد التعاون والبر يغتفر معه ما لا يغتفر في المعاملات (صحيح البخاري، كتاب الشركات حديث رقم: ٢٤٨٦، وصحيح مسلم؛ باب فضائل الصحابة حديث رقم: ٢٥٠٠)۔

وبعد هذا التعليق، انتقل إلى تأصيل التأمين التكافلي على صيغة الوقف، فإن الوقف صيغة أصيلة في الفقه الإسلامي، مبني على أساس التعاون، وأنشأت لمباشرة الأعمال الخيرية، وله شخصية اعتبارية مستقلة في كل من الشريعة والقانون، ويجوز فيه من الشروط ما لا يجوز فى غيره، وأن الوقف يصلح لثبوت الحقوق له وعليه۔ فلو استدان الناظر على الوقف لا يكون ذلك ديناً على الناظر، وإذا تأخر المستفيد من الوقف في أداء ما عليه كان مديناً للوقف لا للناظر، وتأصيل التأمين التكافلي على أساس الوقف، هو الصيغة التي اختارها أستاذي العلامة القاضي فضيلة الشيخ محمد تقي العثماني حفظه الله۔

٣ـ تطبيق التأمين الإسلامي على أساس الوقف:

١ـ٣ ـ تقوم الشركة بإنشاء محفظة (Portfolio) للوقف وتعزل جزءاً معلوماً من رأس مالها يكون وقفاً مؤبداً لأغراض الوقف۔ وإن هذه المحفظة هي التي تقوم بدفع التعويضات إلى المشتركين حسب لوائح الوقف۔

---

[1] المحامي بالقضاء المدني والشرعي، ڈربن، ساؤتھ افریقہ۔

ویکون ذلك من باب وقف النقود، وهو قول محمد بن عبد الله الأنصاري، صاحب الإمام زفر واختاره ابن تيمية (فتح القدير ۶:۱۹)۔

۲-۳- إن محفظة الوقف شخصية اعتبارية (Juristic Person) يصح أن يتملك الأقساط ويستثمرها، ويدفع التعويضات، حسب شروط الوقف۔

۳-۳- إن الراغبين في التأمين الإسلامي يشتركون في عضوية الوقف بالتبرع إليه حسب شروط الوقف۔

۴-۳- ما يتبرع به المشترك، يخرج من ملكه ويدخل في ملك الوقف، لأن التبرع له، وبما أن ما يتبرع به للوقف ليس وقفاً، وإنما هو مملوك للوقف، يصرف لأغراض الوقف وللموقوف عليهم۔

وجاء في ''الفتاوى الهندية'':

''رجل أعطى درهماً في عمارة المسجد أو نفقة المسجد أو مصالح المسجد صح، لأنه وإن كان لا يمكن تصحيحه وقفاً يمكن تصحيحه تمليكاً للمسجد، فإثبات الملك للمسجد على هذا الوجه صحيح، فيتم بالقبض'' (كتاب الوقف)۔

۵-۳- تنص في اللوائح أو في الوثائق للوقف، شروط استحقاق التعويض، التزامات المشترك، أن الشركة وكيلة في إدارة المحفظة للتأمين، ومضارب أو وكيلة في استثمار موجودات الوقف (غير النقود الموقوفة)۔

۶-۳- إن التعويضات المدفوعة من محفظة التأمين للوقف، ليس عوضاً عما تبرعوا به، وإنما هو عطاء مستقل من صندوق الوقف لدخول المشتركين في جملة الموقوف عليهم حسب شروط الوقف. فلا تتحول به العلاقة إلى معاوضة، وبما أن الواقف يجوز له الانتفاع إن كان داخلاً في جملة الموقوف عليهم۔

۷-۳- بما أن الوقف مالك لجميع موجوداته، وأن الفائض التأميني جزء منها. ويتم التصرف فيه حسبما ينص عليه في اللوائح. فيجوز أن يخصص كل الفائض أو جزئاً منه كاحتياطي، لما قد يحدث من النقص في السنوات المقبلة، أو يوزع ما تبقى من الفائض على المشتركين بنسبة أقساطهم، ويجوز أن يصرف جزئاً منه في وجوه الخير، على أن لا تستحق الشركة المديرة شيئاً من ذلك الفائض۔

۸-۳- يجب أن ينص في اللوائح، بصرف جميع المبالغ الباقية فيه، بعد المصروفات، إلى وجه غير منقطع من وجوه الخير عند تصفية المحفظة (Winding Up) (المغني لابن قدامة ۶:۲۱۴)۔

۹-۳- إن الشركة التي تقوم بإدارة عمليات الصندوق، من إعداد وثائق التأمين، وجمع الاشتراكات ودفع التعويضات وغيرها من الأعمال الفنية، وهي تستحق لقاء هذه الخدمات أجرة معلومة ينص عليها في العقد المناسب بين الشركة وبين الوقف۔

۱۰-۳- وأما استثمار أموال المحفظة، فيمكن أن تقوم به الشركة على أساس الوكالة بأجر، أو كمضارب فتستحق بذلك جزئاً مشاعاً من الأرباح الحاصلة بالاستثمار، ولا تضمن إلا بالتعدي، أو التقصير أو مخالفة الشروط۔

۱۱-۳- تتحمل الشركة المصروفات الخاصة بتأسيس الشركة وجميع المصروفات التي تخصها۔

۴- وإن المجلس الشرعي للمؤسسات المالية الإسلامية (Aoofi) قد اتخذ المعيار الشرعي رقم (۲۶) حول التأمين الإسلامي، وبنى التكييف الشرعي للتأمين الإسلامي على أساس الالتزام بالتبرع من المشتركين لمصلحتهم، فلا مانع من أن يكون عندنا تأصيلان تأخذ كل شركة بما شاء۔ والله سبحانه وتعالى أعلم۔

☆☆☆

عالم اسلام کے اکابر علمائے کرام کے جدید فقہی مسائل پر مقالہ جات اور مناقشات کا مجموعہ نئی ترتیب کے ساتھ

سلسلہ
جدید فقہی مباحث

میڈیکل انشورنس فقہ اسلامی کی روشنی میں

میڈیکل انشورنس کے سلسلہ میں علماء ہند کا فیصلہ، نیز تحقیقی مقالات ومناقشات کا مجموعہ، جو پندرہویں فقہی سمینار منعقدہ میسور مورخہ ۱۱ تا ۱۳ مارچ ۲۰۰۶ء میں پیش کیے گئے

پہلا باب: تمہیدی امور ⊂⊃ دوسرا باب: میڈیکل انشورنس کا تعارف
تیسرا باب: فقہی نقطہ نظر

تحقیقات اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا

زیر سرپرستی
حضرت مولانا مجاہد الاسلام قاسمی
حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی دامت برکاتہم

دار الاشاعت
اردو بازار ○ ایم اے جناح روڈ ○ کراچی پاکستان

مجلس ادارت

ابتدائیہ

یہ دور جمہوریت کا دور ہے اور جمہوریت عوام پر عوام کی حکومت سے عبارت ہے؛ لیکن سرمایہ دارانہ نظام کے غلبہ کی وجہ سے جمہوری حکومتوں میں بھی عوام کی بنیادی ضرورتوں سے سرکار اپنا دامن بچا رہی ہے، صحت، انصاف اور تعلیم ایسی ضرورتیں ہیں جن سے نہ وہ سرمایہ دار مستغنی ہو سکتا ہے جو سونے کی پلنگ پر سوتا ہے، اور نہ وہ مزدور بے نیاز ہو سکتا ہے جس کے لئے فٹ پاتھ پر بچھی ہوئی چٹائی بستر ہے اور ابھرے ہوئے اینٹ اور پتھر تکئے، اس لئے حکومت کا فریضہ ہے کہ ان بنیادی ضرورتوں کو وہ خود ہر شہری کے لئے فراہم کرے، لیکن پرائیوٹیشن کے موجودہ رجحان کی وجہ سے اب یہ سارے بوجھ عوام کو خود اٹھانے پڑتے ہیں، تعلیم اور انصاف گو ضروری چیزیں ہیں، لیکن انسان ان کے بغیر بھی زندہ رہ سکتا ہے، مگر صحت تو ایسی لازمی ضرورت ہے کہ اس کے بغیر تو انسان زندہ بھی نہیں رہ سکتا۔

ایک طرف حکومت کی یہ عنایت اور دوسری طرف علاج کی گراں باری کی وجہ سے آج ترقی یافتہ ملکوں میں میڈیکل انشورنس کمپنیاں نہ صرف وجود میں آچکی ہیں، بلکہ وہ ایک سماجی ضرورت بن گئی ہیں، اور بہت سے ملکوں میں تو ہر شہری کے لئے انشورنس کی یہ صورت لازم کردی گئی ہے، ہندوستان کے حالات ابھی ایسے نہیں ہوئے ہیں، یہاں علاج نسبتاً سستا ہے، اور لوگوں پر اس کا قانونی لزوم نہیں ہے، ہندوستان میں سرکاری انشورنس کمپنیاں تو پہلے سے موجود ہیں، جو میڈیکل انشورنس بھی کرتی ہیں، اب پرائیوٹ اور غیر ملکی کمپنیاں بھی اس میدان میں قدم رکھ رہی ہیں، ابھی گو یہ کمپنیاں خسارہ میں چل رہی ہیں، لیکن انہیں امید ہے کہ مستقبل میں جب ان کے گاہک بڑھ جائیں گے تو انشورنس کے دوسرے شعبوں کی طرح یہ بھی ایک نفع آور شعبہ بن جائے گا۔

اس پس منظر میں اکیڈمی نے مناسب سمجھا کہ اس ابھرتے ہوئے مسئلہ پر علماء اور ارباب افتاء کی اجتماعی رائے حاصل کی جائے، چنانچہ مؤرخہ ۱۱ - ۱۳ / مارچ ۲۰۰۶ء کو منعقد ہونے والے پندرہویں فقہی سمینار 'میسور' میں یہ مسئلہ بھی زیر بحث آیا، اس سلسلہ میں انشورنس کے شعبہ سے متعلق لوگوں سے معلومات بھی حاصل کی گئیں، سمینار میں بھی انہوں نے صورت حال کی وضاحت کی، اس سلسلہ میں ارباب افتاء جس نتیجہ پر پہنچے وہ یہ ہے کہ انشورنس کی یہ شکل بھی قمار سے خالی نہیں ہے، اور ہندوستان میں ابھی ایسے ناگفتہ بہ حالات پیدا نہیں ہوئے ہیں کہ میڈیکل انشورنس کے بغیر انسان کے لئے علاج کرانا ممکن نہ رہے اور نہ حکومت نے اسے قانونی طور پر لازمی قرار دیا ہے؛ اس لئے ہمارے ملک کے حالات میں میڈیکل انشورنس جائز نہیں ہے۔

اکیڈمی کا یہ نقطۂ نظر نہ صرف "میڈیکل انشورنس" کے بارے میں ہے، بلکہ یہی رائے جان و مال کے انشورنس کے بارے میں بھی ہے، قمار اور ربا کی آمیزش کی وجہ سے اکیڈمی انشورنس کی ان صورتوں کو بھی اصولاً ناجائز سمجھتی ہے، البتہ فرقہ وارانہ فسادات اور فسادات میں خاص طور پر مسلمانوں کی جان واملاک پر حملہ نیز حکومت کی طرف سے نہ صرف مسلمانوں کے تحفظ سے پہلو تہی؛ بلکہ مفسدین کی حوصلہ افزائی کے پس منظر میں یہ بات کہی گئی ہے کہ مسلمانوں کے لئے ہندوستان کے موجودہ حالات میں جان و مال کا انشورنس کرانے کی اجازت ہے، اب اگر فسادات میں جان و مال کا نقصان ہو تو انشورنس کی پوری رقم حلال ہوگی؛ کیوں کہ یہ حکومت سے اپنے نقصان کا حرجانہ وصول کرنا ہے اور اگر فساد میں جان و مال کا نقصان نہیں ہوا، طبعی اسباب یا فرقہ وارانہ فساد کے علاوہ کسی اور سبب سے نقصان ہوا تو صرف اپنی جمع کی ہوئی رقم حلال ہوگی، اور اس سے زائد ملنے والی رقم کو بلا نیت ثواب غرباء پر خرچ کردینا یا رفاہی کاموں میں لگا دینا واجب ہوگا، یہ نہ صرف اکیڈمی کا فیصلہ ہے، بلکہ اس سے پہلے مجلس تحقیقات شرعیہ ندوۃ العلماء لکھنؤ اور ادارۃ المباحث الفقہیہ، جمعیۃ علماء ہند بھی یہی فیصلہ کرچکی ہے، اور ملک کے متعدد اکابر اور ارباب افتاء پہلے سے یہ فتویٰ دیتے رہے ہیں۔

میڈیکل انشورنس کے موضوع پر مقالات و تحقیقات اور شرکاء سمینار کے مناقشات کے اس مجموعہ کو محب عزیز مفتی احمد نادر القاسمی (رفیق شعبہ علمی) نے بڑی خوش سلیقگی کے ساتھ مرتب کیا ہے، اور حسب ضرورت مجلس ادارت کے ارکان کے مشورہ اور رہنمائی سے بھی استفادہ کیا ہے، اللہ تعالیٰ ان سبھوں کو اجر خیر عطا فرمائے، اور اس مجموعہ کو صواب و سداد کی رہنمائی کا ذریعہ بنائے۔

خالد سیف اللہ رحمانی (جنرل سکریٹری)

17 فروری 2007ء ...... ۲۸ محرم الحرام ۱۴۲۸ھ

اکیڈمی کا فیصلہ:

میڈیکل انشورنس

شریعت اسلامی میں جوئے کی کوئی بھی شکل جائز نہیں۔ اس وقت میڈیکل انشورنس کی جو صورت رائج ہے وہ اپنے نتیجہ کے اعتبار سے جوا میں شامل ہے اور اس نے علاج کو خدمت کے بجائے نفع آور تجارت بنا دیا ہے۔ اس پس منظر میں سمینار نے میڈیکل انشورنس کے بارے میں درج ذیل فیصلے کئے ہیں:

۱- میڈیکل انشورنس، انشورنس کے دوسرے تمام شعبوں کی طرح بلاشبہ مختلف قسم کے ناجائز امور پر مشتمل ہے، لہٰذا عام حالات میں میڈیکل انشورنس ناجائز ہے اور اس حکم میں سرکاری وغیر سرکاری اداروں میں کوئی فرق نہیں ہے۔

۲- اگر قانونی مجبوری کے تحت میڈیکل انشورنس لازمی ہو تو اس کی گنجائش ہے، لیکن جمع کردہ رقم سے زائد جو علاج میں خرچ ہو، صاحب استطاعت کے لئے اس کے بقدر بلا نیت ثواب صدقہ کرنا واجب ہے۔

۳- موجودہ مروج انشورنس کا متبادل اسلامی تعلیمات کی روشنی میں ممکن ہے اور آسان صورت یہ ہے کہ مسلمان ایسے ادارے و نظام قائم کریں، جن کا مقصد علاج ومعالجہ کے ضرورت مندوں کی ان کی ضرورت کے مطابق مدد کرنا ہو۔

سوالنامہ:

میڈیکل انشورنس کا شرعی حکم

صحت اللہ تعالی کی ایک بہت بڑی نعمت ہے اور حتی المقدور اس کی حفاظت انسان کا فریضہ اور اس کی ذمہ داری بھی ہے، یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ موجودہ دور میں صنعتی انقلاب، ماحولیاتی عدم توازن اور غذائی اجناس میں اضافہ کے لئے نئے نئے تجربات کی وجہ سے بیماریاں بڑھ رہی ہیں اور امراض پیچیدہ تر ہوتے جارہے ہیں، اس کے ساتھ ساتھ امراض کی تشخیص اور علاج کے نت نئے زود اثر طریقے بھی دریافت ہورہے ہیں، لیکن جدید طریقہ علاج اتنا گراں ہو چکا ہے کہ متوسط معاشی صلاحیت کے حامل لوگوں کے لئے بھی اس کے اخراجات نا قابل برداشت ہوجاتے ہیں، اور ستم بالائے ستم یہ ہے کہ طب وعلاج جو خدمت خلق کا ذریعہ اور ایک باعزت پیشہ تھا اب اس نے تجارت کی صورت اختیار کرلی ہے۔

اس صورت حال نے میڈیکل انشورنس کی صورت کو وجود بخشا ہے، میڈیکل انشورنس کرنے والے ادارے سرکاری بھی ہیں اور نجی بھی، دونوں طرح کی کمپنیوں میں یہ بات مشترک ہے کہ آدمی اپنے اختیار سے ایک طے شدہ رقم سال بھر کے لئے جمع کرتا ہے جس کی بنیاد پر اس سال کے درمیان ہونے والی کسی پیچیدہ بیماری کے علاج کے لئے وہ ایک بڑی رقم (جس کی زیادہ سے زیادہ حد معاملہ کے وقت متعین ہوجاتی ہے) کا مستحق قرار پاتا ہے، اور اس سال بیمار نہ ہونے کی صورت میں اس کی جمع کی ہوئی رقم یا اس کا کوئی حصہ واپس نہیں ملتا ہے، نیز ہر سال اس انشورنس کی تجدید کے لئے طے شدہ رقم دینی ہوتی ہے۔

انشورنس انفرادی طور پر افراد کے لئے اور اجتماعی طور پر خاندان یا ادارہ کے لئے بھی کرایا جاسکتا ہے، واقف کار حضرات کا کہنا ہے کہ میڈیکل انشورنس کا شعبہ مسلسل اور بہت زیادہ خسارہ میں چل رہا ہے، حکومت اس تصور کے ساتھ اسے چلا رہی ہے کہ اس کے ذریعہ عوام کو سماجی تحفظ حاصل ہوگا جو حکومت کے فرائض میں سے ہے، اور نجی کمپنیاں اس توقع کے ساتھ اسے چلا رہی ہیں کہ آئندہ یہ ان کے لئے نفع کا باعث ہوگا۔

بعض ملکوں میں اپنے شہریوں بلکہ دوسرے ملکوں سے آنے والوں کے لئے اس انشورنس کو لازم قرار دے دیا گیا ہے، اور اس میں شبہ نہیں کہ بہت سے مواقع پر میڈیکل انشورنس غریب اور نادار لوگوں کے لئے سہولت کا باعث ہوتا ہے، لیکن ظاہر ہے کہ مسلمان اللہ اور رسول کے احکام کا پابند ہے، اور اس کے لئے اسی وقت سہولتیں اور آسانیاں قابل استفادہ ہوسکتی ہیں جب کہ شریعت اس کی اجازت دیتی ہو۔

اسی پس منظر میں درج ذیل سوالات پیش خدمت ہیں:

۱- میڈیکل انشورنس (صحت بیمہ) کرانے کا کیا حکم ہے؟

۲- صحت بیمہ کرانے والا جو رقم جمع کرتا ہے اور پھر ضرورت پر اس سے کہیں زیادہ مالیت کے علاج سے مستفید ہوتا ہے، اس کا کیا حکم ہوگا؟

۳- سرکاری ونجی اداروں میں مقصد کا جو فرق ذکر کیا گیا ہے اس کی بنا پر سرکاری میڈیکل انشورنس کے ادارے سے فائدہ اٹھانے کا حکم دوسرے اداروں سے مختلف ہوگا یا دونوں کا حکم ایک ہوگا؟

۴- سرکاری انشورنس ادارہ جو علاج کی ضرورت پر مطلوبہ یا مقررہ رقم دیتا ہے اس کو سرکار کی طرف سے امداد وتعاون کا درجہ دیا جاسکتا ہے یا نہیں؟

۵- اگر میڈیکل انشورنس کی مذکورہ صورت جائز نہیں ہے تو کیا اسلامی تعلیمات کی روشنی میں اس کی کوئی متبادل صورت ہوسکتی ہے جو میڈیکل انشورنس کے بنیادی مقصد-غریبوں کے لئے گراں علاج کی سہولت فراہم کرنا- کو بھی پورا کرتا ہو اور شرعا دائرہ جواز میں بھی ہو۔

۶- جن ممالک میں میڈیکل انشورنس وہاں کے شہریوں یا وہاں جانے والوں کے لئے لازم کردیا گیا ہے ان ملکوں میں میڈیکل انشورنس کرانے کا کیا حکم ہے اور اگر قانونی مجبوری کے تحت انشورنس کرانے والے بیمار پڑجائیں تو کیا ان کے لئے انشورنس کی سہولت سے فائدہ اٹھانا درست ہوگا؟

پہلا باب / تمہیدی امور

میڈیکل انشورنس / ایک تعارف
ماہرین سے حاصل معلومات کی روشنی میں ضروری نکات

موجودہ دور میں تیزی سے بڑھتے امراض اور ان کے علاج میں زبردست مہنگائی کے پس منظر میں میڈیکل انشورنس (صحت بیمہ) لوگوں کی سہولت اور بالخصوص متوسط طبقہ کی آسانی کے لئے رائج ہوا ہے۔ اس انشورنس کا بنیادی مقصد کسی فریق کی جانب سے نفع اندوزی نہیں ہے بلکہ یہ حکومت کی سوشل سیکورٹی (سماجی تحفظ) کی ذمہ داری ادا کرنے کی ایک صورت ہے۔

ہندوستان میں اس وقت صحت بیمہ پالیسی جو سرکاری ادارہ چلا رہا ہے، اس کا نام ''جنرل انشورنس کارپوریشن آف انڈیا'' ہے، اس میں گاڑی، سامان و دکان وغیرہ کی طرح صحت بیمہ کا بھی ایک شعبہ ہے، اس شعبہ کو مذکورہ اداروں کی زیر نگرانی چار ذیلی ادارے پورے ملک میں چلا رہے ہیں، جو درج ذیل ہیں:

۱- یونائیڈ انڈیا انشورنس کمپنی لمیٹڈ۔ ۲- اورینٹل انشورنس کمپنی لمیٹڈ۔

۳- نیشنل انشورنس کمپنی لمیٹڈ۔ ۴- نیو انڈیا انشورنس کمپنی لمیٹڈ۔

ان چاروں ذیلی اداروں میں باہم کوئی بنیادی فرق نہیں ہے، کیونکہ یہ سب ایک ہی جنرل انشورنس کارپوریشن کے اصول وضوابط کے پابند ہیں۔

انشورنس کا طریقہ یہ ہے کہ مختلف عمر کے افراد کے لئے پریمیم کی علاحدہ علاحدہ رقمیں طے ہیں، مثال کے طور پر ۳۵/ سال کی عمر کے افراد اگر انشورنس کراتے ہیں تو ایک لاکھ کا انشورنس کرانے پر ایک سال کے لئے =/۱۳۱۰ / روپے جمع کرنے ہوں گے۔ دو لاکھ کے انشورنس کے لئے ۲۴۶۹ روپے ایک سال کے لئے ہیں، اسی طرح انشورنس کی علاحدہ رقموں کے لئے علاحدہ پریمیم کی پوری فہرست موجود رہتی ہے۔ عمر کے بڑھنے سے پریمیم کی رقم بھی کسی قدر بڑھتی ہے، ۴۵/ سال سے اوپر والوں کے لئے انشورنس کے وقت کچھ خاص قسم کے چیک اپ بھی ضروری ہوتے ہیں۔

انشورنس کی پریمیم ایک سال کے لئے ہوتی ہے اور اس سال کے اندر بیماری ہو تو انشورنس کی رقم کی حد تک علاج کا خرچ انشورنس کمپنی فراہم کرتی ہے، سال گزر جانے پر پالیسی ختم ہو جاتی ہے، اور اگلے سال کے لئے پھر پریمیم دینی ہوتی ہے۔ بیماری نہ ہونے کی صورت میں پریمیم کی رقم واپس نہیں ملتی ہے۔

میڈیکل انشورنس میں صرف اسی وقت علاج کا خرچ انشورنس کمپنی دیتی ہے جب داخل اسپتال ہونا پڑے۔ آؤٹ ڈور علاج اور سردی کھانسی وغیرہ جیسی بیماریوں کا علاج انشورنس کے ذیل میں نہیں آتا ہے۔ اسی طرح جو امراض انشورنس کرانے کے پہلے سے موجود ہوں

انہیں شامل نہیں کیا جاتا ہے۔صرف بعض حالات میں مزید رقم پریمیم میں لے کر بعض امراض موجودہ کو شامل کرتے ہیں۔

انشورنس کے بعد اسپتال میں علاج کی ادائیگی کے دو طریقے ہیں: علاج کرانے کے بعد بل انشورنس کمپنی کو دیا جائے، کمپنی کا ڈاکٹر بل اور کاغذات چیک کرتا ہے، پھر کمپنی انشورنس ہولڈر کو وہ رقم فراہم کرتی ہے، دوسرا طریقہ یہ ہے کہ انشورنس کمپنی سے بیمہ کارڈ حاصل کرلیا جائے، اس کارڈ کے ساتھ پورے ملک کے ایسے اسپتالوں کی ایک فہرست ہوتی ہے جہاں اس کارڈ کا اعتبار ہوتا ہے، درج فہرست کسی بھی اسپتال میں وہ کارڈ دکھا کر داخلہ لیا جاسکتا ہے، اور علاج کے بعد مریض کو ادائیگی سے کوئی مطلب نہیں ہوتا۔ اسپتال کو ہی کمپنی رقم ادا کرتی ہے۔

میڈیکل انشورنس انفرادی بھی کرایا جاتا ہے اور گروپ انشورنس بھی، گروپ انشورنس میں پوری فیملی کا انشورنس یا کسی ادارہ کے تمام ملازمین کا انشورنس کرایا جاتا ہے، گروپ انشورنس میں پریمیم کی ایک ہی رقم دی جاتی ہے اور جتنی مقدار کا انشورنس ہے، اس میں گروپ کے مذکورہ ممبران میں سے ایک، چند یا تمام کا علاج ہوتا ہے، گروپ انشورنس کی صورت میں پریمیم کے اندر تخفیف بھی رکھی جاتی ہے، نیز بعض موجودہ امراض کا علاج بھی شامل کیا جاتا ہے۔

خاص طور پر شہروں میں میڈیکل انشورنس کا رواج اب بہت تیزی سے بڑھ رہا ہے، اس وقت ایک اندازہ کے مطابق ۸۰ / فی صد لوگ میڈیکل انشورنس کرا چکے ہیں، چونکہ انشورنس کے لئے پریمیم کی رقم بہت معمولی ہوتی ہے اور علاج کے بڑے اخراجات کی ادائیگی ہوتی ہے، اس لئے انشورنس کمپنیوں کے پاس اتنی رقم نہیں ہوتی کہ وہ اس سے نفع کماسکیں، چنانچہ اس وقت میڈیکل انشورنس کمپنیاں بڑے خسارے میں جارہی ہیں، لیکن چونکہ یہ سرکاری ادارے ہیں، اس لئے یہ اپنے نقصان کی تلافی دوسرے ذرائع سے کرتی ہیں، البتہ اس کی وجہ سے اب یہ کمپنیاں اپنی شرائط وضوابط کو سخت کررہی ہیں، چنانچہ ۴۵ / سال سے زائد عمر والے افراد کا انشورنس مشکل سے کرتی ہیں، بغیر چیک اپ کے ان کا انشورنس نہیں ہوتا ہے۔

اس وقت ملک کے اندر مذکورہ سرکاری انشورنس کمپنیوں کے علاوہ کچھ پرائیوٹ کمپنیوں کو بھی میڈیکل انشورنس کرنے کی اجازت دی گئی ہے، چنانچہ ٹاٹا کی AIG کمپنی، ICICI بینک، HDFC بینک وغیرہ کمپنیاں میڈیکل انشورنس کررہی ہیں، ان پرائیوٹ کمپنیوں کے پیش نظر نفع اندوزی ہوتی ہے، اس لئے یہ بظاہر اپنی پالیسیوں کو زیادہ جاذب نظر بنا کر پیش کرتی ہیں، لیکن ان میں شرائط زیادہ سخت ہیں، ویسے بنیادی ضوابط میں سرکاری اور نجی کمپنیوں کے درمیان زیادہ فرق نہیں ہے۔ پرائیوٹ کمپنیوں میں ۶۰ / فی صد غیر ملکی کمپنیوں کے شیئرز ہوتے ہیں، جب کہ سرکاری کمپنیوں کا سارا سرمایہ اپنا ہوتا ہے۔ یہ کمپنیاں بھی ابھی خسارہ میں چل رہی ہیں۔ تاہم آئندہ نفع کی امید پر کام کررہی ہیں۔

بعض ممالک میں قانونی طور پر انشورنس کرانا ضروری ہے، البتہ ہندوستان میں میڈیکل انشورنس ابھی قانوناً ضروری نہیں ہے، ویسے بڑی تیزی سے لوگ انشورنس کرارہے ہیں، ادارے اپنے ملازمین کا گروپ انشورنس کراتے ہیں۔ ہندوستان سے باہر بعض ممالک کے سفر کے وقت تو وہاں داخلہ کے ساتھ میڈیکل انشورنس قانوناً ضروری ہے۔

☆☆☆

تلخیص:

میڈیکل انشورنس کا شرعی حکم

مفتی محمد سراج الدین قاسمی

۱- میڈیکل انشورنس (صحت بیمہ) کرانے کا کیا حکم ہے؟

اکثر مقالہ نگاروں کی رائے یہ ہے کہ عمومی حالات میں میڈیکل انشورنس کرانا حرام ہے، جبکہ مولانا سلطان احمد اصلاحی، مولانا شاہد علی قاسمی اور مولانا نعیم اختر قاسمی کی رائے یہ ہے کہ میڈیکل انشورنس کی بنیاد چونکہ باہمی تعاون اور جذبہ ہمدردی پر ہے، اس لئے میڈیکل انشورنس کرانے کی اجازت ہے۔

حرام قرار دینے والوں کے دلائل الفاظ وتعبیرات کے کچھ فرق کے ساتھ تقریباً یکساں ہیں، جن کا خلاصہ یہ ہے:

۱- میڈیکل انشورنس اداروں کے طریقہ کار اسلام کے منافی ہیں، جن میں سود، قمار، غرر اور ظلم شامل ہیں، کیونکہ میڈیکل انشورنس کے اندر پالیسی ہولڈر (مدت متعینہ کے لئے) ایک متوہم بیماری کے علاج کے لئے ایک رقم جمع کرتا ہے، اگر پالیسی ہولڈر اس متعینہ مدت کے اندر بیمار ہوجاتا ہے تو پالیسی کے طے شدہ وقت میں بوقت معاملہ طے شدہ رقم تک کمپنی اس کا علاج کراتی ہے اور اگر بیمار نہیں ہوا تو یہ رقم پالیسی ہولڈر کو واپس نہیں کی جاتی ہے، اور یہی میسر (جوا) ہے، اللہ تعالی کا ارشاد ہے: "إنما الخمر والميسر والأنصاب والأزلام رجس من عمل الشيطان" (سورۂ مائدہ: ۹۰)۔

۲- اس میں غرر بھی پایا جاتا ہے، کیونکہ یہ عقد ایک امکانی خطرہ کے پیش نظر طے پاتا ہے، جو موہوم اور معدوم کی قبیل سے ہے، اور ایسے معاملات کو جن میں غرر ہو، شریعت نے منع کیا ہے، روایت میں ہے:

"نهى رسول الله صلى الله عليه وسلم عن بيع الحصاة وعن بيع الغرر" (صحیح مسلم)۔

۳- یہ پالیسی سود کو بھی متضمن ہے، اس لئے کہ جو رقم جمع کی جاتی ہے، حادثہ پیش آنے کی صورت میں اس سے زائد رقم کی ادائیگی یا زیادہ مالیت کے علاج کا معاہدہ ہوتا ہے، یہ قرض کے ساتھ مشروط منفعت کی صورت ہے، اور یہ قاعدہ ہے:

"كل قرض جر نفعًا فهو حرام أي إذا كان مشروطًا" (شامی ۷/ ۳۹۵)۔

عمومی دلائل پر ایک جھلک کے بعد اب مقالہ نگاروں کی آراء پیش کی جاتی ہیں:

مفتی حبیب اللہ صاحب قاسمی لکھتے ہیں: صحت بیمہ جس کا رواج آج عام ہوتا جارہا ہے، سود وقمار پر مشتمل ہے جس کی حرمت منصوص ومتفق علیہ ہے، قمار یعنی ملکیت کو ایسی صورت پر معلق کردینا جس میں خطر ہو، یعنی اس کے وجود وعدم دونوں کا احتمال ہو، اس کے اندر مکمل طور سے پایا جارہا ہے، اس لئے کہ اگر پالیسی ہولڈر بیمار ہوجاتا ہے تو کمپنی اس کے جمع کردہ روپے سے زائد ایک متعین رقم ادا کرے گی، اور اگر بیمار نہیں ہوا تو اس کی جمع کردہ رقم بھی سوخت ہوجائے گی، یہ واضح ہے کہ اس کا بیمار ہونا یا نہ ہونا ایک امر موہوم ہے اور امر موہوم کو عقد کا دارومدار قرار دینا بھی قمار ہے جس کی حرمت قرآن سے ثابت ہے۔

مولانا ابرار خان ندوی لکھتے ہیں: اس میں غرر کثیر ہے، کیونکہ یہ عقد مستقبل میں پیش آنے والی امکانی بیماری پر ہورہا ہے۔ شیخ شریف جرجانی کے حوالہ سے غرر کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "الغرر ما يكون مجهول العاقبة لا يدرى أيكون أم لا" (کتاب التعریفات)۔ غرر کہتے ہیں جس کا نتیجہ مجہول ہو اور اس کا وجود وعدم وجود معلوم نہ ہوسکے۔ مزید لکھتے ہیں: صحت بیمہ کے عدم جواز کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ اس میں بیمار نہ ہونے کی صورت میں رقم واپس نہ کرنے کی شرط ہے، اور معاملات میں ایسا کرنا قطعاً درست نہیں ہے، فقہاء نے تجارت کے اندر معاملہ طے نہ ہونے پر بیعانہ کی رقم واپس نہ

کرنے کو ناجائز قرار دیا ہے (فقہ السنہ ۳/ ۱۴۰)۔

مولانا رحمت اللہ ندوی لکھتے ہیں: اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس کی حرمت سود کی حرمت کے برابر بلکہ اس سے بھی بڑھ کر ہے، کیونکہ بیمہ ایک طرف سود سے ہم آہنگ ہے تو دوسری طرف قمار، غرر، رہان اور مجازفہ پر مشتمل ہے، مزید لکھتے ہیں کہ اس کو امداد باہمی کہنا قطعاً غلط ہے، کیونکہ اس میں تعاون و تکافل کے شرائط نہیں پائے جارہے ہیں، تکافل کے شرائط ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں: حصہ دار اپنے واجبی حصہ کو بطور تبرع محض اخوت اور بھائی چارگی کے لئے ادا کرے، تبرع اس شرط پر نہ ہو کہ اگر وہ کسی حادثہ کا شکار ہوگا تو اس تبرع کے عوض اس کو ایک مقرر رقم ادا کی جائے گی (الحلال والحرام فی الاسلام/ ۲۵۰)۔

مولانا تنظیم عالم قاسمی لکھتے ہیں: انشورنس کا شعبہ اگر چہ خسارہ میں ہے، تاہم یہ عقد شرعی اصول وقواعد کی رو سے مبنی بر حرام ہونے کی وجہ سے ممنوع اور ناجائز قرار پائے گا، حضرت عمرؓ کا ارشاد ہے: "دعوا الربا والریبۃ" (مسند احمد)، بیمار پڑنے کا ایک شبہ ضرور رہتا ہے، لیکن اضطرار اور مجبوری کی ایسی کوئی کیفیت نہیں ہے کہ "الضرورات تبیح المحظورات" اور "الضرر یزال" وغیرہ جیسے قواعد کے ذریعہ اس کو جائز قرار دیا جائے۔

دکتور شیخ صدیق احمد ضریر صاحب نے کافی طویل بحث کی ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ میڈیکل انشورنس ادارے اور پالیسی ہولڈر کے درمیان معاہدے کی کیا حیثیت ہے، پہلے اس پر ایک نظر ڈالنی چاہئے، اس معاہدے میں انشورنس ادارے اور پالیسی ہولڈر کے درمیان معاہدے کی حیثیت اجارہ کی ہے، کیونکہ اس معاہدہ میں دونوں فریق کے درمیان ایک متعینہ مدت تک کے لئے دوا اور علاج کا معاہدہ ہوتا ہے، اس لئے دیکھنا یہ ہے کہ اس میں اجارہ کے شرائط پائے جارہے ہیں یا نہیں۔ اس صورت معاہدہ کے تین مرکزی نقاط ہیں: متعین مدت تک ممبر کا علاج، مریض کا ہسپتال میں قیام اور مریض کے لئے دوا اور کھانے کی فراہمی، پہلے نقطہ کے مطابق اجارہ اس لئے درست نہیں ہے کہ پالیسی ہولڈر کا مریض ہونا متعین نہیں ہے، اور اگر پالیسی ہولڈر کو بالفرض مریض تصور کر بھی لیا جائے تو وہ کتنے دنوں تک ہسپتال میں رہے گا وہ معلوم نہیں ہے، تیسری چیز یعنی دوا اور طعام پر اجارہ نہیں ہوسکتا ہے، اس لئے ان چیزوں کی فراہمی کو بیع تصور کیا جاسکتا ہے، اور بیع کے صحیح ہونے کے لئے ضروری ہے کہ مبیع معلوم و متعین ہو، لیکن مبیع یعنی دوا یہاں غیر متعین ہے، اس لئے میڈیکل انشورنس ناجائز ہے، البتہ موصوف نے رفاہی میڈیکل انشورنس کا تذکرہ کیا ہے اور پھر مختلف دلائل سے اس کو جائز قرار دیا ہے۔

جن حضرات نے میڈیکل انشورنس کو جائز قرار دیا ہے، ان کا کہنا یہ ہے کہ میڈیکل انشورنس کی بنیاد باہمی تعاون و ہمدردی پر ہے، اس لئے میڈیکل انشورنس جائز ہے۔

مولانا سلطان احمد اصلاحی لکھتے ہیں: روٹی، کپڑا اور مکان کی طرح علاج بھی انسان کی بنیادی ضرورت ہے، یہ علاج امیر اور غریب ہر ایک کی یکساں ضرورت ہے اور اکثر اوقات اس کی ضرورت امیر سے زیادہ غریب کو ہوتی ہے، اور بہت سی صورتوں میں علاج کے اخراجات غیر معمولی طور پر گراں ہوتے ہیں، جن کے تقاضوں کی ادائیگی میڈیکل انشورنس جیسی کسی اسکیم کے ذریعہ ہی پوری کی جاسکتی ہے، البتہ چونکہ اللہ تعالیٰ کی ذات سے حسن ظن ضروری ہے، اس لئے اس اسکیم میں شرکت آدمی دوسرے کی مدد کی نیت سے کرے۔

مولانا نعیم اختر قاسمی لکھتے ہیں: میڈیکل انشورنس کرانا جائز ہے، کیونکہ یہ امداد باہمی کی قبیل سے ہے، جس میں سود اور قمار وغیرہ کا تحقق نہ ہوگا اور کمپنی کا نفع حاصل کرنا شرکاء کی اجازت سے ہے، نیز حصول نفع ایک تبعی اور ظنی چیز ہے۔

۲- صحت بیمہ کرانے والا جو رقم جمع کرتا ہے اور پھر ضرورت پر اس سے کہیں زیادہ مالیت کے علاج سے مستفید ہوتا ہے، اس کا کیا حکم ہوگا؟

اکثر مقالہ نگاروں نے پالیسی ہولڈر کی جمع کردہ رقم کو قرض تصور کیا ہے اور ضرورت کے وقت اس سے زیادہ رقم لینے کو سود قرار دیا ہے اور ان حضرات نے ان احادیث وقواعد فقہیہ کو اپنا مستدل بنایا ہے، جن میں قرض دہندہ کے لئے مقروض سے زیادہ رقم لینے یا اس کی کسی چیز سے استفادہ کرنے کی ممانعت کی گئی ہے۔

بعض حضرات نے لکھا ہے کہ پالیسی ہولڈر اضافی رقم سے مستفید ہوسکتا ہے، البتہ صحت یاب ہونے کے بعد اس رقم کی واپسی کو انہوں نے ضروری قرار دیا ہے، اس کے برخلاف جن حضرات نے میڈیکل انشورنس کو جائز قرار دیا ہے، ان کے نزدیک اس اضافی رقم سے استفادہ جائز ہے۔

مولانا رحمت اللہ ندوی رقم طراز ہیں: اپنی جمع شدہ مالیت کے برابر رقم استعمال کرسکتا ہے، لیکن اس سے زائد حصہ رقم مستحقین پر واجب التصدق ہوگی،

فائدہ اٹھانے کا حکم دوسرے اداروں سے مختلف ہوگا یا دونوں کا حکم ایک ہوگا؟

اکثر مقالہ نگاروں کی رائے یہ ہے کہ میڈیکل انشورنس ادارے سرکاری ہوں یا غیر سرکاری، چونکہ دونوں کے طریقہ کار میں کوئی فرق نہیں ہے، اس لئے دونوں کا حکم یکساں ہوگا۔

ڈاکٹر ظفر الاسلام صاحب، قاضی عبدالجلیل صاحب اور مفتی عبدالرحیم صاحب بھوپال نے دونوں اداروں کے درمیان فرق کیا ہے، ان حضرات کی رائے یہ ہے کہ چونکہ حکومت کا مقصد نفع اندوزی نہیں ہے، بلکہ عوام کی خدمت ہے، اس لئے اس اسکیم سے فائدہ اٹھانے کی گنجائش ہے۔

مفتی محمد ثناء الہدیٰ صاحب لکھتے ہیں: اس مسئلہ میں سرکاری اور نجی اداروں کا حکم یکساں ہوگا، کیونکہ دونوں کے طریقہ کار میں فرق نہیں ہے، صرف یہ کہنا کہ سرکاری ادارے، سماجی تحفظ کے ادارے اور نجی کمپنیاں منافع کے حصول کے لئے بیمہ کراتی ہیں اور سرکاری انشورنس ادارہ کی طرف سے خرچ کی گئی زیادہ رقم کو امداد وتعاون مان لیا جائے گا، صحیح نہیں، کیونکہ جو رقم بیمار نہ ہونے کی شکل میں بیمہ کمپنیوں کی ملکیت ہوگی، اس کو معاملات کے کس خانہ میں ڈالا جائے گا۔

مفتی حبیب اللہ قاسمی لکھتے ہیں: چونکہ سرکاری ادارے اور نجی ادارے دونوں اس امر پر متفق ہیں کہ اگر پالیسی ہولڈر بیمار ہوا تو ایک متعین اضافی رقم سے اس کی مدد کی جائے، لیکن اگر پالیسی مدت میں وہ صحت یاب رہا تو اس کی یہ جمع کردہ رقم کالعدم قرار دی جاتی ہے، اس لئے دونوں کا حکم عدم جواز ہی کا ہوگا۔

مولانا عبداللطیف پالنپوری لکھتے ہیں: عدم جواز کی علت (سود، قمار) دونوں صورتوں میں موجود ہے۔

مولانا محی الدین غازی لکھتے ہیں: حکومت اور نجی اداروں کا حکم یکساں ہے، تاہم جہاں ضروری ہو وہاں ''أهون البليتين'' کے اصول پر سرکاری ادارے کو ترجیح دی جائے گی۔

مولانا خورشید احمد اعظمی لکھتے ہیں: سرکاری اداروں کے بارے میں یہ کہنا کہ حکومت اسے سماجی خدمت کے لئے چلا رہی ہے، مغالطہ ہے، کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو پھر یہ خدمت ہر فرد کے لئے ہوتی، خواہ وہ پالیسی ہولڈر ہو یا نہ ہو، اس لئے کہ سرکار بدون کسی معاوضہ عوام کے ہر ہر فرد کی حفاظت اور ان کے لئے قیام امن کی ذمہ دار ہے۔

مولانا عطاء اللہ قاسمی لکھتے ہیں: اگر حکومت بلا کسی پیشگی شرط اور انشورنس کے سوشل سیکورٹی کے تحت انسانی بنیادوں پر امداد دے تو اسے عطیہ کہا جا سکتا ہے اور اس سے استفادہ جائز ہو سکتا ہے، بصورت دیگر استفادہ جائز نہیں ہوگا۔

مولانا ابرار خان ندوی لکھتے ہیں: حکومت کا اپنی طرف سے مریض کے علاج میں زائد رقم خرچ کرنا اور مریض کا اس سے استفادہ جائز ہونا چاہئے لیکن چونکہ یہاں یہ مشروط ہے کہ حکومت صرف صحت بیمہ کرانے والوں کو ہی یہ سہولت دیتی ہے، جن لوگوں کا بیمہ نہیں ہے ان کو نہیں دیتی ہے، لہٰذا یہ ''كل قرض جر منفعة فهو ربا'' کے تحت داخل ہوگا۔

ڈاکٹر ظفر الاسلام صاحب لکھتے ہیں: چونکہ حکومت کا مقصد نفع اندوزی نہیں، بلکہ سماجی تحفظ کی ذمہ داری کو پورا کرنا ہے، اس لئے پرائیوٹ وسرکاری بیمہ صحت کے اداروں کے احکام جداگانہ ہوں گے۔

قاضی عبدالجلیل صاحب لکھتے ہیں: سرکاری اداروں سے فائدہ اٹھانے کی گنجائش ہو سکتی ہے۔

مفتی عبدالرحیم صاحب بھوپالی لکھتے ہیں: نجی اداروں اور پرائیوٹ کمپنیوں کا معاملہ سود وجوے پر مشتمل ہوگا، لہٰذا ان سے معاملہ جائز نہیں ہے، البتہ سرکاری اداروں سے صحت بیمہ کرانے کے سلسلہ میں وہ ابوزہرہ اور شیخ عبدالمنعم نمر کے حوالہ سے لکھتے ہیں: حکومت کے زیر اہتمام جو اجتماعی بیمے ہوتے ہیں ان کے جواز میں کوئی اختلاف نہیں، ان میں اجتماعی تعاون پایا جاتا ہے، خواہ ان کا دائرہ کار بعض گروہ تک محدود ہو یا عام ہو، سرکاری انشورنس ادارہ علاج کی ضرورت پر جو مطلوبہ یا مقررہ رقم دیتا ہے اس کو سرکار کی طرف سے امداد وتعاون کا درجہ دیا جا سکتا ہے، کیونکہ حکومت مختلف انتظامات کے ذریعہ عوام کی نگرانی ومالی کفالت کی ذمہ دار ہے۔ آگے مفتی نظام الدین کے حوالے سے لکھتے ہیں: سرکاری بیمہ کمپنیوں کی طرف سے جو زائد رقم دی جاتی ہے اس کا وہی حکم ہوگا جو پرائیوٹ فنڈ کا ہے اور ہم اسے حکومت کی طرف سے عطیہ وانعام کہہ سکتے ہیں۔

مولانا سلطان احمد اصلاحی لکھتے ہیں: میڈیکل انشورنس کی اسکیم سے فائدہ اٹھانے میں سرکاری اور غیر سرکاری دونوں طرح کے اداروں کا حکم ایک ہوگا اور ان

دونوں کے مقاصد کے جزوی فرق سے اس کے حکم میں کوئی فرق واقع نہیں ہوگا۔

مولانا شاہد لکھتے ہیں: جس طرح سرکاری میڈیکل انشورنس ادارہ سے صحت بیمہ کرانا جائز ہے، اسی طرح پرائیوٹ ادارہ سے بھی جائز ہے، البتہ شرط یہ ہے کہ پرائیوٹ ادارہ جمع شدہ رقوم کو سود یا حرام پر مبنی کاروبار میں خرچ نہ کرتا ہو۔

۴- سرکاری انشورنس ادارہ جو علاج کی ضرورت پر مطلوبہ یا مقررہ رقم دیتا ہے، اس کو سرکار کی طرف سے امداد و تعاون کا درجہ دیا جاسکتا ہے یا نہیں؟

اکثر مقالہ نگاروں کی رائے یہ ہے کہ سرکاری انشورنس ادارہ کی طرف سے ملنے والی اضافی رقم کو تعاون کا درجہ نہیں دیا جاسکتا ہے، کیونکہ عرف میں بلا معاوضہ بطور احسان محض انسانی بنیادوں پر مدد کرنے کو تعاون اور امداد کہتے ہیں، بعض حضرات نے لکھا ہے کہ اگر سرکاری انشورنس ادارہ بغیر کسی شرط کے اور پہلے روپے جمع کرائے بغیر اگر یہ ادارے رقم دیں تو پھر یہ ان کی طرف سے تعاون ہوگا، جبکہ قاضی عبدالجلیل صاحب، مولانا ابوسفیان صاحب مفتاحی، مولانا نعیم اختر صاحب قاسمی، مولانا سلطان احمد صاحب اصلاحی، ڈاکٹر ظفر الاسلام صاحب اور مفتی عبدالرحیم صاحب قاسمی کی رائے ہے کہ سرکاری انشورنس ادارہ کی طرف سے دی جانے والی اضافی رقم ان کی طرف سے تعاون ہے اور اس کا لینا جائز ہوگا۔

مولانا خورشید احمد اعظمی لکھتے ہیں: اگر اس کو امداد قرار دیا جائے تو یہ تعاون علی الاثم کے قبیل سے ہوگا، جو کہ ناجائز ہے۔

مولانا رحمت اللہ ندوی لکھتے ہیں: سرکاری انشورنس ادارہ علاج کی ضرورت پر جو مقررہ رقم دیتا ہے اسے امداد و تعاون کا درجہ نہیں دیا جاسکتا، کیونکہ تعاون و تکافل کے شرائط اس پر منطبق نہیں ہوتے۔

مفتی حبیب اللہ صاحب لکھتے ہیں: سرکار کی اس رقم کو امداد نہیں کہا جاسکتا ہے، کیونکہ اگر اس کے پیش نظر امداد ہوتی تو بغیر کسی عوض کے وہ یہ خدمت فراہم کرتی، نیز بیماری کے نہ ہونے کی صورت میں جمع شدہ رقم واپس مل جانی چاہئے۔

مولانا خورشید احمد اعظمی لکھتے ہیں: بیمہ پالیسی ایک عقد و معاملہ ہے، جس میں غرر و قمار کے ذریعہ نفع اندوزی ہوتی ہے اور یہ ایک ناجائز و حرام عقد ہے اس لئے اگر اس کو امداد و تعاون قرار بھی دیا جائے تو یہ تعاون علی الاثم کے قبیل سے ہوگا جو کہ ممنوع ہے۔

مولانا عطاء اللہ قاسمی لکھتے ہیں: سرکار کی طرف سے ملنے والی رقم کو امداد نہیں کہا جاسکتا ہے کیونکہ عرف عام میں بلا معاوضہ بطور احسان محض انسانی بنیادوں پر مدد کرنے کو تعاون اور امداد کہتے ہیں اور انشورنس اس کے بالکل ضد ہے۔

مولانا تنظیم عالم قاسمی لکھتے ہیں: سرکاری انشورنس ادارہ علاج کی ضرورت پر جو مطلوبہ یا مقررہ رقم دیتا ہے، اسے سرکار کی طرف سے امداد و تعاون نہیں کہا جا سکتا ہے، کیونکہ اگر تعاون پیش نظر ہوتا تو بیمار نہ پڑنے کی صورت میں پالیسی ہولڈر کو اس کی جمع کی ہوئی رقم واپس مل جانی چاہئے، حالانکہ ایسا نہیں ہے، اس لئے محض نام کے بدلنے سے حقائق تبدیل نہیں ہوں گے۔

مولانا برہان الدین سنبھلی لکھتے ہیں: اگر پہلے سے رقم جمع کرنے کی شرط کے بغیر سرکاری ادارہ امداد دیتا ہے تو اس کا استعمال درست ہوگا۔

مفتی محبوب علی وجیہی اور مولانا عبداللطیف صاحب لکھتے ہیں: حکومت اگر بطور امداد بغیر کسی شرط کے یہ رقم دے تب تو جائز ہے، لیکن اگر یہ شرط لگائی ہو کہ ایک متعین رقم متعین مدت کے لئے جمع کرواس مدت میں اگر تم بیمار ہوئے تو ہم خرچ کریں گے اور اگر بیمار نہیں ہوئے تو یہ رقم سوخت ہو جائے گی، تو یہ صورت جائز نہ ہوگی۔

قاضی عبدالجلیل قاسمی، مولانا ابوسفیان مفتاحی، مولانا نعیم اختر قاسمی، مولانا سلطان احمد اصلاحی، مولانا شاہد علی قاسمی اور مفتی عبدالرحیم قاسمی کی رائے یہ ہے کہ سرکار کی طرف سے دی جانے والی اضافی رقم کو امداد و تعاون قرار دیا جاسکتا ہے۔

مولانا ابوسفیان مفتاحی لکھتے ہیں: سرکاری انشورنس ادارہ علاج کی ضرورت پر جو مطلوبہ رقم یا مقررہ رقم دیتا ہے تو اس کو سرکار کی طرف سے امداد اور تعاون کا درجہ دیا جانا چاہئے، کیونکہ بے کس اور مجبوروں اور معذوروں کے علاج و معالجہ کی ذمہ داری سرکار و حکومت پر عائد ہوتی ہے، چنانچہ اس کے لئے سرکار کی طرف سے

ہسپتال قائم کئے جارہے ہیں جن میں مریضوں کا مفت علاج کیا جاتا ہے اور دوائیں مفت دی جاتی ہیں، سرکار اس طرح اپنی ذمہ داری ادا کرتی ہے، لہذا اس کو سرکاری امداد و تعاون کا ہی درجہ دیا جانا چاہئے۔

ڈاکٹر ظفر الاسلام صاحب لکھتے ہیں: میڈیکل انشورنس کرانے والا زیادہ مالیت کے علاج سے مستفید ہوسکتا ہے، یہ حکومت کی جانب سے امداد ہے، گورنمنٹ کی امداد لینے میں کوئی مضائقہ نہیں معلوم ہوتا، یوں بھی ہم حکومت کے طرح طرح کے فلاحی ورفاہی اداروں سے مستفید ہوتے رہتے ہیں، اس لئے حدود شرع میں رہ کر ان سے انتفاع جائز ہونا چاہئے۔

۵- اگر میڈیکل انشورنس کی مذکورہ صورت جائز نہیں ہے تو کیا اسلامی تعلیمات کی روشنی میں اس کی کوئی متبادل صورت ہوسکتی ہے، جو میڈیکل انشورنس کے بنیادی مقصد، غریبوں کے لئے گراں علاج کی سہولت فراہم کرنا، کو بھی پورا کرتا ہو اور شرعاً دائرہ جواز میں بھی ہو؟

اس سوال کے جواب میں عموماً مقالہ نگاروں نے یہ رائے دی ہے کہ زکوۃ وصدقات اور عطیات کا اجتماعی نظم، اور اس سے اس طرح کے ادارے قائم کئے جائیں جن سے ضرورت مندوں کا علاج کیا جائے۔

مولانا نیاز احمد عبد الحمید صاحب لکھتے ہیں: ملکی، صوبائی، ضلعی اور قروی پیمانہ پر زکوۃ کا اجتماعی نظام، بیت المال کا قیام، رفاہی تنظیموں کا قیام صرف طبی خدمات کے لئے رفاہی تنظیم کا قیام، زکوۃ کے مال سے، ہسپتال کا قیام اور مستحقین زکوۃ اور فقراء ومساکین کے لئے مفت علاج کا انتظام۔

مولانا ابرار خان ندوی لکھتے ہیں: زکوۃ وصدقات سے علاج، اجتماعی مضاربت، جس کی صورت یہ ہے کہ چند افراد مل کر ایک کمیٹی تشکیل دیں اور اس کے جو ممبر مقرر ہوں وہ ہر ماہ معین رقم اس میں جمع کرتے رہیں اور مضاربت کے اصول کے مطابق اس جمع شدہ رقم سے تجارت کی جائے، انشورنس تعاونی جس کی صورت یہ ہے کہ چند افراد مل کر قسط وار ایک مقررہ رقم آپس میں جمع کریں اور شرکاء میں سے جو بیمار ہوں اس کی رقم اس کے علاج میں صرف کردی جائے اور بیمار نہ ہونے کی صورت میں حسب مطالبہ اس کی رقم واپس کردی جائے۔

مولانا برہان الدین سنبھلی لکھتے ہیں: اس مقصد کے لئے خیراتی وامدادی ادارے قائم کئے جاسکتے ہیں، جن میں بغیر کسی پیشگی رقم کی ادائیگی کی شرط کے معذوروں کی مدد کی جائے۔

مولانا عبد اللطیف پالنپوری لکھتے ہیں: مسلمانوں کو چاہئے کہ عطیات کی مدد سے ہر شہر میں اپنا الگ ہسپتال قائم کریں۔

مولانا خورشید احمد اعظمی لکھتے ہیں: باہمی کفالت کا ایک نظام بنالیا جائے، جس میں ہر صاحب استطاعت اپنی استطاعت کے مطابق یا کوئی متعینہ رقم تبرعاً جمع کرے، اور اس سے بغیر کسی شرط کے متاثرہ شخص کا تعاون کیا جائے۔

مولانا عطاء اللہ قاسمی لکھتے ہیں: مسلم سرمایہ دار بطور وقف اعلی معیار کے ہسپتال اور میڈیکل کالج قائم کریں جس سے پوری قوم مستفید ہو اور اس کی آمدنی سے ضرورت مندوں کا علاج بھی کیا جائے۔

مولانا رحمت اللہ ندوی لکھتے ہیں: شخصی طور پر رفاہی تنظیموں کا قیام، بیت المال کا قیام، غیر سودی قرضے، شعبہ زکوۃ وصدقات کو مستحکم بنانا، امدادی فنڈ ریلیف وغیرہ۔

مفتی محمد عبد الرحیم قاسمی لکھتے ہیں: بیمہ کا متبادل تعاونی بیمہ ہے جس میں شرکاء اپنی اپنی مرضی سے فنڈ میں رقمیں جمع کراتے ہیں اور ختم سال پر اگر رقم بچ گئی تو وہ شرکاء کو بحصہ رسدی واپس کردی جاتی ہے یا ان کی طرف سے آئندہ سال کے فنڈ کے لئے ان کے حصہ کے طور پر رکھ دی جاتی ہے۔

۶- جن ممالک میں میڈیکل انشورنس وہاں کے شہریوں یا وہاں جانے والوں کے لئے لازم کردیا گیا ہے، ان ملکوں میں میڈیکل انشورنس کرانے کا کیا حکم ہے؟ اور اگر قانونی مجبوری کے تحت انشورنس کرانے والے بیمار پڑ جائیں تو کیا

ان کے لئے انشورنس کی سہولت سے فائدہ اٹھانا درست ہوگا؟

تقریباً تمام مقالہ نگاروں نے لکھا ہے کہ ایسے ملکوں میں جہاں داخل ہونے کے لئے انشورنس لازم کردیا گیا ہے، تو اس مجبوری کی حالت میں انشورنس کرانے کی حاجت ہوگی، مولانا عبداللطیف پالنپوری، مولانا نعمت اللہ قاسمی، مولانا تنظیم عالم قاسمی اور مولانا ابرار خان ندوی لکھتے ہیں کہ ایسے ملکوں میں انشورنس کرانے کی اجازت تو ہوگی، لیکن کمپنی میں جمع کردہ رقم سے زیادہ کے استعمال کی اجازت نہیں ہوگی، بعض مقالہ نگاروں کی رائے یہ ہے کہ ایسے ملکوں میں جہاں میڈیکل انشورنس کولازمی قرار دیا گیا ہے، بغیر کسی ناگزیر شرعی مجبوری کے جانے کی اجازت نہیں ہوگی۔

مولانا محی الدین غازی، مولانا نیاز احمد اور مولانا عطاء اللہ قاسمی لکھتے ہیں: جن ممالک میں میڈیکل انشورنس وہاں کے شہریوں یا وہاں جانے والوں کے لئے لازم کردیا گیا ہے، ان ملکوں میں میڈیکل انشورنس کرانا مجبوری ہے، اس لئے بوجہ مجبوری محض مجبوری کے بقدر گنجائش نکل سکتی ہے، اور بیمار ہوجانے کی صورت میں انشورنس کی سہولت سے فائدہ اٹھانا بوجہ مجبوری درست ہوگا۔

مولانا خورشید اعظمی لکھتے ہیں: اجباری یا لازمی انشورنس جسے حکومتیں ضروری قرار دیتی ہیں جائز ہے یہ بمنزلہ ٹیکس ہے جو حکومت کو ادا کیا جاتا ہے۔

مفتی حبیب اللہ قاسمی لکھتے ہیں: عوارض کی بنیاد پر ضرورۃ اس کی اجازت ہوسکتی ہے اور اس جواز کی بنیاد ''الحاجة إذا عمت كانت كالضرورة، الضرر يزال، الحرج مدفوع، الضرورات تبيح المحظورات، كم من شيء يثبت ضمنا لا يثبت قصداً'' جیسے قواعد ہیں۔

مولانا محمد برہان الدین سنبھلی لکھتے ہیں: حکومتی قانون کی مجبوری کو فقہاء نے حاجت کے درجہ میں رکھا ہے، بنابریں حاجت کی وجہ سے جو محظورات جائز ہوجاتے ہیں وہ اس صورت میں بھی جائز ہوجانے چاہئیں، لیکن یہ ملحوظ رہے کہ ایسے ملکوں میں جانا جہاں یہ قانون رائج ہے، ہر کس وناکس کے لئے جائز نہ ہوگا، صرف انہی لوگوں کے لئے جائز ہوگا جو وہاں کا باشندہ ہو یا کسی ناگزیر شرعی مجبوری کے تحت جارہا ہو۔

مولانا ابوالعاص وحیدی، مولانا ابوسفیان مفتاحی، مفتی ثناء الہدی قاسمی، مولانا رحمت اللہ ندوی اور مولانا نعیم اختر قاسمی لکھتے ہیں: اضطرار کی وجہ سے انشورنس کرانے کی اجازت ہوگی اور انشورنس کرنے والے بیمار پڑ جائیں تو ان کے لئے انشورنس کی سہولت سے استفادہ جائز ہوگا۔

مولانا سلطان احمد اصلاحی لکھتے ہیں: جن ممالک میں میڈیکل انشورنس وہاں کے شہریوں کے لئے لازم کردیا گیا ہے وہاں یہ انشورنس کرایا جاسکتا ہے، اور ضرورت کے تحت انشورنس کی اس سہولت سے فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔

قاضی عبدالجلیل صاحب لکھتے ہیں: جن ممالک میں وہاں جانے والوں کے لئے میڈیکل انشورنس لازم کردیا گیا ہے، وہاں کے بارے میں سمجھا جائے گا کہ وہ حکومت اپنے یہاں آنے والوں سے اتنی رقم بطور فیس لیتی ہے، اگر وہ بیمار نہ ہو تو وہ اپنی فیس ادا کرچکا ہے اور اگر وہ بیمار ہوجائے تو حکومت کی طرف سے اس کے علاج پر جو خرچ ہوگا اس کو حکومت کی طرف سے امداد وتعاون سمجھا جائے گا۔

مولانا ابرار خان ندوی لکھتے ہیں: جن ممالک میں داخلہ کے لئے میڈیکل انشورنس قانوناً ضروری ہے ایسے ممالک میں سیر وتفریح اور سیاست کے لئے جانا جائز نہیں ہے البتہ جن لوگوں کو وہاں جانا ضروری ہو تجارتی مقاصد کی غرض سے، دعوت وتبلیغ، یا کسی دوسرے مقاصد کے حصول کے لئے، الضرورات تبیح المحظورات کے تحت میڈیکل انشورنس کرانے کی اجازت ہوگی۔ ضرورت کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں: وہ اس حد تک پہنچ جائے کہ اگر ممنوع چیز کا استعمال نہ کرے تو ہلاک ہوجائے گا یا ہلاک ہونے کے قریب پہنچ جائے گا ایسی صورت میں حرام کا استعمال مباح ہے (الاشباہ والنظائر للسیوطی)

نیز وہاں مقیم مسلمانوں کے لئے صحت بیمہ سے کوئی مفر نہیں ہے، لہذا ''إذا ضاق الأمر اتسع'' کے تحت اس کی اجازت ہوگی، دیگر یہ کہ صحت بیمہ کے عدم جواز کی ایک وجہ غرر بھی ہے اور معاملات میں غرر سے بچنا محال ہو تو غرر کے ساتھ معاملہ کرنا جائز ہے۔ ابن القیم فرماتے ہیں: ہر غرر حرمت کا باعث نہیں ہوتا ہے، اگر غرر معمولی ہو یا اس سے بچنا ممکن نہ ہو تو معاملہ کے درست ہونے میں وہ مانع نہیں ہوتا ہے (زاد المعاد)،

البتہ اپنی جمع شدہ رقم سے زائد سے مستفید ہونے کی اجازت نہ ہوگی۔

☆☆☆

عرض مسئلہ:

میڈیکل انشورنس

مفتی محمد عبدالرحیم قاسمی

سوال (۱) میڈیکل انشورنس کے متعلق جن مقالہ نگار علماء کرام نے پہلے سوال کے جواب میں قمار و ربوا کی علت کی بنا پر میڈیکل انشورنس کو ناجائز کہا ہے ان کے اسماء گرامی یہ ہیں: مولانا محمد برہان الدین سنبھلی، قاضی عبدالجلیل قاسمی، مفتی حبیب اللہ قاسمی، مولانا محی الدین غازی، مولانا ابرار خان ندوی، مولانا نیاز احمد، مولانا خورشید اعظمی، مولانا رحمت اللہ ندوی، مولانا عطاء اللہ قاسمی، ڈاکٹر ظفر الاسلام صاحب، مولانا ابوالعاص وحیدی، مولانا اطہر حسن صاحب، مولانا عبد اللطیف پالنپوری، مفتی محبوب علی وجیہی، مولانا نعمت اللہ قاسمی، مفتی تنظیم عالم قاسمی اور راقم الحروف محمد عبدالرحیم قاسمی۔

ان حضرات کے دلائل حسب ذیل ہیں:

إنما الخمر والميسر والأنصاب والأزلام رجس من عمل الشيطان (سورہ مائدہ:۹۰)

لا تأكلوا أموالكم بينكم بالباطل (سورہ نساء:۲۹)

كل قرض جر منفعة فهو ربًا (كنز العمال)

نهى رسول الله صلى الله عليه وسلم عن بيع الحصاة وعن وبيع الغرر (صحيح مسلم)

كل قرض جر نفعا حرام أي إذا كان مشروطا (شامی ۷/ ۳۹۵)

ولا تعاونوا على الإثم والعدوان (سوره مائده:۲)

إذا اجتمع الحلال والحرام غلب الحرام، الربوا فضل خال عن عوض بمعيار شرعي مشروط لأحد المتعاقدين في المعاوضة (الموسوعة الفقهية)

لا خلاف بين أهل العلم في تحريم القمار وإن المخاطرة من القمار (أحكام القرآن للجصاص)۔

دوسرا نقطہ نظر باہمی تعاون کے مقصد سے بیمہ کرانے کی اجازت ہے، یہ رائے مولانا شاہد علی قاسمی، مولانا نعیم اختر قاسمی اور مولانا سلطان احمد اصلاحی کی ہے، ان کی دلیل یہ آیت ہے: تعاونوا على البر والتقوى الآیہ، نیز حضرت مولانا یوسف لدھیانوی نے بھی امداد باہمی اور تعاون کی بنیاد پر بیمہ کی جائز صورت لکھی ہے (آپ کے مسائل اور ان کا حل ۶/ ۲۵۸)۔

مجوزین کی مستدلات یہ ہیں: احادیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم:

المؤمن للمؤمن كالبنيان يشد بعضه بعضا (متفق عليه)، مثل المؤمنين في توادهم وتراحمهم وتعاطفهم كمثل الجسد إذا اشتكى منه عضو تداعى له سائر الجسد بالسهر والحمى (متفق عليه)، خير الناس أنفعهم للناس (رواه الدار قطني)، من استطاع منكم أن ينفع أخاه فليفعل (رواه مسلم)، من نفس وفي رواية فرج عن أخيه كربة من كرب الدنيا نفس وفي رواية فرج الله عنه كربة من كرب يوم القيمة (مسلم، ابو داؤد، ترمذی)۔

سوال (۲): کے جواب میں مولانا محمد برہان الدین سنبھلی نے فرمایا کہ اگر بیمار نہیں پڑا تو جمع کردہ رقم سوخت ہو جاتی ہو تو اس میں قمار کی شان آگئی، لہذا یہ

ناجائز ہوگا، اگر جمع شدہ کل رقم واپس مل جاتی ہو تو پھر زیادہ مالیت سے استفادہ کمپنی کی طرف سے گویا تبرع ہونے کی وجہ سے شرعاً جائز ہوگا، جمع کردہ رقم سے زیادہ اضافی رقم سے استفادہ کو ربوا اور قمار کی بنا پر ناجائز کہنے والے علماء کرام کے اسماء گرامی حسب ذیل ہیں: مولانا عبدالجلیل قاسمی قاضی امارت شرعیہ پٹنہ، مفتی ثناء الہدیٰ قاسمی، مفتی حبیب اللہ قاسمی، مولانا ابرار خان ندوی، مولانا نیاز احمد، مولانا رحمت اللہ ندوی، مولانا عطاء اللہ قاسمی، مولانا ابوالعاص وحیدی، مولانا عبداللطیف پالنپوری، مفتی محبوب علی وجیہی، مولانا نعمت اللہ قاسمی اور راقم الحروف محمد عبدالرحیم قاسمی۔

مولانا محی الدین غازی نے علاج کا کوئی ذریعہ نہ ہونے کی اضطراری حالت پر محمول کر کے اس زائد رقم سے علاج کو درست قرار دیا ہے تاہم انشورنس کرانے کا وبال اس پر ہوگا۔

مفتی تنظیم عالم قاسمی نے مندرجہ ذیل شرائط کے ساتھ زائد سے استفادہ کو درست قرار دیا:

۱- اس مرض میں جان ضائع ہونے کا خطرہ ہو۔

۲- اتنا غریب اور بے بس ہو کہ از خود علاج نہیں کر سکتا۔

۳- انشورنس کمپنی کے علاوہ دوسرے سے قرض ملنا ناممکن ہو۔

۴- انشورنس کمپنی سے حاصل شدہ زائد رقم صحتیابی کے بعد کمپنی کو واپس کر دینے کا عزم رکھتا ہو۔

گویا زائد رقم اس کے حق میں قرض کی حیثیت میں ہوگی، اگر کمپنی کو واپس کرنے کی کوئی شکل نہ ہو، یا کمپنی کو واپس کرنیکی صورت میں غلط جگہوں میں استعمال کرنے کا اندیشہ ہو تو بینک کے سود کی طرح وہ زائد رقم غرباء اور مساکین میں تقسیم کر دی جائیگی، فمن اضطر غیر باغ ولا عاد فلا اثم علیه (سورہ بقرہ ۲/ ۱۷۳)، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے قبیلہ عرینہ کو از راہ علاج اونٹ کا پیشاب پینے کا حکم دیا (ترمذی/ص ۲۱)

عالمگیری میں ہے: يجوز للعليل شرب البول والدم وأكل الميتة للتداوي، إذا أخبره طبيب مسلم أن شفائه فيه ولم يجد من المباح ما يقوم مقامه (عالمگیری ص ۳۵۵ ج ۵)۔

علامہ ابن نجیم مصری نے حلق میں پھنسے ہوئے لقمہ کو نگلنے کے لئے شراب پینے، مخمصہ کی حالت میں مردار کے کھانے اور جان کے تحفظ کے لئے بحالت اکراہ کلمہ کفر زبان سے ادا کرنیکی اجازت دی ہے (الاشباہ ۹۴)۔

ڈاکٹر ظفر الاسلام صاحب نے میڈیکل انشورنس کرانے والوں کو اپنی رقم سے زیادہ مالیت کے علاج سے مستفید ہونیکی اجازت دیتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ حکومت کی جانب سے امداد ہے، گورنمنٹ کی امداد لینے میں کوئی مضائقہ نہیں معلوم ہوتا۔

مولانا شاہد علی قاسمی کی نظر میں جمع شدہ رقم سے زیادہ علاج میں خرچ شدہ رقم انشورنس کی اس اسکیم میں حصہ لینے والوں کی طرف سے تبرع ہے اس لئے جائز ہے۔ مولانا نعیم اختر قاسمی نے بھی جمع شدہ رقم سے زائد مالیت کے علاج سے مستفید ہونے کو جائز لکھا ہے۔ مولانا اطہر حسن صاحب نے جمع شدہ رقم سے زیادہ مالیت کے علاج میں خرچ ہوئی رقم کو قرض قرار دیا ہے، جس کا ادا کرنا لازم ہوگا یا قدرت نہ ہونے کی صورت میں سرکار یا تنظیم سے اس کو معاف کرانا پڑے گا۔

مولانا سلطان احمد اصلاحی نے لکھا ہے کہ اپنے مولی سے حسن ظن کے تقاضہ سے بیماری سے محفوظ رہنے کا آرزومند ہو اور دوسروں کے تعاون کی نیت سے بیمہ کرائے، پھر ضرورت پڑنے پر جمع کردہ رقم سے زیادہ علاج کرائے تو اس کے لئے اس اضافی رقم سے استفادہ کرنا جائز ہوگا۔

سوال (۳) حکومتی اور نجی اداروں سے بیمہ کے عدم جواز میں یکسانیت:

حکومت کے انشورنس محکموں اور نجی کمپنیوں دونوں کے طریقہ کار میں ربا و قمار کی حقیقت مشترک ہونے کی بنا پر ان سے بیمہ کرانے کے عدم جواز میں دونوں کا حکم یکساں کہنے والے علما کرام کے اسماء یہ ہیں: مولانا محمد برہان الدین سنبھلی، مفتی حبیب اللہ قاسمی، مولانا رحمت اللہ ندوی، مولانا عطاء اللہ قاسمی، مفتی ثناء الہدیٰ قاسمی، مولانا ابرار خان ندوی، مولانا نیاز احمد حمید، مولانا خورشید احمد اعظمی، مولانا عبداللطیف پالنپوری، مولانا نعمت اللہ قاسمی، مفتی تنظیم عالم قاسمی، مولانا ابوالعاص وحیدی، مولانا اطہر حسن صاحبان۔

حکومتی اور نجی اداروں سے بیمہ کے جواز میں یکسانیت:

مولانا نعیم اختر قاسمی اور مولانا سلطان احمد اصلاحی سرکاری اور نجی دونوں دونوں قسم کے اداروں سے انشورنس کرا کر علاج کے لئے زائد رقم کے استفادہ کو یکساں طور پر انشورنس کے مشابہ ہے۔ یہ امداد باہمی ہی کا شعبہ ہے، خواہ اسے سرکاری طور پر چلایا جائے یا نجی طور پر۔

نجی اور سرکاری اداروں سے بیمہ کرانے کے حکم میں فرق:

مولانا قاضی عبد الجلیل صاحب فرماتے ہیں کہ سرکاری اداروں سے فائدہ اٹھانے کی گنجائش ہوسکتی ہے۔

مولانا محی الدین غازی حکومت اور نجی اداروں سے بیمہ کرنے کو منع کرتے ہیں، تاہم ضرورت کے وقت ''اہون البلیتین'' کے اصول پر سرکاری ادارے سے بیمہ کرانے کو ترجیح دیتے ہیں۔

مفتی محبوب علی وجیہی نے لکھا ہے کہ نجی کمپنیوں کی نیت تو تجارت کی ہے، اس لئے یہ اور بھی زیادہ برا ہے، البتہ جن ممالک میں مسلمانوں کی حکومت نہیں نہ ان کی مؤثر طاقت ہے، وہاں ''الضرورات تبیح المحظورات'' کے تحت اس قانون پر عمل کرنے سے معافی کی امید ہے۔

مولانا شاہد علی قاسمی سرکاری بیمہ کے ادارہ سے صحت بیمہ کرا کے استفادہ کرنے کو جائز کہتے ہیں اور پرائیویٹ کمپنی کے بیمہ سے استفادہ کی یہ شرط لکھتے ہیں کہ پرائیویٹ ادارے جمع شدہ رقم کو سود یا حرام پر مبنی کاروبار میں انویسٹ نہ کرتے ہوں۔

راقم الحروف محمد عبد الرحیم قاسمی نے ''نظام الفتاویٰ'' کے حوالہ سے لکھا ہے کہ نجی اداروں اور پرائیویٹ و پبلک بیمہ کمپنیوں کا معاملہ سود و جوے پر مشتمل ہوگا، لہذا یہ معاملہ جائز نہیں، ان سے اگر انشورنس کرالیا تو چونکہ ان سے ملنے والی رقم آپسی معاملہ کی بنیاد پر ہوگی، اس لئے اس ملی ہوئی رقم میں اپنی اصل رقم سے زائد ملی ہوئی رقم کو اس کے وبال سے بچنے کی نیت سے صدقہ کرنا یا اپنی ملکیت سے نکالنے کا حکم متوجہ ہوتا ہے (نظام الفتاویٰ ۲/ ۳۶۷) اس سے معلوم ہوا کہ نجی اداروں اور پرائیویٹ و پبلک بیمہ کمپنیوں سے بیمہ کرانے کی شرعاً اجازت نہیں اور اگر بیمہ کرالیا تو اپنی جمع کی ہوئی رقم کے علاوہ زائد رقم سے استفادہ کرنا شرعاً جائز نہیں ہوگا، بلکہ اس کو بغیر نیت ثواب ملکیت سے نکالنا ضروری ہوگا۔

سوال (۴) بیمہ دار کا سرکاری علاج تعاون نہیں لہذا ممنوع ہے:

سرکاری انشورنس ادارہ بیمہ دار کو علاج کیلئے جو مطلوبہ یا مقررہ رقم دیتا ہے یہ پہلے سے رقم جمع کرنیکی شرط کے ساتھ مشروط ہے، لہذا یہ تعاون و امداد نہیں اور اس کو استعمال کرنا درست نہیں ہوگا، یہ رائے مندرجہ ذیل علماء کرام کی ہے: مولانا محمد برہان الدین سنبھلی، مفتی حبیب اللہ قاسمی، مولانا ابرار خان ندوی، مولانا نیاز احمد، مولانا خورشید اعظمی، مولانا رحمت اللہ ندوی، مولانا عطاء اللہ قاسمی، مولانا ابو العاص وحیدی، مولانا عبد اللطیف پالنپوری، مفتی محبوب علی وجیہی اور مفتی تنظیم عالم قاسمی۔

مولانا محی الدین غازی نے لکھا ہے کہ اس رقم کے سوا کوئی چارہ علاج نہ ہو تو اسے استعمال کیا جائے گا، ورنہ احتراز ضروری ہوگا، مولانا نعمت اللہ قاسمی نے بھی اسی طرح لکھا ہے کہ جب تک اضطرار کی صورت نہ ہو اس کے اختیار کرنے کی اجازت نہیں۔

بیمہ دار کا علاج یا امداد سرکاری تعاون ہے:

سرکاری انشورنس ادارہ علاج کیلئے جو مطلوبہ یا مقررہ رقم بیمہ دار کو دیتا ہے، اس کو سرکاری امداد و تعاون قرار دیا جائے گا، اس رائے کے حاملین مولانا قاضی عبد الجلیل، مولانا اطہر حسن، مولانا نعیم قاسمی، مولانا سلطان احمد اصلاحی، مولانا شاہد علی قاسمی اور راقم الحروف محمد عبد الرحیم قاسمی۔ حضرت مفتی نظام الدین صاحبؒ سابق مفتی دار العلوم دیو بند تحریر فرماتے ہیں: حکومت کی بیمہ کمپنی اپنے قانون حکومت کے اعتبار سے رقم اپنے بیمہ کرنے والوں کو دیگی اس رقم کا حکم وہی ہوگا جو پرائیویٹ فنڈ میں حکومت یا محکمہ اپنے قانون کے اعتبار سے خواہ کسی نام سے دے ہم اس کو شرعاً عطیہ وانعام قرار دیکر اس کا لینا اور استعمال کرنا جائز قرار دیتے ہیں۔ یا ایکسیڈینٹ وغیرہ میں یا کسی جانی و مالی نقصان کے حادثہ میں جو رقم حکومت دیتی ہے اس کو ہم عطیہ شمار کرتے ہیں، اسی طرح اس رقم کو بھی حکومت کے عطیہ کے قبیل سے قرار دے سکتے ہیں پس حکومت سے اس ملی ہوئی رقم کو خواہ نیشنل بیمہ کمپنی کے

ذریعہ دو مستحق سے دے اس کو یا اس کے کسی جزء کو ناجائز یا ربوا وغیرہ قرار دے کر اخراج عن الملک کا حکم شرعا نہ ہوگا (نظام الفتاوی ۲/ ۳٦۷)۔

سوال (۵) بیمہ کے متبادل نظام کی تجویزیں:

مولانا سلطان احمد اصلاحی کی رائے ہے کہ سرکاری اور نجی انشورنس اسکیموں کو زیادہ سے زیادہ بڑھانے کی کوشش کی جائے۔

ڈاکٹر ظفر الاسلام صاحب لکھتے ہیں: بیمہ صحت کرانے والا یہ سوچ لے کہ اگر میں بیمار نہ پڑا تو میری یہ رقم میرے دوسرے بھائیوں کے کام آئے خواہ وہ مسلمان ہوں یا غیر مسلم۔ مولانا نعیم اختر قاسمی کی نظر میں انشورنس ادارہ جمع شدہ سرمایہ میں اضافہ کی غرض سے غیر شرعی طریقہ اپناتا ہو تو رد کیا جائے ورنہ درست نہیں، بقیہ چیزیں خلاف شرع معلوم نہیں ہوتیں۔

مولانا عبد الحنیف پالنپوری کی تجویز ہے: عطیات کی مد سے اسپتال قائم کریں، ان میں غریبوں کا علاج زکوۃ کی مد سے مفت کیا جا سکتا ہے۔

مولانا بدر الحسن وحیدی کی تجویز ہے: بیت المال قائم کیا جائے، رفاہی تنظیمیں بنائی جائیں، صدقات واجبہ ونافلہ سے اسپتال قائم کئے جائیں۔

مولانا عطاء اللہ قاسمی کی تجویز ہے: خیراتی اور رفاہی ادارے کیلئے چندے سے فنڈ اکٹھا کیا جائے اور اس سے اسپتال قائم کریں، مولانا رحمت اللہ ندوی کی تجویز ہے: زکوۃ اور عطیات کا فنڈ الگ الگ ہو، ویلفیر سوسائٹیوں اور رفاہی اداروں کے ذریعہ ضرورت مندوں کی امداد کی جائے۔

مولانا خورشید اعظمی کی تجویز ہے: ہر صاحب استطاعت بطور تبرع متعینہ رقم جمع کرے، جس سے اس کا یا کسی فرد کا علاج کیا جائے۔

مولانا نیاز احمد کی تجویز ہے: رفاہی تنظیم کا قیام اور زکوۃ کے مال سے اسپتال کا قیام اور فقراء کے مفت علاج کا انتظام ہو۔

مولانا شاہد علی قاسمی لکھتے ہیں: سوالنامہ میں مفروضہ کمپنی کی جو تفصیلات ذکر کی گئیں وہ تقریبا شریعت کے دائرہ میں ہیں۔

مولانا محمد برہان الدین سنبھلی نے تحریر فرمایا: بغیر پیشگی رقم کی ادائیگی کی شرط یا اس جیسی کوئی شرط لگائے بغیر ضرورتمندوں کی مدد کیلئے خیراتی ومددی ادارے قائم کئے جائیں۔

مولانا محی الدین غازی نے لکھا ہے کہ تجارتی بنیادوں کے بجائے تعاونی بنیادوں پر ادارہ تشکیل دیا جائے جس میں دی گئی رقم تبرع کی حیثیت رکھے۔

مولانا ابرار خان ندوی کی تجویز ہے: انشورنس تعاونی کی صورت یہ ہے کہ چند افراد کر قسطوار ایک مقررہ رقم آپس میں جمع کریں، شرکاء میں سے جو بیمار ہو اس کی رقم اس کے علاج میں صرف کردی جائے، بیمار نہ ہونے کی صورت میں حسب مطالبہ اس کی رقم واپس کردی جائے، شیخ وہبہ زحیلی نے تعاونی انشورنس کی بحث میں اس جیسی صورت کے جواز کا فتوی دیا ہے، ایک صورت یہ بھی ہے کہ قسط جمع کرنیوالا کمیٹی کو مالک بنادے۔

مفتی تنظیم عالم قاسمی کی تجویز ہے کہ تمام شرکاء چندہ کی رقم جمع کرتے ہوئے، باہمی امداد کی نیت کرلیں، ان میں سے کسی کے بیمار پڑنے پر اس فنڈ سے رقم دی جائے اور بیمار نہ ہونے کی صورت میں پیسہ فنڈ میں جمع رہے کسی کو واپس نہ کیا جائے، اسی سے ملتی جلتی شکل حضرت مولانا یوسف صاحب لدھیانوی نے لکھی ہے (آپ کے مسائل اور انکا حل ٦/ ۲۵۷)۔

راقم الحروف محمد عبد الرحیم قاسمی نے جدید معیشت کے حوالہ سے لکھا ہے کہ بیمہ کا متبادل تعاونی بیمہ ہے، جس میں شرکاء اپنی اپنی مرضی سے فنڈ میں رقمیں جمع کراتے ہیں اور سال کے دوران جن جن لوگوں کو کوئی نقصان پہنچا اس فنڈ سے ان کی امداد کرتے ہیں، پھر سال کے ختم پر اگر رقم بچ گئی تو وہ شرکاء کو بحصہ رسدی واپس کردی جاتی ہے، یا ان کی طرف سے آئندہ سال کے فنڈ کے لئے ان کے حصے کے طور پر رکھ دی جاتی ہے، شرعا اس میں کوئی اشکال نہیں اور جتنے علماء نے بیمے پر گفتگو کی ہے وہ سب اس کے جواز پر متفق ہیں (اسلام اور جدید معیشت ص ۱٦۱ مصنفہ حضرت مفتی تقی عثمانی)۔

سوال (٦) میڈیکل انشورنس جبری ہو یا اختیاری جائز ہے:

مولانا نعیم اختر قاسمی کی رائے ہے کہ میڈیکل انشورنس میں حصہ لینا جبرا یا اختیارا جائز ہے، لہذا علاج کے وقت اس کی سہولیات سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ مفتی حبیب اللہ قاسمی نے لکھا ہے: میڈیکل انشورنس فی نفسہ ناجائز ہے، البتہ عوارض کی بنا پر ضرورۃ اس کی اجازت ہو سکتی ہے اور اس جواز

کی بنیاد'' الحاجة إذا عمت كانت كالضرورة۔ الضرر يزال۔ الحرج مدفوع، الضرورات تبيح المحظورات، كم من شئ يثبت ضمنا لا يثبت قصداً'' جیسے قواعد ہیں، جن ممالک میں میڈیکل انشورنس لازم کردیا گیا ہے وہاں تو قانونی مجبوری ہے لیکن جن ملکوں میں لازمی نہیں مذکورہ بالا اصولی کی بنیاد پر گنجائش نکالی جاسکتی ہے۔

قانونی مجبوری کی بنا پر بیمہ کرانا اور استفادہ کرنا جائز ہے:

جن ممالک میں رہنے والوں پر یا وہاں جانے والوں پر میڈیکل انشورنس لازم کردیا گیا ہے تو قانونی مجبوری کے تحت انشورنس کرانے اور اس سے فائدہ حاصل کرنے کی اجازت ہوگی۔ یہ رائے مندرجہ ذیل علما کرام کی ہے:

مفتی ثناء الہدی قاسمی مولانا محی الدین غازی، مولانا محمد ابرار خان ندوی، مولانا نیاز احمد عبد الحمید، مولانا خورشید احمد اعظمی، مولانا رحمت اللہ ندوی، مولانا عطاء اللہ قاسمی، ڈاکٹر ظفر الاسلام صاحب، مولانا ابو العاص وحیدی، مفتی محتوب علی وجیہی، مولانا اطہر حسن، مفتی عبد الرحیم قاسمی اور قاضی عبد الجلیل صاحب۔

دلائل:

''يجوز التأمين الإجباری أو الإلزامي الذي تفرضه الدولة؛ لأنه بمثابة دفع ضريبة للدولة''(الفقه الاسلامی وأدلته ۵/ ۳۴۲۲)۔ ''المشقة تجلب التيسير۔ الضرورات تبيح المحظورات''۔

مولانا عبد اللطیف پالنپوری کی رائے ہے کہ جتنی رقم جمع کی ہے اس سے زیادہ علاج کی سہولت حاصل کرنا جائز نہیں زائد رقم غربا و محتاجوں کو بلا نیت ثواب تقسیم کردی جائے۔

جبری بیمہ جائز، استفادہ ناجائز:

مولانا نعمت اللہ قاسمی اور مفتی تنظیم عالم قاسمی کے نزدیک ان ممالک میں جانے یا رہنے کے لئے قانونی مجبوری کی بنا پر انشورنس کرایا جاسکتا ہے، جہاں رہنے یا داخلہ کیلئے صحت بیمہ کرانا قانونی طور پر لازم ہے، لیکن انشورنس کئے ہوئے سے استفادہ کرنا درست نہیں مولانا نعمت اللہ قاسمی کہتے ہیں اپنی رقم واپس لینا جائز ہوگا۔

بلا حاجت ان ملکوں میں جانے یا رہنے کی اجازت نہیں:

مولانا محمد برہان الدین سنبھلی نے تحریر فرمایا کہ حکومتی قانونی کی مجبوری کو فقہاء نے حاجت کے درجہ میں رکھا ہے، بنا بریں حاجت کی وجہ سے جو محظورات جائز ہوجاتے ہیں وہ اس صورت میں بھی جائز ہوجانے چاہئیں، لیکن اس صورت میں ایک بات یہ ملحوظ رکھنی ہوگی کہ جن ملکوں میں ایسے قوانین رائج ہیں جو اصلاً ممنوع شرعی ہیں، وہاں کا یہ شخص یا تو اصل باشندہ ہو یا باہر کا کوئی شخص ایسے کام سے گیا ہو جس کے لئے جانا شرعاً ناگزیر تھا، ورنہ ایسے ملکوں میں جانا اتنی مدت کے لئے کہ یہ قانون لاگو ہوجائے یا مستقل رہنا شریعت کے اصل حکم کی رو سے جائز نہیں۔

☆☆☆

دوسرا باب

میڈیکل انشورنس اور صحت کارڈ

پروفیسر الصدیق محمد الامین الضریر [1]

موضوع کے بنیادی عناصر:

۱- میڈیکل انشورنس کی تعریف اور صحت کارڈ کے استعمال کا شرعی حکم۔

۲- مختلف کمپنیوں اور اسپتالوں کے مابین ایک متعین مدت کے لئے دوا اور آپریشن وغیرہ کے اہتمام کے ساتھ شہریوں کے علاج معالجہ سے متعلق طے پانے والے معاہدہ کا شرعی حکم۔

۳- کسی فرد اور اسپتال کے درمیان طے شدہ معاہدہ کا شرعی حکم۔

۴- علاج سے فائدہ اٹھانے والوں اور علاج کی ذمہ داری قبول کرنے والے ادارہ کے باہمی تعلق میں کسی تجارتی یا امدادی انشورنس کمپنی کے واسطہ کا شرعی حکم۔

۵- معاوضہ کا مستحق ہونے کے لئے شفایابی کی شرط لگانے کا شرعی حکم۔

۱- میڈیکل انشورنس کی تعریف اور صحت کارڈ کے استعمال کا شرعی حکم:

اول- میڈیکل انشورنس کی تعریف:

قانون دانوں نے مختلف حیثیتوں سے بیمہ کی مختلف قسمیں کی ہیں، چنانچہ انہوں نے مقصد کے اعتبار سے اس کی دو قسمیں کی ہیں:

(الف) سوشل انشورنس۔ (ب) اسپیشل انشورنس۔

سوشل انشورنس کا مقصد معاشرہ یا سماج کی عام مصلحت کی تکمیل ہے، جیسے مزدوروں کو درپیش بعض خطرات سے تحفظ فراہم کرنا جن کے لاحق ہونے سے وہ کام کرنے کی اہلیت سے محروم ہو سکتے ہیں مثال کے طور پر بیماری، معذوری اور بوڑھاپا، بیمہ کی اس قسم کا دارومدار سماجی تحفظ کے تصور پر ہے۔

(التکافل الاجتماعی فی الاسلام ۹۰، وانظر ایضا التامین الصحی ۸۰)۔

جہاں تک بیمہ کی خاص قسم کا تعلق ہے تو اس کا مقصد بیمہ پالیسی ہولڈر کی اپنی مخصوص مصلحت ہے (الوسیط للدکتور السنہوری ۷/۱۳۷۵، ۱۱۵۶، والتأمین فی القانون المصری والمقارن للدکتور البدراوی ۳۹، والأسلوب الإسلامی لمزاولة التأمین للدکتور السید عبدالمطلب ۲۰)

بیمہ کے ماہرین نے سوشل انشورنس کی متعدد تعریفیں کی ہیں جن میں سب سے بہتر تعریف ڈاکٹر سید عبدالمطلب کی ہے۔ اس تعریف کو ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی سوشل انشورنس سے متعلق اصطلاحات کی کمیٹی نے تسلیم کیا ہے۔ یہ تعریف مندرجہ ذیل ہے:

سوشل انشورنس خطرات کو کسی ادارہ کی طرف منتقل کر کے انہیں دور کرنے کا ایک وسیلہ ہے۔ یہ ادارہ عموماً سرکاری ہوتا ہے۔ بیمہ قانون کے مطابق معین شروط کے ساتھ مخصوص خسارہ کے واقع ہونے کی صورت میں ادارہ کے ممبر بننے والے افراد کو یہ ادارہ مخصوص خدمات فراہم کرنے کا پابند ہوتا ہے

(الأسلوب الإسلامی لمزاولة التأمین/۱۵۵)۔

---

[1] لا کالج، خرطوم یونیورسٹی، سوڈان۔

سوشل انشورنس کا دائرہ

ایک شہر کے سوشل انشورنس کا دائرہ دوسرے شہر کے سوشل انشورنس کے دائرہ سے مختلف ہوتا ہے، لیکن بعض قسمیں سوشل انشورنس کی ریڑھ کی ہڈی سمجھی جاتی ہیں خواہ شہر کوئی بھی ہو، یہ قسمیں درج ذیل ہیں:

(۱) بوڑھاپے کا بیمہ (۲) اتفاقی موت کا بیمہ۔ (۳) معذوری کا بیمہ (۴) بے روزگاری کا بیمہ۔ (۵) صحت کا بیمہ (۶) حوادث کا بیمہ۔

(المصدر السابق ۱۶۹، وانظر أيضا التأمين الصحي وأثره في حماية القوى العاملة/ ۳۵، والتأمينات الاجتماعية والتكافل الاجتماعي في الاسلام ۳۲۲، ۲۷۲، ۲۷، ۴)۔

میڈیکل انشورنس کی تعریف:

میڈیکل انشورنس سوشل انشورنس کی ایک قسم ہے۔ اسی وجہ سے سوشل انشورنس کی تعریف عام طور پر اس پر صادق آتی ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ بعض (فی کتاب التأمین الصحیح وأثره فی حماية القوى العاملة/ ۴۹ از ڈاکٹر شوکت محمد الفیتوری) ماہرین نے میڈیکل انشورنس کی تعریف یوں کی ہے کہ میڈیکل انشورنس ایک ایسا نظام ہے جس کا دارومدار بیمہ پالیسی ہولڈر کو ممبر شپ یا پیشگی ادا کردہ یا قسط وار ادا کی جانے والی رقوم کے عوض انشورنس سسٹم کے طے کردہ حالات میں اس کی طرف سے خدمات یا سہولیات کی فراہمی پر ہے۔ ان قسطوں کو ادا کرنے میں مزدور، مالک اور بعض ممالک میں حکومت کی بھی شرکت ہوتی ہے (حوالہ سابق)

بعض (حوالہ سابق) لوگوں نے اس کی تعریف یوں کی ہے کہ میڈیکل انشورنس سوشل انشورنس کا ایک طریقہ ہے جس کا تعلق براہ راست طبعی سماجی بیماریوں سے ہے جیسے عارضی بیماری، عدم صحت و بوڑھاپے کی مجبوری۔ اگر ایک طرف صحت بیمہ مریض کو طبی ادویہ وغیرہ فراہم کرتا ہے تو دوسری طرف مریض کی کوئی آمدنی نہ ہونے کی صورت میں مالی متبادل بھی فراہم کرتا ہے (حوالہ سابق)۔

دوم-صحت کارڈ:

صحت کارڈ ایک ایسا کارڈ ہوتا ہے جس کو انشورنس ادارہ بیمہ پالیسی ہولڈر کو عطا کرتا ہے۔ اس کارڈ کی بدولت بیمہ پالیسی ہولڈر میڈیکل انشورنس کی خدمات وسہولیات سے مستفید ہونے کا مستحق قرار پاتا ہے۔

سوم-میڈیکل انشورنس کا حکم:

میڈیکل انشورنس کے مذکورہ بالا مفہوم کی رو سے اس کے جواز کے سلسلے میں معاصر فقہاء کے مابین مجھے کسی اختلاف کا علم نہیں ہے۔ اسی طرح اس سوشل سیکورٹی کے جواز کے سلسلے میں بھی مجھے کسی اختلاف کا علم نہیں جس پر میڈیکل انشورنس کا دارومدار ہے۔ بعض اسلامی اکیڈمیوں نے اس نظام کے جواز سے متعلق فیصلے کئے ہیں اور اس کو عام کرنے کی دعوت دی ہے۔ ان میں سے بعض فیصلے درج ذیل ہیں:

۱- "مجمع البحوث الاسلامیہ" کی دوسری کانفرنس منعقدہ قاہرہ مورخہ محرم ۱۳۸۵ھ مطابق مئی ۱۹۶۵ء کے فیصلہ میں کہا گیا ہے: پنشن کا سرکاری نظام اور اس کے مشابہ سوشل سیکورٹی کا نظام جو کہ بعض ملکوں میں رائج ہے، اسی طرح سوشل انشورنس کا نظام، یہ سب جائز اعمال ہیں۔

۲- "مجمع البحوث الاسلامیہ" کی تیسری کانفرنس منعقدہ قاہرہ مورخہ ۱۷/ رجب ۱۳۸۶ھ مطابق ۲۷/ اکتوبر ۱۹۶۶ء کے فیصلہ میں کہا گیا ہے: جہاں تک تعاونی اور سوشل انشورنس اور ان دونوں کے ذیل میں آنے والے معذوری، بے روزگاری، بوڑھاپے اور ناگہانی حادثات وغیرہ سے تحفظ کے لئے کرائے جانے والے میڈیکل انشورنس وغیرہ کا تعلق ہے تو دوسری کانفرنس اس کے جواز کا فیصلہ کر چکی ہے۔

۳- اسلامی قانون سازی سمینار منعقدہ لیبیا مورخہ ربیع الاول ۱۳۹۲ھ مطابق مئی ۱۹۷۲ء کی سفارشات میں مذکور ہے:

سوشل سیکورٹی کو عام کرنا ضروری ہے تاکہ ہر خاندان کو ایسا اطمینان بخش آمدنی کا ذریعہ مل جائے جو اس کی کفالت کرنے والے کی وفات، معذوری یا دیگر کسی بھی انقطاع رزق کا باعث بننے والے سبب کے لاحق ہونے کے وقت اس کی کفالت کر سکے۔ میڈیکل انشورنس کے جواز کی بنیاد رعایا کی مصلحت ہے جس کی ذمہ داری حاکم وقت پر ہے اور اس بات میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ میڈیکل انشورنس کے نظام اور سوشل انشورنس کی تمام قسموں میں رعایا کی مصلحت ہے۔

خصوصاً غیر ترقی یافتہ ممالک کے لئے یہ نظام زیادہ ہی اہمیت کا حامل ہے، کیونکہ یہ ممالک مفت میں ہیلتھ سروس کی فراہمی پر قادر نہیں ہیں۔

۲- مختلف کمپنیوں اور اسپتالوں کے مابین ایک متعین مدت کے لئے دوا اور آپریشن کے اہتمام کے ساتھ شہریوں کے علاج معالجہ سے متعلق طے پانے والے معاہدہ کا شرعی حکم:

یہ معاہدہ بنیادی طور پر عقد اجارہ میں داخل ہے، لہٰذا اس کے اوپر اجارہ کا حکم ثابت ہوگا، اس معاہدہ میں اجارہ کی تمام شرطوں کا مکمل طور سے پایا جانا ضروری ہے، اجارہ کی بعض شرطیں تو اس کے الفاظ سے متعلق ہوتی ہیں جبکہ بعض شرطیں عقد کرنے والوں سے متعلق ہوتی ہیں اور ان میں سے بعض اجرت سے متعلق ہوتی ہیں جبکہ بعض کا تعلق محل سے ہوتا ہے۔

ہم یہ مان لیں کہ صیغہ اور عقد کرنے والوں سے متعلق شرطیں اس معاہدہ میں موجود ہیں، اسی طرح اجرت سے متعلق شرطیں بھی اس میں موجود ہیں، اس لئے کہ اس کے بارے میں مقررہ رقم کی بات کہی گئی ہے۔ اب محل کے بارے میں غور کرنا باقی ہے۔

اس معاہدہ میں محل تین چیزوں سے مرکب ہے:

اول- بذات خود مقصود (ایک متعین مدت کے لئے کسی ادارہ کے ملازمین کا علاج ومعالجہ) یہ صورت اشخاص کے اجارہ میں داخل ہے اور اس میں اجیر مشترک ہوتا ہے، یعنی اسپتال، ڈاکٹرز اور اسپتال کا عملہ جو ادارہ کے ملازمین کے علاج کا کام انجام دیتے ہیں۔ یہ سب اجیر مشترک کی حیثیت رکھتے ہیں۔ لہٰذا اس معاہدہ پر اجیر مشترک کے اجارہ کا حکم ثابت ہوگا۔

دوم- مریض کے اسپتال میں قیام کی صورت میں اسپتال کے بیڈ اور کمرے، یہ چیزیں اعیان کے منافع کے اجارہ کے قبیل سے ہیں۔ لہٰذا ان کے اوپر اعیان کے منافع کو اجارہ پر دینے کا حکم ثابت ہوگا۔

سوم- دوا اور آپریشن وغیرہ:

جہاں تک آپریشن کی بات ہے تو وہ پہلی شق میں داخل ہے اور جہاں تک دوا اور اس جیسی چیز جیسے کھانے وغیرہ کا تعلق ہے تو یہ چیزیں اجارہ کا محل نہیں بن سکتیں، اس لئے کہ یہ اعیان کے قبیل سے ہیں اور اجارہ اعیان میں نہیں بلکہ اعیان کے منافع میں ہوتا ہے۔ لہٰذا ایک متعین رقم کے عوض دوا وغیرہ کا التزام بیع شمار کیا جائے گا اور اس کے اوپر بیع کا حکم لگایا جائے گا۔

پہلی شق (ایک متعین مدت کے لئے ادارہ کے ملازمین کا علاج ومعالجہ):

اس کا حکم جاننے کے لئے ضروری ہے کہ ادارہ کے ملازمین کا مفہوم متعین ہو جائے، اسی طرح یہ بھی متعین ہو جائے کہ مدت سے کیا مقصود ہے؟ جہاں تک مقررہ مدت کی بات ہے تو مجھے سمجھ میں آتا ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ادارہ اسپتال کے ساتھ اس بات پر اتفاق کرے کہ اسپتال اس کے ملازمین کا علاج کرے گا اور بدلے میں ادارہ ہر مہینہ یا ہر سال ایک مقررہ رقم ادا کرے گا۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اسپتال اس مقررہ رقم کے بدلے مثلاً دو مہینہ تک علاج کرے گا اور پھر چھوڑ دے گا جیسا کہ عبارت سے یہی مفہوم ذہن میں آتا ہے۔ اگر مدت مقرر ہو اور اجرت بھی مقرر ہو تو مجھے اس اتفاق میں کوئی شرعی مانع نظر نہیں آتا۔

ادارے کے ملازمین سے مقصود کبھی تو تعداد کی تحدید کئے بغیر ادارہ کے تمام ملازمین ہوتے ہیں اور کبھی وہ ملازمین مراد ہوتے ہیں جن کی تعداد متعین ہو اور ان دونوں حالتوں میں یہ اتفاق غرر (دھوکہ) پر مشتمل ہے جو محل کے مجہول ہونے کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔ پہلی صورت میں مقدار نہ معلوم ہونے کی وجہ سے یہ غرر پیدا ہوتا ہے اور دونوں حالتوں میں علاج کے ضرورت مند افراد کی تعداد اور علاج کی نوعیت کے مجہول ہونے کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔

دوسری شق (اسپتال کے بیڈ اور کمرے) کا حکم:

میری رائے یہ ہے کہ اس صورت میں معاہدہ اعیان کے منافع کے اجارہ کے قبیل سے ہے۔ لہٰذا اس اتفاق میں اس کی تمام شرطوں کا پوری طرح پایا جانا ضروری ہے اور اس کی شرطوں میں سے ایک شرط یہ ہے کہ عقد کے وقت منفعت معلوم ہو نیز جب منفعت توسیع کی حامل ہو تو اجارہ کی مدت کو بھی بیان کردینا

چاہئے۔

اور اس حالت میں منفعت بیڈ اور کمروں کا استعمال ہے اور یہ منفعت توسیع کی حامل ہے۔لہٰذا اس کے اندر مدت کی تحدید ضروری ہے جبکہ اس اتفاق میں مدت کی تحدید نہیں ہے۔مریض اسپتال میں کبھی ایک دن، کبھی ایک ہفتہ اور کبھی ایک مہینہ بھی ٹھہرتا ہے، اس لئے اس میں غرر ہے جس سے عقد فاسد ہوجاتا ہے۔

تیسری شق (دواوغیرہ) کا حکم:

اس صورت میں اتفاق بیع ہے، لہٰذا اس پر بیع کا حکم لگایا جائے گا۔بیع کے صحیح ہونے کی ایک شرط یہ ہے کہ جس چیز کو فروخت کیا جائے وہ معلوم ہو، یہاں بیع دوا ہے اور دوا کی نوعیت اور مقدار دونوں مجہول ہیں۔لہٰذا اس اتفاق میں دوطرف سے غرر پایا جاتا ہے۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ یہ اتفاق ہر پہلو سے غرر پر مشتمل ہے۔اس اتفاق میں عقد بیع کا غرر ہے جس کے بارے میں خصوصی ممانعت وارد ہوئی ہے، اسی طرح اس میں عقد اجارہ کا غرر ہے جس کو فقہاء نے بالا اتفاق بیع کے ساتھ ملحق کیا ہے، اسی طرح اس میں معقود علیہ میں غرر ہے۔اس اتفاق کی ضرورت وحاجت بھی نہیں، کیونکہ اس غرر پر مشتمل طریقہ کے علاوہ علاج کے دوسرے جائز ذرائع موجود ہیں۔

اسی لئے اتفاق کی یہ صورت میرے نزدیک حرام ہے۔

۳-کسی فرد اور اسپتال کے درمیان طے شدہ معاہدہ کا شرعی حکم:

اس صورت کا مطلب یہ ہے کہ ایک شخص اسپتال سے اس بات پر معاہدہ کرتا ہے کہ وہ اسپتال کو ایک مقررہ رقم ادا کرے گا، اس کے بدلہ میں اسپتال سرجری اور دواوغیرہ کے ساتھ اس شخص کے علاج کا معاہدہ کرتا ہے، اس صورت کا حکم سابقہ صورت کی طرح ممانعت کا ہے، اس لئے کہ اس صورت میں بھی غرر پایا جاتا ہے۔یہ غرر دوا کی مقدار اور اس کی نوعیت کے مجہول ہونے کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔مزید برآں علاج کے حصول کے مجہول ہونے سے بھی غرر پایا جاتا ہے، اس لئے کہ کبھی وہ شخص مقررہ رقم ادا تو کردیتا ہے لیکن متعین وقت میں اس کو علاج کی ضرورت ہی نہیں پڑتی، کبھی اس کی موت اپنے گھر میں ہوتی ہے اور کبھی کسی حادثہ کے پیش آنے کی وجہ سے راستہ ہی میں اس کا انتقال ہوجاتا ہے اور اسپتال کو اس کا علاج کرنے کا موقع ہی نہیں ملتا، تو کس بنیاد پر وہ رقم اسپتال کے لئے حلال ہوجائے گی جو اس نے اس شخص سے لی ہے۔اس صورت میں بغیر کسی مجبوری کے غرر کا ارتکاب ہورہا ہے، اس لئے کہ یہ شخص مرض لاحق ہونے پر اسپتال جاکر جائز طریقہ سے اس سے معاہدہ کرسکتا ہے۔

۴-علاج سے فائدہ اٹھانے والوں اور علاج کی ذمہ داری قبول کرنے والے ادارہ کے باہمی تعلق میں کسی تجارتی یا امدادی انشورنس کمپنی کے واسطہ کا شرعی حکم:

علاج سے فائدہ اٹھانے والوں اور اسپتال کے درمیان کسی تجارتی بیمہ کمپنی کا آنا کسی بھی صورت میں درست نہیں ہے۔

اسلامی فقہ اکیڈمی مکہ مکرمہ کے اجلاس منعقدہ شعبان ۱۳۹۸ھ میں تجارتی بیمہ اور اس کی تمام انواع واقسام کی حرمت کے بارے میں فیصلہ کیا جاچکا ہے، اسی طرح جدہ فقہ اکیڈمی کے اجلاس دوم منعقدہ ربیع الثانی ۱۴۰۶ھ مطابق دسمبر ۱۹۸۵ء کے فیصلہ میں اس بات کی صراحت کی گئی ہے کہ تجارتی بیمہ کمپنیوں کے عقد میں تجارتی کمپنیوں کی مجوزہ قسطوں کی وجہ سے بہت زیادہ غرر پایا جاتا ہے، یہ غرر عقد کے لئے مفسد ہے۔لہٰذا یہ شرعاً حرام ہے۔میرے خیال میں اس کے بعد تجارتی بیمہ کمپنیوں کے بارے میں بحث کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہ گئی ہے۔جہاں تک علاج کرانے والوں اور اسپتال کے مابین تعلقات کے قیام کے لئے تعاونی بیمہ کمپنی کے بیچ میں آنے کی بات ہے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔اس لئے کہ تمام معاصر فقہاء کے نزدیک تعاونی بیمہ کمپنیوں کے ساتھ کاروبار کرنا جائز ہے۔سوال یہاں اس طریقہ کے بارے میں باقی رہ جاتا ہے جس کے ذریعہ تجارتی بیمہ کمپنی بیچ میں آتی ہے۔اگر ادارہ اور اسپتال کے درمیان یا فرد اور اسپتال کے درمیان آنے کا مقصود وہی ہے جو دوسرے اور تیسرے عنصر میں مذکور ہے تو یہ جائز نہیں ہے، اس لئے کہ یہ طریقہ قطع نظر اس کے کہ اس کو اپنانے والا کون ہے، بذات خود ممنوع ہے۔

ادارہ اور اسپتال یا فرد اور اسپتال کے بیچ میں آنے کا جائز طریقہ وہی ہے جس کو بعض اسلامی تعاونی کمپنیاں مشترکہ تحفظ صحت کے نظام کے تحت اختیار کرتی ہیں۔

۵- معاوضہ کا مستحق ہونے کے لئے شفایابی کی شرط لگانے کا شرعی حکم:

اس سلسلہ میں فقہاء کی آراء کا خلاصہ یہ ہے:

ڈاکٹر سے شفایابی کی شرط لگانا کبھی اجارہ کے لفظ سے ہوتا ہے اور کبھی "جعالہ" کے لفظ سے اگر شرط صیغۂ اجارہ کے ذریعہ سے ہو تو امام مالکؒ کے نزدیک جائز ہے، جیسا کہ "المدونہ" (دیکھئے: المدونہ ۱۱/ ۶۴)، "البھجۃ" (البھجۃ شرح التحفۃ ۲/ ۱۷۸، نیز دیکھئے: حلی المعاصم مع البھجۃ) اور "الشرح الکبیر" (الشرح الکبیر مع حاشیۃ الدسوقی ۴/ ۵۷) اور اس کے حاشیہ میں ہے، لہٰذا ڈاکٹر بیماری سے شفایابی کے حصول پر ہی مستحق اجر قرار پائے گا۔ الشرح الصغیر (الشرح الصغیر علی أقرب المسالک مع حاشیۃ الصاوی ۴/ ۴۷، ۷۵) میں مذکور ہے کہ یہی قول زیادہ صحیح ہے۔ فقہاء حنابلہ میں سے ابن ابی موسیٰ نے اس کو جائز قرار دیا ہے، جیسا کہ 'المغنی' میں ابن قدامہ (المغنی لابن قدامہ ۵/ ۵۴۱) کی عبارت سے سمجھ میں آتا ہے، ان دونوں کے علاوہ مجھے نہیں معلوم کہ کسی نے اس کو جائز قرار دیا ہے۔

اگر شرط جعالہ کے ذریعہ سے ہو تو شافعیہ کے نزدیک اور ابن قدامہ کی روایت کے مطابق حنابلہ کے نزدیک جائز ہے، جبکہ 'المقنع' کے محشی کی روایت کے مطابق مذہب کے صحیح قول کی رو سے جائز نہیں ہے، فقہاء مالکیہ کا اس بارے میں اختلاف ہے، باجی کا کہنا ہے کہ اس سلسلے میں امام مالک کے دو اقوال ہیں۔ ایک قول تو عدم جواز کا ہے جو 'المدونۃ' میں مذکور ہے اور ایک قول جواز کا ہے۔ دردیر نے 'الشرح الکبیر' میں نیز دسوقی نے ذکر کیا ہے کہ ڈاکٹر کے ساتھ بیماری سے شفایابی کی شرط لگانا ہمیشہ اجارہ ہی کے حکم میں ہوگا، اگرچہ شرط لفظ جعالہ کے ذریعہ لگائی گئی ہو، دردیر نے 'الشرح الصغیر' میں بیان کیا ہے کہ یہ شرط اجارہ کے حکم میں ہوگی اگر لفظ "جعالہ" کے ذریعہ نہ لگائی گئی ہو، صاوی نے ان سے اس بات میں اتفاق کیا ہے کہ اگر عقد میں جعالہ کی صراحت نہ ہو تو یہ شرط اجارہ کے حکم میں ہوگی ورنہ جعالہ قرار پائے گی جو لازم نہیں ہوگی۔ حنفیہ کے نزدیک صیغۂ جعالہ کے ذریعہ ڈاکٹر سے شرط لگانا جائز نہیں ہے، اسی طرح ان کے نزدیک یہ صیغۂ اجارہ کے ذریعہ سے بھی جائز نہیں ہے، جعالہ کے سلسلے میں ان کے اقوال سے مجھے یہی معلوم ہوتا ہے۔ اگرچہ اس موضوع کے سلسلے میں مجھے ان کی طرف سے صراحت کا علم نہیں ہے۔

ڈاکٹر سے شفایابی کی شرط لگانے کے عدم جواز کے قائلین میں سے "ظاہریہ" بھی ہیں۔ علامہ ابن حزمؒ کا کہنا ہے کہ ڈاکٹر سے شفایابی کی شرط لگانا بالکل ہی جائز نہیں ہے، اس لئے کہ کسی کو شفا دینا یا نہ دینا اللہ کے ہاتھ میں ہے یہ کسی آدمی کے ہاتھ میں نہیں ہے اور شفایابی پر قادر صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے (المحلی ۷/ ۲۲۷)۔

عدم جواز کی صراحت زیدیہ نے بھی کی ہے۔ ان لوگوں نے ممانعت کی علت یہ بتائی ہے کہ شفا دینا ڈاکٹر کے ہاتھ میں نہیں ہے (البحر الزخار ۴/ ۴۶)۔ جو حضرات ڈاکٹر سے شفایابی کی شرط کے جواز کے قائل ہیں انہوں نے دوا کی ذمہ داری مریض پر عائد کی ہے، اگر یہ ذمہ داری ڈاکٹر پر عائد کی جائے تو عقد درست نہ ہوگا۔

ڈاکٹر سے شفایابی کی شرط لگانے کے سلسلے میں میری رائے:

میرے نزدیک یہ شرط چاہے صیغۂ اجارہ سے ہو یا لفظ 'جعالہ' سے جائز نہیں ہے اس کے وجوہ یہ ہیں:

(۱) ڈاکٹر سے شفایابی کی شرط لگانا صیغۂ اجارہ کے ذریعہ سے جائز نہیں ہے، اس لئے کہ اس کے اندر محل عقد میں غرر پایا جاتا ہے، نیز عقد سے جڑی ہوئی شرط کے اندر بھی غرر ہے، اس لئے کہ جس چیز پر عقد ہو رہا ہے وہ شفایاب ہونے تک علاج کرنا ہے، اس کے اندر غرر مدت علاج کا علم نہ ہونے کی بنیاد پر پیدا ہوتا ہے، کیونکہ مریض کبھی تو ایک دن کے علاج کے بعد، کبھی ایک ہفتہ کے علاج کے بعد اور کبھی ایک مہینہ کے علاج کے بعد شفایاب ہوتا ہے۔ لہٰذا معاوضہ کا دارومدار شفایابی پر ہے۔

اس عقد اجارہ میں شرط کی وجہ سے پیدا ہونے والا ایک دوسرا غرر بھی ہے۔ مریض ڈاکٹر کو اپنے علاج پر معاوضہ ادا کرتا ہے اس شرط کے ساتھ کہ ایک مقررہ رقم کے بدلے وہ اپنی بیماری سے شفایاب ہو جائے، یہ شرط فاسد ہے جو عقد کے لئے مانع ہے۔ اس شرط کے فساد کی وجہ یہ ہے کہ اس کے وجود ہی میں غرر ہے۔ اس لئے کہ شفایابی کبھی ملتی ہے اور کبھی نہیں ملتی۔

کاسانی کا کہنا ہے کہ صحت بیع کی شرطوں میں سے ایک بیع کا فاسد شرطوں سے پاک ہونا بھی ہے، پھر وہ کہتے ہیں کہ فاسد شرطوں کی بہت ساری قسمیں

ہیں۔ ان میں سے ایک شرط تو یہ ہے کہ اس کے وجود ہی میں غرر ہو بایں طور کہ جس چیز کی شرط لگائی گئی ہو اس کے وجود اور عدم دونوں کا احتمال ہو اور حال میں اس کی واقفیت ممکن نہ ہو (البدائع ۵ / ۱۶۸)۔

اسی وجہ سے میری رائے معاوضہ کے استحقاق کے لئے ڈاکٹر سے شفایابی کی شرط لگانے کے سلسلے میں عدم جواز کی ہے۔

(۲) لفظ جعالہ کے ذریعہ ڈاکٹر سے شفایابی کی شرط لگانا جائز نہیں ہے، اس لئے کہ جعالہ جیسا کہ ابن رشد نے اس کی تعریف کی ہے: "ایسی منفعت پر اجارہ ہے جس کے حصول کا گمان ہو"۔

جعالہ فقہاء کے نزدیک جائز ہے، جعالہ کے جواز کے قائلین کا کہنا ہے کہ از روئے قیاس جعالہ میں غرر ہے، اس لئے کہ اس کے اندر عمل مجہول ہوتا ہے نیز مدت بھی، اس لئے کہ عامل کام سے فراغت کے بعد ہی مزدوری کا مستحق ہے اور یہاں وقت مجہول ہوتا ہے، البتہ حاجت کے وقت جعالہ جائز ہے۔

وہ حاجت جو باہمی لین دین کے معاملہ میں غرر کو غیر موثر بنا دیتی ہے متعین ہے اور اس کے تعین سے مراد یہ ہے کہ مقصد کے حصول کے لئے اس ایک راستہ کے سوا جس میں غرر پایا جارہا ہے بقیہ تمام جائز راستے بند ہو چکے ہوں اور یہ صورت شفایابی سے مشروط جعالہ میں نہیں پائی جاتی، کیونکہ مریض کے لئے ممکن ہے کہ وہ علاج کے سلسلے میں شرعی شرطوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے ڈاکٹر کے ساتھ اجارہ کا معاہدہ کرلے۔ عرف عام میں یہی طریقہ رائج ہے، لہذا شفایابی پر جعالہ کی ضرورت ہی نہیں، نیز شفایابی جیسا کہ مانعین کا کہنا ہے اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے۔ اللہ کے علاوہ اس پر کوئی قادر نہیں (البحر الزخار ۴ / ۴۶، المحلی ۸ / ۲۲۷)۔

اسی لئے میری رائے یہ ہے کہ جس جعالہ کا دارومدار شفایابی پر ہو وہ جائز نہیں ہے اگر چہ دوا مریض ہی کی جانب سے کیوں نہ ہو۔

اگر دوا کی ذمہ داری ڈاکٹر پر ہو تو پھر ممانعت اور زیادہ شدید ہو جائے گی، اس لئے کہ ڈاکٹر سے شفایابی کی شرط لگانے کو جائز قرار دینے والوں نے یہ شرط عائد کی ہے کہ اس صورت میں دوا مریض کی طرف سے ہوگی۔

ڈاکٹر سے شفایابی کی شرط لگانے کو جائز قرار دینے والوں نے جھاڑ پھونک کے جواز سے متعلق حدیث سے بھی استدلال کیا ہے، یہ حدیث صحیح ہے لیکن اس حدیث سے ان کا دعوی ثابت نہیں ہوتا، کیونکہ اس سے زیادہ سے زیادہ یہ ثابت ہو سکتا ہے کہ جھاڑ پھونک پر اجرت لینا جائز ہے۔ اس میں شفایابی کی شرط کا کوئی ذکر نہیں ہے۔

مصادر و ماخذ

کتب فقہ:

فقہ حنفی کی کتابیں

۱- بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع - علاء الدین ابوبکر مسعود کاسانی متوفی 587ھ - مطبعۃ الجمالیہ بمصر 1910۔

۲- رد المحتار علی الدر المختار - محمد امین بن عمر عابدین الشہیر بابن عابدین متوفی 1252ھ - طبع بولاق۔

فقہ مالکی

۳- المدونۃ الکبری - روایۃ سحنون بن سعید التنوخی عن الامام عبد الرحمن بن القاسم بن انس الاصبحی متوفی 179ھ - مطبعۃ السعادۃ 1323ھ۔

۴- المنتقی شرح موطا امام مالک - ابو الولید سلیمان بن خلف الباجی الاندلسی متوفی 494ھ - مطبعۃ السعادہ۔

۵- عقد الجواہر الثمینۃ - جلال الدین عبد اللہ بن نجم بن شاش متوفی 616ھ - مطبعۃ دار المغرب الاسلامی۔

۶- الذخیرہ - شہاب الدین احمد بن ادریس القرافی متوفی 684ھ - مطبعۃ دار الغرب الاسلامی۔

۷- الشرح الکبیر مع حاشیۃ الدسوقی - احمد بن محمد بن احمد العدوی الشہیر بالدردیر متوفی 1201ھ - مطبعۃ الازہریۃ۔

۸- الشرح الصغیر مع حاشیۃ الصاوی الدردیر - مطبعۃ دار المعارف۔

٩-البہجۃ فی شرح التحفۃ- ابوالحسن علی بن عبدالسلام التسولی-مطبعۃ البہیۃ۔

١٠-بدایۃ المجتہد ونہایۃ المقتصد-ابوالولید محمد بن احمد بن محمد بن احمد القرطبی متوفی 595ھ-مطبعۃ مصطفی البابی الحلبی۔

فقہ شافعی

١١-التکملۃ الثانیۃ/المجموع شرح المہذب مطبعۃ دارالفکر۔

١٢-نہایۃ المحتاج الی شرح المنہاج-شمس الدین محمد بن ابی العباس بن حمزۃ بن شہاب الدین الرملی متوفی 1004ھ-مطبعۃ مصطفی البابی الحلبی۔

فقہ حنبلی

١٣-المغنی-ابومحمد عبداللہ بن احمد محمد بن قدامۃ المقدسی متوفی 620ھ-مطبعۃ عالم الکتب بیروت۔

١٤ -حاشیۃ علی المقنع-مطبعۃ مکتبۃ الریاض الحدیثۃ۔

دیگر فقہی مسالک

١٥-البحر الزخار الجامع لمذاہب علماء الأمصار-احمد بن یحییٰ بن المرتضی بن مفضل بن منصور الحسنی متوفی 840ھ-مطبعۃ القاہرۃ۔

١٦-المحلی-ابومحمد علی بن احمد بن سعید بن حزم الظاہری متوفی 456ھ-مطبعۃ الامام

دیگر مؤلفات

١٧-الغرر واثرہ فی العقود فی الفقہ الاسلامی-الدکتور الصدیق محمد الامین الضریر-دوسرا ایڈیشن 1416ھ۔

کتب قانون

١-الوسیط-للدکتور عبدالرزاق السنہوری-مطبعۃ لجنۃ التالیف والترجمۃ والنشر۔

٢-التأمین فی القانون المصری والمقارن-للدکتور عبدالمنعم البدراوی-مطبعۃ نہضۃ مصر۔

٣-الاسلوب الاسلامی لمزاولۃ التأمین-الدکتور السید عبدالمطلب عبدہ پہلا ایڈیشن۔

٤-التأمین الصحی وأثرہ فی حمایۃ القوی العاملۃ-المرکز العربی للتأمینات الاجتماعیۃ۔

٥-التأمینات الاجتماعیۃ والتکافل الاجتماعی فی الاسلام-المرکز العربی للتأمینات الاجتماعیۃ-الخرطوم۔

٦-قانون الھیئۃ العامۃ للتأمین الصحی ١٩٩٤ء-سوڈان۔

☆☆☆

میڈیکل انشورنس، تعارف اور مقاصد

ڈاکٹر محمد ہیثم الخیاط[1]

یہ مقالہ میڈیکل انشورنس سے متعلق ہے۔ اس موضوع کی تمہید میں ہم سب سے پہلے صحت اور انشورنس کی تعریف الگ الگ بیان کریں گے اور اس کے بعد میڈیکل انشورنس کی تعریف، اس کی تاریخ، انواع واقسام، مقاصد واہداف کا تذکرہ کریں گے تا کہ اس سلسلہ میں احکام شرعیہ تک رسائی حاصل ہوسکے۔

صحت:

نصف صدی قبل عالمی صحت کے ادارہ نے اپنے دستور میں صحت کی تعریف ان الفاظ میں کی تھی: صحت محض مرض یا بیماری یا معذوری کا فقدان نہیں بلکہ صحت یہ ہے کہ انسان جسمانی، نفسیاتی اور سماجی ہر طرح کی بیماریوں سے محفوظ رہے۔

اس تعریف سے ہمیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ حدیث یاد آتی ہے جو صحیح ابن ماجہ میں حضرت ابوبکرؓ سے مروی ہے:

''سلو الله المعافاة فإنه لم يؤت أحد بعد اليقين خيرًا من المعافاة''

(اللہ تعالیٰ سے عافیت مانگو، کیونکہ ایمان کے بعد عافیت سے بہتر کوئی چیز نہیں ہے)۔

عالمی ادارہ صحت کی اس تعریف کو کافی سراہا گیا۔ اس سے پہلے یورپ کے اطباء صحت کی تعریف محض مرض کی عدم موجودگی سے کیا کرتے تھے، ٹھیک ویسے ہی جیسے کچھ لوگ حیات کی تعریف عدم موت سے کرتے ہیں۔

ہماری اسلامی اور عربی ثقافت کے علمبردار اطباء نے اس میدان میں سیکڑوں سال قبل کارہائے نمایاں انجام دیئے جبکہ اس صدی کے نصف اول تک دانشوران یورپ کو اس کا کوئی علم نہیں تھا۔

صحت بقول علی بن عباس ایک جسمانی کیفیت ہے جس کی بدولت انسانی افعال طبعی رفتار میں پایۂ تکمیل کو پہنچتے ہیں۔

یا صحت جیسا کہ سات سو سال قبل ابن النفیس نے کہا تھا: وہ جسمانی کیفیت ہے جس کی وجہ سے انسانی افعال صحیح طریقہ پر انجام پاتے ہیں اور مرض اس کے برعکس جسمانی کیفیت کا نام ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ہمارے تمام اطباء کے نزدیک صحت بنیادی شی اور اصل سرچشمہ ہے اور مرض صحت کے برعکس کیفیت سے عبارت ہے۔

علی بن عباس نے بہت ہی فصیح وبلیغ اور مختصر عبارت میں صحت کی تعریف ''اعتدال بدن'' سے کی ہے۔

انسان کا کوئی بھی کام نقصان کے احتمال سے خالی نہیں ہوتا، اگر کوئی پیدل چلتا ہے تو ممکن ہے کہ اس کا پیر پھسل جائے اور وہ گر پڑے، اس کا ہاتھ ٹوٹ جائے اور اس کی صحت برباد ہوجائے، ممکن ہے کہ بس میں سوار آدمی کو کوئی حادثہ لاحق ہوجائے اور اس کو اسپتال جانا پڑے، اس میں بھی صحت کا نقصان ہے، گھر میں سوئے ہوئے کسی آدمی پر یا اس کے گھر پر کوئی آفت آسکتی ہے اور اس سے اس کا گھر برباد ہوسکتا ہے، اگر کوئی تاجر ہے تو ممکن ہے کہ اس کا سامان ڈھونے والی کشتی ڈوب جائے اور اس کا سامان تجارت برباد ہوجائے لیکن ان تمام صورتوں میں نقصان کے اندیشہ کو ہم یقین کا درجہ نہیں دے سکتے، محض یہ شک ہی ہوتا ہے جس کے بارے میں انسان سوچتا ہے جیسے کوئی شک کے ساتھ موت کے بارے میں سوچتا رہتا ہے۔

---

[1] رکن اکادمی برائے عربی زبان دمشق، بغداد، عمان، قاہرہ، علی گڑھ۔

ایک مسلمان کی نظر میں اس طرح کے نقصانات کا خیر یا شر سے کوئی تعلق نہیں اور نہ درستگی اور خطا سے اس کا کوئی ربط ہے، نا ہی اس میں اللہ کی رضامندی یا ناراضگی شامل ہے، اس لئے کہ اللہ فرماتا ہے: وعسیٰ أن تكرهوا شيئا و هو خير لكم و عسیٰ أن تحبوا شيئا و هو شر لكم (سورۂ بقرہ: ۲۱۶) (ممکن ہے کہ تم کسی چیز کو ناپسند کرو اور وہ تمہارے لئے اچھی ہو، اسی طرح ممکن ہے کہ تم کسی چیز کو پسند کرو اور وہ تمہارے لئے بری ہو)۔

ایسے امور میں تجارت افضل اعمال میں سے ہے جن میں خطرات کے پیش آنے کا احتمال ہوتا ہے۔

کوئی عقلمند آدمی اس بات میں اختلاف نہیں کرے گا کہ مال و دولت، جسم و جان اور پھلوں کو ممکنہ خسارہ سے بچانے کے لئے انسان کو ضروری اقدام کرنا چاہئے یا یہ کہ اگر کوئی حادثہ پیش آجائے تو اس کے اثر کو زائل کرنے کی کوشش کرنی چاہئے، یہ خلیفہ راشد عمر بن خطابؓ کے کلام سے ثابت ہے، آپؓ نے فرمایا کہ یہ اللہ کے ایک فیصلہ سے دوسرے فیصلہ کی طرف بھاگنا ہے۔ خطیب نے اپنی تاریخ میں حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت کی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جو برائی سے بچتا ہے اس کو بچایا جاتا ہے"، اور ہمیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سکھایا، میرے ماں باپ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر قربان ہوں کہ ہم ان خطرات سے کیسے بچیں۔ اسی طرح بخاری و مسلم میں حضرت ابو موسیٰ اشعری سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جو کوئی ہماری کسی مسجد یا بازار سے گذرے اور اس کے ساتھ تیر ہو تو اس کو پکڑ کر چلے یا فرمایا کہ تھام کر چلے کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ کسی مسلمان کو چوٹ پہنچائے"۔

اللہ کے رسول نے اس امت کی بھلائی کو تفصیل سے بیان کیا ہے، چنانچہ بھلائی پر تعاون کے سلسلے میں اللہ کے رسول نے متعدد احادیث میں اس کی اہمیت اور ضرورت کو بیان فرمایا ہے، بخاری و مسلم میں حضرت ابو موسیٰ اشعری سے مروی ہے: "المؤمن للمؤمن كالبنيان يشد بعضه بعضاً"۔

ایک مومن دوسرے مومن کے لئے عمارت کی طرح ہے جس کا ایک حصہ دوسرے حصہ کو تقویت پہنچاتا ہے۔ امام قرطبی لکھتے ہیں کہ کوئی عمارت اس وقت تک مکمل اور نفع بخش نہیں ہو سکتی جب تک کہ اس کا بعض حصہ بعض سے مربوط نہ ہو اور ایک دوسرے کو مضبوطی نہ عطا کرتا ہو۔

مصالح اور منافع کے حصول کا یہ ایک ایجابی پہلو ہے، جو کہ تعاون علی البر کا ایک مظہر ہے، تعاون علی البر کا ایک دوسرا مظہر اور پہلو بھی ہے، وہ یہ کہ مومنین سے مفاسد کو دور کیا جائے، برائیوں سے ان کو بچایا جائے، ان کے مصائب و پریشانیوں کو ختم کیا جائے، بخاری و مسلم نے حضرت ابن عمرؓ سے ایک حدیث روایت کی ہے کہ آپ نے فرمایا: ایک مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے، نہ تو وہ اپنے بھائی پر ظلم کرتا ہے اور نہ اس کو رسوا کرتا ہے اور جس شخص نے اپنے بھائی کے اوپر کسی خطرہ کو پیش آتے ہوئے دیکھا اور اس کو بچانے کے لئے کوئی کام نہ کیا یا اس کو کوئی خطرہ لاحق ہو گیا اور اس نے اس مصیبت زدہ شخص کو خطرہ سے بچانے کے لئے کوئی کام نہ کیا تو سمجھ لو کہ اس نے اپنے بھائی کو بے یار و مددگار چھوڑ کر رسوا کیا۔

عز بن عبد السلام نے بعض مکلفین پر بعض کے حقوق اور ان حقوق کے قاعدہ و ضابطہ کے سلسلے میں کافی اچھی بحث کی ہے، وہ کہتے ہیں کہ "اس طرح کے حقوق کی اساس ہر طرح کی مصلحت کا حصول ہے چاہے وہ واجبی ہو یا استحبابی اور ہر طرح کی برائی کا ازالہ ہے چاہے وہ حرام ہو یا مکروہ، ان میں سے کچھ حقوق فرض عین کی حیثیت رکھتے ہیں، کچھ فرض کفایہ کی، کچھ سنت عین اور کچھ سنت کفایہ کی۔ ان تمام چیزوں کی دلیل اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"و تعاونو على البر التقوىٰ و لا تعاونوا على الاثم و العدوان" (سورۂ مائدہ: ۲)

اس میں کوئی شک نہیں کہ دور حاضر میں، بیمہ یا تحفظ کے متعدد طریقے ہیں جن کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ انسان اپنے اوپر آنے والی مصیبت یا خسارہ سے محفوظ ہو جائے، مثلاً یہ کہ تجارت میں گھاٹا اس کو مفلس نہ بنا دے، خاندان کے افراد اس بات سے مامون ہو جائیں کہ ان کے سرپرست کی موت کی وجہ سے وہ اتنا نادار نہیں ہو جائیں گے کہ انہیں لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلانا پڑے گا۔ اسی طرح ایک انسان کو اس بات کا اطمینان ہو جائے کہ وہ تھوڑی سی مشقت اٹھا کر اپنی بیماری کا علاج کروا سکے گا۔

پچھلی صدی میں لوگوں کے سامنے متعدد طریقے ابھر کر سامنے آئے، تاکہ ان کے ذریعہ اس طرح کے تحفظ (بیمہ) کا وجود ممکن ہو سکے۔ ان میں سے بعض بہت ہی اہم ہیں جن کا ذکر ذیل میں کیا جا رہا ہے:

۱- چھوٹی تعاونی بیمہ کمپنیاں: ان کی ایک واضح شکل یہ ہے کہ لوگوں کی ایک چھوٹی سی جماعت ممکنہ خطرات کی تلافی میں تعاون کرنے پر اتفاق کرتی ہے، چنانچہ ان میں سے ہر آدمی ہر مہینہ اپنے مال میں سے طے شدہ رقم جمع کرتا ہے جو اسے خسارہ یا خطرہ لاحق نہ ہونے کی صورت میں واپس نہیں ملتی۔ اگر ان

میں سے کسی کو خطرہ لاحق ہوجاتا ہے تو وہ اپنے خسارہ کی تلافی کے لئے اس مجموعی مال سے روپیہ لینے کا مستحق قرار پاتا ہے، ان چھوٹی تعاونی بیمہ کمپنیوں میں تعاون علی البر اچھی طرح سے نمایاں ہوتا ہے۔ اگرچہ ان کمپنیوں کی سرگرمیوں میں اعلیٰ پیمانہ پر غرر یا جہالت موجود ہے، لیکن یہ جہالت تنازع کا سبب نہیں ہے، ایسا غرر ہے جو ان شاء اللہ قابل معافی ہوگا، لیکن بیمہ کی اس قسم کا فائدہ بہت ہی محدود ہے، اس لئے کہ مجموعی مال جس کو آپس میں تعاون کرنے والے دیتے ہیں، کبھی کبھی ایک ہی آدمی کے خسارہ کی تلافی میں ختم ہوجاتا ہے اور باقی لوگوں کے پاس مستقبل میں پیش آنے والے ممکنہ خطرات سے نمٹنے کے لئے کوئی محفوظ سرمایہ نہیں ہوتا ہے۔

۲- بڑی تعاونی بیمہ کمپنیاں: یہ کمپنیاں مذکورہ بالا کمپنیوں کے مشابہ ہوتی ہیں، فرق اتنا ہے کہ ان میں آپس میں مدد کرنے والوں کی تعداد زیادہ ہوتی ہے، اس کے دو فائدے ہیں (۱) جو مال بھی ہوتا ہے بڑی مقدار میں ہوتا ہے، (۲) اس کی وجہ سے بیمہ کمپنیاں بڑی تعداد کے زمرے میں داخل ہوجاتی ہیں اور احتمالات کے تخمینہ میں بڑی تعداد کی شان ہی کچھ الگ ہوتی ہے، اس لئے کہ اس میں خطرہ پیش آنے کا احتمال ظنی ہوتا ہے جس میں شک کا پہلو غالب ہوتا ہے، بہرحال بڑی تعداد میں شک دھیرے دھیرے ختم ہوتے ہوتے تقریباً معدوم ہوجاتا ہے اور خسارہ ایک حد تک یقینی شکل اختیار کرلیتا ہے جس کا حساب لگانا آسان ہوجاتا ہے، ہم اس قول کی توضیح کے لئے ایک مثال پیش کریں گے۔ مان لیجئے کہ کسی تجارتی کام میں ایک شخص کے حوالہ سے خسارہ کے پیش آنے کا احتمال بیس فیصد ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس بات کا امکان ہے کہ وہ خسارہ اٹھائے گا (اب ہوسکتا ہے کہ یہ احتمال سو فیصد ثابت ہوجائے) اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ کبھی خسارہ ہی نہ اٹھائے تو ایسی صورت میں احتمال زیرو فیصد ہوجاتا ہے، لیکن جب اس کام کو کرنے والے آدمی ایک ہزار ہوں تو خسارہ کے پیش آنے کا تخمینی احتمال جو کہ بیس فیصد ہے حتمی یا تقریباً قطعی ثابت ہوتا ہے، لہٰذا وہ خسارہ جو مجموع پر واقع ہوتا ہے اس کے وقوع کا احتمال تاکیدی یا تقریباً مؤکد ہوجاتا ہے، اگرچہ اس خسارہ کا تحقق بعینہ ایک ایک شخص کے حوالہ سے ظنی شکل میں باقی رہتا ہے، اسی وجہ سے غرر یا جہالت کا شبہ کم ہوتا رہتا ہے، یا تقریباً ختم ہوجاتا ہے، اگر اس میں کچھ غرر باقی بھی رہ جائے تو وہ غرر ان شاء اللہ معفو عنہ ہے، اس لئے کہ بڑی تعاونی بیمہ کمپنی ایک مخصوص سال میں درپیش ہونے والے خسارہ کا اندازہ لگاسکتی ہے جو کہ یقین کے مشابہ ہے، لہٰذا وہ ان قسطوں کی تعیین کرسکتی ہے، جنہیں ہر ایک پالیسی ہولڈر کو خسارہ کے واقع ہونے کی صورت میں خسارہ کی تلافی کے لئے ادا کرنی چاہئے، ٹھیک ویسے ہی جیسے ہر ایک تعاون کرنے والا اپنے اختیار سے جو کچھ ادا کرتا ہے اسے شروع ہی سے یقین ہوتا ہے کہ وہ اتنی مقدار میں گھاٹا اٹھائے گا۔

یہاں یہ بات قابلِ غور ہے کہ کس طرح کی بڑی تعاونی بیمہ کمپنیاں اتنا بڑا انتظام، اتنی بڑی رقوم پر دفتری کارروائیاں، قسطوں کی وصولی اور رقوم کی ادائیگی کا کام محض رضا کارانہ طور پر انجام نہیں دے سکتی ہیں، ان تمام کاموں کو کرنے کے لئے کمپنیوں میں تنخواہ دے کر کچھ ملازمین کو رکھنے کی ضرورت پڑتی ہے۔ یہ ملازمین زکاۃ وصول کرنے والے عاملین کی طرح ہیں جو بڑی بیمہ کمپنی کے خزانہ سے اپنی تنخواہ و مشاہرہ وغیرہ کا مطالبہ کرتے ہیں، اسی طرح اسی خزانہ سے تمام مشترک اخراجات نکالے جاتے ہیں۔

۳- بیمہ کمپنیاں: کبھی ایسا ہوتا ہے کہ بڑی تعاونی کمپنی کی مجموعی رقوم اتنی نہیں ہوتیں کہ وہ کمپنی کے ممکنہ خطرہ یا خسارہ کی تلافی کرسکیں تو یہاں ایک دوسری پارٹی (یہ دوسری پارٹی ایک حکومت یا ایک فرد یا ایک جماعت بھی ہوسکتی ہے) اس تعاونی کمپنی میں ایک مقررہ رقم دے کر شریک ہوجاتی ہے، بسا اوقات اس پارٹی کی دی ہوئی رقم پہلے جمع کرنے والے لوگوں کی مجموعی رقم سے زیادہ ہوتی ہے۔ یہ دوسری پارٹی کمپنی کے گھاٹے میں شامل ہوتی ہے، اسی طرح ملازمین اور کمپنی کے تمام دیگر اخراجات نیز خسارہ لاحق ہونے کی صورت میں معاوضہ کی ادائیگی کے بعد اگر کمپنی کو نفع ہوتا ہے تو وہ اس میں شریک ہوتی ہے، اسی وجہ سے یہ دوسری پارٹی پہلی پارٹی کے ساتھ مل کر ایک ایسی کمپنی تشکیل دیتی ہے جو دیگر کمپنیوں سے الگ نہیں ہے، لہٰذا اس کمپنی میں غرر یا جہالت کا پہلو کمزور یا معدوم ہوجاتا ہے بڑی تعداد کے قانون کی بدولت جس کا ہم نے ابھی ابھی بڑی تعاونی بیمہ کمپنیوں کے بحث میں ذکر کیا ہے، یہ ایسی کمپنی بن جاتی ہے جس میں قمار بازی یا سٹہ بازی کا شبہ ختم ہوجاتا ہے، اس لئے کہ اس میں کسی بے بنیاد خطرہ یا خسارہ کو فرض نہیں کیا جاتا ہے جیسے کہ قمار بازی یا سٹہ بازی میں ہوتا ہے۔

۴- سوشل اور پنشن بیمہ کمپنیاں: اس طرح کی کمپنیوں کا مقصد ملازمین یا کارکنان یا ان جیسے لوگوں کو مستقبل کے کسی ممکنہ خطرہ کے احتمال سے جو یقینی بھی ہوسکتا ہے، تحفظ فراہم کرنا ہوتا ہے جیسے عمر کی ایک متعین منزل میں پہنچنے پر تنخواہیں بند ہوسکتی ہیں یا کام کاج وغیرہ چھوڑ دینے کی صورت میں پریشانی لاحق ہوسکتی ہے، اس طرح کی بیمہ کمپنیوں میں قسطوں کا کچھ حصہ ملازمین یا کارکنان یا ان جیسے جو لوگ ہیں وہ جمع کرتے ہیں جبکہ دوسری طرف کچھ قسطیں حکومت یا

کام کرانے والے یا جوان کے حکم میں ہیں وہ ادا کرتے ہیں۔ لہٰذا ایک پارٹی تو یہاں ملازمین اور کارکنان کی ہوتی ہے اور دوسری پارٹی حکومت یا کام کرانے والوں کی ہوتی ہے جو اس طرح کی بیمہ کمپنیوں کی مجموعی مالیات میں اپنی مقررہ رقم جمع کرتی ہے، پھر اس مجموعی مال یا رقم سے کمپنی میں کام کرنے والے کی تنخواہ اور کمپنی کے دیگر اخراجات نکالے جاتے ہیں اور چونکہ حکومت ان کمپنیوں سے براہ راست نفع حاصل نہیں کرتی ہے اس لئے تمام حکومتیں یہاں تک کہ جو ترقی یافتہ بھی ہیں عام طور پر اس مجموعی رقم میں سے کچھ رقم قرض لیتی ہیں جو بسا اوقات ان کے عام بجٹوں کو تقویت پہنچانے کے لئے کافی مددگار ثابت ہوتی ہیں۔ لہٰذا یہ بالواسطہ طور پر نفع ہے جس کو حکومت کمپنی میں شریک ہونے کے بدلے لیتی ہے اور اس وجہ سے یہ کمپنیاں بیمہ کمپنیوں کے بہت زیادہ قریب نظر آتی ہیں۔

میڈیکل انشورنس (صحت کا بیمہ):

آج صحت وتندرستی کا اعتبار انسانی حقوق میں ہوتا ہے، لیکن صرف صحت وتندرستی کی اہمیت ومقام کا اعتراف کافی نہیں بلکہ اس کو عملی طور پر نافذ بھی کرنا ہوگا اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب ہر ہر شہر میں ایسا نظام بنایا جائے جس کے تحت ہر شہری کو بلا کسی امتیاز وتفریق کے تحفظ صحت کا حق ملے۔

عہد اسلامی میں نادار لوگوں کے علاج کی ذمہ داری بیت المال کی ہوتی تھی یعنی زکوۃ وغیرہ سے یہ ضرورت پوری ہوتی تھی، جیسا کہ حدیث میں بھی آتا ہے کہ اسلامی حکومت بیت المال سے حفاظت صحت پر بھی خرچ کرتی تھی جو کہ علاج سے اہم ہے، اس کی دلیل وہ روایت ہے جس میں آتا ہے کہ حکومت تمام بچوں کی رضاعت اور بہترین غذا کے اخراجات بیت المال سے پورا کرتی تھی، ان میں اٹھائے ہوئے بچے بھی شامل ہیں۔

صحتی خدمات کے ضمن میں یہ تین مبادی بڑی اہمیت کے حامل ہیں:

۱- وسائل حفظان صحت کی فراہمی میں عدل ومساوات کی ضمانت کا لازمی طور پر لحاظ رکھنا۔

۲- صحتی خدمات کی عمدگی کی ضمانت۔

۳- حفظان صحت کے اداروں سے زیادہ حفاظتی اقدامات کا اہتمام۔

ان اصولوں کی روشنی میں ہیلتھ سروس میں سرمایہ کاری کی مندرجہ ذیل شکلیں ہوسکتی ہیں:

۱- مریض ہیلتھ سروس کا خرچ براہ راست خود ادا کرے یا یہ کہ حکومت خود اس صرفہ کی ذمہ داری لے اور سرکاری خزانہ سے اس مقصد کے لئے لازمی سرمایہ پیش کرے (اس لئے کہ سرکار براہ راست یا بالواسطہ طور سے مختلف قسم کے ٹیکس کے ذریعہ اپنے سرمائے اکٹھا کرتی ہے) اس طرح سوشل انشورنس کمپنی کی بدولت ہیلتھ سروس کے اخراجات حاصل کئے جاسکتے ہیں، نیز سرمایہ کا حصول میڈیکل انشورنس کے ذریعہ بھی ہوسکتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ:

☆ پہلی صورت جس میں مریض اپنی جانب سے براہ راست ڈاکٹر، ڈینٹسٹ، سرجن، دواساز، ایکسرے اسپیشلسٹ یا اسپتال کو فیس ادا کرتا ہے، کے علاوہ بقیہ تمام صورتوں میں جس میں مرض یا معذوری کے تمام ممکنہ خطرات کے پیش نظر لوگ اجتماعی شکل میں بیمہ کراتے ہیں اور نقصانات کی تلافی میں برابر کے حصہ دار ہوتے ہیں، اس طور پر کہ مریض کو ہمیشہ اس کی بیماری میں صرف ہونے والے اخراجات سے کم ادا کرنا پڑتا ہے، ان تمام طریقوں میں تعاون کا کوئی نہ کوئی عنصر موجود ہوتا ہے، اس لئے کہ جو لوگ براہ راست یا بالواسطہ طور پر حکومت کے ٹیکس یا سوشل انشورنس کی قسطیں یا اسپیشل میڈیکل انشورنس کی قسطیں ادا کرتے ہیں وہ معاشی اعتبار سے برابر نہیں ہوتے، اس لئے کہ جن کو اللہ نے دولت وثروت سے نوازا ہے یا جن کو اللہ نے صحت وتندرستی عطا کی ہے یا جنہیں یہ دونوں نعمتیں دی گئی ہیں وہ تنگ دست اور غیر صحت مند لوگوں کی مدد کرتے ہیں۔

۲- ایک بڑی کمپنی یا ادارہ اپنے ملازمین کی صحت کے تحفظ کے لئے ایک مستقل حفاظتی فنڈ قائم کرے۔

جہاں تک اسپیشل میڈیکل انشورنس (جس کو بعض لوگ تجارتی بیمہ بھی کہتے ہیں) کی بات ہے تو یہ مخصوص کمپنیوں کے بیمہ کی ایک قسم ہے جو حفظانِ صحت کے اخراجات کے لئے مخصوص ہوتی ہے، اس میں لوگ بیماری کے لاحق ہونے کے تخمینی احتمالات کے تناسب سے روپیہ ادا کرتے ہیں جیسے نشہ آور چیزوں کا استعمال کرنے والے، عمر دراز اور اسی طرح دائمی بیماری کے شکار جنہیں مرض کے لاحق ہونے کا زیادہ خطرہ ہوتا ہے، ایسے لوگوں کو ان لوگوں کے مقابلے میں زیادہ

روپیہ ادا کرنا پڑتا ہے جنہیں امراض لاحق ہونے کا احتمال کم ہوتا ہے جیسے نوجوان اور نشہ آور چیزوں کا استعمال نہ کرنے والے لوگ۔

بہر حال ہیلتھ سروس کی فراہمی کے بدلے بیمہ کمپنی کی مدد سے فائدہ اٹھانے والے لوگ مندرجہ ذیل طریقے سے ادائیگی کرتے ہیں:

پہلی صورت یہ ہے کہ آدمی خدمت صحت کے بدلے ڈاکٹر، اسپتال دوا ساز وغیرہ کو کچھ دے اور نہ بیمہ کمپنی کو کچھ ادا کرے اور جو ادائیگی بھی اس کی طرف سے ہو وہ محض بیمہ کی قسطوں تک محدود ہو۔

دوسری صورت یہ ہے کہ ہیلتھ سروس کے بدلے مریض ہیلتھ سروس انجام دینے والوں کو ایک چھوٹی سی رقم کٹوتی کر کے دے دے اور بقیہ رقم بیمہ کمپنی کو ادا کردے۔

تیسری صورت یہ ہے کہ مریض ہیلتھ سروس کے بدلے کل اخراجات کے فیصدی تناسب سے ہیلتھ سروس پیش کرنے والوں کو دے اور بقیہ بیمہ کمپنیوں کو دے دے، ان تمام حالات میں بیمہ کمپنی جو کچھ ادا کرتی ہے وہ متعین بھی ہوسکتا ہے اور غیر متعین بھی۔

اسی طرح بیمہ کمپنیوں کے خدمات کی فراہمی کی صورتیں درج ذیل ہیں:

۱- یہ کہ مریض اپنے تمام اخراجات خدمت گذار کو ادا کردے اور پھر بیمہ کمپنیوں سے یہ پورے کے پورے اخراجات یا فیصدی تناسب سے وصول کرلے۔

۲- یہ کہ مریض ہیلتھ سروس کرنے والے کو فیصدی تناسب سے کٹوتی کی ہوئی رقم کے علاوہ کچھ بھی نہ دے اور ہیلتھ سروس کرنے والے اپنی سروس کے اخراجات کی ادائیگی کے لئے بیمہ کمپنیوں کے پاس اخراجات کا بل بھیج دیں۔

۳- یہ کہ مریض ہیلتھ سروس کرنے والوں کو کچھ بھی نہ دے اور بیمہ کمپنی اپنی جانب سے ہیلتھ سروس کے آدمیوں کو تنخواہ یا معاوضہ ہیلتھ سروس سے فائدہ اٹھانے والوں کی تعداد کے تناسب سے دے یا متعین رقم کی صورت میں ادا کرے۔

ان تفصیلات کی روشنی میں سوالنامہ کا جواب یہ ہے:

۱- ہر ایک انسان اپنی صحت کی حفاظت کرنے کا حریص ہوتا ہے اور وہ تمام وسائل وذرائع اپناتا ہے جن کی بدولت وہ بیماری سے محفوظ رہ سکے، اس کی مشروعیت میں کسی کو اختلاف بھی نہیں ہوگا۔

۲- اس بات میں کسی کا کوئی اختلاف نہیں کہ مریض طبی خدمات پیش کرنے والے کو وہ فیس ادا کرسکتا ہے جس فیس پر بالفعل ان دونوں کے درمیان اتفاق ہوا ہو یا حکماً (مثلاً اس طرح کہ ایک ریٹ معروف ومشہور ہو) طبی خدمت پیش کرنے والے سے مراد طبیب، نرس، ڈنٹسٹ، دوا ساز، اسپتال، ایکسرے کرنے والا یا ہر وہ شخص ہے جو کسی بھی طرح کا حفظان صحت کا کام کرتا ہو۔

۳- مریض فیس کی ادائیگی کے لئے طبی خدمت پیش کرنے والے سے شفایابی کی شرط لگا سکتا ہے۔ یہ جعالہ کی ایک قسم ہے جس کو امام مالکؒ اور امام احمد بن حنبلؒ نے متعین ہونے کی صورت میں جائز قرار دیا ہے۔ ان لوگوں نے اللہ تعالیٰ کے قول "ولمن جاء به حمل بعير و أنا به زعيم" (سورۂ یوسف: ۷۲) سے استدلال کیا ہے۔

۴- کسی متعین طبیب یا اسپتال، اسی طرح کسی متعین علاجی ادارہ کے ساتھ ایک متعینہ مدت کے دوران مخصوص رقم کے بدلے کوئی ادارہ اپنے ملازمین کے علاج کے لئے جن کی تعداد متعین ہو، معاہدہ کرسکتا ہے، ایسی صورت میں علاج کے لئے ضروری دوا تشخیص اور دیگر علاجی لوازمات کی فراہمی کا التزام اسپتال کرے گا، ان مستلزمات وضروریات کے مجہول ہونے کی وجہ سے عقد کی تنفیذ میں کوئی رکاوٹ نہیں پیدا ہوگی۔

حنفیہ نے اسی پر قیاس کرتے ہوئے عام وکالت کو جائز قرار دیا ہے ٹھیک ایسے ہی جیسے انہوں نے مستقبل میں ثابت ہونے والے حقوق کی کفالت کو جائز قرار دیا ہے، فقہاء نے ضرورت کے پیش نظر دایہ کو بشمول کھانے، پینے اور لباس کے اجرت پر رکھنے کو جائز قرار دیا ہے باوجودیکہ دونوں جانب غرر وجہالت کا وجود ہوتا ہے، اس لئے کہ دودھ کی مقدار نیز دوران رضاعت کھانے اور پینے کی مقدار بھی نامعلوم ہوتی ہے، اسی طرح کھانا اور لباس اور ان دونوں کی نوعیت بھی مجہول ہوتی ہے۔

۵- مذکورہ تمام عقود میں کوئی ایسی جہالت موجود نہیں جو عقد کو فسخ کردے، مزید اس طرح کے بیمہ کی ضرورت بھی ہے۔

ابن قدامہؒ نے "المغنی" میں جعالہ کی تائید میں کتاب اللہ اور سنت رسولؐ کی نصوص ذکر کرنے کے بعد لکھا ہے کہ ضرورت اس کا (عقد جعالہ کا) تقاضا کرتی ہے، لہٰذا عمل کے تحقق کے نامعلوم ہونے کے باوجود جعل (مزدوری) کے مباح ہونے کا ضرورت تقاضا کرتی ہے۔

امام ابن تیمیہؒ نے "القواعد النورانیہ" میں ذکر کیا ہے کہ ہر اس چیز میں غرر معاف ہے جس کا دارومدار حاجت وضرورت پر ہو یا جس میں غرر کم ہو، چنانچہ ان کی عبارت کا مفہوم یہ ہے کہ مالک احمد وغیرہ ائمہؒ کے قول سے ایسے معاملات کے جواز کی صراحت ملتی ہے۔ اکثر سلف صالحین کا یہی مسلک ہے، ایسا نہ کرنے سے انسان کی معاشی زندگی غیر متوازن ہوجائے گی اور ہر وہ شخص جو غرر کو حرام سمجھنے میں غلو سے کام لیتا ہے، ایسی حالت میں وہ یا تو اپنے اس مسلک سے خروج کرتا ہے جس کی وہ تقلید کرتا ہے یا یہ کہ اس کے بارے میں کوئی حیلہ یا بہانہ کرتا ہے پھر امام ابن تیمیہؒ نے یہ ذکر کیا ہے کہ بیع میں غرر کی علت دشمنی اور بغض وعداوت پیدا ہونے کا گمان ہے، نیز ناحق طریقے سے اموال کو کھا جانا بھی بیع میں غرر کی علت ہے، لہٰذا اگر کوئی مصلحت اس مفسدہ کے بالمقابل آجاتی ہے تو پھر مصلحت کو مقدم کیا جائے گا۔

۶- جائز بلکہ مستحب ہے کہ لوگوں کی ایک جماعت دفع مرض کے لیے باہم ایک دوسرے کا تعاون کرے اور طبی اخراجات میں لوگ ایک دوسرے کے شریک ہوں، مثلاً وہ مل کر ایک کمپنی قائم کریں جس میں اپنی مرضی سے ایک مقررہ رقم بیمہ کی قسطوں کی شکل میں ادا کریں اور اس مشترکہ فنڈ سے تمام لوگوں کی مرضی سے علاج کے محتاج شخص کے اخراجات کے لئے رقم لی جائے۔

۷- اس فنڈ کے سرمایہ کو حلال طریقہ سے بڑھانے میں کوئی حرج نہیں ہے، کیونکہ اس کی وجہ سے زیادہ بہتر طریقہ سے لوگ اس فنڈ سے مستفید ہوسکیں گے، نیز بسا اوقات قسطوں کی ادائیگی کے لئے مقررہ رقم میں اسی کی بدولت تخفیف بھی کی جاسکتی ہے۔

۸- کمپنی کو تعاون دینے والوں کی تعداد کا زیادہ ہونا زیادہ بہتر ہے، کیونکہ اس سے فنڈ میں اطمینان بخش سرمایہ ہوگا نیز بڑی تعداد کے قانون کی وجہ سے مرض کے پیش آنے کا احتمال متحقق ہوگا۔ جہالت وعدم علم کا صفایا ہوگا، ایسے ادارہ کے نظم ونسق اور انتظام وانصرام کے لئے ملازمین کی تقرری میں کوئی حرج نہیں ہے۔ نہ حلال طریقے سے مال میں اضافہ کرنے میں کوئی حرج ہے اور نہ کمپنی کے علاجی اداروں وغیرہ سے معاملہ کرنے میں کوئی حرج ہے، نیز ایسے ملازمین کی تنخواہ وغیرہ اگر کمپنی کے فنڈ سے لی جائے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔

۹- میڈیکل انشورنس کے تمام ادارے جن میں اسپیشل بیمہ کمپنیاں بھی شامل ہیں، کو کامیاب بنانے کے لئے حکومت کو ایک اہم رول ادا کرنا چاہئے جیسے جو لوگ قسطوں کی ادائیگی نہیں کرسکتے ان کی قسطوں کو ادا کرنا، اسی طرح بیمہ کے پروگرام کی کامیابی کی ضمانت کے لئے حکومت کو نگرانی اور منصوبہ بندی کا کردار نبھانا چاہئے۔ یہ بھی مناسب ہوگا کہ حکومت کم سے کم خرچ میں عمدہ سے عمدہ ہیلتھ سروس کی فراہمی کے لئے خاص بیمہ کمپنیاں قائم کرے جو دیگر کمپنیوں سے خدمات فراہم کرنے میں مقابلہ کریں، اسی طرح سے حکومت اسپیشل بیمہ کمپنیوں کے اوپر ان کی آمدنی کا کچھ حصہ دوا سازی، جدید آلات کی تفتیش اور علمی تحقیق کے لئے لازم کرے۔

۱۰- حکومت غیر مستطیع جیسے ریٹائرڈ، معذور اور سماجی امداد کے محتاج افراد کی قسطوں کی ادائیگی (زکاۃ اور سماجی امور کی وزارتوں کے فنڈ یا خیراتی ادارے سے) کرے۔

اسی طرح قیدیوں اور طلباء کے قسطوں کی ادائیگی زکاۃ یا سماجی امداد کے فنڈ سے کرے، اور انہیں میڈیکل کارڈ فراہم کرے تاکہ ضرورت پڑنے پر وہ لوگ مفت حفظان صحت کے لئے بیمہ کمپنی کو وکارڈ پیش کرسکیں، اسی طرح سے جو لوگ کلی طور پر اپنی قسطوں کو ادا نہیں کرسکتے جیسے کسان، مختلف قسم کے پیشوں سے وابستہ افراد اور چھوٹی آمدنی والے لوگ ان کی مدد کرے، حکومت ان کی قسطوں کو ایک خاص نظام کے تحت ادا کرے۔

☆☆☆

تیسرا باب / تفصیلی مقالات

میڈیکل انشورنس (صحت بیمہ) کا حکم

مولانا زبیر احمد قاسمی[1]

۱- میڈیکل انشورنس جس میں ہر ممبر ایک خاص مقدار میں سال بھر کے لئے رقم جمع کرتا ہے، اس شرط کے ساتھ کہ اگر سال کے اندر بیمار ہوا تو جمع کردہ رقم کے ساتھ مزید ایک خاص حد تک اضافہ شدہ رقم کے مجموعہ سے علاج ہوگا، ورنہ یہ جمع کردہ رقم بھی سوخت ہو جائے گی۔

یہ معاملہ بنیادی طور پر سود، قمار، غرر بلکہ ظلم تک پر مشتمل ہے، اس لئے اس کی اجازت ہرگز نہیں دی جاسکتی، زائد از جمع کردہ رقم سے استفادہ ربا ہے تو مجہول العاقبہ ہونے اور معلق علی الامر المتردد ہونے کے سبب غرر و قمار ہے اور جمع کردہ رقم کے عدم واپسی کی شرط کے سبب ایک ظلم ہے، ظاہر ہے ان تمام امور ممنوعہ کے باوجود اس انشورنس کو کیسے جائز کہا جاسکتا ہے۔

بلکہ اگر جمع کردہ رقم کی واپسی بھی مشروط ہوئی تب بھی یہ معاملہ ناجائز ہی ہوتا، کیونکہ بیمار ہونے کی صورت میں جو قدر زائد سے استفادہ ہوگا وہ بہرحال سود ہی ہوگا، اسے کمپنی کی طرف سے تبرع و امداد نہیں کہا جاسکتا، تبرع و تعاون لازم و مشروط نہیں ہوتا، جبکہ یہاں علاج از زائد لازم و مشروط ہوتا ہے۔

۲- جمع کردہ رقم سے زائد مالیت سے استفادہ و علاج شرعاً سود و ربا ہی کہلائے گا "وھو ظاھر جدا، وورود النصوص الصریحة"۔

۳- انشورنس کے ادارے، خواہ سرکاری ہوں یا نجی، دونوں کا حکم ایک ہی ہوگا، سرکار کی طرف سے بھی اسے تعاون و تبرع کہنا مشکل ہے، تبرع و تعاون مشروط نہیں ہوتا، اور سرکاری تبرع و تعاون سے استفادہ میں پوری رعایت یکساں طور پر ایک درجہ میں ہوتی ہے جبکہ یہاں سرکار کے اس ظاہری تعاون سے خاص شرط کے ساتھ خاص ہی افراد مستفید ہو سکتے ہیں، جو تعاون و تبرع کی اصل حقیقت کے بھی منافی ہے اور سرکار کی ذمہ داریوں سے بھی میل نہیں کھاتا۔

۴- سرکاری انشورنس ادارہ جو علاج کی ضرورت پر جمع کردہ رقم سے زائد مقدار علاج پر خرچ کرتا ہے اسے تعاون سرکار نہیں کہا جاسکتا، جیسے کہ اوپر سوال نمبر ۳ کے ذیل میں یک گونہ مفصل عرض کر دیا گیا ہے۔

۵- ایک رفاہی اور تعاونی ادارہ و انجمن کی تشکیل کی جائے اور اس کے سارے ممبران و شرکاء اپنی اپنی استطاعت و سہولت کے بقدر محض تبرعاً اور محتاجوں کے ہر طرح کے تعاون کی نیت سے جمع کریں اور ضابطہ یہ طے ہو جائے کہ سارے شرکاء و نامزد ممبران ہر ماہ یا ہر سال، اپنی رضا سے اور اپنی استطاعت و گنجائش کے مطابق جتنی رقم چاہیں جمع کریں اور اس جمع شدہ رقم سے ہر ایک محتاج و ضرورت مند کا خواہ وہ شریک و نامزد ہوں یا نہ ہوں روپے جمع کرتے رہے ہوں یا نہ، ہر ایک کا جب وہ تعاون و مدد کے حاجت مند ہوں تو تعاون ہر قسم کا بشمول علاج کیا جائے، اور جمیع شرکاء و ممبران کی طرف سے صراحۃ یا دلالۃ اس کی اجازت ہو کہ ہماری یہ رقم بطور صدقہ نافلہ ایک تبرع کے طور پر جمع ہے، اسے ہم کو کبھی واپس نہیں لینا ہے، بلکہ ہر محتاج کی مدد و اعانت کے لئے جمع کر رہے ہیں تو یہ صورت بے غل و غش شرعاً جائز ہوگی اور ایک عظیم خدمت خلق و ملت ہوگی۔

---

[1] مدرسہ اشرف العلوم کنہواں، سیتامڑھی بہار

اے کاش کہ قوم مسلم خصوصاً ارباب مال خدمت خلق کے اس مخلصانہ جذبات کے حامل ہو جائیں اور اس طرح کی تشکیل دادہ انجمن و کمیٹی کے جو ذمہ دار بنائے جائیں ان کی امانت ودیانت لائق صدر شک بھی ہو جائے تو

مشکلے نیست کہ آسان نشود

۶- جن ممالک میں میڈیکل انشورنس وہاں کے شہریوں، یا وہاں جانے والوں کے لئے قانوناً لازم کردیا جائے تو شہریوں کے لئے تو بدرجہ مجبوری اس انشورنس کی اجازت ہوگی، مگر اس شرط کے ساتھ کہ وہ اپنی جمع کردہ رقم سے زائد قدر سے ہرگز مستفید نہ ہوں اور وہاں جانے والے اگر کسی ناگزیر ضرورت کے تحت اس ملک میں جانے پر مجبور ہو جائیں تو ایک حاجت کے تحقق کی بنا پر ''الحرج مدفوع بالشرع'' کے تحت ان کو میڈیکل انشورنس کرانے کی اجازت تو دی جاسکتی ہے، مگر استفادہ بس اپنی جمع کردہ رقم ہی سے کر سکتے ہیں۔

☆☆☆

صحت بیمہ کے احکام

مولانا خورشید احمد اعظمی [1]

۱- میڈیکل انشورنس (صحت بیمہ) کرانے کا حکم:

انشورنس یا بیمہ، جس کا طریقہ کار یہ ہے کہ ایک شخص اس خیال سے کہ اسے جان، مال، یا صحت کا خطرہ درپیش ہے، اس کی تلافی کے لئے کسی فرد یا کمپنی کے ساتھ معاہدہ کرتا ہے، یا کوئی کمپنی، لوگوں کے ساتھ اس قسم کا معاہدہ کرتی ہے کہ وہ شخص یکمشت یا قسط وار ایک سال میں (مخصوص مدت میں) ایک مخصوص رقم فرد یا کمپنی کو ادا کرے، اور اس مدت مخصوص میں اسے جان، مال صحت یا جس کا بھی بیمہ مقصود ہے وہ خطرہ پیش آ گیا تو وہ فرد یا کمپنی ایک متعینہ رقم جو جمع کردہ رقم سے کئی گنا زائد ہوتی ہے، اس شخص کو ادا کرنے کی ذمہ دار ہوگی۔

اور اگر مدت مخصوصہ میں وہ خطرہ پیش نہیں آیا تو وہ جمع کردہ رقم فرد یا کمپنی کی ہوگی، اور وہ شخص اس رقم کو واپس نہیں لے سکے گا یا بیمہ کرانے والا شخص، وہ مخصوص رقم پوری جمع نہیں کر سکا، تو ایک، دو قسطیں جو وہ جمع کر چکا ہے وہ رقم بھی فرد یا کمپنی کی ہوجائے گی اور جمع کرنے والے کو واپس نہیں ملے گی اور نہ وہ متعینہ رقم کو پانے کا مستحق ہوگا (اگر اسے حادثہ پیش آجائے)۔

معاملہ کی مذکورہ صورت یا انشورنس متعدد شرعی خرابیوں کو متضمن معلوم ہوتا ہے۔

۱- اس میں ''میسر'' اور ''قمار'' کی صورت پائی جاتی ہے کہ متعاقدین میں سے ایک شخص بلا مقابل خسارہ کا شکار ہوتا ہے، موہومہ خطرہ پیش نہ آنے کی صورت میں رقم جمع کرنے والا اپنی پوری رقم سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے اور خطرہ پیش آنے کی صورت میں کمپنی ایک بڑی رقم کے خسارہ سے دوچار ہوتی ہے۔

۲- بیمہ یا انشورنس غرر کو مشتمل ہے، اس لئے کہ یہ معاملہ ایک امکانی خطرہ کے پیش نظر طے پاتا ہے جو موہوم ہے معدوم کی قبیل سے ہے، اور ایسے معاملات جو غرر کو مشتمل ہوں، شریعت میں ممنوع ہیں، بیع کی متعدد صورتیں محض اس لئے ناجائز ہیں کہ وہ غرر پر مشتمل ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صریح الفاظ میں بیع غرر سے منع کیا ہے:

''نهى رسول الله صلى الله عليه وسلم عن بيع الحصاة وعن بيع الغرر'' (صحیح مسلم)۔

جس خطرہ کی تلافی کے لئے رقم جمع کی گئی ہے نہیں معلوم وہ خطرہ پیش آئے گا بھی یا نہیں۔

۳- بیمہ پالیسی ''التزام ما لا یلزم'' کو متضمن ہے، یعنی بیمہ کرانے والے کو جو خطرہ پیش آتا ہے یا جو بیماری لاحق ہوتی ہے اس میں بیمہ کمپنی کا کوئی دخل نہیں ہوتا، اس لئے اس کا ضمان، تاوان یا ذمہ داری شرعی طور پر اس پر لازم نہیں ہوتی، اس لئے اس سے لینا جائز نہیں ہوگا۔

۴- بیمہ پالیسی سود اور ربا کو بھی متضمن ہے، اس لئے کہ جو رقم جمع کی جاتی ہے حادثہ پیش آنے کی صورت میں اس سے زائد کی ادائیگی یا زیادہ مالیت کے علاج کا معاہدہ ہوتا ہے اور یہ قرض کے ساتھ مشروط منفعت کی صورت ہے۔

''وكل قرض جر نفعًا حرام أي إذا كان مشروطًا'' (شامی ۷/ ۳۹۵)۔

۵- نیز بیمہ پالیسی یا انشورنس کو اگر کفالت یا باہمی تعاون کا نام دیا جائے، تو کفالت یا باہمی تعاون چونکہ تبرع محض ہے جس پر اجرت لینا جائز یا مستحسن نہیں ہے۔

---

[1] المکتب العلمی، رگھوناتھ پورہ مئو

۲- صحت بیمہ میں زائد رقم سے استفادہ کا حکم؟

صحت بیمہ کرانے والا جو رقم بیمہ کمپنی میں جمع کرتا ہے، وہ رقم ودیعت یا امانت نہیں ہوتی، اس لئے کہ رقم جمع کرنے والا جانتا ہے کہ وہ رقم بجز ایک صورت کے کہ دوران مدت اسے حادثہ پیش آجائے، واپس نہیں ملنے والی اور یہ مضاربت کے طور پر بھی بیمہ کمپنی کو نہیں دی گئی ہے، اس لئے کہ بیمہ کرانے والا بیمہ کمپنی کی تجارتوں میں شریک نہیں ہوتا اور نہ ان کے نفع ونقصان میں شریک ہوتا ہے۔

بلکہ اس کا رقم جمع کرنا ایک جوا، اور قمار کے طور پر ہوتا ہے کہ حادثہ پیش آگیا تو اس سے زیادہ رقم ہاتھ آجائے گی، ورنہ یہ رقم ہاتھ سے گئی، گویا یہ قرض کی صورت ہوگئی کہ ملا، ملا نہیں ملا تو ڈوب گیا، اس صورت میں یہ زائد رقم ربا کی قسم سے ہوگی جس کا لینا جائز نہیں ہوگا، بلکہ جمع کرنے والا صرف اتنی ہی رقم کا مستحق ہوگا جو اس نے جمع کیا ہے۔

۳- نجی وسرکاری ادارے سے فائدہ اٹھانے کا حکم:

جواب یہ ہے کہ دونوں کا حکم ناجائز اور حرام ہونے میں ایک ہے۔

سرکاری اداروں کے بارے میں یہ کہنا کہ حکومت اس تصور کے ساتھ اسے چلا رہی ہے کہ اس کے ذریعہ عوام کو سماجی تحفظ حاصل ہوگا جو حکومت کے فرائض میں سے ہے، ایک زبردست مغالطہ ہے۔

کیا حکومت کے فرائض میں سے صرف انہیں لوگوں کا سماجی تحفظ ہے جو بیمہ کرائیں، اور جو لوگ کمزور ہیں، حقیقۃً حکومتوں کی نظر کرم کے مستحق ہیں وہ حکومت اور سرکاری اداروں کی کرم فرمائیوں سے محروم ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ بیمہ پالیسی ایک خوبصورت فریب ہے جس کے ذریعہ لوگوں کی دولت پر ہاتھ صاف کیا جاتا ہے، بے سبب دولت کمانے کا بہترین ذریعہ ہے۔ نجی کمپنیاں ہوں یا سرکاری ادارں درحقیقت دونوں کا مقصد یہی نفع اندوزی ہے، اس لئے دونوں کا حکم ایک ہے۔

یہ اشکال کہ سرکار اور حکومتیں، حفاظت اور قیام امن کی ذمہ دار ہیں، اس لئے جو بیمہ کمپنیاں سرکاری ہیں ان کے ساتھ بیمہ پالیسی درست ہونی چاہئے، وجہ جواز نہیں بن سکتا، اس لئے کہ سرکار بدون کسی معاوضہ عوام کے ہر ہر فرد کی حفاظت اور ان کے لئے قیام امن کی ذمہ دار ہے۔

۴- سرکاری انشورنس ادارہ سے ملنے والی امداد وتعاون کا حکم؟

بیمہ پالیسی کے تحت سرکاری انشورنس ادارہ علاج کی ضرورت پر جو مطلوبہ یا مقررہ رقم دیتا ہے اس کو سرکار کی طرف سے امداد وتعاون قرار دینے پر انشراح نہیں ہوتا، بیمہ پالیسی تو ایک عقد ومعاملہ ہے جس میں غرر وقمار کے ذریعہ نفع اندوزی ہوتی ہے، اور یہ ایک ناجائز اور حرام عقد ہے، اس لئے اگر کسی طرح سے اسے امداد وتعاون قرار دے بھی دیا جائے تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہوگا کہ یہ معاملہ جائز ہے، اس طرح کا تعاون تو سودی معاملات میں بھی پایا جاتا ہے، تو کیا سود کو امداد وتعاون قرار دے دیا جائے گا، تعاون علی البر بھی ہوتا ہے اور تعاون علی الاثم بھی، اللہ تعالی نے تعاون علی البر کا حکم دیا ہے اور تعاون علی الاثم سے منع کیا ہے۔

''تعاونوا علی البر والتقوی ولاتعاونوا علی الإثم والعدوان'' (سورۂ مائدہ)۔

۵- نعم البدل:

کسی بھی معاشرہ کی فلاح وبہبود، اس کی بھلائی اور کامیابی اس پر منحصر ہے کہ اس کے افراد میں باہم ترابط واتحاد کس حد تک پختہ اور مضبوط ہے، ایک دوسرے کے لئے خیر خواہی کے جذبات کس حد تک پائے جاتے ہیں اور وہ معاشرہ، آپسی بدخواہی، ایذا رسانی اور عیب جوئی سے کس حد تک پاک وصاف ہے۔

چنانچہ اسلام نے ایسی ہی تعلیمات کو فروغ دیا ہے جو اعلی قدروں کی حامل ہیں، انسانی اخوت اور بھائی چارگی کی علم بردار ہیں، بلکہ اس نے دین ہی نصیحت وخیر خواہی کو قرار دیا ہے۔ ''الدین النصیحۃ'' (صحیح مسلم) اور ایسی تمام باتوں سے منع کیا ہے جس سے معاشرہ کے افراد میں باہم کشیدگی اور

رنجش پیدا ہو۔

اس نے خاص طور سے مسلم معاشرہ کو ایک ایسی عمارت سے تعبیر کیا ہے جس کی اینٹ، پتھر اور دیگر حصے ایک دوسرے سے جڑے ہوتے ہیں۔

''المؤمن للمؤمن کالبنیان یشد بعضه بعضا'' (صحیح مسلم کتاب البر والصلہ)

اور کبھی انہیں باہم ایک دوسرے پر شفقت ومحبت، اور رحم دلی کی ترغیب دیتے ہوئے انہیں ایک جسم سے تعبیر کیا ہے۔

''مثل المؤمنين في توادهم وتراحمهم وتعاطفهم مثل الجسد، إذا اشتكى منه عضو تداعى له سائر الجسد بالسهر والحمى'' (صحیح مسلم)۔

(مومنین کی ایک دوسرے سے محبت کرنے، ایک دوسرے پر رحم کرنے اور ایک دوسرے کے ساتھ ہمدردی کی مثال بدن کے مثل ہے، کہ جب اس کا کوئی عضو بیمار ہوتا ہے تو بخار (تکلیف) اور جاگنے میں سارے بدن کے اعضاء ایک دوسرے کو (شرکت کی) دعوت دیتے ہیں)۔

اسی طرح معاشرہ میں کسی مومن فرد کو کوئی پریشانی لاحق ہو تو معاشرہ کے سارے افراد کو اس کے درد میں شریک ہونا چاہئے، اس کی مدد کرنا چاہئے، اسی طرح ایک حدیث میں وارد ہے:

''المسلم أخو المسلم لا يظلم ولا يخذله... الخ'' (صحیح مسلم کتاب البر والصلہ)۔

(مسلمان مسلمان کا بھائی ہے، نہ اس پر ظلم کرے اور نہ اسے بے یار ومددگار چھوڑ دے، بلکہ ایک بھائی دوسرے بھائی کے ساتھ جو معاملہ کرتا ہے وہی ہر مسلمان کے ساتھ کرنا چاہئے)۔

ایک حدیث میں کچھ اس طرح ارشاد ہے:

''قال رسول الله ﷺ: يا ابن آدم! إنك أن تبذل الفضل خير لك وأن تمسك شر لك، ولا تلام على كفاف وابدأ بمن تعول، واليد العليا خير من اليد السفلى'' (صحیح مسلم، کتاب الزکاۃ، حدیث: ۹۷)۔

(اے ابن آدم! تم اپنی ضرورت سے زائد (مال) کو (اللہ کے راستے میں) خرچ کرو، تمہارے لئے بہتر رہے گا، اور اس کو روکے رکھو گے تو تمہارے لئے برا ہوگا، اور ضرورت بھر رکھنے میں کوئی ملامت نہیں، اور جن کے تم کفیل ہو انہیں سے ابتدا کرو (یعنی پہلے ان پر خرچ کرو) اور اوپر (دینے) والا ہاتھ نیچے (لینے) والے ہاتھ سے بہتر ہے)۔

ان گرانقدر تعلیمات کے پیش نظر باہمی کفالت کا ایک نظام بنالیا جائے جس میں ہر صاحب استطاعت اپنی استطاعت کے مطابق، یا کوئی متعینہ رقم تبرع اور بھائی چارگی کے طور پر جمع کرے۔

اور بلا کسی متعینہ رقم کی شرط کے بوقت ضرورت کسی حادثہ، یا پریشانی کے موقع پر معاشرہ کے کسی بھی فرد کا اس رقم سے تعاون کیا جائے، خود رقم جمع کرنے والے کو کوئی مصیبت پیش آجائے تو اس کا بھی تعاون ہو، تو اس طرح انشاء اللہ بڑے سے بڑے حادثات وخطرات میں ایک دوسرے کے نقصان کی تلافی ہوجائے گی، اور اس طرح لوگ عند اللہ اجر عظیم کے بھی مستحق ہوں گے، اور غریب یا امیر سبھی کے گراں علاج کی سہولت فراہم ہوجائے گی۔

۶- جن ممالک میں میڈیکل انشورنس وہاں کے شہریوں یا وہاں جانے والوں کے لئے لازم کردیا گیا ہے، ان ملکوں میں میڈیکل انشورنس کرانا قانونی مجبوری کے تحت جائز ہوگا۔

''يجوز التأمين الإجباري أو الإلزامي الذي تفرضه الدولة لأنه بمثابة دفع ضريبة للدولة'' (الفقہ الاسلامی وادلتہ ۵/ ۳۴۲۲)۔

(اور اجباری یا لازمی انشورنس جسے حکومتیں ضروری قرار دیتی ہیں جائز ہے، اس لئے کہ وہ بمنزلہ ٹیکس ہے جو حکومت کو ادا کیا جاتا ہے)۔

☆☆☆

میڈیکل انشورنس سے متعلق سوالات کے جوابات

مفتی جنید عالم ندوی[1]

اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا کی طرف سے پندرہویں فقہی سمینار کے لئے جو سوالات ارسال کئے گئے ہیں ان میں سے کچھ سوالات ''میڈیکل انشورنس'' سے متعلق بھی ہیں، میڈیکل انشورنس کا طریقہ یہ ہے کہ مختلف عمر کے افراد سال بھر کے لئے متعینہ رقم جمع کرتے ہیں، اگر سال بھر کے اندر وہ کسی پیچیدہ امراض کے شکار ہو گئے تو انشورنس کرنے والی کمپنی انشورنس میں طے شدہ رقم علاج کے لئے دیتی ہے، اگر سال گذر گیا اور وہ بیمار نہیں ہوئے تو جمع شدہ رقم واپس نہیں ہوتی ہے، دوسرے سال کے لئے دوسری رقم جمع کرنی پڑتی ہے، سردی، نزلہ وغیرہ امراض کے لئے یہ رقم نہیں ملتی ہے، انہیں بیماروں کو انشورنس کی رقم ملتی ہے جو ہسپتال میں داخل ہوں، بیمار پڑنے والوں کو اس اسکیم کے تحت جمع کردہ رقم سے زائد رقم ملتی ہے، ''میڈیکل انشورنس'' کرنے والی کمپنیاں سرکاری بھی ہوتی ہیں اور غیر سرکاری بھی، سرکاری کمپنیوں کا مقصد خدمت خلق ہے، یہی وجہ ہے کہ یہ کمپنیاں خسارے میں چل رہی ہیں اور غیر سرکاری کمپنیوں کا مقصد نفع اندوزی ہے، اگرچہ یہ کمپنیاں بھی ابھی خسارے میں ہیں، لیکن مستقبل میں نفع کی امید پر کام کر رہی ہیں، اس سلسلے میں چند سوالات ہیں جن کے جوابات مطلوب ہیں۔

میڈیکل انشورنس کرانے کا شرعی حکم:

پہلا سوال یہ ہے کہ کسی مسلمان کے لئے میڈیکل انشورنس کرانا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟ بہت سے لوگ ایسے ہیں جو کسی مہلک مرض کے علاج کے لئے بیک مشت بڑی رقم جمع نہیں کر سکتے ہیں، وہ تھوڑی تھوڑی رقم جمع کر کے اس اسکیم کے تحت کسی مہلک مرض کے علاج کے قابل ہو جاتے ہیں۔

''میڈیکل انشورنس'' کی حقیقت پر غور کرنے کے بعد یہ بات کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ اس کا پورا نظام غیر شرعی اصولوں پر قائم ہے، اس میں سود بھی ہے، قمار بھی ہے اور غرر و دھوکہ بھی ہے نیز ظلم و ستم بھی ہے اور یہ سب ناجائز و حرام ہیں، سود اس لئے ہے کہ اگر واقعی بیمار پڑ گئے تو جمع کردہ رقم سے زائد رقم ملتی ہے جو سود ہے جس کی حرمت نص قطعی سے ثابت ہے، اور قمار اس لئے ہے کہ قمار میں نفع و نقصان دونوں کا احتمال ہوتا ہے، مذکورہ صورت میں اگر بیمار پڑ گیا تو اصل رقم سے زائد رقم ملے گی جو نفع ہے اور اگر بیمار نہیں پڑا تو جمع شدہ رقم واپس نہیں ہوگی جو نقصان ہے اور قمار بھی بنص قرآنی حرام ہے:

''إنما الخمر والميسر والأنصاب والأزلام رجس من عمل الشيطان'' (سورہ مائدہ: ۹۰)۔

اس میں ظلم بھی ہے، اس لئے کہ سال کے اندر بیمار نہ پڑنے کی صورت میں اصل رقم واپس نہیں ہوتی ہے، جبکہ فقہاء کرام نے بیعانہ کی رقم کو معاملہ ختم ہو جانے کی صورت میں واپس کر دینے کا حکم دیا ہے، اگر کوئی شخص یہ رقم واپس نہ کرے یا کسی معاملہ میں یہ رقم سوخت ہو جائے تو یہ ناجائز ہے، پھر یہ کہ بیمار پڑنے کی صورت میں انشورنس کمپنیوں سے رقم نکالنے کی جو تفصیل بیان کی گئی ہے وہ ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہے، نیز امر موہوم پر معاملہ ہونے کی وجہ سے غرر و دھوکہ بھی ہے، خلاصہ کلام یہ ہے کہ سود، قمار، غرر و دھوکہ اور ظلم و ستم پر مبنی ہونے کی وجہ سے ''میڈیکل انشورنس'' کرانا شرعاً حرام ہے۔ ہر مسلمان پر اس سے احتراز لازم ہے۔

۲، ۴: اصل رقم سے زائد رقم کا حکم:

دوسرا سوال یہ ہے کہ بیمار پڑنے پر ''میڈیکل انشورنس'' کرانے والے شخص کو کمپنیوں کی طرف سے ملنے والی اضافی رقم کا شرعی حکم کیا ہے؟ کیا اس رقم کو اپنے علاج یا دیگر مصارف پر استعمال کر سکتا ہے؟ نیز کیا اس کو سرکار کی طرف سے امداد و تعاون کا درجہ دے سکتے ہیں؟

اس کا جواب یہ ہے کہ مذکورہ صورت میں ملنے والی اضافی رقم سود ہے جس کی حرمت نص قطعی سے ثابت ہے۔ اس رقم کو لے کر اپنے علاج یا کسی دوسرے

---

[1] صدر مفتی، امارت شرعیہ بہار، اڑیسہ و جھارکھنڈ، پٹنہ۔

مصرف پر صرف نہیں کر سکتے ہیں۔اس کو لے کر بلا نیت ثواب صدر کرنا ہوگا، سرکاری اداروں کی طرف سے بھی اضافی رقم ایک ایسے معاہدہ کے تحت مل رہی ہے جو غیر شرعی اصولوں پر قائم ہے، اس لئے اس اضافی رقم کو امداد و تعاون کا درجہ نہیں دے سکتے ہیں۔

۳-سرکاری و نجی اداروں کا حکم:

جہاں تک اس سوال کے جواب کا تعلق ہے کہ سرکاری اور نجی کمپنیوں میں فرق ہوگا یا دونوں کا حکم یکساں ہوگا؟ اس لئے کہ دونوں کا مقصد الگ الگ ہے، جب ہم دونوں کمپنیوں کی حقیقت پر غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ دونوں کی حقیقت یکساں ہے دونوں کے مقصد میں کوئی فرق نہیں ہے، کہنے کی بات ہے کہ سرکاری کمپنیوں کا مقصد خدمت اور سہولت پہنچانا ہے۔ درحقیقت ان کمپنیوں کا مقصد بھی نفع اندوزی ہے، یہی وجہ ہے کہ نجی کمپنیوں کی طرح سرکاری کمپنیاں بھی بیمار نہ پڑنے کی صورت میں جمع کردہ رقم واپس نہیں کرتی ہیں۔ ''میڈیکل انشورنس'' کرانے کی حرمت کی جو علتیں بیان کی گئی ہیں وہ دونوں طرح کی کمپنیوں میں پائی جاتی ہیں، لہذا دونوں کا حکم یکساں ہوگا، یعنی ''میڈیکل انشورنس'' کرانا حرام ہوگا، خواہ سرکاری کمپنیاں کریں یا نجی کمپنیاں۔

میڈیکل انشورنس کی متبادل صورت:

ایک اہم سوال یہ ہے کہ میڈیکل انشورنس کے ناجائز ہونے کی صورت میں متبادل صورت کیا ہے، جو میڈیکل انشورنس کے بنیادی مقاصد کو بھی پورا کرے اور حد جواز میں بھی ہو۔

غور کرنے کے بعد متبادل صورت یہی سمجھ میں آتی ہے کہ اجتماعی نظام قائم کیا جائے، جہاں امارت شرعیہ قائم ہو اور امیر شریعت کے تحت بیت المال کا نظام چل رہا ہو وہاں بیت المال کے نظام کو زیادہ سے زیادہ مستحکم کیا جائے، زکاۃ اور دیگر صدقات واجبہ کی رقوم بیت المال میں جمع کی جائیں، بلکہ اصحاب خیر حضرات عطیات کی رقم سے اس طرح کے علاج کے لئے علاحدہ سے بیت المال میں فنڈ قائم کرائیں اور اس فنڈ کے ذریعہ غریبوں کی مدد کی جائے جیسا کہ امارت شرعیہ بہار، اڑیسہ و جھارکھنڈ کے بیت المال سے حسب گنجائش مریضوں کی مدد کی جاتی ہے اور جہاں امارت شرعیہ قائم نہ ہو اور اس کے تحت بیت المال کا نظام نہ چل رہا ہو وہاں پر مسلمان باہمی اتفاق واتحاد سے اجتماعی نظام قائم کریں اور غریبوں کے علاج کے لئے فنڈ قائم کر کے صدقات واجبہ وصدقات نافلہ اور عطیات کی رقوم اکٹھا کر کے غریبوں کی مدد کریں، اس اجتماعی نظام میں علماء کی شمولیت بھی ضروری ہے تا کہ ہر رقم اس کے مصرف پر صرف ہو سکے۔

قانونی مجبوری کے تحت میڈیکل انشورنس کرانے کا حکم:

اس سلسلہ کا آخری سوال یہ ہے کہ بعض ممالک میں میڈیکل انشورنس کرانا قانوناً ضروری ہے، گویا کہ یہ قانونی مجبوری ہے، ملک کے باشندوں کے لئے بھی اور باہر سے جانے والے حضرات کے لئے بھی، سوال یہ ہے کہ ان ممالک میں میڈیکل انشورنس کرانا جائز ہوگا؟ اور میڈیکل انشورنس کرانے کی صورت میں بیمار پڑنے پر ملنے والی اضافی رقم کا استعمال جائز ہوگا یا نہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ جن ممالک میں میڈیکل انشورنس کرانا لازم ہے ان ممالک میں میڈیکل انشورنس ایک ضرورت ہے اور ضرورت کے تحت بعض ناجائز وحرام چیزیں بھی جائز ہو جاتی ہیں، جیسا کہ تصویر کھنچوانا حرام ہے، لیکن ضرورت پڑنے پر جواز کا فتوی دیا گیا ہے، بینک میں رقم جمع کرنے کی صورت میں گناہ اور معصیت کے کام میں تعاون دینا ہے، لیکن حفاظت کی غرض سے ضرورت کے تحت جائز قرار دیا گیا ہے، مذکورہ صورت میں جبکہ قانونی مجبوری ہو میڈیکل انشورنس کرانا جائز ہوگا، خواہ وہ ملک کا باشندہ ہو یا دوسرے ملک سے کسی ضرورت کے تحت وہاں گیا ہو، البتہ بیمار پڑنے کی صورت میں ملنے والی اضافی رقم سود ہے، اس کو اپنے علاج پر صرف نہیں کر سکتے ہیں، الا یہ کہ انشورنس کرانے والا شخص مجبور و پریشان حال ہو، اس کے پاس علاج کرانے کے لئے رقم نہ ہو اور کہیں سے تعاون کی بھی امید نہ ہو اور علاج نہ کرانے کی صورت میں ہلاکت یا بیماری کے بڑھنے کا اندیشہ ہو تو بدرجہ مجبوری اس اضافی رقم کے استعمال کی گنجائش ہوگی۔

☆☆☆

میڈیکل انشورنس کا شرعی حکم

مولانا ابوسفیان مفتاحی[1]

۱- چونکہ انسان کو مرض لاحق ہونے کا علم نہیں ہوسکتا، تو فقط علم جو اللہ تعالی کو معلوم ہے اور انسان یہ بھی جاننے سے قاصر ہے کہ مرض لاحق ہوگا تو معمولی درجہ کا سردی، زکام وغیرہ یا خطرناک مہلک درجہ کا تو جس چیز کے جاننے کے بارے میں انسان قاصر ہے تو اس کے بیمہ کا جواز کا حکم کیسے لگایا جاسکتا ہے؟ لہذا میڈیکل انشورنس (صحت بیمہ) کو جائز نہیں کہا جاسکتا۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ میڈیکل انشورنس (صحت بیمہ) شرعا جائز نہیں ہے۔

۲- صحت بیمہ کرانے والا جو رقم جمع کرتا ہے اور پھر ضرورت پر اس سے کہیں زیادہ مالیت کے علاج سے مستفید ہوتا ہے تو مالیت سے زیادہ علاج میں جو رقم خرچ ہوتی ہے وہ بر سبیل قرض کی تسلیم کی جائے گی، لہذا تندرست ہونے کے بعد مریض کو وہ قرض ادا کرنا لازم ہوگا، یا قدرت نہ ہونے کی صورت میں سرکار سے یا تنظیم سے اس کو معاف کرالے گا، یا سرکار اور وہ تنظیم اس رقم زائد کو امداد وتعاون کا نام دے کر اسی سے اس رقم کا مطالبہ نہیں کیا جائے گا۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ زائد مالیت کو قرض کا درجہ دیا جائے گا۔

۳- سرکاری میڈیکل انشورنس کے ادارے سے فائدہ اٹھانے کا جو حکم ہے یہی حکم رہے گا دوسرے اداروں سے فائدہ اٹھانے کا، یعنی دونوں کا حکم ایک ہی ہوگا۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ دونوں کا حکم ایک ہی ہوگا۔

۴- سرکاری انشورنس ادارہ جو علاج کی ضرورت پر مطلوبہ رقم یا مقررہ رقم دیتا ہے تو اس کو سرکار کی طرف سے امداد وتعاون کا درجہ دیا جاسکتا ہے، بلکہ دیا جانا چاہئے، کیونکہ بے کس اور مجبوروں اور معذوروں کے علاج ومعالجہ کی ذمہ داری سرکاری وحکومت پر عائد ہوتی ہے، چنانچہ اس کے لئے سرکار کی طرف سے دینا حکومتوں میں سرکاری اسپتال قائم کئے گئے ہیں اور قائم کئے جاتے ہیں، جن میں مریضوں کا علاج مفت میں کیا جاتا ہے اور دوائیں مفت دی جاتی ہیں یہ اس طرح سے سرکار اپنی ذمہ داری ادا کرتی ہے، اور دنیا کی سرکاروں میں عوام کے لئے اور طرح کے بھی امدادی ادارے قائم ہوتے ہیں، جن سے غرباء ومساکین کی مدد کی جاتی ہے، لہذا اس کو سرکاری امداد وتعاون کا ہی درجہ دیا جانا چاہئے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ سرکاری انشورنس ادارہ علاج کی ضرورت میں جو رقم مطلوب دیتا ہے اس کو امداد وتعاون کا درجہ دیا جانا چاہئے۔

۵- میڈیکل انشورنس کی مذکورہ صورت شرعا جائز نہیں ہے تو اسلامی تعلیمات کی روشنی میں اس کی بہترین متبادل صورت شریعت مطہرہ نے بتادی وہ زکوۃ وصدقات ہیں جس کی شکل یہ ہوگی کہ ہر ہر شہر ودیہات میں مسلمان اپنی ایک تنظیم قائم کریں اور اس کے لئے ذمہ داران کو منتخب کیا جائے اور زکوۃ وصدقات وصول کر کے اسی رقم سے غریبوں ومسکینوں کے لئے علاج کی سہولت فراہم کی جائے اور اپنی نگرانی میں علاج کرایا جائے اور

[1] استاذ حدیث، جامعہ مفتاح العلوم، مئو۔

یہ شکل وصورت عین ممکن ہے اور اسی رقم سے تحقیق کر کے غریب لڑکے ولڑکیاں ان کی شادی کا بندوبست کیا جائے اور جن کے رہنے کے لئے گھر ومکان نہ ہوتو تحقیق کر کے اس کے لئے گھر ومکان بنوادیا جائے یہ بہترین، حلال، جائز، طیب اور پاکیزہ صورت ہے جس کو مسلمانوں کو اختیار کرنا چاہئے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ میڈیکل انشورنس کی مذکورہ صورت کے بجائے اسلامی تعلیمات کی روشنی میں اس کی بہترین حلال وطیب صورت یہ ہے کہ ہر ہر جگہ مسلمان اپنی اسلامی تنظیم بنا کر زکوۃ وصدقات وصول کریں اور ان سے یہ کام لیں۔

۶- جن ممالک میں میڈیکل انشورنس وہاں کے شہریوں یا وہاں جانے والوں کے لئے قانونا لازم کر دیا گیا ہے تو ضابطہ فقہ ''الضرورات تبیح المحظورات'' کے پس منظر میں ان ملکوں میں میڈیکل انشورنس کرانے کی گنجائش دی جاسکتی ہے۔

بنابریں قانونی مجبوری کے تحت انشورنس کرانے والے بیمار پڑ جائیں تو ان کے لئے انشورنس کی سہولت سے فائدہ اٹھانا درست ہوگا۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ قانون کی وجہ سے انشورنس کی سہولت سے فائدہ اٹھانا درست ہوگا۔

☆☆☆

شرعی نقطہ نظر سے میڈیکل انشورنس

مولانا محمد قمر الدین بڑودی[1]

۱- میڈیکل انشورنس (صحت بیمہ) کرانے کا کیا حکم ہے؟

جواب: اسلام ایک ایسے مکمل ضابطۂ حیات کا نام ہے جس کی تعلیمات وہدایات بحیثیت اصولی آسمانی ہیں، اور جن کی تشریح حضور اکرم ﷺ نے فرمائی ہے، اسی لئے شریعت کا دارو مدار عقول انسانی پر نہیں رکھا گیا ہے، بلکہ دنیوی اور اخروی طور پر انسان کے فلاح وبہبود پر رکھا گیا ہے جو رضاء الٰہی پر منتج ہوتا ہے، لہذا ایسے امور وافعال واعمال کے اختیار کرنے کا حکم دیا گیا ہے جس میں دنیوی واخروی فوائد کے ساتھ ساتھ رضاء الٰہی بھی شامل ہو اور ایسے امور وافعال واعمال سے احتراز کا حکم دیا گیا جن میں انفرادی طور پر یا اجتماعی طور پر دنیوی واخروی فائدہ نہ ہو اور ساتھ ہی ساتھ رضاء الٰہی سے بھی وہ خالی ہو، اسی لئے شریعت مطہرہ نے جو اوامر ونواہی دئے ہیں ان پر عمل یا ان سے احتراز ضروری ہے۔

اسلام نے سود، میسر (قمار) وغیرہ کو حرام قرار دیا ہے، لہذا وہ اشیاء کہ جن میں سود کا یا قمار کا تحقق ہو وہ حرام قرار دی جائیں گی، اب اس پہلو سے ہم میڈیکل انشورنس کا جائزہ لیتے ہیں تو اس میں قمار کی شکل پائی جاتی ہے، کیونکہ میڈیکل انشورنس میں پالیسی ہولڈر کے لئے ہر سال پریمیم کے طور پر ایک متعین رقم انشورنس ادارہ کو جمع کرنی پڑتی ہے اور اس کے عوض پالیسی ہولڈر کو کسی موہوم بیماری کے علاج کے لئے ایک مخصوص رقم خرچ کا ادارہ عہد وپیمان کرتا ہے اب اگر وہ پالیسی ہولڈر اس کی مقرر کردہ مدت میں بیمار ہوجاتا ہے تو ادارہ نے اس کے پریمیم کے عوض جو رقم اس کے علاج کے لئے مخصوص کی تھی اس حد تک وہ رقم خرچ کرتا ہے اور اگر پالیسی ہولڈر اس مقررہ مدت میں بیمار نہ ہو تو پریمیم کی دی ہوئی رقم انشورنس ادارہ واپس نہیں کرتا ہے اور یہ شکل جوے (میسر) کی ہوجاتی ہے جو نص قرآنی کی رو سے ناجائز ہے، ساتویں پارہ کے دوسرے رکوع میں یہ آیت صریح طور پر اس کی حرمت پر دال ہے وہ یہ ہے:

"یاأیھا الذین آمنوا إنما الخمر والمیسر والأنصاب والأزلام رجس من عمل الشیطان فاجتنبوہ لعلکم تفلحون" (مائدہ: ۹۰)

علاوہ ازیں اس میں سود کی بھی حقیقت پائی جاتی ہے، اس لئے کہ اس میں پالیسی ہولڈر جتنی رقم جمع کرتا ہے اس سے کئی گنا زیادہ رقم کے ذریعہ علاج کا معاہدہ ہوتا ہے، گویا اس نے جو قرض دیا اس کے عوض ایک زائد رقم سے فائدہ اٹھانے کی شرط لگادی اور فقہ کا یہ اصول ہے:

"کل قرض جر نفعاً فھو حرام"۔

نیز اس اعتبار سے بھی یہ ناجائز ہے کہ اس میں غرر ہے اور حدیث میں اس کی ممانعت موجود ہے:

"نھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن بیع الحصاۃ وعن بیع الغرر"، اس لئے میڈیکل انشورنس حرام ہے۔

۲- صحت بیمہ میں جمع مالیت سے زیادہ مستفید ہونا؟

مذکورہ بالا اصول کی روشنی میں جب میڈیکل انشورنس کرانا ہی حرام قرار پایا جو دی گئی رقم سے زیادہ کی مالیت سے فائدہ اٹھانا ہی کیسے جائز ہوگا۔

اگر کسی نے میڈیکل انشورنس کرالیا ہے اور اب متعینہ مدت میں وہ بیمار ہوجائے تو اس نے جتنی رقم انشورنس ادارہ کو جمع کرائی ہے اس سے زیادہ رقم سے فائدہ اٹھانا جائز نہیں ہے، کیونکہ اس پالیسی ہولڈر نے جو رقم پریمیم کے طور پر ادارہ کو دی ہے وہ بطور قرض ہے اور قرض کی شکل میں مقرض کے لئے زیادہ رقم سے فائدہ اٹھانا سود میں داخل ہے اور وہ حرام ہے، جیسا کہ ماسبق میں قاعدہ فقہیہ: "کل قرض جر نفعاً فھو حرام" کے ذیل میں ذکر کیا

[1] اصلاح المسلمین، جامع مسجد بلڈنگ، مانڈوی، بڑودہ گجرات

گیا ہے۔

اور شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے ''حجۃ اللہ البالغہ'' کی دوسری جلد میں فرمایا ہے: ''الربا ہو القرض علی أن یؤدی إلیه أکثر وأفضل مما أخذ'' ربا در حقیقت اس شرط کے ساتھ قرض دینا ہے کہ مقروض اس کو اصل میں اضافہ کے ساتھ یا اس سے عمدہ چیز واپس کرے گا۔

لہٰذا دی ہوئی رقم قرض کے عوض میں زیادہ رقم سے فائدہ اٹھانا سود میں داخل ہوگا اور وہ حرام ہے۔

۳-انشورنس کے سرکاری وغیر سرکاری ادارہ سے فائدہ اٹھانے میں فرق:

میڈیکل انشورنس ادارہ سرکاری ہو یا پرائیوٹ دونوں ہی میں یہ بات قدر مشترک ہے کہ وہ پالیسی ہولڈر کی جانب سے ہر سال ایک متعینہ رقم لیتے ہیں اور مدت مقررہ میں بیماری کی شکل میں وہ معاہدہ میں طے شدہ رقم جو پریمیم سے زیادہ ہوتی ہے وہ خرچ کرتے ہیں اور مدت مقررہ میں عدم بیماری کی صورت میں وہ دی گئی رقم واپس نہیں دی جاتی، اس لئے سرکاری ادارہ ہو یا پرائیوٹ دونوں میں وہی سود، قمار، غرر والی شکلیں پائی جاتی ہیں جو ناجائز ہیں، لہٰذا پرائیوٹ ادارہ والا میڈیکل انشورنس بھی جائز نہ ہوگا۔

انشورنس کے ادارے سے ملنے والی رقم کیا امدادی اور تعاونی ہے؟

سرکاری انشورنس ادارہ کی طرف سے جو زائد رقم دی جاتی ہے اسے تعاون اور امداد نہیں کہا جاسکتا، کیونکہ امداد و تعاون اسے کہتے ہیں جس کے مقابل کوئی عوض نہ ہو، بلکہ انسانی ہمدردی کی بنیاد پر امداد دی جارہی ہو اور یہاں یہ بات مفقود ہے، کیونکہ پالیسی ہولڈر سے پیشگی ایک متعینہ رقم لی جاتی ہے اور وہ رقم بصورت عدم بیماری واپس بھی نہیں دی جاتی اور صرف پالیسی ہولڈر کو ہی یہ رقم فراہم کی جاتی ہے دوسروں کو نہیں دی جاتی، اگر انسانی ہمدردی کی بنیاد پر یہ امداد ہوتی تو ہر ایک اس کا مستحق ہوسکتا ہے، لہٰذا یہ اضافی رقم امداد و تعاون نہیں شمار کی جائے گی اور یہ ناجائز ہوگی۔

علاوہ ازیں اس میں تعاون علی الإثم بھی پایا جاتا ہے، اس لئے بھی یہ ناجائز ہے۔

۵-کیا میڈیکل انشورنس کی اسلامی متبادل صورت ہوسکتی ہے؟

اسلام نے مال داروں پر زکاۃ کو فرض قرار دیا ہے علاوہ ازیں فقراء، مساکین وغیرہ پر خرچ کرنے کی ترغیبات اور ان پر اجر وثواب کا وعدہ قرآن وحدیث میں جگہ جگہ مذکور ہے، اس لئے جہاں اسلامی مملکتیں ہیں وہاں بیت المال کے ذریعہ سے مفت علاج کی سہولیات وغیرہ کا انتظام آسان ہے، البتہ جہاں اسلامی حکومتیں نہیں ہیں ان ممالک میں مسلمان باہمی طور پر بیت المال کی امداد، مفت علاج کی سہولت وغیرہ کا انتظام کریں۔

اس طرح کا انتظام میڈیکل انشورنس کا متبادل ہوسکتا ہے، اور شریعت میں وہ نہ صرف جائز، بلکہ مستحسن اور باعث اجر وثواب ہے۔

۶-جن ممالک میں میڈیکل انشورنس لازم کردیا گیا ہے، ان کا کیا حکم ہے؟

جن ممالک میں وہاں کے شہریوں کے لئے یا باہر سے آنے والوں کے لئے میڈیکل انشورنس لازمی قرار دیا گیا ہو تو وہاں مجبوری کی صورت میں میڈیکل انشورنس کرانے کی اجازت ہوگی، مگر چونکہ جیسا اوپر ذکر کیا گیا ہے کہ اس میں سود کے تحقق کی شکل بھی پائی جاتی ہے، اس لئے میڈیکل انشورنس ادارہ کو جتنی رقم پالیسی ہولڈر نے جمع کرائی ہے اس حد تک اس رقم کا استعمال اس کے لئے درست ہوگا، زیادہ کی رقم کا استعمال درست نہ ہوگا۔

☆☆☆

میڈیکل انشورنس کا شرعی پہلو

مولانا ڈاکٹر ظفر الاسلام اعظمی[1]

۱- میڈیکل انشورنس (صحت بیمہ) کی تفسیر کردہ صورت میں قمار ہے، قمار اس لئے کہ ایک طرف سے ادائیگی متعین ہے اور دوسری طرف سے موہوم، جو قسطیں ادا کی گئی ہیں وہ تمام رقم ڈوب بھی سکتی ہیں اور اس سے زیادہ کی مالیت سے فائدہ بھی حاصل ہوسکتا ہے، اسی کو قمار کہتے ہیں، بنا بریں بندہ کے نزدیک یہ صورت جائز نہیں معلوم ہوتی۔

۲، ۴- میڈیکل انشورنس کرانے والا زیادہ مالیت کے علاج سے مستفید ہوسکتا ہے، یہ حکومت کی جانب سے امداد ہے، گورنمنٹ کی امداد لینے میں کوئی مضائقہ نہیں معلوم ہوتا، یوں بھی ہم حکومت کے طرح طرح کے فلاحی ورفاہی اداروں سے مستفید ہوتے رہتے ہیں، ان سے حدود وشرع میں رہ کر انتفاع جائز ہونا چاہئے۔

۳- چونکہ حکومت کا مقصد نفع اندوزی نہیں، بلکہ سماجی تحفظ کی ذمہ داری کو صرف پوری کرنا ہے، اس لئے بندہ کے خیال میں پرائیوٹ وسرکاری بیمہ صحت کے اداروں کے احکام جداگانہ ہوں گے، جواب ۵ میں بتائی گئی جائز صورت کے مطابق اگر بیمہ صحت کرانا ہے تو سرکاری ادارہ سے ہی کرایا جائے۔

۵- بندہ کے خیال میں انشورنس کی سوال کردہ صورت من وجہ ''بیع عربون'' کے مشابہ ہے اور ''بیع عربون'' بیع کی وہ صورت ہے جس میں خریدار بیعانے کی رقم اس شرط کے ساتھ دیتا ہے کہ اگر اس نے چیز خرید لی تو یہ رقم قیمت کا حصہ ہوگی اور باقی قیمت وہ ادا کردے گا، لیکن اگر اس نے وہ چیز نہ خریدی تو بیعانے کی رقم واپس لینے کا حقدار نہ ہوگا، بلکہ وہ بائع کی ہوگی، بیعانے کی رقم اس طرح ضبط کر لینے کا جواز صرف فقہ حنبلی میں ہے، ائمہ ثلاثہ کے یہاں جائز نہیں، صاحب ''اعلاء السنن'' تحریر فرماتے ہیں:

''وحديث الباب يدل على تحريم البيع مع العربان، وبه قال الجمهور، وخالف في ذلك أحمد فأجازه'' (اعلاء السنن ۱۴/ ۱۶۷)

مصنف مذکور ایک دوسرے مقام پر رقم طراز ہیں:

''اقوال: قال الزرقاني في شرح هذا الحديث: هو باطل عند الفقهاء لما فيه من الشرط والغرر، وأكل أموال الناس بالباطل'' (اعلاء السنن ۱۴/ ۱۶۶)۔

(زرقانی اس حدیث کی شرح کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں کہ بیع عربون فقہاء کے نزدیک باطل ہے، اس لئے کہ اس میں شرط فاسد کے ساتھ غرر بھی ہے اور لوگوں کے مال کو باطل طریقہ سے ہڑپ بھی کر لینا)۔

''بیع عربون'' ہی کے تحت ڈاکٹر وہبہ زحیلی تحریر فرماتے ہیں:

''وضعف أحمد الحديث المروي في بيع العربان وقد أصبحت طريقة البيع بالعربون في عصرنا الحاضر أساسا للارتباط في التعامل التجاري الذي يتضمن التعهد بتعويض ضرر الغير عن التعطل والانتظار، وفي تقديري

[1] شیخ الحدیث، دار العلوم مئو۔

أنه يصح ويحل بيع العربون وأخذه عملا بالعرف؛ لأن الأحاديث الواردة في شأنه عند الفريقين لم تصح'' (الفقه الاسلامی وادلتہ ۴/ ۳۵۰۴۴۹)۔

آج کے انتہائی ناگفتہ بہ حالات میں جہاں بیعانہ کی بیع کا طریقہ خرید وفروخت میں بالکل اساسی اور بنیادی طریقہ اختیار کر چکا ہے اگر امام احمد بن حنبل کے مسلک کو اپناتے ہوئے جواز کا فتوی دیا جائے تو مناسب ہوگا۔

بیعانے کی رقم سوخت ہونے کی بابت ''اعلام الموقعین'' میں بھی ایک عبارت درج ذیل طریقہ پر موجود ہے:

''عن نافع بن الحارث عامل عمر على مكة انه اشترى من صفوان بن أمية دار العمر بن الخطاب باربعة آلاف درهم واشترط عليه إن رضي عمر فالبيع له، وان لم يرض فلصفوان أربعمائة درهم''

(اعلام الموقعين لابن الجوزی ۳/ ۴۰۱ موسوعہ فقہ عمر ۶۴۸)۔

(نافع بن الحارث جنہیں حضرت عمرؓ نے مکہ معظمہ کا عامل بنایا تھا انہوں نے صفوان بن امیہ سے عمر بن الخطاب کے لئے ایک مکان چار ہزار درہم میں اس شرط کے ساتھ خریدا کہ اگر عمرؓ راضی ہو گئے تو بیع ہوگی اور اگر وہ راضی نہ ہوئے تو صفوان بن امیہ کے وہ چار ہزار درا ہم ہو جائیں گے)۔

بہر کیف ضرورتاً غیر کے مذہب پر فتوی دیا جاسکتا ہے، حضرت مولانا تقی عثمانی صاحب تحریر فرماتے ہیں: چونکہ چاروں مذاہب بلاشبہ برحق ہیں اور ہر ایک کے پاس دلائل ہیں، اس لئے اگر مسلمانوں کو کوئی شدید اجتماعی ضرورت داعی ہو تو اس موقع پر کسی دوسرے مجتہد کے مسلک پر فتوی دینے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے (البلاغ کراچی مفتی اعظم نمبر)۔

مولانا عبدالحیؒ فرنگی محلی اپنے ایک فتوی میں تحریر فرماتے ہیں:

عند الضرورت بعض مسائل میں امام شافعی وامام مالک رحمہما کی تقلید کرنا درست ہے، ایک جگہ اور لکھتے ہیں: ضرورت شدیدہ کے وقت امام شافعی کے مذہب کی تقلید درست ہے۔

اسی طرح شامی میں ہے کہ حضرت امام ابو یوسفؒ نے ایک مرتبہ جمعہ کی نماز پڑھائی نماز کے لئے جب مجمع منتشر ہو چکا تو معلوم ہوا کہ حضرت امام نے جس حمام میں غسل کیا تھا اس میں چوہا مرا ہوا تھا اس وقت حضرت امام ابو یوسفؒ نے فرمایا کہ آج ہم اپنے مدنی بھائیوں کے قول و مذہب پر عمل کر لیتے ہیں۔

چونکہ حضرت امام مالکؒ کا مسلک ''إذا كان الماء قلتين لم يحمل الخبث'' کا تھا، اسی جانب حضرت امام ابو یوسفؒ کا اشارہ تھا، اس طرح ایک معروف مسئلہ یہ ہے کہ طاعت وعبادت پر اجرت لینا جائز نہیں ہے، مگر ضرورتاً بعض صورتوں میں اسے جائز قرار دیا گیا ہے، جبکہ یہ جواز کا قول بقول سرخسی اہل مدینہ کا ہے (شامی)۔

یہ تمام باتیں اس وقت تھیں جبکہ اسے من وجہ ''بیع عربون'' کے مشابہ مان کر جواز کا قول لیا جائے، لیکن اگر اس مسئلہ کو من وجہ اس کے مشابہ قرار نہ دیا جائے تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ معاملہ کرتے وقت بیمہ صحت کرانے والا یہ سوچ لے کہ اگر میں بیمار نہ پڑا تو میری یہ رقم میرے دوسرے بھائیوں کے کام آوے، خواہ وہ مسلمان ہوں یا غیر مسلم، اگر مسلمان ہیں تو حقوق اسلامی وانسانی دونوں اعتبار سے اور اگر غیر مسلم ہیں تو صرف حقوق انسانی کے اعتبار سے دیگر بھائیوں کا ہم پر حق ہے۔

۶- ''المشقة تجلب التيسير، الضرورات تبيح المحظورات'' کے تحت اگر حکومت بیمہ صحت کو لازمی قرار دے تو یہ صورت بدرجہ مجبوری جواز کی ہوگی اور اس انشورنس سے استفادہ درست ہوگا۔

☆☆☆

ہیلتھ انشورنس کتاب وسنت کی روشنی میں

مولانا خورشید انور اعظمی[1]

انسان کی فطری خواہش ہوتی ہے کہ اپنی کمائی سے کچھ رقم پس انداز کرے تا کہ مستقبل میں پیش آمدہ ضروریات میں کام آسکے، اور مالی دشواری کی وجہ سے کوئی کام رکنے نہ پائے، جو منصوبہ ہو پایہ تکمیل تک پہنچے، اور جو ضرورت ہو پوری ہو، اور اگر خدانخواستہ کوئی ناگہانی مصیبت آپہنچے یا بیماری لاحق ہوجائے یا کسی تجارتی ... ہ سے دوچار ہوجائے تو اس رقم کے ذریعہ اپنی مشکل دور کرسکے، اسی سوچ نے انشورنس کو جنم دیا اور آج اس کی مختلف شکلیں پوری دنیا میں رائج ہیں، میڈیکل انشورنس بھی انہیں شکلوں میں سے ایک ہے۔

انشورنس اگر اسلامی اصول وضوابط کے مطابق ہو اور اس میں کوئی شرعی قباحت نہ ہو تو اس کے اختیار کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں، لیکن اتفاق سے انشورنس کی آج دنیا میں جتنی بھی شکلیں رائج ہیں ایسی چیزوں پر مبنی ہیں جن کی ممانعت وحرمت منصوص ہے، یعنی سود وقمار، جس کی وجہ سے مروجہ تمام صورتیں شرعی نقطہ نظر سے حرام وناجائز ہیں، اور اس لائق ہیں کہ حتی الامکان ان سے احتراز کیا جائے۔

۱- میڈیکل انشورنس کا حکم:

میڈیکل انشورنس کی مروجہ صورتوں پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا کرانا حرام ہے، اس کے کئی اسباب ہیں:

اول یہ کہ اس میں قمار ہے، اس لئے کہ میڈیکل انشورنس میں پریمیم سال بھر کے لئے ہوتا ہے، اور سال کے بعد ختم ہوجاتا ہے، اگر سال کے اندر بیماری لاحق ہو تو کمپنی اس پریمیم کے بقدر علاج کی رقم فراہم کرتی ہے، اور اگر بیماری نہیں ہوئی تو وہ رقم ختم ہوجاتی ہے، ظاہر ہے یہ قمار ہے، جواہر الفقہ میں ہے:

> ہر وہ معاملہ جو نفع اور نقصان کے درمیان ... ہم ہو اصطلاح شرع میں قمار اور میسر کہلاتا ہے (جواہر الفقہ ۲/ ۳۳۶)۔

ابوبکر جصاص رازی اپنی شہرۂ آفاق تصنیف ''احکام القرآن'' میں رقم طراز ہیں:

''لا خلاف بین أہل العلم فی تحریم القمار وأن المخاطرة من القمار. قال ابن عباس: إن المخاطرة قمار'' (احکام القرآن ۱/ ۳۸۸)۔

قمار کو قرآن کریم میں شیطان کا گندہ عمل بتایا گیا ہے، اور اس سے بچنے کی تاکید کی گئی ہے، ارشاد باری ہے:

''یا أیہا الذین أمنوا إنما الخمر والمیسر والأنصاب والأزلام رجس من عمل الشیطان فاجتنبوہ لعلکم تفلحون'' (سورۂ مائدہ/ ۹۰)۔

(اے ایمان والو یہ جو ہے شراب اور جوا اور بت اور پانسے، سب گندے کام ہیں شیطان کے، سو ان سے بچتے رہو، تا کہ تم نجات پاؤ)۔

---

[1] شیخ الحدیث، دار العلوم مئو۔

مختصر تفسیر ابن کثیر میں ہے:

''قال ابن عمرو ابن عباس: الميسر هو القمار، كانوا يتقامرون فى الجاهلية إلى مجئ الإسلام فنها هم الله عن بهذه الأخلاق القبيحة'' (مختصر تفسیر ابن کثیر ا / ۵۴۴، نیز مزید تفصیل کے لئے دیکھئے: حجۃ اللہ البالغہ ۲ / ۱۰۸، نصب الرایہ للزیلعی ۴ / ۶۰، المغنی ۶ / ۴۳۶، المبسوط ۱۲ / ۱۹۴، الفروق ۳ / ۲۶۵)۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے معاملہ غرر سے منع فرمایا ہے:

''عن ابي هريرة نهى رسول الله صلى الله عليه وسلم عن بيع الحصاة وبيع الغرر'' (صحيح مسلم ۲/۲)۔

چہارم یہ کہ اس میں ''اثم وعدوان'' کی حوصلہ افزائی ہے، اس لئے کہ بیمہ کمپنیاں ان جمع شدہ رقموں سے سودی کاروبار کرتی ہیں، جس میں بیمہ کرنے والا ایک طرح کا معاون ہوتا ہے، اللہ تعالی نے ''تعاون علی الاثم والعدوان'' سے منع فرمایا ہے:

''تعاونوا على البر والتقوى ولا تعاونوا على الإثم والعدوان'' (سورۂ مائدہ/)۔

۲- جمع شدہ رقم سے زائد مالیت سے استفادہ کا مسئلہ:

میڈیکل انشورنس اولاً تو کرانا درست نہیں ہے، لیکن اگر کسی مجبوری کے تحت کرانا ہی پڑ جائے تو جمع شدہ رقم سے زائد مالیت سے استفادہ کرنا درست نہیں ہے، کیونکہ یہ اضافی رقم سود ہے، جو بیمہ کمپنی کو دیئے گئے قرض سے زائد رقم کی مالیت کی صورت میں حاصل ہو رہا ہے۔

''المغنی'' میں ہے:

''قال ابن منذر: أجمعوا على المسلف إذا شرط على المستلف زيادة أو هدية فأسلف على ذلك أن أخذ الزيادة على ذلك ربا'' (المغنی ۶/۴۳۶)۔

''ردالمحتار'' میں ہے:

''كل قرض جر نفعا حرام أي إذا كان مشروطا'' (ردالمحتار ۷/ ۳۵۵)۔

مولانا محمد یوسف صاحب لدھیانوی رقم طراز ہیں:

بیمہ کی موجودہ صورتیں رائج ہیں وہ شرعی نقطۂ نظر سے صحیح نہیں، بلکہ قمار اور جوا کی ترقی یافتہ شکلیں ہیں، اس لئے اپنے اختیار سے بیمہ کرانا جائز نہیں اور اگر قانونی مجبوری کی وجہ سے بیمہ کرانا پڑے تو اپنی ادا کردہ رقم سے زیادہ وصول کرنا درست نہیں (آپ کے مسائل اور ان کا حل ۶ / ۲۵۵)۔

۳- سرکاری اور نجی اداروں میں فرق کا مسئلہ:

میڈیکل انشورنس کے بعض ادارے سرکاری ہوتے ہیں، اور بعض نجی اور دونوں کے مقاصد بظاہر مختلف معلوم ہوتے ہیں، لیکن حقیقت میں ان کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے، اس لئے کہ مقصد جو بھی ذکر کیا جائے مآل کار کے اعتبار سے دونوں کی حیثیت یکساں ہے، لہذا دونوں کے حکم میں بھی یکسانیت ہوگی اور کوئی فرق نہ ہوگا۔

۴- انشورنس کو مالی تعاون کا درجہ دینا:

میڈیکل انشورنس کے ادارے جو رقم، علاج ومعالجہ کے نام پر خرچ کرتے ہیں، اسے امداد وتعاون کا درجہ نہیں دیا جا سکتا، اس لئے کہ امداد، بقدر ضرورت اور بوقت ضرورت ہوا کرتی ہے، جبکہ یہاں صورتحال یہ ہے کہ متعینہ رقم سے زائد سے علاج نہیں کرایا جاتا، عمر کے بعض مرحلوں میں چیک

اپ کو ضروری قرار دیا جاتا ہے، موجودہ امراض اور آوٹ ڈور کے علاج کو اس سے خارج مانا جاتا ہے، پھر متعینہ اسپتالوں ہی میں علاج کرانے کی اجازت ہوتی ہے، نیز علاج کی بل کی پوری جانچ کرانے پر ہی رقم کی ادائیگی ہوتی ہے، اسی طرح ایک سرمایہ دار کو ضرورت مند سے زیادہ دیا جاتا ہے، اس لئے کہ وہ زیادہ کا بیمہ کراتا ہے، جبکہ نادار، غریب، محتاج کو کم ملتا ہے، اگر یہ تعاون ہوتا تو ضرورت مند کو زیادہ ملتا، پتہ چلا کہ یہ تعاون نہیں ہے، بلکہ قمار، سود اور غرر پر مبنی معاملہ کی ایک صورت ہے، جسے مالی تعاون کا نام دینے کی سعی لاحاصل کی جارہی ہے، نام بدلنے سے حقیقت نہیں بدلا کرتی، حضرت مولانا محمد شفیع صاحب عثمانیؒ نے ''جواہر الفقہ'' میں بہت صاف لفظوں میں تحریر فرمایا ہے:

بیمہ کے کاروبار کو امداد باہمی کا نام دے کر جائز قرار دینے کی کوشش کی جاتی ہے، لیکن اس کی مروجہ صورتیں جتنی ہماری نظر سے گذری ہیں، سود اور قمار سے خالی نہیں، اس لئے وہ سب حرام ہیں (جواہر الفقہ ۲ / ۳۴۵)۔

البتہ اگر واقعتا انشورنس کا کوئی ادارہ ایسا ہو جس میں صرف اور صرف جذبہ تعاون کارفرما ہو تو وہ بلاشبہ جائز، درست اور مستحسن ہے، اس لئے کہ وہ تبرع اور تعاون علی البر ہے، جس کی شریعت میں تاکید آئی ہوئی ہے، یہ اور بات ہے کہ ہمارے معاشرے میں اس طرح کا نظام نادر الوجود ہے۔

ڈاکٹر وہبہ الزحیلی تحریر فرماتے ہیں:

''أما التامين التعاوني فهو أن يتفق عدة أشخاص على أن يدفع كل منهم اشتراكا معينا لتعويض الأضرار التي قد تصيب أحدهم اذا تحقق خطر معين وهو قليل التطبيق في الحياة الاجتماعية'' (الفقه الاسلامي وادلته ۵/ ۳۴۱۶)۔

۵- انشورنس کی متبادل صورت:

اسلام میں باہمی اخوت ومحبت، احسان وسلوک، رحم وکرم اور تعاون وہمدردی پر کافی زور دیا گیا ہے، اور اس بات کی بطور خاص تاکید کی گئی ہے کہ انسان مشکل وقتوں میں دوسرے انسان کے کام آئے، ضرورت مندوں کی ضرورت کا خاطر خواہ خیال رکھے، اور دوسروں کے ساتھ احسان کا معاملہ کرے، اللہ تعالی ارشاد فرماتا ہے:

''أحسن كما أحسن الله إليك'' (سوره قصص / ۷۷)۔

ایک دوسری آیت میں ہے:

''والله يحب المحسنين'' (سوره بقره:)۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی لوگوں کے ساتھ رحم وکرم کا معاملہ کرنے پر زور دیا ہے ارشاد گرامی ہے:

''من لم يرحم الناس لم يرحمه الله'' (ترمذی شریف ۲/ ۱۴)۔

اس تناظر میں دیکھا جائے تو ملت اسلامیہ کے تمام افراد کی ذمہ داری بنتی ہے کہ وہ معاشرے میں باہمی تعاون کی فضا قائم کریں، اور ایسا ماحول بنائیں کہ ہر شخص حاجت مندوں کی حاجت کے تئیں فکر مند اور ان کی ناگہانی مشکلات کے حل کرنے میں کوشاں ہو، اس سلسلے میں ایسے فنڈ قائم ہوں جو محتاجوں، غریبوں اور بے سہارا لوگوں کے تعاون میں کام آسکے، نیز شرکت ومضاربت پر مبنی تجارتی کاروبار کا سلسلہ شروع کیا جائے، جو ضرورت مندوں کے لئے معاون ثابت ہو، اس طرح جب معاشرے میں اجتماعی وانفرادی سطح پر جذبہ تعاون کی فضا عام ہوجائے گی تو اس نوع کی بہت ساری مشکلات بہ آسانی رفع ہوجائیں گی، اور لوگ سودی نظام کی نحوست وقباحت سے محفوظ رہ سکیں گے۔

۶- لازمی انشورنس کا حکم:

اگر حکومت کی جانب سے انشورنس کرانا لازم ہو کہ اس کے بغیر کوئی چارہ ہی نہ ہو تو ایسی صورت میں ضرورتا انشورنس کرانا جائز ہوگا، ڈاکٹر وہبہ

زحیلی رقم طراز ہیں:

''یجوز التأمین الإجباری أو الإلزامی الذی تفرضه الدولة، لأنه بمثابة دفع ضریبة للدولة'' (الفقه الاسلامی وادلته ۵/ ۳۴۲۲)۔

مولانا محمد یوسف صاحب لدھیانوی تحریر فرماتے ہیں:

بیمہ سود و قمار کی ایک شکل ہے، اختیاری حالت میں کرانا ناجائز ہے، لازمی ہونے کی صورت میں قانونی مجبوری کے طور پر جس قدر کم سے کم مقدار بیمہ کرانے کی گنجائش ہو اسی پر اکتفا کرے (آپ کے مسائل اور ان کا حل ۶ / ۲۵۸)۔

اسی طرح حضرت مولانا مفتی رشید احمد صاحب ایک استفتا کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں:

چونکہ گاڑی کے مالک کی طرف سے بیمہ کا معاہدہ بطیب خاطر نہیں، بلکہ حکومت کی طرف سے یکطرفہ جبر و ظلم ہے، لہذا بوقت ضرورت گنجائش ہے، لیکن بصورت حادثہ جمع کردہ رقم سے زائد واجب التصدق ہے (احسن الفتاوی ۷ / ۳۵)۔

لیکن اگر قانونی مجبوری کے تحت لازمی طور پر میڈیکل انشورنس کرانا ہی پڑ جائے تو جمع کردہ رقم سے سہولت حاصل کرنا درست ہوگا۔

''ردالمحتار'' میں ہے:

''فإذا ظفر بمال مدیونه له الآخذ دیانة بل له الأخذ من خلاف الجنس'' (ردالمحتار ۳/ ۲۰۱)۔

☆☆☆

میڈیکل انشورنس شرعاً ناجائز ہے

مفتی حبیب اللہ قاسمی [1]

۱،۲- میڈیکل انشورنس کرانا جسے صحت بیمہ بھی کہتے ہیں جائز نہیں (احسن الفتاوی ۵ / ۲۵)، کیونکہ یہ صحت بیمہ جس کا رواج اب عام ہوتا جارہا ہے سود وقمار پر مشتمل ہے جس کی حرمت منصوص ومتفق علیہ ہے قمار کے بارے میں علماء کی یہ تحریر کہ ملکیت کو ایسی صورت پر معلق کردینا جس میں خطر ہو یعنی اس کے وجود وعدم دونوں کا احتمال ہو "تعلیق الملک علی الخطر" ہے اس کے اندر مکمل طور سے پایا جارہا ہے، اس لئے کہ اگر یہ پالیسی ہولڈر بیمار ہوجاتا ہے تو کمپنی اس کے جمع کردہ روپیہ کے ساتھ اس سے زائد ایک متعین رقم ادا کرے گی اور اگر بیمار نہیں ہوتا ہے تو اس کی جمع کردہ رقم بھی سوخت ہوجائے گی اور یہ بات واضح ہے کہ اس کا بیمار ہونا یا نہ ہونا کسی کے اختیار میں نہیں یہ ایک امر موہوم ہے اور امر موہوم کو عقد کا دارومدار قرار دینا ہی قمار ہے جس کی حرمت کے متعلق قرآن نے کہا ہے:

"إنما الخمر والميسر والأنصاب والأزلام رجس من عمل الشيطان" (سورۂ مائدہ: ۹۰)۔

اور اس میڈیکل انشورنس کے اندر سود کی لعنت بھی موجود ہے کیونکہ کمپنی جو بیمار ہونے پر اضافی رقم صاحب بیمہ کو دیتی ہے وہ سود ہے کیونکہ فقہاء نے جو سود کی تعریف لکھی ہے وہ اس پر صادق آتی ہے۔

"الربا هو القرض على أن يودي إليه أكثر أو أفضل مما أخذ" (حجۃ اللہ البالغہ مترجم ۲/ ۳۱۷)

(کہ کسی کو اس شرط پر قرض دینا کہ وہ اس سے زیادہ یا اس سے بہتر واپس کرے گا حرام ہے)۔

۳- اصلی چیز تو علت ہے، علت ہی کی بنیاد پر حلت وحرمت کا فیصلہ ہوتا ہے، یہاں "میڈیکل انشورنس" کے لئے جن اداروں اور کمپنیوں کا انتخاب کیا جاتا ہے، خواہ وہ ادارے سرکاری ہوں یا غیر سرکاری دونوں باہم اس طریقہ کار میں شریک ہیں کہ پالیسی ہولڈر جب مقررہ رقم جمع کردے اور کسی ناگہانی مرض سے دوچار ہوجائے تو ایک متعین اضافی رقم سے اس کی امداد کی جائے، لیکن اگر پالیسی مدت میں وہ صحت یاب رہا تو پھر اس کی یہ جمع کردہ رقم کالعدم قرار دی جاتی ہے، اس لئے "میڈیکل انشورنس" کے یہ سرکاری ادارے دونوں کا حکم مذکورہ بالا سبب کی وجہ سے ایک ہوگا۔

۴- امداد وتعاون کے سب سے زیادہ مستحق تو غرباء وفقراء ہیں اگر سرکار کا مقصد لوگوں کی امداد کرنا ہو یا مہلک بیماریوں سے حفاظت اس کے پیش نظر ہو تو بلاعوض ان کی یہ خدمت ہونی چاہئے یا اگر عوض ہی لینا ہو تو اول وہلہ میں جو رقم جمع کی جاتی ہے اس کی مقدار اتنی ہونی چاہئے جسے ہر غریب ادا کرسکے، نیز بیماری کے عدم تحقق کی صورت میں اس جمع شدہ رقم کی واپسی بھی ان اداروں کے فرض منصبی کا ایک جز ہونا چاہئے۔

نیز انشورنس سے وابستہ ہونے کے لئے بھی ایسی ایسی شرطیں اور دفعات لگائی گئیں کہ جن کا تحمل شاید سرمایہ داروں کے علاوہ کوئی غریب نہ کرسکے تو پھر ان سرکاری اداروں کی جانب سے جمع شدہ رقم کے علاوہ اضافی رقم کو امداد وتعاون کا نام کیسے دیا جاسکتا ہے۔

---

[1] جامعہ مظہر العلوم، وارانسی

۵- انشورنس کی متبادل صورت:

حکومت اور اس کی آمدنی ومنافع یہ عوام الناس کی خدمت اور اس کی ہر ممکن حفاظت اور نگہداشت کے لئے ہوتی ہے، اور چونکہ میڈیکل انشورنس شرعاً ناجائز ہے، اس لئے اس کی متبادل شکل یہ نکل سکتی ہے کہ حکومت ایسا ادارہ قائم کرے جس میں مناسب قیمت اور مناسب خرچ پر خدمت خلق ہو اور زیادہ سے زیادہ لوگوں کا علاج بسہولت ہو سکے، یہی طریقہ نجی کمپنیوں کو بھی اختیار کرنا چاہئے، تو اس صورت میں سود کی لعنت اور خسارہ ہر ایک سے دونوں (عوام اور کمپنی) بچ جائیں گے۔

۶- شدید حاجت میں میڈیکل انشورنس کرانا جائز ہوسکتا ہے:

مذکورہ تفصیلات سے یہ بات واضح ہوگئی کہ ''میڈیکل انشورنس'' فی نفسہ ناجائز ہے، البتہ عوارض کی بنا پر ضرورۃً اس کی اجازت ہوسکتی ہے اور اس جواز کی بنیاد ''الحاجة إذا عمت كانت كالضرورة، الضرر يزال، الحرج مدفوع، الضرورات تبيح المحظورات، كم من شئ يثبت ضمنا لا يثبت قصداً'' جیسے قواعد ہیں جن ممالک میں ''میڈیکل انشورنس'' لازم کردیا گیا ہے وہاں تو قانونی مجبوری ہے، لیکن جن ملکوں میں لازمی نہیں مذکورہ بالا اصول کی بنیاد پر گنجائش نکالی جاسکتی ہے۔

☆☆☆

صحت بیمہ کا شرعی حکم

مولانا نورالحق رحمانی[1]

علاج ومعالجہ شرعاً مطلوب ہے، لیکن اس مطلوب کو حاصل کرنے کے لئے صحیح ذرائع ووسائل کا اختیار کرنا ضروری ہے۔ کسی ایسے طریقے سے علاج کرانے کی اجازت نہیں ہے جو شرعاً ناجائز اور حرام ہو۔ سوال نامہ میں درج سوالات کے جوابات درج ذیل ہیں:

۱- ''میڈیکل انشورنس'' کرانے کی جو صورت سوال نامہ میں مذکور ہے اس کی روشنی میں یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ یہ صورت سود اور جوا پر مشتمل ہے، جن کی حرمت قرآن وسنت میں منصوص ہے۔

سود کے بارے میں ارشاد باری ہے:

وأحل الله البيع وحرم الربا (البقرۃ:۲۷۵)۔

یا ایھا الذین آمنوا اتقوا الله وذروا ما بقی من الربا إن کنتم مؤمنین (بقرۃ:۲۷۸)۔

اور جوا کے بارے میں ارشاد باری ہے:

یاأیها الذین آمنوا إنما الخمر والمیسر والأنصاب والأزلام رجس من عمل الشیطان فاجتنبوه لعلکم تفلحون (المائدہ:۹۰)۔

(اے ایمان والو! یہ شراب اور جوا اور پوجا کے بت اور جوئے کے تیر یہ سب گندے اور شیطانی کام ہیں، لہذا تم ان سے پرہیز کرو تاکہ تم کامیاب ہوجاؤ)۔

آیت کریمہ میں مذکور ربا کی تعریف فقہاء نے اس طرح کی ہے:

''کل زیادۃ مشروطة في العقد خالیة عن عوض مشروع'' (معجم لغة الفقهاء)۔

(ربا ہر وہ زیادتی ہے جس کی عقد میں شرط لگادی گئی ہو اور وہ جائز عوض سے خالی ہو)۔

صحت بیمہ کرانے والا میڈیکل انشورنس کمپنی کے ساتھ جو معاملہ کرتا ہے اس پر سود کی یہ تعریف صادق آتی ہے، اس لئے کہ بیمہ کرانے والا اسی شرط کے ساتھ مقررہ رقم جمع کرتا ہے کہ بیمار ہوجانے کی صورت میں اسے اپنی جمع کی ہوئی رقم کے مقابلے میں بہت زیادہ رقم کمپنی کی طرف سے علاج کے لئے ملے گی، ظاہر ہے کہ جمع کی ہوئی رقم سے زائد رقم اس کے علاج پر خرچ ہوئی وہ جائز عوض سے خالی ہے، اس لئے وہ سود ہے۔

اور قمار (جوا) کی تعریف یوں کی گئی ہے:

''تعلیق الملك علی الخطر والمال من الجانبین'' (حوالہ سابق)۔

(ملک کو خطر پر معلق کرنا جب کہ مال دونوں طرف سے ہوا ہے)۔

---

[1] ناظم جامعہ اسلامیہ دارالعلوم مہذب پور، اعظم گڑھ

دیکھا جائے تو میڈیکل انشورنس پر میسر اور قمار (جوا) کی یہ تعریف بھی صادق آرہی ہے، اس لئے کہ اس معاملہ میں مال دونوں جانب سے ہوتا ہے، بیمہ کرانے والا بھی مال جمع کرتا ہے اور کمپنی کی طرف سے بھی مال ہوتا ہے، لیکن اس کی ملکیت ایک ایسی شرط کے ساتھ مشروط ہوتی ہے جس میں خطر ہے، یعنی اس کے وجود وعدم وجود دونوں کا امکان واحتمال ہے، اگر بیمہ کرانے والا سال بھر کے اندر بیمار ہوتا ہے تو کمپنی اس کے علاج پر اس کی جمع کردہ رقم سے بہت زیادہ رقم خرچ کرے گی، مثلاً تیرہ ہزار کی رقم جمع کرنے کی صورت میں اسے تقریباً ایک لاکھ تک کے علاج کا حق حاصل ہوگا اور بیمار نہ ہونے کی صورت میں نہ صرف یہ کہ کمپنی کی طرف سے اسے کوئی اضافی رقم نہیں ملے گی، بلکہ اس کی جمع کی ہوئی رقم بھی چلی جائے گی، پھر آئندہ ہر سال انشورنس کی تجدید کے لئے اسے طے شدہ رقم جمع کرنی پڑے گی اور بیمار نہ ہونے کی صورت میں وہ رقم بھی سوخت ہوجائے گی، ظاہر ہے کہ یہ جوا ہے، لہٰذا جو معاملہ سود اور جوا جیسی قبیح اور حرام چیزوں پر مشتمل ہو اسے شرعاً جائز قرار نہیں دیا جاسکتا۔

۲- بیمار ہونے کی صورت میں بیمہ کرانے والے کو جو اپنی جمع کردہ رقم سے کہیں زیادہ مالیت کے علاج سے مستفید ہونے کا موقع ملتا ہے وہ اس کے لئے شرعاً جائز نہیں ہے، اس لئے کہ نجی یا سرکاری بیمہ کمپنی کی طرف سے علاج کی یہ سہولت محض غربت وافلاس کی بنا پر نہیں ملتی، بلکہ بیمہ کرانے کے معاوضہ میں ملتی ہے، ایسا نہیں ہے کہ ہر مفلس ولاچار اس سے فائدہ اٹھا سکے، بلکہ اس کے لئے بیمہ کرانا اور سالانہ فیس جمع کرنا ضروری ہے، لہٰذا یہ اصل جمع کی ہوئی رقم پر ایسی مشروط زیادتی ہے جو عوض سے خالی ہے جو سود اور قطعی طور پر حرام ہے۔

۳- میڈیکل انشورنس کی کمپنیاں اور ادارے، خواہ نجی ہوں یا سرکاری دونوں کا حکم ایک ہوگا، اس لئے کہ معاملہ کی صورت اور طریقۂ کار دونوں میں یکساں ہے۔

۴- سرکاری انشورنس ادارہ جو علاج کی ضرورت پر مطلوبہ یا مقررہ رقم دیتا ہے اس کو سرکار کی طرف سے امداد وتعاون کا درجہ نہیں دیا جاسکتا، نہ یہ تصور صحیح ہے کہ اس کے ذریعہ عوام کی اکثریت تو خط افلاس سے نیچے زندگی گذارتی ہے، جب وہ اپنی بنیادی ضرورتوں کی تکمیل کے لئے بھی وسائل زندگی سے محروم ہیں تو ان میں اتنی سکت کہاں ہے کہ وہ میڈیکل انشورنس کی فیس جمع کرسکیں اور ظاہر ہے کہ بیمہ کرائے بغیر علاج کی یہ سہولت حاصل نہیں ہوسکتی، اس لئے اس سے عوام کے اس طبقہ کو کوئی تحفظ حاصل نہیں ہوتا جو امداد واعانت کا زیادہ مستحق ہے، بلکہ اس سے یا تو مالدار طبقہ فائدہ اٹھائے گا یا حکومت کے ملازمین جن کی مالی حالت عام طور پر عوام سے بہتر ہوتی ہے اور چونکہ علاج کی ضرورت پر مطلوبہ یا مقررہ رقم اس فیس کا بدل ہے جو بیمہ کرانے کے وقت ادا کی جاتی ہے، اس لئے جمع کردہ رقم سے زائد حصہ معاوضہ سے خالی ہونے کی وجہ سے سود اور حرام ہے اور انشورنس کرانے کے سال بیمار نہ ہونے کی صورت میں چونکہ اس کی جمع کی ہوئی رقم یا اس کا کوئی حصہ واپس نہیں ملتا، اس لئے اس پر قمار کی تعریف بھی صادق آتی ہے، لہٰذا یہ معاملہ ازروئے شرع جائز نہیں ہوسکتا۔

۵- میڈیکل انشورنس کمپنیوں کا بنیادی مقصد اگر غریب عوام کے لئے گراں علاج کی سہولت مہیا کرنا ہے تو انہیں اسی مقصد کے لئے کام کرنا چاہئے، سوال نامہ میں مذکور صورت میں اس طبقہ کا فائدہ ہوتا نظر نہیں آتا اور نہ شرعی لحاظ سے یہ صورت جائز ہے، اسلامی تعلیمات کی روشنی میں اگر اس کی کوئی متبادل صورت تلاش کی جائے تو پھر اس معاملے سے ان شرائط کو ختم کرنا ہوگا جو شرعاً اس کی صحت سے مانع ہیں، مثلاً اس سہولت سے فائدہ اٹھانے کے لئے لازمی طور پر انشورنس کرانا اور اس کی مقررہ فیس ادا کرنا یا ہر بیمہ کرانے والے کو اس سہولت سے استفادہ کا حق دینا، لہٰذا اس کی جائز صورت یہ ہوسکتی ہے کہ حکومت اس مقصد کے لئے (یعنی غریب اور متوسط طبقہ کو گراں علاج کی سہولت فراہم کرنے کے لئے) ایک فنڈ قائم کرے اور صوبائی سطح پر یا مرکزی مقامات اور شہروں میں ایسے امدادی اور رفاہی ادارے قائم ہوں جو اس مقصد کے لئے کام کریں اور ملک کے متمول لوگوں سرکاری عہدہ داروں، کارخانوں اور فیکٹریوں کے مالکان اور خوشحال اور متوسط طبقہ کے لوگوں کو ترغیب دے کہ وہ اپنی مرضی سے اس کی رکنیت قبول کریں، رکنیت کی کوئی سالانہ فیس (جس کی کم سے کم مقدار متعین ہو) مقرر کی جائے جسے تمام ارکان رضا کارانہ طور پر ادا کریں، علاج میں اس کی رعایت کی جائے کہ اس کا نصف حصہ اس ادارہ کے ممبران میں سے زیادہ سے زیادہ متوسط طبقہ کے علاج کے لئے خاص ہو اور پچاس فی صد فنڈ صرف غریبوں کے لئے خاص ہو جو نہ اس ادارہ کے رکن ہوں، نہ ان سے کوئی فیس لی گئی ہو، اور اس ادارہ کے

وہ ممبران جو زیادہ مالدار ہوں وہ اپنا علاج خود کرا سکتے ہیں، اس لئے انہیں علاج کی سہولت فراہم نہ کی جائے، ایسے لوگوں سے رکنیت ہی کے وقت یہ معاہدہ کرالیا جائے، یہ صورت جواز کی ہوسکتی ہے کہ اس میں علاج کی سہولت حاصل کرنے کے لئے اس ادارہ کی رکنیت شرط نہیں رہی اور نہ اس کے ہر رکن کو علاج کی سہولت فراہم کی گئی، اس لئے اس فنڈ میں جمع شدہ رقم جو ممبران کے ذریعہ آئی ہے اگر وہ ان غریب بیماروں پر خرچ ہو جو سرے سے اس کے رکن ہی نہیں ہیں تو اس کے جواز میں کوئی کلام ہی نہیں ہے، اسی طرح اگر متوسط طبقہ کے مریضوں پر خرچ ہو جو اس کے رکن ہوں اور باقاعدہ فیس ادا کی ہو تو ان کے لئے بھی استفادہ جائز ہوگا، اس لئے کہ امداد پانے کے لئے ممبری شرط نہیں رہی۔

بہر حال اس طرح کی کوئی صورت اختیار کی جاسکتی ہے جس کا جواز بے غبار ہو، البتہ حکومت سے اس کی توقع نہیں کی جاسکتی کہ وہ اسلامی تعلیمات کی روشنی میں اس طرح کا ادارہ قائم کرے گی، ہاں مسلمان اجتماعی طور پر زکاۃ وصدقات، عطیات اور ان اوقاف کے ذریعہ جو اس مقصد کے لئے وقف کئے گئے ہوں اس طرح کا فلاحی ادارہ قائم کر سکتے ہیں۔

۶- جن ممالک میں میڈیکل انشورنس وہاں کے شہریوں یا وہاں جانے والوں کے لئے لازم کردیا گیا ہے وہاں اس کے بغیر چارہ ہی نہیں ہے، اس لئے اضطرار اور مجبوری کی بنا پر وہاں انشورنس کرانا جائز ہوگا: "الضرورات تبیح المحظورات" اور اگر قانونی مجبوری کے تحت انشورنس کرانے والے بیمار پڑ جائیں تو ان کے لئے انشورنس کی سہولت سے فائدہ اٹھانا جائز ہوگا، کیونکہ ایسے ممالک میں علاج کی سہولت تمام شہریوں اور سرکاری ملازمین کے لئے ہوتی ہے، اس لئے اسے حکومت کی طرف سے امداد وتعاون اور سماجی تحفظ قرار دیا جاسکتا ہے جس کا ممکن حد تک عوام کے لئے نظم کرنا حکومت کے فرائض میں داخل ہے، اس کی ایک نظیر پراویڈنٹ فنڈ کی رقم ہے کہ قانونی طور پر سرکاری ملازم کی تنخواہ میں سے ایک حصہ ہر ماہ کٹتا ہے اور اس کے ساتھ سرکار اتنی ہی رقم اپنی طرف سے ملاتی ہے اور ریٹائر ہونے کے بعد وہ رقم یکمشت ملتی ہے ہمارے مفتیان کرام نے اسے حکومت کی طرف سے عطیہ وانعام اور اس کے عمل کی اجرت کا ایک حصہ قرار دے کر اس کے لینے کو جائز قرار دیا ہے (دیکھئے: منتخبات نظام الفتاوی ۱/ ۲۰۴)۔

☆☆☆

شرعی تناظر میں میڈیکل انشورنس

مفتی عبدالرحیم قاسمی[1]

۱- میڈیکل انشورنس (صحت بیمہ) کرانے والے مختلف عمر کے افراد کے لئے علاحدہ علاحدہ رقمیں طے ہوتی ہیں، مثلاً ایک لاکھ کا انشورنس دو لاکھ کا بیمہ ان رقموں کو معینہ مدت میں قسط وار ادا کرنا لازم ہوتا ہے، انشورنس کی پریمیم ایک سال کے لئے ہوتی ہے اس سال کے اندر اگر بیماری ہو تو انشورنس کی رقم کی حد تک علاج کا خرچ انشورنس کمپنی فراہم کرتی ہے، سال گذر جانے پر پالیسی ختم ہو جاتی ہے اور اگلے سال کے لئے پھر پریمیم دینی ہوتی ہے، پریمیم کی رقم بیماری نہ ہونے کی حالت میں واپس نہیں ملتی، اسی طرح کے بیمہ کی حرمت کے متعلق حضرت مفتی تقی عثمانی دامت فیوضہم تحریر فرماتے ہیں: ''بیمے میں قمار بھی ہے اور ربا بھی، قمار اس لئے کہ ایک طرف سے ادائیگی متعین ہے اور دوسری طرف سے ادائیگی موہوم ہے جو قسطیں ادا کی گئی ہیں وہ تمام رقم ڈوب بھی سکتی ہے اور اس سے زیادہ بھی مل سکتی ہے اسی کو قمار کہتے ہیں اور ربا اس طرح کہ یہاں روپے کا روپے سے تبادلہ ہے اور اس میں تفاضل (زیادتی) ہے کہ بیمہ دار کی طرف سے کم رقم دی جاتی ہے اور اسے زیادہ رقم ملتی ہے''

(اسلام اور جدید معیشت/۱۴۱)۔

مذکورہ عبارت کی روشنی میں اس پالیسی کے تحت میڈیکل انشورنس کا حرام ہونا ظاہر ہے۔

۲- اداشدہ رقم سے زیادہ وصول کی گئی رقم سود ہے۔

۳- نجی اداروں اور پرائیوٹ و پبلک بیمہ کمپنیوں کا معاملہ سود و جوے پر مشتمل ہوگا، لہذا یہ معاملہ جائز نہیں اور اگر ان سے انشورنس کرالیا تو کیونکہ ان سے ملنے والی رقم اپنے ایک آپسی معاملہ کی بنیاد پر ہوگی جو عموماً قمار و ربا محض کی حقیقت پر مشتمل ہوگی، اس لئے اس ملی ہوئی رقم میں اپنی اصل رقم سے زائد ملی ہوئی رقم کو اس کے وبال سے بچنے کی نیت سے صدقہ کرنا یا اپنی ملکیت سے نکالنے کا حکم متوجہ ہوتا ہے۔

(نظام الفتاوی ۲/ ۳۶۷)۔

۴- علماء عرب میں شیخ ابوزہرہ نے جواز اور عدم جواز کے لحاظ سے بیمہ کے دو حصے کئے ہیں:

۱- بیمہ کمپنیوں سے یہ معاملہ ناجائز ہے۔

۲- حکومت اپنے ملازمین اور کارکنوں کے درمیان یہ نظام قائم کرے تو جائز ہے۔

(یعنی اختلاف صرف بیمہ کمپنیوں کے ساتھ معاملہ کرنے میں ہے جو بیمہ سے کاروباری نفع کماتے ہیں، لیکن حکومت کے زیر اہتمام جو اجتماعی بیمے ہوتے ہیں ان کے جواز میں کوئی اختلاف نہیں، ان میں اجتماعی تعاون پایا جاتا ہے، خواہ یہ بیمے محنت کشوں کے درمیان ہوں یا دیگر ملازمین کے درمیان اسی طرح، خواہ ان کا دائرہ کار بعض گروہ تک محدود ہو یا مختلف گروہ کے لوگوں کو شامل ہو) (عقد التأمین/ ۵۶)۔

سرکاری انشورنس ادارہ علاج کی ضرورت پر جو مطلوبہ یا مقررہ رقم دیتا ہے اس کو سرکار کی طرف سے امداد و تعاون کا درجہ دیا جا سکتا ہے، شیخ عبد

[1] استاذ، المعہد العالی للتدریب فی الافتاء والقضاء، پھلواری شریف، پٹنہ۔

المنعم نمر نے بیمہ کمپنیوں سے بیمہ کو ناجائز اور حکومت کی قائم کردہ تنظیموں سے جائز کہا ہے، چنانچہ عدم جواز کے بعض وجوہ بیان کرنے کے بعد کہتے ہیں حکومت چونکہ مختلف انتظامات کے ذریعہ عوام کی نگرانی ومالی کفالت کی ذمہ دار ہے اس بنا پر حکومت کی قائم کردہ تنظیموں سے بیمہ کرانا جائز ہے:
''إن الحکومة راع أکبر ومسؤولة عن رعایاها''، حکومت اور عوام کی مثال ایسی ہی ہے جیسے کسی بڑے خاندان کا سربراہ کار افراد سے کچھ رقم جمع کرتا رہے اور حاجت وضرورت کے وقت ان پر خرچ کرے۔

''فلکل فرد إذن من أفراد الدولة في مالیتها العامة فإذا أخذ الفرد منها مالا فمن حقه أخذ؛ لأن الدولة المسؤولة عنه والراعیة لشؤونه وهذا الاعتبار غیر قائم في الشرکات'' (الاسلام والشیوعیہ/۲۰۹)۔

(ایسی صورت میں حکومت کے خزانہ میں ہر فرد کا حق ہے جب کسی نے خزانہ سے مال لیا تو اپنا حق وصول کیا، کیونکہ حکومت ہر فرد کے حقوق کی محافظ وذمہ دار ہے، کمپنی پر یہ نگرانی وذمہ داری نہیں) (اسلام اور جدید دور کے مسائل ۱۸۹-۱۹۰)۔

حضرت مفتی نظام الدین صاحب تحریر فرماتے ہیں: آج کل ملکی حالات کی خرابی بھی اس بات کی متقاضی ہو چکی ہے کہ جان ومال وجائداد واملاک غرض ہر چیز کے بیمہ کرا لینے کی کھلی اجازت دے دی جائے، اس لئے کہ اس سے اگرچہ پورا تحفظ نہ ہو مگر کچھ تحفظ تو ہو سکتا ہے بشرطیکہ بیمہ کرانے والے بھی قانونی اعتبار سے پورے اتریں، پھر پبلک اور پرائیوٹ بیمہ کمپنیوں کے مقابلہ میں جو بیمہ کمپنی نیشنل اور حکومت کی ہو چکی ہے ان میں بیمہ کرانا زیادہ اچھا رہے گا، اس لئے کہ حکومت قانوناً بھی پورے ملک کے جان ومال کی حفاظت کی ذمہ دار ہوتی ہے اور وہ قانوناً بھی اس ذمہ داری کو تسلیم کرتی ہے، اس لئے حکومت کی بیمہ کمپنی اپنے قانون حکومت کے اعتبار سے جو رقم اپنے بیمہ کرنے والوں کو دے گی اس رقم کا حکم وہی ہوگا جو پرائیوٹ فنڈ میں حکومت یا محکمہ اپنے قانون کے اعتبار سے خواہ کسی نام سے دے ہم اس کو عطیہ وانعام قرار دے کر اس کا لینا اور استعمال کرنا جائز قرار دیتے ہیں یا ایکسیڈنٹ وغیرہ میں یا کسی جانی ومالی نقصان کے حادثہ میں جو رقم حکومت دیتی ہے اس کو ہم عطیہ شمار کرتے ہیں، اس طرح اس رقم کو بھی حکومت کے عطیہ کے قبیل سے قرار دے سکتے ہیں، پس حکومت سے ملی ہوئی اس رقم کو خواہ نیشنل بیمہ کمپنی کے ذریعہ اور واسطہ سے دے اس کو یا اس کے کسی جزء کو ناجائز یار با وغیرہ قرار دے کر اخراج عن الملک کا حکم شرعاً نہ ہوگا (نظام الفتاوی ۲/۳۶۷)۔

۵- بیمہ کا متبادل تعاونی بیمہ ہے جس میں شرکاء اپنی اپنی مرضی سے فنڈ میں رقمیں جمع کراتے ہیں اور سال کے دوران جن جن لوگوں کو کوئی نقصان پہنچا اس فنڈ سے ان کی امداد کرتے ہیں، پھر سال کے ختم پر اگر رقم بچ گئی تو وہ شرکاء کو بحصہ رسدی واپس کر دی جاتی ہے یا ان کی طرف سے آئندہ سال کے فنڈ کے لئے ان کے حصے کے طور پر رکھ دی جاتی ہے شرعاً اس میں کوئی اشکال نہیں اور جتنے علماء نے بیمے پر گفتگو کی ہے وہ اس کے جواز پر متفق ہیں (اسلام اور جدید معیشت/۱۶۱)۔

۶- جن ممالک میں میڈیکل انشورنس وہاں کے شہریوں یا وہاں جانے والوں کے لئے لازم کر دیا گیا ہے ان کے بیمہ کرانے کی گنجائش ہے، فقیہ الامت حضرت مفتی محمود صاحب تحریر فرماتے ہیں بیمہ میں سود بھی ہے اور جوا بھی یہ دونوں چیزیں شرعاً ممنوع ہیں، بیمہ بھی ممنوع ہے، لیکن اگر کوئی شخص ایسے مقام پر اور ایسے ماحول میں ہو کہ بغیر بیمہ کرائے جان ومال کی حفاظت بھی نہ ہو سکتی ہو یا قانونی مجبوری ہو تو بیمہ کرانا درست ہے (فتاوی محمودیہ/۲۴۰)۔

☆☆☆

علاج ومعالجہ کی اسکیموں سے فائدہ اٹھانے کا حکم

مولانا سلطان احمد اصلاحی[1]

اس سے متعلق سوالات کے جوابات سے پہلے ایک اصولی گفتگو ضروری معلوم ہوتی ہے، اس کی روشنی میں جوابات کو بہتر طور پر سمجھا جاسکے گا۔

روٹی کپڑا اور مکان کی طرح علاج بھی انسان کی بنیادی ضرورت ہے، جس کے سلسلے میں فرد کی محنت کے ساتھ معاشرہ کا تعاون کافی نہ ہو تو اس کے تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے کے لئے ریاست کا لازمی تعاون ہونا چاہئے، بلاشبہ آج کے دور میں رفاہی حکومتیں اس کے سلسلہ میں بہت کچھ کررہی ہیں، لیکن ہندوستان جیسے ملکوں کے پس منظر میں جو کچھ کیا جارہا ہے، وہ کافی سے بہت کم ہے، علاج کی شرعی حیثیت کی تفصیل میں جائے بغیر جواز کے علاوہ جو صورتیں اس کے وجوب کی ہیں جس میں بیمار پڑے رہنے کی صورت میں اس کے بیوی بچوں کے حقوق تلف ہوتے ہوں یا ملازم ہونے کی صورت میں متعلق مالک اور دفتر اور فرم کا نقصان لازم آتا ہو، وجوب کی ان صورتوں میں بیماری کا پالا اور علاج کا ٹالا نہیں جاسکتا، یہ علاج امیر اور غریب ہر ایک کی یکساں ضرورت ہے، بلکہ اکثر اوقات امیر سے زیادہ اس کی ضرورت غریب کے لئے ہوتی ہے، دریں حالیکہ یہی وہ طبقہ ہے جس کے لئے عام طور پر ''میڈیکل انشورنس'' کی اسکیم میں حصہ دار بننا آسان نہیں ہوتا علاج کی مجبوری سے گنجائش نہ ہوتے ہوئے بھی اگر وہ زبردستی اس اسکیم کا ممبر بنتا ہے تو دل کی آمادگی نہ ہونے کے باعث کی دوسرے کے لئے اس کی جمع کردہ رقم سے استفادہ جائز نہیں ہوتا، اس لئے کہ حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں اس کی صراحت ہے کہ:

''لا يحل مال امرء إلا بطيب نفسه منه'' (بیہقی فی شعب الایمان بحوالہ: سلطان احمد اصلاحی، اسلام کا تصور/ ۱۷۸، مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز نئی دہلی)۔

لیکن اس کے ساتھ ہی یہی حقیقت ہے کہ علاج ایک ضرورت ہے، اور بہت سی صورتوں میں وہ غیر معمولی طور پر گراں ہے جس کے تقاضوں کی ادائیگی ''میڈیکل انشورنس'' جیسی کسی اسکیم کے ذریعہ ہی پوری کی جاسکتی ہے، اس لئے مناسب ہے کہ اس کی اس اسکیم میں زیادہ سے زیادہ افراد کی شمولیت ہو، البتہ آمدنی اور حیثیت کے اعتبار سے ان کی قسطوں میں تفاوت ہو جبکہ اسکیم سے استفادے میں برابری اور مساوات کو یقینی بنایا جائے، اس تمہید کے بعد اب سوالات کے جوابات پیش ہیں:

۱- ''میڈیکل انشورنس'' (صحت بیمہ) کرایا جاسکتا ہے، البتہ چونکہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی ذات سے ''حسن ظن'' ضروری ہے جس کی حدیث میں تاکید ہے۔ حضرت جابرؓ کی روایت سے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد:

''لا يموتن أحدكم إلا وهو يحسن بالله الظن'' (مسند احمد ۳/ ۲۹۱، ۲۹۰، میمنیہ مصر)۔

دوسرے موقع پر حسن ظن کو حسن عبادت کا ایک حصہ قرار دیا گیا ہے:

''أن حسن الظن من حسن العبادة'' (مسند احمد ۲/ ۳۰۴، ۲۹۷ المیمنیہ مصر)۔

اس لئے اس اسکیم میں شرکت آدمی دوسرے کی مدد کی نیت سے کرے، اپنے مولیٰ سے حسن ظن کے تقاضے سے بیماری محفوظ رہ کر زندگی

---

[1] ناظم جامعہ خیر العلوم، نور محل روڈ، بھوپال

گزارنے کا آرزومند وہو، اللہ کے فیصلے سے اسی کا کوئی حصہ اس کی قسمت میں آ جائے تو بدرجہ آخر اس اسکیم سے فائدہ اٹھالے۔

۲- اس نیت سے جو شخص اپنا صحت بیمہ کرائے اور ضرورت پڑنے پر اپنی جمع شدہ رقم سے زیادہ کا علاج کرائے تو اس کے لئے اس اضافی رقم سے استفادہ کرنا جائز ہوگا۔

۳- ''میڈیکل انشورنس'' کی اسکیم سے فائدہ اٹھانے میں سرکاری اور غیر سرکاری دونوں طرح کے اداروں کا حکم ایک ہوگا، اور ان دونوں کے مقاصد کے جزوی فرق سے اس کے حکم میں کوئی فرق اور نہ ہوگا۔

۴- سرکار انشورنس ادارہ علاج کی ضرورت پر جو مطلوبہ یا مقررہ رقم دیتا ہے اس کو امداد اور تعاون کا درجہ دیا جاسکتا ہے۔

۵- ضرورت کے تقاضے سے ''میڈیکل انشورنس'' کی زیر نظر صورت کو گوارا کرنے کے باوجود اسلامی تعلیمات کی روشنی میں اس کا متبادل تلاش کرنا ضروری ہے، جس کی ایک صورت یہ ہے کہ ''أن في المال ......سوی الزکوۃ'' کے اصول پر حکومت کی طرف سے خوشحال طبقے سے علاج وا لگ ٹیکس وصول کیا جائے، دوسری صورت میں ٹیکس کی موجودہ شرح میں ضرورت کے تقاضے سے نظر ثانی کر کے اس کے ایک حصے کو علاج کے لئے خاص کر دیا جائے، اس کے ساتھ ہی سرکاری اور نجی میڈیکل انشورنس کمپنی اسکیموں کو وسعت دے کر حسب حیثیت قسطوں میں تفاوت رکھتے ہوئے اس کے دائرے کو زیادہ سے زیادہ بڑھانے کی کوشش کی جائے۔

۶- جن ممالک میں میڈیکل انشورنس وہاں کے شہریوں کے لئے لازم کر دیا گیا ہے، وہاں یہ انشورنس کرایا جاسکتا ہے، ساتھ ہی ضرورت کے تحت انشورنس کی اس سہولت سے فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔

☆☆☆

ہیلتھ انشورنس کا شرعی حکم

مولانا محمد ارشد مدنی[1]

تجارتی انشورنس کی قسموں میں سے ایک قسم ''میڈیکل انشورنس'' بھی ہے، جس کے چلانے والے ادارے سرکاری اور غیر سرکاری دونوں ہوتے ہیں اور دونوں کے اصول وضوابط بھی مشترک ہوتے ہیں، یہ انشورنس انفرادی طور پر افراد کے لئے اور اجتماعی طور پر خاندان یا اداروں کے لئے بھی کرایا جاسکتا ہے، حکومت ''میڈیکل انشورنس کا شعبہ'' اس تصور کے ساتھ چلا رہی ہے کہ اس کے ذریعہ عوام کو سماجی تحفظ حاصل ہوگا جو حکومت کے فرائض میں سے ہے اور کمپنیاں فائدے کے حصول کے لئے چلا رہی ہیں، بعض ملکوں میں اپنے شہریوں، بلکہ دوسرے ملکوں سے آنے والوں کے لئے اس انشورنس کو لازم قرار دے دیا گیا ہے۔

(تلخیص ماخوذ از جاری شدہ خط)۔

انشورنس موجودہ زمانے کا کوئی نیا فقہی مسئلہ نہیں ہے بلکہ ایک تاریخ ہے جس کی تفصیل کتابوں کے صفحات میں موجود ہے، علمائے اسلام اور فقہائے کرام میں اولین عالم دین اور فقیہ شیخ ابن عابدین (متوفی ۱۲۵۲ھ مطابق ۱۸۳۶ء) کو اس مسئلہ پر گفتگو کا موقع ملا اور انہوں نے اپنے فتوی میں انشورنس اور اس کے کاروبار کو ممنوع اور ناجائز قرار دیا (حاشیہ ابن عابدین ۴/ ۱۷۰)، پھر شیخ ابن عابدین کے بعد علماء، فقہاء اور باحثین نے اس موضوع پر گفتگو کی اور غور وخوض کے بعد بعض علماء وفقہاء نے تجارتی انشورنس کی جملہ صورتوں کو حرام ٹھہرایا، بعض نے ہر صورت کو مباح وجائز قرار دیا، بعض نے میانہ روی اختیار کی اور کچھ صورتوں کو مباح وجائز اور کچھ صورتوں کو ممنوع قرار دیا، بعض نے اس کے متعلق گفتگو نہ کر کے توقف اختیار کرنے کو بہتر سمجھا۔

انشورنس کا مفہوم:

انشورنس کا لغوی معنی: انشورنس عربی لفظ ''التامین'' اور اردو لفظ ''بیمہ'' کا انگریزی ترجمہ ہے، جس کے معنی لغت میں یقین دہانی اور تحفظ وضمانت کرنے کو کہتے ہیں۔

شیخ الحدیث علامہ عبید اللہ رحمانی مبارکپوریؒ لکھتے ہیں کہ کمپنی چونکہ بیمہ کرانے والوں کو مستقبل کے بعض خطرات سے حفاظت اور بعض نقصانات کی تلافی کی یقین دہانی کر دیتی ہے، اس لئے اس سے انشورنس (INsurance) کمپنی کہتے ہیں (بیمہ (انشورنس) کی شرعی حیثیت اسلام کی نظر میں/ ۷)۔

انشورنس کا اصطلاحی مفہوم: علماء نے انشورنس کی متعدد تعریفیں کی ہیں، ''مصری'' قانون مدنی کی دفعہ (747) میں انشورنس کی تعریف یوں کی گئی ہے کہ یہ ایک ایسا معاہدہ ہے جس کی رو سے تحفظ دینے والے پر یہ لازم ہوجاتا ہے کہ وہ اس شخص کو جس نے پالیسی خریدی ہے، یا وہ مستفید جس کی خاطر یہ پالیسی خریدی گئی ہے کو ایک مخصوص رقم یا طے شدہ منافع یا کوئی دوسرا مالی معاوضہ حادثہ یا معاہدہ میں بیان کردہ نقصان کے پہنچنے کی صورت میں بیمہ دار کی طرف سے تحفظ فراہم کرنے والے کو ادا کردہ قسط یا کسی دوسری مالی ادائیگی کی نسبت سے ادا کرے (حکم الشریعۃ الاسلامیہ فی عقود التامین (اردو نسخہ)/ ۱۶)۔

''اردن'' کے سول قانون کی دفعہ (920) میں انشورنس کی تعریف معمولی اختصار کے ساتھ ان الفاظ میں آئی ہے کہ انشورنس ایک ایسا معاہدہ ہے جس کی رو سے تحفظ فراہم کرنے والے پر لازم ہے کہ وہ بیمہ دار کو یا اس مستفید کو جس نے اپنے فائدہ کے لئے انشورنس کی شرط لگائی ہے، ایک مخصوص رقم یا طے شدہ منافع یا کوئی دوسرا مالی معاوضہ بیمہ دار کے حادثہ سے دوچار ہونے کی صورت میں یا اسے معاہدہ کے اندر مذکور خطرات کے لاحق

[1] ادارہ تحقیقات اسلامی، دودھ پور (علی گڑھ)۔

ہونے کی صورت میں ادا کرے جب کہ قبل ازیں بیمہ دار نے تحفظ فراہم کرنے والے کو اس کے بالمقابل ایک متعین رقم یا متعینہ قسط میں مالی ادائیگی کردی ہو۔

(المذكرة الايضاحية للقانون المدني الاردني ۲/ ۶۱۵)۔

انشورنس کی مذکورہ دونوں تعریفوں سے جو کچھ ظاہر ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ ایک شخص جسے بیمہ دار یا پالیسی خریدنے والا کہا جاتا ہے، وہ ایک اور شخص سے معاہدہ کرتا ہے جسے تحفظ فراہم کرنے والا کہتے ہیں (اور اکثر اوقات ایسا معاہدہ کرنے والی شراکتی کمپنی ہوتی ہے) اس شرط پر کہ پہلا شخص اس کمپنی کو قسط وار یا یکمشت ایک مخصوص رقم ادا کرے جس کے مقابلے کمپنی یہ ذمہ داری لے گی کہ وہ خود اسے یا اس شخص کو جسے یہ متعین و نامزد کردے (جسے مستفید کہا جاتا ہے) حادثہ سے دوچار ہونے یا معاہدہ کے اندر مذکور خطرات کے لاحق ہونے کی صورت میں ایک مخصوص رقم یا طے شدہ منافع یا کوئی دوسرا مالی معاوضہ ادا کرے گی۔

انشورنس کی مذکورہ تعریفات وتشریحات سے اس کے تین بنیادی عناصر کا علم ہوتا ہے جن کے بغیر انشورنس کا تحقق نہیں ہوسکتا اور وہ عناصر شارحین قانون کی صراحت کے مطابق یہ ہیں: خطرہ جسے تحفظ دیا جاتا ہے، انشورنس کی رقم، اور اس کی قسط۔

بہر حال ہندوستان میں مسلمانوں کے لئے سودی کاروبار کرنا اور سود لینا و دینا جائز نہیں ہے اور چونکہ انشورنس چاہے وہ ''لائف انشورنس'' ہو یا ''میڈیکل انشورنس'' یا کوئی دوسرا انشورنس ایک سودی کاروبار کا نام ہے، لہذا ہمارے نزدیک حرام ہے۔ تمام مسلمانوں کو چاہئے کہ اسے پرہیز کریں۔

میڈیکل انشورنس میں جمع کردہ رقم سے زیادہ مالیت کے علاج سے مستفید ہونے کا حکم:

گذشتہ سطور میں یہ بات آچکی ہے کہ ہمارے نزدیک میڈیکل انشورنس کرانا حرام ہے، لہذا صحت بیمہ کرانے والا جو رقم جمع کرتا ہے اور پھر ضرورت پر اس سے کہیں زیادہ مالیت کے علاج سے مستفید ہوتا ہے اس کا یہ مستفید ہونا بھی ہمارے نزدیک از روئے شرع ناجائز و حرام ہے، اس لئے کہ صحت بیمہ کرانے والا شخص جس کاروبار کی زیادہ مالیت سے مستفید ہوتا ہے وہ کاروبار ہی از روئے شرع درست نہیں ہے، لہذا زیادہ مالیت سے مستفید ہونا کیونکر درست ہوگا، نیز زیادہ مالیت سود ہے جو حرام ہے۔

سرکاری ونجی انشورنس اداروں سے فائدہ اٹھانے کا حکم:

سرکاری ونجی اداروں میں مقصد کا جو فرق ذکر کیا گیا ہے اس کی بنیاد پر ''سرکاری میڈیکل انشورنس'' کے ادارے سے فائدہ اٹھانے کا حکم دوسرے اداروں سے مختلف نہیں ہوگا، بلکہ دونوں کا حکم ایک ہوگا، اس لئے کہ دونوں کے کاروبار کے اصول وضوابط اور طریقہ یکساں ہیں از روئے شرع جو قباحتیں نجی انشورنس اداروں میں پائی جاتی ہیں وہ قباحتیں سرکاری انشورنس اداروں میں بھی پائی جاتی ہیں، عوام کو سماجی تحفظ فراہم کرنا یہ تو حکومت کی ذمہ داری اور اس کا فریضہ ہے جو انشورنس اداروں کی وساطت سے کبھی بھی انجام نہیں دیا جاسکتا، اور نہ ہی انجام دیا جاتا ہے، کیونکہ جو بھی سرکاری انشورنس ادارے ہوتے ہیں وہ انہی عوام کو حادثات سے دوچار ہونے کی صورت میں اضافی مالیت سے مستفید کرتے ہیں جو بیمہ دار ہوتے ہیں کوئی ایک بھی مثال آج تک اس طرح کی سامنے نہیں آئی ہے کہ کسی بھی سرکاری انشورنس ادارے نے کسی ایسے شخص کے ساتھ مالی تعاون کیا ہو جو اس کا بیمہ دار نہ ہو، لہذا ہمارے نزدیک سرکاری ونجی اداروں میں بظاہر مقصد کا جو بھی فرق رکھا گیا ہو، دونوں کا حکم یکساں ہوگا۔

انشورنس اداروں کی رقم کو امداد وتعاون کا درجہ دینا:

سرکاری انشورنس ادارہ جو علاج کی ضرورت پر مطلوبہ یا مقررہ رقم دیتا ہے اس کو سرکار کی طرف سے امداد وتعاون کا درجہ نہیں دیا جاسکتا ہے، شیخ الحدیث علامہ عبید اللہ رحمانی مبارکپوریؒ فرماتے ہیں کہ ''خود کمپنی اس کو امداد واعانت اور احسان وتبرع سمجھ کر نہیں، بلکہ بیمہ دار کا اپنے اوپر لازمی وواجبی حق سمجھ کر دیتی ہے، محض کسی کے قرض لینے سے ضروری چیز غیر ضروری اور غیر ضروری چیز ضروری ہوجایا کرے تو ضروری اور غیر ضروری کا ضابطہ اور فرق ختم ہوجائے گا، نیز تبرع واحسان اور حسن سلوک مشروط نہیں ہوا کرتا، اور کمپنی اپنے قواعد وضوابط کے مطابق اس رقم کے دینے کی شرط کرلیتی ہے اور اس

شرط کے مطابق ادائیگی کی قانوناً پابند ہوتی ہے۔

(بیمہ (انشورنس) کی شرعی حیثیت اسلام کی نظر میں/ ۲۸)۔

انشورنس کی لعنت سے بچنے کی متبادل صورت:

چونکہ ہماری نگاہ میں ''میڈیکل انشورنس'' کی صورت وشکل جائز نہیں ہے، اس بنا پر ہمارا کہنا ہے کہ اس لعنت سے محفوظ رہنے کے لئے ملکی، صوبائی، ضلعی، شہری وقصباتی اور مقامی شکل میں مسلم رفاہی تنظیمیں بلا اختلاف مسلک ومذہب قائم کی جائیں، ان تمام تنظیموں کے مابین روابط قائم ہوں، مقامی اور شہری وقصباتی شکل کی تنظیمیں ضلعی تنظیموں کے، ضلعی تنظیمیں صوبائی تنظیموں کے اور صوبائی تنظیمیں ملکی ومرکزی تنظیم کے ماتحت ہوں، ملک کے تمام روساء واغنیاء، تجار، اصحاب مال، اصحاب دکان اور کمانے والے لوگوں کو ان تنظیموں سے جوڑا جائے اور غریب سے غریب مسلم فرد وگھر پر بھی لازم قرار دیا جائے کہ کم از کم ایک روپیہ وہ ہر مہینہ اپنی قریبی تنظیم کو ادا کیا کرے، یقیناً اس طرح سے رفاہی تنظیموں کے پاس کثیر رقم ہر وقت جمع رہا کرے گی، جن کو صرف ان غریب اور نادار مسلمانوں پر خرچ کیا جائے جو بیمار پڑنے پر علاج ومعالجہ کے اخراجات کو خود برداشت کرنے سے قاصر ہوں، اس طور پر غریبوں کے لئے گراں علاج کی سہولت فراہم ہوسکتی ہے اور ''میڈیکل انشورنس'' کی لعنت سے بھی محفوظ رہا اور رکھا جاسکتا ہے۔

میڈیکل انشورنس کرانا لازمی ہو تو اس کا حکم:

جن ممالک میں ''میڈیکل انشورنس'' وہاں کے شہریوں یا وہاں جانے والوں کے لئے لازم کردیا گیا ہے ان ملکوں میں میڈیکل انشورنس کرانا اضطراری حالت یا فقہی قاعدہ: ''الضرورات تبیح المحظورات'' کے تحت آسکتا ہے، لیکن واضح رہے کہ اضطراری حالت میں اس کو جائز قرار دینے کا قیاس صحیح نہیں ہے، مشہور عالم دین مفتی حبیب الرحمن فیضیؒ اپنے ایک استفتاء کے جواب میں رقم طراز ہیں کہ مجوزین بیمہ کا یہ کہنا کہ اضطراری حالت میں جائز ہے تو یہ قیاس صحیح نہیں ہے، بلکہ صریح غلط فارق وفاسد ہے، کیونکہ خنزیر اور میتہ میں اضطرار کا ذکر موجود ہے اور سود وربا کے بیان میں حالت اضطرار کا قرآن کریم میں کوئی ذکر نہیں ہے اور جو اشیاء محرمات سے ہیں، حالت اضطراری میں قدر قلیل بطور قوت لایموت رکھی گئی ہیں، سود میں ہرگز یہ صورت جائز نہیں ہے، نیز یہ کہ اشیاء محرمہ جو حالت اضطرار میں جائز ہیں ان کی مقدار نہایت قلیل ہے تو سود جب بحالت اضطرار بالفرض جائز بھی ہو تو اس کی مقدار بھی نہایت قلیل ہوگی، حالانکہ یہ عرفاً ممکن نہیں ہے، اس لئے بیمہ کرانا ہرگز جائز نہیں ہے (مجلۃ اللسان، اکتوبر ۱۹۹۷ء)۔

اور فقہی قاعدہ: ''الضرورات تبیح المحظورات'' کے تحت بیمہ کو جائز قرار دینے کے متعلق مفتی موصوف رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ ''واضح ہو کہ یہ اصول اشیاء غیر منصوص میں اگر چل سکتا ہے تو اشیاء منصوص میں ہرگز جائز نہ ہوگا، اگر اسی طرح ضرورت کی بنا پر ناجائز کو جائز قرار دیا جاتا ہے تو کوئی چیز ناجائز باقی نہیں رہے گی، خواہ وہ منصوص ہو یا غیر منصوص'' (حوالہ مذکور)۔

لہٰذا اس ملک کے مسلم شہریوں کو جس ملک میں وہاں کے شہریوں کے لئے ''میڈیکل انشورنس'' کرانا لازم کردیا گیا ہے، اس قانون کے خلاف اعتدال اور مثبت انداز میں آواز اٹھانی چاہئے یا کم از کم مسلمانوں سے اس طرح کے قانون کی پابندی کرانے کو ختم کرانے کی کوشش کرنی چاہئے، لیکن اس کے باوجود اگر نجات کی کوئی سبیل نظر نہ آئے تو قانونی مجبوری کے تحت (حکومت کے امر کی خلاف ورزی سے بچتے ہوئے) ''میڈیکل انشورنس'' کراسکتا ہے، اور اس وقت یہاں ''ارتکاب أھون الضررین'' کا قاعدہ جاری ہوسکتا ہے (الاشباہ والنظائر، از سیوطی/ ۸۷، الاشباہ والنظائر، از ابن الوکیل ۲/ ۱۶۰)۔

البتہ بیمار پڑ جائیں تو افضل واحوط یہ ہے کہ میڈیکل انشورنس کی طرف سے دی جانے والی سہولت (سود) سے اجتناب کریں، لیکن اگر اس سہولت سے مستفید ہونے کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ علاج ومعالجہ کے لئے نظر نہ آئے تو پھر اس سے مستفید ہوا جاسکتا ہے۔

☆☆☆

صحت بیمہ

مولانا محمد ارشد فاروقی [1]

۱- میڈیکل انشورنس کرانے کا کیا حکم ہے؟

عمومی احوال میں صحت بیمہ کرانا شرعی اصولوں کے خلاف ہے، اس لئے ناجائز ہے، صحت بیمہ کے عقد کا تجزیہ کیا جائے تو یہ کئی ممنوع چیزوں پر مشتمل ہے:

۱- عاقد کی مستقبل میں بیماری موہوم ہے جو تقاضائے عقد کے خلاف ہے۔

۲- عاقد کے بیمار ہونے کی صورت میں جمع کی گئی رقم سے اگر زائد صرفہ علاج پر آتا ہے تو یہ سود ہے اور اگر عاقد بیمار نہیں ہوا تو جمع شدہ رقم سے ہاتھ دھو بیٹھا، یہ میسر وجوا ہے، اس کے علاوہ اس عقد میں دھوکہ بھی ہے تو سود میسر وغرر پائے جانے کے باعث صحت بیمہ کی اجازت عمومی احوال میں نہیں دی جاسکتی، جہاں تک بات باہمی تعاون اور جذبہ خیر کی کی جاتی ہے تو اول اس کے ذرائع وتدابیر پر جواز کے حدود بہت ہیں، ورنہ نفس نفع کا پایا جانا تو میسر میں بھی ہے

إثمهما أكبر من نفعهما۔

۲-صحت بیمہ کرانے والے علاج کی صورت میں کمپنی کی زائد رقم استعمال کرتا ہے تو کیا حکم ہے؟

پہلے سوال کے جواب زائد رقم کو سود تسلیم کیا گیا ہے، اس لئے استعمال درست نہیں، لیکن اگر عاقد کا مرض مہلک ہے اور اس زائد رقم کے علاوہ علاج کی کوئی صورت نہیں ہے تو بوجہ ضرورت بقدر ضرورت اس رقم زائد سے فائدہ اٹھا سکتا ہے اور جب گنجائش ہو تو زائد استعمال شدہ رقم واپس کردے، واپسی میں دشواری ہو تو صدقہ کردے۔

۳-سرکاری ونجی صحت بیمہ اداروں میں کیا فرق ہے؟

دونوں اداروں کے طریقہ کار ایک ہیں، اس لئے دونوں کا حکم بھی ایک ہے، اگر سرکاری ادارے کی بابت یہ کہا جائے کہ زائد رقم سرکاری عطیہ وتعاون ہے تو بیمار نہ ہونے کی صورت میں جو اصل رقم سوخت ہو جاتی ہے اس کی تاویل کیا ہوگی؟ اس لئے میسر وغرر کی بنیاد پر سرکاری ادارے سے صحت بیمہ کرانا ناجائز ہوگا۔

۴-سرکاری انشورنس ادارہ جو علاج کی ضرورت پر مطلوبہ یا مقررہ رقم دیتا ہے اس کو سرکار کی طرف سے امداد وتعاون کا درجہ دیا جاسکتا ہے؟

سرکاری ادارہ جو علاج کی ضرورت پر زائد رقم دیتا ہے اس کو تعاون نہیں قرار دیا جاسکتا، کیونکہ تعاون کی تعریف صادق نہیں آتی یہ زائد رقم ایک ایسے عقد کے نتیجہ میں مل رہی ہے جو سود غرر پر مشتمل ہے، البتہ وقت ضرورت بقدر ضرورت استعمال کی اجازت ہوگی۔

۵-میڈیکل انشورنس کا شرعی متبادل کیا ہے؟

---

[1] نائب رئیس جامعہ امام ابن تیمیہ، مدینۃ السلام مشرقی چمپارن، بہار۔

اگر اسلامی نظام کا قیام ہوتا ہے تو بیت المال مریضوں کا علاج کرنے کا نظم عدم استطاعت کی صورت میں کرے گا۔

ہندوستان جیسے ملک میں باہمی تعاون کے ذریعہ یہ کام انجام پائے گا جس کی مختلف صورتیں ہیں، ہر گاؤں اور ہر شہر کے اصحاب خیر ضرورت مندوں کے علاج کے لئے ایک فنڈ مختص کریں، باہمی تعاون سے معیاری ہسپتال بنائے جائیں جن میں ضرورت مندوں کا علاج مفت کیا جائے اور باحیثیت لوگوں کے علاج سے جو فائدہ ہو اس کو غریبوں کے علاج معالجہ پر خرچ کیا جائے۔

ایک شہر کے لوگ چٹ فنڈ کے ذریعہ ہر وقت خطیر رقم جمع رکھ سکتے ہیں کوئی بیمار پڑ جائے تو اس کے علاج پر یکمشت رقم لگائی جاسکے اور پھر ہر ممبر کو جمع کی ہوئی رقم دیر سویر واپس ہو جائے۔

۶-جن ممالک نے میڈیکل انشورنس کو لازمی قرار دیا ہے وہاں جانے والوں کے لئے کیا حکم ہے؟

جن ملکوں نے داخل ہونے والے کے لئے صحت بیمہ کرانا ضروری قرار دیا ہے وہاں جانے والوں کے لے صحت بیمہ کرانا ضرورت شرعی کی بنیاد پر درست ہوگا اور بوقت ضرورت بقدر ضرورت زائد رقم کا استعمال بھی درست ہوگا، البتہ اگر ان ملکوں میں داخل ہونے والے باحیثیت و بااثر ہوں تو اس نظام کو بدلنے کا مشورہ حکمرانوں کو ضرور دیں۔

☆☆☆

میڈیکل انشورنس کی شرعی حیثیت

مفتی اقبال احمد قاسمی[1]

۱- ''میڈیکل انشورنس'' اپنی ہیئت کے اعتبار سے ایک تعاونی بیمہ ہے، تعاونی بیمہ کے جواز پر تقریباً فقہاء کا اتفاق ہے، اور یہ عقد تبرع کی ایک قسم ہے جس کا مقصد اصلی نقصانات کی تقسیم اور مصیبت زدہ کے راحت رسانی میں اشتراک ہے، اس کے لئے جو لوگ رقومات جمع کر کے حصہ دار بنتے ہیں وہ نقصان رسیدہ شخص کے معاون ثابت ہوتے ہیں، تعاونی بیمہ گروہ کا مقصد نہ تجارت ہوتا ہے نہ دوسروں کے مال سے حصول نفع، بلکہ اپنے درمیان نقصانات کی تقسیم اور اس کی تلافی مقصود ہوتی ہے اس میں جو کمی ہوتی ہے وہ کمپنی یا حکومت اس کو پورا کرتی ہے، تعاونی بیمہ میں ''ربا ء الفضل'' اور ''ربا النسیئہ'' بھی نہیں ہوتا، رہا غرر وخطرہ کہ نہ معلوم اس کا فائدہ کس کو پہنچے؟ تو یہ اس لئے جواز میں مضر نہیں کہ غرر ان معاملات میں ممنوع ہے جن میں دونوں طرف سے عوض یا قرض کا تبادلہ ہو، تبرعات میں غرر سے کوئی نقصان نہیں، اور یہاں یہ عقد تبرع ہی ہے۔ ''المجمع الفقہ الاسلامی مکہ مکرمہ'' کے فقہی فیصلوں منعقدہ ۱۰ / شعبان ۱۳۹۸ھ میں اس کے یعنی تعاونی بیمہ کے جواز پر علماء کا اتفاق ہو چکا ہے۔ (فقہی فیصلے/ ۳۸)۔

۲- علاج معالجہ کے معاملہ میں شریعت نے ممنوعات ومحرمات کے ارتکاب کے لئے لچک رکھی ہے اور انسانی زندگی کے تحفظ اور اس کی صحت کے بچاؤ کے لئے بہت سے مواقع میں ناجائز چیزوں کو جائز رکھا گیا ہے، مثلاً سونے کا استعمال مردوں کے لئے ممنوع ہے، لیکن دانتوں کی بیماری میں سونے کے تاروں سے دانت باندھنے کی اجازت ہے، اسی طرح ریشمی کپڑا منع ہے لیکن خارش کی وجہ سے اس کو پہننے کی اجازت ہے، امام ابو یوسفؒ کے نزدیک بیمار کے لئے خون وپیشاب کا پینا اور مردار کا کھانا ازراہ علاج جائز ہے، بشرطیکہ کسی مسلمان طبیب نے اس میں شفایابی کی اطلاع دی ہو، اور جائز چیزوں میں اس کا کوئی بدل نہ ہو، یہی مالکیہ اور حنابلہ کا قول ہے (معارف السنن ۱/ ۲۷۹، عالمگیریہ ۵/ ۳۵۵)۔

علاج کے معاملہ میں شریعت کی نرم روش کا بھی تقاضا ہے کہ میڈیکل انشورنس میں اگر خرابی بھی ہے، لیکن علاج میں یہ طریقہ مشکل کو آسان بناتا ہے تو اس کو جائز قرار دیا جانا چاہئے۔

۳- موجودہ دور میں جبکہ مسلمانوں کے مجموعی حالات اور ضروریات کی بنا پر بہت سی چیزوں میں ضرورتاً جواز نکالا جا رہا ہے اور ہندوستانی مسلمانوں کے لئے مطلق بیمہ کے جواز کے فیصلے تک کئے جا چکے ہیں، ایسی صورت حال میں میڈیکل انشورنس (جس کو تعاونی بیمہ کی قسم مانا جاتا ہے) اگر تعاونی بیمہ نہ بھی ہو تو حاجت وضرورت کے درجہ میں ہونے کی وجہ سے جواز کا حکم پانے کا مستحق ہے۔

امام محمدؒ کی تصریح کے مطابق ایسے ملک میں جو اصلاً ''دار الحرب'' ہو، لیکن اہل اسلام سے اس کی مصالحت ہو گویا اس کی حیثیت ''دار المعاہدہ'' کی ہو جائے تو ان سے عقود فاسدہ کے ذریعہ مال ونفع کا حصول مسلمان کے لئے جائز ہے۔

''فلو أن أهل دار من دار الحرب وادعوا أهل الإسلام فدخل إليهم مسلم وبايعهم بالدرهمين لم يكن بذلك بأس؛ لأن بالموادعة لم تصر دارهم دار الإسلام'' (الشرح الکبیر ۴/ ۱۴۹۳)۔

(اگر دار الحرب کے لوگ اہل اسلام سے صلح کر لیں پھر کوئی مسلمان ان کے ملک میں جائے اور دو درہم کے بدلے ایک درہم خرید کرلے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں، اس لئے کہ مصالحت کی وجہ سے ان کا ملک دار الاسلام نہیں بن جاتا)۔

خلاصہ یہ کہ ''میڈیکل انشورنس'' اولاً ممنوع بیمہ کے تحت داخل نہیں، ثانیاً علاج معالجہ میں بہت سی ممنوعات حد جواز میں آجاتی ہیں، ثالثاً

[1] سرائے میر، اعظم گڑھ۔

میڈیکل انشورنس اگر ممنوع بیمہ کی ایک قسم ہو تو بھی ہندوستانی سماج میں بربنائے حاجت وضرورت اس کی گنجائش ہوگی۔

لہذا موجودہ حالات میں مذکورہ بالا تفصیلات کی روشنی میں میڈیکل انشورنس جائز ہے، اس اصل حکم کے بعد باقی جزئیات کا حکم نمبروار حسب ذیل ہے:

۱- میڈیکل انشورنس کے جواز میں یہ تفصیل ہے کہ وہ غیر مستطیع حضرات جو علاج کی حیثیت نہیں رکھتے ان کے لئے بربنائے حاجت میڈیکل انشورنس کرانا تو جائز ہے، مستطیع اور باحیثیت لوگوں کے لئے جواز اس وقت ممکن ہے جب اس کو تعاونی بیمہ کی ایک قسم تسلیم کرلیا جائے، ورنہ اس کا جواز ضرورت تک محدود رہے گا۔

۲- جن کے لئے میڈیکل انشورنس کرانے کی اجازت ہے ان کے لئے اس کے نتیجے میں علاج سے مستفید ہونا بھی جائز ہے۔

۳- ضرورت مند کا مقصد میڈیکل انشورنس کرا کر علاج کی سہولت حاصل کرنا ہے، کمپنیوں کے مقاصد کے اختلاف سے انشورنس کرانے والے کے لئے حکم نہ بدلے گا اور ''الامور بمقاصدھا'' کی بنا پر خود کمپنیوں کی نیت کے اعتبار سے کمپنی جائز یا ناجائز کام کی مرتکب کہلائے گی محض نفع خوری کی نیت ہوگی تو بیمہ کا یہ کاروبار حرام ہوگا، ورنہ جائز رہے گا۔

۴- سرکاری یا غیر سرکاری ادارے علاج کے لئے مریض پر اس کی جمع سے زائد رقم جو خرچ کرتے ہیں یہ ادارہ کی طرف سے مریض کا تعاون ہے، اس لئے جائز ہے۔

۵- میڈیکل انشورنس کی موجودہ شکل بھی تعاونی بیمہ ہونے کے باعث حد جواز میں ہے، لیکن جو بالکل غریب افراد ہیں ان کے لئے استفادہ کی اس میں کوئی راہ نہیں، یعنی جو انشورنس کرانے کی بھی اہلیت نہیں رکھتے وہ علاج سے بھی محروم ہیں، اس لئے ایسے غریب افراد کے لئے بھی اسکیم میں کوئی ترتیب بنانی چاہئے، یا کم از کم مخصوص فنڈ اور صدقات وخیرات کا ایک حصہ اس میں فراہم کرکے غریبوں کے لئے گراں علاج کی سہولت فراہم کرنی چاہئے تا کہ اصل مقصد کی تکمیل ہو سکے۔

۶- ''جبری انشورنس'' میں انسان مجبور ہے اس میں مجبوری کے تحت آنے والے افراد تو معذور ہی ہیں، لیکن جبکہ انشورنس کرانا ہی جائز ہے تو مجبور وغیر مجبور سب کے لئے گنجائش ہے، اور گراں علاج سے بچنے کی سہولت کا فائدہ اٹھانا بھی جائز ہے، خصوصاً حاجت مند افراد کے لئے جواز واضح ہے۔

☆☆☆

میڈیکل انشورنس اور اس کا شرعی حکم

مفتی سعید الرحمن قاسمی[1]

میڈیکل انشورنس (صحت بیمہ) سے متعلق بھیجے گئے سوالات کے جوابات بالترتیب قلم بند کئے جا رہے ہیں:

۱- عام حالات میں میڈیکل انشورنس کرانا شرعاً ناجائز وحرام ہے اس لئے کہ یہ قمار (جوا) سود اور غرر پر مشتمل ہے اور یہ تینوں چیزیں شریعت اسلامیہ کی نظر میں ناجائز وحرام ہیں۔ اس میں قمار (جوا) اس طور پر حرام ہے کہ پالیسی ہولڈر ایک موہوم بیماری کے علاج ومعالجہ کے لئے ایک متعینہ رقم جمع کرتا ہے اگر وہ اس مدت متعینہ کے اندر بیمار نہیں پڑتا ہے تو پالیسی ہولڈر کو اس کی جمع شدہ رقم واپس نہیں ملتی ہے اور یہی قمار ہے اور اس کی حرمت نص قطعی سے ثابت ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

یاأیہا الذین آمنوا إنما الخمر والمیسر والأنصاب والأزلام رجس من عمل الشیطان فاجتنبوہ لعلکم تفلحون (المائدہ:۹۰)۔

(اے ایمان والو! شراب، جوا پوجا کے بت اور جوئے کے تیر یہ سب شیطان کے گندے اعمال ہیں، لہذا تم ان سے پرہیز کرو تاکہ کامیاب ہوجاؤ)۔

اور اس پالیسی کے اختیار کرنے میں سود اس طور پر ہے کہ جو رقم جمع کی جاتی ہے بیمار پڑنے پر اس سے زیادہ رقم کے ذریعہ علاج ومعالجہ کرانے کا معاہدہ ہوتا ہے اور یہی سود ہے، اس لئے کہ زائد رقم سے جو استفادہ کیا جائے گا وہ خالی عن العوض ہے اور اس کی حرمت بھی نص قطعی سے ثابت ہے، حق سبحانہ وتعالیٰ کا ارشاد ہے:

أحل اللہ البیع وحرم الربا (سورۂ بقرہ:۲۷۵)۔

(اللہ رب العزت نے خرید وفروخت کو حلال قرار دیا اور سود کو حرام)۔

اور اس پالیسی میں غرر (دھوکہ) یہ ہے کہ یہ معاملہ ومعاہدہ امکانی خطرے کے پیش نظر ہوتا ہے جو موہوم ہے یعنی فی الواقع پیش آ بھی سکتا ہے، اور نہیں بھی آسکتا ہے اور اسی کا نام غرر ہے جس کی ممانعت حدیث شریف سے بالکل واضح ہے۔

''نھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن بیع الحصاۃ وعن بیع الغرر'' (صحیح مسلم)۔

(رسول اللہ ﷺ نے کنکری کے ذریعہ بیع اور غرر کی بیع سے منع فرمایا ہے)۔

۲-۳-۴- اگر کسی شخص نے بیمہ کرایا ہے تو وہ اپنی جمع شدہ رقم ہی سے استفادہ کرسکتا ہے اس سے زائد رقم سے استفادہ اس کے لئے جائز نہیں ہوگا، اس لئے کہ وہ سود ہے، اور سودی رقم کا حکم یہ ہے کہ اس کو اپنے ذاتی کسی بھی مصرف میں اس کا استعمال نہیں کرسکتے ہیں، بلکہ بلانیت ثواب صدقہ کرنا ہوگا، اور اس کی نظیر کتب فقہ کا وہ جزئیہ ہے جس میں یہ صراحت ہے کہ قرض دے کر اس سے زائد رقم لینے کو ربا قرار دیا ہے۔

''کل قرض جر نفعاً فھو ربا'' (الدر المختار)۔

---

[1] مدرسہ اشاعت العلوم، کانپور

لیکن اگر بیمہ کرانے والا ایسے مہلک مرض میں مبتلا ہو گیا کہ جس کے علاج و معالجہ پر خطیر رقم صرف ہوگی جس کے لئے اس کی جمع شدہ رقم ناکافی ہے اور علاج کرانے کے لئے اسے کوئی قرض دینے کے لئے بھی تیار نہیں ہے اور علاج نہیں کرایا گیا تو جان کی ہلاکت کا ظن غالب ہے تو ایسی صورت میں بدرجۂ مجبوری اس کے لئے اس اضافی رقم سے استفادہ جائز ہونا چاہئے جس طرح سے کہ مضطر کے لئے جان بچانے کی خاطر مردار اور خنزیر کے گوشت کے استعمال کی اجازت دی گئی ہے، البتہ صحت یابی کے بعد جو اضافی رقم صرف ہوئی ہے اس کی واپسی لازم و ضروری ہوگی۔

واضح رہے کہ مذکورہ جواب اس صورت میں ہے جب کہ غیر سرکاری ادارہ سے صحت بیمہ کرارہا ہو اور اگر سرکاری ادارہ سے کرایا ہو تو راقم الحروف کی رائے یہ ہے کہ اضافی رقم سے فائدہ اٹھانے کی گنجائش ہونی چاہئے، اس لئے کہ اس صورت میں اضافی رقم سرکار کی جانب سے امداد و تعاون سمجھا جائے گا، کیونکہ ملک کے ہر شہری کو تحفظ دینا اور بوقت ضرورت اس کی امداد و راحت رسانی کے کام انجام دینا سرکار کی ذمہ داری ہے۔

۵- اس کی شرعی اور جائز متبادل صورت یہ ہے کہ جہاں امارت شرعیہ قائم ہے اور وہاں بیت المال کا نظام ہے تمام مسلمان اس میں اپنی زکاۃ، عشر و دیگر صدقات واجبہ کی رقم جمع کریں اور وہاں سے ایسے مریضوں کا علاج کرایا جائے اور جہاں یہ نظام قائم نہ ہو وہاں صوبائی یا ضلعی یا محلہ کی سطح پر اجتماعی طور پر زکاۃ و دیگر صدقات واجبہ کی رقم جمع کی جائے اور وہاں سے مریضوں کی امداد ہو۔

واضح رہے کہ اس تنظیم کا ذمہ دار ایسے افراد کو بنایا جائے جو متدین، امانت دار اور پابند شرع ہوں تاکہ رقم صحیح مصرف میں صرف ہو۔

۶- جن ملکوں میں وہاں کے باشندوں کے لئے صحت بیمہ کروانا لازم و ضروری ہے، وہاں بدرجۂ مجبوری اس کے لئے صحت بیمہ کرانے کی شرعاً اجازت ہوگی، اس لئے اصول فقہ کا مسلمہ ضابطہ ہے:

"الضرورات تبیح المحظورات" (الاشباہ والنظائر)۔

(مجبوریاں ممنوعات کو جائز قرار دیتی ہیں)۔

البتہ اضافی رقم سے فائدہ اٹھانے کے سلسلے میں وہی تفصیل ہے جو جواب نمبر ۲، ۳، ۴ میں تحریر کی گئی ہے۔

☆☆☆

میڈیکل انشورنس

مولانا محمد ابرار خان ندوی[1]

تمہید:

ماحولیاتی عدم توازن، غذائی اشیاء میں ملاوٹ، اخلاقی زوال، دل ودماغ کو نقصان پہنچانے والے مشروبات وماکولات کا استعمال، صحت کو برقرار رکھنے کے لئے ضروری اصول وضوابط کی عدم رعایت کی وجہ سے ایڈز و کینسر اور اس جیسے دیگر مہلک وسنگین امراض پیدا ہوتے جارہے ہیں، تو وہیں دوسری طرف میڈیکل سائنس نے بھی حیرت انگیز حد تک ترقی کی ہے، اور طبی تحقیقات کے ذریعہ مہلک وپیچیدہ ترین امراض کا علاج دریافت کرلیا گیا ہے، البتہ بعض نئے امراض کے علاج تک میڈیکل سائنس کی ابھی رسائی نہیں ہو پائی ہے، لیکن تحقیق وریسرچ کا کام جاری ہے، اور انشاء اللہ ایک دن وہ ضرور آئے گا کہ ان امراض کا علاج دریافت کرلیا جائے گا اس لئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ہے: "ہر مرض کی دوا موجود ہے"

(المستدرک للحاکم مع التلخیص للذہبی ۴/۲۰۰، کتاب الطب، دار المعرفہ بیروت)۔

جدید میڈیکل سائنس نے ان پیچیدہ وسنگین امراض کا علاج تو دریافت کرلیا ہے، مگر جدید طبی ذرائع ووسائل سے علاج اتنا گراں ہے کہ عام ومتوسط آدمی کے بس کی بات نہیں ہے، کسی فرد یا بینک سے سودی قرض لئے بغیر علاج کرانا مشکل ہے، کیونکہ آج انسانی جذبہ تعاون مفقود ہے، اس لئے حکومت نے "میڈیکل انشورنس" (صحت بیمہ) کا پروگرام شروع کیا ہے، تا کہ علاج ومعالجہ آسان ہوسکے۔

حکومت ہند کا انشورنس کا مرکزی ادارہ "جنرل انشورنس کارپوریشن آف انڈیا" ہے، جس کا ایک شعبہ "میڈیکل انشورنس" کا ہے، اور اس شعبہ کو مذکورہ ادارہ کی زیر نگرانی چار ذیلی ادارے چلا رہے ہیں، جو درج ذیل ہیں:

۱- یونائیٹڈ انڈیا انشورنس کمپنی لمیٹیڈ۔

۲- اورینٹل انشورنس کمپنی لمیٹیڈ۔

۳- نیشنل انشورنس کمپنی لمیٹیڈ۔

۴- نیو انڈیا انشورنس کمپنی لمیٹیڈ۔

مذکورہ چاروں اداروں کے اصول وضوابط تقریبا یکساں ہیں۔

میڈیکل انشورنس ایک تعارف:

انشورنس کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ مختلف عمر کے افراد کے لئے الگ الگ انشورنس کی رقم متعین ہوتی ہے، اور ہر سال قسط کی شکل میں ایک متعین رقم جمع کرنی ہوتی ہے، اور اس سال کسی پیچیدہ بیماری میں مبتلا ہونے پر داخل اسپتال شخص کا علاج کمپنی برداشت کرتی ہے، (جس رقم کی زیادہ سے زیادہ حد معاملہ کے وقت متعین ہوتی ہے اس سے علاج کرایا جاتا ہے) اور اس سال بیمار نہ ہونے کی صورت میں جمع کی ہوئی رقم واپس نہیں ملتی ہے، پھر اگلے سال کے لئے مقرر قسط جمع کرنی ہوتی ہے۔

نیز سرکاری انشورنس کمپنیوں کے علاوہ کچھ پرائیوٹ کمپنیاں مثلاً ٹاٹا کی AIG کمپنی، ICICI بینک، HDFC بینک وغیرہ کمپنیاں بھی میڈیکل انشورنس کررہی ہیں، البتہ ان کا مقصد نفع اندوزی ہے، اس لئے ان کی پالیسی بڑی جاذب نظر ولبھانے والی ہے، لیکن ان کی شرائط زیادہ سخت ہیں۔

---

[1] مفتی امارت شرعیہ، پھلواری شریف، پٹنہ

میڈیکل انشورنس کا شرعی حکم:

سرکاری میڈیکل انشورنس کمپنیوں کا مقصد سماجی خدمت، اور پرائیوٹ کمپنیوں کا مقصد نفع اندوزی ہے، لیکن یہاں اس سے بحث نہیں ہے، مقاصد کچھ بھی ہوں اس سے عام لوگوں کو علاج و معالجہ کی سہولت حاصل ہے، بعض امراض کے لئے اتنا پیسہ درکار ہوتا ہے کہ ایک ایسے اسپتال میں جہاں علاج کے لئے تمام سہولیات مہیا ہوں، ہر شخص کے بس کی بات نہیں ہوتی کہ وہ اپنا علاج وہاں کراسکے، لیکن صحت انشورنس کے ذریعہ یہ چیز آسان ہے کہ آدمی صحت کی حالت میں تھوڑی تھوڑی رقم قسطوں میں جمع کرتا ہے اور بیمار ہونے پر اس سے فائدہ اٹھائے۔

سوشل سیکورٹی و سماجی خدمت و تحفظ یہ ایک خوشنما عنوان ہے، ورنہ عملی طور پر اس کا جائزہ بتاتا ہے کہ حکومت کا مقصد خدمت نہیں ہے، اگر مقصد خدمت ہوتا تو غربا اور متوسط طبقے کے وہ افراد جو اپنا علاج کرانے کی استطاعت نہیں رکھتے ہیں حکومت ان کا بالکل مفت علاج کراتی، اور صحت بیمہ کرانے والوں کو بیمار نہ ہونے کی صورت میں پیسہ واپس کرتی۔

میڈیکل انشورنس کے عدم جواز کے کئی اسباب ہیں:

پہلا سبب:

اس میں غرر کثیر پایا جاتا ہے، وہ اس طور پر کہ انشورنس مستقبل میں پیش آنے والی امکانی بیماری پر ہو رہا ہے اور بیماری کا پیش آنا غیر یقینی و موہوم ہے، اور پیش نہ آنے کی صورت میں اس کی جمع شدہ رقم بلاعوض چلی جائے گی، غرض غرر کثیر انشورنس کا جز لاینفک ہے، اور معاملات میں غرر کثیر ناجائز ہے، اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع فرمایا ہے:

"نهى رسول الله صلى الله عليه وسلم عن بيع الحصاة وعن بيع الغرر"

(اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے کنکریوں کے ذریعہ خرید و فروخت کرنے اور دھوکہ والی بیع سے منع فرمایا ہے)۔

علامہ ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں کہ معاملات میں غرر اور ربا یہ دونوں چیزیں ظلم ہیں، اور ظلم حرام ہے، اور کسی بھی معاملہ میں فریقین میں سے ایک کو غرر لاحق ہو تو وہ معاملہ ناجائز ہوگا، علامہ موصوف نے اس پر بڑی عمدہ بحث فرمائی ہے:

(ان عوضی و تقابلی چیزوں میں اصل یہ ہے کہ دونوں جانب برابری ہو، اگر ان میں سے کسی میں غرر یا ربا شامل ہے تو یہ ظلم ہے، اور اللہ نے ان دونوں چیزوں کو حرام قرار دیا ہے، جس نے اپنے اوپر ظلم کو حرام کیا ہے اور اپنے بندوں پر بھی حرام کیا ہے، اگر متعاقدین میں سے ایک قیمت کا مالک ہو جائے اور دوسرے کو غرر لاحق ہو تو وہ معاملہ درست نہیں ہوگا) (مجموعہ فتاوی شیخ الاسلام ابن تیمیہ ۲۹ / ۱۰۷)۔

غرر کثیر کے عدم جواز پر علماء کا اتفاق ہے، بلکہ یہ فقہی قاعدہ بن گیا ہے کہ غرر کثیر سے معاملات نادرست قرار پاتے ہیں۔

"الغرر الكثير يفسد العقود دون يسيرة" (جمهرة القواعد الفقهية ۱/ ۳۷۰، دكتور على احمد ندوى)۔

(غرر کثیر سے معاملات فاسد ہو جاتے ہیں الا یہ کہ وہ معمولی ہو)۔

غرر کی تعریف شیخ شریف جرجانی نے ان الفاظ میں کی ہے:

"الغرر: ما يكون مجهول العاقبة لا يدرى أيكون أم لا"۔

(غرر اس چیز کو کہتے ہیں جس کا نتیجہ مجہول ہو، اس کا وجود عدم وجود معلوم نہ ہو سکے) (كتاب التعريفات لجرجانى / ۱۸۴ دار الرشاد قاهره)۔

۲- دوسرا سبب:

خطر ہے اور خطر و مخاطرہ کہتے ہیں کہ فریقین میں سے کسی ایک کے لئے نفع کی شرط ایسی چیز پر ہو جس کا وجود عدم وجود موہوم ہو۔

تیسرا سبب:

صحت بیمہ کے عدم جواز کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ بیمار نہ ہونے کی صورت میں رقم واپس نہ کرنے کی شرط ہے اور یہ معاملات میں ایسا کرنا قطعا درست نہیں ہے، فقہاء نے تجارت کے اندر معاملہ طے نہ ہونے پر بیعانہ کی رقم واپس نہ کرنے کو ناجائز قرار دیا ہے۔

سابق مفتی اعظم مجاہدین فلسطین شیخ سید سابق (۱۹۱۵-۲۰۰۰ء) فرماتے ہیں:

(بیع عربون کا طریقہ یہ ہے کہ کوئی چیز خریدے اور بائع کو کچھ قیمت ادا کردے، اگر بیع ہوجائے تو وہ قیمت میں شمار کرلیا جائے، اور اگر بیع نہ ہو تو اس کو بائع لے لے گا، اس طور پر کہ وہ مشتری کی جانب سے ہبہ ہے، جمہور فقہاء کا اس بیع کے عدم صحت پر اتفاق ہے، ابن ماجہ نے روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بیع عربون سے منع کیا ہے) (فقہ السنۃ ۳/۱۴۰)۔

میڈیکل انشورنس کمپنی کا رقم واپس نہ کرنا یہ ظلم صریح ہے، اور دوسرے کی رقم کو ناجائز طور پر ضبط کرنا ہے، اور یہ اللہ کے اس فرمان کا مصداق ہے۔

''لا تأکلوا أموالکم بینکم بالباطل'' (سورۂ نساء:۲۹)۔

(آپس میں ایک دوسرے کا مال باطل طریقہ سے نہ کھاؤ)۔

نیز یہ ''میسر'' (جوا) ہے۔ جس کو قرآن نے شیطان کا گندا عمل کہا ہے اور اس سے بچنے کی سخت تاکید کی ہے۔

آیت کی تفسیر میں علامہ ابن القیم الجوزیؒ فرماتے ہیں:

"یاأیہا الذین آمنوا إنما الخمر والمیسر والأنصاب والأزلام رجس من عمل الشیطان، فاجتنبوہ لعلکم تفلحون" (مائدہ:۹۰)۔

(اے لوگو جو ایمان لائے ہو! یہ شراب اور جوا اور یہ آستانے اور پانسے، یہ سب گندے شیطانی کام ہیں، ان سے پرہیز کرو، امید ہے کہ تمہیں فلاح نصیب ہوگی) اس کی تفسیر میں علامہ ابن القیم الجوزیؒ فرماتے ہیں: ''ودخل کل اکل مال بالباطل'' (اعلام الموقعین ۴/۳۳) اس میں ہر وہ مال شامل ہے جو باطل طریقہ سے کھایا جائے۔

میڈیکل انشورنس کی بابت مفتی رشید احمد صاحب کا فتوی:

برصغیر ہندوپاک کی معروف علمی شخصیت مفتی رشید احمد صاحب کا بھی فتوی صحت بیمہ کے ناجائز ہونے کا ہے، استفتاء جواب نقل کئے جاتے ہیں:

سوال: امریکہ میں میڈیکل (علاج معالجہ) کی سہولتیں پرائیویٹ اداروں کے سپرد ہیں، حکومت وقت کی طرف سے لوگوں کے علاج کے لئے ہسپتال وغیرہ کا انتظام نہ ہونے کے برابر ہے، حکومت کا کہنا ہے کہ مریض کو چونکہ اچھے سے اچھے علاج اور دیکھ بھال کی ضرورت ہوتی ہے، اور پرائیویٹ ادارے زیادہ خوش اسلوبی سے علاج معالجہ کی سہولتیں بہم پہنچا سکتے ہیں، عام لوگوں نے علاج کے لئے پرائیویٹ کمپنیوں سے انشورنس (بیمہ) کرایا ہوتا ہے، ضرورت پڑنے پر مریض کے تمام اخراجات انشورنس کمپنی ہسپتال کو ادا کردیتی ہے، انشورنس کمپنی بیمہ کرانے والے سے ماہانہ کچھ رقم وصول کرتی ہے، کیا امریکہ جیسے ماحول اور صورت حال میں اس مقصد کے لئے انشورنس کرانا جائز ہے؟

جواب: جائز نہیں ہے، واللہ اعلم (احسن الفتاوی ۷/۲۵)۔

جمع شدہ رقم سے زائد رقم کا علاج میں استعمال؟

جمع شدہ رقم کی حیثیت قرض کی ہے، اور قرض سے منافع حاصل کرنا ناجائز ہے، اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

''کل قرض جر منفعۃ فھو ربا''۔

(ہر وہ قرض جس سے کوئی فائدہ حاصل ہو وہ سود ہے) (کنز العمال ۶/۲۳۸، حدیث ۱۵۵۱۶، موسسۃ الرسالۃ بیروت)۔

دوسری حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم میں سے کوئی کسی کو قرض دے اور قرض لینے والا اسے کوئی ہدیہ و تحائف پیش کرے تو اس کو مت قبول کرو۔

''إذا أقرض أحدکم قرضا فاہدی إلیہ طبقا فلا یقبلہ أو حملہ علی دابتہ فلا یرکبہا، إلا أن یکون جری بینہ وبینہ قبل ذلک(عن السنن)'' (کنز العمال ۶/ ۲۳۸، حدیث ۱۵۵۱۵)۔

(جب تم سے کوئی کسی کو قرض دے تو وہ (قرض دار) اسے تشتری ہدیہ دے تو اسے چاہئے کہ قبول نہ کرے، یا اسے اپنی سواری پر سوار کرے تو وہ اس میں سوار نہ ہو، الایہ کہ پہلے سے ہی ان کے درمیان اس طرح کا معمول رہا ہو)۔

نیز علامہ ابن عابدین شامیؒ فرماتے ہیں:

(اگر مقروض قرض خواہ کو باعتبار وزن قرض سے زائد واپس دے، تو اگر اتنی زیادتی ہے جو دو وزنوں میں ہوا کرتی ہے اس طور پر کہ وہ ایک میزان میں ظاہر ہو دوسری میں (زیادتی) ظاہر نہ ہو تو جائز ہے، اور ایک یا دو درہم کی مقدار زیادہ ہے، وہ درست نہیں ہے) (ردالمحتار ۴/ ۱۷۴)۔

میڈیکل انشورنس کا پروگرام چلانے والی کمپنیاں مریض کی جمع شدہ رقم سے جو زائد پیسہ اس کے علاج میں صرف کرتی ہیں وہ ربا وسود ہے، دوسری چیز یہ ہے کہ صحت بیمہ کرانے والے بہت سے افراد بیمار نہیں ہوتے اور ان کی رقم ضبط ہوجاتی ہے، تو اس کا علاج دوسروں کی ناجائز طور پر ضبط شدہ رقم سے کیا جارہا ہے اور یہ ناجائز ہے، نیز آج کل بہت زیادہ شرح فیصد پر سودی قرض دینے کا عام رواج ہے، تجار اور بڑی تجارت پیشہ کمپنیاں سودی قرض لیتی ہیں تو امکان قوی ہے کہ یہ کمپنیاں بھی سودی قرض دیتی ہوں گی اور سود کے ذریعہ حاصل ہونے والا زائد پیسہ اس کے علاج میں خرچ کیا جاتا ہوگا، تو سود کا استعمال وہ بھی اپنی رقم پر ملنے والا سود درست نہیں ہے، ورنہ اس دور میں یہ جذبہ تعاون وانسانی ہمدردی ان دولت کے پرستاروں کے پاس کہاں کہ دوسرے کا علاج اپنی محنت کی کمائی سے کریں۔

قانونی مجبوری کے تحت میڈیکل انشورنس کا حکم:

جن ممالک میں داخلہ کے لئے میڈیکل انشورنس قانوناً ضروری ہے، تو جن لوگوں کی آمد ورفت تجارتی مقاصد کے لئے ضروری ہے، اسی طرح دعوت وتبلیغ یا کسی علمی ودینی مجلس میں شرکت کے لئے جانا ضروری ہو، یا مسلم ممالک کے سفراء کا وہاں قیام وداخلہ سفارتی تعلقات برقرار رکھنے کے لئے لازم ہوتا ہے تو ''الضرورات تبیح المحظورات'' (الاشباہ والنظائر لابن نجیم المصری / ۹۴) کے تحت ان تمام لوگوں کے لئے صحت بیمہ کرانے کی اجازت ہوگی، ورنہ اقتصادی، دینی، دعوتی وسفارتی تعلقات کو نقصان پہنچے گا، البتہ سیر وتفریح اور سیاحت کے لئے جانے والوں کے لئے اس کا جواز نہیں ہوگا۔

وہ مسلمان جو وہاں کے مستقل باشندے ہیں یا ان کو حقوق شہریت ملے ہوئے ہیں، ان کے لئے صحت بیمہ قانوناً لازم ہے، ورنہ ملکی قانون کی خلاف ورزی کے الزام میں بہت سی دشواریوں وپریشانیوں میں مبتلا ہونے کا قوی خطرہ ہے اور کسی بھی ملک میں وہاں کے شہریوں پر اس کے ملک کے قانون کی پاسداری لازم ہوتی ہے، لیکن کوئی بھی قانون جو اسلامی احکام سے متصادم ہو اور مزاج شریعت سے میل نہ کھاتا ہے، اس سے مسلمانوں کے لئے اجتناب بھی ضروری ہے، اور جہاں تک ممکن ہو اس طرح کے قانون کے خاتمہ کی جدوجہد کریں، قانون کی منسوخی مشکل ہو تو کم از کم اس سے مسلمانوں کو مستثنیٰ رکھنے کا مطالبہ کریں، اور یہ بھی ممکن نہ ہو تو دل میں اس کو برا سمجھیں۔

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے:

''من رأی منکم منکرا فلیغیرہ بیدہ، فإن لم یستطع فبلسانہ، فإن لم یستطع فبقلبہ. وذلک أضعف الإیمان'' (سنن النسائی بشرح السیوطی ۸/ ۱۱۱، باب تفاضل أہل ایمان، داراحیاء التراث العربی)۔

(تم میں سے کوئی کسی منکر کو دیکھے تو اسے اپنے ہاتھ سے بدل دے، اگر اس کی استطاعت نہ ہو تو زبان سے روک دے اور اگر یہ بھی نہ کرسکے تو دل میں برا سمجھے اور یہ ایمان کا سب سے کمزور درجہ ہے)۔

مگر حالات نامساعد ہوں اور مسلمان اس پوزیشن میں نہ ہوں کہ اس قانون کی مخالفت کرسکیں، بلکہ مخالفت وخلاف ورزی کی صورت میں وہاں مقیم مسلمانوں کے ملی وجود کو خطرہ ہوسکتا ہے، اور آپ کو یہ معلوم ہے کہ موجودہ عالمی نظام میں اجتماعی ہجرت بھی تقریباً ناممکن ہے، لہذا جان ومال اور عزت وآبرو کی حفاظت کی خاطر اور پوری ملت کو اجتماعی ضرر سے بچانے اور حقوق شہریت کو برقرار رکھنے کے لئے صحت بیمہ کرانا مجبوری وضرورت ہے اور ضرورت کے وقت بہت سی ممنوعات کی گنجائش ہوجاتی ہے، انہیں ممنوعات میں سے ایک ممنوع صحت بیمہ ہے۔

علامہ سیوطی نے ضرورت کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے:

''فالضرورة: بلوغه حدا إن لم يتناوله الممنوع هلك أو قارب، وهذا يبيح تناول الحرام'' (الاشباه والنظائر للسیوطی: ۸۵)

(ضرورت کی تعریف یہ ہے کہ وہ اس حد تک پہنچ جائے کہ اگر ممنوع چیز کا استعمال نہ کرے تو ہلاک ہوجائے گا یا ہلاک ہونے کے قریب پہنچ جائے گا تو ایسی صورت میں حرام کا استعمال مباح ہے)۔

علامہ ابن نجیم نے ''الضرر یزال'' کے تحت یہ فروعی قاعدہ تحریر کیا ہے:

''مفسدتان روعي أعظمها ضررا بارتكاب أخفهما'' (الاشباہ والنظائر لابن نجیم / ۹۸، دار الفکر بیروت دمشق)

(جب دو مفسدوں میں تعارض ہوجائے تو زیادہ ضرر والے کے مقابلہ کم ضرر والے مفسدہ کو اپنایا جائے گا)۔

نیز علامہ ابن نجیم مصریؒ نے امام زیلعی کے حوالہ سے یہ عبارت نقل کی ہے:

''أن من ابتلى ببليتين وهما متساويان يأخذ بأيتهما شاء، وإن اختلفا يختار أهونهما؛ لأن مباشرة الحرام لا تجوز إلا للضرورة، ولا ضرورة في حق الزيادة'' (الاشباہ والنظائر / ۹۸)۔

(کوئی آدمی دو آزمائشوں سے دوچار ہو اور وہ دونوں برابر ہوں تو ان میں سے جس کو چاہے اختیار کرلے، اور اگر وہ دونوں مختلف ہوں تو ان میں سے کم مضرت والی کو لے لے گا، اس لئے کہ حرام کا ارتکاب صرف ضرورت کے وقت جائز ہے، اور زیادہ ضرورت میں شامل نہیں ہے)۔

وہاں مقیم مسلمانوں کے لئے ''صحت بیمہ'' سے کوئی مفر نہیں ہے، لہذا ''إذا ضاق الامر اتسع'' (۳) کے تحت اس کی اجازت ہوگی۔

نیز صحت بیمہ کے عدم جواز کی ایک وجہ غرر ہی ہے، اور معاملات میں جب غرر سے بچنا محال ہو تو غرر کے ساتھ معاملہ کرنا درست ہے۔

علامہ ابن قیم جوزی فرماتے ہیں:

''فليس كل غرر سبب للتحريم، والغرر إذا كان يسيرا أولا يمكن الإحتراز منه، لم يكن مانعا من صحة العقد'' (زاد المعاد ۵/ ۸۲۰، مؤسسة الرسالة مكتبة المنار الاسلاميه)۔

ہر غرر حرمت کا باعث نہیں ہوتا ہے، اگر غرر معمولی ہو یا اس سے بچنا ممکن نہ ہو تو معاملہ کے درست ہونے میں وہ مانع نہیں ہوتا ہے۔

خلاصہ کلام یہ کہ جن ممالک میں میڈیکل انشورنس وہاں کے باشندوں یا وہاں سے باہر آنے والوں کے لئے قانونا لازم ہے تو قانونی مجبوری کے تحت اور بہت سے مفاسد سے بچنے کے لئے اس کی اجازت ہوگی، اور بیمار پڑنے پر انشورنس کی سہولت سے فائدہ اٹھانے کی بھی اجازت ہوگی، البتہ اپنی جمع شدہ رقم سے زائد سے مستفید ہونے کی اجازت نہیں ہوگی، اس لئے کہ وہاں صحت بیمہ کرانا قانونی مجبوری ہے، اور وہ مجبوری واضطرار کی حالت میں صرف ضرورت بھر ہی عمل کرنے کی گنجائش ہے۔

سرکاری و پرائیوٹ کمپنیوں کے حکم میں کوئی فرق نہیں:

سرکاری و پرائیوٹ میڈیکل انشورنس کمپنیوں میں جمع شدہ رقم کی حیثیت قرض کی ہے اور قرض سے فائدہ حاصل کرنا ربا وسود ہے، اگرچہ حکومت کی ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ رعایا کی دیکھ ریکھ کرے، اور ان کے علاج معالجہ کی فکر کرے اور انہیں ہر ممکن سہولت بہم پہنچائے، اس لحاظ سے تو حکومت کا اپنی طرف سے اس کے علاج میں زائد رقم خرچ کرنا اور مریض کا اس سے استفادہ جائز ہونا چاہئے، لیکن یہاں یہ مشروط ہے کہ حکومت صرف صحت بیمہ کرانے والوں کو یہ سہولت دیتی ہے جن کا بیمہ نہیں ہے ان کو نہیں، لہذا یہ ''کل قرض جر منفعة فهو ربا'' (کنز الاعمال ۶/ ۲۳۸ حدیث ۱۵۵۱۶) کے تحت داخل ہے۔

تجاویز و مشورے:

میڈیکل انشورنس کے انفرادی واجتماعی زندگی میں کچھ دنیاوی فوائد ضرور ہیں، لیکن اس میں غرر کثیر، قمار اور خطر پایا جاتا ہے جس کی بنا پر یہ ناجائز ہے

اور ظاہری فوائد وسہولیات کے مقابلہ اس کے دنیاوی واخروی نقصانات اتنے زیادہ ہیں کہ اس کے جواز کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

نیز ایسا بھی نہیں ہے کہ میڈیکل انشورنس کی مروجہ صورت کے علاوہ علاج معالجہ بالکل ناممکن ہو یا عموم پایا جاتا ہو کہ اس کو اختیار کرنا ضروری ہو، یہ بھی نہیں ہے۔

شریعت اسلامی جو آفاقی وہمہ گیر شریعت ہے، اس میں زندگی کے تمام مسائل کا حل موجود ہے، حیات انسانی کا کوئی گوشہ نہیں ہے جس میں شریعت رہنمائی ورہبری نہ کرتی ہو، قیامت تک پیش آمدہ مسائل ومشکلات اور نت نئے معاملات کا واضح مفید وقابل قبول حل صرف اور صرف اسلامی شریعت میں موجود ہے۔

غریب ومتوسط طبقہ سے تعلق رکھنے والے جو لوگ اپنے علاج کے مصارف برداشت نہیں کر سکتے ہیں، ان کے علاج ومعالجہ کے لئے شریعت کی تعلیمات کی روشنی میں ایسی شکلیں ممکن ہیں، جن کو اپنانے سے ہر شخص کو علاج کرانا آسان ہوگا، اس سلسلہ میں چند تجاویز پیش خدمت ہیں:

۱- زکوۃ وصدقات سے علاج:

اسلام کے نظام زکوۃ کا بنیادی فائدہ یہ ہے کہ اس سے جہاں مالداروں کا مال پاک ہوتا ہے، وہیں غربا ومساکین کی امداد ونصرت ہوتی ہے، اہل حاجت، پریشان حال، یتیم وبے سہارا، اپاہج ومعذور، بیوہ ومریض اور ضرورت مند کی کفالت ہوتی ہے، لہذا زکوۃ کے مال سے ان کا علاج کرادیا جائے، یعنی بیماروں کو زکوۃ کی رقم دی جائے تاکہ وہ اپنا علاج کرا سکیں، اور اگر زکوۃ کی رقم علاج کے لئے ناکافی ہو تو شریعت نے اصحاب ثروت پر زکوۃ کے علاوہ بھی رقم واجب کی ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

"إن في المال لحقا سوى الزكوة" (سنن الترمذی ۳/۴۸، باب ماجاء ان في المال حقا سوى الزكاة، دار الحديث للازهر قاهره)۔

اور علامہ سید سابق نقل فرماتے ہیں:

(تمام فقہاء اس پر متفق ہیں کہ زکوۃ دینے کے بعد بھی اگر مسلمانوں کو کوئی ضرورت پیش آجائے تو اس میں مال صرف کرنا ضروری ہے، امام مالکؒ کہتے ہیں کہ لوگوں پر اپنے قیدیوں کو فدیہ دے کر چھڑانا واجب ہے، چاہے اس میں ان کا پورا مال لگ جائے، اور یہ اجماع ہے)۔

(فقه السنة ۱/ ۳۶۸، دار الکتاب العربی بیروت)۔

نیز اس کی کوئی حد یا نصاب متعین نہیں ہے، بلکہ دینے والے کی حیثیت اور جس کو دیا جانا ہے اس کی ضرورت کا اعتبار ہے۔

شیخ سید سابق نقل فرماتے ہیں:

(زکوۃ کے علاوہ مال ان اصناف میں خرچ کرنے کے لئے نہ زمانہ کی قید ہے اور نہ ہی کسی مقررہ نصاب کا مالک ہونے کی شرط، اور نہ ہی مملوکہ مال کے اعتبار سے مقررہ مقدار خرچ کرنے کی تعیین ہے، مثلاً دسواں حصہ، یا دسویں کے دسویں کا چوتھائی، بلکہ یہ مطلق احسان کرنے کا حکم ہے جس میں دینے والے کی سہولت و حیثیت اور جسے دیا جارہا ہے اس کی حالت کا اعتبار ہوگا) (فقہ السنۃ ۱/ ۳۶۹)۔

زکوۃ کے علاوہ مالداروں کے مال میں فقراء واہل حاجت کا حق ہے، اگر ضرورت کے وقت ان کا یہ حق نہ دیا جائے تو سرمایہ داران کا حق روکنے کا مجرم اور اس پر زیادتی کرنے کا مرتکب ہے۔

علامہ ابن حزم اندلسی فرماتے ہیں:

"ومانع الحق باغ على أخيه الذي له حق" (المحلى لابن حزم ۶/ ۱۵۹)۔

(اپنے بھائی کو اس کا حق نہ دینے والا اس پر زیادتی کرنے والا ہے)۔

نیز اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

"من لم يهتم بأمر المسلمين فليس منهم" (مجمع الزوائد و منبع الفوائد ۱۰/ ۲۴۸، کتاب الزهد، دار الکتب العربی بیروت)

جو مسلمانوں کے معاملات کی فکر نہ کرے وہ ان میں سے نہیں ہے۔

اور جا بجا اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ان لوگوں کے لئے بددعا بھی فرمائی ہے جو خود تو آسودہ و خوشحال ہوں، اور کوئی مسلمان بھوکا پیاسا رات بسر کرے، ایک حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''أیما أھل عرصۃ أصبح فیھم امرؤجائعا، فقد برئت منھم ذمۃ اللہ'' (الترغیب والترھیب ۲/ ۵۸۲ دار الإیمان دمشق بیروت) (کسی بھی مقام کے باشندے ہوں، اگر ان میں کوئی شخص بھوکے ہونے کی حالت میں صبح کرے تو ان پر اللہ کا ذمہ نہیں ہے)۔

دوسری حدیث میں ہے: (ابو محمد کہتے ہیں، اور کوئی شخص صاحب حیثیت ہو، اور وہ اپنے مسلمان بھائی کو، بھوکا، برہنہ و بے سہارا پائے اور اس کی مدد نہ کرے، تو بلاشبہ اس نے اس پر رحم نہیں کیا) (المحلی لابن حزم ۶/ ۱۵۷)۔

الغرض صاحب حیثیت و اہل ثروت مسلمانوں کی ذمہ داری ہے کہ نادار و غریب مسلمانوں کے علاج و معالجہ کی فکر کریں، اور انہیں بیماری میں تڑپ تڑپ کر اور بلا علاج شدت مرض میں کراہتے ہوئے زندگی گذارنے اور ہلاک ہونے سے بچانے کی کوشش کریں، بلکہ ان پر ایسا کرنا واجب ہے۔

سید سابق فرماتے ہیں: (محترم انسان کو ہلاک اور ضائع ہونے سے بچانا ہر اس شخص پر ضروری ہے جو اس کی قدرت رکھتا ہو، اور جو اس سے بڑھ کر ہے تو اس کی کوئی حد مقرر نہیں ہے) (فقہ السنۃ ۱/ ۳۶۹)۔

۲- اجتماعی مضاربت:

یہ ہے کہ چند افراد مل کر ایک کمیٹی تشکیل دیں اور اس کے جو ممبر مقرر ہوں وہ ہر ماہ معین رقم اس میں جمع کرتے رہیں، اور مضاربت کے اصول کے مطابق اس جمع شدہ رقم سے تجارت کی جائے یا کوئی ایسی کمپنی جو اصول مضاربت کی بنیادوں پر تجارت کرتی ہو اس کے حصص خرید لئے جائیں اور جب کوئی ممبر بیمار ہو تو اس کی جمع شدہ رقم سے اس کا علاج کرادیا جائے، اور اگر بیمار نہ ہو تو اس کے سرمایہ کے فیصد کے حساب سے منافع اس کو دے دیا جائے، اور بالغرض وہ اس منصوبہ و کمیٹی سے الگ ہونا چاہے تو اس کی اصل رقم منافع کے ساتھ واپس کردی جائے۔

۳- انشورنس تعاونی:

ایک صورت انشورنس تعاونی کی ہے: وہ یہ کہ چند افراد مل کر قسط وار ایک مقررہ رقم آپس میں جمع کریں، اور شرکا میں سے جو بیمار ہو اس کی رقم اس کے علاج میں صرف کردیجائے، اور بیمار نہ ہونے کی صورت میں حسب مطالبہ اس کی رقم واپس کردیجائے، شیخ وہبہ زحیلی نے تعاون پر مبنی انشورنس پر بحث کرتے ہوئے اس کے جواز کا فتوی دیا ہے وہ تحریر فرماتے ہیں:

''وتجوز التأمینات الإجتماعیۃ ضد العجز والشیخوخۃ والمرض والتقاعد'' (الفقہ الإسلامی وادلتہ ۴/ ۴۴۲)۔
عاجزی، بڑھاپہ، بیماری اور بے بسی کے مسائل حل کرنے کے لئے اجتماعی انشورنس جائز ہے۔

۴- ارکان کمیٹی کو مالک بنادیا جائے:

ایک صورت یہ اختیار کی جاسکتی ہے کہ، بلکہ ''تعاونوا علی البر والتقوی ولا تعاونوا علی الإثم والعدوان'' اور ''المسلم للمسلم کالبنیان یشد بعضہ بعضا'' کے جذبہ کے تحت چند افراد مل کر باہم رضامندی سے ایک متعین رقم بیٹی یا تنظیم بنا کر جمع کریں اور ہر شخص خوشدلی سے اپنی قسط، ارکان کمیٹی کو تملیکا ادا کرے اس کے بعد ان میں سے کوئی بیمار ہو تو اس کا علاج اس سے کرادیا جائے، مالک بنادینے سے یہ فائدہ ہوگا کہ بعد میں رقم واپس لینے کا اسے اختیار نہیں رہے گا، اور اگر وہ درمیان میں قسط جمع کرنا بند کردے تو اس کی رقم کمیٹی کی ملکیت ہوگی واپس نہیں کرنی پڑے گی، نیز یہ کمیٹی ان لوگوں کے علاج میں معاونت کرسکتی ہے جن کا پیسہ اس میں جمع نہیں ہے۔

☆☆☆

ضرورت کے وقت صحت بیمہ

مولانا رحمت اللہ ندوی[1]

انشورنس مستقبل میں جان و مال کو درپیش خطرہ کو ختم یا اس کے اثرات ونتائج کو کم کرنے کے لئے بیمہ دار اور بیمہ کمپنی کے درمیان ایک معاہدہ کا نام ہے، آج کل اس کی بہت سی صورتیں رائج ہوگئی ہیں، ان میں سے ایک زیر بحث مسئلہ ''میڈیکل انشورنس'' بھی ہے۔

بیمہ کے حکم شرعی سے متعلق دو طرح کے اقوال ملتے ہیں، ایک قول بہر صورت اس کے جواز کا ہے، اور دوسرا قول عدم جواز اور حرام کا ہے، کیونکہ اس کی متبادل صورتیں ہیں، جو شرعی دائرہ میں درست اور جائز ہیں اور امداد باہمی اور اخوت و بھائی چارگی کو ان سے فروغ ملتا ہے، البتہ آیات قرآنیہ اور احادیث نبوی کی روشنی میں ''مجبوری'' اور ''ضرورت'' کی صورت میں اس کی اجازت ہے، کسی حکومت کا اپنے تمام شہریوں کے لئے انشورنس لازم قرار دے دینا بھی مجبوری میں داخل ہے۔

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی نے اپنی کتاب ''جدید فقہی مسائل'' (ج ۴ ص ۱۲۳) پر انشورنس کے تعلق سے جو خلاصہ بحث تیار کیا ہے نمبر ۴-۵-۶ اور ۷ بھی اسی کے تحت آتے ہیں۔

حلت وحرمت کے دلائل پر نظر ڈالنے اور غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حرمت کے قائلین کے دلائل استنباط کے اعتبار سے زیادہ مضبوط، استدلال کے لحاظ سے زیادہ کامل، حجت ہونے کی حیثیت سے زیادہ ٹھوس اور پرزور اور شریعت اور اس کے عام قواعد سے زیادہ ہم آہنگ ہیں۔

جوابات:

۱- میڈیکل انشورنس کرانا ناجائز ہے، خواہ انفرادی ہو یا گروپ انشورنس کی شکل میں۔

۲- اگر کسی نے بیمہ کرا ہی لیا ہے تو وہ اپنی جمع شدہ مالیت کے برابر رقم استعمال کرسکتا ہے، لیکن اس سے زائد حصہ رقم مستحقین پر واجب التصدق ہوگی اور خود اس کا استعمال کرلینا اکل مال باطل ہے، جس سے قرآن میں "لا تأكلوا أموالكم بينكم بالباطل" کہہ کر منع کیا گیا ہے۔

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی اس سلسلہ میں تحریر فرماتے ہیں کہ ''لیکن یہ حکم اس وقت ہے جب موت طبعی طور پر ہوئی ہو یا کاروبار کسی آفت سماوی کا شکار ہوا ہو، اگر ہندو مسلم فسادات میں ہلاکت واقع ہوئی یا کاروبار متاثر ہوا تو اب پوری رقم جائز ہوگی، کیونکہ انشورنس کمپنی نیم سرکاری کمپنی ہے اور مسلمانوں کا تحفظ بھی سرکاری ذمہ داری ہے (جدید فقہی مسائل ۴/۱۲۵)۔

۳- چونکہ سرکاری ونجی اداروں کا طریقہ کار اور مقصد مشترک ہے، اس لئے دونوں کا حکم یکساں ہوگا، کوئی فرق نہ ہوگا۔

۴- سرکاری انشورنس ادارہ علاج کی ضرورت پر جو مقررہ رقم دیتا ہے اسے امداد وتعاون کا درجہ نہیں دیا جاسکتا، کیونکہ تعاون وتکافل کے شرائط اس پر منطبق نہیں ہوتے۔

۵- اسلامی تعلیمات کی روشنی میں میڈیکل انشورنس کی متبادل صورت ہندوستان جیسے ملک میں یہی ہوسکتی ہے کہ رفاہی اداروں اور ویلفیئر

---

[1] جامعۃ الہدایہ، جے پور، راجستھان۔

سوسائٹیوں کا قیام عمل میں آئے، مالدار مسلمان زکوۃ کی ادائیگی کو اپنا فرض سمجھ کران اداروں میں جن کی حیثیت بیت المال کی ہوگی، زکوۃ کی رقوم جمع کریں اور چندہ و دیگر عطیات کی رقم بھی جمع کی جائے لیکن دونوں کا فنڈ الگ ہو، پھر ضرورت پر ضرورتمند کو اتنی رقم دی جائے جس سے اس کی ضرورت پوری ہو سکے یا بعض ادارے قرض کے نام سے قائم کئے جائیں جن میں غیر سودی قرض کا نظام ہو، خواہ کوئی چیز گروی ہی رکھ کر کیوں نہ ہو، لیکن جب ادارہ یہ محسوس کرلے کہ یہ شخص واقعی مفلس ہے اور ادائیگی نہیں کر پائے گا تو معذور سمجھ کر معاف کردیا جائے، اس کے علاوہ اور صورتیں بھی ہوسکتی ہیں، اس مقالہ میں متبادل صورتیں کے عنوان سے چند شکلیں حکومتی سطح پر حکومت کے کرنے کی ہیں اور کچھ انفرادی و اجتماعی طور پر دیگر لوگوں کے لئے ہیں۔

۶- جن ممالک میں وہاں کے شہریوں کے لئے میڈیکل انشورنس حکومت کی طرف سے لازم کردیا گیا ہے، وہاں کے باشندے میڈیکل انشورنس کرا سکتے ہیں، کیونکہ یہ ان کی مجبوری ہے، پھر جب مجبوری کی صورت میں ان کے لئے انشورنس کرانا درست ہے تو اس سہولت سے فائدہ اٹھانا بھی درست ہوگا۔

موجودہ حالات میں میڈیکل انشورنس

مولانا محی الدین غازی فلاحی (نئی دہلی)

انشورنس کی جملہ رائج اقسام اب زندگی کی ضرورت تسلیم کی جانے لگی ہیں۔

حالانکہ انشورنس واقعی ضرورت ہونے کے بجائے محض ذہنی اختراع ہے، اس کا تعلق زندگی کے حقیقی مسائل سے کہیں زیادہ ذہنی مشاکلہ سے ہے۔

انسان کو پیش آمدہ خطرات سے خوفزدہ کر کے انشورنس کو اس کے تمام مسائل کا حل باور کرادیا گیا ہے۔

مزید برآں انشورنس ایک بہت بڑی تجارت کی صورت اختیار کر گیا ہے جس میں میدان تجارت کے بڑے بڑے کھلاڑی طالع آزمائی اور دور جدید کے انسان کی نفسیاتی کمزوریوں کے استحصال میں مصروف ہیں۔

انشورنس کی شرعی حیثیت پر طویل بحثیں اور کسی قدر متفق علیہ فیصلے ہو چکے ہیں۔

انشورنس کی متبادل صورتوں پر گفتگو ان کی توثیق اور ان پر عمل بھی دنیا کے مختلف ممالک میں شروع ہو گیا ہے، گو کہ یہ تجربات ابھی ابتدائی نوعیت کے ہیں۔

بعض مخصوص حالات میں جنہیں خالت خوف سے تعبیر کیا جاسکتا ہے تجارتی انشورنس کے باب میں کچھ گنجائش بھی نکالی گئی ہیں۔

میڈیکل انشورنس بھی اپنی مجموعی اور اصل حیثیت میں عام انشورنس سے مختلف نہیں ہے۔

سوائے چند بہت جزوی امور کے جن کی حیثیت مستقل امور کی بھی نہیں ہے، حکومت کی پالیسیاں تبدیل ہوتی رہتی ہیں مراعات میں کمی اور اضافہ بھی ہوتا رہتا ہے۔

وہ چند امور جو اس مسئلے پر دوبارہ سوچنے پر مجبور کرتے ہیں یا اس پر از سر نو غور کرنے کا جواز فراہم کرتے ہیں حسب ذیل ہو سکتے ہیں۔

۱- پیچیدہ بیماریوں کا عام ہو جانا۔

۲- پیچیدہ بیماریوں پر عام آدمی کی استطاعت سے زیادہ خرچ آنا۔

۳- انشورنس کے لئے جمع کردہ رقم کا علاج کی رقم کے مقابل بہت کم ہونا۔

۴- منافع اندوزی سے زیادہ تعاون کا رنگ نظر آنا۔

۵- بعض ملکوں، ہندوستان کی بہت ساری ملٹی نیشنل کمپنیوں اور تعلیمی اداروں میں اس کا لازم ہو جانا۔

تاہم ان امور کے پیش نظر کوئی فیصلہ کرنے سے پہلے مندرجہ ذیل امور پر غور کرنا بھی ضروری ہے:

۱- اس میدان میں نجی کمپنیوں کے اترنے کا یقینی مطلب نفع اندوزی کے امکانات کا قوی شکل میں پایا جانا ہے۔

۲- حکومت کی مراعات کے سلسلے میں پالیسی یکساں نہیں رہتی ہے۔

۳- زیادہ عمر والوں سے انشورنس کی زیادہ رقم لینا اس بنیاد پر کہ ان کے بیمار ہونے کے امکانات زیادہ ہوتے ہیں تعاون کی روح کے خلاف ہے۔

۴- انشورنس سے پہلے انشورنس کمپنی چیک اپ کے ذریعہ یہ اطمینان کرلیتی ہے کہ متعلقہ فرد کو کوئی بڑی بیماری نہیں ہے۔

۵- بیماری کی عملاً حالت تو ضرورت کے درجہ میں آسکتی ہے، مگر بیمار ہوجانے کا محض امکان جس کی بنیاد صرف یہ ہو کہ لوگ بیمار ہوتے ہیں، اضطرار کی حالت شاید قرار نہیں دی جاسکتی۔

۶- انشورنس کراتے وقت فرد صحت مند ہوتا ہے، ایسے فرد کے لئے سودی نظام پر مبنی انشورنس کیسے جائز ہوسکتا ہے۔

۷- بیمار نہ ہونے کی صورت میں ادا کی گئی رقم مذکورہ ادارے کے منافع کا حصہ بنتی ہے جس کا کوئی جواز نہیں ہے، جس طرح فاضل رقم سے بیمار ہونے کی صورت میں استفادہ کا جواز نہیں ہے۔

الغرض، راقم السطور کی رائے ہے کہ:

۱- میڈیکل انشورنس بھی عام انشورنس کی طرح حرام ہے۔

۲- اگر کسی نے میڈیکل انشورنس کرالیا تو بیمار ہونے کی صورت میں اس کے لئے فاضل رقم سے استفادہ کرنا جائز نہیں ہے، الا یہ کہ اس وقت اسکے پاس کوئی اور ذریعہ علاج نہ ہو تو اضطراری کیفیت پر محمول کرکے اس رقم سے علاج درست ہوگا تاہم انشورنس کرانے کے عمل کا وبال اس پر ہوگا۔

۳- اس سلسلہ میں حکومت اور نجی اداروں کا حکم یکساں ہے، تاہم جہاں ضروری ہو وہاں ''اھون البلیتین'' کے اصول پر سرکاری ادارے کو ترجیح دی جائے گی۔

۴- جن ملکوں یا اداروں میں داخلہ کے لئے انشورنس ضروری ہو وہاں ''الضرورۃ تقدر بقدرھا'' کے اصول کو ملحوظ رکھا جائے گا، اسی طرح بیمار ہوجانے کی صورت میں بھی اگر اس رقم کے سوا کوئی چارہ علاج نہ ہو تو اسے استعمال کیا جائے گا، ورنہ احتراز ضروری ہوگا۔

۶- متبادل شرعی صورت یہی ہے کہ تجارتی بنیادوں کے بجائے اسے تعاونی بنیاد پر تشکیل دیا جائے، جس میں:

۱- دی گئی رقم تبرع کی حیثیت رکھے۔

۲- علاج کے لئے ادا کی جانے والی رقم پہلے سے متعین نہ ہو، بلکہ حسب حال فیصلہ کیا جائے۔

۳- بچی ہوئی رقم سے متعلقہ ادارہ فائدہ نہ اٹھائے، بلکہ تعاون کی حد میں محفوظ رہے۔

۴- ادارہ اس سے اپنے اخراجات کی تکمیل کرے، مگر وہ نفع اندوزی کا ذریعہ نہ ہو۔

''مجمع الفقہ الاسلامی'' نے جس تامین تعاونی کی توثیق کی وہ بھی پیش نظر رہے۔

☆☆☆

صحت کی حفاظت کے لئے انشورنس

مفتی تنظیم عالم قاسمی[1]

بلا شبہ صحت اللہ تعالی کی بہت بڑی نعمت ہے، اس کا نہ کوئی بدل ہے اور نہ ہی تدارک کی کوئی شکل، اس لئے ہر انسان کو صحت کی حفاظت کی طرف خاص طور پر توجہ دینے کی تاکید کی گئی ہے، یہ ذمہ داری انسان پر اس لئے بھی ہے کہ جسم، توانائی، قوت وطاقت اور سانس کی ہر گھڑی اللہ کی امانت ہے، جس کا تحفظ ہر شخص پر ضروری ہے، یہی وجہ ہے کہ روح کی بقاء اور استحکام کے لئے حالت اضطرار میں حرام اشیاء کے استعمال کو بھی جائز قرار دیا گیا، ارشاد باری ہے:

''إنما حرم عليكم الميتة والدم ولحم الخنزير فمن اضطر غير باغ ولا عاد فلا إثم عليه'' (سورۂ بقرہ ۲/ ۱۷۳)۔

(اس نے تم پر بس مردار، خون، سور کا گوشت اور جو جانور غیر اللہ کے لئے نامزد کیا گیا حرام کیا ہے لیکن اس میں جو شخص مضطر ہو جائے اور نہ بے حکمی کرنے والا ہو اور نہ حد سے نکل جانے والا ہو تو اس پر گناہ نہیں ہے)۔

ان تمام کے باوجود میڈیکل انشورنس (صحت بیمہ) کرانا شرعا درست نہیں ہے، چونکہ اس میں بنیادی طور پر دو مفاسد پائے جاتے ہیں ایک ربا اور دوسرے قمار، ربا تو اس لئے ہے کہ پیچیدہ امراض میں مبتلا ہونے کی صورت میں جمع کردہ رقم سے زیادہ رقم سے وہ استفادہ کرتا ہے، مثلاً اس نے طے شدہ پروگرام کے مطابق ایک سال کے لئے دس ہزار روپئے جمع کیا، لیکن وہ ایسے مہلک مرض کا شکار ہوا ہے جس میں کمپنی نے پچاس ہزار روپئے خرچ کئے، سوال یہ ہے کہ مزید چالیس ہزار روپئے کس کا عوض ہے، ظاہر ہے کہ چالیس ہزار روپئے کی مقدار بلاعوض اس کو حاصل ہوا ہے، اسی کو ربوا کہا جاتا ہے۔

''الربوا فضل خال عن عوض بمعيار شرعي مشروط لأحد المتعاقدين في المعاوضة'' (الموسوعة الفقهيه ۲۲/ ۲۵۰)۔

اور اگر پورے سال میں کوئی مرض یا حادثہ پیش نہیں آیا تو قمار پایا گیا، اس لئے کہ اس صورت میں جمع کردہ رقم کا کوئی حصہ واپس نہیں ملتا ہے، گویا رقم اور منافع کے حصول کو ایک ایسی چیز پر معلق کر دیا جس کا وجود موہوم اور مبہم ہے اور اسی کا نام قمار ہے، اور قمار حرام ہے۔

''لا خلاف بين أهل العلم في تحريم القمار وأن المخاطرة من القمار'' (احکام القرآن للجصاص ۱/ ۳۸۸)۔

انشورنس کا شعبہ اگرچہ خسارہ میں ہے تاہم یہ عقد شرعی اصول وقواعد کے رو سے مبنی بر حرام ہونے کی وجہ سے ممنوع اور ناجائز قرار پائے گا، امیر المؤمنین حضرت عمر فاروق ؓ نے ارشاد فرمایا:

''دعوا الربا والريبة'' (مسند احمد/ ۲۴۶)۔ (ربا اور شبہ ربا کو ترک کردو)۔

حرمت اور گناہ کے ادنی شبہ سے بھی بچنے کی تاکید کی گئی ہے اور ایمان کا بھی یہی تقاضہ ہے، اگر بڑھتے ہوئے نت نئے امراض اور علاج ومعالجہ کے عدم وسائل کو ضرورت قرار دے دیا جائے تو اس سے سود وقمار کا دروازہ کھل جائے گا، اور پھر حد بندی ناممکن ہوگی، اس لئے بہتر یہی ہے کہ ''میڈیکل انشورنس'' کو املاک اور جان کے بیمہ کی طرح ناجائز قرار دیا جائے، بیمار پڑنے کا ایک شبہ اور خطرہ تو رہتا ہے، لیکن اضطرار ومجبوری کی کوئی

[1] استاذ دار العلوم سبیل السلام (حیدرآباد)

ایسی کیفیت نہیں ہے کہ ''الضرورات تبیح المحذورات''، ''الضرر یزال''، ''الحرج مدفوع''، ''إذا ضاق الامر اتسع'' اور اس طرح کے دوسرے فقہی قواعد کا سہارا لیتے ہوئے اس کو جائز قرار دیا جائے، جیسا کہ جان ضائع ہونے کے خطرہ کے وقت شراب، مردار، خنزیر اور دوسرے ناپاک اشیاء کو درست قرار دیا گیا ہے، البتہ ضرورت وحاجت، مشقت اور مضمون کے شروع میں مذکور آیت وحدیث پر نظر رکھتے ہوئے راقم الحروف کا خیال ہے کہ 'میڈیکل انشورنس' جائز تو نہیں، لیکن اگر کسی نے کرالیا ہے اور اتفاق سے کسی سخت مرض میں مبتلا ہو گیا تو درج ذیل شرائط کے ساتھ میڈیکل انشورنس کے علاج سے استفادہ درست ہونا چاہئے۔

الف- اس مرض میں جان ضائع ہونے کا خطرہ ہو۔

ب- اتنا غریب اور بے بس ہو کہ از خود علاج نہیں کرا سکتا ہے۔

ج- انشورنس کمپنی کے علاوہ دوسرے سے قرض ملنا ناممکن ہو۔

د- انشورنس کمپنی سے حاصل کردہ زائد رقم صحتیابی کے بعد کمپنی کو واپس کر دینے کا عزم رکھتا ہو۔

گویا یہ زاید رقم اس کے حق میں قرض کی حیثیت ہوگی، جس کا واپس کرنا ضروری ہوگا اور اگر کمپنی کو واپس کرنے کی کوئی شکل نہ ہو یا کمپنی کو واپس کرنے کی صورت میں اس رقم کو غلط جگہوں میں استعمال کا اندیشہ ہو تو بینک کی سود کی طرح وہ زائد رقم غرباء اور مساکین میں تقسیم کردی جائے۔

۲- صحت بیمہ کرانے والا جو رقم جمع کرتا ہے اور پھر اس سے زیادہ مالیت کے علاج سے مستفید ہوتا ہے یہ شرعاً سود اور حرام ہے، اس سے اجتناب از حد ضروری ہے، البتہ دفعہ ایک کے تحت ذکر کردہ تفصیل ذہن میں رہنی چاہئے۔

۳- سرکاری و نجی ادارے بنیادی مقاصد و اغراض میں متفق ہیں، اس لئے دونوں طرح کے اداروں سے انشورنس کے ذریعہ فائدہ اٹھانے کا حکم ایک ہوگا۔

۴- سرکاری انشورنس ادارہ جو علاج کی ضرورت پر مطلوبہ یا مقررہ رقم دیتا ہے، اس کو سرکار کی طرف سے امداد و تعاون کا درجہ نہیں دیا جا سکتا ہے، اس لئے کہ کمپنی کا اہم مقصد منافع کا حصول ہے، اور تجارت و کاروبار ہے، اگر تعاون پیش نظر ہوتا تو بیمار نہ پڑنے کی صورت میں انشورنس کرانے والے کو جمع کردہ رقم واپس کردی جاتی حالانکہ ایسا نہیں ہے، اس لئے محض نام کے بدلنے سے حقائق تبدیل نہیں ہوں گے، حقیقت اور اصل ماہیت کو سامنے رکھتے ہوئے حکم لگایا جائے گا۔

حضرت مولانا سید عبدالرحیم لاجپوریؒ اسی طرح کے ایک سوال کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں:

''جی نہیں، یہ ربا کی صورت ہے یا قمار کی، ایجنٹ کے لکھنے اور نام بدلنے سے حقیقت نہیں بدل سکتی، شریعت کے احکام کا دارومدار حقیقت پر ہے نہ کہ نام پر، جب تک حقیقت نہیں بدلے گی حکم نہیں بدلے گا''۔

''وأنه لا یتغیر حکمه بتغیر هیئته وتبدیل اسمه... مرقاة المفاتیح'' (فتاوی رحیمیه ۱۰/ ۲۵۴)۔

۵- میڈیکل انشورنس کی مذکورہ صورت جائز نہ ہونے کی صورت میں اصحاب حل وعقد اور ارباب فقہ وفتاوی کو کوئی ایسی تدبیر اور شکل نکالنی چاہئے جس سے غرباء اور مساکین کو علاج ومعالجہ کی آسانی ہو سکے اور بضرورت مہلک امراض سے نجات کی راہیں نکل سکیں۔

راقم الحروف کی رائے میں اس کی بہتر صورت یہ ہے کہ ہر گاؤں اور سماج کے لوگ الگ الگ یا اجتماعی طور پر 'امدادی سوسائٹی' کے نام سے ایک فنڈ قائم کریں اور ہر شریک پر سال میں ایک متعین رقم لازم کردی جائے، تمام شرکاء چندہ کی رقم جمع کرتے ہوئے باہمی امداد کی نیت کرلیں اور یہ سوچ لیں کہ یہ رقم وقف فی سبیل اللہ ہے، اب اس سے ہمارا کوئی تعلق نہیں ہے، اب جو لوگ اس میں شریک ہیں ان میں سے کسی کے بھی بیمار پڑنے پر سوسائٹی کے شرائط کے مطابق ہر شریک کے علاج ومعالجہ کے لئے اسی فنڈ سے رقم فراہم کی جائے اور بیمار نہ ہونے کی صورت میں پیسہ فنڈ میں جمع رہے

کسی کو واپس نہ کیا جائے، اسی طرح فنڈ کی مالی حیثیت مستحکم اور مضبوط ہوگی اور غربا اور پریشان حال لوگوں کا تعاون بھی کیا جاسکتا ہے۔

تقریباً اس سے ملتی جلتی شکل حضرت مولانا محمد یوسف لدھیانویؒ نے ''میڈیکل انشورنس کی ایک جائز صورت'' کے عنوان سے تحریر فرمائی ہے، اس موقع پر اس کا مطالعہ مفید ہوگا (آپ کے مسائل اور ان کا حل ۶ / ۲۵۷)۔

۶- جن ممالک میں باہر سے آنے والوں کے لئے ''میڈیکل انشورنس'' لازم کردیا گیا ہے، مجبوری کے تحت ان کے لئے انشورنس کرانا جائز ہوگا، البتہ اگر قانونی مجبوری کے تحت انشورنس کرانے والے بیمار پڑ جائیں تو ان کے لئے انشورنس کی سہولت سے استفادہ درست نہیں ہوگا بلکہ از خود اپنا علاج کرائیں، یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ ہندوستان میں سرکاری ملازمین کے لئے جبری لائف انشورنس کو فقہاء نے جائز قرار دیا ہے اور جمع کردہ رقم کے علاوہ اضافی رقم غرباء میں تقسیم کردینے کا فیصلہ کیا ہے، اس لئے کہ وہ حقیقت کے اعتبار سے سود ہے اور سود بہر حال حرام ہے، ہاں البتہ باہر ممالک جانے والے کے پاس اگر علاج کے لئے روپے موجود نہ ہوں اور حصول رقم کی کوئی اور شکل بھی نہ ہو تو وقتی طور پر انشورنس سے استفادہ کیا جاسکتا ہے، لیکن یہ قرض کی حیثیت ہوگی جو بعد میں ادا کردینا ہوگا، اس کی قدرے تفصیل دفعہ ایک کے تحت ذکر کی جاچکی ہے۔

خلاصہ بحث:

۱- میڈیکل انشورنس (صحت بیمہ) ناجائز اور حرام ہے۔

۲- صحت بیمہ کرانے والا جو رقم جمع کرتا ہے اور پھر ضرورت پر اس سے کہیں زیادہ مالیت کے علاج سے مستفید ہوتا ہے وہ شرعاً سود ہے جس کی حرمت نصوص شرعیہ میں واضح کردی گئی ہے۔

۳- سرکاری و نجی اداروں کے انشورنس کا ایک ہی حکم ہے۔

۴- سرکاری انشورنس کی طرف سے علاج و معالجہ کے لئے مطلوبہ یا مقررہ دی گئی رقم کو امداد و تعاون کا نام نہیں دیا جاسکتا ہے۔

۵- سود و قمار اور ناجائز امور سے بچتے ہوئے امداد باہمی کی شکل اوپر تفصیل سے بیان کردی گئی ہے۔

۶- باہر ممالک جانے والوں کے لئے جبری انشورنس جائز ہے، البتہ بضرورت انشورنس کی سہولت سے استفادہ درست نہیں ہے۔

صحت بیمہ کے شرعی احکام

مفتی محمد شاہد علی قاسمی[1]

اس میں شک نہیں کہ انشورنس کی متعدد صورتیں ہیں اور ہر ایک کا حکم ایک جیسا نہیں ہے، ''میڈیکل انشورنس'' کی جو تفصیل سوالنامہ میں مذکور ہے اس سے واضح ہے کہ یہ کوئی مالی لین دین نہیں ہے، بلکہ اس کی بنیاد تعاون باہمی ہے، اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ انشورنس کی ابتداء ہوئی ہی ہے تعاون باہمی کے لئے، لیکن بعد میں سود و قمار آمیز صورتیں پیدا کر دی گئیں، لیکن ''میڈیکل انشورنس'' کی مسئولہ صورت تعاون باہمی ہی پر مبنی ہے، اس لئے راقم کے نزدیک میڈیکل انشورنس کرانا جائز ہے، تائید کے لئے مولانا محمد یوسف لدھیانویؒ کی ایک تحریر ملاحظہ ہو جو انہوں نے ایک سوال کے جواب میں رقم فرمایا ہے:

''میڈیکل انشورنس کی جو تفصیل سوال میں بیان کی گئی ہے چونکہ اس کے کسی مرحلہ میں سود یا قمار نہیں اور بھی کوئی چیز خلاف شریعت نہیں، اس لئے امداد باہمی کی یہ صورت بلا کراہت جائز بلکہ مستحسن ہے، علماء کرام کی طرف سے انشورنس اور امداد باہمی کی جو جائز صورتیں مختلف مواقع پر تجویز کی گئی ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے، مگر افسوس کہ مسلمان ملکوں میں اس طرف توجہ نہ دی گئی، کاش! ان کو بھی توفیق ہو کہ وہ انشورنس کی رائج الوقت حرام صورتوں کو چھوڑ کر جائز صورتیں اختیار کر لیں'' (تفصیل کے لئے دیکھئے: آپ کے مسائل اور ان کا حل ۶/ ۲۵۸)۔

۲- صحت بیمہ میں اضافی رقم سے استفادہ:

صحت بیمہ کرانے والا بیمار ہونے پر اپنی جمع شدہ رقم سے کہیں زیادہ خطیر رقم سے مستفید ہوتا ہے، وہ اس کے حق میں جائز ہے، کیونکہ اس پر اس کی جمع شدہ رقم سے زائد خرچ ہونے والی رقم اس انشورنس اسکیم میں حصہ لینے والوں کی طرف سے تبرع ہے، تبرع ہونے کی وجہ یہ ہے کہ ہر بیمہ کنندہ یہی سمجھ کر رقم جمع کرتا ہے کہ اگر میں بیمار نہیں ہوا تو اس کا بیمار ہونے والا بھائی اس رقم سے استفادہ کرے گا اور رقم کبھی واپس نہیں لے گا۔

۳- سرکاری اور غیر سرکاری میڈیکل انشورنس کے درمیان فرق ہے؟

راقم کے نزدیک جس طرح سرکاری ''میڈیکل انشورنس'' ادارہ سے صحت بیمہ کرانا جائز ہے، اسی طرح پرائیوٹ ادارہ سے بھی جائز ہے، البتہ ایک شرط ہے کہ پرائیوٹ ادارہ جمع شدہ رقوم کو سود یا حرام پر مبنی کاروبار میں انویسٹ نہ کرتا ہو۔

۴- سرکاری میڈیکل انشورنس سے ملی ہوئی رقم تعاون ہے:

سرکاری انشورنس ادارہ ہو یا پرائیوٹ، وہ اولاً تو اپنے ہی ادارہ کی جمع شدہ رقم خرچ کرتا ہے، پھر بھی رقم کم پڑ جائے تو کسی اور محکمہ کی طرف تعاون کا ہاتھ پھیلاتا ہے، اس لئے اگر سرکاری انشورنس ادارہ کے پاس مطلوبہ علاج کے لئے بجٹ ناکافی ہو اور وہ کسی اور محکمہ سے اس کی بھرپائی کرے تو یقیناً اس کو تعاون و امداد ہی کہا جائے گا۔

---

[1] المعہد العالی الاسلامی (حیدرآباد)۔

مجوزہ متبادل انشورنس:

اس میں شک نہیں کہ انشورنس کی مختلف صورتیں مروج ہیں، جن میں اکثر صورتیں قمار اور سود پر مبنی ہونے کی وجہ سے ناجائز ہیں، اس لئے ضرورت ہے کہ اس کا کوئی متبادل نظام پیش کیا جائے، تاکہ امت مسلمہ کے لئے کوئی جائز حل نکل آئے، سوالنامہ میں مفروضہ کمپنی کی جو تفصیلات ذکر کی گئی ہیں، وہ تقریباً شریعت کے دائرہ میں ہیں، کاش کہ یہ مجوزہ نقشہ حقیقت بن کر امت کے سامنے جلد سے جلد آ جائے، اور یہ ذہنی خاکہ عملی شکل میں تبدیل ہو، مجوزہ کمپنی کی تفصیلات ذکر کئے جانے کے بعد جو پانچ سوالات اٹھائے گئے ہیں ترتیب وار ان کے جوابات تحریر کئے جاتے ہیں:

۱-الف: مجوزہ کمپنی کی حدود و قیود میں ایک شرط یہ ہے کہ ممبر کی عمر ۱۵ سال سے کم اور ۶۰ سال سے زیادہ نہ ہو، تو یہ کوئی شرط فاسد نہیں، کیونکہ کمپنی جو ایک شخص اعتباری ہے اور اس کی حیثیت مضارب کی ہے، اپنے مقاصد واہداف میں کامیابی کے لئے ایسی شرط لگا سکتی ہے جو اس کے لئے مفید ہو، چونکہ ساٹھ سال کے بعد اور ۱۵ سال سے پہلے تک موت کے امکانات بہ مقابلہ جوان عمر کے زیادہ ہوتے ہیں، اس لئے اندیشہ ہے کہ اگر بچے اور بوڑھے اسکیم میں حصہ لیں تو اموات کی شرح زیادہ ہونے سے کمپنی کا نقصان زیادہ ہوگا، یا عمر کی قید کی کوئی اور حقیقی مصلحت ہو بہر صورت یہ شرط فاسد نہیں ہے، چنانچہ فقہاء نے صراحت کی ہے کہ:

"ولا يملك (المضارب) أيضا تجاوز بلد أو سلعة أو وقت أو شخص عينه المالك، لأن المضاربة تقبل التقييد المفيد ولو بعد العقد" (الدر المختار علی ہامش رد المحتار ۴/ ۴۸۶ طبع دیوبند)۔

(ایک متعین شہر، متعین سامان وغیرہ کی قید اسی لئے تو ہیں کہ رب المال کو اطمینان ہو کہ اس کا سرمایہ محفوظ رہے گا، اس لئے عمر کی قید کمپنی جو اگرچہ مضارب ہے نہ کہ رب المال کی طرف سے لگانا مناسب نہیں ہے)۔

۱- ب: ایک مقررہ مدت کے بعد ہی رقم کی واپسی کی شرط فی زمانہ ایک مناسب شرط ہے یہ شرط بھی درحقیقت کمپنی کو امکانی نقصان سے بچانے کی ایک صورت ہے، کیونکہ اگر مدت کی کوئی قید نہ ہو تو ایسا ممکن ہے کہ کمپنی میں مال لگانے والے اکثر سرمایہ کار کسی وجہ سے اچانک امڈ پڑیں اور اپنا سرمایہ واپس کرنے کا مطالبہ کریں، اور ایسا بعض کمپنیوں کے ساتھ ہو چکا ہے، اور اس کے بعد کمپنی ہی ختم ہوگئی، اس شرط کے جواز کو اس جزئیہ پر بھی قیاس کیا جاسکتا ہے، جو فقہاء نے لکھا ہے کہ اگر رب المال عقد مضاربت ختم کرنا چاہے تو اگر مضاربت کا مال عروض کی شکل میں ہو تو مضاربت یکلخت ختم نہیں ہوگی، بلکہ مضارب کو موقع دیا جائے گا کہ وہ عروض کو بیچ کر اثمان لوٹائے اور پھر مضاربت ختم کرے۔

"ولا يملك المالك فسخها في هذه الحالة بل ولا تخصيص الاذن، لأنه عزل من وجه" (درمختار علی ہامش ردالمحتار ۴/ ۴۸۹ طبع نعمانیہ دیوبند)۔

لہذا صورت مسئولہ میں کمپنی کو بھی اپنی مصلحت کی خاطر ایک متعین مدت کے بعد ہی رقم واپسی کی شرط لگانا جائز ہے۔

۱- ج: سرمایہ کا ایک حصہ امدادی فنڈ کے لئے مخصوص کرنے کی شرط شرط فاسد ہے، جیسا کہ فقہاء نے لکھا ہے کہ اگر خریدار فروخت کنندہ پر یہ شرط لگائے کہ وہ خریدار کو فلاں چیز ہبہ کرے تب ہی وہ اس سے سامان خریدے گا تو یہ شرط فاسد ہوگی۔

"وكذا ما اشتراه على أن يدفعه البائع إليه قبل دفع الثمن... أو على أن يهبه البائع منه كذا" (ردالمحتار مع الدر ۴/ ۱۲۱، باب البیع الفاسد)۔

فقہاء کی یہ عبارت اگرچہ بیع سے متعلق ہے، لیکن بیع کی طرح عقد مضاربت میں بھی تقاضہ عقد کے خلاف شرط لگانا درست نہیں، اور ایسی شرط شرط فاسد سمجھی جاتی ہے، اس لئے سرمایہ کا ایک حصہ امدادی فنڈ کے لئے مخصوص کرنے کی بات بطور شرط نہ رکھی جائے، بلکہ سرمایہ دار کو اس کی ترغیب دی جائے، اور اسے کمپنی کی مصلحت وغیرہ سمجھائی جائے، اور اس بات پر آمادہ کیا جائے کہ وہ برضا و رغبت امدادی فنڈ کے لئے بھی کچھ مختص کرے، بہر

حال اس کو شرط کا درجہ نہ دیا جائے، واضح ہو کہ اگر اسے شرط کا درجہ نہ دینے کی وجہ سے بعض لوگ امدادی فنڈ میں رقم دینے پر آمادہ نہ ہوں اور اس کی وجہ سے کمپنی کے نظام میں خلل کا اندیشہ ہو تو اس کی تلافی اس طرح بھی ہوسکتی ہے کہ ممبروں کے لئے نفع کا جو تناسب رکھا گیا ہے اس میں معمولی کمی کردی جائے تاکہ کمپنی کو کچھ زیادہ نفع مل سکے، پھر اس زائد نفع کو امدادی فنڈ میں رکھ دیا جائے۔

۲- مضاربت یا شرکت کا معاملہ فریقین کرتے ہی اس لئے ہیں کہ سرمایہ سے دونوں فائدہ اٹھائیں، اور اس طرح کے معاملہ کے صحیح ہونے کے لئے اہم بنیاد یہ ہے کہ فریقین نفع ونقصان میں برابر شریک ہوں، اس لئے مقررہ مدت پوری ہونے کے بعد جمع کردہ رقم سے زائد ملنے والی رقم جبکہ نفع ونقصان میں دونوں شریک ہوں درست ہے۔

۳- مقررہ مدت سے قبل موت کی صورت میں امدادی فنڈ سے طے شدہ رقم کی تکمیل درست ہے، کیونکہ یہ محض ایک تبرع اور تعاون ہے، اور کسی پر تبرع احسان کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔

۴- چند اقساط کی ادائیگی کے بعد ادائیگی بند کردینے پر جمع کردہ رقم کا پورا حساب کرکے لینا دینا درست ہے، کیونکہ شرعی اصول یہی ہے کہ سرمایہ دار کو ایک متعین اقساط کی ادائیگی پر مجبور نہ کیا جائے، بلکہ اسے اس میں آزاد رکھا جائے، اگرچہ کمپنی کی مصلحت کی وجہ سے ایک متعین اقساط کی ادائیگی کی بات کہی گئی ہے، لیکن یہ ایک گونہ مجبوری (کمپنی کی مصلحت) کے تحت ہے، اصل تو سرمایہ دار کو آزاد رکھنا ہے کہ چاہے وہ جتنا قسط ادا کرے، اسی کے مطابق اس کے ساتھ نفع ونقصان کا معاملہ کیا جائے، اس لئے صورت مسئولہ درست ہے۔

۵- جمع شدہ رقم میں کمی کی تلافی امدادی فنڈ سے لازمی طور سے کرنا ایک شرط زائد ہے، کیونکہ جو چیز تبرع وانعام کی قبیل کی ہو وہ اصلا لازم نہیں ہوتی، اور بندہ کے واجب کرنے سے بھی واجب نہیں ہوتی، البتہ اسے اخلاقا واجب قرار دیا جاسکتا ہے، جس طرح وعدہ کا وفا اخلاقا واجب ہے نہ کہ قانونا، اس لئے صورت مسئولہ میں امدادی فنڈ سے کمی کی تلافی کو عقد ومعاملہ کے تحت قانون کا درجہ نہ دیا جائے، بلکہ عقد ومعاملے کے وقت یہ صراحت کی جائے کہ کمپنی فضل واحسان کرتے ہوئے کمی کی تلافی امدادی فنڈ سے بھی کرسکتی ہے، اور چونکہ امدادی فنڈ میں تصرف کا حق کمپنی کو ہے، اس لئے اس عقد تبرع کو نافذ کرنے میں آئندہ مشکلات بھی (انشاء اللہ) پیش نہیں آئیں گی۔

☆☆☆

موجودہ حالات میں میڈیکل انشورنس

مولانا عطاء اللہ قاسمی [۱]

تمہید:

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میڈیکل انشورنس کا نظام بھی تعاون وامداد باہمی کی بنیاد پر نہیں، بلکہ کاروباری بنیاد پر ہے، دلیل یہ ہے کہ کمپنی جب تک بیمہ دار سے ایک مقررہ رقم کی ادائیگی کا معاہدہ نہ کرالے اور بیمہ دار اس کی کوئی قسط نہ ادا کر لے اس وقت تک مدد دینے یا علاج کا خرچہ برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتی، لہذا یہ سودے بازی ہوئی، تعاون وامداد نہیں ہوا، عرف عام میں تعاون بلا معاوضہ اور بطور احسان مدد اور امداد کے معنی میں بولا جاتا ہے، یہی وجہ ہے کہ ایسے لوگ جو بوڑھے ہوں یا شدید بیماری میں مبتلا ہوں تو یہ لوگ اپنا انشورنس نہیں کرا سکتے، حالانکہ دوسروں کی بہ نسبت یہ لوگ یا ان کے ورثاء تعاون وامداد کے زیادہ مستحق ہیں۔

میڈیکل انشورنس کا تعارف کراتے ہوئے کہا گیا ہے کہ ''اس انشورنس کا بنیادی مقصد کسی فریق کی جانب سے نفع اندوزی نہیں، (یہ ایک گمراہ کن مغالطہ ہے، کیونکہ اگر انشورڈ شخص بیمار نہیں ہوا تو کمپنی اس کی اصل رقم ہضم کر جاتی ہے اور اس کا سود یا نفع ہمیشہ کھاتی رہے گی، کیا یہ نفع اندوزی نہیں ہے؟) بلکہ حکومت کی سوشل سیکورٹی (سماجی تحفظ) کی ذمہ داری ادا کرنے کی ایک صورت ہے'' گویا میڈیکل انشورنس کے تحت ملنے والی طبی سہولیات کو حکومت کی سوشل سیکورٹی کا نام دے کر اسے جائز کرنے کی کوشش کی جارہی ہے، حالانکہ ان دونوں میں کھلا ہوا فرق ہے اور وہ یہ ہے کہ میڈیکل انشورنس کے تحت ملنے والی طبی سہولت وامداد صرف اسی شخص کو حاصل ہو سکتی ہے جس نے انشورنس کرایا ہو اور پریمیم کی رقم بھی جمع کر چکا ہو، بصورت دیگر اس کی طبی سہولیات سے استفادہ ناممکن ہے، جب کہ حکومت کی سوشل سیکورٹی حکومت کے ہر شہری کے لئے ہوتی ہے خواہ انشورڈ ہو یا نہ ہو۔

حکم:

لائف انشورنس کی طرح میڈیکل انشورنس کرانا حرام ہے، کیونکہ علت حرمت قمار اور ربا دونوں میں مشترک طور پر موجود ہے۔ [۲]

۱- سوال نامہ کی تمہید میں کہا گیا ہے کہ ''آدمی اپنے اختیار سے ایک طے شدہ رقم سال بھر کے لئے جمع کرتا ہے جس کی بنیاد پر اس سال کے دوران پیدا ہونے والی کسی پیچیدہ بیماری کے علاج کے لئے وہ ایک بڑی رقم (جس کی زیادہ سے زیادہ حد معاملہ کے وقت متعین ہو جاتی ہے) کا مستحق قرار پاتا ہے اور اس سال بیمار ہونے کی صورت میں اس کی جمع کردہ رقم یا اس کا کوئی حصہ واپس نہیں ملتا'' ظاہر بات ہے کہ بیماری کا حال معلوم نہیں کہ واقع ہوگی یا نہیں؟ اور ہوگی تو کب اور کس پیمانہ پر؟ ایسی صورت میں فریقین (بیمہ کمپنی اور بیمہ ہولڈر) کا نفع بھی مجہول اور نقصان بھی مجہول ہے، اسی معاملہ کو شریعت میں قمار کہتے ہیں جسے قرآن کریم نے صراحۃ بلفظ ''میسر'' حرام قرار دیا ہے۔

---

[۱] صدر المدرسین، جامعہ امداد العلوم، کوپا گنج، مئو۔

[۲] دلیل: انشورنس کمپنی بیمہ ہولڈر سے مقررہ وقت کے لئے متعینہ رقم لیتی ہے اور اس کے عوض میں اس کی جمع کردہ رقم سے کہیں زیادہ رقم بصورت خرچۂ علاج دیتی ہے۔ یہ زیادتی مشروط اور میعاد کے عوض میں ہوتی ہے جو بلا شبہ ربا اور سود ہونے کی وجہ سے حرام ہے، کیونکہ دیون میں میعاد کے مقابلہ میں جو منافع بطور مشروط یا معروف دیا جائے وہ شریعت کی اصطلاح میں سود ہے)۔

۲- صحت بیمہ کرانے والا جو رقم جمع کرتا ہے، اتنی ہی رقم کی مالیت کے علاج سے استفادہ کرنا اس کے لئے جائز ہے، اس رقم سے زیادہ مالیت کے علاج سے مستفید ہونا حرام ہے۔

دلیل:

بیمہ کمپنی اور بیمہ ہولڈر کے درمیان باقاعدہ معاہدہ ہوتا ہے کہ ہولڈر متعینہ مدت کے لئے مقررہ رقم جمع کرے گا تو اس مدت کے دوران پیدا ہونے والی بیماری کے علاج کے لئے وہ بڑی رقم کا مستحق ہوگا'' اس سے ثابت ہوتا ہے کہ جمع شدہ رقم سے زائد رقم مشروط طور پر میعاد کے عوض میں مل رہی ہے جو ربا ہے، کیونکہ ربا کا تحقق معاوضات میں ہی ہوتا ہے جس کے لئے عقد شرط ہے۔

۳- میڈیکل انشورنس اصلاً ربا اور قمار کا معاملہ ہے، اس لئے یہ ادارہ سرکاری ہو یا نجی بہر صورت اس سے استفادہ حرام ہوگا، حکم میں کوئی فرق نہیں ہوگا۔

رہ جاتی ہے یہ بات کہ ناگہانی حادثات کی صورت میں متاثرہ افراد کی امداد حکومتوں کی ذمہ داری سمجھی جاتی ہے، تو اگر حکومت بلا کسی پیشگی شرط اور انشورنس کے سوشل سیکورٹی کے تحت انسانی بنیادوں پر امداد دے تو اسے عطیہ قرار دیا جاسکتا ہے اور اس سے استفادہ جائز ہوسکتا ہے۔ بصورت دیگر استفادہ جائز نہیں ہوگا۔

۴- انشورنس کا سرکاری ادارہ جو علاج کی ضرورت پر مطلوبہ یا مقررہ رقم دیتا ہے اس کو سرکار کی طرف سے امداد و تعاون کا درجہ نہیں دیا جاسکتا ہے۔

دلیل:

انشورنس کمپنی علاج کے لئے رقم اسی وقت دے گی جب کہ وہ بیمہ دار سے مقررہ مدت کے لئے مقررہ رقم کی ادائیگی کا معاہدہ نہ کرالے اور پھر بیمہ دار اس کی کوئی قسط ادا نہ کردے، بصورت دیگر کمپنی ایک حبہ دینے کی روادار نہیں ہوسکتی، لہذا کمپنی کی طرف سے ملنے والی رقم کاروباری صحیح معنی میں سودے بازی نوعیت کی ہے، اس کو کسی صورت میں امداد و تعاون نہیں کہا جاسکتا، کیونکہ عرف عام میں بلا معاوضہ بطور احسان محض انسانی بنیادوں پر مدد کرنے کو تعاون اور امداد کہتے ہیں، انشورنس اس کے بالکل ضد ہے۔

انشورنس میں تعاون و امداد کے بالکل منافی جو چیز پائی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ خوش حال سرمایہ دار کو ضرورت مند نادار سے زیادہ دیا جاتا ہے، اس لئے کہ وہ سرمایہ دار بڑی رقم کا بیمہ کراتا ہے تو وفات یا آفت کے وقت اس کو زیادہ حصہ ملتا ہے جب کہ تعاون و امداد کا ادنی اصول یہ ہے کہ محتاج یا مصیبت زدہ کو دوسرے سے زیادہ دیا جائے۔

خلاصہ یہ ہے کہ ''انشورنس'' لائف ہو یا میڈیکل، سرکاری ہو یا نجی درحقیقت بے محنت دولت کمانے کا ناحق حصول زر اور چالبازی سے دوسروں کی کمائی ہتھیانے کا ذریعہ ہے اس کو تعاون و امداد کہنا گمراہ کن مغالطہ ہے۔

۵- جن ممالک میں میڈیکل انشورنس وہاں کے شہریوں یا وہاں جانے والوں کے لئے لازم کردیا گیا ہے، ان ملکوں میں میڈیکل انشورنس کرنا مجبوری ہے، اس لئے بوجہ مجبوری محض مجبوری کے بقدر گنجائش نکل سکتی ہے، اور بیمار ہوجانے کی صورت میں انشورنس کی سہولت سے فائدہ اٹھانا بوجہ مجبوری درست ہوگا، اس کا یہ حکم بالکل لائف انشورنس کے حکم کی طرح ہے۔ حضرت اقدس مفتی نظام الدین صاحبؒ ایک فتوے میں تحریر فرماتے ہیں:

''لائف انشورنس'' کو جائز نہیں کہا جاسکتا، البتہ شدید مجبوری کی بات دوسری ہے، مثلاً قانوناً لازم ہوجائے یا مثلاً ملازمت نہ ملے، یا مثلاً ملازمت برقرار و بحال نہ رہے اور بغیر ملازمت کے گذارہ یا معاشرہ قائم نہ رہے تو بوجہ مجبوری محض مجبوری کے بقدر گنجائش نکل سکتی ہے (نظام

الفتاوی ۲ / ۲۵۲)۔

۶-میڈیکل انشورنس: متبادل کیا ہے؟

ہر شخص کھلی آنکھوں دیکھ رہا ہے کہ موجودہ دور میں صنعتی انقلاب ماحولیاتی عدم توازن اور نت نئے غذائی اجناس کے استعمال کی وجہ سے امراض اور امراض کی پیچیدگیاں بڑھ رہی ہیں۔ اسی کے ساتھ ساتھ علاج معالجہ کے نت نئے طریقے دریافت ہو رہے ہیں پھر بھی بہت سے امراض لاعلاج ہوتے جارہے ہیں، علاج بھی اتنا گراں ہوتا جارہا ہے کہ متوسط آمدنی والوں کے بس سے باہر ہے کہ جدید علاج سے مستفید ہوسکیں۔

امراض کی پیچیدگی، لاعلاج امراض کی زیادتی، علاج کے لئے سرمایہ کی کمی، یہ چیزیں جہاں حضرت انسان کی بے بسی کو ظاہر کرتی ہیں وہیں انسانیت کو امداد و تعاون، رحمت و مروت کا محتاج بنادیتی ہیں، لیکن شقی القلب یہودی ساہوکاروں نے انسانیت کی اس مجبوری کو بھی اپنی زراندوزی اور نفع خوری کے لئے استعمال کرنے سے دریغ نہیں کیا اور انشورنس، تعاون وامداد کے دل فریب عنوان سے اپنا جال بچھایا اور اس زور وشور سے پروپیگنڈہ کیا کہ آج ہر شعبہ زندگی کی طرح صحت ومرض اور علاج کا شعبہ بھی پوری طرح ان کی گرفت میں ہے۔

جب کہ حقیقت یہ ہے کہ یہ انشورنس تعاون وامداد سے کوسوں دور ہے، ربا اور قمار کا یہ معجون مرکب بہرحال مسلمانوں کے لئے ناقابل عمل اور ناقابل قبول ہے، اس یہودی نظام نے ہماری دنیا بھی خراب کر رکھی ہے اور ہماری آخرت بھی۔

اس سلسلہ میں یہ طریقہ کار بھی صحیح نہیں کہ ماہرین شریعت کی طرف رجوع کرکے ان سے کہا جائے کہ بیمہ کو حلال کردیں یا ضرورت ومجبوری کے نام پر کوئی حیلہ نکالیں، بلکہ اس کا صحیح حل یہ بھی ہوسکتا ہے کہ جگہ جگہ خیراتی اور رفاہی ادارے قائم کئے جائیں جس میں تبرعات اور چندے اکٹھا کرکے فنڈ قائم کیا جائے اور اس سے غریبوں اور ضرورت مندوں کے علاج کا انتظام کیا جائے، اور خود چندہ دہندگان بھی اس سے مستفید ہوسکتے ہیں۔

یہ بھی ممکن ہے کہ مسلم سرمایہ دار بطور وقف اعلی معیار کے اسپتال اور میڈیکل کالج قائم کریں جس کے دروازے پوری قوم کے لئے کھلے ہوں اور اس کی آمدنی سے ضرورت مندوں اور غریبوں کا علاج بھی کیا جائے۔

تحریری آراء:

میڈیکل انشورنس کا شرعی حکم

مولانا محمد برہان الدین سنبھلی [1]

۱- جو زندگی کے بیمہ کا حکم ہے وہی اس کا بھی ہونا چاہئے (یعنی عدم جواز)۔

۲- اگر بیمار نہیں پڑا تو جمع کردہ رقم سوخت ہو جاتی ہو تو اس میں قمار کی شان آ گئی، لہذا ناجائز ہوگا۔ ہاں اگر جمع شدہ کل رقم واپس مل جاتی ہو تو پھر زیادہ مالیت سے استفادہ کمپنی کی طرف سے گویا تبرع ہونے کی وجہ سے شرعاً جائز ہوگا۔

۳- جب دونوں، عقد ایک ہی طرح کے ہیں تو دونوں کا حکم بھی ایک ہی ہوگا (جو اوپر ۲ میں مذکور ہوا)۔

۴- اگر پہلے سے رقم جمع کرنے کی شرط کے بغیر سرکاری ادارہ مدد دیتا ہے تو اس کا استعمال درست ہوگا، ورنہ وہی حکم ہوگا جو اوپر (۲ و ۳) میں گذرا۔

۵- اس مقصد سے خیراتی و امدادی ادارے قائم کئے جا سکتے ہیں، بلکہ بعض جگہ قائم بھی ہیں جن میں بغیر کسی پیشگی رقم کی ادائیگی کی شرط کے یا اس جیسی کوئی اور شرط لگائے بغیر ہی ضرورت مندوں کی مدد کی جائے۔

۶- حکومتی قانون کی مجبوری کو فقہاء نے ''حاجت'' کے درجہ میں رکھا ہے، بنابریں حاجت کی وجہ سے جو محظورات جائز ہو جاتے ہیں وہ اس صورت میں بھی جائز ہو جانے چاہئیں، لیکن اس صورت میں ایک ضروری بات یہ ملحوظ رکھنی ہوگی کہ جن ملکوں میں ایسے قوانین رائج ہیں جو اصلاً ممنوع شرعی ہیں وہاں کا یہ شخص یا تو اصل باشندہ ہو یا باہر کا کوئی شخص وہاں ایسے کام سے گیا ہو جس کے لئے جانا شرعاً ناگزیر تھا، ورنہ ایسے ملکوں میں جانا اتنی مدت تک یہ قانون لاگو ہو جائے شریعت کے اصل حکم کی رو سے جائز نہیں، لہذا ایسے لوگوں کے لئے وہاں کے قانون کو ''حاجت'' کا درجہ دینا بھی شاید محل نظر ہو جائے (مؤخر الذکر لوگوں کے لئے)۔

☆☆☆

---

[1] استاذ تفسیر وحدیث دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنو۔

میڈیکل انشورنس سے متعلق سوالات کے جوابات

مولانا قاضی عبدالجلیل قاسمی[1]

۱- میڈیکل انشورنس صریح خالص قمار (جوا) ہے۔

۲- صحت بیمہ کرنے والا جو اضافی رقم لیتا ہے یا علاج سے مستفید ہوتا ہے وہ قمار میں حاصل کردہ رقم کے حکم میں ہے۔

۳- سرکاری اداروں سے فائدہ اٹھانے کی گنجائش ہوسکتی ہے۔

۴- سرکاری ادارہ علاج کی ضرورت پر جو رقم دیتا ہے اس کو امداد و تعاون کا درجہ دیا جاسکتا ہے۔

۵- میڈیکل انشورنس کے بجائے اگر مسلمان شرعی نظام کے تحت بیت المال قائم کریں اور اس میں تمام صدقات واجبہ کی رقم جمع ہو تو غریبوں کے لئے صرف علاج ہی نہیں ان کی دوسری ساری ضروریات کی کفالت ہوسکتی ہے۔

۶- جن ممالک میں وہاں جانے والوں کے لئے ''میڈیکل انشورنس'' لازم کردیا گیا ہے وہاں کے بارے میں سمجھا جائے گا کہ وہ حکومت اپنے یہاں آنے والوں سے اتنی رقم بطور فیس لیتی ہے اگر وہ بیمار نہ پڑے تو فیس ادا کرچکا ہے، اور اگر بیمار ہوجائے تو حکومت کی طرف سے اس کے علاج پر جو خرچ ہو اس کی طرف سے امداد و تعاون تصور کیا جائے گا۔

---

[1] استاذ تفسیر و حدیث، دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ۔

صحت بیمہ قمار اور سود پر مبنی ہے

مفتی محبوب علی وجیہی، رامپور[1]

۱،۲- ''میڈیکل انشورنس'' یعنی صحت کا بیمہ کرانا جوے اور سود دونوں پر مبنی ہے، بیمار نہیں ہوا تو جمع شدہ رقم گئی اور بیمار ہوا تو جمع شدہ رقم سے زیادہ حاصل کی، پہلی صورت میں جوا ہے اور دوسری صورت میں سود ہے۔

۳،۴-حکومت اگر بطور امداد پر رقم دے، مثلاً پبلک سے کہے کہ اس بیمار کے علاج میں جو خرچ آئے گا اس کا اتنا فیصد تم کو دینا ہوگا اور باقی خرچ ہم کریں گے تو یہ جائز ہے، لیکن متعین کر کے ایک رقم لینا اور یہ کہنا کہ اگر تم مدت معینہ میں بیمار نہیں ہوئے تو یہ رقم واپس نہیں ہوگی یہ جوا ہے جو ناجائز ہے اور نجی کمپنیوں کی نیت تو تجارت کی ہے، اس لئے یہ اور بھی زیادہ برا ہے، البتہ جن ممالک میں مسلمانوں کی حکومت نہیں ہے، نہ ان کی مؤثر طاقت ہے وہاں ''الضرورات تبیح المحظورات'' کے تحت اس قانون پر انشاء اللہ عمل کرنے سے معافی کی امید ہے۔

۵- اسلامی تعلیمات کی روشنی میں اس کی متبادل صورت میں نے اوپر لکھی ہے کہ جتنا وہ غریب یا وہاں کا باشندہ دے سکتا ہے وہ دے باقی گورنمنٹ دے یا پھر ملکی مسلمان حکومت یہ کام مدزکوۃ سے بھی کر سکتی ہے۔

٦- اس کا جواب بھی ''الضرورات تبیح المحظورات'' میں آ گیا کہ وہ انشورنس کرا سکتے ہیں اور اس سے فائدہ بھی اٹھا سکتے ہیں۔

[1] قاضی شریعت امارت شرعیہ، پھلواری شریف پٹنہ۔

میڈیکل انشورنس خالص قمار آمیز ہے

مفتی محمد ثناء الہدیٰ قاسمی [1]

اللہ تعالیٰ نے ہر مرض کی دوا پیدا کی ہے، موجودہ صنعتی انقلاب، فضائی آلودگی اور غذائی اجناس میں کیمیکلس کے غیر معمولی استعمال نے انسان کو مجموعہ امراض بنادیا ہے یہ امراض اتنے پیچیدہ ہوتے ہیں کہ علاج میں غیر معمولی اخراجات برداشت کرنے ہوتے ہیں، اس لئے غربا اور اوسط آمدنی والے خاندان اس اخراجات کے متحمل نہیں ہوتے ایسے میں یا تو وہ گھٹ گھٹ کر مرجائیں یا پھر کوئی ایسا رابطہ انشورنس کمپنیوں سے بنائیں جو ان کے مشکل وقت میں کام آئے اور ہر علاج کے لئے رقم فراہم کردے، انسان کی فطری خواہش کا تقاضا ہے کہ وہ ان کمپنیوں سے رابطہ بنائے جو صحت کا بیمہ کرتی ہیں اور صرف اسی کام کے لئے قسطیں جمع کراتی ہیں۔

۱- اس کا طریقہ کار یہ ہے کہ سرکاری یا نجی کمپنیاں فرد یا پورے خاندان کا ''میڈیکل انشورنس'' کرتی ہیں ان کی عمر اور جسمانی صلاحیت کے اعتبار سے علاحدہ علاحدہ رقمیں طے کر کے اس کی قسطیں سال بھر میں جمع کرنی ہوتی ہیں، سال بھر میں اگر انشورنس کرانے والا بیمار ہو گیا تو کمپنی اس کے علاج کا خرچ برداشت کرتی ہے اگر بیمار نہیں ہوا تو سال بھر کے بعد وہ رقم کمپنی کی ملکیت ہو جاتی ہے اس صورت کو شریعت کی اصطلاح میں قمار کہتے ہیں جو جائز نہیں ہے۔

۲- اب اگر کسی نے صحت بیمہ کرالیا، اور ضرورت پر زیادہ مالیت کے علاج سے مستفید ہوا تو اضافی رقم کا حکم قمار کے ذریعہ حاصل کردہ رقم کا ہوگا۔

۳- اور اس مسئلہ میں سرکاری اور نجی اداروں کا حکم یکساں ہوگا، کیونکہ دونوں کے طریقہ کار میں فرق نہیں ہے، صرف یہ کہنا کہ سرکاری ادارے، سماجی تحفظ کے ادارے اور نجی کمپنیاں منافع کے حصول کے لئے یہ بیمہ کراتی ہیں اور سرکاری انشورنس ادارہ کی طرف سے خرچ کی گئی زیادہ رقم کو امداد وتعاون مان لیا جائے، صحیح نہیں، کیونکہ جو رقم بیمار نہ ہونے کی شکل میں بیمہ کمپنیوں کی ملکیت ہوگی اس کو معاملات کے کس خانے میں ڈالا جائے گا؟ صحیح یہ ہے کہ انشورنس کرنے والا ادارہ سرکاری ہو یا غیر سرکاری اس کا جو طریقہ ہے اس کی وجہ سے یہ خالص قمار ہے۔

۴- اس مسئلہ کا حل یہ سمجھ میں آتا ہے کہ کوئی ایسی کمپنی ہو جس کا کاروبار حلال ہو اس کے شیئر ہولڈرس ہوں جن کے خالص منافع کی رقم اسی کام کے لئے مختص ہو، بیمار نہ ہونے کی صورت میں وہ رقم سال بسال شیئر ہولڈر کے نام جمع ہو، بیمار پڑ گیا۔ اس کی جمع شدہ رقم علاج کے لئے کافی نہ ہو تو کمپنی کے دوسرے شیئر ہولڈر کی خالص آمدنی سے بطور قرض اس رقم کو لیا جائے اور آئندہ سالوں کے منافع سے اس فرد خاص کی رقم سے قرض کی ادائیگی ہوتی رہے تاکہ ساری رقم واپس ہو جائے، اور اگر شیئر ہولڈر کا انتقال ہو جائے تو اس کے حصص کی قیمت، نیز منقولہ وغیر منقولہ جائداد سے قرض کی وصولی کی جائے، اور اس کے بعد بھی کچھ رہ جائے تو سارے شیئر ہولڈرس امداد وتعاون کے جذبہ سے اسے معاف کردیں۔

۵- البتہ جن ممالک میں شہریوں پر یا وہاں جانے والوں پر ''میڈیکل انشورنس'' لازم قرار دیا گیا ہے تو برضا ورغبت نہیں، مجبوری کی وجہ سے انشورنس کرانے کی گنجائش ہوگی، اور حالت اضطرار میں انشورنس کی اس خاص صورت سے فائدہ بھی اٹھایا جاسکتا ہے۔

☆☆☆

[1] نائب ناظم امارت شرعیہ، پھلواری شریف، پٹنہ

صحت بیمہ ناجائز ہے

مفتی جمیل احمد نذیری[1]

۱- میڈیکل انشورنس میں مختلف طے شدہ رقمیں، مختلف متعین کردہ بیماریوں کے ہونے کے اندیشہ کے تحت علاج کی امید پر دی جاتی ہیں، اور دینا بھی اس شرط کے ساتھ مشروط ہوتا ہے کہ دی ہوئی رقم سے کہیں زیادہ علاج کے اخراجات برداشت کئے جائیں گے اور متعین کردہ بیماریاں نہ ہونے کی صورت میں جمع کردہ رقم واپس نہ ملے گی۔

اس معاملہ پر قمار (جوا) کی تعریف "تملیک علی الخطر" صادق آتی ہے، قمار میں بھی لگائی ہوئی رقم سے زیادہ ملنے کی امید ہوتی ہے اور لگائی ہوئی رقم ضائع چلی جانے کا بھی اندیشہ ہوتا ہے۔

لہذا میڈیکل انشورنس (صحت بیمہ) کرانا جائز نہیں۔

۲- جمع کردہ رقم سے زیادہ مالیت کے علاج سے مستفید ہونا ممنوع نہیں، لیکن مشروط ہونے کی وجہ سے ممنوع ہے۔

۳- سرکاری اور نجی اداروں کا طریقہ کار چونکہ ایک ہی ہے، اس لئے مقصد کے فرق کے باوجود، حکم ایک ہی رہے گا، اور وہ ہے دونوں کی حرمت۔

۴- سرکاری انشورنس ادارہ یا نجی ادارہ جو مطلوبہ یا مقررہ رقم دیتا ہے، اس کو سرکار یا نجی ادارہ کی طرف سے امداد وتعاون کا درجہ دیا جاسکتا تھا، اگر مشروط نہ ہوتا بلا تعیین رقم، اور بلا شرط رقم ہوتا۔

۵- متبادل صورت یہ ہے کہ حکومت کا محکمہ صحت غرباء کے علاج کے لئے مخصوص رقم فراہم کرے، اس کا طریقہ کار ایسا ہو جس سے رقم کی وصولی غرباء کے لئے آسان ہو اور جلد ہو جائے اور ایسا انتظام کرے کہ رقم مستحقین تک پہنچے، بیچ میں نہ رہ جائے یا غیر مستحقین اس سے نہ فائدہ اٹھانے لگیں، یہ انتظام ان مخصوص بیماریوں کے لئے جن کے علاج میں کافی سرمایہ کی ضرورت پڑتی ہے۔

ایسا انتظام نجی فلاحی ادارے بھی کر سکتے ہیں۔

اسی طرح سرکاری ونجی اسپتالوں کی آمدنی سے ایک فنڈ غرباء ومتوسط طبقہ کے علاج کے لئے مختص کیا جائے اور پوری جانچ پڑتال کے بعد مستحقین تک پہنچایا جائے، اور علاج کرانے والے غرباء یا ان کے متعلقین سے کہا جائے کہ وہ بطور چندہ، جتنی رقم اس فنڈ میں دے سکیں، دے دیں، اس کا لحاظ کئے بغیر کہ علاج پر خرچ کتنا آئے گا۔

۶- قانونی مجبوری کے تحت انشورنس کرانے کی گنجائش ہے، ایسے لوگوں کے پاس اگر علاج کی رقم نہ ہو تو انشورنس کی سہولت سے فائدہ اٹھالیں، گنجائش: ہوجانے کے بعد اتنی رقم صدقہ کردیں، اور اگر غریب ومفلوک الحال ہوں تو صدقہ کی ضرورت نہیں۔

☆☆☆

---

[1] ناظم، جامعہ عین العلوم نوادہ، مبارکپور، اعظم گڑھ
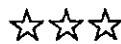
میڈیکل انشورنس

مولانا عبداللطیف پالنپوری[1]

۱- میڈیکل انشورنس (صحت بیمہ) کرانا شرعاً جائز نہیں ہے، کیونکہ بیمہ قمار اور سود پر مشتمل ہے اور یہ دونوں بڑے سنگین گناہ ہیں جن کی حرمت نص قطعی سے ثابت ہے۔

۲- اگر کسی نے لاعلمی میں صحت بیمہ کرالیا ہو تو اس پر توبہ استغفار لازم ہے، اور جمع شدہ رقم سے زیادہ مالیت کے علاج سے مستفید ہونا جائز نہیں ہے، کیونکہ یہ سود ہے۔

۳- میڈیکل انشورنس کا تعلق سرکاری ادارہ سے ہو یا نجی ادارہ سے دونوں صورتوں میں ناجائز ہے، عدم جواز کی علت (سود، قمار) دونوں صورتوں میں موجود ہے۔

۴- سرکاری انشورنس ادارہ جو علاج کی ضرورت پر مطلوبہ یا مقررہ رقم دیتا ہے یہ ایک مخصوص رقم انشورنس ادارہ میں جمع کرنے کے ساتھ مشروط ہے، لہذا اس کو سرکار کی طرف سے امداد و تعاون کا درجہ نہیں دیا جاسکتا، بلکہ یہ سود ہے جو حرام ہے۔

۵- مسلمانوں کو چاہئے کہ عطیات کی مد سے ہر شہر میں اپنا الگ اسپتال قائم کریں، جس میں دواؤں وغیرہ ہر طرح کی سہولیات فراہم کی جائے، نیز صدقات وزکوۃ کی مد سے غرباء کو مفت علاج بھی فراہم کیا جاسکتا ہے، سرکاری طور سے ایسے اسپتال ہیں جن میں غریبوں کے لئے علاج کی سہولت فراہم ہے۔

۶- فقہ کا مشہور قاعدہ ہے: "الضرورات تبیح المحظورات" ضرورت ناجائز اشیاء کو مباح کر دیتی ہے، جن ممالک میں میڈیکل انشورنس کرانا وہاں کے شہریوں یا وہاں جانے والوں کے لئے ضروری کر دیا گیا ہو، ان کے لئے اس فقہی قاعدہ کے تحت میڈیکل انشورنس کی گنجائش ہے۔

لیکن بیمہ کمپنی میں جتنی رقم جمع ہوتی ہے اس سے زیادہ علاج کی سہولت حاصل کرنا جائز نہیں ہے، زائد رقم غرباء اور محتاجوں میں بلا نیت ثواب تقسیم کر دی جائے، البتہ اگر خود ہی محتاج ہو تو بقدر ضرورت اپنے استعمال میں لینے کی گنجائش ہے (فتاوی رحیمیہ ۶/ ۱۳۳)۔

☆☆☆

[1] دار العلوم نذیریہ، کاکوسی، گجرات۔

میڈیکل انشورنس شرعاً ناجائز

مولانا نیاز احمد عبدالحمید مدنی[1]

۱- ناجائز ہے۔

۲- ناجائز ہے۔

۳- دونوں کا حکم ایک ہوگا۔

۴- مذکورہ تفصیل کے روشنی میں اس کو تعاون کا درجہ نہیں دیا جاسکتا۔

۵- ملکی، صوبائی، ضلعی اور قروی پیمانہ پر زکوۃ کا اجتماعی نظام، بیت المال کا قیام، رفاہی تنظیموں کا قیام، صرف طبی خدمات کے لئے رفاہی تنظیم کا قیام زکوۃ کے مال سے اسپتال کا قیام اور مستحقین زکوۃ اور فقراء ومساکین کے لئے مفت علاج کا انتظام۔

۶- مجبوری کی حالت میں جائز ہوگا، قانونی مجبوری کے تحت کئے گئے بیمہ سے استفادہ درست ہوگا۔

☆☆☆

[1] ڈومریا گنج، سدھارتھ نگر، یوپی۔

ہیلتھ انشورنس میں قمار کا عنصر ہے

مولانا محمد نعمت اللہ قاسمی[1]

میڈیکل انشورنس (علاج بیمہ) کی اگر یہ صورت ہو کہ انشورنس کرانے والے کو ایک مقرر رقم نہیں، بلکہ اس مقررہ رقم کے بقدر دوا اور علاج کی سہولت حاصل ہوگی تو اسے ہم بیع اور اجارہ کی صورت کہہ سکتے ہیں جو سود پر مشتمل نہیں ہے اور جائز ہے، لیکن قمار سے پھر بھی مفر نہیں ہے کہ ایک طرف سے رقم کا ادا کیا جانا تو یقینی ہے، لیکن دوسری طرف سے طبی سہولیات کا حاصل ہونا فریق اول کے بیمار ہونے پر، بلکہ اس کی خاص بیماری پر موقوف جو غیر یقینی ہے اور قمار کی حرمت بھی منصوص بنص قطعی (قطعی الثبوت اور قطعی الدلالہ) ہے، پس جب تک کہ اضطرار کی صورت نہ ہو اس کے اختیار کرنے کی اجازت نہیں دی جائے گی جیسا کہ تمہید کی شق ۵ میں گذر چکا ہے اور ظاہر ہے کہ منتظر بیماری کو اضطرار چہ معنی حاجت بھی قرار نہیں دے سکتے ہیں، پس میڈیکل انشورنس کے جواز کی طرف جانا راقم الحروف کی رائے میں صحیح نہیں ہے اور سرکاری و نجی میڈیکل انشورنس کمپنی کے درمیان حکم میں میرے نزدیک کوئی فرق نہیں ہے۔

جہاں تک سرکاری قانونی کے ذریعہ لزوم اور جبر کا سوال ہے تو اس مجبوری کے تحت انشورنس کرا لینے کی اجازت تو ہوگی لیکن استفادہ کی اجازت نہیں ہوگی، البتہ اپنی رقم کسی طرح واپس لے لینا جائز ہوگا۔

۵- اگر بنیادی مقصد غریبوں کو گراں علاج کی سہولت فراہم کرنا ہے و فی سبیل اللہ خلق خدا کی خدمت کی نیت سے یہ کام کرنا چاہئے اور کم از کم مختلف کمپنیاں ہر بیماری نہیں تو خاص خاص بیماری کے علاج کی ذمہ داری قبول کر لے اور وہ بھی زیادہ نہیں، محدود انداز میں قبول کر لے، اس طرح اگر بہت سی کمپنیوں نے یہ کام کیا تو بہت سے غریب مریض کو گراں علاج کی سہولت حاصل ہو جائے گی۔

☆☆☆

[1] جامعہ اسلامیہ دار العلوم، ملیا، گوگری جمالپور، کھگڑیا، بہار۔
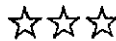
یہ انشورنس غیر شرعی ہے

مولانا ابوالعاص وحیدی [1]

۱- میڈیکل انشورنس کے بارے میں جو تفصیل سوال نامہ میں ذکر کی گئی ہے اس کے پیش نظر وہ ناجائز ہے۔

۲- صحت بیمہ کرانے والا جو رقم جمع کرتا ہے اور پھر ضرورت پر اس سے کہیں زیادہ مالیت کے علاج سے مستفید ہوتا ہے وہ بھی ناجائز ہے۔

۳- سرکاری ونجی میڈیکل انشورنس اداروں کا حکم ایک ہی ہوگا۔

۴- سرکاری انشورنس ادارہ جو علاج کی ضرورت پر مطلوبہ یا مقررہ رقم دیتا ہے اس کو سرکار کی جانب سے امداد وتعاون کا درجہ نہیں دیا جاسکتا۔

۵- اسلامی نقطۂ نظر سے ملکی، صوبائی، ضلعی اور مقامی سطح پر متبادل صورت یہ ہے کہ:

☆ زکاۃ کا اجتماعی نظام قائم کیا جائے۔

☆ بیت المال قائم کیا جائے۔

☆ رفاہی تنظیمیں قائم کی جائیں۔

☆ طبی خدمات کے لئے رفاہی تنظیم قائم کی جائے۔

☆ صدقات واجبہ ونافلہ کے مال سے ہسپتال قائم کیا جائے جہاں غرباء ومساکین کے لئے مفت علاج کا انتظام ہو۔

۶- جن ممالک میں میڈیکل انشورنس وہاں کے شہریوں یا وہاں جانے والوں کے لئے لازم کردیا گیا ہے بدرجۂ اضطرار اسے جائز مانا جائے گا، اسی طرح اگر قانونی مجبوری کے تحت انشورنس کرانے والے بیمار پڑجائیں تو ان کے لئے انشورنس کی سہولت سے استفادہ جائز ہوگا۔

نوٹ:...... میڈیکل انشورنس کے بارے میں اوپر جو رائے ذکر کی گئی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ میڈیکل انشورنس کے پورے نظام میں قمار (جوا) کی روح پائی جاتی ہے جو نص صریح سے حرام ہے، انشورنس اور قمار کی مشابہت پر مولانا برہان الدین سنبھلی حفظہ اللہ نے بڑی مفصل بحث کی ہے۔

(ملاحظہ ہو: موجودہ زمانہ کے مسائل کا شرعی حل/ ۹۹-۱۰۰)۔

☆☆☆

---

[1] سدھارتھ نگر، یوپی۔

میڈیکل انشورنس اور اس کا شرعی حکم

مولانا نعیم اختر قاسمی [1]

انشورنس کے موضوع پر ہند اور بیرون ہند میں کئی سمینار منعقد کئے جا چکے ہیں، خصوصا ''اسلامک فقہ اکیڈمی'' کا چوتھا سمینار اسی موضوع پر حیدرآباد میں منعقد ہوا تھا، جس میں کثیر تعداد میں علمائے کرام نے شرکت کی تھی، مقالے بھی تحریر کئے گئے تھے اور اپنی قیمتی آراء بھی پیش کی تھیں اور حسب دستور تجاویز بھی پاس کی گئی تھیں۔

مگر چونکہ ''میڈیکل انشورنس'' بھی انشورنس ہی کی ایک قسم ہے، اس لئے انشورنس سے متعلق کچھ اپنے خیالات کا مختصر طور پر اظہار کر دینا بھی ضروری ہے تاکہ میڈیکل انشورنس سے متعلق سوالات کا جواب دینے میں مطابقت رہے۔

میڈیکل انشورنس:

سوالنامہ میں میڈیکل انشورنس کا جو تعارف کرایا گیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انشورنس کی یہ قسم املاک اور ذمہ داری کے انشورنس کے مشابہ ہے، لہٰذا اس پس منظر میں میڈیکل انشورنس سے متعلق سوالات کے جوابات حسب ذیل ہیں:

۱- میڈیکل انشورنس کرانا جائز ہے، کیونکہ یہ امداد باہمی کی قبیل سے ہے جس میں سود قمار وغیرہ کا تحقق نہ ہوگا، کمپنی کا نفع حاصل کرنا شرکاء کی اجازت سے ہے، نیز حصول نفع ایک تبعی اور طبعی چیز ہے۔

۲- جمع شدہ رقم سے زائد مالیت کے علاج سے مستفید ہونا بھی جائز ہے۔

۳- سرکاری اور نجی دونوں قسم کے اداروں سے فائدہ اٹھانا یکساں طور پر جائز ہے، کیونکہ نجی کمپنیوں کا حصول نفع کے پیش نظر اس طرح کا ادارہ قائم کرنا امداد باہمی کے منافی نہیں جیسے موجودہ پرائیوٹ تعلیمی ادارے۔

۴- انشورنس ادارہ کی جانب سے علاج کے لئے دی گئی رقم کو ادارہ کی جانب سے امداد وتعاون قرار دیا جائے گا۔

۵- انشورنس ادارہ اگر جمع شدہ سرمایہ میں اضافہ کی غرض سے غیر شرعی طریقہ اپناتا ہو تو ادارہ کا ایسا کرنا درست نہیں، بقیہ چیزیں خلاف شرع معلوم نہیں ہوتیں۔

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ نے مروجہ بیمہ کے صحیح بدل کی جو صورت بیان کی ہے تھوڑے فرق کے ساتھ وہ موجودہ نظام سے ملتی جلتی ہے۔

(جواہر الفقہ ۲/ ۱۸۸ تا ۱۹۰)۔

ہندوستان کے موجودہ حالات کے تناظر میں امداد باہمی کی اگر اس سے بہتر کوئی شکل بن سکتی ہو تو چھوٹے پیمانے پر ہی سہی اس کا عملاً آغاز کرنے کی کوشش کی جانی چاہئے۔

۶- میڈیکل انشورنس میں حصہ لینا جبراً یا اختیاراً جائز ہے، لہٰذا علاج کے وقت اس کی سہولیات سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔

☆☆☆

---

[1] جامعہ عربیہ امداد العلوم، گوپا گنج، مئو۔
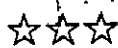
مناقشہ:

میڈیکل انشورنس

جناب باگ سراج صاحب:

جناب صدر جلسہ اور مہمان خصوصی اور معزز سامعین اس وقت کا عنوان "میڈیکل انشورنس یا ہیلتھ انشورنس" ہے اور اس پر جو سوالات آئے ہیں اس میں جو سب سے اہم سوال ہے وہ یہ کہ ہیلتھ انشورنس جو اس وقت ہندوستان اور دنیا بھر میں رائج ہے اس کے کیا اہم مقاصد ہیں؟

ان کے تین مقاصد ہیں، پہلا مقصد کسی بھی ملک میں ہیلتھ انشورنس اور جنرل انشورنس تمام انشورنس کمپنیز کا دولت کا پیدا کرنا یا بڑھانا، یعنی کریٹ منی ہے، اب اس دولت کے کماتے ہوئے کچھ اچھے کام بھی ہوجاتے ہیں تو وہ ضمنی ہیں، دوسرا جو مقصد ہے خاص کر ہیلتھ انشورنس کا وہ پروٹیکشن آف ہیلتھ ہے، یعنی عوام کی صحت کا خیال رکھنا، یا صحت کے لئے تحفظ کی فراہمی ہے اور تیسرا مقصد ہے انسانی زندگی اور پراپرٹی کے نقصانات کی تلافی کرنا ہے، یہ تین مقاصد ہیں۔

میں صرف مسلمانوں کی بات نہیں کررہا ہوں، پوری دنیا کی عوام انشورنس ایجنسیز سے جو توقع رکھتی ہے، وہ یہی کہ ان کی بھی دولت بڑھے، اور جان و مال کے نقصانات کی تلافی کی ضمانت بھی ملے، ہندوستان میں بھی بہت سارے کام کرنے والوں کے لئے انشورنس ضروری قرار دیا گیا ہے اور ریٹائرڈ ہوتے وقت جو مختلف پینشن ملتے ہیں تو ایک تو پینشن کا بینیفٹ ملتا ہے، دوسرے گریجویٹی کا اور تیسرے انشورنس کا بینیفٹ بھی کمپلسری (ضروری) میں شامل ہے تو جس طرح عوام ان تمام چیزوں کو دولت اور منافع کے حصول کے طور پر دیکھتی ہے، حکومت بھی اسی نقطہ نظر سے دیکھتی ہے، اب حکومت کے پاس جہاں دوسرے ذرائع ہیں وہیں انشورنس کے تمام ذرائع بھی ہیں، اس میں حکومت اپنے فائدہ اور بچت کے نظریئے سے پالیسی جاری کرتی ہے اور عوام اپنے فائدہ کی غرض سے پالیسی لیتے ہیں، آپ اس بچت کا اندازہ اس سے لگائے کہ ۲۰۰۵ء میں جو ہے کل رقم لائف انشورنس کے ذریعہ جمع کی گئی اس کی تعداد پانچ سونوے بلین کروڑ روپے ہے ایک ہزار ملین کا ایک بلین ہوتا ہے، اور دس لاکھ کا ایک ملین ہوتا تو اتنی رقومات جب انشورنس سے جمع ہوتی ہیں تو عوام کیا دیکھتی ہے، عوام بھی یہ دیکھتی ہے کہ اپنی بچت ہو اور اپنی پونجی بڑھے، پونجی یوں بڑھتی ہے کہ ہیلتھ انشورنس میں تو یہ نہیں ہوتا ہے، لیکن دوسرے انشورنس میں ربا دیا جاتا ہے، اس لئے اضافہ ہوجاتا ہے تو عوام دیکھتی ہے کہ اپنی پونجی میں اضافہ ہو اور دوسرا تحفظ بھی ملے ساتھ ساتھ، اس تحفظ میں زندگی کا بھی تحفظ شامل ہے، صحت کا بھی تحفظ شامل ہے اور مال کا بھی تحفظ شامل ہے تو یہ رہے انشورنس ایجنسیز کے مقاصد اور عوام کے مقاصد بھی اب ایجنسیز کا بھی سوال تھا اس میں مختلف اسپتالوں یا مختلف ایجنسیز انشورنس مہیا کرتی ہیں، یہ خیال صحیح نہیں ہے کہ صرف انشورنس ایجنسیز ہی انشورنس مہیا کرتی ہیں۔

جس شخص کی کمپنیز میں تنخواہ ساڑھے چھ ہزار روپے ماہانہ سے کم ہوتی ہے اس کے لئے ہیلتھ انشورنس کا نظم ہوتا ہے، ان کے ورکروں کی پوری فیملی اور ان کے بچوں کی صحت کا خیال رکھا جاتا ہے اور وہاں پر ان کا علاج ومعالجہ ہوتا ہے، یہ گورنمنٹ سیکٹر کی ایجنسی بھی کرتی ہے اور پبلک سیکٹر کی ایجنسیز بھی، یعنی مختلف کارپوریشنس ہیں، ایک سوال اسی سلسلہ میں یہ بھی آیا تھا تو جی ہاں کمپنیاں اور کارپوریشن اپنے اپنے طور پر آفیسرس اور اپنے تمام عملہ کو انشورنس کی سہولت فراہم کرتی ہے۔

اب گروپ انشورنس کی صورت میں کمپنیاں انشورنس کمپنی سے بھی انشورس کراتی ہے، اور خود بھی جو کمپنی کا اپنا نفع ہوتا ہے اس میں سے بھی رقومات جو ہیلتھ کے تحفظ پر آتے ہیں کمپنی خرچ کرتی ہے، تو پبلک سیکٹر ایجنسی یا پھر پرائیوٹ سیکٹر ایجنسیز جیسا کہ سوال آیا MNC ملٹی نیشنل کارپوریشن کا تو ملٹی نیشنل کارپوریشن کا تو نہیں، البتہ جو بلائنڈ آف کمپنیز ہیں وہ تمام اپنے عملہ کو ان کے ہیلتھ کے تحفظ کے لئے انشورنس فراہم کرتی ہے۔

ان کے علاوہ سینٹرل گورنمنٹ بھی اپنے امپلائز اور عملہ کو انشورنس فراہم کرتی ہے، اس کی خاص اسکیم یہ ہے کہ وہ ہندوستان کے قوانین کے تحت بنائے گئے ہیں پھر عوام الناس کے انشورنس کے لئے دو ایجنسیز ہیں، پہلے بہت ساری تھی ان کو نیشنلائز کیا گیا، ایک لائف انشورنس کارپوریشن کے نام سے اور ایک جنرل

انشورنس کارپوریشن کے نام سے، اور جہاں تک ہیلتھ انشورنس کا سوال ہے تو یہ صرف جنرل انشورنس کمپنی مہیا کرتی ہے، اور ایک خاص نکتہ جس کی طرف یہاں اشارہ کیا گیا تھا کہ ہیلتھ کے انشورنس میں رفاہی کام زیادہ نظر آتا ہے، اس تعلق سے یہ عرض ہے کہ اس وقت تک یہ بات صحیح نہیں ہے، اس لئے کہ عام آدمی جو اپنے صحت کو انشورڈ کراتا ہے، اور وہ رقومات جو ایک سال کے لئے پریمیم کی شکل میں دیتا ہے، اس میں اور جو جنرل انشورنس کارپوریشن جو اپنی پالیسیز کے کلیمس پہ پیسہ خرچ کرتا ہے، اسپتال میں لوگوں کے علاج میں اس میں فرق ہے، اس لئے کہ کلیمس تو سو فیصدی ہیں جب کہ اس وقت کے رائج ڈاٹا کے حساب سے کلکشن ۴۰ فیصدی ہے، تو سو فیصدی کلیمس ہیں جب کہ اخراجات میں اس کا تناسب ایک سو چالیس فیصدی سے زیادہ آرہا ہے، اس لئے ہیلتھ انشورنس سیکشن بہت سنجیدگی سے یہ غور کررہا ہے کہ ہیلتھ انشورنس کے پریمیم کو جلد سے جلد سے بڑھایا جائے تو عنقریب ہیلتھ انشورنس کی جو لاگت ہے، اور اس کی کاسٹ کے بڑھنے کے چانسز ہیں اور یہ اس لئے بھی کہ ہیلتھ انشورنس، بلکہ تمام انشورنس کو ہندوستان میں ۲۰۰۱ء سے پرائیوٹ سیکٹر میں پھر سے لایا گیا ہے، پہلے سے پرائیوٹ سیکٹر میں تھا، بعد میں نیشنلائز کیا گیا تھا اب پھر سے پرائیوٹ سیکٹر میں لایا گیا ہے، اب پرائیوٹ سیکٹر میں جنرل انشورنس کی بہت ساری کمپنیاں آ گئی ہیں، لیکن صرف ایک کمپنی اس وقت ہندوستان میں ایسی بنی ہے بجاج کی جو ہیلتھ انشورنس کرتی ہے، اور وہ واحد پرائیوٹ ہیلتھ انشورنس کمپنی ہے جو کوئی اپنا انشورنس کراتا ہے اس کو اپنے مخصوص ہاسپیٹل میں علاج کرواتی ہے، اس نے اکتالیس ہاسپیٹل کے ساتھ اپنا معاہدہ کررکھا ہے، ہندوستان کے مختلف شہروں میں اور وہ اکتالیس ہاسپیٹل نہایت ہی عمدہ اور تمام سہولیات سے آراستہ ہیں ان میں سے کسی اسپتال میں جس نے اپنے ہیلتھ کا انشورنس کرایا ہے جا کر اپنا علاج مفت کراسکتا ہے، اسے اپنی طرف سے کوئی پیسہ ادا نہیں کرنا پڑتا ہے، باقی تمام ہیلتھ کے انشورنس کی کمپنیز میں پہلے اپنا پیسہ خرچ کرنا پڑتا ہے اور جو بلس آتے ہیں ان کے لئے اپنے کلیمس پیش کرنے پڑتے ہیں، اور جنرل انشورنس کا جو ہیلتھ کا شعبہ ہے اس کو پروسس کرتا ہے، کبھی کبھار وہ کلیمس دینے سے انکار بھی کردیتا ہے اگر ان کے رپورٹ میں یہ بات آتی ہے کہ یہ صحیح نہیں ہے، لیکن یہ پرائیوٹ کمپنی ہیلتھ کی جو بجاج ہے اس نے اکتالیس اسپتال کے ساتھ اپنا معاہدہ کررکھا ہے وہاں جا کر مفت مکمل علاج کیا جاسکتا ہے، اور ان کے اخراجات بھی کچھ زیادہ نہیں ہیں۔

ان کے علاوہ بھی ایسی ایجنسیز اور کمپنیز ہیں جو ہیلتھ کی سہولت فراہم کرتی ہے، اب بہت ساری NGOs ہیلتھ انشورنس میں آگئیں ہیں، اور وہ NGOs اسپتال چلاتی ہیں، دوائیاں دیتی ہیں اور ساتھ ساتھ وہ بھی ان کے جو ممبرز ہیں ان کا بھی انشورنس کرتی ہیں، اور یہ سہولیات عوام الناس کے لئے مختلف ایریاز (علاقے) تک محدود ہیں، یہ پورے ملکی پیمانے پر نہیں کرتے، کچھ علاقے ایڈاپٹ کرتے ہیں، کوئی شہر ایڈاپ کرتے ہیں اور اس شہر کے لوگوں کو ہیلتھ انشورنس کی سہولیات مہیا کرتے ہیں۔

مولانا عبید اللہ اسعدی:

ایک سوال یہ بھی ہے بعض حضرات کا ہے کہ کن ممالک میں یہ قید ہے کہ انشورنس کے بغیر سفر نہیں کیا جاسکتا؟

باگ سراج صاحب:

زیادہ تر ویسٹرن ممالک میں جو ڈولپ کنٹریز ہیں اور جہاں ہیلتھ انشورنس کرانا لازم ہے، جیسے امریکہ میں ہیلتھ انشورنس بالکل ضروری ہے، بلکہ انہوں نے اپنا ہیلتھ کارڈ بنایا ہے، اور جو لوگ گلف جاتے ہیں تو جاتے وقت تو انشورنس ضروری نہیں ہے، لیکن جانے کے بعد جیسے ہی وہ وہاں کا مستقل اقامہ اور کام کرنے کا اجازت نامہ حاصل کرتے ہیں تو وہاں بھی ان کے لئے ہیلتھ انشورنس کرانا اور ہیلتھ کارڈ بنانا ضروری ہوتا ہے، لیکن جانے کے لئے نہیں، جانے کے بعد کی بات ہے۔

مولانا عتیق احمد قاسمی:

یہ جو میڈیکل انشورنس کا مسئلہ زیر بحث ہے اس کے بارے میں یہ عرض ہے کہ جن ملکوں اور جن سروس میں جانے کے لئے انشورنس کو لازم کردیا گیا ہے وہ موضوع الگ ہے اور زیادہ پیچیدہ نہیں ہے، ہمیں معلوم یہ کرنا ہے کہ جو سوال نامہ تیار کیا گیا تھا اور بھیجا گیا تھا ان میں جو باتیں سامنے آئیں تھیں کہ امریکہ ہے یا جن ملکوں میں علاج اتنا گراں ہوگیا ہے کہ بغیر "میڈیکل انشورنس" کے اگر کوئی علاج کرائے تو ان کے لئے علاج کا بل ناقابل ادا ہوتا ہے، متوسط طبقہ بھی وہاں کا متحمل نہیں ہوتا کہ میڈیکل انشورنس کرائے بغیر اپنا علاج یا کوئی معمولی علاج بھی کرالے۔ میرے ایک ساتھی ہیں شکاگو میں مولانا عبد اللہ سلیم صاحب جو دار العلوم دیوبند کے فاضل ہیں، بہت بڑے عالم ہیں، اس زمانے میں ان کے کسی صاحبزادہ کا ایکسیڈنٹ ہوگیا تھا، انگلی میں چوٹ آ گئی تھی، کہنے لگے مولانا ۲۰ /

ہزار ڈالر اس پر صرفہ آیا ہے، اگر میڈیکل انشورنس نہ کرایا گیا ہوتا تو کیسے ہم اس کو ادا کرتے اور کیا صورت حال بنتی، تو ہم کو جو غور کرنا ہے کہ میڈیکل انشورنس میں قمار کا پہلو ہونا اور بھی جو محظورات شرعیہ ہیں جو تقریباً طے شدہ ہیں سب کچھ ہیں، ہم ماہرین سے یہ جاننا چاہیں گے کہ جو صورت حال امریکہ میں ہے، یا یورپ میں ہے کہ علاج اتنا مہنگا ہو گیا ہے کہ وہاں اوسط درجہ کے آدمی کے لئے بھی گویا بیماریوں کا علاج میڈیکل انشورنس کے بغیر ممکن اور قابل تحمل نہیں رہا، کیا ہمارے ملک ہندوستان میں بھی صورت حال ایسی پیدا ہوگئی ہے؟ ہندوستان کا کوئی سروے ہو، کوئی جائزہ ہو، کم سے کم بڑے شہروں کا ہو کہ جہاں علاج کی جو قیمتیں ہیں اس کی جو گرانی ہے کس حد تک ہے، اور کیا واقعہ ہے کہ ایک متوسط درجہ کے آدمی کے لئے جو متوسط امراض ہوا کرتے ہیں، زیادہ غیر معمولی امراض کی بات نہیں کہہ رہا ہوں جیسے کینسر ہے، یا دوسرے اسی طرح کے امراض ہیں، جو درمیانی قسم کے امراض ہوتے ہیں، ان امراض کا علاج بھی عام حالات میں ناقابل تحمل ہے، کیا یہ صورت حال پیدا ہوگئی ہے؟ اس کی اگر کچھ وضاحت ہو جائے ہمارے سامنے تو غور کرنے میں شاید سہولت ہو۔

باگ سراج صاحب:

یہ بالکل صحیح ہے کہ اب علاج و معالجہ کے اخراجات بڑھ گئے ہیں، لیکن جہاں تک انشورنس کی بات ہے اور ایک دو نکات اس کے علاوہ بھی ہیں جن پر فقہی نقطۂ نگاہ سے غور بہت ضروری ہے کہ یہ ہیلتھ انشورنس کمپنی جو پریمیم کے ذریعہ سے پیسہ جمع کرتی ہے، کمپنی اس پیسے کا کیا کرتی ہے؟ یہ بھی تو دیکھنا ہے، ہندوستان کی جو انشورنس کمپنیاں ہیں ان کا طریقہ یہ ہے کہ جو پیسہ انشورنس میں آیا ہے اس کا اسی (۸۰) فیصدی حکومت کے جاری کردہ بانڈز آف سیکورٹیز میں انویسٹ (Invest) کرتی ہیں، جن پر فکس سود کمپنی کو ملتا ہے تو کمپنیز کا اسی فیصدی پریمیم پیسہ گورنمنٹ کے بانڈز آف سیکورٹیز میں لگایا جاتا ہے اور گورنمنٹ اس پیسہ کا استعمال راستہ وغیرہ انفراسٹرکچر میں کرتی ہے، باقی کے ۲۰ / فیصدی میں سے پندرہ فیصدی حصہ میوچول فنڈس میں لگایا جاتا ہے میوچول فنڈ زدہ ہیں جو نفع اور نقصان اور شرکت پر بنیاد پر پیسہ لگاتے ہیں، انوسٹ کیا جاتا ہے انہیں کہتے ہیں یہ اسلامی نقطہ نظر سے جائز ہو سکتے ہیں، لیکن میوچول فنڈز میں دونوں قسم کے کام ہوتے ہیں، اپنی پونجی کو بچانے کی خاطر کچھ حصہ اپنے فنڈ کا شیئرز بازار میں نفع اور نقصان کی بنیاد پر لگایا جاتا ہے اور کچھ حصہ انٹرسٹ ڈپازٹ پر، تو یہ بھی دیکھنا پڑے گا کہ یہ جو پیسہ جمع ہو رہا ہے اس پیسہ کا اصراف انشورنس کمپنی کیسے کر رہی ہے؟ حلال طریقے پر یا حرام طریقے پر۔

اب رہ گئی یہ بات کہ اخراجات بہت ہو گئے ہیں، اس لئے صحت کا انشورنس کا خاص کر ضروری نظر آتا ہے، بالکل صحیح، یہاں میں ایک رائے یہ دوں گا کہ اگر انفرادی طور پر ہیلتھ کا انشورنس کیا جاتا ہے تو اس کی Cost اس وقت ذرا کم ہے، یعنی چالیس فیصدی کم ہے، وہ بہت جلد بڑھ جانے والی ہے تو پھر بھی کافی زیادہ ہے، انفرادی ہیلتھ انشورنس کی جگہ اگر اجتماعی ہیلتھ انشورنس کرایا جاتا ہے یا گروپ ہیلتھ انشورنس کرایا جاتا ہے تو اس انشورنس میں کافی چھوٹ دیتی ہیں، یہ بھی ایک فرق واضح رہنا چاہئے، اس کا فائدہ تمام ملٹی نیشنل کمپنیاں اور گروپ اٹھا رہے ہیں، ہم بھی جو اپنی انجمنیں ہیں کافی عملہ کام کرتا ہے ان کا گروپ انشورنس ہیلتھ کا کروانے کی طرف قدم بڑھائیں تو بہتر ہوگا۔

اور ایک خاص بات جو آپ سب کے گوش گذار کرنا چاہتا ہوں وہ یہ کہ چونکہ جو مال ہمارے پریمیم کے ذریعہ سے ہیلتھ انشورنس کی کمپنی کما رہی ہے، اسلامی طریقے پر جائز کاموں یا جائز طریقے سے ان کا استعمال نہیں ہو رہا ہے، اس لئے ضروری ہے کہ ''اسلامک ہیلتھ انشورنس'' کمپنی بھی بنائی جائے، جس طرح سے کوششیں ہوگئی ہیں کہ اسلامی بنکس بنائے جائیں یا اسلامی مالی ادارے بنائے جائیں تو اسی طرح سے یہ کوشش بھی کرنی چاہئے، بلکہ ان دونوں کو اب ملایا بھی جاسکتا ہے، اب حالات ایسے پیدا ہو گئے ہیں ہندوستان کی اقتصادیات میں کہ بنکنگ اور انشورنس کے دونوں کلچر کو ایک ساتھ ملایا جاسکتا ہے، لیکن ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اسلامی طریقے پر بھی جس کو ''تکافل'' کے طور پر ڈولپ کیا گیا ہے اور بہت سے چھوٹے بڑے ممالک میں رائج ہے۔

مولانا عتیق احمد قاسمی:

میڈیکل انشورنس میں ہندوستان کی صورت حال کیا ہے؟

باگ سراج صاحب:

جی ہاں! میڈیکل انشورنس کا جہاں تک تناسب ہے صرف پانچ فیصدی ہندوستانیوں نے آج میڈیکل انشور کیا ہوا ہے اور اسی پانچ فیصدی میں سے ساڑھے چار فیصدی شہروں سے تعلق رکھتے ہیں اور باقی دیہاتوں سے تعلق رکھتے ہیں وہ بھی درمیانی درجہ کے شہری ہیں جو ان سے تعلق رکھتے ہوں گے، تو کل

انشورنس ہندوستانیوں نے اب تک صرف پانچ فیصد ہی کرایا ہے، اور لائف انشورنس کا تناسب صرف ۲۰ / فیصدی ہے۔

مولانا ذاکر رشادی:

ابھی جیسے حضرت مولانا عبید اللہ اسعدی نے فرمایا تھا کہ کسی صاحب نے سوال اٹھایا کہ کن ممالک میں جانے کے لئے ہیلتھ انشورنس ضروری ہے، ممالک کی بات تو اپنی جگہ ہے، لیکن بعض مقامات ایسے ہیں جہاں پر داخلے کے لئے ہیلتھ انشورنس کا ہونا ضروری ہے، بہت سے مصانع اور کارخانے ہیں جہاں پر لوگ کام کرتے ہیں، کہیں لوہے اور اسٹیل کی فیکٹری ہے، اسی طرح میرا تعلق نیلور سے ہے جو ساحل سمندر ہے اور خلیج بنگال سے قریب ہے، "افرو" ہمارے یہاں ہندوستان کا بہت معروف ادارہ ہے جہاں سے پرواز خلا اور اسپیس میں جو بھیجا جاتا ہے وہیں سے بھیجا جاتا ہے، وہاں پر جتنے ملازمین ہیں سب کا ملازمت سونپے جاتے وقت ہی ہیلتھ انشورنس کرایا جاتا ہے، اس کے علاوہ جیسے صدر جمہوریہ یا اور کوئی بڑے حضرات وہاں پر آنا چاہیں تو پہلے ان کا ہیلتھ انشورنس کروایا جاتا ہے اور زائرین کے لئے وہاں پر دخول ممنوع ہے، تو اس صورت میں بات یہ سمجھ میں آتی ہے کہ میڈیکل انشورنس ایک نارمل اور عمومی حالات میں کوئی ضروری چیز نہیں ہے اور بعض خصوصی حالات میں جن پر علماء یہاں پر بیٹھے ہیں غور کر کے مسئلہ بڑی آسانی سے طے کیا جا سکتا ہے، ہاں وہ لوگ جن کی روزی روٹی اللہ تعالی نے ایسے ہی کاموں میں رکھی ہے، جیسے ہمارے یہاں پر بہت سے ایسے لوگ ہیں یا ہندوستان کے بہت سے ایسے صوبے ہیں جہاں پر غربت زیادہ ہے ان علاقوں میں جیسے مدراس ہے، مدراس میں گنڈی ایک علاقہ ہے ایسے اور بھی بہت سے جنوبی ہند کے مقامات ہیں جہاں پر لوگ آکر پانچ سو روپے ماہانہ پر کام کرتے ہیں، کنٹریکٹ پر ان کو رکھا جاتا ہے اور ان کے علاج ومعالجہ کا بھی انتظام کیا جاتا ہے، میں بزرگوں اور اکیڈمی کا زیادہ وقت نہیں لینا چاہتا، کہنا یہ ہے کہ بعض مصانع ایسے ہیں جہاں پر فیکٹری خود ذمہ داری لے لیتی ہے، یہ لازمی چیز ہو جاتی ہے کہ ہیلتھ انشورنس اپنے ساتھ رکھیں، لیکن یہ ذمہ داری ان کو جنہیں ملازمت دی جاتی ہے، فیکٹری خود لے لیتی ہے، بس اتنا ہی مجھے عرض کرنا تھا کہ بجائے ممالک کہنے کے وہاں پر "مقامات" کہا جائے تو یہ مناسب ہوگا۔

باگ سراج صاحب:

یہاں پر آپ یہ بھی یاد رکھیں کہ جو کوئی ہوائی سفر کرتا ہے اندرون ملک یا بیرون ملک ان کا انشورنس ٹکٹ کے اندر ہی ہو جاتا ہے تو انشورنس تو لائف کا مختلف چیزوں میں ہوتا ہی ہے۔

احسان الحق صاحب:

جناب صدر، اور ڈائز پر تشریف فرما اکیڈمی کے ذمہ دار اور مہمانان وفقہاء حضرات! آج کا جو انشورنس کا موضوع ہے، اس میں چونکہ میرے مقالہ کا اردو میں ترجمہ نہیں ہو سکا تھا اور سرکولیٹ بھی نہیں ہوا، اس لئے میں آج کچھ وقت زیادہ آپ کا لوں گا۔

میڈیکل انشورنس کی نوعیت یہ ہے کہ ایک شخص ایک قلیل رقم پریمیم کی شکل میں دینے کے بعد کمپنی سے یہ ضمانت لیتا ہے کہ اگر وہ معین مدت کے اندر بیمار پڑ جائے تو اس کے علاج ومعالجہ میں جو خرچ آئے گا، کمپنی ایک حد تک اس کی امداد کرے گی، اور جو مالی نقصان اس میں اس کو پہنچے گا اس مالی نقصان کی تلافی کمپنی کرے گی، اس میں جو علاج ومعالجہ پر اصل اخراجات آتے ہیں وہ بھی شامل ہوتے ہیں اور کبھی کبھی بیماری کی وجہ سے اس آدمی کو چھٹی لینی پڑتی ہے، اگر وہ تنخواہ دار آدمی ہے تو یہ بھی سمجھا جاتا ہے کہ اس کا اتنا تنخواہ کا نقصان ہوا، بہر حال یہ اس کے معاہدہ کی شرائط میں سے ہے کہ وہ رکی ہوئی تنخواہ کی تلافی کرے گی یا نہیں کرے گی، جہاں تک قانونی حیثیت کا تعلق ہے تو انشورنس، انشورنس ہے اور اس میں چاہے میڈیکل انشورنس ہو یا فائر انشورنس ہو، یا میرین انشورنس ہو، اس میں کوئی زیادہ فرق نہیں ہے، قوانین دونوں کے یکساں ہیں۔

میڈیکل انشورنس میں انشورنس کرنے کے بعد طریقہ کار یہ ہوتا ہے کہ کمپنی اس کو ایک انڈنٹٹی کارڈ جاری کر دیتی ہے اور کمپنی کچھ اسپتالوں کی لسٹ جاری کر دیتی ہے جن سے اس کا معاہدہ ہوتا ہے کہ جب بھی آپ بیمار ہو جائیں تو فلاں اسپتال میں دیکھائیں اور اس کے بعد وہاں آپ کا علاج شروع ہو جائے گا، اس میں آپ کو اپنی جیب سے کوئی پیسہ نہیں دینا پڑے گا، اس میں بھی دو طریقے ہوتے ہیں کبھی کبھی کچھ پیسہ بھی دینا پڑتا ہے عام طور پر جو آوٹ آف فیسلٹیز ہوتی ہیں جن میں زیادہ پیسہ نہیں دینا پڑتا اس میں کبھی کبھی جیب سے پیسہ دینا پڑتا ہے اور بعد میں وہ ملتا ہے، وہ اوٹ آف فیسلٹیز جو ہیں وہ اونچی بیماریوں کے لئے نہیں ہوتی ہیں کہ جس میں مریض کو اسپتال میں داخل کرنا ضروری نہیں ہوتا ہے، مثلاً کسی کا کوئی عضو فریکچر ہو گیا اس میں پلاسٹر ڈال دیا اور وہ گھر چلا گیا، یا کسی کو ایک دانت

نکلوانا ہے تو ڈاکٹر نے دانت نکال دیا پھر دوسرے دن ڈاکٹر نے بلایا اور وہ دانت چڑھادیا اس کے لئے ہاسپٹلائز ہونے کی ضرورت نہیں ہوتی، دوسری بیماری میں ہاسپٹلائز ہونے کی ضرورت ہوتی ہے، تو جیسے ہی وہ اسپتال جاتا ہے تو عام طور سے کمپنی یہ کرتی ہے، یا اس کو جب محسوس ہو کہ اس کی طبیعت ہورہی ہے کہ اب وہ اسپتال میں جائے تو اپنا کارڈ دکھائے تو اسپتال والے کارڈ دیکھتے ہی یا تو انٹرنیٹ سے یا فیکس کے ذریعہ انشورنس کمپنی کو انفارم کرتے ہیں اور کمپنی اس کے بارے میں کہہ دیتی ہے کہ ہاں یہ کارڈ ویلڈ ہے ان کا علاج کردیا جائے، اس کے بعد وہ علاج شروع ہوجاتا ہے۔

علاج ومعالجہ میں یہ نہیں ہے کہ وہ جتنی چاہے رقم خرچ کردے، بلکہ اس کا تعلق پریمیم سے ہوتا ہے، کسی میں ایک لاکھ کا ہوگا، کسی میں دولاکھ کا ہوگا، کسی میں تین لاکھ کا ہوگا اور اس میں کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ آپ کون سا روم لیں گے اے سی روم لیں گے یا آڈنری روم لیں گے، اتنا پریمیم دیں گے تو ایسا روم ملے گا او راتنا پریمیم دیں گے تو ایسا روم ملے گا، اور کبھی کچھ بیماریوں کا پیکیج ہوتا ہے، کمپنی کہتی ہے کہ اگر آپ کو بائی پاس سرجری کرانی ہے تو وہ ایک لاکھ بیس ہزار روپیہ دے گا، اسپتالوں میں بھی اس طرح کے پیکیج ہوتے ہیں کہ اس میں کتنا وقت لگے گا، یہ کوئی طے نہیں ہوتا ہے، کہ آٹھ دن لگیں گے یا دس دن لگیں گے کمپنی اس کے لئے وہ پیکیج مقرر کردیتی ہے، یہ طریقہ عام طور سے اس کے لئے اختیار کیا جاتا ہے۔

لیکن ہمارے فقہی مسائل کا جہاں تک تعلق ہے تو اس میں میڈیکل انشورنس ہو یا جنرل انشورنس ہو اس کے لئے الگ الگ قانون نہیں ہے، ہمارے یہاں جو قانون ہے صرف دو ہے، ایک لائف انشورنس کے لئے قانون ہے ایک جنرل انشورنس کے لئے قانون ہے اس کے علاوہ جتنے بھی انشورنس ہیں ان کو دو ہی کیٹگری میں بانٹا جاتا ہے یا تو وہ لائف انشورنس ہوتے ہیں یا وہ جنرل انشورنس ہوتے ہیں، جنرل انشورنس وہ نقصان کی تلافی کا انشورنس ہے کہ ایک حد تک جو کسی حادثہ سے نقصان پہنچا ہے اس کی تلافی کی جائے گی، اس کو نقصان کی تلافی کا کنٹریکٹ کہا جاتا ہے اور لائف انشورنس میں چونکہ انسان کے جان کی قیمت طے نہیں کی جاسکتی، اس لئے اس کو نقصان کی تلافی کا کنٹریکٹ نہیں کہا جاتا، اس کو انشورنس کا کنٹریکٹ کہا جاتا ہے، یا جان کے فوت ہونے کا کہ اگر کسی حادثے میں آپ کی جان فوت ہوجاتی ہے تو آپ کے ورثاء کو اتنا پیسہ ملے گا اور جنرل انشورنس میں جتنا نقصان اور ایکسچول لاس ہوتا ہے اس کا تخمینہ لگایا جاتا ہے اور اس کی تلافی ہوتی ہے۔

دوسرے جنرل انشورنس اور لائف انشورنس میں ایک فرق اور بھی ہے، جنرل انشورنس میں عام طور پر انوالومنٹ کنسیپٹ نہیں ہوتا ہے، لائف انشورنس میں ہے کہ وہ اس میں شامل ہوتا ہے کہ اگر آپ اس مدت کے اندر فوت ہوگئے تو فوت ہونے کے بعد آپ سے پریمیم لینا بند کردیا جائے گا اور آپ کو اتنی رقم دیدی جائے گی اور اگر آپ میوچرٹی کو پہنچ گئے، آپ نے دس سال کی پالیسی لی تھی اور وہ مدت پوری ہوگئی تو آپ کو اتنی رقم مل جائے گی، یعنی لائف انشورنس میں اتنا ملنا طے ہے کب رقم ملے گی یہ طے نہیں ہوتا ہے تو اس کے لئے کچھ پریمیم زیادہ لیا جاتا ہے، اس میں یہ خیال کیا جاتا ہے کہ رسک بھی کور (Cover) ہوجائے اور جتنا روپیہ وصول کرنے کا منصوبہ ہے اس میں کمپنی اتنا روپیہ رکھتی ہے کہ ان کو دس سال کے بعد جو طے کیا ہے وہ ان کو دیدیں۔ اب اس میں پریمیم کمپنی کس طرح کرتی ہے، اس کے لئے ایسے تو اوسط نکالتے ہیں ہر چیز کا مال لیجئے کہ ایک سال میں سو آدمی میں سے ساٹھ آدمی فوت ہوجائے اور دوسرے سال چالیس آدمی فوت ہوجائے تو دو سال کا ایوریج پچاس پچاس نکلے گا، لیکن یہ اوسط یہاں کارگر نہیں ہوتا ہے، یہاں ایک اور امکانی اوسط لیا جاتا ہے، اور اس کو تھیوری آف پرولٹی کہتے ہیں اور اسی کے حساب سے پریمیم طے ہوتا ہے اس کو پتہ رہتا ہے کہ کس رسک کو Cover کرنے کے لئے کتنا خرچ آئے گا، تھیوری آف پرولٹی یہ ہے کہ جیسے کہ ہمارے پاس چار رنگ کی چار گیندیں ہیں اور چار گیندیں یہ ایک تھیلے میں ڈال دی اور چار بار ہاتھ ڈالا ہم نے اس میں سے ایک نکالی پھر واپس ڈال دی، پھر نکالی، پھر واپسی ڈالی پھر نکالی پھر واپس ڈالی، یہاں امکان یہ ہے کہ چاروں بار آپ کے ہاتھ میں سرخ آئے یا یہ امکان ہے کہ دوبار سرخ آئے یا یہ امکان ہے کہ تین بار سرخ آئے اور یہ بھی امکان ہے کہ ایک ہی بار سرخ آئے تو تھیوری آف پرولٹی یہ ہے کہ جتنی آپ تعداد بڑھاتے چلے جائیں گے اس کا اوسط وہ نکلتا چلا جائے گا اب یہ کمپنی سوچتی ہے کہ ایک سال میں کتنا ایکچول نقصان ہوگا، اور اس کی نقصان کی تلافی کے لئے مجھے کتنا پریمیم لینا چاہئے کہ جس سے اس کی تلافی بھی ہوجائے، دفتر کے اخراجات بھی نکل آئیں اور کچھ منافع بھی مل جائے، یہ طریقہ پریمیم میں کرنے کا ہے۔

لائف انشورنس کے معاملہ چونکہ یہ ریگولر انشورنس ہے، اس لئے ایک ڈاٹا ریگولر اینڈ ڈولپ منٹ اتھارٹی ہے اور وہی اس کا پریمیم اس کا وہی طے کرتی ہے کہ اس سے زیادہ پریمیم آپ نہیں لیں گے، کیونکہ یہ عوام کا معاملہ ہے کہیں معاملہ الٹا نہ ہوجائے، اس لئے گورنمنٹ اس میں اپنا دخل رکھتی ہے۔

انشورنس کے لئے کچھ قانونی اور اخلاقی اصول بھی ہیں، اس لئے آل موسٹ تمام معلومات ظاہر کردینی چاہئے، اگر آپ کینسر کے مریض ہیں اور فارم میں لکھا

ہے کہ آپ کو کینسر ہے یا نہیں تو آپ کو یہ صاف کرنا پڑے گا کہ آپ کینسر کے مریض ہیں اور اگر آپ نے کہہ دیا کہ میں کینسر کا مریض نہیں ہوں اور بعد میں علاج کے لئے آپ گئے اور پتہ چلا کہ اس سے پہلے کسی آدمی نے چیک اپ کرایا تھا اور اس میں کینسر نکلا تھا تو ایسی حالت میں کمپنی پر کلیم واجب نہیں ہوگا۔ یہ گڈ فیتھ (Good Faith) اور انتہائی خلوص کا معاملہ ہے۔ اس میں ساری چیزیں بتانی ضروری ہیں اور یہ ہمارے اسلامی اصولوں سے بھی مطابقت رکھتی ہے، دوسرا اینڈ م لیٹی کا اصول ہے جتنا نقصان آپ کو ہوا ہے اتنا ہی ملے گا اور اس حد تک ملے گا جس حد تک آپ نے انشورنس کرایا ہے، اور اگر کوئی نقصان نہیں ہوا تو کچھ نہیں ملے گا۔

ایک یہ کہ جو آپ کو خطرہ ہے اور اس خطرہ کا تذکرہ آپ نے انشورنس کے وقت کیا تھا تو اسی خطرہ سے آپ کو نقصان پہنچنا چاہئے، ڈائرکٹ اسی خطرہ سے اس کے پیچھے کسی خطرہ سے نقصان پہنچتا ہے تو وہ نہیں ہوا جیسے کسی نے سنترے لے جانے کا اپنا انشورنس کرایا اور یہی انشورنس تھا کہ اس کے سنترے اگر سڑ جائیں گے کسی حادثے میں سوکھ جائیں، بکھر جائیں سمندر میں گر جائیں یا برباد ہو جائیں تو اس کو کلیم ملے گا، اب ہوا یہ کہ اس سے آگے جو جہاز جا رہا تھا اس کا ایکسڈینٹ ہو گیا اور سنترے والا جہاز پیچھے کھڑا رہ گیا اور اس کی کو وہیں پہ دس بارہ دن لگ گئے تو دیر لگنے سے جو اس کو نقصان ہوا تو چونکہ وہ رسک اس میں کور نہیں تھا، اس میں ایکسیڈنٹ کا رسک کور تھا، لہذا اس کمپنی کو وہ رسک نہیں بھرنا پڑے گا۔

اب ایک چیز یہ بھی ہے کہ انشورنس کرنے والے کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے مال کی اسی طرح حفاظت کرے جس طرح اس کا مال بغیر انشورنس کے تھا اور حفاظت کر رہا تھا ایسا نہیں ہے کہ آپ نے انشورنس کرالیا اور جو چوکیدار رکھا تھا آپ نے گودام پر اس کو ہٹا دیا کہ مجھے اب اس کو تنخواہ دینے کی کیا ضرورت ہے، اگر کمپنی کو پتہ لگ جائے تو اب کمپنی اس کا کلیم نہیں دی گئی۔

دیکھئے میں نے جیسا کہ عرض کیا کہ انشورنس کسی بھی طرح کا ہو فقہی اور قانونی مسائل کا جہاں تک تعلق ہے تو وہ اس کنٹریکٹ کی نوعیت سے ہے کہ کنٹرکٹ کیا ہے؟ میں اب اس بات پہ آتا ہوں جس سے آپ اپنے فقہی مسائل طے کریں گے ابھی تک دنیا کے قانون نے اس کو کس نظر سے دیکھا ہے؟ تو عام طور سے دنیا کے قانون نے شروع شروع میں یہ بتایا تھا کہ یہ قمار کا، جوئے کا، شرط کا اور بازی لگانے کا کام ہے اور اس کے اندر برٹش پول کا جو فیصلہ ہے، جنھوں نے جوے کی تعریف کی ہے ''الف'' کو کچھ رقم ''ب'' کو اس شرط کے ساتھ دینا پڑے کہ کوئی حادثہ اگر پیش آئے تو ''ب'' کو وہ رقم پہنچائے گا اور اگر وہ حادثہ نہیں ہوا تو وہ نہیں دے گا اس کو کہتے ہیں کہ یہ جوے کا کنٹرکٹ ہے، اس میں اور انشورنس میں کوئی فرق نہیں ہے، یہ برٹش کورٹ کا فیصلہ ہے (کارٹن ہارڈ کوٹ کا فیصلہ)۔

انشورنس کا قانون لانے کے باوجود بھی وہ کہتے ہیں کہ اس میں اور شرط لگانے میں نوعیت میں کوئی فرق نہیں ہوا، اس کا مطلب یہ ہوا کہ جائز مقاصد کے حصول کے لئے تھوڑے بہت ناجائز ذرائع بھی استعمال کئے جا سکتے ہیں، جب کہ اسلام یہ کہتا ہے کہ جائز مقاصد کے حصول کے لئے ذرائع بھی جائز استعمال کئے جائیں۔

دوسرے وہ یہ کہتے تھے کہ اس میں کاروبار کرنے میں دقت آرہی ہے، اس لئے غیر قانونی کہنے میں انشورنس کمپنیاں اپنا کاروبار بند کر دیں گی اور لوگوں کو انشورنس کی سہولت کم مہیا ہوگی اور جیسا کہ میں نے کہا کہ کمپنیز کا معاملہ یہ ہے کہ جتنے زیادہ سے زیادہ لوگ انشورنس کرائیں گے اتنا ہی زیادہ کامیابی سے چلے گا، تو اسی کے لئے انہوں نے ایک انشورنس انفرسٹکچر قانون لگا دیا کہ جن لوگوں کی وابستگی اس کی جان سے یا مال سے ہے، وہ لوگ انشورنس کرا سکتے ہیں، لیکن یہ بات اب بھی وہیں ہے کہ اس کی نوعیت میں کوئی فرق نہیں پڑا، صرف مقصد میں فرق آیا، دوسری طرف وہ یہ کہتے ہیں کہ جہاں اخلاق اور ایسٹینسی میں تضاد ہو تو وہاں ایسٹینسی کی خاطر اخلاق کو ترک کر جانا چاہئے تو تجارت کے معاملہ میں یہی فرق ہے کہ وہاں یہی تجارت کے معاملہ میں ہوا، یہی سٹے کے معاملے میں اور یہی لاٹری کے معاملہ میں ہوا۔ لاٹری پہلے غیر قانونی تھی، پھر وہ اسٹیٹ لاٹری کا کنسپٹ لے کر آئے کہ اگر کوئی اسٹیٹ لاٹری چلاتی ہے تو اس کا جو فائدہ پہنچتا ہے اسٹیٹ گورنمنٹ کو پہنچتا ہے اور وہ پبلک پر خرچ ہوتا ہے، لیکن اس میں بھی بہت ساری فیملی جب برباد ہو گئی تب انہوں نے یہ اسٹیٹ لاٹری بند کی، اسی طرح ایسٹینسی میں ہے جہاں تضاد ہوتا ہے وہاں ان کا جھکاؤ کسی قدر ایسٹینسی کی طرف آتا ہے کہ کارکردگی، تجارت یہ سب چیزیں بڑھنی چاہئے، اخلاقی اگر تھوڑی بہت کوئی کمی رہ گئی تو اس کو برداشت کیا جائے، جہاں تک اسلام کا تعلق ہے تو یہاں اخلاقیات آگے رہتی ہیں اور باقی مسائل ان کے پیچھے رہتے ہیں۔

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی:

جناب احسان صاحب! وضاحت دراصل اس میں یہ ہے کہ لائف انشورنس اور کاروبار کے انشورنس پر چوتھے اور پانچویں سمینار میں تفصیلی بحث ہو چکی

ہے اور یہ تو ہمارے یہاں کے مسلمات میں سے ہے کہ یہ قمار آمیز معاملات ہیں تو ہم یہ چاہتے ہیں کہ "میڈیکل انشورنس" کے بارے میں وضاحت آئے کہ اس کے مقاصد کیا ہوتے ہیں نمبر ۱، نمبر ۲ اس کا طریقہ کار کیا ہوتا ہے اور نمبر ۳ اس سلسلہ میں سرکاری انشورنس کمپنیاں اور پرائیوٹ انشورنس کمپنیاں کیا ان دونوں کے طریقہ کار اور مقاصد میں فرق ہے؟ کیا اس کا مقصد صرف تجارت اور بزنس ہے یا خدمت ہے، اس پہلو پر اگر آپ روشنی ڈالیں تو سہولت ہوگی۔

احسان الحق:

جہاں تک میڈیکل انشورنس کمپنیوں کا تعلق ہے تو اس میں سرکاری انشورنس کمپنیاں لائف انشورنس اور جنرل انشورنس کرتی ہیں اور پرائیوٹ انشورنس کمپنیاں بھی انشورنس کرتی ہیں اس میں جنرل انشورنس بھی ہے اور اس میں میڈیکل انشورنس بھی شامل ہے تو ان کے طریقہ کار میں تو بالکل کوئی فرق نہیں ہے، ایسا نہیں ہے کہ سرکار کوئی رفاہی کام کر رہی ہو اور پرائیوٹ کمپنی کوئی منافع لے کر کام کر رہی ہو۔ یہ بات ضرور سامنے آئی ہے کہ آج کل بیماریوں کے بڑھنے کی وجہ سے پریمیم کا جو تخمینہ لگایا گیا تھا، کمپنیوں کو اس سے زیادہ خرچ کرنا پڑ رہا ہے۔

اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ آگے انشورنس کنٹریکٹ لیں گے اس میں پریمیم کی شرح بڑھائیں گے تا کہ ان کو خسارہ نہ ہو تو اس میں پرائیوٹ میں اور سرکاری میں کوئی فرق نہیں ہے، دوسرے انھوں نے یہ عرض کیا کہ وہ اپنا آئی ڈنٹی کارڈ بنا دیتے ہیں کہ پریمیم کس طرح ہوگا اس میں وہی ساری باتیں ہیں اور اس میں جو قانونی بات ہے وہی ہے کہ ان کے پاس پریمیم کی شکل میں تو جو فنڈ جمع ہوتا ہے، ان کے یہاں چونکہ منی زیر دایل (L) ہے، اگر کیش غلہ میں پڑا ہے تو وہ کہتے ہیں کہ بے کار پڑا ہے کوئی منافع نہیں دے رہا ہے، لہذا وہ اسی کو سود پر اٹھاتے ہیں اور یہ ضروری نہیں کہ اس کو سود پر مہینے بھر رکھنا ہے، بلکہ آج کل محض ۲۴ / گھنٹے کے لئے بھی مارکٹ میں سود پر معاملہ چل رہا ہے، اس لئے اگر کوئی رقم فالتو (زیادہ) رہ گئی تو ۲۴ / گھنٹے کے لئے اس کو سود پر رکھ دیتے ہیں تو ایک تو ان کی آمدنی میں سود کا عنصر ہے ہی اور دوسرے یہ کہ اگر پریمیم پر ان کو زیادہ خرچ کرنا پڑتا ہے تو اس میں جو خسارہ ہوا اس کے بارے میں وہ یہ کہتے ہیں کہ وہ اتفاقی امر کی وجہ سے ہوا، وہی جوے کا حال ہے اور اگر اس میں کوئی منافع ہوا تو یہ بھی اتفاقی امر ہے کہ لوگ کم بیمار پڑے اور کم خرچ کرنا پڑا، تو اس میں جوے کا اثر آ گیا۔

اب میں اسلامی انشورنس کے بارے میں بتاتا ہوں، اسلامی انشورنس کا طریقہ یہ ہے کہ اس میں نفع اور نقصان دونوں پالیسی ہولڈر کا ہے، اس میں کمپنی کوئی ایسی نہیں ہے کہ اس کا نفع اور نقصان ہو اور اس کو کئی طریقے سے کیا جا سکتا ہے، ایک تو فنڈ کے طریقے سے کہ ایک ادارہ نے جس میں چالیس پچاس ہزار افراد کام کرتے ہیں اس ادارہ نے کوئی فنڈ قائم کر لیا اور خود ہی اس کا انتظام کیا اور اس میں یہ طے کر لیا کہ سال میں جتنے لوگ فوت ہو جائیں گے سب میں وہ فنڈ تقسیم ہو جائے گا تو یہاں جو پریمیم فکس ہو گیا ہے ان ہی کی طرح سے، لیکن ملنے والی رقم جو ہے وہ فکسڈ نہیں ہوتی ہے، اور یہ تعاون کی کیٹگری (زمرے) میں آتا ہے کہ ایک فنڈ ہم نے جمع کر دیا اس سے ہمیں کوئی فائدہ نہیں اٹھانا ہے، بس یہ طے کر لیا کہ اگر کوئی غریب بیمار ہو یا فوت ہو تو اس فنڈ میں سے پیسہ ان کو دیدیا جائے گا، یہ بالکل رفاہی کام ہے اس میں کوئی اپنا فائدہ نہیں ہے۔

اسلامی انشورنس:

دوسرے یہ کہ اس فنڈ کو اگر خود ہم نہیں چلا پاتے اور فنڈ جمع ہو گیا اور کاروبار بہت زیادہ بڑھ گیا تو اس کے لئے ہم کوئی فنڈ آپریٹر رکھ لیں جو کہ اچھی طرح ہمارے فنڈ کا انتظام دیکھے، اب یہ آپریٹر دو طرح سے کام کر سکتا ہے، وکالت کے طریقے سے کام کر سکتا ہے، اس کی ایک فیس یا کوئی تنخواہ مقرر کی جا سکتی ہے، دوسرا اگر اس میں انوسٹ منٹ کا پہلو ہے تو اس کو تجارت و مضاربت کے اصولوں پر انوسٹ کیا جا سکتا ہے، یہاں وہ اس کے منافع میں شریک ہو جائے گا اور وہ مضارب بن جائے گا اور اگر اس کو تعاون کی شکل میں دیکھا جائے تو کوآپریٹو سوسائٹی کی شکل میں بھی قائم کیا جا سکتا ہے، جو کہ اپنے پالیسی ہولڈر کے لئے کام کرے، اس کے علاج و معالجہ کے لئے کام کرے، اس کا مال سے کوئی لینا دینا نہ ہو، کمپنی کی شکل میں بھی ہو سکتا ہے، یہ کمپنی اپنے امپلائی کے لئے پالیسی جاری کرے اور انہیں کے علاج و معالجہ کے لئے جاری کرے، اور اگر یہ سوچا جائے کہ یہ تجارت میں انوسٹ کیا جائے تو یہاں مضاربت کی شکل میں بھی کیا جا سکتا ہے، اس پر آپ لوگ غور کر سکتے ہیں۔...... اس کے علاوہ اگر کوئی سوال ہو تو بتائیں۔

عبدالحنان چاندنا:

میں سب سے پہلے میڈیکل انشورنس کی دو جملوں میں تعریف پیش کروں گا، انشورنس ایک ایسا رباعی اور ایک ایسا کنٹریکٹ ہے جو کوآپریٹو کی بنیاد پر جو

انشورڈس ہوتے ہیں وہ لوگ اس میں انوالو (شامل) ہوتے ہیں اور ان کے خسارے کو کم سے کم کرنے کی کوشش کرتا ہے، یعنی جو خسارہ ہونے جارہا ہے یا جس خسارہ اور نقصان کے ہونے کا امکان ہے اس خسارے کے امکان کو آپسی تعاون سے بانٹنے کی کوشش کرتا ہے کہ اگر ہوا تو پورا کیا جائے گا اور اگر نہیں ہوا تو اس کی کوئی بھرپائی نہیں ہوگی وہ سوخت ہوگیا ختم ہوگیا۔

انشورنس کے لئے پانچ چیزوں کا ہونا ضروری ہے:

۱- انشورنس یعنی جس کا انشورنس کیا جارہا ہے، انشورر جو انشورنس کررہا ہے سب جیکٹ میٹر، یعنی ہمارا میڈیکل انشورنس، انشورول انٹرنس، یعنی علاج، اور رسک، یعنی بیمار ہوجانے کا خطرہ یہ پانچ چیزیں ہونے بہت ضروری ہیں میڈیکل انشورنس میں، آج چونکہ بہت زیادہ بیماریاں ہوگئی ہیں جو اپنی بیماریوں سے خوف زدہ ہوگئے ہیں تو اسی واسطے ''میڈیکل انشورنس'' کا چلن بھی عام ہوگیا ہے، میڈیکل انشورنس کسی دوسرے کے لئے بھی کرایا جاسکتا ہے، مثال کے طور پر میں اپنی بیوی کا میڈیکل انشورنس کرواسکتا ہوں، پرپوزر میں ہوں، انشورڈ میری بیوی ہے، پرپوزر میں ہوں انشورڈ میرے بچے ہیں ''ایک ٹرم سامنے آئی پرپوزر'' تو پانچ کے بجائے چھ لوگ بھی ہوسکتے ہیں، لیکن پانچ لوگوں کی موجودگی بہت ضروری ہے، یہ انشورنس آدمی ذاتی طور پر بھی، یعنی اپنے لئے کرواسکتا ہے، خاندان کے لئے بھی کراسکتا ہے اور اپنے ادارہ کے تمام افراد کے لئے بھی کراسکتا ہے، یہ انشورنس ایک سال کی مدت کے لئے ہوتا ہے ایک سال میں اگر کوئی واقعہ پیش نہیں آیا تو انشورنس کے لئے ادا کی گئی وہ رقم سوخت ہوجائے گی، اب اس کا کوئی کلیم نہیں ملے گا، جیسے عام جنرل انشورنس میں ہوتا ہے، لائف انشورنس میں ایسا نہیں ہوتا، کیونکہ لائف انشورنس ہمارا موضوع نہیں ہے، اس لئے ہم لائف انشورنس کی بات ہی نہیں کررہے ہیں۔

''میڈیکل انشورنس'' میں ہمارے احسان صاحب نے ایک بات بتائی تھی (Al most Good Faith)، کوئی آدمی اگر پہلے ہی سے بیمار ہو اس کے ساتھ رسک کچھ زیادہ ہے، یعنی جو پرولٹی کی بات احسان صاحب بتارہے تھے، اس کو میں تھوڑا سا اور واضح کروں کہ اس کے بیمار ہوجانے کے امکانات زیادہ قوی ہیں، کوئی آدمی کینسر کے مرض میں مبتلا ہے، اس کے بیمار ہونے اور اسپتال جانے کے چانسز زیادہ ہیں، کوئی آدمی ڈائبٹک ہے اس کو کسی بھی بیماری کی وجہ سے زیادہ پریشانی ہونے کے امکانات زیادہ ہیں تو جیسے جیسے بیماریاں کسی کے ساتھ زیادہ ہوں گی اسی کے لئے انشورنس کا پریمیم بھی زیادہ ہوگا، یا خاص قسم کے مرض کے اپنی ایک حد پر آجانے کے بعد اس کا انشورنس ہی نہیں ہوگا، یہ میڈیکل انشورنس کے لئے تین باتوں کا ہونا بھی ضروری ہے، ایک تو بیمار ہونا ضروری ہے، متعینہ مدت کے اندر بیمار ہونا ضروری ہے، علاج ہونا ضروری ہے، مریض کا اسپتال میں جانا ضروری ہے اور مریض کے لئے دوا کھانا بھی اور فراہمی بھی ضروری ہے، اگر کوئی کلیم نہیں ہے تو وہ ساری رقم سوخت ہوجائے گی، جو انشورنس کی رقم بیمار ہونے کی صورت میں ملے گی وہ ادا شدہ رقم سے کہیں زیادہ ہوگی، ممکن ہے کہ وہ سوگنی ہو، ممکن ہے وہ پچاس گنی ہو، جیسا انشورنس کرایا جائے گا، یعنی جس آدمی کی اعلی درجہ کی بیماری ہوگی اس کا اعلی درجہ کا پریمیم بھی ہوگا تو دونوں کا ایک دوسرے سے براہ راست رابطہ اور تعلق ہوگا، کچھ ممالک ایسے ہیں جہاں پر انشورنس لازمی قرار دیا گیا ہے، بغیر میڈیکل انشورنس کے کوئی رہ ہی نہیں سکتا، کچھ ایسے ہیں کہ وہاں پر اگر یہ جائیں تو ہمیں میڈیکل انشورنس کرا کے ہی جانا ہوگا، اگر میڈیکل انشورنس نہیں کراتے تو ہم جا ہی نہیں سکتے داخل ہی نہیں ہوسکتے۔

کل کریڈٹ کارڈ سے متعلق بات آئی تھی اس میں یہ بات ہم سب کے ذہن سے نکل گئی کہ وہ کل کی بات سے بھی متعلق ہے اور آج کی بات سے بھی جو کریڈٹ کارڈ بینک سے جاری کئے جاتے ہیں اس میں میڈیکل انشورنس کی سہولت بھی شامل ہوتی ہے، بشرطیکہ مثلاً فلاں فلاں حالتوں میں ہم کو الیفائی نہ کریں، تو کیا فلاں فلاں چیزوں کے لئے ہم کو میڈیکل مل جائے گا تو میڈیکل انشورنس سے متعلق جو دوسری باتیں اس کو میرے خیال میں اس سے زیادہ کچھ نہیں ہے، اگر مزید اس میں کوئی سوال ہو تو اس کا جواب دینے کے لئے ہم ہیں۔

مفتی زاہد علی صاحب:

میرا ان دونوں حضرات سے سوال یہ ہے کہ سرکاری جو ملازمین ہوتے ہیں ان کے لئے سنٹرل گورنمنٹ یا اسٹیٹ گورنمنٹ کی جو اسکیم ہوتی ہے اس کو میڈیکل اٹنڈنس اسکیم کہتے ہیں اس کا نام انہوں MAS رکھا ہے، غالباً اس کو میڈیکل انشورنس تو نہیں کہتے ہیں، لیکن اس میں ہر ملازم کی ان کی تنخواہ کے اعتبار سے ہوتا ہے، مثلاً کوئی پوسٹ گریجوٹ ملازم ہے اس کو تین ہزار روپے کے حساب سے تنخواہ ملتی ہے تو وہ پچیس روپے دیتا ہے، ایک جو کوئی ریڈر ہے وہ تیس ہزار روپیہ تنخواہ پاتا ہے تو وہ تیس ہزار کے حساب سے ڈیڑھ سو یا دو سو روپے دیتا ہے، کوئی پروفیسر ہے تو وہ ڈھائی سو یا تین سو روپے دیتا ہے، اور اس کے لئے پورا کول بنا دیا جاتا ہے، اور بیماری ہونے کی شکل میں سب کو یکساں طور پر اس سے فائدہ ہوتا ہے، جہاں جتنی ضرورت ہوتی ہے اس کے مطابق اس میں یہ یقینی بات ہے کہ جو

پیسہ جمع ہوتا ہے وہ اس کے مقابلہ میں نہایت کم ہوتا ہے، جتنا پیسہ اس میں دیا جاتا ہے اور یہ سب یقینی معاملہ ہے اس میں کوئی معاملہ ایسا نہیں ہے کہ سرکار اس پیسے کی بھرپائی کرتی ہے، اگر سرکار اس کی بھرپائی کرتی ہے تو اس کو کیا کہا جائے؟ یعنی مثلاً بیس لاکھ روپے جمع ہوئے سب لوگوں کے کول سے کسی خاص یونیورسٹی یا کسی کالج یا کسی فیکٹری جو کسی انڈر ہیں کل ملا کر وہاں دو کروڑ روپیہ خرچ ہوا تو بیس لاکھ روپیہ وہاں کے دفتر نے دیا اور ایک کروڑ اسی لاکھ انہوں نے دیا، لیکن سب کا پیسہ اس میں شامل ہے، پچیس روپے والے کو تین سو روپے والے کو ڈھائی سو روپے والے کو یکسا طور پر علاج کی سہولت حاصل ہے، جبکہ سب کا معاملہ ایک دوسرے سے مختلف ہے، اور روپیہ تنخواہ کے ساتھ ساتھ دیا جاتا ہے، کوئی اگر اس کا ممبر نہ بننا چاہے تو اپنے طور پر ویڈرا کر سکتا ہے۔ اس کے علاوہ دو طرح کے اور یہاں معاملات ہیں ایک کمپلسری گروپ انشورنس کمپنی اسکیم ہوتی ہے جس کے اندر عجیب وغریب صورت حال یہ ہے کہ اگر کسی کا انتقال دوران سروس ہو جائے گا تو اس کو پوری رقم مثلاً اگر ایک لاکھ کا اگر اس کا انتقال ہوتا ہے تو اس کو وہ دیں گے ایک لاکھ روپیہ، جب بھی دیں ایک دو تین پانچ سال میں انتقال ہو جائے لیکن اگر وہ ریٹائرمنٹ لے گا تو اس کو کل چالیس ہزار روپے ملیں گے اور انتقال کرے گا تو ایک لاکھ روپیہ ملے گا، جب کہ ایک سو بیس روپے سب کو دیتے ہیں، جو ادائیگی ہوگی وہ چالیس فیصد ہوگی اور جو رسک ہوگا اس میں وہ صد فیصد پائے گا، چاہے اس نے کتنا ہی کم جمع کیا ہو، اس کے علاوہ بھی اور کئی اسکیم ہے۔

احسان الحق:

اس میں میں اپنا ذاتی تجربہ بتاتا ہوں کہ بینک میں ہمارے یہاں ایک ایسی اسکیم تھی اور ایک سو بیس روپے ایک سال میں لئے جاتے تھے اور اس میں ہم کو فری ٹریٹ منٹ ملتا تھا، اس میں میں نے خود ہی بائی پاس سرجری کرائی، میں نے اسٹنڈنگ کرائی، تقریباً دو لاکھ روپیہ کا اس اسکیم سے فائدہ اٹھایا، تو اس میں وہ ایک سو بیس روپے لیتے تھے لیکن وہ ایک سو بیس روپے میں انشورنس کمپنی کا کام نہیں چلتا، یہ جو میڈیکل اسکیم ہوتی ہے وہ بینک نے اپنے طور پر بنائی ہوتی ہے، اس میں کوئی کمپلیکیٹیڈ بات نہیں ہوتی۔

گروپ انشورنس کے لئے ضرور باہر کی کمپنی سے رابطہ کر لیتے ہیں، لیکن سوال یہ ہے کہ اس میں جو ڈمانڈ تھی آفیسرز نے کہ دوران سروس تو یہ فیسلٹی مہیا ہوتی ہے ریٹائرمنٹ کے بعد بینک کوئی ایسی اسکیم بنا کے دے دے تو اس میں فائدہ ہو جائے گا تو اس میں انشورنس کمپنی نے رابطہ کیا گیا تو اس میں جہاں ہم ایک سو بیس روپیہ دیا کرتے تھے اس نے تین ہزار کی ڈمانڈ کی کہ تین ہزار روپے سال میں اگر آپ دیں تو ہم اس کی ذمہ داری لیں تو یہ سمجھئے کہ باقی جو فرق رہا ایک سو بیس روپیہ اور تین ہزار کا، وہ سب بینک نے بیئر کیا، بالکل یہی معاملہ گروپ انشورنس کا ہے کہ بہت سارا پریمیم جو ہے وہ ادارہ خود دیا کرتا ہے، اور تھوڑا پریمیم وہ امپلائی دیا کرتے ہیں۔

مولانا محی الدین غازی:

اصل میں یہ جو سوال نامہ آیا تھا اور اس میں جو صورت مسئلہ کی وضاحت کی گئی تھی اس صورت میں مسئلہ کو ماہرین کے ذریعہ جو سند ملنی چاہئے تھی وہ ہماری امید کے خلاف ہوئی وہ ساری چیز مل نہیں سکی، انشورنس کے سلسلہ میں تو سارا موقف واضح ہے متفق علیہ ہے، اس کے بعد پھر میڈیکل انشورنس کے سلسلہ میں ہمیں دوبارہ بیٹھنے کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی؟ اس بارے میں جو جواب سامنے آرہا تھا سوال نامے سے وہ یہ کہ یہ تجارتی اور استحصالی کے بجائے رفاہی اور خدمت کی اسکیم ہے، اب چونکہ مقاصد میں فرق ہو گیا، اس لئے اس موضوع پر غور کیا جائے، ورنہ اس موضوع پر غور کرنے کی بھی ضرورت نہیں تھی، لائف اور دوسرے انشورنس کی طرح اس کا بھی وہی فیصلہ تھا تو یہ جو بنیادی نوعیت کا فرق سامنے آیا ہے، یہ فرق کیا واقعی ہے یہ ماہرین سے میری گذارش ہے کہ وہ یہ بتائیں کہ واقعی جو سرکاری انشورنس کمپنی ہے وہ خالص رفاہی ہے، تجارتی نہیں ہے اور جو پرائیوٹ کمپنیاں اس کو چلا رہی ہیں وہ بھی اتنے کم مقدار میں اس کو چلا رہی ہیں کہ ابھی گویا الو... مستقبل میں ہو سکتا ہے کہ اس کے لئے وہ نفع کا سامان بنے جو جواز دیا گیا، ایک بات تو یہ ہے، دوسری چیز یہ کہ سوال نامہ کے صورت مسئلہ میں یہ ...ی کہ بعض دوسرے ملکوں سے میڈیکل انشورنس ضروری ہوتا ہے، لیکن کیا خود ہندوستان میں بھی بہت ساری ملٹی نیشنل کمپنی میں ملازمت کے لئے میڈیکل انشورنس کو کرانا لازم ہے، میرے علم کے مطابق بہت ساری ملٹی نیشنل کمپنی میں ہندوستان کی میڈیکل انشورنس تو کرانا ضروری ہے اور ہندوستان کی یونیورسٹیز میں ایڈمیشن کے لئے بھی میڈیکل انشورنس کرانا ضروری ہے تو کیا صورت ایسی ہی ہے؟

مفتی زاہد علی:

اس میں بہت سے وہ لوگ جو ہیلتھ سے وابستہ ہیں ان لوگوں سے اس کا پیسہ بھی ملتا ہے مثلاً ہمارے یہاں ایک صاحب میڈیکل اٹنڈنس میں سات سو

روپیہ اور چپراسی کے مقابلہ زیادہ ملتے ہیں ان کو اور ساتھ میں اس کا میڈیکل انشورنس بھی ہوتا ہے۔

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی:

ایک وضاحت مناسب معلوم ہوتی ہے کہ ہمارے مولانا محی الدین غازی صاحب کے سوال کے پس منظر میں کہ سوال نامہ میں ایسی کوئی بات ذکر نہیں ہے، یا کوئی جواز کا رخ بھی اختیار نہیں کیا جاتا ہے، ایسا ہے کہ عالمی سطح پر جو مختلف اکیڈمیاں ہیں، انھوں نے مسئلہ تامین پر اور تامین صحی پر الگ الگ بحثیں کی ہیں اور تامین صحی کے مسئلہ پر رائے منقسم ہے بہت سے ملکوں میں تو اس پس منظر میں یہ سوال نامہ ہے اور اس میں انہیں ماہرین کے جو سوالات کئے گئے تھے اس کی روشنی میں یہ لکھا گیا تھا کہ واقف کار لوگوں کا کہنا ہے کہ میڈیکل انشورنس کا شعبہ مسلسل اور بہت زیادہ خسارہ میں چل رہا ہے، حکومت اس کو اس تصور سے چلا رہی ہے کہ عوام کو سماجی تحفظ حاصل ہوگا ان حضرات کی بات نقل کی گئی تھی، اور ایک بنیادی فرق تو سمجھ میں آتا ہے کہ لائف انشورنس کیس ربا کا پہلو بھی ہے، کیونکہ اگر وہ زندہ رہا موت اس کی اس درمیان واقع نہیں ہوئی تب بھی اس کے بعد اس کو رقم ملتی ہے اور میڈیکل انشورنس کا مسئلہ جو ہے اس میں رقم کا ملنا ضروری نہیں رہتا ہے، اس لئے اس مسئلہ میں تھوڑا اختلاف رائے پایا جاتا ہے، اس پس منظر میں یہ سوال رکھا گیا ہے، اکیڈمی کی اپنی کوئی رائے نہیں ہے، آپ حضرات جو فیصلہ کریں گے وہی اکیڈمی کی رائے ہوگی۔

مفتی شیر علی گجراتی:

یہ بلوی عام ہے اور بہت زیادہ مشہور ہوگیا ہے، ہمیں اس پر سوچنا چاہئے کہ ربا کی تعریف میں یہ سب صورتیں آتی ہیں یا نہیں، ربا عقد میں تراضی طرفین سے لین دین اور اس پر جو زائد ہو اس زیادتی کا نام ہے، بہت سی ایسی صورتیں رائج ہوگئی ہیں کہ جن میں تراضی طرفین نہیں ہوتا ہے، ایک طرف رضامندی ہوتی ہے تو دوسری طرف نہیں ہوتی تو جب دوسری طرف رضامندی نہیں ہے وہ مجبوراً قبول کررہا ہے تو اس کو آپ ربا کس اعتبار سے کہہ رہے ہیں؟ اس پر علماء کرام کو ذرا سوچنا چاہئے کہ رباء کی تعریف میں یہ سب صورتیں آتی ہیں یا نہیں، کیونکہ لین دین میں اور رضامندی طرفین میں جو زائد ہے وہ فضل ربا ہے، تو بدل کی صورت میں ربا کے تحقق کے لئے رضامندی طرفین سے ہونا چاہئے اور اگر ایک طرف مجبور ہے تو اس کو شریعت میں ربا نہیں کہتے ہیں، یہ ہے میرا خیال ہے۔

مفتی اقبال احمد قاسمی:

میڈیکل انشورنس کی تعارفی تفصیلات میں یہ بات آچکی ہے کہ میڈیکل انشورنس کرانے کا مقصد علاج ومعالجے کرانے کی مشکلات سے بچنا ہے، لیکن مسلمانوں کے لئے اس سے استفادہ کی راہ میں رکاوٹ انشورنس کی حرمت ہے۔

اس سلسلہ میں احقر علاج معالجے کی بابت شرعی حکم کے حوالے سے یہ بات پیش نظر رکھنا چاہتا ہے کہ علاج ومعالجہ معاملے میں شریعت نے ممنوعات ومحرمات کے ارتکاب کے لئے لچک رکھی ہے اور انسانی زندگی کے تحفظ اور اس کی صحت کے بچاؤ کے لئے بہت سے مواقع میں ناجائز چیزوں کو جائز رکھا گیا ہے، مثلاً سونے کا استعمال مردوں کے لئے ممنوع ہے، لیکن دانتوں کی بیماری میں سونے کے تار سے دانت باندھنے کی اجازت دی گئی ہے، اسی طرح ریشمی کپڑا مردوں کے لئے ممنوع ہے، لیکن خارش کی وجہ سے اس کو پہننے کی اجازت ہے، امام ابویوسفؒ کے نزدیک بیمار کے لئے خون و پیشاب کا پینا اور مردار کا کھانا از راہ علاج جائز ہے، بشرطیکہ کسی مسلمان طبیب نے اس میں شفایابی کی اطلاع دی ہو اور جائز چیزوں میں اس کا بدل نہ ہو، یہی اور بھی مسالک میں ہے، علاج کے معاملہ میں شریعت کی اس نرم روش کا بھی تقاضا ہے کہ میڈیکل انشورنس میں مسلمانوں کو استفادے سے محروم نہ رکھا جائے، اگر خرابی بھی ہے، لیکن علاج کا یہ طریقہ مشکل کو آسان بناتا ہے تو اس کو جائز قرار دیا جانا چاہئے۔

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی:

(۱) مولانا اقبال صاحب نے اہم پہلو کی طرف توجہ دلائی ہے، لیکن یہ بات قابل غور ہے کہ "الضرورات تبیح المحظورات" میں ضرورات سے ضرورات واقعہ مراد ہے یا ضرورت ممکنہ وہ ضرورت جو فی الفور واقع ہو چکی ہو اس سے محظورات کا جواز پیدا ہوتا ہے، یا وہ ضرورتیں جو امکانی طور پر پیدا ہوسکتی ہیں ان کا بھی جواز اس کی وجہ سے پیدا ہوگا؟ یہ غور طلب مسئلہ ہے، میرے خیال میں اس سے مراد وہ ضرورتیں ہیں جو وقوع پذیر ہو چکی ہوں۔

۲- ایک نکتہ اس میں اور زیر بحث آیا حضرت مولانا مفتی شیر علی صاحب کی طرف سے کہ ربا میں ضروری ہے کہ ایسا عقد معاوضہ ہو جس پر طرفین راضی ہوں اور

ایک طرف سے زائد ہو اور اس میں جہاں انشورنس کرانے پر آدمی مجبور ہے تو ایک طرف سے تو رضامندی پائی جاتی ہے اور ایک طرف سے رضامندی نہیں پائی جاتی ہے، تو اس سلسلہ میں یہ عرض ہے کہ ایک ہے دل کی آمادگی کے ساتھ کرنا، فقہاء کی اصطلاح میں ایجاب وقبول میں جو رضا مراد ہے، اس میں دل کی آمادگی ضروری نہیں ہے، الفاظ وکلمات کے ذریعہ یا کسی دستاویز پر دستخط کے ذریعہ اگر آپ نے بظاہر چاہے کسی مجبوری ہی کی وجہ سے اپنی رضامندی کا اظہار کردیا تو ایجاب وقبول کا تحقق ہوگیا، اور اگر اس نے اگر کسی مجبوری سے کیا ہے تو گناہ گار نہیں ہوگا، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ یہ چیزیں ربا کے تحقق میں مانع نہیں ہوگی، ایسا خیال ہوتا ہے۔

مولانا سعید الرحمن:

حضرات ماہرین نے جو یہ رائے پیش کی کہ "لائف انشورنس" میں جمع کی جانے والی رقم، اور صحت انشورنس میں جمع کی جانے والی رقم میں کوئی فرق نہیں ہے، ڈوبنے یا ضائع ہونے کے اعتبار سے تقریباً دونوں متحد ہیں، اس لئے یہ بات تو طے ہونی چاہئے کہ یہ جمع کی جانے والی رقم جو ہے، یہ خود کس حد تک جائز ہے؟ سب سے پہلے تو یہ مسئلہ ہے، اس کے بعد آپ نے یہ بات کہی کہ ایک دفع ضرر موہوم کے لئے ارتکاب محظور فوری طور پر کیا جائے گا، یہ بات تو شرعاً درست نہیں ہونی چاہئے؟ تیسری بات یہ میرے ذہن میں آرہی ہے کہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے لکھا ہے: "التداوی لیس بواجب" تو کیا اس حوالہ سے ہر آدمی کے لئے ہر حال میں تداوی واجب ہے؟ اگر ہر حال میں واجب نہیں ہے تو احکامات میں فرق ضرور ہونا چاہئے، جب تداوی ہی لازم اور واجب نہ ہوگی تو پھر انشورنس کا مسئلہ ایک مشکل مسئلہ ہوگا، وہاں تک پہنچنے کے لئے افراد کے اعتبار سے احکامات بھی مختلف ہوں گے، یہ دو تین اہم باتیں میرے جو ذہن میں تھیں، اسی طرح شامی میں ایک جزیہ یہ بھی ہے کہ شوہر پر بیوی کا علاج کرانا واجب نہیں، حالانکہ اور نفقات تو واجب ہیں، تو دوا علاج بھی واجب ہونا چاہئے۔

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی:

میرے خیال میں یہ ایک مستقل موضوع ہے کہ شوہر کے ذمہ بیوی کا علاج ہے یا نہیں، اور اس وقت ہمارے زیر بحث بھی نہیں ہے، اور ہمارے مولانا سعید الرحمان صاحب نے جو بات کہی کہ علاج واجب نہیں ہے، اس کا مقصد فقہاء کے بیان میں یہ ہے کہ اگر کسی آدمی نے علاج نہیں کروایا اور اس کی موت واقع ہوگئی تو وہ اس کی وجہ سے گنہگار اور قاتل نفس نہیں سمجھا جائے گا، لیکن یہ تو حقیقت ہے کہ اگر بیماری پیدا ہوچکی ہو تو اس کے لئے بعض محرمات کے استعمال کی اجازت دی گئی ہے۔

مولانا عتیق احمد قاسمی:

الحمد للہ یہ علماء کی محفل ہے، اور ایسے مواقع بہت کم آتے ہیں کہ اس طرح کی محفل میں علمی مباحث سامنے آئیں، ایک طرف تو فقہاء نے یہ بات کہی ہے کہ علاج کرنا جائز ہے، مباح ہے، لیکن اس کے بعد یہ بھی لکھتے ہیں کہ نصوص اور فقہاء کی تصریحات کی بنیاد علاج کے باب میں پر بہت سی محرمات کی گنجائش دی گئی ہے، مسئلہ یہ ہے کہ جو احکام شرعیہ کے مدارج اور اس کے جو مراتب ہیں اس کے اعتبار سے احکام دیئے جاتے ہیں، علاج کو جائز کہنا خود قابل بحث چیز ہے، خاص طور سے یہ کہ بیوی کا علاج شوہر کے ذمہ ہے یا نہیں، مجھے یاد پڑتا ہے ایک تفصیلی بحث حضرت قاضی صاحبؒ کی اس موضوع پر آئی تھی، لیکن چونکہ مسئلہ یہاں پر دوا علاج میں جان کی حفاظت کا ہوتا ہے، اور جہاں صورت حال یہ ہوتی ہے کہ ایک علاج سے جان کا بچنا ممکن ہوتا ہے اور اس میں بے اعتدالی کرنے سے جان کے فوت ہونے کا خطرہ ہے، ضرر لاحق ہونے کا خطرہ ہے۔ تو ایک طرف ان کو مباح کہہ رہے ہیں، دوسری طرف گویا ہم نے اس کی خاطر اس طرح کے محرمات کے استعمال کی گنجائش دی ہے۔ اس طرح سے ہمیں غور کرنا چاہئے کہ صرف مباح کہنے کی بنیاد پر ہم سمجھتے ہیں کہ اس کی اہمیت بہت کم ہوگئی ہے، یا قابل رحم چیز نہیں ہے، یہ بات نہیں ہے۔

شریعت میں جو ضروریات ہیں، حاجیات ہیں اور تحسینیات ہیں، اس کا تعلق چونکہ ضروریات سے ہے، جیسے نفس انسانی کی بقا، مال کی بقاء و دین کی بقا، اس لئے یہاں اس حکم کو مباح قرار دے رہے ہیں۔ اب ایک مسئلہ مان لیجئے تصویر کا ہے، ہم اس کو حرام کہتے ہیں اور ہم نفلی حج کرنے جاتے ہیں، حج فرض کی بات نہیں کررہا ہوں، نفلی حج کرنے کے لئے تصویر کھینچواتے ہیں اب یہاں غور کرنے کی بات ہے کہ ایک طرف تو نفل حج کرنا کیا ہے؟ واجب و فرض نہیں ہے، لیکن تصویر کھینچوانا جو کہ حرام ہے، پھر بھی تصویر کھینچوانے کا ہم ارتکاب کررہے ہیں تو ہمارے لئے غور کرنے کی یہ بات ہے کہ ہم مقاصد شریعت کی علامہ شاطبی نے جو تقسیمات کیں ہیں اس کو سامنے رکھ کر زیر بحث مسئلہ پر غور کریں، بہر حال وقت مختصر ہے، اس لئے اس وقت اس پر زیادہ گفتگو نہیں ہوسکتی ہے۔

انشورنس کے تعلق سے جو بات مولانا اقبال صاحب نے کہی ہے، وہ بھی قابل غور ہے کہ بہر حال علاج معالجے کے باب میں شریعت نے بہت کچھ سہولتیں رکھی ہیں، تو اگر صورت حال یہ ہو جیسا کہ میں نے یہ بات عرض کی کہ امریکہ اور یورپ وغیرہ کے کئی ملکوں میں ہے، جہاں انشورنس کے لزوم کی بات ہے، وہاں لزوم کی بات ہوگی، لیکن جہاں لزوم نہ ہو، لیکن عملاً علاج اتنا گراں ہوگیا ہو کہ وہاں پر گویا عام طریقے سے ہیلتھ انشورنس کے بغیر علاج کا امکان نہ ہو سخت تنگی کا باعث ہوتا ہو تو ان ملکوں میں ظاہر بات ہے کہ یا تو ہم متبادل اسلامی انشورنس بیمے کا تصور پیش کریں اور اس کو عملی شکل دیں یا پھر انہیں میں کوئی ایسی راہ تلاش کریں جس میں مشکلات کا حل ہو، افسوسناک بات یہ ہے کہ جو سہولتیں ہمیں مل رہی ہیں اور ان میں ناجائز پہلو بھی شامل ہیں، اس کا متبادل شرعی حکم مہیا کر کے عملاً اس کو ہمیں بر پا کرنا چاہئے اور اس کو سماج میں نافذ کرنا چاہئے، یہ نہیں ہو پا رہا ہے، چاہے اسلامی بینکنگ کی صورت میں ہو، انشورنس کے تعلق سے ہو بہر حال یہ تعاونی جذبے کے ساتھ اس طرح کا اگر کام کیا جائے تو کچھ اہل خیر ہمت کریں اور کام شروع کریں تو ہو سکتا ہے کہ کام پھیلے اور امت کو بہت بڑا فائدہ حاصل ہو، یہ گفتگو علماء کی ہے اس میں اس طرح کے مباحث آئیں گے اور فائدہ ہوگا انشاء اللہ۔

الشیخ عبدالقادر العارفی:

اس وقت جو ہمارے علماء اور مشائخ کی طرف سے ''میڈیکل انشورنس'' کے موضوع پر قیمتی مناقشات، بحثیں اور عرض مسئلہ کی شکل میں مقالات کا خلاصہ پیش کیا گیا عمدہ اور علمی بحثیں تھیں، اللہ تعالیٰ تمام حضرات کو جزائے خیر عطا فرمائے۔

میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ہمارے یہاں ایران میں ''صحت بیمہ'' حکومت کی طرف سے لازمی نہیں ہے، مگر وہاں پر جو دشواری ہے وہ یہ کہ عام طور پر جو لگ بیمار پڑتے ہیں اور کسی ایسی بیماری میں مبتلا ہوتے ہیں وہ سرکاری شفاخانوں سے رجوع ہوتے ہیں، بیمار شخص ایک دن، دو دن وہاں رہتا ہے تو اس کے اخراجات ایک ایک لاکھ تک پہنچ جاتے ہیں، بسا اوقات ان بیماریوں کی وجہ سے مہینہ اور دو دو مہینے اسپتال میں رہنا پڑتا ہے، اگر بحکم خداوندی شفایاب ہوتے ہیں تو بھی اور اگر کسی کا وہیں وقت موعود آجاتا ہے اور وہاں سے جسد خاکی لانے کی نوبت آتی ہے تب بھی دونوں صورتوں میں جب تک شفاخانوں کے ذمہ داران اپنے ضابطے کے مطابق پوری رقم وصول نہیں کر لیتے لاش تک نہیں لانے دیتے، اور ان اخراجات کی شرح لاکھوں بلکہ دس دس لاکھ تک ہندوستانی کرنسی میں پہنچ جاتی ہے۔

ان مالی دشواریوں اور اس قدر گراں علاج کے بار کو لوگوں سے کم کرنے اور اس باب میں لوگوں کو آسانیاں فراہم کرنے کے لئے اسلامک فقہ اکیڈمی جماعت اہل سنت ایران کے علماء نے آج سے پانچ سال قبل اپنی فقہی نشست رکھی اور بحث و مناقشہ اور غور و خوض کے بعد ''میڈیکل انشورنس'' کے جواز کا اجتماعی فتویٰ دیا۔

''للأجل هذه بنالت تكلم العلماء والشيوخ في هذا الموضوع قبل خمس سنوات في إجدى البرامج الفقهية التي تم تنظيمه من قبل مجمع الفقه الإسلامي لأهل السنة في ايران وتكلموا في هذا الموضوع، وافتوا بجواز هذا أي لهذه الضرورة''۔

جہاں تک انشورنس کی دوسری اقسام کا تعلق ہے جیسے گاڑی وغیرہ کا انشورنس، تو اس کے بھی جواز کا فتویٰ ضرورت کی بنا پر ہمارے یہاں کے علماء نے دیا ہے، ''فهذا أيضا افتى بجوازه لأجل الضرورة'' کیونکہ حکومت نے یہ قانون بنا رکھا ہے کہ بغیر انشورنس کے کسی بھی شخص کو گاڑی چلانے کی اجازت نہیں ہے، اس کو اضطراری یا غیر اختیاری، یا اجباری انشورنس بھی آپ کہہ سکتے ہیں۔

انشورنس کی تیسری قسم ہے جسے ہم ''اجتماعی انشورنس'' کہتے ہیں، جس کی شکل یہ ہے کہ حکومت کی طرف سے یہ اعلان ہے کہ جو شخص اپنا انشورنس کرانا اور حکومت کی اس پالیسی سے فائدہ اٹھانا چاہتا ہے وہ آئے اور اپنا انشورنس کرائے، اور عمر کے جس مرحلہ میں ہے اسی حساب سے پریمیم جمع کرائے۔ پالیسی کے حساب سے اگر اسی درمیان موت واقع ہوگئی تو انہیں حکومت متعین رقم اس کے ورثا کو دے گی اور طبعی یا حادثاتی موت واقع نہیں ہوتی تو ان کے پیسے انہیں واپس ملیں گے، یہ مسئلہ ایران میں علماء کے درمیان زیر بحث ہے، میں آپ حضرات سے یہ امید کرتا ہوں کہ اس پر بھی آپ حضرات روشنی ڈالیں۔

جہاں تک اس مسئلہ کا تعلق ہے جس پر علماء کا خیال ہے کہ اس میں غرر ہے، یا قمار ہے، یا دوسری شرعی قباحتیں ہیں، میرے خیال میں ''تامین اجتماعی'' میں غرر و قمار وغیرہ سے متعلق ایسی کوئی بات نہیں ہے، یہ انشورنس اختیاری ہے جس کا جی چاہے کرائے جس کا جی نہ چاہے نہ کرائے، جزاکم اللہ خیرا۔

مولانا محمد برہان الدین سنبھلی:

ابھی مولانا عتیق احمد صاحب نے جو بات فرمائی دراصل انہوں نے میرے خیال میں ایک اشکال پیش کیا ہے کہ ایک طرف تو فقہاء جان بچانے کے لئے شراب کے پینے کی اجازت دیتے ہیں تو دوسری طرف علاج کو صرف مباح کہتے ہیں، میں سمجھتا ہوں کہ اس اشکال کا رفع کرنا کوئی زیادہ مشکل نہیں ہے، اصل میں علاج کا لفظ بہت ساری شکلوں پر حاوی ہے، لیکن یہ جو شریعت کی طرف سے احکام دیئے گئے ہیں یہ سب شکلوں پر حاوی نہیں ہیں، خواہ شراب پینے کی اجازت یا مردار کھانے کی اجازت، وہ قرآن مجید کی اس آیت سے ماخوذ ہے: "فمن اضطر غیر باغ ولا عاد فلا إثم علیه" وہ اس مرحلہ کو پہنچ جائے مرض کہ اس کے بغیر جان بچ ہی نہیں سکتی، چنانچہ فقہاء نے تصریح کی ہے کہ جان بچانے کا واحد ذریعہ رہ گیا ہو اور اس حرام چیز کے استعمال کے علاوہ اور کوئی جائز ذریعہ باقی نہ رہا ہو، طبیب حاذق نے، مسلم (بعض لوگوں نے یہ شرط لگائی ہے کہ وہ مسلم طبیب ہو)، اس نے اس کی اجازت دے دی ہو، تو گو وہ مرحلہ جواز کا الگ ہے اور کسی حرام چیز کے استعمال کے جواز کا مسئلہ الگ ہے، دونوں چیزیں الگ الگ ہیں، چنانچہ جن حضرات نے اجازت دی ہے، انھوں نے اسی آیت کو مستدل بنایا ہے، یعنی: "فمن اضطر غیر باغ ولا عاد فلا إثم علیه" کو۔ یا پھر "عرنیین" کے واقعہ کو مستدل بنایا گیا ہے، عرنیین کے واقعہ میں "اشربوا من أبوالها وألبانها" فرمایا گیا تھا۔ اسے منسوخ کہا گیا ہے یا یہ چونکہ اس کا اگلا حصہ عرنیین کی آنکھیں پھوڑیں گئیں۔ اور کیا کیا گیا، وہ بالاتفاق منسوخ ہے، تو بعض نے اس کو منسوخ قرار دیا ہے، یا بعض نے اسے خصوصیات نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں سے قرار دیا ہے، جن لوگوں نے مطلقا ہر علاج میں حرام کے استعمال کے جواز کی اجازت نہیں دی ہے، اور رہا یہ درجہ کہ جس میں آج کل جان کا خطرہ نہ ہو، بس یہ ہے کہ مثلاً اس کے کچھ اس کے کام متاثر ہو جائیں گے، وہ کچھ دن بخار میں مبتلا رہے گا، کام پہ نہیں جائے گا، یا نماز بیٹھ کر پڑھنے لگا، تو غالباً یہ دو درجے الگ الگ ہیں، اس لئے ان دونوں میں خلط ملط کرنے سے اشتباہ اور اشکال پیدا ہوتا ہے۔

مولانا عتیق احمد قاسمی:

مولانا کی گفتگو سے بہت مفید بات سامنے آئی کہ ایک ہے "مطلق علاج کو جائز کہنا کہ یہ جائز ہے، یہ مطلق حکم لگانا صحیح نہیں ہے، اس لئے کہ بعض ایسے مرحلے مرض کے ہوتے ہیں جس میں علاج ضروری ہوتا ہے، تو گویا وہاں لازم ہوا اور علاج واجب ہوا، اس مرحلہ کو گویا فقہاء نے واجب قرار دیا ہے، خیر یہ تو یہ علمی محفل ہے، اس طرح کی گفتگو آتی رہے گی، دراصل احکام کے جو مدارج ہیں ایک تو وہ جو ضروریات ہیں، ضروریات خمسہ یا ستہ اس کے تعلق سے جو احکام ہیں، مال کا تحفظ ہے، دین کا تحفظ ہے، جان کا تحفظ ہے، تو ان چیزوں کو غیر معمولی اہمیت ہے شریعت میں اور اس کے بعد جو حاجیات کا درجہ ہوتا ہے، تحسینیات کا درجہ ہوتا ہے، تو جن احکام کا تعلق تحسینیات سے ہے، مثلاً ستر عورت ہے، لباس ہے، یہ چیزیں تحسینیات کے قبیل کی ہیں اور تحسینیات کا اگر کوئی حکم واجبی بھی ہو تو اس میں شریعت گنجائش رکھتی ہے، جب مسئلہ آجائے گا ضروریات کا، تو ہم جب غور کریں ان احکامات پر تو ایک طرف مان لیجئے جو پہلے مثال دی تھی، تصویر کو اگر حرام کہتے ہیں، پھر بھی نفلی حج کے لئے تصویر کھینچوانا اور بعض کارروائی ضروری ہوجاتی ہے اور بعض دفعہ انشورنس بھی ضروری ہوجاتا ہے، جیسے ہوائی سفر ہے ظاہر ہے انشورنس ضروری ہے اس لحاظ سے آپ دیکھیں تو گویا ان کو صحیح نہیں ہونا چاہئے؟ لیکن دوسری طرف اس بات کو ہم دیکھتے ہیں کہ یہ جو عبادات کا حصہ ہے، یہ ہماری ضروریات میں شامل ہے، ضروریات خمسہ میں، تو ضروریات کے تحفظ کے لئے اور اسی کی رعایت میں یہ ان چیزوں کو کرتے ہیں، یا مثلاً علاج کا معاملہ ہے، اگر ڈاکٹر ضرورت سمجھتا ہے کہ اس حصہ کو دیکھے بغیر علاج ممکن نہیں ہے تو اس کو ہم گویا اجازت دیتے ہیں، یہ کوئی جھگڑ کی بات نہیں ہے، ایک نکتہ کی میں نے وضاحت کرنی چاہی ہے، بہرحال آپ حضرات کو اظہار رائے کا پورا موقع ہے، فرمائیں آپ لوگ جو فرمائیں۔

ایک آواز

میری گذارش یہ ہے کہ یہ حضرات جن کو ہم ذمہ دار سمجھتے ہیں مولانا خالد سیف اللہ رحمانی ہوں، مولانا عبید اللہ اسعدی صاحب ہوں اور یہ حضرت (مولانا عتیق احمد صاحب) ہوں آپ ہمارے لئے قابل احترام ہیں، ہم سر پر بیٹھائیں آپ حضرات کو، ایک رائے آتی ہے جواز کی تو بھی کچھ بولیں اور عدم جواز کی آئے تو بھی آپ یہ سمجھانے کی کوشش کریں، آپ کے درجہ کے لئے میں سمجھتا ہوں مناسب نہیں ہے۔

مولانا عتیق احمد صاحب

آپ نے جو بات فرمائی ہے وہ آپ کے اخلاص کی بنیاد پر ہے، اور ویسے ہم سبھی حضرات اس بات کو محسوس کرتے ہیں کہ ہمارے ذہن میں اگر

کوئی بات ہو تو آپ کے سامنے پیش کردینا بھی ہماری ذمہ داری ہے، اور فیصلہ تو وہی ہوگا جو شرکاء کی رائے ہوگی، کمیٹی بنے گی اس میں جو حضرات ہوں گے، میں نے تو اپنے حساب سے مسئلہ کی وضاحت کرنی چاہی تھی۔

مفتی ظہیر الدین کانپوری:

میں تھوڑی سی توجہ ایک دوسرے موضوع کی طرف دلانا چاہتا ہوں کہ ہم کو اس پر بھی غور کرنا چاہئے کہ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ بعض اصطلاحات اگر اس کو شرعی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو اس کی اصطلاح بدل سکتی ہے، مثال کے طور پر لائف انشورنس تو ٹھیک ہے اس میں قباحت موجود ہے، لیکن میڈیکل انشورنس اس کا نام ہم نے تو انشورنس رکھ دیا ہے، لیکن حقیقی اعتبار سے اگر اس کو دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ عقد اجارہ ہے یا ٹھیکہ داری ہے کہ ایک طرف ایک شخص گویا کہ اپنی کمپنی سے معاملہ کررہا ہوتا ہے یا جو بھی کمپنی انشورنس کررہی ہے کہ آپ ہمارے اتنی اتنی مدت تک علاج کی ذمہ داری لے لیجئے، رہی یہ بات کہ ایک نقطہ مقالہ نگاروں کی جانب سے اٹھایا گیا ہے کہ یہ امر موہوم ہے، بیماری ابھی ہے ہی نہیں، لیکن یہاں یہ بتائیے کہ ظن غالب کے اعتبار سے کوئی بھی شخص بیماری سے پاک ہے کیا؟ اگر مان لیجئے کہ اس نے ساٹھ سال کا بیمہ کروایا ہے جو ریٹائر منٹ تک کا اس کا بیمہ ہے، عام طور سے ظن غالب یہ ہے کہ وہ بیمار ضرور ہوتا ہے، مثال کے طور پر آپ کسی وکیل کو ماہانہ طور پر رکھ لیجئے کہ جتنے بھی کیس ہمارے آئیں گے آپ اس کو ڈیل کریں اور ہم آپ کو ماہانہ اتنی تنخواہ دیں گے، اسی طریقے سے اگر پریمیم کے نام سے اس کو ادا کرتے ہیں تو وہ ماہانہ دی جانے والی رقم کو اگر اجرت کا نام دے دیں تو اس میں کونسی پریشانی ہے۔

اسی طریقے سے کسی ڈاکٹر کو آپ ماہانہ اجرت پر رکھ لیں کہ آپ ہمارا علاج معالجہ کیجئے ہم آپ کو ماہانہ ایک ہزار روپیہ دیں گے تو کیا یہ ناجائز ہوگا؟ اس پر بھی اگر تھوڑا سا غور کرلیا جائے تو بہتر ہوگا۔

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی:

بس ایک بات یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اجارہ میں اجرت بمقابلہ عمل کے ہوتی ہے، اجرت بمقابلہ مال کے نہیں ہوتی ہے، یعنی عقد اجارہ میں ایک طرف سے مالی عوض اور ایک طرف سے عمل پایا جاتا ہے اور یہاں جب کوئی کمپنی آپ کے علاج کا ذمہ لیتی ہے تو اس میں دوائیں بھی داخل ہیں اس میں اور بھی بہت سی چیزیں جو میڈیکل میں استعمال ہوتی ہیں، وہ بھی داخل ہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ اجرت میں عمل کا متعین ہونا آپ لوگ ضروری قرار دیتے ہیں، یہاں یہ عمل متعین نہیں ہوتا ہے، نہ معلوم کونسی بیماری ہو، کس طرح کی ضرورت پڑے، کس ٹسٹ کی ضرورت دامن گیر ہو تو اس پہلو سے بھی اگر غور فرمائیں تو مناسب ہوگا۔

مفتی ظہیر الدین:

اجرت کے معاملہ میں کافی حد تک جہالت کو برداشت کیا جاتا ہے ایک حد تک علی الاطلاق اتنا بھی کافی ہے، لیکن بیع کے اندر تو یقینی طور پر اس کا متعین ہونا ضروری ہوتا ہے، رہی بات عمل کے اعتبار سے عام طور پر کرانا تو یہ عمل کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ جیسے کوئی مستری ہے، آپ نے سائیکل دی اس نے پنچر بنایا اور پوری سروس کی اور مال بھی کچھ لگایا تو اگر مان لیجئے کہ کوئی کمپنی یا کوئی ٹھیکہ دار نے کہا کہ ہم آپ کی سائیکل کا پنچر بنوادیں گے، آپ نے اپنی سائیکل دے دی، اس نے اسے کھولا اور اس کی مرمت کی، ظاہر ہے اس میں محنت بھی لگی اور سامان بھی، تو اس میں جو اس نے ٹیوب وغیرہ لگایا ہے، یہ کیا ہے، یہ مال نہیں ہے؟۔

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی:

اسی لئے فقہاء نے زکاۃ کے مسئلہ میں فرق کیا ہے، اگر اجیر کو اس عمل میں کوئی مال بھی استعمال کرنا پڑتا ہو، جیسے رنگ ریز رنگ کا استعمال کرتا ہو تو اس مال میں زکوۃ واجب ہوگی، یعنی باوجود اجیر ہونے کے، اس معاملہ میں اس کو مال تجارت کی حیثیت سے قبول کیا گیا ہے۔

مولانا ارشد فاروقی:

میڈیکل انشورنس کے سلسلے میں جو تفصیلات سامنے آئی ہیں تو اس میں اصولی طور سے دو باتیں سامنے آتی ہیں: اول یہ کہ صحت بیمہ کے جواز کے

ترکیبی ہیں اس میں غرر، ربا، قمار ہیں، اس لئے اس کو حرام ہونا چاہئے اور حرام ہے، پھر دوسری بات یہ ہے کہ چونکہ ضرورت کے تحت بہت سی چیزیں جائز قرار دی جاتی ہیں تو اس میں ضرورت کی تطبیق یہ ایک اہم مسئلہ ہے، اس میں خاص طور سے ہندوستان کو سامنے رکھا جائے تو وہ کمپنیاں، وہ یونیورسٹیاں، وہ مراکز جہاں انشورنس لازمی ہے کہ اس میں بغیر اس کے داخلہ نہیں ہوسکتا تو وہاں ضرورت کی بنیاد پر جواز کا فتویٰ دیا جانا چاہئے، پھر وہ ممالک جہاں جانے کے لئے یا وہاں قیام پذیر ہونے کے لئے یہ بیمہ کرانا ضروری ہے، وہاں بھی اس کی اجازت ہونی چاہئے۔ اب ایک مسئلہ اٹھتا ہے کہ اگر وہ شخص بیمار پڑ جاتا ہے دوسرے ملک میں جہاں اس نے انشورنس کرایا ہے تو وہ زائد رقم جو اس کے علاج سے خرچ ہوتی ہے، اس کا استعمال جائز ہے یا نہیں، بعض حضرات نے کہا ہے کہ اس کا استعمال اضطرار کی صورت میں جائز ہے، تو ہمارے سامنے جو ہم نے تجزیہ کیا ہے۔ U.A.E کا، یا اسی طرح سعودی عرب کا تو ہمارے ملک سے جو مزدور طبقہ کے لوگ یا دوسرے طبقہ کے لوگ جاتے ہیں، وہ اس حال میں ہوتے ہیں کہ انشورنس تو کرانا ان کے لئے لازمی ہے، لیکن اگر وہ بیمار پڑے اور ان کا علاج ہوا تو کثیر رقم خرچ ہوئی اور اس کو ادا کرنا یا اس کو واپس کرنا اس کے لئے ناممکن ہوتا ہے، اس لئے اس زائد رقم کو اضطرار کی وجہ سے جائز سمجھنا مناسب ہوگا۔

پھر ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ ہمارے نزدیک یہ ہے کہ جب بھی کوئی نئی چیز ہمارے سامنے آتی ہے، اس طرح کی تو اس کو حرام کہہ دینا ہمارے لئے تو بہت آسان ہے، ہم حرام کہہ دیتے ہیں، لیکن اس کا بدل یا نعم البدل جو بہت وسیع پیمانہ پر ہے، عملی طور پر، پیش کرنا ہمارے سماج اور ہماری قیادت کے لئے ذرا مشکل مسئلہ ہے اس واسطے ہمیں یہ بھی پیش کرنا ہوگا۔

مولانا مشتاق احمد باقوی:

میڈیکل انشورنس کے تعلق سے بات تقریباً آگئی، میں کہنا یہ چاہ رہا تھا کہ بیماری یہاں کئی قسم کی ہیں۔ ایک بیماری وہ ہے جس میں عام طور پر متوسط آدمی اپنے آپ کو برداشت کرلیتا ہے، بعض بیماریاں ایسی ہیں کہ وہ خرچہ برداشت نہیں کرسکتا، مثال کے طور پر 'دل' کی بیماری ہے اس میں لاکھوں روپے خرچ ہوجاتے ہیں، اگر کوئی متعین بیماری کے لئے، اگر کوئی متوسط آدمی انشورنس کرائے تو اس کے لئے کیا صورت اور کیا شکل اختیار کیا جا سکتا ہے، اس پر بھی غور کریں، اس لئے کہ عام طور پر متوسط آدمی دل کی بیماری کے علاج کرانے کے لئے بہت پریشان ہوجاتا ہے، اور بلکہ اپنے گھر و بار کو بھی وہ فروخت کردیتا ہے، لہذا اس پر بھی غور کیا جائے۔

مولانا عبدالقیوم:

یہ بات تو ٹھیک ہے کہ انشورنس کمپنیاں جتنی بھی ہیں ان کا اپنا کاروبار، سود، میسر اور غرر سے مرکب ہے اور اصولاً سبھی قسم کے انشورنس جو ہیں، جیسا کہ رائے دی گئی کہ ناجائز اور حرام ہی ہونا چاہئے، مجھے یہ بات عرض کرنی ہے وہ یہ کہ ہمارے اپنے ملک میں اسلامی اور جائز انشورنس کی کوئی صورت ہمارے پاس نہیں ہے، حالانکہ باہمی تعاون والی تکافل کی جو شکل ہے کو آپریٹیو انشورنس کی، اسلام میں اس کی شکل موجود ہے، اگر ہم اس بارے میں غور کریں کہ یہ جو کمپنیاں ہیں اس میں شریک ہونے والا اور انشورنس کرانے والا ہر فرد یہ سمجھے کہ میں اپنا پیسہ کمپنی کو بطور وقف اور تعاون دے رہا ہوں، بایں طور کہ میں اور اس کمپنی میں شریک ہونے والے تمام افراد اس سے فائدہ اٹھائیں گے، اگر میں بیمار ہوا تو میں بھی اپنی ضرورت کے بقدر فائدہ اٹھاؤں گا اور اس میں باقی جو لوگ ہیں وہ بھی فائدہ اٹھائیں گے، سال پورا ہوگیا، میں اپنی رقم کے استحقاق سے نکل گیا۔

ایک آواز:

اس سلسلہ میں فقہی جو جزئیہ ہے کہ ایک آدمی نے اپنے کھلیان میں بیل لگا کر بالیوں سے گیہوں نکلوایا اور بیلوں نے اس پر چلتے ہوئے پیشاب بھی کیا، پاخانہ بھی کیا، تو فقہی جزئیہ موجود ہے کہ اس میں سے تھوڑا سا حصہ کسی کو صدقہ کردیا جائے یا جو مزدور ہے اس کو دیدیا جائے اور باقی اناج کے بارے میں سمجھا جائے کہ جو میرے گھر آیا وہ تمام پاک ہے اور ناپاک اس کے گھر سے چلا گیا۔ تو کمپنی میں جو پریمیم جمع ہوتا ہے اس کی اصل رقم بھی ہوتی ہے اس کا سود بھی ہوتا ہے، کمپنی کے اخراجات بھی ہوتے ہیں تو مسلمان یہ سمجھے کہ میرے حصے میں جو کچھ آئے گا وہ خود پریمیم کا حصہ ہے اور کمپنی کے اخراجات اور کلیم میں یا دوسرے لوگ جو علاج کے اخراجات لیں گے مسلمان کے علاوہ وہ سودی رقم سے اپنے اخراجات وصول کررہے ہیں۔

دوسرے یہ کہ آپ شیئرز کے کاروبار کو جائز کہتے ہیں، حضرت مولانا مفتی تقی صاحب عثمانی دامت برکاتہم نے یہ بات لکھی ہے کہ شیئرز کی خرید وفروخت چار شرطوں کے ساتھ جائز ہے، اسمیں ایک شرط یہ ہے کہ کمپنی کے حصص کو خرید وفروخت کرنے والا آدمی سال میں ایک مرتبہ ان کی میٹنگ ہوتی ہے وہ کم سے کم اپنی طرف سے درج کروائے کہ ہم سودی کاروبار کو فروغ نہیں دینا چاہتے، اور آپ جائز کاروبار کرنے کے باوجود جتنا حصہ سودی لین دین کرتے ہیں اس کو بھی بند کیجئے، شرعاً یہ جائز نہیں ہے تو ہم ان کمپنیوں کو جب بھی آدمی پالیسی لے سب اسلامی صورت کے اعتبار سے انہیں یہ لکھے کہ آپ جو کچھ سودی لین دین کرتے ہیں اسلام میں یہ جائز نہیں ہے اور اس کو بند کر کے سرمایہ کاری کیا جائے۔ میری گذارش یہی ہے کہ وہ جو سود آرہا ہے وہ شیئرز میں اس کے جواز کی جو بنیاد بنائی گئی ہے یہاں بھی اس کی بنیاد بنائی جائے۔ اور چونکہ ضرورت کا تحقق ہے بایں معنی کہ کوئی آدمی جب بیمار ہوجاتا ہے اور بالخصوص پانچ، سات، آٹھ، دس، امراض ایسے مہلک ہیں کہ ان کا علاج اچھے خاصہ مالدار آدمی کے لئے بھی ممکن نہیں ہے یا بہت مشکل ہے کہ اپنی رقم سے وہ علاج کرائے۔ اگر کرائے گا تو دیوالیہ ہوجائے گا۔ چہ جائیکہ کوئی غریب آدمی، ایڈز میں، کینسر میں، دل کی بیماری میں یا گردے کی بیماری میں مبتلا ہوجاتے ہیں، ان کے لئے تو جان کا مسئلہ ہوتا ہے، اس لئے اس پہلو پر غور کیا جانا ضروری ہے۔

مولانا ولی اللہ رشادی:

میرے عرض کرنے کا مطلب یہ ہے کہ مسلمان الحمدللہ بہت سے رفاہی ادارے قائم کر رہے ہیں اور کئے ہوئے ہیں ایسی خدمت ہو رہی ہے ہر جگہ اور آئندہ بھی ہونے کی امید ہے انشاء اللہ، اس لئے حرام کو حلال بنانے کی فکر کرنے کی ضرورت نہیں جو حضرات یہ کہتے ہیں: من نفس عن مومن قربة من قرب الدنیا، یہ سب معاوضہ لے کر کچھ پیسہ اپنا سودی پیسہ لینے کے لئے ہرگز نہیں ہے استدلال جو ہے بالکل ناحق ہے، وہ ترغیب ہے مبتلا لوگوں کے لئے، ان کی تکلیفوں کو دور کرنے کے لئے تاہم سود پر کاروبار کے ذریعہ سے اس سے تھوڑا پیسہ لے کر زائد پیسہ سودی لگا نا علاج معالجہ کرنے کی غرض سے اس میں بظاہر کوئی ترغیب نہیں۔

مولانا محی الدین غازی:

صورت مسئلہ میں کافی فرق ہو چکا ہے، اب سرکاری اور غیر سرکاری کی تفصیل بھی جیسا کہ یہ بات آئی کہ ختم ہو چکی ہے اور ہو رہی ہے۔ دوسری طرف پریم بھی بڑھنے والے ہیں، اس کے علاوہ یہ کہہ رہا تھا کہ مولانا عتیق صاحب نے جو بات اٹھائی ہے ہندوستان میں کیا علاج واقعی بہت مہنگا ہے؟ اس پر بھی غور کرنے کی ضرورت ہے۔ میرا خیال تو یہ ہے کہ جہاں انشورنس لازم ہے ترقی یافتہ ودیگر ممالک میں تو وہاں پر صرف ایلو پیتھک طریقہ علاج ہونے کی وجہ سے علاج مہنگا ہے۔ ہندوستان میں ایک تو متبادل طریقہ علاج موجود ہے، رائج ہے جو بہت سستے ہیں (۱) نمبر (۲) یہاں پر طبی اداروں میں ویلفیر ٹسٹ کا کالم بھی رہتا ہے، جس کی وجہ سے بڑی حد تک غریبوں کو سہولت ملتی ہے، جو لوگ اس سے فائدہ اٹھانا چاہیں۔ تو ان ساری چیزوں کو دیکھتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہندوستان کے لئے یہ ابھی ضرورت کا مسئلہ نہیں بنا۔ بعض مخصوص امراض ہیں جن میں ضرورت پڑتی ہے، بہت زیادہ رقم کی، وہ بہت ہی مخصوص ہے، اس میں ابھی اس طرح کی پوزیشن نہیں ہے نمبر ایک اور نمبر ۲ یہ کہ زیادہ پیسوں کی ضرورت اس وقت سے پڑنے لگی ہے جب سے ایلو پیتھک طریقہ علاج نے یہ جو رجحان دیا ہے کہ مرتے ہوئے آدمی کے بھی طبعی موت کو ٹالنے کی حتی الامکان کوشش کی جاتی ہے۔ ایسی صورت میں بہت زیادہ پیسے خرچ ہوتے ہیں عجیب عجیب انداز میں ان کو ہوسپیٹل میں رکھا جاتا ہے تو ان چیزوں سے ظاہر ہے ایک مومن کو پرہیز کرنا چاہئے، ظاہر ہے ابھی ہم اس مقام تک نہیں آئے ہیں، اس لئے ہمیں بچنا چاہئے۔

مفتی زاہد صاحب علی گڑھ:

میرا عرض کرنا یہ ہے کہ جو میں نے شروع میں یہ بات عرض کی تھی کہ جس میں لفظ انشورنس تو نہیں تھا M.A.S. میڈیکل انشورنس کی اس کے بارے میں اگرچہ کوشش کی گئی ہے سرکاری وغیر سرکاری ختم کرنے کی، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس سلسلہ میں جو سرکار میں ہے تو چونکہ زمین وآسمان کا فرق ہے کہ جو اس کو واپس ملتا ہے، اس لئے اس کے جواز کی طرف توجہ دینے کی ضرورت بظاہر محسوس ہوتی ہے، اس کے علاوہ ایک اہم بات اور بھی ہے کہ چونکہ ہر حکومت آج کل اپنے کو رفاہی حکومت کہلانا چاہتی ہے، اور ہمارے یہاں کانسٹی ٹیوشن آف انڈیا کے اندر صحت اور تعلیم کو بنیادی اور اہم لسٹ میں رکھا گیا ہے، اس میں تینوں کی ذمہ داری رکھی گئی ہے، حکومت مرکزی، صوبائی حکومت، اور اسی طرح سے وہ فرد کی بھی ذمہ داری ہے کہ وہ بھی اس میں حصہ لے تو یہ گویا اہم مسئلہ ہے کوئی اتنا سرسری نہیں، اس لئے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا، آٹھ، دس اتنے خطرناک امراض ہیں

کہ یقینی طور پر بڑے صاحب حیثیت لوگ بھی اس میں کچھ نہیں کر سکتے، ایک بات یہ ہے کہ حضرت مولانا نے جو وضاحت فرمائی تھی وہ میں سمجھتا ہوں، اس کی مزید وضاحت ہو جائے، اس میں ذرا غلط فہمی اور التباس پیدا ہو گیا ہے، آپ نے حضرت مولانا شیر علی صاحب کی بات پر جو ارشاد فرمایا کہ ایجاب وقبول اگر چہ بظاہر صحیح نہ ہو، لیکن اگر وہ ہو جاتا ہے تو تسلیم کیا جائے گا میرا اس سلسلہ میں عرض کرنا یہ ہے کہ ہمارے حنفیہ کے یہاں اکراہ کی شکل میں بیع منعقد نہیں مانی جاتی ہے، لیکن طلاق وعتق کو منعقد مانا جاتا ہے، غالباً یہ بات ملتبس سی ہو گئی، اس لئے یہ بات عرض کی۔

مفتی عبدالرشید:

سب سے پہلی بات تو یہ کہ یہاں کوشش یہ ہونی چاہئے کہ کوئی شخص کسی پر ایسا لفظ یا ایسا انداز اختیار نہ کرے کہ کسی کی توہین معلوم ہو، ہر شخص اخلاص کے ساتھ بیٹھا ہوا ہے، اس سے پرہیز کیا جائے۔ دوسری چیز یہ کہ جن حضرات نے یہ تشبیہ دی ہے کہ حرام چیزوں سے علاج بیماری واقع ہونے کے وقت ہے اور اپنی دلیلوں کو پیش کیا ہے، مولانا خالد سیف اللہ صاحب رحمانی نے جو اس پر فرق بیان کیا ہے کہ ایک ہے متوقعہ بیماری اور ایک ہے کہ محتملہ، قرآن وحدیث میں اس کی اجازت دی گئی ہے، یہ وہ بیماری ہے جو وقوع پذیر ہو چکی ہو اور جن کا احتمال ہے، ان میں کوئی بحث نہیں ہے۔ جہاں تک میں سمجھتا ہوں کہ جن حضرات نے یہاں پر دلیل پیش کی ہے وہ تشبیہ من کل الوجوہ نہیں ہے، بلکہ تشبیہ صرف اس سلسلے میں ہے کہ شریعت نے لچک دی ہے یا نہیں؟ میں ان حضرات سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ جنہوں نے دانت کے ٹوٹنے پر سونے کے دانت لگانے کی اجازت دی ہے، فقہاء نے بتایا ایک دانت ٹوٹنے سے کونسی قباحت ہوتی ہے وہ کھانا نہیں کھا سکتا، یا اس کے حسن میں کمی آجائیگی، آخر کس وجہ سے شریعت نے اور ہمارے فقہاء نے سونے کے دانت لگانے کی اجازت دی ہے یہ لچک نہیں ہے تو اور کیا ہے؟ یہاں پر کوئی ضرورت بھی نہیں ظاہر بات ہے کہ یہ لچک ہی ہے اور یہ تشبیہ بھی صرف لچک کی بنیاد پر دی گئی ہے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ جان کے بیمہ اور صحت کے بیمہ میں فرق ہے۔ جان کا بیمہ جو لوگ کراتے ہیں وہ لالچ ہوتی ہے کہ ہمیں زیادہ رقم شاید مل جائے، لیکن آپ بتائیں کہ جب تک آدمی اپنے اندر یہ محسوس نہیں کرتا کہ میں کسی بیماری میں مبتلا ہوں اس وقت تک وہ بیمہ کراتا ہی نہیں، کسی کو پیسہ نہیں کاٹ رہا ہے کہ صحت کا بیمہ کرائے گا، جب وہ محسوس کر لیتا ہے کہ شاید کوئی بیماری مجھے متوقع ہے تب ہی وہ اس سلسلے میں بیمہ کرائے گا، لہذا مقصد پر بھی نظر رہنی چاہئے کہ جان کا بیمہ اور صحت کے بیمہ میں ذرا سا فرق ہے۔

مفتی شیر علی گجراتی:

یہ جو ادارے انشورنس کے قائم کئے گئے ہیں اس کا مطلب یہی ہے کہ مخلوق خدا کو فائدہ پہنچے، لیکن اس پر غور کرنے کی بات ہے کہ ضرورتمند تو غریب ہوتے ہیں اب وہ بیچارے کہیں دیہات میں دور رہتے ہیں غریب ہیں وہ یہاں نہیں آسکتے، اسپتال نہیں جا سکتے، اسپتال پہنچنے کا بہت خرچہ ہے، تو وہ بیچارے محروم ہی رہتے ہیں، اور دوسری بات یہ ہے کہ جو بڑے بڑے مالدار ہیں وہ زیادہ فائدہ اٹھاتے ہیں غریبوں کا تو بیچارہ اگر بیمار بھی نہیں ہوا تو پیسہ واپس نہیں ہوا تو یہ تو غریبوں کا نقصان ہے، اس لئے اس میں ایسا کچھ طریقہ ہونا چاہئے کہ ان غریبوں کا نقصان نہ ہو۔

دوسری بات یہ فرمایا کہ جو زائد رقم ان کو ملی تو وہ اس پر تو بہت سے حضرات نے کلام کیا ہے، لیکن اس پر بہت کم نے کلام کیا کہ جو کوئی بیمار ہی نہیں ہوا اس کو کچھ نہیں ملے گا، تو اس پر غور کرنا چاہئے کہ اس کو کچھ فائدہ ملے۔

ڈاکٹر شیخ عبدالمجید سوسوہ:

حضرات علماء اور ہمارے دینی بھائیو!

حقیقت یہ ہے کہ آپ حضرات کی گفتگو کی، آراء اور بحثوں سے جو کچھ میں نے استفادہ کیا ہے اور آپ کی بحثیں سنیں ہیں ان میں اور ہمارے کہنے میں صرف اتنا فرق ہے کہ آپ نے انہیں باتوں کو اردو زبان میں فرمایا ہے اور میں عربی میں آپ کے سامنے دہرا رہا ہوں۔

آج کا موضوع ہے "میڈیکل انشورنس" یہ یقیناً بڑا اہم مسئلہ ہے، اور مغرب کی تاجرانہ اقتصادی اور معاشی فکر کی دین ہے، جسے اس نے سماج کی معاشی دشواریوں کے حل کے طور پر رواج دیا ہے، بدقسمتی سے آج مسلم سماج بھی اس میں ملوث ہو گیا ہے، اب ہمارے سامنے دو ہی راستہ ہے یا تو ہم اس کا تجزیہ کریں اور اس میں سے خیر کا عنصر نکالیں اور اس کے متبادل کے طور پر اسلامی انشورنس کا نظام اپنی امت کے سامنے پیش کریں، یا پھر یہ

کہہ کر کہ ہم مجبور ہیں اور اسے ضرورت واضطرار کا نام دے کر اس کے سامنے ہتھیار ڈال دیں اور اسی کو اختیار کر لیں۔

جہاں تک ''ہیلتھ انشورنس'' کا تعلق ہے۔ یہ بات ہم سبھی لوگ جانتے ہیں کہ ''صحت کا بیمہ'' یعنی میڈیکل انشورنس' دراصل جنرل انشورنس ہی کی ایک شاخ ہے، اور انشورنس جیسا کہ آپ حضرات علماء ہیں جانتے ہیں کہ اس کی دو صورتیں ہوتی ہیں: تجارتی انشورنس، تعاونی انشورنس۔

تجارتی انشورنس کے بارے میں آپ لوگ جانتے ہیں اور آپ حضرات نے خود گفتگو فرمائی اور اس نتیجہ پر پہنچے کہ چونکہ اس انشورنس میں ربا، غرر اور قمار جیسی حرام چیزیں پائی جاتی ہیں، اس لئے یہ ممنوع ہے۔

اور ''تعاونی بیمہ'' ان چیزوں سے خالی اور پاک ہے، کیونکہ تعاونی بیمہ کا مقصد دراصل عوام کو ان مصائب سے نجات دلانا ہے، جن سے وہ اس وقت معاشی طور پر دو چار ہیں اور اس وقت کی میڈیکل انشورنس کی کمپنیاں اس کا فائدہ اٹھا کر ضرورت، بیماری اور لوگوں کو سکون وراحت پہنچانے کا نام دے کر ان سے پیسے وصولتی اور ان پیسوں کو سودی کاروبار میں لگا کر کثیر سودی رقم حاصل کرتی ہیں، اس لئے:

اب ہمارے پاس صرف اور صرف تعاونی بیمہ کی شکل متبادل کے طور پر بچتی ہے، جس میں لوگ تعاونی اور تکافلی جذبہ سے اپنے پیسہ جمع کریں گے، اور جب ان میں سے کسی کے ساتھ کوئی حادثہ پیش آئے گا (خدانہ کرے) تو ان کو رقم کے بقدر پیسہ دیا جائے گا، اس طرح اس کے نقصان کی تلافی ہو جایا کرے گی، اور ہر شخص کے لئے تعاون اور تکافل کا دروازہ کھلا رہے گا، اور اگر کسی کو کوئی حادثہ پیش نہیں آیا تو جمع کی ہوئی رقم کو اس کی طرف سے تعاون سمجھا جائے گا، تو یہ تعاونی بیمہ کی جو شکل ہے یہ مثالی اور آئیڈیل بن سکتی ہے۔

اور میڈیکل انشورنس کے بارے میں حتمی بات یہ ہے کہ شرعاً جائز نہیں ہے، سوائے اس کے کہ ضرورت شدیدہ واقع ہو جائے، اب اس حالت شدیدہ کے کئی پہلو ہیں:

۱- اگر کہیں کسی معاملہ میں ضرورت شدیدہ واقع ہو جائے تو اس کے لئے شریعت میں حل موجود ہے، اب ضرورت یا تو اجباری اور اضطراری ہوگی، مثلاً حکومت نے قانون بنادیا کہ آپ کو انشورنس کرانا ہے، ظاہر ہے کہ یہ اجباری ہے، یا انسان خود ایسے حالات سے دو چار ہو جائے کہ بغیر انشورنس کے کوئی چارہ کار نہ ہو تو ایسی صورت میں قاعدہ شرعیہ: ''الضرورۃ تقدر بقدرہا'' کی روشنی میں اس حد تک اس کی اجازت ہوگی۔

۲- یہ ہے کہ تجارتی بیمہ کو بدرجہ مجبوری اور ضرورت کی بنیاد پر جائز قرار دینے میں کسی قسم کی سہل پسندی نہیں ہونی چاہئے کہ مجبوری کا نام دے کر اسی پر تکیہ کئے رہیں اور نہ ہی عوام کو اتنی تنگی اور سختی میں مبتلا کر دیں، بلکہ عوام کو اس بات کے لئے آمادہ کرتے رہیں کہ وہ تعاونی انشورنس کی طرف راغب ہوں اور متبادل کے طور پر اسلامی انشورنس کا نظام اور نمونہ بھی پیش کرنے کی جدوجہد جاری رکھیں، اگر چہ اس میں کچھ وقت ہی کیوں نہ لگ جائے۔

جس طرح امت کو ربا اور حرام سے بچانے کے لئے اللہ کی توفیق سے اسلامی بینکنگ کے نظام کو بروئے کار لانے کی کوشش کی گئی اور آج اسلام کا مالیاتی نظام اسلامی بینکنگ کی شکل میں الحمد للہ موجود ہے، اسی طرح میں یہ کہتا ہوں کہ انشورنس کے سلسلہ میں بھی ضرورت کے نام پر اس قدر تساہل نہ برتی جائے اور اسلامی انشورنس کا نظام متبادل کی صورت میں پیش کرنے میں کوتاہی نہ کی جائے کہ لوگ موجودہ انشورنس میں ملوث ہو کر حرام چیزوں کے عادی ہو جائیں، بلکہ ہر حال میں متبادل سسٹم لانے کی کوشش کی جائے۔

ساتھ ہی اس مسئلہ کی طرف بھی آپ کی توجہ مبذول کراتا چلوں کہ بہت سے لوگ ''تعاونی انشورنس'' کو بھی جنرل انشورنس کے تناظر میں دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں، جبکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ جنرل انشورنس محض ایک امکانی اور احتمالی چیز ہے اور تعاونی انشورنس قطعی محتمل اور امکانی چیز نہیں ہے، اور میڈیکل انشورنس میں بھی کوئی احتمالی چیز نہیں ہے، بلکہ یہ ایک وقوع پذیر چیز ہے اور بہت سے لوگ بیمار پڑتے ہیں اور بیمار ہونا انسانی فطرت ہے کوئی امکانی چیز نہیں ہے، اور بسا اوقات لوگ دوسرے ادیان ومذاہب کے لوگوں کی دیکھا دیکھی ان امراض کو قمار، سود اور غرر پر مشتمل تجارتی بیمہ جیسی حرام چیزوں کو برتنے کے لئے گنجائش کا ذریعہ تصور کرنے لگتے ہیں، یہ انسانی فطرت ہے، اس میں علماء کے لئے دانشمندی کی ضرورت ہے۔

اس لئے محض ضرورت کا نام دے کر علی الاطلاق حرام کے دروازے کو نہ کھولا جائے، بلکہ اس بات کا گہرائی کے ساتھ تجزیہ کیا جائے کہ جب تک لوگ اس حد کو نہ پہنچیں جس میں حرام چیز مباح ہو جاتی ہے تب تک محض ضرورت کے نام پر اس کی اجازت نہ دی جائے جن کو ... کتاب وسنت،

سے واضح ہے۔ یہ شریعت کے مسلمات میں سے ہے اور واضح ہے، یہاں علماء اور فقہاء تشریف فرما ہیں اس بات کو اچھی طرح جانتے ہیں کہ حرج اور تنگی کی کیا حد ہے، غور کریں اور سوچیں تا کہ کسی امر کی واضح حرمت کا حل تلاش کر سکیں۔

میں آخر میں اللہ تعالی سے دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالی تمام مسلمانوں کو میڈیکل انشورنس اور انشورنس سسٹم کے اسلامی متبادل نظام کا حل اور نمونہ ایجاد کرنے اور پیش کرنے میں ہمیں توفیق دے اور ہماری مدد فرمائے۔

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی:

یہ آخری نشست تھی اس میں مولانا عبید اللہ صاحب، کمیٹی کا اعلان فرمادیں گے، ایک بات وضاحت کے طور پر عرض کر دیتا ہوں کہ ایک مسئلہ جو بار بار اٹھ رہا ہے علاج کے لئے محرمات کے استعمال کا، اس پر تو میں اظہار رائے کرنا نہیں چاہتا، لیکن جو اکیڈمی کا سمینار ہوا تھا میڈیکل مسائل پر علی گڑھ میں، اس میں یہ بحث تفصیل سے آچکی ہے کہ کن حالات میں علاج کے لئے ممنوعات کا استعمال کرنا شرعا درست ہوگا۔ اور میں نے جو بات کہی تھی ضرورت واقعہ اور ضرورت ممکنہ کی، اس کا مقصد یہ نہیں تھا کہ خاص علاج کے بارے میں یہ بات عرض کر رہا ہوں، میں نے فقہاء کا جو قاعدہ ہے: ''الضرورات تبیح المحضورات''. تو اس سے کس درجے کی ضرورت مراد ہے، اس بارے میں عرض کر رہا تھا، اور وہ جو سونے کے دانت والی بات ہے وہ الگ مسئلہ ہے جو آپ قواعد کی کتابوں میں پڑھتے ہیں کہ حاجت کو بھی کبھی ضرورت کے درجے میں لے لیا جاتا ہے، اور ''الحاجۃ قد تنزل منزلۃ الضرورۃ''، اس قاعدہ کے تحت اہل علم نے اس کو داخل فرمایا ہے، بہر حال ایک بات اصولی طور پر ہم تمام رفقاء کی طرف سے ہے حضرت مولانا عبید اللہ صاحب، حضرت مولانا عتیق صاحب، ہمارے مولانا صدر محترم صاحب کی طرف سے کہ اکیڈمی کی ایک روایت یہ رہی ہے کہ ہم کھلے دل سے مناقشہ کرتے ہیں، رائے پر نقد بھی ہوتا ہے، رائے پر تنقید بھی ہوتی ہے، لیکن اس میں کوئی بے احترامی کا یا "تنابذوا الألقاب" کا یا تمسخر کا پہلو نہیں ہوتا، اور اس وقت بھی جو مجلس رہی ہے اس میں بھی میں سمجھتا ہوں کہ ایسا کوئی پہلو نہیں رہا، اگر ایسی کوئی بات ہمارے دوستوں اور ہم لوگوں میں سے کسی کی طرف سے آئی ہو تو ہم بہت معذرت خواہ ہیں آپ سے، ہمیں امید ہے کہ ہم لوگ ایسے ہی جو ہمارے سلف کی روایت ہے تحمل اختلاف رائے کو برداشت کرنے کی اس روایت کو قائم رکھتے ہوئے گفتگو کریں گے۔

جو بحث آپ حضرات کے سامنے آئی ہے اس کے لحاظ سے کئی پہلو ہیں، اس میں اجباری انشورنس، اختیاری انشورنس، اگر کوئی شخص کسی مرض میں مبتلا ہو چکا ہے تو اس کے لئے انشورنس اور ابھی نہیں ہوا ہے، مستقبل میں احتمال ہے، اس کے لئے انشورنس، ان تمام پہلوؤں کو سامنے رکھ کر غور کیا جائے گا، ایک بات آپ حضرات کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ ہندوستان میں بھی جو بجاج کمپنی ہے، جو انشورنس کے میدان میں اتر رہی ہے وہ اسلامی اصولوں پر مسلمانوں کے لئے انشورنس کا شعبہ قائم کرنے پر آمادہ ہے، اس سلسلہ میں ہمارے پاس بھی ایک آدمی کا مراسلہ آیا تھا اور خود آپ کے بنگلور میں مولانا شعیب اللہ مفتاحی صاحب انہوں نے ان سے کافی ربط رکھا اور پھر ساؤتھ افریقہ سے اور پڑوسی ملک سے جو اسلامی متبادل ہے اس کی ضرورت کی طرف اشارہ گیا ہے، حضرت مفتی شفیع صاحبؒ نے بھی ''جواہر الفقہ'' میں تکافل کی اور وقف کی صورت ہو تو اس کی روشنی میں جو ماڈل ہے وہ ان کو بنا کر دیا گیا ہے اور وہ چاہتے ہیں کہ اسلامی بنیادوں پر ہم انشورنس کی کمپنی کو چلائیں اور اس کے سرمایہ کو بزنس اور تجارت میں لگائیں، حلال طریقہ پر اس سے نفع حاصل کریں، تا کہ زیادہ سے زیادہ مسلمان اس کی اس اسکیم میں شریک ہو سکے، اللہ کرے کہ یہ صورت پیدا ہو جائے تو انشاء اللہ ایک اسلامی متبادل بھی ہمارے اس ملک میں فراہم ہو جائے گا، بہر حال ہماری جو تجویز ہو، جیسا کہ ہمارے بہت سے دوستوں نے کہا اس پہلو کو بھی ہمیں پیش نظر رکھنا چاہئے کہ اس کا حلال متبادل کن اصولوں پر ہے، مفتی شفیع کا، مولانا تقی عثمانی صاحب کا اور بعض دوسرے ملکوں میں جہاں تکافل کے نام سے اس کو قائم کیا گیا ہے، اس کا ماڈل اور عملی صورت موجود ہے تو اس کو سامنے رکھتے ہوئے ہم لوگ اس بارے میں بھی کوئی بات پیش کر سکیں تو اس سے لوگ محسوس یہ کریں گے کہ ایسا نہیں ہے کہ ہماری مشکلات کا حل شریعت میں موجود نہیں ہے، اگر آپ لوگ اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ یہ ناجائز ہے تو شریعت میں اس کا جائز متبادل بھی موجود ہے، اس سے انشاء اللہ شریعت کی محبت ان کے اندر پیدا ہوگی اور وہ محسوس کریں گے کہ یہ شریعت ہمارے لئے بوجھ نہیں ہے۔

☆☆☆

عالم اسلام کے اکابر علمائے کرام کے جدید فقہی مسائل پر مقالہ جات اور مناقشات کا مجموعہ نئی ترتیب کے ساتھ

سلسلہ
جدید فقہی مباحث

اسلام کا نظام معیشت

شیئرز اور کمپنی

حصہ اول: شیئرز کی شرعی حیثیت
حصہ دوم: کمپنی و حصص کمپنی

تحقیقات اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا

زیر سرپرستی
حضرت مولانا مجاہد الاسلام قاسمی
حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی دامت برکاتہم

دارالاشاعت
اردو بازار ٥ ایم اے جناح روڈ ٥ کراچی پاکستان

ابتدائیہ

اس وقت عالمی اور ملکی سطح پر جو مالیاتی ادارے نظام معیشت کو کنٹرول کر رہے ہیں، ان میں تین اداروں کی بڑی اہمیت ہے: بنک، انشورنس کمپنی اور اسٹاک ایکسچینج...... ان میں سے بنک اور انشورنس کی جو شکلیں مروج ہیں، وہ بنیادی طور پر سود اور قمار پر مبنی ہیں، اللہ کا شکر ہے کہ ان دونوں اداروں کی جائز خدمات کو فراہم کرنے اور مفاسد سے بچنے کی غرض سے ان کا متبادل پیش کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے، اسلامی بنک اور اسلامی تکافل کے تجربات پوری دنیا میں کئے جا رہے ہیں اور بحمد اللہ اس کے نتائج حوصلہ افزا ہیں، اسٹاک ایکسچینج ایک ایسا ادارہ ہے جہاں شیئرز کے واسطہ سے مالی اثاثہ کی خرید وفروخت ہوتی ہے اور اس سے نفع حاصل کیا جاتا ہے۔

یہ ادارہ بنیادی طور پر ربا اور قمار پر مشتمل نہیں ہے؛ لیکن دو باتیں اس میں محل نظر ہیں: اول یہ کہ بہت سی کمپنیوں کا بنیادی کاروبار ہی حلال نہیں ہوتا، جیسے فلمی کمپنیاں یا شراب بنانے والی کمپنی وغیرہ، دوسرے بعض کمپنیاں بنک سے سودی قرض حاصل کرتی ہیں یا اپنے فاضل سرمایہ کو نفع آور بنانے کی غرض سے کچھ مدت کے لئے بنک کے پاس ڈپازٹ کرتی ہیں اور جو نفع انہیں حاصل ہوتا ہے، ان میں ایک حصہ سود پر مبنی نفع کا بھی ہوتا ہے، ان اسباب کی بنیاد پر شیئرز کی خرید وفروخت کا مسئلہ اس عہد کے فقہاء کی بحث کا موضوع بن گیا ہے، اس کے ساتھ ساتھ ایک صورت حال یہ بھی پیش آ گئی ہے کہ بعض دفعہ شیئرز خرید کئے جاتے ہیں مگر ان کا مقصد شیئرز کا خریدنا اور بیچنا نہیں ہوتا؛ بلکہ چند گھنٹے کا رسک مول لے کر نفع ونقصان کو برابر کرنا مقصود ہوتا ہے، اس طرح خرید وفروخت کو سٹہ بازی کا ذریعہ بنایا جاتا ہے۔

دوسری طرف یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ موجودہ حالات میں شیئرز مارکٹ ایک ایسا ادارہ ہے، جو اسلام کے قانون شرکت اور قانون مضاربت سے قریب تر ہے، اور اگر بعض مفاسد دور کر دیئے جائیں تو یہ مکمل طور پر اسلامی پیکر میں ڈھل سکتا ہے؛ اسی لئے موجودہ دور کے فقہاء نے اصولی طور پر شیئرز کی خرید وفروخت کو جائز قرار دیا ہے، ان کے نزدیک شیئرز کو خریدنا روپے کے بدلہ روپے خریدنا نہیں ہے! بلکہ یہ اس اثاثہ کو خریدنا ہے جس کی شیئرز سرٹیفکٹ نمائندگی کرتی ہے؛ لہٰذا اس پر بیع صرف یعنی زر کی زر سے خرید وفروخت کے احکام جاری نہیں ہوں گے۔

یہ بات بھی ملحوظ رکھنے کی ہے کہ جہاں آپ خود کسی نظام کو وجود بخشنے کے موقف میں ہوں اور جہاں آپ اس موقف میں نہ ہوں؛ بلکہ پہلے سے مرتب نظام کے دائرہ میں رہتے ہوئے کام کرنا اور اس کے مواقع سے فائدہ اٹھانا ہو، دونوں کے احکام میں فرق کرنا ایک مجبوری ہے، اور شریعت اسلامی چونکہ انسانی ضرورتوں سے ہم آہنگ شریعت ہے؛ اس لئے اس میں اس کا قدم قدم پر لحاظ رکھا گیا ہے، شیئرز کی خرید وفروخت کے مسئلہ پر غور کرتے ہوئے اور اس کے معیارات کی تعیین میں اس پہلو کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے، اس مجموعہ کو اسی پس منظر میں مطالعہ کرنا چاہئے۔

اس مجموعہ کا مطالعہ کرتے ہوئے اس بات کو بھی پیش نظر رکھنا مناسب ہوگا کہ یہ مقالات اکیڈمی کے نویں فقہی سمینار منعقدہ جے پور راجستھان بتاریخ ۱۱-۱۴/اکتوبر ۱۹۹۶ء میں پیش کئے گئے تھے، اب جبکہ یہ سطریں لکھی جا رہی ہیں، شیئرز کے قوانین میں بہت کچھ تبدیلیاں آ چکی ہیں؛ اس لئے اگر فنی معلومات اور ان پر مبنی جوابات کو موجودہ مروجہ طریقوں سے کچھ مختلف محسوس کیا جائے یا بعض فقہی پہلو جواب اٹھائے گئے ہیں، زیر بحث نہیں آئے ہوں تو اس کو اسی پس منظر میں دیکھنا چاہئے۔

یہ مجموعہ پہلی بار بانی اکیڈمی حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ کی حیات ہی میں شائع ہو چکا تھا، اب اس کا دوسرا ایڈیشن طبع ہونے جا رہا ہے، اس مجموعہ میں سمینار میں پیش کئے گئے بیش قیمت علمی وفقہی سرمایہ کے علاوہ خود بانی اکیڈمی کا چشم کشا مقدمہ بھی شامل ہے، جو ہم لوگوں کے لئے اب علمی تبرک کا درجہ رکھتا ہے، دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے قبول فرمائے اور جو لوگ اس میدان میں کام کر رہے ہیں، ان کے لئے نشانِ راہ ثابت ہو۔ واللہ ہو الموفق۔

خالد سیف اللہ رحمانی

۱۴/جمادی الاولی ۱۴۳۱ھ/ ۲۹/اپریل ۲۰۱۰ء

مقدمہ

اسلام ایک مکمل نظام حیات ہے جو اقتصادی جدو جہد، تجارتی وصنعتی ترقی، خرید وفروخت کے معیارات اور طریقے متوازن وعادلانہ معاشی نظام اور مستحکم اصولوں کی روشنی میں پیش کرتا ہے۔

اسلام سرمایہ، سرمایہ کاری، اخراجات، پیسہ کی بچت، مالیاتی لین دین، مال بیچنے اور بھیجنے، سرمایہ محفوظ کرنے اور خرچ کرنے، منافع کم لینے یا زیادہ لینے، قیمت کے اتار چڑھاؤ، صنعت وحرفت نیز مہارت وحقوق کی فروخت، اجرت ومحنت جیسے تمام امور کی ضابطہ بندی کرتے ہوئے انسانوں کی واضح رہنمائی پیش کرتا ہے۔

آج کی دنیا صنعتی انقلاب کے بعد فنی اور تکنیکی اعتبار سے بہت آگے بڑھ گئی ہے، چنانچہ خرید وفروخت، تجارت اور سرمایہ کاری کی اتنی متنوع شکلیں پیدا ہو چکی ہیں جن کی ماضی میں کوئی نظیر نہیں ملتی، مثلاً بینکاری کا نظام، کرنسی کا نظام، مارکٹنگ کا نظام، قبضہ سے پہلے فروخت اور نفع کے حصول کا سریع الحرکت نظام، حصص کے خرید وفروخت کا نظام، بین الاقوامی تجارتی نظام، کرنسی کے مساوی کارڈ کا نظام، اور ان ساری سرگرمیوں کو چلانے اور کنٹرول کرنے کے لئے مختلف النوع اداروں اور کمپنیوں کا نظام یہ سب اپنی جگہ آج کے عہد میں ایسی ضرورت بن چکے ہیں جن سے بے شمار مسائل و سوالات جڑے ہوئے ہیں۔

اس میں شک کی کوئی گنجائش نہیں کہ موجودہ رائج معاشی نظام اصلاً سود پر مبنی ہے جس میں زیادہ تر سرمایہ داروں کا معاشی ومفاداتی تحفظ ہوتا ہے، اور غریبوں کا لہو، ان کی شب وروز کی محنت اور سستی اجرت سے نچوڑا جاتا ہے۔

اسلام دراصل اقتصادی محاذ پر ظلم واستحصال کا خاتمہ، معاشی عدل کا قیام اور سود کے شائبہ سے پاک نظام کا نفاذ واحیاء اور بقا چاہتا ہے، اسی لئے اسلامی شریعت اپنے جامع و پائدار اصولوں کے ذریعہ انسانی سماج کو ہر عہد، ہر دور اور ہر خطہ میں فلاحی و دنیوی ترقی اور معاشی خوشحالی سے ہمکنار کرنا چاہتی ہے۔

ہندوستان میں قائم معاشی نظام کی اساس سود پر مبنی ہے، اس لئے کروڑوں ہندوستانی مسلمانوں کی قرآنی حکم اور اسلامی شریعت پر عمل کرنے کے لئے غیر سودی معاشی نظام، غیر سودی بنکاری اور اسلامی مالیاتی ادارے قائم کرنے اور دستوری و آئینی طور پر موجود گنجائشوں اور امکانات وحدود میں رہتے ہوئے مثبت وتعمیری کوششیں کرنے کی فکر بجا اور لائق تحسین ہے، واضح رہے کہ ہندوستان میں تجارت کے جو مختلف اصول جاری وساری ہیں، جن کے ذریعہ سرمایہ کاری بھی ہوتی ہے اور بینک میں پیسے جمع کرنے والوں کو جائز منافع بھی تقسیم کیا جاتا ہے، ان پر اکیڈمی نے بہت پہلے کام شروع کیا، اور خوشی کی بات یہ ہے کہ بینکنگ اور موجودہ قانون کے بڑے ماہرین، جو اسلامی شریعت کی ہدایات کی پابندی کرتے ہوئے اپنے فن کے بارے میں بہتر رائے دینے کی پوزیشن میں ہیں، کا تعاون بھی اکیڈمی کو حاصل رہا۔ اللہ ان کو جزائے خیر دے۔

اس سلسلہ میں اقتصادی ماہرین پر مشتمل تشکیل شدہ کمیٹی کی کئی نشستیں ہوئیں، جن میں علماء بھی شریک رہے، ماہرین میں پروفیسر کے جی منشی صاحب جو معاشیات بالخصوص اسلامی معاشیات پر اچھا خاصا کام کر چکے ہیں، ہمارے عزیز دوست جناب کمال فاروقی صاحب جو Chartered Accountant ہیں، جناب رحمن خاں صاحب جو الامین اسلامک بینک کے مؤسس و بانی ہیں، جو سرمایہ کاری بھی کرتا ہے، فائنانس بھی کرتا ہے، اور جس کو شریعت کے مطابق چلانے کا عزم انہوں نے کر رکھا ہے، ایک کامیاب ادارے کی حیثیت سے وہ کام بھی کر رہا ہے، اور بھی بعض بہت ہی مفید کام اللہ ان سے لے رہا ہے۔ جناب سید امین الحسن رضوی صاحب جو ماشاء اللہ شریعت پر بھی نظر رکھتے ہیں اور جدید قانون پر بھی، بہت محنت اور بڑی جانفشانی سے مطالعہ کرتے رہتے ہیں، ڈاکٹر فضل الرحمن فریدی صاحب جو اسلامی معاشیات کے معروف ونمایاں اسکالر ہیں، جناب احسان الحق

صاحب جو مالیاتی اداروں اور بینکوں کے انتظامی امور سے خاص دلچسپی رکھتے ہیں اور اسلامی اقتصادیات سے بھی بخوبی واقف ہیں، عبدالوہاب دیلوی صاحب جو بینکنگ کا خاص تجربہ رکھتے ہیں، اور سب سے منفرد صلاحیت اور تجربات کے حامل ڈاکٹر عبدالحسیب صاحب اس کمیٹی میں روز اول سے ہی شریک رہے، ان سب کے علاوہ اور بھی متعدد ماہرین کمیٹی کے ساتھ علمی تعاون کرتے رہے، مولانا شمس پیرزادہ صاحب جن کو اقتصادی موضوعات سے خصوصی دلچسپی بھی ہے، اور شرعی معاملات میں کوئی مصالحت بھی کرنے کا مزاج ان کا نہیں ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ یہ سب لوگ ان نشستوں میں شریک رہے، چونکہ بات بہت پرانی ہوگئی ہے اس لئے تھوڑی سی کہانی بھی سنا دینا ضروری سمجھتا ہوں۔

پہلا فیصلہ تمام قانونی تجزیہ کے بعد یہ ہوا کہ اصطلاح میں جس کو بینک کہا جاتا ہے اور جو International Banking Law یا Indian Banking Law کے تحت Govern ہوتا ہے، ایسے کسی بینک کو ہندوستان میں چلانا ہمارے لئے شریعت کی روشنی میں ممکن نہیں ہے، علماء اور ماہرین کی کمیٹی قطعی طور پر اس نتیجہ تک پہنچ چکی ہے، بنیادی بات یہ ہے کہ شریعت کا اصول کتاب اللہ نے واضح کردیا ہے: "أحل الله البيع وحرم الربوا" اللہ نے تجارت کو حلال کیا اور ربا کو حرام کیا، لیکن Banking کے رائج قوانین کی شکل "أحلوا الربا وحرموا البيع" ابھرتی ہے یعنی کوئی بھی بینک براہ راست Commercial Activities نہیں کرسکتا ہے، کوئی تجارتی نشاط اس کے اندر نہیں ہوسکتا، البتہ وہ سود پر قرض دیتا ہے، اور لینے والے اس سے تجارت کرتے ہیں، گویا بالواسطہ تجارت میں شرکت ہے، اس طرح کہ بینک کا سرمایہ ہر طرح محفوظ اور Secure رہتا ہے اور اس کا منافع بھی Secure اور محفوظ رہتا ہے، وہ کوئی Risk نہیں لیتا، یہ ایک بنیادی فرق ہے کہ بینک اپنی جدید اصطلاح کے اعتبار سے ایک ایسا سودی کاروبار ہے جس کے ساتھ وہ اپنے سرمایہ کو کبھی بھی Risk میں نہیں ڈالتا، منافع ضرور حاصل کرتا ہے، ظاہر ہے کہ جب شریعت آئے گی تو وہ پہلے کہے گی کہ بیع اور تجارت حلال ہے، Commercial Activities حلال ہیں اور جملہ ربوی معاملات حرام ہیں۔

اگر ایسا کوئی قانون کبھی بن جائے تو ہمارے لئے سہولت یہ ہوسکتی ہے کہ ہم جو بینک قائم کریں وہ اپنا سرمایہ ممکن حد تک قابل اعتماد طریقہ پر تجارت میں لگا کر منافع حاصل کرے، اور بینک کے یہ منافع جہاں اس کے اخراجات کو Maintain کرے گا، Depositers کو بھی جائز منافع دینے کی پوزیشن میں ہوگا۔

فی الحال بعض نئے رجحانات ضرور پیدا ہوئے ہیں جیسے Mutual Fund وغیرہ کی بعض صورتیں رائج کی گئی ہیں، ان کے بارے میں ایک بات یہ ہے کہ Mutual Fund میں تجارت کرنے کے مواقع ہیں اور قانوناً اس کی اجازت ملتی ہے، کیسی تجارت ہو، کیا ہو، یہ بعد کا مسئلہ ہے، لیکن یہ بینکنگ کی بنیادی روح سے الگ ہے۔

یہ بات بھی سامنے آئی کہ بینکنگ کے اغراض ومقاصد میں دو ایک چیزیں بنیادی ہیں، ایک تو اعتماد اور بھروسہ اور ساکھ کی خصوصیت ہے، اور غالباً انگریزی زبان کے اس لفظ کے مفہوم میں بھی اس بات کی رعایت موجود ہے، (Banking Upon) یعنی ہم کسی پر بھروسہ کرتے ہیں، یہ بھروسہ والی کیفیت کہ جب میں سرمایہ لگاؤں یا بینک کے حوالہ کروں تو مجھے اطمینان ہو کہ یہ سرمایہ مجھے لوٹے گا اور منافع بھی مجھے ملے گا، اعتماد کی یہ خصوصیت بینکنگ میں ہوتی ہے، بینکنگ کے ادارے کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ سرمایہ بجائے جامد ہونے کے متحرک رہے، کسی ایک جگہ دولت کے منجمد ہوجانے کو شریعت اسلامی کبھی پسند نہیں کرتی، اسی لئے "اکتناز ذهب وفضة" اور "کي لا يكون دولة بين الأغنياء"، اور خود شریعت کے دیگر احکام کی روح سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ سرمایہ کو حرکت میں رہنا چاہئے، اور حرکت پذیر سرمایہ کا مقصد پیسے سے پیسہ کمانا نہیں ہونا چاہئے، پیسہ وسیلہ ہے، اس کے ذریعہ Production ہو، پیداوار ہو، کسی ملک کی یا سوسائٹی کی صنعتی ترقی ہو، جس سے انسانوں کو راحت ملے، اور جو سرمایہ کاری کرتے ہیں ان کو بھی اس کا واجب نفع ملے، سرمایہ کو سوسائٹی کی فلاح کے لئے استعمال کرنا چاہئے، بجائے اس کے کہ اس کو جام کردیا جائے، یہی وجہ ہے کہ شریعت نے اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہوئے کہ ہر انسان میں تجارت کی صلاحیت نہیں ہوتی، نہ تجارت کا ہنر ہوتا ہے، اور ہر ہنرمند کے پاس ضروری نہیں کہ سرمایہ بھی ہو، کسی شخص کے اندر تجارت کی اور صنعت کی صلاحیتیں موجود ہیں، اس میں Skill بھی ہے، ہنر بھی ہے، وقت بھی ہے، افراد بھی ہیں، Human Resources انسان کی دماغی صلاحیتیں بھی اس کے پاس موجود ہیں، لیکن سرمایہ نہیں ہے، اور جن کے پاس سرمایہ ہے وہ ان چیزوں سے محروم ہیں، اسی لئے شریعت نے اصول مضاربت کو تجارت کے ضروری اصولوں میں سے تسلیم کیا ہے، اور مضاربت کے ذریعہ ایک

طرف ماہرین کی فنی مہارت، افراد کی وہ قوت جس سے تجارت کر سکیں صنعت قائم کر سکیں اور چلا سکیں، اور دوسری طرف جس کے پاس سرمایہ ہے اور یہ صلاحیتیں نہیں ہیں ان سب کو جوڑ کر شریعت نے سوسائٹی کو بھی فائدہ پہونچانے کی کوشش کی ہے اور سرمایہ کو بھی صحیح رخ پر لگا کر صاحب سرمایہ کو بھی فائدہ پہنچانے کی کوشش کی ہے۔ یہ شریعت کے ان اعمال کی روح ہے جو تجارت کے اصولوں میں ہیں، اسی طرح شرکت ہے کہ دو شریکوں میں سے دونوں کا سرمایہ ہے، لیکن ضروری نہیں ہے کہ ہر ایک ان میں سے شریک عامل بھی ہو، شریک عامل ہونا بھی ضروری نہیں ہے، جس طرح آج کی اصطلاح میں Silent Partner اور Working Partner ہوتے ہیں۔ اس طرح شریعت نے بھی اس کی گنجائش دی ہے کہ دو شرکاء میں سے ایک کام کی ذمہ داری سنبھال رہا ہے، اور ایک Silent ہے، وہ عملی طور پر حصہ نہیں لے پاتا ہے، ان تمام چیزوں کو دیکھنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ سرمایہ کا انجماد غلط ہے، اور سرمایہ جب جمتا ہے تو پھر غلط قسم کی راہوں میں بھی لگتا ہے اور سوسائٹی کے لئے اس کی افادیت بھی مجروح اور متاثر ہوتی ہے، اور دوسری طرف پیسے سے پیسہ کمانا اور پیسے کو Production کے ذریعہ، Development کے ذریعہ، ترقیات کے ذریعہ سماج کے منافع کے لئے استعمال نہ کرنا بھی شریعت میں پسندیدہ نہیں ہے، اس وقت ہندوستان میں ہی نہیں، بلکہ دنیا کے جن ملکوں میں آپ جائیں گے چاہے وہ اپنے کو اسلامی ملک کہتے ہوں یہ دشواری موجود ہے، حالانکہ ان اسلامی ممالک کے پاس مواقع ہیں، وہ قوانین میں تبدیلیاں لا سکتے ہیں، اور اپنے پورے مالیاتی نظام کو اسلام کی اساس پر قائم کر سکتے ہیں، لیکن یا تو شاید اسلام کے اوپر اعتماد کی کمی ہوگئی ہے، یا یہ احساس پیدا ہو گیا ہے کہ موجودہ دور میں اسلامی نظام ایک طرح کا العیاذ باللہ فرسودہ نظام ہے، اور حقیقتاً میرے خیال میں اس کے پیچھے ذہنی مرعوبیت ہے، کہ جو یورپ اور امریکہ سے آتا ہے وہی خیر ہے، اس کے علاوہ جو کچھ ہے وہ چلنے والا نہیں ہے، اور:

جانتا ہوں ثواب طاعت وزہد پر طبیعت ادھر نہیں آتی

والا مضمون پیدا ہوتا ہے، چنانچہ نتیجہ یہ ہے کہ سعودی عرب ہو، چاہے عرب امارات ہو، چاہے دنیا کا کوئی بھی ملک ہو ان میں یہی مغربی نظام معاشیات جاری ہے، البتہ حالیہ دنوں میں کچھ تبدیلیاں آئی ہیں، اور ایران اور سوڈان میں اسلامی نظام معاشیات کو عملی طور پر نافذ کرنے کے لئے بلا شبہ کچھ مثبت فیصلے کئے گئے ہیں، بہر حال یہ تو ان ممالک کے مسائل ہیں، وہ زیادہ مکلف ہیں، استطاعت کے باوجود اگر نہیں کرتے تو وہ اللہ تعالی کے یہاں جوابدہ ہوں گے۔

ہمارا مسئلہ یہ ہے کہ ہمارے پاس اتنی استطاعت نہیں ہے، لیکن اللہ کا شکر ہے کہ فکر مندی ضرور ہے، اور یہ بڑی مبارک ہے، اگر اللہ کی شریعت کے مطابق معاشیات کو درست کرنے کی اپنے مشکل اور نازک حالات میں بھی فکر مندی موجود ہے تو یہ بڑی مبارک اور بڑی مسعود ہے، اور ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالی اس کے ذریعہ کوئی دوسرے راستے نکالے، اس لئے کہ ہمارا اس پر یقین ہے کہ جس حد تک ہم کسی کام کے کرنے کی استطاعت رکھتے ہیں، اگر ہم نے موجودہ استطاعت کے مطابق شریعت کے نفاذ کی کوشش کی، تو اللہ تعالی وہ دن لا سکتا ہے کہ جب ہم پورے دین کی تنفیذ وتطبیق کے اہل ہو جائیں، لیکن اگر ہم نے اپنی موجودہ استطاعت کے مطابق کوئی اقدام نہیں کرنا چاہا کہ کل نہیں مل سکتا اس لئے جزو بھی نہ لو، "مالا یدرک کلہ لا یدرک جزءہ" والی صورت ہم نے اختیار کی اور جمود کا شکار رہے اور کچھ کرنا نہیں چاہا، کاہلی کے ساتھ بیٹھے رہے اور جو ہو رہا ہے اس پر راضی ہو گئے تو ظاہر ہے کہ یہ بات ہمیں نہ صرف یہ کہ آگے کی استطاعت سے محروم رکھے گی بلکہ جو آج استطاعت ہے وہ بھی ہمارے ہاتھ سے نکل جائے گی۔

بدقسمتی سے یہ صورتحال Central Asia میں پیدا ہوئی، روسی واشتراکی اقتدار کے بعد ایک جانب ان کا آپسی انتشار بڑھا، دوسری جانب مذہب کا رشتہ زندگی سے منقطع کر دیا گیا۔ سب سے پہلا مرحلہ کسی امت کے مٹنے کا یہ ہوتا ہے کہ مذہب کا رشتہ زندگی سے منقطع ہو جائے، یہاں بھی یہی ہوا، مذہب زندگی سے کٹا اور مسجدوں میں گیا، خانقاہوں میں گیا، اور آہستہ آہستہ یہ صورت حال ہوگئی کہ ابھی ایک سفر میں تھوڑا بہت کہیں کہیں قرآن شریف پڑھنے والے بچے ملے تو وہاں یہی بہت بڑی معراج مجھے محسوس ہوئی، میں نے پوچھا کہ تم نے قرآن کہاں سے محفوظ رکھا، تو انہوں نے کہا "فی الحجرۃ والسرداب" یعنی مکانات کے تہہ خانوں کے ذریعہ دین کا اتنا چھوٹا سا سرمایہ محفوظ رہ سکا ورنہ وہ بھی شاید محفوظ نہ رہتا، پس مذہب زندگی کے میدانوں سے ہٹا، تجارت کے مرکزوں سے ہٹا، اور ایوان حکومت واقتدار سے ہٹا، اور عدالتوں سے ہٹا، اور زندگی کے روزمرہ معاملات یہاں تک کہ شادی بیاہ اور احوال شخصیہ سے ہٹا، مسجدوں میں آیا، خانقاہوں میں آیا، زاویوں میں آیا، اور وہاں سے گھس کر اب زمین کے تہہ خانوں میں چھپ کر

اسلام ستر برس تک وہاں رہا، کیا ہم بھی اس پوزیشن کو اختیار کرنے کو تیار ہیں؟ مجھے یقین ہے کہ ہمارے لوگ اس پر انشاء اللہ کبھی صلح نہیں کریں گے، مشکلات سے گزریں گے، لیکن اللہ کی شریعت کا رشتہ زندگی سے نہیں کٹنے دیں گے۔

خلاصہ یہ ہے کہ ہمارے تمام ماہرین وعلماء اس نتیجہ پر پہنچے کہ یقینا بینکنگ موجودہ اصطلاح میں، ہندوستان میں اسلامی اساس پر قائم کرنے کے امکانات قانونی دشواریوں کی وجہ سے نہیں ہیں، اس کے متبادل کی تلاش میں یہ حضرات اس نتیجہ پر پہنچے کہ ہم اسلامی مالیاتی کمپنی قائم کرسکتے ہیں، بینک اپنی موجودہ Terminology میں ہم قائم نہیں کرسکتے، لیکن اسلامی مالیاتی کمپنی ہم لوگ قائم کرسکتے ہیں، ہندستان کے کمپنی لاء (Indian Companies Act) میں گنجائش ہے کہ ہم اپنے سرمایہ کو تجارت میں مشغول کرسکتے ہیں، اس لئے بنیادی طور پر اس کا امکان پیدا ہوتا ہے کہ بینکنگ کا ایک متبادل اسلامی مالیاتی کمپنی کی راہ سے قائم کیا جاسکے، علماء کرام کے سامنے حیدرآباد کے فقہی سمینار میں ایک پروجیکٹ تیار کیا گیا، بیرون ہند سے تشریف لانے والے علماء، اور ماہرین اقتصادیات ڈاکٹر انس زرقا، اور ڈاکٹر علی جمعہ وغیرہ، سبھی لوگوں نے اس پروجیکٹ کو بہت زیادہ غیر معمولی نظر استحسان سے دیکھا اور اس کی تعریف کی، لیکن اس پروجیکٹ کی حیثیت ایک خاکہ کی ہے، جب اس میں رنگ بھرنے کا وقت آتا ہے تو دشواریاں بہت بڑھ جاتی ہیں، چنانچہ اب اس پروجیکٹ کو ایک عملی پروجیکٹ بنانے کی کوشش میں پچھلے دنوں بہت سے سوالات پیدا ہوئے، بار بار ماہرین کی نشستیں ہوئیں، اس میں کئی دشوار کن سوالات ہیں جن کا حل علماء کو پیش کرنا ہے، شریعت کی روشنی میں علماء کرام اثبات یا نفی میں جواب دیں گے، اگر وہ ہاں کہتے ہیں تو ٹھیک ہے، اگر نا کہتے ہیں تو پھر یہ ماہرین اس کا کوئی متبادل تلاش کرنے کی بھی کوشش کریں گے کہ شریعت نے جس کو حرام کیا اگر اسی کو ہم حلال کرلیں تو فائدہ کیا ہوگا، اس لئے جو سوالات ہیں ان میں دراصل ان ماہرین کو رہنمائی علماء کرام دیں گے کہ اس کی روشنی میں کس طرح کام کو آگے بڑھایا جائے؟

بینکس میں ایک تو سیدھا سیدھا سودی کاروبار ہوتا ہے، Money Lending کا، یعنی روپیہ قرض پر لگا کر اس پر سود کمانے کا کاروبار ہوتا ہے، جو کبھی پرانا مہاجن کرتا تھا، آج فنی تنظیم کے ساتھ وہ بینک کرتے ہیں، کچھ ایسے کام ہیں جن کو Non Banking Services کہتے ہیں، اس کا مطلب یہ ہے کہ بینک جہاں سود پر قرض دینے والا مالی ادارہ ہوتا ہے وہیں ساتھ ہی کچھ دوسرے قسم کے کام میں وہ بحیثیت اجیر ہوتا ہے، پہلی صورت میں مقرض اور مستقرض کا رشتہ پیدا ہوتا ہے، اور دوسری صورت میں اجارہ کا رشتہ قائم ہوتا ہے، آج کے بینکس بہت سارے ایسے کام کررہے ہیں جن کا تعلق Money Lending اور اقراض سے نہیں ہے، بلکہ ان کا تعلق مختلف قسم کی Services سے ہے، جو لوگ اقراض کا کام کرتے ہیں، اس کے ساتھ ساتھ کچھ Services بھی کرتے ہیں، مثلاً مجھے کچھ پیسہ یہاں سے دہلی بھیجنا ہے، میں بینک جاتا ہوں، ان کو دس ہزار روپے دیتا ہوں کہ مجھے اپنے دوست کو دہلی میں یہ دس ہزار روپے پہنچانے ہیں، وہ ایک ڈرافٹ ایشو کردیتا ہے، اور ہم وہ بینک ڈرافٹ اپنے دوست کے پاس دہلی بھیج دیتے ہیں، وہ وہاں جاکر بینک سے لے لیتا ہے، بنک نے قابل اعتماد طریقہ پر روپے پہنچانے کی خدمت انجام دی، اس کے لئے وہ کچھ اجرت لیتے ہیں، جس کو کمیشن یا فیس یا کچھ اور نام دیا جاسکتا ہے، یہ ایک خدمت ہے، قرض لینے اور قرض دینے سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہوتا ہے، اسی طرح مال کی بلٹی چھوڑوانا ہے، اس میں بنک ضامن بن کر اعتماد پیدا کرتا ہے، اسی طرح بینک کچھ ٹیکنکل خدمتیں بھی انجام دیتا ہے، مثلاً ایک تجارتی ادارہ قائم کرنا ہے، بینک کے پاس ایسی فنی صلاحیتیں موجود ہیں کہ وہ اس قائم کئے جانے والے ادارہ کا ایک عملی خاکہ، پروجیکٹ اور اسکیم بنا کردے سکتا ہے، اسکیم بنانے میں اس کا وقت لگتا ہے یا محنت لگتی ہے، اس کی بنیاد پر وہ اجرت لیتے ہیں، اس طرح کے دسیوں ایسے کام ہیں جو آج کے بینکس علاوہ قرض دینے کے انجام دیتے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ ہمارا اسلامی مالیاتی ادارہ اجارہ کے اصول پر ایسی خدمات پیش کرسکتا ہے اور اجرت پر خدمت حاصل کرسکتا ہے یا نہیں؟ اس میں شاید کسی کو کوئی اشکال نہ ہو کہ بینک خدمات کے عوض اجرت لے سکتا ہے، لیکن تفصیلات میں جاکر کچھ اہم سوالات پیدا ہوجاتے ہیں کہ کیا ہر خدمت وہ انجام دے سکتا ہے، یا کچھ ایسی خدمتیں ہیں جن کا انجام دینا اس کے لئے مناسب نہیں۔ مثلاً کوئی بھی ادارہ یا کمپنی یا کارخانہ کسی شخص کو بنانا ہے، وہ کسی فنی ماہر سے اس کی اسکیم بنوانا چاہتا ہے، اب اسکیم میں پہلا سوال یہ ہوگا کہ سرمایہ کہاں سے آئے گا، دوسرا سوال یہ ہوگا کہ یہ سرمایہ کہاں اور کیسے کیسے خرچ ہوگا، سرمایہ کے ذرائع یہ ہیں کہ کمپنی کے دس ہزار شیئرز بنالئے جائیں، شیئر ہولڈرس پیسہ دیں گے، اور کمپنی کے منافع ان پر تقسیم کردئے

جائیں گے، یہاں تک بھی کوئی مسئلہ نہیں، لیکن پھر بھی دشواریاں ہیں، سارا ہی سرمایہ شیئر ہولڈرس سے نہیں مل پاتا ہے یا نہیں مل پائے گا، اس لئے کمپنی کی ترقی کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے سرمایہ میں اضافہ کرنے کے لئے قرض بھی لے، اس نے قرض لیا، اس حد تک بھی کوئی حرج کی بات نہیں، لیکن قرض پر اس کو سود دینا پڑتا ہے، یہاں یہ مشکل پیدا ہوتی ہے جو ماہر فن کمپنی کی اسکیم بنائے گا وہ یہ لکھے گا کہ کمپنی کو اتنا روپیہ قرض سے حاصل کرنا پڑے گا، اور اس قرض پر بینک کو اتنا انٹریسٹ بھی ادا کرنا پڑے گا، اس لئے اس کے آمد و خرچ اور اس کے حساب کو دیکھ کر منافع، اس کی نافعیت، افادیت وغیرہ طے کی جائے گی، اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایسی فنی خدمت جس میں اس اسکیم و پروجیکٹ میں سود کا بھی ذکر ہو، آیا اسلامی مالیاتی ادارے کے لئے ایسی سروس (خدمت) انجام دینا جائز ہوگا یا نہیں؟

دوسری شکل یہ ہے کہ اسلامی مالیاتی ادارہ کو اپنا سرمایہ جائز نفع بخش اسکیموں میں لگانا ہے، بلکہ ایک اور لفظ بڑھا دیجئے، قابل اعتماد اسکیموں میں سرمایہ لگانا ہے، تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کہاں لگائیں، ایں خانہ ہمہ آفتاب است، کسی کمپنی کا شیئر ہم خریدتے ہیں، اور آج کل سرمایہ کاری کا سب سے زیادہ قابل اعتماد طریقہ یہ ہے کہ شیئرز لے لئے جائیں، اور کمپنی کے شیئرز سے حاصل ہونے والے نفع کو Depositors میں تقسیم کریں، یا خرچ چلائیں، تو ہم کسی کمپنی کا شیئر لیتے ہیں، اب کمپنیاں تین قسم کی ہیں: ایک کمپنی وہ ہے جو خالص غیر سودی کاروبار کرتی ہے، دوسری کمپنی وہ ہے جو خالص سودی کاروبار کرتی ہے، مثلاً بینکس ہیں، بینکس کے بھی شیئرز فروخت ہوتے ہیں۔ لیکن بینکس کی بنیادی اساس انٹرسٹ یعنی سود پر ہے، تو کیا اسلامی مالیاتی کمپنی کو اس کی اجازت دی جاسکتی ہے کہ بینکس یا اس طرح کی وہ کمپنیاں جو سو فیصد خالصتاً سود پر مبنی تجارت کرتی ہیں ان کے حصص خریدے، بظاہر یہ ہے کہ اس کی اجازت نہیں دی جاسکتی، اور دوسری صورت یہ ہے کہ وہ کمپنی خالص غیر سودی کاروبار کرتی ہے، ظاہر ہے کہ اس میں کوئی اشکال نہیں ہے، مگر اشکال یہاں پیدا ہوتا ہے کہ اس کمپنی کا بنیادی مقصد تو غیر سودی ہے، بنیادی طور پر اس کمپنی کا کام، اس کی Activities، اس کے مقاصد، Objects قطعاً غیر سودی ہیں، لیکن موجودہ قانون وحالات میں اس کو کوئی ایسے مبادلات کرنے پڑتے ہیں جن کا تعلق سود سے ہے، تو جس کمپنی کا بنیادی مقصد جائز وحلال ہو لیکن فی الجملہ سودی معاملات میں اس کو ملوث ہونا پڑتا ہے، اور اس طرح ضمنی تلوث سودی کاروبار میں پیدا ہوتا ہے، کیا ایسی کمپنیز کے شیئرز ہماری اسلامی مالیاتی کمپنی حاصل کرسکتی ہے یا نہیں؟ یہ ہے وہ اصل اور ٹیڑھا سوال جو جواب کا متقاضی ہے، اور مجمع الفقہ الاسلامی جدہ میں بھی یہ سوال آچکا ہے، لیکن ابھی وہاں بھی کوئی فیصلہ اس پر نہیں ہوسکا ہے، بار بار تحقیق ہو رہی ہے، اس طرح کی اور بھی کئی صورتیں پیدا ہوسکتی ہیں۔

بہرحال اس رخ پر جاری کوششیں انشاء اللہ مسلسل جاری رہیں گی اور علماء اور ماہرین اقتصادیات کے گرانقدر علمی وعملی تعاون سے اسلامک فقہ اکیڈمی (انڈیا) کے لئے عصر حاضر کے نئے اقتصادی مسائل کا فقہ اسلامی کی روشنی میں واضح حل پیش کیا جانا ممکن ہوسکے گا۔

زیر نظر کتاب کا ابتدائی حصہ شیئرز کے موضوع پر ہے، یہ موضوع اکیڈمی کے نویں فقہی سمینار منعقدہ جے پور (راجستھان) میں زیر بحث آیا اور اس بابت تفصیلی فیصلے طے پائے، کتاب کا دوسرا حصہ کمپنی وحصص کمپنی کے موضوع سے تعلق رکھتا ہے، اکیڈمی نے اپنے چھٹے فقہی سمینار منعقدہ عمر آباد (تمل ناڈو) میں حصص کمپنی اور بینکنگ کے موضوعات سے تعلق رکھنے والے متعدد سوالات پر غور وخوض کیا جن میں سے بعض پر فیصلے بھی طے پائے، مرابحہ سے متعلق ایک مخصوص سوال کے جوابات بھی اس کے آخر میں شامل ہیں، موضوع کی یکسانیت کی وجہ سے یہ تمام مسائل یکجا کردیئے گئے ہیں۔

دعا ہے کہ یہ علمی وفقہی مباحث امت کے لئے زیادہ سے زیادہ نافع ومفید ثابت ہوں۔

قاضی مجاہد الاسلام قاسمی

۹رشوال المکرم ۱۴۲۰ھ/ ۱۷رجنوری ۲۰۰۰ء

☆☆☆

پہلا حصہ شیئرز

اکیڈمی کا فیصلہ:

شیئرز کی شرعی حیثیت

[تمام مقالات کے بعض شقوں میں نقطہائے نظر مختلف تھے چنانچہ شرکائے سمینار کے درمیان
بحث ومباحثہ کے بعد جو متفقہ طور پر فیصلے کئے گئے وہ درج ذیل ہیں]۔

۱۔ کسی کمپنی کا خریدکردہ ایکویٹی شیئر (Equity Share) کمپنی میں شیئر ہولڈر کی ملکیت کی نمائندگی کرتا ہے، وہ محض اس بات کی دستاویز نہیں ہے کہ اس نے کمپنی کو اتنی رقم دی ہے۔

۲۔ ایسی کمپنیوں کے شیئرز کی ابتدائی خریداری جو ابھی سرمایہ اکٹھا کرنے کے مرحلے سے گذر رہی ہیں، شرعا خریداری نہیں بلکہ اس کمپنی میں شرکت ہے۔

۳۔ عام طور پر کمپنیوں کی دوسری املاک نقد سرمایہ سے زیادہ ہوتی ہیں، اس لئے کمپنیز کے شیئرز کی خریداری درست ہے، لیکن اگر معلوم ہوجائے کہ ادا کردہ نقد اس مقدار نقد کے برابر یا اس سے کم ہے جس کی شیئر نمائندگی کرتا ہے تو ایسی صورت میں شیئرز کی خریداری اس کی مقررہ قیمت سے کم یا زیادہ پر درست نہ ہوگی۔

۴۔ جن کمپنیوں کا بنیادی کاروبار حرام ہے، مثلاً شراب وخنزیر کے گوشت کی تجارت یا سودی قرضے دینا وغیرہ، ان کے شیئرز کی خرید وفروخت ناجائز ہے۔

۵۔ شرکاء سمینار کا احساس ہے کہ ہندوستان میں ایسی کمپنیز کا قیام قابل عمل ہے جو خالص اسلامی اصول تجارت کے اعتبار سے کاروبار کریں، سمینار مسلم تجار اور ماہرین معاشیات کو اس طرف متوجہ کرنا ضروری سمجھتا ہے کہ وہ اپنی دینی ذمہ داری کا احساس کرتے ہوئے ایسی کمپنیز کے قیام کی جدوجہد کریں جو کامل طور پر اسلامی احکام پر کاربند ہوں۔

لیکن چونکہ فی الحال ایسی کمپنیاں ہندوستان میں موجود نہیں ہیں یا بہت کم ہیں جو خالص اسلامی بنیادوں پر کاروبار کرتی ہوں، اس لئے جن مسلمانوں کے پاس نقد سرمایہ ہو اور اپنے مخصوص حالات کی بنا پر ان کے لئے جائز تجارت میں اس سرمایہ کو لگانا قابل عمل نہ ہو، ان کے لئے ایسی کمپنیز کے شیئرز خریدنے کی گنجائش ہے جن کا بنیادی کاروبار حلال ہو (مثلا: انجینئرنگ کے سامان یا عام استعمال کی مصرفی چیزیں تیار کرنا) اگرچہ انہیں بعض قانونی مجبوریوں کی وجہ سے سودی معاملات میں ملوث ہونا پڑتا ہو۔

۶۔ جن مسلمانوں نے ایسی کمپنیز کے شیئرز خریدے ہیں جن کا بنیادی کاروبار حلال ہے لیکن وہ کمپنیز ضمنی طور پر بعض ناجائز تصرفات میں بھی ملوث ہوتی ہیں، ان مسلمانوں کی ذمہ داری ہے کہ شیئر ہولڈرس کی سالانہ میٹنگ میں کمپنی کو آئندہ ایسے ناجائز تصرفات سے روکنے کی

کوشش کریں اور دوسرے شیئر ہولڈرس کو افہام وتفہیم کے ذریعہ اس بات پر آمادہ کرنے کی سعی کریں کہ وہ بھی ان کے نقطہ نظر سے اتفاق کرتے ہوئے میٹنگ میں ان کی تائید کریں۔

۷۔ اگر کمپنی کے منافع میں سود بھی شامل ہو اور اس کی مقدار معلوم ہو تو شیئر ہولڈر کے لئے منافع میں سے اس کے بقدر بلا نیت ثواب صدقہ کر دینا ضروری ہے۔

۸۔ اگر کمپنی کے منافع میں سود بھی شامل ہو اور حاصل ہونے والی سودی آمدنی کو کاروبار میں لگا کر نفع کمایا گیا ہو تو جتنا فیصد کل آمدنی میں سود مخلوط ہو گیا ہے اسی تناسب سے ملنے والے منافع سے نکال کر بلا نیت ثواب اپنی ملک سے نکال دینا ضروری ہے۔

(نوٹ: دفعہ ۷ اور ۸ میں مولانا رئیس الاحرار ندوی کے نزدیک سود کی رقم غیر مسلم ہی کو دی جائے)۔

۹۔ کمپنی کی اپنی قانونی شخصیت ہے جو شیئر ہولڈرس کی اجتماعی حیثیت کی نمائندگی کرتی ہے، بورڈ آف ڈائرکٹرس کمپنی کے منتخب کردہ افراد کا مجموعہ ہے کمپنی کی طرف سے تصرفات کرتا ہے اور اس طرح شیئر ہولڈر کے مجموعہ کا وکیل ہے، لہذا بورڈ آف ڈائرکٹرس کے تصرفات جو کمپنی کے مقرر کردہ اصول وضوابط کی حدود میں ہوں، کی بالواسطہ ذمہ داری سبھی شیئر ہولڈرس پر آتی ہے۔

۱۰۔ حلال کاروبار کرنے والی کمپنیوں کے شیئرز کی تجارت کرنا درست ہے۔

۱۱۔ فیوچر سیل (Future Sale) جس کا مقصد شیئرز خریدنا نہیں ہوتا بلکہ بڑھتے گھٹتے دام کے ساتھ نفع نقصان برابر کر لینا مقصود ہوتا ہے، اسلامی شریعت کی نگاہ میں ناجائز ہے کیونکہ یہ کھلا ہوا جوا ہے۔

۱۲۔ غائب سودا (Forward Sale) جس میں بیع تو ہو جاتی ہے لیکن اس کی اضافت مستقبل کی طرف کی جاتی ہے، بیع نہیں وعدۂ بیع ہے، مقررہ تاریخ آنے پر ایجاب وقبول ہونے کے بعد ہی بیع وجود میں آئے گی۔

۱۳۔ حاضر سودے (Spot Sale_Cash Sale) میں شیئر سرٹیفیکٹ پر قبضہ سے پہلے خرید کردہ شیئرز کو فروخت کرنا جائز نہیں ہوگا۔

۱۴۔ شیئر سرٹیفیکٹ (Share Certificate) حاصل ہونے کے بعد خریدار کا اس پر قبضہ متحقق ہو جاتا ہے، اگرچہ بعض انتظامی دشواریوں کی وجہ سے کمپنی میں اس کے نام کا اندراج نہ ہو سکا ہے، لہذا اس شیئر کو خریدار فروخت کر سکتا ہے۔

۱۵۔ جن شیئرز کی خرید وفروخت جائز ہے ان کی خرید وفروخت میں بروکر (Broker) کی حیثیت سے کام کرنا درست ہے، ناجائز اور حرام کاروبار کرنے والی کمپنیوں کے شیئرز کی خرید وفروخت میں بحیثیت بروکر کام کرنا جائز نہیں ہے۔

☆☆☆

سوالنامہ:

شیئرز کی شرعی حیثیت

۱۔ کیا کسی کمپنی کا خرید کردہ شیئر کمپنی میں شیئر ہولڈر کی ملکیت کی نمائندگی کرتا ہے یا یہ محض اس بات کی دستاویز ہے کہ اس نے اتنی رقم کمپنی کو دے رکھی ہے۔

بعض حضرات کا نقطہ نظر یہ ہے کہ شیئرز سرٹیفیکٹ محض کمپنی کو دیئے ہوئے پیسے کی دستاویز ہے، کمپنی کے اثاثوں اور اس کی املاک میں حسب تناسب حصہ دار ہونے کی دلیل نہیں ہے، احکام شرع کی تفصیل میں شیئرز کی حیثیت کے تعین کو بڑا دخل ہے، اگر شیئرز کو اثاثوں اور املاک کا ایک حصہ تسلیم کرلیا جائے تو شیئرز کی حقیقت یہ قرار پاتی ہے کہ وہ نقد اور اثاثوں کا مجموعہ ہے، اس لئے کہ کسی بھی کمپنی میں اس کی جامد املاک، اراضی اور تعمیرات کے علاوہ مشینیں، تیار شدہ مال، خام مال، جمع رقوم، دوسروں پر اس کی واجب الادا رقمیں وغیرہ بھی شامل ہوتی ہیں، اس طرح یہ تمام چیزیں شیئرز کے ذیل میں آجاتی ہیں، اب شیئرز کی خرید وفروخت نقد کی نقد کے ساتھ خرید وفروخت نہیں بلکہ نقود واملاک کے مجموعہ کو نقود کے ذریعہ فروخت کرنا ہے۔

اور اگر شیئرز کو محض اس کمپنی میں لگائی گئی نقد رقم کی دستاویز تسلیم کیا جائے تو اس کی بیع وشراء نقد کی نقد کے ساتھ بیع وشراء ہوگی، ظاہر ہے کہ اس صورت میں اس پر بیع صرف کے احکام وارد ہوں گے، جو لوگ اسے محض قرض کی دستاویز مانتے ہیں وہ اپنے نقطہ نظر کی تائید میں یہ بات کہہ سکتے ہیں کہ شیئر ہولڈر کے دیوالیہ ہونے کی صورت میں جب موجودہ قانون کے مطابق اس کی املاک ضبط کر کے اس کے قرضے ادا کئے جاتے ہیں اس وقت اس کے حصہ کے تناسب سے کمپنی کے اثاثے قرق نہیں کئے جاسکتے۔

دوسرا نقطہ نظر رکھنے والے اپنے موقف کی تائید میں یہ بات پیش کرتے ہیں کہ اگر کمپنی باہمی قرارداد سے تحلیل ہوجائے تو ہر شیئر ہولڈر کو اس کے شیئرز کے تناسب سے اس کے اثاثوں میں حصہ ملتا ہے، اور نفع ہو تو اس کے لگائے ہوئے سرمایہ سے زائد رقم ملتی ہے اور اگر خسارہ ہو تو اسے نقصان بھی برداشت کرنا ہوتا ہے، برخلاف بانڈ وغیرہ قرض کی دستاویزوں کے کہ صرف لگی ہوئی رقم مع سود ملتی ہے، اثاثوں میں کوئی حصہ نہیں ملتا ہے، بہر حال یہ ضروری ہے کہ کمپنی کے اندر شیئرز کی حیثیت کا تعین کر کے احکام شرعی اس پر مرتب کئے جائیں۔

۲۔ بعض اوقات کمپنی قائم کرتے وقت شیئرز کا اعلان کیا جاتا ہے، اور اس وقت اس کے پاس کچھ بھی املاک نہیں ہوتی ہیں، اس وقت اگر کمپنی کے خرید کردہ شیئر کی بیع کی جائے تو اس صورت میں نقد نقد کے مقابل ہوتا ہے، اس کا کیا حکم ہوگا؟

۳۔ کمپنی کے وجود میں آجانے کے بعد اس کا اثاثہ مخلوط ہوتا ہے (یعنی نقد اور املاک کا مجموعہ) اس صورت میں جبکہ مجموعہ مال ربوی وغیر ربوی دونوں پر مشتمل ہے، شیئرز کی نقد کے ساتھ خرید وفروخت کا کیا حکم ہوگا؟

۴۔ وہ کمپنیاں جن کا بنیادی کاروبار حرام ہے، جیسے شراب اور خنزیر کے گوشت کی تجارت اور ایکسپورٹ، یا بینکس اور سودی اسکیموں میں روپیہ لگانا، ایسی کمپنیز کے شیئرز کی خرید وفروخت کا کیا حکم ہوگا؟

۵۔ ایسی کمپنیز جن کا کاروبار حلال ہے، مثلاً انجینئرنگ کے سامان تیار کرنا، عام استعمال کی مصرفی چیزیں تیار کرنا وغیرہ، پھر ان کمپنیوں کا بنیادی کاروبار حلال ہونے کے باوجود انہیں بعض اوقات انکم ٹیکس وغیرہ کی زد سے بچنے کے لئے بینک سے سودی قرض لینا پڑتا ہے، کیا ایسی کمپنیز کا شیئر خریدنا جائز ہے؟

۶۔ اسی طرح حلال کاروبار کرنے والی کمپنیوں کو بھی قانونی تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے اپنے سرمایہ کا کچھ حصہ ریزرو بینک میں جمع کرنا پڑتا ہے، یا سیکورٹی بانڈز خریدنے پڑتے ہیں، جن کی وجہ سے انہیں سود بھی ملتا ہے، کیا ایسی کمپنیز کا شیئرز خریدنا ناجائز ہوگا؟

۷۔ سودی قرضہ لینے کی صورت میں اس قرض سے حاصل ہونے والے منافع کی شرعی حیثیت کیا ہوگی، آیا وہ قرض مفید ملک ہے یا نہیں، اور اس کے ذریعہ حاصل ہونے والی آمدنی حلال شمار کی جائے گی یا نہیں؟

۸۔ کیا کمپنی کا بورڈ آف ڈائرکٹرس شیئرز ہولڈرس کا وکیل ہے اور اس کا عمل شیئر ہولڈرس کا عمل سمجھا جائے گا؟

۹۔ بورڈ آف ڈائرکٹرس میں کوئی فیصلہ کثرت رائے سے ہوتا ہے، کیا اس کمیٹی میں کسی شیئر ہولڈر کا سودی قرض لینے سے اختلاف کرنا اور اپنے اختلاف کا اعلان کر دینا وکیل کے عمل کی ذمہ داری سے اسے بری الذمہ کر دے گا؟

۱۰۔ اگر کمپنی کے منافع میں سود بھی شامل ہو، اور اس کی مقدار معلوم ہو تو کیا شیئر ہولڈر کے لئے منافع سے اس کے بقدر نکال کر صدقہ کر دینا کافی ہوگا؟

۱۱۔ اور اگر کمپنی کے منافع میں سود بھی شامل ہو اور حاصل ہونے والی سودی آمدنی کو کاروبار میں لگا کر نفع کمایا گیا ہو تو جتنا فیصد کل آمدنی میں سود مخلوط ہو گیا ہے اتنا فیصد ملنے والے منافع سے نکال کر صدقہ کر دینا کافی ہوگا؟

۱۲۔ شیئرز کی تجارت کرنا کیسا ہے، یعنی کوئی شخص کچھ شیئرز خریدے کہ قیمت بڑھنے کی صورت میں نفع کے ساتھ فروخت کر دوں گا، خلاصہ یہ کہ شیئرز کی بیع وشراء کو ایک تجارت کی طرح کرنے کا حکم کیا ہوگا، جبکہ اس میں ایک طرح کی قیاس آرائی کو دخل ہوتا ہے کہ بازار کی صورت حال کو دیکھ کر زیادہ منافع دینے والے شیئرز خرید لئے جاتے ہیں، اور کیا ہر تخمین وقیاس آرائی ممنوع ہے یا اس میں کچھ تفصیل ہے؟

۱۳۔ شیئر مارکیٹ میں ایک سودا جسے فیوچر سیل (بیاعات مستقبلیات) کہتے ہیں مروج ہے، اس کا مقصد شیئرز خریدنا نہیں ہوتا بلکہ بڑھتے گھٹتے دام کے ساتھ نفع نقصان کو برابر کر لینا مقصود ہوتا ہے، مثلاً زید نے سو شیئرز کا سودا بہ حساب سو روپے فی شیئر کیا، اور ادائیگی اور وصولی کی تاریخ ۳۰ر مارچ مقرر کی، اب جب ۳۰ر مارچ آئی تو اس شیئر کی قیمت ڈیڑھ سو روپے ہوگئی تو وہ پانچ ہزار روپے منافع کے طور پر لے لیگا، اور اگر ۳۰ مارچ کو اس شیئر کی قیمت گھٹ کر پچاس روپے ہوگئی تو وہ پانچ ہزار روپے ادا کرے گا، اصل سودا محض کاغذی کارروائی ہے، نہ مشتری ثمن دیتا ہے، نہ بائع مال دیتا ہے، البتہ مقررہ تاریخ پر بڑھتے ہوئے دام کی صورت میں منافع یا گھٹتے ہوئے دام کی صورت میں خسارہ ادا کیا جاتا ہے، شریعت میں مذکورہ فیوچر سیل کا کیا حکم ہے؟

۱۴۔ غائب سودا جس میں بیع کی نسبت مستقبل کی طرف کی جاتی ہے، جائز ہوگی یا نہیں؟

۱۵۔ شیئرز کے نقد سودے میں بھی بعض انتظامی مجبوریوں کی وجہ سے سرٹیفکیٹ پر قبضہ ایک سے تین ہفتوں تک تاخیر سے ہوتا ہے، اس ذیل میں اصل سوال یہ ہے کہ شیئر پر قبضہ کا مطلب کیا ہوگا، اگر بوقت بیع وشراء ہی کمپنی کے اثاثوں اور املاک میں شیئر ہولڈر کی ملکیت آجاتی ہے، اور وہ اس کی ضمان میں آجاتا ہے، اور حقوق وذمہ داریاں خریدار کی طرف منتقل ہو جاتی ہیں، اگر چہ ابھی شیئرز سرٹیفکیٹ نہ ملا ہو تو اس کو شیئر پر قبضہ معنوی حاصل ہوگا یا نہیں، کیا شرع میں ہر شئی پر اس کی خاص نوعیت کے اعتبار سے قبضہ کی نوعیت مختلف ہوگی جس کی بناء عرف وعادت پر ہوگی، یا ہر صورت میں قبضہ حسی ہی ضروری ہوگا؟

۱۶۔ اس طرح خرید کردہ شیئر کو (جس کی موجودہ قیمت خریدار نے ادا کر دی ہے) اگر خریدار سرٹیفکیٹ حاصل کرنے سے قبل اگلے دن یا دو چار دن میں کسی دوسرے کے ہاتھ فروخت کر دیتا ہے تو اس کا کیا حکم ہوگا، اور اس طرح دوسرے کے خریدنے کے بعد تیسرے وچوتھے کے ہاتھ فروخت کرنا درست ہوگا؟ بالخصوص جبکہ شیئر کا ضمان ومنافع خریدنے کا معاملہ کرنے کے ساتھ ہی خریدار کی طرف منتقل ہو جاتا ہو۔

۱۷۔ اسٹاک ایکسچینج بازار میں خرید وفروخت کے لئے واسطہ بننے والے کو "بروکر" کہتے ہیں (جو موجودہ وقت میں شیئرز کی خرید وفروخت اور قیمتوں سے واقفیت رکھتا ہے، اور خرید وفروخت کی کاروائی کا اندراج کرتا ہے) یعنی اس کی حیثیت ایجنٹ کی ہے، اس کا کیا حکم ہوگا؟ یعنی کیا بروکر کی حیثیت سے کام کرنا درست ہے؟

☆☆☆

تلخیص مقالات:

۱۔ شیئرز کی شرعی حیثیت:

سبھی مقالہ نگار حضرات اس بات پر متفق ہیں کہ کسی کمپنی کا خرید کردہ شیئر کمپنی میں شیئر ہولڈر کی ملکیت کی نمائندگی کرتا ہے، اسی وجہ سے اگر کمپنی باہمی قرارداد سے تحلیل ہوجائے تو ہر شیئر ہولڈر کو اس کے شیئرز کے تناسب سے اس کے اثاثوں میں حصہ ملتا ہے، اور نفع ہوتو اس کے لگائے ہوئے سرمایہ سے زائد رقم ملتی ہے اور اگر خسارہ ہو تو نقصان بھی برداشت کرنا ہوتا ہے، برخلاف بانڈز وغیرہ قرض کی دستاویزوں کے کہ صرف لگی ہوئی رقم مع سود ملتی ہے، اثاثوں میں کوئی حصہ نہیں ملتا ہے۔ ان حضرات نے مخالفین کی اس دلیل کو ”کہ قانونی طور پر کمپنی کے اثاثوں کو قرق نہیں کیا جاتا ہے“ بالکل رد کر دیا ہے۔

۲۔ شیئرز کی خرید وفروخت:

شیئرز کی خرید وفروخت جب کہ کمپنی کے پاس کچھ بھی اثاثہ نہ ہو۔

اس مسئلہ میں مقالہ نگار حضرات کی آراء مختلف ہیں جو درج ذیل ہیں:

الف۔ یہ سوال ہی صحیح نہیں، کیونکہ ایسا ہو ہی نہیں سکتا کہ کمپنی کا وجود ہو اور کچھ بھی اثاثہ نہ ہو، کیونکہ کمپنی کا رجسٹریشن ہوتا ہے، اور رجسٹریشن کے لئے کچھ نہ کچھ اثاثے کا ہونا ضروری ہے، تب کمپنی رجسٹرڈ ہوتی ہے، لہذا یہ سوال درست نہیں۔ مولانا شمس پیرزادہ، مولانا عبد العظیم اصلاحی، حکیم ظل الرحمن۔

ب۔ شیئرز کو نوٹوں کے بدلے خریدنا بیع صرف نہیں، بلکہ یہ عقد بیع ہی نہیں عقد شرکت ہے (مفتی شکیل احمد)۔

ج۔ اس میں غیر مملوک کی بیع لازم آتی ہے اور یہ ناجائز ہے، کیونکہ شیئرز کی بیع دراصل اثاثوں اور املاک کی بیع ہوتی ہے اور ابھی کمپنی کی ملکیت میں اثاثے ہی نہیں لہذا ناجائز ہے (مفتی محمد جعفر ملی رحمانی، مولانا ابوبکر قاسمی)۔

نوٹ: مولانا ابوبکر صاحب نے آگے چل کر اس کو بیع صرف کہا ہے۔

د۔ یہ بیع جائز ہے باوجودیکہ تقابض طرفین سے نہیں ہے، قیاسا علی جواز بیع الحظوظ و بیع الحقوق الموجودة قبل القبض دون المعدومة.
اس میں معدوم یا غیر مملوک کی بیع لازم نہیں آتی۔

موصوف نے برابری کی بھی کوئی شرط نہیں لگائی، البتہ اتنا کہا ہے کہ اس میں نقد نقد کے مقابل ہوتا ہے (مولانا ابوسفیان مفتاحی، مفتی محمد زید)۔

ھ۔ اس پر عقد صرف صادق نہیں آتا، کیونکہ یہ عقد صرف اثمان خلقیہ میں ہی ہوگا، اور شیئرز ثمن خلقی نہیں بلکہ من وجہ ثمن خلقی سے مشابہ ہیں اور من وجہ فلوس نافقہ کے مشابہ ہیں، لہذا ثمن خلقی کی مشابہت کی وجہ سے تفاضل جائز نہ ہوگا۔

اور فلوس نافقہ کی مشابہت کی وجہ سے عقد میں بدلین پر قبضہ کی شرط نہ ہوگی۔ حیث جاء فی رد المحتار للشامی: باع فضة بفلوس فإنه يشترط قبض أحد البدلين قبل الافتراق لا قبضهما كما في البحر عن الذخيرة (رد المحتار ۴؍۲۶۲)۔ مولانا بدر احمد مجیبی، مولانا عبد القیوم پالنپوری۔

و۔ یہ بیع النقد بالنقد ہے، لہذا تفاضل تو جائز نہ ہوگا البتہ برابر رقم کے ساتھ درست ہے۔

مولانا سمیع اللہ قاسمی، مولانا اختر امام عادل، مولانا شمشاد احمد نادر القاسمی، مولانا زبیر احمد سیتامڑھی، مولانا نسیم الدین قاسمی، مولانا انور علی اعظمی، مولانا تنویر احمد قاسمی، مولانا عتیق احمد قاسمی، مولانا اعجاز احمد قاسمی، مولانا ظفر الاسلام صاحب، مولانا قمر عالم سنبھلی، مفتی عبد الرحمن پالنپوری، مولانا عبد اللطیف گجرات، مولانا ابراہیم صاحب، مولانا سید محمد ایوب سنبھلی، مولانا محمد ابرار خان ندوی، مولانا اخلاق الرحمن قاسمی، مولانا ابوبکر شکر پور...... انہوں نے اس معاملہ کو غیر مملوک کی بیع بھی کہا ہے۔

ز۔ یہ بیع صرف ہے، اگر برابر رقم کے بدلے میں تبادلہ ہو تو جائز ہے۔

ان حضرات نے تقابض یا یداً بید کی شرط نظر انداز کردی ہے۔

مولانا ابوالحسن علی گجرات، مفتی عبید اللہ الاسعدی، مولانا مجاہد الاسلام حیدر آباد، مولانا محمد قمر الزماں، مولانا محمد نور القاسمی، مفتی محبوب علی وجیہی، مولانا نعیم رشیدی، مفتی عبدالرحیم، مولانا منظور احمد قاسمی، مولانا سلطان احمد اصلاحی، مولانا نعیم اختر قاسمی۔

ب۔ یہ معاملہ بالکل درست نہیں ہے، چاہے برابر رقم کے ساتھ تبادلہ ہو، کیونکہ یہ بیع صرف ہے اور بیع صرف میں تقابض وتساوی دونوں ضروری ہیں، تفاضل اور ادھار جائز نہ ہوگا۔

اس صورت میں دوسری شرط مفقود ہے کہ طرفین سے نقد ادائیگی نہیں پائی جاتی، ایک طرف روپیہ ہے اور دوسری طرف روپیوں کی دستاویز نہ کہ روپے، لہذا یہ عقد درست نہ ہوگا۔ مولانا محمد رضوان قاسمی، مولانا خالد سیف اللہ رحمانی، مولانا طاہر مظاہری، مولانا محمد ارشد قاسمی، مولانا محمد شاہد قاسمی، مولانا اقبال احمد قاسمی، مولانا نسیم احمد قاسمی۔

بعض حضرات نے اس مسئلہ کا کوئی جواب نہیں دیا۔ (مولانا احمد دیولوی، مفتی نظام الدین صاحب دار العلوم دیوبند، جناب حفظ الرب صاحب الہ آباد)

۳۔ نقد واملاک کے مجموعہ کا حکم:

اس مسئلہ میں بھی بہت سی آراء ہیں جن کو ذکر کیا جاتا ہے:

ا۔ زیادہ تر مقالہ نگار حضرات نے یہ رائے دی ہے کہ اس کا حکم چاندی یا سونا چڑھی ہوئی تلوار کا سا ہے، چنانچہ حنفیہ کے نزدیک یہ صورت جائز ہوگی بشرطیکہ شیئر کی قیمت اثاثے میں لگے ہوئے نقد کے مقابلہ میں زائد ہو، ورنہ (یعنی اگر شیئر کی قیمت اثاثے میں لگے ہوئے نقد سے کم یا برابر ہے تو) درست نہیں۔

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی، مولانا سید محمد ایوب سنبھلی، مولانا ابوسفیان مفتاحی، مولانا قمر عالم سنبھلی، مولانا محمد حنیف صاحب، مولانا عبداللطیف گجرات، مولانا نسیم احمد قاسمی، مولانا ابوبکر آواپوری، مولانا بدر احمد مجیبی، مولانا عتیق احمد قاسمی، مولانا نسیم الدین صاحب قاسمی، مولانا طاہر مظاہری، مولانا نعیم اختر قاسمی، مولانا نعیم رشیدی، مولانا عبید اللہ الاسعدی، مفتی احمد نادر القاسمی، مولانا اقبال احمد قاسمی، مولانا عبدالقیوم پالنپوری، مولانا ابراہیم، مولانا ابرار خاں، مولانا مجاہد الاسلام حیدر آباد، مفتی عبدالرحمن پالنپوری، مولانا نور القاسمی، مولانا محمد رضوان القاسمی، مفتی عبدالرحیم صاحب، مولانا اعجاز احمد قاسمی، مولانا محمد شاہد القاسمی، مولانا اختر امام عادل، مولانا انور علی الاعظمی، مولانا محمد ارشد قاسمی، مولانا محمد قمر الزماں، مولانا ظفر الاسلام، مولانا عبدالجلیل القاسمی، مولانا اخلاق الرحمن قاسمی، مولانا زبیر احمد قاسمی، مولانا ابوالحسن علی بھروچ، مولانا سمیع اللہ قاسمی۔

مگر مولانا محمد قمر الزماں نے کہا ہے کہ اس مسئلہ میں سامان کا جائزہ لینا ضروری نہیں ہے اور مولانا سمیع الحق صاحب ومفتی زید صاحب نے مزید ایک شرط کا اضافہ کیا ہے کہ یداً بید ہو، ادھار نہ ہو۔ اور اخلاق احمد القاسمی صاحب نے مزید دو شرطوں کا اضافہ کیا ہے: ۱۔ سودی کاروبار کے خلاف آواز اٹھاتا رہے۔ ۲۔ ربوی مال کا صدقہ کرے۔

موخر الذکر حضرات (ابوالحسن علی، ظفر الاسلام، زبیر احمد قاسمی) نے ایک دوسری عبارت سے استدلال کیا ہے:

”ولو قال أعطني نصف درهم فلوسا و نصفا إلا حبة جاز لأنه قابل الدرهم بما يباع من الفلوس بنصف درهم و بنصف درهم إلا حبة بمثله وما وراء ه بإزاء الفلوس (هدايه كتاب الصرف ۳٫۱۱۱)۔

۲۔ یہ معاملہ درست ہے درج ذیل شرائط کے ساتھ:

الف۔ سودی کاروبار کے خلاف آواز اٹھائی جاتی رہے۔ ب۔ مال ربوی کا صدقہ کرے۔ (مولانا منظور احمد قاسمی)

۳۔ اگر کمپنی کے اثاثے نقد کے مقابلہ میں نمایاں طور پر غالب ہیں تو شیئر خریدنا درست ہے، چنانچہ فقہ میں مشہور مقولہ ہے: ”للأكثر حكم الكل“ (مفتی محبوب علی وجیہی صاحب)۔

۴۔ جائز ہے کیونکہ سودی عنصر پورے کاروبار میں ضمنی حیثیت رکھتا ہے۔ (مولانا شمس پیرزادہ)

۵۔ مطلقاً جائز ہے۔ (مفتی محمد جعفر، مولانا تنویر احمد قاسمی، مولانا احمد دیولوی)۔

مزید مولانا تنویر احمد اور احمد دیولوی دونوں اس بات پر متفق ہیں کہ اختلاط الحلال بالحرام میں ہم حلال کو ترجیح دیں گے، مگر مولانا احمد دیولوی نے کہا ہے کہ

چونکہ اس میں سود کی آمیزش ہے اس لئے مناسب نہیں۔

۶۔ مطلقاً جواز ہونا چاہئے (یہاں تک مولانا سلطان احمد اصلاحی اور مولانا عبدالعظیم اصلاحی متفق ہیں) مگر دونوں حضرات نے مختلف وجوہ کی بنا پر جواز کا مطالبہ کیا ہے۔

مولانا عبدالعظیم اصلاحی صاحب کا موقف ہے کہ چونکہ کمپنی کے مخلوط اثاثہ میں نقد کی مقدار ہمیشہ بدلتی رہتی ہے ایک ہی نہیں رہتی، اس لئے اس کی تعیین پُر مشقت ہی نہیں، عام شرکاء کے لئے تقریباً ناممکن ہے، اس لئے اس مخلوط اثاثہ کے مجموعہ کو جس کی نمائندگی کمپنی کرتی ہے نقد سے مختلف چیز سمجھا جائے، اور اس اجتہادی مسئلہ میں کمپنی کے سرٹیفکیٹ (شیئر) کا نقد سے تبادلہ مطلقاً جائز ہونا چاہئے۔

جبکہ مولانا سلطان احمد صاحب فرماتے ہیں کہ ہندوستان دار الحرب ہے، اگر اس کو من کل الوجوہ دار الحرب نہ مانا جائے تو کم از کم معاملات ربویہ میں تو اس کا لحاظ ضرور کرنا چاہئے۔

لیکن موصوف نے دوسرے سوال کے جواب میں کہا ہے کہ نقد کا معاملہ نقد کے ساتھ کی صورت میں برابری کے ساتھ ہی درست ہوگا، کمی زیادتی کے ساتھ درست نہ ہوگا، کیونکہ یہ بیع صرف ہے۔

۷۔ شیئر کی تجارت جو کہ نقد واعراض کا مجموعہ ہے اس کو بطور جزء مشاع کے بدلے خریدنا درست ہے۔ (مفتی نظام الدین صاحب دار العلوم دیوبند)۔

۸۔ یہ کاروبار ٹھیک نہیں ہے اور اس سے حتی المقدور بچا جائے (مفتی عزیز الرحمن صاحب)۔

۴۔ وہ کمپنیاں جن کا بنیادی کاروبار حرام ہے:

اس مسئلہ میں جملہ مقالہ نگار حضرات عدم جواز پر متفق ہیں بجز مولانا احمد دیولوی صاحب کے، کہ ان کی رائے جواز کی ہے لیکن وہ کہتے ہیں کہ ایسا کرنا مناسب نہیں، ان کا کہنا ہے کہ عقود عاقد کی طرف لوٹتے ہیں اور یہاں پر عاقد کمپنی ہے جو کہ وکیل کی حیثیت رکھتی ہے، لہذا یہ معاملہ کمپنی کی طرف ہی راجع ہوگا نہ کہ موکل (خریداران شیئرز) کی جانب، اس لئے جائز ہے، لیکن سود کی آمیزش کی وجہ سے مناسب نہیں۔ جبکہ مولانا احمد دیولوی کے علاوہ جملہ مقالہ نگار ایسی کمپنی کے بارے میں جو حرام کاروبار کرتی ہو اس کے عدم جواز پر متفق ہیں۔

مفتی عزیز الرحمن صاحب نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا۔

درج ذیل حضرات اس مسئلہ میں عدم جواز کے قائل ہیں: مولانا محمد حنیف، مولانا سید محمد ایوب، مولانا شمس پیرزادہ، جناب حفظ الرب، مولانا محمد طاہر، مولانا بدر احمد مجیبی، مفتی محمد زید، مولانا عبید اللہ الاسعدی، مولانا خالد سیف اللہ رحمانی، مولانا اختر امام عادل، مولانا ظفر الاسلام، مولانا عبدالعظیم اصلاحی، مولانا سلطان احمد اصلاحی، مولانا محمد قمر الزماں ندوی، مولانا مفتی نظام الدین صاحب دار العلوم دیوبند، مولانا عبدالجلیل قاسمی، مولانا ابوالحسن گجراتی، مولانا منظور احمد قاسمی، مولانا محمد رضوان قاسمی، مولانا اعجاز احمد قاسمی، مولانا شمشاد احمد نادر قاسمی، مولانا شکیل احمد سیتاپوری، مولوی مجاہد الاسلام، مولانا محمد ابرار خاں ندوی، مولانا محمد جعفر ملی رحمانی، مولانا تنویر احمد قاسمی، مولانا نور القاسمی، مولانا عبدالقیوم پالنپوری، مولانا ابراہیم محمد صاحب، مولانا عتیق احمد قاسمی، مولانا ابوسفیان مفتاحی، مولانا قمر عالم سنبھلی، مفتی نسیم احمد قاسمی، مفتی عبدالرحیم بھوپال، مولانا نعیم اختر قاسمی، مولانا سمیع اللہ قاسمی، مولانا عبدالرحمن پالنپوری، مولانا اخلاق الرحمن قاسمی، مولانا نذیر احمد قاسمی، مولانا اقبال احمد قاسمی، مولانا نسیم الدین قاسمی، مولانا محبوب علی، مولانا ابوبکر شکر پور دربھنگہ۔

۵۔ ایسی کمپنی کے شیئرز خریدنا جس کا کاروبار حلال ہو مگر اس کو سودی قرض لینے پڑتے ہوں:

اس مسئلہ میں جملہ مقالہ نگار حضرات اس بات پر متفق ہیں کہ ایسی کمپنی کی آمدنی حلال وجائز ہوگی۔ مگر اس کے شیئرز خریدنے کے بارے میں اختلاف پایا جاتا ہے۔

۱۔ اکثر حضرات کی رائے ہے کہ یہ معاملہ بامر مجبوری جائز ہے، پھر بعض حضرات نے اس کو ایک شرط کے ساتھ مقید کیا ہے کہ سودی کاروبار کے خلاف آواز اٹھاتا رہے۔ ان کے نام درج ذیل ہیں: مولانا اقبال احمد قاسمی، مولانا اختر امام عادل، مولانا عبدالرحیم، مولانا نسیم الدین قاسمی، مولانا محمد حنیف، مولانا ابوسفیان مفتاحی، مولانا اعجاز احمد قاسمی، مولانا عبدالعظیم اصلاحی، مولانا محمد جعفر، مولانا اخلاق الرحمن قاسمی، مولانا محمد قمر الزماں ندوی، مولانا شکیل احمد سیتاپوری، مولانا سمیع اللہ قاسمی، مولانا عبداللطیف گجرات، مفتی نظام الدین صاحب، مولانا مفتی عبدالرحمن پالنپوری، مولانا عبدالقیوم پالنپوری۔

مفتی نظام الدین صاحب کا کہنا ہے کہ کمپنی سے تحریری یا زبانی طور پر معاہدہ کیا جائے کہ ہمارے پیسے سے سود نہ دیا جائے، اور بعض حضرات نے کوئی شرط ذکر کئے بغیر بامر مجبوری جائز قرار دیا ہے، ان کے اسماء درج ذیل ہیں: مولانا خالد سیف اللہ رحمانی، مولانا محمد زید، مولانا شمس پیرزادہ، مولانا احمد نادر القاسمی، مولانا محمد نعیم رشیدی، مولانا ابوسفیان مفتاحی، مولانا ابرار خاں ندوی، مولانا قمر عالم سبیلی، مولانا سید محمد ایوب، مولانا عتیق احمد قاسمی، مولانا محمد ارشد قاسمی، مولانا احمد دیولوی، مولانا نسیم احمد قاسمی، جناب حفظ الرب، مولانا ظفر الاسلام، مولانا تنویر احمد قاسمی، مفتی محبوب علی وجیہی، مولانا بدر احمد، مولانا محمد رضوان قاسمی، مولانا محمد شاہد قاسمی، مولانا سلطان احمد اصلاحی۔

۲۔ دوسرا قول عدم جواز کا ہے، وہ کہتے ہیں کہ ایسی کمپنی کے شیئرز خریدنے کا مطلب کمپنی کو سودی کاروبار کرنے کا وکیل بنانا ہے جو حرام ہے چاہے ضمنی طور پر ہی کیوں نہ ہو۔ (مولانا ابوبکر شکر پور، مفتی عزیز الرحمن)

بعض حضرات نے کوئی جواب نہیں دیا، مثلاً منظور احمد قاسمی۔

محمد نور القاسمی صاحب نے دونوں قول (جواز و عدم جواز) ذکر کئے ہیں مگر اپنی کوئی رائے نہیں لکھی۔

۶۔ حلال کاروبار کرنے والی کمپنیوں کو ریزرو بینک میں کچھ سرمایہ رکھنا پڑتا ہے یا سیکورٹی بانڈز خریدنے پڑتے ہیں پھر اس سے سود ملتا ہے اس کا کیا حکم ہے؟

اس مسئلہ میں سبھی حضرات اس بات پر متفق ہیں کہ حاصل شدہ سود سے نفع اٹھائے بغیر ایسی کمپنیز کے شیئرز بامر مجبوری خریدنا جائز ہے اور سود والی رقم صدقہ کر دی جائے۔ ان کے اسماء گرامی درج ذیل ہیں:

مولانا قمر عالم سبیلی، مولانا ابوسفیان مفتاحی، مولانا خالد سیف اللہ رحمانی، مفتی محبوب علی وجیہی، مولانا سمیع اللہ قاسمی، مولانا شمس پیرزادہ، مولانا شکیل احمد، مولانا تنویر احمد قاسمی، مولانا جعفر ملی، مولانا اخلاق الرحمن قاسمی، مولانا محمد قمر الزماں ندوی، مولانا عزیز الرحمن، مولانا اعجاز احمد قاسمی، مولانا مفتی نظام الدین دار العلوم دیوبند، مولانا عبید اللہ الاسعدی، مولانا عبد الجلیل قاسمی، مولانا محمد نعیم رشیدی، مولانا عبد الرحیم بھوپال، مولانا محمد ارشد قاسمی، مفتی احمد نادر القاسمی، مولانا عبد الرحمن پالنپوری، مولانا محمد شاہد قاسمی، مولانا ابرار خاں، مولانا ابراہیم محمد، مولانا محمد رضوان القاسمی، مولانا عتیق احمد قاسمی، مولانا ابوبکر شکر پور، مولانا نسیم الدین قاسمی، مولانا محمد نور القاسمی، مولانا محمد حنیف، مولانا اقبال احمد قاسمی، مفتی انور علی اعظمی، مولانا سید طاہر مظاہری، مولانا اختر امام عادل، مولانا مفتی محمد زید، مولانا سلطان احمد اصلاحی، مولانا ابوالحسن علی، مولانا بدر احمد مجیبی، مولانا احمد دیولوی، مولانا ظفر الاسلام، مولانا مجاہد الاسلام، مولانا عبد القیوم پالنپوری۔

لیکن ان حضرات میں سے بعض کا کہنا ہے کہ یہ تصدق واجب نہیں بلکہ مستحب ہے۔ مولانا محمد نعیم رشیدی، مولانا محمد نور القاسمی، مولانا تنویر احمد قاسمی، مولانا اعجاز احمد قاسمی۔

نوٹ: (الف) مفتی نظام الدین صاحب کہتے ہیں کہ کمپنی سے اس بات کا معاہدہ کیا جائے خواہ تحریری ہو یا زبانی، کہ ہمارے حصے میں سود کا پیسہ نہ ملایا جائے۔

(ب) حکیم ظل الرحمن کا کہنا ہے کہ یہ سوال بھی غلط فہمی پر مبنی ہے کیونکہ کسی بھی کمپنی کو اپنے سرمایہ کا کوئی حصہ کسی بینک میں جمع نہیں کرنا ہوتا بلکہ منافع کی غیر تقسیم شدہ رقم کو کسی سرکاری سیکورٹی میں جمع رکھنا ہوتا ہے۔

(ج) بعض نے اس کا کوئی جواب تحریر نہیں کیا ہے۔ (مولانا منظور احمد قاسمی، جناب حفظ الرب)

۷۔ سودی قرض اور اس کے منافع کی حیثیت:

اس مسئلہ میں چند آراء ہیں جو درج ذیل ہیں:

مقالہ نگار حضرات میں اکثریت کی رائے ہے کہ:

۱۔ ایسا سودی قرضہ جو بضرورت لیا گیا ہو مفید ملک ہوگا، کیونکہ سودی قرض لینے میں حرمت لغیرہ ہے لذاتہ نہیں۔

مولانا عتیق احمد قاسمی، مولانا خالد سیف اللہ رحمانی، مفتی انور علی اعظمی، مفتی احمد نادر القاسمی، مولانا محمد طاہر مظاہری، مولانا ابرار خاں ندوی، مولانا محمد نعیم رشیدی، مولانا سید محمد ایوب، مولانا عبد اللطیف گجرات، مولانا محمد قمر الزماں ندوی، مولانا محمد حنیف، مولانا مجاہد الاسلام، مولانا ابوبکر شکر پور، مفتی محمد جعفر ملی، مولانا نسیم الدین قاسمی، مولانا محمد ارشد قاسمی، مولانا شمس پیرزادہ، مولانا نعیم اختر قاسمی، مولانا عبد الجلیل قاسمی، مولانا محمد رضوان القاسمی، مولانا اقبال احمد قاسمی، مولانا ابوالحسن علی، مولانا شاہد قاسمی، مفتی عبد الرحمن پالنپوری، مولانا بدر احمد مجیبی، مفتی نسیم احمد قاسمی، مولانا عبد الرحیم، مولانا سلطان احمد اصلاحی، مولانا ابوسفیان مفتاحی، مولانا اختر امام عادل، مولانا عبد القیوم پالنپوری، مولانا سمیع اللہ قاسمی، مولانا قمر عالم سبیلی، مولانا نور القاسمی، مولانا تنویر احمد

قاسمی، مولانا منظور احمد قاسمی، مولانا زبیر احمد قاسمی، مولانا مفتی محمد زید۔

۲۔ مفید ملک ہوگا مگر ذمہ داران کمپنی کے حق میں حلال نہ ہوگا، عام آدمی کے حق میں درست ہے۔ (اقبال احمد قاسمی)

۳۔ اگر ساری رقم سودی قرض کی ہے تو اس سے حاصل شدہ منافع بھی سود ہوں گے اور یہ سودی قرض مفید ملک نہ ہوگا۔ (مولانا ظفر الاسلام، مفتی محبوب علی وجیہی)

۴۔ اس کی آمدنی کا اندازہ کرکے رفاہ کے کاموں میں لگادیا جائے۔ (ڈاکٹر عبد العظیم اصلاحی)

۸۔ کمپنی کا بورڈ آف ڈائریکٹرس شیئر ہولڈرس کا وکیل ہے؟

اس مسئلہ کے بارے میں جملہ مقالہ نگار حضرات اس بات پر متفق ہیں کہ بورڈ آف ڈائریکٹرس شیئر ہولڈرس کا وکیل متصور ہوگا۔

اس میں بھی سبھی حضرات متفق ہیں کہ بورڈ کا عمل شیئر ہولڈر کا عمل شمار کیا جائے گا بجز مولانا ابوبکر شکر پوری کے، وہ فرماتے ہیں کہ یہ ضروری نہیں کہ بورڈ کا عمل شیئر ہولڈرس کا عمل شمار کیا جائے۔

پھر اکثر حضرات نے اس معاملہ کو شرکت عنان کہا ہے جب کہ بعض حضرات نے اس کو عقد مضاربت سے تعبیر کیا ہے جن میں مولانا زبیر احمد قاسمی، مولانا تنویر احمد قاسمی، اور مفتی عبید اللہ صاحب ہیں۔

بعض حضرات نے اس سوال کا جواب دینے کی زحمت نہیں فرمائی جن کے اسماء گرامی درج ذیل ہیں:

مولانا ظفر الاسلام، مفتی عزیز الرحمن۔

۹۔ بورڈ آف ڈائریکٹرس کے سودی قرض لینے کے فیصلے سے اختلاف اور پھر اس اختلاف کے اعلان سے وہ بری الذمہ ہوجائے گا؟

اس مسئلہ کے بارے میں مقالہ نگار حضرات کی آراء مختلف ہیں جو درج ذیل ہیں:

۱۔ بورڈ آف ڈائریکٹرس کے سودی قرض لینے کے فیصلے سے اختلاف کرنا اور پھر اس اختلاف کا اعلان کردینا، یہ اس کی براءت کے لئے کافی ہے۔ یہ قول درج ذیل حضرات کا ہے:

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی، مولانا عبد اللطیف گجرات، مولانا ابوسفیان مفتاحی، مولانا اختر امام عادل، مفتی نظام الدین دار العلوم دیوبند، مولانا نسیم الدین قاسمی، مولانا ابراہیم، مولانا قمر عالم سنبھلی، مولانا سمیع اللہ قاسمی، مولانا محمد قمر الزماں ندوی، مولانا تنویر احمد قاسمی، مولانا عبد القیوم پالنپوری، مولانا عبد العظیم اصلاحی، مفتی محمد زید، مفتی انور علی اعظمی، مولانا محمد طاہر مظاہری، مفتی محبوب علی وجیہی، مولانا محمد رضوان القاسمی، مولانا اقبال احمد قاسمی، مولانا ابوبکر شکر پور، مولانا محمد ارشد قاسمی، مولانا عبد الرحیم، مولانا محمد جعفر ملی، مولانا محمد نور القاسمی، مولانا محمد حنیف، مولانا ابرار احمد قاسمی، مولانا محمد نعیم رشیدی، مولانا نسیم احمد قاسمی، مولانا اعجاز احمد قاسمی، مولانا بدر احمد مجیبی، مولانا عبد الرحمن پالنپوری۔

۲۔ اختلاف کرنا اور اس کا اعلان کرنا براءت کے لئے کافی نہ ہوگا، ہاں معذور کا حکم اس سے مستثنیٰ ہے، کیونکہ یہ جانتے ہوئے کہ میری بات مسترد کردی جائے گی ایسی کمپنی میں شرکت کرنا ضمناً رضامندی ہے۔ شرکت امر اختیاری ہے، اگر اس کی بات نہیں سنی جاتی تو وہ کمپنی سے علیحدہ ہوجائے، الا یہ کہ اس کے حالات ایسے ہوں کہ وہ پیسہ دوسری جگہ نہیں لگا سکتا تو پھر بدرجہ مجبوری ایسے شخص کو اجازت ہوگی۔ اس قول کے قائل درج ذیل حضرات ہیں:

مولانا عتیق احمد قاسمی، مولانا احمد القاسمی، مولانا محمد ابرار خاں ندوی، مفتی عبید اللہ الاسعدی، مولانا مجاہد الاسلام حیدرآباد، مولانا شاہد القاسمی، مولانا ابوالحسن علی گجراتی، مولانا عبد الجلیل قاسمی، مولانا اخلاق الرحمن قاسمی، مولانا منظور احمد قاسمی۔

۳۔ مولانا شمس پیرزادہ صاحب فرماتے ہیں کہ شیئر ہولڈر کے لئے براءت کا اظہار کرنا ضروری نہیں کیونکہ وہ ناقابل عمل ہے، عبث ہے۔

۴۔ مولانا سلطان احمد اصلاحی صاحب فرماتے ہیں کہ بینک سے جب سودی قرض لینے کی نوعیت ہی محل نظر ہے تو پھر اس سے اختلاف کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔

۵۔ بورڈ آف ڈائریکٹرس شیئرز ہولڈرس کا وکیل ہے، لہذا اس سوال کے جواب کی ضرورت ہی نہیں (حفظ الرب)۔

بعض حضرات نے جواب ہی تحریر نہیں فرمایا۔ (نعیم اختر قاسمی، مفتی عزیز الرحمن، مفتی شکیل احمد، مولانا احمد دیولوی)

۱۰۔ اگر کمپنی کے منافع میں سود کی مقدار معلوم ہو تو اس کے بقدر صدقہ کر دینا کافی ہوگا؟

سبھی مقالہ نگار اس مسئلہ میں اس باب پر متفق ہیں کہ سودی رقم کا صدقہ کرنا ضروری ہے، اور سودی منافع کے بقدر صدقہ کر دینا کافی ہوگا، بجز مولانا سلطان احمد اصلاحی صاحب کے کہ ان کے نزدیک صدقہ کرنا ضروری نہیں۔

مولانا اخلاق الرحمن قاسمی، مولانا ابوسفیان مفتاحی، مولانا ظفر الاسلام، مفتی محبوب علی وجیہی، مولانا اقبال احمد قاسمی، مولانا شمس پیرزادہ، مولانا اختر امام عادل، مولانا خالد سیف اللہ رحمانی، مولانا ابوالحسن علی، مولانا بدر احمد مجیبی، مولانا عبدالعظیم اصلاحی، مولانا قمر الزماں ندوی، مولانا عبدالجلیل قاسمی، مفتی محمد زید، مولانا اعجاز احمد قاسمی، مولانا محمد ارشد قاسمی، مولانا عبداللطیف گجرات، مولانا ابراہیم محمد، مولانا محمد شاہد القاسمی، مولانا نعیم رشیدی، مولانا محمد رضوان القاسمی، مولانا منظور احمد قاسمی، مولانا ابوبکر شکر پور، مولانا مجاہد الاسلام، مولانا احمد نادر القاسمی، مولانا زبیر احمد قاسمی، مولانا عبدالقیوم پالنپوری، مولانا ابرار خاں ندوی، مولانا محمد حنیف، مفتی محمد عبید اللہ الاسعدی، مولانا محمد نور القاسمی، مولانا تنویر احمد قاسمی، مولانا عبدالرحیم بھوپال، مولانا عتیق احمد قاسمی، مولانا محمد ایوب سبیلی، مولانا عبدالرحمن پالنپوری، مولانا نسیم احمد قاسمی، مولانا نعیم اختر قاسمی، مولانا انور علی اعظمی، مولانا محمد طاہر مظاہری، مولانا نسیم الدین قاسمی، مولانا سمیع اللہ قاسمی، مولانا قمر عالم سبیلی۔

ان حضرات کا جواب واضح طور پر مذکور نہیں ہے۔ مفتی شکیل احمد سیتاپوری، مفتی عزیز الرحمن، مولانا احمد دیولوی، مفتی نظام الدین صاحب دارالعلوم دیوبند۔

صدقہ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں یہ اس کی جائز آمدنی ہے اسے وہ بے کھٹک زیر استعمال لاسکتا ہے (مولانا سلطان احمد اصلاحی)۔

۱۱۔ سودی آمدنی کے منافع کا حکم:

اگر کمپنی کے منافع میں سود بھی شامل ہو اور حاصل ہونے والی سودی آمدنی کو کاروبار میں لگا کر اس سے نفع کمایا گیا ہو تو جتنا فیصد کل آمدنی میں سود مخلوط ہو گیا ہے کیا اتنا فیصد صدقہ کر دینا کافی ہوگا؟

اس مسئلہ میں تقریباً تمام مقالہ نگار حضرات اس بات پر متفق ہیں کہ اگر سود کی مقدار معلوم ہو یا ہو سکتی ہو تو اس کا تصدق واجب ہے ورنہ واجب نہیں، کیونکہ مخلوط الحلال بالحرام کا حکم حلت کا ہے۔

بعض حضرات نے اس کا کوئی جواب تحریر نہیں کیا۔ مفتی عزیز الرحمن، مولانا احمد دیولوی، مولانا شکیل احمد، مولانا محمد رضوان القاسمی، مفتی نظام الدین صاحب دارالعلوم دیوبند۔

۱۲۔ شیئرز کی تجارت:

۱۔ شیئرز کی تجارت جائز ہے، بشرطیکہ اصل کاروبار حلال ہو اور کچھ اثاثے وجود میں آچکے ہوں، تخمین مطلقاً ناجائز نہیں بلکہ ایسی تخمین ممنوع ہے جس میں خطرو غرر ہو، ورنہ کچھ نہ کچھ تخمین تو ہر تجارت میں ہوتی ہے۔

مولانا ابوسفیان مفتاحی، مولانا خالد سیف اللہ رحمانی، مولانا شمس پیرزادہ، مفتی عبدالرحمن پالنپوری، مولانا نسیم الدین قاسمی، مولانا انور علی، مولانا ابوبکر شکر پور، مولانا سمیع اللہ قاسمی، مولانا محمد حنیف، مولانا زبیر احمد قاسمی، مولانا طاہر مظاہری، مولانا نظام الدین صاحب دارالعلوم دیوبند، مولانا محمد شاہد القاسمی، مولانا رضوان القاسمی، مولانا منظور احمد قاسمی، مفتی احمد نادر القاسمی، مولانا مجاہد الاسلام، مولانا اقبال احمد قاسمی، مولانا عبدالعظیم اصلاحی، مولانا نعیم اختر قاسمی، مولانا قمر الزماں ندوی، مولانا ابوالحسن علی، مولانا ابراہیم محمد، مولانا اعجاز احمد قاسمی، مولانا عبداللطیف گجرات، مولانا عبدالجلیل قاسمی، مولانا مفتی محمد زید، مولانا محمد ارشد قاسمی، مولانا سید محمد ایوب سبیلی، مولانا قمر عالم سبیلی، مولانا احمد دیولوی، مفتی محمد جعفر، مولانا محمد ابرار خاں ندوی، مولانا مفتی عزیز الرحمن صاحب، مولانا سلطان احمد اصلاحی، مولانا محمد نور القاسمی، مولانا عبدالقیوم پالنپوری، مولانا بدر احمد مجیبی، مفتی محمد عبید اللہ الاسعدی، مولانا ظفر الاسلام، مولانا عبدالرحیم، مولانا تنویر احمد، مولانا اخلاق الرحمن، مفتی محبوب علی، مولانا اختر امام عادل، مولانا عتیق احمد، مولانا نسیم احمد قاسمی۔

۲۔ ناجائز ہے، یہ جوئے کی ایک قانونی شکل ہے، ہاں اگر شیئرز کا اندراج کرا کے پھر فروخت کرے تو جائز ہوگا، ورنہ بالا بالا کی فروخت بغیر اندراج ملکیت کی کوئی حیثیت نہیں (مفتی شکیل احمد)۔

۳۔ شیئرز کی تجارت کی نہ تو گنجائش ہے اور نہ ضرورت۔ عوام کو اس سے دور رہنے کا حکم دیا جائے اس سے وسائل ثروت سمٹ کر سرمایہ داروں کے ہاتھ میں پہنچ جاتے ہیں (حفظ الرب)۔

۴۔ شیئرز نہ ثمن ہیں اور نہ مبیع، لہذا ان کی تجارت درست نہیں کیونکہ راس المال یا ثمن وہ زر مبادلہ ہے جو شیئرز ہولڈر ادا کرتا ہے، اور مبیع وہ سامان ہے جو فیکٹری

میں تیار ہوگا۔ شیئر دونوں میں سے کچھ بھی نہیں ہے۔ (مفتی شکیل احمد سیتاپوری)

۱۳۔ فیوچر سیل (Future Sale):

جملہ مقالہ نگار حضرات اس مسئلہ کے بارے میں اس بات پر متفق ہیں کہ یہ معاملہ ناجائز ہے کیونکہ یہ دونوں طرف سے ادھار ہے اور پھر اس میں قمار بھی ہے، اور قمار کی حرمت پر بہت سی نصوص موجود ہیں۔

مولانا محمد نعیم رشیدی، مولانا خالد سیف اللہ رحمانی، مولانا محمد نور القاسمی، مولانا محمد طاہر مظاہری، مولانا مفتی محمد زید، مولانا مجاہد الاسلام، مولانا سلطان احمد اصلاحی، مولانا ابوبکر شکر پور، مولانا ابوالحسن علی، مولانا عبد اللطیف گجرات، مولانا اختر امام عادل، مولانا ابرار خاں ندوی، مولانا محمد حنیف، مولانا ابراہیم محمد، مفتی عبد القیوم پالنپوری، مولانا مفتی محبوب علی وجیہی، مولانا محمد ایوب سنبھلی، مولانا ظفر الاسلام، مولانا اخلاق الرحمن قاسمی، مفتی عبد الرحیم، مولانا احمد القاسمی، مولانا قمر الزماں ندوی، مولانا قمر عالم سنبھلی، مفتی محمد عبید اللہ اسعدی، مولانا عبد الرحمن پالنپوری، مولانا بدر احمد مجیبی، مولانا نازبیر احمد قاسمی، مولانا نعیم اختر قاسمی، مولانا منظور احمد قاسمی، مولانا شمس پیرزادہ، مولانا سمیع اللہ قاسمی، مولانا احمد دیولوی، مولانا نسیم الدین قاسمی، مولانا عبد العظیم اصلاحی، مولانا محمد رضوان القاسمی، مفتی انور علی اعظمی، مفتی شکیل احمد سیتاپوری، مولانا عبد الجلیل قاسمی، مولانا اقبال احمد قاسمی، مولانا نسیم احمد قاسمی، مولانا محمد شاہد قاسمی، مولانا ابوسفیان مفتاحی، مولانا عتیق احمد قاسمی، مولانا محمد ارشد قاسمی، مولانا محمد جعفر ملی، مولانا اعجاز احمد قاسمی۔

بعض حضرات نے جواب نہیں لکھا۔ مفتی عزیز الرحمن، مفتی نظام الدین دار العلوم دیوبند، جناب حفظ الرب، مولانا تنویر احمد قاسمی۔

۱۴۔ غائب سودا جس میں بیع کی نسبت مستقبل کی طرف کی جاتی ہے:

اس مسئلہ کے بارے میں مقالہ نگار حضرات کی آراء مختلف ہیں، دراصل یہ اختلاف آراء سوال کے واضح نہ ہونے کی وجہ سے ہوا ہے، چنانچہ ہر شخص نے جیسا سمجھا اسی کے مطابق جواب تحریر کیا ہے۔ اسی وجہ سے بعض حضرات نے لکھا بھی ہے کہ "سوال واضح نہیں ہے"۔ جن حضرات نے جواب دیئے ہیں وہ درج ذیل ہیں:

۱۔ زیادہ تر مقالہ نگار حضرات کی رائے میں یہ غائب سودا جس میں بیع کی نسبت مستقبل کی طرف کی جاتی ہے ناجائز ہے، اس کی حیثیت محض ایک وعدہ کی ہے۔

مولانا عبد القیوم پالنپوری، مولانا محمد نور القاسمی، مولانا عبد الرحمن پالنپوری، مولانا عتیق احمد قاسمی، مولانا انور علی اعظمی، مفتی محمد جعفر، مولانا خالد سیف اللہ رحمانی، مولانا قمر عالم سنبھلی، مولانا محمد زید، مولانا ابوسفیان مفتاحی، مولانا اخلاق الرحمن قاسمی، مولانا عبد الرحیم، مولانا مجاہد الاسلام، مولانا اختر امام عادل، مولانا نسیم الدین قاسمی، مفتی نسیم احمد قاسمی، مولانا بدر احمد مجیبی، مولانا محمد نعیم رشیدی، مولانا اقبال احمد قاسمی، مولانا اعجاز احمد قاسمی، مولانا نعیم اختر قاسمی، مولانا شمس پیرزادہ، مولانا محمد ارشد قاسمی، مولانا احمد نادر القاسمی، مولانا محمد شاہد قاسمی، مولانا سید محمد ایوب سنبھلی، مولانا محمد رضوان قاسمی، مولانا محمد قمر الزماں ندوی، مولانا محمد ابرار خاں ندوی، مولانا عبد اللطیف گجرات، مولانا محمد طاہر مظاہری۔

۲۔ درست ہے، بشرطیکہ خریدار دیکھنے کے بعد اس کا آخری فیصلہ کرے۔ یہ رائے درج ذیل حضرات کی ہے: مولانا ابراہیم، مولانا محمد ظفر الاسلام، مولانا سمیع اللہ قاسمی۔

۳۔ یہ بیع سلم ہے، بیع سلم کے احکام جاری ہوں گے۔ مولانا تنویر احمد قاسمی، مولانا نازبیر احمد قاسمی اور مفتی محبوب علی وجیہی۔

۴۔ یہ بیع الآجل بالآجل ہے۔ نہی رسول اللہ ﷺ عن بیع الکالی بالکالی (مولانا محمد حنیف)۔

۵۔ بعض حضرات نے فرمایا ہے کہ سوال واضح نہیں ہے۔ وضاحت کے بعد جواب دیا جائے گا۔

مولانا عبد العظیم اصلاحی، مولانا عبید اللہ الاسعدی، مولانا احمد دیولوی، مولانا نازبیر احمد قاسمی، مولانا ابوالحسن علی، مولانا عبد الجلیل صاحب۔

نوٹ: بعض حضرات نے اس کا جواب ہی نہیں لکھا۔ مفتی نظام الدین صاحب دیوبند، مولانا منظور احمد قاسمی، مفتی عزیز الرحمن، مولانا شکیل احمد سیتاپوری، جناب حفظ الرب۔

۱۵۔ شیئرز کی خرید وفروخت کے ساتھ ہی سرٹیفکیٹ ملنے سے قبل شیئرز پر قبضہ تسلیم کیا جائے گا یا نہیں؟

اس مسئلہ کے بارے میں بھی مقالہ نگار حضرات کی آراء مختلف ہیں جو درج ذیل ہیں:

۱۔ محض شیئرز کی بیع وشراء سے ہی کمپنی کے اثاثے واملاک شیئرز ہولڈر کی ملکیت میں آجاتے ہیں: لأن التخلیة قبض حکما (درمختار ۴/۴۷) سرٹیفکیٹ محض اس کا ایک تحریری ثبوت ہے۔

یہ رائے درج ذیل حضرات کی ہے:

مفتی محمد عبید اللہ الاسعدی، مولانا محمد ایوب سبیلی، مفتی عبد الرحیم، مولانا عبد الجلیل قاسمی، مولانا منظور احمد قاسمی، مولانا نعیم اختر قاسمی، مولانا محمد نعیم رشیدی، مولانا سلطان احمد اصلاحی، مولانا جعفر ملی رحمانی، مولانا ابراہیم، مفتی محبوب علی وجیہی، مولانا مجاہد الاسلام، مولانا اخلاق الرحمن قاسمی، مولانا اقبال احمد قاسمی، مفتی احمد نادر القاسمی، مولانا احمد دیولوی، مولانا محمد ابرار خاں ندوی، مولانا طاہر مظاہری، مولانا محمد رضوان القاسمی، مولانا محمد شاہد، مولانا محمد حنیف، مولانا زبیر احمد قاسمی۔

۲۔ معنوی قبضہ تو شیئرز خریدتے ہی ہوجائے گا مگر بہتر ہے کہ سرٹیفیکٹ کے حصول کے بعد ہی شیئرز فروخت کئے جائیں۔

مولانا عبد اللطیف، مولانا سمیع اللہ قاسمی، مولانا ابوسفیان مفتاحی، مولانا انور علی اعظمی، مولانا عبد الرحمن پالنپوری، مولانا ارشد قاسمی، مولانا نسیم الدین قاسمی، مولانا اختر امام عادل۔

۳۔ سرٹیفیکٹ ملنے سے قبل شیئرز فروخت کرنا درست نہیں، اس لئے کہ عرف میں سرٹیفیکٹ کے بغیر قبضہ تصور نہیں کیا جاتا جیسا کہ ارشاد باری ہے: وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ۔ مولانا خالد سیف اللہ رحمانی، مولانا نسیم احمد قاسمی، مولانا ظفر الاسلام، مولانا تنویر احمد قاسمی، مولانا نور احمد قاسمی، مولانا شمس پیرزادہ، مولانا قمر عالم سبیلی، مولانا عتیق احمد قاسمی، مولانا محمد قمر الزماں ندوی، مولانا بدر احمد مجیبی۔

۴۔ ضمان وقبضہ دونوں علیحدہ علیحدہ شئ ہیں، محض کسی چیز کے ضمان میں آجانے سے قبضہ کا تحقق نہیں ہوتا جب تک کہ قبضہ حقیقی یا معنوی نہ ہو۔ یہاں پر قبضہ معنوی سرٹیفیکٹ کے حصول تک مکمل نہیں ہوتا (مفتی محمد زید مظاہری باندہ)۔

۵۔ کمپنی کے حصص پر ملکیت اور قبضہ سرٹیفیکٹ پر نئے خریدار کے نام کے اندراج کے بعد ہی مانا جاتا ہے۔ لیکن ۹۸ فیصد خریداری ایسی ہی سرٹیفیکٹ پر اندراج نام کے بغیر ہو رہی ہے، اس اعتبار سے اسے معنوی قبضہ تسلیم کرلینا ہی مناسب ہے (حکیم ظل الرحمن)۔

اس سوال کا جواب نہیں دیا۔ مفتی نظام الدین دار العلوم دیوبند، مولانا شکیل احمد سیتاپوری، مولانا عزیز الرحمن، جناب حفظ الرب۔

۱۶۔ شیئرز سرٹیفیکٹ ملنے سے قبل شیئرز کی خرید وفروخت:

اس مسئلہ کے بارے میں مقالہ نگار حضرات کی تین آراء ہیں:

۱۔ خریدار سرٹیفیکٹ کے حصول کے بغیر کسی دوسرے شخص کے ہاتھ فروخت نہیں کرسکتا، چونکہ عرف میں قبضہ سرٹیفیکٹ کے حصول کے بعد ہی مانا جاتا ہے، جیسا کہ ارشاد باری ہے: وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ۔ مولانا خالد سیف اللہ رحمانی، مولانا تنویر احمد قاسمی، مولانا ظفر الاسلام، مفتی محمد زید، مولانا قمر عالم سبیلی، مولانا عتیق احمد قاسمی، مولانا شمس پیرزادہ، مولانا محمد قمر الزماں ندوی، مولانا نسیم احمد قاسمی، مولانا بدر احمد مجیبی، مولانا ابوبکر قاسمی۔

۲۔ سرٹیفیکٹ کے حصول تک قبضہ مشتبہ ہے، اس لئے اس کی خرید وفروخت احتیاط کے خلاف ہے، مزید یہ کہ اس سے سٹہ بازی کی حوصلہ افزائی بھی ہوسکتی ہے۔

مولانا عبد اللطیف، مولانا عبد القیوم، مولانا عبد الرحمن، مولانا نسیم الدین قاسمی، مولانا ابوسفیان مفتاحی، مفتی انور علی اعظمی، مولانا عبد العظیم اصلاحی، مولانا سمیع اللہ قاسمی، مولانا اختر امام عادل، مولانا اعجاز احمد قاسمی، مولانا ابوالحسن علی، مولانا محمد ارشد قاسمی۔

۳۔ خریدار سرٹیفیکٹ کے بغیر بھی دوسرے کے ہاتھ فروخت کرسکتا ہے چونکہ حکماً اس کا قبضہ ہوگیا ہے، سرٹیفیکٹ محض ایک شہادت ہے لأن التخلية قبض حكما (در مختار ۴۰۳/۴)۔

مولانا عبید اللہ الاسعدی، مولانا منظور احمد قاسمی، مولانا نور القاسمی، مولانا عبد الرحیم، مفتی محمد جعفر ملی، مفتی محبوب علی وجیہی، مولانا ابراہیم محمد، مولانا محمد رضوان القاسمی، مولانا اخلاق الرحمن قاسمی، مولانا احمد دیولوی، مولانا اقبال احمد قاسمی، مولانا سید محمد ایوب، مولانا نعیم اختر قاسمی، مولانا سلطان احمد اصلاحی، مولانا حنیف، مولانا محمد طاہر مظاہری، مولانا نعیم رشیدی، مولانا مجاہد الاسلام، مولانا احمد نادر القاسمی، مولانا عبد الجلیل قاسمی، مولانا زبیر احمد قاسمی، مولانا محمد ابرار خاں، مولانا شاہد القاسمی۔

بعض حضرات نے اس سوال کا جواب نہیں دیا۔ مفتی نظام الدین دار العلوم دیوبند، مولانا شکیل احمد سیتاپوری، مولانا عزیز الرحمن۔

۱۷۔ بروکری کا حکم: ...... اس مسئلہ میں جملہ مقالہ نگار حضرات اس بات پر متفق ہیں کہ اس کا حکم دلالی کا ہے، اور دلالی باتفاق جائز ہے، لہٰذا جن شیئرز کی خرید وفروخت جائز ہے ان کی خرید وفروخت میں بروکر اور ایجنٹ کی حیثیت سے کام کرنا بھی درست ہے (در مختار ۲۹/۵-۳۹، شامی ۴۴/۵)۔

بعض حضرات نے جواب نہیں دیا۔ مفتی نظام الدین صاحب دار العلوم دیوبند، مولانا عزیز الرحمن، مفتی انور علی اعظمی۔ ☆☆☆

عرض مسئلہ:

شیئرز کی شرعی حیثیت

سوال نمبر ۱، ۲، ۳

مولانا عبدالقیوم پالنپوری [1]

۱۔ کیا کسی کمپنی کا خرید کردہ شیئر کمپنی میں شیئر ہولڈر کی ملکیت کی نمائندگی کرتا ہے یا یہ محض اس بات کی دستاویز ہے کہ اس نے اتنی رقم کمپنی کو دے رکھی ہے؟

بندہ کو شیئرز کے مسائل سے متعلق کل اکتالیس (۴۱) مقالات اور جوابات موصول ہوئے تھے اور سب ہی مقالہ نگار اور جواب دینے والے حضرات علماء کرام اس بات سے متفق ہیں کہ جس کمپنی کے کچھ اثاثے وجود میں آچکے ہیں، اس کا خرید کردہ شیئر کمپنی میں شیئر ہولڈر کی ملکیت کی نمائندگی کرتا ہے، محض اس بات کی دستاویز نہیں ہے کہ اس نے کمپنی کو اتنی رقم دی ہے، اکثر حضرات نے سوالنامہ میں اس موقف کی دلیل موجود ہونے کی وجہ سے مختصر جواب پر اکتفا کیا ہے۔

مفتی محمد عبید اللہ اسعدی صاحب، مولانا اختر امام عادل صاحب، مولانا عبدالجلیل قاسمی صاحب اور مولانا شمس پیرزادہ صاحب نے لکھا ہے کہ شیئر ہولڈر کا کمپنی کے نفع و نقصان میں شریک رہنا اور کمپنی کے تحلیل ہوجانے کی صورت میں شیئر ہولڈر کو اس کے شیئرز کے تناسب سے کمپنی کے اثاثوں میں حصہ ملنا یہ واضح ثبوت اور دلیل ہے کہ شیئر کمپنی میں شیئر ہولڈر کی ملکیت کی نمائندگی کرتا ہے۔

اب رہا یہ قانون کہ شیئر ہولڈر کے دیوالیہ ہونے کی صورت میں موجودہ قانون کے مطابق جب اس کی املاک ضبط کر کے اس کے قرضے ادا کئے جاتے ہیں، اس وقت اس کے حصے (شیئرز) کے تناسب سے کمپنی کے اثاثے قرق نہیں کئے جاسکتے، تو اس قانون سے شیئرز کی حقیقت پر کچھ اثر نہیں پڑے گا اور اس کے باوجود شیئر ہولڈر کی کمپنی میں ملکیت و شرکت باقی رہے گی۔ مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب نے لکھا ہے کہ شیئر سرٹیفکیٹ پر جو رقم کا ذکر ہوتا ہے، وہ محض اس بات کا اظہار ہوتا ہے کہ یہ اثاثہ اپنی ابتدائی صورت میں اسی قدر و قیمت و قوت خرید کا حامل تھا، اور قانونی طور پر کمپنی کے اثاثوں کو قرق نہ کیا جانا شرعی اعتبار سے کوئی اہمیت نہیں رکھتا ہے، بلکہ یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ شیئر قانون کی نگاہ میں اثاثہ کا درجہ نہ رکھتا ہو، کیونکہ ممکن ہے کہ شیئرز پر مبنی اثاثہ میں اشتراک و شیوع کی وجہ سے اس طرح کا قانون بنایا گیا ہو، مولانا عبدالجلیل قاسمی صاحب پٹنہ نے لکھا ہے کہ اگر کوئی مفلس ہو تو صاحبین ؒ کے نزدیک اس کی غیر منقولہ اشیاء اراضی وغیرہ بھی فروخت کر کے اس کے قرضہ کی ادائیگی کی جائے گی، لیکن اس کا رہائشی مکان فروخت کر کے قرضہ ادا نہیں کیا جائے گا، اس سے یہ لازم نہیں آتا ہے کہ یہ مفلس مکان کا مالک نہیں ہے، اسی طرح اگر حکومت نے کسی مصلحت سے یہ قانون بنایا ہے کہ شیئر ہولڈر کے دیوالیہ ہونے کی صورت میں اس کے حصہ تناسب سے کمپنی کے اثاثے قرق نہ کئے جائیں گے، تو یہ لازم نہیں آتا ہے کہ وہ اثاثوں کا مالک نہیں ہے۔ حکیم ظل الرحمن اور ڈاکٹر عبدالعظیم اصلاحی صاحب نے لکھا ہے کہ قرق نہ کئے جانے کے قانون کے باوجود یہ ممکن ہے کہ اس شیئر ہولڈر کے پاس پائے جانے والے شیئرز پر قبضہ کر کے قرض خواہ کے نام منتقل کردئے جائیں، جس سے کمپنی میں اس کے بجائے قرض خواہ کی ملکیت و شرکت ہوجائے گی اور کمپنی کے اثاثے کے قرق کرنے کی ضرورت ہی نہیں رہے گی۔

حاصل کلام یہ ہے کہ سب ہی مقالہ نگار اور جواب دینے والے حضرات اس بات کو درست مانتے ہیں کہ جس کمپنی کا کچھ اثاثہ وجود میں آچکا ہو اس کے خرید کردہ ایکویٹی شیئرز شیئر ہولڈر کی کمپنی میں ملکیت کی نمائندگی کرتے ہیں، کمپنی کو قرض دینے کی دستاویز نہیں ہے۔ ان مقالہ نگاروں کے اسماء گرامی یہ ہیں:

مفتی محمد عبید اللہ الاسعدی، مولانا خالد سیف اللہ رحمانی، مولانا زبیر احمد قاسمی، مولانا مفتی نظام الدین دیوبند، مولانا مفتی عزیز الرحمن بجنوری، مولانا ابوالحسن علی، مولانا مفتی احمد دیولوی بھروچ، مولانا عبدالجلیل قاسمی پٹنہ، مولانا جعفر ملی رحمانی، مولانا شمس پیرزادہ، مولانا تنویر احمد قاسمی، مولانا ابراہیم بڑودوی، مولانا مفتی عبدالرحمن پالنپوری، مولانا عبداللطیف مظاہری پالنپوری، مولانا سمیع اللہ قاسمی، ڈاکٹر عبدالعظیم اصلاحی، مولانا سلطان احمد اصلاحی، مولانا مفتی محبوب علی وجیہی، مولانا اقبال احمد قاسمی، مولانا اختر امام عادل، مفتی شکیل احمد سیتاپوری، مولانا

[1]

اخلاق الرحمن قاسمی، مولانا منظور احمد قاسمی، مولانا عبدالرحیم بھوپال، مولانا ظفر الاسلام مئو، مولانا ابوسفیان مفتاحی، مفتی انور علی، عبدالقیوم پالنپوری، مولانا نعیم رشیدی، مولانا شمشاد احمد نادر قاسمی، مولانا قمر الزماں ندوی، مولانا ابرار خاں ندوی، مولانا محمد رضوان القاسمی، مولانا شاہد قاسمی، مولانا ارشد قاسمی، مولانا طاہر مظاہری، مولانا سید ایوب سبیلی، مولانا مجاہد الاسلام، مولانا قمر عالم سبیلی، مولانا محمد نور القاسمی۔

۲۔ بعض اوقات کمپنی قائم کرتے وقت شیئرز کا اعلان کیا جاتا ہے، اور اس وقت اس کے پاس کچھ بھی املاک نہیں ہوتی ہیں، اس وقت اگر کمپنی کے خرید کردہ شیئر کی بیع کی جائے تو ایسی صورت میں نقد نقد کے مقابل ہوتا ہے، اس کا کیا حکم ہے؟

اس کا جواب ۳۷ حضرات علماء کرام نے دیا ہے، اس سوال کے متعلق مولانا شمس پیرزادہ صاحب نے لکھا ہے کہ ہر کمپنی کو ابتداءً قانون حکومت کی بنا پر کچھ سرمایہ اشیاء منقولہ وغیر منقولہ میں لگانا پڑتا ہے، جس کے بعد ہی اسے شیئرز کا اعلان کرنے کی اجازت مل سکتی ہے، اس لئے یہ خیال صحیح نہیں کہ کمپنی کے پاس کچھ بھی املاک نہیں ہوتی اور وہ شیئرز کا اعلان کردیتی ہے، لہذا شیئرز کی بیع اس صورت میں بھی جائز ہوگی جبکہ کمپنی پوری طرح قائم نہ ہوئی ہو۔ اس کے متعلق عرض یہ ہے کہ اگر اس قانون کے مطابق کمپنیوں کا عمل بھی ہے تو اس سوال کی ضرورت نہیں، لیکن ہندوستان جیسے ممالک میں یہ ممکن ہے کہ کمپنی اپنے اثاثے وجود میں لانے سے پہلے ہی خلاف قانون متعلقہ افسران سے رشوت وغیرہ کے ذریعہ اجازت حاصل کرکے شیئرز کا اجراء کردے، لہذا اس سوال کی ضرورت باقی رہے گی۔

اور ڈاکٹر عبدالعظیم اصلاحی صاحب نے لکھا ہے کہ کمپنی کے وجود میں آنے سے پہلے اس کا پروجیکٹ اور خاکہ تیار کیا جاتا ہے اور اس پر کافی وقت اور روپیہ صرف ہوتا ہے، لہذا یہ پروجیکٹ بھی کسی مصنف کے مسودے کی طرح اہم اور قیمتی ہے، اور چونکہ نقد کا مقابلہ نقد سے نہیں، لہذا شیئرز کی خرید وفروخت درست ہے۔

اس بارے میں عرض ہے کہ اگر پروجیکٹ یا پلان مال تسلیم کرلئے جائیں تب تو یہ بات درست ہے، لیکن بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ کوئی مال نہیں ہے۔

اور مفتی محمد عبیداللہ اسعدی صاحب نے اس صورت کو حوالہ کا معاملہ قرار دیا ہے اور لکھا ہے کہ اس میں کمی وبیشی درست نہیں ہے، لیکن اس کو حوالہ کا معاملہ کہنا درست معلوم نہیں ہوتا ہے، اس لئے کہ حوالہ میں دَین محیل سے محتال علیہ کی طرف منتقل ہوجاتا ہے، اور محتال علیہ سے محتال لہ دَین وصول کرتا ہے، اور سوال کی صورت میں کمپنی محتال علیہ ہوگی اور اس سے شیئر واپس کرکے دَین وصول کرنے کی کوئی صورت نہیں ہے، لہذا یہ بیع کا معاملہ ہے نہ کہ حوالہ کا۔

باقی حضرات کے مقالات وجوابات سے دو نقطۂ نظر سامنے آئے ہیں: ایک یہ کہ اس صورت میں شیئرز کی خرید وفروخت نہ کمی وبیشی سے اور نہ اس کی قیمت اسمیہ (متعینہ) سے جائز ہے، اس لئے کہ یہ نقد کی بیع نقد سے ہے جو بیع صرف ہے، اور بیع صرف میں تقابض علی البدلین اور تساوی دونوں ضروری ہیں، اور اس صورت میں کمی وبیشی سے بیع کرنے میں دونوں نہیں پائے جاتے ہیں، اور شیئرز کے برابر قیمت سے بیع میں تقابض علی البدلین نہیں پایا جارہا ہے، لہذا اس صورت میں نہ کمی بیشی کے ساتھ اور نہ برابر قیمت کے ساتھ شیئرز کی خرید وفروخت درست ہے، یہ رائے حسب ذیل حضرات علماء کرام کی ہے:

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی، مفتی محبوب علی وجیہی، مولانا اقبال احمد قاسمی، مولانا شاہد قاسمی، مولانا محمد رضوان القاسمی، مولانا طاہر مظاہری، مولانا محمد نور القاسمی، مولانا ارشد قاسمی، مولانا سید ایوب سبیلی، مولانا قمر الزماں ندوی، مولانا ابرار خاں ندوی۔

مولانا جعفر ملی رحمانی صاحب نے عدم جواز کی وجہ یہ لکھی ہے کہ ابھی کمپنی کے پاس اثاثہ نہیں ہے لہذا یہ غیر مملوک (یعنی بعد میں وجود میں آنے والے اثاثے) کی بیع ہے جو شرعاً درست نہیں ہے۔

لیکن اسے بیع غیر مملوک قرار دینا صحیح نہیں، اس لئے کہ دونوں جانب نقد موجود ہے تو نقد کی بیع نقد سے ہی قرار دی جائے گی۔ اسی طرح اس صورت کو بیع صرف قرار دینا بھی درست نہیں معلوم ہوتا ہے، اس لئے کہ بیع صرف میں عوضین کا خلقی ثمن ہونا ضروری ہے جیسا کہ بیع صرف کی تعریف میں ہے:

وهو... شرعاً بيع الثمن بالثمن أي ما خلق للثمنية... جنساً بجنس أو بغير جنس كذهب بفضة (الدر المختار مع الشامی ۴،۲۲۵)۔

اور موجودہ نقد یعنی نوٹ ثمن خلقی نہیں بلکہ ثمن عرفی یا اصطلاحی ہے، لہذا یہ بیع صرف نہیں ہے، لیکن ایک ہی ملک کی کرنسی کا باہم تبادلہ یا خرید وفروخت ہو تو جنس ایک ہونے کی وجہ سے تقابض علی البدلین ضروری ہے، یا تقابض علی احد العوضین صحت بیع کے لئے کافی ہے، تو یہ مسئلہ مختلف فیہ ہے، اور اس صورت میں یہی مسئلہ ہے، اور اکثر حضرات کی رائے میں ان علماء کی بات درست معلوم ہوتی ہے جو احد البدلین پر قبضہ شرط مانتے ہیں۔

جو حضرات سوال دوم کی صورت میں شیئر کی مطلقاً خرید وفروخت کے عدم جواز کے قائل ہیں، ان کی یہ رائے اس بات کی متقاضی ہے کہ سوال سوم میں مذکور صورت میں، کہ جس میں نقد کا مقابلہ نقد و مال سے ہے، جتنے حصہ میں نقد کا تقابل نقد سے ہے بیع ناجائز ہو، حالانکہ ان میں سے اکثر حضرات تیسرے سوال میں مذکور صورت میں شیئرز کی خرید وفروخت جائز قرار دیتے ہیں۔

دوسرا نقطہ نظر یہ ہے کہ اس صورت میں خرید کردہ شیئر کی بیع اس کی قیمت اسمیہ سے کم وبیش کے ساتھ سود ہونے کی وجہ سے جائز نہیں، اور شیئر پر لکھی ہوئی قیمت کے برابر سے بیچنا جائز ہے، اس لئے کہ یہ بیع صرف نہیں ہے، اور موجودہ نقد ونوٹ چونکہ فلوس کے مانند ہے، لہٰذا جس طرح فلوس کی بیع فلوس کے ساتھ کمی بیشی کے ساتھ جائز نہیں امام محمدؒ کے قول کے مطابق، اسی طرح روپیہ کی بیع روپئے سے کمی بیشی کے ساتھ درست نہیں، سداً للباب الربوا۔ اور امام کرخیؒ کے قول کے مطابق فلوس کی بیع فلوس سے ہو تو تقابض علی احد البدلین شرط ہے۔ اسی طرح روپیہ کی بیع میں ان کے قول کو اختیار کرتے ہوئے دو عوضوں میں سے ایک پر قبضہ شرط رہے گا نہ کہ دونوں پر۔ اور زیر بحث صورت میں بھی نقد کا تقابل نقد سے ہے لہٰذا کمی بیشی جائز نہ ہوگی، اور برابر قیمت کے ساتھ شیئر بیچا جائے تو درست ہوگا، اس لئے کہ احد البدلین پر مجلس عقد میں قبضہ ہو جاتا ہے۔ ملک العلماء علامہ کاسانی تحریر فرماتے ہیں:

تبايعا فلسا بعينه بفلس بعينه فالفلسان لا يتعينان وإن عيّنا. إلا أن القبض في المجلس شرط، حتى يبطل بترك التقابض في المجلس، لكونه افتراقا عن دين بدين، ولو قبض أحد البدلين في المجلس فافترقا قبل قبض الآخر. ذكر الكرخي: أنه لا يبطل العقد. لأن اشتراط القبض من الجانبين من خصائص الصرف، وهذا ليس بصرف، فيكتفى فيه بالقبض من أحد الجانبين لأن به يخرج عن كونه افتراقا عن دين بدين، و ذكر في بعض شروح مختصر الطحاوي أنه يبطل لا لكونه صرفا بل لتمكن ربا النَّسَاء فيه لوجود أحد وصفي علة ربا الفضل وهو الجنس (بدائع ۵،۲۳۷۔ نقلاً عن احسن الفتاوی ۷،۸۷)۔

اور بحر العلوم مولانا فتح محمد صاحب تائب تحریر فرماتے ہیں: نوٹ، نوٹ یا روپئے سے جب بدلا جاوے تو مساوات۔۔۔ شرط ہے اور تقابض لازم نہیں..... پس جائز ہے نقد بیچیں یا قرض (عطر الہدایہ رص ۷۲)۔

اور حضرت مولانا تقی صاحب عثمانی تحریر فرماتے ہیں: تمام معاملات میں کرنسی نوٹوں کا حکم بعینہ سکوں کی طرح ہے، جس طرح سکوں کا آپس میں تبادلہ برابر سرابر کر کے جائز ہے، اسی طرح ایک ہی ملک کی کرنسی نوٹوں کا تبادلہ برابر سرابر کر کے بالاتفاق جائز ہے، بشرطیکہ مجلس عقد میں فریقین میں سے کوئی ایک بدلین میں سے ایک پر قبضہ کرلے (فقہی مقالات جلد اول رص ۳۱)۔

حاصل بحث یہ ہے کہ اس صورت میں در حقیقت نوٹ کی بیع کرنسی نوٹ سے ہے اور یہ حوالہ یا بیع غیر مملوک یا بیع صرف نہیں ہے، لہٰذا ایسے شیئر کی خرید و فروخت کمی بیشی کے ساتھ جائز نہیں ہے اور اس کی برابر قیمت کے ساتھ جائز ہے، اور مجلس عقد میں احد البدلین پر قبضہ صحت بیع کے لئے کافی ہے۔ یہ رائے حسب ذیل حضرات کی ہے: مولانا سمیع اللہ قاسمی، مولانا عبد الجلیل قاسمی، مولانا ظفر الاسلام مئو، مولانا ابو الحسن علی، مولانا عبد الرحیم بھوپال، مولانا زبیر احمد قاسمی، مفتی انور علی، مولانا عبد الرحمن پالنپوری، مولانا عبد اللطیف پالنپوری، مولانا سلطان احمد اصلاحی، ڈاکٹر عبد العظیم اصلاحی، مولانا اختر امام عادل، مولانا ابراہیم بڑودوی، مولانا ابو سفیان مفتاحی، مولانا اخلاق الرحمن قاسمی، مولانا منظور احمد قاسمی، مولانا تنویر احمد قاسمی، عبد القیوم پالنپوری، مولانا شمشاد احمد نادر قاسمی، مولانا مجاہد الاسلام، مولانا نعیم رشیدی، مولانا قمر عالم سنبھلی۔

۳۔ کمپنی کے وجود میں آجانے کے بعد اس کا اثاثہ مخلوط ہوتا ہے (یعنی نقد اور املاک کا مجموعہ) اس صورت میں جبکہ مجموعہ مال ربوی وغیر ربوی دونوں پر مشتمل ہے شیئرز کی نقد کے ساتھ خرید وفروخت کا کیا حکم ہوگا؟

اس کا جواب ۳۸ حضرات علماء کرام نے دیا ہے، لیکن ان میں سے سات حضرات مولانا احمد دیولوی، مولانا شمس پیرزادہ، مولانا تنویر احمد قاسمی، حکیم ظل الرحمن، مولانا سلطان احمد اصلاحی، مولانا مفتی محبوب علی وجیہی، اور مولانا منظور احمد قاسمی سے سوال سمجھنے میں غلطی ہوئی ہے، انہوں نے سوال کا یہ معنی سمجھا ہے کہ جب شیئرز میں مجموعہ مخلوط ہے حلال مال اور سود سے، تو ایسے شیئرز کی بیع نقد سے جائز ہے یا نہیں؟ اور انہوں نے اس اخذ کردہ مفہوم کے مطابق اپنے الفاظ میں جواب دیئے ہیں جن کا حاصل یہ ہے کہ جب مجموعہ میں غلبہ حلال مال کا ہے اور سودی لین دین قانونی ضرورت کی وجہ سے ہوتا ہے لہٰذا غالب کا اعتبار کرتے ہوئے ایسے شیئرز کی خرید وفروخت جائز ہے۔

اور مولانا اقبال احمد قاسمی نے لکھا ہے کہ یہ صورت بیع صرف کی ہے، اور مجلس عقد میں تقابض علی البدلین ضروری ہے، لہذا بغیر حیلہ کے ان شیئرز کی خرید و فروخت درست نہیں ہے، لیکن ان کا اس کو بیع صرف کہنا صحیح نہیں ہے، اس لئے کہ یہاں نقد ثمن خلقی نہیں ہے، اور اس میں کچھ نقد کا تقابل نقد سے ہے اور اس کی صحت کے لئے احد البدلین پر قبضہ شرط ہے جو اس صورت میں پایا جاتا ہے، لہذا بیع جائز ہے۔

اور باقی تیس حضرات علماء کرام نے لکھا ہے کہ امام اعظم ابوحنیفہؒ کے نزدیک مال ربوی یعنی نقد و دیون اور مال غیر ربوی یعنی اثاثہ کی بیع نقد کے ساتھ جائز ہے بشرطیکہ نقد مجموعہ میں مخلوط نقد سے زائد ہو، تاکہ نقد نقد کے مقابل ہوجائے اور زائد نقد اثاثہ کے مقابلہ میں ہوگا، مثلاً دس روپے کے شیئرز میں آٹھ روپے اگر نقد و دیون کے مقابل ہیں اور دو روپے جامد اثاثوں کے مقابل تو شیئرز کی بیع آٹھ روپے یا اس سے کم میں جائز نہ ہوگی، البتہ نو روپے یا اس سے زائد میں جائز ہوگی۔ عالمگیریہ میں ہے:

لو اشترى سيفا محلّى بالفضة أو لجاما مفضضا بالفضة الخالصة، و وزنها أكثر جاز، وإن كان وزنها أقل من الحلية أو مثلها أو لا يدرى لا يجوز (هنديه ۳،۱۸۷)۔

یہ رائے حسب ذیل مقالہ نگاروں کی ہے:

مفتی محمد عبید اللہ اسعدی، مفتی انور علی، مولانا سمیع اللہ قاسمی، مولانا اختر امام عادل، مولانا ابوالحسن علی، مولانا عبد الرحمن پالنپوری، مولانا عبد اللطیف پالنپوری، مولانا عبد الجلیل قاسمی، مولانا ابراہیم بڑودوی، مولانا ظفر الاسلام مئو، مولانا اخلاق الرحمن قاسمی، مولانا زبیر احمد قاسمی، مولانا عبد الرحیم بھوپالی، مولانا ابوسفیان مفتاحی، مولانا خالد سیف اللہ رحمانی، مولانا جعفر ملی رحمانی، ڈاکٹر عبد العظیم اصلاحی، مولانا عبد القیوم پالنپوری، مولانا طاہر مظاہری، مولانا قمر عالم سبیلی، مولانا ایوب سبیلی، مولانا مجاہد الاسلام، مولانا نعیم رشیدی، مولانا احمد نادر القاسمی، مولانا قمر الزماں ندوی، مولانا ابرار خاں ندوی، مولانا نور قاسمی، مولانا ارشد قاسمی، مولانا شاہد قاسمی، مولانا محمد رضوان القاسمی۔

حاصل بحث یہ ہے کہ اس صورت میں شیئرز کی خرید و فروخت جائز ہے، بشرطیکہ نقد اثاثہ میں مخلوط نقد سے زائد ہو۔

☆☆☆

عرض مسئلہ:

سوال نمبر ۴، ۵، ۶

مولانا قاضی عبدالجلیل قاسمی[1]

حضرات علماء کرام!

مجھے شیئرز کے بارے میں سوال نمبر ۴، ۵، اور ۶ سے متعلق عرض مسئلہ کی ذمہ داری دی گئی ہے۔ اس سلسلہ میں اکیڈمی کی طرف سے اکتالیس (۴۱) مقالات موصول ہوئے۔ ایک مقالہ پھلواری شریف میں ملا۔

مقالہ نگار حضرات کے اسماء گرامی یہ ہیں: حضرت مولانا مفتی نظام الدین صاحب دیوبند، مفتی عزیز الرحمن بجنوری، جناب شمس پیرزادہ، مولانا زبیر احمد قاسمی، مفتی محمد عبید اللہ الاسعدی، مولانا محمد رضوان القاسمی، مولانا خالد سیف اللہ رحمانی، مفتی انور علی اعظمی، مولانا احمد دیولوی، مولانا ابراہیم بڑودی، مولانا ابوالحسن علی، مفتی عبدالرحیم بھوپال، مولانا اختر امام عادل، مولانا ظفر الاسلام مئو، مولانا شکیل احمد سیتاپوری، مولانا اخلاق الرحمن، مولانا مفتی محبوب علی وجیہی، مولانا عبدالعظیم اصلاحی، مولانا عبدالقیوم پالنپوری، مولانا ابوسفیان مفتاحی، مولانا سلطان احمد اصلاحی، مولانا عبداللطیف، مولانا منظور احمد قاسمی، مولانا مفتی عبدالرحمن پالنپوری، مولانا اقبال احمد قاسمی، مولانا محمد طاہر مظاہری، مولانا ارشد قاسمی، مولانا محمد شاہد قاسمی، مولانا قمر عالم سبیلی، مولانا مفتی جعفر ملی رحمانی، مولانا تنویر احمد قاسمی، مولانا سمیع اللہ قاسمی، مفتی نسیم احمد قاسمی، مولانا محمد نور القاسمی، مولانا محمد نعیم رشیدی، مولانا مجاہد الاسلام حیدرآباد، مولانا ابرار خاں ندوی، مولانا قمر الزماں ندوی، مفتی احمد نادر القاسمی، مولانا سید محمد ایوب سبیلی، راقم الحروف عبدالجلیل قاسمی، حکیم ظل الرحمن۔

۴۔ وہ کمپنیاں جن کا بنیادی کاروبار حرام ہے جیسے شراب اور خنزیر کے گوشت کی تجارت اور اکسپورٹ، یا بینک اور سودی اسکیموں میں روپئے لگانا، ایسی کمپنیز کے شیئرز کی خرید وفروخت کا کیا حکم ہوگا؟

اس کے جواب میں تمام مقالہ نگار حضرات اس پر متفق ہیں کہ جس کمپنی کا بنیادی کاروبار حرام ہو اس میں شرکت جائز نہیں ہے، اس لئے کہ ایسی کمپنیز کے شیئرز خریدنا تعاون علی الاثم ہے جو بنص قرآنی حرام ہے: "ولا تعاونوا علی الإثم والعدوان" (الآیة)۔

نیز حرام اشیاء مسلمان کی مملوک نہیں ہوتیں اور غیر مملوک کی بیع جائز نہیں، اس لئے حرام اشیاء کی خرید وفروخت مسلمان کے لئے جائز نہیں ہے۔ اور جس کام کا کرنا جائز نہ ہو اس کے کرنے کا امر کرنا اور اس کے کرنے کے لئے کسی کو وکیل بنانا بھی جائز نہ ہوگا..... ما حرم فعلہ حرم طلبہ۔

ولأن ما ثبت للوكيل ينتقل إلى مؤكل فصار كأنه باشره بنفسه ولو باشر بنفسه لم يجز فكذا التوكيل به...
(عنایة مع فتح القدیر ۶ / ۴۴۰)۔

۵۔ ایسی کمپنیز جن کا کاروبار حلال ہے مثلاً انجینئرنگ کے سامان تیار کرنا، عام استعمال کی مصرفی چیزیں تیار کرنا وغیرہ، پھر ان کمپنیوں کا بنیادی کاروبار حلال ہونے کے باوجود انہیں بعض اوقات انکم ٹیکس وغیرہ کی زد سے بچنے کے لئے بینکس سے سودی قرض لینا پڑتا ہے، تو کیا ایسی کمپنیز کے شیئرز کا خریدنا جائز ہے؟

حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمن بجنوری نے سوال نمبر ۵ اور ۶ پر بحث کرتے ہوئے اس وجہ سے اس کو ناجائز قرار دیا ہے کہ اس میں سود لینا دینا پڑتا ہے اور یہ دونوں حرام ہیں، اور مسلمان اس کا مکلف ہے کہ وہ منہی عنہ کو مٹائے، اس سے صرف اظہار بیزاری یا اظہار ناپسندیدگی کافی نہیں ہے۔

مولانا عبدالعظیم اصلاحی صاحب نے بکراہت جائز لکھا ہے۔

باقی دوسرے مقالہ نگار حضرات نے اس صورت میں شیئرز کی خریداری کو جائز قرار دیا ہے۔ سودی قرض لینے کی صورت میں چونکہ سود دینا ہوتا ہے اس لئے مال اور اس سے حاصل ہونے والے منافع میں کوئی خبث موجود نہیں ہے، اس لئے اس کے منافع کے حلال ہونے میں کوئی کلام نہیں ہے۔

---

[1] امارت شرعیہ، پھلواری شریف، پٹنہ۔

البتہ چونکہ سود دینا ہوتا ہے اور وہ بھی حرام ہے۔اس کا حل بعض حضرات نے یہ پیش کیا ہے کہ شیئر ہولڈر کمپنی کی میٹنگ میں سودی قرض کے حاصل کرنے پر اپنی ناپسندیدگی ظاہر کردے یا خط ہی کے ذریعہ اظہار بیزاری کردے، اس کے بعد کمپنی کے عملہ کے کام کی ذمہ داری شیئر ہولڈر پر نہیں ہوگی۔

جبکہ دوسرے حضرات نے یہ لکھا ہے کہ چونکہ یہ قرض سرکار کے انکم ٹیکس کے ظالمانہ قانون کی زد سے بچنے کے لئے لیا جاتا ہے اس لئے یہ قرض لینا مجبوری کی وجہ سے ہے، اور مجبوری میں سودی قرض لینے کی اجازت ہے۔فقہ کا مشہور جزئیہ ہے: یجوز للمحتاج الاستقراض بالربح۔

مولانا ابوالحسن علی گجرات نے سوال نمبر ۵ اور ۶ پر بحث کرنے کے بعد آخر میں تحریر فرمایا ہے کہ اس سے بچنا افضل ہے۔

ظاہر بات ہے کہ جن محظورات کی اجازت مجبوری کی حالت میں دی جاتی ہے عام حالات میں اس کی اجازت نہیں رہتی ہے۔جو لوگ کسی کمپنی کے مالک ہیں یا جن کے پاس آمدنی کے دوسرے ذرائع موجود نہیں ہیں اور وہ ایسی کمپنی کے شیئرز خریدنے پر مجبور ہیں، ان کو تو اجازت دی جائے گی، مگر جن لوگوں کے پاس دوسرے وسائل اور آمدنی کے اسباب وذرائع موجود ہیں، ان کو محض اپنے مال میں اضافہ کے لئے ایسی کمپنی کے شیئرز نہیں خریدنا چاہئے۔میں نے بھی اپنے مقالہ میں بچنے کو ہی افضل لکھا ہے۔

۶۔ایسی حلال کاروبار کرنے والی کمپنیوں کو بھی قانونی تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے اپنے سرمایہ کا کچھ حصہ ریزرو بینک میں جمع کرنا پڑتا ہے، یا سیکورٹی بانڈس خریدنے پڑتے ہیں، جن کی وجہ سے انہیں سود بھی ملتا ہے۔کیا ایسی کمپنیز کے شیئرز خریدنا جائز ہوگا؟

حضرت مولانا زبیر احمد قاسمی نے سوال نمبر ۵ اور ۶ کا جواب ایک ساتھ ہی لکھا ہے، اور انہوں نے مجبوری میں سودی قرض لینے کی اجازت دی ہے۔آخر میں لکھا ہے کہ اگر کمپنی سود لیتی ہے تو ناجائز ہے۔

ہمارے اکابر نے عرصہ قبل مال کی حفاظت کی خاطر روپیہ بینک میں رکھنے کی اجازت دی ہے، اور اس روپئے پر ملنے والے سود کو بلا نیت ثواب فقراء ومساکین پر خرچ کرنے کا حکم دیا ہے۔

جب اپنی رضامندی سے حفاظت کی خاطر بینک میں روپئے رکھنے کی اجازت دی گئی ہے تو حکومت کے قانون کے جبر کی وجہ سے بینک میں روپئے رکھنے کو مولانا ناجائز فرمادیں گے مجھے امید نہیں ہے۔

اس لئے مجھ کو محسوس ہوتا ہے کہ عام حالات میں جبر کے بغیر اگر کمپنی نے آمدنی میں اضافہ کی غرض سے سود حاصل کرلیا ہے تو اس کو مولانا ناجائز فرمارہے ہیں۔اور ظاہر ہے اس کے حرام ہونے میں کسی کو اختلاف نہیں ہوگا۔اور اگر کوئی دوسرا مقصود ہے تو مولانا خود ہی اس کی وضاحت فرمادیں گے۔

مولانا محمد ارشد قاسمی نے لکھا ہے کہ اگر معلوم ہو کہ منافع میں سود بھی ہے تو شیئرز خریدنا ناجائز ہوگا ورنہ جائز ہوگا۔حالانکہ اس کا علم تو اس وقت ہوگا جب کمپنی حساب دے گی کہ منافع میں سود کی آمیزش ہے یا نہیں، اگر ہے تو اس کی مقدار کیا ہے۔

باقی دوسرے مقالہ نگار حضرات نے اس صورت میں بھی شیئرز کی خریداری کو جائز قرار دیا ہے، مگر اس صورت میں چونکہ سود لینا ہے، اس لئے سود لینے کے عمل کے ساتھ مال میں سود کی آمیزش بھی ہے، اس طرح مال میں خبث بھی ہے۔اس کا حل انہوں نے یہ تجویز کیا ہے کہ کمپنی کی میٹنگ میں سودی کاروبار کے خلاف آواز اٹھائے یا خط کے ذریعہ اظہار بیزاری کردے، اور سود کی جتنی مقدار اس کے منافع میں شامل ہے اس کو بلا نیت ثواب صدقہ کردے۔

میں نے اپنے مقالہ میں ایک تجویز پیش کی ہے۔مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آپ حضرات کے سامنے بھی پیش کردوں۔

سوال نمبر ۵ اور ۶ پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک طرف سرکاری قانون کے جبر کی وجہ سے سرمایہ کا کچھ حصہ ریزرو بینک میں جمع کرنا پڑتا ہے یا بانڈس خریدنے پڑتے ہیں، اور اس پر بینک کی طرف سے سود ملتا ہے۔دوسری طرف انکم ٹیکس کے ظالمانہ قانون کی زد سے بچنے کے لئے اپنے کو مقروض دکھانا پڑتا ہے، اور اس کے لئے بینک سے قرض کی شکل میں رقم لینی پڑتی ہے، اور اس پر سود دینا ہوتا ہے۔

اس سلسلہ میں میری رائے ہے کہ اگر کمپنی مسلمانوں کی ہو یا اس پر مسلمانوں کا اثر ہو تو یہ طریقہ اختیار کیا جائے کہ روپئے ریزرو بینک میں جمع کرنے کی صورت میں جس قدر سود ملتا ہے اتنا روپیہ بطور سود لوٹانے کے لئے جتنا روپیہ بینک سے قرض لینا ہو لیا جائے۔

اس صورت میں جتنی رقم سود کے نام پر ملی گئی ہے وہ پوری کی پوری سود ہی کے نام پر بینک کو لوٹادی جائے گی، اور درحقیقت نہ سود کا لینا ہوگا اور نہ سود کا دینا ہوگا۔اور ان حضرات کو بھی شیئرز کی خریداری کی اجازت دینے میں کوئی اختلاف نہیں رہ جائے گا جو سود کے لین دین کی وجہ سے شیئرز کی خریداری کی اجازت نہیں دیتے۔☆☆☆

عرض مسئلہ:

سوال نمبر ۷، ۸، ۹، ۱۰، ۱۱

مولانا اختر امام عادل[1]

شیئرز کے سوال نمبر ۷ تا ۱۱ کا عرض مسئلہ مجھ سے متعلق ہے۔سوال نمبر ۷ سے ۱۱ تک یوں تو پانچ سوالات ہیں مگر ان کو سمیٹا جائے تو بنیادی طور پر صرف تین باتیں ہمارے لئے موضوع بحث بنتی ہیں جو درج ذیل ہیں:

۱۔ سودی قرض مفید ملک ہے یا نہیں؟ اور اس سے حاصل ہونے والے منافع کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

۲۔ کیا کمپنی کا بورڈ آف ڈائرکٹرس شیئرز ہولڈرس کا وکیل ہے؟ اور اس کا عمل شیئرز ہولڈرس کا عمل سمجھا جائے گا؟ اگر کوئی شیئرز ہولڈر بورڈ کے کسی عمل سے اپنے اختلاف کا اظہار کردے تو اس عمل کی ذمہ داری سے وہ بری ہوگا یا نہیں؟

۳۔ اگر کمپنی کے منافع میں سودی آمدنی بھی شامل ہو جس کی مقدار معلوم ہو تو کیا شیئر ہولڈر کے لئے منافع سے اس کے بقدر نکال کر صدقہ کردینا کافی ہوگا؟

شیئرز کے موضوع پر اکیڈمی کو کل ۴۰ مقالات موصول ہوئے، جن میں ۳۷ مقالہ نگاروں نے مذکورہ تین باتوں پر صراحتہً یا دلالۃً اپنی رائے ظاہر کی ہے، جبکہ تین حضرات نے ان سے کوئی تعرض نہیں کیا۔

ان ۳۷ حضرات کے اسمائے گرامی یہ ہیں:

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی، مولانا ابوالحسن علی، شمس پیرزادہ، مولانا سلطان احمد اصلاحی، مولانا عبدالجلیل قاسمی، مولانا جعفر ملی رحمانی، مولانا اخلاق الرحمن قاسمی، مفتی عبدالرحیم بھوپال، مفتی انور علی، مولانا تنویر احمد قاسمی، مولانا ابوسفیان مفتاحی، مولانا ابراہیم محمد بڑودوی، مفتی محمد عبیداللہ الاسعدی، مفتی عبدالرحمن پالنپوری، مولانا عبدالقیوم پالنپوری، مولانا عبداللطیف، مولانا محمد رضوان القاسمی، مفتی نظام الدین صاحب دیوبند، مولانا نذیر احمد قاسمی، مولانا اقبال احمد قاسمی، مولانا منظور احمد قاسمی، مولانا سمیع اللہ قاسمی، مولانا محمد نور القاسمی، مولانا محمد نعیم رشیدی، مولانا محمد مجاہد الاسلام حیدرآباد، مولانا محمد طاہر مظاہری، مولانا محمد قمر عالم سبیلی، مولانا ایوب سبیلی، مولانا محمد ارشد قاسمی، مولانا احمد نادر القاسمی، مولانا قمر الزماں ندوی، مفتی محبوب علی وجیہی، مولانا عبدالعظیم اصلاحی، مولانا ظفر الاسلام، مولانا شاہد القاسمی، حکیم ظل الرحمن، اور خود راقم الحروف۔

۷۔سودی قرض اور اس سے حاصل شدہ منافع کا مسئلہ:

مذکورہ مسائل میں سب سے پہلا مسئلہ (جو سوالنامہ کی ترتیب سے ساتویں نمبر پر ہے) سودی قرض کے مفید ملک ہونے یا نہ ہونے اور اس سے حاصل شدہ منافع کی شرعی حیثیت کا ہے۔تمام مقالات کے پڑھنے سے اس پر بنیادی طور پر تین رائیں سامنے آئی ہیں:

۱۔ ایک رائے جس کو صرف تین حضرات مفتی محبوب علی وجیہی، مولانا عبدالعظیم اصلاحی اور مولانا ظفر الاسلام نے اختیار کیا ہے۔وہ یہ ہے کہ سودی قرض خواہ بضرورت ہو یا بلا ضرورت مفید ملک نہیں ہے، اور نہ اس سے حاصل ہونے والے منافع حلال ہیں۔اس نقطہ نظر کی بنیاد یہ ہے کہ کمپنی بینکوں سے جو سودی قرضہ لیتی ہے وہ مجبوری میں لیتی ہے خوشی سے نہیں، اس لئے اس حد تک اس کو اجازت دی جاسکتی ہے۔رہا اس قرض سے انتفاع کا معاملہ تو یہ اگلا مرحلہ ہے جو جبری نہیں اختیاری ہے، اور اختیاری صورت میں مال حرام سے استفادہ کی اجازت نہیں دی جاسکتی، مگر یہ استدلال انتہائی کمزور ہے۔

(الف) اس لئے کہ اگر قرض سے انتفاع درست نہ ہو تو پھر قرض لینے کی ضرورت کیا ہوگی؟ اور سودی قرضہ لینے کی اجازت کیوں دی جائے گی؟ فقہاء نے بلا قید یہ قاعدہ بیان کیا ہے:

---

[1] ناظم وبانی، جامعہ رحمانی، سمستی پور۔

يجوز للمحتاج الاستقراض بالربح (الاشباه والنظائر)۔ ضرورت مند کے لئے سودی قرض لینا جائز ہے۔

اس میں کوئی پابندی نہیں لگائی گئی کہ قرض تو لے لو مگر اس سے انتفاع نہ کرنا، اس لئے کہ پھر تو اجازت کا یہ قاعدہ ہی بے معنی ہو کر رہ جائے گا۔

(ب) دوسری بات جس کی طرف ان حضرات کی نگاہ نہیں گئی، وہ یہ ہے کہ مسلمہ فقہی اصول ہے: حرمة العقد لا يستلزم حرمة المال۔ معاملہ کی حرمت سے مال کی حرمت لازم نہیں آتی۔

سودی قرض لینا اگر بدرجہ مجبوری نہ بھی ہو تو زیادہ سے زیادہ اس عمل کو غیر درست قرار دیا جائے گا، مگر اس عمل کے نتیجہ میں جو مال آیا ہے اس میں خباثت نہیں آئے گی، اس لئے کہ اس میں سود کی رقم شامل نہیں ہے، سود دیا گیا ہے لیا نہیں گیا ہے۔ حضرت تھانویؒ نے امداد الفتاوی (۱۷۰/۳) میں اسی طرز استدلال سے سودی قرض اور اس سے حاصل شدہ منافع کی حلت کا فتوی دیا ہے۔

۲۔ دوسری رائے جس کو تنہا مولانا شاہد القاسمی نے پیش کیا ہے، وہ یہ ہے کہ اگر سودی قرض بضرورت لیا گیا ہو تو وہ اور اس کے منافع حلال وطیب ہیں، اور اگر بلا ضرورت لیا گیا ہو تو وہ اور اس سے حاصل شدہ منافع دونوں حلال نہیں، دونوں قابل تصدق ہیں۔

انہوں نے اس مسئلہ کو بیع فاسد پر قیاس کیا ہے کہ کسی شخص نے کوئی چیز بیع فاسد کے طور پر خریدی تو اس عقد کو توڑنا ضروری ہے، لیکن اگر مشتری اس کو توڑنے کے بجائے کسی تیسرے کے ہاتھ وہ چیز فروخت کر دے تو اس سے مشتری اول کو جو منافع حاصل ہوں گے ان کا صدقہ کرنا ضروری ہے (رد المحتار)۔

اگر چہ اس استدلال میں کئی نقائص ہیں:

(الف) پہلی بات تو یہ ہے کہ اس میں استقراض کے مسئلہ کو بیع کے مسئلہ پر قیاس کیا گیا ہے جب کہ دونوں معاملات کی جنس اور احکام جداگانہ ہیں، اس لئے ایک کے کسی جزئیہ کو دوسرے کے لئے نظیر نہیں بنایا جاسکتا۔

(ب) دوسری بات یہ ہے کہ قیاس پوری طرح قرض والے مسئلہ پر منطبق بھی نہیں ہے، اس لئے کہ قرض والے مسئلہ میں مولانا موصوف نے ضرورت اور عدم ضرورت کی تفصیل کی ہے، جب کہ بیع فاسد کے مذکورہ جزئیہ میں اس طرح کی کوئی تفصیل نہیں ملتی۔

(ج) اور اصل بات یہ ہے کہ بیع فاسد کے مسئلہ کی بنیاد اس پر ہے کہ خبث کہاں مؤثر ہوتا ہے، مال متعین میں یا غیر متعین میں؟ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک اگر خبث فساد ملک کی بنا پر آیا ہو تو صرف مال متعین میں اثر انداز ہوگا غیر متعین میں نہیں، اور اگر عدم ملک کی بنیاد پر آیا ہو تو دونوں صورتوں میں اثر انداز ہوگا۔

بیع فاسد میں ملکیت حاصل ہوتی ہے مگر فساد کے ساتھ، اس بنا پر اگر مال مبیع متعین مثلاً باندی یا جانور وغیرہ ہو تو اس کے فروخت سے جو منافع ہوں گے وہ خبث سے خالی نہیں ہوں گے، اس بنا پر قابل تصدق ہوں گے۔ مگر وہیں اس کی صراحت بھی فقہاء کے یہاں ملتی ہے کہ بائع اول اس شئی کے ثمن (درہم ودینار یا کرنسی) سے جو منافع حاصل کرے گا وہ اس کے لئے طیب ہوں گے اس لئے کہ رقوم اور نقد متعین نہیں ہوتے (ہدایہ ۶۶/۳، رد المحتار ۱۴۵/۴)۔

کتب فقہ میں اس طرح کی کئی نظیریں ملتی ہیں کہ غیر متعین چیزوں پر فساد عقد یا فساد ملک کا اثر نہیں پڑتا، سودی قرض کا معاملہ بھی وہی ہے، سود دیکر قرض کے طور پر جو رقم حاصل ہوتی ہے، وہ بھی غیر متعین ہوتی ہے، اس لئے فساد عقد کا اثر بھی بیع فاسد کے اسی مذکورہ جزئیہ کی روشنی میں سودی رقم اور اس سے ہونے والی آمدنی پر نہیں پڑے گا، اس طرح یہ جزئیہ ان کی موافقت میں نہیں بلکہ ان کے خلاف میں جاتا ہے۔

۳۔ تیسری رائے جس کو باقی تمام مقالہ نگاروں نے اختیار کیا ہے وہ یہ ہے کہ بلا ضرورت سودی قرضہ لینے کا عمل درست نہیں، صرف ضرورت کے وقت اس کی اجازت ہے۔ لیکن دونوں ہی صورتوں میں اگر سود پر قرض لیا گیا تو یہ قرض مفید ملک ہوگا اور اس سے حاصل شدہ منافع شرعی طور پر حلال ہوں گے، البتہ ضرورت نہ ہونے کی صورت میں وہ اپنے عمل کی بنا پر گنہگار ہوگا، مگر اس کے عمل کی حرمت مال پر اثر انداز نہ ہوگی، یہی نقطۂ نظر زیادہ قوی اور راجح معلوم ہوتا ہے، اور اس کی کئی وجوہ واسباب ہیں:

(الف) فقہاء نے خود سود کے بارے میں لکھا ہے کہ قبضہ کے بعد اس پر ملکیت حاصل ہو جاتی ہے۔

و ظاهر ما في جمع العلوم و غيره ان المشتري يملك الدرهم الزائد إذا قبضه في ما إذا اشترى درهمين بدرهم فإنهم جعلوه من قبيل الفاسد وهكذا صرح به الأصوليون في بحث النهي (البحر الرائق ۱۲۵/۶)۔

اگر کوئی شخص دو درہم کو ایک درہم کے بدلہ خریدے تو قبضہ کے بعد وہ زائد درہم کا (جو اس نے بطور سود کے لیا ہے) مالک ہو جائے گا۔ فقہاء نے اس کو عقد فاسد کے قبیل سے شمار کیا ہے۔

تو جب خود سود قبضہ کے بعد ملکیت میں آجاتا ہے تو اس کی بنا پر جو قرض حاصل ہوگا وہ بدرجہ اولی ملکیت میں داخل ہوگا۔ جامع الرموز میں بھی اس کی صراحت ملتی ہے: الثانی کل عقد فیہ فضل والقبض فیہ مفید للملک (جامع الرموز ۲۲۷/۳)۔ یعنی ہر وہ معاملہ جس میں سود ہو قبضہ کے بعد مفید ملک بنتا ہے۔

(ب) مشہور فقہی اصول ہے: ویجوز للمحتاج الاستقراض بالربح (الاشباہ والنظائر) کہ ضرورت مند کے لئے سودی قرض لینے کی اجازت ہے۔ اس سے بھی سودی قرض کے مفید ملک اور اس کی آمدنی کے حلال ہونے کا ثبوت ملتا ہے۔

(ج) سودی قرض لینے کا عمل فی نفسہ کتنا ہی غیر درست سہی، مگر اس عقد کے نتیجہ میں جو مال آئے گا وہ خبث سے پاک ہوگا، اس لئے کہ سود کا عنصر اس میں شامل نہیں۔ اور مشہور مسلمہ اصول ہے: حرمۃ العقد لا یستلزم حرمۃ المال (الاشباہ والنظائر) عقد کی حرمت مال کی حرمت کو مستلزم نہیں۔

خصوصاً جب ضرورت کے وقت سودی قرض لیا جائے تو عمل بھی جائز ہو جاتا ہے۔

(د) اور اگر ہم مخصوص ہندوستانی کمپنیوں کے تناظر میں دیکھیں تو یہاں یہ سارے معاملات براہ راست شیئر ہولڈرس نہیں کرتے بلکہ کمپنیاں کرتی ہیں اور وہی سودی قرض لے کر نفع حاصل کرتی ہیں، اور پھر ان کے توسط سے شیئرز ہولڈرس کو منافع میں حصہ ملتا ہے۔ اس صورت میں یہاں امام ابوحنیفہؒ کا وہ مشہور فقہی قاعدہ بھی جاری ہو سکتا ہے کہ بیع وشراء میں حقوق وکیل کی طرف لوٹتے ہیں موکل کی طرف نہیں، اسی طرح دوسرا ضابطہ کہ تبدل ملک سے فساد رفع ہو جاتا ہے۔

وفی صورۃ إرباء الوکیل کان البیع فاسدا لا یضرنا فإن الوکیل بالبیع کالعاقد لنفسہ وفساد البیع فی حق الذمی لا یستلزم حرمۃ الربح علی المسلم فإن تبدل الملک یدفع خبث الفساد وأما علی قول من جوز الربوا بین المسلم والکافر فی دار الحرب فالأمر أوسع (امداد الفتاوی ۴۹۷/۳، وکذا فی نظام الفتاوی ۴۰۰/۱)۔

اس لحاظ سے مسلم حاملین حصص پر سودی قرض کے عمل کی ذمہ داری نہیں آئے گی، اور منافع تبدل ملک کی وجہ سے حلال قرار پائیں گے۔

ان دلائل کی روشنی میں اکثر مقالہ نگاروں نے جو موقف اختیار کیا ہے وہی مضبوط معلوم ہوتا ہے۔

۸، ۹۔ کمپنی کے بورڈ آف ڈائرکٹرس اور شیئرز ہولڈرس کا باہمی رشتہ:

دوسرا مسئلہ (جو سوالنامہ میں آٹھواں اور نواں سوال ہے) یہ ہے کہ کمپنی کے بورڈ آف ڈائرکٹرس اور شیئرز ہولڈرس کے مابین تعلق کی نوعیت کیا ہے۔ (۱) یعنی کیا بورڈ آف ڈائرکٹرس تمام شیئر ہولڈرس کا وکیل ہے؟ اگر ہے تو کیا بورڈ کے ہر عمل کی نسبت شیئرز ہولڈرس کی طرف بھی کی جائے گی؟ (۲) اگر کوئی شیئرز ہولڈر بورڈ کے کسی فیصلہ سے اختلاف کرے، یہ اختلاف خواہ بورڈ کے اکثریتی فیصلہ پر اثر انداز ہو یا نہ ہو، لیکن کیا فی نفسہ اس شیئرز ہولڈر کو بورڈ کے اس عمل کی ذمہ داری سے بری کردے گا۔

اس سوال میں مسئلہ کے دو پہلو میں سے ایک پہلو پر تمام مقالہ نگاروں کا اتفاق ہے کہ بورڈ آف ڈائرکٹرس شیئرز ہولڈرس کا وکیل ہے اور بورڈ کا عمل شیئرز ہولڈرس کا عمل سمجھا جائے گا، اس لئے کہ شیئرز کی خرید کو اگر شرکت عنان سے قریب تر قرار دیا جائے جیسا کہ حضرت تھانویؒ اور بہت سے علماء کا خیال ہے تو فقہاء کی تصریح کے مطابق شرکت عنان کی بنیاد وکالت پر ہوتی ہے۔

وأما شرکۃ العنان فتنعقد علی الوکالۃ دون الکفالۃ (ہدایہ مع فتح القدیر ۱۷۶/۶)۔

اور اگر اس کو مضاربت مانا جائے جیسا کہ کچھ لوگوں کا خیال ہے، تو مضاربت کو بھی فقہاء نے توکیل ہی قرار دیا ہے۔

المضاربۃ توکیل بالعمل لتصرفہ بأمرہ (در مختار ۴۸۴/۴)۔

اور اگر اسے شرکت کی ایک نئی قسم قرار دی جائے تو بھی چونکہ تمام شیئرز ہولڈرس نے بورڈ کو انتظامی امور کے لئے اپنا وکیل اور نمائندہ منتخب کیا ہے، اس لئے

بورڈ بہر حال تمام شیئرز ہولڈرس کا وکیل رہے گا، اور اس کا عمل شیئرز ہولڈرس کا عمل سمجھا جائے گا، البتہ مولانا ابوالحسن علی کے یہاں اس کی کچھ تفصیل ملتی ہے۔ وہ یہ کہ جو چیز حصہ خریدنے کے بعد خریدی جائے گی اس میں تو وہ کارکنان حصہ دار کے وکیل ہوں گے، اور جو پہلے سے موجود ہے اس میں وہ کارکنان خود بائع اور حصہ دار مشتری ہوگا، اور یہ بیع تعاطی ہے جس میں بائع ثمن پر بلاواسطہ قابض ہو گیا اور مشتری مبیع پر بواسطہ بائع کے کہ وہ اس کا وکیل بھی ہے، قابض ہو گیا (بحوالہ امداد الفتاوی ۳/۴۹۰)۔

البتہ مسئلہ کا دوسرا پہلو اختلافی ہے، اور وہ یہ ہے کہ اگر کوئی شیئرز ہولڈر بورڈ کے کسی فیصلہ سے اختلاف ظاہر کرے تو کیا اس فیصلہ کی ذمہ داری سے وہ بری قرار پائے گا؟ اس مسئلہ میں بنیادی طور پر دو طرح کے خیالات ملتے ہیں: ایک خیال یہ ہے کہ اختلاف رائے ظاہر کردینے سے شیئرز ہولڈر بری ہو جائے گا۔ دوسرا خیال یہ ہے کہ بری نہیں ہوگا۔ یہی دو مرکزی خیال ہیں۔ ان کے علاوہ ذیلی طور پر دو رائیں اور بھی ملتی ہیں:

(الف) جناب شمس پیرزادہ صاحب کا خیال یہ ہے کہ چونکہ شیئرز ہولڈر کا اختلاف اکثریت کے فیصلہ کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں رکھتا، اس لئے اختلاف کرنے کی کوئی ضرورت نہیں، مجبوری میں بورڈ کے فیصلہ کو مان لینے کی اجازت ہے۔

(ب) دوسرا خیال مولانا سلطان احمد اصلاحی نے پیش کیا ہے، وہ یہ کہ اگر کمپنی بینک سے سودی رقم حاصل کرتی ہے تو اس سے اختلاف کرنے کی ضرورت ہی نہیں، اس لئے کہ بینک کا سود درحقیقت سود نہیں ہے بلکہ وہ نفع اور انٹرسٹ ہے جو جائز ہے۔

مگر یہ دونوں خیالات ہماری بحث سے خارج ہیں، اس لئے کہ گذشتہ سمیناروں میں یہ طے ہو چکا ہے کہ بینک کا سود حرام ہے، خواہ اسے نفع، انٹرسٹ یا کوئی بھی نام دے دیا جائے۔ اسی طرح پیرزادہ صاحب کا یہ خیال کہ چونکہ اختلاف موثر نہیں، اس لئے اختلاف کرنے کی ضرورت نہیں، یہ بھی خارج از بحث ہے، اس لئے کہ بحث اس سے نہیں کہ اس کا اختلاف اکثریت کے فیصلہ پر اثر انداز ہوگا یا نہیں؟ بلکہ بحث اس سے ہے کہ کیا اس اختلاف سے شیئرز ہولڈر اپنی ذمہ داری سے سبکدوش قرار پائے گا یا نہیں؟

۳۵ مقالہ نگاروں نے اس کے متعلق اپنی رائے ظاہر کی ہے۔ جن میں پانچ حضرات کا خیال یہ ہے کہ اختلاف کرنے کے بعد شیئرز ہولڈر اپنی ذمہ داری سے سبکدوش نہیں ہوگا، ان کے اسمائے گرامی درج ذیل ہیں:

مفتی محمد عبید اللہ اسعدی، مولانا عبد الجلیل قاسمی، مفتی عزیز الرحمن بجنوری، مولانا مجاہد الاسلام، مولانا شاہد القاسمی۔

ان حضرات کا استدلال یہ ہے کہ جب کمپنی ایک نظام کے تحت چل رہی ہے، اور یہ معلوم ہے کہ وہ کوئی ناجائز عمل کر رہی ہے یا کسی سودی معاملہ میں ملوث ہے اس کے باوجود اس کے شیئرز خریدنا اور اس کی وکالت قائم رکھتے ہوئے اختلاف کا اظہار کرنا ایک بے معنی سی بات ہے۔ امداد الفتاوی میں حضرت تھانویؒ کا ایک فتوی بھی اسی مضمون کا موجود ہے (دیکھئے: ۳/۱۳۰)۔

مگر یہ استدلال محل نظر ہے، کیوں کہ اس میں یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ وکیل کبھی موکل کی مرضی کے خلاف کر ہی نہیں سکتا، حالانکہ یہ صحیح نہیں، جب کوئی فرد یا ادارہ کسی شخص کی طرف سے کسی پھیلے ہوئے کام کا وکیل بنتا ہے تو اس میں بعض ایسی جزئیات کا آجانا بعید از امکان نہیں جو موکل کی مرضی کے مطابق نہ ہوں، ایسے موقعہ پر طریق کار یہ نہیں اختیار کیا جاتا کہ وکیل کی وکالت ختم کردی جائے بلکہ یہ اختیار کیا جاتا ہے کہ خلاف مرضی چیزوں کی ذمہ داری (جب کہ وکیل کو خلاف مرضی ہونا معلوم ہو) موکل پر نہیں آتی، اور وہ اس حد تک خود ذمہ دار ہوتا ہے، جیسا کہ حضرت مولانا مفتی نظام الدین صاحب نے اپنے مقالہ میں اس کی صراحت کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ فقہ کی کتاب الوکالۃ میں اس کی تصریح ہے کہ جب موکل کسی کام کے کرنے سے منع کردے تو وکیل کا معاملہ موکل کی جانب منسوب نہیں ہوگا محض وکیل تک محدود رہے گا۔

مثلاً: الأصل أن الموكل إذا قيد على وكيله فإن كان مقيدا اعتبر مطلقا وإلا لا۔ (الاشباہ والنظائر کتاب الوكالة هكذا في قواعد الفقه ص۷۱، ناقلا عن السرخسي وهكذا المستفاد من الهندية ايضا ۳/۵۶۷ كتاب الوكالة)۔

اور رہا حضرت تھانویؒ کا فتوی تو خود امداد الفتاوی میں اس کے خلاف بھی ایک فتوی موجود ہے جس میں حضرتؒ نے تجویز پیش کی ہے کہ شیئرز ہولڈر اپنی براءت کا اعلان کردے تو کافی ہے، اور غالب گمان یہ ہے کہ یہ دوسرا فتوی بعد کا ہے، جو حضرت کا راجح نقطۂ نظر تھا۔

مذکورہ چھ اصحاب قلم کے علاوہ بقیہ تمام مقالہ نگاروں نے اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ بورڈ کے سودی عمل سے شیئرز ہولڈر اپنی براءت کا اعلان کردے تو وہ اس عمل کی ذمہ داری سے بری ہو جائے گا۔ اس موقف کے کچھ دلائل ماقبل میں گذر چکے ہیں اور کچھ نئے دلائل جن سے اس موقف کی ترجیح و تقویت ہوتی ہے یہ ہیں:

(الف) شیئرز ہولڈر نے کمپنی کو تجارت کے باب میں وکیل بنایا ہے نہ کہ سودی قرض لینے کے معاملہ میں، اور اگر اس معاملہ میں وکالت ہو بھی تو یہ دلالۃً ہوگی، لیکن جب صراحت کے ساتھ وہ اختلاف کردے تو صراحت دلالت پر مقدم ہوگی۔

(ب) فقہاء نے تصریح کی ہے کہ وکیل کی وکالت انہی امور تک محدود رہے گی جو مؤکل کی مرضی کے مطابق ہوں، بقیہ چیزوں میں خود وکیل ذمہ دار ہوگا مؤکل اس سے بری الذمہ ہوگا، اور ان اختلافی امور کی حد تک وکیل معزول سمجھا جائے گا، جیسا کہ درمختار کی اس تصریح سے معلوم ہوتا ہے:

فلو اشتراه بغير النقود أو بخلاف ماسمى المؤكل له من الثمن وقع الشراء للوكيل لمخالفته أمره وينعزل فى ضمن المخالفة (در مختار على رد المحتار ۴،۴۵۰)۔

(ج) خصوصاً جب وکیل غیر مسلم ہو اور معاملہ شرکت یا مضاربت کا ہو تو فقہاء کی تصریح کے مطابق خلاف شرع امور کی ذمہ داری (جو مؤکل کی مرضی کے خلاف ہوں) خود وکیل پر آتی ہے، اس لئے کہ بیع وشراء میں حقوق عقد عاقد کی طرف لوٹتے ہیں اور تبدل ملک سے خبث دور ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ عالمگیری کے اس جزئیہ سے سمجھ میں آتا ہے جو امداد الفتاوی میں نقل کیا گیا ہے:

إذا دفع المسلم إلى النصرانى مالا مضاربة بالنصف فهو جائز إلا أنه مكروه فإن اتجر فى الخمر والخنزير فربح جاز على المضاربة فى قول أبى حنيفة وينبغى للمسلم أن يتصدق بحصته من الربح (عالمگیری بحواله امداد الفتاوی ۳،۴۹۷)۔

ان دلائل کی بنیاد پر اکثر مقالہ نگاروں نے جو خیال پیش کیا ہے وہی زیادہ درست معلوم ہوتا ہے۔

۱۰،۱۱۔ سود اور اس سے حاصل شدہ منافع کے تصدق کا مسئلہ:

یہاں دو مسئلے زیر بحث ہیں:

(۱) ایک یہ کہ اگر کمپنی کے منافع میں سود بھی شامل ہو اور اس کی مقدار معلوم ہو تو کیا شیئرز ہولڈرس کے لئے منافع سے اس کے بقدر نکال کر صدقہ کر دینا کافی ہوگا؟

(۲) دوسرا مسئلہ سود سے حاصل شدہ آمدنی کا ہے کہ اگر کمپنی سود کی رقم کو کاروبار میں لگا کر اس سے نفع اٹھاتی ہے تو اس نفع کا کیا حکم ہے؟ کیا منافع میں سے سود اور اس سے حاصل شدہ نفع دونوں صدقہ کرنا ہوگا یا صرف سود کے بقدر نکال کر صدقہ کرنا کافی ہوگا؟

پہلے مسئلہ میں مولانا سلطان احمد اصلاحی کے علاوہ (جن کا نقطہ نظر یہ ہے کہ بینک کا سود جائز ہے اس لئے اس کے تصدق کا مسئلہ نہیں آتا) باقی تمام مقالہ نگاروں کا اتفاق ہے کہ منافع میں سے سود کے بقدر نکال دینا کافی ہوگا۔

اس لئے کہ کئی فقہی نظائر سے ثابت ہوتا ہے کہ اگر مال حلال کے ساتھ مال حرام مل جائے اس طور پر کہ دونوں کے درمیان امتیاز مشکل ہو اور مال حلال کی مقدار غالب ہو تو غیر معین طور پر اس میں سے کچھ نکال دینا پورے مال کی تطہیر کے لئے کافی ہو جاتا ہے۔ جیسے کہ گیہوں گاہتے وقت اگر جانور اس پر پیشاب کر دے اور یہ معلوم نہ ہو کہ ناپاک گیہوں کون سا ہے، تو اگر مشترک ہو تو تقسیم کر دینے سے اور غیر مشترک ہو تو لاعلی التعیین اس میں سے کچھ نکال دینے سے پورا گیہوں پاک ہو جاتا ہے، اسی طرح وکیل اگر کئی لوگوں کے مال سے تجارت کرے اور اس میں ایک دوسرے کے دراہم کو خلط ملط کر دے یا سودی رقم اس میں شامل کر دے تو تقسیم کے بعد ہر ایک کا حصہ پاک قرار پاتا ہے (امداد الفتاوی ۳؍۴۹۷)۔

ہدیہ کے بارے میں فقہاء نے تصریح کی ہے کہ ایسے شخص کا ہدیہ قبول کیا جا سکتا ہے جس کے پاس حلال وحرام دونوں طرح کے مال ہوں، بشرطیکہ مال حلال غالب ہو (فتاوی خانیہ علی الہندیہ ۳؍۴۰۰)۔

علامہ ابن قیمؒ کی درج ذیل عبارت سے یہی حکم بصراحت ثابت ہوتا ہے: إذا خالطه درهم حرام أو أكثر أخرج مقدار الحرام وحل له الباقى بلا كراهة سواء كان المخرج عين الحرام أو نظيره لأن التحريم لم يتعلق بذات الدرهم وجوهر، وأما تعلق بجهة الكسب فيه فإذا خرج نظيره من كل وجه لم يبق لتحريم ماعداه معنى (بدائع الفوائد لابن قيم ۳،۱۵۷)۔

اس عبارت کا حاصل یہی ہے کہ رقوم چونکہ متعین نہیں ہوتیں اس لئے اگر ان میں حرام مقدار تھوڑی سی شامل ہو جائے تو اسی کے بقدر رقم نکال دی جائے، اس سے بقیہ پوری رقم حلال ہو جائے گی، خواہ بعینہ حرام والی رقم نکالی گئی ہو یا اس جیسی کوئی اور، اس لئے کہ فی نفسہ کسی معین درہم میں حرمت نہیں ہے، حرمت عمل و

کسب کی جہت سے آئی ہے۔

ماقبل میں نصرانی کو مضاربت یا شرکت کے لئے وکیل بنانے کا جزئیہ مذکور ہوا ہے، اس سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ اگر کوئی وکیل (خصوصاً غیر مسلم ہو تو کیا کہنا) منافع میں سود لیتا ہے اور جائز رقم میں اس کو خلط کر دیتا ہے تو تقسیم کے بعد جو حصہ رب المال کو ملے گا وہ پاک قرار دیا جائیگا، اگر چہ مسلمان کے لئے احتیاط یہ ہے کہ اتنے منافع سے سود کے بقدر صدقہ کر دے (عالمگیری) اس لئے کہ امام ابوحنیفہؒ کے اصول کے مطابق خلط دلیل استہلاک ہے، اور تقسیم یا اس میں سے کچھ اخراج مطہر ہے (امداد الفتاوی ۳/۴۹۷)۔

اس طرح کی متعدد نظیریں کتب فقہ میں ملتی ہیں۔ یہ تمام نظائر ہمارے یہ سمجھنے کے لئے کافی ہیں کہ کمپنی نے منافع میں سود کی رقم جو شامل کر دی ہے اس سے ہمارا پورا نفع ناپاک نہیں ہوتا، بلکہ ایک تو تقسیم کے بعد ہمیں اپنا جو حصہ ملے گا یہ تطہیر کے لئے خود کافی ہے، اس پر بھی اگر سود کے بقدر صدقہ کر دیا جائے تو اس کی طہارت میں کیا شبہ باقی رہ جائے گا۔

رہا یہ کہ یہ صدقہ کرنا لازم ہے یا غیر لازم؟ تو اس کی وضاحت عام طور پر لوگوں نے نہیں کی ہے، زیادہ تر مقالہ نگاروں نے صرف اس قدر پر اکتفا کیا ہے کہ صدقہ کرنا کافی ہوگا، البتہ مولانا زبیر احمد قاسمی، مولانا ابوالحسن علی، اور مولانا احمد دیولوی نے اس کی وضاحت کی ہے کہ صدقہ کرنا لازم نہیں ہے، یہ صرف احتیاط اور تقوی کا تقاضا ہے۔ جبکہ دوسری طرف مفتی محمد عبید اللہ اسعدی، مولانا عبدالقیوم پالنپوری، مولانا تنویر احمد قاسمی اور مولانا قمر عالم سبیلی نے اس کو لازم قرار دیا ہے۔

غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ احتیاط و تقوی والی بات ہی زیادہ درست ہے۔

اس لئے کہ ابھی جن دلائل و نظائر کا تذکرہ کیا گیا ان سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ غیر معینہ اموال میں حرام مغلوب کا حلال غالب کے ساتھ ایسا اختلاط جس میں امتیاز باقی نہ رہے، باعث استہلاک ہوتا ہے، اور مال مشترک ہونے کی صورت میں اس کی تقسیم اور غیر مشترک ہونے کی صورت میں حرام کے بقدر نکال دینا باعث تطہیر ہو جاتا ہے۔ یہاں کمپنی کی صورت حال بھی یہی ہے کہ کمپنی کا سرمایہ اور منافع مشترک ہیں، اس لئے تقسیم کے بعد حصہ دار کو جو منافع ملے گا وہ طیب و طاہر ہوگا، اس لئے صدقہ کرنا اب لازم نہیں رہا، صرف احتیاط یہ ہے کہ سود کی مقدار اگر معلوم ہو تو صدقہ کر دیا جائے۔

اسی طرح مضاربت کے سلسلہ میں غیر مسلم وکیل کی بحث میں گذر چکا ہے کہ سودی معاملات میں اس کا فعل مؤکل کی طرف منسوب نہ ہوگا، اور جب تک کہ خالص حرام تجارت مثلاً شراب و خنزیر کی نہ کرے اس وقت تک اس پر اپنے ملے ہوئے حصہ سے صدقہ کرنا لازم نہیں ہوگا جیسا کہ حضرت مولانا ظفر احمد تھانوی نے عالمگیری کا مذکورہ جزئیہ نقل کرنے کے بعد تحریر فرمایا ہے کہ "تصدق کا حکم ورع و تقوی پر محمول ہے جیسا کہ عبارت سے ظاہر ہے، اور اگر وجوب پر محمول کیا جاوے تو یہ اس وقت ہے جب کہ شراب اور خنزیر کی بیع ہو اور اس کے علاوہ کی نہ ہو (یعنی صرف حرام ہی حرام ہو اختلاط حلال و حرام نہ ہو) (امداد الفتاوی ۳/۴۹۷)۔

جناب شمس پیرزادہ صاحب اور حکیم ظل الرحمن صاحب کا کہنا یہ ہے کہ کمپنیوں کو بینک سے جتنا سود ملتا ہے اس سے کہیں زیادہ دینا پڑتا ہے۔ اس لئے جتنا سود ملے اس کو دینے میں محسوب کر دینا چاہئے، سود حصہ داروں میں تقسیم کرنے اور اس سے منافع حاصل کرنے کی بات محض فرضی ہے جس کا واقعہ سے کوئی تعلق نہیں۔

۱۱۔ دوسرا مسئلہ سود سے حاصل شدہ منافع کا ہے، ان منافع کی حلت و حرمت اور ان کے قابل تصدق ہونے کے متعلق بنیادی طور پر مقالات میں دو طرح کے خیالات پائے جاتے ہیں:

۱۔ ایک خیال جس کو مولانا عبید اللہ اسعدی، مفتی عبدالرحمن پالنپوری، مولانا عبدالقیوم پالنپوری، مولانا تنویر احمد قاسمی اور مولانا قمر عالم سبیلی نے اختیار کیا ہے، یہ ہے کہ سود اور اس سے حاصل شدہ تمام منافع حرام ہیں ان کا صدقہ کرنا لازم ہے، ان حضرات نے درج ذیل جزئیات سے استدلال کیا ہے:

(الف) شامی میں ہے: الحرمة تتعدى (۵/۹۸) اس کا تقاضہ ہے کہ حرام سے جو منافع حاصل ہوں گے وہ بھی حرام ہوں گے۔

(ب) خبث کے متعدی ہونے کا ثبوت شامی کی ایک اور عبارت سے ملتا ہے: الخبث لفساد الملك إنما يعمل فيما يتعين لا فيما لا يتعين وأما الخبث لعدم الملك كالغصب فيعمل فيهما كما بسطه خسرو وابن كمال (شامي ۵/۹۷)۔ (فساد ملک کی بنا پر جو خبث ہوتا ہے وہ متعین میں اثر کرتا ہے غیر متعین میں نہیں، اور جو خبث عدم ملک کی بنا پر پیدا ہوتا ہے وہ متعین و غیر متعین دونوں قسم کے اموال میں اثر انداز ہوتا ہے) اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ خبث اپنی حد تک محدود نہیں رہتا وہ متعدی ہوتا ہے۔

(ج) ایک استدلال غصب کے اس مسئلہ سے بھی کیا جاتا ہے جو ہدایہ وغیرہ میں مذکور ہے کہ کسی شخص نے ایک ہزار روپئے غصب کر کے اس سے ایک باندی خریدی اور پھر اس کو فروخت کر کے ایک ہزار کا نفع حاصل کیا، پھر دو ہزار میں دوسری باندی خریدی اور اس کو تین ہزار میں بیچا تو یہ نفع جو اس نے حاصل کیا ہے اس کے لئے حلال ہوگا یا نہیں؟ حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ اور امام محمدؒ کے نزدیک حلال نہیں ہوگا، اس کا صدقہ کرنا ضروری ہے۔ اور امام ابو یوسفؒ کے نزدیک حلال ہوگا۔ صاحب ہدایہؒ نے طرفینؒ کے قول کو مختار قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ ہمارے مشائخ کے نزدیک کسی بھی حال میں یہ نفع حلال نہیں ہے (ہدایہ ۳/۴۵۶)۔

مگر ان دلائل میں سے کوئی دلیل کمپنی کے مسئلہ پر منطبق نہیں آتی۔

اس لئے کہ مذکورہ تمام صورتوں میں خبث یا حرمت کے متعدی ہونے کی بات جو کہی گئی ہے وہ اموال متعینہ میں ہے غیر متعینہ میں نہیں، جبکہ کمپنی سے حاصل شدہ منافع رقم کی شکل میں ملتے ہیں یا جس سود سے منافع حاصل کئے جاتے ہیں وہ بھی رقم کی شکل میں ہوتا ہے، اور فقہاء کے مطابق رقوم اور دراہم و دنانیر متعین نہیں ہوتے۔

البتہ عدم ملک کی بنا پر جو خبث پیدا ہوگا وہ غیر متعینہ میں بھی متعدی ہوگا، مگر فقہاء کی صراحت کے مطابق سودی عقد، عقد فاسد ہے، اور عقد فاسد مفید ملک ہوتا ہے (البحر الرائق ۶/۱۲۵)۔ زیادہ سے زیادہ اس میں فساد ملک ہوتا ہے اور فساد ملک کی بنا پر جو خبث آتا ہے وہ صرف اموال متعینہ میں اثر انداز ہوتا ہے غیر معینہ میں نہیں، جب کہ کمپنی کے لئے اموال غیر متعین ہوتے ہیں اس لئے ان میں اثر انداز ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

۲۔ دوسرا نقطہ نظر جس کو بقیہ تمام علماء نے اختیار کیا ہے وہ یہ ہے کہ سود سے حاصل شدہ منافع کا تصدق لازم نہیں، مگر احتیاط یہی ہے کہ سود کے ساتھ ان کو بھی صدقہ کر دیا جائے، اس لئے کہ:

(الف) اولاً خود سود پر بھی قبضہ کے بعد ملکیت ثابت ہو جاتی ہے تو اس سے جو منافع حاصل ہوگا ان پر بدرجہ اولی ملکیت ثابت ہوگی، اور خبث ان تک اس لئے متعدی نہیں ہوگا کہ یہ غیر متعین ہیں اور فساد ملک کی بنا پر جو خبث آتا ہے وہ غیر متعین میں اثر انداز نہیں ہوتا۔

(ب) علامہ شامی کی درج ذیل عبارت بھی اس سلسلہ میں کافی چشم کشا ہے: رجل اکتسب مالا من حرام ثم اشتری فهذا علی خمسة أوجه: إما ان دفع تلك الدراهم إلی البائع أولا ثم اشتری منه بها أو اشتری قبل الدفع بها و دفعها أو اشتری قبل الدفع بها و دفع غيرها أو اشتری مطلقا و دفع تلك الدراهم أو اشتری بدراهم أخر و دفع تلك الدراهم۔ قال الكرخي في الوجه الأول والثاني: لا يطيب وفي الثلاث الأخيرة يطيب، وقال أبو بكر: لا يطيب في الكل، لكن الفتوی علی قول الكرخي دفعا للحرج عن الناس (رد المحتار ۴/۲۳۴)۔

یعنی کسی شخص نے مال حرام کمایا پھر اس نے خرید کیا تو اس کی پانچ صورتیں ہیں:

(۱) یا تو پہلے بائع کو دراہم دیئے پھر اس سے اس کے بدلے کچھ خرید کیا (۲) یا انہیں دراہم کے بدلہ پہلے خرید کیا پھر دراہم دیئے (۳) یا انہیں دراہم سے خرید کیا اور بعد کو اس کے بجائے دوسرا درہم دے دیا (۴) یا مطلقاً کسی خاص درہم کی تعیین کے بغیر خرید کیا اور عوض میں وہی دراہم ادا کر دیئے (۵) یا دوسرے دراہم متعین کئے اور ان کے بجائے یہ درہم دیئے۔ امام کرخی نے کہا کہ پہلی اور دوسری صورت میں خرید کی ہوئی چیز اس کے لئے طیب نہیں، باقی تینوں صورتوں میں طیب ہیں، اور علامہ ابوبکرؒ نے کہا کہ کسی صورت میں طیب نہیں، لیکن لوگوں سے حرج دور کرنے کے لئے امام کرخی کے قول پر فتوی ہے۔

اس عبارت میں مذکورہ پانچ قسموں میں سے پہلی دو قسموں میں دراہم قبضہ اور بعینہ ادائیگی کی بنا پر چونکہ متعین ہیں اس لئے خبث کو متعدی مانا گیا اور نفع کو طیب نہیں کہا گیا لیکن بقیہ تین صورتوں میں تعیین نہیں ہے، اس لئے مفتی بہ قول کے مطابق نفع کو طیب قرار دیا گیا اگر چہ احتیاط اپنی جگہ درست ہے۔

(ج) اسی طرح ما قبل میں گذر چکا ہے کہ خلط دلیل استہلاک ہے اور تقسیم مطہر ہے، اس لحاظ سے کمپنی سودی آمدنی کو کاروبار میں شامل کر کے جو نفع اٹھاتی ہے تقسیم کے بعد شیئرز ہولڈرس کو اس میں جو حصہ ملے گا طاہر قرار پائے گا۔ احتیاطاً صدقہ کرنا الگ سی بات ہے جیسا کہ علامہ شامیؒ کی اس عبارت سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے:

وإن كان مالا مختلطا مجتمعا من الحرام ولا يعلم أربابه ولا شيئا منه بعينه حل له حكما والأحسن ديانة التنزه عنه (رد المحتار ۵/۲۳۵)۔ (اگر حلال و حرام مل جائے اور حرام کے مالک کا پتہ نہ ہو تو حکماً اس کے لئے پورا مال حلال رہے گا (بشرطیکہ حلال غالب رہا ہو) اگر چہ ایسے مال سے بچنے ہی میں احتیاط ہے)۔ ان وجوہات کی بنا پر عامۃ العلماء اور اکثر مقالہ نگاروں نے جو نقطہ نظر اختیار کیا ہے وہی زیادہ مضبوط اور راجح معلوم ہوتا۔ ☆☆☆

عرض مسئلہ:

سوال نمبر ۱۲، ۱۳، ۱۴، ۱۵، ۱۶، ۱۷

مولانا عتیق احمد بستوی [1]

شیئرز کے سوال نمبر ۱۲ تا ۱۷ کے جوابات کا عرض مسئلہ مجھ سے متعلق کیا گیا ہے، اسلامک فقہ اکیڈمی کی طرف سے شیئرز کے موضوع پر جو مقالات اور جوابات میرے پاس بھیجے گئے ان کی تعداد ۴۲ ہے، گیارہ مقالات ہمارے ان نوجوان اور ہونہار فضلاء مدارس کے ہیں جو دارالعلوم سبیل السلام حیدرآباد یا دارالعلوم حیدرآباد کے شعبہ تخصص فی الفقہ والافتاء میں زیر تربیت ہیں۔ ۲۹ مقالات وجوابات معزز علماء اور اصحاب افتاء کے ہیں، ایک جواب نامہ جناب حکیم ظل الرحمن صاحب کا ہے۔

اصحاب مقالات وجوابات علماء واصحاب افتاء کے اسماء گرامی یہ ہیں:

حضرت مولانا مفتی نظام الدین صاحب دیوبند، مولانا مفتی عزیز الرحمن بجنوری، مفتی محمد عبید اللہ الاسعدی، مولانا خالد سیف اللہ رحمانی، مولانا محمد رضوان القاسمی، مولانا اختر امام عادل، مولانا ابوالحسن علی گجرات، مولانا احمد دیولوی، مولانا عبدالقیوم پالنپوری، مولانا عبدالجلیل قاسمی، مولانا مفتی محبوب علی وجیہی، مولانا سلطان احمد اصلاحی، مفتی شکیل احمد سیتاپوری، مولانا عبدالعظیم اصلاحی، مولانا مفتی انور علی اعظمی، مفتی عبدالرحمن پالنپوری، مولانا عبداللطیف، مولانا عبدالرحیم، مولانا ابراہیم بڑودوی، مولانا شمس پیرزادہ، مولانا منظور احمد قاسمی، مولانا ابوسفیان مفتاحی، مولانا اخلاق الرحمن قاسمی، مولانا نازبیر احمد قاسمی، مولانا اقبال احمد قاسمی، مولانا محمد جعفر ملی، مولانا تنویر احمد قاسمی، مولانا سمیع اللہ قاسمی، مولانا عتیق احمد قاسمی۔

دارالعلوم سبیل السلام حیدرآباد اور دارالعلوم حیدرآباد میں زیر تربیت جن ہونہار فضلاء مدارس نے سوالنامہ بابت شیئرز کے جوابات لکھے ہیں، ان کے نام یہ ہیں:

مولانا نعیم احمد رشیدی، مولانا محمد نور القاسمی، مولانا مجاہد الاسلام قاسمی، مولانا محمد طاہر مظاہری، مولانا محمد ابرار خاں ندوی، مولانا محمد قمر الزماں ندوی، مولانا احمد نادر القاسمی، مولانا سید محمد ایوب سبیلی، مولانا محمد ارشد قاسمی، مولانا محمد شاہد قاسمی، مولانا محمد عالم سبیلی۔

۱۲۔ شیئرز کی تجارت کرنا کیسا ہے؟ یعنی کوئی شخص کچھ شیئرز خریدے کہ قیمت بڑھنے کی صورت میں نفع کے ساتھ فروخت کردوں گا، خلاصہ یہ کہ شیئرز کی بیع و شراء کو ایک تجارت کی طرح کرنے کا کیا حکم ہوگا جب کہ اس میں ایک طرح کی قیاس آرائی کو دخل ہوتا ہے کہ بازار کی صورت حال کو دیکھ کر زیادہ منافع دینے والے شیئرز خرید لئے جاتے ہیں، اور کیا ہر تخمین وقیاس آرائی ممنوع ہے یا اس میں کچھ تفصیل ہے؟

حضرت مولانا مفتی نظام الدین صاحب دارالعلوم دیوبند اور جناب مفتی عزیز الرحمن صاحب بجنوری کے جواب ناموں میں سوال نمبر ۱۲ تا ۱۷ کے جوابات تحریر نہیں ہیں۔ جناب مفتی شکیل احمد سیتاپوری صاحب کے علاوہ باقی تمام حضرات اس بات پر متفق ہیں کہ شیئرز کی تجارت کرنا جائز ہے، کیونکہ جب یہ بات تسلیم کرلی گئی کہ شیئرز قابل بیع وشراء ہیں، شیئرز کی بیع دراصل کمپنی کے اثاثوں میں متناسب حصے کی بیع ہے تو خرید وفروخت جائز ہوگی خواہ کسی بھی نیت سے ہو، کسی چیز کو قابل بیع وشراء ماننے کے بعد محض نیت کی بنیاد پر جواز وعدم جواز کی تفریق درست نہیں خصوصاً جب کہ نیت بھی کسی ناجائز چیز کی نہ ہو، تجارت کی نیت ایک جائز امر کی نیت ہے، تخمین وقیاس آرائی بذات خود حرام نہیں ہے، تجارت میں تو تخمین وقیاس آرائی ایک مضبوط عامل ہے، تجارت کے اکثر مراحل میں اس کی ضرورت پیش آتی ہے، لہذا تخمین وقیاس آرائی کا عنصر شامل ہونے کی وجہ سے شیئرز کی تجارت کو ناجائز نہیں کہا جاسکتا۔

تنہا مولانا مفتی شکیل احمد صاحب نے شیئرز کی تجارت کو نادرست لکھا ہے، موصوف تحریر فرماتے ہیں: شیئرز جب نہ ثمن ہیں اور نہ مبیع، تو ان کی تجارت کیسے درست ہوسکتی ہے، راس المال یا ثمن وہ زر مبادلہ ہے جو شیئر ہولڈر ادا کرتا ہے، اور مبیع وہ سامان ہے جو فیکٹری میں تیار ہوگا، شیئرز ان دونوں میں سے کچھ بھی نہیں ہے لہذا اس کی بیع وشراء درست نہیں ہے، نیز جب شیئر کا معاملہ عقد شرکت ہے تو شریک کے لئے یہ درست نہیں کہ وہ اپنا حصہ دوسرے کو فروخت کردے۔

جناب مفتی شکیل احمد صاحب کی رائے اور استدلال پر تبصرہ کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ انہوں نے اپنے مضمون کی تمہید میں یہ بات واضح کردی ہے کہ کمپنی

---

[1] استاذ فقہ، دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنو۔

اور شیئرز کی حقیقت ان پر پورے طور پر منکشف نہیں ہوسکی ہے، انہوں نے شیئرز کی حقیقت معلوم کرنے کے لئے مزید مواد کی ضرورت محسوس کی ہے، لکھتے ہیں:

''شیئرز کی ماہیت اور اس کی تعریف کیا ہے؟ اس سلسلہ میں اگر کسی معتبر کمپنی کے بورڈ آف ڈائرکٹرس کا شائع کردہ مواد ترجمہ کرکے سوالنامہ کے ساتھ منسلک کیا جاتا تو شیئرز کا مفہوم سمجھنے میں آسانی ہوتی، غالباً یہ بھی ایک طرح کا نظام ہے جس طرح بینکنگ ایک نظام ہے، اس لئے نظام چلانے والے ادارے اپنے نظام کے تعارف کیلئے جو مواد شائع کرتے ہیں اسی سے اس کی ماہیت سمجھ میں آتی ہے، ماہیت سمجھنے کے بعد ہی کوئی حکم لگانے کا مرحلہ آتا ہے''۔

ماہیت سمجھنے سے پہلے حکم لگانے میں غلطی ہونا تعجب نہیں بلکہ غلطی نہ ہو تو تعجب ہے، اگر مفتی صاحب کی یہ بات درست ہو کہ ''عقد شرکت میں شریک کے لئے یہ درست نہیں کہ وہ اپنا حصہ دوسرے کو فروخت کردے'' تو شیئرز کی خرید وفروخت کا قضیہ ہی ختم ہوجائے، لیکن تمام مسالک کے فقہاء کی تصریحات اس کے خلاف ہیں، تمام فقہاء شرکت عنان کے شرکاء کے لئے اپنے حصہ کی فروختگی درست قرار دیتے ہیں۔

۱۳۔ شیئر مارکیٹ میں ایک سودا جسے فیوچر سیل (بیاعات مستقبلیات) کہتے ہیں مروج ہے، اس کا مقصد شیئرز خریدنا نہیں ہوتا بلکہ بڑھتے گھٹتے دام کے ساتھ نفع نقصان کو برابر کرلینا مقصود ہوتا ہے، مثلاً زید نے سو شیئرز کا سودا بہ حساب سو روپے فی شیئر کیا، اور ادائیگی اور وصولی کی تاریخ ۳۰ / مارچ مقرر کی، اب جب ۳۰ / مارچ آئی تو اس شیئر کی قیمت ڈیڑھ سو روپے ہوگئی تو وہ پانچ ہزار روپے منافع کے طور پر لے لے گا، اور اگر ۳۰ / مارچ کو اس شیئر کی قیمت گھٹ کر پچاس روپے ہوگئی تو وہ پانچ ہزار روپے ادا کرے گا، اصل سودا محض کاغذی کارروائی ہے، نہ مشتری ثمن دیتا ہے، نہ بائع مال دیتا ہے، البتہ مقرر تاریخ پر بڑھتے ہوئے دام کی صورت میں منافع یا گھٹتے ہوئے دام کی صورت میں خسارہ ادا کیا جاتا ہے، شریعت میں مذکورہ فیوچر سیل کا کیا حکم ہے؟

اس سوال کے جواب میں تمام حضرات متفق ہیں کہ فیوچر سیل ناجائز ہے، کیونکہ یہ قمار (جوئے) کی واضح شکل ہے۔

۱۴۔ غائب سودا جن میں بیع کی نسبت مستقبل کی طرف کی جاتی ہے جائز ہوگی یا نہیں؟

اس سوال کے جواب میں اکثر حضرات نے لکھا ہے کہ چونکہ اس میں بیع کی نسبت مستقبل کی طرف کی جاتی ہے اس لئے یہ بیع منعقد اور لازم نہیں ہوئی، اسے بیع نہیں صرف وعدۂ بیع کہا جاسکتا ہے۔

متعدد حضرات نے اس سوال کو مبہم اور غیر واضح قرار دے کر جواب دینے سے گریز کیا ہے یا مختلف شقیں قائم کرکے جواب دیا ہے اور سوال کی مزید وضاحت چاہی ہے، ان کے اسماء گرامی یہ ہیں: مولانا احمد دیولوی، مفتی محمد عبید اللہ الاسعدی، مولانا عبد الجلیل قاسمی، مولانا نازبیر احمد قاسمی، مولانا عبد العظیم اصلاحی، مولانا ابوالحسن علی، مفتی محبوب علی وجیہی رامپور اور مولانا تنویر احمد قاسمی سیتامڑھی نے صورت مسئولہ کو بیع سلم پر محمول کرتے ہوئے بیع سلم کی شرائط کے ساتھ جائز قرار دیا ہے، مولانا ابراہیم بڑودوی نے لکھا ہے کہ جائز اور درست ہے بشرطیکہ خریدار دیکھنے کے بعد اس کا آخری فیصلہ کرے گا۔

واقعہ یہ ہے کہ سوال نمبر ۱۴ میں کافی اجمال ہے، اسی لئے صورت مسئلہ بہت سے حضرات پر واضح نہ ہوسکی اور بعض حضرات نے اسے بیع سلم پر محمول کیا ہے، اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ شیئرز کے غائب سودے کی تھوڑی وضاحت کردی جائے۔

مولانا محمد تقی عثمانی شیئرز کے حاضر اور غائب سودے کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں: شیئرز کے سودے دو طرح کے ہوتے ہیں: ایک کو حاضر سودا (Spot Sale) کہتے ہیں اور دوسرے کو غائب سودا (Forward Sale) کہتے ہیں۔

حاضر سودے میں شیئرز کی بیع ابھی ہوجاتی ہے اور حقوق کی منتقلی بھی ابھی ہوجاتی ہے، خریدار ابھی سے شیئرز لینے کا حقدار ہوتا ہے مگر بعض انتظامی مجبوریوں کی بنا پر شیئرز کے سرٹیفکیٹ کی ادائیگی (ڈیلیوری) میں تاخیر ہوتی ہے...... غائب سودے میں بیع تو ابھی ہوجاتی ہے مگر مستقبل کی طرف مضاف ہوتی ہے، جیسے ابھی شیئرز کی بیع ہوچکی، مگر قبضے وغیرہ کے حقوق فلاں تاریخ سے متعلق ہوں گے...... (اسلام اور جدید معیشت وتجارت / ۷۳، ۷۴)۔

غائب سودے میں صورت حال یہ نہیں ہوتی ہے کہ ایجاب وقبول کے لئے مستقبل کا صیغہ استعمال کیا جائے، یعنی بیچنے والا یہ کہے کہ میں فلاں تاریخ کو تمہارے ہاتھ اتنے شیئرز اس قیمت میں بیچوں گا اور خریدار کہے کہ میں فلاں تاریخ میں اتنے شیئرز اس قیمت میں خریدوں گا بلکہ صیغہ ماضی ہی کا استعمال ہوا ہے، لیکن مبیع اور ثمن کی حوالگی کے لئے آئندہ کی کوئی تاریخ طے ہوتی ہے، اس تاریخ سے پہلے حقوق ایک دوسرے کی طرف منتقل نہیں ہوتے، نہ اس تاریخ سے قبل شیئرز بیچنے والا خریدار سے قیمت کا مطالبہ کرسکتا ہے نہ خریدار بائع سے شیئرز پر قبضہ دینے کا مطالبہ کرسکتا ہے۔

اس صورت معاملہ کو بیع سلم کے زمرہ میں اس لئے شامل نہیں کیا جاسکتا ہے کہ بیع سلم میں ثمن کی حوالگی نقد ضروری ہے اور شیئرز کے غائب سودے میں ثمن کی حوالگی بھی متعین تاریخ پر موقوف رہتی ہے، دوسری غور طلب بات یہ ہے کہ کیا کمپنی کے شیئرز کو ان اموال میں شمار کیا جاسکتا ہے جن میں بیع سلم درست ہے۔

سوال نمبر ۱۵ اور ۱۶ گہرے طور پر باہم مربوط ہیں اس لئے دونوں کا عرض بھی ایک ساتھ پیش کیا جاتا ہے۔

۱۵۔ شیئرز کے نقد سودے میں بھی بعض انتظامی مجبوریوں کی وجہ سے سرٹیفکیٹ پر قبضہ ایک سے تین ہفتوں تک تاخیر سے ہوتا ہے، اس ذیل میں اصل سوال یہ ہے کہ شیئر پر قبضہ کا مطلب کیا ہوگا، اگر بوقت بیع وشراء ہی کمپنی کے اثاثوں اور املاک میں شیئر ہولڈر کی ملکیت آجاتی ہے، اور وہ اس کی ضمان میں آجاتا ہے، اور حقوق وذمہ داریاں خریدار کی طرف منتقل ہوجاتی ہیں اگر چہ ابھی شیئرز سرٹیفکیٹ نہ ملا ہو، تو اس کو شیئر پر قبضہ معنوی حاصل ہوگا یا نہیں، کیا شرع میں ہر شئ پر اس کی خاص نوعیت کے اعتبار سے قبضہ کی نوعیت مختلف ہوگی جس کی بناء عرف وعادت پر ہوگی، یا ہر صورت میں قبضہ حسی ہی ضروری ہوگا؟

۱۶۔ اس طرح خرید کردہ شیئر کو (جس کی موجودہ قیمت خریدار نے ادا کردی ہے) اگر خریدار سرٹیفکیٹ حاصل کرنے سے قبل اگلے دن یا دو چار دن میں کسی دوسرے کے ہاتھ فروخت کردیتا ہے تو اس کا کیا حکم ہوگا، اور اس طرح دوسرے کے خریدنے کے بعد تیسرے وچوتھے کے ہاتھ فروخت کرنا درست ہوگا، بالخصوص جبکہ شیئر کا ضمان ومنافع خریدنے کا معاملہ کرنے کے ساتھ ہی خریدار کی طرف منتقل ہوجاتا ہو؟

سوال نمبر ۱۵ کے ذیل میں اٹھائے گئے اس اصولی سوال ''کیا شرع میں ہر شئے پر اس کی خاص نوعیت کے اعتبار سے قبضہ کی نوعیت مختلف ہوگی جس کی بنا عرف وعادت پر ہوگی، یا ہر صورت میں قبضہ حسی ہی ضروری ہوگا؟'' کے جواب میں جن حضرات نے بھی اظہار رائے کیا ہے انہوں نے اثبات ہی میں جواب دیا ہے، اور اس حقیقت کا اظہار کیا ہے کہ ہر صورت میں قبضہ حسی ہی ضروری نہیں بلکہ قبضہ کا مدار بڑی حد تک عرف وعادت پر ہے، بعض حضرات نے لکھا ہے کہ اس سوال کا جواب ہم نے بیع قبل القبض کے سوالنامہ کے جواب میں دیا ہے اور یہ واقعہ ہے کہ اس سوال پر تفصیلی گفتگو کا مناسب موضوع ''بیع قبل القبض'' ہے۔

سوال نمبر ۱۵ میں شیئرز کے حاضر سودے کے تعلق سے قبضہ کی جو بحث اٹھائی گئی ہے اس کا منشا یہ نہیں ہے کہ حاضر سودے کی بیع کی صحت قبضہ پر موقوف ہے یا نہیں؟ کمپنی اگر نقد رقوم اور دیون کے علاوہ جامد اثاثوں اور دوسری املاک پر بھی مشتمل ہے اور حاضر سودا طے کرنے کے بعد قیمت کی ادائیگی کردی گئی تو شیئر پر اس مجلس میں قبضہ نہ کرنے سے بیع کی صحت متاثر نہیں ہوتی، ہاں اگر کمپنی نقود اور دیون سے عبارت ہو تو شیئرز پر قبضہ مجلس عقد ہی میں ضروری قرار پائے گا اور قبضہ کا مسئلہ بیع کی صحت سے بھی جڑ جائے گا۔

سوال نمبر ۱۵ اور ۱۶ میں بنیادی مسئلہ یہ اٹھایا گیا ہے کہ حاضر سودے میں جب بیع وشراء مکمل ہوتے ہی کمپنی کے اثاثوں اور املاک میں خریدار کی ملکیت آجاتی ہے اور فروخت شدہ شیئرز خریدار کے ضمان میں آجاتے ہیں، حقوق اور ذمہ داریاں خریدار کی طرف منتقل ہوجاتی ہیں تو کیا حاضر سودے میں نفس خریداری کو شیئرز پر قبضہ تصور کیا جائے گا اور خریدار کے لئے شیئرز سرٹیفکیٹ ملنے سے پہلے ان شیئرز کی دوسروں کے ہاتھ بیع درست ہوگی، یا شیئرز سرٹیفکیٹ ملنے کے بعد ہی شیئرز پر قبضہ تصور کیا جائے گا اور اس سے پہلے خریدار کے لئے ان شیئرز کا کسی دوسرے کے ہاتھ بیچنا جائز نہ ہوگا؟ اس مرکزی سوال کے بارے میں علمائے کرام اور اصحاب افتاء کی تین آراء ہمارے سامنے ہیں۔

اکثر حضرات نے سوال میں ذکر کردہ صورت مسئلہ کو بنیاد بنا کر شیئرز کے حاضر سودے میں نفس بیع وشراء کو معنوی قبضہ تصور کرلیا ہے، کیونکہ حاضر سودے میں بیع وشراء کا معاملہ طے ہوتے ہی شیئرز کی ملکیت خریدار کی طرف منتقل ہوگئی، شیئرز اس کے ضمان اور اختیار میں چلے گئے، شیئرز سرٹیفکیٹ ملنے اور کمپنی کے کاغذات میں بحیثیت شیئر ہولڈر اندراج پر قبضہ موقوف نہیں، اور جب نفس خرید وفروخت کو قبضہ مان لیا گیا تو شیئرز سرٹیفکیٹ ملنے سے پہلے ان شیئرز کو کسی دوسرے کے ہاتھ فروخت بھی کیا جاسکتا ہے، اسی طرح دوسرا خریدار خریدنے کے فوراً بعد تیسرے کے ہاتھ فروخت کرسکتا ہے، یہ رائے درج ذیل حضرات کی ہے:

مفتی محمد عبید اللہ اسعدی، مولانا زبیر احمد قاسمی، مولانا محمد رضوان القاسمی، مولانا ابوالحسن علی، مولانا سلطان احمد اصلاحی، مولانا محبوب علی وجیہی، مولانا عبدالجلیل قاسمی، مولانا اخلاق الرحمن قاسمی، مولانا منظور احمد قاسمی، مولانا جعفر ملی، مولانا ابراہیم بڑودوی، مفتی احمد دیولوی، مولانا عبدالرحیم، مولانا اقبال احمد قاسمی۔

دوسری رائے یہ ہے کہ محض بیع وشراء ہوجانا قبضہ تصور نہیں کیا جائے گا بلکہ شیئرز سرٹیفکیٹ حاصل ہونا قبضہ مانا جائے گا، لہذا حاضر سودے میں جو شیئرز خریدے گئے ہیں ان کی فروختگی شیئرز سرٹیفکیٹ ملنے سے پہلے جائز نہیں کیونکہ یہ بیع قبل القبض ہے، اس نقطہ نظر کا اظہار درج ذیل حضرات نے کیا ہے:

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی، مولانا شمس پیرزادہ، مولانا عبدالعظیم اصلاحی، مولانا ظفر الاسلام، مولانا تنویر عالم قاسمی۔

اس نقطہ نظر کی ترجمانی کرتے ہوئے مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب سوال نمبر ۱۵ اور ۱۶ کے جواب میں لکھتے ہیں: اصل میں یہ مسئلہ انتقال حصص کے قانون سرکاری اور شیئر مارکیٹ کے عرف پر موقوف ہے، لیکن بظاہر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شیئرز سرٹیفکیٹ شیئر کا علامتی وجود ہے یا حقیقی شیئر کی کلید کے درجہ میں ہے، لہذا جیسے فقہاء نے مکان کی بیع میں کنجی حوالہ کردینے کو قبضہ قرار دیا ہے، اسی طرح شیئرز سرٹیفکیٹ پر نام کی منتقلی کو قبضہ تصور کیا جانا چاہئے، ورنہ اگر صرف ایجاب و قبول ہی کو قبضہ مان لیا جائے تو قبضہ کا حکم بے معنی ہوجائے گا، اس لئے سرٹیفکیٹ حاصل ہونے سے پہلے خرید وفروخت درست نظر نہیں آتی۔

جناب شمس پیرزادہ صاحب لکھتے ہیں: شیئرز فروخت کرنے کے بعد کمپنی کو نام کی تبدیلی کے لئے بھیجے جاتے ہیں، اگر بائع کے دستخط صحیح نہ ہوئے تو کمپنی شیئرز بائع کو واپس بھیج دیتی ہے، ایسی صورت میں نام کی تبدیلی کا کام التواء میں پڑ جاتا ہے، اس لئے شیئرز پر حقیقی قبضہ اسی صورت میں ہوتا ہے جب کہ شیئر سرٹیفکیٹ تبدیلی شدہ نام کے ساتھ مل جائیں، اس سے پہلے اگر مشتری شیئرز کسی تیسرے شخص کو فروخت کرتا ہے تو یہ فروخت حقیقی قبضہ سے پہلے ہوگی اور اس میں نزاعات کا بھی اندیشہ ہے اس لئے اس کی اجازت دینا صحیح نہ ہوگا۔

تیسرا نقطہ نظر یہ ہے کہ سوالنامہ میں ذکر کردہ تفصیل کے مطابق چونکہ شیئرز کے حاضر سودے میں فروختگی مکمل ہوتے ہی شیئرز خریدار کے ضمان میں آجاتے ہیں، شیئرز کا نفع نقصان خریدار کی طرف لوٹتا ہے خواہ شیئرز سرٹیفکیٹ پر ابھی اس کا نام نہ چڑھا ہو، اس لئے حاضر سودے میں خرید وفروخت طے ہوتے ہی شیئرز پر قبضہ تصور کرلیا جائے گا، اس کا تقاضا یہ ہے کہ شیئر سرٹیفکیٹ پر قبضہ سے پہلے ہی اس کی بیع کسی دوسرے کے ہاتھ جائز ہو لیکن مسئلہ کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ ہر چیز کے قبضہ کا طریقہ عرف سے متعین ہوتا ہے اور عرف میں شیئرز پر قبضہ اسی وقت سمجھا جاتا ہے جب سرٹیفکیٹ ہاتھ میں آجائے تو پھر عدم جواز کا حکم ہونا چاہئے، بالخصوص جب کہ اس طرح سٹے کے کاروبار کی حوصلہ افزائی بھی ہوسکتی ہے، لہذا ان متعارض جہات کی موجودگی میں احتیاط یہی ہے کہ سرٹیفکیٹ پر قبضہ کئے بغیر آگے بیع نہ کی جائے۔

اس نقطہ نظر کے حاملین یہ ہیں: مفتی انور علی، مولانا عبدالقیوم پالنپوری، مولانا عبدالرحمن پالنپوری، مولانا اختر امام عادل، مولانا عبداللطیف گجرات۔

میرے خیال میں سوال نمبر ۱۵ اور ۱۶ کے جواب میں جو اختلاف رائے پایا جاتا ہے اس کی زیادہ تر بنیاد صورتحال کی تحقیق میں اختلاف پر ہے، سوالنامہ میں جو صورت درج کی گئی ہے وہ بھی "اگر" کی شرط کے ساتھ تحریر ہے جس سے عدم تعین جھلکتا ہے، اس سلسلے میں آخری رائے قائم کرنے سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ کمپنیز اور اسٹاک ایکسچینج (بازار حصص) کے ماہرین سے چند امور کی وضاحت کرالی جائے تاکہ بربنائے بصیرت ایک متفقہ رائے تک ہماری رسائی ہوسکے۔

(۱) شیئرز کے حاضر سودے میں قانونی صورت حال کیا ہے، کیا واقعی سودا ہوجانے کے فوراً بعد شیئرز سرٹیفکیٹ پر قبضہ سے پہلے فروخت شدہ شیئرز کا ضمان، رسک (Risk) خریدار کی طرف منتقل ہوجاتا ہے، شیئرز کا حاضر سودا ہوجانے کے بعد کمپنی کے کاغذات میں خریدار کا نام چڑھنے سے پہلے اگر کمپنی تباہ ہوجائے تو قانون کی نگاہ میں نقصان شیئرز بیچنے والے کا ہوا یا شیئرز خریدنے والے کا، کیا اس صورت میں خریدار بیچنے والے سے قانوناً وہ قیمت وصول کرسکتا ہے جو اس نے بیچنے والے کو دی تھی، خریداری کے بعد شیئر سرٹیفکیٹ پر خریدار کا نام چڑھنے سے پہلے اگر کمپنی شیئرز کے منافع تقسیم کرتی ہے تو یہ منافع کس کو دیئے جاتے ہیں، شیئرز بیچنے والے کو یا شیئرز خریدنے والے کو، کمپنی نے اگر منافع شیئرز بیچنے والے کو دے دیئے تو کیا خریدار یہ منافع کمپنیز اور اسٹاک ایکسچینج کے قوانین کے اعتبار سے بیچنے والے سے واپس لے سکتا ہے۔

(۲) شیئر مارکیٹ اور بازار حصص کے عرف میں شیئرز کے حاضر سودے کی صورت میں شیئرز پر قبضہ کب تصور کیا جاتا ہے، سودا ہونے کے فوراً بعد یا شیئر سرٹیفکیٹ پر خریدار کا نام چڑھنے کے بعد۔

اگر اوپر درج سوالات کے جواب میں ماہرین متفق الرائے ہوں تو شاید علماء اور اصحاب افتاء کی رائے بھی متفق ہوسکے۔

۱۷۔ اسٹاک ایکسچینج بازار میں خرید وفروخت کے لئے واسطہ بننے والے کو "بروکر" کہتے ہیں (جو موجودہ وقت میں شیئرز کی خرید وفروخت اور قیمتوں سے واقفیت رکھتا ہے، اور خرید وفروخت کی کارروائی کا اندراج کرتا ہے) یعنی اس کی حیثیت ایجنٹ کی ہے، اس کا کیا حکم ہوگا؟ یعنی کیا بروکر کی حیثیت سے کام کرنا درست ہے؟

اس سوال کا جواب بعض حضرات کی تحریر میں متعین طور پر نہیں دیا گیا ہے، باقی تمام لوگوں نے لکھا ہے کہ جن شیئرز کی خرید وفروخت جائز ہے ان کی خرید و فروخت میں بروکر کی حیثیت سے کام کرنا درست ہے۔ ناجائز اور حرام کاروبار کرنے والی کمپنیوں کے شیئرز کی خرید وفروخت میں بحیثیت "بروکر" کام کرنا جائز نہیں۔

☆☆☆

تمہیدی مقالات

ا۔ڈاکٹر علی محی الدین قرہ داغی، قطر ۲۔جناب ارشاد باقوی صاحب، بنگلور ۳۔ڈاکٹر کے جی منشی، احمد آباد

شیئرز، کمپنی اور سرمایہ کاری

بنیادیں۔ شکلیں

ڈاکٹر علی محی الدین القرہ داغی[1]

الحمد لله رب العالمين والصلاة والسلام على المبعوث رحمة للعالمين وعلى آله وصحبه ومن تبع هداه إلى يوم الدين۔

یہ حقیقت ہے کہ دور حاضر کی اقتصادیات میں جوائنٹ اسٹاک کمپنیوں (Joint Stock companies) کا اہم رول ہے، اسی طرح یہ بھی واقعہ ہے کہ ان کمپنیوں کے اہم اثاثے اور ذرائع شیئرز ہیں، یہ شیئرز ہی ہیں جن کے ذریعہ امکانی حد تک مال کی ایک بڑی مقدار کو جمع کرنے کا عمل انجام پاتا ہے، کیونکہ اصل سرمایہ کو چھوٹے چھوٹے حصص میں تقسیم کردینے کی وجہ سے تمام لوگوں کو اس میں شراکت کا موقعہ حاصل ہوتا ہے، اور اس مجموعی شراکت کے نتیجہ میں اصل سرمائے کی ایک بڑی رقم جمع ہوجاتی ہے، اور اس کے ذریعہ کمپنیاں بڑے بڑے پروجیکٹس شروع کرسکتی ہے۔

آج کے دور میں شیئرز کا کاروبار صرف کمپنی کے بانی شراکت داروں پر منحصر نہیں ہے، بلکہ آج کے دور میں شیئرز کی حیثیت ان سیکورٹیز کی ہوگئی ہے جو وسیع پیمانہ پر لوگوں میں اور خصوصاً انٹرنیشنل اسٹاک ایکسچینج میں متداول ہیں۔

اس موقعہ پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ عمومی طور پر شیئرز کے کاروبار کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ اسی طرح شیئرز کی سرمایہ کاری، خصوصاً ان شیئرز کی سرمایہ کاری کی شرعی حیثیت کیا ہے جو عالمی کمپنیوں یا عالم اسلام کے اندرون کی مقامی کمپنیوں کی زیر ملکیت ہیں اور جن کے معاملات ربا کے شائبہ سے خالی نہیں۔

سب سے سنگین چیز جس سے ہمارا سماج دوچار ہے، غیر اسلامی (سرمایہ دارانہ یا اشتراکی) نظام کی موجودگی ہے جس کے زیر سایہ ہی عالم اسلام میں کمپنیوں کی تشکیل عمل میں آئی ہے، جس کا نتیجہ ہے کہ ان میں سے بیشتر کمپنیاں صحیح اسلامی طریقہ کی پابندی نہیں کرتیں، چنانچہ بینکوں سے سودی قرض کے لین دین کا معاملہ کرتی ہیں۔

آج کے بیشتر مسلمان تذبذب اور گومگو کی کیفیت سے دوچار ہیں کہ کیا وہ ان کمپنیوں کو ترک کردیں، ان کا بائیکاٹ کردیں اور ان میں شراکت اختیار نہ کریں، دوسرے الفاظ میں فساق اور ضعیف الایمان لوگوں کو ان کمپنیوں کا نظم ونسق سنبھالنے کے لئے چھوڑ دیں جو اقتصادی زندگی کے لئے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتی ہیں، ایسا اس لئے کہ یہ کمپنیاں قائم ہیں اور مخلص وغیرت مند افراد کے بائیکاٹ سے ان کمپنیوں کی رفتار کار پر کوئی اثر نہیں پڑے گا، یا یہ کہ وہ اصلاح اور تبدیلی کے مقصد سے ان میں شراکت اختیار کریں؟

عام مسلمانوں کے اس تذبذب کے بالمقابل معاصرین کے درمیان اختلافات بھی پائے جاتے ہیں، بعض معاصرین نے مقاصد شریعت، کمپنیوں کے بائیکاٹ اور ان میں عدم مشارکت سے مرتب ہونے والے مفاسد پر غور کرکے چند شروط وضوابط کے ساتھ ان میں شراکت اختیار کرنے کی اجازت دی ہے، جب کہ دوسرے بعض معاصرین اس معاملہ میں حرام کے شائبہ کے پیش نظر اسے مطلقاً رد کرتے ہیں۔

---

[1] قطر یونیورسٹی، قطر۔

اس تحریر میں ہم نے پوری امانت داری اور اخلاص کے ساتھ اس مسئلہ کا جائزہ لیا ہے، ہمیں اللہ تعالیٰ سے امید ہے کہ وہ ہمارے قدموں کو صحیح رخ عطا کرے گا، درست بات ہمارے دل میں ڈالے گا اور عقیدہ اور قول وعمل کی غلطی سے ہماری حفاظت فرمائے گا۔

استثمار (Investment) کا لغوی واصطلاحی مفہوم:

لغت میں استثمار کا معنی:

لغۃً لفظ استثمار، استثمر یستثمر کا مصدر ہے جس کا مفہوم ہے: طلب ثمر یعنی پھل طلب کرنا، اس کا مادہ ثمر ہے جس کے متعدد مفاہیم ہیں، اس کا ایک مفہوم درخت کا پھل اور اس کی پیداوار ہے، اس کا ایک معنی اولاد بھی ہے، چنانچہ کہا جاتا ہے: الولد ثمرۃ القلب، اس کا ایک مفہوم مال کی انواع واقسام بھی ہے۔

ثمر کی میم کے فتحہ کے ساتھ کہتے ہیں: ثمر الشجر ثمورا یعنی درخت کا پھل ظاہر ہوا، اسی طرح کہا جاتا ہے: ثمر مالہ یعنی اس کا مال زیادہ ہوگیا، اور أثمر الشئ کا مفہوم ہے: اس چیز کا نتیجہ ظاہر ہوگیا، اور أثمر مالہ۔ لام کے ضمہ کے ساتھ۔ کا مفہوم ہے: اس کے مال کی کثرت ہوگئی۔

اسی طرح کہا جاتا ہے: استثمر المال وثمّرہ (میم کی تشدید کے ساتھ) اس کا مطلب ہوا: اس نے مال کو پیداواری عمل میں لگایا، رہ گیا لفظ ثمرۃ تو وہ ثمر کا واحد ہے، جب اس کی اضافت شجر (درخت) کی طرف کردی جاتی ہے تو اس کا مفہوم ہوتا ہے: درخت کا پھل، اور جب اس کی اضافت کسی شئے کی طرف کردی جاتی ہے تو اس کا مفہوم ہوتا ہے اس شئے کا فائدہ، اور قلب کی طرف اس کی اضافت ہو تو اس کا مفہوم ہوتا ہے قلب کی محبت، ثمرۃ کی جمع ثمر، ثمار اور أثمار بھی آتی ہے[1]۔

استثمار کا اصطلاحی مفہوم:

لفظ "تثمیر" فقہاء کے عرف میں اس مقام پر ذکر کیا گیا ہے جہاں انہوں نے سفیہ اور رشید کے سلسلے میں گفتگو کی ہے، چنانچہ فقہاء کہتے ہیں کہ رشید وہ ہے جو اپنے مال کی تثمیر اور اصلاح پر قادر ہو، اور سفیہ جو ایسا نہ ہو، امام مالک فرماتے ہیں:

''الرشد تشمیر المال وإصلاحہ فقط'' یعنی رشد (Maturity) مال کی صرف تثمیر اور اس کی اصلاح ہے[2]۔

فقہاء نے تثمیر سے وہی مراد لیا ہے جو آج ہم استثمار سے مراد لیتے ہیں[3]۔

جہاں تک لفظ استثمار کا تعلق ہے تو وہ آج کے اقتصادی مفہوم میں مذکور نہیں ہے، اسی لئے معجم الوسیط میں ہے: ''الاستثمار: استخدام الأموال في الإنتاج، إما مباشرۃ بشراء الآلات والمواد الأولیۃ، وإما بطریق غیر مباشر کشراء الأسھم والسندات'' یعنی استثمار کا مفہوم ہے: سرمایے کو پیداواری عمل میں لگانا، خواہ وہ براہ راست ہو جیسے مشینوں اور خام مال کی خرید کے ذریعہ، یا بالواسطہ ہو جیسے شیئرز اور بانڈز کی خرید۔ المعجم الوسیط میں اس تعریف کے بعد ''مج'' کا رمز دیا گیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مفہوم ''مجمع اللغۃ'' کا وضع کردہ ہے[4]۔

استثمار (سرمایہ کاری) کا حکم:

شرعی نصوص اور شریعت کے عمومی مقاصد سے واضح ہوتا ہے کہ سرمایہ کاری مجموعی طور پر واجب ہے، یعنی امت کے لئے جائز نہیں کہ سرمایہ کاری کو ترک کرے۔

کیونکہ فرد اور امت کی زندگی میں مال کی اہمیت نصوص سے ثابت ہے، بیشتر آیات میں مال کو نفس پر مقدم رکھا گیا ہے، اللہ تعالیٰ نے مال کا بطور امتنان ذکر فرمایا ہے، اور مجاہدین اور حصول رزق کے لئے کوشاں لوگوں کو برابر قرار دیا گیا ہے جیسا کہ سورۂ مزمل کے آخر میں ہے، اور بیشتر احادیث میں کام کرنے والے اور تاجر کو مجاہد فی سبیل اللہ قرار دیا گیا ہے۔ ان تمام باتوں سے پوری طرح واضح ہو جاتا ہے کہ مال پر توجہ دینا، اس کی سرمایہ کاری اور اس کو مستحکم کرنے کی کوشش کرنا

---

[1] ملاحظہ ہو: لسان العرب، طبع دار المعارف۔ القاموس المحیط اور المعجم الوسیط، مادہ ''ثمر''۔

[2] بدایۃ المجتہد، طبع الحلبی (۲/۲۸۱)۔

[3] ''مبدأ الرضائی العقود، دراسۃ مقارنۃ'' (۱۹۸۵ء میں جامع ازہر میں پیش کردہ ڈاکٹریٹ کا مقالہ) از: ڈاکٹر علی القرہ داغی (۱/۳۳۱-۳۵۳)۔

[4] المعجم الوسیط (۱/۱۰۰) مادہ ''ثمر''۔

واجب ہے، تاکہ امت جہاد، تعمیر، علم، ترقی، سعادت وخوشحالی، بیداری اور تمدن پر قادر ہوسکے، کیوں کہ یہ سارے امور مال ہی سے تکمیل کو پہونچ سکتے ہیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

''ولا تؤتوا السفهاء أموالكم التي جعل الله لكم قياماً وارزقوهم فيها''[1]۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے مال کو اسلامی معاشرہ کا ستون (سہارا) قرار دیا ہے، اس کا مطلب یہ ہوا کہ معاشرہ مال ہی کے ذریعہ قائم اور حرکت پذیر ہے اور اسی کے ذریعہ اسے فروغ حاصل ہوسکتا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے قول ''وارزقوهم فيها'' میں ہے، یہاں ''منها'' کے بجائے ''فيها'' کہا گیا ہے، اس سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ استثمار (سرمایہ کاری) واجب ہے، تاکہ استثمار سے حاصل ہونے والے منافع سے مجورین (under guardianship) (یعنی بچے اور ذہنی طور پر معذور افراد) کے اخراجات پورے کئے جائیں، نہ کہ اصل سرمایہ سے۔

امام رازی فرماتے ہیں: ...... یہاں "فيها" کہا گیا ہے "منها" نہیں کہا گیا ہے، تاکہ یہ اس بات کا حکم نہ ہو کہ لوگ اپنے مال کے کچھ حصے کو اپنے لئے ذریعہ رزق بنالیں، بلکہ انھیں حکم دیا گیا ہے کہ اپنے مال کو ذریعۂ رزق اس طرح بنائیں کہ اس میں تجارت کریں اور سرمایہ کاری کریں اور منافع سے اپنے رزق کا کام لیں نہ کہ اصل سرمایہ سے......[2]۔

اور یہ مسلم ہے کہ مال میں زکاۃ کے وجوب کی وجہ سے لوگ تجارت پر آمادہ ہوں گے، کیونکہ اگر وہ اس میں تجارت نہیں کریں گے تو صدقہ اور اخراجات سے وہ ختم ہوجائیں گے، موجودہ اقتصادی نقطۂ نظر بھی اس کی تائید کرتا ہے، چنانچہ وہ مال والوں پر مختلف قسم کے ٹیکس عائد کرتا ہے، تاکہ وہ اسے جمع نہ کرسکیں، بلکہ چند احادیث جو مجموعی حیثیت سے صحیح یا حسن کے درجہ کی ہیں اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ صغار (یتیم وغیرہ) اور مجورین (کم عقل، مجنون اور ناقص اہلیت والے) کے مال میں تجارت واجب ہے، چنانچہ امام شافعی نے یوسف بن ماھک سے روایت کیا ہے، کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''یتیم کے مال میں (یا یتامی کے اموال میں) ذریعہ آمدنی تلاش کرو۔ تاکہ اسے صدقہ ختم یا صرف نہ کرڈالے''، امام نووی اور بیہقی فرماتے ہیں: اس کی سند صحیح ہے، لیکن مرسل ہے، جس کی تائید دوسرے نصوص اور یتیم کے مال میں زکاۃ کے وجوب سے متعلق صحابہ سے مروی صحیح روایات سے ہوتی ہے[3]۔

شیخ قرضاوی فرماتے ہیں: احادیث وآثار اوصیاء (guardians) کو اس بات کی طرف توجہ دلاتے ہیں کہ یتیموں کے مال کی سرمایہ کاری کرنا واجب ہے، تاکہ زکاۃ اسے ہضم نہ کرلے...... لہٰذا یتیموں کے سرپرستوں پر ان کے اموال کو بڑھانا اسی طرح واجب ہے جس طرح ان کے ذمہ یتیموں کے مال کی زکاۃ نکالنا واجب ہے، ہاں ان دونوں حدیثوں (عمرو بن شعیب کی مرفوع حدیث اور یوسف بن ماہک کی حدیث) میں سند یا اتصال کے اعتبار سے ضعف ہے، لیکن چند امور سے وہ دونوں قوی کے درجہ کو پہنچ جاتے ہیں، شیخ نے ان میں سے ایک کا ذکر اس طرح فرمایا ہے: ''یہ روایت اسلام کے عمومی اقتصادی نظام کے مطابق ہے جو سرمایہ کاری کے وجوب اور دولت کے ارتکاز کی حرمت پر مبنی ہے''[4]۔

دولت کی سرمایہ کاری کے وجوب پر اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد بھی دلالت کرتا ہے: "کی لا یکون دولة بین الأغنیاء منکم" (سورہ حشر/۷۔) کیوں کہ مال کے متداول ہونے کی صورت یہی ہے کہ صدقات تقسیم کئے جائیں، اور ایسی سرمایہ کاری کی جائے جس کے نتیجہ میں مزدور، کاریگر، تاجر اور اسی طرح دوسرے تمام لوگ اس سے فائدہ اٹھائیں، اسی طرح اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "وأعدوا لهم ما استطعتم من قوة" (سورہ انفال/۶۰۔) اور بلاشبہ قوت میں مال کی قوت بھی شامل ہے، بلکہ بیشتر آیات میں اسے نفس پر مقدم کیا گیا ہے، لہٰذا اگر جسم اور ہتھیار کی قوت مطلوب ہے تو مال کی قوت اشد اور وجوبی طور پر مطلوب ہے۔

پھر یہ بھی ملحوظ رہے کہ شریعت اسلامی کا ایک مقصد مال کی حفاظت ہے، اور یہ مقصد مال کی سرمایہ کاری کرکے اور اسے فروغ دے کر ہی حاصل کیا جاسکتا ہے۔ اسی طرح شریعت کا ایک مقصد خدائی نظام کی روشنی میں کائنات کی تعمیر بھی ہے: "هو أنشأكم من الأرض واستعمركم فيها" (سورہ ہود/۶۱۔) اس آیت کے ذیل میں مفسرین فرماتے ہیں: اس کا مفہوم یہ ہے کہ اس نے (اللہ تعالیٰ نے) تمہیں روئے زمین پر اپنی ضروریات زندگی کی تعمیر کا حکم دیا جیسے مکانات

---

[1] سورہ نساء/۴۔

[2] تفسیر کبیر، طبع دار احیاء التراث العربی، بیروت (۱۸۶/۹)

[3] السنن الکبری للبیہقی، طبع ہندوستان (۱۰۷/۴)، المجموع للنووی، طبع شرکۃ کبار العلماء (۳۲۹/۵)۔

[4] فقہ الزکاۃ، از: ڈاکٹر یوسف قرضاوی، طبع وہبہ، قاہرہ (۱۳۰/۱)۔

کی تعمیر اور شجر کاری[1]۔ اسی طرح شریعت کا ایک مقصد استخلاف (جانشیں وخلیفہ بنانا) بھی ہے، جس کا تقاضا ہے کہ زمین کے امور انجام دیئے جائیں، اس کا نظم و نسق سنبھالا جائے، اس سے خلق کو فائدہ پہنچایا جائے اور اسے آباد کیا جائے، یہ تمام مقاصد مکمل طور پر سرمایہ کاری کے ذریعہ ہی حاصل ہو سکتے ہیں۔

خلاصہ:

یہ کہ عمومی طور پر سرمایہ کاری واجب کفایہ ہے، لہٰذا امت پر واجب ہے کہ سرمایہ کاری کے امور انجام دے تاکہ مال میں وسعت ہو، افراد برسر روزگار ہوں اور اگرچہ مالداری کی حد تک نہیں لیکن بقدر کفایت تمام لوگوں کو (مال) ملے، اور اس سلسلے میں فقہی قاعدہ ہے کہ جس چیز پر واجب کے تحقق کا دارومدار ہو وہ بھی واجب ہوتی ہے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر کسی شخص کے پاس زائد از ضرورت مال ہو تو کیا اس پر سرمایہ کاری واجب ہے؟ تو منہج اسلامی اس کے تعلق سے کہ بلاشبہ مال اللہ کا مال ہے اور اس پر انسان کی ملکیت مطلق نہیں مقید ہے، جس کا تقاضہ کرتا ہے وہ یہ کہ اس پر شرعی طریقوں سے مال کی سرمایہ کاری واجب ہے، خواہ یہ سرمایہ کاری وہ خود سے کرے یا شرکت ومضاربت جیسے طریقوں سے یہ سرمایہ کاری کی جائے، اور اس کے لئے مناسب نہیں کہ وہ اپنے سرمایہ کاری کے قابل مال کو یونہی چھوڑ دے، اور سرکولیشن کے میدان میں اپنا رول ادا کرنے اور اس کے اقتصادی دائرے میں اضافہ کو جو سوسائٹی کے لئے منفعت عامہ کا باعث ہے معطل کردے۔

اسی طرح یہ بھی واقعہ ہے کہ سماج اور امت کی قوت کا دارومدار سماج اور امت کے افراد پر ہے، خصوصاً اسلام کے اقتصادی نظام کی روشنی میں جو کہ انفرادی ملکیت کو تسلیم کرتا ہے اور اس بات کا قائل ہے کہ حکومت کی ملکیت محدود ہوتی ہے، چنانچہ امت کے افراد پر ایک بڑی ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ سرمایہ کاری کے ذریعہ مال کی زیادتی اور اس کی ترقی وتقویت کے لئے جدوجہد کریں۔

شیخ محمد شلتوت فرماتے ہیں: ''جب عقل ودین کا تقاضا ہے کہ جس چیز کے ذریعہ واجب کا تحقق ہوتا ہو وہ بھی واجب ہے، اور اسلامی جماعت کا غلبہ اہل اسلام کی اولین ذمہ داری ہے، اور اس کا دارومدار تین ستونوں پر ہے یعنی زراعت، صنعت اور تجارت، تو یہ تینوں ستون واجب قرار پائے اور ان کی ایسی باہمی ترتیب وتنسیق کہ جس سے امت خیر وفلاح سے ہمکنار ہو واجب ٹھہری.....''[2]۔

سرمایہ کاری سے متعلق اسلامی نظام کے بنیادی خطوط:

اس مقالہ میں اس موضوع کی تفصیلات کا احاطہ مشکل ہے، لہٰذا ہم مختصراً اس موضوع کے اہم خطوط کے ذکر پر اکتفا کریں گے۔ یہ خطوط مندرجہ ذیل ہیں:

اول: اسلام میں جو سرمایہ کاری کا منہج ہے اس سے اسلامی فکر وعقیدہ الگ نہیں ہے، جس طرح سرمایہ دارانہ نظام میں سرمایہ دارانہ نظریہ ہی سرمایہ کاری کے امور انجام دیتا ہے، اور جس طرح کمیونسٹ نظریہ سابقہ سوویت یونین اور دوسرے اشتراکی ممالک میں اپنے مخصوص وسائل کے ذریعہ اپنے فلسفیانہ حدود اور اپنے مقاصد کے تحت ہی سرمایہ کاری کا عمل انجام دیتا ہے۔ اسی طرح اسلامی عقیدہ بھی اسلام کے اقتصادی نظریہ، سرمایہ کاری کے طریق کار، ذرائع، اسباب اور وسائل میں کلیدی حیثیت کا حامل ہے، چنانچہ ایک مسلمان کا یہ عقیدہ ہے کہ مال اللہ کی ملکیت ہے اور وہ اس سلسلہ میں قائم مقام اور جانشین کی حیثیت رکھتا ہے، اسی بنا پر اس کے لئے لازم ہے کہ وہ سرمایہ کاری وغیرہ کے معاملہ میں منہج الٰہی کے تحت ہی کام کرے، اور خدائی شریعت کو پس پشت نہ ڈال دے، اسی طرح اس کے لئے یہ ضروری ہے کہ کائنات کو عدل اور حق سے معمور کرے اور دوسروں پر شاہد بنے۔

اس عقیدہ کی بنیاد پر مومن کے اعمال کافر سے مختلف ہوتے ہیں، چونکہ ایک مسلمان کمانے، خرچ کرنے اور سرمایہ کاری میں رضائے الٰہی کو پیش نظر رکھتا ہے جب کہ ایک کافر سب سے پہلے تمام قدروں پر اپنے شخصی مفادات کو فوقیت دیتا ہے پھر اپنی قوم کے مفادات کو، بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ ان دونوں کے علاوہ دوسری قدریں اس کے پیش نظر نہیں ہوتیں، مومنین کی صفت بیان کرتے ہوئے قرآن یہ کہتا ہے: "ویطعمون الطعام علی حبه مسکیناً ویتیماً وأسیراً إنما نطعمکم لوجه الله لانرید منکم جزاء ولا شکوراً" (سورہ الانسان/۹-۸) جبکہ کافر کے بارے میں یہ کہتا ہے کہ اسے یتیموں اور مسکینوں کو کھانا کھلانے سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی، کیونکہ اس میں اس کو اپنا کوئی دنیوی مفاد نظر نہیں آتا، اگر وہ کسی کو کھلاتا بھی ہے تو اس سے اس کا مفاد وابستہ ہوتا ہے، جیسے جاہ ومنصب کے

---

[1] تفسیر الماوردی المسمی: النکت والعیون، طبع أوقاف الکویت (۲/۲۱۸)۔

[2] بحوالہ ''منهج الادخار والاستثمار'' از: ڈاکٹر رفعت العوضی، طبع الاتحاد الدولی للبنوك الاسلامیه (ص ۷۳)۔

حائل افراد (کہ ان کو کھانا کھلانے کا مقصد حصول مفاد ہے) چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''أرأیت الذی یکذب بالدین. فذلك الذی یدعّ الیتیم ولا یحض علی طعام المسکین'' (سورہ ماعون) اسی عقیدہ کی بنا پر مسلمان یہ اعتقاد رکھتا ہے کہ سود مالوں کو مٹانے اور اس کو کم کرنے کا باعث ہے، اور صدقات و خیرات کرنے سے اس میں اضافہ ہوتا ہے، یقیناً یہ تصور کافر کے تصور کے بالکل برعکس ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''یمحق اللہ الربا ویربی الصدقات'' (سورہ بقرہ ۲۷۶)۔

اسی عقیدہ کی بنا پر وہ محرمات سے پرہیز کرتا ہے اور طاعات کی طرف لپکتا ہے، وہ سرمایہ کاری، تجارت اور محنت کر کے یہ سمجھتا ہے کہ اس نے حکم الٰہی کی تعمیل کی اور اس عمل پر وہ اپنے کو اجر وثواب کا مستحق سمجھتا ہے، اسی کے ساتھ ساتھ وہ انجام کار کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دیتا ہے، یہی وجہ ہے کہ نقصان کی صورت میں وہ رنجیدہ اور غمزدہ نہیں ہوتا، نہ آسودگی، خوشحالی اور نفع کی صورت میں اتراتا اور سرکشی کرتا ہے: ''لکیلا تأسوا علی ما فاتکم ولا تفرحوا بما آتاکم'' (سورہ حدید ر ۲۳)۔ چنانچہ وہ ہمیشہ دو میں سے ایک یا دونوں مقامات میں ہوتا ہے: یعنی حمد و شکر کے مقام میں، اور صبر و رضا کے مقام میں۔

اسی طرح اس عقیدہ کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ کے اوامر اور نواہی کی تعمیل میں تیزی آجاتی ہے، اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ایمان کے ذکر کو اپنے اوامر ونواہی پر مقدم فرمایا ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''یا أیها الذین آمنوا لا تأکلوا أموالکم بینکم بالباطل إلا أن تکون تجارة عن تراض منکم'' (سورہ نساء ۲۹)۔ اسی طرح ارشاد باری ہے: ''یا أیها الذین آمنوا اتقوا اللہ وذروا ما بقی من الربا إن کنتم مؤمنین'' (سورہ بقرہ ۲۷۸)۔

دوسری طرف اگر مسلمان سرگرم عمل ہوتا ہے اور سرمایہ کاری کرتا ہے تو اس کا یہ عمل اس عقیدہ کے پیش نظر ہوتا ہے کہ الٰہی نظام کے مطابق کائنات کی تعمیر کرنا اور سارے جہاں میں خیر و رحمت کو عام کرنا اس کا فرض ہے۔

دوم: سرمایہ کاری کے سلسلہ میں اسلامی نظام کی بنیاد اور اہم صفت یہ ہے کہ وہ اقدار، اخلاق، اور اصولوں کا نگہبان ہوتا ہے، اسی لئے اسلام نے حیلے، فریب، استحصال اور فراڈ (Fraud) کو حرام قرار دیا ہے، چنانچہ صحیح احادیث میں ہے کہ ''من غشنا فلیس منا'' (جس نے دھوکہ دیا وہ ہم میں سے نہیں)[۱] اسی طرح تدلیس کی حرمت احادیث صحیحہ سے ثابت ہے، خواہ وہ قول کے ذریعہ سے ہو جیسے نجش[۲] کی صورت میں، یا فعل کے ذریعہ ہو جیسے تصریہ[۳] وغیرہ کی شکل میں۔ اس کے بالمقابل اسلام نے لازم قرار دیا ہے کہ سرمایہ کاری عدل کی بنیاد پر اور بیع و شراء اور تقاضے میں رواداری کی بنیاد پر کی جائے، اور مبیع میں جیسے کچھ بھی عیوب و نقائص ہوں ان کو بغیر جھوٹ، قسم اور جعلسازی کے صاف صاف بیان کر دیا جائے (مبدأ الرضائی العقود ص ر ۳ ۶۷۳ - ۸۵۰)۔

سوم: اسلامی نظام سرمایہ کاری کا ایک بنیادی امتیاز یہ ہے کہ وہ شریفانہ اور صالح مارکیٹ کمپیٹیشن کی نگرانی کرتا ہے اور حکومت کی کسی قسم کی مداخلت کے بغیر تمام لوگوں کو مواقع فراہم کرتا ہے، حکومت صرف اسی صورت میں مداخلت کر سکتی ہے جب شرعی ضوابط اور کمزوروں کے حقوق کا تحفظ مقصود ہو، اسی وجہ سے مارکیٹ کی دیکھ ریکھ کی ذمہ داری پبلک اتھارٹی پر ہوتی ہے، جو شخصی وقومی تحفظ اور احتسابی نظام کی شکل میں سامنے آتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اللہ کے رسول نے کمزور عقل والے کو حق خیار عطا فرمایا ہے، جیسا کہ حضرت ابن عمر کی روایت میں ہے کہ ایک شخص نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ خرید و فروخت میں وہ دھوکہ کھا جاتا ہے، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''إذا بایعت فقل: لا خلابة''۔ امام احمد اور اصحاب سنن نے ان الفاظ سے روایت کیا ہے: ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں خرید و فروخت کرتا تھا، اس کی عقل کچھ کمزور تھی، اس کے گھر والے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور عرض کیا: اے اللہ کے رسول: فلاں پر پابندی عائد کر دیجئے، وہ خرید و فروخت کرتا ہے جب کہ وہ کمزور عقل والا ہے، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے بلایا اور منع فرمایا، تو اس نے کہا

---

[۱] مسلم (۱ر ۹۹)، ابوداؤد مع عون المعبود (۹ ر ۳۲۲)، ترمذی مع تحفۃ الأحوذی (۴ ر ۵۴۴)، ابن ماجہ (۲ ر ۷۴۹) میں حضرت ابوہریرہ سے روایت ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم غلے کے ایک ڈھیر کے پاس سے گذرے، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس میں اپنا ہاتھ ڈالا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی انگلیاں نم ہو گئیں، اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے غلے والے یہ کیا معاملہ ہے؟ اس نے کہا کہ اے اللہ کے رسول اس پر پانی پڑ گیا تھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''أفلا جعلته فوق الطعام کي یراه الناس؟ من غش فلیس مني''۔ یہ حدیث ہر قسم کے دھوکہ اور حقیقت کو چھپانے کی حرمت کے باب میں صریح ہے۔

[۲] نجش: ایسے شخص کی طرف سے قیمت بڑھا کر بولنے کو کہتے ہیں جس کا ارادہ سامان خریدنے کا نہ ہو، اس سے متعلق حدیث کے لئے دیکھئے: بخاری مع الفتح (۴ ر ۳۵۵)، مسلم (۳ ر ۱۱۵۶)۔

[۳] تصریہ کہتے ہیں جانور کے تھن میں اس مقصد سے دودھ روک لینے کو کہ اس کے تھن میں دودھ نظر آئے، اور حدیث اس کی ممانعت سے متعلق متفق علیہ ہے، دیکھئے صحیح بخاری مع الفتح (۴ ر ۳۶۱)، مسلم (۳ ر ۱۱۵۵)۔

کہ میں تو بیع سے صبر نہیں کرسکتا، تب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "إن کنت غیر تارك للبیع فقل هاء وها، ولا خلابة"[1]۔ یہ حدیث اس امر کی رہنمائی کے لئے اچھی بنیاد ہے کہ کمزور عقل والوں کو اور دوسروں کے زیر سایہ رہنے والے ان لوگوں کو جنہیں کاروبار اور معاملات کا تجربہ نہ ہو اس کا زیادہ موقع دیا جانا چاہئے کہ وہ اپنے لئے خیار کی شرط لگائیں، بلکہ یہ حق انھیں اس وقت تک دیا جانا چاہئے جب تک ان کے غبن میں پڑنے کا اندیشہ برقرار رہے اگر چہ وہ خیار کی شرط نہ لگائیں[2]۔

چہارم: (اسلامی نظام سرمایہ کاری کے اہم اوصاف میں سے ایک) ظلم وربا، لوگوں کے مال ناجائز طور سے کھانے اور قمار بازی کو حرام قرار دینا ہے، اور اس کے علاوہ دوسرے وہ افعال بھی جن کو اسلام نے حرام اور ممنوع قرار دیا ہے۔

شیئرز

اسہم جمع ہے سہم کی۔ لغت میں اس کے متعدد معنی ہیں: اس کا ایک معنی حصہ ہے جس کی جمع ہے "سہمان" سین کے ضمہ کے ساتھ۔ اس کا ایک مفہوم وہ لکڑی ہے جس کے ایک سرے پر کمان سے پھینکا جانے والا پھل ہوتا ہے اس کی جمع سہام ہے۔ اس کا ایک معنی وہ تیر ہے جس سے قرعہ اندازی کی جاتی ہے یا جس سے جوا کھیلا جاتا ہے، اسی سے کہتے ہیں: أسهم بینهم یعنی اس نے اس کے درمیان قرعہ اندازی کی، اسی طرح کہتے ہیں: ساهمه یعنی اس نے کھیل میں مقابلہ کیا اور دوسرے پر غالب آیا، اور کہتے ہیں: ساهمه یعنی اس نے اس کے ساتھ شراکت اختیار کی اور ایک حصہ حاصل کیا، المعجم الوسیط میں ہے: ومنه شرکة المساهمة[3] (اسی سے جوائنٹ اسٹاک کمپنی ہے)، قرآن کریم میں ہے: "فساهم فکان من المدحضین" (سورۃ الصافات، ۱۴۱) أی قارع بالسهم فکان من المغلوبین[4]۔ ماہرین معاشیات "سهم" کا اطلاق کبھی دستاویز پر کرتے ہیں اور کبھی حصص پر، دونوں کا مفہوم ایک ہے، پہلے مفہوم کے اعتبار سے ان کا خیال ہے کہ سہم سے مراد وہ دستاویز ہے، جو کمپنی کے اصل سرمایہ کے ایک حصہ کی نمائندگی کرتی ہے، یہ حصہ کمپنی کے سرکولیشن کے حساب سے گھٹتا بڑھتا ہے۔

دوسرے مفہوم کے اعتبار سے ماہرین معاشیات کا خیال ہے کہ سہم سے مراد کسی سرمایہ دار کمپنی میں شیئرز ہولڈر کا حصہ ہے، یا وہ حصہ ہے جس کی قیمت کے مطابق کمپنی کا وہ مجموعی سرمایہ منقسم ہوتا ہے جو قدر عرفی والے دستاویز میں مذکور ہوتا ہے، کیونکہ شیئرز مجموعی طور پر کمپنی کے اصل سرمایہ کی نمائندگی کرتے اور یکساں قیمت کے حامل ہوتے ہیں[5]۔

شیئرز کا خاصہ یہ ہے کہ وہ یکساں قیمت کے حامل ہوتے ہیں، ایک شیئر منقسم نہیں ہوتا، خواہ وہ عام ہو یا خاص، اصولی طور پر حقوق والتزام میں یکسانیت اور مساوات پر مبنی ہوتا ہے اور متداول ہوتا ہے، لیکن بعض قوانین نے (جیسے سعودی نظام نے) بانیوں کے زیر ملکیت حصص کو اس سے مستثنی قرار دیا ہے، چونکہ عام قاعدہ کے مطابق دو مکمل مالی سال کے بعد اور میزانیہ (بجٹ) کے عام ہونے سے پہلے اس کا اجراء درست ہوگا۔ اسی طرح انتظامیہ کی سیکورٹی کے لئے انتظامی کونسل کے ممبر کی طرف سے پیش کئے گئے سیکورٹی شیئرز کا اجراء دوران ممبری درست نہیں ہے، اور اس وقت تک درست نہیں ہے جب تک کہ جواب دہی کے دعوی کی ساعت کے لئے مقررہ مدت ختم نہ ہو جائے[6]۔

کمپنی کے اصل سرمایہ کی تقسیم کا حکم:

---

[1] صحیح بخاری مع الفتح (۴ر ۳۳۷)، مسلم (۳ر ۱۱۶۵)، مسند احمد (۲ر ۸۰، ۱۲۹)، سنن أبی داؤد مع العون (۹ر ۳۹۵)، ترمذی مع التحفۃ (۴ر ۴۵۵)، نسائی (۷ر ۲۲۲)، ابن ماجہ (۲ر ۷۵۳)۔

[2] اس کی تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: مبدأ الرضائی العقود، ص ر ۸۵۲، اور اس کے بعد کے صفحات۔

[3] القاموس المحیط، لسان العرب، المعجم الوسیط، مادہ: "سہم"۔

[4] النکت والعیون للماوردی، طبع أوقاف الکویت (۳ر ۴۲۶)، اور ملاحظہ ہو: أحکام القرآن لابن العربی، طبع دار المعرفۃ بیروت (۴ر ۱۶۲۲)۔

[5] ملاحظہ ہو: ڈاکٹر علی حسن یونس کی کتاب: الشرکات التجاریۃ، طبع الاعتماد، قاہرہ (ص ر ۵۳۹)، ڈاکٹر شکری حبیب شکری اور میشیل میکالا کی کتاب: شرکات الأشخاص اور شرکات الاموال علماً وعملاً، طبع الاسکندریۃ (ص ر ۱۸۴)، ڈاکٹر صالح بن زابن المرزوقی البقمی، طبع جامعۃ أم القری ۱۴۰۶ھ (ص ر ۳۳۲)، اور ڈاکٹر ابو زید رضوان کی کتاب: الشرکات التجاریۃ فی القانون المصری المقارن، طبع دار الفکر العربی، قاہرہ ۱۹۸۹ء (ص ر ۵۲۶)۔

[6] ڈاکٹر صالح البقمی: حوالہ سابق (ص ر ۳۳۷۔۳۳۸)۔

قابل لحاظ امر یہ ہے کہ اصل سرمایہ کی مختلف حصص واجزاء میں تقسیم اور سابقہ شرائط کا عائد کیا جانا اسلامی شریعت کے عام اصولوں اور کمپنی سے متعلق عام فقہی قواعد سے متعارض نہیں ہے، کیونکہ اس صورت میں کمپنی کے معاملہ کے تقاضے سے متصادم ہونے والی کوئی چیز نہیں، بلکہ اس میں تنظیم، تیسیر (آسانی پیدا کرنا) اور رفع حرج ہے جو اس شریعت کا ایک نمایاں وصف ہے اور ایفائے عقود کے ضمن میں داخل ہے "یا أیہا الذین آمنوا أوفوا بالعقود۔۔۔۔۔" (المائدہ/۱)، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قول ہے: "المسلمون عند شروطهم" [۱] اور ایک روایت میں ہے: "......والمسلمون على شروطهم إلا شرطا حرم حلالا أو أحل حراما" [۲]، امام ترمذی فرماتے ہیں: یہ حدیث حسن صحیح ہے [۳]۔

یہ اور اس طرح کے دوسرے نصوص اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ ہر قسم کی مصالحت اور شرط جائز ہے، سوائے اس شرط اور مصالحت کے جس کی حرمت پر دلیل قائم ہو جائے، اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ صلح وشرط میں اصل اباحت ہے، اور ممانعت ایک خاص دلیل کی بنا پر ثابت ہوتی ہے۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہ فرماتے ہیں: "کتاب وسنت اسی مفہوم کی شہادت دیتے ہیں......" (مجموع الفتاوی ۲۹/۳۴۶، ۳۵۱)۔ مزید فرماتے ہیں: "شروط میں اصل صحت اور لزوم ہے سوائے ان کے جن کے خلاف دلیل قائم ہو جائے...... کیونکہ کتاب وسنت عقود وعہود کے ایفاء پر دلالت کرتے ہیں اور غدر و بدعہدی کی مذمت کرتے ہیں...... اور یہاں مقصود اصول ونصوص کا یہ مقتضی ہے کہ شرط کو لازم قرار دیا جائے مگر یہ کہ وہ کتاب اللہ کے مخالف نہ ہو......" (مجموع الفتاوی ۲۹/۳۴۶، ۳۵۱)۔

یہ امر مخفی نہیں کہ سابقہ قواعد کے نتیجہ میں فقہ اسلامی ہر ایسے عقد، یا تصرف یا مالی یا انتظامی تنظیم کو قبول کرتی ہے جب تک کہ وہ کتاب وسنت کے نصوص سے متعارض نہ ہو اور اس کے عمومی قواعد سے متصادم نہ ہو، اور یہ کہ شریعت غراء ہر نفع بخش حکمت کو مومن کی متاع گم شدہ قرار دیتی ہے بلالحاظ اس کے کہ اس کا سرچشمہ اور نام کیا ہے، اصل واساس تو اس کا مفہوم، اس کے مشمولات، اس کے وسائل ومقاصد اور اس سے پیدا شدہ مصالح ومنافع یا مضرتیں اور مفاسد ہیں۔

شیئرز کی خصوصیات اور حقوق:

شیئرز کی چند خصوصیات ہیں جن میں سے کچھ اہم یہ ہیں:

قانون کے طے کردہ ضابطہ کے مطابق شیئر کی قیمت میں برابری، اور اس کے حقوق میں برابری ہوتی ہے، اور ہر شیئر ہولڈر کی ذمہ داری اس کے حصص کی قیمت، اس کے تداول کی صلاحیت، اور شیئرز کی تجزی کی عدم صلاحیت کے مطابق ہوتی ہے۔ شیئرز کے حقوق کا جہاں تک تعلق ہے تو اس سے مراد ہے کمپنی میں شیئر ہولڈر کا حق بقاء، عمومی اجلاس میں رائے دہندگی کا حق، حق سرپرستی، منتظمین کے خلاف دعوی مسئولیت دائر کرنے کا حق، منافع میں حصہ کا حق، احتیاطات (Reserves) اور شیئرز سے دست کش ہونے اور اس میں تصرف کا حق، اندراج میں ترجیح کا حق، اور کمپنی کے تحلیل ہونے کے وقت کمپنی کے اثاثہ جات کی تقسیم کا حق [۴]۔

اجراء اور دائرۂ کار کی حیثیت سے شیئرز کا حکم:

ہم نے ذکر کیا ہے کہ کمپنی کے اصل سرمایہ کی مساوی حصص میں تقسیم جنہیں شیئرز کہتے ہیں، درست ہے، اس میں اسلام کے اصول ومبادی سے کسی قسم کا تعارض نہیں پایا جاتا۔ یہاں پر ہم عمومی شکل میں ان شیئرز کے متداول ہونے اور خرید وفروخت وغیرہ کے ذریعہ ان میں عام طور پر تصرف کرنے کا حکم بیان کریں

---

[۱] بخاری نے تعلیقاً سے روایت کیا ہے، کتاب الإجارة (۴/۴۵۱)۔

[۲] سنن ترمذی مع شرح تحفۃ الأحوذی، کتاب الأحکام (۴/۵۸۴)۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہ فرماتے ہیں: یہ اسانید اگرچہ ان میں سے ہر ایک علاحدہ طور پر ضعیف ہے لیکن مختلف طرق سے سب مل کر ایک دوسرے کی تائید کرتی ہیں (مجموع الفتاوی ۲۹/۱۴۷)۔

[۳] مجموع الفتاوی، طبع ریاض (۲۹/۱۵۰) اور "عقود وشروط میں اصل اباحت ہے" کے اثبات کے لئے ملاحظہ ہو: مبدأ الرضا فی العقود، طبع دار البشائر الإسلامیۃ (۲/۱۱۴۸)۔

[۴] ملاحظہ ہو: گزشتہ فقہی مآخذ، اور ڈاکٹر عبد الغفار الشریف کا مجمع الفقہ الاسلامی کے چھٹے اجلاس میں پیش کردہ مقالہ (ص/۱۰-۱۱)، اور ڈاکٹر محمد الحبیب الجرایۃ کا مقالہ بعنوان "الأدوات المالية التقليدية" جو مجمع الفقہ کے چھٹے اجلاس میں پیش کیا گیا تھا، اور ڈاکٹر الخیاط کی کتاب: الشرکات، طبع الرسالۃ (۲/۹۴۔۔۔۔۔)، نیز ڈاکٹر صالح بن زابن کی کتاب: شرکۃ المساهمة (ص/۳۳۴)۔

گے، پھر ہم ہر قسم کے شیئرز کو بیان کرتے وقت اللہ کی توفیق سے اس کا خاص حکم بھی بیان کریں گے۔

قابل غور امر یہ ہے کہ بعض محققین نے شیئرز سے متعلق معاصر علماء کے اختلاف کو مطلقاً نقل کیا ہے بغیر کسی تفصیل کے کہ اس سلسلہ میں ان کی طرف سے کوئی صراحت موجود ہے یا نہیں بلکہ عمومی طور پر کمپنیوں کے بارے میں ظاہر کردہ ان کی آراء سے سمجھے گئے مفاہیم پر اعتماد کرلیا گیا ہے[1]۔

اس اطلاق پر اعتماد نہیں کیا جانا چاہئے، کیونکہ طے شدہ اصول ہے: "لازم المذهب ليس بمذهب" اسی طرح یہ بھی واضح ہے کہ ان علماء کے تمام مباحث ان کمپنیوں کے سلسلے میں ہیں جو مسلم ممالک میں قائم کی گئی ہیں، اور ان مباحثوں کا ان کمپنیوں سے کوئی تعلق نہیں جنہوں نے متعینہ طور پر اپنا دائرہ کار خنزیر اور شراب جیسے محرمات کو بنایا ہے......[2]۔

اسی وجہ سے ہم شیئرز کو دو قسموں میں تقسیم کرتے ہیں:

ایک قسم وہ ہے جو واضح طور پر حرام ہے، اور دوسری قسم وہ ہے جس میں بحث، تفصیل اور اختلاف کی گنجائش ہے۔

پہلی قسم وہ شیئرز ہیں جن کا دائرہ کار خنزیر، شراب، نشہ آور اشیاء، جوا اور دیگر محرمات ہیں، اسی طرح وہ کمپنیاں بھی اس میں شامل ہیں جن کا کاروبار سود پر منحصر ہو، جیسے سودی بینک۔

اس قسم کے تمام شیئرز کا اجراء اور اس میں شراکت اختیار کرنا درست نہیں اور نہ خرید وفروخت کے ذریعہ یا ان جیسے دوسرے امور کے ذریعہ ان میں تصرف جائز ہے۔ ابن القیم بعض اشیاء کی بیع کی حرمت سے متعلق احادیث کا ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں: یہ جامع کلمات تین اجناس کی تحریم پر مشتمل ہیں: عقل کو خراب کرنے والے مشروبات جیسے خمر، ایسے کھانے جو طبیعت کو مکدر بنانے والے اور ناپاک غذا دینے والے ہوں جیسے مردار کا گوشت اور خنزیر، اور اعیان جیسے بت جو ادیان کو خراب کرنے اور فتنہ اور شرک کا باعث بنتے ہیں، اس طرح شارع نے پہلی قسم کو حرام قرار دے کر عقول کو زائل کرنے اور خراب کرنے والے اسباب سے ان کی حفاظت فرمائی، دوسری قسم کو حرام قرار دے کر قلوب کو مفسدات یعنی غذاء خبیث کو ان تک پہونچنے سے بچایا...... اور تیسری قسم کو حرام قرار دیکر ادیان کو ان امور سے محفوظ فرمادیا جو ان کے بگاڑ کے لئے وضع کئے گئے ہیں[3]۔

یہی وہ اصول ہے جس سے تجاوز کرنا درست نہیں اور نہ اس میں توقف کیا جانا مناسب ہے، حرام شیئرز کی اس قسم کے علاوہ بھی دو قسمیں ہیں:

قسم اول:

ان کمپنیوں کے شیئرز جو اللہ تعالی کی شریعت کے مطابق قائم ہیں اور جن کا راس المال حلال ہے، وہ حلال کاروبار بھی کرتی ہیں، اور ان کا بنیادی معاہدہ اس بات کی صراحت بھی کرتا ہے کہ وہ حلال کے حدود میں کاروبار کرتی ہیں، اور سودی قرض کا لین دین نہیں کرتیں، نہ ہی بعض کے مقابلہ میں بعض کے لئے مخصوص رعایت یا مالی ضمانت کی ذمہ داری لیتی ہیں۔ کمپنیوں کے اس قسم کے شیئرز خواہ وہ کمپنیاں تجارتی ہوں، صنعتی ہوں یا زرعی، ان کے حلال ہونے اور ان میں ہر قسم کے شرعی تصرفات کے درست ہونے کے بارے میں فقہاء کا قول طے شدہ ہے، کیونکہ مالی معاملات وتصرفات میں اصل اباحت ہے، اور ان شیئرز میں کوئی حرام شئی شامل نہیں ہے، حاصل کلام یہ ہے کہ ان شیئرز کی وجہ سے کمپنی کے سرمائے کو جدید اقتصادی اصولوں کے تقاضے کے مطابق اور کسی اسلامی اصول سے تصادم

---

[1] دیکھئے: حوالہ سابق (ص ر ۳۴۰) از: ڈاکٹر صالح بن زابن البقمی، وہ تحریر فرماتے ہیں: اس موقع پر ہم ان کے (علماء کے) اقوال کی تین قسمیں کرسکتے ہیں: ایک قسم وہ ہے جس میں شیئرز کا کاروبار علی الاطلاق حرام ہے، دوسری قسم کے مطابق علی الاطلاق ان کا کاروبار جائز اور درست ہے لیکن بعض کے نزدیک ان کا موجب حرمت اسباب سے خالی ہونا شرط ہے، تیسری قسم وہ ہے جس میں بعض قسم کے شیئرز جائز اور بعض حرام ہیں ...."

[2] اس کی تفصیل کے لئے دیکھئے: الشركات في الفقه الاسلامي، از: شيخ على الخفيف، طبع دار النشر للجامعات المصرية (ص ر ۹۶)، الشركات في الشريعة الاسلامية والقانون الوضعي، از: ڈاکٹر عبد العزيز الخياط طبع المطابع التعاونية ۱۹۷۱ء (۲، ۱۵۳-۲۱۲)، شركة المساهمة في النظام السعودي، از: ڈاکٹر صالح بن زابن، طبع جامعة ام القرى ۱۴۰۶ھ (ص ر ۳۴۰)۔ شیئرز کی خرید وفروخت کو علی الاطلاق حرام قرار دینے والوں میں شیخ تقی الدین النبہانی ہیں، دیکھئے ان کی کتاب: النظام الاقتصادي في الإسلام، طبع القدس ۱۹۵۳ (ص ر ۱۴۱-۱۴۲) اور جو لوگ بغیر کسی تفصیل کے شیئرز کے کاروبار کی اباحت کے قائل ہیں ان میں ڈاکٹر محمد یوسف موسی اور شیخ شلتوت ہیں، لیکن یہ واقعہ ہے کہ یہ حضرات شیئرز کے محرمات سے خالی ہونے کو ضروری قرار دیتے ہیں۔ دیکھئے: فتاوی شیخ شلتوت، طبع الشروق (ص ر ۳۵۵) نیز سابقہ حوالہ جات۔

[3] زاد المعاد في هدى خير العباد، طبع مؤسسة الرسالة (۵ر۷۴۶)۔

کے بغیر منظم کیا گیا ہے۔

اسی کے ساتھ اس کے متعلق دو امور سامنے آئے:

امر اول: جسے ایک مؤلف نے اٹھایا وہ یہ کہ یہ شیئرز اس سرمایہ دارانہ نظام کا ایک جزو ہیں جو اجمالاً یا تفصیلاً کسی بھی طرح اسلام سے ہم آہنگ نہیں ہے، بلکہ جدید کمپنیاں اور خصوصاً فائنانس کمپنیاں حرام اور شرعاً ناجائز ہیں، کیونکہ یہ سرمایہ دارانہ نظام کے نقطہ نظر کی نمائندگی کرتی ہیں، لہٰذا نہ ان کا اختیار کرنا درست ہے اور نہ انہیں فقہ اسلامی میں موجود کمپنیوں کے اصول وضوابط کے تابع کرنا درست ہے[1]۔

یہ عام حکم قابل التفات نہیں اور نہ اسے قبول کیا جائے گا، کیونکہ اسلام کسی چیز کو صرف اس وجہ سے رد نہیں کرتا کہ وہ فلاں نظام سے ماخوذ ہے، یا اس میں موجود ہے، اسلام میں حکم موضوعی اور اس بنیاد پر مبنی ہوتا ہے کہ وہ قواعد شرعیہ سے کس حد تک ہم آہنگ یا متصادم ہے، کیونکہ ''الحكمة ضالة المؤمن فهو أحق بها أنى وجدها'' (حکمت تو مومن کا گم شدہ سرمایہ ہے، اسے جہاں کہیں پالے وہی اس کا زیادہ حقدار ہے) اور چونکہ حلال پر مبنی شیئرز کسی مانع شرعی پر مشتمل نہیں ہیں اس لئے جیسا کہ ذکر کیا جا چکا، ان کو حرام قرار دینا درست نہیں۔

اسی طرح یہ بھی استدلال کیا گیا ہے کہ شیئرز کمپنی کے اثاثے کی قیمت سے متعلق دستاویزات کے مقابلہ میں ہیں، یہ کمپنی کے تخمینہ کے وقت کمپنی کے ثمن کی نمائندگی کرتے ہیں، یہ کمپنی کے غیر منفک اجزاء نہیں ہیں، اور نہ کمپنی کے قیام کے وقت اس کے راس المال کی نمائندگی کرتے ہیں[2] یہ الگ بات ہے کہ شیئرز کا یہ حکم اور تصور حقیقت سے بعید ہے، معاصر کمپنیاں جس حقیقت پر مبنی ہیں وہ یہ ہے کہ شیئرز دستاویزات نہیں ہیں، یہ تو کمپنی کے حصص ہیں، اور ہر شیئر کمپنی کے ڈھانچہ کے ایک غیر منفک جز کے بالمقابل ہے، اور شیئرز کا مجموعہ ہی کمپنی کا اصل سرمایہ ہے[3]۔

جیسا کہ انہوں نے شیئرز کو کرنسی نوٹوں پر قیاس کیا ہے جن کی قیمت بدلتی اور تبدیل ہوتی رہتی ہے، یہی وجہ ہے کہ کمپنی کے آغاز کے بعد شیئر کی راس المال والی حیثیت ختم ہو جاتی ہے اور وہ ان سیکورٹیز کی صورت اختیار کر لیتا ہے جن کی ایک متعین قیمت ہوتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ شیئرز کی یہ فقہی تطبیق دقت نظر پر مبنی نہیں ہے اور انہیں کرنسی نوٹوں پر قیاس کرنا قیاس مع الفارق ہے، کیونکہ شیئرز دراصل کمپنی کے وہ حصص اور اجزاء ہیں جو کمپنی کے راس المال اور اس کے اثاثے کے مقابلے میں ہوتے ہیں، یہ اگرچہ تحریری دستاویزات ہوتے ہیں لیکن ان سے مقصود وہی ہوتا ہے جو ان کے مقابلے میں ہے۔

جہاں تک اتار چڑھاؤ کا مسئلہ ہے تو اس کے اسباب شیئرز میں مختلف ہوتے ہیں اور نقود میں مختلف ہوتے ہیں، چنانچہ شیئرز کی قیمت میں تغیر خود کمپنی کی فعالیت کا نتیجہ ہوتا ہے، لہٰذا جب اس کے منافع بڑھ جاتے ہیں، یا اس کے ساتھ اس کے اثاثوں کا اضافہ ہو جاتا ہے اور اس پر لوگوں کا اعتماد بڑھ جاتا ہے تو ان کی قیمت بڑھ جاتی ہے، اور خسارہ کی صورت میں ان کی قیمت گھٹ جاتی ہے، اس کی مثال اس شخص یا شرکاء کی ہے جن کے پاس متعین سامان ہوں اور انہوں نے ان کو اچھے منافع پر فروخت کیا ہو، تو اس صورت میں نفع کے بقدر ان میں سے ہر ایک کے مال کا تناسب بڑھ جاتا ہے، اسی طرح ان میں سے بعض کے مفقود ہو جانے یا ہلاک ہو جانے، یا سامان کو خسارہ کے ساتھ فروخت کئے جانے کی صورت میں ان میں سے ہر ایک کے مال کا تناسب گھٹ جاتا ہے۔ پس یہ کمپنیوں کے شیئرز کا ایک مختصر سا نمونہ ہے۔

جہاں تک کرنسی نوٹوں کا تعلق ہے تو ان کے گھٹنے کا سبب افراط زر اور اس سے متعلق بین الاقوامی نظام اور مزید کرنسی نوٹ جاری کرنے کی ملکی پالیسی ہوتی ہے جس کا حقیقی بدل نہیں پایا جاتا، ان کے علاوہ اور دوسرے اقتصادی عوامل اس کا سبب بنتے ہیں، جبکہ کمپنی کا جز بننے والے رقم کی نمائندگی کرنے والا شیئر کمپنی کے سرمائے اور اثاثے میں نمائندگی کرتا ہے۔

امر دوم: جو اس قسم کے شیئرز کے متعلق زیر بحث لایا گیا ہے اس کا تعلق ان کی خرید وفروخت سے ہے، اور اس سلسلہ میں تین باتیں (ملاحظات) قابل غور

---

[1] شیخ تقی الدین النبہانی: النظام الاقتصادی فی الاسلام، طبع القدس، تیسرا ایڈیشن ۱۳۷۶ھ (ص/ ۱۳۳)۔

[2] النبہانی: حوالہ سابق (ص/ ۱۴۱-۱۴۲)۔

[3] ڈاکٹر صالح بن زابن: حوالہ سابق (ص/ ۳۴۴)۔

ہیں جنہیں ہم جواب کے ساتھ بیان کرتے ہیں[۱]:

اول: جہالت، کیونکہ مشتری کو شیئرز کی معنویت کا تفصیلی علم نہیں ہے۔

اس کے جواب میں ہم کہیں گے: کہ جہالت صحت عقد کے لئے اس صورت میں مانع ہوتی ہے جب نزاع کا سبب ہو یا فقہاء کی اصطلاح میں جب "جہالت فاحشہ ہو"[۲]۔

امام قرافی فرماتے ہیں: غرر اور جہالت کی تین اقسام ہیں: کثیر جو بالاجماع ممنوع ہے، جیسے ہوا میں پرندوں کی بیع۔ قلیل جو بالاجماع جائز ہے، جیسے گھر کی بنیاد...... اور متوسط جو مختلف فیہ ہے[۳]۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ مغیبات جیسے گاجر، شلجم اور اروی کی بیع کے سلسلے میں فرماتے ہیں:

پہلا یعنی ان کی بیع کی صحت کا قول جو امام مالک کا مسلک اور امام احمد کا ایک قول ہے، زیادہ صحیح ہے...... اس لئے کہ تجربہ کار افراد جب ان سے ظاہر ہونے والے پتی وغیرہ کو دیکھتے ہیں تو بقیہ چیزوں کو بھی اسی پر قیاس کرتے ہیں، دوسری بات یہ کہ لوگوں کو ان بیاعات کی ضرورت ہے، اور کسی ایک نوع کے غرر کی وجہ سے شارع نے ایسے بیوع کو حرام نہیں کیا ہے جن کی لوگوں کو ضرورت پیش آتی ہو، بلکہ شارع تو ایسی چیزوں کو جائز قرار دیتا ہے جن کی اس سلسلے میں ضرورت پڑتی ہے، جیسا کہ شارع نے بدو صلاح سے پہلے پھل کی بیع کو جائز قرار دیا ہے...... اگرچہ مبیع کا کچھ حصہ ابھی تک پیدا نہ ہوا ہو...... اور بیع عرایا کو اندازہ سے جائز قرار دیا ہے، چنانچہ ضرورت کے وقت تخمین بالخرص کو تخمین بالکیل کے قائم مقام قرار دیا ہے باوجودیکہ یہ اس ربا کے ذیل میں آتا ہے جو بیع غرر سے بھی زیادہ شدید ہے، اور یہ ایک شرعی قاعدہ ہے کہ دو مصلحتوں میں سے ادنیٰ کو چھوڑ کر بڑی (اعلیٰ) مصلحت کو روبہ عمل لایا جائے گا، اور دو فسادوں میں سے ادنیٰ کو اپنا کر (بروئے کار لا کر) بڑے فساد کو رفع کیا جائے گا[۴]۔

استاد صدیق الضریر فرماتے ہیں: غرر جو صحت عقد میں مؤثر ہوتا ہے وہ ہے جو مبیع میں اصالتاً پایا جائے، جہاں تک تابع میں غرر کا تعلق ہے...... تو وہ عقد میں مؤثر نہیں ہوتا[۵]۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ بجٹ کی اشاعت، کمپنی کی فعالیت اور اس طرح کے دوسرے امور کے توسط سے خریدار شیئر کی قیمت اور شیئرز کے بالمقابل اثاثوں سے متعلق اجمالی اور مناسب معلومات حاصل کر لیتا ہے، اور یہ علم صحت بیع کے لئے کافی ہے، اسی کے ساتھ یہ واضح رہے کہ ہر چیز کا علم اسی کے بقدر ہوتا ہے۔

پھر یہ بھی واضح رہے کہ مشترک حصص کی بیع بالاتفاق درست ہے، شیخ الاسلام ابن تیمیہ فرماتے ہیں: مشترک شئی کی بیع باتفاق مسلمین جائز ہے، جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سے ثابت ہے......[۶]۔

ابن قدامہ لکھتے ہیں: اگر کوئی شریک اپنے شریک کا حصہ خرید لے تو درست ہے، کیونکہ وہ اپنے علاوہ کی ملکیت خرید رہا ہے، یہی حکم اس صورت میں بھی ہوگا جب اسے کسی اجنبی سے فروخت کر دے۔ یہی حکم ان کے علاوہ دوسرے علماء کے نزدیک بھی ہے[۷]۔

دوم: شیئرز کی بیع کا مطلب سرمائے اور نقود کے ایک حصہ کی بیع ہے، اس مفہوم کا تقاضا ہے کہ اس میں بیع صرف کا قاعدہ یعنی جنس واحد کے درمیان مثل بالمثل اور مجلس میں ہی قبضہ، اور اختلاف جنس کے وقت صرف مجلس میں قبضہ کو ملحوظ رکھا جائے، کیونکہ شیئر عام طور پر کمپنی کے اثاثے کو اس کے نقود سے برابر کرتا ہے۔

---

[۱] دیکھئے: شیخ عبد اللہ بن سلیمان: بحث فی حکم تداول أسہم الشرکات المساہمۃ (ص ر ۳)، اور شیخ محمد بن ابراہیم (مفتی الدیار السعودیہ) کا فتویٰ بابت قومی کمپنیوں کے شیئرز کے تداول کا جواز جو کتاب "فتاویٰ ورسائل" میں شامل ہے (۷ر ۴۲-۴۳)۔

[۲] ملاحظہ ہو: الموسوعۃ الفقہیہ (الکویتیہ) مصطلح "جہالۃ" (۱۶ر ۱۶۷)۔

[۳] الفروق طبع دار المعرفۃ (۳ر ۲۶۵-۲۶۶)۔

[۴] مجموع الفتاویٰ طبع الریاض (۲۹ر ۲۲۷)۔

[۵] الغرر وأثرہ (ص ر ۵۹۴)۔

[۶] مجموع الفتاویٰ (۲۹ر ۲۳۳)۔

[۷] ملاحظہ ہو: المغنی (۵ر ۴۵)، المجموع (۹ر ۲۹۲)، ڈاکٹر صالح بن زابن: حوالہ سابق (ص ر ۳۴۸) اور سابقہ دیگر حوالہ جات۔

اس کا جواب یہ ہے کہ شیئرز میں نقود کا پایا جانا تبعاً اور غیر مقصود ہے، کیونکہ ان میں اصل واساس جامد اثاثے ہیں، اسی بنا پر ہمارا کہنا ہے کہ کمپنی کے کاروبار کے آغاز سے پہلے اور عمارتوں وغیرہ کی خریداری سے قبل شیئرز کی بیع اسی صورت میں درست ہوگی جب بیع صرف کے قواعد ملحوظ رکھے جائیں۔

شیئر سے مراد کمپنی کا یہ عام جزو ہوتا ہے قطع نظر اس سے کہ اس کی تفصیلات کیا ہیں، لہذا جب تک کمپنی کے اثاثے میں سے شیئرز کا کوئی مقابل موجود رہے گا اس وقت تک اس کے ساتھ نقد کا معاملہ نہیں کیا جائے گا کیونکہ اثاثے کا ایک حصہ نقد ہے، اور فقہی اصول کا تقاضا ہے کہ تابع میں اس چیز کی ضرورت پڑ جاتی ہے جس کی غیر تابع میں نہیں پڑتی، اور یہ کہ ضمناً کسی چیز میں ایسی ضرورت پیش آ جاتی ہے جو قصداً اس میں پیش نہیں آتی۔ امام سیوطی لکھتے ہیں: "بیع کی فروع میں سے ہے...... کہ ہری کھیتی کی بیع کٹائی کی شرط کے ساتھ ہی درست ہے، تو اگر اس نے زمین کے ساتھ اس کو بھی فروخت کر دیا تو تبعاً جائز ہے......"[1] بلکہ اس مسئلہ کی اصل تو حدیث شریف میں مذکور ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے غلام کو خریدنے کی اجازت دی ہے جس کے ساتھ مال ہو، خواہ وہ نقد ہی کیوں نہ ہو، لہذا مشتری کے شرط لگا دینے کی صورت میں اس غلام کا مال تبعاً مشتری کا ہو جائے گا قطع نظر اس کے کہ بیع صرف کے اصول وضوابط کیا ہیں، چنانچہ بخاری، مسلم اور ان کے علاوہ دوسرے ائمہ حدیث نے حضرت عبداللہ بن عمر کی روایت یہ بیان کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کہتے سنا ہے: "ومن ابتاع عبداً وله مال فماله للذي باعه إلا أن يشترط المبتاع" (جس نے کوئی ایسا غلام خریدا جس کے لئے مال ہے، تو اس کا مال بائع کے لئے ہے الا یہ کہ مشتری اس کی شرط لگا دے)[2]۔

حافظ ابن حجر فرماتے ہیں: "اس کے مفہوم سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ جس نے کسی ایسے غلام کو بیچا جس کے پاس مال ہو اور مشتری اس کی شرط لگا دے تو بیع صحیح ہے"۔ اس کے بعد انہوں نے اموال ربویہ کے سلسلہ میں علماء کے اختلاف کا تذکرہ کیا ہے کہ امام مالک کا خیال ہے کہ ایسا عقد درست ہے اگرچہ وہ مال جو اس غلام کے ساتھ ہے ربوی ہو، کیونکہ حدیث مطلق ہے، اور اس لئے بھی کہ عقد تو بالخصوص غلام پر واقع ہوا ہے اور جو مال اس کے ساتھ ہے اس کا عقد میں کوئی دخل نہیں ہے (فتح الباری ۵/۵۱)۔ امام مالک فرماتے ہیں: "ہمارے یہاں اس پر اتفاق ہے کہ اگر مشتری نے غلام کے مال کی شرط لگا دی تو وہ اسی کا ہوگا، خواہ وہ مال نقد ہو، دین ہو یا سامان ہو، معلوم ہو یا مجہول ہو" (المؤطا ص ۳۷۸)۔

سوم: شیئر کا جز کمپنی میں دین کی نمائندگی کرتا ہے، لہذا ثمن مؤجل کے عوض اس کی بیع درست نہیں ہوگی، کیونکہ اس صورت میں دین کی بیع دین سے ہوگی، جو کہ ممنوع ہے، چنانچہ روایت میں آتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیع الکالی بالکالی (یعنی دین کی دین سے بیع) سے منع فرمایا ہے[3]۔

اس کے متعدد جواب دیئے جا سکتے ہیں:

۱۔ یہ حدیث ضعیف ہے، کیونکہ اس کی سند میں موسی بن عبیدہ نامی راوی ہیں جو ضعیف ہیں[4]، لہذا یہ قابل استدلال نہیں ہے، نیز اس حدیث کی متعدد تشریحات کی گئی ہیں، جن میں بیشتر سے ہمارے موضوع کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

۲۔ اس بیع پر بیع الدین بالدین کا انطباق نہیں ہوتا ہے، کیونکہ کمپنی کے قرضہ جات کا یہ حصہ شیئرز میں تبعاً شامل ہے، ایسی صورت میں دوسرے ملاحظہ کے ذیل میں دیا گیا جواب اپنی تمام تفصیلات کے ساتھ اس اشکال کا بھی جواب ہو جائے گا۔

۳۔ سابق حکم یعنی شیئر کے جز کا دین ہونا یہ عام نہیں ہے، چونکہ جب کمپنی میں قرضے نہیں ہوتے تو اس وقت وہ نقد معاملہ کرتی ہے، اور اگر کمپنی کے دیون کا وجود تسلیم بھی کر لیا جائے تو یہ کمپنی کے اثاثے کے ایک قلیل تناسب کی نمائندگی کرتے ہیں، جبکہ فقہی قاعدہ کا تقاضا ہے کہ اعتبار اکثر کا کیا جائے (سابقہ تمام حوالہ جات)۔

خلاصہ یہ ہے کہ جو شیئرز حلال پر مبنی ہیں اور جن کا تعلق ایسی کمپنیوں سے ہے جو کسی حرام کاروبار کرنے سے احتراز کرتی ہیں، اور جن کاروبار میں کمپنی کے

---

[1] الاشباہ والنظائر للسیوطی، طبع عیسی الحلبی، قاہرہ (ص/۱۳۳) اور ملاحظہ ہو اسی موضوع کی ایک اور کتاب: الاشباہ والنظائر لابن نجیم طبع موسسۃ الحلبی قاہرہ (ص/۱۲۱-۱۲۲)۔

[2] صحیح بخاری مع الفتح طبع السلفیۃ-المساقاۃ (۵/۴۹)، مسلم طبع عیسی الحلبی-البیوع (۳/۱۱۷۳)، احمد (۲/۱۵۰)، موطا (ص/۳۷۸)۔

[3] ہیثمی نے مجمع الزوائد (۴/۸۰) میں لکھا ہے، جسے بزاز نے روایت کیا ہے، اور اس میں موسی بن عبیدہ ہیں جو ضعیف ہیں۔

[4] تقریب التہذیب (۲/۲۸۶)، مجمع الزوائد (۴/۸۰)۔

اصول منطبق ہوتے ہوں یعنی ذمہ داریوں اور نقصانات کے برداشت کرنے میں شرکت پائی جاتی ہو، اور یہ شیئرز دوسرے کے مقابلہ میں کسی مالی خصوصیت کے حامل نہ ہوں تو یہ ان وجوہ کی بنا پر جن کا ذکر ہم ماسبق میں کر آئے ہیں حلال ہیں، ان کا اجراء اور ان میں تصرف کرنا جائز ہے، کیونکہ یہ صورت بھی ان جائز تصرفات کے حدود میں داخل ہے جن کی اجازت شارع نے مالک کو اپنی زیر ملکیت چیز کے سلسلے میں دے رکھی ہے اللہ تعالی کے اس قول کی تعمیل میں: "... وأحل الله البيع..." (اور اللہ نے بیع کو حلال قرار دیا) (سورہ بقرہ/۲۷۵) اور ان دوسرے دلائل کی بنا پر جن میں سے بعض کا تذکرہ ہم کر چکے ہیں۔

قسم دوم: ایسے شیئرز جن میں سابقہ شرائط کا تحقق نہ ہو:

اس سے مراد وہ شیئرز ہیں جن کا تعلق (پہلے نوع کی طرح) حرام کاروبار کرنے والی کمپنیوں سے نہ ہو، اور نہ ان کمپنیوں سے جو حلال پر مبنی ہوں قسم اول کی طرح، بلکہ ان سے مراد ان کمپنیوں کے شیئرز ہیں جو بعض اوقات بینکوں میں سود پر اپنے پیسے جمع کرتی ہیں، یا بینکوں سے سود پر قرضے لیتی ہیں، یا ان کے معاملات کا ایک مختصر تناسب عقود فاسدہ کے ذریعہ انجام پاتا ہے جیسے کہ مسلم ممالک کی بیشتر کمپنیاں یا غیر مسلم ممالک میں وہ کمپنیاں جن کا دائرۂ کار مباح ہوتا ہے جیسے زراعت، صنعت اور تجارت (یعنی نوع اول میں ذکر کئے گئے سابقہ محرمات کے علاوہ)۔

اس قسم کے شیئرز کا حکم بیان کرنے سے پہلے میں اس سلسلے میں شرعی اصولوں کی بالاجمال وضاحت کرنا چاہتا ہوں:

اول: مسلمانوں سے اس بات کا مطالبہ کیا گیا ہے کہ وہ حلال وطیب مال جس میں کوئی شبہ نہ ہو، فراہم کریں، اللہ تعالی کا فرمان ہے: "يا أيها الناس كلوا مما في الأرض حلالا طيبا" (سورہ بقرہ/۱۶۸)۔ ترجمہ: (اے لوگو! زمین میں جو کچھ ہے ان میں سے حلال اور طیب رزق کھاؤ)۔

اور ایک مقام پر ارشاد ہے: "فكلوا مما رزقكم الله حلالا طيبا واشكروا نعمة الله" (سورۃ النحل/۱۱۴) (جو کچھ اللہ نے تم کو عطا کیا ہے ان میں سے حلال وطیب کو کھاؤ اور اللہ کی نعمت پر شکر ادا کرو)۔ اور آپ ﷺ کا ارشاد ہے: "الحلال بيّن والحرام بيّن وبينهما مشتبهات لا يعلمها كثير من الناس، فمن اتقى الشبهات فقد استبرأ لدينه وعرضه..." (حلال صریح ہے اور حرام بھی صریح ہے اور ان دونوں کے درمیان مشتبہ امور ہیں جن کو بیشتر لوگ نہیں جانتے، تو جس نے شبہات سے احتراز کیا تو اس نے اپنے دین اور اپنی آبرو کو بچا لیا)[1]

حافظ ابن حجر فرماتے ہیں: شبہات کے حکم میں اختلاف ہے، چنانچہ کہا گیا ہے کہ اس سے مراد تحریم ہے، لیکن یہ بات قابل رد ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ اس سے مراد کراہت ہے، ایک قول توقف کا ہے۔ مزید فرماتے ہیں: چوتھا قول یہ ہے کہ اس سے مراد مباح ہے، اور اس قول کے قائل کے لئے ممکن نہیں کہ وہ اسے ہر وجہ کے دونوں پہلوؤں کے مساوی ہونے پر محمول کرے، البتہ وہ اسے خلاف اولی کی قسم پر محمول کرسکتا ہے...... ابن منیر نے اپنے شیخ قباری کے مناقب میں ان سے نقل کیا ہے کہ وہ فرماتے تھے:

مکروہ، بندے اور حرام کے درمیان ایک رکاوٹ ہے، تو جو مکروہ کا زیادہ ارتکاب کرنے لگے وہ حرام تک جا پہونچے گا...... یہ ایک اچھا مقصد ہے (فتح الباری ۱/۱۲۷)۔

دوم: شریعت اسلامی کی بنیاد رفع حرج، دفع مشقت اور امت کے لئے مصالح وسہولت فراہم کرنے پر ہے، چنانچہ اللہ تعالی کا ارشاد ہے: ''وما جعل عليكم في الدين من حرج'' (سورہ حج/۷۸) (اور اس نے دین میں تم پر کوئی تنگی نہیں رکھی)، اور ارشاد باری ہے: ''يريد الله بكم اليسر ولا يريد بكم العسر'' (سورة البقرہ: ۱۸۵) (اللہ تمہارے ساتھ آسانی چاہتا ہے وہ تمہارے ساتھ تنگی نہیں چاہتا)، یہ اصول اتنا واضح ہے کہ دلیل کی ضرورت نہیں، بلکہ یہ تو مقاصد شرع میں سے ایک ہے۔

اسی اصل کی بنا پر ضرورت کے وقت ممنوعات جائز قرار دی گئی ہیں، "فمن اضطر غير باغ ولا عاد فلا إثم عليه" (پس جو کوئی مجبور کر دیا جائے، چاہنے والا نہ ہو، حد سے تجاوز کرنے والا نہ ہو تو اس پر کوئی گناہ نہیں)۔

اور جس طرح ضرورت قابل رفع ہے اسی طرح حاجت بھی ضرورت کے قائم مقام ہے، امام سیوطی، ابن نجیم اور دوسرے علماء فرماتے ہیں: "حاجت

---

[1] (صحیح بخاری مع الفتح، الایمان ۱/۱۲۶، مسلم، المساقاۃ ۳/۱۲۲۰، أحمد ۴/۲۶۷)۔

ضرورت کے درجہ میں ہے خواہ وہ عام ہو یا خاص"۔ اسی بنا پر اجارہ، جعالہ وغیرہ جائز قرار دیئے گئے ہیں[1]۔

شیخ احمد الزرقاء فرماتے ہیں: حاجت سے مراد وہ حالت ہے جو حصول مقصود کے لئے تیسیر و تسہیل کی متقاضی ہو، اس اعتبار سے یہ ضرورت سے کم درجہ کی چیز ہے، اگر چہ حاجت کی وجہ سے ثابت شدہ حکم مستقل ہوگا اور ضرورت کی وجہ سے ثابت شدہ حکم وقتی ہوگا[2]۔

اس قاعدہ کی فقہی مثال وہ ہے جسے فقہائے حنفیہ نے جائز قرار دیا ہے جیسے بیع الوفاء، باوجودیکہ اسکا مقتضی عدم جواز ہے، کیونکہ یا تو وہ ربا کے قبیل سے ہے، چونکہ یہ دین کے عوض عین سے انتفاع ہے، یا کسی معاملہ میں مشروط کوئی معاملہ ہے، گویا اس نے یہ کہا: میں نے اسے تم سے اس شرط کے ساتھ بیچا کہ جب میں تمہارے پاس قیمت لے آؤں تم اس کو مجھ سے بیچ دو، اور یہ دونوں ناجائز ہیں، لیکن جب بخارا میں وہاں کے باشندوں پر دیون کی کثرت کے باعث اس کی سخت ضرورت پیش آئی تو اسے اس تاویل کی بنا پر جائز قرار دیا گیا کہ وہ رہن ہے جس کے منافع اور ثمرات سے فائدہ اٹھانا جائز ہے جیسے بکری کا دودھ، اور رہن اس کیفیت کے ساتھ جائز ہے (حوالہ سابق)۔

اور اسی طرح کا ایک اجتہاد وہ ہے جسے ابن عابدین نے ذکر کیا ہے کہ مشائخ بلخ اور امام نسفی نے غلہ کو منتقل کرنے کو اسی غلہ کے ایک حصہ کے بدلے اور کپڑے کی بنائی کو اسی کپڑے کے ایک حصہ کے بدلے میں جائز قرار دیا ہے، اس لئے کہ وہاں کے باشندوں میں یہ طریقہ عام تھا اور ضرورت کے پیش نظر ایسا کیا گیا، باوجودیکہ وہ خلاف قیاس ہے، اور متقدمین حنفیہ نے اس کے عدم جواز کی صراحت کی ہے[3]۔ ابن عابدین نے یہ بھی ذکر کیا ہے کہ جب بعض متقدمین حنفیہ سے سوال کیا گیا کہ اس فیصد (Percentage) کا کیا حکم ہے جسے ایجنٹ لیا کرتے ہیں مثلاً ۱۰٪، تو انہوں نے جواب دیا: یہ ان پر حرام ہے، صرف ان کے لئے اجر مثل واجب ہے، جبکہ دوسرے بعض لوگوں نے اس کی اجازت دی ہے جیسے محمد بن سلمہ، چنانچہ جب ان سے ایجنٹ کی اجرت کے بارے میں سوال کیا گیا تو انہوں نے فرمایا: میرا خیال ہے اس میں کوئی حرج نہیں، کثرت تعامل کی بنا پر۔ اگر چہ اصلاً فاسد ہے۔ اور اس طرح کے بہت سے امور ناجائز ہیں، لیکن فقہاء نے ان کو لوگوں کی ضرورت کی بنا پر جائز قرار دیا ہے....." (حاشیہ ابن عابدین ۳۹/۵)۔

اس فقہی اصول کے عملی دلائل حدیث شریف میں موجود ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیع عرایا کو جائز قرار دیا[4] اس کے باوجود کہ اس کی اصل ربا میں شامل ہے، چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تازہ کھجوروں کے عوض خشک کھجوروں کی بیع کو جائز نہیں قرار دیا ہے[5] کمی اور حقیقی مماثلت کے نہ پائے جانے کی بنا پر، لیکن اس کے باوجود آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کی ضرورت کے پیش نظر اس کو جائز قرار دیا۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ فرماتے ہیں: "اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کی ضرورت کے پیش نظر بیع عرایا کو جائز قرار دیا ہے باوجودیکہ یہ ربا میں داخل ہے"۔ مزید فرماتے ہیں: "شریعت کی تمام تر بنیاد اس بات پر ہے کہ مفسدہ جو تحریم کا متقاضی ہے اگر کوئی ترجیحی حاجت اس کے مقابل آ جائے تو اس شئی حرام کو مباح قرار دیا جائے گا"۔ اور پھر لکھتے ہیں: کسی ایک نوع کے غرر کی وجہ سے شارع ان چیزوں کو حرام نہیں کرتا جن کی لوگوں کو بیع میں ضرورت پیش آتی ہے، بلکہ اس سلسلے میں جو بھی ضرورت پیش آتی ہے شارع اسے جائز قرار دیتا ہے[6]۔

---

1. الاشباہ والنظائر للسیوطی (ص ۹۷-۹۸)، الأشباہ والنظائر لابن نجیم (ص ۹۱-۹۲)۔
2. شرح القواعد الفقہیہ، از: شیخ احمد الزرقاء، طبع دار الغرب الاسلامی (ص ۱۵۵)۔
3. حاشیہ ابن عابدین، طبع دار احیاء التراث العربی، بیروت (۳۶/۵-۳۷)۔
4. لوگوں کی ضرورت کی بنا پر بیع عرایا کی رخصت کے لئے دیکھئے: صحیح بخاری مع الفتح (۳۹۰/۴)، مسلم (۱۱۶۸/۳)، احمد (۱۸۱/۵)۔ عریہ کہتے ہیں: کھجور کے درخت پر لگے ہوئے کھجوروں کو ٹوٹے ہوئے کھجوروں کے عوض اندازے اور تخمینہ سے بیچنا۔
5. آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے خشک کھجوروں کے عوض تازہ کھجوروں کی بیع کے بارے میں سوال کیا گیا تو آپ نے فرمایا: کیا خشک ہونے کے بعد کھجوروں میں کمی ہو جاتی ہے؟ عرض کیا گیا: ہاں، تو آپ نے فرمایا: "تب تو نہیں"۔ دیکھئے: مسند الشافعی (ص ۵۱)، احمد (۳۱۲/۳)، ترمذی (۲۳۱/۱)، نسائی (۲۶۹/۷)، ابن ماجہ (۷۶۱/۲)، سنن أبی داؤد (۲۵۱/۳)، السنن الکبری (۲۹۴/۵) اور دیکھئے: تلخیص الحبیر (۹/۳-۱۰)۔
6. مجموع الفتاوی (۲۲/۲۹، ۴۹)۔

سوم: عرف کے رول اور فقہ اسلامی میں اس کے اثر کا جب تک کہ وہ نصوص شریعت سے متصادم نہ ہو، انکار نہیں کیا جا سکتا، ابن نجیم کہتے ہیں: ''جان لو کہ فقہ میں بہت سے مسائل میں عرف وعادت کے اعتبار کی طرف رجوع کیا جاتا ہے، یہاں تک کہ فقہاء نے اس کو ایک قاعدہ بنا دیا ہے،.....''۔ مزید لکھتے ہیں: ''خلاصہ کلام یہ کہ عام مذہب تو عرف خاص کے عدم اعتبار کا ہے لیکن بہت سے مشائخ نے اس کے معتبر ہونے کا فتوی دیا ہے، اس کو معتبر مانتے ہوئے میرا کہنا یہ ہے کہ یہ فتوی دیا جانا چاہئے کہ جو قاہرہ کے بعض بازاروں میں ہوتا ہے یعنی دوکانوں کی پگڑی لینا، وہ لازم ہے، اور دوکان کی پگڑی اس کا حق ہوگا، لہذا دوکان کے مالک کو اسے وہاں سے نکالنے کا اختیار نہ ہوگا اور نہ اسے دوسرے کو اجارتاً دینا درست ہوگا اگر چہ وہ دوکانیں وقف ہی کیوں نہ ہو، غوریہ میں جملون کی دوکانوں میں ایسا ہوا ہے کہ شاہ غوری نے جب اس کی تعمیر کی تو اسے پگڑی پر تاجروں کو رہنے کے لئے دیا اور ہر دوکان پر ایک رقم متعین کر دی جو ان سے لیا جاتا اور اسے وقف نامہ میں لکھا جاتا، اسی طرح میں بھی عرف خاص کے معتبر ہونے کا قائل ہوں''۔

ابن نجیم مزید یہ بھی لکھتے ہیں کہ: ''متعدد مسائل میں علماء نے قاہرہ کے عرف کا اعتبار کیا ہے، ان میں سے ایک مسئلہ وہ ہے جو فتح القدیر میں ہے کہ صرف قاہرہ میں نہ کہ دوسرے مقامات پر، فروخت کئے گئے گھر میں سلّم (سیڑھی) بھی داخل سمجھا جائے گا، کیونکہ اہل قاہرہ کے مکانات کئی منزلہ ہوتے ہیں جن سے انتفاع سیڑھی (سلّم) کے ذریعہ ہی ہو سکتا ہے''[1]۔

علمائے محققین نے تو اسی عالم کے لئے فتوی دینے کو جائز کہا ہے جو لوگوں کے احوال اور ان کے عرف سے واقف ہو، اور یہ کہ ہر ملک کا عرف بھی پیش نظر رہے، اس سلسلے میں ابن القیم لکھتے ہیں: ''......تو جب بھی کوئی نیا عرف وجود میں آئے اس کا اعتبار کرو، اور جو عرف ساقط ہو جائے اسے ترک کر دو، پوری عمر منقولات (کتابوں میں نقل کی گئی باتوں) پر جمے نہ رہو، بلکہ اگر تمہارے پاس کسی اور ملک سے کوئی آجائے اور تم سے فتوی چاہے تو تم اسے اپنے ملک کے عرف کے مطابق مت چلاؤ بلکہ اس سے اس کے ملک کا عرف معلوم کر کے اس کے مطابق اس کی رہنمائی کرو......''[2]۔

چہارم: آج ہم مسلمان ایسے زمانہ میں نہیں جی رہے ہیں جس میں اسلامی نظام پورے طور پر نافذ العمل ہو، اور اس پر اسلام کے سیاسی، اقتصادی، اجتماعی اور تربیتی نظام کا غلبہ ہو، بلکہ ہم ایسے دور میں جی رہے ہیں جس میں سرمایہ دارانہ اور اشتراکی نظام کا دور دورہ ہے، ایسی صورت میں یہ ممکن نہیں کہ ہم جو چاہیں یک بیک حاصل کر لیں، یعنی یہ کہ رخصت سے صرف نظر کر کے عزیمت کی بنیاد پر، مختلف فیہ کو چھوڑ کر متفق علیہ مسائل کے مطابق، اور شبہات کے وجود سے قطع نظر خالص، طیب اور حلال کو بنیاد بنا کر تمام معاملات مسلمانوں کے درمیان جاری وساری ہو جائیں۔ لہذا ہمارا دور اس بات کا تقاضہ کرتا ہے کہ نافع حل تلاش کئے جائیں اگر چہ وہ کسی ایک ہی فقیہ کی رائے کے مطابق ہوں جب تک اس فقیہ کی اس رائے سے مسلمانوں کے مصالح پورے ہوتے رہیں، بلکہ اب یہ شرط بھی نہ ہونی چاہئے کہ ہمیں کوئی سابق رائے ملے، ہمارے لئے ضروری صرف یہ ہے کہ ہم شریعت کے ان عام اصولوں اور مبادی کے دائرے میں غور وفکر کریں جن سے امت کا بھلا ہو اور جو کسی ثابت شدہ نص شرعی سے متصادم نہ ہوں۔

ہماری ذمہ داری ہے کہ اقتصادی نظام کو بروئے کار لانے کی کوشش کریں، ہمارا فرض ہے کہ مسلمانوں کے مال کو بچانے اور اغیار کے قبضہ کے بغیر مسلمانوں کی معاشیات کو ان کے ہاتھوں میں باقی رکھنے کے لئے سنجیدہ کوشش کریں۔ ہمیں شیخ الاسلام عزبن عبد السلام کے اس وسیع افق کی طرف دیکھنے کی ضرورت ہے جس میں وہ فرماتے ہیں:

''اگر روئے زمین پر حرام عام ہو جائے، اس طور پر کہ اس میں کوئی حلال چیز نہ پائی جائے تو جائز ہے کہ اس چیز کو حلال قرار دیا جائے جس کی حاجت متقاضی ہو، اس کو حلال قرار دینا ضرورت پر موقوف نہ ہوگا، اس لئے کہ اگر یہ ضرورت پر موقوف رہی تو اس کا نتیجہ بندوں کی کمزوری اور اہل کفر وعناد کا ممالک اسلامیہ پر غلبہ کی شکل میں ظاہر ہوگا، اور لوگوں کا تعلق ان پیشوں، صنعتوں، ہنر اور ذرائع سے منقطع ہو جائے گا جو خلق کے مصالح کی تکمیل کرتے ہیں (قواعد الاحکام ۱۵۹/۲)۔

اس قسم کے شیئرز کا حکم:

---

[1] الاشباہ والنظائر لابن نجیم (ص/ ۹۳-۱۰۳-۱۰۴) اور ابن عابدین کے رسائل کے ضمن میں ملاحظہ ہو: نشر العرف فی بناء بعض الاحکام علی العرف، طبع آستانہ (۱۱۵/۲-۱۱۸)۔

[2] اعلام الموقعین، طبع شقرون قاہرہ (۷۸/۳)۔

ان اصولوں کو ذکر کرنے کے بعد ہم اس قسم کے شیئرز کے حکم، معاصرین کے اختلاف رائے اور ان کے ترجیحی دلائل کو بیان کرتے ہیں۔ معاصرین نے اس سلسلے میں دو رائیں اختیار کی ہیں:

پہلی رائے: یہ ہے کہ اس قسم کے شیئرز میں تصرف حرام ہے جب تک کہ حلال خالص پر ان کی بنیاد نہ ہو، بعض نے ایسے شیئرز کے لئے ایک شرعی نگراں بورڈ کے قیام کو ترجیح دی ہے [۱]۔

دوسری رائے: (ذکر کردہ) شیئرز اور ان میں تصرف کی اباحت کی ہے۔

یہ ایک پہلو ہے، دوسری طرف، بہت سارے حضرات اس تفصیل میں گئے بغیر جس کا میں نے ذکر کیا ہے مسلم ممالک میں مطلقاً شیئرز کی اباحت کے قائل ہیں، ان میں مندرجہ ذیل شیوخ ہیں: علی الخفیف، ابوزہرہ، عبدالوہاب خلاف، عبدالرحمن حسن، عبدالعزیز الخیاط، وہبہ الزحیلی، قاضی عبداللہ سلیمان بن منیع وغیرہ، ان تفصیلات وفروعات کی بنیاد پر جن پر ان میں سے بعض حضرات کے نزدیک نظر ثانی کی ضرورت ہے [۲]۔

پہلی رائے کے حاملین نے اپنی رائے کی بنیاد اس بات پر رکھی ہے کہ ان شیئرز میں جب تک حرام کا وجود ہو یا ان کی کمپنیاں بعض حرام کاروبار کرتی ہوں مثلاً اپنے کچھ سرمائے سودی بینکوں میں ڈپوزٹ کرتی ہوں تو ان شیئرز کا خریدنا حرام ہوگا، اس کی بناء ان نصوص پر ہے جو حرام اور شبہات سے احتراز کے وجوب پر دلالت کرتی ہیں، اسی طرح یہ اصول بھی اس کی بنیاد ہے کہ: جب حلال وحرام کا اجتماع ہوجائے تو حرام غالب ہوگا۔

جو جواز کے قائل ہیں ان کی دلیل یہ ہے کہ شیئرز فی نفسہ مخالف شریعت نہیں ہیں، جہاں تک ان بعض شوائب، شبہات اور محرمات کا تعلق ہے جن کی ان میں آمیزش ہوتی ہے تو وہ حلال کی بہ نسبت کم ہیں، لہذا جب تک رأس المال کا بیشتر حصہ اور بیشتر تصرفات حلال رہیں گے قلیل نادر کو کثیر شائع کے حکم میں مانا جائے گا، اور خصوصاً محرمات کے اس تناسب کا ازالہ اور اس کے بعد اس سے چھٹکارا اسی صورت میں حاصل ہوسکتا ہے جب مفصل بجٹ کے ذریعہ یا کمپنی کے متعلق دریافت کے ذریعہ ان سے واقفیت حاصل کی جائے [۳]۔

اور شریعت کے عموم اور اس کے یسر اور رفع حرج سے متعلق اصولوں پر مبنی فقہاء کے نصوص اور فقہی قواعد کی روشنی میں مندرجہ ذیل طریقے سے اس کی اصل تلاش کی جاسکتی ہے:

اول: بیشتر لوگوں کے نزدیک ایک حرام جز کے اختلاط سے مجموعی مال حرام نہیں ہوتا، چنانچہ انہوں نے ایسے حلال مال میں جس میں حرام کی ایک قلیل مقدار ملی ہوئی ہو شرعی تصرفات یعنی ان کو زیر ملکیت رکھنے، کھانے، ان کی خرید وفروخت کرنے اور اس طرح کے دوسرے امور کو جائز قرار دیا ہے، البتہ فقہاء نے حرام لذاتہ اور حرام لغیرہ میں فرق کیا ہے۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ فرماتے ہیں: حرام کی دو قسمیں ہیں:

۱۔ جو اپنی ذات میں حرام ہو، جیسے مردار، خون اور خنزیر کا گوشت، چنانچہ اگر یہ پانی، سیال چیز اور طعام جیسی چیزوں سے مخلوط ہوجائے اور اس کا مزہ یا رنگ یا اس کی بو بدل جائے تو وہ چیز حرام ہوجائے گی، اور اگر اس نے اسے تبدیل نہ کیا ہو تو ایسی صورت میں اختلاف ہے......

۲۔ جو کسب کے نتیجہ میں حرام ہو، جیسے غاصبانہ طور پر یا عقد فاسد کے ذریعہ حاصل کی گئی چیز، تو یہ چیز اگر حلال سے مخلوط ہوجائے تو اسے حرام نہیں کرے گی، لہذا اگر ایک شخص نے چند دراہم، یا دینار، یا آٹا، یا گیہوں یا روٹی غصب کرلیا اور اسے اپنے مال سے مخلوط کردیا تو پورا مال حرام نہیں ہوگا، نہ یہ سامان اور نہ وہ سامان،

۱۔ الاسواق المالیۃ، از: ڈاکٹر علی السالوس: ایک مقالہ جو آرگنائزیشن آف اسلامک کانفرنس کے چھٹے اجلاس میں پیش کیا گیا تھا (ص ر ۷)۔

۲۔ الشرکات للشیخ علی الخفیف (ص ر ۹۶ - ۹۷)، شیخ ابوزہرہ کا مقالہ جو مجمع البحوث الاسلامیہ کی دوسری کانفرنس کی مطبوعات کے ساتھ شائع کیا گیا تھا (۲ ر ۱۸۴)، ڈاکٹر الخیاط کی کتاب: الشرکات فی الشریعۃ الاسلامیہ والقانون الوضعی، طبع الرسالۃ (۲ ر ۱۸۷)، ڈاکٹر وہبہ الزحیلی کا مجمع الفقہ الاسلامی کے چھٹے اجلاس میں پیش کردہ مقالہ (ص ر ۵)، ڈاکٹر صالح بن زابن: حوالہ سابق (ص ر ۳۴۲) اور قاضی عبداللہ بن سلیمان کا محولہ بالا مقالہ۔

۳۔ سابقہ مراجع، خاص طور سے شیخ عبداللہ بن سلیمان کا مقالہ، جس میں موصوف نے بہت اچھی تفصیل بیان فرمائی ہے۔

بلکہ اگر وہ دونوں مماثل ہوں تو اسے تقسیم کردیں، یہ اپنے حصہ کے بقدر لے لے گا اور وہ اپنے حصہ کے بقدر لے لے گا......

یہ ایک مفید بنیاد ہے، کیونکہ بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ حرام دراہم جب حلال دراہم سے مخلوط ہو جائیں تو تمام مال حرام ہو جاتا ہے، یہ ایک غلط خیال ہے، حالانکہ ان لوگوں نے حلال دراہم کم ہونے کی صورت میں ورع سے کام لیا ہے، اور رہ گئی بات کثرت کی صورت میں تو میں نہیں جانتا کہ اس میں کوئی اختلاف ہے (مجموع الفتاوی، طبع الریاض ۲۹/۳۲۰-۳۲۱)۔

اس تفصیل کی روشنی میں، ہمارا مذکورہ مسئلہ دوسری قسم کے ذیل میں آتا ہے، کیونکہ ہماری گفتگو ان شیئرز کے بارے میں ہے جن میں بعض حرام تصرفات کا شائبہ ہو، مثلاً یہ کہ شیئرز کی بعض رقوم سودی بینکوں میں ڈپوزٹ کرنا۔ اس صورت کی مزید وضاحت کے لئے ہم اس مسئلہ میں فقہاء کی تصریحات کا ذکر کرتے ہیں:

ابن نجیم حنفی فرماتے ہیں: "اگر ہدیہ کرنے والے کا بیشتر مال حلال ہو تو اس کا ہدیہ قبول کرنے اور اس کا مال کھانے میں کوئی حرج نہیں جب تک یہ معلوم نہ ہو جائے کہ وہ حرام ہے، اور اگر اس کے مال کا بیشتر حصہ حرام ہو تو وہ اسے قبول نہ کرے گا اور نہ اسے کھائے گا، الا یہ کہ وہ کہے کہ: یہ مال حلال ہے جو اسے وراثتاً حاصل ہوا ہے یا اس نے بطور قرض لیا ہے"۔ ابن نجیم پھر ذکر کرتے ہیں کہ اگر بازار والوں کی بیشتر بیع فساد اور حرام سے خالی نہ رہنے لگے تو مسلمان اس کے خریدنے سے گریز کرے گا، لیکن اگر اس کے باوجود وہ اسے خرید لیتا ہے تو وہ اس کے لئے پاک ہے۔ نیز یہ بھی فرماتے ہیں کہ: "اگر شہر میں حلال وحرام مخلوط ہو جائیں تو اس وقت تک خرید وفروخت جائز ہے جب تک اس بات کی دلیل نہ مل جائے کہ یہ حرام ہے، اصل میں بھی اسی طرح ہے"۔

اس کے بعد دوسری صورتیں ذکر کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں: "انہیں میں سے وہ بیع ہے جب کسی ایک معاملہ میں حرام وحلال جمع ہو جائے، چنانچہ اگر شئ حرام مال نہ ہو جیسے ذبح شدہ اور مردار جانور کا یکجا ہو جانا، تو اس صورت میں حرام کے بطلان کی قوت کی بنا پر حلال میں بھی بطلان سرایت کر جائے گا، اور اگر حرام ضعیف ہو مثلاً وہ مجموعی حیثیت سے مال ہو جیسے مدبر اور عام غلام کا اجتماع .... تو ایسی صورت میں (قن) کے ضعف کی بنا پر اس میں فساد منتقل نہیں ہوگا......"[1]۔

کاسانی فرماتے ہیں: "ہر وہ شئ جسے حرام نے فاسد کر دیا ہو، اور اس میں حلال غالب ہو تو اس کی بیع میں کوئی قباحت نہیں ہے"[2]۔

فقیہ ابن رشد نے اس مسئلہ کو تفصیل سے بیان کیا ہے، ہم ان میں سے کچھ کا ذکر ذیل میں کرتے ہیں: وہ تحریر فرماتے ہیں: "جہاں تک پہلی صورت کا تعلق ہے: یعنی اس کے مال میں غالب حصہ حلال ہو تو اپنی ذات کے سلسلے میں اس پر واجب ہے کہ اللہ تعالیٰ سے استغفار کرلے، اور جو کچھ اس میں حرام مخلوط ہو گیا ہے اسے لوٹا کر توبہ کرلے ...... یا اگر ان کو نہ جانتا ہو تو ان کی طرف سے صدقہ کردے ...... اور اگر سود ہو تو اپنے دیئے ہوئے مال سے جتنا زیادہ اس نے لیا ہو اسے صدقہ کردے ......"۔

پھر لکھتے ہیں: "اور اگر اس پورے معاملہ میں اپنے بائع کو جانتا ہے تو اسے وہ زائد حصہ لوٹا دے گا جس میں اس نے اس کے ساتھ معاملہ کیا ہے، جب یہ کر لے گا تو باتفاق علماء اس کی حرمت رفع ہو جائے گی، اس کی عدالت درست ہوگی، وہ گناہ سے بری ہو جائے گا، اس کے مال کا باقی حصہ اس کے لئے حلال ہوگا، اس میں اس کا بیع وشراء کرنا، اس کا ہدیہ قبول کرنا اور اس کا کھانا کھانا جائز ہوگا۔ اور اگر ایسا نہ کرے تو اس سے معاملہ کرنے، اس کا ہدیہ قبول کرنے اور اس کا کھانا کھانے کے جواز میں اختلاف ہے، ابن القاسم نے اس کے معاملہ کو جائز قرار دیا ہے، ابن وہب نے اس کا انکار کیا ہے اور اصبغ نے اسے حرام قرار دیا ہے......"۔

جہاں تک دوسری صورت کا تعلق ہے: یعنی یہ کہ اس کے مال میں غالب حصہ حرام ہو تو اس کا حکم ان معاملہ میں جو اس کے لئے اپنی ذات کے سلسلے میں واجب ہے ماقبل ہی جیسا ہے۔

اور جہاں تک اس سے معاملہ کرنے اور اس کا ہدیہ قبول کرنے کا تعلق ہے تو ہمارے علماء نے اس سے روکا ہے، کہا گیا ہے کہ ایسا کراہتاً ہے۔ یہ قول ابن القاسم کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ ایسا تحریماً ہے، الا یہ کہ وہ حلال سامان خریدے تو ایسی صورت میں اس سے خریدنے اور اس سے ہدیہ قبول کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے......[3]۔

عز بن عبد السلام کہتے ہیں: "اگر حلال غالب ہو اس طور پر کہ ایک حرام درہم ایک ہزار حلال درہم سے مخلوط ہو جائے تو معاملہ درست ہے......" (قواعد

---

[1] الاشباہ والنظائر لابن نجیم (ص ۱۱۲، ۱۱۳، ۱۱۴)، اور ملاحظہ ہو: حاشیہ ابن عابدین (۴/۱۳۰)۔

[2] بدائع الصنائع (۶/۱۴۴)۔

[3] فتاوی ابن رشد، تحقیق: المختار بن الطاہر التلیلی طبع دار الغرب الاسلامی (۱/۶۳۱-۶۴۹)، مواہب الجلیل (۵/۷۷)۔

لأحکام ار۲۷-۳۷)۔ زرکشی نے بھی اسی طرح کی بات کہی ہے [1]۔ لیکن سیوطی نے ذکر کیا ہے کہ امام غزالی کو چھوڑ کر فقہاء شافعیہ کا اصح قول یہ ہے کہ انہوں نے اس شخص کے معاملہ کو حرام نہیں قرار دیا ہے جس کا بیشتر مال حرام ہو، لیکن یہ اس صورت میں جب کہ وہ متعین نہ ہو، فقہاء شافعیہ کے نزدیک ایسا مال صرف مکروہ ہے، یہی حکم سلطان کے عطایا کو قبول کرنے کا ہوگا جب اس کے مملوکہ مال میں حرام غالب ہو، جیسا کہ مہذب میں ہے: اس سلسلے میں مشہور قول کراہت کا ہے تحریم کا نہیں برخلاف غزالی کے...... انہوں نے "الاحیاء" میں فرمایا ہے: "اگر شہر میں کوئی ایسی حرام چیز جس کا احاطہ نہ کیا جا سکے، خلط ملط ہو جائے تو اس میں سے خریدنا حرام نہیں بلکہ اس میں سے لینا درست ہے، الا یہ کہ اس کے ساتھ کوئی ایسا قرینہ پایا جائے جو اس کے حرام ہونے کو بتائے"۔ مزید کہتے ہیں: اسی قاعدہ میں "تفریق صفقہ" بھی داخل ہے، وہ یہ کہ دو عقدوں یعنی حرام اور حلال کا اجتماع ہو جائے، یہ قاعدہ چند ابواب میں جاری ہوتا ہے، عموماً اس سلسلے میں دو قول یا صورتیں ہیں، ان میں اصح قول عقد حلال میں صحت کا ہے، دوسرا قول دونوں میں بطلان کا ہے...... بیع میں اس کی مثال یہ ہے کہ کوئی شخص سرکہ اور شراب فروخت کرے...... [2] ابن المنذر کا کہنا ہے کہ: جس کے مال میں حرام کا اختلاط ہو اس کی بیع وشراء، اس کا ہدیہ اور بخشش قبول کرنے میں فقہاء کا اختلاف ہے، حسن، مکحول، زہری اور شافعی کے نزدیک اس میں رخصت ہے، شافعی فرماتے ہیں: "میں اسے پسند نہیں کرتا، اور اسے ایک جماعت نے مکروہ قرار دیا ہے......" (المجموع للنووی (۹/ ۳۵۳) طبع المنیریہ)۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ نے اس مسئلہ کی تفصیل اس وقت بتائی جب ان سے ایک سوال کیا گیا جسے موجودہ دور میں بھی ہم سنتے رہتے ہیں، سوال یہ ہے: ایک شخص نے فقہاء سلف میں سے کسی سے نقل کیا کہ وہ فرماتے ہیں: حلال کھانا دشوار ہے، اس دور میں اس کا وجود ناممکن ہے، ان سے کہا گیا کہ ایسا کیوں ہے؟ تو انہوں نے بیان کیا کہ منصورہ کی جنگ میں غنائم کی تقسیم نہیں ہوئی، اور اموال معاملات کے ساتھ خلط ملط ہو گئے، تو ان سے کہا گیا کہ: ایک شخص حلال کاموں میں سے کسی کام کو بطور اجیر کر سکتا ہے اور اپنی حلال اجرت لے سکتا ہے، تو انہوں نے بتایا کہ درہم بذات خود حرام ہے۔

ابن تیمیہؒ نے اس کا جواب یہ دیا کہ: یہ قائل خاطی ہے اور غلط کہتا ہے...... اس قسم کی باتیں بعض اہل بدعت، فقہ فاسد کے بعض حاملین اور بعض بے جا شک کرنے والے کہا کرتے تھے، ائمہ کرام نے اس بات کو ناپسند کیا یہاں تک کہ امام احمد اپنے معروف ورع کے باوجود اس قسم کی باتوں کو ناپسند کرتے تھے...... انہوں نے فرمایا: اس خبیث کو دیکھو، مسلمانوں کے اموال کو حرام قرار دے رہا ہے۔

اس کے بعد انہوں نے اس فاسد خیال کے سنگین اثرات کا ذکر کیا ہے، اس کا ایک برا اثر یہ ہوا کہ بعض لوگوں نے یہ سمجھ لیا کہ جب تک روئے زمین پر حرام کا غلبہ رہے گا اس وقت تک حلال کی تحقیق وتلاش کیوں کی جائے؟ لہذا انہوں نے حلال اس کو سمجھا جو ان کے قبضہ میں تھا اور حرام اس کو جس سے وہ محروم تھے، اور بعض نے ورع کو حجت بنا کر جھوٹی حکایتیں گھڑ لیں۔

اس کے بعد انہوں نے اس بات کا رد کیا ہے اور بیان کیا ہے کہ مسلمانوں کے اموال میں غالب حلال ہے، پھر چند اصولوں کا ذکر کیا ہے:

"ان میں سے ایک یہ ہے کہ ہر وہ چیز جس کو کوئی متعین فقیہ حرام سمجھے وہ حرام نہیں ہے، حرام تو وہ ہے جو کتاب یا سنت، یا اجماع یا اس بات کو راجح کرنے والے قیاس سے ثابت ہو، اور جس چیز میں علماء کا اختلاف ہو اس کو ان اصولوں کی طرف لوٹایا جائے گا"۔ پھر فرماتے ہیں کہ مسلمانوں کو کسی متعین مسلک پر آمادہ کرنا غلط ہے۔ پھر ایک دوسری اصل کا ذکر کرتے ہیں اور وہ یہ کہ حرام کا حلال سے مخلوط ہو جانا تمام مال کو حرام نہیں کرتا، جیسا کہ ماسبق میں گزرا۔

اسی طرح انہوں نے ایک اور ضابطہ بتایا ہے، وہ یہ کہ شریعت میں مجہول معدوم اور معجوز عنہ کی طرح ہے، اسی وجہ سے اگر لقطہ کا مالک معلوم نہ ہو تو اس کو اٹھانے والے کے لئے اس کے اشتہار کے بعد حلال ہے، اسی بنا پر اگر اس مال کا حال معلوم نہ ہو جو اس کے ہاتھ میں ہے تو معاملہ کی بنیاد اصل پر ہوگی یعنی اباحت پر (مجموع الفتاوی ۲۹/ ۳۱۱-۳۲۳)۔

جن لوگوں کے مال کا اکثر حصہ حرام ہے جیسے مکاسین اور سود خور، ان کے ساتھ معاملہ (لین دین) کرنے سے متعلق ایک سوال کے جواب میں فرمایا:

اگر حلال اغلب ہو تو معاملہ کی تحریم کا حکم نہیں لگایا جائے گا، اور اگر حرام اغلب ہو تو ایک قول یہ ہے کہ معاملہ حلال ہوگا اور ایک قول یہ ہے کہ معاملہ حرام ہے۔ جہاں تک سود سے معاملہ کا تعلق ہے تو اس کے مال پر غالب حلال ہے، الا یہ کہ کسی اور وجہ سے کراہت کا علم ہو جائے، مثلاً اگر ایک ہزار کو ایک ہزار اور دو سو کے

---

[1] المنثور فی القواعد، طبع اوقاف الکویت (۲/ ۲۵۳)۔

[2] الاشباہ والنظائر للسیوطی (ص/ ۱۲۰-۱۲۱)، وحاشیۃ القلیوبی مع عمیرۃ علی المنہاج (۲/ ۱۸۶)۔

عوض فروخت کرے تو صرف زیادتی حرام ہوگی، اور اگر اس کے مال میں حلال وحرام دونوں ہوں اور مخلوط ہوں تو حلال حرام نہ ہوگا بلکہ اس کو حق ہوگا کہ بقدر حلال لے لے، مثلاً اگر مال دو شریکوں کا ہو اور ان میں سے ایک مال دوسرے کے مال سے مخلوط ہوجائے تو اس مال کو شریکین کے درمیان تقسیم کیا جائے گا، اسی طرح اگر کسی کے مال میں حلال وحرام کا اختلاط ہوجائے تو حرام کی مقدار نکال لی جائے گی اور باقی اس کے لئے حلال ہوگا (مجموع الفتاوی ۲۹/۲۷۲-۲۷۳)۔

ایک سوال اس شخص کے بارے میں کیا گیا جس کا حلال مال، حرام سے مخلوط ہوجائے، تو انہوں نے جواب دیا: میزان کے ذریعہ حرام کی مقدار نکال کر اس شخص کو دے دی جائے گی جو اس کا مالک ہوگا اور حلال کی مقدار اس کے لئے ہوگی، اور اگر وہ اس کے مالک کو نہ جانتا ہو اور جاننا مشکل ہو تو وہ اسے اس کی طرف سے صدقہ کردے گا (حوالہ سابق ۲۹/۳۰۸)۔

اسی سے ملتی جلتی بات کی وضاحت کرتے ہوئے ابن القیم فرماتے ہیں: تحریم نفس درہم اور اس کے جوہر سے متعلق نہیں ہے، یعنی حرام درہم جو اس کے مال سے مخلوط ہوگیا ہے، بلکہ تحریم اس میں کسب کے پہلو سے متعلق ہے، جب اس کی نظیر ہر اعتبار سے نکل گئی تو اس کے ماسوا کی تحریم کا کوئی مطلب نہیں رہا..... اس نوع کے سلسلہ میں صحیح قول یہی ہے، اور خلق کے مصالح کی تکمیل بھی اسی سے ہوتی ہے (بدائع الفوائد ۳/۲۵۷)۔

اس اصول کی روشنی میں، ہم دیکھتے ہیں کہ بہت سے علماء نے اس شخص کے ساتھ معاملہ کو جائز قرار دیا ہے جس کے مال میں حرام مخلوط ہو لیکن اس کا غالب حصہ حلال ہو، لہٰذا اس قسم کے شیئرز میں کاروبار کی اباحت کی بات کہی جاسکتی ہے، لیکن اس کا مالک اس میں حرام کے بقدر کو عوامی فلاح و بہبود کے مصارف میں خرچ کردے گا، اس کے ساتھ ساتھ ان ضوابط کی بھی رعایت ملحوظ رکھے گا جن کا ذکر ہم اخیر میں کریں گے[1]۔

دوم: قاعدہ: جو چیز مستقل جائز نہیں ہوتی وہ تابع ہوکر جائز ہوجاتی ہے، ہم یہ قاعدہ صحیح اور متفق علیہ حدیث سے ماخوذ دلیل کے ساتھ بیان کرچکے ہیں[2]۔

اس اصول کی روشنی میں شیئرز کی اس قسم میں اگرچہ کچھ تناسب حرام کا بھی ہے لیکن وہ تبعاً ہیں، تملک اور تصرف کے مقصد سے وہ اصلاً نہیں آئے ہیں، لہٰذا کمپنی کے اثاثے مباح رہیں گے جبکہ وہ جائز کاروبار کے لئے قائم کی گئی ہو، یہ الگ بات ہے کہ اسے کبھی کبھی افراط زر وغیرہ کی وجہ سے اپنے کچھ سرمائے سودی بینکوں میں رکھنے پڑتے ہیں، یا ان سے قرضے لینے پڑتے ہیں، تو یہ عمل تو بغیر کسی شک وشبہ کے حرام ہے اور اس کا کرنے والا (مجلس انتظامیہ) گنہگار ہوگا، لیکن اس کی وجہ سے بقیہ اموال اور دیگر جائز تصرفات حرام نہیں ہوجائیں گے، یہ بھی ایک تبعی عمل ہے، یہ وہ اصل غالب نہیں ہے جس کے لئے کمپنی کا قیام عمل میں آیا ہے۔

سوم: ایک اصول: "للأكثر حكم الكل" ہے۔ حرام سے مخلوط مال کے حکم کے سلسلہ میں گزشتہ صفحات میں فقہاء کی تصریحات کا ذکر ہم کرچکے ہیں، جس میں یہ بات آچکی ہے کہ جمہور فقہاء کی رائے یہ ہے کہ اعتبار اغلب کا ہوگا[3]۔

فقہاء نے طہارت، عبادات، معاملات، لباس جیسے ریشم، شکار، طعام، قسم اور دیگر ابواب میں اس قاعدہ سے متعلق بہت ساری تطبیقات کا ذکر کیا ہے[4]۔

ایک اور قاعدہ: "الحاجة العامة تنزل منزلة الضرورة" ہے، (عام حاجت ضرورت کے قائم مقام ہے)۔ اس کا ذکر پہلے ہوچکا ہے۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہ نے ذکر کیا ہے کہ ضرورت پڑنے پر اس شخص سے خریدنے میں کوئی کراہت نہیں جس کے مال میں شبہ ہو[5]۔

اس اصول کی تطبیق ہمارے اس موضوع پر اس طرح ہوتی ہے کہ مسلم دنیا میں لوگوں کو شیئرز کمپنیوں کی شدید ضرورت ہے، کیونکہ افراد اپنی جمع شدہ رقوم کی سرمایہ کاری سے بے نیاز نہیں رہ سکتے، اسی طرح حکومتوں کو بھی عوام کے سرمایوں کو طویل مدتی سرمایہ کاری میں لگانے کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ اس کا فائدہ سب لوگوں کو حاصل ہوسکے، اور اگر مسلمان ان کمپنیوں کے شیئرز خریدنے سے گریز کریں گے تو دو صورتوں میں سے کوئی ایک صورت کا پیدا ہونا لازمی ہے:

---

[1] گزشتہ مراجع اور شیخ عبداللہ بن سلیمان کا مقالہ (ص/۱۶)۔

[2] گزشتہ مراجع اور شیخ عبداللہ بن سلیمان کا مذکورہ مقالہ۔

[3] گزشتہ مراجع اور شیخ عبداللہ بن سلیمان کا مذکورہ مقالہ۔

[4] ملاحظہ ہو: جمل الأحکام للناطقی، ازہر میں ایم اے کا مقالہ، تحقیق: حمد اللہ سید (ص/۳۰۷-۳۸۱)۔

[5] مجموع الفتاوی (۲۹/۲۴۱)، اسی طرح انہوں نے اس شخص کے سلسلے میں جس کے مال میں حرام کی آمیزش ہو اغلب کے اعتبار کا قاعدہ ذکر کیا ہے۔

ایک یہ کہ یہ اسکیمیں جو عالم اسلامی کی حیویت کا ذریعہ ہیں تعطل کا شکار ہو جائیں گی۔ دوم یہ کہ ان کمپنیوں اور ان کے انتظام پر غیر مسلموں یا کم از کم فساق و فجار کا غلبہ ہو جائے گا۔

لیکن اگر مخلص مسلمان ان شیئرز کو خریدنے پر آمادہ ہو جائیں تو وہ مستقبل میں ان کمپنیوں کے سودی بینکوں کے ساتھ معاملات کو روکنے پر قادر ہو جائیں گے اور اسلام کے مفاد کے لئے کمپنی کے رخ کو تبدیل کر سکیں گے۔

اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ کمپنی وغیرہ کے وہ ذمہ دار جو تبدیلی پر قادر ہیں گناہ سے بری ہیں، بلکہ وہ بھی گنہگار ہیں، لیکن عوام کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ ان قواعد کے مطابق جن کا ہم ذکر کریں گے، ان شیئرز کو خریدیں، یہی وجہ ہے کہ اگر کوئی شیئر ہولڈر کمپنی کو اپنے کچھ سرمایہ کو ڈپوزٹ کرنے سے روک سکتا ہو تو کمپنی کو روکنا اس پر واجب ہے۔

اس نوع کے شیئرز کے اجراء سے روکنے والی پہلی رائے کا محاکمہ:

اول: حلال مال میں حرام کے معمولی مقدار کے پائے جانے سے مال حرام نہیں ہوگا، بلکہ جیسا کہ تفصیل گزر چکی، صرف حرام کو دور کرنا واجب ہوگا۔

دوم: بعض حضرات نے جو یہ شرط لگائی ہے کہ شیئرز کے جواز یا کمپنیوں کے ساتھ کاروبار کے حلال ہونے کے لئے شرعی نگرانی کا ہونا ضروری ہے، کتاب یا سنت یا اجماع یا قیاس صحیح سے ہمیں اس شرط کی کوئی دلیل نہیں ملتی، کیونکہ مسلمان اپنے دین اور حلت و حرمت کے سلسلے میں امانت دار ہیں اور ان کے احوال پوشیدہ ہیں۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہ فرماتے ہیں: ”کوئی مسلمان اگر ایسے معاملات کرتا ہے جن کے جواز کا وہ اعتقاد رکھتا ہو جیسے حیلے...... جس کے جواز کا فتوی بعض دیتے ہیں...... تو دوسرے مسلمان کے لئے جائز ہے کہ اس کے ساتھ اس مال کے سلسلہ میں معاملہ کرلے“، پھر فرماتے ہیں: ”جہاں تک اس مسلمان کا تعلق ہے جس کا حال پوشیدہ ہے تو حقیقتاً اس کے معاملہ میں کوئی شبہ نہیں، اور جو تقوی کی وجہ سے اس سے معاملہ کرنا ترک کردے تو اس نے دین میں ایسی بدعت ایجاد کردی جس کی اللہ نے کوئی دلیل نہیں نازل کی ہے“ (مجموع الفتاوی ۲۹/۳۱۹-۳۲۴)۔

بلکہ ان امور میں جو حرام نہیں ہیں کفار کے ساتھ کاروبار بالاتفاق جائز ہے، ابن تیمیہ فرماتے ہیں: ”......ایسی صورت میں وہ تمام مال جو مسلمان، یہود اور نصاری کے ہاتھ میں ہیں جن کے بارے میں کسی علامت اور دلیل سے یہ نہیں معلوم کہ وہ غصب کردہ یا مقبوضہ ہیں، ان کے ساتھ قابض کا سا معاملہ کرنا درست نہیں ہے، لہذا ان اموال میں بغیر کسی شک وشبہ کے ان کے ساتھ معاملہ کرنا جائز ہے، اس سلسلہ میں ائمہ کے درمیان مجھے کسی اختلاف کا علم نہیں ہے“۔

ہاں! بے شک حلال و حرام کی واقفیت ہر اس شخص کے لئے ضروری ہے جو مارکیٹ میں گھسنا چاہتا ہے، تاکہ وہ اپنے دین کی حفاظت کر سکے، اور حلال و حرام کا علم یا تو خود سے حاصل کرے یا اہل علم و بصیرت سے پوچھ کر کے معلوم کرلے لیکن ان کے ساتھ یا ان کی کمپنیوں کے ساتھ معاملہ کرنے کے جواز کا حکم شرعی نگرانی کی شرط کے ساتھ نہیں ہونا چاہئے، کیونکہ یہ شرط لگانا تشدد اور شریعت کے وسیع دائرے کو محدود کرنا ہے۔

یہ قول درست ہے کہ کمپنی کے لئے شرعی نگرانی کے ہونے سے اس کے ساتھ کاروبار کرنے والے شرکاء کو تحفظ حاصل ہوگا، لیکن اس کی موجودگی سے کاروبار کے جواز کو مشروط کرنے کی بات قابل غور اور محل نظر ہے۔

ترجیحی رائے اور اس کے ضوابط:

میرے نزدیک جو چیز راجح ہے، اور اللہ ہی کو بہتر علم ہے، وہ یہ کہ مسلمانوں کی زیر ملکیت کمپنیوں کے تعلق سے اس قسم کے شیئرز کی پوزیشن مندرجہ ذیل ہے:

اول: مجلس انتظامیہ اور منتظم کے لئے کسی قسم کا حرام کاروبار کرنا درست نہیں، لہذا ان کے لئے سود پر نہ قرض دینا جائز ہے اور نہ لینا، اگر وہ ایسا کریں تو وہ اس جنگ میں گھس رہے ہیں جس کا اعلان اللہ تعالی نے ان کے خلاف کیا ہے، "فأذنوا بحرب من الله ورسوله"۔ خصوصاً ان حالات میں جب کہ اللہ نے مسلمانوں کے لئے بیشتر مقامات پر اسلامی بینکوں کا یا ان کی طرف سے اپنے تمام سرمایوں کو بیشتر اسلامی خیارات (Options) میں لگانے کا انتظام فرمادیا ہے۔

دوم: جہاں تک ان کمپنیوں میں، ان کے شیئرز خریدنے میں اور ان میں تصرف کرنے میں مسلمانوں کے شریک ہونے کا تعلق ہے تو وہ اس وقت تک جائز ہے جب تک ان کمپنیوں کے غالب سرمائے اور ان کے تصرفات حلال ہوں، اگرچہ احتیاط کا پہلو یہی ہے کہ گریز کیا جائے۔

لیکن اس میں شریک ہونے والے کو مندرجہ ذیل امور کا لحاظ رکھنا چاہئے:

۱۔ ان کمپنیوں کے شیئرز کی خرید کے ذریعہ اس کا مقصد یہ ہو کہ وہ عام اجلاس یا مجلس انتظامیہ میں اپنے ووٹ کے ذریعہ کمپنی کو خالص حلال میں تبدیل کرے۔

۲۔ وہ اپنی پوری محنت اور اپنا سرمایہ حتی الوسع خالص اور حلال وطیب مال کی فراہمی میں لگادے، اور صرف شدید ضرورت، مسلمانوں کے مصالح اور بڑی بڑی کمپنیوں کے ذریعہ ان کی اقتصادیات کو بڑھانے اور مضبوط کرنے کے پیش نظر ہی شبہ والی چیز کو اختیار کرے۔

۳۔ ان شیئرز کے حامل کو چاہئے کہ سود کے اس تناسب کو ملحوظ رکھے جو کمپنی بینکوں میں اپنے ڈپوزٹ شدہ سرمائے پر لیتی ہے، یہ کمپنی کے بجٹ کے ذریعہ یا کمپنی کا حساب رکھنے والے ذمہ داروں کے ذریعہ معلوم ہوگا، اگر اسے معلوم کرنا ممکن نہ ہو تو کوشش کر کے اس کا اندازہ لگائے، پھر اتنی مقدار عوامی فلاح وبہبود کے شعبوں میں صرف کردے۔

۴۔ کسی مسلمان کے لئے ایسی کمپنی کا قائم کرنا جائز نہیں جس کے نظام اساسی میں اس بات کی صراحت ہو کہ یہ کمپنی سودی قرضوں کے لین دین کا معاملہ کرے گی، اسی طرح جب تک یہ صورت ہو اس کمپنی کے قیام میں تعاون بھی جائز نہیں، کیونکہ یہ گناہ اور زیادتی میں تعاون ہے، ہاں اس شخص کے لئے اس کی اجازت ہے جو کمپنی کے رخ کو حلال کی طرف موڑنے کی طاقت رکھتا ہو۔

سوم: مذکورہ ضوابط کے ساتھ ان شیئرز کی خرید وفروخت کی اباحت کا حکم اس صورت کے ساتھ خاص ہے جب شیئرز عام ہوں، یا ترجیحی ہوں تو ان کی ترجیح مال کی بنیاد پر نہ ہو۔

ان دو قسموں کے علاوہ اقسام کا حکم علاحدہ طور سے بیان کیا جائے گا۔

جہاں تک ان کمپنیوں کے شیئرز کا تعلق ہے جو غیر مسلموں کی زیر ملکیت ہیں لیکن ان کا نظام حرام کاروبار کی صراحت نہیں کرتا ہے پھر بھی بعض لوگوں نے ایسی کمپنیوں کے سلسلے میں شدت سے کام لیا ہے[۱] لیکن سابقہ ضوابط کے ساتھ ان میں کاروبار کرنے میں مجھے کوئی حرج نہیں محسوس ہوتا، رابطہ میں ۲۰ تا ۲۵ ربیع الآخر ۱۴۱۰ھ میں "الأسواق المالية من الوجهة الإسلامية" کے عنوان سے منعقد کئے گئے سمینار میں یہ فیصلہ ہو چکا ہے کہ ایسی کمپنیوں کے شیئرز کا مالک ہونا یا ان کا اجراء درست ہے جن کا بنیادی مقصد تو حلال ہو مگر کبھی کبھی ان کو سودی کاروبار کرنے پڑتے ہوں...... سودی قرض کے لین دین کی حرمت، اس کی تبدیلی کے وجوب اور اس کے چلانے والے پر اعتراض اور اس کی مذمت کے ساتھ یہ حکم کمپنی کے مقصد کی مشروعیت کی بنا پر ہے، اور شیئر ہولڈر پر واجب ہے کہ جب وہ شیئر کا نفع حاصل کرے تو اس حصہ سے دستبردار ہو جائے جس کے بارے میں اس کا یہ گمان ہو کہ یہ سودی کاروبار سے حاصل شدہ نفع کے بقدر ہے، اور اسے رفاہی مصارف میں صرف کردے۔

اسی طرح "البرکۃ" کے سمینار برائے "اقتصاد اسلامی" میں باتفاق شرکاء مسلم ممالک میں کاروبار کرنے والی کمپنیوں کے معاملات کو اسلامائز (Islamize) کرنے کے مقصد سے ان کے شیئرز کی خرید کو جائز قرار دیا گیا ہے، بلکہ شرکاء سمینار نے اسے امر مطلوب قرار دیا ہے، کیونکہ اس میں اس بات کے زیادہ امکانات ہیں کہ مسلمان احکام شریعت کی پابندی کریں، اور اکثریت کے ساتھ انہوں نے غیر مسلم ممالک میں کاروبار کرنے والی کمپنیوں کے شیئرز کی خرید کو اس صورت میں جائز قرار دیا ہے، جب آمیزشوں سے پاک کوئی اور متبادل نہ ملے (الفتاوی الشرعية في الاقتصاد طبع مجموعۃ برکۃ ۱۴۱۱ھ ص ر ۱۷)۔

اگر کمپنی کے نظام میں حرام کاروبار کی صراحت نہ ہو، اور سابقہ ضوابط کی پابندی کی جائے تو ایسی صورت میں جواز کا قول ہی روح شریعت سے ہم آہنگ ہے جس کی بنیاد سرمایہ کاری میں آسانی پیدا کرنے، اور حرج کو دور کرنے، اور عوام کی ضروریات کو ملحوظ رکھنے پر ہے، کیونکہ اگر اس میں حرام پایا بھی جارہا ہے تو وہ معمولی تناسب سے پایا جارہا ہے جو بقیہ مال میں مؤثر نہیں ہوگا، اسی طرح اس مقدار کو عوامی رفاہی مصارف میں خرچ کر کے اس سے بچا جاسکتا ہے، مزید یہ کہ مجموعی طور پر معقود علیہ بیع کا محل مباح امور ہیں، اور ان میں شرکت اختیار کرنا جائز ہے۔ صف اول کے کسی بھی بزرگ نے مجموعی طور پر اہل کتاب سے معاملہ کرنے سے نہیں

---

[۱] شیخ عبداللہ بن سلیمان کا سابقہ مقالہ (ص ر ۳۱)، اس میں انہوں نے مسلمانوں کی زیر ملکیت کمپنیوں کے شیئرز کی خرید کی اجازت دی ہے، خواہ ان کا کاروبار سود پر ہی کیوں نہ ہو بشرطیکہ ان کا بیشتر معاملہ اور ان کے غالب سرمائے حلال ہوں، لیکن انہوں نے غیر مسلموں کی زیر ملکیت کمپنیوں کے شیئرز کے مالک ہونے کو ناجائز قرار دیا ہے، البتہ اس صورت میں ان کو جائز قرار دیا ہے جب وہ بالفعل ان کا رخ تبدیل کرنے اور علی الاطلاق ان کو حرام کاروبار سے روکنے پر قادر ہو، انہوں نے یہ بھی ذکر کیا ہے کہ شیخ صالح کامل نے ان سے بتایا کہ وہ اس طرح کے پچاس حصص کمپنیوں میں شراکت کر کے اور اس کے بعد یہ شرط لگا کر ان کو شرعی احکام کی پابندی کرنے والی شراکت دار کمپنیوں میں تبدیل کر چکے ہیں۔

روکا ہے، اور باوجودیکہ اہل کتاب کے تمام معاملات اوران کے اموال اسلام کی مطلوبہ شرائط کے مطابق نہیں تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام ان کے ساتھ معاملات کرتے تھے، چنانچہ امام بخاری نے ترجمہ قائم کیا ہے: "باب المزارعۃ مع الیھود" (یہودیوں کے ساتھ کاشتکاری کا باب) حافظ ابن حجر فرماتے ہیں: "اس سے امام بخاری کی مراد اس بات کی طرف اشارہ کرنا ہے کہ اس معاملہ کے جواز میں مسلمانوں اور ذمیوں کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے [1]۔ اسی طرح صحیح روایت سے ثابت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک یہودی سے ادھار غلہ خریدا اور اپنی زرہ اس کے پاس بطور رہن رکھ دی [2]۔ یہی حال صحابہ کرام کا تھا، چنانچہ ان کے دور میں بھی فی الجملہ ان کے ساتھ معاملات ہوتے تھے اور اس کا رواج تھا [3]۔

خلاصہ بحث

۱۔ اسلام میں سرمایہ کاری کا ایک مخصوص اور منفرد نظام ہے جس کی بنیاد اقدار واخلاق اور عقیدہ پر ہے۔

اسی کا نتیجہ ہے کہ:

عمل اور سرمایہ کاری کے سلسلے میں مومن کا اقدام اس نقطۂ نظر سے شروع ہوتا ہے کہ کائنات کی تعمیر وترقی سے متعلق حکم الٰہی کا نفاذ ہو، اس کے عمل کا نقطۂ آغاز اس کے اس ایمان پر مبنی ہوتا ہے کہ سود اور دیگر محرمات مال کو گھٹانے اور مٹانے کا باعث ہیں، اور یہ کہ اللہ کی راہ میں خرچ کرنا مال کی کثرت، برکت اور خیر کا باعث ہے۔

اسی کا نتیجہ ہے کہ مومن اللہ کی رضا کو اپنا نصب العین بناتا ہے، اسی کی خاطر وہ فقراء، یتیموں اور قیدیوں کے کھلانے کا اہتمام کرتا ہے، جبکہ کافر اپنے مفاد ہی کو بنیاد بناتا ہے اور اس کا خرچ کرنا اپنے ظاہری اور مادی مفاد ہی کی خاطر ہوتا ہے۔

اور اسی کا نتیجہ ہے کہ حیلے، فریب، استحصال، ذخیرہ اندوزی، ظلم، سود اور دیگر ایسے افعال جن کو اللہ تعالیٰ اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حرام قرار دیا ہے، وہ حرام قرار پاتے ہیں۔

۲۔ اُسھم جمع ہے سھم کی، اس سے مراد وہ دستاویز ہے جو کمپنی کے اصل سرمایہ کے ایک حصہ کی نمائندگی کرتی ہے، یا اس سے مراد کسی سرمایہ دار کمپنی میں شیئر ہولڈر کا حصہ ہے۔

۳۔ ایسی کمپنیوں کے شیئرز میں سرمایہ کاری جن کا کاروبار حرام ہو، جیسے سودی بینک اور وہ کمپنیاں جو خنزیر، نشہ آور اور مسکر اشیاء کا کاروبار کرتی ہیں، بغیر کسی اختلاف کے حرام ہے۔

۴۔ ایسی کمپنیوں کے شیئرز میں سرمایہ کاری جن کا کاروبار حلال ہو جیسے اسلامی بینکس اور اسلامی کمپنیاں، بلاشبہ جائز اور مباح ہے۔

۵۔ ایسی کمپنیوں کے شیئرز کا حکم مختلف فیہ ہے، جن کا کاروبار حلال ہو اور جن کے بنیادی نظام میں حرام کاروبار کرنا تو نہ ہو، لیکن کبھی کبھار ان کو سودی بینکوں سے قرض کے لین دین کا معاملہ کرنا پڑتا ہو۔

مقاصد شریعت اور مصالح مرسلہ کا تقاضا ہے کہ ایسی صورت میں مندرجہ ذیل شرائط کے ساتھ سرمایہ کاری کو جائز قرار دیا جائے:

۱۔ اس قسم کی کمپنیوں میں شیئرز ہولڈر کی شرکت کا مقصد کمپنی کا نظام تبدیل کرنا اور اس کو اسلامائز کرنا ہو۔

۲۔ بجٹ کے مطابق حرام مال کا جو تناسب ہے شیئر ہولڈر اس سے دستبردار ہو جائے اور اس حرام مال کو عوامی فلاح بہبود کے شعبوں میں صرف کردے۔

جہاں تک ڈائرکٹر مجلس انتظامیہ کے ممبران اور ان تمام افراد کا تعلق ہے جو سودی معاملات کے اندراج میں حصہ لیتے ہیں تو اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ اس وقت تک گنہگار رہیں گے جب تک کہ سود کو ترک نہ کردیں۔

اسی کے ساتھ ایک مسلمان کا فرض ہے کہ شبہات سے دور رہ کر حلال کی تلاش کرے، اور مسلم ممالک اور حکومتوں کی ذمہ داری ہے کہ اسلامی شریعت کی پابندی کریں، اور اپنے نظام کو سود، محرمات اور شبہات سے پاک کریں۔ واللہ المستعان ☆☆☆

---

[1] صحیح بخاری مع فتح الباری، طبع السلفیۃ (۵/۱۵)۔

[2] حوالہ سابق (۵/۱۴۲)۔

[3] المغنی لابن قدامہ (۴/۲۴۵-۲۴۷)۔

شیئرز، شیئر مارکیٹ اور کمپنی
ایک مختصر جائزہ و تعارف

مولانا ارشاد باقوی، بنگلور

(الف) حصص (شیئرز) کی مختلف اقسام۔

(ب) حصص بازار (شیئرز مارکیٹ) میں حصص کی مختلف اقسام اور اس کی اشکال۔

(ج) تجارت کے لحاظ سے قومی وعالمی بازار میں حصص کا مقام۔

(د) حصص کی قیمت کے اتار چڑھاؤ، حصص کی خرید وفروخت اور مستقبل میں اس کی فروخت کے سلسلے میں اس سے متعلق استدلال۔

(ھ) حصص کے کاروبار میں حصص بازار (شیئرز مارکیٹ) کا کردار۔

(و) حصص کے تصدیق ناموں (سرٹیفکیٹ) کی ملکیت کا مطلب۔

(ز) حصص کے کاروبار پر سود کا اثر۔

(ح) حصص کے کاروبار میں رونما ہونے والی جدید ترین تبدیلیاں۔

ہندوستانی شیئر بازار

کاروباری افراد اور ان کے کاروباری منصوبوں (Projects) کے لئے فنڈ کی فراہمی کے مختلف مآخذ میں سے ایک سرمایہ بازار (Capital Market) ہے، بینکوں اور مالیاتی اداروں کے ذریعہ دیئے جانے والے میقاتی قرضوں یا بینک سے مہیا کئے جانے والے کاروباری سرمایہ کی مانند رقم براہ راست عوام الناس سے سرمایہ بازار کے ذریعہ بھی حاصل کی جاسکتی ہے جس کا استعمال کاروباری منصوبوں کو تکمیل تک پہونچانے کے لئے ایک حصے کے طور پر کیا جا سکتا ہے، یہ رقم Shares (حصص) Debenture کسی کمپنی کی طرف سے قرض لی ہوئی رقم کا سرٹیفکیٹ، دستاویز قرض، یا Bond (تمسک) وغیرہ کے ذریعے حاصل کی جاسکتی ہے۔

جب ایک کاروباری کمپنی رفرد بنیادی طور پر فنڈ کے حصول کے لئے عوام الناس تک (ایک درمیانی رابطہ کے ذریعے جسے Merchant Banker) کہتے ہیں) پہونچتا ہے اور اس سلسلے میں حصص کے تصدیق نامے (سرٹیفکیٹ) جاری کرتا ہے، (یا ڈبینچر سرٹیفکیٹ جاری کرتا ہے) تو ابتدائی بازار Primary Market)) میں اسے پبلک ایشو (Public Issue) کے نام سے جانا جاتا ہے، اس طریقے کے تحت سرمایہ کاری کرنے والے عوام اپنی رقم کمپنی میں لگاتے ہیں اور رقم لگانے کے تصدیق نامے کے بطور شیئر سرٹیفکیٹ (حصص تصدیق نامے) حاصل کرتے ہیں، اس طرح سے کمپنی کے اصل سرمائے کی رقم میں حصہ دار ہونے کے ناطے سرمایہ کاری کرنے والے افراد کمپنی کے حصہ دار (Share Holder) بن جاتے ہیں، کمپنی کے شیئر ہولڈر کمپنی کے ذریعے حاصل کردہ نفع میں حصہ دار ہوتے ہیں۔ یہ نفع انہیں نفع کی رقم (Dividend) کی شکل میں یا بعض اوقات اضافی حصص کے اجراء کی شکل میں (یہ حصص بلا قیمت دیئے جاتے ہیں جنہیں (Bonus Share) کہا جاتا ہے، حاصل ہوتا ہے، حصہ دار جب تک اس کی مرضی ہو حصص اپنے قبضے میں رکھ سکتا ہے اور کمپنی کو حاصل ہونے والے نفع یا بونس وغیرہ میں حصہ دار ہوتا ہے۔

اگر کسی وقت حصہ دار اپنی سرمایہ لگائی گئی رقم واپس چاہتا ہے تو وہ کمپنی کو وہ حصص واپس نہیں کرسکتا جو کمپنی نے اس کے نام جاری کئے تھے، بلکہ اسے یہ حصص سرمایہ کاری میں دلچسپی رکھنے والے کسی دوسرے شخص کو فروخت کرنا پڑتے ہیں جو کہ ان کو خریدنا اور بدلے میں ان حصص کی رقم پہلے سرمایہ کار کو ادا کرنا چاہتا ہے، اس

سودے میں چونکہ خریدار براہ راست کمپنی سے حصص حاصل نہیں کرتا بلکہ کسی دوسرے شیئر ہولڈر سے حصص کے تصدیق نامے خریدتا ہے اس لئے اس سودے کو ثانوی بازار (Secondary Market) کے نام سے معنون کیا جاتا ہے، ایسا ہمیشہ نہیں ہوتا ہے کہ فروخت کنندہ کو حصص کے لئے خریدار فوری طور پر دستیاب ہو جائے لہذا فروخت کنندہ کو ایک درمیانی شخص تک رسائی کرنا پڑتی ہے جسے بروکر (Broker شیئر دلال) کہتے ہیں، اس قسم کے بہت سے حصص دلال (بروکر) اپنے گاہکوں، خریداروں اور فروخت کنندگان سے آرڈر لیتے ہیں اور ایک مخصوص وقت میں ایک مخصوص مقام پر دوسرے دلالوں سے ان آرڈروں کا تبادلہ (Exchange) کرتے ہیں، وہ مقام جہاں حصص دلال اکٹھا ہوتے ہیں اسٹاک ایکسچینج (Stock Exchange) کہتے ہیں، حصص دلال اس اسٹاک ایکسچینج کے ارکان ہوتے ہیں، کسی اسٹاک ایکسچینج میں صرف اس کے ممبر دلال ہی سودے کر سکتے ہیں، اسٹاک ایکسچینج کے مخصوص ضابطے اور اصول ہوتے ہیں جن پر عمل درآمد ہر ممبر دلال کے لئے لازمی ہوتا ہے، ان ضوابط کو اس لئے تشکیل دیا جاتا ہے کہ سرمایہ کار کے مفادات کی حفاظت کی جاسکے۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ حصص دلال سودے والے دن ہی رقم یا حصص کا تبادلہ کریں بلکہ کھاتوں میں ان سودوں کی تفصیلات کا اندراج کرلیا جاتا ہے اور اسٹاک ایکسچینج کے ارباب اختیار تک ان کی رپورٹ پہونچادی جاتی ہے، اسٹاک ایکسچینج اپنے ہر رکن کے سودوں کی تفصیلات کا باقاعدہ ریکارڈ رکھتا ہے اور معاملات طے ہونے کی مدت کے بعد جو کہ عام طور پر ایک ہفتہ ہوتی ہے، حصص نئے خریدار تک پہنچا دیئے جاتے ہیں اور ان کے بدلے میں رقم کی ادائیگی کردی جاتی ہے۔

اسٹاک ایکسچینج

دنیا کے سب سے پہلے اسٹاک ایکسچینج نے ۱۶۱۱ء میں ایمسٹرڈم میں ایک بے چھت صحن میں کام کرنا شروع کیا۔ ہندوستان میں اسٹاک ایکسچینج کا آغاز اٹھارویں صدی عیسوی کے دوسرے نصف میں ہوا، اس وقت سرمایہ بازار محض ایسٹ انڈیا کمپنی کے قرضہ جاتی اسٹاک کے تبادلے تک محدود تھا۔ ۱۸۳۰ء میں امریکی خانہ جنگی کے بعد کپڑا بننے کی ملوں میں اچانک بے حد ترقی ہوئی اور ہندوستان سے کپڑے کی برآمد میں روزافزوں اضافہ ہوا جس کے نتیجے میں کارپوریٹ اسٹاک (اجتماعی تمسکات) روبہ ظہور ہوئے اور بمبئی، کلکتہ اور احمد آباد اسٹاک ایکسچینج کا قیام عمل میں آیا۔ ۱۸۷۵ء میں "دیسی حصص وحصص دلال ایسوسی ایشن" کے قیام کے بعد بمبئی اسٹاک ایکسچینج قائم کیا گیا۔ پہلی اور دوسری جنگ عظیم کے بعد تجارت اور کاروبار کے میدان میں بڑی تیزی سے مثبت تبدیلیاں روبہ عمل ہونے لگیں جن کے نتیجے میں نئی کمپنیاں قائم ہوئیں اور حصص کے کاروبار کو فروغ ہوا، لہذا کئی ایک علاقائی اسٹاک ایکسچینج مثلاً بنگلور، مدراس، کانپور، دہلی وغیرہ قائم ہوئے۔

اسٹاک ایکسچینج ایک نیلام بازار ہوتا ہے جہاں خریدار اور فروخت کنندگان اپنے اپنے گاہکوں کے آرڈروں کی تعمیل میں حصص اور ہنڈیوں (Securities) کا تبادلہ کرتے ہیں۔ حصص کے کاروبار میں اسٹاک ایکسچینج ایک کلیدی کردار ادا کرتا ہے چونکہ اس کے ذریعہ حصص اور ہنڈیوں کی خرید وفروخت کی سہولت حاصل ہوتی ہے اور یہ تبادلہ یا کاروبار ایک باقاعدہ اور باضابطہ انداز سے انجام پاتا ہے۔

وہ کمپنی جس نے پبلک ایشو کے ذریعہ حصص کے اجراء کے بعد سرمایہ اکٹھا کیا ہے اس کے لئے لازم ہے کہ وہ اسٹاک ایکسچینج میں اپنے حصص کا اندراج کرائے تاکہ حصص کی خرید وفروخت کا کاروبار بسہولت ہو سکے اور سرمایہ کاری کرنے والے افراد کو ان کے حصص کے بدلے بآسانی رقم فراہم کی جاسکے۔ اسٹاک ایکسچینج کسی بھی کمپنی کو اجازت دیتا ہے کہ وہ اپنے حصص کا اندراج کرائے، اور بعد ازاں ان (کے تبادلے) کا کاروبار کر سکے لیکن اس سے قبل اسٹاک ایکسچینج کے اصول وضوابط کی پابندی کرنے کا اقرار لازمی ہے، عام سرمایہ کار جو حصص کو خریدنا یا فروخت کرنا چاہتا ہے اسے ایسے حصص دلال کے پاس اپنا آرڈر نوٹ کرانا پڑتا ہے جو اسٹاک ایکسچینج کا ممبر ہو، وہ دلال اسٹاک ایکسچینج کے ہال میں اپنے گاہک کی جانب سے دوسرے دلال ممبر کے ساتھ حصص کو فروخت کرتا یا خریدتا ہے، اس سودے میں حصص کی وہی قیمت ادا یا وصول کی جاتی ہے جو کہ اس مخصوص دن اس حصص کی ہوتی ہے، دلال گاہک سے اپنی دلالی کی فیس بھی وصول کرتا ہے۔

سرمایہ بازار کے دستاویزات (Instrument) کی مختلف اشکال

جیسا کہ پہلے ذکر کیا جاچکا ہے سرمایہ بازار (Capital Market) میں مختلف قسموں کے دستاویزات (Instrument) مثلاً حصص، دستاویز قرض (Debenture) تمسکات (Bond) اور وارنٹ ضمانتی دستاویز (Warrants) وغیرہ کا لین دین کیا جاتا ہے۔ اگرچہ شیئر بازار میں سب سے زیادہ کاروبار مساوی حصص (Equity Share) کا ہوتا ہے، لہذا اسی وجہ سے شیئر بازار کی اصطلاح زبان زد خاص وعام ہے اور اسٹاک مارکیٹ یا کیپٹل مارکیٹ کی اصطلاحوں کو زیادہ استعمال نہیں کیا جاتا۔

سرمایہ بازار (Capital Market) کے دو حصے۔ شیئر بازار اور قرض بازار۔ ہوتے ہیں۔

- قرض بازار (Debt Market) میں دستاویزات قرض اور تمسکات وغیرہ کی خرید وفروخت ہوتی ہے، یہ اس قسم کی ہنڈیاں ہوتی ہیں جن پر ایک مقررہ مدت میں مقررہ شرح کے لحاظ سے سودادا کیا جاتا ہے، کمپنی ان کے خریدار کو لگاتار باقاعدہ طے شدہ شرح کے حساب سے سودادا کرتی رہتی ہے اور ایک معینہ مدت کے بعد کمپنی ان کو واپس لے کر ان میں لگائی گئی رقم سرمایہ کاروں (Investors) کو واپس کر دیتی ہے، اس ہنڈی کے سرمایہ کار کو کمپنی کے ہونے والے نفع میں کسی قسم کی حصہ داری کا حق حاصل نہیں ہوتا ہے اور سرمایہ میں لگائی گئی رقم (شیئر کی اصل قیمت) میں کسی قسم کا اضافہ بھی نہیں ہوتا ہے، سرمایہ کار کو اس بات کا اختیار ہوتا ہے کہ وہ اس معینہ مدت تک جب تک کے لئے یہ ہنڈیاں جاری کی گئی ہیں ان پر سود حاصل کرتا رہے اور بعد میں ان حصص کی قیمت کمپنی سے واپس لے، یا پھر ان کو درمیان ہی میں کسی ایسے دفتر کو حصص دلال/اسٹاک ایکسچینج کے ذریعہ فروخت کردے جو ان کی خریداری میں دلچسپی رکھتا ہو۔

شیئر بازار کسی کمپنی کے حصص کی لین دین/خرید وفروخت میں معاون ومددگار ثابت ہوتا ہے۔ ''حصص (شیئرز) کا مطلب کمپنی کے حصص سرمایہ میں حصہ داری ہے''۔ اس کے ذریعہ کمپنی کے سرمایہ میں کسی حصے دار (Share Holder) کے ذریعہ کیا جانے والا تعاون واشتراک ہے۔ حصص بنیادی طور پر حساب کی ایک اکائی ہے جس کے ذریعہ سرمایہ کار کے کمپنی میں مفادات کا تعین کیا جاتا ہے۔ حصص ایک ایسی دستاویز ہے جو شیئر ہولڈر کو کمپنی کی ملکیت کا مختار بناتی ہے، حصص یا تو کمپنی کے ذریعہ جاری کئے جاتے ہیں یا اسٹاک بازار میں انہیں خریدا جاسکتا ہے۔

کمپنی قانون ۱۹۵۶ء کی رو سے ایک پبلک لمیٹڈ کمپنی دوطرح کے شیئر بناسکتی ہے اور ان کا اجراء کرسکتی ہے، یہ دو اقسام ترجیحی سرمایہ حصص اور مساوی سرمایہ حصص ہیں۔ ترجیحی شیئر ہولڈر کو یہ حق حاصل ہوتا ہے کہ وہ ایک مقررہ اور متعینہ نفع حاصل کرے اور اپنا اشتراک شدہ سرمایہ بعد میں واپس وصول کرلے اگر کمپنی کسی وجہ سے بند ہوجاتی ہے، حالانکہ ترجیحی حصص کے مالکان کو کمپنی کے معاملات اور جنرل میٹنگوں میں حق رائے دہی حاصل نہیں ہوتا ہے۔

مساوی حصص سرمایہ اس بات کی ضمانت نہیں ہے کہ حصص کی رقم کمپنی کی جانب سے واپس کردی جائے گی۔ حالانکہ کسی قسم کی رقم کی واپسی کی ضمانت نہیں ہوتی لیکن اسی کے ساتھ ساتھ اس قبیل کے سرمایہ کار کو حاصل ہونے والے متوقع منافع کی کوئی حد بھی مقرر نہیں ہوتی، اس قسم کے حصص میں نقصان کا بھی اندیشہ ہوتا ہے لہذا انہیں زیادہ خطرے والے حصص کی حیثیت سے جانا جاتا ہے، مساوی حصص میں یہ مالی نقصان پوشیدہ ہوتا ہے کہ اگر کمپنی نقصان سے گذرتی ہے یا اسے کسی وجہ سے بند کرنا پڑتا ہے تو سرمایہ کار کو بھی نقصان برداشت کرنا پڑتا ہے۔ لیکن بہ صورت دیگر اگر کمپنی اپنے کاروبار میں ترقی حاصل کرتی ہے اور زیادہ نفع حاصل کرتی ہے تو اسے حصص میں سرمایہ لگانے والے افراد کو اسی تناسب سے فائدہ بھی ہوتا ہے۔ مساوی حصص کے مالکان سرمایہ کاروں کو ان کے حصص کی تعداد کے لحاظ سے کمپنی کی میٹنگوں میں تمام قراردادوں اور فیصلوں کے بارے میں اپنے حق رائے دہی کے استعمال کا حق بھی حاصل ہوتا ہے۔

مساوی حصص (Equity Shares)

زیادہ بہتر اور خوش نما مواقع مہیا کرنے کی صلاحیت رکھنے کے باعث عام طور پر لوگ مساوی شیئر کی خرید وفروخت میں زیادہ دلچسپی رکھتے ہیں اور شیئر بازار میں ان کا زیادہ لین دین ہوتا ہے۔ کمپنی کے ہر شیئر کی قیمت ہوتی ہے جو کہ بالعموم ۱۵/روپئے ہوتی ہے، ہر ایک شیئر ہولڈر کو اس کے ذریعہ کمپنی میں لگائے گئے سرمائے کے حساب سے حصص کے تصدیق نامے دئے جاتے ہیں اور اس کے کمپنی میں کتنے حصص ہیں اس کا تعین کیا جاتا ہے۔ یہ حصص تصدیق نامے بالعموم ۱۰۰ حصص کے لئے (ایک تصدیق نامہ کے حساب سے) جاری کئے جاتے ہیں جنہیں (Market Lot) کہتے ہیں۔ سرمایہ کاران حصص کو ۱۰۰ کی لوٹ (Lot) میں بہ آسانی ثانوی بازار میں فروخت کرسکتا ہے، اگر کسی سبب سے سرمایہ کار سو سے کم حصص کے تصدیق نامہ حاصل کرنا چاہتا ہے تو وہ یا تو انہیں اس تعداد میں بازار سے خرید سکتا ہے یا پھر اپنے حصص کو چھوٹے حصوں میں تقسیم کرسکتا ہے۔

وہ کمپنی جو حصص جاری کرتی ہے اس کے ایک رجسٹر میں تمام حصص کے سرمایہ کاروں کے ناموں کا اندراج کرلیا جاتا ہے، اگر حصص کا مالک ان حصص کو کسی دوسرے شخص کو فروخت کرتا ہے تو خریدار کو ان حصص کو پھر سے کمپنی کے پاس بھیجنا پڑتا ہے تاکہ یہ حصص اس کے نام منتقل کئے جاسکیں، کیوں کہ اب نیا خریدار ہی ان حصص کا جائز مالک ہے۔ زیادہ تر کمپنیاں چند باہری ایجنٹوں کو جنہیں حصص منتقلی ایجنٹ (Share Transfer Agent) کہتے ہیں، حصص کی منتقلی کی دفتری کارروائی کے لئے مقرر کرتی ہیں تاکہ اس منتقلی کا عمل زیادہ بہتر اور تیزی سے مکمل کیا جاسکے۔ اگر خریدار چاہے تو وہ ان حصص کو اپنے نام سے منتقل کرائے بغیر ہی فوری طور پر بازار میں فروخت کرسکتا ہے۔

حصص کی قیمتوں میں حرکت/اتار چڑھاؤ

خرید ار وفروخت کنندہ کی ضروریات کے لحاظ سے کسی بھی کمپنی کے حصص کا بار بار لین دین کیا جاسکتا ہے، اگر کمپنی کی کارکردگی بہتر ہے اور وہ زیادہ نفع حاصل کررہی ہے تو اس کمپنی کے حصص کی بازار میں بہت زیادہ مانگ (Demand) ہوتی ہے، کیوں کہ ہر ایک اس کمپنی کے حصص کو خریدنے میں دلچسپی رکھتا ہے، جب مانگ بڑھتی ہے، اور فراہمی (Supply) چوں کہ محدود ہوتی ہے لہذا حصص کی قیمت بھی بڑھ جاتی ہے۔ اگر مانگ لگاتار بڑھتی رہتی ہے تو حصص کی قیمتیں بھی زیادہ اور زیادہ بڑھتی رہتی ہیں، اگر کسی کمپنی کی خراب کارکردگی کی بنا پر کمپنی کے حصص کے مالکان (Share Holders) حصص کو زیادہ تعداد میں فروخت کرتے ہیں یا بہتر کارکردگی کی صورت میں نفع حاصل کرنے کے لئے حصص کے مالکان حصص کو زیادہ تعداد میں فروخت کرتے ہیں تو چونکہ بازار میں حصص کی فراہمی (Supply) بڑھ جاتی ہے لہذا ان کی قیمت میں گراوٹ آجاتی ہے۔

سرمایہ کار اس وقت جبکہ حصص کی قیمت میں کمی آجاتی ہے حصص خرید سکتے ہیں اور انہیں اس وقت ثانوی بازار میں فروخت کرسکتے ہیں جبکہ ان کی قیمت بڑھ گئی ہو۔ قیمت خرید اور قیمت فروخت کا فرق ہی بالحقیقت ''اصل سرمایہ نفع'' (Capital Gain) ہوگا یا اصل نقصان (Loss) ہوگا اگر قیمت خرید زیادہ اور قیمت فروخت کم ہو۔

محصولیاتی زاویہ (Tax Angle)

حصص کی لین دین کے ذریعہ ہونے والے منافع آمدنی پر محصول (Incomtax) کی ادائیگی لازمی ہے، اگر سرمایہ کار حصص کو ایک سال تک اپنی ملکیت میں رکھتا ہے اور بعد ازاں اس کو فروخت کردیتا ہے تو اس سے حاصل ہونے والے نفع کو ''طویل المدتی سرمایہ نفع'' (Long term capital gain) کہتے ہیں اور اس پر ۲۰ رفیصد کی شرح سے آمدنی ٹیکس ادا کرنا پڑتا ہے۔ اگر حصص کو ایک سال کے دوران ہی خریدا اور بیچا جاتا ہے تو اس سے حاصل ہونے والے نفع کو ''مختصر المدتی سرمایہ نفع'' (Short term capital gain) کہتے ہیں اور افراد پر لاگو ہونے والی عمومی شرح کے حساب سے ٹیکس کی رقم کا تعین کیا جاتا ہے جو کہ طویل المدتی سرمایہ نفع کے مقابلے میں زیادہ ہوتا ہے۔ طویل المدتی یا مختصر المدتی سرمایہ کاری کے نتیجے میں حاصل ہونے والا نقصان کل نفع میں سے منہا کرکے باقی بچ رہنے والی رقم پر ٹیکس ادا کرنا پڑتا ہے۔

غیر مقیم ہندوستانیوں NRIs اور غیر ممالک میں ان کے ذریعہ قائم کردہ کاروباری اداروں (OCBs) کے ذریعہ کی جانے والی سرمایہ کاری

ہمارے ملک کے مختلف کاروباری منصوبوں میں سرمایہ کاری کے لئے غیر مقیم ہندوستانیوں اور ان کے ذریعے غیر ممالک میں قائم کردہ کاروباری اداروں (Overseas Corporate Bodies) کو متوجہ کرنے اور اس ضمن میں ان کی حوصلہ افزائی کرنے کی غرض سے قومی حکومت انہیں مختلف قسم کی سرمایہ کاری سہولیات مہیا کرتی ہے تاکہ وہ زیادہ سے زیادہ مناسب رقم ہندوستانی کمپنیوں کے حصص میں لگاسکیں۔ یہ سہولت انہیں ابتدائی اور ثانوی دونوں بازاروں میں مہیا کی جاتی ہے۔ مثلاً NRIs اور OCBs کے لئے پبلک ایشوز ترجیحی حصص میں ایک مخصوص حصہ ریزرو کردیا جاتا ہے اور سرمایہ کاری کے ذریعہ حاصل ہونے والے فائدے رمنافع وغیرہ کو غیر ممالک میں منتقل کرنے کی اجازت ہوتی ہے، مزید برآں انہیں ''طویل المدتی سرمایہ نفع'' پر رعایتی شرح پر آمدنی ٹیکس ادا کرنے کی سہولت بھی حاصل ہوتی ہے۔

عالمی (بین الاقوامی) ایشوز

ہندوستانی کمپنیوں کے حصص کا اندراج ملک کے ایک یا ایک سے زائد اسٹاک ایکسچینجوں میں ہوتا ہے۔ ملک میں معاشی رواداری (Liberalisation) کے تعارف وفروغ کے بعد قومی کمپنیوں کا مطمح نظر وسیع تر ہوا ہے، اور عالمی سطح پر بھی ان کی کوششیں جاری ہیں۔ ملکی کمپنیاں عالمی فنڈ حاصل کرنے کی کوششیں کررہی ہیں جو کہ قومی فنڈ کی شرح سود کے مقابلے میں سستا پڑتا ہے۔ حکومت نے غیر ملکی اداراتی سرمایہ کاروں (Foreign Institutional Investors) کو اس امر کی اجازت دی ہے کہ وہ ہندوستانی سرمایہ بازار میں سرمایہ کاری کریں، اور اسی کے ساتھ ساتھ دوسری جانب حکومت نے ہندوستانی کمپنیوں کو یہ سہولت بھی مہیا کی ہے کہ وہ عالمی جمع رسید (Global Deposit Receipts

GDR......) جاری کریں اور عالمی بازار کے توسط سے اپنے حصص کو فروخت کرنے کی کوشش کریں۔ GDR کا اندراج لندن، لکزمبرگ، اور نیو یارک اسٹاک ایکسچینجوں میں کیا گیا ہے جہاں ان کا کاروبار ہوتا ہے۔

شیئر بازار میں رونما ہونے والی حالیہ تبدیلیاں

ہندوستانی شیئر بازار اب سن بلوغ کو پہونچ رہا ہے حصص کے کاروبار میں جدید ترین تکنیک کا استعمال کیا جارہا ہے جس کی وجہ سے سرمایہ کار کے لئے زیادہ شفافیت (Transperancy) رہتی ہے اور حصص تصدیق ناموں کے لین دین اور کاروبار کو زیادہ بہتر طریقے سے انجام دیا جاسکتا ہے، بمبئی اسٹاک ایکسچینج کی مکمل کارروائی کمپیوٹروں کے ذریعے ہوتی ہے اور سودے اور حصص کا لین دین بھی دلال عمارت میں نصب لاتعداد کمپیوٹروں کے ذریعے کرتے ہیں، ملک کے دوسرے اسٹاک ایکسچینج بھی اس نہج پر چل رہے ہیں اور اسٹاک ایکسچینج کو ترقی یافتہ انداز سے آراستہ کرنے کی کوششیں کی جارہی ہیں۔ علاقائی اسٹاک ایکسچینجوں کے علاوہ قومی اسٹاک ایکسچینج بھی ملک کے اہم شہروں تک پہونچ چکا ہے اور چونکہ اس انداز سے کام انتہائی ذمہ دارانہ اور شفاف طریقہ سے انجام دیا جارہا ہے، سرمایہ کاروں کا یقین بڑھا ہے اور ان کے بے بنیاد خوف کا ازالہ ہوا ہے، کیوں کہ تمام سودے باضابطہ اور بہتر انداز سے انجام پارہے ہیں، بمبئی اسٹاک ایکسچینج کا یہ بھی منصوبہ ہے کہ وہ اپنی قومی کمپیوٹر ٹریڈنگ (بمبئی آن لائن ٹریڈنگ) کو دوسرے شہروں تک بھی پھیلائے جس کے باعث شیئر ٹریڈنگ سے متعلق معلومات اور کاروبار کو ملک کے ان شہروں تک بھی لے جایا جاسکے جہاں پر تسلیم شدہ (Recognised) اسٹاک ایکسچینج کی سہولیات مہیا نہیں ہیں۔ اسٹاک ایکسچینج کی کارکردگی کی نگرانی کرنے والا قومی ادارہ (Securities Exchange Board of India) باضابطہ طور پر سرمایہ کاری کے اس کاروبار اور پوری عمل کی نگرانی کررہا ہے۔ جس کے باعث سرمایہ کاروں کے درمیان اعتماد کی فضا پیدا ہورہی ہے اور ملک کا سرمایہ کاری بازار ترقی کی راہ پر گامزن ہے۔ حال ہی میں منظور ہونے والا قانون (Depositeries Bill ڈیپوزیٹریز بل) اس سلسلے میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے جس کے اطلاق سے اسٹاک ایکسچینج کے رائج قدیم نظام کی خامیاں مکمل طور سے ختم کی جاسکیں گی۔

حصص کے کاروبار پر سود کا اثر

حصص کے کاروبار میں سود کی ادائیگی یا وصولیابی شامل نہیں ہے۔ اس کے ذریعہ کمپنیاں یا کاروبار شروع کرنے والے افراد اور حصص میں سرمایہ کاری کرنے والے افراد ''حلال نفع'' میں شریک ہوتے ہیں، ایک کمپنی چونکہ کسی منصوبے کو روبہ عمل لانا چاہتی ہے اس کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ سود کی ادائیگی پر رقم بطور قرض حاصل کرے اس کے بجائے کمپنی حاصل ہونے والے نفع میں اپنے حصص مالکان کو شریک کرسکتی ہے، جس کی مختلف شکلیں ڈیویڈنڈ (Dividends) بونس شیئرز (Bonus Shares) وغیرہ ہیں، سرمایہ کار بھی کسی قسم کا سود حاصل نہیں کرتا ہے بلکہ کمپنی کے نفع میں حصہ دار ہوتا ہے، اور اگر یہ حصص فروخت کئے جاتے ہیں تو ان کا نتیجہ ''سرمایہ نفع'' (یا نقصان) کی شکل میں ہی سامنے آتا ہے۔

ثانوی بازار میں بھی حصص کے لین دین میں کسی قسم کے سود کی عمل داری نہیں ہوتی ہے، ان حصص کی خرید و فروخت بازار کے (موجودہ) نرخ کے مطابق ہوتی ہے اور قیمت خرید و قیمت فروخت کا فرق ہی نفع یا نقصان کا تعین کرتا ہے۔

مزید برآں سرمایہ کار کو اس امر کا بھی اختیار رہتا ہے کہ وہ سرمایہ کاری کے لئے کمپنیوں کا انتخاب کرسکے، اور ان کمپنیوں کا ہی انتخاب کرے جن کا کاروبار قرآن میں مذکورہ خطوط پر چل رہا ہو، اور سرمایہ کاری کے لئے ان کمپنیوں کو نہ چنیں جو منع کی گئی سمت میں کاروبار کررہی ہیں۔

☆☆☆

اسٹاک ایکسچینج کے کاروبار کا بیان

ڈاکٹر کے، جی، منشی۔ احمد آباد

اسٹاک ایکسچینج میں کاروبار کی تمام تر کارروائی بروکر کی کسی فرم یا ایجنسی کے ذریعے انجام دی جاتی ہے۔ یہ بروکر اسٹاک ایکسچینج کے ارکان تصور کئے جاتے ہیں۔ اسٹاک ایکسچینج کے اصول وضوابط کے مطابق کسی باہری شخص کو بروکر کی کسی فرم یا ایجنسی کی مدد لئے بغیر کسی قسم کا کاروبار یا لین دین کرنے کا اختیار نہیں ہے۔ کاروبار میں دلچسپی رکھنے والے شخص کو کسی بروکر کے ذریعے کھاتہ کھولنا پڑتا ہے۔ لیکن بروکر کسی نئے شخص کا اکاؤنٹ کھولتے وقت دوسرے تاجروں کی مانند یہ چاہتا ہے کہ وہ شخص اپنا ذاتی تعارف اس سے کرائے یا کسی بینک کار یا کسی دوسرے قابل بھروسہ شخص کا حوالہ پیش کرے تاکہ بروکر کو نئے شخص کی کاروباری یا مالی حیثیت کے بارے میں پوری طرح معلومات حاصل ہوسکیں۔ لہذا وہ اشخاص جو کہ نیا اکاؤنٹ، ہاؤس کے کسی رکن کے ذریعہ کھولنا چاہتے ہیں اس بارے میں پوری طرح تیار رہیں کہ انہیں ایک قابل اعتماد حوالہ پیش کرنا پڑے گا۔

لین دین کے بہت سے طریقے مروج ہیں جن کا استعمال ارکان یا رقم لگانے والے افراد کے ذریعہ کیا جاتا ہے۔ عام حالات میں یا تو نقد رقم یا اکاؤنٹ کے ذریعہ کاروبار کیا جاتا ہے۔ ہمارے ملک کے اسٹاک ایکسچینج میں کاروبار عام طور پر نقد رقم کے ذریعہ ہی کیا جاتا ہے۔ بمبئی چونکہ ایک بازار ہے لہذا یہاں اکاؤنٹ کے ذریعہ بھی کاروبار انجام دیا جاتا ہے بلکہ درحقیقت یہاں اس کا ہی زیادہ رواج ہے۔ کانپور اور مدراس میں بھی اکاؤنٹ کے ذریعہ کاروبار ہوتا ہے لیکن بہت قلیل مقدار میں۔ کلکتہ اسٹاک ایکسچینج میں زیادہ تر کاروبار نقد رقم کے ذریعہ انجام پاتا ہے جبکہ انڈین اسٹاک ایکسچینج حالانکہ فارورڈ لین دین (Forward Dealings) کی اجازت دیتا ہے لیکن بمبئی سیکوریٹیز کنٹریکٹس کنٹرول ایکٹ ۱۹۲۵ کے تحت اس ایکسچینج میں فارورڈ لین دین نہیں کے برابر ہے۔

(الف) لین دین برائے رقم:

نقد رقم کی لین دین کا مطلب ہے کہ کاروبار میں نقد رقم ادا کی جائے گی یعنی خرید کے بدلے میں رقم کی ادائیگی کی جائے گی۔ اس کی وضاحت یوں کی گئی ہے کہ اس کے لئے کسی عرصہ مخصوص کو واضح طور سے بیان نہیں کیا گیا ہے اور حصص (Securities) کی خرید یا فروخت کے بدلے میں فوری طور پر یا ایک طے شدہ مناسب عرصے کے دوران (جو کہ مخصوص حالت میں الگ الگ ہوسکتا ہے) رقم کی ادائیگی کردی جائے گی۔ "Borkers Natie Share

t a i c

کی ذیلی دفعات میں ضابطہ ۳۲۱ کے مطابق فوری طور پر ادائیگی سے متعلق کاروبار کے تحت رقم یا حصص کی ادائیگی سودا طے ہونے کے اگلے دن سہ پہر ۳ بجے تک ہوجانی چاہئے۔ اگر سودے کا دن اتفاق سے سنیچر ہے تو رقم یا حصص کی ادائیگی اگلے کاروباری دن ۳ بجے سہ پہر تک ہونی چاہئے۔ اگر متعلقہ پارٹیوں کے درمیان یہ طے ہوچکا ہے تو سودا طے ہونے کے زیادہ سے زیادہ سات دنوں تک رقم اور حصص کی ادائیگی اور سپردگی ہوجانی چاہئے، اور اس عرصے کے دوران طے شدہ سودا منسوخ نہیں ہوگا، حالانکہ کلکتہ اسٹاک ایکسچینج میں یہ مدت تین یوم کی ہے۔ مدراس اسٹاک ایکسچینج میں کاروبار بمبئی کے نہج پر ہوتا ہے اور یہاں ادائیگی وغیرہ کے لئے سات دن کا عرصہ دیا جاسکتا ہے۔

(ب) اکاؤنٹ کے تحت لین دین:

اکاؤنٹ کے تحت لین دین کا مطلب ہوتا ہے کہ سودے کی ادائیگی سے متعلق تفاوت آئندہ ادائیگی کے وقت ادا کیا جائے گا اس طرح کے سودے "وقتی سودے" کہلاتے ہیں، کیونکہ ان کی تکمیل کے بعد اور ان کی ادائیگی سے قبل کچھ وقت گذرنا لازمی ہے، اور اس مدت کے دوران سیکورٹی کی قیمت میں مثبت یا منفی فرق آسکتا ہے، اس شکل میں یہ سودا ادائیگی کے دن سے قبل کسی بھی وقت مکمل کیا جاسکتا ہے، اور اس طرح سرمایہ کار سیکورٹی کی قیمت میں آنے والے ممکنہ فرق کو اپنے فائدے کے لئے استعمال کرسکتا ہے، اور بعض اوقات تیزی سے ہونے والے اتار چڑھاؤ کے باعث منافع بھی کما سکتا ہے۔ "وقتی سودے" میں زیادہ تر

حصہ محض امکانی نوعیت کا ہوتا ہے۔ وقتی سودے ان افراد کے ذریعہ کئے جاتے ہیں جو ان سیکورٹیز کو حوالے کرنا نہیں چاہتے جنہیں انہوں نے فروخت کیا ہے یا ان کے بدلے میں رقم حاصل کرنا نہیں چاہتے۔ ایسے کاروباری افراد یہ مان لیتے ہیں کہ وہ ادائیگی کے دن سے قبل نفع حاصل کرتے ہوئے حصص کو خرید یا فروخت کرسکتے ہیں اور ان کے درمیان موجود "تفاوت" کی شکل میں منافع حاصل کرسکتے ہیں۔ اب سے کچھ عرصہ قبل تک بمبئی اسٹاک ایکسچنج کا زیادہ تر کاروبار "وقتی سودوں" کی شکل میں ہی ہوتا تھا اور بہت کم نقد رقم کے سودے ہوتے تھے۔

موجودہ صدی کے آغاز سے قبل بمبئی اسٹاک ایکسچنج کا کاروبار محض چند ایک جوائنٹ اسٹاک کمپنیوں بالخصوص ٹیکسٹائل، کاٹن، Gining اور Pressing کمپنیوں کے اضافی حصص کے لین دین (خرید و فروخت) تک ہی محدود تھا، نقد اور آئندہ ادائیگی میں کوئی فرق نہیں تھا کیونکہ کسی بھی حصص کے بدلے میں آئندہ ادائیگی کی جاسکتی تھی۔ ماہانہ ادائیگی کا نظام مروج تھا، اور یہ تین قسموں میں منقسم تھا:

۱۔ ترن کنگلیا، یا سہ کاغذی۔ اس میں درخواست فارم، ٹرانسفر ڈیڈ اور شیئر سرٹیفیکیٹ شامل ہوتے تھے۔ خریدار کو سودے والے دن یا زیادہ سے زیادہ اگلے دن تک ان کاغذات کے وصول کرنے کے لئے رقم کی ادائیگی کرنی پڑتی تھی۔

۲۔ دوسرے طریقے میں ایک ہفتہ کی مدت درکار ہوتی تھی، خریدار کو سودا ہونے کے آٹھ دنوں کے بعد شیئر حاصل ہوتے تھے جس کے بدلے میں اسے اسی وقت ادائیگی کرنی پڑتی تھی۔

(۳) حوالگی اور ادائیگی ماہانہ ادائیگیوں کی شکل میں: یہ وہ نظام ہے جو جون ۱۹۶۵ء کے باعث فارورڈ ٹریڈنگ کے ملتوی ہونے سے قبل رائج تھا۔

کاروبار کے طریقے: ...... فرض کیجئے کہ ایک شخص کے پاس چند ہزار روپئے کی رقم ہے اور وہ کسی اسٹاک ایکسچنج (مثلاً بمبئی) میں کاروبار کرنا چاہتا ہے، اس سلسلے میں کاروبار سے متعلق ضروری اقدامات بالترتیب اس طرح ہوں گے:

۱۔ پہلا قدم:

چونکہ کسی باہری شخص کو ایکسچنج کے ہال میں داخل ہونے کی اجازت نہیں ہے۔ رقم لگانے والے شخص کو اولاً ایک بروکر (اسٹاک ایکسچنج کا دلال) یا بروکر کی کسی فرم کا انتخاب کرنا پڑے گا۔ چونکہ اسٹاک ایکسچنج کے قواعد وضوابط کے مطابق اس کے ارکان (بروکر) بذات خود رقم لگانے والے شخص کو اپنی جانب متوجہ نہیں کرسکتے لہذا بروکر کے انتخاب میں کچھ وقت صرف ہوسکتا ہے، ایسے شخص کو یا تو اپنے ان دوستوں اور واقف کاروں کے مشوروں کے مطابق کسی ایسے بروکر یا ان کی فرم کا انتخاب کرنا پڑے گا جن سے ان واقف کاروں نے اس سے قبل کاروبار کیا ہے، یا پھر وہ اسٹاک کے سکریٹری سے اسٹاک ایکسچنج کے ارکان کی فہرست طلب کرسکتا ہے۔ اس فہرست میں بروکر یا ان کی فرموں کے نام درج ہوتے ہیں چونکہ صرف ناموں سے کسی طرح کی کوئی بات ثابت نہیں ہوتی لہذا اس طرح کیا جانے والا انتخاب سود مند بھی ثابت ہوسکتا ہے اور نقصان دہ بھی۔

اگر کوئی رقم لگانے والا شخص براہ راست بروکر کی فرم سے تعلق قائم نہیں کرسکتا تو اپنے بینک کے ذریعہ (جو کہ اپنے بروکر کے ذریعہ اپنے گاہکوں کے لئے اسٹاک ایکسچنج کا کاروبار کرنے کے لئے تیار رہتے ہیں) لین دین کرسکتا ہے۔ اس طریقے سے بلاشبہ رقم لگانے والے شخص کو زیادہ تحفظ حاصل ہوتا ہے کیونکہ بروکر کے غلط اقدامات کے باعث ہونے والے نقصانات کا امکان کم سے کم ہوسکتا ہے، کیونکہ بینک کے ذمہ داران یہ چاہیں گے کہ ان کے گاہکوں کا نقصان نہ ہو، اس کے علاوہ بینک کے اسٹرونگ روم (رقم رکھنے کے کمرے) کے ذریعہ ادائیگی کی جاسکتی ہے یا ان میں حاصل شدہ رقم محفوظ رکھی جاسکتی ہے، لیکن اس طریقے میں نقصانات بھی ہیں، سب سے پہلا نقصان وقت کا زیاں ہے۔ اسٹاک ایکسچنج کے اتار چڑھاؤ منٹوں میں بدلتے رہتے ہیں۔ بینک کے ذریعہ بروکر سے رابطہ قائم کرنے میں اچھا خاصا وقت ضائع ہوسکتا ہے۔ مزید برآں بینک منیجر اسٹاک ایکسچنج کی اس وقت کی صورت حال اور دوسرے عوامل کے بارے میں زیادہ معلومات بھی نہیں رکھتے۔ بروکر چونکہ اس کاروبار سے براہ راست تعلق رکھتے ہیں لہذا انہیں پل پل کی خبر رہتی ہے۔ اس کے علاوہ کسی بھی دوسرے کاروبار کی مانند ذاتی عمل دخل اس میں بھی بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ بینک کے ذریعہ طے کئے جانے والے سودے میں بینکر کی ذاتی دلچسپی کا سوال ہی نہیں اٹھتا جبکہ اگر آپ براہ راست بروکر سے رابطہ قائم کئے ہوئے ہیں اور اس کو ذاتی طور سے جانتے ہیں اور وہ آپ کو جانتا ہے تو وہ بذات خود بھی سودے میں دلچسپی لے گا۔

۔ اسی کے ساتھ ساتھ سیکورٹیز کے لئے کی جانے والی ادائیگی اور ان کو محفوظ طریقے سے رکھنے کے لئے بینک کی سہولیات بھی مہیا ہیں۔ یہاں تک کہ اگر

کاروبار کسی دلال کے ذریعہ براہ راست بھی کیا جارہا ہے تب بھی بینک کے منیجران اپنے گاہکوں کے لئے یہ خدمت ایک معمولی کمیشن کے عوض انجام دینے کے لئے تیار رہتے ہیں۔ جب کاروبار کسی بینک کے ذریعہ انجام دیا جارہا ہے تو رقم لگانے والے شخص (Investor) کو بینک کو بھی ایک اضافی کمیشن ادا کرنا پڑتا ہے، لہذا کسی دلال کے ذریعہ براہ راست کاروبار کرنا ہمیشہ سودمند ثابت ہوتا ہے، لیکن بروکر (دلال) کا انتخاب دیکھ بھال کر کرنا چاہئے۔

بروکر کا انتخاب کرنے کے بعد اس کے نام ایک خط لکھا جاتا ہے جس میں اس سے یہ سوال کیا جاتا ہے کہ وہ کاروبار کرنے والے شخص کے لئے سودا کرنے میں دلچسپی رکھتا ہے یا نہیں، اگر وہ راضی ہے تو پھر اس کا مشورہ طلب کیا جاتا ہے۔

۲۔ حوالہ ضروری ہے:...... کوئی بھی بروکر کسی نئے گاہک کی جانب سے لین دین شروع کرنے سے قبل گاہک کا باقاعدہ تعارف چاہے گا یا پھر بینک کا حوالہ ضروری ہوگا تا کہ وہ گاہک کی معاشی حالت اور اس کی ایمانداری کے بارے میں پر یقین ہو سکے۔ کوئی بھی شرط باز (Bookmaker) اور یقینی طور پر کوئی بھی دلال کسی ایسے گاہک سے تعلق رکھنا پسند نہیں کرتا جس کے بارے میں وہ کچھ بھی نہیں جانتا۔ اور نہ ہی کوئی شخص اپنی رقم کو جیب سے نکال کر اسٹاک کے کاروبار میں لگا سکتا ہے جب تک اس کا تعارف کسی بروکر سے باقاعدہ نہ کرایا جا چکا ہو۔

۳۔ خرید کا حکم دینا:

اپنے خیر خواہوں کا مشورہ حاصل کرنے کے بعد یا کسی تجارتی اخبار کے بغور مطالعہ کے بعد یا اپنے بروکر کا مشورہ حاصل کرنے کے بعد اور یہ طے کرنے کے بعد کہ کون سی سیکورٹیز خریدنا ہے، رقم لگانے والا اپنے بروکر کو سیکورٹیز خریدنے کے لئے حکم دے سکتا ہے، مثلاً وہ اس سے کہے کہ سینچری مل کے ۱۰۰ عمومی حصص خرید لے۔ غیر ضروری تاخیر سے بچنے کے لئے عام طور پر ٹیلی گرام کے ذریعہ یا ٹیلی فون کے ذریعہ بروکر سے رابطہ قائم کیا جاتا ہے، اور یہ پیغامات مختصر ہوتے ہیں تا کہ غیر ضروری طور پر ترسیل میں زیادہ رقم نہ خرچ کرنی پڑے۔ مثلاً یہ پیغام اس طرح دیا جا سکتا ہے: "میرے لئے سو (۱۰۰) سنچریز ۹۵۰ کے نرخ پر خریدلو"۔ یہ حکم ایک طے شدہ رقم کا ذکر کرتا ہے اور اس میں کسی کمی بیشی کی گنجائش نہیں ہے لہذا اس کی تعمیل کرنا تقریباً ناممکن ہے۔ کیونکہ حصص کی قیمت میں ہر منٹ اضافہ یا کمی ہوسکتی ہے یا پھر اگر اس کی قیمت ۹۵۰ روپئے سے کم ہے تو اس میں کمی یا زیادتی زیادہ وقفے سے ہوگی۔ خرید کا حکم دینے کے دوسرے طریقے کا استعمال بھی کیا جا سکتا ہے جس میں بروکر کے لئے بھی گنجائش ہو اور دوسری جانب اس میں رقم لگانے والے شخص کے مفادات کا بھی تحفظ ہوتا ہو۔

گاہک کے خرید کے حکم کو مندرجہ ذیل حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے: (۱) قیمت کا ذکر جس پر خرید کے حکم کی تعمیل کی جائے گی (۲) مدت کا ذکر جس کے دوران اس حکم پر عمل درآمد کیا جائے (۳) یا اس مدت کا ذکر جس کے گذرنے کے بعد ہی حوالگی (Delivery) کی جائے۔

قیمت کے مطابق درجہ بندی:...... اس درجہ کے تحت آرڈر کی مندرجہ ذیل شکلیں ہوسکتی ہیں:

(الف) بہترین یا مارکیٹ آرڈر:...... اس قسم کے آرڈر میں کسی قیمت کا تعین نہیں کیا جاتا ہے اور فوری طور پر بہترین اور مناسب ترین قیمت پر خرید یا فروخت کی جاتی ہے۔ اس قسم کے احکامات پر فوری طور پر بروکر کے ذریعہ عمل درآمد کیا جاتا ہے، اور بازار میں زیادہ تر اسی قسم کے آرڈر آتے ہیں۔ اس قسم کے آرڈر کچھ اس طرح دیئے جاتے ہیں: "خریدو (یا فروخت کرو) ۱۰۰ سینچری بہترین (قیمت) پر"۔

(ب) طے شدہ قیمت یا حدود کے آرڈر:...... اس قسم کے آرڈر گاہک کے ذریعہ طے شدہ قیمت پر عمل پذیر ہوتے ہیں۔ ان کی ایک مثال ہے: "خریدو (یا فروخت کرو) ۱۰۰ سینچری ۹۵۰ پر"۔ مندرجہ ہدایات کے مطابق بروکر کو ۹۵۰ روپئے یا اس سے کم قیمت پر حصص کو خریدنا چاہئے۔ اسی طرح فروخت کرنے کے اسی قسم کے ایک آرڈر کی تعمیل ۹۵۰ روپئے یا اس سے زیادہ قیمت پر کی جائے گی۔ بعض اوقات اس قسم کے امکانات میں تھوڑی بہت گنجائش رکھی جاتی ہے۔ مثلاً "تقریباً ۹۵۰ پر خریدلو"۔ لیکن بروکر کے نقطہ نظر سے یہ طریقہ زیادہ اطمینان بخش نہیں ہے کیونکہ اس میں اس بات کی وضاحت نہیں ہے کہ تقریباً کا تعین کن حدود میں رہتے ہوئے کیا جائے، لہذا واضح حدود کا تعین بروکر کے ذریعے پسند کیا جائے گا۔ مثلاً "۹۵۰ سے زیادہ پر مت خریدو"۔ یا "۹۵۰ سے کم پر فروخت مت کرو"۔ اس قیمت کے حدود کے تعین میں مذکورہ رقم اس طرح نہیں جیسے کہ ایک تاجر کو زیادہ سے زیادہ رقم کا آفر کیا جاتا ہے، بروکر محض ایک کارپرداز ہے، اور وہ بذات خود خریدار کو حصص فروخت نہیں کرتا ہے بلکہ وہ اپنے گاہک کے مفادات کو مدنظر رکھتے ہوئے کم سے کم قیمت پر حصص خریدتا ہے اور زیادہ سے زیادہ قیمت پر حصص کو فروخت کرتا ہے۔

(ج) فوری یا منسوخی کا آرڈر:...... یہ آرڈر ایک طے شدہ قیمت کے آرڈر کے مقام پر استعمال کئے جاتے ہیں، اس کی ایک مثال یہ ہوسکتی ہے: "۱۰۰ سینچر یز فوری طور پر خرید لو"۔ اس میں "فوری" کی جگہ منسوخ بھی استعمال کیا جاسکتا تھا۔ اس قسم کے آرڈر ممکنہ بہترین قیمت پر فوری طور پر پورے کئے جاتے ہیں، اور اگر قیمت کے سود مند نہ ہونے کے باعث فوری طور پر ان پر عمل درآمد نہیں کیا جاسکتا تو اس آرڈر کو منسوخ کردیا جاتا ہے، اور بروکر بازار کی صورت حال کی رپورٹ اپنے گاہک کو روانہ کرتا ہے۔

(د) اسٹاپ لاس آرڈر (Stop Loss Order):...... اس نظام کے پس پشت یہ محرک کارفرما ہے کہ گاہک کو قیمت میں تیزی سے ہونے والے اتار چڑھاؤ سے محفوظ رکھا جاسکے۔ خرید کے لئے ایک اسٹاپ لاس آرڈر کچھ اس طرح ہوگا "۱۰۰ سینچر یز ۹۵۰ پر اسٹاپ"۔ اس آرڈر کے موصول ہونے کے بعد بروکر اس وقت تک کوئی قدم نہیں اٹھائے گا جب تک بازار بھاؤ ۹۵۰ سے کم ہے، لیکن جیسے ہی یہ ۹۵۰ تک پہنچتا ہے یا بڑھنا شروع ہوتا ہے بروکر کو ممکنہ مناسب ترین قیمت پر ۱۰۰ حصص خرید لینا چاہئے۔ اسی طرح قیمت میں کمی ہونے کے باعث تیزی سے ہونے والے نقصان کو محدود کرنے کے لئے ایک خاص نقطے کی وضاحت کی جاسکتی ہے جس کے بعد حصص کو فروخت کردیا جائے۔ مثلاً "الف" ایک شخص ہے جس نے ۱۰۰ سینچر یز حصص ۹۵۰ کی نرخ سے خریدے ہیں، اپنے بروکر کو "۱۰۰ سینچر یز ۹۳۰ پر اسٹاپ" کا آرڈر دے سکتا ہے، لہٰذا اس طرح رقم لگانے والے کو فی حصص ۲۰ روپئے کا ہی نقصان اٹھانا پڑے گا۔ یعنی جیسے ہی بازار بھاؤ ۹۳۰ پر پہنچتا ہے یا کم ہونا شروع ہوجاتا ہے بروکر حصص فروخت کردے گا۔ اسٹاپ لاس آرڈر، مارکیٹ آرڈر بن جاتا ہے جب حصص کا نرخ ایک معینہ قیمت کے قریب پہونچتا ہے، بروکر تیزی سے اتار چڑھاؤ کے اس بازار میں اپنے گاہک کے احکامات پر معینہ قیمت پر خرید و فروخت نہیں کرسکتا، لیکن جب معینہ قیمت تک بازار بھاؤ پہنچ جاتا ہے تو بروکر کے لئے یہ لازمی ہوجاتا ہے کہ وہ سرعت سے احکامات پر عمل پیرا ہونے کی کوشش کرے، اور اگر کوئی بروکر فوری طور پر قدم نہیں اٹھاتا اور آرڈر کی تکمیل میں تاخیر کا موجب بنتا ہے جس کے نتیجے میں گاہک کو نقصان اٹھانا پڑے تو وہ بروکر اس نقصان کا ذمہ دار ہوگا۔ اس کے علاوہ تحفظ کی ایک شکل پٹ اور کال (Put and Call) بھی ہے جس کا مقصد رقم لگانے والوں کے نقصان کی حد کو کم سے کم کرنا ہے، لیکن تمام ایکسچینجوں پر اختیاری سودوں کی ممانعت ہے۔

(ھ) مرضی پر مبنی احکامات:

یہ وہ آرڈر ہیں جو کہ بروکر کی زیرک مندی اور ہوشیاری پر چھوڑ دیئے جاتے ہیں، اس کا استعمال بہت کم ہوتا ہے، اور عام طور پر اس کا استعمال تب ہوتا ہے جب کوئی رقم لگانے والا شخص چند بے حرکت حصص کو خریدنا یا فروخت کرنا چاہتا ہے اور اسے اپنے دلال پر پورا بھروسہ ہو۔ اس آرڈر کے الفاظ یوں ہوسکتے ہیں "خرید لو (یا فروخت کردو) ۱۰۰ سینچر یز"۔ اس آرڈر کا پُر اطمینان نتیجہ اسی وقت برآمد ہوسکتا ہے جب گاہک اور بروکر (دلال) کے درمیان مکمل ہم آہنگی ہو۔ اس میں قیمت کے بارے میں ہدایات کے علاوہ وقت کے محدود عرصہ کا بھی تعین کیا جاسکتا ہے۔ چند حالات کے تحت وقت کی کوئی مدت مخصوص نہیں کی جاتی ہے، اس قسم کے آرڈر کو "کھلا آرڈر" یا (Open Order) کہا جاتا ہے۔ جبکہ دوسری شکل میں اس حکم کی مدت ایک دن، ایک ہفتہ یا ایک مہینہ بھی ہوسکتی ہے، اس قسم کے تحت آرڈر کے الفاظ یوں ہوسکتے ہیں "۱۰۰ سینچر یز ۹۵۰ پر فروخت کردو"۔ مدت معینہ اس وقت تک مانی جائے گی جب تک (آرڈر) منسوخ نہ کردیا جائے (یا ایک دن کے لئے یا ایک مہینے کے لئے) اس قسم کے آرڈر بروکر کو سست روی کی ترغیب دے سکتے ہیں۔ لہٰذا آرڈر میں حوالگی کی مدت کا ذکر بھی ہونا چاہئے اور اس کا بھی کہ سودا نقد رقم کی حوالگی کی شکل میں ہو یا اکاؤنٹ کے ذریعہ۔

آرڈر کسی بھی شکل میں ہو یہ ضروری ہے کہ آرڈر واضح اور صریح الفاظ و انداز میں جاری کیا جائے تاکہ غیر ضروری تاخیر سے بچا جاسکے اور تمام ممکنہ تنازعات سے بھی محفوظ رہا جاسکے۔ صراحت اور اختصار کسی بھی اچھے آرڈر کی دو اہم خصوصیات ہیں۔

۴۔ آرڈر کا اندراج اور اس کی تعمیل:...... تمام آرڈر جو کہ موصول ہوتے ہیں اولاً ایک عمومی ڈائری یا نوٹ بک پر درج کرلئے جاتے ہیں اور بعد میں انہیں آرڈر بک میں درج کیا جاتا ہے۔ عمومی ڈائری میں اندراج کئے جانے کے بعد آرڈر پر فوری عمل درآمد کیا جاسکتا ہے کیونکہ آرڈر بک میں اندراج کرنے میں خاصا وقت صرف ہوتا ہے۔ عملی طور پر زبانی یا ٹیلیفون سے دیئے گئے آرڈر بھی عمومی نوٹ بک میں درج کرلئے جاتے ہیں۔ ایسی صورت میں کہ بہت سارے آرڈر موصول ہوچکے ہوں ان کی درجہ بندی کی جاتی ہے تاکہ اضافی حصص کی خرید یا فروخت کی قیمت یا ان کی اصل حیثیت کا تعین کیا جاسکے، اور ان آرڈر کی تکمیل میں بروکر کی جانب سے کئے جانے والے اقدامات کا منفی اثر بازار پر نہ پڑے۔

۵۔فرش:

دراصل معتبر اور مستند کلرک ہی اسٹاک ہال میں ہونے والے سودے اور لین دین کرنے والے ہوتے ہیں، بروکر تمام ہدایت اپنے مستند کلرک کے حوالے کردیتے ہیں۔ چھوٹے دلال جن کے پاس زیادہ کام نہیں ہوتا خود ہی سودے انجام دیتے ہیں۔

اسٹاک کا ہال مختلف بازاروں میں تقسیم ہوتا ہے اور ہر بازار پر اضافی حصص کے نام کا تذکرہ ہوتا ہے۔ جب کسی مخصوص کمپنی کے حصص میں لین دین کرنا ہو تو مستند کلرک ہال میں اس بازار تک جاتے ہیں جہاں ان حصص کا کاروبار ہور ہا ہو۔

لندن اسٹاک ایکسچینج کے برخلاف ایکسچینج کے ارکان ''Jobbers'' اور ''Brokers'' میں تقسیم نہیں کئے جاسکتے ہیں لہٰذا کسی اضافی حصص کی دو قیمتیں بیان نہیں کی جاتی ہیں۔ مستند کلرک حالات کے تحت اضافی حصص کی خرید وفروخت کے لئے اپنی قیمت کا اعلان کرسکتا ہے۔ مثلاً وہ کہے ''میں ۵۲ پر خریدتا ہوں'' جب کہ اس کا مدمقابل کاروباری شخص ۵۴ سے ۸/۵۳ تک اپنی قیمت کم کرسکتا ہے، اور یہ فرض کیا جائے گا کہ سودا مکمل ہوگیا۔ سودے کی تکمیل کرتے ہوئے عام طور پر سیکڑے اور ہزار کے مقام کے ہندسے حذف کردیئے جاتے ہیں۔ جب یہ کہا جائے کہ سینچری کی شرح ۵۲ یا ۸/۵۴ ہے تو اس کا مطلب ہے کہ شرح ۹۵۲، ۹۵۴ یا ۸/۹۵۳ ہے، ایسے اعداد وشمار جن میں سیکڑے کے مقام کا ہندسہ حذف کردیا گیا ہو، گاہک یا کسی نئے آدمی کے لئے بے معنی ہیں، لیکن ایک ایسے کاروباری شخص کے لئے جو کہ اسٹاک ایکسچینج میں لین دین کرتا رہتا ہے، کسی پریشانی یا مشکل کا باعث نہیں بن سکتے، کیونکہ وہ حذف کردہ ہندسوں سے پوری طرح واقف ہوتا ہے۔

عام سودے الفاظ کے ذریعے یا زبانی طور پر کئے جاتے ہیں اور دونوں پارٹیوں کے درمیان اسٹاک ایکسچینج میں کوئی تحریری معاہدہ نہیں ہوتا، بعض اوقات محض ایک لفظ یا گردن کی جنبش سے ہی سودے کئے جاتے ہیں جن سے یہ اشارہ کیا جاتا ہے کہ خرید وفروخت کے سودے کو مکمل سمجھا جائے۔ اس کے بعد اس سودے کو پورا کرنے کی ذمہ داری خریدار اور فروخت کنندہ دونوں پر عائد ہوتی ہے۔ جیسے ہی سودا مکمل ہوتا ہے دونوں پارٹیاں پاکٹ بک میں اپنے سودے کی تفصیلات درج کرلیتی ہیں۔ یہ اندراج عام طور پر پنسل سے ہوتا ہے۔ سودے کی تکمیل کے بعد کاغذی کاروائی کے لئے کلرکوں کی بھاگ دوڑ دیکھ کر اسٹاک ایکسچینج میں منٹ منٹ کی قیمت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ کلرک بھاگتے دوڑتے ہوئے اپنی ڈائریوں میں سودے کی تفصیلات مختصراً درج کرتے ہیں۔ یہ کام سیڑھیوں پر چڑھتے اترتے وقت یا لفٹ میں بھی کیا جاسکتا ہے۔ پیڈ یا ڈائری دو حصوں میں تقسیم ہوتی ہے۔ خرید کا اندراج رقم کے خرچ ہونے کے خانے (Debit) میں کیا جاتا ہے اور فروخت کا اندراج آمد کے خانے (Credit) میں کیا جاتا ہے۔ حصص کی تعداد، ان کا تفصیلی بیان اور ان پارٹیوں کا نام بھی جنہوں نے حصص فروخت کئے یا خریدے ہیں درج کیا جاتا ہے۔

حصص کے سودے ایک مخصوص ومتعین تعداد کے تحت ہی انجام دیئے جاسکتے ہیں جس کا تعین حصص یا سیکورٹیز کی قیمت کو مدنظر رکھتے ہوئے کیا جاتا ہے۔ ہر اسٹاک ایکسچینج کے اصول وضوابط کے مطابق ایک مخصوص تعداد اس سلسلہ میں متعین کردی جاتی ہے جن کے تحت ہی حوالگی (Delivery) کی جاسکتی ہے یا پھر یہ کہ فروخت کے وقت اس تعداد کا تعین کیا جاچکا ہو۔

صرف انہی سیکورٹیز میں سودا کیا جاسکتا ہے جن میں سودے کی اجازت اسٹاک ایکسچینج کے ذریعہ ان کو اسٹاک میں شامل کئے جانے کے بعد دی جاتی ہے۔ حالانکہ ہندوستان کے دوسرے اسٹاک ایکسچینجوں میں لین دین کے تحت حاصل ہونے والی سیکورٹیز کا سودا بمبئی اسٹاک میں نقد رقم کے ذریعہ کیا جاسکتا ہے اگرچہ اسٹاک کے گورننگ بورڈ نے متذکرہ سیکورٹیز کے لئے کسی رقم کا تعین نہ کیا ہو۔

رقعہ معاہدہ (Contract Note):

سودے کی تکمیل کے بعد کلرک اپنے دفتر واپس لوٹتا ہے، اور یادداشتی ڈائریوں، کلرک کے عام پیڈ یا نوٹ بک سے سودے کی تفصیلات ''کچا سودا کتابوں'' میں درج کی جاتی ہیں اور وہاں سے انہیں پکی کتابوں یا حساب کتاب کے باقاعدہ کھاتوں میں نقل کیا جاتا ہے۔ ساتھ ہی یہ ذکر بھی ہوتا ہے کہ سودا نقد رقم یا آئندہ ادائیگی (بینک اکاؤنٹ) کے تحت انجام پایا ہے۔ بروکر سے متعلق اور پارٹیوں سے متعلق تفصیلات بھی درج کی جاتی ہیں۔ اس کے بعد بروکر ایک معاہدے کی دستاویز (نوٹ) تیار کرتا ہے جو دوسری پارٹی کے لئے ہوتا ہے۔ بروکرس کے ذریعہ ایسوسی ایشن سے منظور شدہ معاہدے کے نوٹ استعمال کئے جاتے ہیں۔ نقد رقم یا بینک کے ذریعہ سودا ہونے کی شکل میں الگ الگ قسم کے معاہدے کی دستاویزات استعمال کی جاتی ہیں۔ ایک

کنٹریکٹ نوٹ گاہک کو بھی بھیجا جاتا ہے۔ان معاہدوں پر بروکر کے خود کے یا اس کی جانب سے نامزد اتارنی کے دستخط ہونے چاہئیں، ان پر باقاعدہ ٹکٹ بھی الگ ہونا چاہئے۔اگر نقد رقم کی شکل میں سودا ہوا ہے تو اس طرح تیار کئے جانے والے معاہدے کے نوٹ میں بروکر کے کمیشن کا خانہ نہیں ہوتا ہے جیسا کہ فارورڈ ڈلیوری کے معاہدے میں ہوتا ہے۔اس کے علاوہ گاہک کو ایک اور میمو بھیجا جاتا ہے جس میں ادا کی گئی یا حاصل ہونے والی رقم کی تفصیل بروکر کی اپنی فیس اور ٹرانسفر فیس (اگر گاہک یہ چاہتا ہے کہ اس کو اس کے نام ٹرانسفر کردیا جائے) کی تفصیلات درج ہوتی ہیں۔

اگلے دن کنٹریکٹ نوٹ (Contract Note) کا دونوں پارٹیوں کے ذریعے ۱۲ بجے سے ۳ بجے کے درمیان تقابلی معائنہ کیا جاتا ہے، اور جب دونوں کنٹریکٹ نوٹ کا معائنہ ہو جاتا ہے تو دونوں پارٹیوں کے کلرک ایک دوسرے کے کھاتے میں اپنے اپنے دستخط کرتے ہیں جو اس بات کا ثبوت ہوتا ہے کہ کنٹریکٹ نوٹ باقاعدہ اور صحیح طور پر تیار کئے گئے ہیں۔صرف چند کلرک ہی جو کہ باقاعدہ بروکر کی جانب سے ان کی نمائندگی کرنے کے لئے مقرر کئے جاتے ہیں بروکر کی جگہ اپنے دستخط کرسکتے ہیں۔ایسے کلرک کو ایک کارڈ دیا جاتا ہے جس پر اس کے نمونے کے دستخط ہوتے ہیں اور اس کارڈ کو کلرک کو کنٹریکٹ ہال میں لے کر جانا پڑتا ہے۔تمام غلطیاں یا خامیاں باضابطہ طور پر متعلقہ افراد کے سامنے لائی جاتی ہیں جن کا قابل قبول او رمنصفانہ حل تلاش کرلیا جاتا ہے۔عام طور پر اگر کسی حقیقی غلطی کے نتیجے میں کوئی نقصان ہو رہا ہو تو دونوں پارٹیاں اس کو آپس میں آدھا آدھا بانٹ لیتی ہیں، اور ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ تنازعہ کے حل کے لئے ثالثی کمیٹی سے رجوع کیا جائے۔کنٹریکٹ نوٹ میں ہوئی کسی غلطی کے لئے گاہک ذمہ دار نہیں ہوتا ہے اور اس کی پوزیشن میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں آتی ہے۔بلاشبہ یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ اسٹاک ایکسچینج کا نظام جو کہ صرف لفظوں یا زبانی طور پر ہی چلتا ہے، اس نظام کے قابل احترام اور ایماندارانہ ہونے کی مثال ہے۔

۶۔ کمیشن:

بروکر دیئے گئے مشورے کے لئے کسی قسم کی فیس نہیں مانگتا ہے۔جب سودا مکمل ہو جاتا ہے تب ہی کمیشن کی ادائیگی کا سوال اٹھتا ہے۔اس لئے کہ فائدہ مند اور مناسب مشورہ ہمیشہ بروکر کے حق میں سودمند ثابت ہوتا ہے اور اسی مشورے کی بنیاد پر اس کے لئے آئندہ بڑے پیمانے پر کاروبار کی راہیں استوار ہوتی ہیں۔اسٹاک ایکسچینج کے اصول وضوابط کے تحت بروکر کے زیادہ سے زیادہ کمیشن کی شرحیں مقرر کردی گئی ہیں۔اس کا مقصد یہ ہے کہ بروکرس کے درمیان مقابلہ زیادہ نہ ہو اور کمیشن کی شرح کم سے کم نہ ہوتی جائے۔یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ کم سے کم کمیشن کی شرح مقرر کردی گئی ہے اور بروکر اس شرح سے زیادہ کمیشن طلب کرنے کا مجاز ہے لیکن عملی طور سے ایسا تقریباً نہیں کے برابر ہوتا ہے کیونکہ بروکرس کے آپس کے مقابلے کے نتیجہ میں یہ کم سے کم ہی زیادہ سے زیادہ ہو کر رہ جاتا ہے۔بمبئی اسٹاک ایکسچینج کے اصول وضوابط کے مطابق اس کم سے کم کمیشن کی شرح میں بھی بروکر کے ذریعہ چھوٹ دی جاسکتی ہے لیکن یہ چھوٹ کمیشن کی آدھی رقم سے کم نہ ہو۔یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ بروکر کی کم سے کم فیس کا اطلاق نقد رقم کی شکل میں کئے گئے ہر سودے پر نہیں ہوتا، اور اس کا اندراج اسی صورت میں کیا جاتا ہے جب رقم کی ادائیگی فی الوقت نہیں کی جارہی ہے۔درحقیقت اس طرح سے حاصل ہونے والے کمیشن کی مقدار بہت کم ہوتی ہے اور بروکر کے منافع کا بہت کم حصہ اس شکل میں حاصل ہوتا ہے۔

۷۔ تصفیہ (Settlement):

تصفیہ کے طریق کار کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

(الف) نقد رقم کی ادائیگی کے معاہدوں کا تصفیہ۔ (ب) آئندہ ادائیگی کے معاہدوں کا تصفیہ۔

بمبئی اسٹاک ایکسچینج کے انداز کو مد نظر رکھتے ہوئے مثال کے طور پر آگرہ کا باشندہ 'الف' اپنے بروکر 'اب ج' کمپنی کو آرڈر دیتا ہے کہ "۱۵ اسینچریز خریدلو"۔ بروکر یہ حصص ۹۴۵ کے حساب سے "دل ج" کمپنی سے خرید لیتا ہے جس نے اپنے گاہک "ب" کی نمائندگی کرتے ہوئے یہ حصص فروخت کئے ہیں۔ "ب" نے یہ حصص ۹۴۰ کی شرح پر "ھ وز کمپنی" کے ذریعہ "ج" سے خریدے تھے۔اس سودے میں ایک کے بعد ایک کڑی موجود ہے۔

(الف) نقد رقم کی ادائیگی کا معاہدہ (Ready Delivery Contract):

نقد رقم کی فہرست کے مطابق حصص کو دو درجوں "Cleared" اور "Non Cleared" میں تقسیم کیا جاسکتا ہے اور ان دونوں کے

تصفیہ کے طریقے میں بھی فرق ہوتا ہے۔ کلیئرڈ حصص کا تصفیہ کلیئرنگ ہاؤس کے ذریعے ہوتا ہے جبکہ نان کلیئرڈ حصص، دستی ڈلیوری کے ذریعے انجام پاتے ہیں یعنی ان میں کلیئرنگ ہاؤس کا کسی طرح کا دخل نہیں ہوتا، اور یہ ممبران کے درمیان آپس میں ہی طے پا جاتے ہیں۔

(۱) نان کلیئرڈ حصص (Non Cleared Securities): فوری ڈلیوری معاہدے کا مطلب یہ ہے کہ معاہدے سے متعلق پارٹیاں حصص کو فوری طور پر وصول کرنے اور ان کی ادائیگی کرنے کے لئے تیار ہیں۔ فروخت کنندہ 'ہ وز' کمپنی اپنے گاہک 'ج' سے شیئر سرٹیفکیٹ وصول ہونے کے بعد آئندہ پیر (دو شنبہ) کو ایک 'فروخت کنندہ ڈلیوری ٹکٹ' جاری کرے گا جس کو بازار میں عرف عام میں کیلی کے نام سے جانا جاتا ہے۔ ساتھ ہی اس کی ایک نقل بھی جاری کی جاتی ہے۔ اس ٹکٹ کے ذریعے فروخت کنندہ کا بروکر دوسری پارٹی کو مطلع کرتا ہے کہ وہ حصص فروخت کرنا چاہتے ہیں۔ خریدنے والا بروکر سیاہ رنگ کی نقل پر اپنے دستخط کرے گا اور اسے "ہ وز" کمپنی کو واپس بھیج دے گا۔ کیلی کی اصل جو کہ سرخ رنگ میں ہوتی ہے خریدنے والے بروکر کے ذریعہ اپنے پاس رکھ لی جائے گی۔ "دل ج" کمپنی بھی 'اب ج' کمپنی کو ایک کیلی جاری کرے گی جو کہ اس کی نقل پر دستخط کر کے اسے 'دل ج' کمپنی کو واپس کر دیں گے۔ خریدنے والے بروکر تک کیلی ۳ بجے سہ پہر سے قبل پہنچ جانی چاہئے۔

۳ بجے کے بعد تصفیہ والے کمرے میں کیلی لے جائی جاتی ہے۔ تمام بروکرس کے کلرک یہاں اکٹھے ہوتے ہیں اور تمام پارٹیوں کے نام کا اعلان کرنے کے ساتھ ساتھ خریدار پارٹیاں سامنے آتی ہیں اور ان کے ذریعہ ٹکٹ کی نقول ان کے معائنے اور ان پر دستخط کرنے کے بعد وصول کی جاتی ہیں، اسٹیچینج کا ایک عہدے دار بھی وہاں موجود ہوتا ہے، اور اگر کوئی خریدار غیر حاضر ہے اور کیلی وصول نہیں کرتا ہے تو وہ عہدے دار کیلی اپنے قبضے میں لے لیتا ہے تا کہ اس بات کا ثبوت رہے کہ سودا ہوا ہے۔ اس کے بعد وہ غیر حاضر پارٹی کے دفتر میں پیش کی جاتی ہے، اور اگر اس کے بعد بھی خریدار اس کو قبول کرنے سے انکار کرتا ہے، تو فروخت کنندہ اپنے حقوق کا استعمال کرتے ہوئے متعلقہ پارٹی سے اپنے نقصان کا معاوضہ طلب کر سکتا ہے۔

جمعرات کا دن جو کہ ادائیگی کا دن ہوتا ہے، فروخت کنندہ بروکر حصص کے سرٹیفکیٹ مع ٹرانسفر فارم (باقاعدہ اندراج اور دستخط کے ساتھ) خریدار کو دے دے گا۔ دستاویز حصص (Share Certificate) اور دستاویز منتقلی (Transfer Deed) خریدار بروکر کے دفتر میں پیش کی جاتی ہیں۔ جب حصص کی ادائیگی ہو جاتی ہے تو رقم ادا کی جاتی ہے۔ حصص کی ادائیگی قسطوں (حصوں) میں بھی کی جاسکتی ہے اور خریدار اس کو قبول کرنے کا پابند ہے۔ 'اب ج' کمپنی "الف" کو ایک میمو مع کنٹریکٹ نوٹ کے آئندہ روز روانہ کرے گا جس میں مندرجہ بالا اندراجات ہوں گے۔

	روپئے	آنہ	پیسے
۱۰ حصص سینچری ملس ۹۴۵ پر	۹۴۵۰	۰	۰
بروکر فیس فی ۱۰۰ روپئے یا ہر حصص کے مطابق ۸ فیصد کے حساب سے جوڑی جائے۔	۵۰	۰	۰
ٹکٹ کی فیس ۲/۱ فیصد	۱۰۶	۶	۰
فی حصص ۴ آنہ کے حساب سے رجسٹریشن فیس	۲	۸	۰

۹۶۰۸، روپئے، ۱۴ آنے، ۰ پیسے

اس میمو کی وصولی کے بعد 'الف' ۹۶۰۸ روپئے ۱۴ آنے کا چیک روانہ کرے گا۔ 'دل ج' کمپنی "ہ وز" کمپنی سے حصص وصول کرنے کے بعد انہیں اور ٹرانسفر ڈیڈ (Transfer Deed) کو 'اب ج' کمپنی کے حوالے کر دے گی جس کو ۹۴۵۰ کے عوض یہ حصص حاصل ہوں گے۔

(۲) کلیئرڈ حصص (Cleared Securities): اس کا طریقہ بھی تقریباً گذشتہ کی مانند ہی ہے، صرف اتنا فرق ہے کہ سودے کا تصفیہ کلیئرنگ ہاؤس کے ایجنٹ کے ذریعہ کیا جاتا ہے، کسی بھی کام کے دن کیا جانے والا سودا آئندہ جمعرات کو تکمیل پاتا ہے، اور یہ دن (Clearing Day) کی حیثیت سے جانا جاتا ہے۔ سنیچر کے دن کئے گئے سودے کو پیر کے دن کے حساب سے مانا جاتا ہے۔ پیر کے دن فروخت کنندہ 'فروخت کنندہ کلیئرنس ٹکٹ' مع اس کی نقل کے بنائے گا جسے خریدار کے پاس بھیجا جائے گا۔ خریدار اس کی اصل اپنے پاس رکھ لے گا اور نقل پر دستخط کرنے کے بعد اسے واپس کر دے گا۔

بدھ کے دن 'یعنی کلیئرنگ ڈے' سے ایک روز قبل فروخت کنندہ کو (Clearing House) میں ایک کلیئرنگ شیٹ داخل کرنا پڑتی ہے مع ڈلیوری

فارم اور رسید فارم کے۔ اس شیٹ میں خریدے ہوئے حصص کی تفصیل، ان کی قیمت جو کہ ادا کی گئی Debit سائڈ پر درج کی جاتی ہے، اور فروخت کئے گئے حصص اور ان کے بدلے میں حاصل ہونے والی رقم کی تفصیل Credit سائڈ پر درج کی جاتی ہے، اور کل فرق (Balance) بھی درج کیا جاتا ہے، اور ممبر اس رقم کا چیک بھی روانہ کرتا ہے۔ یا اگر کریڈٹ بیلنس ہے تو کلیئرنگ ہاؤس کے نام ایک ڈرافٹ روانہ کیا جاتا ہے۔

کلیئرنگ ڈے کو تمام حصص جو کہ فروخت ہوئے مع ضروری ٹرانسفر ڈیڈ کے فروخت کنندہ کی طرف سے کلیئرنگ ہاؤس میں جمع کئے جاتے ہیں۔ خریدار رکن کو کلیئرنگ ڈے کے اگلے روز یہ حصص کلیئرنگ ہاؤس سے موصول ہوجاتے ہیں۔ وہ کلرک جو کہ بروکرس کی جانب سے حصص کے حصول کے لئے نامزد یا مقرر کئے جاتے ہیں اسٹاک ایکسچینج کی جانب سے حصص کی وصولی کی رسید پر دستخط ثبت کرتے ہیں:

فارورڈ ڈلیوری معاہدوں کی ادائیگی:

آئندہ یا فارورڈ ڈلیوری معاہدوں کے لئے بمبئی اسٹاک ایکسچینج کے سال کو بارہ (۱۲) ادائیگیوں میں تقسیم کیا گیا ہے کیونکہ یہ ادائیگیاں ماہانہ ہوتی ہیں۔ گورننگ بورڈ ہر سال آئندہ سال کیلئے بارہ اکاؤنٹ اور ادائیگی کے دن مقرر کردیتا ہے۔ عام طور پر ہر ادائیگی مہینے کے آخری ہفتہ میں کی جاتی ہے اور ادائیگی کا نام مہینے کے حساب سے رکھا جاتا ہے۔ اس قسم کے سودوں میں کاروبار کا مقصد حصص کا حصول یا ان کے بدلے میں ادائیگی نہیں ہوتا ہے بلکہ اس کا مقصد خریدنے اور بیچنے کے ذریعہ مہینوں کے دوران نفع حاصل کرنا ہوتا ہے۔ قانونی طور پر فروخت کے ہر معاہدے کے تحت حصص کی ادائیگی ضروری ہوتی ہے لیکن عملی طور پر ایسا بہت کم ہوتا ہے۔ ہر ادائیگی کے دوران ارکان کے درمیان کئی ایک ادائیگیاں ہوتی ہیں۔ اور ان سب کا نیٹ بیلنس ڈلیور کیا جاتا ہے اور اس کی ادائیگی کی جاتی ہے۔ یہ تمام ادائیگیاں کلیئرنگ ہاؤس کے ذریعہ کلیئر کی جاتی ہیں اور یہ پیچیدہ عمل آسان بنادیا جاتا ہے۔ جب ادائیگی کا دن آتا ہے تو:

۱۔ وصولی کرلی جاتی ہے اور یہ بہت کم ہوتا ہے۔

۲۔ سودا پلٹ دیا جاتا ہے یعنی خرید، فروخت میں بدل جاتی ہے اور ایسا ہی فروخت کے ساتھ ہوتا ہے۔

۳۔ آئندہ ادائیگی (Sattlement) والے سودے عام طور پر موجودہ ادائیگی کے لئے ہی ہوتے ہیں لیکن بیک وقت دو ادائیگیوں کے لئے بھی ہر ادائیگی کے چار دنوں کے بعد نئے سودے کئے جاسکتے ہیں۔ یہ چار دن ادائیگی کی آخری تاریخ سے شمار کئے جاتے ہیں اور آئندہ مہینے کے تین دنوں تک ہوتے ہیں، مثلاً فروری کی ادائیگی ۳ر فروری کو ختم ہورہی ہے، اس صورت میں چار دن یعنی ۳۱ر جنوری، یکم، ۲ر اور ۳ر فروری کو ایک ساتھ دو اکاؤنٹ فروری اور مارچ کی ادائیگی کے کھولے جائیں گے تاکہ جو افراد حصص کو وصول کرنا پسند نہیں کرتے یا ان کی ادائیگی پسند نہیں کرتے وہ ان چار دنوں کے درمیان اپنے سودے پورے کرسکتے ہیں۔ ۳ر فروری کو فروری کی ادائیگی ختم ہوجائے گی اور اس کے بعد صرف مارچ کی ادائیگی ہی حالیہ ادائیگی رہ جائے گی، لیکن درحقیقت دونوں ادائیگیاں ایک دوسرے کے ساتھ جڑی رہتی ہیں۔ نئی ادائیگی اسی دن نہیں شروع ہوجاتی ہے بلکہ پہلی ادائیگی کے خاتمے کے چار دن قبل سے ہی شروع ہوتی ہے۔

آئندہ سودوں میں ادائیگی کی مدت چھ دن پر محیط ہوتی ہے۔ Sattlement Period کے آخری دن خریدار بروکر فروخت کنندہ بروکر کے ساتھ اپنی میمورنڈم سلپ کا تبادلہ کرتا ہے اور اس طرح حساب کتاب کے بعد اس دوران کئے گئے کاروبار کا اندازہ لگاتا ہے۔ عملی طور پر یہ تقابلی معائنہ بہت کم ہوتا ہے۔ دوسرے دن کو "Clearance Day" یا Ticket Day کے نام سے جانا جاتا ہے۔ ایکسچینج کے ارکان اس دن کلیئرنس کی فہرست اور ڈلیوری کی فہرست کلیئرنگ ہاؤس میں پیش کرتے ہیں، جن میں وصول ہونے والی سیکورٹیز اور ادا کی جانے والی سیکورٹیز کی تعداد وغیرہ درج ہوتی ہے۔ سودے کی رقم اور خریدے گئے اور فروخت کئے گئے حصص کی تعداد کا بھی ذکر کیا جاتا ہے، یہ ذکر اس کے لئے علیحدہ مخصوص فارموں میں کیا جاتا ہے، یہ تمام فارم کلیئرنگ ہاؤس میں ۱۲ بجے دوپہر اور ۵ بجے سہ پہر کے درمیان جمع کرانا ضروری ہے۔ تیسرے اور چوتھے دن حصص کلیئرنگ ہاؤس کے سپرد کئے جاتے ہیں۔ جو سیکورٹیز سپرد کی جاتی ہیں ان کا اندراج ایک تیار شدہ فارم میں کیا جاتا ہے۔ پانچواں دن ادائیگی کا دن ہوتا ہے، جسے "Pay Day" یا "Account Day" کہتے ہیں۔ اس تاریخ کو ارکان بیلنس شیٹ اور خرید و فروخت کے درمیان فرق کا ایک بیان کلیئرنگ ہاؤس میں داخل کرتے ہیں۔ اس میں دکھلایا گیا بیلنس کلیئرنگ ہاؤس کے ساتھ اس کے کھاتے میں جمع کردیا جاتا ہے یا اس میں سے منہا کرلیا جاتا ہے۔ کوئی ممبر جو کہ پے ڈے کے اگلے روز دوپہر تک ادائیگی نہیں کرپاتا ہے اسے قصوروار گردانا جاتا ہے۔ اس دن حصص کے آئندہ کاروبار کے لئے بازار بند رہتا ہے۔ آخری دن جو کہ ادائیگی کے دن (Settling Day) کی حیثیت سے جانا جاتا ہے، ارکان کلیئرنگ ہاؤس سے

حصص یا ان کے بدلے کی رقم حاصل کرتے ہیں۔

خرید وفروخت:

اگر نقد رقم کے سودے کی شکل میں فروخت کنندہ دوشنبہ (پیر) کے دن گذشتہ ہفتہ ہوئے سودے کے بارے میں 'کیلی' جاری نہیں کرتا ہے، یا اگر اس نے کیلی جاری کردی ہے اور اس کے بعد حصص کی ادائیگی کرنے میں ناکام رہتا ہے تو اس کے خلاف سیکورٹیز خرید لی جائیں گی۔ اسی طرح اگر خریدار کیلی وصول کرنے سے انکار کرتا ہے یا جب اس سے کہا جائے تو وہ حصص کی ادائیگی سے انکار کرتا ہے تو اس کی طرف سے سیکورٹیز کو فروخت کر دیا جائے گا۔ دوسری جانب اگر اس سلسلے میں فروخت کنندہ کی جانب سے غلطی (Default) کی جارہی ہے تو خریدار ان سیکورٹیز کو خرید لے گا، لیکن اگر سیکورٹیز کی خریداری ممکن نہیں ہے تو پھر معاملہ ثالث کمیٹی کے سپرد کر دیا جاتا ہے۔ حصص کی اس طرح کی خرید وفروخت کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ قصوروار پارٹی کو اس سے متعلق کوئی نوٹس یا اطلاع دی جائے۔ بمبئی اسٹاک ایکسچینج کے گورننگ بورڈ کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ فروخت کرنے کے اس اصول کو ملتوی کردے اگر اس کی رائے میں یہ سسپنشن (التواء یا تعطل) ضروری ہے اور عمومی حق میں بہتر ثابت ہوتا ہو، لیکن یہ التواء محض ۲۴ گھنٹوں تک رہتا ہے اور اس سے زیادہ عرصے کے (التواء یا تعطل) کے لئے حکومت کی اجازت درکار ہوتی ہے۔

سودوں کا بدل دینا اور تفاوت (Differences) کی ادائیگی:

عام طور پر آئندہ ادائیگی کے سودوں میں اس وقت حصہ لیا جاتا ہے جب مارکیٹ کے اتار چڑھاؤ کا فائدہ اٹھانا مقصود ہو اور ادائیگی سے قبل سودوں کا بدل دیا جانا (Reverse) اور اس طرح تفاوت کا حصول یا ادائیگی کرنا مقصد ہو۔ یہ تفاوت مارکیٹ کی حالیہ قیمت کے حساب سے طے کرنے کے بعد ادا کیا جاتا ہے یا وصول کیا جاتا ہے۔ مثلاً ہماری پچھلی مثال سے متعلق 'الف' 'اب ج' کمپنی کے ذریعہ ۹۴۵ پر ۱۰ اسینچر یز خریدنے کے بعد بازار کے بڑھتے بھاؤ کو دیکھتے ہوئے اور اس سے فائدہ اٹھانے کی غرض سے (مثال کے طور پر) ۹۹۰ پر اپنے حصص فروخت کر دیتا ہے، اس شکل میں عام کمیشن فروخت کنندہ بروکر کو ادا کیا جائے گا۔

ادائیگی کے آخری دن بروکر اپنا اسٹیٹمنٹ اس طرح روانہ کرے گا:

تاریخ	خرید/فروخت	تفصیلات	روپئے	روپئے
	خریدے گئے	۱۰ اسینچری ۹۴۵ پر۔ کمیشن بھی جوڑیں	۹،۴۵۰ ۵۰	۹،۵۰۰
	فروخت کئے گئے	۱۰ اسینچری ۹۹۰ پر۔ کمیشن کم کریں	۹،۹۰۰ ۵۰	
		بیلنس کریڈٹ ادا کیا جانے والا بیلنس	۹۸۵۰ ۳۵۰	 ۳۵۰
				۹،۸۵۰

ہماری سابقہ مثال میں 'ج' نے ۱۰ اسینچر یز ۹۴۵ پر فروخت کئے ہیں اور اسے ۹،۴۵۰ میں سے بروکر کی فیس ۵۰ روپئے منہا کرنے کے بعد ۹۴۰۰ روپئے حاصل ہوں گے۔ اس نے یہ فروخت اس امید پر کی ہے کہ بھاؤ میں کمی آئے گی، لیکن اگر قیمت بڑھتی ہے اور وہ اس سودے کو جاری رکھنا نہیں چاہتا ہے اور بازار سے جانا چاہتا ہے تو وہ اپنا سودا نقصان پر ختم کرے گا اور اپنے بروکر 'ای الیف جی کمپنی' کو ہدایت کرے گا کہ مثال کے طور پر ۹۹۲ پر ۱۰ اسینچر یز خرید لو۔ بروکر اپنا عام طور سے لیا جانے والا کمیشن چارج کرے گا۔ 'ای الیف جی' کمپنی اس سے متعلق اسٹیٹمنٹ مندرجہ ذیل انداز سے بھیجے گی:

تاریخ	خرید/فروخت	تفصیلات	روپئے	روپئے

	فروخت کئے گئے	۱۰ اسپنچری ۹۴۵ پر کمیشن کم کریں	۹،۴۵۰ ۵۰	۹،۴۰۰
	خریدے گئے	۱۰ اسپنچری ۹۹۲ پر کمیشن جوڑیں بیلنس ڈیبٹ آپ کی جانب سے بقایا ادائیگی	۹،۹۲۰ ۵۰ ۹،۹۷۰	۵۷۰ ۹،۹۷۰

اس طرح حصص کو نہ تو حوالے کیا گیا اور نہ ہی انہیں وصول کیا گیا لیکن سودا تبدیل ہوگیا، چاہے اس کے نتیجے میں نفع ہو یا نقصان، بقایا رقم یا تو ادا کرنی پڑے گی یا وصول کی جائے گی۔

(۳) (Carry Over) یا بدلی:

Carry Over یا بدلی آئندہ ادائیگی کے التواء کی جانب اشارہ کرتا ہے۔ ایک ادائیگی سے دوسری ادائیگی کے التواء کی شکل میں بدلی اثر پذیر ہوتی ہے، بدلی بروکر فیس ادا کرنی پڑتی ہے۔ یہ درحقیقت خرید یا فروخت کے سودے کے تکمیل پائے بغیر جاری رہنے کی جانب دلالت کرتی ہے۔ کیری اوور یا بدلی کا طریقہ اس وقت استعمال کیا جاتا ہے جب متعلقہ پارٹیوں کے اندازے کے مطابق قیمت میں تبدیلی نہیں آتی ہے۔ بروکر کی فیس کی کم سے کم شرح کے مقابلے میں بدلی فیس اس کا ایک چوتھائی حصہ ہوتی ہے۔

بدلی کس طرح اثر پذیر ہوتی ہے:

دو نئے سودوں کے نتیجے میں بدلی عمل میں آتی ہے۔ قیمت میں اتار ہونے کے اندیشے کے باعث حصص فروخت کئے جاتے ہیں تاکہ حالیہ ادائیگی کی جاسکے، اور انہیں اگلی ادائیگی کے لئے دوبارہ اس امید پر خرید لیا جاتا ہے کہ قیمت میں اضافہ ہوگا۔ ہماری مثال میں اگر 'الف' حصص کو وصول کرنا نہیں چاہتا ہے یا تفاوت سے تعلق رکھنا نہیں چاہتا ہے، لیکن یہ چاہتا ہے کہ سوداCarry Over ہوجائے اور اگلی ادائیگی تک پہنچ جائے، نتیجۃً اگلی ادائیگی کی قیمت کم ہوجاتی ہے، اور بدلی گالا بدل جاتے ہیں یعنی ایک "Bull" بجائے سودا ادا کرنے کے سود کا مطالبہ Bear سے کرتا ہے۔ لہذا بُل نہ صرف یہ کہ اپنے حصص پر رقم وصول کرتے ہیں بلکہ ایک مخصوص شرح میں سود بھی حاصل کرتے ہیں۔ اسی طرح ایک زائد فروخت شدہ (Over Bought) بُل اکاؤنٹ بدلی گالا کی شرح بڑھا دیتا ہے، یعنی رقم کی کمی ہوجاتی ہے اور سود کی شرح بڑھ جاتی ہے۔

بیک وارڈیشن (Back Wardation):

آپریٹرس کی جانب سے زائد فروخت بازار میں بگ بیئر اکاؤنٹ کی صورتحال پیدا کردیتی ہے۔ ان حالات کے تحت سیکورٹیز کی سپلائی کم ہو جاتی ہے اور بیئر (Bear) اس بات کے خواہش مند ہوتے ہیں کہ شیئرز کی حوالگی اگلی ادائیگی تک کے لئے کیری اوور ہوجائے، لہذا بُل (Bull) بجائے اس کے کہ حصص کی وصولی نہ کرنے کے باعث کنٹانگو (Cantango) ادا کرتے وہ بیئرس سے حصص کی حوالگی نہ کرنے کے بدلے میں کچھ رقم حاصل کرتے ہیں جسے بیک وارڈیشن کہا جاتا ہے۔ بیک وارڈیشن کی وضاحت اس طرح کی جاسکتی ہے کہ سابقہ ادائیگی کے ادا نہ کرنے کے باوجود نئے سودے میں ہاتھ ڈالنے کے بدلے میں بیئر کی جانب سے ادا کی جانے والی رقم کو بیک وارڈیشن کہتے ہیں۔ بعض اوقات دونوں پارٹیوں میں سے کوئی بھی ایک دوسرے کے سودے کیری اوور کرنے کے لئے کسی کو سودا ادا نہیں کرتے ہیں، سودے کی اس شکل میں کہا جاتا ہے کہ کیری اوور برابر رہا ہے۔

اس بات کی وضاحت یہاں کردینی چاہئے کہ کیری اوور کا طریقہ قانونی اعتبار سے ادھار نہیں ہے۔ یہ بیک وقت خرید اور فروخت کا دوہرا طریقہ ہے۔ بدلی والا اس بات کا مجاز ہے کہ وہ ان حصص کا مالک کل بن جائے اور ان کا سودا کرے جن کے لئے وہ رقم دے رہا ہے۔ ایک سودا کئی بار کیری اوور کیا جاسکتا ہے لیکن طویل المیعاد مدت میں یہ سودمند ثابت نہیں ہوتا ہے، کیونکہ نفع کا بڑا حصہ بروکر فیس اور کنٹانگو فیس میں ضائع ہوجاتا ہے۔ بدلی بزنس کسی بھی اسٹاک ایکسچینج کے لازمی عناصر میں سے ایک ہے اور اس سے پہلوتہی ممکن نہیں ہے حالانکہ کوئی بھی پارٹی اس بات کی پابند نہیں ہے کہ کیری

اوور سہولیت کو جاری رکھا جائے، اور اگر وہ چاہیں تو شیئر کو حوالے یا وصول کر سکتے ہیں اور ان کے بدلے میں رقم ادا یا وصول کر سکتے ہیں۔ لیکن عملی طور پر ایسا ہوتا نہیں ہے اور کیری اوور کی شکل میں تبدیلی نہیں ہوتی ہے۔ لیکن بروکر کو گاہک کی معاشی پوزیشن اور مالی حالت کے بارے میں بہت احتیاط سے دیکھ بھال کرنے کے بعد ہی کوئی قدم اٹھانا چاہئے۔

(ج) سرکاری سیکورٹیز:

سرکاری سیکورٹیز حکومت ہند یا صوبائی حکومتوں کے ذریعے ایک طے شدہ شرح سود پر حاصل کیا جانے والا ادھار ہے۔ ان کو عام طور پر تین قسموں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

(الف) اسٹاک، (ب) بیئرر بانڈ، (ج) پرونوٹ (پرومیسری نوٹ)۔

اسٹاک رجسٹرڈ سیکورٹی ہے اور اس کی منتقلی ایک دستخط شدہ ٹرانسفر ڈیڈ کے ذریعہ ممکن ہے جبکہ کسی قسم کی اسٹامپ ڈیوٹی یا منتقلی کی فیس ادا نہیں کی جاتی ہے جبکہ بیئرر بانڈ کرنسی نوٹ کی مانند کسی کے حوالے کرنے سے ہی منتقل ہو جاتے ہیں اور ان کے لئے کسی تصدیق کی ضرورت نہیں ہوتی ہے، ہر بانڈ کے ساتھ سود کے کوپن منسلک ہوتے ہیں لیکن یہ یورپ کی مانند ہندوستان میں زیادہ مقبول نہیں ہیں۔ تیسری قسم کی سرکاری سیکورٹی یعنی پرومیسری نوٹ میں سکریٹری آف اسٹیٹ برائے ہند کی جانب سے گورنر جنرل ان کونسل کا وعدہ ہوتا ہے کہ ایک مخصوص شخص کو ایک طے شدہ تاریخ یا اس کے بعد طے شدہ رقم ادا کی جائے گی، اور اس کے بعد ایک اطلاع کے بعد سال میں دو مرتبہ مقررہ تاریخوں پر طے شدہ شرح سود کے حساب سے رقم ادا کی جائے گی۔ سرکاری سیکورٹی کی ہی شکل سب سے زیادہ مقبول ہے۔ اس قسم کے نوٹ تصدیق کے بعد منتقل یا ڈلیور کئے جا سکتے ہیں۔ موجودہ روپئے کے ادھار ہندوستان میں دو قسموں میں بانٹے جا سکتے ہیں: (۱) میعادی (Terminable) اور (۲) غیر میعادی (Terminable_Non)۔ غیر میعادی قرضے حکومت کی مرضی کے مطابق کسی بھی وقت ادا کئے جا سکتے ہیں، اس کے لئے کوئی طے شدہ میعاد نہیں ہوتی جس کے خاتمے پر حکومت کی جانب سے قرض ادا کیا جانا ضروری ہو۔ یہ برطانوی حکومت کے فنڈ ڈیبٹ کی طرح ہوتے ہیں۔ دوسری جانب میعادی قرضے ادا کئے جانے ضروری ہیں، یہ یا تو ایک مقرر شدہ تاریخ پر ادا کئے جاتے ہیں یا کسی ایک مقررہ تاریخ سے قبل نہیں ادا کئے جاتے ہیں اور ایک مقررہ تاریخ کے بعد بھی نہیں ادا کئے جاتے ہیں۔

سرکاری سیکورٹیز کا لین دین:

سرکاری سیکورٹیز ملک کے مختلف اسٹاک ایکسچینج میں رقم لگانے کا اہم ذریعہ ہیں۔ وہ افراد جن کے پاس رقم کی محدود مقدار ہوتی ہے اس قسم کی سرمایہ کاری کو پسند کرتے ہیں، کیونکہ حکومت کو قرض پر دی جانے والی رقم ہمیشہ محفوظ رہتی ہے اور اس پر بازار کے اتار چڑھاؤ کا اثر بھی نہیں ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ ان قرضوں پر حاصل ہونے والا منافع گارنٹی شدہ ہوتا ہے اور باقاعدگی سے ادا کیا جاتا ہے کیونکہ یہ قرضے حکومت کی اجازت، منظوری، اس کی اتھارٹی اور اس کی مضبوطی کے دعویدار ہوتے ہیں۔ بیشتر سرمایہ کار تنظیمیں مثلاً انشورنس کمپنیاں اور بینک اپنی آمدنی اور اپنے زیر تصرف رقموں کا بیشتر حصہ سرکاری سیکورٹیز میں لگا دیتی ہیں، سیکورٹیز کی قیمت کا تحفظ Reserve Bank of India کے ذریعہ کیا جاتا ہے۔ حکومت کی سیکورٹیز میں آنے والا اتار چڑھاؤ بیحد معمولی ہوتا ہے، اور عام حالات میں ان کا انحصار بازار کی حالت پر ہوتا ہے۔

سیکورٹیز کے تحت حکومت ہند، صوبائی حکومتوں کی سیکورٹیز، ڈبینچر، پورٹ ٹرسٹ کے اسٹاک اور میونسپل کارپوریشنز کے اسٹاک جو کہ Negotiable Instrument Act 1887 کے تحت آتے ہوں، شامل ہیں۔ ان سیکورٹیز میں کاروبار نقد رقم کی شکل میں یا اکاؤنٹ کے ذریعے بھی انجام دیا جا سکتا ہے۔ نقد رقم کے تحت ہونے والے سودوں میں بمبئی اسٹاک ایکسچینج میں سودے کے اگلے دن سیکورٹیز حوالے کی جاتی ہیں اور ان کی ادائیگی کی جاتی ہے، لیکن اگر سودے کے وقت واضح طور سے تذکرہ کر دیا جائے تو حوالگی سات دنوں کے اندر اندر کی جا سکتی ہے۔ فارورڈ (آئندہ) سودوں کی شکل میں کاروبار کی اکائی ۲۵۰۰۰ روپئے ہیں، اور اس سے کم کے سودوں کی ممانعت ہے، ادائیگی پندرہ روز میں ہوتی ہے، اور ان سودوں میں اسٹاک ایکسچینج کے عام سودوں کے مقابلے میں بہت کم فرق ہوتا ہے۔ عملی طور پر تمام بروکر ہر قسم کی سیکورٹیز کا کاروبار کرتے ہیں۔ عام حصص کی طرح کاروبار کا طریقہ ایک جیسا ہی ہوتا ہے۔

ادائیگی کے دن سے ایک دن قبل جس کو "ٹکٹ ڈے" بھی کہا جاتا ہے، ایسے تمام افراد جو کہ سودوں میں شامل ہیں اور سیکورٹیز حوالے کرنا چاہتے ہیں یا ان کی ادائیگی کرنا چاہتے ہیں اسٹاک ایکسچینج کے کلیئرنگ ہاؤس میں اپنے کاروبار کی ایک فہرست جمع کرتے ہیں۔ یہ بیان ایک مخصوص فارم میں درج کیا جاتا ہے، اور ان کے ساتھ ڈلیوری ٹکٹ یا رسیدی ٹکٹ بھی لگایا جاتا ہے۔

یہ ٹکٹ اسٹاک ایکسچینج سے ایک معمولی قیمت پر حاصل کئے جاسکتے ہیں۔ مختلف قرضوں کے لئے مختلف رنگوں کے ٹکٹ فروخت کئے جاتے ہیں۔ ہر ٹکٹ ۲۵۰۰۰ ہزار روپئے کے لئے ہوتا ہے۔ اگلے دن ان ٹکٹوں پر خریدار یا فروخت کنندہ رکن کا نام درج کرنے کے بعد کلیئرنگ ہاؤس سے واپس کردیئے جاتے ہیں۔ فرض کیجئے کہ 'الف' نے ایک لاکھ روپئے کا قرض فروخت کیا ہے اور وہ اسے حوالے کرنا چاہتا ہے تو وہ اپنی فہرست اور چار ٹکٹ کلیئرنگ ہاؤس میں جمع کرے گا۔ اگلے دن کلیئرنگ ہاؤس ان ٹکٹوں پر خریدار رکن یا ارکان کے ناموں کا اندراج کرنے کے بعد 'الف' کو یہ ٹکٹ واپس کردے گا، اور اس طرح عملی طور پر خرید وفروخت میں حصہ لینے والے افراد باہم یکجا ہوجاتے ہیں، اور وہ آپس میں طے کرتے ہیں کہ ایکسچینج کی جانب سے ان سودوں کے لئے مقرر کی گئی شرح کے مطابق وہ حوالگی اور ادائیگی کرتے رہیں گے۔ اس شرح اور اصلی شرح خرید کے درمیان موجود فرق کو یہ ارکان اپنے درمیان طے کرتے، حاصل کرتے یا ادا کرتے ہیں۔ ارکان جو کہ نہ ہی ادائیگی کرتے ہیں اور نہ ہی حوالگی کرتے ہیں بلکہ دونوں کے درمیان موجود فرق کو وصول کرتے یا ادا کرتے ہیں۔ حاصل ہونے والا سود، سودے میں شامل نہیں ہوتا ہے لیکن اس کو باقاعدہ ایڈجسٹ کیا جاتا ہے۔ اور خریدار کو یہ سود فروخت کنندہ کو ادا کرنا ہوتا ہے اور بروکر مندرجہ بالا اسٹیٹمنٹ جاری کرتا ہے۔ فرض کیجئے 'الف' ۵۰۰۰ روپئے کے برابر ساڑھے تین فیصد سرکاری کاغذ اور ۳۰ رجون اور ۳۱ ردسمبر کو ادا کئے جانے والے سود کو خریدنا چاہتا ہے، اور خرید نے کا عمل ۳۰ رستمبر کو ہوا ہے لہذا ۳۰ رستمبر کو ۳ مہینے کا سود ادا کرنا ہوگا۔

	پیسے	آنہ	روپے
۵۰۰۰ ساڑھے تین فیصد سرکاری کاغذ ۹۵ پر	۰	۰	۴۷،۵۰۰
بروکر کی فیس ۱/۶ کی شرح سے جوڑیں	۰	۴	۳۱
	۰	۴	۴۷،۵۳۱
ساڑھے تین فیصد کی شرح سے تین مہینے کا سود	۰	۸	۴۳۷
انکم ٹیکس زیادہ سے زیادہ ۴/۹ فی روپئے کی شرح سے کم کریں	۰	۱۲	۱۲۹
	۰	۱۲	۳۰۷
	۰	۰	۴۷،۸۳۹

☆☆☆

مقالات شیئرز

شیئرز کی خرید وفروخت

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی[1]

۱۔شیئر سرٹیفکیٹ کی حیثیت:...... یہ بات زیادہ درست معلوم ہوتی ہے کہ شیئرز نقد اور اثاثوں کا مجموعہ ہے، اور شیئرز سرٹیفکیٹ پر اگر رقم کا ذکر ہوتا ہے تو وہ محض اس بات کا اظہار ہے کہ یہ اثاثہ اپنی ابتدائی صورت میں اسی قدر قیمت اور قوت خرید کا حامل تھا۔ قانونی طور پر کمپنی کے اثاثے کو فرق نہ کیا جانا شرعی اعتبار سے کوئی اہمیت نہیں رکھتا بلکہ یہ بھی ضروری نہیں کہ خود قانون کی نگاہ میں شیئرز اثاثہ کا درجہ نہ رکھتا ہو کیونکہ ممکن ہے کہ شیئرز پر مبنی اثاثہ میں اشتراک اور شیوع کی وجہ سے اس طرح کا قانون بنایا گیا ہو۔

۲۔شیئر کی خرید وفروخت:

یہ صورت بیع صرف کی ہے جس میں برابری بھی ضروری ہے اور کسی فریق کی طرف سے ادھار کی بھی گنجائش نہیں، اس لئے کمی بیشی کیساتھ خرید وفروخت تو ناجائز ہوگی ہی، مساوی قیمت میں بھی خرید وفروخت کو جائز نہیں ہونا چاہئے، کیوں کہ شیئر ہولڈر روپے کی دستاویز ادا کرتا ہے روپیہ نہیں اور خریدار خود روپیہ ادا کرتا ہے، اس طرح طرفین سے نقد ادائیگی نہیں پائی گئی، سوائے اس کے کہ فی زمانہ بعض اہل علم نے بینک ڈرافٹ کی حوالگی کو معینہ نقد کی حوالگی کا درجہ دے دیا ہے، تو اس اعتبار سے عقد کے اثاثہ میں تبدیلی سے پہلے شیئر سرٹیفکیٹ کو یہی درجہ دیا جاسکتا ہے، ایسی صورت میں مساوی قیمت پر ایسے شیئر کو فروخت کرنا جائز ہوگا، تاہم راقم کی رائے وہی ہے کہ ایسے شیئرز کی بیع ہی جائز نہیں، نہ کم وبیش قیمت پر نہ مساوی قیمت پر۔

فقہاء حنفیہ کے نزدیک ایسی صورتوں میں دونوں طرف سے ادا کئے جانے والے ربوی مال کو غیر ربوی مال کے مقابلہ میں رکھ کر کمی بیشی کے ساتھ خرید و فروخت کو جائز قرار دیا جاتا ہے، چنانچہ ہدایہ میں ہے: من باع درھمین و دینارا بدرھم و دینارین جاز البیع وجعل کل جنس بخلافه (ھدایہ ۳٫۹۰)۔ جس نے ایک درہم اور دو دینار کے بدلے دو درہم اور ایک دینار خرید کیا تو بیع جائز ہے، اور دونوں طرف سے درہم کو دینار اور دینار کو درہم کے مقابلہ میں تصور کیا جائے گا۔ اس لئے کمپنی کے نقد اور املاک کے مجموعی اثاثہ کو نقد کے عوض خرید وفروخت کرنا جائز ہوگا۔

۳۔حرام کاروبار لی کمپنی:

جن کمپنیوں کا بنیادی کام ہی حرام پر مبنی ہو ان کے شیئرز خرید کرنا جائز نہیں کہ یہ براہ راست معصیت میں تعاون بلکہ اس میں شرکت ہے، اگر کمپنی کے مالکان مسلمان ہوں تب تو یہ حکم ظاہر ہی ہے لیکن اگر وہ غیر مسلم ہوں جیسا کہ آج کل ہندوستان میں اکثر کمپنیوں کا حال ہے تب بھی یہ صورت ناجائز ہی ہوگی، گو امام صاحب کے یہاں شدید کراہت کے ساتھ اس کا جواز معلوم ہوتا ہے، لیکن صاحبین نے اس کو غیر درست قرار دیا ہے، اور فقہاء نے صاحبین ہی کے قول کو زیادہ درست سمجھا ہے (دیکھئے: درمختار ۵٫۲۶۲)۔

فتاوی عالمگیری میں ہے کہ اگر کسی مسلمان نے عیسائی کو بطور مضاربت سرمایہ حوالہ کیا اور اس نے شراب وخنزیر کی تجارت کر کے منافع کمایا تو امام ابوحنیفہ کے نزدیک گو یہ جائز ہوگا لیکن: ینبغی للمسلم أن یتصدق بحصته من الربح (فتاوی ھندیه ۴٫۳۳۳)۔ مسلمان کے لئے مناسب ہے کہ اپنے حصہ نفع کو صدقہ کردے۔

غالباً یہ اس صورت پر محمول ہے جب مطلقاً مضاربت کے لئے پیسہ دیا ہو اور اس غیر مسلم نے خمر وخنزیر کی تجارت میں اس کا استعمال کیا ہو، اگر پہلے سے معلوم ہو کہ اسی کام میں سرمایہ کا استعمال کرے گا تو پھر اس کے جائز ہونے کا کوئی سوال ہی نہیں ہے۔

چونکہ انکم ٹیکس سے بچنے کے لئے سودی قرض لینا ایک حاجت ہے اور حاجت کی بنا پر سودی قرض حاصل کرنے کی اجازت دی گئی ہے۔ "ویجوز للمحتاج

---

[1] بانی وناظم المعہد العالی الاسلامی، حیدر آباد۔

الاستقراض بالربح "اس لئے ایسی کمپنی کا شیئرز خرید کرنا جائز ہے۔

یہاں بھی بینک میں رقم محفوظ کرنا ایک قانونی حاجت ہے اس لئے حاصل شدہ سود سے نفع اٹھائے بغیر ایسی کمپنیز کا شیئرز خرید کرنا جائز ہوگا۔

۴۔سودی قرض سے حاصل کیا ہوا نفع:

سودی قرض پر قرض گیرندہ کی ملکیت ثابت ہوجائے گی اور اس سے حاصل ہونے والا نفع حلال وجائز نفع ہوگا، کیوں کہ فقہاء نے تو خود سود کے بارے میں لکھا ہے کہ اس پر ملکیت ثابت ہوجاتی ہے، علامہ ابن نجیم مصری کا بیان ہے: و ظاهر ما في جمع العلوم وغيره أن المشترى يملك الدرهم الزائد إذا قبضه فيما إذا اشترى درهمين بدرهم فإنهم جعلوه من قبيل الفاسد وهكذا صرح به الأصوليون في بحث النهي (البحر الرائق ۶،۱۲۵)۔ جمع العلوم وغیرہ کا ظاہر یہ ہے کہ ایک درہم کے بدلہ دو درہم خرید کرنے کی صورت میں قبضہ کرنے والا مالک ہوجائے گا کیونکہ اس کو فقہاء نے بیع فاسد میں شمار کیا ہے اور علماء اصول نے "نہی" کی بحث میں اس کی صراحت کی ہے۔

بورڈ آف ڈائرکٹرس کی حیثیت فی الجملہ مالکان حصص کے وکیل کی ہے، گو ان ڈائرکٹرس کا انتخاب کثرت رائے سے ہوتا ہوگا لیکن چونکہ دستوری اعتبار سے مالکان حصص نے اکثریت کے فیصلہ کو قبول کرنے پر رضامندی ظاہر کی ہے، اس لئے یہ تمام ہی سرمایہ کاروں کے وکیل تصور ہوں گے۔

اصولی طور پر وکیل کے افعال مؤکل کی طرف منسوب ہوتے ہیں تاہم شیئر ہولڈر کا سودی قرض سے اختلاف کا اظہار اس کے بری الذمہ ہونے کے لئے کافی ہے، اس لئے کہ شیئرز ہولڈر نے اس کو اصل میں تجارت کے لئے وکیل بنایا ہے نہ کہ سودی قرض لینے کے لئے، ہاں مطلق وکالت کی وجہ سے یہ سمجھا جاسکتا ہے کہ دلالۃً اس نے سودی قرض کی بھی اجازت دے دی ہے، لیکن جب شیئر ہولڈر صراحۃً اس سے اختلاف کرتا ہے تو چونکہ صراحت کا درجہ دلالت سے بڑھ کر ہے اس لئے وکیل کے اس فعل میں مؤکل کی شرکت متصور نہ ہوگی۔

اگر کمپنی کا بنیادی کاروبار ہی سود پر رقم لگا کر سود حاصل کرنا ہو تب تو اس کے حصص خریدنا جائز نہیں، ہاں اگر قانونی ضرورت کے تحت کچھ سرمایہ ڈپوزٹ کرنا پڑا جس سے سود حاصل ہوا تو اس حصہ نفع کو بلانیت ثواب غرباء پر یا رفاہی کام میں خرچ کردینا اس کے بری الذمہ ہونے کے لئے کافی ہوگا۔ اس پر ان فقہی جزئیات سے بھی استدلال کیا جاسکتا ہے جن میں ایسے شخص کی دعوت اور تحفہ قبول کرنے کی اجازت دی گئی ہے جس کے مال کا غالب حصہ حلال ہو اور باقی حرام (ہندیہ ۳۴۲/۵)۔

اس سلسلہ میں علامہ ابن قیم کی تحریر بھی قابل ملاحظہ ہے، فرماتے ہیں: وإذا خالطه درهم حرام او أكثر أخرج مقدار الحرام وحل له الباقي بلا كراهة. سواء كان المخرج عين الحرام أو نظيره لأن التحريم لم يتعلق بذات الدرهم وجوهره وأما تعلق بجهة الكسب فيه فإذا خرج نظيره من كل وجه لم يبق لتحريم ما عداه معنى (بدائع الفوائد لابن قيم ۲،۲۵۷)۔ (اگر اس کے مال کے ساتھ ایک یا اس سے زیادہ حرام درہم مخلوط ہوگیا تو مقدار حرام نکال دی جائے، اب باقی بلا کراہت حلال ہوجائے گا چاہے بعینہ حرام درہم ہو یا اس کے برابر، اس لئے کہ تحریم درہم کی ذات اور جوہر سے متعلق نہیں ہے بلکہ کسب کے اعتبار سے ہے، لہذا جب من کل الوجوہ اس کے مثل نکل گیا تو اب اس کے ماسوا میں حرمت کی کوئی وجہ باقی نہیں رہی)۔

منافع سے اتنی مقدار نکال کر بلانیت ثواب صدقہ کردینا کافی ہوگا، فقہاء کے یہاں تو اس سے کسی قدر زیادہ ہی توسع ملتا ہے، گذر چکا ہے کہ سود پر بھی لینے والے کی ملکیت ثابت ہوجاتی ہے (البحر الرائق ۱۲۵/۶) اگر سودی پیسے سے سرمایہ کاری کر کے کسی شخص نے نفع حاصل کیا یا کوئی چیز خرید کی تو یہ کن صورتوں میں حلال ہوگا اور کن صورتوں میں حرام، اس بارے میں علامہ شامی لکھتے ہیں: رجل اكتسب مالا من حرام ثم اشترى فهذا على خمسة أوجه: إما إن دفع تلك الدراهم إلى البائع أولاً ثم اشترى منه بها أو اشترى قبل الدفع بها و دفعها، أو اشترى قبل الدفع بها و دفع غيرها، أو اشترى مطلقاً ودفع تلك الدراهم، أو اشتري بدراهم أخر و دفع تلك الدراهم... قال الكرخي في الوجه الأول والثاني: لا يطيب، وفي الثلاث الأخيرة يطيب، وقال أبوبكر: لايطيب في الكل، لكن الفتوى الآن على قول الكرخي دفعا للحرج عن الناس (رد المحتار ۴،۲۴۴)۔ (کسی شخص نے مال حرام کمایا، پھر اس سے خرید کیا تو اس کی پانچ صورتیں ہیں:

۱۔ یا تو پہلے بائع کو دراہم دیا پھر اس سے اس کے بدلہ میں کچھ خرید کیا، ۲۔ یا انہیں دراہم کے بدلہ پہلے خرید کیا پھر دراہم دیئے، ۳۔ یا انہیں دراہم سے خرید

کیا اور بعد کو اس کی بجائے دوسرا درہم دے دیا، ۴۔ یا مطلقاً کسی خاص درہم کی تعیین کے بغیر خرید کیا اور عوض میں یہی درہم ادا کر دیئے، ۵۔ یا دوسرے دراہم متعین کئے اور ان کے بجائے یہ درہم دیدیئے...... کرخی نے کہا کہ پہلی اور دوسری صورت میں خرید کی ہوئی چیز اس کے لئے بہتر نہیں، باقی تینوں صورتوں میں جائز ہے۔ اور ابوبکر نے کہا کہ کسی صورت میں حلال نہیں۔ لیکن لوگوں سے حرج دور کرنے کے لئے امام کرخی کے قول پر فتویٰ ہے)۔

گویا امام کرخی کے اصول پر اگر مطلق روپے پر خرید وفروخت کا معاملہ طے کیا گیا اور غیر شرعی طریقہ پر کمایا گیا روپیہ اس کی قیمت میں ادا کر دیا گیا تو خریدی ہوئی شئے حلال ہوگی، اور شامی کے بقول اسی پر فتویٰ ہے۔ تاہم احتیاط یہی ہے کہ نہ صرف سود کے ذریعہ حاصل ہونے والا نفع بلکہ اس نفع کی مقدار سرمایہ پر حاصل ہونے والا نفع بھی بلا نیت ثواب صدقہ کر دیا جائے۔

۵ شیئرز کی تجارت:...... حلال کاروبار پر مبنی شیئرز کی تجارت جائز ہے، نہ تخمین وقیاس مطلقاً ناجائز ہے اور نہ عام طور پر تجارتیں اس سے خالی ہوتی ہیں بلکہ اموال زکوۃ میں تو خود شارع علیہ السلام نے تخمین کرایا ہے، جو ''خرص فی الزکوۃ'' کے عنوان سے کتب حدیث میں موجود ہے، اور امام احمد نے تو اس کو خود مقدار زکوۃ میں بھی معتبر مانا ہے، معاملات میں تخمین وقیاس کی ایسی صورت ممنوع ہے جس میں خطر اور غرر ہو، نہ کہ مطلق تخمین وقیاس۔

۶۔ فیوچر سیل:...... معاملہ کی اس صورت میں نہ قیمت ادا کی جاتی ہے اور نہ اس کے مقابلہ میں آنے والی مبیع، گویا یہ دونوں طرف سے ادھار ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسی خرید وفروخت سے منع فرمایا ہے۔ نیز اس میں قمار بھی ہے کہ حقیقت میں خرید وفروخت مفقود ہے اور محض ایک کاغذی کارروائی کی بنیاد پر نفع یا نقصان ہوتا ہے۔

۷۔ غائب سودا:

خرید وفروخت ان معاملات میں ہے جو مستقبل کی طرف منسوب ہو کر نہیں کئے جاسکتے، علامہ حصکفی رقمطراز ہیں: وما تصح إضافته إلى المستقبل عشرة: البيع وإجازته وفسخه والقسمة و الشركة والهبة والنكاح والرجعة والصلح عن مال والإبراء عن الدين لأنها تمليكات للحال فلا تضاف للاستقبال (الدر المختار مع الرد ۴،۲۹۰)۔ (مستقبل کی طرف جن امور کی نسبت درست نہیں ہے وہ دس ہیں: بیع، اجازت بیع، فسخ بیع، تقسیم، شرکت، ہبہ، نکاح، رجعت، مال پر صلح، دین سے ابراء اس لئے کہ ان سب میں فی الحال تملیک ہوتی ہے، لہذا مستقبل کی طرف ان کی نسبت درست نہیں)۔

اس لئے غائب سودے کی صورت بیع کی نہیں ہے بلکہ یہ محض وعدہ بیع ہے، اس لئے اس پر بیع کے احکام جاری نہیں ہوں گے۔

۸،۹۔ سرٹیفیکٹ ملنے سے پہلے شیئر کی فروخت:

اصل میں یہ مسئلہ انتقال حصص کے قانون سرکاری اور شیئر مارکیٹ کے عرف پر موقوف ہے، لیکن بظاہر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شیئرز سرٹیفیکٹ شیئرز کا علامتی وجود ہے یا حقیقی شیئر کی کلید کے درجہ میں ہے، لہذا جیسے فقہاء نے مکان کی بیع میں کنجی حوالہ کر دینے کو قبضہ قرار دیا ہے اسی طرح شیئرز سرٹیفیکٹ پر نام کی منتقلی کو قبضہ تصور کیا جانا چاہئے، ورنہ اگر صرف ایجاب وقبول ہی کو قبضہ مان لیا جائے تو قبضہ کا حکم بے معنی ہو جائے گا، اس لئے سرٹیفیکٹ حاصل ہونے سے پہلے خرید وفروخت درست نظر نہیں آتی۔

۱۰۔ بروکر:

اوپر ذکر کی گئی تفصیلات کے مطابق جائز اور حلال کاروبار پر مبنی شیئرز کی خرید وفروخت میں ''بروکر'' بننا اور اجرت حاصل کرنا جائز ہے، ایسے ہی درمیانی لوگوں کو فقہاء دلال سے تعبیر کرتے ہیں، علامہ شامی کا بیان ہے: تجب الدلالة على البائع أو المشتري أو عليهما بحسب العرف (رد المحتار ۴،۳۶)۔ (فروخت کنندہ یا خریدار یا دونوں پر حسب عرف ورواج دلالی کی اجرت واجب ہوگی)۔

شیئرز کی شرعی حیثیت

مفتی محمد عبید اللہ الاسعدی [1]

۱۔ شیئرز کی شرعی حیثیت کی بابت یہ نظریہ ہی صحیح وراجح معلوم ہوتا ہے کہ کسی کمپنی کا خرید کردہ شیئر کمپنی میں شیئر ہولڈر کی ملکیت کی نمائندگی کرتا ہے اور وہ نقد اور اثاثہ کا مجموعہ ہوتا ہے، صرف دیئے گئے پیسے کی دستاویز نہیں۔ اسی نظریہ کا عرف میں اعتبار ہے، اور فقہاء معاصرین اور متقدمین بھی اکثر یہی نظریہ رکھتے ہیں۔

اس کی واضح شرعی دلیل وہ تفصیل ہے جو کہ سوال کے اخیر میں درج کی گئی ہے کہ شیئر ہولڈر کو کمپنی سے نفع ملتا ہے جو کہ اس کی لگائی ہوئی رقم سے زائد ہوتا ہے، اور اس کو نقصان بھی برداشت کرنا پڑتا ہے اس طرح کہ اس کی کل رقم یا اس کا ایک حصہ ڈوب جاتا ہے، اور کمپنی تحلیل ہوجائے تو شیئرز کے تناسب سے اثاثہ میں حصہ ملتا ہے۔

۲۔ کمپنی کا ابتدائی حال جبکہ صرف نام اور منصوبہ پایا جاتا ہے اور ابھی کوئی عمل، اقدام، عمارت واملاک کا کوئی وجود نہیں ہوتا، اس وقت جو اولین شیئر خریدنے والے ہوتے ہیں جو کہ کمپنی کا اعلان کرنے والوں اور قائم کرنے والوں سے شیئر لیتے ہیں تو ان کے معاملہ میں کوئی قباحت نہیں، اور یہ خرید وفروخت کا معاملہ نہیں بلکہ یہ تو شرکت اور عقد شرکت کا معاملہ ہے، البتہ ان اولین شیئر کے خریداروں سے جب کوئی خریدے گا تو یہ معاملہ درست نہ ہوگا، اس لئے کہ جب کوئی اثاثہ واملاک اب تک نہیں بنیں تو باہم یہ معاملہ حوالہ کا معاملہ ہوگا جس میں کمی بیشی درست نہیں ہے، اس معاملہ میں رقم کے مقابلہ میں رقم ہی ہے۔ ایک ادھار اور ایک نقد۔

اگر اس کو خرید وفروخت قرار دیں تو صرف کا معاملہ قرار پائے گا، اور اس کے احکام جاری ہوں گے جن میں مساوات مال بھی ہے۔ اس لئے یہ معاملہ صرف اس طرح درست ہوسکتا ہے کہ اصل سرمایہ لے کر پہلا شریک دستبردار ہوجائے۔

۳۔ جب کمپنی باقاعدہ وجود میں آجاتی ہے اور اس کا اثاثہ نقد اور املاک کا مجموعہ ہوتا ہے تو خرید وفروخت نقد کے ساتھ درست ہے باوجودیکہ مجموعہ مال ربوی وغیر ربوی دونوں پر مشتمل ہے، یہ جواز فقہاء کی ذکر کردہ مشہور توجیہ وتعبیر کے مطابق اس بنیاد پر ہے کہ خریدار کے ادا کردہ نقد کے دو حصے مانے جائیں گے، شیئر کے حصہ نقد کے مقابلہ میں ایک حصہ قرار دیا جائے گا جو کہ مساوی ہوگا اور باقی رقم ونقد کو شیئر کے حصہ اثاثہ کا مقابل مانا جائے گا۔ مثلاً شیئر سو روپے کا خریدا گیا، اور وہ مشتمل ہے چالیس نقد اور اثاثہ پر۔ تو سو (۱۰۰) میں سے چالیس (۴۰) کے بالمقابل، اور باقی ساٹھ (۶۰) اثاثہ کے بالمقابل وبالعوض ہوگا (امداد الفتاوی ۳؍۱۳۰ میں بھی اس قسم کا سوال وجواب آیا ہے)۔

۴۔ وہ کمپنیاں جن کا کاروبار بنیادی طور پر حرام ہے ان کے شیئرز کی خرید وفروخت ناجائز ہے۔

۵۔ جن کمپنیوں کا کاروبار بنیادی طور پر حلال ودرست ہے، البتہ انہوں نے سودی قرض لے رکھا ہے تو ان کے شیئرز کا خریدنا جائز ہے۔ یہ جواز اس لئے ہے کہ کاروبار اور کمپنی وشرکاء کے درمیان لین دین درست ہے، اور سودی قرض مجبوری کی وجہ سے لیا گیا ہے، یا مجبوری نہ ہو تو مالکان نے لیا ہے، جس کے سود کی ادا کرنے کی ذمہ داری خود ان پر ہے۔

رہ گئی یہ بات کہ حاصل شدہ کل منافع سے سود ادا کیا جاتا ہے تو سود کے ادا کرنے میں شیئر ہولڈر کی بھی شرکت ہوئی لہٰذا وہ اس گناہ میں شریک ہوا، تو اس کا جواب یہ ہے کہ معاہدہ ومعاملہ کی رو سے کل اخراجات ومطالبات کو ادا کرنے کے بعد جو بچتا ہے وہ نفع ہے، اور اس میں شیئر ہولڈر کا حق وحصہ ہے، اور ان اخراجات ومطالبات میں سودی قرض کا سود بھی داخل وشامل ہے، اور چونکہ سود سرمایہ کے صرف اس حصہ کے مقابل ہوگا جو کہ کمپنی کے مالکان وذمہ داران نے خود لیا ہے، اس لئے اس کو نفع میں ان کے حصہ وحق سے مانا جائے گا نہ کہ سب کے حق سے۔

۶۔ کمپنیوں کا کاروبار حلال ہونے کے ساتھ مجبوری کی بنا پر ان کو جو بعض ایسے معاملات کرنے پڑتے ہیں جن کی وجہ سے ان کو سود ملتا ہے، تو ایسی کمپنیز کا شیئر خریدنا درست ہے۔ خواہ انہوں نے ایسا اس لئے کیا ہو کہ اس کے بغیر کاروبار ہی ممکن نہیں یا اس لئے کہ اس کو بڑھانا ممکن نہیں۔

البتہ یہ ضروری ہے کہ شیئر ہولڈر کے نفع میں سود شامل نہ کیا جائے، اور اگر شامل کیا جائے تو اس کو الگ وممتاز رکھا اور لکھا جائے تاکہ شیئر ہولڈرس اس کی ذمہ

---

[1] شیخ الحدیث، جامعہ عربیہ اسلامیہ، ہتھورا، باندہ۔

داری سے عہدہ برآ ہوسکے۔

۷۔ سودی قرض سے حاصل ہونے والے جائز منافع اور اس کی حلال آمدنی درست ہے۔ اس لئے کہ خرابی سود پر قرض لینے میں اور سود ادا کرنے میں ہے اور اس قرض کی رقم کو جائز کاروبار میں لگایا جائے یا ضروریات میں استعمال کیا جائے تو اس میں حرمت کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی، ہاں قباحت وکراہت ضرور ہوگی جبکہ انتہائی مجبوری کے بغیر یہ قرض لیا گیا ہو (سودی قرض کی آمدنی کی حلت کا فتوی۔ امداد الفتاوی ۳؍ ۱۷۰ میں آیا ہے)۔

۸۔ کمپنی کا معاملہ مضاربت کا معاملہ ہوتا ہے جس میں مضارب رب المال کا وکیل ہوتا ہے، لہذا کمپنی کا بورڈ آف ڈائرکٹرز تمام شیئرز ہولڈرس کا وکیل ہوتا ہے اور اس کا عمل شیئر ہولڈرس کا عمل سمجھا جائے گا، اور بورڈ کے تمام اعمال کی نسبت تمام شرکاء کی طرف ہوگی۔

۹۔ بعض حضرات کی رائے یہ ضرور ہے کہ شیئر ہولڈرس اختلاف کا اعلان کردے تو کافی ہے مگر بات سمجھ میں نہیں آتی، بالخصوص ان لوگوں کے حق میں جو کہ کمپنی کے قیام میں آنے کے بعد اس کے شیئرز خریدتے ہیں، البتہ ابتدائی شرکاء یعنی اولین شیئرز ہولڈرس کی طرف سے اگر یہ بات کہی جائے تو براءت سمجھ میں آتی ہے، مگر کمپنی جب ایک نظام کے تحت کام کرنے لگے اور اس میں یہ معروف ومعلوم ہو کہ سودی قرض لیا گیا ہے اور سود کا معاملہ کیا گیا ہے، اور پھر ایک آدمی حصہ لیتا ہے اور بعد میں براءت کا اظہار کرتا ہے تو یہ براءت بے معنی سمجھ میں آتی ہے۔

۱۰۔ کمپنی کے منافع میں شامل سود کی مقدار معلوم ہونے کی صورت میں اگر شیئر ہولڈر سود کی بقدر رقم نکال کر صدقہ کردے تو کافی ہے، جیسے بینک میں جمع کردہ سرمایہ پر ملنے والا سود اور اس کو الگ کردینا اصل رقم کو متاثر نہیں کرتا۔

۱۱۔ اگر سود کی آمدنی کو اصل کے ساتھ ملا کر کاروبار میں لگا دیا گیا تو حساب کرنے پر سود کی رقم نیز اس سے حاصل ہونے والا نفع سب کو صدقہ کرنا لازم ہے، اور آدمی بری ہوجائے گا۔

شامی میں ہے: الحرمة تتعدد (٥.٩٨)، نیز الخبث بفساد الملك إنما يعمل فيما يتعين لا فيما لا يتعين۔ وأما الخبث لعدم الملك كالغصب فيعمل فيهما كما بسطه خسرو و ابن الكمال (درمختار مع حاشیہ شامی ٥.٧، ٩٥) عدم ملک کی خباثت وحرمت ہر چیز میں اثر انداز ہوتی ہے، سامان ونقد اور ان سے حاصل ہونے والے منافع سب میں۔

۱۲۔ شیئرز کی تجارت کم از کم فی الجملہ درست ہے، شیئر کا مطلب ہے کمپنی کا ایک حصہ، اور آج کل عرف میں شیئرز کو خود ایک استقلالی حیثیت حاصل ہے، لہذا یہ تجارت درست ہے بشرطیکہ دوسرا کوئی محظور نہ پایا جائے۔ مثلاً قبضہ وغیرہ کا تحقق اور قبل القبض بیع، اور ربح مالم یضمن وغیرہ کا مسئلہ پیدا نہ ہوتا ہو۔ اور رہ گئی تخمین تو یہ بیع کی روح اور بنیادی عنصر ہے۔

۱۳۔ فیوچر سیل اور بیع المستقبلیات درست نہیں ہے، ذکر کردہ تفصیل کے مطابق یہ کھلا ہوا سود وقمار کا معاملہ ہے، اس کے بجائے اگر یہ معاملہ ہو کہ وقت مقررہ پر باقاعدہ فروخت کیا جائے خواہ نفع ہو یا نقصان، تو درست ہے۔

۱۴۔ سوال سمجھ میں نہیں آسکا، بظاہر تکرار ہے۔

۱۵۔ رہ گیا شیئرز کے نقد سودے میں شیئرز پر قبضہ کا مسئلہ تو قبضہ کا معاملہ شریعت کی نگاہ میں وسعت رکھتا ہے۔ ہر شئے کا قبضہ اس کے مناسب حال ہوتا ہے اور اس میں عرف کا بھی دخل ہے، اس لئے اگر خریدار کی حیثیت سے بروکر کے یہاں نام آجانے پر حقوق منتقل ہوجاتے ہیں اور "ربح مالم یضمن" کا معاملہ نہیں رہ جاتا تو قبضہ مان لیا جائے گا۔ سرٹیفکیٹ تو ایک سرکاری ورسمی چیز ہے، ضروری نہیں ہے کہ وہ اسی کے نام ہو جس کو حقیقی ملکیت حاصل ہو، بلکہ ایسا ہوتا ہے کہ ایک شئے حقیقۃً ملکیت کسی کی ہوتی ہے اور نام کسی دوسرے کا چلتا رہتا ہے۔

۱۶۔ شیئر کا خریدار قیمت ادا کرنے کے بعد سرٹیفکیٹ حاصل کرنے سے قبل اگر شیئر کو فروخت کرے تو درست ہے، بشرطیکہ سرٹیفکیٹ کے بغیر شیئر اس کے ضمان میں آجاتا ہو اور حقوق ومنافع اس کو حاصل ہوجاتے ہوں۔

۱۷۔ شیئر بازار میں بروکر کی حیثیت سے کام کرنا درست ہے، اس لئے کہ بروکر کی حیثیت دلال اور کمیشن ایجنٹ کی ہے۔ مگر یہ شرط ہے کہ وہ ان ہی کمپنیز کے شیئرز کا کام کرے جن کا کاروبار بنیادی طور پر حلال ہے، اور یہ کہ اس میں شرعی ضوابط کا لحاظ کرے۔

☆☆☆

حصص کے مختلف مسائل کا حکم

مولانا محمد حنیف [۱]

۱۔ شیئر کمپنی میں شیئر ہولڈر کی ملکیت کی نمائندگی کرتا ہے، قرض کی دستاویز نہیں ہے۔

۲۔ بیع صرف کا حکم ہے، برابر سرابر جائز ہے، کمی بیشی حرام ہے۔

۳۔ جب کمپنی کے املاک میں عروض ونقود دونوں ہوں تو اس کا حکم سیف محلّٰی کا ہے، اس کی بیع وشراء ان نقود سے زائد پر ہونا ضروری ہے جتنے کی شیئر ضمانت دے رہا ہے۔

۴۔ حرام ہے۔ ۵۔ جائز ہے۔ ۶۔ جائز ہے۔

۷۔ سودی قرض سے حاصل ہونے والے منافع حلال وطیب اور مفید للملک ہیں (کمافی البحر ۸ / ۱۱۴)۔

۸۔ وکیل ہوتے ہیں، وکالت کے احکام ان پر جاری ہوتے ہیں۔

۹۔ بریٔ الذمہ کردے گا کیونکہ اعلان کرنے کے بعد وہ فضولی کا ایسا عمل ہوگا جس پر اصیل راضی نہیں ہے۔

۱۰۔ صدقہ کردینا واجب ہے جس کی وجہ سے مال سے خبث دور ہوجائے گا اور یہ عمل مال کی طہارت کے لئے کافی ہوگا، اور ساتھ ہی ساتھ اللہ رب العزت سے توبہ بھی کرے۔

۱۱۔ سود سے حاصل ہونے والی رقم سے جتنا نفع ہوگا اس نفع کو مع اصل سود کے سب کا صدقہ کردینا واجب ہے (الہدایہ ۳ / ۵۹۔ ۳ / ۶۰ والبحر ۸ / ۱۱۴):

قال مشائخنا لا يطيب له بكل حال فهو المختار وإطلاق الجواب في الجامعين يدل على ذلك۔

۱۲۔ حاضر سودے کے شیئرز کی تجارت بشرائط جائز ہیں، بازار کی صورت حال کو دیکھ کر قیاس آرائیوں سے زیادہ منافع دینے والے شیئرز خریدنے اور بیچنے میں شرعاً کوئی قباحت نہیں ہے، کیونکہ ہر تجارت میں قیاس آرائیوں کا دخل ہوتا ہے اور تجارت میں نفع حاصل کرنا مقصود ہوتا ہے اور یہ جائز بھی ہے بشرطیکہ امر محظور کا ارتکاب نہ ہو، اور قیاس آرائی کوئی امر محظور نہیں۔

۱۳۔ یہ صورت قمار میں داخل ہے۔

۱۴۔ یہ بیع الی آجل بالی آجل ہونے کی بنا پر حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے حرام وناجائز ہے: نهى رسول الله ﷺ عن بيع الكالي بالكالي

۱۵۔ قبضہ کی جو حقیقت ہے یعنی ضمان میں داخل ہونا، نفع ونقصان کا مالک ہونا، جب یہ حاصل ہوجاتا ہے تو اس کی بیع وشراء جائز ہے، اگرچہ نام کی تبدیلی اور سرٹیفیکٹ کی ادائیگی میں تاخیر ہو۔

۱۶۔ جائز ہے، کیونکہ قبضہ کی حقیقت حاصل ہے، بشرطیکہ إفضاء إلى المفسدة نہ ہو۔

۱۷۔ بروکر دلال کے مثل ہے، دلالی اور اس کی اجرت جائز ہے، بشرطیکہ خداع وغیرہ نہ ہو اور اجرت متعین ہو، نیز فیصد کے اعتبار سے متعین کرنا یہ تعیین کے درجہ میں ہے۔

☆☆☆

[۱] بیت العلوم، سرائے میر، اعظم گڑھ۔

کمپنی اور شیئرز سے متعلق نئے مسائل اور حل

مولانا ابوبکر قاسمی[1]

کاروبار کی قسمیں:......ملکیت کے اعتبار سے کاروبار کی تین قسمیں ہیں: (۱) شخصی کاروبار، (۲) شرکت (۳) کمپنی۔ کاروبار کی پہلی دو قسمیں اسی وقت سے رائج ہیں جب سے انسان کاروبار کررہا ہے۔ حضرات فقہاء نے بھی ان کی بنیادی تفاصیل واحکام کو بیان فرمایا ہے، اور ان کی موجودہ صورتحال ماضی سے بنیادی طور پر مختلف نہیں ہے، اس لئے یہاں ان کی تفصیلات کا ذکر نہیں ہوگا، البتہ کمپنی کاروبار کی ایک نئی قسم ہے جس کا پہلے فقہاء کے دور میں وجود نہ تھا، اس لئے یہاں اس کی تفاصیل کو بیان کرنے کی ضرورت ہے۔

کمپنی کا تعارف:

کمپنی کے لغوی معنی "شرکت" کے ہیں اور کبھی رفقائے کار کو بھی کمپنی کہا جاتا ہے، لیکن یہاں پر کمپنی سے کیا مراد ہے، اس کو جاننے کے لئے اس کی مختصر تاریخ سے واقفیت ضروری ہے۔

یورپ میں صنعتی انقلاب رونما ہونے کے بعد سترہویں صدی کے آغاز میں بڑے بڑے کارخانوں وغیرہ کے قائم کرنے کے لئے جب عظیم سرمایہ کی ضرورت پڑنے لگی جس کو کوئی شخص اکیلا یا چند افراد مل کر فراہم نہیں کرسکتے تھے، تو اس وقت عام لوگوں کی منتشر بچتیں یکجا کرکے اجتماعی فائدہ اٹھانے کے لئے کمپنی کا نظام رائج ہوا، ابتدائی کمپنیاں نیم سرکاری ہوتی تھیں، جو عموماً حکومت کے چارٹر (اجازت نامے) کے تحت غیر ملکی تجارت کے لئے وجود میں آتی تھیں، اور انہیں بہت وسیع اختیارات دیئے جاتے تھے، بسا اوقات ان کو قوانین وضع کرنے کا بھی اختیار ہوتا تھا، سکہ ڈھالنے، پولیس اور فوج رکھنے کا بھی اختیار ہوتا تھا، برصغیر پر قابض ہونے والی ایسٹ انڈیا کمپنی بھی اسی قسم کی ایک کمپنی تھی، اب وسیع اختیارات کے تحت ایسی کمپنیاں موجود نہیں رہیں، اب صرف تجارتی کمپنیاں ہوتی ہیں، جو حکومت کی اجازت سے قائم ہوتی ہیں، کمپنیوں کی تشکیل کی اجازت اور ان کو کنٹرول کرنے کا کام جو ادارہ کرتا ہے اس کو ہمارے ملک میں کارپوریٹ لاء اتھارٹی (Corporate Law Authority) کہا جاتا ہے، یہ وزارت خارجہ کا ایک ذیلی ادارہ ہے، اس کی اجازت کے بعد جب کمپنی وجود میں آجاتی ہے تو اس کو شخص قانونی یا شخص فرضی کا درجہ حاصل ہوجاتا ہے، جو بیع وشراء کرتا ہے، اور مدعی ومدعا علیہ بنتا ہے، اسی طرح دائن ومدیون ہوتا ہے، اب اس کو کاروبار شروع کرنے کے لئے سرمایہ کی ضرورت ہے جس کی فراہمی کے لئے لوگوں کو کمپنی میں شرکت کی دعوت دی جاتی ہے، اور کمپنی کو جتنے سرمائے کی ضرورت ہوتی ہے اور اس کے کاروبار میں جتنے لوگوں کو شریک کرنا مقصود ہوتا ہے، اسی حساب سے کمپنی کے شیئرز متعین کئے جاتے ہیں اور اس کا اعلان کیا جاتا ہے، کمپنی کے اس اعلان پر جو لوگ اس کے حصہ میں شریک ہوکر سرمایہ دیتے ہیں، اس کے لئے کمپنی ایک سرٹیفکیٹ جاری کرتی ہے، جو اس بات کی سند ہوتی ہے کہ اس شخص کا کمپنی کے اثاثوں اور سرمایوں میں اتنا حصہ ہے، اسی سرٹیفکیٹ کو اردو میں "حصہ" عربی میں "سہم" اور انگریزی میں "شیئر" کہا جاتا ہے۔

کمپنی کی حقیقت:......مندرجہ سطور میں کمپنی کا جو مختصر تعارف پیش کیا گیا اس کو جان لینے کے بعد اب یہاں پر چند باتیں قابل غور ہیں، پہلی بات یہ ہے کہ کمپنی کی حقیقت کیا ہے، تو اس سلسلہ میں مذکورۃ الصدر تصریحات سے بظاہر یہ محسوس ہوتا ہے کہ فقہاء کرام نے کتب فقہ وفتاوی میں جو عقد شرکت کی بحث فرمائی ہے، بعینہ اسی کو دور حاضر کی اصطلاح میں کمپنی کا نام دے دیا گیا ہے، چنانچہ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی نے کمپنی کے مروجہ نظام کو عقد شرکت کی دوسری قسم شرکت عنان میں داخل فرمایا ہے (امداد الفتاوی ۳/ ۴۹۴) لیکن دور حاضر کے جن حضرات علماء نے کمپنی کے پورے نظام پر اس کے دستور کو سامنے رکھ کر غور کیا ہے، ان کا کہنا ہے کہ کمپنی اور شرکت کے نظام میں بہت کچھ فرق ہے، اور کمپنی کے بعض مخصوص خصائص ہیں جو عقد شرکت میں نہیں پائے جاتے ہیں۔

---

[1] جامعہ اسلامیہ، شکر پور بھروارہ، دربھنگہ۔

کمپنی اور شرکت کے درمیان فرق:...... مثلاً کمپنی کی سب سے پہلی خصوصیت یہ ہے کہ شرکت میں ہر شریک کی الگ الگ ملکیت متصور ہوتی ہے، مگر اس نظام میں کئی افراد کے مجموعے کو ایک شخص قانونی قرار دیا جاتا ہے، اس شخص قانونی کو کارپوریشن کہتے ہیں جس کی ایک قسم کمپنی ہے۔

کمپنی کے نظام کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ اس کا اپنا مستقل قانونی وجود ہوتا ہے، جس کی رو سے خود کمپنی ہی کو اس کے املاک وغیرہ کا مالک قرار دیا جاتا ہے، اور خود کمپنی ہی کی طرف اس کے سارے حقوق لوٹتے ہیں، یہاں تک کہ کمپنی مدعی بھی بنتی ہے اور مدعا علیہ بھی، اسی طرح کمپنی دائن و مدیون بھی بنتی ہے، جبکہ شرکت کے اندر ایسا نہیں ہوتا، کیونکہ اس کا الگ سے کوئی قانونی وجود نہیں ہوتا، ہاں شرکت میں اس کا ہر شریک کاروبار کے تمام اثاثوں کا مشاع کے طور پر مالک ہوتا ہے، اور اس کے ہر شریک کو ایک دوسرے کا وکیل قرار دیا جاتا ہے، اور اس میں ہر شخص کی ذمہ داری یکساں ہوتی ہے، مثلاً کوئی دین واجب ہوا تو عقد شرکت میں اس کے تمام شرکاء سے برابر درجے میں مسئولیت ہوگی، مگر جیسا کہ عرض کیا گیا کمپنی میں ایسا نہیں ہوتا۔

کمپنی کی تیسری خصوصیت یہ ہے کہ اس کے حصہ داروں کو کمپنی کے اثاثوں میں اس حد تک تو شریک مانا گیا ہے کہ اگر کسی وجہ سے کمپنی تحلیل ہو جائے اور وہ بند کردی جائے تو اثاثے کی تقسیم کے وقت اس کے ہر حصہ دار کو متناسب حصے ملیں گے، لیکن کمپنی کی تحلیل سے قبل اس کے حصہ داروں کو ہرگز یہ حق حاصل نہیں کہ وہ کمپنی کے اثاثوں میں تصرف کر سکے، یہی وجہ ہے کہ کمپنی کا کوئی شریک اگر اتنا مدیون ہو گیا کہ اس کے اثاثے قرق (ضبط) کئے گئے تو اس کے ہاتھ میں کمپنی کا جو حصہ ہے وہ تو قرق ہوگا لیکن اس کے حصے کے تناسب سے کمپنی کے اثاثوں میں سے اس کا جو حصہ بنتا ہے وہ قرق نہیں ہوگا، اس لئے کہ قانوناً کمپنی کے اثاثوں میں اس کو تصرف کا حق نہیں ہے، لیکن شرکت کے اندر ہر شریک با اختیار ہوتا ہے، اور اس کو تصرف کا حق حاصل ہوتا ہے، اگر وہ چاہے تو شرکت کو ختم کر سکتا ہے۔ اسی طرح اگر کوئی شریک مدیون ہو جائے اور اس کے سارے اثاثے قرق کئے جائیں تو شرکت میں اس کے حصہ کے تناسب سے جو اس کا حق بنتا ہے وہ سب قرق ہو جائے گا۔

کمپنی کی چوتھی خصوصیت یہ ہے کہ اگر اس پر کاروبار کی جہت سے کسی کا دعوی ہو یا خود کمپنی کا کسی پر دعوی ہو تو خود کمپنی ہی مدعی یا مدعا علیہ ہوگی، اس کے حصہ دار ہرگز مدعی یا مدعا علیہ نہ ہوں گے، کیونکہ خود کمپنی کو شخص قانونی کا درجہ حاصل ہے شخص حقیقی کے مثل، البتہ کمپنی کی نمائندگی عدالت میں اس کی انتظامیہ کا کوئی فرد کرے گا، اس کے برعکس اگر شرکت میں کاروبار کی جہت سے اس کا کسی پر دعوی ہو یا اس پر کسی کا دعوی ہو تو اس کے تمام شرکاء مدعی یا مدعا علیہ ہوں گے۔

کمپنی کی پانچویں خصوصیت یہ ہے کہ اس کا کوئی شریک اپنا سرمایہ نہیں نکال سکتا، البتہ اپنے حصہ کو فروخت کر سکتا ہے، جبکہ شرکت کے اندر اگر اس کا کوئی شریک شرکت فسخ کر کے اپنا سرمایہ نکالنا چاہے تو نکال سکتا ہے۔

کمپنی کے نظام کی چھٹی خصوصیت یہ ہے کہ کمپنی میں ذمہ داری محدود ہوتی ہے، جبکہ شرکت میں عموماً ذمہ داری کاروبار کے اثاثوں تک محدود نہیں ہوتی۔

مندرجہ ذیل تفصیل سے معلوم ہوا کہ شرکت اور کمپنی کے نظاموں کے درمیان بہت نمایاں فرق ہے، اور کمپنی کے نظام کی کچھ مخصوص خصوصیات ہیں جن کے پیش نظر کمپنی شرکت کی معروف اقسام میں سے کسی میں داخل نہیں ہے، اور جیسا کہ حضرات علماء بخوبی جانتے ہیں فقہاء کرام نے عقد شرکت کی چار قسمیں بیان فرمائی ہیں: (۱) شرکت مفاوضہ، (۲) شرکت عنان، (۳) شرکت صنائع، (۴) شرکت وجوہ۔ اگر شرکت کے ساتھ مضاربت کو بھی شامل کر لیا جائے تو شرکت کی پانچ قسمیں بن جاتی ہیں، ظاہر ہے کمپنی کا یہ مروجہ نظام شرکت کی مذکورہ پانچوں قسموں میں سے کسی میں بتمام وکمال داخل نہیں ہے، جیسا کہ کمپنی اور شرکت کے نظاموں کے درمیان مندرجہ بالا فرق وخصائص میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے۔

کمپنی کی شرعی حیثیت:

اب یہاں دوسرا سوال یہ ہے کہ جب کمپنی مروجہ شرکت کی معروف اقسام میں داخل نہیں ہے تو کیا یہ شرعاً جائز ہے؟ تو اس سلسلہ میں علمائے معاصرین کی بنیادی طور پر دو رائیں ہیں: ایک رائے یہ ہے کہ چونکہ شرکت کا معاملہ پانچ قسموں میں منحصر ہے اور کمپنی ان میں سے کسی میں داخل نہیں ہے، لہذا یہ جائز نہیں ہے۔ لیکن دوسرا نقطہ نظر یہ ہے کہ محض اس بنا پر کہ کمپنی شرکت کی معروف اقسام میں داخل نہیں ہے اس کو ناجائز نہیں قرار دیا جا سکتا، اس لئے کہ حضرات فقہاء نے شرکت کی جو اقسام بیان فرمائی ہیں وہ منصوص نہیں ہیں، بلکہ ان حضرات نے اپنے زمانہ میں شرکت کی مروجہ صورتوں کا استقراء کر کے اس کی روشنی میں شرکت کی تقسیم فرمائی ہے، علاوہ ازیں کسی نص یا تصریحات فقہاء میں یہ درج نہیں ہے کہ جو صورت ان اقسام سے خارج ہو وہ جائز نہ ہوگی، لہذا اگر شرکت کی کوئی اور صورت شرکت کی مذکورہ اقسام سے خارج ہو، لیکن شرکت کے اصول منصوصہ میں سے کسی کے خلاف نہ ہو تو اسے شرعاً جائز قرار دیا جائے گا، چنانچہ جب کمپنی کی مذکورہ

خصوصیات پر غور کیا جاتا ہے تو ان میں سے اکثر کا تعلق انتظام سے ہے، جو شرعاً قابل اعتراض نہیں ہے، البتہ کمپنی سے متعلق دو چیزیں شرعی اعتبار سے قابل غور ہیں:

پہلی چیز یہ ہے کہ عقد شرکت کا تو کوئی قانونی وجود نہیں ہوتا، لیکن کمپنی کا مستقل قانونی وجود ہوتا ہے، جس کو شخص فرضی یا شخص قانونی کہا جاتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ شخص قانونی کا تصور شرعاً درست ہے یا نہیں تو جائزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ مذہب اسلام میں گو شخص قانونی کی اصطلاح موجود نہیں ہے لیکن اس کے نظائر موجود ہیں، چنانچہ وقف، بیت المال، ترکہ مستغرقہ بالدین، اسی طرح ائمہ ثلاثہ کے مسلک کے مطابق خلطۃ الشیوع۔ یہ چاروں چیزیں شخص قانونی کے نظائر ہیں، اگر چہ ان کے لئے شخص قانونی کی اصطلاح استعمال نہیں ہوئی ہے، لیکن حقیقت کے اعتبار سے یہ چیزیں شخص قانونی کے ذیل میں آتی ہیں، اس لئے کہ ان میں سے ہر ایک پر حضرات فقہاء نے ان کو شخص قانونی کے درجہ میں رکھ کر شخص حقیقی کے احکام جاری کئے ہیں، مثلاً وقف مالک بھی ہوتا ہے، دائن و مدیون بھی ہوتا ہے، مدعی و مدعا علیہ بھی ہوتا ہے، ظاہر ہے کہ یہ سارے اوصاف شخص حقیقی کے ہیں، لیکن وقف میں شخص قانونی کی خصوصیات تسلیم کی گئی ہیں۔ اسی طرح بیت المال کہ اس سے پوری قوم کا حق متعلق ہوتا ہے، لیکن کوئی شخص اس کی املاک میں ملکیت کا دعویٰ نہیں کرسکتا، بلکہ اس کے اموال کا مالک بیت المال ہی کو قرار دیا جاتا ہے، اور اس کی ایک مد شخص قانونی کا درجہ رکھتی ہے، اور ضرورت پڑنے پر دوسری مد سے اس کے لئے قرض لیا جاتا ہے، اب ظاہر ہے کہ اس صورت میں جس مد سے قرض لیا گیا وہ دائن اور جس مد کے لئے لیا گیا وہ مدیون ہوگا، معلوم ہوا کہ بیت المال کو شخص قانونی کا درجہ دیا گیا ہے۔ اسی طرح کسی میت کا ترکہ جو دیون سے مستغرق ہو اس کو مدیون تسلیم کیا گیا ہے، جو ایک شخص قانونی کے حکم میں ہے۔ اسی طرح ائمہ ثلاثہ کے نزدیک خلطۃ الشیوع کی صورت میں (جبکہ مال مشاع کے طور پر کئی شخصوں میں مشترک ہو تو) زکوۃ لوگوں کے انفرادی حصوں پر واجب نہیں ہوتی ہے بلکہ کل مال کے مجموعے پر ہوتی ہے، معلوم ہوا کہ ائمہ ثلاثہ کے نزدیک اس صورت میں مال کا مجموعہ ایک شخص قانونی ہے (یاد رہے کہ خلطۃ الشیوع کی جو نظیر پیش کی گئی ہے وہ فقہ حنفی کے مطابق ہے)۔ مندرجہ نظائر سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ شخص قانونی کا تصور فی نفسہ کوئی ناجائز تصور نہیں ہے اور نہ فقہ اسلامی کی رو سے یہ کوئی اجنبی تصور ہے، البتہ شخص قانونی کی یہ اصطلاح ضرور نئی ہے۔

کمپنی سے متعلق دوسرا قابل غور پہلو:

یہاں پر کمپنی کے نظام کی دوسری خصوصیت جو شرعی اعتبار سے قابل غور ہے وہ یہ ہے کہ اس کے حصہ داروں کی ذمہ داری ان کے لگائے ہوئے سرمائے کی حد تک محدود ہوتی ہے، جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اگر کمپنی خسارے میں گئی تو ان کا زیادہ سے زیادہ یہ نقصان ہوگا کہ ان کا لگایا ہوا سرمایہ ڈوب جائے گا، لیکن اگر کمپنی پر قرض زیادہ ہو گیا تو اس کے حصہ داروں سے ان کے لگائے ہوئے سرمایہ سے زیادہ کا مطالبہ نہ ہوگا، اسی طرح کمپنی کی ذمہ داری بھی اس کے اثاثوں کی حد تک محدود ہوتی ہے، یہی وجہ ہے کہ قرضے کی ادائیگی کے لئے زیادہ سے زیادہ کمپنی کے اثاثے قرق کرائے جاسکتے ہیں، لیکن اثاثوں سے زیادہ کا مطالبہ نہ ہوگا۔ اب یہاں قابل غور پہلو یہ ہے کہ کمپنی اور اس کے شرکاء کی محدود ذمہ داری کا نقصان یہ ہوگا کہ اس کے قرض خواہوں کا کمپنی کے اثاثوں سے زائد جو قرض ہوگا اس کی وصولیابی کی کوئی صورت نہیں رہے گی، جس کے سبب قرض خواہوں کا ذمہ خراب ہوگا، اسی کو فقہ کی اصطلاح میں خراب الذمہ کہا جاتا ہے۔ بعض علماء نے اسی اشکال کی وجہ سے کہا ہے کہ محدود ذمہ داری کا شرعاً تصور صحیح نہیں ہے، اس لئے کہ اس سے لوگوں کے حقوق ضائع ہوتے ہیں، لیکن اگر اس مسئلہ کو ایک دوسرے اعتبار سے دیکھا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ کمپنی کی محدود ذمہ داری کے تصور کی بنیاد در اصل شخص قانونی کے تصور پر ہے، اگر شخص قانونی کو تسلیم کرلیا جائے تو اس کی محدود ذمہ داری کو ماننا کچھ مشکل نہیں رہتا۔ شخص حقیقی اگر مفلس ہوجائے تو اس کے قرض خواہ اپنا قرض صرف اس کے اثاثوں سے وصول سکتے ہیں، اس سے زیادہ کا مطالبہ نہیں کرسکتے، چنانچہ حضرت معاذ بن جبل کے متعلق مشہور ہے کہ جب وہ مفلس ہو گئے تو حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے قرض خواہوں سے فرمایا تھا کہ:

خذوا ما وجدتم ليس لكم إلا ذلك (صحیح مسلم، باب وضع الجوائح)۔

اگر قرض دار کی موت اس کے مفلس ہونے کی حالت میں ہوجائے تو خراب الذمہ ہوجاتا ہے یعنی اس کے قرض خواہوں کے قرض کی ادائیگی کی کوئی صورت نہیں رہتی۔ اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ شخص حقیقی اگر مفلس ہو کر مرجائے تو اس کی ذمہ داری اثاثوں تک محدود رہتی ہے، اور قرض خواہوں کا ذمہ خراب ہوجاتا ہے، اسی طرح کمپنی کو جب شخص قانونی مان لیا گیا تو یہ بھی اگر دیوالیہ ہو کر تحلیل ہوجائے تو اس کی ذمہ داری بھی اثاثوں ہی کی حد تک محدود ہونی چاہئے، اس لئے کہ کمپنی کا تحلیل ہوجانا اس شخص قانونی کی موت ہے۔ مندرجہ تفصیل سے معلوم ہوا کہ محدود ذمہ داری کا تصور کوئی ناجائز تصور نہیں ہے کہ اس کے سبب سے کمپنی کی شرکت کو فاسد قرار دیا جائے۔ کمپنی کی محدود ذمہ داری کی دلچسپ نظیر عبد ماذون فی التجارہ ہے، کہ جس طرح ایک غلام کو آقا کی طرف سے تجارت کی اجازت ہوتی ہے، اور جو

کچھ وہ تجارت کرتا ہے وہ آقا کا مملوک ہوتا ہے، لیکن اس کے باوصف اگر غلام پر دیون واجب ہوں تو وہ اس غلام کی قیمت تک محدود ہوں گے، اس سے زیادہ کا نہ غلام سے مطالبہ ہوسکتا ہے اور نہ مولی سے، یہاں بھی قرض خواہوں کا ذمہ خراب ہوگیا، اگر غور سے دیکھا جائے تو یہ نظیر کمپنی کی محدود ذمہ داری سے، بہت قریب ہے، کمپنی کے قرض خواہوں کا ذمہ خراب ہوجاتا ہے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ جن وجوہ سے بعض علماء نے کمپنی کے مروجہ نظام کو ناجائز قرار دیا ہے، ان سب وجوہ کی شریعت میں جائز نظیر موجود ہے، یہی وجہ ہے کہ اکثر علماء نے کمپنی کے مروجہ نظام کو شرعاً درست قرار دیا ہے۔

آخر میں کمپنی کے شیئرز سے متعلق ایک بحث رہ جاتی ہے، اور وہ یہ ہے کہ کمپنی کا شیئر کمپنی کے اثاثوں میں شیئرز ہولڈر کی ملکیت کی نمائندگی کرتا ہے یا نہیں، تو اس سلسلہ میں بعض علماء معاصرین کی رائے یہ ہے کہ کمپنی کا شیئر اس کے اثاثوں میں شیئرز ہولڈر کی ملکیت کی نمائندگی نہیں کرتا بلکہ یہ محض اس بات کی دستاویز ہے کہ اس شخص نے کمپنی کو اتنی رقم دے رکھی ہے، جیسے دیگر قرضوں مثلاً بانڈز وغیرہ کی دستاویزات ہوتی ہیں ایسے ہی یہ بھی ایک شہادت و دستاویز ہے، صرف اتنا فرق ہے کہ بانڈز وغیرہ پر متعین شرح سے سود ملتا ہے لیکن شیئرز پر سود کی شرح متعین نہیں ہوتی، بلکہ کمپنی کو جو نفع ہوتا ہے اس کا ایک متناسب حصہ اس کو دیدیا جاتا ہے۔ اب یہاں پر قابل غور پہلو یہ ہے کہ بعض علماء نے شیئرز کے متعلق جو یہ رائے قائم کی ہے اس کی بنیاد کیا ہے، تو اس سلسلہ میں ان حضرات کا کہنا ہے کہ اگر شیئرز کمپنی کے اثاثوں میں ملکیت کی نمائندگی کرنے والا ہوتا تو شیئرز ہولڈر کے دیوالیہ ہونے کی صورت میں جہاں اس کی دیگر املاک کی قرقی ہوتی ہے اسی طرح کمپنی میں اس کے متناسب حصے کی بھی قرقی ہونی چاہئے تھی مگر نہیں ہوتی، معلوم ہوا کہ کمپنی کے اثاثوں میں شیئرز ہولڈر کی ملکیت نہیں ہوتی۔

لیکن ان بعض علماء کے مذکورہ نظریہ پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا مذکورہ قول صحیح نہیں ہے، کیونکہ کمپنی کے ظاہری نظام اور اس موضوع پر جو کتابیں لکھی گئی ہیں ان کو پڑھنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ شیئرز ہولڈر کی کمپنی کے اثاثوں میں ملکیت ہوتی ہے کہ اگر کمپنی باہمی قرارداد سے تحلیل ہوجائے تو شیئرز ہولڈرس کو صرف ان کی لگائی ہوئی رقم واپس نہیں ملتی بلکہ کمپنی کے اثاثوں کا متناسب حصہ شیئر ہولڈرس کو دیا جاتا ہے جبکہ دوسری مالی دستاویزات مثلاً بانڈز وغیرہ پر کمپنی کے تحلیل ہونے کی صورت میں صرف لگی ہوئی رقم سود کے ساتھ واپس دی جاتی ہے۔ مذکورہ تفصیل سے صاف ہوا کہ کمپنی کا شیئرز محض قرضے کی شہادت نہیں ہے، بلکہ یہ کمپنی کے اثاثوں میں شیئرز ہولڈر کی متناسب ملکیت کی نمائندگی کرتے ہیں، لہذا کمپنی کا جو شیئر ہولڈر اپنے شیئر کو فروخت کرتا ہے تو درحقیقت وہ کمپنی کے جامد اثاثوں، سامان تجارت، نقد، قابل وصول دین وغیرہ میں جو اس کا متناسب حصہ ہوتا ہے اس کو فروخت کرتا ہے، البتہ اگر کمپنی ابھی قائم ہورہی ہو اور اس کے پاس کچھ منجمد اثاثے نہ ہوں تو اس وقت اگر کوئی شیئر ہولڈر اپنے حصہ کو فروخت کرتا ہے تو درحقیقت وہ نقد رقم کو نقد کے ساتھ فروخت کرتا ہے، اس لئے شیئرز کی مذکورہ دونوں صورتوں کے احکام میں فرق ہوگا۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ کمپنی کے شیئرز کی دستاویز کی حیثیت قرض وغیرہ کی دستاویز کے مانند نہیں ہے بلکہ کمپنی کے شیئرز کی دستاویز درحقیقت کمپنی کے اثاثوں میں شیئرز ہولڈر کی متناسب ملکیت کی نمائندگی کرتی ہے۔ رہا یہ اعتراض کہ شیئرز ہولڈر کے دیوالیہ ہونے کی صورت میں جہاں اس کے دیگر املاک کی قرقی ہوتی ہے، اسی طرح کمپنی میں اس کے متناسب حصے کی بھی قرقی ہونی چاہئے مگر نہیں ہوتی، تو اس کا جواب یہ ہے کہ کمپنی میں شیئر ہولڈر کے متناسب حصے کی قرقی ہوتی ہے لیکن اس کی صورت یہ ہے کہ جب وہ دیوالیہ ہوجائے تو وہ اپنا حصہ کسی دوسرے شخص کے ہاتھ فروخت کردے، لہذا جن وجوہ کی بنیاد پر کمپنی کے شیئرز کی خرید و فروخت کو ناجائز قرار دیا ہے وہ سب حقیقت سے دور ہیں، اور ان میں سے ہر ایک محل نظر ہے، اس لئے درست بات یہ ہے کہ اگر کمپنی کا بنیادی کاروبار حلال ہو تو ایسی کمپنیوں کے شیئرز کی خرید وفروخت شرعاً درست ہے۔

یہاں تک کاروبار کی قسمیں، کمپنی کا تعارف، شرکت و کمپنی کے نظاموں میں فرق اسی طرح کمپنی کے قابل غور پہلو شیئرز کی حقیقت کے سلسلہ میں جو کچھ مختصر جائزہ پیش کیا گیا وہ حضرت مولانا محمد تقی صاحب عثمانی کی کتاب ''فقہی مقالات'' اور ''اسلام اور جدید معیشت وتجارت'' سے ماخوذ ہیں، کمپنی کے دیگر امور کی تفصیل جاننے کے لئے مندرجہ بالا کتابوں کا مطالعہ مناسب ہوگا۔

شیئرز کی شرعی حیثیت اور اس کی خرید وفروخت سے متعلق فقہی احکام

۱- دور حاضر کی تجارتوں میں جن نئی صورتوں کا اضافہ ہوا ہے، ان میں سے ایک نئی صورت شیئرز کی خرید وفروخت کا مسئلہ بھی ہے، چونکہ شیئرز کا کاروبار آخری

صدیوں میں شروع ہوا ہے، اس لئے قدیم فقہاء کی کتابوں میں اس کی خرید وفروخت کے سلسلہ میں تفاصیل نہیں ملتیں، لہذا ضروری ہے کہ ہم قرآن وسنت اور تصریحات فقہاء کی روشنی میں شیئرز کی خرید وفروخت سے متعلق فقہی احکام کو تلاش کریں، لیکن شیئرز کی خرید وفروخت سے متعلق فقہی احکام کو تلاش کرنے سے پہلے ہمارے لئے لازم ہے کہ ہم شیئرز کی حقیقت ونوعیت کو جانیں۔

تو اس سلسلہ میں جہاں تک شیئرز کی نوعیت کے تعین کا مسئلہ ہے تو یہ بات سب پر واضح ہے کہ زمانہ سابق میں جو شرکت کا معاملہ ہوتا تھا، دور حاضر میں شیئرز کی خرید وفروخت کا مسئلہ اسی کی ایک خاص قسم ہے، یا اسی سے ملتا جلتا ایک مسئلہ ہے، البتہ پہلے زمانہ میں جو شرکت کا کاروبار ہوا کرتا تھا وہ چند افراد کے درمیان ہوا کرتا تھا، جس کو آج کل کی اصطلاح میں پارٹنرشپ کہتے ہیں، لیکن آج جو شرکت کی نئی قسم وجود میں آئی ہے اس کو جوائنٹ اسٹاک کمپنی کہا جاتا ہے۔

۲۔ نئی قائم ہونے والی کمپنی کا شیئر خریدنا:

جب کوئی نئی کمپنی قائم ہوتی ہے تو اس وقت اس کمپنی کے پاس کچھ بھی املاک نہیں ہوتی، مگر اس کے قیام کے ساتھ اس کے شیئرز کا اعلان کیا جاتا ہے، اب اگر اس وقت اس کمپنی کے خرید کردہ شیئرز کو فروخت کیا جائے تو اس صورت میں چونکہ اس کمپنی کے خرید کردہ شیئرز کی حیثیت ابھی اثاثے کی نہیں ہے، بلکہ وہ ابھی نقد کی شکل میں ہے، یا واجب الوصول قرض کی شکل میں ہے، اس لئے اس کمپنی کے اس قسم کے شیئرز کو کمی بیشی کے ساتھ تو فروخت کرنا شرعاً جائز نہیں ہے، ہاں فیس ویلو (Face Value) یعنی اصل رقم پر خریدنا اور فروخت کرنا جائز ہے، کیونکہ اس صورت میں جو بیع ہو رہی ہے وہ نقد کی بیع نقد کے ساتھ ہو رہی ہے، جو شرعاً بیع صرف ہے جس میں اتحاد جنس کے وقت مبیع اور ثمن کے درمیان تساوی شرط ہے، اسی کے ساتھ مجلس عقد میں مبیع وثمن دونوں پر تقابض ضروری ہے، لیکن شیئرز کی خرید وفروخت کی مندرجہ بالا صورت میں تساوی تو ممکن ہے لیکن بدلین پر دست بدست تقابض ممکن نہیں ہے، کیونکہ خریدار تو فی الفور بائع کو روپیہ دے دیتا ہے اور قبضہ کرا دیتا ہے، لیکن بائع کا روپیہ تو کمپنی کے یہاں جمع ہے، جس پر وہ خریدار کو قبضہ نہیں کرا رہا ہے بلکہ اس کو صرف شیئرز سرٹیفکیٹ دے رہا ہے، اس صورت حال کا تقاضا تو یہ ہے کہ شیئرز کی یہ خرید وفروخت شرعاً جائز نہ ہو لیکن اس کے جواز کے لئے مولانا اشرف علی تھانوی نے امداد الفتاوی میں یہ حیلہ لکھا ہے کہ جو شخص اپنا شیئر فروخت کر رہا ہے وہ خریدار سے روپے قرض لے لے اور خریدار کے اس قرض والے روپے کا حوالہ کمپنی پر اپنے شیئر کے بدلے میں کر دے، کہ تمہارا جو قرض مجھ پر ہے وہ تم فلاں کمپنی سے وصول کر لو، اور شیئر کا یہ خریدار شخص کمپنی سے اپنا قرض والا روپیہ وصول کرنے کے بجائے اپنے مدیون والا شیئر لے لے اور کمپنی کے منیجر کو اپنی طرف سے شیئر پر قبضہ کا وکیل بنا دے تو یہ شرعاً درست ہے، اور اس خریدار کا قبضہ شیئر پر کمپنی کے منیجر کے واسطہ سے ہو جائے گا، اور اب وہ شیئر اس خریدار کے قبضہ میں آ کر اس کا مملوک ہو جائے گا (مستفاد از امداد الفتاوی ۳؍۵۱۱)۔

۳۔ نقود وغیر نقود سے مخلوط اثاثہ والی کمپنی کے شیئرز کی خرید وفروخت کا حکم:

کمپنی کے وجود میں آ جانے کے بعد جب اس کا اثاثہ مخلوط شکل میں نقد واملاک کا مجموعہ ہو جاتا ہے تو اگرچہ ایسی صورت میں کمپنی کی املاک مال ربوی وغیر ربوی دونوں پر مشتمل ہوتی ہے، مگر ایسی کمپنی کے شیئرز کو نقد رقم کے ساتھ خریدنا اور بیچنا شرعاً جائز و درست ہے، لیکن شرط یہ ہے کہ مذکورہ کمپنی کا ہر شیئر جتنی نقد رقم پر مشتمل ہے، اس سے زیادہ نقد رقم کے عوض اس کے شیئر کو فروخت کیا جائے تب جائز ہے، تاکہ کمپنی کا ہر شیئر جتنی نقد رقم پر مشتمل ہے اس کو نقد رقم سے برابر کرنے کے بعد جو زائد رقم بچے اس کے بدلے میں کمپنی کا اثاثہ ہو۔ شیئرز کی اس خاص صورت کے جواز کی دلیل 'سیف محلی' اور 'منطقہ مفضضہ' والا مسئلہ ہے، جس میں مال ربوی وغیر ربوی سے مخلوط مال کو مال ربوی کے عوض فروخت کیا جاتا ہے، جو فقہ حنفی کی رو سے جائز ہے، جبکہ خالص مال ربوی مال مخلوط میں شامل مال ربوی سے زیادہ ہو، تاکہ مال ربوی کے مقابلہ میں مال ربوی ہو اور جو زائد خالص مال ربوی ہو وہ مخلوط مال غیر ربوی کے مقابلہ میں ہو، لیکن حضرت امام شافعی علیہ الرحمۃ کے نزدیک ربوی وغیر ربوی سے مخلوط مال کی بیع خالص مال ربوی کے ساتھ جائز نہیں ہے، جب تک کہ مخلوط مال میں سے مال ربوی کو الگ نہ کر لیا جائے، البتہ بعض شافعیہ اور حنابلہ کا موقف یہ ہے کہ اگر مال مخلوط میں اکثر مال ربوی ہو تب تو اس کی بیع خالص مال ربوی سے جائز نہیں ہے، لیکن اگر مال مخلوط میں غیر ربوی مال زیادہ ہو اور مال ربوی کم ہو تو پھر اس کی بیع خالص مال ربوی سے جائز ہے۔

مذکورہ تفصیل کا تقاضا یہ ہے کہ حضرت امام شافعیؒ کے مسلک کے مطابق نقود واملاک سے مخلوط شیئرز کی بیع شرعاً جائز نہ ہو، البتہ بعض شافعیہ اور حنابلہ کے موقف کے مطابق ضروری ہوگا کہ شیئرز کے خریدنے سے پہلے کمپنی کے اثاثوں کا جائزہ لیا جائے کہ اس کے شیئرز میں نقود کی مقدار زیادہ ہے یا غیر نقود کی، تاکہ اسی کے مطابق جواز وعدم جواز کا حکم لگایا جائے، کہ اگر کمپنی کے شیئرز میں اثاثے زیادہ ہوں اور نقود کی مقدار کم ہو تو شیئرز کی خرید وفروخت جائز ہو، اور اگر نقود کی

مقدار زیادہ ہواور دیگر اثاثے کم ہوں توشیئرز کی بیع کو ناجائز کہا جائے۔

۴۔مکمل حرام کاروبار کرنے والی کمپنی کا شیئر خریدنا:......وہ کمپنیاں جن کا بنیادی کاروبار حرام ہے جیسے شراب اور خنزیر کے گوشت کی تجارت اور اکسپورٹ، یا بینکس اور سودی اسکیموں میں روپیہ لگانا،اسی طرح سود اور جوئے پر مشتمل کاروبار کرنا یا بیمہ کرانا وغیرہ،تو ایسی کمپنی کے شیئرز کی خرید وفروخت شرعاً ناجائز ہے،اسی طرح بینک جس کا اصل کاروبار ہی سودی لین دین ہے تو وہ بھی اگر شیئر جاری کرے تو اس کے شیئر کی بھی بیع وشراء جائز نہیں۔

۵۔ضمناً حرام کاروبار کرنے والی کمپنی کا شیئر خریدنا:

اگر کوئی کمپنی ایسی ہے جس کا بنیادی کاروبار اصلاً حلال ہے،مثلاً انجینیرنگ کے سامان تیار کرنا یا عام استعمال کی مصرفی چیزیں تیار کرنا یا کوئی اور جائز کاروبار کرنا،تو ایسی کمپنیز کو اگر ان کے بنیادی کاروبار کے حلال ہونے کے باوجود بعض اوقات انکم ٹیکس وغیرہ سے بچنے کی غرض سے بینک سے سودی قرض لینا پڑتا ہو یا اس قسم کی کمپنی اپنی زائد رقم کو بینک میں رکھوا کر اس پر سود لیتی ہو،تو ظاہر ہے کہ یہ کمپنی کا اصل کاروبار نہیں ہے بلکہ یہ اس کا ایک ذیلی اور ضمنی کام ہے،تو اس قسم کی کمپنیوں کے شیئرز کی خرید وفروخت کے سلسلہ میں حضرات علماء کا اختلاف ہے،بعض علماء کی رائے یہ ہے کہ جو کمپنی سودی کاروبار کرتی ہے خواہ اس کا یہ کاروبار اصلاً ہو یا ضمناً ہو،اسی طرح اس کا سودی کاروبار کم ہو یا زیادہ ہو،بہر صورت ایسی کمپنی کے شیئرز کی خرید وفروخت ناجائز ہے،کیونکہ جو شخص ایسی کمپنیز کا شیئر خریدتا ہے یا لیتا ہے تو در حقیقت وہ کمپنی کے کارندوں کو حرام وناجائز اور سودی کاروبار کرنے کا وکیل بناتا ہے،لہذا کمپنی کا سودی لین دین بھی اس کی طرف منسوب ہوگا،اس لئے جو کمپنی کسی نہ کسی طرح سودی لین دین میں ملوث ہے اس کے شیئرز کو خریدنا درست نہیں،خواہ اس کا حقیقی وبنیادی کاروبار حلال وجائز ہی کیوں نہ ہو۔لیکن غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کمپنی کے سودی لین دین کی دو صورتیں ہیں:

ایک صورت تو یہ ہے کہ کمپنی قرضہ لے اور اس پر سود ادا کرے،اس صورت میں کمپنی کی آمدنی میں تو کوئی حرام عنصر شامل نہیں ہوا،اس لئے کہ جب کوئی شخص سودی قرضہ لیتا ہے تو یقیناً یہ فعل حرام اور سخت گناہ کا باعث ہے مگر وہ قرض کا مالک ہو جائے گا،لہذا اس رقم کے ذریعہ کاروبار کرکے جو آمدنی حاصل کرے گا وہ شرعاً حلال ہوگی،البتہ اس صورت میں زیادہ سے زیادہ یہ اشکال ہوسکتا ہے کہ کمپنی چونکہ شیئرز ہولڈر کی وکیل ہے،اس لئے سودی قرضہ لینے کی نسبت اس کی طرف بھی ہو گی،اور اس شخص کو سودی قرضہ لینے پر رضامند سمجھا جائے گا،تو اس اشکال کا جواب حضرت مولانا تھانویؒ نے یہ دیا ہے کہ جن حضرات کو کمپنی کے سود لینے کا علم ہو جائے تو وہ تصریحاً کارکنان کمپنی کو منع کردیں،گو اس ممانعت پر عمل نہ ہو مگر اس ممانعت سے اس فعل کی نسبت اس شخص کی طرف نہ ہوگی،اور اگر کمپنی کے سودی قرضہ لینے کا سرے سے علم ہی نہ ہو تب تو ظاہر ہے کہ بدرجہ اولی کارکنوں کا یہ فعل اس کی طرف منسوب نہ ہوگا،کیونکہ اس نے کارکنان کمپنی کو اس کا وکیل بنایا ہی نہیں ہے (امداد الفتاوی ۳؍۴۹۱)،یاد رہے کہ کمپنی کے سودی قرضہ لینے کی صورت میں شیئرز ہولڈرس کا کمپنی کے ذمہ داران کی طرف عدم رضامندی کا خط لکھ دینا کافی ہوسکتا ہے۔اور دور حاضر میں تو اس کی بہترین صورت یہ ہے کہ کمپنی کی سالانہ میٹنگ میں اس کے خلاف آواز اٹھائی جائے۔

لیکن جہاں فیصلے کثرت رائے سے ہوتے ہیں،وہاں اگر کوئی شخص سودی لین دین کے خلاف آواز اٹھائے،اور اقلیت میں ہونے کی وجہ سے اس کی رائے پر عمل نہ ہوسکے اور سودی لین دین بدستور جاری رہے تو کیسے کہا جاسکتا ہے کہ کمپنی میں سودی قرضہ وغیرہ لینا اس کے خلاف آواز اٹھانے والے شخص کی وکالت اور اس کی رضامندی سے ہو رہا ہے،لہذا صحیح اور درست بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ جب کمپنی کا اصل کاروبار تو جائز ہو اور ضمناً وہ کمپنی سود پر قرضہ لیتی ہو تو ایسی کمپنی کے شیئرز کو خریدنا جائز ہے،بشرطیکہ سود سے برأت کا اظہار کردیا جائے۔

کمپنی کے سودی لین دین کی دوسری صورت یہ ہے کہ کمپنی قرضہ دے کر سود لے جیسا کہ دور حاضر میں بیشتر کمپنیاں زائد رقموں کو بینکوں کے سیونگ اکاؤنٹ میں رکھوا کر اس پر سود لیتی ہیں،اب یہاں پر دو اشکال ہے:ایک تو یہ ہے کہ سودی معاملہ میں شیئرز ہولڈر کی شرکت ہو جائے گی،لیکن اس کا جواب تو وہی ہے جو اوپر گذرا۔دوسرا اشکال یہ ہے کہ کمپنی جو منافع تقسیم کرے گی اس میں سود کی رقم بھی شامل ہوگی جبکہ آمدنی کا جو حصہ سود سے حاصل ہوا ہے وہ شرعاً حرام ہے،تو اس اشکال کے جواب میں حضرت تھانویؒ نے دو باتیں بیان فرمائی ہیں:ایک بات تو یہ ہے کہ ہر کمپنی کے بارے میں یقین سے یہ معلوم نہیں کہ اس نے سود لیا ہے۔دوسری بات یہ ہے کہ اگر بالفرض کمپنی نے سود لیا بھی ہے تو وہ قلیل ہے،جو مال حلال میں مخلوط ہو گیا ہے۔اب ظاہر ہے کہ اگر مال مخلوط میں اکثر مال حلال ہو تو اس کے استعمال کی شرعاً گنجائش ہے۔لیکن یہاں مذکورہ جواب پر ایک اشکال وارد ہوتا ہے،اور وہ یہ ہے کہ اگر کوئی شخص مال مخلوط میں سے ہدیہ دے اور اس مال مخلوط میں حرام مال کم ہو تو ہدیہ لینا اس لئے جائز ہے کہ اس صورت میں یہ امکان ہے کہ یہ ہدیہ ممکن ہے کہ حلال مال میں سے دے رہا ہو۔لیکن کمپنی کے منافع میں

صورت حال اس سے مختلف ہے، اس لئے کہ کمپنی کو جتنی مدوں سے آمدنی حاصل ہوتی ہے، ہر مد کی آمدنی کا ایک متناسب حصہ اس نفع میں شامل ہوتا ہے، لہذا سود کا متناسب حصہ بھی نفع میں شامل ہوا، اب اگر کمپنی کی آمدنی کا دس فیصد حصہ سودی اکاؤنٹ سے حاصل ہوا ہے تو نفع کا بھی دس فیصد حصہ سودی ہوگا، لہذا نفع کا جتنا حصہ سودی ہے اس کا بلا نیت ثواب صدقہ کرنا لازم ہوگا۔

۶۔ سود دینے یا لینے والی کمپنی کے شیئرز خریدنا:...... جن حلال کاروبار کرنے والی کمپنیوں کو قانونی تقاضا پورا کرنے کے لئے اپنے سرمایہ کا کچھ حصہ ریزرو بینک میں جمع کرنا پڑتا ہے جس سے ان کمپنیوں کو سود ملتا ہے، یا ان کمپنیوں کو بانڈس خریدنے پڑتے ہیں جن کا کمپنیاں سود ادا کرتی ہیں تو ایسی کمپنیز کا شیئرز خریدنا جائز ہے، البتہ سود کی جو رقم ملتی ہے اس کا تصدق ضروری ہے (فقہی مقالات ۱/۱۵۰)۔

۷۔ سودی قرضہ کے ذریعے حاصل ہونے والے منافع کا حکم:...... سودی قرضہ لینے کی صورت میں اس قرض سے جو منافع حاصل ہوتے ہیں شرعاً وہ مفید ملک ہیں، اور ان کے ذریعے حاصل ہونے والی آمدنی حلال شمار کی جائے گی۔

۸۔ کیا مطلقاً وکیل کا عمل مؤکل کا عمل شمار ہوتا ہے:

کمپنی کا جو بورڈ آف ڈائریکٹرس ہوتا ہے اس کی حیثیت شیئرز ہولڈرس کے وکیل کی ہے لیکن اس کا عمل شیئرز ہولڈرس کا عمل سمجھا جائے گا، تو اس سلسلہ میں تصریحات فقہاء سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لازم نہیں ہے کہ وکیل کا عمل بعینہ مؤکل کا عمل شمار ہو۔

والدليل عليه ماقال صاحب الهداية: إذا أمر المسلم نصرانيا ببيع خمر أو بشرائها ففعل ذلك جاز عند أبي حنيفة (الهدايه ۴۱/۳)۔

۹۔ وکیل کے عمل سے مؤکل کب بری سمجھا جائے گا:...... اگر کسی کمپنی کا بورڈ آف ڈائریکٹرس کثرت رائے پر فیصلہ کرتے ہوئے بنیادی کاروبار کے حلال ہونے کے باوجود کچھ سودی قرضہ وغیرہ لیتا ہے اور کمپنی کی میٹنگ میں شیئرز ہولڈر سودی قرض سے اختلاف کرتا ہے اور اپنے اختلاف کا اعلان کر دیتا ہے، تو ایسی صورت میں اس کا یہ اعلان وکیل کے عمل کی ذمہ داری سے اسے بری کر دے گا (ایضاح النوادر ۱۰۵، امداد الفتاوی ۴۹۱/۳)۔

۱۰۔ کمپنی کے منافع میں ملنے والے سود کا حکم:...... اگر کسی کمپنی کے منافع میں سود کی رقم بھی شامل ہو اور اس کی مقدار معلوم ہو تو ایسی صورت میں منافع سے بقدر سود نکال کر صدقہ کر دینا واجب وضروری ہے (فتاوی عالمگیری ۳۳۳/۴)۔

۱۱۔ حلال کاروبار کرنے والی کمپنی میں آئے ہوئے سود کا حکم:...... اگر کمپنی کے منافع میں سود بھی شامل ہو اور حاصل ہونے والی سودی آمدنی کو کاروبار میں لگا کر نفع حاصل کیا گیا ہو مگر اس کمپنی کا کاروبار حلال ہو، تو ایسی صورت میں جتنا فیصد سود کل آمدنی میں مخلوط ہو گیا ہے اتنا فیصد سود کی رقم آنے اور ملنے والے منافع سے نکال کر صدقہ کر دینا شرعاً جائز و درست اور کافی ہے۔

۱۲۔ نفع حاصل کرنے کی غرض سے شیئرز کی تجارت کرنا:

شیئرز کی تجارت کرنا یعنی کوئی شخص کسی کمپنی کے شیئرز اس ارادے سے خریدے کہ قیمت بڑھنے کی صورت میں نفع کے ساتھ فروخت کر دوں گا تو شرعاً جائز ہے، البتہ کسی کمپنی کے شیئرز کی خرید وفروخت کے جواز کے لئے شرعاً چار شرطوں کا ملحوظ رکھنا ضروری ہے:

۱۔ کمپنی کا اصل کاروبار حلال ہو، ۲۔ کمپنی کے شیئرز کو فیس ویلو سے کم بیش کر کے فروخت کرنے کے لئے ضروری ہے کہ کمپنی کے اثاثے صرف نقد کی شکل میں نہ ہوں، بلکہ کچھ منجمد اثاثے بھی وجود میں آچکے ہوں، کیونکہ اگر نقد کی شکل میں کمپنی کا سرمایہ ہوگا تو کمی بیشی کے ساتھ خرید وفروخت کرنا جائز نہ ہوگا، ۳۔ اگر کمپنی سودی لین دین کرتی ہو تو اس کی سالانہ میٹنگ میں سود کے خلاف آواز اٹھائی جائے، ۴۔ اگر کمپنی کی آمدنی میں سود کی رقم شامل ہو، تو جب منافع تقسیم ہو کر ملیں تو اس وقت نفع کا جتنا حصہ سودی ڈپازٹ سے حاصل ہوا ہو اتنی مقدار صدقہ کر دے (اسلام اور جدید معیشت وتجارت ۸۹)۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ جس طرح کمپنی کے شیئرز کو خریدنا جائز ہے اسی طرح ان کو فروخت کرنا بھی جائز ہے، بشرطیکہ ان شرائط کو پورا کر لیا جائے جو اوپر ذکر کی گئیں۔

اب رہا یہ سوال کہ بازار کی صورت حال کو دیکھ کر جو منافع والے شیئرز لئے جاتے ہیں یا کم قیمت والے شیئرز خریدے جاتے ہیں، بظاہر یہ ایک طرح کی تخمین اور قیاس آرائی معلوم ہوتی ہے، تو کیا اس قسم کی قیاس آرائی شرعاً ممنوع ہے اور کیا اس قیاس آرائی کے سبب شرعاً شیئرز کی خرید وفروخت ناجائز ہوگی، تو اس سلسلہ میں حضرات علماء کے دو نقطہ نظر ہیں: عالم اسلام کے معروف عالم دین شیخ محمد صدیق الضریر، جو فقہ خصوصاً فقہ للمعاملات میں بڑی مہارت رکھتے ہیں، ان کی رائے یہ ہے کہ چونکہ شیئرز کو دیگر سامان تجارت کے مثل قرار دے کر قیمت بڑھنے کا اندازہ کر کے نفع کمانے کے ارادے سے اس کو خریدنے کی بنیاد محض تخمین اور قیاس آرائیوں پر ہے جس کو سٹہ (Speculation) کہتے ہیں، اس لئے جائز نہیں ہے، ان کا کہنا یہ ہے کہ قیاس آرائیوں کی بنیاد پر خرید وفروخت کی اجازت دینا سٹہ بازی کا راستہ کھولنا ہے، لہذا یہ جائز نہیں ہے، ان کے یہاں شیئرز کا خریدنا اور فروخت کرنا صرف اس صورت میں جائز ہے جبکہ خریدار کمپنی کے نفع نقصان میں شریک ہو کر سرمایہ کاری کے لئے خرید رہا ہو، لیکن اگر اصولی نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ اصل سوال شیئرز کی تجارت کے سلسلہ میں یہ نہیں ہے کہ اس کا خریدار کس نیت سے خرید رہا ہے، بلکہ اصل سوال یہ ہے کہ شیئرز فی نفسہ بیع وشراء کے قابل ہے یا نہیں؟ لہذا جب دلائل وشواہد کی روشنی میں یہ بات تسلیم کر لی گئی کہ شیئرز بیع وشراء کے قابل ہے اور اس کی بیع درحقیقت کمپنی کے اثاثوں میں متناسب حصہ کی بیع ہے، تو اب کوئی وجہ نہیں کہ شیئرز کی تجارت اور خرید وفروخت کو خواہ حصول نفع کی نیت سے کیوں نہ ہو، ناجائز قرار دیا جائے، اس لئے درست بات یہ ہے کہ بیع وشراء کی شرعی شرائط کو ملحوظ رکھ کر شیئرز کی خرید فروخت شرعاً جائز ہے، خواہ کسی بھی نیت سے ہو، خواہ شیئرز کو اپنے پاس رکھ کر سرمایہ کاری کے ارادے سے خریدا جائے یا قیمت بڑھنے پر نفع کمانے کی غرض سے خریدا جائے بہرصورت جائز ہے، البتہ خرید وفروخت کی شرائط کا ملحوظ رکھنا ضروری ہے، کیونکہ ان شرائط کی رعایت سے خود سٹہ بازی کا سد باب ہو جائے گا۔ البتہ اگر کمپنی کے شیئرز کی خرید وفروخت آپس کے ڈیفرنس کو برابر کرنے کی غرض سے قبضہ سے پہلے ہو اور شیئرز کا لینا دینا مقصود نہ ہو تو ایسا کرنا شرعاً جائز نہیں ہے، اور سٹہ بازی میں داخل ہے۔

۱۳۔ فیوچر سیل کا شرعی حکم:

شیئر مارکیٹ میں ایک سودا جو فیوچر سیل کے نام سے مروج ہے، جس کا مقصد شیئرز خریدنا نہیں ہوتا بلکہ بڑھتے گھٹتے دام کے ساتھ نفع نقصان کو برابر کر لینا ہوتا ہے، مثلاً زید نے سو شیئرز کا معاملہ فی شیئر سو روپے کے حساب سے کیا، اور ادائیگی ووصولی کی تاریخ مثلاً ۳۰ راگست مقرر کی، اب جب تیس اگست کی تاریخ آئی تو اس کی قیمت بڑھ کر ڈیڑھ سو روپے ہوگئی تو وہ خریدار شخص بائع سے پانچ ہزار روپے منافع وصول کر لے، اور اگر ۳۰ راگست کو اس شیئرز کی قیمت گھٹ کر پچاس روپے ہوگئی تو وہ شخص بائع کو پانچ ہزار روپے ادا کر دے، تو یہاں پر چونکہ اصل سودا محض کاغذی کارروائی ہے، نہ مشتری ثمن دیتا ہے اور نہ بائع مال دیتا ہے، اسی طرح نہ شیئرز پر قبضہ ہوتا ہے اور نہ ہی قبضہ پیش نظر ہوتا ہے، البتہ مقررہ تاریخ پر بڑھتے ہوئے دام کی صورت میں منافع یا گھٹتے ہوئے دام کی صورت میں خسارہ ادا کیا جاتا ہے، تو شریعت میں مذکورہ فیوچر سیل بالکل ناجائز وحرام ہے، کیونکہ اس قسم کی خرید وفروخت سراسر سٹہ بازی ہے جس کی حرمت قرآن پاک میں منصوص ہے۔ چنانچہ باری تعالی کا ارشاد ہے: ''يسئلونك عن الخمر و الميسر قل فيهما إثم كبير و منافع للناس وإثمهما أكبر من نفعهما'' (البقرہ ۲۱۹)۔ (لوگ آپ سے شراب اور جوے کے بارے میں پوچھتے ہیں، آپ کہہ دیجئے کہ ان دونوں میں بڑا گناہ ہے اور لوگوں کے لئے فائدے بھی ہیں، اور ان دونوں کا گناہ ان کے فائدے سے بہت بڑا اور زیادہ ہے)۔

ایک دوسری جگہ اس سے زیادہ تفصیل سے فرمایا گیا ہے: ''يا أيها الذين آمنوا إنما الخمر والميسر والأنصاب والأزلام رجس من عمل الشيطان فاجتنبوه لعلكم تفلحون، إنما يريد الشيطان أن يوقع بينكم العداوة والبغضاء في الخمر والميسر'' (المائدہ ۹۰-۹۱)۔ (اے ایمان والو! بلاشبہ شراب، جوا، بت اور پانسے یہ سب گندے کام ہیں شیطان کے، ان سے بچو تا کہ نجات پاؤ، شیطان تو یہی چاہتا ہے کہ تمہارے درمیان شراب اور جوئے کے ذریعہ دشمنی پیدا کر دے)۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ فیوچر سیل کا معاملہ جس میں شیئرز پر نہ مشتری کا قبضہ ہوتا ہے اور نہ بائع کا، بلکہ شیئرز کا لینا دینا ہی سرے سے مقصود نہیں ہوتا، بلکہ اصل مقصد سٹہ بازی کر کے آپس کے ڈیفرنس کو برابر کر لینا ہوتا ہے، تو شرعاً اس قسم کا معاملہ کرنا حرام وناجائز ہے، اور مذہب اسلام میں بیع منابذہ، ملامسہ وغیرہ کی جو ممانعت ہے اس کی وجہ بھی ان بیوعات میں جوئے کا ہونا ہے، چنانچہ ہدایہ میں بیع ملامسہ ومنابذہ کی ممانعت کے ذیل میں لکھا ہے:

۱۴۔ صیغہ استقبال کے ساتھ خرید وفروخت:...... غائب سودا جس کی بیع مستقبل کی طرف کر کے کی جاتی ہے، اور مشتری ثمن نہیں ادا کرتا، اور نہ ہی

کمپنی کو سامان تیار کرنے کا آرڈر دیتا ہے، تو شرعاً اس قسم کے معاملہ پر حقیقت بیع کا اطلاق نہیں ہوسکتا، کیونکہ اس کی حیثیت محض وعدہ کی ہے، لہذا وہ کسی کے لئے عقد لازم کے درجہ میں نہ ہوگا، اب اگر وقت مقررہ کے آنے پر بائع ومشتری میں سے کسی نے اس کا انکار کر دیا تو اس کو مجبور نہیں کیا جاسکتا، ہاں اسے وعدہ خلافی کہہ سکتے ہیں، البتہ اگر کوئی فریق عرف وعادت کی وجہ سے مجبور سمجھا جاتا ہو تو شرعاً اس طرح کا معاملہ کرنا ممنوع وناجائز ہے۔

۱۵۔ شیئرز پر قبضہ کا مطلب: ...... اس سلسلہ میں حضرات فقہاء نے جو کچھ لکھا ہے اس کا حاصل یہ ہے کہ بائع مبیع کو اپنے مال سے الگ کر کے اس طرح رکھ دے کہ خریدار اپنے سامان کو اپنے اختیار سے جب لے جانا چاہے، یا اس میں جب تصرف کرنا چاہے تو اسے اپنے سامان کو اٹھا کر لے جانے اور اس میں تصرف کرنے کے وقت کوئی رکاوٹ بائع کی طرف سے پیش نہ آئے، چنانچہ صاحب بدائع نے قبضہ کی حقیقت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے: ولا يشترط القبض بالبراجم لأن معنى القبض هو التمكين والتخلي وارتفاع الموانع عرفا وعادة وحقيقة (بدائع ۵٫۱۴۸)۔

ایک دوسری جگہ صاحب بدائع نے آگے چل کر قبضہ کے سلسلہ میں مزید بحث کی ہے اور لکھا ہے: ثم لا خلاف بين أصحابنا في أن أصل القبض يحصل بالتخلية في سائر الأموال (بدائع ۵٫۲۴۴)۔

یعنی فقہائے احناف کے درمیان اس بات میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ تمام اموال میں اصل قبضہ تخلیہ (یعنی مال کو چھوڑ دینے اور الگ کر دینے) سے حاصل ہوجاتا ہے، اور قبضہ کے تحقق کے لئے قبضہ بالید شرط نہیں ہے، بلکہ رکاوٹ کو دور کر دینا عرف وعادت میں قبضہ کے لئے کافی ہے۔ صاحب بدائع نے ایک اور جگہ قبضہ کی حقیقت پر تفصیلی بحث کرتے ہوئے لکھا ہے: تفسير التسليم والقبض فالتسليم والقبض عندنا هو التخلية والتخلي وهو أن يخلي البائع بين المبيع و بين المشتري عن التصرف فيه فيجعل البائع مسلما للمبيع والمشتري قابضا له (بدائع ۵٫۲۴۴)۔ (بائع کا خریدار کو مال) سونپنے اور (خریدار کا اس مال مبیع پر قبضہ) کرنے کی تفسیر ہمارے علمائے احناف کے نزدیک تخلیہ اور تخلی ہے، اور وہ یہ ہے کہ بائع مبیع مشتری کو حوالہ کر دے کہ وہ اس میں تصرف کر سکے، لہذا اب کہا جائے گا کہ بائع نے مبیع کو سونپ دیا اور مشتری اس پر قابض ہوگیا)۔

مذکورہ تفصیل کا حاصل یہ ہے کہ بائع اگر مبیع کو اپنے ضمان سے نکال کر مشتری کے ضمان میں کر دے کہ مشتری جیسے چاہے تصرف کر سکے، تو اسے شرعاً مبیع پر قبضہ کہا جائے گا، اگر یہ صورت شیئرز میں بھی ہوجاتی ہے کہ شیئرز مشتری کے ضمان میں آجاتا ہے، اور خریدار اگر اپنے خریدے ہوئے شیئرز میں تصرف کرنا چاہے تو اسے کوئی رکاوٹ پیش نہیں آتی ہے تو یہاں بھی یہ کہا جائے گا کہ شیئرز مشتری کے قبضہ میں آگیا، اور اب اگر وہ اس شیئرز کو فروخت کرنا چاہے تو فروخت کر سکتا ہے، اور شیئرز پر قبضہ کے تحقق کے لئے حسی قبضہ ضروری نہیں ہے بلکہ قبضہ حکمی کافی ہے، اسی طرح شیئرز پر قبضہ کے ثبوت کے لئے قبضہ بالید کی ضرورت نہیں ہے، بلکہ اگر غور سے دیکھا جائے تو شیئرز پر قبضہ کے ثبوت کے لئے قبضہ بالید ممکن بھی نہیں ہے، اس لئے شیئرز پر قبضہ کے تحقق کے لئے فقط قبضہ حکمی کافی ہے۔

اگرچہ شیئرز پر خریدار کی ملکیت کا تحریری ثبوت اس کے پاس سرٹیفکیٹ ملنے کے بعد آئے گا، اس لئے احتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ سرٹیفکیٹ پر قبضہ کئے بغیر آگے شیئرز کی خرید وفروخت کا معاملہ نہ کیا جائے، اور اسی قول محتاط پر فتوی دیا جائے۔

۱۶۔ شیئرز سرٹیفکیٹ کے حصول سے پہلے اس کی خرید وفروخت کا حکم: ...... اگر کوئی خریدار اپنے خرید کردہ شیئرز کو جس کی قیمت اس نے ادا کر دی ہے چاہتا ہے کہ اس کی سرٹیفکیٹ کے حصول سے پہلے اس کو فروخت کر دے تو یہ جائز ہے یا نہیں؟ تو اس سلسلہ میں جیسا کہ اوپر عرض کیا جا چکا ہے کہ عرف میں شیئرز کا قبضہ اسی وقت سمجھا جاتا ہے جبکہ سرٹیفکیٹ ہاتھ میں آجائے، نیز ہر چیز کے قبضہ کا طریقہ عرف ہی سے متعین ہوتا ہے، علاوہ ازیں بغیر سرٹیفکیٹ ملے ہوئے دھوکا دہی کا امکان ہے، نیز عرف میں اکثر لوگ بغیر کاغذی ثبوت کے قبضہ کا اعتبار نہیں کرتے ہیں، لہذا ان دلائل کا تقاضا ہے کہ سرٹیفکیٹ پر قبضہ کئے بغیر ہرگز آگے خرید وفروخت نہ کیا جائے۔

۱۷۔ شیئرز کی خرید وفروخت کے لئے دلالی کرنا: ...... اسٹاک ایکسچینج بازار میں خرید وفروخت کے لئے واسطہ بننے والوں کو بروکر کہتے ہیں جو دور حاضر میں شیئرز کی خرید وفروخت اور قیمتوں سے واقفیت رکھتا ہے، اور خرید وفروخت کی کاروائی کا اندراج کرتا ہے، تو ایسے شخص کی حیثیت ایجنٹ اور اجیر مشترک کی ہے، دوسرے لفظوں میں بروکر ہی کو دلال کہا جاتا ہے، اگر ایسے لوگ حلال کاروبار کرنے والی کمپنیوں کے ایجنٹ اور بروکر کی حیثیت سے کام کریں تو یہ شرعاً جائز ہے، اور ان کی اجرت شرعاً حلال ہوگی (بحث ونظر: شمارہ نمبر ۲۱ صفحہ ۳۸)۔ ☆☆☆

شیئرز یا حصص

مفتی عزیز الرحمن مدنی (دارالافتاء، بجنور)

موجودہ زمانہ میں ہر چیز کی وسعت پذیری کی وجہ سے تجارتی کاروبار میں بھی وسعت آئی ہے، چنانچہ کمپنیوں کے شیئرز اور اس کی خرید وفروخت موجودہ زمانہ کی دین ہے، ہمارے متاخرین علماء تک اس کی مثال نہیں ملتی، اس لئے شرعی بنیادوں اور اصولوں پر ہی اس کو قیاس کیا جاسکتا ہے۔

ابتدائی منزل میں جب کسی کاروبار کی تشکیل کی جاتی ہے تو ایک رجسٹریشن باڈی کاروبار کے کچھ اصول مرتب کر کے اپنے کاروبار میں شریک ہونے کی دعوت دیتی ہے اور اپنے تخمینہ کے مطابق شریکوں کے لئے ایک حصہ کی قیمت مقرر کر دیتی ہے، اب اگر وہ کاروبار جائز ہے تو شرکت بھی جائز ہے اور ناجائز ہے تو شرکت بھی ناجائز ہے، مثلاً شراب کی فیکٹری، سود کے لئے بینکوں کا وجود اسی ضمن میں آتا ہے، اس کمپنی میں شرکت کے حصہ کو شیئر کہتے ہیں، مثلاً ۱۰۰ روپے کے کاروبار میں ہر حصہ کی قیمت دس روپیہ ہو تو گویا دس روپیہ کی شرکت کا سرٹیفکیٹ خریدنے والا اس کمپنی کا شریک ہے اور یہ سرٹیفکیٹ اس کے حصہ شرکت کی نمائندگی کرتا ہے، یہ سرٹیفکیٹ نوٹ سے ذرا مختلف ہے، فرق صرف اس قدر ہے کہ نوٹ کی ملکی قیمت یکساں رہتی ہے جبکہ سرٹیفکیٹ کی قیمت یعنی حصہ شرکت کی قیمت گھٹتی بڑھتی رہتی ہے۔

مختلف شیئرز سے حاصل شدہ رقم کو طے شدہ پروگرام کے مطابق کاروبار میں ''زرلازری کشد'' کے اصول پر خرچ کیا جاتا ہے، مثلاً کمپنی انکم ٹیکس سے بچنے کے لئے کچھ سودی رقم بینکوں سے اسی تناسب سے لیتی ہے اور اپنی رقم بینک میں جمع کرتی ہے، کہ سود دے کر بھی بینک کی رقم سے نفع ہو اور اپنی رقم کا اتنا سود مل جائے کہ بینک کے ساتھ برابر سرابر کا معاملہ ہو جائے۔ اس طرح کاروبار میں شرکت کا یہ حصہ سودی کاروبار ہوتا ہے جو حرام ہے اور اس میں شرکت جائز نہیں ہے۔ اتفاق سے شیئرز ہولڈر کے حصہ میں یہ سودی رقم بھی آتی ہے جس میں اس کے حصہ کی نمائندگی ہوتی ہے۔

اس کے بعد بنیادی کاروبار شروع ہوتا ہے، اور کل رقم میں بلڈنگ، سامان تجارت، مشینری وغیرہ جامد اشیاء ہوتی ہیں، ان ہی سب چیزوں کو رکھ کر شیئر کی قیمت مقرر کی جاتی ہے، اس لئے ہر ایک شیئر کے مقابل کمپنی کی جامد اشیاء اور کمپنی کا سیال سرمایہ جو قرضوں میں بٹا ہوا ہوتا ہے نمائندہ ہوتا ہے اور ہر ایک حصہ دار اپنے حصہ کو فروخت کرنے کا کمی بیشی کے ساتھ مالک اور مختار ہوتا ہے، لیکن اس کے لئے چند شرائط ہیں جن کو ذہن میں رکھنا چاہئے:

۱۔ بنیادی طور پر کاروبار حرام نہ ہو۔

۲۔ کمپنی کا تمام سرمایہ سیال نہ ہو بلکہ کچھ سرمایہ منجمد، بلڈنگ، مشینری، تیار ہونے والا خام مال بھی ہو، شیئرز کا وہ جزو جو کمپنی کے اس اثاثہ کے مقابل ہے اسی کو کمی بیشی سے بیچنا جائز ہے، اور شیئرز کا وہ حصہ جو سیال سرمایہ کے مقابل ہے وہ بیع صرف کے حکم میں ہے اس میں کمی بیشی جائز نہیں ہے۔

کمپنیوں کے ان شیئرز اور حصص کی مارکیٹ میں ایک دوسری صورت بن جاتی ہے جو سٹہ بازی اور غلط طور پر نفع اندوزی کی شکل اختیار کر لیتی ہے جس کی شریعت میں گنجائش نہیں ہے۔

ہم سے بعض حضرات نے بتلایا ہے کہ کمپنیوں کے بنیادی خریدار یعنی قوت منتظمہ جو ابتدائی شرکاء ہوتے ہیں ان کے لئے لازم ہے کہ وہ سود سے حاصل شدہ رقم کو صدقہ کر دیا کریں، اور سودی رقم کے علاوہ جو ان کے حصہ میں منافع اور اثاثہ آتا ہے اس پر زکوۃ بھی دیا کریں، اور اس کاروبار کی شرکت کو اچھا نہ سمجھیں تو کمپنی کے حصے دار بننے اور شیئرز ہولڈر ہونے میں کوئی حرج نہیں ہے جائز ہے، اتفاق سے میں اس رائے سے بالکل متفق نہیں ہوں، کیونکہ ہر مسلمان بقدر حیثیت اتباع دین اور اشاعت دین کا مکلف ہے۔

رہا زکوۃ وغیرہ کا معاملہ تو کمپنی کے بنیادی ممبران کی ذمہ داری ہے یا پھر ہر شیئرز ہولڈر کی بقدر اثاثہ ذمہ داری ہے، کیونکہ ہر شیئرز ہولڈر بقدر حصہ مالک ہے اور بتوسط قوت حاکمہ قابض ہے، اسی بنیاد پر اس کو اپنا شیئر کم یا زیادہ میں فروخت کرنے کا اختیار ہے ورنہ بیع قبل القبض، یا بیع غیر مقدور التسلیم لازم آئے گی جو جائز نہیں۔ ☆☆☆

شیئرز۔ فقہ اسلامی کی روشنی میں

مولانا زبیر احمد قاسمی[1]

ایک بڑی رقم سے بڑے پیمانے پر تجارت وسرمایہ کاری کرکے زائد منافع حاصل کرنے کی غرض سے ''مشترک تجارت'' کے عنوان پر مختلف کمپنیاں ملک میں قائم ہیں اور ہو رہی ہیں۔ ہمارے علم واطلاع اور تحقیق وآگہی کے مطابق تقریباً ساری کمپنیاں دو دور یا دو مرحلہ سے گذرتی ہیں۔

پہلا مرحلہ:

یہ دور ومرحلہ اس کے ابتدائی وجود وقیام کا ہوتا ہے، جس میں اولاً چند اشخاص پر مشتمل ایک بورڈ بنتا ہے جو بنام فلاں کمپنی اپنا اشتہار شائع کرتا ہے، جس میں کچھ اصول وضوابط کے ساتھ کسی خاص تجارت کے منصوبے اور طریقہ کار کی وضاحت، اس تجارت کے لئے جتنے سرمایہ کی ضرورت ہوتی ہے اس کا اظہار، اور پھر اس میں شرکت اور حصہ دار بننے کی نوعیت وشرائط کو بیان کرتے ہوئے مطلوب سرمایہ کو مختلف حصوں پر تقسیم کرکے ایک ایک حصہ کو شیئرز سے موسوم کیا جاتا ہے، اور عام لوگوں کو اس شیئرز کے خریدنے کی دعوت دے کر گویا اس تجارت میں شریک ہونے اور اس مشترکہ سرمایہ کاری کے ذریعہ منافع حاصل کرنے کی ترغیب دی جاتی ہے۔

مثلاً زیر ہدف تجارت کے لئے مطلوب سرمایہ اگر ایک ہزار روپے ہیں اور اس کو سو حصہ کرکے کمپنی فروخت کرتی ہے، اور کوئی شخص ایک حصہ دس روپے دے کر اور کوئی دو حصہ بیس روپے دے کر خریدتا ہے تو اس کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ پہلا خریدار پورے سرمایہ کا ایک فیصد اور دوسرا دو فیصد حصہ کمپنی کے حوالہ کرتا ہے اور سرمایہ میں ایک فیصد اور دو فیصد کا یہ دونوں مالک سمجھے جاتے ہے، چنانچہ تجارت شروع ہونے اور منافع حاصل ہونے کے بعد اسی حساب وتناسب سے منافع میں دونوں کو حصہ ملا کرتا ہے۔ اس کا حاصل یہ نکلا کہ کمپنی کے اس ابتدائی وجود وقیام کے مرحلے میں جو شخص بھی شیئرز کا خریدار بنتا ہے وہ دراصل قیمت شیئرز کی صورت میں اپنا مال کمپنی کے حوالہ کرتا ہے کہ وہ تجارت کرے اور منافع میں حسب ضابطہ وشرائط ہمیں شریک کرے۔

اب کمپنی کی طرف سے اس حصہ کی خریدگی کا جو ثبوت بشکل دستاویز اور شیئرز سرٹیفیکٹ دیا جاتا ہے وہ دراصل اسی قدر مال ومالیت کا ثبوت اور نمائندہ ہے جو اس شخص کا کمپنی کے مشترک سرمایہ میں حصہ ہوتا ہے اور بس۔ اب یہاں یعنی کمپنی کے اس ابتدائی مرحلہ کے دوران چند سوالات پیدا ہوں گے:

پہلا سوال تو یہ ہوگا کہ اس قسم کی کمپنیوں کے شیئرز کا اس ابتدائی مرحلہ میں خریدنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟ اس کا جواب یہی ہوگا کہ اگر وہ کمپنی غیر شرعی کاروبار اور عقود فاسدہ کے ذریعہ منافع حاصل نہ کرنے کی پابند رہے تو جائز ہے، ورنہ تعاون علی الاثم کی معصیت کا ارتکاب ہوگا جو ناجائز ہے۔

دوسرا سوال یہ پیدا ہوگا کہ شیئرز کا یہ خریدار اول خواہ شیئرز سرٹیفیکٹ کے حاصل ہونے سے پہلے یا اس کے بعد اگر اپنا وہ حصہ فروخت کرنا چاہے تو کتنے میں بیچ سکتا ہے؟

اس کے جواب میں تفصیل یہ ہوگی کہ اگر کمپنی کی اعلان کردہ پالیسی اور کاروبار کے متعلق اس کے ضابطے اور طریقہ کار میں یہ طے ہو کہ جمع شدہ کل مشترک سرمایہ میں سے اتنا فیصد تو جامد املاک، اراضی، عمارت، مشین، فرنیچر وغیرہ میں مشغول رکھا جائے گا اور باقی حصہ سے منافع بخش کاروبار کرکے منافع حاصل کئے جائیں گے۔ لیکن کمپنی اب تک اپنے وجود وقیام کے ابتدائی مرحلے ہی میں ہے، کام صرف شیئرز کی بیع وشراء کے ذریعہ مطلوب سرمایہ جمع کرنے ہی کا ہو رہا ہے، جامد املاک، اراضی، عمارت، مشین، فرنیچر وغیرہ کے حصول تک کا کام شروع نہیں ہوا ہے، اور اسی دوران شیئرز کا کوئی خریدار اول اپنا شیئرز بیچنا چاہے تو وہ اپنے حصہ کی مالیت کے بقدر ہی نقد روپے کے بدلے فروخت کرسکتا ہے، کیونکہ یہ نقد کی نقد سے بیع ہوگی، مساوات ضروری اور کمی بیشی ناجائز ہوگی۔

دوسرا مرحلہ:

لیکن اگر کمپنی عملاً کاروبار شروع کرچکی ہے اور اب سارا نقدی سرمایہ طے شدہ پالیسی وضابطہ کے مطابق جامد املاک، اراضی وعمارت، مشین اور خام مال

---

[1] ناظم، اشرف العلوم کنہواں، سیتامڑھی۔

وغیرہ میں بدل چکا ہے تو اب پہلا شیئر ہولڈر فقہ کے مشہور ضابطہ ''صرفا الی خلاف الجنس'' کے مطابق اپنا حصہ کمی بیشی کے ساتھ فروخت کرسکتا ہے۔

اگر کمپنی کی پالیسی اور اعلان کردہ ضابطہ اور طریقہ کار یہ طے ہو کہ شیئر ہولڈروں سے حاصل کردہ پورا سرمایہ صرف منافع بخش کاروبار ہی میں مشغول رہے گا۔ کاروبار کے لئے ضروری اشیاء یعنی جامد املاک، عمارت وفرنیچر اور مشین وغیرہ میں وہ سرمایہ نہیں لگایا جائے گا، ایسی صورت میں اگر کوئی شیئرز ہولڈر اپنا شیئرز بیچنا چاہے تو پہلے تحقیق کرنی ہوگی کہ ان دنوں کمپنی کا سارا سرمایہ نقد ودیون کی شکل میں بدل چکا ہے، یا کچھ نقد ودیون ہیں اور کچھ اسباب تجارت وعروض کی شکل میں بھی ہیں، اور پھر اس شیئرز ہولڈر کا منافع وغیرہ ختم ہو کر اب اس کا پورے سرمایہ میں کتنا حصہ کتنی مالیت کا بن چکا ہے۔ تب نقد دیون والی صورت میں اپنے حصہ کی مالیت کے مساوی نقد کے بدلے بیچے گا، کمی بیشی جائز نہ ہوگی۔ ہاں دوسری صورت جس میں کچھ نقد دیون بھی ہیں اور کچھ اسباب وعروض بھی ہیں، اس میں کمی بیشی کے ساتھ جتنی قیمت میں چاہے اپنا حصہ فروخت کرسکتا ہے۔ صرفا الی خلاف الجنس معاملہ جائز ہوگا۔

آج کل کمپنیوں کی واقعی حیثیت:

اوپر جو کچھ بیان کیا گیا ہے وہ کمپنی کی امکانی نوعیت وحیثیت کے پیش نظر کیا گیا ہے لیکن عموماً کمپنیوں کی جو نوعیت ہے اس سے واقف وباخبر بعض حضرات سے گفتگو کے بعد معلوم ہوا کہ دراصل کمپنی کا بورڈ آف ڈائریکٹرس کمپنی کے جملہ منجمد اثاثے، اراضی وعمارت، فرنیچر اور مشین وغیرہ کا مالک ہوتا ہے، اور شیئرز کی بیع وشراء کے ذریعہ شیئرز ہولڈروں سے جو سرمایہ جمع ہوتا ہے اسی سے منافع بخش کاروبار کئے جاتے ہیں۔ گو اس میں وہ بورڈ آف ڈائریکٹرس شیئرز کے خریدار ہو کر شیئرز ہولڈر کی حیثیت بھی حاصل کئے رہتے ہیں اور سب کے سب اپنے اپنے شیئرز کی مناسبت سے حسب ضابطہ وشرائط منافع میں بھی شریک ہوتے ہیں۔

اگر کمپنی کی واقعی نوعیت یہی ہے تو پھر سب سے پہلے یہ طے کرنا ہوگا کہ جب بورڈ آف ڈائریکٹرس اپنا سرمایہ بھی لگاتے ہیں اور عملاً کاروبار میں حصہ بھی لیتے ہیں، اور عام طور پر جو شیئرز ہولڈر ہوا کرتے ہیں وہ قیمت شیئرز کی شکل میں صرف اپنا سرمایہ کمپنی کے حوالہ کرتے ہیں، کسی کاروبار میں عملاً کوئی حصہ نہیں لیتے تو فقہی اصطلاح میں یہ کون سا معاملہ ہوا۔

شیئرز کی خریداری عقد قرض ہے یا شرکت یا مضاربت:

میں نے اپنے طور پر جتنا غور کیا اسی نتیجے پر پہونچا کہ یہ دراصل مضاربت ہے۔ عقد شرکت فی العنان بھی کہنا مشکل ہے۔ اور قرض واستقراض تو ہرگز نہیں، ورنہ پھر منافع مطلقاً حرام بن جائے۔ عقد شرکت بھی نہیں، کیونکہ فقہاء لکھتے ہیں: وأما العمل في الشركة فمن الجانبين فلو شرط خلوص اليد لأحدهما لم تنعقد الشركة لانتفاء شرطها وهو العمل منهما (التحرير المختار للعلامه الرافعی ۲/۷۱)۔

آگے لکھتے ہیں: شرط منها شرط لتحقق الشركة وإذا شرط على أحدهما تكون مضاربة (حوالہ سابق)۔

مذکورہ بالا فقہی نصوص کا واضح مطلب یہی نکلتا ہے کہ کمپنی کے شیئرز ہولڈرس جب قیمت شیئرز کی شکل میں اپنا سرمایہ کمپنی کے حوالہ کر کے عملاً اور اصالۃً کاروبار میں کوئی حصہ نہیں لیتے تو رب المال کے درجہ میں ہوئے اور کمپنی مضارب ہوئی۔ ہاں کمپنی میں شریک وہ سارے لوگ جو اپنا اپنا سرمایہ بھی لگاتے ہیں اور پھر سب عمل تجارت اور اس کے متعلقہ کاموں میں عملی طور پر حصہ بھی لیتے ہیں وہ لوگ باہم شرکاء کہلا سکتے ہیں۔ اور یہ شرعاً ممکن وجائز ہے کہ چند شرکاء کے مشترک کاروبار میں کچھ اور لوگ محض بعقد مضاربت شریک فی النفع ہو جائیں، اور یہ رب المال حضرات محض شریک فی النفع ہوں، کمپنی کے منجمد املاک، عمارت وفرنیچر اور صنعت وحرفت کے آلات ومشین میں شریک نہ قرار پائیں۔

شیئرز سرٹیفیکٹ محض ثبوت ودستاویز ہے:

میری نظر میں سارے شیئرز ہولڈرس کو جو کمپنی یا اس کے ایجنٹ کی طرف سے شیئرز سرٹیفیکٹ دی جاتی ہے وہ محض اس بات کا ثبوت ہے کہ اس شیئرز ہولڈر کا فلاں کمپنی میں اتنا سرمایہ اور اتنی ملکیت مسلّم وموجود ہے، یعنی وہ سرٹیفیکٹ کمپنی میں شیئرز ہولڈر کی ملکیت وحصص کی نمائندگی کرتی ہے۔

مرسلہ سوالوں کے مختصر جوابات

۱۔ شیئرز سرٹیفیکٹ کمپنی میں شیئرز ہولڈر کی ملکیت کی نمائندہ ہے، اور کمپنی کے جمیع سرمایہ میں حسب تناسب حصہ دار ہونے کی دلیل وثبوت ہے۔

بعض وہ صورت جس میں باہمی قرارداد سے کمپنی تحلیل ہوجاتی ہے اور تمام شیئرز ہولڈرس کو اس کے شیئرز کے تناسب سے اگر صرف تجارتی اثاثے میں حصہ ملتا ہے، نفع ہو تو نفع کے ساتھ اور نقصان ہو تو خسارہ کے ساتھ، تو یہ دراصل تقسیم اثاثہ ہے جو ہونا ہی چاہئے، اور حسب شرائط وضابطہ نفع ونقصان دونوں میں شرکت ہونی ہی چاہئے، اور ظاہر ہے کہ یہ تقسیم اسی شیئرز سرٹیفیکٹ کی بنیاد پر حصہ رسدی ہوتی ہوگی، اور اگر کمپنی کی تحلیل کے بعد سارے شیئرز ہولڈرس کو بھی جمیع املاک حتی کہ اراضی وعمارت، فرنیچر وغیرہ کے ساتھ تجارتی اثاثے میں حسب تناسب حصہ ملا کرتا ہے، تو یہ کمپنی کی اسی نوعیت وحیثیت میں ہوگی جس میں شیئرز سے حاصل شدہ جمیع سرمایہ کا کچھ حصہ جامد املاک کے مہیا کرنے میں مشغول رکھا گیا ہوگا اور بقیہ سرمایہ سے تجارتی اور منافع بخش کاروبار کئے گئے ہوں گے۔

۲۔ کسی کمپنی کے ابتدائی وجود وقیام کے مرحلہ میں جب شیئرز کا اعلان ہوتا ہے اور کوئی شخص شیئرز خرید لیتا ہے تو جب تک وہ سرمایہ کاروبار میں لگ کر اسباب وعروض کی شکل میں بدل نہیں جاتا، کسی شیئرز ہولڈر کا اپنا حصہ فروخت کرنا اپنے حصہ کی مالیت کے بقدر مساوی ہی جائز ہوگا، کمی بیشی ناجائز ہوگی۔

۳۔ کمپنی کے دوسرے مرحلہ میں داخل ہوجانے یعنی عملاً کاروبار شروع ہوجانے کے بعد جن ایام میں اثاثہ مخلوط من النقد والعروض ہوگا تو شیئرز ہولڈر اپنے حصہ کی فروخت کمی بیشی کے ساتھ کرسکتا ہے۔ صرفاً الی خلاف الجنس معاملہ جائز ہوگا، ورنہ پھر بقدر مساوی ہی بیچنا جائز ہوسکے گا۔

۴۔ جن کمپنیوں کا بنیادی کاروبار حرام ہوگا اس کے شیئرز کی خریداری مسلمانوں کے لئے تعاون فی الاثم کی بنا پر جائز نہیں ہوگی۔

۵،۶۔ جن کمپنیوں کا بنیادی کاروبار حلال ہو مگر کبھی کاروبار کے خاص اور ناگزیر حالات میں بدرجہ مجبوری سودی قرضہ لینا پڑتا ہو تو قاعدہ فقہیہ "یجوز للمحتاج الاستقراض بالربح" کے تحت جب کسی مسلمان تک کے لئے یہ استقراض مباح ہوجاتا ہے تو کمپنی جو غیر مسلم فرد اعتباری کے درجہ میں ہے اس کے لئے یہ استقراض تو بدرجہ اولی جائز ہوگا، اور ایسی کمپنیوں کا شیئرز خریدنا یقیناً جائز ہوگا، اگر کمپنی سود لے تب ناجائز ہوگا۔

۷۔ سودی قرضہ بوقت مجبوری اور بوجہ حاجت شرعیہ لیا جائے، یا بلا حاجت شرعیہ محض فروغ تجارت کے لئے لیا جائے، پہلی صورت میں بطور قرض حاصل کردہ مال تو حلال ہی ہوگا اور اس سے حاصل شدہ منافع بھی حلال ہی رہیں گے۔ البتہ دوسری صورت میں ضابطہ شرعیہ "حرمة العقد لا يستلزم حرمة المال" کے تحت قرض کے طور پر حاصل کردہ مال اور پھر اس سے حاصل کردہ منافع کو مباح وحلال ہی رہیں گے، لیکن بلا حاجت شرعیہ چونکہ استقراض بالربح کا یہ عقد حرام افراد کمپنی، بورڈ آف ڈائریکٹرس نے اصالۃً (بشرط اسلام) اور تمام مسلمان شیئرز ہولڈرس نے وکالۃً کیا، اس لئے عند اللہ مجرم وگنہگار ہوں گے۔ بایں ہمہ "حرمة العقد لا يستلزم حرمة المال" کے مطابق مال ومنافع حلال وطیب ہی کہلائیں گے۔

۸۔ جیسا کہ اوپر ہم نے تفصیلاً لکھا ہے اس کی روشنی میں واقعہ یہی ہے کہ شیئرز ہولڈر کی حیثیت ایک رب المال کی اور کمپنی کے بورڈ آف ڈائریکٹرس فرد اعتباری کی حیثیت مضارب ہی کی ہوتی ہے۔

المضاربة توكيل بالعمل لتصرفه بأمره (در مختار ۴۸۴،۴)۔

۹۔ اگر کوئی شیئرز ہولڈر سودی قرضہ لینے سے اپنے اختلاف کا اعلان کردے اور اپنی وسعت کے مطابق بورڈ آف ڈائریکٹرس کو استقراض بالربح سے روک دے تو گو یہ غیر موثر ہی ہو، مگر یہ عند اللہ کمپنی کے فعل حرام کی ذمہ داری سے انشاء اللہ بری الذمہ ہوگا۔

۱۰،۱۱۔ اگر کوئی کمپنی منافع حاصل کرنے میں عقود فاسدہ وباطلہ کی پرواہ نہ کرے حتی کہ قرض دے کر سود حاصل کرنے سے بھی احتراز نہ ہو، یا قانونی مجبوری کے تحت ہی کمپنی کو اپنا سرمایہ بینک میں رکھ کر سود لینا پڑے، یا سیکورٹی بانڈس خرید کر سود لینے سے نہ بچ سکے گو یا وہ کمپنی عقود فاسدہ وباطلہ کے ذریعہ منافع حاصل کرنے سے بچنے کی پابند نہ رہ سکے تو ان سارے حالات ومعاملات سے واقف ہوتے ہوئے کسی مسلمان کے لئے شرعاً جائز نہیں ہوگا کہ وہ ایسی کسی کمپنی کا شیئرز خریدے۔

بایں ہمہ اگر کسی مسلمان نے ایسی کمپنی کا شیئرز خرید ہی لیا تو گرچہ وہ اس فعل حرام کے سبب عند اللہ مجرم وگنہگار قرار پائے گا لیکن کمپنی کی طرف سے جو منافع اس کو حصہ رسدی سے ملے گا اس میں وہ منافع بھی یقیناً شامل ہوگا جو مال حلال سے بطریقہ حلال حاصل کیا گیا ہوگا۔ اس لئے ورع وتقوی اور احتیاط کا تقاضا تو یہی ہوگا کہ شیئرز ہولڈر اپنے حصہ سے اپنے علم وتحقیق، قیاس وتخمین بظن غالب کے مطابق سودی آمدنی اور اس سے حاصل شدہ منافع کے بقدر نکال کر صدقہ کردے۔ لیکن چونکہ خلط استہلاک اور تقسیم مطہر مال ہوجاتا ہے، اس لئے اس تمام ملے ہوئے منافع کو خود شیئرز ہولڈر بھی ازروئے فتوی استعمال میں لاسکتا ہے، اس صورت کی پوری تفصیل اور اس کے مفصل دلائل امداد الفتاوی (۳؍۴۹۸) میں مذکور ہیں۔

۱۲۔ شیئرز کی تجارت فی نفسہ جائز وصحیح ہے، حضرت تھانویؒ نے اسے بیع حظوظ الائمہ (اوقاف کے وہ حصے جس کو واقف نے ائمہ مساجد پر وقف کیا ہو) پر قیاس کرتے ہوئے فرمایا ہے: حاصله جواز بيع الحقوق الموجودة قبل القبض دون المعدومة (امداد الفتاوی ۳؍۴۹۵)۔ ہمارے خیال میں شیئرز کی بیع دراصل اس حصہ حقوق کی بیع ہے جو کسی شیئرز ہولڈر کا اس کمپنی میں حسب ضابطہ بشکل سرمایہ ومنافع رہتا ہے۔ اب بازار کے اتار چڑھاؤ، کمپنی کی ساکھ اور کاروبار کی نوعیت سے ہر حصہ کے منافع کا اضافہ کبھی تھوڑی تھوڑی مدت ہی میں نمایاں محسوس ہونے لگتا ہے، اور ہر تجربہ کار ذہن جسے کاروباری معاملات سے تعلق ہوتا ہے اور بازار کی رسد وطلب کے تجزیہ کی صلاحیت ہوتی ہے وہ اندازہ کر لیتا ہے کہ کس کمپنی کے شیئرز کی مالیت وقدر اور اس کا ویلوویشن کب کتنا بڑھ گیا ہے، اس طرح ان شیئرز کے زیادہ منافع بخش ہونے کا تصور ہونے لگتا ہے اور پھر ان شیئرز کی فروخت زیادہ سے زیادہ ثمن میں ہونے لگتی ہے، اور یہ حقیقت ہے کہ کسی شیئر کی قدر اور ویلوویشن کے بڑھنے یا گھٹنے کا پتہ کمپنی کے اعلانیہ وغیرہ کے علاوہ بازار کے حالات اور کمپنی کی ساکھ کی روشنی میں قیاس وتخمین سے ہی ہوا کرتا ہے۔

اب کبھی یہ قیاس واقع کے مطابق بھی ہوتا ہے اور کبھی خلاف واقعہ، مگر اپنی جگہ یہ بھی امر واقعی ہی ہوتا ہے کہ کمپنی کے کاروباری مرحلہ میں داخل ہوجانے کے بعد عام حالات میں سارا سرمایہ صرف نقد ودیون ہی کی شکل میں متبدل نہیں ہوجاتا بلکہ ہمیشہ سرمایہ کا کچھ حصہ بشکل نقد ودین رہتا ہے تو کچھ حصہ بشکل اسباب وعروض وخام مال بھی رہا کرتا ہے، اور شیئرز ہولڈر کا حق اپنے شیئرز کے بقدر نقد ودین اور اسباب وعروض اور خام مال سبھی میں دائر وسائر ہوتا ہے، اس لئے ان شیئرز کا جو بھی ویلوویشن اور قدر ومالیت ظن وتخمین سے قرار دے کر جس قیمت میں بھی خرید ااور بیچا جائے، صرفا إلى خلاف الجنس یہ معاملہ حد جواز ہی میں رہے گا۔

۱۳۔ شیئرز مارکیٹ میں وہ سودا جسے فیوچر سیل (بياعات مستقبليات) کہا جاتا ہے اس کے مقصد اور طریقہ کار کی جو وضاحت سوال میں کی گئی ہے، یہ تو ہماری سمجھ کے مطابق سٹہ بازی اور جوا بازی ہے، جسے حرام ہی کہا جاسکتا ہے۔ واللہ اعلم

۱۴۔ اگر اس سوال کا مقصود وہی فیوچر سیل ہے تب تو حکم اوپر لکھا جاچکا ہے، اور اگر بیع سَلَم کی طرح کا کوئی دوسرا معاملہ مراد ہے تو عقد سَلَم کی شرائط کے ساتھ اسے جائز کہا جاسکتا ہے ورنہ نہیں۔ بہرحال یہ سوال میری سمجھ میں نہیں آیا۔

۱۵۔ شیئرز کی جب اصل حیثیت یہ ٹھہری کہ دراصل وہ شیئرز ہولڈر کا حق وحصہ ہوتا ہے جو اس کمپنی کے اثاثے اور تجارتی سامان وعروض وغیرہ میں ہوتا ہے اور شیئرز سرٹیفکیٹ صرف اس حصہ وحق کا ایک ثبوت ہوتا ہے، تو شیئرز کی نقد بیع کا مطلب یہ ہوا کہ صاحب شیئرز اپنے اس حصہ وحق کا جو اس کا کمپنی میں موجود وثابت ہے عوض لے کر خریدار کے حق سے دست بردار ہوگیا۔ گویا شیئرز کی بیع وشراء ایک کے لئے اپنے حق سے دست برداری ہوتی ہے اور دوسرے کے حق میں اس حصہ وحق پر اس کی ملکیت کا اثبات ہوتا ہے۔

۱۶۔ اسے صلح وتخارج کے عنوان سے بھی تعبیر کیا جاسکتا ہے یعنی شیئرز کے بائع نے کچھ عوض لے کر مشتری کے حق میں اپنے حصہ کے استحقاق سے دست بردار ہوگیا، شیئرز سرٹیفکیٹ پر قبضہ ہونے نہ ہونے سے اس معاملہ میں کچھ فرق نہیں ہوسکتا، شیئرز کی اس پہلی بیع وشراء کے بعد جو دوسری یا تیسری بیع ہوگی سب کی حیثیت وہی اپنے حق وحصہ سے دست برداری اور تخارج کی قرار دی جاتی رہے گی، اور حق موجودہ کی بیع قبل القبض کا جواز اوپر لکھا جاچکا ہے۔

۱۷۔ اسٹاک ایکسچینج بازار میں شیئرز کی خرید وفروخت کے لئے واسطہ بننے والے جسے "بروکر" کہتے ہیں اور جس کی حیثیت ایک ایجنٹ کی ہوتی ہے، کا یہ عمل فریب ودغا سے اگر خالی ہو تو "اجیر مشترک" کی طرح ایک اجرت معینہ پر یہ دلالی جائز کہی جائے گی ورنہ نہیں۔

☆☆☆

حصص کی شرعی حیثیت

مولانا قاضی عبدالجلیل قاسمی [1]

۱۔ کمپنی کا خرید کردہ شیئر کمپنی میں شیئر ہولڈر کی ملکیت کی نمائندگی کرتا ہے۔ یہ محض کمپنی کو رقم دیئے جانے کی دستاویز نہیں ہے۔ شیئر ہولڈر کے دیوالیہ ہونے کی صورت میں موجودہ قانون کے مطابق اس کی املاک ضبط کر کے اس کے قرض ادا کئے جاتے ہیں، اس وقت اس کے حصہ کے تناسب سے کمپنی کے اثاثے قرق نہیں کئے جاسکتے۔ یہ اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ شیرز کمپنی کو دی گئی رقم کی دستاویز ہے۔

اگر کوئی شخص مفلس ہو تو صاحبین کے نزدیک اس کی منقولہ بلکہ غیر منقولہ اشیاء اراضی وغیرہ بھی فروخت کر کے اس کے قرضہ کی ادائیگی کی جائے گی، لیکن اس کا رہائشی مکان فروخت کر کے قرضہ ادا نہیں کیا جاتا ہے، اس سے یہ لازم نہیں آتا ہے کہ وہ مکان کا مالک نہیں ہے۔

اسی طرح اگر حکومت نے کسی مصلحت کی وجہ سے یہ قانون بنا دیا کہ شیئر ہولڈر کے دیوالیہ ہونے کی صورت میں اس کے حصہ کے تناسب سے کمپنی کے اثاثے قرق نہیں کئے جائیں گے، تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ اثاثوں کا مالک نہیں ہے۔ بلکہ کمپنی اگر تحلیل ہو جائے تو شیئر ہولڈر کو اس کے شیئرز کے تناسب سے اثاثوں میں حصہ ملنا واضح ثبوت اور مضبوط دلیل ہے کہ شیئر اثاثوں میں ملکیت کا ثبوت ہے نہ کہ قرض کی دستاویز۔

۲۔ جب تک کمپنی کے پاس املاک نہیں ہیں اس وقت تک کمپنی کے شیئرز کی بیع کی جائے تو یہ نقد کی بیع نقد سے ہے۔ اس میں بیع صرف کے احکام جاری ہوں گے یعنی نہ کمی زیادتی ہو اور نہ ادھار ہو۔

اگر شیئر ہولڈر ایسی صورت میں اپنے شیئر کو کم قیمت یا زیادہ قیمت میں فروخت کرے گا تو ناجائز ہوگا، اس لئے کہ یہ سود ہوگا اور وہ ناجائز ہے۔

لیکن اگر جتنے روپے میں شیئر خریدا ہے اتنے روپے ہی میں فروخت کرتا ہے تو جائز ہوگا یا نہیں؟ اس سلسلہ میں حضرت تھانوی علیہ الرحمہ نے اس کو ناجائز کہا ہے۔ وہ لکھتے ہیں: اسی طرح حصص خریدنا چونکہ یہ روپیہ کا مبادلہ روپے سے ہے، اور دست بدست نہیں ہے، اس لئے ناجائز ہے (امداد الفتاوی ۳/۱۳۰)۔

حضرت تھانویؒ کا یہ جواب کمپنی کے کاروبار شروع کئے جانے کے بعد شیئر کی خریداری کے بارے میں ہے، اس لئے حاشیہ میں یہ کہہ کر کہ حصص بصورت عروض تجارت و مشینری ہوتے ہیں، اس لئے روپیہ کا مبادلہ روپے سے نہیں ہے بلکہ عروض سے ہے۔ اس کو جائز قرار دیا گیا ہے۔

لیکن یہاں کاروبار شروع کرنے سے قبل جب کہ تمام شیئرز ابھی نقد کی صورت میں موجود ہیں، حصص نقد ہی ہیں، اس لئے یہاں نقد کی بیع نقد سے ہے۔

حضرت تھانویؒ نے اپنے اس جواب میں لکھا ہے کہ ہر حصہ دار اپنے حصہ کا مالک ہوتا ہے اور عملہ کاروبار میں ان حصہ داروں کا وکیل ہوتا ہے، اور شرعاً ان کا فعل حصہ داروں کی طرف منسوب ہوگا۔ اگر وہ کوئی ناجائز تجارت کریں گے تو ایسا ہی ہوگا جیسے خود حصہ دار ادا کریں۔

حضرت تھانویؒ نے کمپنی کے عملہ کو حصہ داروں کا وکیل تسلیم کیا ہے، تو جس طرح وکیل ہونے کی حیثیت سے جو کچھ وہ کریں گے سب حصہ داروں کا عمل سمجھا جائے گا، تو پھر ان عملہ کے قبضہ کو حصہ دار کا قبضہ کیوں نہیں تسلیم کیا جائے۔ اور شیئر ہولڈر اپنا شیئر فروخت کر رہا ہے۔ جب تک وہ شیئر ہولڈر تھا عملہ اس کا وکیل ہے اور شیئر کی رقم جو عملہ کے قبضہ میں ہے خود شیئر ہولڈر کے قبضہ میں ہے، اور جس وقت اس نے فروخت کر دیا، اس کے مساوی روپے لے لیا تو اب خریدار شیئر ہولڈر ہو جائے گا اور عملہ اس کا وکیل ہوگا، اور عملہ کا قبضہ اس کا قبضہ مانا جائے گا۔ پھر یہ کہنا کہ یہ دست بدست نہیں ہے ناقابل فہم ہے، اس لئے میرے خیال میں اگر مساوی قیمت میں فرق ہو تو اس کو ادھار کہہ کر ناجائز نہیں کیا جائے گا بلکہ اس کی اجازت دی جانی چاہئے۔

۳۔ کاروبار شروع ہو جانے کے بعد جب کمپنی کا اثاثہ نقد اور املاک کا مجموعہ ہے تو اس کو کم زیادہ پر فروخت کرنا جائز ہے، نقد کے مقابلہ میں نقد اور باقی املاک

---

[1] امارت شرعیہ، پھلواری شریف پٹنہ۔

کے مقابلہ میں سمجھا جائے گا۔ مثلاً اگر ایک شیئر ایک ہزار روپے کا ہے تو اس میں سے چھ سو روپے نقد اور چار سو روپے کے املاک ہیں۔ اگر شیئر ہولڈر نے اس کو بارہ سو روپے میں فروخت کر دیا تو چھ سو روپے کے مقابلہ میں چھ سو روپے اور املاک کے مقابلہ میں چھ سو روپے ہوئے۔ اسی طرح اگر اس نے آٹھ سو روپے میں فروخت کیا تو چھ سو کے مقابلہ میں چھ سو ہوں گے۔ اور دو سو روپے املاک کے مقابلہ میں ہوں گے، اس لئے یہ بیع جائز قرار پائے گی۔

۴۔ وہ کمپنیاں جن کا بنیادی کاروبار حرام ہے ان کے شیئرز کی خرید و فروخت جائز نہیں ہے۔

۵۔ بچنا بہتر ہے، لیکن اگر کوئی شریک ہونا چاہے تو اجازت دی جانی چاہئے۔

۶۔ اس میں بھی پرہیز کرنا اولی ہے، اور شرکت کی اجازت دی جانی چاہئے۔

نوٹ: سوال نمبر ۵و۶ پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ سرکاری قانون کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے کبھی قرض لینا پڑتا ہے اور کبھی قرض دینا پڑتا ہے۔ ایسی حالت میں مناسب یہ ہے کہ جتنا سرمایہ ریزرو بینک میں جمع کرنا پڑے، سیکورٹی بانڈس خریدنے پڑیں، اتنی رقم انکم ٹیکس کی زد سے بچنے کے لئے قرض کی شکل میں لی جائے تاکہ جس قدر سود کی رقم بینک سے ملے اسی قدر سود کی شکل میں اس کو واپس کر دیا جائے، اس طرح صرف سود کا حساب ہوگا، نہ سود دینا ہوگا نہ لینا ہوگا۔

۷۔ سودی قرض لینا بلا مجبوری کے جائز نہیں ہے، یہ عمل غلط ہے، لیکن قرض میں لی گئی رقم میں کوئی خبث نہیں ہے۔ قرض لینے والا اس کا مالک ہوگا، اس کے ذریعہ کاروبار کر کے جو منافع حاصل کیا جائے وہ بلا شبہ حلال ہوگا۔

۸۔ جی ہاں! بلکہ کمپنی کا پورا عملہ حصہ داروں کا وکیل ہے اور عملہ کا عمل حصہ داروں کا عمل سمجھا جائے گا۔ حضرت تھانویؒ لکھتے ہیں: ''عملہ کاروبار میں حصہ داروں کا وکیل ہوتا ہے، اور شرعاً ان کا فعل حصہ داروں کی طرف منسوب ہوگا، اگر وہ کوئی ناجائز تجارت کریں گے...... تو ایسا ہی ہوگا جیسے خود حصہ دار کریں (امداد الفتاوی ۳؍۱۳۰)۔

۹۔ صرف اختلاف کا اعلان کر دینا کافی نہیں ہوگا اس کو کمپنی سے الگ ہو جانا چاہئے۔

۱۰۔ کافی ہوگا۔

۱۱۔ اگر نکال دے تو اچھا ہے ورنہ ضروری نہیں ہے، اس لئے کہ روپیہ ثمن ہے اور وہ متعین نہیں ہوتا ہے، اس لئے اگر سود کی رقم سرمایہ میں ملی ہوئی ہے تو منافع کا سودی رقم کا نفع ہونا متعین نہیں ہوگا۔

۱۲۔ شیئرز کی تجارت میں کوئی قباحت معلوم نہیں ہوتی ہے۔

۱۳۔ یہ قمار ہے اور حرام ہے۔

۱۴۔ سوال کی وضاحت کی جائے، اگر مقصد یہ ہے کہ مال موجود نہیں ہے اور بائع مشتری سے وعدہ کرتا ہے کہ میں مال منگا دوں گا، پھر مال منگا کر مشتری کو دیتا ہے تو یہ وعدہ ہے، مال منگانے پر ان کو ایجاب و قبول کرنا چاہئے، یہ درست ہوگا۔ لیکن مال منگانے کے بعد نہ بائع پر بیع لازم ہوگی نہ مشتری پر۔ بائع کو اختیار ہے کہ وہ بیع کرنے سے انکار کر دے، اسی طرح مشتری کو حق ہے کہ نہ خریدے۔ کیونکہ دونوں میں بیع نہیں ہوئی ہے صرف وعدۂ بیع ہے۔ اگر اس کے علاوہ کوئی دوسرا مقصد ہے تو اس کی وضاحت کی جائے۔

۱۵۔ بوقت بیع و شراء ہی کمپنی کے اثاثوں اور املاک پر شیئر ہولڈر کی ملکیت آجاتی ہے۔ اور بحث میں گذر چکا ہے کہ کمپنی کا عملہ شیئر ہولڈر کا وکیل ہے۔ ان کا قبضہ ہی شیئر ہولڈر کا قبضہ سمجھا جائے گا۔ ملکیت بیع و شراء سے ہوتی ہے نہ کہ سرٹیفیکٹ سے۔ شیئرز سرٹیفیکٹ ملکیت کا ثبوت ہے نہ کہ علت کا، اس لئے عملہ کا قبضہ ہی اس کا قبضہ سمجھا جائے گا۔

۱۶۔ خرید کردہ شیئر کی موجودہ قیمت خریدار نے ادا کر دی ہے، اگر وہ سرٹیفیکٹ حاصل کرنے سے قبل دوسرے کو فروخت کر دے تو جائز ہوگا۔

۱۷۔ جن صورتوں میں شیئرز کی خرید و فروخت جائز ہے اس میں واسطہ بننا بھی جائز ہوگا، یعنی بروکر بننا جائز ہوگا۔ اور خرید و فروخت کی جو صورتیں ناجائز ہیں ان میں واسطہ بننا بھی ناجائز ہوگا۔

☆☆☆

فقہ اسلامی میں شیئرز کی حیثیت

مولانا عتیق احمد بستوی[1]

۱۔ کمپنی کا خرید کردہ شیئر کمپنی میں شیئر ہولڈر کی ملکیت کی نمائندگی کرتا ہے، شیئر خرید کر شیئر ہولڈر کمپنی کے املاک واثاثوں میں اپنے شیئر کے بقدر شریک ہوجاتا ہے، یہ سمجھنا صحیح نہیں ہے کہ شیئرز کی خریداری کمپنی میں شراکت نہیں ہے بلکہ شیئر سرٹیفیکٹ محض اس بات کی دستاویز ہے کہ حامل سرٹیفیکٹ نے اتنی رقم کمپنی کو دے رکھی ہے۔

حضرت تھانویؒ کا یہ موقف بالکل درست ہے کہ اپنی روح کے اعتبار سے کمپنی شرکت عنان میں داخل ہے، اگرچہ کمپنی کی بعض ایسی خصوصیات ہیں جو معروف شرکت عنان میں نہیں پائی جاتیں، لیکن ان کی وجہ سے عنان کی حقیقت تبدیل نہیں ہوتی، شیئرز سرٹیفیکٹ کو محض قرض کی دستاویز ماننا صحیح نہیں ہے۔

۲۔ جس کمپنی کے تمام اثاثے نقد کی صورت میں ہیں، اس کمپنی نے ابھی اپنے نقد اثاثے کو کسی اور شکل میں تبدیل نہیں کیا ہے، اس کمپنی کے شیئرز کو کمی بیشی کے ساتھ فروخت کرنا جائز نہیں ہے، جتنے میں شیئرز خریدا ہے (فیس ویلو پر) اتنے ہی میں فروخت کیا جاسکتا ہے، یہ دراصل روپئے کی فروخت روپئے کے بدلے میں ہے۔

۳۔ جس کمپنی کے کچھ اثاثے نقد روپے کی شکل میں ہوں اور کچھ سرمائے زمین، جائداد، مکان ودوکان، تیار شدہ مال یا خام مال کی شکل میں، اس کے شیئر کی بیع اس شرط کے ساتھ جائز ہے کہ حساب کرنے پر ہر شیئر میں جتنا نقد روپیہ آتا ہے اس سے زیادہ کے بدلے میں شیئر خریدا جائے، اس کے مساوی یا اس سے کم کے بدلہ میں نہ خریدا جائے۔ مثلاً کمپنی کے نقد روپیوں کا حساب لگانے پر ہر شیئر میں دس روپیہ آتا ہے تو ایک شیئر کی خریداری دس روپئے یا اس سے کم میں نہ ہو بلکہ اس سے زیادہ پر ہو، تاکہ دس روپے دس روپیوں کے بدلے میں ہوجائیں، اور دس سے زیادہ جو قیمت طے ہوئی وہ ہر شیئر پر آنے والے دوسرے جامد اور غیر جامد اموال کے بدلے میں ہوجائے۔

۴۔ جن کمپنیوں کا بنیادی کاروبار حرام ہے اس کے شیئرز کی خرید وفروخت جائز نہیں ہے۔

۵۔ جن کمپنیز کا بنیادی کاروبار حلال ہے لیکن انہیں بعض اوقات انکم ٹیکس وغیرہ کی زد سے بچنے کے لئے بینک سے سودی قرض لینا پڑتا ہے ایسی کمپنیوں کے شیئرز خریدنا درست ہے۔

۶۔ حلال کاروبار کرنے والی کمپنیوں کو اگر قانونی جبر کے تحت اپنا کچھ سرمایہ ریزروبینک میں جمع کرنا پڑتا ہے یا سیکورٹی بانڈس خریدنے پڑتے ہیں جن پر انہیں سود ملتا ہے، ایسی کمپنیوں کا شیئر خریدنا بھی جائز ہے، لیکن ملنے والے سود کا حساب کتاب الگ رکھنا ضروری ہے، سودی رقم کا استعمال نہ کمپنی کرسکتی ہے نہ شیئر ہولڈرس۔

۷۔ سودی قرض حاصل کرنے کی صورت میں اس قرض کی رقم سے کئے گئے کاروبار سے حاصل ہونے والے منافع قرض لینے والے شخص کی ملکیت ہوں گے، قرض مفید ملک ہے، قرض کی رقم کو اگر جائز کاروبار میں لگا کر نفع حاصل کیا گیا ہے تو وہ نفع بلاشبہ حلال ہے، ہاں قرض دے کر سود حاصل کرنے والا سخت گنہگار ہے، سود کی رقم اس کی ملکیت نہیں ہے، اسی طرح انتہائی ضرورت اور مجبوری کے بغیر سود بردار قرض حاصل کرنا بھی شدید گناہ ہے۔

۸۔ بلاشبہ کمپنی کا بورڈ آف ڈائرکٹرس شیئرز ہولڈرس کا وکیل ہے اور اس کا عمل شیئرز ہولڈرس کا عمل سمجھا جائے گا۔

۹۔ کسی کمپنی میں شرکت، اس کے شیئرز کی خریداری انسان کا اختیاری عمل ہے، کمپنی جب تک صحیح خطوط پر کام کررہی ہے، اس کا کاروبار اسلامی تعلیمات کے مطابق ہے اس میں شرکت باقی رکھی جاسکتی ہے، لیکن جب کمپنی کا بورڈ آف ڈائریکٹرس غلط فیصلہ کرنے لگے، کمپنی کے ڈھانچے میں غیر اسلامی

---

[1] استاذ فقہ، دار العلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ۔

اجزاء شامل کرنے لگے تو کمپنی میں شرکت باقی رکھنا جائز نہیں ہوگا، کیونکہ کمپنی کا سودی قرض حاصل کرنا (اگر قانونی جبر کی بنا پر نہ ہو) ایک ناجائز عمل ہے۔بورڈ آف ڈائرکٹرس چونکہ تمام شیئر ہولڈرس کا وکیل ہے اس لئے اس کے فیصلہ کی ذمہ داری شرعاً تمام شیئر ہولڈرس پر عائد ہوتی ہے۔

جو کمپنی در کار سرمایہ کا ایک معتد بہ حصہ بینکوں سے سودی قرض لے کر فراہم کرتی ہے، ایسی کمپنی کے شیئرز خرید کر صرف سالانہ میٹنگ میں سودی لین دین کے خلاف آواز اٹھا کر مطمئن ہو جانا کہ کمپنی کے سودی معاملات سے ہماری براءت ہو گئی، درست نہیں ہے۔کیونکہ شیئرز کی خریداری کمپنی میں شرکت ہے، اور شرکت میں ہر شریک دوسرے کا وکیل ہوتا ہے، یہ وکالت خواہ کتنی کمزور مانی جائے بہر حال موکل وکیل کے تصرف کی ذمہ داری سے بری نہیں ہو سکتا۔

ہاں جو لوگ دوسرے میدانوں میں سرمایہ کاری سے معذور ہیں، مثلاً کوئی بیوہ یا معمر وضعیف شخص ہے، اس کے پاس کچھ سرمایہ ہے، اس سرمایہ سے خود تجارت کرنا اس کے بس میں نہیں ہے، کسی اور شخص کو مضاربت پر دیں تو دیانت کی کمی کی وجہ سے اصل سرمایہ ڈوب جانے کا خطرہ ہے، سرمایہ منجمد رکھے تو سرمایہ رفتہ رفتہ خرچ یا تحلیل ہو جائے نیز اپنے پاس سرمایہ رکھنے میں اس کی حفاظت کا بھی مسئلہ ہے، اس معذور شخص کے سامنے دو ہی راستے ہیں، یا تو بینک میں فکس ڈپازٹ کر کے سود حاصل کرے یا ایسی کمپنی کے شیئرز خریدے جس کا اصل کاروبار حلال ہے لیکن وہ کمپنی سودی قرض حاصل کرنے میں بھی ملوث ہے، ایسے معذور شخص کے لئے بینک میں فکس ڈپازٹ کرنے کے مقابلہ میں اس کمپنی کے شیئرز خریدنا اہون ہے، اس کے لئے شرعاً مذکورہ بالا کمپنی کے شیئرز خریدنے کی گنجائش ہے۔

۱۰۔ اگر کمپنی کے منافع میں سود بھی شامل ہو (مثلاً کمپنی کو اپنے سرمایہ کا کچھ فیصد لازماً ریزرو بینک میں جمع کرنا پڑتا ہو اور اس جمع شدہ رقم پر اسے سود ملتا ہو) اور اس کی مقدار معلوم ہو تو منافع میں سے سود کے بہ قدر نکال کر صدقہ کر دینا شیئر ہولڈرس کے لئے ضروری ہے۔

۱۱۔ اگر کمپنی کے منافع میں سود بھی شامل ہو اور حاصل ہونے والی سودی آمدنی کو کاروبار میں لگا کر نفع کمایا گیا ہو تو جتنا فیصد کل آمدنی میں سود مخلوط ہو گیا ہے اتنا فیصد ملنے والے منافع سے نکال کر صدقہ کرنا ضروری ہے۔

۱۲۔ جن کمپنیوں کے شیئرز خریدنا شرعاً جائز ہے ان کے شیئرز کی تجارت بھی جائز ہے، حلال کاروبار کرنے والی کمپنیوں کے شیئرز خواہ اس نیت سے خریدے جائیں کہ ان پر سالانہ ملنے والے منافع سے استفادہ کریں گے، یا اس نیت سے خریدے جائیں کہ شیئرز کی قیمت چڑھنے پر انہیں فروخت کر دیں گے، بہر دو صورت ان کی خرید و فروخت درست ہے، تجارت میں خرص و تخمین کا عنصر تو ہوتا ہی ہے، خرص و تخمین کی بنا پر تجارت کو ممنوع قرار نہیں دیا جا سکتا۔

۱۳۔ فیوچر سیل جس کا مقصد شیئرز خریدنا نہیں ہوتا بلکہ آخر میں جا کر آپس کا فرق (Deference) برابر کر لیا جاتا ہے، اس میں نہ تو شیئرز پر قبضہ ہوتا ہے اور نہ قبضہ پیش نظر ہوتا ہے، یہ ایک قسم کی سٹہ بازی ہے اس لئے شریعت اسلامی میں اس کی گنجائش نہیں۔

۱۴۔ غائب سودا جس میں بیع کی اضافت مستقبل کی طرف کی جاتی ہے وہ شرعاً بیع نہیں ہے، کیونکہ فقہاء کرام کا اس بات پر اتفاق ہے کہ آئندہ زمانہ کی طرف بیع کی اضافت یا تعلیق ناجائز ہے، اس کو بہت سے بہت وعدہ بیع کہا جا سکتا ہے، وقت مقررہ آنے پر مکمل بیع کرنی ہوگی۔

۱۵۔ شیئرز کے نقد سودے میں بعض انتظامی مجبوریوں کی وجہ سے شیئرز سرٹیفکیٹ پر قبضہ میں ہفتہ دو ہفتہ کی جو تاخیر ہوتی ہے اس سلسلہ میں پیدا شدہ سوال کا جواب یہ ہے کہ شیئر مارکیٹ سے شیئرز کی نقد خریداری کرتے ہیں، اگر خرید کردہ شیئرز قانوناً خریدار کی ملکیت میں آجاتے ہیں اور ان کا نفع یا نقصان خریدار کی طرف لوٹتا ہے تو اسے شیئرز پر خریدار کا قبضہ تصور کیا جائے گا اور ان شیئرز کی فروختگی خریدار کے لئے جائز ہوگی، اور اگر صورت حال اس کے برعکس ہو یعنی شیئرز کا نقد سودا ہو جانے کے بعد شیئرز سرٹیفکیٹ پر قبضہ ہونے سے پہلے خرید کردہ شیئرز قانوناً خریدار کی ملکیت نہ مانے جاتے ہوں، ان شیئرز کا نفع و نقصان خریدار کی طرف منتقل نہ ہوتا ہو بلکہ شیئرز سرٹیفکیٹ پر قبضہ کرنے کے بعد ہی ان شیئرز پر قانوناً خریدار کی ملکیت قائم ہوتی ہو تو شیئرز سرٹیفکیٹ حاصل ہونے سے پہلے خریدار کے لئے ان کی فروختگی جائز نہ ہوگی، اور اگر کمپنی کا شیئر صرف روپیوں پر مشتمل ہو تو شیئرز کی یہ خرید و فروخت ہی ناجائز ٹھہرے گی کیونکہ ایک طرف سے روپیہ نقد ہے ایک طرف سے ادھار۔

۱۶۔ اس کا جواب سوال نمبر ۱۵ کے جواب سے واضح ہو چکا ہے۔

۱۷۔ حلال کاروبار کرنے والی کمپنیوں کے بروکر کی حیثیت سے کام کرنا درست ہے، اور حرام کاروبار کرنے والی کمپنیوں کے بروکر ہونے کی حیثیت سے کام کرنا جائز نہیں ہے۔

☆☆☆

شیئرز کے چند حل طلب مسائل

مفتی نظام الدین صاحب [۱]

شیئرز کے ذریعہ سرمایہ کاری کا انتظام آج انتہائی عروج پر پہنچ چکا ہے، اور یہ اس ترقی یافتہ عہد میں تجارت کی سب سے زیادہ رائج اور مقبول صورت ہے اور عالمی پیمانہ پر اس میں عام ابتلاء ہو گیا ہے۔ اس لئے اس کے طریقہ کار کی تنقیح کر کے حل طلب مسائل کا شرعی حکم دریافت کرنا وقت کا اہم تقاضا ہے۔ اس لئے اولاً کمپنی کے نظام کو ذکر کر کے چند حل طلب سوالات پیش کئے جاتے ہیں۔

۱۔ مشترک تجارت کا نام دے کر ایک کمپنی قائم کی جاتی ہے جس کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ ابتداءً چند سرمایہ کار (جو ترقی دینے والے حصہ دار کہلاتے ہیں) ایک اسکیم مرتب کر کے اور قواعد وضوابط متعین کر کے رجسٹرار آف کمپنیز کے یہاں رجسٹریشن کراتے ہیں جو قانوناً ضروری ہوتا ہے، اسی طرح کسی معتبر بینک سے یہ ضمانت حاصل کی جاتی ہے کہ اگر پیش کردہ حصص پر سرمایہ فراہم نہ ہو سکے تو بینک اتنے اتنے حصے خریدنے کو تیار ہے۔ رجسٹریشن کے بعد کمپنی اپنی مصنوعات یا مال تجارت متعین کر کے اشتہار دیتی ہے جس میں لاگت سرمایہ، مصارف اور قیمت کے تخمینہ کے ساتھ متوقع نفع کی صراحت ہوتی ہے۔

۲۔ اور اس اشتہار کے ذریعہ کمپنی میں بذریعہ شیئرز (حصص) شرکت کی کھلی اور عمومی پیشکش کی جاتی ہے اور اس سے وسیع پیمانے پر تجارت کے لئے سرمایہ کی فراہمی مقصود ہوتی ہے۔

۳۔ اور کبھی پہلے سے موجود کمپنی بھی اپنے کاروبار کو فروغ دینے کے لئے عوام کو سرمایہ کاری کے لئے کھلی پیشکش کرتی ہے۔

۴۔ اس کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ لاگت اور سرمایہ کو عموماً دس روپئے اور بعض دفعہ سو روپئے کے مساوی اجزاء میں تقسیم کیا جاتا ہے، جس میں سے ہر جز کو ایک حصہ تجارت کہا جاتا ہے، پھر خواہش مند لوگ اپنی اپنی قوت اور منشا کے مطابق حصے کم اور زیادہ خریدتے ہیں۔ اس پیشکش کو قبول کر کے حصص کی خریداری کے ذریعہ سرمایہ لگانے پر حصہ شرکت کے مالک ہو جاتے ہیں اور اس شرکت کی بنا پر ان کو کمپنی کے تجارتی امور میں رائے دہندگی کا حق حاصل ہوتا ہے، اور نفع ونقصان میں بقدر حصص شرکت ہوتی ہے، لیکن کمپنی کے املاک اور اثاثے میں نہ تو وہ دعویدار ہو سکتے ہیں اور نہ ہی کسی تصرف کے مالک ہوتے ہیں، اسکیم مرتب کرنے میں بھی ان کو کچھ دخل نہیں ہوتا۔

۵۔ اور عموماً کمپنیوں کو ان حصص کے ذریعہ مکمل سرمایہ کی فراہمی متیقن نہیں ہوتی، اس لئے پھر اسی کے بقدر یا کم زیادہ ایسے حصص کی پیشکش کرتی ہیں جن کی حیثیت سرمایہ ہونے کے ساتھ ساتھ قرض کی بھی ہوتی ہے، ان حصص کے بدلے وثیقہ یا سند دی جاتی ہے، ایسی سندات کو ''Bonds'' اور ایسے حصص قرض کو ''Debentures'' کہا جاتا ہے۔

۶۔ حصص قرض کے ذریعہ شریک ہونے والے مالکانہ حقوق نہیں رکھتے، ان کو رائے دہندگی کا حق بھی نہیں ہوتا، ان کو سود اور نفع بھی دیا جاتا ہے، اور نقصان یا اتلاف کی صورت میں سرمایہ کی واپسی کی ضمانت دی جاتی ہے اور اسے ترجیحی حصص (Preference Shares) بھی کہا جاتا ہے۔

۷۔ حصص قرض کو حصص تجارت میں محول کیا جا سکتا ہے۔

۸۔ اگر کوئی اپنے حصص کو واپس لے کر شرکت کو ختم کر لینا چاہے تو وہ براہ راست کمپنی سے سرمایہ کو واپس نہیں لے سکتا بلکہ اس کی ایک ہی صورت ہے کہ اپنے حصص کو کسی اور شخص کے نام پر منتقل کر دے اور اس کے حق میں حق شرکت سے دستبردار ہو جائے۔ اس کے عوض وہ حصص کی بازاری قیمت لیتا ہے، جو ابتدائی کمپنی کی مقرر کردہ قیمت سے کئی گنا زیادہ ہوتی ہے۔

---

[۱] سابق مفتی دار العلوم دیوبند۔

۹۔ جوں جوں کمپنی کے مال تجارت اور اثاثوں کی قیمت میں اضافہ ہوتا ہے حصص کی قیمت بھی بڑھتی جاتی ہے، جو کمپنی مسلسل نفع بنائے بازار میں اس کے حصص اونچی قیمت پر فروخت ہوتے ہیں۔

۱۰۔ کمپنی ہر سال حساب کر کے منافع کو حصص پر تقسیم کرتی ہے، اس کا ایک جز وقت ضرورت کے لئے اپنے پاس جمع کر لیتی ہے بقیہ حصہ داروں کو پہنچا دیتی ہے۔ جمع شدہ رقم حصہ کی قیمت سے بڑھ جائے تو اسے اصل سرمایہ میں شامل کر لیا جاتا ہے، اس طرح حصص میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔

۱۱۔ حصص تجارت اور حصص قرض کی ایک متعین قیمت ہوتی ہے جو ان کے جاری ہونے کے وقت متعین کی جاتی ہے، اور ایک مارکیٹ کی قیمت ہوتی ہے جو ملک کی سیاسی اقتصادی حالات، ان کی مانگ اور دوسرے عوامل کے نتیجہ میں گھٹتی بڑھتی رہتی ہے۔

۱۲۔ بازار حصص میں خرید وفروخت بروکرس (دلالوں) کے ذریعہ ہوتی ہے جو کمپنیوں کے بدلتے ہوئے حالات پر آگہی رکھتے ہیں، باقاعدہ رجسٹریشن اور قواعد وضوابط کے ساتھ بازار حصص (Stock Exchange) قائم کر کے اس کے ممبر بن جاتے ہیں، اور حصص کی خرید وفروخت کے لئے افراد اور کمپنیاں بازار حصص کی طرف رجوع کرتی ہیں، بازار حصص کے اتار چڑھاؤ کا ملکی معیشت پر گہرا اثر پڑتا ہے، اب بازار حصص میں خود ان حصص تجارت اور حصص قرض کی خرید و فروخت ہو جاتی ہے۔

ان بنیادی تصریحات کے بعد چند حل طلب سوالات پیش خدمت ہیں، چونکہ اس زمانہ میں عالمی تجارت کا اکثر و بیشتر حصہ اسی نوعیت کے مسائل پر مبنی ہے اس لئے قواعد فقہیہ کی روشنی میں ان کے احکام کا استخراج بہت سے مسائل کا مداوا ثابت ہوگا۔

سوالات:

۱۔ مذکورہ کمپنیوں میں شیئرز (حصص) کے ذریعہ سرمایہ کاری عقود شرعیہ میں سے کونسا عقد ہے، بیع یا مضاربت یا شرکت؟ اگر عقد شرکت ہے تو شرکت کی کونسی قسم ہے؟ اور کیا شریک (صاحب حصص) کو اپنے حصہ پر مکمل مالکانہ تصرف حاصل نہ ہونے سے حکم میں کوئی تغیر نہ آئے گا؟

۲۔ ایسی کمپنیوں میں شیئرز کے ذریعہ سرمایہ کاری کا جن میں حصص قرض (جن پر سود دینا لازمی ہے) اور بینک کے سودی قرضے بھی شامل ہوتے ہیں، کیا حکم ہے؟ کیا اس اختلاط بالحرام کی وجہ سے حصص تجارت (جن میں سود نہیں) کے منافع کا جواز متاثر نہ ہوگا؟ ''المال المختلط بالحلال والحرام'' کا شرعا کیا حکم ہے؟ یہ واضح رہے کہ نہ صرف ایسی کمپنیوں کی تجارت بلکہ ہر بڑے پیمانے کی تجارت در آمدات وبرآمدات کا کسی نہ کسی مرحلہ میں بینک سے یعنی سودی لین دین پر انحصار ناگزیر ہے۔

۳۔ حصص قرض (Debentures) کے ذریعہ سرمایہ کاری کا کیا حکم ہے؟ واضح رہے کہ اس پر کمپنی طے شدہ فیصد کے مطابق سود دیتی ہے اس کے علاوہ نفع بھی دیتی ہے، اور اتلاف ونقصان کی صورت میں سرمایہ کی واپسی کی ضامن ہوتی ہے۔

۴۔ اگر کسی کمپنی میں حصص تجارت حاصل کرنے کی گنجائش ہو تو بدرجہ مجبوری حصص قرض کو اس نیت سے خریدنا کہ آئندہ اسے حصص میں محول کر لیا جائے، شرعا اس کا کیا حکم ہے؟

۵۔ حصص تجارت (Shares) جن کی بازار حصص میں خرید وفروخت ہوتی ہے خود ان حصص کی شرعا کیا حیثیت ہے؟

(الف) کیا ان کو شرعا مال متقوم قرار دیا جاسکتا ہے؟ جن کی خرید وفروخت ورہن وغیرہ درست ہو۔

(ب) کیا ان کو حق شرکت کی بیع وشراء قرار دیا جاسکتا ہے؟ بصورت اثبات اس کی بیع وشراء کا کیا حکم ہے؟

۶۔ سندات حصص قرض (Bonds) جن کی خرید وفروخت ہوتی ہے رہن رکھا جاتا ہے، شرعا ان کی کیا حیثیت ہے؟

۷۔ اسٹاک ایکسچنج (بازار حصص) میں شیئرز (حصص تجارت)، ڈبینچرز (حصص قرض) کی خرید وفروخت کا کیا حکم ہے؟ جبکہ اس میں کمپنی کی متعین کردہ قیمت سے کہیں زیادہ قیمت پر بیع وشراء کا معاملہ ہوتا ہے۔

۸۔ بازار حصص میں دلال (Broker) اپنے نام پر حصص کو منتقل کئے بغیر جو بیع وشراء بحیثیت وکیل یا فضولی کرتا ہے اس کا کیا حکم ہے۔ اور کیا ان بروکروں کی معرفت حصص تجارت وحصص قرض کی خرید وفروخت درست ہے۔

۹۔ کمپنی اگر حرام اشیاء شراب وغیرہ کی تجارت کرے تو کیا ایسی کمپنی سے حصص خریدنا اور اس سے منتفع ہونا جائز ہوگا؟ یہ واضح رہے کہ ہندوستان جیسے ممالک میں کمپنی کا پورا عملہ غیر مسلم ہوتا ہے تو کیا ان کو شرکاء کا وکیل قرار دے کر اس طرح کے عقد کی اجازت دی جائے گی، کیونکہ حقوق عقد عاقد کی طرف لوٹتے ہیں؟

جوابات:

۱۔ حصص قرض خریدنے کی شرعاً اجازت نہیں ہے، اس لئے کہ اس میں اپنے اختیار سے سود لینا اور دینا پڑتا ہے، اور اس کی اجازت نہیں اور "المال المختلط بالحلال والحرام" کے ضابطہ پر قیاس کرنا بھی صحیح نہیں ہے، اس لئے کہ المال المختلط میں وہ اختلاط مراد ہے جو غیر شعوری یا غیر اختیاری طور سے ہو جائے اور اس خاص صورت میں اکثر کا اعتبار ہوتا ہے، کما صرح به فی الأصول الفقهية وغير ذلك۔ اور حصص تجارت میں جہاں کہیں سودی لین دین کرنا پڑجاتا ہے وہ بوجہ مجبوری ہوتا ہے، اور اس کی اجازت فقہاء نے بعض موقعوں میں دی ہے، کما فی الأشباه: ويجوز للمحتاج الاستقراض بالربح، لہذا یہ قیاس قیاس مع الفارق ہوگا۔

۲، ۳۔ اوپر سوال میں حصص قرض لینے کا عدم جواز مدلل ومکمل طور پر واضح ہو چکا ہے، اور اتلاف ونقصان کی صورت میں سرمایہ کی واپسی کی ضمانت وجہ جواز نہیں بن سکتی، بوجوہ ومنها تقدم دفع المضرة على جلب المنفعة وغیرہ اصول سے واضح ہے۔

۴۔ ناجائز ہے۔ والدلائل ما مضت فی ضمن سوال ۲،۳۔

۵۔ ان حصص تجارت کی شرعی حیثیت یہ ہے کہ جب کوئی ایک یا چند افراد ممبر بن جانے کے بعد شرعاً اپنے شیئر کا مالک ہو جائے، اور شرعاً کوئی شخص مالک ہو چکنے کے بعد معاملہ شرکت سے نکلنا چاہتا ہے تو کمپنی والے اس کو حصہ شرکت سے نکل جانے کی اجازت دے دیتے ہیں، اس لئے اجازت دیدینے کے بعد اس اجازت کے ثبوت کے لئے ایک سند یا رسید (کاغذ کا ٹکڑا) دیدیتے ہیں، کہ اس کو دکھلا کر وہ شخص اپنا حصہ متعین کر کے جس کو چاہے بیچ دے یا جو چاہے کرے، ورنہ یہ رسید اور سند (کاغذ کا ٹکڑا) ہے، بذات خود یہ کوئی قیمت نہیں رکھتا کہ اس کے بیع وشراء کا معاملہ ہو، اور نہ وہ کاغذ کا ٹکڑا حق شرکت ہے کہ اس کی بیع وشراء کا حکم متوجہ ہو، اور نہ تو کاغذ کا وہ ٹکڑا اثاثہ تجارت کے جزو مشاع کا بدل ہے کہ اس کے بیع وشراء کا حکم متوجہ ہو، بلکہ خریدار شیئر کا جو حصہ تجارت میں ہے (نقود وعروض وغیرہ میں سے) اس حصہ کے خرید وفروخت کرنے کا اجازت نامہ ہے، بلکہ یہ سب حصے جزو مشاع کے درجہ میں ہوتے ہیں اور ان سب حصوں کی بیع مشاعاً از روئے شرع جائز ہوتی ہے، اس لئے یہ بیع جائز ہوگی۔ کما صرح به الفقهاء۔ پس ان تمام حصوں کی خرید وفروخت مشاعاً بلاشبہ جائز رہے گی اور اس کے جواز میں شرعاً کوئی قباحت نہیں ہوگی۔

۶۔ یہ بونڈز حصص قرض کی محض سند ہیں، ان سندوں کی خرید وفروخت کرنا یا رہن رکھنا کچھ بھی جائز نہیں، جس کی کچھ تشریح پہلے بھی گذر چکی ہے۔

۷۔ اسٹاک ایکسچینج میں محض حصص تجارت کا تبادلہ ہوتا ہے، اور یہ اگرچہ بصورت بیع وشراء مشاعاً ہوتا ہے مگر یہ جائز رہے گا، اور حصص قرض میں چونکہ حصہ لینا ہی جائز نہیں اس لئے اس میں تبادلہ کی گنجائش بھی نہ ہوگی۔

۸۔ بازار حصص میں دلال اپنی طرف حصص کو منتقل کر کے یا بحیثیت وکیل یا بحیثیت فضولی حصص تجارت کی بیع وشراء کریں تو سب درست رہے گا بشرطیکہ معاملہ مجہول یا مفضی الی النزاع نہ ہو، البتہ حصص قرض میں اپنے اختیار سے سود وربا کا تحقق ہوتا ہے اس لئے یہ کسی طرح درست نہ ہوگا۔

۹۔ شراب میں خمور اربعہ جس کی حرمت منصوص بنص قطعی ہے، اور نجاست بھی مثل پاخانہ پیشاب کے غلیظ ونجس ہے اور اس کی نجاست بھی نجاست لعینہ ہے۔ یہی حکم ان کے الکوحل کا بھی ہے کہ ان کے کاروبار میں حصص خریدنا اور اس سے منتفع ہونا جائز نہیں رہے گا، خواہ ہندوستان جیسے ملک میں ہو خواہ اس کا پورا عملہ غیر مسلم ہی کیوں نہ ہو، کسی طرح جائز نہ ہوگا۔ اسی طرح جوا (قمار) سے کمائی ہوئی اور حاصل شدہ رقوم کا بھی حکم ہے کہ اس میں شرکت یا اس کا استعمال وغیرہ کچھ بھی کسی طرح ہندوستان جیسے ملک میں بھی جائز وحلال نہیں رہے گا لقولہ تعالیٰ: إنما الخمر والميسر والأنصاب والأزلام رجس من عمل الشيطان (سورہ مائدہ)۔

لہذا ان حرام ونجس عقود کا وکیل وغیرہ بننا کچھ بھی جائز ودرست نہ ہوگا اور نہ ان کی آمدنی سے منتفع ہونا ہی درست رہے گا، اور جو الکوحل ان خمور اربعہ مذکورہ کے علاوہ میں ہوں گے ان کا حکم بھی دوسرا ہوگا، اور جب تک ان میں سکر (نشہ) کا تحقق وثبوت شرعی ضابطہ سے نہ ہو جائے اس وقت تک ان کی نجاست وحرمت کا حکم نہ ہوگا۔

☆☆☆

شیئرز کے چند مسائل

اور ان کا حکم

مولانا شمس پیرزادہ[1]

۱۔ شیئر کمپنی میں شیئر ہولڈر کی ملکیت کی نمائندگی کرتا ہے یا نہیں؟

ملکیت کا تصور اصل میں کمپنی کے ساتھ وابستہ ہے اور اس کی ایک علیحدہ قانونی حیثیت ہے:

"A Joint Stock Company has separate legal status and it is absolutely separable from the owners i_e_ from general body of members as well as separable from board of directors. A company is purely a creation of law. It can do every thing like a human being, like as individual it can hold property, appoint employees, incur debts, file suits and be sued upon".(Company Secreterial Practice by Prof. Tahil Vorhani P. 95)

"A Company is an in corporated assosiation which is an artificial person created by law, having a common seal and perpetual succession. (do .p .18)"

"The liability of Share holders of Joint Stock Company is limited to the nominal value of the shares hold. As the debts of company have the debts of a separate legal person, a share holder is not personally liable for them. The company may have to be dissolved on account of its financial adversity, but its shareholders can not be called upon to contribute more then the nominal value of shares held by them."(do. p_18)

ان اقتباسات سے واضح ہے کہ کمپنی کی قانونی طور سے ایک جداگانہ حیثیت ہوتی ہے اور اسی کے ساتھ اثاثوں کی ملکیت اور قرضوں کی ادائیگی وغیرہ کی ذمہ داریاں وابستہ ہیں۔ کمپنی کے دیوالیہ ہونے کی صورت میں شیئر ہولڈر اپنے شیئر کی مالیت سے زیادہ نقصان کی تلافی کے ذمہ دار نہیں ہوتے۔ اور یہ بھی واقعہ ہے کہ شیئرز کی رقم کمپنی کے اکاؤنٹ میں (Liblities) یعنی واجبات میں دکھائی جاتی ہے لیکن معاملہ کا یہ قانونی پہلو ہے، اور جہاں تک عملی پہلو کا تعلق ہے تو شیئر ہولڈر کمپنی کے اثاثہ کی ملکیت میں حصہ دار ہوتے ہیں۔ چنانچہ شیئرز کی قیمتوں میں بازار میں جو اتار چڑھاؤ ہوتا ہے وہ صرف شیئرز کے سرمایہ (Capital) کے پیش نظر نہیں ہوتا بلکہ کمپنی کی مجموعی مالی حیثیت اور اس کی ساکھ کے پیش نظر ہوتا ہے، نیز اگر کمپنی کا دیوالیہ (Liquidation) ہو جاتا ہے تو قرض وغیرہ واجبات ادا کرنے کے بعد بچی ہوئی رقم شیئر ہولڈرس میں تقسیم کی جاتی ہے جو شیئر کی اصل قیمت سے کم بھی ہو سکتی ہے اور زیادہ بھی، اس لئے شیئر ہولڈرس کا کمپنی کے اثاثہ کی ملکیت میں شریک ہونا بالکل ظاہر ہے۔

لہذا شیئرز کی خرید و فروخت نقود و املاک کے مجموعہ کو نقود کے ذریعہ فروخت کرنا ہے اور یہ بالکل جائز ہے۔

منظمۃ المؤتمر الاسلامی جدہ کی مجلس مجمع الفقہ الاسلامی منعقدہ مئی ۱۹۹۲ء کے فیصلہ سے بھی جو درج ذیل ہے یہی بات واضح ہوتی ہے:

بما أن المبيع في (السهم لحامله) هو حصة شائعة في موجودات الشركة وأن شهادة السهم هي وثيقة لإثبات هذا الاستحقاق في الحصة فلا مانع شرعاً من إصدار أسهم في الشركة بهذه الطريقة وتداولها۔

[1] سابق بانی و چیئرمین ادارہ دعوۃ القرآن، ممبئی۔

شیئر ہولڈر کے شیئر میں مبیع (فروخت شدہ چیز۔Sale) کمپنی کی موجودات (اثاثہ) میں مشترک حصہ ہوتا ہے اور شیئر سرٹیفکیٹ حصہ میں استحقاق کے ثبوت کا وثیقہ ہوتا ہے، لہذا اس طریقہ پر کمپنی کے شیئر جاری کرنے اور ان کے لین دین میں شرعاً کوئی مانع نہیں ہے۔

۲۔آغاز میں جب کہ کمپنی کے پاس املاک نہ ہو تو کیا شیئرز کی بیع جائز ہوگی؟

کوئی کمپنی شیئرز کا اعلان نہیں کرسکتی جب تک کہ اس کے (Promoters) کارخانہ وغیرہ کی بنیاد نہ رکھیں۔ اس طرح انہیں ابتدائی سرمایہ اشیائے منقولہ وغیر منقولہ میں لگانا پڑتا ہے۔ جس کے بعد ہی انہیں شیئرز کا اعلان کرنے کی اجازت قانوناً حاصل ہوتی ہے، اس لئے یہ خیال صحیح نہیں کہ کمپنی کے پاس کچھ بھی املاک نہیں ہوتیں اور وہ شیئرز کا اعلان کردیتی ہے۔ لہذا شیئرز کی بیع اس صورت میں بھی جائز ہوگی جب کہ کمپنی پوری طرح قائم (Establish) نہ ہوئی ہو۔

۳۔کمپنی کے وجود میں آجانے کے بعد جبکہ اس کا اثاثہ مخلوط ہوتا ہے شیئرز کی فروخت کا حکم:...... کمپنی کے وجود میں آجانے کے بعد اس کا اثاثہ مخلوط ہوتا ہے (یعنی نقد اور املاک کا مجموعہ) اس صورت میں جبکہ مجموعہ مال سودی (ایسے قرضے جن پر کمپنی سود ادا کرتی ہے) اور غیر سودی دونوں پر مشتمل ہے، اس کے شیئرز کی نقد کے ساتھ خرید وفروخت جواز کے حکم میں ہے، کیونکہ سودی عنصر پورے کاروبار میں ضمنی حیثیت رکھتا ہے، اور موجودہ غیر اسلامی معاشرہ اور غیر اسلامی نظام میں اس قسم کے ضمنی مفاسد کو برداشت کئے بغیر چارہ کار نہیں ہے، ورنہ لوگوں کیلئے معیشت کے دروازے بند ہوجائیں گے۔

۴۔حرام کاروبار کرنے والی کمپنیوں کے شیئرز:...... وہ کمپنیاں جن کا بنیادی کاروبار حرام ہے جیسے شراب اور خنزیر کے گوشت کی تجارت اور امپورٹ، یا بینکس اور سودی اسکیموں میں روپیہ لگانا، ایسی کمپنیوں کے شیئرز کی خرید وفروخت جائز نہیں ہے، یہ بات متفق علیہ ہے، اس لئے اس پر دلائل پیش کرنے کی ضرورت نہیں۔

۵۔جائز کاروبار کرنے والی کمپنیاں اگر سودی قرضے حاصل کرتی ہیں تو کیا ان کے شیئرز خریدنا جائز ہے؟...... ایسی کمپنیاں جن کا کاروبار حلال ہے اگر انکم ٹیکس وغیرہ سے بچنے کے لئے بینک سے سودی قرض لیتی ہیں تو ان کے شیئرز خریدنا جائز ہے، کیونکہ سود دینا ایک ایسی مجبوری ہے جو بالکل عام ہے۔

۶۔جائز کاروبار کرنے والی کمپنیوں کے شیئرز خریدنا جبکہ انہیں اپنا کچھ سرمایہ ریزرو بینک میں جمع کرنا پڑتا ہو:...... جائز کاروبار کرنے والی کمپنیوں کو اگر قانونی تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے اپنے سرمایہ کا کچھ حصہ ریزرو بینک میں جمع کرنا پڑتا ہو یا سیکورٹی بانڈس خریدنے پڑتے ہوں اور ان پر سود ملتا ہو تو ایسی کمپنیوں کے شیئرز خریدنا جائز ہوگا، کیونکہ یہ مجبوری قانون نے پیدا کردی ہے اور اس قسم کی قانونی مجبوریاں عام ہیں جن کی وجہ سے کسی جائز کاروبار کو ترک نہیں کیا جاسکتا، البتہ احتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ منافع ملنے پر اس میں سے کچھ رقم صدقہ کردی جائے تاکہ منافع سود کی آمیزش سے پاک ہوسکے۔

۷۔سودی قرضہ سے حاصل ہونے والے منافع کی شرعی حیثیت:...... سودی قرضہ لینے کی صورت میں اس قرض سے حاصل ہونے والا منافع بالکل جائز ہوگا کیونکہ قرض کی رقم تو حلال ہی ہے اور سود کی شرط باطل ہے، مگر مجبوراً اس شرط کو قبول کرنے کی وجہ سے قرض کی اصل رقم حرام نہیں قرار پائی، اس لئے اس سے ہونے والی آمدنی بالکل جائز ہوگی۔

۸۔کمپنی کا بورڈ آف ڈائرکٹرس:

کمپنی کا بورڈ آف ڈائرکٹرس شیئرز ہولڈرس کا وکیل ہے اور اس کا عمل شیئر ہولڈرس کا عمل سمجھا جائے گا۔

"The owners of a company do not take part in its management. The shareholders simply contribute to its capital by purchasing its shares and vest the power of management in their representative i_e_ Board of Directors."(Company Secreterial Practice P_18)

مگر موجودہ معاشی نظام نے لوگوں کے لئے بے شمار مجبوریاں پیدا کردی ہیں، اس لئے حقیقی مجبوری کا یہاں بھی خیال رکھنا ہوگا اور اس بنا پر بورڈ آف ڈائرکٹرس کے ایسے فیصلوں کو جو شرعاً ناجائز ہوں بادل ناخواستہ گوارا کرنا ہوگا۔ موجودہ حالات میں یہ اجتہاد ضروری ہے۔

۹۔بورڈ آف ڈائرکٹرس میں کسی شیئر ہولڈر کا سودی قرض لینے سے اختلاف کرنا:...... بورڈ آف ڈائرکٹرس میں فیصلے کثرت رائے سے

ہوتے ہیں۔ اس میں کسی شیئر ہولڈر کا سودی قرض لینے سے اختلاف کرنا اور اپنے اختلاف کا اعلان کر دینا عملاً مشکل ہے اور بے اثر بھی، اور ہو سکتا ہے کمپنی کے لئے ناقابل عمل بھی ہو، اس لئے ایسا کرنا شیئر ہولڈر کے لئے ضروری نہیں قرار دیا جا سکتا، بورڈ آف ڈائرکٹرس کے فیصلہ کو کرہاً ماننا ہی پڑے گا۔

۱۰۔ منافع میں شامل سود کے بقدر رقم نکال کر صدقہ کرنا:...... اگر کمپنی کے منافع میں سود بھی شامل ہو اور اس کی مقدار معلوم ہو تو شیئر ہولڈر کے لئے منافع میں سے اس کے بقدر رقم نکال کر صدقہ کر دینا کافی ہوگا۔

واضح رہے کہ کمپنی کی آمدنی میں سود کی رقم بہت کم شامل ہوتی ہے جبکہ وہ لئے ہوئے قرضوں پر سود کی رقم ادا زیادہ مقدار میں کرتی ہے، اس لئے جو سود آمدنی میں شامل ہوا ہے سود کی ادائیگی میں خرچ محسوب کیا جا سکتا ہے، یہ بھی ایک اجتہادی مسئلہ ہے۔

۱۱۔ اگر کمپنی کے منافع میں سود شامل ہو اور حاصل ہونے والی سودی آمدنی کو کاروبار میں لگایا گیا ہو...... اگر کمپنی کے منافع میں سود بھی شامل ہو اور حاصل ہونے والی سودی آمدنی کو کاروبار میں لگا کر نفع کمایا گیا ہو تو جتنا فیصد کل آمدنی میں سود مخلوط ہو گیا ہے اتنا فیصد ملنے والے منافع سے نکال کر صدقہ کر دینا کافی ہوگا۔

۱۲۔ شیئرز کی تجارت کرنا کیسا ہے؟...... شیئرز کی تجارت جائز ہے، کیونکہ شیئر کمپنی کی ملکیت میں جس میں اس کا اثاثہ شامل ہے ایک حصہ ہے، لہٰذا جس طرح دوسری چیزوں کی تجارت کی جاتی ہے شیئرز کی بھی تجارت کی جا سکتی ہے۔

۱۳۔ فیوچر سیل کا حکم:...... فیوچر سیل جائز نہیں کیونکہ یہ حقیقۃً بیع و شراء نہیں ہے بلکہ محض کاغذی کارروائی ہے، اور شریعت میں اعتبار حقیقی بیع و شراء کا ہے نہ کہ محض کاغذی کارروائی کا۔ شیئر کو اگر واقعی فروخت کیا گیا ہو تو نام کی منتقلی کی کارروائی لازمی ہے، اور جب یہ کارروائی نہیں کی گئی تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ شیئر واقعۃً فروخت نہیں کیا گیا، پھر اس پر نفع حاصل کرنے یا نقصان برداشت کرنے کے لئے کوئی وجہ جواز نہیں ہے۔

۱۴۔ غائب سودا:...... غائب سودا جن میں بیع کی نسبت مستقبل کی طرف کی جاتی ہے جائز نہیں ہوگی۔ اوپر سوال نمبر ۱۳ کے جواب میں ان کی وضاحت ہو چکی۔

۱۵۔ شیئرز پر قبضہ کا مطلب:...... شیئرز فروخت کرنے کے بعد کمپنی کو نام کی تبدیلی کے لئے بھیجے جاتے ہیں، اگر بائع کے دستخط صحیح نہ ہوئے تو کمپنی شیئرز بائع کو واپس بھیج دیتی ہے، ایسی صورت میں نام کی تبدیلی کا کام التوا میں پڑ جاتا ہے، اس لئے شیئرز پر حقیقی قبضہ اسی صورت میں ہوتا ہے جبکہ شیئرز سرٹیفکیٹ تبدیلی شدہ نام کے ساتھ مل جائیں۔ اس سے پہلے اگر مشتری شیئرز کسی تیسرے شخص کو فروخت کرتا ہے تو یہ فروخت حقیقی قبضہ سے پہلے ہوگی اور اس میں نزاعات کا بھی اندیشہ ہے اس لئے اس کی اجازت دینا صحیح نہ ہوگا، البتہ بعض مجبور کن حالات میں اگر مشتری تیسرے شخص کو شیئرز فروخت کرتے وقت نام کی منتقلی کی ضمانت دیدے تو ایسا کرنے کی گنجائش نکالی جا سکتی ہے۔

۱۶۔ خرید کردہ شیئرز سرٹیفکیٹ حاصل کرنے سے پہلے دوسرے کے ہاتھ فروخت کرنا:...... اس کا جواب اوپر سوال نمبر ۱۵ میں گذر چکا ہے۔

۱۷۔ بروکر (ایجنٹ) کی حیثیت سے کام کرنا:...... شیئرز کی خرید و فروخت کے لئے بروکر کی ضرورت حالات کا تقاضا ہے، اس لئے بروکر کی حیثیت سے کام کرنا فی نفسہ جائز ہے۔

☆☆☆

حصص کی خرید وفروخت اور اس کے احکام

مفتی جنید عالم ندوی قاسمی [1]

ا۔ کمپنی کا خرید کردہ شیئر کمپنی میں شیئر ہولڈر کی ملکیت کی نمائندگی کرتا ہے یا یہ محض اس بات کی دستاویز ہے کہ اس نے اتنی رقم کمپنی کو دے رکھی ہے؟ اس سوال کا جواب دینے سے قبل یہ طے کرلینا ضروری ہے کہ کمپنی کا یہ معاملہ شریعت کے اصول تجارت میں سے کسی قسم میں داخل ہے یا نہیں؟

ایک نقطہ نظر یہ ہے کہ کمپنی سے شیئر ہولڈر کا یہ معاملہ شریعت مطہرہ کے اصول تجارت میں سے کسی قسم میں شامل نہیں ہے، لہذا شیئر کی خرید وفروخت ہی جائز نہیں ہے۔ دوسرا نقطہ نظر یہ ہے کہ یہ معاملہ شرعاً جائز ودرست ہے۔ شیئر کی خرید وفروخت شریعت کے اصول تجارت کے خلاف نہیں ہے۔ غور کرنے کے بعد دوسرا نقطہ نظر زیادہ صحیح اور اقرب الی الفقہ معلوم ہوتا ہے، اس کو اصول تجارت کے خلاف کہنا صحیح نہیں۔

مذکورہ معاملہ کی مشابہت شرکت عنان سے:

شیئر ہولڈر کمپنی سے جو معاملہ کرتا ہے اس کو شریعت کے اصول تجارت "شرکت عنان" میں شامل کرسکتے ہیں، اس لئے کہ "شرکت عنان" ایسا عقد شرکت ہے جس میں دو آدمی سامان یا غلہ یا عام تجارت میں شریک ہوں اور کمپنی سے شیئر ہولڈر کا جو معاملہ ہے اس میں عام تجارت میں دونوں شریک ہوتے ہیں، ہدایہ میں ہے: وأما شركة العنان فتنعقد على الوكالة دون الكفالة وهي أن يشترك اثنان في نوع بر أو طعام أو يشتركان في عموم التجارات (ہدایہ ۲،۶۲۹)۔

حکیم الامت حضرت تھانوی کا رجحان بھی یہی ہے کہ اس کا تعلق شرکت عنان سے ہے، چنانچہ وہ ایک سوال کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں: "بظاہر اس عقد کی حقیقت شرکت عنان ہے" (امداد الفتاوی ۳/۴۹۴)۔

البتہ شرکت عنان تسلیم کرنے کی صورت میں یہ اشکال ہوتا ہے کہ اس شرکت میں تمام شرکاء مال اور محنت دونوں میں شریک ہوتے ہیں۔ اور کمپنی جو معاملہ کرتی ہے اس میں صرف کمپنی کے افراد کام کرتے ہیں۔ شیئر ہولڈر کی شرکت صرف سرمایہ میں ہوتی ہے محنت میں نہیں ...... اس کا جواب یہ ہے کہ شرکت عنان میں تمام شرکاء کا محنت میں بھی شریک ہونا ضروری نہیں ہے۔ اگر وہ کسی ایک فرد پر محنت کی شرط لگادیں تو اس طرح کی شرط صحیح ودرست ہوگی، یہ شرط شرکت عنان کے منافی نہیں ہوگی۔ البتہ اس صورت میں ضروری ہے کہ نفع کی تقسیم تمام شرکاء کے درمیان برابر ہو یا جس شریک کے لئے عمل کی شرط لگائی گئی ہے اس کو زیادہ نفع ملے، اگر کام کرنے والے شریک کو کم نفع ملے، مثلاً یہ شرط لگادی جائے کہ نفع کے دو حصے دوسرے شریک کو ملیں گے اور کام کرنے والے شریک کو صرف ایک حصہ ملے گا تو یہ جائز نہیں ہوگا۔ اس کی پوری تفصیل تحفۃ الفقہاء (۳/۸۷) میں موجود ہے۔

مذکورہ معاملہ کی مشابہت مضاربت سے:

اس عقد کی مشابہت ومماثلت عقد مضاربت سے بھی معلوم ہوتی ہے۔ اس لئے کہ عقد مضاربت وہ عقد ہے جس میں ایک فریق کا سرمایہ ہوتا ہے اور دوسرے فریق کی محنت۔ اور دونوں فریق باہم طے شدہ معاملہ کے مطابق منافع میں شریک ہوتے ہیں۔

"كتاب المضاربة (هي) عقد شركة في الربح بمال من جانب رب المال (وعمل من جانب) المضارب" (تنویر الابصار مع الدر المختار ۴،۴۸۳)۔

اور شیئر ہولڈر کا کمپنی سے جو معاملہ ہوتا ہے اس کی صورت یہی ہے کہ شیئر ہولڈر کا سرمایہ ہوتا ہے اور کمپنی کی محنت، اور منافع میں دونوں شریک ہوتے ہیں،

---

[1] مفتی امارت شرعیہ، پھلواری شریف، پٹنہ۔

البتہ مضاربت تسلیم کرنے کی صورت میں یہ اشکال ہوتا ہے کہ مضاربت میں نقصان صرف رب المال برداشت کرتا ہے۔ مضاربت پر خسارہ کی ذمہ داری نہیں ہوتی ہے حتی کہ اگر یہ شرط لگادی جائے کہ مضارب بھی خسارہ میں شریک ہوگا تو مضاربت فاسد ہوجائے گی۔ یہی صاحبین کا قول ہے۔ اور کمپنی جو معاملہ کرتی ہے اس میں کمپنی کے افراد اور شیئر ہولڈرس دونوں ہی منافع کے ساتھ ساتھ خسارہ میں بھی شریک ہوتے ہیں، حالانکہ خسارہ صرف شیئر ہولڈرس کو برداشت کرنا چاہئے، کمپنی کے افراد پر خسارہ کی ذمہ داری نہیں آنی چاہئے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ گرچہ صاحبین کے قول کے مطابق مضارب خسارہ میں شریک نہیں ہوتا ہے لیکن امام صاحب کے قول کے مطابق مضارب بھی خسارہ میں شریک ہوتا ہے۔

''فالربح والوضیعة نصفان فی قول أبی حنیفة رحمه الله تعالی کذا فی المبسوط وفی قول أبی یوسف و محمد الوضیعة کلها علی رب المال کذا فی المحیط (فتاوی هندیه ۴،۲۹۱)۔

موجودہ دور میں جبکہ لوگ خیر القرون سے دور ہیں، شر و رفتن کا غلبہ ہے، امانت داری، دیانت داری اور تقوی وللّٰہیت کی قلت اور دھوکہ بازی اور امانت میں خیانت کی کثرت ہے، مضاربت پر معاملہ کرنے کے لئے کسی باوثوق اور قابل اعتماد شخص کی تلاش مشکل ہے۔ اگر کل خسارہ کا ذمہ دار صرف رب المال (مالک) کو ٹھہرایا جائے تو پھر مضاربت کے اصول پر تجارت مشکل ہوجائے گی۔ اس دور پرفتن میں امام صاحب کا قول راجح اور اس پر عمل اقرب الی الفقہ معلوم ہوتا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ کمپنی کا معاملہ شریعت کے اصول تجارت کے خلاف نہیں ہے بلکہ یا تو شرکت عنان میں شامل ہے یا مضاربت میں۔

کمپنی کے شیئرز کی حیثیت:

مذکورہ بالا تفصیل کی روشنی میں کمپنی کے شیئرز کی حیثیت بھی واضح ہوگئی کہ اس کی حیثیت صرف اس بات کی دستاویز کی نہیں ہے کہ کمپنی کو اتنی رقم دے رکھی ہے، بلکہ یہ کمپنی میں شیئر ہولڈر کی ملکیت کی پوری نمائندگی کرتا ہے۔ اور شیئر ہولڈر اپنی رقم کے بقدر کمپنی میں موجود نقد اور اثاثوں کا مالک ہے، اس لئے کہ عقد شرکت ہو یا مضاربت دونوں صورتوں میں رب المال اپنی اصل رقم کے ساتھ منافع کا بھی حقدار ہوتا ہے۔ اور جو بھی سرمایہ ہو خواہ نقد رقم سے حاصل شدہ ہو یا منافع کی شکل میں ہو، رب المال اس میں شریک ہوتا ہے۔ اس کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے جو سوالنامہ میں مذکور ہے۔ یعنی اگر کمپنی باہمی قرارداد سے تحلیل ہو جائے تو ہر شیئر ہولڈر کو اس کے شیئرز کے تناسب سے اس کے اثاثوں میں حصہ ملتا ہے، اور نفع ہو تو اس کے لگائے ہوئے سرمایہ سے زائد رقم ملتی ہے اور اگر خسارہ ہو تو اسے نقصان بھی برداشت کرنا ہوتا ہے۔

حضرت مفتی نظام الدین صاحب مفتی دار العلوم دیوبند نظام الفتاوی میں ایک سوال کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں:

شیئر ز حصوں کا نام ہے۔ شیئر کا مالک شیئر کے مطابق کمپنی کا حصہ دار اور مالک ہوتا ہے، اور کمپنی کے سرمایہ و سامان واثاثہ وغیرہ سب چیزوں کا حسب شیئرز مالک ہوتا ہے اور سرمایہ وسامان وغیرہ کی حیثیت و قیمت کی کمی وبیشی کے اعتبار سے شیئر کی حیثیت و قیمت بھی کم وبیش ہوتی رہتی ہے، اور شیئر کا خریدنا و بیچنا ان حصوں کا اور ان حصوں میں داخل شدہ چیزوں کا خریدنا و بیچنا شمار ہوتا ہے، اور اس کا جائز ہونا ظاہر ہے (نظام الفتاوی ۱/۱۱-۱۲)۔

رہی یہ بات کہ شیئر ہولڈر کے دیوالیہ ہونے کی صورت میں اس کے قرض کی ادائیگی اس کے شیئر کے تناسب سے کمپنی میں موجود سامانوں کو الگ کر کے نہیں کی جاتی ہے۔ جبکہ سرکاری قانون کے مطابق اس کے دیگر املاک ضبط کر کے اس کے قرض کی ادائیگی ہوتی ہے تو اس سے اس بات کی تائید نہیں ہوتی کہ کمپنی کے شیئر کی حیثیت صرف جمع کردہ روپے کے دستاویز کی ہے۔ اس لئے کہ کتب فقہ میں یہ مسئلہ مصرح ہے کہ اگر مقروض قرض کی ادائیگی کے لئے جائداد فروخت کرنے سے باز آجائے تو قاضی اس کے تمام سامان وجائداد فروخت کر کے قرض کی ادائیگی کردے گا لیکن اس کے کپڑے فروخت نہیں کرے گا۔

''وحاصله أنه إذا امتنع عن البیع یبیع علیه القاضی عرضه وعقاره و غیرهما و فی البزازیة وفرع علی صحة الحجر أنه یترك له دست من الثیاب و یباع الباقی و تباع الحسنة ویشتری له الکفایة ویباع کانون الحدید ویشتری له من طین ویباع فی الصیف ما یحتاجه للشتاء وعکسه'' (شامی ۴،۳۲۰)۔

کپڑے ضبط نہ کرنے کی وجہ سے یہ لازم نہیں آتا کہ ان کپڑوں کی ملکیت مقروض کی نہیں ہے۔ قرض کی ادائیگی میں کسی مصلحت کی بنیاد پر کسی چیز کو سرکاری طور پر ضبط نہ کرنا اس کے غیر مملوک ہونے کی دلیل نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ کمپنی میں موجود سامان پر شیئر ہولڈر کی جو ملکیت ہے وہ مشترک اور مشاع ہے۔

ان سامانوں کو الگ کرنا دشوار ہے جس کی بنیاد پر اس کو ضبط کرنا مشکل ہے۔ لہذا اگر اس طرح کا قانون بن گیا تو اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ شیئر ہولڈر ان سامانوں کا مالک نہیں ہے۔

۲۔ شیئر کی خرید وفروخت جبکہ کمپنی کے پاس کچھ بھی املاک نہ ہوں:

اگر کمپنی کے پاس کچھ بھی املاک نہیں ہیں اس وقت کمپنی شیئر کی بیع کرتی ہے تو اس صورت میں نقد کی بیع نقد سے ہو رہی ہے جو بیع صرف کی شکل ہے، جس میں نہ تو کمی بیشی جائز ہے اور نہ ہی ادھار کی گنجائش ہے۔ لہذا اس صورت میں کمپنی کے شیئرز کی بیشی کے ساتھ نہیں خرید سکتے ہیں، البتہ مساوی قیمت میں خرید سکتے ہیں یا نہیں؟ اس سلسلہ میں علماء کی دو رائیں ہیں: ایک تو یہ کہ مساوی قیمت میں بھی خرید وفروخت جائز نہیں ہے اس لئے کہ یہ بیع صرف ہے جس میں نسیئہ یعنی ادھار جائز نہیں ہے۔

دوسری رائے یہ کہ مساوی قیمت پر شیئرز کی خرید وفروخت جائز ہے اور شیئرز سرٹیفکیٹ پر قبضہ درحقیقت نقد رقم پر قبضہ ہے لہذا یہ ادھار بیع نہیں ہوئی۔ میری ناقص رائے میں اگر بیع کی مجلس ہی میں فروخت کرنے والا ثمن پر اور خریدار شیئر سرٹیفکیٹ پر قبضہ کرلے تو مساوی قیمت پر خرید وفروخت کی گنجائش ہونی چاہئے۔

۳۔ نقد اور اموال ربویہ وغیر ربویہ کی بیع نقد کے ساتھ:

کمپنی جب وجود میں آجائے اور اس میں اثاثہ (نقد واملاک کا مجموعہ) موجود ہو تو ایسی صورت میں شیئر کی خرید وفروخت نقد سے کمی بیشی کے ساتھ شرعاً جائز و درست ہے گرچہ املاک میں مال ربوی وغیر ربوی دونوں ہوں، اس لئے کہ اس صورت میں شیئر ہولڈر اپنے شیئر کے تناسب سے کمپنی کے اس نقد اور مال کو دوسروں سے نقد کے عوض فروخت کرتا ہے جس کا وہ مالک ہے اور مال خواہ ربوی ہو یا غیر ربوی اس کی خرید وفروخت روپے سے کمی بیشی کے ساتھ جائز ہے اور اگر خریدار کی جانب سے ملنے والا ثمن بھی مال ربوی یا غیر ربوی ہے تو خریدار کے مال ربوی کو کمپنی کے مال غیر ربوی کے مقابلہ میں اور کمپنی کے مال ربوی کو خریدار کے مال غیر ربوی کے مقابلہ میں رکھ کر بیع کو جائز قرار دیں گے۔ کتب فقہ میں یہ جزئیہ موجود ہے کہ اگر کسی نے دو درہم اور ایک دینار کی بیع ایک درہم اور دو دینار کے بدلہ میں کی تو ایک درہم کو دو دینار کے مقابلہ میں اور دو دینار کو ایک درہم کے مقابلہ میں رکھ کر جنس کو خلاف جنس کی طرف پھیرتے ہوئے جائز قرار دیا جائے گا۔

(وصح بیع درهمین و دینار بدرهم و دینار ین) بصرف الجنس بخلاف جنسه (در مختار) (قوله بصرف الجنس بخلاف جنسه) ای تصحیحا للعقد کما لو باع نصف عبد مشترك بینه و بین غیره فإنه ینصرف إلی نصیبه تصحیحا للعقد (رد المحتار باب الصرف ۴،۲۳۹)۔

۴۔ حرام کاروبار کرنے والی کمپنیوں کے شیئرز کی خرید وفروخت:

جن کمپنیوں کا کاروبار حرام ہو مثلاً شراب اور خنزیر کے گوشت کی تجارت کریں یا سودی اسکیموں میں پیسے لگائیں، ایسی کمپنیوں کے شیئرز کی خرید وفروخت شرعاً جائز نہیں ہے، اس سے احتراز لازم ہے، اس لئے کہ مال حرام یا ذریعہ حرام سے حاصل ہونے والا نفع بھی حرام ہے۔ اور اس میں تعاون علی الاثم ہے، والعدوان بھی ہے، جس کی ممانعت نص قرآنی سے ثابت ہے: "ولا تعاونوا علی الإثم والعدوان (سورہ مائدہ)۔

اس طرح کی کمپنیوں کے شیئرز خریدنے کا مطلب یہ ہے کہ ان کو حرام کاروبار کرنے کا وکیل بنایا گیا جس کی قطعاً اجازت نہیں ہے۔

''أن یکون التصرف مباحا شرعاً فلا یجوز التوکیل فی فعل محرم شرعا کالغصب أو الاعتداء علی الغیر'' (الفقه الاسلامی وادلته ۴،۱۵۴)۔

علامہ شامی نے لکھا ہے کہ اگر کسی نے خنزیر اور شراب کی بیع کا وکیل بنایا تو اس پر واجب ہے کہ کل ثمن کو صدقہ کردے۔ ولو وکله ببیعهما یجب علیه أن یتصدق بثمنهما (ردالمحتار)۔

۵۔ انکم ٹیکس سے بچنے کے لئے سودی قرض لینے والی کمپنیوں کے شیئرز کی خرید وفروخت:

جن کمپنیوں کا کاروبار بذات خود جائز و حلال ہے لیکن انکم ٹیکس سے بچنے کے لئے بینک سے سودی قرض لینا پڑتا ہے ان کمپنیوں کے شیئرز کی خرید وفروخت

شرعاً جائز و درست ہے، اس لئے کہ انکم ٹیکس سے بچنے کے لئے دیگر ضروریات کی بنیاد پر بینک سے سوی قرض لینے کی گنجائش ہے، یجوز للمحتاج الاستقراض بالربح (الاشباہ والنظائر ۱۲۹)۔

۶۔ ریزروبینک میں رقم جمع کرنے اور سیکورٹی بانڈس خریدنے والی کمپنیوں کے شیئرز کی خرید و فروخت:

جن کمپنیوں کا بنیادی کاروبار حلال ہے لیکن قانونی تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے ضرورتاً ان کو اپنے سرمایہ کا کچھ حصہ ریزروبینک میں جمع کرنا پڑتا ہے یا سیکورٹی بانڈس خریدنا پڑتا ہے جس پر ان کمپنیوں کو سود بھی ملتا ہے، تو ظاہر ہے کہ کمپنیوں کا یہ عمل ضرورتاً ہے جس کی گنجائش ہے، لہذا سودی رقم سے بچتے ہوئے ان کمپنیوں کے شیئرز کی خرید و فروخت شرعاً جائز و درست ہے۔ شیئرز ہولڈر پر لازم ہوگا کہ بینک سے ملنے والی سودی رقم سے حصہ نہ لے، اور اگر حصہ لیتا ہے تو اس کے بقدر بلا نیت ثواب صدقہ کردے۔

فی القنية لو كان الخبيث نصابا لا يلزمه الزكوة لأن الكل واجب التصدق عليه فلا يفيد إيجاب التصدق ببعضه أو مثله في البزازية (رد المحتار كتاب الزكوة ۲،۲۵)۔

۷۔ سود پر لئے گئے قرض سے حاصل ہونے والے منافع کی شرعی حیثیت:...... سود پر لئے گئے قرض کی صورت میں چونکہ قرض کی رقم فی نفسہ جائز اور حلال ہے، اس رقم کے ساتھ حرمت کی آمیزش نہیں ہے، لہذا سود پر لئے گئے قرض سے جو منافع حاصل ہوں گے وہ بھی شرعاً حلال ہوں گے۔ ان کو لے کر اپنے ذاتی مصرف میں استعمال کر سکتے ہیں۔ وہ قرض یقیناً مفید ملک ہے۔ اس کے مفید ملک نہ ہونے کی کوئی وجہ بظاہر سمجھ میں نہیں آتی ہے۔

۸۔ بورڈ آف ڈائریکٹرس کی حیثیت:...... اوپر یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ کمپنی کا معاملہ یا تو شرکت عنان میں شامل ہے یا مضاربت میں، اور شرکت عنان میں دونوں فریق ایک دوسرے کے وکیل ہوتے ہیں۔ اور جب کام کی شرط ایک فریق پر لگادی جائے تو کام کرنے والا فریق اپنے سرمایہ کے بقدر اصیل ہوگا اور اپنے شریک کے سرمایہ میں وکیل ہوگا۔ اسی طرح مضاربت میں مضارب، رب المال کا وکیل ہوتا ہے، لہذا کمپنی کے بورڈ آف ڈائریکٹرس کی حیثیت شیئر ہولڈر کے وکیل کی ہوگی اور اس کا عمل شیئر ہولڈر کا عمل سمجھا جائے گا (دیکھئے: تحفۃ الفقہاء ۳؍۷، ۲۱، درمختار ۴؍۴۸۴، امداد الفتاوی ۳؍۴۹۰)۔

۹۔ شیئر ہولڈر کا سودی قرض لینے سے اختلاف کا اظہار کافی ہے؟...... یہ تو صحیح ہے کہ اصولی طور پر وکیل کے تصرفات مؤکل کی طرف منسوب ہوتے ہیں، اور اگر وکیل خلاف شرع کوئی عمل کرتا ہے تو مؤکل بری الذمہ نہیں ہوگا۔ لیکن یہ بھی طے شدہ حقیقت ہے کہ وکیل اسی عمل اور تصرف کا مجاز ہوتا ہے جس کی اجازت مؤکل نے صراحۃً یا دلالۃً دی ہو۔ اگر مؤکل نے کسی عمل سے صراحۃً روک دیا تو وکیل کو اس کا اختیار نہیں ہوگا، اور وکیل کا وہ عمل مؤکل کی طرف منسوب نہیں ہوگا، لہذا مذکورہ صورت میں بورڈ آف ڈائریکٹرس کا سودی قرض لینا جو عام حالات میں خلاف شرع عمل ہے، یہ عمل شیئر ہولڈرس کی طرف منسوب ہو سکتا تھا اس لئے کہ شیئر ہولڈرس کی جانب سے صراحۃً نہیں تو دلالۃً اجازت سمجھی جا سکتی تھی لیکن جب کوئی شیئر ہولڈر کمپنی کے عملہ کو عام حالات میں سودی قرض لینے سے پوری قوت کے ساتھ منع کردے اور صراحۃً اپنے اختلاف کا اعلان کردے تو اللہ تعالی کی ذات سے امید ہے کہ وہ اس اعلان کی بنا پر خلاف شرع عمل سے بری الذمہ ہوگا اور وکیل کا عمل مؤکل کی جانب منسوب نہیں ہوگا (دیکھئے: امداد الفتاوی ۳؍۴۹۱)۔

۱۰۔ منافع سے متعینہ سودی رقم نکال کر صدقہ کردینا کافی ہوگا:

اگر کمپنی کے منافع میں سودی رقم بھی شامل ہو اور وہ رقم متعین و معلوم ہو تو شیئر ہولڈر کے لئے سود کی اتنی رقم نکال کر بلا نیت ثواب صدقہ کردینا کافی ہوگا، اور بقیہ رقم حلال ہوگی، اس کو شیئر ہولڈر اپنے مصرف میں استعمال کر سکتا ہے۔ اس مسئلہ پر فتاوی ہندیہ کے اس جزئیہ سے بھی روشنی ملتی ہے کہ اگر کوئی مسلمان، کسی نصرانی کو مال مضاربت کے لئے دے تو کراہت کے ساتھ جائز ہوگا، اگر وہ نصرانی شراب اور خنزیر کی تجارت کرے اور نفع ہو تو امام صاحب کے قول کے مطابق یہ معاملہ مضاربت کے اصول پر جائز ہوگا لیکن مسلمان کو چاہئے کہ وہ اپنے حصہ کے بقدر نفع کو صدقہ کردے۔

إذا دفع المسلم إلى النصراني مالا مضاربة بالنصف فهو جائز إلا أنه مكروه فإن اتجر في الخمر والخنزير فربح جاز على المضاربة في قول أبي حنيفة رحمه الله تعالى و ينبغي للمسلم أن يتصدق بحصته من الربح (فتاوی ہندیہ ۴،۳۲۳)۔

۱۱۔ سود کی آمدنی سے حاصل شدہ منافع: ...... اگر کمپنی کے منافع میں سود بھی شامل ہو اور حاصل ہونے والی سودی آمدنی کو کاروبار میں لگا کر نفع کمایا گیا ہو تو شیئر ہولڈر کے لئے اپنے حصہ سے صرف سود کے تناسب سے رقم نکال کر صدقہ کر دینا کافی نہیں ہوگا۔ بلکہ سودی رقم اور اس سے حاصل ہونے والے تمام منافع نکال کر بلا نیت ثواب صدقہ کرنا ہوگا، اس لئے کہ مال حرام یا ذریعہ حرام سے حاصل کیا ہوا نفع بھی حرام ہوتا ہے، جس کی صراحت اور اس سے متعلق متعدد جزئیات کتب فقہ میں موجود ہیں۔

۱۲۔ شیئرز کی تجارت: ...... تاجروں کے عرف میں شیئر مال متقوم ہے اور مال متقوم کی خرید وفروخت شرعاً جائز و درست ہے۔ شیئر کی خرید وفروخت درحقیقت کمپنی کے اس سرمایہ کی خرید وفروخت ہے جس کا مالک شیئر ہولڈر ہے، اور سرمایہ کی خرید وفروخت کمی بیشی کے ساتھ جائز و درست ہے۔ نیز مال کی ذخیرہ اندوزی تاکہ قیمت میں اضافہ کے وقت فروخت کیا جائے اس وقت ممنوع ہے جبکہ لوگوں کو اس کی سخت ضرورت ہو اور بازار میں وہ مال نہ ملتا ہو، ذخیرہ اندوزی کی صورت میں لوگ پریشان وحرج میں مبتلا ہوں، اور اگر اس طرح کی بات نہ ہو تو ذخیرہ اندوزی ممنوع نہیں ہے۔ شیئرز کو خرید کر رکھنے میں لوگوں کو کوئی حرج نہیں ہے، لہٰذا اس کی تجارت کرنا اور اس کو خرید کر رکھنا تاکہ قیمت میں اضافہ کے وقت اس کو فروخت کیا جائے شرعاً جائز و درست ہے۔ تجار دیگر اموال کو خرید کر رکھتے ہیں اس امید پر کہ قیمت میں اضافہ کے وقت فروخت کریں گے۔ اکثر قیمت میں اضافہ بھی ہوتا ہے لیکن بعض دفعہ خسارہ بھی اٹھانا پڑتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہاں بھی قیاس آرائی ہی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ہر تخمین وقیاس آرائی ممنوع اور خلاف شرع نہیں ہے، بلکہ وہ تخمین اور قیاس آرائی ممنوع ہے جس میں غرر اور دھوکہ ہو۔

۱۳۔ فیوچر سیل کا حکم: ...... فیوچر سیل جس میں نہ بائع مال دیتا ہے اور نہ مشتری ثمن، بلکہ مقررہ تاریخ پر بڑھتے ہوئے دام کی صورت میں منافع اور گھٹتے ہوئے دام کی صورت میں خسارہ ادا کیا جاتا ہے، تو حقیقت میں یہ بیع نہیں ہے بلکہ یہ قمار وجوا کی ایک شکل ہے، یہ صورت شرعاً جائز نہیں ہے، اس سے احتراز لازم ہے۔

۱۴۔ غائب سودا کی بیع: ...... یہ سوال وضاحت طلب ہے، اگر اس کا مطلب یہ ہے کہ مبیع موجود نہیں ہے، اور بائع یہ کہتا ہے کہ فلاں چیز موجود نہیں ہے، آنے کی امید ہے، اس کے آجانے پر میں تمہارے ہاتھ اتنے روپے میں فروخت کردوں گا، اور خریدار کہتا ہے کہ میں خرید لوں گا، تو شرعاً یہ بیع نہیں ہے بلکہ وعدہ بیع ہے، اس لئے کہ صحت بیع کے لئے ایک شرط تو یہ ہے کہ ایجاب وقبول ایسے صیغہ سے ہو جس میں انشاء کا مفہوم پایا جائے، اور دوسری شرط یہ ہے کہ مبیع موجود ہو۔ یہاں پر دونوں شرطیں مفقود ہیں، لہٰذا یہ بیع صحیح نہیں ہوگی، اور بیع کے احکام اس پر جاری نہیں ہوں گے۔

۱۵۔ شیئرز پر قبضہ کی حقیقت: ...... جمہور فقہاء کے نزدیک ہر چیز پر قبضہ حسی ضروری نہیں ہے بلکہ بعض چیزوں میں معنوی قبضہ بھی کافی ہے اور ہر چیز پر قبضہ اس کی نوعیت کے اعتبار سے مختلف ہوگا جس کی بنا عرف وعادت پر ہوگی۔ فقہائے کرام نے شئی کے ضمان میں آجانے، حقوق وذمہ داریاں خریدار کی طرف منتقل ہوجانے اور غرر ودھوکہ سے محفوظ رہنے کی صورت میں قبضہ تصور کیا ہے۔ لہٰذا مذکورہ صورت میں جبکہ شیئرز کے خریدتے ہی قانونی طور پر کمپنی کے اثاثے اور املاک شیئر کے بقدر خریدار کے ضمان میں آجاتے ہیں اور حقوق وذمہ داریاں خریدار کی طرف منتقل ہوجاتی ہیں۔ ایسی صورت میں گرچہ قانونی دشواریوں کی وجہ سے شیئر سرٹیفکیٹ نہ ملا ہو پھر بھی شیئرز خریدتے ہی اس پر خریدار کا قبضہ سمجھا جائے گا اور اس میں ہر جائز تصرف کا اختیار ہوگا۔

۱۶۔ شیئرز سرٹیفکیٹ حاصل ہونے سے قبل شیئرز کی خرید وفروخت: ...... جب شیئرز خریدتے ہی شیئرز کے بقدر کمپنی کے تمام اثاثے اور املاک خریدار کے ضمان میں آجاتے ہیں اور تمام حقوق وذمہ داریاں خریدار کی طرف منتقل ہوجاتی ہیں تو اس کو قبضہ تسلیم کیا جائے گا، اور شیئرز سرٹیفکیٹ کے حاصل ہونے سے قبل شیئرز کی خریداری کے دوسرے یا چوتھے دن خریدار کا دوسروں کے ہاتھ فروخت کرنا شرعاً جائز و درست ہوگا۔ اس کو بیع بعد القبض کہیں گے نہ کہ بیع قبل القبض۔ اسی طرح تیسرے یا چوتھے کے ہاتھ فروخت کرنا بھی جائز و درست ہوگا۔

۱۷۔ شیئرز کی خرید وفروخت میں ایجنٹ کی حیثیت سے کام کرنا: جن صورتوں میں شیئرز کی خرید وفروخت شرعاً ناجائز ہے ان صورتوں میں بروکر یعنی ایجنٹ کی حیثیت سے کام کرنا بھی ناجائز ہوگا، اس لئے کہ یہ گناہ اور خلاف شرع امور میں تعاون دینا ہے۔ جس کی ممانعت نص قرآنی سے ثابت ہے۔ البتہ جن صورتوں میں شیئرز کی خرید وفروخت شرعاً جائز و درست ہے ان صورتوں میں ایجنٹ کی حیثیت سے کام کرنا بھی جائز و درست ہوگا۔ یہ درحقیقت دلالی کی ایک صورت ہے، اور فقہاء کرام کی صراحت موجود ہے کہ ضرورت کی بنیاد پر پیشۂ دلالی اور اس کی اجرت شرعاً جائز و درست ہے (رد المحتار ۵/۲۹)۔ ☆☆☆

شیئرز

ڈاکٹر وہبہ مصطفی الزحیلی [1]

تمہید:

اسٹاک کمپنیوں (Stock Companies) میں شیئرز کے ذریعہ کاروبار رائج اور اہمیت کا حامل ہو گیا ہے، اس قسم کے کاروبار کا مقصد اجتماعی محنت کی شکل میں انفرادی یا جزئی رقوم کے ایک مجموعہ کی سرمایہ کاری کر کے یا ان کو کاروبار میں لگا کر منافع حاصل کرنا ہوتا ہے۔ عموماً عام لوگ اس کاروبار کی ایک بڑی اسکیم کو تن تنہا چلانے پر قادر نہیں ہوتے، لہذا بڑے سرمائے کو شیئرز یعنی ان کاروباری دستاویزات (Commercial Papers) کے ذریعہ تقسیم کیا جاتا ہے جنہیں اسٹاک ایکسچینج یا دیگر مارکیٹوں میں آفر کئے جاتے ہیں، اور دسیوں یا سیکڑوں افراد کی طرف سے جن کی قیمت ادا کی جاتی ہے۔

اس طرح بڑی بڑی صنعتی یا زرعی تجارتی اسکیموں کی سرمایہ کاری کے لئے بینکوں یا دیگر فنڈز اور مقامات میں جمع شدہ پرائیوٹ اور پوشیدہ سرمائے سے فائدہ اٹھانا ممکن ہوتا ہے۔

شیئرز کی بالفور یا بتاخیر، قبضہ کے ذریعہ یا بغیر قبضہ کے، براہ راست یا ایجنٹوں اور بروکر (Broker) کے ذریعہ، خرید وفروخت کے مختلف پہلوؤں کے تعلق سے چند سوالات پیدا ہوتے ہیں۔

شیئرز کے ذریعہ شراکت داری کا مسئلہ اس وقت اور پیچیدہ ہو جاتا ہے جب جوائنٹ اسٹاک کمپنی اپنی اسکیم کو فروغ دینے، اسے کامیاب بنانے، اس کے کاروبار کے دائرہ کو وسیع کرنے، اس کو زیادہ فعالیت عطا کرنے اور زیادہ مفید اور انتہائی ترقی یافتہ مشینوں کی خریداری کے لئے بینکوں سے سودی قرضے لینے پر مجبور ہوتی ہے۔

مقالہ کے موضوعات:

زیر نظر مقالہ مندرجہ ذیل موضوعات پر مشتمل ہے:

۱۔ کیا شیئرز کمپنی میں جز و ملکیت کی حیثیت رکھتے ہیں یا یہ رقوم کی دستاویز ہیں؟

۲۔ کمپنی کے اپنے کاروبار شروع کرنے سے پہلے خریدے گئے شیئرز کی بیع؟

۳۔ ایسی کمپنی کے شیئرز کی خرید وفروخت جس کے قیام کے بعد اس کا سرمایہ سودی اور غیر سودی دونوں کے مجموعہ مال پر مشتمل ہو؟

۴۔ حرام کاروبار کرنے والی کمپنی کے شیئرز کی خرید وفروخت کا حکم؟

۵۔ ایسی کمپنی کے شیئرز کی خرید وفروخت کا حکم جس کا کاروبار تو حلال ہو لیکن انکم ٹیکس کی زد سے بچنے کے لئے اسے سودی قرض لینا پڑتا ہو؟

۶۔ ایسی کمپنی کے شیئرز کی خرید وفروخت کا حکم جس کا کاروبار حلال ہو مگر اسے اپنے سرمائے کا ایک حصہ سینٹرل ریزرو بینک میں جمع کرنا پڑتا ہو یا سیکورٹی بانڈز خریدنے پڑتے ہوں؟

۷۔ سودی قرض سے حاصل ہونے والے منافع کا حکم۔ کیا وہ حلال اور مفید ملک ہیں؟

---

[1] دمشق یونیورسٹی، سیریا۔

۸۔ کیا کمپنی کا بورڈ آف ڈائریکٹرس شیئرز ہولڈر کا وکیل ہے؟

۹۔ کیا کسی شیئر ہولڈر کا سودی قرض لینے کے فیصلہ سے اختلاف کرنا اسے سودی قرض کے وبال سے بری الذمہ کردے گا؟

۱۰۔ کیا شیئر ہولڈر کے لئے سود سے پیدا شدہ متعین منافع کے بقدر صدقہ کردینا کافی ہے؟

۱۱۔ کیا کل آمدنی میں مخلوط سود سے حاصل شدہ منافع کے بقدر صدقہ کردینا شیئرز ہولڈر کیلئے کافی ہے؟

۱۲۔ قیمتوں کے بڑھنے کی صورت میں شیئرز کی تجارت (یعنی نفع کے ساتھ اس کو فروخت کرنے) کا کیا حکم ہے؟

۱۳۔ شرعاً فیوچر سیلز (جس میں نہ مبیع کی حوالگی ہوتی ہے اور نہ ہی ثمن کی ادائیگی) کا کیا حکم ہے؟

۱۴۔ کسی شئے کے سلسلے میں ہونے والی اس بیع کا کیا حکم ہے جس کی اضافت مستقبل کی طرف کی گئی ہو؟

۱۵۔ حکمی قبضہ سے متصف شیئرز کی اس خرید کا کیا حکم ہے جس میں شیئرز سرٹیفکیٹ پر قبضہ حسی مؤخر ہو؟

۱۶۔ قبضہ حسی سے پہلے شیئرز کی بیع کا کیا حکم ہے؟

۱۷۔ اسٹاک ایکسچینج مارکیٹ میں بروکرز یعنی ایجنٹ کی حیثیت سے کاروبار کرنے کا کیا حکم ہے؟

ا۔ کیا شیئرز کی حیثیت کمپنی میں حصہ کی ہے یا رقوم کے دستاویز کی ہے؟

شیئرز: یکساں قیمت (Value) کے حامل، ناقابل تقسیم (Indivisible) اور تجارتی ذرائع سے قابل تداول وہ دستاویزات (Documents) ہیں جو کمپنیوں کے اصل سرمائے میں شراکت اختیار کرنے والے شیئر ہولڈرز کے حقوق کی نمائندگی کرتے ہیں۔

مصری سول قانون کی دفعہ ۵۰۵، اور شامی سول قانون کی دفعہ ۴۷۳ میں کمپنی کی تعریف یہ بیان کی گئی ہے کہ:

کمپنی ایک ایسا عقد ہے جس کے بموجب دو یا دو سے زائد اشخاص اس بات کے پابند ہوتے ہیں کہ ان میں سے ہر ایک سرمایہ یا محنت کا ایک حصہ پیش کر کے کسی مالی اسکیم میں شراکت اختیار کرے گا، اور اس اسکیم سے پیدا شدہ نفع یا نقصان آپس میں تقسیم ہوں گے۔

موجودہ تجارتی قانون کے ماہرین کی اس تعریف سے واضح ہوجاتا ہے کہ: شیئرز وہ دستاویزات ہیں جنہیں شیئرز کمپنی جاری کرتی ہے، اور یہ کمپنی کے اصل سرمائے اور اس کے ضمن میں حاصل ہونے والے حقوق میں مشترک حصص کی نمائندگی کرتے ہیں، کمپنی کے اصل اثاثے اور اس سے حاصل شدہ حقوق کا دارومدار کمپنی کی خالص املاک، اس کی آمدنیوں اور اس کے انتظام وانصرام پر ہوتا ہے، لہذا کمپنی ایک قسم کا عقد ہے، کیونکہ یہ شرکاء کے اتفاق کے نتیجہ میں وجود میں آتی ہے۔

شیئر کمپنی کے اصل اثاثے کے ایک جزو کی نمائندگی کرتا ہے، اور اس کا مالک شیئر ہولڈر ہوتا ہے، شیئرز کی مندرجہ ذیل خصوصیات ہیں ا:

۱۔ یہ مساوی درجہ (Face Value) کے حامل ہوتے ہیں: یہ وہ قیمت ہے جو شیئرز کے اجراء کے وقت طے پاتی ہے اور اسی کے ساتھ شیئرز جاری کئے جاتے ہیں، یہی وہ قیمت ہے جس کی تحدید قانونی طور سے دنیا کے بعض ملکوں جیسے متحدہ عرب امارات میں ایک اور سو درہم کے درمیانی تناسب سے کی جاتی ہے۔

۲۔ یہ ناقابل تجزی ہوتے ہیں: یعنی کمپنی کے مقابلہ میں ایک سے زائد شیئر ہولڈرس کی صورت میں یہ کسور کی شکل میں ظہور پذیر نہیں ہوتے۔

۳۔ تجارتی طریقے سے رواج پذیر ہوتے ہیں: یعنی معروف تجارتی طریقوں سے اور کمپنی کی طرف سے بغیر کسی سول آرڈر کے شیئرز کی ملکیت ایک شخص سے دوسرے تک منتقل ہوسکتی ہے، اگر شیئر شیئر ہولڈر کی اجازت یا اس کے حکم سے جاری کیا گیا ہو تو اس کی منتقلی توثیق سے ہوگی اور اگر وہ Bearer Share ہو تو اس کی منتقلی محض دستی حوالگی ہی سے ہوجائے گی، شیئر ہولڈرس پر حکومتی نگرانی وسرپرستی کی ضمانت کی خاطر، عموماً شیئرز نامزد ہوتے ہیں۔ جہاں تک بانڈز (Bonds) کا تعلق ہے تو وہ متعین نام سے بھی ہوتے ہیں اور Bearer بھی ہوتے ہیں۔

الغرض شیئرز کمپنی کے سرمائے میں حصص کی نمائندگی کرتے ہیں۔ بالفاظ دیگر شیئرز اپنی فطرت وحقیقت کے اعتبار سے مستقل بالذات نقود اور کمپنی کی عینی املاک یعنی فرنیچرز، عمارتوں، مشینوں، اوزار، مصنوعات اور تیار شدہ ساز وسامان، یا غیر تیار شدہ خام یا پختہ مال، اور دوسروں کے ذمہ کمپنی کی واجب الاداء دیون کا مجموعہ قرار پاتے ہیں، یہ تمام اشیاء شیئرز اور اس کی تشکیل کے ذیل میں آتی ہیں۔ اب ایسی صورت میں شیئرز کی خرید وفروخت نقد کی نقد کے ساتھ خرید وفروخت

نہیں بلکہ یہ نقود کا اپنے بالمقابل نقود واملاک کے مجموعہ سے تبادلہ ہے۔

شیئر ہولڈر اگر اپنا شیئر فروخت کردے تو اس کے بالمقابل حصہ کا وہ مالک قرار پائے گا، اسی طرح کمپنی کے تحلیل ہونے کی صورت میں بھی وہ اپنے شیئرز کے بالمقابل حصص کا بحیثیت مالک مستحق ہوگا، اور اگر شیئر میں نفع ہوگا تو اس میں بھی اس کا حق ہوگا۔ اور اگر کمپنی کو خسارہ ہو تو وہ اپنی زیر ملکیت شیئرز کے تناسب سے خسارہ بھی برداشت کرے گا، اس کے برعکس جو عمل بھی ہوگا اس سے کمپنی کے عقد کے تقاضوں کی خلاف ورزی لازم آئے گی۔

شیئرز کی حیثیت ادا شدہ رقوم کی دستاویزات جیسی ہرگز نہیں ہے، اس لئے کہ یہ تو ان قرضہ جات کے ذرائع ہیں جن پر متعین شرح سے سود واجب الاداء ہوتے ہیں، ان کے مالکان کو کمپنی میں شراکت کا حق حاصل نہیں ہے، اور نہ ہی شیئرز کی شیئرز کے ساتھ بیع وشراء نقد کی نقد کے ساتھ بیع وشراء ہے، اور قرضہ جات ایک متعین قیمت کی نمائندگی کرتے ہیں، لہذا مقروض کے دیوالیہ ہونے کی صورت میں اس کی املاک ضبط کی جاسکتی ہیں، اس کا کمپنی کی املاک اور اثاثوں سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

شیئرز کی اس حیثیت کا تعین کرکے اس کے مناسب شرعی احکام اس پر مرتب کئے جاسکتے ہیں، خواہ اس کا تعلق شیئر ہولڈرس کے ذمہ ادائیگی زکاۃ کے وجوب سے ہو، یا شیئرز کو متداول اور قابل بیع وشراء بنانے سے، یا کمپنی کے کاروبار کے نتیجہ میں حاصل شدہ منافع کے واجب الاداء ہونے سے، یا کمپنی کے مالکان کو ہر شیئر کی واضح ملکیت کے تناسب سے پیش آمدہ خسارے کو برداشت کرنے کا پابند بنانے سے۔

۲۔ کمپنی کے کاروبار شروع کرنے سے پہلے خریدے گئے شیئرز کی بیع:

کمپنی کے قیام کے بعد اور اس کے کاروبار کے آغاز اور اس اسکیم کو جس کے پیش نظر کمپنی کا قیام عمل میں آیا ہے، روبعمل لانے سے قبل خریدے گئے شیئرز کی بیع درست ہے، بشرطیکہ عقد صرف کے شرائط اور اس کے ضوابط کا تحقق ہو، اس لئے کہ یہ نقد کی نقد کے ساتھ خرید وفروخت ہے، اور حرام (ربا) میں پڑنے سے بچانے کے لئے اس پر بیع صرف کے احکام منطبق ہوں گے۔

مختصراً بیع صرف کی مندرجہ ذیل شرطیں ہیں:

۱۔ ادھار سود (ربا النسیئۃ) کی زد سے بچانے کے لئے مجلس معاملہ سے متعاقدین کے جدا ہونے سے پہلے قبضہ کا تحقق۔

۲۔ **مماثلت:** اگر نقد کی بیع اس کی جنس سے ہو جیسے سونے کی بیع سونے سے، یا چاندی کی چاندی سے، یا نقدی نوٹ کی بیع اس کے مثل سے ہو، تو مقدار میں مماثلت واجب ہے، دونوں ثمن میں وزن کے اعتبار سے، اور نقدی نوٹوں میں تعداد کے اعتبار سے، اس میں کسی قسم کی کمی یا زیادتی جائز نہیں ہے۔

۳۔ **عقد میں خیار شرط نہ ہو:** اس لئے کہ اس عقد میں عوضین پر قبضہ شرط ہے، اور خیار شرط (اختلاف فقہاء کے اعتبار سے) ثبوت ملک یا تکمیل ملک کے لئے مانع ہے، اور خیار، قبض مشروط میں مخل ہوتا ہے، قبض مشروط سے مراد وہ قبضہ ہے جس سے تعیین کا حصول ہوتا ہے، لہذا اس خیار کی شرط لگاتے ہی عقد فاسد ہوجائے گا۔

۴۔ **اس میں کوئی مدت نہ ہو:** اس لئے کہ عقد میں متعاقدین کے جدا ہونے سے پہلے عوضین پر قبضہ مطلوب ہے، اور مدت سے قبضہ مؤخر ہوگا، لہذا یہ عقد فاسد ہوگا۔

اخیر کی دو شرطیں بیع صرف میں واجب قبضہ سے متفرع ہیں، اور شروع کی دو شرطیں ربا النسیئۃ میں مبتلا ہونے سے بچانے کے لئے لگائی گئی ہیں۔

جدہ اسلامک فقہ اکیڈمی کی چوتھی کانفرنس (منعقدہ ۱۴۰۸ھ۔ مطابق ۱۹۸۸ء) کے فیصلہ میں مقارضہ بانڈز یا دستاویزات مضاربہ پر گفتگو کے ضمن میں درج ذیل صراحت موجود ہے:

نقرہ۔ا: اگر جمع شدہ مال قراض (مضاربہ) اندراج کے بعد اور سرمائے سے کاروبار کے آغاز سے قبل نقود کی شکل میں برقرار ہوں، تو مقارضہ بانڈز (MBs) کی منتقلی اور اس کا تداول نقد کا نقد سے تبادلہ قرار پائے گا، اور اس پر بیع صرف کے احکام منطبق ہوں گے۔

۳۔ ایسی کمپنی کے شیئرز کی بیع کا حکم جس کا سرمایہ سودی وغیر سودی دونوں طرح کے مال پر مشتمل ہو:

عموماً ایسا ہوتا ہے کہ بعض شیئرز کی بیع کمپنی کے قیام اور اس کے کاروبار کے شروع ہونے کے بعد ہوا کرتی ہے، لیکن اگر ایسی صورت میں کمپنی کا اصل سرمایہ حرام سے مخلوط ہو، اس طور پر کہ مجموعہ مال ربوی اور غیر ربوی دونوں پر مشتمل ہو تو یہ بیع ضرورت یا حاجت کے پیش نظر درست ہوگی اور یہ آمدنی مشتبہ قرار پائے گی،

لہذا ان سودی قرضہ جات کے تناسب سے جن سے یہ آمدنی حاصل ہوئی ہے منافع کا ایک حصہ نکالنا واجب ہے، اور یہ ناجائز آمدنی ضرورت مندوں پر صرف کی جائے گی۔ اس سے کسی شخص کے ذمہ عائد ہونے والے اخراجات نہیں پورے کئے جاسکتے، نہ ہی یہ رقم ان لوگوں پر خرچ کی جاسکتی ہے جن کا نفقہ اس کے ذمہ لازم ہو، اور اس سے سوائے اس ٹیکس کے جو اس آمدنی کے ساتھ مخصوص ہو، دوسرے حکومتی ٹیکس نہیں ادا کئے جائیں گے، لہذا عام ضرورت و حاجت کے نہ پائے جانے کی صورت میں اس قسم کی بیع وشراء جائز نہیں ہے، اس لئے کہ اصل سرمائے کی حرمت کو تقویت پہنچانے والا شبہ موجود ہے، ہاں اگر اصل سرمایہ سود سے پاک ہو تو اس قسم کی خرید و فروخت جائز ہے۔

مذکورالصدر فقہ اکیڈمی کی طرف سے مقارضہ بانڈز کے سلسلے میں کئے گئے فیصلے میں دو فقروں پر مشتمل مندرجہ ذیل باتوں کی صراحت موجود ہے، جو راس المال کے سود سے پاک ہونے کی صورت میں شیئرز کی بیع وشراء اور ان کی منتقلی پر منطبق ہوتی ہے:

ب: اگر مال مقارضہ دیون کی شکل میں ہو تو عقد دیون کے احکام مقارضہ بانڈز کے تداول پر منطبق ہوں گے۔

ج: اگر مال مقارضہ نقود، دیون، اعیان اور منافع کے مجموعی اثاثے کی صورت میں ہو تو فریقین کے درمیان طے شدہ قیمت کے مطابق مقارضہ بانڈز کا تبادلہ درست ہے، بشرطیکہ اس صورت میں اعیان و منافع غالب ہوں، لیکن اگر نقود یا دیون غالب ہوں تو تبادلہ میں نقود کے تبادلہ یا دیون کی بیع کے سلسلہ میں طے شدہ شرعی احکام ملحوظ رکھے جائیں گے۔

یہ واضح رہے کہ نقود کی بیع کا عقد صرف کے مذکورہ احکام کا تابع ہونا ضروری ہے، دیون کی ایک دوسرے کے ساتھ بیع کے عدم جواز کی مختصر تفصیل یہ ہے[۱]

☆ اگر دین کی بیع نقد ہو، تو مذاہب اربعہ میں مقروض کو دین کی بیع یا اس کے ہبہ کرنے کا حق ہے، اس لئے کہ اس صورت میں حوالگی کی ضرورت نہیں ہے، مذہب ظاہریہ اور حنفیہ کے نزدیک دین کی بیع مدین کے علاوہ کے لئے جائز نہیں ہے، اس لئے کہ بیع میں حوالگی مفقود ہے۔

☆ اور اگر دین کی بیع ادھار یعنی ایک مدت کو موخر ہو جیسے "بیع الکالی بالکالی" یعنی دین کی دین سے بیع، تو یہ شرعاً ممنوع ہے، اس لئے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے "بیع الکالی بالکالی" سے منع فرمایا ہے[۲]۔

لوگوں کا اس بات پر اتفاق ہے کہ دین کی دین سے بیع جائز نہیں ہے، خواہ یہ مدین سے ہو یا غیر مدین سے اور دین: مبیع کے ثمن، قرض کے بدل، عورت کے مہر، منفعت کے بدلہ اجرت، معاوضۂ جنایت، تاوان اتلاف، عوض خلع اور سامان سلم کے مثل ہے۔

"البرکہ" بینک کے چھٹے سمینار کی طرف سے جاری کردہ فتویٰ نمبر ۵ میں ان شراکت دار کمپنیوں کے شیئرز خرید نے سے متعلق جن کو بعض اوقات سودی قرض کے لین دین کا معاملہ کرنا پڑتا ہو، مندرجہ ذیل تفصیل ملتی ہے:

(الف) مسلم ممالک میں قائم عام کمپنیوں کے معاملات کو اسلامائز (Islamise) کرنے کی خاطر ان کے شیئرز خریدنا ایک امر مطلوب ہے، اس لئے کہ اس صورت میں مسلمانوں کے لئے احکام شرع کی پابندی کے زیادہ سے زیادہ مواقع اور امکانات ہیں۔

(ب) غیر مسلم ممالک کی کاروباری کمپنیوں کے شیئرز خریدنا سرمایہ کاروں کے لئے اس صورت میں درست ہے جب انہیں ایسا متبادل نہ ملے جو شائبہ سے پاک ہو۔

(ج) اسلامی مالیاتی اداروں کی طرف سے کمپنیوں کے شیئرز خریدنا جائز ہے، بشرطیکہ فاضل نقود کی سرمایہ کاری مقصود ہو، اور اس میں شریک ہونے کے لئے افراد کو تعاون دینے کی خاطر سرمایہ کاری کے خصوصی فنڈز قائم کئے جائیں۔

اس تفصیل کی بنیاد پر اسلامی بینکوں کے لئے جائز مقاصد کی حامل کمپنیوں کے شیئرز خریدنا، اسی طرح ان کمپنیوں کے شیئرز خریدنا جو کبھی کبھار سودی قرض کے لین دین کا معاملہ کرتی ہوں، جائز ہے، بشرطیکہ اس کا مقصد ان کمپنیوں کے کاروبار کو صحیح اسلامی رخ دینا ہو، اور یہ اس صورت میں جبکہ مشتری کو ظن غالب ہو کہ وہ ایسا کرنے پر قادر ہے۔

خلاصہ یہ کہ اگر ان کمپنیوں کے شیئرز کی خرید کا مقصد ان کے معاملات اور کاروبار کو اسلامائز کرنا نہ ہو تو بغیر ضرورت یا حاجت کے اس قسم کے شیئرز کی خرید درست نہیں ہے، اس لئے کہ کمپنی کے اصل سرمایہ کا مال ربوی اور غیر ربوی دونوں پر مشتمل ہونے کی وجہ سے ایک قسم کا شبہ موجود ہے۔

اسی طرح ضرورت کے وقت اسلامی بینکوں کے لئے جائز ہے کہ وہ جائز مقاصد کی حامل کمپنیاں اور ان کمپنیوں کے شیئرز خریدیں جن کو کبھی کبھار سودی قرض کے لین دین کا معاملہ کرنا پڑتا ہو، اور یہ بھی اس صورت میں جب کہ اس کا مقصد زائد (Liquidity) کو اسلامی بینکوں میں صرف کرنا اور ضرورت کے وقت انہیں رواں کرنا ہو، ایسا اس لئے کہ اسلامی بینکوں کو شدید ضرورت ہے کہ وہ ان سرگرمیوں کو انجام دیں، تا کہ ان کے اس پیغام کی اشاعت کا سلسلہ جاری رہے جس کا مقصد امت مسلمہ کو غیر شرعی معاملات سے نجات دلانا ہے۔

جہاں تک عام لوگوں کا تعلق ہے تو ان کے لئے ضرورت یا حاجت کے سوا ان کا خریدنا جائز نہیں، اس لئے کہ شیئرز کمپنی کے اصل سرمایہ میں حرمت موجود ہے۔ بخاری اور مسلم نے حضرت نعمان بن بشیر کی یہ روایت نقل کی ہے، وہ فرماتے ہیں: میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے سنا ہے:

"إن الحلال بيّن وإن الحرام بيّن، وبينهما أمور مشتبهات لا يعلمهن كثير من الناس، فمن اتقى الشبهات فقد استبرأ لدينه وعرضه، ومن وقع في الشبهات وقع في الحرام..."۔

(بلاشبہ حلال واضح ہے اور حرام بھی واضح ہے، اور ان دونوں کے درمیان کچھ مشتبہ امور ہیں جنہیں بہت سے لوگ نہیں جانتے، تو جس نے شبہات سے پرہیز کیا تو اس نے اپنے دین اور اپنی عزت کو بچا لیا، اور جو شبہات میں پڑا وہ حرام میں پڑا)۔

شراح حدیث کہتے ہیں: جو مشتبہ امور کو اور ان کی حرمت کو جانتا ہو، اس کے لئے جائز نہیں کہ ان کو اختیار کرے، بلکہ وہ اپنے علم کی ہدایت پر عمل کرے، اس کی تائید گذشتہ حدیث کی ایک اور روایت سے ہوتی ہے جو صحیحین میں مذکور ہے: "ومن اجترأ على ما يشك فيه من الإثم، أوشك أن يواقع ما استبان"۔ (اور جس کسی نے ایسے امر جس کے گناہ ہونے میں شبہ ہو، کے ارتکاب کی جسارت کی تو قریب ہے کہ وہ صریح گناہ کا ارتکاب کر بیٹھے)۔

ترمذی اور ابن ماجہ نے رسول اللہ ﷺ سے مروی حضرت عبداللہ بن یزید کی یہ حدیث نقل کی ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: "لا يبلغ العبد أن يكون من المتقين حتى يدع ما لا بأس به حذرا لما به بأس"۔ (بندہ کا شمار متقیوں میں اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک کہ ان چیزوں سے پرہیز کرتے ہوئے جس میں کوئی حرج ہے، ان چیزوں کو نہ چھوڑ دے جس میں کوئی حرج نہیں)۔ حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ نے فرمایا: کمال تقوی یہ ہے کہ بندہ اللہ سے تقوی کرے، یہاں تک کہ ایک ذرہ کے برابر اللہ سے تقوی کرے، حتی کہ تقوی کے پیش نظر بعض حلال چیزوں کو ترک کر دے اس اندیشے سے کہ (ہوسکتا ہے) وہ حرام ہوں......

اس کا مطلب ہے کہ اشیاء تین قسم کی ہیں:

اللہ تعالی نے جس کے حلال ہونے کی تصریح فرمادی وہ حلال ہے، اور اللہ تعالی نے جس کے حرام ہونے کی صراحت فرمادی وہ واضح طور پر حرام ہے، اور جہاں تک شبہات کا تعلق ہے تو ان میں ہر وہ چیز شامل ہے جس کے بارے میں کتاب وسنت کے دلائل مختلف ہوں اور جس کے مفاہیم ومعانی میں متعدد احتمالات ہوں، تو ایسی چیز سے پرہیز غایت درجہ احتیاط اور ورع کی بات ہے۔ مشتبہ امور کے سلسلہ میں علماء کی تین آراء ہیں:

ایک طبقہ جو سد ذرائع کا قائل ہے اس کا کہنا ہے کہ: یہ حرام ہیں، اس لئے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: "استبرأ لدينه وعرضه" اس نے اپنے دین و عزت کو بچا لیا، لہذا جو اپنے دین اور اپنی عزت کو نہ بچا سکا وہ حرام میں مبتلا ہوا۔ دوسرا طبقہ جو سد ذرائع کا قائل نہیں ہے، کہتا ہے: یہ حلال ہیں، اس کی دلیل آپ ﷺ کا یہ ارشاد ہے: "كالراعي يرعى حول الحمى" اس چرواہے کی طرح جو چراگاہ کے اردگرد چراتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ حلال ہے، اور اس کو ترک کرنا ورع ہے۔ تیسرا طبقہ کہتا ہے: حدیث میں مذکور مشتبہ امور نہ حلال ہونے کی صراحت کرتے ہیں، نہ حرام ہونے کی، چنانچہ آپ ﷺ نے انہیں حلال صریح اور حرام صریح کے درمیان رکھا ہے، لہذا ہمیں چاہئے کہ اس سلسلہ میں توقف کریں، اور یہ بھی ورع ہی کے باب میں آتا ہے۔

ہماری اس وقت کی گفتگو کا موضوع ان شراکت دار کمپنیوں کے شیئرز کی خرید ہے جن کا اصل سرمایہ ربوی اور غیر ربوی دونوں کے مجموعہ مال پر مشتمل ہو: ان کا تعلق حرام کی اس نوع سے ہے جس کی حرمت معلوم ہے، اور جو صرف ضرورت ہی کے وقت مباح ہے، چونکہ ضرورتیں ممنوعات کو مباح بنا دیتی ہیں، اور حاجت ضرورت کا درجہ حاصل کر لیتی ہے۔

لہذا ضرورت کے وقت ایسی کمپنی کے شیئرز کا لینا درست ہے جس کا مقصد جائز ہو، لیکن اس کو سودی قرض لینا پڑتا ہو، اور شیئرز سالانہ آمدنی والے ہوں،

شرط یہ ہے کہ سودی قرضہ جات جن سے آمدنی حاصل ہوئی ہے، کے تناسب سے اس آمدنی کا ایک حصہ نکال دیا جائے، اور ناجائز آمدنی کا یہ حصہ ضرورت مندوں پر خرچ کیا جائے گا، اس سے کسی کے ذمہ عائد ہونے والے اخراجات نہیں پورے کئے جائیں گے، نہ اسے اس شخص پر صرف کیا جاسکتا ہے جس پر کوئی نفقہ لازم ہے، اور نہ اس سے ٹیکس کی ادائیگی کی جائیگی، سوائے ٹیکس کے اس حصہ کے جو اس آمدنی کے ساتھ خاص ہو۔

۴۔ حرام کاروبار کرنے والی کمپنیوں کے شیئرز کی خرید وفروخت کا حکم:

اس میں کوئی شک نہیں کہ شراکت دار کمپنیوں کی طرف سے شرعاً حرام کاروبار کے سلسلے میں جاری کئے گئے شیئرز کی خرید وفروخت اور ان کی تجارت حرام اور گناہ کبیرہ ہے، یہ ان حرام امور میں سے ہے جن کی آمدنی کا حصول اور جن سے انتفاع حرام ہے، جیسے شراب کی تجارت، خنزیر کے گوشت کی خرید وفروخت اور اس کی درآمد وبرآمد، خواہ مسلم ممالک میں یا غیر مسلم ممالک میں جیسے یورپ، امریکہ، ہندوستان اور جاپان وغیرہ، اسی طرح سودی اسکیموں اور سودی بینکوں میں سرمایہ کاری کرنا حرام ہے، اسی کے ذیل میں بڑی بڑی کمپنیوں کے تحت چلائے جانے والے وہ ہوٹل بھی آتے ہیں جو اپنے کھانوں میں خنزیر کا گوشت اور الکوہل ملے ہوئے مشروبات (Alcoholic Drinks) پیش کرتے ہیں۔ اس لئے کہ اللہ تعالی کا فرمان ہے:

''...وحرم الربا''۔ اور (اللہ تعالی نے) سود کو حرام کیا (البقرہ: ۲۷۵)۔

''حرمت عليكم الميتة والدم ولحم الخنزير وما أهل لغير الله به'' (المائدہ: ۳)۔

''قل إنما حرم ربي الفواحش ما ظهر منها وما بطن والإثم والبغي بغير الحق'' (الأعراف: ۳۳)۔

اثم: شراب کے مختلف ناموں میں سے ایک نام ہے، اللہ تعالی نے بعض اہل کتاب کی مذمت وتوبیخ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے:

''سمّاعون للكذب أكّالون للسحت'' (المائدۃ: ۴۲)۔

اور ''سحت'' مال حرام کو کہتے ہیں، اگر کسی نے حرام کی کمائی کی تو عرب کہتے ہیں: أسحت في تجارته"۔

۵۔ حلال کاروبار کرنے والی کمپنی کے شیئرز کا حکم جو انکم ٹیکس سے بچنے کے لئے سودی قرض لیتی ہے:

یہ بات واضح ہے کہ اللہ تعالی نے سود کھانے والے، اس کے کھلانے والے، اس کی گواہی دینے والے اور اس کے لکھنے والے پر لعنت فرمائی ہے، اسی طرح یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ کوئی حرام مثلاً جھوٹی گواہی، حق اور حلال تک پہنچنے کا ذریعہ نہیں بن سکتا ہے، اور ایک ظلم کا مداوا کسی دوسرے ظلم سے نہیں ہوسکتا ہے، لہذا اگر انکم ٹیکس ظالمانہ یا زیادہ ہو، تو اس سے چھٹکارا شراکت دار کمپنی کے اصل سرمائے کو حرام یعنی ربا سے مخلوط کر کے نہیں حاصل کیا جاسکتا ہے، بنا بریں عام ضرورت کے سوا اس قسم کی کمپنیوں کے شیئرز کی خرید جائز نہیں ہے، اس لئے کہ اس صورت میں انکم ٹیکس کی زد سے بچنے کے لئے سودی قرض لینے کی وجہ سے کمپنی کا اصل سرمایہ حرام سے مخلوط ہوتا ہے، اس لئے کہ اس قرض کی ادائیگی اور اس کا سود شیئر ہولڈرز کے حساب میں جاتا ہے، اور اتنا حصہ منافع سے منہا کر لیا جاتا ہے۔

ہاں اگر کمپنی کے اصل سرمائے سے سودی مال مخلوط نہ ہو اور کمپنی کے بعض منتظمین تبرعاً قرض کے سود کی ادائیگی کی ذمہ داری لے لیں، جس کا تصور عموماً ممکن نہیں، تو ایسی صورت میں اس قسم کی کمپنیوں کے شیئرز کا خریدنا جائز ہے، اس لئے کہ اس صورت میں کمپنی حرام سودی مال سے پاک ہوگی، لیکن یہ محض ایک فرضی بات ہے جس کا عام حالات میں وقوع نہیں ہوتا۔

۶۔ ایسی کمپنیوں کے شیئرز کا حکم جنہیں اپنے سرمایہ کا ایک حصہ سینٹرل ریزرو بینک میں جمع کرنا پڑتا ہو یا سیکورٹی بانڈز خریدنے پڑتے ہوں:

...... اگر کوئی کمپنی از روئے قانون اپنے سرمائے کا ایک حصہ سینٹرل ریزرو بینک میں جمع کرنے کی پابند ہو یا ضرورت کے شرعی اصول وضوابط کے اعتبار سے ایسا کرنے پر مجبور ہو، یا اسے سیکورٹی بانڈز (Security Bonds) خریدنے پڑتے ہوں، جن کی وجہ سے اسے سود بھی ملتا ہو، تو اس قسم کی کمپنیوں کے شیئرز کی خرید ممنوع نہیں ہے، بشرطیکہ اس سود سے جتنی جلد ممکن ہو چھٹکارا حاصل کر لیا جائے اور اسے رفاہی امور میں صرف کر دیا جائے یا ضرورت مندوں یا مفادات عامہ پر خرچ کر دیا جائے، اسے کمپنی کے بجٹ یا اس کے اصل سرمائے میں شامل کرنا درست نہیں، اس لئے کہ ضرورت یا حاجت کا اعتبار اسی قدر کیا جاتا ہے جس قدر ضرورت ہو، اور کمپنی کو حرام یا ناجائز آمدنی میں ملوث کرنا ضرورت نہیں ہے۔

۷۔ سودی قرضوں سے حاصل شدہ منافع کا کیا حکم ہے، کیا یہ جائز اور مفید ملک ہیں؟

صرف فقہاء احناف کی رائے یہ ہے کہ سود پر مشتمل عقد خواہ وہ بیع ہو یا ایسا قرض جس کے نتیجہ میں کوئی منفعت حاصل ہو، "عقد فاسد" ہے، اور ان کے خیال کے مطابق عقد فاسد "مِلک خبیث" کا فائدہ دیتا ہے، جس سے چھٹکارا حاصل کرنا واجب ہے، خواہ معاملہ کی درستگی کے ذریعہ اور اس سے سود کا ازالہ کر کے، یا اسے محتاجوں پر صدقہ کر کے۔ بنابریں سود پر حاصل کئے گئے قرضہ جات سے پیدا شدہ منافع قبضہ سے زیر ملکیت تو آ جائیں گے، البتہ یہ ملکیت "ملک خبیث" کی نوعیت کی ہوگی، جس کو نہ شریعت درست ٹھہراتی ہے، نہ اس میں کوئی برکت ہوگی، نہ وہ حاصل کرنے والے کے لئے شرعاً حلال ہے، اور نہ اس سے انتفاع جائز ہے۔

جمہور فقہاء کے نزدیک سودی قرض سرے سے مفید ملک ہی نہیں، بالفاظ دیگر اس سے حاصل شدہ منفعت علی الاطلاق درست نہیں، اس لئے کہ ان حضرات کے نزدیک عقد باطل اور عقد فاسد میں کوئی فرق نہیں ہے، ان کے نزدیک معاملات میں یہ دونوں الفاظ ایک دوسرے کے مترادف ہیں۔

رہے احناف تو انہوں نے باطل اور فاسد کے درمیان فرق کیا ہے، ان کے نزدیک بیع باطل قبضہ کے باوجود مفید ملک نہیں ہے، جہاں تک بیع فاسد کا تعلق ہے تو اس میں مالک کی صراحۃً یا دلالۃً اجازت سے قبضہ کر لینے کی صورت میں ملکیت ثابت ہو جاتی ہے، مالک کی اجازت سے قبضہ کرنے کی صورت یہ ہے کہ مشتری مجلس عقد ہی میں بائع کے سامنے مبیع پر قبضہ کر لے اور بائع اس پر کوئی اعتراض نہ کرے۔ یہ رائے جمہور فقہاء کی رائے کے خلاف ہے، ان کا خیال ہے کہ "بیع فاسد" بھی بیع باطل کی طرح سرے سے مفید ملک ہی نہیں۔

۸۔ کیا کمپنی کا بورڈ آف ڈائرکٹرس شیئر ہولڈرس کا وکیل ہے، اور کیا اس بورڈ کا عمل ان کے عمل کے قائم مقام ہے؟

موجودہ قوانین تجارتی اور شہری کمپنیوں کو محض ان کی تشکیل کی بنیاد پر ایک قانونی اور معنوی حیثیت دیتے ہیں، چنانچہ مصری سول قانون کی دفعہ ۵۰۶ اور شامی سول قانون کی دفعہ ۴۷۴ میں اس بات کی صراحت کی گئی ہے کہ:

۱۔ کمپنی محض اپنی تشکیل کی بنیاد پر ایک قانونی حیثیت کی حامل تسلیم کی جائے گی، مگر اس کی یہ حیثیت لوگوں کیلئے اس وقت تک دلیل نہیں بن سکتی جب تک کہ قانون کی طرف سے طے کردہ تشہیری کارروائیوں کی تکمیل نہ ہو جائے۔

۲۔ اس کے باوجود دوسرے کو یہ حق ہے کہ وہ اپنے کو کمپنی کی اس حیثیت سے وابستہ رکھے اگر چہ کمپنی نے اب تک طے شدہ تشہیری کارروائیاں مکمل نہ کی ہوں۔

اب جب کہ کمپنی کو ایک قانونی حیثیت حاصل ہو گئی تو متعدد وجوہ سے اس کی حیثیت عام افراد کی سی ہوگی، چنانچہ اس کا ایک نام، پتہ، مقام اور اس کی ایک قومیت ہوگی، اسی طرح اسے کچھ حقوق حاصل ہوں گے اور اس پر چند ذمہ داریاں عائد ہوں گی، اس طرح شرکاء کی مسئولیتوں سے آزاد اور الگ خود اس کی ایک مالی مسئولیت (liability) ہوگی۔ شرکاء کی مسئولیتوں سے الگ کمپنی کی اپنی ایک علاحدہ مسئولیت سے دو اہم نتیجے برآمد ہوں گے:

الف۔ حصص کی ملکیت کمپنی کی طرف منتقل ہو جائے گی اور کمپنی کو اس میں تصرف کرنے کا اختیار ہوگا، اور کمپنی کے تعلق سے شراکت دار کا حق شخصی التزامات کے ضمن میں شمار ہوگا، جو قابل انتقال ہیں، لہذا جب کمپنی تحلیل ہوگی تو اس کے باقی ماندہ اثاثے شرکاء پر تقسیم کئے جائیں گے۔

ب۔ کمپنی کی مالی مسئولیت شرکاء کی مسئولیتوں سے مختلف ہوگی، اور اس کا ایک علیحدہ وجود ہوگا جو خود کمپنی کے وجود سے مربوط ہوگا، اسی طرح شرکاء کی مسئولیتیں کمپنی کی مسئولیت سے جداگانہ ہوں گی، چنانچہ شراکت دار کمپنی کے قرضہ جات کے سلسلے میں صرف اپنے حصص کے تناسب سے جواب دہ ہوگا، سوائے شیئرز کی شہری کمپنیوں یا مشترکہ مسئولیت کی تجارتی کمپنیوں (Commercial Company of Joint Liability) کے، ان صورتوں میں شراکت دار شخصی ذمہ داری کے اعتبار سے کمپنی کے قرضہ جات کے سلسلے میں جواب دہ ہوگا (الشرکات التجاریۃ: از ڈاکٹر علی یونس: ص ۵۱۔ ۶۳)۔

جہاں تک فقہ اسلامی کا تعلق ہے تو اس کی اب تک کی تاریخ میں اس کلیہ کا پتہ نہیں چلتا کہ کمپنی ایک معنوی اور حکمی وجود کی حامل ہوتی ہے، جس کی مسئولیت شرکاء کی مسئولیت سے جداگانہ اور مختلف ہوتی ہے، بلکہ وہاں تو سرے سے یہ بات ہی نہیں ملتی کہ کمپنی کسی مالی مسئولیت کی بھی حامل ہوتی ہے، اس وجہ سے اسلامی فقہ میں جو چیز "کمپنی" کی حیثیت سے معروف ہے وہ قریب قریب وہی ہے جو انگریزی اور سوڈانی قانون میں شراکت کے نام سے معروف ہے، اور یہ شراکت "وکالت" اور "امانت" پر مبنی ہوتی ہے، چنانچہ ہر وہ شراکت دار جو کمپنی کے عقد کے بموجب کاروبار کرتا ہے وہ کمپنی میں اپنے حصص کے تناسب سے اس معاملہ کے ایک حصہ میں اصیل ہوگا، اور باقی ماندہ اجزاء میں دوسروں کا وکیل ہوگا، اور ان اجزاء میں اس کے تصرفات احکام وکالت جیسا عمل کریں گے۔

اسلامی تصور کے مطابق کمپنی سے متعلق یہ شرعی احکام شرکاء کے لئے حکم عقد یا مقتضائے عقد ثابت کرتے ہیں (یعنی کمپنی کے اثاثے میں ملکیت کی منتقلی)، اسی طرح حنابلہ کے نزدیک (حقوق عقد یعنی مبیع کی حوالگی اور ثمن کی وصولی کی پابندیاں) مؤکل کے لئے ثابت ہوں گے، لیکن دیگر فقہاء کے نزدیک حقوق وکیل کے لئے ثابت ہوں گے، ان حقوق میں دَین وثمن کا مطالبہ اور ان اشیاء کی حوالگی اور وصولی بھی شامل ہے جن پر معاملہ طے ہوا ہو۔

رہیں عقد سے پیدا شدہ پابندیاں تو وہ شرکاء کی مسئولیتوں میں اس طرح ثابت ہوں گی کہ ان کا ثبوت ان کی مسئولیتوں میں موت تک برقرار رہے گا، اور یہ کمپنی کے راس المال سے ان کی ادائیگی نہ ہونے کی صورت میں ان کے مخصوص اموال اور سرمایوں تک ممتد ہوگا۔ کمپنی کے اثاثے اور اس کی جائدادوں میں ہر ایک شراکت دار کا قبضہ "قبضہ امانت" ہوگا، لہذا اگر کمپنی کے کاروبار کے دوران کوئی قابل ضمان شئی برباد یا صرف ہوتی ہے، تو اس کا ضمان تمام شرکاء پر عائد ہوگا، نہ کہ صرف برباد کرنے والے یا صرف کرنے والے پر۔ موجودہ قانون کے مطابق اس کی مثالیں مشترکہ مسئولیت کی تجارتی کمپنیوں (Commercial Company of Joint Liability) اور اس طرح کی دوسری کمپنیوں میں دیکھی جاسکتی ہیں، بنا بریں ہمارے اسلامی تصور کے مطابق کمپنی وکالت اور امانت کی بنیاد پر تشکیل پاتی ہے، اور کمپنی کا بورڈ آف ڈائرکٹرس شیئر ہولڈرس کا وکیل ہے، اور اس کا عمل شیئر ہولڈرس کا عمل تصور کیا جائے گا، لیکن انجام کار یہ تمام ذمہ داریاں خود شرکاء کی ضمانتوں میں ثابت ہوں گی۔

۹۔ کیا کسی شیئر ہولڈر کا سودی قرض لینے کے فیصلہ سے اختلاف کرنا اسے حرام کی جواب دہی سے بری الذمہ کردے گا؟

اگر انتظامی بورڈ کے ممبران میں کا کوئی شیئر ہولڈر سودی قرض لینے کے فیصلے سے اختلاف کرے، اور کثرت رائے سے طے شدہ فیصلے سے اپنے اختلاف کا اظہار بھی کردے، جب بھی اس کا یہ اختلاف کرنا سودی قرض کے وبال یا اس کے گناہ سے اسے بری الذمہ کرنے کے لئے کافی نہیں ہے، اس لئے کہ انتظامی بورڈ اور انتظامی کونسل کے چیئرمین کے تصرفات تمام شرکاء کی طرف سے بطور امین اور وکیل ہوتے ہیں، اور تمام شرکاء مالی ذمہ داریوں کے پابند ہوتے ہیں، ان ہی ذمہ داریوں میں کمپنی کے حقوق اور ذمہ داریوں میں شریک ہونے کی حیثیت سے ان کی طرف سے قرض اور اس کے سود کی ادائیگی بھی ہے، اور یہی وہ شرکاء ہیں جو پیش آمدہ شرعی اور قانونی مخالفتوں کو بطور اشتراک گوارا کرتے ہیں، اس کی تفصیل سابقہ مسئلہ میں گذر چکی ہے، زیادہ سے زیادہ اس کے اس عمل کو صرف امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فریضہ کی ادائیگی قرار دے سکتے ہیں۔

۱۰۔ کیا شیئر ہولڈر کے لئے سود سے پیدا شدہ معلوم منافع کے بقدر صدقہ کردینا کافی ہے؟

کمپنی کی انتظامیہ اور اس کے چیئرمین کی ذمہ داری ہے کہ ہر اس عمل سے کمپنی کو دور رکھیں جو اسے حرام میں ملوث کرتا ہو، خواہ اس عمل کا تعلق کمپنی کی تجارتی سرگرمیوں سے ہو یا صنعتی اور دیگر سرگرمیوں سے، یعنی دھوکہ، غبن، ضرر اور شریعت کی حرام کردہ اشیاء کی پیداوار سے کلی اجتناب کیا جائے، اسی طرح دوسروں کے ساتھ معاملات طے کرنے میں، خواہ کمپنی کا سابقہ فرد سے پڑے یا حکومت سے یا کسی ادارے سے، بہر صورت شریعت کی حرام کردہ صورتوں سے پرہیز کیا جائے، لہذا کمپنی کے کسی معاملہ کا شریعت سے متصادم امور پر مبنی ہونا درست نہیں ہے، شریعت سے متصادم صورتوں میں سے سب سے اہم صورت یہ ہے کہ کوئی معاملہ سود یا سودی قرض پر مشتمل ہو۔

چونکہ فقہ اسلامی کے مطابق شرکاء کی ذمہ داری، ذمہ داریوں کے اٹھانے اور حقوق کے ثبوت کے معاملہ میں شراکت پر مبنی ہے، اس لئے کوئی شراکت دار دوسرے سے الگ نہیں قرار دیا جائے گا، اور شرکاء کی حیثیت مؤکلین کی ہے، اور انتظامیہ کی حیثیت وکیل کی، انتظامیہ کے تصرفات کا نتیجہ خود شراکت داروں پر منحصر ہوگا، چنانچہ کسی شراکت دار کا اپنے حصص کے بقدر سود سے پیدا شدہ متعین نفع کو نکال کر صدقہ کردینا اسے سودی عقد کے فساد کی ذمہ داری اور اس کے گھناؤنے مالی اثرات سے بری الذمہ کرنے کے لئے کافی نہیں ہے، اس لئے کہ اس صورت میں منافع تمام کے تمام عقد فاسد سے پیدا ہوں گے، اور عقد فاسد حرام ہے جس کی درستگی اور اس کے شرعاً ممنوع اثرات کا ازالہ واجب ہے، تاکہ آمدنی شرعاً جائز اور درست ہوسکے۔

اس کے باوجود تقوی کا تقاضا ہے کہ شیئر ہولڈر اپنی ذمہ داری کو ہلکا کرنے کے لئے سود سے حاصل شدہ متعین منافع کے بقدر اپنے مال سے صدقہ کردے، تاکہ اس کا مال اور اس کی آمدنی مشتبہ اور حرام سے مخلوط نہ رہے، اور "جس نے شبہات سے پرہیز کیا تو اس نے اپنا ایمان اور اپنی آبرو بچالی"۔

۱۱۔ کیا کل آمدنی میں مخلوط سود سے حاصل شدہ منافع کے بقدر صدقہ کر دینا شیئر ہولڈر کے لئے کافی ہے؟

یہ صورت بھی سابقہ صورت ہی کی طرح ہے، بس فرق یہ ہے کہ اس صورت میں سود کل آمدنی میں مخلوط ہوتا ہے، اس کا پتہ یا تو اندازے سے لگایا جا سکتا ہے یا کمپیوٹر کے دقیق حساب کے ذریعہ، اس صورت میں بھی آمدنی حرام ہوگی، اور فاسد سودی عقد حرام قرار پائے گا، اور کل آمدنی میں مخلوط سود کے بقدر حاصل ہونے والے منافع سے صدقہ کر دینے سے شیئر ہولڈر کی ذمہ داری ختم نہیں ہوگی، اس کے باوجود حرمت سے چھٹکارا پانے کا واحد راستہ منافع کے اس حصہ کو صدقہ کر دینا ہی ہے، اس لئے کہ مال حرام کا علاج یہی ہے کہ اسے صدقہ کر دیا جائے، تاکہ وہ حلال مال سے مخلوط نہ ہو، تاکہ ایک مسلمان کسب حرام کی آمیزش سے کسی ضرر میں مبتلا نہ ہو۔

صاحب مال کی طرف سے نکالی گئی مقدار کے بارے میں متعین طور پر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہی عین سودی رقم ہے، کیونکہ روپے تعیین سے متعین نہیں کئے جا سکتے۔ تفسیر قرطبی (۳۶۶/۲) میں ربا سے متعلق احکام اور اسے حلال سمجھنے والے اور اس کے ارتکاب پر اصرار کرنے والے کی وعید پر مشتمل چھتیسویں مسئلہ میں مندرجہ ذیل تفصیل آئی ہے:

بعض غالی قسم کے اہل تقوی کا خیال ہے کہ اگر حلال مال سے حرام مال اس طرح مخلوط ہو گیا کہ حلال وحرام کے درمیان امتیاز کرنا مشکل ہو اور پھر اس میں سے مخلوط مال حرام کے بقدر نکال لیا جائے تب بھی وہ مال حلال اور طیب نہ ہوگا، کیونکہ اس کا امکان ہے کہ جو مال نکال دیا گیا ہو وہی حلال ہو اور جو بچ گیا ہو وہی حرام ہو۔ ابن العربی فرماتے ہیں: یہ دین میں غلو ہے، اس لئے کہ ہر وہ مال جس میں حلال اور حرام کے درمیان امتیاز نہ کیا جا سکتا ہو، اس میں مقصود اس کی مالیت ہے نہ کہ اس کی عینیت، اگر وہ تلف ہو گیا تو اس کا مثل اس کے قائم مقام ہوگا، اور اختلاط مال کی "تمیز" کے اتلاف ہی کا نام ہے جیسا کہ "اہلاک" "عین مال" کے اتلاف کا نام ہے، اور ہلاک شدہ شئے کا مثل اس کے قائم مقام ہوتا ہے، یہ کلیہ حسی اور معنوی دونوں حیثیتوں سے واضح ہے۔

قرطبی اس پر مزید تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں: ہمارے علماء کا قول ہے کہ سود کے ذریعہ حاصل ہونے والے مال سے (جو کسی کے قبضہ میں ہو) چھٹکارا کی صورت یہ ہے کہ اسے اس شخص کو واپس کیا جائے جس سے اس نے بطور سود لیا تھا، اور اگر وہ موجود نہ ہو تو اسے تلاش کرے، اور اگر اس کی موجودگی سے مایوس ہو گیا ہو تو اس رقم کو اس کی طرف سے صدقہ کر دے، اور اگر ظلماً اس نے یہ مال حاصل کیا ہو تو یہ طریقہ اس آدمی کے سلسلہ میں بھی اختیار کرے جس پر اس نے ظلم کیا ہو، لیکن اگر معاملہ اس پر مشتبہ ہو اور اپنے پاس موجود رقم میں وہ حلال وحرام کے درمیان امتیاز نہ کر سکتا ہو تو پہلے وہ اپنے پاس موجود رقم میں سے اتنی رقم کا ٹھیک اندازہ لگائے جتنے کی واپسی اس پر واجب ہے، یہاں تک کہ جب اسے اس بات میں کوئی شک نہ ہو کہ جو کچھ بچ رہا ہے وہ خالصتاً اسی کا ہے تب وہ یہ رقم ان لوگوں کو لوٹائے جن سے اس نے ظلماً یہ رقم لی ہو یا جن کے ذمہ اس نے سود عائد کیا ہو، اور اگر ان لوگوں کی موجودگی سے مایوس ہو چکا ہو تو ان کی طرف سے اتنی رقم صدقہ کر دے۔

اور اگر ظلماً حاصل کی گئی رقم اس کے پورے حصص کو محیط ہو اور اسے یہ معلوم ہو کہ اس کے ذمہ سود کی اتنی زیادہ رقوم واجب الادا ہیں جن کی ادائیگی وہ کبھی نہیں کر سکتا، تو اس کی توبہ یہ ہے کہ اپنے پاس موجود پورے مال کو اپنی ملکیت سے الگ کر دے، یا تو فقراء کو دے دے یا مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے راستے میں صرف کر دے، یہاں تک کہ اس کے پاس اتنی رقم رہ جائے جو نماز میں اس کے لباس (یعنی ناف سے گھٹنوں تک کے قابل ستر مقامات کو ڈھکنے کے لئے) اور ایک دن کی روزی کے لئے کفایت کرتی ہو، اس لئے کہ اس صورت میں اس کا حال اس شخص کا ہے جس پر حالت اضطرار میں دوسروں کا مال لینا واجب ہے، اگرچہ اس کا یہ عمل ان لوگوں کے لئے ناپسند ہو جن کا مال وہ لے۔

۱۲۔ قیمتوں کے بڑھنے کی صورت میں شیئرز کی تجارت (یعنی نفع کے ساتھ اس کی بیع) کا کیا حکم ہے؟

اگر کوئی شخص قیمتوں کے بڑھنے کی صورت میں نفع کے ساتھ فروخت کرنے کے مقصد سے کچھ شیئرز خریدے تو اس سے خواہ کتنا ہی زیادہ نفع ہو شرعاً اس قسم کے شیئرز کی تجارت یعنی (نفع کے ساتھ ان کی فروخت) ممنوع نہیں ہے، اس لئے کہ شیئرز شرعاً، قانوناً اور عرفاً قابل تداول ہیں، اور یہ نقود اور کمپنی کے بعض اثاثے یعنی اعیان، منافع، سامان تجارت، خام یا تیار شدہ مال کی نمائندگی کرتے ہیں، لیکن اس شرط کے ساتھ کہ یہ اثاثے نقود سے زائد ہوں، جیسا کہ اسلامک فقہ اکیڈمی کے فیصلہ میں ذکر کیا گیا ہے کہ ۵۱ فیصد یا اس سے بھی زائد فیصدی تناسب سے ان اثاثوں کا غلبہ ہونا چاہئے، تاکہ دین کی دین سے یا نقد کی نقد سے بیع لازم نہ آئے۔ دین کی دین سے بیع کی صورت نہ پیدا ہونے دینے کے لئے شرط ہے کہ بیع کے متصلاً بعد ہی شیئرز سرٹیفکیٹ پر قبضہ ہو، خواہ یہ قبضہ حکماً ہی کیوں نہ ہو۔

شیئرز کی اس قسم کی تجارت پر احتکار (ذخیرہ اندوزی) کا حکم منطبق نہیں ہوتا ہے، اس لئے کہ احتکار کی حرمت کا پہلو ان اشیاء صرف سے متعلق ہے جن کے بیع کی ممانعت کے نتیجہ میں لوگوں کو ضرر لاحق ہوتا ہو، جیسے غلہ یا چارہ۔ کسی سامان تجارت کی خرید اور مستقبل میں اعلی قیمت پر اسے فروخت کرنے کے انتظار سے

ممانعت کی شرعاً کوئی وجہ نہیں ہے، اور شیئرز جیسا کہ میں ذکر کر چکا ہوں، نقود، اعیان اور منافع کی نمائندگی کرتے ہیں، اس لئے کہ شرعی طور پر یہ اصول متعین ہے یعنی اقتصادی آزادی اور تبادلہ کی آزادی، اور اس میں منافع کے انتہا کی کوئی تحدید نہیں ہوتی۔ اس کی دلیل حضرت جابر سے مروی وہ روایت ہے جس کی تخریج بخاری کے علاوہ پوری جماعت نے کی ہے، جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

لا یبع حاضر لباد، دعوا الناس یرزق اللہ بعضهم من بعض (منتقی الاخبار مع نیل الاوطار ۵،۱۶۴)۔ کوئی شہری کسی دیہاتی کے لئے بیع نہ کرے، لوگوں کو چھوڑ دو کہ اللہ بعض کو بعض سے روزی دے۔

۱۳۔ فیوچر سیل (جس میں نہ بائع کی طرف سے مبیع کی حوالگی ہوتی ہے اور نہ مشتری کی طرف سے ثمن کی ادائیگی) کا شرعاً کیا حکم ہے؟

اسٹاک ایکسچینج مارکیٹ میں ایک قسم کی بیع ہوتی ہے جسے فیوچر سیل (Future Sale) کہتے ہیں، اس بیع کا مقصد شیئرز خریدنا نہیں ہوتا بلکہ بڑھتے گھٹتے داموں کے ساتھ نفع ونقصان کو برابر کر لینا مقصود ہوتا ہے، مثلاً زید نے سو شیئرز کا سودا بہ حساب سو روپے یا سو ریال فی شیئر کیا، اور ادائیگی اور وصولی کی تاریخ ۳۰ رمارچ مقرر کی، اب جب مذکورہ تاریخ آئی تو اس شیئر کی قیمت ڈیڑھ سو روپے یا ڈیڑھ سو ریال ہوگئی، تو ایسی صورت میں وہ پانچ ہزار ریال یا روپے منافع کے طور پر لے لے گا، اور اگر مذکورہ تاریخ کو اس شیئر کی قیمت گھٹ کر پچاس روپے یا پچاس ریال ہوگئی تو اسے پانچ ہزار ریال یا روپے کا خسارہ برداشت کرنا ہوگا۔

اس صورت میں عقد کا دارومدار صرف اوراق مالیہ (Bonds) پر ہوتا ہے، نہ مبیع کی حوالگی ہوتی ہے نہ ثمن کی ادائیگی، چنانچہ اس صورت میں نہ مشتری ثمن ادا کرتا ہے اور نہ بائع مبیع حوالے کرتا ہے، لیکن مقررہ تاریخ آنے پر شیئرز کے دام بڑھنے کی صورت میں نفع حاصل ہوتا ہے، یا شیئرز کے دام گھٹنے کی صورت میں خسارہ ہوتا ہے۔

اس قسم کے فیوچر سیلز کا شرعی حکم یہ ہے کہ یہ عقود حرام اور فاسد ہیں، اس لئے کہ یہ دَین کی بیع دَین سے ہے، اور جیسا کہ ذکر کیا جا چکا ہے بیع کی یہ صورت شرعاً ممنوع ہے، اس لئے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیع کالی بالکالی سے منع فرمایا ہے، اور یہ دَین آجل کی بیع دَین مؤجل سے ہے، جو شرعاً فاسد ہے اور اس کی آمدنی شرعاً ناپاک اور ممنوع ہے، وہ اس کے حاصل کرنے والے کے لئے حلال نہیں، اسے ضرورت مندوں پر خرچ کر کے اس سے چھٹکارا حاصل کرنا واجب ہے۔

۱۴۔ مستقبل کی طرف منسوب عقد (Forward Sale) کا کیا حکم ہے؟

عقد بیع کا تقاضا قطعیت ہے، یعنی اس کے اثر کی افادیت تب ظاہر ہوتی ہے جب مبیع کی ملکیت مشتری کی طرف منتقل ہوتی ہے اور مشتری کے ذمہ بائع کا ثمن واجب الاداء ہوتا ہے، لہذا اسے معلق بالشرط کرنا درست نہیں، مثلاً معاملہ بیع کے وقت یہ الفاظ کہنا کہ: اگر میرے والد حجاز سے آگئے تو میں نے فلاں جائداد تم سے فروخت کردی۔ اسی طرح اس کی اضافت مستقبل کی طرف بھی کرنا درست نہیں، مثلاً یہ کہنا کہ: سال آئندہ ۱۹۹۷ کے آغاز سے میں نے یہ سامان یا یہ زمین یا یہ شیئر تم سے بیچا، اسی بنا پر یہ بیع درست نہیں ہے، اس طرح کی بیع کا سرے سے کوئی اثر ہی نہیں پڑے گا، کیونکہ یہ بیع باطل ہے، اور باتفاق علماء بیع باطل کے نتیجہ میں مبیع کی ملکیت منتقل نہیں ہوتی۔ لیکن بیع سلم کسی ایسی شئی پر درست ہوتی ہے جو ذمہ میں معلوم ہو، اور جو مجلس عقد ہی میں مکمل ثمن کی ادائیگی کی شرط کے ساتھ مستقبل تک موخر ہو۔

ہاں اگر بیع کسی ایسی غائب شئے کے سلسلے میں ہو جسے اس کے متعین اوصاف کے ساتھ رؤیت نہ پائی گئی ہو تو جمہور فقہاء کے نزدیک ایسی بیع جائز اور درست ہے، لیکن حنفیہ کے نزدیک بغیر رؤیت اور بغیر وصف کے بھی درست ہے، اس صورت میں ان کے نزدیک عاقد (معاملہ دار) کو خیار رؤیت حاصل ہوگا، اس لئے کہ حدیث میں وارد ہے کہ: "من اشتری مالم یرہ فہو بالخیار اذا رآہ" (جس نے دیکھے بغیر کوئی چیز خرید لی تو دیکھنے کے بعد اسے اختیار حاصل ہوگا)۔ شافعیہ نے اس بیع کو باطل قرار دیا ہے، اس لئے کہ اس میں غرر یعنی جہالت ہے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غرر سے منع فرمایا ہے۔

اگر متعین وقت کے بدلہ میں قیمت کی ایک متعین فیصدی رعایت کی بنیاد پر ادائیگی کے وقت سے پہلے ہی تاخیر سے ادا کئے جانے والے کاروباری دستاویز یا شیئرز فروخت کردیئے جائیں تو اس بیع کی صورت یہ ہوگی کہ دَین آجل کی بیع کم رقم پر نقد عاجل سے کی جائے، اس قسم کی بیع ربا محرم میں شمار ہوگی۔ حرام اور سود ہونے میں اس کا حال بھی وہی ہے جو کاروباری ڈرافٹ کے ڈسکاؤنٹ (چھوٹ) کا ہے، یہ حکم "البرکہ بینک" کے پہلے سمینار کے فتوی ۱۲ میں صراحت کے ساتھ آچکا ہے۔

۱۵۔ حکمی قبضہ سے متصف شیئرز کی اس خرید کا کیا حکم ہے جس میں شیئرز سرٹیفکیٹ پر حسی قبضہ تاخیر سے ہو؟

عموماً نئے مالک کے نام سے شیئرز سرٹیفکیٹ کی وصولی یا اس پر قبضہ میں بعض انتظامی اسباب کی وجہ سے ایک سے تین ہفتے تک کی تاخیر ہوتی ہے، اور کمپنی

شیئرز خریدتے وقت اپنے اثاثے اور اپنی املاک میں شیئر ہولڈر کی ملکیت کو تسلیم کرتی اور اس کی ضمانت لیتی ہے، اور ایسی صورت میں حقوق اور ذمہ داریاں مشتری کی طرف منتقل ہوتی ہیں، سوال یہ ہے کہ اس بیع کا کیا حکم ہوگا، کیا حکمی یا معنوی قبضہ کافی ہے یا حسی اور عملی قبضہ ضروری ہے؟

فقہاء کا اصول یہ ہے کہ شئی کی ماہیت کے اعتبار سے قبضہ کی مختلف شکلیں ہوتی ہیں، چنانچہ اشیاء غیر منقولہ میں تخلیہ سے اور اشیاء منقولہ جیسے سامان تجارت، سرمائے، مشینیں، اور اوزار وغیرہ میں عملی قبضہ یا تخلیہ سے قبضہ تسلیم کیا جاتا ہے، یا کسی ایسے طریقہ سے جو عرف وعادت میں قبضہ متصور ہوتا ہو، چنانچہ حنفیہ کے سوا جمہور فقہاء نے اس بات کی صراحت کی ہے کہ منقولات جیسے سامان زندگی، چوپائے اور جانوروں میں قبضہ ان کی نوعیت کے اعتبار سے یا لوگوں کے درمیان رائج عرف کے مطابق تسلیم کیا جائے گا۔

لہذا کمپنیوں کے نظام میں عرف وعادت کے مطابق قبضہ کا تحقق ہوجائے گا، اگر اس بیع میں کمپنی کی طرف سے شیئرز کی حوالگی کی تصدیق یا ضمانت کی ضرورت پیش آئے تو اختیار کردہ طریقہ کار کے مطابق کمپنی کے لئے ایسا کرنا واجب ہوگا۔

۱۶۔ عملی یا حسی قبضہ سے پہلے شیئرز کی بیع کا کیا حکم ہے؟

شیئرز کمپنی کے اثاثے یعنی اعیان ومنافع اور ان کے علاوہ نقود اور دیون کی نمائندگی کرتے ہیں، اور ان کی منتقلی اور خرید وفروخت عام قاعدے کے مطابق ان پر قبضہ کے بعد یا کمپنی یا بائع کی طرف سے ان کی ادائیگی کے بعد ہوا کرتی ہے، یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا شیئرز سرٹیفیکٹ کے حصول سے قبل شیئرز کی بیع درست ہے؟ خصوصاً ایسی صورت میں جبکہ یہ بھی معلوم ہے کہ محض بیع وشراء ہی سے شیئرز کے منافع مشتری کی ملکیت میں آجاتے ہیں اور اس کے ضمان میں بھی داخل ہوجاتے ہیں۔

قبضہ سے پہلے کسی چیز کی خرید وفروخت کے سلسلہ میں علماء کی تین قسم کی آراء ہیں۔

۱۔ حنفیہ کی رائے ہے کہ: بیع منقول میں قبضہ سے پہلے تصرف جائز نہیں، کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے غیر مقبوضہ شئی کی بیع سے منع فرمایا ہے، جیسا کہ ابو داؤد نے حضرت ابن عمر کے حوالہ سے اس روایت کی تخریج کی ہے کہ حضرت زید بن ثابت نے ان سے کہا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات سے منع فرمایا ہے کہ سامان تجارت کو اس جگہ فروخت کیا جائے جہاں سے اسے خریدا جائے، یہاں تک کہ تاجر اسے اپنے کجاوے تک منتقل کرلیں۔
جہاں تک جائداد غیر منقولہ کا تعلق ہے جیسے زمینیں اور مکانات تو شیخین یعنی امام ابوحنیفہ اور امام ابو یوسف کے نزدیک استحساناً قبضہ سے پہلے ان کی بیع جائز ہے، اس لئے کہ اشیاء غیر منقولہ میں کوئی غرر نہیں، کیونکہ نہ تو ان کی ہلاکت کا اندیشہ ہے، اور نہ ہی عام حالات میں بیع ہوجانے کے بعد اور قبضہ سے پہلے ان کے تبدیل ہونے کا خدشہ ہے، اس مسلک کے مطابق قبضہ سے پہلے شیئرز کی بیع جائز نہیں۔

۲۔ شوافع، محمد بن الحسن اور امام زفر کا خیال ہے کہ: جس چیز کی ملکیت ثابت نہ ہوئی ہو اس کی بیع قبضہ سے پہلے علی الاطلاق جائز نہیں، خواہ اس کا تعلق اشیاء منقولہ سے ہو یا اشیاء غیر منقولہ سے، اس لئے کہ غیر مقبوضہ اشیاء کی خرید وفروخت سے ممانعت عام ہے، اسی سے یہ بھی متفرع ہوتا ہے کہ قبضہ سے پہلے شیئرز کی بیع درست نہیں۔

۳۔ مالکیہ اور حنابلہ کا خیال ہے کہ: صرف غلہ کی بیع قبضہ سے پہلے درست نہیں، اور حنابلہ نے اسے اس بات سے مقید کیا ہے کہ غلہ کیلی یا وزنی یا عددی (یعنی ناپی، تولی اور شمار کی جانے والی چیزیں) ہونا چاہئے، لہذا ایسے شیئرز کی بیع قبضہ سے پہلے درست ہے جن کا تعلق غلہ سے نہ ہو، اس خیال کی تائید "البرکہ بینک" کے چھٹے سمینار کے فتوی نمبر ۱۴ میں کی گئی ہے، جس کا مفہوم اس طرح ہے: کمپنیوں اور بینکوں کے لئے ایسے سامانوں کی بیع درست ہے جن پر ابھی تک ان کا قبضہ نہ ہوا ہو یا جو ان کی زیر ملکیت نہ آئے ہوں بشرطیکہ وہ سامان غلہ نہ ہوں، کیونکہ اشیائے غیر مقبوضہ کی بیع کی ممانعت صرف غلہ تک محدود ہے۔

میرے نزدیک اس سلسلے میں شیئرز اور ان بانڈز کے تعلق سے جو تجارتی سکیورٹیز کی نمائندگی کرتے ہیں، سب سے مناسب رائے حنفیہ اور شوافع کی ہے، اس لئے کہ قبضہ سے پہلے ان کی تجارت یا ان کی منتقلی محض ان عقود کی ایک علامت ہوگی جو بانڈز کے ذریعہ کئے جاتے ہیں، چونکہ اس میں نہ تو وصولی ہے اور نہ ہی قبضہ، اور اس میں ایسا واضح غرر ہے جو شریعت کی اس ممانعت سے متصادم ہے جو اس بیع کے سلسلے میں وارد ہوئی ہے، جیسا کہ اس روایت میں ہے جسے امام احمد نے حضرت حکیم ابن حزام کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "لا یحل سلف و بیع، ولا ربح مالم یضمن، ولا بیع مالیس عندك"۔ اور یہ بیع

بھی اشیائے غیر مضمونہ کی بیع سے متعلق ہے، جس کا مفہوم اشیائے غیر مقبوضہ ہی ہے، کیونکہ تلف ہونے سے پہلے سامان تجارت مشتری کے ضمان میں نہیں ہوتا ہے، ایسی صورت میں جب وہ تلف ہوتا ہے تو بائع کے مال سے تلف ہوتا ہے۔

۱۷۔ اسٹاک ایکسچینج مارکیٹ میں بروکر (ایجنٹ) کی حیثیت سے کام کرنے کا کیا حکم ہے؟

اسٹاک ایکسچینج مارکیٹ میں بروکر یا ایجنٹ عموماً بازار میں شیئرز کی رائج قیمتوں سے واقف ہوتے ہیں اور ایجنٹ کی حیثیت سے خرید وفروخت کی کارروائی کا اندراج کرتے ہیں، اس تصرف میں تھوڑی تفصیل ہے:

(الف) اگر بروکر کا یہ تصرف ایجنٹ کی ''انابت'' یا ''توکیل'' کے بغیر ہے تو ان کا یہ تصرف فضولی کے تصرف کے حکم میں ہوگا جو ایجنٹ کی اجازت پر موقوف ہوگا، یہ مسلک صرف احناف اور مالکیہ کا ہے، لہذا اگر ایجنٹ نے اجازت دے دی تو یہ تصرف نافذ ہوگا، اس لئے کہ بعد میں دی جانے والی اجازت سابقہ وکالت کی طرح ہے، اور اگر ایجنٹ نے اس کی اجازت نہ دی تو یہ تصرف باطل اور لغو ہوگا، اور بروکر یا ایجنٹ خود اس کا ذمہ دار ہوگا۔

جہاں تک اجرت کا تعلق ہے تو اگر بروکر نے مفت یہ عمل کیا ہے تو وہ ابضاع ہے، اور اس کی دلیل اصحاب سنن اور دیگر محدثین کی روایت کردہ یہ حدیث ہے: "باع قدحاً ببيع من يزيد" کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک پیالہ کو بولی لگا کر فروخت کیا۔ اور اگر اس نے متعین اجرت کے عوض یہ کام کیا ہے تو وہ اجیر خاص ہے، اور اگر منافع کی ایک شرح کے عوض اس نے یہ کام انجام دیا ہے تو یہ مضاربہ ہے۔

(ب) اور اگر بروکرز مؤکل کی طرف سے وکیل بنائے جانے کے بعد یہ تصرف کریں، تو ایسی صورت میں ان کی حیثیت ایسے وکلاء کی ہوگی جن پر وکالت کے احکام منطبق ہوں گے خواہ یہ وکالت حسب اتفاق اجرت متعین کرکے ہو یا بغیر اجرت کے ہو۔

خلاصہ بحث

زیر نظر مقالہ میں اس موضوع سے متعلق ۱۷ نکات ہیں:

موجودہ زمانہ میں شیئرز اور سندات جیسے تجارتی بانڈز کے ذریعہ کاروبار کا عام رواج ہو چکا ہے۔ جہاں تک کسی ایسی کمپنی کے شیئرز کا تعلق ہے جس کا کاروبار یا جس کی اسکیم حلال ہو تو وہ جائز ہیں، رہے بونڈز تو وہ جائز نہیں، کیونکہ یہ سود بردار قرض کے ذرائع ہیں، کبھی کبھی حلال کاروبار کرنے والی کمپنیاں بھی سودی قرضے حاصل کرتی ہیں، لہذا یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ موجودہ دور کی شراکت دار کمپنیوں کے ان افعال کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

۱۔ شیئرز کی حیثیت مساوی قیمت کی حامل اور تجارتی طریقوں سے رواج پذیر دستاویزات کی ہے، شیئرز کمپنی کے اصل اثاثے اور اس کے نتیجہ میں حاصل ہونے والے حقوق میں مشترک حصص کی نمائندگی کرتے ہیں، کمپنی کے اصل اثاثے اور اس سے حاصل شدہ حقوق کا انحصار اس کی خالص املاک، اس کی آمدنیوں اور اس کے انتظام وانصرام پر ہوتا ہے۔ شیئرز کی حیثیت صرف ادا کردہ رقوم کے دستاویزات کی نہیں ہے، کیونکہ یہ دستاویزات (خواہ کمپنی نفع میں جارہی ہو یا خسارہ میں) ان قرضہ جات کا لازمہ ہیں جن پر متعین سود واجب الاداء ہوتا ہے، ان دستاویزات کے حاملین کو کمپنی میں شراکت کا اختیار نہیں ہوتا ہے، یہ قرضہ جات ایک متعین قیمت کی نمائندگی کرتے ہیں جو مقروض کے دیوالیہ ہونے کی صورت میں ضبط کی جاسکتی ہے۔ کمپنی کی املاک اور اس کے اثاثوں سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہوتا ہے۔

وضعی قوانین میں کسی حصہ دار کے قرض دہندہ گان کو مقروض شیئرز ہولڈر کے حصص کے سلسلہ میں جب تک کمپنی قائم ہے، کوئی حق تنفیذ حاصل نہ ہوگا، اس لئے کہ شرکاء کی ذمہ داریوں سے الگ خود کمپنی کی ایک مالی ذمہ داری ہوتی ہے، دائن کو صرف حصہ دار مدیون کو حاصل ہونے والے منافع کے تناسب سے تنفیذ کا حق ہوگا، لیکن چونکہ فقہ اسلامی نے کمپنی کی ایک معنوی حیثیت (مستقل مالی مسئولیت) کی صراحت نہیں کی ہے، اسلئے اس کے نزدیک شراکت دار کے حصص کی ضبطی کی اجازت ہوگی۔ فقہ اسلامی اور موجودہ قانون دونوں اس بات پر متفق ہیں کہ بعض حالات میں شراکت دار کے سرمائے میں عمل دخل کے سلسلے میں شراکت دار کے قارضین کمپنی کے قارضین کے تابع ہوں گے، کیونکہ شرکاء کی ذمہ داریوں (liabilities) سے الگ خود کمپنی کی اپنی علیحدہ اور مستقل مسئولیت پورے طور پر مطابق قانون نہیں ہے۔

۲۔ کمپنی کے وجود میں آنے کے بعد اور کاروبار شروع کرنے سے پہلے خریدے گئے شیئرز کی خرید وفروخت درست ہے، بشرطیکہ بیع صرف کے اصول واحکام ملحوظ رکھے جائیں، اس لئے کہ یہ نقد کی نقد کے ساتھ خرید وفروخت ہے، لہذا مجلس عقد ہی میں قبضہ اور سود (ربا النسیئۃ) کی زد سے بچنے کے لئے یکسانیت ضروری ہے، اور معاملہ کا کسی مدت یا خیار شرط سے متعلق ہونا درست نہیں ہے، کیونکہ بیع صرف میں عوضین پر قبضہ شرط ہے۔

۳۔ ضرورت یا حاجت کے وقت سالانہ آمدنی کی حامل اور سودی قرض لینے والی کمپنی کے شیئرز حاصل کرنا درست ہے، اس قسم کے شیئرز کی بیع بھی درست ہے، بشرطیکہ آمدنی کا ایک حصہ ان سودی قرضوں کے تناسب سے جن سے آمدنی حاصل ہوئی ہے نکال دیا جائے، ایسی آمدنی کو ضرورت مندوں پر خرچ کر دیا جائے، اس طرح کی رقوم سے نفقے یا شیئر ہولڈرس کے ذمہ عائد ہونے والے ٹیکس (Taxes) کی ادائیگی نہیں کی جائے گی۔

۴۔ وہ کمپنیاں جن کا کاروبار حرام ہے، جیسے شراب، خنزیر کے گوشت، لہو ولعب کے سامانوں کی خرید وفروخت اور سودی اسکیموں یا بینکوں میں روپیہ لگانا، ایسی کمپنیز کے شیئرز کی خرید وفروخت قطعی حرام ہے، اسی ذیل میں وہ کمپنیاں بھی آتی ہیں جن کے بڑے بڑے ہوٹل اپنے کھانوں میں خنزیر کے گوشت اور الکوہل ملے ہوئے مشروبات (Alcoholic drinks) پیش کرتے ہیں، اسی طرح موسم گرما گذارنے کا انتظام کرنے والی وہ کمپنیاں بھی اسی زمرہ میں آتی ہیں جو عورتوں اور مردوں کے درمیان مخلوط تیراکی کے لئے سواحل سمندر (Beach) پر کیبنز (Cabins) بناتی ہیں۔

۵۔ عام ضرورت وحاجت کے سوا ایسی کمپنیز کے شیئرز خریدنا جائز نہیں جن کا کاروبار اور مقصد تو جائز اور درست ہو، لیکن انکم ٹیکس کی زد سے بچنے کیلئے انہیں کبھی کبھار سودی قرضے لینے پڑتے ہوں، اس لئے کہ ایسی صورت میں اصل سرمایہ حرام سے مخلوط ہو جاتا ہے، اور اس وجہ سے بھی کہ ایک ظلم کا حل کسی دوسرے ظلم یا حرام سے نہیں نکالا جاسکتا ہے، لہذا ضرورت وحاجت کے وقت اور گراں اور ظالمانہ ٹیکسیز کی وجہ سے اس قسم کے شیئرز خریدنا جائز ہے۔

۶۔ اگر کوئی کمپنی از روئے قانون اپنے سرمائے کا ایک حصہ سینٹرل ریزرو بینک میں جمع (Deposit) کرنے کی پابند یا ضرورت کے شرعی اصول و ضوابط کے اعتبار سے اس پر مجبور ہو یا اسے سیکورٹی بانڈز (Security Bonds) خریدنے پڑتے ہوں جن کی وجہ سے اسے سود بھی ملتا ہو تو یہ ممنوع نہیں ہے، بشرطیکہ اس سود سے جلد از جلد چھٹکارا حاصل کر لیا جائے اور اسے رفاہی امور میں صرف کر دیا جائے، اس کے مستحق نہ کمپنی کے شرکاء ہیں اور نہ ہی کمپنی کی انتظامیہ کمیٹی۔

۷۔ احناف کی رائے کے مطابق سودی قرضوں سے حاصل شدہ منافع مفید ملک تو ہیں، مگر یہ ملک، ملک خبیث ہے، یعنی یہ منافع اس کے لئے جائز اور حلال نہیں ہیں جس نے انہیں حاصل کیا ہو، جیسا کہ حنفیہ کے نزدیک بیع فاسد کے حکم کے سلسلہ میں مقرر ہے، چنانچہ ان کے نزدیک عقد فاسد ملک خبیث کا فائدہ دیتا ہے، ایسے عقد کا فسخ کرنا، اس کے فساد کے اسباب کا ازالہ کرنا اور ایسے مال کا محتاجوں پر صدقہ کرنا واجب ہے، دیگر ائمہ کے نزدیک ایسے منافع نہ مفید ملک ہیں اور نہ حلال۔

۸۔ کمپنی کا بورڈ آف ڈائریکٹرز شیئر ہولڈرس کا وکیل ہے، اس کی حیثیت سرمائے کے امین کی ہے، بورڈ آف ڈائریکٹرس اسی صورت میں سرمائے کا ضامن ہوگا جب اس کی طرف سے سرمائے کی حفاظت کے سلسلے میں تعدی یا کوتاہی پائی جائے گی، بورڈ کا عمل شیئر ہولڈرس کے عمل کا قائم مقام ہے، ایسا اس لئے کہ فقہ اسلامی کے نقطہ نظر سے کمپنی کی حیثیت ایک ٹرسٹ (Trust) اور شراکت (Partnership) کی ہے، اور جہاں تک ماہرین قانون کا تعلق ہے تو ان کے نزدیک کمپنی کا ایک قانونی اور معنوی وجود ہوتا ہے، چنانچہ اس کا ایک نام، پتہ، مقام اور اس کی ایک قومیت ہوتی ہے، وہ حقوق حاصل کرتی ہے اور ذمہ داریوں کی پابند ہوتی ہے، اور جیسا کہ گذشتہ صفحات میں بیان کیا گیا کہ شراکت داروں کی مسئولیت (Liabilities) سے الگ خود کمپنی کی اپنی ایک مالی مسئولیت ہوتی ہے، لیکن شراکت دار صرف اپنے حصص کے بقدر ہی کمپنی کے قرضہ جات کا ذمہ دار ہوگا، شراکت دار کے قرض دہندگان کو اس کے حصص ضبط کرنے یا اس میں کسی طرح مؤثر ہونے کا اختیار نہیں ہے، انہیں یہ اختیار صرف اس کے منافع میں ہے۔

۹۔ کمپنی کی مینیجنگ کمیٹی کے کسی ممبر کا سودی قرض لینے کے فیصلے سے صرف اختلاف کرنا اسے بری الذمہ قرار دینے لئے کافی نہیں، کیونکہ انتظامی بورڈ اور ڈائرکٹر کے اقدامات وتصرفات کے اثرات موکل ہونے کی حیثیت سے تمام شرکاء کو محیط ہوں گے، زیادہ سے زیادہ اس ممبر کا یہ عمل صرف امر بالمعروف اور نہی عن المنکر قرار پاسکتا ہے اور بس۔

۱۰۔ سود پر مبنی معاملہ کی خرابی کا اثر تمام شرکاء پر پڑے گا، اور وہ سب کے سب اس کے ذمہ دار قرار پائیں گے۔ جہاں تک شراکت دار کے مال کو

حرام کے اختلاط سے بچانے اور اس کے ضرر سے دور رکھنے کا سوال ہے تو اس کے لئے شراکت دار کو ایک اقدام کرنا ہوگا اور وہ یہ کہ سود سے پیدا شدہ متعین منافع میں سے اس کے بقدر صدقہ کر دیا جائے، اس طرح شراکت دار حرام شئے سے انتفاع کے وبال سے بچ جائے گا اور اپنے آپ کو حرام کے ارتکاب سے بچالے گا۔

۱۱۔ اسی طرح اگر شیئر ہولڈر کل آمدنی میں مخلوط سودی منافع میں سے اس کے تناسب سے صدقہ کر دے تو اپنے مال کو حرام سے مخلوط کرنے کے گناہ سے بچ سکتا ہے، کل آمدنی میں مخلوط سودی منافع میں سے اسی کے بقدر رقوم تخمینہ سے بھی نکالی جاسکتی ہیں اور موجودہ دور کے کمپیوٹر کے دقیق حساب کے مطابق بھی، عین مال حرام کا نکالنا ضروری نہیں، اسلئے کہ مال کا تعین ممکن نہیں جیسا کہ اس حقیقت کی طرف مالکی مسلک کے دو بزرگوں ابن العربی اور قرطبی نے اشارہ کیا ہے۔

۱۲۔ شیئرز کی تجارت یعنی قیمت بڑھنے کی صورت میں نفع کے ساتھ اس کی خرید وفروخت شرعاً ممنوع نہیں، بشرطیکہ قبضہ پایا جائے، خواہ حکمی ہی سہی، شیئرز کا یہ کاروبار احتکار (ذخیرہ اندوزی) کے ذیل میں نہیں آتا، اس لئے کہ سامان تجارت فی نفسہ مارکیٹ میں موجود ہے، اور شیئر ہولڈر کا اپنے شیئرز کی بیع کے لئے قیمتوں کے بڑھنے کا انتظار صرف کنندہ (Consumer) کے حق میں ضرر رساں نہیں۔

۱۳۔ فیوچر سیل (Future Sale) جس کا مقصد شیئرز خریدنا نہیں ہوتا، اس میں شیئرز سرٹیفکیٹ کی نہ حوالگی ہوتی ہے اور نہ ثمن کی وصولی، بلکہ اس کا مقصد بڑھتے گھٹتے داموں کے ساتھ نفع ونقصان کے توازن کو برابر کرنا ہوتا ہے، ایسی بیع شرعاً حرام اور فاسد ہے، اس لئے کہ یہ دَین کی دَین سے بیع ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیع کالی بالکالی سے (یعنی دَین کی بیع دَین سے) منع فرمایا ہے، اور اس قسم کی بیع کے فاسد ہونے پر علماء کا اتفاق ہے۔

۱۴۔ غائب سودا (Forward Sale) جن کا انعقاد مستقبل میں ہونے والا ہو، درست نہیں ہے، اس لئے کہ بیع کا تقاضا قطعیت ہے، لہذا نہ تو اسے کسی شرط پر معلق کیا جاسکتا ہے اور نہ اس کی اضافت مستقبل کی طرف کی جاسکتی ہے، جب تاخیر سے واجب الادا شیئرز کی بیع اس کی قیمت سے کم پر ادائیگی کے وقت سے پہلے نقداً کی جائے تو ایسی بیع فاسد ہے، اس لئے کہ یہ دَین آجل کی اقل نقد عاجل کے ساتھ بیع ہے جیسے بل ڈسکاؤنٹ (Bill Discount)، البتہ بیع سلم کسی ایسی شئے میں درست ہے جو ذمہ میں معلوم ہو اور جس کی حوالگی مستقبل میں کسی وقت تک مؤخر ہو، بشرطیکہ مجلس عقد ہی میں پورا ثمن ادا کر دیا جائے۔

۱۵۔ فروخت کردہ شیئرز پر حکمی قبضہ میں کوئی ممانعت نہیں ہے، اسلئے کہ کمپنی انتظامی اسباب کی وجہ سے نئے مالک کے نام سے شیئرز سرٹیفکیٹ کی حوالگی میں تاخیر کے باوجود اس بیع کو تسلیم کرتی ہے، اور شیئرز کے نئے خریدار کے حصص کی ضمانت لیتی ہے۔ حنفیہ کے سوا جمہور ائمہ نے صراحت کی ہے کہ ہر چیز پر قبضہ اس کی نوعیت کے اعتبار سے عرف وعادت کی بنا پر ہوتا ہے، لیکن شیئرز کے اس نئے مالک کے لئے شیئرز سرٹیفکیٹ پر قبضہ سے پہلے اس شیئر کی بیع درست نہیں ہوگی، جیسا کہ مندرجہ ذیل مسئلہ میں ہے۔

۱۶۔ قبضہ سے پہلے شیئرز کی خرید وفرخت یا اس کی منتقلی درست نہیں ہے، اس لئے کہ غرر کا اندیشہ ہے، اور اسی طرح شیئرز کے داموں کے بڑھنے کی صورت میں عدم حوالگی کا امکان ہے، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے غرر اور قبضہ سے پہلے کسی چیز کو فروخت کرنے سے منع فرمایا ہے۔

۱۷۔ اسٹاک ایکسچینج مارکیٹ میں بروکر (ایجنٹ) کا معاملہ کرنا مؤکل کے معاملہ کرنے کی طرح ہے اگر مؤکل اسے اپنے معاملہ کا وکیل یا نائب بنادے، اس لئے کہ اگر توکیل نہ پائی جائے تو حنفیہ اور مالکیہ کے مطابق ''بروکر'' کا تصرف ''فضولی'' کے تصرف کے حکم میں ہوگا، اگر مؤکل اجازت دیدے تو معاملہ کا نفاذ ہوگا، ورنہ عقد باطل ہو جائے گا، اور خریداری کے معاملہ کا ذمہ دار ایجنٹ ہوگا۔

☆☆☆

شیئرز کے شرعی احکام

مولانا انیس الرحمن قاسمی [1]

۱۔ کمپنی کے شیئرز کے بارے میں یہ سوال کہ وہ کمپنی میں شیئر ہولڈر کی ملکیت کی نمائندگی کرتا ہے یا محض اس بات کی دستاویز ہے کہ اس نے اتنی رقم کمپنی کو دے رکھی ہے؟

اس سلسلہ میں علماء کرام کی یہ رائے صحیح ہے کہ کمپنی کے شیئرز کمپنی میں دی گئی رقم کی صرف دستاویز نہیں بلکہ کمپنی کے سیال (نقد) و جامد اثاثوں میں ملکیت کے سرٹیفکیٹ ہیں۔

اور عرف و قانون میں یہی سمجھا جاتا ہے کہ کمپنی میں شیئر ہولڈر کے متناسب ملکیت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اگر کمپنی باہمی قرارداد سے تحلیل ہوجائے تو شیئر ہولڈر کو اسکے شیئرز کے تناسب سے کمپنی کے اثاثوں میں حصہ ملتا ہے، اسی طرح اگر نفع ہوتو اسکے لگائے ہوئے سرمایہ سے زائد رقم ملتی ہے، یا خسارہ ہوتو نقصان برداشت کرنا پڑتا ہے، برخلاف بانڈس وغیرہ دیگر مالی دستاویزات کے کہ جن پر کمپنی تحلیل ہونے کی صورت میں صرف لگی ہوئی رقم سود کے ساتھ واپس ملتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ جب کمپنی کو ابتداءً قائم کیا جاتا ہے تو اس کے زمینی وجود سے پہلے بازار میں اسکے شیئرز پیش ہوتے ہیں اور لوگوں کو خریدنے کی دعوت دی جاتی ہے۔ چنانچہ عوام و خواص حسب خواہش اس کے شیئرز خرید کر ممبر بنتے ہیں۔ عرف میں تو ابتدائی شیئرز لینے کو بھی خرید و فروخت سے تعبیر کیا جاتا ہے، مگر حقیقت میں وہ خرید و فروخت نہیں ہوتی ہے، کیونکہ شیئرز لینے والا تو روپیہ دیتا ہے مگر اسکے عوض میں مبیع کوئی شئی نہیں ہوتی ہے۔ چونکہ کمپنی نے نہ تو اب تک اپنا کام شروع کیا ہے اور نہ اسکے املاک و اثاثے وجود میں آئے ہیں، پس حقیقت یہی ہے کہ شیئر لینے والا کمپنی میں حصہ دار ہوتا ہے۔ اور حصہ داری کی جو سرٹیفکیٹ ملتی ہے اسکی حیثیت کمپنی میں ملکیت کی نمائندگی کی دستاویز کی ہے۔

۲۔ اس صورت میں جب کہ کمپنی کے پاس کوئی اثاثہ یعنی بلڈنگ، زمین وغیرہ کی نوعیت کا نہ ہو بلکہ صرف نقد رقوم ہوں تو ایسی صورت میں شیئر خریدنے والا اگر اسے فروخت کرتا ہے تو اسے شیئرز کی اصلی قیمت سے کم یا زائد لینا یا دینا جائز نہیں ہوگا۔

۳۔ کمپنی کے وجود میں آنے کے بعد اگر سیال و جامد دونوں طرح کے اثاثے و املاک ہوں تو ایسی صورت میں شیئرز کی بیع کمی بیشی کے ساتھ جائز ہوگی، کیونکہ اس صورت میں نقد ثمن کے مقابلہ میں مبیع نقد اور سامان دونوں ہیں، اور جب ایسی صورت ہو تو اس پر بیع صرف کے احکام جاری نہیں ہوں گے، کیونکہ یہاں مال ربوی (نقد) سے غیر ربوی (نقد و سامان) کی خریداری عمل میں آرہی ہے (دیکھئے: ردالمحتار ۵/ ۲۶۵)۔

۴۔ بنیادی طور پر کمپنیوں کا شیئر لینا یا فروخت کرنا جائز ہے۔ البتہ اگر ایسی کوئی کمپنی ہو جس کا بنیادی کاروبار حرام ہو، جیسے شراب، خنزیر کا گوشت، سودی بینک وغیرہ کی کمپنی تو کسی مسلمان کے لئے ان کا شیئرز خریدنا جائز نہیں ہوگا (دیکھئے: درمختار ۵/ ۶۴-۶۵)۔

۵، ۶، ۷۔ البتہ ایسی کمپنیاں جن کا بنیادی کام حلال کا ہے جیسے انجینیرنگ یا عام استعمال کی چیز تیار کرنا، اگر وہ ضرورتاً یا انکم ٹیکس سے بچنے کے لئے سودی قرضے لیتی ہیں تو ان کا شیئرز خریدنا جائز ہے، اس لئے کہ جب کوئی شخص سود پر قرضہ لیتا ہے تو باوجودیکہ وہ گناہ کا عمل کرتا ہے مگر وہ لئے ہوئے قرضے کا مالک بن جاتا ہے، اس شئی میں حرمت داخل نہیں ہے، بلکہ اس پر جو سود دینا پڑتا ہے وہ ایک خارجی عمل ہے جو مستوجب عقاب ہے، اس لئے اس قرضے سے جو بھی کاروبار کیا جائے گا یا اس سے جو بھی آمدنی حاصل ہوگی وہ حلال ہوگی۔

۸، ۹۔ یہ صحیح ہے کہ کمپنی کا بورڈ آف ڈائرکٹرس قانونی طور پر شیئر ہولڈر کا وکیل ہوتا ہے، اس لئے اگر وہ کمپنی کے لئے سودی قرضے لیتے ہیں تو اس کی نسبت حسب

[1] ناظم امارت شرعیہ، پھلواری شریف، پٹنہ۔

تناسب شیئر ہولڈر کی طرف ہوگی، مگر اس سے شرعی طور پر ایک مسلمان کے لئے بچنے کا طریقہ یہ ہے کہ وہ اپنی نارضامندی کا اظہار کردے۔ یہی رائے حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی ہے۔

۱۰، ۱۱۔ اگر کمپنی کے منافع میں سود بھی شامل ہو جائے جبکہ اس کا بنیادی کاروبار غیر سودی ہے، تو اس صورت میں شیئر ہولڈر کو سودی منافع کی مقدار کا علم ہونے پر اس کے بقدر بلانیت ثواب صدقہ کر دینا ضروری ہوگا۔

۱۲۔ جس طرح ابتدائی طور پر کمپنی کے شیئرز لینا جائز ہے اسی طرح ان شیئرز کو فروخت کرنا بھی جائز ہے، نیز کسی سے خریدنا بھی جائز ہے۔ کبھی کبھی شیئرز کی خرید وفروخت کمپنی میں ملکیت وحصہ داری کی نیت سے نہیں ہوتی بلکہ (Capital Gain) کے مقصد سے ہوتی ہے جس میں شیئرز کے خریدار کا یہ مقصد ہوتا ہے کہ آئندہ جب قیمت بڑھ جائیگی تو فروخت کر کے نفع حاصل کرے گا۔ یہ خرید وفروخت بھی جائز ہے۔

البتہ شیئرز کی خرید وفروخت کا وہ طریقہ جس میں شیئرز کا لین دین مقصود نہیں ہوتا بلکہ شیئر مارکیٹ میں خرید وفروخت کی آواز لگا کر اخیر میں آپس کا ڈیفرینس برابر کر لیا جاتا ہے، جو ایک طرح کی سٹہ بازی (قیاس وتخمین آرائی) ہے، جس میں شیئرز پر نہ تو قبضہ ہوتا ہے اور نہ ہی قبضہ پیش نظر ہوتا ہے، یہ صورت جائز نہیں ہے۔

۱۳۔ فیوچر سیل (بیاعات مستقبلیات) کے طور پر شیئرز کی خرید وفروخت جس میں مقصد شیئرز خریدنا نہیں ہوتا بلکہ بڑھتے گھٹتے دام کے ساتھ نفع ونقصان کو برابر کر لینا ہوتا ہے، نہ خریدار ثمن دیتا ہے، اور نہ فروخت کرنے والا مال یعنی شیرز سرٹیفکیٹ دیتا ہے، بلکہ کاغذی کارروائی خرید وفروخت کی ہوتی ہے۔ اس طرح خرید وفروخت کرنا جائز نہیں ہے، کیونکہ یہ بیع منعقد ہوتی ہی نہیں ہے، لہذا اس کا منافع لینا بھی کسی فریق کے لئے جائز نہیں ہوگا۔

۱۴۔ شیئرز کی ایسی خرید وفروخت جن میں بیع کی اضافت مستقبل کی طرف کی جاتی ہے، یہ شرعاً جائز نہیں ہے۔ یعنی باتفاق فقہاء یہ بیع منعقد نہیں ہوتی ہے، البتہ مستقبل میں بیع کا وعدہ کیا جا سکتا ہے، وقت آنے پر اس کی بیع باقاعدہ کرنی ہوگی۔

۱۵، ۱۶۔ شیئرز پر قبضہ کرنے سے پہلے اس کی بیع جائز نہیں ہے، لیکن یہ ذہن میں رکھنا چاہئے کہ ہر شئی کا قبضہ حسی طور پر ضروری نہیں ہے، بعض اشیاء حکماً بھی قبضہ میں آجاتی ہیں۔ شیئرز کے کاروباری ضابطے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جب کوئی حاضر سودا شیئرز کا ہو جاتا ہے تو گرچہ خریدار کے ہاتھ میں شیئرز کی سرٹیفکٹ فوری طور پر منتقل نہیں ہوتی ہے، اور حسی قبضے میں عموماً تاخیر ہوتی ہے، مگر اس کے باوجود شیئرز کے تمام حقوق اور ذمہ داریاں خریدار کی طرف منتقل ہو جاتی ہیں، اور وہ خریدار کے ضمان میں داخل ہو جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ شیئرز پر حسی قبضہ سے پہلے اگر کمپنی کسی حادثہ کے نتیجے میں بالکل نیست ونابود ہو جائے تو نقصان مشتری کا سمجھا جائے گا۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سرٹیفکٹ کے ہاتھ میں آنے سے پہلے بھی شیئرز کی بیع جائز ہو، لیکن عرف کے اوپر نگاہ کی جائے تو یہ کہنا پڑیگا کہ عرف میں شیئرز کا قبضہ اسی وقت سمجھا جاتا ہے جب سرٹیفکٹ ہاتھ میں آجائے، اس لئے احتیاط کا پہلو یہ ہے کہ سرٹیفکٹ پر قبضہ کئے بغیر شیئرز کو آگے نہ بیچا جائے۔

۱۷۔ اسٹاک ایکسچینج بازار میں شیئرز کی خرید وفروخت کے لئے بروکر بننا اور اس پر کوئی اجرت لینا جائز ہے۔ مگر بروکر بائع اور مشتری دونوں سے کسی ایک ہی کام کی ڈبل اجرت نہیں لے سکتا ہے، اس لئے کہ دلال یعنی بروکر شرع میں اجیر کو کہتے ہیں، اور اس پر کمیشن اصطلاح شرع میں اجرت کا نام ہے، اور اجیر جس کا کام کرتا ہے اسی سے اجرت پانے کا مستحق ہوتا ہے۔

ہاں اگر کوئی شخص دونوں کا کام الگ الگ کرے تو الگ الگ کام ہونے کی بنا پر بائع اور خریدار دونوں سے متعارف اجرت لے سکتا ہے (دیکھئے: رد المحتار ۴۲/۴)۔

☆☆☆

حصص کمپنی کے شرعی احکام

مفتی محمد زید ندوی[1]

ا۔ شیئرز کی حقیقت:

زیر بحث مسئلہ میں شیئرز کمپنی کی وہ صورت متعین کرنا ضروری ہے جو کہ اقرب الی الصحت والجواز ہو، کمپنی سے خرید کردہ شیئر کی بابت اگر چہ بعض علماء نے اس کے قطعاً ناجائز اور حرام ہونے کا فتوی دیا ہے (کفایت المفتی ۱۰۹/۸) نیز بعض علماء نے شیئر کو صرف اس بات کی علامت وشہادت قرار دیا ہے کہ اس شخص نے کمپنی کو اتنی رقم دے رکھی ہے (سوالنامہ بابت شیئرز کی شرعی حیثیت)۔

لیکن دلائل کے اعتبار سے مضبوط اور جمہور علماء کی رائے یہی ہے کہ یہ صورت شرکت عنان کی ہے (امداد الفتاوی ۴۹۴/۳) کیونکہ شرکت عنان کی تعریف اس پر صادق آتی ہے جس میں ایک شریک کی طرف سے مال اور دوسرے شریک کی طرف سے مال وعمل دونوں ہوتے ہیں (عطر الہدایہ/ ۱۱۴)، البتہ اگر ایک شریک کا صرف مال اور کمپنی کی طرف سے صرف کام ہو تو یہ صورت مضاربت کی ہوگی اور اس میں مضاربت کے احکام جاری ہوں گے۔ اور اس شرکت کے نتیجہ میں اس کو جو شیئرز سرٹیفیکٹ حاصل ہوگا وہ درحقیقت اس شخص کی اس کمپنی میں متناسب حصہ کی ملکیت کی نمائندگی کر رہا ہے (فقہی مقالات مولانا تقی عثمانی/ ص ۱۴۳)۔

۲۔ کمپنی سے خریدے ہوئے شیئر کی بیع:

شیئر کی حقیقت واضح ہو جانے کے بعد اس کی خرید وفروخت کا حکم بھی واضح ہے۔ جب شیئر کی یہ حقیقت متعین ہوگئی کہ یہ شرکت عنان کی صورت ہے اور شیئر کمپنی کے متناسب حصہ کی ملکیت کی نمائندگی کرتا ہے، لہذا جس نے بھی کمپنی سے شیئر خریدے وہ اس کمپنی کا حصہ دار بن گیا، اور اب جو شخص اس شیئر کو اس (کمپنی کے حصہ دار) سے خریدے گا وہ دراصل ملکیت کے اس متناسب حصہ کو خرید رہا ہے جو اس پہلے شخص کا اس کمپنی میں آتا ہے۔ یہ حقیقت ہے شیئرز کی خرید وفروخت کی جو بالکل جائز ہے۔

لیکن وہ صورت جس کا سوال میں ذکر ہے کہ کمپنی نے ایسے وقت شیئرز فروخت کئے جس وقت کہ کمپنی کے پاس کچھ بھی املاک نہیں ہوتیں محض ایک تجویز اور خاکہ ومنصوبہ ہوتا ہے، ظاہر بات ہے کہ کمپنی سے شیئر کا خریدار تو کمپنی کا شرکت دار بن گیا لیکن ایسی حالت میں خود اس شریک کا اپنے شیئر کو دوسرے کے ہاتھ فروخت کرنا جائز نہیں ہونا چاہئے کیونکہ کمپنی کے پاس کچھ املاک ہی نہیں کہ اس کی بابت یہ کہہ دیا جائے کہ یہ متناسب حصہ کی بیع ہے۔

چونکہ اس طرح شیئر کی خرید وفروخت کا عرف وتعامل ہے لہذا اس کو بھی جائز ہونا چاہئے، ورنہ دوسرے مسالک کی روشنی میں اس کے جائز ہونے کا فتوی دینا چاہئے۔ البتہ شبہ ربوا سے بچنے کے لئے یہ شرط ضروری ہے کہ اصل شریک دار نے جتنے کا حصہ خریدا ہے اتنی ہی قیمت کا فروخت کرے اس سے زائد قیمت نہ لے۔

۳۔ کمپنی کا مال اگر مال ربویہ وغیر ربویہ کو متضمن ہو:

کمپنی کا مال اگر مخلوط یعنی اموال ربویہ وغیر ربویہ دونوں کو متضمن ہو (اور ایسی صورت میں شیئرز کی خرید وفروخت کی جائے) تو اس میں دو باتوں کا لحاظ رکھنا ضروری ہے ورنہ معاملہ ناجائز ہو جائے گا۔ ایک تو یہ کہ اموال ربویہ کے مساوی حصہ میں نقد ضروری ہے ادھار جائز نہیں، دوسرے یہ کہ اموال ربویہ کے مساوی د مقابل حصہ سے ثمن کچھ زائد ہونا چاہئے تا کہ ربوی مال باہم مساوی ہو جائے (جو بیع صرف ہوگی) اور زائد ثمن دیگر سامان کے مقابلہ میں ہوگا، ورنہ پھر سود ہو جائے گا۔

۴۔ سود میں ملوث کمپنیوں میں شرکت اور ان کے منافع کا حکم:

---

[1] جامعہ عربیہ اسلامیہ، ہتھورا، باندہ۔

ایسی کمپنیاں جو بنیادی طور پر حرام کام کرتی ہیں ان میں شرکت قطعی حرام ہے انکی اعانت بھی جائز نہیں (امداد الفتاوی ۳؍۱۳۰)۔

۵،۶۔ ایسی کمپنیاں جن کا کاروبار بنیادی طور پر حلال ہو اس میں شرکت بلاشبہ جائز ہے، اور انکم ٹیکس یا اور دوسرے ناجائز ظالمانہ ٹیکسوں سے بچنے کے لئے ظاہر میں بینک سے قرض لینا پڑے یا اور کسی قانونی مجبوری سے بینک میں جمع کرنا پڑے، چونکہ مقصود دفع مضرت ہے لہذا ایسی صورت میں کمپنی کا (دفع مضرت یا حفظ مضرت) کے لئے بینک میں رقم جمع کرنا اور لینا دونوں جائز ہے جیسے کہ دفع مضرت کے لئے جھوٹ بولنا اور رشوت دینا جائز ہے۔ جب یہ جائز ہے تو ایسی کمپنیوں کے شیئرز خریدنا بھی جائز ہے۔

لیکن یہ جواز اسی وقت تک ہے جب تک کہ واقعی مقصود دفع مضرت ہو ورنہ اگر کمپنی کا مقصود جلب منفعت ہے اور اغلب یہی ہے تو ظاہر ہے کہ یہ سود ہے اس کی اجازت کس طرح ہوسکتی ہے، اور جب یہ معلوم ہوجائے کہ یہ کمپنی سودی طریقہ سے مال میں اضافہ کرتی اور سودی کاروبار کرتی ہے ایسی کمپنیوں میں شرکت کرنا، اس کے شیئرز خریدنا بھی درست نہ ہوگا۔ اور اگر کسی نے خرید لئے تو اگر کمپنی دوسرے جائز کاروبار بھی کرتی ہے نیز اس میں سودی نفع بھی شامل ہوتا ہے ایسی صورت میں تجارت کے واسطے سے حاصل شدہ نفع حلال ہوگا اور سودی نفع کا صدقہ ضروری ہوگا۔

۷۔ سودی قرض کے واسطے سے جو تجارت کی جائے اور اس سے جو آمدنی ہوگی وہ حلال اور طیب ہوگی، مفید ملک بھی ہوگی، لیکن سودی قرض لینے کا گناہ ہو گا (ملاحظہ ہو: امداد الفتاوی ۳؍۱۷۰)۔

۸۔ کمپنی کے افراد حصہ داروں کے وکیل ہیں اور ناجائز معاملہ کی توکیل ناجائز ہے:

کمپنی اور شیئرز ہولڈر کے معاملہ کو شرکت کہا جائے یا مضاربت، دونوں ہی صورتوں میں کمپنی کے ذمہ دار وعمال شیئرز ہولڈرس کے وکیل ہوں گے۔ محقق تھانویؒ نے بھی کمپنی کے افراد کو حصہ داروں کا وکیل ہونا تحریر فرمایا ہے (امداد الفتاوی ۳؍۱۳۰)، اب رہا یہ مسئلہ کہ ایک مسلمان کا کسی غیر مسلم کو اس طرح کا وکیل بنانا درست ہے یا نہیں جس میں کہ وہ غیر مسلم یقیناً ناجائز کاروبار اور سودی معاملات بھی کرے گا؟ سو اس مسئلہ میں امام صاحب اور دیگر ائمہ کا اختلاف ہے۔

امام شافعیؒ اور صاحبین کے نزدیک تو یہ توکیل قطعاً ناجائز اور باطل ہے کیونکہ وکیل کا عمل مؤکل کا عمل ہے، وہ جو بھی تصرف کرے گا اس کے مؤکل ہی کا عمل سمجھا جائے گا، ہدایہ، مغنی وغیرہ میں اس کی صراحت موجود ہے۔

لأن ما یثبت للوکیل ینتقل إلی المؤکل فصار کأنه باشره بنفسه فلا یجوز (هدایه فتح القدیر ۶؍۷۵)۔

محقق تھانویؒ نے بھی صاحبین کے اسی قول کو اختیار فرما کر ایسی کمپنی میں شرکت کو ناجائز قرار دیا ہے (امداد الفتاوی ۳؍۱۳۰)، البتہ امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں کہ بیع میں حقوق وکیل ہی کی طرف عائد ہوتے ہیں اور سارے احکام بھی اسی سے متعلق ہوتے ہیں۔ وکیل ابتدائً عاقد لنفسہ یعنی اپنے لئے معاملہ کرتا ہے، اس لئے یہ توکیل جائز ہے۔ اور جائز کا مطلب یہ ہے کہ اس معاملہ کا انعقاد ہوجائے گا، اس کو باطل نہ قرار دیا جائے گا، ورنہ ایسی توکیل کی اشد کراہت یعنی اس کا مکروہ تحریمی ہونا (جو کہ حرام کے قریب قریب ہے) خود امام صاحب سے بھی منقول ہے۔ نیز ایسی توکیل سے جو آمدنی ہو اس کا صدقہ کردینا بھی واجب ہے۔ مبسوط سرخسی (۲۲؍۱۲۵) شامی (۴؍۱۲۰) بحر (۶؍۸۴) وغیرہ میں اس کی تصریحات موجود ہیں۔

۹۔ حصہ دار کا اپنے وکیل سے سودی کاروبار کو منع کردینا اور اس سے اختلاف کرنا کافی ہے:

جب ایسی توکیل کا ناجائز، اور مکروہ تحریمی ہونا معلوم ہوگیا تو اب زیر بحث مسئلہ میں سوال پیدا ہوگا کہ کمپنی کی مروجہ صورت میں کسی شیئرز ہولڈر کا محض ناجائز کاروبار، سودی قرض لینے سے اختلاف کرنا یا اس کی شرط لگا دینا وکیل کے عمل سے مؤکل (شیئرز ہولڈر) کو بری کردے گا یا نہیں، اور وہ معاملہ درست ہوگا یا نہیں؟ سو اس سلسلہ میں احقر کی ناقص رائے وہی ہے جو حضرت تھانویؒ، مفتی محمد شفیع صاحب، اور مولانا تقی عثمانی صاحب کی ہے کہ شیئرز ہولڈر (کمپنی کے حصہ دار) کا سودی قرض اور سودی معاملات، حرام کاروبار سے معاملہ کے وقت اختلاف کرنا، یا شرط لگانا اور اس سے براءت کرنا خود اس کی براءت کے لئے کافی ہوگا، اور اس کے بعد جو نفع ہوگا وہ اس حصہ دار کے لئے حلال ہوگا، الا یہ کہ متعین طور پر سودی نفع دیا جائے تو اس سودی نفع کا صدقہ کرنا ضروری ہوگا جس کی دلیل ماقبل میں گذر چکی (فقہی مقالات شیئرز کی خرید وفروخت ص ۱۵۰، امداد الفتاوی ۳؍۴۹۱)۔

۱۰، ۱۱۔ نفع بھی حلال ہے:

رہ گیا دوسرا مسئلہ۔ یعنی یہ کہ کمپنی سے جو نفع حصہ دار کو ملا ہے، سو اغلب تو یہی ہے کہ اس میں سودی اور ناجائز نفع بھی شامل ہوگا، لیکن جب مؤکل (حصہ دار) پہلے ہی صراحت و براءت کر چکا کہ سودی کاروبار اور ناجائز نفع میں اس کی شرکت نہ ہوگی، اس کو صرف وہ آمدنی اور نفع چاہئے جو غیر سودی اور حلال ہو، ایسی صورت میں کمپنی والے جو نفع اس کو دیں گے وہ کل کا کل حلال ہوگا، الا یہ کہ متعین طور پر یہ معلوم ہو جائے یا وہ کمپنی اس صراحت کے ساتھ اس کو نفع دے کہ اس منافع میں سودی نفع اتنا ہے جو تمہارے حصہ میں آیا ہے، اس صورت میں صرف اتنے حصہ کا صدقہ کرنا ضروری ہوگا (خانیہ ۳/ ۴۶۳، امداد الفتاوی ۳/ ۴۹۸)۔

۱۲۔ شیئرز کی تجارت کا شرعی حکم:

شیئرز کی تجارت فی نفسہ جائز ہے، بشرطیکہ جملہ حدود وقیود اور شرائط کا لحاظ کیا جائے۔ اور چونکہ عام طور پر ان حدود وقیود اور شرائط جواز کا لوگوں کو علم نہیں ہوتا اور اس کی رعایت نہیں کرتے جس کی وجہ سے مختلف خرابیوں کے وقوع اور فساد کا احتمال بکثرت ہوتا ہے، اس لئے اس تجارت سے خالص تجارت کرنا زیادہ بہتر ہے جس میں فساد کا احتمال کم ہے۔ حاصل یہ کہ فتوی کی رو سے بلا کراہت جائز ہے گو تقوی و احتیاط کے خلاف ہے۔

بعض ناجائز صورتیں:

۱۳۔ فیوچر سیل (بیع المستقبلیات) اس تفصیل کے ساتھ جس کا سوال میں ذکر ہے قطعی ناجائز وحرام ہے۔ مولانا تقی عثمانی صاحب نے مع دلائل اس کی تصریح فرمائی ہے (فقہی مقالات ص ۱۵۲)۔

۱۴۔ یہ شکل بھی ناجائز ہے (ایضاً ص ۱۵۵)۔

۱۵۔ سرٹیفیکٹ پر قبضہ سے پہلے شیئر کی بیع ناجائز ہے:

ضمان وقبضہ دونوں علیحدہ شئی ہیں اور دونوں میں کوئی تلازم نہیں، حدیث پاک میں مستقل طور پر دونوں کی ممانعت وارد ہوئی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ قبضہ حسی کی طرح قبضہ معنوی بھی ہوتا ہے اور ہر شئی پر اس کی خاص نوعیت کے اعتبار سے قبضہ کی نوعیت بھی مختلف ہوتی ہے جس میں عرف وعادت کا بھی اعتبار ہوتا ہے۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے جیسا کہ عرض کیا گیا کہ ضمان وقبضہ دونوں علیحدہ شئی ہیں۔ کسی شئی کے محض ضمان میں آجانے اور کاغذی کارروائی ہو جانے سے قبضہ کا تحقق نہیں ہوتا جب تک کہ واقعی وہ شئی (یا اس کے قائم مقام) قبضہ میں نہ آجائے۔ مثلاً صورت مسئولہ میں قبضہ معنوی کافی ہے، لیکن قبضہ معنوی کی تکمیل بھی اس پر موقوف ہے کہ سرٹیفیکٹ اور اس کی سند قبضہ میں آجائے جو کہ قبضہ حسی کے قائم مقام ہے، اس کے بغیر قبضہ معنوی بھی ناقص وناکافی ہوگا۔

۱۶۔ سرٹیفیکٹ حاصل کرنے سے قبل یعنی قبضہ معنوی کی تکمیل سے پہلے اس کی بیع ناجائز ہے۔ حدیث وفقہ میں ربح مالم یضمن کی طرح قبل القبض بیع کی مستقلاً ممانعت وارد ہوئی ہے: نهى رسول الله ﷺ عن بيع ما ليس عندك و عن ربح ما لم يضمن (مصنف عبد الرزاق ۸،۳۹)۔

اور محض ضمان میں آجانے سے قبضہ کا تحقق ضروری نہیں۔

۱۷۔ شیئرز کمپنی کی دلالی جائز ہے:

اس کی حیثیت اجیر ودلال کی ہے، جو حکم اجیر ودلال کا ہوتا ہے وہی اس کا بھی ہوگا یعنی جائز عقود کی دلالی اور اس کی اجرت جائز ہے اور ناجائز کی ناجائز، یعنی جو حکم وکالت کا ہے وہی اس کا ہے۔

☆☆☆

شیئرز کی خرید وفروخت اور اس کے شرعی احکام

مفتی احمد دیولوی[1]

۱۔ شیئرز کی حقیقت:

شیئرز کو اردو میں حصے اور عربی میں سہوم سے تعبیر کرتے ہیں، یہ شیئرز کسی کمپنی کے اثاثوں میں شیئرز ہولڈرس کی ملکیت کے ایک مناسب حصے کی نمائندگی کرتے ہیں، اور شیئرز خریدار کو جو کاغذ یعنی شیئرز سرٹیفیکٹ کی شکل میں ملتا ہے وہ خریدار کی کمپنی میں ملکیت کی نمائندگی کرتا ہے۔ شیئر خریدنے کی وجہ سے خریدار کمپنی کے اثاثوں اور املاک میں اپنے حصے کے تناسب سے مالک بن جاتا ہے، جب کمپنی ابتداءً وجود میں آتی ہے تو اس وقت جو شخص بھی شیئر خریدتا ہے وہ درحقیقت کمپنی کے کاروبار میں حصہ دار بن جاتا ہے اور کمپنی کے ساتھ شرکت کا معاملہ کرتا ہے، اور اگرچہ عرف میں اس کو شیئر خریدنا کہا جاتا ہے لیکن شرعاً وہ خرید وفروخت نہیں ہے بلکہ یہ عقد شرکت کی صورت ہوتی ہے۔

۲۔ کمپنی قائم کرتے وقت اس کے پاس کچھ بھی املاک نہیں ہوتی ہیں اس صورت میں نقد کا مقابلہ نقد سے ہوتا ہے، لہذا اس وقت کمپنی کے شیئرز کو فیس ویلو سے کم یا زیادہ پر فروخت کرنا جائز نہیں ہے، بلکہ برابر سرابر خریدنا ضروری ہے، کیونکہ دس روپے کا شیئر دس روپے کی ہی نمائندگی کرتا ہے۔ اس وقت ایسا ہی ہوگیا جیسے کہ دس روپے کے نوٹ کو گیارہ روپے یا نو روپے میں فروخت کرنا جائز نہیں ہے۔

۳۔ شیئرز کمپنیوں کا کاروبار سودی اور غیر سودی دونوں قسم کے سودوں پر مشتمل ہوتا ہے، لہذا خریداروں کو ملنے والا نفع بھی مختلط بالحلال والحرام ہوگا، تو اس سلسلہ میں قاضی خاں فرماتے ہیں کہ اگر ہدیہ کرنے والے کا غالب واکثر مال حلال ہے تو ہدیہ قبول کرکے کھا سکتا ہے، جب تک کہ اس کے حرام ہونے کا واضح ثبوت نہ ہو حلال ہے۔ کیونکہ لوگوں کے اموال حرام کی کسی قدر آمیزش سے خالی نہیں ہوتے ہیں، لہذا اغلب کا اعتبار ہوگا۔

وإذا مات عامل من عمال السلطان و أوصى أن يعطى الحنطة للفقراء قالوا إن كان ما أخذه من أموال الناس مختلطا بماله لا بأس به وإن كان غير مختلط لا يجوز للفقراء أن يأخذوه إذا علموا أنه مال الغير وإن لم يعلم الآخذ أنه من ماله أو مال غيره فهو حلال حتى يتبين أنه حرام (فتاوی قاضی خاں بحوالہ امداد الفتاوی ۳/۲۹۷)۔

بہر حال فقہائے کرام کی عبارات میں توسعات اور دار الحرب میں سودی مسائل میں تخفیف وغیرہ ابحاث سے مسئلہ میں گنجائش کا پہلو ضرور موجود ہے، لیکن سچی بات یہ ہے کہ سود کی آمیزش قباحت سے خالی نہیں ہے۔ حضرات فقہاء کرام کی جانب سے گنجائش مبتلی بہ کے لئے ہے جو حرام سے بچ نکلنے کا راستہ فراہم کرتی ہے، لیکن زیادتی مال کے لئے بالارادہ (اصالۃً) اس قسم کے کاروبار میں مشغولیت اللہ تعالی کی حرام کردہ چیز کی آمیزش کے قطعی علم کے ساتھ ایک مومن کے لئے قطعاً مناسب نہیں ہے، اس لئے جہاں تک ممکن ہو اس سے اجتناب ہی صحیح راستہ ہے۔

۵۔ کمپنی کا سودی کاروبار:

اکثر کمپنیاں اپنی سرمایہ کاری حصص قرض (Bonds) اور بینک کے سودی قرضے وغیرہ شامل کرکے ہی کرتی ہیں لہذا منافع میں سود کا اختلاط ضرور ہی ہوگا جو شرعی نقطۂ نگاہ سے ایک تشویشناک صورت ہے، لیکن فقہاء کرام کی عبارتوں اور کتابوں میں چند ایسی مثالیں بھی ملتی ہیں جو اس کے جواز کی مشیر ہیں (تفصیل کے لئے دیکھئے: امداد الفتاوی ۳/۴۹۶)۔

۶۔ بانڈز (سندات حصص قرض) کی خرید وفروخت سودی کاروبار ہونے کی وجہ سے جائز نہیں ہے۔

---

[1] جامعہ علوم القرآن، جمبوسر، گجرات۔

۷۔ کمپنی کاروبار میں جتنے مسائل ہیں ان میں سب سے زیادہ پریشان کن امر کمپنی کا سودی کاروبار ہی ہے، اسی لئے بہت سے فقہائے کرام نے کمپنیوں کے حرام کاموں میں ملوث ہونے کی وجہ سے شیئرز کی خرید وفروخت کو ناجائز کہا ہے، اور دلیل یہ دی ہے کہ جب ہم شیئرز کی خرید وفروخت کریں گے تو اس کاروبار میں شریک ہو گئے اور اس کاروبار کا ایک شریک دوسرے شریک کا وکیل اور ایجنٹ ہے تو گویا کہ شیئر ہولڈران کو اس کام کے لئے ایجنٹ اور وکیل بنا رہا ہے کہ تم سودی قرضے کو اور سودی آمدنی کو بھی حاصل کرو۔ حضرت مفتی کفایت اللہ صاحب اس قسم کے سوال کے جواب میں عدم جواز ہی کو پسند فرماتے ہیں (کفایت المفتی ۸/ ۱۲۳، ۱۲۲)۔

۸۔ حضرت تھانویؒ اس کو شرکت سے تعبیر کرتے ہیں، چنانچہ فرماتے ہیں کہ حقیقت اس معاملہ کی شرکت ہے یعنی متعدد حصہ دار اپنا سرمایہ جمع کر کے تجارت کرتے ہیں اور اس سے جو نفع ہوتا ہے وہ باہم تقسیم کر لیتے ہیں، اور تحریر بالا میں جو عبارت ہے کہ یہ لوگ ایک لاکھ روپے کے ایک ہزار حصے فی صد سو روپے قائم کرتے ہیں اور حصص فروخت کرنا شروع کرتے ہیں تو اس کو اصطلاحاً فروخت کرنا کہا جاتا ہے ورنہ در حقیقت یہ شرکت ہے اور کارکنان کمپنی تمام کاروبار میں ان حصہ داروں کے وکیل ہیں، اور شرکت کے دو جز ہیں: ایک جز یہ کہ جو اعیان وسامان اس کارخانہ میں موجود ہوتے ہیں تو ہر شریک بواسطہ کارکنان کمپنی اس سامان کے مالک ہوتے جاتے ہیں، مثلاً اگر کسی نے سو روپے داخل کئے تو گویا وہ سامان موجودہ کا ہزارواں حصہ اس نے خرید لیا۔ اور دوسرا جز یہ کہ آگے جو کاروبار میں نفع ہوگا وہ حصہ رسد پر شریک کی ملک ہوگا، اور اگر اس حصہ کے داخل کرنے کے بعد کچھ سامان خریدا گیا تو اسی نسبت سے یہ حصہ دار مذکور اس کا بھی مالک ہوگا۔

۹۔ حضرت مولانا تقی عثمانی صاحب حضرت تھانویؒ اور حضرت مفتی محمد شفیع صاحبؒ کی طرف سے جواز کی دلیل پیش کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اگرچہ کمپنیوں میں سودی لین دین کی خرابی پائی جاتی ہے لیکن اس کے باوجود اگر کسی کمپنی کا بنیادی کاروبار مجموعی طور پر حلال ہے تو پھر دو شرطوں کے ساتھ اس کمپنی کے شیئرز لینے کی گنجائش ہے: اول شرط یہ ہے کہ سالانہ میٹنگ میں یہ آواز اٹھائی جائے کہ ہم سودی لین دین کو درست نہیں سمجھتے ہیں اس لئے اس کو بند کر دیا جائے، اور یہ نقار خانہ میں طوطی کی آواز چاہے مسترد کر دی جائے لیکن یہ آواز اٹھانا بقول حضرت تھانویؒ انسان کا اپنی ذمہ داری پوری کر دینا ہے۔

دوسری شرط یہ ہے کہ منافع کی تقسیم کے وقت نفع کا جتنا حصہ سودی ڈپازٹ سے حاصل ہوا ہو اس کو صدقہ کر دے، مذکورہ شرطوں پر عمل کر لینے کی شکل میں اس کے خرید وفروخت کی گنجائش ہے۔

۱۰، ۱۱۔ حضرت مولانا ظفر احمد تھانویؒ اس مسئلہ کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ مسلمانوں کو اپنا حصہ صدقہ کرنے کا حکم ورع اور تقوی پر محمول ہے، اور اگر وجوب پر محمول کریں تو یہ اس وقت جبکہ صرف شراب اور خنزیر کی بیع کی ہو اور اس کے علاوہ کی نہ ہو، اور سودی کاروبار کی شکل میں صاحبین کے نزدیک جو بیع کو فاسد قرار دیا گیا ہے تو وہ ہمارے دعوی کے خلاف نہیں ہے کیونکہ وکیل بالبیع بذات خود عاقد کے مانند ہے اور ذمی کے حق میں بیع کا فساد مسلمان کے حق میں نفع کی حرمت کو مستلزم نہیں ہے، کیونکہ ملکیت کا تبادلہ فساد کے خبث کو دور کر دیتا ہے، پس ایسی صورت میں مال مستفاد میں حرمت نہیں ہوگی جبکہ کمپنی قائم کرنے والے کافر ہوں، البتہ کفار کی کمپنیوں میں شرکت مکروہ ہے جیسا کہ علامہ سرخسی کے قول سے معلوم ہوتا ہے:

یکرہ للمسلم أن یدفع إلی النصرانی مالا مضاربة وھو جائز فی القضاء (مبسوط ۲۲،۱۲۵)۔

اور مبسوط ہی میں یہ بھی ہے کہ امام صاحب فرماتے ہیں کہ صفقہ کا ولی تو وکیل ہے اور شراب اس کے حق میں مال متقوم ہے تو وہ اپنے لئے خرید سکتا ہے لہذا دوسرے کے لئے بھی خرید سکتا ہے، اور وجہ یہ ہے کہ اس جگہ اسلام کے سبب سے شراب کا عقد کرنا منع ہے نہ کہ ملکیت کے سبب سے (دیکھئے: مبسوط ۱۲/ ۲۱۶ بحوالہ امداد الفتاوی ۳/ ۴۹۷)۔

۱۲۔ حصص کی تجارت:

مال کی تعریف میں فقہاء کرام نے چند شرطیں لگائی ہیں۔ ابن عابدین لکھتے ہیں:

المراد بالمال ما یمیل إلیه الطبع ویمکن ادخارہ لوقت الحاجة والمالیة تثبت بتمول الناس کافة أو بعضھم والتقوم یثبت به وبإباحة الانتفاع به شرعاً۔

فقہائے احناف نے اگرچہ بیع میں مبیع کے عین ہونے کی شرط لگائی ہے لیکن ان لوگوں نے حق مرور کی بیع کو جائز قرار دیا ہے، اور جواز کی علت یہ بیان کی ہے کہ یہ ایک ایسا حق ہے جو عین سے متعلق ہے لہذا جواز بیع میں اس کو عین کا حکم حاصل ہوگا (دیکھئے: فتح القدیر ۵/ ۲۵۶)۔

اعیان سے تعلق رکھنے والے حقوق کا احناف کے یہاں وہی حکم ہے جو خود اعیان کا ہے، اور بعض اشیاء کو اموال میں داخل کرنے میں عرف کو بڑا دخل ہے جیسا کہ ابن عابدین نے فرمایا ہے کہ مالیت لوگوں کے مال بنا لینے سے ثابت ہو جاتی ہے، یہ جملہ فرما کر بہت سی چیزوں کو کچھ شرائط کے ساتھ مال کی تعریف میں داخل کر دیا ہے، اور عرف کی وجہ سے فقہائے کرام نے بہت سے حقوق کی بیع جائز قرار دی ہے، لہذا جو چیز عرف میں مال متقوم سمجھی جاتی ہے اور لوگ اس کے ساتھ مال جیسا معاملہ کرتے ہوں تو اس کی بیع جائز ہوگی بشرطیکہ وہ فی الحال ثابت ہو اور صاحب حق کیلئے اصالۃً ثابت ہو، دفع ضرر کے لئے نہ ہو، وہ حق ایسا ہو جو ایک شخص سے دوسرے شخص کی طرف منتقل ہو سکے، تحدید کرنے سے اسی حق کی تحدید بھی ہو جاتی ہو، غرر یا جہالت کو مستلزم نہ ہو، تاجروں کے عرف میں یعنی دین کے سلسلہ میں اس حق کو اموال واعیان کی حیثیت حاصل ہو۔

مذکورہ شرائط کی روشنی میں جب ہم شیئرز کے معاملہ کا جائزہ لیتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ تجار کے عرف میں اس کو مال متقوم مانا جاتا ہے، بلکہ وہ اقتصادیات کی دنیا میں اتنا عام ہے اور اس کا شیوع اس قدر ہو چکا ہے کہ لوگوں کے اذہان میں اس کی مالیت کے انکار کا تصور بھی نہیں کر سکتے ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ کمپنی کی طرف سے اس پر زبردست اعتماد کیا جاتا ہے لہذا اس کی خرید و فروخت اور رہن جائز ہوگا، جیسے کہ ثمن اصطلاحی کی پشت پر حکومت اور عوام کا اعتماد ہی کام کر رہا ہے بلکہ لوگوں نے اس کو ہی ثمن اصلی شمار کر لیا ہے۔

حقیقت میں تو اثاثہ تجارت کے جزء شائع کا ہی بدل ہے لیکن عرف میں اس کا اعتبار کر کے کمپنی کسی کو جزء شائع سے کچھ واپس نہیں کرتی ہے بلکہ شرکت بھی خود درنہیں کرتی، بلکہ دلال کے ذریعہ ہی کاغذات کی منتقلی ہوتی ہے اور اس کو حصص کی بیع سے تعبیر کیا جاتا ہے، جیسے کہ ثمن اصطلاحی کی پشت پر حکومت کے خزانہ کا سونا ذمہ دار اور مدار ہوتا ہے لیکن کوئی بھی بینک اب سونا واپس نہیں کرتا ہے اگر چہ کاغذی نوٹوں پر وثیقہ لکھا ہوا ہوتا ہے، اسی طرح شیئرز میں حصہ دار کو کاغذات سے ہی واسطہ ہوتا ہے۔

۱۳۔ فیوچر سیل کا مقصد جب خریدنا ہے ہی نہیں بلکہ صرف نفع نقصان برابر کر لینا مقصود ہے لہذا یہ جائز نہیں ہوگا، اور جب اس میں بیع وشراء کا تحقق ہی نہیں ہوتا تو پھر اس کو بیع کہنا بھی صحیح نہیں ہے، یہ حرام ہے۔

۱۴۔ غائب سودا کی وضاحت نہیں معلوم ہو سکی لہذا اس کا حکم بھی متعین نہیں ہو سکتا۔ اگر سوال نمبر ۱۳ کی ہی طرح ہوتا ہے کہ صرف آپس کا فرق (ڈیفرنس) برابر کر لیا جاتا ہے، اور سٹہ بازاری کی شکل ہوتی ہے تو یہ صورت بھی ماقبل کی فیوچر سیل والی شکل کی طرح حرام ہے۔

۱۵۔ اگر اس کے ضمان میں حقوق وذمہ داری منتقل ہو جاتی ہیں تو وہ اس کا مالک ہو جائے گا، چاہے شیئر سرٹیفکیٹ بعد میں ملے۔ اصل رسید ملنے کو ہی عرف میں شیئر خریدنا کہتے ہیں، بعد میں دو یا تین مہینے بعد ہی سرٹیفکیٹ ملتا ہے، اس سے پہلے رسید کا ہی اعتبار کیا جاتا ہے۔

۱۶۔ جب یہ مال متقوم کے درجہ میں ہے تو اعیان کی طرح اس کی خرید وفروخت اور دوسرے کے ہاتھ فروخت کرنا بھی جائز ہے بالخصوص جبکہ شیئر کا ضمان خریدنے کا معاملہ کرنے کے ساتھ ہی خریدار کی طرف منتقل ہو جاتا ہو۔

۱۷۔ دلال کے ذریعہ شیئرز کی خرید وفروخت:

آج کل کے کاروباری دنیا میں دلال کے بغیر کوئی بھی کام نہیں ہوتا ہے، اکثر تجارت وکاروبار دلال کے ذریعہ ہی مکمل ہوتے ہیں، لہذا فقہائے کرام نے دلال کے ذریعہ کاروبار کو جائز قرار دیا ہے اور دلال کے لئے اجرت بھی جائز قرار دیا ہے۔

علامہ شامی فرماتے ہیں: قال فی التاتارخانیة و فی الدلال والسمسار یجب أجر المثل وما تواضعوا علیه۔ إن فی کل عشرة دنانیر کذا فذاك حرام علیهم۔ وفی الحاوی سئل محمد بن سلمة عن أجرة السمسار فقال أرجو أنه لابأس به وإن کان فی الأصل فاسد لکثرة التعامل وکثیر من هذا غیر جائز فجوزه لحاجة الناس إلیه کدخول الحمام (شامی ۵؍۴۲)۔

اور اسی تعامل اور حاجت کی وجہ سے فقہائے کرام نے فرمایا ہے کہ دلال کی اجرت کام اور محنت کے موافق لینا اور دینا جائز ہے بشرطیکہ ظاہر کر کے رضامندی سے لیا جاوے، اور جو خفیہ طریقہ سے لیتے ہیں وہ حرام ہے (امداد المفتین ۲؍۷۱۰، فتاوی محمودیہ ۴؍۱۷۵)۔

☆☆☆

شیئرز سے متعلق مسائل

مفتی عبدالرحمن پالنپوری

۱۔ کمپنی کا خرید کردہ شیئر کمپنی میں شیئر ہولڈر کی شرکت وملکیت کی نمائندگی کرتا ہے، اور یہی نقطہ نظر صحیح ہے۔

۲۔ کمپنی قائم کرتے وقت جب تک کمپنی کے پاس کچھ بھی املاک اور اثاثے نہ ہوں اس وقت تک کمپنی کا خرید کردہ شیئر خرید قیمت سے کم یا زیادہ پر فروخت کرنا جائز نہیں ہے کیونکہ شرعاً یہ سود ہے۔ شیئر کو خرید قیمت کے برابر قیمت پر بیچنا شرعاً جائز ہے۔

۳۔ کمپنی نقد اور املاک (مال ربوی وغیر ربوی) دونوں پر مشتمل ہو تو شیئر کے حصہ میں جتنا نقد مال ربوی آتا ہے اس سے زیادہ پر شیئر کو فروخت کرنا امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک جائز ہے، اس کے برابر یا کم قیمت پر بیع کرنا جائز نہیں ہے۔ مثلاً دس روپے کے شیئر کے حصہ میں اگر آٹھ روپیہ نقد، مال ربوی کے مقابل ہیں اور دو روپے اثاثوں، املاک کے مقابل ہیں تو شیئر کی بیع آٹھ روپے یا اس سے کم میں جائز نہ ہوگی۔ البتہ نو روپے یا اس سے زائد میں جائز ہوگی (اسلام اور جدید معیشت وتجارت رص ۸۷)۔

۴۔ ایسی کمپنیاں جن کا بنیادی کاروبار حرام ہے۔ جیسے شراب اور خنزیر کے گوشت کی تجارت یا سودی اسکیموں میں روپیہ لگانا۔ ایسی کمپنیوں کے شیئرز کی خرید وفروخت ناجائز اور حرام ہے۔

۵۔ ایسی کمپنیاں جن کا بنیادی کاروبار حلال ہونے کے باوجود انہیں بعض اوقات انکم ٹیکس وغیرہ کی زد سے بچنے کے لئے بینک سے سودی قرض لینا پڑتا ہے ایسی کمپنیوں میں شیئرز خریدنے کی اجازت ہوگی بشرطیکہ سالانہ میٹنگ میں سودی لین دین کے خلاف آواز اٹھائی ہو۔

۶۔ بنیادی حلال کاروبار کرنے والی جن کمپنیوں کو بھی قانونی تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے اپنے سرمایہ کا کچھ حصہ ریزرو بینک میں جمع کرنا پڑتا ہے یا سکیورٹی بانڈس خریدنے پڑتے ہیں ایسی کمپنیوں کے شیئرز خریدنے کی گنجائش ہوگی، بشرطیکہ نفع میں سے سود کی مقدار بلا نیت ثواب صدقہ کر دے۔

۷۔ سودی قرض لینے کی صورت میں اس قرض سے حاصل ہونے والی آمدنی ومنافع حلال شمار ہونگے اور یہ قرض مفید ملک ہوگا لیکن سودی قرض کا معاملہ کرنا سخت گناہ کا کام ہوگا، اور قرض کی واپسی کے وقت قرض سے زائد رقم دینا سود ہے جو گناہ کبیرہ اور حرام ہے (امداد الفتاوی ۳ / ۱۷۰)۔

۸۔ کمپنی کا بورڈ آف ڈائرکٹرس شیئرز ہولڈرس کا وکیل ہے اور اس کا عمل شیئر ہولڈرس کا عمل شمار ہوگا۔

۹۔ کمپنی میں شیئر ہولڈر کا سودی لین دین کے خلاف آواز اٹھانے اور ناجائز امور سے منع کرنے کے بعد شیئر ہولڈر وکیل کے عمل کی ذمہ داری سے بری الذمہ شمار ہوگا۔

۱۰۔ کمپنی کے منافع میں اگر سود شامل ہو اور اس کی مقدار معلوم ہو تو شیئر ہولڈر کے لئے منافع سے سود کی مقدار کا صدقہ کرنا ضروری ہے، اور اگر سود کی مقدار معلوم نہ ہو تو تخمینہ سے سودی مقدار کا صدقہ کرنا کافی ہوگا۔

۱۱۔ اگر سودی آمدنی کو کاروبار میں لگا کر نفع کمایا گیا ہو تو سودی آمدنی ونفع دونوں کا صدقہ کرنا ضروری ہے (ہدایہ ۳ / ۴۵۶)۔

۱۲۔ شیئرز کی خرید وفروخت کے جواز کے شرائط کے ساتھ شیئرز کی تجارت کرنے کی اجازت ہے۔ شیئرز کو اس نیت سے خریدنا کہ قیمت بڑھنے کی صورت میں نفع کے ساتھ فروخت کردوں گا اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ ہر تخمین اور قیاس آرائی ممنوع نہیں ہے، بلکہ وہ تخمین اور قیاس آرائی

ممنوع ہے جس میں شرعی شرائط کی رعایت نہ کی گئی ہو (اسلام اور جدید معیشت وتجارت رص ۹۰)۔

۱۳۔ فیوچر سیل (بیاعات مستقبلیات) یعنی شیئرز کی ایسی بیع وشراء کہ شیئر لینا دینا مقصود نہ ہو، محض نفع نقصان برابر کر کے نفع کمانا مقصود ہو، یہ بھی شرعاً جائز نہیں ہے (اسلام اور جدید معیشت وتجارت رص ۹۱)۔

۱۴۔ غائب سودے جن میں بیع کی نسبت مستقبل کی طرف کی جاتی ہے وہ بھی شرعاً جائز نہیں ہے۔ اس لئے کہ بیع کی وقت مستقبل کی طرف اضافت یا تعلیق باتفاق فقہاء ناجائز ہے، البتہ مستقبل میں بیع کا وعدہ کیا جا سکتا ہے، لیکن وقت آنے پر بیع باقاعدہ کرنی ہوگی (جدید معیشت و تجارت رص ۹۱)۔

۱۵۔ شیئرز کے نقد سودے ہو جانے کے بعد شیئرز کے تمام حقوق اور ذمہ داریاں خریدار کی طرف منتقل ہو جاتی ہیں، وہ خریدار کے ضمان میں داخل ہو جاتے ہیں تو ان کی بیع سرٹیفکیٹ پر قبضہ سے پہلے جائز ہونی چاہئے، لیکن عرف میں شیئر کا قبضہ اسی وقت سمجھا جاتا ہے جب سرٹیفکیٹ ہاتھ میں آجائے، لہذا احتیاط یہی ہے کہ سرٹیفکیٹ پر قبضہ کئے بغیر آگے بیع کی اجازت نہیں ہے (حوالہ بالا رص ۹۱-۹۲)۔

۱۶۔ خرید کردہ شیئر کو اگر خریدار سرٹیفکیٹ حاصل کرنے سے پہلے کسی دوسرے کے ہاتھ فروخت کر دیتا ہے تو یہ جائز نہیں ہے تا کہ سٹے بازی کا سد باب بھی ہو۔

۱۷۔ جن شیئرز کی خرید وفروخت شرعی شرائط کے ساتھ ہوتی ہو ان شیئرز کی خرید وفروخت میں بروکر وایجنٹ کی حیثیت سے کام کرنا جائز ہے۔ اور جن شیئرز کی خرید وفروخت میں شرعی شرائط کی رعایت نہ ہوتی ہو ان شیئرز کی خرید وفروخت میں بروکر اور ایجنٹ کی حیثیت سے کام کرنا جائز نہیں ہے۔

☆☆☆

شیئرز ۔ شریعت کی نظر میں

مولانا ابوالحسن علی[1]

۱۔ شیئرز کی حقیقت: ...... اردو میں اس کو حصص اور عربی میں سہوم سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یہ شیئرز کسی کمپنی کے اثاثوں میں شیئر ہولڈرس کی ملکیت کے ایک مناسب حصے کی نمائندگی کرتے ہیں اور شیئر خریدار کو ملنے والے کاغذ یعنی سرٹیفیکٹ خریدار کی کمپنی میں ملکیت کی نمائندگی کرتا ہے شیئر خریدنے کی وجہ سے خریدار کمپنی کے اثاثوں اور املاک میں اپنے حصے کے تناسب سے مالک بن جاتا ہے۔ جب کمپنی ابتداءً وجود میں آتی ہے تو اس وقت جو شخص بھی شیئر خریدتا ہے وہ درحقیقت کمپنی کے کاروبار میں حصہ دار بن جاتا ہے اور کمپنی کے ساتھ شرکت کا معاملہ کرتا ہے اگرچہ عرف میں اس کو شیئر خریدنا کہا جاتا ہے لیکن شرعاً وہ خرید و فروخت نہیں ہے بلکہ عقد شرکت کی صورت ہوتی ہے۔

۲۔ نئی کمپنی کے شیئرز ۔ نقد کا نقد سے مقابلہ:

جب کسی کمپنی کے شیئرز ابتداء میں جاری (Issue) ہوتے ہیں اور اس کے پاس املاک منجمد شکل میں نہ ہو بلکہ نقد اور سیال (Liquid۔ Assets) کی شکل میں ہو تو اس وقت ہمارے شیئرز اتنے ہی روپیہ کی نمائندگی کرتے ہیں جتنے روپئے ہم نے کمپنی میں دیئے ہیں، جیسے دس روپئے کا نوٹ دس روپئے کی ہی وکالت کرتا ہے، اس شکل میں اس کو کمی زیادتی سے بیچنا جائز نہ ہوگا بلکہ سود ہونے کی وجہ سے حرام ہوگا، کیونکہ یہ بیع صرف کی شکل ہوگی جس میں کمی زیادتی جائز نہیں ہے۔

۳۔ اثاثے کا مخلوط ہونا:

جب کمپنی کے کچھ اثاثے منجمد (Assets۔Fixed) کی شکل میں ہیں مثلاً اس نے کوئی بلڈنگ بنائی یا مشینری خریدی یا کچا مال خرید لیا تو اب اس کے شیئر کو کمی یا زیادتی سے بیچنا جائز ہوگا۔

بہت سے مسائل فقہاء کرام نے انفرادی اور علی سبیل البدلیت ناجائز قرار دیا ہے کیونکہ اس میں تفاضل کی شکل ہو کر سود ہو جاتا ہے، اور جب مجموع کا مجموعہ سے تقابل کیا جاتا ہے تو جواز کی گنجائش نکل آتی ہے کیونکہ مختلف جنسوں کا باہم تقابل ہوتا ہے۔

۴۔ جن کمپنیوں کا کاروبار حرام ہے ان کے شیئرز کی خرید و فروخت ناجائز ہے، نہ تو ابتداء میں Float (جاری) ہوتے وقت جائز ہے، اور نہیں بعد میں اسٹاک مارکیٹ سے لینا جائز ہے۔

۶،۵۔ کمپنی کا سودی کاروبار:

اکثر کمپنیاں انکم ٹیکس سے بچنے کے لئے یا دوسرے قانونی تقاضوں کی وجہ سے بینک سے سودی قرض لیتی ہیں یا ریزرو بینک میں جمع کرتی ہیں، لہذا منافع میں سود کا اختلاط ہو جاتا ہے جو شرعی نقطہ نظر سے ایک تشویشناک صورت ہے، اس مسئلہ میں فقہاء کرام کی دو جماعتیں ہوگئی ہیں، ایک جماعت سودی کاروبار ہونے کی وجہ سے اس کو ناجائز قرار دیتی ہے کیونکہ کاروبار میں ایک شریک دوسرے شریک کا وکیل ہوتا ہے تو گویا کہ شیئر ہولڈران کو اس کام کا ایجنٹ بنا دیتا ہے کہ تم سودی قرض لو اور سودی آمدنی حاصل کرو۔

دوسری جماعت یہ کہتی ہے کہ اگرچہ ان کمپنیوں میں یہ خرابی پائی جاتی ہے لیکن اس کے باوجود اگر کسی کمپنی کا بنیادی کاروبار مجموعی طور پر حلال ہے تو پھر کچھ

---

[1] شیخ الحدیث، دار العلوم ماٹلی والا، بھروچ گجرات۔

شرائط کے ساتھ اس کمپنی کے شیئرز لینے کی گنجائش ہے۔

حضرت تھانویؒ نے ''رسالہ القصص السنی فی حکم حصص کمپنی'' میں جو بعد کی تحریر معلوم ہوتی ہے اس میں شیئرز کے جواز کا حکم بیان فرمایا ہے اور بہت تفصیلی گفتگو فرمائی ہے جس میں حضرت مفتی کفایت اللہ صاحبؒ کے جواب میں ذکر کردہ بہت سے اشکالات کے جوابات بھی آگئے ہیں۔ مولانا مفتی تقی صاحب ،حضرت تھانویؒ، اور حضرت مفتی شفیع صاحبؒ کی جانب سے جواز کی دلیل پیش کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اگرچہ کمپنیوں میں سودی لین دین کی خرابی پائی جاتی ہے لیکن اس کے باوجود اگر کسی کمپنی کا بنیادی کاروبار مجموعی طور پر حلال ہے تو پھر دو شرطوں کے ساتھ اس کمپنی کے شیئرز لینے کی گنجائش ہے۔

۱۔ پہلی شرط یہ ہے کہ سالانہ میٹنگ میں یہ آواز اٹھائی جائے کہ ہم سودی لین دین کو درست نہیں سمجھتے ہیں اس لئے اس کو بند کردیا جائے، یہ نقار خانہ میں طوطی کی آواز چاہے مسترد کردی جائے لیکن یہ آواز اٹھانا بقول حضرت تھانویؒ انسان کا اپنی ذمہ داری پوری کردینا ہے۔

۲۔ دوسری شرط یہ کہ منافع کی تقسیم کے وقت نفع کا جتنا حصہ سودی ڈپازٹ سے حاصل ہوا ہو اس کو صدقہ کردے، مذکورہ شرطوں پر عمل کرلینے کی شکل میں اس کی خرید فروخت کی گنجائش ہے اور یہ جواز کا موقف معتدل اور اسلامی اصولوں کے مطابق ہے اور لوگوں کے لئے سہولت کا راستہ فراہم کرتا ہے (شیئرز کی خرید فروخت ص ۱۰، ۱۱)۔

فقہاء کرام کی عبارات میں توسع اور دار الحرب میں سودی کاروبار میں تخفیف وغیرہ ابحاث سے مسئلہ میں گنجائش کا پہلو ضرور موجود ہے لیکن سچی بات یہ ہے کہ سود کی آمیزش قباحت سے خالی نہیں ہے۔ حضرات فقہاء کرام کی جانب سے گنجائش مبتلی بہ کے لئے ہے جو حرام سے بچ نکلنے کا راستہ فراہم کرتی ہے لیکن زیادتی مال کے لئے بالارادہ اس قسم کے کاروبار میں مشغولیت اللہ تعالیٰ کی حرام کردہ چیز کی آمیزش کے قطعی علم کے ساتھ ایک مومن کے لئے مناسب نہیں ہے، اس لئے جہاں تک ممکن ہو اس سے اجتناب ہی صحیح راستہ ہے۔

۷۔ سودی قرض کے ذریعہ حاصل شدہ آمدنی:

فتاویٰ عالمگیری میں ہے: وإن أربى فاشترى درهمين بدرهم كان البيع فاسدا ولكن لا يصير ضامنا لمال المضاربة والربح بينهما على الشرط۔

مولانا ظفر احمد تھانویؒ اس مسئلہ کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ سودی کاروبار کی شکل میں صاحبینؒ کے نزدیک جو بیع کو فاسد قرار دیا ہے تو وہ ہمارے دعوی کے خلاف نہیں ہے کیونکہ وکیل بالبیع بذات خود عاقد کے مانند ہے اور ذمی کے حق میں بیع کا فساد مسلمان کے حق میں نفع کی حرمت کو مستلزم نہیں ہے، کیونکہ ملکیت کا تبادلہ فساد کے خبث کو دور کردیتا ہے، پس ایسی صورت میں مال مستفاد میں حرمت نہ ہوگی جبکہ کمپنی کے قائم کرنے والے کافر ہوں، البتہ کفار کی کمپنیوں میں شرکت مکروہ ہے جیسا کہ علامہ سرخسیؒ کے قول سے معلوم ہوتا ہے۔

ويكره للمسلم أن يدفع إلى النصراني مالا مضاربة وهو جائز في القضاء (مبسوط ۲۲،۱۲۵)۔

مفتی نظام الدین صاحب اسی طرح کے جواب میں فرماتے ہیں: الجواب۔ اس فیکٹری کے نفع کے جواز میں تو کوئی شبہ نہیں اس کا نفع لینا تو جائز رہے گا۔ پھر آگے فرماتے ہیں کہ اگر شیئر ہولڈر خود بینک سے لون نہیں لیتا ہے بلکہ فیکٹری کا عملہ یہ سب کام خود انجام دیتا ہے اور وہ اکثر غیر مسلم ہے یا کل غیر مسلم ہے تو ایسی صورت میں یہ شیئرز خریدنا جائز رہے گا، منع نہ ہوگا (نظام الفتاوی ۱/ ۲۰۰)۔

۸۔ کمپنی کے بورڈ آف ڈائرکٹرس کی حیثیت:

ظاہر میں شیئر کی خرید فروخت کو بیع وشراء سے تعبیر کیا جاتا ہے لیکن حقیقت میں یہ شرکت ہے اور کمپنی کے کارکنان تمام کاروبار میں حصہ دار کے وکیل ہیں۔

۹۔ کمپنی میں شیئر ہولڈر کا سودی قرض لینے سے اختلاف کرنا اور اس کا اعلان کرنا وکیل کے عمل کی ذمہ داری سے اسے بری الذمہ تو نہیں کرے گا لیکن بظاہر اس کا اور کوئی حل نہیں ہے، یا تو آدمی شیئرز کی خرید وفروخت ہی نہ کرے یا اپنی مقدور بھر آواز اٹھائے جو حقیقت میں نقار خانہ میں طوطی کی آواز ہے لیکن بقول حضرت حکیم الامت وکیل اپنی ذمہ داری پوری کردیتا ہے۔

۱۰، ۱۱۔ سود کی مقدار کو صدقہ کرنا:

فتاوی عالمگیری میں ہے: إذا دفع المسلم إلى النصراني مالا مضاربة بالنصف فهو جائز إلى أنه مكروه فإن اتجر في الخمر والخنزير فربح جاز على المضاربة في قول أبي حنيفة وينبغي للمسلم أن يتصدق بحصته من الربح۔

مولانا ظفر احمد تھانوی اس عبارت کو نقل کر کے فرماتے ہیں کہ تصدق کا حکم ورع اور تقوی پر محمول ہے جیسا کہ عبارت سے ظاہر ہے، اور اگر وجوب پر محمول کیا جاوے تو یہ اس وقت ہے جبکہ صرف شراب اور خنزیر کی بیع ہو اور اس کے علاوہ کی نہ ہو (امداد الفتاوی ۳/ ۴۹۷)۔

مولانا تقی صاحب فرماتے ہیں کہ جب منافع (Dividend) تقسیم ہو تو وہ شخص انکم اسٹیٹ منٹ (Income Statement) کے ذریعہ یہ معلوم کرے کہ آمدنی کا کتنا حصہ سودی ڈپازٹ سے حاصل ہوا ہے، مثلاً فرض کیجئے کہ اس کمپنی کو کسی آمدنی کا پانچ فیصد حصہ سودی ڈپازٹ میں رقم رکھوانے سے حاصل ہوا ہے تو اب وہ شخص اپنے نفع کا پانچ فیصد حصہ صدقہ کردے۔

۱۲۔ شیئرز کی تجارت:

مال کی تعریف میں فقہاء کرام نے چند شرطیں لگائی ہیں، ابن عابدین لکھتے ہیں:

یعنی مال سے مراد وہ چیز ہے جس کی طرف طبیعت مائل ہو اور وقت ضرورت کے لئے اس کو ذخیرہ کرنا ممکن ہو، اور مالیت تمام لوگوں یا بعض لوگوں کے مال بنانے سے ثابت ہوتی ہے اور تقوم مالیت بنانے کے ذریعہ بھی ثابت ہوتا ہے اور شرعاً اس سے انتفاع جائز ہونے سے بھی حاصل ہوتا ہے (شامی ۴/۳)۔

اس سے معلوم ہوا کہ اعیان سے تعلق رکھنے والے حقوق کا احناف کے یہاں وہی حکم ہے جو خود اعیان کا ہے، اور بعض اشیاء کو اموال میں داخل کرنے میں عرف کو بڑا دخل ہے جیسے کہ علامہ شامیؒ نے مال کی تعریف میں بتمول الناس کے لفظ سے فرمایا، عرف کی وجہ سے فقہاء کرام نے بہت سے حقوق کی بیع جائز قرار دی ہے، لہذا جو چیز عرف میں مال متقوم سمجھی جاتی ہو اور لوگ اس کے ساتھ مال جیسا معاملہ کرتے ہوں تو اس کی بیع جائز ہوگی، بشرطیکہ وہ فی الحال ثابت ہو، صاحب حق کے لئے اصالۃً ثابت ہو، دفع ضرر کے لئے نہ ہو، وہ حق ایک آدمی سے دوسرے کی طرف منتقل ہوسکے، اس کی تحلیل ہوسکتی ہو، غرر و جہالت کو مستلزم نہ ہو، تاجروں کے عرف میں لین دین کے سلسلہ میں اس حق کو اموال و اعیان کی حیثیت حاصل ہو۔

مذکورہ شرائط کی روشنی میں جب ہم شیئر کے معاملہ کا جائزہ لیتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ تجار کے عرف میں اس کو مال متقوم سمجھا جاتا ہے بلکہ یہ اقتصادیات کی دنیا میں اتنا عام اور شائع ہے کہ لوگوں کے اذہان میں اس کی مالیت کا تصور بھی نہیں ہوسکتا، لہذا اس کی خرید و فروخت جائز ہوگی اور تجارت کے طور پر بیع و شراء کرنا بھی جائز ہوگا بشرطیکہ اصل کاروبار حلال ہو، کمپنی کے کچھ اثاثے منجمد شکل میں ہوں صرف نقد کی صورت نہ ہوں، سودی ڈپازٹ سے حاصل شدہ نفع میں سے اتنا حصہ صدقہ کردے۔

بازار کی صورت حال مختلف احوال و واقعات کی وجہ سے بدلتی رہتی ہے، لہذا اس میں تخمین و اندازہ سے ہی شیئرز کی قیمت میں کمی زیادتی سمجھی جاتی ہے، اس کی قطعی تعیین خود بروکر اور دلال وغیرہ کو بھی کم ہی معلوم ہوتی ہے۔ البتہ جہاں سٹہ بازاری کا معاملہ چل رہا ہو اور آدمی کو معلوم ہو کہ یہ کمپنی کے منافع کی تقسیم اعتماد و کریڈٹ پر نہیں ہو رہی ہے تو بہتر یہ ہے کہ اس وقت سٹہ بازاروں کو تعاون دینے والے کی حیثیت بھی اختیار نہ کرے اور "ولا تعاونوا على الإثم والعدوان" پر عمل پیرا ہو۔

۱۳۔ فیوچر سیل:

سوال میں مذکور تفصیل کے مطابق جب اصل سودا محض کاغذی کارروائی ہے، نہ مشتری ثمن دیتا ہے نہ بائع مال دیتا ہے تو یہ بیع ہی نہیں ہوئی، اور نہ مقصود شیئرز کا لین دین ہے بلکہ آخر میں جاکر آپس کا فرق (Difference) برابر کرلیا جاتا ہے، شیئرز کی (Delivery) مقصود نہیں ہوتی ہے بلکہ اصل مقصود یہ ہو کہ اس طرح سٹہ بازاری کر کے آپس کے ڈیفرنس کو برابر کرلیا جائے، تو یہ صورت حرام ہے۔

۱۴۔ غائب سودا جن میں بیع کی نسبت مستقبل کی طرف کی جاتی ہے، جائز ہوگی یا نہیں؟

یہ سوال تشریح طلب ہے، بغیر تشریح و تفصیل کے اس کا صحیح جواب مشکل ہے۔ لیکن یہ کہا جاسکتا ہے کہ بظاہر شرائط صحت موجود نہ ہونے کی وجہ سے یہ بیع

ناجائز ہے۔

۱۵۔ سوالنامہ کی تفصیل کے مطابق جب کمپنی کے اثاثوں اور املاک میں شیئر ہولڈر کی ملکیت آجاتی ہے اور اس کی ضمان میں آکر حقوق وذمہ داری خریدار کی طرف منتقل ہوجاتی ہے تو چاہے شیئر سرٹیفکیٹ نہ ملا ہو معنوی طور پر شیئر پر اس کا قبضہ سمجھا جاوے گا، کیونکہ شریعت میں ہر شئی پر اس کی خاص نوعیت کے اعتبار سے قبضہ کی نوعیت مختلف ہوتی ہے۔

لہذا صورت مذکورہ میں شیئر سرٹیفکیٹ حقیقت میں شیئر نہیں ہے بلکہ شیئر تو اس ملکیت کا نام ہے جو اس کمپنی کے اندر ہے، سرٹیفکیٹ تو اس ملکیت کی علامت اور ثبوت وشہادت ہے۔

لہذا اب تنقیح طلب امر یہی ہے کہ کمپنی کا اصل حصہ جس کی یہ شیئر نمائندگی کررہا ہے وہ اس شخص کی ملکیت میں آگیا یا نہیں؟ اور یہ بات ظاہر ہے کہ وہ حصہ ایسا نہیں ہے کہ وہ شخص کمپنی میں جاکر اپنا حصہ وصول کرے اور اس پر قبضہ کرلے، ایسا کرنا ممکن نہیں ہے، لہذا اصل حصہ کی ملکیت کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ شخص اس حصہ کے فوائد ونقصانات اور اس حصہ کی ذمہ داریوں اور منافع کا حقدار بن جائے۔

سوال نامہ کے مطابق جب حقوق وذمہ داریاں خریدار کی طرف منتقل ہوتی ہیں اور سرٹیفکیٹ نہ ملنے کے باوجود شیئرز پر معنوی قبضہ حاصل ہوگیا ہے، پھر بھی احتیاطی پہلو یہی ہے کہ جب تک ڈلیوری نہ مل جائے اس وقت تک آگے فروخت نہ کیا جاوے۔

۱۶۔ ماقبل کے جواب سے اس مسئلہ کو بھی حل کرلیا گیا کہ جب شیئر کا ضمان ومنافع خریدنے کا معاملہ کرنے کے ساتھ ہی خریدار کی طرف منتقل ہوجاتا ہے تو اس کا معنوی قبضہ ہوگیا، اور جب اس کا مالک بننا صحیح ہوگیا تو اسکے لئے دوسرے کو فروخت کرنا بھی صحیح ہوگیا، اور پھر ہر ایک کے معنوی قبضہ کی صورت میں دوسرے کو منتقل کرنا فی نفسہ جائز ہوگا لیکن پھر بھی احتیاطی پہلو ڈلیوری تک انتظار کرنے میں ہی ہے تاکہ حسی قبضہ بھی مکمل ہوجائے۔

۱۷۔ بروکر اور دلال:

آج کل کی کاروباری دنیا میں دلال کے بغیر کوئی بھی کام نہیں ہوتا ہے، اکثر تجارت وکاروبار دلال ہی کے ذریعہ مکمل ہوتے ہیں، لہذا فقہاء کرام نے دلال کے ذریعہ کاروبار کو جائز قرار دیا ہے اور دلال کے لئے اجرت بھی جائز قرار دی ہے۔

اور اسی تعامل اور حاجت الناس کی وجہ سے فقہاء کرام نے فرمایا ہے کہ دلال کی اجرت کام اور محنت کے موافق لینا اور دینا جائز ہے بشرطیکہ ظاہر کرکے رضا مندی سے لیا جاوے اور جو خفیہ طریقہ سے لیتے ہیں وہ حرام ہے (فتاوی محمودیہ ۱۴/ ۱۷۰، امداد المفتین ۲/ ۱۷۱)۔

حاصل یہ کہ دلال اجرت سے کام کرتا ہے، اب اگر وہ بائع کا کام کرتا ہے تو بائع کا اجیر ہے اور اس سے اجرت کا مستحق ہوگا اور اگر مشتری کا کام کرتا ہے تو مشتری سے اجرت پائے گا، یہ نہیں ہوسکتا کہ عمل تو کسی ایک کا کرے اور اجرت دونوں سے وصول کرے، یہ ناجائز ہے۔

البتہ اگر وہ دونوں کا کام الگ الگ کرے تو الگ الگ کام ہونے کی وجہ سے دونوں سے عمل کے علیحدہ ہونے کی وجہ سے اجرت متعارفہ لے سکتا ہے۔

☆☆☆

مسائل حصص پر ایک نظر

مولانا خلیل احمد قاسمی، راجستھان

۱۔ خرید کردہ شیئر کمپنی میں شیئر ہولڈر کی ملکیت کی نمائندگی کرتا ہے، محض دستاویز نہیں ہے۔

۲۔ املاک وغیرہ نہ ہونے کی صورت میں بغیر برابری کے جائز نہیں ہے۔

۳۔ حیثیت مشترکہ کا اعتبار کرتے ہوئے اس کی خرید وفروخت درست ہے۔

۴۔ جائز نہیں۔

۵۔ اصل بنیادی کاروبار کا اعتبار کرتے ہوئے شیئرز خریدنا درست ہے۔

۶۔ اصالۃً جائز ہے مگر بچنے کی کوشش کی جائے۔

۷۔ اضطراری حالت میں ایسے سودی قرض لینے کی مشروط اجازت ہے اور یہ مفید ملک بھی ہے، اور ایسے قرض سے حاصل ہونے والی آمدنی درست ہے۔

۸۔ ہاں وکیل سمجھا جائے گا۔

۹۔ اختلاف کرنے کا نام بری الذمہ ہونا نہیں ہے جبکہ اس میں شریک ہو۔

۱۰۔ جواز کے لئے اتنی بات کافی نہیں ہے بلکہ اس کو لازم قرار دیا جائے۔

۱۱۔ بلکہ ضروری ہے۔

۱۲۔ نفس شیئرز کا خریدنا درست ہے تو سوال میں مذکورہ صورت بھی درست ہوگی۔

۱۳۔ شرعاً یہ صورت جائز نہیں ہے۔

۱۴۔ جائز نہیں ہے، یہ محض وعدہ ہے۔

۱۵۔ شریعت میں قبضہ عرفی کا اعتبار ہے چاہے جس حیثیت کا ہو۔

۱۶۔ یہ سرٹیفیکٹ محض ایک وثیقہ ہے، اصل معاملہ خرید وفروخت کا ہے جبکہ ضمان اور منافع خریدار کی طرف لوٹتے ہیں، اور عرفاً قبضہ کی سرٹیفیکٹ کے علاوہ کوئی دوسری علامت ہو جس کے ذریعہ سے تبدیلی منافع کا پتہ چلتا ہو، جائز ہے ورنہ نہیں۔

۱۷۔ معاملہ خرید وفروخت کے درست ہونے کی صورت میں صحیح ہے۔

خلاصہ کلام:

موجودہ شیئرز کمپنیوں میں سے کوئی کمپنی ایسی نہیں ہے کہ جس میں سودی کاروبار نہ ہو، اور سود کی حرمت منصوص ہے، اس لئے شیئرز کی خرید وفروخت کو علی الاطلاق ناجائز وحرام قرار دینا تو اقرب الی الصواب نہ ہوگا اس لئے کہ اس میں بعض صورتیں ایسی بھی ہیں کہ جن میں جواز کا پہلو ہے، البتہ شیئرز کو نہ خریدنا اقرب الی الصواب ضروری ہے، اور اگر شیئر خریدنا ضروری ہے تو بیان کردہ شرعی حیثیت کو مدنظر رکھا جائے تاکہ شیئر کی آمدنی درجہ جواز میں آجائے۔

☆☆☆

حصص

مولانا عبداللطیف پالنپوری[1]

۱۔ کسی بھی کمپنی کا خرید کردہ شیئر کمپنی کے اثاثوں میں شیئر ہولڈر کی ملکیت کی نمائندگی کرتا ہے یا یہ محض اس بات کی دستاویز ہے کہ اس نے کمپنی کو اتنی رقم دے رکھی ہے، اس میں ان علماء کا نقطۂ نظر صحیح معلوم ہوتا ہے جو یہ کہتے ہیں کہ شیئر ہولڈر کی کمپنی کے اثاثوں میں متناسب ملکیت ہوتی ہے (اسلام اور جدید معیشت وتجارت رص ۸۵)۔

۲۔ اگر کمپنی نے ابھی تک کسی قسم کے جامد اثاثے (مثلاً بلڈنگ، مشینری وغیرہ) یا سامان تجارت نہیں خریدے بلکہ اس کے پاس صرف نقود ہیں یا کسی کے ذمے دیون ہیں تو اس صورت میں شیئر کی بیع وشراء اس کی اصل قیمت سے کم وبیش پر سود ہونے کی وجہ سے جائز نہیں ہے، اس لئے کہ اب شیئر صرف نقد کی نمائندگی کر رہا ہے، مثلاً دس روپے کا شیئر صرف دس روپے کی نمائندگی کر رہا ہے، اگر اس کو گیارہ روپے میں فروخت کیا جائے گا تو دس روپے کی بیع گیارہ روپے کے ساتھ ہوئی جو کہ ناجائز ہے۔

۳۔ جب نقود کے علاوہ کمپنی کے دیگر اثاثے (مثلاً بلڈنگ، مشینری، خام مال وغیرہ) وجود میں آگئے اور کمپنی کے اثاثوں میں نقود وغیر نقود دونوں شامل ہو گئے تو اب شیئرز کی بیع وشراء اس کی اصل قیمت سے کم وبیش پر جائز ہوگی، البتہ ہر شیئر کے حصے میں کمپنی کے نقود اور دیون کی جتنی مقدار آئی ہے، اگر شیئر کی کل قیمت اس کے برابر یا اس سے کم ہو تو بیع جائز نہ ہوگی، مثلاً دس روپے کے شیئر میں اگر آٹھ روپے نقود ودیون کے مقابل ہیں اور دو روپے جامد اثاثوں کے مقابل تو شیئر کی بیع آٹھ روپے یا اس سے کم میں جائز نہ ہوگی، البتہ نو روپے یا اس سے زائد میں جائز ہوگی (اسلام اور جدید معیشت وتجارت ر۸۶، ۸۷)۔

۴۔ وہ کمپنیاں جن کا بنیادی کاروبار حرام ہے، جیسے شراب اور خنزیر کے گوشت کی تجارت یا بینکس اور سودی اسکیموں میں روپیہ لگانا، ایسی کمپنیوں کے شیئرز کی خرید وفروخت جائز نہیں ہے (حوالہ سابق)۔

۵، ۶۔ ایسی کمپنیاں جن کا کاروبار اصلاً تو حلال ہے لیکن کسی نہ کسی طرح وہ سود میں ملوث ہو جاتی ہیں، ایسی کمپنیوں کے سودی لین دین کی دو صورتیں ہیں: ایک تو یہ کہ کمپنی قرضہ لے اور اس پر سود ادا کرے، اس صورت میں کمپنی کی آمدنی میں تو کوئی حرام عنصر شامل نہیں ہوا، اس لئے کہ جب کوئی شخص سود پر قرضہ لے تو یہ فعل تو حرام ہے اور ایسا کرنا سخت گناہ ہے مگر وہ قرض کا مالک بن جائے گا، اور اس کے ساتھ کاروبار کر کے جو آمدنی حاصل ہوگی وہ بھی حلال ہوگی۔

کمپنی کے سودی لین دین کی دوسری صورت یہ ہے کہ کمپنی قرضہ دے کر سود لے، جیسا کہ آج کل بیشتر کمپنیاں زائد رقم بینکوں کے سیونگ اکاؤنٹ میں رکھوا کر اس پر سود لیتی ہیں۔ یہاں دو اشکال ہیں: ایک یہ کہ سودی معاملے میں شیئر ہولڈر کی بھی شرکت ہو جائے گی، اس کا حل تو وہی ہے جو اوپر مذکور ہوا۔ دوسرا اشکال یہ ہے کہ کمپنی جو منافع تقسیم کرے گی اس میں سود بھی شامل ہوگا اور آمدنی کا جو حصہ سود سے حاصل ہو وہ حرام ہے، اس کا حل یہ ہے کہ نفع کا جتنا حصہ سودی ہے اس کا بلا نیت ثواب صدقہ کرنا لازم ہوگا، رہی یہ بات کہ آمدنی کا کتنا حصہ سود ہے؟ یہ کمپنی کے ذمہ داران سے معلوم کیا جا سکتا ہے۔

۷۔ سودی قرضے لینے کی صورت میں یہ قرض مفید ملک ہوگا، اور اس کے ذریعے حاصل ہونے والی آمدنی حلال شمار کی جائیگی، البتہ ایسا معاملہ کرنا

---

[1] جامعہ نذیریہ، کاکوسی، شمالی گجرات۔

سخت گناہ ہے (امداد الفتاوی ۳ر۱۷۰)۔

۸۔ جی ہاں کمپنی کا بورڈ آف ڈائرکٹرس شیئرز ہولڈرس کا وکیل ہے۔

۹۔ بورڈ آف ڈائرکٹرس میں چونکہ فیصلہ کثرت رائے سے ہوتا ہے، اس لئے کمیٹی میں کسی شیئر ہولڈر کا سودی قرض لینے سے اختلاف کرنا اور اپنے اختلاف کا اعلان کردینا وکیل کے عمل کی ذمہ داری سے اسے بری الذمہ کردے گا۔

۱۰۔ منافع سے سود کی مقدار نکال کر صدقہ کردینا لازم ہوگا۔

۱۱۔ اگر سود کمپنی کے منافع میں شامل ہو اور حاصل شدہ سود کو کاروبار میں لگا کر کمپنی نے نفع کمایا ہے تو امام ابوحنیفہؒ اور امام محمدؒ کے نزدیک صرف اس سودی آمدنی کا صدقہ کرنا کافی نہیں ہوگا بلکہ اسے کاروبار میں لگا کر جو نفع کمایا ہے اس نفع کو بھی صدقہ کرنا ضروری ہے، اور امام ابویوسفؒ کے نزدیک صرف اس سودی آمدنی کا صدقہ کرنا کافی ہوگا، اور طرفین کا قول مفتی بہ ہے۔

۱۲۔ جب یہ بات تسلیم کرلی گئی کہ شیئرز بیع وشراء کے قابل ہے، شیئرز کی بیع دراصل کمپنی کے اثاثوں میں متناسب حصے کی بیع ہے تو خرید وفروخت جائز ہوگی خواہ کسی بھی نیت سے ہو، خواہ شیئرز اپنے پاس رکھ کر سرمایہ کاری کے لئے ہو یا قیمت بڑھتے پر بیچ کر نفع کمانے کے لئے ہو، ہاں البتہ بیع وشراء کی شرعی شرائط کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے (اسلام اور جدید معیشت وتجارت ر۹۰)۔

۱۳۔ شیئر مارکیٹ میں فیوچر سیل کے نام سے جو سودا مروج ہے، جس میں شیئرز کا خرید نا مقصود نہیں ہوتا بلکہ بڑھتے گھٹتے دام کے ساتھ نفع ونقصان کو برابر کرلینا مقصود ہوتا ہے، یہ سودا جائز نہیں ہے، کیونکہ یہ ایک قسم کا سٹہ ہے (اسلام اور جدید معیشت وتجارت رص ۹۱)۔

۱۴۔ غائب سودا جس میں بیع کی نسبت مستقبل کی طرف کی جاتی ہے وہ بھی شرعاً جائز نہیں ہے، اس لئے کہ بیع کی وقت مستقبل کی طرف اضافت یا تعلیق باتفاق فقہاء ناجائز ہے (حوالہ بالا)۔

۱۵، ۱۶۔ حاضر سودے میں سرٹیفکیٹ حاصل کرنے سے پہلے خرید کردہ شیئر کی بیع کے جواز کا دارومدار اس بات کے معلوم ہونے پر ہے کہ یہ بیع قبل القبض ہے یا نہیں؟ اگر بیع قبل القبض ہے تو جائز نہیں ورنہ جائز ہے۔ یہ فیصلہ کرنے کے لئے کہ یہ بیع قبل القبض ہے یا نہیں؟ پہلے یہ معلوم کرنا ہوگا کہ شیئر کا قبضہ کس چیز کو کہیں گے۔ ''شیئر'' درحقیقت کمپنی کی املاک میں متناسب حصہ داری کا نام ہے، اور ''شیئر سرٹیفکیٹ'' درحقیقت اس حصہ داری کا تحریری ثبوت ہے، لہذا مبیع وہ تحریری ثبوت نہیں بلکہ کمپنی کے املاک کا ایک مشاع حصہ ہے، یہ مشاع حصہ بیع کی تکمیل ہوتے ہی مشتری کی طرف منتقل ہوجاتا ہے، چونکہ وہ حصہ مشاع ہے اس لئے اس پر حسی قبضہ تو ہو نہیں سکتا، لہذا اس میں معنوی قبضہ ہی معتبر ہونا چاہئے، حسی قبضہ ضروری نہیں، اور معنوی قبضہ اس وقت ہوگا جبکہ وہ مشاع حصہ مشتری کے ضمان میں آجائے، اور حاضر سودوں میں سودا ہوجانے کے بعد شیئرز کے تمام حقوق اور ذمہ داریاں خریدار کی طرف منتقل ہوجاتی ہیں، اور وہ شیئرز خریدار کے ضمان میں داخل ہوجاتے ہیں۔

ان باتوں سے معلوم ہوا کہ حسی قبضہ سے پہلے بھی وہ شیئرز مشتری کے ضمان میں آچکے ہیں اور اس کا تقاضا یہ ہے کہ سرٹیفکیٹ کے ہاتھ میں آنے سے پہلے بھی شیئر کی بیع جائز ہو، لیکن اگر اس جانب نظر کی جائے کہ ہر چیز کے قبضہ کا طریقہ عرف سے متعین ہوتا ہے، اور عرف میں شیئر کا قبضہ اسی وقت سمجھا جاتا ہے جب سرٹیفکیٹ ہاتھ میں آجائے تو پھر عدم جواز کا حکم ہونا چاہئے، لہذا ان متعارض جہات کی موجودگی میں احتیاط یہی ہے کہ سرٹیفکیٹ پر قبضہ کئے بغیر آگے بیع نہ کی جائے (اسلام اور جدید معیشت وتجارت ر۹۱، ۹۲)۔

۱۷۔ جن شیئرز کی خرید وفروخت جائز ہے ان شیئرز کی خرید وفروخت میں بروکر اور ایجنٹ کی حیثیت سے کام کرنا جائز ہے، اور بنیادی طور پر حرام اشیاء کا کاروبار کرنے والی کمپنیوں کے شیئرز اور تمام کمپنیوں کے بونڈز کی خرید وفروخت میں بروکر کی حیثیت سے کام کرنا ناجائز اور حرام ہے۔

☆☆☆

شیئرز کی خرید وفروخت۔ ایک عملی جائزہ

مولانا بدر احمد مجیبی ندوی[1]

۱۔ موجودہ زمانے میں رائج کمپنیوں کا جو طریق کار ہے اور اس کے جو اصول وضوابط ہیں ان کو سامنے رکھ کر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس طریقہ سے سرمایہ کاری کرنا عقد شرکت ہے۔ اگر چہ اس میں شریک ہونے کو عرف عام میں شیئر (Share) کی خریداری سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ لیکن یہ ابتداءً بیع وشراء نہیں ہے بلکہ عقد شرکت ہے، اور شرکت کی قسموں میں سے شرکت عنان کی تعریف اس پر تقریباً صادق آتی ہے۔ کیونکہ شرکت عنان میں تمام شرکاء کی جانب سے محنت وعمل کی شرط نہیں ہوتی۔ بعض شریک کی جانب سے بھی عمل پایا جائے اور سب کی طرف سے سرمایہ، جب بھی شرکت عنان درست ہوجاتی ہے جبکہ نفع ونقصان میں سب فریق شریک ہوں۔

اس لئے شیئرز خریدنا عقد شرکت میں حصہ دار بننا ہے۔ شیئر ہولڈر (Share Holder) اس کمپنی کا شریک ہے۔ وہ کمپنی کے نفع ونقصان میں حصہ دار ہے۔ اس کو اپنے حصہ میں اس کے بقدر تصرف کا اختیار ہے۔ اسی سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ کسی کمپنی کا خرید کردہ شیئر کمپنی میں شیئر ہولڈر کی ملکیت کی نمائندگی کرتا ہے کیونکہ کمپنیوں کے اصول کے مطابق اگر کمپنی تحلیل ہوجائے تو ہر شیئر ہولڈر کو اس کے شیئر کے تناسب سے کمپنی کے اثاثوں میں سے حصہ ملتا ہے۔ نفع کی صورت میں اس کے لگائے ہوئے سرمایہ سے زائد رقم ملتی ہے اور خسارہ کی صورت میں اسے بھی نقصان برداشت کرنا پڑتا ہے۔ اس لئے شیئر کو ادا کردہ رقم کی صرف دستاویز قرار نہیں دیا جاسکتا بلکہ اسے کمپنی میں اس کے بقدر حصہ کی ملکیت کی دستاویز قرار دیا جائے گا۔

۲۔ کمپنی کے قیام کے وقت جب اس کے پاس کچھ بھی املاک منقول وغیر منقول نہیں ہوتی صرف نقد رقم ہوتی ہے اس وقت خرید کردہ شیئر کو فروخت کرنا بیع النقد بالنقد ہے اس میں تساوی ضروری ہے۔ یعنی ۱۰۰ روپے کے شیئرز ہیں، یہی ان کی قیمت اصلیہ (Face Value) ہے، اب ان کو فروخت کرنا ہے تو ان کو ۱۰۰ روپے میں ہی فروخت کر سکتے ہیں، کم یا زیادہ میں فروخت کرنا جائز نہیں ہے، لیکن شیئر کی اس بیع کو بیع صرف نہیں کہا جاسکتا۔ بیع صرف میں بدلین کو ثمنین یعنی سونا چاندی میں سے ہونا ضروری ہے، اس کی تعریف یہ ہے:

بیع الثمن بالثمن أی ما خلق للثمنیة (در مختار کتاب الصرف، در منتقی ۲،۱۱۶، مجمع الانهر ۲،۱۱۶)۔

عقد الصرف ما وقع علی الأثمان ذهبا وفضة بجنسه أو بغیر جنسه (فتح القدیر ۵،۱۵۹)۔

ان عبارتوں میں ما خلق للثمنیة اور ذہبا وفضۃ سے یہ واضح طور پر معلوم ہوجاتا ہے کہ عقد صرف کا حکم صرف اثمان خلقیہ پر ہی لگے گا، غیر ثمن پر عقد صرف کا حکم جاری نہیں ہوگا۔

کمپنی کے خرید کردہ شیئر فروخت کرنے میں بدلین دونوں طرف کرنسی نوٹ ہیں۔ کرنسی نوٹ ثمن عرفی قرار دیئے گئے ہیں، یہ ایک وجہ سے ثمن خلقی سے مشابہت رکھتے ہیں کہ یہ مکمل طور سے ثمن خلقی کا کام انجام دے رہے ہیں، اور ایک وجہ سے فلوس نافقہ سے مشابہت رکھتے ہیں کہ اصلیت کے لحاظ سے یہ ثمن خلقی نہیں ہیں، اس لئے کرنسی نوٹ کے آپس میں تبادلہ یا خرید وفروخت میں ثمن خلقی کا لحاظ کرتے ہوئے تفاضل جائز نہیں ہوگا ورنہ سود کا دروازہ کھل جائے گا۔ اور فلوس نافقہ کا لحاظ کرتے ہوئے مجلس عقد میں بدلین پر قبضہ ضروری نہ ہوگا، کسی ایک پر قبضہ کر لینا کافی ہے۔ متعدد فقہاء نے فلوس کی دراہم سے بیع کے سلسلے میں صراحت کی ہے کہ بدلین میں سے ایک پر قبضہ کافی ہے، دونوں پر قبضہ ضروری نہیں ہے (امام کرخی، امام سرخسی،

---

[1] امارت شرعیہ، پھلواری شریف، پٹنہ۔

علامہ ابن ہمام وغیرہ نے اس کی صراحت کی ہے)، اور جب دونوں طرف فلوس ہوں تو بدرجہ اولی یہی حکم ہوگا۔

اس لئے کرنسی نوٹ کے آپس میں تبادلہ کے وقت اس میں تفاضل یعنی کمی بیشی جائز نہیں ہے، اور عوضین میں سے کسی ایک پر مجلس میں قبضہ کافی ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ کمپنی کے قیام کے وقت جبکہ اس کے پاس صرف نقد رقم ہوتی ہے ایسے وقت میں شیئر کی خرید وفروخت بیع صرف نہیں ہے، اس لئے کسی ایک ثمن پر بھی قبضہ ہو جانا کافی ہے، لیکن بدلین میں برابری ضروری ہے کہ جس رقم میں شیئر خریدا ہے اسی رقم میں فروخت کریں، اس سے کم یا زیادہ میں فروخت کرنا جائز نہیں ہے۔

۳۔ کمپنی قائم ہو جانے کے بعد جب کمپنی نے اپنا سامان، زمین، مشینری، بلڈنگ وغیرہ خرید لیا تو اب اس کا اثاثہ نقد رقم اور منقول وغیر منقول اشیاء سے مخلوط ہو گیا۔ اب اگر کوئی شیئر ہولڈر اپنا شیئر فروخت کرنا چاہتا ہے تو یہ بیع النقد مع غیرہ بالنقد ہے۔ بدلین میں ایک طرف نقد رقم ہے اور دوسری طرف شیئر کے بقدر کمپنی میں اس کا متناسب حصہ جو نقد رقم اور بعض اثاثے پر مشتمل ہے۔ یعنی نقد وغیر نقد کے مجموعہ کی بیع نقد سے ہے، اس کا حکم یہ ہے کہ اس میں ثمن والے نقد کو مخلوط کے نقد سے زیادہ ہونا چاہئے۔

شیئر کی بھی یہی صورت ہے کہ ہر شیئر کے مقابلہ میں اس کے متناسب کمپنی میں نقود واثاثے ہیں، مثلاً ۱۰ روپئے کے ایک شیئر کے مقابلہ میں کمپنی میں ۶ روپئے نقد اور ۴ روپئے کے اثاثے ہیں، اب اس شیئر کی بیع ۶ روپئے یا اس سے کم میں جائز نہیں ہے، البتہ ۷ روپئے یا اس سے زائد میں جائز ہے، تاکہ ۶ روپئے مبیع کے نقد کے برابر کرنے کے بعد زائد رقم جو ثمن میں ہے وہ مبیع کے اثاثے کے عوض میں ہو جائے۔

۴۔ ایسی کمپنیاں جن کا بنیادی کاروبار حرام ہے۔ مثلاً شراب کی فیکٹری قائم کر رہی ہے، انشورنس کمپنی کھول رہی ہے، سودی بینک چلا رہی ہے یا شراب اور خنزیر کے گوشت کی تجارت کر رہی ہے، تو ایسی کمپنی میں شرکت کرنا یعنی اس کے شیئرز خریدنا کسی طرح جائز نہیں ہے۔

''تعاونوا على البر والتقوى ولا تعاونوا على الإثم والعدوان'' (سورہ مائدہ)۔

جب گناہ پر تعاون کی ممانعت ہے تو اس میں شریک ہو کر اس کو فروغ دینا بدرجہ اولی سخت منع ہے۔

۵۔ ایسی کمپنیاں جن کا بنیادی کاروبار حلال ہے لیکن اپنی بعض مجبوریوں یا قانونی دشواریوں کی وجہ سے انہیں بینک سے سودی قرضہ لینا پڑتا ہے جس کا بینک کو سود دینا پڑتا ہے۔ اس کا حکم یہ ہے کہ سودی لین دین کی حرمت کی وجہ سے کمپنی کا یہ عمل سخت گناہ کا کام ہے مگر اس سے کاروبار میں کوئی حرام حصہ شامل نہیں ہوا، اور کمپنی کا بنیادی کاروبار حلال ہے اس لئے ایسی کمپنی میں بھی شیئر خریدنا جائز ہے۔

۶۔ ایسی کمپنیاں جن کا بنیادی کاروبار حلال ہے لیکن قانونی تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے اپنے سرمایہ کا کچھ حصہ انہیں ریزرو بینک میں جمع کرنا پڑتا ہے جس کا سود انہیں ملتا ہے، اس طرح وہ سود میں ملوث ہو جاتی ہیں اور یہ سود ضمنی طور سے کاروبار میں بھی لگ جاتا ہے۔ اس کا حکم یہ ہے کہ بنیادی کاروبار حلال ہونے کی وجہ سے ان کے شیئرز خریدنا درست ہے، البتہ سود کا جو حصہ اس میں آرہا ہے اس سے احتیاط لازم ہے۔

۷۔ حلال کاروبار کرنے والی بعض کمپنیاں جو قانونی دشواریوں کی وجہ سے سودی قرضہ لیتی ہیں اور اس کو کاروبار میں لگاتی ہیں، ان کا لیا ہوا قرضہ ان کی ملکیت ہو جاتا ہے، اس قرضہ کی رقم کو وہ کاروبار میں لگا کر نفع حاصل کرتی ہیں تو یہ منافع (Profits) حلال ہے، کیونکہ کمپنی نے بینک سے سودی قرضہ (Loan) لیا، اپنے کاروبار میں قرضہ کو لگایا، سود کو نہیں لگایا۔ قرضہ ان کی ملکیت ہے اور حلال ہے، اس لئے اس سے جو نفع ہوا وہ حلال ہے۔ اگرچہ سودی قرض لینا گناہ ہے اس سے بچنے کی کوشش کی جانی چاہئے۔

۸۔ کمپنی کا طریق کار شرکت عنان سے قریب ہے۔ شرکت عنان وکالت کے ساتھ منعقد ہوتی ہے جس کی وجہ سے تمام شرکاء ایک دوسرے کے وکیل ہوتے ہیں۔

وأما شركة العنان فتنعقد على الوكالة دون الكفالة (ہدایہ: کتاب الشرکۃ)۔

کمپنی کے اصول وضوابط کے مطابق اس میں عمل ومحنت کمپنی کے کارکنان (Board of Directors) ہی انجام دیتے ہیں، باقی شیئرز ہولڈرس کا اس میں سرمایہ ہوتا ہے، اس لئے بورڈ آف ڈائرکٹرس شیئر ہولڈرس کے وکیل ہوں گے، اوران کا عمل شیئر ہولڈرس کا عمل قرار دیا جائے گا۔

۹۔ شرکت عنان خاص بھی ہوتی ہے۔ خاص کا مفہوم یہ ہے کہ کچھ متعین صورتوں میں کاروبار کرنا طے ہو، یا کاروبار سے کچھ صورتیں مستثنی کردی جائیں کہ فلاں فلاں طریقے سے کاروبار نہیں ہوں گے، چنانچہ شرکت عنان میں اگر کسی شریک نے یہ شرط لگادی کہ بیع ادھار نہیں ہوگی تو یہ شرط لگانا درست ہے، ابتداءً بھی اور بعد میں بھی۔ بعد کی صورت یہ ہے کہ ابتداءً تو نقد وادھار دونوں پر شرکت منعقد ہوئی تھی، بعد میں ایک فریق نے ادھار سے روک دیا تو اسے روکنے کا حق ہے۔

اگر منع کرنے کے باوجود دوسرے شریک نے ادھار بیع کی تو اس بیع کے نفع ونقصان کا ذمہ دار وہی ہوگا، فریق اول اس سے بری الذمہ رہے گا، اگر بعد میں اس نے اجازت دیدی تو پھر وہ بھی اس میں شریک ہوجائے گا۔

اگر فریق اول نے اس کی اجازت نہیں دی تو اس کے حصے میں یہ بیع باطل ہوجائے گی (دیکھئے: بحر الرائق ۵/ ۱۸۰، ردالمحتار ۳/ ۳۷۹)۔

اس تفصیل کو پیش نظر رکھ کر غور کیا جائے۔ بورڈ آف ڈائرکٹرس سے بعض شیئر ہولڈرس کا اختلاف سودی لین دین سے متعلق ہوا، انہوں نے اس سے منع کیا لیکن کثرت رائے سے ان کی بات نہیں مانی گئی، اب کارکنان کمپنی اگر سودی لین دین کرتے ہیں تو مانعین سود شیئر ہولڈرس کے وہ سودی لین دین میں وکیل نہیں ہیں، کیونکہ انہوں نے شرکت کو خاص کردیا، بورڈ آف ڈائرکٹرس کو سودی لین دین میں جو نفع یا نقصان ہوگا اس کے ذمہ دار وہ خود ہیں، مانعین سود شیئر ہولڈرس پر اس کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔

۱۰۔ اگر کمپنی کے منافع میں سود بھی شامل ہوگیا ہے اور اس کی مقدار معلوم ومتعین ہے تو شیئر ہولڈر کو اتنی مقدار منافع میں سے نکال کر صدقہ کردینا لازم ہے۔ باقی منافع اس کے لئے حلال وطیب ہوں گے۔

۱۱۔ کمپنی کا بنیادی کاروبار حلال ہے لیکن کمپنی کی آمدنی میں سود کا حصہ بھی شامل ہوگیا ہے جو کاروبار میں لگ کر منافع میں آ گیا ہے، اس کا حکم یہ ہے کہ اگر یہ معلوم ہوجائے کہ کل آمدنی میں سود کی مقدار کتنی فیصد ہے تو شیئر ہولڈر پر اپنے حصہ نفع (Dividend) میں سے اتنا فیصد نکال کر صدقہ کردینا ضروری ہے اور اگر متعین طور سے معلوم نہ ہوسکے کہ آمدنی میں سود کی کتنی مقدار مخلوط ہوگئی ہے تو ایسی صورت میں شیئر ہولڈر غور وفکر کرکے دیانتداری کے ساتھ سود کا تخمینہ کرے گا اور اس تخمینہ کے مطابق سود کی رقم نکال کر صدقہ کردے گا۔

۱۲۔ شیئرز کی تجارت کرنا یعنی اس ارادہ سے شیئر خریدنا کہ قیمت بڑھ جانے کے وقت اس کو فروخت کرکے نفع کمائیں گے یہ جائز ہے، شیئر قابل فروخت شئی ہے، یہ کمپنی میں اپنے متناسب حصہ کی نمائندگی کرتا ہے، اس کو بیع مشاع کہہ سکتے ہیں اور بیع مشاع جائز ہے۔

بيع المشاع وإعارته جائز (فصول عماديه ۲،۸۲۱)۔

تجارت کا اصول یہی ہے کہ کم قیمت پر سامان خرید کر اس کو زیادہ قیمت پر فروخت کیا جائے، اگر اس نیت سے شیئرز خرید رہے ہیں تو اس کے جواز میں شبہ نہیں ہونا چاہئے، لیکن تمام شرائط کے ساتھ یہ بیع ہونی چاہئے۔

۱۳۔ یہ سودا جو فیوچر سیل (Future Sale) کہلاتا ہے جائز نہیں ہے، کیونکہ اس کا مقصد کمپنی میں حصہ دار بننا نہیں ہوتا اور نہ شیئرز کی تجارت ہوتی ہے، بلکہ اس کا اصل مقصد نفع نقصان برابر کرنا ہے، کہ اگر شیئر کی قیمت طے شدہ مدت کے اندر متعین ثمن سے زیادہ ہوگئی تو بائع مشتری سے زائد رقم وصول کرے گا، اور اگر شیئر کی قیمت کم ہوگئی تو مشتری بائع سے اتنی رقم وصول کرے گا، نہ بائع مشتری کو مال دیتا ہے اور نہ مشتری بائع کو ثمن ادا کرتا ہے، اس لئے شرعی طور پر یہ سودا نہ تجارت میں داخل ہے اور نہ شرکت میں، بلکہ یہ سٹہ بازی (Speculation) ہے جو کہ حرام ہے۔

۱۴۔ غائب سودے (Forward Sale) جن کی بیع کی نسبت مستقبل کی طرف کی جاتی ہے، یہ بیع نہیں ہے، کیونکہ مستقبل کے صیغے سے بیع نہیں ہوتی۔

وما لا تصح إضافته إلى المستقبل عشرة: البيع وإجازته و فسخه...... فإنها تمليكات للحال فلا تضاف للاستقبال (درمختار، قبيل باب الصرف)۔

یہ غائب سودے بیع نہیں وعدۂ بیع ہیں، مگر وعدۂ بیع کوئی مستقل عقد نہیں ہے، اصل بیع بعد میں کرنی پڑے گی۔

۱۵۔ فقہاء کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ قبضہ حقیقی بھی ہوتا ہے اور حکمی بھی۔ حقیقی قبضہ کو فقہاء التقابض بالبراجم سے تعبیر کرتے ہیں یعنی بالفعل قبضہ ہونا چاہئے کہ مبیع کو مشتری کے ہاتھ میں دیدی جائے یا مشتری کے جیب میں رکھ دی جائے۔ حکمی قبضہ کو فقہاء تخلیہ سے تعبیر کرتے ہیں، تخلیہ کا مفہوم اذن بالقبض ہے کہ بائع نے مشتری کو مبیع پر قبضہ کرنے کی اجازت دیدی اور اس کے موانع دور کردیئے اس طرح پر کہ مشتری مبیع پر حقیقی قبضہ کرسکتا ہے۔

شیئرز کی خرید وفروخت کے معاملہ میں قبضہ (Delivery) اسی وقت ہوسکتا ہے جب اس کی دستاویز ((Certificate شیئر ہولڈر یا اس کے کسی نمائندہ کو مل جائے، کیونکہ شیئر کی بیع دراصل شیئر کے متناسب کمپنی میں نقد اور منقول وغیر منقول اثاثے کی بیع ہے۔ اس میں قبضہ حقیقی تو یہ ہے کہ نقد اور منقول وغیر منقول اثاثے پر بالفعل قبضہ ہو، اور اس کا حکمی قبضہ یہ ہے کہ اس کی دستاویز شیئر ہولڈر کے ہاتھ میں آجائے۔ حقیقی قبضہ تو بہت مشکل ہے اس لئے حکمی قبضہ ہی ہوسکتا ہے۔

بنیادی طور پر غور طلب یہ ہے کہ شیئر کی خرید وفروخت جو بیع النقد مع غیرہ بالنقد ہے، اس میں مبیع نقد وغیر نقد پر قبضہ کیا اس طرح درست ہوسکتا ہے کہ مبیع تو بائع کے پاس ہی ہے لیکن یہ تسلیم کرلیا گیا ہے کہ وہ مشتری کے ضمان میں آگیا ہے؟ یا یہ ضروری ہے کہ اس کی دستاویز مشتری کے ہاتھ میں آجائے تب قبضہ درست ہو؟

میرے خیال میں قبضہ حکمی کے لئے اتنا ضروری ہونا چاہئے کہ شیئر کی دستاویز (Certificate) شیئر ہولڈر یا اس کے کسی وکیل کو مل جائے، اس کے بغیر شیئر پر قبضہ درست نہیں ہونا چاہئے۔

۱۶۔ شیئر ہولڈر شیئر خریدنے کے بعد اس کی سرٹیفکیٹ حاصل کرنے سے قبل شیئر کو فروخت کرتا ہے تو یہ بیع قبل القبض ہے جو باتفاق فقہاء ناجائز ہے۔ شیئر دراصل کمپنی میں اس کے متناسب نقد اور منقول وغیر منقول اثاثے کی ملکیت کا نام ہے اور بیع بھی اسی کی نسبت سے ہوتی ہے۔

۱۷۔ شیئر بازار (Stock Exchange) میں جو افراد خرید وفروخت کے لئے بائع ومشتری کے درمیان واسطہ بنتے ہیں جنہیں قیمتوں سے واقفیت اور شیئرز کے خرید وفروخت کے طریقے میں مہارت ہوتی ہے اور اس کارروائی کا اندراج کرتے ہیں، ان کو بروکر کہا جاتا ہے یعنی ان کی حیثیت ایجنٹ کی ہوتی ہے۔ ایجنٹ کا کام کرنا درست ہے لیکن ناجائز بیع اور سود وقمار کی صورتوں میں کام کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ کمیشن ایجنٹ چونکہ بائع اور مشتری دونوں کا کام کرتے ہیں اس لئے وہ عرف کے اعتبار سے دونوں سے اجرت لے سکتے ہیں (دیکھئے: درمختار کتاب البیوع، ردالمحتار ۴/۴۶)۔

حصص فقہ کی روشنی میں

ڈاکٹر عبدالعظیم اصلاحی [1]

۱۔ کسی کمپنی کا خرید کردہ شیئر کمپنی میں شیئر ہولڈر کی اس حصہ کے بقدر ملکیت کی نمائندگی کرتا ہے۔

۲۔ یہ کہنا بڑی سادگی ہوگی کہ بعض اوقات کمپنی قائم کرتے وقت شیئرز کا اعلان کیا جاتا ہے اور اس کے پاس کچھ بھی املاک نہیں ہوتی۔ کمپنی کے قیام کا اعلان کرنے اور اس کے حصص کی فروخت سے قبل اس کے بانیوں کو اچھی خاصی تیاری کرنی پڑتی ہے، اور بہت سے مراحل اور صرفوں کے بعد کمپنی کے پروجیکٹ میں اشتراک کی دعوت دی جاتی ہے، اور اس پر جو سرٹیفکیٹ جاری کیا جاتا ہے وہ نقد نہیں ہوتا۔ کمپنی کے پروجیکٹ کی منفعت، حیویت، اس کے پروموٹرس کا تجربہ، مستقبل کے امکانات وغیرہ کے مطابق اس سرٹیفکیٹ کی ظاہری قدر (Face Value) سے اس کی بازاری قدر زیادہ بھی ہوسکتی ہے اور کم بھی۔ اب اس سرٹیفکیٹ کی فروخت سے ہرگز نقد نقد کے مقابل نہیں ہوگا، اس کے علاوہ دونوں کی سیولت (Liquidity) اور قبولیت (Acceptance) میں فرق ہے جو نقد کو سرٹیفکیٹ سے ممتاز کرتے ہیں، اس لئے میرے خیال میں اس مرحلہ پر بھی کمپنی کے شیئرز کی خرید وفروخت میں کوئی حرج نہیں ہے۔

۳۔ کمپنی کے مخلوط اثاثہ میں نقد کی مقدار ہمیشہ متغیر رہتی ہے جس کی تعیین پرُ مشقت ہی نہیں عام شرکاء کے لئے تقریباً ناممکن ہے، اسی لئے اس مخلوط اثاثہ کے مجموعہ کو جس کی نمائندگی کمپنی کی سند (Share Certificate) کرتی ہے نقد سے ایک الگ ماہیت کی چیز سمجھنا چاہئے۔ اور اس اجتہادی مسئلہ میں سرٹیفکیٹ کے نقد سے تبادلہ کو جائز ہونا چاہئے۔

۴۔ اس میں کوئی دورائے نہیں کہ اس طرح کی کمپنیوں کے شیئرز کی خرید وفروخت حرام ہوگی۔

۵۔ یہ ہمارے سیاسی ومعاشی نظام کی خرابی ہے کہ اس طرح کی آمیزش آہی جاتی ہے۔ بہر حال جب تک کوئی اس کا بدل سامنے نہیں آتا بکراہت جائز ہوگا۔

۶۔ مذکورہ بالا جواب اس کا بھی ہے۔

۷۔ اس کا اندازہ کرکے اسے رفاہ عام کے کاموں میں لگادیا جائے۔

۸۔ کمپنی کا بورڈ آف ڈائرکٹرس عام شیئرز ہولڈر کا ویسے ہی وکیل ہوتا ہے جیسے ملک کا صدر یا وزیر اعظم ہر شخص کا وکیل ہوتا ہے۔ اس لئے جب تک شیئرز ہولڈر کی اس کے تقرر میں پوری رضامندی حاصل نہ ہو اس کی وکالت مشروط ہوگی یعنی جائز کام کرے تو اس کی وکالت کو اس کام میں آدمی تسلیم کرے، ناجائز ہو تو اسے رد کردے، اور اس سے اپنی براءت ظاہر کرے۔

۹۔ اگر غیر اہل ایمان کے ساتھ شرکت ومضاربت اور تجارت صحیح ہوسکتی ہے تو اس کو بھی بدرجہ مجبوری صحیح سمجھا جاسکتا ہے۔ اور جہاں تک بورڈ آف ڈائرکٹرس کی میٹنگ میں کسی شیئر ہولڈر کا سودی قرض لینے سے اختلاف کرنے یا اختلاف کا اعلان کردینے کا تعلق ہے اگر اس کا موقع ملے تو ضرور کرنا چاہئے، لیکن اس کے اور طریقے بھی ہوسکتے ہیں، مثلاً خط وکتابت، کتابچہ، اور مضامین کی اشاعت، اور تقریر وتحریر کے دوسرے وسائل کے ذریعہ۔

---

[1] کنگ عبدالعزیز یونیورسٹی، جدہ، سعودی عرب۔

۱۰، ۱۱۔ انشاء اللہ کافی ہوگا۔

۱۲۔ شیئرز کی تجارت فی نفسہ جائز ہے، بشرطیکہ ناجائز کاروبار کرنے والی کمپنیوں کے شیئرز سے احتراز کیا جائے۔ کسی نہ کسی حد تک ہر تجارت میں تخمینے اور قیاس آرائی کو دخل ہوتا ہے، البتہ اس تخمینے کو ناجائز ہونا چاہئے جو غبن فاحش کی حدود میں داخل ہو جائے۔

۱۳۔ فیوچر سیل جس کا مقصد شیئرز خریدنا نہیں ہوتا بلکہ بڑھتے گھٹتے دام کے ساتھ نفع و نقصان کو برابر کر لینا مقصود ہوتا ہے حرام ہونا چاہئے۔

۱۴۔ سوال واضح نہیں ہے۔

۱۵۔ اصل قبضہ تو سرٹیفکیٹ اپنے نام ٹرانسفر کروا لینے کے بعد ہی ہوتا ہے، ورنہ کمپنی میں جس کے نام سرٹیفکیٹ درج ہے اسی کو نفع ملے گا البتہ نقصان سرٹیفکیٹ ہولڈر کو ہوگا، بہرحال جہاں سرٹیفکیٹ کا رواج ہے وہاں کم از کم سرٹیفکیٹ کا ہاتھ میں آ جانا قبضہ سمجھا جا سکتا ہے۔

۱۶۔ صرف خریدنے کا معاملہ کرنا اور کچھ ادائیگی کرنے کے بعد بالا بالا دوسرے اور تیسرے کو فروخت کرنا بیع قبل القبض ہوگا، کیونکہ اس وقت تک نہ تو اس کا قبضہ تام ہوتا ہے اور نہ ہی ناقص، یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ ہندوستان کے دو اسٹاک ایکسچینج (OTCE) اور (NSE) میں سرٹیفکیٹ کا رواج ختم ہوتا جا رہا ہے، اور کمپیوٹر کے ذریعہ فوراً خریدار کا نام کمپنی کے شیئر ہولڈر کی حیثیت سے منتقل ہو جاتا ہے۔ اسی طرح بیرون ملک اعلیٰ ترقی یافتہ ملکوں میں بغیر سرٹیفکیٹ ٹرانسفر کے لین دین ہوتے ہیں کیونکہ اس میں وقت، لاگت، اور خریداروں کی مصلحت کی رعایت ہوتی ہے۔ علماء کو اس طریقہ کی شرعی حیثیت پر بھی غور کرنا چاہئے۔

۱۷۔ بروکر کی حیثیت سے کام کرنا جائز ہو سکتا ہے بشرطیکہ سودی یا ناجائز کام کرنے والی کمپنیوں کے حصص کی تجارت یا وکالت کرنے سے پرہیز کیا جائے۔

☆☆☆

حصص کے مختلف مسائل کا حکم

مفتی عبدالرحیم قاسمی [1]

۱۔ کمپنی کا خرید کردہ شیئر کمپنی میں متناسب حصے کی ملکیت کی نمائندگی کرتا ہے۔

۲۔ جب تک کمپنی کے پاس جامد املاک نہ ہوں تو اس کے شیئرز کی خرید وفروخت بیع صرف کے حکم میں ہوگی، کمی زیادتی کے ساتھ ان شیئرز کی خرید وفروخت جائز نہیں، برابر سرابر معاملہ کرنا ضروری ہے (کمافی امداد الفتاویٰ ۳؍ ۱۳۰)۔

۳۔ کمپنی وجود میں آجانے کے بعد اس کا اثاثہ ربوی اور غیر ربوی دونوں قسم کے مالوں پر مشتمل ہوتا ہے، لہذا کمی زیادتی کے ساتھ اس کے شیئرز کی خرید وفروخت درست ہوگی، اور زیادتی کو غیر ربوی کے مقابل مانا جائے گا (امداد الفتاویٰ ۳؍ ۱۳۰)۔

۴۔ جن کمپنیوں کا کاروبار حرام ہے جیسے شراب، خنزیر کے گوشت کی تجارت، بینکس اور سودی اسکیموں میں روپیہ لگانا، ان کے شیئرز کی خرید وفروخت شرعاً حرام ہے۔

۵،۶،۱۰،۱۱۔ جن کمپنیوں کا کاروبار بنیادی طور پر حلال ہے مگر کسی قانونی مجبوری کی وجہ سے بینک سے لین دین کرتے ہیں جس میں سود کی آمیزش ہوتی ہے ایسی کمپنیوں میں دو شرطوں کا پایا جانا ضروری ہے۔

(۱) سود کے خلاف شیئر ہولڈر کمپنی کی سالانہ میٹنگ میں ضرور آواز اٹھائے۔

(۲) منافع تقسیم ہوتے وقت شیر ہولڈر آمدنی کا حساب لگا کر یہ معلوم کرے کہ آمدنی کا کتنا فیصد حصہ سودی ڈپازٹ سے حاصل ہوا ہے، اور جس قدر سودی ڈپازٹ میں رقم رکھوانے سے حاصل ہوا ہو اس کو بلا نیت ثواب محتاجوں کو تقسیم کردے (خلاصہ امداد الفتاویٰ، شیئرز کی خرید وفروخت)۔

۷۔ قرض پر سود کا لین دین حرام ہے مگر وہ قرض مفید ملک ہوگا، اور اس قرض کو حلال ذریعہ میں لگا کر حاصل کی جانے والی آمدنی میں حرمت سرایت نہیں کرے گی۔

۸۔ کمپنی کا بورڈ آف ڈائرکٹرس شیئر ہولڈرس کا وکیل ہے اور اس کا عمل شیئر ہولڈرس کا عمل سمجھا جائے گا، جس عمل سے شیئر ہولڈر منع کردے تو اس میں وکالت نہیں رہے گی۔

۹۔ بورڈ آف ڈائرکٹرس کی کمیٹی میں شیئر ہولڈر کا سودی قرض لینے سے اختلاف کا اعلان اور بیزاری کا اظہار کردینا کافی ہوگا کیونکہ اس کے اختیار میں اس سے زیادہ کچھ نہیں۔

۱۲۔ شیئرز کو مقصود بنا کر خرید وفروخت کرنا اور قیمت بڑھنے پر ان کو منافع کے ساتھ فروخت کرنا بھی مندرجہ ذیل شرائط کے ساتھ مشروط ہے:

☆ کمپنی کا اصل کاروبار حلال ہو۔

☆ کمپنی کے منجمد اثاثے وجود میں آچکے ہوں۔

---

[1] جامعہ خیر العلوم، نور محل روڈ، بھوپال۔

☆اگر کمپنی سودی لین دین کرتی ہو تو اسکی سالانہ میٹنگ میں سود سے براءت ظاہر کی جائے۔

☆منافع میں سے سودی ڈپازٹ کا حساب لگا کر اسی قدر بلا نیت ثواب صدقہ کردے۔

۱۳۔ اگر شیئرز کا خریدنا مقصود نہ ہو بلکہ بڑھتے گھٹتے داموں کے ساتھ نفع نقصان کو برابر کرلینا مقصود ہو، مثلاً زید نے ایک سو روپے شیئر کے حساب سے سو شیئرز کا سودا کیا اور ادائیگی کی تاریخ ۳۰/ مارچ مقرر کی، جب ۳۰/ مارچ تک اس شیئر کی قیمت ڈیڑھ سو روپے ہوگئی تو وہ پانچ ہزار روپے منافع کے طور پر لے گا، اور اگر ۳۰/ مارچ کو اس شیئر کی قیمت گھٹ کر پچاس روپے ہوگئی تو وہ پانچ ہزار روپے ادا کرے گا، اصل سودا محض کاغذی کارروائی ہے، نہ مشتری ثمن دیتا ہے نہ بائع مال دیتا ہے، البتہ بڑھتے ہوئی دام کی صورت میں منافع اور گھٹتے ہوئے دام کی حالت میں خسارہ ادا کیا جاتا ہے، اس طرح ڈیفرنس برابر کرکے سٹہ بازی کرنا حرام ہے، شریعت میں اس کی اجازت نہیں۔

۱۴۔ بیع معاومہ سے حدیث میں منع کیا گیا ہے یعنی ایک شخص آئندہ دو تین سال کے لئے بیک وقت اپنے کھیت کی پیداوار یا باغ کے پھل بیچ دے اس کو معاومہ کہتے ہیں، اسی طرح جانور کے ایک یا کئی حمل فروخت کردے، یہ حبل الحبلہ کہلاتا ہے، اسکی بھی حدیث میں ممانعت ہے، اس قسم کے کاروبار کو غرر اور جوا کی وجہ سے روکا گیا ہے، لہذا مستقبل کے سودے شریعت میں ممنوع ہیں۔

۱۵۔ اگر بوقت بیع وشراء ہی کمپنی کے اثاثوں اور املاک میں شیئر ہولڈر کی ملکیت آجاتی ہو اور اس کے ضمان میں آنے کی بنا پر حقوق اور ذمہ داریاں خریدار کی طرف منتقل ہوجاتی ہوں تو اگرچہ اس کو شیئرز کا سرٹیفیکٹ نہ ملا ہو قبضہ معنوی تصور کیا جاسکتا ہے۔

۱۶۔ شیئرز خریدنے کے ساتھ ہی اس کے ضمان ومنافع خریدار کی طرف منتقل ہوجاتے ہوں تو سرٹیفیکٹ حاصل کرنے سے قبل خریداران شیئرز کو دوسرے شخص کے ہاتھ فروخت کرسکتا ہے۔

۱۷۔ بروکر کو شرعی اصول کے مطابق وکیل بنایا جائے اور جائز طریقوں سے وہ اپنا کام انجام دے تو بروکر کی حیثیت سے اسکا کام کرنا شرعاً درست ہے (امداد الفتاوی ۳/ ۱۲۹)۔

☆☆☆

حصص کے شرعی احکام

مولانا عبدالقیوم پالنپوری[1]

۱۔ کسی کمپنی کے ایکویٹی شیئرز (Equity Shares) کمپنی میں شیئر ہولڈر کی شرکت وملکیت کی نمائندگی کرتے ہیں، جیسا کہ حکیم الامت حضرت تھانویؒ اور مفتی محمد شفیع صاحبؒ کی رائے ہے، اور حضرت مولانا تقی عثمانی مدظلہ نے اپنی کتاب ''اسلام اور جدید معیشت و تجارت'' (ص ۷۹۔۸۳) میں علماء کے مختلف نقطہ نظر پیش کرنے کے بعد کمپنیوں میں شرکت کو شرکت عنان قرار دیا ہے۔

۲۔ جب کمپنی کے قائم کرتے وقت شیئرز کا اعلان کیا جاتا ہے، اور اس وقت کمپنی کی املاک، اثاثے موجود نہیں ہوتے ہیں تو اس وقت اس کے خرید کردہ شیئرز کی بیع اس کی قیمت اسمیہ سے کم وبیش کے ساتھ سود ہونے کی وجہ سے قطعاً جائز نہیں ہے، اور شیئر پر لکھی ہوئی قیمت کے برابر کے ساتھ بیچنا جائز ہے اس لئے کہ یہ بیع صرف نہیں ہے، اور بیع صرف کے لئے ضروری ہے کہ اثمان خلقی ہوں، اور روپیہ ثمن عرفی ہے ثمن خلقی نہیں ہے۔

۳۔ اس صورت میں جبکہ مجموعہ جو مشتمل ہے مال ربوی (نقد، دیون) وغیر ربوی پر، اس کی بیع نقد کے ساتھ امام ابوحنیفہؒ کے یہاں جائز ہے بشرطیکہ نقد مجموعہ میں مخلوط مال ربوی سے زیادہ ہو، تاکہ مال ربوی کے مقابلہ میں مال ربوی ہوجائے گا اور زائد (نقد میں سے) مال غیر ربوی کے مقابلہ میں ہوگا، البتہ ہر شیئر کے حصہ میں کمپنی کے دیون ونقود کی (نہ کہ اثاثے کی) جتنی مقدار آئی ہے اگر شیئر کی کل قیمت اس کے برابر، یا اس سے کم ہو تو بیع ناجائز ہوگی، مثلاً دس روپے کے حصہ میں آٹھ روپے اگر نقود اور دیون کے مقابل ہیں اور دو روپے جامد اثاثوں کے مقابل، تو شیئر کی بیع آٹھ روپے یا اس سے کم میں جائز نہ ہوگی، البتہ نو روپے یا اس سے زائد میں جائز ہوگی (اسلام اور جدید معیشت وتجارت ۸۶، ۸۷)۔

۴۔ ایسی کمپنیاں جن کا بنیادی کاروبار حرام ہے، ایسی کمپنیوں کے شیئرز کی خرید وفروخت جائز نہیں ہے (حوالہ بالا)۔

أمر المسلم ببيع الخمر والخنزير وشرائهما اى وكّل المسلم ذميًّا...... صح ذلك عند الإمام مع أشد الكراهة ...... وقال لا يصح هو الأظهر وفي رد المحتار (قوله لا يصح) اى يبطل كما في البرهان. (الدر المختار مع رد المحتار ۴، ۱۶۲)۔

۵، ۶۔ جن کمپنیوں کا بنیادی کاروبار مجموعی طور پر حلال ہے لیکن ساتھ میں وہ کمپنی بینک سے سودی قرضے لیتی ہے یا قانونی تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے اپنے کچھ سرمایہ کو ریزرو بینک میں جمع کرتی ہے یا بانڈز خریدتی ہے جس کی وجہ سے اس کو سود بھی ملتا ہے، ایسی کمپنیوں کے شیئرز لینے کی دو شرطوں کے ساتھ اجازت ہے: پہلی شرط یہ ہے کہ اس کی سالانہ میٹنگ میں آواز اٹھائی جائے کہ ہم سودی لین دین کو درست نہیں سمجھتے اور ہم اس پر راضی نہیں ہیں۔ دوسری شرط یہ ہے کہ کمپنی کی آمدنی میں سود شامل ہو تو نفع میں سے اس سود کی مقدار بلانیت ثواب صدقہ کردے۔

۷۔ سودی قرضہ لینے کی صورت میں حاصل شدہ قرض میں کوئی خبث نہیں ہے، وہ مفید ملک ہے، اور اس سے حاصل ہونے والے منافع اور آمدنی حلال ہوگی، البتہ یہ معاملہ اور قرض کی واپسی کے وقت زائد رقم ادا کرنا سخت گناہ اور سود ہے (امداد الفتاوی ۳ ر ۱۷۰)۔

۸۔ کمپنی کا بورڈ آف ڈائرکٹرس شیئر ہولڈرس کا وکیل ہے، اس کا عمل شیئر ہولڈر کا عمل سمجھا جائے گا، الا یہ کہ شیئر ہولڈر کسی عمل کے خلاف آواز اٹھا کر اسے مطلع کردے تو شیئر ہولڈر اپنے وکیل کے عمل سے بری الذمہ ہوجائے گا۔

---

[1] مدرسہ جامعہ نذیریہ کاکوسی، گجرات۔

۹۔ سالانہ میٹنگ میں سودی لین دین کے خلاف آواز اٹھانے سے شیئرز ہولڈر اس سودی لین دین سے بری الذمہ ہوگا۔

۱۰۔ سودی لین دین کے خلاف آواز اٹھانا، اور منافع میں مخلوط سود کی مقدار معلوم کر کے اتنی مقدار صدقہ کرنا ضروری ہوگا۔

۱۱۔ اگر سود کمپنی کے منافع میں شامل ہو، اور حاصل شدہ سود کو کاروبار میں لگا کر کمپنی نے نفع کمایا ہے تو امام ابوحنیفہؒ اور امام محمدؒ کے نزدیک صرف اس سودی آمدنی کو صدقہ کرنا کافی نہیں ہوگا بلکہ اسے کاروبار میں لگا کر جو نفع کمایا ہے اس نفع کو بھی صدقہ کرنا ضروری ہے، اور امام ابو یوسفؒ کے نزدیک صرف اس سودی آمدنی کا صدقہ کرنا کافی ہوگا۔ اور طرفینؒ کا قول مفتی بہ ہے (ہدایہ ۳/ ۴۵۶)۔

۱۲۔ جس طرح ہمیشہ کے لئے کمپنی میں شرکت کی غرض سے اس کے شیئرز کے خریدنے کی اجازت ہے، اسی طرح تجارت، یعنی قیمت بڑھنے کی صورت میں بیچ دینے کے ارادے سے بھی شیئرز خریدنے کی اجازت ہے، اور ہر تخمین وقیاس آرائی ممنوع نہیں ہے، اس کو حضرت مولانا مفتی محمد تقی صاحب نے بہت اچھی طرح واضح فرمایا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

یہ بات جو مشہور ہوگئی ہے کہ تخمین وقیاس آرائی......... بذات خود حرام ہے، یہ بات غلط ہے، تخمین یہ ہے کہ یہ اندازہ لگایا جائے کہ کس چیز کی قیمت بڑھ رہی ہے اور کس کی قیمت کم ہو رہی ہے، جس کی قیمت کم ہونے کا اندیشہ ہو اس کو بیچ دیا جائے اور جس کی قیمت بڑھنے کی امید ہو اس کو رکھا جائے یہ بات بذات خود ممنوع نہیں، یہ تو ہر تجارت میں ہوتی ہے، جو بات ممنوع ہے وہ یہ ہے کہ بیع وشراء کی شرعی شرائط کی رعایت نہ کی جائے، مثلاً غیر مملوک کی بیع، یا غیر مقبوض کی بیع کی جارہی ہو یا قمار کی شکل بن رہی ہو، قمار دو باتوں سے مل کر بنتا ہے: ایک یہ کہ ایک طرف سے ادائیگی متعین ہو، اور دوسری طرف سے موہوم ہو۔ دوسری بات یہ کہ جس طرف سے ادائیگی ہوگئی ہے اس کی رقم دو باتوں میں دائر ہو، یا تو یہ رقم خود بھی ڈوب جائے گی یا اور رقم کو کھینچ لائے گی (اسلام اور جدید معیشت ر ۹۰)۔

۱۳، ۱۴۔ فیوچر سیل:

جس میں شیئر لینا دینا مقصود نہیں ہوتا ہے، محض نفع ونقصان برابر کرنا مقصود ہوتا ہے، یہ شرعاً جائز نہیں ہے۔ اسی طرح غائب سودے جس میں بیع کی اضافت مستقبل کی طرف کی جاتی ہے وہ بھی شرعاً جائز نہیں ہے، اس لئے کہ بیع کی وقت مستقبل کی طرف اضافت یا تعلیق باتفاق فقہاء ناجائز ہے، البتہ مستقبل میں بیع کا وعدہ کیا جاسکتا ہے لیکن وقت آنے پر بیع باقاعدہ کرنی ہوگی (حوالہ بالا۔ ص ر ۹۱)۔

۱۵، ۱۶۔ جب حاضر سودا ہو جانے کے بعد شیئرز کے تمام حقوق اور ذمہ داریاں خریدار کی طرف منتقل ہو جاتی ہیں اور وہ خریدار کے ضمان میں داخل ہو جاتے ہیں تو ان کی بیع سرٹیفکیٹ ہاتھ میں آنے سے پہلے بھی جائز ہے، البتہ عرف میں شیئرز پر قبضہ اس وقت سمجھا جاتا ہے جب سرٹیفکیٹ ہاتھ میں آجائے، نیز اس طرح سٹے کے کاروبار کی حوصلہ افزائی بھی ہوسکتی ہے، لہذا احتیاط کا تقاضہ یہ ہے کہ جب تک کمپنی میں شرکت کے سرٹیفکیٹ (کاغذی شیئر) پر قبضہ نہ ہو آگے فروخت نہ کئے جائیں جیسا کہ مفصلاً حضرت مولانا مفتی تقی عثمانی صاحب نے تحریر فرمایا ہے۔

(اسلام اور جدید معیشت ر ۹۱، ۹۲)۔

۱۷۔ جن شیئرز کی خرید وفروخت جائز ہے ان شیئرز کی خرید وفروخت میں بروکر اور ایجنٹ کی حیثیت سے کام کرنا جائز ہے، اور بنیادی طور پر حرام اشیاء کی کاروبار کرنے والی کمپنیوں کے شیئرز اور تمام کمپنیوں کے بونڈز کی خرید وفروخت میں بروکر کی حیثیت سے کام کرنا ناجائز اور حرام ہے۔

☆☆☆

شیئرز کی خرید وفروخت/شرعی حکم

مفتی نسیم احمد قاسمی [1]

۱۔ شیئرز سرٹیفکیٹ کی حیثیت:

کمپنی کی طرف سے جاری کردہ حصے خرید کر لوگ اپنا سرمایہ لگاتے ہیں تو خریدار کو کمپنی کی طرف سے سرٹیفکیٹ جاری کی جاتی ہے جو اس بات کی سند ہوتی ہے کہ اس شخص کا کمپنی میں لگائے ہوئے سرمایہ کے تناسب سے حصہ ہے۔ یہاں فقہی نقطہ نظر سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کسی بھی کمپنی کا خرید کردہ شیئر کمپنی میں شیئر ہولڈر کی ملکیت کی نمائندگی کرتا ہے یا یہ محض اس بات کی سند اور دستاویز ہے کہ اس نے اتنی رقم کمپنی کو دے رکھی ہے۔ اس سلسلہ میں علماء کی دو رائیں ہیں:

☆ بعض علماء کا خیال یہ ہے کہ کمپنی کا شیئر سرٹیفکیٹ کمپنی کے عروض اور اثاثوں میں شیئر ہولڈر کی ملکیت کی نمائندگی نہیں کرتا ہے، بلکہ یہ صرف اس بات کا وثیقہ اور دستاویز ہے کہ اس شخص نے اتنی رقم کمپنی کو دے رکھی ہے جیسے دیگر قرضہ جات کی دستاویزات ہوتی ہیں۔

☆ دوسری رائے جو راجح اور زیادہ قرین قیاس ہے، یہ ہے کہ شیئر سرٹیفکیٹ کمپنی کی املاک، جائداد اور اثاثوں میں شیئر ہولڈر کی ملکیت کی نمائندگی کرتا ہے، اور شیئر ہولڈر کی کمپنی کی املاک اور اثاثوں میں متناسب ملکیت ہوتی ہے جس کا تحریری ثبوت شیئر سرٹیفکیٹ ہے۔

مولانا تقی عثمانی نے اسی رائے کو راجح قرار دیا ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

کمپنی کے ظاہری تصور کے اعتبار سے اور اس موضوع پر جو کتابیں لکھی گئی ہیں ان کی روشنی میں واقعتاً یہ سمجھا جاتا ہے کہ شیئر ہولڈر کی کمپنی کے اثاثوں میں متناسب ملکیت ہوتی ہے، یہی وجہ ہے کہ اگر باہمی قرارداد سے کمپنی تحلیل ہوجائے تو شیئر ہولڈرس کو صرف ان کی لگی ہوئی رقم واپس نہیں ملتی بلکہ کمپنی کے اثاثوں کا متناسب حصہ ہر شیئر ہولڈر کو دیا جاتا ہے (اسلام اور جدید معیشت وتجارت ر ۸۵)۔

۲۔ کمپنی کے ابتدائی مرحلے میں شیئرز کی بیع:

کمپنی کی تشکیل کے ابتدائی مرحلے میں جبکہ کمپنی کے پاس صرف نقدی کی صورت میں سرمایہ جمع ہوتا ہے، املاک، مشینریاں، جامد اثاثے، سامان تجارت وغیرہ میں سے کچھ نہیں ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں اگر کمپنی اپنے شیئرز کی فروخت کا اعلان کرتی ہے تو گویا یہ نقد کی بیع نقد کے عوض ہے جسے اصطلاح فقہ میں ''بیع صرف'' سے موسوم کیا جاتا ہے۔ بیع صرف میں ثمن اور مبیع دونوں ہی اثمان اور نقود کی قبیل سے ہوتے ہیں۔ بیع صرف میں برابری اور نقد تبادلہ ضروری ہے، لہذا دس روپے کے شیئر کو صرف دس روپے کے عوض فروخت کرنا جائز ہوگا اور ادھار کی گنجائش نہیں ہوگی۔ شیئر کی خرید وفروخت کی صورت میں شیئر ہولڈر کی طرف سے صرف دستاویز کی ادائیگی ہوتی ہے جب کہ خریدار اس کے عوض میں نقد روپے ادا کرتا ہے۔ اس طرح دیکھا جائے تو طرفین کی جانب سے شیئرز کی خرید وفروخت میں نقد ادائیگی نہیں پائی جاتی ہے، اس لئے اس صورت کے جواز کی گنجائش نہیں ہوگی۔

۳۔ کمپنی کے وجود میں آجانے کے بعد شیئرز کی بیع:

جب کمپنی وجود میں آجاتی ہے تو اس کا اثاثہ مخلوط ہوتا ہے جس میں نقد، قابل وصول دیون، جامد اثاثے اور سامان تجارت وغیرہ شامل ہوتے ہیں، ایسی صورت میں جبکہ مجموعہ مال ربوی وغیر ربوی دونوں پر مشتمل ہے، اگر اس کے شیئرز کی بیع کی جاتی ہے تو اس کا شرعی حکم کیا ہوگا؟ اس سلسلہ میں

---

[1] سابق نائب ناظم، امارت شرعیہ، پٹنہ۔

حکم شرعی یہ ہے کہ ایسے مال کو جو ربوی وغیر ربوی سے مخلوط ہو خالص مال ربوی کے عوض فروخت کیا جائے ،مثلاً ایسی تلوار جس پر سونا لگا ہوا ہو، اسے دینار کے عوض فروخت کیا جائے ،تو اس میں ایک طرف تلوار ہے جو غیر ربوی ہے اور اس پر لگا ہوا سونا مال ربوی ہے، اسے دینار کے عوض فروخت کرنا گویا مال ربوی اور غیر ربوی کے مجموعہ کو خالص مال ربوی کے عوض فروخت کرنا ہے۔حضرت امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک ایسی صورت جائز ہے جب کہ حضرت امام شافعیؒ اس کو ناجائز قرار دیتے ہیں۔اسی طرح سے فقہاء نے دو درہم اور ایک دینار کے مجموعہ کی بیع کو ایک درہم اور دو دینار کے عوض جائز قرار دیا ہے۔لہذا کمپنی کے اثاثے کے مخلوط ہو جانے کے بعد شیئر ہولڈر کے لئے اپنے حصے کی بیع کمی بیشی کے ساتھ جائز ہوگی۔

۴۔ناجائز کاروبار کرنے والی کمپنیوں کے شیئرز خریدنا:

وہ کمپنیاں جن کے کاروبار بنیادی طور پر حرام ہیں، جیسے شراب اور خنزیر کے گوشت کی تجارت،خون اور دیگر حرام اشیاء کی تجارت اور ایکسپورٹ، یا بینکس اور سودی اسکیموں میں روپیہ لگا کر منافع حاصل کرنا۔ایسی کمپنیز کے شیئرز کی خرید وفروخت حرام اور ناجائز ہے۔

۵۔انکم ٹیکس سے بچنے کے لئے سودی قرض لینا:

ایسی کمپنیاں جو حلال کاروبار کرتی ہیں اور حرام کاروبار سے بچتی ہیں،صرف کاروباری مجبوری اور ملکی قانون کے پیش نظر سودی قرض لینے کی ضرورت پیش آجاتی ہے۔مثلاً انکم ٹیکس سے بچنے کے لئے سودی قرض لینا ایک ضرورت اور حاجت ہے۔ضرورت وحاجت کی بنیاد پر سودی قرض لینے کی اجازت دی گئی ہے۔علامہ ابن نجیمؒ نے الاشباہ والنظائر میں لکھا ہے:

ویجوز للمحتاج الاستقراض بالربح (الاشباہ والنظائر)۔

لہذا ان کمپنیوں کے لئے انکم ٹیکس سے بچنے کے لئے سودی قرض لینے کی گنجائش ہوگی اور ان کے شیئرز کی خرید وفروخت جائز رہے گی۔

۶۔ چونکہ حلال کاروبار کرنے والی کمپنیاں قانون ملکی کے تحت مجبور ہو کر اپنے سرمایہ کا مخصوص حصہ ریزرو بینک میں جمع کرتی ہیں یا بانڈس خریدتی ہیں،لہذا اس کی وجہ سے ان کے کاروبار میں حرمت پیدا نہیں ہوگی اور ان کے شیئرز کی خرید وفروخت جائز رہے گی،البتہ ان کمپنیوں کو ریزرو بینک یا بانڈس خریدنے کی وجہ سے جو سودی رقم ملے گی اس رقم کا استعمال کمپنی کے مصارف میں جائز نہیں ہوگا بلکہ فقراء مسلمین پر بلانیت ثواب تصدق ضروری ہوگا یا پھر رفاہ عام کے کاموں میں بھی اسے صرف کیا جاسکتا ہے۔اگر کمپنی غیر مسلم ہونے کی صورت میں سودی رقم کو اس کے مصارف میں صرف نہ کرے تو پھر مسلم شیئر ہولڈرس کی ذمہ داری ہوگی کہ اپنے حصہ میں آئی ہوئی رقم کو بلانیت ثواب صدقہ کردیں یا رفاہ عام کے کاموں میں لگادیں۔

۷۔سودی قرض لینے کی صورت میں منافع کی شرعی حیثیت:

سودی قرضہ ضرورت وحاجت اور قانون ملکی کے تحت مجبور ہو کر حاصل کیا جائے یا محض کاروبار کو فروغ دینے کی خاطر، ہر دو صورت میں قرض سے حاصل ہونے والے منافع جائز ودرست قرار پائیں گے، کیونکہ قرض لی ہوئی رقم میں کسی طرح کا خبث نہیں پایا جاتا،اور قرض لینے والا قرض کے ذریعہ حاصل کی گئی رقم کا مالک قرار پاتا ہے،لہذا اس رقم سے حاصل شدہ نفع بھی جائز اور مباح ہوگا۔البتہ دوسری صورت میں جبکہ سودی قرض بلا حاجت شرعیہ محض کاروبار کو فروغ دینے کی خاطر حاصل کیا گیا تو کمپنی کا عملہ اصالۃً استقراض بالربح کے عقد حرام کے ارتکاب کی وجہ سے اور شیئر ہولڈرس وکالۃً اس کے ارتکاب کی وجہ سے عنداللہ گنہ گار ہوں گے۔فقہاء کی صراحت سے معلوم ہوتا ہے کہ سودی رقم پر بھی قبضہ کے بعد ملکیت ثابت ہو جاتی ہے تو سودی قرض پر قرض لینے والے کی بدرجہ اولی ملکیت ثابت ہو جائے گی (دیکھئے:البحر الرائق ۱۲۵/۶)۔

۸۔کمپنی کے عملہ کی حیثیت:

کمپنی کا عملہ جسے بورڈ آف ڈائرکٹرس کہا جاتا ہے، کی حیثیت فی الجملہ مالکان حصص کے وکیل کی ہے،اور وکیل کا عمل مؤکل کا عمل قرار پاتا ہے۔ لہذا کمپنی کے عملہ کا عمل اور ان کا تصرف مالکانہ حصص کا تصرف اور عمل سمجھا جائے گا،اور شرعاً ان کا فعل مالکان حصص کی طرف منسوب ہوگا۔

۹۔ شیئر ہولڈر کا سودی قرض لینے سے اختلاف کردینا کافی ہوگا:

اصولی طور پر وکیل کے افعال مؤکل کی طرف منسوب ہوتے ہیں، تاہم اگر کوئی شیئر ہولڈر سودی قرض لینے سے اپنی ناراضگی اور اختلاف کا اظہار واعلان کردے تو یہ اظہار واعلان اس کے بری الذمہ ہونے کے لئے کافی ہوگا۔

۱۰۔ کمپنی کے منافع میں سے سودی رقم نکال دینا کافی ہوگا:

اگر کمپنی کا بنیادی کاروبار ہی حرام اشیاء کی تجارت ہو، سودی قرضہ جات دے کر سود حاصل کرنا ہو، تب تو ایسی کمپنیوں کے حصص اور شیئرز کی خریداری جائز نہیں ہوگی، البتہ اگر کمپنی کا بنیادی کاروبار تو حلال ہولیکن قانونی پیچیدگی کے تحت کچھ سرمایہ ڈپازٹ (Deposit) کرنا پڑتا ہو یا بانڈز (Bonds) خریدنے پڑتے ہوں جس سے کمپنی کو سودی رقم بھی حاصل ہوتی ہو، ایسی صورت میں شیئر ہولڈرس کا اپنے منافع میں سے سودی رقم نکال کر بلا نیت ثواب فقراء ومساکین پر صدقہ کردینا یا رفاہ عام کے کاموں میں صرف کردینا ان کے بری الذمہ ہونے کے لئے کافی ہوگا (دیکھئے: بدائع الفوائد لابن القیم ۲/ ۲۷۵)۔

۱۱۔ اگر کمپنی کے منافع میں سود شامل ہو تو اسے کاروبار میں لگا کر نفع حاصل کرنے کا کیا حکم ہوگا؟

اگر کمپنی کے منافع میں سود بھی شامل ہو اور حاصل ہونے والی سودی رقم کو کاروبار میں لگا کر نفع حاصل کیا گیا ہو تو ایسی صورت میں مال حلال کے ساتھ مال حرام بھی مخلوط ہو گیا ہے، اس لئے جتنا فیصد سود کل آمدنی میں مخلوط ہو گیا ہے شیئر ہولڈر کے لئے اسی تناسب سے ملنے والے منافع سے سودی رقم وضع کرکے بلا نیت ثواب فقراء ومساکین مسلمین پر صدقہ کردینا یا رفاہ عام کے کاموں میں صرف کردینا کافی ہوگا، اور باقی ماندہ نفع اس کے لئے حلال و درست قرار پائے گا۔

۱۲۔ شیئرز کی تجارت:

حلال کاروبار پر مبنی شیئرز کی تجارت فی نفسہ جائز ودرست ہے اور شیئرز کی بیع درحقیقت شیئر ہولڈر کے اس حصہ کی بیع ہے جو سرمایہ کے تناسب سے کمپنی کے نقود، قابل وصول دیون، جامد اثاثے، سامان تجارت اور ان چیزوں سے حاصل ہونے والے منافع میں اسے پہونچتا ہے جس کی نمائندگی شیئر سرٹیفکیٹ کرتی ہے۔ پس وہ اپنے موجود ومملوک حق کی بیع کرتا ہے نہ کہ معدوم وغیر مملوک کی۔ حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ شیئرز کی بیع کو "بیع حظوظ ائمہ" پر قیاس کرتے ہوئے اس کے جواز کی صراحت فرمائی ہے (امداد الفتاوی ۳/ ۴۹۵)۔

اب رہا یہ سوال کہ شیئرز کی تجارت میں تجار حضرات تخمین وقیاس سے کام لیتے ہیں۔ شیئرز کی خریداری کے وقت ان کی نیت یہ ہوتی ہے کہ قیمت بڑھنے کی صورت میں نفع کے ساتھ فروخت کردیں گے یا جب شیئرز کی قیمت کم ہوگی تو خرید کر اپنے پاس رکھ لیں گے پھر قیمت بڑھنے کی صورت میں فروخت کردیں گے۔ تو اس سے شیئرز کی تجارت کے جواز میں فرق نہیں پڑے گا، اس لئے کہ مطلقاً تخمین وقیاس عقود ومعاملات میں ممنوع نہیں ہے اور نہ ہی تجارتیں عام طور پر اس قسم کے تخمین وقیاس سے پاک ہوتی ہیں۔

۱۳۔ فیوچر سیل کا حکم:

شیئر مارکیٹ میں ایک سودا جسے فیوچر سیل (Future Sale) اور عربی میں بیاعات مستقبلیات کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اس معاملہ کا مقصد شیئرز کی خریداری نہیں ہوتی ہے بلکہ بڑھتے گھٹتے دام کے ساتھ نفع نقصان کو برابر کرلینا مقصود ہوتا ہے۔ اس صورت معاملہ میں نہ تو خریدار کی طرف سے قیمت کی ادائیگی ہوتی ہے اور نہ ہی بائع کی طرف سے مبیع کی حوالگی، بلکہ محض کاغذی کارروائی ہوتی ہے، لہذا فیوچر سیل جائز نہ ہوگا۔

۱۴۔ غائب سودے کی بیع کا حکم:

غائب سودے جن میں حقیقۃً بیع وشراء نہیں ہوتی ہے بلکہ بیع کی اضافت مستقبل کی طرف کی جاتی ہے، اس طرح کا معاملہ بھی شرعاً جائز نہیں ہے، کیوں کہ خرید وفروخت ان عقود ومعاملات کی قبیل سے ہے جن کی اضافت مستقبل کی طرف کرنا یا تعلیق باتفاق فقہاء ناجائز ہے۔ البتہ مستقبل میں بیع کا

وعدہ کیا جاسکتا ہے لیکن وقت آنے پر باضابطہ بیع کے معاملات طے کرنے پڑیں گے۔

۱۵۔ خرید کردہ شیئر کی سرٹیفکیٹ حاصل کرنے سے پہلے بیع:

اس سوال کے جواب کا دارومدار اس پر ہے کہ یہ معلوم کیا جائے کہ اس صورت میں بیع قبل القبض لازم آتی ہے یا نہیں؟ اگر یہ بیع قبل القبض ہے تو اس کے جواز کی گنجائش نہیں ہوگی، اور اگر بیع قبل القبض نہیں ہے تو یہ صورت جائز ہوگی۔ اب رہا سوال کہ یہ بیع قبل القبض ہے یا نہیں؟ تو یہ تو ظاہر ہے کہ شیئر درحقیقت مال نہیں ہے بلکہ کمپنی کے املاک میں متناسب حصہ داری سے عبارت ہے اور شیئر سرٹیفکیٹ اس حصہ داری اور کمپنی کے اثاثے اور املاک میں شیئر ہولڈر کی شرکت کا تحریری ثبوت ہے، لہذا شیئرز کی بیع کی صورت میں مبیع شیئرز سرٹیفکیٹ نہیں بلکہ کمپنی کی املاک واثاثے کا ایک مشاع حصہ ہے۔ چونکہ وہ حصہ جو مبیع ہے مشاع ہے، اس لئے اس پر حقیقی قبضہ کا تحقق مشکل ہے، اس لئے اس میں معنوی قبضہ ہی معتبر ہونا چاہئے، اور عرف عام میں شیئرز پر قبضہ اسی وقت تسلیم کیا جاتا ہے جب خریدار کے ہاتھ میں شیئر سرٹیفکیٹ آ جائے۔ لہذا میری رائے یہ ہے کہ صورت مسئولہ میں خریدار کے نام شیئر سرٹیفکیٹ کی منتقلی سے پہلے شیئر پر اس کا حقیقی قبضہ نہیں سمجھا جائے گا اور خریدار کے لئے شیئرز کی بیع جائز نہیں ہوگی۔ ہر شئے پر اس کی خاص نوعیت کے اعتبار سے قبضہ کی نوعیت مختلف ہوتی ہے، جس کا مدار عرف وعادت پر ہوتا ہے، یعنی عرف وعادت میں جس چیز پر قبضہ کی جو نوعیت سمجھی جاتی ہو وہی معتبر ہوگی، ہر صورت میں قبضہ حسی ضروری نہیں ہوگا۔

۱۶۔ سرٹیفکیٹ کے حصول سے پہلے شیئر کی بیع:

جب تک خریدار شیئر سرٹیفکیٹ حاصل نہ کرلے اور اسے اپنے نام منتقل نہ کرالے اس وقت تک شیئر پر خریدار کا حقیقی قبضہ تسلیم نہیں کیا جائے گا، اور اگر قبضہ سے پہلے خریدار کسی دوسرے شخص کے ہاتھ شیئرز کی بیع کرتا ہے تو یہ بیع حقیقی قبضہ کے تحقق سے پہلے ہوگی جو شرعاً جائز نہیں ہے۔

۱۷۔ بروکر کی اجرت کا حکم:

جائز اور حلال کاروبار پر مبنی شیئرز کی خرید وفروخت میں کسی مسلمان کے لئے بروکر بننا اور اس پر اجرت لینا درست وجائز ہے، ایسے درمیانی اشخاص کو جو خرید وفروخت کے معاملات میں واسطہ بنتے ہیں، فقہاء کی اصطلاح میں دلال کہتے ہیں۔ دلالی کی اجرت کو جائز قرار دیا گیا ہے۔ چنانچہ بخاری کی شرح فتح الباری میں ہے کہ:

ابن سیرین، عطاء، ابراہیم اور حسن سے منقول ہے کہ ان حضرات کے نزدیک دلالی کی اجرت لینے میں کوئی حرج نہیں ہے (فتح الباری لابن حجر عسقلانی ۹/ ۴۱۴)۔

علامہ شامی نے اس سلسلہ میں تحریر کیا ہے کہ: تجب الدلالة على البائع أو المشتري أو عليهما بحسب العرف. بائع اور خریدار یا دونوں پر عرف ورواج کے مطابق دلالی کی اجرت واجب ہوگی۔

لہذا صورت مسئولہ میں کسی مسلمان کے لئے اسٹاک ایکسچینج میں بروکر بننا اور اس کی اجرت لینا جائز ودرست ہوگا۔

☆☆☆

شیئرز......فقہی تناظر میں

مولانا ڈاکٹر ظفر الاسلام صدیقی (شیخ الحدیث و پرنسپل، دار العلوم مئو)

۱۔ احقر کی رائے یہ ہے کہ شیئر خریدنے والے کا مقصد عموماً یہی ہوتا ہے کہ وہ کمپنی میں بحیثیت شیئر ہولڈر شرکت کرے اور یہ تجار کے مقصد کے زیادہ قریب بھی ہے جیسا کہ حضرت مولانا تقی عثمانی صاحب تحریر فرماتے ہیں: "یہ شیئر در حقیقت کسی کمپنی کے اثاثوں میں شیئر ہولڈر کی ملکیت کے ایک متناسب حصے کی نمائندگی کرتا ہے (فقہی مقالات رص ۱۴۳)۔

۲۔ اولاً دونوں جانب نقد کی صورت میں خرید و فروخت کے متعلق ائمہ اربعہ کا مسلک پیش خدمت ہے، اسی کی روشنی میں شیئرز کے بیع و شراء کا مسئلہ بھی واضح ہو جائے گا۔

حضرت امام مالکؒ کے نزدیک ایک پیسہ کی بیع دو پیسوں سے جائز نہیں، کیوں کہ ان کے نزدیک علت ربا ثمنیت ہے، خواہ حقیقی ہو یا عرفی بہر دو نوع تفاضل جائز نہیں، اس کی دلیل المدونۃ الکبری کی عبارت "لأن مالکا قال لا یجوز فلس بفلسین" ہے (المدونۃ الکبری ۷ ر ۱۰۴)۔

حضرت امام ابوحنیفہؒ و ابو یوسفؒ کے نزدیک یہ کمی و بیشی صحیح ہے، کیوں کہ ان کے نزدیک سکے خلقی طور پر ثمن نہیں ہیں اصطلاحاً ثمن ہیں، اس لئے متعاقدین کو چاہئے کہ ان سکوں کی تعیین کر کے ان کی ثمنیت اصطلاحی باطل کر دیں، ایسا ہو جانے کے بعد ان سکوں کا درجہ سامان و عروض کا ہو جائے گا، بنا بریں قلت و زیادت جائز ہوگی۔

حضرت امام محمدؒ کے نزدیک قلت و زیادت موجب للربا ہوگی، کیوں کہ جب یہ سب کے اصطلاحی ثمن قرار دیئے جاچکے تو صرف بائع اور مشتری کے ثمنیت باطل کرنے سے باطل نہ ہوگی تا وقتیکہ تمام لوگ اسے باطل قرار نہ دے دیں۔

حضرت امام احمد بن حنبلؒ کے نزدیک قلت و زیادت جائز ہے، کیوں کہ سکے عددی ہیں اور علت ربا وزن ہے۔ "إذا فات الشرط فات المشروط" یہ پہلا قول ہے۔

امام مذکور کا دوسرا قول عدم جواز کا ہے، جس کی دلیل یہ ہے کہ سکے فی الحال تو عددی ہیں لیکن اصلاً دھات ہونے کی وجہ سے وزنی ہیں، اس لئے دونوں جائز نہیں۔

حضرت امام شافعیؒ کے نزدیک ربا کی علت خلقی ثمنیت ہے اور یہ علت یہاں مفقود ہے، اس لئے کمی و بیشی کے ساتھ معاملہ کرنا درست ہے۔

اس تفصیل کے بعد عرض ہے کہ اگر اس کمپنی یا فیکٹری میں جس کے شیئرز خریدے گئے ہیں کچھ بھی منجمد اثاثے خواہ بلڈنگ کی شکل میں ہوں یا مشین وغیرہ کی شکل میں، ابھی تک خریدے نہیں گئے ہیں یعنی ابھی دونوں جانب نقد ہی نقد ہے، تو اس صورت میں اس کی بیع و شراء کمی و بیشی کے ساتھ جائز نہیں، سو روپے کا شیئر سو ہی روپے میں فروخت کیا جاسکتا ہے کمی و بیشی موجب للربا ہوگی۔

حضرت مولانا مفتی تقی عثمانی صاحب فرماتے ہیں: جتنے لوگوں نے اس کمپنی میں اپنی رقم سبسکرائب (Subscribe) کی ہے اس رقم سے ابھی تک کوئی سامان نہیں خریدا گیا اور نہ اس سے کوئی بلڈنگ بنائی گئی اور نہ کوئی مشین خریدی گئی اور نہ ہی کوئی اثاثہ وجود میں آیا بلکہ ابھی وہ تمام پیسے نقد کی شکل میں ہیں، تو اس صورت میں دس روپیہ کا شیئر دس روپئے کی نمائندگی کرتا ہے، لہذا جب دس روپئے کا شیئر دس روپئے کی نمائندگی کرتا ہے تو اس صورت میں اس شیئر کو گیارہ روپئے میں یا نو روپئے میں فروخت کرنا ہو جائے گا جو سود ہو جانے کی وجہ سے قطعاً جائز نہیں (فقہی مقالات رص ۱۴۵)۔

۳۔ کمپنی کے وجود میں آجانے کے بعد بالفاظ دیگر اثاثہ و نقد کے پائے جانے کی صورت میں اس شیئر کی بیع و شراء کمی و بیشی کے ساتھ جائز ہے۔ کیوں کہ اب شیئر مرکب ہو گیا جس میں اموال ربویہ و غیر ربویہ دونوں پائے جاتے ہیں، اس لئے دس روپے کا شیئر دس روپیہ سے زائد میں فروخت کیا جاسکتا ہے، دس روپئے تو دس روپئے کے مساوی ہو جائے گا اور زیادتی بلڈنگ و اثاثہ وغیرہ کے بالمقابل ہو جائے گی جس میں شرعاً کوئی قباحت نہیں۔

۴۔ اگر کمپنی کسی مسلمان کی ہے اور وہ حرام کاروبار میں ملوث ہے (جس کی بہت ساری صورتیں ہیں چند صورتیں سوال میں مذکور بھی ہیں) تو اس کمپنی کے شیئرز خریدنا جائز نہیں۔ حضرت مولانا تقی عثمانی صاحب تحریر کرتے ہیں:

ایسی کمپنی کے شیئرز لینا کسی حال میں جائز نہیں، نہ ابتدائی جاری (Float) ہونے کے وقت لینا جائز ہے اور نہ ہی بعد میں اسٹاک مارکیٹ سے لینا جائز

ہے (فقہی مقالات رص ۱۴۴)۔

کمپنی غیر مسلم کی ہو اور یقین سے معلوم ہو کہ وہ سودی لین دین نہیں کرتا تو اس کی خرید و فروخت صحیح ہے، اور اگر اس کی بابت علم نہیں تو اس کی خرید و فروخت مکروہ تحریمی ہوگی۔ کراہت تحریمی کی وجہ یہ ہے کہ ان کے یہاں سودی کاروبار میں کوئی قباحت نہیں۔

۵۔ بنیادی کاروبار حلال ہوتے ہوئے بعض ممالک میں خصوصاً ہندوستان میں اضطراراً سود لینا پڑتا ہے، اگر ایسا نہ کیا جائے تو نت نئے مسائل سے دوچار ہونا پڑتا ہے جو تجار سے مخفی نہیں، اس لئے اسے حاجیات کی قبیل سے مان کر اس طرح کی کمپنیوں سے شیئرز خریدے جاسکتے ہیں۔

۶۔ اس سوال کا جواب بھی احقر کے نزدیک وہی ہے جو سوال نمبر ۵ کے ضمن میں گذرا۔

۷۔ اگر سارا دارومدار سودی قرض پہ ہے، اپنی جائز اور حلال کمائی کی اکثریت نہیں، تو اس صورت میں سود سے حاصل ہونے والی رقم ظاہر ہے سود ہے، بناء فاسد علی الفاسد فاسد ہے، وہ مفید للملک کیسے ہوسکتی ہے۔

۹۔ کمپنی کی میٹنگ میں اگر شیئر ہولڈر اس سودی لین دین کے خلاف آواز اٹھائے تو وہ اپنے فرض سے سبکدوش ہو جائے گا، حکیم الامت حضرت تھانوی، حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب، اور مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب کی بھی یہی رائے ہے۔

۱۰، ۱۱۔ پہلے اور دوسرے سوال میں جزوی فرق ہے مگر جواب دونوں کا ایک ہی ہے، جتنی بھی سودی رقم ہو باقاعدہ اہتمام کے ساتھ حساب لگا کر بلا نیت ثواب صدقہ کردیں۔ حضرت مولانا تقی عثمانی صاحب فرماتے ہیں: "جب منافع تقسیم ہو تو اس وقت جتنا نفع کا جتنا حصہ سودی ڈپازٹ سے حاصل ہوا ہے اس کو صدقہ کردے" (فقہی مقالات رص ۱۵۱)۔

۱۲۔ شیئرز کی خرید و فروخت، شرائط کا لحاظ کرتے ہوئے صحیح ہے، ہر کوئی تاجر یہ سوچ کر اور اس غالب ظن سے خرید و فروخت کرتا ہے کہ آئندہ اسے نفع حاصل ہو گا۔ ہاں نفع کی شرط کے ساتھ بیع جائز نہیں۔

۱۳۔ یہ صورت قطعاً حرام ہے اور اس کا شمار بھی سٹہ میں ہوگا جو کہ ناجائز ہے۔ حضرت مولانا تقی عثمانی صاحب رقمطراز ہیں:

لیکن اس خرید و فروخت کو درست کہنے کی دشواری اس سٹہ بازی کے وقت پیش آتی ہے جو اسٹاک ایکسچینج کا بہت بڑا اور اہم حصہ ہے، جس میں بسا اوقات شیئرز کا لین دین بالکل مقصود نہیں ہوتا بلکہ آخر میں جا کر آپس کا فرق (Deference) برابر کر لیا جاتا ہے اور شیئرز پر نہ تو قبضہ ہوتا ہے اور نہ ہی قبضہ پیش نظر ہوتا ہے، اس لئے جہاں یہ صورت ہو کہ قبضہ بالکل نہ ہو اور شیئرز کا نہ لینا مقصود ہو اور نہ دینا مقصود ہو بلکہ اس طرح سٹہ بازی کر کے آپس کے ڈیفرنس کو برابر کر لینا مقصود ہو تو یہ صورت بالکل حرام ہے اور شریعت میں اس کی اجازت نہیں (فقہی مقالات رص ۱۵۲)۔

۱۴۔ ایک تو سودا وہ ہے جس میں بیع کی نسبت کسی بھی زمانہ کی طرف کی جائے وہ باطل یا فاسد ہے، جیسے لبن فی الضرع، سمک فی الماء، طیر فی الهواء، سمن فی اللبن، حبل الحبلة یا ملاقیح ومضامین وغیرہ کی بیع۔ کیوں کہ ان تمام صورتوں میں مبیع معدوم ہے، جہالت فاحشہ کا وجود ہے اور قدرت علی تسلیم المبیع ناممکن ہے۔

دوسرا سودا وہ ہے جو موجود تو ہے مگر حاضر نہیں غائب ہے، اب اس کی دو صورتیں ہیں: ایک تو وہ جسے پہلے سے دیکھا جاچکا ہے اور اس کے اوصاف بھی معلوم ہیں تو اس صورت میں بصیغۃ المتعارف اس کی بیع صحیح ہو جائے گی اور اگر دیکھا نہیں ہے تو بھی امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک اس کی بیع صحیح ہوگی اور اسے خیار رؤیت حاصل ہوگا اور عدم رؤیت کی وجہ سے جو غرر یسیر پیدا ہوا تھا وہ خیار رؤیت سے مرتفع ہو جائے گا، کیوں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: "من اشتری مالم یرہ فهو بالخیار إذا رآہ"۔

۱۵۔ قبضہ کی اولاً دو قسمیں ہیں: (۱) حقیقی (۲) حکمی

حقیقی قبضہ تو حبس اور تسلیم سے ہوگا، اور حکمی قبضہ استیلاء، تمکن، اشارہ، تخلیہ و تمییز سے کتاب اور سنت و نصوص فقہاء سے معلوم ہوتا ہے کہ قبضہ مبیع کے اختلاف سے بدلتا رہتا ہے، اور جہاں کا جیسا تعامل ہوگا حجت قرار پائے گا۔

۱۶۔ راقم کے خیال میں جب تک خریدار شیئر سرٹیفکیٹ حاصل نہ کرلے اس وقت تک شیئر فروخت نہیں کرسکتا، گو کہ معاملہ متعاقدین کے درمیان شیئر کی قیمت ادا کرنے ہی سے ہو گیا، مگر تمامیت بیع موقوف ہوگی ڈلیوری کی وصولیابی پر، اور یہی ڈلیوری قبضہ حقیقی کے ممکن نہ ہونے کی صورت میں قبضہ حکمی کے مرادف ہوگی۔

۱۷۔ شیئرز کی وہ خرید و فروخت جو جائز اور درست ہے اس میں بروکر کی حیثیت سے کام کرنا صحیح ہے، اس کے ماسوا میں نہیں۔

☆☆☆

شرعی اعتبار سے شیئرز کی حیثیت

مولانا سلطان احمد اصلاحی[1]

۱۔ کسی کمپنی کے خرید کردہ شیئر کے مسئلے میں یہی بات زیادہ راجح معلوم ہوتی ہے کہ وہ محض رقم کی دستاویز نہ ہو کر اس کمپنی میں شیئر ہولڈر کی ملکیت کی نمائندگی کرتا ہے۔ اور وہ نقد کے ساتھ کمپنی کے اثاثوں اور اس کی املاک میں حسب تناسب حصہ دار ہوتا ہے۔ اس طرح اس پر بیع صرف کے احکام وارد نہ ہونے چاہئیں۔ دیوالیہ ہونے کی صورت میں کمپنی کے اثاثے قرق نہ کر کے اس کی املاک کی ضبطی سے اس کے قرضے ادا کئے جانے کے سلسلے میں کہا جاسکتا ہے کہ موجودہ قانون کی یہ دفعہ بحیثیت مجموعی کمپنی کے مفاد کے مدنظر رکھی گئی ہے، جس سے کہ کمپنی کے دیگر شرکاء کے لئے اس کے دیوالیہ ہوئے حصے کو دوبارہ بحال کرنے میں غیر معمولی دقتوں اور دشواریوں کا سامنا نہ کرنا پڑے۔

۲۔ کمپنی قائم کرتے وقت شیئرز کا جو اعلان کیا جاتا ہے جبکہ اس وقت اس کے پاس کچھ بھی املاک نہیں ہوتیں، اس وقت کمپنی کے خرید کردہ شیئر کی بیع پر بیع صرف کے احکام وارد ہوں گے، یہ اصلاً نقد کا نقد سے تبادلہ ہوگا، اور اس پر کسی قسم کا تفاضل جائز نہ ہوگا، ایک شیئر جتنی رقم جمع کر کے خریدا گیا ہے اسے اتنی ہی رقم پر فروخت کیا جانا ضروری ہوگا۔

۳۔ کمپنی کے وجود میں آجانے کے بعد اس کے مخلوط اثاثہ میں جس میں ربوی اور غیر ربوی دونوں طرح کے مال کی شمولیت ہوتی ہے، اس کی نقد کے ساتھ فروخت جائز ہوگی۔ ربا اور انٹرسٹ کا حوالہ اس سے آگے بھی آرہا ہے اس لئے ابتداءً ہی اس کے سلسلے میں چند نکات کی وضاحت مناسب معلوم ہوتی ہے جس سے کہ آئندہ اس کی تکرار کی ضرورت نہ رہے۔

(الف) دراصل آج کے دور میں بینک کے انٹرسٹ کے مسئلہ پر ہی نئے سرے سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔ قرآن وسنت میں حرام کردہ ربا کا سخت گیر اطلاق ہر حال میں اس پر درست معلوم نہیں ہوتا۔ بینک کا کردار بہر صورت صرف امانت دار ہی کا نہیں ہوتا بلکہ آج کے دور میں اس کا اصل کردار مضارب در مضارب کا ہے۔ جس میں وہ اب تک کی معروف اسلامی مضاربت کے متناسب منافع کے بجائے جمع کردہ بالواسطہ کاروبار میں لگی رقم پر متعین فیصد پر منافع دینے کا اہتمام کرتا ہے۔ آج علماء کی ایک مقتدر جماعت جب مضاربت کی اس صورت کو جائز قرار دیتی ہے (تفصیل کے لئے دیکھئے: اسلامک فقہ اکیڈمی کے اجلاس گزشتہ میں ہمارا پیش کردہ مقالہ "شریعت کا اصول عرف وعادت اور موجودہ حالات میں اس کی معنویت") تو اس مضاربانہ کردار کے ساتھ بینک کے انٹرسٹ کو مطلق حرام وممنوع ربوا کے ہر حال میں قائم مقام رکھنا مناسب نہیں معلوم ہوتا۔

(ب) دوسری بات فقہ کے اس جزئیہ کی ہے جسے بالکل ہی نظر انداز کیا جارہا ہے، اور وہ یہ کہ: لا ربوا بین المسلم والحربی فی دار الحرب (ھدایہ ۳؍۷۰، نیز شرح السیر الکبیر ۳؍۱۱۲)۔

ہندوستان جیسے ملکوں کو آج من کل الوجوہ "دار الحرب" تسلیم نہ بھی کیا جائے تب بھی معاملات ربویہ کی تعیین وتحقیق میں اس کا کچھ نہ کچھ لازمی اثر پڑنا چاہئے۔ جبکہ دوسرے موقع پر حضرت امام اعظم کی طرف سے اس پر اضافہ ہے کہ دار الحرب میں اسلام لائے دو مسلمانوں کے درمیان اس معاملے پر بھی اسی حکم کا اطلاق ہوگا۔

وقال أبو حنیفة: لا یجری الربا بین مسلم وحربی فی دار الحرب، وعنه فی مسلمین أسلما فی دار الحرب لا ربا بینهما (المغنی لابن قدامه ۴؍۴۵)۔ اس کی دلیل وہ حضرت مکحولؒ کی روایت سے دیتے ہیں جس کے مطابق نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: لا ربا بین المسلمین وأهل الحرب فی دار الحرب (مغنی ۴؍۴۵، ۴۶)۔

---

[1] ادارہ تحقیق وتصنیف اسلامی، دودھ پور، علی گڑھ۔

دور حاضر میں دعوتِ اسلامی کی مطلوب مصالح کے مدنظر فقہ اسلامی کی اس رخصت کو چاہے ضرورت سے زیادہ وسعت نہ دی جائے لیکن مسائل کی توجیہ تحقیق میں اس کو بالکل نظر انداز کر دینا بھی مناسب نہیں معلوم ہوتا۔

۴۔ ہر چند کہ دور اول میں ذمی سے خنزیر کی تو نہیں لیکن شراب کی قیمت سے جزیہ وصول کرنے کی نظیر موجود ہے (شرح السیر الکبیر للسرخسی ۴/۲۲۷-۲۲۸) تاہم وہ کمپنیاں جن کا کاروبار خالص شراب اور خنزیر کے حرام پر مشتمل ہو، ایسی کمپنیوں کے شیئرز کی خرید وفروخت درست نہیں معلوم ہوتی۔

۵۔ حلال کاروبار کی کمپنیاں جنہیں انکم ٹیکس وغیرہ سے بچنے کے لئے مجبوراً بینک سے سودی قرض لینا پڑتا ہے ان کے شیئرز کا خریدنا جائز ہے۔

۶۔ دوسری حلال کاروبار کی کمپنیاں جن کو قانونی تقاضوں کی تکمیل کی غرض سے سرمایہ بینک میں جمع کرنا پڑتا ہے یا سیکورٹی بانڈز خریدنے پڑتے ہیں، جن کی وجہ سے انہیں سود بھی ملتا ہے، ایسی کمپنیوں کا شیئرز خریدنا جائز ہے۔

۷۔ جواب نمبر ۲ کی تنقیح سے اس کا جواب بھی صاف ہے، سودی قرضہ سے حاصل ہونے والا منافع جائز ہے۔ یہ قرض مفید ملک ہے اور اس سے حاصل ہونے والی آمدنی حلال ہوگی۔

۸۔ ہاں! کمپنی کا بورڈ آف ڈائرکٹرس شیئر ہولڈرس کا وکیل ہے، اور اس کا عمل شیئر ہولڈرس کا عمل سمجھا جائے گا۔

۹۔ جواب نمبر ۲ کی تنقیح کے حوالہ سے بینک سے سودی قرضے کی سودی نوعیت ہی جب محل نظر قرار پائی تو پھر اس اختلاف کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی ہے۔ اپنے مضاربانہ کردار سے جس طرح جمع شدہ رکاروبار میں لگائی گئی رقم پر بینک متعین فیصد کا منافع دیتا ہے، ایسا ہی منافع وہ دوسرے ان لوگوں سے وصول کرتا ہے جنہیں ملنے والی رقم کا ایک نام ''قرض'' دیا جاتا ہے، جبکہ بینک اسے عملاً مضاربت کی صورت قرار دیتا ہے۔

۱۰۔ جواب نمبر ۲ کے حوالہ سے صدقہ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں، یہ اس کی جائز آمدنی ہے جسے وہ بے کھٹک زیر استعمال لاسکتا ہے۔

۱۱۔ تنقیح محولہ جواب نمبر ۲ سے اس کا جواب بھی واضح ہے۔ صدقہ کی ضرورت نہیں، سود کی روایتی شمولیت کے باوجود اس کی آمدنی جائز ہے۔

۱۲۔ شیئرز کی تجارت جائز ہے۔ کاروبار کا مطلب ہی ہے کہ آدمی منافع کا تخمینہ اور اس کی پیش بینی کر سکے، جس کے اندر یہ صلاحیت نہیں وہ کاروبار کرنے کا اہل نہیں۔ یہ تخمین اور قیاس آرائی تو ہر کاروبار میں شامل ہوتی ہے، اس لئے شیئرز کی تجارت کی پیش بینی اور قیاس آرائی شریعت میں ممنوع تخمین وقیاس آرائی کے دائرے میں نہیں آتی۔

۱۳۔ فیوچر سیل اپنی اس تفصیل کے ساتھ ناجائز ہے۔ یہ دراصل خالص قمار کی صورت ہے جسے ''بیاعات مستقبلیات'' کا خوبصورت نام دے دیا گیا ہے۔ یہ نہ بیع صرف ہے جس میں نقد کا نقد سے تبادلہ ہوتا ہے، نہ یہ شیئر کے دائرے میں آتا ہے جس میں اثاثے اور نقد کی خرید وفروخت نقد سے کی جاتی ہے۔ پس اس کے لئے تیسری صورت قمار کی ہی رہ جاتی ہے جو شریعت میں صراحۃً ممنوع ہے۔

۱۴۔ غائب سودا جس میں بیع کی نسبت مستقبل کی طرف کی جائے نادرست ہے (دیکھئے: مغنی ۴/۲۸۸)۔

۱۵۔ شیئرز کے نقد سودے میں قبضہ کے تحقق کے لئے شیئرز سرٹیفکیٹ کا فوری طور پر قبضے میں آجانا ضروری نہیں ہے، سودے کی تکمیل کے بعد عرف میں معتبر شیئر پر جو معنوی قبضہ حاصل ہو جاتا ہے عقد کی صحت کے لئے وہ کافی ہے، قبضہ حسی پر اصرار کی کوئی ضرورت نہیں۔

۱۶۔ جب اس طرح شیئر کی خریداری درست قرار پاگئی تو پھر اسے دوسرے تیسرے اور چوتھے خریدار کو بیچنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ جب شیئر کا ضمان ومنافع خریدنے کے ساتھ خریدار کی طرف منتقل ہو گیا تو وہ ''بیع مالا یضمن'' کے دائرے سے اپنے آپ نکل گیا اور آگے کے لئے اس کے لئے اپنے شیئر کی خرید وفروخت میں کوئی رکاوٹ نہیں رہتی۔

۱۷۔ اسٹاک ایکسچینج کے بروکر اور ایجنٹ کی حیثیت سے کام کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے، بشرطیکہ وہ سودے جن کی بروکری اور ایجنٹی کا وہ کام کر رہا ہے، فی نفسہ ان میں کوئی حرمت اور ممانعت کا پہلو نہ ہو۔

☆☆☆

شیئرز
مقاصد شریعت کے دائرہ میں

مولانا ابوسفیان مفتاحی [1]

۱۔ ابتلاء عام کی وجہ سے اس مسئلہ میں شرکت کے جواز کا فتوی دیا جاتا ہے، اور شیئرز اپنی ذات میں کوئی چیز نہیں بلکہ اس کی پشت پر جو املاک و اثاثے ہیں وہ اصل چیز ہے، لہذا شیئرز کی خرید وفروخت دراصل کمپنی کے اثاثوں میں متناسب ملکیت کی خرید وفروخت ہے، اور اس خرید و فروخت کے جواز کے لئے چار شرائط ہیں:

۱۔اصل کاروبار حلال ہو، ۲۔اس کمپنی کے منجمد اثاثے وجود میں آچکے ہوں، رقم صرف نقد کی شکل میں نہ ہو، ۳۔اگر کمپنی سودی لین دین کرتی ہے تو اس کی سالانہ میٹنگ میں آواز اٹھائی جائے، ۴۔جب منافع تقسیم ہوں اس وقت نفع کا جتنا حصہ سودی ڈپازٹ سے حاصل ہو رہا ہو اس کو صدقہ کردے۔

۲۔ صورت مسئولہ میں خرید کردہ شیئرز کی بیع جائز ہے۔

۳۔ صورت مسئولہ میں بشرط مذکور خرید وفروخت جائز ہے۔

۴۔ صورت مسئولہ میں بنیادی حرام کاروبار والی کمپنیوں کے شیئرز کی خرید وفروخت حرام ہے کیونکہ جواز کے لئے کمپنی کے کاروبار کا حلال ہونا شرط ہے۔

۵۔ صورت مسئولہ میں ایسی کمپنیز کے شیئرز خریدنا جائز ہے جن کا کاروبار حلال ہے، اس شرط کے ساتھ کہ سود کے خلاف آواز اٹھائی جائے، اور تجارت پر انکم ٹیکس ادا کرنا جو قانون حکومت ہے اس کی رعایت لازم ہونے کی وجہ سے بینک سے سودی قرضہ لے سکتے ہیں۔

۶۔ صورت مسئولہ میں مذکورہ کمپنیوں کے شیئرز خریدنا جائز ہے اور ملنے والی سودی رقم فقراء ومساکین کو بلانیت ثواب صدقہ کردینا لازم ہے۔

۷۔ صورت مسئولہ میں مجبوری میں سودی قرض لینا جائز ہے اور حلال کاروبار وتجارت کے واسطے لینے کی وجہ سے جو کاروبار سے منافع حاصل ہوں گے وہ شرعاً حلال اور مفید ملک ہوں گے اور اس کے ذریعہ حاصل ہونے والی آمدنی حلال ہوگی۔

۸۔ صورت مسئولہ میں کمپنی کا بورڈ آف ڈائرکٹرس شیئر ہولڈرس کا وکیل ہو کر اس کا عمل شیئرز ہولڈرس کا عمل ہوگا۔

۹۔ صورت مسئولہ میں شیئر ہولڈر کا سودی قرض لینے سے اختلاف کرنا اور اپنے اختلاف کا اعلان کردینا اسے بری الذمہ کردے گا۔

۱۰۔ صورت مسئولہ میں منافع میں سے سود کا صدقہ کردینا اور رفاہ عام کے کاموں میں لگادینا کافی ہوگا۔

۱۱۔ صورت مسئولہ میں چونکہ سودی لین دین کا غلبہ ہے تو جو حاصل ہونے والی سودی آمدنی کو کاروبار میں لگا کر نفع کمایا ہے تو جتنا فیصد کل آمدنی میں سود مخلوط ہو گیا ہے اتنا فیصد ملنے والے منافع سے نکال کر صدقہ کردینا کافی ہوگا۔

۱۲۔ شیئرز کی تجارت جائز ہے، اور مولانا تقی عثمانی لکھتے ہیں: یہ بات مشہور ہوگئی ہے کہ تخمین وقیاس آرائی بذات خود حرام ہے یہ بات غلط ہے، تخمین یہ ہے کہ اندازہ لگایا جائے کہ کس چیز کی قیمت بڑھ رہی ہے اور کس کی قیمت کم ہو رہی ہے، جس کی قیمت کم ہونے کا اندیشہ ہو اس کو بیچ دیا جائے اور جس کی قیمت بڑھنے کی امید ہو اس کو رکھا جائے، یہ بات بذات خود ممنوع نہیں ہے، یہ تو ہر تجارت میں ہوتی ہے، جو بات ممنوع ہے وہ یہ ہے

---

[1] جامعہ عربیہ مفتاح العلوم، مئو۔

کہ بیع وشراء کی شرعی شرائط کی رعایت نہ کی گئی، مثلاً غیر مملوک کی بیع یا غیر منصوص کی بیع کی جارہی ہو، یا قمار کی شکل بن رہی ہو، قمار دو باتوں سے ملکر بنتا ہے: ایک یہ کہ ایک طرف سے ادائیگی متعین ہو اور دوسری طرف سے موہوم ہو، دوسری بات یہ ہے کہ جس طرف سے ادائیگی ہوگئی ہے اس کی رقم دو باتوں میں دائر ہے، یا تو یہ رقم خود بھی ڈوب جائے گی یا اور رقم کو کھینچ کر لائے گی (اسلام اور جدید معیشت وتجارت رص ۹۰)۔

۱۳۔ صورت مسئولہ میں فیوچر سیل شرعاً جائز نہیں ہے۔

۱۴۔ صورت مسئولہ میں غائب سودا جن میں بیع کی اضافت مستقبل کی طرف کی جاتی ہے شرعاً جائز نہیں ہے، کیونکہ تمام رکن اور انعقاد بیع کے لئے صیغۂ ماضی یا حال شرط ہے، اور صیغہ استقبال سے بیع جائز نہیں ہے۔

۱۵۔ شیئرز پر قبضہ کا مطلب:

شیئرز درحقیقت کمپنی کی املاک میں متناسب حصہ داری کا نام ہے اور شیئر سرٹیفیکٹ درحقیقت اس حصہ داری کا تحریری ثبوت ہے، لہذا مبیع وہ تحریری ثبوت نہیں بلکہ کمپنی کی املاک کا ایک مشاع حصہ ہے، اس لئے اس پر حسی قبضہ تو نہیں ہوسکتا لہذا اس میں معنوی قبضہ ہی معتبر ہوگا۔ اب دو صورتیں ہیں: یا تو یوں کہا جائے کہ معنوی قبضہ اس وقت ہوگا جب سرٹیفیکٹ ہاتھ میں آجائے، یا پھر یوں کہا جائے کہ جس وقت وہ مشاع حصہ مشتری کے ضمان میں آجائے اس وقت معنوی قبضہ متصور ہوگا، اور ہر چیز کے قبضہ کا تصور عرف سے متعین ہوتا ہے اور عرف میں شیئرز کا قبضہ اس وقت سمجھا جاتا ہے جب سرٹیفیکٹ ہاتھ میں آجائے۔

۱۶۔ صورت مسئولہ میں احتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ سرٹیفیکٹ پر قبضہ کئے بغیر آگے بیع نہ کی جائے۔

۱۷۔ صورت مسئولہ میں بروکر کی حیثیت سے کام کرنا درست ہے۔

☆☆☆

کمپنی کے شیئرز اور ان کا شرعی حکم

مفتی انور علی اعظمی[1]

۱۔ کمپنی کے شیئرز کے بارے میں دو نقطہ نظر ہیں:

ایک یہ کہ شیئرز سرٹیفیکٹ محض کمپنی کو دیے ہوئے پیسے کی دستاویز ہے، کمپنی کے اثاثوں اور اسکی املاک میں حسب تناسب حصہ دار ہونے کی دلیل نہیں ہے۔ دوسرا نقطہ نظر یہ ہے کہ کسی کمپنی کا خرید کردہ شیئر کمپنی میں شیئر ہولڈر کی ملکیت کی نمائندگی کرتا ہے، یہی نظریہ درست ہے۔

۲۔ کمپنی کے قیام کے وقت جبکہ اس کے صرف سیال اثاثے یعنی نقد روپے ہیں، ابھی اس کمپنی نے نہ کوئی بلڈنگ خریدی ہے اور نہ مشینری، نہ اس کے پاس خام مال ہے اور نہ تیار مال ہے، اس وقت کمپنی کے شیئر کا کمی بیشی کے ساتھ بیچنا خریدنا جائز نہیں ہے۔ اس لئے کہ جب کمپنی کے پاس نقد رقم کے علاوہ اور کوئی ملکیت نہیں ہے تو اس صورت میں دس روپے کا شیئر دس روپے ہی کی نمائندگی کر رہا ہے، لہذا اس کو نو روپے میں بیچنا یا گیارہ روپے میں خریدنا، ایسے ہی ہے جیسے دس روپے کے نوٹ گیارہ روپے کا بیچنا یا خریدنا، جو کہ ناجائز ہے۔

۳۔ جب کمپنی کے پاس سیال اثاثے کے علاوہ کچھ منجمد اثاثے مثلاً بلڈنگ، مشینری، خام مال وغیرہ ہو گئے تو اس وقت اس کے شیئرز کی بیع کمی بیشی کے ساتھ جائز ہوگی، لیکن اس صورت میں ایک بات کا لحاظ رکھنا ضروری ہے کہ جب کمپنی کا کاروبار ترقی کر جائے اور کمپنی کے واجب الوصول قرضے اور نقد کی مقدار بڑھ جائے تو شیئر کے مقابلہ میں واجب الوصول قرض اور نقد کی جو مقدار آتی ہے اس سے زیادہ میں بیچنا ضروری ہوگا، اس کے برابر یا کم میں بیچنا جائز نہیں، مثلاً ابتداء میں ایک کمپنی کی کل رقم سو روپے قرض لی گئی اور اجزاء اس طرح تھے:

واجب الوصول قرض	بلڈنگ	مشینری	مال	نقد
۱۰	۴۰	۲۰	۲۰	۱۰

لیکن ترقی کے بعد کمپنی کے اثاثوں کی مالیت دو سو بیس (۲۲۰) ہوگئی۔

واجب الوصول قرضے	نقد شیئرز	بلڈنگ	مشینری	خام مال
۷۰	۷۰	۴۰	۲۰	۲۰

اب کمپنی کے شیئر کی ویلو دس سے بڑھ کر بیس ہوگئی، لہذا اس وقت دس روپے کے شیئر کی مجموعی مالیت اکیس روپے ہوگئی، اکیس میں سے چودہ نقد اور واجب الوصول قرضے اور بقیہ سات میں بلڈنگ، مشینری اور خام مال وغیرہ، اس صورت میں دس روپے کے شیئر کو چودہ روپے سے کم کا فرخت کرنا جائز نہیں ہوگا، بلکہ چودہ روپے سے زیادہ بیچنا ضروری ہوگا، تاکہ چودہ کے مقابلہ میں نقد اور واجب الوصول قرضے کے چودہ ہو جائیں اور زائد کے مقابلہ میں بلڈنگ مشینری اور خام مال کا حصہ ہوگا۔

۴۔ وہ کمپنیاں جن کا بنیادی کاروبار حرام ہے، جیسے شراب اور خنزیر کے گوشت کی تجارت اور اکسپورٹ، یا بینکس اور سودی اسکیموں میں روپے لگانا، ان کے شیئرز خریدنا جائز نہیں۔

۵۔ موجودہ حالات میں انکم ٹیکس وغیرہ کا جو غیر عادلانہ قانون رائج ہے اس سے بچنے کے لئے سودی قرض لینا ایک مجبوری ہے اور یہ مجبوری شخصی

---

[1] مفتی دار العلوم مئو، مئو۔

کاروبار میں حائل ہوتی ہے اور کمپنی کو پیش آسکتی ہے، لہذا اگر کمپنی نے بدرجہ مجبوری سودی قرض لئے تو اس کے شیئرز خریدنا جائز ہوگا۔

البتہ شیئرز ہولڈر اس بات کی کوشش کرے کہ مجبوری ختم ہونے کے بعد بلاضرورت سودی قرض میں کمپنی ملوث نہ رہے، دوسرے یہ کہ جتنا حصہ سودی اکاؤنٹ سے حاصل ہوا اتنا حصہ بلانیت ثواب صدقہ کرے۔

۶۔ دو شرطوں کے ساتھ ایسی کمپنی کے شیئرز خریدنے کی اجازت ہوگی: ایک تو یہ کہ شیئر ہولڈر اپنی استطاعت بھر سودی آلودگی سے کمپنی کو بچانے کی کوشش کرے، اور دوسرے یہ کہ کمپنی کے اجلاس میں اس کے خلاف آواز اٹھائے۔

۷۔ سودی قرض لینے کی صورت میں اس قرض سے حاصل ہونے والے منافع جائز ہونگے، وہ قرض مفید ملک ہوگا، اور اس سے حاصل ہونے والی آمدنی حلال ہوگی، مفتی محمد تقی عثمانی صاحب اپنی کتاب ''اسلام اور جدید معیشت وتجارت'' میں تحریر فرماتے ہیں: بعض علماء کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ کمپنی سودی کاروبار اصلاً کررہی ہو یا تبعاً، سودی کاروبار کم ہو یا زیادہ، اس کے شیئرز لینا جائز نہیں خواہ اسکا حقیقی کاروبار درست ہو، لیکن صحیح یہ معلوم ہوتا ہے کہ کمپنی کے سودی لین دین کی دو صورتیں ہیں: ایک یہ کہ کمپنی قرضہ لے اور اس پر سود ادا کرے، اس صورت میں کمپنی کی آمدنی میں کوئی حرام عنصر شامل نہیں ہوا، اس لئے کہ جو کوئی شخص سود پر قرض لے تو یہ فعل حرام اور سخت گناہ ہے مگر وہ قرض کا مالک ہوجائیگا، اس کے ساتھ کاروبار کی جو آمدنی حاصل ہوگی وہ بھی حلال ہوگی (صفحہ ۸۷)۔

۸۔ کمپنی کا بورڈ آف ڈائرکٹرس شیئر ہولڈرس کا وکیل ہے لیکن یہ وکالت شرکت کی وکالت سے مختلف ہے، اس لئے کہ شرکت میں ہر شریک کی وکالت اس درجہ قوی ہوتی ہے کہ اگر ایک شریک بھی کسی کاروبار سے اختلاف کردے تو وہ کاروبار نہیں کیا جاسکتا، لیکن کمپنی کے سیکڑوں شرکاء ہوتے ہیں بلکہ کبھی کبھی یہ تعداد ہزار تک پہنچ جاتی ہے، لہذا یہاں شیئر ہولڈرس باوجود شریک ہونے کے اتنا پاور نہیں رکھتے کہ اپنی تنہا رائے سے کمپنی کے اجتماعی فیصلے کو رد کرسکیں، اس لئے ان کا کمپنی کے اجلاس میں سودی کاروبار سے اختلاف کردینا اور بقول حضرت تھانویؒ کمپنی کے ذمہ داران کو اس مضمون کا خط لکھ دینا کافی ہوگا، اور اپنی استطاعت کے مطابق کوشش کرلینے کے بعد شیئر ہولڈر بورڈ آف ڈائرکٹرس کے اس عمل کا ذمہ دار نہیں ہوگا۔

۹۔ کمپنی کی میٹنگ میں شیئر ہولڈر کا سودی قرض لینے سے اختلاف کرنا اور اپنے اختلاف کا اعلان کردینا وکیل کے عمل کی ذمہ داری سے اسے بری الذمہ کردے گا۔

۱۰۔ اگر کمپنی کے منافع میں سود بھی شامل ہو اور اسکی مقدار معلوم ہو تو شیئر ہولڈر کو منافع سے اس کی بقدر نکال کر صدقہ کرنا بھی ضروری ہوگا۔

۱۱۔ اگر کمپنی کے منافع میں سود بھی شامل ہو اور حاصل ہونے والی سودی آمدنی کو کاروبار میں لگا کر نفع کمایا گیا ہو تو جتنا فیصد کل آمدنی میں سود مخلوط ہوگیا اتنا فیصد ملنے والے منافع سے نکال کر صدقہ کردینا شیئر ہولڈر کی بقیہ منافع کو جائز بنانے کے لئے کافی ہوگا۔

۱۲۔ شیئرز کی خریداری دو مقصد سے ہوتی ہے: ایک تو باقاعدہ کمپنی کا حصہ دار بن کر اسکا سال بسال نفع حاصل کرنے کے لئے، دوسرے شیئرز کو سامان تجارت کے طور پر بیچنے خریدنے کے لئے۔ شیئرز خریدنے والے کمپنی کے نفع کو سامنے رکھنے کے بجائے شیئرز کی قیمت میں اتار چڑھاؤ کو سامنے رکھتے ہیں، جب کسی کمپنی کا شیئر گھٹ جاتا ہے تو اسکا شیئر خرید لیتے ہیں اور بڑھ جانے کے بعد بیچ دیتے ہیں۔ اس دوسرے مقصد سے بھی شیئر کی خرید وفروخت جائز ہے، اور اس خریداری میں اور فروختگی میں جس قیاس آرائی اور تخمین کو دخل ہے وہ شرعاً ممنوع نہیں ہے، اس طرح کی قیاس آرائی تو ہر قسم کی تجارت میں چلتی ہے۔ البتہ تخمین اور قیاس آرائی کی بنیاد پر شیئرز کی خرید وفروخت وہاں ناجائز ہوگی جہاں شرعی اصول کی رعایت نہ کی جائے، مثلاً جہاں غیر مملوک کی بیع یا غیر مقبوض کی بیع ہو یا قمار کی شکل بن رہی ہو، مثلاً کمپنی کے وجود میں آنے سے پہلے اس کے منجمد اثاثوں کی بیع کی جائے، کمپنی کا ابھی صرف وجود ذہنی ہے خارج میں کچھ بھی نہیں، اور اس کے دس روپے کے شیئر کو پچاس روپے کا بیچا جائے، خواہ نیت سرمایہ کاری کی ہو یا شیئر بیچ کر نفع کمانے کی۔

۱۳۔ فیوچر سیل یا بیاعات مستقبلیہ:

شیئرز مارکیٹ میں مروج فیوچر سیل یعنی بیاعات مستقبلیہ کا سودا ناجائز ہے، کیونکہ یہ ایک جوا ہے، مقصد کسی چیز کی خرید وفروخت نہیں بلکہ صرف سٹے بازی اور ڈیفرنس برابر کرنا ہے، یہ صورت بالکل حرام ہے، اس لئے کہ اس بیع میں مشتری نہ تو مبیع پر قبضہ کرتا ہے اور نہ بائع ثمن پر، بلکہ یہ مقصد ابتداء ہی سے معدوم ہوتا ہے، دونوں کے درمیان قبضہ کی تاریخ طے ہوتی ہے اور اس تاریخ پر اگر شیئرز کی قیمت گھٹ گئی تو یوم خرید اور یوم قبضہ کا فرق مشتری بائع کو دیتا ہے، اور اگر شیئرز کی قیمت بڑھ گئی تو دونوں تاریخوں میں قیمت کا فرق بائع مشتری کو دیتا ہے، شرعی ضابطہ سے یہ بیع بالکل ناجائز ہے، اور اسی قسم کے تخمین اور قیاس آرائی کو ممنوع قرار دیا گیا ہے۔

۱۴۔ غائب سودے جن میں بیع کی نسبت مستقبل کی طرف کی جاتی ہے وہ بھی شرعاً ناجائز ہے، مستقبل میں بیع کا وعدہ کیا جاسکتا ہے لیکن وقت آنے پر باقاعدہ بیع ضروری ہوگی۔ بیع کی مستقبل کی طرف اضافت یا تعلیق بہ اتفاق ناجائز ہے (اسلام اور جدید معیشت وتجارت/۹۱)۔

۱۵۔ شیئرز کا قبضہ:

کمپنی کے شیئر ہولڈر یعنی حصہ دار سے حصہ خریدنے کے بعد خریدار اس حصہ کا مالک ہوجائے گا، چاہے اس سے اپنے حصہ کا سرٹیفیکٹ ملا ہو یا نہ ملا ہو، جیسے مکان کا خریدار نفس خرید سے مکان کا مالک ہوجائے گا، چاہے رجسٹریشن کا کاغذ ملا ہو یا نہ ملا ہو، شیئرز ہولڈر کا شیئر سرٹیفکٹ پر اگرچہ حسی قبضہ نہیں ہوا لیکن کمپنی کے حصہ پر اسکا معنوی قبضہ ثابت ہوجائے گا، اس لئے کہ اسٹاک ایکسچینج کے قانون کے حساب سے خریدنے والا خریدنے کے وقت سے اسکے نفع نقصان کا ذمہ دار مانا جاتا ہے، یعنی اگر خریداری کے بعد سرٹیفکٹ ملنے سے پہلے کمپنی تباہ ہوگئی تو نقصان مشتری کا ہوگا بائع کا نہیں ہوگا۔ مفتی محمد تقی عثمانی تحریر فرماتے ہیں: اسٹاک ایکسچینج کے لوگوں سے تفصیلی گفتگو کے نتیجے میں یہ بات سامنے آتی ہے کہ حاضر سودا ہوجانے کے بعد شیئرز کے تمام حقوق اور ذمہ داریاں خریدار کی طرف منتقل ہوجاتی ہیں، وہ خریدار کے ضمان میں داخل ہوجاتے ہیں، اس دلیل سے معلوم ہوتا ہے کہ شیئر کے بیع ہی سے خریدار مالک ہوجائے گا اور اس کا قبضہ سرٹیفکٹ کی حصولیابی پر موقوف نہیں ہوگا۔ لیکن دوسری دلیل اسکے خلاف کی متقاضی ہے، وہ یہ کہ عرف میں سرٹیفکٹ پر قبضہ کو ہی شیئر پر قبضہ تصور کیا جاتا ہے، کیونکہ کمپنی کے حصہ مشترکہ پر قبضہ حسی کی کوئی شکل نہیں، لہذا جب تک سرٹیفیکیٹ نہیں مل جاتا عرف میں وہ آدمی اپنے شیئر پر قابض نہیں ہوا، اس دلیل کا تقاضہ یہ ہے کہ سرٹیفکٹ حاصل کرنے سے پہلے اس کی بیع دوسرے کے ہاتھ نہ کرے۔

۱۶۔ سرٹیفکٹ حاصل کرنے تک ابھی شیئر پر قبضہ مشتبہ ہے، اس لئے اس کی بیع احتیاط کے خلاف ہے اور اس کی اجازت سٹہ بازی کی حوصلہ افزائی کے مترادف ہے، اس لئے اس سے پرہیز لازم ہے۔

☆☆☆

شیئرز کے احکام

مفتی شبیر احمد قاسمی [۱]

کمپنی کے حصص اور شیئرز خریدنا:

اگر کوئی براہ راست کمپنی سے شیئرز کا فارم خرید کر شرکت کر لیتا ہے اور حصص کے تناسب سے نفع ونقصان اور راس المال سب میں شریک ہوجاتا ہے تو شرعاً یہ معاملہ شرکت عنان کے دائرہ میں داخل ہو کر جائز اور درست ہو جائے گا (مستفاد امداد الفتاوی ۳/ ۴۹۴، ۳/ ۴۹۰) اس لئے کہ شرکت عنان میں ہر فریق کا عمل میں شریک ہونا لازم نہیں ہے بلکہ اس میں وکالت کا مفہوم موجود ہونے کی وجہ سے عمل میں شرکت کے بغیر بھی درست ہو جاتی ہے (مستفاد فتاوی عالمگیری ۲/ ۳۱۹) روپے دینے والے اس کمپنی کے شرکاء ہیں اور کارکنان کمپنی ان کے وکیل ہوتے ہیں (امداد الفتاوی ۳/ ۴۹۱)، لہذا کمپنی کے حصص اور شیئرز کا خریدنا اور ان سے نفع حاصل کرنا جائز اور حلال ہوگا (ایضاح النوادر ۱/ ۱۰۲)۔

مارکیٹ سے شیئرز خریدنا:

ہمارے ہندوستان میں یہ طریقہ رائج ہے کہ بعض لوگ کمپنی کے ایجنٹ بن کر ایجنسی کھول کر کمپنی سے کافی مقدار میں شیئرز لے کر بازار میں شیئرز فارم فروخت کرتے ہیں، تو کیا اس طرح ایجنسی سے کمپنی کے شیئرز خریدنا جائز ہو سکتا ہے؟ تو جواب یہ ہے کہ اس کی تین شکلیں زیادہ واضح نظر آتی ہیں:

۱۔ خریدار کی نگاہ میں یہی بات پیش نظر ہوتی ہے کہ شیئرز کا فارم خرید کر متعلقہ کمپنی میں شرکت حاصل کرتا ہے اور تناسب کے حساب سے نفع ونقصان میں شریک ہوتا ہے، تو ایسی صورت میں اگر ایجنسی نے کمپنی کو ان حصوں کا عوض ادا نہیں کیا ہے تو ایجنسی من جانب کمپنی وکیل ہے اور شیئرز کے خریدار کمپنی کے شریک ہوں گے، اور اگر ایجنسی نے ان حصوں کا عوض ادا کر دیا ہے تو ایجنسی کمپنی کی شریک ہوگی، اور جب ایجنسی اپنے حصص بازار میں جا کر دوسروں کے ہاتھ عوض لے کر منتقل کر دے گی تو ایجنسی درمیان سے نکل جائیگی اور خریدار کمپنی کی شرکت میں حصہ دار بن جائیں گے (مستفاد امداد الفتاوی ۳/ ۴۹۲)۔

۲۔ خریدار کے ذہن میں یہ بات نہیں ہوتی ہے کہ کمپنی میں شرکت کرنا ہے بلکہ اس کے ذہن میں صرف یہ بات ہوتی ہے کہ آئندہ چند روز کے بعد ان حصص کا بھاؤ بڑھ جائے گا اور اس سے زیادہ قیمت میں فروخت ہو سکتے ہیں لہذا اب خرید لئے جائیں، تو اس طرح شیئرز کی خرید وفروخت بھی شرعاً بقول امام ابو یوسف جواز کے دائرہ میں داخل ہو کر جائز اور حلال ہو جائے گی۔

وقال أبو يوسف لا يكره هذا البيع (الى قوله) حتى لو باع كاغذة بألف يجوز الخ (شامی ۵،۳۲۶، فتح القدير ۷،۲۱۲)۔

(حضرت امام ابو یوسفؒ فرماتے ہیں کہ یہ بیع مکروہ نہیں ہے حتی کہ اگر کوئی کاغذ ایک ہزار میں فروخت کیا جائے تو بھی جائز ہے)۔

۳۔ کمپنی کے ایجنٹ تو نہیں بلکہ کوئی شخص براہ راست شخصی طور پر شیئرز خرید لیتا ہے اور پھر اپنے شیئرز کو کسی وجہ سے فروخت کر دیتا ہے اور خریدار اس سے کمپنی میں شرکت کی غرض سے یا آئندہ شیئرز کے بھاؤ بڑھنے پر اچھی شرح پر فروخت کرنے کی غرض سے خریدتا ہے تو یہ بھی شرعاً جواز کے دائرہ میں داخل ہو کر درست ہو جائے گا (ایضاح النوادر ۱/ ۱۰۳، امداد الفتاوی ۳/ ۴۹۲، ۳/ ۴۹۵)۔

---

[۱] دار الافتاء مدرسہ شاہی، مراد آباد۔

مسلم کمپنی کے شیئرز خریدنا:

اگر مسلمان کی کمپنی ہے اور کمپنی میں جائز کاروبار ہے اور سودی کاروبار کرنا شیئرز کے خریدار کو یقین سے معلوم نہیں ہوسکا ہے تو ایسی کمپنی سے شیئرز کا خریدنا بلاشبہ جائز اور حاصل ہونے والا نفع حلال ہوگا، لہذا اگر کمپنی فی الواقع سودی لین دین کرتی ہے تو اس کا وبال کمپنی کے ذمہ داروں پر ہوگا شیئرز کے خریدار پر نہ ہوگا۔ ہاں البتہ اگر مسلم کمپنی کا سودی کاروبار یقین سے معلوم ہوجائے تو اس شیئرز کا خریدنا ناجائز اور ممنوع ہوگا (امداد الفتاوی ۳/۴۹۱)۔

اور امداد الفتاوی میں یہ بات صراحت سے بیان کی گئی ہے کہ اگر کمپنی کے سودی کاروبار سے خریدار مطلع ہوجائے اور خریدار کمپنی کو سودی لین دین سے صراحت سے منع کردے تو ایسی صورت میں لین دین کا ذمہ دار خریدار نہ ہوگا اور اس کے لئے نفع حلال ہوجائے گا اور ذمہ دار کمپنی کے عملہ ہوں گے (امداد الفتاوی ۳/۴۹۷)۔

سودی کاروبار میں حصہ لینے والی مسلم کمپنی کے شیئرز:

اگر کسی شخص نے سودی کاروبار میں حصہ لینے والی کمپنی کے شیئرز خریدے ہیں اور اس نے کمپنی کے عملہ سے صراحۃً کہہ دیا ہے کہ سودی کاروبار جائز نہیں ہے تو ایسی صورت میں عقود فاسدہ کے لین دین کے ذمہ دار بقول حضرت تھانویؒ کمپنی کے عملہ ہوں گے، شیئرز کا خریدار نہ ہوگا، اور اگر پھر بھی کمپنی نے سودی کاروبار میں حصہ لے لیا ہے تو یہ کمپنی کے عملہ سے معلوم کرے کہ سالانہ آمدنی میں سے کتنا فیصد سودی کاروبار کی وجہ سے منافع ہوا ہے تو یہ خریدار اپنے حاصل شدہ منافع میں سے اتنا ہی فیصد نکال کر صدقہ کردے، یہ شیئرز کے معاملہ میں حرام مال سے بچنے کے لئے ایک بہترین شکل ہے (فقہی مقالات/ص ۱۵۰)۔

غیر مسلم کمپنی کے شیئرز خریدنا:

اگر کمپنی غیر مسلم کی ہے اور اس میں سودی کاروبار نہیں ہے تو بلاشبہ غیر مسلم کی ایسی کمپنی کے شیئرز کا خریدنا اور اس کے منافع حاصل کرنا جائز اور حلال ہوگا، اور اگر غیر مسلم اپنی کمپنی میں سودی کاروبار بھی کرتا ہے یا حالات معلوم نہیں ہیں، اور ظاہر ہے کہ ان کے یہاں سودی لین دین مذموم نہیں ہے تو ایسی صورت میں غیر مسلم کی کمپنی کے شیئرز خریدنا شرعاً مکروہ تحریمی ہوگا (امداد الفتاوی ۳/۴۹۷، ایضاح النوادر ۱/۱۰۶)۔

اگر غیر اسلامی ممالک میں کمپنی کے شیئرز کا معاملہ چل رہا ہے تو شیئرز کمپنی کی تین قسمیں ہیں:

قسم اول۔ غیر اسلامی ممالک کی مسلم کمپنی:

غیر اسلامی ممالک کی مسلم کمپنی کی تین شکلیں زیادہ واضح ہیں:

۱۔ کمپنی مسلمانوں کی ہو، چاہے اس میں کام کرنے والے غیر مسلم بھی ہوں پھر بھی اس کو مسلم کمپنی قرار دیا جائے گا، اگر ایسی مسلم کمپنی کا پورا کاروبار سودی لین دین پر ہے اور اس کمپنی میں کوئی بھی جائز معاملہ نہیں کیا جاتا ہے، مثلاً فکس ڈپازٹ کی کمپنی ہے یا لائف انشورنس کی کمپنی ہے یا شراب کی کمپنی ہے، تو ایسی مسلم کمپنی میں شیئرز خرید کر شرکت کرنا جائز نہیں ہوگا۔

۲۔ مسلم کمپنی جائز معاملہ کرتی ہے، مثلاً پلاٹ اور عمارت کا کام کرتی ہے یا خود اس کمپنی میں اشیاء تیار ہوتی ہیں، مثلاً جوتا، چپل یا کپڑا یا صابن یا گاڑی وغیرہ خود اس کمپنی میں بنتے ہیں تو ایسی کمپنی کی شرکت اور اس کے شیئرز خرید کر منافع حاصل کرنا بلاشبہ جائز اور درست ہے، اس لئے کہ یہ معاملہ شرعی طور پر مضاربت یا شرکت کے دائرہ میں داخل ہو کر جائز اور درست ہو جاتا ہے۔

۳۔ مسلم کمپنی کا اصل کاروبار جائز تجارت یا جائز چیزوں کی ایجاد ہے لیکن ضمناً فکس ڈپازٹ وغیرہ بھی کرتی ہے یا سرکار سے سود پر قرض لے کر بھی

کام کرتی ہے تو ایسی مسلم کمپنی سے شیئرز خریدتے وقت صاف کہہ دیا جائے کہ ہم سودی معاملہ کو جائز نہیں سمجھتے ہیں اور ہمارے اسلام میں سودی معاملہ جائز نہیں ہے اس لئے آپ سودی معاملہ نہ کیجئے، پھر بھی اگر کمپنی سودی معاملہ کر بیٹھے تو سال کے آخر میں منافع تقسیم کرتے وقت کمپنی سے معلوم کرلیا جائے کہ کتنے فیصد منافع سودی لین دین سے حاصل ہوا ہے تو خریدار اپنے منافع میں سے اتنا فیصد صدقہ کردیا کرے (مستفاد فقہی مقالات رص ۱۵۱)۔

قسم دوم۔ مسلم وغیر مسلم کی مشترک کمپنی:

اگر غیر اسلامی ممالک میں کمپنی مسلمان وغیر مسلم کے درمیان مشترک ہے اور ایسی کمپنی کا شیئرز خریدا جارہا ہے تو اس میں وہ سارے احکام لاگو ہوں گے جو خالص مسلم کمپنی سے شیئرز خریدنے کے متعلق ذکر کئے جاتے ہیں، جو صورتیں مسلم کمپنی کے شیئرز میں جائز ہیں وہ مشترک کمپنی میں بھی جائز ہوں گی، اور جو شیئرز مسلم کمپنی کے جائز نہیں ہیں وہ مشترک کمپنی کے بھی جائز نہ ہوں گے۔

قسم سوم۔ غیر مسلم کمپنی کے شیئرز:

اگر کمپنی کے مالک غیر مسلم ہیں اگر چہ اس میں کام کرنے والا بعض عملہ مسلمان کیوں نہ ہو، اس پوری کمپنی کو غیر مسلم کمپنی کہا جائے گا، اور غیر مسلموں کے ساتھ مضاربت کا معاملہ کرنا یا شرکت عنان کا معاملہ کرنا بالاتفاق جائز ہے، البتہ صرف شرکت مفاوضہ میں حضرات طرفین اور حضرت امام ابو یوسف کا اختلاف ہے، حضرات طرفین کے نزدیک شرکت مفاوضہ میں مساوات فی الدین شرط ہے، اور حضرت امام ابو یوسف کے نزدیک مساوات فی الدین شرط نہیں ہے۔ اور کمپنی کے شیئرز کے معاملہ میں شرکت مفاوضہ کی تعریف یوں ہی صادق نہیں آتی ہے بلکہ شرکت عنان یا مضاربت کی تعریف صادق آتی ہے، اس لئے شیئرز کی خریداری میں مضاربت یا شرکت عنان کو پیش نظر رکھتے ہوئے مسئلہ پر غور کرنے کی ضرورت ہے، اور مضاربت اور شرکت عنان مسلم وغیر مسلم کے درمیان جائز ہوتا ہے، ان میں مساوات فی الدین شرط نہیں۔ لہذا مسلمان کے لئے غیر مسلم کمپنی کے شیئرز خریدنا بلاتردد جائز و درست ہوگا۔[1]

غیر مسلم کمپنی میں سودی کاروبار:

اگر مسلمان نے غیر مسلم کمپنی سے شیئرز خرید لیا ہے اور وہ غیر مسلم عقود فاسدہ اور ربا کا معاملہ بھی اپنی تجارت میں کرتا ہے تو ایسی صورت میں کمپنی کے شیئرز سے ملا ہوا منافع مسلمان کے لئے حلال ہے یا نہیں؟ تو اس سلسلہ میں غور طلب مسئلہ یہ ہے کہ عقود فاسدہ اور ربا کا معاملہ کرنے میں مسلمان کا کوئی دخل نہیں ہے، سارا دخل اور اختیار اور معلومات اس غیر مسلم ہی کو حاصل ہے اور عقد کے حقوق بھی اسی غیر مسلم پر لاگو ہوں گے، اور خریدار مسلمان کو پوری طرح حقیقت بھی معلوم نہیں تو ایسی صورت میں حاصل شدہ منافع اس مسلم کے لئے حلال ہونے میں کسی قسم کا تردد نہیں ہے، اس لئے کہ ہم کو شریعت نے یہ حکم دیا ہے کہ ہم ان کو ان کے معاملات پر چھوڑ دیں، وہ اپنے اعتقاد کے اعتبار سے معاملہ کرتے رہیں، اور عقود فاسدہ اور سودی معاملہ ان کے دین کے اعتبار سے جائز ہے، اس لئے اگر غیر مسلم کمپنی نے اپنی کمپنی کے اندر سودی لین دین کر رکھا ہے تو اس کا وبال خریدار مسلم پر نہیں پڑے گا اس لئے کہ معاملہ کو طے کرنے میں مسلمان کا کوئی دخل نہیں ہے بلکہ غیر مسلم کمپنی کا دخل رہا ہے، لہذا غیر مسلم اپنے طور پر معاملہ کر کے جو منافع حاصل کرتا ہے وہ اس کے لئے حلال ہے اور جب وہ مسلمان کو دے گا تو اس کے لئے بھی حلال ہوجائے گا، لیکن جان بوجھ کر ایسا معاملہ کرنا مسلمان کے لئے مکروہ ہے البتہ تجارت کا منافع حلال ہوگا (اعلاء السنن ۱۴ر۱۱۱۔ ۱۱۲)۔

☆☆☆

---

[1]

شیئرز کا شرعی حکم

مولانا محمد رضوان القاسمی[۱]

۱۔ کسی کمپنی کا خرید کردہ شیئر، کمپنی میں شیئر ہولڈر کی ملکیت کی نمائندگی کرتا ہے، یا محض اس بات کی دستاویز ہے کہ اس نے اتنی رقم کمپنی کو دی ہے۔ اس سلسلے میں علماء کرام کی رائیں مختلف ہیں۔ تاہم کمپنی کی حقیقت اور خصوصیات سے اس گروہ کی تائید ہوتی ہے جو کہتے ہیں کہ وہ ملکیت کی نمائندگی کرتا ہے۔ کیوں کہ اگر کمپنی شرکاء کی باہمی قرارداد سے تحلیل ہوجائے تو ہر ایک کو کمپنی کے اثاثہ واملاک کا متناسب حصہ ملتا ہے، نفع حاصل ہونے کی صورت میں ہر شیئر ہولڈر کو راس المال کے تناسب سے حصہ ملتا ہے اور خسارہ کی صورت میں اسی تناسب سے نقصان برداشت کرنا پڑتا ہے۔

۲۔ جب کمپنی کا وجود عمل میں نہ آیا ہو تو ظاہر ہے کہ شرکاء کے حصص صرف نقود کی شکل میں ہوں گے، تو ایسے شیئر کی بیع میں نقد کا مقابلہ نقد سے ہوگا، جس کے جواز کی شرط یہ ہے کہ مجلس میں قبضہ ہو، لہذا اس شرط کے مفقود ہونے کی وجہ سے ایسے شیئر کو خریدنا جائز نہ ہوگا، کیونکہ نقد کے مقابلہ میں نقد ہے۔

۳۔ کمپنی کے وجود میں آجانے کے بعد اس کا سرمایہ نقود واملاک کا مجموعہ ہوتا ہے، تو اس کا شیئر خریدنا جائز ہے جب کہ ثمن کے مقابلہ میں نقد کم ہو، تاکہ بقیہ ثمن املاک کے مقابل ہوجائے، جیسا کہ فقہاء چاندی سے ملمع کی ہوئی تلوار وغیرہ کی بیع میں یہ شرط لگاتے ہیں کہ ثمن کے مقابلے میں چاندی کم ہو، چنانچہ علامہ ابن عابدین شامی فرماتے ہیں:

والأصل انه متی بیع نقد مع غیره کمفضض و مزرکش بنقد من جنسه شرط زیادة الثمن۔

اصل یہ ہے کہ جب نقد اور غیر نقد سے مخلوط شئی مثلاً چاندی سے ملمع کی ہوئی چیز اور زری والے کپڑے کی بیع خالص نقد کے ساتھ کی جائے تو اگر دونوں نقد کی جنس متحد ہو تو ثمن کی زیادتی شرط ہے۔

۴۔ وہ کمپنیاں جن کا بنیادی کاروبار حرام ہے تو ان کا شیئرز خریدنا ناجائز ہے، کیونکہ یہ اعانت علی المعصیۃ ہے، اور کتاب وسنت اور فقہاء کی عبارات اس کے حرام وممنوع ہونے پر ناطق ہیں۔

۵۔ اگر کمپنی کا بنیادی کاروبار حلال ہو لیکن وہ عائد ہونے والے ناواجبی ٹیکس مثلاً انکم ٹیکس وغیرہ کی زد سے بچنے کے لئے سودی قرض لیتی ہو تو یہ احتیاج وضرورت کی وجہ سے جائز ہے، چنانچہ علامہ ابن نجیم فرماتے ہیں: یجوز للمحتاج الاستقراض بالربح (الاشباہ والنظائر ص ۹۲)۔ (محتاج کے لئے سودی قرض لینا جائز ہے)۔

۶۔ اور اگر قانونی تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے سرمایہ کا کچھ حصہ ریزرو بینک میں جمع کرنا پڑتا ہو تو یہ بھی ضرورت کی وجہ سے جائز ہے، اس لئے ایسی کمپنی کے شیئرز خریدنے کے جواز میں بھی کوئی کلام نہیں۔

۷۔ سودی لین دین عقود فاسدہ میں سے ہے، اس لئے اس پر قبضہ کرنے سے ملکیت آجائیگی، اگر یہ معاملہ ضرورتاً کیا گیا ہو تو اس سے حاصل ہونے

---

[۱] سابق بانی وناظم، دارالعلوم سبیل السلام، حیدرآباد۔

والے منافع بھی حلال ہوں گے، چونکہ اس میں کوئی حرام عنصر شامل نہیں ہوا ہے، اور ضرورتاً لئے جانے کی وجہ سے اس میں خبث بھی نہیں ہے، لیکن اگر بلاضرورت قرض لیا گیا ہو تو وہ مال خبیث سمجھا جائے گا، اس لئے منافع بھی حلال نہ ہوں گے۔

۸، ۹۔ کمپنی کا بورڈ آف ڈائرکٹرس شیئرز ہولڈرس کا وکیل ہے، لیکن شیئر ہولڈر اگر ڈائرکٹرس کے کسی عمل سے صراحتہً براءت کا اظہار کر دے تو وہ اس کا ذمہ دار نہ ہوگا۔

۱۰۔ مذکورہ تمام صورتوں میں سودی منافع کا صدقہ کر دینا کافی ہوگا، جیسا کہ مال حلال وحرام کے خلط ملط ہو جانے کا حکم ہے کہ جب حرام مال کی مقدار معلوم ہو تو صرف اس کو صدقہ کر دینا کافی ہوگا۔

۱۱۔ اگر سودی آمدنی کو کاروبار میں لگایا جاتا ہو اور سبھی شیئرز کمپنیاں ایسا کرتی ہوں تو ان کے شیئرز خرید کرنا جائز ہے۔

۱۲۔ شیئرز کی خرید وفروخت درحقیقت کمپنی کے اثاثوں میں متناسب حصہ کی خرید وفروخت ہے، گویا اسے تجارت کی حیثیت حاصل ہے، اس لئے شریعت کے دائرے میں رہتے ہوئے اس کی تجارت جائز ہے، بیع کے جواز وعدم جواز میں قیاس وتخمین کا کوئی دخل نہیں ہے۔

۱۳، ۱۴۔ غائب سودا جس میں بیع کی نسبت مستقبل کی طرف کی جاتی ہے، نہ جائز ہے اور نہ معتبر، چنانچہ وہبہ زحیلی فرماتے ہیں:

البيع المضاف: هو ما أضيف فيه الايجاب إلى زمن مستقبل كأن يقول شخص لغيره: بعتك هذه السيارة بكذا من أول الشهر القادم ...... اتفق الفقهاء على عدم صحة البيع المعلق أو المضاف (الفقه الاسلامی وادلته ۴۰۳۶۱)۔

(بیع مضاف وہ ہے جس میں ایجاب کی کیفیت زمانہ مستقبل کی طرف کی جائے، جیسا کہ کوئی شخص دوسرے سے کہے: میں نے تیرے ہاتھ یہ گاڑی اتنے میں فروخت کیا لیکن اسے آئندہ مہینہ کے شروع میں حوالہ کرونگا.......... فقہاء کرام بیع معلق یا بیع مضاف کے صحیح نہ ہونے پر متفق ہیں)۔

۱۵، ۱۶۔ فقہاء احناف کے یہاں تخلیہ کو حکماً قبضہ سمجھا گیا ہے، جس کا مقصد یہ ہے کہ مشتری بلا رکاوٹ ومشقت مبیع میں تصرف کر سکے، یہ کیفیت شیئر ہولڈر کو بوقت شراء ہی حاصل ہو جاتی ہے، جیسا کہ کمپنی کی خصوصیات وقوانین سے معلوم ہوتا ہے کہ تمام حقوق وذمہ داریاں اور دیگر تصرفات کا حق بوقت شراء ہی حاصل ہو جاتا ہے، لہذا عقد تام ہوتے ہی یہ سمجھا جائے گا کہ وہ مبیع (کمپنی کے املاک کا متناسب حصہ) پر قابض ہے، لہذا شیئر (تحریری ثبوت) پر قبضہ کئے بغیر اس کی بیع درست ہوگی، چونکہ اصل مبیع اس کے ضمان میں آ چکی تھی۔

۱۷۔ بروکر یعنی ایجنٹ کی حیثیت سے کام کرنا درست ہے، چنانچہ علاء الدین حصکفی فرماتے ہیں:

أما الدلال فإن باع العين بنفسه بإذن ربها فأجرته على البائع (در مختار ۴۰۵۶۰)۔

اگر دلال مالک مال کی اجازت سے مال خود فروخت کرے تو اس کی اجرت بائع پر ہے۔

☆☆☆

حصص سے متعلق شرعی نقطہ نظر

مفتی شکیل احمد سیتاپوری

شیئرز کی ماہیت اور اس کی تعریف کیا ہے؟ اس سلسلے میں اگر کسی معتبر کمپنی کے بورڈ آف ڈائرکٹرس کا شائع کردہ مواد ترجمہ کرکے سوالنامہ کے ساتھ منسلک کیا جاتا تو شیئرز کا مفہوم سمجھنے میں آسانی ہوتی۔ غالباً یہ بھی ایک طرح کا نظام ہے جس طرح بینکنگ ایک نظام ہے، اس لئے نظام چلانے والے ادارے اپنے نظام کے تعارف کے لئے جو مواد شائع کرتے ہیں اسی سے اسکی ماہیت سمجھ میں آتی ہے۔ ماہیت سمجھنے کے بعد ہی کوئی حکم لگانے کا مرحلہ آتا ہے، نیز بعض مسلم ممالک میں بھی یہ نظام رائج ہے، وہاں کے علماء کے خیالات معلوم ہو جاتے تو آسانی ہوتی، مناسب ہو تو اگلے سمینار میں اسی مسئلہ کو زیادہ شرح وبسط کے ساتھ دوبارہ لایا جائے تاکہ بصیرت کے ساتھ رائے قائم کی جاسکے۔

۱۔ بظاہر یہ سمجھ میں آتا ہے کہ شیئرز دستاویز ہیں، لیکن اس طرح کی دستاویز نہیں ہے جیسی ڈالر، پاؤنڈ، ریال، اور روپے ہیں۔ ثانی الذکر زر مبادلہ ہے اور اول الذکر ایک طرح کا اسٹامپ ہے زر مبادلہ نہیں ہے، چنانچہ شیئرز کے بدلے اگر کوئی شخص اناج کی منڈی میں اناج خریدنا چاہے تو اس کو اناج نہیں ملے گا، شیئرز کا چلن تو صرف شیئرز کے مارکیٹ میں ہوتا ہے۔ اس لئے شیئرز کو نوٹوں کے بدلے خریدنا بیع صرف کیونکر ہوسکتا ہے، بیع صرف تو جب ہوتی جب دونوں جانب زر مبادلہ ہوتا، یہاں ایک جانب زر مبادلہ یعنی روپے ہیں اور دوسری جانب ایک مخصوص قسم کا اسٹامپ ہے۔

جب شیئرز نہ مبیع ہے نہ ثمن بلکہ متعینہ حصص کی تفصیل اور اسکی ضمانت ہے تو اس کے معاملہ کو عقد بیع کہنے کے بجائے عقد شرکت کہنا درست معلوم ہوتا ہے۔

شیئرز کا معاملہ شرکت عنان ہے جس میں تمام شرکاء اپنا مال بھی لگاتے ہیں اور محنت بھی کرتے ہیں، شیئرز میں شرکاء کا مال لگانا تو ظاہر ہے، اور محنت لگانا یہ ہے کہ ان ہی کے پیسوں سے تمام کام کرنے والوں کو اجرت دی جاتی ہے، گویا ان کا نائب ان کی طرف سے کام کررہا ہے۔ ومعنی شركة العنان أن يشترك رجلان بماليهما على أن يعملا فيهما بأبدانهما والربح بينهما وهى جائزة بالاجماع (المغنی ۵،۱۶)۔ (یعنی شرکت عنان کا معنی ہے کہ دو آدمی اپنا مال بھی لگائیں اور اپنی محنت بھی لگائیں اور نفع آپس میں بانٹ لیں، اس طرح کی شرکت بالاتفاق جائز ہے)۔

ولا يجوز أن يكون رأس مال الشركة مجهولا ولا جزافاً (المغنی) (عقد شرکت میں راس المال کا مجہول ہونا یا اس کا انکل پر مبنی ہونا درست نہیں ہے)۔

وشركة العنان مبنية على الوكالة والأمانة لأن كل واحد ملهما بدفع المال إلى صاحبه أمنه ويإذنه له فى التصرف وكله (بحوالہ سابق)۔ (یعنی شرکت عنان کی بنیاد وکالت اور امانت پر ہے۔ اس لئے کہ ہر ایک نے اپنا مال دوسرے کو دیکر اس کو امین بنادیا ہے، اور اس کو تصرف کی اجازت دیکر وکیل ٹھہرادیا ہے)۔

۴۔ جو کمپنیاں ناجائز مال تیار کرتی ہیں ان کے شیئرز خریدنا ناجائز ہے۔

۶،۵۔ سود کی مجبوری:

جس صورت میں کمپنی اپنے طور پر پوری طرح سود سے بچنے کی کوشش کر رہی ہے، لیکن قانونی مجبوری کی وجہ سے اور انکم ٹیکس سے بچنے کے لئے اس کو سودی قرض لینا پڑا ہے، یا اس نے بادل ناخواستہ سود لے کر اتنا صدقہ کر دیا ہے، تو یہ صورت تمام صورتوں میں سب سے زیادہ اوراہون ہے۔ لیکن مال کو بڑھانے اور مالدار بننے کے لئے سودی قرض لینا حرام اور انتہائی قبیح ہے۔

اگر کوئی کمپنی جائز الاستعمال مال تیار کرتی ہے اور اس میں شرکت کے وقت ہر شریک کا راس المال متعین کر دیا گیا ہے اور اس سے حاصل ہونے والے نفع کی نسبت یعنی نصف، ثلث، ربع، ثمن کے طور پر ذکر کی گئی ہے تو اس کے شیئرز کا خرید نا درست ہے۔

۱۲۔ شیئرز کی تجارت:

شیئرز جب نہ ثمن ہیں اور نہ مبیع، تو ان کی تجارت کیونکر درست ہوسکتی ہے، رأس المال یا ثمن وہ زر مبادلہ ہے جو شیئر ہولڈر ادا کرتا ہے، اور مبیع وہ سامان ہے جو فیکٹری میں تیار ہوگا، شیئر ان دونوں میں سے کچھ بھی نہیں ہے، لہذا اس کی بیع وشراء درست نہیں ہے، نیز جب شیئر کا معاملہ عقد شرکت ہے تو شریک کے لئے یہ درست نہیں ہے کہ وہ اپنا حصہ دوسرے کو فروخت کر دے۔

۱۳۔ فیوچر سیل درست نہیں ہے، کیونکہ یہ قمار ہے۔

عن عبداللہ بن مسعود قال نهى النبي ﷺ عن صفقتين في صفقة رواه أحمد، قال سماك يبيع البيع فيقول هو بنسأ بكذا وبنقد بكذا و قال الشوكاني والعلة في تحريم بيعتين في بيعة عدم استقرار الثمن في صورة بيع الشئ الواحد بثمنين (نيل الاوطار ۵،۱۵۲)۔ (حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے ایک بیع دو بیعوں کی صورت میں کرنے سے منع فرمایا، سماک کہتے ہیں کہ اسکی صورت یہ ہے کہ کہے یہ مال ادھار لو تو اتنے میں اور نقد لو تو اتنے میں۔ قاضی شوکانی کہتے ہیں کہ علت نہی یہ ہے کہ ثمن میں استقرار نہیں ہے)۔

جس صورت میں شیئرز خرید نا درست ہے اس صورت میں بروکری بھی درست ہے۔

ولا بأس أن يأخذ السمسار أجره قال البخاری فی صحيحه لم ير ابن سيرين وعطاء وإبراهيم والحسن بأجر السمسار بأسا، وقال ابن عباس لابأس بأن يقول بع هذا الثوب فما زاد على كذا وكذا فهولك، وقال ابن سيرين إذا قال بعه بكذا فما كان من ربح فهو بيني وبينك فلا بأس به، وقال النبي ﷺ المسلمون عند شروطهم (الحلال والحرام في الإسلام ۲۲۸)۔

یعنی اگر ایجنٹ اجرت لے لے تو کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ امام بخاری فرماتے ہیں کہ ابن سیرین اور عطاء بن ابی رباح اور ابراہیم اور حسن بصری ایجنٹ کی اجرت میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھتے۔ حضرت ابن عباس فرماتے ہیں کہ اگر کوئی کسی سے کہے کہ یہ کپڑا بیچ دو اور جو زیادہ پیسے ملیں گے وہ تمہارے ہونگے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اور ابن سیرین کہتے ہیں کہ اگر کوئی کہے کہ یہ چیز فروخت کر دو جو نفع ہوگا وہ ہمارے اور تمہارے درمیان نصف نصف ہوگا تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے، نبی ﷺ کا ارشاد ہے: مسلمانوں کو اپنی شرط پوری کرنی چاہئے۔

☆☆☆

شیئرز کے چند مسائل

مفتی محبوب علی وجیہی [1]

۱۔ جو شخص کسی کمپنی یا فیکٹری کے شیئرز خریدتا ہے تو وہ اس کمپنی کے ہر حصہ اور ہر چیز میں اپنے شیئرز کے تناسب سے مالک ہوجاتا ہے، اس لئے یہ شیئرز اس کی ملکیت کا نمائندہ ہے، پس شیئرز کی یہ حقیقت ہے کہ نقد، اثاثوں، اس کی زمین، مشینیں وغیرہ شیئرز کے ذریعہ اس کی ملکیت میں آجاتی ہیں، اس لئے شیئرز کی خریداری یا فروخت نقد کی نقد کے ساتھ نہیں ہے بلکہ اس کے شیئرز کے حصے کے بقدر جو چیز بھی کمپنی کی ملک ہے اس کی اس پر ملک ہوجاتی ہے، اور جو قانون گورنمنٹ کا ہے وہ ہمارے نقطہ نظر سے غلط ہے، اس میں شیئرز ہولڈر کے شیئرز کے بقدر کمپنی کے اثاثے یا اتنی رقم کمپنی کی قرق ہونا ضروری ہے۔

۲۔ اگر کمپنی کا کوئی وجود نہیں ہے صرف کاغذ پر ہے تو شیئرز خریدنا جائز نہیں ہے، جب کمپنی کا وجود کچھ نہ کچھ ہوجائے مثلاً میٹریل وغیرہ تعمیر کے لئے آگیا، زمین خرید لی تو پھر فروخت کرسکتا ہے، یہ بیع بیع صرف ہوگی۔

۳۔ اگر کمپنی کے اثاثے نقد کے مقابلہ میں نمایاں طور پر غالب ہیں تو شیئرز خریدنا درست ہے کیونکہ اس سے بچنا بہت دشوار ہے اور معاملات کا دارومدار سہولت پر ہے۔ فقہ کا مشہور مقولہ ہے جو احناف کے یہاں بطور دلیل موجود ہے: "للأکثر حکم الکل" اگر حرام اور حلال میں حلال غالب ہے تو کھانا پینا حلال ہے، اور حرام غالب ہے تو حرام، کیونکہ اس میں غالب کے اعتبار سے حکم ہوگا۔

۴۔ ان کمپنیوں کے شیئرز خریدنا مسلمان کے لئے حرام ہے۔

۵۔ چونکہ ان کمپنیوں کا نظام ہمارے ہاتھ میں نہیں ہے، اس لئے ان کے شیئرز کا خریدنا جائز ہوگا، پھر گورنمنٹ کی طرف سے بہت سے ایسے قوانین ہیں جن سے بچنا مسلمان کے اختیار میں نہیں ہے اس لئے "المشقة تجلب التیسیر" کے تحت ان شیئرز کا خریدنا اور بیچنا جائز ہے، اسی طرح "الضرورات تبیح المحظورات" بھی اس پر دلیل جواز ہے۔

۶۔ اگر یہ قانون گورنمنٹ کی طرف سے بالجبر ہے اور اس جبر کو دفع کرنا ہمارے اختیار میں نہیں ہے تو سیکورٹی بانڈس خریدنا یا ریزرو بینک میں جمع کرنا جائز ہے، البتہ اس سے حاصل ہونے والا سود گورنمنٹ کو جو سود دینا پڑتا ہے اس میں دیدے، یا کوئی امدادی فنڈ غرباء کے لئے کھول دے اس سود کی رقم سے، اور یہ رقم اس میں خرچ کردے۔

۷۔ یہ قرض مفید ملک نہیں ہوگا اور اس سے حاصل ہونے والی آمدنی حلال نہیں ہوگی، قرض لینا خوشی سے نہ تھا مجبوری سے تھا اس لئے لینا پڑا، لیکن اب اس سے انتفاع جائز نہ ہوگا کیونکہ نفع اختیاری ہے۔

۸۔ وکیل کا کام مؤکل کی منشاء اور اس کے کہنے کے مطابق عمل کرنا ہے، لہذا اگر وکیل مؤکل کے کہنے اور مؤکل کی مرضی اور منشاء کے مطابق کام کرے گا تو اس کا عمل مؤکل کا عمل سمجھا جائے گا۔

۹۔ جی ہاں! اگر مؤکل وکیل کے کام سے اختلاف کرے تو پھر اس کام میں وہ اس کا وکیل نہیں رہے گا اور یہ وکیل کے عمل سے بری الذمہ ہوجائے

---

[1] دار العلوم فرقانیہ، انگوری باغ، رامپور۔

گا۔

۱۰۔ جی ہاں! مؤکل پہلے تو اپنے وکیل کے سود کے عمل میں اختلاف کر کے اس سے بریٔ الذمہ ہوگا، اب اس کے حصہ میں جو سود کی رقم آئے اس کو تصدق علی الفقراء کر دے تو یہ عند اللہ بریٔ الذمہ ہو جائے گا۔

۱۱۔ جی ہاں کافی ہوگا۔

۱۲۔ تجارت میں خرید وفروخت کے اندر بالعموم ظن وتخمین ہی کام کرتا ہے، آج بڑا تاجر بہت سا سامان اس لئے خرید کر رکھتا ہے کہ آئندہ دام بڑھیں گے اور میں نفع پر اس کو فروخت کروں گا، اسی طرح فیکٹری موجود ہے حلال سامان تیار ہو رہا ہے، یا فیکٹری بننے والی ہے پلان منظور ہو گیا یا بن رہی ہے، یا فیکٹری چل رہی ہے اس کے مال کی کھپت منڈی میں خوب ہے، پس ایسی فیکٹری کے اس خیال سے شیئرز خریدنا کہ اس میں نفع ہوگا بالکل جائز ہے، لیکن وہ فیکٹریاں جن کا ابھی وجود نہیں ہے صرف کاغذ پر ہیں ان کے شیئرز دوسرے آدمی کے ہاتھ فروخت نہیں کر سکتا تاوقتیکہ وہ تعمیر نہ ہونے لگیں اور ان کا وجود نہ ہو جائے۔

۱۳۔ قانون شریعت کے مطابق یہ خرید وفروخت ناجائز ہے۔

۱۴۔ اگر بیع سَلَم کی تعریف اس پر صادق آتی ہے اور وہ شرائط بیع سلم کے ساتھ ہو تو جائز ہوگی ورنہ نہیں۔

۱۵۔ جس وقت شیئرز کی خرید وفروخت کا عمل مابین بائع ومشتری جاری ہوا اسی وقت مشتری اس شیٔ کا مالک ہو گیا اور قبضہ حکمی اس کا ہو گیا، سرٹیفکیٹ تو محض ایک دستاویز ہے جس سے اس کی خریداری کا اور بائع کے فروخت کرنے کا ثبوت ہوتا ہے، جیسے ہم نے کسی جائداد کو خریدا، بعد کو رجسٹری کرائی تو رجسٹری ہمارے ہاتھ میں کبھی مہینہ بھر میں کبھی اس کے بھی بعد آتی ہے مگر جانبین میں عمل دخل اسی وقت سے شروع ہو جاتا ہے، لہذا یہاں عرف وعادت کی بنا پر قبضہ حکمی کافی ہوگا، حسی قبضہ ضروری نہیں۔

۱۶۔ مشتری نے شیئرز کی قیمت ادا کر دی، سودا پکا ہو گیا تو اب سرٹیفکیٹ کے انتظار کی ضرورت نہیں ہے وہ تو صرف کاغذی ثبوت ہے، مشتری اُس کو دوسرے کے ہاتھ فروخت کر سکتا ہے۔

۱۷۔ ایسے آدمی کو شرع کی اصطلاح میں سمسار کہتے ہیں، آج کل کی اصطلاح میں بروکر کہتے ہیں، بروکر کی حیثیت سے کام کرنا جائز ہے، یہ شخص عرف وعادت کے مطابق اپنا کمیشن بھی لے سکتا ہے اور طے کر کے بھی لے سکتا ہے۔

☆☆☆

کمپنیوں میں سرمایہ کاری اور شیئرز/ احکام و مسائل

مولانا اختر امام عادل[1]

''کمپنی'' مشترکہ کاروبار کی ایک نئی شکل ہے، ورنہ خود مشترکہ کاروبار کا تصور نیا نہیں، فقہاء متقدمین کی کتابوں میں شرکت کی مختلف قسموں اور احکام کا تفصیلی ذکر ملتا ہے، کمپنی اسی شرکت کی ایک جدید قسم ہے، جس کا پس منظر حضرت مولانا تقی عثمانی کے بقول یہ ہے کہ:

''یورپ میں صنعتی انقلاب رونما ہونے کے بعد سترہویں صدی کے آغاز میں بڑے بڑے کارخانوں وغیرہ کے قائم کرنے کے لئے عظیم سرمایہ کی ضرورت پڑنے لگی، جس کو کوئی شخص اکیلا یا چند افراد مل کر فراہم نہیں کر سکتے تھے، تو اس وقت عام لوگوں کی منتشر بچتیں یکجا کر کے ان سے اجتماعی فائدہ اٹھانے کے لئے کمپنی کا نظام رائج ہوا (اسلام اور جدید معیشت وتجارت ص ر ۵۵)۔

شرکت و کمپنی میں فرق:

کمپنی کو شرکت کی جدید قسم ماننے کی وجہ یہ ہے کہ فقہاء نے شرکت کی جو چار قسمیں بیان کی ہیں، اور مضاربت کو بھی شامل کرلیا جائے تو پانچ قسمیں ہو جاتی ہیں، ان میں سے کسی بھی قسم میں کمپنی کو پورے طور پر داخل نہیں کیا جاسکتا، بنیادی طور پر اشتراک ہونے کے باوجود دونوں کے تصور وعمل میں کافی فرق ہے، مثلاً:

۱۔ شراکت میں ہر شریک کاروبار کے جز ومشاع کا مالک ہوتا ہے، تمام شرکاء ملکیت واختیارات میں برابر ہوتے ہیں، ہر شخص دوسرے کا وکیل اور جواب دہ ہوتا ہے، جبکہ کمپنی میں ایسا نہیں ہوتا، کمپنی کا خود مستقل قانونی وجود ہے، اس کو ''شخص قانونی'' یا ''شخص فرضی'' کہا جاتا ہے، حاملان حصص کو کمپنی کے اثاثوں میں حق ملکیت تو حاصل ہے، مگر حق تصرف حاصل نہیں، کمپنی تحلیل ہونے کے بعد اگر کمپنی کے اثاثوں کی تقسیم عمل میں آئے تو شرکاء کو ان کے متناسب حصہ کے مطابق اثاثہ ملے گا، مگر تحلیل سے قبل وہ کوئی تصرف نہیں کرسکتا، اسی بنا پر کسی حامل حصص کے مدیون ہونے کی صورت میں اگر اس کے سامان کی قرقی عمل میں آئے تو کمپنی میں موجود اس کے حصہ کا اثاثہ قرق نہیں کیا جاسکتا۔

۲۔ شرکت میں کاروباری سلسلے میں کوئی دعوی ہو تو تمام شرکاء مدعی یا مدعا علیہ بنیں گے، ہر ایک فرد اس کا ذمہ دار قرار پائے گا، اس کے برخلاف کمپنی کا خود مستقل قانونی وجود ہے، وہ خود مدعی یا مدعا علیہ بنے گی، مگر دوسرے حاملان حصص پر اس کی ذمہ داری نہیں آئے گی۔

۳۔ شرکت میں سے کوئی شریک اپنا معاملہ فسخ کر کے سرمایہ نکالنا چاہے تو نکال سکتا ہے، جبکہ کمپنی سے سرمایہ نہیں نکالا جاسکتا، البتہ شیئرز فروخت کئے جاسکتے ہیں۔

۴۔ شرکت میں عموماً ذمہ داری کاروبار کے اثاثوں تک محدود نہیں ہوتی، جبکہ کمپنی میں ذمہ داری محدود ہوتی ہے (اسلام اور جدید معیشت وتجارت ص ر ۶۲)۔

ان باہمی وجوہ فرق کی بنا پر کمپنی کے ساتھ مشارکت، یا اس کے شیئرز کی خرید وفروخت کو شرکت کی معروف فقہی قسموں میں سے کسی قسم میں پورے طور پر داخل نہیں کیا جاسکتا۔ اسی بنا پر اس کے جواز وعدم جواز کے بارے میں علماء کی رائیں مختلف ہوگئی ہیں، ایک محدود طبقہ اس کا قائل ہے کہ چونکہ شرکت صرف پانچ قسموں میں منحصر ہے، اور کمپنی ان میں سے کسی کے ذیل میں مکمل طور پر نہیں آتی اس لئے یہ جائز نہیں۔

جبکہ اس کے بالمقابل علماء کا بڑا طبقہ یہ کہتا ہے کہ کمپنی اگرچہ فقہ کی معروف پانچ قسموں میں داخل نہیں ہے، لیکن اس کے باوجود یہ جائز ہے، اس لئے کہ شرکت انہی پانچ قسموں میں محصور نہیں ہے، فقہاء نے اپنے زمانہ کی مروجہ صورتوں کا استقراء کر کے یہ قسمیں بیان کی تھیں، اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں تھا کہ ان کے علاوہ کوئی نئی قسم پیدا نہیں ہوسکتی، کسی فقیہ نے اس کا دعوی نہیں کیا، اور نہ کسی کتاب فقہ میں یہ لکھا ہے کہ ان کے علاوہ جو بھی قسم ہوگی وہ ناجائز ہے، بلکہ اصل چیز یہ ہے کہ شرکت کے اصول منصوصہ کی مخالفت لازم نہ آئے تو ہر نئی قسم جائز ہوگی ورنہ نہیں۔

---

[1] ناظم، جامعہ ربانی منورہ شریف، سمستی پور۔

ایک تیسرا نقطہ نظر حکیم الامت حضرت تھانوی کا ہے، حضرت تھانوی کے نزدیک کمپنی اپنی حقیقی روح کے اعتبار سے شرکت عنان میں داخل ہے (امداد الفتاوی ۳/ ۲۶۴)۔

اگر چہ اس میں بعض ایسی خصوصیات پائی جاتی ہیں جو معروف شرکت عنان میں پائی نہیں جاتیں، لیکن ان کی وجہ سے عنان کی حقیقت تبدیل نہیں ہوتی۔

شیئرز کی شرعی حیثیت:

اب تک کی گفتگو سے اتنی بات ثابت ہوگئی کہ کمپنیوں کے ساتھ مشارکت کرنا اور اس کے شیئر خریدنا فی نفسہ ناجائز نہیں ہے، اس لئے کہ اگر ہم شرکت کی معروف قسموں میں سے کسی قسم میں اس کو داخل کریں، مثلاً شرکت عنان یا مضاربت میں، تو اس کے بعض امتیازات کے باوجود ان کی قسموں کی روح بنیادی طور پر اس میں باقی رہے گی، اور اگر شرکت کی معروف قسموں کے بجائے کمپنیوں کو ہم نئی قسم قرار دیں تو بھی اس کے عدم جواز کی کوئی وجہ نہیں ہے، اس لئے کہ اس میں کوئی ایسا واقعی پہلو نہیں ہے جو شرکت کے بنیادی اصول کے خلاف ہو۔

البتہ یہاں ایک بات پیدا ہوتی ہے جیسا کہ سوالنامہ میں اس کو اٹھایا گیا ہے کہ شیئرز کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ اصول کی روشنی میں محقق بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ شیئر دراصل کمپنی میں موجود اثاثوں کی متناسب ملکیت کی نمائندگی کرتا ہے، اور جب کوئی انسان کسی کے ہاتھ شیئرز فروخت کرتا ہے تو وہ دراصل اثاثہ تجارت کے جزو مشاع یا حصہ متناسبہ کی بیع کرتا ہے، اور شیئرز سرٹیفکیٹ اس حصہ کی حقداری کا ایک وثیقہ ہے، جس کے ذریعہ اس متناسب حصہ کی ملکیت کو ثابت کرنا مقصود ہوتا ہے، اس لئے شیئرز کی خرید و فروخت میں شرعاً کوئی مضائقہ نہیں۔

بعض علماء کا خیال یہ ہے کہ شیئر حصہ متناسبہ کی ملکیت کی نمائندگی نہیں کرتا بلکہ وہ محض ایک وثیقہ ہے، جیسے کہ بانڈز یا سندات قرض، اور اس کا مطلب صرف اس قدر ہوتا ہے کہ اس شخص نے اتنی رقم کمپنی کو ادا کی ہے، گویا شیئر سرٹیفکیٹ محض ادائیگی رقوم کی رسید ہے۔

ان حضرات کی دلیل یہ ہے کہ شیئرز ہولڈر اگر مدیون ہوجائے تو دین مستغرق ہوجانے کی صورت میں مدیون کے صرف اثاثوں کی قرقی ہوتی ہے، کمپنی میں اس کے حصہ متناسبہ کی قرقی نہیں ہوتی، اگر شیئر کمپنی میں ملکیت متناسبہ کی نمائندگی کرتا تو جہاں اس کے دیگر اثاثوں کو قرق کیا گیا وہیں کمپنی میں اس کے حصوں کو بھی قرق کیا جانا چاہئے تھا۔ لیکن ان حضرات کی یہ دلیل اس لئے صحیح نہیں کہ اس سے زیادہ سے زیادہ حق تصرف واختیار کے فقدان کا ثبوت ملتا ہے، نفس ملکیت کے فقدان کا نہیں، چونکہ کمپنی کے اصول میں سے یہ ہے کہ کوئی شیئر ہولڈر اپنے حصہ کا سرمایہ کمپنی کے تحلیل ہونے سے پہلے نہیں نکال سکتا، ہاں وہ شیئر فروخت کرسکتا ہے، اس بنا پر مدیون حامل حصص کے اثاثوں کی قرقی کے وقت کمپنی سے اس کے حصہ متناسبہ کے نکالنے کی اجازت نہیں ہوتی۔

حصہ متناسبہ کی ملکیت کی دلیل یہ ہے کہ اگر کمپنی تحلیل ہوجائے تو اس کے اثاثوں کی تقسیم کے وقت ہر شیئر ہولڈر کو اپنے حصہ متناسبہ کے مطابق اثاثہ ملے گا، خواہ اس کی مالیت اس کی لگائی ہوئی رقم سے زیادہ ہو یا کم، اگر شیئر ہولڈر کمپنی کے اثاثوں میں ملکیت نہ رکھتا تو تحلیل ہونے کے وقت اس میں اس کو حصہ کیسے ملتا؟

شیئرز خریدنے کے مقاصد:

شیئرز خریدنے کے دو مقاصد ہوتے ہیں: (۱) کبھی مقصد نفع و نقصان میں شریک ہونا اور کمپنی سے سالانہ یا ماہانہ منافع حاصل کرنا ہوتا ہے، اس کو انگریزی میں "Investment" کہتے ہیں۔ (۲) اور کبھی یہ مقصد نہیں ہوتا، بلکہ تجارت کے طور پر اس کو خریدتے ہیں، یہ لوگ شیئرز کی قیمتوں پر نگاہ رکھتے ہیں، اور جن شیئرز کی قیمتیں آج کم ہیں مگر آئندہ بڑھنے کا امکان ہے، ان کو خرید لیتے ہیں، اور پھر قیمت بڑھ جانے کے بعد بیچ دیتے ہیں، اسی طرح جو شیئر ان کے پاس ہیں، آئندہ ان کی قیمتوں میں اگر گراوٹ کا امکان ہو تو اس کو بیچ دیتے ہیں، اور جن میں بڑھنے کی امید ہے ان کو فی الحال نہیں بیچتے، بلکہ اس مدت کا انتظار کرتے ہیں، اس کو انگریزی میں "Capital Gain" کہتے ہیں، مدتوں کے درمیان قیمتوں میں جو کمی بیشی ہوتی ہے اسی سے وہ نفع اٹھاتے ہیں۔

شیئرز خواہ جس مقصد کے لئے خریدے جائیں کچھ ایسے اصول و شرائط ہیں کہ ان کی رعایت کے ساتھ شیئرز کی خرید و فروخت ہو تو شیئرز کا کاروبار جائز ہوگا، اس کے لئے بنیادی طور پر درج ذیل شرائط ہیں:

(۱) سب سے اولین شرط یہ ہے کہ کاروبار بنیادی طور پر حلال ہو، مثلاً شراب کا کاروبار نہ ہو، اس کی بنیاد سودی لین دین پر نہ ہو وغیرہ۔ حرام کاروبار یا ناجائز اصول تجارت پر مبنی کمپنی کے شیئرز خریدنا بالکل جائز نہیں، نہ جاری ہونے کے وقت لینا جائز ہے، اور نہ بعد میں اسٹاک ایکسچینج سے لینا

جائز ہے، اس لئے کہ اس میں شرکت کرنا در اصل خود ان معاملات میں جانتے ہوئے شرکت کرنا ہے جو حرام ہے (امداد الفتاوی ۱۳۰/۳)۔

(۲) رہی وہ کمپنیاں جن کا بنیادی کاروبار جائز اور حلال ہو، مگر کبھی اس کو سودی لین دین یا ناجائز معاملہ میں بھی ملوث ہونا پڑتا ہے، اور آج کل زیادہ تر کمپنیاں اسی قسم کی ہیں، ان کے ساتھ مشارکت کرنا اور ان کے شیئرز خریدنا جائز ہے یا نہیں؟ یہ ایک اختلافی موضوع ہے۔

بعض علماء کا خیال یہ ہے کہ ایسی کمپنیوں کے شیئرز خریدنا بھی جائز نہیں، اس لئے کہ اس صورت میں بھی بالواسطہ ناجائز معاملات میں شرکت لازم آتی ہے۔ لیکن محقق علماء جن میں حضرت تھانویؒ کا نام سرفہرست ہے، ان کا خیال ہے کہ ایسی کمپنیاں جو کبھی کبھار سودی کاروبار میں ملوث ہو جاتی ہیں ان میں شرکت کرنا اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے جائز ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ کسی کمپنی کے سود میں ملوث ہونے کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں:

۱۔ ایک صورت یہ ہے کہ سود پر قرض حاصل کیا جائے یا کسی کاروبار کے فروغ واستحکام کے لئے رشوت دی جائے، جس میں سود کی رقم دینی پڑتی ہے، کوئی ناجائز رقم کاروباری سرمائے میں شامل نہیں ہوتی، اس میں زیادہ سے زیادہ کمپنی کے عمل کو ناجائز کہا جا سکتا ہے، مگر اس سے سرمایہ کی پاکیزگی میں کوئی فرق نہیں آتا (امداد الفتاوی، کتاب الربا ۱۷۰/۳)۔

رہا کمپنی کا ناجائز عمل تو اس کے لئے حضرت تھانویؒ نے تجویز پیش فرمائی کہ شیئر ہولڈر کسی طرح یہ آواز اٹھادے کہ میں سودی کاروبار پر راضی نہیں ہوں تو اس کی ذمہ داری ختم ہو جائے گی، کمپنی کے ذمہ داران کی طرف اس مضمون کا خط لکھ دینا بھی کافی ہو سکتا ہے (امداد الفتاوی ۴۹۱/۳)۔

آج کل اس کی بہترین صورت یہ ہے کہ اس کی سالانہ جمعیت میں آواز اٹھائی جائے۔

اس موقع پر مولانا تقی عثمانی نے ایک بہت ہی معقول سوال اٹھایا ہے، اور پھر اس کا عمدہ جواب بھی دیا ہے، مولانا کے سوال وجواب کا خلاصہ یہ ہے کہ یہاں اعتراض یہ ہو سکتا ہے کہ کمپنی کے ذمہ داران شیئر ہولڈر کے وکیل ہیں، اور شیئر ہولڈر کو معلوم ہے کہ اس کی مخالفت مؤثر نہ ہوگی، پھر وکالت قائم رکھتے ہوئے مخالفت کی آواز اٹھانے سے کیا فائدہ؟ اور اس کے بعد وہ اپنی ذمہ داری سے سبکدوش کس طرح ہو جائے گا؟

اس کا جواب یہ ہے کہ کمپنی کی وکالت شرکت کی وکالت کی طرح مضبوط نہیں ہوتی، شرکت میں تو کوئی ایک شریک بھی کسی کاروبار سے اختلاف کر دے تو وہ کاروبار نہیں کیا جا سکتا، اسی طرح ہر شریک جب چاہے اپنا سرمایہ نکال سکتا ہے، جبکہ کمپنی کی وکالت اس قدر مضبوط نہیں ہوتی، یہاں شیئرز ہولڈرس کو نہ اس قدر حقوق تصرف حاصل ہیں، اور نہ ہر شریک کے فیصلہ کو مستقل اہمیت حاصل ہے، یہاں فیصلے کثرت رائے سے ہوتے ہیں، اقلیت کی رائے اکثریت کے مقابلے میں رد کر دی جاتی ہے، اس لئے اگر کوئی شیئر ہولڈر مخالفت میں آواز بلند کرے اور اس کی مرضی کے خلاف کثرت رائے کی بنا پر فیصلہ ہو جائے تو یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ کاروبار یا کمپنی کا فلاں عمل اس کی مرضی واجازت سے ہو رہا ہے، اس لئے حضرت تھانوی کی یہ رائے درست معلوم پڑتی ہے کہ مخالفت کی آواز بلند کرنے سے اس کی ذمہ داری ختم ہو جائے گی۔

۲۔ مسئلہ کی دوسری صورت یہ ہے کہ سودی لین دین دونوں ہو، کمپنی قرض بھی جاری کرتی ہو اور اس پر سود بھی لیتی ہو، تو ایسی صورت میں سرمائے کے اندر مال خبیث کا اختلاط ہوتا ہے، اس وقت فیصلہ کی صورت یہ ہوگی کہ اگر مال حرام کا اختلاط بڑے پیمانے پر ہو رہا ہو، یعنی کمپنی کا بنیادی کاروبار ہی حرام وناجائز ہے، تب تو اس کے شیئرز خریدنا جائز نہ ہوگا، البتہ جن کمپنیوں میں یہ اختلاط بقدر قلیل ہو تو اصول کی روشنی میں اس کو نظر انداز کیا جا سکتا ہے، اس لئے کہ اموال میں غالب سرمائے کا اعتبار ہوتا ہے، اس بنا پر غالب سرمایہ اگر پاک ہو تو جائز قرار دیا جائے گا، حضرت تھانوی کی یہی رائے ہے (اسلام اور جدید معیشت وتجارت ص ۸۸)۔

اس کی تائید فتاوی خانیہ کی درج ذیل عبارت سے بھی ہوتی ہے: وإن كان غالب مال المهدي من الحلال لا بأس بأن يقبل الهدية ويأكل مالم يتبين عنده أنه حرام لأن أموال الناس لا تخلو عن قليل حرام فيعتبر الغالب (فتاوى خانيه على هامش الهنديه ۴۰۰/۳)۔ وكذا في الاشباه في باب الهدية والبيع جميعا (الاشباه والنظائر ۳۴۴/۱)۔

البتہ یہاں شبہ یہ ہوتا ہے کہ ہدیہ کے مال اور شیئرز میں فرق ہے، اگر کسی آدمی کا کاروبار حلال وحرام دونوں ہے، اور وہ ہدیہ دے رہا ہے تو یہ احتمال ہے کہ حلال کمائی میں سے دے رہا ہو، جبکہ شیئرز میں جو نفع ہوتا ہے وہ تمام مدات کے تناسب سے ہوتا ہے، اس لئے سود پر جو دیون جاری کئے گئے ان سے جو سود حاصل ہوگا، نفع میں اس کا تناسب بھی جوڑا جائے گا، اس طرح شیئرز مال خبیث سے پاک نہیں ہو سکتا۔ اس صورت میں مولانا تقی عثمانی کی یہ تجویز پسندیدہ ہے کہ کمپنی کے "Income Statements" کے ذریعہ یا کمپنی کے ذمہ داروں سے تقسیم شدہ منافع کا تناسب معلوم

کرے، اور شرح سود سے جس قدر نفع آیا ہو اس کو لازماً بلا نیت ثواب صدقہ کر دے۔ رہا سودی عمل میں کمپنی کے ساتھ بالواسطہ شرکت تو اس کے بارے میں عرض کیا جا چکا ہے کہ اس عمل کے خلاف شیئر ہولڈر کا آواز اٹھا دینا کافی ہے، اور وہ اس ذمہ داری سے بری ہو جائے گا۔

چونکہ آج کل کوئی کمپنی سودی معاملہ سے بالکلیہ پاک نہیں ہے، اس بنا پر مسلمانوں کو ان کے شیئرز خریدنے سے روکا نہیں جاسکتا، ورنہ مسلمان اقتصادی طور پر اور بھی کمزور ہو جائیں گے، البتہ ان کے مضرات سے بچنے کی ہر امکانی تدبیر کرنی ہوگی، یہ کوئی دانشمندی نہیں کہ حالات کو سمجھے بغیر ظاہری مضرات سے بچنے کے لئے کوئی ایسا اقدام کر دیا جائے کہ قوم کو اس سے بھی زیادہ بھیانک نتائج کا سامنا کرنا پڑ جائے۔

شیئرز کی بیع کمی بیشی کے ساتھ:

کمپنی کے شیئرز کو کمی بیشی کے ساتھ بھی فروخت کیا جاسکتا ہے، بشرطیکہ کمپنی کا سارا سرمایہ بصورت نقود نہ ہو، بلکہ کچھ فکسڈ اثاثے (مثلاً مشینری اور بلڈنگ وغیرہ) حاصل کر لئے گئے ہوں، اگر کمپنی نے ابھی اپنا کاروبار شروع نہ کیا ہو یا اس کا سارا سرمایہ بصورت نقود ہو تو شیئرز کی خرید و فروخت کمی بیشی کے ساتھ جائز نہیں، اس لئے کہ اس وقت یہ شیئرز اپنے حصے کے نقود کی نمائندگی کریں گے، اور خالص نقود میں کمی بیشی کے ساتھ بیع جائز نہیں، البتہ جس صورت میں نقود کے علاوہ کچھ دیگر منجمد اثاثے بھی حاصل کر لئے گئے ہوں تو یہ شیئرز نقود کے ساتھ کمپنی میں موجود اثاثوں کی بھی نمائندگی کریں گے، اور اب شیئرز کی بیع کا مطلب یہ ہوگا کہ کمپنی کے اثاثوں میں ہر ایک کے متناسب حصے کی بیع ہو رہی ہے، اس مسئلہ کا مدار ''سیف محلی'' یا ''منطقہ مفضضہ'' کے مسئلہ پر ہوگا، جو امام ابوحنیفہ اور امام شافعی کے درمیان اختلافی مسئلہ ہے۔ اس مسئلہ کا حاصل یہ ہے کہ ایسے مال کو جو مال ربوی اور غیر ربوی سے مخلوط ہو خالص مال ربوی کے عوض فروخت کیا جائے، امام شافعی کے نزدیک یہ بیع جائز نہیں جب تک کہ مال مخلوط سے مال غیر ربوی کو الگ نہ کر دیا جائے۔ جبکہ امام ابوحنیفہ کے نزدیک اس کی بیع جائز ہے، بشرطیکہ خالص مال ربوی، مخلوط مال ربوی سے زیادہ ہو، اس لئے کہ اس وقت مخلوط مال ربوی اپنے بقدر خالص مال ربوی کے مقابلے میں ہو جائے گا، اور خالص میں جو مقدار زیادہ ہوگی وہ مال غیر ربوی کے مقابلہ میں ہو جائے گی۔

یہاں بالکل یہی صورت ہے کہ شیئرز جو نقود و غیر نقود کی نمائندگی کرتے ہیں ان کی بیع خالص نقود سے ہو رہی ہے، اس لئے امام اعظم کے نزدیک ان کی بیع جائز ہوگی، اور امام شافعی کے نزدیک ایسی حالت میں بیع جائز نہ ہوگی، البتہ بعض شافعیہ اور حنابلہ کے موقف کے مطابق اگر کمپنی کے اثاثے زیادہ ہیں اور نقود کم ہیں، تو شیئرز کی بیع جائز ہوگی، اور اگر نقود زیادہ اور دیگر اثاثے کم ہیں تو شیئرز کی بیع ناجائز ہوگی۔ آج کل علماء عرب زیادہ تر یہی فتوی دے رہے ہیں۔

بانڈز اور ڈبینچرز:

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کمپنی کو سرمائے کی ضرورت ہوتی ہے، تو بجائے شیئرز کے عوام کو قرضے دینے کی دعوت دیتی ہے، اس کے لئے دو طرح کی دستاویزات کمپنی جاری کرتی ہے، جس کو لے کر لوگ کمپنی کو قرضے دیتے ہیں، ایک دستاویز کو سند (بانڈ Bond) اور دوسرے کو شہادة الاستثمار (ڈبینچر۔Debenture) کہتے ہیں، یہ دونوں قرض ہی کے دستاویز ہوتے ہیں، جو معینہ مدت کے لئے لئے جاتے ہیں، ان دونوں میں اس قدر تو مشترک ہے کہ دونوں قسم کے دستاویز حاصل کرنے والے لوگ کمپنی میں حصہ دار نہیں ہوتے، بلکہ محض دائن ہوتے ہیں، جن کو کمپنی کی طرف سے سالانہ سود دیا جاتا ہے، اور وقت مقرر پر رقم واپس کر دی جاتی ہے، جس کی ضمانت دی جاتی ہے، البتہ دو لحاظ سے فرق ہے: ایک فرق تو یہ ہے کہ بانڈ محض سند قرض ہے، جبکہ ڈبینچر قرض کے ساتھ رہن کا بھی وثیقہ ہے۔ بعض اوقات سند قرض کو تحفظ دینے کے لئے ایک دستاویز جاری کی جاتی ہے، جس میں اس سند کو کمپنی کی کسی ایک جائداد یا بہت سی جائدادوں کے ساتھ متعلق کر دیا جاتا ہے، کہ اگر یہ قرضے ادا نہ ہوئے تو ان متعلقہ جائدادوں سے ادا کر دیئے جائیں گے۔

دوسرا فرق یہ ہے کہ اگر کمپنی دیوالیہ ہو جائے تو حقوق کی ادائیگی کی ترتیب میں ڈبینچرز اس جائداد کی حد تک قانوناً مقدم ہوں گے، جس کو رہن بنایا گیا تھا، بانڈز کی ادائیگی اس کے بعد ہوتی ہے۔

بانڈز کی ایک قسم ایسی ہے جو شیئرز میں تبدیل ہو سکتی ہے، اس کے لئے کبھی مدت مقرر ہوتی ہے کبھی نہیں ہوتی، کبھی اس کے لئے کچھ مخصوص شرائط ہوتے ہیں اور کبھی نہیں ہوتے، ایسے سندات قرض کو انگریزی میں (Convertible Bonds) کنورٹیبل بانڈز کہتے ہیں (اسلام اور جدید معیشت و تجارت رص ۶۴)۔

اس تفصیل سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ بانڈز، ڈبینچرز، یا کنورٹیبل بانڈز اصلاً سندات قرض ہیں اس لئے ان سے سرمایہ کاری نہیں کی جاسکتی، اور ان سندات کے حاملین کو صرف اتنی ہی رقم لینا درست ہوگا، جس قدر اس نے جمع کی ہوگی، اس سے زیادہ جو کچھ ملتا ہے وہ سود ہے حرام ہے، اس کو نفع قرار نہیں دیا جاسکتا۔

اس سے یہ بات بھی واضح ہوجاتی ہے کہ سندات قرض کو کمی بیشی کے ساتھ فروخت کرنا جائز نہیں ہے، اس لئے کہ یہ سندات جمع کردہ رقم کی محض رسید ہیں، یہ کمپنی کے اثاثوں میں کسی قسم کی ملکیت کی نمائندگی نہیں کرتے ہیں، اس لئے ان کی بیع کمی بیشی کے ساتھ جائز نہیں۔

بانڈز کی بیع دراصل کمپنی سے اپنے وصولی قرض کے حق کو دوسرے کی طرف منتقل کرنا ہے، یعنی اب کمپنی سے قرض اس کے وصول کرنے کے بجائے فلاں شخص وصول کرے گا اور اس میں شرعاً کوئی قباحت نہیں، البتہ کمی بیشی کے ساتھ معاملہ کرنا جائز نہ ہوگا، بلکہ یہ سود قرار دیا جائے گا۔

سندات قرض کو رہن رکھا جاسکتا ہے، اس لئے کہ رہن کی بنیاد اصلاً اعتماد پر ہے، اور یہ بات اس میں پائی جاتی ہے۔

ولأن الكفالة والرہن شرعاً للتوثق (بدائع الصنائع، کتاب الاجارہ ۴/۲۰۳)۔

اگر کسی کمپنی میں حصص تجارت حاصل کرنے کی گنجائش نہ ہو تو بدرجہ مجبوری قابل تبدیل سندات قرض (Convertible Bonds) خریدے جا سکتے ہیں، بشرطیکہ کمپنی کا بنیادی کاروبار حلال ہو، اور شیئرز میں تبدیل ہونے کی مدت تک جو سود ملے وہ اپنے استعمال میں نہ لایا جائے بلکہ صدقہ کردیا جائے۔

سندات قرض کی خرید وفروخت میں فیس ویلو (Face Value) کا لحاظ رکھنا ضروری ہوگا، اس میں مارکیٹ ویلو کا لحاظ کرنا درست نہیں اگر وہ فیس ویلو سے مختلف ہو، اس لئے کہ یہ محض وصولی حق کی رسید ہے، کمپنی کے جزو مشاع کا بدل نہیں کہ اس کی قیمت میں اضافہ یا نقصان ہو۔

حصص کی تقسیم حصہ دار کے حقوق کے لحاظ سے:

پریفرنس شیئرز (Preference Share) جس کو اردو میں ترجیحی حصص اور عربی میں السہم الممتاز بھی کہتے ہیں، یہ نہ پوری طرح حصہ تجارت ہے اور نہ پوری طرح سند قرض ہے، دراصل حصص کی ایک تقسیم حصہ دار کے حقوق کے اعتبار سے ہوتی ہے، یعنی نفع وصول کرنے یا کمپنی کی پالیسی میں مداخلت کے اعتبار سے حصص کی دو قسمیں ہیں:

(۱) آرڈینری شیئر (Ordinary Share) جس کو عربی میں السہم العادی کہتے ہیں، (۲) دوسری قسم وہی پریفرنس شیئر ہے۔

ان دو قسم کے حصص میں بنیادی فرق یہ ہے کہ پریفرنس شیئر کے حامل کو نفع تقسیم کرنے یا حق رائے دہی میں آرڈینری شیئر کے حامل سے مقدم رکھا جاتا ہے۔ مولانا تقی عثمانی نے ان کے درمیان وجوہ فرق کو بڑی وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے:

(۱) السہم الممتاز کا نفع اس کے لگائے ہوئے سرمائے کی خاص شرح کے مطابق مقرر ہوتا ہے، مثلاً اس کے لگائے ہوئے سرمائے کا دس فیصد (10٪) پہلے السہم الممتاز کے حاملین میں نفع تقسیم کرکے ان کا معینہ نفع ان تک پہونچایا جاتا ہے، اس کے بعد اگر کچھ بچے تو السہم العادی کے حاملین کو ملتا ہے، ورنہ وہ نفع سے محروم رہیں گے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی سال کمپنی کو نفع نہیں ہوا تو ایسی صورت میں بھی السہم الممتاز کا نفع محفوظ رہتا ہے، آئندہ سال جب نفع ہوگا تو پہلے ان کو دیا جائے گا، اس کے بعد نفع بچا تو السہم العادی کو ملے گا۔

(۲) بعض اوقات ترجیح کی صورت یہ ہوتی ہے کہ السہم الممتاز کے نفع کی شرح السہم العادی سے زیادہ رکھی جاتی ہے۔

(۳) کبھی ترجیح اس طرح ہوتی ہے کہ کمپنی کے سالانہ اجلاس میں السہم الممتاز والوں کو ووٹ کا حق ہوتا ہے۔ السہم العادی والوں کو ووٹ کا حق نہیں ہوتا۔

(۴) کبھی السہم الممتاز والے کو زیادہ ووٹ کا حق ہوتا ہے اور السہم العادی والے کو کم ووٹ کا، مثلاً یہ کہ السہم الممتاز والے کو دو ووٹ کا اور السہم العادی والے کو ایک ووٹ کا حق ہوگا۔

حاصل یہ کہ السہم الممتاز ترجیحی حصے کا نام ہے، پھر ترجیح کی شکلیں مختلف ہوسکتی ہیں، اس کی ضرورت عموماً اس وقت پیش آتی ہے، جبکہ کسی خاص بڑی پارٹی مثلاً انشورنس کمپنی وغیرہ سے سرمایہ لینا ہو، اب وہ اس پر آمادہ نہیں کہ عام حصہ دار (شیئر ہولڈر) کی حیثیت سے رقم لگائے اس لئے کہ اس میں نفع طے شدہ نہیں ہے، اور اس پر بھی آمادہ نہیں کہ محض قرض دہندہ (دائن) کی طرح سود پر قرض دے، اس لئے کہ محض قرض دہندہ کی حیثیت میں وہ کمپنی کی پالیسیوں پر اثر انداز نہیں ہوسکے گی، ایسی پارٹی سے سرمایہ لینے کے لئے اس کو ترجیحی حصص دیئے جاتے ہیں، تاکہ اس کو مقررہ نفع بھی ملے اور کمپنی میں حصہ دار بھی ہو، چنانچہ یہ ایک اعتبار سے دائن اور ایک اعتبار سے حصہ دار ہوتی ہے (اسلام اور جدید معیشت وتجارت رص ۶۰)۔

شیئرز کی خرید وفروخت کے مختلف طریقے: ......اسٹاک ایکسچینج میں شیئرز کی خرید وفروخت کے مختلف طریقے رائج ہیں:

(۱) کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کمپنی کے وجود میں آنے سے پہلے ہی اس کے شیئرز کی خرید وفروخت شروع ہوجاتی ہے، ایسی کمپنیوں کے شیئرز کی بیع وشراء جائز نہیں، اس لئے کہ جب کمپنی کا وجود ہی نہیں تو یہ شیئرز کس چیز کی نمائندگی کریں گے، اس لئے یہ بیع غیر مملوک ہے جو اصولاً ناجائز ہے۔

(۲) جو کمپنیاں موجود ہیں ان کے شیئرز کی خرید وفروخت کے بھی کئی طریقے ہیں، ایک طریقہ فیوچر سیلز (Future Sales) کہلاتا ہے، اس میں شیئرز لینا دینا مقصود نہیں ہوتا، بلکہ محض مدت کے لحاظ سے نفع نقصان کی کمی بیشی برابر کرنا مقصود ہوتا ہے، یہ قمار ہے جو جائز نہیں۔

(۳) دوسرا طریقہ غائب سودا کا ہے، جس میں بیع کی اضافت مستقبل کی طرف کی جاتی ہے، یہ بیع بھی صحیح نہیں اس لئے کہ بیع کی تعلیق یا مستقبل کی طرف اس کی اضافت باتفاق فقہاء جائز نہیں، اس کو محض وعدۂ بیع قرار دیا جاسکتا ہے۔

(۴) تیسرا طریقہ حاضر سودا کا ہے، جس میں شیئرز کی بیع وشراء ایک ہی مجلس میں ہوجاتی ہے، اور عقد تام ہوجاتا ہے، البتہ شیئرز کا قبضہ کرانے میں کچھ تاخیر ہوتی ہے، شیئرز دو طرح کے ہوتے ہیں، ایک کو رجسٹرڈ شیئر (Registered Share) کہتے ہیں وہ حامل حصص کے نام پر کمپنی میں رجسٹرڈ ہوتا ہے، دوسرا بیئرر شیئر (Bearer Share) کہلاتا ہے، وہ کسی کے نام پر رجسٹرڈ نہیں ہوتا، جس کے قبضہ میں ہو اسی کا کہلاتا ہے، بیئرر شیئر کا قبضہ کرانے میں تو کوئی دیر نہیں ہوتی، البتہ رجسٹرڈ شیئرز کا قبضہ کرانے میں عموماً ایک ہفتہ سے تین ہفتوں تک کی تاخیر ہوجاتی ہے، اس میں بائع کو اپنے نام کی جگہ مشتری کا نام رجسٹرڈ کرنا پڑتا ہے، اس کی دفتری کارروائی میں تاخیر ناگزیر ہوجاتی ہے۔ اس دوران کبھی ایسا ہوتا ہے کہ مشتری جس کے نام پر اب تک شیئر رجسٹرڈ نہیں ہوا ہے وہ رجسٹرڈ ہونے سے پہلے ہی کسی دوسرے کے ہاتھ فروخت کردیتا ہے، کبھی کبھی تو ایسا بھی ہوتا ہے کہ مشتری اول کے نام رجسٹرڈ ہونے تک آگے چار پانچ ہاتھوں میں شیئر فروخت ہوچکا ہوتا ہے، سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ شیئرز کا بغیر قبضہ میں آئے ہوئے فروخت کرنا درست ہے یا نہیں؟ اس سوال کے جواب کے لئے ہمیں قبضہ کی حقیقت کو سمجھنا ہوگا، اتنی بات تو طے ہے کہ قبل القبض بیع دو وجہ سے ناجائز ہے:

۱۔ ایک تو اس بنا پر کہ یہ ابھی مقدور التسلیم نہیں ہے، اور اس پر کوئی تصرف نہیں کیا جاسکتا۔

۲۔ دوسرے اس بنا پر کہ یہ ابھی بائع کے ضمان میں داخل نہیں ہوا، اور ربح مالم یضمن جائز نہیں۔

اس لئے شیئرز کی بیع سے قبل قبضہ بہر حال ضروری ہے، مگر شیئرز کے قبضہ کی نوعیت کیا ہوگی؟ ہر چیز کا قبضہ اس کے لحاظ سے ہوتا ہے، قبضہ حسی ہر جگہ ضروری نہیں، حکماً قبضہ بھی بعض جگہوں پر کافی ہوجاتا ہے، شیئرز کی صورت حال یہ ہے کہ محض شیئرز سرٹیفکیٹ تو مبیع نہیں، بیع دراصل وہ حصہ متناسبہ ہے جو کمپنی کے اثاثوں میں شامل ہے، اس لئے اس پر قبضہ حسی بہر حال ناممکن ہے، اس بنا پر قبضہ حکمی ہی کو کافی قرار دینا ہوگا، قبضہ حکمی یہ ہے کہ مبیع مشتری کے قبضہ میں آجائے، اور اس کا غرم وغنم بھی مشتری کی طرف منتقل ہوجائے۔ مولانا تقی عثمانی کے بقول کمپنیوں کے ذمہ داروں سے کافی بات چیت کے بعد پتہ چلا کہ مبیع مشتری کے ضمان میں منتقل ہوجاتا ہے، یہی وجہ ہے کہ اگر بیع کے بعد اور شیئرز قبضہ میں آنے سے قبل منافع کی تقسیم ہوجائے تو کمپنی تو بائع کے نام پر ہی منافع تقسیم کرے گی، اس لئے کہ رجسٹر میں اسی کا نام درج ہے، مگر اسٹاک ایکسچینج کی ذمہ داری ہے کہ وہ بعد عقد تقسیم ہونے والے منافع مشتری کو دلائے، اسی طرح اگر نقصان ہوگا تو یہ مشتری کو برداشت کرنا ہوگا، اس لحاظ سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ عقد کے بعد ہی شیئر مشتری کے قبضہ میں چلا جاتا ہے۔

مگر وہیں یہ بات بھی کھٹکتی ہے کہ شیئرز کی خرید وفروخت کا معاملہ اصل تو کمپنی سے ہے، اسٹاک ایکسچینج سے نہیں، اور کمپنی کے نزدیک شیئرز کا قبضہ اس وقت تک تسلیم نہیں کیا جاتا جب تک کہ نام پر منتقل نہ ہوجائے، اسی طرح عرف میں جس چیز کو قبضہ کہا جائے گا وہی قبضہ کہلائے گا، اور رجسٹرڈ شیئرز کا قبضہ کمپنی میں نام درج کرانے اور اس کی رسید مل جانے کے بعد ہی مانا جاتا ہے، اس کے بغیر عرفاً قبضہ نہیں مانا جاتا، اس کا تقاضا ہے کہ بغیر رجسٹرڈ ہوئے شیئرز کی بیع درست نہ ہو، احتیاط بھی ہے کہ شیئرز اپنے نام پر منتقل ہوئے بغیر فروخت نہ کئے جائیں۔

البتہ اسٹاک ایکسچینج میں جو لوگ ممبر بن کر شیئرز کی خرید وفروخت کرتے ہیں وہ دراصل کمپنیوں کے وکیل ہوتے ہیں، ان کے نام پر شیئرز نہیں ہوتے وہ کمپنیوں کی اجازت سے شیئرز خریدتے اور بیچتے ہیں، اس لئے ان کے لئے قبضہ رجسٹرڈ کی ضرورت نہیں ہونی چاہئے، اور یہ ممکن بھی نہیں، اس لئے کہ روزانہ سیکڑوں شیئرز کی خرید وفروخت ہوتی ہے، ہر ایک کے بارے میں یہ اہتمام کرنا کہ بیچنے والا ممبر پہلے اپنے نام پر منتقل کرائے پھر فروخت کرے، یہ ناممکن ہے، اس لئے خیال یہ ہوتا ہے کہ یہاں وہی قبضہ معتبر ہونا چاہئے جو اوپر ذکر کیا گیا، کہ اگرچہ شیئرز نام پر نہیں ہوتے لیکن کمپنیوں کی اجازت اور لوگوں کے تعامل کی بنا پر غرم و

غنم دونوں ہی اسٹاک ایکسچینج کے ممبروں کے قبضہ میں سمجھے جاتے ہیں، یہ قبضہ حکمی ہے جو کافی ہونا چاہئے۔

خلاصہ جوابات:

مذکورہ تفصیل کی روشنی میں مختصر جوابات تحریر کئے جاتے ہیں:

۱۔ کسی کمپنی کا خرید کردہ شیئر کمپنی میں شیئر ہولڈر کی متناسب ملکیت کی نمائندگی کرتا ہے، یہی نقطہ نظر راجح اور حقیقی ہے، رہا یہ کہ شیئر ہولڈر کے دیوالیہ ہونے کے وقت کمپنی میں اس کے متناسب حصہ کی قرقی نہیں ہوتی، اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ ملکیت نہیں ہوتی بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ کمپنی کی تحلیل سے قبل ہولڈر کو تصرف کا اختیار نہیں ہوتا، اور تصرف کا اختیار نہ ہونا ملکیت کو نقصان نہیں پہنچاتا۔

۲۔ اگر کمپنی نئی قائم ہوئی ہو، اس کے پاس کچھ املاک نہ ہوں، تو ایسی کمپنی کے شیئرز کی خرید وفروخت صرف اس کے فیس ویلو سے درست ہوگی، مارکیٹ ویلو کے لحاظ سے کمی بیشی جائز نہیں، اس لئے کہ یہ بیع صرف ہوگی۔

۳۔ البتہ اثاثہ مخلوط ہونے کی صورت میں جبکہ مجموعہ مال ربوی وغیر ربوی دونوں پر مشتمل ہو، کمی بیشی کے ساتھ بیع جائز ہوگی۔

۴۔ جن کمپنیوں کا بنیادی کاروبار حرام ہے ایسی کمپنیوں کے شیئرز خریدنا جائز نہیں۔

۶،۵۔ البتہ جن کمپنیوں کا بنیادی کاروبار حلال ہے مگر بعض اوقات کسی مصلحت یا مجبوری کی بنا پر بعض ناجائز چیزیں کرنی پڑتی ہیں، ایسی کمپنیوں کے شیئرز خریدنا جائز ہے، بشرطیکہ بورڈ کے سامنے ان چیزوں کے بارے میں اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کردے، اور اگر کچھ سودی یا ناجائز حصہ اس کے منافع میں آرہا ہو تو اسکے تناسب سے بلانیت ثواب صدقہ کردے۔

۷۔ سود پر حاصل شدہ قرض سے ہونے والے منافع شرعی طور پر طیب ہیں، البتہ یہ عمل بلاضرورت جائز نہیں۔

۸۔ کمپنی کا بورڈ آف ڈائرکٹرس شیئرز ہولڈر کا وکیل ہے، مگر اس کی وکالت اس قدر مضبوط نہیں جس قدر کہ شرکت کی عام قسموں میں ہوتی ہے، جس کی بنا پر عمل کی نسبت کے باب میں قدرتی طور پر فرق واقع ہوگا۔

۹۔ بورڈ آف ڈائرکٹرس کا فیصلہ کثرت رائے سے ہوتا ہے، اس لئے اس میں کسی شیئرز ہولڈر کا سودی قرض لینے سے اختلاف کرنا اور اپنے اختلاف کا اعلان کردینا وکیل کے عمل کی ذمہ داری سے اسے بری الذمہ کردے گا۔

۱۰،۱۱۔ اس کا جواب ۵ اور ۶ کے تحت آچکا ہے۔

۱۲۔ شیئرز کی تجارت کرنا درست ہے، ہر تخمین وقیاس آرائی ممنوع نہیں ہے، تجارت میں اموال تجارت کی خرید انسان مارکیٹ کی طلب ورسد کے لحاظ سے قیمتوں کے تناسب کا اندازہ کر کے ہی کرتا ہے، خواہ وہ کسی قسم کا مال تجارت ہو، اس لئے محض یہ عدم جواز کے لئے بنیاد نہیں بن سکتا۔

۱۳۔ شیئرز مارکیٹ میں فیوچر سیل کا طریقہ جائز نہیں، یہ قمار کی ایک شکل ہے۔

۱۴۔ غائب سودا کا طریقہ بھی درست نہیں، اس لئے کہ بیع کی تعلیق یا مستقبل کی طرف اس کی اضافت باتفاق فقہاء درست نہیں، اس کو محض وعدۂ بیع قرار دیا جاسکتا ہے۔

۱۵۔ شیئرز کی خرید وفروخت کے لئے قبضہ حسی ضروری نہیں اور ممکن بھی نہیں، قبضہ حکمی کافی ہے، اور اس میں اعتبار عرف کا ہے، رجسٹرڈ شیئرز میں احتیاط اس میں ہے کہ اندراج نام سے قبل قبضہ تسلیم نہ کیا جائے۔

۱۶۔ اسٹاک ایکسچینج کے تعامل کے لحاظ سے تو غرم وغنم کے بعد ہی فروخت کرنا لازم آتا ہے، مگر کمپنی کے قانون کے لحاظ سے یہ ربح مالم یضمن میں داخل ہے، اس لئے اندراج نام یا تبدیلی نام سے قبل اگلے مشتری سے معاملہ کرنا بطور احتیاط درست نہیں۔

۱۷۔ بروکر کمپنی کا وکیل ہوتا ہے، اس لئے اس کے لئے رجسٹرڈ قبضہ ضروری نہیں، ورنہ اس میں حرج عظیم لازم آئے گا، قبضہ کا مقصد مقدور التسلیم ہونا اور مشتری کا فریب سے محفوظ رہنا ہے، اور یہ دونوں مقاصد تعاملاً بغیر رجسٹرڈ قبضہ کے بھی حاصل ہیں۔

☆☆☆

مناقشہ بابت شیئرز

قاضی صاحب:

مثلاً ایک شیئر آج زید نے خریدا، لیکن پندرہ دن کے بعد اس کا نام رجسٹر پر درج ہوگا، اور عمر جس نے بیچا ہے، اور جو انتقال شیئر کے لئے تیار تحریر پر جو دستخط کیا ہے، فرض کر لیجئے کہ وہ دستخط اس کے اصلی دستخط سے علاحدہ ہے تو بظاہر ایسا لگتا ہے کہ کمپنی اس کو واپس کر دے گی اور اس کو خریدار کے نام پر ٹرانسفر نہیں کرے گی، اور اس کے بعد ایسا ہوتا ہے کہ شیئر کا دام بہت آگے بھاگ جاتا ہے، اب بائع کی نیت خراب ہوتی ہے، اور وہ نہیں چاہتا کہ پرانے دام پر اسے بیچے، تو وہ گڑبڑ کر سکتا ہے، یہ جو معاملہ ہمارا اس کے درمیان ہوا تھا اس معاملہ کے فسخ ہو جانے کا اندیشہ ہے، غرر انفساخ ہے، کیا ایسا ہوتا ہے یا ایسا نہیں ہوتا؟، اس کی وضاحت آپ حضرات کو کرنا ہے؟

شیئرز سے متعلق مسائل کی تفصیل آپ حضرات کے سامنے آچکی ہے، سوالات بھی آپ کے سامنے ہیں، جوابات بھی آپ کے سامنے ہیں، اس کا خلاصہ بھی آیا اور دلائل بھی ذکر کئے گئے، جیسا کہ میں بار بار کہتا رہا ہوں، پھر اس کو دہراتا ہوں کہ ہمارے ماہرین کا کام ہے تصویر مسئلہ، اور علماء اور فقہاء کا کام ہے تطبیق حکم شرعی، دونوں ہی چیزیں جب مل جاتی ہیں تب صحیح نتیجہ تک پہنچنا آسان ہوتا ہے، اور دونوں کام اپنی جگہ پر کسی بھی حکم شرعی کے جاننے کے لئے ضروری ہیں، اگر صورت مسئلہ صحیح طور پر سامنے نہیں آئی تو مفتی کا فتوی اور فقیہ کا استخراج احکام کبھی صحیح نہیں ہو سکتا، اس لئے حقیقت واقعہ کا ادراک بہت ضروری ہے، اب مثلاً اس میں ایک سوال ہے کہ اگر کمپنی کے پاس صرف نقد ہی نقد .... کے لئے ہی کمپنی قائم کی جاتی ہے اور لینڈنگ کا کاروبار اس میں ہوتا ہے، وہاں بظاہر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کسی دیگر Assets کا بنیادی طور پر امکان ہے، یہ ہے وہ ہے، اس کو چھوڑ دیتے ہیں، لیکن دیگر کوئی مشینری ہو یا کوئی اور ایسی چیز ہو وہاں نظر نہیں آتی یا رومیٹریل (Raw Material) ہو، پیسہ آتا ہے پیسہ جاتا ہے۔ پہلا مرحلہ وہ ہوتا ہے جس وقت کمپنی قائم کی جارہی ہوتی ہے، جب کمپنی قائم کی جاتی ہے تو کھلی ہوئی بات ہے کہ شرکت کے لئے سرمایہ اکٹھا کیا جاتا ہے، وہ مرحلہ جو بنیادی مرحلہ ہوتا ہے وہاں پر کسی اثاثے کا سوال نہیں پیدا ہوتا ہے، اور عام طور پر طریقہ یہی ہے کہ پیسہ جمع کر کے کاروبار شروع کر دیا جاتا ہے، تو بتائیں کہ کون سی صورتیں ایسی ہیں جن میں صرف نقد ہی نقد ہوتا ہے، عام حالات میں تو نقد کے ساتھ Assets بھی ہوتے ہیں لیکن کیا ایسی صورتیں ہیں؟ اگر ہیں تو اس کی وضاحت ہونی چاہئے، اسی طرح دوسرے سوالات ہیں، میں یہ چاہوں گا کہ ان سارے سوالات پر بات کی جائے، پہلے ہم ماہرین کی بات سنیں گے اور پھر ہم صورت مسئلہ کے تعین کے بعد اس پر تحقیق حکم فقہی کریں گے، اس دوران میں اپنے تینوں سکریٹری صاحبان مولانا خالد سیف اللہ رحمانی، مولانا عتیق احمد بستوی، مولانا عبید اللہ اسعدی صاحب سے یہ چاہوں گا کہ جو جملہ جوابات علماء کے آئے ہیں اس میں جن امور پر متفق ہیں سب لوگ تقریباً، اب قول شاذ ہو تو الگ ہے، مولانا سلطان صاحب کی وہ بات تو ظاہر ہے کہ پوری قوم نہیں مانے گی کہ بینک کا سود منافع ہے، لیکن اس طرح کے قول شاذ کو تھوڑی دیر کیلئے نظر سے ہٹا کر باقی جو مسائل اجماعی آگئے ہیں ان کو الگ رکھ لیں، اور جو مسائل مختلف فیہ ہیں ان پر ہم بات کریں، قبل اس کے کہ اس دلچسپ بحث کا آغاز کیا جائے میں چاہوں گا کہ ہمارے فاضل مہمان ڈاکٹر وہبہ زحیلی صاحب جن کا ایک مفصل مقالہ اس موضوع پر ہمارے پاس موجود ہے، ان کے اس مقالہ کو ہم بہت غور اور توجہ کے ساتھ سن لیں، بہترین تجزیہ کے ساتھ ہے، ظاہر ہے کہیں کہیں رائے سے اختلاف بھی ہوگا، اس سے بحث نہیں، لیکن جو تجزیہ ہے ان کا، جس طرح انہوں نے عنوانات مقرر کئے ہیں، اور ہر موضوع پر علاحدہ علاحدہ بات کی ہے، میں سمجھتا ہوں سبھی حضرات کو سن لینا چاہئے، (اس کے بعد وہبہ زحیلی صاحب نے اپنا مقالہ پڑھ کر سنایا)۔

قاضی صاحب:

......اب جیسا کہ آپ سب نے جانا کہ یہ چودہ پندرہ سوالات جو ہمارے سوالنامہ میں تھے، ہر سوال کے بارے میں واضح باتیں، ائمہ کی رائے

اور کتاب وسنت کی روشنی میں دکتور وہبہ زحیلی نے قائم کی ہے، اور کچھ صورت مسئلہ کی بھی وضاحت ان کی اس تحریر میں موجود ہے، انشاء اللہ ہم لوگ اس سے استفادہ کریں گے۔

مولانا عتیق احمد قاسمی صاحب:

شیئرز کے بارے میں جو سوالات تھے اور جو جوابات اور مقالات آئے ان کا خلاصہ اور تجزیہ آپ کے سامنے پیش کر دیا گیا، میں نے عرض کیا تھا کہ جس سوال کے بارے میں جس کو کچھ کہنا ہو، بہتر یہ ہے کہ وہ کسی کاغذ پر نوٹ کر کے دے دیں، تو آسانی ہوگی، اس لئے کہ اس سے پہلے جو ہمارے ماہرین ہیں ان سے بہت سی چیزوں کی وضاحت کروانی ہے، تاکہ حکم لگانے میں آسانی ہو۔ پہلا سوال تو یہ تھا کہ اس سلسلہ میں کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ابھی کمپنی شروع ہوئی ہے، یعنی محض پیسے داخل کئے گئے ہیں اور شیئرز بک رہے ہیں، ابھی اس کمپنی میں کچھ اثاثہ نہیں ہوتا، کچھ املاک نہیں ہوتے، اور اسی مرحلہ میں گویا اس کی بیع وشراء اور خرید وفروخت شروع ہو جاتی ہے، اس سلسلہ میں بعض حضرات نے یہ رائے ظاہر کی تھی کہ ایسا ہوتا نہیں ہے، یہ محض فرضی سوال ہے، ایسا نہیں ہوتا ہے کہ کمپنی کے پاس محض نقد روپے ہوں، اثاثے نہ ہوں، املاک نہ ہوں، اور اس کے بغیر رجسٹریشن ہو جائے اور اس کے آگے کی کارروائی چلتی رہے بیچنے خریدنے کی، جناب کھٹکھٹے صاحب اس کی وضاحت فرمائیں کہ ایسا ہوتا ہے یا نہیں؟

کھٹکھٹے صاحب:

جیسا کہ مولانا عتیق صاحب نے فرمایا، یہ سوال ویسے فرضی ہے، بالکل تھیوریٹکل (Theoritical) ہے، کیونکہ کوئی وقت ایسا نہیں ہوتا ہے کہ کمپنی کے پاس صرف کیش کی صورت میں اثاثہ ہو، اثاثے کے علاوہ اس کے پاس کچھ نہ کچھ اور چیز ہوتی ہے، جیسے مثلاً اگر آپ شروع کا مرحلہ لیں جب کمپنی شروع ہو رہی ہے، تو کمپنی جب شروع ہوتی ہے تو اس کے رجسٹریشن وغیرہ کے لئے پہلے ٹرانزیکشن (Transaction) کرنا ہوتا ہے، اس کے علاوہ جب کوئی کمپنی کوئی کاروبار کرنے جاتی ہے تو اس کے لئے اور مزید چیزیں اس میں کام کرتی ہیں، جیسے کہ وہ اس کا رپورٹ بناتی ہے اس کا اندازہ نکالتی ہے کہ اس میں کیا ممکنات (Posiblities) ہیں، اس کے مارکیٹ کیا ہیں، اس کی ٹیکنالوجی کیا ہے، کیسی ٹکنالوجی لینا چاہئے، یہ ساری جو چیزیں ہیں اس میں اس پہ خرچ ہوتا ہے چاہے اس میں Consumer Assets نہیں بنتے ہیں، ایسے اثاثے نہیں بنتے ہیں جسے ہم دیکھ سکتے ہیں مگر اس میں خرچ تو ہوتا ہی ہے، لوگوں کو Hire کیا جاتا ہے، لوگوں کو ملازمت پر رکھا جاتا ہے، ان سے Experties لی جاتی ہیں، تو یہ سارے کام ہوتے ہیں، اور اس وجہ سے کبھی کبھی یہ بھی ہم دیکھتے ہیں کہ نئی کمپنی ابھی اس کے شیئرز کا اجراء ہو رہا ہے، بالکل Initial Issue ہے مگر وہ Premium کہلاتی ہے، دس روپئے کا شیئر تیس روپئے میں بکتا ہے، مطلب کمپنی خود تیس روپے میں نکال رہی ہے، ہوسکتا ہے مارکیٹ میں اس کے پچاس روپئے بولے جائیں، مگر وہ خود تیس روپئے میں نکالتی ہے، وہ پبلک خریدتی ہے، اور جتنے شیئرز ہوتے ہیں اس سے زیادہ مانگ ہوتی ہے، یہ اس وجہ سے ہوتا ہے کہ اس کمپنی میں کچھ خاص چیزیں ہیں، جیسے یہ ہوسکتا ہے کہ ان کے کوئی اچھے (Collaborator) ہیں، (Foriegn Collaborate) ہیں، جس کی وجہ سے کمپنی کے شیئرز کے دام بڑھ گئے ہیں، ہوسکتا ہے ان کے پاس کوئی ٹیکنالوجی ہے اس سے کافی Profit ہونے کے Chances ہیں، یا جس کمپنی سے ان کا معاہدہ ہوا ہے، ان کا جو برانڈ ہے وہ بہت چلنے والا برانڈ ہے، یا اس کمپنی کے ساتھ میں ان کا معاہدہ ہوا ہے کہ وہ ان کا مال بیرون ملک میں اچھے دام میں فروخت کر کے دیں گے، تو یہ سب وجہیں ہوسکتی ہیں جس کی وجہ سے خواہ اس کے کوئی خاص اثاثے نہ ہوں پھر بھی اس کے شیئرز کے شروع میں دام زیادہ ہوسکتے ہیں، اس کے علاوہ ایک مرتبہ کام شروع ہو جاتا ہے تو اس کے بعد اس مرحلہ میں صرف Cash (نقد) ہونا بہت ناممکن سی چیز ہے، اس میں کچھ نہ کچھ اثاثے تو ہوں گے، اس کے علاوہ دوسری چیزیں تو ہوں گی ہی، گو شروع میں نہ ہوں تو بعد میں تو ضرور ہوسکتی ہیں، اس کے علاوہ اس کی Goodwill کا Proportion اس میں بڑھ سکتا ہے، تو اس بناء پر میرے خیال میں یہ ویسے Practical Problem نہیں ہے۔

اسٹاک ایکسچینج سے جو متعلق چیزیں ہیں اس میں ایک چیز مدنظر رکھنی چاہئے کہ ہم جو بھی کہیں گے وہ آج کے حالات کے اوپر منحصر ہوگا، کیونکہ آج کل اس پورے Financial Sector میں بہت تیزی سے Changes آ رہے ہیں، اور ہوسکتا ہے آج جو چیزیں ہیں وہ کل نہ رہیں، دوسرے (Rules) آئیں، یہ آج کے حالات کے مطابق میں بتا رہا ہوں۔

قاضی صاحب کا جو سوال تھا کہ اگر کسی نے شیئر خریدا اور اس نے کمپنی کے پاس اس کو تبادلہ کے لئے بھیجا، اور کمپنی میں اس کے دستخط میں کچھ فرق پتہ چلا اور کمپنی نے اس کا وہ شیئر واپس کر دیا، تو کیا یہ جو (Perchase) کا (Transaction) ہے، کیا یہ ختم ہو سکتا ہے؟ اس کا مطلب یہ ہے کہ جس شخص نے شیئر خریدا ہے اور اس نے کمپنی کو ٹرانسفر کے لئے بھیجا ہے، اگر وہ چاہے تو Insist کر سکتا ہے کہ نہیں مجھے یہ شیئر چاہئے، اگر اس نے صحیح کر کے نہیں دیا تو اسکے بروکر کے ذریعہ شیئر کا (Option) ہوگا، اور مارکیٹ میں جو دوسرا آدمی (Option) میں شیئر ڈالے گا وہ شیئر اس کو ملے گا، تو وہ تو (Insist) کر سکتا ہے اور اس کو وہ شیئرز مل سکتے ہیں، اگر جس نے پہلے دستخط کر کے دیا تھا وہ اگر دستخط کرنے سے انکار بھی کر دے تو اس میں بیچ کے بروکر کی ذمہ داری ہوتی ہے، اور بروکر کو کسی نہ کسی طرح وہ شیئر اس کو دلانا ہوگا، مگر اس میں یہ اس کو تکلیف ضرور آسکتی ہے کہ جس آدمی نے شیئر خریدا ہے اگر اس نے اس درمیان میں وہ شیئر بیچ دیا، اور اس کے پاس شیئر ابھی واپس آ گیا ہے اور وہ (Deliver) نہیں ہو سکتا ہے تو پھر اسی طرح سے جو اس نے شیئر بیچا تھا اس کا (Option) کرے گا اگلے والا آدمی، اور اس کو اس کے پیسے دینے ہوں گے۔

قاضی صاحب:

اصل میں ہمارے یہاں جو بحث ہے وہ یہ ہے کہ جب تک اس کا Transfer (لکھا نہیں جاتا) تب تک اس بات کا خطرہ ہے کہ جس شخص نے پہلے ہمارے ہاتھ شیئر بیچا ہے، وہ اس سودے کو پورا نہ ہونے دے، اور وہ شیئر ہمارے قبضہ میں نہ آئے، اور جب تک کمپنی کے رجسٹر پر اس کا نام ہٹا کر ہمارا نام درج نہیں ہوتا تب تک شاید اس کے منافع کے بھی ہم حقدار نہیں ہوں گے، منافع اس کو ملے گا جس کا نام اس کمپنی کے رجسٹر میں ہے، اب اس کے لئے بروکر لڑتا رہے، یہ ایک الگ بات ہے، لیکن ٹرانسفر جب تک رجسٹر پر نہیں ہوتا اس وقت تک حصہ کا منافع یا اگر خسارہ ہو تو وہ خسارہ جو پہلا مالک تھا اس کا ہوگا یا جو نیا خریدار ہے اس کا ہوگا؟

کھٹکھٹے صاحب: ...... نہیں! اس سے مولانا عتیق صاحب کا سوال بھی وابستہ ہے، کہ اگر آپ نے شیئر خریدا ہے تو چاہے آپ نے اپنے نام پہ اس کو

(Transfer) کیا ہے یا نہیں کیا ہے۔

قاضی صاحب: ...... ہم کریں گے یا کمپنی کرے گی؟

کھٹکھٹے صاحب:

نہیں ہم کو کرنا ہے، ہم خود کمپنی کو بھیجیں، یا ہم اپنے بروکر کے ذریعہ بھیجیں، ٹرانسفر کے لئے ہم کو بھیجنا ہے، تو چاہے ہم نے کیا ہو یا نہ کیا ہو، قانوناً جو بھی منافع اس کے بعد میں ڈکلیئر ہوگا، یا کمپنی کے جو بھی حالات ہوں گے، وہ ہمارے اوپر رہے گا، مطلب یہ ہے کہ اگر منافع ہو تو اس کا منافع رہے گا، اگر خسارہ ہو تو ہمارا خسارہ ہوگا، اس کو جو ہم نے شیئرز کے روپئے دے دیئے ہیں وہ اس کے ہو گئے، یہ قانوناً پوزیشن ہے، مگر (Practical Procedure) کے حساب سے پوزیشن یہ ہے کہ جس تاریخ پہ کمپنی اپنا Dividend ڈکلیئر کرتی ہے، اس تاریخ پہ ان کے پاس شیئرز ہولڈرس کی لسٹ میں جو نام درج ہیں، ان کو وہ Dividend بھیجے گی۔ اب اگر خریدنے والے نے شیئر ٹرانسفر کے لئے نہیں بھیجا تھا، ظاہر ہے کہ اس کے نام نہیں آئے گا، پچھلے ہولڈر کے ہی نام پہ جائے گا، اب یہ اپنے بروکرس کے تھرو اس سے مطالبہ کر سکتا ہے کہ یہ Dividend نکلا ہے اسے ہم نے پہلے خریدا تھا لہٰذا آپ ہمیں دیں، اگر وہ دینے سے انکار کرتا ہے تو پھر اس کو یہ Possibility ہے کہ وہ کورٹ میں جا کے لڑ کر اس سے لے، حالانکہ عام طور سے چونکہ ڈیویڈنڈ کی رقم کم ہوتی ہے تو یہ کوئی کرتا نہیں، اگر بہت بڑی ہولڈنگ کسی کی ہو تو یہ اس کے لئے سوچ سکتے ہیں، ورنہ اس کو چھوڑ دیتے ہیں، شیئرز میں جو زیادہ منافع ہوتا ہے اصلاً اس کی قیمتوں کے بڑھنے کی وجہ سے ہوتا ہے، ڈیویڈنڈ میں جو منافع ہوتا ہے وہ اس کا ایک چھوٹا حصہ ہوتا ہے، یہ سمجھ لیجئے کہ اگر سو روپئے کا ٹوٹل منافع ہے تو اس میں شیئرز کا جو منافع ہوگا وہ زیادہ سے زیادہ دس روپئے ہوگا یا اس سے کم ہوگا۔ تو قانوناً جو پوزیشن ہے وہ تبادلہ کے اوپر منحصر نہیں ہے۔

قاضی صاحب: ...... قانونی طور پر کمپنی کے شیئر رجسٹر میں جب تک ٹرانسفر نوٹ نہیں ہوتا کمپنی سے ملنے والے منافع یا کمپنی میں ہونے والے

نقصانات کی

ذمہ داری اول مالک پر ہوگی۔

کھٹکھٹے صاحب: ......اول مالک پر، جہاں تک کمپنی کا سوال ہے کمپنی اس کو منافع دے کر بری ہو جائے گی۔

قاضی صاحب:

کمپنی کی بات میں کہہ رہا تھا، اور یہ بھی طے ہے کہ بزنس میں سب فرشتے تو رہتے نہیں ہیں، اور کبھی کبھی بہت زیادہ منافع اوپر بھاگ جاتا ہے، تو اگر ایک شخص نے دستخط نہیں کیا، اور ظاہر ہے کہ جب تک بائع دستخط صحیح نہیں کرتا ہے کمپنی تو اس کو ٹرانسفر دے گی نہیں، یہ تو طے ہے اگر صحیح دستخط نہیں ملا تو وہ بینک لوٹا دیتا ہے کہ صاحب یہ ہمارے (Customer) کا صحیح دستخط نہیں ہے، اس لئے جب تک ٹرانسفر نہ ہو قانونی طور پر اس کے قبضہ میں یہ شئے نہیں آتی ہے، اور اس کے نفع اور نقصان کا یہ مالک نہیں ہوتا ہے۔

کھٹکھٹے صاحب: ......نہیں قانونی طور سے وہ ہے، Procedurally نہیں ہے، یہ سمجھئے کہ کسی کا فلیٹ ہے، Ownership فلیٹ ہے اب اس

کے ساتھ میں اس نے Nominee کے نام کسی کا ڈال دیا، تو اگر وہ مر گیا......

احسان صاحب:

ایسے کام جو کہ حسی شخص کر سکتا ہو مثلاً شادی کا معاہدہ تو کمپنی کوئی حس نہیں رکھتی وہ شادی کا معاہدہ نہیں کر سکتی، تو جو کام غیر حسی شخص کر سکتا ہے وہ کمپنی کر سکتی ہے، کمپنی کا Incorporation کمپنی کا پیدائشی سرٹیفکیٹ ہے، اس کے بعد جو (Public Limited Company) ہے اس کو ایک سرٹیفکیٹ اور لینا ہوتا ہے، اور وہ Certificate to commence the business ہوتا ہے، یہ سرٹیفکیٹ ملنے کے بعد کمپنی بالغ ہو جاتی ہے، اور اپنے نام سے معاہدہ کرنے لگتی ہے، حالانکہ کمپنی کی معرفت معاہدہ کمپنی کے وجود سے پہلے ہی شروع ہو جاتے ہیں۔ کچھ Incorporation سے پہلے ہی شروع ہو جاتے ہیں، کمپنی کے نام سے کچھ اثاثے خریدنے کا پلان بنایا جاتا ہے، اس کا کنٹریکٹ بھی پروموٹرس کرتے ہیں کمپنی کے Behalf پہ، اور اپنے پاس سے کچھ ایڈوانس بھی دے دیتے ہیں، لیکن وہ سودا مکمل نہیں مانا جاتا، جب تک کہ کمپنی کو Certificate to commence the business نہ مل جائے، اور جب Certificate to commence the business مل جاتا ہے تو کمپنی کے وجود سے پہلے جتنے سودے کئے جاتے ہیں کمپنی اس کا Ratification کرتی ہے اپنی میٹنگ میں، اور ایک Resolution پاس کرتی ہے کہ اس کمپنی کی معرفت آج تک جتنے سودے کئے گئے ہیں وہ کمپنی ان سب سودوں کو تسلیم کرتی ہے، اور ان سب سودوں کی ذمہ داری کمپنی اپنے اوپر عائد کر لیتی ہے۔ یہ Certificate to commence the business کے بعد ہوتا ہے، تو اب جہاں تک یہ سوال ہے کہ کچھ دیر تک کمپنی کے اثاثے رقم کی شکل میں رہتے ہیں، کمپنی کا جمع شدہ سرمایہ رقم کی شکل میں رہتا ہے، اثاثوں میں منتقل نہیں ہوتا، یہ عام طور سے صحیح نہیں ہے، کیونکہ جس وقت شیئر ہولڈرس کے پاس عام طور سے شیئر سرٹیفکیٹ آتے ہیں اس وقت تک کمپنی کو Certificate to commence the business مل گیا ہوتا ہے اور کمپنی کاروبار شروع کر چکی ہوتی ہے، کچھ نہ کچھ اثاثے اس کی ملک میں آ جاتے ہیں، رقم سے اثاثوں میں سرمایہ تبدیل ہو جاتا ہے، اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ ساری کی ساری رقم...... یوں ہی جمع ہے اور کمپنی نے اپنے پچھلے اثاثوں کا Ratification بھی نہیں کیا ہے جو اس کے نام آنے ہیں، پھر بھی کچھ غیر حسی اثاثے ایسے ہوتے ہیں کہ جن کا اثر شیئر کی قیمت پر ضرور پڑتا ہے، کمپنی کو بہت اچھے Promoters اگر مل گئے ہیں، کمپنی کا پروجیکٹ بھی بہت اچھا ہے، تو ان سب کا ایک جگہ جمع ہو جانا کمپنی کے نام پہ، یہ اس کی قیمت پہ ضرور اثر انداز ہوتا ہے، اور اگر کسی پروموٹر کی Reputation خراب ہو جائے، تو وہ بھی اس کمپنی کی قیمت پہ ضرور اثر انداز ہوتا ہے، تو کمپنی کے پروموٹرس کی جو ریپوٹیشن ہے یہ Goodwill تو باقاعدہ کمپنی کے Balance Sheet تک میں کہیں کہیں درج کی جاتی ہے، Patents کمپنی کی بیلینس شیٹ میں بھی اثاثوں کی فہرست میں درج کئے جاتے ہیں، جبکہ نہ Goodwill کو اور نہ Patents کو ہم چھو سکتے ہیں اور نہ دیکھ سکتے ہیں، پھر بھی ان کی ایک

قیمت ہوتی ہے، اور وہ کمپنی بیلنس شیٹ میں درج ہونے کے علاوہ بھی اپنا اثر ضروری نہیں ہے کہ اسی حد تک رکھیں جس کی قیمت اس میں لگائی گئی ہے، اس کا اثر اس سے زیادہ ہوتا ہے، کمپنی کے Assets جو ہیں، جو بیس سال پہلے زمین خریدی گئی ہے، اس کی قیمت وہی لکھی جاتی ہے جو کہ بیس سال رہی جب تک کہ اس کا Revaluation باقاعدہ نہ کیا جائے اور قانونی طور پر اس کے Revaluation کو تسلیم نہ کیا جائے، لیکن اصل میں دس سال قیمت کی جو اس کی Assets File میں لکھی ہوئی ہے قیمت، زمین کی وہ قیمت نہیں ہوتی، اس کی قیمت کئی گنا زیادہ ہو جاتی ہے، لہذا آج مارکیٹ میں بہت سارے شیئر ایسے بھی ہیں کہ ان کی جو قیمت ہے وہ ان کی اصل قیمت سے Book value کمپنی میں دکھائی گئی ہے وہ بہت زیادہ ہے، اور کچھ شیئرز ایسے بھی ہیں جو اپنی قیمت اپنی Book value سے بہت کم رکھتے ہیں، کمپنی کے شیئرز کی قیمت کا جہاں تک تعلق ہے یہ آس اور یاس کے اوپر منحصر ہے، اگر آج ہمیں امید ہو جاتی ہے کہ پانچ سال میں کمپنی کو اتنے اتنے زیادہ منافع جات ملنے والے ہیں تو کل ہی مارکیٹ میں اس کی قیمت بڑھ جائے گی، اور اگر کوئی ایسی وجوہات آجائیں کہ جس سے پتہ لگے کہ اگلے پانچ سال میں کمپنی کو یہ یہ نقصانات ہونے والے ہیں تو کل ہی مارکیٹ میں اس کی قیمت اتنی ڈاؤن ہو جائے گی، تو شیئرز کی قیمت گرنا اور اٹھنا اس کا تعلق شیئر کی اصل قیمت سے نہیں ہے، کبھی کبھی مارکیٹ میں Demand Supply کے توازن سے شیئر کی قیمت پر بہت اثر پڑتا ہے، آج کل مارکیٹ میں پیسے کی Liquidity Crunch مانا جا رہا ہے دو سال سے، پیسے کی کمی ہے اور نمبر آف شیئرز بہت موجود ہیں، لہذا اصل قیمت سے نیچے ان کی قیمت جا چکی ہے، بہت سارے شیئرز کی، تقریباً اس وقت جو ہے پچاس فیصدی شیئرز کمپنی کے اپنی اصل قیمت سے نیچے چل رہے ہیں، اور کبھی کبھی Inflation ہوتا ہے، مارکیٹ میں پیسے ہی پیسے زیادہ ہوتے ہیں، پیسے کے مقابلے میں شیئرز کی تعداد کم ہوتی ہے، اس وقت شیئرز کی قیمت اوپر پہونچ جاتی ہے، جیسے کہ ہرشد مہتہ کے دور میں ہوا تھا، اس وقت Rate of inflation تقریباً سولہ فیصد چل رہا تھا، اس وقت قیمتیں بہت اوپر چلی گئیں تھیں، اب Rate of Inflation چار پانچ فیصد چل رہا ہے، Liquidity Crunch ہے، اب قیمتیں نیچے چل رہی ہیں، تو یہ کہنا کہ جب تک کمپنی کا سرمایہ رقم کی شکل میں ہے تو اس کی خرید وفروخت اس لئے نہیں ہوسکتی کہ ہم پیسے کے بدلے پیسے کو خرید رہے ہیں، وہ شاید مناسب نہیں ہوگا، کیونکہ اس کا پروجیکٹ، اس کا Colaboration اور اس کے Promoters کی Reputation کا اس کے اندر دخل ہے۔

ایک آواز: ...... جائنٹ ووز مین وغیرہ کب خریدتی ہے کمپنی؟

احسان صاحب: ...... شروع میں خریدتی ہے، اور بیچ میں بھی جب ضرورت ہوتی ہے ..... جیسے پروجیکٹ بناتے ہیں، اس پروجیکٹ میں سب دیا ہوتا ہے کہ کب زمین خریدیں گے، کب تک مشین خریدیں گے، اور اس میں تاخیر بھی ہو جاتی ہے، اس سے Cast of Project بھی بڑھ جاتا ہے، اس کے لئے پھر مزید سرمایہ اکٹھا کرنا پڑتا ہے اور قرض بھی لینا پڑتا ہے، تو یہ پروجیکٹ رپورٹ میں سب دیا جاتا ہے، کب زمین خریدیں گے، کب کیا ہوگا۔

دوسرا سوال تھا شیئرز کے اوپر قبضہ سے متعلق، کمپنی کے شیئرز عام طور سے قابل تبادلہ ہوتے ہیں، یہ عام طور سے اس لئے بات کہی جا رہی ہے کہ وہ حتمی طور سے قابل تبادلہ نہیں ہوتے، کبھی کبھی کمپنی اپنے شیئرز Restrictions لگا سکتی ہے، مثال کے طور پر کمپنی یہ کہے کہ ہم اس میں غیر ملکی کو اس سے زیادہ شیئرز نہیں خریدنے دیں گے، اور Number of Shares غیر ملکی لوگوں کو اتنے بک چکے ہیں، اس سے اوپر جو بھی غیر ملکی شیئر خریدے گا، کنٹریکٹ اس کا Valid نہیں مانا جائے گا، کمپنی بھی Restriction لگا سکتی ہے کہ جو شیئر بیچنا چاہے وہ پہلے ہمیں بتائے، اور ہم جو کمپنی کے پرانے شیئر ہولڈرس ہیں، ہم ان کو اختیار دیں گے کہ پہلے اگر وہ خریدنا چاہیں تو وہ شیئرز خریدیں، اور اس کے بعد اگر وہ نہیں خریدنا چاہیں، تو ہم شیئر ہولڈر کو بتائیں گے کہ اب وہ مارکیٹ میں بیچ سکتا ہے، لیکن یہ چونکہ عام طور سے قابل تبادلہ ہوتے ہیں، اور جو شیئرز قابل تبادلہ ہیں ان کے اوپر کوئی Restriction نہیں لگی ہے، وہ جب خریدار نے خرید لئے ہیں، اور بیچنے والے نے اس کو اپنا دستخط کر کے حوالہ کر دیا ہے، ہر چیز کی Delivery کا بھی ایک سسٹم ہے، خرید وفروخت تو ہوتی ہی ہے مال کی، لیکن ملکیت جو ہے ڈیلیوری کے بعد ہی منتقل ہوتی ہے، بغیر ڈیلیوری کے کوئی ملکیت منتقل نہیں ہوتی، اور ڈیلیوری کا طریقہ ہر مال کا الگ ہے، کچھ چیزیں ایسی ہیں جو دست بدست دی جاتی ہیں، اٹھا کے، اور جیسے چیک کی ہے، بیئرر چیک کی ہے، آپ بغیر کسی دستخط کے ڈیلیوری دے سکتے ہیں، وہ valid ہے، اگر وہ چیک آرڈر ہے تو بغیر ایگزارمنٹ کے اس کی ڈیلیوری صحیح نہیں مانی جائے گی، اگر وہ آرڈر چیک کسی خاص ایک شخص کے نام کٹا ہے، تو جب تک وہ آرڈر نہیں کرے گا کہ یہ پیسہ دوسرے آدمی کو ملے، تب تک اس کی ڈیلیوری

Valid نہیں مانی جائے گی، تو اسی طرح شیئرز کی ڈیلیوری Share Transfer Deed کے ساتھ ہونا ضروری ہے، اور شیئر ٹرانسفر ڈیڈ کے اوپر دستخط شیئر ہولڈر کا ہونا ضروری ہے، جب شیئر ہولڈر اپنے دستخط Transfer Deed کے اوپر کر کے ٹرانسفر سرٹیفیکٹ کے ساتھ دیدیتا ہے، وہ اس وقت ڈیلیوری مانی جاتی ہے، اور شیئر کی ملکیت اسی دم منتقل ہو جاتی ہے خریدار کے پاس، رہا یہ مسئلہ کہ اب وہ جو اس نے ٹرانسفر کے لئے نہیں بھیجے ہیں، وہ صرف Procedural Matter ہے، کمپنی نے اپنی سہولت کے لئے رکھا ہے کہ جن لوگوں کے شیئرز ہمارے نام پر اس تاریخ کو آ گئے ہمارے رجسٹر میں درج ہو جائیں گے، وہ تو ہم سے طلب کرے گا Dividends، اور جس نے نہیں بھیجے ہیں تو وہ بیچنے والے سے ڈائرکٹ طلب کر لے، کمپنی اس کے اندر کوئی ذمہ دار نہیں ہوگی، یہ کمپنی کا اپنا طریقہ ہے، بہرحال خریدار اسی وقت شیئرز کے اوپر ملنے والے تمام منافع جات کا حقدار ہو جاتا ہے، جب شیئرز اس کی تحویل میں شیئر ٹرانسفر ڈیڈ کے ساتھ آ جاتے ہیں، اب دستخط کا مسئلہ ہے، یہاں معاملہ یہ ہے کہ اگر بیچنے والے نے خود کئے ہیں تو اس کی ملکیت منتقل ہو جائے گی، اور یہ اگر کمپنی کے ریکارڈ میں نہیں ملتے ہیں تو کمپنی اپنے یہاں اس کو ٹرانسفر نہیں کرے گی جب تک کہ ریکارڈ میں نہیں ملیں، یا Notery لکھ کر نہیں دیں کہ میرے سامنے اس شخص نے دو گواہوں کی موجودگی میں دستخط کئے ہیں، تب تک کمپنی اگر دستخط نہیں بھی ملتے ہیں لیکن اس نے Notary کرائی ہوئی ہے، اور Notary وکیل نے لکھا ہوا ہے کہ اسی شخص نے دستخط کئے ہوئے ہیں تب کمپنی ٹرانسفر کر دے گی، چاہے دستخط ملیں یا نہیں ملیں، لہذا Transfer Deed پہ دستخط شیئر ہولڈر کا ہونا ضروری ہے، اگر وہ دستخط Forge ہیں تو Forgery کسی بھی چیز کی ملکیت کو ٹرانسفر نہیں کرتی، وہ Invalid ہوگا، اس کی Delivery ناقص مانی جائے گی۔

پانچ نمبر سوال میں یہ لکھا ہوا ہے کہ سودی قرض لینے پڑتے ہیں، اس معاملہ میں میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ کیا مجبوری ہے، اور قرض کے کیا محرکات ہیں، قرض کیوں لینے پڑتے ہیں، تاکہ آپ اس میں ضرورت اور اباحت دیکھ کر اپنا حکم جاری کر سکیں۔ قرض کے محرکات میں سب سے پہلا محرک یہ ہوتا ہے کہ جن لوگوں نے یہ منصوبہ بنایا ہے ان لوگوں کو اتنا اندازہ ہوتا ہے کہ اتنا روپیہ تو ہم پبلک سے جمع کرا سکتے ہیں، خود جمع کرا سکتے ہیں، اور پروجیکٹ پورا کرنے کے لئے باقی رقم کو قرض کے ذریعہ لینا ضروری ہوتا ہے۔ دوسرا محرک یہ ہے کہ یہ لوگ کمپنی کے اوپر اپنا مکمل کنٹرول رکھنا چاہتے ہیں، قرض دینے والے کا کمپنی کے معاملات میں، Management میں کوئی کنٹرول نہیں ہوتا، اس کو کوئی حق رائے دہندگی حاصل نہیں ہوتا، اگر وہ سارا سرمایہ شیئرز کی صورت میں لیتے ہیں تو سارے شیئر ہولڈرس کو حق رائے دہندگی ہوتا ہے، اور بورڈ آف ڈائرکٹرس کو شیئر ہولڈرس بالکل ایسے ہٹا دیتے ہیں جیسے کہ حکومت کے خلاف عدم اعتماد آتا ہے، اور اپنا بورڈ آف ڈائرکٹرس وہ خود قائم کر لیتے ہیں جن کی اکثریت ہوتی ہے، تو یہ وہ اپنے Management میں عدم مداخلت کی وجہ سے قرض لیتے ہیں۔ تیسرا محرک شرح سود کا شرح منافع سے کم ہونا ہے، جتنے بھی Funds وہ اپنی تجارت میں لگاتے ہیں اس کے اوپر اگر بیس فیصدی منافع ان کو حاصل ہوتا ہے، اور قرض کی صورت میں رقم پندرہ فیصد ان کو مل جاتی ہے تو وہ برابر قرض لیتے چلے جاتے ہیں، کیونکہ منافع بیس فیصدی ہو رہا ہے اور پندرہ فیصدی دینا پڑ رہا ہے، پانچ فیصدی یہ ڈیفرنس ہے، یہ شیئر ہولڈرس کا حصہ رہتا ہے جب تک یہ شرح سود شرح منافع سے کم رہتی ہے، تجارتی اصول ہے، یہودیوں کا اصول ہے کہ اس وقت تک قرض لیتے چلے جائیے جب تک یہ دونوں برابر نہ ہو جائیں، یا اوپر نہ چلے جائیں۔ چوتھا محرک ہے ٹیکس کے فائدے حاصل کرنا، جو کمپنی قرض کے اوپر سود ادا کرتی ہے، انکم ٹیکس میں وہ خرچ مانا جاتا ہے، کمپنی کا یہ ایک خرچہ ہے، اور منافع میں سے وہ رقم کم کر دی جاتی ہے، تو اس کے برخلاف جو Dividend دیا جاتا ہے تو اس کو انکم ٹیکس والے خرچ نہیں تسلیم کرتے، اس کو منافع کا ایک حصہ مانتے ہیں، اور وہ کمپنی کی انکم میں سے Deduct نہیں ہوتا، اس کے اوپر ٹیکس پورا لگتا ہے، تو ہم لوگوں کی جو پچھلی میٹنگس ہوتی رہی تھیں، ہمارے اندر بھی رائے میں اختلافات ہوئے، اور پہلے ہم لوگ یہ بھی سمجھتے تھے کہ شاید یہ ٹیکس کی اتنی بڑی مجبوری ہے کہ اس کی وجہ سے قرض لینا ہی ضروری ہے، نہیں Competitive Market میں ہم پیچھے رہ جائیں گے اگر زیادہ ٹیکس دیں گے، اور دوسرے لوگ حاوی ہو جائیں گے جو کہ کم ٹیکس دیں گے، لیکن بعد میں ہم لوگوں نے اس کے اوپر اور غور کیا تو ہم نے نتیجہ یہی پایا کہ ایک ٹیکس کی شرح کمپنی کے اوپر جو گورنمنٹ مقرر کرتی ہے اصل ٹیکس تقریباً پچاس فیصدی اس سے کم ادا ہوتا ہے، بہت سارے ایسے Deductions ملتے ہیں، بہت ساری ایسی مراعات ملتی ہیں جن کے اوپر ٹیکس نہیں دینا پڑتا، لہذا کمپنی کے اوپر اگر پینتالیس پرسنٹ سرکار ٹیکس مقرر کرتی ہے، تو Effective Tax اور اصل ٹیکس جو ہے وہ ساڑھے بائیس پرسنٹ ہی تقریباً ہوتا ہے، تو اب چونکہ ٹیکس جو ہے منافع پر ہوتا ہے نقصان کے اوپر تو ہوتا نہیں ہے، سوال یہ ہے کہ جب ہمیں منافع مل رہا ہے تو پھر ٹیکس دینے میں اس میں کم اور زیادہ تھوڑا بہت جبکہ وہ ساڑھے بائیس پرسنٹ ہے Maximum اگر ہم

سارے (Deductions) (Avail) کرلیں تو یہ اتنا بڑا فرق نہیں ہے کہ ہماری تجارت کے اوپر اثر انداز ہوسکے، پھر کمپنی کی منافع کمانے کی صلاحیت میں بہت بڑا فرق ہے، ایک کمپنی دس سال سے نقصان دیتی چلی آرہی ہے، ایک نئی کمپنی قائم ہوتی ہے اور وہ اپنے دس روپے کے شیئر کو پہلے ہی سال میں دس روپئے منافع کما کر دے سکتی ہے، تو ان دونوں میں صلاحیت کا جہاں تک تعلق ہے اس کی کوئی قید نہیں ہے، اگر ہم بھی اپنے اندر صلاحیت ایسی پیدا کرلیں تو ہمیں یہ ٹیکس اتنا ناگوار نہیں ہوگا جتنا ہمیں ڈر لگتا ہے کہ اس سے شاید ہمارا پروجیکٹ ہی فیل ہوجائے، پھر جو یہ معاملہ ہے ہم تو اسے شرعی نقطہ نظر سے دیکھتے چل رہے ہیں، اس کو دوسرے ہمارے ہم وطن نے مادی نظر سے دیکھا ہے، اور ان کی طرف سے جو اخبارات میں یہ Demand آئی ہے کہ جس طرح سے قرض کے اوپر سود کو انکم ٹیکس سے الگ کردیا جاتا ہے اسی طرح سے Dividend کو بھی انکم میں سے الگ کر کے ٹیکس لگایا جائے، اور جب تک ان کے Artcles ایسے پیپر میں نکلے ہیں تب تک میں نے تائید میں صرف مادی نظریہ سے اخبار میں خط دیا ہے اور اس سلسلہ میں میرا پہلا خط "Business Standard" میں شائع ہوا ہے، اور پھر ایک بار "Economic Times" میں ایک Editorial لکھا تھا کہ اب ملٹی نیشنل کمپنیاں ہمارے یہاں آ گئی ہیں، اور ان کی طاقت بہت زیادہ ہے، طاقت ان کی اس وجہ سے ہے کہ ان کا اپنا سرمایہ زیادہ ہوتا ہے، وہ قرض کم لیتے ہیں، اور وہ جو کچھ بھی قرض لیتے ہیں ان کے یہاں شرح سود چار یا پانچ فیصدی ہے، ہمارے یہاں شرح سود سولہ سترہ سے بڑھ کے پچیس تیس پرسنٹ تک پہونچ جاتی ہے، لہذا اس نے اپنے Editorial میں یہ Advise کیا تھا کہ ہماری کمپنیوں کو چاہئے کہ وہ اپنا قرض کا Ratio گھٹائیں، اور اپنا Capital Ratio بڑھائیں، تاکہ ان سے Competition کے مقابلہ میں ان کو طاقت حاصل ہو، اس سلسلہ میں میں نے جو خط "Economic Times" کو اس Editorial کی تائید میں لکھا، تو انہوں نے Good Advise کر کے اسے شائع کیا، میں نے یہ کہا کہ آپ یہ تو Advise کرتے ہیں کہ کمپنیاں اپنی Equity بڑھائیں اور قرض Down کر [illegible] لیکن ہمارا Taxation قانون اس سلسلہ میں مانع آتا ہے، جو کمپنی زیادہ سرمایہ رکھتی ہے وہ کم قرض رکھتی ہے، اس کو زیادہ ٹیکس دینا پڑتا ہے جو کمپنی زیادہ قرض رکھتی ہے اس کو کم ٹیکس دینا پڑتا ہے، اور ان کو یہ فارمولہ بھی میں نے تجویز کیا کہ آپ اگر اس فارمولہ کو اپنائیں تو گورنمنٹ کی آمدنی پر بھی کوئی فرق نہیں پڑے گا، اور قرض لینے والی اور نہ قرض لینے والی دونوں کمپنیوں کو ٹیکس کا Burden برابر ہوجائے گا، تو یہ آوازیں تو غیر مسلم ہی کی جانب سے اٹھی تھیں، تو اس میں ہم نے اپنی آواز لگائی، تو یہ جو چوتھی بات ہے جو ہمیں زیادہ پریشان کررہی تھی اگر اس کو ہم سلیقہ کے ساتھ حکومت کے سامنے لے جائیں تو یہ مسئلہ ہمارا حل ہوسکتا ہے۔

چھٹے سوال کے اندر لکھا ہے کہ ریزرو بینک میں کچھ روپے جمع کرنے پڑتے ہے، یا سرکاری بانڈز خریدنے پڑتے ہیں جس پر سود ملتا ہے، یہ Finance Company اور Banking Company کے معاملہ میں تو بالکل صحیح ہے کہ کچھ روپے ان کو ریزرو بینک میں رکھنا پڑتا ہے، یا گورنمنٹ بانڈز خریدنے پڑتے ہیں، لیکن Commercial یا Manufacturing Companies کے لئے یہ معاملہ نہیں ہے، اور شرکت اور مضاربت چونکہ اسلام کی بنیاد ہے، اس لئے ہماری کمپنیوں کے سامنے کم سے کم یہ مسئلہ پیش آنے والا نہیں ہے۔

سودی قرض پر منافع جو ملے اس کے حکم کے بارے میں کچھ سوالات کئے گئے ہیں، تو کمپنی قرض لیتی ہے اور اپنی ساری رقم کے اوپر منافع کماتی ہے، اس میں یہ تخصیص نہیں ہوتی ہے کہ قرض والی رقم کے اوپر کتنا منافع ہوا، اور اس نے جو اپنا سرمایہ لگایا تھا اس کے اوپر کتنا منافع ہوا، پھر بھی ہم ڈائری کو دیکھ کر یہ حساب لگا سکتے ہیں کہ قرض شیئر، سود کی آمدنی کیا ہے، لیکن یہاں مسئلہ یہ آتا ہے کہ کمپنی نے سود کی آمدنی تو حاصل کی اور منافع بھی کمایا، ضروری نہیں کہ جو منافع کمائے کمپنی اسے تقسیم بھی کردے، اور اگر تقسیم بھی کرے تو ضروری نہیں کہ پورا کا پورا منافع تقسیم کرے، یہ کمپنی کی اپنی پالیسی کے اوپر منحصر ہوتا ہے، اور شیئر ہولڈرس کی اکثریت اگر منافع کو آگے تجارتی فروغ میں لگانا چاہتی ہے تو بھی منافع تقسیم نہیں ہوتا، تو چونکہ کمپنی کی کتابوں میں یہ صرف لکھا ہوا ہے، اس میں پھر یہ حساب لگانا کہ ہم اس کو خیرات کریں یا نہ کریں اپنے حصہ کے بقدر، یہ ذرا ایک مشکل کام ہوجائے گا، اور پھر یہ کہ کمپنی کی جو رپورٹ ہے جس میں کمپنی کے منافع کی خبر آئی ہے اس کا بازار کی قیمتوں کے اوپر کافی اثر پڑتا ہے، خاص طور پر جبکہ بنیادی طور پر دو طرح کے Factors ہوتے ہیں جو کہ شیئر کی قیمت پہ اثر انداز ہوتے ہیں، ایک کو ہم Fundamentals کہتے ہیں، دوسرے کو Technicals کہتے ہیں، Fundamentals تو کمپنی کی خامیوں اور خوبیوں کے اوپر منحصر ہوتے ہیں، اور Technicals بازار کے اندر روپے کی اور شیئرز کی فراہمی کے اوپر منحصر ہوتے ہیں تو ان دونوں میں بہت بڑا فرق ہوتا ہے، کبھی کبھی Fundamental بہت اچھے ہوتے ہیں،

لیکن بازار میں شیئرز کی سپلائی زیادہ ہوتی ہے، پیسہ کم ہوتا ہے، تو اچھے منافع کے باوجود بھی اس کی قیمتیں نیچے چلی جاتی ہیں، اور کبھی کبھی اس کے بر خلاف شیئرز کی قلت ہوتی ہے مارکیٹ میں، پیسہ زیادہ ہوتا ہے، تو نقصان والی کمپنی کا بھی شیئر اپنی چار گنی پانچ گنی قیمت پہ ہوتا ہے، ان حالات میں جب Fundamentals حاوی ہوتے ہیں تو ہر خبر کا اثر شیئر کی قیمت پہ بہت اچھا پڑتا ہے، اگر سودی خبر سے اس کی قیمت بڑھ جائے تو یہ حساب لگانا بڑا مشکل ہوگا کہ ہم اصل جو سود کمپنی کو ملا ہے وہ خیرات کریں یا کمپنی کے شیئرز کی قیمت پہ جو اس کا اثر پڑا ہے اس کو خیرات کریں، یہ کافی مشکل کام ہو جائے گا ہمارے لئے۔

آٹھویں سوال کے اندر بورڈ آف ڈائریکٹرس کا شیئر ہولڈرس کے وکیل ہونے سے متعلق سوال ہے، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ بورڈ آف ڈائریکٹرس جو شیئر ہولڈرس کی اکثریت کی رائے سے Appoint ہوتے ہیں، یہ اصل میں شیئر ہولڈرس ہی ہوتے ہیں، جس طرح کہ اسمبلی کے ممبران میں سے کوئی چیف منسٹر بنتا ہے اور کیبنٹ بنتی ہے، اسی طرح کمپنی کے شیئر ہولڈرس میں سے بورڈ آف ڈائریکٹرس ہوتا ہے، جیسا کہ میں نے پہلے ہی عرض کیا تھا کہ کمپنی جو ہے وہ ایک شخص اعتباری ہے، یہ قانون کی نظر میں تو ایک شخص ہے، لیکن یہ اپنے حسی شخص میں جسے ہم دیکھ نہیں سکتے ہیں چھو نہیں سکتے، لہٰذا یہ اپنے معاملات کا انتظام خود نہیں کر سکتی، یہ دوسروں کے اوپر منحصر ہے کہ اس کے معاملات کا انتظام کوئی دوسرے لوگ کریں، اور شیئر ہولڈرس اپنے ہی میں سے کچھ لوگوں کو اپنا وکیل مقرر کر دیتے ہیں، اور ان کو کچھ اختیارات دیتے ہیں کہ روزمرہ کے معاملات میں ان حدود میں رہ کے بورڈ آف ڈائریکٹرس کام کرے گا، پھر بھی جو اہم معاملات ہوتے ہیں وہ کمپنی کی میٹنگ میں ہی طے ہوتے ہیں، جو کمپنی کی پالیسی سے متعلق معاملات ہوتے ہیں وہ کمپنی کی عام میٹنگ میں طے ہوتے ہیں، آج یہ مسئلہ کہ کوئی شیئر ہولڈر اختلاف کرے بورڈ آف ڈائریکٹرس کی رائے سے تو کیا پوزیشن ہوگی اس کی، وہ کہاں تک بری الذمہ ہوگا کمپنی کے جائز کاروبار اور ناجائز کاروبار سے اس میں میں یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ جب کمپنی قائم ہوتی ہے، اور بازار میں Issue لا رہی ہوتی ہے، تو کمپنی اپنا ایک Prospectus جاری کر دیتی ہے، اس Prospectus میں کمپنی کی پروجیکٹ رپورٹ پوری لکھی ہوتی ہے، اس وقت ہر شیئر ہولڈر کو معلوم ہوتا ہے کہ کمپنی قرض لینے جا رہی ہے یا قرض نہیں لینے جا رہی ہے، کمپنی حلال کاروبار کرنے جا رہی ہے یا حرام کاروبار کرنے جا رہی ہے، اس کے علاوہ کمپنی کے Articles of Association میں بھی کمپنی کو پہلے Powers دی جاتی ہیں قرض لینے کی، جب تک Articles of Association میں کمپنی کے رجسٹریشن کے وقت ہی کمپنی کو پاور نہیں ملے گا تب تک کمپنی قرض نہیں لے سکتی ہے، پھر جو پاور آرٹکلس آف ایسوسی ایشن میں دیا گیا ہے اس کے مطابق Resolution جو بورڈ آف ڈائرکٹرس کی میٹنگ میں پاس ہوتا ہے کہ قرض لیا جائے گا اس معاملہ میں، اتنی چیزیں شیئر ہولڈرس کے سامنے ہوتی ہیں، ان سب کے باوجود وہ شیئر ہولڈرس بنا اس میں قبول کرتا ہے، جبکہ اس کے اوپر کوئی پابندی عائد نہیں کی گئی ہے، اگر ان معاملات سے اس کو اختلاف ہے تو اپنا شیئر بیچ کر وہ باہر بھی ہو سکتا ہے، اور یہاں دیکھا جا سکتا ہے کہ کہاں تک اس کی مجبوری ہے اس معاملہ میں کہ وکیل کی ذمہ داری اس کے اوپر آتی ہے یا نہیں آتی ہے؟

ایک Back Delivery کے بارے میں سوال کیا گیا تھا کہ ایک شخص نے شیئرز بیچے ہیں، اور اس کے دستخط نہیں ملتے ہیں، کمپنی کے پاس اس نے رجسٹریشن کو بھیجا، کمپنی نے واپس کر دیا، ایسے میں سودے کی کیا نوعیت رہے گی؟ سودا تو Valid رہے گا، جو شیئرز اس نے بھیجے ہیں اس پہ دستخط نہیں ملے ہیں تو اس کی حوالگی ناقص ہے، اور وہ اس کے نام میں منتقل نہیں ہو سکتی، لیکن بیچنے والے کے اوپر ڈیلیوری واجب ہے، اور وہ اس کو ڈیلیوری کرے گا اور ڈیلیوری کے بعد ہی اس کا Contract پورا ہوگا، اس سے پہلے وہ چھوٹ نہیں سکتا ہے، وہ دوسرے شیئرز کی ڈیلیوری کرے گا، لیکن ان شیئرز کی ملکیت ہماری نہیں مانی جا سکی کیونکہ ہم نے بھیجے تھے اور اس پر دستخط الگ ہوئے تھے، حالانکہ اس نے ٹرانسفر ڈیڈ پر دستخط کر کے شیئر سرٹیفکیٹ دیا تھا، چونکہ اس پہ دستخط آپ کے نہیں تھے اس لئے وہ ڈیلیوری ناقص تھی، اور یہ ہمیں اس وقت پتہ چلا جبکہ کمپنی نے بتایا، اور اس سے پہلے تو ہم اس کو صحیح تسلیم...... یہ ناقص ڈیلیوری جب بھی پتہ لگ جائے تو اسی وقت سے یہ سارے لوگوں کے اوپر پیچھے Invalid ہوتے ہیں، مان لیجئے ایک شخص سے میں نے شیئرز خریدے، اس کے بعد دوسرے سے بیچ دیئے، دوسرے نے تیسرے کو بیچ دیئے، تیسرے نے چوتھے کو، پانچویں آدمی نے ٹرانسفر کے لئے بھیجے اور پانچویں آدمی کو جواب یہ ملا کہ یہ ناقص ڈیلیوری ہے، تو وہ ناقص قبضہ ہم چاروں پانچوں پانچوں آدمی کا رہا، کیونکہ Forgery جو ہے وہ کسی بھی ملکیت کو ٹرانسفر نہیں کرتی۔

اس کے علاوہ کوئی اور سوالات ہوں تو (ایک آواز......) ہاں وہی، جو ڈیلیوری کا طریقہ ہے کہ شیئر سرٹیفکیٹ Blank Transfer

Deed کے اوپر شیئر ہولڈر دستخط کر کے دیتا ہے تو کوئی دوسرا آدمی پھر دستخط نہیں کرتا، اس کو یونہی Blank ہی بیچتے رہتے ہیں، پہلے آدمی کے دستخط کئے ہوئے کو صحیح ڈیلیوری مانی جاتی ہے شیئر سرٹیفکیٹ کے لئے، جیسے کہ چیک میں اگر آرڈر چیک ہے تو ایک آدمی Endorse کرے گا ایک دوسرے کے نام، پھر اگر وہ دوسرا آدمی کسی کو منتقل کرے گا وہ اس کے نام Endorse کرے گا، شیئر سرٹیفکیٹ کے معاملہ میں ایسا نہیں ہے، کیونکہ وہ Deed بھرا ہوا نہیں ہے، Blank ہے، اس میں کسی کا نام نہیں لکھا ہوا ہے، تو وہ شیئر سرٹیفکیٹ سب کے پاس اسی طرح ہی چلتا رہے گا اور جب کمپنی کی جانب سے اس کے اوپر دستخط پاس ہو جائیں گے تو سب کی ملکیت ٹھیک مانی جائے گی اور اگر نہیں پاس ہوں گے تو سب کی ناقص ملکیت مانی جائے گی۔

حکیم ظل الرحمن صاحب:

قبضہ کی بات جو قاضی صاحب نے کہی تھی وہ اصل بنیادی بات ہے، میں بتانا چاہوں گا کہ کمپنی کیسے قائم ہوتی ہے، سب سے پہلے ایک پروجیکٹ رپورٹ تیار ہوتی ہے، اس کا ایک دستور اساسی بنایا جاتا ہے، اس میں کتنے سرمائے کی جگہ اس کی تفصیلات درکار ہوتی ہیں، اس کے ساتھ رجسٹرار کو رجسٹریشن کے لئے درخواست دی جاتی ہے۔

رجسٹریشن کے بعد رجسٹرار قید لگاتا ہے کہ جو Promoter Share Holders ہیں وہ سرمائے کا پچیس فیصدی اپنے پاس سے لگا دیں، پروموٹر شیئر ہولڈرس کو درکار سرمایہ کا پچیس فیصدی پہلے لگانا ہوتا ہے، جو تصویر آئی تھی کہ رقم سے رقم کی بات ہوتی ہے وہ بالکل بیجا ہے، پچیس پرسینٹ سرمایہ لگا دیں گے، Assets ہو جائیں گے تب جا کر کے وہ پھر رجسٹرار کو درخواست دیں گے کہ اب ہمیں [illegible] مایہ کی ضرورت ہے، شیئرز ڈکلیئر کرنے کے لئے، ایشو کرنے کی اجازت دے دی جائے، چوتھائی سرمایہ جب لگ گیا تو اثاثے کمپنی کے بن [illegible] اور بغیر اثاثے کے کمپنی نہیں رہی اور نقد کی صورت جو سوال میں تھی وہ بیجا تھی، اس میں چوتھائی سرمایہ میں عام طور پر زمین خرید لی جاتی ہے، کمپنی کے اخراجات میں اپنے پروجیکٹ کے مطابق سرمایہ لگانا پڑتا ہے، مشینیں خریدیں گے، زمینیں خریدیں گے، جو کچھ بھی ہو وہ سرمایہ پچیس فیصدی لگا دیں گے، تب رجسٹرار ان کو اجازت دے گا کہ اب آپ Issue (جاری) کر سکتے ہیں، اب ان کو شیئر کی اجازت ملتی ہے، شیئر عموماً دس روپئے کا ہوتا ہے، اچھی کمپنیاں اس کو Premium کے ساتھ فروخت کرتی ہیں، دس روپئے کا شیئر پچاس روپئے میں بھی بکتا ہے، بیس روپئے میں بھی بکتا ہے، اس کے بعد جو لوگ شیئر خریدنا چاہتے ہیں تو ایک فارم ہوتا ہے، جسے درخواست کا فارم کہتے ہیں، وہ ایک درخواست کے ساتھ ایک معینہ رقم اس کے ساتھ بھیجتے ہیں، پوری رقم مطلوبہ نہیں بھیجتے، کمپنی اس پر فیصلہ کرتی ہے کہ اگر ایک آدمی پانچ ہزار شیئرز مانگتا ہے تو کوئی ضروری نہیں کہ وہ پانچ ہزار دے دے، کمپنی یہ فیصلہ کرتی ہے کہ نہیں ہم تو تمہیں پانچ سو دے سکتے ہیں، پانچ سو دے دیتی ہے، کمپنی کو یہ بھی حق پہنچتا ہے کہ کسی آدمی کو اپنے لئے نامناسب سمجھے تو اس کے شیئر کی درخواست کو بالکل مسترد ہی کر دے، اور اس کے بعد جب وہ لوگ شیئر خرید لیتے ہیں تو اس کا رجسٹریشن مالکان اور حصہ داران کی حیثیت سے کمپنی میں ہو جاتا ہے، جن لوگوں کا نام درج ہو جاتا ہے وہی قانونی حصہ دار کہلاتے ہیں، یہ صورتحال ہوتی ہے، اب ہوتا یہ ہے کہ ان کی حیثیت کیا ہے، شیئر ہولڈرس کمپنی کے اصل مالکان ہوتے ہیں، یہ ڈائریکٹرس کو چنتے ہیں، کس کے شیئر کی کیا قیمت ہے، جتنے حصے اس کے پاس ہوتے ہیں اس کے شیئر کا وزن اتنا ہی ہوتا ہے، عام طور پر دس فیصدی جس کسی کے پاس ہو جاتے ہیں تو وہ ڈائریکٹر بن جاتا ہے، اس لئے کہ دس بارہ ڈائریکٹر چنے جاتے ہیں، یہ شکل تو ہوئی کمپنی کے قیام کی، اس سلسلہ میں جب تک اندراج نہیں ہو جاتا کمپنی کے رجسٹر میں وہ مالک قرار نہیں پاتا، اب صورت حال یہ ہے کہ اسٹاک ایکسچینج سے جو شیئرز فروخت ہوتے ہیں...... تو جب تک کمپنی میں اندراج نہ ہو جائے تب تک آپ کا نام مالکان میں نہیں ہوتا اور کمپنی کو یہ حق پہنچتا ہے جیسا ابھی احسان صاحب نے بتایا کہ مختلف بنیادوں پر کمپنی ریجیکٹ کر سکتی ہے کہ آپ کو نہیں بیچتے، ہم تو اپنے شیئر ہولڈرس کو بیچیں گے، آپ ہم سے پیسہ لے جایئے، تو قبضہ اس وقت شمار ہوتا ہے قانونی طور پر جب کمپنی میں رجسٹریشن ہو جاتا ہے، اس سے پہلے جیسا کہ انہوں نے بتایا کہ ایک Certificate Maintain Letter ہوتا ہے، اس کے ساتھ ساتھ دستخط کر کے دے دیئے جاتے ہیں، کسی کا نام نہیں لکھا جاتا اور چار چار پانچ پانچ آدمیوں میں وہی بکتا رہتا ہے، اب اگر جیسی صورتحال ہے کہ دستخط نہیں ملے تو کمپنی اس فروخت کی بالکل ذمہ دار نہیں ہے، کمپنی اصل مالک کو شمار کرے گی، Dividend ہوگا تب اس کو بھیجے گی، ووٹنگ کی تاریخ، انجمن کا دعوت نامہ بھیجے گا تو اصل کو جائے گا، یہ صورتحال ہے، ان حضرات کی جو بیچ میں جنہوں نے خریدی ہے، کوئی اسٹیٹس، قانونی حیثیت نہیں ہے، اخلاقی طور پر جو بھی ہو کہ جس سے انہوں نے خریدا ہے وہ جا کر کے ان سے لڑتے

رہیں کہ بھائی اصل منافع تو تمہیں کمپنی سے ملا ہے، ہم نے خرید لیا تھا، ہمیں دو، یہ سب ان کا اخلاقی فرض ہے، قانونی طور پر ان کی کوئی حیثیت نہیں ہے، ایک چیز یہ ہوتی ہے کہ بعض لوگ صرف شیئرز ہی بیچنے کا کام کرتے ہیں، انہیں کمپنی سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا، بعض حضرات نے لکھا ہے اور میں نے بھی لکھا ہے اور میرا خیال ہے کہ ایسے شیئرز جنہیں نہ یہ پتہ ہو کہ کمپنی کی کیا صورتحال ہے اور ہم شیئرز صرف منافع کے لئے بیچتے ہیں، جیسے ٹھیکے پہ ہوتا ہے، یہ فروخت جو ہے وہ ناجائز ہونی چاہئے، اس کی صورتحال یہ ہے کہ قبضہ کی بات جو قاضی صاحب نے فرمائی تھی اس سلسلہ میں یہی عرض کروں گا، ابھی احسان صاحب نے تو فرمایا کہ مالک وہ اسی وقت ہو جاتا ہے جس وقت اس نے شیئرز خرید لیا، میں صاف کہہ رہا ہوں کہ قانونی طور پر مالک وہ اس وقت ہوتا ہے جب کمپنی اس کی خریداری کو قبول کر کے اپنے یہاں اس کا اندراج کر لے۔

کھٹکھٹے صاحب:

یہ جو شیئرز کی خرید وفروخت کا سسٹم ہے اس کو ذرا ہم ایک مرتبہ مرحلہ وار دیکھ لیں، کہ کس طرح سے شیئرز کی خرید وفروخت میں کیا Stages آتے ہیں، آپ یہ سمجھیں کیونکہ یہاں جیسا قاضی صاحب فرما رہے تھے، یہاں بیع قبل القبض کا مسئلہ ہے، تو ہم اگر Sale کر رہے ہیں، شیئرز بیچ رہے ہیں، تو اس میں وہ مرحلے دیکھیں، ایک تو یہ کہ اسٹاک ایکسچینج میں آپ کے پاس شیئرز نہ ہوں تو بھی بیچ سکتے ہیں، تو شیئرز کی خرید سے پہلے شیئرز بیچنا، یہ ایک اسٹیج ہے، دوسرا اسٹیج یہ ہو سکتا ہے کہ آپ نے شیئرز خریدے ہیں، بروکر کو آرڈر دیا ہے، بروکر نے آپ کو کنٹریکٹ دیا ہے کہ میں نے مارکیٹ سے آپ کے شیئرز خرید لئے ہیں، وہ آپ کے پاس کنٹریکٹ موجود ہے، آپ کے نام کے فلاں کمپنی کے اتنے شیئرز میں نے خریدے، اس کے بعد اسٹیج آتا ہے ادائیگی کا کہ جو شیئرز آپ نے خریدے ہیں آپ نے اس کا Payment کیا ہے، یہ سکینڈ اسٹیج ہے، فرسٹ اسٹیج Transaction ہے، آپ بروکر کو آرڈر دیں، بروکر اسٹاک ایکسچینج سے وہ شیئرز خریدے گا، مطلب وہاں بولی کرے گا اور وہ بیچنے والا کہے گا کہ ٹھیک ہے میں نے اتنے شیئرز آپ کو فلاں رقم میں بیچ دیئے۔

قاضی صاحب: ...... ایجاب وقبول ہو گیا؟

کھٹکھٹے صاحب: ...... ہاں ایجاب وقبول ہو گیا۔

قاضی صاحب: ...... اس نے کہا کہ میں نے بیچا، انہوں نے کہا کہ میں نے لیا، فلاں کے لئے لیا، یہ بیع ہو گئی۔

قاضی صاحب: ...... یہ طے ہو گیا کہ آپ نے خریدا۔ اس کے بعد کیا ہوتا ہے؟

کھٹکھٹے صاحب:

اس کے بعد آپ اس کو شیئرز کے لئے Payment کریں گے تب اس کے بعد مارکیٹ سے آپ کو شیئرز کی ڈیلیوری آئے گی، Transfer Form اور Share Certificate، ٹرانسفر فارم جس نے بیچا ہے اس کی دستخط ہوگی، اور اس کے ساتھ سرٹیفکیٹ ہوگا، آپ کو اس کے اوپر دستخط کر کے کمپنی میں بھیجنا ہے آپ کے نام منتقل کرنے کے لئے، تو یہ ڈیلیوری آ گئی، آپ اگر کمپنی کو بھیجتے ہیں تو وہاں ان کے رجسٹر میں اندراج ہو جاتا ہے اور واپس آپ کو سرٹیفکیٹ آتے ہیں، تو اس کو ٹرانسفر کہیں گے، یہ پورا Transaction خریدنے کا مکمل ہو گیا، اب اس میں یہ چیز دیکھنے لائق ہے کہ جب آپ نے Transaction کیا، آپ کو بروکر نے خریدنے کا جو کنٹریکٹ نوٹ دیا ہے، اس کے بعد سے جو بھی کمپنی کی چیزیں ڈکلیئر ہوتی ہیں، جیسے آج میں نے خریدا، ابھی میں نے Payment بھی نہیں کیا ہے، کل اگر کمپنی نے Bonus Share ڈکلیئر کیا تو یہ میرا حق ہے، اگر Right Share ڈکلیئر کیا، Dividend ڈکلیئر کیا تو یہ میرا قانوناً حق ہے، اخلاقاً نہیں قانوناً یہ حق ہے، اور یہ بروکر کو دینا ہوگا، اب اس کے بعد اگر آپ Payment کرتے ہیں، اور وہ Delivery ہو جاتی ہے تو آپ کا معاملہ اور پکا ہو گیا، مگر جب آپ کو Contract آ گیا، اس کے بعد سے وہ بروکر مکر نہیں سکتا ہے، اس کو یہ شیئرز دینا ہے اور وہ سارے اس Benifits کے ساتھ جو اس دن سے اس کمپنی میں آپ کو مل سکتے ہیں، حالانکہ آپ نے اس وقت Payment بھی نہیں کیا ہے، اگر آپ Payment میں پھر بعد میں جا کر اگر ڈیفالٹ (Default) کرتے ہیں تو پھر وہ اس کو Revoke کر سکتے ہیں، اگر آپ نے Payment میں Default نہیں کیا ہے تو پھر سوال ہی نہیں اٹھتا کہ وہ Revoke

کرے گا۔

قاضی صاحب:......ڈیلیوری کا لفظ کس اسٹیج میں بولتے ہیں؟

کھٹکھٹے صاحب:...... جب آپ کو سرٹیفکیٹ اور ٹرانسفر فارم مارکیٹ سے مل جائے اس کو کہتے ہیں ڈیلیوری۔

قاضی صاحب:......یہ بھی قبضہ ہی ہوا؟

کھٹکھٹے صاحب:

ہاں، اچھا اس میں جیسے حکیم صاحب نے بتایا یا احسان صاحب نے بتایا، یہ جو شیئر ڈیلیوری آ گئی وہ ضروری نہیں کہ ہم اپنے نام پر ٹرانسفر کر کے ہی بیچیں، قانوناً ہم اس کو بیچ سکتے ہیں بغیر اس کو اپنے نام پر ٹرانسفر کئے ہوئے، صرف یہ ہے کہ اس کے درمیان اگر جو بھی منافع آتا ہے یا شیئر ہولڈر کو جو بھی Benifit آتا ہے کمپنی کی طرف سے، وہ ہم کو نہیں ملے گا جب تک کمپنی کو اس کا علم نہ ہو کہ یہ شیئرز ہمارے ہیں، اور کمپنی کے علم میں لانے کے لئے ہم کو اسے ٹرانسفر کے لئے کمپنی کے پاس بھیجنا پڑتا ہے، تو دیکھئے شیئرز ہم نے کمپنی سے نہیں خریدے ہیں، ہم نے XYZ سے خریدے ہیں، کمپنی تو ایک طرح کا صرف حساب کتاب رکھ رہی ہے کہ کس کے پاس کون سے شیئرز ہیں، کمپنی نے تو شیئرز شروع میں جب اجراء کئے تب بیچ دیئے اور اس کے پیسے لے لئے، اب ہم جو خرید رہے ہیں وہ ایک فرد سے خرید رہے ہیں، اس کے روپئے جو ہیں وہ اس فرد کو جا رہے ہیں، تو کمپنی اس Transaction میں نہ Buyer ہے نہ Saler ہے۔

ایک آواز:......تو کیا ڈیلیوری کے آتے ہی قبضہ ہو جاتا ہے اس کا؟

کھٹکھٹے صاحب:......نہیں وہ تو آپ لوگ طے کریں، میں تو اس کی (Characteristics) خصوصیات بتا رہا ہوں۔

قاضی صاحب:

سوال یہ ہے کہ مان لیجئے کہ کمپنی کے رجسٹر میں یہ جو نام کی منتقلی یا ٹرانسفر ہے، یہ تو ویسے ہی ہے جیسے اراضی ہم خریدیں اور ایجاب وقبول ہو گیا، بیع مکمل ہو گئی، لیکن اب تک رجسٹری نہیں ہوئی ہے، تبدیل نہیں ہوئی ہے، لہذا کھتیان میں اور رجسٹر میں جو نام رہے گا وہ سابق کا رہے گا، مالگزاری کا مطالبہ اس سے ہوگا، اور اس میں یہ ہے کہ قانونی طور پر یہ حقدار ہو جاتا ہے، Procedure یہ ہے کہ جب رجسٹر میں اندراج ہوگا تب وہ جانے گا کہ ہاں صاحب ان کو نفع دینا ہے یا ان کو اطلاع کرنا ہے۔

کھٹکھٹے صاحب:

اس سلسلہ میں ایک دو چیزیں میں عرض کرنا چاہوں گا، یہ Uncertainty کا جو مسئلہ ہے، جو اکثر ہم لوگ Discuss کر رہے ہیں کہ جو غرر کی صورت ہے، ابھی اس کے خریدنے کا تو اس کا حق ہو گیا، مگر اس کے اوپر اس کے بیچنے کا حق مکمل نہیں ہوا، کیونکہ اگر وہ بیچے گا تو صرف کچھ صورتوں میں ہی، مثلاً آج ہم نے Transaction کیا بروکر کے ساتھ خریدنے کا، اسٹاک ایکسچینج میں ایک مدت ہوتی ہے کہ یہ کام فلاں دن سے فلاں دن تک ہوگا، اس کا حساب مدت پوری ہونے کے بعد فلاں دن کو ہوگا، تو اس مدت میں جو بھی Transactions ہوں گے ایک Date پہ اس کا Settlement ہو جاتا ہے، تو اس کو کہتے ہیں کہ یہ مدت تو Settlement Period کا ہے، تو اگر کسی Settlement Period میں ہم نے شیئر خریدا ہے، اگر اسی سیٹلمنٹ میں اسی بروکر کے ہاتھ ہم نے وہ شیئر بیچ دیا، تو پھر ہمارے اوپر کوئی ذمہ داری نہیں ہے کہ وہ شیئر واپس آئے گا، یا کچھ بھی ہو، وہ ٹرانزیکشن کلیئر ہو جائے گا، اس میں بالکل Uncertainty نہیں ہوگی، اگر وہ شیئر بعد میں ہم اسی بروکر کے ہاتھ بیچیں سیٹلمنٹ پورا ہونے کے بعد، تو اس میں پھر Uncertainty رہے گی کہ ہم اس شیئر کو ڈیلیور کر پائیں گے یا نہیں، جیسے مثلاً ہم کو ڈیلیوری مارکیٹ میں آنے میں لیٹ ہو گئی، تو ہم اتار نہیں سکیں گے جب ہمارا دینے کا وقت آئے گا، یہ ابھی فی الحال جو قانون ہے اس کے مطابق اسٹاک ایکسچینج اس کے تحت ہے۔ اس سے پہلے کچھ اور قانون تھا، اس میں بھی وہ چل سکتا تھا اور ابھی جو ہے اگر اسی سیٹلمنٹ پہ اسی بروکر سے ہم نے لیا ہے اسی ایکسچینج پر، تو آپ اسی سیٹلمنٹ

میں اس کو بیچ سکتے ہیں، مگر اس میں جو ہے اگر ایسا کریں ہم تو پھر اس میں Speculation کا Element بہت اونچا ہو جاتا ہے، کیونکہ اگر ہم اس کی اجازت دیدیں کہ بغیر Payment کئے بھی کوئی شخص اسی سیٹلمنٹ میں اس کو بیچ سکتا ہے، تو وہ پھر فرضی جیسا ہو گیا، اور عام طور سے جو Speculation ہوتا ہے وہ ایسے ہی ہوتا ہے کہ ایک شخص کے پاس صرف سو روپے ہیں، ایک شیئر کی قیمت دس روپے ہے، مگر وہ ہزار روپے کے سو شیئرز خرید رہا ہے، دو ہزار روپے کے شیئرز خرید رہا ہے، کیونکہ اس کو پیسے دینا نہیں ہے، اور پھر وہ سیٹلمنٹ ختم ہونے سے پہلے وہ کلیئر کردے گا، اب اس میں سوال یہ ہوتا ہے کبھی آپ نے ڈیلیوری کے لئے شیئرز لئے ہیں، آپ کے پاس سو روپے ہیں، اور سو روپے کے شیئرز آپ نے لئے ہیں، مگر اس سیٹلمنٹ کے دوران شیئر کے دام کافی بڑھ گئے، اور آپ نے سمجھا کہ ابھی تو اس کے بڑھنے کے زیادہ Chances نہیں ہیں، یہ صورت الگ ہے کہ آپ نے خریدا تھا اس نیت سے کہ اس میں آپ Invest کریں، آپ اس کے روپے دیں اور ڈیلیوری لیں، مگر وقتی طور پر اگر وہ بڑھ گیا، اور آپ نے اس کو Settle کر دیا، یا یہ ہو سکتا ہے کہ آپ نے جب خریدا، آپ کے پاس روپے تھے، مگر پیمنٹ کا وقت سیٹلمنٹ پورا ہونے سے پہلے پہلے تک ہے کچھ اور ایسی اشد ضرورت آ گئی کہ آپ کو کچھ روپیہ خرچ کرنا پڑ رہا ہے، آپ ڈیلیوری نہیں لے سکتے ہیں، تو آپ آخر میں بروکر کو کہیں گے کہ بھائی ہمارے پاس روپے نہیں ہیں، آپ Settle کردیں، تو اس میں نیت کا دارومدار ہوگا، مگر اس میں یہ Possibility ہے کہ یہ Assets کیا جائے کہ آپ جیسے بھی کریں، اگر اسی سیٹلمنٹ میں آپ کو اسکوائر آف کرنا ہو تو پہلے آپ پیمنٹ کریں، پیمنٹ کرکے اسی سیٹلمنٹ میں اسکوائر آف کردیں، اگر آپ کو یہ کرنا ہے، اس طرح یہ ہوگا کہ اس میں Speculation کا جو عنصر ہے اس میں بیچ میں اس کو Benefit نہیں ہوگا، اگر ہم یہ تصور کرلیں کہ کنٹریکٹ آنے کے بعد میں قبضہ Complete ہو جاتا ہے تو یہ Insist کریں کہ اس شیئرز کا Payment کرنا چاہئے، تبھی اس کے اوپر آپ کا قبضہ ہوگا، ورنہ Speculation کو کافی چھوٹ مل جائے گی......

عبدالقیوم اختر صاحب:

میرے فاضل دوست پروسیجر کے بارے میں زیادہ بات کرتے رہے ہیں، پروسیجر کے بارے میں صحیح بات میں سمجھتا ہوں شاید طے نہیں ہوگی کہ یہ شیئر کا کاروبار جائز ہے یا ناجائز؟ حرام ہے یا حلال؟ بنیادی بات سمجھنے کی یہ ہے کہ ہندوستان کی معیشت میں اپنے آپ کو اپنے ملک تک ہی محدود رکھ رہا ہوں، ہندوستان کی معیشت Interest Base معیشت ہے، یعنی سود اس کا جز نہیں بنیاد ہے، اس کو آپ اپنے ذہن میں ملحوظ رکھیں، جہاں تک شیئر کا کاروبار ہے یہ اس پر پوری طرح محیط ہے، آپ کھلے دل سے جانئے، میں معذرت چاہتا ہوں اس بات کو کہنے میں کہ ہم نے وقت کی ضرورت کو محسوس کیا ہے، لوگ دو طرح سے اپنا سرمایہ شیئر میں لگاتے ہیں، ایک وہ لوگ جو صرف منافع کمانا چاہتے ہیں، ایک وہ لوگ جو اس کا کاروبار کرتے ہیں، اس بات کو سمجھ لیں کہ آج چاہے مزدور ہو، چاہے کسان ہو، چاہے نوکری پیشہ ہو، اس کے پاس کچھ فاضل Money رہتا ہے، فاضل سرمایہ رہتا ہے، کچھ بچت رہتی ہے، یقینی طور سے ہر آدمی اس بچت سے سونا نہیں خرید سکتا، جائداد انہیں خرید سکتا، یا اور کسی اپنی ضرورت کے لئے بچا کے کچھ وقت کے لئے رکھنا چاہتا ہے، تو یقینی طور سے وہ رکھنے کے لئے محفوظ جگہ تلاش کرتا ہے، کوششیں کرتا ہے کہ وہ سرمایہ کہیں لگ جائے، چونکہ آج کل Inflation اتنی پھیل گئی ہے کہ آپ اگر کسی چیز کے بارے میں معلوم کرنا چاہیں تو یہ بہت دشوار گزار بات نہیں ہے، ہم بنیادی طور سے یہاں یہ بات طے کرنے بیٹھے ہیں کہ شیئر مارکیٹ کیا بلا ہے؟ میں چونکہ تسلسل اس کا قائم نہ رکھ سکوں گا چونکہ میرے ذہن میں بہت ساری باتیں ہیں، مجھے یہ نہیں معلوم کہ میں کس طریقہ سے یہاں اس کو ذکر کروں، یہاں صرف شیئر کی بات کی گئی، شیئر کے بارے میں اگر میں بتاؤں تو شیئرز آٹھ دس طریقے کے ہیں، کس شیئر کے بارے میں بات کریں گے، Equity Share ہے، Preference Share ہے جس میں ایک محدود بارہ پرسینٹ پندرہ پرسینٹ حصہ دیا جاتا ہے، ایک نئی چیز آئی ہے، Voting Share ہے، Non Voting Share ہے، ووٹنگ شیئر میں آپ کو کم ملے گا ڈیویڈنڈ، نان ووٹنگ شیئر میں آپ کو کچھ زائد بھی ملے گا، Convertible Share ہے، کچھ وقت کے لئے آپ نے سرمایہ کمپنی کو دیا، انہوں نے سود پر آپ کو کچھ سود دیا، اور اس سود کے بدلہ میں مزید آپ کو ایک شیئر دے دیا۔ Bonus Share ہیں، اور Right Share ہیں۔۔۔۔۔۔ اس کے بعد Public Undertaking کے شیئرز ہیں، اگر آپ تھوڑی جانکاری رکھتے ہوں تو اس بار جو بجٹ پیش کیا گیا تو حکومت اپنی کمپنیز کے کتنے ہزار کروڑ کے شیئرز Disinvest کرے گی، ایک اس قسم کے شیئرز ہیں، یہ جو Company Formation کی بات ابھی ہمارے دوست کر رہے تھے، تو فورمیشن ہوتے ہی سود کی شرح شروع ہو جاتی ہے، جو سرمایہ Application کے ذریعہ لیا جاتا ہے، وہ

بینک میں Fixed Deposit رکھ دیا جاتا ہے، تین مہینے تک آپ کا وہ سرمایہ بینک میں فکسڈ ڈپوزٹ کے طریقہ سے رہتا ہے، وہ اپنے اخراجات کا بہت بڑا حصہ اس سے پورا کرتی ہے، ایک کمپنی کو اپنا ایشو لانے کے لئے کم سے کم دس پندرہ فیصد سرمایہ خرچ کرنا پڑتا ہے، مان لو ایک کروڑ روپے کا سرمایہ اگر بازار سے جٹانا ہے، تو تقریباً پندرہ بیس لاکھ روپے خرچ کریں گے، وہ پیسہ تو وہ جو سود سے آئے گا، کچھ اس سے پورا کریں گے، فاضل ہوگا تو کمپنی کی آمدنی میں چلا جائے گا، تو بنیاد کمپنی کی وہیں سے پڑے گی اور سود کا پیسہ وہاں سے شروع ہو جائے گا، دوسری بات جب وہ کاروبار شروع کرے گی، جیسے پروجیکٹ رپورٹ کی بات کی گئی تھی اس میں وہ سرمایہ کی تفصیل دیتے ہیں، اس سرمایہ میں ایک پیسہ وہ ہوتا ہے جو Promoters خود لگاتے ہیں، ایک سرمایہ وہ ہوتا ہے جو پبلک سے Equity Share کے نام پہ لیا جاتا ہے، ایک سرمایہ وہ ہوگا جو گورنمنٹ سے قرض لیا جائے گا، اور ایک سرمایہ ہوگا جو گورنمنٹ Subsidy کے طریقہ سے دے گی، (Insenting) کے طریقہ سے دے گی، تو یہ کل ملا کر کے کمپنی کا سرمایہ ہوگا، کمپنی اس سے چلے گی، کمپنی کا Concept یہ سمجھ لیجئے کہ اس طرح نہیں ہے کہ ہم نے جیسے ایک دکان کھولی، سرمایہ لگایا اور جب چاہا چلایا جب چاہا بند کر دیا، جب چاہا دوسرا بدل لیا یا اور کچھ کر لیا، ایک سائڈ چیزیں ہوتی ہیں، جیسا کہ بتایا گیا کہ ایک Prospectus بنتا ہے اور وہ پروسپیکٹس کم سے کم دس قوانین سے مدوّن ہوتا ہے، اور آپ ابھی مجھے معاف کریں، جتنے لوگ یہاں آ رہے ہیں سب ظالمانہ قانون بتا رہے ہیں، انکم ٹیکس کو بھی ظالمانہ قانون اور ان ظالمانہ قانون کی اور فہرست سن لیجئے، Contract Act سے متاثر ہوگا، Company Act سے متاثر ہوگا، Saving Act کے مطابق ہے، پھر Income Tax سے متاثر ہوگا، پھر Local Act جہاں کمپنی لگ رہی ہے وہاں سے متاثر ہوتا ہے، مجھے معاف کیجئے کہ مجھے وہ Terminology نہیں آتی ہے، یہ جو ڈیلیوری کی بات ہوتی ہے، اب یہ نیا Concept آ جائے گا کہ اس میں کہیں لین دین نہیں ہوگا، اصطلاحی طور پر ایک Deposit Act پاس ہو گیا ہے، بس آپ نے جیسے شیئر خریدا، آپ اس کو اطلاع کر دیجئے، آپ کا نام درج ہو جائے گا، آپ کو کوئی لین دین کی کہیں ضرورت نہیں رہے گی، ان تمام قوانین کو اگر آپ ظالمانہ قانون کہیں گے، جو میں نے آپ کو بیان کئے، تو پھر یہ شیئر کے کاروبار کی آپ کو ضرورت نہیں ہے، اور اگر آپ یہ سمجھ رہے ہیں کہ ہندوستان میں رہنا ہے اور اس ہندوستان کی حکومت میں ہماری برابر کی حصہ داری ہے، تو برائے مہربانی ان الفاظ کا استعمال چھوڑ دیجئے، یہ قوانین ہماری جمہوری حکومت میں Welfare State کے قوانین ہیں، جو کہ آپ اختیار دیتے ہیں ان قوانین کو بنانے کا، جب ووٹنگ میں آپ شیئر کرتے ہیں تو آپ ہی ان لوگوں کو اختیار دیتے ہیں کہ یہ سب قوانین بنائے جائیں، دوسری بات جس کی آج سب سے زیادہ ضرورت ہو رہی ہے، معیشت پھیل گئی، پہلے معیشت کنٹرول میں تھی اور شیئر بازار سب سے زیادہ Sensitive تھی، اگر آج یوپی میں بی جے پی کی حکومت بن جائے تو شیئر مارکیٹ بہت اونچا چلا جائے گا، دیوگوڑا کی حکومت گر جائے تو شیئر مارکیٹ ڈاؤن چلا جائے گا، آج فائنانس منسٹر کوئی اعلان کر دیں تو شیئر مارکیٹ اوپر چلا جائے گا، آج شرح سود ایک فیصد کم کر دی جائے تو آج ہی پر چلا جائے گا، تو مختلف صورتحال ہیں، میں اب زیادہ تفصیل میں آپ کی سمع خراشی نہیں کرنا چاہتا اس سے Confusion بہت پیدا ہوگا، میری گذارش یہ ہے کہ اگرچہ یہ قیاس، اندازے اور پورے طریقہ سے ایک بہت بصیرت افروز چیز ہے، جو شیئر مارکیٹ ہے، اس میں اتنا Vigilant آدمی کو رہنا پڑتا ہے کہ اگر بروکر کو آپ نے صبح کہا، اگر اس نے دوپہر میں سودا کیا تو Transaction بدل جائے گا، اگر آپ نے آج فیصلہ کیا ہے، جو لوگ کاروبار کرنا چاہتے ہیں، جو لوگ صرف منافع کے لئے خریدنا چاہتے ہیں، ان کی بات تو الگ ہے، وہ لوگ جن کے پاس فاضل سرمایہ ہوتا ہے کچھ پیسہ دس بیس ہزار روپئے لگایا، لے کر رکھ لیا، کبھی بیچتے ہیں، کبھی انکم سالانہ آتی ہے، کبھی نہیں آتی ہے، بہر حال فاضل پیسہ ایک Asset کی طرح پڑا ہے، لیکن آپ ان کی تفصیلات میں جائیں گے تو یقین مان لیجئے کہ کوئی کمپنی ہندوستان میں Exist نہیں کرتی ہے، جب سود کا پیسہ اس کے انکم میں شامل نہیں ہوتا ہے، مجھے اس بات کے کہنے میں کوئی تکلف نہیں ہے کہ شاید قاضی صاحب سے بھی ایک بات ہوئی، ہوسکتا ہے مجھے غلط فہمی ہو، میں تو اب بھی اپنی غلط فہمی مان لیتا ہوں، لیکن صحیح بات یہ ہے کہ ٹاٹا کے ذریعہ وہ Core Company شروع کرائی گئی، ہمارے Barkat Investment والے بیٹھے ہیں، اس میں یہ تھا کہ ہم کوئی سودی کاروبار نہیں کریں گے، لیکن Cover Sector میں کریں گے، جیسے سڑکیں بنانا، پل بنانا وغیرہ اور وہ جائز کاروبار ہوگا، لیکن انہوں نے اس Prospectus میں یہ Term دی تھی کہ تین سال میں ہم Diversify کر سکیں گے، اور اس وقت اگر آپ کو پیسے کی ضرورت ہو تو، قاضی صاحب کو کسی نے کہا کہ تو انہوں نے اسے ریجیکٹ کر دیا، وہ سیدھے ریجیکٹ نہیں کر سکتے، پروسپیکٹ، کا حصہ تھا، انہوں نے جب Application لکھی تو اس میں ظاہر کر دیا تھا کہ SEBI کو اس بات کا اختیار نہیں کہ وہ کسی کو ریجیکٹ کرے یا نہیں کرے، وہ SEBI کا قانون

یہ ہے کہ سرمایہ جو آپ نے لگایا وہ کس طرح محفوظ رہے، اس میں اس نے اسی کے لئے بہت سارے قوانین بنا دیئے، اور اتنے قوانین ہیں کہ اب ان کمپنیز کو اس کی پابندی کرنا بڑا مشکل ہوتا ہے، صرف اس لئے کہ Investors کے پیسے کمپنیاں بلا لحاظ کسی کے ضائع نہ کریں، لیکن پھر بھی کمپنیاں بہت قائم ہوتی ہیں، اور SEBI کے Rules بھی اپناتی ہیں، کمپنی کے ایکٹ بھی اپناتی ہیں، اور چونکہ ہندوستان کی معیشت میں اس بات کی ضرورت محسوس کی جاتی ہے کہ اس کی ترقی کے لئے ضروری ہے کہ Industrialisation ہو، انڈسٹریلائزیشن کے لئے ضروری ہے کہ کمپنیاں زیادہ سے زیادہ بنیں، اب اس میں مسلمانوں کا کس طرح حصہ ہو، اور کس طریقے کی بات ہو، یہ آپ کے سوچنے کی چیز ہے، جہاں تک بات جائز و ناجائز کی ہے، یہ آپ کے فیصلہ کرنے کی چیز ہے، میری گذارش یہ ہے کہ آپ حضرات کے پاس، جو شرعی نقطہ نظر سے ایک علم ہے، اور جو اکنامک کے Base پر شیئر مارکیٹ کے اتنے سارے قوانین ہیں، ان کے ماہرین بیٹھے ہیں، آپس میں Interaction کریں، اس کے بارے میں جان لیں، اور پھر اس کا اطلاق کہاں ہوتا ہے، ڈیلیوری کے لئے، قبضہ کے لئے، اور دوسری چیزوں کے لئے صورتحال خود نکالیں، میں یہ بات اس لئے عرض کررہا ہوں کہ امت کا پیسہ، ہم لوگوں کا پیسہ، ہمارے برادران وطن اور دوسرے لوگ لے جارہے ہیں، آج گلی گلی فائنانس کمپنیاں کھل گئی ہیں، اور خاص طور سے مسلم علاقوں کو نشانہ بنایا گیا ہے، چونکہ ہمارے برادران وطن سمجھتے ہیں، اور وہ اپنا پیسہ دوسری جگہ استعمال کرتے ہیں اور رکھتے ہیں، لیکن مسلمانوں کا فاضل سرمایہ خواتین اور مزدوروں کے پاس ہے، ان لوگوں نے اپنے اپنے محلوں میں فائنانس کمپنیاں بنا دی ہیں، جس میں آپ نے JVG کا نام اور سہارا کمپنی کا نام سنا ہوگا، ایسی پچاسوں کمپنیاں ہیں، اور ان لوگوں نے مسلم علاقوں میں اپنے دفتر کھول لئے ہیں، بارہ فیصد پندرہ فیصد سود کہہ کے وہ پیسہ لے رہے ہیں، باشرع لوگوں کو وہاں بیٹھا رکھا ہے، اور صالح بے خبر علماء کے تصدیق نامے حاصل کررکھے ہیں، اور جوق در جوق لوگ وہاں جمع کرارہے ہیں، جس کی ایک مثال میں بتاتا ہوں کہ جودھپور میں ایک مدراس کی کمپنی بنی ہے، ہمارے مسلم دوست اس کے منیجر ہیں، اور وہ دس لاکھ روپئے ہر سال وہاں سے اٹھاتے ہیں، جس میں تیس فیصد پیسہ مسلمانوں کا ہوتا ہے، تو اللہ آپ سے گذارش یہ ہے کہ آپ اس اکنامی میں اور معیشت کے اصولوں کو طے کرتے ہوئے آپ اس کا حل جب تک متبادل نہیں دیں گے، تو یہ سودی کاروبار میں پیسہ جاتا رہے گا ہمارے لوگ آپ کے منتظر ہیں، ہم لوگ چاہتے ہیں کہ اسلامی نقطہ نظر سے شرعی نقطہ نظر سے کاروبار ہو، لیکن اگر متبادل نہیں ہوگا، تو یقینی طور سے وہی یہ اٹھائیں گے، اس کے بعد بھی بہت ساری باتیں ہیں، میں مزید سمع خراشی نہیں کرنا چاہتا ہوں، کیونکہ یہ نازک مسئلہ ہے، جو اتنی آسانی کے ساتھ Procedure سے دو چار باتوں سے حل نہیں ہوسکتا، اور معاف کیجئے وہ آپ کی سمجھ میں بھی نہیں آسکتا، میں جو کچھ کہہ پایا ہوں ایک بنیادی بات کی طرف اشارہ کیا ہے، اس کو ملحوظ رکھیں، وآخر دعوانا أن الحمد للہ رب العالمین۔

قاضی صاحب:

جناب عبدالقیوم اختر صاحب نے بہت دردمندی کے ساتھ، تعمق کے ساتھ اور گہرائی کے ساتھ اپنی معلومات سے ہمیں فائدہ پہنچایا، جس کے لئے ہم ان کے شکر گذار ہیں، ویسے ان کو اتنا تو اطمینان دلاتے ہیں کہ استاد اچھا ہو تو شاگرد کمزور ذہن کے باوجود بات سمجھ لیتا ہے، اور یہ مجمع جو آپ کے سامنے بیٹھا ہے، بہت گہری قانونی الجھنوں کو حل کرتا رہا ہے اور انشاء اللہ حل کرتا رہے گا، صرف مسئلہ یہ ہے کہ جو یہ سب نہیں جانتے اس کی تفصیل آپ ہماری زبان میں سمجھانے کی کوشش کیجئے، اور اگر آپ ہماری زبان نہیں جانتے تو آپ ہماری زبان سیکھئے، اور ہم نہیں جانتے تو ہم آپ کی زبان سیکھیں، مجھے ان کی رائے سے قطعی اتفاق ہے کہ شیئر بازار کے جو ماہرین ہیں ان کے درمیان اور جو ہمارے ماہر فقہاء ہیں ان کے درمیان ایک باہم مکالمہ ضرور ہونا چاہئے جس میں بہت تفصیل کے ساتھ بیٹھ کر ان معاملات کو جو آج روز بروز شیئر بازار میں پیش آتے جارہے ہیں؛ ان کے بارے میں First Hand واقفیت، مکمل اور براہ راست واقفیت ہماری ہوسکے، تاکہ ہم حکم مسئلہ کی بنیاد پر اس کو رکھ سکیں۔

دوسری بات جیسا کہ میں نے خود شروع میں کہا تھا کہ ہم انشاء اللہ اصول طے کریں گے، اور جزئیات جو روز بدلتی ہیں وہ بہت زیادہ ہمارے زیر بحث نہیں رہیں گی، ہم اصول طے کریں گے، اور جب اصول طے ہوں گے تو اس کو کہیں بھی منطبق کیا جاسکتا ہے، جیسے بھی حالات بدلیں گے ویسے اس اصل کی تطبیق ہوتی رہے گی۔ تیسری بات انہوں نے ٹاٹا کے بارے میں کہی، اس سلسلہ میں مجھے عرض کرنا ہے کہ ہمارے پاس یہ اطلاع بھیجی گئی کہ یونٹ ٹرسٹ آف انڈیا (UTI) ایک ایسی اسکیم چاہتا ہے جو اسکیم مسلمانوں کے لئے مذہبی طور پر قابل اعتراض نہ ہو، ہمیں اس بات کی خوشی ہوئی کہ

جتنا بھی تصلب ہم نے ان مسائل میں اختیار کیا الحمد للہ، چونکہ یہ تو بزنس والے لوگ ہیں، Commercial Approach ہے ان کا، یہ تو بہر حال چاہتے ہیں کہ ہمارا سرمایہ لگے، اس لئے انہوں نے یہ ضرور چاہا کہ صاحب ایسے اصول ہم وضع کریں جن پر وہ ایک ایسے ادارہ کی بنیاد رکھ سکیں جس میں مسلمانوں کو اپنے مذہب کے اعتبار سے سرمایہ لگانے میں کوئی اعتراض نہ ہو، دوسری طرف یہ بھی واقعہ ہے کہ کوئی مسلمان ریٹائر ہو جاتا ہے، اور اس کو لاکھ دو لاکھ روپئے کی رقم ملتی ہے، یا تو وہ بیٹھا بیٹھا اس کو کھا جائے، یا فکسڈ ڈپوزٹ میں رکھے، روپیہ بھی محفوظ اور سود کے نام پہ نفع بھی مل رہا ہے، یا پھر کوئی جائز سرمایہ کاری کا یا استثمار کا راستہ اس کے لئے نکلنا چاہئے، جس سے وہ اپنے سرمایہ کو نہ کھا کر ختم کردے، اس کا سیدھا راستہ تجارت تھا، اور شریعت اسلامی نے اس کو سامنے رکھتے ہوئے یا شریعت کی تعلیم سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ ہر شخص کے پاس سرمایہ نہیں ہوتا اور ہر شخص کے پاس Skill اور ہنر تجارت کا نہیں ہوتا، تو سرمائے کی صلاحیت اور تجارتی سلیقے اور ہنر کی صلاحیت کو جوڑا کیسے جائے، اور اس کا Skill اور اس کا ہنر اور دوسرے شخص کا سرمایہ مل کر ایک سرمائے کو دورے میں رکھتا ہے، اس کو Rotate کرتا رہتا ہے، اس سے منافع حاصل ہوتا رہتا ہے، یا پھر شرکت کا اصول ہے جس میں شریک عامل اور شریک غیر عامل دونوں ہوسکتا ہے، جس میں اس کے ذریعہ بھی سرمایہ لگایا جاسکتا ہے، لیکن اس کی کھوج تو ہم پر بہت ضروری ہے کہ کس طرح اس جامد سرمایہ کو جو ہمارے بہت سے بھائیوں کے پاس ہے، زندگی کے سرگرم میدان میں لایا جائے، اور جو سرمایہ زندگی کے میدان میں آتا ہے، وہ جہاں سماج کے لئے فائدہ مند ہوتا ہے وہیں اس شخص کی ذات کے لئے بھی فائدہ مند ہوتا ہے، جامد سرمایہ نہ اس کے لئے بہتر ہے اور نہ سماج کے لئے بہتر ہے، اس لئے یہ مقصد صحیح ہے، بہر حال جب یہ بات آئی اور UTI پیچھے رہ گیا، لیکن ٹاٹا اس کو لے کر ہم لوگوں کے پاس آیا ہماری میٹنگ میں، میٹنگ میں جناب کھنکھٹے صاحب بھی موجود رہے ہیں، اور بھی ہمارے کئی دوست، تو اس کا جب ہم لوگوں نے جائزہ لیا تو اس میں دو تین باتیں قابل غور نظر آئیں، ایک بات تو یہ ہے کہ سرمایہ ہمارا لگایا کہاں جائے گا، انہوں نے Core Sector کی صراحت کر کے یہ طے کر دیا کہ حرام کاروبار میں چاہے وہ Landing کا ہو، سرمایہ دے کر اس پر سود کمانے کا کاروبار ہو، یا شراب کا ہو، یا خنزیر کا ہو وغیرہ وغیرہ، اس طرح کی چیزوں میں وہ سرمایہ نہیں لگے گا، تو اتنا اطمینان ہوتا ہے کہ سرمایہ صحیح جگہ لگے گا، دوسرا سوال یہ ہے کہ اس تجارت سے جو منافع ہوگا اس منافع کی تقسیم کس طرح ہوگی، آیا وہ Fixed ہم کو ملے گا جو سود کی شکل ہے، یا جو حسب حصہ رسدی ہوگا جو تجارت کی حیثیت ہے، یہ مان لیا گیا کہ حسب حصہ رسدی ہوگا تو جہاں سرمایہ لگایا گیا وہ صحیح، اور منافع کی تقسیم صحیح، یہ دونوں باتیں بہت اچھی ہیں۔ تیسری چیز، اس میں ایک بڑی خطرناک چیز تھی جو ہمارے شرعی نقطہ نظر سے قابل اعتراض چیز تھی کہ Generally وہ Equity Share ہی ہوں گے، لیکن کبھی بعض مجبوریوں سے ان میں کچھ دوسرے قسم کے شیئر بھی ہوں گے جن میں حسب حصہ رسدی منافع تقسیم نہیں ہوتا بلکہ متعین سود ملتا ہے، اس پر ہم لوگوں نے اعتراض رکھا، لیکن وہ لازمی طور پر Convertible ہے، یعنی تین مہینے...... چار مہینے یا چھ مہینے کی مدت کے بعد وہ Equity Share میں تبدیل ہو جائے گا، تو اولاً ہم کو اس میں اختیار ہے کہ ہم وہ شیئر لیں یا نہ لیں، جو سودی شیئر ہے، اور اگر ہم لیں تو ہم کو اس کا موقع ہے کہ اس نام پر جو سود ملے اس کو ہم صدقہ کر دیں، لیکن بہر حال وہ ایک قابل اعتراض پہلو تھا۔ تیسرا حصہ اس کا یہ تھا کہ یہ ایگریمنٹ جو تین سال کے لئے ہوگا، تین سال کے بعد اس کمپنی کو اختیار ہوگا کہ وہ Core Sector کو کراس کر جائے، اور Landing یا دوسرے معاملات میں بھی سرمایہ لگانا شروع کر دے، ایسے موقع پر ان کی تحریر کے مطابق کمپنی اس کی پابند ہوگی کہ ایک مہینہ یا تین مہینے پہلے شیئر ہولڈرس کو اطلاع کر دے کہ ہم ایسا کرنے جا رہے ہیں، آپ کو اس کے ساتھ شیئر رکھنا منظور ہو تو رکھئے، اور شیئر رکھنا منظور نہ ہو تو آپ اپنا شیئر واپس لے لیجئے، بیچ لیجئے، اس پر ہم لوگوں نے یہ سمجھا کہ یہ ٹھیک ہی ہے، یہ شرط تو ٹھیک ہی ہے، تین سال کے بعد وہ گڑبڑ ہوتی ہے ہم نہ رکھیں نہ لیں، اختیار ہم کو ہے، لیکن ہمارا اس پر اعتراض تھا کہ تین سال تک ہمارے پیسوں سے اس کمپنی نے اپنا ایک وجود بنایا، اور پھر جب تین سال بیت جاتا ہے تو پھر کمپنی اس کو دوسری طرف لے جاتی ہے، اور ہم کو اس کی حق ملکیت سے محروم کرنا چاہتی ہے، اس لئے یہ ہمیں منظور نہیں، بعد کو مجھے یہ بتایا گیا کہ SEBI میں جب وہ چیز منظوری کے لئے گئی تو (SEBI) نے اس کو تسلیم نہیں کیا، میرا خیال ہے کہ کھنکھٹے صاحب اس کو بتا دیں گے کہ یہ اطلاع میری صحیح ہے یا غلط، اس طرح وہ ایک صورت پیدا ہوتی ہے، SEBI جو اس طرح کی اسکیموں کو کنٹرول کرتا ہے، بینکس کو، جو یہاں پر ہندوستان بھر میں سب سے Higher Body ہے، اس کی منظوری کے بعد ہی کوئی چیز منظور اور تسلیم کی جاتی ہے، اور جہاں تک مجھے معلوم ہے کہ SEBI کو کوئی بھی کمپنی جب اپنا کوئی ڈرافٹ بھیجتی ہے تو اس میں اس کا استحقاق رہتا ہے کہ کسی حصہ کو وہ باقی رکھے اور

کسی حصہ پر وہ اعتراض کرے اور اس کو ریجیکٹ کرے، جہاں تک میری معلومات ہے، میں سمجھتا ہوں کھٹکھٹے صاحب اس کو واضح کریں گے، تو اس روشنی میں ٹاٹا کا کام ہوا ہے، اور کھٹکھٹے صاحب وضاحت کر دیں گے تو بات صاف ہو جائے گی، میں سمجھتا ہوں کہ جس تفصیل کے ساتھ یہاں پر چیز آ گئی ہے، کھٹکھٹے صاحب کی وضاحت کے بعد میں صرف اتنا چاہوں گا کہ جو لوگ اس پر مقالہ لکھ چکے ہیں اور اپنی رائے ان مختلف مسائل پر مثبت یا منفی دے چکے وہ تو خاموش رہیں، ان حضرات کے علاوہ کسی صاحب کو جو مسائل اس سوال میں زیر بحث آئے ہیں کچھ کہنا ہو تو وہ اپنا نام ہمیں لکھا دیں تو ہمارے پاس تھوڑا سا وقت ہے ان کی بات سنیں گے۔

کھٹکھٹے صاحب:

قاضی صاحب نے دو نقطے Raise کئے ہیں، Tata Core Sector Equity Fund کے سلسلہ میں، پہلا یہ ہے کہ اس کی اسکیم کے تحت وہ Mutual Fund کے پیسے شیئرز ہیں، اور اس کے علاوہ Convertible Debenture میں لگائے جاسکتے تھے، مگر صرف اسی کمپنی کے Convertible Debenture جو Rights کی بنیاد پر ملتے ہیں، مطلب یہ کہ اختیار اسی کمپنی کے شیئرز ڈبینچرز میں ہے جس میں Already ہمارے ایکویٹی شیئرز ہیں، اگر ایسے ڈبینچرز کو کمپنی Subscribed نہیں کرتی ہے تو پھر اس کو نقصان ہوگا، وہ اب تفصیل کی بات ہے کبھی اگر کوئی سمجھنا چاہے تو میں فرداً فرداً سمجھا سکتا ہوں، اور اس وجہ سے اس کے اوپر ہم کو اتفاق کرنا پڑا، حالانکہ بعد میں ٹاٹا والوں نے ہم سے کہا، یہ کہیں لکھ کر نہیں دیا ہے مگر انہوں نے کہا ہے کہ ہم اس کی حتی الامکان کوشش کریں گے کہ جہاں Convertible Debenture بھی لئے جائیں گے تو جس Period میں وہ انٹریسٹ Barry ہوں گے تو وہ ہم اپنے دوسرے اسکیم میں رکھیں گے اور جب وہ قابل تبدیل ہوں گے تو اس کو اس میں لے لیں گے، تو یہ انہوں نے ہم کو ایک Assurance دیا ہے کہیں لکھ کر نہیں دیا ہے، تو اس کے اسکیم لاء کے مطابق وہ Convertible Debentures جو Rights کے طور پر ملیں اس میں لگا سکتے ہیں، جو کچھ وقت کے لئے انٹریسٹ بیرنگ ہوں گے اور اس میں انٹریسٹ آئے گی، اس کے بعد وہ شیئرز میں تبدیل ہو جائے گا، دوسرا جو ہے وہ تین سال کے بعد تبدیل ہونے کا ہے، تو یہ چونکہ معاملہ ایسا ہے کہ بہت دیر رک نہیں سکتا، ایک مرتبہ شروع کر دیئے Assets تو وہ جیسے Procedure میں آ گیا، اور پھر اس میں وقت کا بھی بہت لحاظ رکھنا پڑتا ہے، جب ہم مارکیٹ کی طرف جاتے ہیں جیسے اس وقت الیکشن قریب تھا، حج کا زمانہ آرہا تھا، مانسون کا زمانہ آرہا تھا، یہ سب چیزیں مدنظر رکھتے ہوئے ایک Situation ایسا تھا کہ ہم کو ابھی جتنی جلدی ہوسکتا ہے اس کو نکالنا چاہئے کہ اس وقت ایسا لگ رہا تھا کہ یہ بہت صحیح کام ہے شیئرز میں انویسٹ کرنے کے لئے، ان کی اسکیم میں ایک چیز یہ تھی کہ تین سال کے بعد اگر وہ چاہیں تو دوسری جگہوں پر بھی لگا سکتے ہیں، مگر Existing Share Holders کو نوٹس دینا ہوگا، اس کے بعد وہ جب SEBI میں گیا تو سیبی والوں نے ان کو کافی دن تک Delay کیا، میرے خیال میں ایک مہینہ میں جو ان کو ہاں یا ناں کا جواب دینا تھا اس میں انہوں نے کچھ نہیں تو چار مہینے لگائے، اور اس درمیان کچھ Objection بھی اٹھائے، اس میں ایک Objection انہوں نے یہ کیا تھا، اس کی شاید ہمارے پاس کاپی بھی ہوگی، کہ اس کی جو Basic Scheme ہے اس میں آپ تبدیلی نہیں کر سکتے ہیں، تو اس وقت ہم کو یہ سمجھ میں آیا کہ اس کی Basic Scheme چونکہ Strategy یہی ہے کہ Equities میں ہی انویسٹ کرنا ہے تو اس سے ہمارا جو مسئلہ ہے وہ حل ہو گیا ہے، مگر فائنل جب ان کا پروسپیکٹس وغیرہ آیا ہے تو اس میں وہ تین سال کا پھر بھی تھا، اس کا مطلب یہ ہے کہ یا تو انہوں نے SEBI کو Convince کیا ہے یا اس کا انہوں نے جو مطلب لیا ہے کہ بیسک اسکیم میں رد و بدل نہیں کر سکتے، وہ کچھ اور ہے، ہوسکتا ہے کہ یہ جو آپ نے تین سال کا دیا ہے وہ بھی انہوں نے بیسک اسکیم میں لے لیا ہو، بہر حال یہ کہ وہ تین سال تک تو نہیں جاسکتا، جہاں تک قاضی صاحب کا اندیشہ ہے کہ شروع میں وہ فنڈ ہمارے روپیوں سے بنائے گا اور پھر بعد میں وہ ہم کو نظر انداز کر دیں گے، الگ کر دیں گے، تو میرا خیال یہ ہے کہ اس میں کچھ تو یہ ہے کہ Judgement کے حساب سے میں نہیں سمجھتا کہ یہ صحیح ہے، کیونکہ یہ جو گروپ ہے ٹاٹا والوں کا، ملک میں یہ سب سے معتبر گروپ سمجھا جاتا ہے، اور ایک مرتبہ جب انہوں نے ہمارے ساتھ میں یہ طے کیا ہے تو وہ اتنی آسانی سے اس کو تبدیل نہیں کریں گے، اس میں ہم نے ان سے پوچھا تھا کہ یہ کس لئے آپ نے رکھا ہے تو انہوں نے یہ کہا کہ ہوسکتا ہے آئندہ چل کر گورنمنٹ کا قانون بدل جائے، کچھ ہو جائے، تو اس

میں ہم کو تبدیلی کرنے میں سہولت ہوگی۔ دوسری بات یہ ہے کہ یہ شروع کا جو پیریڈ ہے، ہمارے نزدیک تو یہ ہے کہ شروع کے دور میں جتنا منافع ہوگا وہ شاید بعد میں نہیں ہوگا، کیونکہ آج کل جو شیئر کی قیمتیں ہیں ایک سال کے اندر کا جو Period ہے یہ کم قیمت کا پیریڈ ہے، اور اس کے بعد ہوسکتا ہے تین سال کے بعد کا جو پیریڈ آئے گا وہ اتنا اچھا نہیں ہوگا سرمایہ کاری کے لئے جتنا کہ ابھی ہے، اور یہ Mutual Fund ہے وہ عام کمپنی سے مختلف ہے، یہ کوئی اپنا پروجیکٹ نہیں لگانے جارہی ہے، جو عام کمپنی ہوتی ہے، اس میں یہ ہوتا ہے کہ اس کا پروجیکٹ لگتا ہے، فیکٹری لگتی ہے، Production شروع ہوتا ہے، جب جا کے منافع آتا ہے، جبکہ Mutual Funds میں یہ نہیں ہے، یہ تو مختلف کمپنیز کے شیئرز خریدتے ہیں جو چلتے کمپنیز ہیں، اس میں زیادہ منافع کا وقت وہ ہوتا ہے جب شیئر میں انویسٹ منٹ کرنے کا وقت صحیح ہوتا ہے۔

قاضی صاحب:

مجھے ان تفصیلات میں نہیں جانا ہے، مجھے صرف اتنی بحث ہے کہ ٹھیک تین سال پورا ہونے پر وہ اختیار لیتے ہیں کہ ہم اس پوری اسکیم کو تبدیل کر دیں گے، تو شرعی طور پر تو ٹھیک ہے کہ تین سال میں ہم کو لینے کا اختیار ہوگا، لیکن اس طرح ہمارے وہ لوگ جو اس میں لگ چکے اور منافع ان کو مل رہا ہے، ان کو ایک طرح کی تحریض ہے کہ وہ تین سال کے بعد بھی اس میں کم ہی لوگ ہوں گے جو اسکیم کے بدلنے کے بعد پھر وہ اپنا نام واپس لیں، اس طرح ایک خطرہ میں ہم ڈال رہے ہیں لوگوں کو، اس لئے اب وہ بحث ختم کرنی چاہئے۔

کھٹکھٹے صاحب:

ایک اور چیز میں اگر آپ اجازت دیں تو کہنا چاہوں گا کہ دوسری بات یہ ہے کہ اسٹاک کا جو میوچیول فنڈ لانا تھا ہم اس کی کوشش قریب پانچ سال پہلے سے کر رہے تھے، دوسرے کچھ اور میوچیول فنڈس سے ہم نے بات کی تھی، UTI سے تو نہیں کی تھی، اور لوگوں سے کہا تھا، مگر کوئی اس کے لئے تیار نہیں تھا کہ یہ Accept کرے کہ ہم صرف شیئرز میں لگائیں گے، وہ کہتے تھے کہ ٹھیک ہے Prospectus میں ہم لوگ دیں گے لوگ اسے پڑھ کر ہی لگائیں گے، پھر بھی یہ ہے کہ کل کو اگر شیئرز نیچے آگئے تو ہمارے پاس اور کوئی راستہ نہیں ہے کہ ہم Fix Basis پر لگائیں، تو ہماری اسکیم میں نقصان ہوگا، نام ہمارا خراب ہوگا، تو پہلی مرتبہ ایک ایسی اسکیم ایک غیر مسلم گروپ اور اچھے بڑے گروپ نے اس کو Accept کیا ہے، تو کچھ حد تک تو ہم کو دھیرے دھیرے تبدیلی لانی چاہئے، اگر ہم یہ کہیں کہ ہم پوری طرح سے صحیح ہو کر کوئی اسکیم لائیں تو کبھی بھی یہ ممکن نہیں ہوسکتا۔

قاضی صاحب:

بہر حال یہ گوارا کی حد تک ہی گوارا کیا جاسکتا ہے، اور آپ لوگوں کے لئے یہ ایک بہت بڑا چیلنج ہے، جو آپ لوگ اس کاروبار میں ہیں ماشاء اللہ، کہ آپ کیوں نہیں ایسا Mutual Fund قائم کریں جس میں میوچیول فنڈ کو شرعی بنیادوں پر علماء کی رائے کے مطابق آپ چلائیں، جو اس میں تجارتی امکانات ہیں ان کو سامنے رکھیں، یہ آپ کے لئے تشفی بخش نہیں ہے جو ہوا، مگر آئندہ کے لئے آپ لوگوں کے لئے یہ چیلنج ہے، اور میں سمجھتا ہوں کہ آپ لوگوں کی صلاحیتیں اس کی متحمل ہیں کہ ماشاء اللہ آپ دیندار بھی ہیں، تجارت کے اصولوں کو بھی سمجھتے ہیں، اس لئے آج ہی سے یہ بات دماغ میں دوڑائیے کہ دوسروں کا سہارا لینے کے بجائے کسی ایسے فنڈ کی آپ جلد سے جلد تشکیل کرنے کی کوشش کریں گے، اور اگر Multinational Companies یہاں آرہی ہیں تو اس میں مسلمان ملکوں کی بھی کمپنیاں ہیں اور ایسے بھی لوگ ہیں جو ربا کو برداشت نہیں کرتے، تو ہوسکتا ہے کہ امکانات اس سلسلہ میں بڑھے ہوں، جلد سے جلد کچھ ایسی صورت نکلنی چاہئے کہ جو مسلمان اللہ اور رسول کا خوف نہیں رکھتا، اور جہاں چاہتا ہے ڈالتا ہے، اس کی ہم کو فکر نہیں ہے، لیکن جو علماء کی ہدایت کا منتظر رہتا ہے اور وہ چاہتا ہے کہ جہاں جائز ہو وہاں ہم لگائیں، ان کے لئے کوئی راستہ نکلنا چاہئے۔

عبدالعظیم اصلاحی صاحب:

ایک چیز کمپنی کے شیئرز کے سلسلہ میں، کمپنی کی حیثیت کے سلسلہ میں آئی ہے وہ کمپنی کا قانونی وجود بلکہ مستقل قانونی وجود ہے، اس بنیاد پر بہت سے لوگوں نے اسے ناجائز کہا ہے، یہ بہت ہی بدعت قسم کی شدت ہے جو ہمارے فقہاء کے یہاں بھی پائی گئی ہے، اور شیخ وہبہ زحیلی نے بھی سوال کا

جواب دیتے ہوئے اس چیز کو بنیاد بنایا ہے کہ اس لحاظ سے یہ چیز اسلامی فقہ میں عجیب وغریب ہے، ان کی خدمت میں بھی کچھ عرض کرنا ہے،
ملاحظة لی إلی سعادة الدکتور وهبة الزحیلی ذکرت فی إجابة السؤال التاسع عمل الشرکة شخصیة قانونیة مستقلة وأنه لاتوجد فی الفقه الإسلامی شخصیة قانونیة مستقلة، ففی رأیي أن المصطلح شخصیة قانونیة مستقلة جدیدة، ولکن الفکرة لیست جدیدة......شخصیة قانونیة مستقلة و فی خصوصیة الإسلام أیضا و مثاله الوقف، فللوقف شخصیة قانونیه مستقلة مثل الشرکة، وهذا هو المستفاد من رأی سماحة الشیخ مولانا محمد تقی العثمانی قاضی قضاة المحکمة الشرعیة السابق لباکستان۔

اس مختصر جملہ کے بعد ایک اور خاص چیز کی کمی مجھے جو یہاں محسوس ہوئی وہ میوچیول فنڈ کے بارے میں ہے، آخر میں اس کا ذکر آیا کہ میوچیول فنڈ خاص طور سے ٹاٹا کے سیکٹر کا جو میوچیول فنڈ ہے، ضرورت اس بات کی تھی ہم جانیں کہ میوچیول فنڈ کیا چیز ہے اور اس میں دوسری کمپنیوں میں کیا فرق ہے، اس سلسلہ میں بھی کچھ وضاحت آتی، اور بہتر معلوم ہوتا ہے کہ میں چند منٹ میں اس کی طرف بھی کوئی اشارہ کردوں، ایک تو کمپنی سوچ سمجھ کے براہ راست کسی پیداوار میں مشغول ہوتی ہے، جیسے کوئی چیز کپڑا یا مشینری وغیرہ پیدا کرتی ہے، اب تک جو گفتگو ہماری ہوئی ہے جو وضاحت ہوئی وہ ایسی ہی کمپنی کے بارے میں تھی، لیکن کچھ استثماری کمپنیاں یا سرمایہ کاری کی کمپنیاں ہوتی ہیں جو صرف براہ راست کسی پیداواری کام میں مشغول نہیں ہوتی ہیں، کوئی پیداواری کام نہیں کرتی ہیں، بلکہ وہ سرمایہ کار یا بچت کار کے درمیان اور پیداواری کرنے والی کمپنیوں کے درمیان ایک طرح سے وسیلہ کا کام کرتی ہیں، اس طرح کی کمپنیوں کو میوچیول فنڈ کہا جاتا ہے، یہ کوئی واقعی اور حقیقی پیداوار کا کام نہیں کرتی ہیں، بلکہ بچت کاروں سے پیسہ جمع کرکے اس کو ان کمپنیوں کے شیئرز میں یا ڈبینچرز میں استعمال کرتی ہیں، اب اس طرح کی کمپنیوں کے شیئرز کی کیا حیثیت ہوگی، اس سلسلہ میں بھی ہمیں غور کرنا چاہئے، اور مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی قاضی صاحب سے سن کر کہ یوٹی آئی نے بھی کوشش کی تھی کہ وہ اس طرح کا کوئی میوچیول فنڈ قائم کرنا چاہتے ہیں، جو مسلمانوں کے لئے Acceptable ہو، اب میں یہاں ایک اور بات ذکر کردوں.........ایک طرح کا میوچیول فنڈ Ethical Unit Trust کے نام سے قائم ہوجائے، اتھیکل یونٹ یعنی اخلاقی میوچیول فنڈ، یہ میوچیول فنڈ صرف ان چیزوں میں پیسہ لگاتا ہے جو اخلاقا قابل قبول ہوں، یعنی حقیقی پیداوار ہو، ایسی پیداوار نہ ہو جو سماجی حیثیت یا اخلاقی حیثیت سے نقصان دہ ہو، جیسے شراب یا اس طرح کے ہوٹل، یہ بڑی اچھی چیز ہے کہ ہم بھی اس طرح کے اتھیکل یونٹ ٹرسٹ ہندوستان میں قائم کرنے کے لئے کوشش کریں، اور اس کے لئے فقہ اکیڈمی جو کہ پہلے بھی اس طرح کے (Intrest Free Banking) کے لئے کافی مجلسیں منعقد کراچکی ہے، تو اس طرح کی کوشش کے لئے ہم جدوجہد کریں۔

شیئرز سے متعلق جس سطح پر گفتگو ہورہی ہے ہمارے علماء اور ماہرین کے درمیان، ایک تو مسلم ماہرین معاشیات ہیں جو اس سلسلہ میں کافی غور و خوض کریں، جسے ہمارے علماء اور اصحاب افتاء اور خاص طور سے علماء اور اصحاب افتاء ایک کثیر المیعاد قسم کا حل اس کے لئے نکالنا چاہتے ہیں، جو ضروری بھی ہے، اس وقت جو صورتحال ہے اس میں ہم کیا کرسکتے ہیں، ہمارا کیا رویہ ہونا چاہئے، کہاں تک یہ صحیح ہے؟ اور اس وقت جو ہمارے سامنے بحثیں ہیں اس میں یہی چیز ہے کہ موجودہ صورتحال میں ہم کس طریقہ سے یعنی کہاں تک یہ اصول صحیح ہوگا، کہاں تک یہ ہمارے لئے قابل قبول ہے،......
دسیوں قسم کے شیئرز ہیں تو ہم کس چیز کے اندر بحث کررہے ہیں، اصل میں اس وقت جو ہمارے سامنے بحث کا مسئلہ ہے میرے خیال میں وہ Equity Shares ہیں، یعنی وہ شیئرز جو شرکت کی بنیاد پر ہیں، جن میں یعنی نفع نقصان میں دونوں میں آدمی شریک ہوتا ہے جس کا کوئی متعین نفع ملتا ہے، باقی اور دوسری طرح کے جو شیئرز ہیں، اس سلسلہ میں رائیں بہت واضح آچکی ہیں کہ وہ ناجائز ہیں، تو ایک تو ہمارے علماء اور اصحاب افتاء کی فکر کا اور غور کا میدان ہے یعنی موجودہ صورتحال میں وہ ہمارے اس ہندوستانی معاشرہ میں یا جہاں بھی جو معاشرہ پایا جاتا ہے، ایک طویل المیعاد حل اور جو خاص طور سے مسلم ممالک کے ماہرین معاشیات کررہے ہیں، وہ یہ کہ موجودہ شیئر مارکیٹ کو، اس کے اعمال و وظائف کو کس طریقہ سے اسلامی اصولوں کے مطابق ڈھالا جائے اور اس سلسلہ میں وہ اپنی رائیں دے رہے ہیں، ریسرچ کررہے ہیں اور جہاں ان کو اقتدار حاصل ہے، جو موقع حاصل ہے وہ اس طرح کی کوششیں کررہے ہیں، اس لئے بجائے ہم افسردہ اور گھبرانے کے فاتقوا اللہ ما استطعتم کے طور پر فی الحال تو یہی ہمیں سمجھنا چاہئے صورتحال میں قیوم اختر صاحب نے بتایا کہ کوئی بھی سود سے بالکل پاک Alternative یا بدل نہیں حاصل ہے، تو ظاہر ہے کہ موجودہ

صورتحال میں جو کمتر ین برائی کے طور پر اپنایا جاسکتا ہے اس کا حل کریں، لیکن بہر حال یہ بات ذہن میں رکھتے ہوئے کہ ہمیں اس کا ایک صحیح اور خالص اسلامی حل نکالنے کے لئے جدو جہد اور کوشش اور اس کے لئے گفتگو اور بحث جاری رکھنی ہے۔

ڈاکٹر وہبہ زحیلی صاحب:

شكراً للأخ الكريم حول إثارة موضوع الشخصية الاعتبارية فى الفقه الإسلامى. الواقع أن الفقه الإسلامى قرر معانى وأصولاً وأحكام الشخصية الاعتبارية فى بعض الأحوال دون البعض الآخر. فقرر أن للدولة شخصية اعتبارية... إن الإمام الحاكم إذا كان قد ولّى المؤظفين والقضاة والعمال والولاة و غير ذلك، ثم مات هذا الإمام أو... تظل ولاية هؤلاء قائمة، لأن الإمام لا يمثل شخصه، وإنما يمثل الدولة، وذلك باعتبار أن الدولة شخصية اعتبارية، هذا مقرر صراحة، كذلك قرروا أن لبيت مال المسلمين شخصية اعتبارية. ولذلك يقولون بيت المال وارث من لا وارث له. فهو يتملك ويملك، ويكون له الحقوق وعليه الالتزامات، كذلك أن المعاهدات تعقدها الدولة مع الأطراف فى خارج الدولة مع الدول غير الإسلامية قرروا أن للدولة شخصية اعتبارية، تظل هذه المعاهدات نافذة، حتى ولو تغيرت شخصية الدولة أو القائمون عليها...أو ثورة أو مشاكل ذلك تغير الدولة شخصية اعتبارية، وهذا مأخوذ من الحديث النبوى الصحيح "ذمة المسلمين واحدة يسعى بها أدناهم وهم يد على من سواهم"، فإذن هنالك عدة أحكام فى الفقه الإسلامى أن للدولة شخصية اعتبارية، ولبيت المال شخصية اعتبارية، وكذلك ما ذكره صديقنا وأخونا الشيخ تقى العثمانى أن للوقف شخصية اعتبارية، وللمسجد شخصية اعتبارية، بدليل أن المسجد لله يوقف له ويكون مستحقا ومستحقا عليه، وكذلك نظام الوقف يكون أيضا مستحقا و مستحقا عليه، وناظر الوقف حينما يمارس صلاحياته على الأوقاف، إنما يمارسها لا بصفته الشخصية، وإنما باعتبار أن للوقف شخصية اعتبارية، هذا اصطلاح القانون الجديد إذن عرفه الفقه الإسلامى وإن لم يعرف له التسمية، هذا الكلام فى هذه الأمور صريح و صحيح. ولا يمكن بأن الفقه الإسلامى سبق القوانين الوضعية فى تقرير الشخصية الاعتبارية، ولكن فى الأنظمة، أما العقود كالشركات، هذه عقد قائم على التراضى بين شخصين أو عدة أشخاص إلى هذا المفهوم، وهو إذا كان النظام أو التصرف قائما على عقد لم يقرروا له شيئا من معانى الشخصية الاعتبارية، و حينئذ حتى القانون، القانون هو الذى أعطى للشخصية القانون الوضعى، هو الذى فرض للشركات المساهمة هذه الشخصية الاعتبارية، فهو إذن منح من الدولة و تقرير من الدولة للشركات المساهمة أن لها شخصية اعتبارية، وهنا يأتى السؤال، هل نقيس الشركات المساهمة على نظام الدولة أو بيت المال أو المسجد أو الوقف أو ما شاكل ذلك، الحقيقة هذا يحتاج إلى....... هل نقيس الشركة على هذه الأنظمة. نحن نقرر أن شركة الزاد هى عقد يقوم على التراضى، فإدارة الشركة بمثابة الوكلاء، والمساهمون بمثابة المؤكلين، فمن الصعب إلى الآن بحسب الأحكام الفقهية المقررة لدينا لانجد أثرا لهذا القرار، وهو إعطاء شخصية اعتبارية للدولة، و مع ذلك نحن إذا أردنا أن نقرر للشركة المساهمة شخصية اعتبارية، و تمنح الدولة هذا الوصف لهذه الشركات، أنا معك لا مانع من أن نعطى لهذه الشركة شيئا من الشخصية الاعتبارية، وهذا يكون تطورا جديدا فى مفهوم الشركات فى الفقه الإسلامى، لكن الشركات بحسب ما ذكرته فى بحثى، بحسب ما قرره الفقهاء السابقون لم يشيروا لا عن قريب ولا عن بعيد إلى الشركة القائمة على التراضى، فإذن هناك ... وهو الدولة و بيت المال والوقف و بين العقود التى يحدث فيها قيام الشركة بما على التراضى بين طرفيه...لا يعرف شخصية اعتبارية للشركة فقط، وإنما هى شراكة كنظام القانون البريطانى للشركات. فالواقع الفقه الإسلامى أقرب إلى القانون البريطانى باعتبار أن الشركة هى شراكة تقوم على الوكالة والأمانة، هذا ما قررته ولا التباس بين هذا المفهوم وبين المفاهيم الأخرى، و شكراً۔

قاضی صاحب:

خلاصہ یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے یہ بات کہی تھی کہ شرکت کے باب میں کسی شخصیت اعتباری، شخصیت قانونی کا کوئی تصور شریعت اسلامی میں نہیں ملتا ہے اور ہمارے ڈاکٹر عبدالعظیم اصلاحی صاحب نے یہ اظہار فرمایا کہ وقف کی صورت میں شخصیت اعتباری پائی جاتی ہے، ان کا یہ کہنا صحیح ہے کہ شریعت اسلامی میں اس کے نظائر موجود ہیں اور شیخ کا کہنا یہ ہے جو ان کی عبارت میں ہے کہ بعضے شرکت میں نہیں پایا جاتا ہے، میں سمجھتا ہوں کہ پارٹنر شپ میں کسی شخصی کسی قانونی شخصیت کا تصور شرع اسلامی میں نہیں موجود ہے، یہ بھی صحیح ہے، اور شریعت میں شخصیت قانونی کے اور بہت سے نظائر ہیں یہ بھی درست ہے، اب وقت بہت ہو گیا ہے، میں سمجھتا ہوں کہ اس مسئلہ پر کئی حیثیت سے اچھی خاصی بحث ہو چکی ہے، اگر آپ اجازت دیں تو کمیٹی بنادی جائے، ابھی ہمارے پاس دو بہت اہم مسئلے اور ہیں جن پر زیادہ بحث تو نہیں ہوئی ہے، لیکن جو کچھ پچھلی بحثیں ہو چکی ہیں ان کو سامنے رکھ کر کچھ اس پر آپ کو فیصلے کرنے ہیں، اور اب نماز کا وقت بھی ہو رہا ہے جو ٹائم مقرر ہے، اس لئے اب اس بحث کو یہیں ختم کر کے......

ایک آواز:......ایک درخواست یہ ہے کہ ماہرین معاشیات نے جو تقریریں اس سلسلہ میں کی ہیں ان کا خلاصہ تیار کر کے بھیج دیا جائے تمام شرکاء حضرات کے پاس۔

قاضی صاحب:

اچھا مشورہ ہے، اس سے زیادہ اچھا یہ ہے کہ آپ حضرات کو بیٹھا کر جو ماہرین ہیں ان کے ساتھ ایک آپ کا آپس میں مکالمہ کرایا جائے، تو مسئلہ کے فہم میں زیادہ سہولت ہوگی، انشاء اللہ دونوں باتوں پر ہم لوگ غور کریں گے، اس سلسلہ میں شیئرز کے جتنے مسائل آئے ہیں، ہم نے یہ بھی تیار کرا لیا ہے کہ کتنے مسائل پر سبھی مقالہ نگاروں کا اتفاق ہے، اور کن مسائل پر اختلاف ہے، یہ بھی کمیٹی کو دے دیں گے، اور جو ساری بحثیں ہوئی ہیں، اور شیخ کا مقالہ اس میں ایک کلیدی مقالہ کی حیثیت رکھتا ہے، تو اس پر بحث کرنا بھی انشاء اللہ کافی آسان ہوگا، اور جلد ہی اس نتائج تک ہم لوگ پہنچ سکیں گے، اور اس کے باوجود اگر کچھ چیزیں واضح نہیں ہیں تو ہم اسے اگلے سمینار کے لئے جس میں ایک Special Session اس مسئلہ پر ہو، رکھنا چاہیں گے انشاء اللہ، کمیٹی کے ارکان کے نام ہیں:

مولانا سید جلال الدین عمری صاحب، مولانا اختر امام عادل صاحب، مولانا عتیق احمد بستوی صاحب، مولانا عبدالقیوم پالنپوری، مفتی جنید عالم ندوی، مفتی اسماعیل صاحب گجرات، جناب ایم ایچ کھٹکھٹے صاحب، جناب احسان الحق صاحب، ڈاکٹر عبدالعظیم اصلاحی صاحب، مفتی محبوب علی وجیہی صاحب، مولانا بدر احمد مجیبی صاحب، مفتی نسیم احمد قاسمی صاحب، مولانا قاضی عبدالاحد ازہری صاحب، مفتی عبداللہ پٹیل صاحب ہانسوٹ، مولانا شفیق الرحمن ندوی صاحب لکھنؤ، مفتی نیاز احمد صاحب بنارس۔

جن حضرات کے نام اس کمیٹی میں ہیں میں ان حضرات سے خصوصیت سے یہ درخواست کرنا چاہتا ہوں کہ اس کمیٹی کو اپنا کام بعد نماز عصر شروع کر دینا چاہئے، اس کے کنوینر ہو جائیں گے مولانا عتیق احمد صاحب، بعد عصر یہ کمیٹی بیٹھے اور کچھ کام کرے، جتنا بھی کر سکے، تو کل ذرا آسانی ہو جائے گی، اب اسی کے ساتھ جلسہ کے اختتام کا اعلان کرتا ہوں۔

☆☆☆

اسلام کا نظام معیشت

دوسرا حصہ

کمپنی و حصص کمپنی

ترتیب

قاضی مجاہد الاسلام قاسمی

سوالنامہ:

کمپنی و حصص کمپنی

۱۔ کیا کسی کمپنی کے قیام کی ایسی اسکیم بنا کر جس میں کاروبار کے لئے سود پر قرض لینا شامل ہو، اجرت حاصل کی جاسکتی ہے؟

۲۔ کیا کسی کمپنی کو کسی مالیاتی ادارے سے سودی قرض دلانے میں مدد کر کے اجرت حاصل کی جاسکتی ہے؟

۳۔ کیا کسی کمپنی کے سودی قرض تمسکات کے اجراء سے متعلق امور انجام دے کر اجرت حاصل کی جاسکتی ہے؟

۴۔ کیا کسی کمپنی کے حصص سے منسلک قرض تمسکات کے اجراء سے متعلق امور انجام دے کر اجرت حاصل کی جاسکتی ہے؟

۵۔ کیا کسی کمپنی کے قابل تبدیل (کلی وجزوی طور پر) سودی قرض تمسکات کے اجراء سے متعلق امور انجام دے کر اجرت حاصل کی جاسکتی ہے؟

۶۔ کیا کسی کمپنی کے صفر سود کی در پر قرض تمسکات کے اجراء سے متعلق امور انجام دے کر اجرت حاصل کی جاسکتی ہے؟

۷۔ کیا کسی ایسی کمپنی میں سرمایہ کاری کر کے اس کے قیام میں مدد دی جاسکتی ہے جس کے قیام کی اسکیم میں کاروبار کے لئے سودی قرض لینا شامل ہو؟

۸۔ کیا کسی ایسی کمپنی کے حصص میں سرمایہ کاری کی جاسکتی ہے جو پہلے ہی سے کاروبار میں سود پر لئے قرض کا استعمال کر رہی ہو؟

۹۔ کیا حصص سے منسلک قرض تمسکات اس نیت کے ساتھ کمپنی سے یا بازار سے خریدے جاسکتے ہیں کہ تمسکات تحویل میں آنے کے بعد جتنی جلد ممکن ہو، فروخت کر دیئے جائیں؟

۱۰۔ کیا قابل تبدیل قرض تمسکات اس شرط کے ساتھ خریدے جاسکتے ہیں کہ حصص میں تبدیل ہونے تک انہیں اپنے پاس روکا جائے اور تبدیلی کے بعد اگر کوئی نا قابل تبدیل اجزاء باقی رہ جائیں تو انہیں جلد از جلد فروخت کر دیا جائے؟

۱۱۔ اگر قابل تبدیل سودی قرض تمسکات اس نیت سے خریدے جائیں کہ انہیں حصص میں تبدیل کرنے کے وقت تک اپنے پاس روکا جائے اور نا قابل تبدیل اجزاء کو جلد از جلد فروخت کر دیا جائے، لیکن ان میں مضمر حصص کی قیمت میں اضافہ کے سبب تبدیلی سے پہلے ہی ان کی قیمت میں بھی اضافہ ہو جائے، تو کیا انہیں تبدیلی سے پہلے ہی فروخت کر کے منافع حاصل کیا جاسکتا ہے؟

۱۲۔ کیا صفر سود کی در پر جاری ہوئے قابل تبدیل قرض تمسکات کمپنی سے یا بازار سے خریدے جاسکتے ہیں؟

۱۳۔ کیا کمپنی سے ملے بطور حق حصص سے منسلک قرض تمسکات، قابل تبدیل قرض تمسکات یا صفر سود کی در پر قرض تمسکات کی پیشکش کو فروخت کر کے فائدہ حاصل کیا جاسکتا ہے؟

۱۴۔ قابل تبدیل قرض تمسکات کو حصص میں تبدیل کرتے وقت کمپنی کچھ اضافی قیمت لیتی ہے جبکہ قرض تمسکات پر سود ادا کرتی ہے، کیا سود کی رقم کو کمپنی سے وصول کی گئی اضافی قیمت کی روم سے منہا کر کے حصص پر آئی لاگت کو کم کیا جاسکتا ہے، تاکہ سود پر جاری ہوئے قرض تمسکات نتیجے کے اعتبار سے صفر سود پر جاری کئے سمجھے جائیں۔

۱۵۔ کیا جزوی طور پر قابل تبدیل قرض تمسکات کے حصص میں تبدیلی کے بعد نا قابل تبدیل اجزاء کی فروخت پر حاصل ہوئی اضافی قیمت حصص پر کمپنی کے ذریعہ حاصل کی گئی اضافی قیمت سے منہا کر کے حصص کی لاگت کو کم کیا جاسکتا ہے؟

۱۶۔ کیا جزوی طور پر قابل تبدیل قرض تمسکات کے حصص میں تبدیل ہوجانے کے بعد نا قابل تبدیل اجزاء کی فروخت پر ہوئے نقصان کی تلافی ان پر واجب سود سے کی جاسکتی ہے؟

۱۷۔ اگر سوال نمبر ۱۴، ۱۵، ۱۶ کا جواب نفی میں ہو تو قرض تمسکات پر ملے سود اور ان کی فروخت سے ہوئے منافع کا جائز مصرف کیا ہے؟

۱۸۔ کیا حصص کی بغیر انہیں اپنے نام منتقل کرائے اجناس بازار کی طرح خرید وفروخت سے فائدہ حاصل کیا جاسکتا ہے؟

۱۹۔ قابل تبدیل قرض تمسکات میں مضمر حصص کی وجہ سے ان کی قیمتوں میں بھی ان کے حصص کی قیمتوں کے موافق اتار چڑھاؤ آتے رہتے ہیں، کیا اس حقیقت کی بنیاد پر ان کی بغیر انہیں اپنے نام منتقل کرائے اجناس بازار کی طرح خرید وفروخت سے فائدہ حاصل کیا جاسکتا ہے؟

نوٹ:...... حصص سے مراد ہر جگہ برابری کے حصص اور قرض تمسکات سے مراد سودی قرض تمسکات ہیں۔

☆☆☆
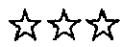
تمہیدی تحریر:

کمپنی کے حصص میں سرمایہ کاری
تعارف۔ طریقہ کار

جناب احسان الحق پنجاب نیشنل بینک، نئی دہلی۔

کمپنی میں حصص کے ذریعہ سرمایہ کاری اسلامی طریقہ مشارکت کے مثل ہے، سرمایہ کاری کا اس سے زیادہ آسان، قابل اعتماد اور کچھ نقصان کے خطرے کے ساتھ انتہائی منافع بخش کوئی دوسرا طریقہ شاید ہی موجود ہو۔

چونکہ تجارت میں سود کا رواج اس قدر عام ہوگیا ہے کہ اس کی گرد سے بچنا مشکل ہی ہوگیا ہے، اس لئے حصص میں سرمایہ کاری کے کچھ جائز فوائد حاصل کرنے کی غرض سے سرمایہ کار کو کبھی کبھی بادل ناخواستہ سودی معاملات میں ملوث ہونا پڑتا ہے، ساتھ ہی سود سے دستبرداری و سودی معاملات سے خلاصی کی راہیں بھی کھلی ہونے کے سبب سرمایہ کار کو یہ موقع حاصل رہتا ہے کہ وہ سرمایہ کاری کا جائز منافع لے کر سود سے سبکدوش ہو سکے اور سودی معاملات سے دستبردار ہو جائے۔

اس طرح کے ناپسندیدہ سودی معاملات سیکولر ممالک میں قدم قدم پر پیش آتے ہیں، مثال کے طور پر اگر کوئی شخص سرکاری تعمیرات کا کام انجام دینے کا ٹھیکہ لینا چاہتا ہے تو اسے متعلقہ محکمہ میں کسی بینک کے ذریعہ جاری شدہ ایک متعینہ رقم کی میعادی رسید بطور ضمانت رہن رکھنی پڑتی ہے، ایسی صورت میں جو ٹھیکیدار صرف تعمیری کام میں دلچسپی رکھتا ہے اور جس کا بینک کی میعادی رسید میں سرمایہ کاری کا کوئی ارادہ نہ ہو اسے بھی اپنی تعمیرات کی ٹھیکہ داری جیسے جائز مقصد کو حاصل کرنے کے لئے بادل ناخواستہ بینک میں ایک خاص مدت کے لئے ایک طے شدہ سود کی در پر جمع کر کے رسید حاصل کرنی ہوتی ہے جس کو وہ ٹھیکہ داری کی شرائط کے مطابق امور انجام دینے کی ضمانت کے طور پر متعلقہ محکمہ کے پاس رہن رکھ سکے، ٹھیکیداری کا کام معاہدہ کی شرائط کے مطابق تکمیل کو پہنچنے پر سرکاری محکمہ یہ رسید ٹھیکیدار کو واپس دے دیتا ہے، اب ٹھیکیدار کو یہ موقع حاصل ہو جاتا ہے کہ وہ اپنی اصل رقم مع سود بینک سے واپس لے لے اور اصل کو اپنے پاس روک کر سود کو بغیر ثواب کی نیت کے کسی مسکین کو دے دے۔ یہاں اگر ٹھیکیداری جیسے جائز کام پر اس لئے پابندی عائد کردی جائے کہ اس کی شرائط کے مطابق ٹھیکیدار کو سودی معاملہ میں ملوث ہونا پڑتا ہے تو کیا ایک جائز فعل کو ناجائز قرار دینے کے مترادف نہ ہوگا؟

اس کی ایک اور مثال یوں دی جاسکتی ہے کہ ایک عالم دین کو کسی یونیورسٹی میں دینیات کی تعلیم دینے کے لئے ملازمت کی پیش کش کی جائے تو کیا وہ عالم دین محض اس وجہ سے دینیات کی تعلیم دینے کی ملازمت کو ناجائز سمجھ کر اس پیش کش کو قبول کرنے سے انکار کردے کہ یونیورسٹی کے اصول وضوابط کی رو سے ہر ملازم کی تنخواہ میں سے کچھ حصہ پراویڈنٹ فنڈ میں جمع ہوتا ہے جس پر ایک مقررہ در سے سود واجب ہوتا ہے؟

اسی طرح کا معاملہ ایسی اشیاء کی خریداری میں پیش آتا ہے جن کی طلب ان کی رسد سے بہت زیادہ ہوتی ہے جیسے کار، اسکوٹر وغیرہ، ان اشیاء کو فروخت کرنے والے خریداروں سے کچھ کم رقم پیشگی لے کر ان کا نام منتظرین کی فہرست میں درج کر لیتے ہیں اور جب ان کی مدت انتظار ختم ہو جاتی ہے تب وہ اس پیشگی رقم کو مع اس پر واجب سود کے اس کی قیمت فروخت سے منہا کر دیتے ہیں، کیا یہ مناسب ہوگا کہ اسکوٹر کی خرید وفروخت کو صرف اس وجہ سے ناجائز ٹھہرایا جائے کہ اس کی خریداری میں سودی معاملہ میں ملوث ہونا پڑتا ہے؟ یا اسکوٹر کے خریدار کو اس شرط کے ساتھ اسکوٹر خریدنے کے لئے پیشگی رقم جمع کرنے کی اجازت دی جاسکتی ہے کہ اگر اس پر کوئی سود کمپنی یا فروخت کنندہ سے ملے تو اسے بغیر نیت ثواب کے کسی مسکین کو دے دیا جائے؟

فی زمانہ ایسی کمپنیوں کا فقدان ہے جو صرف سرمایہ حصص پر انحصار کرتی ہوں اور سودی قرض پر سرمایہ حاصل کرنے سے مکمل اجتناب کرتی ہوں، اس کی چند وجوہات میں سے ایک وجہ یہ بھی ہے کہ حصص میں سرمایہ کاری میں مسلمانوں کا رجحان کم ہے، اگر مسلمانوں میں یہ رجحان عام ہو جائے اور کسی بھی کمپنی کے حصے داروں کی حیثیت میں ان کی اکثریت ہو جائے تو ان کے لئے یہ ممکن ہوگا کہ وہ اس کمپنی کے آئین وضوابط میں ترمیم کر کے اس کے معاملات کو مکمل طور پر سود سے پاک کردیں۔

اس راہ میں سودی معاملات پر مطلقاً پابندی کے معنی سرمایہ کار کے لئے نہ صرف جائز منافع سے محرومی بلکہ اصل سرمایہ میں خسارے کے بھی ہوں گے، لہذا علماء کرام سے گذارش ہے کہ ملکی حالات میں مسلمانوں کی بے بسی کے پیش نظر شریعت کے بنیادی اصولوں میں بغیر کوئی سمجھوتہ کئے ہوئے جس قدر رعایت ممکن ہو منسلک سوالنامے کا جواب دیتے وقت عطا فرمائیں۔

کمپنی میں سرمایہ کاری

[اس مضمون میں کمپنی کے حصص میں سرمایہ کاری پر بحث کی جارہی ہے، یہاں کمپنی سے مراد محدود ذمہ داری والی عوامی کمپنی (Public Limited Company) ہے اور حصص (Shares) سے مراد برابری کے حصص (Equity Shares) ہیں۔ حصص میں سٹہ بازی کو غیر شرعی مان کر خارج از بحث رکھا گیا ہے (احسان الحق)]۔

کمپنی کی تعریف:

قانون کی نظر میں کمپنی ایک شخص ہے جو کہ اپنے اراکین سے الگ اپنی ایک مستقل وراثت رکھتی ہے، یہ اپنی مشترکہ مہر (Stamp) کا استعمال دستخط کے لئے کرتی ہے۔

کمپنی کی اہم خصوصیات

۱۔ کمپنی اپنے اراکین سے الگ اپنا لگاتار چلتے رہنے والا مستقل وجود رکھتی ہے، کمپنی کے اراکین کے جلدی جلدی بدلتے رہنے سے کمپنی کے وجود کوئی فرق نہیں پڑتا، اپنے کسی رکن کی موت، دیوالیہ پن یا جنون کی وجہ سے کمپنی ختم نہیں ہوجاتی، یہ اس وقت تک قائم رہتی ہے جب تک کہ ا باضابطہ طور پر ختم نہ کردیا جائے۔

۲۔ کم کارجسٹرار آف کمپنیز کے پاس رجسٹریشن کرانا ضروری ہوتا ہے، کمپنی کا رجسٹریشن سرٹیفکیٹ کمپنی کے لئے سند پیدائش کے ہم معنی ہے، اس بعد ہی کمپنی کا وجود عمل میں آتا ہے۔

۳۔ کمپنی نسٹریشن ہونے کے بعد جب کمپنی سرمایہ حصص کی فراہمی سے متعلق امور بخوبی انجام دے لیتی ہے تب رجسٹرار کی طرف سے کمپنی کے حق میں وبار شروع کرنے کا سرٹیفکیٹ جاری کردیا جاتا ہے، کمپنی کے لئے یہ سند بلوغت (Maturity Certificate) کے ہم معنی ہے، اس بعد کمپنی کاروبار شروع کرسکتی ہے۔

۴۔ اب کمپنی ایک قانونی شخص کی حیثیت میں اپنے اراکین سے ودیگر اشخاص سے معاہدہ کرسکتی ہے، اثاثوں کی خرید وفروخت کرسکتی ہے، اپنے منتظمین او رکنوں کا تقرر کرسکتی ہے، غرض وہ سارے کام جنہیں یہ اپنے آئین وضوابط کی رو سے کرنے کی مجاز ہو، کرسکتی ہے۔

۵۔ کمپنی باختیار ملازمین کمپنی کی جانب سے دستخط کرتے وقت کمپنی کی مشترکہ مہر کا استعمال کرتے ہیں۔

کمپنی کے حصے دار (Share Holders of Company):

پنی کے اراکین کو کمپنی کا حصہ دار کہا جاتا ہے، یہ کمپنی کے نفع ونقصان میں اپنے حصوں کی تعداد کی نسبت سے برابر کے شریک ہوتے ہیں، ان حصہ روں کو دو زمروں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

۔ترقی دینے والے (Promoters)

دراصل یہ کمپنی کے بانی ہوتے ہیں، کمپنی کے قیام کی اسکیم مرتب کرکے اسے رجسٹرار کے پاس رجسٹر کراتے ہیں، حصص کے الاٹ منٹ کا ایک حصہ ان کے لئے محفوظ ہوتا ہے، یہ کمپنی کے ابتدائی حصے دار ہوتے ہیں۔

۲۔ دیگر حصے دار(Other Share Holders)

یہ کمپنی سے باہر کے لوگ ہوتے ہیں، کمپنی کی اسکیم مرتب کرنے میں ان کا کوئی دخل نہیں ہوتا ہے، حصص کے الاٹ منٹ میں بھی ان کا کوئی حصہ محفوظ نہیں ہوتا ہے۔

۳۔ کمپنی کے امور پر ضبط(Control over affairs of Company)

کمپنی کے جملہ معاملات میں نظم وضبط رکھنے کے لئے ہدایت کاروں کی انجمن کی تشکیل حصے داروں کے ذریعہ کثرت رائے سے کی جاتی ہے، کمپنی کی پالیسی سے متعلق اہم فیصلے بھی حصہ داروں کی کثرت رائے سے طے پاتے ہیں، حصے داروں کی رائے کا وزن ان کے نام پر حصوں کی تعداد پر موقوف ہوتا ہے، رائے دہندگی کا یہ حق قابل تبادلہ ہوتا ہے۔

۴۔ کمپنی کا سرمایہ حصص(Company's Share Capital)

کمپنی کے سرمایہ حصص کو ایک حصے کی مصرحہ قیمت والے کل حصوں کی تعداد سے منقسم کر کے بیان کیا جاتا ہے، سرمایہ حصص کی حسب ذیل قسمیں ہیں:

۱۔ منظور شدہ سرمایہ(Authorised Capital)

اس کی تصریح کمپنی کے آئین میں کی جاتی ہے، یہ سرمایہ حصص کی زیادہ سے زیادہ حد ہے، جس سے زیادہ سرمایہ کے حصص کا اجراء کمپنی اپنے آئین میں ترمیم کئے بغیر نہیں کرسکتی۔

۲۔ جاری شدہ سرمایہ(Issued Capital)

منظور شدہ سرمایہ کے جس حصے کی سرمایہ کاری کی پیش کش کمپنی کے ذریعہ عوام کو یا خواص کو دیا جاتا ہے وہ کمپنی کا جاری شدہ سرمایہ(Issued Capital) کہلاتا ہے۔

۳۔ پیشکشی سرمایہ(Subscribed Capital)

جاری شدہ سرمایہ میں سرمایہ کاری کی پیشکش کے جواب میں جس قدر سرمایہ کاری کی پیشکش طالبان حصص کرتے ہیں اسے پیشکشی سرمایہ کہا جاتا ہے، اگر یہ پیشکشی سرمایہ جاری شدہ سرمایہ کے مساوی ہو تو اسے مکمل پیشکشی، اور اگر کم ہو تو اسے ناقص پیشکشی، اور اگر زیادہ ہو تو زائد پیشکش کہا جاتا ہے۔ انہیں انگریزی میں بالترتیب مکمل پیشکشی(Fully Subscribed) ناقص پیشکشی(Under Subscribed) زائد پیشکشی(Over Subscribed) کہا جاتا ہے۔

۴۔ اداشدہ سرمایہ(up Capital_Paid)

پیش کشی سرمایہ کا وہ حصہ جو کمپنی کی طلب کے عین مطابق کمپنی کو ادا کر دیا جاتا ہے، اداشدہ سرمایہ کہلاتا ہے، چونکہ کمپنی جاری شدہ سرمایہ سے زیادہ سرمایہ طالبان حصص سے طلب نہیں کرسکتی، اس لئے اداشدہ سرمایہ جاری شدہ سرمایہ سے کبھی تجاوز نہیں کرسکتا۔

حصہ(Share):

حصہ کمپنی کے سرمایہ کا غیر منقسم قلیل ترین جز ہے، یہ عام طور پر دس روپئے کا ہوتا ہے، کچھ کمپنیوں کا حصہ ایک سو روپئے کا بھی ہوتا ہے، بعض کمپنیوں میں کچھ حصے دس روپئے والے ہوتے ہیں اور سو روپئے والے بھی ہوتے ہیں، کمپنی کا جاری پیش کشی اور اداشدہ سرمایہ حصص ایک خاص تعداد کے برابری یا ترجیحی حصص پر منقسم ہوتا ہے، ہر قسم کے حصے کی رقم کی بھی تصریح کردی جاتی ہے، حصے کی یہ مصرحہ رقم حصے کی قدر عرفی (Face Value) کہلاتی ہے، مثال کے طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ ABC کمپنی کے جاری، پیش کشی اور اداشدہ ۶ کروڑ روپئے کے سرمایہ کی تفصیل حسب ذیل ہے:

لاکھ برابری حصص ۳۰ روپئے قدر عرفی والے ۱۰ Rs. 3,00,00,000
لاکھ ترجیحی حصص ۳ روپئے قدر عرفی والے ۱۰۰ Rs. 3,00,00,000

RS. 6,00,00,000

حصص دو قسم کے ہوتے ہیں:

۱۔ ترجیحی حصص (Preference Shares)

جب تک کمپنی جاری رہتی ہے ان پر ایک طے شدہ درسے منافع واجب ہوتا رہتا ہے، اور جب کمپنی بند ہوجاتی ہے تو اثاثوں کی تقسیم میں بھی انہیں ترجیح دی جاتی ہے۔

۲۔ برابری کے حصص (Equity Shares)

جب تک کمپنی جاری رہتی ہے یہ نفع ونقصان میں برابر کے شریک ہوتے ہیں، اور کمپنی کے بند ہونے پر جو کچھ اثاثے باقی رہ جاتے ہیں ان پر مساوی طور سے تقسیم کردیئے جاتے ہیں، دراصل ان کی حیثیت کمپنی میں برابر کے شرکاء کی طرح ہوتی ہے۔

اسناد حصص (Share Certificates)

کمپنی اپنے حصص ایک متعین تعداد کی اسناد میں جاری کرتی ہیں، جیسے کوئی کمپنی اپنے سرمایہ حصص میں ۲۰۰۰ روپئے سے سرمایہ کاری کرنے والے شخص کے حق میں دس دس روپئے والے سو سو حصص کی دوسندیں جاری کرے، اگر کمپنی کا حصہ سو روپئے والا ہے تو دس دس حصص کی دوسندیں جاری کرے، چونکہ یہ اسناد قابل تبادلہ ہوتی ہیں، لہذا انہیں آسانی سے خریدا اور بیچا جاسکتا ہے، ان کو رہن رکھ کران پر قرض بھی لیا جاسکتا ہے۔

حصص حاصل کرنے کے طریقے:

حصص دو ذرائع سے حاصل کئے جاسکتے ہیں:

۱۔ اجراء حصص کے وقت براہ راست کمپنی سے۔ ۲۔ جن لوگوں کے حق میں کمپنی سے حصص جاری ہوچکے ہوں ان سے خرید کر۔

براہ راست کمپنی سے حصص اجراء کی حسب ذیل صورتیں ہیں:

۱۔ عمومی اجراء (Public Issue)

ہر کمپنی اپنے رجسٹریشن کے بعد کاروبار کے لئے سرمایہ حصص جمع کرنے کی غرض سے عوام کو سرمایہ کاری کی کھلی پیش کش کرسکتی ہے، ایک موجودہ کمپنی بھی اپنے کاروبار کو فروغ دینے کے لئے عوام کو سرمایہ کاری کی کھلی پیش کش دے سکتی ہے۔

۲۔ برابری کے حصص سے منسلک قرض تمسکات کا اجراء (Issue of Equity Linked Debentures)

کمپنیاں اپنے کاروبار میں سرمایہ حصص کے علاوہ سرمایہ قرض کا بھی استعمال کرتی ہیں، سرمایہ قرض بھی سرمایہ حصص کی مانند قرض تمسکات کے اجرا سے حاصل کرتی ہیں، یہ قرض تمسکات بھی عام طور سے قابل تبادلہ ہوتے ہیں اور اسناد حصص کی طرح خریدے بیچے جاسکتے ہیں، سرمایہ قرض پر کمپنی ایک طے شدہ درسے سود ادا کرتی ہے، کمپنی اپنے حصص کا اجراء قرض تمسکات سے منسلک کرکے بھی کرتی ہے، جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ جو شخص صرف حصص میں سرمایہ کاری کرنا چاہتا ہے اسے کمپنی کے حصص کے ساتھ قرض تمسکات بھی لازماً بادل نخواستہ لینے پڑتے ہیں، ایسی صورت میں کمپنی اسناد حصص اور اسناد قرض تمسکات الگ الگ جاری کرتی ہے، جو شخص صرف سرمایہ حصص میں دلچسپی رکھتا ہو اس کے لئے اس بات کی گنجائش رہتی ہے کہ وہ اسناد حصص کو اپنے پاس روک کر (اسناد قرض) قرض تمسکات فروخت کردے، عام طور پر حصص اپنی قیمت اجراء سے زائد قیمت پر بازار میں فروخت ہوتے ہیں، اور قرض تمسکات بازار میں اپنی قیمت اجراء سے کم قیمت پر فروخت ہوتے ہیں، لیکن دونوں کی مجموعی قیمت بازار میں ان کی مجموعی قیمت اجراء سے زائد ہوتی ہے، اس طرح حصص بازار سے خریدنے کے بجائے براہ راست کمپنی سے کم قیمت پر حاصل کئے جاسکتے ہیں۔

۳۔ قابل تبدیل قرض تمسکات کا عوامی اجراء (Public Issue of Convertible Debentures)

کمپنی اس طرح کے بھی قرض تمسکات جاری کرتی ہے جو کہ ایک خاص مدت تک قرض تمسکات کی شکل میں رہتے ہیں، اور اس کے بعد جزوی

طور پر یا کلی طور سے اجراء کی شرائط کے مطابق حصص میں تبدیلی کردیئے جاتے ہیں، قرض تمسکات کا جو حصہ حصص میں تبدیل کردیا جاتا ہے کمپنی کی طرف سے اس پر سود کا وجوب بند ہوجاتا ہے، اور وہ کمپنی کے نفع ونقصان میں برابر کا شریک ہوجاتا ہے، باقی حصہ قرض کی صورت میں برقرار رہتا ہے اور اس پر سود ادا کرنا واجب ہوتا رہتا ہے، اب جو شخص کمپنی کے صرف سرمایہ حصص ہی میں سرمایہ کاری کرنا چاہتا ہے وہ قرض تمسکات کی حصص میں تبدیلی کے بعد حصص اپنے پاس روک سکتا ہے، اور قرض تمسکات کا اگر کوئی جز یا اجزاء باقی رہ گئے ہوں تو انہیں بازار میں فروخت کرسکتا ہے، عام طور پر بازار سے حصص خریدنے کے بجائے اگر قابل تبدیل قرض تمسکات کمپنی سے لے کر انہیں حصص میں تبدیل کرایا جائے تو حصص مقابلۃً کم قیمت پر حاصل ہوجاتے ہیں۔

۴۔ حصص وقرض تمسکات کا ان کی قدر عرفی پر یا کم وبیش پر اجراء

(premium or discount,Issue of Shares at par)

عام طور پر کمپنی اپنے قیام کے فوراً بعد اپنے حصص وقرض تمسکات کا اجراء ان کی قدر عرفی ہی پر کرتی ہے، ایسے اجراء کو برابری پر اجراء(Issue at par) کہا جاتا ہے، مثال کے طور پر کوئی کمپنی اپنے دس روپے والے حصص کا اجراء اگر دس روپے ہی میں کرے تو وہ برابری پر اجراء کہا جائے گا۔

پہلے ہی سے موجود مالی طور پر مستحکم کمپنی کے حصص کی بازاری قیمت ان کے قدر عرفی سے کہیں زیادہ ہوتی ہے، اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ کمپنی ہر سال اپنے منافع کا ایک حصہ اپنے پاس جمع کرتی رہتی ہے اور اسے اپنے محفوظ سرمایہ میں رکھتی ہے، اس سے مزید اثاثے خریدتی ہے اور وقت گذرنے کے ساتھ کچھ اثاثوں کی اصل قیمت میں بھی اضافہ ہوچکا ہوتا ہے، کمپنی کی مالیت کے اس اضافہ کے اصل حق دار کمپنی کے موجودہ حصہ دار ہی ہوتے ہیں، لہذا یہ بات حق وانصاف کے خلاف سمجھی جاتی ہے کہ کمپنی کا نیا سرمایہ کار اپنے حصے کی قیمت تو پرانی ہی در سے ادا کرے لیکن اثاثوں میں برابر کا شریک ہوجائے، پرانے حصے داروں کے مفاد کی حفاظت کے پیش نظر یہ مناسب سمجھا جاتا ہے کہ کمپنی اپنے نئے حصہ داروں کو حصص کچھ زائد قیمت پر جاری کرے تاکہ یہ زائد قیمت کمپنی اپنے منافع میں شامل کرکے اس میں پرانے حصہ داروں کو شریک کرے، اس طرح حصص کے اجراء کو برابری سے اوپر اجراء یا اضافی قیمت پر اجراء (Issue at a premium) کہا جاتا ہے، اسی طرح کچھ مخصوص حالات میں حصص وقرض تمسکات کا اجراء برابری سے کم پر بھی کیا جاتا ہے جو کہ منہائی پر اجراء (Issue at a discount) کہا جاتا ہے۔

مالی طور پر مستحکم کمپنی اپنے ذریعہ جاری کئے گئے قابل تبدیل قرض تمسکات کو حصص میں تبدیل کرتے وقت حصص کی قیمت ان کی قدر عرفی سے زیادہ وصول کرتی ہے، یعنی حصص کا اجراء (issue at a premium) اضافی قیمت پر کرتی ہیں۔

قرض تمسکات کے حصص میں تبدیلی کے بعد اگر عام حالات یکساں رہیں تو حصص کی رسد میں اضافہ ہونے کے سبب بازار میں ان کی قیمت کچھ کم ہوجاتی ہے لیکن یہ گری ہوئی بازاری قیمت بھی حصص کی قیمت اجراء (قدر عرفی + اجراء پر اضافی قیمت Face Value+Premium on Issue) سے زائد ہی ہوتی ہے، اس طرح حصص بازار سے خریدنے کے بجائے قرض تمسکات کمپنی سے لے کر انہیں حصص میں تبدیل کرانے سے اس حقیقت کے باوجود کہ کمپنی ان کے حصص میں تبدیلی کچھ منافع پر ہی کیوں نہ کرے، فائدہ ہوتا ہے، یعنی حصص مقابلۃً کم قیمت پر حاصل ہوتے ہیں، اس کو حسب ذیل مثال سے سمجھا جاسکتا ہے:

(الف) ایک کمپنی جس کے دس روپے والے حصے کی بازاری قیمت ایک سو روپے ہو تو قابل تبدیل قرض تمسکات کے اجراء کی پیش کش کرسکتی ہے۔

کمپنی ۱۴ فیصد سالانہ سود کی در پر ۱۵۰ روپے والے دو لاکھ کلی طور پر قابل تبدیل قرض تمسکات میں عوام کو سرمایہ کاری کی اس شرط پر پیش کش کرسکتی ہے کہ قرض تمسکات کے الاٹ منٹ کی تاریخ کے ایک سال بعد ایک قرض تمسک دس دس روپے والے ۳ حصص میں فی حصہ ۴۰ روپے اضافی قیمت پر اجراء سے تبدیل کردیا جائے گا، تاریخ معینہ پر کمپنی قرض تمسکات واپس لے لے گی، اور ان کے عوض اسناد حصص کے ساتھ قرض تمسکات پر واجب سود کی رقم کا چیک ایک ماہ کے اندر سرمایہ کاروں کو روانہ کردے گی۔

ایک سال بعد قرض تمسکات کے حصص میں تبدیلی ہوجانے سے بازار میں حصص کی رسد میں اضافہ کے سبب اگر حصے کی نرخ ۱۰۰ روپے سے کم

ہو کر ۸۰ روپئے رہ جائے تو اس طرح کی سرمایہ کاری میں فی حصہ لاگت کا تعین یوں ہوگا۔

کمپنی کے ایک قابل تبدیل قرض تمسک پر آئی لاگت...... ۱۵۰ روپے

ایک سال بعد ۱۵۰ روپئے پر ۱۴ فیصد کی در سے کمپنی پر واجب سود...... ۲۱ روپئے

قرض تمسک کی اصل لاگت...... ۱۲۹ روپئے

ایک سال بعد ۱۵۰ روپئے کا ایک قرض تمسک = ۳ حصص

(فی حصہ ۴۰+۱۰ روپئے اضافی قیمت) ۱۵۰ روپئے میں تبدیل

ایک حصہ کی اصل لاگت ۳/۴۳=۱۲۹ روپئے

حصے کی بازار سے خریداری پر لاگت...... ۸۰ روپئے

اس طرح کمپنی کا ایک حصہ جو بازار میں ۸۰ روپئے میں مل رہا ہے ایک سال پہلے کمپنی سے قابل تبدیل تمسکات خرید کر حصص میں تبدیل کرا کر صرف ۴۳ روپئے میں حاصل کر لیا گیا، لہٰذا یہ کہا جا سکتا ہے کہ حصص کو بازار سے خریدنے کے بجائے اگر کمپنی سے قابل تبدیل قرض تمسکات خرید کر انہیں حصص میں تبدیل کرایا جائے تو حصص سستے پڑتے ہیں۔

قابل تبدیل قرض تمسکات حصص میں تبدیلی سے پہلے پہلے عام طور پر بازار میں اپنی قیمت اجراء سے زیادہ قیمت پر فروخت ہوتے ہیں اگر کمپنی سے براہ راست ان کا الاٹ منٹ حاصل نہ کیا جا سکا ہو تو انہیں بازار سے خریدا جا سکتا ہے اور حصص میں تبدیلی کے ذریعہ حصص اپنے نام جاری کرائے جا سکتے ہیں، اس کی مثال یوں ہو سکتی ہے:

(ب) مثال (الف) میں بیان کردہ ۱۵۰ روپئے والا قرض تمسک اگر کمپنی سے براہ راست نہ مل پایا ہو تو اسے بازار میں ۲۰۰ روپئے قیمت پر خریدا جا سکتا ہے، اس طریقہ سے فی حصہ لاگت کا تعین یوں ہوگا:

۱۵۰ روپئے والے قرض تمسک پر بازار میں خرید پر آئی لاگت...... ۲۰۰ روپئے

۱۵۰ روپئے پر کمپنی سے ۱۴ فیصد کی در سے ایک سال کا سود...... ۲۱ روپئے

ایک قرض تمسک کی اصل لاگت...... ۱۷۰ روپئے

ایک سال بعد ایک قرض تمسک ۳= حصص

ایک حصے کی لاگت ۳/۱۷۹=۵۹٫۶۷ روپئے

ایک حصے کی بازار سے خرید پر لاگت = ۸۰ روپئے

اس طرح یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اگر قرض تمسک کو بازار سے خرید کر حصص میں تبدیل کرا لیا جائے تو حصص براہ راست بازار سے خریدنے کے مقابلہ میں کم قیمت پر حاصل ہوتے ہیں، دوسری جانب اگر قرض تمسکات کو حصص میں تبدیل کرائے بغیر ہی فروخت کر دیا جائے تو صرف ۵۰ روپئے ہی کا منافع ہوگا لیکن انہیں حصص میں تبدیل کرنے کے بعد بازار میں فروخت کرنے سے ۱۱۱ روپئے کا منافع ہوتا ہے (اصل لاگت ۱۲۹ روپئے، ۳ حصص کی بازاری قیمت فی حصہ ۸۰ کے در سے ۲۴۰ روپئے)۔

یہ تھیں کلی طور پر قابل تبدیل قرض تمسکات کی صورتیں، جزوی طور پر قابل تبدیل قرض تمسکات کی تفصیلات حسب ذیل ہیں:

جزوی طور پر قابل تبدیل قرض تمسکات کا قابل تبدیل جز تاریخ معینہ پر حصص میں تبدیل کر دیا جاتا ہے، اور نا قابل تبدیل جز قرض تمسک کی صورت میں باقی رہ جاتا ہے، اس کی مثال یوں دی جا سکتی ہے:

(ج) ایک کمپنی جس کے دس روپئے والے حصے کی قیمت بازار میں ایک سو روپئے ہو تو جزوی طور پر قابل تبدیل قرض تمسکات کے اجراء کی پیش کش ان شرائط پر کرسکتی ہے کہ کمپنی ۱۵۰ روپئے والے ۱۴ فیصد سالانہ سود کی در پر ڈیڑھ کروڑ روپئے کے ایک لاکھ جزوی طور پر قابل تبدیل قرض تمسکات جن کا ایک تہائی حصہ ۴۰ روپئے فی حصہ اضافی قیمت (Premium) کے ساتھ دس روپئے والے حصص میں قرض تمسک کی الاٹ منٹ کی تاریخ کے ایک سال بعد تبدیل کرایا جاسکتا ہے۔

اب اگر یہ فرض کرلیا جائے کہ ایک سال بعد قرض تمسکات کا قابل تبدیل جز کے حصص میں تبدیل ہونے کے سبب حصص کی رسد میں اضافہ ہوجانے سے دس روپئے والے حصے کی بازار میں قیمت ۱۰۰ روپئے سے کم ہوکر ۹۰ روپئے رہ جائے گی، اور قرض تمسک کا ۱۰۰ روپئے والا حصہ دوتہائی ناقابل تبدیل جز صرف ۸۰ روپئے ہی میں فروخت ہوسکے گا تو اس طرح کی سرمایہ کاری میں فی حصہ لاگت کا تعین یوں ہوگا:

۱۵۰ روپئے والا قرض تمسک پر آئی لاگت...... ۱۵۰ روپئے

ایک سال بعد کمپنی سے ملا ۱۴ فیصد کی در سے سود...... ۲۱ روپئے

اصل لاگت...... ۱۲۹ روپئے

حصص میں تبدیلی کے بعد ایک قرض تمسک = ایک حصہ

(قدر عرفی ۱۰ روپئے + اضافی قیمت ۴۰ روپئے) ۵۰ روپئے والے جز کے عوض

۱۰۰ روپئے کا ایک قرض تمسک (ناقابل تبدیل جز) بازاری قیمت...... ۸۰ روپئے

ایک حصہ کی اصل لاگت...... ۴۹ روپئے

اس طرح یہ نتیجہ نکلا کہ کمپنی کا ایک حصہ جو کہ آج ۹۰ روپئے میں بازار میں مل رہا ہے، ایک سال پہلے جزوی طور پر قابل تبدیل قرض تمسک خرید کر حصص میں تبدیل کرانے پر صرف ۴۹ روپئے میں حاصل کیا جاسکتا ہے، لہٰذا حصص کو بازار سے خریدنے کے بجائے جزوی طور سے قابل تبدیل قرض تمسکات کو حصص میں تبدیل کرانے سے کم قیمت پر حاصل کئے جاسکتے ہیں۔

(د) اگر ان قرض تمسکات کا اجراء براہ راست کمپنی سے نہ ہوسکا ہو تو انہیں کچھ زائد قیمت پر بازار سے بھی خریدا جاسکتا ہے، اگر بازار سے یہ ۱۶۰ روپئے میں خریدے جائیں تو فی حصہ لاگت کا تعین یوں ہوگا:

۱۵۰ روپئے والے قرض تمسک کی بازار خرید پر لاگت...... ۱۶۰ روپئے

ایک سال بعد ۱۴ فیصد کی در سے ملا سود................ ۲۱ روپئے

قرض تمسک کی اصل لاگت...... .... ۱۳۹ روپئے

۱۵۰ والے قرض تمسک کے عوض کمپنی سے ملا:

۱۔ ۱۰۰ والا ناقابل تبدیل قرض تمسک ۱۰۰ = روپئے

۲۔ ۱۰ روپئے والا ۴۰ روپئے اضافی قیمت پر حصہ = ۵۰ روپئے

۱۰۰ روپئے والے قرض تمسک کی بازاری فروخت سے آمد ۸۰ روپئے

ایک حصہ پر آئی اصل لاگت...... ۵۹ روپئے

اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ کمپنی کا ایک حصہ جس کی آج بازار میں قیمت ۹۰ روپئے ہے ایک سال پہلے بازار سے جزوی طور پر قابل تبدیل قرض تمسک خرید کر حصص میں تبدیل کرانے سے صرف ۵۹ روپئے میں حاصل کیا جاسکتا تھا قرض تمسکات کو فروخت کرنے والے کی حیثیت سے دیکھا جائے تو یہ محسوس ہوگا کہ قرض تمسک کو بغیر حصے میں تبدیل کرائے بازار میں فروخت کرنے سے صرف ۱۰ روپئے کا منافع ہوتا ہے، لیکن اسے اپنے

نام حصص میں تبدیل کرالیا جائے تو ۱۶ روپئے کا فائدہ حاصل کیا جاسکتا ہے۔

یہ حقیقت اس بات کا تقاضہ کرتی ہے کہ قابل تبدیل قرض تمسکات اگر براہ راست کمپنی سے مل جائیں تو انہیں بغیر حصص میں تبدیل کرائے بازار میں نہ فروخت کیا جائے۔

صفر سود کی در پر قابل تبدیل قرض تمسکات:
(Zero Interest Convertible Debentures)

سرمایہ کاروں کو قرض تمسکات کے اوپر سود کی مد سے جو آمدنی ہوتی ہے اس پر انکم ٹیکس واجب ہوتا ہے، کمپنی اپنے سرمایہ کاروں کو اس ذمہ داری سے بچنے کا موقع فراہم کرنے کی غرض سے صفر سود کی در پر قابل تبدیل قرض تمسکات کے اجراء کی پیش کش کرتی ہے۔

اس طرح کے قرض تمسکات غیر سودی سرمایہ کاری کی خواہش رکھنے والے حضرات کے لئے غیر معمولی دلچسپی کا باعث ہو سکتے ہیں، اس طرح کے قرض تمسکات کے پیش کش کی شرائط کے مطابق نہ تو کمپنی کسی طے شدہ در سے قرض پر سود ادا کرنے کا وعدہ کرتی ہے نہ فی الواقع سود ادا کرتی ہے، لیکن قرض تمسک کو حصص میں تبدیل کرتے وقت اپنے حصص کی جو اضافی قیمت مقرر کرتی ہے اس میں قرض تمسک پر دستور کے مطابق تعبیری سود کو منہا کردیتی ہے، اس طرح کا تعبیری سود کا معاملہ قیاس وگمان میں تو رہتا ہے لیکن اس کی کہیں کوئی صراحت نہیں کی جاتی، اس کی مثال یوں دی جاسکتی ہے:

(ھ) ایک کمپنی جس کے دس روپئے والے حصہ کی بازار میں قیمت ۱۰۰ روپئے چل رہی ہو تو ۱۳۰ روپئے والے صفر سود کی در پر کلی طور پر قابل تبدیل قرض تمسکات ان شرائط پر جاری کرسکتی ہے، قرض کی رقم پر کمپنی کے اوپر کوئی سود واجب نہیں ہوگا، قرض تمسک کے الاٹ منٹ کی تاریخ کے ایک سال بعد کمپنی اپنا دس روپئے والا ایک حصہ ۳۰ روپئے اضافی قیمت کے ساتھ اور دس دس روپئے والے دو حصے فی حصہ ۳۵ روپئے اضافی قیمت کے ساتھ جاری کرکے قرض تمسک واپس لے لے گی، اس طرح کی سرمایہ کاری میں کمپنی کے ۳ حصوں پر آئی لاگت کا تعین یوں ہوگا:

۱۳۰ روپئے والے صفر سود کی در پر جاری کئے گئے ایک قابل تبدیل قرض تمسک کی لاگت...... ۱۳۰ روپئے

ایک سال بعد کمپنی سے ملا سود (کچھ نہیں)...... ۰ روپئے

قرض تمسک کی اصل لاگت...... ۱۳۰ روپئے

قرض تمسک حصص میں تبدیل کرانے پر فی حصہ لاگت:

پہلا حصہ قدر عرفی ۱۰ روپئے + کمپنی کی اضافی قیمت ۳۰ روپئے = ۴۰ روپئے

دوسرا حصہ قدر عرفی ۱۰ روپئے + کمپنی کی اضافی قیمت ۳۵ روپئے = ۴۵ روپئے

تیسرا حصہ قدر عرفی ۱۰ روپئے + کمپنی کی اضافی قیمت ۳۵ روپئے = ۴۵ روپئے

میزان قدر عرفی ۳۰ روپئے + کمپنی کی اضافی قیمت ۱۰۰ روپئے = ۱۳۰ روپئے

فی حصہ بازاری قیمت پر لاگت فی حصہ ۸۰ روپئے۔

اس طرح کی سرمایہ کاری کا موازنہ اگر مثال (الف) سے کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ مثال (الف) میں کمپنی نے قرض کی رقم پر ۱۴ فیصد سالانہ کی در سے ۲۱ روپئے سود ادا کیا تھا تو قرض تمسک کو حصص میں تبدیل کرتے وقت اضافی قیمت فی حصہ ۴۰ روپئے کی در سے مقرر کیا، اس طرح کمپنی نے ۳ حصص پر کل ۱۲۰ روپئے اضافی قیمت سرمایہ کار سے وصول کیا، لہذا کمپنی نے اصل منافع صرف ۱۲۰۔۱۲۱ = ۹۹ روپئے وصول کیا، لیکن کمپنی نے قرض کی رقم پر کوئی سود نہ ادا کرنے کی صورت میں کل اضافی قیمت ۱۰۰ روپئے مقرر کی، یعنی قرض پر سود دینے کے عوض کمپنی نے اپنے منافع میں تقریباً اسی کے بقدر تمسکات کو حصص میں تبدیل کرتے وقت کمی کردی، اس طرح صفر سود کی در پر قرض تمسکات کو حصص میں تبدیل کرانے پر آئی لاگت کا موازنہ اگر بازار سے حصص کی خریداری پر آئی لاگت سے کریں تو معلوم ہوگا کہ پہلا حصہ جس کی لاگت طریقہ اول سے ۴۰ روپئے ہے، طریقہ دوم یعنی بازاری خرید کے مطابق ۸۰ روپئے ہے۔

دوسرے اور تیسرے حصوں کی لاگت فی حصہ طریقہ اول سے ۴۵ روپے ہے، جبکہ طریقہ دوم سے ۸۰ روپئے ہے، لہذا صفر سود کی در پر قابل تبدیل قرض تمسکات کو حصص میں تبدیل کرانے پر لاگت حصص کو بازار سے خریدنے کے مقابلہ میں کم آتی ہے۔

حصص میں سرمایہ کاری کے فوائد (Benefits of Investment in Shares)

ا۔ منافع کی تقسیم (Distribution of Dividend)

عام طور پر کمپنی ہر سال جو منافع کماتی ہے اس کا ایک جز حصہ داروں میں ان کے سرمایہ پر ایک مقررہ در سے تقسیم کرتی ہے، باقی جز کو اپنے کاروبار میں استعمال کرنے کی غرض سے اپنے محفوظ سرمایہ میں رکھتی ہے، جن کمپنیوں کے حصص کی بازار میں خرید و فروخت ہوتی ہے ان کے ذریعہ کمایا گیا منافع فوراً ان کے حصص کی قیمت میں اضافہ کی شکل میں ظاہر ہو جاتا ہے، اس طرح جو منافع کمپنی اپنے پاس روک لیتی ہے سرمایہ کاروں کے اصل سرمایہ میں اضافہ کا سبب بنتا ہے، کمپنی کے ذریعہ جو کچھ منافع تقسیم کیا جاتا ہے وہ کمپنی کے حصص کی قدر عرفی (Face Value) کا ۲۰ یا ۳۰ فیصد ہو سکتا ہے، لیکن اصل سرمایہ (کمپنی کے حصص کی بازاری قیمت) پر بمشکل ۲ یا ۳ فیصد ہی ہوتا ہے، مثال کے طور پر ایک کمپنی جس کے دس روپے والے حصے کی قیمت بازار میں سو روپے ہو، اگر ۲۰ فیصد منافع کا اعلان کرے تو حصص کی بازاری قیمت کے اعتبار سے یہ صرف ۲ فیصد ہی ہوگا، یعنی سرمایہ کاری پر حقیقی منافع ۲ فیصد ہوگا۔

۲۔ منافع کے حصص کا اجراء (Issue of Bonus Shares)

جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے کہ عام طور پر کمپنی اپنے کمائے ہوئے منافع کا ایک حصہ اپنے مالی استحکام اور کاروبار کو فروغ دینے کے لئے اپنے پاس روک لیتی ہے اس طرح یہ رکا ہوا منافع (سرمایہ محفوظ) سرمایہ حصص سے کئی گنا بڑھ جاتا ہے، اگر کمپنی کو مستقبل میں نقصان کا کوئی اندیشہ نہیں ہوتا تو کمپنی اس سرمایہ محفوظ کو سرمایہ حصص میں تبدیل کر کے اپنے حصہ داروں کے حق میں ان کے حصص کی تعداد پر ایک خاص تناسب سے بطور بونس جاری کرتی ہے، اس طرح کمپنی کے حصہ داروں کے حصص کی تعداد میں اضافہ کے سبب ان کے اصل سرمایہ میں غیر معمولی اضافہ ہوتا ہے، مثال کے طور پر ایک کمپنی جس کے روپئے والے حصے کی قیمت بازار میں ۱۰۰ روپئے ہو، ایک حصہ پر ایک کی نسبت سے بونس جاری کرے تو جس شخص کے پاس کمپنی کا ایک حصہ تھا اس کے پاس دو حصے ہو جائیں گے، اب اگر اس کمپنی کے حصص کی بازار میں رسد کے اضافہ کے سبب ان کے حصے کی قیمت ۱۰۰ روپئے سے کم ہو کر ۷۰ روپئے ہی رہ جائے تب بھی اس کا اصل سرمایہ ۱۰۰ روپئے سے بڑھ کر ۱۴۰ روپئے ہو جائے گا۔

۳۔ حصص و قرض تمسکات کا اجراء بطور حق
(Rights for Issue of Shares and Convertible Debentures)

مالی طور سے مستحکم کمپنیوں کے حصص و قابل تبدیل قرض تمسکات کی بازاری قیمت، ان کی قدر عرفی یا ان کی قیمت اجراء سے کہیں زیادہ ہوتی ہے، ایسی کمپنیاں کبھی کبھی اپنے حصص و قابل تبدیل قرض تمسکات کے اجراء کی عوام کو پیش کش کرنے کے بجائے اپنے موجودہ سرمایہ کاروں (حصے داروں و حاملین قرض تمسکات) کو ان کے حصص و قرض تمسکات کی نسبت سے بطور حق اجراء کی پیش کش کرتی ہیں۔

عام طور پر کمپنیوں سے بطور حق ملی پیش کش قابل تبادلہ ہوتی ہے، اگر حق دار مزید سرمایہ کاری کرنا مناسب نہ سمجھے یا حق کا فوری نقد فائدہ اٹھانا چاہے تو وہ اپنا حق اس خاص کمپنی میں سرمایہ کاری کی دلچسپی رکھنے والے شخص کے ہاتھ معقول قیمت لے کر بیچ سکتا ہے، لیکن عام طور پر اس حق کو اس طرح بیچ کر حاصل ہونے والا فائدہ اس منافع سے کم ہوتا ہے جو کمپنی کے حصص حاصل کرنے یا قابل تبدیل قرض تمسکات کو حصص میں تبدیل کرانے پر حاصل ہوتا ہے، یہ حقیقت اس بات کا تقاضہ کرتی ہے کہ اگر کمپنی سے اس طرح حصص یا قابل تبدیل قرض تمسکات میں سرمایہ کاری کی پیش کش بطور حق مل جائے تو اسے بازار میں یوں ہی فروخت نہ کیا جائے بلکہ کمپنی سے حصص یا قابل تبدیل قرض تمسکات حاصل کر لئے جائیں، قابل تبدیل قرض تمسکات کو جب تک کہ انہیں حصص میں تبدیل نہ کرا لیا جائے اپنے پاس روکا جائے۔

حصص یا قرض تمسکات کے اجراء کی ترجیحی پیشکش

(Preferencial offer for issue of shares or debentures)

کچھ کامیاب کمپنیوں کے بانی (Promoters) جب کسی نئی کمپنی کے لئے سرمایہ حصص یا قابل تبدیل قرض تمسکات کا اجراء کرتے ہیں تو اپنی پرانی کمپنی کے سرمایہ کاروں کو فائدہ پہنچانے کی غرض سے اس نئی کمپنی میں حصہ دار بنانے کے لئے کسی حد تک نئی کمپنی کے حصص کے الاٹ منٹ میں عوام کو ترجیح دیتے ہیں، عام طور پر ایسے بانیوں (Promoters) کے ذریعہ جو بھی نئی کمپنی قائم کی جاتی ہے اس کے حصص کی بازاری قیمت ان کی قیمت اجراء سے زیادہ ہی ہوتی ہے، اس طرح پرانی کمپنیوں کے سرمایہ کاروں کو نئی کمپنی میں حصص کے اجراء میں جو ترجیح ملتی ہے ان کے لئے منافع بخش ہوتی ہے، یہ ترجیحی پیشکش قابل تبادلہ نہیں ہوتی ہے، اس کو بازار میں فروخت نہیں کیا جاسکتا، اس سے فائدہ حاصل کرنے کی واحد صورت یہ ہے کہ حصص یا قابل تبدیل قرض تمسکات اپنے نام جاری کرائے جائیں، قابل تبدیل قرض تمسکات جب تک حصص میں تبدیل نہ ہو جائیں اپنے پاس روکا جائے۔

جن کمپنیوں کے حصص کی بازار میں آزادانہ خرید وفروخت ہوتی ہے، ان کی اچھی یا خراب کارکردگی اور ان کے روشن وتاریک مستقبل کی خبروں اور افواہوں کا براہ راست اثر ان کی بازاری قیمت پر پڑتا ہے، لہذا جیسے ہی کسی کمپنی سے اوپر بیان کردہ فوائد میں سے کسی فائدہ کے ملنے کی امید کی خبر حصص بازار میں آتی ہے، حصص کی بازار میں اس کے متوقع فائدہ کی نسبت بڑھ جاتی ہے، اور جونہی وہ فائدہ سرمایہ کاروں کو پہنچ جاتا ہے بازار میں حصص کی قیمت میں کمی آجاتی ہے۔

اوپر نمبر ۱ اور نمبر ۲ میں بیان کئے گئے فائدے تو کمپنی سے بنا طلب کئے حاصل ہوتے ہیں، لیکن نمبر ۳ اور نمبر ۴ میں بیان کئے گئے فائدے حاصل کرنے کے لئے کمپنی میں پیشکش کی درخواست اجراء کی شرائط کے مطابق دینی پڑتی ہے، اس طرح فائدے حاصل کرنے میں بے اعتنائی برتنے سے نہ صرف اس فائدہ سے محرومی ہوتی ہے، بلکہ یہ موقع ہاتھ سے نکل جانے کے بعد حصص کی قیمت میں گراوٹ کے سبب اصل سرمایہ میں کمی کا بھی امکان رہتا ہے، یہ حقیقت بھی اس بات کا تقاضہ کرتی ہے کہ اگر قابل تبدیل قرض تمسکات کی پیشکش بطور حق یا بطور ترجیح ملے تو کمپنی سے قرض تمسکات حاصل کرکے انہیں حصص میں تبدیل کرانے کے وقت تک اپنے پاس روکا جائے۔

حصص وقرض تمسکات کی خرید وفروخت

(Sale and Purchase of Shares and Debentures)

چونکہ حصص وقرض تمسکات عام طور پر قابل تبادلہ ہوتے ہیں، اس لئے اجناس بازار کی طرح ان کی بھی خرید وفروخت ہوتی ہے، بعض کمپنیاں اپنے حصص وقرض تمسکات کی (Liquidity) نقدیت برقرار رکھنے کی غرض سے انہیں حصص بازاروں کی فہرست میں درج کراتی ہیں، ان بازاروں کی فہرست میں درج حصص وقرض تمسکات کے نرخ روزمرہ اخبارات میں شائع ہوتے رہتے ہیں، اس طرح ان کے خریدنے اور بیچنے والوں کے مابین ان کی قیمت کے تعین میں آسانی ہوجاتی ہے، حصص بازار میں حصص وقرض تمسکات کے خریداروں کو دو زمروں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

۱۔ وہ جو کہ سرمایہ کاری کی غرض سے حصص وقرض تمسکات خرید کر اپنے نام انہیں منتقل کراکر کمپنی میں نفع ونقصان یا سود کے مستحق ہوتے ہیں۔

۲۔ وہ جو کہ حصص وقرض تمسکات کو اپنے نام کرائے بغیر اجناس بازار کی طرح اپنے پاس رکھتے ہیں اور روزمرہ کی قیمتوں میں آئے اتار چڑھاؤ کا فائدہ حاصل کرنے کی غرض سے ان کی خرید وفروخت کرتے ہیں۔

خلاصہ

۱۔ قانون کی نظر میں کمپنی ایک شخص ہے۔

۲۔ کمپنی کے حصے داروں کی حیثیت کمپنی میں نفع ونقصان میں اپنے حصص کی تعداد کی نسبت سے برابری کے شرکاء کی ہے۔

۳۔ کمپنی کا نظم وضبط جمہوری طریقے سے کثرت رائے پر ہوتا ہے، حصے داروں کا حق رائے دہندگی قابل تبادلہ ہوتا ہے۔

۴۔ کچھ اقتصادی فائدہ کی مصلحت کے تحت کمپنیاں اپنے کاروبار میں سرمایہ حصص کے ساتھ سود پر حاصل کیا ہوا سرمایہ بھی استعمال کرتی ہیں۔

۵۔ سرمایہ حصص کے لئے حصص اور سرمایہ قرض کے لئے قرض تمسکات کا اجراء کرتی ہیں، اسناد حصص Share Certifactes اور قرض تمسکات (Debenture Certificates) عام طور پر قابل تبادلہ ہوتے ہیں۔

٦۔ مقابلۃً کم قیمت پر حصص حاصل کرنے کے طریقے یہ ہیں:

ا۔ براہ راست کمپنی سے عوامی پیش کش کے جواب میں۔

۲۔ برابری کے حصص سے منسلک قرض تمسکات کے اجراء کے ذریعہ۔

۳۔ قابل تبدیل قرض تمسکات کے اجراء کے ذریعہ۔

۴۔ قرض تمسک کو بازار سے خرید کر حصص میں تبدیل کرانے کے ذریعہ

۵۔ حصص و قابل تبدیل قرض تمسکات کی پیشکش بطور حق دیئے جانے پر حق داروں کے حق خرید کر کمپنی سے اجراء کے ذریعہ۔

٦۔ حصص کو بازار سے خرید کر۔

۷۔ مالی طور پر مستحکم کمپنیاں اپنے حصص ان کی قدر عرفی سے زائد قیمت پر جاری کرتی ہیں۔

۸۔ مالی طور سے مستحکم کمپنیوں کے حصص و قابل تبدیل قرض تمسکات کی بازار میں قیمت ان کی قیمت اجراء سے زائد ہوتی ہے۔

۹۔ قابل تبدیل قرض تمسکات حصص میں تبدیل ہونے کے بعد اگر اپنا کوئی جز باقی رکھتے ہیں تو وہ جز بازار میں اپنی قدر عرفی سے کم پر فروخت ہوتا ہے، قابل تبدیل قرض تمسکات میں چونکہ حصص مضمر ہوتے ہیں، اس لئے اپنی قدر عرفی سے زائد پر بازار میں فروخت ہوتے ہیں۔

۱۰۔ قابل تبدیل قرض تمسکات کے اجراء میں کمپنی قرض کی رقم پر سود ادا کرتی ہے اور قرض کی حصص میں تبدیلی پر اضافی قیمت حاصل کرتی ہے، یعنی ایک ہی معاملہ میں کچھ لیتی ہے اور کچھ دیتی ہے۔

۱۱۔ کمپنی صفر سود کی در پر قرض تمسکات جاری کر کے قرض پر تعبیری سود کو حصص میں تبدیلی کے وقت اپنی اضافی قیمت سے منہا کرتی ہے، یعنی ایک معاملہ میں صرف لیتی ہے، دیتی نہیں۔

۱۲۔ کمپنی سے فوائد، منافع، منافع کے حصص، حصص، حصص و قابل تبدیل قرض تمسکات کے اجراء کی پیش کش بطور حق و بطور ترجیح کی شکلوں میں حاصل ہوتے ہیں۔

۱۳۔ کمپنی سے فوائد حاصل کرنے میں گریز کی صورت میں نہ صرف فوائد سے محرومی بلکہ سرمایہ کی اصل لاگت کم ہونے کا بھی اندیشہ ہوتا ہے۔

۱۴۔ حصص و قرض تمسکات کی خرید و فروخت بغیر انہیں اپنے نام منتقل کرائے اجناس بازار کی طرح بھی کی جاتی ہے۔

☆☆☆

کمپنی کے حصص سے متعلق جوابات

مفتی نظام الدین صاحبؒ، دار العلوم دیوبند

اس تحریر میں تین صورتیں جو درج ہیں ان میں سے کسی پر سود (ربوا) کی شرعی تعریف صادق نہیں آتی، سود کی شرعی تعریف یہ ہے: اموال ربویہ میں جیسے کرنسیوں میں عقد معاوضہ کا معاملہ کیا جائے اور کسی جانب زیادتی عوض سے خالی رہے۔

صورت مسئولہ مذکورہ کی پہلی صورت میں حکومت ٹھیکہ داروں سے کچھ رقم لے کر اس کی میعادی رسید دے کر رقم جو اپنے قبضہ میں رکھتی ہے وہ محض بطور ضمانت رکھتی ہے تاکہ کبھی کوئی ٹھیکہ دار تعمیراتی سامان وغیرہ ہڑپ یا ضائع نہ کرڈالے، نہ کہ عقد معاوضہ کرتی ہے، اسی وجہ سے کارہائے ٹھیکہ پورا ہوجانے کے بعد واپس کردینے کا معاہدہ ہوتا ہے، پس یہ معاملہ شرعاً زرضمانت رکھنے کا اور اپنے اپنے سامان کے تحفظ کا ہوا، اور شرعاً صرف بعد تکمیل کارہائے ٹھیکہ داری زرضمانت کی واپسی کا ہوا، پھر کار ٹھیکہ داری ختم ہوجانے کے بعد صرف اسی زرضمانت کی واپسی لازم ہوتی ہے، باقی حکومت خود اپنی طرف سے یہ زائد رقم اپنے ضابطہ کے مطابق دیتی ہے، لہذا یہ دینا از قبیل تبرع من جانب الحکومت ہوا اور حکومت چونکہ غیر مسلم ہے اس لئے اس رقم ضمانت سے کچھ کاروبار کر کے کچھ نفع حاصل کرے اور وہ تصرف شرعاً خیانت شمار ہو مگر وہ اس کے مکلف نہیں ہوتے، اس لئے یہ دینا ان کی جانب سے شرعاً تبرع قرار پائے گا۔

اس کی نظیر پراویڈنٹ فنڈ کا معاملہ ہے کہ پراویڈنٹ فنڈ میں محکمہ جو جز تنخواہ ملازم کے قبضہ میں جانے سے قبل ہی خود ہی کاٹ کر ماہ بہ ماہ جمع کرتا رہتا ہے اور بعد ختم ملازمت اس جمع شدہ رقم کو دوگونہ سہ گونہ کر کے اپنے ضابطہ کے مطابق ملازم کو دیتا ہے، اگرچہ محکمہ اس جمع شدہ رقم سے اپنے ضابطہ کے تحت نفع حاصل کرچکا ہوتا ہے، پھر بھی اس زائد رقم کو از روئے قواعد شرعیہ تبرع قرار دے کر اس کا لے لینا بلا کراہت شریعت نے جائز فرمایا ہے (کما صرح بہ امداد الفتاوی ایضا)۔

پس یہی حکم یہاں بھی رہے گا، کہ اس زرضمانت کے اندر جمع کی ہوئی رقم سے زائد رقم شرعاً سود نہ قرار پائے گی، بلکہ بحکم تبرع ہو کر اس کا لے لینا بلا کراہت درست رہے گا اور بطور تصدق غریبوں کو دے کر اپنی ملک سے نکال دینا واجب نہ رہے گا۔

اسی طرح اسکوٹر، کار، ٹرک وغیرہ کے خرید کے معاملہ میں نامزد منتظرین سے کمپنی جو رقم پیشگی لیتی ہے، وہ زرثمن پیشگی کے قبیل کی چیز ہے یا بطور بیعانہ یا مثل بیعانہ لینے کی ہوتی ہے، نہ کہ اموال ربویہ عقد معاوضہ کی ہوتی ہے، چنانچہ نمبر خریدا جانے کے بعد خریدی ہوئی مطلوبہ چیز کمپنی خریدار کو دیتی ہے تو اس کی قیمت میں سے یہ پیشگی دی ہوئی رقم وضع کردیتی ہے، اب اس وقت اپنے ضابطہ کے تحت جو زائد رقم خود دیتی ہے اس پر ربوا (سود) کی تعریف شرعی صادق نہیں آتی، نیز اس زائد رقم کو بائع (کمپنی) خود اسی شئی مشتراۃ کے ثمن میں منضم کردیتا ہے جس سے وہ رقم خریدار تک نہیں پہنچتی، لہذا یہ بھی کمپنی کا اپنے خریداروں کے ساتھ شرعاً ایک تبرع کا معاملہ ہوا اور اس کا تعلق سود سے نہیں کہ "اجتنبوا عن الربوا والريبة" کا حکم جاری ہو۔

نوٹ: یہ شبہ نہ کیا جائے کہ پھر بینک میں جمع کردہ رقم پر جو زائد رقم ملتی ہے اس کو سود کیوں کہا جاتا ہے، وجہ فرق یہ ہے کہ بینک میں جو رقم کوئی جمع کرتا ہے محض اپنی مرضی سے بغیر کسی قسم کے دباؤ جبر کے کرتا ہے، لہذا جمع کرنے میں فارم کی خانہ پری میں ایک قسم کے عوض ومعاوضہ کا معاملہ ہوتا ہے کہ اس جمع شدہ رقم پر ماہانہ یا سالانہ یا اس شرط کے ساتھ اتنا انٹرسٹ ملے گا اور یہاں ایسا نہیں ہے، لہذا دونوں میں فرق ہوگیا، اگر کوئی پھر بھی اس پر قیاس کرے تو یہ قیاس محض قیاس عقلی ہوگا شرعی قیاس نہیں ہوگا اور معتبر شرعی قیاس ہے نہ کہ قیاس عقلی۔

۱۔ **کمپنی کی تعریف:**......(الف) کمپنی خواہ محدود ذمہ داری والی اور عوامی ہو اس میں شرکت بحدود ہا وقیود ہا جائز ہوسکتی ہے اور حصص خریدنے والے شرکت عنان کے ضابطہ کے مطابق شریک ہوجاتے ہیں اور کمپنی چلانے والے اور اس کے ذمہ داران شرعاً حصص خریدنے والوں کے وکیل ہوجاتے ہیں، جب تک عقد شرکت عنان کے ضابطہ کے مطابق کام ہوتا رہے گا شرکت عنان صحیحہ کا حکم جاری رہے گا، ورنہ جیسا حال ہوگا ویسا حکم لگے گا۔

(ب) کمپنی کی یہ مذکورہ تعریف شرعی تعریف نہیں ہے اور نہ کمپنی شرعاً وارث ہونے کا حکم رکھتی ہے، بلکہ انتظامی امور کے چلانے اور نافذ کرنے کی شرعی حیثیت رکھتی ہے، چنانچہ کمپنی جو مشترکہ مہر کو استعمال ودستخط وغیرہ کے لئے رکھتی ہے وہ از قبیل انتظام ہونے کی بنا پر درست اور صحیح ہے۔

کمپنی کی اہم خصوصیات: اس عنوان کے نیچے پانچوں درج شدہ نمبرات امور انتظامیہ سے متعلق ہیں، حسب ضابطہ شرع سب جائز اور درست رہیں گے۔

۲۔ کمپنی کے حصہ دار:...... اس سلسلہ میں عرض ہے کہ ارا کین سے مراد محض حصہ خریدنے والے ہیں، جب تو بلاشبہ یہ سب رکن شمار ہوں گے اور اگر ارا کین سے مراد حصہ خریدنے والوں کے علاوہ بھی ہوں مثلاً کمپنی کے چلانے والے اور ذمہ داران ہوں، تو اگر حصہ داروں کی اجازت سے ہو خواہ اجازت صراحتہ ہو یا دلالۃ، تو یہ لوگ بھی ارکان اور حصہ دار شمار ہو سکتے ہیں، ورنہ صرف وکیل اور نائب شمار ہوں گے۔

۳۔ کمپنی کے امور پہ ضبط:...... اس عنوان کے ماتحت دونوں پیراگراف درج شدہ صحیح اور درست ہے۔

۴۔ کمپنی کا سرمایہ حصص:...... یہ طریقہ کار بھی درست ہے۔

۵۔ منظور شدہ سرمایہ:...... یہ طریقہ کار بھی درست ہے۔

۶۔ جاری شدہ سرمایہ:...... یہ طریقہ کار بھی درست ہے۔

۷۔ پیش کشی سرمایہ یا ادا شدہ سرمایہ:...... یہ مفہوم واصطلاح بھی درست ہے۔

۸۔ آمد شدہ سرمایہ:...... اس کے متعلق گفتگو بھی صحیح ودرست ہے۔

۹۔ حصہ یعنی کمپنی کے سرمایہ کا غیر منقسم قلیل ترین جز:...... اس کے تحت ذکر کردہ کا مفہوم واصطلاح سب درست ہے۔

۱۰۔ ترجیحی حصص:...... یہ طریقہ کار بھی درست ہے۔

۱۱۔ اسناد حصص:...... یہ طریقہ کار بھی درست ہے۔

۱۲۔ حصص حاصل کرنے کے طریقے:...... اس عنوان کے تحت حصول حصص کے دو ذریعوں میں سے پہلا ذریعہ (اجزاء حصص) کا طریقہ کار بھی درست ہے اور دوسرے ذریعہ کے تحت درج کردہ پہلا ذریعہ (عوامی اجزاء) طریقہ کار بھی درست ہے۔

۱۳۔ البتہ حصول حصص کا ذریعہ نمبر ۲ یعنی برابری کے حصص سے منسلک قرض تمسکات کا اجراء، یہ محل کلام ہو سکتا ہے، کیونکہ تمسک کی اصل حقیقت اس پرچہ (کاغذ) کی ہوتی ہے، اور اس کاغذ کی حیثیت سے سند ووظیفہ یا رسید کی ہوگی نہ کہ مال کی، لہذا اس کی بیع وشراء یا قرض لینا دینا درست نہ ہوگا۔

البتہ اگر اس کی حیثیت عرفی عام طور سے مال جیسی ہو جاوے جیسا کہ کاغذی نوٹ، ڈالر وغیرہ کی حیثیت عرفی مال جیسی ہوگئی اور اس حیثیت عرفی میں اس کا تبادلہ وادائیگی زکوۃ وغیرہ کی اباحت کا حکم ہوگیا، اسی طرح ان تمسکات (رسیدات) کا حکم بھی ہو جاوے گا، کیونکہ مال کی فقہی تعریف ان تمسکات پر صادق آجاوے گی اور مال کی فقہی تعریف یہ ہے:

''المراد بالمال ما يميل إليه الطبع ويمكن ادخاره لوقت الحاجة والمالية تثبت بتمول الناس كافة أو بعضهم والتقوم يثبت بها وبإباحة الانتفاع بها شرعا'' (شامی نعمانی ۴؍۳)۔

ورنہ ان تمسکات کا شرعاً بیع وشراء وغیرہ سوائے عقد حوالہ کے درست نہ رہے گا، لہذا اس مفہوم پر خوب غور کرکے حکم لگایا جاوے۔

اسی طرح جس صورت میں شرعی ربا لینے دینے کا معاملہ ہوگا اس صورت میں حتی المقدور سودی معاملہ سے بچنے کی سعی کرنا لازم رہے گا اور انہی وجوہ سے مضمون کے قرض تمسکات سے متعلق بقیہ مباحث پر مزید کوئی گفتگو نہیں کی گئی ہے۔

۱۴۔ حصص میں سرمایہ کاری کے فوائد: اس کے تحت درج ۱، ۲ کا طریقہ کار درست ہے، اور ۱۳ اور اس کے بعد کے مندرجات از ۱۲ تا ۱۴ میں وہی گفتگو ہے جو قرض تمسکات کے مباحث میں مذکور ہو چکی ہے۔

نوٹ: اتنی گفتگو کے بعد (زیر عنوان خلاصہ اور سوال نامہ پر) کچھ لکھنے کی حاجت نہیں۔ ☆☆☆

کمپنی اور حصص

مولانا شمس پیرزادہ، ممبئی

کسی سودی اسکیم میں شریک ہونا یا تعاون کرنا ہرگز جائز نہیں، البتہ موجودہ حالات میں واقعی مجبوریوں کا لحاظ کئے بغیر چارہ کار نہیں ہے، اس لئے جس کے لئے جس حد تک مجبوری ہے، اس کے لئے اسی قدر رعایت ہو سکتی ہے کہ "اتقوا اللہ ما استطعتم"۔

۱ تا ۵: ان سوالوں کا جواب نفی میں ہے۔

۶۔ صفر سود یہ قرض تمسکات سے متعلق ہے جو دراصل سود کے لئے ایک حیلہ ہے، لہذا جائز نہیں۔

۷۔ ضرورتاً ایسی کمپنی کے قیام میں مدد دی جا سکتی ہے، جس کی اسکیم میں کاروبار کے لئے سودی قرض لینا شامل ہو، کیونکہ قرض لینے کی مجبوری عام طور سے نہیں آتی ہے۔

۸۔ اس کا جواب اثبات میں ہے۔

۹ تا ۱۲۔ ان سب کا جواب نفی میں ہے۔

واضح رہے کہ معاملہ کی نوعیت اگر یہ ہو کہ اصلاً وہ درست ہے، لیکن ضمناً اس میں سود شامل ہو گیا ہے، تو اس کے لئے جواز کی صورت ہے، لیکن اگر معاملہ کی نوعیت ہی سودی کاروبار کی ہو تو جائز نہ ہوگا، ڈبینچر (Debenture) کا معاملہ صریح طور پر سودی معاملہ ہی ہے، اس لئے اس کے لئے کوئی وجہ جواز نہیں۔

۱۳۔ اگر کمپنی نے حصص کے سلسلے میں بطور حق قرض تمسکات کی پیشکش کی ہے تو اس کو فروخت کر کے فائدہ حاصل کیا جا سکتا ہے۔

۱۴۔ جب قرض تمسکات خریدنا ہی جائز نہیں تو ان کو حصص میں تبدیل کرنے کا کیا سوال پیدا ہوتا ہے۔

۱۶،۱۵۔ ان دونوں کا جواب بھی عدم جواز کا ہے۔

۱۷۔ سود اگر وصول ہی کرنا پڑا ہو تو اس کا مصرف فقراء و مساکین پر صرف کرنا ہے۔

۱۸۔ حصص کی فروخت اپنے نام منتقل کرائے بغیر جائز ہے۔

۱۹۔ جب قرض تمسکات خریدنا جائز نہیں تو ان کی فروخت کا کیا سوال، اگر کسی کے پاس قرض تمسکات ہوں تو وہ فروخت کر کے سود کی رقم اس میں سے منہا کر دے۔

☆☆☆

کمپنی و حصص

مولانا محمد برہان الدین سنبھلی، ندوۃ العلماء لکھنو

۱۔ سوال واضح نہیں ہے، اس لئے جواب دینا مشکل ہے۔

۲، ۳۔ جائز نہیں۔

۴۔ اگر قرض غیر سودی ہو تو ایسی شکلیں جائز ہوں گی، جن میں ربا (سود) لازم نہ آئے، لیکن قرض دلانے کا ''واسطہ'' بننے کی اجرت اصلاً جائز نہیں۔

۵۔ جائز نہیں۔

۶۔ جو سوال نمبر ۴ کا جواب ہے وہی اس کا بھی جواب ہے۔

۷۔ جائز نہیں۔

۸۔ اگر سود پر لئے گئے قرض کی رقم کا کاروبار اور غیر سودی رقم کا کاروبار علاحدہ علاحدہ ہو تو اس میں سرمایہ کاری کی جاسکتی ہے، ورنہ نہیں۔

۹، ۱۰۔ اگر حصص غیر سودی ہوں تو انہیں فروخت کی غرض سے خریدنا شرعاً جائز ہونا چاہئے۔

۱۱۔ جب سودی قرض کے تمسکات خریدنا ہی جائز نہیں تو اس پر متفرع صورت بھی جائز نہیں۔

۱۲۔ جائز ہے، خریدے جاسکتے ہیں۔

۱۳۔ محض ''پیشکش'' شرعاً قابل عوض نہیں، جو شئ یا عمل قابل عوض نہ ہو اس پر مال لینا جائز نہیں۔

۱۴، ۱۵۔ شکل واضح نہیں، تفصیل معلوم ہونے اور شکل کے واضح ہوجانے کے بعد ہی کوئی رائے دی جاسکتی ہے۔

۱۶۔ جس سے سود وصول ہوا ہے اسی کو وہ رقم دے دی جائے تو جائز ہے ورنہ نہیں۔

۱۷۔ جیسا کہ سوال نمبر ۱۶ کے تحت گذرا کہ اس میں (۱۶ میں) تو ایک شکل جواز کی نکل سکتی ہے، بقیہ میں نہیں، پھر جب ایسے ''تمسکات'' کا خریدنا ہی جائز نہیں تو اس پر ملنے والے سود سے متعلق سوال ہی بے محل ہے اور اس کا حکم بھی واضح ہے کہ ہر قسم کے سود کا لینا حرام ہے۔

۱۸، ۱۹۔ ''بیع قبل القبض'' کی صورت نہ پیدا ہو تو اس شکل سے فائدہ حاصل کرنا جائز ہوسکتا ہے۔

☆☆☆

کمپنی و حصص

مفتی حبیب الرحمن خیرآبادی، دارالعلوم دیوبند

۱۹ نمبرات پر مشتمل سوالنامہ کا تجزیہ خلاصہ کے طور پر دو حصوں میں کیا جاسکتا ہے:

۱۔ یہ کہ کمپنی جو تجارت کے لئے قائم کی جاتی ہے اور اس کا سرمایہ مقرر کر کے اس کے شیئرز (Shares) خریدے جاتے ہیں، اس اسکیم میں کاروبار کا جو طریقہ ہے مثلاً سود پر قرض لینا اور اس کا سود اصل رقم سے یا نفع کی رقم سے دینا، اسی طرح اصل یا نفع کی رقم کو سود پر دینا اور حاصل شدہ سودی رقم کمپنی کے نفع میں شامل کر کے شیئر ہولڈرس (Share Holders) کو تقسیم کرنا، کیا ایسی کمپنی میں مسلمانوں کے لئے شیئرز خریدنا یعنی اس میں حصہ دار بننا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

۲۔ یہ کہ شیئرز کی قیمتوں میں کمپنی کے نفع اور نقصان کے اعتبار سے کمی اور زیادتی ہوتی رہتی ہے، لہذا شیئرز ہولڈرس شیئرز کی قیمتیں زیادہ ہو جانے کے وقت بعض دفعہ اپنا حصہ کسی دوسرے کے ہاتھ فروخت کر دیتے ہیں، تو کیا کمپنی کے شیئرز کی خرید و فروخت شرعاً درست ہے؟ غرضیکہ سوالنامہ کا حاصل یہ دو سوالات ہیں، ان میں سے ہر ایک کا جواب بالترتیب ذیل میں ملاحظہ فرمائیں:

۱۔ کمپنی میں شیئرز خریدنے کا جو طریقہ کار ہے اور کاروبار چلانے کی جو اسکیم ہے شرعی نقطہ نظر سے یہ شرکت کا معاملہ ہی نہیں ہے، فقہی اصول و ضابطے کے مطابق نہ تو یہ شرکت عنان ہے، نہ شرکت مفاوضہ میں داخل ہے، نہ ہی شرکت صنائع وتقبل میں اس کا شمار ممکن ہے، اگر اسے شرکت مضاربت میں رکھا جائے تو اس کے تمام شرائط بھی اس میں نہیں پائے جاتے، سب سے زیادہ خطرناک بات یہ پائی جاتی ہے کہ شیئرز ہولڈرس جو کچھ پیسے کمپنی میں جمع کرتے ہیں وہ پیسے کبھی کسی حالت میں واپس نہیں ملتے، کمپنی کبھی واپس نہیں کرتی، شیئر ہولڈر اگر اپنا شیئر کسی کے ہاتھ فروخت نہ کرے تو اس کے سرمایہ کی رقم ایک طرح سے سوخت ہو جاتی ہے۔

۲۔ رہا کمپنی کے شیئرز کا فروخت کرنا تو اس کا فروخت کرنا بھی جائز نہیں، اول تو اس وجہ سے کہ وہ رسید جو شیئرز ہولڈر کو کمپنی کی طرف سے رقم کی وصولیابی کے ساتھ شرعاً ناجائز ہے، جیسا کہ ظاہر ہے، دوسرے یہ کہ کمپنی میں جو رقم جمع ہوتی ہے وہ نقد کی شکل میں جمع نہیں رہتی ہے، بلکہ کچھ عمارت کی شکل میں، کچھ فرنیچر کی شکل میں، کچھ سامان تجارت کی شکل میں اور کچھ دوسروں کے یہاں سودی قرض کی شکل میں ہوتی ہے، لہذا مبیع اس صورت میں مجہول ہے معلوم اور متعین نہیں ہے، اور یہ کھلا ہوا مسئلہ ہے کہ جس بیع میں مبیع مجہول ہو اس کی بیع درست نہیں، اوپر بتایا جاچکا ہے کہ شیئرز ہولڈر کی جو رقم کمپنی میں جمع ہوتی ہے وہ رقم واپس نہیں ملتی ہے، نہ وہ خود واپس لے سکتا ہے، پس جو چیز مشتری کو سپرد کرنے پر بائع قدرت نہیں رکھتا ہے اس کی بیع شرعاً کس طرح جائز ہوگی، علاوہ ازیں شیئر کو فروخت کرتے وقت بائع اور مشتری ہر دو کے نزدیک نفع کی رقم نامعلوم ہوتی ہے، نیز کمپنی میں پوری رقم نقد کی شکل میں بہت سے لوگوں کے ذمہ دین ہوتی ہے، اور بیع صرف دین میں جائز نہیں، یہاں مدیون بائع اور مشتری کے علاوہ تیسرا شخص ہے، غرض ان سب وجوہ سے کمپنی کے شیئرز کا فروخت کرنا شرعاً جائز نہیں۔

☆☆☆

کمپنی و حصص

مفتی محمد عبید اللہ اسعدی، باندہ

۱۔ گنجائش سمجھ میں آتی ہے، بالخصوص جبکہ سودی قرض کا تذکرہ قانونی مصالح کی بنا پر ہو۔

۲۔ اگر وہ کمپنی جواز کا فتوی لے چکی ہے اور وہ محض سفارش کی حد تک نہیں بلکہ با قاعدہ بھاگ دوڑ اور وقت کی قربانی کے ساتھ ہو تو جائز ہے۔

۳ تا ۵۔ بظاہر یہ سارے کام سودی دستاویز و کاغذات سے متعلق ہیں، اس لئے یہ اجرت جائز نہ ہوگی۔

۶۔ لی جا سکتی ہے۔

۷، ۸۔ جی ہاں۔

۹ تا ۱۳ و ۱۸۔ قرض تمسکات کی بیع کا جواز سمجھ میں نہیں آتا، اصولاً یہ تمسکات اسناد قرض ہیں اور یہ معاملہ حوالہ ہے جس میں صاحب حق اصل سے کم تو تاویل کے ساتھ لے سکتا ہے مگر ادا کردہ رقم سے زائد لینا سمجھ میں نہیں آتا کہ کس تاویل سے ہوگا۔

البتہ مالکیہ کے یہاں قرض کو غیر مقروض کے ہاتھ بھی بیچا جا سکتا ہے (الفقہ الاسلامی وادلتہ ۴/ ۴۳۴) اور کمپنیوں کا اب جو عام رواج ہے اس کی وجہ سے اس کے معاملات کو ابتلائے عام کے تحت شمار کر کے ایک موقع پر حضرت تھانویؒ نے دوسرے مذہب پر فتوی کا ذکر کیا ہے (امداد الفتاوی ۳/ ۴۹۵)، اس لئے ضرورتاً یہاں اس کو اختیار کر لینے کی گنجائش معلوم ہوتی ہے، بشرطیکہ اس کے ساتھ سود کے لین دین کا معاملہ جڑا ہوا نہ ہو اور یہ تمسکات عموماً اس سے خالی نہیں ہوتے، اس لئے منع کیا جائے گا۔

۱۴، ۱۵۔ صورت پورے طور پر سمجھ میں نہیں آتی، آدمی اپنے حق کی واجبی لاگت میں کمی و زیادتی کر سکتا ہے۔

۱۶۔ نہیں۔

۱۷۔ ہاں

۱۹۔ حوالہ کی مذکورہ صورت درست ہے۔

☆☆☆

کمپنی و حصص

مفتی جمیل احمد نذیری، مبارکپور

۱۔ اجرت لی جاسکتی ہے، اس کی نظیر فتاوی عالمگیری کے یہ جزئیات ہیں:

الف۔ ''إذا استأجر رجلا ليحمل له خمرا فله الأجر في قول أبي حنيفة و قال أبويوسف و محمد لا أجر له وإذا استأجر ذمي مسلما ليحمل له خمرا و لم يقل ليشرب أو قال ليشرب جازت الإجارة في قول أبي حنيفة خلافا لهما۔

(ب) إذا استأجر ذمي دابة من مسلم أو سفينة لينقل عليها الخمر جاز في قول أبي حنيفة۔

(ج) إذا استأجر الذمي من المسلم بيتا ليبيع فيه الخمر جاز عند أبي حنيفة۔

(د) ولو استأجر مسلما ليرعى له الخنازير يجب أن يكون على الخلاف كما في الخمر۔

(ھ) مسلم آجر نفسه من مجوسي ليوقد له النار لا بأس به كذا في الخلاصة۔

(و) وإن استأجر لينحت له طنبورا أو بربطا ففعل طاب له الأجر إلا أنه يأثم به كذا في فتاوى قاضي خان۔

(ز) ولو استأجر الذمي ليبني له بيعة أو كنيسة جاز و يطيب له الأجر كذا في المحيط '' (فتاوی عالمگیری کتاب الاجارہ ۳،۵۲۶)

اس کی ایک اور نظیر امداد الفتاوی (۳؍۱۶۷) میں حضرت تھانویؒ کا وہ فتوی بھی ہے جس میں ایک سوال کے جواب میں فرمایا گیا ہے کہ مدارس و مکاتب میں استاذ اگر نصاب کی کتاب میں سود کا حساب پڑھائے تو جائز ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ حساب کتاب خود معصیت نہیں بلکہ اس کا عملی استعمال معصیت ہے، اسی طرح کسی کمپنی کے قیام کی ایسی اسکیم بنانا جس میں کاروبار کے لئے سود پر قرض لینا شامل ہو، بذات خود معصیت نہیں بلکہ کاروبار کے لئے سودی قرض لینا معصیت ہے۔

۲۔ جائز نہیں، کیونکہ سودی قرض دلانے میں مدد کرنا خود معصیت ہے (دیکھئے: تنقیح فتاوی حامدیہ ۲؍۱۴۰)۔

۳،۴۔ اجرت حاصل کی جاسکتی ہے، جواب نمبر ۱ کے تحت دلائل ذکر کئے جاچکے ہیں۔

۵،۶۔ اجرت حاصل کی جاسکتی ہے۔

۷،۸۔ ایسی کمپنی میں سرمایہ کاری جائز ہے، بشرطیکہ کمپنی جو کاروبار کرنے والی ہو یا کر رہی ہو وہ فی نفسہ مباح ہو اور سرمایہ کاری کرنے والے کا سرمایہ اور نفع سود سے محفوظ رہے، حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ لکھتے ہیں:

حقیقت شرعیہ اس معاملہ کی شرکت ہے، یعنی روپے داخل کرنے والے اس تجارت کے شرکاء ہیں اور کارکنان کمپنی تمام کاروبار میں ان کے وکیل ہیں، چونکہ یہ تجارت یعنی بجلی تیار کرکے اہل حاجت کے ہاتھ فروخت کرنا جائز ہے، اس لئے اس کا نفع وغیرہ بھی حلال ہے، رہا وہ امر خلاف شرع جو اخیر میں لکھا ہے اس عبارت میں کہ بعض اوقات قرضہ......الی قولہ......وصول کرتی ہے سو جس حصہ دار کو حصہ داخل کرتے وقت اس کی اطلاع نہ ہو اس نے تو کارکنان کمپنی کو ان دو امر (یعنی قرض لینا اور اس پر سود وصول کرنا) کا وکیل ہی نہیں بنایا، اس لئے کارکنوں کا یہ فعل اس کی طرف منسوب نہ ہوگا اور جن کو اطلاع ہو وہ تصریحا اس کی ممانعت کردیں، گو اس ممانعت پر عمل نہ ہوگا مگر اس ممانعت سے اس فعل کی طرف نسبت تو نہ ہوگی، یہ کلام تو منسوب ہونے یا نہ ہونے میں ہے، لیکن یہ سوال اب بھی باقی ہے کہ کمپنی جو سود وصول کرے گی حصہ داروں پر بھی وہ تو تقسیم ہوگا، تو سود سے یہ حصہ دار منتفع

ہوئے، سواس میں کئی حالتیں ہیں، ایک تو یہ کہ اس کا وقوع لازم تو ہے نہیں، کیونکہ ممکن ہے کہ کمپنی کا کسی کے ذمہ قرض ہی نہ ہو، اس لئے سود لینے کی نوبت ہی نہ آئے، اور اصل صورت تجارت کمپنی کی حلال تھی، تو شک سے حرمت کا حکم نہ کریں گے اور تفتیش ایسے امور میں واجب نہیں، نہ تفتیش سے ہر شخص کو اس جز کا وقوع یا عدم وقوع معلوم ہوسکتا ہے۔

دوسری حالت یہ ہے کہ کمپنی نے یہ سود غیر مسلم سے لیا ہے تو اس میں ربوا من الحربی کا مسئلہ جاری ہوگا، جس کا مختلف فیہ ہونا معلوم ہے، اس لئے مبتلا کو اس میں تنگی نہ ہوگی، اور جو سود کمپنی نے دیا ہے اس میں شرکاء کا سود سے انتفاع محتمل ہی نہیں (امداد الفتاوی ۳/ ۴۹۱، ۴۹۲)۔

۹۔ اگر حصص کے ساتھ قرض تمسکات کا خریدنا لازم نہ ہو تو صرف حصص ہی خریدے جائیں گے اور اگر حصص کے ساتھ قرض تمسکات بھی خریدنا لازم ہو تو سوال میں ذکر کردہ نیت کے ساتھ خریدنا جائز ہے، لیکن جتنے میں خریدا ہے اس سے زیادہ پر فروخت کرنے کی گنجائش نہیں، زائد رقم سود ہوجائے گی۔

اسی طرح فروختگی سے پہلے اس پر جو سود کا اضافہ ہو چکا ہو اس کو بھی شامل کر کے دونوں کی مجموعی قیمت پر بھی فروخت کرنا جائز نہیں، بلکہ خالص قرض کی رقم پر فروخت کیا جائے، البتہ کم پر فروخت کرنے کی گنجائش ہے، کیونکہ سوال میں اگرچہ اسے ''فروختگی'' سے تعبیر کیا گیا ہے مگر حقیقت میں یہ ''خرید وفروخت'' نہیں، ''حوالہ'' ہے، اگر بیع کی نیت ہو تو کسی طرح یہ بیع جائز نہ ہوگی، کیونکہ دین کی بیع درست نہیں، درمختار میں ہے:

''وأفتی المصنف ببطلان بیع الجامکیة لما فی الأشباہ بیع الدین إنما یجوز من المدیون، وفی ردالمحتار إذا باع الدین من غیر من ھو علیه کما ذکر لا یصح''۔

ہاں اگر حوالہ کی نیت کی جائے تو یہ معاملہ جائز ہوگا مگر پھر حوالہ کی ساری شرائط کا لحاظ رکھنا ضروری ہوگا، یہاں تین فریق ہیں:

محیل: حوالہ کرنے والا یعنی وہ شخص جس نے کمپنی سے قرض تمسک خریدا ہے۔

محتال: جس کا قرض دوسرے کے حوالہ کیا جارہا ہے یعنی کمپنی۔

محتال علیہ: جسے اب قرض کی وصولیابی کا ذمہ دار بنایا جارہا ہے یعنی وہ شخص جو قرض تمسک خریدنے والے سے قرض تمسک خرید رہا ہے۔

محیل قرض تمسکات پر زائد رقم اس لئے نہیں لے سکتا کہ حوالہ کرنا ہے، اور کم اس لئے لے سکتا ہے کہ اسے جائز تھا کہ وہ قرض کی پوری رقم حوالہ کرے یا اس کا کوئی جز۔

محیل کا جو قرضہ کمپنی کے ذمہ تھا، اس نے اسے محتال علیہ سے وصول کر کے اور قرض تمسکات محتال علیہ کے سپرد کر کے یہ بتادیا کہ اب یہ قرضہ کمپنی سے تم وصول کرو اور اپنے پاس رکھ لو، یہاں اہم بات یہ ہے کہ جب محیل نے قرض تمسکات دے کر محتال علیہ سے کمپنی پر عائد شدہ قرض کی رقم وصول کرلی تو یہ محتال علیہ کا قرض دار ہوگیا اور محتال علیہ قرض خواہ، اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ اگر محتال علیہ کمپنی سے کسی وجہ سے تمسکات کی رقم وصول کرنے پر قادر نہ رہا تو جو رقم وہ محیل کو دے چکا ہے محیل اسے لوٹائے گا (دیکھئے: ہدایہ ۳/ ۱۲۹، تنقیح فتاوی حامدیہ ۱/ ۲۹۳)۔

قرض تمسکات کو کم قیمت پر حوالہ (فروخت) کرنے کی صورت میں محتال (مشتری) سے کہہ دیا جائے کہ تمہاری دی ہوئی رقم سے جو زائد رقم تم کو ملے گی (یعنی اصل قرض تھا ایک ہزار روپئے، حوالہ ہوئی نوسو روپئے کی تو قرض تمسکات پر محتال کو ایک سو روپئے زائد ملے) وہ تمسکات سے روپئے حاصل کرنے کی دوڑ دھوپ کی اجرت میں رکھ لینا، ساتھ ہی اسے یہ بھی بتادیا جائے کہ ان تمسکات پر جو سود لگ رہا ہے اسے وصول نہ کرنا، اس کے بعد بھی وہ وصول کرے گا تو خود گنہگار ہوگا، اس کی ذمہ داری ختم ہوجائے گی (دیکھئے: امداد الفتاوی ۳/ ۴۹۱)۔

۱۰۔ خریدے جاسکتے ہیں اور ان تمسکات پر ملنے والے سود کو بلا نیت ثواب غرباء پر صدقہ کردیا جائے۔

۱۱۔ قرض تمسکات کی فروختگی دراصل حوالہ ہے اور حوالہ کی ہی نیت وشرائط کے ساتھ جائز ہوسکتا ہے ورنہ نہیں، جیسا کہ سوال نمبر ۹ کے جواب کے تحت تفصیل سے لکھا جاچکا ہے، لہذا زائد قیمت پر فروخت (حوالہ) کرنا جائز نہیں ہے۔

مضمر حصص کی قیمت میں کمی بیشی کا کوئی اعتبار نہ ہوگا بلکہ قرض تمسکات جتنی رقم کے ہیں وہی رقم معتبر ہوگی اور اسی کی حوالگی صحیح ہوگی۔

۱۲۔ کمپنی اور بازار دونوں سے خریدے جاسکتے ہیں لیکن کمپنی سے خریدنا دراصل کمپنی کو قرض دے کر سند قرض حاصل کرنا ہے، لیکن بازار سے خریدنا بیع کی نیت وشرط کے ساتھ جائز نہیں کیونکہ یہ حوالہ ہے، لہذا حوالہ کے احکام پر عمل درآمد ضروری ہے، جن کی تفصیل گذر چکی ہے۔

۱۳۔ مذکورہ قرض تمسکات میں بھی حوالہ کے احکام پر عمل کرسکتے ہیں، لیکن ''فائدہ'' غالبا نہ ہوسکے گا کیونکہ زائد پر فروخت (حوالہ) کرنے کی گنجائش نہیں ہے۔

۱۴۔ احقر کے نزدیک یہ صورت جائز معلوم ہوتی ہے، اس کی نظیر انکم ٹیکس (Income Tax) وسیل ٹیکس (Sale Tax) میں سودی رقم دینے کا جواز ہے (فتاوی رحیمیہ ۳/۱۷۵، نظام الفتاوی ۲/۴۳۰، ۴۳۱)۔

۱۵۔ ناقابل تبدیل اجزاء کی فروخت (حوالگی) پر اضافی رقم نہیں لی جاسکتی، لہذا یہ سوال ہی ختم ہوجاتا ہے کہ حصص کی لاگت کو اضافی قیمت سے منہا کرکے کم کیا جاسکتا ہے یا نہیں۔

۱۶۔ ناقابل تبدیل اجزاء کے حوالہ (فروخت) کرنے پر ''نقصان'' سے مراد یہ ہو کہ اتنی رقم نہ مل پائے گی جو حصص مضمر ہونے کی صورت میں ملتی، لیکن وہ رقم مل جائے گی جو اب کمپنی کے ذمہ قرض رہ گئی ہے، تو یہ نقصان شرعا نقصان نہیں، لہذا سود سے اس کی تلافی کا کیا سوال۔

لیکن اگر نقصان سے مراد یہ ہو کہ اتنی رقم نہ مل پائے گی جو اب کمپنی کے ذمہ باقی رہ گئی ہے تو بھی موجودہ صورت میں سود کی رقم سے اس کی تلافی احقر کے نزدیک جائز نہیں، کیونکہ سود ملا ہے کمپنی سے اور نقصان ہوا ہے کسی اور کو ناقابل تبدیل اجزاء حوالہ (فروخت) کرنے سے۔

جہاں تک سوال نمبر ۱۴ کا تعلق تھا تو اس میں اضافی رقم لینا اور سود دینا، دونوں کام کمپنی ہی کرتی تھی، لہذا جو رقم جہاں سے آئی تھی وہیں پہنچ گئی، پھر موجودہ صورت میں نقصان کا کیا سوال؟ ناقابل تبدیل اجزاء کی رقم کمپنی تو دے گی ہی، خواہ تاخیر سے ہی سہی۔

۱۷۔ قرض تمسکات پر ملا سود واجب التصدق ہوگا اور قرض تمسکات کی فروخت (حوالہ) پر منافع کا سوال ہی نہیں، تفصیل جواب نمبر ۹ کے تحت گذری ہے۔

۱۸۔ حصص کی بیع منقول کی بیع ہے اور منقولات کی بیع بلا قبضہ جائز نہیں ہے۔

''وبيع المنقول قبل القبض لا يجوز بلا خلاف بين أصحابنا'' (بدائع الصنائع ۵،۳۰۶)۔

بزازیہ میں ہے: ''لا يصح بيع المنقول قبل قبضه من البائع أو الأجنبي لنهيه عليه الصلوة والسلام عن بيع مالم يقبض'' (بزازیہ ۴،۳۹۶، شامی ۴،۱۶۲، فتح القدير ۶،۱۳۵)۔

نام کی منتقلی ہی قبضہ ہے، جب نام منتقل نہیں ہوا تو قبضہ نہیں ہوا، لہذا یہ خرید وفروخت جائز نہ ہوگی۔

۱۹۔ قرض تمسکات کو زائد رقم پر فروخت (حوالہ) نہیں کیا جاسکتا، انتظار کیا جائے اور حصص میں تبدیل ہونے کے بعد فروخت کیا جائے تاکہ زائد رقم جائز رہے، چونکہ یہ حوالہ ہے اس لئے قبضہ کی شرط نہیں ہے، نام منتقل ہوئے بغیر بھی ''حوالہ'' کرنا جائز ہے، لیکن زائد رقم لینا جائز نہیں ہے۔

☆☆☆

کمپنی و حصص

مفتی اسماعیل بھدکودروی، گجرات

۱۔ کمپنی کی جس اسکیم میں سود پر قرض لینا شامل ہو، ایسی اسکیم بنا کر اجرت لینا جائز نہیں ہے، کیونکہ باختیار خود سودی قرض لینے کا مباشر بننا ہے۔

۲۔ سودی قرض دلانے کی کارروائی میں مدد کر کے اجرت حاصل کرنا جائز نہیں ہے، حدیث شریف میں سودی معاملہ میں معاون بننے پر بھی وعید وارد ہوئی ہے۔

۳۔ ناقابل تبدیل سودی قرض تمسکات سے متعلق امور انجام دے کر اجرت حاصل کرنا جائز نہیں ہے، یہ حکم کمپنی کے غیر حصہ دار کے لئے مذکورہ تمسکات کی کارروائی سے متعلق ہے، کیونکہ کمپنی کے پرانے حصہ دار کے لئے بطور حق سودی قرض تمسکات سے متعلق امور انجام دے کر اجرت حاصل کرنا محل غور وفکر ہے۔

۴۔ اس صورت میں بھی غیر شریک کے لئے حصص سے منسلک ناقابل تبدیل قرض تمسکات کے اجراء سے متعلق امور انجام دے کر اجرت حاصل کرنے کا حکم جواب نمبر ۳ کی طرح ناجائز ہے اور حصہ دار کے لئے یہ امور انجام دے کر اجرت حاصل کرنا محل غور وفکر ہے۔

۵۔ کلی طور پر قابل تبدیل سودی قرض تمسکات سے متعلق امور انجام دے کر اجرت حاصل کرنا جائز ہے، چاہے یہ امور کمپنی کے حصہ دار کے لئے انجام دیئے جائیں یا غیر حصہ دار کے لئے، دونوں صورتوں میں اجرت لینا جائز ہے کیونکہ سود کے نام سے ملنے والی رقم کو برابری کے حصص کی قیمت کی کمی پر محمول کیا جاسکتا ہے۔

جزوی طور پر قابل تبدیل قرض تمسکات سے متعلق امور غیر حصہ دار کے لئے انجام دے کر اجرت حاصل کرنا ناجائز ہے، البتہ حصہ دار کے لئے یہ امور انجام دینا اور اجرت حاصل کرنا محل غور ہے۔

۶۔ اس صورت میں سود کا دخل نہیں ہے، لہذا ایسے غیر سودی قرض تمسکات سے متعلق امور انجام دے کر اجرت حاصل کرنا جائز ہے، اس صورت میں اگرچہ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ قرض دے کر برابری کے حصص کم قیمت میں حاصل کرنے کا فائدہ اٹھانا پایا جاتا ہے، مگر اس قرض تمسکات کے سرمائے میں اگر یہ توجیہ کی جائے کہ یہ سرمایہ قرض نہیں ہے بلکہ ملنے والے حصص کی داخل کردہ قیمت ہے، تو پھر قرض دے کر اس سے کم قیمت میں حصص حاصل کرنے کا اشکال باقی نہ رہے گا۔

۷، ۸۔ حکیم الامت حضرت مولانا تھانویؒ نے ایسی کمپنی کے شیئرز خرید کر اس میں سرمایہ لگانے کا یہ حل تحریر فرمادیا ہے کہ: سو جس حصہ دار کو حصہ داخل کرتے وقت اس کی اطلاع نہ ہو اس نے تو کارکنان کمپنی کو ان دو امر کا وکیل ہی نہیں بنایا، اس لئے کارکنوں کا یہ فعل اس کی طرف منسوب نہ ہوگا، اور جس کو اطلاع ہو وہ تصریحاً اس سے ممانعت کردیں، گو اس ممانعت پر عمل نہ ہوگا مگر اس ممانعت سے اس فعل کی طرف نسبت تو نہ ہوگی (امداد الفتاوی ۳/ ۴۹۱)۔

۹۔ حصص سے منسلک ناقابل تبدیل یا قابل تبدیل سودی قرض تمسکات بازار سے خریدنا نہ کمپنی کے پرانے حصہ دار کے لئے جائز ہے نہ غیر حصہ دار کے لئے، اس لئے کہ یہ صورت تو نقد رقم دے کر دوسرے سے اس کا کمپنی کو دیا ہوا قرض خریدنا ہے اور اگر نقد رقم اور قرض تمسکات میں ادا شدہ سرمایہ میں کمی زیادتی ہو تو اور بھی زیادہ مذموم ہے کہ ربائے فضل کا تحقق بھی ہوگا۔

کلی قابل تبدیل سودی قرض تمسکات کو براہ راست کمپنی سے خریدنا حصہ دار اور غیر حصہ دار دونوں کے لئے جائز ہو اس کی گنجائش ہے، کیونکہ اس صورت میں ملنے والے سود کو برابری کے حصص کی قیمت کی کمی پر محمول کیا جاسکتا ہے۔

جزوی طور پر قابل تبدیل سودی قرض تمسکات کو براہ راست کمپنی سے خریدنا غیر حصہ دار کے لئے تو جائز نہیں ہے، کیونکہ اس کے سرمایہ کا ناقابل تبدیل جز تو خالص سودی قرض ہی میں محبوس رہے گا، البتہ کمپنی کے حصہ دار کے لئے ایسے تمسکات کا خریدنا محل غور وفکر ہے۔

۱۰۔ اس میں بھی وہی تفصیل ہے جو نمبر ۹ کے جواب میں مذکور ہوئی اور اس صورت میں ایسی نیت کرنے سے کہ ان تمسکات کو بقدر ضرورت (یعنی حصص میں تبدیل ہونے تک) ہی روکا جائے گا، خریداری کے ناجائز ہونے پر کچھ اثر نہ ہوگا۔

۱۱۔ قابل تبدیل قرض تمسکات کے حصص میں تبدیل ہونے سے پہلے ان کو فروخت کرنا اور منافع حاصل کرنا جائز نہیں ہے کیونکہ سرمایہ تمسکات کے حصص میں تبدیل ہونے سے پہلے یہ سرمایہ دین کے عوض کی زیادتی کے ساتھ تبادلہ ہے جو کھلا ہوا سودی معاملہ ہے۔

۱۲۔ مذکورہ غیر سودی قابل تبدیل تمسکات کو براہ راست کمپنی سے خریدنا کمپنی کے حصہ دار اور غیر حصہ دار دونوں کے لئے جائز ہے، مگر بازار سے خریدنا جائز نہیں ہے کیونکہ یہ سرمایہ نقد و دین کا کمی زیادتی کے ساتھ تبادلہ ہوگا۔

۱۳۔ نا قابل تبدیل قرض تمسکات اور جزوی طور پر قابل تبدیل قرض تمسکات کی پیشکش سے دوسرے کے حق میں دستبردار ہو کر اس کا عوض لینا جائز نہیں ہے، کیونکہ کمپنی کے حصہ دار کے لئے ان دونوں قسم کے تمسکات کا لینا قابل غور وفکر ہے اور غیر حصہ دار کے لئے تو اس کا لینا جائز ہی نہیں ہے، اور کلی طور پر قابل تبدیل سودی قرض تمسکات کا خریدنا (ادائیگی قیمت اور ملنے والے سود میں نقص قیمت کی تاویل سے) اگر چہ جائز ہے مگر کمپنی تو اس کو قرض ہی کا نام دیتی ہے اور حق اقراض سے دستبرداری کا عوض لینا جائز نہیں ہے، لہذا احتیاط یہی ہے کہ اس قسم کے تمسکات سے دوسرے کے حق میں دستبردار ہو کر فائدہ نہ حاصل کیا جائے۔

۱۴۔ جیسا کہ مذکورہ بالا جوابات میں واضح کیا گیا ہے اس کے مطابق کلی طور پر قابل تبدیل سودی تمسکات پر ملنے والے سود کو حصص کی قیمت کی کمی پر محمول کیا جاسکتا ہے۔

۱۵۔ اس طرح قرض تمسکات کے نا قابل تبدیل اجزاء کے فروخت پر حاصل شدہ اضافہ کو حصص کی اضافی قیمت میں سے منہا سمجھنا درست نہیں ہے، کیونکہ حصص کی اضافی قیمت کمپنی حاصل کرتی ہے اور نا قابل تبدیل اجزاء کے فروخت پر ملنے والا اضافہ اس کے خریدار سے حاصل ہوتا ہے، جو سودی معاملہ سے حاصل ہوا ہے۔

۱۶۔ قرض تمسکات کے نا قابل تبدیل اجزاء کے فروخت پر ہوئے نقصان کی تلافی اس پر ملنے والے سود سے کرنا جائز نہیں ہے، کیونکہ نقصان خریدار سے ہونے والے سودی معاملہ میں ہے اور ملنے والا سود کمپنی ادا کرتی ہے۔

۱۷۔ سوال نمبر ۱۵ اور ۱۶ میں ذکر کردہ جزوی طور پر قابل تبدیل قرض تمسکات کا خریدنا ہی ناجائز ہے، اگر کسی نے لاعلمی میں خرید لیا تو اس کے سود کو بلا نیت ثواب فقراء پر صدقہ کردینا چاہئے اور اگر لاعلمی میں نفع لے کر دوسرے کو فروخت کردیا تو اگر اس معاملہ کو فسخ کرنا دشوار ہو تو لیا ہوا نفع خریدار کو واپس کردے، اس لئے کہ یہ نفع شرعاً سود ہے اور اس کا مالک معلوم ہے۔

۱۸۔ حصص کی خرید وفروخت کا مطلب حصہ دار (شیئر ہولڈر) کمپنی کے مشترکہ اثاثوں میں سے جس مشاع حصہ کا مالک ہے اس حصہ کی خرید وفروخت کرنا ہے، اور اپنے نام حصص کو منتقل کرنے کا مطلب تو صرف اپنی ملکیت کا دستاویزی ثبوت اور استحکام فراہم کرنا ہے، اور ظاہر ہے کہ مالک حصص کی ملکیت شرعاً دستاویزی ثبوت پر موقوف نہیں ہے، لہذا شیئر ہولڈر اپنے مملوکہ حصص اپنے نام منتقل کرائے بغیر بھی فروخت کرسکتا ہے، کمپنی کے مشترکہ اثاثوں میں اشیاء غیر منقولہ (مکانات، فیکٹری وغیرہ) اور اشیاء منقولہ (فرنیچر، تیار شدہ مال، خام مال، نقد سرمایہ وغیرہ) دونوں قسم کی چیزیں شامل ہیں، اشیاء غیر منقولہ کی فروخت تو قبضہ سے قبل ہی جائز ہے مگر اشیاء منقولہ کی فروخت قبضہ کے بعد جائز ہے، لیکن کارکنان کمپنی شیئر ہولڈر کے وکیل ہیں اس لئے ان کا قبضہ مالک کا قبضہ شمار ہوگا، کمپنی کی اشیاء مشترکہ میں نقد سرمایہ بھی شامل ہوگا، لہذا حصص کی فروخت میں بظاہر مالک حصص کا سرمایہ نقد کا حصہ بھی شامل ہوگا، اور سرمایہ نقد کے تبادلہ میں طرفین سے قبضہ ہونا شرط ہے، ورنہ معاملہ جائز نہ ہوگا، اور یہاں مجلس میں طرفین کا قبضہ نہیں پایا جائے گا اس پیچیدگی کا حل حکیم الامت حضرت مولانا تھانویؒ نے ان الفاظ میں تحریر فرمایا ہے: "رہا قصہ تقابض کا سو اس کا ایک حیلہ ہوسکتا ہے، وہ یہ کہ مشتری بائع سے یوں کہے کہ تمہارا جتنا روپیہ کمپنی میں ہے میں اپنے اس زرثمن میں سے تم کو اس قدر (قرض) دیتا ہوں اور تم اس قرض کا حوالہ اس کمپنی پر کردو، کہ اس سے وصول کروں یا کسی کام میں لگوا دوں، اور جو زرثمن میں اس روپئے سے کچھ زیادہ ہے، اس کے عوض تمہارے حصہ کا سامان از قبیل عروض خریدتا ہوں" (امداد الفتاوی ۳؍ ۴۹۲)۔

۱۹۔ مذکورہ تمسکات میں لگے ہوئے سرمایہ کے حصص میں تبدیل ہونے سے پہلے (چاہے وہ تمسکات مالک کے نام منتقل ہوئے ہوں یا نہ ہوئے ہوں) ان تمسکات کو کمپنی کے علاوہ کسی دوسرے سے خریدنا یا کمپنی سے خرید کر کسی دوسرے کو فروخت کرنا، یہ سرمایہ نقد و دین کا کمی زیادتی کے ساتھ تبادلہ کا معاملہ ہے، جو سودی معاملہ ہے، لہذا جائز نہیں ہے۔

☆☆☆

کمپنی سے متعلق جوابات کی تلخیص

(۱۹ سوالات کے جوابات)

مفتی محمد فہیم اختر ندوی

۱۔ جائز نہیں ہے (مولانا شمس پیرزادہ، مفتی اسماعیل)
سوال واضح نہیں ہے (مولانا محمد برہان الدین سنبھلی)
اجرت لینا جائز ہے (مفتی جمیل احمد نذیری، مفتی محمد عبید اللہ اسعدی)۔

۲۔ جائز نہیں ہے (مفتی اسماعیل، مولانا شمس پیرزادہ، مولانا محمد برہان الدین سنبھلی، مفتی جمیل احمد نذیری)۔
اگر وہ کمپنی جواز کا فتوی لے چکی ہے اور یہ مدد محنت و وقت کی قربانی کے ساتھ ہو تو درست ہے (مولانا محمد عبید اللہ اسعدی)۔

۳۔ حاصل کی جا سکتی ہے (مفتی جمیل احمد نذیری)۔
جائز نہیں ہوگی (مفتی محمد عبید اللہ اسعدی، مولانا محمد برہان الدین سنبھلی، مولانا شمس پیرزادہ)۔
کمپنی کے غیر حصہ دار کے لئے درست نہیں ہے، پرانے حصہ دار کے لئے محل غور وفکر ہے (مفتی اسماعیل)۔

۴۔ نہیں کی جا سکتی (مولانا شمس پیرزادہ، مولانا محمد برہان الدین سنبھلی، مفتی محمد عبید اللہ اسعدی)۔
حاصل کی جا سکتی ہے (مفتی جمیل احمد نذیری)۔
غیر حصہ دار کے لئے درست نہیں ہے، حصہ دار کے لئے محل غور ہے (مفتی اسماعیل)۔

۵۔ جائز نہیں ہے (مولانا محمد برہان الدین سنبھلی، مولانا شمس پیرزادہ، مفتی محمد عبید اللہ اسعدی)۔
اجرت حاصل کی جا سکتی ہے (مفتی جمیل احمد نذیری)۔
کلی طور پر قابل تبدیل میں درست ہے، جزوی طور پر قابل تبدیل میں غیر حصہ دار کے لئے درست ہے (مفتی اسماعیل)۔

۶۔ اجرت حاصل کی جا سکتی ہے (مفتی جمیل احمد نذیری، مفتی محمد عبید اللہ اسعدی، مولانا محمد برہان الدین سنبھلی، مفتی اسماعیل)۔
جائز نہیں ہے (مولانا شمس پیرزادہ)۔

۷۔ جائز نہیں ہے (مولانا محمد برہان الدین سنبھلی)۔
جائز ہے (مفتی محمد عبید اللہ اسعدی، مولانا شمس پیرزادہ، مفتی اسماعیل)۔
جائز ہے بشرطیکہ کمپنی کا کاروبار مباح ہو (مفتی جمیل احمد نذیری)۔

۸۔ کی جا سکتی ہے (مفتی جمیل احمد نذیری، مفتی اسماعیل، مولانا شمس پیرزادہ، مفتی محمد عبید اللہ اسعدی)۔
سود پر لئے قرض کی رقم اور غیر سودی رقم کے کاروبار علاحدہ علاحدہ ہوں تو جائز ہے (مولانا محمد برہان الدین سنبھلی)۔

۹۔ جائز نہیں ہے (مولانا شمس پیرزادہ، مفتی محمد عبید اللہ اسعدی، مفتی اسماعیل)۔

جائز ہے بشرطیکہ جتنے میں خرید اہے اسی قیمت پر فروخت کرے (مفتی جمیل احمد نذیری)۔

اگر حصص غیر سودی ہوں تو انہیں فروخت کی غرض سے خرید نا شرعا جائز ہے (مولانا محمد برہان الدین سنبھلی)۔

۱۰۔ نہیں (مولانا شمس پیرزادہ، مفتی محمد عبید اللہ اسعدی)۔

اگر حصص غیر سودی ہوں تو انہیں بغرض فروخت خرید نا درست ہے (مولانا محمد برہان الدین سنبھلی)۔

خریدے جاسکتے ہیں (مفتی جمیل احمد نذیری)۔ بازار سے خرید نا درست نہیں ہے (مفتی اسماعیل)۔

۱۱۔ درست نہیں ہے (مفتی اسماعیل، مولانا محمد برہان الدین سنبھلی، مولانا شمس پیرزادہ، مفتی محمد عبید اللہ اسعدی)۔

زائد رقم پر فروختگی درست نہیں ہے، جتنی رقم کے قرض تمسکات ہیں وہی رقم معتبر ہوگی (مفتی جمیل احمد نذیری)۔

۱۲۔ نہیں (مولانا شمس پیرزادہ، مفتی محمد عبید اللہ اسعدی)۔ جائز ہے (مولانا محمد برہان الدین سنبھلی)۔

کمپنی سے خرید نا درست ہے، بازار سے خریدنے میں حوالہ کے احکام پر عمل ضروری ہے کیونکہ یہ حوالہ ہے (مفتی جمیل احمد نذیری)۔

کمپنی سے خرید نا جائز ہے، بازار سے خرید نا درست نہیں ہے (مفتی اسماعیل)۔

۱۳۔ جائز نہیں (مفتی محمد عبید اللہ اسعدی، مفتی اسماعیل)۔ فائدہ حاصل کیا جاسکتا ہے (مولانا شمس پیرزادہ)۔

اس میں بھی حوالہ کے احکام پر عمل کر سکتے ہیں (مفتی جمیل احمد نذیری)۔

محض ''پیشکش'' شرعا قابل عوض نہیں، لہذا درست نہیں ہے (مولانا محمد برہان الدین سنبھلی)۔

۱۴۔ درست نہیں ہے (مولانا شمس پیرزادہ)۔ جائز معلوم ہوتی ہے (مفتی جمیل احمد نذیری، مفتی اسماعیل)۔

سوال سمجھ میں نہیں آیا (مفتی محمد عبید اللہ اسعدی، مولانا محمد برہان الدین سنبھلی)۔

۱۵۔ نا قابل تبدیل اجزاء کی فروخت پر اضافی رقم نہیں لی جاسکتی، لہذا یہ سوال ہی ختم ہوجاتا ہے (مفتی جمیل احمد نذیری)۔

درست نہیں ہے (مولانا شمس پیرزادہ، مفتی اسماعیل)۔ سوال سمجھ میں نہیں آیا (مفتی محمد عبید اللہ اسعدی، مولانا محمد برہان الدین سنبھلی)۔

۱۶۔ نہیں (مولانا شمس پیرزادہ، مفتی محمد عبید اللہ اسعدی، مفتی جمیل احمد نذیری، مفتی اسماعیل)۔

جس سے سود وصول ہوا ہے اسی کو وہ رقم دی جائے تو جائز، ورنہ نہیں (مولانا محمد برہان الدین سنبھلی)۔

۱۷۔ بلا نیت ثواب فقراء ومساکین پر صدقہ کردینا چاہئے (شمس پیرزادہ، مفتی اسماعیل، مفتی محمد عبید اللہ اسعدی)۔

واجب التصدق ہوگا (مفتی جمیل احمد نذیری)۔ یہ سوال ہی بے محل ہے (مولانا محمد برہان الدین سنبھلی)۔

۱۸۔ جائز ہے (مولانا شمس پیرزادہ، مفتی اسماعیل)۔ جائز نہیں ہے (مفتی جمیل احمد نذیری)۔

بیع قبل القبض کی صورت نہ پیدا ہو تو جواز ہے (مولانا محمد برہان الدین سنبھلی)۔

۱۹۔ جائز نہیں ہے (مفتی اسماعیل)۔ چونکہ یہ حوالہ ہے اس لئے درست ہے، لیکن زائد رقم لینا جائز نہیں ہے (مفتی جمیل احمد نذیری)۔

بیع قبل القبض کی صورت نہ پیدا ہو تو درست ہے (مولانا محمد برہان الدین سنبھلی)۔ قرض تمسکات خرید نا جائز نہیں، تو فروخت کا کیا سوال (مولانا شمس پیرزادہ)۔

نوٹ: مفتی نظام الدین صاحب نے ''کمپنی میں سرمایہ کاری'' مضمون کے ذیلی عناوین پر تبصرہ فرمایا ہے، نیز مولانا حبیب الرحمن خیرآبادی صاحب نے ایک عمومی تبصرہ ایک صفحہ کے مضمون میں فرمایا ہے، ان دونوں کی تلخیص شامل نہیں ہے۔

☆☆☆

کمپنی کے کاروبار سے متعلق چند مزید سوالات

۱۔ کمپنیز کی اپنے کاروبار کی نوعیت کے اعتبار سے تین قسمیں ہوسکتی ہیں:

۱۔ وہ کمپنیاں جن کا کاروبار حلال ہو۔

۲۔ وہ کمپنیاں جن کا کاروبار حرام ہو۔

۳۔ وہ کمپنیاں جن کا بنیادی کاروبار حلال ہے، لیکن ان کو بعض اوقات سودی لین دین میں ملوث ہونا پڑتا ہے۔

ظاہر ہے کہ نمبر ۲ میں مذکور کمپنی میں حصہ لینا جائز نہیں اور نمبر ۱ میں حصہ لینا جائز ہے، نمبر ۳ کے بارے میں کیا شرعی حکم ہے؟

اس ضمن میں اس حقیقت کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے کہ کمپنی خود ایک فرد اعتباری ہے جس کا قانونی وجود تسلیم کیا جاتا ہے، کمپنی کا طریقہ کار یہ ہوتا ہے کہ تمام شیئرز ہولڈرس مل کر مجموعی طور پر کمپنی کے مالکان ہوتے ہیں، کمپنی کو اپنی میٹنگ میں کثرت رائے سے بورڈ آف ڈائرکٹرس یعنی انتظامیہ کا انتخاب کرنا ہوتا ہے، کمپنی کا یہ انتظامیہ کمپنی کو چلانے اور اس کی پالیسی کے بارے میں ان فیصلوں کا پابند ہوگا جو کمپنی کی مجلس عمومی طے کرے گی، مجلس عمومی سے مراد وہ مجلس ہے جس کے رکن تمام حصہ دار ہوں گے، واضح رہے کہ ہر حصہ دار کے ووٹ کی قیمت اس کے حصص کے تناسب سے متعین ہوگی، کمپنی کے ہر حصہ دار کو مجلس عمومی کی نشست میں کمپنی کے بارے میں اظہار خیال کا حق ہوگا، اگر کوئی شخص کمپنی کی کسی ایسی پالیسی کو جس میں سودی لین دین کا ارتکاب ہوتا ہو پسند نہیں کرتا ہو تو اس پالیسی پر وہ اعتراض کرسکتا ہے اور وہ یہ بھی کوشش کرسکتا ہے کہ اس کی رائے کو اکثریت حاصل ہو، عمل بہر حال اسی رائے پر ہوگا جو کثرت رائے سے منظور کی جائے، اب یہاں پر چند سوالات پیدا ہوتے ہیں:

الف۔ شیئرز ہولڈر (اپنی انفرادی حیثیت میں) اور بورڈ آف ڈائرکٹرس کے درمیان کیا رشتہ ہے؟ کیا بورڈ آف ڈائرکٹرس کے ہر تصرف اور عمل کی نسبت ہر شیئرز ہولڈر کی طرف کی جائے گی؟ کمپنی قوانین کے ماہرین کا خیال یہ ہے کہ بورڈ آف ڈائرکٹرس، شیئرز ہولڈرس کی انفرادی حیثیت میں نمائندگی نہیں کرتا ہے، بلکہ وہ کمپنی کی نمائندگی کرتا ہے جس کا خود علاحدہ قانونی وجود ہے۔

ب۔ اگر کوئی شیئرز ہولڈر مجلس عمومی میں کسی ایسی پالیسی کی مخالفت میں ووٹ دیتا ہے جو سودی لین دین پر مشتمل ہو اور اکثریت حاصل نہیں ہونے کے باعث اس کی مخالفت کامیاب نہیں ہوتی، تو کیا اسے اس صورت میں سودی لین دین کے اس عمل کی ذمہ داری سے بری الذمہ قرار دیا جاسکتا ہے؟

۲۔ مالیاتی ادارے اجرت پر لوگوں کی مختلف خدمات بھی انجام دیا کرتے ہیں، منجملہ ان خدمات کے ایک کام مختلف کمپنیوں کے پروجیکٹ بنانا بھی ہے، کیا اسلامی مالیاتی ادارہ اس طرح کی فنی خدمات انجام دے سکتا ہے جبکہ بعض کمپنیوں کی اسکیمیں ایسی بھی ہوں گی جن میں حصہ داروں کے سرمایہ کے علاوہ:

(الف) سود پر قرض حاصل کرنا

(ب) ڈبینچر جاری کرنا (حصص میں قابل تبدیل اور نا قابل تبدیل)

(ج) حصص سے منسلک ڈبینچر جاری کرنا

(د) کچھ عرصے بعد کلی یا جزوی طور پر حصص میں تبدیل ہونے والے ڈبینچر جاری کرنا

(ھ) صفر سودی قرض تمسکات جاری کرنا بھی شامل ہے۔

واضح رہے کہ ڈبینچر سود بردار قرض تمسک کو کہتے ہیں یہ قرض تمسک جزوی یا کلی طور پر حصص میں تبدیل ہونے والے بھی ہوسکتے ہیں اور حصص میں تبدیل نہ ہونے والے بھی ہوسکتے ہیں، اول الذکر کو (کنورٹیبل ڈبینچر) (Convertible Debenture) اور آخر الذکر کو (نن کنورٹیبل ڈبینچر) (Non

Convertible Debenture) کہتے ہیں، صفر سودی قرض تمسک پر بظاہر نہ سود آتا ہے اور نہ اس کے بقدر زائد رقم کمپنی کو دی جاتی ہے، لیکن جن شیئرز میں یہ تمسک تبدیل ہوتے ہیں ان کی قدر، عرفی قدر سے نسبتاً زیادہ ہوتی ہے اور یہ اجراء سے قبل ہی طے پاتا ہے، حصص سے منسلک ڈبینچر کے اجراء کی اسکیم یہ ہے کہ سرمایہ کار کو حصص میں اگر سرمایہ کاری کرنی ہے تو سود بردار تمسکات میں بھی سرمایہ کاری لازماً کرنی ہوگی۔

۳۔ سوال ۲ (ج) میں حصص سے منسلک ڈبینچر کا ذکر ہے، اس اسکیم کے ذریعہ سرمایہ کار اگر سرمایہ کاری کرے اور اس سرمایہ کاری کے نتیجہ میں حاصل ہوئے ڈبینچر کو بازار میں فروخت کردے تو نتیجہ کے طور پر حصص میں جو خالص سرمایہ کاری ہوئی وہ اس قدر بازار سے حاصل کئے گئے حصص سے کم ہوتی ہے، کیا اس فائدہ کے پیش نظر اس اسکیم میں سرمایہ کاری جائز ہوگی؟

۴۔ سوال نمبر ۲ (د) میں حصص میں تبدیل سود بردار قرض تمسکات کے ذریعہ اگر سرمایہ کاری کی جائے اور صرف قرض تمسکات کے اس حصہ کو جو تبدیل ہو گیا ہوا چاہتا ہے برقرار رکھا جائے اور بقیہ کو بازار میں فروخت کردیا جائے تو بھی خالص سرمایہ کاری حصص میں بازاری قدر کے مقابلہ میں کم ہوگی، کیا اس فائدہ کے پیش نظر اس اسکیم میں سرمایہ کاری جائز ہوگی؟

۵۔ سوال نمبر ایک شق (ھ) میں دی گئی صفر سودی قرض تمسک اسکیم میں سرمایہ کاری کے لئے شرعی حکم کیا ہوگا؟

۶۔ سوال نمبر ۲ اور نمبر ۳ میں قرض تمسک اپنی قدر عرفی سے ہمیشہ کم قدر پر فروخت ہوتا ہے الا یہ کہ اسے حصص میں تبدیل ہونے سے قبل فروخت کردیا جائے، کیا قرض اپنی قدر عرفی سے کم یا زیادہ قدر پر فروخت کیا جاسکتا ہے؟ نیز اس پر حاصل ہوئے سود سے اس کے نقصان کی تلافی کیا ممکن ہے؟

۷۔ کمپنی کو سرکار، سرکاری مالیاتی ادارے، بینک یا دوسری ایجنسیوں سے قرض لینا پڑتا ہے اور مالیاتی ادارے ایسی درخواستوں کو منظور کرانے کے لئے کوشش اور پیروی کا کام اجرت پر کرتے ہیں تو کیا اسلامی مالیاتی اداروں کے لئے ایسی خدمات انجام دینا جائز ہوگا؟

۸۔ پہلے سے قائم اور مالی طور پر مستحکم کمپنیوں کے حصص کی بازاری قدر ان کی قدر عرفی سے کہیں زیادہ ہوتی ہے، ایسی کمپنیاں کبھی کبھی اپنے موجود حصہ داروں اور ڈبینچر ہولڈرس کو فائدہ پہنچانے کی غرض سے ان کے حصص اور ڈبینچر کی نسبت سے بطور حق انہیں قابل تبدیل ڈبینچر میں سرمایہ کاری کی پیش کش کرتی ہیں، یہ حق قابل تبدیل بھی ہوتا ہے، حقدار اپنا حق استعمال کرکے سرمایہ کاری کرنا مناسب نہ سمجھے تو اپنا حق بازار میں فروخت بھی کرسکتا ہے اور فائدہ اٹھا سکتا ہے، لیکن اس فائدہ سے یقیناً کم ہوتی ہے جو سرمایہ کاری سے حاصل ہوتی ہے، واضح رہے کہ اس اسکیم کے ختم ہونے کے بعد حصص کی قیمت بازار میں کم ہوجاتی ہے، سوال یہ ہے کہ اس طرح ملے حق کے ذریعہ قابل تبدیل ڈبینچر میں سرمایہ کاری کے لئے کیا شرعی حکم ہے؟ اور اس کی فروخت کے سلسلہ میں شرعی حکم کیا ہے؟

۹۔ کیا جزوی طور پر قابل تبدیل ڈبینچر کے حصص میں تبدیل ہوجانے کے بعد ناقابل تبدیل جز کے فروخت پر ہوئے نقصانات کی تلافی اس پر ملے سود سے کی جاسکتی ہے؟

۱۰۔ شیئرز میں حصص کے خریداروں کو دو زمروں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے: ۱۔ ایک وہ لوگ جو کہ حصص خرید کر انہیں اپنے نام منتقل کرا کر کمپنی میں نفع و نقصان کے مستحق ہیں، ۲۔ دوسرا وہ شخص جو کہ شیئرز بازار میں حصص کی قیمت کے اتار چڑھاؤ سے فائدہ اٹھانے کی غرض سے حصص کی خرید و فروخت کرتا ہے، کیا اس غرض سے حصص کی خرید و فروخت بغیر اپنے نام منتقل کرائے ہوئے جائز ہوگا؟

۱۱۔ (الف) کیا یہ شرعاً روا ہوگا کہ حصص کو رہن رکھ کر غیر سودی قرض حاصل کیا جائے یا دیا جائے؟

(ب) کیا یہ شرط روا ہوگا کہ ڈبینچر (سود بردار تمسکات) رہن رکھ کر سودی قرض حاصل کیا جائے یا دیا جائے؟

۱۲۔ عام طور سے حصص کو بازار سے خرید کر کمپنی میں اپنے نام منتقل کرانے میں ۳ ماہ کا عرصہ لگ جاتا ہے، اس عرصہ میں حصص کی قیمت میں کافی اتار چڑھاؤ کا امکان رہتا ہے، ایسے حالات میں اگر کسی قیمت میں اضافہ ہوجائے اور حصص جو کہ کمپنی کو بھیجے جاچکے ہیں لیکن منتقل ہوکر واپس نہیں آئے ہیں، ان کو مستقبل بازار میں بیچنے کا طریقہ اپنا کر سودا کیا جاسکتا ہے؟ اس طرح حصص بردار حصص ہاتھ میں نہ ہوتے ہوئے بھی حصص فروخت کرکے ان کی قیمت میں مستقبل میں آئی امکانی گراوٹ کے خطرہ سے اپنے آپ کو محفوظ کرسکتا ہے۔

سوال یہ ہے کہ اس طرح سے مالک کا حصص ہاتھ میں نہ ہوتے ہوئے بھی حصص کو بازار مستقبل میں بیع کرنا جائز ہوگا؟ ☆☆☆

کمپنی کے کاروبار سے متعلق جوابات

مولانا شیر محمد خاں رضوی، راجستھان

کمپنی کے حصص کے بارے میں کافی عرصہ سے غور وخوض جاری ہے، شیئرز ہولڈر، بورڈ آف ڈائرکٹر اور ڈبینچر کے باہمی تعلقات کے تمام تر پہلوؤں پر تامل کیا گیا، مگر ان میں جواز کی کوئی صورت نظر نہیں آتی ہے، ڈبینچر میں صریحاً سود کا پہلو موجود ہے، اس لئے اس کے عدم جواز میں کوئی شک نہیں "أحل الله البیع وحرم الربا"۔

رہا سوال شیئرز کا تو یہ بھی اقسام بیوع میں سے کسی بھی قسم کے تحت نہیں آتے، شرکت ومضاربت کی شرائط میں سے کسی بھی شرط پر من کل وجہ پورے نہیں آتے، البتہ شیئر میں ربا وقمار کا اشتباہ بظاہر عیاں ہے، اس لئے احتراز لازم ہے۔

کمپنی کے حصص کے تعلق سے فاضل بریلویؒ فتاوی رضویہ میں رقم طراز ہیں: ''ظاہر ہے کہ حصہ روپیوں کا ہے اور وہ اتنے ہی روپیوں کو بیچا جائے گا جتنے کا حصہ ہے یا کہ زائد کو بیچا گیا تو ''ربوا'' ہے، اور اگر مساوی ہی کو بیچا گیا تو ''صرف'' ہے، جس میں تقابض بدلین نہ ہوا، یوں حرام ہے'' (فتاوی رضویہ ۷/۱۱۱)۔

تمسکات کے بارے میں علماء دیوبند وبریلی شریف ہر دو کا یہی نظریہ ہے کہ اس سے احتراز کیا جائے۔

ڈاکٹر قدرت اللہ باقوی، میسور کرناٹک

ارسال کردہ سوال نامہ بہت دیر سے دستیاب ہونے پر مضامین پر نظر غائر ڈالنے کا موقع نصیب نہ ہوا، لہذا طائرانہ نظر وتوجہ کے سہارے جواب وخیالات پیش خدمت کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہوں، خدا کرے ان موضوعات پر خاص مطالعہ رکھنے والے بزرگوں سے استفادہ کا موقع نصیب ہو۔

۱۔ وہ کمپنی جن کا بنیادی کاروبار حلال ہے، لیکن ان کو بعض اوقات سودی لین دین میں ملوث ہونا پڑتا ہے اس کمپنی میں حصہ لینا جائز ہے، اس لئے کہ اس کا بنیادی کاروبار حلال ہے، چونکہ عام شیئر ہولڈرس مجموعی طور پر کمپنی کے مالک ہوتے ہیں، کمپنی کا انتظامیہ مجلس عمومی کے اشاروں کے ماتحت ہوتا ہے، ہر حصہ دار کو سودی لین دین کی پالیسی پر اعتراض کا حق ہے، اپنی رائے کو منوانا اور اکثریت حاصل کرنا اس کے زور وہمت اور اثر ورسوخ پر منحصر ہے، کم از کم حقیقت کو واضح کرنے کے لئے مواقع فراہم ہوتے رہتے ہیں اور اپنی مخالفت منوانے کے بجائے کم از کم اس کے عدم جواز کا اعلان تو کر سکتا ہے، لہذا اس کو سودی لین دین کی ذمہ داری سے بری الذمہ قرار دیا جاسکتا ہے۔

۲۔ اسلامی مالیاتی ادارہ مختلف کمپنیوں کے پروجیکٹ بنانے کی خدمات انجام دے سکتا ہے، غیر اسلامی کج راہ روی کی تدریجی اصلاح کی بے حد گنجائش اور علمی وہ ذہنی تبلیغ کے بے حساب مواقع فراہم ہوتے ہیں، ان خدمات سے دامن کش ہونا ''الساکت عن الحق'' کے تحت آنے کی گنجائش معلوم ہوتی ہے، چونکہ اس میں صفر سودی قرض تمسکات جاری کرنا بھی شامل ہے، اسلام میں تخمینات کی اصلاح کی اجازت ہے، حصص سے منسلک ڈبینچر کے اجراء کی اسکیم بھی تخمینہ ہے، اس لئے اسلامی مالیاتی ادارہ مجاز ہوسکتا ہے۔

۳، ۴۔ جائز ہے۔ ۵۔ صفر سودی قرض تمسک اسکیم میں منفعت متعین نہیں ہوتی، لہذا جائز قرار دی جاسکتی ہے۔ ۷۔ اسلامی مالیاتی اداروں کے لئے ایسی خدمات کا انجام دینا جائز ہے۔ ۸۔ زیر غور ہے۔ ۹۔ تلافی کی جاسکتی ہے۔ ۱۰۔ حصص کی خرید وفروخت اپنے نام منتقل کرانا بہتر ہے۔ ۱۱۔ روا

ہے۔ ۱۲۔ جائز ہے۔

مولانا شمس پیرزادہ رح، ممبئی

۱۔ جن کمپنیوں کا بنیادی کاروبار حلال ہے لیکن ان کو بعض اوقات سودی لین دین میں ملوث ہونا پڑتا ہے، ان میں حصہ لینا بحالات موجودہ جائز ہے، کیونکہ ان کا سودی لین دین ایک ضمنی بات ہے اور شاید ہی کوئی کمپنی ایسی ہو جو سودی لین دین سے بالکل بچی ہوئی ہو، ہر کمپنی کو بینک سے قرض لینا پڑتا ہے اور اس پر سود دیئے بغیر چارہ کار نہیں ہے، اور وہ ڈبینچر بھی جاری کرتی ہے، نیز ہر کمپنی اپنے ریزرو فنڈ پر سود بھی حاصل کرتی ہے، جو سود وہ وصول کرتی ہے وہ مقدار میں کم ہوتا ہے اور جو سود وہ ادا کرتی ہے وہ مقدار میں زیادہ ہوتا ہے، اس لئے کمپنی کے منافع (Dividend) میں عام طور سے شامل نہیں ہوتا۔

(الف) بورڈ آف ڈائرکٹرس کو کمپنی کے قوانین کے مطابق اختیارات حاصل ہوتے ہیں اور شیئرز ہولڈرس کی جو سالانہ میٹنگ ہوتی ہے اس کے ان فیصلوں کے وہ پابند ہوتے ہیں جو کثرت رائے سے ہوئے ہوں، اس لئے بورڈ آف ڈائرکٹرس کے ہر تصرف اور عمل کا ذمہ دار ہر شیئر ہولڈر کو نہیں قرار دیا جاسکتا۔

(ب) اگر کوئی شیئر ہولڈر مجلس عمومی میں سودی لین دین کی مخالفت کرتا ہے اور اکثریت حاصل نہ ہونے کی وجہ سے اس کی بات مانی نہیں جاتی تو موجودہ حالات میں اسے اس عمل کی ذمہ داری سے بری الذمہ قرار دینا پڑے گا۔

۲۔ مالیاتی ادارے مختلف کمپنیوں کے پروجیکٹ بنا سکتے ہیں اور اجرت پر فنی خدمات انجام دے سکتے ہیں بشرطیکہ ان کمپنیوں کا اصل کاروبار حرام نہ ہو اور نہ ان اداروں کو کسی حرام سے ملوث ہونا پڑتا ہو۔

۳۔ حصص سے منسلک ڈبینچر میں سرمایہ کاری جائز نہیں، کیونکہ یہ سودی معاملہ میں شرکت ہے۔

۴۔ حصص میں تبدیل سود بردار قرض تمسکات میں سرمایہ کاری جائز نہیں ہوگی، کیونکہ حصص میں تبدیل نہ ہونے والے ڈبینچر (Non Convertible Debenture) کا معاملہ کرنا خواہ وقتی طور پر ہی کیوں نہ ہو، سودی معاملہ میں شرکت کے مترادف ہے۔

۵۔ صفر سودی قرض تمسک (Zero Interest Debenture) میں سرمایہ کاری جائز ہوگی، کیونکہ ایسے ڈبینچر کچھ عرصہ بعد حصص میں تبدیل ہوجاتے ہیں، یعنی وہ (Convertible) ہیں اور سود سے خالی ہیں، لہذا ان ڈبینچر کی نوعیت سود بردار ڈبینچر کی نہیں ہے۔

۶۔ ڈبینچر قرض تمسک ہے اور اس کو قدر عرفی سے زیادہ قدر پر فروخت کرنے کا مطلب قرض پر سود حاصل کرنا ہے، رہا قدر عرفی (جو حقیقی قرض ہے) سے کم قدر پر فروخت کرنا تو یہ صورت ڈبینچر سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے جائز ہوگی، ورنہ قرض تمسک قابل فروخت چیز نہیں ہے۔

۷۔ کمپنیاں جن اداروں سے قرض لیتی ہیں وہ سود پر ان کو رقم دیتے ہیں، لہذا کسی اسلامی مالیاتی ادارہ کے لئے ایسے خدمات اجرت پر انجام دینا جائز نہ ہوگا۔

۸۔ قابل تبدیل ڈبینچر (Convertible Debenture) ایک عرصہ بعد ہی تبدیل کئے جاسکتے ہیں، اس وقت تک سودی معاملہ کرنا ہوگا، اس لئے ان میں سرمایہ کاری نہیں کی جاسکتی۔

۹۔ ڈبینچر کے ناقابل تبدیل جز کے فروخت پر ہوئے نقصان کی تلافی اس پر ملے سود سے نہیں کی جاسکتی، کیونکہ سود کمپنی دیتی ہے جبکہ فروخت کا معاملہ دوسرے شخص سے کیا جاتا ہے۔

۱۰۔ حصص کی خرید و فروخت بغیر اپنے نام منتقل کرائے جائز نہیں، کیونکہ نام پر منتقل کرائے بغیر اسے خرید و فروخت کے حقوق حاصل نہیں، وہ ابھی کمپنی کے حصص کا مالک نہیں بنا، اور ایسی خرید و فروخت پر قانونی پابندی بھی ہے۔

۱۱ (الف) حصص کو رہن رکھ کر غیر سودی قرض حاصل کرنے میں کوئی حرج نہیں کیونکہ حصص مالیت رکھنے والی چیز ہے۔

(ب) ڈبینچر خریدنا سودی معاملہ ہے، اس لئے یہ معاملہ کیا ہی نہ جائے، رہن وغیرہ رکھنے کا سوال پیدا ہی کہاں ہوتا ہے۔

۱۲۔ مالک کا حصص ہاتھ میں نہ ہوتے ہوئے یعنی اپنے نام منتقل کرانے سے پہلے حصص کو بازار مستقبل میں فروخت کرنا جسے (Forward Trading) کہتے ہیں جائز نہیں، وجوہ وہی ہیں جو جواب نمبر ۱۰ میں بیان ہوئے۔ (Stock Exchange) میں سٹے کا کاروبار اسی بنیاد پر ہوتا ہے۔

مولانا محمد شعیب اللہ مفتاحی، بنگلور

۱۔ (الف) شیئرز ہولڈر اور بورڈ آف ڈائرکٹرس کے مابین وکیل و مؤکل کا رشتہ ہے، شیئرز ہولڈر مؤکل ہوگا اور بورڈ آف ڈائرکٹرس (انتظامیہ) اس کا وکیل، کیونکہ کمپنی چلانے اور اس کی پالیسی میں یہ بورڈ ''کما ہو مصرح فی السوال'' ان فیصلوں کا پابند ہوگا جو کمپنی کے حصہ دار طے کرتے ہیں، لہذا بورڈ کے تصرف کو شیئر ہولڈر کا تصرف قرار دیا جائے گا، مگر چونکہ شیئر ہولڈر کو یہ حق ہے کہ وہ کمپنی کی کسی پالیسی سے اختلاف رائے رکھتا ہو تو وہ اس پر اعتراض کرے، اس لئے اگر کوئی شیئر ہولڈر کسی ناروا و ناجائز پالیسی سے اختلاف ظاہر کردے گا تو وہ آگے ہونے والی ناروا و غلط کارروائی میں شریک نہ قرار دیا جائے گا اور وہ عمل اس کی طرف منسوب نہ ہوگا، حضرت حکیم الامت تھانویؒ نے لکھا ہے کہ:

''جس حصہ دار کو حصہ داخل کرتے وقت اس (سودی لین دین) کی اطلاع نہ ہو اس نے تو کارکنان کمپنی کو ان دو امر کا وکیل ہی نہیں بنایا، اس لئے کارکنان کا یہ فعل اس کی طرف منسوب نہ ہوگا، اور جن کو اطلاع ہو وہ تصریحاً اس سے ممانعت کردیں، گو اس ممانعت پر عمل نہ ہوگا، مگر اس ممانعت سے اس فعل کی طرف نسبت تو نہ ہوگی'' (امداد الفتاوی ۴۹۱/۳)۔

(ب) اس کا جواب اوپر کے جواب سے ظاہر ہے یعنی مخالفت کے بعد بورڈ کی کاروائی سے یہ بری الذمہ ہوجائے گا، مگر یہ براءت صرف مباشرت سے ہوگی نہ کہ اعانت سے، لہذا یہ مباشرۃ تو سودی لین دین سے بری ہوگا، مگر اعانت علی المعصیۃ سے بری نہ ہوگا اور اعانت علی الاثم کے باب میں اگرچہ فقہاء کی عبارات میں اضطراب و اختلاف پایا جاتا ہے، تاہم غور و فکر کے بعد یہ واضح ہوتا ہے کہ معصیت کی اعانت اس صورت میں حرام ہے جبکہ حقیقۃ یا حکماً قصد معصیت اس میں شامل ہو، حقیقۃ قصد تو ظاہر ہے اور حکماً قصد معصیت ایک تو یہ ہے کہ صلب عقد میں اس کا تذکرہ احد المتعاقدین کی طرف سے ہوجائے، دوسرے یہ کہ کوئی ایسی چیز میں لگائے جو سوائے معصیت کے کسی اور چیز میں استعمال نہ ہوتی ہو، جیسے آلات غناء وغیرہ۔

مفتی محمد شفیع صاحبؒ نے فقہاء کے تمام اقوال کو پیش نظر رکھ کر اعانت کے مسئلہ میں یہی ضابطہ تنقیح فرمایا ہے، وہ فرماتے ہیں:

''إن الإعانة على المعصية حرام مطلقا بنص القرآن أعني قوله تعالى ''ولا تعاونوا على الإثم والعدوان'' وقوله ''فلن أكون ظهيرا للمجرمين'' ولكن الإعانة حقيقة هي ما قامت المعصية بعين فعل المعين ولا يتحقق إلا بنية الإعانة أو التصريح بها أو تعينها فى استعمال هذا الشئ بحيث لا يحتمل غير المعصية'' (تفصیل الکلام مندرجہ جواہر الفقہ ۴۴۷،۲)

یہی بات ملخصاً آپ نے اپنے دوسرے رسالہ ''الاستبانة لمعنى التسبب والإعانة'' میں تحریر فرمائی ہے (دیکھئے: احکام القرآن ۷۷/۳)۔

اس اصول پر جب ہم غور کرتے ہیں تو زیر بحث صورت میں اعانت علی المعصیۃ کھلے طور پر معلوم ہوتی ہے، کیونکہ صلب عقد میں اس کا ذکر آیا اور آتا ہے، پھر بھی وہ کمپنی میں حصہ دار ہوکر اپنا مال لگا رہا ہے تو یہ صریح اعانت علی الحرام ہے، نیز اس ارتکاب حرام کا علم ہونے کے بعد اس کے لئے شیئر ہولڈر باقی رہنے کی کوئی گنجائش نہیں ہوسکتی، علامہ حصکفی درمختار میں لکھتے ہیں: ''ويكره تحريما بيع السلاح من أهل الفتنة إن علم لأنه إعانة على المعصية الخ'' (۲۶۸،۴)۔

الغرض مخالفت سے اس فعل کی نسبت اس کی طرف نہ ہوگی، مگر اعانت علی الحرام کی وجہ سے اس کو اس میں اپنا حصہ لگانا جائز نہ ہوگا، ہاں البتہ اس شیئر ہولڈر کا حصہ و نفع دونوں کو سود سے محفوظ رکھا جانا ہو تو اس قسم کی کمپنی میں شیئر (حصہ) داخل کرنا درست ہوگا اور یہ شخص مباشرت و اعانت علی الحرام

سے بری ہوگا۔

۲۔ اسلامی مالیاتی ادارہ کا مختلف کمپنیوں کے پروجیکٹ (Projects) تیار کر کے فنی خدمت انجام دینا جائز ہے، اگر چہ اس میں ایسی اسکیمیں بھی شامل ہوں جن میں سود کا لین دین ہوتا ہو، جیسے سودی قرض حاصل کرنا، ڈبینچر جاری کرنا وغیرہ جن کے متعلق سوال میں تفصیل مذکور ہے، کیونکہ محض پروجیکٹ بنانا ایسا ہے جیسے سود کے مسائل کی تعلیم دینا اور علماء نے سود کے مسائل کی تعلیم کو جائز قرار دیا ہے، حضرت حکیم الامت تھانویؒ نے لکھا ہے کہ:

''چونکہ حربی کو حربی سے سود لینے میں کوئی خطاب شرعی نہیں ہے، اس لئے اس کو حرام نہ کہا جائے گا، پس سود کی ایک صورت ایسی نکلی جو حرام نہیں اور یہ مسئلہ ہے کہ جس امر میں ایک صورت بھی حلال ہو اس کی تعلیم اعانت علی الحرام نہیں'' (امداد الفتاوی ۳/ ۱۶۸)۔

یہی صورت پروجیکٹ کی بھی ہے کہ یہ پروجیکٹ حربی کے حربی سے سود دینے کی صورت میں کام آسکتا ہے اور یہ حلال ہے، تو اس کا تیار کرنا بھی حلال وجائز ہوا۔

۳۔ حصص سے منسلک ڈبینچر کی اسکیم حسب سوال یہ ہے کہ سرمایہ کار کو حصص میں اگر سرمایہ کاری کرنی ہے تو سود بردار تمسکات میں بھی سرمایہ کاری لازما کرنی ہوگی اور یہ ظاہر ہے کہ سود بردار تمسکات میں سرمایہ کاری حرام و ناجائز ہے تو حصص سے منسلک ڈبینچر کی اسکیم میں سرمایہ کاری بھی ناجائز ہوگی، نیز حصص میں سرمایہ کاری کے لئے سود بردار تمسکات کو لازم و شرط قرار دینا صفقۃ فی صفقۃ کی صورت ہے جو کہ ناجائز ہے، لہٰذا یہ معاملہ درست نہیں ہے۔

۴۔ حصص میں تبدیل ہونے والے ڈبینچر میں سرمایہ کاری بھی ناجائز ہوگی اگر وہ سود بردار ہیں، بعض حضرات جو یہ کہتے ہیں کہ یہ جائز ہے اور اس سے حاصل ہونے والے سود کو بلانیت ثواب صدقہ کر دیا جائے، میں ان سے متفق نہیں ہوں، کیونکہ بلا نیت ثواب صدقہ کا مسئلہ تو علماء نے اس لئے بیان کیا تھا کہ اگر کوئی شخص لاعلمی یا لاپروائی کی بنا پر سودی کاروبار میں پھنس گیا اور اب اس کی وجہ سے اس کے نام کا سود جمع ہو گیا تو اس کو وہ دفع کر سکے اور وبال سے بچے، نہ اس لئے کہ برابر سودی کاروبار کا ارتکاب کر کے آخر میں بلانیت ثواب حرام مال (سود) کو صدقہ کر دیا کرے۔

۵۔ صفر سودی قرض تمسک اسکیم جو دراصل بلاسودی قرض کی صورت ہے اس میں سرمایہ کاری درست وجائز ہے۔

۶۔ قرض تمسک کو فروخت کرنا ہی درست نہیں، کیونکہ دین کی بیع صحیح نہیں ہے، علامہ ابن نجیمؒ نے ''الاشباہ'' میں فرمایا ہے: ''وبيع الدين لا يجوز'' (الاشباہ ۱۴، ۴)، اور درمختار میں ہے کہ جامکیہ کی بیع کو مصنف نے باطل قرار دیا ہے: ''وأفتى المصنف ببطلان بيع الجامكية'' اور شامی نے مصنف کے فتاوی سے بیع جامکیہ کی تفسیر یہ نقل کی ہے: ''وهو أن يكون لرجل جامكية في بيت المال ويحتاج إلى دراهم معجلة قبل أن تخرج الجامكية فيقول له رجل بعتني جامكيتك التي قدرها كذا بكذا أنقص من حقه في الجامكية فيقول له: بعتك. فهل البيع المذكور صحيح أم لا لكونه بيع الدين بنقد؟''

اس کے بعد مصنف کا جواب نقل کیا ہے کہ: ''إذا باع الدين من غير من هو عليه كما ذكر لا يصح و قال مولانا في فوائده وبيع الدين لا يجوز ولو باعه من المديون أو وهبه'' (شامی علی الدر المختار ۴، ۵۱۶)۔

یہ بعینہ وہی صورت ہے جو ہمارے زیر بحث ہے، لہٰذا وہ بھی ناجائز ہوگی، البتہ یہ ہوسکتا ہے کہ اس قرض تمسک کا حوالہ کر دیا جائے کہ ان تمسکات کا حامل اپنا قرضہ جو کمپنی کے ذمہ ہے دوسرے کسی شخص کے حوالہ کر دے جو برضا اس کو قبول کر لے۔

ھدایہ میں ہے: ''الحوالة وهي جائزة بالديون... وتصح الحوالة برضاء المحيل والمحتال والمحتال عليه'' (۳، ۱۱۳)۔

مگر چونکہ یہ قرض کا حوالہ ہے اس لئے اس میں کمی وبیشی جائز نہ ہوگی، جیسا کہ مفتی کفایت اللہؒ نے ایک سوال کے جواب میں لکھا ہے کہ کمی بیشی باطل ہے (کفایۃ المفتی ۸/ ۱۵۸)۔

البتہ حضرت تھانوی نے اپنے فتاوی میں حوالہ میں کمی کی صورت کو ایک تاویل سے درست قرار دیا ہے، وہ تاویل یہ ہے کہ حوالہ کرنے والا حوالہ

قبول کرنے والے کو یہ کہہ دے کہ کمپنی کی طرف سے جو زائد رقم وصول ہو وہ تمہاری اجرت ہے، حاصل یہ کہ حوالہ قبول کرنے والے کو پہلے وکیل بنا دے کہ وہ قرض وصول کرنے میں سعی کرے اور اس سعی کی اجرت میں وہ رقم زائد طے کردے جو کمپنی کی طرف سے وصول ہوگی، کیونکہ اس نے حوالہ کم رقم پر کیا ہے، حضرت کی عبارت یہ ہے:

یوں کرے کہ خالد کو وکیل بنادے کہ تم اس انگریز سے تقاضا کر کے وصول کرو اور اڑھائی سو روپئے اس کام پر تمہاری اجرت ہے اور دو سو روپئے تم ہم کو قرض دے دو (امداد الفتاوی ۳؍ ۳۲۲)۔

حاصل یہ کہ دین کی بیع تو جائز نہیں اس کا حوالہ کیا جاسکتا ہے اور اس میں زیادتی تو ناجائز ہے، کمی کے ساتھ حوالہ مذکورہ تاویل سے جائز ہے۔

۷۔ یہ صورت دلالی کی ہے اور اس کے جواز میں اختلاف ہے مگر عموم بلوی اور ضرورت کی بنا پر جواز کا ہی فتوی دیا جاتا ہے، شامی نے فرمایا کہ:

''وفی الحاوی: سئل محمد بن سلمة عن أجرة السمسار فقال: أرجو أنه لا بأس به وإن كان فی الأصل فاسدا لكثرة التعامل وكثير من هذا غير جائز فجوزوه لحاجة الناس إليه'' (شامی ۶۳، ۶)۔

مگر یہ واضح ہونا چاہئے کہ یہ دلالی محض وجاہت کی بنا پر نہ ہو، بلکہ سعی ومحنت پر اس کا مدار ہو، محض وجاہت سے کسی کام کی سفارش کرنا اور اس پر اجرت لینا جائز نہیں، مولانا تھانویؒ رشتہ مقرر کرنے پر اجرت کے مسئلہ پر فرماتے ہیں: اگر اس سائی (دلال) کو کوئی وجاہت حاصل نہ ہو اور جہاں اس نے سعی کی ہے وہاں کوئی دھوکہ نہ دے، تو اس اجرت کو جانے آنے کی اجرت سمجھ کر جائز کیا جائے گا۔

''وإلا فلا يجوز أخذ الأجرة على الشفاعة ولا الخداع'' (امداد الفتاوی ۳۹۳، ۳)۔

وجہ یہ ہے کہ محض اپنی وجاہت سے سفارش کوئی متقوم شئی نہیں ہے، لہذا اس پر اجرت نہیں لی جاسکتی، اور جہاں تک زیر بحث سوال کا تعلق ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ اس میں محض سفارش بالوجاہت سے نہیں، بلکہ محنت ومجاہدہ سے کام لیا جاتا ہے، لہذا اجرت پر ایسی خدمت کا انجام دینا درست ہے۔

۸۔ قابل تبدیل ڈبینچر میں سرمایہ کاری کی بحث اوپر گذر چکی کہ اگر سود بردار ہے تو جائز نہیں، رہا حق مذکور کا فروخت کرنا تو یہ جائز ہے، جیسا کہ تیسرے فقہی سمینار میں اس پر بحث ہو چکی ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ:''حقوق دو قسم کے ہوتے ہیں: ایک وہ جو صاحب حق سے ضرر کو دفع کرنے کے لئے ہوتے ہیں، جیسے حق شفعہ شفیع کے لئے، حق قسم زوجہ کے لئے، دوسرے وہ حقوق جو اصالۃً صاحب حق کے لئے ثابت ہوئے ہوں، جیسے حق قصاص، حق رقیت وغیرہ۔

پہلے قسم کے حقوق کی بیع جائز نہیں اور دوسرے قسم کے حقوق کی بیع جائز ہے، چنانچہ تیسرے فقہی سمینار نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ:

''وہ تمام حقوق جن کی مشروعیت اصالۃً نہیں بلکہ صاحب حق سے کسی ضرر کو دور کرنے کے لئے ہوتی ہے، ایسے حقوق پر عوض لینا جائز نہیں، جیسے شفعہ۔ جو حقوق نصوص شرعیہ سے ثابت ہوں، البتہ ان سے مالی منفعت متعلق ہوگئی اور عرف میں ان کا عوض لینا مروج اور معروف ہو چکا ہو، نیز ان کی حیثیت محض دفع ضرر کی نہ ہو اور نہ وہ شریعت کے عمومی مقاصد ومصالح سے متصادم ہوں، ایسے حقوق پر عوض حاصل کرنا جائز اور درست ہے (اہم فقہی فیصلے ؍ص ۳۱)۔

اب رہا یہ سوال کہ زیر بحث حق کس قسم میں داخل ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ دوسرے قسم کے حقوق میں داخل ہے، کیونکہ یہ محض دفع ضرر کے لئے نہیں ہے، بلکہ اس سے مالی منفعت متعلق ہے، جیسے حق قصاص ورق وغیرہ، لہذا اس پر عوض حاصل کرنا جائز ہے۔

۹۔ اولاً تو اس کو نقصان ہی نہیں کہا جاسکتا، کیونکہ نفع کی کمی ہے، دوسرے اگر یہ نقصان ہے بھی تو سود سے تلافی جائز نہیں، کیونکہ اس کا مصرف صرف فقراء ہیں، جن کو بلانیت ثواب دینا ہے، سود سے خود کا منتفع ہونا قطعاً حرام ہے اور اس کو انکم ٹیکس وغیرہ پر قیاس کرنا درست نہیں، کیونکہ وہ ضرر کی صورت ہے، اور اس میں سود کا روپیہ لگانا دفع ضرر کہا جاسکتا ہے "کما هو رأى بعض أهل الفتوى" اور زیر بحث صورت جلب منفعت کی ہے، اس میں سود لگانا سود سے انتفاع ہے، وھو غیر جائز۔

۱۰۔ اس میں کوئی قباحت نہیں معلوم ہوتی، مگر سوال میں ایک ابہام ہے جس کا صاف ہونا ضروری ہے، وہ یہ کہ دوسری شکل میں لکھا گیا ہے کہ ''بغیر

اپنے نام منتقل کرائے" یہ واضح نہیں ہے، جب وہ خرید کرے گا تو اس کے نام منتقل نہ ہونے کا کیا مطلب؟ جب وہ خریدے گا تو لازماً وہ حصہ مشتری کا ہوگیا، اگر اس میں اصطلاحی کوئی تفصیل ہو تو واضح فرمایا جائے اور میرے خیال میں یہ صورت اس صورت سے مختلف ہے جس سے حدیث میں منع فرمایا گیا ہے، یعنی نجش "لا تناجشوا" (صحیحین) کیونکہ نجش کی صورت حسب تصریح فقہاء یہ ہے:

"وھو أن یزید فی الثمن ولا یرید الشراء یرغب غیرہ" (ھدایہ ۳،۵۰)۔ تو اس میں خریدنا مقصد ہی نہیں، بلکہ لوگوں کو دھوکہ میں ڈالنا مقصد ہے، جبکہ زیر بحث صورت میں خریدنا مقصود ہے اور اس سے نفع حاصل کرنا مطلوب ہے (فافترقا)۔

۱۱(الف): کمپنی میں حصص داری دراصل مشارکت ہے، کما ھو ظاہر، لہذا حصہ کمپنی مال شرکت ہے اور فقہاء نے تصریح کی ہے کہ مال شرکت کا رہن رکھنا صحیح نہیں، قال فی الھدایہ: ''ولا یصح الرھن بالأمانات کالودائع والعواری والمضاربات، قال و مال الشرکۃ'' (ھدایہ ۳،۵۱۰)۔

نیز درمختار و ردالمحتار میں بھی اس کی تصریح ہے (دیکھئے: درمختار مع شامی ۶/ ۴۹۲)۔

(ب) ڈبینچر کی حقیقت سود بردار قرضہ ہے، بظاہر اس کے رہن رکھنے میں کوئی قباحت نہیں معلوم ہوتی۔

۱۲۔ یہ جائز نہیں، کیونکہ حصص کی بیع دراصل منقول کی بیع ہے اور منقول کی بیع قبل القبض جائز نہیں۔ 'فی البدائع: وبیع المنقول قبل القبض لا یجوز بلا خلاف بین أصحابنا'' (۵،۳۰۶)۔

اور بزازیہ میں ہے: "لا یصح بیع المنقول قبل قبضہ من البائع أو الأجنبی لنھیہ علیہ السلام عن بیع مالم یقبض" (بزازیہ)

مفتی محبوب علی وجیہی، رامپور

آپ کے ارسال کردہ سوالوں کے جواب سے پہلے یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ سود کے مسائل پیچیدہ اور احتیاط طلب ہیں، چونکہ کمپنیز اور بینکاری مغرب کی دین ہے جن کے نزدیک مذہب ایک نجی وہ بھی بہت محدود دائرہ کے اندر محصور ہے، اس لئے احکام شریعت سے عام طور پر اس کا ٹکراؤ ہوتا ہے، اس میں ایک مسلمان کو آخرت اور رضائے الٰہی مقدم رکھنا ضروری ہے۔

اس تمہید کے بعد گذارش ہے کہ قرآن پاک کی یہ آیت "ولا تعاونوا علی الإثم والعدوان" اور "أحل اللہ البیع وحرم الربوا" اور رسول اللہ ﷺ کا یہ فرمان: "دعوا الربوا والریبۃ" اور فقہ حنفیہ کا مشہور قاعدہ "والشبھۃ فی ھذا ملحقۃ بالحقیقۃ" جیسے دلائل کی روشنی میں جوابات درج ذیل ہیں:

۱(الف)۔ شیئرز ہولڈر کی طرف سے بورڈ آف ڈائرکٹر وکیل ہے، اس لئے اس کا ہر فعل اس کمپنی سے متعلق معاملات میں شیئرز ہولڈر جو مؤکل ہے اس کی طرف منسوب ہوگا، کمپنی بذات خود قائم نہیں ہوسکتی، اس کا قیام انہی لوگوں کے ذریعہ سے ہے، کمپنی میں ہونے والے معاملات انہیں لوگوں کی طرف منسوب ہوں گے کیونکہ یہی لوگ فاعل مختار ہیں۔

(ب) چونکہ سودی لین دین سے شیئرز ہولڈر ہونے کے ناطے اس کا بھی تعلق قائم ہے، پس تعاون علی الاثم کا یہ بھی مرتکب ہوگا، اس لئے اس کی براءت ممکن نہیں، اس کی مخالفت کامیاب نہ ہو تو اس کو چاہئے کہ یہ وہاں سے اپنے کاروبار کو ختم کردے، یہ نہیں ہوسکتا کہ صرف مخالفت کرکے یہ بری الذمہ ہوجائے۔

۲۔ مالیاتی ادارے ایسے کام انجام دیں جن میں سود یا قمار یا اور اس طرح کی خرابی نہ ہو تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں، البتہ:

(الف) سود پر قرضہ حاصل کرنا ناجائز ہوگا۔

(ب) ڈبینچر زاگر سودی لین دین سے متعلق ہوں تو ناجائز ہیں اور اگر بلا سودی ہوں تو جائز ہیں۔

(ج) اس کا جواب بھی یہی ہے کہ اگر ان حصص کے متعلق ڈبینچر جاری کرنے میں سود کی آمیزش نہیں ہوتی ہے تو جائز ہے ورنہ ناجائز ہے، عام طور سے

ڈبینچرز سود سے مستثنیٰ نہیں ہوتے۔

(د) میں سمجھتا ہوں کہ آپ کے اس سوال کا جواب بھی (ج) کے جواب میں آ گیا۔

(ھ) اس کا جواب بھی واضح ہے کہ سود کا لین اور دین دونوں حرام ہیں، اور اس ذریعہ سے جو چیز حاصل ہو وہ بھی حرام ہے، شیئرز میں قدر عرفی اور غیر عرفی اس کے فرق سے سود لازم نہیں آئے گا، جیسا کہ فقہاء نے لکھا ہے کہ سامان نقد بیچنے میں بائع قیمت کم لے سکتا ہے اور ادھار بیچنے میں زائد، لیکن اگر سرمایہ کار کو حصص میں سرمایہ کاری کرنے کے لئے سودی کاروبار کرنا پڑتا ہے تو یہ بھی ناجائز ہے۔

۳۔ اگر اس سرمایہ کاری سے حاصل ہوئے ڈبینچر میں کوئی سود کا تعلق نہیں ہوتا تو بازار سے وہ خرید کر اس سے نفع حاصل کر سکتا ہے۔

۴۔ چونکہ اس میں سود بردار قرض تمسکات کی خرید وفروخت ہوتی ہے، اس لئے ناجائز ہے۔

۵۔ یہ بھی ناجائز ہے۔

۶۔ اس سلسلہ میں عرض ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی حدیث ہے: ''نہی رسول اللہ ﷺ عن قرض جر نفعا'' اس لئے یہ بھی ناجائز ہے اور سود حرام ہے اور حرام واجب التصدق ہے، اس لئے اس سے کسی اپنے نقصان کی تلافی جائز نہیں۔

۷۔ اپنے کام اور محنت کی مزدوری اور اجرت لینا جائز ہے، البتہ اس میں سود کا لین دین اور کوئی گناہ شامل نہ ہو، ورنہ تعاون علی الاثم لازم آئے گا، اور یہ ممنوع ہے۔

۸۔ صرف حق قابل بیع نہیں ہے، اس لئے کہ حق بذات خود کوئی مال نہیں ہے، ہدایہ میں صرف حق تعلی (فضا کی بیع مثلاً چھت کی بیع) اور حق مسیل (مشترکہ مفاد کی چیزیں) کی بیع ممنوع قرار دی گئی ہے، جب تک کہ اس کے ساتھ کوئی زمین وغیرہ نہ ہو، البتہ کمپنی کے جو حصص اور شیئرز ہیں وہ فروخت کئے جا سکتے ہیں، کیونکہ کمپنی جو بلا سودی لین دین کرتی ہے وہ ایک موجود چیز ہے اور قابل بیع ہے۔

۹۔ سود سے کسی نقصان کی تلافی کیسے ہو سکتی ہے، کیونکہ اس میں سود کا حاصل کرنا اور پھر اس کو اپنے تصرف میں لانا لازم آئے گا اور حدیث میں ہے: "دعوا الربوا والريبة"۔

۱۰۔ (۱) اس قسم کے حصص خریدنا درست ہے۔

(۲) حصص خریدنے کے بعد جب رقم ادا کر دی تو اس کی ملکیت ان پر قائم ہو گئی اور یہ ان کو فروخت کر سکتا ہے، نام کا انتقال امر زائد ہے۔

۱۱۔ (الف) رہن ایک وثیقہ ہے، اس لئے حصص کو رہن رکھ کر غیر سودی قرض حاصل کیا جا سکتا ہے اور ان حصص کو رہن رکھ قرض دیا جا سکتا ہے۔

(ب) سود بردار تمسکات رہن رکھ کر غیر سودی قرض لینا یا دینا ناجائز ہے۔

۱۲۔ اگر یہ خطرہ ہے کہ کمپنی ان حصص کو رد بھی کر سکتی ہے تب تو ان حصص کی بیع تاوقتیکہ کمپنی اسے تسلیم نہ کر لے، جائز نہیں ہو گی اور اگر ان حصص کی کمپنی میں نام کا انتقال ایک کاغذی اور احتیاطی چیز ہے تو بیع ہو جائے گی، کیونکہ بیع کی تعریف ہے: ''مبادلة المال بالمال بالتراضي'' وہ یہاں صادق آتی ہے۔

☆☆☆

مناقشہ

کمپنی و حصص کمپنی

مناقشہ بابت کمپنی و حصص کمپنی

[قاضی صاحب کے افتتاحی کلمات کے بعد مفتی محمد عبید اللہ اسعدی صاحب نے کمپنی سے متعلق سوالات پڑھ کر سنائے جو گذشتہ صفحات میں مذکور ہوئے، اس کے بعد مندرجہ ذیل مناقشہ ہوا]۔

قاضی صاحب:...... آپ حضرات نے اس تفصیلی سوالنامہ کو سنا، پتہ نہیں کچھ بہت خشک تھا، خواب آور تھا، اس سلسلہ میں جو پہلا سوال آپ کے سامنے آیا ہے، اس کی وضاحت میں آپ کے سامنے کر چکا ہوں، یعنی ایسے پروجیکٹس اور ایسی اسکیمیں بنانا اور بنا کر فنی طور پر اس کی اجرت وصول کرنا جس پروجیکٹ میں سود کا بھی ذکر ہو، یہ جائز ہوگا یا نہیں؟ یہ سوال تو میں آپ کے سامنے واضح کر چکا ہوں۔ دوسرا سوال جو آپ کے سامنے ہے مختصراً یہ ہے، کہ یہ مالیاتی کمپنی ایک کام یہ کر سکتی ہے کہ بینکوں سے یا دوسرے ایسے اداروں سے قرض دلوا سکتی ہے، تو اس کی ساکھ اس میں کام آتی ہے، مثلاً ہم نے ضمانت لے لیا آپ ان کو قرض دے سکتے ہیں اور قرض کی ادائیگی کی ضمانت ہم نے لے لی، یہ جو ضمانت ہم نے لے لی ہے ہماری ساکھ یا فقہ کی زبان میں یہ کہئے کہ ہماری وجاہت، جس کو آپ نے شرکت وجوہ میں ایک مال مانا ہے، آپ نے میری وجاہت کا استعمال کیا ہے اس کا معاوضہ اس شریک پارٹی سے حاصل کر سکتے ہیں، اور ساتھ ساتھ یہ بھی ہو سکتا ہے اس میں کہ اس کو بینک سے قرض لینا ہوتا ہے تو لوگوں کو سود بھی دینا ہی پڑے گا...... سود کا تعلق ہم سے نہیں ہے اس شخص سے تو رہے گا ہی، بینک سے اگر لون لیں گے تو بینک تو سود لے گا، لیکن بینک سودی قرضہ بھی ہر ایک کو نہیں دیتا، وہ کوئی ضمانت چاہتا ہے، کوئی سیکوریٹی چاہتا ہے، تو اس میں آپ کی ضمانت اور آپ کی ساکھ کام آئے گی۔

اچھا تیسرا مسئلہ جلدی جلدی میں بتا دیتا ہوں، صرف ایک دو الفاظ ضروری ہیں، یہ بار بار سود بردار قرض تمسکات، یا انگریزی میں Debenture کا لفظ آتا ہے، تو یہ سوال ذہن میں پیدا ہو سکتا ہے ہو کہ Companies جب قائم ہوتی ہیں تو کچھ تو اپنے شیئرز رکھتی ہیں کہ دس ہزار شیئرز ہم نے سو سو روپے کے رکھے، تو وہ تو خیر شیئر ہے، حصہ ہے، کمپنی میں آپ اتنے حصے کے مالک ہو جاتے ہیں، لیکن وہ آپ سے کچھ اور پیسے بھی لیتے ہیں، یعنی دوسری نوعیت سے بھی پیسے لیتے ہیں، اور اس میں کمپنی مقروض ہوتی ہے اور آپ مقرض ہوتے ہیں اور اس پر وہ سود ادا کرنے کی پابند ہوتی ہے، تو ایک ہے Share اور دوسرا ہے Debenture، ڈبینچر "دراصل وہ قرض ہے جو ایک عام آدمی کسی کمپنی کو سود کی شرط پر دیتا ہے" تو ڈبینچر کی اصل حقیقت یہ ٹھہری کہ یہ وہ قرضہ ہے جو ایک عام آدمی نے کسی کمپنی کو دیا اور کمپنی کچھ خاص مدت کے بعد اصولاً وہ قرض مع سود واپس کرنے کی پابند ہے، یہ تو Debenture کی عام بات ہوئی، اب Debenture میں ایک لالچ اور دے رہے ہیں، لوگ کہتے ہیں کہ یہ Convertible ہے، یعنی آگے چل کر یہ کل کا کل جتنا آپ نے قرضہ دیا ہے وہ، یا اس کا کوئی جز شیئر میں متبدل ہو جائے گا اور دوسرا Non Convertible ہے جس میں کبھی تبدیلی نہیں آئے گی، تو یہ دو الگ الگ چیزیں ہیں، ان پر الگ الگ حیثیتوں سے غور کرنا ہے، دشواری یہاں پر آتی ہے کہ بعض دفعہ شیئرز جن کو ہم لوگ چاہے شاید جائز کہیں، ان کی خریداری کے لئے بھی کچھ ڈبینچر ز تمسکات کو خریدنے کی شرط لگا دی جاتی ہے، اب وہ ڈبینچرز Convertible ہے، آگے چل کر کے شیئر میں تبدیل ہو جائیں گے، کل یا جز، تو بہر حال کچھ حصہ ایسا بھی رہ جاتا ہے جو کبھی تبدیل نہیں ہوتا، تو ہمارے لئے جائز شیئرز خریدنا اس شرط پر کہ کچھ ڈبینچرز بھی خریدنا پڑے گا، کیا اس مجبوری میں ڈبینچرز خریدنا جائز ہوگا یا نہیں؟ پھر اگر وہ Totally Convertible ہے کہ آگے چل کر وہ Convert ہو جائے گا تو ایک حد تک بات چلتی ہے، لیکن اگر Partially Convertible ہے تو کچھ نہ کچھ ہمارے ذمہ رہ جائے گا، پھر اس میں ایک الگ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ہم خریدنے کے بعد ڈبینچر کو بیچ ڈالیں، یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ڈبینچر کو ہم بیچ ڈالیں جو Non Convertible ہے، تو یہ سوال پیدا ہوگا کہ اس کے لئے بیچنا ہمارا جائز ہوگا کہ نہیں، زائد پر بیچنا، کم پر بیچنا، برابر میں بیچنا، اس طرح کے کئی سوالات پیدا ہوں گے، تو یہ سوالات تو آپ سارے کے سارے لوگوں نے سن لئے اور سب لوگ سمجھ بھی گئے ہیں، اب مسئلہ ہے اس کے جواب کے سلسلہ میں گفتگو کرنے کا۔

مفتی احمد خانپوری صاحب:...... حضرت ہمارے پاس ۱۹ سوالات پر مشتمل سوالنامہ پہنچا تھا، ہم نے سارے سوالات کے جوابات دیئے تھے۔

قاضی صاحب:...... وہ الحمد للہ ہمارے پاس سامنے رکھا ہوا ہے، ابھی تمام علماء کے جوابات پر بات ہونی ہے، میں ایک طرف سے چلتا ہوں، یا آپ کہیں تو تلخیص سنا دوں، اچھا کے جی منشی صاحب آپ کا جواب اسٹاک ایکسچینج پر ہے، اس کو بعد میں شروع کروں گا، ابھی ہم لوگ جو گفتگو شروع کرتے ہیں تو پہلا سوال وہ لے لیجئے کہ دو قسم کے کاروباری یونٹ ہیں، تین قسم کی کمپنیاں ہیں، ایک کا خالص مقصد ہی سودی کاروبار ہے، اس میں اسلامی مالیاتی ادارہ حصہ لے، اس کے ناجائز ہونے پہ آپ سب لوگ متفق ہیں یا کوئی اختلاف بھی ہے؟ ایسی کمپنی، ایسا ادارہ جس کا مقصد ہی سودی کاروبار کرنا ہے، کیا یہ اسلامی مالیاتی ادارہ اس میں حصہ لے سکتا ہے؟

آوازیں:...... نہیں۔

قاضی صاحب:...... اس میں تو بہت زور سے آپ لوگوں کو ناجائز کہنا چاہئے تو اس کی حرمت پہ تو شک کسی کو نہیں ہے، مسئلہ طے ہے، اچھا جہاں پر مالیاتی ادارہ جائز کاروبار کرتا ہے، اس میں حصہ لینے میں تو آپ لوگ کوئی اعتراض نہیں کریں گے؟ میں نے تو یہاں صرف آپ سے یہ سوال کیا کہ ایسے مالیاتی ادارے جن کا بنیادی مقصد اور بنیادی کام حرام کاروبار ہے، اس میں حصہ لینا ناجائز، اور جس کا مقصد حلال وجائز ہے اس کے سارے طریقے جائز ہیں۔

مولانا مجیب اللہ ندوی صاحب:...... جائز حصہ لینے کے بعد کیا ہوتا ہے؟ اسے بھی ذرا واضح کر دیجئے۔

قاضی صاحب:...... اس میں کیا واضح کرنا ہے۔ اس میں حصہ لینے میں کوئی اعتراض کی بات نہیں ہے، مسئلہ جو قابل غور ہے دراصل وہ ادارے ہیں جن کے اندر بنیادی مقصد تو جائز کاروبار ہے، لیکن وہ سودی کاروبار میں بھی ملوث ہوتے ہیں، اس میں کیا ہوگا؟ یہ اصل جو زیر بحث مسئلہ ہے وہ یہی ہے، اس سلسلہ میں ہمارے پاس جو جوابات آئے ہیں، جناب مولانا شمس پیرزادہ صاحب، مولانا ایوب ندوی صاحب بھٹکلی، مولانا عتیق احمد صاحب لکھنؤ، مولانا اختر امام عادل صاحب، مولانا مفتی نور الہدی قاسمی، مولانا عبدالجلیل قاسمی، مفتی محمد عبیداللہ اسعدی، مفتی احمد خانپوری، مولانا عبدالرحمن قاسمی، مولانا مصلح الدین، مولانا عبدالقیوم پالنپوری، مولانا مفتی نظام الدین صاحب، ان حضرات نے کہا کہ دونوں قسم کے یعنی جس کا جائز ہی جائز کاروبار ہے، اور جس کا اصل مقصد جائز کاروبار ہے لیکن اس کو ضمنی طور پر سودی کاروبار میں ملوث ہونا پڑتا ہے، ایسے دونوں ہی اکائیوں میں اسلامی مالیاتی ادارہ کے لئے سرمایہ لگانا جائز ہے، اب اس میں کچھ لوگوں نے شرائط لگائی ہیں، آگے جو جواب ہے، کچھ لوگ علی الاطلاق مجوزین ہیں، اور کچھ لوگوں نے اس میں بعض شرطیں لگائی ہیں، مثلاً مولانا برہان الدین صاحب کی شرط یہ ہے کہ اگر سود پہ حاصل کی ہوئی رقم کا حساب الگ رکھا جاتا ہو تو جائز ہے، یعنی وہ ادارہ جو اصلاً تو حلال کاروبار کرتا ہے، لیکن اس کے یہاں سودی کاروبار میں بھی ملوث ہونا پڑتا ہے، اس کے لئے یہ شرط لگاتے ہیں کہ وہ ادارہ دونوں حساب الگ رکھے، تیسرا مولانا جمیل احمد نذیری صاحب کا ہے، یہ فرماتے ہیں کہ جائز ہے بشرطیکہ ادارہ کا سرمایہ اور نفع سود سے محفوظ ہو، مولانا صدر الحسن ندوی کی رائے یہ ہے کہ عدم جواز راجح ہے، تو کل جوابات میں سے مولانا صدر الحسن صاحب مطلق عدم جواز کے قائل ہیں، جمیل احمد نذیری صاحب ادارہ کے سرمایہ و نفع کا سود سے محفوظ ہونا شرط قرار دیتے ہیں، مولانا برہان الدین صاحب الگ حساب رکھنے کی پابندی عائد فرماتے ہیں اور باقی جن حضرات کا میں نے نام لیا ہے یہ حضرات مطلق جواز کی بات کہتے ہیں، یہ ہے خلاصہ۔

مفتی عبدالرحمن صاحب (بنگلہ دیش):...... حکومتی قوانین مالیاتی سلسلہ میں ایسے ہیں کہ اسلامی بینک کاری کرنا بڑا مشکل مسئلہ ہے، کتنی بھی کوشش کی جائے کہ بلاسودی بینک کاری خالص ہو، پھر بھی ملوث ہونا ضروری ہے، ملوث ہئے بغیر کوئی صورت نہیں، سوائے اس کے کہ گھر بیٹھے رہیں، اب جبکہ ملوث ہونا ضروری ہے، تو یا گھر بیٹھے رہیں یا کوشش کریں، اگر یہ فیصلہ ہو کہ کوشش کرنا چاہئے تو ملوث ہونا ضروری ہے، صرف اتنی بات ہے کہ اس میں ملوث ہوتے ہوتے کہیں حرمت کی ذہنیت ختم ہو جاتی ہے اور حلت آجاتی ہے، ابھی بنگلہ دیش میں ۱۹۸۵ء سے اسلامی بینک کا سلسلہ شروع ہوا، قانونی طور پر شرعیہ کونسل بنانا پڑا، شرعیہ کونسل نے اس قسم کے حالات کو سامنے رکھ کر ضرورتاً اجازت دیدی ہے کہ سودی کاروبار میں ملوث ہونا پڑے گا، ضرورتاً اجازت دی گئی، نتیجہ یہ نکل رہا ہے کہ پہلے سود کھانے والے حرام سمجھ کر کھاتے تھے، اب سود کھانے والے حلال سمجھ کر کھا رہے ہیں، سب سے بڑی بات یہ ہے کہ بینک چلانے والے حضرات عموماً سودی بینکاری کی تعلیم حاصل کر کے امریکہ و یورپ سے سندیں لے کر آتے ہیں، بینک چلاتے ہیں، تجربہ بہت ہے، لیکن ان کو شرعی اصول وضوابط سے تجربہ ہونا تو مشکل ہے، ضروری مسائل سے بھی واقفیت نہیں، ایسے حالات میں خوف وخشیت کا فقدان ہے، مسائل سے ناواقفیت ہے اور سودی بینکوں کے ساتھ کمپیٹیشن

کر کے آگے بڑھ رہا ہے، ملوث ہونے کی ضرورت کی حد تک تو نہیں بلکہ آگے بڑھ رہا ہے، کہیں ایسا نہ ہو جائے جائز تو کہنا پڑے گا کہ ملوث ہونے کی ضرورت تو جائز ہے، سرمایہ لگائے، اسلامی ادارے میں تعلقات قائم رکھے، لیکن ہمارے خیال میں مولانا مفتی برہان الدین صاحب مدظلہ نے جو شرط لگائی وہ شرط اگر اول تا آخر لاگو رہے تو شاید کچھ کام آ جائے اور خطرہ ہے کہ لاگو نہ رہے گا، بنگلہ دیش میں ہم لوگوں سے فتویٰ لے کر، ضرورت ضرورت کہہ کر ہم سے اجازت لے لی تو آج تک ضرورت ختم نہیں ہوئی، آگے بھی امید نہیں ہے، تو میرے خیال میں جس صورت میں ہم لوگوں کو فیصلہ کرنا ہے اس صورت میں تو بلا شبہ مطلق کی اجازت نہ دی جائے اور شرط کی پابندی کی خاص طور پر رعایت کی جائے، تو شاید یہ کام آگے آ سکتا ہے، ورنہ پھر وہ سودی نظام ہی اچھا ہے، اس قسم کے بلا سودی نظام سے، جس میں حرام حلال ہو جانے کا خطرہ ہو جائے۔

قاضی صاحب:......سب سے پہلی درخواست تو یہ ہے کہ مسائل پر فقہی حیثیت سے بحث کر لیجئے، وعظ کرنا ہو تو بعد کو کر لیجئے گا، مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں ہے، لیکن مسائل کی پہلے خالصتاً جو فقہ اسلامی کہتی ہے اس پر شدت سے قائم رہتے ہوئے اس میں ذرہ برابر مصالحت نہ کیجئے، اللہ کا خوف بھی دلاتے رہئے، لیکن اصلاً بنیادی بات اس وقت یہ ہے کہ فقہ اسلامی اگر صحیح اصولوں پر قائم ہے اگر اسی میں کچھ گڑبڑ ہے تو دوسری بات ہے، لیکن اگر وہ صحیح ہے تو فقہ کے اصولوں پر، فقہ کی سیمینار میں فقہی نقطہ نظر سے بحث کیجئے اور یہ بے حد ضروری ہے کہ جو فقہی مباحث آپ کے پاس موجود ہیں، فقہاء نے اتنی ساری بحثیں کیوں کی ہیں، آپ کہئے کہ فلاں دلیل کی وجہ سے ناجائز ہے، ضرور کہئے خوشی کی بات ہے۔

مولانا یعقوب منشی صاحب:......مولانا برہان الدین صاحب نے جو علیحدہ حساب رکھنے کی شرط لگائی ہے، اس سے کیا مراد ہے، کیا پیسے الگ رکھے جائیں یا سب چیزیں علیحدہ ہوں کیا مطلب ہے؟

قاضی صاحب:......یہ تو مولانا محمد برہان الدین صاحب بیٹھے ہیں وہی وضاحت کر دیں، مولانا اپنی رائے کی خود وضاحت کر دیں تو زیادہ بہتر ہے۔ آپ کو اختیار ہے کسی چیز کو آپ جس کو جائز سمجھتے ہوں شرعاً اس کو جائز کہئے، جس کو نہیں سمجھتے ہوں اس کو قطعاً کہئے کہ ناجائز ہے۔

مفتی عزیز الرحمن چمپارنی صاحب: مولانا محمد برہان الدین صاحب کا جواب اگر پڑھ دیا جائے تو زیادہ بہتر رہے گا، اس سے ہو سکتا ہے کہ کچھ روشنی مل جائے۔

ڈاکٹر محمد منظور عالم صاحب:......میرے خیال میں پہلے مفتی نظام الدین صاحب دارالعلوم دیوبند کا جواب پڑھ کر سنا دیا جائے اور اس دوران مولانا برہان صاحب کا جواب تلاش کر لیا جائے۔

مولانا محمد برہان الدین سنبھلی صاحب:......اصل میں دو سوالنامے ہیں۔

قاضی صاحب:......مفتی اسماعیل صاحب اپنے جواب میں لکھتے ہیں کہ حکیم الامت حضرت تھانویؒ نے ایسی کمپنی کے شیئرز خرید کر اس میں سرمایہ لگانے کا یہ حل تحریر فرمایا ہے کہ "سو جس حصہ دار کو حصہ داخل کرتے وقت اس کی اطلاع نہ ہو کہ اس نے تو کارکنان کمپنی کو ان دوامر کا وکیل ہی نہیں بنایا، اس لئے کارکنوں کا یہ فعل اس کی طرف منسوب نہ ہوگا اور جس کو اطلاع ہو وہ تصریحاً اس سے ممانعت کر دیں، گو اس ممانعت پر عمل نہ ہوگا، مگر اس ممانعت سے اس فعل کی طرف نسبت تو نہ ہوگی"۔ یعنی حضرت تھانوی اس طرف دو راستے بتاتے ہیں کہ علم نہیں ہے کہ وہ کمپنی کاروبار اس طرح کرتی ہے، وہ لاعلمی کی بات ہوگئی، اگر علم ہو تو وہ اس کو منع کر دے، جیسا کہ وہ تذکرہ آیا کہ وہ جو Board of Directores کی میٹنگ ہو اور اس کے اندر وہ جو ممبرس کی میٹنگ ہو اس میں اپنی مخالفت کا اظہار کر دے، تو دو صورتیں ہیں، یا تو اس کو Majority مل جائے گی تو اس پر عمل ہوگا، یا Majority نہیں ملے گی تو Board of Directors کا عمل اس کی طرف منسوب نہیں ہوگا، یہ غیر مباشر ہوا، اس لئے اس عمل کی نسبت اس کی طرف نہیں ہوگی، یہ حصہ نقل کیا ہے مولانا محمد مفتی اسماعیل صاحب نے، اس میں لکھتے ہیں: جس سوال کے جواب میں حضرت تھانوی نے یہ بات لکھی ہے کہ کوئی مسلمان کسی ہندو کے پاس سے کسی ضرورت کے موقع پر سودی قرض لیتا ہے اور اس سے اپنا بیوپار چلاتا ہے یا کوئی زمین خریدتا ہے، چند دن کے بعد وہ قرضہ ادا کر دیتا ہے، اپنی باقی ماندہ ملک کو پاک ملک سمجھتا ہے، نیز یہ بھی اعتقاد رکھتا ہے کہ سود کے دینے سے تو خود گنہگار ہوا مگر حرمت اس کی باقی ماندہ ملک میں سرایت نہیں کرے گی...... کیونکہ اس شخص نے دیا ہے لیا تو نہیں ہے، پس اس ملک کا کیا حکم ہے؟ بہر حال تو آپ نے حضرت تھانویؒ کا جواب سن لیا ہے جس کو مولانا اسماعیل صاحب نے نقل کیا ہے، اس کے جواب میں مفتی نظام الدین صاحب فرماتے ہیں،

مختصر جواب ہے ان کا، جواب نمبر۔ ا و ۲: اس کی گنجائش ہے۔ وہ صرف اتنا لکھتے ہیں کہ اس کی گنجائش ہے۔ اس کے بعد مولانا برہان الدین صاحب فرماتے ہیں کہ اگر یہ اکائی سودی کاروبار نہ کرتی ہو بلکہ خالص شرعی بنیادوں پر تجارت کرتی ہو، سود پہ حاصل کی گئی رقم کا حساب الگ رکھا جاتا ہو تو اس میں سرمایہ لگانا جائز ہے، تو یہ گویا مولانا کا جواب ہے جو آپ لوگ سننا چاہتے تھے، چونکہ یہ لوگ جانتے ہیں اس بات کو کہ جتنے بھی Accounts تیار ہوتے ہیں اس میں انٹرسٹ کا الگ کالم ہوتا ہے، تو مولانا اگر صرف حساب کی بات کرتے ہیں کہ اس کا اکاؤنٹ الگ ہو تو جتنے بھی حسابات آج کل یہ لوگ تیار کرتے ہیں اس میں سود دیا گیا تو اس کو الگ لکھتے ہیں اور سود لیا گیا تو اس کو الگ لکھتے ہیں۔

مفتی احمد خانپوری صاحب:...... یہ تو مولانا ان کی سالانہ رپورٹ میں بھی الگ ہی سے درج ہے، یہاں پر مسئلہ زیر بحث یہ ہے کہ ڈبینچر وغیرہ تو کمپنی اس میں سود دے گی، اس میں شیئر ہولڈروں کو کتنا سود میرے حصہ میں آیا یہ تو دیکھنے کا ہی نہیں ہے، چونکہ وہ تو سود دے گی، جمع نہیں کرنے کی ہے، البتہ وہ ڈبینچر جو کمپنی حکومت کو سود دیتی ہے یا وکاس پتر وغیرہ کے نام سے بانڈز وغیرہ جو خریدتی ہے اس میں سود کمپنی کے پاس آئے گا، وہاں اس حساب کی ضرورت پڑے گی کہ کمپنی نے کتنا سود اپنے شیئر ہولڈروں کو تقسیم کیا ہے، تاکہ وہ اپنے نفع میں سے اتنا صدقہ کردے یا جو بھی حکم ہو۔

قاضی صاحب:...... یہ بات کہ صاحب کمپنی کو جو سود دینا پڑتا ہے، وہ لکھا رہتا ہے اور جو سود آمدنی میں آتا ہے وہ بھی جو سال کا آخری اکاؤنٹ ہوتا ہے اس میں لکھا رہتا ہے کہ کمپنی کو اتنا صحیح منافع ہوا اور اتنا بذریعہ سود آیا، یہ تفصیلات رہتی ہیں یا نہیں؟

مفتی احمد خانپوری صاحب:...... انفرادی طور پر شیئر ہولڈر یہ نہیں معلوم کرسکتا کہ مجھے جو Dividend ملا ہے اس میں کتنا حصہ سود کا ہے، اس کی رپورٹ میں اجمالی طور پر یہ تو ہوگا کہ اتنے کروڑ روپئے یا اتنے لاکھ روپئے بینکوں کے پاس سے سود کے جمع ہوئے۔

قاضی صاحب:...... یہ رپورٹ تو رہتی ہے لیکن یہ کہ ہم کو ہمارے شیئر میں جو منافع ملا ہے اس میں کتنا اصل کا حصہ ہے اور کتنا انٹرسٹ کا حصہ ہے۔ دوسرا سوال اس میں یہ ہے کہ......

مولانا شمس پیرزادہ صاحب:...... اس میں ایک بات اور بھی ہے کہ جب کمپنی سود ادا کرتی ہے اور دوسری طرف سود کا کچھ حصہ اس کے پاس پہنچتا ہے، تو کیا یہ سمجھا نہیں جاسکتا کہ جو سود آیا دہ سود دینے میں چلا گیا، ضرورت کیا ہے کہ Dividend میں سے ہم کچھ Minus کرنے کی بات کریں......

مولانا یعقوب اسماعیل منشی صاحب:...... اس مائنس پلس میں یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ سود گیا زیادہ ہو آیا کم ہو؟

شمس پیرزادہ صاحب:...... سود آیا کم اور گیا زیادہ تو اس لئے یہی ہے کہ گویا ہمارا پروفٹ ڈیوڈنڈ میں شامل نہیں ہوا ہے جو شیئر ہولڈر ہے اس کے ڈیوڈنڈ میں سود شامل کہاں ہوا؟ تھوڑا سا آیا، گیا زیادہ۔

قاضی صاحب:...... نہیں اب دو تین صورتیں ہیں، کہ جو سود کمپنی نے ادا کیا، فرض کر لیجئے کہ دس لاکھ روپئے سود میں کمپنی نے دوسروں کو دیا اور اس کو بھی سود آیا، اب جو سود آیا، یا تو وہ نو لاکھ ہے یا گیارہ لاکھ ہے، تو اگر نو لاکھ ہے، نو لاکھ اس نے لیا ہے اور دس لاکھ اس نے دیا ہے، یا دس لاکھ لیا ہے اور دس لاکھ دیا ہے تو گویا جو انٹرسٹ آیا وہ انٹرسٹ چلا گیا، اب جو ہمارے پاس آمدنی ہے وہ ایک حد تک کہا جاسکتا ہے کہ خالص ہے، لیکن اگر گیارہ لاکھ آتا ہے تب پھر آگے سوال یہ ہے کہ کمپنی اپنا شیئر حاصل کرتی ہے، کمپنی میں دو طرح کے شیئرز ہوتے ہیں، ایک تو جو پروموٹرز ہیں ان کا حصہ جاتا ہے، پھر اس کے بعد تب شیئر ہولڈرس کا حصہ جاتا ہے، پھر مینجمنٹ کے اخراجات جاتے ہیں، اتنی قسموں میں تقسیم ہوتا ہے، تو پہلے میں جاننا چاہوں گا کہ عام طور پر کمپنیز جو جائز کاروبار کے لئے قائم ہوتی ہے جن کا مقصد جائز کاروبار ہے، سودی کاروبار جن کا مقصد نہیں ہے، ایسی کمپنیاں جو ان کو لینا پڑتا ہے یا دینا پڑتا ہے، اس میں عام حالات میں کیا ہوتا ہے؟

کمال فاروقی صاحب:...... Payment ہمیشہ زیادہ ہوگی، اگر جائز کاروبار وہ کرتی ہے اور انٹرسٹ اس کو لینا دینا پڑتا ہے تو پیمنٹ ہمیشہ زیادہ ہوگا اور انکم بہت کم ہوگی اس کے مقابلہ میں......

جناب کے رحمن خان صاحب:...... ہمارے یہاں تین کمپنیوں کی بحث ہے، ایک وہ کمپنیاں جن کا کاروبار حلال ہے اس میں کوئی بحث نہیں ہے۔ وہ

کمپنیاں جن کا کاروبار حرام ہے وہ بھی......اب سوال یہاں ہے کہ وہ کمپنیاں جن کا بنیادی کاروبار حلال ہے، لیکن ان کو بعض اوقات سودی لین دین میں ملوث ہونا پڑتا ہے، ایسے ہی جو کمپنیاں ہمارے ملک میں ہیں، تقریباً ننانوے فیصد کمپنیاں اس تیسرے ذیل میں آتی ہیں، یعنی اب سوال ہمارے پاس یہ ہے کہ وہ کمپنیاں جن کا بنیادی کاروبار حلال ہے، لیکن ان کو بینکوں سے کاروبار کئے بغیر وہ کمپنیاں نہیں چلا سکتے، اس لئے سودی لین دین میں ان کمپنیوں کو ملوث ہونا پڑتا ہے، اور ننانوے فیصد ایسی کمپنیاں سود زیادہ دیتی ہیں اور ان کے پیسے سے جو سود ملتا ہے وہ بہت ہی کم ملتا ہے، تو یہاں سوال یہ ہوتا ہے کہ یہ سود جو آتا ہے ہمارے ڈیویڈنٹ میں اس میں کتنا سود ملا ہوا ہے، اس میں یہ ننانوے فیصد ناممکنات میں سے ہے، کوئی ایک دو ایسی کمپنیز ہو سکتی ہیں، Financial Companies جن کا کاروبار صرف سود کا لینا ہے، اسی کمپنی میں یہ ہو سکتا ہے کہ جہاں ہمارے ڈیویڈنٹ میں سود کا ہونا ممکن ہو جاتا ہے، وہ کمپنیاں نمبر دو میں آجائیں گی، وہ کمپنیاں جن کا کاروبار حرام ہے یعنی کہ بینکنگ کی کمپنیاں، چاہے اسٹیٹ بینک کا ہو، حال ہی میں اسٹیٹ بینک کے شیئرز پلاٹ کئے گئے، اگر کوئی اسٹیٹ بینک کے شیئرز لیتا ہے تو معلوم ہے کہ اسٹیٹ بینک پورا سودی کاروبار کرتا ہے، وہ حرام ہے، اب یہاں پر دوسری کمپنیاں ہیں جو مجبوراً بغیر سود لئے کام نہیں کرسکتیں، بینکوں سے لے کر ہی چلانا ہے، وہ تیسری کمپنیاں ہیں، وہاں تو یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، اب ہم کو یہاں پر ہدایت ملنی ہے کہ ایسی کمپنیوں میں Investment جائز ہے یا نہیں؟

مولانا یعقوب اسماعیل منشی صاحب: ......سود کا زیادہ دینا ہوا، یہ سود کہاں سے دیا جائے گا؟ جب سود اس میں زیادہ دینا ہوا اور آیا کم ہے تو یہ سود کہاں سے دیا جائے گا؟

کمال فاروقی صاحب: ......یہ ہمارے خرچ کا Part ہے، It is part of our expenditure، دیکھئے حضرت! ایک اور بات یہ سمجھ لیجئے جیسا کہ رحمن خاں صاحب نے فرمایا، ہمارے لئے کوئی بھی لمیٹیڈ کمپنی شروع کرنا ناممکنات میں سے ہے، اگر ہم اس میں Banking Finance کو نہیں Involve کرتے ہیں تو ہمیں شیئرز جاری کرنے کی اجازت ہی نہیں ملے گی، پہلی بات یہ سمجھ لیجئے، اور بنیادی طور پر یہ سمجھ لیجئے کہ کسی کمپنی کو شروع کرنے کی اجازت ہی نہیں ملے گی جب تک ہم بینک سے فائنانس کا اس میں پروجیکٹ نہیں رکھیں گے، ہمارا اپنا کوٹہ جو ہوگا Shares Capital وہ اتنا ہوگا اور جو بینک سے فائنانس لیں گے وہ اتنا ہوگا، اس کے بغیر نہیں ہوگا، تو یہ بات جیسا کہ خاں صاحب نے بتلایا ۹۹ فیصد، میں اس سے اور آگے سو فیصد کی بات کہتا ہوں......

مولانا یعقوب اسماعیل منشی صاحب: ......اس کا مطلب یہ کہ ہم جو یہ کہہ رہے ہیں کہ بنیادی طور پر ہماری حلال کمپنی ہوگی وہ ہی صحیح نہیں ہے۔

کمال فاروقی صاحب: ......بنیادی طور پر کاروبار اس کا حلال ہوگا، دیکھئے Objects بھی دو ہوتے ہیں: ایک تو کسی کمپنی کا Main Object ہوگا، جو حلال کام ہوگا جس کی ہم بات کر رہے ہیں لیکن اس Main Object کو پانے کے لئے اس کو انٹرسٹ پر پیسہ لینا پڑے گا، یہ پارٹ ہے اور وہ ہمارا جو خرچ ہے اس میں سے جیسے ہم تنخواہ دیں گے، جیسے ہم آفس کا کرایہ دیں گے، جیسے ٹیلیفون کے Expenses دیں گے، اسی طرح سے ہمیں سود کی ادائیگی بھی کرنی پڑے گی۔

مولانا یعقوب اسماعیل منشی صاحب: ......اصل بنیاد جو ہوگی اسی میں سے ہمارا پیمنٹ ہوگا، سوچئے اس کو، الگ حساب رہا اپنی جگہ......

قاضی صاحب: ......یعنی اس کی صورت جو ہے وہ یہ ہوئی گویا آپ لوگوں کے بیان کے مطابق جو ہم نے سمجھا، مثلاً ہم کو گھڑی بنانے کی یا الیکٹرونک کی ایک فیکٹری قائم کرنی ہے، اس کو ایک کمپنی کی شکل ہم نے دیا، اس میں دس لاکھ روپئے چاہئے، تو ہم نے پانچ لاکھ روپئے شیئر فروخت کئے اور ان سے حاصل کر لئے، اور مزید پانچ لاکھ کے لئے ہم جو سرمایہ بینک سے لیں گے اس پر ہم کو سود دینا پڑے گا، اور کچھ پیسہ ہمارا بھی ان کے یہاں ہو جس سے ہم کو سود حاصل ہو کیا شکل ہے، (ایک آواز: بہت کم) یعنی پھر سود لینے کا سوال آیا نا، ایک تو سود دینا ہوا، دوسرے سود لینا ہوا۔

جناب رحمن خاں صاحب: ......ایسی کمپنیوں میں سود لینے کا جو سوال آتا ہے، ۹۰ یا ۹۹ فیصد جو کمپنیاں ہیں ان میں سود لینے کا سوال نہیں، کیونکہ خود ان کے پاس پیسہ نہیں ہے تو اسی لئے وہ بینک سے لیتے ہیں، اب جن کو قانونی طریقے سے سود آئے گا، کچھ Investment کرنا پڑتا ہے یعنی بانڈز میں کرنا پڑتا ہے، یا Saving میں کرنا ہے، وہ مجبوری کے طور پر اس کی رقم بہت ہی کم ہوتی ہے۔

مولانا یعقوب اسماعیل منشی صاحب:...... نہیں اگر کوئی کمپنی ایسا کرتی ہے کہ ایک ملین سرمایہ ہم اپنی طرف سے روکتے ہیں اپنی طرف سے، اور ہمیں قانونی مجبوری کے تحت اگر ایک لاکھ روپے لینا پڑتا ہے، تو ہم ایک لاکھ روپے لے لیتے ہیں، لیکن اگر ہم قانونی طور پر ہمارے اپنے ایک ملین روپے کہتے ہیں تو اس وقت میں کوئی ضروری تو ہے نہیں، یہ تو آپ اس صورت کو بتا رہے ہیں کہ جس صورت میں سرمایہ ہمارے پاس تھوڑا ہے، اس لئے ہم لینے پر مجبور ہیں، لیکن اگر کوئی کمپنی اس طور پر آئی ہے کہ ہم پورا دیتے ہیں، بس فوراً کمپنی کوئی آئی، اس نے کہا کہ ہم ایک ملین روپیہ لگاتے ہیں، اس کو تو ضروری نہیں ہے کہ وہ بینک سے لون لے (رحمن خاں صاحب: نہیں کوئی ضروری نہیں) تو اب یہ بات واضح ہوگئی کہ کمپنی کو قائم کرنے کے لئے بینک سے قرض لینے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، اگر ہمارے پاس پورا سرمایہ ہے تو ہم لینے پر مجبور نہیں ہیں۔

جناب رحمن خاں صاحب:...... اب ہماری جو یہاں بحث ہو رہی ہے، اسٹاک ایکسچینج سے شیئر کا کاروبار کس طرح سے کیا جانا چاہئے، کیا ایسی کمپنی میں شیئر لینا جائز ہے، پہلی بات، یہ جو آپ کا سوال تھا کہ اگر کوئی کمپنی چاہتی ہے کہ پورا سرمایہ لگا کر قرضہ کے بغیر کمپنی شروع کرنا ہے، تو وہاں سودی قرض لینے کی کسی کو مجبوری نہیں ہے، اب سوال ہے کہ اسلامی مالیاتی ادارے کیا ایسی کمپنیوں میں Share Invest کر سکتے ہیں؟ یہ سوال ہمارے سامنے ہے۔

یعقوب اسماعیل منشی صاحب:...... اب یہ بات واضح ہوگئی کہ ہم ایسی کمپنی بنا سکتے ہیں، اب سوال یہ جو رہ گیا کہ کمپنی کی بنیاد تو حلال ہے، لیکن کمپنی نے سرمایہ کچھ سودی بھی لیا ہے، اب ہمارے لئے مشکل جو ہے سوچنے کی وہ یہ کہ جو سرمایہ سود کے اوپر لیا ہے، اس کا سود ہمیں دینا پڑتا ہے، اب اس کو سوچنا چاہئے کہ یہ سود جائے گا شیئر ہولڈروں میں سے، یا یہ کمپنی سرمایہ سے جائے گا، بینک سے تو آئیگا نہیں، تو گویا سارے شیئر ہولڈر سود دے رہے ہیں۔

جناب کمال فاروقی صاحب:...... میرے خیال سے Clarification یہاں دینا بہت ضروری ہے، آپ جو بات فرما رہے ہیں ہمارے یہاں اس کو کتابی بات کہی جاتی ہے یہ Theoretical Part ہے، کوئی بھی کمپنی ایسی نہیں Create ہو سکتی، پبلک میں آپ نہیں جا سکتے، پبلک ایشو نہیں لے جا سکتے، جب تک آپ اپنے پروجیکٹ رپورٹ کے اندر یہ نہ بتائیں کہ آپ کا اپنا Capital اتنا ہوگا اور اتنا کیپٹل آپ Banking Institution سے لیں گے، یہ چیز بہت واضح ہونی چاہئے، بس یہ کہ آج کے نظام میں ایسی کوئی Possibility ہے ہی نہیں کہ آپ Public Limited Company بنائیں۔

مفتی احمد خانپوری صاحب:...... کمپنی شروع ہونے کے بعد سرمایہ سے نہیں جائے گا، بلکہ اس کا جو Production ہوگا وہ فروخت ہوگا، اس میں سے جو منافع ملے گا اس میں سے کم ہوگا اور یہ سوال تو پہلے اٹھایا گیا ہے کہ بھئی یہ جو طریقہ ہے اس میں سود کا کچھ دینا بھی پایا جائے گا، لینا بھی پایا جائے گا اور شیئر ہولڈر نہیں چاہتے، جو مسلمان ہیں وہ نہیں چاہتے کہ ہمارے نام پر اس طریقہ سے سودی لین دین ہو، تو ایسی کمپنیوں میں ہم Investment کریں یا نہ کریں؟ یہی سوال ہے۔

مفتی مصلح الدین صاحب:...... بنیادی سوال ایک دوسرا اور ہے کہ "أحلّ الله البيع وحرّم الربا" بیع حلال ہے اور ربا حرام ہے اور ربا کا لین دین جیسا لینا جائز نہیں ہے اور حرام ہے، ایسا دینا بھی حرام ہے، اِلا بوقت ضرورت شدیدہ، اب وہ ضرورت شدیدہ کیا ہے؟ شریعت ضرورت شدیدہ کس چیز کو مانتی ہے، پہلے تو ہم اس کو طے کریں، اس کے بغیر ہم......

قاضی صاحب:...... مولانا ضرورت یا حاجت؟

مفتی مصلح الدین صاحب:...... حاجت، حاجت شدیدہ شریعت کے نزدیک کون سی معتبر ہوگی، تو اس صورت کے اندر ایسا کوئی کاروبار کہ جس میں ہمیں سود دینا پڑتا ہے، اس کاروبار کی بھی اجازت ہمیں حاصل ہو، ایسی حاجت شدیدہ کون سی ہے؟ اس لئے پہلے تو ہمیں بنیادی طور پر اس بات کو طے کرنا ہوگا۔

مولانا یعقوب اسماعیل منشی صاحب:...... میرا خیال یہ ہے کہ کوئی صاحب ان میں سے ذرا وضاحت کردیں، اس لئے کہ بہت ساری چیزیں ایسی ہو رہی ہیں کہ جس کی وجہ سے مسئلہ الجھ رہا ہے، اب یہ نئی بات اس وقت آئی تو اگر بنیادی طور پر ان میں سے کوئی صاحب تفصیلی بات کرلیں کہ بھئی یہ چیزیں ہیں اور اس کے اوپر سوچا جائے تو میرا خیال ہے زیادہ مناسب ہوگا۔

امین الحسن رضوی صاحب:...... دیکھئے میں عرض کروں، دراصل Confusion ہو رہا ہے، بات ہم یہ نہیں کر رہے ہیں کہ ہمیں کوئی ایسی کمپنی قائم کرنی ہے جس میں سود لینا یا دینا ہے، یہاں گفتگو جو ہو رہی ہے وہ ایسی ہو رہی ہے کہ ہم سرمایہ کار ہیں، ایک اسلامک برانچ کارپوریشن موجود ہے، اب اس کو اپنے پیدا آور ذرائع میں سرمایہ کاری کرنی ہے تو ایسی سرمایہ کاری کرنے کی ایک صورت یہ ہے کہ ایک کمپنی ہے، ہم سے کوئی تعلق اس کا نہیں ہے، ایک دوسری کمپنی ہے جو ایک جائز کاروبار کرتی ہے، ہم صرف سرمایہ کار ہیں، اسلامی فائنانس کارپوریشن ہے، ہمارا کوئی تعلق کمپنی قائم کرنے سے نہیں ہے، Already موجود ہے یہاں، اب ہمیں اپنے سرمائے کو نفع آور کاروبار میں لگانا ہے، اب ہم نفع آور کاروبار کی تلاش میں باہر نکلے، ہم کو ایک ایسی کمپنی کا پتہ چلا جو اچھے لوگوں کے ہاتھ میں ہے، فی نفسہ اس کا کاروبار پورا جائز ہے، کوئی غیر شرعی کام جیسے شراب وہ نہیں بناتی ہے، اس قسم کا کوئی کام نہیں کرتی ہے، اب اس کمپنی کے بارے میں ہم کو یہ معلوم ہوا کہ اس کمپنی کا کچھ تو سرمایہ اس کا اپنا ہے جو اس نے شیئر ہولڈرس سے لیا ہے، لیکن اس کمپنی کے کچھ سرمایہ کا جز ایسا بھی ہے جو اس نے سود پر لیا ہے، اب سوال صرف یہ ہے کہ کیا ایسی کمپنی میں کوئی مسلمان اپنا سرمایہ لگائے یا شیئر خریدے جبکہ یہ معلوم ہے کہ اس کے پاس جو سرمایہ آ رہا ہے جس سے وہ کاروبار کر رہا ہے اس کا ایک جز سود پر قرض لیا ہوا ہے، اب مسئلہ کیا ہے، معافی چاہتے ہیں آپ بزرگوں سے کہ سود لینا اور دینا حرام کہا گیا ہے، لیکن سود لینے کی کسی حال میں گنجائش نہیں رکھی گئی ہے، البتہ سود دینے کیلئے (حالت اضطرار میں) رخصت دی گئی ہے۔ اگر کسی کو حالت اضطرار یا حاجت میں سود دینا پڑے تو اس کی اجازت ہے، لیکن سود لینے کی اجازت کسی صورت میں نہیں ہے، تو یہ فرق بہر حال ضروری ہے، اب یہاں یہ صورت حال آ رہی ہے کہ ہم کو ایسی سرمایہ کاری کرنی ہے، ایک ایسے ادارہ میں کہ جو اپنی مجبوری کے تحت چونکہ قانون کے تحت یہ ممکن نہیں ہے اس کمپنی کے لئے کہ وہ سودی سرمایہ کے بغیر کاروبار کر سکے، کچھ جز اس کا، کل نہیں، وہ کمپنی مجبور ہے سود دینے پر، سود لینے پر وہ مجبور نہیں ہے، سود لے بھی نہیں رہی ہے، صرف سود دے رہی ہے، اب اس کو سود دینے کے نتیجہ میں جو فائدہ حاصل ہوا اس فائدہ میں کچھ جز اس سرمایہ کا ہے جو سود پر حاصل کیا گیا، اس فائدے کا جزوہ آپ کو آپ کے سرمایہ کے معاوضہ میں دینا چاہتا ہے، تو کیا اس کا لینا جائز ہوگا؟

آل مصطفی مصباحی صاحب:...... سود کے یہ حصہ دار منتفع ہوئے، سو اس میں کئی حالتیں ہیں، یعنی احکام متنوع ہیں: ایک تو یہ کہ اس کا وقوع لازم تو ہے نہیں، کیونکہ ممکن ہے کہ کمپنی کا کسی کے ذمہ قرض ہی نہ ہو، اس لئے سود لینے کی نوبت ہی نہ آئے اور اصل صورت تجارت کمپنی کی حلال تھی، تو شک سے حرمت کا حکم نہ کریں گے، یعنی قطعیت پر فیصلہ ہوگا اور تفتیش ایسے امور میں واجب نہیں، نہ تفتیش میں ہر شخص کو جز کا وقوع یا عدم وقوع معلوم ہو سکتا ہے، دوسری حالت یہ ہے کہ کمپنی نے یہ سود غیر مسلم سے لیا ہے تو اس میں ربا من الحربی کا مسئلہ جاری ہوگا، جس کا مختلف فیہ ہونا معلوم ہے، اس لئے مبتلی بہ کو اس میں تنگی نہ ہوگی، لہذا احکام جو ہیں متنوع ہو سکتے ہیں، اکثریت اور قطعیت پر فیصلہ ہونا چاہئے۔

مولانا اسماعیل صاحب:...... کوئی بھی مسلمان اس میں بطور مباشرت سود کی لین دین نہیں کر سکتا ہے اور یہ نص قطعی سے ثابت ہے، یہاں جو مسئلہ زیر بحث ہے ہمیں اسی پر غور و فکر کرنا چاہئے کہ مسلم ہولڈر از خود نہیں کرتا ہے، لیکن کمپنی کا جو بورڈ آف ڈائرکٹرس ہے وہ اس کی مرضی کے خلاف کرتا ہے، شیئر ہولڈر تو چاہتا ہے کہ تمہیں میرے نام پر جتنے سرمائے کی ضرورت ہو، میرے حصے میں سود نہ لو، سودی لون نہ لو، آپ کو چاہئے تو میں اپنے حصہ کا پورا سرمایہ نقد دے دوں، لیکن وہ ان کی مرضی کے خلاف، بورڈ آف ڈائرکٹرس سارے شیئر ہولڈرس کے نام سے کہو یا کمپنی کے نام سے کہو، لون لیتا ہے، تو اب اس صورت میں یہ شیئر ہولڈر بری الذمہ ہوگا یا نہیں ہوگا؟ جبکہ وہ اس سے راضی نہیں ہے اور وہ جنرل میٹنگ جو اس کی ہوتی ہے سالانہ اس میں اپنی رائے بھی دیتا ہے کہ بھئی سودی لون نہ لو، جتنا سرمایہ کمپنی کو چاہئے شیئر ہولڈر سے وصول کرو، تو اب اس کے بعد یہ جو شیئر ہولڈر ہے وہ سود کا کاروبار کرنے والا سمجھا جائے گا یا نہیں سمجھا جائے گا؟ جس کی تاویل حضرت مولانا تھانویؒ نے یہ بیان فرمائی ہے کہ شیئر ہولڈر کمپنی سے کہہ دے کہ بھئی تم میرے نام پر یا میرے حصے پر سودی قرض، سود لینے یا دینے کا کاروبار نہ کرو، جتنا سرمایہ چاہئے مجھ سے نقد لے لو، میں دینے کو تیار ہوں، اگر چہ بورڈ آف ڈائرکٹرس اس کو ماننے والا نہیں ہے، اس پر عمل کرنے والا نہیں ہے، لیکن اب اس معاملہ کی نسبت تمہاری طرف نہیں ہوگی اور یہ مسئلہ فقہ سے بھی ظاہر ہے کہ وکیل جب مخالفت کرتا ہے اور مخالفت رالی الضرر کرتا ہے تو اس صورت میں وکیل کا وہ تصرف موکل کی طرف منسوب نہیں ہوتا۔

ایک آواز:...... بات یہ ہے کہ آخر وہ پہلے سے جانتا ہے کہ میں جو کچھ کہوں گا وہ ماننے والا نہیں ہے، اب اس کے باوجود اس کو کیا ضرورت پیش آگئی ہے کہ وہ اس کمپنی سے شیئرز خریدے، یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس کو کون سی حاجت پیش آگئی کہ وہ اس طریقہ پر کہہ کر حالانکہ وہ جانتا ہے کہ سود لینا بھی ہے اور دینا بھی ہے، یہ ایک حیلہ ہے، بالکل ظاہر ہے حیلہ ہوگا، تو اس کو اس طرح شیئرز خریدنے کی کون سی حاجت پیش آئی۔

ایک آواز: ...... یہاں جو سوال کیا گیا تھا، قاضی صاحب نے شروع میں جو بات فرمائی اس میں پہلے ہی وضاحت فرمادی تھی کہ اس وقت ہمیں بحث اس پر کرنا ہے کہ ایک آدمی کے پاس سرمایہ موجود ہے، ایک بیوہ ہے، بیوہ کے پاس پانچ ہزار روپے ہیں، اب وہ چاہتی ہے کہ اپنے گذران کے واسطے اس پانچ ہزار روپیوں سے کوئی شکل پیدا کرے، کسی کے ہاتھ میں تجارت کے لئے دیتی ہے، تو وہ معلوم نہیں تجارت میں کیسا معاملہ کرے گا، اس پر اعتماد نہیں، اس وقت ایک نفع بخش قابل اعتماد شکل ہمارے سامنے لانی ہے، تو یہ آپ جو فرمارہے ہیں کہ کیا ضرورت ہے، تو آپ اس بیوہ کے متعلق ضرورت محسوس کرسکتے ہیں جب کہ آج عام طور پر مزاج یہ بن گیا ہے کہ کسی بیوہ کے پاس کوئی رقم آتی ہے تو سیدھی Fixed Deposit میں جا کر جمع کرادیتی ہے۔

ایک آواز: ...... تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس قسم کے جو معذور لوگ ہیں ان کے لئے تو رخصت نکلے، لیکن وہ جو اپنے سرمائے کے بڑھانے کے لئے شیئرز خریدتے ہیں ان کا کیا حکم ہوگا؟

کمال فاروقی صاحب: ...... ہم لوگ یہ جو بحث کررہے ہیں ایسا لگتا ہے کہ ہم لوگ Financial Institution اور آج کاروبار کرنے کا جو مزاج ہے اس سے ناواقف ہیں، میں نے عرض کیا کہ پہلی بات تو یہاں جیسا کہ رضوی صاحب نے Clarification فرمایا بالکل صحیح ہے کہ ایک اسلامک بینک ہے، اس کے پاس پیسہ ہے اور وہ شیئرز میں Investment کررہا ہے، پہلے اور دوسرے سوال کا جواب ہی نہیں دے رہے ہیں، ہم تو تیسرے کی بات کررہے ہیں، آپ کے لئے Possible ہی نہیں ہے، میں دوبارہ پھر اس بات کو دوہرا رہا ہوں کہ آپ کے لئے ممکن ہی نہیں ہے کہ آپ کوئی کمپنی کا شیئر پبلک میں لا پائیں جب تک کہ Financial Institution میں اس کے پروجیکٹ میں آپ پیسہ نہ رکھیں، اب اگر آپ کے پاس اتنا پیسہ موجود ہے کہ آپ اپنے طور پر کاروبار کررہے ہیں تو کس نے کہا ہے آپ سے کہ شیئر لیجئے، آپ اپنا کاروبار خود ہی اکٹھا کرلیجئے، Partnership Forum میں چلا لیجئے کاروبار، Civil Propriter میں کاروبار چلا لیجئے، لیکن اگر آپ Public Limited Company بنائیں گے تو پبلک لمیٹیڈ کمپنی بنانے کے لئے شیئرز جاری کرنا آپ کے لئے یہ ضروری ہوگا، خان صاحب نے تو ۹۹ فیصد کہا تھا......

قاضی صاحب: ...... آپ کی وضاحت سے پھر یہ خطرہ ہے کہ لوگ غلط طرف چلے جائیں گے، وہ اس لئے کہ یہاں پر یہ بحث ہی نہیں کہ کیا ہم ایسی پبلک لمیٹیڈ کمپنی بنائیں جس میں کام اس بنیادی طور پر صحیح ہو، لیکن اس میں اتفاقاً ہم سودی معاملہ میں ملوث ہوجاتے ہیں، اگر یہ سوال کریں گے تو اس کی نوعیت دوسری ہوجاتی ہے، کیا ہم ایسی کمپنی بناسکتے ہیں یا نہیں جس کا بنیادی کاروبار جائز ہو، لیکن اس میں کبھی کبھی سودی معاملات میں ملوث ہونا پڑتا ہے، کبھی کچھ لینا پڑتا ہے کبھی کچھ دینا پڑتا ہے، آپ کا نشانہ یہ ہے...... جب اس پوائنٹ پر زیادہ زور دیا جائے گا کہ ایسی کسی کمپنی کا قائم کرنا ممکن ہی نہیں ہے جو سودی کاروبار میں بینکنگ سے ملوث ہوئے بغیر کوئی کمپنی قائم کی جاسکے، میرا کہنا ہے کہ وہ کمپنی ہمارے یہاں زیر بحث ہی نہیں ہے اس وقت، ہمارا مسئلہ ہی وہ نہیں ہے، اس کے بارے میں ہم سے آپ پوچھئے گا تو ہوسکتا ہے کہ سارے لوگ متفق ہوجائیں، یا بعض حالات مجبوری اور حاجت وغیرہ کی رعایت کرکے آپ کو اجازت بھی دیں تو بہت مشکل سے دیں گے...... اب مسئلہ جو یہاں زیر بحث ہے دراصل یہ ہے کہ ایسی کمپنی جو اس اساس پر بنی ہے، ذرا دھیان دیں آپ لوگ، پہلے سے بنی ہوئی ہے ایسی کمپنی یا بن رہی ہے، اپنے بننے کے مرحلہ میں ہے یا بنی ہوئی ہے، جائز مقصد کے لئے بنی ہے وہ......

ایک آواز: ...... تو آپ کے کہنے کے مطابق جب اس طرح کا کوئی بھی پبلک کام آپ کریں گے تو اس میں بینک سے تعلق پیدا کرنا ضروری ہوگا۔

قاضی صاحب: ...... یہ بات ہی نہیں ہے، ذرا آپ میری طرف توجہ دیں، اصل میں فاروقی صاحب نے جس مسئلہ پر زیادہ زور دیا ہے وہاں سے دشواری پیدا ہوگئی ہے، مسئلہ یہاں پر سرے سے یہ ہے ہی نہیں کہ ہم کوئی ایسی کمپنی قائم کرنے جارہے ہیں، ہمارا مسئلہ یہ ہے کہ ایسی کمپنی کسی نے قائم کی ہے، چاہے ہندو نے کی ہو یا مسلمان نے کی ہو، یا کرسچن نے کی ہو...... فرضی نہیں یہ واقعہ ہے، دیکھئے ذرا میں اس کو اور تفصیل سے بتاتا ہوں، بعض کمپنیاں شراب بنانے کے لئے بنتی ہیں، بعض کمپنیاں خنزیر کا گوشت سپلائی کرنے کے لئے بنتی ہیں، ظاہر ہے جو فیکٹری اس کام کے لئے بنی ہے اس کا بنیادی کاروبار حرام ہے، اس کا شیئر خریدنا کسی مسلمان کے لئے یا اسلامی ادارے کے لئے جائز نہیں ہوگا، اس پر ہم اتفاق کرچکے ہیں، کوئی کمپنی یا فیکٹری بنائی جاتی ہے کہ وہ گھڑیاں بنائے گی، Electronic Goods بنائے گی، فرنیچر بنائے گی، اس طرح کے کاروبار کے لئے بنتی ہے، مقصد اس کا جائز ہے، لیکن وہ کمپنیاں اپنی رضا سے یا اپنی مجبوری سے یا جیسے بھی بینک سے قرض لیتی ہیں اور بینک کے لون کی بھی شرکت اس میں ہوتی ہے، ملوث ہوتے ہیں، کام تو بڑا اچھا ہے، کام صحیح ہے لیکن ان کو

ملوث ہونا پڑتا ہے، سوال یہ ہے کہ جو اسلامی مالیاتی ادارہ آپ نے قائم کیا وہ ایسی کمپنیوں میں جو قائم ہو چکی ہیں یا قائم ہونے کے مرحلہ میں ہیں ان میں شیئر خرید سکتا ہے یا نہیں؟ مسئلہ اتنا ہے اور اس پر آپ لوگوں کو جواب دینا ہے۔

ایک آواز:...... اس کا مطلب یہ ہوا حضرت کہ ایک شخص قرض دے رہا ہے، وہ نقد منافع سود کی شکل میں لے رہا ہے اور میں قرض دے رہا ہوں اور مجھے منافع چاہئے سود نہیں چاہئے...... کمپنی جو فرنیچر یا جو کچھ بنائے وہ بینک سے قرض لیتی ہے، تو بینک قرض دے کر اس سے سود منافع میں لے گا، اور ہم اس کو قرض دے رہے ہیں، یعنی ہم شیئر خرید رہے ہیں تو ہم اس سے منافع لیں گے، سود نہیں لیں گے، تو پھر ہماری شرکت ناجائز ہونے کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔

قاضی صاحب:...... ارے بھائی دس لاکھ کا سرمایہ ہے، فرض کرلو یہ فیکٹری دس لاکھ کے سرمایہ سے بنی ہے، جس میں انہوں نے نو لاکھ روپئے اپنے یا کچھ لوگوں سے لے کر لگادیئے ہیں اس شرط پر کہ اس کا جو منافع حاصل ہوگا اس میں ان کو حصہ دیا جائے گا، لیکن اس میں ایک لاکھ روپئے انہوں نے قرض بھی لیا ہے، یہ علماء سے میرا ایک سوال ہے اس کو بھی ذرا ذہن میں رکھیں کہ سود کی بنیاد پر جو قرض لیا جاتا ہے، جو قرض کی رقم ہمارے پاس آئی، یہ رقم ہمارے لئے جائز ہے یا نہیں اس کا مصرف......

ایک آواز:...... یہ رقم حلال ہے بغیر قباحت کے۔

ایک آواز:...... امداد الفتاوی میں جس کا آپ نے ابھی میرے جواب میں حوالہ دیا تھا میرے جواب میں، یہ صراحت موجود ہے کہ ایک آدمی نے کسی کے پاس سے کوئی رقم لی، پانچ ہزار روپئے مثلاً، اور رقم دینے والے نے اس سے یہ شرط رکھی کہ میں اس پر تمہارے پاس سے دوسو روپئے سود لوں گا، اس نے پانچ ہزار قرض لے کر کے اس رقم سے تجارت کی اور اس تجارت سے منافع حاصل کیا، اس کو سود بھی ادا کیا، اور وہ یہ سمجھتا ہے کہ میں نے یہ سود دینے کا کام بھی کیا ہے وہ حرام کام کیا ہے، لیکن ساتھ ہی وہ یہ بھی سمجھتا ہے کہ یہ منافع جو مجھے اس پر ملا وہ حلال ہے، تو کیا اس کا یہ سمجھنا درست ہے، تو حضرت تھانویؒ نے جواب دیا کہ درست ہے۔

قاضی صاحب:...... میرا سوال دراصل یہی تھا کہ سود کی ادائیگی کا عمل حرام ہے، لیکن قرض لینے سے جو رقم آتی ہے وہ تو حرام نہیں ہوتی ہے، قرض میں، ہم نے جو رقم لی ہے، یہ قرض لینا ہے اور سود ادا کرنا ہے، سود ادا کرنا عمل حرام ہوا، لیکن جو قرض لیا وہ مال جائز ہے کہ نہیں۔

ایک آواز:...... یہ اصول کے طور پر بھی ہمارے یہاں معروف ہے کہ "إباحة العقد لا يستلزم إباحة المال و حرمة العقد لا يستلزم حرمة المال" یہ اصول ہے۔ سودی قرض لینا یہ ہمارا معاملہ ہے، یہ ہمارا معاملہ حرام ہے، لیکن اس سے جو مال حاصل ہوگا کوئی ضروری نہیں کہ وہ بھی حرام ہی ہو۔

قاضی صاحب:...... اب سوال یہ ہے کہ دس لاکھ سرمایہ جو اس میں لگا، نو لاکھ اس کا اپنا تھا، شیئر ہولڈرز سے لایا تھا یا پرموٹرس لائے تھے، اور ایک لاکھ روپئے اس نے سودی قرض پر حاصل کیا تھا، تو یہ دس لاکھ جائز سرمایہ کی حیثیت سے ہے، اس سے جو آمدنی حاصل ہوگی وہ آمدنی اور منافع جائز ہوگا یا نہیں ہوگا؟

آوازیں:...... جائز ہوگا۔

قاضی صاحب:...... اس منافع کی اگر تقسیم شیئر ہولڈرس پر ہوگی تو وہ جائز ملے گا یا ناجائز ملے گا؟

آوازیں:...... جائز ملے گا۔

قاضی صاحب:...... اب اس کے بعد ایک دوسرا سوال کہ وہ جو سود ادا کرتا ہے یہ ایک گناہ کرتا ہے، اس گناہ میں یہ بھی شریک ہوا کہ نہیں ہوا، اس کو آپ لوگ طے کرلیجئے، یہ مباشر ہے، یہ سبب ہے، اس کی رضا یا عدم رضا کے اثرات پڑیں گے کہ نہیں پڑیں گے؟

ایک آواز:...... اسی موقع پر مولانا برہان الدین صاحب کی اس شرط کی حیثیت واضح ہوجانی چاہئے تھی، انہوں نے کہا ہے کہ حساب کتاب الگ الگ ہو تو یہ شکل جائز ہوگی۔

قاضی صاحب:...... اب مسئلہ زیر بحث پر پھر دوبارہ گفتگو آگے جاری رکھتے ہوئے میں ڈاکٹر محمد حبیب الخوجہ صاحب جو ہمارے معزز مہمان ہیں، ان سے درخواست کرتا ہوں کہ اس مسئلہ پر اپنے خیالات سے ہم سب کو مستفید فرمائیں، تفضل یا شیخ مشکوراً۔ مولانا عبد اللہ جولم صاحب ایک کاغذ رکھیں ہر پوائنٹ کو نوٹ کرلیں، ایک دم صحیح نکتے آنے چاہئیں۔

ڈاکٹر محمد حبیب الخوجہ صاحب

بسم الله الرحمن الرحيم، وصلى الله على سيدنا و مولانا محمد وعلى آله وصحبه وسلم۔

شكراً سيد الرئيس على إعطاء هذه الكلمة بعد ما استمعت إليه بغاية الدقة والانطباع قدر الطاقة من المسائل المعروضة فى هذه الجلسة، والتى تعتبر شيئا جديدا بالنسبة لما كنت أتوقع من هذه الندوة أو من هذا المؤتمر بأن الموضوع الذى سيبحث فى هذه الدورة السادسة مقصور على الخراج والعشر، ولكن على كل حال ما دمنا قد تعرضنا إلى هذا بالأمس وكان الحديث عنه مطولا و مفصلا، ومادامت بحمد الله قد تحققت كثيرا من النظريات و النتائج بعد المناقشات والعروض، فإنى أحمد الله أن وجدت هذا العنصر الجديد الذى يكمل القضايا المختلفة التى يجتمع من أجلها العلماء المسلمون ويحتاجون إلى بحثها ودراستها، وهذا شأن الهيئات العلمية الفقهية فى كل بلد، وقد نشأ على ذلك مجمع الفقه الإسلامى الدولى بجدة، فنحن من السنة الاولى عندما عقدنا اجتماعنا العلمى بعد الاجتماع التأسيسى بدأنا ننظر فى المشاكل، وكان من بين هذه المشاكل القضايا الاقتصادية، لكن قبل أن أطرح عليكم الملاحظات التى دونتها واستمعت إلى العروض والمناقشات وبعد أن قرأت البيان الذى صدر بشأنها وأعده فضيلة الإمام الأستاذ القاسمى أريد أن أشير إلى ما أشار إليه هو بالإجابة، ذلك أن الأعداء والمخالفين بالمجتمع الإسلامى والذين قاموا بغزوه و محاربته لم تكن هذه الحركات الشرسة فى الغزو والاحتداد والإبادة و تقسيم الجموع و تفريقها شيئاً مقصورًا على الناحية الترابية الأرضية المادية، بل كانت تحويلا للناس أيضا فى أفكارهم وفى تصوراتهم وفى ثقافتهم وفى تشريعهم، واستبدل كثير من الناس بالقرآن والسنة نظماً تشريعية جديدة من هذه القوانين الواردة من البلاد الغربية و غيرها، وأصبح القانون الوضعى هو الذى يتحكم فى المجتمعات الإسلامية شاءت أو أبت، فإذا تكونت هذه الروح التى نلمسها يقظة و عزيزة فى مثل هذا الاجتماع ونجد مثلها فى كل اجتماع أو فى كل مجلس من مجالس الفقه الإسلامى، مما يدل على أن حركات الغزو لم تقدر على إطفاء نور الله، ولم تتمكن من القضاء على الجذوة الأساسية للإيمان التى تربط كل واحد منا وكل المسلمين عامة بالكتاب والسنة وبالهدى الدينى الذى جاء به محمد بن عبد الله ﷺ، ومن أجل ذلك فإنى اعتبر أن التحرك للكشف أولاً لنا، ثانياً للناس عن حقيقة الفكر الإسلامى والمنهج الإسلامى فى المجال الاقتصادى أمر ضرورى لابد منه، ومن ثلاثة أيام فقط قبل سفرى إلى هنا إلى هذه الأرض الطيبة وإلى هذا الاجتماع الكريم لقيت رجلا من كبار أهل القانون القديم الوضعى فى جدة جاء زائرا وهو من رجال القانون ومن رجال الأعمال يبطل الإسلام خوفا من هذه وجماعاته ولكنه متحمس تحمسا كبيرا إلى الكتابة عن الفقه الإسلامى و تدوين القواعد و ضبط الأحكام فى لغته الفرنسية مع لجنة يختارها من الكتاب والعلماء، ويقول أحدهم بعد ذلك معروضا علينا فى مجمع الفقه الإسلامى لنقره أو لنعزله، وهذا أمر مهم، فعند ما تحدثنا عن هذا قال لى كلمة قال ما سمعتها يقول: إن الاقتصاد الإسلامى لا وجود له، هو مجرد كلام، هو ادعاء و الناس يدعون أن فى الإسلام اقتصادا، قال لى: ولكن الأعمال التى أخرجتموها فى المؤتمرات الكثيرة لأنكم ما قضيتم عملا فى مؤتمر من المؤتمرات التسع التى مرت، إلا وكان جانب كثير من المسائل الاقتصادية يطرح ويبحث من خلال الفكر الإسلامى، فهذا دليل على أن الفكر الإسلامى له سلطانه، له منهجه وله سيطرته على التشريع عند المسلمين، وبذلك تصبح القاعدة التى ترجع إليها هذه الأسئلة الثلاثة، الأولى: شركة تقوم بأعمال الحلال، وأخرى تقوم بأعمال الحرام، وأخرى تجمع بين الحلال والحرام، هى التى يوجب عنها النبى ﷺ بقوله ''الحلال بيّن والحرام بيّن و بينهما أمور مشتبهات'' أنا لا أريد أن أنظر إلى هذه القضية بصفة عامة

ولكنى أدخل فى صميم الموضوع، بما أنى فى رحاب هذه الجامعة أريد أن أسأل كما أريد أن أقرّبه، أريد أن أسأل هل فى هذه الجامعة يدرس علم الاقتصاد الإسلامى، فإن لم يكن يدرس فالحاجة إلى هذه كبيرة، والطلبة التى نريد تخريجها من هذه الجامعة ينبغى أن تكون آخذة من يد بالفقه الإسلامى وبالأخرى بالاقتصاد الإسلامى، وأبيّن معنى هذا، لأن الاقتصاد الإسلامى نحن كفقهاء عند ما اجتمعنا فى المرة الأولى بجدة، وجاء تنا أسئلة من مؤتمر بنك التنمية الإسلامى الذى كان يرأسه الدكتور أحمد محمد على، جاء تنى أسئلة كثيرة وأردت أن أجيب عنها أى أن يجيب عنها المؤتمر فلم أفهم شيئا، ما معنى هذا، الاصطلاحات التى كُتبت بها والمعانى التى ترمز إليها هذه الاصطلاحات هى منقولة باللفظ و بالمعنى من الاقتصاد الغربى، وليس بين الفقيه المسلم و بين النظريات الاقتصادية العربية من جامع يجعلها بعد ذلك يسيرة يستطيع أن يجيب عنها بسهولة. فاضطررت إلى عقد اللجنة تتكون من الاقتصاد يين الموجود ين فى البنك الإسلامى للتنمية، ومن أعضاء المؤتمر الإسلامى فى مجمع الفقه الإسلامى ليعيد سياق هذه الأسئلة بلغة يفهمها الفقهاء، وفعلنا ذلك، مرة أولى ومرة ثانية، لأنها عندما عرضت فى المرة الأولى على المؤتمر لم يفهم شيئا، فاضطررنا إلى تعديلها و تبسيطها وجعلها باللغة التى يمكن أن يفهمها عامة الناس، وكُتبت وأجيب عنها، وكانت المسئلة الأولى التى طرحت من طرف البنك الإسلامى للتنمية على مجمع الفقه الإسلامى فى دورته الثالثة هى قضية خطاب الضمان، وما الحكم الشرعى بالنسبة لخطاب الضمان؟ ونحن نعلم بأن هذه المسئلة شديدة الحساسية يختلط فيها الحلال فى الحرام، وفيها وجوه من الربا، و فيها بعد عن الربا، فوقع ضبط الشروط التى يكون بها خطاب الضمان بريئا فى المعاملات الربوية خارجا عن تأثيرها، فإذا توفرت هذه الشروط فإنه يجوز العمل بذلك العقد به، لكننا بعد هذا عندما نظرنا فى المؤسسات المصرفية كما قال سماحة الشيخ وجدنا بعض المؤسسات الإسلامية تريد أن تطوع الشريعة لها، وبعض المؤسسات الإسلامية الاقتصادية تريد أن تأخذ بماجاء ت به الشريعة، ولا تبحث عن تطويع ولا عن حيل، فكانت المعركة شديدة، وكان أكثر من هذه المعركة الشديدة ما علمنا من أن كل مؤسسة بنكية أومصرف من المصارف الإسلامية، له لجنة تسمى لجنة الرقابة الشرعية، لتتولى هذه اللجنة تعقّب الأعمال التى تصدر عن تلك المؤسسة فتلغيها إن كانت حراما و تبقى عليها إن كانت حلالا، وإن كان فيها شئ من الاضطراب فإنما تبيّن الوجهة وتكشف عن سبيل الحق الذى ينبغى اتباعه۔

هذا من جهة، ومن جهة ثانية لسنا أن هذه المؤسسات مع اختلاف اللجان التى نسميها لجان الرقابة الشرعية وقعت فى أحيان كثيرة فى خلط و فى اضطراب، لأن هذه تقضى بالحلّية وهذه تقضى بالحرمة، أصبح الناس الذين يتعاملون مع هذه المؤسسات لا يدرون شيئا، ونضيف إلى هذا مشكلة أخرى، وأن الذين يعملون أو أكثر الذين يعملون فى المصارف الإسلامية ويبشرون النشاط الاقتصادى والتجارى والبنكى فيها هؤلاء تخرجوا من المدارس الغربية ومن المؤسسات البنكية الربوية، ولذلك فهم لايحسنون تطبيق التعليمات الإسلامية فيقع الخطأ من هؤلاء والخطأ من أولئك، وهنا كانت الطامة الكبرى، فاضطررنا فى مجمع الفقه الإسلامى إلى عقد كثير من الندوات زيادة على المؤتمر السنوى لبحث كثير من المشاكل الاقتصادية على وجه لايُكتفى فيه بالمذهب الواحد، وهذا طبيعى، لأن مجمع الفقه الإسلامى الدولى يمثل دول الأمة الاسلامية قاطبة، وتشارك فيه الدول الإسلامية كلها، فهناك لحد الآن اثنتان و خمسون دولة ممثلة فى المجمع بأشخاص يقع اختيارهم من طرف دولهم ليكونوا لسان صدق عنها، وإلى جانب هؤلاء قد يكون بعضهم ذا اتجاه فكرى اقتصادى لكن ليس إسلاميا، وقد تكون بواعث فقهية مزجاة، وقد يكون لايعرف من الفقه المسائل السطحية أو السهلة التى يعرفها كل أحد،

فالعمق الذى يحتاج إلى خبراء۔

ومن أجل ذلك فإننا فى كل موضوع من الموضوعات التى تطرح على المجمع نستأنس بآراء الخبراء الذين يكتبون إلينا ويقدمون البحوث ويعرضون الحلول، ثم تُناقش هذه الأشياء كلها من وجهة النظر الإسلامية الفقهية. فنكون قد أتينا على الصورة المطلوبة والشكل المرغوب فيه للوصول إلى النتائج التى تصدر فى القرارات أو التوصيات، وبهذه المناسبة فإنى أرحب بهذه الجمهرة الكبيرة من الفقهاء وبهذه الثلة الصغيرة القليلة العدد إن شاء الله ولكن كبيرة الفائدة من الاقتصاديين الذين حضروا معنا هذا اليوم. وعندما أتناول هذه القضية أريد أن أشير كما قال شيخنا إلى أن كثيرا من الدول الإسلامية فيها مؤسسات مصرفية الاسلامية لكنها لا تلتزم بذلك التزاما حرفيا، وأن ممن يلتزم الالتزام الحرفى كما تفعل السودان و إيران، وأنا أقول إن الصراع بين الحياة العملية الواقعة وبين النصوص والآراء هو الذى حمل البنوك الإسلامية نفسها على أن تتخذ مجالس فقهية وعلى أن تكوّن مؤتمرات و ندوات البحث كثيرا من القواعد الجارية. فاضطررت أنا كأمين عام لمجمع الفقه الإسلامى أن أجمع كل الأسئلة التى طرحت فى الماضى فى المؤسسات الاقتصادية والمصرفية، البنك الإسلامى للتنمية، البركة، بيت التمويل الكويتى، بيت التمويل السعودى وما إلى ذلك من المؤسسات التى لها قرارات ودراسات وبحوث مكتوبة.وكوّنّا قائمة فى الموضوعات المطروحة التى يطرحها البنك على العلماء، وبذلك تتصورون بأن القضية ليست قضية معرفة الحلال والحرام فقط بل قضية بيان الحكم الشرعى فى الطرق المستعملة أو المعتمدة لدى هذه البنوك فى إجراء أعمالها سواء فى باب الأسهم أو الاستثمار أو غير ذلك، وفى أشكال السندات أو أشكال الحصص التى تكون للأعضاء إلى آخره، واضطررنا أيضا إلى عقد دورتين حول تغيير قيمة العملة وأثر ذلك على الاقتصاد الإسلامى والأحكام الشرعية المنوطة بتغير قيمة العملة. وعقدنا أيضا ندوات بالإضافة إلى مؤتمرات كانت حول السوق المالية الإسلامية، العالم كله فيه أسواق مالية. لكن العالم الإسلامى راح عادما، ويعدم إلى الآن السوق المالية، فهل جاء الوقت لنكوّن أسواقا مالية، ما هى شروط إقامة السوق المالية، ما هى الموارد الأساسية فى الأسواق المالية التى يؤمن بها الغرب ويستخدمها، وهل هى جائزة عندنا، وعما هى البدائل التى تعوضها لنستطيع أن ننهض بمشروع إسلامى، ثم هنالك هذه البدعة الجديدة بطاقات الائتمان التى اختلفت اختلافا كبيرا، وأقر منها المجمع ما هو جار على الأصول الشرعية ورفض الكثير مما لا يجرى على الأصول الشرعية. عندما بحثنا هذه القاعدة تبين لنا و نحن نناقش كل قضية تعرض وتُطرح على المجمع مناقشة لانلتزم فيها بحكم ما بيّنته من اختلاف التنصيص لهذا المجمع. لا نلتزم فيها مذهبا واحدا، لماذا؟ لأن الأعضاء منهم مالكيون ومنهم أحناف ومنهم حنابلة ومنهم شوافع ومنهم زيديون ومنهم جعافرة ومنهم إباضيون، وهذه الجموع الكبيرة من الفقهاء والقضاة تتعاون كلها مع بعضها، فإذا كان واحد من الفقهاء الذين يشهدون هذه المجالس يرى حكما لم ينتبه إليه إخوانه من الناحية الشرعية لكونه غير وارد فى كتبهم، وإنما هو وارد عنده فإنه يذكّر بما عنده لعلنا نجد الدليل الأقوى من جهة الأقوم والأفضل الذى يخدم المصلحة الشرعية و مصالح الناس، لأن مصالح الناس والمصالح الشرعية المعتبرة هى التى يعتمدها الإسلام واعتمدها القرآن فى تقرير المنهج الذى ينبغى أن يسير عليه المجتهد، لأن المجتهد ليس عليه إلا أن يبحث عن المصلحة فأينما وجدت المصلحة فثمّ شرع الله، بالإضافة إلى هذا، عندما قرأت هذه الأسئلة الكثيرة وهى أسئلة مهمة، ولابد أن تجيش بها نفس المؤمن وأن يتحرك إلى الإجابة عنها، لكنها أسئلة جزئية لاترجع إلى مساكن مطروحة فى الصحة حقيقة، أستطيع أن أقول هى التساؤلات التى تصدر عن المسلم عند الفقيه من غير أن يكون اقتصاديا ومن غير أن يكون مشاركا فى العمل الاقتصادى،

وإلا فإن الأسئلة المطروحة اليوم فيها النوع الذى يحمل المسلم على التساؤل، هذا حلال أم حرام، يجوز بأن أقوم به أم لا يجوز؟ تجنبا للمحاذير وسيرا على وسط المنهج الإسلامى، أما الأسئلة الأخرى فهنالك الأسئلة التى تصدر عن المصارف ذاتها، المصارف هى فى حاجة إذا من يأتيها، جعلنا بسبب التأسيس والبناء للمصرف الإسلامى على الوجه الكامل، ولم يصل بعد إلى النهاية، هو فى خطواته يتحسر، مرة يريد أن يأخذ بما فيه ربح، وقد وجد عند المصارف الغربية أو الربوية ويقول هل من سبيل لتوفير الإنتاجات المادية عندنا ويكون بذلك قوة للمسلمين، فيقول له لا، هذا ليس بجائز، لأن المساهمة من البنوك الاسلامية مثلا فى الهيئات الربوية فى شركات مساهمة غير جائز، عقدنا لهذا ثلاث ندوات، بحثنا أصول هذه المسئلة وفروعها، وتقدم الاقتصاديون من المسلمين بنصوص كثيرة تبيّن لنا وحالتها وبُعدها عن الفكر الإسلامى، والأجوبة التى كانت مترتبة عليها بالجواز، نقضت إذ نقض أصلها، فلم يبق إلا التحريف، وبقينا نبحث عن المخارج أو التخريجات الشرعية مرة وعن أحوال الضرورة التى تمس المجتمع ككل أو بعض الأفراد كأشخاص لنجد بعض المبررات فى بعض المسائل الجزئية، وهذا موجود فى كثير من الأحكام والقرارات التفصيلية التى صدرت عن المجمع......صورة عن هذه القضايا التى بحثناها فى المجمع والتى اريد أن نبحث هنا فى مجمع الفقه الإسلامى فى الهند، أريد أن يكون بيننا و بينكم، بين مجمع الفقه الاسلامى بجدة ومجمع الفقه الإسلامى بالهند اتصال دائم، وبيمين الله يكون ذلك من باب التعاون على الخير ومن باب التطلع إلى الحكم الشرعى الواضح الذى لا التباس فيه، ومن جهة أخرى إذا عرض علينا هنا بعض المسائل نطرحها على مجمع الفقه الإسلامى ونقول لهم نريد الاجابة عن هذه القضايا، وهذا سائرا وراء التوحيد فى الأجوبة والقرارات حتى لا يكون بعض المسلمين يفتون برأى والآخرون يخالفونهم فى ذلك الرأى. نحاول التجميع والاتفاق قدر الاستطاع، هذا من جهته، ونكوّن الاتفاق قدر الاستطاع لينفى أن تكون هناك حاجات ماسة وخاصة فى مجتمع ما، فيفتى علماء ذلك البلد أو تلك الأرض بما لا يفتى به عامة المسلمين، وهذا مثل بيع الوفاء عند أهل خراسان الذين اضطروا إليه فرارا، ولكنهم أحلوه ولو كانت فيه شبهة الربا، لأنهم جمعوا بين أشكال مختلفة وصوروه بصور متعددة، والكلام فى هذا يطول، فإن ابن الهمام له فيه كثير من الصور التطبيقية والإجابات عن الأسئلة التي عرضت عليه، وكذلك المرغينانى فى كتابه ''الهداية'' وغيرهم من أكابر العلماء الذين ظهروا فى خراسان وفى ماوراء النهر وفى البلاد الهندية أيضا، لأن بعض هؤلاء العلماء آخذ بما ذكره الآخرون من صفوة أهل العلم والمفكرين السابقين والتابعين منهم فكم يتعاونون على ذلك، فإذا كانت القضية خاصة ولها ظروف معينة فتلك التى يجوز فيها التأويل أو التؤول ويجوز فيه طرح النظريات التى قد لاتتفق معه ما يصدر عن المجتمعات الإسلامية ولكن لها حكمها، وأنا يعجبنى ماقرره الشيخ محمد طاهربن عاشور رحمه الله فى كتابه ''مقاصد الشريعة'' من أن الرخص التى يأخذ بها الفقه الإسلامى ليس كالرخص الشخصية....لا معنى لها، لأن كل واحد يستطيع أن يفتيك إذا كانت هناك ضرورة قائمة وحاجة ماسة أن تأخذ فى قول......لكن هذا يكون لفائدة المجتمعات الكبيرة والقضايا العامة ليخرج الناس من الضيق إلى الوسع ومن القلق والحيرة إلى الاطمئنان، ولتفسير بعض هذه الأشياء أريد أن أقول لكم بأننا بحثنا فى ندوات خاصة مسائل كثيرة لم يصدر فيها قرار مجمعى فى جميعها، لماذا؟ لأنها بالرغم عن عقد الندوات الخاصة لم تستوف حقها من النظر، وهذا مثل الأسهم فى الشركات وقضايا الاستثمار، بل عقدنا له ثلاث مؤتمرات، واحدة فى جدة، والثانية فى المغرب فى الرباط، والثالثة فى البحرين، وهنالك تغير قيمة العملة التى صدر فيها ما صدر من توصيات أو قرارات أخذت بما هو معروف من مقابلة مثلى بالمثلى ومقابلة القيمى بالقيمى، وأنه لا يجوز أن انتقل من المثلى إلى القيمى.......ويلى

قضية مطروحة على كل حال، لكن الواقع يصادم هذه النظرية، ونحن نجد فى المذهب الحنفى تيسيرا، وخروجا عن هذا التضييق، لأن ما بين الإمام أبي حنيفة وبين الإمامين أبي يوسف و محمد بن الحسن الشيبانى من التأمل والغوص على هذه القضية ما يساعد على الخروج من الأزمة التى واجهها الناس فى المجتمعات الإسلامية اليوم، وآخذ مثالا بسيطا عندما أقول لك: عليّ دين تركت فى ذمتى من عشر سنوات بالروبية، هذا الدين قيمته ألف روبية أو عشرة آلاف روبية، هل العشرة آلاف روبية التى هى دين عليّ من عشر سنوات، بقيت قيمتها هى نفسها اليوم أم تغيرت هذه القيمة، ربما كنت أستطيع أن أشتري بيتا بالعش......من عشر سنوات، والآن لا أستطيع أن أشترى بها سيارة، وعندئذ فرق كبير، وفى الأسواق التى أصيبت فيها بعض العملات بالانحطاط والهبوط قياسا على الوضع العام الاجتماعى من جهة وقياسا على تغير الأسعار، فتغير الأسعار أو مانسميه بارتفاع الأسعار......كان سببا شديدا فى إرهاق الناس وحملهم على أن ينشدوا الحق من الطريق الذى يوصّل إلى ذلك الحق۔

أما أن قول المثلى بالمثلى أنفع إليك بعشرة آلاف روبية التى كانت فى ذمتى من عشر سنوات أو من مائة سنة ويكون بيننا هذا عدل، فليس من العدل فى شئ، لأن المثلية هنا لا اعتبار لها، وماذهب إليه الفقهاء فيه دليل على ذلك و شهادة، على أن هذه القضية لم يُبتّ فيها، مازال الدارسون يبحثون عن أشكال لإيجاد التحرير الدقيق للمسائل والإجابة عنها، ولذلك من كل هذه القضايا المعروضة على المجمع من الرياض والمعروضة على الندوات الفقهية التابعة للمجمع كوّنّا لجنة، هذه اللجنة تعرض على نشر البحوث الموسوعية، وهذه الموسوعة هى الموسوعة الفقهية الاقتصادية، وأدخلنا فيها عدة موضوعات واستكتبنا الاقتصاديين......ونحن فى كل دورة وفى كل اجتماع نتلقى أسئلة، وسؤالى الذى أطرحه كما أطلب من مجمع الفقه الإسلامى بالهند أن يكتب إلينا غير مأمور بأن يسألنا ما هى القضية أو وجه الحكم فى القضايا التالية لنصنّفها فى جملة القضايا المطروحة على المجمع إذا تعذر عليه القيام بذلك، أو إذا وجد حرجا بأن كانت النظرة فيها مذهبية أكثر من كونها فقهية عامة، فنحن نرحب ونريد أن نتعاون فى هذا المجال، ومن جهة ثانية أطلب من سماحة الإمام شيئا هو أدرى به مني، أنا لا أعرف فقهاء الهند، هذا الاتصال الكريم الذي هيأه الله سبحانه و تعالى لى، وإنا سعيد به كثيرا، فأنا أريد أن أعرف الفقهاء الهنود الذين لهم إلمام بالجانبين الاقتصادي والفقهي، أو على الأقل الذين إذا طرحت عليهم المشاكل الاقتصادية من طرف الموسوعة يستطيعون الكتابة فيما يعرض عليهم من دراسات شرائع اقتصادية، ليدلى مجمع الفقه الإسلامى بالهند بدلوه مع إخوانه الذين يعملون فى مشارق الأرض ومغاربها، والله أحمد على هذا الاجتماع المبارك الذى جمعنى بكم ودفعنى إلى الاستزادة من المعرفة بالقضايا الإسلامية عن طريقكم وبوجوه تحليلها، وأشكر الشيخ زبير بارك الله فيه۔ على أن عاد بمسألة سألناه عنها بالأمس إلى مصادرها الفقهية مشيراً إلى الوجه أى وجه الحكم الشرعى مع بيان الحالات المطلوبة، وهذا من فضل الله علينا، كنا عندما نسير إلى بلاد الشرق الأقصى، وهذه من بلاد الشرق الأقصى نظن أنفسنا سنختلط بأعاجم لما كوّنه الإنكليز والفرنسيون والمستعمرون فى أذهاننا، وأننا سوف لا نجد كلمة بالعربية أو فقها إسلاميا ولكنى أؤكد بأننى فى أول زيارة قمت بها إلى باكستان وفى أول زيارة قمت بها إلى الهند، وذلك من نحو ثلاثين سنة و شفت عكس ما يقوله الإنكليز والفرنسيون والولنديون وغيرهم، يعنى وجدت فقهاء بحمد الله فى كل مكان من هذه القارة الهندية، ووجدت علماء يدركون إدراكا دقيقا المفاهيم الشرعية التى أدلى بها علماء نا رضى الله عنهم۔ فى الماضى، ونحن فى حاجة كبيرة إلى جهودكم جعلها الله مثمرة وإلى أعمالكم جعلها الله نامية وخصبة، حتى نلتقى دائما على التعاون فى سبيل الله وفى سبيل إعلاء كلمة الله عن طريق تطبيق الشريعة الإسلاميه ببيان فضلها وإسكات الأصوات المنادية بتغييرها واللمس فيها، والحمد لله أولا وآخرا، وصلى الله على سيدنا محمد وعلى آله وصحبه وسلم۔

قاضی صاحب:......میرا خیال ہے اکثر علماء نے تو بات سمجھ ہی لی ہے، لیکن ہمارے کچھ دوست ایسے بھی ہیں، جنہوں نے بات نہیں سمجھی ہے، میں نے چاہا تھا کہ میرے دوست ڈاکٹر عبداللہ جولم صاحب اس کی تفصیل بتادیں، لیکن درمیان میں انہوں نے یہ پرچہ دیا کہ تمہیں ہی اس کے بارے میں کچھ بتادینا ہے، تو میں مختصراً ان نکات کی وضاحت کردیتا ہوں جن کے بارے میں شیخ نے بات کی ہے، گرچہ وہ پوری حاوی نہیں ہوگی، بہت سی باتیں چھوٹیں گی، پہلی بات تو انہوں نے یہ کہی کہ صاحب جو دشمنان اسلام اس وقت دنیا میں کام کررہے ہیں ان کا ایک بڑا نشانہ صرف مادی طور پر اراضی پر قبضہ ودخل کرلینا اور کسی ملک کو اپنی حکومت میں داخل کرلینا نہیں، بلکہ اصل فکر اسلامی کو برباد کردینے کی کوشش ہے، ان کا ایک بڑا نشانہ یہ ہے کہ اسلامی فکر اور اسلامی عقیدہ، اسلامی تصور، اس کو کسی طرح معاشرہ سے مٹادیں، آج جو ہمارے سامنے چیلنج درپیش ہے وہ یہ ہے کہ ہم کس طرح فکر اسلامی کو نہ صرف یہ کہ باقی رکھیں بلکہ نظری ہونے کے ساتھ ساتھ اس کو عملی اور تطبیقی صورت ہم دے سکیں، خصوصیت کے ساتھ اقتصادیات کے میدان میں جو عمل دخل مغرب سے آنے والے نظریات کا ہوا، ظاہر ہے کہ جو اقتصادی نظام بنا ہے اس کا کوئی رابطہ بھی اسلام کے اقتصادی نظریات سے نہیں ہے، بلکہ اس کی اساس ان افکار ونظریات پر ہے جو مغرب سے آئے ہوئے ہیں، اس لئے جب ہم اقتصادی مسائل پر غور کرنے بیٹھتے ہیں تو ایک بڑی مشکل یہ ہوتی ہے کہ ان مغربی افکار سے آزاد ہوکر خالص اسلامی نظریات کی اساس پر کسی نظام کی ترتیب ایک مشکل صورتحال اختیار کرتی ہے، اسی کا ایک بڑا نتیجہ یہ ہے کہ جو اسلامی ممالک میں اس وقت اسلامی بینکنگ کے مختلف ادارے قائم ہورہے ہیں، ان میں دو طرح کا عنصر پیدا ہوتا ہے، یا تو وہ ہیں جو اسلام اور شریعت کو اپنے تابع بنالینا چاہتے ہیں، وہ چاہتے ہیں کہ شریعت میرے پیچھے پیچھے چلے، اور دوسرے وہ لوگ ہیں جو مسائل کا کوئی متبادل حل نکالنے کے بجائے ایک ایسا کنارے کا راستہ اختیار کرتے ہیں جن سے کسی چیز کی حلت یا حرمت کا تو فتوی دیا جاسکتا ہے، لیکن مسائل کا حل نہیں ہوتا ہے، اسی سلسلہ میں جو اسلامی بینک قائم کئے گئے ہیں انہوں نے اپنا رقابت شرعیہ کا یا شرعی بورڈ کا ایک نظام تو قائم کیا ہے کہ ان کے کس عمل کو حلال کہا جائے، کس عمل کو حرام کہا جائے۔ سوالات بھی بہت سے پیدا ہوئے ہیں اور ان سارے سوالات کو انہوں نے ہمارے پاس مجمع الفقہ الاسلامی میں بھیجا ہے، اس کی بہت لمبی تفصیلات ہیں، لیکن اگر کوئی فیصلہ علماء اور شریعت کی طرف سے ہوبھی جاتا ہے تو جو طبقہ اصل میں اس بینک کو عملی طور پر چلاتا ہے چونکہ وہ مغرب کے اقتصادی نظریات سے متاثر ہے، یا مغربی بینکنگ کے اصولوں پر عمل کرنے کا عادی ہے، اس لئے علماء اور شریعت کے اس فیصلہ کی صحیح عملی تطبیق بھی وہ نہیں کرپاتا ہے، کوئی بات اگر غلط کہہ دوں تو آپ لوگ بتادیجئے گا۔

دوسری طرف انہوں نے وہ تفصیلات بتائیں کہ کس طرح بینک اسلامی کے سوالات کو اور مختلف اداروں کے سوالات کو جمع کیا اور ایک قائمۃ الموضوعات ایک فہرست تفصیلی ان مسائل کی تیار کی اور کتنی قسم کی انہوں نے الگ الگ کمیٹیاں تشکیل دیں، جس میں ماہرین اقتصادیات اور ماہرین فقہ اسلامی دونوں کو جمع کیا، پہلے انہوں نے اصل مواد ماہرین اقتصادیات کے ذریعہ جمع کرایا، پھر علماء سے علمی اور تحقیقاتی کام کرایا، اس کی پوری تفصیلات، پھر ایک ایسا موسوعہ اقتصادیہ اسلامیہ مرتب کرانے کی کوشش جس کے ذریعہ ان تمام مسائل کے بارے میں تفصیلات سامنے آسکیں، اسی ذیل میں انہوں نے ایک اہم بات کہی کہ ہمارے مدرسوں میں جو یہ ہمارے جامعات ہیں ان میں آپ فقہ تو پڑھارہے ہیں، لیکن کیا اقتصاد اسلامی کا آپ درس دے رہے ہیں لڑکوں کو یہاں، ظاہر یہ ہے کہ اس کا جواب نفی میں ہوگا، تو وہ مسائل جو آگے آنے والے ہیں اقتصادیات کے میدان میں ان کے حل کرنے کے لئے جہاں ایک طرف فقہ اسلامی کی مہارت ہونی چاہئے دوسری طرف اقتصاد کے اصولوں کو سمجھنے کی صلاحیت اور اس کا شعور ہونا چاہئے، ہم اپنے مدارس میں اقتصاد اسلامی کو ایک موضوع کی حیثیت سے پڑھاتے ہی نہیں ہیں، یہ ایک بہت بڑا خلا ہے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اقتصادی مسائل جب علماء کے سامنے پیش کئے جاتے ہیں تو وہ ان کی اصطلاحات کو سمجھ کر کوئی حکم شرعی کی تخریج کے لائق نہیں رہتے، یہ ایک بڑا مسئلہ ہے جسے ہمارے اداروں میں حل کیا جانا چاہئے۔ اسی طرح آگے بڑھ کر انہوں نے ایک اہم بات یہ کہی کہ صاحب جہاں ہم کام کرتے ہیں یعنی مجمع الفقہ الاسلامی الدولی جو انٹرنیشنل اسلامک فقہ اکیڈمی ہے، ہم چونکہ دنیا بھر کے مسلمانوں کی نمائندگی کرتے ہیں، اور ہر ملک میں بسنے والے مسلمانوں کے مسالک فقہی مختلف ہیں، کہیں مالکیہ ہیں، کہیں حنابلہ ہیں، کہیں پر شوافع ہیں، کہیں پر احناف ہیں، کہیں پر اباضیہ ہیں، کہیں پر جعفری، کہیں پر زیدی ہیں، مختلف فقہ معمول بہا ہے، تو ہمارا جو نقطۂ نظر ہوتا ہے یہ جملہ مسالک فقہیہ کو سامنے رکھ کر غور کرنے کا ہوتا ہے، اور جو ماحول بنا ہے اس میں خلاصہ یہ ہے کہ اس میں تعصب مذہبی کے بجائے مصالح اسلام کی تحقیق پیش نظر رہتی ہے، اس لئے اگر فرض کرلیجئے کہ کسی مسئلہ کا حل کسی خاص فقہ کی روشنی میں وہاں نہیں ہورہا ہے، لیکن دوسرا فقیہ اپنے یہاں ان کی فقہ میں جس مسئلہ سے بحث کی گئی ہے وہ سامنے لے آتا ہے، تاکہ اس کے دلائل کا لوگ جائزہ لے لیں، اقوی دلائل کیا ہیں؟ قوت دلیل کو دیکھ لیں، اور مصالح مسلمین کو دیکھ لیں، اور تحقیق مصالح جو بنیادی مقصد بھی ہے، تحقیق مصالح اور قوت دلیل کو سامنے رکھتے ہوئے اگر کوئی حل نکلتا ہے تو مسئلہ کا حل کریں، اس طرح مخلصانہ تعاون تمام اہل مذاہب ومسالک کے درمیان مسائل کے حل میں ہمارے یہاں رہتا ہے، شیخ نے یہ بھی کہا کہ

صاحب ایک اچھا راستہ یہ کھلا ہے، اور انہوں نے آخر میں جو بات کہی لیکن اول ہے، کہ صاحب دنیا کے بہت سے ملک میں میں جاتا ہوں، وہاں جا کر بالکل عجمی بن کر رہ جاتا ہوں، عرب لیکن بن جاتا ہوں عجمی، اسلئے کہ کوئی میری بات سمجھنے کے لائق نہیں رہتا، میں نے جو پاکستان یا ہندوستان کا سفر کیا تو مجھے اس بات کی بے حد خوشی ہوئی کہ میں اپنی بات عربی زبان میں کہہ بھی سکتا ہوں اور ایک بڑی تعداد علماء اور فقہاء کی جن کی نظر فقہ کے دقائق پر ہے اور جو تعبیرات کی گہرائیوں کو سمجھتے بھی ہیں، اور جو کتاب وسنت کی تعبیرات پر بھی اچھی نظر رکھتے ہیں، عبارات فقہاء پر بھی، میں ان کے سامنے کھل کر بات کرنے کی پوزیشن میں بنتا ہوں۔

میرے لئے یہ سفر بہت اہم ہے کہ اس طرح ہم وہ رابطہ اور اتصال پیدا کر سکتے ہیں جو اسلام کے حق میں مفید ہوگا، اب اس کی ایک صورت یہ ہے کہ آپ کے سامنے جو مسائل آئیں بے تکلف آپ ان مسائل کی فہرست ہمارے پاس بھیج سکتے ہیں، اور ہم بھی ان مسائل کو اس بین الاقوامی المجمع الفقہی کے سامنے رکھ سکتے ہیں کہ صاحب ان مسائل کا جواب ہمیں دنیا بھر کے علماء سے مطلوب ہے، اور وہاں ان سے جواب ہم حاصل کر سکتے ہیں۔ دوسری طرف ایسے افراد اور ایسے باصلاحیت لوگ جو فقہ واقتصاد دونوں پر نظر رکھتے ہیں، اگر ایسے لوگوں کے نام ہمیں بھیجے جائیں تو ہم ان کی صلاحیتوں کے مطابق ان سے بحوث اور مقالات لکھوا کر فائدہ اٹھا سکتے ہیں، یا کم سے کم فقہ ہی میں وہ اس لائق ہوں، مہارت ان کی اصلاً فقہ اسلامی میں ہو، لیکن وہ اقتصادی مسائل پر فقہ اسلامی کی تخریج اور مسائل کی تحقیق اور تطبیق کا کام کر سکتے ہوں، تو ایسی شخصیات اور ایسی صلاحیتیں پورے ملک کے لئے پوری دنیا کے لئے جو اسلامی زندگی اور اسلامی مسائل کو حل کرنے کے راستے پر جب ہم غور کرنے بیٹھتے ہیں تو ان کی صلاحیتیں جو ہمارا ایک سرمایہ ہوگی ان سے ہم استفادہ کر سکیں گے، تو اس طرح مجمع الفقہ الاسلامی الہند اور مجمع الفقہ الاسلامی الدولی جدہ دونوں کے درمیان گہرا تعاون اور ارتباط ہوسکتا ہے۔ موصوف نے یہ بھی فرمایا کہ بہت سے مسائل ایسے ہیں جو ہمارے سامنے آئے لیکن اب تک ہم نے ان میں کوئی فیصلہ نہیں کیا ہے، بار بار ہم نے اس پر بحثیں کی ہیں لیکن جب تک کوئی تشفی بخش صورتحال نہ پیدا ہوا اس وقت تک ہم نے فیصلہ نہیں کیا ہے بہت سے مسائل میں، اب ان ہی مسائل کے ذیل میں انہوں نے کریڈٹ کارڈ کی بات کہی ہے، یا Letter Of Credit کی بات کہی ہے، یا Letter of Securities کی بات کہی ہے، اس طرح کے دسیوں مسائل ہیں جو بھی ہمارے یہاں زیر بحث ہیں، اسی طرح ہمارے یہاں موضوع بحث رخصت کی بحث بھی ہے، ایک حوالہ دیا انہوں نے کہ رخصت کی بحث میں یہ بھی بحث آچکی ہے کہ رخصت کا حکم انفرادی طور پر ہر شخص کے لئے اپنے طور پر عمل کرنے کا ہے، یا رخصت ایک اجتماعی ضرورت سے پیدا ہوتا ہے، اور امت کے اجتماعی حالات میں رخصت کی کیا گنجائشیں ہیں، اس کا کس طرح فیصلہ کیا جاسکتا ہے، اس طرح کے متعدد مسائل ہیں جن پر ہمارے یہاں بحث ہوتی رہی ہے، اور ان بحثوں کو ہم اگر مجمع الفقہ الاسلامی الہند کے کاموں کے ساتھ ہمارا رابطہ ہوتا ہے تو ہم یہاں کے مسائل واحوال پر بھی رائے قائم کرنے کی پوزیشن میں ہوں گے۔

خلاصہ ساری گفتگو کا، بہت سارا چھوڑ کر، یہی ہے، جو میرے ذہن میں نہیں رہا اس کے لئے معافی چاہتا ہوں، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اجمالی طور پر بنیادی باتیں آگئیں، میں شیخ کا شکر گذار ہوں، أشكركم شكرا جزيلا على ما بعثتم إلينا وعلى ما فضلتم بأن التعاون والاتصال والترابط بين مجمع الفقه الإسلامي بالهند وبين مجمع الفقه الإسلامي الدولي، إن شاء الله سنرجو من جميعنا وجميع أركاننا، إن شاء الله كلهم يرحبكم وكلهم يشكركم على هذا التعاون العلمي الوثيق الإسلامي، إن شاء الله سنستفيد منكم ومن علومكم ومن علوم جميع العلماء الذين قد رأيتهم في مجمع الفقه الإسلامي، ولا شك أنها نخبة العلماء و نخبة الفضلاء والفقهاء الذين هم متفرقون في العالم ولكنهم قد اجتمعوا على منصة مجمع الفقه الإسلامي بجدة، وإن شاء الله سنستفيد من علومهم و نعرض عليكم أسئلتنا ونرجو أننا نجد منكم جوابا شافيا لما ابتلينا به في بلادنا، وأنكم تعرفون يا سيدي أننا نحن في حالة خاصة و متاعب مختلفة، ونحن في سعة أن نشرع القوانين حسبما نرضى، بل قوانين و تشريع القوانين بأيدي غيرنا، لانستطيع أن نغيرهم الآن، لعل الله يحدث بعد ذلك أمرا، لا نقول شيئا ولكن نرجو إن شاء الله رجاء خير، والآن نحن الأقليات الإسلاميه في جميع بلاد الهند و مثل ذلك في بلاد أخرى، هم في متاعب كثيرة، ولهم مسائل كثيرة، ولهم مشكلات كثيرة، هذا ما ذهبنا إليه في ندوات سابقة، إننا نحتاج إلى فقه الأقليات خصوصا، المسلمون في أقلية وليس لهم أي استطاعة، فماذا يفعل؟ بل يمكن كما قلتم يا سيدي إنه يمكن أن نفتي في السعودية بفتوى أخرى ونفتي في الهند بفتوى أخرى، فهذا من الممكن، لأن أحوالنا غير ما أنتم فيه من الأحوال۔

تو ایک مسئلہ جو ہمارے یہاں زیر بحث تھا، جو ابھی تک بات چل رہی تھی، وہ میرا خیال ہے کہ اچھی خاصی رائے آئی اس پر اور ہم اس مسئلہ کی پھر تلخیص کرتے ہوئے بات ختم کرتے ہیں کہ اگر آپ کوئی اسلامی مالیاتی ادارہ صحیح بنیادوں پر قائم کریں تو کیا اس مالیاتی ادارہ کے لئے یہ جائز ہوگا کہ وہ اپنا سرمایہ ایسی تجارتی کمپنیوں میں لگائے جو تجارتی کمپنیاں جائز کاموں کی تجارت کے لئے قائم کی گئی ہیں، لیکن ان ہی حالات کی بنیاد پر ان کے جائز کاموں میں، سرمائے میں کچھ سود پر لیا ہوا قرضہ بھی شامل ہوجاتا ہے، ایسے اداروں سے ایسی تجارتی کمپنیوں میں یہ ہمارا اسلامی مالیاتی ادارہ شیئر لے سکتا ہے یا نہیں لے سکتا ہے؟ یہ سوال تھا اس پر آپ حضرات نے کافی جوابات بھی دیئے ہیں، کیا اس پر مزید کسی بحث کی ضرورت ہے، یا اس پر آپ ماہر علماء کی کارکردگی میں ایک کمیٹی بنادی جائے جو آئے ہوئے جوابات کو بھی سامنے رکھے، اور اس کے بارے میں ایک تجویز تیار کرے، کیا اس پر مزید کسی صاحب کو کچھ کہنا ہے؟ مفتی صاحب آپ کو کچھ کہنا ہے؟

مفتی محبوب علی وجیہی صاحب:...... میرا خیال یہ ہے کہ اس تناظر میں اس پس منظر میں آپ دیکھیں کہ انفرادی ضرورت نہیں ہے یہ تو ضرورت ہے، اور ایسے ماحول میں ہے کہ ہم قوانین بنا بھی نہیں سکتے، اور ان کے اندر دخل بھی نہیں دے سکتے، تو اس کے لئے کچھ ...... سوچنا اور گنجائش ایسی نکالنا کہ ہمارا جو احکام اسلامی ہے اس کے اندر بھی کوئی ایسی کھلی ہوئی ہم سے زیادتی نہ ہوجائے، اور ہمارے لئے مخرج جو نہیں ہے اس کے لئے کوئی راستہ نکل جائے، اس کے لئے دنیا میں رہنا ہے تو قوم وملت کو بھی کچھ کرنا ہے، ایسے پیچھے رہ کر صف ثانی میں یا ثالث میں ہمیں جانا نہیں ہے۔

ایک آواز:...... میری رائے میں جو کمپنیاں ایسی ہیں جو حلال کاروبار کرتی ہیں، اس کے اندر سرمایہ لگائے، لیکن اپنی طرف سے کوئی سودی لین دین نہیں کرے، اگر کچھ آمیزش ہوجائے تو اس کو اس میں سے نکال کر صدقہ کردے جو اس کا مسئلہ ہے، واجب التصدق ہے۔

مفتی جنید عالم صاحب:...... میری رائے یہ ہے کہ اس طرح کی کمپنیوں کے حصص کی خرید، یہ درحقیقت مال حلال اور حرام جو مخلوط ہیں ان کی خریداری ہے، اور اگر مال حلال وحرام مخلوط ہوں تو ان کی خریداری جائز ہے یا نہیں؟ اس سلسلہ میں کتب فقہ میں یہ تفصیل موجود ہے، فتاوی ہندیہ میں بہت اچھی بحث ہے، فتاوی ہندیہ میں اس مسئلہ میں بحث کرتے ہوئے اس کی تین صورتیں بیان کی گئی ہیں جو درج ذیل ہیں: نمبرا۔ یقین کے ساتھ معلوم ہو یا ظن غالب ہو کہ یہ مال حرام ہے، ظلماً کسی سے لے کر بازار میں فروخت کیا گیا تو ایسی صورت میں اس مال کی خرید وفروخت شرعاً جائز نہیں ہے، جبکہ لوگوں کے درمیان اس کی خرید وفروخت کا سلسلہ جاری ہو۔ دوسری صورت یہ ہے کہ یقین کے ساتھ یہ معلوم ہو کہ مال حرام موجود ہے لیکن مال حرام اور مال حلال دونوں اس طرح محفوظ ہیں کہ ان دونوں کے درمیان تمیز مشکل ہے تو امام ابوحنیفہؒ کے ضابطہ اور اصل کے مطابق حلال وحرام کے باہم مخلوط ہوجانے کی وجہ سے۔

قاضی صاحب:...... آپ کیا کہنا چاہتے ہیں وہ کہئے، عبارت پڑھنا ضروری نہیں ہے، آپ کا ذہن کس نتیجہ پر پہنچا کہ اسلامی مالیاتی ادارہ ایسی کسی کمپنی کا حصہ لے سکتا ہے یا نہیں جس کا کاروبار جائز ہے، لیکن اس کو کچھ ضمناً سودی معاملہ میں شریک ہونا پڑتا ہے یعنی سود پر قرض لینا پڑتا ہے، یوں کہئے کہ اس کے سرمایہ میں کچھ حصہ سود پر لئے ہوئے قرض کا ہے۔

مفتی جنید صاحب:...... میری رائے یہ ہے کہ جائز ہے۔

مولانا عبدالجلیل صاحب:...... میں نے تو اس میں لکھا ہی ہے کہ جائز ہے۔

مولانا زبیر احمد قاسمی صاحب:...... میں ذرا تفصیل سے بات کو دہرا دینا چاہتا ہوں، اسلامی مالیاتی ادارے کا اس کمپنی کے اندر شرکت کرنا بشکل خریداری شیئر ہو، یا اور دوسرے انداز سے ہو، یہ میرے نزدیک جائز ہے، اس میں مولانا برہان الدین صاحب کی شرط ہے، ان کی پوسٹ مارٹم نہ ہو، لیکن ان کی شرط کی پوسٹ مارٹم ہونی چاہئے کہ شرط کیوں لگائی ہے، میرا خیال ہے کہ یہ حساب وکتاب کے الگ الگ رکھنے کا جو انہوں نے سوال اٹھایا ہے وہ غالباً اس لئے کہ مال حرام اور حلال کے اختلاط کے بعد پھر مالیاتی ادارے کو اس کے منافع میں سے لینے کا جو سوال پیدا ہوگا تو پھر گڑ بڑی اور اشکال ہوگا، مگر اس سلسلہ میں ہمارے فقہاء کا یہ مشہور اصول ہے کہ مال حرام اور مال حلال کے اختلاط کے بعد استعمال کے جواز اور عدم جواز کے اندر غلبہ کا اعتبار ہے، یہ مشہور مسئلہ ہے اصول کی شکل میں ہے، لیکن اس اصول سے بھی بہت سی جزئیات مستثنیٰ ہیں، حضرت تھانویؒ نے اس اصول کی تفصیلات اور اس کے کچھ نظائر وجزئیات کو پیش کرتے ہوئے یہ لکھا ہے کہ اگر مال حلال اور حرام مخلوط ہو اور وہ تقسیم ہوجائے تو اس تقسیم کے بعد جو شرکاء کے اوپر حصہ منقسم ہو کر کے

پہنچے گا وہ اس کے حق میں حلال ہی قرار پائے گا اور اس کی نظیر میں کہتے ہیں کہ جیسے کہ ہم لوگ گیہوں یا کوئی غلہ ذونی کرتے ہیں اور اس کے اندر جانور پیشاب وغیرہ کر دیتا ہے وہ ناپاک ہے حرام ہے، لیکن جب اس کی تقسیم شرکاء کے درمیان ہوجاتی ہے تو اس بنیاد پر کہ وہ ناپاک حصہ ان کے حصے میں گیا، ہمارا حصہ پاک ہے، ہم اسی کے مکلف ہیں، ہم اس کو پاک سمجھ کر استعمال کرتے ہیں، اس لئے میرا خیال یہی ہے کہ اس مسئلہ میں ان کی شرط کے بغیر اس حد تک جواز کی اجازت ہونی چاہئے، جہاں تک ہمارے مولانا صاحب کو یہ اشکال ہے کہ یجوز الاستقراض بالربح للمحتاج تو ان کو احتیاج یا حاجت جو بھی کہہ لیجئے ان کے تحقق میں اشکال ہے، میں کہتا ہوں کہ واقعۃ بظاہر نظر یہ شبہ ہوسکتا ہے کہ ہمارے پاس ابھی پچاس ہزار ہے، کیا ضرورت ہے کہ ہم اتنے اونچے پیمانے پر کوئی کاروبار کریں، اور سودی لین دین کا مسئلہ پیدا ہو، یہ ہے، لیکن ایک ہے ہماری ذاتی ضرورت یا ہماری ذاتی حاجت، اور ایک ہے قومی ملکی ضرورت اور ملی ضرورت، بلاشبہ اونچے سے اونچے پیمانہ پر تجارت کرنا آج ہندوستان کی ملکی اور ملی ضرورت ہے ورنہ کبھی بھی آپ سر اٹھا کر نہیں جی سکتے ہیں، ہم اس کو ضرورت کہتے ہیں، ذاتی ضرورت نہیں بلکہ ملکی ضرورت، اس لئے یجوز الاستقراض بالربح للمحتاج اس کا تحقق ہے۔

مولانا مصلح الدین صاحب: ...... یہ جائز ہے، قانونی مجبوری یا بڑے کاروبار کے لئے قرض ضروری ہو تو یجوز الاستقراض بالربح، یہ الاشباہ میں ہے، ابن نجیم نے لکھا ہے، اس لحاظ سے جائز ہو جائے گا۔

مولانا عبداللہ پٹیل صاحب:

قومی مصلحت کے پیش نظر مولانا برہان الدین صاحب نے جو شرط رکھی ہے اس کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے اور اس شرط کے ساتھ اسے جائز قرار دیا جائے۔

مفتی احمد دیلوی صاحب: ...... حضرت تھانویؒ نے فتاوی کے اندر جو تشریح فرمائی اس کی روشنی میں اس کی اجازت ہے، گنجائش ہے۔

مفتی احمد صاحب خانپوری: ...... میں تو پہلے ہی اپنے فتوے میں اس کی اجازت دے چکا ہوں۔

مولانا ابراہیم صاحب: ...... میں اس کا جواب لکھ چکا ہوں، جائز ہے۔

مولانا رفیق المنان صاحب: ...... میرے خیال میں بھی جائز ہے۔

مولانا ابوسفیان مفتاحی صاحب: ...... ہمارے نزدیک بھی اکابر علمائے ہند کی تصریحات کی روشنی میں درست ہے۔

مولانا اختر امام عادل صاحب: ...... میں نے بھی لکھ دیا ہے کہ جائز ہے۔

مولانا عبداللہ طارق صاحب: ...... میں تو اس کو جائز سمجھتا ہوں۔

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب: ...... میرے نزدیک جائز ہے۔

مولانا عتیق احمد بستوی صاحب: ...... میں بھی جائز لکھ چکا ہوں، اور اب تک یہی رائے ہے۔

مولانا انیس الرحمن قاسمی صاحب: ...... میری رائے میں یہ شکل جائز ہے۔

مفتی عزیز الرحمن چمپارنی صاحب: ...... حضرت مولانا برہان الدین صاحب کے شرط کی رعایت کرتے ہوئے اس کے جواز پر میں متفق ہوں۔

مولانا مفتی انور علی صاحب: ...... مذکورہ بحث کی روشنی میں جائز ہے۔

مولانا بدر احمد مجیبی صاحب: ...... میرے نزدیک بھی جائز ہے۔

مولانا ارشد قاسمی صاحب: ...... میں مولانا زبیر صاحب کی رائے سے اتفاق کرتا ہوں اور حضرت استاذ مولانا برہان الدین صاحب کی شرط کی مزید تفصیل چاہتا ہوں۔

مولانا خلیل الرحمن اعظمی صاحب: ......"دعوا الربا والريبة" کے پیش نظر میں اسے درست نہیں سمجھتا ہوں۔

مولانا نعیم صاحب آسام: ...... میں بھی اس کو درست نہیں سمجھ رہا ہوں۔

مولانا شفیق الرحمن صاحب: ...... اس سلسلہ میں اگر وہ ادارہ جو اپنی رقم لگا رہا ہے، اس کمپنی کا شریک ہے اور غالباً یہی صورت ہے کہ وہ بھی اس کمپنی کا مالک شریک ہے، تو ایسی صورت میں اگر وہ ضرورت ہو کہ واقعی بغیر اس کے وہ کمپنی قائم نہیں ہو سکتی ہے تو ایسی صورت میں، بہر حال سرمایہ لگانا جائز ہوگا ضرورت کے پیش نظر...... بہر حال جواز کی صورت معلوم ہوتی ہے۔

مولانا عبد العلیم صاحب: ...... اس میں کوئی خاص قباحت نظر نہیں آتی اگر حساب و کتاب صاف رکھا جائے۔

مولانا ابوالحسن ماٹلی والا: ...... میرے نزدیک یہ صورت جائز تو ہے مگر یہ معلوم ہو جائے کہ سود کی آمدنی سے جو پیسے ملے ہیں اس کو صدقہ کر دینا چاہئے اور جو اہل حصص ہیں اس پر تقسیم نہیں کرنا چاہئے۔

قاضی صاحب: ...... میرا خیال ہے مسئلہ کی پھر وضاحت ہو جانی چاہئے، صورتحال یہ ہے کہ وہ جو نو لاکھ روپے سرمایہ لگا ہے وہ انہوں نے شیئرز ہولڈرس سے لیا، ایک لاکھ روپیہ انہوں نے قرض لیا، اس قرض پہ ان کو سود دینا پڑتا ہے، اور یہ بھی صاف کہہ دینا چاہئے کہ بعض صورتوں میں ان کے پاس تھوڑا بہت سود آتا بھی ہے، تو بہر حال یہ دونوں صورتحال ہے، جو ہے صورت یہ واضح ہے، ویسے اکاؤنٹس کا جہاں تک تعلق ہے اکاؤنٹس میں دونوں Figure الگ الگ ہر جگہ آمد میں بھی خرچ میں بھی لکھے جاتے ہیں، بہر حال جو آپ کی رائے ہو دو لفظوں میں ذرا واضح کر دیجئے:

مولانا ابوالحسن علی صاحب ماٹلی والا: ...... ویسے تو جائز ہی میں سمجھتا ہوں، لیکن یہ کہ سود کی کوئی بھی صورت جو حاصل ہو اور مسلمان کو معلوم ہو تو بہر حال اس سے احتراز کرنا ضروری ہے۔

مولانا عبد الاحد ازہری صاحب: ...... میرے نزدیک بھی کوئی قباحت نہیں ہے، جائز ہے۔

مولانا جلال الدین انصر عمری صاحب: ...... میرا رجحان عدم جواز کی طرف ہے۔

مولانا مصطفی رفاعی صاحب: ...... حضرت استاذ گرامی مولانا برہان الدین صاحب کی شرط کے ساتھ میں اس کو جائز سمجھتا ہوں۔

مولانا محمد قلندر صاحب: ...... میرے نزدیک جائز ہے۔

مولانا جمیل احمد نذیری صاحب: ...... ضرورت ملی کے تحت جائز ہے۔

مولانا منیر احمد ملی صاحب: ...... میرے نزدیک بھی جائز ہے۔

مولانا ولی اللہ صاحب وانمباڑی: ...... میری رائے میں یہ ہے کہ "من رعى حول الحمى يوشك أن يواقعه فيه" کی حدیث کی بنیاد پر اگر امت کو ہم سود کے قریب لے جائیں گے تو وہ پوری طرح سود میں مبتلا ہو جائیں گے، اس لئے احتیاط کا پہلو یہی ہے کہ ایسے کاروبار میں شرکت سے منع کر دیا جائے اور اس کی گنجائش نہیں ہے۔

مولانا زین العابدین صاحب: ...... احتیاطاً اجازت نہ دی جائے۔

مفتی حبیب اللہ صاحب: ...... میری رائے میں یہ جائز ہے۔

مولانا جعفر ملی صاحب: ...... میرے نزدیک عدم جواز راجح ہے۔

مولانا صدر الحسن ندوی صاحب: ......ضرورت شدیدہ کی بنیاد پر جائز ہے۔

مولانا تاج الدین صاحب: ......میرے نزدیک عدم جواز رجحان ہے۔

مولانا ایوب صاحب بھٹکل: ......مع الکراہت جائز ہے۔

مفتی عزیز الرحمن صاحب بجنوری: ......سود نہ لینا نہ دینا، یہ صرف اسلام ہی کا طرۂ امتیاز ہے، اور سود کے بارے میں قرآن شریف میں اتنی شدت ہے کہ اگر ہم تھوڑی سے لچک دیتے چلیں تو اسلام کا یہ شعار بالکل ختم ہوجائے گا، ہمیں قومی اور ملی امتیاز باقی رکھنا چاہیئے، اس لئے میرے نزدیک جائز نہیں ہے۔

مفتی عقیل صاحب: ......ہندوستانی مسلمانوں کے جو حالات ہیں اور مشکلات ہیں اور ان حالات کی بنا پر بہت سے مقامات پر ہمارے بڑے بڑے اکابر اور مفتیان کرام نے وسعت سے کام لیا ہے، تو میں اس معاملہ میں بھی مولانا برہان الدین صاحب سنبھلی کی رائے سے اتفاق کرتا ہوں۔

مولانا عبد الصمد صاحب: ......پیارے نبی ﷺ نے فرمایا ہے: "لا يبلغ العبد أن يكون من المتقين حتى يدع مالا بأس به حذرا مما به بأس" اس کے تحت یہ میرے نزدیک جائز نہیں ہے۔

مفتی نسیم احمد قاسمی صاحب: ......اس سلسلہ میں میری رائے یہ ہے کہ اسلامی مالیاتی ادارہ کی دو صورت ہو سکتی ہے: ایک صورت تو یہ کہ اسلامی مالیاتی ادارہ بالکل ابتدائی مرحلہ میں ہو تو اس کے لئے جائز اور منفعت بخش کاروبار کی صورت چونکہ اس کی ساکھ ابھی نہیں بنی ہے، اسے فراہم ابھی نہیں ہو پا رہی ہے، تو اس مجبوری اور اس ضرورت کے پیش نظر اسلامی مالیاتی ادارہ ایسی کمپنیز میں بھی اپنا سرمایہ لگا کر نفع حاصل کر سکتا ہے جو سودی کاروبار میں ملوث ہوتی ہیں، لیکن اگر اسلامی مالیاتی ادارہ ایسی پوزیشن میں ہے کہ اسے کافی مقدار میں جائز اور منفعت بخش کاروبار ملتے ہیں جن کے ذریعہ وہ جائز آمدنی فراہم کر سکتا ہے تو اسے اس طرح کی کمپنیز میں اپنا سرمایہ لگا کر سرمایہ کاری نہیں کرنی چاہیئے......

قاضی صاحب: ......یعنی شروع میں جائز ہے، جب مالی حالت مستحکم ہوجائے تو احتیاط کرے۔

مفتی نسیم احمد صاحب: ...... جی ضرورت ہے اس کو، یہ رائے ہے میری۔

مولانا شمس پیرزادہ صاحب: ......جائز ہے۔

مولانا مجیب اللہ ندوی صاحب: ......میری رائے محفوظ ہے۔

مفتی محمد عبید اللہ اسعدی صاحب: ......یہ جائز قرار دیتے ہیں (قاضی صاحب)

مولانا محمد برہان الدین سنبھلی صاحب: ......اس تجویز کے سلسلہ میں بار بار میرا نام آیا ہے تو اس میں جو شرط میں نے لگائی ہے، بعض حضرات نے اس کی وضاحت بھی چاہی ہے، اصلاً میرا مقصد یہ تھا کہ ایسی کمپنی جس کا حلال و حرام دونوں طریقے سے کاروبار ہو، لیکن اپنے حلال کاروبار کو الگ رکھتی ہو اور حرام کا حساب الگ رکھتی ہو، اور اگر مسلمان اس میں کوئی شیئر لیتا ہے تو......جی وہی مطلب ہے میرا، کہ جو اس نے مال حاصل کیا ہے حرام ذریعہ سے اس کا الگ حساب رکھتی ہو، کاروبار اس سے الگ کرتی ہو، اور حلال حصہ سے کاروبار الگ کرتی ہو، تو ایسی کمپنی میں شیئر لینا جائز ہے اس حصہ کے اندر جس سے وہ حلال کاروبار کرتی ہو، یہ مطلب ہے میرا۔

قاضی صاحب: ......میرے خیال میں کافی اس پر رائے ہو چکی، تو اس پر انشاء اللہ ایک کمیٹی بنا دیتا ہوں اور یہ حضرات بیٹھ کر تمام آراء اور بحثوں اور سب چیزوں کو سامنے رکھ کر ایک تحریر تیار کریں گے، پھر آپ کے سامنے پیش کی جائے گی، اس مسئلہ کو فی الحال یہیں پر ختم کرتے ہوئے اور اس سلسلہ کے اور مسائل کو ابھی ملتوی کرتے ہوئے میں سوچتا ہوں کہ ایک اہم مسئلہ جس پر ہمارے دوست ایم ایچ کھٹکھٹے صاحب اور دوسرے حضرات تیار ہو کر آئے ہیں وہ اس پر بات کریں گے۔ تو پہلے آپ کو کرنا ہے حضرت یا کے جی منشی صاحب کو؟ موضوع کیا ہے؟ اسٹاک ایکسچینج ہے؟ پہلے یہ لیا جائے، تو پھر کھٹکھٹے صاحب تشریف لائیے اور

اس کے بارے میں وضاحت فرمائیے۔

ایک آواز:......عرض یہ کرنا ہے کہ اس وقت جو بات سامنے آئی کہ اسلامی مالیاتی ادارہ اگر ایسے کاروبار میں جس کا مدار حلت کے اوپر ہو حلال چیزوں پر ہو تو اس میں اگر وہ اپنا سرمایہ روکنا چاہے تو اس کے لئے آپ نے یہ رائیں معلوم کی ہیں، تو کیا انفرادی طور پر اشخاص اگر کسی ایسے کاروبار کے اندر جو حلال ہو اس میں اپنے شیئرز لینا چاہیں تو وہ لے سکتے ہیں یا نہیں؟

قاضی صاحب:......یہ سوال بھی کمیٹی کو دے دیتا ہوں کہ اسلامی ادارہ شیئر لے سکتا ہے یا نہیں؟ اور افراد چاہیں تو شیئر لے سکتے ہیں یا نہیں؟ اسی کمیٹی کو یہ سوال بھی آپ کا Refer کر دیا جاتا ہے۔

اچھا صاحب اب اسی ذیل میں کچھ اور سولات بھی ہیں ان پر ہم تھوڑی دیر بات کرتے ہیں آگے، ایک مسئلہ ہے کہ شیئر ہولڈرس کی دو حیثیتیں ہیں، ایک انفرادی حیثیت ہے اور ایک کمپنی کے شیئر ہولڈرس کی اجتماعی حیثیت ہے جو اس کا ایک جزء ہے، یہ دو حیثیتیں قرار دی ہیں ان حضرات نے، ان کا کہنا ہے کہ شیئر ہولڈر اپنی انفرادی حیثیت میں اور بورڈ آف ڈائریکٹر کے درمیان کیا رشتہ ہے؟ کیا بورڈ آف ڈائریکٹرس کے ہر تصرف کی نسبت ہر شیئر ہولڈر کی طرف کی جائے گی یا نہیں، اب ذرا آپ حضرات تھوڑا دھیان دے کر اس بات کو سنیں، کمپنی قوانین کے ماہرین کا خیال یہ ہے کہ بورڈ آف ڈائریکٹرس شیئر ہولڈرس کی انفرادی حیثیت میں نمائندگی نہیں کرتا ہے بلکہ وہ کمپنی کی نمائندگی کرتا ہے جس کا خود ایک علاحدہ قانونی وجود ہے، اس کی Legal Identity ہے، اس کا ایک شخص اعتباری ہے، یہ ان کا کہنا ہے، اگر کوئی شیئر ہولڈر مجلس عمومی میں کسی ایسی پالیسی کی مخالفت میں ووٹ دیتا ہے جو سودی لین دین پر مشتمل ہو، اکثریت حاصل نہیں ہونے کے باعث اس کی مخالفت کامیاب نہیں ہوتی تو کیا اسے اس صورت میں سودی لین دین کے اس عمل کی......

غالباً جو سوال ہے وہ تو واضح ہو گیا نا، یہ لوگ جو ماہرین ہیں ان کا کہنا یہ ہے کہ ایک شخص اپنی ذاتی حیثیت میں نہیں، اور اسی طرح جو بورڈ آف ڈائریکٹرس ہیں وہ شیئر ہولڈرس کی ذاتی حیثیت میں ان کے نمائندے نہیں ہوتے بلکہ کمپنی جو کہ اس کا ایک مجموعہ ہے جس کا اپنا ایک علیحدہ قانونی وجود ہے دراصل اس کمپنی کی نمائندگی کرتے ہیں، تو اب ان کا کہنا یہ ہے۔ سوال جو ہمارے سامنے ہے وہ یہ کہ ان کے عمل کو ان شیئر ہولڈرس کی طرف منسوب کیا جائے گا یا منسوب نہیں کیا جائے گا۔ اس سلسلہ میں شرع میں کچھ نظیریں بھی مل سکتی ہیں، ہاں یا نہیں، جو بھی ہو میں تو سمجھتا ہوں کہ خالص فقہی طریقے پر اس کو سوچنے کی ضرورت ہے، لیکن یہ صورتحال کہ یہ لوگ کمپنی کی جو ایک Legal Identity ہے اس کی نمائندگی کرتے ہیں، اشخاص کی ذاتی حیثیت میں نمائندگی نہیں کرتے ہیں، اس کی وضاحت ان لوگوں کو کرنی پڑے گی جن ماہرین نے یہ رائے دی ہے، کیا میں ان لوگوں کو پہلے وضاحت کے لئے کہوں؟

مولانا نذیر احمد قاسمی صاحب:......اس میں جو سوال کا پہلا جز ہے اس میں جو تفصیل لکھی جارہی ہے اس سے تو سمجھ میں آتا ہے کہ دونوں میں رشتہ وہی وکالت کا ہے، وکیل و موکل کا......

قاضی صاحب:......ذرا ان لوگوں کی پہلے وضاحت سن لیں، یہ لوگ کیا کہنا چاہتے ہیں، انشاء اللہ اس پر پھر حکم تو ہم لوگ لگائیں گے ہی، پہلے یہ لوگ وضاحت کر دیں کہ یہ لوگ کیوں ایسا کہتے ہیں اور اس کی کیا وجہ ہے؟

رحمن خاں صاحب:......جہاں تک شیئر ہولڈرس کا سوال ہے، شیئر ہولڈر انفرادی حیثیت سے کمپنی کا ایک شیئر ہولڈر ہوتا ہے، مگر بورڈ آف ڈائریکٹرس کو شیئر ہولڈر سے الگ کرتے ہیں، اب یہاں سوال جو ہمارے سامنے ہے کہ اگر ایک کمپنی شیئر ہولڈرس کو یہ معلوم ہو کہ کچھ ایسے اس کا سرمایہ جو کمپنی کے کاروبار میں لگ رہا ہے وہ سودی کاروبار سے ہو رہا ہے، اگر وہ شیئر ہولڈر کیونکہ ایک ہی وقت اس کو سال میں حقوق دیا جاتا ہے، جنرل باڈی میں شریک ہو کر وہاں خیالات کے اظہار کا اسے پورا اختیار ہے، اگر وہ شیئر ہولڈر اس جنرل باڈی میں شریک ہو کر جہاں اس کے خیالات کے اظہار کا اسے پورا اختیار ہے، اگر کوئی ایسی کمپنی باہر سے سود لے کر کام کر رہی ہے، اس کے خلاف ووٹ دے کر وہ اپنی ذمہ داری سے بری ہو سکتا ہے، کیا اس کے بری ہونے کے بعد، اس کا اظہار خیال کرنے کے بعد وہ بری ہو سکتا ہے۔

قاضی صاحب:......مسئلہ یہ ہے کہ چاہے شخصی حیثیت میں ہو یا شیئر ہولڈر کی حیثیت سے ہو، آپ حیثیتوں کا جو بھی فرق کر لیں، یہ مسئلہ اب وہ پہلے والا مسئلہ نہیں ہے، بلکہ براہ راست اس کمپنی کا مسئلہ ہے جو سودی کاروبار میں ملوث ہے، محض اتنا بھی نہیں ہے کہ سود پہ کوئی سرمایہ وہ لے لیتی ہے، بلکہ ہو سکتا ہے کہ وہ

سود دیتی بھی ہو اور سود لیتی بھی ہو، تو محض ایک شخص اتنا کہہ کر کہ میں اس کی مخالفت کرتا ہوں اس سے ناراض ہوں، اور اس پر پوری تقریر چاہے وہ ایک گھنٹہ کی کر جائے، لیکن یہ سب ناراضی کے اظہار کے بعد اس پورے کاروبار میں شریک رہے تو وہ ذمہ داری سے فارغ ہوتا ہے یا نہیں ہوتا، سوال یہ ہے کہ وہ ذمہ داری سے فارغ ہوتا ہے یا نہیں ہوتا؟ ویسے جواب تو یہ حضرات دیں گے لیکن یہ بات سمجھ میں نہیں آرہی ہے۔

رحمن خاں صاحب: ...... یعنی کہ شیئر ہولڈر کا، اس کی تشریح میں اس طرح سے یہاں دیتا ہوں کہ ایک ووٹر ہے، جب الیکشن یہاں ہوتا ہے، ایک پارٹی کے خلاف میں ووٹ دیتا ہوں، میں یہ خیال اظہار کرتا ہوں، مگر اکثریت دوسری پارٹی جسے میں نے نہیں ووٹ دیا وہ چن کر آتی ہے اور وہ حکومت کرتی ہے، اب جو پارٹی منتخب ہو کر حکومت کرتی ہے، اس کے تمام فیصلے کا میں جواب دہ ہوں یا نہیں، یہی صورت ہے۔

قاضی صاحب: ...... ویسے اس پر بات ہوگی، میرا خیال یہ ہے پہلے اور حضرات اپنی رائے دے دیں تو اچھا ہے۔

ایم ایچ کھٹکھٹے صاحب: ...... ایک وضاحت کرنا چاہتا ہوں، کمپنی دو طرح کی ہوتی ہیں، پرائیوٹ لمیٹیڈ، پبلک لمیٹیڈ اور پبلک لمیٹیڈ میں کچھ کمپنیز ہیں جو اسٹاک ایکسچینج پر Listed ہوتی ہیں، اور ان کے شیئرز کی Trading ہوسکتی ہے، جہاں تک جو شیئرز Trade ہو سکتے ہیں ان کی Trading ہو سکتی ہے، وہاں اس میں یہ Possibility ہے کہ وہ آدمی شیئرز بیچ کے اپنا روپیہ نکال سکتا ہے، سمجھ لیجئے کوئی انجینیرنگ کی کمپنی ہے اگر کل کو Diversification کے طور پر وہ شراب بنانا چاہے اور وہ پاس کردے اور شروع کرنے کی کوشش کرے، تو اگر وہ لمیٹیڈ کمپنی ہے اور اس کے شیئرز Listed ہیں تو وہ بیچ سکتا ہے، تو جہاں تک سوال یہ ہے کہ وہ شیئر بیچ سکتا ہے، تو ہوسکتا ہے اس کی نوعیت الگ ہو، اور اگر جہاں پرائیوٹ لمیٹیڈ کمپنی ہے یا پبلک لمیٹیڈ ہے جو Listed نہیں ہے، اس میں ہوسکتا ہے اس کو شیئرز بیچنے میں تکلیف ہو، مشکل ہو تو اس میں ہوسکتا ہے کہ فیصلہ الگ ہو، اس کی نوعیت تھوڑی الگ ہوجائے گی......

مفتی مصلح الدین صاحب: ...... یہ جو بتایا گیا کہ بورڈ آف ڈائریکٹرس جو ہے وہ کمپنی کا تو نمائندہ ہے، لیکن افراد کا وہ نمائندہ نہیں ہے، اس کا کیا مطلب ہے؟ اس کی وضاحت ہونی چاہئے، اجزاء سے مجموعہ بنتا ہے۔

کمال فاروقی صاحب: ...... میں سمجھتا ہوں کہ اس میں تھوڑا سا ہمیں بتانے کی ضرورت ہے، مسئلہ جبھی سمجھ میں آئے گا، کمپنی جو بنتی ہے وہ شیئر ہولڈرس سے بنتی ہے اور شیئر ہولڈرس جو ہے اپنی Annual General Meeting کے اندر ایک خاص، یہ ہم لمیٹیڈ کمپنی کی بات کر رہے ہیں جو بڑی کمپنی ہے، پرائیوٹ لمیٹیڈ کمپنی جو فورم کی طرح ہوتی ہے اس کا بھی کمپوزیشن اسی طرح سے ہوتا ہے، لیکن جو لمیٹیڈ کمپنی ہے اس میں شیئر ہولڈرس ہوتے ہیں، اور شیئر ہولڈرس ایک خاص تعداد میں ہر سال ڈائریکٹرس کو Appoint کرتے ہیں By Rotation، مثال کے طور پر مجموعی تعداد جو ہے ڈائریکٹرس کی وہ نو ہے تو اس میں سے چھ رہیں گے اور اس میں سے تین ریٹائر ہوں گے By Rotation، اب یہ Annual General Meeting کے اندر جو شیئر ہولڈر کو حق دیا جاتا ہے وہ دو تین چیزوں کا دیا جاتا ہے، ایک تو یہ ہے کہ وہ اکاؤنٹ سے Approve کرے گا، دوسرا یہ ہے کہ وہ Rotation والے ڈائریکٹرس Appoint کرے گا، اور تیسرا یہ ہے کہ اگر کوئی Extra اور Daisy کام جو Diversification وغیرہ کا بہت Major کر رہا ہے اس کے اوپر اپنی رائے دے گا، جہاں تک روزمرہ کے کاروبار کا تعلق ہے وہ بورڈ آف ڈائریکٹرس ہی Run کریں گے، روزمرہ جو کچھ بھی ان کو بینک سے پیسہ لینا ہے یا نہیں لینا ہے، کیا کام کرنا ہے کیا نہیں کرنا ہے، وہ جو اس کا Main Object ہے اس کے دائرہ میں رہ کر، جو انہوں نے Main Frame Work اینول جنرل میٹنگ میں یا میمورنڈم آف ایسوسی ایشن اپنا بنایا ہوا ہے اس دائرہ کے اندر رہ کر ڈائریکٹرس جو ہیں وہ Day Today Affairs میں اپنے کس طرح سے کاروبار کریں گے، وہ ڈائریکٹرس ہی Decision لیں گے اور عام شیئر ہولڈر اس میں حصہ نہیں لے سکتا، صرف اینول جنرل میٹنگ کے اندر شیئر ہولڈر کو اگر کمپنی اپنے Original جو اس کے پروگرام ہیں جو ہماری نظر کے اندر Suppose کر لیجئے کہ وہ حلال پروگرام ہیں اور وہ اس کو Diversify کر کے حرام کی طرف جا رہے ہیں تو اس کو بات کرنے کا اختیار ہے، وہاں وہ بول سکتا ہے، اس کے اندر Objection اپنا Raise کر سکتا ہے، لیکن اگر کوئی Normal کام ہے اس کے اندر شیئر ہولڈر کو کچھ زیادہ بولنے کا اختیار نہیں ہوتا...... ہاں بالکل، ٹیکنکل بات تو یہ ہے کہ وہ ڈائریکٹر شیئرز ہولڈرس کا نمائندہ ہے۔

قاضی صاحب: ...... یہ آپ لوگوں نے کہا کہ ایک کمپنی کا نمائندہ ہے، جو ایک الگ Legal Identity رکھتا ہے، شیئر ہولڈر کا اپنی انفرادی حیثیت

میں نمائندہ نہیں ہے، یہ صورتحال کی غلط تصویر ہے؟

کمال فاروقی صاحب:...... جی ہاں، بس یہ کہ ڈائریکٹر جو ہے وہ شیئر ہولڈر کا نمائندہ ہے، کمپنی بالکل Separate Identity ہے، اور اس کمپنی کو چلانے کے لئے باقاعدہ ایک نظام ہے جس کو بورڈ آف ڈائریکٹرس کہا جاتا ہے، لیکن وہ بورڈ آف ڈائریکٹرس جو Appoint ہوگا وہ Appoint شیئر ہولڈرس ہی کے ذریعہ کیا جائے گا، چاہے وہ Two Third کی Majority والا ہو، یا One Third والا ہو، لیکن بورڈ آف ڈائریکٹرس جو Appoint ہوکر۔

قاضی صاحب:...... یعنی شیئر ہولڈر Represented By Board Of Directors ہے نا؟ (بالکل: فاروقی صاحب)، صورت حال یہ ہوئی کہ شیئر ہولڈرس کی نمائندگی بذریعہ بورڈ آف ڈائریکٹرس ہورہی ہے، اس لئے بورڈ آف ڈائریکٹرس کی حیثیت گویا وکیل کی ہے اور شیئر ہولڈرس کی حیثیت موکلین کی ہے، انہوں نے اپنا اختیار ان کو دے دیا ہے، ہمارے رحمن خاں صاحب نے جو Peoples Representation Act ہے اس کا حوالہ دیتے ہوئے یعنی جس طرح آپ سرکار میں شریک ہوتے ہیں عملاً اس کا حوالہ دیا ہے اس پر ذرا بعد میں عرض کروں گا، لیکن یہ بات تو واضح ہوگئی کہ اس میں اس طرح لکھا ہوا ہے کہ کمپنی قوانین کے ماہرین کا خیال یہ ہے کہ بورڈ آف ڈائریکٹرس شیئر ہولڈرس کی انفرادی حیثیت میں نمائندگی نہیں کرتا ہے بلکہ وہ کمپنی کی نمائندگی کرتا ہے جس کا خود علاحدہ قانونی وجود ہے، یہ غلط ہے؟ (یہ غلط ہے: فاروقی صاحب) آپ حضرات اس پر متفق ہوجایئے تو ہمارا کام آسان ہوجاتا ہے، کہہ رہے ہیں کہ صاحب بورڈ آف ڈائریکٹرس شیئر ہولڈرس کی انفرادی حیثیت میں نمائندگی نہیں کرتا بلکہ وہ کمپنی کی نمائندگی کرتا ہے، کمپنی نام ہے اس مجموعہ کا جو شیئر ہولڈرس سے بنتی ہے، یا زیادہ سے زیادہ Promoters کا آپ اس میں اضافہ کردیجئے، تو Promoters اور Share Holders وہ بھی ان کا ایک طرح کا شیئر ہی ہے، وہ بنیادی شیئر ہے، یہ ایک الگ مسئلہ ہے، تو ان کو بھی ہم شیئر ہولڈرس ہی سمجھیں گے تو کمپنی نام ہے اس مجموعہ کا جو شیئر ہولڈرس کے اکٹھا ہونے سے وجود میں آتی ہے، اب شیئر ہولڈر ایک کمپنی میں شیئر لیتا ہے، ایک اس کا نام مجاہد الاسلام ہے، محمد احسان ہے، رحمن خاں ہے، تو یہاں پر احسان اور رحمن خاں کا تو سوال ہی نہیں ہے، لیکن اس کمپنی کا وہ شیئر رہے، اس کا ایک جزء ہے، اس کا ایک رکن ہے۔ اسی مجموعہ کی نمائندگی کررہا ہے بورڈ آف ڈائریکٹرس، اس لئے اگر آپ یہ لکھتے کہ بورڈ آف ڈائریکٹرس شیئر ہولڈرس کی ذاتی حیثیت میں نمائندگی نہیں کرتا ہے تو شاید جائز ہوتا، لیکن یہاں جب آپ نے کہا انفرادی حیثیت میں نمائندگی نہیں کرتا تو شاید یہ بات صحیح نہیں، اس پر اگر آپ لوگ اتفاق کرلیں تو ہم آگے بڑھیں۔

کمال فاروقی صاحب:...... حضرت جو آپ نے فرمایا وہ بالکل درست ہے، Translation میں کہیں ہلکی سی غلطی ہوئی ہے، انگریزی سے اردو میں Translation......

قاضی صاحب:...... غلطی ہلکی نہیں، یہ غلطی بنیادی ہوگئی ہے، اس لئے ہم لوگ اس بات کو واپس لیتے ہیں کہ شیئر ہولڈرس کا انفرادی حیثیت میں نمائندہ نہیں ہے یہ غلط ہے، شیئر ہولڈرس کا مجموعہ جس کا نام کمپنی ہے، یا شیئر ہولڈرس ان کی ہی نمائندگی کرتا ہے وہ دراصل بورڈ آف ڈائریکٹرس ہے (بالکل ٹھیک: کمال فاروقی صاحب) اب مجھے اجازت دیتے ہیں آپ لوگ ایک بات اور کہہ دوں قبل اس کے کہ آپ لوگوں کی رائے لوں، یہ ہمارے رحمن خان صاحب نے ایک بڑا اہم سوال کھڑا کیا ہے، یہ میں نہیں کہہ سکتا کہ میں اس کی صحیح تصویر کرسکتا ہوں یا نہیں، حکومت کا، بالکل صحیح ہے کہ حکومت کی حیثیت بھی دراصل عوام کے نمائندہ کی ہوتی ہے، خاص کر کوئی جمہوری حکومت میں۔ اس کو آپ کہتے ہیں کہ صاحب عوام کی حکومت عوام کے لئے عوام کے ذریعہ، آپ لوگ جمہوریت کی تعریف کرتے ہیں تو وہاں پر بھی حکومت عوام کی مانی جاتی ہے، عوام کے ذریعہ مطلب عوام کے منتخب افراد کے ذریعہ، اور عوام کے لئے یعنی عوام کے مفاد کے لئے، تو خیر یہ بہت اچھی چیز ہے، وہاں بھی حکومت میں یہی ہوا کرتا ہے، لیکن جب کسی ملک کا ایک دستور بن گیا تو اس کے بعد ہم ووٹ نہ دیں تو، اور ہم ووٹ دیں، چاہے بی جے پی کو دیں جو بابری مسجد توڑوادے یا کسی اور کو دیں جو اس کی حفاظت کرے، یا سارے سودی کاروبار کرے، اس میں صورت جبر کی ہے، یعنی ہم کو اپنے اختیار سے شریک یا غیر شریک ہونے کا کوئی موقع ہمارے پاس نہیں ہے، نمائندگی طے ہے، آپ اپنے حق نمائندگی کو استعمال کریں یا استعمال نہیں کریں، لیکن جو گورنمنٹ کو کسی اسٹیٹ، جو اسٹیٹ ہوتا ہے، اس کے سامنے سارے ہی لوگ جبر کا شکار ہیں، ان کو بہر حال اس کے تحت چلنا ہے، ووٹ نہ دے کر بھی، ووٹ مخالفت میں دے کر بھی، اور ووٹ موافقت میں دے کر بھی، بجائے اس کے جو ان کمپنیز کا معاملہ ہے ان کو مکمل طور پر اس پر قیاس نہیں کیا جاسکتا، اس لئے کہ ہم کو اختیار ہے کہ ہم اس کمپنی میں شریک ہوں یا شریک نہیں ہوں، لہذا حکومتوں کے غلط عمل کی جوابدہی ہم پر اس حد تک نہیں آتی ہے اگر ہم نے اپنی پوری کوشش کرلی کہ حکومت

صحیح بنیادوں پر قائم ہو، اس کے باوجود اگر نہیں قائم ہوسکتی تو حکومتوں کے عمل کی ذمہ داری ہم پر اس درجہ نہیں آتی جس طرح کمپنی میں ہماری شرکت کے بعد اس کے عمل کی ذمہ داری ہم پر آتی ہے، یہ بات ہمارے سمجھ میں آتی ہے، اب آپ حضرات اس پر رائے دے دیجئے۔

مفتی مصلح الدین صاحب: ...... چونکہ وہ موکل ہے اور وکیل ہے، اور موکل نے اپنے تصرفات وکیل کو سپرد کردیئے، اب وکیل جو کچھ بھی کرے گا اس کی نسبت موکل کی طرف ہوگی، اس لئے وکیل نے اگر کوئی ایسا عمل کیا ہے جو فاسد ہے تو موکل بھی اس کا ذمہ دار ہوگا، اب یہ کہ موکل ایک مجلس میں وکیل کی موجودگی میں کہہ رہا ہے کہ فلاں چیز کی اجازت میری طرف سے نہیں ہے تو پھر اتنی حد تک وہ وکیل معزول ہوجاتا ہے، یعنی موکل وکیل کی موجودگی میں یہ کہتا ہے کہ فلاں عمل کی اجازت میری طرف سے نہیں ہے، میں اس کا مخالف ہوں، تو پھر اس تصرف میں وکیل معزول ہوجاتا ہے، مگر جب اس نے اپنے اختیار سے اس کو وکیل بنایا ہے، اب اس کا مطلب تو یہ تھا کہ جتنے بھی تم تصرفات کروگے میری طرف سے ان کی اجازت ہے، اب اس کے بعد جب یہ کہتا ہے کہ فلاں عمل کی اجازت آپ کو نہیں ہے تو اب یہ وکیل کو معزول کرنا ہوا، (نتیجہ کیا نکلا؟ قاضی صاحب) ہاں یہ معزولی تو جائز نہیں ہے، اب وہ یا تو بالکل معزول ہوجائے گا .... تو شخصی طور پر وہ معزول ہوگیا، تو اب وہ جب ان کا نمائندہ نہ رہا (تو وہ جو حرکت کرنے اس کی ذمہ داری ان پر نہیں آتی: قاضی صاحب) ان پر تو نہیں آتی، لیکن اس کے اندر یہ کہ آگے چل کر پھر دوسرے معاملات ان کی طرف منسوب کیسے ہوں گے۔

قاضی صاحب: ...... آپ نے کہا کہ عزل صرف اس نقطہ میں ہوا ہے جس میں انہوں نے اپنی مخالفت ظاہر کردی، آپ کا مطلب آپ کے الفاظ میں شاید فقہ کی زبان میں یہ ہو کہ اگر موکل نے کسی کو کسی بڑے کام کے لئے وکیل بنادیا، اور ایک خاص جزئیہ میں ہدایت دی کہ ایسا مت کرنا تو اس ہدایت میں جو عمل کا ارتکاب کرے گا اس حد تک وہ معزول سمجھا جائے گا، دیگر امور میں وہ وکیل رہے گا، جو مطابق آمر کے اور مطابق موکل کے وہ عمل کررہا ہے، تو اس لئے وہ عمل جو اس نے اس کی رائے کے خلاف کیا ہے اس کی جوابدہی اس پر نہیں آتی ہے، میں آپ کی بات سے یہی مطلب سمجھتا ہوں، .... یہ نتیجہ نکالنا حضرت کہ منع کرنے کے باوجود بھی ذمہ داری سے بری نہیں ہوگا اگرچہ اس عمل میں وہ معزول ہوجائے گا۔

مفتی احمد خانپوری صاحب: ...... تو اسی لئے وہ معزول نہیں ہوگا اور بری نہیں ہوگا۔

قاضی صاحب: ...... اور میں نے جو سوال کیا تھا وہ سوال ...... لیکن بہر حال بورڈ آف ڈائریکٹرس جو ہے وہ شیئر ہولڈرس کا نمائندہ ہے، اس لئے اصولی اور عمومی بات یہ ہوتی ہے کہ شیئر ہولڈرس پر اس کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے جو بورڈ آف ڈائریکٹرس تصرفات کرتے ہیں، اس لئے کہ جو منافع ان کے تصرف سے پیدا ہوتا ہے، اس منافع میں بھی آپ استحقاق رکھتے ہیں، اگر کوئی نقصان ہو کمپنی کا تو اس کے بھی آپ متحمل ہوتے ہیں، تو تصرفات کے بارے میں عمومی طور پر یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ بورڈ آف ڈائریکٹرس کے تصرفات شیئر ہولڈرس کی طرف رجوع کرتے ہیں، یہ تو عمومی بات ہے، اس سے تو اتفاق ہے ناں سب لوگوں کو؟ دراصل میں نے یہ پوچھا تھا، اور حکومت والی مثال یہاں منطبق نہیں ہوسکتی، اس لئے کہ حکومت کی صورتحال دوسری ہوتی ہے، یہاں ہم شریک ہوں یا مت ہوں ہمیں اختیار ہے، اور پہلے سے جب معلوم ہے کہ اس میں سودی کاروبار ہوگا، یا العیاذ باللہ شراب کا کاروبار ہوگا یا خنزیر کے گوشت کا کاروبار ہوگا، تو ہمارے لئے شریک ہونے کا سوال ہی پیدا اس میں نہیں ہوتا۔

مفتی احمد خانپوری صاحب: ...... ڈائریکٹر کے سلسلہ میں جو فرمایا گیا تو حقیقت تو یہ ہے کہ ڈائریکٹر تو اس پالیسی کو نافذ کرتا ہے جس کو سب نے طے کر رکھا ہے، اب جب پالیسی طے کی جارہی ہے اس وقت تو اکثریت کی رائے کو معتبر قرار دیا گیا، اور یہ بھی طے ہے کہ ڈائریکٹر کو اسی کے مطابق کرنا ہے، پھر ڈائریکٹر کے متعلق یہ کہنا کہ اس نے موکل کی رائے کے خلاف کیا اور وہ معزول ہوا، اتنی حد تک، یہ کیسے درست ہوسکتا ہے؟

قاضی صاحب: ...... موکلوں کے مجموعہ کی اکثریتی رائے کے مطابق اس نے عمل کیا۔

مفتی احمد خانپوری صاحب: ...... اس لئے کہ وہ تو ڈائریکٹر بنایا ہی اس لئے گیا ہے، اس لئے کہ ڈائریکٹر کے لئے خود یہ اصول وضع شدہ ہے، تو اس کو اکثریت کی رائے کے مطابق یہ کام کرنا ہے......

مفتی مصلح الدین صاحب: ...... شخصی حد تک وہ معذور ہو گیا۔

مولانا مجیب اللہ ندوی صاحب: ...... یہ مسئلہ جڑا کس سے ہے، یہ جو اتنی بات پوچھی جارہی ہے یہ اسی پہلے مسئلہ سے جڑا ہوا ہے یا الگ سے کوئی بات ہے؟ ذرا اس کو واضح کردیجئے کہ جو پہلے آپ نے......

قاضی صاحب: ...... وہ مسئلہ تو مولانا ایک علاحدہ مسئلہ ہوا، ایسی کمپنی جو ایسی اساس پر قائم ہوتی ہے، اس میں جب ہم حصہ دار بننے جاتے ہیں، فریق بننے جاتے ہیں، تو وہاں پر بہت سے ناجائز فیصلے ہوتے ہیں، تو یہ ناجائز عمل جو ہوتا ہے اس کی ذمہ داری ہم پر لوٹتی ہے یا نہیں؟

کمال فاروقی صاحب: ...... حضرت اس کا اصل میں جو مسئلہ ہے یہ پہلے والے مسئلہ سے جڑا ہوا ہے، اس میں یہ غور فرمالیں آپ لوگ کہ بورڈ آف ڈائریکٹرس جو ہے جیسا آپ نے فرمایا کہ کوئی کام ایسا نہیں کرسکتا جو میمورنڈم آف ایسوسی ایشن کے اندر Main Objects کے باہر ہو، اور اگر وہ Main Objects کے باہر کبھی کوئی کام کرنے کی کوشش کی جائے گی تو پہلے اینول جنرل میٹنگ میں یا Extra Ordinary General Meeting کے اندر اس کی تمام شیئر ہولڈر سے اجازت لینی پڑے گی، وہ جو Border جو Frame Work ہے، جو Main Object کا Frame Work ہے، جو ہم پہلے Decide کر چکے ہیں کہ وہ کررہا ہے جائز کام، حلال کام کرنے جارہے ہیں، لیکن وہ جب اپنے Other Objects میں آتے ہیں تو اس کو Achieve کرنے کے لئے، اس کو حاصل کرنے کے لئے، تو اس کو مجبوراً ادھر ادھر جانا پڑتا ہے، بورڈ آف ڈائریکٹرس جو ہے وہ Main Objects سے باہر نہیں جاسکتا، وہ غیر قانونی ہوگا، رہنا تو ہوگا اس کو اسی Main Frame Work کے اندر، جو اس کو چلانے کے لئے روزمرہ کس طرح سے چلانا ہے، کس سے تعلقات رکھنے ہیں، کس کو Appoint کرنا ہے، کون سے بینک جانا ہے، کیسے جانا ہے، وہ الگ مسئلہ رہا۔ (..........) اصل میں حضرت بینکنگ کے اوپر ہم لوگ بالکل Discuss نہیں کررہے ہیں، یہ تمام معاملہ جو آرہا ہے بس شیئر ہولڈرس وغیرہ کا یا اسٹاک ایکسچینج کے اوپر آرہا ہے، ہم لوگوں نے جو بمبئی میں اور اس سے پہلے جو Discussion کیا ہے جو آٹھ دس لوگ (ماہرین) بیٹھے تھے وہاں، اور اس میں کچھ ایسی تجاویز آئی تھیں جو ہم آپ لوگوں کی اس میں رہبری چاہ رہے تھے، اس کے اوپر کوئی Discussion نہیں ہو پارہا ہے۔

قاضی صاحب: ...... کوئی کیسے ہوتا؟ یہی نہیں بینکنگ والے لوگ، ابھی آئے ہیں وہ کہہ رہے ہیں کہ ابھی ہم لوگوں نے میٹنگ اس پر نہیں کیا ہے، اس لئے میں تو وقت ٹال رہا ہوں آپ لوگوں کے انتظار میں، تھوڑی سی بحث کرا کے۔ انشاء اللہ عصر کے بعد ہم بیٹھیں گے تو اسی پر بات کریں گے، اور اس وقت سے لے کر آپ لوگوں کو لیٹنے کی اجازت نہیں، ویسے بھی آپ لوگ مولوی نہیں ہیں کہ قیلولہ کریں، تو آپ لوگ ظہر کی نماز پڑھ کرکے، کھانا کھا کر آپ لوگ بیٹھ کر اس کو پوری طرح Discuss کرلیں بغیر میرے، یہ سخت ضروری ہے، اور عصر کے بعد اس کو آپ لوگ پیش کریں۔ میں سمجھتا ہوں کہ بات اس وقت ختم کی جائے، اذان کا وقت قریب ہورہا ہے، آپ لوگ وضو کریں گے، پھر نماز پڑھیں گے، اور انشاء اللہ پھر ہم لوگ عصر کے بعد فوراً بیٹھیں گے، اور اس دوران بینکنگ کمیٹی کا یہ فرض ہے کہ وہ پوری طرح بیٹھ کر بحث کرکے، اور اگر ضرورت سمجھیں تو مولانا محمد برہان الدین صاحب، مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب، مفتی محمد عبید اللہ اسعدی صاحب، مولانا عتیق احمد بستوی صاحب، مولانا ابراہیم صاحب بھروچ اور مفتی احمد خانپوری صاحب ان حضرات کا میں نے نام لے لیا ہے، لکھ لیجئے، ان حضرات سے اس پر آپ ضرور بحث کرلیں ان لوگوں کا قیلولہ منع کیا جاتا ہے۔

دوسری نشست......

قاضی صاحب: ...... حضرات آپ نے پہلے دن اسلام کے نظام عشر کے بارے میں مختلف مسائل پر تفصیلی بحث کی تھی، اور اس پر کمیٹیاں بنادی گئی تھیں، کمیٹیوں نے اپنا کام کیا بھی ہے، اور کچھ ابھی آخری صورت انشاء اللہ وہ لوگ الگ بیٹھ کردے لیں گے، ابھی جو دوسرا مسئلہ کل سے شروع ہوا ہے، بینکنگ سے متعلق جو چند مسائل اٹھے ہیں، ان میں سے کئی مسئلوں پر آپ نے گفتگو کی، بعض پر اتفاق ہوا، بعض پر اختلاف ہوا، اور کچھ جن میں بہت سے علماء کے جوابات بھی پہلے سے حاصل کئے گئے تھے، اور بعض سوالات نئے ہیں، تو میں سمجھتا ہوں کہ تفصیلی بحث تو شاید اس پر نہیں ہوسکے گی، اور اس مسئلہ کا حق یہ ہے کہ اس پر مستقل ایک نشست ہو جس میں یہ ماہرین بھی ہوں اور ہمارے علماء بھی ہوں، افسوس یہ ہے کہ یہاں پر ہمارے بعض دوست جاچکے ہیں، لیکن ہم انشاء اللہ کوشش

کریں گے کہ ان مسائل پر تفصیل سے غور کرنے کے لئے ایک مستقل نشست کی جائے، ابھی میں صرف جناب احسان صاحب کو تکلیف دوں گا کہ جو سوالات ہیں ان کے سامنے یا جو متبادل انہوں نے تجویز کیا ہے یا جو ان کی دشواریاں ہیں ان کو صرف آپ کے سامنے رکھ دیں، تاکہ ذہن اس کی طرف متوجہ رہے، اور آئندہ جب اس کی کوئی نشست ہو دو چار مہینے کے بعد، تو اس وقت اگر آپ کے پاس اس سلسلہ میں تفصیلی سوالنامہ جائے تو آپ جواب بھی دیں، اور پھر اجتماع ہو تو ہم لوگ بیٹھ کر کے اس کے بارے میں کوئی فیصلہ لے سکیں، میں جناب احسان صاحب سے درخواست کرتا ہوں.........

احسان صاحب:......کل Bill Discounting کا ایک مسئلہ رکھا گیا تھا، اس کی عموماً شکل یہ ہوتی ہے کہ مال بیچنے والا جو ایک شہر میں رہ رہا ہے اور خرید نے والا دوسرے شہر میں رہ رہا ہے، مال بیچنے والا سودا ہونے کے بعد مال کو دوسرے شہر کے لئے روانہ کرتا ہے، اور یہ بیچنے والا بلٹی پہ مال پانے والے کی جگہ اپنا ہی نام لکھتا ہے، یہ خریدار کا نام نہیں لکھتا، تو ریلوے کو آرڈر دیتا ہے کہ یہ مال جو میں بھیج رہا ہوں یہ دوسرے شہر میں مجھے ہی ملے، یہ بلٹی جو ہے عموماً قابل تبادلہ ہوتی ہے، اب اگر یہ مال بیچنے والا بینک سے پیسہ لینا چاہتا ہے، تو اس سے پہلے کہ خریدار سے پیسہ وصول کرے، یہ بلٹی کی پشت پر یہ لکھ دیتا ہے کہ اس بلٹی کا مال اس بینک کو دے دیا جائے، اس طرح سے بینک اس بلٹی کا مالک ہو جاتا ہے، اور بلٹی ایک بار بینک میں دینے کے بعد اور پیسہ لینے کے بعد پھر مال بھیجنے والے کو یہ اختیار نہیں ہوتا کہ ریلوے کو دوبارہ لکھ دے کہ یہ مال بینک کو نہ دیا جائے، اگر وہ ایسا لکھے گا بھی تو قانوناً اس کا کوئی عمل نہیں ہو سکتا، ریلوے اس کی اس ہدایت کو نہیں مانے گا، کیونکہ اس نے بلٹی بینک کے حوالہ کر دی، اب بینک سے یہ ہزار روپئے کے عوض میں آٹھ سو روپئے یا نو سو روپئے لے لیتا ہے، بینک یہ سمجھتا ہے کہ اس بلٹی کا پیسہ خریدار سے ایک مہینہ کے بعد ملے گا، تو یہ ایک سو روپئے Difference جو ہے اس کا، Service Charges بھی ہیں اس میں اور ایک مہینے کا سود بھی ہے، کیونکہ بینک کے سوچنے کا اپنا انداز ہے، تو ظاہر ہے اسلامی مالیاتی ادارے کے لئے یہ شکل قابل قبول نہیں ہوئی، لیکن اس کی ایک دوسری شکل ہم تجویز کرتے ہیں اور اس کو مرابحہ کی شکل میں اگر اپنایا جائے تو اس میں آپ لوگوں کی کیا رائے ہوگی، اس کی شکل یہ بنتی ہے کہ مال بیچنے والا بینک سے یہ کہتا ہے، اسلامی مالیاتی ادارے سے کہ اس مال کا ایک ہزار روپئے میں خریدار موجود ہے، میں آپ کو ایسا پتہ بتاتا ہوں خریدار کا کہ وہ اس مال کو آپ سے ایک ہزار روپئے میں لے لے گا، اور آپ کی میں اس سے بات بھی کرا دیتا ہوں، آپ کا سودا بھی طے کرا دیتا ہوں، آپ یہ مال مجھ سے نو سو روپئے میں خرید لیجئے، اس میں جو مال کا آخری خریدار ہے وہ بینک میں کہتا ہے کہ یہ مال آپ میرے پاس پہنچا دیں گے تو میں ایک ہزار روپئے میں آپ سے خریدنے کے لئے تیار ہوں، اس شکل میں اور پہلی شکل میں فرق یہ ہے کہ پہلی شکل میں اگر بینک کا پیسہ خریدار سے وصول نہیں ہوتا، خریدار اس مال کو لینے کے لئے تیار نہیں ہوتا، تو بینک لوٹ کر اسی کے پاس آتا ہے جس نے پیسہ بینک سے لیا ہے اور بینک کو بلٹی دی ہے، آپ کا مال وہ لینے کے لئے تیار نہیں ہے، بلٹی چھڑانے کے لئے تیار نہیں ہے، لہذا آپ وہ واپس دیجئے، تو ایک طرح سے یہ قرض ہوا جو اس نے بینک میں دیا تھا اور وہ واپس قرض وصول رہا ہے اس سے، لیکن دوسری شکل میں یہ قرض کی نوعیت نہیں ہوگی، اس میں وہ مال کا بیچنے والا پہلے ہی کہہ دے گا، دیکھئے میں آپ کا سودا تو کرائے دیتا ہوں، لیکن بعد میں اگر وہ اپنے سودے سے مکر جاتا ہے اور وہ مال نہیں لیتا تو اس کی میرے اوپر کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوگی، تو یہاں وہ اگر سودے سے مکر جاتا ہے تو بینک کے ہاتھ میں جو کچھ بھی مال ہے وہ ایک ہزار کے بجائے آٹھ سو روپئے میں بک جائے یا گیارہ سو روپئے میں بک جائے، وہ بینک کا مال ہے، اس میں وہ خریدار سے یہ نہیں کہے گا کہ اگر آٹھ سو روپئے میں بکا تو دو سو روپئے مجھے اس میں نقصان ہو گیا، آپ مجھے یہ دو سو روپئے دے دیجئے اور Service Charges جو میرے ہیں وہ بھی دیجئے، تو دوسری شکل مرابحہ کی یہی ہو سکتی ہے کہ وہ جو بیچنے والا ہے اس سے بالکل تعلق منقطع ہو جائے، اور بینک مال کے اوپر انحصار کرے یا کہ خریدار کے اوپر انحصار کرے، تو اگر آپ اس کا جواز رکھ دیتے ہیں تو مرابحہ کے طور پر اسلامی مالیاتی ادارہ اس کو اپنا لے گا۔

امین الحسن رضوی صاحب:.......میں معلوم یہ کرنا چاہ رہا تھا کہ پہلی صورت کو آپ نے ناجائز کیوں قرار دیا، پہلی صورت جو ہے مثلاً میں آپ کو بتاؤں، میں وضاحت کے طور پر عرض کرنا چاہتا تھا، جیسے ایک شخص کے Promissory Note ہیں، میرے Favour میں کسی کا تفویض کردہ Promissory Note ہے، جس پر میں دعوی کر کے کبھی بھی اس رقم کو حاصل کر سکتا ہوں اگر وہ نہ دے، اب یہ Promissory Note از روئے قانون قابل انتقال ہے، میں اس کو کسی اور شخص کے نام منتقل کر سکتا ہوں، تو میرے حق میں جو پانچ ہزار روپئے کا Promissory Note ہے وہ میں چار ہزار پانچ سو روپئے میں کسی کے ہاتھ فروخت کر سکتا ہوں، اس کے نام Hand Over کر سکتا ہوں، اب اس شخص کو یہ اختیار حاصل ہو جاتا ہے کہ وقت موعود پر وہ پانچ ہزار روپئے اس شخص سے وصول کر لے، اس سودے میں ناجوازی کی بات میری سمجھ میں نہیں آتی، میں نے مثلاً ایک بات بتائی ہے، تو پہلی صورت آپ نے بتائی تھی اس میں ناجوازی کی صورت کیسے ہے؟ اس لئے کہ آپ نے اپنے منہ سے تصوراتی طور پر ایک لفظ سود استعمال کر لیا، اس کو صرف حق محنت آپ رکھیں تو کیا حرج ہے؟

احسان صاحب:......نہیں ایسا ہے جو رقعہ ہے اور ایک قرض ہے اس کا سرٹیفکیٹ ہے، تو وہ رقعہ جو ہے کوئی مال نہیں ہے وہ پیسہ ہے اور پیسے کو کم یا زیادہ قیمت پر خریدنا، میں سمجھتا ہوں اس کی اجازت علماء نہیں دیں گے۔

امین الحسن رضوی صاحب:......ثمن نہیں ہے وہ Promissory Note زرثمن میں نہیں آتا ثمن نہیں ہے وہ، میرے خیال میں فقہی اعتبار سے وہ ثمن نہیں ہے، کرنسی نوٹ تو ثمن ہے، تسلیم کیا جا چکا ہے، لیکن Promissory Note تو ثمن نہیں ہے، Promissory Note ثمن ہوگا کیا؟

احسان صاحب:......Promissory Note اور Currency Note میں صرف اتنا فرق ہے کہ کرنسی نوٹ کو کوئی بینک یا Authorised ادارہ ہی جاری کرتا ہے اور Promissory Note ہر آدمی جاری کرسکتا ہے، اس کے علاوہ فرق نہیں ہے، کرنسی نوٹ بھی ایک طرح کا Promissory Note ہے۔

امین الحسن رضوی صاحب:......میں یہ کہنا چاہ رہا تھا کہ فقہی اعتبار سے کرنسی نوٹ کو ہمارے ہی سمینار نے ثمن Declare کر دیا ہے، لیکن Promissory Note ثمن نہیں ہے، وہ صرف وثیقہ ہے۔

احسان صاحب:......یہاں مسئلہ صرف پرامیزری نوٹ کا نہیں تھا، پیچھے جو اس کے بلٹی لگی ہے، اور بلٹی میں جو مال ہے اس کا مسئلہ تھا، اور اس میں مال کی خرید و فروخت یا بلٹی کی خرید و فروخت کہی تو جاتی ہے، لیکن اصل میں ہوتی نہیں ہے، وہ ایک طرح سے بلٹی کی ضمانت کے اوپر بینک کا قرض ہی ہوتا ہے۔

امین الحسن رضوی صاحب:......نہیں اگر شرعی اعتبار سے وہ سود ہے، میں نے عرض کیا نا کہ آپ نے فرمایا تھا گفتگو میں کہ وہ اس پر حق المحنت اور مدت کے معاوضہ میں سود لیتا ہے، یہ تو ایک تصوراتی بات ہوئی، فرض کیجئے کہ اسلامی ادارہ تصور میں ہی نہ لائے کہ میں سود دے رہا ہوں، بلکہ صرف ہم اس کو حق محنت مانیں۔

احسان صاحب:......نہیں ایسا ہے کہ اس میں ایک تو دو شکلیں ہوتی ہیں: جو بینک Bills Collection کا، اور Bills Purchase کا کام کرتے ہیں، ایک شکل میں بینک کا اپنا پیسہ لگتا ہے، اور دوسری شکل میں بینک کا اپنا پیسہ نہیں لگتا ہے، جب بینک کا اپنا پیسہ لگتا ہے تو اس کے Charges زیادہ ہوتے ہیں بہ نسبت اس کے جہاں اس کا اپنا پیسہ نہیں لگتا ہے......جس سے یہ ظاہر ہے کہ جو زیادہ چارج بینک نے لیا وہ اپنا پیسہ لگنے کی بنیاد پر لیا۔

امین الحسن رضوی صاحب:......یہ تو تعامل کی بات ہوئی۔

احسان صاحب:......یہ Financing ہے (اصولی بات کیا ہے: رضوی صاحب) نہیں ویسے یہ طریقہ بھی بینک کی کتابوں میں درج ہے، وہ طریقہ فائنانس کا ہی ہے، اڈوانس کا۔

امین الحسن رضوی صاحب:......یہ تو تعامل کی بات ہوئی، ہم اصول کی بات کریں گے نا، یہ تو تعامل کی بات ہوئی علماء جواب دے دیں گے اس کا۔

مفتی احمد دیلوی صاحب:......اگر وہ بلٹی کرنسی نہیں ہے تو پھر وہ حقوق بنے گا کیا؟

احسان صاحب:......ہاں حقوق میں تو آتا ہے، لیکن اس کی بنیادی بات یہ ہے کہ جب مال چھڑانے والا مال نہیں چھڑاتا تو وہ تنہا مال کے اوپر اکتفا نہیں کرتا، اگر بینک مال کو بیچ بھی دے، اور مان لیجئے کہ ہزار روپئے کا مال آٹھ سو روپئے میں بکے تو بینک کو قانونی اختیار ہوتا ہے کہ وہ دو سو روپئے وصول کر لے، مال بیچنے والے سے وہ دو سو روپئے وصول کر لے۔ یہ قانونی اختیار جو بینک کو مل رہا ہے اس سے۔

امین الحسن رضوی صاحب:......استعمال نہ کرنا چاہے بلکہ وہ جوکھم لینا چاہے تو کیا حرج ہے؟

احسان صاحب:......وہ جوکھم کی شکل یہی ہے کہ پیچھے جو مال کا بیچنے والا ہے اس سے تعلق منقطع ہو جائے اور بینک اس سے مال خرید لے، اور آگے جو مال کا خریدنے والا ہے اس کو مال بیچ دے، ایسی حالت میں اگر مال کم قیمت پہ بکے گا تو اصل بیچنے والے سے بینک نہیں وصول کر سکے گا، تب اس کو نقصان برداشت کرنا

پڑے گا۔

مفتی محبوب علی وجیہی صاحب:......اس میں مسئلہ کی کیا تنقیح ہوئی۔

مفتی اسماعیل صاحب:......ابھی چند مسائل باقی ہیں جن کو مجلس میں پیش کرنا ہے۔

امین الحسن رضوی صاحب:......ایسی صورت میں آپ کے خیال میں کیا یہ جائز ہوگا یا ناجائز؟

احسان صاحب:......یہ تو علماء بتائیں گے۔

مفتی محبوب علی وجیہی صاحب:......یہ صورت تو جواز کی معلوم ہوتی ہے، یہ جو صورت ہے کہ کم روپے میں مال خرید لیا، یا وہ لے لے زیادہ روپے کے، تو اس میں تو کوئی حرج نہیں ہے۔ بینک والا بیچے گا تو بینک والا اس کا مالک ہو گیا۔

احسان صاحب:......مرابحہ کی ایک شکل یہ ہے جو اسلامی مالیاتی ادارے کو پیش آتی ہے کہ ایک شخص اپنی تجارت کے لئے مال خریدنا چاہتا ہے، لیکن مال خریدنے کے لئے اس کے پاس پیسہ نہیں ہے حالانکہ وہ مال کی خامی اور خوبی پرکھنے میں پوری مہارت رکھتا ہے اور اس کو یہ بھی معلوم ہے کہ اس مال کا صحیح سپلائر کون ہے، وہ اپنی مرضی کا مال بازار میں تلاش کرتا ہے، سودے بازی کرنے پہ کسی آدمی سے مال کی خریداری طے کر لیتا ہے، اتنے روپئے میں میں آپ کا مال خریدنے کے لئے تیار ہوں، اب چونکہ اس کے پاس پیسہ نہیں ہے وہ اسلامی مالیاتی ادارہ کے پاس آتا ہے اور یہ کہتا ہے کہ اس قسم کا مال مجھے درکار ہے اور وہ اس قیمت پہ مل رہا ہے، بازار میں اس کے سپلائر کا میں پتہ آپ کو بتائے دیتا ہوں، آپ یہ مال اس سے خرید لیجئے اور مجھے تین مہینے کے ادھار پہ اضافی قیمت پہ بیچ دیجئے، میں تین مہینے کے اندر اپنی دکان میں اس مال کو لگا کے کوئی منافع کے ساتھ بیچ دوں گا اور آپ کی رقم وعدہ کے مطابق ادا کر دوں گا، بینک کہتا ہے کہ دیکھئے ہم آپ کی ضرورت تو پوری کر دیں گے، لیکن ہمارے پاس اسٹاک جو ہے وہ کچھ کتابی کام کا ہے بازار کے مطلب کا نہیں ہے، ہم آپ کو اپنا وکیل مقرر کر دیتے ہیں، آپ ہمارے Behalf پہ یہ مال اس سے خرید لیجئے، اور وہ آگے کہہ دیتا ہے کہ چلئے میں نے آپ کی طرف سے مال خرید لیا، اور بینک یہ کہہ دیتا ہے کہ یہ مال ہم نے آپ کو جیسا آپ اضافی قیمت بتارہے ہیں اس پر آپ کو بیچ دیا، اس مال کو یہ گراہک وہاں سے اٹھا لیتا ہے، اپنی دکان میں لے جا کر لگا دیتا ہے، اور تین مہینے کے بعد اس کو اور زیادہ قیمت پر بیچ کے بینک کا قرض ادا کر دیتا ہے تو کیا آپ کی رائے میں یہ شکل جائز ہوگی؟......روپیہ بینک نے دیا ہے جو اصل بازار میں مال کا بیچنے والا تھوک بازار میں مال کا بیچنے والا ہے، اس سے بینک نے وہ مال خریدا ہے، لیکن بینک سے جو مال خریدنے والا ہے، بینک نے مال خریدنے کے لئے اس کو اپنا وکیل بنایا، اور جب اس نے آ کے اطلاع دیدی کہ یہ سودا ہو گیا (مولانا مجیب اللہ ندوی صاحب: Bihalf کرتا ہے یا پیسے دینے کے لئے تیار کرتا ہے) نہیں پیسہ بینک کا لگا ادائیگی بینک نے کی۔

مفتی احمد دیلوی صاحب:......اس میں صرف ایک اشکال ہے، وہ یہ ہے کہ ایک ہی شخص بائع بھی بن جاتا ہے اور مشتری بھی بن جاتا ہے، ایک ہی شخص خریدار بھی بن جاتا ہے اور وہی فروخت کرنے والا بھی بن جاتا ہے، اس کی اجازت شریعت میں نہیں ہے۔

احسان صاحب:......دیکھئے خریدار تو بینک ہی بنا، اور بینک یہ بھی خواہش کرتا ہے کہ پہلی Invoices جو آئے جو ہول سیلر ہے وہ بینک کے ہی نام آنی چاہئے، بینک یہ بھی امید کرتا ہے، یا آئے تو دونوں کے نام کے ساتھ آئے جس میں کہ بینک نے وکیل بنایا ہے، اس کی حیثیت وکیل کی ہو، اور خریدار کی حیثیت بینک کی ہو، بینک یہ بھی امید کرتا ہے کہ وہ Invoices بینک کے نام بنے۔

مفتی احمد دیلوی صاحب:......لیکن ایجاب وقبول ایک ہی شخص کر رہا ہے، اور قانون یہ ہے کہ ایجاب کوئی دوسرا کرے اور قبول کوئی دوسرا کرے۔

احسان صاحب:......ایسے ایجاب تو بینک کا ہی ہے، بیچ میں ایک شخص جو ہے بینک کا وکیل ہے جو کہ بیچنے والے کے پاس جاتا ہے اور کہتا ہے کہ اس مال کو بینک خریدنے کے لئے تیار ہے، تو بیچنے والا کہہ دیتا ہے کہ میں اس کو بیچ رہا ہوں، اگر سودا ہو جاتا ہے، بینک کے نام وہ Invoice بھی کاٹ دیتا ہے، بینک اپنا ڈرافٹ مال بیچنے والے کے نام پر ایشو کر دیتا ہے، اس کے بعد وہ کہہ دیتا ہے کہ آپ یہ مال اب اٹھا لیجئے، میں نے مال آپ کو بیچ دیا، جب مال وہ اٹھانے کے لئے

جاتا ہے، بینک کا پرچہ بھی لے جاتا ہے، کہتا ہے آپ مال مجھے دے دیجئے تو وہ مال تو بینک کے لئے دیتا ہے لیکن وہ اپنی دکان میں لے جاتا ہے، کیونکہ بینک نے اس کو پہلے ہی بیچ دیا ہے...... بینک کے قبضہ میں مال نہیں آئے گا۔

مفتی احمد دیلوی صاحب:...... بینک کے وکیل نے لیا ہے اپنے قبضہ میں تو وہ بینک کا ہی قبضہ ہے، اس نے جو قبضہ کیا ہے وہ بینک نے ہی قبضہ کیا ہے، اس کے بعد پھر بینک کی طرف سے وہ لے گیا ہے، تو بینک نے اب اس کو سپرد کر دیا۔

مولانا مجیب اللہ ندوی صاحب:...... اصل میں صورت یہ بنی، آپ کے کہنے کا مطلب ذرا اس کو واضح کر لیجئے، صورت یہ بن گئی کہ بینک نے خرید لیا اور بینک نے پھر ادھار اس کو بیچ دیا، یہ صورت بنی، اس پر غور کیا جائے۔

امین الحسن رضوی صاحب:...... لیکن آپ نے یہ نہیں بتایا کہ بینک کو منافع کس مرحلہ میں ہوا۔

احسان صاحب:...... بینک نے کچھ اضافی قیمت پر بیچا اور تین مہینے کے ادھار پر بیچا۔

مفتی یوسف جودھپوری صاحب:...... بینک نے جس وکیل کو دیا ہے وہ بینک ہی کا وکیل ہے، تو گویا خود ہی کو دے دیا۔

مفتی احمد دیلوی صاحب:...... اب وہ مشتری ہو گیا اور بینک بائع ہو گیا۔

احسان صاحب:...... جی یہی حالت ہے، دوسری مرتبہ جب آیا تو وہ خود خریدار ہے اور بینک بیچنے والا ہے۔

مفتی احمد دیلوی صاحب:...... اب بینک بائع اور وہ مشتری ہے تو وہ بڑھا کے دے رہا ہے تو اسے اختیار ہے۔

مولانا مجیب اللہ ندوی صاحب:...... بس فرق اتنا ہی ہوا کہ وہ نقد اس نے خریدا ہے اور اس نے ادھار بیچ دیا، اسی پر غور کرنا ہے۔

احسان صاحب:...... Payment ہونے کے بعد اس کی وکالت ختم ہو جاتی ہے...... پہلے سودے میں بینک کا وکیل ہے جب بینک نے ڈرافٹ جاری کر دیا، اس نے Invoice بینک کے نام جاری کر دیا، اب بینک اس کا مالک ہو گیا، اب وہ کہتا ہے، کہ میں اس کا خریدار ہوں جیسا کہ میں نے پہلے بتایا تھا، میں سمجھتا ہوں سودا مکمل ہونے کے بعد اس بینک کی وکالت ختم ہو گئی۔

مولانا عبید اللہ اسعدی صاحب:...... حقیقی صورتحال کچھ ایسی سامنے آ رہی ہے کہ وہ بیک وقت خریدار بھی ہے اور وکیل بھی ہے، اور کچھ......

احسان صاحب:...... اس میں دو سودے ہیں، ایک سودا بینک کرتا ہے مال کے تھوک بیچنے والے سے، دوسرا سودا مال کو جو Retail میں بیچنے والا ہے وہ بینک سے کرتا ہے۔

جناب شمس پیرزادہ صاحب:...... نہیں بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب تکنیکی باتیں ہیں، حقیقتاً وہ خریدار بھی ہے اور وکیل بھی ہے، اس لحاظ سے یہ قابل غور ہے اور دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ ادھار کی بنیاد پر بینک قیمت زیادہ وصول کر رہا ہے، تو آیا ادھار کی وجہ سے زیادہ قیمت وصول کرنا کسی چیز کی جائز ہے؟ یہ دونوں مسئلے قابل غور ہیں۔

مولانا مجیب اللہ ندوی صاحب:...... ہمارا خیال ہے کہ بہت سادہ صورت ہے، اس میں کوئی قابل غور بات ہے ہی نہیں، بینک نے خرید لیا، اب خریدنے کے بعد اس کا وہ مالک ہو گیا، وہ ادھار بیچ رہا ہے، بس یہ سادہ صورت ہے۔

مفتی عزیز الرحمن صاحب ممبئی:...... حضرت یہ جو صورت اس میں ہے، یہ بیع قبل القبض ہو رہا ہے، بینک جو بیچ رہا ہے تو یہ قبضہ سے پہلے بیچ رہا ہے۔

مولانا مجیب اللہ ندوی صاحب:...... بھائی اس نے قبضہ تو کرلیا، وکیل کا قبضہ ہوا، وکیل کا قبضہ بینک کا قبضہ ہوا، اب وہ.........

مفتی عزیز الرحمن صاحب ممبئی:......قبضہ کہاں ہوا، صرف بات ہوئی ہے، قبضہ تو وکیل نے بھی نہیں کیا ہے۔

مولانا مجیب اللہ ندوی صاحب:......قبضہ کا مطلب یہ ہے کہ آپ فرض کر لیجئے کہ یہاں بیٹھ کر آپ مدراس میں کسی خرید وفروخت کا کوئی معاملہ کریں آپ نے مال دیکھ لیا ہو یا نہ دیکھا ہو، ایسے آپ نے اپنے اندازے سے کرلیا، تو کیا اس کو مانیں گے نہیں؟ اس کو نہیں سمجھے گے کہ ماعندہ ہے وہ؟

احسان صاحب:...... مالیاتی اداروں کی کچھ خدمت ایسی ہوتی ہے کہ جس میں ان کا اپنا کوئی سرمایہ نہیں لگتا، ان کی ساکھ لگتی ہے اور ان کو کچھ Risk بھی ہوتا ہے، مثال کے طور پر کوئی گورنمنٹ ادارہ اگر کوئی پل کی تعمیر کا ٹھیکہ کسی Constructor کو دیتا ہے اور وہ بیچ میں چھوڑ بھاگتا ہے تو اس میں سرکار کا بہت پیسہ اور وقت لگ جاتا ہے، اس لیے سرکار یہ چاہتی ہے کہ کوئی مالیاتی ادارہ ضمانت دے کہ اگر Contractor اس کو چھوڑ کر چلا جائے گا تو اس میں سرکار کو نقصان جو ہوا ہے اب وہ پہلے سے ہی متعین ہو جاتا ہے کہ اتنی Penalty اس مالیاتی ادارہ کو دینی پڑے گی اور مالیاتی ادارہ لوگوں کی صلاحیت کا جائزہ لیتا ہے اور جو Constructor ہیں ان کی پوری مالی حیثیت بھی دیکھتا ہے کہ کہاں تک وہ اپنا کانٹریکٹ پورا کرنے کے اہل ہیں، اور یہ دیکھتے ہوئے سرکاری ادرہ کو وہ ضمانت دے دیتا ہے، کہ میں ضامن ہوں اگر یہ Contract پورا نہیں کرے گا تو ایک لاکھ دو لاکھ Penalty جو آپ طے کریں گے وہ میں ادا کروں گا، اب یہ جو بینک خطرہ مول لیتا ہے جس سے وہ Contractor کی جائداد اپنے پاس رکھ لیتا ہے، تو چونکہ ان میں ایک خطرہ بھی شامل ہے اور جائداد سے وصول کرنے میں وقت بہت لگ جاتا ہے، دس دس سال مقدمے چلتے ہیں، اسی خطرہ کے عوض بینک کچھ اجرت حاصل کرتا ہے، اس کو Guarantee Fees کہتے ہیں، ضمانت کی اجرت، تو کیا یہ بینک کی اجرت جائز ہوگی؟.......... یہ کانٹریکٹ ہی ہوتی ہے، یہ Commitment ہوتا ہے کہ ایک وعدہ ہے جو پورا کرنا ہے، دوسرا Payment کی ادائیگی کی ہوتی ہے، ایک مشین کا کوئی Supplier ہے، وہ ادھار خریدار کو اپنی مشین بیچتا ہے، تو وہ یہ چاہتا ہے کہ کوئی مالیاتی ادارہ ضمانت لے لے، اگر وقت مقررہ پر پیسہ خریدار نے نہ واپس کیا تو وہ مالیاتی ادارہ سے رجوع کرے، اور مالیاتی ادارہ جو ہے اس کو دینے کا پابند ہوگا، اس میں بھی بینک کو خطرہ ہے کہ اس کا پیسہ چلا جائے گا اور خواہ مخواہ دس سال تک مقدمہ بازی ہوگی اپنا پیسہ دوسری طرف وصول کرنے میں، تو یہ ایک طرح سے قرض کی ضمانت ہے اور اس میں قرض سودی بھی ہوسکتا ہے اور غیر سودی بھی ہوسکتا ہے، سود کی بات تو اس وقت نہیں کر رہے ہیں، اگر وہ غیر سودی قرض ہے تو کیا اس میں Guarantee Commission بینک کو غیر سودی قرض جائز ہوگا۔

مفتی یوسف جودھپوری صاحب:......وہ سودی ہو یا غیر سودی ہو، لیکن آپ جو ضمانت دے رہے ہیں وہ اس بات کی دے رہے ہیں کہ سرکاری ادارہ اگر قرضدار کو قرض ادا نہ کرے، تو اب سرکاری ادارہ سود سمیت ادا کرے گا۔ سرکاری ادارہ تو سود لیتا ہے، جس کی ضمانت آپ جس ادارہ کو دے رہے ہیں وہ تو سود سمیت وصول کرنے والا ہے۔

احسان صاحب:......جس نے مشین سپلائی کی ہے ادھار وہ Supplier کو دے گا۔

مفتی احمد دیلوی صاحب:......بہر حال ضمانت اس بات کی ہوگی کہ وہ قرض ادا نہ کرے تو ہم ادا کریں گے اور سود کے ساتھ ادا کریں گے۔

احسان صاحب:......نہیں سود کا کوئی ذکر نہیں ہے، مان لیجئے غیر سودی قرضہ ہے یا جو مال اس نے بیچا ہے وہ تو اس کا قیمت فروخت ہے۔

مفتی احمد دیلوی صاحب:......سرکاری اداروں میں تو بغیر سود کے کوئی بات ہوتی ہی نہیں۔

احسان صاحب:......ہوتی ہے، وہ میں نے پہلے ہی عرض کیا کہ بینکوں کی بہت ساری خدمات ایسی ہیں جس میں ان کا پیسہ نہیں لگتا ہے، اس کی ساکھ لگتی ہے اور یہ کہ وہ خطرہ مول لیتے ہیں، یہ انہی اقسام میں سے ہے۔

مولانا مجیب اللہ ندوی صاحب:...... تو اس کے معنی یہ کہ مسئلہ قابل غور ضمانت کی اجرت ہے، بس اتنا ہی مسئلہ ہے کہ ضمانت کی اجرت لی جائے، جائز ہے یا نہیں جائز ہے؟

احسان صاحب:...... ضمانت بھی دو طرح کی ہے، ایک قرض سے متعلق ہے، ایک کام سے متعلق ہے۔

مولانا مجیب اللہ ندوی صاحب:...... آپ فرمارہے ہیں کہ ضمانت اور کفالت کی اجرت نہیں ہوسکتی، کفالت بالضمان بھی تو شاید کوئی چیز ہوتی ہے، یعنی اگر کوئی چیز دے لے اور نقصان ہوجائے تو اس کا کیا ہوگا؟

مفتی احمد خانپوری صاحب:...... کفالت اس کی اجرت نہیں ہوسکتی اس کی بنیاد کیا ہے، کیا عقد تبرع ہے۔

تیسری نشست

احسان صاحب:...... کمپنی کے حصص سے متعلق کچھ سوالات ہیں، جو برابری کے حصص ہوتے ہیں ان کی بنیاد تو شرکت پر ہوتی ہے اور وہ کمپنی کے نفع و نقصان میں برابر کے شریک ہوتے ہیں، لیکن ملکی قانون اور ٹیکس کی پیچیدگیاں کچھ ایسی ہیں کہ اس میں جو کمپنی تنہا غیر سودی سرمایہ سے کاروبار کرے تو اس کو بہت زیادہ ٹیکس ادا کرنا پڑتا ہے اور دوسرے لوگوں کے لئے چونکہ سود حرام بھی نہیں ہے تو ان کو اس بات میں کوئی کراہیت نہیں ہے کہ سود کے اوپر قرضہ لیں، ان کا تو منافع جب تک سود سے اوپر رہتا ہے تب تک وہ قرض لیتے چلے جاتے ہیں، اگر ایک روپئے پر ان کو دس روپئے سود دینا پڑ رہا ہے اور بارہ روپئے ان کا منافع ہوتا ہے تو جب تک یہ دو روپئے کا ڈیفرنس رہے گا وہ سود لیتے چلے جائیں گے، اب چونکہ ہم اس کے نفع ونقصان میں شریک رہنا چاہتے ہیں اور سودی معاملہ نہیں کرنا چاہتے، اور آگے کمپنی لے آتی ہے اپنے سرمایہ کو اور بڑھاتی ہے، اس کمپنی کی مان لیجئے بازار کے اندر دس روپئے والے حصص کی قیمت ایک سو روپئے ہے، تو وہ اپنے پرانے جو شیئر ہولڈرس ہیں ان کو خاص طور سے نفع پہنچانے کی غرض سے وہ دس روپئے کا شیئر ان کو پچاس روپئے میں دے دیتی ہے، لیکن وہ ایک شرط لگاتی ہے کہ ہم یہ پچاس روپئے کا آپ کو ایک شیئر دیں گے جس میں دس روپئے شیئر کی قیمت ہوگی اور چالیس روپئے منافع ہوگا، وہ منافع میں جمع ہوجائے گا، وہ سارے شرکاء کی برابری ہوگی۔ دوسرے ہمیں قرض کی بھی ضرورت ہے، تو ہم بجائے اس کے کہ بینک کے باہر سے لیں، آپ قرض سرٹیفیکٹ بھی ہم سے لیجئے، لہٰذا وہ حصص سے منسلک Debenture جاری کرتی ہے، اور چونکہ حصص میں پچاس روپئے کا فرق ہے، چالیس روپئے کا فرق ہے، جو کمپنی نے پچاس روپئے میں جاری کیا، بازار میں وہ نوے روپئے میں بک رہا ہے، تو ہر حصہ دار حصص لینا چاہتا ہے، لیکن کمپنی مجبور کررہی ہے کہ آپ کو Debenture بھی لینا ہوگا، فی الحال آپ لے تو لیجئے، اگر آپ اس کو نہیں رکھنا چاہتے تو اس کے خریدار بازار میں موجود ہیں، یہ پچاس روپئے کا آپ کا ۳۵ روپئے میں یا ۴۵ روپئے میں بک جائے گا، کچھ حصص بازار کی ایسی روش ہے کہ ڈبینچر کے اوپر سود بینکوں کے سود سے دوگنا بھی اگر کردیا جائے پھر بھی اس کو حصص خریدنے والے نہیں خریدنا چاہتے، وہ چاہے مسلمان ہوں یا غیر مسلم ہوں، وہ حصص میں ہی دلچسپی رکھتے ہیں، ڈبینچر میں نہیں رکھتے، ان کی نظر میں جو زائد سود ہے وہ زیادہ منافع بخش نہیں ہے، لہٰذا جب یہ ڈبینچر بکنے کے لئے بازار میں جاتا ہے تو یہ پچاس روپئے سے ہر حالت میں کم پر ہی بکتا ہے، چاہے اس پر پندرہ فیصدی یا بیس فیصدی بھی سود ہو، تب بھی یہ پچاس روپئے ۳۵ روپئے میں ۴۰ روپئے میں ہی بکے گا، ایسی صورت میں کیا یہ جائز ہوگا کہ ڈبینچر کمپنی سے لے تو لیا جائے اور حصص اور ڈبینچر دونوں جب ہمارے پاس آجائیں تو حصص ہم روک لیں اور ڈبینچر کو ہم بازار میں فروخت کردیں، چاہے وہ کچھ خسارے سے ہی فروخت ہو، لیکن جو شیئر کی قیمت اور ڈبینچر کی کل قیمت پر منافع ہورہا ہے وہ خسارہ اس سے ہر حالت میں کم ہی رہے گا، جو شیئر میں چالیس روپئے کا منافع ہورہا ہے، ڈبینچر کے فروخت میں زیادہ سے زیادہ پندرہ روپئے کا نقصان ہوسکتا ہے، ایسے میں پچیس روپئے کا پھر بھی فائدہ حصص میں رہ جاتا ہے اور اگر ہم یہ سوچ لیں کہ چونکہ اس میں ایک سودی معاملہ ہے، ہم حصص بھی نہ لیں ڈبینچر بھی نہ لیں اور پرانے شیئر کے اوپر اکتفا کرجائیں، تو یہ نئے شیئر جیسے ہی مارکیٹ میں آتے ہیں ہمارے پرانے شیئر کی بھی قیمت گرجاتی ہے، وہ نوّے روپئے کا اسّی روپئے میں بکنے لگتا ہے، تو اس طرح سے تو ہمیں پچیس روپئے کا جو منافع ہورہا تھا ہم اس سے محروم رہ گئے، دوسرے ہمارے ہاتھ میں جو حصص تھے اس میں بھی دس روپئے کی قیمت کا فرق آگیا، اس کو نہ لینے میں یہ مجبوری ہے۔

مفتی محمد عبید اللہ اسعدی صاحب:......ایک بات کی وضاحت چاہتا ہوں کہ ڈبینچر زیادو قسم کے ہوتے ہیں Secured اور Unsecured، اور جن ڈبینچر ز کا آپ ذکر کر رہے ہیں وہ Secured کا غالباً کر رہے ہیں، Unsecured Debenture کو کیا کمپنی جاری نہیں کرتی۔

احسان صاحب:......نہیں Secured اور Unsecured کا یہاں سوال نہیں اٹھتا، ڈبینچر زتو Secured ہی ہوتے ہیں، لیکن ان کا نمبر دوسرے قرضوں کے بعد آتا ہے، ایک General Loan ہوتا ہے لیکن اس سے پہلے اگر وہ پراپرٹی کسی خاص رہن میں رکھ دی گئی ہے تو خاص رہن کے لئے پہلے وہ پراپرٹی ضمانت ہوگی، بعد میں Debenture Holder کی ضمانت ہوگی۔

مفتی محمد عبید اللہ اسعدی صاحب:......Unsecured کی صورت یہ ہوتی ہے غالباً کہ اگر کہیں کوئی Loss ہو جائے تو وہ اس پر سود نہیں دے گی۔

احسان صاحب:......نہیں ایسا نہیں ہے، وہ تو قرض ہے اور قرض میں صرف ترجیح میں تو فرق پڑتا ہے، جو پہلے پراپرٹی اگر مخصوص طور سے کسی کے نام کمپنی نے رکھ دی ہے، پہلے اس قرض کی ادائیگی ہوگی، بعد میں ڈبینچر کی ادائیگی ہوگی، تو قرض تو جب تک وہ قرض دینے کی پوزیشن میں ہے کمپنی مع سود کے ادا کرے گی اور جب اس پوزیشن میں نہیں ہوگی تو اس کی ایک فہرست ہے کہ پہلے سرکاری قرضے ادا ہوتے ہیں، Employees کے قرضے ادا ہوتے ہیں، پھر دوسرے قرضوں میں Debenture Holder کا بھی ذکر آتا ہے۔

مفتی محمد عبید اللہ اسعدی صاحب:

نہیں Secured اور Unsecured کا فرق یہ ہے جہاں تک مجھے معلوم ہو سکا ہے، کہ Secured پر تو کمپنی ہر صورت میں سود دیتی ہے، Secured Debenture پر، لیکن Unsecured پر دینے کی وہ پابند نہیں ہے اور دیتی بھی نہیں ہے، جبکہ کمپنی کو Loss ہوا۔

احسان صاحب:

ایسا ہے وہ Secured اور Unsecured کا فرق نہیں ہے، اب حکومت نے اس بات کی اجازت دے دی ہے کہ کمپنی اگر چاہے تو غیر سودی ڈبینچر بھی جاری کر سکتی ہے، اور اس کی ضرورت صرف اس لئے آئی کہ وہ Convertible Debenture کے معاملہ میں ضرورت پیش آئی تھی، کہ ایک طرف کمپنی ایک ایسا رقعہ جاری کرتی ہے جس کے اوپر کچھ اضافہ سے ادائیگی کرتی ہے یعنی سود دیتی ہے، دوسری طرف سرٹیفکیٹ ایسا جاری کرتی ہے جس میں کمپنی الٹا منافع شیئر ہولڈرس سے لے رہی ہے، جو شیئر سرٹیفکیٹ دس روپئے کا اس نے جاری کیا اور پچاس روپئے میں شیئر ہولڈر کو دے رہی ہے تو چالیس روپئے یہاں لیتی ہے، تو ایک ہی معاملہ میں شیئر ہولڈر کو کچھ دیتی ہے کمپنی اور دوسرے معاملہ میں شیئر ہولڈر سے کچھ لے لیتی ہے، یہاں شیئر ہولڈر کو یہ دقت آتی ہے کہ چالیس روپئے جو ان کے پاس سے گئے وہ تو چلے ہی گئے، اب جو ڈبینچر کے اوپر سود ملا وہ انکم ٹیکس کے قانون میں آجاتا ہے اور ان کی آمدنی میں وہ سود درج ہو جاتا ہے، تو اس کے اوپر ان کو انکم ٹیکس بھی ادا کرنا پڑتا ہے، کچھ کمپنیز نے یہ سوچا کہ ہم کیوں نہ یہ سود کی رقم اپنے منافع میں سے ہی کم کر دیں، اگر ہم اس کو چالیس روپئے منافع پر شیئر جاری کرنا چاہ رہے تھے تو ہم اس کو تیس روپئے منافع پر ہی جاری کریں، وہ سود یہاں کاٹ لیں تاکہ اس کے ہاتھ میں پہنچنے پر ٹیکس نہ دینا پڑا، تو اس کی وضاحت کمپنی کہیں نہیں کرتی ہے کہ کتنا سود اس کے اوپر متوقع تھا اور اس کی رعایت رکھتے ہوئے ہم نے کتنا Premium کم کر دیا ہے، لیکن یہ سمجھا ضرور جاتا ہے کہ اگر غیر سودی ڈبینچر نہ جاری کیا ہو تو Premium کچھ کمپنی نے زیادہ چارج کیا ہوتا، اس میں یہ جو حصص سے منسلک ڈبینچر کا مسئلہ آیا، اس میں ایک یہ بھی اختیار ہوتا ہے کہ اگر آپ چاہتے ہیں کہ بھئی یہ جو سودی معاملہ ہے اس سے بالکل بچ جائیں، تو کمپنی یہ کہتی ہے کہ آپ یہ اپنا حق حصص کا اور ڈبینچر کا ملا کے کسی کو بازار میں بیچ بھی سکتے ہیں آپ فارم کے اوپر اپنے دستخط کر کے اس کو دید یجئے، وہ اپنا نام بھر کے جب دے گا ہم اسی کو دیدیں گے یہ آپ کے حصص اور ڈبینچر ز ہیں، اور اسی سے پیسہ لے لیں لے۔ تو یہ جو حق ہے قابل تبادلہ اور قابل فروخت ہوتے ہیں، کوئی آدمی اگر زیادہ احتیاط برتنا چاہے کہ میں یہ قرض تمسک چھوڑ دیتا ہوں اور شیئر سرٹیفکیٹ بھی چھوڑ دیتا ہوں، اس میں جو مجھے پچیس روپئے منافع مل رہا تھا اگر کوئی شخص مجھے دس روپئے منافع دے دے تو میں یہ حق اس کو دے دیتا ہوں، وہ اپنا روپیہ لگا لے گا اور پندرہ روپئے منافع وہ شخص اس طرح سے حاصل کرے گا، تو کیا وہ یہ حق اپنا بازار میں بیچ سکتا ہے؟

عبد العظیم اصلاحی صاحب:......عرض یہ ہے کہ یہ شیئر ہولڈر کو جو رعایت مل رہی ہے ڈبینچر کی یا حصص سے منسلک ڈبینچر کی، یہ حق صرف رعایت کا ہے، رعایت ہے، باقی اس کو ڈبینچر بھی خریدنا پڑ رہا ہے، کم قیمت میں ہے، اور اسی طرح حصص اور شیئر کو بھی خریدنا پڑ رہا ہے، کمپنی کی طرف سے تو یہ رعایت ہے، یہ خالی ایسا حق ہے جو اس پر نہ تو قبضہ ہے یعنی اس کا حق موکد نہیں ہے، یہ شفعہ سے بھی کمزور درجہ کا ہے، یا شفعہ کے مثل ہے، اس کو فقہ حنفی کی رو سے فروخت نہیں کرسکتا ہے۔

احسان صاحب:

یہ ایسا ہے، جو کمپنی کے دس روپے کے شیئر کی قیمت بازار میں نوے روپے ہے، اس کی کئی وجوہ ہوتی ہیں، کمپنی ہر سال جتنا منافع کماتی ہے وہ سارا کا سارا تقسیم نہیں کردیتی ہے، وہ اپنے پاس روک کر رکھ لیتی ہے، اس سے اس کی مالیت میں اضافہ ہوجاتا ہے اور جو کمپنی اب سے چالیس سال پچاس سال پہلے قائم ہوئی تھی اس وقت جو اس نے اثاثے خریدے تھے، زمین اور بلڈنگ میں پیسہ لگایا تھا آج اس کی بھی قیمت زیادہ بڑھ جاتی ہے، تو اس کو بازار میں ایک عوامی آفر دینے کے بجائے کمپنی یہ سوچتی ہے کہ کیوں نہ ہم اپنے پرانے شیئر ہولڈرس کو یہ شیئر جاری کریں اور کچھ کم قیمت پر جاری کریں، تا کہ وہ جو اس سے نکلنا چاہتے ہیں بیچنا چاہتے ہیں، وہ اس کو اگر بازار میں بیچ دیں تو وہ اثاثوں کی بڑھی ہوئی قیمت اور اس کا منافع جو رکا ہوا ہے اس طرح اس کو مل جائے گا، کیوں شیئرز کا ایسا طریقہ نہیں ہوتا کہ جو شخص شیئر ہولڈر آگے نہیں رکھنا چاہتا وہ کمپنی کو واپس کردے اور کمپنی اپنی پونجی میں سے نکال کر پیسہ اس کو دے دے، ایسا طریقہ کمپنی میں نہیں ہوتا کمپنی تو یہ کہہ دیتی ہے کہ اگر آپ آگے کے لئے شریک نہیں بننا چاہتے تو یہ اپنا حق شرکت کسی دوسرے کو بیچ دیجئے، جو خرید لے گا وہ اس میں شریک کل ہوجائے گا۔

عبد العظیم اصلاحی صاحب:......ویسے اگر عدول جائز ہو تو امام مالکؒ کے نزدیک حق شفعہ کو بھی فروخت کرسکتا ہے، اس صورت میں اگر علماء سوچیں تو عدول کے بارے میں یہ ایک صورت ہوسکتی ہے، اس سے پہلے جو سوال تھا کہ ڈبینچر اور یہ اس کو حق ملتا ہے، تو ڈبینچر یہ قرض ہے تو متضمن بر حوالہ ہم اس وثیقہ کو خریدنا جائز قرار دیں گے، لیکن اس میں ربا کی شرط ہے، سود بردار ہے، اسی لئے تو یہ ربا کی شرط کی وجہ سے عقد فاسد ہوجائے گا، لیکن اگر خرید لیا تو فقہ حنفی کی رو سے ملکیت ثابت ہوجائے گی، اور وہ شرط فاسد ہوگی، اب وہ فروخت کررہا ہے تو یہ فروخت کرنا بھی درست ہوگا، لیکن کم قیمت میں اگر بیع کررہا ہے تو پھر یہ بیع فاسد ہوگی، چونکہ قرض کی بیع کم قیمت میں بھی درست نہیں ہے، برابر میں ضروری ہے۔

احسان صاحب:......اس میں ایک شکل یہ بھی آتی ہے، چونکہ ڈبینچر ہاتھ میں آتے آتے چار مہینے یا پانچ مہینے کا وقت لگ جاتا ہے، اور اس کے اوپر سود اسی تاریخ سے جاری ہوجاتا ہے جو کہ اس کی تاریخ اجراء ہے، تو اب بازار میں جب وہ بیچنے کے لئے جاتا ہے، مان لیجئے کمپنی نے کچھ سود ادا کردیا، اس کو مان لیجئے کہ پچاس روپئے والے ڈبینچر پر کمپنی نے پانچ روپئے سود دے دیا، اب اگر اس کا ڈبینچر ۴۵ روپئے میں بکتا ہے تو کیا یہ جائز ہوگا کہ وہ پانچ روپئے کا خسارہ کمپنی سے ملے سود سے پورا کرلے؟

عبد العظیم اصلاحی صاحب:......نہیں یہ درست نہیں معلوم ہوتا ہے، اس لئے کہ یہ عقد جو کہ کا ہوا ہے وہ تیسرے آدمی سے ہوا ہے اور کمپنی کو جو وثیقہ کے ذریعہ قرض دیا گیا تھا، وہ تو باقاعدہ محفوظ ہے اور اخیر میں جاکر کے وصول ہوسکتا ہے جب بھی وہ ڈبینچر ختم ہوگا، تو وہ حوالہ اپنی جگہ میں محفوظ ہے، کمپنی نے کوئی اس کا حق تلف نہیں کیا ہے۔

احسان صاحب:......اب لب لباب یہ ہے کہ کیا علماء اس بات کی اجازت دیتے ہیں کہ حصص سے منسلک ڈبینچر شیئر ہولڈر خرید لے، اگر اس بات کی اجازت نہیں دیتے تو کیا اس بات کی اجازت دیتے ہیں کہ وہ اپنا حق یہ بازار میں بیچ کے فائدہ حاصل کرلے۔

ایک سوال قابل تبدیل ڈبینچرس کا ہے، کمپنی چونکہ اپنا جو حصص سرمایہ ہے اس میں بھی دلچسپی رکھتی ہے اور قرض میں بھی دلچسپی رکھتی ہے، وہ چاہتی یہ ہے کہ سرمایہ حصص کم رہے، قرض زیادہ رہے، یا ہمیں پہلے قرض مل جائے، بعد میں ہم اس کو سرمایہ حاصص میں تبدیل کردیں، اس کے لئے کمپنی قابل تبدیل ڈبینچر جاری کرتی ہے جو کہ کچھ عرصہ تک ڈبینچر رہتے ہیں اور وہ عرصہ پورا ہونے کے بعد حصص میں تبدیل کردیئے جاتے ہیں، اس صورت میں بھی اگر ڈبینچر خرید کے اس کو حصص میں تبدیل کرالیا جائے تو وہ حصص بازار میں بازاری قیمت کے اعتبار سے کم قیمت میں حاصل ہوجاتی ہیں، تو کیا حصص کا یہ حاصل کرنے کا طریقہ جائز ہوگا کہ پہلے قرض کی صورت میں اس کو رکھا جائے، بعد میں ڈبینچر جو کہ کلی طور سے قابل تبدیل نہیں ہے، جزوی طور سے قابل تبدیل ہے؟ دوسرا حصہ رہ جاتا ہے جو کہ قرض ہی کا ہے، تو اس کو پھر اسی طرح بازار میں بیچنا پڑتا ہے، تو اس کو بازار میں بیچ سکتے ہیں دوسرے حصہ کو یا نہیں بیچ سکتے؟ اور جو سود ملا اس سے تلافی کرسکتے ہیں

خسارے کی یا نہیں کر سکتے؟ یا اس سود کو خیرات ہی کرنا پڑے گا؟

عبدالعظیم اصلاحی صاحب: ......اس میں جو ڈبینچر Convertible ہے یعنی قابل تبدیل ہے وہ شیئر اور حصص میں کلی اعتبار سے ایک مدت کے بعد تبدیل ہو جائے گا، یہ ایک صورت ہوئی، دوسری صورت یہ ہے کہ جزئی اعتبار سے تبدیل ہوگا، اس کا کچھ فیصد طے ہوگا کہ کچھ حصہ تبدیل ہوگا اور کچھ سود بردار قرض ڈبینچر ہی رہے گا، تو بہر حال ڈبینچر کی کوئی بھی صورت ہو اس میں شرط رباہے، ایسی تمسکات اور ایسے وثیقے ہیں جس میں شرط ربا ضرور ہے ڈبینچر کا مطلب یہی ہے، لہذا یہ شرط ہے اس وجہ سے یہ عقد فاسد ہوگا، لیکن خرید لیا تو مالک ہو جائے گا اور جب تبدیل ہو جائے گا شیئر اور حصص میں تو اپنے منافع اور سرمایہ کاری کا باقاعدہ جواز ہوگا، لیکن جو جز قابل تبدیل نہیں ہے یا جب تک تبدیل نہیں ہوا ہے اس پر سود حاصل ہوگا، تو وہ سود بہر حال سود ہے، ناجائز ہی رہے گا۔

احسان صاحب: ......یہ سوچ کر آدمی خریدے کہ بازاری قیمت سے کم قیمت پہ مل رہا ہے اس لئے میں ڈبینچر لے لوں، اور جو کچھ بھی سود اس کے اوپر ادا کرنا پڑ رہا ہے تو اس کو خیرات کر دوں، تو کیا ایسا جائز ہے؟

ایک آواز: ......مگر مسائل ظاہرہ میں حرام وحلال کے معاملہ میں نیت تو پاس نہیں ہوتی، نیت سے پاس نہیں کی جاسکتی، آپ جس نیت سے بھی خریدیں وہ سود کا سود رہے گا۔

احسان صاحب:

تو یہ قابل تبدیل ڈبینچر ہے، تو ظاہر ہے کہ اس میں کچھ حصص مضمر ہیں جو کچھ عرصہ کے بعد مل جائیں گے، ان ڈبینچرس کی بازاری قیمت میں بھی اتار چڑھاؤ آتا رہتا ہے، جس کمپنی کے شیئرز اس کے اندر مضمر ہیں جو چھ مہینے بعد یہ شیئرز ملنے والے ہیں، آج بازار میں جو قیمت ہے ان کی اس کے اعتبار سے ڈبینچرس کی بھی قیمت میں اتار چڑھاؤ آتا رہتا ہے، مان لیجئے کہ وہ اس ڈبینچر میں دو شیئرز مضمر ہیں جو کہ کمپنی پچاس پچاس روپئے میں دے رہی ہے، اس میں دس روپئے تو شیئر کی قیمت ہے چالیس روپئے منافع، اس طرح دو شیئر کی قیمت بیس روپئے اور اسّی روپئے کمپنی کا منافع، اور بازار میں اس شیئر کی قیمت نوے روپئے ہے، تو دو شیئرز کو ملا کے اسّی روپئے کا منافع ہو رہا ہے ڈبینچر ہولڈر کو، اب اگر بازار میں شیئرز کی قیمت نوے روپئے سے ۱۵۰ روپئے ہو جاتی ہے تو ظاہر ہے کہ اس ڈبینچر کی قیمت میں بھی اسی طرح سے اضافہ ہوگا، اس ڈبینچر کی قیمت بازار میں بھی ڈیڑھ سو روپئے دو سو روپئے ہو سکتی ہے، تو کیا یہ جائز ہوگا کہ ڈبینچر شیئر میں تبدیل کرانے سے پہلے ہی اگر اضافہ اس کی قیمت میں ہو جائے تو اس کو اور اضافی قیمت پہ بازار میں بیچ دیا جائے؟ ......جو قابل تبدیل ڈبینچر ہیں ان میں کچھ شیئر مضمر ہوتے ہیں جو ایک عرصہ کے بعد ملنے والے ہوتے ہیں...... کمپنی قابل تبدیل ڈبینچر جاری کرتی ہے، وہ یہ کہتی ہے کہ ایک سو روپئے کا ڈبینچر چھ مہینے کے بعد دو شیئر میں تبدیل کر دیا جائے گا، اس کا مطلب یہ ہوا کہ دس روپئے کا شیئر ہے تو کمپنی اس کو چالیس روپئے منافع سے دے رہی ہے، دو شیئر کے اوپر کمپنی ایک سو اسّی روپئے منافع حاصل کر رہی ہے، اور بازار میں ایک شیئر کی قیمت نوے روپئے ہے تو یہ دو شیئر ایک سو اسّی روپئے میں بازار میں بک سکتے ہیں جو کہ اس کو سو روپئے میں حاصل ہوئے، اس طرح سے اسّی روپئے کا منافع متوقع ہے، اب یہ چونکہ متوقع ہے اور چھ مہینے کا فرق ہے، آج ڈبینچر میں اس کا پورا کا پورا اثر نہیں پڑتا ہے، یہ ڈبینچر میں صرف اس میں سے پچاس روپئے ہی منافع کا اثر پڑے گا، یعنی یہ جو کمپنی ڈبینچر ایک سو روپئے میں دے رہی ہے یہ بازار میں آپ کا آج ہی ایک سو پچاس روپئے میں بک سکتا ہے، کیونکہ اس میں جو دو شیئر مضمر ہیں وہ ایک سو اسّی میں بک سکتے ہیں، اس میں اسّی روپئے کا منافع متوقع ہے، لہذا خریدار اس کو تیس روپئے کم کر کے پچاس روپئے میں لینے کے لئے تیار ہو جائے گا، تو یہ فوراً بھی بک سکتے ہیں جیسے ہی آپ کے ہاتھ میں آئے۔ اب سوال یہ ہے کہ ہم نے یہ سوچا تھا کہ ہم قرض نہیں رکھیں گے، اور حصص میں تبدیل ہونے کے بعد حصص اپنے پاس رکھیں گے، قرض میں جو سود ملا اس کو بھی بیچ دیں گے، اگر آج ہی ہمیں یہ منافع ہو رہا ہے تو آج ہی یہ ڈبینچر ہم بیچ دیں، اور اس کے اوپر جو منافع ہوا اس کو یہ نہ سوچیں کہ یہ منافع قرض کے اوپر ہوا ہے، بلکہ یہ سوچیں کہ جو حصص اس کے اندر مضمر ہے اس کی وجہ سے یہ منافع ہوا، اور یہ آپ بالکل یقین جانئے قرض کا کوئی بھی رقعہ اس پر کتنا ہی اچھا انٹرسٹ کیوں نہ ہو، کتنا ہی زیادہ سود کیوں نہیں ہو وہ اپنے قدر عرفی سے کم ہی بازار میں بکتا ہے، کیونکہ حصص میں سرمایہ کاری کرنے والے قرض میں سرمایہ کاری کرنا ہی نہیں چاہتے، اب اگر وہ زیادہ پر بک رہا ہے تو اپنے اندر حصص مضمر ہونے کی وجہ سے ہی زیادہ پر بک رہا ہے، وہ کسی سود کی وجہ سے زیادہ پر نہیں بک رہا ہے، کیا اضافی قیمت پہ اس ڈبینچر کو بیچنا جائز ہوگا؟

ایک آواز:...... بیچنے سے پہلے خریدنے کی بات......... ڈبینچرس جو ملتے ہیں وہ سود کے بغیر ملتے نہیں، اس لئے خریدنا پہلے ٹھیک ہو پھر بیچنے کی تفصیلات ہوں گی، خریدنا تو درست نہیں ہے، اس لئے کہ اس میں بہر حال سود کا تعلق ہے۔

ایک آواز:...... یہ کسی خریداری پر ڈبینچر ملتا ہے یا اس کی کیا صورت ہے؟.........

احسان صاحب:...... نہیں نہیں یہاں مسئلہ یہ آرہا ہے، کہتے ہیں کہ معاملہ ہی قرض کا ہو رہا ہے، چاہے چھ مہینے کے بعد وہ حصص میں تبدیل ہو، لیکن اس کا اجراء جو ہے وہ سود پر ہے۔

ایک آواز:...... نہیں ڈبینچر کی تعبیر قرض بالربا سے ہے، قرض ربوی کو ڈبینچر کہتے ہیں۔

ایک آواز:...... صحیح فرمایا انہوں نے کہ یہ سب ذیلی سوالات ہیں، بنیادی سوال تو یہ ہے کہ ڈبینچر خریدنا جائز بھی ہے یا نہیں؟

کھٹکھٹے صاحب:

دیکھئے اس وقت ہم ڈبینچر خریدنے کی بات کر رہے ہیں، جہاں ہمارے پاس پہلے سے اس کے حصص موجود ہیں اور ہم ڈبینچر خریدنا نہیں چاہ رہے ہیں ہم اسی وقت ڈبینچر خرید رہے ہیں جبکہ ہمارے پاس اس کمپنی کے حصص ہیں، اور اگر ہم یہ ڈبینچر نہیں خریدیں گے تو اس میں ہم کو ناحق نقصان ہوگا، کیونکہ ڈبینچر کے اجراء کے بعد شیئر کی قیمت گرے گی، لازماً گرے گی، تو اگر یہ ڈبینچر کے جاری ہونے میں ہم حصہ نہیں لیں گے اور وہ ڈبینچر لے کے پھر بعد میں اس کو شیئر میں تبدیل نہیں کریں گے یا بازار میں نہیں بیچیں تو پھر ناحق آپ کو نقصان ہوگا۔

احسان صاحب:

میں اس کی ذرا سی وضاحت کردوں، کمپنی اپنا منافع جو شیئر ہولڈرس میں تقسیم کرتی ہے، اس کی کوئی ایک شکل نہیں ہے، دو تین شکلیں ہیں، ایک شکل تو یہ ہے سیدھا سادا کہ کمپنی کو مان لیجئے ایک کروڑ روپے منافع ہوا، تو کمپنی نے یہ مناسب سمجھا کہ اس میں سے ستر لاکھ شیئر ہولڈرس میں تقسیم کردیا جائے، تیس لاکھ کمپنی کے کاروبار کو مزید بڑھانے کے لئے اپنے پاس روک لیا جائے، ایک طریقہ یہ ہوا۔ اب یہ رکا ہوا منافع جب اکٹھا ہوتا چلا جاتا ہے اور کمپنی یہ بھی محسوس کرتی ہے کہ جو ہمارے پرانے شیئر ہولڈرس ہیں انہوں نے جب شیئرز خریدے تھے اور ان کے سرمایہ سے کمپنی نے جو اثاثے خریدے تھے آج اس کی قیمت میں بہت اضافہ ہوگیا ہے، تو کمپنی Bonus Share بھی جاری کردیتی ہے، بونس شیئر کا مطلب یہ کہ ایک شیئر کسی کا بھی ہو وہ ایک تناسب فکس کردیتی ہے، ایک کے اوپر ایک بونس، یا دو کے اوپر ایک بونس، یا پانچ کے اوپر تین بونس، یا پانچ کے اوپر دو بونس، مطلب ایک شیئر کسی کے پاس پہلے سے ہے، کمپنی نے ایک شیئر مفت میں اس کو دیا کہ آپ کا جو حصہ تھا اس کو ڈبل کردیا جو منافع اکٹھا ہوا تھا اس کے عوض ایک شیئر اور جاری کردیا، اس کو بونس شیئر کا طریقہ کہتے ہیں، تیسرا طریقہ یہ ہے کہ کمپنی مفت میں شیئرز نہ جاری کرے لیکن بازاری قیمت سے کم قیمت پر حصص جاری کردے، ایک طریقہ یہ ہوا، یہ بھی منافع تقسیم کرنے کا طریقہ ہے...... ایک طریقہ تو بونس شیئر ہے وہ مفت شیئر کا ہے، دوسرا آفری شیئر بطور حق جاری کرے کہ جو پرانے شیئر ہولڈرس ہیں انہیں کا یہ حق ہے، آگے وہ شیئر ہولڈر...... بجائے اس کے کہ کمپنی ایک عوامی آفر دیدے، عوامی ایجاب دے کہ جس کی مرضی چاہے وہ Apply کردے اور شیئر ہولڈر بن جائے، اس کے بجائے کمپنی یہ سوچے کہ ہم اپنے پرانے شیئر ہولڈرس کو ہی شیئر ہولڈر بنائیں تاکہ جو نوے روپے کا شیئر ہے ان کو اگر ہم پچاس روپے میں دیں تو چالیس روپے ان کو پھر بھی منافع ہوجائے گا۔ اس طرح کمپنی بطور حق بازاری قیمت سے کم قیمت پر شیئر کا اجراء کرتی ہے، یہ بھی منافع کی تقسیم کا ایک طریقہ ہے، اس میں یہی بطور حق ڈبینچر سے منسلک کرکے بھی کرسکتی ہے، کمپنی کا تو ارادہ ہے کہ منافع کچھ تقسیم ہوجائے لیکن ہمیں قرض بھی مل جائے، غیر سودی کاروبار کرنے والے کو یہاں مجبوری آجاتی ہے، وہ حصص تو لینا چاہتا ہے ڈبینچر نہیں لینا چاہتا، اس کے لئے اجازت چاہئے کہ فی الحال اس کو اس شرط سے حصص مل رہے ہیں کہ ڈبینچر بھی وہ لے تو وہ اپنا منافع حاصل کرنے کے لئے دونوں چیزیں لے لے اور ڈبینچر کو وہ فروخت کردے اور وہ خسارہ سے ہی فروخت ہوگا لیکن یہ مجموعی خسارہ جو مجموعی منافع ہے اس کا اس سے نہیں بڑھے گا، اس لئے یہ بھی نہیں کہا جاسکتا کہ اس نے ایک قرض کو کم قیمت پہ جو فروخت کیا اس نے سود ادا کیا، کیوں کہ ابھی بھی کم قیمت پہ فروخت کرنے کے بعد اس کو منافع بچ رہا ہے، خالص خسارہ اگر ہوجائے تو آپ کہہ سکتے ہیں کہ اس نے سود ادا کیا، تو یہ بطور حق جو ہے یہ بھی ایک منافع

تقسیم کرنے کا طریقہ ہے، اس میں اگر وہ اپنا حق نہیں استعمال کرے گا تو اس کے ہاتھ میں جو پرانے شیئرز ہیں اس کی بھی آگے چل کر قیمت گر جائے گی، جبکہ نئے شیئرز بازار میں آ جائیں گے، عام حالات ایک سے رہنے کے باوجود بھی اس کی قیمت اپنے حصص کی گر جائے گی، اور اسی کا ایک طریقہ جو Convertible Debenture جاری کرنے کا ہے، Convertible Debenture بھی کمپنی ایک عرصہ تک اس کو قرض رکھتی ہے اور پھر حصص میں تبدیل کر دیتی ہے، لیکن وہ بھی بازاری قیمت سے کم دے رہی ہے اور اپنے ہی پرانے شیئر ہولڈرس کو فائدہ پہنچانے کی غرض سے دے رہی ہے، اس کے بھی خریدار بازار میں بہت مل جائیں گے، اور اس کی قیمت اجراء سے کہیں زیادہ پر خریدار مل جائیں گے وہ فوراً بازار میں بک سکتا ہے، تو اس طرح سے بھی وہ کمپنی اپنے پرانے شیئر ہولڈرس کو فائدہ پہنچانا چاہتی ہے۔

اب حصص کی خرید وفروخت کا معاملہ آتا ہے، تو حصص خریدنے والے دو طرح کے لوگ ہوتے ہیں: ایک ایسے لوگ ہوتے ہیں جو حصص کو حصص بازار سے خرید لیں اور اپنے نام منتقل ہونے کے لئے کمپنی کے پاس بھیج دیں، حصص کو حصص بازار خریدنے کے بعد حصص کا مالک تو بن جاتا ہے، ان حصص کو حصص بازار میں بیچ بھی سکتا ہے لیکن کمپنی سے کوئی فائدہ حاصل نہیں کر سکتا، جب تک کہ وہ اپنے نام پہ حصص منتقل نہ کرالے اور کمپنی کے رجسٹر میں اس کا حصص برداروں میں نام نہ آ جائے، تو کیا یہ طریقہ جائز ہے کہ حصص کو مال تجارت کی طرح بازار سے خریدا جائے اور بغیر اپنے نام منتقل کرائے جب بھی اس کی قیمت میں اضافہ ہو جائے اس کو بیچ دیا جائے؟ یا ضرورت پڑنے پر کم قیمت پہ بھی بیچا جائے، یہ تو تجارت ہے مال کم قیمت پر بھی بک سکتا ہے اور زیادہ قیمت پر بھی بک سکتا ہے۔

ایک آواز:...... کیا نام پر منتقل کئے بغیر خریدنے کا Authorise ہے۔

احسان صاحب:...... اس حصص کا وہ بازاری اعتبار سے مالک بن جاتا ہے، لیکن کمپنی کی نظر میں وہ مالک تب تک نہیں ہے جب تک کہ کمپنی کے رجسٹر میں اس کا اندراج نہ ہو جائے، اور اس میں تین مہینے کا عرصہ کم سے کم لگتا ہے، اور تین مہینے میں دس بار بازار میں اتار چڑھاؤ آ جاتے ہیں۔

ایک آواز:...... تو گویا کہ یہ بالائی خرید وفروخت ہے۔

احسان صاحب:...... ہاں، تو بہت سے لوگ حصص کو اس نیت سے خریدتے ہیں کہ جب اس کی قیمت بڑھے گی اس وقت ہم فروخت کر دیں گے، کچھ لوگ باقاعدہ کمپنی کے ممبر بننا چاہتے ہیں، اپنے نام درج کراتے ہیں، کمپنی سے جو فائدے حاصل ہوتے ہیں وہ ان کو ملتے رہتے ہیں، اور جو حصص مال تجارت کی طرح خریدے بیچے جاتے ہیں، اس میں کمپنی سے اس کو براہ راست کوئی فائدہ نہیں ملتا ہے۔

ایک آواز:...... اس میں ایک شق یہ معلوم ہوتی ہے کہ جس نے شیئر کمپنی سے باقاعدہ Nomination کے بعد خریدا، اس کو خریدنے کے بعد اس نے بالائی طور پر فروخت کر دیا، اور دوسرے خریدنے والے نے اپنا Nomination نہیں کیا، اس کا رجسٹریشن نہیں ہوا، اگر اس بیچ میں کمپنی سے کوئی منافع ہوا تو اس منافع کا کون حقدار ہوگا۔

احسان صاحب:...... اس میں کمپنی ایک تاریخ کا تعین کرتی ہے اور کافی وقت دیتی ہے، جو منافع اس کو دینا ہوتا ہے وہ ایک مہینہ پہلے دو مہینے پہلے ہی بتا دیتی ہے کہ فلاں تاریخ تک جو ہمارے ممبر ہوں گے یہ منافع ہم ان ہی کو دیں گے، اور جو لوگ حصص خرید کے اس تاریخ سے پہلے پہلے کمپنی کے پاس بھیج دیں گے، ان کو منافع آئے گا، اور جس نے حصص خرید تو لئے لیکن کمپنی کو نہیں بھیجا تو منافع پرانے آدمی کو پہنچے گا، اس کے ہاتھ میں نہیں آئے گا، لیکن بازاری عرف میں وہ اس کا مالک ہوگا جب وہ چاہے گا اس کو فروخت کر دے گا۔

ایک آواز:...... تو اس میں یہ خریدنے کے بعد دوسرا آدمی اس شیئر کا مالک ہو گیا اور ملکیت کے ختم ہونے کے بعد جو اس سے متعلق منافع ہیں وہ تو اسی بعد والے آدمی کو ملنا چاہئے۔

احسان صاحب:...... لیکن جو ایک تاریخ کا تعین رہتا ہے تو اس میں ایک دو مہینے کا وقت رہتا ہے، کافی لوگ سوچ لیتے ہیں کہ اس کو ہم خرید لیں اس کو، اور اس کو وہاں بھیج دیں گے، لیکن پھر بھی آخری تاریخ تک لوگ انتظار کرتے ہیں اس بات کا کہ اچھا ہے بازار میں قیمت بڑھ جائے تو میں اس کو نہ بیچوں، بازار میں ہی بیچ کر آج ہی پیسہ...... سے پہلے واپس نہیں آئیں گے اور بازار میں قیمت بڑھنے کے باوجود بھی میں اس کو نہیں بیچ پاؤں گا۔

شمس پیرزادہ صاحب: ......بھئی جب تک ٹرانسفر نہیں ہوتا شیئر اس کے نام پر وہ مالک کہاں سے ہوا کہ وہ فروخت کردے؟

احسان صاحب:

مالک سرٹیفکیٹ سے ہوجاتا ہے، بیچنے والا شیئر کے ساتھ ایک فارم بھی اس کو دیتا ہے، اس فارم پر دستخط کردیتا ہے، اس دستخط کرنے کا مطلب یہ ہوا کہ آج میں نے سارے حقوق اس کو دوسرے کے نام منتقل کردیئے جس کو ڈیلیوری دے رہا ہوں جس کے قبضہ میں دے رہا ہوں، اپنے حقوق وہ اس کو دے رہا ہے، وہ آگے جس کو اس کے قبضہ میں دے گا وہ اپنے حقوق اس کو دے دے گا۔

شمس پیرزادہ صاحب: ......مگر اس نے اپنے حقوق جو منتقل کرنا چاہا اس کو کمپنی نے ابھی تسلیم ہی نہیں کیا اور اس سے پہلے وہ فروخت کرتا ہے، اور کیا اس وقت جو سٹہ چل رہا ہے، Forward Trading ہو رہی ہے اور ابھی حکومت نے کچھ قانونی پابندی بھی اس پر عائد کردی ہے، یہی شکل نہیں ہے وہ؟

احسان صاحب:

وہ دوسری شکل ہوتی ہے جو سٹہ کی ہوتی ہے، سٹہ کی شکل یہ ہے کہ حصص بازار نے اس بات کی کچھ شیئرز کے معاملہ میں گنجائش رکھی ہے کہ اگر آپ کے ہاتھ میں حصص نہیں ہے اور آپ کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ ان حصص کی قیمت گرجائے گی تو آپ اس کو بیچ دیجئے، اور ایک وقت سیٹلمنٹ کا ہوتا ہے، ایک وقت مقرر ہوتا ہے کہ اس کے اندر اندر آپ حصص دیدیجئے، اگر آپ نہیں دیتے ہیں تو وہ آپ کا سودا ٹرانسفر کردیتے ہیں اگلے وقفے کے لئے، اور اس طرح سے وہ سالہا سال سودا آپ کا ٹرانسفر ہوتا رہتا ہے اگلے وقفے کے لئے، لیکن اس وقفہ میں حصص کی قیمت میں جو اتار چڑھاؤ آیا اس کے مطابق وہ آپ کا Clearance چاہتے ہیں، اگر واقعی شیئرز کی قیمت گرگئی تو آپ کو Deference مل جائے گا اور اگر قیمت بڑھ گئی تو آپ کو اس میں Deference جمع کرنا پڑے گا، سٹہ بازاری یہ ہے کہ ایک شخص کے پاس پوری قیمت ادا کرنے کے لئے پیسہ نہیں ہے، اس کو گنجائش ہے کہ آپ کچھ کم پیسہ دیدیجئے، سودا آپ کا کردیں گے، باقی شیئر جب آپ کے ہاتھ میں آجائے تب دیدیجئے گا، لیکن وہ پھر بھی منع کردیتا ہے کہ میرے پاس ابھی پیسہ نہیں ہے تو کہہ دیتے ہیں کہ یہ سب وقفہ کا جو نفع نقصان ہوا وہ ہمیں دے جایئے، اگلے وقفہ کے لئے سودا آپ کا کھڑا رہا، تو وہ سالہا سال تک چلتے رہتے ہیں، یہ صورت بالکل دوسری ہے، یہاں حصص ہمارے پاس ہے، اور اس کو ہم دوسرے کو ڈیلیوری بھی دے رہے ہیں، قبضہ بھی دے رہے ہیں اور اپنا پیسہ لے رہے ہیں، یہ سٹہ بازاری میں نہیں آتا، یہ تو اصل مال کا سودا ہے۔

مفتی عزیز الرحمن چمپارنی صاحب:

بہرحال یہ جو شیئرز کے بالائی خرید وفروخت کا مسئلہ ہے، اس میں یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ بالائی خرید وفروخت سے حق ملکیت منتقل ہوجائے گی، گوکہ بینک کے رجسٹر میں وہ بعد والا آدمی رجسٹرڈ نہیں ہوا ہے، اور حق ملکیت کے منتقل ہونے کے بعد حق نفع کا بھی وہی حقدار ہوگا، اور یہ میں اس لئے کہہ رہا ہوں کہ فقہاء کی بعض عبارتوں سے ایسا معلوم بھی ہوتا ہے، جیسے زمین کسی شخص نے اگر خریدی اور اس میں کوئی درخت ہے تو اس زمین کی بیع کے بعد اس کا جو درخت ہے، یا اور اس سے کچھ متعلق چیز ہے، اگر اس زمین میں ہے تو اس کا وہی حقدار ہوگا یعنی مشتری، تو پہلا مسئلہ تو یہ ہے کہ اس اشترائے بالائی کے بعد یعنی بالائی طور پر آؤٹ خرید فروخت جو ہوا ہے بالائی طور پر، اس سے حق ملکیت منتقل ہوتی ہے کہ نہیں، اس پر غور کرنا چاہئے۔ اگر منتقل ہوجانا تسلیم ہے تو حق نفع منتقل ہونے کے لئے فقہاء کی عبارتیں اور اس کے شواہد مل جائیں گے۔

مفتی یوسف جودھپوری صاحب:

عرض یہ ہے کہ یہ شیئر اور حصص جو بازار میں آئے ان کے نمبر ہوتے ہیں، شیئر کے نمبر بھی ہوتے ہیں، اور شیئر بازار کا ایسا اصول ہے کہ وہ شیئر بازار کی جو خاص مارکیٹ ہے وہیں فروخت ہوں گے اور جب فروخت ہوں گے تو خاص ایجنٹ ہوں گے ان سے رسید کٹوائیں گے، ایک رسید ایجنٹ کے پاس رہے گی، ایک رسید جو ہے خریدنے والے کے پاس رہے گی، اور جو فروخت کرے گا وہ فروخت کرنے والا دستخط کرکے ایک فارم پہ دے گا، یہ تمام عقد کرنے اور خرید وفروخت کے لئے سارے ثبوت ہیں، دوسری قانونی بات یہ سمجھ میں آتی ہے کہ وہ کمپنی شیئر کے بارے میں مطلقاً قانونی اجازت دیتی ہے کہ جو چاہے خرید وفروخت کرے، اور جس کا قبضہ ہوگا اور جو اخیر سال میں ایک مدت ہے وہ ہمارے سامنے آئے گا تو ہم اس کو منافع دیں گے، جس کا

رجسٹریشن یعنی کاغذی کارروائی ہوگی، تو اس سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ خرید وفروخت وغیرہ کی قانونی اعتبار سے اس کو اجازت مل گئی ہے، اور شرعی اعتبار سے ہم یہ سوچیں کہ یہ جو وثیقہ ہے اور جو حصہ اس کا کمپنی میں لگا ہوا ہے تو یہ اس کا وثیقہ ہے اور سامان تجارت کی طرح اس کی خرید وفروخت کر سکتا ہے۔

احسان صاحب:...... یہ اس کی دوسری مثال جیسا کہ آپ نے فرمایا تھا زمین کے کاغذات کی ہے کہ بیع نامہ تو ہوتا رہتا ہے، بیع نامہ ہو جاتا ہے لیکن جب تک اس کی رجسٹری نہیں کرائی جائے اور اندراج نہ کرایا جائے کھسرا کھاتہ میں نام پرانے ہی مالک کا چلتا رہتا ہے، اسی طرح کمپنی میں بھی پرانے مالک کا نام چلتا رہتا ہے جب تک کہ اس کا اندراج نہ ہو جائے، جب کہ سودا تو بیع نامہ کی رو سے ہو ہی جاتا ہے۔

شمس پیرزادہ صاحب:...... مگر رجسٹری میں اور اس معاملہ میں فرق ہے، رجسٹری کا معاملہ ایک اندراج کا معاملہ ہوتا ہے، اور یہاں کمپنی سے براہ راست معاملہ ہے کہ کمپنی شریک کس کو قرار دے رہی ہے؟

احسان صاحب:...... دیکھئے کمپنی تو اسی کو شریک تسلیم کرے گی جس کا نام اس کے رجسٹر میں درج ہے، لیکن جو خریدار ہے، بیچنے والا ہے اس نے اپنا سرٹیفکیٹ ایک اور فارم کے ساتھ جس پر یہ لکھا ہوا ہے کہ میں اپنے کلی اختیارات اس سرٹیفکیٹ کے ساتھ دوسرے آدمی کو بیچ رہا ہوں، تو ایسی حالت میں وہ مالک تو ہو جاتا ہے، اس کا اندراج ابھی کمپنی کے رجسٹر میں نہیں ہے، اگر وہ آدمی جلدی سے کسی دوسرے کو نہیں بیچنا چاہتا، کمپنی میں اپنا اندراج چاہتا ہے تو اندراج کرالے اندراج، اور اگر وہ چاہتا ہے کہ بازار میں قیمت اس کی بڑھ گئی، میں کسی دوسرے آدمی کو اپنے حق کو منتقل کر کے منافع کما لوں، بیچ لوں، تو وہ مال تجارت کی طرح اس کی خرید وفروخت ہے، تو یہی دو شکلیں ہیں کہ ایک ایسا شخص ہے جو کہ باقاعدہ ممبر بنتا ہے اور اس کو اپنے پاس رکھتا ہے اپنے پاس، اور ایک ایسا شخص ہے جو اس کو جنس تجارت کی طرح خرید وفروخت کرتا ہے۔

مولانا مجیب اللہ ندوی صاحب:...... تو وہ کس حیثیت میں ہوگا؟

احسان صاحب:...... اس کے ہاتھ میں قبضہ آنے کے بعد اس کو سارے اختیارات مل جاتے ہیں، اور وہ چاہے تو کمپنی میں اپنا نام اندراج کرالے یا اپنا نام اندراج کرانے کا حق دوسرے کو منتقل کر دے۔

مفتی یوسف جودھپوری صاحب:...... وضاحت طلب یہ ہے کہ یہ شیئر ایک سال میں جاری ہوئے، کسی بھی کمپنی کے جاری ہو گئے، تو اس سال تو ایک خریدار کے نمبر رجسٹریشن ہو گئے، اب وہ دوسرا سال ختم ہو گیا، تو وہ مدت جب آتی ہے منافع تقسیم کرنے کی تو باقاعدہ پھر کارروائی ضروری ہے...... تو اس کارروائی کے بعد جو آخری نام آیا، اور پھر دوسرے سال کی خرید وفروخت چلتی رہے گی، تو اس میں یہ جانچ پڑتال جو کرتے ہیں تو اس کی کیا شکل ہے؟

احسان صاحب:...... اس میں دیکھئے، ملکیت تو بازار سے خریدنے کے بعد دوسرے کی ہو جاتی ہے اور کمپنی میں نام پرانے آدمی کا ہی درج ہے، تو جو منافع اس کو ملے کمپنی سے اس کا وہ قانونی مالک نہیں ہوتا، اور یہ شخص چاہے تو عدالت سے وصول کر سکتا ہے، لیکن وہ منافع اتنا قلیل ہوتا ہے کہ اس کے لئے کوئی آدمی عدالت سے رجوع نہیں کرنا چاہے گا، اخلاقی طور سے کچھ رواج ہے، کچھ جان پہچان کے لوگ ایسے بھی ہیں جو اخلاقی طور سے وہ منافع اس کو دے دیتے ہیں کہ کمپنی سے چونکہ میرا نام اس میں درج تھا، میرے پاس آیا ہے، لیکن یہ حق آپ کا ہی ہے، کمپنی جو ہے وہ مجبور ہے اسی آدمی کو دینے کے لئے جس کا نام رجسٹر میں درج ہے، لیکن اگر وہ پہلے بیچ چکا ہے اپنے اختیارات دوسرے کو دے چکا ہے۔

یہ اس سے وصول کر سکتا ہے، اور وہ منافع اتنا کم ہوتا ہے کہ اس کو سارے لوگ نظر انداز ہی کر دیتے ہیں، چلئے تھوڑا اس سال کا بہت ہے گیا، اگلے سال کے لئے ہم کرائیں گے، کیوں کہ روزانہ جو قیمتوں میں فرق ہوتا ہے وہ منافع سے کہیں زیادہ ہوتا ہے، منافع تو ایک شیئر پر مان لیجئے پچیس روپئے ملا، تو اس کے بازار میں جو قیمتوں میں اتار چڑھاؤ ہے اس کا کہیں دو سو روپئے تین سو روپئے اس شیئرز کی قیمت میں اتار چڑھاؤ ہوگا، جیسے مان لیجئے ACC ہے، اس کی تین ہزار روپئے قیمت ہے بازار کی، ایک شیئرز پر منافع مشکل سے وہ پچیس روپئے دیتی ہے، اور قیمت تین ہزار روپئے ہے، اور اس کی جب پیچھے مارکیٹ گری تھی اس کی پندرہ سو ساڑھے پندرہ سو روپئے قیمت رہ گئی تھی، اب جب مارکیٹ بڑھنی شروع ہوئی ہے تو اس کی تین ہزار روپئے قیمت بڑھ گئی ہے، یہاں پچیس روپئے کو کوئی نہیں گردانتا، ہر آدمی چھوڑتا ہے کہ اس کو جانے دیجئے، اب ہم مارکیٹ میں جو منافع مل

رہا ہے اس کو ہی لے لیتے ہیں، یا ہمارے جو تین ہزار روپے کے پندرہ سو روپے رہ گئے تھے وہ پچیس روپے اور برداشت کر لیں گے۔

مفتی عزیز الرحمن صاحب:...... اس بیان سے یہ سمجھ میں آیا کہ جو شیئر کے Document ہوتے ہیں وہ ایک وثیقہ ہے، تو اصحاب فقہ وفتاوی کے لئے محل غور ہے کہ اس وثیقہ کی مستزاد قیمت پر بیع وشراء جائز ہوگی یا نہیں؟

احسان صاحب:...... دیکھئے قرض کا معاملہ نہیں ہے اس میں بالکل بھی، یہ ایک حصہ ہے......

مفتی یوسف جودھپوری صاحب:...... سوال صرف اتنا ہے کہ مثلاً مارچ میں منافع تقسیم کرنے کی میعاد ہے، شیئر ایسے ہیں کہ مارچ میں...... نوٹس آئیگا کہ اس کی اطلاع کر دیں کہ کون اس کا آخری مالک ہے تو اب یہ آخری اطلاع نہیں پہنچی یا پہنچ جاتی ہے تو سابق جو مالک تھا جس کے نام وہ شیئر تھا تو اس کا اعتبار کمپنی کے نزدیک کیا ہے، مارچ کے بعد یا مارچ سے پہلے؟

احسان صاحب:...... کمپنی کے رجسٹر میں اس کی حیثیت مالک کی ہی ہے (مارچ کے بعد بھی وہی رہے گی؟ اصلاحی صاحب) ہاں اسی کی رہے گی جب تک کہ یہ نیا آدمی اپنا اندراج نہیں کرالے گا، لیکن مارکیٹ کے اعتبار سے نیا آدمی مالک ہو گیا، اور یہ اپنا نام اندراج کرا سکتا ہے جب چاہے، اور اس کو کسی دوسرے آدمی کو بھی بیچ سکتا ہے انہیں اختیارات کے ساتھ میں۔

مفتی یوسف جودھپوری صاحب:...... مارکیٹ کے اعتبار سے یہ اس کا مالک ہو گیا؟

احسان صاحب:...... مالک ہو جاتا ہے، جس نے قیمت ادا کر کے وہ چیز خریدی ہے وہ اس کا مکمل مالک ہوتا ہے، اس کی قیمت ادا کرنے کے بعد جس نے قبضہ حاصل کر لیا وہ اس کی ملکیت مکمل ہو گئی، دو شرطیں ہیں: قیمت کے عوض قبضہ، اب ایک سوال اس میں ایسا ہے جو قابل غور ہے، جیسا کہ ہم نے یہ چاہا کہ ہم اس کے مالک بنیں، اور باقاعدہ کمپنی سے جو منافع مل رہا ہے وہ سیدھا ہمارے پاس آئے، تو ہم اس کو ٹرانسفر کے لئے بھیج دیتے ہیں، کمپنی تین مہینے کا وقت لگاتی ہے، کبھی کبھی چار مہینے کا چھ مہینے کا سات مہینے کا، اور ارادۃً بھی کمپنی زیادہ وقت لگا دیتی ہے، کیونکہ کمپنی جو ہے ان کے فیصلے بھی لوگوں کے فیصلے کے اوپر منحصر کرتے ہیں اور جو لوگ فیصلہ کرنے والے ہیں وہ بھی شیئر ہولڈرس ہوتے ہیں، تو کبھی کبھی وہ مصنوعی قلت پیدا کرنے کی کوشش بھی کرتے ہیں بازار کے اندر، تاکہ حصص کی قیمت بڑھ جائے، وہ اس کو روکا بھی دیتے ہیں، اب ایسے میں بازار کی قیمت بڑھ جاتی ہے۔ بازار میں شیئر کی قیمت بڑھ گئی، ہم نے شیئرز کمپنی کو بیچ دیئے، ہمارے ہاتھ میں شیئرز نہیں ہیں، ہم مالک ہیں، اور جب بھی وہ شیئرز ہمارے ہاتھ میں آئیں گے ہم اس کو بیچ سکتے ہیں، لیکن ہم آج کی قیمت سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں، اب چونکہ حصص بازار میں اس بات کی گنجائش رکھ دی گئی ہے کہ اگر آپ کے ہاتھ میں حصص نہیں بھی ہیں تو آپ یہاں سودا کر سکتے ہیں، اور جب آپ کے حصص آجائیں ہاتھ میں تب اس کو ڈال دیجئے اور اس کی قیمت بعد میں لے لیجئے، تو میرا کوئی ارادہ اسے سٹہ کرنے کا نہیں ہے

میں ایسا مالک نہیں ہوں جس نے سرے سے شیئرز خریدے ہی نہیں ہیں، میں تو ایسا مالک ہوں کہ جس نے شیئرز خریدے ہیں، اس کی قیمت بھی میں نے ادا کر دی ہے، میری مجبوری صرف یہ ہے کہ میں نے اس کو اپنے نام منتقل کرانے کے لئے بھیجے ہیں، اور جس کی واپسی تین مہینے سے پہلے ممکن نہیں ہے، اور بازار ان شیئرز کی واپسی کا انتظار نہیں کر سکتی، میں تو آج ہی اس کو بیچنا چاہتا ہوں، لہذا مستقل بازار میں میں نے یہ کہہ کر بھیج دیا کہ میرا سودا آج کے Rate پر پکا کر دیا جائے، جب میرے پاس شیئرز آئیں گے میں شیئرز ڈال دوں گا، پیسہ اپنا اسی وقت لے لوں گا، تو بازار کے اصولوں میں اس بات کی گنجائش ہے، کبھی کبھی شیئرز کی بہت زیادہ قلت ہوتی ہے تو بازار اس کے اوپر جرمانہ تو ڈالدیتی ہے کہ آپ اس کا جرمانہ ادا کیجئے، آپ نے کہا تھا کہ میں شیئرز دوں گا اور وقت مقررہ پر آپ نے نہیں دیا، لیکن یہ کیفیت بہت کم آتی ہے، سو میں سے پانچ فیصدی جس کے امکانات ہیں، کہ اتنی قلت ہو جائے کہ اس میں تاوان پڑے، ورنہ عموماً کوئی تاوان بیچنے والے کو نہیں پڑتا، تو کیا ایسا جائز ہوگا کہ میں آج کے Rate پر اپنا سودا کر کے منافع محفوظ کر لوں، اور جب میرے پاس حصص آجائیں تو میں اس کو آج کے Rate حصص کی حوالگی کر کے قیمت وصول کر لوں۔

مفتی یوسف جودھپوری صاحب:...... یہ وثیقے جو ہیں یہ ایجنٹ کے اعتبار سے، خرید وفروخت کے اعتبار سے ہیں، اب وہ وثیقہ جو ہے صرف کمپنی میں

پہنچا ہے، اور اتفاقی طور پر ایسا ہوسکتا ہے کہ رک جائے، باقی کوئی لازم نہیں ہے کہ رک جائے گا (نہیں تین مہینے تو لگ ہی جاتے ہیں۔ احسان صاحب) وہ ٹائم اپنی جگہ پر ہے، تو یہ وثیقہ ہے، اب اس وثیقہ کی حیثیت صرف یہ ہے فقہی اعتبار سے کہ یہ جو کمپنی میں مال ہے اور جائداد ہے غیر منقولہ اور منقولہ، دونوں کے وہ حصہ دار ہیں، ہر چیز میں اس کا حصہ ہے، تو غیر منقولی جائداد جو ہے وہ تو فقہی اعتبار سے قبضہ کے بغیر بھی فروخت کرنا جائز ہے، اور جو منقولی جائداد ہے اس میں قبضہ شرط ہے، تو اب یہ وثیقہ تو خالی کاغذ ہے جو پہنچا ہے، باقی جو حق ہے اصل کمپنی کے اندر جائداد، تو اس میں دو شکلیں نظر آرہی ہیں، منقولہ اور غیر منقولہ، تو اس اعتبار سے سوچنا چاہئے کہ منقولہ جو جائداد ہے اس کے قبضہ کے بغیر کیا ہوگا؟ یہ صورت فقہی اعتبار سے سوچنی چاہئے۔

احسان صاحب: ...... یہ تو اصل میں شرکت کا ایک حصہ ہے، ایک جز ہے، جو کچھ بھی اس میں منقولہ اور غیر منقولہ مشترک جائداد ہے اس کا ایک جز ہے، یوں سمجھئے، اور اس جز کی ہی خرید وفروخت ہوتی ہے، اس کے شرکاء بدلتے رہتے ہیں، کمپنی کا ڈھانچہ ایسا کا ایسا ہی بنا رہتا ہے، شرکاء میں تبدیلی آتی رہتی ہے، وہ اپنے حق شرکت منتقل کرتے رہتے ہیں، تو اس میں کوئی منقولہ اور غیر منقولہ کا فرق نہیں ہے، یہ ایک مکمل شرکت کا جز ہے۔

مولانا مجیب اللہ ندوی صاحب: ...... نہیں مقصد یہ کہ یہ جو شیئر ہے یہ تو منقولہ ہے، کہنے کا مطلب یہ ہے۔

احسان صاحب: ...... نہیں شیئر تو بذات خود منقولہ ہے، اس پر نمبر پڑا ہوا ہے نام بھی لکھا ہوا ہے، لیکن یہ ہے کہ سودا جو بازار میں ہوتا ہے اس کی شکل دوسری ہوتی ہے، سودا جب بازار میں ہوتا ہے تو اس میں نمبر نہیں دینے پڑتے، اس میں تو صرف ہم نے ایک سو شیئر بیچے بھی کہنا پڑتا ہے، اس کمپنی کے ایک سو شیئر بیچ دیئے، اب وہ کسی بھی نمبر پر آپ دیدیجئے، آپ کے اپنے نہیں ہیں، کسی دوسرے کا دیدیجئے، تب بھی آپ کو پیسہ مل جائے گا، جب آپ کے اپنے آجائیں اس شخص کو واپس دیدیجئے۔

مفتی عزیز الرحمن صاحب: ...... نہیں سوال یہ ہے کہ یہ شیئر، اس کی خرید وفروخت Property Base پر ہوتی ہے یا صرف وثیقہ اور Documents کی بنیاد پر ہوتی ہے۔

احسان صاحب: ...... یہ دیکھئے قیمت میں جو اضافہ ہوتا ہے یہ اس کا Property Base ہے، اور کمپنی سے آگے فائدہ کی کتنی توقع ہے اس سے قیمت کا تعین ہوتا ہے، جیسے آج ایسی کمپنیز بھی ہیں جو کہ فی الحال خسارہ میں چل رہی ہیں، لیکن اگلے دو سال میں تین سال میں ان سے بہت زیادہ منافع کی امید ہے، ان کا شیئر خسارہ میں ہوتے ہوئے بھی اپنی قدر عرفی سے زیادہ قیمت پر بازار میں بک رہا ہے، یہ تو پورا بازار جو ہے آس اور یاس کا بازار ہے، آج کسی کمپنی کی مالی طور سے حالت بہت اچھی ہے، لیکن گورنمنٹ کی پالیسی ایسی آگئی کہ اگلے دس سال میں اس کو منافع نہیں ہوگا، تو مالی استحکام کے باوجود بھی اس کی قیمت اس کے قدر عرفی سے نیچے چلی جائے گی، اور آج جو خسارہ میں کمپنی ہے اس سے اگر زیادہ امیدیں ہیں تو اس کی قیمت بھی بڑھ جائے گی، یہ تو ہر مال کے لئے جو بھی مال آپ خرید رہے ہیں بازار میں، ان ہی وجوہات کی بنا پر آپ یہ سوچتے ہیں کہ مستقبل میں اس کی قیمت میں اضافہ ہوگا .... ابھی جو اخیر میں میں نے سوال پیش کیا اس میں یہ بات ہے کہ حصص کا میں مالک ہوں لیکن میرے ہاتھ میں حصص نہیں ہیں، کمپنی کو میں نے بھیج دیئے ہیں، اور بازار میں اس بات کی گنجائش رکھی ہوئی ہے کہ آپ کے ہاتھ میں حصص نہ ہو تو بھی مستقبل بازار میں آپ اس کو بیچ سکتے ہیں، اگر میں مالک نہیں ہوں اور میں نے اس کی قیمت ادا نہیں کی، میں مستقبل بازار میں بیچ دیتا ہوں اس امید پر کہ کل قیمت گرے گی، تو یہ تو خالص سٹہ ہو جائے گا، لیکن جس چیز کا میں مالک ہوں، جس چیز کی قیمت ادا کی ہے، اور تین مہینے میں چار مہینے میں اس کی واپسی کی امید بھی ہے، اس کا Payment میرا اتنے ہی تاخیر سے ہوگا، جب میں ڈیلیوری کروں گا اسی کے بعد مجھے اس کا Payment ہوگا، ادائیگی ہوگی تو یہ کیا جائز ہوگا کہ میں سودا کرلوں مستقبل بازار میں؟

مفتی عزیز الرحمن صاحب: ...... میں نے یہ سمجھا ہے اس گفتگو سے کہ کمپنی کی جو پراپرٹی ہے یہ اس شیئر کے Weight کو متعین کرنے کی بنیاد ہے، نہ یہ کہ اصل پراپرٹی کی خرید وفروخت ہوتی ہے، تو اس جائداد کی حیثیت ایک ضمان کی ہوگی، شئی مبیع نہیں قرار دی جاسکتی۔

احسان صاحب: ...... مال کوئی بھی ہو اس کی قیمت میں اضافہ کے اور قیمت میں گرنے کے امکانات کوئی وجہ سے ہی ہوتے ہیں، آج اگر ہم کسی جگہ کوئی زمین خرید رہے ہیں، کوئی پلاٹ لے لیتے ہیں، ہم یہ سوچتے ہیں کہ ادھر آبادی بڑھنے والی ہے، آج ہم پلاٹ خریدتے ہیں کہ آبادی جب بڑھ جائے گی اس کی مانگ جب بڑھے گی ہماری زمین کی بھی قیمت بڑھ جائے گی، اسی طرح کمپنی سے بھی توقعات ہوتی ہیں کہ کمپنی کا کاروبار منافع بخش ہوگا، اس کے

حصص ہم خرید لیں اس کی قیمت بڑھ جائے گی، دوسری طرف جب ہماری خریدی ہوئی جائیداد کو بھی یہ خطرہ ہو جاتا کہ اس کو سرکار قبضہ کرنے جارہی ہے، کوئی Dam بنانا چاہتی ہے یا کوئی سڑک بنانا چاہتی ہے، اس کی قیمت فوراً گر جاتی ہے، اسی طرح جب کمپنی کے کاروبار کو بھی سرکاری پالیسی سے یا دوسرے تجارتی وجوہ سے خسارہ کے امکانات بڑھ جاتے ہیں تو حصص کی قیمتیں گرنا شروع ہو جاتی ہیں، اور جب منافع کے امکانات بڑھ جاتے ہیں تو حصص کی قیمتیں بڑھتی ہیں، ایک بارش ہی کا معاملہ ہندوستان میں بہت بڑا رول ادا کرتا ہے، اگر بارش اچھی ہو جاتی ہے تو پوری معیشت کے لئے یہ امید کی جاتی ہے کہ ساری معیشت اب آگے بڑھے گی، سب کارخانوں کو کچا مال ملے گا، کاشتکار کی جیب میں پیسہ ہوگا، وہ پکا مال خریدے گا، لہذا پوری معیشت کو اس کا فائدہ ہوتا ہے، اور سوکھا پڑ جائے تو پوری معیشت خراب ہونے کے مواقع رہتے ہیں، اسی طرح دلی میں بمبئی میں پہلی جون سے دس جون تک کی تاریخوں میں بڑے غور سے خبریں سنی جاتی ہیں کہ کہاں کتنی بارش ہوئی، کیا امکانات بارش کے ہیں، اور جب بارش ہو جاتی ہے تبھی شیئرز کے خریدار شیئرز خریدنا شروع کرتے ہیں، کہ اب پوری معیشت اوپر اٹھے گی، یہ تو مال تجارت ہے، اس میں جو بھی خرید کی جاتی ہے اسی لئے خرید کی جاتی ہے کہ آگے قیمتوں میں اضافہ ہوگا تب ہم اس کو بیچیں گے، اب وہ سوال جو میرا تھا وہ صرف اتنا تھا کہ حصص میرے پاس موجود نہیں ہیں، اور اس بات کی گنجائش ہے مستقبل بازار میں کہ میں اس کو بیچ سکتا ہوں، تو کیا میں اس کو بیچ سکتا ہوں یا نہیں؟۔

احسان صاحب:...... جبکہ وہ قبضہ میں میرے پاس آنی ہی ہے کمپنی سے واپس............

ایک آواز:...... آپ عرض مسئلہ پیش فرمارہے ہیں تو غور وخوض کے لئے آپ کو وقفہ مطلوب ہے، بس عرض مسئلہ پیش فرماتے جایئے اور طلب رائے کے لئے وقفہ لیتے رہئے۔

احسان صاحب: اب ایک پرچہ میرے پاس آیا ہے، کسی صاحب نے چاہا ہے کہ Life Insurance اور کارخانوں کے دیگر انشورنس کی وضاحت چاہئے۔

احسان صاحب:...... خرید وفروخت کے معاملہ میں ایک سوال اور پیدا ہوتا ہے کہ حصص کی خرید وفروخت کئی طریقے سے کی جاتی ہے، ایک تو یہ ہے کہ ذاتی طور پر دو آدمی مل جاتے ہیں، ایک خریدنے والا اور ایک بیچنے والا، خریدنے والا سودا کر لیتا ہے اور بیچنے والا حوالگی دے دیتا ہے، اور اس سے قیمت لے لیتا ہے، یہ بہت ہی کم ہوتا ہے، حصص بازار میں حصص کی خرید وفروخت ہوتی ہے، وہ منظم بازار ہوتے ہیں، اور ان بازاروں کا طریقہ یہ ہے کہ سودوں کا ایک وقفہ طے ہو جاتا ہے کہ پیر کے دن سے جمعہ کے دن تک سودے ہوں گے، اور یہ سودے سارے لکھے جاتے رہیں گے کہ پانچ دن کیا سودے ہوئے، جن لوگوں نے اپنے حصص بیچے ہیں وہ حصص بازار میں سنیچر کے دن اپنے اپنے بروکرس کے ذریعہ حصص دیدیں گے، جن لوگوں نے وہ حصص خریدے ہیں وہ حصص ان کے بروکرس بیچنے والوں کے بروکرس سے حصص لے لیتے ہیں اور اپنے خریدار کو مطلع کر دیتے ہیں کہ آپ کے حصص آگئے ہیں، اب آپ پیسہ ادا کر دیجئے اور یہ لے جایئے، وہ حصص اپنے گراہکوں کو دینے کے بعد ان سے پیسہ لے کر وہ اسٹاک ایکسچینج میں پیسہ جمع کر دیتے ہیں، منظم بازار کے کھاتے میں پیسہ جمع کر دیتے ہیں، اور منظم بازار کے کھاتے سے پیسہ بیچنے والوں کے بروکرس کو مل جاتا ہے اور بیچنے والا بروکر بیچنے والوں کو پیمنٹ کرتا ہے، اس میں سودے خریدار اور مال کے درمیان ڈائریکٹ نہیں ہوتے ہیں، سارے سودے بروکرس کے ذریعہ ہوتے ہیں، تو یہ پانچ دن تک جو سودے ہوتے ہیں اس میں ایسے امکانات کافی رہتے ہیں کہ جن لوگوں نے آج حصص بیچے ہیں اس کی قیمت گر جانے کے بعد وہ فیصلہ کرتے ہیں کہ لاؤ ہم پھر خرید لیں، یا جن لوگوں نے خریدے ہیں اگلے دن بازار میں قیمت بڑھ گئی وہ فیصلہ کرتے ہیں کہ لاؤ بڑھی ہوئی قیمت پہ بیچ دیں، تو اس میں دو قسم کے لوگ ہوتے ہیں، ایک تو خالص سٹے والے ہوتے ہیں، جن کی نیت پوری قیمت ادا کرنے کی نہیں ہوتی، اور نہ مال اٹھانے کی نیت ہوتی ہے، وہ یہی چاہتے ہیں کہ جو ڈیفرنس ہمیں مل جائے وہی ہم لے لیں اور ہم بیچ میں سودا کاٹ دیں، دوسرے اسی طرح کے فروخت کرنیوالے بھی سٹے والے ہوتے ہیں کہ ان کے پاس حصص ہوتے ہی نہیں اور وہ اس امید پہ حصص بیچ دیتے ہیں کہ کل بازار میں قیمتیں گرنے والی ہیں، جب حقیقت میں قیمت گر جائے گی تو ہم واپس اس کو خرید لیں گے، اور اس طرح سے ہمارا سودا برابر ہوگا، ایک طرف ہم نے بیچا تھا دوسری طرف ہم نے خریدا، اب ہمیں صرف ڈیفرنس مل جائے گا، نہ کچھ لینا نہ کچھ دینا، لیکن اکثریت جو ہے ایسے لوگوں کی ہوتی ہے جو کہ فی الواقع قیمت ادا کرنا چاہتے ہیں اور حصص اپنے قبضہ میں لینا چاہتے ہیں، لیکن ان کا بھی نظریہ یہی ہوتا ہے کہ جب بھی قیمت بڑھ جائے گی ہم بیچ دیں گے، اور اگر ایک ہی وقفہ میں قیمت بڑھ جاتی ہے تو پھر ان کو

ضرورت نہیں ہوتی کہ وہ حصص لیں اور اس کی قیمت ادا کریں، بلکہ ان کے دونوں سودے لکھ لئے جاتے ہیں اور ان کا بروکر ان سے صرف ڈیفرنس لے لیتا ہے کہ اب آپ کا کوئی سودا نہیں کھڑا رہا ہے، جو آپ نے خریدے تھے وہ آپ نے بیچ دیئے، آپ نے اتنی اضافی قیمت پہ بیچے، یہ کمیشن کاٹنے کے بعد آپ کو مل گیا، اسی طرح جو آدمی خسارہ کا سودا کرتا ہے وہ بھی ڈیفرنس دے دیتا ہے، تو ایسی صورت میں کیا یہ جائز ہوگا کہ اس طرح Clearing میں ایک ہی وقفہ کے دوران جو ہم نے حصص خریدے ہیں وہ بیچ دیں، جبکہ فی الواقع ہماری نیت یہ تھی کہ ہم وہ حصص خرید کر اپنے پاس رکھیں گے اور جب بھی قیمت بڑھے گی اس کو بیچ دیں گے، اتفاق یہ ہوا کہ قیمت اگلے دن کو بڑھ گئی اسی وقفہ میں بڑھ گئی، اگر یہ قیمت پندرہ دن کے بعد بڑھی ہوتی تو اب ہمیں حصص لینے بھی ہوتے اور اس کی قیمت ادا کرنی ہوتی، اور پندرہ دن کے بعد بیچے ہوتے تب پھر حصص ڈالنے ہوتے اور اس کا واپس پیسہ لینا ہوتا، لیکن چونکہ ایک ہی وقفہ تجارت میں یہ دونوں سودے ہو گئے، اور اس میں مارکیٹ یہ کہتا ہے کہ جب ایک وقفہ تجارت میں ہو گئے تو آپ کو ضرورت نہیں کہ آپ حصص ڈالیں اور اس کی قیمت لیں اور پھر دوبارہ اس کو بیچیں، تو ایک ہی وقت میں وہ سودا پورا ہو جاتا ہے، کچھ وضاحت چاہیں گے اس میں؟

مولانا انیس الرحمن قاسمی صاحب: ...... مال کی جس طرح نوعیت بتائی گئی اس سے سوال پورے طور پر واضح ہو کر سامنے نہیں آیا کہ مسئلہ کیا ہے؟

احسان صاحب: ...... مسئلہ یہ ہے کہ حصص بازار میں سیکڑوں کی تعداد میں بروکر ہوتے ہیں اور ان سیکڑوں بروکرس کے دلال ہوتے ہیں جو کہ سودا کرنے کا حق رکھتے ہیں، وہ اسٹاک ایکسچینج کے ممبر ہوتے ہیں ان کے علاوہ کوئی دوسرا آدمی اس بازار میں سودا نہیں کرسکتا، اب اگر کسی آدمی کو اپنے حصص بیچنے ہیں تو وہ کسی دلال کے پاس جائے گا اور کہے گا کہ میرے حصص آپ بازار میں بیچ دیجئے، جس کو خریدنے ہیں وہ بھی کسی دلال کے پاس جائے گا اور کہے گا کہ میرے لئے اتنے حصص بازار سے خرید دیجئے (ایک دلال دونوں طرف سے ہوسکتا ہے: آواز) نہیں ایک دلال دونوں طرف سے بھی ہوگا تو پھر وہ حصص بازار میں سودا نہیں کرے گا، وہ اپنے کیبن میں بیٹھ کر دونوں کا سودا کردے گا، وہ پھر حصص بازار میں جب سودا ہوگا تو ایک دلال دوسرے دلال سے سودا کرے گا...... اب چونکہ یہ منظم بازار ہے، اس میں جتنے بھی سودے ہوتے ہیں سب لکھے جاتے ہیں، سب کا اندراج ہوتا ہے، اور اس اندراج کے مطابق حوالگی طلب کی جاتی ہے، اور پھر جب حوالگی آجاتی ہے تو ادائیگی طلب کی جاتی ہے، اب یہ حوالگی اور ادائیگی کے جھنجھٹ سے جو دن بھر کا سودے کا ٹائم ہے اس کو بچانے کے لئے کوئی دن مقرر کر لیتے ہیں کہ روزانہ حوالگی نہیں ہوگی اور روزانہ ادائیگی نہیں ہوگی، یہ پانچ دن جو ہیں اس میں آپ سودے کرتے چلے جائیے، جو آپ کو خریدنا ہے خریدیئے جو آپ کو بیچنا ہے بیچ دیجئے، چھٹے دن دیکھیں کہ کن آدمیوں کو کتنا مال حوالے کرنا ہے، اور جب وہ حوالگی آجائے گی تو پھر جن لوگوں نے جن بروکرس نے خریدا ہے ان کے سپرد کردی جائے گی اور کہا جائے گا کہ اس کا پیسہ آپ لائیے، وہ اپنے Client جو ان کے خریدار ہیں ان سے کہیں گے کہ آپ کے شیئرز آگئے ہیں آپ پیسہ دے دیجئے، اور اس کو خریدار بروکر اسٹاک مارکیٹ کے کھاتے میں جمع کردیتے ہیں، تو جو اسٹاک ایکسچینج اتھارٹیز ہیں وہ چیک کاٹ کر ان بروکرس کو دے دیتے ہیں جنہوں نے حوالگی ڈالی تھی، .... وہاں اتنا وقت نہیں ہوتا جو سودے کا ٹائم ہوتا ہے، اس میں صرف سودے ہی ہو رہے ہوتے ہیں اور کوئی کام نہیں ہوتا، حوالگی کا اور ادائیگی کا الگ وقت مقرر رہتا ہے اور اس میں کم سے کم ایک ہفتہ کا وقفہ ضرور رہتا ہے، تو جو ہم نے پیر کے دن حصص بازار میں حصص خریدے اور اس نیت سے خریدے کہ جب بھی تیزی آجائے گی ہم اس کو بیچ دیں گے، اور وہ تیزی اسی وقفہ تجارت میں آگئی، منگل میں آگئی یا بدھ میں آگئی، تو ہم نے دوسرا سودا اس کا کردیا، بیچ دیا، اب ہمارا بروکر کہتا ہے کہ آپ کے نام کوئی سودا نہیں کھڑا ہوا جو آپ نے خریدے تھے، وہ آپ کے بک گئے، لہٰذا نہ آپ کو کوئی قیمت ادا کرنی ہے اور نہ آپ کو شیئرز لینے ہیں نہ دینے ہیں، سودے کا جو فرق ہے وہ آپ کو مل جائے گا، اسی طرح دوسرے شخص نے جو بیچے تھے اس نے واپس خرید لئے اسی وقفہ تجارت میں، اس سے کہہ دیتے ہیں کہ بھئی اگر تمہیں خسارہ ہوا ہے تو تم اپنا خسارہ دیدو، تمہیں ضرورت نہیں کہ شیئرز پہلے ڈالو پھر بعد میں وہی شیئرز واپس لے لو، تو کیا ایسی صورت میں یہ جائز ہوگا کہ ایک ہی وقفہ تجارت میں بغیر حصص لئے ہوئے اور بغیر اس کی قیمت ادا کئے ہوئے صرف سودے کا فرق ہی وصول کرلیا جائے اور دے دیا جائے؟

امین الحسن رضوی صاحب: ...... احسان صاحب مختصراً آپ کا مطلب یہ ہے کہ غائب مال کا سودا ہو رہا ہے، مال نہ ہاتھ میں آرہا ہے......

احسان صاحب: ...... یہ ایک مجبوری ہے، مال بیچنے والے کے پاس مال موجود ہے، ایسا نہیں ہے کہ سرے سے مال موجود ہی نہ ہو، لیکن انتظامیہ نے یہ سہولت رکھی ہے کہ حوالگی روز نہیں ہوگی، ہر سودے کی ہر وقت حوالگی نہیں ہوگی، ایک ہفتہ میں ایک دن حوالگی ہوگی، لہٰذا آپ کے ہاتھ میں جو حصص ہیں آپ

رکھئے جب تک کہ وہ حوالگی کا دن نہیں آ جائے۔

مولانا محمد برہان الدین صاحب:......نہیں مال سے مراد آپ کی مبیع ہے یا وہ حصص ہیں؟ (حصص: احسان صاحب) نہیں مال سے مراد اصل سودا معلوم ہوتا ہے۔ (نہیں مال تو حصص ہے: احسان صاحب)......... لیکن آپ نے نقل نہیں کیا۔

احسان صاحب:...... یہ تو مستقبل بازار کا سودا نہیں ہے، مستقبل بازار میں تو وہ چیز ہمارے پاس ہوتی ہی نہیں ہے، ہم تو اس کو آج ہی حوالہ کرنا چاہتے ہیں، لیکن وہ انتظامیہ کے اصولوں کی وجہ سے ہم مجبور ہیں کہ ہم چھٹے دن اس کو حوالہ کر سکتے ہیں، اس سے پہلے ہم حوالہ ہی نہیں کر سکتے۔

مولانا انیس الرحمن قاسمی صاحب:...... یعنی بیع میں قبضہ نہیں ملا (جی ہاں، قبضہ نہیں ہوا: احسان صاحب)۔

مولانا انیس الرحمن قاسمی صاحب:...... مکمل نہیں ہوا، اور دوبارہ جو آپ نے بیچا وہ اسی آدمی سے بیچا جس سے آپ نے خریدا تھا یا کسی اور فریق سے بیچا؟

احسان صاحب:...... وہ کوئی بھی آدمی ہو سکتا ہے، ایک بات یہ بھی ہونی چاہئے، جو اصل خریدار اور اصل بکوال ہوتے ہیں ان کو دوسرے فریق کا پتہ نہیں ہوتا، وہ صرف اپنے دلال کو جانتے ہیں، ان کا دلال کہتا ہے میں نے بازار میں بیچ دیئے، اس کی ادائیگی کی ذمہ داری میرے اوپر ہے، میں نے XYZ کسی کو بیچ دیا، آپ کو اس سے کوئی مطلب نہیں ہے، آپ مجھے مال دیجئے گا میں آپ کو Payment دوں گا، تو اس میں یہ بھی قابل غور مسئلہ ہے کہ آیا یہاں جس کو دلال کہا جا رہا ہے کہ وہ واقعی دلال ہے بھی یا نہیں، یا وہ خود خریدار ہے، جبکہ دوسرے فریق کا پتہ ہی نہیں ہے یہاں پر۔

مولانا محمد برہان الدین صاحب:...... اس میں ایک نقص اور ہو گیا کہ أن الواحد إذا ولی طرفی شخص، طرفی العقد ایک دونوں کا ذمہ دار بن گیا، یہ بھی اس میں ایک نقص ہے، وہ تو ہے ہی بیع قبل القبض والا قصہ، اور یہ "واحد یتولی طرفی العقد"، پر غور کرنے کی بات ہے۔

احسان صاحب:...... اچھا دلال اپنی کتابوں میں بھی اندراج اسی طرح سے کرتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ جیسے ہم نے رضوی صاحب سے Relience کے ایک سو شیئرز خریدے، اور ہم نے دوسرے دلال کو بیچے، وہ جو ایک پارٹی سے خریدتا ہے وہ دوسرے دلال کو بیچتا ہے، اور اگر ان کے لئے خریدے ہیں تو وہ کہے گا کہ ہم نے رضوی صاحب کو اتنے شیئرز بیچے اور میں نے فلاں دلال سے یہ خریدے، تو اصل جو بیچنے والا حصص کا ہے اس سے یہ دلال بھی ناواقف ہے۔

ایک آواز:...... جس طرح دلال جو دوسرے مشتری کو جانتا ہے، بائع کو بھی جانتا ہے کہ وہ بھی مجہول ہے، شیئرز جس سے خرید رہا ہے اس کو تو جانتا ہے، جس سے بیچا اس کو تو جانتا ہے۔

احسان صاحب:...... ایک شیئرز آپ بازار میں بیچنا چاہتے ہیں، تو آپ کا دلال آپ کو جانتا ہے اور پھر بازار کے دوسرے دلال کو وہ شیئرز بیچ رہا ہے آپ کے حوالے سے اس کو جانتا ہے، اس کا جو خریدار ہے اصل شیئرز کا بیچنے اس کو وہ نہیں جانتا ہے، اس کا تعلق صرف دلال سے ہی رہتا ہے، آپس میں بازار کے اندر دلالوں کا تعلق خریدار اور بکوال کی حیثیت میں ہوتا ہے، ایک دلال دوسرے دلال کو مال بیچتا ہے، اور اسی طرح سے خریدتا ہے۔

ایک آواز:...... بیچنے اور خریدنے والے جانتے نہیں ہیں کس سے بیچ رہے ہیں کس سے خرید رہے ہیں، صرف دلال کو جانتے ہیں۔

احسان صاحب:...... جس دلال کے لئے جو دوسرا دلال ہے وہی خریدار ہے، بیچنے والے تو فلاں صاحب ہیں دلال کی نظر میں، خریدار دوسرا دلال ہے۔

ایک سوال غیر مالیاتی خدمات سے متعلق ہے، (ایک بائع کا وکیل ہوا، ایک مشتری کا وکیل ہوا: ایک آواز) بائع و مشتری کا پتہ تو چلنا چاہئے کہ آپس میں کون ہیں، ان کو پتہ نہیں ہوتا...... ہاں اپنے اپنے کا پتہ ہوتا ہے، دوسرے کا پتہ نہیں ہوتا۔

ایک سوال غیر مالیاتی خدمات سے متعلق ہے کہ مالیاتی ادارہ سے لوگ اکثر تجارتی اسکیمیں بنواتے ہیں، کہتے ہیں کہ ہمیں ٹیزی کی ایک اسکیم بنا کر دیجئے، مالیاتی ادارہ پورا پروجیکٹ اس کا بناتا ہے کہ کتنا آپ اس میں سرمایہ حصص رکھیں گے، کتنا کل سرمایہ درکار ہوگا، مشینری کہاں سے ملے گی، لیبر کے کیا امکانات ہیں، کتنا اس میں خرچ آئے گا، اور کتنا اس میں منافع ہوگا، یہ مکمل اسکیم بنواتے ہیں، اس اسکیم کے اندر ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہ کہتے ہیں سرمایہ حصص اتنا ہوگا، اتنا آپ کو

بینک سے قرض مل سکتا ہے، تو کیا ایسی اسکیم بنا کے اجرت حاصل کرنا جائز ہوگا جس میں کہ بینکوں کا قرض بھی موجود ہو؟ اور عام طور سے یہ مالیاتی ادارے بینکوں سے قرض منظور بھی کراتے ہیں، اسکیم بناتے ہی نہیں ہیں بلکہ اس کو مکمل کراتے ہیں (...... ایک اسکیم بنانے کا ایک قرض دلوانے کا دونوں کو آپ مخلوط کیوں کر رہے ہیں اُس کو الگ رکھئے اور اس کو الگ رکھئے: عبدالعظیم اصلاحی صاحب) ہاں دونوں الگ الگ رکھتے ہیں، صرف پروجیکٹس بھی بکتے ہیں، ایسی بات نہیں ہے پروجیکٹ رپورٹ بھی بکتے ہیں، وہ بھی آپ نے صحیح فرمایا۔

قاضی صاحب:...... میرا خیال یہ ہے کہ اب آپ کی بحث ختم کی جائے، اور Banking کے مسئلہ پر جن باتوں پر کل اتفاق ہوا ان کو لکھ لیا جائے، اور باقی نکات کے بارے میں لکھ دیا جائے کہ یہ اجلاس ہدایت کرتا ہے مجمع الفقہ الاسلامی کو کہ وہ اس سلسلہ میں مخصوص نشست بلائے جو خاص اسی موضوع پر بحث کے لئے ہو، اس میں علماء و محقق بھی رہیں اور جو ان امور کے ماہرین ہیں وہ بھی رہیں، ...... احسان صاحب، کھٹکھٹے صاحب اور رضوی صاحب سے درخواست کی جاتی ہے کہ وہ ایک کمرہ میں بیٹھ کر جن مسائل پر کل اتفاق ہو چکا ہے ان کی فہرست بنا دیں اور باقی جملہ مسائل جو بینکنگ سے متعلق آئے ہیں ان تمام سوالات کو مزید منقح کر کے آئندہ اس سلسلہ میں منعقد ہونے والے کسی خصوصی اجتماع میں پیش کیا جائے، اس پر فیصلہ ابھی ہم لوگ نہیں کریں گے۔

☆☆☆

تجاویز

اسلامی مالیاتی ادارہ اور کمپنیز کے شیئرز

مجمع الفقہ الاسلامی (الہند) کے چھٹے فقہی سمینار میں بینکنگ اور شیئرز سے متعلق بھی کچھ مسائل زیر بحث آئے، اور بحث کے نتیجے میں درج ذیل اتفاقی نقطے سامنے آئے:

۱۔ اسلامی مالیاتی ادارہ کو ریز رو بینک کے حکم کی وجہ سے جبراً اپنے سرمایے کا پانچ فیصد حصہ سرکاری تمسکات میں محفوظ کرنا پڑتا ہے، اس پر حکومت سود بھی دیتی ہے، تو شرکاء سمینار کے نزدیک یہ صورت درست ہے کہ اس محفوظ سرمایہ پر ملنے والے سود کو بتدریج محفوظ سرمایہ بنادیا جائے، اور اصل سرمایہ دھیرے دھیرے نکال لیا جائے۔[1]

۲۔ ایسی کمپنیاں جن کا کاروبار خالص حلال ہے اسلامی مالیاتی ادارہ یا کوئی بھی مسلمان ان کے شیئرز خرید سکتا ہے۔

۳۔ ایسی کمپنیاں جن کا کاروبار خالص حرام ہے، ان کے شیئرز کی خریداری ہرگز جائز نہیں ہے۔

۴۔ بینکنگ و شیئرز کے دوسرے بہت سے مسائل جو کہ سمینار میں پیش کئے گئے، ان کے متعلق یہ سمینار مجمع الفقہ الاسلامی الہند کو یہ ہدایت کرتا ہے کہ وہ ان مسائل کی پورے طور پر تحقیق و تنقیح کے لئے ماہرین وعلماء کا ایک خصوصی اجلاس منعقد کرے، تاکہ وہ غور وخوض کے بعد کسی آخری رائے تک پہنچ سکیں۔

☆☆☆

---

[1] چھٹے فقہی سمینار میں اسلامی مالیاتی ادارہ اور کمپنیز سے متعلق جو سوالات پیش کئے گئے، جو گذشتہ صفحات میں مذکور ہو چکے ہیں، ان کے علاوہ اسلامی بنکنگ سے متعلق بھی پندرہ سوالات پر مشتمل ایک مفصل سوالنامہ کے نکات زیر غور آئے تھے، یہ فیصلہ اسی سوالنامہ کے سوال نمبر ۳ سے متعلق ہے، دیگر سوالات پر فیصلے طے نہیں پاسکے تھے۔

تیسرا حصہ

مرابحہ سے متعلق ایک سوال

ایک شخص روئی کی تجارت کرنا چاہتا ہے، لیکن اس کے پاس روئی خریدنے کے لئے رقم نہیں ہے، وہ رقم حاصل کرنے کے لئے کسی اسلامی بینک سے رجوع کرتا ہے۔ اسلامی بینک ملکی قانون کے تحت تجارت نہیں کرسکتا، وہ ملک کے مرکزی بینک کے ذریعہ طے شدہ شرح سود پر صرف قرض دے سکتا ہے، لہذا اسلامی بینک اس شخص کے سامنے یہ تجویز پیش کرتا ہے کہ بینک زبانی طور پر اسے مرابحہ کے تحت ایک کوئنٹل روئی پر، جس کی بازاری قیمت ۲۰۰۰ روپئے ہے، اپنا منافع (مرکزی بینک کے ذریعہ طے شدہ شرح سود کے عین مطابق) ۴۰ روپئے کا اضافہ کرکے دو ماہ کے لئے ادھار فروخت کرے گا، لیکن ملکی قانون کی پابندی کی مجبوری کے تحت بینک تحریر میں قیمت فروخت کو دو حصوں ۲۰۰۰ روپئے اور ۴۰ روپئے میں تقسیم کرکے بالترتیب دو ماہ کے لئے رقم قرض اور اس پر واجب سود کی شکل میں ظاہر کرے گا۔

کیا ملکی قانون کی پابندی کی مجبوری کے تحت مرابحہ کے معاملہ کو قرض کے معاملہ کی شکل میں تحریری طور سے ظاہر کرنا جائز ہوگا؟

جوابات:

اگر یہ شخص واقعی روئی ہی کی تجارت کرنے پر اور سودی قرض لے کر یہ تجارت کرنے پر مجبور ہے اور غیر سودی قرض نہیں مل رہا ہے تو "یجوز للمحتاج الاستقراض بالربح" (الاشباہ والنظائر) کے شرعی ضابطہ کے تحت حکومت کے مرکزی بینک سے یہ معاملہ کرسکتا ہے، پھر اس کے باوجود اسلامی بینک سے کیوں رجوع کرتا ہے، اور پھر اسلامی بینک بھی واجب سود کی شکل میں ظاہر کرے گا، لہذا پہلے اس تنقیح کی شرعی وجہ و حکم شرعی معلوم کرنے کے لئے واضح کرنا ضروری ہے، بغیر اس کے حکم شرعی منقح نہ ہوگا۔

مفتی نظام الدینؒ دارالعلوم دیوبند...... مرابحہ کی جو شکل پیش کی گئی ہے وہ سود خوری کے لئے حیلہ ہے، اس لئے اس کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔

شمس پیرزادہؒ، ممبئی...... اسلامی بینک ملکی قانون کے تحت تجارت کرنے کا مجاز نہ ہونے کی وجہ سے مرابحہ کے معاملہ کو قرض کی صورت میں ظاہر کرسکتا ہے بشرطیکہ اسلامی بینک روپیہ قرض نہ دے، بلکہ تجارتی سامان خرید کر تجارت کرنے والے کے ہاتھ مرابحۃً فروخت کرے۔

محفوظ الرحمن، جامعہ مفتاح العلوم مئو...... اس کا جواب یہ ہے کہ ایک بعید سی تاویل و توجیہ کرکے اس شکل کے جواز کی گنجائش نظر آتی ہے۔

مولانا محمد برہان الدین سنبھلی...... احقر کے نزدیک یہ جائز صورت ہے، شریعت نے حقیقت واقعہ کا اعتبار کیا ہے نہ کہ اس کا جو خلاف واقعہ تحریر میں آ گیا ہو۔

فتاوی دارالعلوم دیوبند میں فتاوی مہدویہ تکملہ ردالمحتار (۴۵۹/۲) کے حوالہ سے لکھا ہے کہ "العبرۃ للمعانی الواقع لا بما کتب خلاف ذلك (۲۷۵/۶،۵)۔

جب حقیقۃً سودی معاملہ نہیں کیا گیا تو محض قانونی مجبوری سے رقم کو تقسیم کرکے قرض اور سود دکھانا، ناجائز نہیں بنائے گا۔

مرابحہ نقد اور ادھار دونوں طرح جائز ہے، البتہ ادھار کی صورت میں عام طور پر نفع اور بڑھ جاتا ہے۔

''ألا یری أنه یزاد فی الثمن لأجل الأجل'' (ہدایہ ۳،۷۴، باب المرابحة والتولیة)۔

اس معاملہ کی حقیقت شرعیہ صرف یہ ہے کہ اسلامی بینک نے روئی کے خریدار شخص کو ایک کوئنٹل روئی اپنا نفع رکھ کر اور بتا کر ادھار فروخت کی، یہ بلاشک وشبہ جائز ہے، بینک قانونی دشواریوں سے بچنے کے لئے اپنے رجسٹر پر اس کا اندراج خواہ سود ہی کی صورت میں کرے، وہ سود نہیں ہوگا۔ (مفتی جمیل احمد نذیری، مبارکپور)

☆☆☆

چند فقہی معاشی اصطلاحات

ترتیب: مفتی احمد نادر القاسمی

اثمان خلقية:......(قدرتی کرنسی جو پیدائشی طور پر قابل تبادلہ ثمن اور کرنسی ہو) جیسے سونا اور چاندی، اس کو ثمن خلقی کہا جاتا ہے، لوگ اس کے ذریعہ تبادلہ چھوڑ دیں تب بھی اس کی حیثیت اور ثمنیت ہمیشہ کرنسی کی ہی رہے گی۔

اثمان عرفية:......(خود طے کردہ نوٹ اور کرنسی) جیسے سکہ اور کاغذی روپیہ، ڈالر، ریال، یہ وہ کرنسیاں اور ثمن ہیں جو لوگوں کی اصطلاح اور عرف پر مبنی ہیں اور جنہیں لوگوں نے اپنے طور پر قابل تبادلہ ثمن کے مساوی مانا ہے، اسے ثمن عرفی بھی کہا جاتا ہے اور ثمن غیر خلقی بھی۔

اجارة:......(کرایہ داری) کسی چیز کی معلوم منفعت کو طے شدہ رقم یا کسی اور چیز کے بدلہ فروخت کرنا، جیسے مکان، جانور، گاڑی وغیرہ اس کی متعین منفعت کو فروخت کرنا، یا اسے دوسرے کے حوالہ کر کے اس کی اجرت لینا اجارہ کہلاتا ہے۔

إجارة المنافع:......اس کو عربی میں "التأجير التشغيلي" بھی کہتے ہیں، کسی چیز کی منفعت فروخت کرنا، یا کسی چیز کو طے شدہ رقم کے عوض کرایہ پر لگا کر اس کا کرایہ وصول کرنا، "اجارة المنافع" کہلاتا ہے اور اسی کو "بيع المنفعة" بھی کہا جاتا ہے۔

الأجر:......کام کی مزدوری کو "الأجر" یا "الأجرة" کہتے ہیں۔

أجر المثل:......کسی کام کی مناسب اجرت جو اس فن کے ماہرین طے کریں اسے "اجر المثل" کہتے ہیں۔

الاجير الخاص:......وہ شخص جو ایک ہی آدمی کا ایک معلوم مدت تک کام کرتا ہو، اسے اجیر خاص کہتے ہیں۔

الأجير المشترك:......وہ شخص جو کسی متعین شخص کے لئے کام نہ کرتا ہو بلکہ جس کا وہ اجیر ہے اس کا بھی اور دوسرے کا بھی کام کرتا ہو تو وہ اجیر مشترک کہلاتا ہے، جیسے ڈاکٹر، الیکٹریشین، پینٹر وغیرہ۔

الاحتكار:......(کسی چیز کو روکنا)، اصطلاح فقہاء میں ایسے وقت میں محض زیادہ سے زیادہ قیمت میں فروخت کرنے کی غرض سے اپنے سامان کو روکنا اور اسٹاک کرنا، جس وقت لوگوں کو اس کی سخت ضرورت ہو، "احتکار" کہلاتا ہے۔

اموال ربوية:......وہ اموال جن کی خرید و فروخت برابر برابر تو جائز ہو، البتہ کمی اور بیشی کے ساتھ جائز نہیں، انہیں اموال ربویہ کہتے ہیں، جیسے سونا، چاندی، نمک، گندم، جو اور کھجور وغیرہ۔

بائع:......بیچنے والا (فروخت کنندہ)

بدل الخلو:......(پگڑی) مکان یا دوکان خالی کرنے کے عوض جو رقم مالک مکان یا دکان سے لی جاتی ہے اسے "بدل الخلو" کہتے ہیں۔

بيع الاستجرار:......دکاندار سے اپنی ضرورت کے مطابق چیزیں لیتے رہنا، اور ماہ بماہ، یا کوئی متعین مدت کے مطابق بعد میں اس کی قیمت ادا کرنا، فقہ میں "استجرار" کہلاتا ہے۔

بیع اشراك:...... مبیع کے بعض حصہ کو اتنی ہی مقدار کے ثمن کے عوض فروخت کرنا، یہ بیع تولیہ ہی کی طرح ہے، فرق صرف یہ ہے کہ تولیہ میں پورے سامان کو بغیر نفع کے فروخت کیا جاتا ہے اور اشراک میں بعض حصہ کو فروخت کیا جاتا ہے۔ فقہاء اس کی تعبیر یوں کرتے ہیں: "بیع بعض المبیع ببعض الثمن"۔

بیع بالتقسیط:...... خرید و فروخت کا وہ طریقہ جس میں خرید و فروخت کا معاملہ ایک ساتھ ہی طے ہو جاتا ہے اور قیمت بھی طے ہو جاتی ہے اور سامان کی حوالگی بھی اسی وقت ہو جاتی ہے، البتہ قیمت کی ادائیگی قسط وار ہوتی ہے، اسے "بیع بالتقسیط" کہتے ہیں۔

بیع بالحصاۃ:...... تھریا مٹی کے ڈھیلے پھینک کر بیع کرنے کو "بیع بالحصاۃ" کہتے ہیں، اس کی شکل یہ ہوتی ہے کہ خریدار کوئی کپڑا یا پتھر اٹھا کر سامان پر پھینکتا ہے جس سامان پر وہ کپڑا یا پتھر پڑ جائے وہ خریدار کی ملک ہو جاتا ہے اور بغیر کسی غور و فکر اور اختیار کے وہ بیع مکمل ہو جاتی ہے اور خریدار کو سامان کی قیمت ادا کرنی لازم ہوتی ہے، یہ بیع زمانہ جاہلیت میں رائج تھی۔

بیع بالوفاء:...... وفاء، غدر کی ضد ہے، فقہاء کی اصطلاح میں "بیع بالوفاء" وہ بیع ہے جس میں بیچنے والا یہ شرط لگائے کہ جب وہ قیمت واپس کر دے گا تو خریدار بھی سامان اس کے حوالہ کر دے گا۔

بیع تعاطی:...... بغیر ایجاب و قبول کے الفاظ کہے ہوئے، یا صرف ایجاب، یا صرف قبول کے لفظ کے ذریعہ خرید و فروخت کا معاملہ مکمل ہو جائے، بائع چپ چاپ قیمت ادا کر دے، مشتری مبیع حوالہ کر دے اور ثمن قبول کر لے، صرف ظاہری نقل و حرکت اور دلالت حال سے خرید و فروخت مکمل ہو جائے اور جانبین سے قیمت و سامان کا تبادلہ ہو جائے، یہ بیع فقہاء کی اصطلاح میں "معاطاۃ" یا "تعاطی" کہلاتی ہے۔

بیع التلجئة:...... بیچنے والا اور خریدار دونوں خرید و فروخت کے معاملہ کا اظہار کریں مگر باطنی طور پر اسے بیچنا نہ چاہتے ہوں، صرف ظاہری طور پر اس طرح معاملہ کریں کہ دیکھنے والا یہ سمجھے کہ یہ سامان بک چکا ہے، یا بک رہا ہے اور دوسرا آدمی اسے لینے کی کوشش نہ کرے اسے "بیع التلجئة" کہتے ہیں۔

بیع تولیة:...... کوئی سامان جتنی قیمت میں خریدا جائے بغیر قیمت کی کمی و زیادتی کے اتنی ہی قیمت پر فروخت کر دیا جائے اس کو "بیع تولیہ" کہتے ہیں۔

بیع الجنین و الملاقیح:...... جانور کے حمل کی بیع، بالفاظ دیگر جانور کے پیٹ میں موجود بچے کی پیدائش سے پہلے خرید و فروخت کو "بیع الملاقیح" اور "بیع الجنین" کہتے ہیں۔

بیع الحاضر للبادی:...... شہر کے باہر سے بیچنے کی غرض سے سامان لے کر آنے والے کے سامان کو کسی شہری کا یہ کہہ کر اپنے پاس رکوالینا کہ جب قیمت بڑھے گی تب اسے فروخت کریں گے، "بیع الحاضر للبادی" کہلاتا ہے۔

بیع حبل الحبلة:...... حمل کے حمل کی بیع، اس کی شکل یہ ہوتی ہے کہ دو شخص آپس میں بیع اس طرح کریں کہ بائع کہے کہ اس اونٹنی کو جو حمل ہے، جب وہ جنے گی اور جو بچہ ہوگا (مادہ) اس کا جو حمل ہوگا میں اس کو بیچتا ہوں، خریدار اسے قبول کرتا ہے اور اتنے دن انتظار کرتا ہے جب تک وہ بچہ پیدا ہوا اور پھر اس بچے کو بچہ ہو، اسے "بیع حبل الحبلة" کہتے ہیں۔ یہ بیع بھی جاہلیت میں ہوتی تھی۔

بیع الحقوق:...... حقوق دو طرح کے ہوتے ہیں: حقوق مجردہ، اور حقوق غیر مجردہ۔ وہ حقوق جو غیر حسی ہوں اور دیکھنے اور چھونے کے ذریعہ ان کا ادراک نہ ہو، اسے حقوق مجردہ کہتے ہیں، جیسے حق مشورہ، حق تالیف، حق طباعت وغیرہ۔

حقوق جو حسی ہوں اور وہ اپنا مادی وجود رکھتے ہوں انہیں حقوق غیر مجردہ کہتے ہیں، جیسے حق مرور، حق قصاص جو قاتل کی ذات میں ثابت و متعین ہے۔ اسی طرح حقوق کے بہت سے شعبے ہیں، مثلاً: حق حضانت، حق شفعہ، حق زواج، حق ایجاد، حق طباعت، ٹریڈ مارکس وغیرہ ان کی خرید و فروخت کو بیع حقوق کہتے ہیں۔

بیع سلم:...... بیع کی وہ صورت جس میں قیمت پہلے لے لی یا دے دی جاتی ہے اور مبیع (سامان) بعد میں ایک متعین مدت کے اندر خریدار کے حوالہ کیا جاتا ہے، اسے "بیع سلم" کہتے ہیں، زیادہ تر یہ بیع اناج اور غلے میں ہوتی ہے، قیمت پہلے ادا کر دی جاتی اور غلہ فصل کٹنے کے بعد ادا ہوتا ہے۔

بیع صرف:......سونے کی سونے یا سونے کی چاندی سے یا اس کے برعکس سے خرید وفروخت کو "بیع الصرف" کہتے ہیں، دوسرے الفاظ میں اثمان خلقیہ کی آپس میں بیع یا ایک ملک کی کرنسی کی دوسرے ملک کی کرنسی سے تبادلہ اور خرید وفروخت کو "بیع صرف" کہا جاتا ہے۔

بیع عرایا:......درخت پر خوشوں میں موجود کھجور، خوشوں سے الگ کئے ہوئے کھجور کے ساتھ خرید وفروخت کو "بیع العرایا" کہتے ہیں۔

بیع عربون:......لغت میں عربون اعراب سے ماخوذ ہے، خرید وفروخت میں اعراب کی شکل یہ ہوتی ہے کہ خریدار اور بیچنے والے میں سے کوئی ایک کہتا ہے کہ اگر یہ بیع نہیں ہوئی اور میں نے سامان اپنے پاس نہیں رکھا تو اس میں سے اتنی رقم تمہاری ہے۔

اس کی شکل یہ ہوتی ہے کہ خریدار بیچنے والے سے سامان لے لیتا ہے، اور کچھ پیسے بھی دیتا ہے (جسے بیعانہ کہتے ہیں) اور یہ کہتا ہے کہ اگر میں سامان لے لوں اور اپنے پاس رکھ لوں تو اس پیسے کو اس کی قیمت میں شمار کر لینا اور نہیں تو یہ رقم بھی تمہاری اور سامان بھی واپس۔

بیع العقار:......زمین اور پراپرٹی کی خرید وفروخت "بیع الأرض" یا "بیع العقار" کہلاتی ہے۔

بیع الکالی بالکالی:......خرید وفروخت کا وہ معاملہ جس میں سامان بھی ادھار ہو اور قیمت بھی ادھار، اس کو "بیع الکالی بالکالی" اور "بیع الدین بالدین" اور "بیع النسیئہ بالنسیئہ" بھی کہتے ہیں۔

بیع مالم یقبض:...ایسے سامان کی فروختگی، جو اب تک قبضہ میں نہ آیا ہو، خریداری اگر چہ ہوگئی ہو، اسے "بیع مالم یقبض" کہتے ہیں۔

بیع محاقلۃ:...خوشوں میں موجود کھجور یا بالی میں موجود گندم، جو اور چنے وغیرہ کی، تیار کھجور، گندم اور جو کے ساتھ برابر سرابر خرید وفروخت کرنے کو "بیع المحاقلہ" کہتے ہیں۔

بیع المخاضرۃ:......درخت پر پھل آنے یا پھلوں کے استعمال کے لائق ہونے سے پہلے باغات کی بیع کو "بیع المخاضرۃ" یا "بیع الثمر قبل بدوصلاحہ" کہتے ہیں۔

بیع مرابحۃ:......جتنی قیمت میں سامان خریدا تھا اس پر متعینہ نفع کے اضافہ کے ساتھ دوسرے کے ہاتھ اس سامان کے فروخت کرنے کو "مرابحہ" کہتے ہیں۔

بیع مزابنۃ:...درخت پر خوشوں میں لگے کھجور کو خوشوں سے الگ کھجور کے ساتھ انکل یا انداز سے بیع کرنے کو "بیع مزابنہ" کہتے ہیں۔

بیع المزایدۃ:...اس کے معنی زیادہ کرنے کے ہیں، فقہاء کے یہاں بازار میں سامان رکھ کر خریداروں کو جمع کرنا اور جو ان میں زیادہ قیمت لگائے اس کے ہاتھ سامان فروخت کرنا "بیع المزایدۃ" کہلاتا ہے۔

بیع مساومۃ:......خرید وفروخت کا وہ طریقہ جس میں سامان کی اصل قیمت ظاہر کئے بغیر سامان فروخت کیا جائے۔

بیع مسترسل:......کسی شخص سے یہ کہنا کہ یہ سامان آپ اتنی ہی قیمت میں مجھے دیدیجئے جتنی اس وقت اس کی قیمت بازار میں ہے، یا جتنی قیمت میں اور لوگ فروخت کر رہے ہیں، اسے بیع مسترسل کہتے ہیں۔

بیع المصراۃ:......جانور کے تھن میں ایک دو دن تک دودھ چھوڑ دینا اور نہ نکالنا تاکہ تھن دیکھنے میں بڑا اور جانور زیادہ دودھ دینے والا معلوم ہو، اسے "تصریہ" اور تھن میں دودھ چھوڑ کر جانور فروخت کرنا "بیع المصراۃ" کہلاتا ہے۔

بیع المضامین:...وہ نر جانور جس سے مادہ جانوروں کے حاملہ ہونے کے لئے جفتی کا کام لیا جاتا ہے، اس کے پٹھوں میں موجود صلب کی بیع یا جفتی کی بیع کو "بیع المضامین" کہتے ہیں۔

بیع مقایضۃ:......سامان کی بیع سامان کے ذریعہ یعنی ایک قسم کا سامان مبیع ہو، دوسرے قسم کا ثمن، یا سامان کا سامان سے تبادلہ "بیع مقایضہ" کہلاتا ہے۔

بیع ملامسة:......اس کی شکل یہ ہے کہ بائع اور مشتری ایک دوسرے کے کپڑے بغیر کسی غور وفکر کے چھوتے ہیں اور بیع ہوجاتی ہے، یا یہ کہ بائع یا مشتری ایک دوسرے سے کہے کہ میں جب تیرے کپڑے چھودوں تو بیع ہوجائے گی۔

بیع منابذة:...اس کی شکل یہ ہوتی ہے کہ بیچنے والا اور خریدار اپنے اپنے رومال یا کوئی کپڑا ایک دوسرے کی طرف پھینکتے ہیں اور دونوں میں سے کوئی ایک دوسرے کے کپڑے کی طرف نہیں دیکھتے، اور بیع مکمل ہوجاتی ہے، اسے "منابذہ" کہا جاتا ہے۔

بیع نقود:... نقود، اثمان، یا کرنسی کی آپس میں خرید وفروخت کو "بیع نقود" کہتے ہیں۔

بیع وضیعة:... جتنی قیمت کا سامان خریدا گیا تھا اس سے کم قیمت پر فروخت کرنے کو "بیع وضیعہ" کہتے ہیں۔

التأمین التجاری:... کاروباری انشورنس، بحری یا بری ٹرانسپورٹ کے ذریعہ سامان پارسل کرتے وقت یا اس سے پہلے سامان کے ہلاک ہونے، برباد اور غرقاب وغیرہ ہونے کے خوف سے جو سامان کا انشورنس ہوتا ہے، یا کمپنی یا فرم وغیرہ کے قیام کے وقت جو انشورنس ہوتا ہے، اسے "التامین التجاری" کہتے ہیں۔

ثمن:... بیچنے والے اور خریدار کے درمیان کسی سامان کی طے شدہ قیمت۔

حوالة:......کسی چیز کو منتقل کرنے کو کہتے ہیں، فقہاء کی اصطلاح میں قرض کی ادائیگی کی ذمہ داری کسی دوسرے شخص کی جانب منتقل کرنے کو "حوالہ" کہا جاتا ہے، اس کے بھی چار اجزاء ہیں: "محیل" قرض لینے والا، "محتال" قرض دینے والا، "محتال علیہ" قرض کی ادائیگی کی ذمہ داری قبول کرنے والا، یا جس کی جانب یہ ذمہ داری منتقل ہوئی ہے، "محتال بہ" اصل دَین، یا قرضہ جو "حوالہ" کے معاملہ کا باعث ہوتا ہے۔

رأس المال:...اصل سرمایہ (تجارت وغیرہ میں جتنا مال لگا ہوتا ہے) رأس المال کہلاتا ہے۔

ربا:...اس کے معنی زیادتی کے ہیں (سود)۔

ربا استثماری:......ربا استثماری کو ربا انتاجی بھی کہتے ہیں، سرمایہ کاری اور تجارت کی غرض سے جو سودی قرض بینک یا دیگر مالیاتی ادارے سے لئے جاتے ہیں اسے ربا استثماری یا ربا انتاجی کہتے ہیں۔

ربا استہلاکی:...اپنی ذاتی یا گھریلو ضروریات وغیرہ کی وجہ سے جو سودی قرضے لئے جاتے ہیں اسے ربا استہلاکی کہتے ہیں۔

ربا الفضل:......وہ اشیاء جن کو شریعت نے ربوی قرار دیا ہے (مثلاً سونا، چاندی، گندم، جو، نمک اور کھجور) ان کی آپس میں خرید وفروخت میں جو زیادتی ہوگی وہ ربا الفضل ہے، اس لئے کہ ان اشیاء کی بیع صرف برابر سرابر جائز ہے۔

ربا النسیئة:......قرض اور دَین جتنے دن ادھار ہو اس حساب سے دَین اور قرض کی رقم سے زیادہ لینا ربا النسیئہ کہلاتا ہے، یا یوں کہئے کہ جتنے دن قرض ادھار رہے گا اتنی مدت جوڑ کر متعین شرح سے قرض دینے والے کا مقروض سے دَین پر رقم لینا ربا النسیئہ کہلاتا ہے۔

رھن:......کسی چیز کو کسی سبب سے روک لینا "رہن" کہلاتا ہے، یا کسی چیز کو ایسے حق کے عوض گروی رکھنا، جس حق کی کلی یا جزوی طور پر اس کے ذریعہ وصولی ممکن اور یقینی ہو، فقہ کی اصطلاح میں "رہن" ہے، اس کے چار اجزاء ہوتے ہیں: "راہن" سامان گروی رکھنے والا، "مرتہن" جس کے پاس گروی رکھا جائے، یا گروی لینے والا، "مرہون" جو چیز رہن رکھی جارہی ہو، "مرہون بہ" یعنی قرض یا عوض جس کی وجہ سے رہن کا معاملہ ہوا ہے۔

سعر تسعیر:...سامان کی متعین قیمت کو "سعر" کہتے ہیں اور "تسعیر" سامان کی قیمتوں کے متعین کرنے کو کہتے ہیں۔

شرکة:...شرکت کے معنی چند افراد کے کسی چیز میں شریک اور حصہ دار ہونے کے ہیں، یا دو یا اس سے زیادہ حصوں کا اس طرح مل جانا کہ آپس میں تمیز نہ ہوسکے، "شرکت" کہلاتا ہے۔

شرکت صنائع:...اس کو شرکت تقبل بھی کہتے ہیں، یعنی کسی کام میں باہم دو شخص کا شریک ہونا، جیسے دو بڑھئی، یا درزی اس طرح شرکت کا معاہدہ کریں کہ وہ دونوں آدمی کام لیں اور کریں، اور جو آمدنی ہو وہ دونوں اس میں برابر کے شریک ہوں، اس کو شرکت صنائع کہتے ہیں۔

شرکت عنان:......عنان کے معنی کسی چیز سے منہ موڑنے اور پھیرنے کے ہیں، اور اصطلاح فقہ میں چند اشخاص کا اناج، یا دیگر چیزوں کی تجارت میں باہم شریک ہونا "شرکت عنان" ہے، اس کا انعقاد وکالت کے طریقہ پر ہوتا ہے۔

شرکت مفاوضہ:......مفاوضہ کے معنی برابری اور مساوات کے ہیں۔ یعنی دو یا اس سے زائد افراد کا باہم کسی چیز میں شریک ہونا، اور تمام افراد کا مال، تصرف اور دَین میں برابر کا حقدار ہونا "مفاوضہ" کہلاتا ہے۔

شرکت وجوہ:...دو شخص باہم خرید وفروخت میں شرکت کا معاملہ کریں اور کسی کا مال اس میں نہ لگا ہو بلکہ دونوں اپنے اپنے طور پر اپنی شخصیت، امانت اور شہرت وغیرہ کے بل بوتے پر سامان لائیں اور فروخت کریں، اور منافع میں دونوں شریک ہوں۔

عقد:...عقد کے معنی جوڑنے اور کسی چیز کو ایک دوسرے کے ساتھ باندھنے کے ہیں، بیچنے والے اور خریدار کے درمیان خرید وفروخت کے وقت طے پانے والے معاملہ ومعاہدہ کو اسی مناسبت سے عقد کہتے ہیں، جیسے عقد بیع، (بیع کا معاملہ)، اسی طرح عقد نکاح وغیرہ، اسی سے "عاقد" آتا ہے یعنی معاملہ کرنے والا۔

عقد استصناع:...(کسی سے سامان بنوانے کا معاملہ کرنا) اس کی شکل یہ ہوتی ہے کہ کسی خاص سامان تیار کرنے والے سے خاص چیز مثلاً لوہار، ویلڈر وغیرہ سے یہ کہنا کہ آپ فلاں سامان تیار کرکے ہمیں دیں، جو اس کی قیمت ہوگی میں دوں گا، یا اتنا پیسہ آپ کو دوں گا فلاں سامان بنا کر ہمیں آپ دیں، اور دونوں اس پر راضی ہو جائیں اسے "عقد الاستصناع" کہتے ہیں۔

الغرر:...وہ جس کا وجود اور عدم دونوں مشتبہ ہو، یعنی اس طرح کہ وہ چیز ہو بھی سکتی ہے اور نہیں بھی ہو سکتی ہے، اس کو "غرر" کہتے ہیں۔

کفالۃ:.........کسی مطالبہ (Claim) کے معاملہ میں ایک شخص کی ذمہ داری کے ساتھ کسی اور شخص کی ذمہ داری کو ملا دینا "کفالہ" کہلاتا ہے، یہ مطالبہ عام ہے کسی بھی چیز کا ہو سکتا ہے، "ضمانت" کفالہ کے ہم معنی ہے۔

مال خبیث:...ناجائز ذرائع سے کمایا، یا حاصل کیا گیا مال حرام، مال خبیث کہلاتا ہے۔

مال طیب:...حلال طریقہ سے کمایا، یا ملا ہوا حلال مال، مال طیب ہے۔

مبیع:...جو چیز بیچی جارہی ہے (سامان)۔

مجازفۃ:...اندازے اور انکل سے سامان فروخت کرنا۔

مزارعۃ:......کاشتکاری، اور کھیتی میں بٹائی کے معاملہ کو یا بٹائی پر کھیت کسی کو دینے کو "مزارعۃ" کہتے ہیں، جس میں ایک شخص کا کھیت اور دوسرے شخص کی محنت، اور پیداوار میں دونوں شریک ہوتے ہیں، کبھی کبھی بیج محنت کش اور صاحب کھیت دونوں کی طرف سے ہوتی ہے، اور کبھی بیج اور محنت دونوں ایک ہی شخص کی طرف سے۔

مشتری:...خریدنے والا (خریدار)۔

مضاربت:......تجارت اور بزنس میں شرکت اور پارٹنر شپ کا وہ معاملہ جس میں ایک شخص کا پیسہ یا مال اور دوسرے شخص کی محنت ہو اور منافع میں دونوں شریک ہوں، اسے "مضاربت" کہتے ہیں۔

مکایلۃ: کسی خاص قسم کے برتن سے ناپ کر سامان فروخت کرنا "مکایلہ" کہلاتا ہے، جیسے بالو، چونا اور پتھر کی چھوٹی چھوٹی کنکریاں کنستر وغیرہ سے ناپ کر فروخت ہوتے ہیں۔

وکیل:...وہ شخص جو کسی کام میں کسی دوسرے شخص کی طرف سے اس کے سپرد کردہ اختیارات کی بناء پر اس کی نیابت کرتا ہو، اور دوسرے کا کام کر رہا ہو۔

نوٹ: یہ واضح رہے کہ مذکورہ بالا تمام فقہی اور معاشی اصطلاحات کی صرف تشریح کی گئی ہے، حکم شرعی معلوم کرنے کے لئے فقہی کتابوں سے مراجعت کی جائے۔

انگریزی اصطلاحات شیئرز و کمپنی

جمع و ترتیب: صفدر زبیر ندوی

یہ تمام اصطلاحات کو جمع کرنے میں "اسلام اور جدید معیشت و تجارت" از مفتی محمد تقی عثمانی، "شیئرز بازار میں سرمایہ کاری، موجودہ طریقہ کار اور اسلامی نقطہ نظر" از ڈاکٹر عبد العظیم اصلاحی، اور "شرح اصطلاحات بینکاری" از جناب احسان الحق صاحب، ان تینوں کتابوں سے خاص طور سے مدد لی گئی ہے۔

Above Per	جب کوئی شیئر قدر عرفی سے زیادہ قیمت پر بکنے لگے
Accounts Payable	واجب الادا رقومات
Accounts Receivable	واجب الوصول حسابات (رقم)
Active Shares	ایسے حصص جن کی خرید و فروخت کثیر تعداد میں ہوتی ہو
At Per Issue	برابری قیمت پر اجراء
Arbitrage	دو اسٹاک ایکسچینجوں میں قیمتوں کے فرق سے فائدہ اٹھانا
Application Money	درخواست کی رقم
Annual Report	سالانہ رپورٹ
Allotment	شیئرز کی تقسیم یا حصول، شیئرز کی طلب و رسد
Allocation of Resources	وسائل کی تخصیص
Annual General Meeting	عام سالانہ اجتماع
Articles of Association	انتظامی ضوابط
Assets	اثاثے، املاک
Authorised Capital	منظور شدہ سرمایہ، تصریحی سرمایہ
Backwardation	اوندھا بدلہ
Badla Trading (Contango)	بدلہ تجارت
Bad Delivery	عیب دار تمسکات
Balance Sheet	تختہ توازن، کھاتہ، گوشوارہ آمد و خرچ
Barter	سامان کے بدلے سامان کی بیع
Basket of Goods	نوٹ کے پیچھے سونے کے بجائے متفرق اشیاء کا مجموعہ (ثمن عرفی)

Beneficiary	فائدہ اٹھانے والا
Bear Market	قیمت کم ہو جائے تو اس شیئر مارکیٹ کو بیئر مارکیٹ کہتے ہیں
Bearer Share	نام غیر درج شدہ شیئر
Bear	بیئر (ریچھ)۔قیمتیں نیچے لانے والا کاروباری شخص
Bill of Exchange	ہنڈی
Bid Option	خریداری کا حق
Board of Directors	مجلس منتظمہ
Bonds	تمسکات، قرض کی دستاویز
Bonus Shares	بلا قیمت حصص
Boom	ایسی حالت جس میں حصص کی قیمت نیچے چلی جائے
Book Value	کتابی قیمت
Brand	مارکہ
Break Up Value	کمپنی تحلیل ہونے کے بعد ہر شیئر کے مقابلے میں کمپنی کے اثاثوں کا جو حصہ آئے
Broker	شیئر دلال
Brokerage	دلالی کی اجرت
Bull Market	کمپنی کے شیئر کی قیمت بڑھ جائے تو اس شیئر مارکیٹ کو بل مارکیٹ کہتے ہیں
Bull	بل (سانڈ)۔قیمتیں اوپر اٹھانے والا کاروباری شخص
Capital	سرمایہ
Capital Appreciation	افزودنی سرمایہ
Call Option	اختیار بیع وشراء۔فروخت کرنے کا حق
Capital Gain	قیمتوں کے بڑھنے کی وجہ سے جو نفع حاصل ہو
Capitalization	سرمایہ کی بنیاد
Capital Appreciation	سرمایہ کی قدر افزودگی
Capital Market	سرمایہ بازار
Carry Forward	تقدیم
Cahs	نقد

Certificate to commence the Business	
Certificates	سندات
Charter	اجازت نامہ
Clearing House	تصفیہ گھر
Closed End	دربند
Client	معاملہ دار
Commodities Market	وہ منڈی جہاں مال کی خرید وفروخت ہوتی ہے
Contract Order	رقعہ معاہدہ
Collective Interest	اجتماعی مفاد
Collective Property	اجتماعی ملکیت
Commercial Company	تجارتی کمپنی
Commercial Insurance	تجارتی بیمہ
Company Act	کمپنی قوانین
Compensation	تعویض مالی
Consumption of Wealth	صرف دولت
Contract	معاہدہ۔عقد
Convertible Bonds	قابل تبدیل سندات
Convertible Debentures	قابل تبدیل قرض تمسکات
Convertible Shares	قابل تبدیل حصص
Corporate Law Authority	کمپنیوں کی تشکیل کی اجازت دینے والا اوران کوکنٹرول کرنے والا ادارہ
Corporate Stockes	اجتماعی تمسکات
Cost Push Inflation	جب افراط زر اشیاء کی تیاری کے مصارف میں اضافے کی وجہ سے ہو
Competitive Market	مقابلہ جاتی بازار
Creditor	قرض دینے والا
Current Assets	رواں اثاثے
Current Liabilities	رواں ذمہ داریاں

Daily Product Basis	روزانہ پیداوار پر مبنی حساب
Daily Margin	یومیہ حاشیہ
Debentures	قرض تمسکات، قرضے کے رہن کا وثیقہ
Debt Market	قرض بازار
Decreasing Partnership	شرکت متناقصہ
Defence	فرق
Deficit Financing	خساراتی تمویل
Deflation	تفریط زر
Demand Pull Inflation	جب افراط زر اشیاء کی طلب بڑھ جانے کی وجہ سے ہو
Deposits	امانتیں۔ودائع
Determination of Priorities	ترجیحات کا تعین
Direct Expenses	براہ راست فروختگی
Discount	منہا
Discounterq	بٹہ لگانے والا
Distributable Profit	قابل تقسیم منافع
Distribution of Wealth	تقسیم دولت
Distribution of income	آمدنی کی تقسیم
Dividend	منافع قابل تقسیم
Earning Per Share (EPS)	فی حصہ کمائی
Endorsement	کسی دستاویز کے پشت پر مہر تصدیق ثبت کرنا
Enterpreneur	آجر
Equilable Distribution	منصفانہ تقسیم
Euqity Fund	مساوی فنڈ
Equity Shares	مساوی شیئرز (برابری کے حصص)
Equity Capital	شراکتی سرمایہ
Equity Participation	مساوی شرکت

Exchange	تبادلہ
Exchange of Wealth	مبادلہ دولت
Experts	ماہرین
Face Falue, Par Value	متعین لکھی ہوئی قیمت
Factors of Production	عوامل پیداوار
Fictitious Person	فرضی شخص
Fiduciary Money	ایسے نوٹ جس کی پشت پر سو فیصد سونا نہ ہو
Finance Company	سرمایہ کار کمپنی
Financial Leas	اجارہ کی ایک قسم
Financing	سرمایہ فراہم کرنا
Financial Market	اسٹاک ایکسچینج، سرمایہ بازار
Financial Option	مالیاتی اختیار
Fixed Assets	جامد اثاثے
Fixed Deposit	میعادی جمع اسکیم
Floating Loans	رواں قرضے
Forwardation Charge, Contango	اجرت تقدیم
Foreign Loans	بیرونی قرضے
Forward Sale	غائب سودا
Forward Trading	بیع مستقبل
Foreign Investment Institutions (FIIS)	سرمایہ کاری کے بیرونی ادارے
Free Competition	آزاد مقابلہ
Freely Floating Exchange Rate	کرنسی کے ریٹ کو کھلے بازار پر چھوڑ دیا جانا
Ful Margin	اگر درآمد کنندہ لائف انشورنس کھلواتے وقت ہی پوری رقم ادا کر دیتا ہے تو کہتے ہیں کہ فل مارجن پر ایل سی کھلوائی گئی
Fully Convertible	مکمل طور پر قابل تبدیل
Fundamental Analysis	بنیادی تجزیہ

Future Sale	بیع مستقبلیات
Future Financial Market (FFM)	مالیاتی مستقبل بازار
Future Buying	مستقبل خریداری
Future Selling, Shor Position	مستقبل فروخت
General Agreement on Tariff & Trade (GATT)	محصولات وتجارت کا معاہدہ عام
Global Deposit Receipts	عالمی جمع رسید
Gold Bullion Standard	جتنا سونا ہو اتنے ہی نوٹ جاری کیا جانا
Gross profit	اجمالی منافع
Gross Sales	مجموعی فروختگی
Group Insurance	اجتماعی انشورنس
Guarantee	ضمانت
Hedging	نقصان سے تحفظ
Income Statement	مالیاتی وضاحت
Index	اشاریہ
Insider Trading	داخلی تجارت
Inflation	افراط زر
Initial Issue	ابتدائی اجراء
Instruments	دستاویزات
Insurance	بیمہ
Intangible Assets	غیر مادی اثاثے
Interests	سود
Interest Bearing	سود بردار
Interest Bearing Instruments	سودی ذرائع
Internal Loans	داخلی قرضے
Investment	سرمایہ کاری
Investment Trust	سرمایہ کاری کے درمیانی ادارے

Investment Bank	سرمایہ کاری بینک
Investor	سرمایہ کار
Inactive Shares	ایسے حصص جن کا اندراج تو ہوتا ہے لیکن ان کی خرید فروخت کبھی کبھار ہوتی ہے
Irredeemable	نا قابل انفکاک
Issue	اجراء
Issue House	اجراء جدید
Issue at a discount	منہائی پر اجراء
Issue at a Premium	اضافی قیمت پر اجراء
Issue at par	برابری پر اجراء
Issued Capital	جاری کردہ سرمایہ
Islamic Financial Instruments	اسلامی مالیاتی ذرائع
Joint Stock Company	مشترکہ سرمایہ کی کمپنی
Leasing	اجارہ
Legal Person, Juristic Person, Juridical Person	شخص قانونی
Legal Tender	زر قانونی
Legal Entity	قانونی وجود
Lender of the last Resort	آخری چارہ کار کے طور پر قرض دینے والا
Lessee	مستاجر
Lessor	موجر
Letter of Credit	خط اعتماد
Liability	ذمہ داری
Life Insurance	جیون بیمہ
Limited Company	محدود ذمہ داری والی کمپنی
Limited Legal Tender	محدود زر قانونی
Limited Liability	محدود ذمہ داری
Limited Order	ایسا آرڈر جس میں قیمت مقرر کر کے آرڈر دیا جائے

Liquidator	تحلیل کنندہ
Liquidity	نقد پذیری، سیالیت
Listed Companies	جن کمپنیوں کے شیئرز کی خرید و فروخت اسٹاک ایکسچینج میں ہوتی ہے
Listing	درج فہرست
Loan	قرض
Long Term Capital Gain	طویل مدتی سرمایہ نفع
Long Term Credit	طویل المیعاد قرضے
long Term Liabilities	طویل المیعاد ذمہ داریاں
Mandatory Order	وجوبی حکم
Mark up	نفع کی جو شرح طے کی جائے
Market Forces	بازار کی قوت
Market Order	ایسا آرڈر جس میں مارکیٹ ریٹ پر شیئر خریدے جائیں
Market Value	بازاری قیمت
Mercantilism	سوداگری، ملک کی اقتصادی ترقی کے لئے سونا بڑھانا
Merchant Banker	درمیانی واسطہ
Monetary System	نظام زر (نقد)
Monopoly	اجارہ داری
Mortgage	رہن رکھنا
Multinational Company	کثیر قومی کمپنی
Mutual Fund	باہمی فنڈ
Mutual Insurance	باہمی انشورنس
Net Sales	صافی فروختگی
Net Asset Value	خالص قدر اثاثہ
New Issue	اجراء جدید
Net Worth	صافی مالیت
Non Voting Shares	غیر رائے دہی والے حصے

Non Specified Shares	غیر مخصوص حصص
Non Convertible Fund	مبہم جو سرمایہ کا فنڈ
Offer Price	پیشکش قیمت
Offer For Sale	فروخت کی پیشکش
On The Spot	حاضر یا فی الفور سودا
Open End	در کھلا
Operating Leas	اجارہ کی ایک قسم
Options	اختیارات، خاص چیز کو خاص قیمت پر خرید و فروخت کا حق
Origination	بنیادی تیاری
Ordinary Share	معمولی شیئر
Over Head Expenses	روزہ مرہ کی تجارتی ضروریات کے لئے قرض لیا جانا
Over the Counter Transaction	جن شیئرز کا کاروبار اسٹاک ایکسچینج کے توسط کے بغیر ہوتا ہے
Paid_up Capital	ادا شدہ سرمایہ۔ وہ سرمایہ جو شیئر جاری کر کے حاصل کیا جاتا ہے
Partnership	شرکت
Partly Convertible	جزوی طور پر قابل تبدیل
Payment	ادائیگی
Permanent Loans	مستقل قرضے
Port Folio	مختلف مالیاتی رقعہ جات (تمسکات) پر مشتمل سرمایہ کاری کا مجموعہ
Preference Shares	ترجیحی حصص
Premium	شیئر کی قیمت فروخت کا وہ حصہ جو اس کی قدر عرفی سے زائد ہو
Price Index	قیمتوں کا اشاریہ
Price Earning Ratio	قیمت اور کمائی کا تناسب
Price Bond	قیمت کی بندش
Primery Market	ابتدائی بازار
Private Property	ذاتی ملکیت
Private Proprietorship	شخصی کاروبار

Private Sector	نجی شعبہ
Privatization	نج کاری
Private Placement	ذاتی بالواسطہ فروخت
Procedure	کارروائی
Produced Factor of Production	پیدا کردہ عامل پیدائش
Production of Wealth	پیدائش دولت
Profit	نفع
Profit Motive	ذاتی منافع کا محرک
Promoters	ترقی دینے والے (بانی)
Prospectus	کیفیت نما
Promissory Note	معاہداتی دستاویز
Public Company	عوامی کمپنی
Public Issue	اجراء عام، عوامی اجراء
Public Limited Company	محدود ذمہ داری والی عوامی کمپنی
Public Sector	سرکاری شعبہ
Put Option	اختیار بیع
Quality	نوعیت
Quantity	کمیت
Quotation	قیمت کا اظہار
Quick Assets	آسانی کے ساتھ نقد روپے میں تبدیل ہونے والے اثاثے
Quoted Share	وہ حصص جو باضابطہ طور پر فہرست میں درج ہوں اور ان کی قیمت بھی شائع ہوئی ہو
Ratification	قیمت متعین کرنا
Real Value	حقیقی قیمت
Receivable	واجب الوصول
Receiver	تقسیم کنندہ
Redeemable	قابل انفکاک

Refund	رقم کی واپسی
Registered Share	نام درج شدہ شیئر
Rent	کرایہ، لگان
Renouncement	کسی کا اپنے استحقاقی حصص کے حق سے دستبردار ہوجانا
Repurchase Price	واپس خریداری کی قیمت
Reserve	احتیاطی۔ محفوظ فنڈ
Resolution	قرارداد
Restriction	پابندی
Returns	واپسی
Right Share	استحقاقی شیئر
Right Issues	استحقاقی اجراء
Risk	ضمان
Risk Factors	کمپنی کے ممکن خطرات
Row Material	خام مال
Sale on Margin	شیئرز کی ایسی خریداری جس کی قیمت کا کچھ حصہ فی الحال ادا کردیا جائے اور باقی ادھار ہو
Saler	بائع (بیچنے والا)
Sale Before Possession	بیع قبل القبض (قبضہ سے پہلے خرید وفروخت)
Secured	مکفول
Secondary Market	ثانوی بازار
Securities	تمسکات
Securities Market	بازار تمسکات
Securities & Exchange Board of India (SEBI)	سیکورٹیز اینڈ ایکسچینج بورڈ آف انڈیا
Settlement Trading	تصفیہ پر مبنی تجارت
Settlement Price/Made up Price	تصفیہ قیمت
Share	حصہ (جمع حصص) سہم

Share Capital	سرمایہ حصص
Share Holder	حصہ دار
Share Transfer Agent	حصص منتقلی ایجنٹ
Share Certificates	اسناد حصص
Share Market	حصص بازار
Short Sale	بیع غیر مملوک
Short Term Capital Gain	قصیر المیعاد سرمایہ نفع
Short Term Credit	قصیر المیعاد قرضے
Specified Shares	مخصوص شیئرز، پرزور طریقے پر خرید وفروخت کئے جانے والے شیئرز
Speculation	عمل تخمین، سٹہ بازی
Sponsors Capital	کمپنی قائم کرنے والوں کی طرف سے کمپنی میں شامل کی جانے والی رقم
Spot Sale	حاضر سودا
Stock Exchange	بازار حصص
Stop Order	ایسا آرڈر جس میں شیئرز کا مالک اپنے شیئرز کی بیع کا مشروط آرڈر دیتا ہے
Subscribed Capital	اشتراک شدہ سرمایہ، پیشکشی سرمایہ
Subscription	اشتراک
Subsidy	امداد
Supply	رسد
Sub_Broker	ماتحت دلال
Slump	ایسی حالت جس میں حصص کی قیمت نیچے چلی جائے
Take Over Bid	بڑی کمپنی کا کسی درماندہ کمپنی کو اپنے ہاتھ میں لے لینا
Theory of Surplus Value	قدر زائد کا نظریہ
Token Money	ایسے نوٹ جس کی پشت پر سونے یا چاندی کا وجود ضروری نہ ہو
Transfer Certificate	ٹرانسفر سرٹیفیکٹ
Transfer Deed	منتقلی کے دستاویز
Trade Ring	تجارتی دائرہ

Under Writing	کسی ادارہ کا نئی کمپنی کے شیئرز کی ضمانت لینا
Unfunded Loans	قصیر المیعاد قرضے
Unlisted Companies	جن کمپنیوں کے شیئرز اسٹاک ایکسچینج نہیں لیتا ہے، ان کے شیئرز کی خرید وفروخت اوور دی کاؤنٹر ہوسکتی ہے
Unsecured	غیر مکفول
Unloading Charge	فروختنی اجرت
Unit Trust of India	یونٹ ٹرسٹ آف انڈیا
Value At Par	مساوی قیمت عرفی
Venture Capital Fund	مکمل طور پر قابل تبدیل
Voting Shares	رائے دہی والے حصص
Wages	اجرت
Weighted Average	وزن دار اوسط
Working Capital	کاروبار کے رواں اخراجات کے لئے قرض حاصل کیا جانا
Zero Interest	صفر سود
Zero Interest Convertible Debenture	صفر سود مبدل ڈبینچر
Zero Coupon Bond	صفر کوپن بانڈ

☆☆☆

عالم اسلام کے اکابر علمائے کرام کے جدید فقہی مسائل پر مقالہ جات اور مناقشات کا مجموعہ نئی ترتیب کے ساتھ

سلسلہ
جدید فقہی مباحث

خواتین کی ملازمت
اور اسلامی تعلیمات

''سماج میں خواتین کا دائرہ، ملازمت اور کسب معاش کے سلسلہ میں ان کے احکام اور حدود و شرائط، کتاب و سنت اور فقہ اسلامی کی روشنی میں تفصیلی وضاحت پر مشتمل مقالات علماء ہند کے فیصلوں اور مباحثات کا مجموعہ بہ موقع ۱۸واں سمینار منعقدہ مدورائی بتاریخ ۲۔۴ ربیع الاول ۱۴۳۰ھ م ۲۸ فروری تا ۲ مارچ ۲۰۰۹''۔

تحقیقاتِ اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا

زیر سرپرستی

حضرت مولانا مجاہد الاسلام قاسمی

حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی دامت برکاتہم

دارُالاشاعت
اُردو بازار ○ ایم اے جناح روڈ ○ کراچی پاکستان

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

پیش لفظ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں رحمت للعالمین بن کر تشریف لائے، یوں تو کوئی گروہ انسانی ایسا نہیں ہے جو آپ کے سایۂ رحمت سے محروم ہو؛ بلکہ دوسری مخلوقات کے بارے میں بھی آپ نے مشفقانہ سلوک کی تلقین کی اور عملی طور پر رحم دلی اور مہربانی کا برتاؤ فرمایا؛ لیکن آپ کی بعثت کے وقت جو طبقہ زیادہ مظلوم اور ناانصافی کا شکار تھا، اس پر آپ کی نگاہِ رحمت خاص طور پر متوجہ ہوئی، ٹھیک اسی طرح جیسے ماں باپ اپنی اولاد میں سے معذور اور کمزور بچوں کی طرف زیادہ متوجہ ہوتے ہیں، اس سلسلہ میں دو طبقے سرفہرست ہیں: غلام اور عورتیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات اور ہدایات کے نتیجہ میں بتدریج غلامی کی زنجیریں کٹتی گئیں، یہاں تک کہ غلام اور باندی عملاً دنیا سے ناپید ہو گئے۔

عورتوں کو نہ صرف سماجی اعتبار سے ظلم وجور کا شکار بنایا جاتا تھا؛ بلکہ اہل مذاہب اور اصحاب عقل و دانش بھی ان کے متعلق نہایت اہانت آمیز تصورات رکھتے تھے، انہیں گناہ کا دروازہ سمجھا جاتا تھا، انہیں منحوس خیال کیا جاتا تھا، انہیں شیطانی آفت کہا جاتا تھا، ان کے بارے میں یہ بحث جاری تھی کہ ان کے اندر انسانی روح کارفرما ہے یا حیوانی روح؟ جاہلوں نے نہیں، عالموں نے اور نادانوں نے نہیں، عاقلوں نے یہاں تک کہا کہ عورت انسان سے کمتر اور حیوان سے بدتر ایک الگ مخلوق ہے۔

پیغمبر اسلام جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان تصورات کو بدلا اور عورتوں کو عزت کا مقام دیا؛ یہاں تک کہ ماں کے بارے میں فرمایا کہ اس کے قدموں کے نیچے جنت ہے۔

بیوی کے بارے میں ارشاد ہوا کہ اس کے ساتھ بہتر اخلاق وسلوک انسان کے بہتر ہونے کے لیے معیار ہے اور بیٹی کے بارے میں فرمایا گیا کہ جو محبت کے ساتھ اس کی پرورش کرے گا، وہ جنت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہم نشیں رہے گا۔ ان تعلیمات کا اثر یہ ہوا کہ عورتوں کو معاشرہ میں عزت واحترام کا مقام حاصل ہوا اور پوری دنیا میں ان کے تئیں انصاف اور حسن وسلوک کی آواز اٹھنے لگی۔

خواتین کے ساتھ کچھ ایسے فطری عوارض ہیں کہ ان کے لیے کسب معاش کی دوڑ دھوپ مشکل ہے، ہر ماہ انھیں ایک فطری دورانیہ سے گزرنا پڑتا ہے، جس میں اکثر وہ جسمانی اور ذہنی سکون واعتدال سے محروم رہتی ہیں، ماں بننے کے مرحلہ میں، ولادت سے پہلے اور ولادت کے بعد کم وبیش ایک سال وہ جسمانی کمزوری اور متنوع بیماریوں سے دوچار رہتی ہیں، پھر اس کے بعد دو سال انھیں اپنے شیر خوار بچے کو دودھ بھی پلانا ہے اور جب تک بچے شعور وتمیز کے مرحلہ کو نہ پہنچ جائیں وہ ان کی محبت اور توجہ سے مستغنی نہیں ہو سکتے۔ اس کے علاوہ اللہ تعالیٰ نے ان کو مردوں سے زیادہ نرم ونازک اور لطیف بھی بنایا ہے، اور جو چیز لطیف ہوتی ہے وہ کمزور بھی ہوتی ہے۔ اگر گلاب کی پنکھڑی میں لوہے جیسی صلابت آجائے تو اس میں کیا لطافت باقی رہ سکتی ہے؟ اسی لیے فطری طور پر خواتین جسمانی لحاظ سے کمزور ہوتی ہیں اور انہیں محافظ ونگہبان کی ضرورت ہوتی ہے، یہ حفاظتی حصار انہیں بچپن میں باپ کے ذریعہ جوانی میں شوہر کے ذریعہ اور بڑھاپے میں اولاد کے

ذریعہ حاصل ہوتا ہے۔

ان خصوصی حالات کو ملحوظ رکھتے ہوئے شریعت نے خاندانی نظام میں تقسیم کار کا راستہ اختیار کیا ہے، مردوں کو سربراہ خاندان بنایا ہے، کسب معاش کے لیے دوڑ دھوپ اور تگ و دو ان کے ذمہ ہے اور عورتوں کو گھر کی ملکہ بنایا ہے، گھر کا اندرونی نظام ان کی ذمہ داری ہے، لیکن اس تقسیم کو شریعت نے پتھر کی لکیر نہیں بنایا کہ مرد گھر کے کام کاج بالکل نہ کریں اور عورتیں کسب معاش کی سرگرمی میں بالکل حصہ دار نہ بنیں، اس طرح ہمیں اسلامی تعلیمات میں اعتدال اور توازن ملتا ہے، جس میں مردوں اور عورتوں کی صلاحیتوں کو بھی پیش نظر رکھا گیا ہے اور سماجی اور خاندانی ضرورتیں بھی ملحوظ ہیں۔

موجودہ صنعتی عہد میں جب مغربی سماج میں افرادی وسائل کی ضرورت بڑھی تو انہوں نے اپنی صنعت وتجارت کو فروغ دینے کے لیے عورتوں کی ہمدردی کے نام پر انھیں گھروں سے نکالا، پھر چوں کہ کسب معاش کے ساتھ ساتھ ولادت اور بچوں کی پرورش کا کام آسان نہیں تھا؛ اس لیے شرح پیدائش کم ہوتی گئی اور معاشی ترقی کے لیے عورتوں کی مدد ناگزیر ہوگئی۔ حقیقت یہ ہے کہ اس صورتحال نے فائدہ سے زیادہ مغربی سماج کو نقصان پہنچایا ہے، اس کی وجہ سے خاندانی نظام بکھر گیا، اس کی وجہ سے ازدواجی زندگی کا سکون ختم ہوگیا، اس کی وجہ سے بچے ماں کی ممتا سے محروم ہوگئے، اس کی وجہ سے شرح پیدائش کم ہوتی جارہی ہے اور مغرب کی بعض قوموں کے لیے تو یہ خطرہ پیدا ہوگیا ہے کہ کہیں ان کا وجود ہی ختم نہ ہوجائے، اور اس کی وجہ سے طلاق کی شرح میں روز افزوں اضافہ ہورہا ہے اور نکاح کی شرح گھٹتی جارہی ہے؛ اس لیے اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مغربی سماج نے اس تحریک سے پایا کم ہے اور کھویا زیادہ ہے۔

اب گلوبلائزیشن کی وجہ سے صرف مغرب کا سرمایہ ہی مشرقی ملکوں میں نہیں آرہا ہے؛ بلکہ وہاں کی ثقافت اور سماجی اقدار بھی مشرقی ملکوں کو فتح کرنے کی طرف بڑھ رہے ہیں، اسی پس منظر میں اکیڈمی نے اپنے اٹھارہویں فقہی سمینار منعقدہ مدورائی (۲۔ ۴ ربیع الاول ۱۴۳۰ھ مطابق ۲۸ رفروری و یکم و ۲ مارچ ۲۰۰۹ء) میں ایک موضوع ''خواتین کی ملازمت'' کا بھی رکھا تھا، اس سمینار کے لیے ساٹھ سے زیادہ مقالات اصحاب علم کی طرف سے آئے اور موضوع سے متعلق غور وفکر کرتے ہوئے دونوں پہلوؤں کو مدنظر رکھا گیا، اس کو بھی کہ اسلام بنیادی طور پر خواتین کے لیے بیرون خانہ سرگرمیوں کی حوصلہ افزائی نہیں کرتا، اور اس کو بھی کہ اسلام نے خواتین کے لیے کسب معاش کو بالکل منع بھی نہیں کیا ہے اور بعض دفعہ تو خاندان کی کفالت کے لیے عورتوں کا کسب معاش کے لیے نکلنا مجبوری بن جاتا ہے۔

مقالہ نگاروں کے درمیان مسئلہ کے بعض پہلوؤں میں اختلاف رائے بھی تھا؛ لیکن باہمی تبادلۂ خیال کے بعد بالاتفاق تجاویز منظور ہوئیں اور ان تجاویز میں مذکورہ دونوں پہلوؤں کو پیش نظر رکھا گیا۔ امید ہے کہ خواتین کی ملازمت سے متعلق مقالات کا یہ مجموعہ اپنے موضوع پر رہنمائی کے لیے مفید ثابت ہوگا اور اکیڈمی کے دوسرے مجلات کی طرح اسے بھی پذیرائی حاصل ہوگی، عزیز گرامی ہارون رشید ندوی اور فرحان عقیل ندوی (رفیق شعبہ علمی) نے اس کی تصحیح وترتیب کی خدمت انجام دی ہے، دعا ہے کہ اللہ تعالی اسے قبول فرمائے اور امت کے لئے نافع بنائے۔

ربنا تقبل منا إنك أنت السميع العليم۔

خالد سیف اللہ رحمانی (جنرل سکریٹری)

۵/۱۱/۱۴۳۱ھ / ۲۳/۱۲/۲۰۰۹ء

اکیڈمی کا فیصلہ

خواتین کی ملازمت

''اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا'' برصغیر کا ایک ایسا معتبر علمی وفقہی ادارہ ہے، جس کو نہ صرف ہندوستان؛ بلکہ پوری دنیا میں عزت ووقعت اور توقیر کی نظر سے دیکھا جاتا ہے، اکیڈمی عصر حاضر میں پیدا ہونے والے شرعی وفقہی مسائل کو اجتماعی طور پر حل کرنے کے لئے ہر سال فقہی سمینار منعقد کرتی ہے، ان سمیناروں میں کشمیر وآسام سے لے کر کیرالہ اور کنیا کماری تک کے اصحاب افتاء کی بڑی تعداد شریک ہوتی ہے، جو مختلف اہم تعلیم گاہوں اور فقہی مسالک کی نمائندگی کرتے ہیں، اب تک اس کے سترہ سمینار منعقد ہو چکے ہیں، جن میں ۱۷۵/ موضوعات سے جڑے ہوئے چار سو سے زیادہ مسائل پر علماء نے متفقہ طور پر فیصلے کئے ہیں۔

اکیڈمی کا اٹھارہواں سمینار مؤرخہ ۲۔۴/ ربیع الاول ۱۴۳۰ھ مطابق ۲۸ فروری وکیم،۲ مارچ ۲۰۰۹ء کو ریاست تملناڈو کے مشہور تجارتی شہر مدورائی میں ''جامعۃ الریحان'' کے زیر اہتمام منعقد ہوا، جس میں پورے ملک سے تقریباً ڈھائی سو علماء ومفتیان کرام نے شرکت کی، ان کے علاوہ متحدہ عرب امارات، قطر، بحرین اور سری لنکا سے بھی ممتاز علماء شریک ہوئے، اس سمینار میں موجودہ عالمی اور سماجی حالات و ضرورتوں کے پس منظر میں چار موضوعات پر بحث ہوئی اور باتفاق رائے تجاویز منظور کی گئیں، یہ تجاویز حسب ذیل ہیں:

۱۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ اسلام خاندانی نظام کے استحکام کو بڑی اہمیت دیتا ہے؛ چنانچہ اس مقصد کے پیش نظر اس نے مردوں وعورتوں کی ذمہ داریوں میں تقسیم کار سے کام لیا ہے کہ گھر سے باہر کی ذمہ داریاں ۔۔۔ جن میں کسب معاش کی تگ ودو بھی داخل ہے ۔۔۔ مردوں سے متعلق ہوں گی اور گھر کے اندر کے امور عورتوں سے متعلق ہوں گے، یہ وہ بہترین تقسیم کار ہے، جو مسلم معاشرہ میں آج بھی بڑی حد تک خاندانی استحکام کو باقی رکھے ہوئے ہے؛ اسلئے کسب معاش بنیادی طور پر مردوں کی ذمہ داری ہے نہ کہ عورتوں کی، عورتوں کو بلاضرورت آزادی وترقی کے نام پر کسبِ معاش کے لئے مجبور کرنا ایک سماجی ظلم ہے، کہ عورتیں بچوں کی پرورش ونگہداشت اور امور خانہ داری وغیرہ بھی انجام دیں اور اس دوڑ دھوپ میں بھی مردوں کی شریک ہوں۔

۲۔ عام حالات میں شریعت نے خواتین پر کسب معاش کی ذمہ داری نہیں رکھی ہے؛ لیکن شرعی حدود میں رہتے ہوئے ان کے لئے کسب معاش مباح ہے۔

۳۔ شریعت نے اصولی طور پر خواتین پر نفقہ کی ذمہ داری نہیں رکھی ہے؛ البتہ بعض حالات میں ان پر نفقہ کی ذمہ داری عائد کی گئی ہے۔

۴۔ شرعی حدود وشرائط کا پورا پورا لحاظ کرتے ہوئے عورت کے لئے معاشی جدوجہد جائز ہے۔

۵۔ عورت کے لئے اندرون خانہ کسب معاش کی کوئی صورت اختیار کرنے کی اجازت ہے؛ بشرطیکہ اس سے شوہر اور بچوں کے حقوق متاثر نہ ہوں۔

۶۔ (الف) شوہر یا ولی اگر عورت کی کفالت کررہے ہوں، تو عورت کے لئے کسبِ معاش کی غرض سے گھر سے باہر جانے کے لئے ان کی

اجازت ضروری ہے، خواہ وہ جگہ مسافت سفر سے کم ہو یا اس سے زیادہ۔

(ب) رات میں کسب معاش کی خاطر عورت کے باہر نکلنے کے لئے شوہر یا محرم کا ساتھ ہونا ضروری ہے۔

۷۔ خواتین کسب معاش کے لئے گھر سے باہر نکلیں تو درج ذیل امور کا لحاظ رکھنا ضروری ہے:

(الف) ولی یا شوہر کی اجازت شامل ہو، سوائے اس کے کہ ولی یا شوہر نفقہ نہ دیتا ہو اور اس کے لئے خود کسب معاش کے سوا کوئی چارہ نہ ہو۔

(ب) شرعی پردہ کی مکمل رعایت ہو۔

(ج) لباس مردوں کے لئے باعث کشش نہ ہو۔

(د) خوشبو کے استعمال سے پرہیز ہو۔

(ھ) مردوں سے اختلاط بالکل نہ ہو۔

(و) اجنبی مرد کے ساتھ تنہائی کی نوبت نہ آئے۔

(ز) شوہر اور بچوں کے حقوق سے بے اعتنائی نہ ہو۔

۸۔ ملازمت کرنے والی خواتین ایسے اداروں میں کام کریں، جہاں خواتین ہی خدمت انجام دیتی ہوں؛ لیکن ادارہ کے ذمہ دار مرد ہوں، تو اس صورت میں ضروری ہوگا کہ ادارہ کا کوئی مرد تنہائی میں کسی خاتون کارکن سے بات نہ کرے، اگر ذمہ دار مردوں کے ساتھ تبادلہ خیال کی ضرورت ہو تو خواتین پردہ کے اہتمام کے ساتھ بیٹھیں، اپنی آواز میں لوچ سے پرہیز کریں، اسی طرح خواتین کارکن ذمہ دار مردوں کے ساتھ ہنسی مذاق اور بے تکلفی کا ماحول ہرگز نہ بنائیں۔

۹۔ جوان عورتوں کے لئے ایسے اداروں میں کام کرنا جائز نہیں، جہاں ان کے ساتھ مرد کارکن بھی شریک کار ہوں۔

۱۰۔ ملازمت کی غرض سے عورت کا اپنے گھر اور اپنے اقارب سے دور تنہا مستقل قیام کرنا جائز نہیں، اگر کسی عورت کے ساتھ بہت مجبوری ہو تو پھر وہ مفتی سے رابطہ کر کے اپنی مشکل کا حل تلاش کر سکتی ہے۔

۱۱۔ سمینار حکومت سے مطالبہ کرتا ہے کہ خواتین کے لئے رات کی ڈیوٹی کو ممنوع قرار دیا جائے؛ کیوں کہ رات کے وقت ڈیوٹی کے لئے جائے ملازمت تک جانا یا جائے ملازمت پر قیام کرنا ان کی جان و ناموس کے تحفظ کے لئے خطرہ ہے اور یہ ہمارے ملک کے معاشرتی اقدار کے بھی مغائر ہے۔

۱۲۔ سمینار حکومت، تعلیمی و رفاہی اداروں اور خاص کر مسلمان انتظامیہ سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ لڑکیوں کی تعلیم کے لئے الگ درسگاہیں اور خواتین کے لئے الگ ہسپتال، اسی طرح شعبہ ہائے زندگی میں عورتوں کے لئے علاحدہ کاؤنٹرز قائم کریں؛ تاکہ خواتین اور لڑکیاں پاکیزہ اخلاقی ماحول میں تعلیم وعلاج وغیرہ کی خدمات سے فائدہ اٹھا سکیں اور ضرورت مند خواتین کے لئے روزگار کے مواقع بھی بڑھیں۔

☆☆☆

سوالنامہ

خواتین کی ملازمت

یہ بات ظاہر ہے کہ اسلام نے خاندانی زندگی کے نظام کی بنیاد اس پر رکھی ہے کہ مرد باہر کے کام کرے اور خواتین امور خانہ داری کو انجام دیں، یہ یقیناً فطری اصول ہے، جو مردوں کے لئے بھی رحمت ہے اور عورتوں کے لئے بھی، نیز اس میں خاندانی نظام کی بقا و استحکام ہے، تاہم اس میں بھی شبہ نہیں کہ شرعی حدود میں رہتے ہوئے شادی سے پہلے ولی اور شادی کے بعد شوہر کی اجازت سے عورتوں کے لئے کسب معاش کی گنجائش ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کے عہد میں اس کی نظیریں ملتی ہیں۔

موجودہ دور میں مغرب میں خواتین کے کسب معاش میں آنے کا رجحان خاصا بڑھ گیا ہے، اور مادی ذہن وفکر کے غلبہ کی وجہ سے زیادہ سے زیادہ کمانے کے جذبہ نے اس رجحان کو تقویت پہنچائی ہے، اب چونکہ ہندوستان میں بھی خواتین کی تعلیم کی طرف توجہ بڑھی ہے، بلکہ بہت سی ریاستوں میں امتحانات کے نتائج میں لڑکیاں لڑکوں سے فائق ہوتی ہیں، اور تعلیم انسان کے لئے ملازمت کے مواقع پیدا کرتی ہے، اس لئے خواتین میں ملازمت کا رجحان یہاں بھی بڑھ رہا ہے، برادران وطن میں تو اس کا رجحان ہے ہی، مسلمان خواتین بھی اب اس میدان میں آگے بڑھ رہی ہیں، اس کا سبب جہاں زیادہ سے زیادہ کمانے کا جذبہ ہے، وہیں مسلمانوں کی معاشی پسماندگی اور بڑھتی ہوئی ضروریات بھی ایک سبب ہے، خاص کر جب کوئی عورت بیوہ یا مطلقہ ہو یا اس کا شوہر بے روزگار اور کاہل ہو تو اس وقت آبرومندانہ زندگی گذارنے کے لئے عورت خود کسب معاش پر مجبور ہو جاتی ہے۔

اس پس منظر میں درج ذیل سوالات ابھرتے ہیں جن پر روشنی ڈالنے کی ضرورت ہے:

۱۔ شریعت اسلامی خواتین کے لئے کسب معاش کو کس نظر سے دیکھتی ہے؟

۲۔ کیا شریعت نے خواتین پر بھی نان ونفقہ کی ذمہ داری رکھی ہے؟ (خواہ اپنا نفقہ ہو یا بچوں وغیرہ کا)

۳۔ محض معیار زندگی کو بلند کرنے یا وقت گذاری اور سرمایہ واثاثہ پیدا کرنے کی غرض سے عورتوں کے لئے معاشی جدوجہد اختیار کرنے کا کیا حکم ہے؟ جبکہ گھر کی مالی حالت ایسی ہے کہ جس میں تنگی وترشی سے کام چل سکتا ہے اور چلتا ہے۔

۴۔ خواتین کے لئے کسب معاش کی کوئی صورت اختیار کرنے میں کیا اس وقت بھی جبکہ وہ اندرون خانہ ہی اپنی معاشی سرگرمیوں کو محدود رکھیں اپنے ولی یا شوہر سے اجازت لینا ضروری ہوگا؟

۵۔ اگر عورت کو کسب معاش کے لئے گھر سے باہر نکلنا پڑے تو کیا اس کے لئے ولی یا شوہر کی اجازت ضروری ہوگی؟ گھر سے نکلنا مسافت سفر یا اس سے زیادہ کے لئے ہو یا اس سے کم کے لئے، دن کے وقت ہو یا رات کے وقت، ولی اس خاتون کی کفالت کرتا ہو یا نہ کرتا ہو، ان صورتوں میں حکم شرعی کے اعتبار سے کچھ فرق بھی ہوگا؟

۶۔ خواتین کے لئے ملازمت کے سلسلہ میں شرعی حدود کیا ہیں؟

۷۔ ملازمت کرنے والی خواتین اگر ایسے اداروں میں کام کریں (خواہ تعلیمی ادارے ہوں یا دوسرے) جہاں خواتین ہی خدمت انجام دیتی ہوں اور کام کی جگہوں میں مرد نہ ہوتے ہوں البتہ ادارہ کے ذمہ دار مرد ہوں تو اس صورت میں پردہ کے کیا احکام ہوں گے؟

۸۔ اگر عورت ایسی جگہ کام کرے جہاں مرد کارکن بھی ہوں تو اس وقت خاتون کارکنوں کے لئے پردہ کی کیا حدود ہوں گی؟ اس سلسلہ میں کیا سن رسیدہ خواتین اور جوان عورتوں کے درمیان فرق ہوگا؟

۹۔ کیا اس کا بھی فرق ہوسکتا ہے کہ ایک کام کی انجام دہی میں عورت کا سامنا مردوں سے بہت زیادہ اور دوسرے کام کی انجام دہی میں کم ہے مثلاً دوکان میں سیلز مین اور آفس میں یکسوئی سے بیٹھ کر کام کرنے میں فرق ہوسکتا ہے؟

۱۰۔ ملازمت کی غرض سے عورت کا اپنے گھر اور اپنوں سے دور (خواہ اندرون ملک ہو یا بیرون ملک) مستقل قیام کا کیا حکم ہے؟

☆☆☆

تلخیص مقالات:

خواتین کی ملازمت

ہارون رشید ندوی[1]

اسلامک فقہ اکیڈمی کے اٹھارہویں فقہی سمینار منعقدہ مدورائی، تامل ناڈو کے لئے جن موضوعات کا انتخاب کیا گیا ہے، ان میں سے ایک اہم موضوع ''خواتین کی ملازمت'' بھی ہے۔

ہندو بیرون ہند کے علماء وفضلاء نے اس موضوع کو اپنی بحث وتحقیق میں شامل کیا اور اس سے متعلق جاری سوالنامہ کے جوابات ارسال کئے۔

تادم تحریر تقریباً ۵۳ مقالات اکیڈمی کو موصول ہوئے، جن کے اسماء گرامی حسب ذیل ہیں:

مولانا محمد شاہجہاں ندوی، حافظ شیخ کلیم اللہ عمری، مفتی سید باقر ارشد قاسمی، مولانا محمد سلمان کھلی، مولانا ابوسفیان مفتاحی، مولانا محمد فاروق، ڈاکٹر ظفر الاسلام، مولانا لطیف الرحمن فلاحی، مفتی محبوب علی وجیہی، مولانا عبید اللہ ندوی، مفتی عبدالرحیم قاسمی، مولانا محمد ارشد مدنی، مولانا افتخار احمد مفتاحی، مولانا عبداللہ خالد، مفتی عبدالاحد فلاحی، مولانا یاسر اعظمی قاسمی، مولانا مبارک حسین ندوی، مولانا اقبال احمد قاسمی، قاضی محمد ہارون مینگل پاکستان، مولانا اسرار الحق قاسمی، مولانا مصطفی قاسمی، مولانا عبدالحیٔ مفتاحی، مولانا خورشید احمد اعظمی، مولانا اشتیاق احمد اعظمی، مولانا شوکت ثناء قاسمی، مفتی انور علی اعظمی، مولانا عطاء اللہ قاسمی، مولانا محفوظ الرحمن قاسمی، مولانا عبدالتواب اناوی، مولانا شمس الدین مظاہری، مولانا عبدالرشید قاسمی، مولانا صبیح اختر قاسمی، مفتی محمد جعفر ملی رحمانی، مفتی اقبال ٹنکاروی، مولانا عارف باللہ قاسمی، مولانا محمد ارشاد قاسمی، مفتی شیر علی گجراتی، مفتی ثناء الہدی قاسمی، مولانا سید حسین احمد، مولانا سلطان احمد اصلاحی، مفتی جمیل احمد نذیری، مولانا ذکاء اللہ شبلی، مولانا فضیل الرحمن ہلال عثمانی، مولانا اختر امام عادل، مولانا ریاض احمد قاسمی، مولانا محمد صادق مبارکپوری، مفتی تنظیم عالم قاسمی، مولانا ابوبکر قاسمی، مفتی سراج احمد ملی، مولانا محمد اشرف عباس قاسمی، مولانا بدر احمد مجیبی، مولانا نور الحق رحمانی، ڈاکٹر محمد زحیلی (جامعۃ الشارقہ)، ڈاکٹر اسماعیل کاظم عیساوی (متحدہ عرب امارات)۔

موضوع سے متعلق اکیڈمی نے دس سوالات جاری کئے، تمام سوالوں کے جوابات اوران سے متعلق آراء ودلائل بالترتیب پیش کئے جاتے ہیں:

۱۔ شریعت اسلامی خواتین کے لئے کسب معاش کو کس نظر سے دیکھتی ہے؟

اس سوال کے جواب میں بیشتر مقالہ نگار حضرات نے کہا ہے کہ اصولی اعتبار سے عورتوں کو ''قرار فی البیت'' پر عمل کرنا چاہئے، ان کا حقیقی دائرہ کار امور خانہ داری، شوہر اور بچوں کی دیکھ ریکھ اور گھریلو مصروفیات ہونی چاہئیں، کیونکہ اصلاً مرد حضرات عورتوں کے کفیل اور نگراں ہوتے ہیں۔ ''الرجال قوامون علی النساء بما فضل اللہ بعضھم علی بعض وبما أنفقوا من أموالھم''، لہذا کوشش یہ ہو کہ مرد گھر کے باہر کی ذمہ داریوں کو ادا کرے اور عورت گھر کے اندر کے فرائض وواجبات میں مشغول ہو۔

لیکن اکثر حضرات نے عورتوں کے لئے کسب معاش کو بحالت اضطرار ومجبوری جائز قرار دیا ہے، کہ اسلامی اخلاق وکردار کی مکمل پاسداری کے ساتھ اور شوہر کی اجازت سے خواتین کسب معاش میں حصہ لے سکتی ہیں، شرعی حدود میں رہتے ہوئے شادی سے پہلے ولی اور شادی کے بعد شوہر کی اجازت سے عورتوں کے لئے کسب معاش کی گنجائش ہوگی، حتی کہ وہ اجرت پر دودھ پلانے کا کام بھی کرسکتی ہیں۔ ''فإن أرضعن لکم فأتوھن أجورھن''، حضرت شعیب علیہ السلام کی بچیوں کا حضرت اسماء بنت ابوبکر اور حضرت زینبؓ کا کام کرنا ثابت ہے (مقالہ: مولانا ثناء الہدی قاسمی، مولانا فضیل الرحمن ہلال عثمانی، مولانا ارشد مدنی)۔

خواتین گھر کے اندر رہ کر سلائی، دستکاری یا ایسی اشیاء جو گھر میں تیار کر کے فروخت کی جاتی ہوں ان ذرائع سے عورت کسب معاش اختیار کرسکتی ہے (مقالہ: مفتی سید باقر ارشد قاسمی)۔

---

[1] رفیق اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا۔

خواتین کے لئے بہتر ہے کہ وہ ملازمت سے دور رہیں، کیونکہ شرعاً کمانا وغیرہ عورتوں کی ذمہ داریوں سے الگ ہے، بلا ضرورت اگر اس کو رواج دیا جائے گا تو پھر خلوت وجلوت اور اختلاط باہمی کے نتیجہ میں بے شمار مفاسد جنم لیں گے اور بے حیائی کا رواج عام ہوگا (مقالہ: مولانا ابوسفیان مفتاحی، مولانا مبارک حسین ندوی، مولانا محمد فاروق، مولانا عبداللہ خالد، مولانا عطاء اللہ قاسمی، مولانا اقبال احمد قاسمی)۔

محض اضطرار ومجبوری کی صورت میں عورتیں کسب معاش اختیار کرسکتی ہیں (مقالہ: مولانا شاہجہاں ندوی، مولانا عبدالرحیم قاسمی، مفتی عبدالاحد فلاحی، مولانا لطیف الرحمن، مفتی محبوب علی وجیہی، مولانا یاسر اعظمی، مولانا عارف باللہ قاسمی)۔

مولانا مصطفی قاسمی صاحب نے کہا کہ شریعت اسلامی خواتین کے لئے کسب معاش کو جائز قرار دیتی ہے اور خیر کی نگاہ سے دیکھتی ہے۔

مولانا بدر احمد مجیبی صاحب لکھتے ہیں کہ شریعت کے نزدیک کسب معاش خواتین کے لئے مباح ہے، لیکن عام حالات میں جب کوئی ضرورت نہ ہو، خواتین کے لئے کسب معاش کو شریعت پسندیدہ نگاہ سے نہیں دیکھتی ہے، کیونکہ اس کے لئے گھروں سے باہر نکلنا پڑے گا، غیر محرموں کے سامنے جانا ہوگا، ان سے روابط و تعلقات ہوں گے جن سے ہزار پردہ واحتیاط کے باوجود بڑے مفاسد کا قوی اندیشہ ہے۔

ڈاکٹر وہبہ زحیلی صاحب رقم طراز ہیں: ضرورتاً عورتوں کا گھر کے باہر کام میں مشغول ہونے کا ثبوت سنت نبویہ سے ملتا ہے، اسلامی تاریخ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ عورتیں مردوں کے ساتھ گھر کے باہر کے امور انجام دیا کرتی تھیں اور یہ ان کا بنیادی حق ہے، ہاں وہ امور وکام جو مردوں کے ساتھ خاص ہوں وہ مستثنیٰ ہیں۔

ڈاکٹر اسماعیل کاظم عیساوی صاحب کے مطابق: شوہر اگر روزی کمانے سے لاچار ہو، عورت کا شرعی حق دینے سے قاصر ہو تو عورت اپنے دین وایمان کے تحفظات کو بجالاتے ہوئے کسب معاش پر قانع ہوسکتی ہے، اگر مطلق عورتوں کو بازاروں میں نکلنے اور کمانے کی اجازت دی جائے گی تو نوجوانوں کے فطری جذبات برانگیختہ ہوں گے اور جس کے نتیجہ میں فساد وانتشار اور جرم وبرائی کا رواج عام ہوگا۔

جبکہ مولانا سلطان احمد اصلاحی صاحب کے الفاظ میں: ''للرجال نصيب مما اكتسبوا وللنساء نصيب مما اكتسبن'' کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح مرد کو کمائی کا حق ہے بالکل اسی طرح عورت کو بھی کمائی کرنے کا حق حاصل ہے اور اسے اپنے اس حق کو استعمال کرنا چاہئے، تاریخ میں بھی اس کا ثبوت فراہم ہے، حضرت خدیجہؓ کپڑے کی بڑی تاجرہ تھیں، ازواج مطہرات میں بہت سی کی اپنی الگ ذریعہ آمدنی تھی، جس کی وجہ سے وہ امور خیر میں دل کھول کر خرچ کیا کرتی تھیں، موجودہ دور میں خواتین کے اس کردار کو توجہ دینے کی ضرورت ہے، مسلم مردوں کے ساتھ جب تک خواتین کسب معاش نہ اختیار کریں معاشی حالت مستحکم نہیں ہوسکتی۔

مقالہ نگار حضرات نے مندرجہ ذیل نصوص وعبارات کو بطور دلائل پیش کیا ہے۔

* ''وقرن في بيوتكن ولا تبرجن تبرج الجاهلية الأولى''۔

* ''اسكنوهن من حيث سكنتم من وجدكم ولا تضاروهن لتضيقوا عليهن، وإن كن أولات حمل فأنفقوا عليهن حتى يضعن حملهن''۔

* ''الرجال قوامون على النساء بما فضل الله بعضهم على بعض وبما أنفقوا من أموالهم''۔

* ''لينفق ذوسعة من سعته ومن قدر عليه رزقه فلينفق مما آتاه الله''۔

* ''للرجال نصيب مما اكتسبوا وللنساء نصيب مما اكتسبن''۔

* ''المرأة راعية على بيت زوجها وهي مسئولة عنها'' (بخاری)۔

* ''ما حق زوجة أحدنا عليه، قال: أن تطعمها إذا طعمت وتكسوها إذا اكتسيت''۔

* ''إنه قد أذن لكن أن تخرجن لحاجتكن'' (مسلم)۔

* ''ليس للنساء نصيب في الخروج إلا مضطرة'' (الطبری)۔

*''عن جابر قال: طلقت خالته فأرادت أن تخرج إلى نخل لها فلقيت رجلاً فنهاها فجاء ت رسول الله ﷺ فقال: اخرجي فجدي نخلك لعلك أن تصدق و تفعلي معروفاً'' (نسائی)۔

*''فلسفة الإسلام في أن البنت والمرأة بوجه عام لا يصح أن تكلف بالعمل لتنفق على نفسها بل على أبيها أو زوجها أو أخيها مثلاً أن يقوم بالإنفاق عليها لتتفرغ لحياة الزوجية والأمومة'' (المرأة بين الفقه والقانون)۔

*''والأساس الذي وضعه الإسلام للتعامل بين الزوجين و تنظيم الحياة بينهما هو أساس فطري فالرجل أقدر على العمل والكد والكسب خارج المنزل والمرأة أقدر على تدبير المنزل و تربية الأولاد وتيسير أسباب الراحة لبيتة والطمانينة المنزلية... وقد حكم رسول الله ﷺ بين علي ؓ بن أبي طالب و بين زوجة فاطمة ؓ فجعل على فاطمة خدمة البيت وجعل علي على العمل والكسب'' (فقه السنه)۔

*''إن النساء مامورات بلزوم البيت منهيات عن الخروج'' (احكام القرآن)۔

*''لا تكلف المرأة الاكتساب للإنفاق على نفسها أو على غيرها وتكون نفقتها إن كانت فقيرة واجبة على غيرها سواء كانت متزوجة أم ليست بذات زوج'' (موسوعه فقهيه)۔

*''الغرض من المرأة كونها منتفرشة آتية بالولد مدبرة لحوائج البيت وغير ذلك'' (نور الانوار)۔

*''إن المرأة محبوسة بحبس النكاح حقاً للزوج ممنوعة عن الاكتساب بحقه فكان نفع حبسها عائداً إليه فكانت كفايتها عليه كقوله ﷺ: ''الخراج بالضمان'' ولأنها إذا كانت محبوسة بحبسه ممنوعة عن الخروج للكسب بحقه فلولم يكن كفايتها عليه لهلكت'' (بدائع الصنائع)۔

۲۔ کیا شریعت نے خواتین پر بھی نان ونفقہ کی ذمہ داری رکھی ہے (خواہ اپنا نفقہ ہو یا بچوں کا):

بعض حضرات کے مطابق نان ونفقہ کی ذمہ داریوں سے خواتین مطلق بری الذمہ ہیں (دیکھئے مقالہ: شیخ کلیم اللہ عمری، مولانا عبید اللہ ندوی، مولانا ارشد مدنی، مولانا عبد الاحد فلاحی، مولانا اقبال احمد قاسمی، مولانا شمس الدین مظاہری، مولانا جعفر ملی، مولانا یاسر اعظمی، مولانا خورشید اعظمی، مولانا شوکت ثناء قاسمی، مولانا اقبال ٹنکاروی وغیرہ)۔

جبکہ بعض حضرات نے اس ذمہ داری کو مقید رکھا ہے کہ اگر شوہر تنگ دست ہو، کاہل ہو، کماتا نہ ہو، آوارہ و بدمعاش ہو، یا شوہر کا انتقال ہو چکا ہو اور بچے چھوٹے ہوں، گھر میں کوئی اور دوسرا ولی یا محرم کمانے والا نہ ہو تو بحالت مجبوری خواتین کا اپنا اور اپنے بچوں کا نفقہ خود ان کے ذمہ ہوگا (دیکھئے مقالہ: مفتی لطیف الرحمن، مفتی سید باقر ارشد قاسمی، مولانا محمد فاروق، مولانا اسرار الحق سبیلی، مولانا ابوسفیان مفتاحی، مولانا افتخار احمد مفتاحی، مولانا اشتیاق احمد اعظمی، مفتی انور علی اعظمی، مولانا مبارک حسین ندوی)۔

بعض مقالہ نگاران نے کہا ہے کہ عورتیں کما کر نفقہ ادا کرنے کی مکلف نہیں ہیں، البتہ اگر ان کے پاس مال موجود ہے تو بعض شکلوں میں ادائیگی ان کے ذمہ ہوگی (مقالہ: مولانا عبد الرشید قاسمی، مولانا عطاء اللہ قاسمی، مولانا صبیح اختر قاسمی، مولانا ریاض احمد قاسمی)۔

مولانا شاہجہاں ندوی لکھتے ہیں: بعض صورتوں میں یہ ذمہ داری عورتوں پر ہے، مذہب شافعی، مذہب حنبلی، مذہب حنفی کے مطابق باپ یا اوپر کے افراد یعنی دادا وغیرہ نہ ہوں یا تنگ دست ہوں تو ماں پر نان ونفقہ واجب ہوگا، جبکہ امام مالک کے یہاں واجب نہیں ہے۔

مولانا عبد الاحد فلاحی صاحب کے الفاظ میں: اگر شوہر نفقہ نہ دے اور بیوی اپنا گذارہ کرے تو وہ قاضی کی اجازت سے شوہر پر قرض ہوگا، جس کی ادائیگی شوہر پر لازم ہوگی، ''فإن لم تجد من تستدين منه عليه اكتسبت وأنفقت وجعلته دينا عليه بأمر القاضي وإن لم تقدر على الاكتساب لها السوال ليؤمها وتجعل سؤلها ديناً عليه'' (ردالمحتار)۔

ڈاکٹر محمد زحیلی کہتے ہیں کہ: بیوی کا نفقہ اس کے شوہر پر واجب ہے خواہ عورت مالدار، صاحب ثروت ہو یا اس کا شوہر فقیر و مفلس ہو، اگر شوہر کماتا ہو اور بلا کسی ضرورت وحاجت کے عورت گھر کے باہر کام کرے تو اس کا نفقہ شوہر سے ساقط ہو جاتا ہے۔

دلائل مندرجہ ذیل ہیں:

*''وعلى المولود له رزقهن وكسوتهن بالمعروف''۔

*''لا يكون لأحدكم ثلاث بنات أو ثلاث أخوات فيحسن إليهن إلا دخل الجنة'' (ترمذی)۔

*''كما تجب على الأم نفقة الولد لقوله تعالى: لا تضار والدة بولدها... ولما أوجب الشرع على الأم ما عجز عنه الأب من الرضاع وجب عليها ما عجز عنه من النفقة... وإذا ثبت هذا فإن الأم تجب نفقتها ويجب عليها أن تنفق على ولدها إذا لم يكن له أب وبهذا قال أبوحنيفة والشافعي وحكي عن مالك أنه لا نفقة عليها'' (المجموع ۱۹،۲۰۱۶)۔

*''والأم لا يلزمها نفقة ولدها مع وجود أبيه، قلت: يلزم الأم نفقة ولدها إذا كان أبوه فقيراً عاجزاً عن الكسب جداً''۔

*''النفقة واجبة للزوجة على زوجها مسلمة كانت أو كافرة إذا سلمت نفسها إلى منزله فعليه نفقتها وكسوتها وسكناها'' (هدايه)۔

*''ومعتدة الموت تخرج يوما وبعض الليل لتكتسب لأجل قيام المعيشة لأنه لا نفقة لها'' (بحر الرائق)۔

*''ومعتدة الموت تخرج في الجديدين وتبيت أكثر الليل في منزلها، لأن نفقتها عليها فتحتاج للضرورة'' (در مختار)

*''أما إذا كان معسرا بحيث تجب نفقته على غيره من الأصول والفروع و كان عاجزاً عنه فلا نفقة عليه لأنه لا يعقل إيجاب النفقة عليه وهو يأخذ نفقته من غيره إذ أن فاقد الشئ لا يعطيه وهذا هو الصحيح'' (الفقه الاسلامی وأدلته)۔

*''لو استغنت الأنثى بنحو خياطة وغزل فتجب أن تكون نفقتها في كسبها'' (ردالمحتار)۔

*''تجب على الرجل نفقة امرأته'' (تاتارخانیه)۔

*''إن المرأة التي تعمل لا نفقة لها لأن الزوج يستطيع منعها من العمل والخروج. فذلك حق وهو إنما ينفق عليها لأنها متفرغة لزوجها محبوسة عليه فإذا كانت تعمل وتكسب فإن السبب الذي وجب من أجله الإنفاق عليها قد زال'' (الواضح في شرح قانون الأحوال الشخصيه ۱۸۲)۔

۳۔ محض معیار زندگی کو بلند کرنے یا وقت گذاری اور سرمایہ واثاثہ پیدا کرنے کی غرض سے عورتوں کے لئے معاشی جدوجہد اختیار کرنے کا کیا حکم ہے؟ جبکہ گھر کی مالی حالت ایسی ہے جس میں تنگی وترشی سے کام چل سکتا اور چلتا ہے۔

مقالہ نگار حضرات کی ایک معتدبہ تعداد نے معیار زندگی کو بلند کرنے کے لئے عورتوں کی معاشی جدوجہد کو مباح قرار دیا ہے، لیکن بیشتر افراد نے اسے کچھ شرطوں سے مشروط کیا ہے، مثلاً گھریلو ذمہ داریاں متاثر نہ ہوں، شوہر بے روزگار اور کاہل ہو، حدود شرع کی پابندی ہو، بنیادی امور وفرائض میں حصول معاش سے کوئی فرق واقع نہ ہو (دیکھئے مقالہ: مولانا شاہجہاں ندوی، مولانا عبدالرشید قاسمی، مولانا قاضی ہارون مینگل، مفتی شیر علی گجراتی، مولانا فضیل الرحمن ہلال عثمانی، مولانا ریاض احمد قاسمی)۔

مولانا ابوسفیان مفتاحی کے الفاظ میں: مباح ہے بلکہ بہتر ہے، لیکن گھر کے اندر رہ کر مثلاً گھریلو صنعت وحرفت، ہینڈلوم، سلائی کڑھائی، بیل بوٹے بنانا وغیرہ، اس طرح بعض دفعہ عورتیں مردوں سے آگے نکل جاتی ہیں، نیز فن کتابت وغیرہ، الغرض عورتوں کے لئے معاشی جدوجہد اپنے گھروں میں رہتے ہوئے کہیں جائے بغیر اختیار کرنا شرعاً جائز ہے۔

مولانا عبداللہ خالد کہتے ہیں: اگر عزت وآبرو اور شریعت کا منشاء فوت نہ ہو تو اجازت ہوگی، حضرت ابن مسعودؓ کی زوجہ ذاتی صنعت وکاریگری سے اپنا اور شوہر وبال بچوں کی کفالت کرتی تھیں۔

نیز اگر مقصد صدقہ وخیرات، مواسات وخیر خواہی ہو تو یہ امر مستحسن ہے (مقالہ: مفتی تنظیم عالم قاسمی)۔

بعض مقالہ نگار حضرات نے اسے شریعت اسلامی کے اصول وقوانین کے مغائر قرار دیا ہے۔

لہذا معیار زندگی بلند کرنے کے لئے ایسا کرنا اسلامی مزاج و مذاق سے مطابقت نہیں رکھتا ہے (مقالہ: مولانا سلمان منصور پوری)۔

گنجائش نہیں ہوگی، اپنی عزت و ناموس کو سر بازار نیلام کرنا اس کی حمیت وغیرت کے خلاف ہے (مقالہ: مولانا محمد فاروق، مولانا جعفر ملی رحمانی)۔

جبکہ بعض دیگر حضرات نے احتیاط کے پہلو کو ملحوظ رکھتے ہوئے اسے ناپسندیدہ قرار دیا ہے اور حتی الامکان احتراز کو اولی اور مناسب سمجھا ہے، تنگی و ترشی سے کام چلا لینے، صحابہ وصحابیات کی زندگیوں کو اسوہ ونمونہ بنانے کی تلقین کی ہے (مقالہ: مولانا ڈاکٹر ظفر الاسلام، مفتی محبوب علی وجیہی، مولانا صبیح اختر قاسمی، مولانا اختر امام عادل، مولانا ارشد مدنی، مولانا عبد الاحد فلاحی، مولانا ارشاد قاسمی، مفتی ثناء الہدی قاسمی، مولانا عبید اللہ ندوی، مولانا صادق مبارکپوری، مولانا اقبال ٹنکاروی)۔

قاضی محمد ہارون مینگل کے الفاظ میں: اجتناب اولی ہے، لیکن ممنوع قرار نہیں دیا جاسکتا، بشرطیکہ شرعی ہدایات واحکامات کو ملحوظ رکھیں۔

جبکہ مولانا سلطان احمد اصلاحی صاحب نے اسے عورت کا حق مطلق قرار دیا ہے، وہ رقم طراز ہیں: حدود کی رعایت سے آمدنی بڑھانے اور اپنی کمائی کا عورت کو حق مطلق ہے، ہر حال میں تنگی وترشی سے کام چلانا بھی کوئی کارنیک نہیں ہے، لہذا وہ اپنی حدوں میں رہتے ہوئے اپنی کمائی کا حق استعمال کرسکتی ہے۔

دلائل مندرجہ ذیل ہیں:

* ''اعلموا أنما الحياة الدنيا لعب و لهو وزينة وتفاخر بينكم وتكاثر في الأموال والأولاد''۔
* ''ياايها الذين آمنوا لاتلهكم أموالكم ولا أولادكم عن ذكر الله ومن يفعل ذلك فأولئك هم الخاسرون''
* ''ولا تمدن عينيك إلى ما متعنا به أزواجاً منهم زهرة الحياة الدنيا''۔
* ''فكانت أطولنا يدا زينب لأنها كانت تعمل بيدها وتصدق'' (مسلم)۔
* ''ليس للنساء نصيب في الخروج إلا لمضطرة'' (طبرانی)۔
* ''ولها السفر والخروج من بيت زوجها للحاجة'' (ردالمحتار)۔
* ''لا تتخذوا الضيعة فترغبوا في الدنيا'' (ترمذی)۔
* ''إن هند بنت عقبة قامت إلى عمر بن الخطاب فاستقرضته من بيت المال أربعة آلاف تتجر فيها وتضمنها فأقرضها فخرجت إلى بلاد كلب فاشترت وباعت'' (جواهر الفقه)۔

۴۔ خواتین کے لئے کسب معاش کی کوئی صورت اختیار کرنے میں کیا اس وقت بھی جبکہ وہ اندرون خانہ ہی اپنی معاشی سرگرمیوں کو محدود رکھیں، اپنے ولی یا شوہر سے اجازت لینا ضروری ہوگا۔

بیشتر مقالہ نگار حضرات نے کہا ہے کہ اگر خواتین اندرون خانہ اپنی معاشی سرگرمیوں میں حصہ لینا چاہتی ہیں تو انہیں اپنے شوہر یا ولی سے اجازت لینا ہر حال میں ضروری ہوگا (دیکھئے مقالہ: مولانا شاہجہاں ندوی، شیخ کلیم اللہ عمری، مولانا ابوسفیان مفتاحی، مولانا ارشد مدنی، مولانا عبد الاحد فلاحی، مولانا یاسر اعظمی، مولانا اسرار الحق سبیلی، مولانا خورشید اعظمی، مولانا ثناء الہدی قاسمی، مولانا عطاء اللہ قاسمی، مولانا عبد الرحیم قاسمی، مولانا قاضی ہارون مینگل، مولانا جعفر ملی، مولانا اقبال قاسمی، مولانا سلطان احمد اصلاحی، مولانا صادق مبارکپوری)۔

ان کے مطابق جب نفلی عبادات میں اپنے شوہر کی اجازت ضروری ہے تو پھر کسب معاش میں مشغول ہونے کے لئے اجازت بدرجہ اولی ضروری ہوگی (دیکھئے مقالہ: مفتی سید باقر ارشد قاسمی، مولانا صبیح اختر قاسمی، مولانا عبید اللہ ندوی، مولانا شوکت ثناء قاسمی، مولانا عطاء اللہ قاسمی)۔

بعض حضرات نے حلال صنعت وحرفت میں مشغول ہونے کو گھر میں بیکار رہنے سے احسن قرار دیا ہے (دیکھئے مقالہ: مولانا یاسر اعظمی، مولانا جعفر ملی رحمانی)۔

مولانا اقبال احمد ٹنکاروی کے الفاظ میں: اجازت کے ساتھ ایسے کام کرلے، جیسے ہوم ٹیوشن، مدرسۃ البنات میں تدریسی خدمات، عورتوں کے شفاخانہ میں ڈاکٹرس یا نرس کی خدمات انجام دیں تو بہتر ہے۔

بعض مقالہ نگار حضرات کی رائے ہے کہ اگر اندرون خانہ کام میں مشغول ہونے سے عورت کا حسن وجمال متاثر ہوتا ہو یا شوہر کے حقوق کی صحیح ادائیگی نہ

ہوتی ہو، یا اس کی مشغولیت شوہر کے لئے باعث ننگ و عار ہو تو پھر اجازت ضروری ہوگی، اس کے برعکس اگر مندرجہ بالا حقوق متاثر نہ ہوں تو اجازت کی بھی ضرورت نہیں ہے (دیکھئے مقالہ: مفتی محبوب علی وجیہی، مولانا افتخار احمد مفتاحی، مولانا مصطفی قاسمی، مولانا عارف باللہ قاسمی، مولانا اقبال احمد قاسمی، مولانا اشتیاق احمد اعظمی، مفتی انور علی اعظمی، مفتی تنظیم عالم قاسمی)۔

دلائل مندرجہ ذیل ہیں:

*''علموا أبناء کم السباحة والرماية ونعم لهو المؤمنة فی بيتها المغزل'' (معرفة الصحابة)۔

*''أما العمل الذی لا ضرر له فيه فلاوجه لمنعها عنه خصوصاً فی حال غيبته من بيته، فإن ترك المرأة بلا عمل فی بيتها يؤدی إلی وساوس النفس والشيطان أو الاشتغال بما لا يعنی مع الأجانب والجيران'' (شامی)۔

*''وكذا لو أجرت نفسها لإرضاع صبی وزوجها شريف ولم تخرج قيل تكون ناشزة'' (درمختار)۔

*''لزم أنها تصير ناشزة إذا خالفته فی الغزل والنقش والحناء وغير ذلك مما تخالف به أمره وهی فی بيته وفساده لا يخفی نعم يفيد أنه له منعها من هذا الإيجاز، وللزوج أن يمنع امرأته عن ما يوجب خللاً فی حقه'' (شامی)۔

''لا يحل لامرأة أن تصوم وزوجها شاهد إلا بإذنه وينبغی عدم تخصيص الغزل بل له أن يمنعها عن الأعمال كلها المقتضية للكسب لأنها مستغنية عنه لوجوب كفايتها عليه وكذا فی العمل تبرعاً لأجنبی بالأولی'' (البحرالرائق)۔

*''وللزوجة أن تعمل فی البيت عملاً لا يضعفها ولا ينقص جمالها وللزوج أن يمنعها مما يضرها ولكن لا تسقط نفقتها إذا خالفته بل له أن يودبها لعصيانها أمره'' (الفقه الاسلامی)۔

*''وله منعها من الغزل وكل عمل ولو تبرعاً لأجنبی'' (درمختار)۔

۵۔ اگر عورت کو کسب معاش کے لئے گھر سے باہر نکلنا پڑے تو کیا اس کے لئے ولی یا شوہر کی اجازت ضروری ہوگی، گھر سے نکلنا مسافت سفر یا اس سے زیادہ کے لئے ہو یا اس سے کم کے لئے، دن کے وقت ہو یا رات کے وقت، ولی اس خاتون کی کفالت کرتا ہو یا نہ کرتا ہو، ان صورتوں میں حکم شرعی کے اعتبار سے کچھ فرق بھی ہوگا؟

مقالہ نگاران حضرات اس سلسلہ میں کئی رائیں رکھتے ہیں:

۱۔ مطلق شوہر یا ولی سے اجازت ضروری ہوگی (دیکھئے مقالہ: مولانا شاہجہاں ندوی، مولانا محمد سلمان کھلی، مولانا عبید اللہ ندوی، مولانا مبارک حسین ندوی، مولانا عطاء اللہ قاسمی، مولانا صبیح اختر قاسمی، مولانا افتخار احمد مفتاحی، مولانا قاضی ہارون مینگل، مولانا اسرار الحق سبیلی، مولانا مصطفی قاسمی، مولانا شمس الدین مظاہری، مولانا اختر امام عادل)۔

۲۔ اگر شوہر یا ولی کفالت نہ کرے اور نفقہ ورہائش کا کوئی معقول انتظام بھی نہ ہو تو خواتین کسب معاش کے لئے نہ صرف یہ کہ باہر نکلیں گی بلکہ اس صورت میں اپنے ولی یا شوہر سے اجازت طلب کرنے کی بھی ضرورت نہ ہوگی (دیکھئے مقالہ: مولانا محمد سلمان کھلی، مولانا ڈاکٹر ظفر الاسلام صدیقی، مفتی محبوب علی وجیہی، مولانا ارشد مدنی، مولانا اقبال احمد قاسمی، مولانا یاسر اعظمی، مولانا عبد الرشید قاسمی، مولانا عارف باللہ قاسمی، مولانا ارشاد الحق قاسمی، مفتی جمیل احمد نذیری، مفتی تنظیم عالم قاسمی، مولانا محمد صادق مبارکپوری)۔

۳۔ معقول انتظام ہو، نکلنے کی حاجت وضرورت شرعی نہ ہو تو خروج درست نہ ہوگا (مقالہ: مولانا محمد فاروق، مولانا محمد صادق مبارک پوری)۔

۴۔ اختلاط اور شرعی حدود وقوانین کے ٹوٹنے کا امکان ہو تو پھر نکلنا ممنوع اور ناجائز ہوگا (مقالہ: مولانا اقبال احمد قاسمی)۔

مفتی سید باقر ارشد صاحب نے کہا کہ شرعی حجاب کے ساتھ باہر نکل سکتی ہے، لیکن اجازت ضروری ہوگی، مسافت سفر کے اندر تو اجازت ہے، مگر اس سے باہر تنہا سفر کرنا اور ملازمت کرنا حرام ہے، بغیر محرم کے حج فرض نہیں ہے تو ملازمت کجا، اگر رات کے وقت ایسی جگہ ملازمت کرے جہاں صرف عورتیں ہوں تو اجازت کے ساتھ جائز ہوگا ورنہ نہیں۔

اگر دوری مسافت سفر سے زیادہ ہو تو محرم کا ساتھ ہونا لازم ہوگا (مقالہ: مولانا خورشید احمد اعظمی، مولانا لطیف الرحمن فلاحی)۔

دلائل مندرجہ ذیل ہیں:

*"لا يحل لامرأة مسلمة تسافر مسيرة ليلة إلا ومعها رجل ذو حرمة منها" (ابوداؤد)۔

*"عن النبي ﷺ أن امرأة أتته فقالت: ما حق الزوج على امرأته قال: لا تمنعه نفسها وإن كانت على قتب ولا تعطي من بيته شيئا إلا بإذنه فإن فعلت ذلك كان له الأجر وعليها الوزر ولا تصوم تطوعا إلا بإذنه فإن فعلت ذلك أثمت ولم توجر، وأن لا تخرج من بيته إلا بإذنه فإن فعلت لعنتها الملائكة ملائكة الغضب و ملائكة الرحمة حتى تؤوب أو ترجع، قيل: وإن كان ظالماً قال: وإن كان ظالماً" (ابوداؤد)۔

*"ويحرم عليها الخروج بلا إذنه هذا إذا قام الزوج بحوائجها التي لا بدلها منها، وإن لم يقم بحوائجها فلا بدلها من الخروج" (كشاف القناع)۔

*"لا يحل لامرأة تومن بالله واليوم الآخر أن تأذن في بيت زوجها إلا بإذنه ولا تخرج وهو كاره ولا تطيع فيه أحداً" (مستدرک حاکم)۔

*"ليس لها أن تخرج بلا إذنه أصلاً" (شامی)۔

*"فلا تخرج إلا لحق لها أو عليها" (درمختار)۔

*"والحق أن على المفتي أن ينظر في خصوص الوقائع فإن علم في واقعة عجز هذه المختلعة عن المعيشة أن لم تخرج أفتاها بالحل، وإن علم قدرتها أفتاها بالحرمة كما في فتح القدير" (شامی)۔

*"أن له منعها من الغزل وكل عمل ولو قابلة و مغسلة" (شامی)۔

*"ولها السفر والخروج من بيت زوجها للحاجة" (باب المهر سعيديه)۔

*"لا تجب النفقة إذا انتقلت الزوجة من منزل الزوجية إلى منزل آخر بغير إذن الزوج بغير وجه شرعي"۔

*"للزوج أن يضرب المرأة على أربعة خصال... الخروج من البيت" (فتح القدیر)۔

*"ليس للمرأة أن تخرج بغير إذن الزوج إلا بأسباب متعددة: منها: إذا كانت في منزل يخاف السقوط عليها، ومنها: الخروج إلى مجلس العلم إذا وقعت لها نازلة ولم يكن الزوج فقيهاً، و منها: الخروج إلى حج الفرض إذا وجدت محرماً. ومنها: الخروج إلى زيارة الوالدين" (الخانیہ)۔

*"ويسقط حقه في الإذن إذا امتنع عن الإنفاق عليها" (موسوعہ فقہیہ)۔

*"المرأة قبل أن تقبض مهرها لها أن تخرج في حوائجها وتزور الأقارب بغير إذن الزوج فإن أعطاها المهر ليس لها الخروج إلا بإذن الزوج" (فتح القدیر)۔

*"ويجوز للزوجة الخروج بغير إذن الزوج لما لا غناء لها عنه كإتيان بنحو مأكل والذهاب إلى القاضي لطلب الحق واكتساب النفقة إذا أعسربها الزوج والاستغناء إذا لم يكن زوجها فقيهاً" (الموسوعة الفقهيه ١١١/٩)۔

٦۔ خواتین کے لئے ملازمت کے سلسلہ میں شرعی حدود کیا ہیں؟

اس سوال کے جواب میں بیشتر مقالہ نگار حضرات نے کہا ہے کہ اگر ملازمت ناگزیر ہو، اس کے بغیر چارہ کار نہ ہو تو مندرجہ ذیل شرائط کے ساتھ خواتین کسب معاش کے لئے گھر سے باہر نکل سکتی ہیں:

۱۔ ولی یا شوہر کی اجازت شامل ہو۔

۲۔ شرعی پردہ کی مکمل رعایت ہو۔

۳۔لباس دبیز اور مکمل ساتر ہو۔

۴۔لباس اسقدر بھڑ اکیلا نہ ہو کہ مردوں کے لئے کشش کا باعث بنے۔

۵۔خوشبو کے استعمال سے اجتناب۔

۶۔ پایل یا چھلوں کے پہننے سے بچیں۔

۷۔مردوں سے اختلاط بالکل نہ ہو۔

۸۔اگر کبھی اجنبی اور غیر مردوں سے بات کرنے کی ضرورت آن پڑے تو لہجہ میں کرختگی ہو۔

۹۔دن کے اوقات ہی میں نکلیں۔

۱۰۔شوہر اور بچوں کے حقوق سے بے اعتنائی نہ ہو، وغیرہ وغیرہ (دیکھئے مقالہ: مولانا شاہجہاں ندوی، مولانا ارشد مدنی، مولانا افتخار احمد مفتاحی، مولانا عبداللہ خالد، مولانا اشتیاق احمد اعظمی، مفتی انور علی اعظمی، مولانا جعفر ملی رحمانی، مولانا اختر امام عادل، مولانا شیخ کلیم اللہ، مولانا عبید اللہ ندوی، مفتی عبد الرحیم قاسمی، مفتی سید باقر ارشد، مولانا محمد سلمان کھلی، مولانا ابوسفیان مفتاحی، مولانا محمد فاروق، مولانا یاسر اعظمی، مولانا لطیف الرحمن فلاحی، مصطفی قاسمی، مولانا عبدالاحد فلاحی، مولانا اقبال ٹنکاروی، مولانا اسرار الحق سبیلی، مولانا شوکت ثنا قاسمی وغیرہ)۔

مفتی محبوب علی وجیہی صاحب نے کہا ہے کہ انتہائی مجبوری کی حالت میں جواز ہے۔

اعلی تعلیم، صنعت وغیرہ میں خواتین کو باک ہونا چاہئے تا کہ بچوں کی اچھی طرح تربیت کرسکیں (مقالہ: مفتی شیر علی گجراتی)۔

مولانا سلطان احمد اصلاحی کے الفاظ میں: شوہر بیوی دونوں ایک آفس یا ایک کمپنی میں کام کریں یا پھر شوہر کو اعتماد رہے اور اس کی نگرانی قائم رہے تب ہی ملازمت کرسکتی ہے۔

دلائل مندرجہ ذیل ہیں:

*''وقل للمؤمنات يغضضن من أبصارهن ويحفظن فروجهن''۔

*''ولا يضربن بأرجلهن ليعلم ما يخفين من زينتهن''۔

*''إن اتقيتن فلا تخضعن بالقول فيطمع الذی فی قلبه مرض وقلن قولاً معروفا''۔

*''وإذا سألتموهن متاعا فاسئلوهن من وراء الحجاب''۔

*''المرأة عورة إذا خرجت استشرفها الشيطان'' (ترمذی)۔

*''مثل الرافلة فی الزينة فی غير أهلها كمثل ظلمة يوم القيامة لانور لها'' (ترمذی)۔

*''كل عين زانية والمرأة إذا استعطرت فمرت بالمجلس فهی كذا وكذا يعنی زانية'' (ابوداؤد)۔

*''ويجب على المرأة فی حال الخروج التزام الشرعی فلا تظهر شيئاً من جسدها غير الوجه والكفين'' (الفقه الاسلامی وأدلته)۔

*''ولا تخرج من بيتها إلا بإذنه فإن خرجت بإذنه فمختفية فی هيئة رثة تطلب المواضع الخالية دون الشوارع والأسواق، محترزة من أن يسمع صوتها أو يعرف شذها لاتتعرف إلى صديق بعلمها فی حاجاتها بل تنكر على من تظن أن يعرفها أو تعرفه'' (إحياء علوم الدين)۔

*''وحيث أبحنا لها الخروج فإنما يباح بشرط عدم الزينة وتغيير الهيئة إلى ما يكون داعية لنظر الرجال واستمالهم'' (احكام القرآن للقرطبی)۔

۷۔ملازمت کرنے والی خواتین اگر ایسے اداروں میں کام کریں (خواہ تعلیمی ادارے ہوں یا دوسرے جہاں خواتین ہی خدمت انجام دیتی ہوں اور کام کی جگہوں میں مرد نہ ہوتے ہوں، البتہ ادارہ کے ذمہ دار مرد ہوں تو اس صورت میں پردہ کے کیا احکام ہوں گے؟

اس سوال کے جواب میں مقالہ نگاران حضرات کی آراء مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ مردوں سے سابقہ کی صورت میں پردہ مکمل ہو۔

۲۔ لباس سادہ، دبیز اور کشادہ ہو۔

۳۔ ضرورتاً مردوں سے بات کرنی ہو تو لہجہ میں لگاوٹ اور گھلاوٹ نہ ہو بلکہ رعب وداب ہو۔

۴۔ فساد کثیر کا امکان ہو تو چہرہ اور ہتھیلیوں کو چھپانا بھی لازم ہوگا۔

۵۔ اگر مردوں سے سامنا نہ ہو تو برقع اور اوڑھنی لازم نہیں۔ (دیکھئے مقالہ: مولانا شاہجہاں ندوی، مولانا کلیم اللہ عمری، مولانا اختر امام عادل)۔

۶۔ قابل ستر حصہ کا عورتوں سے بھی پردہ کرنا لازم ہوگا۔

۷۔ اگر مسلم عورتوں کے علاوہ غیر مسلم عورتیں بھی وہاں ہوں تو ان سے بھی مکمل پردہ لازم ہوگا (دیکھئے: مقالہ: مولانا محمد فاروق، مولانا محمد سلمان کھلی، مولانا یاسر اعظمی، مولانا شوکت ثناء قاسمی، مولانا جعفر علی رحمانی، مولانا عارف باللہ قاسمی)۔

۸۔ شدید ضرورت کے وقت چہرہ اور ہاتھ کھولا جاسکتا ہے (مقالہ: مولانا لطیف الرحمن، مولانا افتخار احمد مفتاحی، مولانا اسرار الحق سبیلی، مولانا اشتیاق احمد اعظمی، مولانا ریاض احمد قاسمی، مفتی شیر علی گجراتی، مولانا سلطان احمد اصلاحی)۔

۹۔ جہاں صرف خواتین ہوں وہاں ملازمت کرنے میں کوئی قباحت نہیں ہے (مقالہ: مولانا عبید اللہ ندوی، مفتی عبد الرحیم قاسمی، مولانا ارشد مدنی)۔

۱۰۔ اگر کسی ادارہ کے ذمہ دار مرد ہوں اور کام کرنے والی خواتین ہوں، تب بھی پردہ کا لحاظ رکھنا ضروری ہوگا (مقالہ: مفتی فضیل الرحمن ہلال عثمانی، مفتی جمیل احمد نذیری، مفتی انور علی اعظمی)۔

۱۱۔ حالات کے اعتبار سے اس کی صورتیں نکالی جاسکتی ہیں (ڈاکٹر ظفر الاسلام)۔

۱۲۔ ایسے اداروں میں بھی عام حالات میں ملازمت جائز نہیں ہوگی، کیونکہ اس میں بہت سارے مفاسد پائے جاتے ہیں، مثلاً بلاضرورت شرعی گھر سے نکلنا، عورت کا بن سنور کا نکلنا، ان کی طرف فساق وفجار کا میلان وغیرہ، لیکن اگر کوئی کمانے والا نہ ہو تو شرعی حدود کی پابندی کے ساتھ گنجائش ہوگی (مقالہ: مولانا صادق مبارک پوری)۔

دلائل مندرجہ ذیل ہیں:

*''یا ایها النبی قل لأزواجك وبناتك ونساء المؤمنين يدنين عليهن من جلابيبهن''۔

*''وليضربن بخمرهن على جيوبهن''۔

*''فلا تخضعن بالقول فيطمع الذی فی قلبه مرض''۔

*''عن أم سلمة أنها كانت عند رسول الله ﷺ وميمونة إذا أقبل ابن أم مكتوم فدخل عليه فقال رسول الله ﷺ: احتجبا منه، فقلت: يا رسول الله! أليس هو أعمى لا يبصرنا، فقال رسول الله ﷺ: أفعمياوان أنتما؟''۔

*''لا يحل للمسلمة أن تنكشف بين يدي يهودية أو نصرانية أو مشركة ولا ينبغي للمرأة الصالحة أن تنظر إليها المرأة الفاجرة لأنها تصفها عند الرجال فلا تضع جلبابها و خمارها كما فی السراج'' (شامی)۔

*''تمنع المرأة الشابة من كشف الوجه بين الرجال لا لأنه عورة بل لخوف الفتنة'' (درمختار)۔

*''وتنظر المرأة من المرأة إلى ما يجوز للرجل أن ينظر إليه من الرجل'' (فتح القدير)۔

*''...ومن الأجنبية إلى وجهها وكفيها فقط للضرورة'' (شامی)۔

۸۔ اگر عورت ایسی جگہ کام کرے، جہاں مرد کارکن بھی ہوں، تو اس وقت خاتون کارکنوں کے لئے پردہ کی کیا حدود ہوں گی، اس سلسلہ میں کیا سن رسیدہ خواتین اور جوان عورتوں کے درمیان فرق ہوگا؟

اس سوال کے جواب میں مقالہ نگاران حضرات کی مختلف رائیں سامنے آئی ہیں:

۱۔ ضرورتاً خواتین کسب معاش کے لئے ملازمت کرسکتی ہیں، اس صورت میں جوان عورتوں کو مکمل شرعی پردہ کا لحاظ رکھنا ہوگا، اختلاط سے اجتناب، تنہائی میں ملنے سے گریز اور شدید ضرورت کے وقت بات کرنے کی نوبت آجائے تو لہجہ میں لگاوٹ نہ ہو، جبکہ سن رسیدہ خواتین کے سلسلہ میں شریعت نے تھوڑی رخصت دی ہے، لہٰذا ان کے سلسلہ میں بمقابلہ جوان خواتین کے تخفیف ہوگی (دیکھئے مقالہ: مولانا شاہجہاں ندوی، مولانا کلیم اللہ عمری، مولانا لطیف الرحمن، مولانا شوکت ثناء قاسمی، مولانا عطاء اللہ قاسمی، مفتی محبوب علی وجیہی، مولانا صبیح اختر قاسمی، مولانا عبید اللہ ندوی، مولانا اشتیاق احمد اعظمی، مفتی انور علی اعظمی، مفتی ثناء الہدی قاسمی)۔

۲۔ ملازمت کی اجازت ہوگی، لیکن پردہ کے معاملہ میں جوان اور سن رسیدہ دونوں کا حکم یکساں ہوگا (مقالہ: مفتی سید باقر ارشد قاسمی، مولانا ڈاکٹر ظفر الاسلام، قاضی ہارون مینگل، مولانا عبد الاحد فلاحی، مولانا اسرار الحق سبیلی، مولانا مصطفی قاسمی، مولانا عبد الرشید قاسمی)۔

۳۔ ایسی جگہوں میں ملازمت کی بالکل اجازت نہ ہوگی، لیکن وہ عمر رسیدہ خواتین جن سے فتنہ کا اندیشہ نہ ہو، انہیں کسی حد تک اجازت دی جاسکتی ہے (دیکھئے مقالہ: مولانا ابوسفیان مفتاحی، مولانا محمد سلمان کھلی، مولانا اقبال احمد قاسمی، مولانا اختر امام عادل قاسمی)۔

۴۔ بلا کسی تفصیل اس صورت میں ملازمت کی گنجائش نہ ہوگی (مقالہ: مفتی فضیل الرحمن ہلال عثمانی، مولانا محمد فاروق، مولانا ارشد مدنی، مفتی جمیل احمد نذیری، مولانا یاسر اعظمی، مولانا خورشید اعظمی، مولانا عارف باللہ قاسمی، مولانا ریاض احمد قاسمی، مولانا صادق مبارک پوری)۔

مولانا عبد الاحد فلاحی صاحب کے الفاظ میں: اگر مردوں کے ساتھ رہ کر کام کرنا پڑے تو اس صورت میں گنجائش ہوگی کہ چہرہ، ہاتھ اور قدم کھلے رکھے جائیں، ضرورت جہاں زیادہ ہو، وہاں آستین کا اوپر اٹھ جانا گناہ میں شامل نہیں ہوگا، امام ابو یوسفؒ نے بوقت ضرورت آستین کو کھلی رکھنے کی اجازت دی ہے۔

''وعن أبي يوسف أنه يباح النظر إلى ذراعها أيضاً لأنه قد يبدو منها عادة'' (فتح القدير)، اسی طرح اس بات کی بھی وضاحت ہے کہ بوقت ضرورت عورتوں کو دیکھنا جائز ہے، ''ثم النظر إلى المرأة الأجنبية قد يصير مرخصاً عند الضرورة'' (هنديه)۔

مولانا سلطان احمد اصلاحی صاحب کہتے ہیں: نوجوان اور عمر رسیدہ ہر ایک کو صرف ناگزیر ضرورت کی بنا پر اور کم وقفہ کے لئے اختلاط ہو اور اس میں شدید تقاضہ کے باعث چہرہ اور ہتھیلی ہی کھلی رکھی جاسکتی ہے۔

دلائل مندرجہ ذیل ہیں:

*''والقواعد من النساء اللاتي لا يرجون نكاحاً فليس عليهن جناح أن يضعن ثيابهن غير متبرجات بزينة وأن يستعففن خير لهن''۔

*''لا يخلون رجل بامرأة إلا كان ثالثهما الشيطان'' (ترمذی)۔

*''وإن كانت عجوزاً أو مقبحة جاز أن يكشف وجهها وكفيها'' (قرطبی)۔

*''أما العجوز التي لا تشتهى فلا بأس بمصافحتها و مس يدها إذا أمن'' (درمختار)۔

*''وأما في زماننا فالمفتى به منع الكل عن الكل حتى في الوعظ ونحوه'' (حاشية الطحطاوی)۔

۹۔ کیا اس کا بھی فرق ہوسکتا ہے کہ ایک کام کی انجام دہی میں عورت کا سامنا مردوں سے بہت زیادہ اور دوسرے کام کی انجام دہی میں کم ہے، مثلاً دوکان میں سیلز مین اور آفس میں یکسوئی سے بیٹھ کر کام کرنے میں فرق ہوسکتا ہے۔

اس سوال کے جواب میں بیشتر مقالہ نگاران حضرات کی رائے کے مطابق اگر آفس میں یکسوئی ہو، اختلاط کا امکان بعید تر ہو، حجاب شرعی کا مکمل لحاظ ہو اور بے پردگی کم سے کم ہو تو یہ ملازمت کس طرح درست ہوسکتی ہے (دیکھئے مقالہ: مفتی محبوب علی وجیہی، مولانا محمد سلمان کھلی، مفتی ثناء الہدی قاسمی، مولانا شاہجہاں ندوی، مولانا کلیم اللہ عمری، مولانا لطیف الرحمن، مولانا سید باقر ارشد قاسمی، مولانا عبید اللہ ندوی، مفتی عبدالرحیم قاسمی، مولانا اختر امام عادل، قاضی ہارون مینگل، مولانا محفوظ الرحمن قاسمی، مولانا صبیح اختر قاسمی)۔

بطور سیلز گرل کام کرنے یا اس طرح کی ملازمت جہاں عورتوں کو شوپیس بننا پڑے، بے پردگی کا امکان بہت زیادہ ہو، لوچ اور لگاوٹ کا لہجہ استعمال کرنا پڑے، ایسی جگہوں میں ملازمت کی اجازت کو تقریباً تمام ہی مقالہ نگاران حضرات نے ناجائز اور نادرست کہا ہے۔

بعض حضرات وہ بھی ہیں جو مطلقاً دونوں صورتوں کے عدم جواز کے قائل ہیں کہ بہتر ہے کہ ایسی جگہوں سے عورتوں کو کام کرنے سے دور رکھا جائے (دیکھئے مقالہ: مولانا محمد فاروق، ڈاکٹر ظفر الاسلام، مولانا ارشد مدنی، مفتی جمیل احمد نذیری، مفتی فضیل الرحمن ہلال عثمانی، مولانا ریاض احمد قاسمی، مولانا اقبال احمد قاسمی، مولانا سلطان احمد اصلاحی، مولانا صادق مبارک پوری، مولانا یاسر اعظمی، مولانا خورشید اعظمی، مولانا اشتیاق احمد اعظمی، مفتی انور علی اعظمی)۔

دلائل مندرجہ ذیل ہیں:

*''إذا ابتليت ببليتين فاختر أهونهما''۔

*''إذا تعارض مفسدتان روعي أعظمهما ضرراً بارتكاب أخفهما'' (درر الحکام)۔

*''ويتحمل الضرر الأخف لدفع الضرر الأشد أو الأعم'' (المنهاج في علم القواعد)۔

۱۰۔ ملازمت کی غرض سے عورت کا اپنے گھر اور اپنوں سے دور (خواہ اندرون ملک ہو یا بیرون ملک) مستقل قیام کا کیا حکم ہے۔

اس سوال کے جواب میں تقریباً تمام مقالہ نگاران حضرات نے کہا ہے کہ بغرض ملازمت عورتوں کا تنہا سفر کرنا یا قیام کرنا درست نہیں ہے، ہاں اگر محرم ساتھ ہو تو اس میں گنجائش ہوسکتی ہے اور کسی حد تک اجازت دی جاسکتی ہے۔

جبکہ مولانا عارف باللہ قاسمی کے الفاظ میں: البتہ ایسی جگہ جہاں صرف عورتیں قیام کرتی ہوں اور اس کا کوئی محرم اسے ساتھ لے جاکر چھوڑ دے پھر لائے تو ایسی جگہ میں عورتوں کے قیام کی گنجائش ہوسکتی ہے۔

مفتی ثناء الہدی قاسمی کہتے ہیں کہ حدود شرعیہ کی رعایت اور شوہر کی اجازت سے اگر قیام ملک یا بیرون ملک ہو تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔

دلائل مندرجہ ذیل ہیں: *''لا تسافر المرأة ثلاثة أيام إلا ومعها ذو رحم محرم'' (بخاری)۔

*''لا يحل لا مرأة تومن بالله واليوم الآخر أن تسافر سفراً فوق ثلاثة أيام فصاعداً إلا ومعها أبوها أو أخوها أوزوجها أو ابنها أو ذومحرم منها'' (ابوداؤد)۔

*''واحتج أبوحنيفة بأن مامون السفر الشرعي في حكم البيت في جميع الأحكام كعدم جواز القصر فكما يجوزلها أن تكون في بيتها بلا محرم كذلك يجوز لها أن تكون في أقل من مدة السفر بلا محرم'' (اعلاء السنن)۔

*''أما إذا كانت المرأة ليس لها الزوج أو أب أو غيرهما من أقاربها الذين يكلفون لها بالمعيشة وليس عندها من المال ما يسد حاجتها فحينئذ يجوزلها أن تخرج للاكتساب بقدر الضرورة ملتزمة بأحكام الحجاب فيكفي لها في مثل هذه الحال أن تكتسب في وطنها ولا حاجة لها إلى السفر إلى البلاد الأجنبية. ولولم تجد بُداً من السفر في وطنها من بلد إلى بلد آخر ولولم تجد أحداً من محارمها ففي مثل هذه الحالة فقد يسع لها أن تاخذ بمذهب مالك والشافعي حيث جوزوا لها السفر مع النساء المسلمات الثقات'' (المغنی ۳٫۱۹۰)۔

*''وأجمعوا أن العجوز لا تسافر بغير محرم فلا تخلو برجل شاباً أو شيخاً'' (شامی)۔

*''ليس لها السفر مطلقاً بلا رضاها لفساد الزمان لأنها لا تأمن على نفسها في منزلها فكيف إذا خرجت''۔ ☆☆☆

عرض مسئلہ

خواتین کی ملازمت

مولانا بدر احمد مجیبی ندوی[1]

اسلامک فقہ اکیڈمی کے اٹھارہویں فقہی سمینار کے ایک موضوع خواتین کی ملازمت سے متعلق سوالنامہ کے ابتدائی پانچ سوالات کا عرض میرے ذمہ کیا گیا تھا، عرض مسئلہ کے لئے مجھے کل ۴۰ مقالات اکیڈمی کی طرف سے بھیجے گئے تھے، ان میں سے کچھ مقالات تفصیلی ہیں، زیادہ تر مختصر مقالات ہیں اور بعض مقالات میں مقالہ نگار نے صرف اپنی رائے ظاہر کردی ہے۔

مقالہ نگار حضرات کے نام درج ذیل ہیں:

مولانا ابوسفیان مفتاحی، مفتی محبوب علی وجیہی، ڈاکٹر ظفر الاسلام صدیقی، مفتی محمد عارف باللہ قاسمی، مولانا شاہجہاں ندوی، مولانا افتخار احمد مفتاحی، مولانا اقبال احمد قاسمی، قاضی محمد ہارون مینگل، مولانا اسرار الحق سبیلی، مولانا مصطفی قاسمی آدا پوری، مولانا خورشید احمد اعظمی، مولانا عبدالحئی مفتاحی، مولانا اشتیاق احمد اعظمی، مولانا محمد شوکت ثنا قاسمی، مفتی انور علی اعظمی، مولانا عطاء اللہ قاسمی، مولانا محفوظ الرحمن آسام، مولانا شمس الدین مظاہری آسام، مولانا عبدالتواب اناوی، مولانا عبدالرشید قاسمی، مولانا یاسر اعظمی، مفتی سید باقر ارشد قاسمی، مولانا محمد سلمان پالنپوری، مولانا عبید اللہ ندوی، مولانا لطیف الرحمن فلاحی، مولانا کلیم اللہ عمری، مولانا اقبال ٹنکاروی، مفتی محمد جعفر ملی رحمانی، مولانا ارشد مدنی چمپارنی، مولانا مبارک حسین ندوی، مولانا عبدالاحد فلاحی، مفتی عبدالرحیم قاسمی، مولانا عبداللہ خالد لوناواڑی، مولانا صبیح اختر آسام، مولانا محمد فاروق، مولانا نور الحق رحمانی، مفتی ثناء الہدی قاسمی، مفتی جنید عالم ندوی، مولانا توقیر بدر قاسمی، اور راقم الحروف مولانا بدر احمد مجیبی ندوی۔

سوال نمبر ۱: شریعت اسلامی خواتین کے لئے ملازمت کو کس نظر سے دیکھتی ہے؟

اس سوال کے جواب میں اکثر مقالہ نگار حضرات نے تفصیلی بحث کی ہے کہ اسلامی شریعت میں خواتین کا نفقہ خود ان پر واجب نہیں ہے، مرد حضرات یعنی خواتین کے اولیاء یا ان کے شوہر پر واجب ہے، مرد ہی عورت کا کفیل ہوتا ہے، اسی کو خواتین کا نگراں بنایا گیا ہے، اس لئے عورتوں کو اپنے نفقہ کے لئے کسب معاش کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، شادی سے قبل ان کی معاشی کفالت کی ذمہ داری باپ پر آتی ہے، شادی کے بعد معاشی کفالت کی ذمہ داری شوہر پر آجاتی ہے، شوہر کی وفات کے بعد ان کی اولاد پر ان کی کفالت کی ذمہ داری ہوجاتی ہے، ان امور کو قرآن کریم، احادیث نبوی، صحابہ کرام کے واقعات اور فقہاء امت کے اقوال سے ثابت کیا گیا ہے۔

اس نکتہ پر سب مقالہ نگار حضرات کا اتفاق ہے کہ عام حالات میں خواتین پر کسب معاش فرض نہیں ہے، اور نہ یہ ان کی ذمہ داری ہے۔

اکثر مقالہ نگار حضرات اس کے قائل ہیں کہ عام حالات میں خواتین کے لئے اصلاً کسب معاش جائز ہے، لیکن بلا ضرورت کسب معاش کرنا پسندیدہ نہیں ہے، درج ذیل مقالہ نگار حضرات نے اس رائے کو اختیار کیا ہے۔

مولانا خورشید انور اعظمی، مولانا اشتیاق احمد اعظمی، مولانا عبدالحئی مفتاحی، مفتی انور علی اعظمی، مولانا محفوظ الرحمن آسام، مولانا شاہجہاں ندوی، مولانا شوکت ثنا قاسمی، مولانا مصطفی قاسمی آدا پوری، مولانا عطاء اللہ قاسمی، مولانا نور الحق رحمانی، مفتی ثناء الہدی قاسمی، مولانا ارشد فہیم الدین مدنی، مفتی عبدالرحیم قاسمی، مفتی عبدالاحد فلاحی، مفتی عارف باللہ قاسمی، مولانا عبدالتواب اناوی، مولانا عبداللہ خالد لوناواڑی، مولانا عبدالرشید قاسمی، مولانا محمد سلمان پالنپوری، مولانا عبید اللہ ندوی، قاضی محمد ہارون مینگل، مفتی سید باقر ارشد قاسمی، مولانا مبارک حسین ندوی، مفتی جنید عالم ندوی قاسمی، مولانا توقیر بدر قاسمی وغیرہ اور راقم الحروف مولانا بدر احمد مجیبی ندوی کی بھی یہی رائے ہے۔

درج ذیل حضرات نے اس سے کچھ مختلف رائے ظاہر کی ہے۔

---

[1] المعہد العالی الاسلامی، پھلواری شریف، پٹنہ۔

مفتی محبوب علی وجیہی، ڈاکٹر ظفر الاسلام صدیقی، مولانا شمس الدین مظاہری، مولانا افتخار احمد مفتاحی، مولانا شاہجہاں ندوی، مولانا اقبال ٹنکاروی نے یہ تحریر کیا ہے کہ فتنوں کی وجہ سے خارج بیت کسب معاش خواتین کے لئے درست نہیں ہے، استثنائی احوال میں کچھ قیود کے ساتھ خواتین کو کسب معاش کی اجازت دی جاسکتی ہے۔

مولانا ابوسفیان مفتاحی لکھتے ہیں: شریعت نے کسب معاش کو خواتین کے ذمہ نہیں رکھا ہے، اس لئے کمائی کرنا ان پر فرض نہیں ہے۔

مولانا اقبال احمد قاسمی کانپوری لکھتے ہیں: عورت کو مکمل معاش کی آزادی دینا مرد کے معاش کے مواقع کو تنگ کر دیتا ہے، اور عورت کی جو گھریلو مصروفیات ہیں اس میں خلل واقع ہوتا ہے۔

مفتی جعفر ملی رحمانی لکھتے ہیں کہ شریعت عورت کے کسب معاش میں مشغول ہونے کو عام حالات میں ناجائز قرار دیتی ہے۔

مولانا محمد فاروق بارڈولی لکھتے ہیں کہ خواتین کا بلاضرورت شدیدہ کسی کے پاس ملازمت کرنا شریعت کو گوارا نہیں ہے، گھروں میں شوہر کی اجازت سے کسب معاش کرسکتی ہیں۔

مولانا صبیح اختر قاسمی لکھتے ہیں کہ خواتین کے کسب معاش کی چنداں ضرورت نہیں ہے کہ ان کا نفقہ شوہر یا ولی پر ہے۔

مولانا عبداللہ خالد لوناواڑہ لکھتے ہیں کہ بغیر ضرورت کے عورت کو کسب معاش کے لئے باہر نکلنا جائز نہیں ہے۔

مولانا لطیف الرحمن فلاحی لکھتے ہیں کہ محض معیار زندگی کو بلند کرنے کے لئے بلاضرورت شدیدہ وشرعیہ کسب معاش کے لئے نکلنے کو شریعت نہایت ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھتی ہے، اور اس کی اجازت بالکل نہیں دیتی ہے۔

مولانا محمد یاسر اعظمی لکھتے ہیں کہ شریعت نے خواتین کے لئے بلا کسی ضرورت شدیدہ کے کسب معاش کو ناجائز قرار دیا ہے۔ اس کے بالکل برعکس مولانا عطاء اللہ قاسمی لکھتے ہیں کہ تنگ دست شوہر، باپ، بھائی کی معاونت یا خیر کی راہوں میں خرچ کرنے کی نیت سے کسب معاش عورتوں کے لئے مستحب ہے۔

دلائل: عورتوں کے لئے کسب معاش کو ناجائز قرار دینے والے مقالہ نگار حضرات کے دلائل یہ ہیں: شریعت نے عورتوں کی زندگی کے کسی مرحلہ میں بھی کسب معاش ان پر لازم نہیں کیا ہے، ابتدائی زندگی میں ان کے معاش کے ذمہ داران کے اولیاء ہیں، شادی کے بعد معاشی ذمہ داری شوہر پر ہے، بعد میں اولاد پر ذمہ داری عائد ہوجاتی ہے، اس لئے کسی حال میں معاش کی تحصیل خواتین پر لازم نہیں ہے، اور کسب معاش کے لئے گھر سے باہر نکلنا خواتین کے لئے بہت سے مفاسد کا سبب ہوسکتا ہے، اس لئے کسب معاش ان کے لئے بلاضرورت شدیدہ جائز نہیں ہے۔

ان حضرات کی تحریروں سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ خواتین کے لئے شوہر یا ولی کی اجازت سے گھر میں کسب معاش کرنا ان حضرات کے نزدیک بھی ناجائز نہیں ہے، صرف خارج بیت کسب معاش کو ناجائز کہتے ہیں۔

اکثر مقالہ نگار حضرات جو عام حالات میں خواتین کے لئے کسب معاش کو جائز لیکن غیر پسندیدہ کہتے ہیں ان کے دلائل یہ ہیں:

۱۔ عورتوں کو کسب معاش کی اجازت دی گئی ہے، وہ اجرت پر دودھ پلانے کا کام بھی کرسکتی ہیں، قرآن کریم میں ہے:

"فإن أرضعن لكم فآتوهن أجورهن" (سورۂ طلاق)۔

۲۔ حضرت شعیب علیہ السلام کی صاحبزادیوں کا بکریوں کو پانی پلانے کے لئے کنوئیں تک جانے کا تذکرہ خود قرآن کریم میں ہے۔

"قال: ما خطبكما، قالتا: لا نسقي حتى يصدر الرعاء وأبونا شيخ كبير" (سورۂ قصص)۔

۳۔ حضرت مریم سے اللہ تعالی کا یہ ارشاد:

"هزي إليك بجذع النخلة تساقط عليك رطبا جنيا فكلي واشربي وقري عينا" (سورۂ مریم)۔

۴۔ حضرت اسماء بنت ابی بکرؓ کا واقعہ بخاری ومسلم میں مروی ہے کہ وہ کس طرح جانوروں کی دیکھ بھال اور ان کو چارہ دینے کے کاموں میں حضرت زبیرؓ کا تعاون کرتی تھیں اور دو تہائی فرسخ دور زمین سے سر پر کھجور کی گٹھلیاں رکھ کر لاتی تھیں۔

۵۔ حضرت جابر بن عبداللہؓ کی خالہ کا واقعہ کہ وہ اپنے کھجور کے باغ کے کام خود انجام دیتی تھیں۔ کسی صحابی نے ان کو منع کیا تو انہوں نے اس مسئلہ کو بارگاہ

رسالت میں پیش کیا، وہاں سے ان کے کاموں کی تائید کی گئی اور یہ ارشاد ہوا: ''بلی، فإنك عسى أن تصدق أو تفعلي خيرا'' (مسلم)۔

۶۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی اہلیہ کا واقعہ مسند احمد میں موجود ہے کہ وہ خود اپنی اور اپنے بچوں کی کفالت کرتی تھیں، صنعت وحرفت سے واقف تھیں، کچھ چیزیں تیار کر کے اس کو فروخت کرتی تھیں۔

۷۔ ام المؤمنین حضرت زینب بنت جحشؓ کے بارے میں مستدرک حاکم میں صحیح سند کے ساتھ حضرت عائشہؓ کا یہ قول مروی ہے: ''كانت زينب امرأة صناعة اليد تدبغ وتخرز وتصدق في سبيل الله''۔

۸۔ متعدد صحابیات کے بارے میں بخاری ومسلم میں مروی ہے کہ وہ غزوات میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ شریک ہوتی تھیں، مریضوں کی دیکھ بھال کرتی تھیں، زخمیوں کو پانی پلاتی تھیں اور ان کا علاج کرتی تھیں، غزوہ احد میں خود حضرت عائشہؓ اور حضرت ام سلیمؓ کے بارے میں مروی ہے کہ وہ پانی بھر کر مشکیزے اپنی پشت پر لاتی تھیں اور زخمیوں کو پانی پلاتی تھیں۔

۹۔ علامہ ابن عبدالبر نے استیعاب میں ذکر کیا ہے کہ حضرت عمر فاروقؓ نے ایک صحابیہ شفاء بنت عبداللہ قرشیہؓ کو بازار کے بعض معاملات کا ذمہ دار بنایا تھا اور ان کی رائے کو پسند کرتے تھے، ایک صحابیہ حضرت سمراءؓ بازار میں جا کر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتی تھیں اور غلطی کرنے والوں کی کوڑے سے خبر لیتی تھیں۔

ان دلائل کے پیش نظر اکثر مقالہ نگار حضرات نے عورتوں کو کسب معاش کی اجازت دی ہے، خواہ گھر کے اندر رہ کر ہو یا گھر سے باہر جا کر ہو، لیکن اس کے لئے متعدد قیود اور شرائط بھی ذکر کرتے ہیں کہ ان شرائط کے ساتھ اجازت ہوگی۔

۲۔ کیا شریعت نے خواتین پر بھی نان ونفقہ کی ذمہ داری رکھی ہے؟ (خواہ اپنا نفقہ ہو یا بچوں وغیرہ کا):

اکثر مقالہ نگار حضرات کے نزدیک بعض ناگزیر حالات میں خواتین پر بھی اپنا اور دوسروں کا نفقہ لازم ہوجاتا ہے، اور ان کو بھی کسب معاش کی ضرورت پڑ سکتی ہے، اس قول کے قائل درج ذیل مقالہ نگار حضرات ہیں:

مولانا اقبال ٹنکاروی، مفتی ثناء الہدی قاسمی، مولانا لطیف الرحمن فلاحی، مفتی سید باقر ارشد قاسمی، مولانا مبارک حسین ندوی، مولانا صبیح اختر قاسمی، مولانا محمد فاروق بارڈولی، مولانا نورالحق رحمانی، مفتی انور علی اعظمی، مولانا عطاء اللہ قاسمی، مولانا محفوظ الرحمن، مولانا شمس الدین، مولانا عبدالتواب اناوی، مولانا اقبال احمد قاسمی کانپوری، قاضی محمد ہارون مینگل، مولانا اسرارالحق سبیلی، مولانا مصطفی قاسمی، مولانا عبدالحیٔ مفتاحی، مولانا اشتیاق احمد اعظمی، ڈاکٹر ظفر الاسلام صدیقی، مفتی عارف باللہ قاسمی، مولانا ابوسفیان مفتاحی، مفتی محبوب علی وجیہی، مولانا شاہجہاں ندوی، مولانا افتخار احمد مفتاحی، مفتی جنید عالم ندوی قاسمی، مولوی توقیر بدر قاسمی

اور راقم الحروف مولانا بدر احمد مجیبی ندوی کی بھی یہی رائے ہے۔

بعض مقالہ نگار نے یہ صراحت کی ہے کہ شریعت اسلامیہ نے خواتین پر نان ونفقہ کی کوئی ذمہ داری نہیں رکھی ہے، درج ذیل مقالہ نگار کی یہ رائے ہے:

مولانا کلیم اللہ عمری، مولانا عبیداللہ ندوی، مولانا محمد یاسر اعظمی، مولانا محمد سلمان پالنپوری، مولانا عبدالرشید قاسمی، مفتی عبدالاحد فلاحی، مولانا ارشد فہیم الدین مدنی، مفتی محمد جعفر ملی رحمانی، مولانا خورشید احمد اعظمی، مولانا شوکت ثناء قاسمی، ان حضرات کے دلائل یہ ہیں:

۱۔ نفقہ کی ذمہ داری شریعت نے مردوں پر رکھی ہے، عورتوں پر نہیں رکھی ہے۔ ''وعلى المولود له رزقهن وكسوتهن بالمعروف''۔

۲۔ جہاں خواتین پر نفقہ کا ذکر ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اگر مال والیاں ہیں تو ان پر بعض صورتوں میں نفقہ لازم ہے، اگر وہ خود محتاج ہیں تو ان پر کسب کر کے نفقہ کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔

جن مقالہ نگار حضرات کے نزدیک ناگزیر حالات میں خواتین پر بھی نفقہ کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے ان کی دلیل یہ ہے کہ فقہاء کرام نے درج ذیل ناگزیر حالات میں نفقہ کی ذمہ داری خواتین پر عائد کی ہے اور انہوں نے کتب فقہ حنفی سے عبارتیں پیش کی ہیں۔

الف۔ شوہر بد معاش، آوارہ اور کاہل ہو اور بچے چھوٹے ہوں کوئی دوسرا ولی نہ ہو یا ہو لیکن ذمہ داری اٹھانے کو تیار نہ ہو تو خود عورتوں پر اپنے اور اپنے بچوں کے نفقہ کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔

ب۔ شوہر کی وفات ہوگئی ہو اور ذمہ دار ولی نہ ہو تو اس وقت بھی عورتوں پر نفقہ کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔

ج۔ مطلقہ عورت جس کا کوئی ولی نہ ہو یا ہو مگر کفالت سے معذور ہو۔

د۔ محتاج والدین اور اسی طرح محتاج اصول (دادا، دادی وغیرہ) کا نفقہ ان کی مالدار اولاد پر لازم ہوتا ہے، خواہ اولاد ذکور ہوں یا اولاد اناث ہوں۔

ھ۔ مولانا شاہجہاں ندوی نے مذاہب اربعہ کی کتابوں کے حوالے سے ثابت کیا ہے کہ اگر باپ دادا موجود نہ ہوں تو ایسی صورت میں اولاد کا نفقہ ماں پر لازم ہوگا، اس سلسلے میں انہوں نے المجموع شرح المہذب، المغنی، الشرح الصغیر للدردیر اور رد المحتار کے حوالے دیئے ہیں۔

سوال نمبر ۳۔ محض معیار زندگی کو بلند کرنے یا وقت گذاری اور سرمایہ واثاثہ پیدا کرنے کی غرض سے عورتوں کے لئے

معاشی جد وجہد اختیار کرنے کا کیا حکم ہے؟ جبکہ گھر کی مالی حالت ایسی ہے کہ جس میں تنگی وترشی سے کام چل سکتا ہے؟۔

اس سوال کے جواب میں مقالہ نگار حضرات کی مختلف رائیں سامنے آئی ہیں۔ کچھ مقالہ نگار کی رائے یہ ہے کہ خواتین شوہر کا ہاتھ بٹانے یا صدقہ وخیرات کرنے کے لئے گھریلو ذمہ داریوں کی ادائیگی اور مکمل پردے کے ساتھ کسب معاش کی جد وجہد کریں تو جائز ہے، اس رائے کو اختیار کرنے والے حضرات یہ ہیں:

مولانا کلیم اللہ عمری، مولانا اقبال ٹنکاروی، ڈاکٹر ظفر الاسلام صدیقی، مولانا خورشید احمد اعظمی، مولانا مصطفی قاسمی آداپوری، مولانا اقبال احمد قاسمی، مولانا عبد التواب اناوی، مولانا عطاء اللہ قاسمی، مفتی جنید عالم ندوی قاسمی، مولوی تو قیر بدر قاسمی اور راقم الحروف مولانا بدر احمد مجیبی ندوی کی بھی یہی رائے ہے، ان کے دلائل یہ ہیں:

۱۔ "وجعلنا لکم فیہا معایش" (الاعراف:۱۰)۔

۲۔ "ھو الذی خلق لکم ما فی الأرض جمیعا" (سورۂ بقرہ)۔

یہ اور اس طرح کی آیات مردوں اور عورتوں دونوں کے لئے عام ہیں، ان سے کسب معاش کی اباحت ثابت ہوتی ہے۔

۳۔ حضرت زینب بنت جحش کے بارے میں حضرت عائشہؓ کا قول ہے:

"فکانت أطولنا یداً زینب لأنہا کانت تعمل بیدھا" (مسلم)

۴۔ حضرت اسماء بنت ابی بکرؓ کا واقعہ کہ وہ خود کسب معاش کے ذرائع پر عمل کرتی تھیں جبکہ ان کے اوپر کسب معاش کی ذمہ داری لازم نہیں تھی کیونکہ حضرت زبیرؓ موجود تھے۔

بعض دوسرے مقالہ نگار حضرات کی رائے یہ ہے کہ یہ تمام صورتیں ضرورت اور حاجت شدیدہ کے اندر داخل نہیں ہیں، لہذا اس غرض سے عورت کا گھر سے نکلنا جائز نہیں ہے، البتہ خواتین گھر میں رہ کر کسب معاش کر سکتی ہیں۔

اس رائے کو اختیار کرنے والے حضرات یہ ہیں:

مفتی محبوب علی وجیہی، مولانا ابوسفیان مفتاحی، مولانا اشتیاق احمد اعظمی، مولانا شمس الدین مظاہری، مولانا شوکت ثناء قاسمی، مولانا نور الحق رحمانی، مولانا یاسر اعظمی، مولانا لطیف الرحمن فلاحی، مولانا عبید اللہ ندوی، مفتی انور علی اعظمی، مفتی جعفر ملی رحمانی، مولانا ارشد فہیم الدین مدنی، مفتی عبد الاحد فلاحی، مولانا محمد فاروق بارڈولی، مولانا صبیح اختر، مولانا مبارک حسین ندوی، مولانا عبد الرشید قاسمی، مفتی عارف باللہ قاسمی، مفتی سید باقر ارشد قاسمی، مولانا اسرار الحق سبیلی۔ ان حضرات کے دلائل یہ ہیں:

۱۔ "وقرن فی بیوتکن ولا تبرجن تبرج الجاھلیۃ"، اس آیت میں عورتوں کو گھر لازم پکڑنے کا حکم دیا گیا ہے، بلا ضرورت گھر سے باہر نکلنے کی اجازت نہیں ہے، اور یہاں کوئی ضرورت نہیں پائی جا رہی ہے۔

۲۔ ''أذن الله لكن أن تخرجن لحوائجكن'' (بخاری)۔

۳۔ ''ولها السفر والخروج من بيت زوجها للحاجة'' (ردالمحتار)۔

۴۔ ''فمتى انقضت حاجتها لا يحل لها بعد ذلك صرف الزمان خارج بيتها'' (البحرالرائق)۔

۵۔ ان صورتوں میں عورتوں کو معاشی جدوجہد کی اجازت دے دی جائے تو درج ذیل خرابیاں لازم ہوں گی:

الف۔ ملازمت کے میدان میں عورتوں کی شرکت سے مردوں کے اندر بے روزگاری کا اضافہ ہوگا اور یہ اقتصادی اعتبار سے نقصان دہ ہے۔

ب۔ عورت کے گھر چھوڑنے سے اس کے گھر اور اس کے خاندان کو زبردست خسارہ لاحق ہوگا۔

درج ذیل حضرات نے کچھ فرق کے ساتھ اپنی رائے ظاہر کی ہے:

مفتی ثناء الہدی قاسمی لکھتے ہیں: دور جدید میں ضرورتیں بہت آگے بڑھ گئی ہیں، جن کی تکمیل شوہر کی استطاعت سے باہر ہے، ایسے میں عورتیں چاہتی ہیں کہ ان کے پاس اپنا کمایا ہوا مال ہو جس سے وہ اپنی آسائشیں اور آرائشی ضرورتیں پوری کرسکیں، یہ خواہشات جیسی بھی ہوں کم از کم غیر شرعی نہیں ہیں، ان کی تکمیل اسی وقت ممکن ہے جب وہ کسب معاش کریں۔

مولانا افتخار احمد مفتاحی لکھتے ہی: وقت گذاری اور سرمایہ جمع کرنے کی غرض سے معاشی جدوجہد کرنا جب کہ گھر کی حالت ایسی ہے کہ تنگی وترشی سے کام چلتا ہے تو اجازت دینے میں قباحت ہے، کیونکہ دولت وثروت جمع وذخیرہ کے لئے نہیں ہے، بلکہ اجتماعی وانفرادی ضروریات کی کفالت کے لئے ہے۔

قاضی محمد ہارون مینگل لکھتے ہیں: بہتر ہے کہ عورتیں معیار زندگی بلند کرنے یا وقت گذاری کے لئے معاشی جدوجہد سے اجتناب کریں، البتہ ان پر اس جدوجہد کو ممنوع قرار نہیں دیا جاسکتا، بشرطیکہ وہ شرعی ہدایات اور احکامات کی پابندی اور پردے کے ساتھ ہوں۔

مولانا محفوظ الرحمن صاحب لکھتے ہیں: یہ سب مغربی تہذیب کے اثرات ہیں جو مسلم معاشرے کے لئے قابل شرم ہیں نہ کہ لائق تقلید۔

مولانا شاہجہاں ندوی لکھتے ہیں: معیار زندگی بلند کرنے یا سرمایہ واثاثہ پیدا کرنے کی غرض سے معاشی جدوجہد اختیار کرنا اگر یہ چیز اس کے گھریلو ذمہ داریوں نیز شوہر اور اولاد کے حقوق میں اثر انداز نہ ہوں تو شوہر کی اجازت سے مباح ہے، محض وقت گذاری کے لئے معاشی جدوجہد اختیار کرنا ممنوع ہے، کیونکہ گھر سے باہر عورت کے لئے کام کرنے کا جواز ضرورۃً ہے اور جو چیز ضرورت کی بناء پر جائز قرار دی جاتی ہے وہ بقدر ضرورت ہی ثابت رہتی ہے۔

سوال نمبر: ۴۔ خواتین کے لئے کسب معاش کی کوئی صورت اختیار کرنے میں کیا اس وقت بھی جبکہ وہ اندرون خانہ ہی اپنی معاشی سرگرمیوں کو محدود رکھیں اپنے ولی یا شوہر سے اجازت لینا ضروری ہوگا؟

اس سوال کے جواب میں تقریباً تمام مقالہ نگار حضرات نے اس رائے کو اختیار کیا ہے کہ اندرون خانہ کسب معاش کے لئے بھی ولی یا شوہر کی اجازت ضروری ہے، ان کی اجازت کے بغیر کسب معاش خواہ گھر کے اندر ہی کیوں نہ ہو جائز نہیں ہے، ان کے دلائل یہ ہیں:

۱۔ ''الرجال قوامون على النساء بما فضل الله بعضهم على بعض وبما أنفقوا من أموالهم'' (النساء)۔

۲۔ ''قيام الرجال على النساء هو أن يقوم بتدبيرها وتأديبها وإمساكها في بيتها ومنعها عن البروز وأن عليها طاعته وقبول أمره ما لم تكن معصية'' (الجامع لأحكام القرآن للقرطبی ۵،۱۶۹)۔

قوامیت کا مطلب یہ ہے کہ عورتیں مردوں کی نگرانی اور سرپرستی میں کام کریں ان کے مشورے اور اجازت سے کام کریں اور جب مرد ان کی کفالت کررہے ہوں تو ان کو ایسے کاموں سے روکنے کا حق ہے۔

۲۔ ''لا یحل لامرأۃ أن تصوم وزوجها شاهد إلا بإذنه'' (بخاری)۔

۳۔ ''ألا کلکم راع و کلکم مسئول عن رعیته فالإمام علی الناس راع وهو مسئول عن رعیته والرجل راع علی أهل بیته وهو مسئول عن رعیته والمرأۃ راعیة علی بیت زوجها وولده وهی مسئولة عن رعیتها'' (صحیحین)۔

۴۔ ''ولا تتطوع للصلاۃ والصوم بغیر إذن الزوج'' (ردالمحتار)۔

۵۔ ''وله منعها من الغزل ونحوه وعن کل ما یتأذی برائحته کالحناء والنقش والإرضاع أولی لأنه یهزلها ویلحق به عار إذا کان من الأشراف'' (ردالمحتار)۔

۶۔ ''له أن یمنعها من الأعمال کلها المقتضیة للکسب لأنها مستغنیة عنه بوجوب کفایتها علیه وکذا من العمل تبرعا'' (البحر الرائق)۔

۷۔ ''وحقه علیها أن تطیعه فی کل مباح یأمرها به'' (ردالمحتار)۔

درج ذیل پانچ مقالہ نگار حضرات نے اپنی رائے کچھ مختلف ظاہر کی ہے۔

مفتی محبوب علی وجیہی صاحب فرماتے ہیں: اگر خواتین کے گھر کے اندر کسب معاش سے ولی یا شوہر کے کاموں میں خلل واقع ہوتا ہے تو اجازت لینا ضروری ہے، اور اگر خلل واقع نہیں ہوتا ہے تو اجازت لینا ضروری نہیں ہے۔

قاضی محمد ہارون مینگل لکھتے ہیں: اگر اپنے فرائض ادا کرنے کے ساتھ عورت گھر میں کسب معاش کی کوئی صورت اختیار کرے تو گو کہ اس کو اجازت لینا ضروری نہیں ہے تاہم زندگی کو خوشگوار بنانے اور اختلافات کے اندیشہ سے بچنے کے لئے خاوند اور ولی سے اجازت لینا بہتر ہے۔

مولانا اسرار الحق سبیلی لکھتے ہیں: اگر گھر میں ایسی معاشی سرگرمی اختیار کریں جس سے شوہر کے حق میں رکاوٹ نہ ہوتی ہو اور شوہر کو کوئی نقصان بھی نہ ہو تو شوہر سے اجازت لینا ضروری نہیں ہوگا، اس کی دلیل یہ ہے:

''وأما العمل الذی لا ضرر فیه فلا وجه لمنعها عنه خصوصا فی حال غیبته عن بیته'' (ردالمحتار)۔

مفتی جنید عالم ندوی قاسمی لکھتے ہیں: جن حالات میں عورت کے لئے کسب معاش ضروری ہے ان حالات میں اجازت لینا ضروری نہیں ہے، اور جن حالات میں عورت کے لئے کسب معاش ضروری نہیں ہے ان حالات میں اجازت لینا ضروری ہے۔

مولانا لطیف الرحمن فلاحی لکھتے ہیں: اندرون خانہ معاشی سرگرمیوں کے لئے شوہر سے اجازت لینا ضروری ہے، ولی سے اجازت لینا ضروری نہیں ہے، کیونکہ شریعت نے عورت کو شوہر کی خدمت کا پابند بنایا ہے، ولی کی خدمت کا ذمہ دار نہیں بنایا ہے۔

سوال نمبر ۵: اگر عورت کو کسب معاش کے لئے گھر سے باہر نکلنا پڑے تو کیا اس کے لئے ولی یا شوہر کی اجازت ضروری ہوگی؟

گھر سے نکلنا مسافت سفر یا اس سے زیادہ کے لئے ہو یا اس سے کم کے لئے، دن کے وقت ہو یا رات کے وقت، ولی اس خاتون کی کفالت کرتا ہو یا نہ کرتا ہو، ان صورتوں میں حکم شرعی کے اعتبار سے کچھ فرق بھی ہوگا؟

اس سوال کے تین اجزاء ہیں: ہر ایک جزء کے بارے میں ہم نمبر وار مقالہ نگار حضرات کی رائے پیش کرتے ہیں:

الف۔ خواتین کے خارج بیت کسب معاش کے لئے ولی یا شوہر کی اجازت ضروری ہے یا نہیں؟ اور اس مسئلہ میں شوہر یا ولی کی جانب سے کفالت ہونے یا نہ ہونے سے کچھ فرق ہوگا؟

درج ذیل مقالہ نگار حضرات کے نزدیک خارج بیت کسب معاش کے لئے ہر حال میں ولی یا شوہر کی اجازت ضروری ہے، خواہ وہ اس کی کفالت کرتا ہو یا نہ کرتا ہو۔

مولانا عبدالرشید قاسمی، مولانا مبارک حسین ندوی، مفتی عارف باللہ قاسمی، مفتی عبدالرحیم قاسمی، مولانا اقبال ٹنکاروی، مفتی جعفر ملی رحمانی، مولانا عبید اللہ ندوی، مولانا یاسر اعظمی قاسمی، قاضی محمد ہارون مینگل، مولانا اقبال احمد قاسمی، مولانا عبدالتواب اناوی، مولانا محفوظ الرحمن، مولانا شمس الدین مظاہری، مولانا ابوسفیان مفتاحی، مولانا شوکت ثنا قاسمی، مولانا خورشید احمد اعظمی، مولانا مصطفی قاسمی، مولانا اسرار الحق سبیلی، مولوی توقیر بدر قاسمی، مفتی سید باقر ارشد قاسمی، مولانا افتخار احمد مفتاحی۔

درج ذیل مقالہ نگار حضرات کے نزدیک خارج بیت کسب معاش کے لئے ولی یا شوہر کی اجازت کی ضرورت اس وقت ہوگی جب ولی یا شوہر اس خاتون کی کفالت کرتا ہو، اگر شوہر یا ولی اس کی کفالت نہیں کرتا، اپنی تنگ دستی اور مجبوری کی وجہ سے عورت کی بنیادی ضرورتیں مثلاً کھانا کپڑا وغیرہ فراہم نہیں کرسکتا ہو اور عورت مجبوری میں بنیادی ضرورتوں کے حصول کے لئے گھر سے باہر نکلتی ہے تو اس کو شوہر یا ولی سے اجازت لینے کی ضرورت نہیں ہے۔

مفتی عارف باللہ قاسمی، مولانا عبدالرشید قاسمی، ڈاکٹر ظفر الاسلام صدیقی، مفتی عبدالاحد فلاحی، مفتی انور علی اعظمی، مولانا ارشد فہیم الدین مدنی، مولانا لطیف الرحمن فلاحی، مولانا نورالحق رحمانی، مولانا شاہجہاں ندوی، مولانا اشتیاق احمد اعظمی، مفتی جنید عالم ندوی قاسمی، نیز راقم الحروف مولانا بدر احمد مجیبی ندوی کی بھی یہی رائے ہے۔

مولانا نورالحق رحمانی اور راقم الحروف نے لکھا ہے کہ ولی یا شوہر کے کفالت سے عاجز ہونے کی صورت میں اس سے اجازت لینا واجب تو نہیں ہے مگر اس کے قوام ہونے کی وجہ سے اجازت لینا مستحب اور مستحسن ہے۔

مفتی محبوب علی وجیہی صاحب اور مولانا محمد فاروق بارڈولی لکھتے ہیں: ایسی عورت جس کی کفالت کا انتظام ہو اس کا کسب معاش کے لئے نکلنا خواہ ولی یا شوہر کی اجازت سے ہی کیوں نہ ہو بہر صورت ناجائز ہے، اس لئے کہ یہ خروج بلا ضرورۃ شرعیہ ہے، البتہ کفالت کی کوئی صورت نہ ہو اور نہ گھر میں رہ کر کوئی صنعت کرسکتی ہو تو اسے دن کے وقت میں مسافت شرعیہ کے اندر خصوصی طور سے نکلنے کی گنجائش ہوگی۔

مولانا عبید اللہ ندوی لکھتے ہیں: اگر گھر سے نکلنا مسافت سفر یا اس سے زیادہ کے لئے ہو یا رات میں ہو اور ولی اس کی کفالت کرتا ہو تب اجازت واجب ہوگی۔ جن حضرات نے کفالت اور عدم کفالت دونوں صورتوں میں شوہر یا ولی سے اجازت لینے کو لازم قرار دیا ہے، ان کے دلائل یہ ہیں:

۱۔ ''ليس للمرأة أن تخرج بغير إذن الزوج'' (خانیہ)۔

۲۔ ''وله منعها من الغزل ونحوه وعن كل ما يتأذى برائحته كالحناء والنقش والإرضاع أولى لأنه يهزلها ويلحق به عار إذا كان من الأشراف'' (ردالمحتار)۔

۳۔ ''له أن يمنعها من الأعمال كلها المقتضية للكسب لأنها مستغنية عنه بوجوب كفايتها عليه وكذا من العمل تبرعا'' (البحر الرائق)۔

۴۔ ''للزوج أن يمنع القابلة والغاسلة من الخروج لأن في الخروج إضرارا به'' (البحر الرائق)۔

۵۔ ''وحقه عليها أن تطيعه في كل مباح يأمرها به'' (ردالمحتار)۔

جن مقالہ نگار حضرات نے عدم کفالت کے وقت اجازت کو لازم قرار نہیں دیا ہے ان کے دلائل یہ ہیں:

۱۔ ولی یا شوہر کی جانب سے عدم کفالت کی صورت میں اپنے لئے اور اپنے بچوں کے لئے کسب معاش کرنا عورت پر فرض ہوجاتا ہے، اور فرائض کی ادائیگی کے لئے اجازت کی ضرورت نہیں ہوتی، جیسے فرض حج یا فرض نماز یا فرض روزہ کے لئے ولی یا شوہر سے اجازت لازم نہیں ہے۔

۲۔ نکاح کی وجہ سے شوہر کو 'حق احتباس' حاصل ہوتا ہے، اسی لئے بیوی کو گھر سے باہر نکلنے کے لئے شوہر کی اجازت ضروری ہوتی ہے، کیونکہ شوہر چاہے تو اس کو باہر نکلنے سے منع کردے، اسی حق احتباس کی وجہ سے شوہر پر بیوی کا نفقہ لازم ہوجاتا ہے، لیکن اگر شوہر کی معذوری کی وجہ سے

نفقہ کی ادائیگی نہیں ہورہی ہے تو اس کا حق حبس باقی نہ رہے گا، اب وہ بیوی کو باہر نکلنے سے منع نہیں کرسکتا، لہذا بیوی کو اس سے اجازت لینا لازم نہیں ہوگا۔

''وذلك لأن نفقة المرأة فى مقابلة الاحتباس فما دام الاحتباس قائما كانت النفقة واجبة تحقيقا للمعادلة'' (عناية مع الفتح ۴۔۲۲۰)۔

''ولأن النفقة جزاء الاحتباس فكل من كان محبوسا بحق مقصود لغيره كانت نفقته عليه، أصله القاضي والعامل فى الصدقات والمفتي والوالي'' (البحر الرائق ۴،۱۷۲)۔

''ويسقط حقه فى الإذن إذا امتنع عن الإنفاق عليها'' (الموسوعة الفقهيه)۔

''يجوز للزوجة الخروج بغير إذن الزوج لما لا غنى لها عنه كإتيان بنحو مأكل والذهاب إلى القاضي لطلب الحق واكتساب النفقة إذا أعسر بها الزوج'' (الموسوعه ۹،۱۱۰)۔

''ويحرم عليها الخروج بلا إذنه، هذا إذا قام الزوج بحوائجها التي لا بد لها منها وإن لم يقم بحوائجها فلابد لها من الخروج للضرورة'' (كشاف القناع ۳،۱۱۷)۔

۳۔ اجازت کے عدم لزوم کی تیسری وجہ یہ ہے کہ اجازت کے وجوب کا فائدہ اس وقت ظاہر ہوتا ہے جب اجازت دینے والے کو منع کرنے کا اختیار حاصل ہو، مذکورہ صورت میں شوہر اس کے نفقہ کی ادائیگی پر قادر نہ ہونے کی وجہ سے اس پوزیشن میں نہیں ہے کہ اس کو منع کرسکے، کیونکہ اگر منع کرے گا تو وہ عورت اور اس کے بچے بغیر نفقہ کے بھوکے رہیں گے اور شریعت اس کی اجازت نہیں دیتی کہ کسی کو گھر میں روک کر بھوکا مارا جائے۔

ب۔ خواتین کے لئے کسب معاش کی جگہ سفر شرعی کی مسافت پر ہو یا اس سے کم کی مسافت پر ہو، کیا دونوں کے حکم میں فرق ہوگا؟

درج ذیل مقالہ نگار حضرات کے نزدیک اگر وہ سفر شرعی کی مسافت پر ہو تو محرم یا شوہر کا ساتھ ہونا واجب ہے، اس سے کم مسافت پر ہو تو محرم کا ساتھ ہونا واجب نہیں ہے۔

مفتی عبد الرحیم قاسمی، مولانا عبد الرشید قاسمی، مفتی جعفر ملی رحمانی، مولانا لطیف الرحمن فلاحی، مولانا عبد التواب اناوی، مولانا نور الحق رحمانی، مولانا ابوسفیان مفتاحی، مولانا شوکت ثنا قاسمی، مولانا خورشید احمد اعظمی، مولانا مصطفی قاسمی آواپوری، مولانا اسرار الحق سبیلی، مولانا عبد الحئی مفتاحی، مولوی توقیر بدر قاسمی، مفتی سید باقر ارشد قاسمی، مولانا افتخار احمد مفتاحی، مفتی جنید عالم ندوی قاسمی اور راقم الحروف کی بھی یہی رائے ہے۔

ان حضرات کی دلیل یہ حدیث نبوی ہے:

''لا يحل لامرأة تؤمن بالله واليوم الآخر أن تسافر سفرا يكون ثلاثة أيام فصاعدا إلا ومعها أبوها أو ابنها أو زوجها أو أخوها أو ذو محرم منها'' (مسلم، کتاب الحج)۔

بعض مقالہ نگار حضرات سفر شرعی سے کم میں بھی محرم کے ساتھ ہونے کو لازم بتاتے ہیں۔

مفتی عارف باللہ قاسمی لکھتے ہیں: سفر شرعی کا فاصلہ ہو یا اس سے کم فاصلہ ہو لیکن اس جگہ آنے جانے کو سفر سے تعبیر کیا جاتا ہو تو محرم لازم ہے۔

مولانا یاسر اعظمی اور مولانا اقبال ٹنکاروی لکھتے ہیں کہ بغیر محرم کے سفر نہ کرے خواہ مسافت سفر تین دن سے کم ہی ہو۔

مولانا ارشد فہیم مدنی کے نزدیک سفر شرعی کی مسافت ہو یا نہ ہو دونوں کا حکم یکساں ہوگا، اس میں کوئی فرق نہیں ہے۔

مفتی انور علی اعظمی اور مولانا اشتیاق احمد اعظمی لکھتے ہیں: جوان عورت کا کسب معاش کے لئے تنہا بستی سے باہر جانا بالکل درست نہیں ہے، خواہ سفر شرعی کی مسافت سے کم ہو۔

مولانا اقبال احمد قاسمی، مولانا شمس الدین مظاہری اور مولانا محفوظ الرحمن آسام لکھتے ہیں: اگر حصول معاش کے لئے نکلنا ناگزیر ہو تو وہ ایک دن اور رات کی مسافت (سولہ میل) سے کم فاصلہ پر کسی جائز کام کے لئے بغیر محرم کے بھی جا سکتی ہے، اس سے آگے بغیر محرم کے نہیں جا سکتی۔

ان حضرات کی دلیل یہ حدیث نبوی ہے:

''لا يحل لامرأة تؤمن بالله واليوم الآخر تسافر مسيرة يوم إلا مع ذي محرم'' (مسلم)۔

ڈاکٹر ظفر الاسلام صدیقی لکھتے ہیں: اگر بقدر کفاف روزی کا ذریعہ مسافت شرعی سے کم میں حاصل ہو جاتا ہے تو اسی پر اکتفاء کرے بدون مجبوری اگر مسافت شرعی کے حد کو پار کر رہی ہے تو کراہت سے خالی نہیں ہے۔

مفتی عبدالاحد فلاحی نے بغیر مجبوری کے سفر شرعی کی مسافت تک جانے کو ناجائز قرار دیا ہے۔

ج۔ کسب معاش کے لئے دن کے وقت خواتین کے گھر سے باہر جانے میں اور رات کے وقت گھر سے باہر جانے میں کچھ فرق ہے؟

درج ذیل مقالہ نگار حضرات کے نزدیک اس میں رات اور دن میں کوئی فرق نہیں ہے، مجبوری میں شوہر کی اجازت سے رات میں بھی نکل سکتی ہے۔

مولانا عبدالرشید قاسمی، ڈاکٹر ظفر الاسلام صدیقی، مفتی عبدالاحد فلاحی، مولانا محمد ارشد فہیم مدنی، مولانا محمد یاسر اعظمی، مولانا محفوظ الرحمن، مولانا شمس الدین مظاہری، مولانا شاہجہاں ندوی، مولانا شوکت ثنا قاسمی، مولانا مصطفی قاسمی آداپوری۔

مفتی سید باقر ارشد قاسمی لکھتے ہیں کہ اگر اس جگہ صرف عورتیں ہی ملازمت میں ہوں تو رات میں بھی ملازمت کر سکتی ہے اور اگر وہاں مرد بھی ہوں تو رات میں ملازمت کرنا جائز نہیں ہوگا۔

جبکہ دیگر مقالہ نگار حضرات یہ لکھتے ہیں کہ صرف دن میں کسب معاش کے لئے نکلنے کی اجازت ہے، رات میں کسب معاش کے لئے نکلنے کی قطعی اجازت نہیں ہے۔ اس کے قائل ہیں: مفتی عبدالرحیم قاسمی، مفتی جعفر ملی رحمانی، مولانا لطیف الرحمن فلاحی، مولانا اقبال احمد قاسمی، مولانا نورالحق رحمانی، مفتی انور علی اعظمی، مولانا ابوسفیان مفتاحی، مولانا خورشید احمد اعظمی، مولانا اشتیاق احمد اعظمی، مولوی توقیر بدر قاسمی، مولانا افتخار احمد مفتاحی، مفتی جنید عالم ندوی قاسمی اور راقم الحروف کی بھی یہی رائے۔ ان حضرات کے دلائل یہ ہیں:

۱۔ اللہ تعالی نے دن کو کسب معاش کے لئے مقرر فرمایا ہے: ''وجعلنا الليل لباسا وجعلنا النهار معاشا'' (سورۂ نبا)۔

۲۔ جس عورت کے شوہر کی وفات ہوگئی ہو اور وہ محتاج ہو تو اس کو نفقہ کے لئے صرف دن میں نکلنے کی فقہاء نے اجازت دی ہے، اس کی علت یہ بیان کی ہے کہ کسب معاش عادۃً دن میں ہوتا ہے۔

''لأن نفقتها عليها وعسى لاتجد من يكفيها مؤنتها فتحتاج إلى الخروج لنفقتها غير أن أمر المعاش يكون بالنهار عادة دون الليالي فأبيح الخروج لها بالنهار دون الليالي'' (فتح القدير ۴،۱۶۶)۔

۳۔ رات میں کسب معاش کے لئے گھر سے باہر رہنے میں ان کی عفت و عصمت کی حفاظت کا مسئلہ زیادہ ہوگا، بہت سارے فتنے جنم لے سکتے ہیں، بڑی خرابیاں لاحق ہوں گی، مفاسد کا قوی اندیشہ ہے، اس لئے احتیاط کا تقاضہ یہی ہے کہ رات کو کسب معاش کی اجازت نہ دی جائے۔

۴۔ جب ان کو خارج بیت جانے کی اجازت ضرورت کے تحت دی جارہی ہے اور یہ ضرورت دن میں کسب معاش سے پوری ہو جارہی ہے تو اجازت بھی ضرورت کے بقدر صرف دن میں ہی ہونی چاہئے۔

۵۔ رات شوہر کا حق ہے، رات میں کسب معاش سے شوہر کے لئے تسکین نفس نہیں پایا جائے گا اور اس کے حقوق کی ادائیگی نہیں ہوگی۔

نکات بحث:

آج اس مجلس میں ہمیں درج ذیل امور پر غور کرنے کی ضرورت ہے کہ اس دور میں اگر خواتین کو گھر سے باہر نکل کر معاشی جدوجہد کرنے کی

اجازت دے دی جائے تو:

۱۔ کیا حجاب کی شرعی پابندی باقی رہ پائے گی؟

۲۔ غیر محرم افراد سے احتراز ہو پائے گا؟ ان سے روابط میں اور ساتھ بیٹھ کر کام کرنے میں تنہائی اور خلوت سے اجتناب ہو پائے گا؟

۳۔ اپنی خانگی ذمہ داری، شوہر کے حقوق کی ادائیگی، بچوں کی پرورش اور تربیت وغیرہ جیسے فرائض معاشی جدوجہد کے ساتھ پورے ہو پائیں گے؟

۴۔ کسب معاش کے لئے محرم کے ساتھ سفر شرعی کی اجازت اکثر مقالہ نگار حضرات نے دی ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ کیا اس پر عمل ہو سکے گا کہ ہمیشہ محرم کے ساتھ ملازمت کے لئے جائے اور آئے؟

یہ سب ایسے سوالات ہیں جن کا جواب دینا آسان نہیں ہے، حقیقت یہ ہے کہ جب خواتین کے قدم گھر سے باہر نکلنا شروع ہو جاتے ہیں تو پھر کوئی پابندی باقی نہیں رہتی، خواتین کے گھر سے باہر نکل کر معاشی جدوجہد کرنے میں تمام قسم کی خرابیاں بالکل ظاہر اور نمایاں طور سے نظر آتی ہیں، خصوصاً آفس میں، کارخانے میں، دکانوں میں اور دیگر ایسی تمام جگہوں میں جہاں غیر مردوں کے ساتھ صرف اختلاط ہی نہیں بلکہ تنہائی اور خلوت کے بکثرت مواقع پیش آتے رہتے ہیں، اس لئے نفس کسب معاش کی اباحت کے باوجود ان شدید خرابیوں اور مفاسد کی وجہ سے خواتین کو عام حالات میں گھر سے باہر کسب معاش کی اجازت دینا بہت غور طلب مسئلہ ہے۔

۵۔ بعض مقالہ نگار نے لکھا ہے کہ اگر شوہر یا ولی عورت کی کفالت کر رہے ہیں تو عورت کے لئے گھر سے باہر نکل کر کسب معاش کرنا جائز نہیں ہے، اسی طرح متعدد مقالہ نگار حضرات نے لکھا ہے کہ اگر ولی یا شوہر کی طرف سے کفالت ہو رہی ہے تو باہر نکلنے کے لئے اجازت ضروری ہے اور اگر کفالت نہیں ہو رہی ہے تو اجازت ضروری نہیں ہے، سوال یہ ہے کہ کفالت کی وہ کیا مقدار ہے جس کو کسب معاش کے بارے میں معیار اور حد فاصل قرار دیا جائے؟

مولانا عبدالرشید قاسمی نے اس سلسلے میں اچھی بحث اٹھائی ہے اور حدیث اور فقہ کی روشنی میں ایک معیار اور حد فاصل متعین کرنے کی کوشش کی ہے، نفقہ بقدر کفایت ہوتا ہے، حضرت ابوسفیانؓ کی اہلیہ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوسفیانؓ کے مال میں سے ان کے اور ان کی اولاد کے لئے بقدر کفایت لینے کی اجازت دی۔ "خذی من مال أبی سفیان ما یکفیك وولدك بالمعروف"۔

اور چونکہ نفقہ حاجت کی وجہ سے واجب ہوتا ہے تو حاجت کے بقدر ہی لازم ہوگا، بقدر کفایت میں حاجت پوری ہو جاتی ہے، اس لئے اس سے زیادہ لازم نہ ہوگا۔

لیکن اس زمانہ میں بقدر کفایت نفقہ کی مقدار کیا ہوگی؟ کیا صرف چند روٹی اور سالن مہیا کر دینے سے اور سال میں ایک دو جوڑے کپڑے اور کسی جگہ رہائش فراہم کر دینے سے بقدر کفایت نفقہ کی ادائیگی ہو جائے گی، قرن اولی میں تو خلیفہ وقت بھی روکھا سوکھا، کھا کر موٹا جھوٹا پہن کر بلکہ ایک چادر پر بھی بسر کر لیا کرتے تھے، لیکن اس زمانے میں اس کا اعتبار نہیں ہوگا، زمان، مکان، ماحول، معاشرہ، خاندان، علاقہ ان سب کو نفقہ کی ادائیگی میں ملحوظ رکھنا ہوگا۔ اس سلسلہ میں عرف اور عادت کا اعتبار ہوگا، اسی اعتبار سے نفقہ کی مقدار کا تعین ہوگا، دیہاتوں اور شہروں میں فرق ہوگا۔ ہندوستان اور مغربی ممالک میں بھی فرق ہوگا۔

☆☆☆

عرض مسئلہ

خواتین کی ملازمت

مفتی انور علی اعظمی [1]

راقم الحروف کو اٹھارہویں فقہی سمینار کے ایک اہم موضوع ''خواتین کی ملازمت'' سے متعلق سوال نمبر ۶ تا ۱۰ کے عرض مسئلہ کا حکم دیا گیا ہے، اس موضوع پر اکیڈمی کی جانب سے کل ۴۰ مقالات بھیجے گئے تھے:

سوال نمبر:۱۔ شریعت اسلامی خواتین کے لئے کسب معاش کو کس نظر سے دیکھتی ہے؟

شریعت کے پیش کردہ نظام کے مطابق عورت کے نان ونفقہ کی ذمہ داری ان کے باپ، بیٹا، شوہر اور بھائی پر ہے۔ یہ حضرات عورتوں کے نان ونفقہ کے ذمہ دار ہیں، ڈاکٹر مصطفی سباعی اپنی مشہور کتاب ''المرأۃ بین الفقہ والقانون'' میں لکھتے ہیں: ''فلسفة الاسلام أن البنت والمرأة بوجه عام لا يصح أن يكلف بالعمل تنفق على نفسها بل على أبيها أو زوجها أو أخيها مثلاً أن يقوم بالإنفاق عليها لتتفرغ لحياة الزوجية والأمومة''۔

مفتی محمد شفیع صاحب معارف القرآن (۳۹۸/۲) پر "الرجال قوامون علی النساء" کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ دوسرا اشارہ اہم اصول زندگی کی طرف یہ بھی ہے کہ عورت اپنی خلقت اور فطرت کے اعتبار سے نہ اس کی متحمل ہے کہ اپنے مصارف خود کما کر پیدا کرے، نہ اس کے حالات اس کے لئے سازگار ہیں کہ محنت مزدوری اور دوسرے ذرائع کسب میں مردوں کی طرح بازاروں اور دفتروں میں پھرا کرے، اس لئے حق تعالی نے اس کی پوری ذمہ داری مردوں پر ڈال دی ہے (معارف القرآن ۳۹۸/۲)۔

خطبہ حجۃ الوداع میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں کے بارے میں اللہ سے ڈرایا اور ارشاد فرمایا: "ولهن عليكم رزقهن وكسوتهن بالمعروف" (صحیح مسلم)، اس لئے عام حالات میں عورت کسب معاش سے مستغنی ہے، لیکن اگر کوئی عورت ملازمت کرتی ہے تو اس کے لئے کیا حدود ہیں اس کے جواب میں اکثر مقالہ نگار حضرات کی بیان کردہ شرائط بہت حد تک مشترک ہیں اور وہ مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ اسلام اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ ایک جوان عورت اجنبی مرد کے سامنے اپنی زینت ظاہر کرے، زیادہ سے زیادہ اپنی ہتھیلیاں، کلائیاں اور چہرہ کا کچھ حصہ کھول سکتی ہے وہ بھی بغیر زینت اور بناؤ سنگار کے۔

۲۔ اسلام اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ کوئی عورت کسی اجنبی مرد کے ساتھ تنہائی میں رہے باوجودیکہ وہ اپنے لباس پوشاک میں باوقار اور سنجیدہ ہی کیوں نہ ہو، صحیح حدیث میں وارد ہے کہ ایک مرد کسی اجنبی عورت کے ساتھ تنہائی میں نہیں رہتا مگر شیطان ان دونوں کا تیسرا بن جاتا ہے۔

۳۔ اسلام اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ عورت اجنبی مردوں کے ساتھ گھل مل کر رہے (المرأۃ بین الفقہ والقانون، ص ۱۸۵)۔

۴۔ عورت کی ملازمت کے لئے شوہر یا ولی کی اجازت بھی ضروری ہے جبکہ وہ اس کے نان ونفقہ کی ذمہ داریاں پوری کرتے ہوں۔

اجنبی مردوں کے سامنے ڈاکٹر مصطفی سباعی نے چہرہ کھولنے کی اجازت دی ہے لیکن اکثر مقالہ نگار حضرات کچھ مخصوص جگہوں کے علاوہ اس کو جائز نہیں سمجھتے اور مفتی محمد شفیع صاحب کی رائے کو ترجیح دیتے ہیں، وہ تحریر فرماتے ہیں کہ ائمہ اربعہ میں امام مالک، امام شافعی اور امام احمد بن حنبل نے

[1] ...

چہرہ اور ہتھیلیاں کھولنے کی مطلق اجازت نہیں دی۔امام اعظم ابوحنیفہؒ نے اگر چہ خوف فتنہ کا نہ ہونا شرط قرار دیا ہے اور چونکہ عادۃً یہ شرط مفقود ہے اس لئے فقہاء حنفیہ نے غیر محرم مردوں کے سامنے چہرہ اور ہتھیلیاں کھولنے کی اجازت نہیں دی (سورۂ احزاب، معارف ۷ر۲۱۹)۔

سوال ۷۔ ملازمت کرنے والی خواتین اگر ایسے ادارے میں کام کریں جہاں خواتین ہی خدمات انجام دیتی ہوں اور کام کی جگہوں میں مرد نہ ہوتے ہوں، البتہ ادارہ کے ذمہ دار مرد ہوں تو اس صورت میں پردے کے کیا احکام جاری ہوں گے؟

اس سوال کا جواب ۳۱ حضرات نے دیا ہے، جن کے اسمائے گرامی یہ ہیں:

مولانا افتخار احمد مفتاحی، مولانا اقبال احمد ٹنکاروی، مولانا عبداللہ خالد لوناواڑی، مولانا عبیداللہ ندوی، مولانا شوکت ثناء قاسمی، مولانا صبیح اختر آسام، مفتی جعفر ملی رحمانی، مفتی یاسر اعظمی، مولانا عبدالاحد فلاحی، مولانا ظفر الاسلام اعظمی، مولانا اقبال احمد قاسمی کانپوری، مولانا محمد فاروق دربھنگوی، مولانا عبدالرشید کانپوری، مولانا ارشد مدنی، قاضی محمد ہارون مینگل، سید باقر ارشد قاسمی، مولانا خورشید احمد اعظمی، مولانا شمس الدین مظاہری، مولانا اشتیاق احمد اعظمی، مولانا مصطفی قاسمی آواپوری، مولانا لطیف الرحمن فلاحی، مفتی محبوب علی وجیہی، مولانا محفوظ الرحمن آسامی، مولانا سلمان پالنپوری، شیخ کلیم اللہ، مفتی عارف باللہ قاسمی، مولانا شاہجہاں ندوی، مولانا عبدالحیٔ مفتاحی اور مفتی انور علی اعظمی۔

مولانا ظفر الاسلام اعظمی صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ ایسی عورت سے پیغام رسانی کا کام لیا جائے جو ذمہ دار مرد کی محرم ہو، جناب اسرار الحق سبیلی صاحب کی رائے یہ ہے کہ اسکول یا ادارہ کے ذمہ دار کے سامنے چہرہ کھولنے کی اجازت ہوسکتی ہے، دلیل میں انہوں نے علامہ حصکفی کی ایک عبارت تحریر کی ہے، مولانا خورشید احمد اعظمی تحریر فرماتے ہیں کہ ادارہ کے ذمہ دار اگر مرد ہوں تو حسب ضرورت عورت پردے کے پیچھے سے ان سے بات کرسکتی ہے۔

مولانا شمس الدین مظاہری لکھتے ہیں کہ غیر مسلم عورتیں غیر محرم مردوں کے حکم میں ہیں، غیر محرم مردوں سے جتنا پردہ لازم ہے اتنا پردہ ان سے بھی لازم ہوگا۔

بقیہ مقالہ نگاروں نے اس صورت حال میں پردہ کے احکام کے متعلق جو باتیں لکھیں ہیں وہ یہ ہیں:

ادارہ کا کوئی مرد تنہائی میں کسی خاتون کارکن سے بات نہ کرے، ادارہ کی ضروریات کے سلسلہ میں اگر ذمہ دار مردوں کے ساتھ تبادلہ خیال کی ضرورت ہو تو خواتین پردے کے اہتمام کے ساتھ بیٹھیں، چہرہ بھی پورا نہ کھولیں اور یہ بھی ضروری ہوگا کہ دونوں فریق اپنی نگاہیں نیچی رکھیں۔خواتین اپنی آواز میں لوچ اور چاشنی سے پرہیز کریں۔"ولا تخضعن بالقول وقلن قولا معروفا" پر عمل کریں۔اسی طرح خواتین کارکن ذمہ دار مردوں کے ساتھ ہنسی مذاق اور بے تکلفی کا ماحول ہرگز نہ بنائیں۔

سوال نمبر ۸۔ اگر عورت ایسی جگہ کام کرے جہاں مرد کارکن بھی ہوں تو اس وقت خاتون کارکنوں کے لئے پردہ کی کیا حدود ہوں گی، اس سلسلہ میں کیا سن رسیدہ اور جوان عورتوں کے درمیان فرق ہوگا؟

اس مسئلہ میں جوان اور سن رسیدہ عورت کے درمیان فرق نہ کرنے والے حضرات کے اسمائے گرامی یہ ہیں:

مولانا خورشید احمد اعظمی، مفتی عارف باللہ قاسمی، مولانا محمد یاسر اعظمی، مولانا محمد مصطفی قاسمی آواپوری، مولانا محمد ارشد مدنی، قاضی ہارون مینگل، مولانا سید باقر ارشد قاسمی، مولانا ابوسفیان مفتاحی۔

مقالہ نگار حضرات کی اکثریت نے جوان اور سن رسیدہ عورت کے درمیان فرق کیا ہے، فرق کرنے والوں کے اسمائے گرامی یہ ہیں:

مولانا اسرار الحق سبیلی، مولانا صبیح اختر آسام، مولانا عبداللہ خالد لوناواڑی، مولانا شوکت ثناء قاسمی، مفتی محبوب علی وجیہی، مولانا اقبال احمد ٹنکاروی، مولانا افتخار احمد مفتاحی، مولانا عبدالاحد فلاحی، مولانا اشتیاق احمد اعظمی، مولانا لطیف الرحمن فلاحی، مولانا شمس الدین مظاہری، مولانا اقبال احمد کانپوری، مولانا محفوظ الرحمن آسام، مولانا ظفر الاسلام اعظمی، شیخ کلیم اللہ عمری، مولانا شاہجہاں ندوی، مولانا محمد جعفر ملی رحمانی، مولانا سلمان پالنپوری، مولانا عبدالرشید کانپوری، مولانا عبید اللہ فلاحی، مفتی انور علی اعظمی۔

دونوں گروہ کے اکثر علماء کی رائے یہ ہے کہ جوان مشتہاۃ عورتیں ایسے اداروں میں کام نہ کریں جہاں مرد کارکن بھی ہوں، مغربی طرز معاشرت چاہے اس انداز کو پسند کرتا ہو مگر اسلامی تعلیمات اور اسلامی مزاج اس کی بالکل اجازت نہیں دیتا آج بڑے شہروں میں آفسوں میں کام کرنے والی لڑکیاں جس انداز میں رہتی ہیں درحقیقت وہ فحاشی اور بے حیائی کے پرچار کا ایک ذریعہ ہے، ایسے ماحول میں اگر ایک دو فیصد مسلمان لڑکیاں بھی ہوں تو ان کا اپنے آپ کو پردہ کے اہتمام کے ساتھ اور شرعی ضابطہ کے مطابق رکھنا بہت مشکل ہوگا، اس لئے مسلمان جوان لڑکیوں کو ایسی ملازمت کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔ اللہ تعالی کا ارشاد ہے: "وقرن في بيوتكن ولا تبرجن تبرج الجاهلية الاولى"، البتہ ایسی سن رسیدہ عورت جو حد اشتہاء سے آگے نکل چکی ہے اس کے لئے کچھ گنجائش ہوسکتی ہے، ہدایہ جلد رابع کتاب الکراہیہ میں مذکور ہے کہ حضرت ابوبکرؓ اپنی رضاعی قبیلہ کی عمر دراز عورتوں سے مصافحہ کرتے تھے اور عبداللہ بن زبیرؓ نے اپنی تیمارداری کے لیے ایک عمر دراز عورت کو اجرت پر رکھا تھا۔

سوال نمبر ۹۔ کیا اس کا بھی فرق ہوسکتا ہے کہ ایک کام کی انجام دہی میں عورت کا سامنا مردوں سے بہت زیادہ اور دوسرے کام کی انجام دہی میں کم ہے مثلاً دوکان میں سیلز مین اور آفس میں یکسوئی سے بیٹھ کر کام کرنے میں فرق ہوسکتا ہے؟

اس سوال کے جواب میں اکثر مقالہ نگار حضرات نے جوان مشتہاۃ خاتون کے لئے دونوں طرح کا کام ناجائز قرار دیا ہے، اور دونوں میں کوئی فرق نہیں کیا ان حضرات کے اسمائے گرامی یہ ہیں:

مولانا اقبال احمد کانپوری، مولانا ظفر الاسلام اعظمی، مولانا خورشید احمد اعظمی، مولانا ارشد مدنی، مفتی محمد یاسر اعظمی، مولانا سلمان پالنپوری، مولانا افتخار احمد مفتاحی، مولانا ابوسفیان مفتاحی، مولانا عبدالرشید کانپوری، مفتی سید باقر ارشد قاسمی، مولانا محمد فاروق دربھنگوی، مولانا مصطفی قاسمی، مولانا اقبال احمد ٹنکاروی، مولانا عبداللہ خالد لوناواڑی، مولانا مبارک حسنی ندوی، مولانا عطاء اللہ قاسمی، راقم السطور مفتی انور علی اعظمی اور مولانا اشتیاق احمد اعظمی۔

اور دوسرے مقالہ نگار حضرات جنہوں نے ان دونوں کاموں میں فرق کیا ہے، دوکان میں بیٹھ کر سامان بیچنے کو ناجائز قرار دیا ہے اور آفس کی ملازمت کو جائز کہا ہے ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں:

مولانا محفوظ الرحمن آسام، مولانا صبیح اختر آسام، مفتی عبدالرحیم قاسمی، شیخ کلیم اللہ، مفتی عارف باللہ قاسمی، مولانا شمس الدین مظاہری، مولانا عبداللہ ندوی، مولانا شاہجہاں ندوی، مولانا جعفر ملی رحمانی، مولانا اسرار الحق سبیلی، مفتی محبوب علی وجیہی۔

مولانا جعفر ملی رحمانی فرماتے ہیں کہ عورت کے لئے ملازمت کی اجازت بدرجہ مجبوری دی جائے گی، اس لئے وہ اپنے لئے ایسی ملازمت اختیار کرے جس کی انجام دہی میں عورت کا سامنا مردوں سے کم ہو۔ مولانا اسرار الحق سبیلی کہتے ہیں کہ خواتین اگر ملازمت کرنے پر مجبور ہوں تو انہیں ایسی ملازمت کو ترجیح دینا چاہئے جہاں زیادہ سے زیادہ پردہ ہوسکے اور کم سے کم بے پردگی ہو، مولانا عارف باللہ قاسمی نے دونوں طرح کی ملازمتوں میں فرق تو ضرور کیا ہے لیکن کسی اجنبی مرد کے آنے کی صورت میں ایک جوان عورت یکسوئی اور تنہائی کے ساتھ کیسے رہ سکتی ہے؟ اگر ایمانداری کے ساتھ اس کا جائزہ لیا جائے تو یہی فیصلہ کرنا ہوگا کہ آفسوں میں بھی مردوں کی آمدورفت برابر جاری رہتی ہے، اور اگر بالفرض کسی عورت کو یکسوئی اور تنہائی میسر ہو جائے تو اس وقت ایک اجنبی مرد کا تنہا آنا اور زیادہ خطرناک ہوگا، اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت واضح ہدایت دی ہے کہ کوئی اجنبی مرد کسی عورت کے ساتھ تنہائی میں نہ رہے ورنہ ان دونوں کا تیسرا شیطان ہو جائے گا۔ اس لئے جوان مسلمان لڑکیوں کو ایسے کام کرنے کی اجازت نہیں دی جاسکتی البتہ اگر کوئی عمر دراز عورت ہو جو حد اشتہاء سے متجاوز ہو چکی ہو وہ اپنی مجبوری کی بنا پر ایسی ملازمت اختیار کرتی ہے تو اس کے معاملے میں

سوچا جاسکتا ہے۔

سوال نمبر ۱۰۔ ملازمت کی غرض سے عورت کا اپنے گھر اور اپنوں سے دور (خواہ اندرون ملک یا بیرون ملک) مستقل قیام کا کیا حکم ہے؟

ملازمت کی غرض سے عورت کا اپنے گھر اور اپنوں سے دور رہ کر تنہا مستقل قیام کرنا جائز نہیں ہے، خواہ وہ مقام اندرون ملک ہو یا بیرون ملک ہو، یہی رائے تقریباً سبھی مقالہ نگاروں کی ہے، ان حضرات کے اسماء گرامی مندرجہ ذیل ہیں:

مولانا عبدالرحیم قاسمی، مولانا عبیداللہ ندوی، مولانا عبدالرشید کانپوری، مولانا سید اسرار الحق سبیلی، مولانا محمد فاروق دربھنگوی، مولانا افتخار احمد مفتاحی، مفتی محمد یاسر قاسمی، مولانا محمد عارف باللہ قاسمی، مولانا جعفر علی رحمانی، مولانا محمد شاہجہاں ندوی، مولانا عبدالاحد فلاحی، مولانا شمس الدین مظاہری، مولانا شوکت ثنا قاسمی، مولانا اشتیاق احمد اعظمی، مولانا مبارک حسین ندوی، مولانا کلیم اللہ عمری، قاضی محمد ہارون مینگل، مولانا عبدالحئی مفتاحی، مولانا محمد سلمان پالنپوری، مولانا عبداللہ خالد لونا واڑی، مولانا خورشید احمد اعظمی، مولانا سید باقر ارشد قاسمی، مولانا ارشد مدنی، مولانا لطیف الرحمن فلاحی، مولانا محفوظ الرحمن آسام، مولانا صبیح اختر آسام، مفتی محبوب علی وجیہی، مولانا اقبال احمد قاسمی اور راقم السطور مفتی انور علی اعظمی۔

البتہ اس مسئلہ میں مولانا ظفر الاسلام اعظمی نے اختلاف کیا ہے، وہ لکھتے ہیں کہ ایسی عورت جس کا نہ شوہر ہو نہ باپ اور نہ کوئی ایسا رشتہ دار جو اس کی معاشی کفالت کر سکے اور نہ خود عورت کے پاس اتنا مال ہے جس کے ذریعہ وہ اپنی ضروریات پوری کر سکے تو اس صورت میں عورت کے لئے بقدر ضرورت کسب معاش کے لئے شرعی پردہ کی پابندی کے ساتھ نکلنا جائز ہے۔ وہ اپنے وطن یا ملک ہی میں کسب معاش کرے اور بیرون ملک جانے کی اجازت نہیں، لیکن اگر بیرونی ملک جاکر معاشی سدھار ناگزیر ہو جائے نیز انہیں کوئی اپنا محرم بھی نہ ملے تو ایسی صورت میں قابل اعتماد عورتوں کی معیت میں بیرون ملک کا سفر امام مالکؒ، اور امام شافعیؒ کے فقہ کے مطابق کر سکتی ہے، مانعین کی دلیل صحیح مسلم کی یہ روایت ہے: ''لا يحل لامرأة تومن بالله واليوم الآخر تسافر مسيرة ثلاث ليال إلا ومعها ذي محرم وفي رواية لا تسافر المرأة يومين من الدهر إلا ومعها ذو محرم منها أو زوجها وفي رواية لأبي داؤد لا تسافر بريدا وفي رواية مسيرة يوم وليلة وفي رواية لا يحل لامرأة تومن بالله واليوم الآخر تسافر مسيرة يوم الامع ذي محرم''، مذکورہ بالا روایات کی روشنی میں عورت کے لئے ایک دن کا سفر بھی بلا محرم کے درست نہیں، امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک اگرچہ مسافت سفر سے کم میں گنجائش ہے، لیکن فساد زمانہ کی بنا پر احتیاط اسی میں ہے کہ ایک جوان عورت اپنے شہر سے دوسرے شہر کا سفر بھی بغیر محرم نہ کرے، علامہ نووی نے علامہ باجی پر رد کرتے ہوئے یہ کہا کہ کبیرہ غیر مشتہاۃ کو بھی تنہا سفر کی اجازت نہیں ہے، وہ لکھتے ہیں:

''قال النووي: وهذاالذي قاله الباجي لا يوافق عليه، لأن المرأة مظنة الطمع فيها ومظنة الشهوة ولو كانت كبيرة وقد قالوا لكل ساقطة لاقطة'' (صحيح مسلم مع نووی ۱،۴۳۳)۔

اس لئے جوان عورت کا کسب معاش کے لئے تنہا اپنے گھر اور اپنوں سے دور جانا اور مستقل قیام کرنا ناجائز ہوگا۔

☆☆☆

عورتوں کی تعلیم اور ملازمت کے مشترک پیداواری بہبود پر اثرات

ابوصالح شریف

عورتوں کی تعلیم اور ملازمت کلید ہے:

ہندوستان ایک کثیر المذاہب معاشرہ کا ملک ہے، ان میں ایسے فرقے بھی ہیں جن کی اپنی مخصوص مذہبی شناخت ہے، یہ فرقے جس جگہ رہتے ہیں وہاں ان میں معیار زندگی، آمدنی خرچ، مواقع ووسائل تک رسائی، شہری سہولیات اور مقامی نظم وغیرہ جو ایک بہتر معیار زندگی کی ضمانت ہوتے ہیں، ان سہولیات کی فراہمی کی سطح وسعت اور معیار میں فرق ہوتا ہے، اگرچہ دیگر فرقوں کے مقابلے میں مسلمان زیادہ تر شہری علاقوں میں رہتے ہیں، لیکن ان کی اکثریت دیہی علاقوں میں زراعت اور حرفت کے پیشوں سے متعلق ہے، مسلمانوں کا خاندانی نظام خانگی سربراہ کے تحت ہوتا ہے، جس میں خواتین اور بچے اس کے زیر کفالت ہوتے ہیں، خواتین کو اس قابل نہیں سمجھا جاتا کہ وہ ملازمت یا کسی حرفت کے ذریعہ خاندان کی آمدنی میں اضافہ کریں۔ یہ نقطہ نظر بے بصر امتیاز وعصبیت پر مبنی ہے اور خواتین کے اس اہم کردار کو اہمیت نہیں دیتا جو وہ بچوں کی پرورش کے ذریعہ انجام دیتی ہیں۔

جدید تحقیق اور لٹریچر نے اس حقیقت کو متعدد مثالوں کے ذریعہ واضح طور پر ثابت کردیا ہے کہ خواتین نہ صرف مستقبل کے شہریوں کی تربیت اور پرورش کا بنیادی ذریعہ ہیں بلکہ نسلوں تک اقدار، خیالات اور مہارت وہنر کی ترسیل کا بھی ذریعہ ہوتی ہیں، تعلیم، روزگار اور آمدنی ان کا آپس میں گہرا تعلق ہے خواہ صرف ۵ یا ۷ سال کی اسکول کی تعلیم کیوں نہ ہو جس کے ذریعہ خواتین روزگار حاصل کریں، ہم یہاں بہت اعلی تعلیم کے بارے میں نہیں سوچ رہے ہیں کیونکہ انتہائی اعلی تعلیم سے صرف مخصوص مفاد اور منافع حاصل ہوتے ہیں، جبکہ عمومی (ثانوی) تعلیم سے روزگار کے زیادہ مواقع حاصل ہوتے ہیں، اور اس سے وسیع تر معاشرتی اور ملی فوائد کی راہیں کھلتی ہیں اور معاشرہ نیز متعلقہ فرقہ پر اس کے وسیع تر اثرات مرتب ہوتے ہیں، عورتوں کی تعلیم اور روزگار سے بچوں کی صحت میں بہتری ہوتی ہے تعلیم اور روزگار کے مواقع بڑھتے ہیں کیونکہ ان سب باتوں کا آپس میں بہت گہرا تعلق ہے۔

اس بارے میں امت مسلمہ کو اس ہدایت پر یقین رکھنا چاہئے جسے ہم ایمان کا اثر سے تعبیر کرسکتے ہیں اور تعلیم اور روزگار بہتر آمدنی اور وسائل پر کنٹرول سے اسے دوام حاصل ہوسکتا ہے، بالفاظ دیگر آمدنی کی سطح میں اضافہ سے انسان دین کی طرف زیادہ مائل ہوتا ہے کم تر نہیں۔ مقامی احوال وشرائط کو پیش نظر رکھتے ہوئے ملت کے افراد ایسے روزگار یا پیشے اختیار کرسکتے ہیں جسے خواتین بھی انجام دے سکیں اور اس کی مختلف نوعیت سے استفادہ کرسکیں اور صرف روایتی کاموں کی اسیر بن کر نہ رہ جائیں۔

جہاں تک مذکورہ بالا اصطلاح ایمان کا اثر کے عملی رخ کا تعلق ہے تو خواتین کو ضرور کسی نہ کسی روزگار سے وابستہ ہونا چاہئے خواہ اس کے لئے انہیں گھر سے باہر ہی کیوں نہ جانا پڑے، یا سفر کرنا پڑے، مسلم گھرانوں میں اضافی منفعت کے حصول کے لئے روزگار کے جدید ذرائع اختیار کرنا مثلاً ملبوسات تیار کرنا، خوراک (غذائی اشیاء) کے ڈبے پیکٹ وغیرہ تیار کرنا، اور اسی طرح مقامی سطح کے پیشے اور کاروبار کی خاطر افراد کو میدان عمل میں لانا ضروری ہے۔

اس سلسلہ میں کوشش یہ ہونی چاہئے کہ خواتین کو سرکار کی طرف سے شروع کی گئی خود روزگاری کی مختلف اسکیموں تک رسائی کا اہل بنایا جائے، یہ سرکاری اسکیمیں مسلم اکثریتی علاقوں میں شروع کی جاچکی ہیں۔

روزگار اور تعلیم کا بہت گہرا رشتہ ہے، اور یہ دونوں مل کر مسلمانوں کی آئندہ نسلوں کی مالی معاشی بہتری کی ضمانت بنیں گے۔ یہ رشتہ (ربط) مختصر طور پر ذیل میں بیان کیا جاتا ہے۔

۱۔ تعلیم کا معیار اور روزگار / ملازمت کے درجہ کا بچوں کی تعلیم صحت اور غذائیت (معیار خورد و نوش) پر گہرا اثر پڑتا ہے۔

۲۔ باپ کے مقابلہ میں ماں کے تعلیمی معیار اور روزگار کی سطح کا بچوں کی تعلیم و صحت اور معیار زندگی پر زیادہ گہرا اثر ہوتا ہے۔

۳۔ تعلیم کی کم تر سطح مثلاً ساتویں پاس، دسویں پاس یا یونیورسٹی سے پہلے کی معیار کی تعلیم (ثانوی درجہ) کے مثبت اثرات وسیع ہوتے ہیں، اعلیٰ تعلیم کے اضافی فوائد ملت کے لئے بڑھتے رہتے ہیں، لیکن یہ مخصوص طبقہ میں ظاہر ہوتے ہیں۔

۴۔ خواتین کے منصبی معیار کے وسیع مثبت اثرات ہوتے ہیں لیکن اسی کے ساتھ کچھ منفی اثرات بھی ہوتے ہیں جو تین سال سے کم عمر کے بچوں پر ظاہر ہوتے ہیں۔

۵۔ تاہم خواتین (ماں) کے منصبی درجہ سے آمدنی کے جو وسیع ذرائع میسر ہوتے ہیں ان کے اثرات ۶ سے ۱۴ سال تک کی عمر کے بچوں پر خاصے گہرے ہوتے ہیں عمر کا یہ حصہ انسان کے معاشی وسائل کی تشکیل کا مرحلہ ہوتا ہے۔

خاندانی کفالت نظام کا انتشار:

پورے ملک میں خاندانی کفالت کا نظام بکھراؤ کا شکار ہے خصوصاً غریب مسلمان اس سے اور بھی زیادہ متاثر ہیں، مشترکہ اور وسیع خاندان کا تصور اب زمین دار کنبوں میں ہی پایا جاتا ہے، جبکہ غریب گھرانے یا وہ جو مالی اعتبار سے کسی حد تک بہتر پوزیشن میں ہیں ان میں الگ رہنے کا رجحان بڑھ رہا ہے، ظاہر ہے ایسے کنبوں کو اپنے خاندان کے دیگر افراد سے کوئی مالی معاونت حاصل نہیں ہوتی ایسے علاحدہ رہنے والے کنبوں کی خواتین اور بچے استحصال کا شکار بھی ہوجاتے ہیں، ہندوستان میں ایسے متعدد مسلمان کنبے ہیں جن کے مرد روزگار کی تلاش میں باہر جاتے ہیں اور ایسے ہجرت کرنے والے مردان ملکوں میں جاکر یا تو دوسری شادی کرلیتے ہیں یا پھر کام کی جگہ پر کسی عورت سے تعلق قائم کرلیتے ہیں اور اس طرح اپنی اصل بیوی اور بچوں کو بے سہارا چھوڑ دیتے ہیں، ہندوستان میں یہ صورت حال زیادہ سنگین ہے خصوصاً مغربی بنگال، آسام اور کیرالہ میں اس کے اثرات نمایاں ہیں۔

کئی بار ایسی صورت حال بھی پیش آتی ہے جہاں دیگر فرقوں کے مقابلے میں مسلمان اسلام میں دی گئی رعایت کا ناجائز فائدہ اٹھا کر اپنی عورتوں کو چھوڑ دیتے ہیں، اسی طرح مسلم معاشرہ میں خواتین بے تعلقی اور استحصال کے خطرات سے زیادہ ہی دوچار ہوتی ہیں۔

ہندوستان اور ہمسایہ ممالک میں اسلامی اداروں کا بڑا محدود دائرہ کار ہے مثلاً اوقاف جو بے سہارا افراد کو امداد فراہم کرسکیں، یا مسلمانوں کا بیت المال یا انفرادی طور پر فیاضی کے کام، صدقہ زکوۃ، فطرہ جس کے ذریعہ بے سہارا مظلوم اور خطرات سے دوچار مفلس افراد کو مدد فراہم کی جاسکے یا انہیں جو اس وجہ سے بدحالی کا شکار ہیں کہ ان کے گھر کا کمانے والا نہیں رہا۔ ان اسلامی اداروں کے منظم نہ ہونے اور ان کی رقوم کے غبن اور خیانت کے سبب غریب اور مستحق افراد ان ملی ذرائع دوسائل کے نظام سے کوئی مدد حاصل کرنے سے محروم رہتے ہیں اس وجہ سے بعض اوقات مسلم خواتین بعض انتہائی اقدامات مثلاً گداگری، چوری یہاں تک کہ جسم فروشی تک کے لئے مجبور ہوجاتی ہیں۔

افراد ملت (کمیونٹی ویلفیئر) کی بہبود کے وسیع تر فوائد کے لئے حکمت عملی:

ان معاشرتی مفاسد سے بچنے کے لئے جو معاشرے اصلاحی اور تدارکی اقدامات کرتے ہیں وہی وقار اور خودداری کے ساتھ زندہ رہتے ہیں، اس سلسلے میں اگر مندرجہ ذیل سہ رخی حکمت عملی اپنائی جائے تو ان معاشرتی خرابیوں کی اصلاح ہوسکتی ہے۔

۱۔ خواتین کو تعلیم سے آراستہ کیا جائے تاکہ اگر ایسی (ناگوار) صورت حال درپیش ہو تو وہ آزادانہ طور پر فیصلہ کی صلاحیت رکھتی ہوں۔

۲۔ عورتوں کو ایسا روزگار فراہم کرایا جائے جس سے آمدنی ہوتا کہ وہ گھر کے اخراجات برداشت کرسکیں اور کسی گراں بار (بوجھل) صورتحال سے نبرد آزما ہوسکیں، مثلاً اگر گھر کی کفالت کرنے والا نہ ہو تب بھی وہ عزت اور تحفظ کے ساتھ زندگی گزار سکیں۔ ہر ایک معاملہ میں ایسا نہیں ہو پاتا کہ بیوہ، مطلقہ یا شوہر کی جانب سے بے تعلق (معلق) خاتون کو دوسری شادی کا موقع میسر آجائے۔

۳۔ قانونی کاروائی کے ذریعہ خواتین کو املاک میں شریک بنایا جائے (یہ وصیت، میراث اور ترکہ کے علاوہ ہے) اس ملکیت میں مکان زراعتی زمین، زیورات اور دیگر منقولہ وغیر منقولہ اثاثہ جات شامل ہیں نیز آمدنی کے ذرائع مثلاً فیکٹری کاروبار (تجارت) وغیرہ میں ان کو حصہ دار بنایا جائے۔

اگر مسلم خواتین کو مذکورہ بالا تینوں زمروں کے تحت فوائد اور مواقع حاصل ہوتے ہیں تو مردوں کو اس سے خطرہ محسوس نہیں کرنا چاہئے بلکہ انہیں اس پر فخر کرنا چاہئے، یہ ملک اور ملت کے وسیع تر معاشرتی مفاد میں ہے۔

ذیل میں ایک تصویری خاکہ پیش کیا جاتا ہے جو مختصر طور پر صنفی عدل و مساوات اور تفویض اختیارات کو ظاہر کرتا ہے۔

خواتین کے روزگار اور کنبے کی بہبودی کے درمیان ربط کے بارے میں ایک تصوراتی خاکہ

اقتصادی ڈھانچہ۔ لیبر مارکیٹ غیر ہنر مندی اور خواتین کا روزگار

عورتوں کے روزگار کے حق میں معاشی و معاشرتی ردعمل کا طریق کار

صنفی اور بچوں سے مخصوص نتائج تفویض اختیارات اور خانگی بہبود مشترکہ نسلی ترسیل

خواتین کی ذاتی بہبود میں اضافہ ایسے ناخوشگوار حالات جیسے بیوگی، طلاق اور معلق ہونا (شوہر نے چھوڑ رکھا ہو)

صنفی فائدے کو سمجھنے کے لئے ایک تاریخی خاکہ:

موجودہ اقتصادی اصلاحات اور معاشیات کے عالمی ربط و یکجائی قائم کرنے کے تناظر میں معاشی فروغ غربت میں کمی اور روزگار کے کثیر مواقع فراہم کرنا اصل مقصد ہے اس صورت حال میں صنفی تناظر قائم کرنا لازمی ہے کیونکہ پیداواری اور منافع کے کثیر سرگرمیوں کے میدان اور کردار میں خواتین اقتصادی فروغ اور انسانی وسائل کے فروغ (تعلیم) کے دوراہے پر کھڑی ہیں صنفی افلاس اکیسویں صدی کا سب سے بڑا چیلنج ہے جس سے نہ صرف ترقی پذیر بلکہ متعدد ترقی یافتہ ممالک بھی دوچار ہیں یہ سمجھنا بھی نہایت ضروری ہے کہ کس طرح معاشی تبدیلیاں متعدد تبدیلیوں کا باعث بنی ہیں، مثلاً اندرونی مہاجرت جس کا اثر خواتین اور مردوں پر مختلف انداز سے ہوتا ہے اور کس طرح غیر مساوی تعلقات اول الذکر کے لئے دوہرے نقصان کا باعث بنتے ہیں یہ تسلیم کرنا لازمی ہے کہ اگرچہ مرد اور خواتین دونوں کی پیدائش یکساں انداز سے ہوتی ہے لیکن معاشرتی اور معاشی ڈھانچہ، ترقیاتی پالیسیاں اور پیداواری عوامل دونوں پر مختلف طور سے اثر انداز ہوتے ہیں، معاشرتی اور معاشی محرکات سے واضح ہوتا ہے کہ پیداواری عمل کے اثرات اگرچہ صنفی اعتبار سے پورے طور پر غیر موثر نہیں ہیں تاہم افلاس اور اس کی وسعت خواتین پر بری طرح اثر انداز ہوتی ہے۔

یہ ایک دستاویزی طور پر تسلیم شدہ امر ہے کہ افلاس کی وسعت خواتین پر بہت زیادہ منفی اثر ڈالتی ہے اور جب تک مواقع، وسائل، صلاحیت اور خواتین اور مردوں کے درمیان حقوق کے فرق کے موجودہ غیر مساوی رجحانات کو ختم نہیں کیا جاتا اس وقت تک افلاس کم کرنے کا مقصد حاصل نہیں ہو سکتا اس سے خانگی وسائل تک رسائی، معاشی مواقع، اور خانگی امور میں فیصلے کے اختیارات میں خواتین کو ہونے والے نقصانات ظاہر ہوتے ہیں اور اس کے مستقل طور پر مشترکہ نسلی اثرات ہوتے ہیں اس سلسلہ میں گھر کے کفیل (کمانے والے فرد) کا گھر سے باہر چلا جانا (مہاجرت) خانگی معاملات میں فیصلہ کرنے کے عمل مثلاً بچوں کی نگہداشت تعلیم اور مقامی وسائل کے فروغ (مقامی تعلیمی امکانات) پر اثر انداز ہوتے ہیں، ان حالات میں خواتین خانگی امور کے نظم کا مرکز بن جاتی ہیں ان میں سے کچھ معاملات مضر اثرات کے حامل ہوتے ہیں اور بعض ان کے اختیارات کے معاون بھی ہوتے ہیں لہذا یہ ضروری ہے کہ ایسے مواقع اور ان کے نتائج کا احاطہ کیا جائے جو اسی سمت کا تعین کرتے ہیں جن پر کسی گھر کی بہبودی کی راہ معاشی اور معاشرتی دائرہ میں صورت پذیر ہوتی ہے جو حکومت، معاشرہ اور تنظیموں، مذہبی علماء اور دانشوروں کے لئے پالیسی طے کرتی ہے۔

یہ لازمی ہے کہ صنفی مضرت کو ایک مجموعی خاکہ کے تناظر میں زیر بحث لایا جائے اور عدم مساوات کے ان پہلوؤں کا پتہ لگایا جائے اور یہ کہ افلاس کس طرح

خواتین کو دہرے نقصان سے دوچار کرتا ہے اور انہیں معاشی صدمات اور حالات سے مصالحت پر مجبور کرتا ہے۔

ذیل میں ایک عمومی خاکہ کے ذریعہ یہ دکھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ وہ کیا عوامل ہیں جو خواتین کو افلاس کا شکار بناتے ہیں اور وہ کیسے کیسے انداز میں ظاہر ہوتے ہیں۔ ان حالات میں ریاست یا علاقہ کے لحاظ سے خاصا فرق بھی ہوسکتا ہے۔ یہ بات واضح ہے کہ عدم مساوات خانگی طرز زندگی کے پہلے مرحلے سے پیدا ہوتی ہے اور مختلف معاشی اور معاشرتی دائروں میں منعکس ہوتی رہتی ہے، لہذا بحث عدم مساوات کے متعدد پہلوؤں پر مرکوز ہونی چاہئے اور اس پر بھی کہ افلاس کس طرح صنفی غیر مساوی تناظر کو بد سے بدتر بنا دیتا ہے۔

فطری طور پر مرد گھر کے معاشی کفیل ہونے کے ناطے باہر جاتے ہیں، پیسہ کماتے ہیں اور وسائل و اثاثہ جات پر کنٹرول رکھتے ہیں اور بہتر خورد ونوش حفظ صحت و تعلیم کا حق رکھتے ہیں لہذا مرد خانگی طور پر اور معاشرتی طور پر فیصلہ کن پوزیشن میں ہوتے ہیں اور اپنی اس قوت کا مظاہرہ بھی کرتے ہیں اور اپنے مفاد کو تسلیم کراتے ہیں۔ ان اشیاء کو سمجھنے کا یہ منطقی طرز بتدریج تبدیل ہوتا گیا اور کیونکہ اثاثہ جات خصوصاً اراضی اور دیگر معاشی وسائل پر مردوں کا غلبہ تھا اس لئے عدم مساوات میں اور بھی اضافہ ہوا۔ عورتوں کی شناخت مردوں سے ان کے رشتے اور خانگی تعلق کے ذریعہ ہی ثابت کی جاتی رہی یہ شر کا ایک ایسا دائرہ ہے جس سے یہ چیزیں وجود میں آتی ہیں اور پھر غلط رخ اختیار کر لیتی ہیں، معاشی و معاشرتی جمود و یکسانیت اس کا سبب ہے اور افلاس ان حالات سے سمجھوتہ کرنے پر مجبور ہے۔

وقت گذرنے کے ساتھ خواتین نے تعلیم اور معاشی سرگرمیوں میں زیادہ حصہ لینا شروع کیا اور پھر یہ عمل معاشرتی وتہذیبی رسوم سے متصادم ہوا۔ بعد ازاں ترقی اور ہم آہنگی کے عمل نے صنف کے موضوع کو نظر انداز کر دیا بلکہ محض معمولی طور پر ہی اس پر غور کیا اور خواتین کو اہم شریک کے طور پر تسلیم کرنے میں ناکام رہا۔ اس طرح عدم مساوات اور بڑھتے ہوئے افلاس کے حالات میں خواتین کو ہی اس کا نقصان سہنا پڑا اس میں پیداواری اور منفعت دونوں قسم کی سرگرمیوں پر الزام آتا ہے۔ آہستہ آہستہ یہ ہوا کہ جسے طرز زندگی سمجھا جاتا تھا اس نے ایک مختلف رخ اختیار کر لیا اور عدم مساوات کی بعض شکلیں مثلاً خورد ونوش اور تغذیہ تک یکساں رسائی نہ ہونا حفظان صحت اور کاروبار سے بے تعلقی اور خواتین کی کوئی آواز نہ ہونا سامنے آئیں اب یہ صورت حال تبدیلی سے متأثر ہونے لگی ہے۔

خانگی اور کاروباری امور میں صنفی تعلقات کا تجزیہ:

خانگی مرحلہ پر اگر صنفی تعلقات کا جائزہ لیا جائے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ بہتر خورد ونوش کے معاملہ میں خاندان میں مردوں اور لڑکوں کو ترجیح دی جاتی ہے یہ صورت حال اور بھی سنگین ہوجاتی ہے جب موسمی تغیرات کے سبب غذائی قلت درپیش ہوتی ہے یا پھر مختلف استحقاق کے رسوم ورواج ہوں جن کے تحت خواتین اور لڑکیاں کم کھاتی ہیں اور بعد میں کھاتی ہیں۔ یہ گویا اطعام کا آخری مرحلہ ہوتا ہے۔ اگرچہ گھر میں غذا کے تحفظ کی ذمہ داری خواتین پر ہوتی ہے لیکن خود خواتین ہی اپنے لئے پوری خوراک حاصل کرنے سے قاصر رہتی ہیں اس کے سبب خواتین جو تولیدی عمر کے مراحل میں ہوتی ہیں نقص تغذیہ کا شکار ہوجاتی ہیں، خواتین میں اسی وجہ سے خون کی کمی کا عارضہ لاحق ہوجاتا ہے، حمل اور زچگی کے دوران ان کی مناسب اور صحیح ڈھنگ سے طبی نگہداشت نہ ہونے کے سبب خواتین میں وضع حمل کے دوران جاں بحق ہوجانے کا تناسب زیادہ اور بچوں کے زندہ رہنے کا تناسب کافی کم ہے۔

صحت کی دیکھ بھال کے بارے میں بھی اسی قسم کا امتیاز پایا جاتا ہے۔ حفظان صحت کے نظام تک خواتین کی رسائی کم ہوتی ہے، بیماری اور خرابی صحت کے دوران بھی خواتین مردوں کے مقابلے میں کم ہی طبی سہولیات حاصل کر پاتی ہیں اسے ایک طرح سے کفایتی اقدام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ عورتوں میں طبی سہولیات سے فائدہ اٹھانے کا جذبہ ان کے تعلیمی معیار سے بھی تعلق رکھتا ہے، تعلیم یافتہ خواتین صحت اور طبی سہولیات کے بارے میں زیادہ باشعور ہوتی ہیں، دیہی علاقوں میں جہاں خواتین کھانا پکانے کے لئے لکڑی کوئلہ کے ایندھن وغیرہ کا استعمال کرتی ہیں اور دھواں نیز گیس میں گھری رہتی ہیں انہیں تنفس کا عارضہ اکثر لاحق ہوجاتا ہے، جو خواتین غیر صحت بخش ماحول میں رہتی ہیں جہاں صاف ہوا، صفائی اور پینے کا صاف پانی بھی میسر نہیں ہوتا وہ اکثر بیمار رہتی ہیں بڑے شہروں کے سلم علاقوں (جھگی جھونپڑی) میں رہنے والی خواتین اس کی مثال ہیں۔

اس بات پر بہت زیادہ زور دیا جاتا ہے کہ وسعت، خوشحالی اور بہبود کے حصول کے لئے خواتین کا تعلیم یافتہ اور باروزگار ہونا اشد ضروری ہے اگرچہ ترقیاتی امور کے ہرایجنڈے میں خواتین میں ناخواندگی کم کرنے کو بے حد اہمیت دی جاتی ہے لیکن اب بھی خواتین کی تعلیم کے خلاف تعصب پایا جاتا ہے خاص کر لڑکیوں کو اسکول بھیجنا معیوب سمجھا جاتا ہے، یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ لڑکیوں کو ابتدائی عمر میں اسکول بھیجا جاتا ہے لیکن بعد کو لڑکوں کے مقابلے میں لڑکیوں کے اسکول چھوڑ دینے کا تناسب زیادہ ہوجاتا ہے۔ دیہی علاقوں میں چونکہ اسکول دور دراز مقامات پر ہوتے ہیں اس لئے والدین اپنی بچیوں کو اتنی دور اسکول بھیجنے کے لئے

تیار نہیں ہوتے ہیں، دوسرے چونکہ روزگار کے مواقع بھی کم تر ہوتے ہیں اس لئے والدین محض شادی کی خاطر لڑکیوں کو تعلیم دلانے کے مقابلہ میں تعلیم پر ہونے والے خرچ کو بچانے میں عافیت اور بہتری سمجھتے ہیں تاکہ یہ سرمایہ بچی کی شادی میں کام آئے۔ جب افلاس مجبور کرتا ہے تو لڑکیوں کو اسکول سے اٹھالیا جاتا ہے، جبکہ ان کے بھائی اسکول جاتے رہتے ہیں، ایسے خاندانوں میں جہاں خواتین گھر کا خرچ چلانے کے لئے محنت مزدوری کرتی ہیں وہاں لڑکیوں کو گھر پر چھوڑ دیا جاتا ہے تاکہ وہ گھر کی اور اپنے چھوٹے بہن بھائیوں کی نگہداشت کریں یا پھر یہ لڑکیاں اپنی ماؤں کے ساتھ محنت مزدوری کرتی ہیں تاکہ گھر کی آمدنی میں کچھ اور اضافہ ہو۔

مزدوری کے معاملے میں عورتوں کے ساتھ خصوصاً غریب عورتوں کے ساتھ امتیاز برتا جاتا ہے، ان غریب عورتوں کے ساتھ دوہری مصیبت یہ ہے کہ وہ محنت مزدوری کی مشقت بھی جھیلتی ہیں اور پھر بچے پیدا کرنا بھی ایک اور مشقت مزید سہنی پڑتی ہے اگر چہ گلوبلائزیشن کے بعد ترقی پذیر ممالک میں روزگار کے مواقع بڑھ گئے ہیں لیکن اس سے بے ضابطگی کا رجحان بڑھا ہے اور خواتین روز بروز اس سے دور ہوتی جارہی ہیں اگر چہ محنت کے شعبہ میں عورتوں کی کثیر تعداد ہے لیکن وہ بیشتر نچلے درجے کے کارکنوں میں ہوتی ہیں ایک بڑھتا ہوا رجحان یہ ہے کہ غیر رسمی امور میں خواتین کو زیادہ سے زیادہ آگے رکھا جائے اس غیر رسمی محنت کے سیکٹر کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں تنخواہیں کم ہوتی ہیں، کوئی کنٹریکٹ نہیں ہوتا، کام کا کوئی متعین مقام نہیں ہوتا جو عورتیں زیادہ تعلیم یافتہ یا ہنر مند نہیں ہوتیں وہ محنت کے اس زمرہ میں کام کرتی ہیں اس سے ان کے کام کا بوجھ بڑھ گیا ہے لیکن آمدنی میں اضافہ قطعی نہیں ہوا ہے۔ معاشی تنگی خواتین کو اس زمرہ میں کام کرنے پر مجبور کرتی ہے اور اس سے ان کی بہبودی اور خوشحالی میں اضافہ نہیں ہوتا۔

دیہی علاقوں کے کاشتکار گھرانوں میں عورتیں یا تو گھر میں مزدوروں کی طرح کام کرتی ہیں، یا پھر کھیتوں میں مزدوری کرتی ہیں جب کہ ان کے مقابلے میں مردوں کو ان کھیتوں اور زمینوں کے مالکانہ حقوق حاصل ہوتے ہیں اس حقیقت کے باوجود کہ زراعتی شعبہ میں بہت بڑی تبدیلیاں ہو رہی ہیں اور نئی جہتیں سامنے آرہی ہیں مویشی اور مچھلی پالنے اور باغبانی کے شعبوں میں عورتوں کو آگے بڑھنے کے امکانات ہیں لیکن صنفی مساوات کے بارے میں اب بھی احساس بیدار نہیں ہے۔ اگر چہ عملی شہادتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ خواتین اپنی مدد آپ، جیسے گروپ اور اجتماعی انتظامی طریقوں کے واسطہ سے بعض زمروں میں پیش رفت کر سکتی ہیں، لیکن ترقی کی یہ رفتار بہت سست ہے۔

یہ عام دستور ہے کہ اراضی کی ملکیت، قرضہ اور دیگر منافع بخش وسائل تک خواتین کی بہت کم رسائی ہوتی ہے ان تین ممالک میں جہاں سے معلومات حاصل کی گئیں ان میں وراثت کے قوانین میں مردوں کو پوری بالادستی حاصل ہے۔ خواتین کو مردوں کے رشتے کی بابت اراضی پر کچھ مالکانہ حقوق حاصل ہوتے ہیں لیکن وہ ان وسائل سے کوئی فائدہ حاصل کرنے سے محروم رہتی ہیں۔ زمیندار خاندانوں میں مردوں کو اراضی اور دیگر اثاثہ جات پر مالکانہ حقوق حاصل ہوتے ہیں اور زمین و دیگر ذرائع سے جو آمدنی ہوتی ہے وہ بھی ان ہی کے قبضہ میں رہتی ہے، خواتین یا تو گھر میں محنت کا کام کرتی ہیں یا پھر مزدوری کرتی ہیں انہیں اختیارات یا حقوق حاصل نہیں ہوتے حصول قرض میں بھی جو امتیاز ہے اس کی جڑیں بھی ملکیت اراضی میں پیوست ہیں جو مردوں کے نام ہوتی ہے اور رہن وغیرہ کی کاروائی صرف مردوں کے ذریعہ ہی عمل میں آسکتی ہے وہی قرضہ کی سہولیات سے فائدہ اٹھاتے ہیں، اس طرح عورتوں کو قرضہ حاصل کرنے کی بہت کم آسانی حاصل ہے اس کی وجہ سے وہ زراعتی میدان میں کوئی نمایاں تکنیکی کام نہیں کر سکتیں جو اس شعبہ کے فروغ میں بے حد اہمیت کا حامل ہے، اپنی مدد آپ گروپ کے ذریعہ چھوٹے قرضوں کے سلسلے میں ہندوستان میں جو کوششیں ہوتی ہیں ان کے نتائج ملے جلے ہیں جبکہ بنگلہ دیش میں یہ اسکیم بے حد کامیاب ہے۔ وسائل تک رسائی میں عدم مساوات کے سبب زراعتی اور غیر زراعتی شعبوں میں خواتین کی حصہ داری کم اور محدود ہے۔

تعلیم، خورد و نوش، حفظان صحت اور ملازمت کاروبار کے مواقع تک رسائی میں عدم مساوات کے سبب خواتین ایک بہتر معیار زندگی اور فیصلہ کرنے کے امور میں بالکل ساکت وصامت ہو کر رہ گئی ہیں جس کی وجہ سے خواتین کو افلاس، صدمات سے دوچار ہونے اور حالات کے آگے سرنگوں ہونے کے خطرات زیادہ درپیش ہیں، عدم مساوات اور افلاس دو طاقتور عوامل ہیں اور یہ ایک دوسرے کو خراب تر کرنے میں معاون ہوتے ہیں۔ بالفاظ دیگر وسائل، ملازمت اور کاروبار کے مواقع تک رسائی کا غیر مساوی رویہ عورتوں کی معاشی خود مختاری اور افلاس کے شکنجے سے آزاد ہونے میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے، افلاس سے عدم مساوات کو فروغ ہوتا ہے جس کی وجہ سے خواتین زندگی کے ابتدائی مراحل سے ہی کفایت شعاری اختیار کرنے پر مجبور ہوتی ہیں اخراجات میں کمی کر کے بچت کرنا مثلاً کم کھانا اسکول چھوڑ دینا اور ایک غیر صحت مندانہ زندگی گذارنا وغیرہ اور پھر عورتیں چھوٹی موٹی غیر محفوظ ملازمتوں کے ذریعہ اپنی آمدنی بڑھانے کی کوشش کرتی ہیں۔

☆☆☆

خواتین کی ملازمت

صورت حال، مسائل اور اسلامی موقف

عبدالرشید اگوان

علماء کرام، مسلم دانشوران اور ملی قیادت کے سامنے دور جدید کے پیدا کردہ جن چند مسائل کا سامنا رہتا ہے ان میں مسلم خواتین کی ملازمت کا مسئلہ بھی ہے۔ دور حاضر کے تقاضے، نئی طرز زندگی اور مسلمانوں کی عام پسماندگی اس مسئلے کو سنجیدہ بنا دیتی ہے اور کئی سوال اسلامی رہنماؤں کے سامنے ابھر آتے ہیں جن کا مناسب جواب ہر خاص و عام کے لیے انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔ ذیل میں اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ خواتین کی ملازمت کے سلسلے میں موجودہ صورت حال اور اس سے جڑے مسائل کی روشنی میں مناسب اسلامی موقف اختیار کرنے کے لیے راہ ہموار کی جائے۔

موضوع کی اہمیت

خواتین کی ملازمت پر غور وخوض کی چار بنیادی وجوہات سامنے آتی ہیں۔ پہلی یہ کہ اس کا معاشرے پر، اور اس کی تعمیر وترقی اور ارتقاء اور تنزلی پر شدید اثر واقع ہوتا ہے۔ جن معاشروں میں اس کا چلن عام ہو چکا ہے ان پر اس کے اچھے اور برے دونوں قسم کے اثرات رونما ہو رہے ہیں اور جو معاشرے اس مسئلے میں ابھی پیچھے ہیں مگر اول الذکر کی اندھی تقلید کے شکار ہیں وہاں بھی ان اچھے اور برے دونوں اثرات کا سامان پایا جاتا ہے۔ لہٰذا یہ ضروری ہے کہ خواتین کی ملازمت کے مثبت پہلوؤں پر غور وفکر کے بعد انہیں فروغ دیا جائے اور جو منفی اثرات اس ضمن میں سامنے آتے ہیں ان کا بروقت تدارک کیا جائے تا کہ مسلم معاشرہ بالخصوص اور دوسری قومیں اور انسانی معاشرہ بالعموم ان تعلیمات سے فیضیاب ہو سکے جو بالآخر انسانیت کی فلاح و بہبود کے لیے کلیدی حیثیت رکھتی ہے۔

اس موضوع پر غور وخوض اس لیے بھی ضروری ہے کیونکہ خواتین کی عمومی صورت حال اور مسلم سماج میں ان کی خصوصی صورت حال قابل تشویش ہے۔ آج خواتین کئی مسائل اور چیلنجز سے دوچار ہیں اور ان میں اکثر کا تعلق خواتین کی ملازمت سے براہ راست جڑا ہوا ہے۔ آج خواتین بڑی تعداد میں غربت وافلاس، ظلم و زیادتی، استحصال اور امتیاز وغیرہ کا شکار ہوتی ہیں اور انہیں معاشرے میں طاقتور بنانے کے سلسلے میں اور ان کی فوری ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے ان کی ملازمت کو مفید سمجھا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے مسئلے کا تجزیہ انتہائی ضروری ہے تا کہ صحیح موقف اختیار کیا جا سکے۔

یہاں یہ پہلو بھی قابل غور ہے کہ ہمارے ملک میں مسلمانوں کی پسماندگی ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے۔ اس پسماندگی کو دور کرنے کے لیے جو حل تجویز کیے جاتے ہیں ان میں مسلم خواتین کی ملازمت بھی شامل ہے اور اس نظریے سے بھی سوچنے کی ضرورت ہے کہ مسلم خواتین کی ملازمت کی عام اجازت اس پسماندگی کو کس حد تک دور کر سکتی ہے اور اس کے کون سے اچھے اور برے اثرات مسلم سماج پر پڑ سکتے ہیں؟

اس ضمن کی چوتھی اہم ضرورت تصویر اسلام ہے۔ واضح موقف کی عدم موجودگی میں ایک طرف اسلام کی تصویر کو مسخ کرنے کا موقع مل جاتا ہے اور اس سلسلے کی اہم اسلامی تعلیمات خاص وعام کے سامنے نہیں ہونے سے ان کی زندگی میں حرج واقع ہوتا ہے۔ خواتین کی ملازمت کے سلسلہ میں اسلامی تعلیمات واضح طور پر مرتب کر کے پیش کرنے سے اسلام کی بہتر تصویر بھی نمایاں ہوگی اور ان تعلیمات کی روشنی میں لوگ بہتر زندگی کی جانب پیش رفت بھی کر سکیں گے۔

پس منظر

ہر دور میں مرد وزن کے سامنے اپنی معاشی ترقی کا مسئلہ رہا ہے اور قدیم زمانے سے مرد کے شانہ بشانہ خواتین بھی معاشی سرگرمیوں میں شامل رہی ہیں۔ مگر عصری تقاضوں اور مخصوص طرز فکر کی وجہ سے ان سرگرمیوں میں کمی وبیشی ہوتی رہی ہے۔ قبائلی دور میں جنگلوں سے پھل اور لکڑی جمع کرنے میں اور زراعت کی کھوج کے بعد کھیتی باڑی اور مویشی پالنے میں خواتین کا کردار ہمیشہ رہا ہے۔ مگر وہ عام طور پر اپنے گھر کے محرم کی نگرانی یا موجودگی میں اپنا معاشی کردار نبھاتی رہی ہیں۔ آج سے چار ہزار سال پہلے بیبیلون میں خواتین کو تجارت کرنے اور محرر بننے کی اجازت تھی۔ دور قدیم سے ہی شرفاء طبقے کی خواتین گھروں تک محدود رہی ہیں اور محنت ومشقت کے کاموں میں غریب اور غلام خواتین کی شمولیت تسلیم کی جاتی رہی ہے۔

قدیم یونان کی عورتیں گھر سے باہر جا کر نمک، انجیر، روئی، جوٹ کے سامان وغیرہ بیچتی تھیں اور درزی، دایا، دھوبن، موچی، کمہارن وغیرہ کے روپ میں اپنے خاندان کی آمدنی بڑھانے میں حصہ دار ہوتی تھیں۔ ہمارے ملک میں بھی عورتیں پتھر توڑنے، سڑک بنانے سے لے کر کپڑا بننے کے کاموں میں خدمت انجام دیتی رہی ہیں۔ صنعتی انقلاب کے بعد کپڑا بننے والی میل اور سلے سلائے کپڑے بنانے والی فیکٹریوں میں خواتین کی تعداد ہمیشہ مردوں سے زیادہ رہی ہے۔

دور حاضر نے خواتین کے لیے ملازمت اور معاشی سرگرمیوں کا ہر میدان کھول دیا ہے۔ چنانچہ اسکول سے لے کر دفاتر تک، فیکٹریوں سے لے کر فوج تک اور کاروباری مشیر سے لے کر سائنسداں بننے تک خواتین کے لیے سارے راستے کھلے ہوئے ہیں۔ آج عورتیں وزیر اعظم بھی بن رہی ہیں اور بیوٹی کوئین (Beauty Queen) بھی۔ اسی کھلی آزادی نے جہاں خواتین کو اپنی قابلیت دکھانے کا موقع دیا ہے وہیں کچھ مخصوص قسم کے سماجی مسائل سے خواتین اور معاشرہ دونوں زد میں آئے ہیں اور یہ سوال ماہرین سماجیات ونفسیات کے سامنے منہ پھاڑے کھڑا ہے کہ اس چمک دمک والی ترقی اور نئے سماجی مسائل کے بیچ توازن کیسے قائم کیا جائے؟ یہی وہ مقام ہے جہاں اسلامی تعلیمات اپنا مؤثر کردار ادا کرسکتی ہے۔

خواتین کی ملازمت کے تسلیم شدہ جواز

خواتین کی معاشی سرگرمیوں اور ان کی ملازمت کے سلسلہ میں مندرجہ ذیل اہم جواز پیش کیے جاتے ہیں:

۱۔ **مساوات:** مرد وزن کے بیچ مساوات قائم ہوں اور خواتین کو کسی ایسے کام سے نہیں روکا جاسکتا جو مرد کرتے ہوں۔

۲۔ **انسانیت کی خدمت:** جس طرح مرد انسانیت کی ترقی اور اس کی فلاح وبہبود کے لیے سرگرم ہیں اسی طرح عورتوں کو بھی اپنی خدمات پیش کرنی چاہیے۔ انہیں کسی میدان میں کام کرنے سے روکنے کا مطلب یہ ہے کہ سماج کی نصف آبادی معطل ہوجائے گی اور انسانیت ان کی کئی خوبیوں اور صلاحیتوں سے محروم ہو جائے گی۔

۳۔ خواتین فطرتاً کمزور واقع ہوئی ہیں اس لیے مرد انہیں اپنے ظلم وتشدد کا نشانہ بناتے ہیں اس لیے اگر وہ معاشی لحاظ سے اپنے پیروں پر کھڑی ہوتی ہیں تو ان کو اس استحصال اور ظلم سے بچایا جاسکتا ہے۔

۴۔ کئی معاملوں میں خواتین مردوں کے مقابلے بہتر ثابت ہوئی ہیں۔ مثلاً وہ بدعنوانی، رشوت خوری اور ہمسر لوگوں پر ظلم کے معاملے میں مردوں سے بہتر ثابت ہوئی ہیں اور ان کی ملازمت اور معاشی سرگرمیاں سماج میں بہتر رجحانات کو پروان چڑھائیں گی۔

۵۔ غربت وافلاس کے خاتمہ کے لیے ضروری ہے کہ مرد وخواتین دونوں مل کر کام کریں اور اپنی آمدنی میں اضافہ کے ذریعہ اپنی خوشحال زندگی کی تعمیر کریں۔

۶۔ آج جب کہ ترقی کی دوڑ ایک اندھے تکاثر میں تبدیل ہوچکی ہے خواتین کو ملازمت اور معاشی سرگرمیوں سے روکنے کا مطلب ہے اس دوڑ میں پیچھے رہ جانا اور دوسروں کے مقابلہ پسماندگی کا راستہ اختیار کرنا۔

۷۔ خواتین کی معاشی شمولیت کسی بھی ملک کی معاشی ترقی کے لیے لازم وملزوم ہے۔ ان کا کردار ایک Economic Booster کے روپ میں انتہائی ضروری ہے تاکہ مندی کی مار جھیلنے والے ممالک یا معاشی جمود کا شکار ممالک ایک نئی توانائی کے ساتھ اپنی خوشحالی کی جانب گامزن ہوں۔

مذکورہ جواز میں سے کئی ایک پر اختلاف کیا جاسکتا ہے۔ یہاں ان کو پیش کرنے کا مقصد ان پہلوؤں کا احاطہ کرنا ہے جو موضوع پر روشنی ڈال سکیں۔

ملازمت اور معاشی سرگرمیوں میں خواتین کی صورتحال

صنعتی انقلاب کے بعد مغربی ممالک ودوسرے ملکوں میں خواتین سستی مزدور بن کر کارخانوں میں کام کرتی رہی ہیں۔ آزادی نسواں کے سب سے بڑے علمبردار متحدہ امریکہ میں انیسویں صدی کے اواخر میں فیکٹری نظام قائم ہوا۔ ۱۸۱۴ء میں پہلی فیکٹری کے قیام سے لے کر محض چند سالوں میں ۱۸۵۰ء کے آس پاس فیکٹریوں میں مزدوروں کی تعداد میں ۲۴ فیصد حصہ خواتین کا ہوگیا۔ یہ سستی مزدور کپڑے، جوتے، سگار، اور دوسری اشیاء بنانے والی فیکٹریوں میں دن کے اکثر اوقات میں کام کرتی تھیں۔ ۱۸۹۰ء تک آتے آتے مزدور خواتین کی تعداد کل خواتین کا ۱۴ فیصد اور کل مزدوروں کا ۱۷ فیصد ہوگئی۔ ان کی اکثریت گھریلو نوکری، تعلیم وتدریس اور ٹیکسٹائل فیکٹریوں میں لگی ہوئی تھی جب کہ دفاتر اور مال فروخت کرنے کے کاموں میں ان کی مجموعی تعداد کا فقط ۵ فیصد حصہ ہی سرگرم تھا۔ امریکہ میں روشن خیالی، مرد وزن مساوات، آزادی نسواں جیسے نظریات ودیگر عوامل کی وجہ سے ملازمتوں اور معاشی سرگرمیوں میں خواتین کی تعداد میں بتدریج اضافہ ہوا۔ سن ۲۰۰۰ء کے اعداد وشمار کی روشنی میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ ۱۶ سال سے اوپر کی عمر کی ۶۰ فیصد امریکی خواتین کسی نہ کسی پیشے اور معاشی سرگرمیوں سے جڑی ہوئی ہیں جو کہ امریکہ کی قوت کار (Workforce) کا ۴۷ فیصد حصہ ہیں۔ نگرو اور ہسپانی خواتین کا تناسب گوری نسل کی خواتین کے مقابلے زیادہ ہے۔ جن پیشوں سے آج امریکی خواتین جڑی ہوئی ہیں وہ اس طرح ہیں:

۹۹ فیصد سکریٹری، ۹۸ فیصد بچہ پالنے والے افراد، ۹۷ فیصد استقبالیہ کے ملازم، ۹۶ فیصد گھریلو نوکر، ۹۳ فیصد نرس، ۹۰ فیصد بینک میں نوٹ سنبھالنے والے، ۶۵ فیصد دکانوں پر مال بیچنے والوں میں سے خواتین ہیں اس کے علاوہ کپڑے سے جڑے کارخانوں، ٹیلی فون، صحت وطبی خدمات کے کام اور مقامی تعلیم میں خواتین کی تعداد نمایاں ہے۔ ۱۹۹۸ء کے اعداد وشمار کی روشنی میں یہ بات واضح ہوتی ہے کہ کمپیوٹر سے جڑے پروگرامس اور سائنسدانوں میں ۳۰ فیصد سے زائد تعداد خواتین کی ہے۔

یورپ میں بھی پیشہ ور اور مزدور خواتین کی تعداد اچھی خاصی ہے۔ ۱۹۹۰ء کے آس پاس سویڈن کی قوت کار (Workforce) میں خواتین کا حصہ ۵۵ فیصد تک جا پہنچا جو دنیا میں سب سے زیادہ ہے۔ جب کہ اسی عرصہ میں جرمنی کے ملازمت پیشہ لوگوں میں خواتین کا تناسب ۳۸ فیصد تھا۔ ایک زمانہ میں روس (USSR) خواتین کی ملازمت کے لحاظ سے دنیا میں سب سے آگے تھا چنانچہ ۸۰ کی دہائی میں وہاں کی ۸۵ فیصد خواتین روزگار پیشہ تھیں۔

اکثر ممالک میں خواتین کی اوسط تعلیمی لیاقت کے ساتھ ساتھ ان کی ملازمت میں شرکت کا تناسب بڑھتا ہے مگر جاپان میں ٹھیک اس کا الٹا ہے کیونکہ وہاں بڑی تعداد میں خواتین فیکٹریوں ودفاتر کے چھوٹے کاموں میں لگی ہوئی ہیں اور کالج کی ڈگری ایسے کاموں کے لیے ضرورت سے زیادہ (Over qualification) سمجھی جاتی ہے اور جیسے جیسے جاپان میں اعلی تعلیم کا رجحان بڑھتا جارہا ہے ان کی ملازمت کا تناسب کم ہورہا ہے۔

تیسری دنیا کے بیشتر ممالک مغربی ممالک کے نقش قدم پر چل رہے ہیں۔ اور وہاں خواتین کی شرکت مسلسل معاشی سرگرمیوں، روزگار اور ملازمتوں میں بڑھ رہی ہے۔

جہاں تک مسلم ممالک کا تعلق ہے تو یہ مانا جاتا ہے کہ وہاں مزدور پیشہ خواتین کی تعداد غیر مسلم ممالک کے مقابلہ میں کم ہے۔ ۱۹۷۵ء میں یہ درج کیا گیا ہے کہ جہاں غیر مسلم ملکوں میں مزدور پیشہ خواتین کی تعداد کل تعداد کا ۶۔۳۶ فیصد تھا وہیں یہ تناسب مسلم ملکوں میں ۳۔۲۱ فیصد تھا۔ یعنی مسلم دنیا میں مزدور پیشہ خواتین کا تناسب غیر مسلم ممالک کے مقابلے تقریبا ۱۵ فیصد کم تھا۔ انٹرنیشنل لیبر آرگنائیزیشن (International Labour Organization) کی ایک حالیہ رپورٹ کے مطابق مصر میں کام کے بدلہ پیسہ دینے والے کاموں (Monetised Employment) سے جڑے لوگوں میں خواتین کی تعداد ۳۷ فیصد ہے جب کہ ۱۹۸۳ء کے سرکاری اعداد وشمار کے مطابق یہ محض ۱۳ فیصد تھی۔ اس لحاظ سے مصر مسلم ملکوں میں خواتین کی ملازمت اور ان کے روزگار سے جڑنے کی نسبت سے نہ صرف سب سے آگے ہے بلکہ اس عمل میں تیز تر اضافہ بھی ہورہا ہے۔ اور اس لحاظ سے مصر بعض یورپی ممالک سے بھی آگے نکل گیا ہے۔ یہ دیکھا گیا ہے کہ مصر میں خواتین کی بڑی تعداد جدید ملازمتوں کے میدان میں لگی ہوئی ہے اور ان کا تناسب پیشہ وارانہ کاموں میں بہت زیادہ ہے۔ انہیں وجوہات کی بنا پر خواتین کی بہترین تعلیم کے لئے موجودہ ناصری طرز سیاست کو شامل کیا گیا ہے۔

یہ مانا جاتا ہے کہ سوڈان میں بھی خواتین کی ملازمت میں اچھی خاصی ترقی ہورہی تھی مگر ۱۹۸۹ء میں سیاسی تبدیلی کے ذریعہ فوجی راج قائم ہوا جو آج بھی جاری ہے اور اس کے زیر اثر سرکاری اداروں سے جڑے پیشہ وارانہ ملازموں مثلاً ڈاکٹرس، وکلاء، یونیورسٹی کے اساتذہ، نرسوں، وغیرہ کو بڑی تعداد میں ملازمتوں

سے ہٹایا گیا جن میں خواتین کی تعداد اچھی خاصی تھی۔

بنگلہ دیش میں بھی ۱۹۹۰ء کی ورلڈ بینک کی ایک رپورٹ کے مطابق بڑی تعداد میں خواتین کا روزگار پیشہ ہونا درج کیا گیا۔ جہاں بنیادی طور پر ایکسپورٹ سے جڑی فیکٹریوں اور دفاتر، تعمیر سے جڑے کام میں خواتین بڑے پیمانے پر ملازمت اختیار کرتی نظر آتی ہیں۔ اس ملک کی خواتین قوت کار کا کثیر حصہ یعنی ۴۳ فیصد آج بھی زراعت کے کاموں سے جڑا ہوا ہے۔

کیراپیکو اور مائینٹی (Carapico and Mynitti 1991) کے مطابق یمن کے انضمام سے قبل جنوبی یمن کی "بے پردہ خواتین" (Unveiled women) کی تعداد طلبہ، اساتذہ، طب وصحت سے جڑے پیشہ ور خواتین اور فیکٹری مزدوروں کی مجموعی تعداد کا ایک تہائی ہوتی تھی۔

مالے میں خواتین کی نمایاں تعداد غیر منظم معاشی کاموں مثلاً زراعت، غذائیات، تارکول، شراب، برتن سازی، ملبوسات اور گھریلو فنون میں لگی ہے اور بازاروں میں مال بیچتی ہوئی خواتین کی خاطر خواہ تعداد نظر آتی ہے۔

دوسرے مسلم ممالک میں صورت حال بہت واضح نہیں ہے کیونکہ وہاں کے مستند اعداد و شمار دستیاب نہیں ہیں۔ مگر یہ قیاس کیا جاسکتا ہے کہ ایران، سیریا، جورڈن، ملیشیا، پاکستان، ترکستان وغیرہ میں ملازمہ خواتین کی تعداد اچھی خاصی ہے۔ جب کہ سعودی عرب میں یہ تعداد بہت کم ہوگی، جہاں حال ہی میں پہلی وزیر عورت نے شعبہ تعلیم سنبھالا ہے۔ یقیناً انڈونیشیا میں زراعت کا میدان ہی اکثر خواتین کی کارگاہ ہے۔

ہمارے ملک میں بھی خواتین کی معاشی سرگرمیوں، روزگار پیشہ کاموں میں شمولیت اور ملازمت کے لیے مثبت ماحول پایا جاتا ہے۔ اور نوے کی دہائی میں یہ ملک مغربی ملکوں کو اپنا رہنما مان کر سیاسی، سماجی اور معاشی پالیسیاں بنا رہا ہے اور خواتین کی پیشہ وارانہ سرگرمیوں کے جو نتائج مغرب میں رونما ہوئے ہیں وہ بتدریج یہاں بھی ظاہر ہونے لگے ہیں۔ چونکہ ملک میں غالب سماجی رجحان خواتین کو اسٹور، فیکٹری اور سرکاری کارخانوں میں جانے سے روکتا ہے اس لیے ان کے لیے غیر منظم ملازمتوں میں ہی جو ہر دکھانے کے زیادہ مواقع حاصل ہیں۔ روزگار سے جڑی ۹۰٪ عورتیں اسی طرح کے کاموں میں پائی جاتی ہیں۔ سن ۲۰۰۱ء کی مردم شماری کی روشنی میں یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ اس وقت ملک میں خواتین کی تعداد ۴۹،۶۴،۵۳،۵۵۶ تھی ان میں سے ۱۲،۷۲،۲۰،۲۴۸ خواتین یعنی ۲۵.۶۲٪ کسی نہ کسی روزگار سے وابستہ تھیں اور اس طرح ۱۶ سال سے اوپر کی خواتین کی اکثریت Non_worker کے روپ میں درج کی گئی۔ کام کرنے والے مردوں کی تعداد کل مردوں کا ۵۱.۶۸ ٪ تھی یعنی خواتین کے مقابلے ان کا تناسب دوگنا تھا۔ کل روزگار پیشہ لوگوں میں خواتین کی شرکت ۳۲٪ تھی۔ کام کرنے والی خواتین کی کل تعداد کا ۳۳٪ زراعت میں، ۳۹٪ زراعت سے جڑی مزدوری میں، ۶٪ گھریلو صنعت میں اور ۲۲٪ دیگر کاموں میں لگا ہوا درج کیا گیا۔ لیبر منسٹری (Labour Ministry) کے مطابق ۲۰۰۰ء سے ۲۰۰۵ء کے عرصہ میں روزگار خواتین کی تعداد میں اضافہ کی شرح ۴٪ تھی۔ یہ مانا جارہا ہے کہ ۱۹۹۱ء سے جاری نئے معاشی نظام کے بعد سے سرکاری ملازمتوں کے مقابلے غیر سرکاری ملازمتوں میں مردوں اور خواتین دونوں کی تعداد میں اضافہ ہوا ہے۔ بلکہ اضافے کی جو شرح درج کی گئی ہے وہ بھی محض غیر سرکاری ملازمتوں کی وجہ سے ہے۔ ملازمتوں کے منظم دائرے (Organized Sectors) میں مردوں کی بڑی اکثریت لگی ہوئی ہے۔ جب کہ ان ملازمتوں کا ۱۹٪ حصہ ہی خواتین کے نصیب میں آیا ہے۔ روزگار کی متلاشی خواتین کی تعداد ۲۰۰۴ء میں ایک کروڑ ۶ لاکھ تھی جو کہ ایسے افراد کی مجموعی تعداد کا ۲۶٪ تھا۔

یہاں بھارت میں مسلم خواتین کی صورت حال پر بھی ایک نظر ڈال لینا مناسب ہوگا۔ ۲۰۰۱ء میں مسلم خواتین اور بچیوں کی کل تعداد ۶،۶۸،۱۴،۱۰۶ تھی۔ ان میں سے باروزگار خواتین کی تعداد ۹۴،۰۹،۸۸۰ یعنی کل مسلم خواتین کا ۱۴٪ تھی۔ یہ تعداد کل خواتین کی تعداد کا ۷٪ اور کل برسر روزگار اور کام کرنے والے افراد کا ۲٪ تھی۔ کام کرنے والی مسلم خواتین میں سے ۲۲٪ زراعت میں، ۳۱٪ زراعت سے جڑی مزدوری، ۱۹٪ گھریلو صنعت اور ۲۸٪ دیگر کاموں میں لگی ہوئی تھیں۔ شہری آبادی میں باروزگار مسلم خواتین کی تعداد ۱۸،۱۷،۹۷۵ تھی اور ان میں سے تناسب کے اعتبار سے ۲٪ زراعت میں، ۶٪ زراعت سے جڑی مزدوری، ۳۳٪ گھریلو صنعت میں اور ۵۹٪ دیگر کاموں میں لگی ہوئی تھی۔

سچر کمیٹی نے اپنے تجزیات میں یہ بات درج کی ہے کہ اپنے خود کے کاروبار میں جہاں مسلمانوں کا مجموعی تناسب ۶۱٪ تھا وہیں شہری آبادیوں میں یہ تناسب ۳۷٪ رہ جاتا ہے۔ مگر شہروں میں رہنے والی مسلم خواتین کا خود اپنے کاموں کے ذریعہ آمدنی کرنے والیوں کا تناسب ۳۷٪ تھا جو شہری ہندو خواتین کے مقابلے ۱۳٪ زائد درج کیا گیا۔ سچر کمیٹی رپورٹ کے مطابق مستقل ملازمت میں مسلمانوں کا تناسب محض ۱۳٪ تھا اور مسلم خواتین کا محض ۶٪ ہی مستقل ملازمتوں

میں سرگرم نظر آیا۔ آزادانہ روزگار سے جڑی مسلم خواتین کا تناسب ۷۷٪ کے آس پاس درج کیا گیا۔

مندرجہ بالا بحث سے جو نتائج اخذ کیے جاسکتے ہیں وہ حسب ذیل ہیں:

۱۔ مغربی ممالک میں تمام دعوں کے باوجود تقریباً ۴۰٪ کے آس پاس ہی خواتین روزگار سے جڑی ہوئی ہیں۔

۲۔ دنیا کے دوسرے ممالک بشمول مسلم ممالک میں عام طور پر مغربی طرز معاشرت اختیار کی جارہی ہے اور وہاں بھی ملازمتوں اور معاشی سرگرمیوں میں رجحانات مغرب سے جدا نہیں ہیں حالانکہ اس معاملے میں یہ ممالک مغربی ممالک سے پیچھے ہیں۔

۳۔ تیسری دنیا کے ممالک کی طرح بھارت میں بھی خواتین کی کثیر تعداد زراعت اور زراعت پیشہ مزدوری سے جڑی ہے اور ملازمت کے دیگر ذرائع مثلاً فیکٹریوں، دفتروں وغیرہ میں بے روزگار خواتین کا محض ۲۲٪ حصہ ہی لگا ہے۔

۴۔ مستقبل میں بھارت میں روزگار کے مواقع غیر سرکاری اداروں میں ہی بڑھنے کے امکانات ہیں اور منظم سیکٹر میں کام کرنے والی خواتین کے موجودہ ۱۹٪ کے تناسب میں تدریجاً اضافہ ہوگا۔

۵۔ اپنی ہمسر خواتین کی طرح مسلم خواتین کی اکثریت (۵۳٪) بھی زراعت سے جڑے کاموں میں لگی ہے حالانکہ یہ تناسب غیر مسلم خواتین کے مقابلہ کم ہے۔

۶۔ مسلم خواتین کی خاطر خواہ تعداد یعنی ۷۴٪ گھریلو صنعت اور دیگر کاموں میں درج کی گئی تھی جو کہ ہندو خواتین کے مقابلہ کافی زیادہ ہے۔ اسی طرح اپنے خود کے کام کرنے والی مسلم خواتین کی تعداد آزاد پیشہ خواتین کا ۵۷٪ ہے۔

۷۔ فیکٹریوں میں کام کرنے والے کل مسلمانوں میں سے مسلم خواتین کا حصہ ۳۰٪ کے آس پاس درج کیا گیا جو کہ کافی زیادہ ہے۔

۸۔ کام کرنے والی مسلم خواتین کا محض ۶٪ حصہ ہی مستقل ملازمت کے کاموں میں نظر آتا ہے۔

سماج میں عورت کا فطری کردار:

خواتین کی ملازمت کے ضمن میں جو سب سے بڑا سوال سامنے آتا ہے وہ یہی ہے کہ کیا مرد و خواتین کی پیشہ وارانہ اور دیگر معاشی سرگرمیوں میں کوئی امتیاز کیا جاسکتا ہے اور کیا ملازمت اختیار کرنے کے سلسلہ میں دونوں کی ضرورتیں اور صلاحیتیں یکساں ہیں؟ اس سلسلے میں آزادانہ موقف کے مقابلہ سماج میں خواتین کے فطری کردار کی بات کہی جاتی ہے اور یہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ دونوں اصناف کا بنیادی کردار سماج میں ایک جیسا نہیں ہے اور اسی لحاظ سے روزگار، ملازمت اور معاشی سرگرمیوں کے معاملے میں دونوں کی پسند ناپسند، دونوں کی حصہ داری اور دونوں کے لازمی کردار مختلف ہوں گے۔

اس سلسلہ کی سب سے اہم حقیقت مرد وزن کی جسمانی تفریق ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے افزائش نسل کے لیے مرد کو باپ اور عورت کو ماں بنایا ہے۔ ان مختلف ذمہ داریوں کو نبھانے کے لیے نہ صرف دونوں کی ساخت مختلف رکھی گئی ہے بلکہ دونوں کے کئی کیمیائی مادے بھی جدا ہیں۔ حالانکہ بحیثیت انسان دونوں برابر ہیں مگر مرد وزن کی حیثیت سے دونوں الگ الگ ہیں اور یہ ایسی اٹل حقیقت ہے کہ مساوات کی بحث سے مرد وزن کی مکمل برابری ثابت کرنا ناممکن ہے۔ ماں بچوں کو اپنی کوکھ سے پیدا کرتی ہے باپ ایسا نہیں کرسکتا۔ اسی لحاظ سے نہ صرف ماں پر بچوں کی ذمہ داریاں زیادہ ہیں بلکہ بچوں کے فرائض بھی ماں کے لیے اتنے ہی زیادہ ہیں۔

مرد میں ٹیسٹوسٹیرون ہارمون (Testosterone Harmone) کی موجودگی اسے مضبوط، توانا، ٹھوس اقدام کرنے والا، جفاکش اور خودسر بناتا ہے جب کہ عورت میں اسٹروجن (Estrogen) نامی ہارمون انہیں نازک، باحیا، جذباتی اور خودسپرد بناتا ہے۔ جسمانی ساخت اور ہارمون و دوسرے کیمیا کی یہ تفریق نہ صرف زندگی میں ان کے کردار کو جدا بنادیتی ہے بلکہ بہت سے کاموں میں ان کی ترجیحات بھی مختلف ہوجاتی ہیں۔ یہی حقیقت جب ملازمت اور معاشی ذمہ داریوں کے میدان میں تسلیم کی جائے تو دونوں کی معاشی ذمہ داریاں اور ملازمتوں کا رنگ جداگانہ ہوگا۔ دونوں اپنی اپنی ساخت اور فطرت کے مطابق کچھ کاموں کی جانب فطری میلان رکھتے ہیں اور بعض دوسرے کام ان کے لیے دشوار اور مشقت بن جاتے ہیں۔ خواتین کے لیے ایسے تمام کام جو ان کے لیے تن آسان، پرسوز، شفقت اور محبت کے عناصر کو تسکین دے سکیں مثلاً تعلیم وتدریس، نرسنگ، بچوں کی دیکھ بھال ونگرانی، وغیرہ سے تعلق رکھتے ہوں فطری بن جائیں گے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ مردوں والے کام نہیں کرسکتیں۔ وہ ایسے کام کرسکتی ہیں مگر ایک تو ان پر یہ حقیقت میں گراں گزرے گا اور دوئم یہ کہ ان کی

فطری صلاحیتوں سے سماج محروم ہوجائے گا۔ لہٰذا مرد وزن کو فطرت کے مطابق سماج میں اپنا کردار نبھانے کی بات کہنا کوئی عجوبہ نہیں ہے بلکہ حقیقت سے قریب تر ہے۔ آج بھی ملازمت پیشہ خواتین کی کثرت ایسے ہی شعبوں میں پائی جاتی ہے جہاں ان کی فطرت انہیں اجازت دیتی ہے۔

اس ضمن میں دوسرا پہلو سماج میں حسن نظام کے لیے تقسیم کار ہے۔ جب یہ بات کہی جاتی ہے کہ مرد وزن کے کاموں میں فطری تفریق ہے اور اس لحاظ سے ان میں قدرتاً تقسیم کار پایا جاتا ہے تو بعض روشن خیال لوگ اسے فرسودہ خیال سمجھ کر نظر انداز کرنا چاہتے ہیں، مگر زندگی کے ہر شعبہ میں پائے جانے والے تقسیم کار اور حسب صلاحیت اور حسب استطاعت لوگوں سے کام لینے کا فلسفہ اور دستور پایا جاتا ہے اور اسے کوئی عیب نہیں سمجھتا۔ پھر اس بات کو کیوں برا سمجھا جائے کہ روزگار کے میدان میں بھی اس بات کا خیال رکھا جائے کہ دونوں کی فطری ذمہ داریاں کیا ہیں اور انہیں تقسیم کار کے نظام کے تحت کون سا کردار اپنانا ہے؟

مرد وزن کی معاشی ذمہ داریوں کے تعین میں سماجی ضرورتوں کو بھی پیش نظر رکھا جانا انتہائی ضروری ہے۔ آج جب کہ سماج انتشار اور بے راہ روی کی عظیم وبا سے دوچار ہے اور معاشرے میں ظلم وتشدد، نفرت اور کدورت، مایوسی اور خود پرستی عام ہے، یہ سوچنے کا مقام ہے کہ غلطی کہاں ہوئی اور گہرے تجزیے کے بعد یہ بات سامنے آئے گی کہ خواتین کو ان کی فطری ذمہ داریوں سے ہٹا کر جو خلا پیدا کیا جارہا ہے، دور جدید کا کرب اسی کی پیداوار ہے۔

انسانیت کو درپیش ایک عظیم بحران

عورتوں کو اپنی فطری ذمہ داریوں سے نکال کر مرد وزن کے بیچ کلی مساوات کی جو ہوا چلی ہے تو اس کے سماج پر کوئی بہتر اثرات رونما نہیں ہوئے۔ ان مضر اثرات کی ایک لمبی فہرست پائی جاتی ہے۔ ذیل میں چند اہم امور پر روشنی ڈالی جارہی ہے۔

خواتین کی ایسی معاشی سرگرمیاں، روزگار اور ملازمتیں جو انہیں مردوں کے ساتھ اختلاط پر مجبور کرتی ہیں آج سماج میں انتشار کا باعث بن گئی ہیں۔ روزگار میں لگی خواتین دن بھر جب اپنے گھر اور گھر والوں سے دور رہ کر غیر محرم مردوں کے بیچ اپنی معاشی سرگرمیاں نبھاتی ہیں تو ان پر ان کے شوہر کا اعتماد اٹھنے لگتا ہے ان میں جھگڑے شروع ہوتے ہیں اور نوبت طلاق پر جا پہنچتی ہے۔ آج ہر ملک میں شرح طلاق تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ عورتوں پر گھریلو جارحیت اس قدر بڑھ گئی ہے کہ اس کی روک تھام کے لیے قانون سازی کا سہارا لیا جارہا ہے۔ ان جھگڑوں سے بچنے کے لیے ایک طبقہ تو شادی بیاہ کے جھنجھٹ ہی سے بھاگ کھڑا ہوا اور 'لو ان' (Live in) یعنی بغیر شادی کے ساتھ ساتھ رہنے کا چلن شروع ہوگیا ہے۔ دہلی جیسے شہر میں بعض کالونیاں تو 'لو ان' جوڑوں کے لیے مشہور ہوتی جارہی ہیں۔ احمد آباد میں بھی ہزاروں جوڑے اس فیشن کے تحت اپنی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ یہی حال دوسرے شہروں کا بھی ہے۔ مغرب میں تو یہ ایک غیر معیوب طرز زندگی سمجھ لیا گیا ہے۔ اس کے نتیجے میں بچوں کی شرح پیدائش کم ہوتی جارہی ہے اور Single parent یعنی بغیر باپ کے بچوں کی تعداد میں اضافہ ہورہا ہے اور یہ ہمارے ملک میں بھی قانوناً درست مان لیا گیا ہے کہ ایک بچہ اسکول میں باپ کے نام کے بجائے صرف ماں کا نام لکھا کر اپنا کام چلا سکتا ہے۔

آج مغربی دنیا کے چند حقائق اس طرح ہیں: طلاق کی بڑھتی ہوئی شرح اور شادی کا گھٹتا ہوا رجحان، صرف ماں کے ساتھ رہنے والے بچوں کی تعداد میں اضافہ، بچے نہ پیدا کرنے کا رجحان، ملکوں کی گھٹتی ہوئی آبادی، گھروں میں عورتوں کی بے رحمی سے پٹائی کے واقعات میں اضافہ، زنا بالجبر کے واقعات میں زبردست اضافہ، بدکاری اور ناجائز تعلقات میں زبردست اضافہ، تیسری دنیا کے ممالک میں بھی یہی خلفشار بڑھ رہا ہے۔ خود ہمارے ملک میں بھی یہ خرابیاں دن بہ دن بڑھتی جارہی ہیں۔ امریکہ میں خواتین پر ظلم وتشدد کے تقریباً ۵ر لاکھ معاملے ہر سال درج کیے جاتے ہیں جب کہ ہمارے ملک میں ان کی تعداد 1.5 لاکھ ہے۔ ان تمام حقائق کے پیچھے کسی سب سے اہم وجہ کا نام لیا جائے گا تو وہ اباحیت کہلائے گی۔ اباحیت معاشرے میں مختلف انداز سے نفوذ کررہی ہے اور اس کی ایک ناقابل فراموش شکل اداروں، فیکٹریوں، دفتروں اور روزگار فراہم کرنے والے دیگر مقامات پر اختلاط مرد وزن ہے۔ آج اگر مغربی معاشرہ انتشار اور زبردست سماجی بحران کا شکار ہے یا دوسرے ممالک جو اس طرف بڑھ رہے ہیں تو اس کے لیے ذمہ داران ممالک کی روزگار کے سلسلے میں ایسی پالیسیاں بھی رہی ہیں جو اختلاط مرد وزن کو فروغ دیں اور معاشرے میں اباحیت کو عام کردیں۔

مغربی دنیا میں ایسی خواتین کی تعداد بڑھتی جارہی ہے، جو اپنے کیریئر میں ماں بننے کے عمل کو ایک بڑی رکاوٹ سمجھتی ہیں۔ چنانچہ یورپ میں انگلینڈ، فرانس اور اٹلی کو چھوڑ کر تمام ہی ملکوں میں شرح پیدائش منفی ہوگئی ہے۔ وہاں بچہ پیدا کرنے پر عورتوں کو انعام دیا جاتا ہے۔ مگر صورت حال بد سے بدتر ہوتی جارہی ہے۔ لندن کی ۳۹ سالہ خاتون لوسی وارڈ کے یہ الفاظ مغربی خواتین کی ذہنیت کی عکاسی کرتے ہیں: "میں اپنے کام کا لطف اٹھا رہی ہوں جس میں خوب سیر سپاٹے کا موقعہ ملتا ہے حالانکہ میری یہ کوئی شعوری پسند نہیں تھی مگر برسوں سے میں نے کام پر توجہ مرکوز رکھی اور اب مجھے شک ہے کہ میں ماں بن پاؤں گی۔" ۲۰۰۶ء میں

امریکہ میں کیے گئے ایک سروے کے مطابق ۱۰ میں سے ۸ خواتین نے یہ مانا ہے کہ ماں بننے کا عمل ان کے کیریئر کے لیے نقصان دہ ہے۔

یہ بھی حقیقت ہے کہ جو عورتیں ملازمت اور خاندان دونوں کی ذمہ داریاں نبھانا چاہتی ہیں، انہیں دوہرے کام کی وجہ سے خاصہ پریشان رہنا پڑتا ہے۔ اپنے کام سے گھر لوٹ کر انہیں اپنے شوہر، بچوں و دیگر رشتہ داروں کی خدمت کے لیے کھٹنا پڑتا ہے۔ گھر میں نوکر کے ہوتے ہوئے بھی سب کام ان پر نہیں چھوڑے جاسکتے اور کچھ نہ کچھ ذمہ داری نبھانی پڑتی ہے۔ کیرل کی ایک محقق میری اکلورو نے ترونتاپرم ضلع کی بنکنور پنچایت میں اپنی تحقیق کے نتیجہ میں جو مشاہدہ کیا ہے وہ اس طرح ہے: ''اس تحقیق میں ۱۰۰ ر کام کاجی خواتین کے مسائل کی جانچ کی گئی اور ۲۰ ر گھریلو عورتوں کے ساتھ ان کا موازنہ کیا گیا۔ کام کرنے والی عورتوں نے بتایا کہ ان کے روزگار نے انہیں ایک قسم کی معاشی آزادی عطا کی ہے اور گھریلو خرچوں کے لیے زیادہ رقم دستیاب ہوئی۔ ان کی دشواریوں میں آمد ورفت کی سہولیت میں کمی، کم مشاہرہ اور شدید محنت کو شامل کیا گیا۔ برسر روزگار خواتین کے پاس اپنی ذاتی دیکھ بھال کے لیے وقت کی تنگی پائی گئی۔ جب کہ گھریلو عورتوں کو مناسب آرام اور تفریح کا وقت آسانی سے دستیاب تھا۔ دونوں قسم کی خواتین کی غذا میں نمایاں فرق دیکھا گیا اور کام کرنے والی خواتین کی غذا عدم توازن کا شکار پائی گئی۔'' بے روزگار خواتین میں سے نصف سے زائد کو ملازمت سے جڑے تناؤ سے متاثر پایا گیا اور ان کے لیے بچوں کی مناسب نگہداشت، گھر اور کام کے بیچ توازن، تفریحی اوقات کا فقدان اور آرام میں کمی کو لے کر بے چینی درج کی گئی۔'' ۴۳ سالہ جرمن خاتون 'گل تھامس' جو پیشہ سے وکیل اور دو بچوں کی ماں ہیں فرماتی ہیں: ''یہ شدید تناؤ کا باعث ہوتا ہے کہ آپ گھر اور کیریئر دونوں کو سنبھالیں، میں اکثر احساس جرم محسوس کرتی ہوں۔'' آسٹریلیا میں کیے گئے ایک مطالعہ میں ملازمت کرنے والی خواتین کا ۲۰٪ ڈپریشن (Depression) کا شکار پایا گیا۔ دوسرے ملکوں میں کی جانے والی تحقیقات میں بھی ایسے ہی نتائج سامنے آئے ہیں۔ پروفیسر 'لامونٹے گنی' (La Montagne) فرماتے ہیں: ''کام کا دباؤ دماغی بیماریوں کا باعث بنتا ہے۔'' ان تمام حوالوں سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ اگر تمام نہیں تو خواتین کی بڑی تعداد اپنے روزگار اور ملازمت کو لے کر دباؤ کو جھیلتی ہیں اور یہ ان کی صحت پر مضر اثر ڈالتی ہے۔''

ملازمت پیشہ خواتین کے لیے کام کے مقامات اور آمد ورفت کے دوران اپنی حفاظت کو لے کر بھی بے چینی پائی جاتی ہے اور انہیں شب وروز میں کئی دقتوں کا سامنا رہتا ہے۔ گذشتہ اکتوبر میں چھپی 'دی ہندو' (The Hindu) کی ایک خبر کے مطابق نوکری کرنے والی خواتین میں سے ۵۳٪ اپنے آپ کو غیر محفوظ سمجھتی ہیں۔ خاص طور پر وہ خواتین جو رات کی شفٹ میں کام کرتی ہیں۔ بڑی کمپنیوں کی ۲۳٪ خواتین اور چھوٹی فرموں کی ۴۸٪ خواتین خود کو غیر محفوظ سمجھتی ہیں۔ نوکری پیشہ خواتین کی حفاظت کو لے کر سب سے خطرناک صورت حال ملک کی دار السلطنت دہلی میں درج کی گئی ہے جہاں خود کو غیر محفوظ سمجھنے والی خواتین کی تعداد ۶۵٪ تک درج کی گئی ہے۔ رات کو کام کرنے والی خواتین کا ۸۵٪ خود کو غیر محفوظ سمجھتا ہے۔ یہ اعداد وشمار اس بات کو واضح کرتے ہیں کہ خواتین کی اکثریت نوکری کرتے ہوئے نہ صرف خود کو غیر محفوظ تسلیم کرتی ہیں بلکہ بارہا ناگہانی صورت حال کی شکار بھی ہوتی رہتی ہیں۔

ملازمت سے جڑی خواتین کا ایک بڑا مسئلہ ان کے ساتھ ہونے والا مشاہیراتی امتیاز بھی ہے۔ انہیں مردوں کے مقابلہ کم مشاہرہ ملتا ہے اور ''سستی مزدورنی'' کا روایتی تصور ان پر چسپاں رہتا ہے اور یہ امتیاز خواتین کے ساتھ نہ صرف ترقی پذیر ملکوں میں رکھا جاتا ہے بلکہ تقریباً تمام ہی ترقی یافتہ ملکوں میں یہ وبا عام ہے۔ ایسے آٹھ ملکوں میں کیے گئے سروے میں یہی حقائق سامنے آئے ہیں۔ اونچے عہدوں پر کام کرنے والی خواتین کا ۷۰٪ یہ مانتا ہے کہ ان کو مردوں کے برابر کام کرنے کے باوجود کم مشاہرہ ملتا ہے۔ معاشیات کی پروفیسر 'لنڈا ایکیل' کے مطابق امریکہ میں اونچے عہدوں پر کام کرنے والی خواتین کا اپنے ہمسر مردوں کے مقابلہ ۲۵٪ کم پیسہ ملتا ہے۔ جہاں یہ غیر منصفانہ عمل عورتوں کو سستی مزدور سمجھتا ہے وہیں کہیں نہ کہیں مالکان کے ذہن میں یہ بات رہتی ہے کہ اپنے تمام دعوؤں کے باوجود اپنی ساخت اور نفسیات کے لحاظ سے خواتین مردوں کے مقابلہ کم مفید ہوتی ہیں اور انہیں اپنے ہمسر مردوں کے مقابلہ کم دیا جانے والا مشاہرہ جائز ہے۔

خواتین کو طاقتور بنانے کا قومی منشور:

مرکزی حکومت نے خواتین کو طاقتور بنانے کے لیے ۲۰۰۱ء میں ایسی قومی پالیسی منظور کی جس کے کئی مندرجات میں سے چند کا تعلق ان کی ملازمت سے بھی ہے۔ وہ درج ذیل ہیں:

۱۔ غربت کے خاتمہ کے لیے ایسے اقدام کیے جائیں گے جو غریب خواتین اور روزگار کو قریب تر کرسکیں جس میں انہیں معاشی اور سماجی بنیاد پر اپنی ترجیحات کے لیے ایک وسیع میدان فراہم ہو اور انہیں درکار قابلیت کو بڑھانے کے مواقع پیدا کیے جائیں۔

۲۔ الکٹرانکس، انفارمیشن ٹیکنالوجی اور اغذیہ کی صنعت اور ملبوسات کے کارخانوں سے جڑے کاموں میں خواتین ایک اہم کردار نبھاسکتی ہیں۔ انہیں قانون

سازی، سماجی تحفظ اور دوسری معاون سہولیات کے ذریعہ ملک کی صنعت میں کام کرنے کے لیے تعاون دیا جائے گا۔

۳۔ عورت اس وقت فیکٹریوں اور دفاتر کی رات کی شفٹ میں اپنی خواہش کے باوجود کام نہیں کرسکتی۔ ان کی حفاظت اور آمد و رفت کی سہولیت کو بہتر فراہمی کے ذریعہ اسے یقینی بنایا جائے گا۔

۴۔ سرکار اس بات کی بھی کوشش کرے گی کہ چھوٹے بچوں کی دیکھ بھال کے لیے فیکٹریوں اور دفاتر کے آس پاس کریچ (Creche) بنائے جائیں تاکہ زچگی کے فوراً بعد وہ اپنے کام پر لوٹ سکیں۔

اس کے علاوہ عالمی سطح پر خواتین کو بہتر روزگار فراہم کرنے کے سلسلہ میں جو مختلف اقدامات کیے جارہے ہیں ہمارا ملک بھی ان کا پابند ہے۔

غربت اور شدائد کی وجہ سے ملازمت

یہ حقیقت تسلیم شدہ ہے کہ دنیا کی ایک تہائی آبادی غربت اور افلاس میں جی رہی ہے۔ اقوام متحدہ کے مطابق دنیا کی ۷۰٪ بالغ خواتین غربت کا شکار ہیں۔ اس لحاظ سے بھارت کی مسلم آبادی بھی ملک کے دوسرے طبقات کے مقابلے زیادہ غربت زدہ ہے۔ سچر کمیٹی رپورٹ کے مطابق سن ۰۵-۲۰۰۴ء میں جہاں خط افلاس کے نیچے رہنے والے لوگوں کی آبادی ملک کی کل آبادی کا ۲۲.۷٪ تھا وہیں یہ تناسب مسلم معاشرے کے سلسلہ میں ۳۱٪ اور عام ہندوں کے سلسلہ میں محض ۸.۷٪ درج کیا گیا ہے۔ مسلمانوں کی غربت کا یہ شمار شہروں میں ۳۸.۴٪ تک جا پہنچا ہے۔ مدھیہ پردیش (۵۸٪)، چھتیس گڑھ (۶۱٪)، مہاراشٹرا (۴۹٪)، اڑیسہ (۴۸٪)، کرناٹک (۴۵٪)، بہار (۴۵٪) اور اتر پردیش (۴۴٪) وہ صوبے ہیں جہاں مسلمانوں کی تقریباً آدھی آبادی غربت و افلاس کا شکار ہے اور اس کا شمار خط غربت کے نیچے رہنے والی آبادی میں ہوتا ہے یعنی ایسے مسلمان خاندان جو مبلغ ۴۵ روپیہ فی کس یومیہ سے کم خرچ کرپاتے ہیں۔

یہ کہا گیا ہے کہ غربت کفر کی طرف لے جاتی ہے۔ اس اعتبار سے عام مسلمانوں کا ایک تہائی حصہ اور شہری مسلمانوں کا ۴۰٪ حصہ اس خطرہ سے دوچار ہے۔ ایسے میں مسلمانوں کی غربت و افلاس کو ختم کرنے کے لیے خط غربت سے نیچے زندگی جینے پر مجبور افراد بالخصوص خواتین کو معاشی سرگرمیوں میں شامل ہونے اور ان کی ملازمت کے لیے کچھ بہتر راہ اختیار کرنے کی ضرورت ہے۔ مسلم فلاحی اداروں کو اس سلسلہ میں بڑے پیمانے پر کام کرنے کی ضرورت ہے اور زکوۃ وصدقات کا بہتر نظم کرکے غربت کے خاتمہ کی منصوبہ بند تحریک مسلمانوں میں چلانے کی ضرورت ہے۔ اس کے لیے اوقاف قائم کرنے پر بھی مسلمانوں کو ابھارا جائے تاکہ عام مسلمان ایک پروقار زندگی بسر کرنے میں کامیاب ہوسکے۔ مسلم خواتین کی ایسی انجمنیں بڑی تعداد میں بنائی جائیں جو مسلم خواتین کو بالخصوص تربیت دے کر روزگار سے جڑے کاموں میں لگا سکے تاکہ ایک طرف مسلم خواتین اپنی غربت کو ختم کرسکیں تو دوسری جانب انہیں اس کے لیے کسی اسلامی حدود سے تجاوز پر مجبور نہ ہونا پڑے۔ اس طرح کے مواقع اگر پیدا کیے جائیں تو مسلم خواتین کو نامناسب قسم کی ملازمتوں کی جانب جانے سے روکا جاسکے گا۔ اور جب تک مذکورہ نظام مسلم معاشرے میں خاطر خواہ سطح پر قائم نہیں ہوجاتا مسلم خواتین کو ایسی ملازمتوں کو اختیار کرنے کی اجازت دی جائے جو ان کے فطری کردار، اسلامی شعار اور تحفظ میں حارج نہ ہوں۔

تجاویز برائے ملازمت خواتین:

مندرجہ بالا معلومات، اعداد وشمار اور مباحث سے جو نکات خواتین کی ملازمت کی شرعی حیثیت کو متعین کرسکتے ہیں وہ درج ذیل ہیں:

۱۔ زراعت اور زراعت سے جڑے کام: اکثر ممالک بشمول بھارت کے زراعت اور زراعت سے جڑے کاموں میں خواتین کی کثیر تعداد لگی ہوئی ہے مگر ہمارے ملک میں مسلم خواتین کا نسبتاً کم حصہ اس میدان میں سرگرم عمل ہے۔ زراعت اور اس سے جڑے کاموں میں خواتین کی شرکت عموماً دو طرح سے ہوتی ہے یا تو وہ اپنے محرم کے ساتھ مل کر کام کرتی ہیں یا دوسری عورتوں کے ساتھ مل کر مزدوری کرتی ہیں۔ دونوں ہی صورتوں میں ان کے کام کرنے کا شرعی جواز موجود ہے۔ الا یہ کہ کھیتوں پر اختلاط کا اندیشہ ہو۔

۲۔ ایسے پیشوں میں مسلم خواتین کی شرکت کو روکا جائے جو شرعاً حرام ہیں مثلاً شراب اور منشیات کی فیکٹریوں اور اس کی فروخت کے کام، خنزیر پالن (Piggery) یا اس کے اشیاء کی فروخت، لاٹری اور سٹے سے جڑے کام، ایسے ہوٹل میں کام جہاں غیر ذبیحہ یا حرام گوشت دسترخوان کا حصہ ہو، ناچ گانے اور جسم کی نمائش یا فروخت سے جڑے کام، اباحیت کو فروغ دینے والی کتب، اشیاء یا تشہیری کاموں سے جڑی ہوئی ملازمت، ایسے کام جس میں خواتین کی قابلیت

اور صلاحیت سے زیادہ ان کی خوبصورتی اہم سمجھی جائے مثلاً استقبالیہ، ایئر ہوسٹس، سیلس گرل، پہلوان وغیرہ، ایسے اداروں کی ملازمت جہاں سے منصوبہ بند طریقہ سے شرک، کفر اور اسلام دشمنی کو فروغ دیا جائے وغیرہ۔

۳۔ رات کی شفٹ میں ہونے والے تمام کاموں کی ملازمت سے خواتین کو روکا جائے چونکہ اس میں ان کی ذات کے لیے اور معاشرے کے لیے فساد کا اندیشہ رہتا ہے۔ رات کی شفٹ میں مردوں کے وارڈ میں کام کرنے سے نرسوں کو روکا جائے۔

۴۔ ایسی ملازمت سے انہیں دور رکھا جائے جس میں خواتین کو اکیلے یا غیر محرم لوگوں کے ساتھ سفر کرنا لازمی ہو، مثلاً سیاحت سے جڑے گائڈ، اسکورٹ (Escort) وغیرہ کے پیشے۔

۵۔ ایسے تمام کاموں سے خواتین کو محفوظ رکھا جائے جہاں ستر پوشی کرنا ان کے لیے مشکل ہو جائے۔ مثلاً سوئمنگ پول کی ملازمت یا کھیل کود سے جڑے کام۔

۶۔ ایسے کاموں کو کرنے سے ان کی حوصلہ شکنی کی جائے جو فطرتاً خواتین کے شایان شان یا ان کی جسمانی ساخت کے متحمل نہ ہوں۔ مثلاً حمالی، لمبی یا ہیوی ڈرائیونگ (Heavy Driving) کے کام، وغیرہ۔

۷۔ انہیں ایسے کاموں کی ترغیب دی جائے جو فطرتاً خواتین کے لیے بہتر ہوں مثلاً تعلیم وتدریس، بچوں کی پرورش، طب وصحت، وغیرہ۔

۸۔ کسی خاتون کے لیے کام کرنا مجبوری بن جائے تو ایسے کام کی جانب رہنمائی کی جائے جو اس کے وقار کو مجروح نہ کرے مثلاً گھریلو صنعت، اپنے خود کے کام یا ایسے کام جہاں خواتین کی کثرت پائی جائے۔ بھارت میں کام کرنے والی مسلم خواتین کا ۰ ۷ % حصہ پہلے سے ہی اسی طرح کے کاموں سے جڑا ہے اور مستقل ملازمت کی طرف ان کا رجحان کم پایا جاتا ہے۔

۹۔ مسلم اداروں کو ترغیب دی جائے کہ وہ غربت اور افلاس سے متاثر مسلم ودیگر خواتین کے لیے روزگار کے مواقع اس طرح پیدا کریں کہ وہ اپنی عصمت، حیا اور وقار کو مجروح کرنے پر مجبور نہ ہوں۔

۱۰۔ مسلم خواتین کی غربت کو ختم کرنے کے لیے زکوۃ اور صدقات کا استعمال کرتے ہوئے ایسی اسکیموں کی جانب پیش رفت کو فروغ دیا جائے جو ان کی اسلامی زندگی میں حارج نہ ہوں۔

۱۱۔ اُن سرکاری پالیسیوں کی مخالفت کی جائے جو خواتین کو ایسے معاش اختیار کرنے کی ترغیب دیتی ہوں جو اصلاً حرام ہیں یا انہیں اپنے فطری کردار وذمہ داریوں کو ادا کرنے سے روکتی ہیں یا جو انہیں بے حیائی اور اختلاط پر مجبور کرتی ہوں۔

۱۲۔ ایسی سرکاری اسکیموں سے فائدہ اٹھایا جائے جو مسلم خواتین کی معاش کو بہتر بنانے کے لیے انہیں پروقار طریقے سے فراہم ہوں۔

۱۳۔ غریب وپسماندہ عورتوں کی فلاح وبہبود کی جو سب سے زیادہ رائج شکل ہے وہ ہے Self Help Group (حلقہ برائے اپنی خدمت آپ)۔ ابھی حال ہی میں بنگلہ دیش کے ماہرین معاشیات اور سماجی کارکن محمد یونس کو اسی میدان میں اپنے خاطر خواہ کردار کے لئے نوبل اعزاز سے نوازا گیا، سیلف ہیلپ گروپ مروجہ بی سی نظام کا ہی ایک گروپ ہے جس میں بیس بیس خواتین کے حلقے بنائے جاتے ہیں اور انہیں ایک اجتماعی قرض سے باندھ دیا جاتا ہے اور کسی پیشہ ورانہ کام کی تربیت دے کر ان سے مال خرید لیا جاتا ہے، منافع کی ایک رقم قسطوں میں سے قرض کاٹ کر باقی رقم متعلقین میں تقسیم کر دی جاتی ہے، اس طرح خواتین نہ صرف خود کفیل ہو جاتی ہیں بلکہ اجتماعی ربط کی وجہ سے ان میں بتدریج تعلیمی، سماجی اور سیاسی تبدیلیاں بھی واقع ہونا شروع ہوتی ہیں۔ اس سلسلہ میں حکومت کا اعلیٰ ترین ادارہ NABARD ہے جو چھوٹے اداروں اور بینکوں کے ذریعہ SHG کے ذریعہ غریب اور پسماندہ افراد بالخصوص خواتین کو مدد پہنچاتا ہے۔ اس ادارہ کے مطابق ۱۹۹۲ء سے ۲۰۰۲ء کے دہے میں 78 ہزار خاندان اس نظام سے جڑے جن میں ۹۰ فیصد خواتین ذریعہ تھیں۔ خواتین پر اس اعتبار کی وجہ ان کا صحیح مصرف پر قرض کی رقم کو خرچ کرنا اور قرض واپسی میں ان کا حساس ہونا ہے۔ مسلم خواتین کو مضبوط بنانے اور انہیں خود کفیل بنانے کے لئے HSG حلقے برائے اپنی خدمت آپ بنائے جاسکتے ہیں۔ یہاں سرکاری نظام سے فائدہ اٹھانے میں جو سب سے بڑی رکاوٹ نظر آتی ہے وہ متعلقہ قرض سے جڑا سود ہے حالانکہ وہ کافی کم ہوتا ہے۔ HSG کے لئے عام طور پر ۶ فیصد کی شرح سے سود لیا جاتا ہے اقلیتوں کی معاشی ترقی کے لئے بنے ادارے NMFDC کے قرض بھی اسی شرح سے بندھے ہیں۔ مہاراشٹر کی سرکار نے اس اسکیم کی کامیابی کو دیکھتے ہوئے حال ہی میں سود کی شرح کو کم کر کے ۴ فیصد کر دیا ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ غربت وافلاس کو ختم کرنے کے لئے کیا مسلم خواتین کو اس طرح کے اداروں سے جوڑا جاسکتا ہے؟ اس سلسلہ میں خط غربت کے نیچے زندگی بسر کرنے والی خواتین کو کیا رعایت حاصل ہے؟ کیا اس طرح کی اسکیم زکاۃ کے عطیہ سے بھی چلائی جاسکتی ہے؟

☆☆☆

خواتین کی ملازمت
شریعت اسلامی کی روشنی میں

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی [1]

پس منظر

خواتین کی ملازمت کا مسئلہ اس دور میں بڑی اہمیت اختیار کر گیا ہے اور اس کو خصوصی اہمیت موجودہ مغربی معاشرہ کی وجہ سے حاصل ہوئی ہے، یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ مغرب کے سرمایہ دارانہ معاشرتی نظام کی بنیاد خود غرضی اور لذت پرستی پر ہے اور یہی دونوں محرکات خواتین خانہ کو گھر سے باہر لانے کے پیچھے کارفرما ہیں، خود غرضی یہ ہے کہ مغربی معاشرہ میں عورتوں کا معاشی بوجھ مرد برداشت کرنا نہیں چاہتے، یہاں تک کہ جب لڑکی کی عمر اٹھارہ سال کی ہو جاتی ہے، تو والدین خود اس سے تقاضا کرنے لگتے ہیں کہ وہ باہر نکلے، ملازمت کرے اور خود اپنا بوجھ اٹھائے، دوسرے: مردوں کی ہوسنا کی طلب گار ہوتی ہے کہ ہر دفتر اور دکان میں کوئی خوش رو عورت اس کا استقبال کرے، یہ وہ محرکات ہیں، جس نے یورپ کے صنعتی انقلاب کے بعد بڑے پیمانے پر عورتوں کو گھر سے باہر نکلنے کا راستہ دکھایا، یہاں تک کہ اس معاشرہ کو حقیر سمجھا جانے لگا، جس میں عورتیں ''شمع محفل'' بننے کی بجائے ''چراغ خانہ'' بن کر رہتی تھیں۔

فوائد و نقصانات

عورتوں کے گھر سے باہر نکلنے سے فائدہ تو صرف اتنا ہوا کہ بعض خاندانوں کے معاشی حالات بہتر ہو گئے، سماج کے بگڑے ہوئے لوگ جو خواتین کو بالکل مجبور و بے بس سمجھ کر اپنے مظالم کا نشانہ بناتے تھے اور عورتیں ہر طرح کی زیادتی کے باوجود خاموش رہنے پر مجبور تھیں، ان سے کچھ خواتین کو آزادی حاصل ہوئی؛ لیکن سماج کو اور خود خواتین کو اس سے جو نقصان ہوا، وہ ان محدود فوائد سے کہیں بڑھ کر ہے، ان میں سے کچھ اہم باتوں کا یہاں ذکر کیا جاتا ہے:

۱۔ انسان کے لئے خاندانی نظام بہت بڑی ضرورت بھی ہے اور اللہ تعالی کی طرف سے بہت بڑی رحمت بھی، خاندانی نظام مشکل حالات میں اس کی مدد کرتا ہے، تکلیف ہو تو زخم کا مرہم بنتا ہے، خوشی کا موقع ہو تو خاندان کی شرکت اسے دوبالا کر دیتی ہے، یہ اس کے لئے تحفظ کا حصار بھی ہے، خاندان کی بنیاد نکاح کے رشتہ پر ہے؛ کیوں کہ نکاح ہی کے ذریعہ مختلف رشتے وجود میں آتے ہیں اور ان ہی رشتوں کے مجموعہ کا نام ''خاندان'' ہے،...... رشتۂ نکاح میں جتنا استحکام رہے گا، خاندانی نظام اسی قدر مضبوط ہوگا، نکاح کے استحکام کا ایک اہم سبب باہمی احتیاج و ضرورت مندی بھی ہے، شوہر اپنے بچوں کی پرورش کے لئے بیوی کا محتاج ہوتا ہے اور بیوی اپنی معاشی ضروریات کے لئے شوہر کی محتاج ہے، اسی احتیاج کی وجہ سے ایک دوسرے کو برداشت کرنے کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے اور انسان کڑواہٹوں پر بھی ضبط و تحمل سے کام لیتا ہے، جب عورت خود کسب معاش کے میدان میں اتر جاتی ہے، تو وہ اپنی ضروریات کے لئے شوہر کی محتاج نہیں رہتی؛ اس لئے شوہر کی طرف سے خلاف مزاج باتوں کو انگیز کر لینے کا جذبہ کم ہو جاتا ہے اور رشتۂ نکاح میں دڑار آنے لگتی ہے؛ چنانچہ کام کرنے والی خواتین کی ازدواجی زندگی میں طلاق کے واقعات دوسرے خاندانوں کی بنسبت کہیں زیادہ پائے جاتے ہے؛ چنانچہ ایک سروے کے مطابق عورت کے کام کرنے کی وجہ سے مغربی ممالک میں بارہ ملین طلاق کے واقعات پیش آئے ہیں۔

۲۔ نکاح کا ایک اہم مقصد باہمی سکون اور دل کا قرار ہے، جب بیوی ملازمت کے لئے باہر نکلتی ہے، تو اکثر شوہر اس کے بارے میں شکوک و شبہات میں مبتلا ہو جاتا ہے، یہ چیز اسے بے چین کر دیتی ہے، عورت کے لئے بھی یہ بات ممکن نہیں ہوتی کہ وہ اپنے شوہر کی طرح کام کر کے تھک ہار کر گھر آئے اور پھر یہاں شوہر کے لئے فرحت و انبساط کا ساماں بہم پہنچائے کہ۔

---

[1] ۔

افسردہ کند افسردہ انجمنے را

اس طرح نکاح کا حقیقی مقصد فوت ہو کر رہ جاتا ہے۔

۳۔ کسبِ معاش کی یہ مہم بعض خواتین ابتداء میں ایک شوق کے طور پر اختیار کرتی ہیں، مگر یہ بہ تدریج ان کے لئے ایک فریضہ بن جاتا ہے، اب انہیں بچوں کی پرورش بھی کرنی پڑتی ہے، کچھ نہ کچھ امورِ خانہ داری کو بھی انجام دینا پڑتا ہے، حمل اور ولادت کی مشقت بھی انہیں اٹھانی پڑتی ہے، حیض ونفاس کی فطری تکلیفیں بھی ان کے ساتھ لگی ہوئی ہیں، اس طرح انہیں اپنے فطری فرائض بھی انجام دینے پڑتے ہیں، اور جو ذمہ داری مردوں کی تھی، اسے بھی اختیار کرنا ہوتا ہے، یہ دوہری ذمہ داری یقیناً عورتوں کے لئے بوجھ ہے؛ اسی لئے بعض سروے رپورٹوں کے مطابق مغربی ملکوں میں اکثر خواتین گرہست خانون کی حیثیت سے زندگی گذارنے کو ترجیح دیتی ہیں۔

۴۔ اس کا سب سے بڑا نقصان بچوں کو پہنچتا ہے، وہ ماں کی ممتا سے محروم ہو جاتے ہیں، مثلاً جو ماں صبح سویرے دفتر کے لئے نکلے اور شام یا رات میں واپس آئے، وہ کس طرح اپنے بچوں کو ماں کا پیار دے سکتی ہے؟ اسی لئے مغربی ملکوں میں چھوٹے بچوں کے لئے پرورش گاہیں قائم ہوئیں، اور اس نے ایک کاروبار کی صورت اختیار کر لی۔

کام کا بوجھ انسان کی طبیعت میں چڑچڑاپن اور جھلاہٹ بھی پیدا کر دیتا ہے اور یہ چیز بعض اوقات انسان کو غیر معتدل بنا دیتی ہے؛ اس لئے مغربی ملکوں میں ماں کے ہاتھوں چھوٹے بچوں پر زیادتی کے واقعات کثرت سے پیش آرہے ہیں؛ چنانچہ امریکہ میں صرف ایک سال میں پانچ ہزار چھ سو بچے ماں کے زدوکوب کرنے کی وجہ سے ہسپتال میں داخل کئے جا چکے ہیں۔

۵۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ خواتین کی ملازمت اخلاقی اعتبار سے بھی نقصان دہ ہے، مخلوط ماحول میں مردوں اور عورتوں کی ملازمت اخلاقی بے راہ روی کو جنم دیتی ہے اور خاص طور پر عورتوں کے جنسی استحصال کے واقعات کثرت سے پیش آتے ہیں، یہ بات نہ صرف مغربی ممالک میں پیش آتی ہے، بلکہ ہندوستان جیسے ملک میں جہاں ابھی خواتین کی ملازمت کرنے کا تناسب مغربی ملکوں کے مقابلہ بہت کم ہے، وہاں بھی ایسے واقعات کی کثرت ہے اور جو لوگ اخبارات کا مطالعہ کرتے رہتے ہیں، ان کے لئے یہ کوئی قابلِ تعجب امر نہیں۔

۶۔ اس کا گہرا اثر خواتین کی صحت پر بھی پڑتا ہے؛ کیوں کہ اندرونِ خانہ اور بیرونِ خانہ کی دہری ذمہ داریاں اور فطری عوارض عورت کی صحت پر گہرے منفی اثرات ڈالتے ہیں؛ اسی لئے مختلف سروے کے مطابق مغربی ملکوں میں دردکش اور تناؤ کو دور کرنے والی دواؤں کے استعمال کا تناسب کام کرنے والی عورتوں میں بہ مقابلہ مردوں کے 67٪ زیادہ ہے۔

۷۔ خواتین کے کسبِ معاش کے میدان میں آنے کا ایک اثر شرح پیدائش پر بھی پڑتا ہے اور امریکہ نیز دوسرے مغربی ممالک...... جو اس وقت گھٹتی ہوئی شرحِ پیدائش کے سلسلہ میں پریشان ہیں...... اس کا ایک سبب یہ بھی ہے؛ کیوں کہ ملازمت پیشہ خواتین ایک تو شادی ہی میں تاخیر کرتی ہیں اور شادی کے بعد بھی دیر سے ماں بننا چاہتی ہیں اور فطری نظام یہ ہے کہ عمر کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ عورت میں ماں بننے کی صلاحیت کم ہوتی جاتی ہے، یہاں تک کہ چالیس سال کے بعد عورت کے حاملہ ہونے کا امکان دس فیصد ہی باقی رہ جاتا ہے؛ چنانچہ امریکہ میں بانجھ عورتوں کا تناسب تیز رفتاری کے ساتھ بڑھتا جا رہا ہے، یہی وجہ ہے کہ امریکہ، یورپ، کناڈا اور جاپان جیسے ممالک ـــ جہاں خواتین کی آزادی کے نام پر انہیں پوری طرح گھر سے باہر لے آیا گیا ہے...... کی عورتوں پر اس نعرہ کا فریب واضح ہو چکا ہے اور ایک اندازہ کے مطابق ان ملکوں میں کام کرنے والی 87٪ خواتین گھر سے باہر نکل کر کسبِ معاش کرنے کے مقابلہ اس بات کو ترجیح دیتی ہیں کہ وہ شمعِ خانہ بن کر رہیں اور امورِ خانہ کو انجام دینے پر اکتفاء کریں (اس میں مذکور اعداد و شمار ڈاکٹر فؤاد بن عبد الکریم کے مقالہ "عمل المرأۃ رویۃ شرعیۃ" سے لیا گیا ہے، جسے www.saaid.net پر دیکھا جاسکتا ہے)۔

اسلام کی اصولی رائے

مردوں اور عورتوں کے بارے میں اسلام کا بنیادی تصور یہ ہے کہ انہیں تقسیم کار کے ساتھ زندگی گذارنی چاہئے، باہر کی تگ ودو اور دوڑ دھوپ مردوں کے ذمہ ہے؛ اسی لئے ان پر کسبِ معاش کو فرض قرار دیا گیا اور رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "طلب کسب الحلال فريضة بعد الفريضة" (السنن الکبری للبیہقی، کتاب الإجارة، باب کسب الرجل وعمله بيديه، حدیث نمبر: ۱۱۴۷۵، شعب الإيمان للبیہقی، حدیث نمبر: ۸۷۴۱) نیز اللہ تعالیٰ

نے فرمایا: { فَإِذَا قُضِيَتِ الصَّلَاةُ فَانتَشِرُوا فِي الْأَرْضِ وَابْتَغُوا مِن فَضْلِ اللَّهِ } (الجمعہ: ۱۰) اسی طرح جہاد اور لوگوں کے تحفظ کی ذمہ داری مردوں پر رکھی گئی ہے، عورتوں پر نہیں، مردوں پر جماعت کے ساتھ نماز ادا کرنے کو واجب قرار دیا گیا، عورتوں پر جماعت واجب قرار نہیں دی گئی، عورتوں سے فرمایا گیا کہ وہ گھر کی ملکہ ہیں ''المرأة راعية على بيت بعلها'' (صحيح البخاري، كتاب العتق، باب كراهية التطاول على الرقيق وقوله عبدي وأمتي، حدیث نمبر: ۲۴۱۶) اس لئے ان کو اپنی سرگرمیوں کا مرکز گھر کو بنانا چاہئے: { وَقَرْنَ فِي بُيُوتِكُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْأُولَىٰ } (الأحزاب: ۳۳)۔

یہ تقسیم کاریوں تو مردوں اور عورتوں دونوں کے لئے فائدہ مند ہے؛ کیوں کہ جب بیوی گھر میں ہو، تو شوہر امور خانہ داری کی طرف سے مطمئن ہوتا ہے اور بیوی کو اپنی ضروریات زندگی کے لئے کوئی تگ و دو نہیں کرنی پڑتی؛ بلکہ شوہر محنت مزدوری کر کے اپنی ساری کمائی بیوی کے قدموں میں ڈال دیتا ہے؛ لیکن عورتوں کے لئے یہ زیادہ مفید ہے؛ کیوں کہ جو عورتیں ملازمت کرتی ہیں، انہیں بہ یک وقت دونوں ذمہ داریاں انجام دینی پڑتی ہیں، اندرون خانہ کی بھی اور بیرون خانہ کی بھی، یہ عورتوں کے ساتھ یقیناً کھلی ہوئی زیادتی ہے، تقسیم کار کا نظام عورت کو اس سے نجات دیتا ہے۔

مردانہ اور زنانہ حقوق و فرائض کی یہ تقسیم نہ صرف اسلام کا مزاج ہے؛ بلکہ یہی پورے خطۂ مشرق کی روایت رہی ہے اور یہ ایک فطری اور متوازن نظام ہے، جو مرد و عورت دونوں کے لئے راحت و سکون کا باعث ہے:

خواتین اور کسب معاش

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ اسلام عورتوں کے لئے کسبِ معاش کو یا کسبِ معاش کے لئے گھر سے باہر نکلنے کو مطلقاً شجر ممنوعہ قرار دیتا ہو؛ بلکہ قرآن و حدیث اور اس سے مستنبط فقہاء کے اجتہادات میں ہمیں خواتین کے لئے ملازمت اور کسب معاش کی شرعی حدود و قیود کی رعایت کے ساتھ اجازت بھی ملتی ہے:

☆ قرآن مجید میں حضرت شعیب کی دو صاحبزادیوں سے متعلق ایک واقعہ کا ذکر ان الفاظ میں آیا ہے:

{ وَلَمَّا وَرَدَ مَاءَ مَدْيَنَ وَجَدَ عَلَيْهِ أُمَّةً مِّنَ النَّاسِ يَسْقُونَ وَوَجَدَ مِن دُونِهِمُ امْرَأَتَيْنِ تَذُودَانِ قَالَ مَا خَطْبُكُمَا قَالَتَا لَا نَسْقِي حَتَّىٰ يُصْدِرَ الرِّعَاءُ وَأَبُونَا شَيْخٌ كَبِيرٌ } (القصص: ۲۳)۔

''اور مدین کے پانی پر جب آپ پہنچے تو دیکھا کہ لوگوں کی ایک جماعت وہاں پانی پلا رہی ہے اور دو عورتوں کو الگ کھڑی اپنے جانوروں کو روکتی ہوئی دیکھا، پوچھا کہ تمہارا کیا حال ہے، وہ بولیں کہ جب تک یہ چرواہے واپس نہ لوٹ جائیں ہم پانی نہیں پلاتیں اور ہمارے والد بہت بڑی عمر کے بوڑھے ہیں''۔

اس سے معلوم ہوا کہ حضرت شعیبؑ کی صاحبزادی اپنے گھر کے پانی کی ضرورت کے لئے باہر جایا کرتی تھیں اور خود پانی بھر کر لایا کرتی تھیں۔

حضرت عبد اللہ بن عباسؓ سے مروی ہے کہ ''كان آدم حراثا ... وحواء تغزل الشعر فتحوله بيدها، فتكسو أنفسها وولدها'' (كتاب الكسب، للإمام محمد: ۷۶)۔ ''حضرت حواء اپنے ہاتھ سے دھاگہ کاتتی تھیں اور اپنے آپ کو اور اپنی اولاد کو پہنایا کرتی تھیں''

امام محمد نے حضرت عیسیٰؑ کے بارے میں روایت نقل کی ہے کہ ''وعيسى كان يأكل من غزل أمه'' (كتاب الكسب: ص: ۷۶)۔

''حضرت عیسیٰؑ اپنی ماں کے کاتتے ہوئے دھاگے سے کھایا کرتے تھے''

☆ احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں بعض اوقات خواتین فوجی خدمات میں حصہ لیا کرتی تھیں، چنانچہ حضرت ربیع بنت معوذ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے: ''كنا نغزو مع النبي ﷺ فنسقي القوم ونخدمهم ونرد القتلى والجرحى المدينة'' (بخاری، حدیث نمبر: ۲۸۸۳، نیز دیکھئے: حدیث نمبر: ۲۸۸۲)۔

''ہم لوگ حضور ﷺ کے ساتھ جہاد میں شریک رہتے تھے، قوم کو پانی پلاتے تھے، اور ان کی خدمت کرتے تھے، نیز مقتولوں اور زخمیوں کو مدینہ لے جاتے تھے''

☆ اسی طرح حضرت ام عطیہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے: ''غزوت مع رسول الله ﷺ سبع غزوات، أخلفهم في رحالهم، فأصنع لهم الطعام وأداوي الجرحى وأقوم على المرضى'' (مسلم، كتاب الجهاد والسير، باب النساء الغازيات يرضخ لهن ولا يسهم.

والنهي عن قتل صبيان أهل الحرب، حدیث نمبر: ۴۶۹۰)۔

''میں نے رسول اللہ کے ساتھ سات جنگوں میں شرکت کی ہے، میں اپنے کجاوؤں میں ان کے پیچھے رہتی تھی، ان کے لئے کھانے بناتی تھی، زخمیوں کا علاج اور بیماروں کی تیمارداری کرتی تھی''

☆ عہد نبوی میں خواتین کا زراعتی کاموں میں شرکت کرنا بھی ثابت ہے؛ چنانچہ حضرت جابر بن عبداللہؓ سے مروی ہے:

''أن النبي ﷺ دخل على أم مبشر الأنصارية في نخل لها،... فقال: لا يغرس مسلم غرسا، ولا يزرع زرعا، فيأكل منه إنسان ولا دابة ولا شيئ إلا كانت له صدقة'' (مسلم، كتاب المساقاة، باب فضل الغرس والزرع، حدیث نمبر: ۳۹۶۹)

''رسول اللہ حضرت ام مبشر انصاریہ رضی اللہ عنہا کے یہاں ان کے کھور کے باغ میں تشریف لے گئے...... آپ نے فرمایا کہ کوئی مسلمان جو درخت لگاتا ہے، یا کھیتی کرتا ہے، پھر اس میں سے کوئی انسان یا چوپایہ کوئی چیز کھائے تو یہ اس کے لئے صدقہ ہے''

☆ کسبِ معاش کا ایک طریقہ جانوروں کی پرورش ہے، رسول اللہ کے زمانہ میں عام طور پر خواتین اس میں مردوں کا تعاون کرتی تھیں اور بعض اوقات مویشی چرانے کا بھی کام کرتی تھیں؛ چنانچہ حضرت سعد بن معاذؓ سے روایت ہے:

''أن جارية لكعب بن مالك كانت ترعي غنما بسلع فأصيبت شاة منها فأدركتها، فذبحتها بحجر، فسئل النبي ﷺ، فقال: كلوها'' (صحيح البخاري، كتاب الذبائح والصيد، باب ذبيحة المرأة والأمة، حدیث نمبر: ۵۵۰۵)۔

''حضرت کعب بن مالکؓ کی باندی (سلع نامی مکان پر) بکریاں چرایا کرتی تھی، ان میں سے ایک بکری جانور کا شکار بن گئی انہوں نے اسے زندہ حالت میں پالیا، چنانچہ پتھر کی مدد سے اسے ذبح کیا، پھر حضور سے دریافت کیا، تو آپ نے ارشاد فرمایا: اسے کھاؤ''

☆ کسبِ معاش کا ایک اہم ذریعہ تجارت ہے، قرن اول میں خواتین کے تجارت کرنے کا بھی ذکر ملتا ہے:

''عن الربيع بنت معوذ قالت: دخلت في نسوة من الأنصار على أسماء بنت مخرمة أم أبي جهل في خلافة عمر بن الخطاب وكان ابنها عياش بن عبد الله بن أبي ربيعة يبعث إليها من اليمن بعطر، فكانت تبيعه'' (موسوعة حياة الصحابيات لمحمد بن سعيد مبيض: ۱۰۵۱)۔

''حضرت ربیع بنت معوذ سے مروی ہے کہ میں کچھ انصاری خواتین کے ساتھ حضرت عمرؓ کے زمانہ خلافت میں ابوجہل کی ماں اسماء بنت مخرمہ کے پاس گئی ان کے بیٹے عیاش ابن عبداللہ بن ابی ربیع ان کے پاس یمن سے عطر بھیجا کرتے تھے اور وہ اسے فروخت کیا کرتی تھی''

☆ حدیثوں میں کثرت سے تعلیم و تربیت کی فضیلت وارد ہوئی ہے، اس میں آپ نے مردوں اور عورتوں کے درمیان کوئی فرق نہیں کیا ہے؛ اس لئے جیسے مرد فریضۂ تدریس انجام دے سکتے ہیں، اسی طرح شرعی حدود کی رعایت کے ساتھ عورتیں بھی اس فریضہ کو انجام دے سکتی ہیں؛ چنانچہ ہر عہد میں فاضل محدثات وفقیہات تدریس کی خدمت انجام دیتی رہی ہیں، حدیث کا فیض جن سات حضرات کے ذریعہ سب سے زیادہ لوگوں تک پہونچا ہے، ان میں ایک ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا بھی ہیں، اسی طرح فتویٰ دینے کی خدمت خواتین بھی انجام دے سکتی ہیں، علامہ ابن قیمؒ نے سب سے زیادہ فتویٰ دینے والے صحابہ میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا، درمیانی درجہ میں فتوی دینے والی خواتین میں حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کا اور کم تعداد میں فتاوی دینے والی عورتوں میں انیس صحابیات رضی اللہ عنہن کا ذکر کیا ہے؛ بلکہ فقہاء احناف کے نزدیک تو حدود و قصاص کے علاوہ دوسرے مقدمات میں عورتیں قاضی بھی بن سکتی ہیں (روضة القضاة وطريق النجاة لأبي القاسم السمناني: ۱ر ۵۳، ط: دار الفرقان، رد المحتار: ۸ر ۱۴۲، ط: مکتبۂ زکریا)۔

ایک زمانہ میں یہ ساری خدمتیں بلا معاوضہ انجام دی جاتی تھیں؛ کیوں کہ خادمین دین کے لئے مسلمان حکومت کی جانب سے شایانِ شان وظائف مقرر ہوتے تھے اور عام مسلمان بھی ان کے قدر شناس تھے، بعد کو جب حالات بدل گئے، تو تعلیم قرآن اور افتاء و قضاء وغیرہ پر اجرت لینے کا جائز ہونا تمام فقہاء کے درمیان متفق علیہ ہوگیا، پس جب عورتیں ان خدمات کو شرعاً انجام دینے کی اہل ہیں، تو ان کے لئے بھی یقیناً اجرت لے کر ان کاموں کو انجام دینا درست ہوگا۔

☆ کسبِ معاش کا ایک ذریعہ صنعت اور دستکاری بھی ہے، رسول اللہ کے زمانہ میں بعض خواتین اس ذریعۂ معاش کو بھی استعمال کیا کرتی تھیں، ایسی ہی

خواتین میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی زوجہ حضرت زینت رضی اللہ عنہا تھیں:

''... قالت: يارسول الله! إني امرأة ذات صنعة أبيع منها وليس لي ولا لولدي ولا لزوجي نفقة غيرها، وقد شغلوني عن الصدقة فما أستطيع أن أتصدق بشيء، فهل لي من أجر فيما أنفقت؟ قال: فقال لها رسول الله ﷺ: أنفقي عليهم، فإن لك في ذلك أجر ما أنفقت عليهم'' (مسند أحمد، حديث نمبر: ۱۶۱۳۰، صحيح ابن حبان، حديث نمبر: ۴۲۴۷)

''انہوں نے عرض کیا اے اللہ کے رسول! میں ایک کاری گری سے واقف عورت ہوں، میں اس میں سے فروخت کرتی ہوں، میرے، میرے بچے اور میرے شوہر کے لئے اخراجات کا صرف یہی ایک ذریعہ ہے، ان مصارف کی وجہ سے میں کچھ صدقہ نہیں کر پاتی، تو کیا میرے لئے ان پر خرچ کرنے میں کوئی اجر ہے؟ راوی کہتے ہیں کہ رسول اللہ نے ان سے فرمایا کہ تم ان پر خرچ کرتی رہو، تمہارے لئے اس میں تمہارے خرچ کرنے کا اجر ہے''

بلکہ رسول اللہ نے تو عورتوں کو ایسے کاموں کی ترغیب دی ہے، آپ کا ارشاد ہے: ''خير لهو المؤمن السباحة وخير لهو المرأة المغزل'' (کنز العمال، حدیث نمبر: ۴۰۶۱۱، ۴۵۱۶۴) ''مؤمن مرد کے لئے فارغ وقت کا بہترین مشغلہ تیراکی ہے اور عورت کے لئے چرخہ'' آج کل دستکاری کا میدان بہت وسیع ہو گیا ہے، اس میں سلائی کڑھائی سے لے کر ڈرافٹنگ، ڈیزائننگ، کمپوزنگ اور مختلف چیزیں شامل ہو گئی ہیں۔

غرض کہ جو کام مردوں کے لئے جائز ہے، اگر قرآن وحدیث میں عورتوں کو ان سے منع نہ کیا گیا ہو تو عورتوں کے لئے شرعی حدود وقیود کے ساتھ انہیں انجام دینا جائز ہے: اسی لئے فقہاء نے اکثر معاملات جیسے: خرید وفروخت، اجارہ، وکالت، مزارعت (بٹائی پر کاشت کاری) وغیرہ کے لئے مرد ہونے کی شرط نہیں لگائی ہے، یہ گویا اس بات کی صراحت ہے کہ عورتیں بھی ان کاموں کو کرسکتی ہیں۔

کسب معاش کی دو بالواسطہ صورتیں بھی ہیں: ایک مضاربت، اور دوسرے: شرکت، مضاربت یا شرکت کے لئے بھی فریقین یا ان میں سے ایک کا مرد ہونا ضروری نہیں، گویا عورتیں بھی اس طریقہ پر نفع حاصل کرسکتی ہیں، خود رسول اللہ نے نبوت سے پہلے ام المؤمنین حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کا مال مضاربت پر حاصل کیا تھا۔

یہ انسانی ضرورت کا تقاضا بھی ہے؛ کیوں کہ بعض اوقات عورت کے لئے کسب معاش مجبوری بن جاتی ہے، ایک ایسی مطلقہ یا بیوہ عورت، جس کولڑ کا نہ ہو یا ہو اور کسب معاش کے لائق نہ ہو، ایک ایسی عورت جس کا شوہر معذور ہو گیا ہو اور وہ کمانے سے قاصر ہو، ایک ایسی عورت جس کا شوہر بے روزگار ہو اور باوجود کوشش کے روزگار نہیں ملتا ہو اور ایک ایسی عورت جس کے بچے زیادہ ہوں، شوہر کی آمدنی کم ہو اور شوہر چاہتا ہو کہ بیوی اس کی مدد کرے، اس کے لئے یقینا کسب معاش ایک ضرورت کا درجہ رکھتی ہے، وہ نہ صرف اس کے پیٹ کی آگ بجھاتی ہے، اس کے بال بچوں کے پرورش کا ذریعہ بنتی ہے؛ بلکہ اس کے لئے عفت وعصمت کی حفاظت کا بھی سامان ہے۔

بعض دفعہ عورتوں کی ملازمت صرف ملازمت کرنے والی خواتین ہی کی ضرورت نہیں ہوتی، بلکہ ان کی ملازمت معاشرہ کی اجتماعی ضرورت کا درجہ رکھتا ہے، جیسے: میڈیکل خدمات، خواتین کثرت سے ایسی بیماریوں سے دوچار ہوتی ہیں، جن میں بے ستری کی نوبت آتی ہے، ایک عورت کا دوسری عورت کے سامنے ضرورتاً بے ستر ہونا یقینا کسی مرد کے سامنے بے ستر ہونے سے بہتر ہے، اسی طرح تعلیم کے دوسرے شعبوں میں بھی خواتین کی ضرورت ہے؛ تاکہ معلمات کے ذریعہ لڑکیوں کی تعلیم انجام پائے، کبھی اپنے یتیم بچوں، بوڑھے ماں باپ اور بے سہارا بھائیوں اور بہنوں کی پرورش بھی اس سے متعلق ہو جاتی ہے۔

غرض کہ عورت کا کسب معاش کرنا اور اس کا معاش کے لئے شرعی حدود وقیود کے ساتھ گھر سے باہر نکلنا اپنی اصل کے اعتبار سے ناجائز نہیں ہے، اور شریعت اس کو مطلقاً منع نہیں کرتی ہے؛ البتہ یہ ضروری ہے کہ شریعت نے عورتوں کے خصوصی حالات کے تحت جو شرائط اور حدود مقرر کی ہیں، ان کا پورا پورا لحاظ کیا جائے۔

خواتین کی ملازمت کے لئے شرائط وحدود

خواتین کے لئے ملازمت کے سلسلہ میں اصل اہمیت اس بات کی ہے کہ اس کی ملازمت کے جائز ہونے کے لئے کیا شرطیں ہیں؟...... اگر غور کیا جائے تو بحیثیت مجموعی اس سلسلہ میں تین باتیں اہم ہیں:

۱۔ پردہ کے احکام کی رعایت۔ ۲۔ اجنبی مردوں کے ساتھ اختلاط سے اجتناب۔ ۳۔ ولی وسرپرست کی اجازت۔

انہیں تینوں نکات پر مختصر روشنی ڈالی جاتی ہے:

ستر

ستر کے سلسلہ میں قدیم زمانہ سے فقہاء کے درمیان اس بات پر تو اتفاق ہے کہ چہرہ اور ہاتھ کے علاوہ عورت کا پورا جسم قابلِ ستر ہے؛ لیکن چہرے کے سلسلہ میں اختلاف ہے، فقہاء احناف اور بہت سے دوسرے فقہاء کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ چہرہ اصلاً پردہ میں داخل نہیں، ان حضرات کی دلیل اس طرح ہے:

☆ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: { قُل لِّلْمُؤْمِنِينَ يَغُضُّوا مِنْ أَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوا فُرُوجَهُمْ ذَٰلِكَ أَزْكَىٰ لَهُمْ إِنَّ اللَّهَ خَبِيرٌ بِمَا يَصْنَعُونَ. وَقُل لِّلْمُؤْمِنَاتِ يَغْضُضْنَ مِنْ أَبْصَارِهِنَّ وَيَحْفَظْنَ فُرُوجَهُنَّ } (سورۂ نور: ۳۰-۳۱)۔

"آپ ایمان والوں سے کہہ دیجئے کہ اپنی نظریں نیچی رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں، یہ ان کے حق میں زیادہ صفائی کی بات ہے، بے شک اللہ کو ان سب کی خبر ہے، جو کچھ لوگ کیا کرتے ہیں، اور آپ کہہ دیجئے ایمان والیوں سے کہ اپنی نظریں نیچی رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں"۔

اس آیت سے استدلال اس طور پر ہے کہ "غض بصر" کا حکم اسی وقت دیا جا سکتا ہے، جب چہرہ دیکھے جانے کی حالت میں ہو، ورنہ اس کا کوئی معنی نہیں؛ چنانچہ عورتوں کو بھی "غض بصر" کا حکم دیا گیا ہے اور اس کی وجہ یہی ہے کہ مرد کا چہرہ کھلا ہوتا ہے اور وہ دیکھے جانے کی حالت میں ہوتا ہے۔

* "عن جابر أن رسول الله ﷺ قال: إذا خطب أحدكم المرأة فإن استطاع أن ينظر إلى ما يدعوه إلى نكاحها فليفعل" (سنن أبي داؤد، كتاب النكاح، باب في الرجل ينظر إلى المرأة وهو يريد تزويجها، حدیث نمبر: ۲۰۸۲)۔

"حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا کہ جب تم میں سے کوئی شخص عورت کو نکاح کا پیغام دے، تو اگر وہ اس چیز کو دیکھ سکے جو اس کے لئے اس عورت سے نکاح کا باعث ہوا ہے، تو اسے ایسا کرنا چاہئے"

اس مضمون کی متعدد روایتیں حدیث میں منقول ہیں، اس میں مخطوبہ کو دیکھنے کی تلقین کی گئی ہے اور فقہاء نے لکھا ہے کہ بلا اطلاع دیکھ لینا افضل ہے؛ تاکہ اگر رشتہ منظور نہ ہو تو لڑکی کے لئے اذیت کا باعث نہ ہو، احادیث سے بھی یہی اشارہ ملتا ہے، ظاہر ہے کہ یہ اسی وقت ممکن ہے جب عورت کا چہرہ کھلا ہوا ہو؛ چنانچہ معروف شافعی فقیہ ابو اسحاق شیرازیؒ فرماتے ہیں:

"وإذا أراد نكاح امرأة فله أن ينظر وجهها وكفيها ولا ينظر إلى ما سوى وجهها وكفيها ؛ لأنه عورة" (المجموع: ۱۶،۱۳۳)۔ "جب کسی عورت سے نکاح کا ارادہ ہو، تو اس کا چہرہ اور اس کی ہتھیلیوں کو دیکھنا جائز ہے؛ البتہ ہتھیلیوں اور چہرہ کے سوا نہ دیکھے؛ اس لئے کہ وہ حصہ ستر میں داخل ہے"

علامہ ابن قدامہؒ رقمطراز ہیں: "ولا خلاف بين أهل العلم في إباحة النظر إلى وجهها أي وجه المخطوبة... وذلك ؛ لأنه ليس بعورة وهو مجمع المحاسن وموضع النظر" (المغني : ۶،۵۵۳)۔

"اہل علم کے درمیان اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ جس کو پیغام دیا گیا ہو، اس کا چہرہ دیکھنا جائز ہے، اور یہ اس لئے کہ چہرہ حصۂ ستر میں داخل نہیں اور وہی حسن و جمال کا مرکز اور دیکھنے کی اصل جگہ ہے"۔

اس سلسلہ میں علامہ بغویؒ کا بیان ہے:

"باب النظر إلى المخطوبة ... والعمل على هذا عند بعض أهل العلم قالوا: إذا أراد الرجل أن ينكح امرأة فله أن ينظر إليها ... وهو قول الثوري والشافعي وأحمد وإسحاق ... سواء أذنت أو لم تأذن. إنما ينظر منها إلى الوجه والكفين فقط، ولا يجوز أن ينظر إليها حاسرة أو ينظر إلى شيء من عورتها، وقال الأوزاعي: لا ينظر إلا إلى وجهها" (نهاية المحتاج إلى شرح المنهاج: ۶، ۱۸۶ - ۱۸۵)۔

"مخطوبہ کو دیکھنے کا بیان..... بعض اہل علم کے نزدیک اسی پر عمل ہے، ان کا کہنا ہے کہ آدمی جب کسی عورت سے نکاح کرے، تو اسے چاہئے کہ اس کو دیکھ لے، چاہے اس نے اس کی اجازت دی ہو یا نہیں دی ہو، یہی قول سفیان ثوری، امام شافعی، امام احمد اور امام اسحاق رحمۃ اللہ علیہم کا ہے، مگر صرف چہرہ اور دونوں

ہتھیلیوں ہی کا دیکھنا جائز ہے، یہ جائز نہیں کہ اس کو کھلی ہوئی حالت میں دیکھے یا اس کے حصہ ستر میں سے کوئی حصہ دیکھے اور امام اوزاعی علیہ الرحمۃ نے فرمایا کہ صرف چہرہ ہی دیکھ سکتا ہے"

صاحب "نهاية المحتاج" نے اسی پر گفتگو کرتے ہوئے کہا ہے:

"وإذا قصد نكاحها ... سن نظره إليها ... وذلك قبل الخطبة لا بعدها ... وإن لم تأذن هي ولا وليها اكتفاء بإذنه صلى الله عليه وسلم، ففي رواية: "وإن كانت لا تعلم" بل قال الأوزاعي: الأولى عدم علمها ؛ لأنها قد تتزين له بما يغره" (نهاية المحتاج: ٦، ١٨٦ - ١٨٥)۔

"اور جب اسی سے نکاح کرے تو مسنون ہے کہ اس کی طرف دیکھ لے...... اور یہ پیغام دینے سے پہلے ہونا چاہئے نہ کہ اس کے بعد...... گو کہ اس نے یا اس کے ولی نے اجازت نہ دی ہو؛ کیوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت کافی ہے، چنانچہ ایک حدیث میں ہے: "اگر چہ لڑکی کے علم میں نہ ہو؛ بلکہ امام اوزاعی علیہ الرحمۃ تو کہتے ہیں کہ عورت کا واقف نہ ہونا بہتر ہے؛ اس لئے کہ اگر وہ واقف ہو جائے تو ایسی زیبائش و آرائش کر سکتی ہے کہ مرد دھوکہ کھا جائے"

* "عن عائشة رضي الله عنها: أن أسماء بنت أبي بكر رضي الله عنهما دخلت على رسول الله ﷺ وعليها ثياب رقاق، فأعرض عنها رسول الله ﷺ، وقال لها: يا أسماء ! إن المرأة إذا بلغت المحيض لم تصلح أن يرى منها إلا هذا وهذا، وأشار إلى وجهه وكفيه" (سنن أبي داؤد، كتاب اللباس، باب فيما تبدئ المرأة من زينتها، حدیث نمبر: ۴۱۰۴)۔

"حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ حضرت اسماء بنت ابی بکر رسول اللہ کے پاس آئیں ان کے جسم پر باریک کپڑے تھے، حضور نے چہرہ پھیر لیا، اور ان سے فرمایا: اے اسماء عورت جب بلوغ کو پہنچ جائے تو صرف یہ اور یہ نظر آنا چاہئے اور آپ نے چہرہ اور ہاتھوں کی طرف اشارہ فرمایا"

اس حدیث سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ چہرہ اور ہتھیلیوں کو آپ نے حصہ ستر میں شامل نہیں فرمایا ہے، اس طرح کی متعدد روایتیں ہیں، جو صراحتاً یا دلالۃً اس بات کو بتاتی ہیں کہ چہرہ ستر میں داخل نہیں ہے۔

☆ اس سلسلہ میں ان حضرات نے قرآن مجید کی اس آیت سے بھی استدلال کیا ہے:

{ وَلَا يُبْدِينَ زِينَتَهُنَّ إِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا } (سورۂ نور: ۳۰)۔ "عورتیں اپنی آرائش کو ظاہر نہ کریں سوائے اس کے جو ظاہر ہو جائے"

چنانچہ "إلا ما ظهر منها" کی تفسیر علامہ ابن کثیرؒ نے ان الفاظ میں نقل کی ہے:

"إلا ما ظهر منها: الخاتم، الخلخال، ويحتمل أن ابن عباس ومن تابعه أرادوا تفسير ما ظهر منها بالوجه والكفين، وهذا هو المشهور، وليستأنس له بالحديث الذى رواه أبوداؤد عن عائشة رضى الله عنها أن أسماء رضى الله عنها بنت أبي بكر رضى الله عنه دخلت على النبي ﷺ وعليها ثياب رقاق ..." (تفسير ابن كثير: ۲.۵۹۹، سورة النور)۔

"إلا ما ظهر منها" (مگر جو عورت کا ظاہر ہو جائے) سے مراد انگوٹھی اور پازیب ہے اور یہ بھی احتمال ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباس اور ان کے متبعین نے "ما ظهر منها" کی تفسیر چہرہ اور ہاتھوں سے کی ہو، اور یہی مشہور ہے اور اس حدیث سے استدلال کیا ہے، جو ابوداؤد نے حضرت عائشہؓ سے نقل کیا ہے کہ حضرت اسماء حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئیں اور ان کے جسم پر باریک کپڑے تھے......"

نیز علامہ آلوسی فرماتے ہیں:

"إلا ما ظهر منها: أي إلا ما جرت العادة والجبالة على ظهوره، والأصل فيه الظهور كالخاتم والفَتَخة والكحل والخضاب ؛ فلا مؤاخذة في إبدائه للأجانب، وإنما المؤاخذة في إبداء ما خفي من الزينة كالسوار والخلخال والدُملُج والقلادة" (روح المعاني: ۱۰،۳۰۶، سورة النور)۔

"إلا ما ظهر منها" (مگر جو عورت کا ظاہر ہو جائے) سے مراد وہ زینت ہے، جسے عادتاً اور فطرتاً کھلا رکھا جاتا ہے، اور اسی میں اصل ظاہر ہونا ہے، جیسے انگوٹھی، چھلے اور سرمہ، خضاب (شاید مہندی) اجنبیوں کے سامنے اس کو ظاہر کرنے میں مواخذہ نہیں ہے، اور زینت کی جو چیزیں مخفی ہوتی ہیں ان کا کھولنا قابل

مؤاخذہ ہے، جیسے: کنگن، پازیب، بازو بند اور ہار"

"إلا ما ظهر منها" کی تفسیر میں مختلف اہل علم کی آراء کو جمع کرتے ہوئے علامہ قرطبیؒ نے اس طرح روشنی ڈالی ہے:

''ثم استثنى من الزينة واختلف الناس في قدر ذلك، فقال ابن مسعود: ظاهر الزينة هو الثياب، وزاد ابن جبير: الوجه، وقال سعيد بن جبير أيضا وعطاء والأوزاعي: الوجه والكفان والثياب، وقال ابن عباس وقتادة والمسور بن مخرمة: ظاهر الزينة هو الكحل والسوار والخضاب إلى نصف الذراع'' (أحكام القرآن للقرطبي: ۱۲، ۱۵۲، سورة النور)۔

''پھر اظہار زینت کی ممانعت میں سے اللہ تعالیٰ نے بعض چیزوں کو مستثنیٰ کیا ہے، جس کی مقدار کے بارے میں علماء کے درمیان اختلاف ہے، حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ نے کہا کہ ظاہر زینت سے مراد کپڑے ہیں، سعید ابن جبیرؓ نے اس پر چہرہ کا اضافہ کیا ہے، عطاء اور اوزاعی رحمۃ اللہ علیہما اور ایک قول کے مطابق سعید بن جبیر کی رائے یہ ہے کہ اس میں چہرہ دونوں ہاتھ اور کپڑے شامل ہیں، عبد اللہ بن عباس، قتادہ اور مسور بن مخرمہ رحمۃ اللہ علیہما کے نزدیک ظاہر زینت میں سرمہ، کنگن، اور نصف بازو تک خضاب (مہندی) شامل ہیں"

بہر حال عام طور پر اہل علم نے "إلا ما ظهر منها" سے چہرہ و ہتھیلی اور چہرہ اور ہاتھ سے متعلق زیورات مراد لیئے ہیں (تفصیل کے لئے دیکھئے: أحكام القرآن للجصاص: ۳/۸-۴۰۹، باب الاستیذان، أحكام القرآن لابن عربي: ۳/۱۳۸۱، سورۃ النور: ۳۱، البحر المحیط: ۶/۴۴۷، الکشاف: ۳/۷۱، تفسیر أبي السعود: ۶/۱۷۰، تفسیر مظہری: ۶/۴۹۳، مفاتیح الغیب: ۲۲/۲۳۴-۵۳۳)۔

اس سلسلہ میں مناسب ہوگا کہ مذاہب اربعہ کی تصریحات پیش کردی جائیں، چنانچہ فقہاء حنفیہ میں علامہ علاء الدین کاسانیؒ فرماتے ہیں:

''وأما النوع السادس: وهو الأجنبيات الحرائر فلا يحل النظر للأجنبي من الأجنبية الحرة إلى سائر بدنها إلا الوجه والكفين لقوله تعالى: { قل للمؤمنين يغضوا من أبصارهم } (النور: الآية: ۳۰) إلا أن النظر إلى مواضع الزينة الظاهرة وهي الوجه والكفان، رخص بقوله تعالى: { ولا يبدين زينتهن إلا ما ظهر منها } (النور: ۳۱) والمراد من الزينة مواضعها، ومواضع الزينة الظاهرة الوجه والكفان، فالكحل زينة الوجه والخاتم زينة الكف، ولأنها تحتاج إلى البيع والشراء والأخذ والعطاء ولا يمكنها ذلك عادة إلا بكشف الوجه والكفين فيحل لها الكشف، وهذا قول أبي حنيفة رضي الله عنه، وروى الحسن عن أبي حنيفة رحمهما الله أنه يحل النظر إلى القدمين أيضا'' (بدائع الصنائع: ۴، ۲۹۳-۲۹۴)۔

''چھٹی قسم: آزاد اجنبی عورتوں کی ہے، اجنبی مرد کے لئے اجنبی آزاد عورت کے چہرے اور ہاتھوں کے سوا پورے بدن کو دیکھنا جائز ہے؛ کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے نگاہوں کو پست رکھنے کا حکم دیا ہے، البتہ ظاہری زینت کے مواقع ...... اور وہ چہرہ اور دونوں ہاتھ ہیں...... کے سلسلہ میں اللہ تعالیٰ نے اجازت دی ہے، اور زینت سے مراد زینت کی جگہیں ہیں، اور ظاہری زینت کی جگہیں چہرہ اور دونوں ہاتھ ہیں؛ اس لئے کہ چہرہ کی زینت سرمہ ہے اور ہاتھ کی زینت انگوٹھی ہے، اور اس لئے بھی کہ خرید و فروخت اور لین دین میں اس کی ضرورت پڑتی ہے اور عادتاً چہرہ اور ہاتھوں کو کھولے بغیر ان کاموں کو انجام دینا ممکن نہیں، امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا یہی قول ہے اور حسن ابن زیادؒ نے امام ابوحنیفہؒ سے نقل کیا ہے کہ قدموں کو بھی دیکھنا جائز ہے"

اسی طرح فتاوی عالمگیری میں ہے:

''وبدن الحرة عورة إلا وجهها وكفيها وقدميها، كذا في المتون'' (فتاوى هنديه: ۱، ۱۵۸)۔

''آزاد عورت کا بدن حصہ ستر ہے؛ البتہ چہرہ دونوں ہاتھ اور دونوں پاؤں اس سے مستثنیٰ ہے"

یہی نقطہ نظر فقہاء مالکیہ کا ہے، چنانچہ "مختصر خلیل" اور اس کے شارح کا بیان ہے:

''(ومع أجنبي غير الوجه والكفين) قال الأبي عن القاضي عياض: وقيل ما عدا الوجه والكفين والقدمين، انتهى، واعلم أنه إن خشي من المرأة الفتنة يجب عليها ستر الوجه والكفين، قاله القاضي عبد الوهاب ونقله عنه الشيخ أحمد

زروق في شرح الرسالة وهو ظاهر التوضيح: هذا ما يجب عليها، وأما الرجل فإنه لا يجوز له النظر إلى وجه المرأة للذة وأما لغير اللذة، فقال القلشاني عند قول الرسالة: ولا بأس أن يراها ألخ، وقع في كلام ابن محرز في أحكام الرجعة ما يقتضي: أن النظر لوجه الأجنبية لغير لذة جائز بغير ستر، قال: والنظر إلى وجهها وكفيها لغير لذة جائز اتفاقا؛ لأن الأجنبي ينظر إليه، وكلامه في المطلقة الرجعية، وكلام الشيخ هنا يدل على خلافه، وأنه إنما يباح النظر لوجه المتجالة دون الشابة إلا لعذر، والله اعلم'' (مواهب الجليل: ۲،۱۸۱، كتاب الصلاة، فصل في ستر العورة)۔

''اور اجنبی کے لئے چہرہ اور دونوں ہاتھوں کے سوا پورا جسم قابل ستر ہے، قاضی عیاضؒ سے منقول ہے کہ چہرہ، دونوں ہاتھ اور دونوں پاؤں کے علاوہ بدن کا پورا حصہ عورت کے لئے ستر ہے، البتہ جان لو کہ اگر فتنہ کا اندیشہ ہو تو عورت پر چہرے اور ہاتھوں کا بھی چھپانا واجب ہے، یہی بات قاضی عبدالوہابؒ نے کہی ہے اور شیخ احمد زروقؒ نے اس کو ''رسالہ'' کی شرح میں نقل کیا ہے، اور توضیح نامی کتاب سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے کہ عورت پر فتنہ کے وقت چہرہ اور ہاتھوں کو بھی چھپانا واجب ہے، جہاں تک مرد کی بات ہے تو اس کے لئے ازراہ لذت عورت کا چہرہ دیکھنا جائز نہیں، اگر لذت مقصود نہ ہو، تو ''رسالہ'' میں ہے کہ دیکھنے میں کوئی حرج نہیں اور اس کی وضاحت کرتے ہوئے شامی نے کہا ہے کہ رجعت کے احکام کے ذیل میں ابن محیزؒ نے جو کہا ہے اس کا تقاضا ہے کہ اجنبی عورت کا چہرہ لذت کے بغیر بلاستر کے دیکھنا جائز ہے، وہ کہتے ہیں کہ اجنبی عورت کے چہرہ اور ہاتھوں کو بغیر لذت کے دیکھنا بالاتفاق جائز ہے؛ اس لئے کہ اجنبی اسی کی طرف دیکھتا ہے اور کلام مطلقہ رجعیہ کے سلسلہ میں ہے (کہ اس کے چہرے کو دیکھنا جائز ہے یا نہیں)، نیز شیخ کا کلام یہاں اس کے برخلاف پر دلالت کرتا ہے؛ البتہ عمر رسیدہ کے چہرہ کو بغیر لذت کے دیکھنا مباح ہے نہ کہ جوان عورت کے چہرے کو''

نیز فقہ مالکی کی مشہور کتاب ''التاج والإکلیل'' میں ہے:

''(قوله: ومع أجنبي غير الوجه والكفين) في المؤطأ: هل تأكل المرأة مع غير ذي محرم أو مع غلامها؟ قال مالك: لا بأس بذلك على وجه ما يعرف للمرأة أن تأكل معه من الرجال وقد تأكل المرأة مع زوجها ومع غيره ممن يواكله، ابن القطان: فيه إباحة ابداء المرأة وجهها ويديها للأجنبي؛ إذ لا يتصور الأكل إلا هكذا، وقد أبقاه الباجي على ظاهره، وقال ابن محرز: وجه المرأة عند مالك وغيره من العلماء ليس بعورة'' (التاج والإكليل: ۲،۱۸۱، كتاب الصلاة، فصل في ستر العورة)۔

''موطأ میں ہے کہ عورت غیر محرم یا اپنے غلام کے ساتھ کھا سکتی ہے، امام مالک علیہ الرحمۃ نے کہا کہ اس میں کوئی حرج نہیں ہے؛ کیوں کہ یہ طریقہ معروف ہے کہ عورت مردوں میں سے اس کے ساتھ کھاتی ہے اور کبھی اپنے شوہر اور اس اجنبی مرد کے ساتھ کھاتی ہے جسے وہ کھلا رہا ہے، ابن القطان رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں، اسی سے معلوم ہوا کہ عورت کا اجنبی کے سامنے چہرہ اور ہاتھوں کو کھولنا جائز ہے؛ کیوں کہ اس کے بغیر کھانے کا تصور نہیں کیا جاسکتا ہے، علامہ باجی رحمۃ اللہ علیہ نے اس قول کو اس کے ظاہر ہی پر باقی رکھا ہے، اور ابن محرزؒ کہتے ہیں کہ امام مالک اور دوسرے علماء کے نزدیک عورت کا چہرہ ستر میں داخل نہیں ہے''

علامہ ابن عبدالبر مالکی فرماتے ہیں: ''وجائز أن ينظر إلى ذلك منها - أي الوجه والكفين - كل من نظر إليها بغير ريبة ولا مكروه، وأما النظر للشهوة فحرام تأملها من فوق ثيابها لشهوة، فكيف بالنظر إلى وجهها مسفرة'' (التمهيد: ۶،۳۶۵ - ۳۶۴)۔

''بدنیتی اور ناپسندیدہ ارادہ کے بغیر عورت کا چہرہ اور دونوں ہاتھ دیکھنا جائز ہے، اور جہاں تک شہوت کے ساتھ دیکھنے کی بات ہے، تو اس نیت سے کپڑے کے اوپر سے بھی تأمل کرنا حرام ہے، چہ جائے کہ کھلا ہوا چہرہ دیکھے''

فقہ شافعی کے معتبر ترجمان امام نوویؒ فرماتے ہیں: ''نظر الرجل إلى المرأة: فيحرم نظره إلى عورتها مطلقا، وإلى وجهها وكفيها إن خاف فتنة، وإن لم يخف فوجهان: قال أكثر الأصحاب لا سيما المتقدمون: لا يحرم بقول الله تعالى: ولا يبدين زينتهن إلا ما ظهر منها وهو مفسر بالوجه والكفين؛ لكن يكره، قاله الشيخ أبو حامد وغيره، والثاني: يحرم قاله الأصطخري وأبو علي الطبري، واختاره الشيخ أبو محمد والإمام وبه قطع صاحب ''المهذب''

والرویاني، ووجهه الإمام باتفاق المسلمین علی منع النساء من الخروج سافرات ... ثم المراد بالکف: الید من رؤس الأصابع إلی المعصم، وفي وجه: یختص الحکم بالراحة وأما أخمصا القدمین فعلی الخلاف السابق في ستر العورة، وصوتها لیس بعورة علی الأصح ؛ لکن یحرم الإصغاء إلیه عندخوف الفتنة'' (روضة الطالبین: ۷،۲۱، کتاب النکاح، الضرب الأول)

''مرد کا عورت کو دیکھنا..... تو مرد کا عورت کے حصہ ستر کو دیکھنا تو مطلقا ناجائز ہے اور اگر فتنہ کا اندیشہ ہو تو چہرہ اور ہاتھوں کو دیکھنا بھی ناجائز ہے، اگر فتنہ کا اندیشہ نہ ہو تو دو قول ہے: اکثر مشائخ خاص کر متقدمین کی رائے ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد '' ولا یبدین من زینتهن إلا ما ظهر منها'' کی وجہ سے یہ حرام نہیں؛ کیوں کہ اس سے چہرہ اور ہاتھ ہی مراد ہیں؛ البتہ مکروہ ہے، امام غزالیؒ وغیرہ کی یہی رائے ہے، دوسری رائے اس کے حرام ہونے کی ہے، علامہ اصطخری رحمۃ اللہ علیہ اور طبری رحمۃ اللہ علیہ اس کے قائل ہیں اور اسی کو شیخ ابو محمد علیہ الرحمۃ نے اختیار کیا ہے، صاحب مہذب علیہ الرحمۃ اور رویانی رحمۃ اللہ علیہ نے اسی پر یقین ظاہر کیا ہے اور امام نے اس کی دلیل یہ بیان کی ہے کہ مسلمان عورتوں کے بے پردہ نکلنے سے ممانعت پر متفق ہیں...... نیز 'کف' سے مراد انگلی کے کناروں سے گٹوں کی گہرائی تک ہاتھ کا حصہ ہے اور ایک رائے کے مطابق جواز کا حکم صرف ہتھیلی کی گہرائی تک ہے، اور دونوں پاؤں کے تلوؤں کے سلسلہ میں وہی اختلاف ہے، جو ستر عورت کے سلسلہ میں گزر چکا ہے، نیز عورت کی آواز صحیح تر قول کے مطابق ستر میں شامل نہیں ہے؛ لیکن فتنہ کا اندیشہ ہو تو اسے کان لگا کر سننا جائز نہیں ہے''۔

غرض کہ شوافع کے نزدیک بھی ''وجہ'' اور ''کفین'' اپنی اصل کے اعتبار سے ستر میں داخل نہیں ہیں؛ لیکن یہ اندیشۂ شہوت وفتنہ بلا ضرورت ان اعضاء کو دیکھنے سے منع کیا جائے گا، اسی طرح کی صراحتیں فقہاء شوافع کی دوسری کتابوں میں بھی موجود ہیں (دیکھئے: المنهاج: ۲۹/۳، ومغني المحتاج: ۲۹/۳، کتاب النکاح)۔

فقہاء حنابلہ کا نقطۂ نظر بھی یہی معلوم ہوتا ہے؛ چنانچہ ابو الفرج عبد الرحمان مقدسی کا بیان ہے:

''ولا خلاف بین أهل العلم في إباحة النظر إلی وجهها ؛ لأنه لیس بعورة ... ولا یباح له النظر إلی ما لا یظهر عادة ... ولنا قوله تعالی: ولا یبدین زینتهن إلا ما ظهر منها، روي عن ابن عباس أنه قال: هو الوجه وباطن الکف ؛ ولأن النظر أبیح للحاجة فیتخصص بما تدعو الحاجة إلیه... فأما ما یظهر غالبا سوی الوجه کالکفین والقدمین ونحو ذلك مما تظهر المرأة في منزلها، ففیه روایتان: إحدیهما: لا یباح النظر إلیه ؛ لأنه عورة، فلم یبح النظر إلیه کالذي لا یظهر، فإن عبد الله روی أن النبي ﷺ قال: المرأة عورة (حدیث حسن) ؛ ولأن الحاجة تندفع بالنظر إلی الوجه، فبقي ما عداه علی التحریم. والثانیة: له النظر إلی ذلك'' (الشرح الکبیر لابن قدامة المقدسی: ۲۰،۲۱، کتاب النکاح)۔

''اہل علم کے درمیان اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ عورت کے چہرہ کو دیکھنا جائز ہے؛ اس لئے کہ وہ حصہ ستر میں شامل نہیں...... اور جو حصہ عادتاً نہیں کھلتا اس کو دیکھنا جائز نہیں ہے، ہماری دلیل اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: { ولا یبدین من زینتهن إلا ما ظهر منها } اور حضرت عبد اللہ بن عباسؓ سے مروی ہے کہ ''ما ظهر منها'' سے مراد چہرہ اور ہتھیلی ہے، اور اسی لئے دیکھنے کی اجازت ضرورتاً دی گئی ہے؛ لہٰذا ضرورت جتنے حصہ کو دیکھنے کی متقاضی ہو اجازت اسی حد تک محدود ہوگی...... چہرہ کے علاوہ عام طور پر جو حصہ ظاہر ہوتا ہے، جیسے دونوں ہاتھ اور پاؤں وغیرہ جسے عورت اپنے گھر میں کھول کر رکھتی ہے، تو اس سلسلہ میں دو قول ہے: ایک یہ ہے کہ اس کو دیکھنا جائز نہیں؛ اس لئے کہ وہ حصہ ستر میں شامل ہے؛ لہٰذا جو حصہ کھول کر نہیں رکھا جاتا، اسی طرح اس کو دیکھنا بھی جائز نہیں، چنانچہ حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: عورت سراپا قابل ستر ہے، اور اس لئے کہ چہرہ کو دیکھنے سے حاجت پوری ہو جاتی ہے؛ لہٰذا بقیہ اعضاء کی حرمت باقی رہے گی، دوسری رائے یہ ہے کہ ہاتھوں اور قدموں کو بھی دیکھنا جائز ہے''

فقہاء حنابلہ نے عام طور پر یہی لکھا ہے اور ''إلا ما ظهر منها'' کے بارے میں حضرت عبد اللہ بن عباسؓ کی تفسیر سے استدلال کیا ہے۔

دوسرا نقطۂ نظر یہ ہے کہ چہرہ بھی ستر میں داخل ہے اور ان کے دلائل حسب ذیل ہیں:

{ يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ قُل لِّأَزْوَاجِكَ وَبَنَاتِكَ وَنِسَاءِ الْمُؤْمِنِينَ يُدْنِينَ عَلَيْهِنَّ مِن جَلَابِيبِهِنَّ } (احزاب: ۵۹)۔

''اے نبی! اپنی بیویوں سے اور اپنی صاحبزادیوں سے اور مسلمانوں کی عورتوں سے کہہ دو کہ وہ اپنے اوپر اپنی چادریں ڈال لیا کریں''

اس آیت میں عورتوں کو ''جلباب'' کے استعمال کا حکم دیا گیا ہے، جلباب کو موجودہ محاورہ میں ''گھونگھٹ'' سے تعبیر کیا جاسکتا ہے، جس میں چہرہ کا حصہ بھی ڈھک جاتا ہے: ''جلباب: الرداء، وقیل: ھو کالمقنعة تغطي المرأة رأسها وظھرها وصدرها والجمع جلابیب'' (لسان العرب: ۲،۲۱۷)

متعدد حدیثیں بھی اس نقطۂ نظر کی تائید کرتی ہیں:

* ''عن عائشة رضی الله عنها قالت: کان الرکبان یمرون بنا ونحن مع رسول الله ﷺ محرمات، فإذا حاذوابنا سدلت إحدانا جلبابها من رأسها علی وجهها، فإذا جاوزونا کشفناه'' (سنن أبي داؤد، مناسك، فی المحرمة تغطی وجهها، حدیث نمبر: ۱۸۳۳، سنن ابن ماجة، کتاب المناسك، باب المحرمة تسدل الثوب علی وجهها، حدیث نمبر: ۲۹۳۵، السنن الکبری للبیهقی، کتاب الحج، باب المحرمة تلبس الثوب من علو فیستر وجهها، حدیث نمبر: ۹۰۵۱، مسند أحمد، حدیث نمبر: ۲۴۰۱۴)۔

''حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ سواری پر سوار حضرات ہمارے پاس سے گزرتے تھے جبکہ ہم لوگ رسول اللہ کے ساتھ حالت احرام میں تھے، جب وہ ہمارے مقابل آتے تو ہم میں سے ایک عورت اپنا گھونگھٹ سر سے چہرے کی طرف لٹکا لیتی، پھر جب وہ آگے بڑھ جاتے تو اسے ہم ہٹا لیتے''

* ''أمر نساء النبي ﷺ أن یحتجبن، فقالت له زینب: وإنك علینا یا ابن خطاب والوحي ینزل فی بیوتنا، فأنزل الله عز وجل: وإذا سألتموھن متاعا فاسئلوھن من وراء حجاب'' (مسند أحمد، حدیث نمبر: ۴۳۶۳)۔

''رسول اللہ کی ازواج مطہرات کو حکم دیا گیا کہ وہ پردہ کریں، حضرت عمرؓ کے اس ارشاد پر حضرت زینب رضی اللہ عنہا نے ان سے کہا: تم ہمیں سمجھاتے ہوا ے ابن خطاب! حالاں کہ وحی ہمارے گھر میں نازل ہوتی تھی، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے کلام اُتارا: جب تم ازواج مطہرات سے کوئی سامان مانگو تو ان سے پردے کے پیچھے سے مانگا کرو''

* ''عن عائشة رضی الله عنها قالت: کان عتبة بن أبي وقاص عهد إلی أخیه سعد بن أبي وقاص أن ابن ولیدة زمعة مني فأقبضه قالت: فلما کان عام الفتح أخذه سعد بن أبي وقاص ... فقال النبي ﷺ: الولد للفراش وللعاهر الحجر، ثم قال لسودة بنت زمعة زوج النبي ﷺ: احتجبي منه یا سودة! لما رأی من شبهة بعتبة، فما رآها حتی لقي الله'' (صحیح البخاری، کتاب البیوع، باب تفسیر المشبهات، حدیث نمبر: ۲۰۵۳)۔

''حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ عتبہ بن ابی وقاص نے اپنے بھائی سعد بن ابی وقاص سے عہد لیا تھا کہ زمعہ کی باندی کا بیٹا مجھ سے ہے، اس لئے تم اسے اپنے قبضہ میں لے لینا، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ فتح مکہ کے سال حضرت سعد ابن ابی وقاص نے ان کو لے لیا،..... تو حضور نے ارشاد فرمایا: بچہ تو صاحب فراش ہی کا ہوگا، زانی کے لئے صرف محرومی ہے، پھر آپ ﷺ نے ام المؤمنین حضرت سودہ بنت زمعہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا: سودہ! تم اس سے پردہ کرو؛ کیوں کہ میں اس میں عتبہ کی مشابہت دیکھتا ہوں، چنانچہ انہوں نے حضرت سودہ رضی اللہ عنہا کو وفات تک کبھی نہیں دیکھا''

اس سلسلہ میں زیادہ درست نقطۂ نظر یہی معلوم ہوتا ہے کہ چہرہ اپنی اصل کے اعتبار سے ستر میں داخل نہیں ہے؛ لیکن موجودہ دور میں فسق وفجور کی کثرت کی وجہ سے اندیشۂ فتنہ کے باعث عورتوں کے لئے چہرہ کا چھپانا بھی واجب ہوگا، یہی متاخرین فقہاء احناف کی رائے ہے:

''امتنع نظره إلی وجهها، فحل النظر مقید بعدم الشهوة وإلا فحرام، وهذا فی زمانهم، وأما فی زماننا فمنع من الشابة'' (الدر المختار شرح تنویر الأبصار مع رد المحتار: ۹،۵۳۲، کتاب الحظر والإباحة)۔

''مرد کا اجنبی عورت کے چہرہ کو دیکھنا درست نہیں، دیکھنا جائز ہونا اس قید کے ساتھ ہے کہ شہوت پیدا نہ ہو، اگر شہوت پیدا ہو تو حرام ہے اور یہ تو اُن کے زمانے کے لئے تھا، ہمارے زمانے میں نوجوان لڑکی کو دیکھنے سے مطلقاً منع کیا جائے گا''

فقہاء مالکیہ میں علامہ ابوعبداللہ مغربی کا اشارہ گذر چکا ہے:

''إنما یباح النظر لوجه المتجالة دون الشابة لغیر عذر'' (مواهب الجلیل: ۲،۱۸۱)۔

"عمر رسیدہ عورت کے چہرہ کو دیکھنا بلا عذر جائز ہے، نہ کہ جوان عورت کے" فقہاء شوافع کے یہاں یہ بات زیادہ وضاحت اور صراحت کے ساتھ ملتی ہے:

"ويحرم نظر فحل بالغ إلى عورة حرة كبيرة أجنبية، وكذا وجهها وكفيها عند خوف فتنة، وكذا عند الأمن على الصحيح" (المنهاج مع مغني المحتاج: ۳،۱۲۸)۔

"بالغ مرد کا آزاد بالغ اجنبی عورت کے حصۂ ستر کو دیکھنا حرام ہے اور اسی طرح اس کے چہرہ اور ہتھیلی کو بھی اندیشۂ فتنہ کے وقت دیکھنا جائز نہیں اور صحیح قول کے مطابق یہی حکم اس وقت بھی ہے جب فتنہ کا اندیشہ نہ ہو"

اس لئے جو عورتیں ملازمت کرتی ہیں ان کے لئے یہ بات ضروری ہے کہ وہ ایسا ساتر لباس پہنیں کہ وہ مردوں کے سامنے مکمل پردہ میں رہیں، ان کا جسم بھی چھپا ہوا ہو اور چہرہ بھی، البتہ وہ ایسا برقع استعمال کرسکتی ہیں، جن میں آنکھیں کھلی رہیں؛ کیوں کہ یہ ایک ضرورت ہے؛ ورنہ انسان کے لئے راستہ چلنا یا کوئی کام کرنا ممکن نہیں ہوگا؛ چنانچہ علامہ ابن کثیر نقل کرتے ہیں:

"قال ابن عباس: أمر الله نساء المؤمنين إذا خرجن من بيوتهن في حاجة أن يغطين وجوههن من فوق رؤوسهن بالجلابيب ويبدين عينا واحداً، وقال محمد بن سيرين: سألت عن عبيدة السلماني عن قول الله عز وجل: يدنين عليهن من جلابيبهن، فغطى وجهه ورأسه وأبرز عينه اليسرى" (تفسير ابن كثير: ۳،۱۲۱، الاحزاب: ۵۹)۔

"حضرت عبداللہ بن عباس ؓ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمان عورتوں کو حکم دیا ہے کہ جب وہ کسی ضرورت کے لئے اپنے گھر سے نکلیں تو اپنے سر کے اوپر سے گھونگھٹ کے ذریعہ اپنا چہرہ چھپالیں اور ایک آنکھ کھلی رکھیں، نیز محمد بن سیرینؒ نے کہا ہے کہ میں نے عبیدہ سلمانیؒ سے اللہ تعالیٰ کے ارشاد "يدنين عليهن من جلابيبهن" کی تفسیر پوچھی تو انہوں نے اپنا چہرہ اور سر ڈھنک لیا اور بائیں آنکھ کو کھلا رکھا"

اس سلسلہ میں سن رسیدہ خواتین (پچاس سال سے اوپر) اور جوان عورتوں میں کسی حد تک فرق کی بھی گنجائش ہے، یعنی معمر عورتوں کے لئے بعض حالات میں چہرہ کھولنے کی گنجائش ہوسکتی ہے، اگر فتنہ کا اندیشہ نہ ہو؛ اسی لئے فقہاء نے جوان اور بوڑھی عورتوں کے لئے احکام میں فرق کیا ہے اور جوان عورتوں پر چہرے کے چھپانے کو واجب قرار دیا ہے؛ چنانچہ امام ابوبکر جصاص رازیؒ فرماتے ہیں:

"في هذه الآية دلالة على أن المرأة الشابة مأمورة بستر وجهها عن الأجنبيين وإظهار الستر والعفاف عند الخروج؛ لئلا يطمع أهل الريب فيهن" (أحكام القرآن للجصاص: ۳،۴۸۶، باب حجاب النساء، غالبا "إظهار الستر" کا لفظ غلط ہے، اصل میں "عدم إظهار الستر" ہے)۔

"اس آیت میں اس بات کی دلیل ہے کہ جوان عورت کو گھر سے نکلتے وقت اجنبی مردوں سے چہرہ چھپانے اور ستر کو ظاہر نہ کرنے، نیز پاکدامنی اختیار کرنے کا حکم دیا گیا ہے؛ تاکہ بدقماش لوگوں کے اندر ان کے بارے میں کوئی حرص پیدا نہ ہو"

نیز علامہ حصکفیؒ کا بیان ہے: "وأما في زماننا فمنع من الشابة، لا ؛ لأنه عورة، بل لخوف الفتنة" (الدر المختار مع رد المحتار: ۹،۵۳۲)۔

"ہمارے زمانے میں جوان عورت کا چہرہ دیکھنے سے منع کیا جائے گا؛ اس لئے نہیں کہ یہ حصہ ستر میں داخل ہے؛ بلکہ اس لئے کہ فتنہ کا اندیشہ ہے"

ایک اور موقع پر علامہ حصکفیؒ فرماتے ہیں: "وهذا في الشابة: أما العجوز التي لا تشتهي فلا بأس بمصافحتها ومس يدها إذا أمن" (الدر المختار مع رد المحتار: ۹،۵۲۸ - ۵۲۷)۔

"یہ حکم جوان عورت کے بارے میں ہے، بوڑھی عورتیں جن میں شہوت نہیں پائی جاتی، اُن سے مصافحہ کرنے اور ہاتھ چھونے میں بشرطیکہ وہ خود مامون ہوں تو حرج نہیں"

اختلاط سے اجتناب

دوسری ضروری شرط یہ ہے کہ کسی مرد کے ساتھ عورت کی تنہائی نہ ہو، یا عورتوں اور مردوں کا مخلوط ماحول نہ ہو، متعدد روایتوں میں رسول اللہ ﷺ نے غیر محرم مردو

عورت کے تخلیہ کو منع فرمایا ہے، چند روایتیں یہاں ذکر کی جاتی ہیں:

*''عن عبد اللہ بن عمرو بن عاص ... ثم قام رسول اللہ ﷺ علی المنبر، فقال: لا یدخلن رجل بعد یومی هذا علی مغیبة، إلا ومعه رجل أو اثنان'' (مسلم: ۲،۲۱۵، باب تحریم الخلوة بالأجنبیة)۔

''حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاصؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ منبر پر کھڑے ہوئے اور ارشاد فرمایا: آج کے اس دن کے بعد کوئی شخص ایسی عورت پر داخل نہ ہو جس کا شوہر موجود نہ ہو سوائے اس کے کہ اس کے ساتھ (کم سے کم) ایک یا دو مرد ہوں''

*''عن عقبة بن عامر أن رسول اللہ ﷺ قال: إیاکم والدخول علی النساء، فقال رجل من الأنصار: یا رسول اللہ! أفرأیت الحمو؟ قال: الحمو الموت'' (حوالہ سابق)۔

''حضرت عقبہ بن عامرؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہؐ نے ارشاد فرمایا: لوگوں! عورتوں پر داخل ہونے سے بچو، انصار میں سے ایک صاحب نے عرض کیا: اللہ کے رسول! دیور کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟ آپ نے ارشاد فرمایا: دیور تو موت ہے (یعنی اس کے ساتھ تنہائی تو اور زیادہ نامناسب ہے)''

*''عن جابر قال: قال رسول اللہ ﷺ: ألا لا یبیتن رجل عند امرأة ثیب إلا أن یکون ناکحا أو ذا رحم'' (حوالہ سابق)۔

''حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا: کوئی مرد کسی شوہر دیدہ عورت کے پاس رات ہرگز نہ گذارے، سوائے اس کے کہ وہ اس کے نکاح میں ہو یا وہ اس کا محرم رشتہ دار ہو''

حضرت جابر کی روایت میں خاص طور پر شوہر دیدہ عورت کے بارے میں ممانعت آئی ہے، لیکن یہ تخصیص اس وجہ سے ہے کہ کنواری لڑکی کے پاس عام طور پر لوگ جانے سے خود ہی احتیاط کرتے ہیں اور اس پر حیا کا غلبہ بھی ہوتا ہے، شوہر دیدہ عورت کے بارے میں فتنہ کا اندیشہ زیادہ ہوتا ہے؛ چنانچہ امام نوویؒ رقمطراز ہیں:

''قال العلماء: إنما خص الثیب؛ لکونها التي یدخل إلیها غالبا، وأما البکر فمصونة ومتصونة في العادة من جانبة للرجال أشد مجانبة، فلم یحتج إلی ذکرها ؛ ولأنه من باب التنبیة ؛ لأنه إذا نهی عن الثیب التي یتساهل الناس في الدخول علیها في العادة ففي البکر أولی'' (شرح المهذب: ۲،۲۱۵)۔

''علماء نے کہا ہے کہ شوہر دیدہ عورت کی تخصیص اس لئے کی گئی ہے کہ عام طور پر مرد ایسی ہی عورتوں کے پاس جاتے ہیں، کنواری لڑکی عادةً بچا کر رکھی جاتی ہے اور خود بھی بچ کر رہتی ہے اور مردوں سے بہت اجتناب برتتی ہے؛ لہذا اس کو تذکرہ میں شامل نہیں کیا گیا اور اس لئے کہ اس سے مقصود تنبیہ ہے؛ اس لئے کہ جب شوہر دیدہ عورت سے منع کیا گیا تو کنواری لڑکی سے بدرجۂ اولی ممانعت ہوگی''

ولی کی اجازت

عورت کو اپنی خلقی کمزوری کی وجہ سے ہمیشہ کسی ایسے مرد کی ضرورت پڑتی ہے، جو اس کی جان ومال اور عزت وآبرو کا محافظ ہو، جب تک وہ باپ کے گھر میں رہتی ہے، باپ اس کا محافظ ہوتا ہے اور نکاح کے بعد شوہر اس کا محافظ ہوتا ہے؛ اس لئے خواتین کے لئے گھریلو یا گھر سے باہر کی ملازمت اختیار کرنے میں باپ یا شوہر کی اجازت بنیادی اہمیت رکھتی ہے، اس سلسلہ میں درج ذیل صورتیں ہوسکتی ہیں:

الف: عورت اپنے گھر ہی میں کسب معاش کی کوئی صورت اختیار کرے اور اس کی مشغولیت شوہر کے حقوق کی ادائیگی میں حارج نہ ہو۔

ب: عورت اپنے گھر میں ہی کسب معاش کی کوئی تدبیر کرے؛ لیکن اس کی یہ مشغولیت شوہر کے حق کو متاثر کرتی ہو۔

ج: عورت کسب معاش کے لئے گھر سے باہر نکلے اور اس کا یہ نکلنا مجبوری کی بناء پر ہو۔

د: عورت کسب معاش کے لئے گھر سے باہر نکلے، حالاں کہ والد یا شوہر اس کی تمام ضروریات کو پوری کرتے ہوں اور عورت کسب معاش پر مجبور نہ ہو۔

ان مختلف صورتوں کے احکام اس طرح ہیں:

(الف، ب) پہلی صورت میں عورت کے لئے شوہر کی اجازت کے بغیر بھی کسب معاش کرنا جائز ہے؛ کیوں کہ نہ وہ گھر سے باہر نکل رہی ہے اور نہ اس کے عمل کی وجہ سے شوہر کا حق شوہری متاثر ہو رہا ہے، دوسری صورت یہ ہے کہ عورت گھر ہی میں کام کرتی ہے، مگر اس کی مشغولیت شوہر کے حق کو متاثر کرتی ہے، تو شوہر کو منع کرنے کا حق حاصل ہوگا، ان دونوں ہی صورتوں کے سلسلہ میں علامہ ابن عابدین شامیؒ کی یہ صراحت بہت معقول اور چشم کشا ہے:

''بل له أن يمنعها من الأعمال كلها المقتضية للكسب ؛ لأنها مستغنية عنه لوجوب كفايتها عليه ... قلت: ثم إن قولهم له منعها من الغزل يشمل غزلها لنفسها، فإن كانت العلة فيه السهر والتعب والنقص لجمالها فله منعها عما يؤدي إلى ذلك لا ما دونه، وإن كانت العلة استغناءها عن الكسب كما مر، ففيه أنها قد تحتاج إلى ما لا يلزم الزوج شرائه لها ... والذي ينبغي تحريره أن يكون له منعها عن كل عمل يؤدى إلى تنقيص حقه أو ضرره أو إلى خروجها من بيته، أما العمل الذي لا ضرر له فيه، فلا وجه لمنعها عنه'' (رد المحتار: ۵،۲۲۵، باب النفقة)۔

''بلکہ شوہر کو ایسے تمام افعال سے روکنے کا حق ہوگا، جو کسب معاش کے تقاضے سے کئے جاتے ہیں؛ اس لئے کہ عورت اس سے مستغنی ہے؛ کیوں کہ اس کی ضرورتوں کی کفایت شوہر پر واجب ہے...... میں کہتا ہوں: فقہاء کا یہ کہنا کہ شوہر عورت کو دھاگہ بُننے سے بھی منع کر سکتا ہے تو یہ شامل ہے اس صورت کو جب عورت اپنے لئے بُنے، تو اگر عورت کا اس کام کی وجہ سے رات میں جاگنا اور تھک جانا اور اس کے حسن و جمال میں کمی پیدا ہو جانا لازم آتا ہے، تو شوہر کو واقعی اس کام سے روکنے کا حق ہوگا، جو ان امور کا باعث ہے، اور اگر عورت کے ساتھ یہ عوارض پیش نہیں آتے ہیں تو شوہر کو روکنے کا حق نہیں ہوگا، اور اگر روکنے کی علت یہ ہو کہ وہ کمانے سے مستغنی ہے تو اس سلسلہ میں یہ بات قابل توجہ ہے کہ عورت کو کبھی ایسی چیز کے خریدنے کی حاجت دامن گیر ہوتی ہے جس کا خریدنا شوہر پر واجب نہیں...... اور اس سلسلہ میں یہ بات منقح کر دینی چاہئے کہ شوہر کو ایسے عمل سے روکنے کا حق ہے، جس سے اس کا حق متاثر ہوتا ہو یا اس کو ضرر پہنچتا ہو یا عورت کو گھر سے نکلنا پڑتا ہو، اگر ایسا عمل ہو جس میں شوہر کو کوئی نقصان نہیں ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ شوہر بیوی کو اس سے منع کرے''

(ج) اگر عورت مجبور ہو، شوہر نفقہ ادا نہ کرتا ہو، یا وہ کسبِ معاش سے معذور ہو، یا مطلقہ اور بیوہ ہو اور والد وغیرہ کفالت نہ کرتے ہوں، تو اس صورت میں عورت شوہر کی اجازت کے بغیر بھی کسبِ معاش کے لئے شرعی حدود کے ساتھ گھر سے باہر نکل سکتی ہے؛ کیوں کہ فقہاء نے ضرورتاً شوہر کی اجازت کے بغیر بھی عورت کو باہر نکلنے کی اجازت دی ہے، اس سلسلہ میں فقہاء کی یہ صراحتیں قابل توجہ ہیں:

* ''وفي مجموع النوازل: فإن كانت قابلة أو غسالة أو كان لها حق على آخر أو لآخر عليها حق تخرج بالإذن وبغير الإذن'' (فتح القدير: ۴، ۳۵۸، باب النفقة، نیز دیکھئے: البحر الرائق: ۴،۲۲۱، باب النفقة)۔

''مجموع النوازل میں ہے: اگر بیوی دایہ ہو یا مردہ کو غسل دینے سے واقف ہو یا اس کا کسی دوسرے پر حق ہو یا دوسرے کا حق اس پر ہو تو وہ شوہر کی اجازت سے بھی اور بلا اجازت بھی نکل سکتی ہے''

* ''فإن وقعت لها نازلة إن سأل الزوج من العالم وأخبرها بذلك لا يسعها الخروج وإن امتنع من السؤال يسعها أن تخرج من غير رضاه'' (فتح القدير: ۴، ۳۵۸، باب النفقة، نیز دیکھئے: البحر الرائق: ۴،۲۲۱، باب النفقة)۔

''اگر عورت کو کوئی شرعی مسئلہ پیش آیا تو اگر شوہر عالم سے دریافت کر کے بیوی کو اس کے بارے میں بتادے تب تو اس کے لئے نکلنے کی گنجائش نہیں اور اگر وہ دریافت نہ کرے تو اس کی رضامندی کے بغیر بھی عورت کے لئے نکلنے کی گنجائش ہے''

بلکہ علامہ ابن ہمام کے بیان سے تو معلوم ہوتا ہے کہ اگر عورت کا حق شوہر نے ادا نہیں کیا ہے، تو چاہے بیوی گھر سے باہر نکلنے پر مجبور ہو یا نہ ہو، اس کے لئے شرعی حدود کے ساتھ گھر سے باہر نکلنے کی اجازت ہے:

''المرأة قبل أن تقبض مهرها، لها أن تخرج في حوائجها وتزور الأقارب بغير إذن الزوج. فإن أعطاها المهر، ليس لها الخروج، إلا بإذن الزوج'' (فتح القدير: ۴،۳۵۸، باب النفقة، فصل في السكنى)۔

''مہر پر قبضہ کرنے سے پہلے شوہر کی اجازت کے بغیر بھی عورت کو اپنی ضروریات کے لئے نکلنے اور رشتہ داروں سے ملاقات کرنے کا حق حاصل ہے اور اگر شوہر مہر ادا کر چکا ہے تب اس کو شوہر کی اجازت کے بغیر گھر سے نکلنے کی اجازت نہیں ہوگی''

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اگر عورت کے لئے نفقہ اور ضروریات زندگی کا کوئی انتظام نہ ہو، تو اسے کسب معاش کے لئے گھر سے باہر نکلنے کی اجازت ہوگی، اس کی مثال عدت وفات ہے، حالت نکاح میں عورت کے گھر سے باہر نکلنے کے مقابلہ عدت میں گھر سے نکلنے کی ممانعت زیادہ شدید ہے؛ کیوں کہ نکاح میں نکلنے کی ممانعت ''حق العبد'' یعنی شوہر کے حق کی بناء پر ہے، اور عدت میں نکلنے کی ممانعت سابق شوہر کے حق کی بناء پر بھی ہے اور اس کا شمار 'حق اللہ' میں بھی ہے، اس کے باوجود عدت وفات میں عورت کو کسبِ معاش کے لئے گھر سے باہر نکلنے کی اجازت دی گئی ہے۔

البتہ یہ اجازت بقدر ضرورت ہے؛ چنانچہ اگر کسی عورت کے لئے نفقہ کا نظم ہو جائے، تو پھر اس کے حق میں اس کی اجازت نہیں ہوگی:

''والحاصل أن مدار حل خروجها بسبب قيام شغل المعيشة، فيتقدر بقدره، فمتى انقضت حاجتها لا يحل لها بعد ذلك صرف الزمان خارج بيتها'' (رد المحتار: ۵، ۲۲۵، فصل في الحداد)۔

''حاصل یہ ہے کہ عورت کے لئے نکلنے کے جائز ہونے کا مدار کسب معاش کو انجام دینا ہے؛ لہذا اسی قدر نکلنے کی اس کو اجازت ہوگی، جب اس کی یہ ضرورت پوری ہو جائے تو اس کے لئے گھر سے باہر وقت گزارنا جائز نہیں ہوگا''

اس سے معلوم ہوا کہ جن فقہاء کے نزدیک مطلقۂ بائنہ کا نفقۂ عدت واجب نہیں ہوتا، ان کے نزدیک ایسی مطلقہ عورت بھی کسبِ معاش کے لئے گھر سے باہر جا سکتی ہے؛ چنانچہ امام ابوبکر جصاص رازی نقل کرتے ہیں:

''عن عطاء عن ابن عباس: أنه كان يقول في المطلقة ثلاثا والمتوفي عنها زوجها: لا نفقة لهما وتعتدان حيث شائتا'' (أحكام القرآن للجصاص: ۳،۶۱۶، باب السكنى للمطلقة)۔

''حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے مروی ہے کہ وہ اس عورت کے بارے میں جس کو تین طلاق ہو چکی ہے، یا جس کے شوہر کا انتقال ہو گیا ہے، فرمایا کرتے تھے کہ وہ نفقہ کی مستحق نہیں ہے اور وہ جہاں چاہے عدت گزار سکتی ہے''

بلکہ حنفیہ کے یہاں عدت طلاق میں بھی اگر خلع کی صورت ہو، جس میں عورت نے نفقۂ عدت معاف کر دیا ہو؛ لیکن وہ نفقہ کی محتاج ہو، تب بھی اس کے لئے کسبِ معاش کی غرض سے گھر سے باہر نکلنے کی گنجائش ہے؛ کیوں کہ بعض اوقات عورتیں شوہر کے ظلم سے نجات پانے کے لئے نفقۂ عدت وغیرہ معاف کر دیتی ہیں؛ حالاں کہ وہ ضرورت مند ہوتی ہیں؛ چنانچہ علامہ شامیؒ علامہ ابن ہمامؒ کے حوالہ سے نقل کرتے ہیں:

''والحق أن على المفتي أن ينظر في خصوص الوقائع فإن علم في واقعة عجز هذا المختلعة عن المعيشة إن لم تخرج أفتاها بالحل، وإن علم قدرتها أفتاها بالحرمة'' (رد المحتار: ۵،۲۲۲، فصل في الحداد)۔

''حق یہ ہے کہ مفتی پر واجب ہے کہ وہ واقعات کی خصوصی نوعیت کو دیکھے، اگر کسی واقعہ میں اندازہ ہو جائے کہ یہ خلع حاصل کرنے والی عورت اگر گھر سے باہر نہ نکلے تو معاشی ضرورت پوری نہیں کر سکتی تو اس کے حق میں گھر سے باہر نکلنے کے جائز ہونے کا فتوی دے، اور اگر اندازہ ہو کہ وہ اس پر قادر ہے تو پھر اس کے ممنوع ہونے کا فتوی دے''

یہ بات بھی ملحوظ رہنی چاہئے کہ عورت کے لئے ایک ضرورت تو اس کے اپنے اخراجات ہیں دوسرے: بعض اوقات دوسرے رشتہ داروں کا نفقہ بھی اس سے متعلق ہو جاتا ہے، جیسے باپ نفقہ نہ دیتا ہو، یا نفقہ ادا کرنے کے لائق نہ ہو، تو عورت پر اولاد کا نفقہ بھی واجب ہوتا ہے:

''ولو لهم أم موسرة أمرت أن تنفق عليهم فيكون دينا فترجع به على الأب إذا أيسر'' (رد المحتار: ۵،۳۴۲)۔

''اگر بچوں کی ماں ہو جو خوشحال ہو تو اُسے حکم دیا جائے گا کہ وہ ان پر خرچ کرے اور وہ جو کچھ خرچ کرے گی وہ اس کا دین ہوگا، جو وہ بچوں کے باپ سے اس کے خوشحال ہونے کے بعد وصول کرے گی''

بلکہ حنابلہ کے نزدیک تو عورت کو مرد کے خوشحال ہونے کے بعد اس کی واپسی کے مطالبہ کا حق بھی حاصل نہ ہوگا:

''فإن أعسر الأب وجبت النفقة على الأم ولم ترجع بها عليه إن أيسر'' (المغنی: ۱۱،۳۷۳)۔

''اگر باپ غریب ہو تو بچوں کا نفقہ ماں کے اوپر ہوگا؛ بشرطیکہ ماں خوشحال ہو، اور باپ سے اس کے خوشحال ہونے کے بعد بھی وصول نہیں کرے گی''۔

بعض دفعہ اپنے نادار والدین کا نفقہ بھی بیٹی پر واجب ہوتا ہے:

''إذا كان للفقير والد وابن ابن موسرين، فالنفقة على الوالد؛ لأنه أقرب، وإذا كانت له بنت وابن ابن موسر، فالنفقة على البنت خاصة، ... وكذا إذا كان للفقير بنت ومولى عتاقة وهما موسران، فالنفقة على البنت ...، وكذلك المعسرة إذا كانت لها بنت وأخت لأب وأم، فالنفقة على ابنتها ... فإن كان للصغير أم وجد فالنفقة على الأم قدر ميراثهما أثلاثا بخلاف الأب في ظاهر الرواية'' (المحیط البرہانی: ۴،۲۵۲ - ۲۵۳)۔

''اگر کسی محتاج آدمی کے والد بھی ہوں اور پوتے بھی ہوں اور دونوں خوشحال ہوں تو والد پر نفقہ واجب ہوگا؛ اس لئے کہ وہ زیادہ قریبی رشتہ دار ہے اور اگر اس کی بیٹی بھی ہو اور پوتا بھی اور دونوں خوشحال ہوں تو صرف بیٹی پر نفقہ واجب ہوگا...... اور اگر محتاج شخص کی بیٹی بھی ہو اور آزاد کیا ہوا غلام بھی اور دونوں خوشحال ہوں تو بیٹی پر نفقہ کی ذمہ داری ہوگی، اسی طرح کسی تنگدست عورت کی بیٹی بھی ہو اور ماں باپ شریک بہن بھی تو بیٹی کے ذمہ نفقہ ہوگا...... اور اگر کسی نابالغ کی ماں اور دادا ہوں تو ماں اور دادا پر ان کے حصۂ میراث کے لحاظ سے نفقہ واجب ہوگا''

اسی طرح بعض دفعہ بھائی کا نفقہ بہن پر واجب ہوتا ہے اور اگر حقیقی اور ماں شریک و باپ شریک بہنیں ہوں تو ہر ایک پر ان کے حق میراث کے حساب سے نفقہ واجب ہوگا:

''ونفقة الأخ المعسر على الأخوات المتفرقات أخماسا على قدر الميراث'' (الہدایہ مع الفتح: ۴،۳۸۱)۔

غرض کہ کسبِ معاش بعض دفعہ عورت کے لئے حالات کے لحاظ سے ضرورت بن جاتا ہے، ایسی صورت میں اگر والد یا شوہر اجازت نہیں دیں، تب بھی پردہ کی رعایت کے ساتھ اس کے لئے گھر سے باہر نکلنے کی گنجائش ہوگی۔

(د) اگر عورت کسبِ معاش پر مجبور نہ ہو اور شوہر اس کی اور بچوں کی ضروریات معروف طریقہ پر پوری کرتا ہو، تو اب عورت کا کسبِ معاش کے لئے گھر سے باہر نکلنا نکاح سے پہلے والد اور نکاح کے بعد شوہر کی اجازت پر موقوف ہوگا اور ان کی اجازت کے بغیر ملازمت کے لئے گھر سے باہر نکلنا...... گو پردہ کی رعایت کے ساتھ ہو...... جائز نہیں ہوگا۔

☆☆☆

خواتین کی ملازمت کا مسئلہ

مولانا سید جلال الدین عمری[1]

خاندانی نظام میں عام طور پر مرد کی حیثیت سربراہ کی ہوتی ہے، وہ اس کی حفاظت اور نگرانی کرتا ہے، بیوی بچوں اور بعض اوقات قریبی عزیزوں کی معاش اور دوسری ضروریات کا نظم کرتا ہے، تعلیم وتربیت اور شادی بیاہ کے اخراجات برداشت کرتا ہے، عورت امور خانہ داری انجام دیتی ہے، جس میں گھر کے نظام کو ٹھیک رکھنا، بچوں کی دیکھ بھال اور پرورش اور شوہر کے مال کی حفاظت جیسے امور شامل ہیں، خاندان کا یہی نظام عرب میں بھی رائج تھا، اس نظام میں بعض بڑی بے اعتدالیاں تھیں، ایک دوسرے کے حقوق متعین نہیں تھے، ذمہ داریاں واضح نہیں تھیں، بعض اوقات عدل وانصاف کے صریح تقاضے پورے نہیں ہوتے تھے، عورت اپنی طبعی کمزوری کی وجہ سے سب کچھ برداشت کرتی تھی، اسلام نے خاندان کا نظام باقی رکھا، اسے ظلم وناانصافی سے پاک کیا، مرد اور عورت کے حقوق اور ذمہ داریوں کا تعین کیا، مرد کی مطلق بالادستی ختم کی، عورت کی کمزوری کی رعایت کی اور اسے قانونی تحفظ فراہم کیا، خاندان کی بقا اور استحکام کے لئے اس نے مرد کو عورت کی معاش کا ذمہ دار قرار دیا، یعنی ازروئے قانون مرد پر عورت کا نان ونفقہ واجب ہے تاکہ عورت گھر کے داخلی نظم کو چلانے کے لئے خود کو فارغ کرسکے۔

موجودہ دور میں عورت معاش کے معاملہ میں خود کفیل ہونا چاہتی ہے، وہ خاوند یا کسی دوسرے فرد پر انحصار کرنا نہیں چاہتی، اسے اس کے مواقع بھی حاصل ہیں، اس سلسلے میں جو بعض سوالات ابھرتے ہیں یہاں ان کا جواب دینے کی طالب علمانہ کوشش کی جائے گی۔

ا۔ شریعت اسلامی خواتین کے لئے کسب معاش کو کس نظر سے دیکھتی ہے؟

اسلام نے عورت کو معاش کی فکر سے بڑی حد تک بے نیاز کر رکھا ہے، لیکن اس کی معاشی جدوجہد کو ناپسندیدہ نہیں کہا جاسکتا، رزق کو قرآن مجید میں اللہ کا فضل کہا گیا اور اسے تلاش کرنے کی ہدایت دی گئی ہے، سورۂ جمعہ میں ارشاد ہے:

''فإذا قضيت الصلوة فانتشروا فى الأرض وابتغوا من فضل الله''

عورت کو بھی اللہ کا فضل تلاش کرنے کا حق ہے، اس کی کوئی دلیل نہیں ہے کہ یہ حق صرف مرد کو حاصل ہے عورت کو حاصل نہیں ہے، اس پر ایک اور پہلو سے بھی غور کیا جاسکتا ہے۔

عورت کو مختلف ذرائع سے مال حاصل ہوتا ہے، ان میں مہر اور میراث شامل ہے، تحفہ، عطیہ اور ہبہ کی شکل میں بھی اس کے پاس مال آسکتا ہے، وہ وقف کی بھی مالک ہوسکتی ہے، اپنی اس دولت کو وہ محنت اور کوشش سے ترقی دے سکتی ہے اور اپنی آزادی مرضی سے اس میں تصرف کا بھی حق رکھتی ہے۔

''للمرأة الرشيدة التصرف فى مالها كله بالتبرع والمعاوضة'' (ابن قدامہ ۶۰۶/۶)۔

۲۔ شریعت نے عام حالات میں عورت پر معاشی ذمہ داری نہیں ڈالی ہے، خود اس کا نفقہ، پیدائش کے بعد سے بلوغ تک بلکہ جب تک شادی نہ ہوجائے باپ کے ذمہ ہے، شادی کے بعد شوہر پر اس کا نان ونفقہ واجب ہے، لیکن بعض حالات میں کسی نہ کسی درجہ میں اس پر بھی معاشی ذمہ داری عائد ہوتی ہے، اس کی بعض مثالیں ذیل میں دی جارہی ہیں:

فقہاء نے صراحت کی ہے کہ اگر بچوں کا باپ نہیں ہے تو ماں پر ان کا نان ونفقہ واجب ہوگا، علامہ ابن قدامہ حنبلی کہتے ہیں:

''إن الأم تجب نفقتها ويجب عليها أن تنفق على ولدها إذا لم يكن له أب وبهذا قال أبوحنيفة

---

[1] امیر جماعت اسلامی ہند، نئی دہلی۔

والشافعی'' (المغنی لابن قدامہ ۱۱،۳۰۲)۔ (ماں کا نفقہ اولاد پر واجب ہے، اسی طرح ماں پر واجب ہے کہ وہ اپنی اولاد پر خرچ کرے، اگر اس کا باپ نہ ہو، امام ابوحنیفہ اور امام شافعی کی بھی یہی رائے ہے)۔

امام مالک کو اس سے اختلاف ہے، ان کے نزدیک عصبات پر نفقہ واجب ہوتا ہے: ''حکی عن مالك أنه لا نفقة عليها ولا لها لأنها ليست عصبة لولدها'' (المغنی ۱۱،۳۷۳)۔

مزید فرماتے ہیں: ''فإن أعسر الأب وجبت النفقة على الأم ولم ترجع بها عليه إن أيسر'' (المغنی ۱۱،۳۷۳)۔

(اگر باپ تنگ دست ہو اور اولاد کا نفقہ نہ برداشت کر سکے تو ماں پر اس کا نفقہ واجب ہو جائے گا، یہ اس کی طرف سے قرض نہ ہوگا، اس لئے باپ خوش حال یا صاحب حیثیت ہو جائے تو اس کا مطالبہ نہ کر سکے گی)۔

اسی طرح یہ بھی کہا گیا ہے: ''أم معسرة وجدة موسرة النفقة على الجدة'' (المغنی ۱۱،۳۷۶)۔

(ماں تنگ دست اور دادی خوش حال ہے تو نفقہ دادی پر واجب ہوگا)۔

بالغ اولاد جو اپنا خرچ نہیں اٹھا سکتی اس کے متعلق فقہ حنفی میں کہا گیا: ''وتجب نفقة الإبنة البالغة والإبن الزمن على أبويه أثلاثا على الأب الثلثان وعلى الأم الثلث'' (ہدایہ نصب الرایہ ۳،۴۰۷)۔

(لڑکی جو بالغہ ہے اور لڑکا جو بلوغ کے بعد معذور اور اپاہج ہے اس کا نفقہ باپ اور ماں دونوں پر واجب ہوگا، باپ پر دو ثلث اور ماں پر ایک ثلث)۔

اسی طرح کہا گیا ہے کہ بھائی اگر تنگ دست ہے تو بہنوں پر ان کی میراث کے لحاظ سے نفقہ واجب ہے، ''ونفقة الأخ المعسر على الأخوات المتفرقات أخماسا على قدر الميراث'' (ہدایہ مع فتح القدیر ۴،۳۸۱)، وہ اس طرح کہ حقیقی بہن پر ۵/۳، اور اخیافی بہن اور علاتی بہن میں سے ہر ایک پر ۵/۱ ہوگا۔

اسی طرح کی اور بھی صورتیں ہو سکتی ہیں جن میں عورت پر از روئے شرع افراد خاندان کا نفقہ واجب ہوتا ہے، یہ ایک قانونی بحث ہے، افراد خاندان میں الفت ومحبت اور تعاون و ہمدردی کے جو فطری جذبات پائے جاتے ہیں، اس کے کچھ اور تقاضے ہیں، اسلام ان جذبات کو ابھارتا اور تقویت پہنچاتا ہے، شوہر کا نفقہ بیوی پر کسی حال میں واجب نہیں ہے، لیکن خوش حال بیوی تنگ دست شوہر کی مدد کر سکے تو یہ اعلی اخلاق کا ثبوت ہوگا، شریعت اسے بہت بڑے اجر وثواب کا عمل قرار دیتی ہے، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی معاشی حالت اچھی نہیں تھی، ان کی بیوی زینبؓ ان پر اور اپنے یتیم بچوں (جو سابق شوہر سے تھے) پر خرچ کرتی تھیں، انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا:

"أيجزي عني أن أنفق على زوجي وأيتام في حجري" (کیا میرا اپنے شوہر پر اور اپنے ان یتیم بچوں پر جو میری حفاظت اور نگرانی میں ہیں خرچ کرنا میری طرف سے کافی ہو جائے گا اور میں اپنے فرض سے سبکدوش ہو جاؤں گی)، یہی سوال ایک اور خاتون کو درپیش تھا، ان کا نام بھی زینب تھا، آپ نے دونوں سے فرمایا:

''نعم لهما أجران أجر القرابة وأجر الصدقة'' (بخاری، کتاب الزکوۃ، باب الزکوۃ علی الزوج والایتام فی الحجر، مسلم، کتاب الزکوۃ، باب فضل النفقة والصدقة على الاقربين والزوج والاولاد الخ)۔ (ہاں ان کے دو اجر ہیں، ایک قرابت کا اجر اور ایک صدقہ کا اجر)۔

حضرت ام سلمہؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ ابو سلمہؓ کے بچوں پر اگر میں خرچ کروں تو کیا مجھے اس کا اجر ملے گا، میں انہیں چھوڑ بھی نہیں سکتی، بہر حال وہ میرے بچے ہیں، آپ نے فرمایا: ''نعم لك أجر ما أنفقت عليهم'' (بخاری، کتاب النفقات حدیث ۵۳۶۹)۔

اس سلسلہ میں فقہی مباحث سے قطع نظر بعض اوقات عورت پر افراد خانہ کے نان ونفقہ کی قانونی اور اخلاقی ذمہ داری عائد ہوتی ہے، اس لئے اگر وہ اپنی مالی حیثیت کو بہتر بنانے کی کوئی جائز تدبیر اختیار کرے تو اسے غلط نہیں کہا جا سکتا۔

۳- اسلام نے دنیا میں ملوث ہونے اور اپنی تمام توانائیوں کو اس میں لگانے سے منع کیا ہے اور قناعت کی تعلیم دی ہے، لیکن اس کے ساتھ اگر کوئی

شخص جائز اور حلال ذرائع سے مال حاصل کرتا ہے اور آرائش وراحت کی زندگی گذارتا ہے تو اس کی بھی اجازت ہے، اس معاملہ میں مرد اور عورت کے درمیان فرق کی کوئی معقول وجہ نہیں ہے، عورت بھی اسلامی حدود میں عزت کی جگہ راحت کی زندگی گزارنے کی کوئی تدبیر اختیار کرے تو اسے غلط نہیں کہا جاسکتا۔

۴۔ عورت کے اندرون خانہ اپنی معاشی مصروفیت کے لئے شوہر سے اجازت لینی ضروری ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ عورت کے نان ونفقہ کا مرد ذمہ دار ہے، وہ کسب معاش کے لئے مجبور نہیں ہے، دوسری وجہ یہ ہے کہ نان ونفقہ کے عوض شوہر کے لئے وہ اپنا وقت فارغ کرتی ہے، ہدایہ میں ہے:

''النفقة جزاء الاحتباس، فكل من كان محبوسا بحق مقصود لغيره كانت نفقة عليه''

اس کی دلیل یہ دی گئی ہے: ''أصله القاضي والعامل في الصدقات'' (ہدایہ مع الدرایہ ۲۹۶، ۳)۔

جب عورت کے اوقات شوہر کے لئے فارغ ہیں تو وہ اس کی اجازت کے بغیر کوئی دوسری مصروفیت نہیں اختیار کرسکتی۔

۵۔ عورت کے گھر کے اندر کوئی ذریعہ معاش اختیار کرنے کے لئے جب شوہر کی اجازت ضروری ہے تو اس مقصد سے باہر نکلنے کے لئے بدرجہ اولی اجازت ضروری ہوگی، شوہر اسے اجازت بھی دے سکتا ہے اور منع بھی کرسکتا ہے۔

علامہ ابن قدامہ حنبلی کہتے ہیں: ''وللزوج منعها من الخروج إلى مالها منه بد''۔

(شوہر کو یہ حق ہے کہ عورت کو باہر نکلنے سے ان امور کے لئے بھی منع کردے جو اس کے لئے ضروری ہیں)۔

مزید کہتے ہیں: ''ولا يجوز لها الخروج إلا بإذنه'' (المغنی ۲۲۴، ۱۰) (عورت کے لئے شوہر کی اجازت کے بغیر گھر سے باہر نکلنا جائز نہیں ہے)

اس کے ساتھ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ شوہر کو قانونی طور پر اس کا حق ہے کہ بیوی کو اپنے والدین کی عیادت کے لئے جانے سے بھی منع کرے، لیکن یہ والدین کے ساتھ حسن سلوک کے منافی ہے، اس لئے اس کی اجازت دینی چاہئے، اسی طرح وہ بیوی کو مسجد جانے سے بھی روک سکتا ہے، لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ انہیں نہ روکا جائے۔

عورت کے سفر کے سلسلہ میں حدیث میں صراحت ہے کہ مسافت سفر سے زیادہ کا سفر ہو تو اس کے ساتھ محرم کا ہونا ضروری ہے، حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''لا تسافر امرأة مسيرة يوم وليلة إلا ومعها ذو محرم'' (متفق علیہ)۔

آج کل ملازمت کبھی دن کی ہوتی ہے اور کبھی رات کی، خطرات دونوں میں ہیں، اس سلسلہ میں کوئی اصول وضع نہیں کیا جاسکتا، دین دار مرد اور عورت فائدہ اور نقصان اور عدم خطرہ کا خود ہی فیصلہ کرسکتے ہیں۔

عورت کی کفالت کی ذمہ داری اس کے ولی یا شوہر کی ہے، اگر وہ اس ذمہ داری کے ادا کرنے سے معذور ہیں یا عملاً ادا نہیں کررہے ہیں تو اس کے احکام دوسرے ہیں، اس سے اس کا یہ حق نہیں ہوتا کہ ان کی اجازت ہی سے گھر سے باہر نکلنا چاہئے۔

۶۔ اس ذیل میں تین اہم اصول سامنے آتے ہیں، ایک یہ کہ مرد ہو یا عورت وہ ایسی ملازمت نہیں اختیار کرسکتے جو شرعی نقطہ نظر سے جائز نہ ہو، جیسے بینک یا شراب کا کاروبار، یا اسی نوعیت کے دوسرے کام جن کی حرمت قرآن وحدیث سے ثابت ہے۔

دوسرا اصول یہ ہے کہ عورت کو اس کے ولی یا شوہر کی اجازت حاصل ہو۔

تیسرا اصول یہ ہے کہ عورت اور مرد کا اختلاط نہ ہو، اس پر تفصیل سے بحث آگے آرہی ہے۔

خواتین ایسے اداروں میں ملازمت کرسکتی ہیں جہاں خواتین ہی خدمت انجام دیتی ہوں اور کام کی جگہوں میں مرد نہ ہوتے ہوں۔ مرد ذمہ دار ہوں تو شرعی حدود کے اندر ان سے بات ہوسکتی ہے، اس سلسلہ میں دو امور غور طلب ہیں، ایک یہ کہ عورت کی حدود حجاب، دوسرے عورت کا کسی غیر محرم سے بات کرنا۔

جہاں تک عورت کے حجاب کا تعلق ہے، یہ قرآن وحدیث سے ثابت ہے، اس میں چہرہ اور ہاتھ کا پردہ بھی شامل ہے (کسی قدر تفصیل کے لئے دیکھی جائے: المغنی ۹/ ۴۹۸-۵۰۰)۔

علامہ ابن قدامہ حنبلی کہتے ہیں کہ عورت کسی اجنبی کے سامنے اپنے بدن کا کوئی حصہ نہیں کھول سکتی اور کسی معقول وجہ کے بغیر مرد کا اسے دیکھنا بھی جائز نہیں ہے۔

''نظر الرجل إلى الأجنبية من غير سبب فإنه محرم إلى جمعيها'' (المغنی ۹،۴۹۸)۔

فقہ حنفی میں کہا گیا ہے کہ بوقت ضرورت عورت کے چہرہ اور ہاتھ کو دیکھا جاسکتا ہے۔

''وينظر من الأجنبية إلى وجهها وكفيها فقط للضرورة'' (الدر المختار مع رد المحتار ۹،۵۳۱)۔

ابن قدامہ کہتے ہیں کہ اگر کسی عورت سے کاروبار یا اجرت کا معاملہ ہو تو اس کے چہرہ کو آدمی دیکھے گا تا کہ اسے پہچان سکے اور نقصان ہو تو تاوان کا مطالبہ کر سکے، ایک روایت ہے کہ امام احمدؒ نے اسے ناپسند کیا ہے یا بڑی بوڑھی عورت سے متعلق قرار دیا ہے۔

ابن قدامہ کہتے ہیں کہ اس کا تعلق اس سے ہے کہ آدمی عورت کو بے ضرورت دیکھے لیکن جہاں ضرورت ہو اور شہوت نہ پائی جاتی ہو تو دیکھنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

''فأما مع الحاجة وعدم الشهوة فلا بأس'' (المغنی ۹،۴۹۸)۔

اس سے اتنی بات واضح ہے کہ عورت حسب ضرورت ہاتھ اور چہرہ کھلا رکھ سکتی ہے اور مرد کے لئے اس کا دیکھنا جائز ہے، لیکن اس میں یہ احتیاط ضروری ہے کہ اس سے شہوانی جذبات نہ مشتعل ہوں اور آدمی غلط روی نہ اختیار کرے۔

فقہاء کے ہاں نامحرم کے سامنے چہرہ اور ہاتھ کھولنے کی گنجائش ملتی ہیں، ان میں سے بیشتر کا تعلق وقتی اور ہنگامی ضروریات سے ہے، اس لئے اسے قاعدہ کلیہ بنانے میں بہت احتیاط کی ضرورت ہے۔

چہرہ اور ہاتھ کھولنے کی جو صورت بیان ہوئی ہے ان میں یہ شرط موجود ہے کہ جنسی جذبہ محرک نہ ہو ورنہ اس کا جواز ختم ہو جائے گا۔

اس پس منظر میں کسی خاتون کا سیلز گرل ہونا یا ایسی نوع کا کام کرنا صحیح نہیں ہے، اس لئے کہ اس میں حدود حجاب کی پابندی ممکن نہیں ہے، نامحرم مردوں سے مسلسل ربط و تعلق اور ایک طرح کا اختلاط ہوتا ہے، کاروباری گفتگو میں گاہک کو متاثر کرنے کے لئے گفتگو میں دل ربائی کا انداز اختیار کرنا پڑتا ہے، جسے پسندیدہ نہیں کہا جاسکتا۔

☆☆☆

عورتوں کی ملازمت

مولانا مفتی ڈاکٹر محمد صادق محی الدین[1]

موجودہ دور تحقیقات وایجادات کی وجہ سے ترقی یافتہ دور کہلاتا ہے، اس ترقی نے جہاں کچھ فوائد بخشے ہیں وہیں اس نے ضرر ونقصان کے راستے بھی کھولے ہیں، اعلی انسانی اقدار کی جگہ نئے تمدن وتہذیب نے لے لی ہے، جس میں انسانوں بالخصوص عورتوں کی آزادی اور مردوں اور عورتوں میں مساوات کے خوش نما عنوان سے اخلاقی قیود وبند کو پامال کیا گیا ہے، جس کی وجہ سے گھریلو اور معاشرتی زندگی سے سکون رخصت ہوگیا ہے، فکری وذہنی انتشار اور سماجی خلفشار نے زندگیوں کو پراگندہ اور بے مزہ کردیا ہے، ترقی کے نام پر نئی تہذیب اور نئے تمدن کو بڑھاوا دینے سے انسانی سماج میں مردوں سے زیادہ عورتیں متاثر ہورہی ہیں، ایسا محسوس ہورہا ہے کہ پھر سے جاہلیت کا دور لوٹ آیا ہے موجودہ دور کو جاہلیت جدیدہ کا نام دیا جاسکتا ہے، کیونکہ قدیم دور جاہلیت میں جو ظلم وستم، حق تلفی، بے جا زیادتی، عورتوں کی زندگی سے کھلواڑ، بنیادی حقوق سے محروم رکھے جانے کے جاہلی روایات کا چلن تھا، اب وہ نئی تہذیب کے عنوان سے چل پڑا ہے، پھر عورت زندگی کے پردہ سیمیں پر مشق ستم بنتی ہوئی دکھائی دے رہی ہے، موجودہ حالات میں ضرورت اس بات کی ہے کہ پھر سے دنیا کی ساری خواتین محسن انسانیت رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کی ردائے رحمت میں پناہ حاصل کرلیں، انہیں کے دست مبارک سے دنیا کی تمام خواتین کو عزت وآبرو، عظمت وبڑائی توقیر واحترام کا تاج ملا تھا۔

خطبہ حجۃ الوداع میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مردوں کو ہدایت فرمائی کہ وہ عورتوں کے بارے میں خدا سے ڈریں اور یہ کہ اللہ نے تمہارے ذمہ ان کو امانت کی حیثیت دی ہے، اس لئے ان کے کھانے اور پہننے کے لئے عرف ودستور کے مطابق انتظام کرو، خلاق فطرت نے مرد وعورت دونوں میں بحیثیت انسان مساوات رکھا ہے، النساء شقائق الرجال، عورتیں انسان ہونے میں مردوں کے برابر ہیں (ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ)۔

لیکن ان کی فطری ساخت کی بنا پر ان کے دائرہ کار کو مرد کے دائرہ کار سے الگ رکھا ہے، مردوں کو ان کے فرائض وذمہ داریوں کے تحت ہمت وطاقت، دبدبہ وقوت عطا کی ہے کہ وہ قوام ہونے کے فرض کو بخوبی نبھاسکیں، وہیں عورتوں کو ان کی اپنی فطری ساخت اور جبلی حسن ونزاکت کی بنا پر حیا وحجاب، عفت وعصمت کی حفاظت میں ان کا وقار واعتبار رکھا ہے، ایک موقع پر حضرت نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں کو آبگینوں سے تعبیر فرمایا، ان کی فطری نزاکت وخوبی کو پیش کرنے کی اس سے بہتر اور کوئی تعبیر نہیں ہوسکتی، چنانچہ قریبی زمانے میں ایک مغربی خاتون اس تعبیر سے متاثر ہوکر مشرف باسلام ہوئیں۔

عورت کے لئے فطرتاً خاندانی زندگی میں مرد کی حفاظت میں رہنے کا انتظام کیا گیا ہے، اسلام نے مرد کو بیرون خانہ ذمہ داریوں کو نبھانے کا پابند بنایا ہے اور اس کے دائرہ کار کو اندرون خانہ سے بیرون خانہ تک کی ذمہ داریوں تک پھیلا دیا ہے، عورت کا دائرہ کار اندرون خانہ کی سرگرمیوں تک محدود رکھا گیا ہے، اس تقسیم کا مقصود دونوں کے درمیان کسی طرح کا امتیاز برتنا نہیں ہے، بلکہ اس میں دونوں کی جبلی وصنفی امتیازات وخصوصیات کا لحاظ وپاس ہے، تاکہ کسی طرح ان کی یہ خصوصیات مجروح نہ ہونے پائیں، عورت کی خلقت وفطری جبلت کی بنا پر اس کو اگر بیرون خانہ ذمہ داریوں میں مرد کے شانہ بشانہ چلنے کا پابند بنادیا جائے تو اس سے اس کی خصوصیات پر ضرب پڑسکتی ہے، اندرون خانہ اولاد کی تربیت کا جو نظم فطرتاً ماں کے ذمہ ہے وہ متاثر ہوسکتا ہے، عفت وعصمت، پاکدامنی کو نفس پرستوں اور شہوت پرستوں کی طرف سے شدید خطرہ لاحق ہوسکتا ہے، ان کی عزت وناموس کا بے داغ دامن داغدار ہوسکتا ہے، اس لئے اسلام نے اس امت کی سب سے محترم اور پاکدامن ماؤں یعنی ازواج مطہرات رضی اللہ عنہا کو اور دیگر خواتین اسلام کو ہدایت فرمائی کہ وہ دور جاہلیت کی طرح باہر نہ نکلیں، اپنے حسن وجمال کی نمائش وآرائش نہ کریں (سورہ احزاب ۳۳)، اللہ تعالی نے مردوں کو قوام بنایا ہے، سربراہ خانہ ہونے کی وجہ کر ان کو عورتوں پر ایک درجہ فضیلت دی گئی ہے، یہ فضیلت اس لئے ہے کہ وہ عورتوں پر اپنا مال خرچ کرتے ہیں، اس لئے نیک وفرمانبردار خواتین خاوند کی غیر موجودگی میں بحفاظت الٰہی نگہداشت رکھنے والیاں ہوتی ہیں (سورۂ نساء: ۳۴)، خاندانی نظام کو منظم طور پر چلانے کے لئے فطری طور پر اس طریقہ کار کی ضرورت ہے، اس میں دونوں کے لئے سکون وراحت کا سامان

---

[1] خادم دار الافتاء، جامعہ نظامیہ، حیدرآباد۔

رکھ دیا گیا ہے۔

قوام ہونے کی بنا چونکہ اسلام نے مردوں پر عورتوں کا نفقہ واجب کیا ہے، اس لئے سوال نمبر ایک میں کی گئی صراحت کے مطابق اسلامی حکم یہ ہوگا کہ بلاضرورت شدیدہ خواتین کسب معاش کے لئے باہر نہ نکلیں، اسلام اس کو پسندیدہ نگاہوں سے نہیں دیکھتا، شریعت مطہرہ نے ان کی یا ان کے بچوں کے نان ونفقہ کی کوئی ذمہ داری ان پر نہیں ڈالی، شوہر کا ایک فرض یہ ہے کہ وہ اپنی بیوی کا مہر ادا کرے، دوسرا ضروری و بنیادی فرض بیوی کے نفقہ کا وجوب ہے، نفقہ میں ہر وہ چیز شامل ہے، جو کھانے پینے، رہنے سہنے، پہننے اوڑھنے اور دیگر ضروری حوائج جو انسانی زندگی سے متعلق ہیں، پوری بشاشت کے ساتھ مرد کی طرف سے یہ ادا ہوں، اس نفقہ میں شوہر کی حیثیت وآمدنی کو ملحوظ رکھا گیا ہے کہ وہ اپنی حیثیت کے مطابق بیوی پر خوش دلی کے ساتھ خرچ کرے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

''لینفق ذو سعة من سعته ومن قدر علیه رزقه فلینفق مما آتاه الله'' (سورۂ طلاق:۷)۔

(وسعت والے مرد کو اپنے اہل وعیال پر اپنی وسعت کے مطابق خرچ کرنا چاہئے اور جو تنگ دست ہیں ان کو بھی چاہئے کہ جو کچھ حق سبحانہ و تعالیٰ نے ان کو عطا کیا ہے اس میں سے خرچ کریں)۔

''علی الموسع قدره وعلی المقتر قدره متاعاً بالمعروف حقا علی المحسنین'' (بقرہ:۲۳۵)۔

(خوشحال پر اس کی وسعت کے مطابق اور محتاج پر اس کی استطاعت کے بقدر نفقہ واجب ہے، نیک لوگوں پر یہ ایک طریقہ کا حق ہے)۔

''أسکنوهن من حیث سکنتم من وجدکم ولا تضاروهن لتضیقوا علیهن'' (سورۂ طلاق)۔

(عورتوں کو اپنی حیثیت کے مطابق وہیں رکھو جہاں تم رہتے ہو، اور ان کے ساتھ تنگی کا معاملہ کر کے ان کو تکلیف نہ دو)۔

اس لئے سوال نمبر تین کے مطابق بلاضرورت محض معیار زندگی کو بلند کرنے کے لئے عورت کا باہر نکلنا اور بلاضرورت ملازمت اختیار کرنا اسلامی نقطہ نظر سے درست قرار نہیں دیا جاسکتا، کیونکہ اس میں بہت سے مفاسد ہیں، حدیث پاک کی رو سے جب عورت بلاوجہ باہر نکلتی ہے تو شیطان اس کو تاکتا ہے، ظاہر ہے کہ عورت کا باہر نکلنا جہاں گھریلو فرائض وذمہ داریوں میں حارج ہے، وہیں عورت پر گھریلو بوجھ کو سہارنے کے ساتھ باہر کا بوجھ بھی اس کے کاندھوں پر اٹھانا ہے، جو اس کی ذات پر ایک ظلم ہے، وقت گزاری یا سرمایہ واثاثہ پیدا کرنے کی غرض سے معاشی جدوجہد اختیار کرلینا بھی اسلام گوارا نہیں، اگرچہ کہ عسر (تنگی) کے ساتھ ہی زندگی کیوں نہ گزرتی ہو، پوری قناعت کے ساتھ صابرانہ وشاکرانہ زندگی گزارنے میں ہی خیر و بھلائی مضمر ہے، اس لئے ان تمام صورتوں میں عورتوں کو بلاضرورت تحصیل معاش کی دوڑ میں مغرب کی تقلید کرتے ہوئے گھر سے باہر نکلنے کی اجازت دینا صدہا فتنوں کے دروازے کھولنا ہے۔

سوال نمبر ۴ کی صراحت کے مطابق اول تو خواتین کو کسب معاش کے لئے گھر سے باہر نہیں نکلنا چاہئے، اگر وہ اندرون خانہ کچھ کام کرنا چاہتی ہیں اور اپنی جدوجہد کو اسی حد تک محدود رکھتی ہیں تو اس میں اکثر علماء کی رائے یہ ہے کہ ان کو شریعت اس بات کی اجازت دیتی ہے، شوہر کو بھی اس کام سے منع نہیں کرنا چاہئے، کیونکہ جائز طریقہ سے مال کمانے اور حسب ضرورت اس سے استفادہ کرنے میں تقرب الی اللہ کے لئے اللہ کے راستے میں خرچ کرنے کے جذبات واحساسات میں وہ بھی مردوں کی طرح ہیں، شرعاً جائز حدود میں رہتے ہوئے عورت کا مال کمانا ممنوع نہیں، بشرطیکہ یہ اندرون خانہ کیا جانے والا کام شوہر کے حقوق کی ادائیگی میں مانع نہ ہو، اگر مانع ہو تو شوہر کی اجازت ضروری ہوگی، شریعت مطہرہ کا حکم یہ ہے کہ اگر کوئی بیوی نفل روزہ رکھنا چاہے تو شوہر کی اجازت سے رکھ سکتی ہے، اگر اجازت نہ دے تو روزہ رکھنا اس کے لئے درست نہ ہوگا، یہ صحیح ہے کہ اسلام نے عورت پر معاشی جدوجہد کی کوئی ذمہ داری نہیں ڈالی ہے، لیکن اگر حالات مجبور کردیں اور زندگی گزارنے کا کوئی دوسرا ذریعہ ووسیلہ نہ ہو تو اسلام اندرون خانہ ہو یا بیرون خانہ شرعی حدود کی پابندی کے ساتھ ملازمت، کاروبار صنعت وغیرہ اختیار کرنے کی اجازت دیتا ہے، بعض خاندانوں میں مرد کی محنت وکمائی سے گھریلو ضروریات کی تکمیل نہیں ہوسکتی، روزافزوں گرانی کا مقابلہ کرنے اور بنیادی ضرورتوں کی تکمیل کی خاطر عورت کو بھی شوہر کے ساتھ معاشی جدوجہد میں شریک ہونا پڑتا ہے، ایسے حالات میں بھی شرعی احکام وحدود کی پاسداری کے ساتھ عورت ذرائع معاش اختیار کرسکتی ہے۔

حضرت خولہ اور حضرت حلیکہ اور اسماء رضی اللہ عنہم تجارت کرتی تھیں، حضرت سوداء رضی اللہ عنہا کھالوں کی دباغت کا کام جانتی تھیں، بعض صحابیات مختلف غزوات میں ہنگامی حالات کے تحت شریک ہو کر اپنی خدمات انجام دیتی تھیں۔

سوال نمبر ۵ میں کی گئی صراحت کے مطابق عورت اگر کسب معاش کیلئے ضرورت کی بنیاد پر گھر سے باہر نکلنے پر مجبور ہو تو ایک نقطہ نظر یہ ہے کہ اسلام اس کو منع نہیں کرتا، کیونکہ عورت اسلامی نقطہ نظر سے تجارت کرنے یا صنعت وحرفت سیکھنے سکھانے، درس وتدریس کی مصروفیات، تصنیف وصحافت کو اختیار کرنے میں آزاد ہے، اسی طرح علم طب کے سیکھنے سکھانے اور عورتوں کے خصوصی احوال میں علاج ومعالجہ کا پیشہ اختیار کرنے کی بھی اس کو اجازت ہے، لیکن دوسرا نقطہ نظر یہ بھی ہے کہ بلا ضرورت بھی وہ ایسے کاموں کو انجام دے سکتی ہے، کیونکہ اس میں اس کی اپنی ضرورتوں کی تکمیل کے ساتھ غیروں کی ضروریات کی تکمیل بھی اس سے مربوط ہے، کیونکہ خواتین کا خواتین کے اندر پڑھنے پڑھانے کا کام اور خاتون طبیبات سے دیگر ضرورت مند خواتین کا علاج کے لئے رجوع ہونا ایک ایسا ناگزیر امر ہے کہ اس کے بغیر معاشرہ کی بنیادی ضرورتیں تکمیل نہیں پاتیں، البتہ ہر دو نقاط نظر کے علماء اس بات پر متفق ہیں کہ عورت اپنے شوہر یا ولی کی اجازت حاصل کرے، حجاب اور پردہ کی پابندی کا اہتمام کرے اور یہ کہ اس طرح کی بیرونی مصروفیات خاندان کے نظام میں خلل انداز نہ ہوں، ایسی کوئی مصروفیت مسافت سفر کے اندر ہو اور آمد ورفت دن کے وقت میں ہو، اگر معاشی مصروفیت مسافت سفر یعنی ۴۸ میل (تقریباً ۷۸ کلومیٹر) یا اس سے زیادہ کی مسافت پر ہو تو بغیر محرم یا شوہر کے سفر کرنا جائز نہیں ہوگا، اس صورت حال میں شوہر یا اس کا ولی اس کی کفالت کرتا ہو یا نہ کرتا ہو ہر صورت میں یہی احکام ہیں۔

سوال نمبر ۶ میں دریافت طلب امر کی وضاحت سطور بالا میں ہو چکی ہے، سوال نمبر ۷ میں کی جانے والی صراحت کے مطابق اگر خواتین ایسے اداروں میں کام کریں، جہاں ان کا سابقہ صرف خواتین کے ساتھ ہو تو گھر سے اس ادارہ تک سفر میں پردہ اور حجاب کا انتظام ضروری ہوگا، مسافت سفر سے زائد مسافت کا سفر ہو تو محرم کی شرط بھی لازم رہے گی، البتہ اس ادارہ کے اندر حجاب کے بغیر ستر پوشی لباس کے ساتھ کام کاج میں مصروف رہ سکتی ہیں، اگر وہاں ادارہ کے ذمہ دار کچھ مرد موجود ہوں تو اس صورت میں ان کے سامنے جب بھی آنا ہو حجاب کی پابندی لازمی ہوگی، اور کسی مرد کے ساتھ تنہا خلوت میں ملاقات بھی منع ہوگی۔

سوال نمبر ۸ میں کی گئی صراحت کے مطابق اگر کام کی جگہ میں مرد کارکن ہوں تو حسب صراحت بالا احکامات کی پابندی لازمی رہے گی، نوجوان خواتین سے چونکہ فتنہ کا خطرہ رہتا ہے، اس لئے حجاب اور شرعی پابندیوں کا ان پر لزوم رہے گا، البتہ ایسی خواتین جو اس قدر ضعیف ہو چکی ہوں کہ ان کے اندر اب کوئی کشش وجاذبیت باقی نہیں رہی ہو، اس لئے وہ باعث فتنہ بھی نہیں ہوں تو نوجوان لڑکیوں کی طرح ان پر حجاب کو لازم قرار نہیں دیا جائے گا، البتہ ستر کی حفاظت ان پر لازم رہے گی۔

سوال نمبر ۹ کے مطابق اگر کاموں کی انجام دہی میں عورت کا سامنا مردوں سے بہت زیادہ ہوتا ہو تو شدید ضرورت کے بغیر ایسے کاموں کے اختیار کرنے میں احتیاط برتنا چاہئے، اور دوسرے محفوظ مقام پر کام نہ ملنے کی صورت میں ایسی جگہ کام کو اختیار کیا جاسکتا ہے، اگر مردوں سے سابقہ کم پڑتا ہو اور دفتر میں یکسوئی کے ساتھ بیٹھ کر کام کرنے کا موقع ہو یا دکان میں فروخت کرنے کی ذمہ داری ہو تو اس میں بھی درج بالا احتیاط کو ملحوظ رکھتے ہوئے حسب ضرورت کام کو اختیار کیا جاسکتا ہے، ان دونوں میں کوئی زیادہ فرق اس لئے نہیں ہے کہ ہر دو صورتوں میں بہر حال مردوں سے سامنا ہے۔

سوال نمبر ۱۰ میں کی گئی صراحت کی صورت میں ملازمت کی غرض سے اپنے گھر اور اپنوں سے دور خواہ اندرون ملک ہو یا بیرون ملک تنہا مستقل طور پر قیام کرنا سخت فتنہ وآزمائش کا باعث ہے، اس لئے اسلام اس کی قطعاً اجازت نہیں دیتا، خاتون کے ساتھ کم از کم شوہر یا کسی محرم کا ساتھ رہنا عورت کے حق میں حفاظت وپناہ کا کام دیتا ہے، اور اس صورت میں فتنہ کا اندیشہ نہیں رہتا، اس لئے ضرورت کی بنیاد پر اس صورت میں شرعی حدود وقیود کی پابندی کرتے ہوئے ملازمت کی جاسکتی ہے۔

☆☆☆

خواتین کی ملازمت

مولانا ڈاکٹر ظفر الاسلام اعظمی[1]

۱، ۲۔ ان دونوں کے جواب سے پہلے چند باتیں بطور تمہید عرض ہے پہلی بات تو یہ ہے کہ شریعت اسلامی نے مرد اور عورت دونوں کے لئے الگ الگ میدان مقرر کیا ہے، مرد کی ذمہ داری ہے کہ وہ عورت اور بچوں کے لئے اکتساب کے فرائض ادا کر کے ان کی جملہ ضروریات پوری کرے اور عورت گھر کا نظام بچوں کی تعلیم وتربیت ان کی پرورش اور نشوونما کے فرائض انجام دے۔

قدرت نے اسی اعتبار سے دونوں میں دو طرح کی صلاحیتیں رکھی ہیں عورت کی صلاحیتیں باعتبار مرد کمزور اور ضعیف ہیں، جسے علم الحیات اور علم النفس کے ماہرین ہمیشہ سے تسلیم کرتے آئے ہیں۔

دوسری بات: آیات قرآنیہ اور احادیث نبویہ اور اقوال فقہاء سے یہ ثابت ہے کہ نفقہ کی ذمہ داری صرف اور صرف مرد پر ڈالی گئی ہے اور معاش کی ذمہ داری سے عورتوں کو کلیۃً مستثنیٰ رکھا گیا ہے، چنانچہ ارشاد باری ہے: "وعلی المولود له رزقهن و کسوتهن" بچے کے باپ کو دستور کے مطابق عورتوں کو کھانا کپڑا دینا ہوگا۔

''الرجال قوامون علی النساء'' اس آیت کے ضمن میں جصاص رازی تحریر فرماتے ہیں:

''قيامهم عليهن بالتأديب والتدبير والحفظ والصيانة لما فضل الله بالرجل على المرأة في العقل والرأى وبما ألزمه الله تعالى من الإنفاق عليها'' (احکام القرآن ۲،۲۱۹)۔

تلاش معاش کے لئے بھی مردوں ہی کو مکلف بنایا گیا ہے، ''فاذا قضيت الصلوة فانتشروا في الارض وابتغوا من فضل الله'' جب نماز جمعہ سے فارغ ہو جاؤ تو اللہ کا رزق تلاش کرنے نکل جاؤ۔

''من استطاع منكم البائة'' میں استطاعت سے مراد نان ونفقہ کی استطاعت ہے (فتاوی لابن تیمیہ ۶،۲۲)۔

تیسری بات یہ کہ شریعت اسلامیہ نے مردوں کو حق حبس بھی دیا ہے، لہذا عورت کے لئے ایسی مصروفیات کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں جو مرد کے اس حق کو پامال کرتی ہوں کسب معاش تو در کنار اگر عورت بغیر شوہر کی اجازت مجالس علم میں شرکت کرنا چاہے تو اس کا نفقہ شوہر کے ذمہ سے ساقط ہو جائے گا۔

''إذا أرادت المرء ة أن تخرج إلى مجلس العلم بغير إذن الزوج لم يكن لها ذلك'' (الخانیہ علی ہامش الہدایہ ۵،۲۳)

شوہر کو حق ہے کہ بیوی کو دھاگہ کاتنے اور ہر ایسے کام سے روکے جو وہ اجنبی کیلئے تبرعاً انجام دے اگر چہ وہ دایہ یا غسالہ ہو کیونکہ شوہر کا حق، فرض کفایہ پر مقدم ہے اسی طرح وہ مجلس علم میں جانے سے روک سکتا ہے۔

''والذي ينبغي تحريره أن يكون له منعها من كل عمل يؤدي إلى تنقيص حقه أو ضرره أو إلى خروجها من بيته''، بلکہ فقہاء نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ اگر عورت کا حسن وجمال متاثر ہو رہا ہو تو ایسے کام سے بھی شوہر روک سکتا ہے، اسی بنا پر شیر خوار بچوں کو بغیر شوہر کی اجازت دودھ پلانا جائز نہیں۔

چوتھی بات یہ ہے کہ عورت کی طرف سے سپردگی تام ہونی چاہئے اگر سپردگی ناقص ہوئی تو بھی نفقہ کی مستحق نہ ہوگی، "وإذا سلمت نفسها بالنهار دون الليل أو على عكسه لا يستحق النفقة لأن التسليم ناقص"، اگر عورت صرف دن میں شوہر کے ساتھ رہے رات میں یکجائی نہ ہو سکے یا اس کے برعکس تو وہ نفقہ کی مستحق نہ ہوگی، اس لئے کہ یہ سپردگی ناقص ہے۔

---

[1] پرنسپل وشیخ الحدیث دار العلوم مئو، مئو۔

''بحث ونظر'' کے اندر ایک تفصیلی مضمون میں مولانا انوار الحق صاحب کا نظر نواز ہوا جس میں نیویارک کے ڈاکٹر کے اس تجربہ کا ذکر کیا ہے کہ انہوں نے بچوں کی پرورش کے لئے دو ادارے قائم کئے اور دونوں میں پرورش کا یکساں انتظام کیا اور ایک جیسی سہولتیں فراہم کیں، صرف ایک فرق یہ رکھا کہ پہلے ادارے میں بچوں کی پرورش ان کے ماؤں کے سپرد کی اور دوسرے ادارے میں نرسوں کو اس کام پر مامور کیا، دو سال بعد جب دونوں کیمپوں کا جائزہ لیا گیا تو مختلف نتائج سامنے آئے اور دونوں تربیت گاہوں کے بچوں میں سب سے نمایاں فرق جسمانی عقلی اور نفسیاتی بڑھوتری اور نشوونما میں تھا، ڈاکٹر موصوف نے دیکھا کہ ماں کی شفقت سے محروم بچے اب تک نہ گفتگو پر قادر ہوسکے اور نہ خود سے چلنے اور کھانے پر لیکن ماں کی محبت میں پلنے والے بچے اس مرحلہ سے گذر چکے تھے، دوسرا فرق یہ رہا کہ پہلے ادارے کے تحت پرورش پانیوالے بچے سارے کے سارے باحیات تھے، مگر دوسرے ادارے کے بچوں میں سے تقریباً ۳۷ فیصد بچوں کی موت ہو چکی تھی (ماذا عن المرأۃ ص ۱۲۶۔۱۲۷) اس سے واضح طور پر معلوم ہوا کہ کرائے کی ماں اور حقیقی ماں میں کتنا بڑا فرق ہے؟

اس کے علاوہ ہر ماہ حیض آنا جس میں عورت کی کیفیت بسا اوقات مریضہ کی سی ہوجاتی ہے، حمل کی مشقتیں، زچگی کی دقتیں اور نفاس یہ ساری کی ساری الگ مشکلات ہیں۔

ان تمام تفصیلات کو سامنے رکھ کر دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ بجز استثنائی احوال کے عورت کو کسب معاش کا مکلف بنانے کی گنجائش سمجھ میں نہیں آتی علامہ سرخسی کا بہت واضح فیصلہ "وفی امرها بالا کتساب فتنة الخ" گذر چکا ہے، یعنی فقہاء نے ایسی عورتوں کے لئے عدم نفقہ کا قول کیا ہے۔

''قلت بهذا عرف جواب واقعة فی زماننا بأنه إذا تزوج منالمحترفات التی تکون عامة النهار فی الكارخانه والليل مع الزوج لانفقتها'' (البحر الرائق ۲،۱۸۰)، اس سے معلوم ہوا کہ اگر ایسی عورت سے نکاح کرے جو دن میں کارخانہ میں ہو اور رات میں شوہر کے ساتھ تو اس عورت کے لئے نفقہ نہیں ہوگا، بہت سارے فقہاء نے فرمایا ہے کہ اگر عورت ملازمت کی شرط پر عقد کرے تو اس شرط کا ایفاء شوہر کی جانب سے ضروری نہ ہوگا، حنفیہ کے نزدیک یہ صرف ایک وعدہ ہے جسے شوہر کو دیانۃً پورا کرنا چاہئے، اس پر جبر نہیں کیا جاسکتا، امام شافعی کے نزدیک بھی شرط لازم نہیں اگر شوہر نے نکاح کے وقت یا بعد نکاح کسب معاش کی اجازت دے بھی دی تو اسے رجوع کرنے کا حق ہے۔ اور یہ تو بالکل صاف بات ہے کہ جس شریعت میں عورتوں کو مسجد میں جاکر نماز جیسی اہم عبادت اور مجالس علم (بدون اجازۃ شوہر) نیز ولیمہ کی شرکت، اجنبیوں کی بیمار پرسی اور نفلی روزہ سے منع کیا گیا ہو اس میں عورت کے لئے کسب معاش کی کہاں گنجائش نکل سکتی ہے؟

''وماعدا ذلك من زيارة الأجانب والوليمة لا تخرج إلا بإذن ولا تطوع للصلوة والصوم بغير إذن الزوج'' (البحر الرائق ۲،۱۹۲) ''ولو خرجت كانا غاصيين'' (الاشباه ۲،۱۰۹، فتح ۲،۲۰۷)۔

امام شافعی نے تو شوہر کی اجازت کے بغیر ماں، باپ اور بیٹے کے جنازہ میں بھی شرکت سے منع کیا ہے، ''فقد قال الشافعی له منها من شهادة جنازة أبيها وأمها وولدها'' (المجموع شرح مهذب ۱۸،۹۷)۔

ہاں کچھ استثنائی احوال ایسے ہیں جن میں عورتوں کو باہر نکلنے اور ملازمت کرنے کی گنجائش نکل سکتی ہے، ایک صورت یہ ہے کہ وہ کسی ایسے پیش آمدہ مسئلہ سے متعلق ہو جس کو شوہر بذات خود نہ پوچھ سکتا ہو، یا شوہر ایسا ہو کہ وضو اور نماز وغیرہ کے مسائل بیوی کو نہ بتاسکتا ہو تو بیوی ان مسائل کے لئے باہر جاسکتی ہے ورنہ نہیں، ''ولكن إذا أراد أن تخرج لتعلم مسئلة من مسائل الوضوء والصلوة إن كان الزوج يحفظ المسائلة ويذكر معها له أن يمنعها وإن لم يحفظ الاولى أن يأذن لها احيانا'' (شرح فتح القدير ۲،۳۵۸)۔

اسی طرح اگر شوہر بے روزگار اور نکما ہو، ادائیگی نفقہ پر قادر نہ ہو یا از راہ تعنت نفقہ پورا نہ دیتا ہو تو کچھ حدود وقیود کے ساتھ عورت کو ملازمت کی اجازت دی جاسکتی ہے اور چونکہ یہ صورت اضطرار کی سی ہے اضطرار کے بعد ہی ضرورت کا تحقق ہوسکتا ہے تو سب سے پہلی شرط اس سلسلہ میں یہ ہونی چاہئے کہ کچھ متدین حضرات جو صائب الرائے ہوں اور عورت کے حالات سے واقفیت رکھتے ہوں ان کے فیصلہ کے بعد ہی ضرورت ثابت ہوگی۔

۳۔ عام حالات میں استکثار مال شریعت اسلامی کی نگاہ میں پسندیدہ نہیں ہے قرآن پاک اور احادیث نبویہ کے انداز بیان سے بھی ثابت ہو رہا ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

''اعلموا أنما الحيوة الدنيا لعب ولهو وزينة وتفاخر بينكم وتكاثر فى الأموال والأولاد'' (جان لو دنیاوی زندگی کھیل

تماشا، بناؤ سنگار آپس میں تفاخر اور مال و اولاد میں اضافہ ہے) پھر اس آیت کے آخر میں فرمایا کہ یہ سب دھوکے کا سودا ہے ''وما الحیوۃ الدنیا إلا متاع الغرور'' اور ایک جگہ ارشاد فرمایا کہ: دنیاوی زندگی تم کو دھوکہ میں نہ مبتلا کردے ''فلا تغرنکم الحیوۃ الدنیا''، سورہ شوری میں ہے: ''من کان یرید حرث الآخرۃ نزدلہ فی حرثہ ومن کان یرید حرث الدنیا نؤتہ منھا وما لہ فی الاخرۃ من نصیب'' اس آیت کے ذیل میں علامہ قرطبی نے فرمایا: ''قال القشیری والظاھر أن الآیۃ فی الکافر یوسع لہ فی الدنیا'' جس سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیاوی زندگی میں وسعت اور کشادگی کفار کا خاصہ ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے: ''فواللہ ما الفقر أخشی علیکم ولکن أخشی علیکم أن تبسط علیکم الدنیا کما بسطت علی من کان قبلکم فتنافسوھا کما تنا فسوھا ویلھیکم کما الھتھم'' (بخاری ۲،۹۵۱، مسلم ۲،۴۰۷)۔

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے: ''إذا نظر أحدکم إلی من فضل علیہ فی المال والخلق فلینظر الی من ھو اسفل منہ ممن فضل علیہ'' (مسلم ۳،۴۰۷)۔

حدیث شریف: ''لو کان لابن آدم وادیان من مال الخ'' کے ذیل میں امام نووی فرماتے ہیں:

''فیہ ذم الحرص علی الدنیا وحب المکاثرۃ بھا والرغبۃ فیھا''۔

دوسری طرف بعض آثار سے حصول مال کی ترغیب بھی ثابت ہے، امام دارقطنی، بیہقی، ابویعلی اور طبرانی نے حضرت عائشہؓ سے اور ابن عساکر نے حضرت عبداللہ بن عباس بن ربیعہ سے مرفوع حدیث روایت کی ہے: ''اطلبوا الرزق فی خبایا الارض'' (رزق کو زمین کے تمام گوشوں میں تلاش کرو)۔

طبرانی نے شرجیل بن السمط سے یہ مرفوع حدیث نقل کی ہے: ''من تعذرت علیہ التجارۃ فعلیہ بعمان'' (جس کے لئے تجارت مشکل ہوا سے چاہئے کہ عمان چلا جائے)۔ ایک روایت میں اسی طرح مصر جانے کا مشورہ مذکور ہے۔

یہی وجہ ہے کہ فقہاء نے کسب کے مختلف مراتب بیان فرمائے ہیں۔

علامہ سرخسی فرماتے ہیں: ''ثم الکسب اعلی مراتب فمقدار مالا بدلکل احد منہ یعنی ما یقیم بہ صلبہ یفترض علی کل احد اکتسابہ غنیاً او فقیراً لأنہ لا یتوصل إلی إقامۃ الفرائض إلا بہ فما یتوصل بہ إلی إقامۃ الفرائض یکون فرضا، فإن لم یکتسب زیادۃ علی ذلث فھو فی سعۃ من ذلث لقولہ علیہ السلام من اصبح آمنافی سربہ معافی فی بدنہ وعندہ قوت یومہ فکانما حیزت لہ الدنیا بحذا فیرھا'' (مبسوط للسرخسی ۳۰،۲۵۶)۔

مذکورہ بالا عبارتوں سے معلوم ہوا کہ اکتساب دولت کبھی فرض ہے کبھی مستحسن اور کبھی مباح ہے اور ایک درجہ میں حرام بھی ہے یعنی حالات اور مقاصد کے اعتبار سے اس کے احکام ہیں، لیکن مسئلہ اکتساب مرءۃ کا ہے اس لئے بندہ کی ناقص رائے یہ ہے کہ اگر گذران تنگی وترشی سے ہوسکتا ہو تو احوط یہ ہے کہ ملازمت کی اجازت نہیں دینی چاہئے۔

لیکن اگر مقصد محمود ہو تو جواز کی گنجائش ہونی چاہئے۔

۴۔ اس سلسلہ میں مشہور فقیہ دکتور وہبہ زحیلی فرماتے ہیں: ''وللزوجۃ أن تعمل فی البیت عملا لا یضعفھا ولا ینقص جمالھا وللزوج أن یمنع مما یضرھا'' (الفقہ الاسلامی وادلتہ ۷،۶۹۳)، شوہر یا ولی کی اجازت سے اندرون خانہ معاشی سرگرمی جیسے سلائی، کڑھائی، پاورلوم، زیراکس مشین یا کمپیوٹر وغیرہ کے کام انجام دے سکتی ہے اس لئے کہ یہ ''أما العمل الذی لا ضرر فیہ فلا وجہ لمنعھا'' کے مفہوم میں شامل ہے۔

۵۔ سابقہ تفصیلات سے اس کا جواب بھی معلوم ہوگیا کہ اگر حالات اضطراری ہوں اور گذران کے لئے کچھ بھی میسر نہ ہو تو عورت شوہر سے اجازت لے کر اسباب معاش اختیار کرے اور شوہر کو اجازت بھی دے دینا چاہئے لیکن اگر وہ اجازت نہ دے تو بدون اجازت بھی اس کام کو انجام دے سکتی ہے، جیسے کہ عورت کو گھر کے اندر عدت گذارنا ضروری ہے مگر خرچ کے لئے نہ تو اس کے پاس کچھ ہے اور نہ ہی کوئی کفالت کرنے والا ہے تو ایسی صورت میں عورت کمائی کے لئے باہر نکل سکتی ہے، لیکن الضرورۃ تتقدر بقدر الضرورۃ کا قاعدہ بہر حال سامنے رہنا چاہئے۔

حکما دن اور رات خروج و بروز کی جہت سے یکساں ہیں اسی لئے فقہاء ان عورتوں کے لئے جو دن کو نکلیں اور رات کو گھر کے اندر رہیں حبس تام نہ پائے جانے کی وجہ سے نفقہ کی مستحق قرار نہیں دیتے ہیں۔

اگر عورت کی جملہ ضروریات پوری نہیں کی جارہی ہیں تو عورت انتہائی مجبوری کی صورت میں شوہر کی اجازت کے بغیر بھی بقدر ضرورت نکل کر ملازمت کرسکتی ہے (احسن الفتاوی ۵ / ۴۴۰)۔

احقر کی رائے یہ ہے کہ اگر عورت کو بقدر کفاف روزی کا ذریعہ مسافت شرعی سے کم میں حاصل ہوجاتا ہے تو اسی پر اکتفا کرے بدون مجبوری اگر مسافت شرعی کی حد پار کر رہی ہے تو کراہت سے خالی نہیں (دیکھئے: الفقہ الاسلامی وادلتہ ۷ / ۷۹۲)۔

۶۔ سوال نمبر ۱ و ۲ کے تحت اس کا جواب گذر چکا ہے۔

۷۔ اجانب اور غیر محرم سے تو بہر حال پردہ ہے چاہے وہ ایک ہی ہوں یا ایک سے زائد، مگر چونکہ ذمہ دار سے سابقہ تو پڑنا ہی ہے اس لئے درمیان میں ایسی عورت سے پیغام رسانی کا کام لے جو ذمہ دار کی محرم ہو ایسے مرد سے جو عورت کا محرم ہو، حالات کے لحاظ سے اس کی صورتیں نکالی جاسکتی ہیں۔

۸۔ احقر کی یہی رائے ہے کہ عورتیں بدرجہ مجبوری ایسی جگہ ملازمت کریں جہاں نگرانی اور ذمہ داری کے فرائض بھی عورتیں ہی انجام دیتی ہوں، مثلاً لڑکیوں کا اسکول، کالج یا عورتوں کا اسپتال جس کے تمام شعبوں میں عورتیں ہی ہوں، لیکن اگر مرد بھی اس میں کام کرتے ہوں تو اس شرط کے ساتھ گنجائش ملنی چاہئے کہ مردوں سے کلیۃً اختلاط نہ ہو۔

عدم اختلاط کی صورت میں بوڑھی اور جوان عورتوں کا حکم یکساں ہوگا لیکن اختلاط کی صورت میں دونوں کے درمیان تھوڑا سا فرق ہوگا جس کو سمجھنے کے لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پردہ کی تھوڑی سی تفصیل کردی جائے۔ پردہ شرعی کے تین درجے ہیں ایک یہ کہ چہرہ اور ہتھیلیوں اور بعض کے نزدیک پیروں کے علاوہ باقی تمام بدن کو چھپایا جائے، یہ ادنی درجہ کا پردہ ہے، دوسرے چہرہ اور ہتھیلیوں کو بھی چھپایا جائے یہ درمیانی درجہ کا پردہ ہے، تیسرے عورت دیوار کے پیچھے رہے برقعہ کے باوجود بھی گھر سے نہ نکلے یہ اعلی درجہ کا پردہ ہے، تینوں درجات کا ثبوت آیات واحادیث میں موجود ہے۔

صاحب خیر الفتاوی جلد اول میں پردہ سے متعلق تمام تفصیلات رقم فرماکر تحریر فرماتے ہیں کہ بوڑھی عورتوں میں پہلا درجہ واجب ہے یعنی چہرہ اور ہتھیلیوں کے سوا باقی حصہ بدن کو ظاہر کرنا ہرگز جائز نہیں اور درجہ ثانیہ کو برقعہ کے ساتھ باہر جانا مستحب قرار دیا ہے، اس طور پر کہ اس کا قد و قامت ظاہر نہ ہو، لیکن جوان عورتوں کے لئے تینوں درجے واجب ہیں یعنی چہرہ اور ہتھیلیوں کے سوا باقی بدن کا ستر کرنا واجب ہے، اور برقعہ اوڑھ کر چہرہ کو چھپانا بھی واجب ہے اور اپنے آپ کو گھر میں محبوس رکھنا بھی ضروری ہے۔

مذکورہ بالا تفصیلات کی روشنی میں بندہ کا خیال یہ ہے کہ جوان عورتوں کے مقابلہ میں بوڑھی عورتوں میں کچھ وسعت رکھی گئی ہے۔

۹۔ نصوص واحادیث اور فقہاء کے اقوال کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ بے حجابی کی کیست شریعت میں مقصود نہیں بے پردگی بذات خود معیوب ہے۔

۱۰۔ ایسی عورت جس کا نہ شوہر ہو نہ باپ اور نہ کوئی ایسا رشتہ دار ہو جو اس کی معاشی کفالت کرسکے اور نہ خود عورت کے پاس اتنا مال ہے جس کے ذریعہ وہ اپنی معاشی ضروریات پوری کرسکے اس صورت میں عورت کے لئے بقدر ضرورت کسب معاش کے لئے شرعی پردہ کی پابندی کے ساتھ نکلنا جائز ہے، وہ اپنے وطن یا اپنے ملک ہی میں کسب معاش کرے اور بیرون ملک جانے کی اجازت نہیں لیکن اگر بیرون ملک جاکر معاشی سدھار نا گزیر ہوجائے، نیز انہیں کوئی اپنا محرم بھی نہ ملے تو ایسی صورت میں قابل اعتماد عورتوں کی معیت میں بیرون ملک کا سفر امام مالک اور امام شافعیؒ کے فقہ کے مطابق کرسکتی ہے۔

بیرون ملک قیام کی ایک صورت بدرجہ مجبوری اور بھی ہے جس کا تذکرہ مفتی تقی عثمانی نے اپنی کتاب "بحوث فی قضایا فقہیہ معاصرہ ص ۳۴۷" میں کیا ہے، لکھتے ہیں:

"قدر ذكرنا فى الجواب عن السؤال السابع أن النسوة المسلمات لا ينبغى لهن السفر إلى بلاد غير المسلمين للدراسة او الاكتساب وأما إذا كانت المرءة قدتوطنت احدى هذه البلاد مع محارمها ثم بقيت مفردة لموت محارمها أو انتقالهم من ذلك المكان بسبب ما فإنه لا مانع لها من الإقامة بمفردها مادامت ملتزمة بأحكام الشرع فى الحجاب"۔

☆☆☆

خواتین کی ملازمت

مفتی انور علی اعظمی [۱]

۱۔ شریعت کے پیش کردہ نظام کے مطابق عورت کے نان ونفقہ کی ذمہ داری اسکے باپ، بیٹا، شوہر اور بھائی پر ہے یہ مذکورہ مرد عورتوں کے نان ونفقہ کے ذمہ دار ہیں تا کہ ایک عورت اپنی گھریلو ذمہ داریاں اطمینان کے ساتھ انجام دے۔

مصطفی سباعی اپنی مشہور کتاب ''المرأۃ بین الفقہ والقانون'' میں لکھتے ہیں:

''فلسفة الإسلام أن البنت والمرأة بوجه عام لا يصح أن يكلف بالعمل لتنفق على نفسها بل على أبيها أو زوجها أو أخيها مثلاً أن يقوم بالإنفاق عليها لتتفرغ لحياة الزوجية والأمومة''۔

اور قرآن پاک کے الفاظ "وما أنفقوا من اموالهم" سے صاف ظاہر ہے کہ قوامیت کے اسباب میں ایک اہم اور بنیادی سبب مردوں کا عورتوں پر انفاق بھی ہے۔

خطبہ حجۃ الوداع میں اللہ کے رسول ﷺ نے عورتوں کے بارے میں اللہ سے ڈرایا اور مردوں کو مخاطب کر کے ارشاد فرمایا: '' ولهن عليكم رزقهن وكسوتهن بالمعروف'' (صحیح مسلم بحوالہ ابن کثیر ۱/ ۶۰۲)۔

اس لئے عام حالات میں عورت کسب معاش سے مستغنی ہے اور مردوں کے متکفل ہونے کی صورت میں اس کا کمائی اور کسب معاش میں مشغول ہونا شریعت کی نگاہ میں ناپسندیدہ ہے۔

۲۔ بعض صورتوں میں عورتوں پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ نان ونفقہ کا بندوبست خود کریں، مثلاً جب شوہر تنگ دست ہو اور ایسا عاجز ہو کہ خود اس کا نان و نفقہ اسکے اصول یا فروع پر واجب ہو یعنی غریب بھی ہو اور کمانے کی سکت بھی نہ ہو تو ایسی صورت میں شوہر پر دوسرے کے نفقہ کی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی، کیونکہ جب وہ خود اپنا نفقہ دوسرے سے لے رہا ہے تو دوسرے کا نفقہ اس پر لازم کرنا ایک غیر معقول بات ہے، علامہ وہبہ زحیلی تحریر فرماتے ہیں:

''أما إذا كان معسرا بحيث تجب نفقة على غيره من الاصول أو الفروع وكان عاجزا من الكسب فلا نفقة عليه لأنه لا يعقل إيجاب النفقة عليه وهو ياخذ نفقته من غيره إذان فاقد الشي لا يعطيه وهذا هو الصحيح'' (الفقه الاسلامي وأدلته ۷/ ۸۴۳)۔

۳۔ محض معیار زندگی بلند کرنے اور اثاثہ پیدا کرنے کی غرض سے عورتوں کے لئے معاشی جدوجہد کرنے کے دو طریقے ہیں: ایک تو یہ ہے کہ عورت باقاعدہ ملازمت کرے اور اس کو اس کے لئے باہر آنا جانا پڑے اجنبی مردوں کے ساتھ اختلاط ہو گھریلو ذمہ داریاں پوری نہ کر پائے شوہر کی خدمت اور بال بچوں کی دیکھ ریکھ میں خلل پڑے، تو اس صورت میں محض پیسوں کی لالچ یا معیار زندگی کو بلند کرنے کے مقصد سے عورت کا معاشی جدوجہد کرنا درست نہیں ہے، دوسری صورت یہ ہے کہ معاشی تنگی دور کرنے کے لئے عورت گھر کے اندر کوئی کام کرے جیسے سلائی، کڑھائی، بنائی اور کوئی پیشہ ورانہ کام اور اس سے عورت گھر کے معاشی حال کو سدھار سکتی ہو اور شوہر بھی اسے اپنے معیار اور سطح کے خلاف نہ سمجھتا ہو یعنی وہ بھی اس سے راضی ہو تو اس میں کوئی حرج نہیں، کیونکہ گرانی اور مہنگائی کی وجہ سے بہت سے گھرانوں میں ایسی صورت حال پائی جاتی ہے کہ شوہر کی کمائی بال بچوں کی ساری ضروریات کے لئے ناکافی ہے اور عورتوں کے لئے ایسے کام مہیا ہیں جو گھروں میں رہ کر عزت وآبرو کے ساتھ کئے جاسکتے ہیں، تعلیم یافتہ عورتیں ٹیوشن فیس کے ساتھ گھر میں پڑھانے کا کام کرسکتی ہیں، عورتوں کے گھریلو کام کی

---

[۱] مفتی دار العلوم مئو، مئو۔

اجازت فقہاء کے یہاں صراحت کے ساتھ موجود ہے۔

۴۔ خواتین کے لئے کسب معاش کی صورت اختیار کرنے میں ولی یا شوہر سے اجازت لینا ضروری ہے اس صورت میں بھی جبکہ وہ اندرون خانہ اپنی معاشی سرگرمیوں کو محدود رکھیں، اس لئے کہ اللہ تعالی نے مرد کو قوام بنایا ہے وہ عورت پر خرچ کرنے کا ذمہ دار ہے وہ ساری ضروریات اور ذمہ داریاں پوری کرتا ہے تو اگر اسے عورت کی معاشی سرگرمیوں پر کسی وجہ سے اعتراض ہے تو گھریلو مصلحت کے پیش نظر روک لگا سکتا ہے، عورت کے کسب معاش کی وجہ سے کبھی تو مرد کی حیثیت و وجاہت متاثر ہوتی ہے کبھی گھریلو نظم و نسق بگڑنے کا اندیشہ ہوتا ہے اور دوسرے بھی اعتراض کے اسباب ہو سکتے ہیں، درمختار میں بحر کے حوالے سے مذکور ہے:

''له منعها من الغزل وكل عمل ولو تبرعا لا جنبي ولو قابله أو مغسله لتقدم حقي على فرض الكفاية''۔

۵۔ اگر شوہر یا ولی کفالت کرتا ہو تو اس صورت میں کسب معاش کے لئے عورت کا گھر سے نکلنا ان کی اجازت کے بغیر درست نہیں اس لئے کہ تکفل کی صورت میں اگر عورت گھر کے اندر رہ کر بھی کام کرتی ہے تو شوہر کو روکنے کا حق ہے۔

اور اگر شوہر یا ولی تنگ دستی کی وجہ سے عورت کی بنیادی ضرورتیں مثلاً کھانا کپڑا وغیرہ فراہم نہ کر سکتے ہوں تو اس صورت میں اکتساب نفقہ کے لئے شوہر یا ولی کی اجازت کے بغیر بھی نکلنا جائز ہے۔

''يجوز للزوجة الخروج بغير اذن الزوج لما لا غنى لها عنه كإتيان بنحو ما كل والذهاب إلى القاضي لطلب الحق واكتساب النفقة إذا أعسر بها الزوج'' (موسوعہ ۹٫۱۱۰)۔

البتہ یہ بات ضرور ملحوظ رکھنا ہوگا کہ کسب معاش کے سلسلہ میں عورت کے گھر سے باہر نکلنے کی متعدد صورتیں ہیں اور ان کے احکام بھی مختلف ہیں، مثلاً گھر سے نکل کر دن ہی میں اپنی بستی میں کام کرنا اس کا حکم اوپر مذکور ہے، رہا بستی میں رات میں کام کرنے کا معاملہ تو اس کی گنجائش نہیں کیونکہ رات شوہر کا حق ہے اور رات میں فساد کا زیادہ اندیشہ ہے۔

تیسری صورت یہ ہے کہ عورت کا اپنی بستی چھوڑ کر دوسری بستی میں کسب معاش کے لئے جانا اس کی بھی دو شکلیں ہیں ایک یہ کہ وہ دوسری بستی مسافت سفر سے کم ہو دوسرے یہ کہ مسافت سفر کے برابر ہو، چوتھی صورت میں امام ابوحنیفہ اور جمہور فقہاء اس بات پر متفق ہیں کہ شرعی مسافت کا سفر عورت بغیر شوہر یا محرم کے تنہا نہیں کر سکتی، تو جب نفس سفر ممنوع ہے تو کسب معاش کے اس سفر میں ولی یا شوہر کی اجازت بھی ضروری ہوگی، اور ساتھ جانا اور قیام کی صورت میں رہنا بھی ضروری ہوگا۔

اس کی دلیل صحیح مسلم کی یہ روایت ہے: ''لا تسافر المرأة بلدا إلا ومعها ذو محرم'' (مسلم ۱٫۲۳۔۴۳۲)۔

تیسری شکل میں جب کہ عورت کا نکلنا اپنی بستی چھوڑ کر دوسری قریبی بستی کے لئے ہو اس صورت میں اگر امام ابوحنیفہؒ کے یہاں محرم کی پابندی نہیں ہے لیکن دوسرے فقہاء کے نزدیک اس صورت میں زوج یا محرم کی پابندی ہے، علامہ نووی نے نقل کیا ہے: ''لا يحل لا مرأة تومن بالله واليوم الآخر أن تسافر مسيرة يوم إلا مع ذي محرم وفي رواية لأبي داؤود۔ ''لا تسافر بريدا والبريد مسيرة نصف يوم'' (نووی مع مسلم ۱٫۴۳۲)۔

اس لئے جوان عورت کا کسب معاش کے لئے تنہا اپنی بستی کے باہر جانا بالکل درست نہیں ہے۔

۶۔ خواتین کی ملازمت کے سلسلہ میں شرعی حدود بیان کرتے ہوئے اگر چہ علامہ مصطفیٰ نے (المرأة بين الفقه والقانون رص ۱۸۵) میں اجنبی مردوں کے سامنے عورت کو چہرہ کھولنے کی اجازت دی ہے لیکن فقہاء کی عبارتوں سے کچھ مخصوص جگہوں کے علاوہ اس کی عمومی اجازت نہیں معلوم ہوتی چنانچہ مولانا محمد شفیع عثمانی صاحبؒ سورہ احزاب میں آیت ۵۹ کی تفسیر میں شرعی پردہ کی تفصیلی بحث کرنے کے بعد تحریر فرماتے ہیں کہ: ائمہ اربعہ میں سے امام مالک، امام شافعی، امام احمد بن حنبل نے تو پہلا مذہب اختیار کر کے چہرہ اور ہتھیلیاں کھولنے کی مطلق اجازت نہیں دی، خواہ

فتنہ کا اندیشہ ہو یا نہ ہو، امام اعظم ابوحنیفہؒ نے اگرچہ دوسرا مسلک اختیار فرمایا مگر خوف وفتنہ کا نہ ہونا شرط قرار دیا ہے اور چونکہ عادۃً یہ شرط مفقود ہے، اس لئے فقہاء حنفیہ نے بھی غیر محرم مردوں کے سامنے چہرہ اور ہتھیلیاں کھولنے کی اجازت نہیں دی۔

آگے مفتی شفیع صاحب نے فتح القدیر، مبسوط، شامی کی عبارتوں سے اس مسئلہ کی وضاحت فرمائی، شامی کی عبارت کا حصہ ملاحظہ ہو:

''فإن خاف الشهوة أو شك امتنع النظر إلى وجهها فيحل النظر مقيدة بعدم الشهوة وإلا محرم وهذا في زمانهم وأما في زماننا فمنع من الشابة إلا النظر بقاض وشاهد يحكم ويشهد'' (معارف القرآن ۷،۱۹-۲۱۸-۲۱۷)۔

۷۔ ملازمت کرنے والی خواتین اگر ایسے اداروں میں کام کریں جہاں صرف خواتین کام انجام دیتی ہوں اور کام کی جگہوں میں مرد نہ ہوتے ہوں البتہ ادارہ کے ذمہ دار مرد ہوں تو اس صورت میں پردہ کے احکام سے متعلق سب سے اہم بات یہ ہے کہ ادارہ کا کوئی مرد تنہائی میں کسی خاتون کارکن سے بات نہ کرے، ادارہ کی ضروریات کے سلسلہ میں اگر مردوں کے ساتھ تبادلہ خیال کی ضرورت ہو تو خواتین پردے کے اہتمام کے ساتھ بیٹھیں، چہرہ بھی ڈھکی رہیں، آنکھ کھول سکتی ہیں، اور یہ بھی ضروری ہوگا کہ دونوں فریق اپنی نگاہیں نیچی رکھیں، اور صنف نازک اپنی آواز میں لوچ اور چاشنی سے پرہیز کریں، و تحضنعن بالقول پر عمل کرتے ہوئے "وقلن قولا معروفا" کا مظاہرہ کریں۔

اسی طرح عورتیں ان ذمہ دار مردوں کے ساتھ ہنسی مذاق اور بے تکلفی کا ماحول ہرگز نہ بنائیں۔

۸۔ عورتیں ایسے ادارے یا آفس میں کام کرنے سے حتی الامکان گریز کریں جہاں مرد کارکن ہوں، مغربی طرز معاشرت چاہے اس انداز کی زندگی پسند کرتا ہو مگر اسلامی تعلیمات اور اسلامی فلسفہ اس انداز معاشرت کی عمومی اجازت بالکل نہیں دیتا، آج بڑے شہروں میں آفسوں میں کام کرنے والی لڑکیاں جس انداز میں رہتی ہیں، درحقیقت وہ فحاشی اور بے حیائی کے پرچار کا ایک ذریعہ ہے، ایسے ماحول میں اگر ایک دو فیصد مسلمان لڑکیاں بھی ہوں تو ان کے لئے اپنے آپ کو پردہ کے اہتمام کے ساتھ اور شرعی ضابطہ کے مطابق رکھنا بہت مشکل ہوگا۔

اس لئے مسلمان لڑکیوں کو ایسی ملازمت کی اجازت نہیں دی جاسکتی، اسپتال یا تعلیمی اداروں میں کچھ گنجائش دی جاسکتی ہے، تعلیمی ادارے اگر لڑکیوں سے متعلق ہوں تو وہاں کوئی مسئلہ نہیں، اسی طرح سے امراض نسواں کے علاج کے لئے بھی مسلمان عورتوں کو ڈاکٹر یا نرس کا پیشہ اختیار کرنا ایک مجبوری ہے، اس قسم کی مخصوص جگہوں کو چھوڑ کر عام سرکاری آفسوں میں عورتوں کا ملازمت کرنا، اسلامی مزاج کے خلاف ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "وقرن في بيو تكن ولا تبرجن تبرج الجاهلية الأولى" (اور مسلمان عورتیں تم لوگ اپنے گھروں کو لازم پکڑو اور جاہلیت اولی کی طرح سے بن سنور کر باہر نہ نکلو)۔

۹۔ دوکان میں بحیثیت سیلز گرل کام کرنے میں یقیناً مردوں سے سابقہ زیادہ پڑے گا، لیکن آفسوں میں یکسوئی اور تنہائی جوان اور مشتہاۃ عورت کے لئے کچھ کم خطرناک نہیں، اس لئے دونوں طرح کا کام جوان اور مشتہاۃ عورتوں کے لئے جائز نہیں، البتہ کوئی عمر دراز عورت جو حد اشتہا سے متجاوز ہو چکی ہو وہ اس طرح کا کام اپنی ضرورت اور مجبوری کی بنا پر کرے تو اس کی گنجائش ہے، کیونکہ دوکان اور آفس دونوں جگہ اختلاط لازم ہے، اور دونوں جگہ یہ ممکن ہے کہ جوان عورت کے ساتھ کوئی مرد اس وقت آملے جب کوئی تیسرا نہ ہو، اور حدیث پاک کے ارشاد کے مطابق شیطان ان کو گناہ میں مبتلا کردے اس لئے مسلمان لڑکیوں کو ایسے کام کرنے کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔

۱۰۔ ملازمت کی غرض سے عورت کا اپنے گھر اور اپنے لوگوں سے دور تنہا مستقل قیام کرنا جائز نہیں چاہے وہ مقام اندرون ملک ہو یا بیرون ملک، شریعت نے ایک عورت کو حج جیسے مقدس فریضہ کے لئے تنہا جانے کی اجازت نہیں دی تو ملازمت کے لئے اجازت کیسے دی جاسکتی ہے۔

☆☆☆

عورتوں کی ملازمت اور ازدواجی اختلافات میں اس کا اثر

ڈاکٹر محمد الزحیلی [1]

ترجمہ: مولانا صفدر زبیر ندوی، مولانا محمد زکریا ازہری

اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو مردوں اور عورتوں سے پیدا کیا، چنانچہ مرد کو پہلے پیدا کیا، پھر اس سے عورت کو پیدا کیا، تاکہ ولادت اور نسل کا سلسلہ قائم ہو۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: یا أیها الناس اتقوا ربکم الذی خلقکم من نفس واحدة وخلق منها زوجها وبث منهما رجالا کثیراً ونساء۔ (سورۂ نساء ۱)۔

اللہ تعالیٰ نے مرد وعورت کے درمیان شہوانی تعلق کو بھی پیدا کیا تاکہ زمین میں خلافت قائم ہو، اور نسل انسانی قیامت تک قائم ودائم رہے اور یہ کہ ان دونوں میں سے ہر ایک اس کام کو انجام دے جو جسمانی اور شہوانی وجود سے ہم آہنگ ہو، تاکہ انسانی تعمیر کی تکمیل ہوسکے اور تخلیق وایجاد، اسی طرح خلافت اور ازدواج سے مقصود حاصل ہوسکے۔

اسی مقصود کو مؤکد کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے خاندان کے احکام مشروع فرمائے تاکہ لوگوں کو صحیح اور بہتر راستے کی رہنمائی کرے، اور آخرت سے پہلے دنیا میں امن واطمینان، اتحاد، راحت ونیک بختی کو قائم کرنے پر ان کی مدد کرے، اور تاکہ ازدواجی تعلقات خاندان کی سلامتی کی تمنا، اور تعمیر وترقی اور تعاون کے ذریعہ اس کے استحکام پر، اور آپسی مفاہمت اور محبت وملائمت کے ساتھ آپسی میل جول کے دائرے میں ہو۔

اگر لوگوں نے اللہ کی شریعت کو چھوڑا، یا اس کے احکام میں کوتاہی کی، یا اس کے طریقہ سے روگردانی کی، یا اس کی تطبیق میں کھلواڑ سے کام لیا تو انتشار وافتراق، اختلاف ونزاع اور شروع ہوجائے گا، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ومن أعرض عن ذکری فإن له معیشة ضنکا ونحشره یوم القیامة أعمی، قال رب لم حشرتنی أعمی وقد کنت بصیرا، قال کذلك أتتك أیاتنا فنسیتها وکذلك الیوم تنسی۔ (طه ۱۲۴-۱۲۶)۔

اس الٰہی ہدایت اور نبوی راہنمائی نے مسلم خاندان اور اسلامی معاشرہ میں پوری تاریخ میں اور موجودہ زمانہ میں بہتر نتائج سامنے لائے ہیں۔ لیکن درحقیقت صورتحال پوری طرح واضح نہیں ہے، اور مسلم معاشرہ اس طرح مثالی تو نہیں بن سکی ہے جیسا کہ فرشتوں کے معاشرہ میں ہے اور جو ہمیشہ ہمیش کی جنت میں ہوگا، تاکہ دنیا ابتلاء وآزمائش، نقصان وخوف، اضطراب واختلاف اور نزاع وافتراق کی جگہ کی حیثیت سے باقی رہے اور یہ دنیا کی حقیقی صورتحال ہے، جو مسلمانوں کی زندگی میں عام طور پر اور مسلم خاندانوں میں خاص طور پر ہے کبھی کبھی میاں بیوی کے جھگڑے سامنے آجاتے ہیں تو اس وقت ہدایت ورہنمائی، حل وعلاج کی ضرورت پڑتی ہے، اور زندگی کے مصائب ومشکلات بھی اس اختلاف وافتراق کو بھڑکانے میں معاون ہوتے ہیں، ان ہی میں سے عورت کا گھر سے باہر کام کرنے کے لئے جانا اور اسکی ملازمت ہے، اور اس کی وجہ سے ہی میاں بیوی کے اختلافات بھی ہوتے ہیں، اس کو ہم مندرجہ ذیل خاکہ کے مطابق پیش کریں گے:

بحث کا خاکہ:

بحث اول: خاندان اور عورت کی ملازمت پر مقدمہ

بحث دوم: ملازمت کرنے والی بیوی کے لئے شرعی احکام

بحث سوم: ملازمت کی وجہ سے میاں بیوی کے درمیان اختلاف

بحث چہارم: میاں بیوی کا اپنے حقوق کے استعمال میں ظلم برتنا

---

[1] عمید کلیة الشریعة والدراسات الإسلامیة، جامعة الشارقة، الامارات العربیة المتحدة۔

خاتمہ: نتیجہ بحث اور سفارشات

ہم اس مقالہ میں فقہی موازنہ کی منہج کی پابندی کریں گے، نصوص شرعیہ اور فقہاء کے نصوص کا تحلیل وتجزیہ کریں گے، نکاح، طلاق اور خاندان کے تعلق سے دراسہ اور حقیقی اور واقعی مشاکل کا تتبع واحاطہ کریں گے تاکہ اس دراسہ کا حقیقی صورتحال اور زندگی سے ربط پیدا ہوسکے۔

ہم اللہ سے توفیق وتعاون کا سوال کرتے ہیں اور اسی سے رشد وہدایت چاہتے ہیں اور اجر وثواب اور قبولیت عمل کی امید رکھتے ہیں، اور اسی پر اعتماد وبھروسہ کرتے ہیں اور تمام تعریف اللہ رب العالمین ہی کے لئے ہے۔

بحث اول

عورت کی ملازمت اور خاندان

تمہید:

خاندان کی امیدیں بے شمار ہیں اور اسلام اور احکام شریعت میں نظریاتی اعتبار سے اور زندگی اور اسلامی سماج میں عملی طور پر اس کی شاندار نظیریں ہیں، لیکن اضطراب واختلافات نے اس کی صورت کو بگاڑ کر رکھ دیا ہے، ان کو بیان کرنا، واضح کرنا، ان پر مناقشہ کرنا اور ان کا حل تلاش کرنا ضروری ہیں، موجودہ زمانہ میں انہی میں سے اب مخصوص مسئلہ عورت کی ملازمت اور اس سے پیدا ہونے والے مثبت ومنفی پہلوؤں کا ہے، جن کو ہم اس بحث میں ذیل کے فقروں میں بیان کریں گے۔

اول: زندگی کی صعوبتیں اور میاں بیوی کا فریضہ:

زندگی کی صعوبتیں بہت ہیں، اس لئے کہ زندگی بنیادی طور پر ابتلاء وآزمائش اور پریشانی ومشقت سے عبارت ہے جس سے کسی انسان کو چھٹکارا نہیں، لہٰذا وہ حرج وتنگی اور ایسی چیزوں سے بھی دوچار ہوگا جن سے اس کو خوشی نہیں ہوگی اور ایسے حالات سے سابقہ پڑ سکتا ہے جو اس کے مزاج ومذاق کے خلاف ہو۔ اصل تو یہ ہے کہ میاں بیوی کے درمیان پوری طرح باہمی تعاون ہو، لیکن ہر وہ چیز جس کی آدمی تمنا کرتا ہے نہیں پاتا ہے۔

مرد کو گھر سے باہر کام کرنے میں اور لوگوں کے ساتھ معاملات کے دوران غم اور فکر لاحق رہتی ہے، جیسا کہ وہ گھر کے اندر ہر چہار جانب سے ذمہ داریوں، پریشانیاں اور مسائل سے دوچار ہوتا ہے، اسی طرح عورت اگر ملازم ہے تو اسے بھی ملازمت کی فکر اور اس کی پریشانیاں لاحق ہوتی ہیں، اگر وہ گھر کی مالکن ہے تو اس پر اس کی، بچوں اور شوہر کے دیکھ ریکھ کی ذمہ داری ہے، زمانہ کے مصائب ہیں اور اہل خانہ سے جدائی ہے۔

صعوبت وپریشانی، مشکلات ومسائل، ہموم وتفکرات اور تنگی وبحران کے وقت ہی میاں بیوی میں سے ہر ایک کا کردار دوسرے کے تئیں سامنے آتا ہے اور یہ صبر وقناعت، ایثار وقربانی، عطا وبخشش، انس ومحبت اور بہتر وصالح زندگی تک پہنچنے کے لئے باہمی متبادل عملی، نفسیاتی، جذباتی، اور وجدانی مشارکت کے ذریعہ ہوگا۔

دوم: ازدواجی اختلافات:

میاں بیوی کے درمیان اختلافات ایک امر حقیقی ہے بلکہ یہ فطری اور جبلی ہے، اور اس کے متعدد نفسیاتی، معاشرتی، داخلی وخارجی، معنوی ومادی اور جسمانی ووجدانی اسباب ہیں۔

اسباب اختلافات میں سے جو کہ موجودہ زمانہ میں زیادہ ہیں اور سنگین رخ اختیار کرتے جارہے ہیں تاکہ وہ ایک سماجی ایشو بن جائے، شوہر اور ملازمت کرنے والی بیوی کے درمیان اختلافات ہیں، دونوں کا اختلاف خاص طور پر ملازمت اور بیوی کو ملنے والی تنخواہ سے متعلق ہوتا ہے اور یہی محل بحث ہے، اس اشکال سے چند اہم سوالات پیدا ہوتے ہیں، وہ یہ ہیں:

۱۔ میاں بیوی کے درمیان مالی ذمہ داریوں سے الگ ہونے کی حد کیا ہے؟

۲۔ بیوی کو شوہر کے گھر میں رکے رہنے اور شوہر پر اس کے نفقہ کے وجوب کی وجہ کیا ہے؟

۳۔ کیا عورت پر یہ لازم ہے کہ وہ خاندان کے افراد کے لئے وقت نہ دے پانے کے مقابلہ گھر کے بجٹ میں حصہ دار بنے؟

۴۔ بیوی کو ملازمت چھوڑ دینے پر مجبور کرنے میں شوہر کے حق کی کیا حد ہے؟

۵۔ بیوی کو اپنی تنخواہ کا ایک حصہ دینے کا پابند بنانے میں شوہر کے حق کی حد کیا ہے؟

۶۔ کیا بیوی کو یہ حق ہے کہ وہ اپنی ملازمت پر باقی رہنے کی شرط لگائے؟

۷۔ میاں بیوی میں سے ہر ایک کا اپنے حق کے استعمال کی حدود کیا ہیں؟

ان تمام امور کو انشاء اللہ ہم پیش کریں گے اور قرآن وسنت اور احکام شریعت کی روشنی میں ان کا جواب دینے کی کوشش کریں گے۔

سوم: میاں بیوی کے درمیان اختلاف کے اسباب:

بلاشبہ میاں بیوی کے درمیان اختلاف کے اسباب فطری اور معاشرتی ہیں، کبھی یہ قبولیت کی حد میں ہوتے ہیں، کبھی حد سے آگے بڑھ جاتے ہیں، اس کے اسباب بہت سے ہیں جن میں اہم دو ہیں:

۱۔ میاں بیوی کے درمیان مذہبی، فکری، ثقافتی اور معاشرتی ناموافقت، خواہ اس میں زندگی میں فکری اور ثقافتی سطح کے اختلاف کی وجہ سے اور سماج میں متعدد ثقافتوں اور تہذیبوں کے نتیجہ میں پائی جانے والی شخصی اور طبعی عدم توافق ہو یا روحانی اور جذباتی ناموافقت ہو۔

یکسانیت سے باہم قربت اور تعاون کا جذبہ پیدا ہوتا ہے، اختلاف سے نفرت اور کراہیت پیدا ہوتی ہے، پھر یہی میاں بیوی کے درمیان اختلاف اور وسائل وذرائع اور اغراض ومقاصد اور حقوق وواجبات میں جھگڑے کا سبب بنتا ہے۔

۲۔ اقتصادی اسباب، جس میں مثبت یا منفی طور پر اور مطلوب یا ممنوع کے اعتبار سے عورت کا عمل ہی نمایاں ہوتا ہے، خاص طور پر میاں بیوی کی مادی/ مالی سطح، یا دونوں کے خاندانوں کی مالی سطح مختلف ہونے کی وجہ سے یہ چیز سامنے آتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض فقہائے حنفیہ نے عقد نکاح کے لازم ہونے کے لئے مالی کفاءت کو شرط قرار دیا ہے، اس لئے کہ لوگ مالداری پر فخر کرتے ہیں اور فقر سے عار محسوس کرتے ہیں (حاشیہ ابن عابدین ۳؍۹۰)۔

یہ اقتصادی سبب آج کی زندگی میں سب سے نمایاں رول ادا کررہا ہے، جس کی پوری توجہ مغرب کی اندھی تقلید، مادی فلسفہ اور مغربی تہذیب سے متاثر ہوکر انانیت اور مادی منفعت کی طرف ہے۔

چہارم: میاں بیوی کے لئے حفاظت کی گارنٹی اور بچاؤ کے طریقے:

خواہش نفس بعض لوگوں کو مطلق العنان بنادیتی ہے اور عقل وفکر اور حق وصواب کے راستہ سے رشد وہدایت کو ختم کردیتی ہے، پھر وہ اختلاف کی آگ کو بھڑکاتی ہے، اس کے انگارے کو دہکاتی ہے، لڑائی جھگڑے کو ہوا دیتی ہے، پھر تو دشمنی اور نزاع واختلاف شروع ہوجاتا ہے۔

اسی لئے قرآن کریم نے پہلے ہی زوجین کے درمیان حفاظت کی گارنٹی اور بچاؤ کے راستے اور دونوں کے درمیان دوبارہ موافقت پیدا کرنے کے طریقے بتادیئے ہیں، اس سلسلہ میں بہت سی آیات ہیں جو اندرون خانہ سے شروع ہوتی ہیں، چنانچہ اللہ تعالیٰ عورت کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتا ہے: ''وإن امرأة خافت من بعلها نشوزاً أو إعراضاً فلا جناح عليهما أن يصلحا بينهماصلحا، والصلح خير، وأحضرت الأنفس الشح، وإن تحسنوا وتتقوا فإن الله كان بما تعملون خبيرا'' (النساء ۱۲۸)، پھر خطاب الٰہی مردوں سے ہوا اور ان کو بڑی ذمہ داری دی، ان کو قوام بنایا اور انہیں اس کو بہتر طریقے سے انجام دینے کا مکلف بنایا، چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ''الرجال قوامون على النساء بما فضل الله بعضهم على بعض وبما أنفقوا من أموالهم فالصالحات قانتات حافظات للغيب بما حفظ الله واللاتى تخافون نشوزهن فعظوهن واهجروهن فى المضاجع واضربوهن فإن أطعنكم فلا تبغوا عليهن سبيلا إن الله كان عليا كبيرا- (نساء ۳۴)۔ اگر معاملہ نہ رکے اور خطرہ بڑھ جائے تو اللہ تعالیٰ نے ایک خارجی وسیلہ کی طرف رہنمائی کی کہ تحکیم کے ذریعہ دونوں کے درمیان اصلاح کی جائے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فإن خفتم شقاق بينهما فابعثوا حكما من أهله وحكما من أهلها، إن يريدا إصلاحا يوفق الله بينهما، إن الله كان عليماً خبيراً- (نساء ۳۵)۔

اسی طرح قولی وعملی احادیث ہیں، پھر احکام شریعت ہیں جن سے درستگی اور ہدایت اور سیدھے راستہ کی رہنمائی حاصل کی جائے، زوجین کو مکمل تحفظ حاصل ہو، مقصد یہ ہے کہ زوجین کا بندھن مضبوط رہے، یہ امید بھی ہے کہ ازدواجی زندگی کے جو اہداف ہیں وہ بھی حاصل ہوں، تاکہ خاندان اس کے بعد سماج اور قوم کے لئے سعادت وخوشحالی کی ضمانت ہو۔

پنجم: مرد کی عورت پر قوامیت:

مرد کی عورت پر قوامیت قرآن کریم سے ثابت ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: الرجال قوامون علی النساء بما فضل الله بعضهم علی بعض، وبما أنفقوا من أموالهم فالصالحات قانتات حافظات للغيب بما حفظ الله۔ (نساء ۳۴)۔

المعجم الوسیط میں ہے: القوامۃ یعنی معاملہ یا مال کی نگرانی کرنا ہے، یا کسی معاملہ کا ولی بننا ہے (المعجم الوسیط: ۲/ ۷۶۸، مادہ: قوم)۔ چنانچہ مردوں کو عورتوں پر ولایت حاصل ہے، جیسا کہ والی اپنی رعایا کی نگرانی کرتا ہے۔

اس آیت سے قوامیت کے بعض اسباب کی صراحت ہوتی ہے، مثلاً:

۱۔ مرد کو عورت پر فضیلت حاصل ہے اور یہ افضلیت مرد میں پائی جانے والی حقیقی صفات کی وجہ سے ہے، جیسے علم، کمائی پر قدرت، طاقت، عزم ویقین، حسن تدبیر اور معاملات میں تصرف کرنا وغیرہ ہے۔

۲۔ مرد کو عورت کو مہر دینے کا مکلف بنانا ہے اور اس کو بیوی وخاندان کا خرچ اٹھانے کا مکلف بنایا گیا ہے۔

اس کے نتیجہ میں صالح عورتیں فرمانبرداری کرنے والیں، شوہروں کے حقوق ادا کرنے والیاں، اور شوہروں کی عدم موجودگی میں اپنے گھروں میں غیبوبت کے مواقع کی حفاظت کرنے والیاں ہیں، شوہروں کی عدم موجودگی کی صورت میں جن کی حفاظت ان پر واجب ہے یعنی عزت وعصمت، اموال واولاد کی حفاظت کرتی ہیں (تفسیر طبری: ۵/ ۵۸، الکشاف للزمخشری: ۱/ ۵۲۳، تفسیر القرطبی: ۵/ ۱۶۸، تفسیر المنار: ۵/ ۶۹)۔

ایک دوسری آیت میں اس مفہوم کی تاکید آئی ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''ولهن مثل الذی علیهن بالمعروف، وللرجال علیهن درجة، والله عزیز حکیم'' (بقرہ: ۲۲۸)۔ زمخشری کہتے ہیں: درجہ کا معنی حق کا زائد ہونا ہے اور فضیلت ہے......... مرد کا عورت کی نگہبانی کی وجہ سے یا عورت کے مصالح میں اس کے خرچ کرنے کی وجہ سے اس کو فضیلت حاصل ہے۔ (الکشاف: ۱/ ۳۶۶)۔

ششم: عورت کا کام کرنا:

عورت کے کام کے بارے میں گفتگو کا تقاضا یہ ہے کہ ہم بیان کریں، اول: عورت کا اصلی کام، دوم: گھر سے باہر کے کام، پھر اس کے نتیجہ میں مرتب ہونے والے اثرات:

الف: عورت کا اصلی کام:

عورت کا اصلی کام اپنے گھر میں کام کرنا ہے اور یہ ایسا مقدس عمل ہے جو فطری، سماجی، ازدواجی اور عائلی وظیفہ/کام سے جڑتا ہے، یہ ایک عظیم عبادت ہے، اس میں بڑا اجر ہے، اس عمل کا اظہار چار پہلوؤں سے ہوتا ہے:

۱۔ ازدواجی پہلو سے، یہ گھر اور خاندان میں میاں بیوی کا رہنا سہنا اور محبت ومودت اور سکون واطمینان کا حاصل کرنا ہے اور یہ بیوی کی اپنے شوہر کے تئیں ذمہ داری ہے۔

۲۔ حاملہ ہونا اور بچے جننا، اس کے بعد رضاعت وحضانت کا مرحلہ ہے، اسی سے متعلق حیض ونفاس کا معاملہ ہے، یہ تمام امور عورتوں کے ساتھ خاص ہیں، ان میں مرد کسی صورت میں عورت کا ساتھ دے ہی نہیں سکتا، یہ ممتا کا عمل ہے۔

۳۔ اولاد کی پرورش وتربیت، یہ بچپن اور بچے کے شروع کے برسوں کے ساتھ خاص ہے اس کا وافر حصہ اور اولیت ماں کو حاصل ہے اور یہ حضانت وتربیت کا عمل ہے، اللہ تعالیٰ نے ماں کے اندر شفقت ومحبت، رحمت ومہربانی اور صبر وبرداشت کا مادہ ودیعت کررکھا ہے، ماں کے علاوہ کوئی اس کا بدل نہیں ہوسکتا۔

۴۔ شوہر کے گھر، مال، آبرو کی حفاظت، اور یہ نگہبانی وامانت اور حفاظت کا عمل ہے، سابقہ وظائف کا ہر پہلو عورت سے محنت ومشقت اور توجہ چاہتا ہے، جس کے لئے پوری طرح فراغت اور کافی وقت اور لازمی محنت چاہئے، جو اس کی طاقت وقوت کو روز بروز کم کرتی رہتی ہے، اس کے خالی اوقات کو مشغول رکھتی ہے، سماج اور قوم میں اس کی حیثیت، اس کے وجود اور اس کی شخصیت کو ثابت کرتی ہے۔

ب:۔ گھر سے باہر عورت کا کام:

عورت کے پاکیزہ اصلی عمل کا اکثر حصہ ایسی شادی شدہ عورت سے متعلق ہے جو بچے والی ہو اور حضانت وتربیت کے مرحلہ میں ان کی پرورش وپرداخت میں لگی ہو۔

لیکن ایسی عورت کے بارے میں کیا ہونا چاہئے جس نے سرے سے شادی ہی نہیں کی، یا طلاق شدہ ہے، یا جس کا شوہر مر چکا ہے، اور اس کی کوئی اولاد نہیں ہے، یا ایسی بیوی جس کے کوئی بچہ ہی نہ ہوا ہو، یا ایسی ماں جس کے بچے بڑے ہو چکے ہوں اور وہ بچے ماں کی حضانت اور اس کی نگہبانی سے مستغنی ہو چکے ہوں؟ تو اب اس کے پاس محدود اور تھوڑا کام رہ جاتا ہے، اس کے پاس کوئی ایسا بڑا کام نہیں ہوتا جس سے اس کا وقت مشغول رہے، تو اس وقت دوسرے مرحلہ میں گھر سے باہر کام کرنے کا نمبر آتا ہے۔

اسی طرح کوئی شادی شدہ عورت اور بچوں کی پرورش وپرداخت کرنے والی ماں کبھی بیوہ ہو جائے اور اس کے لئے اور نہ اس کے بچوں کے لئے کوئی آمدنی کا ذریعہ ہو، کبھی ایسا ہوتا ہے کہ شوہر زندہ ہے، لیکن اس کی آمدنی بہت محدود ہے اور بیوی کے لئے یہ ممکن ہے کہ وہ اپنے شوہر کی مدد کرے اور اس کو سہارا دے، تو یہاں عورت گھر سے باہر دوسرا کام کرسکتی ہے۔

اسی طرح زوجین کے درمیان مشترکہ جذبات عورت کو اپنے شوہر کا ساتھ دینے کے لئے کھیت میں، باغ میں، کارخانہ میں اور دوسرے مشروع کاموں میں کام کرنے پر ابھارتی ہیں۔

یہ تمام امور گھر سے باہر عورت کے کام کرنے کی مشروعیت کو ثابت کرتے ہیں اور اس کی تائید میں بہت سے دلائل ہیں جو کتاب وسنت، سیرت نبویہ اور عمل صحابہ میں وارد ہوئی ہیں، جن میں سے چند درج ذیل ہیں:

قرآن کریم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعہ میں حضرت شعیب علیہ السلام کی کام کرنے والی دو بیٹیوں کا ذکر کیا ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ولما ورد ماء مدين وجد عليه أمة من الناس يسقون، ووجد من دونهم امرأتين تذودان، قال: ما خطبكما؟ قالتا لا نسقي حتى يصدر الرعاء، وأبونا شيخ كبير۔ (القصص ۲)۔

ربیع بنت معوذ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے وہ فرماتی ہیں: ہم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ غزوہ میں شریک ہوتے تھے، ہم مجاہدین کی خدمت کرتے تھے اور مقتولین اور زخمیوں کو مدینہ لے کر آتے تھے۔ (بخاری: ۳ر ۱۰۵۴ اور مابعد، رقم: ۲۷۲۷، باب مداواۃ النساء الجرحی فی الغزو)۔

اُم عطیہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے فرماتی ہیں: میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سات غزوات میں شریک ہوئی، قافلہ میں قافلہ والوں کے پیچھے رہتی، ان کے لئے کھانا بناتی، زخمیوں کی مرہم پٹی کرتی اور مریضوں کی دیکھ بھال کرتی۔ (مسلم: ۱۲ر ۱۹۴، رقم ۱۸۱۲، کتاب الجہاد، باب غزوۃ النساء مع الرجال)۔ یہ جنگوں میں فوجی اور عسکری خدمت ہے، تو بدرجہ اولیٰ اس کے علاوہ خدمات کی اجازت ہوگی، مثلاً نرسنگ کی خدمات ہیں۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں: میری خالہ کو طلاق ہوگئی، تو انہوں نے چاہا کہ باغ میں جاکر درختوں سے کھجور توڑیں تو انہیں ایک آدمی نے نکلنے سے منع کردیا، وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئیں تو آپ ؐ نے فرمایا: بلکہ تم اپنے درختوں سے کھجور توڑو، شاید کہ تم صدقہ کرسکو یا کوئی خیر کا کام کرسکو (مسلم: ۱۰ر ۱۰۸، رقم ۱۴۸۳، ابوداؤد: ۱ر ۵۳۵، احمد: ۳ر ۳۲۱)۔ یہ زراعتی اور کاشتکاری کے کام ہیں۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ روایت کرتے ہیں کہ حضرت کعب بن مالک ؓ کی ایک باندی تھی جو بکریوں کو سلع پہاڑی کے پاس چرایا کرتی تھی، ایک دن ایک بکری کو کچھ ہوگیا تو اس نے اس بکری کو پکڑا اور پتھر سے ذبح کرڈالا، نبیؐ سے اس بکری کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ ؐ نے فرمایا: اسے کھاؤ (بخاری: ۵ر ۲۰۹۵، رقم: ۵۱۸۳)۔ یہ چرواہی اور ذبح سے متعلق کام ہیں۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی بیوی حضرت زینب رضی اللہ عنہا صنعت سے لگی ہوئی تھیں اور اس سے کماتی تھیں تو انہوں نے پوچھا: اے اللہ کے رسول! میں ہنر والی ہوں، کچھ کچھ بنا کر اس کو بیچتی ہوں اور اس کے علاوہ نہ میرے لئے اور نہ میرے شوہر کے لئے، اور میرے بچوں کے لئے کوئی آمدنی ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو کچھ تم ان پر خرچ کرو اس میں تمہارے لئے اجر ہے (مسند احمد: ۶/ ۲۹۳، نیز دیکھئے: بخاری: ۵/ ۲۰۵۴، رقم: ۲۰۵۴، مسلم ۷/ ۸۷، رقم: ۱۰۰)۔

سنت نبوی میں بہت سے نصوص ہیں جو گھر سے باہر عورت کے کام کرنے کے جواز پر دلالت کرتے ہیں اور تاریخ اسلامی میں بھی ایسے واقعات مذکور ہیں کہ عورتیں ضرورت کے وقت گھر سے باہر جا کر بیع وشراء کا عمل انجام دیتی تھیں، بعض اوقات جب ضرورت ہوتی تھی عورتیں اپنے شوہروں کے زراعتی، صنعتی اور تجارتی کاموں میں تعاون کرتی تھیں۔

عورت کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ گھر سے باہر کام کرے لیکن شرط جو مرد وعورت دونوں کو شامل ہے، یہ ہے کہ احکام شرعیہ اور اسلامی آداب کی پابندی کرے، خاص طور پر حجاب اور حیاء کو لازم پکڑے اور اجنبی مردوں سے خلوت میں ملنے سے گریز کرے۔

عورت کو ان کاموں میں ترجیح دی جائے جو اس کے مناسب حال ہوں اور جن میں ماں، بیوی، بیٹی اور بہن کی حیثیت سے اس کی کرامت و شرافت اور عفت و پاکیزگی محفوظ رہے، جیسے نرسنگ، تعلیم وتربیت، طب، حضانت اور تدریس کے کام۔

آج کے دور میں عورت کے گھر سے باہر کام کرنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ کسی عمومی یا خصوصی ادارہ یا کمپنی سے لگے، اپنے رشتہ داروں سے الگ تھلگ ہو، تاکہ وہ اپنے کام کے مقابلہ میں اجرت حاصل کرنے کے لئے گھر سے باہر کام کرے، اس میں ان کاموں کو نہیں شامل کیا جاتا جنہیں ایک عورت دیہات یا کاشت کے علاقوں میں اپنے شوہر اور اپنے خاندان والوں کے ساتھ اپنی مکمل اور مسلسل شراکت کے ساتھ انجام دیتی ہے۔

گھر کے اندر یا گھر کے باہر بہت سے ایسے کام ہیں جو عورت کے اپنے اصلی کام کے منافی نہیں ہے، مثلاً عورت محدود اوقات میں کہیں معلم یا نرس، یا طبابت کا کام کرے تو اس سے اس کے گھر کے کام، اولاد کی تربیت اور شوہر کے حقوق کی ادائیگی پر کوئی اثر نہیں پڑے گا، لہٰذا وہ اپنے اصلی کام اور اپنے ملازمتی کام دونوں کو انجام دے سکتی ہے۔

فقہاء نے عورت کو گھر سے باہر کام کرنے کی اجازت دی ہے اگر اس کے اسباب پائے جائیں، چنانچہ شافعیہ کہتے ہیں: اگر شوہر تنگ دست ہو کام نہ کرتا ہو اور نہ نفقہ ادا کرتا ہو، تو عورت کو نکلنے کا حق ہے تاکہ وہ کام کر کے نفقہ حاصل کر سکے، شوہر کو اس کو منع کرنے کا حق نہیں ہوگا، اس لئے کہ منع کرنا نفقہ کے مقابلہ میں ہوتا ہے۔ امام نوویؒ کہتے ہیں: عورت کا شوہر کے نفقہ نہ دینے کی مدت میں گھر سے باہر نکلنا جائز ہے، تاکہ وہ کام کر کے یا تجارت کر کے یا بھیک مانگ کر اپنا نفقہ حاصل کر سکے، وہ مزید کہتے ہیں: نفقہ نہ دیئے جانے کے دوران عورت کو نکلنے کا حق ہے تاکہ وہ نفقہ حاصل کرے۔ (الروضہ: ۹/ ۷۸، المنہاج ومغنی المحتاج: ۳/ ۴۴۵، نیز دیکھئے: المجموع: ۲۰/ ۱۶۸، المہذب: ۴/ ۶۱۸)۔

حنابلہ کہتے ہیں: اگر شوہر کے لئے نفقہ ادا کرنا دشوار ہو تو بیوی کو اختیار دیا جائے گا کہ وہ یا تو نکاح فسخ کرالے یا اس کے ساتھ رہے، اور شوہر اس کو کام کر کے آمدنی حاصل کرنے سے منع نہیں کرے گا، لیکن اگر نکاح فسخ نہ ہوا ہو تو شوہر اپنی تنگی کے ساتھ اس کو روک نہیں رکھے گا، اس لئے کہ اس طریقہ سے اس کو نقصان پہنچانا ہوگا، اس لئے کہ وہ اس کو اسی وقت روکے رکھنے کا مالک ہوگا جبکہ وہ اس کو بقدر کفاف نفقہ دے اور بنیادی ضروری چیزوں سے اس کو مستغنی کردے۔ (الروض المربع: ۶۲۲، الممتع فی شرح المقنع: ۵/ ۳۸۹-۳۸۰)۔

ہفتم: عورت کا گھر سے باہر کام کرنے کے اثرات:

گھر سے باہر عورت کے کام کرنے سے اہم نتائج سامنے آتے ہیں، خواہ یہ ایجابی ہوں یا سلبی اور ان میں سے اکثر شوہر اور ملازمت کرنے والی بیوی کے درمیان اختلافات کو بڑھاوا دیتے ہیں، مرتب ہونے والے اہم اثرات مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ حریت اور آزادی: ملازمت کی ذمہ داریوں کے نتیجہ میں ملازم عورت کے دل میں مرد کی تابعداری سے آزادی کی بات پیدا ہوجاتی ہے، خواہ یہ صحیح اسلامی صورت میں ہو، یا شاذ روایتی موروثی صورت میں ہو، عورت شوہر کے معاملہ میں عام طور پر اور معاشی پہلو سے خاص طور پر آزاد

ہونے کا احساس کرنے لگتی ہے، یہاں تک کہ یہ سوچ ترقی کی علامت بن گیا ہے، یہ ایک ہدف ہے جس کے پیچھے چلا جاتا ہے، گویا عورت شوہر سے ایک طرح سے آزاد ہے اور میاں بیوی کے درمیان اس اصول کہ ''جو میرا ہے وہ تمہارا ہے'' کے بدلے ''یہ میں ہوں اور یہ میرا ہے'' کا اصول سامنے آنے لگتا ہے۔

عورت کا معاشی طور پر آزاد ہونے کا مطلب مغربی عورت سے مشابہت اور اس کا ساتھ دینا ہے جو خرچہ دینے میں شوہر کا حصہ دار ہوتی ہے یہاں تک کہ کھانے، پینے اور رہائش میں بھی۔

اس آزادی کے احساس کی وجہ سے بہت سے منفی نتائج سامنے آتے ہیں، جن میں سب سے اہم یہ ہے کہ طلاق کی نسبت بڑھ رہی ہے، اس لئے کہ ملازمت عورت کو ایسا بنا دیتی ہے کہ عورت کا باپ یا شوہر سے کوئی تعلق نہ رہے خواہ وہ کفالت کا تعلق ہو یا نفقہ کی ضرورت سے متعلق ہو۔

۲۔ مرد کی قوامیت سے آزادی: خواہ یہ صحیح اسلامی صورت میں ہو یا غلط رائج شکل میں ہو، عورت اپنے شوہر سے برابری اور حصہ دار کی طرح کا معاملہ کرنے لگتی ہے اور یہ سمجھنے لگتی ہے کہ ملازمت کی ہی وجہ سے اس کو اپنی شناخت ملی ہے اور مثبت ہو یا منفی، سماجی تعلقات وسیع ہوئے ہیں اور یہی سوچ وفکر زندگی میں بے سکونی واضطراب کا سبب بنتی ہے، جیسے کسی ایک مدرسہ کو دو مدیر چلا رہے ہوں، ایک گاڑی کو دو آدمی ڈرائیو کر رہے ہیں، اور ایک جہاز کو بیک وقت دو پائلٹ اڑا رہے ہوں، یہی سوچ بیوی کو شوہر کے خلاف سرکشی پر اور مرد کی قوامیت کو قبول نہ کرنے پر آمادہ کرتی ہے۔

۳۔ ازدواجی زندگی میں زوجین کا ایک دوسرے کے لئے مکمل ہونے کے مفہوم میں ٹکراؤ ہونا جس کی وجہ سے گھر کے اندر اور باہر میاں بیوی کے درمیان کاموں کی تقسیم کی جاتی ہے اور بچوں کی پرورش اور دیکھ ریکھ کے لئے باری لگائی جاتی ہے۔

مولانا ابوالاعلی مودودیؒ اس صورتحال کی تصویر کشی کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

عورت کے معاشی استقلال نے اس کو مرد سے بے نیاز کر دیا ہے، وہ قدیم اصول کہ مرد کمائے اور عورت گھر کا انتظام کرے، اب اس نئے قاعدہ سے بدل گیا ہے کہ عورت اور مرد دونوں کمائیں اور گھر کا انتظام بازار کے سپرد کر دیا جائے، اس انقلاب کے بعد دونوں کی زندگی میں بجز ایک شہوانی تعلق کے اور کوئی ربط ایسا باقی نہیں رہا جو ان کو ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ ہونے پر مجبور کرتا ہو (پردہ: مولانا سید ابوالاعلی مودودی، ص: ۲۱)۔

۴۔ گھریلو ذمہ داریوں کی ادائیگی میں کبھی کبھی تعاون کے اصول کا معطل ہو جانا ہے جس کی وجہ سے میاں بیوی میں سے ہر ایک دوسرے کے لئے تعاون اور راحت و آرام کے لئے فدا ہو جانے کے تعلق سے دوسرے کنارے پر کھڑا نظر آتا ہے۔

۵۔ میاں بیوی کے درمیان اعتماد کا فقدان، ملازمت کرنے والی عورت ازدواجی رازوں، شوہر کے ساتھ جھگڑوں اور گھر کے حالات کے بارے میں جھوٹ یا سچ اپنے دوستوں سے بتاتی رہتی ہے، اسی طرح دوسری عورت بھی اس سے بتاتی ہے، پھر وہ اپنے شوہر اور اپنی دوستوں کے شوہر جو اس سے ہمدردی کا اظہار کرتے ہیں، اور حقیقت کو چھپا لیتے ہیں، کے درمیان موازنہ کرنے لگتی ہے اور اس طرح اس کے دل میں شک وشبہ در آتا ہے اور اپنے شوہر پر اعتماد و بھروسہ کم ہونے لگتا ہے۔ اسی طرح شوہر بھی اپنی بیوی پر دوسرے ملازمین اور کام کرنے والوں سے تعلق کی وجہ سے شک کرنے لگتا ہے اور جب وہ اپنی آفس یا کمپنی میں ملازمت کرنے والے مرد وعورتوں کو اپنی نظروں سے دیکھتا ہے کہ ان کے درمیان تعلقات کس طرح قائم ہوتے ہیں تو اس کا شک اپنی بیوی کے تئیں مزید بڑھ جاتا ہے۔

۶۔ ازدواجی اختلافات، یہ سب سے اہم اور خطرناک نتیجہ ہے، اور یہی بحث کا موضوع ہے، سابقہ آثار کی بنیاد پر شوہر اور ملازم بیوی کے درمیان اختلافات ظاہر ہوتے ہیں اور گہرے ہونے لگتے ہیں یہاں تک کہ وہ تکلیف دہ حد تک پہنچ جاتے ہیں جن کی وجہ سے بہت برے نتائج سامنے آتے ہیں اور اخیر میں علاحدگی ہو جاتی ہے۔ اس لئے کہ یہ معاشرہ میں پھیلنے والی وبا کی شکل اختیار کر چکی ہے جس کا مقابلہ کرنے، اس کو فوکس کرنے اور اس کے لئے مناسب حل کو واضح کرنے کی ضرورت ہے۔

۷۔ گھر کے اندر اور باہر عورت کو دوگنے کام کرنے کا مکلف بنانا، چنانچہ عورت اپنا وقت، قوت وطاقت کام میں صرف کرتی ہے، پھر وہ تھکی تھکائی گھر

پہنچتی ہے تو وہ گھر شوہر اور بچوں کی ذمہ داریوں کو ادا کرنے پر مجبور ہوتی ہے لہٰذا عورت یا تو تھک کر چور چور ہو جاتی ہے یا برابر کام نہیں کر پاتی ہے، اس کی وجہ سے گھر میں بک جھک ہونے لگتی ہے، بچوں پر برے اثرات پڑتے ہیں، اور پھر نفسیاتی کشمکش شروع ہو جاتی ہے۔

۸۔ گھر سے باہر کسی مسلم عورت کا کام کبھی ایک محور پر نہیں رہا اور نہ اس کی صحیح سالم حدود متعین ہوئیں، اس میں صحیح غلط سب کچھ گڈمڈ ہوتا رہتا ہے، کام کی نوعیت کے تعلق سے بہت سی خلل اندازیاں اور مغالطے بھی ہوتے رہتے ہیں، جن کی وجہ سے ازدواجی تعلقات میں استحکام، بچوں کی تربیت اور مضبوط سماجی تعلقات کی استواری میں برا اثر پڑتا ہے۔

۹۔ سماج میں بیکاری کا اضافہ ہونا، عرب اور مسلم ممالک میں کام کرنے والے افراد کی کثرت ہے اور کام کے مواقع کم ہیں اور جب بہت سارے کاموں کی ذمہ داری عورت کو دی جائے اور کمپنیوں میں سکریٹری کی جگہ مردوں کے بجائے پر عورتوں کو ترجیح دی جائے، تجارت و اشتہارات وغیرہ میں عورت کی نسوانیت اور اس کی خوبصورتی کو غنیمت سمجھ کر جگہ دی جائے تو خالی بیٹھے مردوں اور نوجوانوں کو کام کے مواقع نہیں ملیں گے۔

۱۰۔ بچوں کو اجنبی مربیہ کے حوالہ کرنا، جو عام طور سے یا تو ان پڑھ ہوتی ہیں یا مغربی یا کسی اور تہذیب کی حامل ہوتی ہیں، وہ بچوں کی تربیت، زبان، دین و مذہب، اخلاق، یہاں تک کہ ان کی غذا سے کھلواڑ کرتی ہیں، کبھی کبھی بچوں کی طرف سے انتقام کا بھی سامنا کرنا پڑتا ہے اور یہ بچوں کو ماں کے دودھ، غذا، اور اس کی شفقت و محبت (جس کا بدل ممکن نہیں) سے محروم کرنے کا سبب ہوتی ہیں۔

۱۱۔ زوجین کے درمیان الفت و محبت اور سکون واطمینان کا ختم ہو جانا یا ان میں کمی آ جانا، اس لئے کہ وہ دونوں تھکے تھکائے گھر پہنچتے ہیں اور دونوں اس بات کے محتاج ہوتے ہیں کہ یا تو وہ گھر کا کام کریں یا مستقل آرام کریں، چنانچہ دونوں کے درمیان ازدواجی تعلقات میں کمی آنے لگتی ہے۔

۱۲۔ بیوی کی ملازمت کرنے کی وجہ سے بچوں پر برے اثرات کا مرتب ہونا، خواہ یہ عورت کی غیر موجودگی کے وقفہ میں ہو، یا دیکھ بھال نہ ہونے کی وجہ سے ہو، یا ملازمت کی وجہ سے زوجین کے درمیان تنازع کی صورت میں ہو، سوشل سائنس میں یہ بات طے ہے کہ جن بچوں کی پرورش جھگڑالو ماں باپ کے سائے میں ہو ان کے خیالات پراگندہ اور وہ نفسیاتی امراض میں مبتلا ہوتے ہیں جس کی وجہ سے خاندان بکھر جاتا ہے اور ٹوٹ پھوٹ جاتا ہے اور بچے بگڑ جاتے ہیں۔

۱۳۔ بلاشبہ یہ اثرات حتمی اور طے شدہ نہیں اور کبھی کبھی واقع ہوتے ہیں اور کبھی اس کے برعکس بھی ہوتا ہے، جیسے غریب گھرانوں میں ہو، یا سماجی ماحول یا زندگی کے معیار کے مطابق ہو، میاں بیوی کے درمیان مفاہمت ہو جائے اور گھر سے باہر کام کرنے پر اور گھر کے اندر کام کی تقسیم پر پہلے ہی اتفاق ہو جائے، اس کے ساتھ ساتھ دونوں کے درمیان احساس و شعور میں ہم آہنگی ہو اور دونوں میں سے ہر ایک بچوں کی خاطر اور مستقبل کی خاطر قربانی دینے کے لئے تیار ہوں۔

۱۴۔ عورت کے کام کے عام طور پہ اور گھر کے باہر کام کرنے کے خاص طور پر مثبت اثرات بھی ہیں، مثلاً سماجی اور معاشی ترقی میں اس کا حصہ ہوتا ہے عمومی آمدنی میں اضافہ ہو جاتا ہے، شوہر کے مالی بوجھ کو اٹھانے میں مشارکت ہوتی ہے اور کام کرنے والے افراد کو باہر سے بلانے کے بدلہ آپس میں مل کر کام کرنے والے ہاتھ گارنٹی کے ساتھ مل جاتے ہیں۔

اس کے متعدد منفی اثرات بھی پڑتے ہیں، کچھ اثرات شوہر پر پڑتے ہیں جبکہ بیوی پر کچھ جسمانی اور نفسیاتی اثرات پڑتے ہیں، اور اس سے اہم یہ ہے کہ اولاد پر اس کا منفی اثر پڑتا ہے، عورت کے ملازمت کی وجہ سے جو سب سے خطرناک اثر پڑتا ہے وہ اختلاف کا پیدا ہونا ہے جس کی وجہ سے طلاق تک کی نوبت آ جاتی ہے، یا زوجین کے درمیان اکثر نزاع اور کشیدگی رہتی ہے اور ان کے دلوں میں ایک دوسرے کے خلاف بغض پیدا ہو جاتا ہے۔

☆☆☆

بحث دوم

ملازمت یا مزدوری کرنے والی بیوی کے شرعی احکام

اسلامی قانون کے ماہرین نے بیوی کے اپنے گھر کے اندر بنیادی اور ضروری ذمہ داریوں کے متعلق شرعی احکامات کا ذکر تو بکثرت کیا ہے اور ان کے کاموں میں درپیش احوال کی طرف مختصراً اشارہ بھی کیا ہے، لیکن موجودہ دور میں عورتوں کی ملازمت یا کام کرنے کے عام رواج نے عورتوں کے متعلق بالعموم اور بیویوں کے متعلق بالخصوص ڈھیر سارے مسائل پیدا کردئے ہیں، جن میں سے چند کا ذکر پہلی بحث کے ابتدائی فقروں میں کر چکے ہیں اور انہیں میں سے درج ذیل یہ ہیں:

نمبر ا:۔ بیوی کے مال کی حفاظت وضمانت:

نکاح کر لینے اور مرد کا بیوی پر قوامیت حاصل کرنے سے نہ تو اس عورت کا تشخص ختم ہوتا ہے اور نہ ہی اس کے وجود و اہلیت میں تبدیلی آتی ہے اور نہ ہی اختیارات ختم ہو جاتے ہیں، اسلام عورت کے مال اور اس کی اہلیت کو اسی کے لئے مستقل طور پر قانونی تحفظ وضمانت فراہم کرتا ہے، چاہے وہ عورت مسلم ہو یا غیر مسلم، بیوی ہو یا نہ ہو، لہذا وہ اپنی کمائی ہوئی دولت آمدنی یا دیگر املاک میں تصرف کا پورا حق رکھتی ہے اور بغیر عام شرعی موانع کے (جن میں مرد وزن یکساں ہیں) اسے حق تصرف سے روکا نہیں جاسکتا۔

فقہاء کرام کا اس بات پر اتفاق ہے کہ بالعموم عورت اور بالخصوص بیوی حقوق وفوائد کے حصول اور عبادات ومعاملات کے تعلق سے دیگر دینی ودنیوی حقوق و لوازمات کے مطالبات میں مستقل بالذات حیثیت رکھتی ہے، وہ اپنی دولت کی مالک مختار ہے وہ چاہے تو بلا روک ٹوک اور خوش دلی کے ساتھ جیسے چاہے اسے خرچ کر سکتی ہے، شوہر کا اس کے مال پر کسی طرح کا تسلط نہیں رہتا، وہ وراثت، وصیت، ہبہ اور مہر کے اندر جائز ملکیت کے ذرائع سے فائدہ بھی حاصل کر سکتی ہے اور کمائی بھی کر سکتی ہے، اسے دیگر مردوں کی طرح اپنے مال میں تصرف کرنے کا حق حاصل ہے، اس کے لئے شوہر یا کسی اور سے مال کے استعمال اور تصرف میں مخصوص اجازت کی ضرورت نہیں ہے۔

فقہاء نے انوثت کو نہ تو عورت کی اہلیت میں رکاوٹ قرار دیا ہے اور نہ ہی اس سے اہلیت میں کمی آتی ہے اس طور پر شوہر اور بیوی، ملکیت، دولت، آمدنی اور دیگر تصرفات میں مکمل الگ الگ ہیں اور عقد نکاح مہر اور مقرر کردہ شرعی نفقہ کے علاوہ ملکیت اور آمدنی کے معاملہ میں زوجین میں سے کسی پر حق متعین نہیں کرتا۔

اسلام شوہر اور بیوی کے درمیان مالیاتی تعلقات کو منظم شکل میں پیش کرتا ہے، اس نے شوہر اور بیوی دونوں کے مالوں کے درمیان الگ الگ حدود متعین کئے ہیں اور یہ دو الگ الگ شخص کے درمیان تعلق کی مانند ہے، عورت کو اپنے مہر میں تصرف کا مطلق حق حاصل ہے، نیز قرآن کریم سے ثابت شدہ مال وراثت میں شوہر اور اقارب کی جانب سے حاصل شدہ مال وراثت میں مکمل حق حاصل ہے، اسی طرح مانند شوہر تحفہ تحائف کے لینے دینے، صدقہ اور زکوۃ کے حصول و ادائیگی، شرعی معاملات کے راستے سے اپنی ملکیت حاصل کرنے، ملکیت سے دستبردار ہونے اور معاہدات کو برتنے (بہ استثناء عقد نکاح کے کیونکہ اس میں فقہاء کا اختلاف ہے) اور جس کام کو چاہے اسے اختیار کرنے کی آزادی حاصل ہے۔ گھر سے باہر نکل کر کام کرنے میں (جیسا کہ اوپر گزر چکا ہے) کوئی رکاوٹ نہیں ہے، بشرطیکہ وہ اپنے دین واخلاق اور عزت وناموس کی حفاظت کرے تو اس کے اپنے مال ودولت اور اعمال وسلوک میں رکاوٹ نہیں ڈالی جائے گی۔

پتہ چلا کہ عورت کا تشخص شادی کے بعد ختم نہیں ہوتا، نہ تو اس کے نام میں جیسا کہ یورپین سماج میں رائج ہے اور نہ ہی اس کی ملکیت میں۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی وضاحت یوں فرمائی ہے، "یقینا عورتیں مردوں کی ہی صنف سے ہیں" (ابوداؤد ۱، ۵۴، ترمذی ۱، ۶۸، ۳۶۸ وغیرہ عن عائشہؓ مرفوعاً)، اور جیسا کہ آیت کریمہ میں گزر چکا ہے "ولهن مثل الذي عليهن بالمعروف، وللرجال عليهن درجة" (البقرة: ۲۲۸)، عورتوں کا بھی وہی حق ہے جو ان پر حق ہے شرعی دستور کے مطابق اور مردوں کو ان کے اوپر یک گونہ فضیلت حاصل ہے۔

۲۔ بیوی کو گھر میں روکے رکھنا اور شوہر پر اس کے نان ونفقہ کی ذمہ داری:

عورت کے مال کی حفاظت وضمانت اور اس کی مکمل اہلیت اور وجود یہی دونوں شریعت کے عام بنیادی اصول ہیں، لیکن اگر عورت شادی کر لیتی ہے تو اس پر کچھ نئے احکامات جاری ہو جاتے ہیں، انہیں میں سے ایک حکم شوہر کا بیوی کو گھر میں روکنے کا حق اور اس پر بیوی کے نان ونفقہ کی ذمہ داری بھی ہے، کیونکہ شریعت کا اصول اس سلسلہ میں یہ ہے کہ ازدواجی زندگی کی بنیاد باہمی توافق وتعاون، مشترکہ ذمہ داری اور حسن سلوک پر ہے، شوہر کے اوپر گھر سے باہر کی ذمہ داریوں کی ادائیگی واجب ہے، جن میں سب سے اہم کسب معاش ہے جبکہ بیوی کے اوپر اندرون خانہ کی ذمہ داری شرعی احکامات اور عرف عام کی حدود میں رہ کر ادا کرنا واجب ہے۔

انہیں احکامات میں سے ایک حکم گھر کی ذمہ داریوں کی ادائیگی کے بدلہ عورت کا نان ونفقہ حاصل کرنا ہے، بیوی شوہر کے نان نفقہ کی مستحق اس وجہ سے ہوتی ہے کہ وہ اپنے آپ کو شوہر کے حوالہ کر دیتی ہے اور اپنے شوہر کی مصلحتوں کے لئے اس کے گھر میں خود کو مخصوص کر دیتی ہے۔

اسی وجہ سے تمام فقہاء کے نزدیک شوہر اس کے نان نفقہ کا ذمہ دار ہوتا ہے اور یہ نص شرعی سے ثابت ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے شوہروں کو مخاطب کر کے فرمایا ہے: ''اسکنوہن من حیث سکنتم من وجدکم، ولا تضاروہن لتضیقوا علیہن'' (الطلاق: ۶) ان مطلقات کو اپنی حیثیت کے موافق رہنے کا مکان دو جہاں تم رہتے ہو اور انہیں تنگ کرنے کے لئے تکلیف نہ پہنچاؤ۔ اور نیز فرمایا ہے: ''عاشروہن بالمعروف'' اور بیویوں کے ساتھ خوش اسلوبی سے گزر بسر کیا کرو اور معروف یعنی خوش اسلوبی کا یہ بھی تقاضا ہے کہ اسے ایک رہائشی مکان فراہم کرے کیونکہ لوگوں کی نگاہوں سے پردہ پوشی اختیار کرنا اور تمتع اور تصرف کے لئے مکان اسکے لئے ناگزیر ہے (فتح القدیر ۳؍۳۲۱)، نیز اللہ تعالیٰ نفقہ کے ہر ذمہ دار شخص کو مخاطب کر کے فرماتا ہے ''لینفق ذو سعۃ من سعتہ'' (الطلاق: ۷) وسعت والے کو خرچ اپنی وسعت کے مطابق کرنا چاہئے۔ پھر فرمایا ''وعلی المولود لہ رزقہن وکسوتہن بالمعروف'' (البقرۃ: ۲۳۳) اور جس کا بچہ ہے (شوہر) کے ذمہ ان (ماؤں) کا کھانا اور کپڑا دستور کے موافق ہے۔ حضرت جابرؓ فرماتے ہیں کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ دیا اور فرمایا ''اتقو الله فی النساء، فإنکم أخذتموهن بأمانة الله، واستحللتم فروجهن بکلمة الله، ولهن علیکم رزقهن وکسوتهن بالمعروف'' (مسلم: ۸،۱۴۶۔ ۱۸۳، ابوداؤد: ۱،۴۴۴، ابن ماجہ: ۳۲۲، احمد: ۵،۷۳) اللہ سے عورتوں کے بارے میں ڈرتے رہو کیونکہ تم نے انہیں اللہ کی امانت میں لے رکھا ہے اور ان کی شرمگاہوں کو اللہ کے حکم ہی سے جائز کیا ہے اب تمہارے اوپر عورتوں کا کھانا اور کپڑے کا انتظام بھلائی کے ساتھ واجب ہے۔

بیوی کا نان ونفقہ اس کا حق ہے اگرچہ وہ مالدار اور اس کا شوہر فقیر ہی کیوں نہ ہو، یہ نفقہ اسی وقت ساقط ہوگا جبکہ بیوی کی طرف سے عدم اطاعت کا ظہور ہو، کیونکہ نفقہ شوہر کی بنیادی ذمہ داری ہے جو قرآن وسنت سے ثابت ہے اور وہ بیوی کے مال کو اس کی رضامندی کے بغیر ہاتھ نہیں لگا سکتا، کیونکہ اللہ رب العالمین کا ارشاد ہے: ''وآتوا النساء صدقاتهن نحلة فإن طبن لکم عن شئ منه نفسا فکلوه هنیئا مریئا'' (النساء: ۴) اور تم بیویوں کو ان کی مہر خوش دلی کے ساتھ دیا کرو، اگر وہ خوش دلی سے تمہارے لئے اس کا کچھ حصہ چھوڑ دیں تو تم اسے مزیدار اور خوشگوار سمجھ کر کھاؤ۔ نیز فرمایا: ''وإن أردتم استبدال زوج مکان زوج وآتیتم إحداهن قنطارا فلا تأخذوا منه شیئا'' (النساء: ۲۰) اگر تم ایک بیوی کی جگہ دوسری بیوی بدلنا چاہو اور تم اس بیوی کو مال کا انبار دے چکے ہو تو تم اس میں سے کچھ بھی واپس نہ لو۔ اور اس کے عوض میں بیوی اپنے گھر اپنے شوہر اور اپنے بال بچوں کی دیکھ ریکھ کے لئے فارغ ہوتی ہے، شوہر اپنی بیوی کے ذاتی مال میں سے خرچ کرنے کے مطالبہ کا حق نہیں رکھتا، بلکہ وہ خود اس کے اطاعت اور اسکے قابل احترام عمل کے عوض دینے کا حق رکھتا ہے تاکہ پوری فیملی کے لئے امن وسکون اور استحکام کی فضا قائم ہو سکے۔ (فتح القدیر ۳؍۳۲۱، حاشیہ ابن عابدین ۳؍۵۷۲، مذاہب الجلیل ۴؍۱۸۱، وغیرہ)۔

۳۔ بیوی کا گھر سے باہر ملازمت یا مزدوری کرنا اور نفقہ کا حق:

ہم یہ ذکر کر چکے ہیں کہ شوہر کے اوپر بیوی کے لئے نان ونفقہ کی ذمہ داری اس لئے ہوتی ہے کیونکہ اسے گھر کے اندر رکھتا ہے، لیکن کیا بیوی کے گھر سے نکل جانے، اسے کام اختیار کر لینے اور مزدوری اور تنخواہ حاصل کر لینے کی صورت میں بھی سابقہ احکامات باقی رہیں گے؟

فقہائے کرام کا کہنا ہے کہ بیوی کا شوہر کے گھر میں محبوس ہو کر شوہری حق ادا کرنا اور شرعی ذمہ داریوں کو پورا کرنا نفقہ کے مستحق ہونے کے بنیادی وجوہات میں سے ایک اہم وجہ ہے، کیونکہ اس کے گھر میں رکنے کا فائدہ شوہر ہی کو پہنچتا ہے، اس لئے شوہر کے مال سے اس کی کفالت واجب ہو جاتی ہے اور یہاں پر فقہی اصول سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اگر کوئی کسی کو حق بجانب روکتا ہے تو اس پر اس کا نفقہ واجب ہوتا ہے، کیونکہ محبوس شخص کو اپنی ضروریات پوری کرنے کا موقع نہیں ملتا اور یہی اصول ہر ملازم پر چاہے قاضی ہو یا حاکم، مزدور ہو یا زکوٰۃ وخیرات وصول کرنے والے سفراء یا مضاربت کا مال لے کر سفر کرنے والے اشخاص سب پر

منطبق ہوتا ہے۔(بدائع الصنائع ۴/ ۱۶، تبیین الحقائق ۳/ ۵۱، الموسوعۃ الفقہیہ ۴۱/ ۳۶)۔

اسی وجہ سے فقہاء نے یہ بھی کہا ہے کہ بیوی شوہر کے گھر میں منتقل ہونے سے پہلے اس نفقہ کی مستحق نہیں ہوتی اور اسی طرح یہ نفقہ شوہر کی نافرمانی اور اس کی اجازت کے بغیر گھر سے نکل جانے سے بھی ساقط ہوجاتا ہے، کیونکہ اب وہ سبب ہی نہیں رہا جس سے نفقہ واجب ہوتا ہے۔

اس لئے اگر بیوی گھر سے ملازمت یا کام کے لئے اپنے گھر سے نکلتی ہے تو موجودہ دور کے علماء کی اس بارے میں تین رائیں ہیں:

۱۔ گھر سے باہر کام کرنے والی عورت کا نفقہ ساقط ہوجاتا ہے، یہ رائے ڈاکٹر عمر سلیمان الاشقر کی ہے، وہ کہتے ہیں ''جو عورت مزدوری یا ملازمت کرتی ہے اس کے لئے کوئی نفقہ نہیں، کیونکہ شوہر اسے گھر سے باہر نکلنے اور کام کرنے سے روک سکتا ہے اور یہ اس کا حق ہے، شوہر اس کے اخراجات کو اپنے لئے فارغ رکھنے اور روکنے ہی کی وجہ سے برداشت کرتا ہے، لہٰذا اگر وہ کام کرنے لگے اور کمانے لگے تو جس وجہ سے خرچ واجب ہوتا ہے وہ ختم ہوگیا (الواضح فی شرح قانون الأحوال الشخصیۃ ص ۱۸۲)، اس کی تائید دوسرے لوگوں نے بھی کی ہے۔

۲۔ کام کرنے والی عورت کے لئے نفقہ برقرار رہتا ہے (مذکورہ اصول کے مطابق) یہ استاذ عبدالکریم شہبون کا قول ہے، ان کا کہنا ہے: ''جو عورت ملازمت یا مزدوری کرے اس کا نفقہ برقرار رہے گا، لیکن شوہر اسے روکنے کا حق رکھتا ہے''۔

پھر انہوں نے یہ محسوس کیا کہ یہ مطلق حکم خلاف واقعہ ہے، تو انہوں نے یہ مزید کہا: ''صحیح حل مسئلہ کا یہ ہے کہ بیوی شوہر پر نکاح نامہ میں ہی یہ شرط لگادے کہ وہ ملازمت کرتی رہے گی اور اس کی تنخواہ اس اس طرح ہوگی (شرح مدونۃ الأحوال الشخصیۃ المغربیۃ ۱/ ۴۰۷)، اس کی بھی تائید کچھ لوگوں نے کی جن میں سے ایک ملیشیا کے مفتی ہیں جن کا کہنا ہے کہ اگر شوہر کام کی اجازت دیتا ہے تو اس کا نفقہ برقرار رہے گا، اس کی تائید کوالالمپور ملیشیا کی ہائی کورٹ نے بھی کی ہے۔(عند الزواج وآثارہ: ۲۲۴)۔

۳۔ مسئلہ میں تفصیل ہے: اس کے قائلین کچھ علماء ہیں جن میں عبدالحیٔ بن عبدالشکور مالیزی ہیں، وہ کہتے ہیں کہ کام کرنے والی عورت کا نفقہ برقرار رہے گا، لیکن اسے گھر کے اخراجات میں تہائی حصہ میں شریک ہونا ہوگا، کیونکہ وہ کام کرتی ہے اور باقی دو تہائی شوہر کی ذمہ داری ہے، الحاجۃ زاویہ نے اس کی تائید کی ہے کہ عورت کا کام کرنے کی شکل میں بھی شوہر پر نفقہ واجب ہے، لیکن عورت کے لئے مناسب ہے کہ گھر کے اخراجات میں حصہ لے (عند الزواج وآثارہ: ۲۲۵۔۲۲۳)، اور یہ قول بھی حقیقتاً پہلے قول سے موافقت رکھتا ہے، یعنی نفقہ سے روک دینا، کیونکہ گھر کے اخراجات میں سے ایک تہائی حصہ کی شرکت کا مکلف کرنا اس کی خود کے نفقہ استحقاق سے زیادہ ہوجاتا ہے، تو بظاہر یہی لگتا ہے کہ وہ نفقہ لیتی ہے پھر گھر کے اخراجات اپنے مال سے پورا کرتی ہے، نتیجۃً وہ نفقہ سے محروم ہوجاتی ہے گویا کہ وہ گھر پر نہیں بلکہ اپنی ذات پر خرچ کررہی ہے۔

میرا خیال ہے کہ سابقہ اختلاف کا دارومدار عقد نکاح اور اس پر مرتب ہونے والے وجوب نفقہ وغیرہ کی بنیاد پر ایک نیا حکم مستنبط کرنے پر ہے جس کی علت بیوی کو شوہر کے گھر میں اس کی ضروریات پوری کرنے کے لئے محبوس کرنا ہے، یہ ایک عمومی حکم ہوا اور بیوی کے تعلق سے ایک لازمی اور اصلی حالت ہوئی نہ کہ عارضی۔

میرے نزدیک یہ استنباط درست نہیں ہے، کیونکہ زیر بحث موضوع میں بیوی کی حالت عارضی ہے نہ کہ حقیقی اور اصلی، کیونکہ عقد نکاح سے بالکل الگ ایک نئی صورت حال پیدا ہورہی ہے اور وہ بیوی کا گھر سے باہر جاکر کام کرنا ہے، لہٰذا یہ معاملہ سابقہ معاملہ اور اس کے اثرات سے مختلف اور جداگانہ ہے، لہٰذا یہاں پر شرعی حکم کو موجودہ حقیقی صورتحال سے ہم آہنگ کرنا لازم ہے اور اسے حالات زمانہ اور زوجین کے مابین کئے گئے معاہدوں اور شرائط کے مطابق ڈھالنا ضروری ہے جو بیوی کا خارج از بیت کام کرنے سے متعلق ہے، نہ تو ہم ان دونوں کے معاملہ میں دخل اندازی کرسکتے ہیں اور نہ ہی اپنی رائے ان پر تھوپ سکتے ہیں اور اس نئی صورتحال کا تعلق شریعت اور فقہاء کی جانب سے عقد نکاح پر مرتب ہونے والے حقوق وواجبات سے نہیں ہے۔

بناء بریں مسئلہ مذکورہ کے حکم میں درج ذیل حالات کے مطابق تفصیل ہونی چاہئے:

پہلی حالت: شوہر اور بیوی کے مابین نفقہ پر صراحۃً معاہدہ:

اس معاہدہ کی شرائط ولوازمات پر حرف بہ حرف عمل کرنا لازم ہے، اس میں اجتہاد کی کوئی گنجائش نہیں ہے اور زوجین پر اس کی پابندی ضروری ہے، کیونکہ معاہدہ بھی قانونی حیثیت رکھتا ہے، جیسا کہ حدیث میں آتا ہے "والمؤمنون عند شروطھم" اور ایک روایت کے مطابق ''المسلمون علی شروطھم'' (بخاری نے معلق روایت کیا ہے ۲/ ۷۹۴، ابوداؤد موصولاً ۲/ ۳۰۴، ترمذی، حاکم، دارقطنی، بیہقی)۔ مسلمان اپنی شرطوں کے پابند ہوتے ہیں۔ نیز اللہ تعالیٰ کا

فرمان ہے: "یأیہا الذین آمنوا أوفوا بالعقود" (سورۂ مائدہ:۱) اے مومنو اپنے عہدوں کو پورا کرو۔ اس لئے اگر ایسے معاہدوں میں اختلاف پیدا ہو جائے تو جج ان معاہدوں سے ہٹ کر فیصلہ نہیں کرسکتا۔

رہی بات بیوی کی تنخواہ کی تقسیم اور اس میں شوہر کے حصہ کی تو ہم اسے اگلی بحث میں پیش کریں گے۔

دوسری حالت: نان ونفقہ پر غیر صریح یا عرف عام کے مطابق معاہدہ:...... اس حالت میں چونکہ زوجین نے نفقہ پر صراحۃ معاہدہ نہیں کیا ہے، بلکہ بیوی کے کام پر جاتے وقت قرائن اور حالات کو سامنے رکھتے ہوئے معاہدہ ہوا ہے اور یہ بات یا تو شوہر کے علم میں یقینی طور پر ہے (شادی کے وقت یا شادی کے بعد، یا اس نے کام کرنے کی اجازت (ضمناً ہی سہی) دے رکھی ہے اور اسے کوئی اعتراض نہیں ہے، تو ایسی صورت میں اس کا حکم بھی دلالت حال یا عرف عام کا اعتبار کرتے ہوئے سابقہ حکم کی طرح ہوگا اور بیوی کا خارج از بیت کام کرنے پر نفقہ کے باقی رہنے یا نہ رہنے کے لئے شہر میں رائج عرف کا لحاظ رکھا جائے گا، اگر اس فیصلہ پر زوجین کے مابین کوئی اختلاف نہ ہو تو پھر معاملہ ہی ختم ہوا اور مداخلت کی گنجائش بھی نہیں رہی، لیکن اگر بعد میں دونوں کے مابین اختلاف ہو گیا تو جج احوال وقرائن اور عرف عام کا صحیح طور پر جائزہ لیتے ہوئے کوئی فیصلہ کرے گا۔

تیسری حالت: نفقہ دینے پر کسی بھی حالت میں صراحۃ یا دلالۃ یا عرفاً کوئی معاہدہ نہ ہو:

اس حالت میں میری رائے یہ ہے کہ مزدوری یا ملازمت کرنے والی بیوی کے لئے شوہر پر نان ونفقہ واجب ہے، کیونکہ یہی حکم اصل ہے جو نصوص شرعیہ سے ثابت ہے اور اس لئے بھی کہ شوہر نے صراحۃ یا ضمناً کام کرنے کی نہ تو اجازت دی اور نہ اس پر اس کو اعتراض ہے اور نہ ہی نفقہ پر ناراضگی کا اظہار، لہٰذا اصل حکم یعنی شریعت کی جانب سے مقرر کردہ (اصلی حالت پر) نفقہ کا وجوب باقی رہے گا اور یہاں پر کوئی چیز یا علت بھی نہیں پائی جارہی ہے جو اس وجوب کو ختم کردے، اس لئے بھی کہ شوہر نے صراحۃ یا اشارۃ بغیر کسی عوض کے اسے گھر میں روکنے سے تنازل اختیار کیا ہے، لہٰذا نفقہ کا وجوب اس پر برقرار رہے گا، ہاں اگر اپنی رائے پھر بدل لیتا ہے تو اس کا ذمہ دار وہ خود ہوگا، اب رہی بات کہ آیا اسے کام سے روکنے کا حق ہے یا نہیں ہے، تو اس پر ہم بعد میں بحث کریں گے۔

چوتھی حالت:...... بیوی کے ملازمت یا مزدوری کرنے پر شوہر کو اعتراض ہو اور اس کی اجازت کے بغیر بیوی کام کے لئے نکل جائے تو ایسی صورت میں نفقہ ساقط ہو جائے گا، کیونکہ یا تو نفقہ کے وجوب کی وجہ باقی نہیں رہی یا مانعِ نفقہ پایا جارہا ہے اس لئے کہ عورت اب ناشزہ کے حکم میں ہو چکی ہے، بایں طور پر کہ اس نے شوہر کی اجازت اور رضامندی کے بغیر کام کرنا شروع کیا ہے اور گھر کے اندر رکنے اور بنیادی حقوق ادا کرنے سے دستبردار ہو رہی ہے، لہٰذا اب یہ عورت خود اپنی تنخواہ سے اپنی ذاتی ضروریات پوری کرے گی اور اگر بعد میں کام چھوڑ دے اور گھر کی ذمہ داری پھر سے پوری کرنی شروع کردے تو اس کے لئے حق نفقہ پھر سے ثابت ہو جائے گا، کیونکہ اب سبب نفقہ بھی پایا جارہا ہے مانع نفقہ بھی ختم ہو چکا ہے اور فقہ کا قاعدہ ہے کہ: إذا زال المانع عاد الممنوع: جب مانع ختم ہو جائے تو ممنوع چیز پھر سے جائز ہو جاتی ہے۔

۴۔ بیوی کو گھر سے باہر کام کرنے سے منع کرنا شوہر کا حق ہے:

الفت وسکون شادی کے اہم مقاصد میں سے ایک مقصد ہے اور عورت کی بنیادی ذمہ داری گھر میں رہتے ہوئے افزائش نسل، بچوں کی پرورش اور تربیت سازی ہے اور اسی ذمہ داری یعنی گھر میں اپنے آپ کو روکے رکھنے اور شوہری حقوق ادا کرنے کے عوض میں وہ نفقہ کا مستحق ہوتی ہے۔

اس تمہید سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ شوہر کو مذکورہ بالا مقاصد کے حصول کے لئے اس بات کا مکمل حق حاصل ہے کہ بیوی کو گھر سے باہر کام کرنے کے لئے منع کردے۔

اگر عورت شادی سے پہلے کہیں ملازمت یا مزدوری کررہی ہے تو شوہر پر اس معاملہ میں اپنی رغبت کا اظہار کھلے لفظوں میں کرنا اور ملازمت یا کام چھوڑ دینے کی شرط لگانا واجب ہے تاکہ وہ عورت اس کے گھر کی بنیادی ذمہ داریوں کے لئے فارغ ہوسکے، پھر شوہر پر عورت کے نفقہ کی ذمہ داری قطعی طور پر لازم ہوگی۔

لیکن اگر اس نے نہ تو شرط رکھی اور نہ ہی اس معاملہ کی وضاحت کی تو سمجھا یہی جائے گا کہ وہ عورت کے کام کرنے سے راضی ہے اور یہ کہ اسی نے اپنا شرعی

حق ساقط کیا ہے، پھر اسے کام چھوڑنے پر مجبور کرنے کا حق نہیں ہوگا کیونکہ اس نے فعلاً اس کی رضامندی ظاہر کی ہے اب اسے روکنے کا حق نہیں رہا۔[1]

سابقہ دونوں حالتوں میں اگر شوہر کی آمدنی اتنی ہے کہ فیملی کی تمام ضروریات اس سے پوری ہوجاتی ہیں تو بیوی اخلاقی اور دینی طور پر اپنے گھر بال بچوں کی دیکھ ریکھ پرورش اور ان کے لئے خوشحالی کے وسائل فراہم کرنے کی کوشش کرے جوامت، معاشرہ، شوہر اور اولاد کے لئے سب سے اہم ہے اور اس پر وہ عنداللہ ماجور ہوگی۔

اگر عورت شادی کے وقت ملازمت کررہی تھی اور پھر عقد نکاح کے وقت ملازمت برقرار رکھنے کی شرط رکھے یا اس کے پاس کوئی ملازمت نہیں تھی لیکن عقد نکاح کے وقت آئندہ ملازمت کرنے کی شرط لگادی اور شوہر نے اپنی رضامندی ظاہر کردی تو ایسی صورت میں اسے محبوس کرنے کا حق نہیں رہے گا اور شرط پوری کرنی ہوگی اور اسے ملازمت چھوڑنے کے لئے مجبور کرنے کا نہ تو فی الحال اور نہ ہی آئندہ حق ہوگا، الا یہ کہ نئے سرے سے کوئی دوسری رضامندی یا سمجھوتہ کرلیں، ایسی صورت میں موجودہ تفاہم سابقہ معاملہ کو ملغ ختم دے گا، اس بارے میں نہ تو کسی کا اختلاف ہے اور نہ ہی اس میں کوئی حرج کی بات ہے۔

لہٰذا اگر سابقہ صورتوں میں سے کوئی صورت پیش نہیں آئی یا شوہر نے صراحۃً یا دلالۃً ملازمت چھوڑ دینے کی شرط رکھ دی تو وہ اپنی بیوی کو ملازمت چھوڑنے پر مجبور کرسکتا ہے، تاکہ شادی کے تقاضوں کے پیش نظر اور بحیثیت ایک بیوی کے اپنی بنیادی ذمہ داریوں کو نبھانے کی غرض سے گھر کے کام کی طرف دوبارہ لوٹ سکے۔

۵۔ ملازمت کو برقرار رکھنے کی عورت کی شرط:

شریعت مطہرہ نے شوہر کو قوامیت کا حق دیا ہے اور شوہر کی اطاعت خیر اور جائز امور میں بیوی پر واجب قرار دیا ہے، نیز اس پر یہ بھی واجب ہے کہ اپنے شوہر کا احترام کرے، اس کی حکم عدولی نہ کرے، اس کی اجازت کے بغیر گھر سے نہ نکلے تاکہ گھر میں رہ کر شوہر کے حقوق اور اس کے مال واولاد اور عزت وآبرو کی نگہداشت ٹھیک سے کرسکے، اسی لئے شوہر کو یہ حق حاصل ہے کہ بیوی کی ملازمت چھوڑنے یا یکسر ملازمت اختیار نہ کرنے کی شرط لگائے تاکہ بیوی امور خانہ داری کی انجام دہی کے لئے مکمل فارغ رہے اور ایسی صورت میں شوہر پر مکمل نفقہ اور اس کی ضروریات کی تکمیل واجب ہوگی جو کہ قرآن وسنت اور اجماع سے ثابت ہے۔

ایسا بھی ہوتا ہے کہ عورت تعلیم حاصل کرنے میں پوری محنت صرف کرتی ہے اور تعلیمی سندوں کے حصول کے لئے اپنی عمر کا سب سے قیمتی وقت اس لئے لگاتی ہے تاکہ اسے مناسب ملازمت مل سکے، اس کے لئے وہ اپنے مخصوص میدان میں تجربہ بھی حاصل کرچکی ہوتی ہے، پھر اس کے خوابوں کا شہزادہ اس کی زندگی میں آتا ہے اور شادی کے لئے اس کا ہاتھ مانگتا ہے، پھر عورت کو اپنے منگیتر کی ملازمت چھوڑنے کی ڈیمانڈ پر جھٹکا لگتا ہے اور جذبات کی کشمکش میں مبتلا ہوجاتی ہے، حالانکہ اسے شرعی طور پر اپنی خواہش کی تکمیل کے لئے آزادی حاصل ہے اور بہت آسانی کے ساتھ شادی اور ملازمت دونوں کے مابین مطابقت اور ہم آہنگی پیدا کرسکتی ہے، باہمی رضامندی سے تنخواہ کے مسائل بھی حل کرسکتی ہے (جسے ہم آگے ذکر کریں گے) اور اس وقت شوہر بیوی کی شرط کو جسے اس نے بہ رضا ورغبت قبول کیا ہے نافذ کرنے کا پابند ہوجاتا ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے "یأیها الذین آمنوا أوفوا بالعقود" اور صاحب ایمان کے اوصاف میں سے بتایا گیا ہے "الذین یؤمنون بعهد الله ولا ینقضون المیثاق" (سورۃ الرعد: ۲۰) جو عہدوں کو پورا کرتے ہیں وہ عہد وپیمان نہیں توڑتے۔ نیز ارشاد باری ہے "وأوفوا بالعهد إن العهد کان مسئولا" اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے: "المؤمنون علی شروطهم" اور ایک روایت میں ہے "المسلمون عند شروطهم"، نیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: "أحق ما أوفیتم من الشروط أن توفوا به ما استحللتم به الفروج" (بخاری ۵،۱۹۷۸، مسلم ۹،۲۰۱)۔ تم لوگ سب سے زیادہ ان شرطوں کو پورا کرنے کے حقدار

---

[1] پروفیسر عبدالکریم زیدان اس قول سے اتفاق نہیں کرتے، ان کا کہنا ہے: "کہ شوہر کو شادی کے وقت اس بات کا علم ہے کہ عورت گھر سے باہر کہیں ملازمت کررہی ہے۔ اس کے باوجود اس نے خاموشی اختیار کی اور ملازمت چھوڑنے کی شرط نہیں رکھی اور نہ ہی اس عورت نے شوہر پر یہ شرط رکھی کہ وہ ملازمت کرنے سے منع نہیں کرے گا تو شوہر کی یہ خاموشی رضامندی نہیں مانی جائے گی اور نہ ہی اسے عورت کی طرف سے ملازمت سے عدم ممانعت کا درجہ دیا جائے گا اور نتیجہ شوہر کو یہ حق ہوگا کہ بیوی کو ملازمت کے لئے جانے سے روک دے اگر عورت اس کی بات نہیں مانتی تو اسے ناشزہ قرار دیا جائے گا۔" المفصل فی أحکام المرأۃ والبیت المسلم فی الشریعۃ الإسلامیۃ ۷،۱۲۶"۔

میں ان کی بات سے اتفاق نہیں کرتا کیونکہ قرائن سے یہی سمجھ میں آرہا ہے کہ شوہر اس کی ملازمت سے راضی ہے کیونکہ ایسے مقام پر سکوت اختیار کرنا جہاں بیان و وضاحت کی ضرورت ہو وہ بیان ہی ہے، خاص طور پر جبکہ شوہر کو دھوکہ میں پڑجانے کا امکان ہو اور کسی چیز کا اپنی اصلی حالت پر برقرار رہنا ہی اصل ہے، لہٰذا اگر شوہر نے عورت سے گھر سے باہر نکل کر کام کرنے کا علم رکھتے ہوئے شادی کی تو اس پر شوہر کی اجازت سے ملازمت کرنے والی بیوی کا حکم لگایا جائے گا۔

ہو جن سے عورتوں کی شرمگاہ کو جائز کیا ہے نیز مسلم کی روایت میں ہے ''إن أحق الشروط أن یوفی به ......''۔

ایک موقوف روایت کے مطابق: ایک شخص نے ایک عورت سے شادی کی اور اسی کے گھر میں رہنے کی شرط رکھی، پھر اس آدمی نے گھر سے منتقل ہونے کا ارادہ کیا تو وہ آپس میں جھگڑنے لگے اور فیصلہ کے لئے حضرت عمرؓ کے پاس پہنچے تو آپ نے کہا: اس عورت کی شرط پوری ہوگی، تو اس پر اس آدمی نے کہا کہ: تو وہ ہمیں طلاق دے دیں، تو حضرت عمرؓ نے فرمایا: "مقاطع الحقوق عند الشروط" (بخاری نے اس کا ذکر تعلیقاً کیا ہے ۱۹۷۸/۵)۔ حقوق کے سلسلہ میں قطعی فیصلے شرطوں کے مطابق ہی ہوتے ہیں۔

فقہاء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ نکاح کے تقاضوں کو پورا کرنیوالی جو بھی شرطیں لگائی جائیں اس کو پورا کرنا واجب ہوتا ہے، جیسے بیوی کو نفقہ دینا، آپس میں میل ملاپ کے ساتھ رہنا، یا اسی طرح جو عقد نکاح کے تقاضوں کو یقینی بناتے ہوں جیسے مہر ادا کرنے کے لئے کفیل یا ضامن کی شرط یا وہ شرطیں جو شرعی طور پر جائز ہیں، جیسے بیوی کی عصمت اپنے ہاتھ میں رکھنے کی شرط، یا عرف صحیح میں جو شرطیں رکھی جاتی ہیں، جیسے مہر فوراً ادا کرنا یا قسطوں پر یا کچھ نقد اور کچھ ادھار ادا کرنے کی شرط، فقہاء ایسی شرطوں کو فاسد قرار دینے پر بھی متفق ہیں جو عقد نکاح کے تقاضوں کے برخلاف ہو، جیسے شرط لگانا کہ مسلمان بیوی کا وراثت میں حصہ نہیں ہوگا، شوہر اس کو نفقہ نہیں دے گا، یا میل ملاپ کے ساتھ رشتۂ ازدواج نہیں نبھائے گا، یا بغیر مہر کے شادی کرے گا یا خود بیوی اخراجات کی ذمہ دار ہوگی وغیرہ وغیرہ۔ اسی طرح ایسی شرطوں کو فاسد قرار دینے پر بھی متفق ہیں، جس کے فساد پر نص شرعی موجود ہو، مثلاً بیوی کا اپنے سوکن کو طلاق دینے کی شرط، بعض حنابلہ کا قول اس مسئلہ میں استثناء کا ہے (بدائع ۲؍۲۵۶، فتح القدیر ۳؍۱۰۴، حاشیۃ الدسوقی ۲؍۲۳۸، المغنی ۷؍۱۴۱)۔ کیونکہ وہ اس شرط کے جواز کے قائل ہیں۔

پھر فقہاء کرام کی آراء ان عمومی شرطوں کے سلسلہ میں مختلف بیان کی جاتی ہیں، جو عقد نکاح کے تقاضوں کے نہ تو منافی ہیں نہ ہی نکاح کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہیں اور نہ ہی مقاصد نکاح میں خلل پیدا کرنے والی اور تقاضائے نکاح کو یقینی بنانے والی ہیں، اور نہ ہی ایسی ہیں جن پر شریعت نے جواز یا بطلان کا حکم لگایا ہے اور نہ ہی عرف صحیح کی صنف میں آتے ہیں، مثلاً بیوی کا شہر سے باہر سفر نہ کرنے کی شرط لگانا یا اس کے باہر نہ نکلنے کی شرط رکھنا، یا اس کی زندگی میں دوسری شادی نہ کرنے کی شرط، یا کسی مخصوص شہر میں قیام کرنے کی شرط، یا اس کا اپنی ملازمت کو برقرار رکھنے کی شرط یا آئندہ ملازمت اختیار کرنے کی شرط وغیرہ۔

اس سلسلہ میں فقہاء کی دو رائیں ہیں: (۱) شرط باطل ہے (۲) شرط صحیح ہے۔

(۱) **بطلان شرط:** کیونکہ عقد نکاح میں بغیر کسی نص شرعی کے کوئی بھی شرط لگانا درست نہیں ہے، ہاں ایسی شرط لگا سکتا ہے جو نکاح کے عینی تقاضوں کو پورا کرنے والی اور نظام شریعت سے ہم آہنگ ہو، کیونکہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''کل شرط لیس فی کتاب الله فهو باطل'' (بخاری عن عائشہ رضی اللہ عنہا ۱،۱۷۴، رقم الحدیث ۴۴۴، البیہقی ۷،۱۳۲، فی قصة بریرة)۔ جو شرط کتاب اللہ کے مخالف ہو وہ باطل اور مردود ہے۔ باطل شرط وہی ہوتی ہے جو کتاب اللہ سے ماخوذ شریعت کے قواعد و اصول کے مخالف ہو اور کتاب اللہ سے مراد شریعت اسلامی ہے۔ یہ رائے احناف، شوافع اور جمہور مالکیوں کی ہے، لیکن کچھ مخصوص حالات میں بعض لوگ شرط پوری کرنے کے استحباب کے قائل ہیں، مثلاً بیوی کا سفر نہ کرنے کی شرط، یا گھر سے باہر نہ لے جانے کی شرط، یا سوکن نہ بنانے کی شرط۔

۲۔ **صحت شرط:** کیونکہ عام شرعی اصول کے پیش نظر زوجین کو باہمی رضامندی سے اپنی مصلحتوں کے پورا کرنے میں شرائط رکھنے کی آزادی حاصل ہے، یہی رائے حنابلہ اور بعض مالکی، امام اوزاعی اور ابن شبرمہ کا ہے، کیونکہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے: ''المسلمون عند شروطهم إلا شرطا أحل حراما أو حرم حلالا'' یہ اصول ان تمام شرطوں کو شامل ہے جو عقد نکاح اور اصول شریعت کے مخالف نہیں ہیں اور جن کا فائدہ زوجین کو ملتا ہے۔ (دیکھئے: شرح قانون الأحوال الشخصیة للسباعی ۱؍۱۰۸، شرح قانون الأحوال الشخصیة للسرطاوی: ۱۳۵، المدخل الفقہی العام للزرقاء ۱؍۳۳۲۔۳۶۱، زاد المعاد ۴؍۸، أعلام الموقعین ۱؍۴۰۰)۔

میرے نزدیک دوسرا قول قابل ترجیح ہے، کیونکہ یہ عقود کے بارے میں قرآن کریم کے مقرر کردہ اختیار و ارادہ سے قریب ترین اور ہم آہنگ ہے، جس میں کہا گیا: ''إلا أن تكون تجارة عن تراض منكم'' مگر ایسی تجارت جو تمہاری باہمی رضامندی سے طے پائے اور یہ حدیث سے بھی ثابت ہے، جائز مصلحتوں کو پورا کرنے کے مماثل بھی ہے، نیز عقود مالیاتی امور، اور بین الاقوامی معاہدوں اندرون و بیرون ملک کاروبار اور تمام ذاتی تصرفات میں موجودہ دور کے علماء کا رجحان اسی جانب ہے۔

تیسری بحث

بیوی کی ملازمت اور کام کے نتیجہ میں پیدا ہونے والے اختلافات

جن چیزوں سے عمومی طور پر زوجین کے مابین اختلافات جنم لیتے ہیں ان کے جہاں بے شمار اسباب ہیں ان میں سے آپ بیوی کا گھر سے باہر ملازمت یا مزدوری کرنا بھی ہے، جو صرف الفت ومحبت اور فدائیت کے لئے سم قاتل ہی نہیں ہے بلکہ اس سے بغض وحسد اور کینہ کپٹ جیسی مہلک بیماری بھی پیدا ہوتی ہے اور کبھی کبھی اختلاف ونزاع کے اثرات اس قدر بڑھ جاتے ہیں کہ معاملہ کورٹ تک پہنچ جاتا ہے اور طلاق کی نوبت آجاتی ہے، ذیل میں اس کے اہم پہلوؤں کا جائزہ لیا جائے گا۔

ا۔ تنخواہ یا آمدنی پر زوجین کا اختلاف:

ازدواجی تعلقات میں دراڑ پیدا کرنے والی اہم وجوہات میں سب سے اہم وجہ ملازمت کرنے والی عورت کی تنخواہ ہے، آیا اس کا سب سے زیادہ حق دار کون ہے، بالخصوص جب شوہر کی مالی حالت خراب ہو یا کہ شوہر کی فطرت ہر چیز پر ہاتھ مارنے اور اسے اپنی ملکیت سمجھنے کی ہو، یا سماج میں عموماً اور زوجین کے مابین خصوصاً مادیت کا رجحان غالب ہو، ایک طرف خودغرضی کے مظاہر ہوں تو دوسری جانب انسیت، میل جول، اخلاص اور باہمی تعاون کا نقدان ہو اور شاید زوجین کے مابین باہمی تعاون وتفاہم کا فقدان ہی بیوی کی آمدنی اور تنخواہ پر جھگڑنے کی اہم وجہ ہوتی ہے۔

کیونکہ عورت جب یہ سمجھتی ہے کہ اسے کام میں مشقت اور تھکاوٹ جھیلنی پڑ رہی ہے تو اپنی کمائی پر اسے مکمل حق کیوں نہ ہو، اسے جیسے چاہے خرچ کیوں نہ کرے، اس کو اپنی اہلیت، قدرت اور وجود پر ناز کیوں نہ ہو، اس کی اپنی مستقل حیثیت کیوں نہ ہو، بالخصوص وہ اپنی ذاتی زندگی کی ضروریات یا کام وغیرہ کے تعلق سے دوسری ذمہ داریوں کو پورا کیوں نہ کرے، یا یوں کہہ لیں کہ اس کی اپنی ان ذمہ داریوں کا بھی احساس ہونے لگتا ہے جو اس کے ماں، باپ بھائی، بہن اور دیگر رشتہ داروں کی مدد کے تعلق سے ہو، یا صدقہ وخیرات اور نیکی کے اعمال وغیرہ میں حصہ لینے کی خواہش سے ہو، یا مستقبل میں درپیش اندیشوں سے، نبرد آزما ہونے سے مثلاً طلاق یا شوہر کی موت وغیرہ جیسی صورتحال سے دوچار ہوجائے۔

شوہر کی نگاہ بیوی کی تنخواہ اور آمدنی پر ہوتی ہے، وہ چاہے گا کہ اس کی آمدنی فیملی کی ضروریات اور معیار زندگی کو بہتر بنانے میں صرف ہو، نہ تو اس پر کوئی حق جمائے اور نہ ہی فیملی سے باہر کا کوئی شخص اس میں مداخلت کرے، کیونکہ اسی کی اجازت سے ملازمت کررہی ہے اور تنخواہ کی لالچ میں ہی اس نے بیوی کو گھر کی ذمہ داریوں سے دستبردار کیا ہے اور اس کے بدلہ گھر کے اخراجات بڑھ جانے کے بوجھ کو برداشت کررہا ہے، اسی کمائی کی لالچ میں امور خانہ داری میں حصہ لے رہا ہے۔

بیوی کے اہل خانہ یہ سمجھتے ہیں کہ مکمل تنخواہ یا تنخواہ کے کچھ حصہ پر ان کا بھی حق ہے، کیونکہ انہیں لوگوں نے عورت کی تعلیم وتربیت پر خرچ کیا اور اسے اس لائق بنایا کہ وہ سرٹیفکٹ اور پھر ملازمت حاصل کرسکے، لہٰذا اس محنت کا پورا کا پورا پھل انہیں ملنا چاہئے، یا کم از کم ان کی اور بیٹی کے مابین تقسیم ہو، یا صرف بیٹی ہی کو ملے اور اکثر وبیشتر بیوی ان کی امیدوں اور سپنوں کو پورا کرنے میں شریک ہوجاتی ہے، نیز یہ بھی ان کا گمان ہوتا ہے کہ شوہر تنخواہ کا ذرہ برابر بھی نہ تو حق دار ہے نہ تصرف کا حق رکھتا ہے اور نہ ہی اس میں شیئر کرسکتا ہے اور بسا اوقات ماں باپ لڑکی کی تنخواہ کی لالچ میں اس کی شادی سے بھی گریز کرتے ہیں۔

اس طرح کی مشکلات رونما ہوتے ہیں اور کبھی کبھی سنگین بن جاتے ہیں اور ہر شخص کی نظر سے اس مقدس ازدواجی زندگی کے بنیادی مقاصد اوجھل ہونے لگتے ہیں جو الفت ومحبت میل جول افزائش نسل، خوشی اور غم میں شرکت، باہمی ایثار وقربانی کا جذبہ، زندگی کی تکلیفوں، بچوں کی پرورش اور خاندان کی تعمیر وغیرہ میں پنہاں ہیں۔

اکثر وبیشتر زوجین کے مابین اختلافات اور شکایتیں جنم لینے کی دو بنیادی وجہیں ہوا کرتی ہیں۔

۱۔ زوجین کے مابین مالی تعلقات کی ضابطہ بندی کرنے کی اسلامی تعلیمات واحکامات سے ناواقفیت اور بیوی اور فیملی کے نفقہ واخراجات کے سلسلہ میں اسلام کے قائم کردہ حدود سے لاعلمی اور شادی کے شرعی حقیقی اغراض ومقاصد سے جہالت۔

۲۔ نکاح کے وقت زوجین کے مابین بیوی کی ملازمت اور تنخواہ کے سلسلہ میں مکمل وضاحت یا تفاہم کا فقدان۔

خلاصہ کلام یہ کہ بیوی کی رضامندی اور منظوری کے بغیر شوہر بیوی کی کسی طرح کی دولت میں حقدار نہیں ہے، چاہے وہ دولت زمین وجائیداد کی شکل میں ہو یا نقد روپیوں کی شکل میں اور نہ ہی اس کی تنخواہ میں کسی طرح کا حقدار ہے، کیونکہ بیوی کی اپنی ذاتی محنت اور کام کی کمائی ہے۔

لیکن کیا شوہر بیوی کو گھر کے اخراجات میں شریک کرنے کا مطالبہ کرسکتا ہے یا نہیں؟ یا وہ بیوی کو کام اور ملازمت کی اجازت دینے کے عوض اس کی آمدنی کا کچھ حصہ لینے کی شرط لگاسکتا ہے یا نہیں؟ ذیل میں اس کی تفصیلات پیش کی جارہی ہیں:

۲۔ فیملی اور گھر کے اخراجات میں ملازمت کرنے والی بیوی کی حصہ داری:

اسلام نے زوجین کے مابین مالی تعلقات کی بھی ضابطہ بندی کردی ہے اور الگ الگ دونوں کے مال کے درمیان حد فاصل مقرر کی ہے جس کی وضاحت گذشتہ سطور میں ہوچکی ہیں، یہ بعینہ وہی فاصلے اور ضابطے ہیں جو دو الگ الگ فرد کے مابین مقرر کئے گئے ہیں، تاکہ ازدواجی زندگی میں مالی ناحیہ سے کوئی اختلاف رونما نہ ہوسکے۔

شریعت اور قانون میں اصول یہ ہے کہ بیوی کو اس بات پر مجبور نہیں کیا جاسکتا کہ وہ اپنے شوہر کو اپنے مال یا تنخواہ میں سے کچھ دے، ہاں اگر بیوی باہمی تفاہم کی بنیاد پر یا خوش دلی اور اپنے اختیار سے دیتی ہے تو کوئی حرج کی بات نہیں۔

اسلام نے شوہر کو بیوی کے اخراجات کا مکلف بنایا ہے، بیوی کا کام شوہر، بچوں اور امور خانہ داری کو نبھانے ہی کا ہے، لہٰذا شوہر فیملی کے اخراجات کے لئے بیوی کے ذاتی مال میں تصرف اسی وقت کرسکتا ہے جب بیوی کی رضامندی ہو، معلوم یہ ہوا کہ نفقہ کی ذمہ داری شوہر پر ہے جو بیوی کے امور خانہ داری کی انجام دہی کے عوض میں واجب ہے اگرچہ بیوی مالدار ہی کیوں نہ ہو۔

لیکن اگر عورت کام کے لئے گھر سے نکلتی ہے تو موجودہ معاشرتی اور معاشی صورتحال کے پیش نظر حالات بدل جاتے ہیں، نتیجۃً سب سے پہلے بیوی کے ذاتی اخراجات کی ذمہ داری شوہر پر باقی نہیں رہی (باستثناء باہمی اتفاق اور رضامندی کے) اور پھر بیوی کے اوپر گھر کے تمام اخراجات میں حصہ لینا بھی واجب ہوجاتا ہے، کیونکہ کام کے لئے نکلنا گھر کے مزید اخراجات کا سبب بنتا ہے، مثلاً کھانے پینے کا خرچ، لباس و پوشاک کا خرچ، ٹرانسپورٹ اور اسکول کا خرچ، نرسری، خادمہ اور نرس میڈ کا خرچ وغیرہ۔ نیز کام پر نکلنے سے گھر شوہر اور بچوں کے تئیں ذمہ داری نبھانے میں کمی اور کوتاہی بھی ہوگی، ایسی صورت میں مناسب نہیں لگتا کہ صرف شوہر ہی فیملی کے مکمل اخراجات برداشت کرے بالخصوص جب اسکی آمدنی محدود و متعین ہو، کیونکہ ازدواجی زندگی ایک کوآپریٹو کمپنی کی مانند ہے، جس میں زندگی کے مشترکہ ذمہ داریوں کے تحمل میں بیوی شوہر کا تعاون کرتی ہے، اس کے لئے ضروری ہے کہ دونوں مشترکہ تعاون اور خوش دلی کے ساتھ اپنی اور بچوں کی باوقار زندگی کے حصول، اپنی ضروریات کی تکمیل، بچوں کی تعلیم وتربیت کے اخراجات اور خاندان کی معاشی ترقی کے لئے منصوبہ بندی وغیرہ جیسے اہم امور میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیں، کیونکہ ایسی ہی صورت میں فقہی احکامات اور شرعی آداب واصول کی صحیح تطبیق ہوگی اور مستقبل میں متوقع نزاع اور اختلاف سے بچنے کے امکانات ہوں گے۔

ملازمت کرنے والی بیوی کی تنخواہ میں سے شوہر اور بچوں کا بھی حصہ ہوگا، کیونکہ وہ چاروناچار کام کے نتیجہ میں اپنی گھریلو ذمہ داریوں سے دست بردار ہورہی ہے، تبھی تو شوہر اور بچے بالعموم گھر کی صفائی، کپڑوں کی دھلائی، کھانے کی تیاری وغیرہ میں شریک ہوتے ہیں، یہی نہیں بلکہ بسااوقات بچوں کو ماں کی ملازمت کی وجہ سے نگہداشت اور تربیت کا فقدان بھی محسوس ہوتا ہے، جو شوہر اور بچوں کی مزید مادی اور معنوی بوجھ میں اضافہ کا سبب بنتا ہے۔

اگر بیوی شوہر کی اجازت سے گھر چھوڑ کر کام کے لئے جاتی ہے اور اس کے عوض میں اپنی کمائی کا کچھ حصہ فیملی کے اخراجات میں لگاتی ہے تو باہمی رضامندی سے بالکل درست ہے اور جتنی مقدار کا مکلف بیوی نے خود کو کیا ہے اس کا لگانا ضروری ہے، کیونکہ شوہر نے گویا اس حصہ داری کے عوض اپنے بعض حقوق سے تنازل اختیار کرلیا ہے، اخراجات میں حصہ داری کی مقدار کی تعیین وضاحت زوجین کے مابین ضروری ہے اور پھر اس اگریمنٹ کو نافذ کرنا ضروری ہے، اس پر نہ زوجین کو اور نہ ہی کسی اور کو اعتراض کا حق حاصل ہے، بناء بریں شوہر طے شدہ مقدار سے زیادہ کا مطالبہ نہیں کرسکتا، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: "المومنون عند شروطهم" "مسلمان اپنی شرطوں کے پابند ہوتے ہیں۔

زوجین اگر آپس میں طے کرلیتے ہیں کہ ملازمت کرنے والی بیوی گھر چھوڑنے اور بال بچوں کے حقوق کی عدم ادائیگی کے عوض گھر کے اخراجات میں شریک ہو تو اس میں نہ تو شرعی اور عقلی مضائقہ نظر آتا ہے اور نہ ہی قانونی اور عرفی، اس کے لئے زوجین اچھے ماحول میں باہم مشورہ کرلیں اور گھر کی تعمیر وترقی اور

مستقبل سازی کے لئے ایک دوسرے کے معاون اور مددگار ہوں، اگر عرف میں زوجین کے مابین اس طرح کی چیزیں رائج ہوں تو ان کا تحقق رواج اور عرف عام کے مطابق خود بخود ہو جاتا ہے کیونکہ عرف عام کی ایک قوت وحیثیت ہوتی ہے اور عرف میں مشہور چیزوں کی حیثیت شرط ومشروط جیسی ہوتی ہے، اسی لئے جج بھی اختلاف ہو جانے کی صورت میں فیصلہ کرنے کے وقت اس پر اعتماد کر سکتا ہے۔

لیکن اگر آپس میں طے نہ ہو سکا اور نہ ہی عرف عام میں اس کا رواج ہو تو بیوی کی خود سے پیش کش (جس سے وہ دنیا وآخرت میں اجر وثواب کی مستحق ہوگی) اور اس کے مال وجائیداد اور تنخواہ کے ناجائز حصوں کی کوشش یا اخراجات میں حصہ لینے پر زور زبردستی کرنے کے درمیان فرق وامتیاز کرنا ضروری ہے، کیونکہ بیوی اگر برضا ورغبت اپنے مال کو لگانے کی پیش کش کرتی ہے تو یہ شرعاً مطلوب، اخلاقاً مستحسن اور عملاً مرغوب ہے، کیونکہ اس سے گھریلو ذمہ داریوں کی تکمیل، اولاد کی تربیت، باوقار زندگی کا حصول اور الفت ومحبت، باہمی تعاون اور میل جول میں پختگی آتی ہے، لیکن دوسری صورت تو قطعاً ناقابل قبول ہے، کیونکہ بیوی کے حقوق کی پامالی اور اس پر ظلم کے مترادف ہے، اور اس کے مرتکب سے قانوناً اور دیانتاً باز پرس کی جائے گی۔

ملازمت کرنے والی بیوی کے گھریلو اخراجات میں شریک وسہیم ہونے کی بات طے ہو جانے کے بعد پھر اگر بیوی انکار اور منع کردے تو قانونی اور شرعی طور پر اسے اس کا مکلف کیا جائے گا جیسے دوسرے اور معاہدوں اور تکلیفات کی عدم ادائیگی میں مکلف کیا جاتا ہے، لیکن آخری فیصلہ مجبور کرنے کا نہیں ہوگا، کیونکہ یہ باہمی الفت وشفقت کے منافی ہے، بلکہ معاملہ کو مصالحت اور بات چیت سے سلجھایا جائے گا تاکہ اہل خانہ کے مابین ہم آہنگی اتفاق رائے اور سکون وسعادت کی فضاء برقرار رہے، ہاں اگر قاضی مجبور ہو کہ اختلاف کا فیصلہ حق وانصاف وعرف عام کے تقاضوں کے مطابق ہو تو پھر اسے مجبور کیا جا سکتا ہے، کیونکہ عورت ہی بالعموم شوہر کی اجازت سے (صراحتاً یا ضمناً) گھر سے نوکری کے لئے نکلی ہے اور شوہر نے اپنے کچھ حقوق سے بیوی کی تنخواہ کے کچھ حصہ کے عوض تنازل اختیار کیا ہے تاکہ اس سے گھریلو اخراجات کا بوجھ کم ہو سکے۔

اس وقت اسلامی ملکوں میں موجود عام رواج یہی ہے کہ ملازمت کرنے والی بیوی اپنے شوہر اور بچوں کے اخراجات میں شیئر کرتی ہے، بالخصوص جب فیملی ضرورت مند ہو، لیکن اگر فیملی کو اس کی ضرورت نہ ہو تو عورت اپنے والدین کو بطور صلہ رحمی اور حسن سلوک کے کچھ عطا کرتی ہے، جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے "وآت ذی القربی حقہ" (سورہ اسراء: ۲۶) اور قریبی رشتہ داروں کو ان کا حق دو، لیکن اگر بیوی اپنے والدین کی مدد پر اکتفا کرتی ہے اور شوہر اور بچوں کا تعاون ضرورت مندی کے باوجود نہیں کرتی تو شوہر کو بیوی کے کام سے روکنے کا حق حاصل ہے الا یہ کہ نکاح میں اس کام کی شرط رکھ دی گئی ہو۔

۳- بیوی کو اپنی تنخواہ سے کچھ مقدار دینے کے لئے مکلف کرنے کی شوہری حق کی حد:

بیوی کو گھر سے باہر کام کرنے کی اجازت دیتے وقت شوہر بنیادی طور پر یہ سمجھتا ہے کہ اس کی تنخواہ میں سے اس کا بھی کچھ استحقاق ہے، جسے وہ اپنی بیوی کو گھر میں نہ روکنے اور اپنی ضروریات کی انجام دہی سے دستبردار ہونے کے عوض میں تصور کرتا ہے، اس لئے اگر باہمی رضامندی محبت اور مفاہمت سے بات طے ہو جائے تو بہت اچھا ہے، اس میں کسی اور کے زور وزبردستی کرنے کی بات بھی سامنے نہیں آئے گی اور ہم آہنگی الفت اور مشترکہ تعاون بھی باقی رہے گا اور اکثر بیشتر زندگی میں ایسا ہی ہوا کرتا ہے، لیکن بیوی بسا اوقات اس ڈیمانڈ سے انکار کر بیٹھتی ہے اور محنت ومشقت سے کمائی ہوئی آمدنی کی مکمل حق دار بنے رہنے پر اصرار کرتی ہے، اس دلیل کے ساتھ شوہر ہی تنہا گھر کے اخراجات اور فیملی کا ذمہ دار ہے، یا یہ کہ وہ شوہر کے حقوق، گھر اور تربیت وغیرہ کی ادائیگی میں کوتاہی نہیں کرتی یا اکثر حقوق اور ذمہ داریاں پوری کرتی ہے یا وہ بھی ان میں شریک وسہیم ہوتی ہے یا شوہر سے گھریلو ذمہ داریوں میں شیئر کرنے کا بھاؤ تاؤ کرنے لگتی ہے، یا شوہر کے خرچ پر نوکرانی سے گھریلو کام کروانے کے لئے (خوبصورت انداز سے) مجبور کرتی ہے۔

اگر ان صورتوں میں شوہر بہ رضا ورغبت یا تکلفاً یا اجبار لطیف کو مانتے ہوئے یا متوقع شر سے بچتے ہوئے بیوی کی بات مان لیتا ہے تو یہ شوہر کی عنایت اور ذرہ نوازی ہے، اس سلسلہ میں نہ تو کوئی اختلاف ہے اور نہ کوئی رکاوٹ اور نہ ہی کسی کو مداخلت کرنے کا حق ہے اور اس کا اجر دنیا وآخرت میں شوہر کو ضرور ملے گا۔

لیکن اگر شوہر انکار کر رہا ہے اور اپنے موقف پر ڈٹ گیا ہے، پھر بھی بیوی تنخواہ میں سے دینے کے لئے تیار نہیں ہے تو پھر اس کا کیا حل ہو سکتا ہے؟ اس کے جواب میں چند احتمالات ذکر کئے گئے ہیں جن میں اہم درج ذیل ہیں:

۱۔عقد نکاح کے وقت پوری تنخواہ بیوی کی ملکیت ہونے کی شرط:

اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ بیوی شرط لگادے کہ شادی کے بعد ملازمت کرے گی، یا اس ملازمت کو جاری رکھے گی جو شادی سے قبل کررہی تھی اور شوہر اس کی منظوری دے، ماحصل یہ کہ زوجین کے مابین تنخواہ اور نفقہ کی شکلوں کا تعین ہوجائے، چاہے تنخواہ پوری کی پوری عورت کے پاس ہی کیوں نہ رہے یا یہ کہ تنخواہ کی مکمل حق دار وہی ہے، اس میں جیسے چاہے تصرف کرے، چاہے شوہر پر بیوی کے نفقہ کا وجوب باقی رہے یا کلی یا جزئی طور پر خرچ ساقط ہوجائے یا تنخواہ شوہر کی آمدنی میں شامل کرکے گھر کی ضروریات میں خرچ کی جائے، بہر کیف دونوں باہمی اتفاق سے ایک نتیجہ پر پہنچیں۔

یہ اتفاق درست اور طرفین کے لئے واجب العمل ہے اور زوجین کی زندگی کے لئے یہی بہترین شکل ہے، اس سے دونوں کے مابین مفاہمت ومودت، محبت اور تعاون کا جذبہ برقرار رہے گا اور سکون کی فضا قائم رہے گی، نیز شیطانی وسوسوں اور اختلافات کی بیخ کنی کے لئے بھی سب سے کارآمد طریقہ ہے، لیکن اس طریقہ کو نافذ العمل بنانا اور وعدوں کو پورا کرنا واجب ہوگا، کیونکہ عہد وپیمان متعاقدین کے لئے قانونی حیثیت رکھتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے "یا أیھا الذین آمنوا أوفوا بالعقود" (المائدہ:۱)۔

۲۔عقد نکاح کے بعد پوری تنخواہ بیوی کی ملکیت ہونے کی شرط:...... اگر بیوی نے عقد نکاح کے وقت گھر کے باہر کام اور ملازمت جاری رکھنے کی شرط نہیں رکھی، بلکہ شادی کے بعد اس پر اتفاق ہوا ہے اور بیوی نے شرط رکھی ہے کہ بغیر کسی قید وشرط کے تنخواہ اسی کی ملکیت میں ہوگی اور شوہر نے رضامندی کا اظہار کردیا تو اس کا حکم بھی سابقہ حکم جیسا ہوگا اور تنخواہ کے کسی حصہ کا بھی مستحق شوہر نہیں ہوگا، کیونکہ اس نے اس کو گھر میں روکنے سے تنازل اختیار کیا ہے اور تنخواہ تو بیوی کی محنت کا پھل ہے شوہر نفقہ کا شرعی طور پر مکلف ہے۔

۳۔زوجین کے مابین تنخواہ میں حصہ داری پر اتفاق:

اس کی شکل یہ ہے کہ زوجین عقد نکاح سے پہلے یا بعد میں تنخواہ کو مرضی کے مطابق فیصد کے اعتبار سے اپنے مابین یا کسی اور کو شریک کرکے تقسیم کرلیں، یا ملازمت کی اجازت دیتے وقت شوہر تنخواہ کا کچھ حصہ لینے کی شرط لگادے اور بیوی اس شرط پر اتفاق کرے تو ایسی صورت میں یہ اتفاق بھی (سابقہ دونوں شکلوں کی طرح) صحیح اور واجب العمل ہوگا، کیونکہ شوہر نے تنخواہ کے کچھ حصہ کے بدلہ اس کو گھر میں روکنے سے تنازل برت لیا ہے اور بیوی نے بھی اس پر اتفاق کرلیا ہے، لہٰذا بیوی کے لئے یہ معاہدہ پورا کرنا واجب ہوگا کیونکہ شرطوں کو پورا کرنا مسلمانوں پر لازم اور فرض ہے۔

یہ تینوں شکلیں زوجین کی زندگی میں تفاہم، محبت، تعاون، الفت اور راحت وسعادت کے لئے نہایت بہترین شکلیں ہیں، ان سے شیطانی راستے مسدود، خارجی انٹرفیر کے دروازے بند اور اختلافات کی جڑیں ختم ہوجاتی ہیں، نیز یہ شکلیں خاندان کی خوشحالی اور مسرت کے لئے مضبوط قلعہ کی حیثیت رکھتی ہیں، بالخصوص جب ان کو عملی جامہ پہنایا جائے اور شروط وقیود کو پورا کرنے کی سعی پیہم کی جائے، کیونکہ عہد وپیمان متعاقدین کے لئے قانون کا درجہ رکھتے ہیں اور ارشاد باری تعالیٰ ہے: "یا أیھا الذین آمنوا أوفوا بالعقود" نیز مومنین کے اوصاف میں بتایا گیا ہے "والموفون بعھدھم إذا عاھدوا"۔

۴۔تنخواہ کے سلسلہ میں نہ تو پہلے نہ بعد میں کوئی اتفاق ہوا ہو:

اگر بیوی کی تنخواہ کے بارے میں نہ تو پہلے نہ بعد میں کوئی بات طے ہوئی ہو تو اس کی دو شکلیں ہیں:

پہلی شکل، بیوی اپنی تنخواہ شوہر اور اولاد کے لئے خوشی اور رضامندی سے صرف کرے، جیسا کہ عام طور پر اس وقت ہورہا ہے تو وہ ایسا کرسکتی ہے، کیونکہ وہ مال اس کی ملکیت اور تصرف میں ہے، اور ایسا کرنے پر وہ اجر وثواب اور نیک نامی کی مستحق ہوگی، نیز اس سے زوجین کے مابین ہم آہنگی، استحکام اور اہل خانہ کے مابین اعتماد میں مزید پختگی پیدا ہوگی۔

دوسری شکل یہ ہے کہ بیوی شوہر کو اپنی تنخواہ میں سے کچھ دینے سے منع کردے اور اس بارے میں پہلے سے کوئی معاہدہ نہ ہوا ہو تو وہ ایسا کرسکتی ہے اور شوہر کو مطالبہ کا کوئی حق نہیں رہتا کیونکہ کام کی اجازت دینے کے وقت اس نے اس طرح کی کوئی شرط نہیں رکھی تھی، لہٰذا اسے بلاعوض اپنے حق احتباس سے تنازل برتنے والا قرار دیا جائے گا اور چونکہ تنخواہ کی مستحق مکمل طور پر بیوی ہے، اس لئے اسے تنازل اختیار کرنے پر مجبور نہیں کیا جاسکتا۔ اس کے باوجود شوہر اگر مطالبہ کرتا ہے تو یہ سراسر ظلم وزیادتی ہے اگرچہ شوہر اسے شرم وحیاء جیسے جذباتی حیلوں بہانوں سے حاصل کرنے کی کوشش کرے، کیونکہ تنخواہ بیوی کی محنتوں اور کاوشوں کا ثمرہ ہے،

اسے ہی اس میں تصرف مطلق کا حق ہے، چاہے تو اس کو رکھے یا ڈونیٹ کردے، یا استعمال کرے یا انوسٹ کرے، شرعی طور سے وہ شوہر کو سپورٹ کرنے کی مکلف نہیں ہے۔

چوتھی بحث

زوجین کا اپنے حقوق کے استعمال میں تشدد آمیز رویہ

گذشتہ سطروں میں ازدواجی حقوق کو قرآن وسنت اور اجتہاد امت سے ہم ثابت کر چکے ہیں کہ اگر ہر انسان اپنے حقوق کی انجام دہی صحیح طور پر کرنے لگے تو اس دنیا میں وہ خوشیوں اور مسرتوں سے مالا مال ہوجائے اور آخرت میں اللہ تعالیٰ کی خوشنودی سے سرفراز ہوجائے اور کورٹ کچہری کی نوبت ہی نہ آئے، لیکن اکثر و بیشتر انسان اپنے جائز اور متعین حق سے آگے بڑھنے لگتا ہے یا اپنے حق واختیار کا غلط استعمال کرنے لگتا ہے، یا عملی طور پر ظالمانہ رویہ اختیار کرلیتا ہے، جس سے زوجین کا گھر بے اطمینانی، بدحالی، تذبذب اور اختلافات کا شکار ہوجاتا ہے:

یہاں پر ہم بیوی کی ملازمت کی وجہ پیدا کرنے والے ازدواجی اختلافات کے کچھ نمونے بیان کررہے ہیں۔

ا۔ قوامیت میں ظلم وتشدد:

بلاشبہ مرد کا عورت پر قوامیت کا حق شرعاً مقرر اور ثابت ہے، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا عورت پر ظلم کیا جائے، اس کے ارادہ واختیار سے اس کو محروم کردیا جائے اور اس کے تشخص کو ختم کردیا جائے، کچھ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ قوامیت مردوں کو عورتوں پر مسلط کردینے کا نام ہے، انہیں عورتوں کے ساتھ تعامل کرنے میں مکمل آزادی حاصل ہے، اگرچہ معاملہ ظلم واستبداد کی حد تک کیوں نہ پہنچ جائے گویا عورت باندی لونڈی یا تحفہ کی نوکرانی ہے اسے محض حکم کے اشاروں پر چلنا ہے، وہ اپنی عورتوں کو اسی غلط نقطہ نظر سے دیکھتے ہیں اور اپنی مرضی ان پر بغیر مشورہ ڈسکس، خواہش اور ارادے کے تھوپنے لگتے ہیں، جس سے عورت زندگی سے مایوس ہونے لگتی ہے، بلکہ بسا اوقات اس کا الٹا اثر یہ ہوتا ہے کہ اس کا ذہن شوہر کے تئیں تمردانہ ہونے لگتا ہے اور بالخصوص جب اس کے پاس کمائی کا ذریعہ ہو تو غلط رجحان اختیار کرنے لگتی ہے، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ شوہر کی اطاعت کو حماقت کا درجہ دینے لگتی ہے، کیونکہ اسے لگتا ہے کہ میں شوہر کے ہاتھ کی گڑیا یا کھلونا ہوں جب اور جیسے چاہا استعمال کرکے رکھ دیا، پھر حمل وولادت اولاد کی تربیت رضاعت اور پرورش سے گریز کرنے لگتی ہے اور پھر اس کا نصب العین اسلامی اصول واخلاق سے عاری ایک آزاد خیال ملازمت کرنے والی یورپین عورت بننے کا ہوجاتا ہے، اور بالآخر آزادی کے ساتھ برابر سرابر معاملہ کرنے پر اتر آتی ہے۔

اسی طرح کچھ بیویاں مرد کی قوامیت کی نااہلی کا غلط فائدہ اٹھانے لگتی ہیں شوہر کی اطاعت ان کے لئے کوئی معنی نہیں رکھتی اور اس کی رہنمائی کی مخالفت شیوہ بن جاتی ہے، نتیجۃً شادی خانہ آبادی کے بجائے خانہ بربادی ہوجاتی ہے، پھر شوہر کے اندر نخوت وحمیت کا احساس ہوتا ہے اور اسے یہ گوارہ نہیں ہوتا کہ اس پر عورت کی حکمرانی چلے، دونوں طرف آگ کا بھڑکاؤ دن بہ دن بڑھتا جاتا ہے، پھر شوہر ہی کو تنازل اختیار کرنا پڑتا ہے اور بیوی کے لئے قربانی دینے لگتا ہے کیونکہ وہ یہ سمجھتا ہے کہ عزت نفس ایک پاکدامن لڑکی کی مانند ہے جو داغ دھبے کو گوارہ نہیں کرسکتی اور اس پر زیادتی ناقابل معافی جرم ہے اور پھر گھر کی بربادی اور ازدواجی زندگی کی تباہی پر کہانی ختم ہوجاتی ہے۔

جب کہ حقیقت یہ ہے کہ قوامیت ان غلط تصورات سے بعید تر ہے، یہ ایک سلیقہ مند اور منظم قیادت ورہنمائی کا نام ہے، اس کے اندر گھر اور خاندان چلانے اور زندگی کو مستحکم بنانے کی ذمہ داری (Responsibility) ہوتی ہے، نیز اس میں کچھ لمیٹ (حدود) بھی ہیں جن کی پابندی واجب ہے، سب کے سب آرڈر اور قیود وحدود ہی نہیں ہوتے، یہ قوامیت ایک سرپرست کی قوامیت کے مشابہ ہوتی ہے جس میں حاکم کا محکومین سے افضل ہونا ضروری نہیں ہوتا، لیکن چونکہ یہ ایک ضرورت ہے جو معاشرتی زندگی کے لئے نہایت ضروری ہے، ایک مومن شخص اوروں پر علم وفضل اور دین داری میں چاہے کتنا ہی فائق ہو اپنی بیوی پر زیادتی کرنے سے گناہگار ہوجائے گا، شوہر کا عورت پر قوامیت سے قطعاً نتیجہ نہیں نکل سکتا کہ مرد دین وتقوی میں عورت سے افضل ہے، کیونکہ عورت علم وتقوی اور مرکزیت میں مرد سے بھی فائق ہوسکتی ہے، ہر شخص اپنے عمل کی اچھائی اور کرتوت کی وجہ سے ہی بہتر مانا جاتا ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری ہے ''فاستجاب لهم ربهم أني لا أضيع عمل عامل منكم من ذكر أو أنثى بعضكم من بعض، الخ الآية'' (آل عمران: ۱۹۵) پس ان کی دعا کو ان کے

پروردگار نے قبول کرلیا۔ اس لئے کہ میں تم میں سے کسی عمل کرنے والے کے خواہ مرد ہو یا عورت عمل کو ضائع نہیں ہونے دیتا تم آپس میں ایک دوسرے کے جزء ہو۔

قوامیت کے بنیادی تصورات میں نصح وہدایت الفت ومحبت اور ذمہ داری سنبھالنے کی اہلیت ہے۔ اس میں عزت وشرف سے زیادہ احساس ذمہ داری ہوتی ہے جسے مرد نہ تو جانبداری اور دوستی کی خاطر انجام دیتا ہے اور نہ عورت پر ظلم وزیادتی کے ساتھ، بلکہ اس لئے کہ اس کے اندر اس کی اہلیت وصلاحیت زیادہ ہے، مرد ہی بیوی کا امین ومحافظ اور مربی ومصلح ہوتا ہے اور کج روی اختیار کرنے کی صورت میں شعور وسلیقہ سکھاتا ہے (أحکام القرآن، لابن العربی ۱/ ۴۱۶، تفسیر القرطبی ۵/ ۱۶۹، تفسیر ابن کثیر ۱/ ۴۹۱)۔

کچھ لوگوں کے ذہن میں کچھ اس طور کے غلط بلکہ مبغوض تصورات پیوست ہوجاتے ہیں کہ قوامیت روز اول ہی سے تحتی زور آزمائی، دھمکی زور زبردستی، دھاک جمانے اور مار پیٹ کا نام ہے، یہ چیزیں ازدواجی زندگی کے لئے نہایت خطرناک ہیں، اس سے بیوی کے اندر خوف، بغض، کراہیت اور نفاق جیسی چیزیں جنم لینے لگتی ہیں اور زندگی سے نفرت اور بغاوت کا جذبہ پیدا ہونے لگتا ہے، مشہور عربی شاعر نے کیا خوب کہا ہے:

اگر کسی نفس کے تم مالک بن جاؤ تو اسے اتنی خوشیاں دو کہ وہ تمہارا گرویدہ بن جائے پھر دیکھو کہ وہ تمہارے اشاروں پر کیسے ناچتا ہے۔

اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان کا کوئی ثانی نہیں ہے ''خیرکم لأهله وأنا خیرکم لأهلي'' (ترمذی ۲۰۴/ ۳، أحمد ۲۵۰/ ۲، بیہقی ۷/ ۴۶۸، الحاکم ۴/ ۱۰۳)۔ تم میں سب سے بہتر وہ ہے جو اپنے اہل وعیال کے لئے بہتر ہو اور میں اپنے اہل وعیال کے لئے سب سے بہتر ہوں۔

زوجین کے لئے یہ سمجھنا ضروری ہے کہ قوامیت کا مطلب یہ ہے کہ مرد گھریلو ذمہ داریوں کا امین اور مالک ہے جبکہ عورت کو اس کے جائز مطالبات پورا کرنا فرض ہے، اسی میں دنیا وآخرت کی کامیابی مضمر ہے، امام فخر الرازی بیان کرتے ہیں ''معلوم رہے کہ نیک بیوی اسی کو کہا جائے گا جو اپنے شوہر کی مطیع وفرمانبردار ہو'' کیونکہ اللہ تعالیٰ نے صاف طور پر کہا ہے ''فالصالحات قانتات'' (سورۂ نساء: ۳۴)، نیک عورتیں وہ ہیں جو مطیع وفرمانبردار ہوں (مفاتیح الغیب ۱/ ۹۱)۔

قوامیت کے اسی متشددانہ فہم وتطبیق کے نتیجہ میں یہ چیز زوجین کے لئے نزاع کا سبب بن جاتی ہے اور اسی بنا پر آج اختلافات یا طلاق کی شرح میں تیزی سے اضافہ ہوگیا ہے، حتی کہ بذات خود قوامیت کا وجود خطرے میں پڑ گیا ہے، محض گھر کے اخراجات کی ذمہ داری ادا کرنے کا نام قوامیت نہیں ہے، بلکہ قوامیت کے اندر تحفظ، نگہداشت، رہنمائی، قیادت، قوت فیصلہ اور احساس ذمہ داری بھی آتی ہے، جس سے فیملی کی تمام مصلحتیں پوری ہوتی ہوں، اسی لئے اللہ تبارک وتعالیٰ نے قوامیت کا حق مرد کو دیا اور اس کے فرائض میں ایک فریضہ قرار دیا کیونکہ قوامیت والی آیت ''الرجال قوامون علی النساء''، قوامیت کے دو سبب کی طرف اشارہ کرتی ہے، پہلا سبب فطری ہے جو مرد کی تخلیقی اور فطری قوت وحاکمیت کو بتاتا ہے، دوسرا کسبی ہے جسے بدلا بھی جاسکتا ہے اور وہ ہے انفاق، ان دونوں میں ایک کے فقدان سے قوامیت ساقط نہیں ہوتی، کیونکہ حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ کی اہلیہ مالدار تھیں، انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنے شوہر اور اولاد کے اخراجات دینے کی گنجائش کے متعلق سوال کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اجازت دی اور انہوں نے خرچ کیا اور حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ کی قوامیت سے انکار بھی نہیں کیا۔

۲۔ حق نفقہ میں عدم رواداری:

اسلامی، عقلی، منطقی اور واقعاتی نقطۂ نظر سے مال گھر اور خاندان کی تعمیر وترقی کے لئے اہم ذریعہ ہے، شوہر کام اس لئے کرتا ہے کہ وہ فیملی کے لئے باوقار زندگی فراہم کرے اور بیوی بھی بسا اوقات گھر کے باہر اسی لئے کام یا ملازمت کرتی ہے تاکہ اپنے اور گھر کی مستقبل سازی میں حصہ لے، اس طور پر پیسہ اور کام زوجین اور فیملی کے مشترکہ مقاصد کے تحقق کا ذریعہ ہوتے ہیں نہ کہ گھر اجاڑنے اور عدم استحکام کا۔

جمہور فقہاء کا اتفاق ہے اخراجات (نفقہ) کی ذمہ داری صرف مرد پر ہے لیکن کبھی کبھی اس ذمہ داری کا غلط اور غیر منصفانہ استعمال کرتا ہے، اگر شوہر بخیل اور کنجوس ہے تو بدنیتی سے نہ سہی لیکن پھر بھی ایک پیسا خرچ کرنا اس کے لئے بہت مشکل ہوتا ہے، یا اگر بدنیت ہے تو عورت کو پریشان کرنے اور ستانے کے لئے اپنا ہاتھ تنگ کئے رہتا ہے، جس کے نتیجہ میں باہمی اختلاف، نزاع اور سرکشی کا وجود ہونے لگتا ہے، بسا اوقات ایسا شوہر بیوی کو اپنے گھر خاندان یا ان سے قریب ایسے لوگوں کے ساتھ رہنے پر مجبور کرتا ہے جو اسے ستائیں اور پریشان کریں۔

اسی طرح عورت بھی اکثر وبیشتر اخراجات کے سلسلہ میں غلو سے کام لینے لگتی ہے، فضول خرچی کا رجحان اس قدر بڑھ جاتا ہے کہ شوہر سے طرح بطرح کے مطالبات کی ایک طویل فہرست ہمیشہ تیار کئے رہتی ہے، یہاں تک کہ شوہر مطالبات کے ڈھیر میں دب کر کراہنے لگتا ہے، پھر شوہر قرضوں کے بوجھ تلے اتنا دب جاتا ہے کہ دن میں رسوائی اور رات میں غمخواری کے سوا کچھ باقی نہیں رہتا، یا پھر اس راستہ سے نکلنے کیلئے حرام راستوں کے سوا کوئی راستہ نظر نہیں آتا، یہ چیز عورت

کے لئے بسا اوقات گھر سے باہر نکلنے اور کام کرنے کا حیلہ بہانہ بن جاتی ہے اور نتیجۃً وہ گھر کی ذمہ داری چھوڑ کر اپنے جسم کی آرائش و زیبائش میں پیسہ لٹانا شروع کردیتی ہے اور اپنی سہیلیوں اور پڑوسیوں سے مقابلہ آرائی کی لت لگ جاتی ہے، پھر زوجین کے تعلقات میں بدمزگی آنے لگتی ہے بالخصوص جب بیوی اپنی آمدنی کو صرف اپنے تک محدود رکھے اور گھر کی ذمہ داریاں تربیت وغیرہ میں کوتاہی شروع کردے اور گھر میں نوکرانی اور نرس میڈ وغیرہ رکھنے کا مطالبہ کرنے لگے۔

اسی لئے قرآن کریم نے اخراجات میں میانہ روی کی ترغیب دی ہے اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ہند بنت عقبہؓ کے واقعہ میں اس کی وضاحت فرمادی، حضرت ہندؓ نے اپنے شوہر کے بخل اور مصارف میں کمی کرنے کی آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے شکایت کی، کہا: ابوسفیان بخیل آدمی ہیں وہ مجھے اور میرے بچے کو اتنا مال نہیں دیتے جس سے ہماری ضرورت پوری ہوسکے، اس لئے میں ان کی اجازت کے بغیر کچھ لے لیتی ہوں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم اس کے مال میں سے میانہ روی کے ساتھ بغیر اسراف کے اتنا لے سکتی ہو جس سے تمہارے اور بچے کی ضرورت پوری ہوجائے (البخاری ۲؍۷۷۰، ۲۰۹۷، مسلم ۱۲؍۷، بیہقی ۱۰؍۲۷۰ عن عائشہ)، معلوم ہوا کہ آپ نے شوہر کی اجازت کے بغیر لینے کا حق دیا تاکہ قانون اور عدالت کا سہارا لئے بغیر اسے اپنے اور اپنے بچے کا حق مل جائے، لیکن اسی کے ساتھ آپ نے اس حق کو "بالمعروف" سے مقید کردیا تاکہ لینے والا حق کی آڑ میں اسراف و تبذیر اور ناانصافی سے کام لینا نہ شروع کردے، نیز ارشاد باری تعالیٰ "اسکنوهن من حيث سكنتم من وجدكم" الآیۃ اور نیز فرمایا: "لينفق ذو سعة من سعته ..." (الطلاق)۔

یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ دنیا کے ہر شوہر کو بالخصوص ازدواجی زندگی کے ابتدائی مرحلوں میں شدید معاشی بحران سے دوچار ہونا پڑتا ہے، کبھی کبھی یہ پریشانی شادی کے وقت ہی سے شروع ہوجاتی ہے، ایسے ہی مواقع پر باہمی محبت، مشترکہ تعاون، ایک دوسرے کے احساسات و جذبات کو سمجھنے اور ایثار و قربانی کے مظاہر سامنے آتے ہیں، بیوی فضول خرچی سے اجتناب اور خرچ میں جو زندگی کی بنیاد ہے میانہ روی سے کام لیتی ہے، گردش زمانہ سے دوچار شوہر پر ترس کھاتی اور صبر کرتی ہے اور پھر ایک وقت ایسا آتا ہے کہ خوشحالی کے پھول ازدواجی زندگی کے آنگن میں کھلنے شروع ہوجاتے ہیں۔

لیکن بسا اوقات زوجین میں سے کوئی ایک ان حالات کا غلط فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتا ہے اور اپنے حق کے مطالبہ میں عدم رواداری اور تشدد کا طریقہ اختیار کرنے لگتا ہے، یہاں پر رب کائنات کی طرف سے عمومی نصح و ہدایت آتی ہے "ولا تجعل يدك مغلولة إلى عنقك ... الآية" (سورۂ اسراء:۲۹) اور تو نہ اپنا ہاتھ گردن میں سے باندھ لے اور نہ اسے بالکل ہی کھول لے ورنہ تو ملامت زدہ تہی دست ہوکر بیٹھ جائے گا۔ "وقال الله تعالى والذين إذا أنفقوا لم يسرفوا ولم يقتروا وكان بين ذلك قواما" (سورۂ فرقان:۶۷) اور وہ لوگ جب خرچ کرنے لگتے ہیں تو نہ فضول خرچی کرتے ہیں اور نہ تنگی کرتے ہیں اور اس کے درمیان (ان کا خرچ) اعتدال پر رہتا ہے۔

۳۔عورت کی ملازمت کے سلسلہ میں حقوق کے استعمال میں ظالمانہ رویہ:

بہت سی عورتیں عورت کی ملازمت یا کام کو صرف ایک کام کی حیثیت سے یا ذریعہ معاش یا معیار زندگی کو اونچا بنانے یا شوہر کی مالی مدد یا فیملی کے اخراجات میں شیئر یا بچوں کی تعلیم میں تعاون کی حیثیت سے ہی نہیں دیکھتیں، بلکہ یورپ کی تقلید میں کام اور ملازمت کو Self Dependent مستقل بالذات ہونے اور عورت کا "تسلط" منوانے کا ذریعہ سمجھتی ہیں، انہیں یہ زعم ہوتا ہے کہ گھر سے باہر کی دنیا میں قدم رکھنا اور ذمہ داریوں کو فیس کرنا سماج میں اس کے وجود اور تشخص کو ثابت کرنے کا ضامن ہے، نیز گھر کی ذمہ داریوں سے راحت ملنے کا ذریعہ بھی، اس کی یہ سوچ شوہر کے تسلط اور قوامیت سے بغاوت اور انتقام پر ابھارتی ہے اور وہ تمرد و عصیان کو ہتھیار بنا کر شوہر کے سامنے کھڑی ہونے لگتی ہے، کسی مشہور مصنف کے بقول: "کہ اب عورت باطنی طور پر مرد ہوچکی ہے اور مرد باطنی طور پر عورت، اسی تصور کے ساتھ اب عورت مرد سے امور زندگی میں تعامل کرتی ہے نتیجۃً مرد کو اس طرح کی زندگی جھیلنے کی سکت نہیں رہی اور اس سے چھٹکارا لینا بہتر سمجھنے لگا ہے"۔

یہی نہیں بلکہ کبھی کبھی مرد بھی عورت کی ملازمت کے تعلق سے اپنے حقوق کے استعمال میں غیر منصفانہ رویہ اپنانے لگتا ہے، اس کو بغیر کسی معقول عذر، یا کمائی اور آمدنی کی شدید ضرورت کے گھر میں مقید رکھنے کا حکم دینا ہے اور محض پریشان کرنے کے لئے کام سے روکنے کی سازش کرنے لگتا ہے، یا کام کرنے کے لئے یا مزدوری اور تنخواہ میں حصہ لگانے کے لئے یا تنخواہ پر مکمل قبضہ جمانے کے لئے یا گھر اور بچوں کے اخراجات کے لئے طرح بطرح کی شرطیں لگاتا ہے اور بسا اوقات اس کے بالکل برعکس مرد اپنی بیوی کو بغیر کسی معقول وجہ کے گھر سے نکلنے پر مجبور کرتا ہے، اسلام کی بہت سی تعلیمات شوہر کو بیوی کے ساتھ خیر خواہی اختیار کرنے کی ہدایت دیتی ہے اور عورت کو مرد کی اطاعت احترام، حکم کی بجا آوری اور اس کی اجازت بغیر گھر سے نہ نکلنے کی تاکید کرتی ہے۔

لیکن کبھی کبھی عورت کو مرد کے اپنے حقوق کے غلط استعمال کا گمان ہونے لگتا ہے، ہونا تو یہ چاہئے کہ مرد کو جس وقت عورت کی ملازمت یا کام کے بارے

میں علم ہو اور عقد نکاح کے وقت صراحتہ یا ضمناً اپنی نامنظوری کا اعلان کردیا ہو تو اسے کام سے منع کردے، یا اس شرط کے ساتھ اجازت دے کہ وہ اس کے اخراجات برداشت کرنے کے لئے تیار رہے، اس کی صراحت فقہاء پہلے کر چکے ہیں اور اس سلسلہ میں کام کی نوعیتوں میں امتیاز اور تفریق نہیں کی، لیکن آج کی ملازمت پیشہ عورت جس نے تعلیم اور سرٹیفکٹ کے حصول میں عمر کا قیمتی وقت صرف کیا ہو، آسانی سے کام نہیں چھوڑ سکتی، بلکہ اگر شوہر مطمئن نہ ہوا تو اپنے حقوق میں تشدد کا راستہ بھی اختیار کرسکتی ہے اور مرد کی ضد کو مان کر گھر بیٹھ جانے کی وجہ سے بیوی کے لئے مادی، روحانی اور نفسیاتی اعتبار سے برے نتائج کا سامنا کرنا پڑسکتا ہے، ہوسکتا ہے کہ شوہر کی بدسلوکی اور انانیت کے پیش نظر معاملہ طلاق کی حد کو پہنچ جائے اور پھر عورت کو اپنی ملازمت اور ازدواجی زندگی دونوں سے ہاتھ دھونا پڑے۔

۴۔ شوہر کا غلط رویہ طلاق کی دھمکی دے کر:

اکثر و بیشتر شوہر حق طلاق کا استعمال غلط کرتا ہے یا اپنے حقوق کے مطالبہ یا مول کرنے میں طلاق کی دھمکی سناتا ہے، احکام شریعت سے نابلد کچھ حضرات تو اللہ کے حکم کو کھلواڑ بنالیتے ہیں اور لفظ طلاق ان کی زبانوں پر تکیہ کلام کی طرح جاری وساری رہتا ہے اسے اپنے دل کی بھڑاس نکالنے کا بہترین ذریعہ سمجھتے ہیں اور معمولی سی بات پر طلاق کی بوچھار شروع کردیتے ہیں، بسا اوقات طلاق کی قسم کو بیوی پر اپنی رائے تھوپنے کا ہتھیار بنالیتے ہیں اور طلاق معلق کی قسم کھا کر اسے بیوی کی گردن پر لٹکتی تلوار بنائے رہتے ہیں۔

ایسے لوگ طلاق کا غلط استعمال کرتے ہیں جب کہ اللہ تعالیٰ نے طلاق شوہروں کے ہاتھ میں بوقت ضرورت استعمال کرنے کے لئے دیا ہے نہ کہ اپنی مرضی اور من مانی سے یا جذبات کی تسکین وغیرہ کے لئے، یہی وجہ ہیکہ طلاق کی شرح اسلامی ملکوں میں تیزی سے بڑھتی جارہی ہے، اسی لئے موجودہ دور کے مفتیان حضرات اور بہت سے مسلم پرسنل لاء نے مذاہب اربعہ کی مخالفت کرتے ہوئے مجبوراً ضعیف قول پر عمل کرنے کو کہا ہے اور طلاق کی دھمکی کو محض ایک عام قسم کے ضمن میں رکھتے ہوئے قسم توڑنے کا کفارہ ادا کرنے کا فتوی جاری کیا ہے، کیوں کہ اس سے نہ تو طلاق کی مقصدیت اور اس کے جواز کی حکمت ہی باقی رہی اور نہ ہی اپنی اصلی حالت پر برقرار رہا۔

آج عورت بھی کبھی کبھار ان ممالک میں طلاق کے جواز کا غلط استعمال کرنے لگتی ہے جہاں خلع کے دروازے کھول دیے گئے ہیں، چنانچہ عورت قاضی کے پاس معمولی معمولی باتوں پر طلاق وفراق اور خانہ بربادی کا مطالبہ کرتی ہے، قانونی ناحیہ سے قاضی کو بھی اس کی بات ماننی پڑتی ہے اور پھر عورت مطلق العنانی کے ساتھ اپنی بات منوالیتی ہے۔

☆☆☆

۱۔ اس بات کی طرف اشارہ کردینا مناسب ہوگا کہ حق طلاق اور دوسرے خاندانی مسائل کا غلط استعمال کرنے والے عام طور پر وہی لوگ ہوتے ہیں جو نام کے مسلمان ہوتے ہیں، ان کی پوری زندگی اسلامی اصول وضوابط سے دور غیر دینی اور مادی اقدار وقیم پر چل کر گزرتی ہے، ان جیسے لوگوں کے ساتھ کبھی کبھی کچھ مخلص لیکن جاہل مسلمان بھی شریک ہوجاتے ہیں جن کی اسلام کی ہدایت سے واقفیت نا کے برابر ہوتی ہے، لیکن ازدواجی اختلافات میں تشددانہ اور ظالمانہ رویہ ان لوگوں کے یہاں یکسر نہیں پایا جاتا جو دین دار اور عقیدہ وایمان کے لحاظ سے پختہ اور کامل ہوتے ہیں۔

خلاصۂ کلام

اس بحث کے اخیر میں اخذ ہونے والے نتائج کا مختصر خاکہ اور کچھ ضروری ہدایات پیش کئے جارہے ہیں:

۱۔ بحث کا ماحصل اور نچوڑ درج ذیل ہے:

۱۔ فیملی معاشرہ کا ستون ہے اور اسلام کے مضبوط قلعوں میں سے ایک قلعہ ہے، جس کی بنیاد شادی سے پڑتی ہے اور شوہر بیوی اور اولاد سے وجود میں آتی ہے۔

۲۔ فیملی کا قیام الفت ومحبت باہمی مشورہ وتعاون اور سکون ورحمت پر ہے اور اس کا مقصد میل جول حسن سلوک افزائش نسل اور نفسیاتی ومعاشرتی امن وامان کی فضا قائم کرنا ہے۔

۳۔ اصولی طور پر افراد خاندان کے مابین ذمہ داریاں منقسم رہنی چاہیے، لہذا شوہر گھر کے باہر کی ذمہ داریاں نبھائے اور بیوی گھر کے اندر کی اور یہ سب زوجین کے مابین معروف ومتعارف حدوں کے اندر رہوں، بیوی کا یہی بنیادی اصلی اور قابل احترام کام ہے، ایسی صورت میں شوہر کے اوپر زوجیت کا نفقہ خوش اسلوبی کے ساتھ واجب ہے اور بیوی اخراجات میں حصہ لینے کی مکلف نہیں ہے اگر چہ کہ وہ مالدار ہی کیوں نہ ہو۔

۴۔ بیوی کے لئے گھر سے باہر کام کرنے کی اجازت فقہی شرعی اور اخلاقی نقطۂ نظر سے جائز ہے، بشرطیکہ شوہر کی اجازت ہو یا شادی سے پہلے یا بعد میں بوقت ضرورت کام کرنے پر زوجین کے مابین ایگریمنٹ ہو جائے۔

۵۔ عورت کا اپنا ذاتی تشخص وجود اور اہلیت ہے، وہ مکمل مالی تحفظ وضمانت کی مستحق ہے، شریعت نے اسے کمائی میں تصرف کا مطلق حق عطا کیا ہے، شوہر اس میں اسی وقت حصہ دار بن سکتا ہے جب عورت کی مرضی ہو یا پہلے سے اس کی شرط رکھی گئی ہو یا اس پر ایگریمنٹ ہوا ہو، کیونکہ شوہر نے اپنے حق احتباس سے تنازل اختیار کرتے ہوئے خود اسے گھر سے باہر نکل کر کام کرنے کی اجازت دی ہے۔

۶۔ حق احتباس کے عوض اگر زوجین ملازمت کرنے والی بیوی کی فیملی بجٹ میں حصہ داری باہمی رضامندی کے ساتھ طے کرنا چاہیں یا اس کی شرط رکھنا چاہیں تو رکھ سکتے ہیں، اگر شوہر نے کام کی اجازت بغیر ایگریمنٹ یا شرط کے دے دی تو بیوی کو نفقہ کا مکلف نہیں کیا جائے گا، ہاں گھر کے بجٹ میں اس کی حصہ داری واجب ہوگی۔

۷۔ عقد نکاح سے قبل شوہر بیوی کو ملازمت ترک کرنے کا مکلف کر سکتا ہے اور بیوی چاہے تو کام اور ملازمت کی شرط عقد نکاح میں لگا سکتی ہے، لیکن دونوں کے مابین باقاعدہ ایگریمنٹ بنوانا ضروری ہے اور باہمی رضامندی سے لگائی ہوئی شرطوں کو نافذ العمل بنایا جائے گا۔

۸۔ زوجین کے مابین بیوی کی تنخواہ کے متعلق صاف لفظوں میں ایگریمنٹ ہونا ضروری ہے، بصورت دیگر ضمنی یا عرفی ایگریمنٹ پر عمل کیا جائے گا ورنہ تنخواہ کی مستحق بیوی ہی ہوگی۔

۹۔ شوہر اور ملازمت پیشہ بیوی کے مابین فیملی بجٹ میں حصہ داری میں صاف لفظوں میں ایگریمنٹ ہونا ضروری ہے، بصورت دیگر ضمنی یا عرفی ایگریمنٹ پر عمل کیا جائے گا، اگر ان میں سے کوئی چیز نہ پائی جائے تو بیوی کو گھر سے باہر کام کے عوض اخراجات میں شیئر کرنے کا مکلف کیا جائے گا۔

۱۰۔ شریعت کے مقرر کردہ ازدواجی حقوق وفرائض محدود ومتعین ہیں مطلق نہیں ہیں، اس لئے ان کے استعمال میں تشدد، تعسف اور غیر منصفانہ رویہ حرام ہے، اسی طرح سے حقوق واجبات کے استعمال میں زور زبردستی اور شرعی اور عرفی طور پر جائز حدود وقیود کو پار کرنا بالخصوص قوامیت، نفقہ، ملازمت اور طلاق کے معاملہ میں حرام ہے۔

ہدایات:

۱۔ عورت کو سب سے زیادہ فکر مادی پہلو سے محتاط رہنے کی ہونی چاہئے اور اسے دینی، گھریلو تربیتی اور شوہری حقوق کی ادائیگی میں بالکل غفلت نہیں برتنی چاہئے۔

۲۔ عورت اس بات کی حتی الامکان کوشش کرے کہ شوہر کے گھر میں رہ کر اپنی اصلی اور بنیادی ذمہ داری پوری کرے اور اپنا فرض منصبی ایک اچھی بیوی اور ماں کی حیثیت سے ادا کرے، ساتھ ساتھ فیملی کی خوشحالی اور شوہر کے مکان میں الفت ورحمت کی فضا قائم کرنے کی کوشش کرے۔

۳۔ اگر ازدواجی زندگی کے عدم استحکام کا خطرہ نظر آنے لگے تو بہتر مادی وسائل کی فراہمی زوجین کے لئے مقصود بالذات اور نصب العین نہ بنے، کیونکہ سعادت والفت کے ساتھ معمولی وسائل زندگی ایک فیملی کے لئے صرف مادی عیش وآرام کی زندگی سے ہزار ہا بہتر اور افضل ہے۔

۴۔ نکاح نامہ میں ایک خانہ کا مزید اضافہ کیا جائے جس میں مخصوص شرائط مثلاً عورت کی ملازمت، تنخواہ، ذمہ داریاں اور فیملی بجٹ کا ذکر ہو۔

۵۔ عقد نکاح سے واقفیت کے طور پر ایک عمومی ہدایات وضع کی جائے جو زوجین کے حقوق وفرائض کی تعیین وتحدید کرتی ہوں اور اس کے پیراگراف پر بحث کی جائے تاکہ اس کی موافقت یا تبدیلی اور بحث کے سلسلہ میں لوگوں کی آراء سامنے آجائیں۔

۶۔ خاندان معاشرہ اور ملک کو چاہئے کہ مختلف ذرائع ابلاغ کتابوں اور لٹریچروں کے ذریعہ لوگوں کی شادی کے احکامات کے سلسلہ میں ذہن سازی کی جائے جس سے ازدواجی زندگی کو استحکام عطا ہو، خاندانوں کو غلط افکار ونظریات سے محفوظ رکھا جاسکے اور اسے اسلامی تعلیمات پر عمل کرنے پر فخر محسوس ہو۔

☆☆☆

عورتوں کی ملازمت
ایک مطالعہ فقہ اسلامی کی روشنی میں

ڈاکٹر اسماعیل کاظم العیساوی[1]

ترجمہ: مولانا صفدر زبیر ندوی

الحمد لله والصلاة والسلام على رسول الله وعلى آله وصحبه ومن والاه. وبعد!

مقدمہ:

موجودہ زمانہ میں عورتوں کی ملازمت کے موضوع کو خصوصی توجہ اور ایک وسیع میدان حاصل ہے، یہ موضوع کتابوں اور تحریروں میں بھی ہے اور پرنٹ میڈیا اور الیکٹرانک میڈیا میں بھی اس موضوع پر بحث ومباحثے کے حلقے قائم ہیں، اور ہر شخص اس میں حصہ لے رہا ہے، خواہ وہ اسلامیات کا ماہر ہو یا اقتصادیات کا یا سماجیات کا ماہر ہو، اس سلسلہ میں علماء کی آراء اور اقوال، ان کے فکری اور عقائدی رجحانات کی بنیاد پر الگ الگ ہیں، ان میں سے بعض توتوسع کے قائل ہیں اور ان کا مطالبہ ہے کہ عورت کو ہر چیز میں مرد کے ہم پلہ ہونا چاہئے، بعض تنگ ذہن ہیں، ان کا کہنا ہے کہ عورت چہار دیواری میں رہے نہ وہ کسی کو دیکھے اور نہ اسے کوئی دیکھے، اور بعض ایسے ہیں جنہوں نے امور کے انجام اور ان سے پیدا ہونے والے اسباب پر نظر رکھی ہے۔

اکابر علماء کے اقوال وآراء اور تحریروں کی روشنی میں یہ سمینار منعقد ہو رہا ہے، تو تمام مقالہ نگار حضرات کو چاہئے کہ وہ اپنی تحریریں اور آراء پیش کریں، پھر علمی نشستوں میں ان پر بحث کریں اور پھر ایسا نقطہ نظر سامنے لائیں جو نہ موجودہ صورتحال کو بالکل باطل قرار دے اور نہ نصوص شریعت کے دائرے سے باہر ہو۔

میری خواہش ہوئی کہ میں بھی علماء کی اس ممتاز جماعت کے ساتھ اس موضوع میں حصہ لوں، اور میں بعض ایسے حل پیش کرنے پر اتفاق کرتا ہوں جو عورت کو سب سے پہلے ایک انسان ہونے کی حیثیت سے اس کا مرتبہ دے کہ اسے بھی جینے کا حق ہے، اور معاشرہ کی ایک عورت ہونے کی حیثیت سے اس پر نسلوں کو بنانے اور سنوارنے کا حق ہے جن پر قوموں کی بنیاد ہوتی ہے، چنانچہ اس کے اور معاشرے کے حق کے درمیان بلاشبہ اس پر بہت بڑی ذمہ داری عائد ہوتی ہے تو عورت اس مسئلہ سے کیسے نپٹے گی؟ اور اس کی صفات وخصوصیات کو دیکھتے ہوئے جو کہ مرد کی صفات وخصوصیات سے مختلف ہوتی ہیں، کیسے ان مسائل کے درمیان تطبیق ہوگی، اگر یہ فرق واختلاف نہ ہوتا تو پھر وہ دونوں ایک خلیہ ہوتے جس سے معاشرہ چلتا۔

کمالہ مصری کہتے ہیں: مرد اور عورت کے جسمانی ساخت میں واضح فرق ہے، اگر ان دونوں کی ساخت میں فرق نہ ہوتا اور ان کی طبیعتیں مختلف نہ ہوتیں تو دونوں ایک ہی نوع ہوتے، دونوں کے درمیان آپس میں شادی ممکن نہ ہوتی، اور نہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ میاں بیوی کی طرح زندگی گزارتے۔ دونوں کے جسمانی اور نفسیاتی ساخت میں فرق کی وجہ سے ہی ہر ایک اپنے مخصوص دائرہ میں کام کرتا ہے، اور دنیا میں ان کی تخلیق کا مقصد ہی یہی ہے۔

زوجین میں سے ہر ایک کی مخصوص صفات ہیں جو الگ الگ نسب کی وجہ سے مختلف ہوتی ہیں، جو دونوں کی اصل خلقت وفطرت اور حاصل شدہ طبیعتوں میں ہوتی ہیں، جیسے ضعف اور قوت، نرمی اور سختی، اور اس پر قلت یا کثرت تحمل، کسی چیز کو قبول یا رد کر دینا، اور فاعل کی قدرت یا اس کا عاجز ہونا مرتب ہوتا ہے۔

اللہ کا طریقہ اپنی مخلوق میں یہ ہے کہ اس نے مخلوقات کے درمیان فرق واختلاف رکھا ہے، یہاں تک کہ ایک ہی جنس میں روزی اور مدت میں

---

[1] كلية الشريعة والدراسات الإسلامية، جامعة الشارقة، الامارات العربية المتحدة۔

قلت و کثرت کی حیثیت سے، اور خلقت میں قوت وضعف کی حیثیت سے فرق پیدا کیا ہے۔

ڈاکٹر محمد علی البار جو کہ علاج نسواں کے مخصوص ڈاکٹر ہیں، کہتے ہیں:

متعدد طبی مطالعہ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے عورت کی نفسیاتی اور جسمانی وجود کو مرد کے وجود سے الگ پیدا کیا ہے، عورت کے جسم کو اس طرح بنایا کہ وہ امومت رمادریت کے عمل سے پوری طرح ہم آہنگ ہو، اس کی نفسیات بھی اسی طرح بنائی گئی ہے کہ وہ خاندان کی مالکن اور گھر کی سردار بن سکے۔

وہ کہتے ہیں: عورت کی جسمانی ساخت مرد کی ساخت سے مختلف ہے۔

وہ کہتے ہیں: جب ہم نے اس پر غور کیا جو عورت کو حیض، اور ولادت میں پیش آتا ہے تو ہم نے جانا کہ عورت کا ملازمت کے لئے نکلنا خود اس کے اپنے ذاتی عمل کو معطل کر دیتا ہے۔

اور کہتے ہیں: یہ معلوم ہے کہ محنت طلب کام میں، گھر سے باہر نکلنے میں اور زندگی کی مشکلات کا سامنا کرنے میں بہت بڑی قوت، طاقت اور نشاط کی ضرورت پڑتی ہے، اور عورت کے لئے یہ سب کرنا کیسے آسان ہوگا جبکہ وہ ہر مہینہ فطری جسمانی تغیرات سے دو چار ہوتی ہے جو اسے بالکل مریض کی طرح بنا کر رکھ دیتے ہیں، اور جسمانی اور فکری لحاظ سے اسے ادنی حالت میں لا کھڑا کر دیتے ہیں (دیکھئے: عمل المرأة فی المیزان رص ۶۳، ۹۰)۔

زندگی کی بہت سی بنیادی چیزوں میں فرق اور اختلاف پایا جاتا ہے، اور یہ اس لئے کہ ہم میں سے بعض کے ذریعہ بعض کی آزمائش ہو، اور اس لئے کہ ہم میں سے بعض کے ذریعہ بعض کی تکمیل کی جائے، ایک معاشرہ میں ایسے افراد ہوتے ہیں جو آپس میں مصالح کا تبادلہ کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''أهم يقسمون رحمة ربك، نحن قسمنا بينهم معيشتهم في الحياة الدنيا. ورفعنا بعضهم فوق بعض درجات، ليتخذ بعضهم بعضا سخريا، ورحمة ربك خير مما يجمعون'' (الزخرف ۳۲)۔

اگر تمام مخلوق ایک ہی قسم کی صفات سے متصف ہوں جن میں کوئی کمی زیادتی نہ ہو تب تو اس کی وجہ سے بہت ساری سرگرمیاں اور نشاطات، ایجادات اور بڑے پیمانے پر زمین کو آباد کرنا پورے طور پر یہ سب معطل ہو کر رہ جائے گا۔

یہ عدل یا مصلحت نہیں ہے کہ ہر اعتبار سے مرد اور عورتیں برابر ہو جائیں باوجود اس کے کہ ان کے درمیان ان اہم صفات وخصوصیات میں فرق ہے جن کا تعلق حقوق وواجبات سے ہے۔

عورتوں اور مردوں کے درمیان معاشرتی اخلاق اور فطری اخلاق میں موجود یہ فرق خاندان کے مفادات میں ہے، اور خاص طور سے امومت رمادریت اور گھریلو زندگی کے نظام کو چلانے کے مفاد میں ہے۔

اسی طرح ہر صاحب بصیرت، عقل رکھنے والا، منصف مزاج، غیر جانبدار آدمی یہ محسوس کرتا ہے کہ دونوں جنس یعنی مذکر ومؤنث کے درمیان کئی فرق ہیں، بعض تو بنیادی ہیں جو اصل خلقت سے تعلق رکھتے ہیں، بعض فطرت کے ذخائر کا جز ہیں، اور بعض نشو ونما کے راستہ سے پیدا ہوتے ہیں۔

دونوں جنس کے درمیان مکمل مساوات کی دعوت دینے والے کی مثال نہیں ہے مگر ''كمثل الذي ينعق بما لا يسمع إلا دعاء ونداء، صم بكم عمي فهم لا يعقلون'' (بقرہ: ۱۷۱)، یعنی جانوروں کو بلانے والے کی طرح جو صرف بلانے والے کی بلاہٹ ہی سنتے ہیں، اور اس کی بلاہٹ جانوروں کو آواز لگانا ہے اور ان کو جھڑکنا ہے، وہ جانور نہ کوئی دوسری بات سمجھتے ہیں اور نہ اسے محفوظ رکھتے ہیں جس طرح عقل والے سمجھتے ہیں اور محفوظ رکھتے ہیں (دیکھئے: الکشاف للزمخشری ار ۲۱۴)۔۔۔ اور جو لوگ دونوں جنسوں کے درمیان مکمل مساوات کے نظریہ کی تائید کرتے ہیں ان کی مثال جانوروں کی ہے جو صرف آواز کے ظاہر کو سمجھتے ہیں، اس کے مفہوم کو نہیں سمجھتے ہیں اسی طرح یہ لوگ بھی ہیں جو ظاہر حال کو دیکھ کر ان کی پیروی کرتے ہیں اور اس کے معنی ومفہوم کو نہیں سمجھتے ہیں کہ کیا وہ حق پر ہیں یا باطل پر ہیں (حوالہ سابق)۔

اوپر جو کچھ گزرا اس کی بنیاد پر عورت کی ملازمت کے تعلق سے بعض سوالات پیش کرتا ہوں، اس میدان میں عورت کے آنے اور اترنے کی آواز بہت سے لوگ لگاتے ہیں اور انجام کو یا ضرورت کو نہیں دیکھتے ہیں خواہ وہ خاندانی سطح پر ہو یا سماجی سطح پر ہو، ان ہی سوالات کے جوابات اس

مقالہ میں دیئے جائیں گے۔

کیا عورت کا گھر سے باہر کام کرنا اور اس کی آمدنی کے ساتھ ملنے سے معاشی تکمیل ہوتی ہے جو خاندان کی معاشی سطح کو اوپر اٹھاتی ہو، یا یہ طرفین کے درمیان نزاع پیدا کرنے کا ایک سبب ہے جس کی وجہ سے مرد سے الگ عورت کو ایک قسم کی معاشی آزادی رخود مختاری حاصل ہوتی ہے؟

یا یہ بعض کمزور دل مردوں کا عورت سے زور زبردستی کرنے اور اسے تکلیف پہنچانے کا سبب بنتا ہے اگر وہ اپنی خواہشات پوری کرنے کی کوشش کریں؟

کیا عورت کی معاشی خود مختاری اس کے عنوست کا سبب بنتی ہے، یا اس کے اس تصور اور سوچ کی وجہ سے جو شخص اسے پیغام نکاح دے رہا ہے وہ اس کے مال کی لالچ میں دے رہا ہے؟

کیا ایسا مرد جو عورت کے سامنے یہ شرط رکھے کہ وہ اسے ہر مہینے اپنی تنخواہ کا ایک بڑا حصہ دے تو وہ اس سے شادی کرے گا، قوامیت کے قابل ہے؟

کیا یہ ولی الامر کا شعور اور اس کی سمجھ ہے جب وہ اپنی زیر ولایت لڑکی کی آمدنی سے فائدہ اٹھانے اور اس کی لالچ میں اس کی شادی کرانے میں ٹال مٹول کرتا ہے؟

بحث اول

عورت کی ملازمت ایک آسائش یا ضرورت؟

عورت کے کام کی دو قسمیں ہیں:

۱۔ ایک وہ کام جو وہ اپنے گھر میں خاندان کے افراد کے لئے خانگی انتظام، توجہ اور نگرانی کا انجام دیتی ہے، تو عقل و نقل اور عرف عام کے اعتبار سے اس کی صحت و سلامتی میں کوئی شک نہیں ہے، اور یہ عورت کے اہم واجبات میں سے ہے، اور خاندان اور گھر کے تئیں اس کی اولین ذمہ داریوں میں سے ہے۔

مسلمان ہونے کی حیثیت سے ان امور کا التزام مسلم عورت کے لئے لازم ہے، اور جو احکام شریعت میں آئے ہیں خواہ وہ فرد سے متعلق ہوں یا جماعت سے، یہ اس کی صحیح تطبیق ہے، مثال کے طور پر اللہ تعالی کا قول ہے: "وقرن فی بیوتکن..." (احزاب: ۳۳) تو قرن کا معنی (جگہ کو لازم پکڑنے کے تعلق سے) ساکن ہونا، مطمئن ہونا اور ٹھہر جانا کے ہیں۔

اللہ کے رسول ﷺ کا ارشاد ہے: ''کلکم راع، وکلکم مسئول عن رعیته...'' یہاں تک فرمایا کہ: ''والمرأة راعیة فی بیت زوجها و مسئولة عن رعیتها...'' (بخاری: کتاب الجمعة؛ باب الجمعة فی القری والمدن، رقم: ۸۹۳)۔

رعایۃ کے معنی حفاظت کرنے اور معاملہ کی نگرانی کرنے، ملاحظہ کرنے اور انجام پر نظر رکھنے کے ہیں۔

راعی ہر وہ شخص ہے جو دوسروں کے معاملات کی حفاظت اور سیاست کے ذریعہ ذمہ داری نبھائے، ان کے امور کی دیکھ ریکھ کرے اور ان کے مصالح پر نظر رکھے۔

تو پھر اب کون سی فضیلت اور کون سی امتیازی حیثیت عورت کے لئے ہوگی اور وہ اس شان اور مرتبہ کے ساتھ اپنے گھر میں ایک قیمتی پوشیدہ موتی ہے جس کو کسی اجنبی کے ہاتھ نے چھوا نہ ہو اور اس کے جسم کے حصوں میں کسی فاحش یا فاسق کی نظریں پیوست نہ ہوئی ہوں۔

غض بصر کا حکم اللہ تعالی کے اس قول میں مرد و عورت دونوں کو دیا گیا ہے: ''قل للمؤمنین یغضوا من أبصارهم'' (النور: ۳۰)، ''وقل للمؤمنات یغضضن من أبصارهن'' (النور: ۳۱)۔

اللہ تعالی کے حکم کے مطابق اور حقیقی طور پر جانبین کی طرف سے غض بصر کا تحقق اسی وقت ممکن ہے جبکہ دواعی نظر سے بچا جائے۔

اور ان دواعی میں سرفہرست دونوں جنس کے درمیان اختلاط اور میل جول ہے، چونکہ اس اختلاط میں ایک قسم کا تبرج ہے، جو مریض دل کو فسق کے درپے ہونے، مزید پستی کی طرف آنے اور زیادہ سے زیادہ فریب دینے پر جری بنا دیتا ہے۔

اور جب تبرج سے بیزار ہو گیا تو پھر دواعی وطی، بے تکلفانہ گفتگو کی جرأت اور لگاوٹ والی باتیں شروع ہو جاتی ہیں، جیسا کہ شاعر نے کہا ہے:

"إن الهلال إذا رأيت نموه أدركت أن سيكون بدراً كاملاً"

ہلال (شروع کا چاند) کو جب نکلتے ہوئے تم نے دیکھ لیا، تو سمجھ لو کہ وہ بدر کامل (چودھویں کا چاند) ہو کر رہے گا (دیوان ابی تمام بشرالتبریزی ۱۱۵/۴، تحقیق: محمد عبدہ عزام، طبع دار المعارف مصر ۱۹۱۵ء)۔

پھر دونوں طرف سے تکلف کا ختم ہو جانا صرف ایک وقت کا مسئلہ ہوتا ہے نہ کہ زیادہ کا۔

گھر سے باہر عورت کی ملازمت پر جو لوگ تحفظ برتتے ہیں اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ عورت پر اعتماد یا اس کا احترام کم کیا جاتا ہے بلکہ اس کی کرامت، شرافت، عفت اور اس کو ایک قیمتی موتی سمجھتے ہوئے اس کی حشمت کی خاطر اس کے گھر والوں کے لئے اس کی حفاظت واجب ہے، اور پرہیز علاج سے بہتر ہے۔

۲۔ دوسرے وہ ملازمتی سرگرمیاں ہیں جنہیں عورت اپنے گھر سے باہر اور اپنے خاندان کے افراد سے دور رہ کر انجام دیتی ہے، یہ وہ معاملہ ہے جس کا اس سے مطالبہ ہے، اور ملازمت کے قوانین کے مطابق کام کی جگہ کے لئے صبح سویرے نکلنا اور مقررہ مدت وقت تک جو کہ عام طور سے عصر تک ہوتا ہے، وہاں ٹھہرے رہنا اس پر لازم ہوتا ہے، اور کبھی اسے ایسے انتظامی کاموں کا مکلف کیا جاتا ہے جو اسے بالکل ادھ مرا کر دیتے ہیں، یہی وہ چیز ہے جو اسے مجبور کرتی ہے کہ وہ اپنے وقت کا بڑا حصہ اپنے گھر میں لگائے، اور یہ اس کے خاندان کے افراد کے علی الحساب ہو۔

وہ عمل جس کو انسان انجام دیتا ہے، خواہ وہ عمل مشروع ہو یا غیر مشروع، تو اس کی اباحت یا اس کی حرمت نفس عمل سے متعلق نہیں ہے بلکہ اس عمل کا حکم اس سے پیدا ہونے والے اثرات سے متعلق ہوتا ہے، چنانچہ بہت سے مسلم ملکوں میں عورت کی حالت جبکہ ہر خاص وعام کاموں میں مردوں کے مقابلہ میں اسے آزاد چھوڑ دیا گیا، یہ ہوئی کہ وہ حجاب، شرم وحیا اور وقار کے خلاف سرکشی پر اتر آئی، اور ساتھی بنانا، دوستی کرنا اور مردوں کے ساتھ میل جول ایک عام بات ہو گئی جس کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔

اس کی حالت مغربی عورت کی حالت سے ملتی جلتی ہو جاتی ہے، اگر کوئی فرق وامتیاز ہوتا ہے تو آزادروی کے عوامل اور شرعی تقاضوں اور اسلامی اخلاقیات سے مسلسل دوری اسے ختم کر دیتے ہیں۔

جو شخص راستہ پر چلے گا وہ پہنچے گا، زیادہ چھونا، چھونے والے کے احساس کو یا تو کم کر دیتا ہے یا اسے ختم کر دیتا ہے۔

عورت بیرون خانہ:

عورت کا گھر سے باہر نکلنا ممنوع نہیں ہے، اور نہ مرد کی طرف سے مطلق انکار ہے اور نہ اس کی طرف سے مطلق اجازت ہے، بلکہ کام کی نوعیت، وقت اور خاندان کی ضرورت کے مطابق اس کو مرتب کرنے کی ضرورت ہے، جس وقت عورت کام کے لئے گھر سے باہر نکلتی ہے تو اس کی جگہ کا علم اور اس کی نگہبانی گھر کے تمام افراد کو مشغول رکھتی ہے، اس لئے کہ اگر اس کو کوئی بدی لگ جائے تو خاندان کے تمام افراد کو عار کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

دیہات اور گاؤں کی عورت خاندانی تقاضوں کی ادیگی میں ایک اہم عنصر کی حیثیت رکھتی ہے، وہ جانور کو چارہ کھلاتی ہے، اس کا دودھ دوہتی ہے، لکڑیاں اکٹھی کرتی ہے اور کنویں سے پانی نکالتی ہے۔ ان اہم کاموں کے لئے عورت کو دن کے اکثر حصوں میں گھر سے باہر نکلنا ضروری ہوتا ہے، چنانچہ وہ دیہات اور گاؤں کے انسان کی زندگی میں ایک اہم عنصر سمجھی جاتی ہے جس سے استغناء ناممکن ہے۔

موسیٰ علیہ السلام کا مدین میں شعیب علیہ السلام اور ان کی دونوں بیٹیوں کے ساتھ ملاقات کا واقعہ اس کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"ولما ورد ماء مدين وجد عليه أمة من الناس يسقون، ووجد من دونهم امرأتين تذودان قال ما خطبكما قالتا لا نسقي حتى

یصدر الرعاء وأبونا شیخ کبیر. فسقی لهما ثم تولی إلی الظل فقال رب إني أنزلت إلي من خیر فقیر" (القصص ۲۴)۔

یہ دونوں عورتیں اپنے گھریلو امور کی تدبیر اور دیکھ بھال کرتی تھیں، جانوروں کو پانی کے گھاٹ پر لے کر جاتی تھیں، یہ ایک عام جگہ تھی، جب وہاں آنے والے زیادہ ہوتے تھے تو پہل کرنے میں مرد عورت پر غالب آجاتے تھے، چنانچہ عورتیں پیچھے ہٹ جاتی تھیں، یہاں تک کہ مرد اپنے جانور لے جاتے تھے۔

ان دونوں عورتوں نے یہ کہہ کر موسیٰ علیہ السلام سے عذر پیش کیا: "وأبونا شیخ کبیر" (یعنی ہمارے والد گھاٹ پر آنے اور چرواہوں کے ساتھ دھکم دھکا کرنے پر قادر نہیں ہیں)۔

اگر ایسا ہوتا یعنی ان کے والد قادر ہوتے تو دونوں عورتوں کو گھر سے نکلنے کی ضرورت نہیں پڑتی، اور اگر دونوں کے شوہر ہوتے یا بھائی ہوتے تو وہ ان دونوں کی طرف سے اس کام کو انجام دیتے، لہٰذا عورت کا کام کرنا بقدر حاجت اور بتقاضائے ضرورت ہے۔

اور اس پر ان دونوں لڑکیوں کے والد کا عمل دلالت کرتا ہے جبکہ ان دونوں نے اپنے پیش آئے واقعہ کو ان سے بیان کیا، تو انہوں نے اسے تلاش کروایا تاکہ جو اس نے ان کی بچیوں کے ساتھ پانی پلانے کا کام کیا تھا اس کا بدلہ اسے دیں، دونوں عورتوں میں سے ایک نے سوچا کہ پانی پلانے وغیرہ کا معاملہ زندگی کے ضروری تقاضوں میں سے ہے جو بار بار پیش آئے گا، اور آئندہ بھی اسے ایسے شخص کی ضرورت بار بار پیش آئے گی جو ان دونوں کی مدد کرے، تو اس نے اپنے والد کو یہ تجویز دی کہ آپ اسے جانور چرانے کے لئے اجرت پر رکھ لیں، وہ طاقتور بھی ہے اور امانت دار بھی، لیکن والد نے یہ جان لیا کہ موسیٰ علیہ السلام اس سے کہیں عظیم مرتبہ والے ہیں کہ ان کو بکریوں کو چرانے کے لئے اجرت پر رکھا جائے، چنانچہ انہوں نے اپنی ایک بیٹی سے ان کا نکاح کردینے کی پیش کش کی اس شرط پر کہ وہ ان کے ساتھ دس سال رہیں گے، یا جلد جانا چاہیں تو آٹھ سال تک، یہ ان کی بیٹی کے لئے مہر ہوگا، اور ان لوگوں کے ساتھ صلہ رحمی ہوگی، چنانچہ موسیٰ علیہ السلام اپنی بیوی کی حفاظت کرتے ہیں، اس کی ضرورتیں پوری کرتے ہیں اور اس کے گھر والوں کی مدد کرتے ہیں۔

اسماء بنت ابوبکر صدیق مکہ میں اپنے گھر کی بکریاں چراتیں اور جبل ثور تک جاتی تھیں، جس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے ساتھی ابوبکر صدیق کو مدینہ کی طرف ہجرت کرنے کا حکم دیا گیا، ان دونوں نے کفار قریش سے فرار اختیار کیا اور غار میں تین دن تک چھپے رہے وہ ان کے پاس جاتی تھیں اور حالت یہ ہوتی تھی کہ اپنے پٹکے کے ایک کنارے میں کھانا چھپائے ہوتیں اور پٹکہ کے دوسرے حصہ کو لپیٹے ہوتیں، اور وہ قوم کی تازہ خبریں ان کے گوش گزار کرتیں، عرب عورتوں سے کوئی تعرض نہیں کرتے تھے، اسلام پھیلنے کے بعد انہوں نے اپنے شوہر زبیر بن عوام کے ساتھ مدینہ کی طرف ہجرت کی، وہ کہتی ہیں: زبیر کی زمینوں رکھیتوں سے گٹھلیاں میں اپنے سر پر لاتی تھی، اور وہ زمینیں دو تہائی فرسخ کی دوری پر تھیں (دیکھئے: صحیح بخاری: کتاب النکاح؛ باب الغیرۃ۔ ایک فرسخ = ۵۵۴۴ میٹر، دو تہائی فرسخ = ۳۶۹۶ میٹر، دیکھئے: کتاب النظم الاسلامیہ۔ نشأتہا وتطورہا للدکتور صالح رص ۷ر۴۔ کتاب الایضاح والتبیان فی معرفۃ المکیال والمیزان لأبي العباس نجم الدین بن رفعۃ الانصاري، تحقیق: ڈاکٹر محمد احمد اسماعیل الخاروف رص ۷۷)۔

گھر سے باہر عورت کا کام کرنا پرانے زمانے سے معاشرے میں معروف ہے، اور یہ حاجت وضرورت کے مطابق بہت سے حالات سے اور مرد اور معاشرہ کی سخت تیز نگرانی میں گذر چکا ہے یہاں تک کہ یہ موجودہ زمانہ میں ایک غلط اور ہتک آمیز قسم کی چیز ہوگیا ہے، جو دونوں جنسوں کی صلاحیتوں اور قدروں میں پیوست ہوگئی ہے، اور مرد کی کمزور شخصیت واضح طور پر سامنے آگئی ہے، حالانکہ زندگی مہارت پر قائم ہے، تو عورت کا الگ رول ہے جسے مرد ادا نہیں کرسکتا، اسی طرح اس کے برعکس، اور ان دونوں میں سے ہر ایک کا اپنے رول سے گریز کرنا اور دوسرے کے کام میں مشغول ہونا کوششوں کو ضائع کرنا ہے، اور قوتوں کو رائیگاں کردینا ہے، اور مفاسد ونقصانات کو حاصل کرنا ہے۔ (دیکھئے: کتاب تأملات فی عمل المرأۃ للدکتور عبداللہ بن وکیل الشیخ رص ۹۷)۔

عورت کے کام کی نوعیت آج پہلے والی نوعیت سے بہت ہی الگ ہے جس میں عزت ووقار کا غلبہ ہوتا تھا، اور شبہ کے مقامات سے بھی دور تھا۔ سب سے پہلی بات تو یہ کہ اس میں کسی بھی طریقہ سے مردوں کے ساتھ رگڑ اور لمس نہیں ہوتا تھا، اسی طرح دونوں جنس کے درمیان خلوت نہیں ہوتی تھی، اور معاشرے کے لوگ رذیل باتوں میں پڑنے سے گریز کرتے تھے، اور اس وقت مردوں میں شہامت، مروءت اور اخلاق پائے جاتے تھے جو ان کو عورتوں کے پیچھے لگنے سے باز رکھتے تھے۔

دین اسلام کے آنے سے پہلے عرف و عادت اور رسم و رواج ہی ایک مضبوط ضابطہ کا کام کرتے تھے جو ہر اس شخص کو جس کے دل میں روگ ہو، عورت کی عزت و شرافت کے ساتھ کھلواڑ کرنے سے روکتے تھے۔ لیکن جب مذہبی سردار کمزور ہو گئے، بہت سے لوگوں نے عرف و عادت اور رسم و رواج کو غیر اہم سمجھا، اور بہت سے لوگوں کے دلوں پر طلب لذت اور شہوت کا غلبہ ہو گیا تو مردوں نے عورتوں پر نگرانی مزید سخت کر دی اس سبب سے کہ مرد جب دنیا اور اس کی رنگینیوں کی طرف مائل ہوئے تو ان کی مردانگی میں ضعف اور کمزوری آ گئی، چنانچہ وہ اللہ کی ہدایت اور اس کی شریعت سے دور ہو کر ہوی و ہوس کے داعی بن کر سامنے آ گئے۔ "ومن أضل ممن اتبع هواه بغير هدى من الله" (القصص: ۵۰)۔

اور کسی مرد کے نزدیک ہوئی و ہوس کا سب سے طاقتور داعیہ بغیر کسی قید و بند کے عورت کے ساتھ پورے طور پر تمتع حاصل کرنا ہے "زين للناس حب الشهوات من النساء..." (آل عمران: ۱۴)۔

آیت میں الناس سے مراد مرد ہے، اور شہوت سے مراد شدید رغبت اور لذتوں کی خواہشمند نفسانی قوت ہے۔

اگر اس حکم کو شریعت، اقدار، مصالح کے تعلق سے اصولی قواعد، اور دوسروں کے حقوق پر ظلم کے ذریعہ ان کو نقصان پہنچانے سے مطلق احتیاط کے دائرہ سے الگ کر دیا جائے تو انسان طرز زندگی اور کثرت تعداد میں حیوانوں کے مشابہ ہو جائے۔

مبحث دوم

عورت کا کام کے لئے نکلنا۔ حالات و اسباب

یہ کہا جا سکتا ہے کہ تین عوامل کی وجہ سے بعض عورتوں کو کام کی خاطر اپنے گھر سے نکلنا ہوتا ہے، اور وہ عوامل یہ ہیں:

اول: معاشی عوامل، جس کا مطلب مال کی ضرورت ہے، یا مرد کی مالی تابعداری سے آزادی کی کوشش ہے۔

دوم: سماجی عوامل، جس کا مطلب گھر کے احاطہ یا خاندان کے دائرہ سے باہر سماجی تعلقات استوار کرنا ہے۔

سوم: نفسانی عوامل، جس کا مطلب کام کے دوران لذتوں اور خواہشات کی تکمیل کی کوشش کرنا ہے۔

یہ عوامل دائمی طور پر عورت کے لئے گھر سے باہر کام کی خاطر نکلنے میں سب سے مضبوط دفاع اور وجہ جواز نہیں بن سکتے، خصوصاً ایسے معاشرہ میں جو مالی طور پر خوشحال ہو، اور جو سماجی تعلقات سے متعلق امور میں اسلامی شریعت کے مطابق فیصلہ کرتا ہو، جو عورت کے تمام حقوق کی کفالت کرتا ہو، اور جس میں اہل و عیال کی کفالت مرد کی ذمہ داریوں میں سے ہو، لیکن یہاں عامل غیر کی تقلید ہے اور بعض دوسری قوموں کی پیروی ہے، اور ایک قسم کی تعیش پسندی ہے۔

مغربی ممالک میں عورت جب کام کی خاطر گھر سے باہر قدم نکالنے کی کوشش کرتی ہے تو اس سے واضح ہوتا ہے کہ وہاں یہ ایک قسم کی بنیادی اور انتہائی ضرورت ہے جس نے اسے کام کے لئے جانے پر مجبور کیا ہے، یہ الگ بات ہے کہ مالکان اور ایجنٹوں کی طرف سے اس کا بری طرح استحصال کیا جاتا ہے۔

یورپی عورت عمل کے میدان میں اس وقت آئی جب بورجوازی اور سرمایہ دارانہ معاشرہ کی تشکیل ہو رہی تھی اور اس وقت پھیلے ہوئے جاگیردارانہ نظام کا اس کے فساد و سرکشی کی وجہ سے زوال ہو رہا تھا، چونکہ جاگیردار زمین اور اس کی پیداوار کے مالک بن بیٹھے تھے۔

بڑے صنعتی انقلاب اور دخانی آلات کے انکشاف کے وقت تغیر و تبدیلی کے قومی علامات ظاہر ہونے شروع ہو گئے، اس وقت ہزاروں بلکہ لاکھوں دیہاتی کاشتکاروں نے اپنے جاگیردار مالکوں سے بھاگتے ہوئے اپنے گاؤں سے ہجرت کی جہاں نئے کارخانوں نے انہیں نگل لیا تھا، لیکن وہ جاگیردار کے عذاب سے بھاگے اور حریص سرمایہ دار کے چنگل میں پھنس گئے۔

ان مزدوروں کی حالت انتہائی بری ہو گئی تھی، وہ اپنے خاندان سے شہری علاقوں میں آ کر کٹ گئے، وہ ان کے لئے سامان زندگی نہیں بھیج سکتے

تھے، اسی طرح ان کو اپنے پاس بھی نہیں لا سکتے تھے کہ وہ ان کے ساتھ رہ کر زندگی گزاریں۔

عورتیں انتظار کرتی رہ گئیں، اور یکے بعد دیگرے وہ بھی روزی کی تلاش میں شہر کی طرف جانے پر مجبور ہوئیں، پھر تو سرمایہ داروں کے ایجنٹوں نے انہیں بھی اپنے قبضہ میں لیا اور انہیں لے کر کارخانوں میں جھونک دیا۔ سرمایہ داروں نے عورتوں کے نکلنے سے خوب فائدہ اٹھایا، چنانچہ وہ مزدوروں کے بار بار اجرت بڑھانے کے مطالبہ کا مقابلہ کرنے کے قابل ہو گئے (دیکھئے: کتاب عمل المرأۃ فی المیزان رص ۱۰۸۔ ۱۱۰ تھوڑے تصرف کے ساتھ)۔

ڈاکٹر ابراہیم الجویر کہتے ہیں:

مغربی عورت میدان عمل کی طرف نکلنے میں مشرقی عورت پر سبقت رکھتی ہے، عورت کا مرد کی تابعداری سے آزادی کا دعوی، اور اسکے ساتھ برابری کا دعوی ایسا مسئلہ ہے جو اپنے اندر بہت سے منفی اثرات رکھتا ہے، ذیل میں ان چند اسباب کا ذکر کیا جاتا ہے جن کی وجہ سے مغربی عورت کو کام کرنے کے لئے باہر نکلنے میں مدد ملی:

اول: صنعتی انقلاب، جس میں کام کرنے والے ہاتھوں کی بڑی تعداد میں ضرورت پڑی۔

دوم: یورپ میں مستقل ہونے والی جنگ، جس نے عورت پر یہ ضروری کر دیا تھا کہ وہ معاشرہ کی تعمیر وترقی میں حصہ لے، اس لئے کہ مرد یا تو جنگ میں مشغول ہیں یا ختم ہو چکے ہیں۔

سوم: مذہب سے دور ہونا، اور سیکولرزم کا عام ہونا۔

چہارم: معاشرہ کو خراب کرنے کے لئے یہودیوں کی منصوبہ بندی، جس میں عورت کو اس کے دائرہ سے باہر نکالنا ہے، اور اس کا ایسے کاموں میں استعمال کرنا ہے جو اس کی شرافت وکرامت کو ختم کر دے، اور جو اس کی فطرت اور اس کی نسوانیت سے میل نہ کھائے۔

پنجم: مغربی ممالک میں اکیلے پن کی روح کو عام کرنا، چنانچہ خاندانی اور اجتماعی مصالح کی رعایت نہیں کی جاتی، بلکہ شخصی مصالح پر توجہ مرکوز ہوتی ہے (دیکھئے: کتاب عمل المرأۃ فی المنزل وخارجہ رص ۲۳۔ ۳۰ تھوڑے تصرف کے ساتھ)۔

جب پوری مسلم دنیا ایسے مغربی استعمار کا شکار ہوگئی جو بزور قبضہ کرنے والا ہے، حاسد ہے اور جو کنیسہ سے لڑنے اور اس کی تعلیمات سے نکل جانے کے بعد تمام آسمانی مذاہب سے دور ہو چکا ہے، تو اخلاق واقدار میں اباحیت اور الحاد کا اصول بنایا گیا۔

استعماری قائدین ولیڈران کا مسلمان کے اخلاقی اصول ومبادی پر توجہ مرکوز کرنا فطری بات تھی، چنانچہ انہوں نے ان اصول کو بگاڑا، یا انہیں غیر اہم چیز بنا کر انہیں اس طرح کمزور کر دیا کہ ان کے لوازمات یعنی استقامت، غیرت، مروءت، اور شرافت وکرامت سب ثانوی چیز بن کر رہ گئے جن کے اصول وقواعد اور نظام میں بگاڑ اور رد وبدل سے سامراج کے سایہ میں پروان چڑھنے والی نسلوں کو کوئی تنگی وحرج محسوس نہیں ہوتی ہے۔

پھر دین اسلامی کے اصول ومبادی اور اس کی تعلیمات میں شکوک وشبہات پیدا کرنے لگے، اور بعض اہل اصول جن کا ایمان اور علم شرعی دونوں پختہ نہیں تھا، اس کی تائید کرنے میں لگ گئے۔

پھر اس کے بعد انہوں نے شہوت نفسانی کے میدان کا رخ کیا، اور اس کے اطراف وجوانب اور اس کے ابھرے ہوئے اور دھنسے ہوئے حصوں کو قسم قسم کی زینتوں سے مزین کیا، پھر کمزور نفس لوگوں کو مختلف قسم کی کشش کے ساتھ اس میں گھس پڑنے کی ترغیب دی، عورت برانگیختہ کرنے اور گمراہ کرنے کا ایک ہدف، اور دوسروں کو پھانسنے کا ایک جال بن کر سامنے آتی ہے۔ پھر انہوں نے عورت کے سلسلہ میں ایسی چکنی چپڑی باتیں کیں جس نے عورت کو مظلوم، مقہور، دبی کچلی، اور معمولی انسانی حقوق سے محروم بنا کر پیش کیا، اور اس من گھڑت حقوق کے دفاع کے لئے کئی فرنٹ سوسائٹیاں بنائیں، پھر عورت کے لئے مردوں سے میل جول، بے پردگی وعریانیت کو خوبصورت پیکر دیا، اس سب کا نتیجہ یہ ہوا کہ عورت مردوں پر جری ہوگئی، پھر ان سے میل جول بڑھا، پھر تمام میدانوں میں ان کے مقابل آگئی، پھر ان سے برابری کا مطالبہ کیا، اس کے لئے ان سامراجی قائدین نے غلط سلط معلومات کا ذخیرہ اکٹھا کیا، جنہیں وہ گرم گرم صیقل کئے ہوئے پروپگنڈوں اور اشتہارات کی شکل میں پھیلاتے ہیں۔

بلا شبہ بعض منصوبوں میں یہ شیطان کے موافق ہیں، اس نے اپنے گمان کو ان پر سچ کر دکھایا، یہ حقیقت ہے کہ عورتیں شیطان کا پھندا ہیں، جب

وہ اپنے گھروں سے نکلتی ہیں تو برانگیختہ کرنے اور گمراہ کرنے کے لئے شیطان ان کی تاک میں لگ جاتا ہے۔

خاندان پر عورت کے گھر سے باہر نکلنے کا اثر:

جو عورت گھر سے باہر کام کرتی ہے وہ شادی شدہ ہو یا غیر شادی شدہ، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا، اگر وہ شادی شدہ ہو تو وہ یا تو بال بچے والی ہوگی یا بے اولاد ہوگی، اور جس کا شوہر مفقود ہو اور وہ عورت جس نے شادی ہی نہ کی ہو یہ دونوں سابق دونوں قسموں کی طرح الگ الگ قسم ہیں، لہذا شوہر اور بچوں والی عورت کا نکلنا یا تو کسی ضرورت سے ہوگا، مثلاً گھر کی آمدنی میں اضافہ اور شوہر کا تعاون کرنا، یا بغیر کسی ضرورت کے ہوگا یعنی صرف کسی کی پیروی میں، کسی کی مشابہت اختیار کرنے کے لئے یا فخر ومباہات کی خاطر ہوگا، تو یہ ایک قسم کی بے فکری اور تعیش پسندی ہے جس کا منفی اثر خاندان کے افراد پر اور خاص طور پر بچوں پر پڑے گا۔

شاعر نے سچ کہا ہے:

''ليس اليتيم من انتهى أبواه   من همّ الحياة و خلفاه ذليلا''

یتیم وہ نہیں جس کے ماں باپ غم زندگی سے نجات پا گئے اور اسے خوار ہونے کے لئے چھوڑ کر چلے گئے۔

''إن اليتيم هو الذى تلقى له   أما تخلت أو أباً مشغولاً''

بلکہ یتیم وہ ہے جس کو ایسی ماں ملی جو اکیلے رہنا چاہتی ہو یا ایسا باپ ملا جو اپنے ہی کام میں مشغول رہتا ہو (دیکھئے: الشوقیات لأحمد شوقی ۱/ ۱۸۳)

کام کی وجہ سے عورت کے گھر سے غائب رہنے کا ضبط تولید اور فیملی کے افراد کی تعداد کو محدود کرنے میں اثر پڑتا ہے، عورت یہ سمجھتی ہے کہ حمل، ولادت اور رضاعت کی وجہ سے کام میں رکاوٹ آتی ہے، اور اس کے استقلال کو بھی خطرہ لاحق رہتا ہے، اور اس میں شارع اسلامی نے جس چیز کی امت کو ترغیب دی ہے یعنی کثرت اولاد کی، اس کی صریح مخالفت ہے، اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تنزوجوا الودود فإنى مكاثربكم الأمم'' (یعنی بہت محبت کرنے والیوں اور زیادہ بچے دینے والیوں سے شادی کرو، میں قیامت کے دن دوسری امتوں پر تمہارے ذریعہ کثرت پر فخر کروں گا) (دیکھئے: سنن ابوداؤد: کتاب النکاح، باب النہی عن تزویج من لم یلد من النساء، البانی نے کہا کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے، صحیح سنن ابوداؤد ۲/ ۳۸۶، حدیث نمبر: ۲۰۵۰)۔

اسی طرح گھر سے باہر عورت کے کام کرنے کی وجہ سے میاں بیوی کے تعلقات میں اندیشے در آتے ہیں، چونکہ عورت کے پاس گھر میں گزارنے کے لئے جو وقت بچتا ہے اس میں گھر اور بچے کے تعلق سے اتنے کام اس کے منتظر رہتے ہیں کہ باقی رہی سہی کسر ان میں پوری ہو جاتی ہے، پھر اپنے شوہر کو خوش کرنے کے لئے اور مناسب طریقہ سے اس کے واجبات کو پورا کرنے کے لئے کہاں سے طاقت وقوت لائے گی؟

اس کی وجہ سے وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ازدواجی تعلقات کا رنگ اور مزا دونوں پھیکا پڑنے لگتا ہے، اور دونوں کے تعلقات میں کشیدگی آجاتی ہے، اور ان کے درمیان کھائی مزید بڑھ جاتی ہے، اور اعصاب پر دباؤ میں اضافہ ہو جاتا ہے۔

ڈاکٹر ہناء بنت حسن جو کہ ایک کامیاب سعودی طبیبہ ہیں، کہتی ہیں: عورت کی طبعی جگہ اس کا گھر ہے جہاں اس کا شوہر اور اس کے بچے ہوں، اور بقیہ وقت ایسے کام کے لئے ہے جس کے ذریعہ وہ اپنی سماج کی خدمت کرے، لیکن جب دیکھے کہ اس کا کام یا اس کی ملازمت اس کو فیملی سے دور کر دے گی تو اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ ملازمت سے ہاتھ کھینچ لے، اس لئے کہ فیملی کے ساتھ رہنا اس کے لئے ملازمت سے زیادہ بہتر ہے (دیکھئے: جریدہ عکاظ، ۱۲/۳/ ۱۴۲۱ھ، شمارہ: ۱۲۶۰۲، ص ۳۵)۔

عورت کا ملازمت کے لئے گھر سے باہر نکلنے کے منفی اثرات میں سب سے بنیادی یہ ہے کہ اس کا اثر نوجوان نسل اور اس کی تربیت پر پڑتا ہے، اور یہ بات محقق ہے کہ ان میں سے اکثر عورتیں جو ملازمت کی خاطر نکلتی ہیں اور اپنے بچوں کو جنہیں نگہداشت کی ضرورت ہے، چھوڑ جاتی ہیں یقینا انہیں گناہ کا احساس ہوتا ہے، اور اپنے بچوں کے مستقبل اور توجہ، نگہداشت اور رہنمائی میں جو کمی ہوتی ہے اس کی وجہ سے زندگی بھر ان کو قلق رہتا ہے۔

جس وقت اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں سے بیعت لی تو وہ اللہ تعالی کے اس صریح قول کے مطابق تھا:

''يأيها النبى إذا جاءك المؤمنات يبايعنك على أن لا يشركن بالله شيئا ولا يسرقن ولا يزنين ولا يقتلن أولادهن ولا يأتين

ببهتان يفترينه بين أيديهن وأرجلهن ولا يعصينك في معروف فبايعهن واستغفر لهن الله إن الله غفور رحيم" (الممتحنه ۱۲)۔

شرک کے ساتھ امور ایمانیہ درست نہیں رہ سکتے، اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالی کی پوری طرح اطاعت ہو کہ اس کے علاوہ کوئی معبود نہیں۔

سرقہ (چوری) لغت میں: مال کا چھپ کر لینا ہے، اور چوری غیر کے مال میں ہوتی ہے، اسی طرح کان اور آنکھ کی چوری یہ ہے کہ چھپ کر سنا جائے یا دیکھا جائے، یا دوسرے کے وقت کی چوری کی جائے اس طرح کہ وہ وقت جس کام کے لئے مخصوص ہے اس کے علاوہ میں اس وقت کو گزارا جائے، یا دوسرے کے حق کی چوری کی جائے، وہ اس طرح کے دوسرے امور کو اس طرح بنا کر پیش کیا جائے کہ وہ امور اس کی توجہ اور اس کے وقت پر غالب آجائے کہ اس کے بعد اس پر واجب حقوق کی ادائیگی کے لئے اس کو کافی وقت نہ ملے۔

عورت اپنے وقت کا ایک حصہ گھر سے باہر گزارتی ہے تو وہ اس کی وجہ سے دو اختیار کے درمیان ہوتی ہے: یا تو وہ ملازمت کے ذریعہ مال کمائے، یا اپنی فیملی کے افراد کی صحیح طریقہ سے دیکھ ریکھ کرے، دونوں طرف کے حقوق ایک ہی وقت میں اور برابر درجے میں ادا کرنا ممکن نہیں، چنانچہ اللہ تعالی کا ارشاد ہے: "ما جعل الله لرجل من قلبين في جوفه" (الاحزاب ۴) اس اعتبار سے کہ دل انسان کے اندر تدبیر و تدبر کی جگہ ہے۔

مغربی ممالک میں بہت سے کام کرانے والوں کو ہم دیکھتے ہیں کہ وہ عورت کو ملازمت دینے کے لئے یہ شرط لگاتے ہیں کہ اس کا، نہ اپنے شوہر سے اور نہ بچوں سے کوئی ربط ہوگا، اس کے بعد انہیں اس کی کوئی فکر نہیں ہوتی ہے کہ وہ عورت اپنی جنسی خواہشات کے ساتھ اور اپنی ممتا کے ساتھ کیا معاملہ کرتی ہے۔

خاتمہ، نتائج اور سفارشات:

اول: دونوں جنسوں کے درمیان مساوات کی بات کہنا ایسا معاملہ ہے جو حقیقت سے متعارض ہے، اور عقلی ونقلی دلیل اس کو رد کرتی ہے، لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ ہر جنس میں کچھ الگ بنیادی صفات وخصوصیات ہیں جن کی وجہ سے آپس میں ایک دوسرے سے ملنے اور دونوں کو اپنے جنس کی حفاظت پر قدرت حاصل ہوتی ہے۔

دوم: حاصل شدہ حقوق اور شرعی واجبات میں سے ایک کو کبھی دوسرے پر فضیلت حاصل ہوتی ہے، اور کبھی دونوں میں سے ہر ایک اپنے عمل میں اخلاص اور تقوی کے بقدر مساوی ہوتا ہے، اس سلسلہ میں اللہ تعالی فرماتا ہے: "ولا تتمنوا ما فضل الله به بعضكم على بعض، للرجال نصيب مما اكتسبوا وللنساء نصيب مما اكتسبن، واسئلوا الله من فضله إن الله كان بكل شيء عليما" (النساء: ۳۲)۔

سوم: کچھ ایسے لوگ ہیں جو اپنے گھر والوں پر اکثر ضرورتوں میں بھی خرچ کرنے میں بخل سے کام لیتے ہیں، اور پیسے کو پکڑ کر رکھتے ہیں، ایسے وقت میں عورت اپنے کو شدید تنگی میں محسوس کرتی ہے، پھر وہ کیسے اپنی اور اپنے بچوں کی ضرورت پوری کرے گی؟ ایسی صورت میں مردوامیت کے اصول کو توڑنے والا ہوتا ہے، اور اس کی وجہ سے عورت حرکت میں آنے، اپنے اوپر اعتماد کرنے، اور روزی کی تلاش کی کوشش کرنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ اگر عورت شوہر کے مال سے بغیر اس کے علم کے اتنا لے لے جو اس کے لئے اور اس کے بچوں کے لئے کافی ہو تو وہ ایسا کرنے میں حق بجانب ہوگی۔ اور اگر عدالت کا سہارا لے تو اس کی حجت قوی ہوگی اور شوہر کو کہا جائے گا کہ وہ اسے معروف طریقے پر رکھے یا احسان کے ساتھ اس کو چھوڑ دے، اور حاکم شوہر پر اس کے بچوں کا نفقہ جبراً نافذ کرے گا۔

چہارم: جب عورت گھر سے باہر کام کرنے پر مجبور ہوگئی اور اسے مستقل مالی آمدنی ہونے لگی تو اس کی وجہ سے اس کے سامنے ایک دشواری کھڑی ہو جاتی ہے، وہ یہ کہ جب کوئی اسے پیغام نکاح دیتا ہے تو وہ اس کو اس کی آمدنی کا حریص سمجھتی ہے اور پیغام کو قبول کرنے میں تردد کا شکار ہو جاتی ہے اور اس طرح شادی کے موقع کو کھو بیٹھتی ہے، اور ایسا اسکی طرف سے بار بار ہوتا ہے، چنانچہ بغیر شادی کے وہ ادھیڑ عمر کی ہو جاتی ہے۔

اگر عورت شوہر والی ہے اور شوہر نے اس کی تنخواہ کے ایک حصہ کا اس سے مطالبہ کر دیا اگر عورت نے منع کر دیا تو دونوں کے درمیان تعلقات کشیدہ ہو جاتے ہیں، اور کبھی عورت سخت تنگی و پریشانی میں پڑ جاتی ہے، اور یہ چیز آپسی نفرت کا سبب بن جاتی ہے، اور کبھی کبھی معاملہ طلاق تک جا پہنچتا ہے، جو مرد اپنی عزت وکرامت کو ملیامیٹ کرتے ہوئے اور اپنے آپ کو ذلیل کرتے ہوئے اپنی بیویوں کے مال کی طرف حریص نگاہوں سے دیکھتے

ہیں تو ایسے لوگ مرد نہیں بلکہ مرد جیسے ہیں۔

پنجم: عورت کے کثرت سے نکلنے کی وجہ سے شوہر سے، بچوں سے اور گھر سے بے اعتنائی ہونے لگتی ہے جس کی وجہ سے میاں بیوی کے درمیان اختلافات شروع ہو جاتے ہیں، اور ان اختلافات کی وجہ سے دونوں کے درمیان ہر ایک کے تصرفات پر جھگڑے ہونے لگتے ہیں، اور پھر اخیر میں معاملہ دونوں کے درمیان تفریق وعلاحدگی تک جا پہنچتا ہے۔

ششم: ہم مسلمانوں پر یہ ضروری ہے کہ ہم ضرورت کے وقت گھر سے باہر نکلنے والی عورت کے کام کو وحی الٰہی یعنی قرآن اور اس کے احکام کے مطابق درست کریں۔

عورتوں کی عزت وشرافت کے سلسلہ میں جو تجربات ہیں وہ ہمارے لئے کافی ہیں، ہم اپنا ایک مستقل تشخص قائم کریں، کسی کی پیروی نہ کریں، چونکہ کسی مسلمان عاقل باتمیز عورت کے لئے یہ مناسب نہیں کہ وہ اسفنج کی طرح ہو جائے جو نوع، رنگ اور طبیعت کے درمیان بغیر تفریق کئے ہوئے ہر بہنے والی اور تر چیز کو چوس لے۔

ہفتم: ازدواجی زندگی کے پائیدار رہنے کے لئے مرد کو یہ جاننا ضروری ہے کہ معاملات میں سختی برتنا اور بات کہنے میں سخت لہجہ اپنانا مردانگی نہیں ہے، اور نہ یہ مردانگی ہے کہ اللہ تعالی نے جس کو اس کی نگرانی میں دیا ہے اور جس کے ساتھ حسن تعامل کا حکم دیا ہے اس پر سختی کرے، لہذا عورت پر اتنی ہی سختی کرے جس کو وہ اپنے دین کے مناسب خیال کرے، اور خاندان کے تمام افراد پر اللہ کے احکام کی تنفیذ اور اللہ کے حدود کو قائم کرنے پر پوری قوت کے ساتھ جم جائے، اور اپنی بیوی کے فتنہ کے سامنے کمزور نہ پڑے جو دین اور عقیدہ سے قطع نظر صرف سماج کے ساتھ چلنا چاہتی ہے، لیکن اس کے بالمقابل ضروری ہے کہ فضول خرچی سے بچتے ہوئے خرچ کرنے میں سخاوت سے کام لے (دیکھئے: کتاب شخصیۃ المسلم للدکتور عبدالمجید الہاشمی رص ۸۹)۔

ہشتم: عورت اپنے گھر میں محفوظ رہ کر اور اللہ ورسول کی مرضی کے مطابق اپنے خاندان کی پوری طرح نگرانی کر کے بھی اپنے ملک کی خدمت کر سکتی ہے۔

یہ ضروری ہے کہ عورت اپنے بچوں کی تربیت کے میدان میں جو کام انجام دیتی ہے اسے معمولی نہ سمجھا جائے اور بچوں کے مستقبل پر اس کے کام کی اہمیت اور اس کے اثرات کا اعتراف کیا جائے، اس کے لئے ضروری ہے کہ عورت ہر اس ممکنہ عمل سے فارغ ہو جس کی وجہ سے تربیت کے میدان میں اس سے کوتاہی ہو جائے یا اسکی تربیت کے ایجابی پہلوؤں میں کوئی کمی آ جائے۔ اور یہ معلوم ہے کہ عورت اگر خارجی کام میں مشغول ہو جائے تو اس کی وجہ سے خاندان کی ذمہ دار اور گھر کی مالکن کی حیثیت سے اس کے کام کے مواقع میں کمی ہو جاتی ہے۔

ایک عورت ہی کا کہنا ہے: کہ ملازمت کی طرف عورت کے رجحان سے اس کا ثقافتی معیار بلند ہوا اور ولادت کی فیصدی میں کمی آئی، مگر ٹھیک اسی وقت طلاق کا فیصد بھی بڑھا، اور اس کے ساتھ ممتا کی انفرادی صورت شروع ہوگئی (جیسے بچے کا گود لینا، یا منی بینک کی طرف رجوع کرنا، یا رحم کرایہ پر لینا)، اسی طرح برطانیہ میں ایسے لوگوں کی تعداد بھی بڑھی جو غیر قانونی طور پر ازدواجی زندگی گزارتے ہیں، ۱۹۸۱ء میں ۸ فیصد سے بڑھ کر ۱۹۸۸ء میں ۲۰ فیصد تک پہنچ گیا، اور وہ مزید کہتی ہیں: یہ بدیہی بات ہے کہ عورت اپنی ملازمت اور ملازمت کے دوران آگے بڑھنے کی کوشش کی وجہ سے ۲۰ سال کی عمر میں ہی مانع حمل تدابیر اختیار کرنے پر مجبور ہوتی ہے، اور جب ۳۰ سال کی عمر کو پار کر جاتی ہے تو حاملہ ہونے کا امکان کم ہو جاتا ہے تو اب کئی سالوں تک بانجھ پن کے علاج میں دوڑ بھاگ کرتی ہے، اور پھر آخر میں بچہ کو گود لینے پر مجبور ہوتی ہے (دیکھئے: کتاب المرأۃ المسلمۃ فی مواجہۃ التحدیات المعاصرۃ للدکتورۃ شذی سلمان الدرکزلی رص ۹۳۔ ۹۴، ناشر: روائع مجدلاوی، عمان، اردن ۱۹۹۷ء)۔

محمد سلامہ آدم کہتے ہیں: ملازمت کرنے والی عورت بیوی کا رول یا ماں کا رول ادا کرنے میں کشمکش میں مبتلا رہتی ہے؛ اسی طرح وقت کی تنگی کے گہرے احساس سے دو چار ہوتی ہے جو اس کے انجام دینے والے متعدد رول ادا کرنے سے پیدا ہوتا ہے، خواہ وہ گھر سے باہر ملازمت کا رول ادا کرنا ہو یا گھر کے اندر بیوی اور ماں کا کردار ادا کرنا ہو، اور جوں جوں وقت کی تنگی کا احساس بڑھتا ہے اس کے ساتھ ساتھ نفسیاتی دباؤ کا احساس بھی بڑھتا ہے...... اور تمام لوازمات کو پورا کرنے سے عاجز رہنے کے احساس کی وجہ سے وہ تنگی، کشمکش اور کشیدگی کے احساسات سے دو چار رہتی ہے، اور بچوں کی دیکھ ریکھ اور شوہر کے ساتھ وقت گزارنا ان دونوں پہلوؤں سے خاندان پر اس کا ضرور اثر پڑتا ہے (حوالہ سابق رص ۱۰۹)۔

اور تا کہ ہم ایسے ثقافتی معیار کے ضامن بنیں جو تربیت کے اصول اور اس کی اساسیات کے مناسب ہو، لہذا عورت کے لئے ضروری ہے کہ وہ علم

شرعی و دنیوی سے اتنا حصہ حاصل کرلے جس سے اس کے لئے حلال وحرام، خیر وشر، اہم اور اہم ترین، اور سابق ولاحق کے درمیان فرق کرنا ممکن ہو، چنانچہ عورتوں کو چاہئے کہ وہ اپنی صلاحیت کو اپنی فطرت کے تابع ہوکر ہی پروان چڑھائیں، مردوں کی تقلید کرنے کی کوشش نہ کریں اور نہ ان کے ساتھ میل جول بڑھائیں۔

نہم: سیاسی، سماجی، اقتصادی اور صحت وغیرہ کے اعتبار سے جب ہم ممنوع میں پڑ جانے کے اندیشہ سے احتیاطی تدابیر کو اپنانا قبول کرلیتے ہیں تو فضیلت اور قدر ومنزلت کے حصول میں کئی گنا محنت کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ آنے والی نسل ترقی کی رفتار کو نقصان پہنچانے والی چیزوں سے بہت دور رہے۔

میں یہ یقین سے کہتا ہوں کہ کسی دو آدمی کا نقطۂ نظر الگ ہونے کے باوجود اس بات میں ان کا اختلاف نہیں ہوگا کہ عورت کو گھر کے اندر ایسے امور سے بہت کم سابقہ پڑتا ہے جو اس کی حیا کو بگاڑ دے، یا اس کی عفت وعصمت کو ختم کردے یا اس کی کرامت وشرافت میں کمی کردے۔

عورت کا ہر وقت اپنے بچوں کے ساتھ رہنا سماج کے لئے زیادہ سودمند ہے اس بات سے کہ وہ دوسروں کو اس کام میں شریک کرے، یا کسی دوسرے کام کو اس کام پر مسلط کرلے۔

ہم عورت کو گھر سے باہر کام کرنے کی اہمیت کے بارے میں وہم میں ڈالیں اس کے بدلہ ہم پر یہ ضروری ہے کہ ہم اس کے لئے وہ چیزیں مہیا کریں جو اس کی زندگی کے تقاضوں اور مطالبات کو پورا کرے، تاکہ وہ اپنے گھر میں شریفہ، پاکدامن، سنجیدہ بن کر اللہ تعالی کے اس قول پر عمل کرتے ہوئے اطمینان سے رہے "وقرن فی بیوتکن..." (الاحزاب ۳۳)۔

ماں کا گھر میں رہنا سب سے بہتر کام سمجھا جاتا ہے جس کو ہر زمانہ میں عورت انجام دیتی رہتی ہے، اب وقت آگیا ہے کہ گھر کی مالکن کے کردار کو اقتصادی اور سماجی سطح پر مضبوط کیا جائے، اور گھریلو کام پر اور اس میں کوئی نئی چیز کرنے پر بچیوں کی ہمت افزائی کی جائے تاکہ یہ اجنبی پیشہ کی پیچیدگی سے نکلنے کا ایک راستہ ہوجائے۔

دہم: یہ ضروری ہے کہ ہم ہر جگہ میں عورت کی ملازمت کے میدان کو محدود کریں، اس لئے کہ ہمیں ویسے ہی کام کرنے والے مردوں کی قلت کا شکوہ نہیں ہے، اور اس لئے کہ اگر ہم معاملہ جوں کا توں چھوڑ دیں تو بلاشبہ ہم نوجوان نسل کو اس کی فطری جگہ سے ہٹانے والے ہوں گے اور ہم اس کو گھر میں یا سڑک پر چھوڑ دینے والے ہوں گے جس کی وجہ سے بگاڑ اور انارکی پیدا ہوگی اور جرائم پھیلیں گے۔

یازدہم: گھر میں رہنے والی عورت ملک کے معاش کی بنیاد کھڑی کرتی ہے، ملک کے اقتصادی ڈھانچہ میں اس کی بھی حصہ داری ہے، کیونکہ وہ مرد کو راحت بہم پہنچاتی ہے، اور یہی مرد کو اکثر کامیاب بناتی ہے، اور کیونکہ وہ وطن کے لئے صالح بچوں کی تربیت وپرورش کرتی ہے (دیکھئے: کتاب وظیفۃ المرأۃ المسلمۃ فی عالم الیوم ص ۵، ۲، ۵۹، ۶۶ تھوڑے تصرف کے ساتھ)۔

دوازدہم: ملک کو اگر عورت کے کام کی ضرورت ہے، اور عورت کو بھی کام کی ضرورت ہے تو ایسے قوانین بنائے جانے چاہئیں جن میں یہ گنجائش ہو کہ عورت کے کام پر جانے کا وقت اس کے بچوں اور شوہر کے گھر سے نکلنے کے وقت سے اتنے بعد میں ہو کہ وہ اپنے بچوں کو ان کے اسکول چھوڑ سکے اور پھر گھر کے افراد کے لئے کھانا تیار کرسکے تاکہ جب وہ لوٹ کر آئیں تو انہیں وقت پر کھانا پیش کرسکے، یا یہ کہ عورت کے لوٹنے کا وقت تمام افراد کے گھر لوٹنے سے پہلے رکھا جائے۔

سیزدہم: جس جہت میں بھی عورت کام کررہی ہو اس جہت پر مخصوص جگہوں کی ضمانت دینا ضروری ہے تاکہ ماں اپنے بچہ کو وہاں رکھ سکے تاکہ ہر دو گھنٹہ پر وہاں آکر بچوں کو دودھ پلا سکے یا اس کی صاف صفائی کرسکے، اور یہ جگہیں ہیلتھ ٹریز کی نگرانی میں ہوں، عورت کو کام کے لئے کم سے کم گھنٹوں کا مکلف بنایا جائے تاکہ وہ اپنی فیملی کے لئے اتنی طاقت اور حیویت جمع کرلے کہ وہ بھی سکون واطمینان کے ساتھ زندگی میں گھر کے افراد کے ساتھ شریک ہوسکے۔

اس قسم کے ضوابط بنائے جائیں اگر عورت کا گھر سے باہر کام کرنا امر ضروری ہو، اور سماج پر یہ لازم ہو کہ وہ اس کو طے کرے اور اس کو قبول کرے۔

☆☆☆

خواتین کی ملازمت
شرعی نقطہ نظر سے

مولانا اختر امام عادل[1]

اسلامی نظام معاشرت میں کسب معاش کا تعلق عورتوں سے نہیں ہے، مردوں سے ہے، یہاں عورتوں کے تمام بنیادی مالی مسائل کی ذمہ داری مردوں پر ڈالی گئی ہے۔

اسلام نے عورتوں کی مالی سرپرستی کا مسئلہ مردوں کے ذمہ لگا کر ایک طرف صنف ذکور کو مردانہ وقار عطا کیا تو دوسری طرف صنف نازک کے لئے محفوظ پناگاہ بھی فراہم کردی، اگر مالی مسائل خود عورتوں سے متعلق رہتے تو ان کے لئے انہیں مردوں کی طرح دربدر کی ٹھوکریں کھانی پڑتیں اور بہت سے پر مشقت مراحل سے گذرنا پڑتا جو ان کی جسمانی ساخت اور عصمت وعفت کے منافی ہے۔

۲۔ عورت پر کسب معاش کی کوئی ذمہ داری نہیں رکھی گئی، نہ خود اس کی اور نہ اس کے بچوں کی، یہ ساری ذمہ داری مرد کی ہے، فقہاء نے صراحت کی ہے کہ اگر کوئی عورت کسب معاش کی غرض سے کسی کام سے وابستہ ہونا چاہتی ہے تو شوہر اس کو روکنے کا حق رکھتا ہے۔

ردالمحتار میں ہے: ''بل له أن يمنعها من الأعمال كلها المقتضية للكسب لأنها مستغنية عنه لوجوب كفايتها عليه'' (ردالمحتار ۵،۲۸۵)۔ (شوہر کمائی والے ہر کام سے عورت کو روک سکتا ہے، اس لئے کہ اس کو اس کی حاجت نہیں ہے، اس کے ضروری اخراجات شوہر کے ذمہ ہے)۔

شادی سے قبل عورت کے اخراجات کی ذمہ داری والد اور دیگر قریبی رشتہ داروں کے سر ہے، فقہاء نے نسوانیت کو علامت عجز قرار دیا ہے، شامی میں ہے:

''(وأنثى مطلقا) أي ولو غير مريضة. لأن مجرد الأنوثة عجز والمراد بها البنت الفقيرة...بخلاف الزوجة وقرابة الولاد لأن لهم الأخذ قبل القضاء بلا رضاه'' (ردالمحتار على الدر المختار ۵،۳۶۰)۔

اسی طرح شادی سے قبل یا شادی کے بعد عورت کے لئے اپنے اخراجات کا کوئی مسئلہ نہیں ہے، جہاں تک بچوں کے نفقہ کا مسئلہ ہے تو یہ بھی باپ ہی کے ذمہ ہے، ماں کے ذمہ نہیں۔

یہاں تک کہ بچہ کو دودھ پلانے پر بھی ماں کو مجبور نہیں کیا جاسکتا، اس کا انتظام بھی باپ کے ذمہ ہے، اِلا یہ کہ بچہ کسی دوسری عورت کا دودھ قبول نہ کرے، یا دودھ کا متبادل انتظام موجود نہ ہو، یا باپ کے پاس اتنی استطاعت نہ ہو کہ وہ اجرت پر کسی دودھ پلانے والی کا انتظام کرسکے، اور بچہ کی جان جانے کا اندیشہ ہو، تو اس قسم کی بعض صورتوں میں ماں کو دودھ پلانے پر مجبور کیا جاسکتا ہے (ردالمحتار ۵/۲۷۵)۔

اسی طرح اگر باپ موجود نہ ہو اور بچے کے اخراجات کا مسئلہ درپیش ہو، تو ماں کو (اگر وہ صاحب مال ہو) مجبور کیا جائے گا کہ بچہ کی حفاظت کے نقطہ نظر سے بطور قرض اس پر خرچ کرے، بعد میں جب اس کا باپ آئے گا تو اس کے اخراجات اس کو واپس کردیئے جائیں گے (ردالمحتار ۵/۲۷۳، ۲۷۴)۔

---

[1] جامعہ ربانی، منورہ شریف، سمستی پور بہار۔

عورتوں کے لئے کسب معاش کی مشروط اجازت:

اسی طرح شریعت اسلامیہ کی مختلف دفعات میں عورت کی حفاظت اور مالی کفالت کا مکمل انتظام کیا گیا ہے، البتہ کبھی ایسی صورت پیش آجاتی ہے کہ عورت کا کوئی کفیل موجود نہ ہو، وہ بیوہ یا مطلقہ ہو، یا اس کا شوہر مریض، اپاہج یا کمانے کے لائق نہ ہو، اس وقت آبرومندانہ زندگی گذارنے کے لئے عورت کسب معاش کے لئے مجبور ہوجاتی ہے اور اس کے لئے کبھی گھر سے باہر نکلنے کی بھی نوبت آتی ہے، اس طرح کے مجبور کن حالات میں فقہاء نے کسب معاش کے لئے گھر سے باہر نکلنے کی مشروط اجازت دی ہے۔

اس وقت تک جب تک کہ یہ حالات ختم نہ ہوجائیں۔

مکمل شرعی پردہ کے ساتھ گھر سے باہر نکلے، جس میں اس کا چہرہ بھی نامحرموں کے سامنے مستور ہو، چہرہ اگرچیکہ ستر عورت کے دائرہ میں نہیں آتا، لیکن عورت کے لئے سب سے زیادہ باعث فتنہ یہی ہے، اس لئے سد الباب چہرہ کھولنا مکروہ تحریمی ہے، بالخصوص جوان عورتوں کے لئے، شامی لکھتے ہیں:

''النظر إلی وجه الأجنبية الحرة ليس بحرام، ولکنه يکره لغير حاجة وظاهره الکراهة ولو بلا شهوة (وإلا فحرام. وأما في زماننا فمنع من الشابة) لا لأنه عورة بل لخوف الفتنة'' (ردالمحتار ۹،۴۵۱)۔

انتہائی سادہ اور معمولی لباس میں نکلے، جاذب نظر لباس یا کسی قسم کی زیب و زینت کا استعمال نہ کرے، تاکہ وہ خود بھی اور دوسرے لوگ بھی فتنہ سے محفوظ رہیں (فتح القدیر کتاب الطلاق ۳۵۸/۴)۔

اگر سفر شرعی کی نوبت ہو تو کسی معتبر محرم مرد کی رفاقت ضروری ہے، عورت کی رفاقت کافی نہیں ہے، بلکہ سفر شرعی نہ بھی ہو تب بھی بغیر محرم کے نکلنا مکروہ ہے (فتاوی عالمگیری ۳۶۶/۵)۔

''ولا تکون المرأة محرما لامرأة'' (فتح القدير ۴،۳۵۸)۔ (ایک عورت دوسری عورت کے لئے محرم نہیں بن سکتی)۔

ڈیوٹی کے دوران جسم کا صرف وہ حصہ ظاہر ہو جس کے بغیر متعلقہ عمل کی تکمیل ممکن نہ ہو، اس کے علاوہ جسم کے دوسرے حصوں کی نمائش جائز نہیں ہے۔

شوہر یا ولی کی اجازت کے بغیر نہ نکلے۔

اس کے علاوہ کوئی دوسرا متبادل ذریعہ معاش موجود نہ ہو، اگر اندرون خانہ کوئی ذریعہ معاش میسر ہو تو باہر نکلنے کی اجازت نہ ہوگی، اس لئے کہ صنف نازک کا گھر سے باہر نکلنا فتنہ ہے، اور اس کی اجازت محض برائے ضرورت ہے، اس لئے حد ضرورت سے زیادہ اس میں توسیع نہیں کی جاسکتی۔

۳۔ محض معیار زندگی کو بلند کرنے یا وقت گذاری اور سرمایہ واثاثہ پیدا کرنے کی غرض سے عورتوں کا معاشی دوڑ میں داخل ہونا، جبکہ گھر کی مالی حالت ایسی ہو کہ کسی نہ کسی طرح کام چل رہا ہو، اس کی اجازت شرعی اصول سے بالاتر ہے، یہ محض ہوس دنیا ہے، پھر اس کا کوئی حل اس دنیا میں موجود نہیں ہے۔

اندرون خانہ معاشی سرگرمی:

۴۔ اگر عورت کسب معاش کی کوئی ایسی صورت اختیار کرے جس میں اس کی معاشی سرگرمیاں اندرون خانہ محدود ہوں، گھر سے باہر نکلنے کی ضرورت نہ پیش آئے تو اس میں بظاہر کوئی مضائقہ نظر نہیں آتا، بشرطیکہ اس سے اس کے شوہر سے متعلق دیگر حقوق متاثر نہ ہوں اور اس کے حسن و جمال یا صحت پر کوئی منفی اثر مرتب نہ ہو، اس صورت میں شوہر یا ولی کی اجازت کی بھی بظاہر ضرورت نہیں ہے۔

اس لئے کہ بعض چھوٹی چھوٹی ایسی ضرورتیں ہوتی ہیں جو شوہر کے ذمہ لازم نہیں ہیں، عورت کو ان کی تکمیل خود کرنی ہے، اس لئے اگر عورت دوسرے متعلقہ حقوق کی ادائیگی کے ساتھ اپنی ذاتی ضرورتوں کے لئے کچھ رقم حاصل کرنے کی جائز تدبیر کرے تو شوہر کو اس پر کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہئے، ''حرة أجرت نفسها ذا عيال لا باس به'' (عالمگیری ۴،۴۱۴، کتاب الاجارہ)۔

نیز کبھی ایسا ہوتا ہے کہ عورت اپنے گھر میں تنہا ہوتی ہے، اور اس کا شوہر یا دوسرے حضرات گھر کے باہر کی ضروریات میں مصروف ہوتے ہیں، تنہائی کے ان لمحات میں بوریت اور شیطانی خیالات سے بچنے کے لئے عورت اپنے کو کسی کام میں مصروف کرلے اور اس سے اس کی صحت اور جمال متاثر نہ ہو تو اس پر شوہر یا ولی کو اعتراض کا حق نہیں ہونا چاہئے، علاوہ ازیں کبھی کام ایسا ہوتا ہے جس میں عورتوں کی ضرورت پڑتی ہے، اس سے اگر عورت انکار کرے تو لوگوں کے لئے تنگی کا باعث ہوگا، اسی لئے فقہاء نے قابلہ اور غسالہ کو شوہر کی اجازت سے گھر سے باہر نکلنے کی اجازت دی ہے (فتح القدیر ۴/ ۳۵۸، ۵/ ۲۵۹)۔

البتہ ایسا کام جس سے شوہر سے متعلق حقوق کی خاطر خواہ ادائیگی میں خلل واقع ہو یا عورت کی صحت یا حسن و جمال پر اس کے منفی اثرات مرتب ہوں تو اس کے لئے بہرحال شوہر یا ولی کی اجازت ضروری ہوگی (رد المحتار علی الدر المختار ۵/ ۲۵۹)۔

عورت کے لئے محرم کی قید:

۵۔ اسی طرح اگر عورت کو کسب معاش کے لئے گھر سے باہر نکلنا پڑے تو ولی یا شوہر کی اجازت ضروری ہے۔

''للزوج أن یضرب المرأۃ علی أربع خصال... والخروج من البیت'' (فتح القدیر ۴/ ۳۵۸)۔

اگر گھر سے نکلنا مسافت سفر سے زیادہ کے لئے ہو تو باتفاق فقہاء محرم کا ساتھ ہونا ضروری ہے، اور اگر مسافت سفر سے کم ہو تو بھی امام ابو یوسف کی رائے میں بلا محرم نکلنا مکروہ ہے، امام ابو حنیفہ کی ایک روایت بھی یہی ہے (فتاوی عالمگیری ۵/ ۳۶۶)۔

عورت پر شوہر یا ولی کا حق:

یہ نکلنا دن کے وقت ہو یا رات کے وقت شوہر کی اجازت بہرحال ضروری ہے، رات کا مسئلہ عورت کے لئے کچھ زیادہ ہی حساس ہوتا ہے، اس لئے کہ یہ زیادہ فتنہ اور بدگمانی کا وقت ہے، نیز رات میں شوہر کی حق تلفی کا بھی زیادہ امکان ہے، اس لئے رات کی ملازمت سے عورت کو ممکن حد تک گریز کرنا ہی مناسب ہے، لیکن اگر شوہر کی اجازت ہو اور کسی قسم کا فتنہ کے اندیشہ نہ ہو تو مذکورہ بالا شرائط کے ساتھ ملازمت کی گنجائش ہوگی، کتب فقہ میں ایک مسئلہ آیا ہے کہ عورت سے اس کے والدین اور رشتہ دار شوہر کے گھر آ کر مل سکتے ہیں یا نہیں؟ اور اگر رات میں قیام کرنا چاہیں تو کر سکتے ہیں اس سے اس مسئلہ میں روشنی لی جا سکتی ہے، اس ذیل میں صاحب ہدایہ لکھتے ہیں:

رہی یہ بات کہ ولی کو روکنے کی اجازت صرف اس کی کفالت کی صورت میں ہوگی یا کفالت نہ کر رہا ہو تب بھی اس کو روک سکتا ہے؟ میرے خیال میں اس حق کا تعلق مالی کفالت سے نہیں ہے، یہ حق شوہر یا ولی کو عورت کی عصمت وعفت، صحت و جمال اور اس سے متعلق حقوق کے تحفظ کے نقطہ نظر سے دیا گیا ہے۔

فقہاء نے صراحت کی ہے کہ مہر کی ادائیگی تک عورت گھر سے نکلنے کے باب میں شوہر کی پابند نہیں ہے، لیکن مہر پر قبضہ کر لینے کے بعد عورت شوہر کے گھر میں رہنے کی پابند ہو جاتی ہے، اور اس کی اجازت کے بغیر گھر سے باہر نہیں نکل سکتی ہے (فتح القدیر ۴/ ۳۵۸)۔

شوہر کے اس حق کو نان و نفقہ کے ساتھ مشروط نہیں کیا گیا ہے، نان و نفقہ کی کمی یا مالی کفالت کے فقدان کی صورت میں عورت کی مجبوری یا ملازمت کی ضرورت تو ظاہر ہوتی ہے، مگر اس کی بنا پر عورت کو گھر سے باہر نکلنے کی چھوٹ نہیں دی جا سکتی ہے، ورنہ فتنہ و فساد کے سوا کوئی دوسری چیز سامنے نہیں آئیگی اور مغربی تہذیب کی طرح ہماری تہذیب و معاشرت کی بھی خیر نہیں ہوگی۔

خواتین کی ملازمت کے شرعی حدود:

۶۔ مذکورہ بالا تفصیلات سے خواتین کی ملازمت کے حدود اربعہ سامنے آ جاتے ہیں۔

ملازمت یا کسب معاش کا کوئی عمل صنف نازک کے مزاج کے ہم آہنگ نہیں ہے، صرف بدرجہ مجبوری اس کی اجازت دی جا سکتی ہے۔

بشرطیکہ شوہر یا گھریلو نظام سے متعلق حقوق کی ادائیگی میں کمی نہ ہو اور ملازمت گھر کے اندر ہو۔

گھر سے باہر ملازمت یا حقوق کی ادائیگی میں کوتاہی کی صورت میں شوہر یا ولی کی اجازت ضروری ہے۔

گھر سے باہر شرعی پردہ کے ساتھ نکلے اور مقام ملازمت پر شرعی پردہ کا اہتمام کرے۔

ایسی جگہ ملازمت کرنا درست نہیں جہاں پردہ کا اہتمام نہ ہوسکتا ہو یا مرد وعورت مخلوط طور پر کام کرتے ہوں۔

اگر ملازمت اس قسم کی ہو جس میں عورت کی آواز غیر محرم مردوں تک پہنچتی ہو تو یہ بھی باعث فتنہ اور ناجائز ہے، اس لئے کہ عورت کی آواز کا بھی پردہ ہے (طحطاوی علی القرافی ر ۲۴۲، فتح القدیر کتاب الصلوۃ ۱ر ۲۷۶)۔

کسی معتبر محرم کے ساتھ سفر کرے اور اگر مقام ملازمت زیادہ دور نہ ہو تو بھی بہتر ہے کہ کسی محرم کے ساتھ نکلے، ہزار راستے مامون ومحفوظ ہوں اور فتنہ وبدگمانی کا اندیشہ نہ ہو، رات میں کسی دوسری جگہ قیام کرنے سے ہر ممکن پرہیز کرے۔

سادہ اور معمولی لباس میں جائے، خوشبو اور زیب وزینت اور ہر ایسے عمل سے پرہیز کرے جس سے مردوں کی نگاہ یا دل اس کی طرف متوجہ ہوں اور فتنہ کا باعث ہوں۔

کوئی دوسرا متبادل اور اندرون خانہ ذریعہ معاش موجود نہ ہو، تب مذکورہ بالا شرائط کے ساتھ عورت کو ملازمت کی اجازت دی جائے گی محض معیار زندگی بلند کرنے یا وقت گذاری یا زیادہ سے زیادہ دولت بنانے کے لئے اس کی اجازت نہیں ہوگی۔

ایسے ادارے جہاں مرد وعورت دونوں کام کرتے ہوں:

۷۔ ایسے ادارے جہاں خواتین ہی خدمت انجام دیتی ہوں اور کام کی جگہوں میں مرد نہ ہوتے ہوں، البتہ ادارہ کے ذمہ دار مرد ہوں ایسے اداروں میں خواتین کی ملازمت جائز ہے، مگر ذمہ دار مرد کے لئے (اگر وہ محرم نہ ہوں) عورتوں کے حصے میں جانے کی اجازت نہیں ہوگی، اگر انتظامی نقطہ نظر سے ایسی ضرورت پیش آئے تو عورتوں کا باپردہ ہونا ضروری ہے۔

۸۔ البتہ ایسے ادارے جہاں مرد وعورت دونوں کام کرتے ہوں اور دونوں کے شعبے جداگانہ ہوں اور ایک دوسرے کا سامنا برائے نام ہو، تو ایسے اداروں میں بھی ملازمت کی گنجائش ہے، بشرطیکہ مذکورہ بالا تمام احتیاطوں کو ملحوظ رکھا جائے۔

۹۔ ایسا کام جس میں مردوں کا سامنا کم ہوتا ہو، مثلاً آفس کی ملازمت، جہاں صرف عورتیں کام کرتی ہوں اور مرد کبھی کبھی آجاتے ہوں، اس کی اجازت بھی بقدر ضرورت دی جاسکتی ہے، البتہ مردوں کا سامنا ہوتے وقت ان کے لئے پردہ کرنا ضروری ہوگا۔

ملازمت کی غرض سے گھر سے باہر مستقل قیام:

۱۰۔ ملازمت کی غرض سے عورت کا اپنے گھر سے باہر مستقل قیام کرنا اگر شوہر کی اجازت سے ہو، اور جگہ شرعی طور پر مامون ومحفوظ ہو، کسی قسم کے فتنہ کا اندیشہ نہ ہو تو بوقت ضرورت اس کی اجازت دی جاسکتی ہے، بشرطیکہ مقام ملازمت پر کوئی معتبر محرم ساتھ میں ہو، تنہا عورت کا گھر سے باہر قیام کرنا کسی طرح فتنہ سے خالی نہیں، اسی طرح محض معیار زندگی کو بلند کرنے یا سیر وتفریح کی غرض سے اس طرح کی بیرونی ملازمت کو اختیار کرنے کی اجازت نہیں ہے۔

☆☆☆

خواتین کی ملازمت کا شرعی حکم

مفتی محمد جنید عالم ندوی قاسمی [1]

اس مادی دور میں جبکہ عوام وخواص سبھی مادیت کی طرف تیزی سے بھاگ رہے ہیں اس مقابلہ میں ہر ایک سبقت لے جانا چاہتا ہے، مردوں کے شانہ بشانہ عورتیں بھی کام کرنا چاہتی ہیں اور عورتیں کسب معاش میں مردوں سے کسی طرح بھی پیچھے نہیں رہنا چاہتی ہیں، ان حالات میں مفتیان کرام اور علماء ومحققین کو اجتماعی غور وفکر کر کے مسئلہ کی صحیح تصویر پیش کرنی ہوگی ورنہ امت ہلاکت کے دہانہ پر کھڑی ہے۔

خواتین کی ملازمت جائز ہے یا نہیں؟ شریعت ان کے کسب معاش کو کس نظر سے دیکھتی ہے اور اس کے لئے شرعی حدود کیا ہیں؟ اس پر روشنی ڈالنے سے پہلے ابتدائی چند تمہیدی باتیں ذکر کی جاتی ہیں جن کی روشنی میں مسائل کا حل آسان ہو جائے گا۔

حلال روزی کمانے کی اہمیت وفضیلت:

کتاب وسنت میں حلال مال کمانے کی بہت زیادہ اہمیت وفضیلت آئی ہے، قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم الصلوۃ والسلام اور تمام مومنین کو حلال روزی کھانے اور عمل صالح کرنے کا حکم دیا ہے، اس ترتیب سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ عمل صالح کی توفیق حلال روزی کھانے سے ہی ہوتی ہے، حرام مال کی نحوست سے عمل صالح کی توفیق سلب ہو جاتی ہے اور حرام مال کھانے والوں کی دعا قبول نہیں ہوتی ہے۔

حدیث شریف میں اپنے ہاتھ سے کما کر کھانے کو سب سے افضل اور بہتر قرار دیا گیا ہے، حضرت داؤد علیہ السلام کے برگزیدہ نبی ہونے کے باوجود اپنے ہاتھ سے کما کر کھاتے تھے۔

''عن المقدام عن النبی ﷺ قال ما اکل احد طعاما قط خیر امن أن یاکل من عمل یدیه وإن نبی اللّٰه داؤد علیه السلام کان یأکل من عمل یدیه'' (الصحیح البخاری ۱،۲۷۸)۔

کسب معاش کا شرعی حکم:

قرآنی آیات واحکامات اور احادیث کے ذخیرہ سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ اپنے ہاتھ سے کما کر کھانا افضل وبہتر ہے۔ اسی کے ذیل میں یہ بات آتی ہے کہ اس کسب کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ اگر کوئی شخص قدرت کے باوجود نہیں کماتا ہے تو کیا وہ شرعاً گنہگار ہوگا یا اس کا یہ عمل توکل کے مطابق ہوگا؟ اس سلسلہ میں درج ذیل تفصیل ہے:

فرض: اتنی مقدار میں کمانا فرض ہے جو اپنے اور اپنے اہل وعیال کے نفقہ کے لئے کافی ہو اسی طرح جن لوگوں کا نفقہ واجب ہے ان کے نفقہ کے لئے بھی کافی ہو اسی طرح دیون کی ادائیگی کے لئے کمانا فرض ہے۔

مستحب: اس سے زیادہ مقدار میں کسب معاش تاکہ فقیروں اور رشتہ داروں کی خدمت ہو سکے مستحب ہے۔

مباح: ذخیرہ اندوزی، وسعت وفراوانی اور معیار زندگی کو بلند کرنے کے پیش نظر کسب معاش جبکہ فخر ومباحات مقصود نہ ہو شرعاً جائز ودرست ہے۔

حرام: زیادہ سے زیادہ مال کمانا تاکہ دوسروں پر فخر کر سکے اور دوسروں پر اپنی بڑائی ثابت کر سکے، یا ایسی کمائی جس سے اپنا دین برباد ہو، اپنی عزت وعصمت ختم ہو رہی ہو یا حرام مال کمانا شرعاً حرام ہے، ہر مسلمان پر اس سے احتراز لازم ہے (دیکھئے: فتاوی ہندیہ باب خامس عشر فی الکسب ۳۴۸/۵، ۳۴۹)۔

---

[1] صدر مفتی امارت شرعیہ، پھلواری شریف پٹنہ۔

عورتوں کے لئے کسب معاش کا شرعی حکم:

کسب معاش کی اہمیت وفضیلت اور اس کے شرعی حکم کے بعد ایک مسئلہ یہ آتا ہے کہ عورتیں کماسکتی ہیں یا نہیں؟ ان کے لئے کسب معاش کا کیا حکم ہے؟ اس مسئلہ پر غور کرنے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ کتاب وسنت میں کسب معاش کی جو بات کہی گئی ہے وہ مردوں کے ساتھ خاص نہیں ہے اور نہ ہی مردوں کی تخصیص کی کوئی وجہ نظر آتی ہے، جس طرح حلال مال کا استعمال مردوں کے لئے پسندیدہ اور ضروری ہے اسی طرح عورتوں کے لئے بھی ہے، جس طرح مرد کسب کے محتاج ہوتے ہیں اسی طرح عورتیں بھی بعض حالات میں محتاج ہوتی ہیں، اگر عورتوں کو کسب معاش سے روک دیا جائے تو بعض حالات میں ان کو دست سوال دراز کرنے پر مجبور کرنا ہوگا جو شرعاً ناپسندیدہ عمل ہے۔

سورہ مریم میں اللہ تعالیٰ نے حضرت مریمؑ کو کسب معاش کا حکم ان الفاظ میں دیا ہے:

''وهزي إليك بجذع النخلة تساقط عليك رطبا جنيا فكلي واشربي وقري عينا'' (سورۂ مریم ۲۵) (اے مریم کھجور کی ٹہنی کو اپنی طرف کر کے ہلاؤ پکی ہوئی تروتازہ کھجور ٹوٹ کر تمہاری طرف گرے گی پھر کھاؤ پیو اور اپنی آنکھ ٹھنڈی کرو)۔

علامہ قرطبی الجامع لاحکام القرآن میں اس آیت کے تحت لکھتے ہیں: الثانية: ''الأمر بتكليف الكسب في الرزق سنة الله تعالى في عباده، وإن ذلك لا يقدح في التوكل''۔ بندوں کو رزق کمانے کا مکلف بنانا اللہ تعالیٰ کی سنت ہے اور یہ توکل کے خلاف نہیں ہے۔

دوسری دلیل یہ ہے کہ حضرت شعیب علیہ الصلوۃ والسلام بوڑھے اور مجبور تھے تو ان کے حکم سے ان کی دو لڑکیاں جانور کو پانی پلانے گئی تھیں چونکہ بھیڑ تھی، دوسرے چرواہے اپنے جانوروں کو پانی پلا رہے تھے اس لئے وہ دونوں کنارہ کھڑی تھیں، جب حضرت موسیٰؑ نے ان سے الگ رہنے کی وجہ پوچھی تو ان دونوں نے جواب دیا: ہم دوسرے چرواہوں کے پانی پلانے کے بعد ہی اپنے جانوروں کو پانی پلائیں گے اور ہمارے والد بہت بوڑھے ہیں (سورۂ قصص ر ۲۳)۔

الموسوعۃ الفقہیہ میں کتاب وسنت کی روشنی میں بہت واضح انداز میں لکھا ہے کہ:

اسلام عورتوں کو کام کرنے سے نہیں روکتا ہے، عورت کو بیع وشراء اور تجارت کا حق ہوگا، وہ کسی کو اپنا وکیل بھی بناسکتی ہے اور وہ کسی کا وکیل بن بھی سکتی ہے، جب تک کہ احکام شرع کی رعایت کرتے ہوئے کام کرے کوئی بھی اس کو کام سے نہیں روک سکتا ہے (موسوعہ فقہیہ ۷ر ۸۲)۔

''ومع ذلك فالإسلام لا يمنع المرأة من العمل فلها أن تبيع وتشتري وأن توكل غيرها ويوكل غيرها وأن تتأخر بمالها وليس لأحد منعها من ذلك ما دامت مراعية احكام الشرع وآدابه'' (الموسوعة الفقهيه ۷،۸۲)۔

خلاصہ یہ ہے کہ عورت کام بھی کرسکتی ہے، اسلام عورتوں کو کام کرنے سے نہیں روکتا ہے۔

عورتوں کے لئے کام کرنے کے سلسلہ میں شرعی حدود: ...... البتہ عورتیں کام کرنے میں آزاد نہیں ہیں کہ مردوں کی طرح جس طرح چاہیں کام کریں بلکہ ان کے کام کرنے کی شرعی حدیں ہیں، ان حدود کی رعایت کرتے ہوئے کام کرنے کی اجازت ہوگی (حوالہ مذکور ۷ر ۸۳)۔

پردۂ شرعی کی رعایت ہو:

عورتوں کے کام کرنے کے لئے پہلی شرط یہ ہے کہ پردۂ شرعی کی مکمل رعایت ہو، اجنبی مردوں کے ساتھ کسی طرح کا اختلاط نہ ہو، اگر کام ایسا ہو کہ کسی اجنبی مرد کے ساتھ تنہائی میں رہنا پڑے یا اس کے ساتھ کسی طرح کا اختلاط ہو یا اس کے سامنے جانا پڑے تو اس طرح کے کام کرنے کی قطعاً اجازت نہ ہوگی، اسی طرح راستہ میں آنے جانے میں بھی پردۂ شرعی کی مکمل رعایت کرنی ہوگی۔

کسی اجنبی مرد کے ساتھ اختلاط کی صورت میں مرد وعورت دونوں فتنہ سے مامون نہیں رہ سکتے ہیں، کتاب وسنت میں پردہ پر جو زور دیا گیا ہے وہ واضح ہے، مومن مردوں اور مومن عورتوں کو نگاہیں نیچی رکھنے کا حکم دیا گیا ہے، یہ بھی ارشاد نبوی ہے کہ جب کسی جگہ اجنبی مرد وعورت ہوں تو وہاں تیسرا شیطان رہتا ہے۔

فقہاء نے یہ صراحت کردی ہے کہ جس کام میں اجنبی مردوں کے ساتھ اختلاط ہو اس کام کی شرعاً اجازت نہیں ہوگی، چنانچہ درمختار میں یہ مسئلہ ہے کہ لڑکا جب کمانے کے لائق ہو جائے تو باپ اس کو کمانے میں لگادے گا اور اس کی کمائی سے اس پر خرچ کرے گا البتہ لڑکیوں کو کمانے میں نہیں لگاسکتا ہے۔

"وإذا بلغ الذكور حد الكسب يدفعهم الأب إلى عمل ليكتسبوا أو يوجرهم وينفق عليهم من أجرتهم بخلاف الأناث" (الدر المختار على هامش رد المحتار باب الحضانة ۵.۲۷۲)۔

"(قوله بخلاف الأناث) فليس له أن يوجرهن في عمل أو خدمة لأن المستأجر يخلو بها وذلك سيء في الشرع ذخيرة ومفاده أنه يدفعها إلى امرأة تعلمها حرفة كتطريز وخياطة إذ لا محظور فيه" (رد المحتار باب الحضانة ۵.۲۷۲)۔

(یعنی باپ کے لئے جائز نہیں ہے کہ لڑکیوں کو کسی کام یا کسی خدمت کے لئے اجارہ پر دے اس لئے کہ مستاجر کے ساتھ تنہائی ہوگی اور یہ شرعاً غلط ہے، اس کا تقاضا یہ ہے کہ باپ اپنی لڑکیوں کو کسی عورت کے پاس پڑھائی، بنائی اور سلائی یا کوئی دوسرا کام سیکھانے کے لئے دے سکتا ہے)۔

معصیت کا کام نہ ہو:

دوسری شرط یہ ہے کہ عورت گناہ والا کام نہ کرے، مثلاً گانا نہ گائے یا ایسا کام نہ کرے جس میں کوئی فائدہ نہ ہو، اسی طرح ایسا کام نہ کرے جس سے خاندان والوں کو عار محسوس ہو یا جس کی وجہ سے خاندان پر کسی طرح کا دھبہ لگے۔

"لا يكون العمل معصية كالغناء واللهو وألا يكون معيبا مقررا تعييرا به أسرتها" (الموسوعة الفقهيه ۷.۸۳)۔

زیب وزینت کے ساتھ نہ نکلے:

تیسری شرط یہ ہے کہ اگر کام کے لئے گھر سے نکلنا ہو تو زیب وزینت کے ساتھ نہ نکلے، یا ایسی ہیئت اختیار نہ کرے جو فتنہ کا باعث ہو جس سے لوگوں کی نظریں اس کی طرف اٹھنے لگیں، بلکہ معمولی لباس میں نکلے۔

اللہ تعالیٰ نے ازواج مطہرات کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:

"ولا تبرجن تبرج الجاهلية الاولى" (سورۂ احزاب ر ۳۳) (جاہلیت اولیٰ کی طرح بن سنور کر نہ نکلیں)۔

گرچہ خطاب ازواج مطہرات سے ہے لیکن ان کے توسط سے تمام عورتیں مراد ہیں۔

دوسری جگہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "ولا يبدين زينتهن إلا ما ظهر منها" (سورۂ نور ر ۳۱) (اور عورتیں اپنی زینت کو ظاہر نہ کریں مگر وہ جو ظاہر ہو جائے مثلاً چہرہ اور ہتھیلی)۔

چہرہ اور ہتھیلی کو فقہاء نے ضرورۃً عورتوں کے ستر سے خارج قرار دیا ہے، لیکن چونکہ فتنہ کا دور ہے اور فتنہ زیادہ تر چہرہ کے ذریعہ آتا ہے اس لئے فتنہ کے پیش نظر چہرہ کے چھپانے کو بھی ضروری قرار دیا گیا ہے۔

حدیث شریف میں ہے کہ دوسروں کے لئے زیب وزینت اختیار کرنے والی عورت قیامت کے دن تاریکی میں ہوگی، اس کے سامنے کوئی روشنی نہیں ہوگی۔

"الرافلة في الزينة في غير أهلها كمثل ظلمة يوم القيامة لا نور لها" (ترمذی شریف ابواب الرضاع باب ما جاء في كراهية خروج النساء في الزينة)۔

اندرون خانہ رہ کر کام کرنا زیادہ بہتر ہے:

باہر نکل کر کام کرنے یا کسی ادارہ میں ملازمت کرنے کے جو نتائج ہیں وہ سامنے ہیں، مسلسل فتنے ابھر کر سامنے آتے ہیں، عموماً عصمت وعفت محفوظ نہیں رہتی، اس کا تقاضہ یہ ہے کہ عورتیں گھروں میں رہیں اور گھر کے کام کو انجام دیں، عورتیں گھر کی ملکہ ہیں ان کی شان باقی رہنی چاہئے، اسی میں عافیت ہے، اللہ تعالیٰ نے ازواج مطہرات کو مخاطب کر کے فرمایا:

"وقرن في بيوتكن ولا تبرجن تبرج الجاهلية الاولى" (سورۂ احزاب ۳۳) (اور قرار پکڑو اپنے گھروں میں اور دکھلائی نہ پھرو جیسا کہ دکھلانا دستور تھا پہلے جہالت کے وقت)۔

گرچہ یہ خطاب ازواج مطہرات سے ہے لیکن اس میں تمام عورتیں شامل ہیں اور یہ حکم تمام عورتوں کے لئے ہے۔

علامہ قرطبی نے الجامع لاحکام القرآن (۱۷۹/۷) میں اسی آیت کے تحت لکھا ہے:

''اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ عورتوں کو گھروں میں رہنے کا حکم دیا گیا ہے، اگرچہ ازواج مطہرات کو خطاب کیا گیا ہے، لیکن معناً دوسری عورتیں بھی داخل ہیں (دیکھئے: مسلم ۲۱۸/۲، بدائع الصنائع کتاب النفقہ ۲۲۱۵/۵)۔

شوہر یا کسی ولی کی اجازت:

چوتھی شرط یہ ہے کہ عورتیں خواہ گھر میں کام کریں یا گھر سے باہر بہر دوصورت اگر غیر شادی شدہ ہیں تو اپنے ولی سے اور اگر شادی شدہ ہیں تو شوہر سے اجازت لے کر کام کریں، بلا اجازت کام نہ کریں، اگر ان کو کام سے روک دیا جائے تو وہ رک جائیں، چونکہ بیوی کا نفقہ شوہر پر لازم ہے اور اس کی وہ پوری کفالت کرتا ہے، البتہ اگر عورت گھر میں رہ کر کوئی ایسا کام کرے جس سے شوہر کو کسی طرح کا نقصان نہ ہو تو اس طرح کے کام سے شوہر کو نہیں روکنا چاہئے۔ اس لئے کہ اگر عورت گھر میں پڑی رہے اور کوئی کام نہ کرے تو نفس وشیطان کے وساوس کا شکار ہو سکتی ہے یا خلاف شرع امور انجام دے سکتی ہے۔

''بل له أن يمنعها من الأعمال كلها المقتضية للكسب لأنها مستغنية عنه لوجوب كفايتها عليه وكذا من العمل تبرعا لأجنبي بالأولى... أما العمل الذي لا ضرر له فيه فلاوجه لمنعها عنه خصوصا في حال غيبته من بيته، فإن ترك المرأة بلا عمل في بيتها يؤدي إلى وساوس النفس والشيطان أو الإشتغال بما لايعني من الأجانب والجيران'' (ردالمحتار كتاب النفقه ۲،٦٠٣)۔

واضح رہے کہ اگر عورت پر کوئی کام فرض اور ضروری ہو اس کے بغیر عورت کے لئے شرعی دینی یا دنیوی نقصان ہونے والا ہو تو اس کام کو عورت شوہر کی اجازت کے بغیر بھی کرسکتی ہے مثلاً عورت پر حج فرض ہے تو وہ شوہر کی اجازت کے بغیر بھی وہ حج فرض کے لئے کسی محرم کے ساتھ جاسکتی ہے، اسی طرح شوہر اپنی بیوی کا نفقہ ادا نہیں کررہا ہے یا اس عورت پر دوسروں کا نفقہ واجب ہے تو اس صورت میں شوہر اجازت دے یا نہ دے وہ کام کرسکتی ہے اور بیوی شوہر کی اجازت کے بغیر بھی نکل سکتی ہے جبکہ اس نے مہر معجّل ادا نہ کیا ہو، اسی طرح جس گھر میں عورت ہو اور اس کے گرنے کا اندیشہ ہو تو بھی شوہر کی اجازت کے بغیر نکل سکتی ہے، نیز عورت پر کسی کا قرض ہو اس کی ادائیگی ضروری ہو تو اس صورت میں یہ کام کرنے کے لئے شوہر کی اجازت ضروری نہیں ہے۔

''يجوز للرجل أن يأذن لها بالخروج إلى سبعة مواضع: زيارة الأبوين وعيادتهما وتعزيتهما أو أحدهما وزيارة المحارم، فإن كانت قابلة أو غسالة أو كان لها على أخرحق تخرج بالإذن وبغير الإذن والحج على هذا... والمرأة قبل أن تقبض مهرها لها الخروج في حوائجها وتزور الأقاربَ بغير إذن الزوج فإن اعطاها المهر ليس لها الخروج إلا بإذن الزوج'' (البحر الرائق باب النفقة ۴،۲۲۱)۔

سفر شرعی میں محرم ضروری ہے:

عورت کے لئے شوہر کی اجازت سے پردۂ شرعی کی رعایت کرتے ہوئے باہر جا کر کمانے کی گنجائش ہے لیکن ضروری ہے کہ سفر شرعی نہ ہو، اگر سفر شرعی ہو تو ساتھ میں محرم کا ہونا ضروری ہے، بغیر محرم کے سفر شرعی نہیں کرسکتی ہے۔

حدیث شریف میں اس کی سخت ممانعت آئی ہے: ''عن أبي سعيد قال قال رسول الله ﷺ لا يحل لأمرأة تومن بالله واليوم الآخر أن تسافر سفرا فيكون ثلاثة ايام فصاعدا إلا ومعها أبوها أو اخوها أو زوجها أو إبنها أو ذو محرم منها'' (ترمذی شریف ۱۳۹/۱، ابواب الرضاع)۔

عورت کا نفقہ کس پر؟

یہاں پر ایک بحث یہ ہے کہ عورت کا نفقہ کس پر واجب ہے؟ خود اس پر یا کسی دوسرے پر؟ اگر اس پر واجب نہیں ہے تو پھر کمانے کی ضرورت بھی نہیں پڑے گی، کتب فقہ میں اس کی صراحت موجود ہے کہ اگر عورت غیر شادی شدہ ہے تو شادی ہونے تک اس کا نفقہ اس کے والد پر واجب ہے اور اگر شادی شدہ ہے تو

اس کا نفقہ اس کے شوہر پر واجب ہے۔

اللہ تعالی نے مردوں کو عورتوں پر قوام وحاکم بنایا ہے، اس لئے کہ عورتوں کے نفقہ کی ذمہ داری مردوں پر ہے (سورۂ نساء: ۳۴)۔

الجامع لاحکام القرآن میں ہے: ''فقيام الرجال على النساء على هذا الحد، وهو أن يقوم تبد بيرها وتأديبها وإمساكها في بيتها ومعها من البروز وأن عليها طاعته وقبول أمره مالم تكن معصية... أنه متى عجز عن نفقتها لم يكن قواما عليها'' (الجامع لأحكام القرآن ۳،۱۶۹)۔

اگر عورت مطلقہ ہے یا شوہر کا انتقال ہو چکا ہے اور اس کے پاس مال نہیں ہے تو اس کا نفقہ اس کے وارثین پر بقدر میراث واجب ہوگا

''والنفقة لكل ذی رحم محرم إن كان صغيرا فقيرا أو كانت امرأة بالغة فقيرة أو كان ذكرا بالغا فقيرا زمنا أو أعمى... ويجب ذلك على مقدار الميراث ويجبر عليه'' (هدايه على هامش شرح فتح القدير باب النفقه ۴۲۰،۴۱۹)۔

عورت پر نفقہ واجب ہے یا نہیں:

اگر شوہر کسی وجہ سے اپنی بیوی کا نفقہ ادا نہیں کر پا رہا ہے اور عورت کمانے کے لائق ہے یا عورت مطلقہ ہے اور عدت گذر چکی ہے یا شوہر کا انتقال ہو چکا ہے اور عورت کے پاس زندگی گزارنے کے لئے مال نہیں ہے اور وہ کمانے کے لائق ہے تو ان صورتوں میں وہ خود کما کر اپنی زندگی گزارے گی اور نفقہ کا انتظام خود کرے گی۔

مذکورہ بالا تمہیدات کے بعد سوالات کے جوابات درج ذیل ہیں:

۱۔ شریعت اسلامی خواتین کے لئے کسب معاش کو کس نظر سے دیکھتی ہے؟ اس سوال کا جواب اوپر کی تمہید سے واضح ہے کتاب وسنت میں حلال روزی کمانے اور اس کے استعمال کرنے کی جو فضیلت آئی ہے وہ مردوں کے ساتھ خاص نہیں ہے، اور تخصیص کی کوئی وجہ بھی نظر نہیں آتی ہے، جس طرح مرد کسب معاش کے محتاج ہوتے ہیں اسی طرح عورتیں بھی بعض صورتوں میں کسب معاش کی محتاج ہوتی ہیں۔ لہذا پردہ شرعی کی مکمل رعایت کرتے ہوئے شریعت کے حدود میں رہ کر عورتیں بھی کسب معاش کر سکتی ہیں، شرعا جائز ودرست ہے۔

بلکہ اگر ان کی کفالت کرنے والا کوئی نہ ہو مثلاً شوہر اپاہج ہو اس کے پاس مال نہ ہو اور وہ کمانے کے لائق بھی نہ ہو یا عورت مطلقہ ہو اور اسکی عدت گزر چکی ہو یا شوہر کا انتقال ہو چکا ہو اور اس کے پاس مال نہ ہو یا اس پر اولاد یا دیگر رشتہ داروں کا نفقہ واجب ہو تو ان حالات میں بقدر کفاف کسب معاش فرض ہوگا۔ اور اگر اس کی کفالت ہو رہی ہو، اس پر کسی کا نفقہ واجب نہ ہو تو فقیروں یا دینی کاموں پر صدقہ کرنے کی غرض سے یا رشتہ داروں کی دل جوئی کے لئے کمانا مستحب ہے، اور حرام مال کمانا یا ایسی کمائی جس سے عزت وآبرو اور دین خطرہ میں ہو حرام ہے۔

۲۔ اگر عورت کی کفالت کرنے والا کوئی نہ ہو اور وہ کمانے کے لائق ہو تو وہ پردہ شرعی کی رعایت کرتے ہوئے خود کما کر اپنے اخراجات پوری کرے گی، اسی طرح اولاد کا نفقہ بقدر میراث ماں پر واجب ہے جبکہ باپ نہ ہو اور اولاد کمانے کے لائق نہ ہو۔

۳۔ جبکہ تنگی وترشی سے کام چل سکتا ہے اور چلتا ہے تو محض معیار زندگی کو بلند کرنے کے لئے یا وقت گزاری اور اثاثہ جمع کرنے کی غرض سے عورتوں کے لئے کسب معاش شرعا محمود وپسندیدہ معلوم نہیں ہوتا ہے گرچہ جواز کی گنجائش نظر آتی ہے۔

۴۔ جن حالات میں عورت کے لئے کسب معاش ضروری ہے ان میں شوہر یا کسی ولی سے اجازت لینا ضروری نہیں ہے، بلا اجازت بھی وہ کام کر سکتی ہے اور جن حالات میں عورتوں کے لئے کسب معاش ضروری نہیں ہے ان حالات میں اجازت لینا ضروری ہے، بلا اجازت وہ کام نہ کریں بلکہ اگر ولی یا شوہر روک دے تو رک جائیں۔

۵۔ اسی طرح جن حالات میں عورت کے لئے کسب معاش ضروری ہے ان حالات میں گھر سے باہر نکلنے کے لئے ولی یا شوہر سے اجازت لینا ضروری نہیں ہے، بلا اجازت بھی وہ گھر سے نکل کر کام کر سکتی ہے، البتہ رات میں باہر نہیں رہ سکتی ہے، رات اپنے گھر میں جہاں وہ رہتی ہے گزارے گی، اور جن حالات میں کسب معاش عورت پر ضروری نہیں ہے ان حالات میں شادی سے قبل ولی اور شادی کے بعد شوہر سے اجازت لینا ضروری ہے، بلا اجازت وہ گھر سے باہر نکل کر کام نہیں کر سکتی ہے۔ اگر سفر شرعی ہے تو ساتھ میں محرم کا ہونا بھی ضروری ہے، بلا محرم سفر کرنا گناہ عظیم ہے۔

۶۔ عورتیں ملازمت تو کرسکتی ہیں لیکن وہ اس سلسلہ میں آزاد نہیں ہیں، بلکہ ان کی ملازمت کے سلسلہ میں کچھ شرعی حدود ہیں جن کی رعایت ضروری ہے، وہ شرعی حدود درج ذیل ہیں؛

۱۔ گناہ کا کام نہ ہو، اگر گناہ کا کام ہو تو اس کی قطعاً اجازت نہیں ہوگی۔

۲۔ پردۂ شرعی کی مکمل رعایت ضروری ہے، ایسی ملازمت کی قطعاً اجازت نہیں ہوگی جس میں کسی اجنبی مرد کے ساتھ اختلاط ہو، اس کے ساتھ تنہائی ہو یا اس کے سامنے جانا پڑے۔

۳۔ اگر عورتوں کو کام کرنے کے لئے گھر سے باہر نکلنا ہو تو زیب وزینت، بناؤ سنگار اور عمدہ لباس میں نہ نکلیں جس سے لوگوں کی نگاہ ان کی طرف اٹھے اور لوگوں کا میلان ان کی طرف ہو۔

۴۔ اگر عورت غیر شادی شدہ ہو تو اپنے ولی سے اور اگر شادی شدہ ہو تو اپنے شوہر سے اجازت لے کر کام کرے۔

۷۔ جس ادارہ میں کام کرنے والی عورتیں ہوں لیکن ذمہ دار مرد ہو تو اس ادارہ میں عورتیں کام کرسکتی ہیں البتہ ذمہ دار سے بھی پردہ شرعی ضروری ہے، بہتر تو یہ ہے کہ ذمہ دار مرد اپنی کسی محرم عورت کو ساتھ رکھے تاکہ حسب ضرورت وہ عورتوں سے بات کرسکے، لیکن اگر اس طرح کی شکل نہ بن سکے اور ذمہ دار مرد سے بات کرنے کی ضرورت پیش آجائے تو پردہ میں رہ کر بات کرلیں یا خود ذمہ دار کو ضرورت ہو تو پردہ میں رہ کر بات کرے، ذمہ دار مرد کے سامنے ملازمہ عورت کا بے پردہ ہوجانا خطرہ سے خالی نہیں ہے۔ اللہ تعالی نے صحابہ کرام کو مخاطب کرکے فرمایا کہ اگر تم کو ازواج مطہرات سے کچھ مانگنا ہو تو پردہ کے پیچھے سے مانگو یہ تمہارے اور تمہارے دلوں کی پاکیزگی کا عمدہ ذریعہ ہے۔

''وإذا سئلتموهن متاعا فاسئلوهن من وراء حجاب ذلكم اطهر لقلوبكم وقلوبهن'' (سورۂ احزاب ۵۳)۔

صحابہ کرام اور ازواج مطہرات جو کائنات کے بہترین مرد اور بہترین عورتیں ہیں جن کے تقوی وطہارت، ان کی عفت وپاکدامنی اور پاکیزگی کی قسم کھائی جاسکتی ہے، ان کو پردہ کے پیچھے سے مانگنے اور دینے کا حکم ہے (سورۂ احزاب ر ۵۳)۔

آیت کریمہ "ولا يبدين زينتهن إلا ما ظهر" سے گرچہ کچھ فقہاء نے چہرہ اور ہتھیلی کو آزاد عورتوں کے ستر سے خارج قرار دیا ہے جس سے ملازمہ عورتوں کے لئے ذمہ دار مرد کے سامنے چہرہ اور ہتھیلی کھول کر ضرورۃً جانے کی اجازت معلوم ہوتی ہے لیکن چونکہ فتنہ عموماً چہرہ کو دیکھنے سے پیدا ہوتا ہے اور اس دور میں فسق وفجور عام ہے اس لئے نماز کے علاوہ چہرہ اور ہتھیلی کو بھی ستر میں داخل کیا گیا ہے اور اجنبی مردوں کے سامنے ان دونوں کو چھپانا بھی ضروری قرار دیا گیا ہے۔ حالات کے پیش نظر اسی قول پر فتوی ہے اور اسی پر عمل بھی ہونا چاہئے۔

۸۔ جہاں مرد وعورت دونوں مخلوط طور پر کام کرتے ہوں اور پردہ شرعی کا کوئی نظم نہ ہو وہاں عورتوں کے لئے ملازمت کی شرعاً اجازت نہیں ہوگی خواہ جوان عورتیں ہوں یا سن رسیدہ، مسلمان عورتوں کے لئے اس سے احتراز لازم ہے، اللہ تعالی رازق ہے، اس کی صفت رزاقیت پر اعتماد کرکے شریعت کے حدود میں رہ کر کام کریں۔

۹۔ پردہ شرعی تو بہرحال لازم ہے اور مرد وعورت کے اختلاط سے اجتناب ضروری ہے، کم وبیش کا فرق ملحوظ نہیں رکھا جائے گا، خواہ دوکان میں خرید وفروخت کا معاملہ ہو یا آفس میں بیٹھ کر کام کرنے کا بہرصورت شرعی حدود کی رعایت ضروری ہوگی، ہاں اگر کوئی عورت آفس میں پردہ کے ساتھ بیٹھ کر کام کرتی ہے اور کسی طرح کے فتنہ کا اندیشہ نہیں ہے تو اس کے لئے کام کرنے کی گنجائش ہوگی ورنہ نہیں ہوگی۔

۱۰۔ عورت ملازمت کی غرض سے اپنے گھر سے دور اندرون ملک یا بیرون ملک مستقل قیام کرسکتی ہے بشرطیکہ اس کے ساتھ اس کا کوئی محرم رہتا ہو اور دیگر شرعی حدود کی رعایت بھی ہو۔

☆☆☆

خواتین کی ملازمت

مولانا انوار الحق رحمانی[1]

۱۔ خواتین کا اصلی دائرۂ عمل گھر کی چہار دیواری اور ان کا بنیادی فریضہ امور خانہ داری کی انجام دہی ہے، اللہ رب العزت کا ارشاد ہے:

''وقرن فی بیوتکن ولا تبرجن تبرج الجاھلیۃ الأولی'' (الاحزاب: ۳۳) (اور اپنے گھروں میں قرار سے رہو اور قدیم جاہلیت کے زمانے کی طرح اپنے بناؤ سنگار کا اظہار نہ کرو)۔

انسانی زندگی میں کام کے دو میدان ہیں ایک داخلی یعنی گھریلو کام کاج اور دوسرے خارجی یعنی گھر کے باہر کے کام، اسلام نے داخلی امور کی انجام دہی عورت کے سر رکھی ہے اور خارجی کاموں کا بار مرد پر ڈالا ہے، احادیث کی رو سے عورت گھر کی ملکہ اور ذمہ دار اور گھریلو امور کی جواب دہ ہے۔

''المرأۃ راعیۃ علی بیت زوجھا وھی مسئولۃ عن رعیتھا'' (بخاری ۲،۷۷۹)۔

ایک حدیث میں یہ صراحت آئی ہے کہ حضرت فاطمہؓ کے نکاح کے بعد رسول اللہ ﷺ نے حضرت علی کرم اللہ وجہ اور حضرت فاطمہ کے درمیان کاموں کی تقسیم فرمائی اور بیرونی کاموں کی ذمہ داری حضرت علیؓ پر ڈالی اور داخلی امور کی انجام دہی حضرت فاطمہؓ کے سپرد فرمائی۔

(بدائع الصنائع ۳؍۴۴۰ باب النفقہ)۔

یہ روایت فقہ حنفی کی متعدد متداول کتابوں بدائع الصنائع، البحر الرائق اور درمختار میں باب النفقہ کے ذیل میں مذکور ہے۔

یہ ایک قدرتی تقسیم اور فطری نظام عمل ہے جو دونوں صنفوں کی طبیعت فطرت اور جسمانی قوت وصلاحیت کے عین مطابق ہے، اسلام کے عین مقرر کردہ نظام میں عورتوں کی عزت وناموس کی حفاظت بھی ہے اور ان کی صنفی کمزوریوں اور فطری نزاکتوں کی رعایت بھی، ان کے گھر سنبھالنے سے گھر اور خاندان کا نظام استوار رہے گا، بچوں کی صحیح تربیت ہوگی، اور ملک ومعاشرہ جنسی انارکی سے محفوظ رہے گا۔

انسان کے دونوں صنفوں کے درمیان قدرتی فرق کا پایا جانا قدرت کا دوٹوک اشارہ ہے کہ خالق نے دونوں کو الگ الگ کام اور الگ الگ میدان کے لئے پیدا کیا ہے، اس فطری فرق کو نظر انداز کر کے دونوں کو ایک میدان میں گھسیٹ لانا اور سرکاری ملازمتوں اور معاشی سرگرمیوں میں شریک کرنا منشائے فطرت کے خلاف ہے۔

مرد وعورت دونوں برابر نہیں ہیں، بلکہ دونوں کی صلاحیتوں میں فرق اور فطری اختلاف کا تقاضا یہ ہے کہ دونوں کی ذمہ داریاں بھی جداگانہ ہوں اور دائرۂ عمل اور حلقہ کار بھی علاحدہ، اسلام نے اس جسمانی وخلقی تفاوت اور جداگانہ صلاحیات کا لحاظ کرتے ہوئے ہر جنس کو اس کے مناسب کام سپرد کیا ہے، گھر کی تنظیم، داخلی امور کی دیکھ ریکھ، بچوں کی تربیت اور گھر کے مال واسباب کی حفاظت کی ذمہ داری عورت پر ڈالی، اور معاشی تگ ودو، سماجی خدمات، حکومتی اور سیاسی نظم ونسق اور حرب وضرب اور فوجی ودفاعی کام مردوں کے سپرد کیا ہے جو ان کی جسمانی قوت وصلاحیت، انتظامی قابلیت، عقل و رائے کی پختگی، عزم واستقلال اور شجاعت وجواں مردی کے مناسب ہے، یہ ایک قدرتی تقسیم اور فطری نظام ہے جس پر زمانہ قدیم سے عمل ہو رہا ہے۔

انسانی تمدن کو جتنی ضرورت مردانہ خدمات کی ہے اتنی ہی ضرورت زنانہ خدمات کی بھی ہے، خارجی کام جتنی اہمیت رکھتے ہیں، عائلی امور اور گھریلو کام کاج اس سے کم اہمیت کے حامل نہیں ہیں، مرد وعورت کے درمیان تخلیقی فرق کا پایا جانا خود اس بات کی دلیل ہے کہ قدرت کا منشا دونوں سے الگ الگ کام لینے کا ہے۔

---

[1] امارت شرعیہ، پھلواری شریف، پٹنہ۔

مغربی ملکوں میں عورتوں کو گھر سے باہر لانے اور زندگی کے تمام شعبوں میں مردوں کے شریک کار بنانے کے چار عظیم نقصانات ہوئے ایک تو یہ کہ دونوں صنفوں کے آزادانہ اختلاط کے نتیجے میں جنسی جرائم کی ایسی کثرت ہوئی کہ پورا معاشرہ عفت وعصمت اور اخلاقی قدروں سے عاری ہوگیا، دوسرا بڑا نقصان یہ ہوا کہ فواحش کی کثرت کے نتیجہ میں امراض خبیثہ وبائے عام کی طرح پھوٹ پڑے، ایڈز کا مرض آج امریکہ اور تمام یورپ کے ممالک میں دردسر بنا ہوا ہے، تیسرا بڑا نقصان یہ ہوا کہ مرد وزن کے آزادانہ ملاپ اور ناجائز تعلق کے نتیجے میں ناجائز اولاد کی کثرت ہوگئی حتی کہ بعض ملکوں میں ناجائز بچوں کا تناسب پچھتر فی صد تک پہنچ گیا چوتھا بڑا نقصان یہ ہوا کہ مرد وزن کے آزادانہ ملاپ اور ناجائز تعلقات کے نتیجے میں ان ممالک میں نکاح کی اہمیت ختم ہوگئی، ازدواجی رشتہ کمزور اور خاندانی نظام منتشر ہوکر رہ گیا، اس لئے حالات کا تقاضا یہ ہے کہ عورتوں کو گھر سے باہر نکل کر ملازمت کرنے اور کسب معاش کے دیگر ذرائع اختیار کرنے کی ہرگز اجازت نہ دی جائے، اور اس مغربی فکر کی کسی طرح ہمت افزائی نہ کی جائے ضرورت کے مواقع اس سے مستثنی ہیں کہ شرعی حدود میں رہتے ہوئے خواتین کے لئے ولی یا شوہر کی اجازت سے کسب معاش کی گنجائش نکلتی ہے جیسا کہ عہد رسالت اور عہد صحابہ میں اس کی نظیریں ملتی ہیں۔

ا۔خواتین کے لئے کسب معاش کی شرعی حیثیت:

مال کو انسانی زندگی میں بڑی اہمیت حاصل ہے، انسانی زندگی مال کے گرد گردش کرتی ہے، انسان کی اکثر ضرورتیں مال سے پوری ہوتی ہیں، اس لئے کسب معاش کے ذرائع اختیار کرنا اور مال کمانا شرعاً مطلوب ہے، مال کی اہمیت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ اللہ رب العزت نے اس کے لئے بعینہ وہی تعبیر استعمال فرمائی ہے جو کعبہ شریف کے لئے استعمال فرمائی ہے، ارشاد باری تعالی ہے:

"ولا تؤتوا السفهاء أموالكم التى جعل الله لكم قياما" (نساء:۵) (اللہ تعالی نے تمہاری گذارن کے قائم رکھنے کا ذریعہ بنایا ہے)۔

اور یہی قیام کا لفظ کعبہ اور بیت اللہ کے لئے استعمال کیا گیا، چنانچہ ارشاد فرمایا گیا:

"جعل الله الكعبة البيت الحرام قياما للناس" (مائدہ:۹۷) (اللہ نے کعبہ کو جو ادب کا مکان ہے لوگوں کو قائم رہنے کا سبب قرار دے دیا)۔

یعنی جس طرح مومن کی دینی وایمانی زندگی کے لئے کعبہ کو مرکزی حیثیت حاصل ہے کہ ہر نماز میں آدمی اس کی طرف رخ کرتا ہے اور ہر صاحب استطاعت مسلمان پر زندگی میں بیت اللہ کا حج فرض ہے اسی طرح مال کو انسانی زندگی میں مرکزیت اور بنیادی حیثیت حاصل ہے کہ زندگی کی چکی اسی کے گرد گھومتی ہے، اسی لئے مال کمانے کی ترغیب قرآن وحدیث میں بار بار آئی ہے، سورہ جمعہ میں ارشاد ہے:

"فإذا قضيت الصلاة فانتشروا فى الأرض وابتغوا من فضل الله" (جمعہ:۱۰) (پھر جب نماز ہو چکے تو زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ کا فضل تلاش کرو)۔

حج اصلاً ایک عبادت اور اسلام کا بنیادی رکن ہے، لیکن سفر حج میں بھی مال کمانے کی اجازت دی گئی، ارشاد باری ہے:

"ليس عليكم جناح أن تبتغوا فضلا من ربكم" (بقرہ:۱۹۸) (تم پر اپنے رب کا فضل تلاش کرنے میں کوئی گناہ نہیں)۔

بخاری شریف کی روایت میں اپنے ہاتھ کی کمائی کھانے کو سب سے بہتر رزق قرار دیا گیا: حضرت مقداد بن معدی کرب فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کسی شخص نے اپنے ہاتھ کی کمائی سے بہتر کھانا نہیں کھایا، اور اللہ کے نبی حضرت داؤد علیہ السلام اپنے ہاتھ کی کمائی سے کھاتے تھے (بخاری حوالہ سابق ر ۲۴۱)۔

اور قرآن وحدیث کے احکام جس طرح مردوں کے لئے ہیں اسی طرح عورتوں کے لئے بھی ہیں، فرق صرف یہ ہے کہ مردوں کو چونکہ اللہ تعالی نے عورتوں پر قوام اور ان کی اور اپنے خاندان کے دیگر افراد کی معاشی کفالت کا ذمہ دار بنایا ہے تو ان پر اپنے زیر کفالت افراد کے اخراجات کا نظم کرنا اور کمانا واجب ہے، لیکن اچھے مقاصد کے لئے شریعت کے حدود میں رہتے ہوئے مال کمانا اور کسب معاش کے ذرائع اختیار کرنا عورت کے لئے بھی جائز اور مباح ہے بشرطیکہ اس کی اس مصروفیت سے اس کے فرائض اور اصل ذمہ داریاں متاثر نہ ہوں جو شریعت نے ان پر عائد کی ہیں۔

۲۔ کیا شریعت نے خواتین پر بھی نان ونفقہ کی ذمہ داری رکھی ہے؟

یہ اسلام کا خواتین پر عظیم احسان ہے کہ اس نے عام حالات میں انہیں فکر معاش سے آزاد کردیا ہے، شادی سے قبل ان کا نفقہ ان کے والد پر ہے اور شادی کے بعد ان کا نفقہ ان کے شوہر پر ہے۔

قرآن کریم کی درج ذیل آیت اولاد کے نفقہ سے متعلق ہے۔

"والوالدات یرضعن أولادھن حولین کاملین لمن أراد أن یتم الرضاعة وعلی المولود له رزقھن و کسوتھن بالمعروف" (بقرہ:۲۳۳)

،اس آیت کی رو سے مطلقہ بیوی جو اپنے سابق شوہر کے بچے کو دودھ پلا رہی ہے وہ نفقہ کی مستحق ہے، جب اولاد کو دودھ پلانے کی وجہ سے دودھ پلانے والی ماں کا نفقہ بچے کے باپ پر واجب ہوا تو خود اولاد کا نفع بدرجہ اولی واجب ہوگا۔

خواتین پر نان ونفقہ کی ذمہ داری کب آتی ہے؟

عام حالات میں عورتوں پر ان کا یا ان کے بچوں کا نفقہ نہیں ہے، بلکہ ان کے باپ، شوہر اور دیگر اولیاء پر ان کا نفقہ واجب ہے، لیکن جب وہ بیوہ یا مطلقہ ہوں اور ان کی کفالت کرنے والے اولیاء باپ بھائی وغیرہ موجود نہ ہوں یا موجود ہوں لیکن کفالت سے معذور ہوں تو اس صورت میں شرعاً ان پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ اگر وہ مالدار ہیں تو اپنے مال سے اپنی اور اپنے بچوں کی کفالت کریں اور اگر گذر بسر کے لائق مال ان کے پاس نہ ہو تو وہ کسب معاش کا کوئی حلال اور معقول ذریعہ اختیار کر کے اپنی اور اپنے بچوں کی کفالت کریں، اور ایسی ضرورت کی حالت میں شریعت نے کسب معاش کے لئے انہیں گھر سے باہر جانے کی اجازت دی ہے، پھر بھی ان کے حق میں بہتر یہی ہے کہ وہ اندرون خانہ اپنے لئے کسب معاش کا کوئی ذریعہ اختیار کرلیں، اور آج کے دور میں جبکہ کسب معاش کے ذرائع میں بڑی وسعت اور تنوع پیدا ہوگیا ہے اس طرح کا کوئی ذریعہ اختیار کرنا مشکل نہیں تاہم اگر ایسا ممکن نہ ہو تو وہ اس مقصد کے لئے شرعی حدود کی پابندی کرتے ہوئے باہر جاسکتی ہیں، بخاری شریف میں حضرت اسماء بنت ابوبکرؓ کا واقعہ مذکور ہے کہ وہ حضرت زبیرؓ کے گھوڑے کے لئے چارہ اور پانی کا انتظام کرتی تھیں اور گھر سے باہر جاتی تھیں (دیکھئے: بخاری ومسلم)۔

لیکن علماء نے یہ صراحت کی ہے کہ ان کا یہ نکلنا بربنائے ضرورت تھا کہ حضرت زبیرؓ حوار رسول کی علمی ودینی مصروفیت اور جہاد کی مصروفیت اس خدمت سے مانع تھی نیز ان کی مالی حالت ایسی نہ تھی کہ وہ بیرونی کاموں کی انجام دہی کے لئے کوئی خادم رکھ سکیں، اس لئے ان کی اہلیہ حضرت اسماءؓ کو اس ضرورت کے لئے باہر جانا پڑتا تھا اور یہ نکلنا حضرت زبیرؓ کی اجازت سے تھا، پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اسے جانتے اور دیکھتے ہوئے اس پر خاموش رہنا اور نکیر نہ فرمانا اس کے جواز کی دلیل ہے۔

۳۔ سرمایہ واثاثہ پیدا کرنے کے لئے عورتوں کا معاشی جدوجہد کرنا:

اگر سرمایہ واثاثہ پیدا کرنے کا مقصد دین کی خدمت، خیراتی ورفاہی کاموں میں حصہ لینا اور حاجت مندوں کی امداد واعانت ہو اور شرعی حدود میں رہتے ہوئے اور اولیاء کی اجازت سے ہو تو نہ صرف یہ کہ یہ ممنوع نہیں ہے بلکہ ایک پسندیدہ عمل ہے جیسا کہ امہات المومنین میں حضرت زینب بنت جحشؓ صنعت وحرفت اور دباغت کا کام جانتی تھیں اور اپنے دست وبازو سے کما کر مسکینوں کی مدد اور راہ خدا میں خیرات کرتی تھیں، امام مسلم نے اپنی صحیح میں ان کے بارے میں حضرت عائشہؓ کا یہ قول نقل کیا ہے:

''کانت تعمل بیدھا وتصدّق'' (صحیح مسلم ۲،۲۸۵) (وہ اپنے ہاتھ سے کام کرتی تھیں اور اسے صدقہ کردیتی تھیں)۔

محض معیار زندگی بلند کرنے یا وقت گذاری کے لئے معاشی جدوجہد کرنا:

لیکن محض زندگی کو بلند کرنے یا وقت گذاری کے لئے گھر سے باہر معاشی جدوجہد اختیار کرنا شرعاً ممنوع ہوگا اس لئے کہ اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے اور اس مصروفیت کی وجہ سے اس کے وہ فرائض متاثر ہوں گے جو شوہر کی خدمت، بچوں کی تربیت اور گھر کی تنظیم سے متعلق اس پر عائد ہوتے ہیں۔

۴۔ خواتین کا اندرون خانہ کسب معاش کے ذرائع اختیار کرنا:

خواتین کا اصل دائرہ کار گھر کی چہار دیواری ہے، اس میں رہتے ہوئے اگر کوئی ذریعہ معاش اختیار کریں اور اندرون خانہ اپنی معاشی سرگرمیوں کو محدود رکھیں مثلاً سلائی، کڑھائی، بنائی، کشیدہ کاری یا کتابت یا آج کے دور کے لحاظ سے کمپیوٹر وغیرہ کے ذریعہ کمائی تو دو شرطوں کے ساتھ اس کی اجازت حاصل ہوگی ایک تو یہ کہ اس کی وجہ سے اس کے بنیادی فرائض میں کوتاہی واقع نہ ہو یعنی امور خانہ داری کی انجام دہی، بچوں کی پرورش و پرداخت اور شوہر کی خدمت وغیرہ اور دوسرے یہ کہ اسے اس کے لئے اپنے شوہر یا ولی کی طرف سے اجازت حاصل ہو، اس لئے کہ مردوں کی قوامیت کا مطلب ہی یہ ہے کہ وہ ان کی معاشی کفالت کرتے ہیں لہذا وہ ان کی نگرانی وسرپرستی میں اور ان کی اجازت اور مشورے سے کام کریں اور جب وہ ان کی کفالت کر رہے ہوں تو انہیں ایسے کاموں سے روکنے کا حق حاصل ہے۔

''والذی ینبغی تحریرہ أن یکون له منعها عن کل عمل یؤدی إلی تنقیص حقه أو ضررہ أو إلی خروجها من بیته'' (ردالمحتار ۵،۲۵۹)۔ (اور وہ جس کا لکھنا مناسب ہے وہ یہ ہے کہ شوہر کو اپنی بیوی کو ہر ایسے کام سے روکنے کا حق ہے جس سے اس کے حق میں کمی واقع ہو یا جس سے اسے ضرر پہنچے یا جس کی وجہ سے اسے گھر سے باہر جانا پڑے)۔

''بل له أن یمنعها من الأعمال کلها المقتضیة للتکسب لأنها مستغنیة عنه لوجوب کفایتها علیه وکذا من العمل تبرعا لأجنبی بالأولی'' (البحر الرائق ۴،۱۰۶) (بلکہ شوہر کو ایسے تمام کاموں سے بیوی کو روکنے کا حق ہے جو کمائی کے ہیں، اس لئے کہ عورت کو کمائی کی ضرورت نہیں ہے اس لئے کہ اس کی کفالت شوہر پر واجب ہے، تو ایسے عمل سے روکنے کا بدرجہ اولی اسے حق ہوگا جسے بیوی رضا کارانہ طریقے کسی اجنبی کے لئے انجام دیتی ہو)۔

۵۔ خواتین کا کسب معاش کے لئے گھر سے باہر نکلنا:

خواتین کا اصل کام گھر کو سنبھالنا اور خانگی امور کو انجام دینا ہے، اس لئے کہ شریعت نے انہیں پردہ کا پابند بنایا ہے اور گھر میں جم کر رہنے کا حکم دیا ہے، اس لئے انہیں چاہئے کہ گھریلو خدمات میں دلچسپی لیں اور ممکن حد تک اپنی سرگرمیوں کو گھر کی چہار دیواری تک محدود رکھیں، اس لئے کہ انہیں قرآن کریم نے جم کر گھروں میں رہنے اور بلاضرورت باہر نہ نکلنے کا حکم دیا ہے (الاحزاب ر ۳۳)۔

اور اگر حالات ایسے ہوں کہ کوئی مرد ان کی کفالت کرنے والا نہ ہو اور نہ خود وہ اتنی مالدار ہوں کہ اس سے گھر کا خرچ چل سکے اور مجبوراً انہیں کسب معاش کے لئے گھر سے باہر نکلنا پڑے تو ایسی ضرورت کی بنا پر گھر سے باہر جانے کی شرعاً اجازت ہے، صحیحین کی ایک حدیث ہے جس کا آخری ٹکڑا ہے:

''قد أذن الله لکن أن تخرجن من البیت لحوائجکن'' (بخاری باب خروج النساء لحوائجهن باب ۱۱۶، حدیث نمبر ۵۲۳۷، فتح الباری مع البخاری ۹،۲۲۱) (اللہ تعالیٰ نے تم عورتوں کو اپنی حاجت کے لئے گھر سے باہر جانے کی اجازت دی ہے)۔

اس حدیث میں ضرورت کی بنا پر عورتوں کو گھر سے باہر جانے کی اجازت دی گئی ہے، لہذا خواتین بر بنائے ضرورت کسب معاش کے لئے گھر سے باہر جاسکتی ہیں لیکن اس کے لئے ولی یا شوہر کی اجازت ضروری ہوگی۔

عورت کا کسب معاش کے لئے اپنی آبادی سے باہر جانا:

عورت کا کسب معاش اور ملازمت کے لئے گھر سے باہر جانا اگر اس آبادی یا شہر میں ہو جہاں وہ رہتی ہے تو بر بنائے ضرورت حدود شرع کی رعایت کرتے ہوئے جائز ہے لیکن اگر اس جگہ کا فاصلہ مسافت سفر یا اس سے زیادہ کا ہو تو محرم کے بغیر اس کا وہاں جانا جائز نہ ہوگا، اس لئے کہ احادیث میں عورتوں کو محرم کے بغیر تین دن یا ایک دن کا سفر کرنے سے منع کیا گیا ہے، مسلم شریف کی حدیث ہے:

''عن عبد الله بن عمر عن النبی ﷺ قال: لا یحل لا مرأة تؤمن بالله والیوم الآخر أن تسافر مسیرة ثلاث لیال إلا ومعها ذو محرم'' (صحیح مسلم کتاب الحج ۱،۴۳۳) (حضرت عبداللہ بن عمرؓ نبی ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے

فرمایا: جو عورت اللہ پر اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتی ہو اس کے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ کسی محرم کے بغیر تین دن کی مسافت کا سفر کرے)۔

اس طرح رات کے اوقات میں عورتوں کا گھر سے نکلنا چونکہ فتنہ کا باعث ہے اس لئے ملازمت یا کسب معاش کے لئے رات کو نکلنے کی اجازت نہ ہوگی، چنانچہ البحر الرائق میں ہے:

''اور جو عورت وفات کی عدت گزار رہی ہو وہ کمانے کے لئے دن میں اور رات کے کچھ حصے میں گھر سے باہر جائے گی تاکہ اسکے گذر بسر کا سامان ہو سکے اس لئے کہ شرعاً اس کے لئے نفقہ نہیں ہے، یہاں تک کہ اگر اس کے ضرورت کے بقدر مال ہو تو وہ مطلقہ کی طرح ہے کہ اس کے لئے کسی سے ملاقات یا کسی اور غرض سے نکلنا جائز نہیں) (البحر الرائق ۴/۲۵۸-۲۵۹ کتاب الطلاق فصل فی الإحداد)۔

لہذا یہاں بھی عورتوں کو بر بنائے حاجت دن کے اوقات میں کسب معاش کے لئے گھر سے باہر جانے کی اجازت دی جائے گی، رات کے اوقات میں نہیں۔

اگر کفالت کرنے والا ولی موجود ہو تو پھر کسب معاش کے لئے باہر جانے کی ضرورت ہی نہیں، لیکن اگر ولی شوہر یا باپ وغیرہ موجود ہوں لیکن اپنے فقر وافلاس یا آفت زدہ اور مریض ہونے کی بنا پر کفالت سے عاجز ہوں تو چونکہ اپنی قوامیت کی ذمہ داری ادا نہیں کر رہے ہیں اس لئے انہیں روکنے کا حق نہیں ہے لیکن چونکہ وہ اس کا سربراہ، ذمہ دار اور نگراں ہے اس لئے ان سے اجازت لینا استحباب کے درجہ میں ہوگا، تاکہ ولی کے مشورہ اور رضامندی سے کام ہو اور اس کی سرپرستی قائم رہے۔

۶۔ خواتین کی ملازمت کے سلسلہ میں شرعی حدود:

۱۔ خواتین کا اصل دائرہ کار ان کا گھر ہے جس میں سکون ووقار کے ساتھ رہنے اور امور خانہ داری کو انجام دینے کا انہیں حکم دیا گیا ہے، گھر سے باہر ملازمت کرنے یا کسب معاش کے دیگر ذرائع اختیار کرنیکی اجازت انہیں اس شرط کے ساتھ دی جائے گی کہ انہیں اس ملازمت کی ضرورت ہو، خواہ اس لئے کہ مردوں میں کوئی اس کی کفالت کرنے والا نہ ہو یا کنبہ اتنا بڑا ہو کہ محض شوہر کی کمائی سے گھر کا خرچ پورا نہ ہوتا ہو اس لئے مجبوراً انہیں بھی کمائی میں ہاتھ بٹانا پڑتا ہو۔

۲۔ دوسری صورت یہ ہے کہ خود اس کی کفالت کا مسئلہ نہ ہو بلکہ اس کے شوہر یا دیگر اولیاء اس کی کفالت کر رہے ہوں لیکن وہ کوئی ایسا ہنر، علم وفن جانتی ہو جس کی ملک اور سماج کو ضرورت ہو مثلاً وہ ڈاکٹر ہو کہ زنانہ امراض کے سلسلہ میں گہرا تجربہ رکھتی ہو کہ اگر وہ علاج ومعالجہ کا کام کرنے لگے تو سماج کی عورتوں کو مرد ڈاکٹروں کے پاس نہ جانا پڑے تو ملکی اور سماجی ضرورت ہے تو وہ اس خدمت میں لگ سکتی ہے، یا اگر وہ اس مقصد کے لئے کوئی اسپتال، نرسنگ ہوم یا زچہ خانہ اور عورتوں کی ولادت کا شعبہ قائم کرنا چاہے، یا پہلے سے قائم شدہ عورتوں کے اسپتال میں خواہ وہ سرکاری ہو یا پرائیوٹ بحیثیت ڈاکٹر یا نرس خدمت انجام دینا چاہے تو کچھ شرائط کے ساتھ اور شرعی حدود میں رہتے ہوئے اس کی اجازت ہوگی اور اس کی نظیر ہمیں خود عہد رسالت میں ملتی ہے۔

۳۔ عورتوں کی ملازمت کے جواز کے لئے تیسری اہم شرط یہ ہے کہ اس سے ان کے وہ فرائض میں خلل اور کوتاہی واقع نہ ہو جو شریعت نے خاص طور پر ان کے لئے متعین کئے ہیں یعنی گھر کی دیکھ ریکھ، بچوں کی پرورش، اور شوہر کے حقوق کی ادائیگی وغیرہ۔

۴۔ عورتوں کی ملازمت کے جواز کے لئے چوتھی اہم شرط یہ ہے کہ اسے اس کے لئے اپنے شوہر یا ولی کی اجازت حاصل ہو اس لئے کہ اللہ تعالی نے مردوں کو عورتوں کا قوام بنایا ہے۔

علامہ شامی نے تحریر فرمایا ہے: ''والذی ینبغی تحریرہ أن یکون لہ منعہا عن کل عمل یؤدی إلی تنقیص حقہ أو ضررہ أو إلی خروجہا من بیتہ'' (ردالمحتار ۵/۲۵۹) اور جس کا لکھنا مناسب ہے وہ یہ ہے کہ شوہر بیوی کو ہر ایسے کام سے روک سکتا ہے جس سے اس کا حق کم ہوتا ہو یا جس سے اسے ضرر لاحق ہوتا ہو یا جس کے لئے بیوی کو اس کے گھر سے باہر جانا پڑے۔

۵۔ پانچویں اور اہم شرط یہ ہے کہ غیر محرم مردوں کے ساتھ ان کا اختلاط نہ ہو اور نہ کسی اجنبی مرد کے ساتھ تخلیہ کی نوبت آئے، کہ یہ از روئے شرع

حرام ہے، کہ اسلامی نظام میں مرد وزن کا آزادانہ اختلاط ممنوع ہے اس لئے شریعت نے دونوں کا دائرہ کار الگ الگ رکھا ہے، اور کسی اجنبی مرد کو تخلیہ میں کسی اجنبی عورت سے ملنے کی اجازت نہیں دی ہے، خصوصاً وہ عورتیں جن کے شوہر گھر میں موجود نہ ہوں مردوں کو تنہائی میں ان کے پاس جانے سے منع کیا گیا ہے اس لئے کہ یہ دونوں کے لئے فتنہ وفساد کا باعث بن سکتا ہے، ایک حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ جب کوئی مرد کسی اجنبی عورت کے ساتھ تنہائی میں ہوتا ہے تو تیسرا شیطان ہوتا ہے یعنی اس کا سخت اندیشہ ہے کہ شیطان انہیں ورغلا سکتا ہے (سنن الترمذی)۔

اس لئے عورتوں کے لئے گرلس اسکول وکالج یا نرسری اور پرائمری اسکول میں تدریسی خدمات انجام دینا بہتر ہے جہاں صرف لڑکیاں یا چھوٹے بچے بچیاں پڑھتی ہوں یا ایسے اسپتال جن میں صرف عورتوں اور بچوں کا علاج ہوتا ہو ان میں ڈاکٹر یا نرس کی حیثیت سے عورتوں اور بچوں کا علاج اور ان کی تیمارداری وغیرہ۔

۶۔ اسی طرح چھٹی اہم شرط یہ ہے کہ وہ ان تمام احکام کی پابندی کے ساتھ گھر سے نکلیں، لباس ڈھیلا ڈھالا نہ ہو، خوشبو لگا کر نہ نکلیں، مردوں کے اختلاط وتخلیہ اور ان سے بات چیت کرنے سے اجتناب کریں، نرم لہجہ سے بات نہ کریں وغیرہ۔

۷۔ ملازمت کرنے والی خواتین اگر ایسے اداروں میں کام کریں (خواہ تعلیمی ادارے ہوں یا دوسرے) جہاں خواتین ہی خدمت انجام دیتی ہوں اور کام کی جگہوں میں مرد نہ ہوتے ہوں تو ایسی ملازمت مذکورہ بالا شرطوں کے ساتھ جائز ہے، بلکہ ضرورت کے وقت ایسے ہی اداروں اور ایسے ہی کاموں کا انتخاب مناسب اور بہتر ہے جس میں مردوں سے واسطہ نہ پڑے، بلکہ صرف عورتوں کے ساتھ اختلاط ہو جن سے پردہ کا حکم نہیں ہے، البتہ اگر ادارہ کے ذمہ دار مرد ہوں اور ان کے لئے غیر محرم ہوں تو ان سے پردہ کرنا ضروری ہوگا، اور ان کے ساتھ تخلیہ میں ہونا درست نہ ہوگا، البتہ ضرورتاً بات چیت کرسکتی ہیں، جس طرح صحابہ کرامؓ بوقت ضرورت امہات المومنین دازواج مطہرات کی طرف رجوع کرتے مسائل دریافت کرتے اور اہم مسائل میں تبادلہ خیال فرماتے اسی طرح بوقت ضرورت دیگر صحابیات سے بھی بات چیت ہوتی تھی۔

۸۔ اگر عورت بر بنائے ضرورت ایسی جگہ کام کرنے پر مجبور ہو اور اس کی متبادل دوسری صورت ممکن نہ ہو تو ممکن حد تک اسے مردوں سے پردہ کا اہتمام کرنا پڑے گا اور اگر کام کی نوعیت ایسی ہو کہ جس سے اس کی عفت عصمت کو خطرہ لاحق ہو یا اپنے مذہب وملت کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو تو ایسی ملازمت کسی حال میں اس کے لئے شرعاً جائز نہیں۔

البتہ ایسی سن رسیدہ خواتین جن میں جنسی کشش باقی نہ ہو اور فتنہ کا اندیشہ نہ ہو ان کے لئے جوان عورتوں کی طرح پردہ کا التزام کرنا ضروری نہ ہوگا، لیکن زیب وزینت کا اظہار ان کے لئے بھی جائز نہیں جیسا کہ سورہ نور میں پردہ کے بارے میں فرمایا گیا (سورۂ نور: ۶۰)۔

۹۔ اگر خواتین ملازمت پر مجبور ہوں تو بھی انہیں ایسے کام کو اختیار کرنا چاہئے جن کی انجام دہی میں ان کا سامنا مردوں سے کم ہو، مثلاً دوکان میں سیلز گرل کی حیثیت سے کام کرنے کے بجائے آفس میں یکسوئی سے بیٹھ کر کام کرنے کو ترجیح دیں، کیونکہ یہ اہون البلیتین اور اخف الضررین یعنی دو مصیبتوں اور دو نقصانات میں سے ہلکے اور آسان کو اختیار کرنا ہے جس کی ہدایت شریعت نے ایسے مواقع پر کی ہے۔

۱۰۔ ملازمت کی خاطر خواتین کا اپنے گھروں اور اولیاء ومتعلقین سے دور (خواہ اندرون ملک ہو یا بیرون ملک) مستقل قیام کرنا کسی حال میں درست نہیں، جس شریعت نے عورتوں کو گھروں میں سکون ووقار سے رہنے کا حکم دیا ہے اور بغیر محرم کے لمبا سفر کرنے کو ممنوع قرار دیا ہو اس کی رو سے بھلا اس کی اجازت کہاں سے نکل سکتی ہے کہ وہ ملک یا بیرون ملک اپنے گھروں اور اپنوں سے دور مستقل طور پر قیام کریں۔

☆☆☆

خواتین کی ملازمت

مولانا محمد ارشاد قاسمی [1]

خواتین کی ملازمت کا تعلق عورت کے پردہ سے، بنیادی اور اصولی طور پر ہے، اس لئے اولاً پردہ سے متعلق کچھ نصوص کتاب اللہ اور کتاب السنۃ سے بیان کئے جاتے ہیں، پھر سوال نامہ کے جواب دیئے جائیں گے۔

کتاب اللہ اور کتاب السنۃ میں اصولی اور اساسی طور پر عورتوں سے متعلق دو قسم کے پردوں کا ذکر ہے:

۱۔ چہرے اور ہتھیلی کے ساتھ پورے جسم کا پردہ۔

''یا ایھا النبی قل لازواجك وبناتك ونساء المومنین یدنین علیھن من جلابیبھن'' کے تحت علامہ جصاص رازی استنباط کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''وفی ھذہ الآیة دلالة علی أن المرأة الشابة مامورة بستروجھھا عن الأجنبیین وإظھار الستر والعفاف عن الخروج'' (۲؍۵۴۶)۔

اس آیت نے اس پر دلالت کی کہ جوان عورت اس حکم کی پابند ہے کہ اجانب سے اپنے چہروں کو چھپائے رکھے اور نکلتے وقت عفت اور پردے میں رہے۔

چنانچہ اس آیت کے نازل ہونے کے بعد صحابیات نے اس پر عمل کرنا شروع کر دیا۔

۲۔ چہرے اور ہتھیلیوں کے کھلے رہنے کی گنجائش:

دوسری شکل پردہ کی یہ ہے کہ جب وہ عورتیں باہر خواہ کسی بھی ضرورت سے نکلیں تو گنجائش ہے کہ چہرہ کھلا رکھیں، ''ولا یبدین زینتھن إلا ما ظھر منھا'' اس آیت کی تفسیر میں حضرت ابن جبیر، عطا اور اوزاعی، چہرہ اور کف مراد لیتے ہیں، کہ یہ کھلے رہ سکتے ہیں۔

احادیث سے ثبوت:

چہرے اور ہتھیلی کے ستر میں نہ ہونے کا ثبوت متعدد احادیث سے بھی ہے۔

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں ہند بن عتبہ نے آپ ﷺ سے بیعت کی درخواست کی تو آپ ﷺ نے فرمایا اس وقت تک بیعت نہ کروں گا جب تک کہ مہندی نہ لگا لو (مشکوۃ ر ۵۷۴)۔

اس روایت سے معلوم ہوا کہ عورت کا چہرہ اور اس کی ہتھیلی کے کھلنے کی گنجائش ہے۔

اوپر کی تمہید اور شرعی ضوابط واصول جو کتاب السنۃ سے ماخوذ تھے ان کے بعد اب سوالنامہ کے جوابات مذکورہ امور کی روشنی میں دیئے جاتے ہیں:

۱۔ شریعت اسلامیہ خواتین کے لئے کسب معاش اور ملازمت کو محمود نہیں بلکہ ممنوع نظر سے دیکھتی ہے، ''إلا بالاضطرار وبالضرورۃ۔ لأن الضرورۃ تبیح المحذورات'' جیسے متوفی عنہا زوجہا کے حق میں کسب معاش۔

• کسب معاش مرد خواہ ولی ہو یا والد ہو یا شوہر اس کے ذمہ ہے، جیسا کہ نصوص قرآنیہ میں اس کی وضاحت ملتی ہے۔

---

[1] مدرسہ ریاض العلوم، گوریی جونپور۔

''الرجال قوامون على النساء۔ وبما أنفقوا من أموالهم۔ وعلى المولود له رزقهن۔ وعاشروهن بالمعروف'' میں بالکل صاف وروز روشن کی طرح عیاں ہے کہ یہ مردوں کا کام ہے، اور ان کی ذمہ داری ہے۔ یہ مسئلہ متفق علیہ ہے، علامہ جصاص کی احکام القرآن میں ہے: ''إن الله تعالى أوجب النفقة على الأب دون الأم'' (۱،۵۵۴)۔

پس ان نصوص قرانیہ کی واضح دلالت ہے کہ کسب معاش اور گھریلو اخراجات کو مکمل کرنے، گھر چلانے، بیوی بچوں کے ضروری اخراجات کی جملہ ذمہ داری مردوں پر ہے۔

۲۔ اس سوال کا جواب (ا) میں آ چکا ہے، جب مرد اس کا مکلف ہے اس پر نصوص قرآنیہ اور احادیث نبویہ سے واجب ہے تو عورت پر اس کی ذمہ داری کہاں سے آئے گی، اور اسی طرح بچوں کا خرچہ بھی مردوں پر ہے، عورتوں کے ذمہ نہیں، ہاں مگر ان صورتوں میں:

ا۔ شوہر کی وفات پر عدت اور اس کے بعد گذارہ اوقات کے لئے اس وقت جب کہ نہ عورت کے پاس اتنا مال ہو کہ وہ گذارہ اوقات کر سکے اور نہ خاندان وغیرہ میں اس کی کوئی کفالت کرنے والا ہو، جیسا کہ فقہاء نے متوفی عنہا زوجہا کے بارے میں تصریح کی ہے:

''وعى لا تجد من يكفيها مؤنتها فتحتاج إلى الخروج لنفقتها'' (فتح القدیر ۳،۳۴۳)۔

شوہر اپاہج اور بیمار، کمانے کے لائق نہ ہو، اور گھریلو خرچ کا کوئی بقدر کفایت انتظام نہ ہو اور ضرورت معاش کی وجہ سے اس حالت اضطراری میں اس کے لئے کسب کا کوئی طریقہ گھر کے اندر نہ ہو سکے تو عورت باہر جا سکتی ہے۔

۳۔ معاشی فراوانی اور معیار زندگی کو بلند کرنے کے لئے جبکہ بقدر ضرورت سادگی سے کام چل سکتا ہے تو عورت کو گھر سے باہر جا کر اور گھر سے نکل کر ملازمت اور کسب معاش کی اجازت ہرگز نہ ہوگی کہ یہ ضرورت کی حد میں عند الشرع نہیں ہے۔ لہذا ایسی حالت میں خواتین کو اسی معمولی گذارہ پر اکتفاء کرنا پڑے گا۔

''عن ابن عمر ﷺ مرفوعا ليس للنساء نصيب في الخروج إلا مضطرة'' (طبرانی کنز العمال ۱۶،۱۶۳)۔

مگر یہ کہ مجبوری اور اضطراری حالت پیش آ جائے، ظاہر ہے جب ضروری کام کسی نہ کسی طرح چل رہا ہے تو اضطرار اور ضرورت نہیں پائی گئی پس اس صورت مسئولہ میں باہر کسب اور ملازمت درست نہیں۔

اس کی وضاحت شامی کی عبارت سے ہوتی ہے: ''له أن يمنعها من الأعمال كلها المقتضية للكسب لأنها مستغنية عنه لوجوب كفايتها عليه'' (۳،۶۰۳)۔

۴۔ اس میں بظاہر دو جز ہیں: ۱۔ گھر میں ہی معاشی صورت کو اختیار کرنا، ۲۔ گھریلو معاشی سرگرمیوں میں شوہر کی اجازت لینی ہوگی یا نہیں۔

جز اول: گھر کے اندر رہ کر خواتین معاشی سہولت بلا قباحت اختیار کر سکتی ہیں اس میں کوئی قباحت اور ملامت نہیں چونکہ اصل مسئلہ باہر نکلنا، فتنہ سے دو چار ہونا ہے۔ عورت کا گھر میں رہ کر معاشی اسباب کا اختیار کرنا عہد نبوت میں صحابیات سے ثابت ہے، خود آپ ﷺ کی بعض ازواج مطہرات گھریلو صنعت وحرفت کیا کرتی تھیں۔

ام المومنین حضرت زینب بنت جحش دست کار تھیں، گھر میں صنعت حرفت کرتی تھیں، دباغت کا کام کیا کرتی تھیں۔

''كانت صناع اليدين تدبغ وتخرز وتصدق في سبيل الله، إمرة صناع'' (سبل الھدی والرشاد ۱۱،۲۰۳)۔

اسی طرح عہد نبوت میں مشہور جلیل القدر صحابی حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی بیوی گھریلو صنعت وحرفت کا کام کیا کرتی تھیں۔

دیکھئے امام طحاوی شرح معانی الآثار میں ذکر کر رہے ہیں کہ حضرت ابن مسعود کی زوجہ صنعت وحرفت کا کام کیا کرتی تھیں، اور اسی مال سے وہ شوہر اور ان کے بچوں پر خرچ کیا کرتی تھیں (طحاوی ۱/۳۰۸)، نہ آپ ﷺ نے ان کو منع کیا نہ جلیل القدر صحابی نے بیوی کو منع کیا، اسی طرح آپ ﷺ نے اپنی بیوی حضرت زینب کو منع نہیں کیا۔

جز دوم: اگر شوہر کو عورت کا گھریلو صنعت پسند نہ ہو وہ عورت کے گھریلو کسب کو بہتر نہ سمجھتا ہو، گھریلو نظام میں فتن کا باعث سمجھتا ہو، بچوں کی تربیت و پرورش میں حارج اور باعث نقصان سمجھتا ہو یا کما حقہ خدمت میں نقصان کا باعث سمجھتا ہو تو وہ اسے منع کرسکتا ہے اور گھریلو صنعت سے بھی روک لگا سکتا ہے، چنانچہ احکام القرآن میں ہے:

''الرجال قوامون على النساء۔ تدل على معان احدها تفضيل الرجل على المرأة في المنزلة وأنه هو الذي يقوم بتدبيرها وتأديبها وهذا يدل على أن له إمساكها في بيته ونهيها من الخروج وإن عليها طاعتها'' (۲۶۶)۔

عورت پر واجب ہے کہ وہ شوہر کے اوامر اور اسکے منشاء کی رعایت کرے تاوقتیکہ شوہر اسے معصیت کا حکم نہ دے۔

اسی طرح علامہ شامی نے رد المحتار میں بیان کیا ہے کہ عورت کو گھر میں رہتے ہوئے کسی اجارہ پر شوہر منع کرسکتا ہے، مثلاً دوسرے کے بچے کو اجرت پر دودھ پلانے سے، ظاہر ہے کہ یہ گھر میں رہ کر کمائی ہے (شامی ۳/ ۵۷۶)، اسی وجہ سے فقہاء کرام نے اس کی تصریح کی ہے کہ ایسا کام جس سے عورت کے حسن وجمال میں فرق پڑے اس میں رخنہ پڑے تو شوہر اسے کام کرنے سے منع کرسکتا ہے۔

۵۔ کسب معاش کے لئے نکلنے پر شوہر کی اجازت بہرصورت ضروری ہوگی۔

شوہر کو حق حبس حاصل ہے، اور حق امساک فی البیت کا حق ہے، جیسا کہ علامہ جصاص کی احکام القرآن میں ہے: ''هذا يدل على أن له إمساكها في بيته ومنعها من الخروج'' (۲،۲۶۶)، چنانچہ اس سلسلہ میں حدیث پاک بھی ہے: ''عن انس ﷺ مرفوعا ايما امرأة خرجت من بيت زوجها بغير إذن زوجها كانت في سخط الله تعالى حتى ترجع إلى بيتها أو يرضى عنها زوجها'' (كنز العمال ۱۶،۱۶۰)۔

اس روایت سے بھی واضح ہوتا ہے کہ اگر عورت گھر سے باہر خواہ کسی ضرورت سے نکلے شوہر کی اجازت خواہ صراحۃً نہ ہو مگر دلالۃً یا حالاً لازم ہے، علت اس کی وہی ہے جو بیان کی گئی، امساک فی البیت لیلاً ونہاراً یہ اجازت بہرصورت ضروری ہے خواہ سفری مسافت سے کم سہی، خواہ رات ہو یا دن۔

چونکہ اس کا حق امساک حق حبس بلا کسی قید لیل ونہار کے ہے، جیسا کہ فقہ الاسلامی وادلتہ کی عبارت سے مستفاد ہے:

''وإن لم يرض بعملها ونهاها عن العمل فخرجت من أجله سقطت حقها عن النفقة (لأنها صارت ناشزة) لأن الاحتباس في هذه الحالة ناقص غير كامل'' (الفقه الاسلامي وادلته ۷،۷۹۲)۔

اگر ولی اس خاتون کی کفالت نہ کرتا ہو:

اگر کوئی ولی یا شوہر یا دیگر ذمہ دار عورت کی کفالت نہ کرتے ہوں تو عورت ضروری اخراجات اور حصول روزی کے لئے بلا اذن باہر جاسکتی ہے۔

اس صورت میں جب شوہر اپاہج ہے یا کفالت نہیں کررہا ہے، تو ناشزہ نہ ہوگی، چونکہ یہ ضروری اور اضطراری حالت ہے، جیسا کہ علامہ ابن نجیم نے بحر الرائق میں بیان کیا ہے:

''أن لها الخروج من منزله بغير إذنه في مواضع وحينئذ لا تكون ناشزة'' (بحر الرائق ۱۹۵)۔

مرد کو حق حبس تھا نان نفقہ دینے کی وجہ سے شوہر یا ولی نے جب اپنا حق ساقط کردیا تو گذارہ اوقات کا صرفہ اس پر آیا، یہ اس کا حق ہے، لہذا اس حق کو حاصل کرنے کے لئے بلا اذن جاسکتی ہے، ہاں مگر پردہ کی رعایت کے ساتھ گویہ مانند ہوگی متوفی عنہا زوجہا کے جو دن میں کسب معاش کرے گی۔

پس معلوم ہوگیا کہ کفالت اور عدم کفالت کے اعتبار سے فرق ہوجائے گا۔

۶۔ خواتین کے لئے ملازمت کے سلسلہ میں شرعی حدود:

ملازمت کا تعلق چونکہ گھر سے باہر نکلنے سے متعلق ہے، لہذا خروج من البیت کے جو شرعی قوانین واصول ہوں گے وہ اس سے وابستہ ہوں گے۔

ملازمت میں پردے کے شرعی حدود:

دفاتر میں ہوٹلوں وغیرہ میں جہاں چہرہ کھولنے کی ضرورت نہ ہو محض آنکھوں سے دیکھنے سے کام ہو جاتا ہو پورا چہرہ کھولنا فتنہ کی وجہ سے ممنوع ہوگا۔

جوان حسین عورتوں کا چہرہ کھول کر کام کرنا جہاں فاسق وفاجر جوان رہتے ہوں عمومی اجازت نہ ہوگی، ضرورت اور اضطرار ہی کی حالت میں اجازت ہوگی۔

چنانچہ الدر المختار میں ہے: ''فإن خاف الشهوة امتنع نظره إلى وجهها وهذا في زمانهم وأما في زماننا تمنع من الشابة لا لأنه عورة بل لخوف الفتنة'' (شامی ۶؍۳۷۰)۔

ملازمت اور گھر سے باہر نکلنے کی صورت میں سر کا کھلا رکھنا حرام ہے، کسی بھی ضرورت کا تعلق سر کے کھلے رہنے کے ساتھ نہیں ہے، عورت کا سر، سر کے بال ستر عورت میں حتمی طور پر داخل ہے، سر پر چادر دبیز دوپٹہ کا رکھنا ضروری ہے، بیشتر بے حیاء عورتیں مغربی ملعون تہذیب سے متاثر ہو کر سر اور بال کھولے رہتی ہیں یہ حرام ہے (شامی ۱؍۴۰۵)۔

مزین منقش کپڑے یا چادر کا پہن کر جانا ممنوع ہوگا، چونکہ یہ لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کا طریقہ ہے، ملازمت سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔

میک اپ چہرہ کو سنوار کر جانا حرام ہوگا چونکہ یہ چیزیں آنکھ کے زنا کی محرک اور داعی ہیں لہذا ملازمت سے اس کا کوئی تعلق نہیں، نہ ضرورت کے دائرے میں داخل ہے۔

کسی بھی ایسی شکل وہیت کا خواہ بدن میں یا کپڑے اور لباس میں اختیار کرنا جس سے لوگ فتنہ میں پڑیں حرام اور ممنوع ہوگا۔

۷۔ ملازمت کرنے والی خواتین ایسے اداروں میں کام کریں جہاں خواتین ہی خواتین ہوں تو ایسی صورت میں دیکھا جائے کہ دیگر خواتین مسلمان ہیں یا غیر مسلم، اگر غیر مسلم خواتین ہیں تو ایسی صورت میں وہ مسلم خواتین کے حق میں اجنبی مرد کی طرح ہیں، غیر مسلم خواتین سے پردہ کرنا ہوگا، ان کے سامنے دوپٹہ چادر اور برقعہ نہیں اتاریں گی۔

''لا يحل لمسلمة أن تنكشف بين يدي يهودية أو نصرانية أو مشركة إلا أن تكون أمة لها... وفي نصاب الاحتساب لا تنبغي للمرأة الصالحة أن تنظر اليها المرأة الفاجرة... فلا تضع جلبابها ولا خمارها'' (الشامیہ ۶؍۳۷۱)۔

اس عبارت سے صراحۃً واضح ہو گیا کہ اگر دیگر خواتین غیر مسلم ہیں تو چہرہ ہتھیلی کے علاوہ گردن، گلے، سینے اور سر کے بالوں کا کھولنا جائز نہ ہوگا، سر پر دوپٹہ رکھ کر وہ کام کریں گی۔

اور اگر وہاں مسلم خواتین ہیں تو دوپٹہ اور برقعہ وغیرہ اتار سکتی ہیں، گلا اور سینہ کے اوپر کا حصہ بھی کھول سکتی ہیں، البتہ پورے پیٹ اور پیٹھ کا پردہ ہوگا (دیکھئے: بحر الرائق ۶؍۲۱۹)۔

اور ذمہ دار مرد کے سامنے اجانب کے احکام جاری ہوں گی، جوان ہوں گے تو چہرہ کا بھی پردہ ہوگا ورنہ گنجائش ہوگی۔

۸۔ ایسی جگہ کام کرے جہاں مرد بھی کارکن ہوں:

جہاں اجنبی مرد بھی ہوں اور کام کے دوران آتے جاتے رہتے ہوں حتی الوسع جوان عورت کو فتنہ سے بچنے کے لئے چہرہ کا پردہ کرنا ہوگا، اگر چہرہ کے پردہ سے کام میں خلل ہو اور تنہائی کی نوبت نہ آتی ہو اور نہ ہی فتنہ اور فساد کا اندیشہ ہو تو جوان عورتیں چہرہ اور ہتھیلی کھول سکتی ہیں، ہاں مگر سر اور بالوں کو کھولنے کی ضرورت نہیں۔

سن رسیدہ، ادھیڑ اور بوڑھی خواتین کا حکم جوان کے مقابلہ میں کچھ گنجائش اور سہولت کا ہوگا۔

۹۔ عورت چونکہ مستور پردہ کے حکم کے ماتحت ہے، لہذا جہاں جس قدر پردہ کا اہتمام ہوگا اجانب اور عام آدمیوں سے خلط کم ہوگا اس کو ترجیح دی جائے گی، اور جہاں اجانب سے کثرت اختلاط ہوگا اسے حتی الوسعۃ احتیاط کرنا ہوگا اور اس سے بچنا ہوگا الا بالضرورۃ، حدیث فاطمہ بنت قیس

سے اس کا ثبوت ہوتا ہے کہ ام شریک کے یہاں اجانب اور عام لوگوں کا زیادہ آنا ہوتا تھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ام کلثوم کے گھر عدت گذارنے کی اجازت دی کہ یہاں اجانب سے مخالطت اور سامنا کم ہوتا ہے یہ حدیث طحاوی کی شرح معانی اثار میں ہے (طحاوی ۲۸/۲)۔

فقہاء کرام کا قاعدہ بھی ہے اخف البلیتین کو اختیار کیا جائے گا۔

پس اس ضابطہ سے معلوم ہوا کہ جہاں منہیات کم سے کم ہوسکے، اجانب سے ربط ومخالطت کم سے کم ہوسکے اس کو اختیار کیا جائے گا۔

۱۰۔ خواتین کا ملازمت کی غرض سے گھر اور اپنوں سے دور جانا، شرعاً اس کی اجازت نہیں ہے، وہ اپنی اس ضرورت کو گھر میں رہ کر پوری کرے یا اپنی جگہ رہ کر دن میں معاش حاصل کرے گی، اگر گھر سے باہر قیام کرے گی تو کسی ذی محرم کا ساتھ رہنا ضروری ہوگا، اسی طرح غیر ملک میں تنہا جانا اور قیام کرنا شرعاً حرام ہوگا، ہرگز مذہب اسلام اس آزادی کی جس میں مغربی تہذیب کی موافقت ہے اجازت نہیں دیتا، عورت اپنے گھر اور جائے سکونت میں رہ کر دن اور شام کے حصہ میں گھر سے باہر جا کر کسب معاش کرسکتی ہے، چونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بلا محرم کے گھر سے دور سفر پر جانے سے منع کیا ہے۔

''عن ابن عباس قال قال النبی ﷺ لا تسافر المرأة إلا مع ذی محرم ولا یدخل علیها رجل ومعها ذو محرم''، شامی کی رد المحتار میں ہے: ''أن الحرة لا تسافر ثلثة أیام بلا محرم'' (۶،۲۹۰)۔ البتہ سفر شرعی کی مدت سے کم ہے تو پھر جواز کی صورت میں اختلاف ہے، پھر بھی ایسی صورت میں کسی صالح یا کم عقل بچے کو یا غیر محرم کو ساتھ رکھے اگر کوئی غیر محرم شریک یا ساتھ ہوسکے تو زیادہ بہتر ہے، خصوصاً اس پرفتن دور میں اور ضروری ہے۔

☆☆☆

خواتین کے لئے کسب معاش۔ شرعی نقطۂ نظر

مولانا مفتی اقبال محمد ٹنکاروی[1]

انسانی اقدار کے تعین میں فیصلہ کن اگر کوئی چیز ہے تو وہ قوانین فطرت ہے، قوانین فطرت کے لحاظ سے انسانی ساخت جس چیز کی مقتضی ہو اور جس چیز میں انسان کی صلاح وفلاح ہو وہی دراصل قدر کی مستحق ہے۔

اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کرسکتا کہ انسان ہونے میں مرد اور عورت دونوں مساوی ہیں، تمدن کی تعمیر اور تہذیب کی تاسیس وتشکیل اور انسانیت کی خدمت میں دونوں برابر کے شریک ہیں، دل ودماغ عقل، جذبات، خواہشات، اور بشری تقاضوں کے دونوں حامل ہیں، لیکن یہاں دوسرا پہلو یہ بھی ہے کہ کیا مرد اور عورت دونوں کا حلقۂ عمل ایک ہو؟ دونوں ایک جیسے ہی کام کریں؟ دونوں پر زندگی کے تمام شعبوں کی ذمہ داریاں یکساں عائد کردی جائیں؟ تجربات شاہد ہیں کہ یہ ناممکن ہے اسلئے کہ ایسی رائے قائم کرنا اس وقت تک درست نہیں جب تک یہ ثابت نہ کیا جائے کہ دونوں کے نظام جسمانی بھی یکساں ہیں، دونوں پر فطرت نے ایک ہی جیسی خدمت کا بوجھ ڈالا ہے اور دونوں کی نفسیاتی کیفیات بھی ایک دوسرے کے مماثل ہیں اب تک کے تمام سائنسی ریسرچ نے ان تینوں امر کی نفی کی ہے۔

قرآن مجید نے انسانی فطرت کو کچھ اس طرح بیان فرمایا ہے، سورۂ روم آیت نمبر ۲۱ خلق لکم من أنفسکم أزواجا لتسکنو إلیھا وجعل بینکم مودۃ ورحمۃ ترجمہ: بنادیئے تمہارے واسطے تمہاری قسم سے جوڑے، کہ چین سے رہو انکے پاس اور رکھا تمہارے بیچ میں پیار اور مہربانی۔ لتسکنو الیھا سے اس طرف اشارہ ہے کہ عورت کی ذات میں مرد کیلئے سرمایۂ سکون وراحت ہے، اور عورت کی فطری خدمت یہی ہے کہ وہ اس جدوجہد اور عمل وملازمت کی اس مشقت بھری دنیا میں سکون وراحت کا کوئی گوشہ اور سامان مہیا کرے۔

اسلام نے صنفی میلان کو خاندان کی تخلیق اور اسکے استحکام کا ذریعہ بنایا پھر اس کی اس طرح تنظیم فرمائی کہ خاندان میں مرد کی حیثیت قوام کی ہے، یعنی وہ خاندان کا حاکم ہے، محافظ ہے، اخلاق اور معاملات کا نگراں ہے، اس پر خاندان کیلئے روزی کمانے اور ضروریات زندگی فراہم کرنے کی ذمہ داری ہے، سورۂ نساء آیت نمبر ۶ میں اس امر کو انتہائی صاف، واضح اور بلیغ انداز میں یوں بیان فرمایا ہے کہ الرجال قوامون علی النساء بما فضل اللہ بعضھم علی بعض وبما أنفقوا من أموالھم ترجمہ: مرد حاکم ہیں عورتوں پر اس واسطے کہ بڑائی دی اللہ نے ایک کو ایک پر اور اس واسطے کہ خرچ کئے انہوں نے اپنے مال۔

قوام کہتے ہیں ایسے شخص کو جو کسی کام یا نظام کا ذمہ دار اور چلانے والا ہو، آیت کریمہ میں جہاں مرد کی قوامیت اور فضیلت کو بیان فرمایا گیا ہے وہیں عورت اور مرد کے دائرۂ کار کی تقسیم بھی بیان فرمادی ہے کہ عورتوں کی تمام تر مالی ذمہ داریاں مردوں پر ہیں، کہ شادی سے پہلے تمام مصارف کی ذمہ داری باپ پر ہے اور شادی کے بعد شوہر پر، گویا آیت کریمہ میں ایک انتہائی اہم اصول زندگی بیان فرمایا ہے جیسا کہ حضرت مفتی شفیع صاحبؒ فرماتے ہیں: ''کہ عورت اپنی خلقت اور فطرت کے اعتبار سے نہ اس کی متحمل ہے کہ اپنے مصارف خود کما کر پیدا کرے نہ اسکے حالات اسکے لئے سازگار ہیں کہ وہ محنت، مزدوری اور دوسرے ذرائع کسب میں مردوں کی طرح دفتروں اور بازاروں میں پھرا کرے، اسلئے حق تعالی نے اسکی پوری ذمہ داری مردوں پر ڈالدی، شادی سے پہلے باپ اسکا متکفل ہے اور شادی کے بعد شوہر۔ اسکے بالمقابل نسل بڑھانے کا ذریعہ عورت کو بنایا گیا ہے، بچوں کی اور امور خانہ کی ذمہ داری بھی اس پر ڈال دی گئی ہے جبکہ مردان امور کا متحمل نہیں ہوسکتا'' (معارف القرآن ج: ۲ رص: ۲۹۸)۔

الغرض بما انفقوا من اموالھم اور حملہ وفصالہ ثلثون شھرا، حملتہ امہ الخ۔۔ وغیرہ آیت کریمہ سے ثابت ہوتا ہے کہ مرد

---

[1] مہتمم دار العلوم اسلامیہ عربیہ ماٹلی والا، بھروچ، گجرات۔

اور خواتین کا دائرۂ کار انکی فطری ساخت کے مطابق ہے، نیز یہ خدائی تقسیم ہے اور چونکہ یہ امر ایک مسلم حقیقت ہے کہ عورت اور مرد کی تخلیق میں خالق کائنات نے فطری تفاوت رکھا ہے، عورت کے کام کا میدان اسکا گھر ہے اور مرد کا میدان عمل گھر سے باہر، جو کام مرد کر سکتے ہیں عورت نہیں کر سکتی اور جو کام عورت کر سکتی ہے مرد نہیں کر سکتا، ہر ایک کا دائرۂ عمل متعین ہے، یہ وہ تقسیم عمل ہے جو خود فطرت نے انسان کی دونوں صنفوں کے درمیان کر دی ہے، کہ خاندان کیلئے روزی کمانا اسکی حمایت وحفاظت کرنا اور تمدن کی محنت طلب خدمات انجام دینا مرد کا کام ہو، بچوں کی پرورش خانہ داری کے فرائض اور گھر کی زندگی کو سکون وراحت کی جنت بنانا عورت کا کام ہو۔

۲۔ احادیث نبویہ میں جہاں حق الزوج علی المرأۃ کو بیان فرمایا گیا ہے وہاں عورت کی تمام ذمہ داریاں صراحۃً، اشارۃً بیان فرمادی گئی ہیں، لیکن ان ذمہ داریوں میں کہیں بھی یہ ذکر نہیں ہے کہ عورت شوہر کو کما کر کھلانے پلانے اور لباس ومسکن کی ذمہ دار ہے جبکہ اسکے برخلاف مرد کو ان امور کا ذمہ دار بنایا گیا ہے۔

(صحیح بخاری حدیث نمبر ۵۳۵۱، نسائی شریف ۴۴۶۷) حضرت ابو مسعود انصاری ؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ''إذا أنفق المسلم نفقة علی أهلها وهو يحتسبها كانت له صدقة: جب مسلمان اپنے اہل وعیال کے نفقہ میں خرچ کریں اور وہ اجر وثواب کی امید رکھیں تو یہ ان کے لئے صدقہ ہے۔

صحیح مسلم ج: ۱ ص: ۵۱۲ پر ہے ولهن عليكم رزقهن وكسوتهن ''اور انکا کھانا اور کپڑا دستور کے مطابق تم پر واجب ہے''

اس جیسی کئی احادیث ہیں جن میں عورتوں کے مردوں کے ذمہ جو حقوق ہیں ان کا تذکرہ ملتا ہے اور اسی طرح مردوں کے حقوق عورتوں پر لیکن کسی ایک روایت میں بھی علی الاطلاق عورتوں پر کما کر مردوں کے نفقہ وسکنی کا تذکرہ نہیں ملتا، جبکہ عورتوں کیلئے مردوں پر نفقہ کے وجوب کی صراحت ہے وہیں انفاق کی نسبت مردوں کی طرف فرما کر اس بات کو بھی واضح فرمادیا کہ انفاق وسکنی کیلئے کسب کی ذمہ داری مردوں کی ہے۔

عورت شوہر کے حق میں مشغول ہونے کی وجہ سے تصرف واکتساب سے روک دی گئی ہے، بلکہ ہمارے فقہائے کرام تو یہاں تک تحریر فرماتے ہیں، جیسا کہ ڈاکٹر وہبہ زحیلی الفقہ الاسلامی وادلتہ جزء سابع ج: ۷ ص: ۹۲۲ پر تحریر فرماتے ہیں: ''کہ لڑکا جب کمانے کے لائق ہو جائے نہ کہ لڑکی تو باپ کیلئے جائز ہے کہ اسے کسی مزدوری میں لگائے یا کسی پیشے کیلئے بھیجے تاکہ وہ کمائے اور لڑکے کی کمائی میں سے باپ اس لڑکے پر خرچ کرے لیکن لڑکی کے بارے میں یہ حکم ہے وہ آگے مزید تحریر فرماتے ہیں۔

أما الأنثى فلا تؤجر للخدمة لما فيها من مخاطر الخلوة بها وهو لا يجوز شرعًا کہ لڑکی کو مزدوری یا خدمت کی ملازمت پر نہیں بھیج سکتا، اس وجہ سے کہ اس میں لڑکی کے ساتھ خلوت کے ڈھیر سارے خطرات ہیں جو شرعاً جائز نہیں ہے۔ آگے فرماتے ہیں:

لكن يجوز تعليمها عند امرأة حرفة معينة مناسبة لها كخياطة أو تطريز أو غزل ونحوها: لیکن اسکو کسی عورت کے پاس تعلیم کے لئے بھیجنا جائز ہے جو اسے کوئی مناسب ہنر سکھا سکے، جیسا کہ سلائی، ڈیزائن یا سوت (اون) بٹنا وغیرہ۔

غرض کہ عورت بحیثیت بیٹی، بیوی، ماں کسب کی ذمہ دار نہیں ہے بلکہ تینوں حالتوں میں اسکے نان ونفقہ کی ذمہ داری مردوں پر ہی رکھی ہے۔

صاحب ھدایہ باب النفقۃ میں فرماتے ہیں قال (النفقة واجبة للزوجة على زوجها الخ۔ بیوی کے لئے شوہر پر نفقہ واجب ہے۔

پھر جب عورت ماں بنتی ہے تو اسکی کفالت کی ذمہ داریاں اولاد پر عائد ہوتی ہیں۔

ان فقہی عبارات سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ عمومی حالات میں خواتین کیلئے کسب معاش واجب اور ضروری نہیں ہے اور اسلامی نقطۂ نظر سے کسب معاش کی مکمل ذمہ داری مردوں کے شانہ پر ہے، البتہ بعض ناگزیر حالات میں ایک عورت کو بوقت ضرورت کسب معاش کیلئے نکلنے کی ضرورت پڑتی ہے

چنانچہ البحر الرائق (۴/۲۵۸ کتاب الطلاق باب العدۃ) میں ہے: ''قوله و معتدة الموت تخرج يوما وبعض الليل لتكتسب لأجل قيام المعيشة لأنه لا نفقة لها''، اسی طرح کی عبارت درمختار کتاب النکاح باب المہر (۳/۱۴۵) میں ہے: ''السفر والخروج

من بيت زوجها للحاجة''۔

مذکورۂ بالا روایات فقہیہ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ عورت بعض ناگزیر حالات میں کسب معاش کی غرض سے باہر جاسکتی ہے۔

اب تک پوری بحث کا خلاصہ یہ نکلتا ہے کہ کسب معاش عورت کے دائرۂ کار سے خارج ہے اور عورت پر کسی کا نفقہ واجب نہیں ہے۔

۳۔ لیکن اگر کوئی عورت اپنی ان تمام ذمہ داریوں کی ادائیگی کے بعد بچے ہوئے وقت کو گذارتے ہوئے بور ہوجاتی ہے اور پھر وہ قدرے خود کفیل بننا چاہتی ہے اور سرمایہ واثاثہ پیدا کر کے اپنے بھائی، باپ یا شوہر کے بوجھ کو ہلکا کرنا چاہتی ہے تو شریعت نے اسکے لئے کچھ شریف اور گھریلو فنون وہنر سیکھنے اور اپنا روزینہ نکالنے کی گنجائش دی ہے اور مباح کا درجہ دیا ہے، جیسے کہ درج ذیل فقہی روایات اس پر شاہد ہیں۔

الفقہ الاسلامی ج:۷،ص:۹۲۴ پر مرقوم ہے ''فان اكتسبت من مهنة شريفة لا تعرضها للفتنة كخياطة وتعليم وتطبيب الخ...''، ''اگر عورت کوئی ایسا شریف پیشہ اختیار کرے جسمیں کوئی فتنہ (اختلاط مردوزن، وبے پردگی وغیرہ کا) نہ ہو، جیسے سلائی، تعلیم اور پیشۂ طبابت۔

ہم جب دور رسالت اور اسکے مابعد کی عورتوں کی تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں تو واقعات سامنے آتے ہیں کہ بعض عورتوں نے کچھ اپنے مناسب اور لائق پیشہ اور ہنر اختیار کئے تھے، جس کے ذریعہ وہ اپنے ضروری اخراجات کے بقدر کما لیتی تھیں انہیں پاکدامن پارسا صفت عصمت وعفت کا ہر وقت خیال رکھنے والی خواتین میں سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی رفیقۂ حیات امت کی ام محترمہ، حضرت زینب بنت جحشؓ کا نام سرفہرست ہے۔

سیر اعلام النبلاء للامام الذہبی ج:۲،ص:۲۱۳ میں ہے: ''وكانت زينب تعمل وتتصدق والحديث مخرج في مسلم'' حضرت زینب بنت جحشؓ خود کام کرتی تھیں اور (اپنی کمائی میں سے) صدقہ کرتی تھیں اور اس حدیث کی تخریج مسلم شریف میں ہوئی ہے۔

الغرض یہ واقعہ اور اس جیسے دیگر واقعات سے ثابت ہوتا ہے کہ عورت دست کاری اور ایسے دیگر شریفانہ اور مناسب پیشے اختیار کرے جو اسکے دائرۂ کار میں یعنی امور خانہ داری اور تربیتی وظائف میں مخل نہ ہو، تو اسکے لئے مباح ہے۔

۴۔ بیوی اپنے گھر ہی میں کوئی اپنے مناسب پیشہ اختیار کرے تو کیا اس میں بھی شوہر کی اجازت ضروری ہوگی؟ اس سلسلہ میں یہ بات یاد رکھنا ضروری ہے کہ شوہر یا ولی عورت کی کفالت کر رہے ہوں تو پھر عورت کیلئے اندرون خانہ یا بیرون خانہ دونوں صورتوں میں شوہر یا ولی کی اجازت ضروری ہوگی۔

اس وجہ سے کہ زوجہ پر زوج کی اطاعت واجب ہے لہذا اس واجب کو غیر واجب (یعنی گھر میں یا گھر سے باہر جا کر کسب معاش کی کوئی شکل اختیار کرنا جو زیادہ سے زیادہ مباح ہے) کی بنیاد پر ترک کرنیکی اجازت نہیں ہے''

اور اسی طاعت واجبہ کی بنیاد پر عورت کو نفل روزہ جیسی عبادت کے لیئے بھی شوہر کی اجازت کو ضروری قرار دیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ کسی عورت کیلئے اپنے شوہر کی موجودگی میں اسکی اجازت کے بغیر (نفل) روزہ رکھنے کی اجازت نہیں ہے۔

المغنی لابن قدامة ج۸ص۲۰ ''طاعة الزوج واجبة: قال احمد في امرأة لها زوج وأم مريض طاعة زوجها أوجب عليها من أمها، إلا أن يأذن لها'' ''شوہر کی اطاعت واجب ہے، امام احمدؒ نے اس حدیث کے متعلق فرمایا جسکا شوہر ہو اور ایک بیمار ماں ہو، اپنی ماں کے مقابلہ میں اپنے شوہر کی اطاعت کرنا واجب ہے، ہاں اگر شوہر ماں کی خدمت وغیرہ کیلئے اجازت دے۔

خلاصہ یہ کہ اندرون خانہ وبیرون خانہ بیوی کے لئے اپنے شوہر اور بیٹی وغیرہ کیلئے باپ یا ولی سے اجازت لینا ضروری ہوگا۔

۵۔ فیما دون الثلاث سفر میں خواتین کا محرم کے بغیر نکلنا:

سفر میں عورت کے جان ومال اور عفت وعصمت کی حفاظت کیلئے شریعت کا یہ تاکیدی حکم ہے جسکو امام بخاریؒ نے اپنی صحیح ج:۱،ص:۱۴۸ میں نقل فرمایا ہے، وعن ابی ہریرةؓ قال قال النبي صلى الله عليه وسلم لا يحل لامرأة تؤمن بالله واليوم الآخر أن تسافر مسيرة يوم وليلة ليس معها حرمة'' ''حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ کسی بھی عورت کیلئے جو اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتی ہو یہ حلال نہیں ہے کہ محرم کے بغیر ایک دن ایک رات کی مسافت کا سفر کرے''۔

اس حدیث پاک میں خواتین کو ایک بہت ہی اہم حکم دیا گیا ہے، کہ ایک دن، ایک رات کی مسافت کا سفر بغیر محرم کے نہ کرے، بعض روایات میں تو مطلق سفر کرنے کی بغیر محرم کے ممانعت وارد ہوئی ہے، اور بعض روایات میں ہے کہ تین دن، تین رات کا سفر بغیر محرم نہ کرے، احتیاط کا تقاضہ تو یہی ہے کہ قریب کا سفر ہو یا دور کا عورت بغیر محرم کے نہ جائے، خصوصاً اس زمانہ میں جو فتنوں کا زمانہ ہے، لیکن دیگر احادیث کے پیش نظر ایسے سفر کیلئے بغیر محرم کے نکلنے کی گنجائش ہے، جو تین دن، تین رات کی مسافت سے کم ہو، مگر بچنا اس سے بھی اولی ہے۔

حضرت امام ابوحنیفہؒ اور امام ابویوسفؒ سے مروی ہے وہ کہ ایک دن کی مسافت کیلئے بھی بغیر محرم یا شوہر کے سفر میں نکلنے کو مکروہ قرار دیتے تھے، اسکے بعد لکھتے ہیں"وینبغی أن یکون الفتوی علیه لفساد الزمان اور چاہئے کہ فتوی اسی پر دیا جائے۔ یہی مضمون فتاوی ہندیہ ج:۵/ص:۳۶۶ میں ہے" ولا تسافر المرأة بغیر محرم ثلاثة أیام فما فوقها و اختلفت الروایات فیما دون ذالك قال أبویوسف رحمه الله تعالی هو أهون من ذالك كذا فی المحیط: وقال حماد رحمه الله تعالی لا بأس للمرأة أن تسافر بغیر محرم مع الصالحین والصبی والمعتوه لیسا بمحرمین والكبیر الذی یعقل محرم كذا فی التاتارخانیة. والفتوی علی أنه یكره فی زماننا هكذا فی السراجیة: والله اعلم۔

آخر عورت کو گھر سے باہر ملازمت یا کسب معاش کیلئے نکلنے سے کیوں منع فرمادیا اور وہ کونسی قباحتیں، برائیاں اور خطرات ہیں، چنانچہ اولاً عورت کے دائرۂ کار میں کسب معاش اور اسکے لئے ملازمت اختیار کرنا ہے ہی نہیں ہے، جیسا کہ ہم شروع میں اس بات کو تفصیلاً بیان کر چکے ہیں، اور اسکے علاوہ دیگر امور بھی ہیں جن پر ہم روشنی ڈالتے ہیں جو کہ عورت کی عصمت وعفت اور معاشرہ کی فلاح وبہبود اور فساد وبدکاری سے معاشرہ کی حفاظت اور اس جیسے کئی امور جیسے ستر وحجاب کے متعلق نصوص قرآنیہ اور فرمودات رسول اللہ ﷺ ہیں نیز آئے دن ملازمت اور کسب معاش کیلئے نکلنے والی خواتین کے ساتھ پیش آنے والے ناقابل ذکر واقعات جنسی استحصال وغیرہ ہیں۔

غیر محارم سے خلوت نشینی سے حفاظت کی غرض سے اللہ تعالی نے عورتوں کو اپنے گھروں کو لازم پکڑنے کا حکم دیا ہے اور زمانۂ جاہلیت کی طرح بناؤ سنگار کر کے باہر نکلنے سے منع فرمادیا ہے، چنانچہ سورۃ الاحزاب آیت نمبر ۳۳/ارشاد ربانی ہے: ''وقرن فی بیوتكن ولا تبرجن تبرج الجاهلیة الاولی'' (اور اپنے گھروں میں ٹکی رہو، اور اگلے زمانۂ جاہلیت کی طرح بناؤ سنگار کے ساتھ نہ نکلا کرو)۔

ترمذی شریف کتاب الرضاع، باب ماجاء فی كراهیة الدخول علی المغیبات کے تحت عبداللہ بن مسعودؓ کے حوالہ سے آپ ﷺ کا یہ ارشاد نقل فرمایا ہے "المرأة عورة فاذا خرجت استشرفها الشیطان" "عورت سراپا پردہ کی چیز ہے، جب وہ نکلتی ہے تو شیطان اسے تاکتا ہے" اور اسے حسین وجمیل کر کے دکھاتا ہے۔

۶۔اختلاط مرد وزن سے بچنے کیلئے بعض اسلامی احکام تک کی تبدیلی:

شریعت اسلامی نے اختلاط مرد وزن سے بچنے کیلئے بعض احکام تک بدل ڈالے ہیں اسے ان تمام فرائض وواجبات سے سبکدوش کیا گیا ہے، جو بیرون خانہ امور سے تعلق رکھنے والے ہیں، مثلاً جماعت کے ساتھ نماز واجب ہے، لیکن یہ وجوب عورتوں سے ساقط کر دیا گیا ہے، مردوں کیلئے مسجد میں نماز ادا کرنا افضل ہے جبکہ عورتوں کو یہ فضلیت گھر میں نماز ادا کرنے سے ملتی ہے۔

چنانچہ مشکوۃ المصابیح کتاب الصلوۃ باب الجماعة وفضلها فصل ثانی میں یہ روایت موجود ہے ''عن ابن مسعود ﷺ قال: قال رسول اللہ ﷺ: صلوة المرأة فی بیتها أفضل من صلوتها فی حجرتها وصلوتها فی مخدعها أفضل من صلوتها فی بیتها (رواه ابوداود) ''عبداللہ ابن مسعودؓ آپ ﷺ کا یہ ارشاد نقل فرماتے ہیں کہ عورت کا اپنے گھر میں نماز پڑھنا افضل ہے، کمرہ میں نماز پڑھنے سے اور اپنی کوٹھری میں نماز پڑھنا افضل ہے اپنے گھر میں پڑھنے سے۔

ردالمحتار کتاب الصلوة باب الجماعة مطلب إذا صلی الشافعی کے ماتحت لکھا ہے (ویكره حضور هن الجماعة ولو لجمعة وعید ووعظ (مطلقًا) ولو عجوزا لیلا علی المذهب المفتی به لفساد الزمان۔ ''عورت کو جماعت میں حاضر ہونا مکروہ ہے اگر چہ جمعہ ہو، عید ہو اور وعظ وارشاد کی مجلس ہو، مطلقا اور اگر چہ بوڑھی ہو یا رات کے وقت ہو، مفتی بہ مذہب کے مطابق فساد زمان کی وجہ سے۔

جہاں تک معاملہ اختلاط مرد وزن کا ہے تو یہ اختلاط ایک مرد سے ہو یا چند مردوں کے ساتھ ہو بہر حال حرام ہے، کسی جگہ مرد کارکنان زیادہ ہوں، کم ہوں، اگر عورتوں کا سامنا بعض اوقات مردوں سے کم ہو، یا زیادہ ہو، کسی صورت میں اختلاط جائز نہیں۔

۷، ۸۔ ملازمت کرنے والی خواتین اگر تعلیمی ادارے مثلاً مدرسۃ البنات، لڑکیوں کا اسکول یا دوسرے ادارے جیسے زچہ خانہ وغیرہ جہاں تمام خواتین ہی کام کرتی ہیں البتہ ادارے کے ذمہ دار مرد ہیں تو وہاں پر بھی ادارہ کے مرد ذمہ داروں سے خواتین کو شرعی پردہ کرنا ہوگا، خلوت وہاں پر بھی حرام ہے، ایسے واقعات بھی سامنے آئے ہیں کہ کمپنی یا ادارہ کے ذمہ دار بھی اپنے یہاں کام کرنے والی خواتین کا جنسی استحصال کرتے ہیں، لہذا احتیاط ضروری اور واجب ہوگا، نیز پردہ کے باب میں سن رسیدہ خواتین اور جوان خواتین کے درمیان کوئی خاص فرق نہیں کیا گیا ہے، البتہ بعض ضروری مواقع میں سن رسیدہ عورتوں کیلئے مردوں کی صفوف اور مجمع میں آنے کی گنجائش دی گئی ہے، چنانچہ فتاویٰ عالمگیری کتاب السیر الباب الاول میں ہے: أما العجائز اللاتي دخلن في السن فلا بأس بأن يخرجن في الصوائف ونحوها من الجنود العظام، ويداوين المرضى والجرحى ويسقين الماء ويخبزن، ولكن لا يقاتلن:

واقعہ یہ ہے کہ پردہ کے متعلق شریعت محمدی میں بڑی تاکید فرمائی گئی ہے، خصوصاً آج کے اس عریانیت، فحاشیت، جنسی استحصالیت کے بدترین دور میں تو پردہ اور قرار فی البیت خواتین کیلئے قلعۂ حفاظت اور نہایت ہی ناگزیر ہے۔

شریعت اسلامیہ تو پردہ کے باب میں اس سے بھی کہیں زیادہ حساس ہے کہ غیر مسلم دائی یا نرس کو زچہ کے وقت بلایا جائے تو اسکے سامنے ستر کھولنا حرام ہے کیوں کہ کافرہ عورت کے سامنے مسلمان عورت صرف منہ اور پہنچوں تک دونوں ہاتھ اور ٹخنوں سے نیچے دونوں پیر کھول سکتی ہے، انکے علاوہ ایک بال کھولنا بھی درست نہیں ہے، جیسا کہ روایات فقہیہ میں اسکی صراحت ہے۔

حدیث پاک میں تو اندھے سے بھی پردہ کا حکم ہے جیسا کہ ترمذی شریف وغیرہ میں عبداللہ ابن ام مکتومؓ کا واقعہ حضرت ام سلمہ اور میمونہؓ کے ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش آیا تھا۔

بہر حال اس دور فتنہ وفساد میں مامون رہنے کی کون گارنٹی دے سکتا ہے اور خوف فتنہ وفساد کی وجہ سے چہرہ کے پردہ پر تمام علمائے کرام متحد ومتفق ہیں، بالفرض اگر چہرہ کا پردہ نہ ہو تب بھی اس دور فساد میں فتنہ کی وجہ سے واجب ہے، ایک فقہی قاعدہ ہے: لان درء المفسدة مقدمة على جلب المنفعة.

۹۔ ملازمت یا دکان وغیرہ پر کام کرنے اسی طرح ہوٹلوں، آفسوں کے استقبالیہ پر بیٹھتے ہوئے ہر خریدار یا ملاقاتی سے لچکدار، نرم نرم اور پرکشش لہجے میں بات کرنی پڑتی ہے، اور شریعت نے ایسی گفتگو سے منع فرمایا ہے، چنانچہ سورۂ احزاب آیت نمبر ۳۲ میں فرمایا گیا: "فلا تخضعن بالقول فيطمع الذي في قلبه مرض" (اگر تم اللہ سے ڈرنے والی ہو) تو نرم گفتگو نہ کرو کہ جسکے دل میں (گناہ کی) بیماری ہو وہ لالچ کرنے لگے۔

اگر کسی نامحرم سے گفتگو کی ضرورت پیش آجائے تو بہت مختصر گفتگو کریں ہاں، نہیں میں گفتگو ختم کردیں، آواز پست رکھیں، لہجہ میں کشش پیدا نہ ہونے دیں: درمختار میں ہے: فإنا نجيز الكلام مع النساء للأجانب ومحاورتهن عند الحاجة إلى ذالك ولا نجيزلهن رفع أصواتهن ولاتمطيطها ولا تليينها وتقطيعها لما في ذالك من استمالة الرجال إليهن وتحريك الشهوات منهن: "یعنی ضرورت کیلئے ہم اس بات کو جائز سمجھتے ہیں کہ عورت نامحرم سے گفتگو کرے لیکن اس بات کی اجازت نہیں ہے کہ نامحرم سے بات کرتے ہوئے گفتگو کو لمبی کرتی چلی جائے، یا نرم لہجہ میں بات کرے، یا بات میں لچک پیدا کرے، کیونکہ ایسا کرنے سے مردوں کے دل مائل ہونگے اور انکی طبیعتوں میں ہیجان ہوگا"۔

اپنے گھر سے دور اجنبی جگہوں میں مہینوں مہینوں مردوں کے ساتھ رہنا یا مردوں سے متصل کمروں میں رہنا جو آج کے بدترین اور یقینی نہیں تو متوقع خطرات سے بھرپور دور میں کسی صورت میں جائز نہیں ہے، آئے دن ایسی عورتوں کی عزت لوٹنا یا اسے بہلا پھسلا کر اس امر خبیث کیلئے آمادہ کرنا اور پھر جنسی استحصال کے واقعات اور پھر اسکے نتیجہ میں ناجائز اولاد کی پیدائش ایک نہیں ایسی ہزاروں مثالیں ہیں، جس سے اب وہ ممالک بھی پریشان ہیں جو عورتوں کی ملازمت کے حق میں ہیں۔

جو عورت دور حاضر میں کام کاج کیلئے گھر سے دور رہتی ہے یا باہر نکلتی ہے عام طور پر مردوں کے ساتھ اسکا اختلاط ہوتا ہے اور کئی ایک کے ساتھ تنہائی کی نوبت بھی آجاتی ہے، جو کہ حرام ہے، اور عورت کے اخلاق دین اور عزت و وقار کے منافی ہے۔

بوقت ضرورت گھر سے باہر کام کرنے کی شرائط اور خلاصہ کلام:

(۱) کسب معاش عام حالات میں خواتین کے دائرۂ کار سے خارج اور فطری و خدائی قانون اور عورت کی صلاحیت نیز اسکی ساخت کے مخالف ہے۔

(۲) نفقہ کی ذمہ داریاں خواتین کو اس سے بے فکر رکھا گیا ہے۔

(۳) محض معیار زندگی کو بلند کرنے کی غرض سے کسب معاش کیلئے میدان میں آنا خود خواتین کے وظیفہ میں مخل ہے، اور اسکے نتیجہ میں کئی مخاطر محرمات اور منہیات شرعیہ کا شکار ہونا لازم آئے گا، لہذا اس سے احتیاط ضروری ہوگا۔

(۴) اگر خاندان میں مرد کماتے ہیں پھر بھی ناکافی رہتا ہے اور عورت کیلئے معاش کا حصول ناگزیر ہو جائے تو اسے کوئی مناسب اور اسکی ساخت کے لائق شریف پیشہ اور ہنر کی ترغیب دی جائے، مثلاً کپڑے سینا، ڈیزائین بنانا، بیل بوٹے لگانا، چھوٹے بچوں یا خواتین کو اپنے گھر بلا کر انکو تعلیم، ٹیوشن دینا یا یہ نہیں ہو سکتا تو کسی ایسے ادارے میں کام کرنا جو خواتین سے متعلق ہو، مثلاً کوئی مدرسۃ البنات ہو جہاں بحیثیت معلمہ یا خادمہ یا زچہ خانہ یا خواتین سے متعلق امراض کا شفا خانہ ہو، وہاں بحیثیت ڈاکٹر یا نرس یا خادمہ کا کام کرنا وغیرہ۔

(۵) خواتین کیلئے بیرون خانہ یا اندرون خانہ کسی بھی طرح کی سرگرمی میں حصہ لینے سے قبل اپنے سرپرست یا شوہر سے اجازت لینا ضروری ہوگا، اور جو کام بھی کرنا ہو وہ مباح اور جائز ہو جیسے مدرسۃ البنات، لڑکیوں کا اسکول یا صرف عورتوں والا اسپتال اور دیگر گھریلو پیشے۔

(۶) خواتین کیلئے ملازمت کے سلسلہ میں شرعی حدود یہ ہیں کہ وہ اجنبی عورتوں کے ساتھ اختلاط سے بچیں، کسی ایک کے ساتھ خلوت اختیار کرنے سے بھی بچیں، بغیر محرم کے سفر نہ کریں، چاہے مسافت سفر تین دن تین رات سے کم ہو، عورت چاہے جوان ہو یا سن رسیدہ پردہ کا پورا خیال رکھے، اپنے باس سے ہو یا دوکان میں موجود دیگر سیلز مین ہو تمام غیر محرم سے پردہ ضروری ہوگا، جو کہ پورے بدن اور چہرہ وغیرہ کو چھپانے والا ہو، البتہ کام کی جگہ میں جہاں صرف خواتین ہی خواتین ہوں اور مرد بالکل نہ آتے ہوں، حتی کہ ذمہ دار بھی تو وہاں الا ما ظھر منھا کے ماتحت چہرہ اور ہتھیلیوں کو کھلا رکھنے کی اجازت ہوگی۔

(۷) عورت اپنے گھر سے دور تنہا بغیر محرم مستقل قیام نہیں کر سکتی مگر ایسے ادارے جو صرف خواتین کے ہیں نیز جہاں ملازمت کے ساتھ خدمت دین اور خدمت خلق بھی ہوتی ہے، مثلاً مدرسۃ البنات، لڑکیوں کے اسکول، خواتین والے اسپتال اور زچہ خانہ وغیرہ۔

(۸) اظہار زیب و زینت اور نمائش اعضاء سے بچے جو کہ باعث فتنہ ہے اور حرام بھی ہے۔

(۹) لچکدار گفتگو سے بچے جسکی ممانعت وارد ہوئی ہے، لہذا آفس، ادارے وغیرہ کے استقبالیہ پر عورت کے لئے بیٹھنا جائز نہیں، جہاں لچکدار گفتگو کے بغیر کام چل ہی نہیں سکتا، اسی طرح ہوائی جہاز میں بحیثیت خادمہ وغیرہ کی بھی اجازت نہیں ہوگی۔

(۱۰) خوشبوؤں کا استعمال کرنے سے گریز کرے اس لئے کہ خواتین کے لئے ممانعت ہے۔

☆☆☆

خواتین کی ملازمت۔ شرعی نقطہ نظر سے

مولانا بدر احمد مجیبی ندوی[1]

۱۔ اسلام ایک فطری مذہب ہے، اس کے تمام اصول وقوانین انسانی فطرت سے ہم آہنگ ہیں، ہر چیز کے بارے میں اس کے احکام بالکل فطرت کے مطابق ہیں، انسانی معاشرے کے لئے مرد وعورت کی حیثیت معاشرے کے اہم ترین افراد کی ہے، ان کے بغیر معاشرے کا وجود نہیں ہوسکتا۔

اولاد آدم ہونے کی حیثیت سے مرد وعورت دونوں معاشرے میں مساوی حیثیت کے حامل ہیں، اسی طرح بشری خواہشات، انسانی جذبات، غور وفکر اور ذہانت وذکاوت کی صلاحیت بھی دونوں میں موجود ہے، لیکن جسمانی ساخت، مزاج وطبیعت اور قوت عمل یعنی محنت ومشقت کرنے کی صلاحیت میں دونوں میں بہت واضح فرق نظر آتا ہے۔

شریعت اسلامیہ نے اسی وجہ سے ان کی فطرت کے مطابق ان کی ذمہ داریوں میں فرق کیا ہے، مرد کی ذمہ داری میں خارجی امور دیئے ہیں۔

اور کسب معاش کی ساری ذمہ داری مرد پر لازم کی ہے، خواتین کو کسب معاش کی دشوار گذار ذمہ داری سے یکسر بری رکھا ہے، ان کو صرف گھریلو ذمہ داریوں میں مشغول رکھا ہے، ان کی صنفی نزاکت کی وجہ سے خانگی ذمہ داریاں ہی ان کے لئے بہت کافی ہوتی ہیں، اگر وہ ان کو اچھی طرح انجام دیں تو اس کے بعد ان کے پاس خارجی کاموں کے لئے وقت باقی نہیں رہتا۔

عام حالات میں کسب معاش کی ذمہ داری اسلام نے عورتوں کے سر نہیں ڈالی، بلکہ اس کو مردوں کے ذمہ رکھا ہے، اللہ تعالی کا فرمان حضرت آدم علیہ السلام کے تذکرہ میں ہے:

''فقلنا: یا آدم! إن هذا عدولك ولزوجك فلا یخرجنكما من الجنة فتشقی'' (سورۂ طٰہٰ: ۱۱۷)۔

(ہم نے کہا کہ اے آدم! یہ (شیطان) تمہارا اور تمہاری بیوی کا دشمن ہے، یہ تم دونوں کو جنت سے نہ نکلوا دے تو پھر تم شقاوت (پریشانی اور مشقت) میں پڑ جاؤ گے)۔

امام قرطبی اس کی تفسیر میں فرماتے ہیں: ''إنما خصه بذکر الشقاء ولم یقل فتشقیا یعلمنا أن نفقة الزوجة علی الزوج فمن یومئذ جرت نفقة النساء علی الأزواج فلما کانت نفقة حواء علی آدم کذلك نفقات بناتها علی بنی آدم بحق الزوجیة'' (الجامع لأحکام القرآن للقرطبی ۱۱/۱۶۸)۔

(یہاں پر اللہ تعالی نے صرف حضرت آدم کو شقاوت کے ساتھ خاص کیا ہے (کہ تم شقاوت میں پڑ جاؤ گے)، یہ نہیں فرمایا کہ تم دونوں شقاوت میں پڑ جاؤ گے (یہاں پر شقاوت سے مراد دنیاوی پریشانیاں اور رزق کی فراہمی کے مسائل ہیں جو جنت میں نہیں تھے)، اس سے ہم لوگوں کو یہ تعلیم دی جا رہی ہے کہ (آدم تنہا پریشانی میں مبتلا اس لئے ہوں گے کہ ان پر اپنے ساتھ حواء کے نفقہ کی ذمہ داری بھی ہوگی کیونکہ) شوہر پر بیوی کا نفقہ لازم ہوتا ہے، تو اس روز سے عورتوں کا نفقہ ان کے شوہروں پر لازم ہوگیا، تو جب حواء کا نفقہ حضرت آدم پر ہوا تو حوا کی بیٹیوں کا نفقہ بھی زوجیت کی وجہ سے آدم کی اولاد پر لازم ہوا)۔

ہم دیکھتے ہیں کہ عورتوں کی زندگی کے چار حالات ہوتے ہیں: ۱۔ جب وہ بچی ہوں، غیر شادی شدہ ہوں، ۲۔ جب وہ شادی شدہ ہوں۔ ۳۔ جب وہ عمر دراز ہوں اور ان کی اولاد ہو، ۴۔ باپ، شوہر اور اولاد نہ ہو، بھائی یا کوئی دیگر رشتہ دار موجود ہوں، ان چاروں حالات میں ان کی

---

[1] امارت شرعیہ، پھلواری شریف پٹنہ۔

معاش کا انتظام اسلام نے مردوں پر ہی رکھا ہے، عورتوں کو معاشی انتظام کی فکر سے بری الذمہ رکھا ہے۔

۱۔ ان کی شادی سے پہلے ان کی معاش کا انتظام ان کے والد پر ہے، پیدائش کے بعد سے شادی تک لڑکیوں کے خرچ کی ذمہ داری ان کے والد پر شریعت نے لازم کی ہے، بچے بلوغ کے بعد اپنی کفالت خود کریں گے، ان کے بالغ ہوجانے کے بعد ان کی معاشی ذمہ داری والد پر باقی نہیں رہتی، لیکن لڑکیوں کی شادی تک ان کی ذمہ داری والد پر ہی رہتی ہے۔

''ونفقة الأناث واجبة مطلقا على الآباء مالم يتزوجن إذا لم يكن لهن مال كذا في الخلاصة'' (الهنديه ۱،۵۶۳)۔

۲۔ شادی شدہ خواتین کی معاشی ضروریات کی تکمیل کی ذمہ داری اسلام نے خود ان پر نہیں رکھی، بلکہ ان کے شوہروں پر رکھی ہے، حجۃ الوداع کے خطبہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں کے حقوق کے سلسلہ میں فرمایا:

''ولهن عليكم رزقهن وكسوتهن بالمعروف'' (صحيح مسلم ۱،۳۹۷، سنن ابوداؤد ۲۶۳، كتاب المناسك)۔

''ونفقة المرأة واجبة على الزوج وإن مرضت وهذا استحسان لأن النكاح بعقد للصحة والألفة'' (المبسوط ۵،۱۶۹)۔

۳۔ جب خواتین معمر ہوجائیں اور وہ صاحب ثروت نہ ہوں اور ان کی اولاد ہو تو ایسے وقت میں اسلام نے ان کی معاشی کفالت ان کی اولاد پر رکھی ہے، اولاد ہی ان کی معاشی ضروریات کی تکمیل کرے گی اور یہ ان کی ذمہ داری اور فریضہ ہے۔

''ويجبر الولد الموسر على نفقة الأبوين المعسرين مسلمين كانا أو ذميين قدرا على الكسب أولم يقدرا'' (الهنديه ۱،۵۶۴)۔

۴۔ جب خواتین کے والد، شوہر اور اولاد میں سے کوئی نہ ہوں تو اس وقت بھی خواتین کی معاشی ذمہ داری کا بوجھ ان کے ناتواں کاندھوں پر نہیں ڈالا گیا ہے، بلکہ ایسے وقت میں ان کے وارثین کو ان کی کفالت کا ذمہ دار بنایا گیا ہے، قرآن میں ہے: ''وعلى الوارث مثل ذلك'' (بقره: ۲۳۳)۔

امام جصاص رازی فرماتے ہیں: ''ثم قال الله تعالى: وعلى الوارث مثل ذلك يعني النفقة والكسوة... وقال زيد بن ثابت رضی اللہ عنہ: النفقة على الرجال والنساء على قدر مواريثهم وهو قول أصحابنا'' (احكام القرآن للجصاص ۱،۴۰۷)۔

غرض عورتوں کی پوری حیات پر نظر ڈالیں، ہر حالت میں عورتوں کی معاشی ضروریات کی تکمیل اسلام نے ان کے سر نہیں رکھی، بلکہ ان کو اس ذمہ داری سے فارغ رکھا ہے، ان کے مختلف زمانہ میں ان کے اپنے مختلف رشتہ داروں کو ان کی کفالت کا ذمہ دار بنایا ہے، کبھی باپ ذمہ دار ہوگا، کبھی شوہر ذمہ دار ہوگا، کبھی بیٹا ذمہ دار ہوگا، کبھی دوسرے رشتہ دار ذمہ دار ہوں گے، عورتوں کی نازک صنف فطرت کے مطابق اسلام نے یہ فطرت اصول متعین کئے ہیں۔

اس تفصیل سے یہ بات بہت واضح ہوکر سامنے آجاتی ہے کہ عام حالات میں عورتوں کا خود کسب معاش کرنا اور معاشی ضروریات کی تکمیل کے لئے خود گھر سے باہر نکلنا اور معاشی ذمہ داری اپنے کاندھوں پر لے لینا یہ اسلام کی نظر میں پسندیدہ نہیں ہے، البتہ صراحت کے ساتھ اس سے منع نہیں کیا گیا ہے، کیونکہ بعض وقت ایسے حالات عورتوں پر آجاتے ہیں جب وہ کسب معاش کے لئے مجبور ہوجاتی ہیں، ایسی صورت میں اس کی اجازت ہوسکتی ہے۔

چنانچہ متعدد صحابیات کے بارے میں یہ ثابت ہے کہ وہ کسب معاش کے لئے گھر سے باہر نکلتی تھیں اور اس سے واقفیت کے باوجود حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اس سے منع نہیں فرمایا، اس سلسلہ میں ہم ذیل میں چند واقعات پیش کرتے ہیں، جو صحیح احادیث سے ثابت ہیں، اور ان کو مستند محدثین نے اپنی کتابوں میں روایت کیا ہے۔

امام مسلم نے حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے: ''طلقت خالتي، فأرادت أن تجد نخلها، فزجرها رجل أن تخرج، فأتت النبي صلی اللہ علیہ وسلم فقال: بلى؟ فإنك عسى أن تصدقي أو تفعلي خيرا'' (صحيح مسلم ۱،۴۸۶)۔

(میری خالہ کو طلاق واقع ہوگئی تو انہوں نے چاہا کہ اپنے کھجور کے باغ میں جاکر کھجور توڑا کریں، (یعنی اس پر گذارا کریں) ایک شخص نے ان کو

گھر سے نکلنے پڑا تو وہ حضرت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اس معاملہ کو لے کر آئیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیوں نہیں، ہوسکتا ہے کہ (اس سے جو حاصل ہوا اس میں سے) تم صدقہ کرو یا اس سے کوئی خیر کا کام کرو)۔

حضرت زبیر حواری رسول ہیں، وہ غزوات میں شرکت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ دوسرے معاملات میں مشغول رہنے کی وجہ سے گھر کی طرف پوری توجہ نہیں دے پاتے تھے تو گھر اور باہر کی ضروریات کے سب کام ان کی زوجہ محترمہ حضرت اسماء خود ہی انجام دیتی تھیں، خصوصا اس وقت جب حضرت زبیرؓ غزوات میں مدینہ سے باہر ہوتے تھے۔

اس سے بھی یہ بات واضح طور سے معلوم ہوجاتی ہے کہ ضرورت کی وجہ سے حضرت اسماء بنت ابی بکرؓ نے خود ہی کسب معاش کی خدمت اپنے ذمہ لے لی تھی، تاکہ حضرت زبیرؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس زیادہ وقت دیں اور اسلام کی خدمت میں مصروف رہیں، اس سلسلہ میں ان کو گھر سے باہر کافی دور جاکر کام کرنا پڑتا تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اس سے منع نہیں فرمایا بلکہ اپنے ساتھ سوار کرکے ساتھ لانے کی پیش کش کرکے آپ نے اس کی تائید فرمائی۔

ان دونوں احادیث سے اور دوسری متعدد احادیث سے بھی بوقت ضرورت عورتوں کے لئے گھر سے باہر نکل کر کسب معاش کرنے کی اجازت ملتی ہے۔

فقہاء کرام نے بھی ضرورت کے وقت کسب معاش کے لئے گھر سے نکلنے کی اجازت خواتین کو دی ہے، جس عورت کے شوہر کی وفات ہوجائے اور کوئی دوسرا اس کی معاشی کفالت کرنے والا موجود نہ ہو تو وہ عدت کے زمانے میں بھی کسب معاش کے لئے دن میں گھر سے باہر نکل سکتی ہے، لیکن عدت کی وجہ سے رات میں اس کی گھر واپسی ضروری ہے (البحر الرائق ۴/ ۱۵۳، باب العدۃ، فتح القدیر ۴/ ۱۶۶)۔

یہ اجازت صرف ضرورت کے وقت ہے، عام حالات میں ان کے لئے یہی حکم ہے کہ وہ بلاضرورت گھر سے باہر نہ نکلیں، سیر وتفریح اور تماشا کے لئے بازاروں اور تفریح گاہوں میں بغیر پردہ کے پھرنے کی قطعاً اجازت نہیں ہے، کسی ضرورت کے بغیر گھر سے باہر قدم نکالنا خود کو شیطان کے روبرو کردینا ہے، حدیث میں ہے:

"المرأة عورة فإذا خرجت استشرفها الشیطان" (سنن الترمذی)۔

(عورت پوشیدہ چیز ہے، جب وہ گھر سے باہر نکلتی ہے تو شیطان اس کے پیچھے لگ جاتا ہے)۔

قرآن کریم میں حکم دیا گیا ہے کہ مسلمان عورتیں گھر سے باہر نکلنے کے وقت پردہ کے لئے چادر اوڑھ کر نکلیں۔

"یا أیها النبی قل لأزواجك وبناتك ونساء المؤمنین یدنین علیهن من جلابیبهن" (احزاب: ۵۹)۔

(اے نبی! آپ اپنی بیویوں، لڑکیوں اور مسلمانوں کی بیویوں سے کہہ دیں کہ (گھر سے باہر نکلنے کے وقت) چادر میں سے اپنے اوپر ڈال لیا کریں)۔

جنازہ کی نماز میں شرکت اور قبرستان تک جنازہ کو پہنچانا اور تدفین کرنا فرض کفایہ ہے، مگر جنازہ کے ساتھ جانے سے عورتوں کو منع کردیا گیا ہے، یہ کام صرف مردوں کے سپرد کیا گیا ہے۔

صحیح بخاری میں حضرت ام عطیہؓ سے مروی ہے، وہ فرماتی ہیں: "نهینا عن اتباع الجنائز ولم یعزم علینا" (۱/۱۷۰ باب اتباع النساء الجنائز) (ہم لوگوں کو جنازے کے ساتھ جانے سے منع کردیا گیا ہے اور اس کو ہم پر لازم نہیں کیا گیا)۔

اصل معاملہ فتنہ کے اندیشہ کا ہے جو گھر سے باہر نکلنے پر عورتوں کے ساتھ ہمیشہ لگا رہتا ہے، اسی لئے ازواج مطہرات کو اور ان کے ساتھ تمام مسلمان عورتوں کو قرآن نے صراحت کے ساتھ حکم دیا ہے کہ وہ گھر میں جم کر رہیں اور زمانہ جاہلیت کی طرح بناؤ سنگار کے ساتھ باہر نہ نکلا کریں۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ شریعت کے نزدیک کسب معاش خواتین کے لئے مباح ہے، لیکن عام حالات میں جب کوئی ضرورت نہ ہو تو خواتین کے لئے کسب معاش کو شریعت پسندیدہ نگاہ سے نہیں دیکھتی، کیونکہ اس کے لئے گھروں سے باہر نکلنا پڑے گا، غیر محرموں کے سامنے جانا ہوگا، ان سے روابط وتعلقات ہوں گے، جن سے ہزار پردہ اور احتیاط کے باوجود بڑے مفاسد کا قوی اندیشہ ہے۔

۲۔ جس طرح عام حالات میں شریعت نے خواتین کے خود اپنے نفقہ کی ذمہ داری ان پر لازم نہیں کی ہے، بلکہ دوسرے مردوں پر اس کو لازم کیا ہے، جیسا کہ تفصیل سے اس کی وضاحت کی جاچکی ہے اسی طرح شریعت نے خواتین پر کسی دوسرے فرد کا نفقہ بھی عام حالات میں لازم نہیں کیا ہے۔

البتہ بعض استثنائی حالات ایسے ہیں جن میں خواتین کے اوپر بھی ان کی اولاد یا ان کے والدین کا نفقہ واجب ہوجاتا ہے، جن کی مختصر تفصیل ہم ذیل میں نقل کرتے ہیں:

۱۔ جب ان کے بچوں کی کفالت کرنے والا کوئی نہ ہو، ان کے شوہر باحیات نہ ہوں یا بیماری یا افلاس کی وجہ سے کفالت سے معذور ہوں، تو ایسی صورت میں ماں پر بچوں کی کفالت کی ذمہ داری آجاتی ہے، علامہ ابن ہمام تحریر کرتے ہیں:

''فإن كان له أم موسرة فنفقته عليها وكذا اذا لم يكن له أب إلا أنها ترجع في الأول'' (فتح القدير ۴/۲۱۶)۔

''ولو كان له أم وجد كانت النفقة عليهما أثلاثا الثلث على الأم والثلثان على الجد على قدر ميراثهما'' (البدائع ۴/۳۳)۔

۲۔ محتاج والدین اور اسی طرح محتاج اصول (یعنی دادا، دادی وغیرہ) کا نفقہ ان کی مالدار اولاد پر لازم ہوتا ہے، خواہ اولاد ذکور ہو یا اولاد اناث، ان سب پر اپنے محتاج وفقیر ماں، باپ دادا، دادی کی کفالت واجب ہے۔

''وتجب على موسر يسار الفطرة النفقة لأصوله الفقراء بالسوية بين الابن والبنت'' (تنوير الأبصار مع الدر المختار باب النفقة)۔

۳۔ معاشی جدوجہد حلال رزق کو طلب کرنا ہے، طلب حلال جتنا بھی ہو بنیادی طور پر مباح ہے، اس کی حرمت کی کوئی دلیل نہیں ہے، کسی فرد پر شریعت کی رو سے یہ لازم نہیں کیا جاسکتا ہے کہ بقدر کفاف ہی معاش حاصل کرے اور اپنے سرمایہ میں اضافہ نہ کرے، مسلمانوں میں اغنیاء کے طبقہ کا وجود بھی ضروری ہے تاکہ اسلام کے کاموں میں ان کی دولت وثروت کام آئے، صحابہ کرام میں زہاد حضرات کے ساتھ اہل ثروت حضرات بھی موجود تھے، حضرت سیدنا عثمان غنی، حضرت عبدالرحمن بن عوف اور بعض دوسرے صحابہ کرامؓ اس کی مثال ہیں۔

خواتین بھی اپنی خانگی ذمہ داریوں کی ادائیگی کے ساتھ اور دیگر مکروہات ومحرمات سے بچتے ہوئے اگر رزق حلال کے حصول کی کوشش کریں تو ان کے لئے بھی اصلا اس کی اباحت ہے، اگر صدقہ وخیرات اور دین کے کاموں میں تعاون کا مقصد بھی کسب معاش میں پیش نظر ہو تو یہ اجر وثواب کا باعث بھی ہے، خواہ کسب معاش کا سلسلہ گھر کے اندر رہ کر ہو یا گھر سے باہر جاکر ہو، لیکن اس شرط کے ساتھ کہ گھریلو ذمہ داریوں کی مکمل ادائیگی ہو رہی ہو، حجاب کی پابندی ہو اور محرمات سے مکمل اجتناب ہو، جیسا کہ متعدد صحابیاتؓ سے کسب معاش میں اپنے شوہروں کا تعاون یا صدقہ وخیرات کی نیت سے کسب معاش کرنا ثابت ہے، ان کے بعض حوالے گذر چکے ہیں۔

اس لئے اس مسئلہ میں اصولی طور سے تو یہی حکم ہے کہ اگر دیگر محرمات ومکروہات نہ پائے جائیں تو عورتوں کو بھی کسب معاش کی اجازت ہے، لیکن سوال یہ اٹھتا ہے کہ اس دور میں اگر خواتین کو گھر سے باہر نکل کر معاشی جدوجہد کرنے کی اجازت دے دی جائے تو:

۱۔ کیا حجاب کی شرعی پابندی باقی رہ پائے گی؟

۲۔ غیر محرم افراد سے احتراز ہو پائے گا؟ ان سے روابط میں اور ساتھ بیٹھ کر کام کرنے میں تنہائی اور خلوت سے اجتناب ہو پائے گا؟

۳۔ اپنی خانگی ذمہ داری، شوہر کے حقوق کی ادائیگی، بچوں کی پرورش اور تربیت وغیرہ جیسے فرائض معاشی جدوجہد کے ساتھ پورے ہو پائیں گے؟

یہ سب ایسے سوالات ہیں جن کا جواب دینا آسان نہیں ہے، حقیقت یہ ہے کہ جب خواتین کے قدم گھر سے باہر نکلنا شروع ہوجاتے ہیں تو پھر کوئی پابندی باقی نہیں رہتی، اس لئے یہ تو کہا جاسکتا ہے کہ گھر کے اندر رہ کر خواتین کسب معاش کا کوئی ذریعہ اپنے شوہر کی اجازت سے اختیار کرلیں، تاکہ اس سے ان کی گھریلو ذمہ داریاں متاثر نہ ہوں تو اس کی اباحت میں کوئی کلام نہیں ہے۔

البتہ لڑکیوں کے اسکولوں میں اور ایسے اداروں میں جہاں خواتین کارکنان سے ہی واسطہ ہوتا ہو، مرد کارکنان سے براہ راست رابطہ نہ ہوتا ہو

وہاں گھریلو ضروریات کی تکمیل کے ساتھ شوہر کی اجازت سے کوئی خاتون کام کرے تو اس کی اجازت ہونی چاہئے۔

۴۔ خواتین اگر اپنے گھروں میں رہ کر کوئی ذریعہ معاش اختیار کرنا چاہیں اور یہ ذریعہ معاش جائز اور حلال ہو، نیز ان کی معاشی جدوجہد بھی اندرون خانہ ہی محدود ہو تو ایسی صورت میں ان کو اپنے شوہر سے اس کام کے کرنے کی اجازت لینا ضروری ہوگا، کیونکہ اس سے ان کی خانگی ذمہ داریوں پر اثر پڑے گا، گھریلو ضروریات، شوہر کی ضروریات، بچوں کی پرورش وغیرہ جیسے ان کے وظائف کی ادائیگی میں دشواری ہوگی۔

شریعت نے بیوی کو شوہر کی موجودگی میں اس کی اجازت کے بغیر نفلی روزہ رکھنے اور نفلی نمازیں پڑھنے سے منع کیا ہے جو کہ اہم ترین عبادتیں ہیں کہ اس سے شوہر کی ضروریات پر اثر پڑے گا، چنانچہ حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''لا تصوم المرأة وزوجها شاهد إلا بإذنه'' (الصحيح للبخاری كتاب النكاح باب صوم المرأة بإذن زوجها)۔

فقہاء کرام اس بات کو صراحت کے ساتھ لکھتے ہیں کہ عورتیں شوہر کی اجازت کے بغیر نہ نفلی روزہ رکھیں گی اور نہ نفلی نمازیں پڑھیں گی۔

''ولا تتطوع للصلاة وللصوم بغير إذن الزوج كذا في الظهيرية'' (البحر الرائق ۴،۱۰۶)۔

جب اس قدر اہم ترین عبادت کے لئے بھی شوہر سے اجازت لینا ضروری ہے تو کسب معاش کے لئے خواہ گھر میں ہی کیوں نہ ہو بدرجہ اولی اجازت ضروری ہوگی، جب کہ اصلاً کسب معاش شوہر کی ذمہ داری ہے، بیوی کی ذمہ داری ہے ہی نہیں۔

اب سوال یہ سامنے آتا ہے کہ کیا شوہر کو یہ حق ہے کہ اندرون خانہ رہ کر کسب معاش کرنے سے بیوی کو منع کردے؟

اس کا جواب اثبات میں ہے کہ شوہر کو یہ اختیار حاصل ہے کہ جب وہ خود کسب معاش کے ذریعہ بیوی کی تمام ضرورتوں کو پورا کر رہا ہے تو بیوی کو کسب معاش سے منع کردے۔

''بل له أن يمنعها من الأعمال كلها المقتضية للكسب لأنها مستغنية عنه لوجوب كفايتها عليه وكذا من العمل تبرعا لأجنبي بالأولى'' (البحر الرائق ۴،۱۰۶)۔

۵۔ اگر کسب معاش کے لئے عورت کو بیرون خانہ نکلنا ضروری ہو اس طرح پر کہ اس کا شوہر اپنی بیماری یا معذوری کی وجہ سے اس کی کفالت پر قادر نہ ہو، بلکہ عورت کی معاشی ذمہ داری خود اسی پر ہو تو ایسی صورت میں اس پر شوہر سے اجازت لینا لازم نہیں ہے، البتہ اس کے لئے مستحب اور افضل ہے کہ وہ اس سے اجازت لے لے۔

اجازت کے عدم لزوم کی ایک وجہ یہ ہے کہ اس صورت میں اپنے لئے اور اپنے بچوں کے لئے کسب معاش کرنا عورت پر فرض ہوجاتا ہے اور فرائض کی ادائیگی کے لئے اجازت کی ضرورت نہیں ہوتی، جیسے فرض حج یا فرض نماز یا فرض روزہ کے لئے شوہر سے اجازت لازم نہیں ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ نکاح کی وجہ سے شوہر کو ''حق احتباس'' حاصل ہوتا ہے، اسی لئے بیوی کو گھر سے باہر نکلنے کے لئے شوہر کی اجازت ضروری ہوتی ہے، کیونکہ شوہر چاہے تو اس کو باہر نکلنے سے منع کردے، اسی حق احتباس کی وجہ سے شوہر پر بیوی کا نفقہ لازم ہوجاتا ہے، لیکن جب شوہر کی معذوری کی وجہ سے اس کی جانب سے نفقہ کی ادائیگی نہیں ہو رہی ہو تو اس کا حق حبس باقی نہ رہے گا، اب وہ بیوی کو باہر نکلنے سے منع نہیں کرسکتا، لہذا بیوی کو اس سے اجازت لینا لازم نہیں ہوگا۔

''وذلك لأن نفقة المرأة في مقابلة الاحتباس فما دام الاحتباس قائما كانت النفقة واجبة تحقيقا للمعادلة'' (عناية مع الفتح ۴،۲۲۰)۔

اجازت کے عدم لزوم کی تیسری وجہ یہ ہے کہ اجازت کے وجوب کا فائدہ اس وقت ظاہر ہوتا ہے جب اجازت دینے والے کو منع کرنے کا اختیار حاصل ہو، مذکورہ صورت میں شوہر اس کے نفقہ کی ادائیگی پر قادر نہ ہونے کی وجہ سے اس پوزیشن میں نہیں ہے کہ اس کو منع کرسکے، کیونکہ اگر منع کرے گا تو عورت اور اس کے بچے نفقہ کے بھوکے رہیں گے اور شریعت اس کی اجازت نہیں دیگی کہ کسی کو گھر میں روک کر بھوکا مارا جائے۔

اگر شوہر یا ولی اس کے نفقہ کی کفالت کرتا ہو لیکن اپنی اور اپنے کنبہ کی مزید ضروریات کے لئے کسی مناسب اور جائز طریقہ سے یہ خاتون معاشی بوجھ اٹھانے میں شوہر کا تعاون کر رہی ہو تو ایسی صورت میں گھر سے باہر نکلنے کے لئے اس کو شوہر سے اجازت لینا لازم ہوگا اور شوہر کو اجازت دینے یا نہ دینے کا اختیار ہوگا۔

کسب معاش کے لئے خواتین کا گھر سے نکلنا مسافت سفر شرعی سے کم ہو یا اس سے زیادہ ہو دونوں صورتوں میں شوہر یا ولی کی اجازت ضروری ہوگی، البتہ اگر اس کا فاصلہ شرعی سفر کی مسافت کے بقدر ہے تو اس کے ساتھ شوہر یا ولی کا ہونا بھی ضروری ہے اور اس سے کم ہونے کی صورت میں شوہر یا ولی کا اس کے ساتھ ہونا لازم نہیں ہے، حدیث میں کسی مسلمان عورت کو تین دن کا سفر بغیر محرم کے کرنے سے ممانعت وارد ہوئی ہے۔

''لا یحل لامرأة تؤمن باللہ والیوم الآخر أن تسافر سفرا یکون ثلاثة أیام فصاعدا إلا ومعها أبوها أو ابنها أو زوجها أو أخوها أو ذومحرم منها'' (الصحیح للمسلم کتاب الحج، باب سفر المرأة مع محرم إلی حج وغیرہ)۔

کسب معاش کے لئے عورتوں کو گھر سے نکلنے کی اجازت صرف دن میں ہوگی، رات میں گھر واپس آجانا لازم ہوگا، ورنہ اس میں بڑی خرابیاں لازم ہوں گی اور مفاسد کا قوی اندیشہ ہے، ویسے بھی کسب معاش کے لئے اللہ تعالیٰ نے دن کو مقرر فرمایا ہے۔

''وجعلنا اللیل لباسا و جعلنا النهار معاشا'' (سورۂ نبا)۔

جس عورت کے شوہر کی وفات ہوگئی ہو اور وہ محتاج ہو تو اس کو نفقہ کیلئے صرف دن میں نکلنے کی فقہاء نے اجازت دی ہے، اس کی علت یہ بیان کی ہے کہ کسب معاش عادۃً دن میں ہوتا ہے (فتح القدیر ۱۶۶/۴)۔

رات میں گھر سے باہر رہنے میں ان کی عفت وعصمت کی حفاظت کا مسئلہ زیادہ ہوگا، جب ان کو خارج بیت جانے کی اجازت ضرورت کے تحت دی جارہی ہے تو اجازت بھی ضرورت کے بقدر ہی ہونی چاہئے، یہی احتیاط کا تقاضہ ہے۔

۶۔ خواتین گھر سے خارج میں اپنی معاشی ضرورت پوری کرنے کے لئے ملازمت کرنا چاہیں تو کچھ شرائط کے ساتھ اس کی اجازت دی جاسکتی ہے، اگرچہ عورتوں کا ملازمت کرنا شریعت کے نزدیک سخت ناپسندیدہ چیز ہے، مگر حاجت کے تحت اس کی اجازت دی جاسکتی ہے، وہ شرائط درج ذیل ہیں:

الف۔ گھر میں رہ کر کسب معاش کی کوئی صورت نہ ہو۔

ب۔ شوہر کی اجازت ضروری ہوگی، شوہر سے اجازت لینے کے بعد ملازمت کے لئے گھر سے باہر جاسکتی ہیں، جب نفقہ شوہر ادا کر رہا ہو تو مزید معاش کی تحصیل کے لئے بلا اجازت جانا جائز نہ ہوگا۔

ج۔ گھر کی ذمہ داریوں، شوہر کی ضروریات، بچوں کی پرورش وتربیت وغیرہ پر اس کا اثر نہ پڑ رہا ہو، کیونکہ یہ چیزیں عورت کے فرائض میں شامل ہیں اور کسب معاش کی صرف اباحت ہے۔

د۔ راستہ میں پورے شرعی حجاب کے ساتھ جائیں، ملازمت کی جگہوں میں مردوں کا سامنا ہو اور ان سے کوئی کام ہو یا ان سے گفتگو کرنا ہو تو بھی شرعی پردہ قائم رہے۔

ھ۔ کسی غیر محرم مرد کے ساتھ تنہا رہ کر کام نہ کریں، یعنی اس خاتون کی ڈیوٹی کسی ایسے روم میں نہ ہو جہاں ان کے اور غیر محرم مرد کے علاوہ کوئی دوسرا نہ ہو، یہ شرعاً جائز نہیں ہے، اس سے حدیث میں ممانعت وارد ہوئی ہے۔

''عن ابن عباس رضی اللہ عنہ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: لا یخلون رجل بامرأة إلا مع ذی محرم. فقام رجل فقال: یا رسول اللہ امرأتی خرجت حاجة واکتتبت فی غزوة کذا کذا قال: ارجع فحج مع امرأتك'' (صحیح بخاری کتاب النکاح باب لا یخلون رجل بامرأة)۔

و۔ آرائش وزینت کر کے نہ نکلیں، اسی طرح بھڑک دار اور شوخ رنگ کے کپڑے پہن کر نہ جائیں، لباس کشادہ ہو بہت تنگ نہ ہو جس سے جسم

کے اعضاء ظاہر ہونے لگیں، سادہ کپڑوں میں جائیں بلکہ ایسی ہیئت میں جائیں جس میں دوسرے غیر محرموں کو ان کی طرف کشش اور میلان نہ ہو (البحر الرائق ۴/۱۰۶)۔

ز۔ غیر محرم مردوں کے ساتھ گفتگو کرنی ہو تو آواز میں لچک اور سریلا پن نہ ہو، لگاوٹ اور مٹھاس نہ ہو، جس سے سننے والے مردوں کے جذبات برانگیختہ ہوں اور ان کو پیش قدمی کا حوصلہ ملے، بلکہ ایسے لب ولہجہ اور طریقہ سے گفتگو ہو جس سے سننے والے کے دل میں اگر کوئی برائی ہو تو اس کو ناامیدی ہو جائے۔

''إن اتقيتن فلا تخضعن بالقول فيطمع الذي في قلبه مرض وقلن قولا معروفا'' (الأحزاب: ۳۲)۔

ان سب شرائط کے ساتھ ملازمت کرنے کی اجازت ہے، لیکن پھر بھی احتیاط ہر حال میں لازمی ہے۔

۷۔ اگر اس ادارے میں کام کرنے والی تمام خواتین مسلمان ہیں غیر مسلم خواتین اس میں نہیں ہیں تو اس صورت میں غیر محرم مردوں سے عورتوں کا جو پردہ ہے وہ پردہ لازم نہ ہوگا، بلکہ عورتوں کا آپس میں جو پردہ ہے وہ لازم ہوگا، ایک عورت کا دوسری عورت سے پردہ ناف سے لے کر گھٹنے تک جسم کے حصے کا ہے، اس کے سوا جسم کے دوسرے اعضاء کا عورتوں کا آپس میں دیکھنا جائز ہے، البتہ احتیاطاً سر پر دوپٹہ ڈالے رہنا چاہئے، اگر کسی مرد کے سامنے جانا ہو تو مکمل پردہ لازم ہوگا۔

اگر اس ادارے میں مسلم خواتین کے ساتھ غیر مسلم خواتین بھی ہیں اور سب ساتھ کام کرتی ہیں تو عورتوں کا غیر محرم مردوں سے جو پردہ ہے وہ مکمل پردہ لازم ہوگا (دیکھئے: ردالمحتار ۵/ ۳۶۲، الحظر والاباحۃ فصل فی النظر والمس، نیز مجمع الأنہر ۴/ ۲۰۱)۔

۸۔ اس صورت میں اصلا کام کی اجازت نہیں ہونی چاہئے، کیونکہ اس میں مرد وزن کا اختلاط ہوگا جس کی شدید ممانعت ہے، مگر کوئی خاتون مجبوری میں اس جگہ کام کر رہی ہو تو اس کے لئے مکمل پردہ لازم ہوگا، وہ آرائش وزیبائش کر کے نہ جائیں، کپڑے بھی چست نہ ہوں، آواز میں لوچ نہ ہو، کسی غیر محرم مرد کے ساتھ تنہائی کی صورت نہ ہو، ان سب کی تفصیل چھٹے سوال کے جواب میں اوپر گذر چکی ہے۔

پردہ کے معاملہ میں سن رسیدہ اور جوان خواتین کا حکم یکساں ہی ہوگا، زیادہ بوڑھی خواتین کو پردے کی کچھ چھوٹ ہے، بس وہ چھوٹ یہ ہے کہ غیر محرم افراد کے سامنے وہ اپنے چہرہ کو کھول سکتی ہیں (دیکھئے: احکام القرآن للجصاص ۳/ ۳۴۴)۔

۹۔ جس ملازمت میں غیر محرم مردوں کے ساتھ اختلاط بالکل نہ ہو، جیسے لڑکیوں کے اسکول وکالج یا مدرسۃ البنات میں پڑھانا یا ایسی جگہ ملازمت کرنا جہاں مردوں سے واسطہ بالکل نہ پڑتا ہو ایسی ملازمت درست ہوگی۔

جس ملازمت میں اختلاط کم ہو، جیسے آفس وغیرہ میں بیٹھ کر یکسوئی سے کام کرنا، وہاں بھی پوری احتیاط اور پردے کے ساتھ مجبوری میں ملازمت کی جاسکتی ہے۔

لیکن جہاں غیر محرم مردوں سے بہت زیادہ اختلاط ہو، بغیر ان سے ربط کے کام ہی نہ ہوسکتا ہو، مثلاً دوکان میں سیلز گرل کا کام یا فیلڈ ورک کی بھاگ دوڑ ہوٹلوں میں استقبالیہ پر بیٹھنے کا کام وغیرہ، وہاں ملازمت میں بہت شدید قباحت ہے، شرعاً ایسے کسب معاش کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔

۱۰۔ خواتین کا ملازمت کے لئے اپنے گھر اور اپنے گھر والوں سے دور کہیں مستقل قیام کرنا شرعاً درست نہیں ہے، جب اڑتالیس میل کی مسافت کا سفر خواتین کو محرم یا شوہر کے بغیر کرنا ممنوع ہے، شریعت نے لازم کیا ہے کہ ایسے کسی سفر میں خواہ حج کا سفر ہی کیوں نہ ہو عورت کے ساتھ محرم یا شوہر کا ساتھ ہونا ضروری ہے ورنہ یہ سفر ناجائز ہوگا اور وہ عورت گنہگار ہوگی۔

اسی سے یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ گھر والوں کو چھوڑ کر محرم اور شوہر کے بغیر حصول معاش اور ملازمت کے لئے دوسرے شہروں میں خواہ ملک کے اندر ہو یا ملک سے باہر ہو تنہا قیام کرنا شرعاً جائز نہیں ہے، کیونکہ اس میں اس کی عصمت وعفت کو شدید خطرہ لاحق ہوگا اور بے شمار مفاسد پیدا ہوں گے۔

☆☆☆

خواتین کی ملازمت

مولانا ڈاکٹر سید اسرار الحق سبیلی [1]

۱۔ خواتین کا کسب معاش:

شریعت اسلامی نے کسب معاش کی ذمہ داری مردوں پر ڈالی ہے اور عورتوں کو کسب معاش اور اس کی فکر سے آزاد رکھا ہے، یہ اسلام کا خواتین پر بڑا احسان ہے، اللہ تعالی کا ارشاد ہے: ''الرجال قوامون علی النساء بما فضل اللہ بعضھم علی بعض وبما أنفقوا من أموالھم'' (سورۂ نساء: ۳۴) (مرد عورتوں پر حاکم ہیں، اس سبب سے کہ اللہ تعالی نے بعضوں کو بعض پر فضیلت دی ہے اور اس سبب سے کہ مردوں نے اپنے مال خرچ کئے ہیں۔

حدیث میں ہے: "ولھن علیکم کسوتھن ورزقھن بالمعروف" (مسند احمد: ۳۲۰/۳) (تم پر عورتوں کا کپڑا اور نفقہ معروف طریقہ پر واجب ہے)۔

۲۔ خواتین پر نان ونفقہ کی ذمہ داری:

بنیادی طور پر شریعت اسلامی نے نان ونفقہ کی ذمہ داری مردوں پر رکھی ہے، شادی سے پہلے خواتین کا نفقہ اس کے والد پر اور شادی کے بعد اس کے شوہر پر ہے، چنانچہ فقہاء کا بیان ہے: ''تجب علیہ النفقۃ علی أولادہ الصغار و الکبار، الذکور الزمن الفقراء، والإناث الفقیرات وإن کن صحیحات'' (بدائع الصنائع ۴۴۸/۲)۔ (مرد پر اس کی چھوٹی اور بڑی اولاد، مذکر اپاہج، محتاج اولاد اور مؤنث محتاج اولاد، اگر چہ وہ تندرست ہوں کا نفقہ واجب ہوگا)۔

حدیث میں ہے: ''إن رجلا جاء إلی رسول اللہ ﷺ فقال: ما حق المرأۃ علی الزوج؟ فقال ﷺ: یطعمھا إذا طعم ویکسوھا إذا کسی'' (مسند احمد ۴۴۶/۴، ۴۴۷)۔

(ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ کے پاس آکر عرض کیا: عورت کا حق مرد پر کیا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: جب مرد کھائے تو اس کو بھی کھلائے اور جب پہنے تو اس کو بھی پہنائے)۔

البتہ اگر عورت کا شوہر نہ ہو، وہ بیوہ ہو اور اس کے اور اس کے بچوں کا نفقہ کوئی رشتہ دار برداشت کرنے کو تیار نہ ہو، ایسی صورت میں عورت کے لئے اپنے اور اپنے بچوں کی کفالت کے لئے ملازمت اختیار کرے بغیر کوئی چارہ کار نہیں ہے، چنانچہ فقہاء نے معتدہ وفات کو عدت کی حالت میں بھی روزگار کے لئے گھر سے باہر جانے کی اجازت دی ہے:

''ومعتدۃ موت تخرج فی الجدیدین وتبیت أکثر اللیل فی منزلھا لأن نفقتھا علیھا، فتحتاج للخروج'' (الدر المختار ۱۸۰/۵)۔ (وفات کی عدت گزارنے والی عورت دن اور رات میں نکلے گی اور رات کا اکثر حصہ اپنے گھر میں گزارے گی، کیونکہ اس کا نفقہ خود اس کے ذمہ ہے، لہذا وہ باہر نکلنے کی محتاج ہے)۔

۳۔ معیار زندگی بلند کرنے کے لئے ملازمت:

آج بہت سی خواتین محض معیار زندگی بلند کرنے، اپنی علمی قابلیت کو ظاہر کرنے یا وقت گزاری اور آزادروی اختیار کرنے کے لئے ملازمت کرتی ہیں، ان مقاصد کے لئے خواتین کا ملازمت کرنا شریعت اسلامی کی روح کے خلاف ہے، اسلام میں عورت کا دائرۂ عمل گھر کی چہار دیواری ہے، اور از راہ ضرورت گھر سے باہر نکلنے کی اجازت ہے، اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

---

[1] لکچرر گورنمنٹ جونیئر کالج ظہیر آباد، ضلع میدک، آندھرا پردیش۔

''وقرن فی بیوتکن ولا تبرجن تبرج الجاهلية الأولى''(احزاب:۳۳)(اور تم اپنے گھروں میں سکون سے رہو اور قدیم زمانہ جاہلیت کی طرح مت پھرو)۔

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''المرأة عورة، فإذا خرجت استشرفها الشيطان''(ترمذی ۱،۲۲، کتاب الرضاع)(عورت سراپا چھپانے کی چیز ہے، جب وہ باہر نکلتی ہے تو شیطان اسے جھانکتا ہے)۔

فقہ کا قاعدہ ہے: ''الضرورات تقدر بقدرها''(المنہاج:۲۹)(جو چیز ضرورتاً جائز ہوتی ہے، وہ بقدر ضرورت ہی جائز رہتی ہے)۔

۴۔ اندرون خانہ معاشی سرگرمی:

مرد اپنی بیوی کے نفقہ کا اس لئے ذمہ دار ہوتا ہے کہ وہ شوہر کے کاموں میں خود کو مصروف رکھتی ہے اور شوہر کے حقوق کی حفاظت کرتی ہے، اگر عورت گھر میں رہتے ہوئے کسی طرح کی معاشی سرگرمی اختیار کرے، جس سے شوہر کے حق میں کوئی رکاوٹ نہ ہو اور اس کو کوئی نقصان نہ ہو تو عورت کے لئے شوہر سے اجازت لینا ضروری نہیں ہوگا، علامہ شامی لکھتے ہیں:

''مناسب بات یہ ہے کہ مرد کے لئے عورت کو ہر ایسے کام سے روکنے کا حق ہوگا جس سے اس کے حق میں کمی آئے یا اس کو نقصان پہنچے، یا عورت کو گھر سے نکلنا پڑے، البتہ ایسا کام جس سے مرد کو کوئی نقصان نہ ہو، تو ایسے کام سے روکنے کی کوئی وجہ نہیں ہے، خصوصاً مرد کے گھر سے باہر رہنے کے وقت میں، کیونکہ عورت کو گھر میں بے کار چھوڑنے سے نفس اور شیطان کے وسوسہ میں مبتلا ہونے کا اندیشہ ہے، یا اجنبی اور پڑوسیوں کے ساتھ بے کار کاموں میں مشغول ہونے کا خطرہ ہے''(ردالمحتار ۵/۲۵۹)۔

موجودہ دور میں انٹرنیٹ پر گھر بیٹھے ملازمت کی سہولت ہے، اسی طرح گھر بیٹھے دوسری معاشی سرگرمی جاری رکھنا باہر نکل کر ملازمت کرنے سے زیادہ بہتر ہے۔

۵۔ کسب معاش کے لئے باہر نکلنا:

عورت کے لئے شوہر کی اجازت کے بغیر گھر سے باہر نکلنا جائز نہیں ہے، خصوصاً روزانہ ملازمت کے لئے باہر جانے کے لئے شوہر یا ولی کی اجازت ضروری ہے، چاہے مرد اس خاتون کی کفالت کرتا ہو یا نہ کرتا ہو، چنانچہ سنن ابوداؤد طیالسی میں ایک روایت ہے:

''سیدا بن عمرؓ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ ایک عورت نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آ کر عرض کیا: شوہر کا حق اس کی بیوی پر کیا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وہ خود کو نہ روکے، اگرچہ وہ اونٹ کے کجاوہ میں ہو، شوہر کی اجازت کے بغیر اس کے گھر سے کچھ خیرات نہ کرے، اگر ایسا کرے گی تو شوہر کو ثواب ملے گا اور عورت کو گناہ، وہ شوہر کی اجازت کے بغیر نفل روزہ نہ رکھے، اگر اس نے روزہ رکھا تو گنہگار ہوگی، اس کو ثواب نہیں ملے گا اور وہ شوہر کے گھر سے اس کی اجازت کے بغیر نہ نکلے، اگر نکلے گی تو غضب اور رحمت کے فرشتے لعنت کرتے رہیں گے، یہاں تک کہ وہ گھر واپس آجائے، کہا گیا: اگر شوہر ظالم ہو؟ فرمایا: اگرچہ وہ ظالم ہو اور بطور ظلم گھر سے باہر نہ نکلنے دے''(سنن ابی داؤد الطیالسی ۱/۲۱۲،۳، المعجم الأوسط ۱/۳۱)۔

لیکن عورت کے لئے بغیر محرم یا شوہر کے مسافت شرعی سے کم دور کا سفر کرنا جائز ہے، مسافت شرعی یعنی ۴۸ میل (۷۷ کیلومیٹر) کا سفر بغیر محرم یا شوہر کے جائز نہیں ہے، جیسا کہ حدیث میں صراحت ہے:

''لا تسافر المرأة ثلاثة أيام إلا مع ذي رحم''(بخاری ۱،۱۴۷)۔(عورت تین دن کا سفر بغیر محرم کے نہ کرے)۔

۶۔ ملازمت کے سلسلہ میں شرعی حدود:

خواتین کے لئے ملازمت کے سلسلہ میں شرعی حدود اور آداب یہ ہیں؛

۱۔ وقت کی پابندی کرے، یعنی وقت پر ملازمت کی جگہ پہنچ جائے اور وقت ختم ہوتے ہی گھر واپس آجائے۔

۲۔ سادہ لباس میں برقعہ اور نقاب پہن کر باہر نکلے اور کام کی جگہ پر بھی برقعہ نہ اتارے۔

۳۔ کام کرنے والے دوسرے مردوں سے بلاضرورت گفتگو اور ربط ضبط نہ رکھے۔

۴۔ مردوں کے ساتھ کھانے پینے سے گریز کرے۔

۵۔ فنکشن وغیرہ میں فرمائش پر بھی نعت یا گانا وغیرہ نہ گائے۔

۶۔ جائے ملازمت کی کوئی بات شوہر سے نہ چھپائے۔

۸۔ راستہ میں یا دوران ملازمت کوئی ناشائستہ سلوک یا ہراساں کرے تو اس کی اطلاع شوہر کو ضرور دے وغیرہ۔

امام غزالی نے اس بارے میں لکھا ہے:

''عورت شوہر کی اجازت کے بغیر گھر سے نہ نکلے، اگر شوہر کی اجازت سے نکلے تو چھپ کر معمولی لباس میں خالی جگہوں سے گزرے، اس بات سے احتراز کرے کہ اجنبی اس کی آواز سنے یا اس کو پہچان پائے، وہ اپنے شوہر کے دوستوں کو پہچنوانے کی کوشش نہ کرے، بلکہ جو بھی اسے پہچانتا ہو یا پہچاننے کی کوشش کرے، اس کے سامنے اجنبی پن کا مظاہرہ کرے'' (احیاء علوم الدین ۲/۶۶)۔

۷۔خواتین کے درمیان ملازمت:

ملازمت کرنے والی خواتین اگر ایسے اداروں میں کام کریں جہاں خواتین ہی خدمت انجام دیتی ہوں اور کام کی جگہوں میں مرد نہ ہوں، البتہ ادارہ کے ذمہ دار مرد ہوں، جیسے گرلز ہائی اسکول میں طالبات کو پڑھانا ہوتا ہے، جس میں زیادہ تر جماعت میں خواتین معلمات اور اسٹاف ہوتی ہیں، لیکن آفس میں مرد ہیڈ ماسٹر اور مرد کارکن بھی ہوتے ہیں، نگرانی کے لئے مرد ہیڈ ماسٹر آتے جاتے رہتے ہیں اور دوسرے مرد آفیسر اور دوسرے مردوں کا اسکول آنا جانا ہوتا ہے، اس لئے وہاں بھی برقعہ اتارنے کی اجازت نہیں ہوگی، البتہ چہرہ سے نقاب اتارنے کی اجازت ہوسکتی ہے کہ نقاب لگا کر کام کرنا مشکل ہوتا ہے، اسی طرح اسکول یا ادارہ کے ذمہ داروں کے سامنے چہرہ کھولنے کی اجازت ہوسکتی ہے، علامہ حصکفیؒ لکھتے ہیں:

''وينظر من الأجنبية ولو كافرة إلى وجهها وكفيها فقط للضرورة قيل: والقدم والذراع إذا أجرت نفسها للخبز'' (الدر المختار ۹/۵۳۱)۔ (اجنبی عورت اگرچہ کافرہ ہو کا صرف چہرہ اور دونوں ہتھیلیاں ضرورت کے وقت دیکھنے کی گنجائش ہے، کہا گیا ہے کہ قدم اور ہاتھ بھی، جبکہ اس کو روٹی بنانے کے لئے اجرت پر رکھا گیا ہو)۔

۸۔سن رسیدہ اور جوان کا فرق:

اگر عورت کے کام کرنے کی جگہ پر دوسرے مرد کارکن بھی ہوں اور عورت کو چہرہ اور ہتھیلی کھولنے کی ضرورت ہو تو ان کے کھولنے کی گنجائش ہوگی جیسا کہ شامی میں ہے:

''قال الإتقاني: عن أبي يوسف أنه يباح النظر إلى ساعدها ومرفقها للحاجة إلى إبدائهما إذا أجرت نفسها للطبخ والخبز'' (رد المحتار ۹/۵۳۱)۔ (اتقانی نے کہا: کہ امام ابو یوسف سے منقول ہے کہ عورت کی کلائی اور کہنی دیکھنا جائز ہے جبکہ اس کے کھولنے پر مجبور ہو اور اس نے کھانا پکانے اور روٹی بنانے کی ملازمت اختیار کی ہو)۔

فقہاء نے بے پردہ کے باب میں بوڑھی اور جوان عورتوں کے درمیان فرق کیا ہے، چنانچہ علامہ حصکفی لکھتے ہیں:

''اگر شہوت کا اندیشہ یا شک ہو تو اس کا چہرہ دیکھنا ممنوع ہوگا، گویا دیکھنے کا جواز عدم شہوت کے ساتھ مشروط ہے، ورنہ حرام ہے، یہ حکم ان کے زمانہ میں تھا، اب ہمارے زمانہ میں جوان عورت کو دیکھنا (مطلقا) ممنوع ہوگا، اس لئے نہیں کہ یہ ستر میں شامل ہے، بلکہ فتنہ کے اندیشہ کی وجہ سے'' (الدر المختار ۹/۵۳۲)۔

علامہ شامی لکھتے ہیں: ''وإذا سلمت المرأة الأجنبية على رجل: إن كانت عجوزا رد الرجل عليها السلام بلسانه بصوت تسمع، وإن كانت شابة رد عليها في نفسه'' (رد المحتار ۹/۵۳۰)۔

(جب اجنبی عورت مرد کو سلام کرے، تو اگر بوڑھی ہو تو مرد سلام کا جواب زبان سے دے جس کو وہ سن سکے اور اگر عورت جوان ہو تو دل میں جواب دے)۔

فقہاء کی ان عبارتوں سے واضح ہوتا ہے کہ پردہ کے باب میں بوڑھی اور جوان عورت کا فرق ہے، اور بوڑھی عورت کے لئے پردہ کے احکام میں زیادہ

گنجائش ہے، لیکن ملازمت خصوصاً سرکاری ملازمت نوجوانوں کو دی جاتی ہے اور بڑھاپے کی عمر یعنی ۵۸ سال ہونے پر ریٹائرڈ کر دیا جاتا ہے، نیز خانگی ملازمت میں بھی جوانوں کو ترجیح دی جاتی ہے، بوڑھوں کو ملازمت دینے سے عموماً لوگ کتراتے ہیں۔

۹۔ سیلزگرل اور آفس کے کاموں میں فرق:

خواتین اگر ملازمت کرنے پر مجبور ہوں تو انہیں ایسی ملازمت کو ترجیح دینی چاہئے جہاں زیادہ سے زیادہ پردہ ہو سکے اور کم سے کم بے پردگی ہو، جس کام میں مردوں کا سامنا کم سے کم ہو، ایسی ملازمت کو ترجیح دینا ضروری ہوگا، فقہ کا قاعدہ ہے:

"ویتحمل الضرر الأخف لدفع الضرر الأشد أو الأعم" (المنہاج فی علم القواعد الفقہیہ: ۳۳)۔
(شدید اور عام نقصان کو دور کرنے کے لئے کم تر نقصان کو برداشت کیا جائے گا)۔

۱۰۔ گھر سے دور رہ کر ملازمت:

عورت کا تنہا اپنے گھر اور اپنوں سے دور رہ کر ملازمت کرنا اور تنہا جائے ملازمت میں مستقل قیام کرنا خواہ اندرون ملک ہو یا بیرون ملک جائز نہیں ہوگا، رسول ﷺ کا ارشاد ہے: "لا تسافر المرأة ثلاثة أيام إلا مع ذي رحم" (بخاری ۱۰۱۷)۔ (عورت تین دن کا سفر بغیر محرم کے نہ کرے)۔

جب تنہا سفر کرنے سے منع کیا گیا ہے تو تن تنہا گھر بار سے دور رہنا کیسے جائز ہوگا۔

جوابات کا خلاصہ:

۱۔ شریعت اسلامی نے خواتین کو کسب معاش کی فکر سے آزاد رکھا ہے۔

۲۔ شریعت نے خواتین کے نان ونفقہ کی ذمہ داری اس کے باپ، شوہر اور بیٹے پر رکھی ہے، لیکن ان کے نہ ہونے کی صورت میں خواتین پر اس کے اور اس کے بچوں کے نفقہ کی ذمہ داری ہوگی۔

۳۔ محض معیار زندگی بلند کرنے یا وقت گزاری کے لئے گھر سے باہر معاشی جدوجہد اختیار کرنا جائز نہیں ہوگا۔

۴۔ خواتین کے لئے اندرون خانہ معاشی سرگرمیوں کے لئے ولی یا شوہر کی اجازت ضروری نہیں ہوگی، بشرطیکہ شوہر کے حق میں کوئی رکاوٹ نہ ہو۔

۵۔ عورت کو کسب معاش کے لئے گھر سے باہر جانے کے لئے ولی یا شوہر سے اجازت لینا ضروری ہوگا، البتہ مسافت سفر کے بقدر دوری کے لئے تنہا سفر کرنا جائز نہیں ہوگا۔

۶۔ خواتین کی ملازمت کے سلسلہ میں شرعی حدود یہ ہیں:

وقت کی پابندی، سادہ لباس، پردہ کی رعایت، بلاضرورت مردوں سے گفتگو اور ربط ضبط سے اجتناب، مرد ساتھیوں کے ساتھ کھانے پینے سے گریز، فرمائش پر نعت یا گانا گانے سے پرہیز، نماز کا اہتمام، باہر کی بات شوہر سے نہ چھپانا وغیرہ۔

۷۔ جس ادارہ میں خواتین ہی کام کرتی ہوں، البتہ ادارہ کے ذمہ دار مرد ہوں، وہاں خواتین کو برقعہ پہنے رہنا چاہئے، البتہ نقاب اتارنے کی گنجائش ہے۔

۸۔ اگر عورت ایسی جگہ کام کرتی ہو جہاں مرد کارکن بھی ہوں، تو ضرورتاً عورت کو چہرہ اور ہتھیلی کھولنے کی اجازت ہوگی، پردہ کے باب میں بوڑھی اور جوان عورت میں فرق کیا گیا ہے، لیکن بڑھاپے کی عمر تک پہنچنے پر ریٹائرڈ کر دیا جاتا ہے۔

۹۔ جس ملازمت میں مردوں کا سامنا کم سے کم ہو، ایسی ملازمت کو ترجیح دینا ضروری ہوگا۔

۱۰۔ ملازمت کی غرض سے عورت کا اپنے گھر اور اپنوں سے دور خواہ اندرون ملک ہو یا بیرون ملک مستقل قیام کرنا جائز نہیں ہوگا۔

☆☆☆

خواتین کی ملازمت

مولانا محمد ارشد فہیم مدنی [۱]

۱۔ خواتین کی ملازمت اور کسب معاش سے متعلق اسلام کا جو نظریہ ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ مختلف معاشرتی مفادات کی رعایت کے پیش نظر ان کو اسلام میں مملکت کی سربراہی کا حق نہیں دیا گیا ہے۔ حکومت کی سربراہی کے علاوہ اس درجہ کے دوسرے اہم مناصب کا بوجھ بھی ان پر نہیں ڈالا جاسکتا۔ کیونکہ معاشرہ میں ان کی دوسری ذمہ داریوں پر اس کا گہرا اثر پڑے گا۔ اور اسی طرح اخلاق وآداب کے اصول بھی متاثر ہوں گے۔

لیکن مذکورہ اہم اور محنت طلب مناصب کے علاوہ دوسرے تمام کام اور ملازمت کا حق عورتوں کو حاصل ہے۔ بشرط کہ عام اسلامی احکام واخلاق کے دائرہ میں رہ کر خواتین اپنی ذمہ داریاں ادا کرسکیں۔

اسلام نے خواتین کے ہاتھوں انجام پانے والے جملہ معاملات اور تجارتی لین دین کو صحیح اور جائز قرار دیا ہے، اور اس سلسلہ میں ان پر یہ پابندی عائد کی ہے کہ وہ اپنے ولی یا شوہر کی اجازت سے ان امور کو انجام دیں۔

اسلام نے یہ وضاحت بھی کی ہے کہ اگر کسی عورت کا شوہر، رشتہ دار یا کوئی اور شخص کفیل نہ ہو، اور بیت المال بھی اسے مدد نہ دے رہا ہو تو ایسی صورت میں وہ اپنی معاشی ضرورت کے لئے کام کاج کرسکتی ہے، حتی کہ اگر باپ کی موجودگی میں اس کی رضامندی سے بیٹی کسی دست کاری سے پیسے کما رہی ہو تو باپ اس پر خرچ کرنے کی ذمہ داری سے مستثنی قرار دیا جائے گا۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ ضرورت کے وقت عورت کے لئے کام کی اجازت پر علماء اسلام کا اتفاق ہے، بشرط کہ اسلامی اخلاق وآداب کو کوئی ٹھیس نہ پہنچے۔

۲۔ اسلامی شریعت نے خواتین پر نان ونفقہ کی ذمہ داری نہیں ڈالی ہے، خواہ اپنا نفقہ ہو یا بچوں وغیرہ کا۔ بلکہ اسلام نے گھریلو اخراجات، اولاد کی تربیت اور دوسری ذمہ داریوں کا بوجھ بیوی کی بجائے شوہر پر ڈالا ہے۔ بیوی اس سلسلہ میں اگر کوئی تعاون کرتی ہے۔ تو یہ اس کا حسن سلوک اور نیکی ہے۔ رسول کریم ﷺ نے فرمایا: "من استطاع منکم الباءۃ فلیتزوج" (جس شخص کے پاس مکان اور اخراجات پورے کرنے کی طاقت ہے، وہ شادی کرے) (بخاری ۱۴۰۰)۔

دوسری حدیث میں فاطمہ بنت قیس رضی اللہ عنہا کو بعد از عدت جنہوں نے پیغام نکاح بھیجے ان میں معاویہ رضی اللہ عنہ بھی تھے تو آپ ﷺ نے فرمایا: "أما معاویۃ فصعلوك لا مال له" (معاویہ تو خالی ہاتھ ہے، اس کے پاس کوئی مال نہیں) (مسلم ۱۴۸۰)، اس وجہ سے ان سے نکاح نہیں کیا، اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما سے ان کا نکاح کردیا، ایک روایت میں ہے کہ ابوسفیان کی بیوی نے رسول کریم ﷺ سے شکایت کی کہ ابوسفیان مجھے اتنا خرچ نہیں دیتا کہ میرا اور میرے بچوں کا گزارہ ہوسکے۔ تو آپ نے فرمایا: تو اپنا حق اس کے مال سے لے سکتی ہے۔ خود لے لیا کرو (بخاری ۳۸۲۵)۔

مذکورہ احادیث سے یہ بات واضح ہوگئی کہ اسلامی شریعت نے خواتین پر نان ونفقہ کی ذمہ داری نہیں ڈالی ہے، خواہ اپنا نفقہ ہو یا بچوں وغیرہ کا۔

۳۔ اگر عورتوں کے ساتھ کوئی اقتصادی مجبوری نہ ہو، اور عورتوں کے اخراجات برداشت کرنے والا کوئی مرد موجود ہو، تو محض معیار زندگی کو بلند کرنے یا وقت گذاری اور سرمایہ واثاثہ پیدا کرنے کی غرض سے عورتوں کے لئے معاشی جدوجہد اختیار کرنا اسلام کی نگاہ میں صحیح نہیں ہے۔

اسلام کے اس نقطۂ نظر کا معاشرہ پر لازمی اثر یہ ہوتا ہے کہ خانگی امور میں نظم وضبط برقرار رہتا ہے، اولاد کی باقاعدہ تربیت ونگرانی ہوتی ہے، زندگی کے مسائل کو حل کرنے میں مرد کو تعاون ملتا ہے، اور غلط کار مردوں کو یہ موقع حاصل نہیں ہوتا کہ وہ عورتوں کو بداخلاقی وبے حیائی کی جانب مائل کرسکیں، اس طرح معاشرہ یقینی طور پر صاف ستھرا اور قابل تقلید بن جاتا ہے، اور اس کے افراد ذہنی سکون وآرام سے بہرہ ور ہوتے ہیں۔

---

[۱] نائب رئیس جامعہ امام ابن تیمیہ، مدینۃ السلام، بہار، ومدیر اعلی ماہنامہ مجلہ طوبی۔

اسلام کے اس نظریہ کے خلاف اگر محض معیار زندگی کو بلند کرنے یا وقت گذاری اور سرمایہ واثاثہ پیدا کرنے کی غرض سے عورتوں کے لئے معاشی جدوجہد کی اجازت دے دی جائے تو درج ذیل حقائق کو فراموش کرنا ہوگا:

(الف) ملازمت کے میدان میں عورتوں کی شرکت سے مردوں کے اندر بے روزگاری کی عام شکایت ہے، اور اس سے اقتصادی حالت پر یقینا برا اثر پڑتا ہے۔

(ب) معیار زندگی کو بلند کرنے یا سرمایہ واثاثہ پیدا کرنے کی غرض سے عورتوں کے معاشی جدوجہد اختیار کرنے سے مادی فائدہ یقینا ہوگا، مگر اس کی بناء پر اس معنوی معاشرتی خسارہ کو نظر انداز کردینا بالکل غلط ہوگا، جو عورت کے گھر چھوڑنے سے خاندان اور اولاد کو لاحق ہوتا ہے۔ کیا یہ خسارہ نفع سے زیادہ مضر ثابت نہیں ہوگا؟

(ج) خانگی امور کی انجام دہی اور اولاد کی تربیت ونگرانی کے بعد عورت کے پاس اتنا وقت ہی نہیں بچ سکتا ہے کہ وہ بیکاری میں مبتلا رہے کہ اس کو وقت گذاری کی ضرورت پڑے۔ اولاد کی تربیت کے کام کو جو لوگ آسان سمجھتے ہیں، وہ حقیقت میں اس کی اہمیت سے ناواقف ہیں۔

۴۔ واضح رہے کہ مذہب اسلام نے عورت کے لئے زندگی کے ہر مرحلہ میں کفالت وحفاظت کا ایک ذمہ دار مقرر کیا ہے، شادی سے پہلے باپ، شادی کے بعد شوہر اور شوہر کے بعد اولاد اس کی کفالت کی ذمہ دار ہے۔ شوہر یا اولاد سے محرومی کے بعد بھی اسلام نے عورت کی کفالت اور باعزت زندگی کا انتظام کیا ہے، اور اس کے والدین، بھائی وغیرہ پر اس کی کفالت کی ذمہ داری ڈالی ہے، لہذا خواتین کے لئے کسب معاش کی کوئی بھی صورت اختیار کرنے میں، چاہے وہ اندرون خانہ ہی اپنی معاشی سرگرمیوں کو محدود رکھیں اپنے ولی یا شوہر سے اجازت لینا ضروری ہوگا۔

۵۔ علماء اسلام نے کتاب وسنت کی روشنی میں عورتوں کے گھر سے باہر نکلنے کے کچھ آداب وشرائط متعین کئے ہیں۔ ان ہی آداب وشرائط میں سے یہ بھی ہے کہ عورت کو گھر سے باہر نکلنے کے لئے ولی یا شوہر کی اجازت ضروری ہے۔ اگر ان کی اجازت نہ ہو تو پھر عورت کا گھر سے نکلنا چاہے کسب معاش کے لئے ہو یا کسی اور غرض سے جائز نہیں۔ امام بیہقی کی ایک روایت میں صراحت کے ساتھ ذکر ہے کہ اگر عورت شوہر کی اجازت کے بغیر باہر نکلتی ہے تو فرشتے اس پر لعنت بھیجتے ہیں (بیہقی ۷: ۲۹۲)۔

بخاری شریف کی ایک حدیث میں ہے کہ، عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا بیان ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا کہ جب عورت تم سے مسجد جانے کی اجازت مانگے تو اسے نہ روکو۔ (بخاری مع الفتح: ۹ / ۳۴۷)۔ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ نماز کے لئے نکلنے میں بھی عورت کو شوہر سے پوچھنا چاہئے، لہذا دوسرے کاموں کے لئے پوچھنا اور زیادہ ضروری ہوا۔

شیخ الاسلام علامہ امام ابن تیمیہ نے لکھا ہے کہ عورت بغیر اجازت شوہر کے گھر سے باہر نکلے گی، تو اللہ اور رسول کی نافرمانی تصور کی جائے گی اور سزا کی مستحق ہوگی (فتاوی ابن تیمیہ: ۳۲ / ۲۸۱)۔

اسلامی شریعت کے جن دلائل سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ خواتین کا ولی یا شوہر کی اجازت کے بغیر گھر سے نکلنا درست نہیں ہے۔ انہیں دلائل سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ اس سلسلہ میں دور ونزدیک اور رات ودن کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے۔ البتہ ولی اگر کسی خاتون کی کفالت نہ کرتا ہو (جو اس کی شرعی ذمہ داری ہے، اور یہ مسئلہ کسی بھی طرح سے حل بھی نہ ہو پاتا ہو) تو ایسی صورت میں اس خاتون کا ولی کی اجازت کے بغیر گھر سے نکلنا درست ہوگا۔ مگر شرعی حدود وقیود کی پابندی اس پر ضروری ہوگی۔

۶۔ عورت کو باہر ملازمت یا کام کاج کرنے میں جن حدود وقیود اور آداب وشرائط کو بنیادی طور پر ملحوظ رکھنا ضروری ہے، ان کی مختصر تفصیل درج ذیل ہے:

(الف)۔ جو کام اختیار کیا جائے وہ ایسا نہ ہو کہ اس سے عورت کی ان گھریلو ذمہ داریوں پر اثر پڑے جو ایک ماں یا خانگی امور کی نگراں کی حیثیت سے اس پر عائد ہوتی ہیں۔

(ب)۔ مردوں کے ساتھ اختلاط نہ ہو، اور جسم کے جن حصوں کا پردہ ضروری ہے، انہیں کھولنے کی نوبت نہ آئے۔

(ج)۔ کام کی ذمہ داریوں کو ادا کرنے کے دوران عورت کو ایک یا چند ملازمین کے ساتھ کسی کمرہ میں تنہا نہ رہنا پڑے، کیونکہ شریعت کی نظر میں ایسی تنہائی انتہائی خطرناک ہے۔

(د)۔ عورت مردوں کے سامنے اپنی زینت وآراستگی کا اظہار نہ کرے، بناوٹ کے انداز سے بات نہ کرے اور ایسا طریقہ نہ اختیار کرے جس سے شک وشبہ پیدا ہو۔

(ھ)۔ اخلاق وآداب کے تحفظ کے لئے اسلام نے جو عام اصول مقرر کئے ہیں، ان کی پابندی کی جائے۔

(و)۔ عورتوں پر ملازمت یا کام کاج کا بوجھ ڈالتے ہوئے ان کی ذہنی وجسمانی صلاحیتوں کو بھی ملحوظ رکھا جائے۔ بلا تفریق ہر طرح کے مشکل وآسان کام میں عورتوں کو لگا دینا ان کی اور خود معاشرہ کی مصلحت کے خلاف ہے، بہت سے کام ایسے ہیں، جنہیں عورتیں مردوں کے مقابلہ میں زیادہ بہتر طور پر انجام دے سکتی ہیں، مثلاً عورتوں اور بچوں کا علاج وتیمارداری، بچوں اور بچیوں کی ابتدائی وثانوی تعلیم اور سماجی خدمات کے مختلف شعبے، عورتوں کو اگر ان شعبوں میں ملازمت دی جائے تو یقیناً وہ مردوں سے بہتر خدمت انجام دے سکتی ہیں، اور ان کی صلاحیتوں سے ملک وقوم کو اہم فائدے پہنچ سکتے ہیں۔

۷۔ ملازمت کرنے والی خواتین اگر ایسے اداروں میں کام کریں (خواہ تعلیمی ادارے ہوں یا دوسرے) جہاں خواتین ہی خدمت انجام دیتی ہوں اور کام کی جگہوں میں مرد نہ ہوتے ہوں، تو اس سے بہتر عورتوں کے لئے کام کرنے کی جگہ اور ہو ہی نہیں سکتی۔ اور ایسی جگہ عورتوں کے اوپر پردہ لازم نہیں ہے۔ ہاں البتہ ان اداروں کے ذمہ دار مرد ہوں تو اگر ان سے مواجہہ ہو یا کسی ضرورت کے تحت ان سے کوئی بات کرنی ہو یا ان کے پاس آنا ہو تو عام اجنبی مردوں کی موجودگی میں جس طرح کا پردہ مطلوب ہے، اسی ڈھنگ سے ان کے پاس بھی پردہ کرنا ضروری ہوگا۔

۸۔ اگر عورت ایسی جگہ کام کرے جہاں مرد کارکن بھی ہوں تو واضح رہے کہ ایسی جگہ عورتوں کا کام کرنا صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ ایسی صورت میں اختلاط مرد وزن ہوگا اور یہ ایسا عظیم فتنہ ہے، جس سے بچنا اور پرہیز کرنا واجب ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اجنبیہ کے ساتھ خلوت وتنہائی اختیار کرنے سے مطلق منع فرمایا ہے اور علت یہ بیان فرمائی ہے "إن ثالثهما الشيطان" (یقیناً ان دونوں کا تیسرا شیطان ہے)۔ نیز رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث ہے: ''ما تركت بعدي فتنة أضر على الرجال من النساء وأن فتنة بني اسرائيل كانت في النساء'' (میں نے اپنے بعد کوئی ایسا فتنہ نہیں چھوڑا جو مردوں پر عورتوں کے فتنہ سے زیادہ سنگین ہو۔ یقیناً بنی اسرائیل کا (پہلا) فتنہ عورتوں کے معاملہ میں رونما ہوا تھا) لہذا ذریعہ فساد کو ختم کرنے، گناہ کے دروازہ کو بند کرنے، اسباب شر کو مٹانے اور شیطان کے مکروفریب سے مرد وزن کو محفوظ رکھنے کی خاطر یہ ضروری ہے کہ فتنہ کے مواقع اور اسباب سے بہرحال خواتین کو دور رکھا جائے۔

مذکورہ تصریحات کی روشنی میں یہ بات واضح ہوگئی کہ مرد وزن کی اختلاط کی جگہوں میں خواتین کی ملازمت ہی از روئے شرع درست نہیں۔ لہذا پردہ کی حدود کی تعیین پر گفتگو کی ضرورت نہیں۔ جہاں تک سن رسیدہ خواتین اور جوان عورتوں کے درمیان فرق کا سوال ہے، تو واضح رہے کہ اسلام کے مزاج میں دونوں کے مابین کوئی فرق نہیں ہے۔ اور فتنہ کے سدباب کے لئے بھی دونوں کے درمیان فرق کرنا درست نہیں۔

۹۔ اس کا تو فرق ہو سکتا ہے کہ ایک کام کی انجام دہی میں عورت کا سامنا مردوں سے بہت زیادہ اور دوسرے کام کی انجام دہی میں کم ہو۔ مگر اسلامی شریعت میں مردوں کے عام اختلاط سے منع کیا گیا ہے۔ لہذا کم سامنا ہو یا زیادہ دونوں صورتوں میں ایسی جگہوں میں عورتوں کا کام کرنا صحیح نہیں ہے۔

۱۰۔ ملازمت کی غرض سے عورت کا اپنے گھر اور اپنوں سے دور (خواہ اندرون ملک ہو یا بیرون ملک) مستقل قیام کی شریعت میں اجازت موجود نہیں ہے، لہذا ایسا کرنا اسلامی شریعت کی نگاہ میں جائز نہیں۔ اسلام نے عورت کو بغیر محرم کے سفر کرنے کی ممانعت فرمائی ہے اور عورت کا اپنے گھر اور اپنوں سے دور قیام کرنا سفر کرنے سے بھی زیادہ خطرناک ہے۔ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث ہے، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "لا تسافر المرأة ثلاثة أيام إلا ومعها ذو محرم" (عورت تین دن کا سفر نہ کرے مگر جب کہ اس کے ساتھ کوئی محرم ہو)۔

اور ابو سعید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عورت کو شوہر یا محرم کے بغیر دو دن یا دو رات کی مسافت طے کرنے سے منع فرمایا۔

اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں: ''لا يحل لإمرأة تسافر مسيرة يوم وليلة إلا مع ذي محرم عليها'' (متفق علیہ) (کسی عورت کے لئے حلال نہیں ہے کہ ایک دن اور ایک رات کی مسافت کا سفر کرے مگر ایسے شخص کے ساتھ جو اس پر حرام ہو)۔

مذکورہ احادیث کی روشنی میں کسی عورت کا گھر یا اپنوں سے دور قیام کرنا خواہ اندرون ملک ہو یا بیرون ملک بلا محرم کے سفر کرنے سے زیادہ خطرناک ہے۔ لہذا ایسا کرنا خواتین کے لئے از روئے شرع درست نہیں۔

☆☆☆

خواتین کی ملازمت

مولانا اقبال احمد قاسمی کانپوری[1]

عورتوں کے تلاش معاش کے سلسلہ میں اسلام کا نظریہ بالکل واضح ہے وہ یہ کہ عام حالات میں خواتین کسب معاش سے بالکل فارغ البال ہیں، مرد وعورت کے مابین تخلیقی اور فطری اعتبار سے جسمانی فرق کو ملحوظ رکھتے ہوئے اسلام نے معاش کی ذمہ داریاں عورت کے سر نہیں ڈالی ہیں، اور یہ حقیقت ہے کہ مرد وعورت کے درمیان طبعی ونفسیاتی فرق موجود ہے چنانچہ عورتوں کی تمام قوتیں (جس میں قوت عمل بھی ہے اور دماغی صلاحیت بھی) مرد کے مقابلہ میں کم تر ہوتی ہیں، صرف علماء شریعت کے نزدیک ہی نہیں بلکہ اہل سائنس اور طبعیات کے ماہرین کے نزدیک بھی۔

کسب معاش کی مختلف شکلیں ہیں جن کے پیش نظر عورت سرمایہ جمع کرنے کے لئے شوہر یا ولی کی اجازت سے وہ صورتیں اختیار کرسکتی ہے جن میں گھریلو مصروفیات کے ساتھ اندرون خانہ رہ کر ہی معاشی ترقی کے مواقع ممکن ہوں اور اگر یہ صورت ممکن نہ ہو تو باہر نکل کر معاش کا حصول بدرجہ مجبوری بوقت حاجت جائز اور بلاضرورت جائز نہیں۔

البتہ ایسی معاشی شکلیں جن میں قباحتیں نہ ہوں عورت بلا اجازت بھی اختیار کرسکتی ہے، جیسا کہ "اما الذی لا ضرر فیه فلا وجه لمنعها" دلالت کرتا ہے۔

اگر عورت کے لئے کسب معاش کی کوئی صورت اندرون خانہ رہ کر نہ بن سکے اور شوہر یا ولی سے اخراجات کا مسئلہ حل نہ ہو اور وہ اس کو باہر نکلنے کی اجازت دے دیں یا مثلاً اس کی کفالت کرنے والا کوئی نہ ہو اور حصول معاش کے لئے نکلنا ناگزیر ہو تو وہ ایک دن اور رات کی مسافت (سولہ میل) سے کم فاصلہ پر رہتے ہوئے کوئی جائز کام کے لئے پردہ وغیرہ کی رعایت کے ساتھ بلا محرم کے بھی جاسکتی ہے، لیکن محض معاشی ترقی کے لئے ان حدود کے باوجود بیرون خانہ معاش کے لئے نکلنا کراہت سے خالی نہیں۔

باقی ضرورت کے تحت باہر نکل کر معاش کے حصول کی اجازت خیر القرون کے واقعات سے بھی ملتی ہے، مثلاً حضرت جابر بن عبد اللہ کہتے ہیں کہ میری خالہ کو ان کے شوہر نے طلاق دے دی انہوں نے عدت کے زمانہ میں ہی اپنے کھجور کے چند پیڑ کاٹ کر فروخت کرنے کا ارادہ کیا تو ایک صاحب نے سختی سے منع کیا کہ اس مدت میں گھر سے نکلنا جائز نہیں یہ حضور ﷺ کی خدمت میں استفسار کے لئے گئیں تو آپ ﷺ نے فرمایا:

''اخرجی فجدی نخلك لعلك أن تصدقی منه أو تفعلی خیرا'' (ابوداؤد باب فی المبتوتة تخرج بالنهار)۔

(کھیت جاؤ اور اپنے کھجور کے درخت کاٹو اور فروخت کرو اس رقم سے شاید صدقہ وخیرات کرسکو یا اور کوئی بھلائی کا کام کرسکتی ہو)۔

اس سے معلوم ہوا کہ دور اول کی خواتین ضرورت پڑ بازار اور کھیت وغیرہ آیا جایا کرتی تھیں اس کی تائید حضرت عائشہ ؓ کے بیان کردہ ایک واقعہ سے بھی ہوتی ہے، فرماتی ہیں کہ حضرت عمر نے حضرت سودہ ؓ کو باہر دیکھ کر تنقید کی تو وہ خاموشی سے گھر واپس چلی آئیں اور حضور ﷺ سے اس کا تذکرہ کیا پھر اس کے بعد آپ ﷺ پر نزول وحی کی سی کیفیت طاری ہوگئی جب یہ کیفیت ختم ہوئی تو آپ ﷺ نے فرمایا:

''انه اذن لکن أن تخرجن لحاجتکن'' (بخاری، مسند احمد ۶۰۵۶، باب قوله لا تدخلوا بیوت النبی)۔

(بے شک اللہ تعالیٰ نے تمہیں اپنی ضروریات کے لئے گھر سے باہر نکلنے کی اجازت دی ہے)۔

---

[1] صدر مدرس ومفتی مدرسہ اسلامیہ عربیہ مظہر العلوم، بیکن گنج کانپور۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی بیوی صنعت وحرفت سے واقف تھیں، اس کے ذریعہ اپنے اور اپنے خاوند اور بچوں کے اخراجات بھی پورے کرتی تھیں ایک دن حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوکر عرض کیا:

''إنی امرأة ذات صنعة ابیع منها ولیس لی ولا لزوجی ولا لولدی شئ'' (طبقات ابن سعد ۸،۲۱۲)۔

(میں ایک کاریگر ہنر مند عورت ہوں، چیزیں تیار کر کے فروخت کرتی ہوں میرے شوہر اور بچوں کے پاس تو کچھ نہیں ہے (میں خرچ پورا کرتی ہوں)۔ آپ ﷺ نے ان کی ہمت افزائی کرتے ہوئے فرمایا: ہاں تم کو اس کا اجر ملے گا۔

یہاں یہ مسئلہ بھی قابل ذکر ہے کہ اگر شوہر کی اجازت سے عورت معاش میں لگی ہے تو وہ بدستور شوہر سے نفقہ پانے کی مستحق رہے گی، اور جو عورت شوہر یا ولی کی اجازت کے بغیر دن ورات حصول معاش میں مشغول رہتی ہو یا دن کو مشغول رہ کر رات کو چلی آتی ہو، یا اس کے برعکس ہو ایسی بیوی کا نفقہ شوہر پر واجب نہیں ہے۔

''ولو سلمت نفسها باللیل دون النهار أو عکسه فلا نفقة لنقض التسلیم'' (درمختار. شامی باب النفقه ۲،۸۹۱)۔

(اگر عورت شوہر کے سپرد رات میں رہے دن میں نہ رہے یا اس کے برعکس تو وہ نفقہ کی مستحق نہیں، کیونکہ اس نے اپنے کو مکمل حوالہ نہیں کیا)۔

جہاں تک بیرون خانہ معاش کے لئے اجازت کی ضرورت کی بات ہے تو اس کے متعلق حدیث وفقہ کی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ شوہر یا ولی کی موجودگی میں جبکہ وہ کفالت اور واجبی خرچ پورا کر رہا ہو ان کی اجازت کے بغیر معاش کے لئے نکلنے کی اجازت نہیں ہے۔

ضرورت کے تحت حصول معاش کے لئے گھر سے باہر نکلنے میں اس کا بھی لحاظ رکھنا ضروری ہوگا کہ اگر عورت گھر سے اتنی دوری پر جارہی ہے جو تین یوم اور تین رات کی مسافت کے بقدر (۴۸ میل) ہے یا ایک روایت کے مطابق صرف ایک دن ورات کی مسافت کا سفر ہے (سولہ میل) تو بلا محرم کے نہ جائے اس سے کم کی مسافت پر آمدورفت میں محرم کی حاجت نہیں اگر چہ مطلق سفر کے لئے بھی احتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ بغیر شوہر یا محرم کے نہ جائے۔

''عن ابی هریرةؓ قال قال النبی ﷺ لا یحل لامرأة تؤمن بالله والیوم الآخر أن تسافر مسیرة یوم ولیلة لیس معها حرمة'' (رواه البخاری ۱،۱۴۸)۔ (حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ حضور اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ کسی بھی عورت کے لئے جو اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتی ہو یہ حلال نہیں ہے کہ وہ محرم کے بغیر ایک دن ایک رات کی مسافت کا سفر کرے)۔

علامہ شامیؒ نے کتاب الحج میں البحر الرائق سے نقل کرتے ہوئے تین دن تین رات سے کم کی مسافت میں کسی حاجت کے درپیش ہونے پر بغیر محرم کے چلے جانے کی اجازت دی ہے لیکن ساتھ ہی امام ابوحنیفہؒ اور امام ابو یوسفؒ کا مسلک لکھا ہے کہ وہ ایک دن کی مسافت کے لئے بھی بغیر محرم یا شوہر کے سفر میں نکلنے کو مکروہ قرار دیتے تھے اس کے بعد لکھتے ہیں:

''وینبغی أن یکون الفتوی علیه لفساد الزمان'' (شرح اللباب)۔

(اور چاہئے کہ فتوی اسی پر دیا جائے (کہ بلا محرم یا شوہر کے ایک دن کا سفر بھی جائز نہیں) کیونکہ زمانہ خراب ہے یعنی زمانہ کے لوگ بگڑ گئے ہیں)۔

جہاں تک مسئلہ حصول معاش کے سلسلہ میں دن ورات کے فرق کا ہے اس سلسلہ میں عورت کے لئے عورت ہونے کی بنا پر اپنی معاشی ضرورت دن کے اندر نکل کر ہی پوری کرنے کی اجازت دی جاسکتی ہے جیسا کہ معتدہ الوفات کے لئے ضرورت پر دن میں ہی معاش ڈھونڈنے کا حکم ہے کسی بھی عورت کے لئے بلا محرم رات کو باہر نکلنا یا ٹھہرنا فتنوں کو دعوت دینا ہے۔

خواتین کی ملازمت کے شرعی حدود:

جس طرح شریعت نے مردوں کو کسب معاش کے سلسلہ میں آزاد نہیں چھوڑا ہے کہ وہ جو چاہیں جیسے چاہیں جہاں چاہیں کماسکیں اسی طرح

عورتوں کے لئے بھی کسب معاش کی اجازت بوقت حاجت ہے مطلقاً نہیں۔

لیکن بعض حالات میں مجبور عورتوں کے لئے ملازمت ہی معاش کا ذریعہ ہوتی ہے مثلاً عورت مطلقہ ہے یا بیوہ ہے اور آمدنی کے سارے راستے اس پر بند ہوں اور وہ نوکری کر کے اپنی اور اپنے بچوں کی کفالت کر سکتی ہے تو اسے چاہئے کہ دوسرے کے سامنے ہاتھ پھیلانے، بوجھ بننے کے بجائے ملازمت اختیار کرے تا کہ وہ تمام رسوائیوں سے محفوظ رہے بعض حالات میں شوہر کی موجودگی میں بھی عورت کو نوکری کرنے کی ضرورت پڑ سکتی ہے، مثلاً شوہر کی آمدنی اخراجات کے لئے ناکافی ہو یا عورت کے بوڑھے ماں باپ ہوں اور چھوٹے چھوٹے بھائی بہن ہوں وغیرہ ان حالات میں اسے کوئی جائز ملازمت اختیار کر لینے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔

حضرت شعیب علیہ السلام جو بوڑھے ہو چکے تھے ان کی بیٹیاں گھر سے باہر جا کر پانی بھرنے اور دوسرے کام کی ذمہ داریاں انجام دیتی تھیں، قرآن میں اس کا ذکر ہے۔ ''قالتا لا نسقی حتی یصدر الرعاء وابونا شیخ کبیر'' (القصص ۲۳)۔ (دونوں بیٹیاں بولیں ہم اپنے جانوروں کو باقی چرواہوں کے جانے کے بعد سیراب کر سکیں گے، اور ہمارے باپ بہت بوڑھے ہیں)۔

بعض شعبے ایسے بھی ہیں کہ ان میں خواتین ملازمہ ہونا بھی ضروری ہے مثلاً بیمار عورتوں کے معالجہ کے لئے لیڈی ڈاکٹرس کا ہونا، مسلم لڑکیوں کی تعلیم وتربیت کے لئے معلمات کا ہونا وغیرہ۔

خواتین کے درمیان رہ کر ملازمت کی صورت:

جن اداروں میں صرف خواتین ہی ملازم ہوں اور مردوں سے اختلاط بھی نہ ہو اگر چہ اس ادارہ کا ذمہ دار مرد ہو تاہم ایسے ادارہ میں اگر عورتیں باپردہ ہو کر آئیں اور عورتوں کے درمیان اپنی ڈیوٹی انجام دے کر باپردہ چلی جائیں اور ادارہ کے ذمہ دار کے ساتھ خلوت میں سامنا نہ ہو تو ایسی صورت میں عورت کے لئے یہ ملازمت ولی یا شوہر کی اجازت سے یا مجبوری میں اختیار کرنا جائز ہے اور بلاضرورت محض مادی ترقی یا شوقیہ نوکری کے لئے ملازمت کرنا درست نہ ہوگا۔

اگر ادارہ کا مالک مرد ہونے کی وجہ سے اس کے ساتھ اختلاط یا خلوت کی نوبت آتی ہو یا اس سے اطمینان نہ ہو تو پھر ایسے ادارہ کی ملازمت قبول کرنا جائز نہ ہوگا، یہ ادارہ کی ملازمت نہیں بلکہ اس کی شخصی اور فرد کی ملازمت ہوگی جس کی ممانعت ہے اگر چہ ملازمت کی اجرت جائز ہی رہے گی۔

جہاں تک مسئلہ ایسی حالت میں یعنی خواتین کے درمیان ملازمت کرنے میں پردہ کا ہے تو اجنبی مرد جو مالک ہے اس سے تو پردہ کے ساتھ ہی ضروری گفتگو کر سکتی ہے بے پردہ ہونا جائز نہیں۔

جس فیکٹری یا ادارہ میں مرد وعورت کا مخلوط اجتماع رہتا ہو وہاں عورت کا ملازمت میں حصہ لینے میں جو قباحتیں ہیں وہ محتاج بیان نہیں۔

مرد کارکنوں کے ساتھ ملازمت کی ممانعت کا حکم تمام عورتوں کے لئے یکساں نہیں ہے بلکہ جس طرح دیگر مسائل میں جوان اور بوڑھی عورتوں کے مابین فرق ہے مثلاً جوان عورت کے لئے چہرہ کا پردہ لازم ہے جبکہ بوڑھی عورت کے لئے تخفیف ہے، اسی طرح بوڑھی عورت کو سلام کرنے اور اس کا جواب دینے کی اجازت ہے اجنبی جوان عورت کو سلام کرنا منع ہے، اگر کوئی اسے سلام کرے تو دل ہی میں جواب دینے کا حکم ہے، نیز میدان جہاد میں مجاہدین کی مرہم پٹی اور ان کے کھانے پینے کا نظم کرنے کے لئے بوڑھی عورتوں کا نکلنا جائز ہے، جوان عورتوں کا نکلنا جائز نہیں۔

اس لئے مرد کارکنوں کے درمیان جوان خاتون کا ملازم رہنا کسی طرح جائز نہیں تاہم ایسی بوڑھی عورتوں کا وہاں کام کرنا جو مردوں کے لئے کسی بھی طرح کشش کے قابل نہیں ضرورت کی صورت میں اس کی اجازت ہوگی۔

خاتون کا سیلز گرل ہونا یا آفس میں کام کرنا:

تجارت کی دوکان ہو یا کسی محکمہ کا آفس، اگر وہاں بے پردہ ہو کر بیٹھنا پڑتا ہے اور غیر محرم سے باتیں کرنی پڑتی ہیں تو شریعت میں ایسی ملازمت کی

گنجائش نہیں ہے، بے پردگی اور بے حجابانہ گفتگو کی قطعاً اجازت نہیں ہے، لہذا خاتون کا سیلز گرل ہونا یا ایسے آفس میں کام کرنا جس میں مردوں سے گفتگو اور سامنا بار بار کرنا پڑتا ہے تو یہ جائز نہیں ہے، البتہ ایسے آفس میں جہاں کئی خواتین ہوں اور مرد کا گذر کم ہو تو ضرورت پر اس کی اجازت دی جاسکتی ہے۔

کسب معاش کے لئے خواتین کا گھر سے باہر مستقل قیام:

بہت سی مسلمان عورتیں کسب معاش کے لئے یا تعلیم کی غرض سے اندرون ملک کسی دور دراز علاقہ میں یا بیرون ملک تنہا قیام پذیر رہتی ہیں ان کے ساتھ ان کا کوئی محرم نہیں ہوتا، اس طرح کسی عورت خصوصاً جوان خاتون کا باہر تنہا قیام کرنا شرعاً ناجائز اور گناہ کا عمل ہے۔

''قد ثبت فی الحديث قول النبی ﷺ ''يخلون رجل بامرأة إلا كان الشيطان ثالثهما'' فالخلوة عامة فی البيت والسيارة والسوق والمتجر ونحوه وذلك لانهما مع الخلوة لا يومن أن يكون حديثهما فی العورات وما يثيرا الشهوة الخ'' (فتاوی المرأة ۱۱۱) (حدیث سے ثابت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کہ کوئی اجنبی مرد وعورت تنہا نہ ہوں ورنہ شیطان ان دونوں کے بیچ آجائے گا، یہاں خلوت (تنہا ہونا) عام ہے گھر، سواری، بازار، تجارت کی دوکان وغیرہ اور یہ اس واسطے کہ خلوت میں اطمینان نہیں ہوتا کہ کہیں دونوں کی گفتگو شرمناک ہو جائے اور شہوت کو ابھارنے والی ہو وغیرہ)۔

خلاصہ یہ کہ گھر سے اور اپنوں سے دور عورت کا تنہا رہنا خواہ اندرون ملک ہو یا بیرون ملک ہرگز جائز نہیں، البتہ گھر سے دور کسی علاقہ میں یا بیرون ملک کسی عورت نے اپنے محرم یا شوہر کے ساتھ سفر کیا تھا اور وہاں مستقل رہائش پذیر ہوگئی تھی پھر یا تو اس عورت کے محرم کا وہاں انتقال ہوگیا یا کسی وجہ سے وہ محرم وہاں سے سفر کر کے کسی اور جگہ چلا گیا اور وہ عورت وہاں تنہا رہ گئی اس صورت میں اس عورت کے لئے وہاں تنہا قیام کرنے میں کوئی حرج نہیں، بشرطیکہ وہ عورت وہاں رہ کر شرعی پردہ کی پابندی کرے (فقہی مقالات ۱/ ۲۴۹ مفتی محمد تقی عثمانی)۔

☆☆☆

خواتین کی ملازمت

مولانا محمد شوکت ثناء قاسمی [1]

اسلام نے زندگی کی تعمیر کا جو نقشہ تیار کیا ہے اس کا تعلق خواہ عبادات سے ہو یا معاملات سے، خاندانی نظم ہو یا معاشرتی آداب سے یا اقتصادی قوانین وغیرہ سے، اس نے ہر جگہ عورت کی مصروفیت کا احترام کیا ہے اور کسی بھی گوشہ میں عورت کی اس حیثیت کو مجروح ہونے نہیں دیا ہے، تعلیم وتربیت کا میدان ہو، یا فکر وعمل کا ہو، اسلام نے اس کی جدوجہد کو محدود نہیں بلکہ اس کو پرواز عمل کی وسیع تر فضا مہیا کی ہے، زیور تعلیم سے آراستہ ہو کر علم وادب کی راہ میں بھی پیش قدمی کرسکتی ہے، اسی طرح اس کے لئے زراعت، تجارت اور مختلف پیشوں اور صنعتوں سے وابستہ ہونے کی گنجائش ہے، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم، صحابہ کرام کے دور اور اس سے پہلے انبیاء کے دور میں بھی عورتیں بوقت ضرورت گھر سے باہر کام کاج کے لئے نکلا کرتی تھیں، اس سلسلہ میں قرآن کریم میں حضرت موسیٰ اور حضرت شعیب کا واقعہ مذکور ہے (سورۂ قصص: ۲۳، ۲۷، ۲۵)۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کے دور میں بھی عورتوں کے لئے کسب معاش کی گنجائش کی نظیریں ملتی ہیں (تفصیل کے لئے دیکھئے: ابوداؤد، باب فی مبتوتہ تخرج بالنہار، مسلم: باب جواز خروج المعتدۃ البائن، ابن ماجہ، ہل تخرج فی عدتہا، بخاری کتاب الجمعۃ، بخاری کتاب النکاح (۴۸۲۳) باب الغیرۃ)۔

عورت پر نان ونفقہ کی ذمہ داری نہیں ہے:

خاندان کی معاشی، تعلیمی اور تربیتی ذمہ داری اصلاً مرد پر ہے اور خاص طور پر معاشی ذمہ داری اس سے تو عورت کو مکمل طور پر الگ رکھا گیا ہے، شریعت عورت کا معاشی بار شادی سے پہلے سرپرست اور شادی کے بعد شوہر کو اٹھانے پر مجبور کرتی ہے اور مرد کی قوامیت وحاکیت کا ایک سبب عورت کے اس معاشی بار کا اٹھانا بھی ہے۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''الرجال قوامون على النساء بما فضل الله بعضهم على بعض وبما أنفقوا من أموالهم'' (سورۂ نساء: ۳۴)۔ (مرد عورتوں پر قوام ہیں اس فضیلت کی بنا پر جو اللہ نے ان میں ایک کو دوسرے پر عطا کیا ہے اور اس بنا پر کہ وہ ان پر (مہر ونفقہ کی صورت میں) اپنا مال خرچ کرتے ہیں)۔

اسلام نے عورت کو گھر کی ملکہ بنایا ہے اور کسب مال کی ذمہ داری اس کے شوہر پر رکھا ہے اور اس مال سے گھر کا انتظام کرنا اس کا کام ہے، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''المرأة راعية على بيت زوجها وهي مسؤلة'' (بخاری باب قوا انفسکم واهليكم نارا)۔

عورت اپنے شوہر کے گھر کی حکمراں ہے اور وہی اپنی حکومت کے دائرہ میں اپنے عمل کے لئے جوابدہ ہے۔

اس لئے شریعت نے عورت کو ایسے تمام فرائض سے سبکدوش کردیا ہے جو بیرون خانہ کے امور سے تعلق رکھنے والے ہیں اور اس کے لئے نماز، جمعہ، جہاد اور جنازوں میں شرکت بھی ضروری نہیں، نماز باجماعت اور مسجدوں کی حاضری بھی لازم نہیں کی گئی، الحاصل یہ کہ عورت کے لئے گھر سے نکلنے کو ناپسند کیا گیا ہے، اس لئے شریعت اسلامی میں پسندیدہ صورت یہی ہے کہ وہ اپنے گھروں میں رہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی "وقرن فی بیوتکن" کا منشا ہے، یہی وجہ ہے کہ شریعت اسلامی میں خواتین کو کسب معاش کی ترغیب نہیں دی گئی ہے، اور نہ ہی ان کے کسب معاش کو سراہا گیا ہے، کیونکہ اسلامی نظام معاشرت میں عورت کا دائرہ عمل اس کا گھر ہے اور عورت کے گھر کی چہاردیواری اس کے دین واخلاق کی پناہ گاہ ہے اور بیرون خانہ اس کے متاع اخلاق لٹ جانے کا اندیشہ ہے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: "المرأة عورة فإذا خرجت استشرفها الشيطان" (ترمذی کتاب الرضاع)۔

(عورت پوشیدہ رکھی جانے والی مخلوق ہے، جب وہ باہر نکلتی ہے تو شیطان اس کی طرف جھانکتا ہے)۔

---

[1] مفتی واستاذ شعبہ تربیت افتاء، جامعہ عائشہ نسواں، داراب جنگ کالونی، مادنا پیٹ حیدرآباد۔

عورت کا گھر سے بکثرت آمد ورفت یقیناً اس سے فتنے کے راستے کھلیں گے جو عورت کے دین ودنیا دونوں کے لئے نقصان دہ ہوسکتا ہے۔ چنانچہ علامہ ابن الہمام لکھتے ہیں:

''فإن في كثرة الخروج فتح باب الفتنة خصوصا إذا كانت شابة والزوج من ذوي الهيئات'' (فتح القدير ۳.۲۲۵)۔

(کیونکہ گھر سے بہت زیادہ آمد ورفت رکھنا فتنہ کے دروازے کھولتا ہے، خصوصاً اس صورت میں جبکہ وہ جوان ہو اور شوہر بااخلاق اور شریف ہو)۔

ان نصوص سے یہ بات بالکل واضح ہوتی ہے کہ شریعت اسلامی نے عورت کے کسب معاش کو پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھا ہے اور نہ ہی اس کی ترغیب دی ہے۔

۳۔ معیار زندگی کو بلند کرنے کے لئے عورت کے لئے کسب معاش:

عام حالات میں عورتوں کے لئے کسب معاش کی جدوجہد کی گنجائش نہیں ہے، لیکن بدرجہ مجبوری مثلاً عورت کا کوئی ایسا ولی نہ ہو جو اس کے نان ونفقہ کا تحمل کر سکے یا محافظ خاندان مفلس وغریب، بیمار ومعذور ہو یا عورت کا خاندان قلت معاش کا شکار ہو اور ایسی صورت میں عورت باہر کام کرنے پر مجبور ہو جائے تو ایسی تمام صورتوں کے لئے شریعت اسلامی میں گنجائش رکھی گئی ہے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''قد أذن الله لكن أن تخرجن لحوائجكن'' (بخاری: باب خروج النساء لحوائجهن)۔

(اللہ تعالیٰ نے تم کو اجازت دی ہے کہ تم اپنی ضروریات کے لئے گھر سے باہر نکل سکتی ہو)۔

محض معیار زندگی کو بلند کرنے یا وقت گذاری، سرمایہ اور اثاثہ پیدا کرنے کی غرض سے عورتوں کو کسب معاش کی اجازت نہیں دی جانی چاہئے، اس لئے کہ عام حالات میں عورت کا دائرۂ عمل اس کا گھر اور اپنے بچوں کی تعلیم وتربیت اور شوہر کے حقوق کی ادائیگی ہے۔

۴۔ خواتین کے کسب معاش کے لئے شوہر کی اجازت ضروری ہے:

شوہر اپنی بیوی کے نفقہ کا کفیل ہوتا ہے، اس لئے عورت اگرچہ کہ اپنی معاشی سرگرمیاں گھر تک محدود رکھے، لیکن اگر اس کی وجہ سے شوہر کے حقوق کی ادائیگی میں کوتاہی یا بچوں کی پرورش وپرداخت میں کمی، یا اس کے حسن وجمال کے متاثر ہونے کا اندیشہ ہو تو شوہر اس کی محدود معاشی سرگرمیوں پر بھی قدغن لگا سکتا ہے اور شوہر کی اجازت کے بغیر بیوی کے لئے گھر میں بھی معاشی سرگرمیاں جاری رکھنا درست نہیں ہوگا۔

علامہ شامی رقم طراز ہیں: ''له أن يمنعها من الأعمال كلها المقتضية للكسب، لأنها مستغنية عنه لوجوب كفايتها عليه'' (حاشيه ابن عابدين ۵.۲۵۸)۔ (شوہر کو حق ہے کہ بیوی کو ایسے کاموں سے روکے جو کسب معاش کے لئے کئے جاتے ہیں، کیونکہ شوہر پر اس کا نان ونفقہ فرض ہونے کی وجہ سے اس کو کمانے کی ضرورت نہیں ہے)۔

اگر کوئی عورت ان سارے حقوق کی ادائیگی کے ساتھ چہار دیواری میں اپنی معاشی سرگرمیاں جاری رکھے تو اس کی اجازت ہونی چاہئے، کیونکہ اس کی وجہ سے عورت مختلف برائیوں سے محفوظ ہو جاتی ہے، خاص طور سے شیطانی خیالات ووساوس اور پڑوسیوں کے ساتھ غیبت اور غیر ضروری گفتگو سے (حاشیہ ابن عابدین، باب النفقہ)۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی عورتوں کو گھر میں مصروف رکھنے کی ترغیب دی ہے، چنانچہ ارشاد نبوی ہے: ''علموا أبناء كم السباحة والرماية، ونعم لهو المومنة في بيتها المغزل'' (معرفة الصحابة برقم ۱۵۳، فيض القدير ۴.۳۲۲)۔

(اپنے بچوں کو تیراکی اور تیر اندازی سکھاؤ اور مومن عورت کا بہترین کھیل گھر میں سوت کاتنا ہے)۔

کسب معاش کے لئے گھر سے باہر نکلنے پر اجازت کا حکم:

یہ تفصیل گذر چکی ہے کہ عورت کے لئے عام حالات میں کسب معاش کے لئے گھر سے باہر جانے کی اجازت نہیں ہے، کیونکہ اگر عورت شادی شدہ ہے تو اس کا نان ونفقہ اس کے شوہر اور غیر شادی شدہ ہے تو اس کے والدیا ان کے عدم موجودگی میں دیگر ولی شرعی پر واجب ہے اور ضرورت شدیدہ کی وجہ سے عورت کو گھر سے باہر کسب معاش کے لئے نکلنا پڑے تو خواہ یہ گھر سے نکلنا مسافت سفر یا اس سے زیادہ کے لئے ہو یا اس سے کم کے لئے، دن میں ہو یا رات میں بہر صورت ولی یا شوہر کی اجازت ضروری ہے اور کسب معاش کی جگہ اگر اس کے گھر سے مسافت سفر یا اس سے زائد کی دوری پر واقع ہو تو ساتھ میں محرم کا ہونا بھی ضروری ہے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''لا یحل لا مرأة تؤمن باللہ والیوم الآخر أن تسافر سفراً یکون ثلاثة أیام فصاعدا إلا ومعها أبوها وأخوها أو زوجها أو ابنها أو ذو محرم منها'' (مسلم ۲۳۹۰، ترمذی ۱۰۸۹)۔

(کسی عورت کے لئے جو اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتی ہو اس کے لئے جائز نہیں ہے کہ وہ تین دن یا اس سے زیادہ کا سفر کرے بغیر اس کے کہ اس کے ساتھ اس کا باپ، بھائی یا شوہر یا بیٹا کوئی محرم مرد ہو)۔

بعض روایتوں میں صراحت ہے کہ ایک دن رات (جو مسافت کا ایک تہائی اور موجودہ پیائش کے لحاظ سے تقریباً ۲۹ کیلومیٹر ہوتا ہے) کی مسافت بھی بغیر محرم کے طے نہیں کر سکتی ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''لا تسافر المرأة میسرة یوم ولیلة إلا ومعها محرم'' (ترمذی: باب ما جاء فی کراہیة ان تسافر. ابوداؤد: ۱۷۲۵)۔ (عورت ایک دن رات کا سفر نہ کرے جب تک کہ اس کے ساتھ کوئی محرم نہ ہو)۔

ان روایتوں سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ عورت کا بغیر محرم کے گھر سے نکلنا موجب فتنہ ہے، اس لئے اگر کوئی عورت کسب معاش کے لئے اپنے گھر سے مسافت سفر یا اس سے زائد یا رات کے وقت نکل رہی ہے تو ولی یا شوہر کی اجازت کے باوجود محرم کا بھی ساتھ ہونا ضروری ہوگا۔

خواتین کے لئے ملازمت کے سلسلہ میں مندرجہ ذیل شرعی حدود ہیں:

الف۔ عورت کا ذریعہ معاش گناہ و معصیت نہ ہو مثلاً گانا، بجانا اور ناچنا وغیرہ۔ امام محمد نے نوحہ اور گانے بجانے کے ذریعہ حاصل شدہ آمدنی کو معصیت قرار دیا ہے۔

''عن محمد فی امرأة نائحة أو صاحب طبل أو مزمار اکتسب مالا فھو معصیة'' (الموسوعہ فقہیہ ۷،۸۳)۔

ب۔ عورت کی معاشی سرگرمیاں ایسی نہ ہوں جو اس کے خاندان کے لئے باعث شرم ہوں، اسی وجہ سے فقہاء نے ایسی صورت میں اس کے اولیاء کو معاہدے کے ختم کر دینے کا اختیار دیا ہے، علامہ کاسانی لکھتے ہیں:

''وکانت المرأة آجرت نفسها ظئرا وهی ممن تعاب بذلك كان لأهلها أن یخرجوها'' (البدائع: فصل فی انواع شرائط رکن الاجارة)۔

ج۔ عورت کی معاشی سرگرمیوں میں غیر محرم مرد سے خلوت کے مواقع نہ ہوں، اس لئے کہ اجنبی مردوں کے ساتھ خلوت مکروہ تحریمی ہے (حاشیہ ابن عابدین ۹/۴۴۸)۔

اور غیر محرم مردوں کے ساتھ معاشی سرگرمیاں جاری رکھنا باعث فتنہ ہی نہیں بلکہ عزت و عصمت کے لٹ جانے کا بھی خطرہ ہے۔

د۔ عورت کسب معاش کے لئے شرعی پردے میں نکلے ایسی زیب و زینت و بے پردگی جو جذبات کو بھڑکانے والی ہو اس سے قطعی احتراز کرے۔

علامہ شامی لکھتے ہیں: ''وحیث أجنالها الخروج فإنما یباح بشرط عدم الزینة وتغییر الهیئة إلی ما یکون داعیة لنظر الرجال واستمالهم'' (حاشیہ ابن عابدین: باب المهر)۔

(عورت کے لئے باہر نکلنے کی اجازت اس شرط کے ساتھ مشروط ہے کہ وہ زیب و زینت میں نہ ہو بلکہ ہیئت ایسی تبدیل ہو کہ مردوں کے لئے باعث کشش اور میلان کا سبب نہ ہو)۔

ھ۔ ملازمت کی جگہ اگر عورت کو کسی غیر محرم سے بات کرنے کی ضرورت درپیش ہو تو گفتگو میں نزاکت و لطافت اور نرمی کے لہجہ سے اجتناب کرے۔

۷۔ ملازمت کی جگہ اگر صرف خواتین ہی ہوں تو پردے کا حکم:

اگر ملازمت کی جگہ صرف خواتین ہی خدمت انجام دیتی ہوں تو ایسی صورت میں مسلمان عورت کے لئے جائز ہے کہ وہ چہرہ، ہتھیلی اور پیر کھلا رکھ سکتی ہے، اگرچہ کہ عورت کا ستر عورت کے سامنے وہی ہے جو محرم رشتہ دار کے لئے ہے (ناف سے لے کر گھٹنے تک پیٹھ، اور پشت کے چھپانے کے ساتھ) لیکن عام طور سے ملازمت کی جگہ مجہول الحال اور مشتبہ چال چلن والیاں اور آوارہ و بدنام ہر قسم کی عورتیں بھی ہوتی ہیں، اس لئے ان کے

سامنے مواضع زینت کو ظاہر کرنے میں فتنہ ہوسکتا ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ ''ولا یبدین زینتھن إلا لبعولتھن... ونسائھن، الآیة'' کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ''لا یحل للمسلمة أن تراھا یھودیة أو نصرانیة لئلا تصفھا زوجھا'' (احکام القرآن للقرطبی ۱۲،۱۵۵)، (کسی مسلمان عورت کے لئے یہ درست نہیں کہ اس کو کوئی یہودی یا عیسائی عورت (بے پردہ) دیکھے اور اپنے شوہروں سے اس کے حسن و جمال کو بیان کرے)۔

حضرت عمرؓ کے دور میں جب ملک شام فتح ہوا اور وہاں مسلمان آباد ہوگئے اور ان کی خواتین وہاں کی نصرانی اور یہودی عورتوں کے ساتھ بے تکلفانہ ملنے لگیں تو حضرت عمرؓ نے امیر شام حضرت ابوعبیدہ بن الجراح کو لکھا کہ مسلمان عورتوں کو اہل کتاب کی عورتوں کے ساتھ حماموں میں جانے سے منع کردو (تفسیر ابن جریر، سورۂ نور: ۳۱)۔

البتہ بعض علماء نے "أو نسائھن" کو مطلق رکھا ہے، چنانچہ امام رازی لکھتے ہیں: اصل بات یہ ہے کہ لفظ "أو نسائھن" میں تو سبھی عورتیں مسلم اور کافر داخل ہیں اور بعض صالحین سے جو کافر عورتوں سے پردہ کرنے کی روایات منقول ہیں وہ استحباب پر مبنی ہے۔

"نسائھن" سے مراد مسلمان عورت ہو یا مسلم وکافر دونوں، بہرصورت کافر ومشرک اور فاسق و فاجر عورت سے مسلمان عورت کے لئے پردہ کرنا کم از کم مستحب تو ضرور ہوگا۔

۸۔ ملازمت کی جگہ مرد وعورت دونوں کارکن ہوں تو پردے کا حکم:

عورت کا چہرہ اور ہتھیلی پردے کے حکم میں داخل ہے یا نہیں؟ اس میں ائمہ اربعہ کا اختلاف ہے، امام مالک اور امام احمد بن حنبل کے نزدیک پردے کے حکم میں ہے، علامہ ابن عربی لکھتے ہیں: عورت تمام تر قابل ستر ہے، اس کا جسم بھی، صورت بھی، سوائے ضرورت وحاجت کے کھولنا جائز نہیں (احکام القرآن لابن عربی ۱۸۲/۲)۔

شافعیہ کے نزدیک بھی راجح قول کے مطابق چہرہ اور ہتھیلی پردے کے حکم میں داخل ہے (نیل الاوطار ۱۲/۶)۔

حنفیہ کے نزدیک چہرہ، ہتھیلی اور دونوں پاؤں پردے کے حکم میں داخل نہیں ہیں، اجنبی لوگوں کے لئے بھی ان اعضاء کو دیکھنا جائز ہے، بشرطیکہ شہوت نہ ہو، شہوت کی کیفیت کے ساتھ دیکھنا جائز نہیں، بلکہ شہوت موجود نہ ہو لیکن اس کا اندیشہ بھی ہو تو دیکھنا جائز نہیں۔

ہمارے سماج میں فتنہ عام ہوچکا ہے، اس لئے یہ سمجھنا کہ مردوں کی نظریں عورتوں کے چہرہ پر غیر شرعی جذبات سے عاری ہوکر پڑیں گی، ایک خوش خیالی اور خام فکری ہے، اس لئے ائمہ ثلاثہ کی رائے زمانے کے حالات سے زیادہ ہم آہنگ ہے اور فتنہ کے وقت حنفیہ کا بھی یہی نقطہ نظر ہے چنانچہ حنفیہ مکتب کے ترجمان علامہ مرغینانی لکھتے ہیں: ''فإن خاف الشھوة لم ینظر من غیر حاجة'' (ھدایہ: کتاب الکراھیة) (اگر شہوت کا اندیشہ ہو تو بلا ضرورت نہ دیکھے)۔

علامہ حصکفی لکھتے ہیں: اگر شہوت کا خوف یا شک ہو تو عورت کے چہرہ کو دیکھنا ممنوع ہے، پس عورت کو دیکھنے کی حلت شہوت نہ پائے جانے کی صورت کے ساتھ مقید ہے ورنہ تو حرام ہے، یہ حکم تو ان کے زمانہ میں تھا، ہمارے زمانہ میں نوجوان لڑکی کو دیکھنے سے ہم (مطلق) منع کرتے ہیں (درمختار مع الرد ۴۵۱/۹)۔

ان عبارات سے یہ مسئلہ بالکل واضح ہے کہ عام حالات میں جبکہ عورت گھر سے باہر نکلے تو مکمل شرعی حجاب میں ہو، جس میں پورے جسم کے ساتھ چہرہ بھی ڈھکا ہوا ہو اور یہی حکم اس خاتون کے لئے بھی ہوگا جو مرد کارکن کے ساتھ کسی جگہ ملازم ہو، البتہ اگر عورت سن رسیدہ اور مردوں کے لئے پرکشش نہ ہو تو اس کے لئے چہرہ کھولنے کی گنجائش ہوگی۔

خواتین کا ملازمت کی غرض سے اپنے گھر سے دور قیام کا حکم:

عورت کا ملازمت کی غرض سے اپنے گھر اور اپنوں سے دور خواہ اندرون ملک ہو یا بیرون ملک مستقل قیام کی اجازت نہیں ہوگی، کیونکہ عورت کا گھر سے نکلنا موجب فتنہ ہے اور خاص طور پر جب عورت اپنے گھر اور اپنوں سے دور مستقل قیام کرے تو اس صورت میں فتنے کا امکان زیادہ رہتا ہے، آج کل ہاسٹل اور لاج میں مقیم لڑکیوں کی صورت حال اہل علم سے مخفی نہیں۔ ☆☆☆

خواتین کی ملازمت کے شرعی احکام

مولانا محمد ارشد فاروقی[1]

انسان ہونے میں مرد وعورت دونوں مساوی ہیں، دونوں نوع انسانی کے دو مساوی حصے ہیں، تمدن کی تعمیر اور تہذیب کی تاسیس وتشکیل اور انسانیت کی خدمات میں دونوں برابر کے شریک ہیں، دل، دماغ، عقل، جذبات، خواہشات اور بشری ضروریات دونوں رکھتے ہیں تمدن کی صلاح وفلاح کے لئے دونوں کی تہذیب نفس، دماغی تربیت اور عقلی وفکری نشوونما یکساں ضروری ہے تا کہ تمدن کی خدمت میں ہر ایک اپنا پورا پورا حصہ ادا کر سکے اس اعتبار سے مرد وعورت کی مساوات کا دعوی بالکل صحیح ہے اور ہر صالح تمدن کا فرض یہی ہے کہ مردوں کی طرح عورتوں کو بھی اپنی فطری استعداد اور صلاحیت کے مطابق زیادہ سے زیادہ ترقی کرنے کا موقع دے۔

مولانا محمد سالم قاسمی فرماتے ہیں: گویا منصوبہ بند طریقے پر خواتین پر تعلیم کے دروازے بند کر دیئے گئے اور حجاب کی یہ تعبیر کی گئی کہ عورت کو گھر کی کال کوٹھری میں ایسا بند کیا جائے کہ درز سے آنے والی شمسی شعاعوں سے بھی محروم رکھا جائے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بڑے بڑے علماء کی حرم کا مبلغ علم چند قرآنی سورتوں کے حفظ اور دعاؤں کے ورد سے آگے نہ بڑھا اور نصف انسانیت علم کے ثمرات سے محروم رہی اور ملت اسلامیہ ہندیہ کی منصوبہ بندی سے دور رہی (قومی آواز روزنامہ)۔

مولانا موصوف درحقیقت معاشرہ نسواں کے اسلامی نقطۂ اعتدال سے ہٹ جانے کی تصویر پیش کر رہے ہیں، اور وہ چاہتے ہیں کہ خواتین کو وہ حق دیا جائے جو شریعت نے تعلیم وتربیت اور زندگی کے مختلف میدان میں انہیں عطا کیا ہے۔

سائنسی مشاہدات کے خلاف:

البتہ مساوات کا وہ پہلو جس میں مرد وعورت دونوں کا حلقۂ عمل ایک ہی ہو دونوں ایک ہی سے کام کریں، دونوں پر زندگی کے تمام شعبوں کی ذمہ داریاں یکساں عائد کردی جائیں اور نظام تمدن میں دونوں کی حیثیتیں بالکل ایک سی ہوں۔ یہ واقعیت اور سائنس کے مشاہدات وتجربات کے خلاف ہے۔

فطرت کے تقسیم عمل کو ملحوظ رکھتے ہوئے خاندان کی جو تنظیم اور معاشرت میں مرد وعورت کے وظائف کی جو تعیین کی جائے گی اس کے ضروری ارکان لامحالہ حسب ذیل ہوں گے:

۱۔ خاندان کے لئے روزی کمانا، اس کی حمایت وحفاظت کرنا مرد کا کام ہو اور اس کی تعلیم وتربیت ایسی ہو کہ وہ ان اغراض کے لئے زیادہ سے زیادہ مفید بن سکے۔

۲۔ بچوں کی پرورش، خانہ داری کے فرائض اور گھر کی زندگی کو سکون وراحت کی جنت بنانا عورت کا کام ہو اور اس کو بہتر سے بہتر تعلیم وتربیت دے کر انہیں اغراض کے لئے تیار کیا جائے۔

۳۔ تمدن کے نظام میں اس تقسیم اور تربیت وتنظیم کو برقرار رکھنے کے لئے ضروری تحفظات رکھے جائیں (دیکھئے: مولانا ابوالاعلی مودودی کتاب پردہ ص ۱۳۸)۔

تخلیقی نظام:

قرآن کریم کی تعلیمات اور رسول اللہ ﷺ کی تعلیمات سے کسی ادنی شبہ کے بغیر یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ درحقیقت انسانی زندگی دو شعبوں پر منقسم ہے، ایک گھر کے اندر کا شعبہ اور ایک گھر کے باہر کا شعبہ، اور ان دونوں کو ساتھ لئے بغیر ایک متوازن اور معتدل زندگی نہیں گذاری جا سکتی۔

اللہ تعالی نے مرد کے ذمہ گھر کے کام لگائے، مثلاً کسب معاش اور روزی کمانے کا کام سیاسی وسماجی کام اور گھر کے اندر کے کام عورتوں کے حوالہ کیا۔

---

[1] صدر شعبہ دار الافتاء جامعہ امام انور دیوبند۔

مولانا ابوالاعلی مودودی سے ایک سوال ''اسلامی حکومت میں خواتین کا دائرہ عمل'' کے عنوان سے کیا گیا، جس کے جواب میں مولانا نے فرمایا:

اسلامی حکومت دنیا کے کسی معاملہ میں بھی اسلامی اصولوں سے ہٹ کر کوئی کام کرنے کی نہ تو مجاز ہے اور نہ وہ اس کا ارادہ ہی کر سکتی ہے، اگر فی الواقع اس کو چلانے والے ایسے لوگ ہیں جو اسلام کے اصولوں کو سچے دل سے مانتے ہوں اور اس پر عمل کرتے ہوں، عورتوں کے معاملہ میں اسلام کا اصول یہ ہے کہ عورت اور مرد عزت واحترام کے لحاظ سے برابر ہیں، اخلاقی معیار کے لحاظ سے بھی برابر ہیں، آخرت میں اُپنے اجر کے لحاظ سے بھی برابر ہیں، لیکن دونوں کا دائرہ عمل ایک نہیں ہے، سیاست اور ملکی انتظام اور فوجی خدمات اور اسی طرح کے دوسرے کام مرد کے دائرہ عمل سے تعلق رکھتے ہیں، اس دائرے میں عورت کو گھسیٹ لانے کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ یا تو ہماری خانگی زندگی بالکل تباہ ہوجائے گی جس کی بیشتر ذمہ داریاں عورتوں سے تعلق رکھتی ہیں، یا پھر عورتوں پر دہرا بار ڈالا جائے گا کہ وہ اپنی فطری فرائض بھی انجام دیں جن میں مرد قطعاً شریک نہیں ہوسکتا اور پھر مرد کے فرائض کا بھی نصف حصہ اپنے اوپر اٹھائیں، عملاً یہ دوسری صورت ممکن نہیں ہے، لازماً پہلی صورت ہی رونما ہوگی اور مغربی ممالک کا تجربہ بتاتا ہے کہ وہ رونما ہوچکی ہے آنکھیں بند کرکے دوسروں کی حماقتوں کی نقل اتارنا عقل مندی نہیں ہے۔

اسلام اصولاً مخلوط سوسائیٹی کا مخالف ہے اور کوئی ایسا نظام جو خاندان کے استحکام کو اہمیت نہ دیتا ہو اس کو پسند نہیں کرتا کہ عورتوں اور مردوں کی مخلوط سوسائٹی ہو مغربی ممالک میں اس کے بدترین نتائج ظاہر ہوچکے ہیں۔

عورتوں کے لئے قرآنی حکم:

''وقرن فی بیوتکن ولا تبرجن تبرج الجاهلية الأولى'' (اپنے گھروں میں وقار کے ساتھ بیٹھی رہو اور زمانہ جاہلیت کے بناؤ سنگار نہ دکھاتی پھرو)۔

البتہ حکم قرآنی کا منشا یہ نہیں ہے کہ عورتیں گھر کے حدود سے قدم بھی باہر نہ نکالیں، حاجت وضروریات کے لئے ان کو نکلنے کی پوری اجازت ہے مگر یہ اجازت نہ غیر مشروط ہے نہ غیر محدود۔

محافظ خاندان کی مفلسی، قلت معاش، بیماری، معذوری اور ایسے وجوہ سے اگر عورت باہر کام کرنے پر مجبور ہوجائے، تو ایسی تمام صورتوں میں اس کے لئے قانون میں کافی گنجائش رکھی گئی ہے، چنانچہ حدیث میں ہے:

''قد أذن الله لكن أن تخرجن لحوائجكن'' (بخاری باب خروج النساء لحوائجهن، مسلم)۔

(اللہ تعالی نے تم کو اجازت دی ہے کہ تم اپنی ضروریات کے لئے گھر سے نکل سکتی ہو)۔

عورت کا دائرہ عمل:

عورت کو گھر کی ملکہ بنایا گیا ہے، کسب مال کی ذمہ داری اس کے شوہر پر ہے، اور اس مال سے گھر کا انتظام کرنا عورت کا کام ہے ''المرأة راعية على بيت زوجها وهي مسئولة'' (عورت اپنے شوہر کے گھر کی حکمراں ہے اور وہی حکومت کے دائرہ میں اپنے عمل کے لئے جوابدہ ہے) (بخاری)۔

اس کو ایسے تمام فرائض سے سبکدوش کیا گیا ہے جو بیرون خانہ کے امور سے تعلق رکھنے والے ہیں مثلاً:

اس پر نماز جمعہ واجب نہیں (ابوداؤد، باب الجمعۃ للمرأۃ)۔

اس پر جہاد بھی فرض نہیں، اگرچہ بوقت ضرورت وہ مجاہدین کی خدمت کے لئے جاسکتی ہے۔

اس کے لئے جنازوں کی شرکت بھی ضروری نہیں بلکہ اس سے روکا گیا ہے (بخاری باب اتباع النساء الجنائز)۔

اس پر نماز باجماعت اور مسجدوں کی حاضری بھی لازم نہیں کی گئی۔

اسکو محرم کے بغیر سفر کرنے کی بھی اجازت نہیں دی گئی (ترمذی باب ماجاء فی کراہتہ ان تسافر المرأۃ وحدہا، ابوداؤد باب فی المرأۃ تحج بغیر محرم)۔

غرض ہر طریقہ سے عورت کے گھر سے نکلنے کو ناپسند کیا گیا ہے اور اس کے لئے قانون اسلامی میں پسندیدہ صورت یہی ہے کہ وہ گھر میں رہے جیسا کہ آیت ''وقرن بیوتکن'' کا صاف منشا ہے۔

اہم شرعی ہدایات (ابوشقہ):

شیخ ابوعبدالرحمن عبدالحلیم محمد ابوشقہ عہد نبوی میں مسلمان عورتوں کی پیشہ ورانہ کام میں شرکت اور جدید معاشرتی رجحانات کو سامنے رکھتے ہوئے عورتوں کے سلسلہ میں اہم شرعی ہدایات بیان کرتے ہیں جو حسب ذیل ہیں:

۱۔ عورت کو مناسب تعلیم اس طرح دی جائے کہ اسلامی تربیت کے عمومی مقاصد کے ساتھ دو اہم چیزیں حاصل ہو جائیں:

اول عورت کو اس قابل بنا دیا جائے کہ گھر میں بچوں کی اچھی نگہداشت کرے۔

دوم: ضرورت کے وقت پوری مہارت کے ساتھ مناسب ملازمت کر سکے۔

۲۔ عورت کو اپنے پورے وقت کا صحیح استعمال کرنا چاہئے۔

۳۔ شوہر کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنی بیوی پر خرچ کرے، والد بیٹی پر خرچ کرے، شوہر و والد دونوں نہ ہوں اور ترکہ بھی ناپید ہو تو عورت کی ذمہ داری اسلامی بیت المال پر ہے۔

۴۔ مرد کو پورے خاندان پر قوامیت حاصل ہے، بیوی یا بیٹا ملازمت کرنا چاہے تو اجازت لینی چاہئے۔

۵۔ مسلمان خاتون کے لئے مستحب بلکہ واجب ہے کہ وہ جلد شادی کر لے اور یہ مکروہ بسا اوقات حرام ہے کہ عورت ملازمت کی وجہ سے شادی نہ کرے، اگر ملازمت کے باعث شادی کی راہیں آسان ہوتی ہیں تو ملازمت اختیار کر لے۔

۶۔ عورت کو ماں بننے کی خواہش ہوتی ہے ملازمت کو اس سلسلہ میں رکاوٹ نہیں بننا چاہئے۔

۷۔ عورت کی ذمہ داری ہے کہ وہ خوب اچھی طرح سے اپنے گھر والوں اور بچوں کی دیکھ بھال اور نگہبانی کرے ملازمت کے سبب ان ذمہ داریوں کی تکمیل میں کوتاہی نہیں ہونی چاہئے۔

۸۔ دو صورتوں میں عورت کے لئے ملازمت اختیار کرنا واجب ہے: الف۔ والد، شوہر یا حکومت اس کی کفالت سے عاجز ہوں، ب۔ معاشرے کو ایسے کاموں کی ضرورت ہو جن کا شمار فرض کفایہ میں ہوتا ہے جیسے ٹیچنگ، نرسنگ وغیرہ۔

۹۔ گھریلو ذمہ داریوں کو پورا کرتے ہوئے عورت کے لئے ملازمت مندرجہ ذیل مقاصد کے تحت مستحب ہے: الف۔ تنگدست شوہر، باپ یا بھائی کی معاونت، ب۔ مسلم معاشرہ کے کسی بہت بڑے فائدے کی تکمیل کے لئے، ج۔ خیر کی راہوں میں خرچ کرنے کے لئے۔

۱۰۔ عورتوں کو ایسی ملازمتوں سے محفوظ رکھنا چاہئے جو ان کی فطرت اور جسمانی ونفسیاتی خصوصیات کے موافق نہ ہوں۔

۱۱۔ عورت ملازمت کے دوران شرعی حجاب کی پابند رہے، شرعی آداب ملحوظ رکھے (خواتین کی آزادی عہد رسالت میں ۲/ص ۳۴۹۔ ۳۷۲)۔

خواتین کی ملازمت کے سلسلہ میں سوالات کے جوابات:

اگر عورت پریشان کن حالات کی شکار ہو جائے تو بہ قدر ضرورت کسب معاش کر سکتی ہے، یہ شریعت کا وہ مفہوم ہے جسے علماء وفقہاء عام طور پر پیش کرتے ہیں۔

اس کے برخلاف جب ہم نصوص قرآنی اور احادیث نبوی، تاریخ اسلامی کا جائزہ لیتے ہیں تو خواتین کی ملازمت وکسب معاش کے سلسلہ میں شریعت کا دامن اس قدر تنگ و تاریک بھی نہیں ہے۔

قرآن نے کہا: ''للرجال نصیب مما اکتسبوا وللنساء نصیب مما اکتسبن'' (مودودی صاحب ترجمہ کرتے ہیں: مرد جیسا عمل کریں ان کا پھل وہ پائیں گے، اور عورتیں جیسا عمل کریں ان کا پھل وہ پائیں گی)۔

آیت کریمہ میں لفظ ''اکتساب'' سے خواتین کی ملازمت وکسب معاش کی اباحت ثابت ہوتی ہے۔

عورتوں کے لئے بھی کسب معاش مردوں کی طرح مشروع ہے، اسی طرح کسب کے بجائے اکتساب کا لفظ پوری توجہ وانہماک کا مطالبہ کرتا ہے۔

عورت کے لئے ملازمت درست ہے:

خواتین کے لئے کسب معاش صنفی نزاکتوں کی رعایت رکھتے ہوئے اور شرعی ضوابط کی پابندی کرتے ہوئے درست ہے۔

ملازمت واجب ہے:

دوشکلوں میں عورت کے لئے ملازمت اختیار کرنا واجب ہے:

۱۔ والد، شوہر، حکومت یا مسلم معاشرہ اس کی کفالت سے عاجز ہوں۔

۲۔ مسلم معاشرے کو ایسے کاموں کی ضرورت ہو جن کا شمار فرض کفایہ میں ہوتا ہے، جیسے بچیوں کے لئے تدریسی خدمات، اور نرسنگ وغیرہ اور ایسے امراض وعوارض جن کے ازالہ کے لئے خواتین کی ضرورت پڑتی ہو جیسے ولادت وغیرہ کے مسائل تو ان کے علاج ومعالجہ کے لئے مجموعی طور پر خواتین پر ذمہ داری عائد ہوتی ہے اور اس سے عہدہ برآ ہونے کے لئے ملازمت کرنا ضروری ہوجاتا ہے۔

احادیث کے ذخیرے میں خواتین کا اجرت ومعاوضہ پر رضاعت اور گلہ بانی، مریضوں کا علاج، گھریلو صنعت میں کام کرنا پایا جاتا ہے جو کم سے کم جواز پر دلالت کرتا ہے۔

تجویز:

۱۔ ایفا ہندوستانی مسلمانوں کی رہنمائی کرے کہ وہ گرلز میڈیکل کالج قائم کریں تاکہ مسلم خواتین ایم بی بی ایس جیسی ڈگریوں کی حامل ہوکر مسلم خواتین کا علاج خود کرسکیں اور مردوں کی طرف امراض مخصوصہ (حمل ووضع حمل آپریشن) میں رجوع سے مسلم خواتین بچ سکیں۔

۲۔ شریعت نے خواتین پر نان ونفقہ کی ذمہ داری رکھی ہے (خواہ اپنا ہو یا بچوں کا)؟

صاحب ہدایہ نے لکھا ہے: ''وتجب نفقة الإبنة البالغة والإبن الزمن على أبويه اثلاثا على الأب الثلثان وعلى الأم الثلث'' (کتاب الطلاق باب النفقۃ ۲؍۴۴۷ مکتبہ ملت دیوبند)۔

بالغ بیٹی اور بالغ اپاہج بیٹے کے نفقہ کی ذمہ داری والدین پر عائد ہوتی ہے، باپ پر دو ثلث اور ماں پر ایک ثلث۔

فقہاء کے یہاں یہی ایک صورت مصرح ہے جس میں عورت پر بحیثیت ماں نفقہ کی ایک تہائی کی ذمہ داری عائد کی گئی ہے۔

اس کے علاوہ اضطراری صورتوں میں اگر عورت کی کفالت کرنے والا باپ، شوہر مسلم معاشرہ وحکومت کوئی نہ ہو تو کسب معاش کے ذریعہ جان بچانا اپنا تحفظ کرنا اور شیر خوار نابالغ بچوں کی کفالت کی ذمہ داری عورت پر عائد ہوگی۔

۳۔ ان مقاصد کے لئے معاشی جدوجہد شرائط کی پابندی برتنے کے ساتھ درست ومباح ہوگی۔

۴۔ اجازت لینا ضروری ہوگا، شوہر سے بیوی کے لئے باپ سے بیٹی کے لئے یا جو ولی ونگراں ہو، ''الرجال قوامون على النساء'' کا تقاضا یہی ہے۔

۵۔ اگر عورت کو کسب معاش کے لئے گھر سے باہر نکلنا پڑے تو ولی یا شوہر کی اجازت ضروری ہوگی۔

الف۔ گھر سے نکلنا مسافت سفر سے کم بھی ہو تو ولی یا شوہر کی اجازت کے ساتھ راستے کا پرامن ہونا ضروری ہوگا، مثلاً بالکل یک وتنہا نہ جائے، دیگر خواتین ساتھ ہوں، کمپنی کی محفوظ ومخصوص برائے خواتین بس ہو، رات کے وقت شرائط اور سخت ہوں گی۔

ب۔ کسب معاش وملازمت کی جگہ اگر اس قدر دور ہے جو مسافت سفر کے برابر یا زیادہ ہو تو یہ سفر محرم کے بغیر درست نہ ہوگا، اور نہ تنہا اجنبی شہر میں قیام درست ہوگا، اجتماعی قیام گاہ جو خواتین کے لئے مختص ہوں اس میں قیام کی گنجائش ہوگی۔

ج۔ ولی کفالت کرتا ہو تو کسب معاش اس کی اجازت سے مباح ہوگا، نہ کرتا ہو تو عورت کے لئے کسب معاش ضروری ہوگا۔

۶۔ عورتوں کو ایسی ملازمتوں سے محفوظ رکھنا چاہئے جو ان کی فطرت اور جسمانی ونفسیاتی خصوصیات کے موافق نہ ہوں اس طرح کے کاموں کی دو قسمیں ہیں:

الف۔ وہ کام و ملازمت جس سے شریعت نے صراحتاً منع کیا ہے جیسے حاکم ہونے کی ذمہ داری برائے اعلیٰ حکومت کے وہ مناصب جس کی عورت کے لئے ممانعت آئی ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وہ قوم کبھی کامیاب نہیں ہوسکتی جس نے ایک عورت کو اپنی ولایت سپرد کی (بخاری)۔

ب۔ وہ کام جسے فقہاء اپنے اجتہادات سے ممنوع قرار دیتے ہیں، اس کی مثالیں وہ سخت اور محنت و مشقت طلب کام ہیں جو عورتوں کو بوجھل کر دیتے ہیں، اسی طرح وہ کام جن میں سخت تکلیف دہ نفسیاتی محنت و مشقت کرنی پڑتی ہے، اور جن کے لئے سخت طاقت وقوت کی ضرورت ہوتی ہے۔

''ولا تبرجن تبرج الجاهلية الاولى'' (احزاب: ۳۳) (اور زمانہ جاہلیت کے سے بناؤ سنگار نہ دکھاتی پھرو)۔

گھر سے باہر نکلتے وقت عورت پوری عصمت عفت ملحوظ رکھے نہ لباس میں کوئی شان اور بھڑک ہونی چاہئے نہ چال میں کوئی خاص ادا، نہ گفتار میں ایسی نرمی وحلاوت کہ اخلاقی بیمار کو توجہ کا موقع ملے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''قد أذن الله لكن أن تخرجن لحوائجكن'' (بخاری، مسلم) (اللہ نے تم کو اپنی ضروریات کے لئے باہر نکلنے کی اجازت دی ہے)۔

حجاب و بے پردگی کے سارے احکامات کی پابند ہو کر ملازمت کے فرائض خاتون انجام دے گی۔

۷۔ ادارہ کے ذمہ داران مرد ہوں تو پردے کے احکام کی پابندی لازمی ہوگی، خلوت سے اجتناب ضروری ہوگا۔

۸۔ اولاً تو ایسی صورت میں ملازمت سے گریز کیا جائے جہاں مردوں سے اختلاط ہو، لیکن اگر ناگزیر صورت ہو تو پردے کے احکام کا حسب حال لحاظ کیا جائے اور مرد و عورت تنہاں ہرگز جمع نہ ہوں سن رسیدگی فتنوں سے بچاتی ہے تو جواں سالی بلاتی ہے اس لئے فقہاء نے بھی فرق کو پردے کے احکام میں ملحوظ رکھا ہے، ''والقواعد من النساء'' سے اس رجحان کی تائید ہوتی ہے۔

۹۔ اس بارے میں اصل پردے کی پابندی ہے مردوں کے بیچ رہ کر بے حجاب ملازمت کی اجازت شریعت نہیں دیتی۔

کسی آفس میں بیٹھ کر عورت کے لئے کام کرنا درست ہے بشرطیکہ آداب شریعت اور احکام حجاب کی پابندی کی جائے۔

مجبوری و استثنائی حالات میں "اهون البليتين" پر عمل کیا جائے۔

۱۰۔ کسب معاش و ملازمت کی غرض سے عورت کا اپنے گھر اور اپنوں سے دور ملک و بیرون ملک میں مستقل قیام کرنے کے سلسلہ میں شریعت کے احکام مندرجہ ذیل ہیں:

الف۔ شرعی سفر بغیر محرم کے عورت کے لئے ناجائز ہے۔

ب۔ اس طرح ملک و بیرون ملک میں عورت کا تنہا قیام کرنا بھی ناجائز ہے۔

ج۔ کوئی عورت محرم کے ساتھ کسی شہر یا ملک گئی وہاں رہنے لگی پھر محرم فوت ہوگیا تو اسے قیام کی اجازت ہے بشرطیکہ شرعی آداب کی رعایت کرے (فقہی مقالات ۱/ ۲۰۹)۔

د۔ ملک کے اندر ایسے دینی اداروں میں جہاں صرف خواتین اجتماعی طور پر رہتی ہوں ان میں عورت سفر محرم کے ساتھ کر کے قیام کرسکتی ہے، کہ فتنوں سے ایسی قیام گاہیں محفوظ ہوتی ہیں۔

☆☆☆

خواتین کی ملازمت

مولانا محمد شاہجہاں ندوی[1]

یہ حقیقت روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ عورت غیر اسلامی معاشرہ میں بے حیثیت اور بے وزن تھی، اسلام نے اسے اس حالت سے نکالا، اور عزت، حرمت اور کرامت کے بلند مقام پر پہنچا دیا نیز اسے شخصی آزادی، رائے ومشورہ کی آزادی اور تعلیم وتعلم کی آزادی سے بہرہ ور کیا، اور ہر طرح کے ظلم وستم سے اس کی حفاظت کی، اسے میراث میں حصہ دلایا، اور آبرومندانہ زندگی گزارنے کے مواقع فراہم کئے۔

چنانچہ قرآن اور حدیث کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مرد اور عورت خلقت و پیدائش، کرامت وحرمت، انسانیت وآدمیت اور حقوق و واجبات میں یکساں ہیں، ارشاد باری ہے:

''یاایها الناس اتقوا ربکم الذی خلقکم من نفس واحدة و خلق منها زوجها، وبث منهما رجالا کثیراً و نساء'' (سورۂ نساء:۱) (اے لوگو! اپنے رب سے ڈرو جس نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا، اور اسی جان سے اس کا جوڑا بنایا، اور ان دونوں سے بہت سے مرد وعورت دنیا میں پھیلا دیئے)۔

عورت مرد کی تفریح طبع کے لئے نہیں بلکہ نظام کائنات کے اہم رکن کی حیثیت سے پیدا کی گئی ہے، لہذا کوئی اس کا غلط استحصال نہ کرے، چنانچہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''استوصوا بالنساء خیرا فإنهن خلقن من ضلع'' (بخاری کتاب النکاح، باب الوصاة بالنساء، حدیث نمبر ۵۱۸۶)۔
(عورتوں کے ساتھ بھلائی کی ہدایت قبول کرو، کیونکہ وہ کجی کے ساتھ پیدا کی گئی ہیں)

ان حقائق کے باوجود مرد اور عورت کے درمیان ذمہ داریوں اور مناصب کا فطری فرق موجود ہے، اسی طرح سے مرد اور عورت کے درمیان جسمانی، عقلی اور نفسیاتی اعتبار سے بھی فرق پایا جاتا ہے، چنانچہ ہر شخص اس فرق کو اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتا ہے، مثلاً عورت کے اعضاء کی بناوٹ، اور اس کے اندر بچہ جننے کی صلاحیت کا ہونا، اور بہت سے وہ امور جن کو ایک عورت کر سکتی ہے، لیکن ایک مرد اس کو نہیں کر سکتا ہے۔

اسلام نے خاندانی زندگی کے نظام کی بنیاد اس پر رکھی ہے کہ مرد باہر کا کام کرے اور خواتین امور خانہ داری کو انجام دیں، یہ یقیناً فطری اصول ہے، جو مردوں کے لئے بھی رحمت ہے، اور عورتوں کے لئے بھی، نیز اس میں خاندانی نظام کی بقا واستحکام بھی ہے لیکن جب سے یورپ میں صنعتی انقلاب آیا، اور لوگوں نے دیہات چھوڑ کر شہروں کا رخ کیا اور یہودی سرمایہ داروں نے مردوں کا استحصال شروع کیا، اور ان کے جائز حقوق ہضم کرنے اور دبانے لگے، اور جب انہوں نے اپنے مطالبات میں آواز بلند کی تو عیار یہودی سرمایہ داروں نے اپنی کمپنیوں کے دروازے عورتوں کے لئے کھول دیئے تاکہ مردوں کا منہ بند کیا جاسکے پھر انہوں نے مرد، عورت اور بچوں سبھی کا استحصال شروع کر دیا۔

اس تمہید کے بعد اب سوالات کے جوابات مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ اصولی اعتبار سے شریعت اسلامی خواتین کے لئے کسب معاش کو مباح سمجھتی ہے، جبکہ وہ عمل جسے وہ اختیار کر رہی ہے شرعی اعتبار سے مشروع ہو، لیکن اسی کے ساتھ ضروری ہے کہ مباح، مندوب ومستحب اور ان پر عائد واجبات وفرائض جیسے امور خانہ داری کی انجام دہی، شوہر کے حقوق کی

---

[1] جامعہ اسلامیہ، شانتاپورم، کیرالہ۔

ادائیگی، اولاد کی پرورش اور تربیت اور ازدواجی زندگی کی تیاری کی ذمہ داریوں سے مزاحم نہ ہوں۔

عام طور سے چونکہ عورتوں کی خانگی ذمہ داریاں اس قدر ہیں کہ جن کے لئے یکسو ہونا لازم ہے، لہذا ان فرائض میں کوتاہی کے بغیر گھر سے باہر عورتوں کے لئے عمل کی انجام دہی تقریباً ناممکن ہے، اس لئے استثنائی صورتوں کے علاوہ اسلامی شریعت عورتوں کے لئے گھر سے باہر عمل کو ممنوع سمجھتی ہے۔

۲۔ بعض صورتوں میں شریعت نے مالدار خواتین پر بھی نان ونفقہ کی ذمہ داری رکھی ہے، تفصیل یوں ہے:

مذہب شافعی میں اگر باپ دادا، خواہ اوپر کے ہوں، موجود نہ ہوں، تو ایسی صورت میں اولاد کا نفقہ ماں پر واجب ہے، ''مجموع'' میں ہے: ''كما تجب على الأم نفقة الولد؛لقوله تعالى لا تضار والدة بولدها'' (بقرہ:۲۳۳)، نیز ارشاد باری ہے: ''والوالدات يرضعن اولادهن حولين كاملين'' (بقرہ:۲۳۳)، ''ولما أوجب الشرع على الأم ما عجز عنه الأب من الرضاع، وجب عليها ما عجز عنه من النفقة ؛ لأن البعضية فيها متحققة، وفي الأب مظنونة ولانه لما تحمل الولد نفقة أبويه، وجب أن يتحمل أبواه نفقته'' (المجموع شرح المهذب ۱۹،۴۰۱، طبع دار الفكر بيروت ۲۰۰۵)۔

(جس طرح ماں پر اولاد کا نفقہ واجب ہے، کیونکہ ارشاد باری ہے: کسی ماں کو اس کے بچہ کے سبب سے نقصان نہ پہنچایا جائے، اور ارشاد ہے: اور مائیں اپنے بچوں کو پورے دو سال دودھ پلائیں، چنانچہ جب شریعت نے ماں پر دودھ پلانے کی ذمہ داری عائد کی ہے، جس سے باپ عاجز ہے، تو باپ کے نفقہ سے عاجز ہونے کی صورت میں بھی ماں پر نفقہ لازم ہوگا، کیونکہ جزئیت ماں میں یقینی ہے، اور باپ میں ظنی ہے، اور اس وجہ سے بھی کہ اولاد، والدین کے نفقہ کی ذمہ دار ہے، تو والدین پر بھی اولاد کے نفقہ کی ذمہ داری ہوگی)۔

۳۔ اس سوال کی دو شقیں ہیں؛

۱۔ معیار زندگی بلند کرنے یا سرمایہ واثاثہ پیدا کرنے کی غرض سے معاشی جدوجہد اختیار کرنا، اگر یہ چیز اس کی گھریلو ذمہ داریوں، نیز شوہر اور اولاد کے حقوق میں خلل انداز نہ ہو، تو شوہر کی اجازت سے مباح ہے خاص طور سے اس صورت میں جبکہ اس کا شوہر بے روزگار اور کاہل ہو، نیز وہ عورت اس پیشہ کو بحسن وخوبی انجام دے سکتی ہو، جسے ہر عورت انجام نہ دے سکتی ہو، چنانچہ عہد نبویت میں کچھ عورتیں گھر کے باہر تولید وختنہ کے کام سے جڑی ہوئی تھیں، ایسے ہی معاشرہ کی مدد اور خدمت کے کام بھی انجام دے سکتی ہے، جیسے حضرت رفیدہ انصاریہ یا اسلمیہ زخمی کے علاج ومعالجہ کا کام انجام دیتی تھیں (الاصابۃ فی تمییز الصحابۃ ۸/۸۱ طبع دار الکتب العلمیہ، بیروت، التراتیب الاداریۃ للشیخ عبد الحی الکتانی ۲/۱۱۸، الاستیعاب لابن عبد البر ۴/۳۹۷-۳۹۸، اسد الغابۃ، رقم الترجمہ ۶۹۲۵)۔

۲۔ محض وقت گذاری کے لئے معاشی جدوجہد اختیار کرنا ممنوع ہوگا، کیونکہ گھر سے باہر عورت کے لئے کام کرنے کا جواز ضرورتاً ہے، اور جو چیز ضرورت کی بنا پر جائز قرار دی جاتی ہے، وہ بقدر ضرورت ہی ثابت رہتی ہے، یہ شریعت کا ثابت شدہ قاعدہ ہے، اور ذکر کردہ صورت میں کوئی ضرورت نہیں ہے، چنانچہ ایسی عورت پر لازم ہے کہ اپنی پوری توجہ اولاد پر دے، اور ان کو خود آگاہی کے جوہر سے آراستہ کرے، تاکہ وہ اسلام اور مسلمانوں کی بہتر خدمت انجام دے سکیں۔

۴۔ جبکہ خواتین اندرون خانہ ہی اپنی معاشی سرگرمیوں کو محدود رکھیں، تو بھی ولی یا شوہر سے اجازت لینا ضروری ہے، کیونکہ اگرچہ اندرون خانہ عورت کے لئے معاشی سرگرمی جائز اور مباح ہے، اور عہد نبویت میں بھی ام سلمہ اور بہت سی عورتیں چرخہ سے سوت کاتتی تھیں (التراتیب الاداریہ ۲/۱۱۹-۱۲۰)۔

لیکن شادی سے پہلے بھی عورتوں کو خوشگوار ازدواجی زندگی گزارنے کے لئے گھریلو عمل کی مشق ضروری ہے، اور شادی کے بعد بھی گھر کے کام کاج اور شوہر اور بچے کے حقوق ادا کرنا لازم ہے، اس لئے اجازت ضروری ہے تاکہ اس کی معاشی سرگرمی گھر اور اس کے کام کاج، بچے اور شوہر کے حقوق میں خلل انداز نہ ہو، دلیل بخاری شریف کی وہ حدیث ہے جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''لا يحل للمرأة أن تصوم، زوجها شاهد إلا بإذنه...'' (صحيح بخاری کتاب النکاح، باب صوم المرأة بإذن زوجها تطوعا، حدیث نمبر ۵۱۹۲، و باب لا تأذن المرأة... حدیث نمبر ۵۱۹۵)۔

(کسی عورت کے لئے حلال نہیں کہ روزہ (مراد نفلی روزہ ہے) رکھے ایسی حال میں کہ اس کا شوہر موجود ہو، مگر اپنے شوہر کی اجازت سے)۔

۵۔ عورت کا اصل دائرہ عمل اس کا گھر ہے، اس کو اسی دائرہ میں رہ کر اطمینان وسکون کے ساتھ اپنے فرائض انجام دینے چاہئیں "وقرن فی بیوتکن، ولا تبرجن تبرج الجاهلية..." (اپنے گھروں میں قرار پکڑو، اور سابق دور جاہلیت کی سی سج دھج نہ دکھاتی پھرو) (سورۂ احزاب: ۳۳)۔

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ عورتیں کسی حالت میں گھر سے باہر نہیں جاسکتی ہیں، بلکہ مطلوب یہ ہے کہ ان کو گھر سے باہر بضرورت ہی نکلنا چاہئے، ابن تیمیہ تحریر کرتے ہیں:

''والامر بالاستقرار۔أی للمرأة۔فی البیوت لا ینافی الخروج لمصلحة مأمورة بها، کما لو خرجت للحج والعمرة، أو خرجت مع زوجها فی سفر، فإن هذه الآية الكريمة (وقرن فی بیوتکن) نزلت فی حیاة النبی ﷺ وقد سافر النبی ﷺ بهن۔أی بزوجاته۔فی حجة الوداع سافر بعائشة وغیرها'' (منهاج السنة النبوية لابن تیمیه ۲،۱۸۵-۱۸۶)۔

(عورت کو گھروں میں قرار پکڑنے کا حکم، اس بات کے منافی نہیں کہ عورت کسی مصلحت سے جس کا شریعت میں حکم ہو، گھر سے باہر نہ نکلے، جیسے وہ حج اور عمرہ کے لئے گھر سے باہر جائے یا شوہر کے ساتھ سفر میں جائے، کیونکہ آیت کریمہ آپ ﷺ کی حیات میں نازل ہوئی، اور آپ ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقع پر ازواج مطہرات جیسے حضرت عائشہ وغیرہ کے ساتھ سفر کیا)۔

لہذا عورت کے لئے ضرورت یا مصلحت کی بنا پر گھر سے باہر نکلنا جائز ہے، لیکن نکلنے سے پہلے شوہر یا ولی شرعی کی اجازت لازم ہے۔

ہاں البتہ اگر ولی ولایت واجب ہونے کے باوجود خاتون کی کفالت نہ کرتا ہو، یا شوہر نان ونفقہ نہ دیتا ہو، اور ملک بھی غیر اسلامی ہو جہاں بیت المال کا انتظام نہ ہو، تو ایسی صورت میں خاتون اپنی ناگزیر ضروریات کے لئے بغیر اجازت کے نکل سکتی ہے (کشاف القناع ۳/۱۱۷)۔

۶۔ خواتین کی ملازمت کے سلسلہ میں شرعی حدود کی تفصیل اس طرح ہے:

۱۔ ملازمت ایسی ہو جو عورت کی طبیعت کے موافق ہو اور اس کی نسوانیت کے مطابق ہو، نیز عورت کی جسمانی طاقت اور فطری صلاحیت کے لحاظ سے موزوں ہو، حتی الامکان مردوں اور عورتوں کا اختلاط نہ پایا جاتا ہو، مثلاً لڑکیوں کو پڑھانا، بچوں کی تعلیم وتربیت کرنا اور عورتوں کا علاج ومعالجہ کرنا وغیرہ۔

۲۔ ساتھ ہی یہ بھی لازم ہے کہ ملازمت عورت کے اصلی فرض میں مخل نہ ہو، اور یہ چیز مخفی نہیں کہ عورت کا اصلی فرض گھر کی نگہداشت، امور خانہ داری کی انجام دہی، بچوں کی تربیت اور شوہر کے حقوق کی ادائیگی ہے۔

ابن حجر لکھتے ہیں: ''ورعاية المرأة تدبير أمر البيت والأولاد، والخدم والنصيحة للزوج فی کل ذلك'' (فتح الباری ۱۳،۱۴۱)۔ (عورت کی نگہبانی یہ ہے کہ گھر کے معاملات، اولاد اور خادموں کی نگہداشت رکھے، اور ان تمام امور میں شوہر کی خیر خواہی کرے)۔

چونکہ عام طور سے ملازمت کی سرگرمیاں گھریلو اور ازدواجی ذمہ داریوں سے لاپرواہ بنادیتی ہیں، یا کم از کم ان میں کوتاہی کا سبب بن جاتی ہیں، لہذا واجب کو ترک کرکے مباح میں لگنا درست نہ ہوگا۔

۷۔ دوران ملازمت عورتوں کا اگر مردوں سے سابقہ پڑتا ہو، تو ایسی صورت میں لازم ہے کہ عورتوں کا لباس ایسا ہو جو عورت کے پورے بدن کو ڈھانپ لے۔ لباس سادہ اور کشادہ ہو، جس سے بدن کا ابھار نظر نہ آئے، اس میں برقع بھی شامل ہے (تفسیر آلوسی ۱۸/۱۳۶)۔

چونکہ معاشرہ میں فساد اور اخلاقی بگاڑ عام ہے، لہذا چہرہ اور ہتھیلی کو چھپانا لازم ہوگا، دسوقی مالکی تحریر کرتے ہیں:

''والاحرم النظر لهما، وهل يجب عليها حينئذ ستر وجهها ويديها، وهو الذی لابن مرزوق قائلاً: إنه مشهور

المذهب'' (فتنہ کا اندیشہ ہو یا لذت کے قصد سے دیکھنا ہو، تو ایسی صورت میں چہرہ اور ہتھیلی کا دیکھنا حرام ہوگا، اور ایسی حالت میں کیا عورت پر دونوں ہاتھ اور چہرہ چھپانا لازم ہوگا، ابن مرزوق کی رائے ہے کہ لازم ہے، اور ان کا کہنا ہے کہ مذہب مالکیہ میں یہی مشہور ہے)۔

اور کبھی ضرورت ایسی ہو کہ مرد سے بات کرنے کی نوبت آجائے تو عورت پر لازم ہے کہ ایسا لب ولہجہ اور انداز گفتگو اختیار کرے کہ بات کرنے والے مرد کے دل میں کبھی یہ خیال نہ گزر سکے کہ اس عورت سے کوئی اور توقع قائم کی جاسکتی ہے۔

اور اگر مردوں سے واسطہ نہ ہو تو ایسی صورت میں برقع اور اوڑھنی لازم نہیں، اور ناف سے گھٹنہ تک کے علاوہ حصوں کو عورتیں باہم دیکھ سکتی ہیں، لیکن غیر مسلم عورتوں کے سامنے پردہ اختیار کرنا زیادہ مناسب اور بہتر ہے، اور اگر قرائن سے پتہ چلے کہ غیر مسلم عورت ایسی ہے جو اپنے شوہروں سے مسلم عورتوں کے محاسن بیان کرتی پھرتی ہے تو چادر اور اوڑھنی ترک کرنا جائز نہ ہوگا (ردالمحتار ۹/۵۲۶-۵۳۴)۔

۸۔ ایسی صورت میں پردہ کے مندرجہ بالا احکام کے ساتھ خواتین پر جو جوان ہوں، چہرہ کا چھپانا لازم ہوگا (دیکھئے: الدر المختار ۱/۷۹)۔

سن رسیدہ خواتین پر چہرہ چھپانا لازم نہ ہوگا، ایسے ہی اگر سن رسیدہ خاتون بہت ہی بدصورت ہو تو کشف وجہ کرسکتی ہے۔

قرطبی نے ابن خویز منداد سے نقل کیا ہے: ''وإن كانت عجوزا ومقبحة جاز أن تكشف وجهها وكفيها'' (تفسیر القرطبی ۱۲، ۲۲۹)۔ (اگر خاتون سن رسیدہ یا بدصورت ہو تو چہرہ اور ہتھیلی کھول سکتی ہے)۔

۹۔ ہاں جس صورت میں اختلاط بالکل نہ ہو، یا بہت کم ہو، وہ بہتر ہے، جیسے عورتوں کا علاج ومعالجہ کرنا، عورتوں کی طبی جانچ کرنا، غیر مخلوط آفس میں کام کرنا، لڑکیوں کی تعلیم کے غیر مخلوط اداروں میں تعلیم دینا یا کام کرنا، بچوں کی تعلیم وتربیت کرنا، اور اس جیسی دیگر ملازمتوں میں لگنا جہاں عورتوں کے ساتھ کام کرنا ہوتا ہو، یا مردوں کے ساتھ اختلاط کا متقاضی نہ ہو، یا ایسی ملازمتوں میں لگنا جہاں اختلاط کم ہو، زیادہ مناسب ہے۔

۱۰۔ اس سوال کا جواب آچکا ہے کہ عورتوں کی ملازمت صرف استثنائی صورتوں میں جائز ہے، اس شرط کے ساتھ کہ اس کی گھریلو ذمہ داریوں، بچوں کی تربیت اور شوہر کے حقوق میں مزاحم نہ بنے، اور غیر شادی شدہ ہو، تو ازدواجی زندگی کی تیاری، اور امور خانہ داری کی عملی مشق کی راہ میں حائل نہ ہو، اسی کے ساتھ اس خاتون کو کسب معاش کے لئے ملازمت کی ضرورت ہو۔

اگر یہ دونوں شرطیں کسی عورت میں پائی جاتی ہوں تو وہ اندرون ملک یا بیرون ملک مستقل قیام کرسکتی ہے، اور ایسی صورت میں لازم ہوگا کہ اس کے ساتھ ذورحم محرم رشتہ دار جیسے باپ، بھائی، شوہر بھی سفر کرے۔

لیکن سوال سے واضح ہے کہ اس میں کوئی نہ کوئی شرط مفقود ہوگی، اگر ایسا ہے تو پھر اس طرح کی ملازمت درست نہ ہوگی۔

☆☆☆

خواتین کی ملازمت

مفتی سید باقر ارشد قاسمی [1]

اسلام نے ہر ایک کی ذمہ داریاں متعین کردی ہیں، مرد کی ذمہ داری بیوی بچوں کی کفالت اور ان کے لئے نان ونفقہ کی فراہمی ہے، جبکہ عورت کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ شوہر کے گھر کو سنبھالے اور بچوں کی تربیت کرے۔

عورت اور مرد میں جو جسمانی اعتبار سے فرق ہے اس کی وجہ یہی ہے کہ مرد کو جفاکش جسم دیا تا کہ وہ محنت اور جدوجہد کرے اور نان ونفقہ مہیا کرے اور عورت کو نازک اور مرد کے مقابلہ میں کمزور جسم دیا تا کہ وہ گھر کی حد تک محدود رہ کر گھر کی دیکھ بھال کرے، دونوں اپنی اپنی ذمہ داریوں کی مناسبت سے ہم پلہ وہم درجہ ہیں۔

چنانچہ صحیح بخاری میں ایک حدیث ہے جو مرد وعورت کی ذمہ داریوں کی تخصیص کررہی ہے:

''والرجل فی أهله راع وهو مسؤول عن رعيته والمرأة فی بيت زوجها راعية وهی مسؤولة عن رعيتها'' (بخاری، رقم حدیث ۲۳۶۷)۔

عام حالات میں تو عورت کے لئے ملازمت یا کسب معاش کا حکم نہیں ہے مگر خصوصی حالات میں شریعت نے عورت کو کسب معاش سے روکا بھی نہیں ہے، شرعی حدود واصول کا لحاظ کرتے ہوئے عورت بھی کسب معاش کرسکتی ہے۔

چنانچہ اس تمہید کے بعد سوالنامہ پر احقر کی رائے پیش خدمت ہے:

۱۔ خواتین کا کسب معاش شریعت کی نظر میں:

روایات سے یہ ثابت ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں کو گھریلو دستکاری کی ترغیب دلائی ہے، حضرت زینب ؓ زوجہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ دھاگہ کاتنا کرتی تھیں اور اپنے گھر والوں کی ضروریات پوری کیا کرتی تھیں۔

صحیح مسلم کی روایت ہے کہ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ حضرت زینبؓ ہم میں سب سے زیادہ سخی تھیں اور کھلے ہاتھ والی، وہ خود سے کام کرتیں اور صدقہ کیا کرتی تھیں (صحیح المسلم، تحت رقم حدیث: ۶۲۶۹)۔

چنانچہ مسلم ہی کی روایت سے ثابت ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اہلیہ حضرت زینبؓ کھال کو دباغت دیا کرتی تھیں۔

صحیح بخاری ہی کی ایک روایت ہے کہ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ حضرت سعدؓ خندق کے دن زخمی ہوگئے تھے، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے لئے مسجد ہی میں خیمہ نصب کروایا تا کہ قریب سے ان کی عیادت کرسکیں۔

اس کے ذیل میں حافظ ابن حجرؒ نے لکھا کہ ابن اسحاقؒ نے یہ ذکر کیا ہے کہ وہ خیمہ رفیدہ اسلمیہ ؓ کا تھا جو زخمیوں کا علاج کیا کرتی تھیں۔

اسلامی شریعت عورت کو بالکلیہ ملازمت یا کسب معاش سے نہیں روکتی، بلکہ کچھ اصول، ضوابط اور حدود کی پابندی کے ساتھ عورت کے لئے کسب معاش کی گنجائش ہے اور کسب معاش کے ایسے ذرائع جن میں گھر سے باہر نکلنے کی ضرورت نہ پڑے بدرجہ اولی بہتر ہے، ان کی نسبت جن میں گھر سے باہر نکلنے کی ضرورت ہو، اگر گھر سے باہر نکلنا ہی پڑ رہا ہو تو ایسی صورت میں وہ ان ذرائع کو اپنا سکتی ہے، جن میں بے پردگی کا خدشہ نہ ہو، غیر مردوں سے اختلاط یا بے حجابانہ گفتگو کے مواقع نہ ہوں اور اسے اس ملازمت میں غیر مرد سے واسطہ نہ پڑتا ہو، کسب معاش کے ایسے ذرائع کو اختیار کرنے کی اجازت شریعت میں ہے، مثلاً کسی

---

[1] چن پٹن، بنگلور، کرناٹک۔

تعلیمی شعبہ میں ملازمت یا لڑکیوں کے لئے کوئی ہنر سکھانے والے ادارے وغیرہ۔

گھر کے اندر رہ کر وہ سلائی، دستکاری، یا ایسی اشیاء جو گھر میں تیار کر کے فروخت کی جاتی ہوں وغیرہ ان ذرائع سے عورت کسب معاش اختیار کرسکتی ہے۔

آج کل جو رجحان عورتوں میں ملازمت کے سلسلہ میں پیدا ہوا ہے کہ وہ بھی مرد کی طرح ملازمت کرسکتی ہیں یا کسب معاش کا پیشہ اختیار کرسکتی ہیں، اس کے تحت ملازمت عورت کی آزادی کے اظہار کے طور پر یا شوقیہ ملازمت یا پھر محض اس لئے کہ لڑکی پڑھی لکھی ہے، یعنی بلاضرورت شدیدہ اور بطور شوق ملازمت اختیار کرنا جائز نہیں ہے۔

عورت کو ایسی ملازمت یا کوئی ایسا پیشہ اختیار کرنے کی اجازت دی جاسکتی ہے، جس میں عورت کو بے حجاب نہ ہونا پڑے یا کسی غیر مرد یا نامحرم مردوں سے سابقہ نہ پڑے۔

کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کسی عورت کا شوہر کاہل ہوتا ہے یا اتنا نہیں کماتا کہ گھر چل سکے یا پھر عورت بیوہ ہے جس کا کوئی ولی یا سرپرست یا کوئی سہارا نہیں ہے، ایسی تمام صورتوں میں عورتوں کا ان پابندیوں کے ساتھ ملازمت یا کوئی پیشہ اختیار کرنا جائز ہے، جیسا کہ سوال نامہ میں اس کی صراحت ہے۔

۲۔ نان ونفقہ کی ذمہ داری خواتین پر ہے یا نہیں؟

شریعت نے عورت پر نفقہ کی ذمہ داری نہیں رکھی ہے، جب تک وہ ان بیاہی ہوتی ہے باپ یا اس کے اولیاء اس کے نفقہ کے ذمہ دار ہیں اور بعد نکاح کے اس کے نفقہ کا ذمہ دار شوہر ہوتا ہے، عورت کو گھر کی حد تک محدود رہ کر گھر کی ذمہ داریوں کو ادا کرنے کا حکم ہے، کیونکہ قرآن میں ہے کہ ''الرجال قوامون علی النساء... الخ'' (سورۂ نساء: ۳۴) (یعنی مرد عورتوں پر قوام ہیں)۔

بخاری میں ہے: ''والرجل فی أہلہ راع وہو مسؤول عن رعیتہ والمرأۃ فی بیت زوجہا راعیۃ وہی مسؤولۃ عن رعیتہا ...'' (بخاری، کتاب الاستقراض رقم حدیث ۲۲۶۷) (اور مرد اپنے گھر کا نگہبان ہے اس سے ان کے بارے میں سوال کیا جائے گا، اور عورت اپنے شوہر کے گھر کی نگہبان ہے اس سے اس گھر میں رہنے والوں کے بارے میں سوال کیا جائے گا)۔

ہاں جبکہ عورت کا کوئی ولی یا سرپرست نہ ہو اور نہ شوہر ہو تو ایسی صورت میں بہ حالت مجبوری وہ اپنے نان ونفقہ کی خود ذمہ دار ہے اور اگر اس کو اولاد بھی ہے جو نابالغ ہے تو اس کا نان ونفقہ بھی اس عورت (ماں) کے ذمہ ہوگا۔

۳۔ بلاضرورت شدیدہ خواتین کا ملازمت کرنے کے احکام:

معیار زندگی بلند کرنے کے لئے خواتین کا ذریعہ معاش اختیار کرنا:...... محض معیار زندگی کو بلند کرنے کے لئے عورتوں کا ملازمت کرنا جائز نہیں، ہاں گھر کی حد تک رہ کر محض معیار زندگی کو بلند کرنے کے لئے شوہر یا ولی کی اجازت سے کوئی ایسا ذریعہ معاش اختیار کرسکتی ہیں جس میں انہیں غیر مردوں سے واسطہ نہ پڑے، اس کے علاوہ ایسی ملازمت کی ان کو اجازت ہے جس میں انہیں گھر کے باہر نکلنا تو پڑے مگر حجاب کی پابندی اور غیر مردوں سے سابقہ بھی نہ پڑے۔

وقت گذاری کے لئے خواتین کا ذریعہ معاش اختیار کرنا:

وقت گذاری کے لئے عورت کا ملازمت کرنا حرام ہے، ہاں گھر کی حد تک رہ کر محض تضیع وقت سے بچنے کے لئے جواز کی صورت ہے۔

سرمایہ واثاثہ پیدا کرنے کے لئے خواتین کا ذریعہ معاش اختیار کرنا:...... سرمایہ واثاثہ پیدا کرنے کے لئے عورتوں کا ملازمت کرنا جائز نہیں، ہاں گھر کی حد تک رہ کر محض معیار زندگی کو بلند کرنے شوہر یا ولی کی اجازت سے کوئی ایسا ذریعہ معاش اختیار کرسکتی ہیں، جس میں انہیں غیر مردوں سے واسطہ نہ پڑے، اس کے علاوہ ایسی ملازمت کی ان کو اجازت ہے جس میں انہیں گھر کے باہر نکلنا تو پڑے مگر حجاب کی پابندی اور غیر مردوں سے سابقہ بھی نہ پڑے۔

۴، ۵۔ خواتین کو کسب معاش کے لئے ولی یا شوہر کی اجازت کی ضرورت واہمیت:

خواتین کے لئے کسب معاش کی کوئی صورت اختیار کرنے میں جبکہ وہ اندرون خانہ ہی اپنی معاشی سرگرمیوں کو محدود رکھیں، اپنے شوہر یا ولی کی اجازت

ضروری ہے، شوہر یا ولی کی اجازت کے بغیر وہ کسی بھی قسم کی معاشی سرگرمی اختیار نہیں کرسکتیں، کیونکہ شوہر یا ولی کی اجازت کی ضرورت واہمیت اس لئے بھی ہے کہ اگر واقعۃً مزید آمدنی کی ضرورت ہو اور ولی یا شوہر مجبور ہے کہ آمدنی میں وہ اضافہ نہیں کرسکتا تو وہ اجازت دے گا، لیکن اگر ولی یا شوہر اس کی ضرورت محسوس نہیں کرتے کہ ان کے علاوہ گھر کی خاتون بھی ملازمت کر کے روپیہ کمائے تو وہ روک سکتے ہیں، اور خواتین کا بلا وجہ باہر نکلنا یا بغیر ضرورت ملازمت کرنا یا کمانا رک سکتا ہے، اور کہیں کہیں ولی یا شوہر حد درجہ غیرت مند ہوتے ہیں، وہ نہیں چاہتے ہیں کہ عورت کما کر ان کی مدد کرے، لہذا اجازت کی قید لگانے پر مرد کی غیرت بلا وجہ مجروح ہونے سے بچ جاتی ہے۔

عورت کا سرپرست اس کا ولی یا باپ یا شادی شدہ ہونے کی صورت میں اس کا شوہر ہوتا ہے اور شوہر کی اجازت کے بغیر یا غیر شادی شدہ ہونے پر اپنے ولی یا باپ کی اجازت کے بغیر عورت کوئی کام نہیں کرسکتی، حتی کہ وہ کوئی عبادت ہی کیوں نہ ہو، لہذا حدیث میں ہے کہ عورت نفلی روزہ اپنے شوہر کی اجازت کے بغیر نہیں رکھ سکتی، نفلی روزہ یا نفلی نماز ادا کرنے کے لئے اس کو حکم ہے کہ وہ اپنے شوہر کی اجازت طلب کرے، اگر وہ اجازت دے تو وہ نفلی روزہ یا نفلی نماز ادا کرسکتی ہے، ورنہ وہ اس سے رک جائے، جب یہ حکم عبادت کے سلسلہ میں ہے تو عورت کی ملازمت بدرجہ اولی شوہر یا ولی کی اجازت پر موقوف ہے۔

مسافت سفر سے کم یا زیادہ کے فاصلہ پر ملازمت کرنے کا حکم:...... عورت مسافت سفر سے کم کی مسافت پر شوہر یا ولی کی اجازت سے ملازمت اختیار کرسکتی ہے، مگر مسافت سفر سے زیادہ فاصلہ طے کر کے اکیلے سفر کر کے ملازمت کرنا حرام ہے، ساتھ میں کسی محرم کا اس مقام پر ہونا ضروری ہے اور پھر شرعی حدود کی پاسداری بھی لازمی ہے، مسافت سفر کے برابر یا اس سے زیادہ کے فاصلہ کے سلسلہ میں محرم کا ساتھ ہونا شرعاً اس لئے ضروری ہے کہ کسی مصیبت یا پریشانی کے وقت عورت کو دشواری نہ ہو، اسی بات کے پیش نظر شریعت نے عورت کے لئے حج کے فرض ہونے کی شرائط میں ایک شرط کا اضافہ یہ کیا کہ اگر عورت ہو تو اس کے ساتھ محرم کا ہونا بھی ضروری ہے، اور جب تک اس کو ساتھ جانے کے لئے کوئی محرم نہیں مل جاتا اس وقت تک اس پر حج فرض نہیں ہوتا، لہذا محرم کی شرط کے ساتھ ساتھ ولی یا شوہر کی اجازت بھی ضروری ہے۔

عورت کا دن اور رات میں ملازمت کا حکم:...... دن کے وقت انہیں شرائط کے ساتھ جو اوپر لکھی جا چکی ہیں عورت کا ملازمت کرنا صحیح ہے، ہاں رات میں ملازمت کرنا یہ محل غور ہے، یہ دیکھا جائے کہ وہ ملازمت کہاں کر رہی ہے، ایسی جگہ جہاں پر عورتیں ہی عورتیں ملازم ہیں اور مردوں سے کوئی واسطہ نہ پڑتا ہو تو شوہر یا ولی کی اجازت سے وہ عورت شرعی حدود کی پابندی کے ساتھ ملازمت کرسکتی ہے، لیکن اگر ایسی جگہ رات میں ملازمت کرنا چاہتی ہے جہاں مردوں سے سابقہ پڑتا ہو تو وہاں رات کے وقت میں ملازمت کرنا جائز نہیں چہ جائیکہ ولی یا شوہر اجازت دے یا نہ دے، کیونکہ یہ پرفتن جگہیں ہیں، جہاں سے ایک پاک دامن عورت کا بچنا از حد ضروری ہے، اور آج کے حالات میں تو اس سلسلہ میں حد درجہ احتیاط کی ضرورت ہے۔

عورت کی ملازمت جبکہ اس کا کفیل موجود ہے:...... جیسا کہ شریعت نے مرد و عورت کی جسمانی ساخت کے مطابق ان کو ذمہ داری سونپ دی ہے، لہذا فطرت کے قانون کے مطابق مرد کا کام کمانا ہے اور عورت کی ذمہ داری گھر کی حفاظت اور دیکھ بھال ہے، اب جبکہ عورت کا ولی یا شوہر کماتا ہو اور عورت کی کفالت کرتا ہو تو ایسی صورت میں عورت کو ملازمت کرنے یا کمانے کی کیا ضرورت ہے، لہذا ولی یا شوہر کی کفالت کرنے کی صورت میں اس خاتون کا ملازمت کرنا چاہے شرعی حدود میں رہ کر ہی سہی جائز نہیں ہے۔

۶۔ خواتین کی ملازمت کے شرعی حدود:

۱۔ عورت کو ملازمت کی شدید ضرورت ہو، مثلاً بیوہ ہے کوئی اس کا کفیل نہیں یا اتنی تنگدستی ہے کہ شوہر کی کمائی کے باوجود گھر چل نہیں پاتا، یا پھر کہیں کہیں ایسا بھی ہوتا ہے کہ شوہر کمانے والا نہیں، کاہل ہے، لہذا گھر چلانے کے لئے عورت کے لئے شرعی حدود واصول کی روشنی میں ملازمت کی اجازت موجود ہے۔

۲۔ شوہر یا ولی یا والد کی اجازت ہو، کیونکہ عورت کا سرپرست اس کا ولی اور شادی کے بعد اس کا شوہر ہوتا ہے، بلا اجازت عورت کو مسجد یا عیدگاہ میں بھی جانے کا حکم نہیں اور نفلی عبادات کی بھی اجازت نہیں جب تک شوہر یا ولی اجازت نہ دے دے، کیونکہ مرد عورتوں پر قوام ہیں۔

۳۔ دوران ملازمت حجاب میں رہے، شدید ضرورت کے موقع پر عورت کے چہرے اور ہتھیلیوں کو دیکھنے کی علماء نے اجازت دی ہے،

۴۔ غیر مردوں سے اختلاط نہ ہو، یعنی جس سے عورت و مرد کی تمیز ختم ہو جائے اور بے تکلفی بڑھ جائے اور جس سے گناہ کا اندیشہ رہتا ہو۔

۵۔ بناؤ سنگار نہ کرے اور خوشبو کا استعمال نہ کرے، تا کہ مرد کو اس کا بناؤ سنگار اور خوشبو نہ للچائے، یہ دواعی زنا میں سے ہے، اس لئے اس سے گریز کرے۔

۶۔ لباس ساتر ہو، یعنی ہتھیلیوں اور چہرے کے علاوہ سارا بدن پوشیدہ رہے، اور لباس اسلامی لباس ہو اور غیر اسلامی یا پھر مردوں والا لباس نہ ہو۔

۷۔ عورت ملازمت کے ساتھ ساتھ گھر کی ذمہ داریوں کو بھی پورا کرے، اگر شوہر موجود ہو تو شوہر کو چاہئے کہ وہ عورت کا گھر کے کام کاج میں ہاتھ بٹائے تا کہ اس کا بوجھ ہلکا ہو جس طرح اس نے ملازمت کر کے مرد کے بوجھ کو ہلکا کیا۔

کن اداروں میں عورت ملازمت کرسکتی ہے؟

ایسے شعبوں میں عورت کو ملازمت اختیار کرنے کی ترغیب دی جاسکتی ہے جہاں سے قوم کے مستقبل کے معمار نونہال بچوں کی تربیت کی جاتی ہو، مثلاً نرسری اسکول، اسکول، کالج (لڑکیوں کا ہو)، تربیت گاہیں وغیرہ۔

نیز ایسے ادارے جو خدمت خلق سے تعلق رکھتے ہوں وہاں پر بھی عورتیں ملازمت کرسکتی ہیں، صرف عورتوں ہی سے واسطہ پڑتا ہو تو دوران ملازمت پردے کی ضرورت نہیں، ہاں اگر مردوں سے سابقہ پڑتا ہو تو ایسی صورت میں شرعی پردہ کے اہتمام کے ساتھ وہ ملازمت کرسکتی ہے، مثلاً ہسپتال (بطور نرس یا ڈاکٹر)، فوجیوں کی خدمت (مرہم پٹی وغیرہ) کلینک (جہاں بیماریوں کی تشخیص کی جاتی ہو) وغیرہ۔

۷۔ایسی جگہوں پر پردہ کے احکام جہاں صرف خواتین ہی خواتین ہوں:...... ایسے اداروں میں جہاں صرف عورتیں ہی کام کرتی ہوں، البتہ مرد اس ادارے کے ذمہ دار ہوں لیکن کام کے مقام پر مرد موجود نہ رہتے ہوں وہاں ملازمت کے سلسلہ میں پردہ کے بارے میں حکم یہ ہے کہ عورت ایسے مقام تک پہنچنے کے لئے تو پردہ کا استعمال کرے، اور جب وہ اس ادارہ میں داخل ہو جائے اس وقت وہ حجاب اٹھاسکتی ہے مگر لباس ساتر ہو اور زیادہ بھڑکیلا نہ ہو، آرائش و زیبائش سے احتراز کرے نیز جب کبھی اس ادارہ کے ذمہ دار مرد سے بات کرنے کی نوبت آئے تو پردہ کرلیا کرے۔

۸۔ایسی جگہوں پر پردہ کے احکام جہاں خواتین و مرد ملازمت کرتے ہوں:...... ایسی جگہیں جہاں مرد وعورتیں دونوں کام کرتے ہوں، ضرورت شدیدہ پر عورت اگر وہاں ملازمت کررہی ہے تو ایسی صورت میں اس کو پردہ کا خصوصی انتظام رکھنا ہوگا، بناؤ سنگار نہ کرے، خوشبو کا استعمال نہ کرے اور بے حجاب نہ ہو، ضرورت شدیدہ ہی پر کسی مرد کارکن سے مختصر بات کرسکتی ہے، اس میں سن رسیدہ یا کم سن خواتین کا کوئی فرق نہیں، پردہ کا حکم ہر عمر کے لئے ہے، عمر کی کوئی تخصیص نہیں۔

۹۔ملازمت کی جگہوں پر مردوں سے اختلاط میں فرق:...... ایسے مقامات جن میں کہیں ایک کام کی انجام دہی میں عورت کا سابقہ مردوں سے محدود اور کہیں زیادہ ہوتا ہے، اس سلسلہ میں شرعی اعتبار سے فرق کیا ہے؟ اس کی تفصیل یہ ہے کہ مردوں سے سابقہ چاہے محدود ہو یا زیادہ دونوں کا ایک ہی حکم ہے، ایک غیر مرد سے بات کرنے کا اتنا ہی گناہ ہے جتنا کہ ایک سے زیادہ غیر مردوں سے ملنے جلنے کا گناہ ہے، ایک اہم بات یہ ہے کہ ایسی ملازمت جہاں عورت شوپیس کی حیثیت رکھتی ہے، وہاں ملازمت کرنا جائز نہیں۔ سیلس گرل کے طور پر عورتوں کو رکھا ہی اس لئے جاتا ہے تا کہ مرد حضرات متوجہ ہوں، اس لئے ایسی ملازمت کرنا جائز ہی نہیں، ہاں البتہ آفس میں بیٹھ کر کام کرنا ہے وہاں پر اس عورت کی ضرورت کو دیکھا جائے اگر واقعی وہ ملازمت کی ضرورت مند ہے تو وہ وہاں کام کرسکتی ہے، مگر شرعی حدود کی پابندی کے ساتھ۔

۱۰۔بہ غرض ملازمت عورت کا اکیلے اپنے گھر سے دور قیام کا حکم:...... ملازمت کی غرض سے عورت کا اکیلی اپنے گھر اور اپنوں سے دور اندرون ملک یا بیرون ملک مستقل قیام ناجائز ہے، چاہے کتنی ہی شدید ضرورت کیوں نہ ہو، ہاں اگر اس کے ساتھ کوئی محترم رشتہ دار ہو تو ایسی صورت میں وہ غیر وطن یا وطن میں اپنے گھر اور اپنوں سے دور مستقل قیام کرسکتی ہے، اس سلسلہ میں شریعت نے جب محرم نہ ہونے کی صورت میں حج ہی کو فرض نہیں کیا، ملازمت کے سلسلہ میں تو یہ اشد ضروری ہے کہ وطن یا وطن سے باہر اپنے گھر سے دور عورت اس وقت تک ملازمت نہیں کرسکتی اور وہاں مستقل قیام نہیں کرسکتی، جب تک کہ اس کے ساتھ رہنے کے لئے کوئی محرم نہ ہو۔

عورتوں کی ملازمت

مفتی محمد عارف باللہ القاسمی[1]

عورتوں اور مردوں کی فطرت اور صلاحیت میں فرق ہے، اسی لئے اللہ تعالی نے ان کی صلاحیتوں کے موافق ان کی ذمہ داریوں کا تعین کر رکھا ہے، مردوں کی صلاحیت کے موافق انسانی زندگی کی معیشت کو ان سے وابستہ کیا ہے، تو عورتوں کے مزاج وصلاحیت کی رعایت کرتے ہوئے اندرون خانہ مصروفیت کو ان سے وابستہ کر کے معاشی تگ ودو سے ان کو دور رکھا ہے، جو کہ ان کی صنفی نزاکت اور عفت وعصمت کا تقاضا بھی ہے، جیسا کہ قرآن وسنت کے ان نصوص سے تقسیم کار کی جانب اشارہ ملتا ہے، مردوں کے بارے میں اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

''الرجال قوامون على النساء بما فضل الله بعضهم على بعض وبما أنفقوا من أموالهم'' (سورۂ نساء:۳۴)۔

(مرد حاکم ہیں عورتوں پر اس سبب سے کہ اللہ تعالی نے بعضوں کو بعضوں پر فضیلت دی ہے اور اس سبب سے کہ مردوں نے اپنے مال (مہر میں اور نان ونفقہ میں) خرچ کئے ہیں)۔

جبکہ عورتوں کی ذمہ داری کو نبی کریم ﷺ نے ان الفاظ میں بیان فرمایا: ''المرأة راعية على بيت بعلها وولده وهي مسئولة'' (بخاری:۳۰۸)۔

(عورت اپنے شوہر کے گھر اور اس کی اولاد کی نگراں ہے اور اس سے اس کے بارے میں پوچھ ہوگی)۔

ان نصوص میں تقسیم کرتے ہوئے مرد کو قوام بنایا ہے اور عورت کو شوہر کے گھر اور اس کے اولاد کا نگراں بنایا: جس سے دونوں کے حقیقی عملی میدان کی تعیین ہوتی ہے، اور قوامیت کا واضح مفہوم یہ ہے کہ عورتوں کی ضرورت کی تکمیل اور ان کی نگہداشت مردوں کی ذمہ داری ہے، علامہ رازی لکھتے ہیں:

''يقال قيم المرأة وقوامها للذى يقوم بأمرها ويحفظها'' (التفسير الكبير للرازى، النساء:۳۴)۔

(عورت کا نگراں اور قوام اسے کہا جاتا ہے جو اس کے مسائل کو حل کرتا ہو اور اس کی حفاظت کرتا ہو)۔

کسب معاش میں خواتین کی مصروفیت شریعت کی نظر میں؟

تاہم اگر کوئی عورت اپنی گھریلو مصروفیات کو انجام دیتی ہوئی، اپنے مخصوص حالات کی وجہ سے جو کہ اس کے کسب معاش میں مصروف ہونے کے متقاضی ہوں کسب معاش میں مصروف ہوتی ہے تو اس کے لئے کسب معاش کی گنجائش ہے، اور کسب معاش میں اس کے لئے سب سے بہتر یہ ہے کہ وہ اسباب معیشت میں سے اپنی ضرورت کی تکمیل کے لئے ان اسباب کو اختیار کرے جو اندروں خانہ انجام دیئے جاسکتے ہوں، کیونکہ عورت کا گھر میں ہی رہنا پسندیدہ ہے اور اسی کا اللہ تعالی نے حکم دیا ہے: ''وقرن في بيوتكن ولا تبرجن تبرج الجاهلية الأولى'' (احزاب:۳۳)۔

(اور تم اپنے گھروں میں قرار سے رہو، اور قدیم زمانہ جاہلیت کے دستور کے مطابق مت پھرو)۔

نیز رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

''المرأة عورة فإذا خرجت استشرفها الشيطان'' (ترمذی:۱۰۹۲)۔

(عورت سراپا پردہ ہے جب وہ گھر سے نکلتی ہے تو شیطان اس کے پیچھے پڑ جاتا ہے)۔

بے کار رہنے کے بجائے مصروف رہنے کے فوائد کے پیش نظر رسول اللہ ﷺ نے بھی عورت کو گھر میں مصروف رہنے کی ترغیب دی اور طریقہ مصروفیت

---

[1] مدرسہ اسلامیہ دار العلوم ربانیہ، حیدر آباد۔

کی جانب اشارہ بھی کر دیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"علموا أبناء كم السباحة والرماية، ونعم لهو المؤمنة في بيتها المغزل" (معرفة الصحابة: ١١٩٤)۔

(اپنے بچوں کو تیراکی اور تیراندازی سکھاؤ اور مومن عورت کا بہترین مشغلہ گھر میں سوت کاتنا ہے)۔

لیکن گھریلو عمل میں مصروفیت کے لئے بنیادی شرط یہ ہے کہ وہ اپنی گھریلو ذمہ داریوں کو ادا کرنے کے بعد اس میں مصروف ہو ورنہ اس کے لئے اس میں مصروف ہونا شرعاً جائز ہوگا۔

اگر کوئی عورت معاشی طور پر اس طرح پریشان ہو کہ اس کے حالات بیرون خانہ مصروفیت ہی کے متقاضی ہوں اس لئے وہ بیرون خانہ معاشی مصروفیت انجام دیتی ہے، نیز ان شرعی حدود وضوابط کی پابندی بھی کرتی ہے جو کہ اس کی صنف کے لحاظ سے اسلام نے متعین کئے ہیں، تو شریعت اسلامیہ میں اس کی بھی گنجائش ہے اور اس کی بہت سی نظیریں ملتی ہیں، مثلاً:

۱۔ حضرت جابرؓ کی خالہ مطلقہ ہوگئیں اور وہ دوران عدت اپنے کھجور کو توڑنے کے لئے نکلیں، ایک صحابی نے انہیں اس سے روکا تو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئیں، اور آپ سے مسئلہ دریافت کیا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں گھر سے باہر نکل کر کھجور توڑنے کی یہ کہتے ہوئے اجازت دی:

"اخرجي فجدي نخلك لعلك أن تصدقي منه أو تفعلي خيرا" (ابوداؤد: ١٥٩٢)۔

(نکلو اور اپنے کھجور کو توڑو، امید کہ تم اس سے صدقہ یا خیر کا کام کر پاؤ گی)۔

۲۔ حضرت زبیرؓ کی بیوی حضرت اسماء بنت ابوبکرؓ اپنے شوہر کی معاشی مصروفیتوں میں بیرون خانہ مدد کرتی تھیں اور ان کے کھیت میں جایا کرتی تھیں، ان کے جانور کے چارہ کا انتظام کرتی تھیں (بخاری: ۴۸۲۳)۔

ان روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر عورت بیرون خانہ معاشی مصروفیت کو انجام دینے پر مجبور ہو تو اس کے لئے شرعی حدود کی رعایت کرتے ہوئے اسے اختیار کرنا جائز ہوگا۔

خواتین پر نان ونفقہ کی ذمہ داری؟

شریعت نے عورتوں کو شوہر کے گھر کا نگراں بنا کر ان کو اس کا مسئول تو قرار دیا، لیکن عام حالات میں بجز چند استثنائی حالات کے اصولی طور پر ان پر کسی کا، یا ان کے بچوں کا نفقہ لازم نہیں کیا ہے، علامہ شامی لکھتے ہیں:

"يجب عليه نفقة الابن في صغره دون الأم" (ردالمحتار مطلب الصغير والمكتسب نفقة في كسبه)۔

(بچپن میں بیٹے کا نفقہ والد پر واجب ہے نہ کہ ماں پر)۔

اور خود عورت کا نفقہ عورت پر لازم کرنے کے بجائے مردوں پر اس طرح لازم کیا کہ شادی سے قبل ان کا نفقہ ان کے والد یا ولی پر ہے اور شادی کے بعد شوہر پر لازم ہے، جیسا کہ علامہ حصکفی کی اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے:

"وتفرض النفقة بأنواعها الثلاثة لزوجة الغائب۔ وطفله ومثله كبير زمن وأنثى مطلقا" (الدر المختار باب النفقة)۔ (نفقہ اس کے تینوں اقسام کے ساتھ متعین کیا جائے گا غائب کی بیوی کے لئے اس کے بچے کے لئے اور اسی کے مثل وہ بڑا لڑکا ہے جو کسی مرض کی وجہ سے کمانے سے عاجز ہو اور لڑکی مطلقاً (اگر چہ وہ مریضہ نہ ہو بشرطیکہ اس کے پاس اپنے نفقہ کے بقدر مال نہ ہو)۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عورت پر کسی کا نفقہ لازم نہیں ہے بلکہ خود اس کا نفقہ مردوں پر لازم ہے۔

معیار زندگی کو بلند کرنے اور سرمایہ کاری کرنے کی غرض سے عورتوں کی معاشی مصروفیت؟

گھر کی معاشی حالت کے مستحکم ہونے اور عورت کی معاشی جدوجہد کے بغیر لازمی ضروریات زندگی کی تکمیل ہونے کے باوجود اگر کوئی عورت اندرون خانہ معاشی جدوجہد اس لئے کرتی ہے کہ گھر کی مالی حالت مزید مستحکم ہو جائے اور معیار زندگی مزید بہتر ہو اور اس نے اپنی جدوجہد کا مرکز خود اپنے گھر کو بنا رکھا ہے، اور

وہ گھریلو تمام تر ذمہ داریوں کی مکمل طور پر تکمیل بھی کر لیتی ہے، تو اس کے لئے ایسی معاشی جدوجہد جائز ہوگی؛ کیونکہ مالی حالت کے استحکام کی کوشش بھی طلب حلال ہی کا ایک حصہ ہے، جو کہ اسلام میں پسندیدہ عمل ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

''طلب كسب الحلال فريضة بعد الفريضة'' (کنز العمال: ۹۲۳۱، فيض القدير: حرف الطاء)۔

(حلال کمائی کو طلب کرنا دین کے اولین فرائض کے بعد دوسرا فریضہ ہے)۔

معاشی حالت کے مستحکم اور ضروریات کی تکمیل کے باوجود عورت معیار زندگی کی بلندی اور مزید مالی حالت کے استحکام کے لئے اگر کوئی ایسا سبب معیشت اختیار کرتی ہے جس کا تعلق گھر کے باہر سے ہو، مثلاً: کسی کمپنی میں ملازمت، کسی ادارے میں تدریس وغیرہ، تو چونکہ یہ اس کی معاشی جدوجہد ایسی ہے جو اس کی لازمی ضرورت میں سے نہیں ہے، اس لئے یہ جائز نہیں ہے، کیونکہ اس کا گھر سے باہر نکلنا ضرورت سے مربوط اور مشروط ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

''أذن الله لكن أن تخرجن لحوائجكن'' (بخاری: ۴۸۳۶)۔

(اللہ نے تم عورتوں کو اس بات کی اجازت دی ہے کہ تم اپنی ضرورتوں کے لئے گھر سے باہر نکلو)۔

جبکہ ضرورت سے قطع نظر ان کے لئے حکم عام یہ ہے:

''وقرن في بيوتكن ولا تبرجن تبرج الجاهلية الأولى'' (احزاب: ۳۳)۔

(اور تم اپنے گھروں میں قرار سے رہو، اور قدیم زمانہ جاہلیت کے دستور کے موافق مت پھرو)۔

اندرون خانہ کسب معاش میں ولی یا شوہر کی اجازت؟

شوہر یا ولی چونکہ عورت کا کفیل اور نگراں ہوتا ہے اس لئے عورت کو اندرون خانہ معاشی مصروفیت انجام دینے کے لئے ان سے اجازت لینا ضروری ہے، البتہ ولی یا شوہر کے لئے کن صورتوں میں کسب معاش سے روکنے کا حق ہے اور کن صورتوں میں نہیں؟ اس سلسلہ میں فقہاء نے لکھا ہے کہ اگر عورت اپنی گھریلو ذمہ داریوں کو انجام دیتی ہوئی اندرون خانہ کسب معاش میں مصروف ہوتی ہے اور وہ جدوجہد ایسی ہے جو اس کی گھریلو ذمہ داریوں میں مخل بھی نہیں ہے، نیز اس سے اس کا حسن و جمال بھی متاثر نہیں ہوتا ہے، اور نہ ہی اس کی وجہ سے شوہر کا کوئی حق ضائع ہوتا ہے تو ایسے کسب معاش کی اجازت دینی چاہئے (دیکھئے: رد المحتار باب النفقة)۔

البتہ اس صورت میں بھی شوہر کو یہ اختیار ہے کہ بیوی کو اس کام سے روک دے بشرطیکہ شوہر بیوی کی تمام ضروریات کی تکمیل کرتا ہو، چاہے وہ نفقہ کے عنوان کے تحت اس پر لازم ہوں یا لازم نہ ہوں، جیسا کہ عموماً مروج ہے، اسی کے پیش نظر فقہاء نے یہ صراحت کی ہے:

''له أن يمنعها من الأعمال كلها المقتضية للكسب؛ لأنها مستغنية عنه لوجوب كفايتها عليه'' (رد المحتار: باب النفقة: مطلب في الكلام على المونسة)۔ (شوہر کو یہ حق ہے کہ وہ بیوی کو ان تمام اعمال سے روک دے جو کسب کے متقاضی ہوں، اس لئے کہ اس کی ضروریات کی تکمیل اس (شوہر) پر لازم ہونے کی وجہ سے بیوی معاشی جدوجہد سے بے نیاز ہے)۔

اگر شوہر محض نفقہ کی تکمیل کرتا ہو، اس کے علاوہ اس کی دیگر وہ ضرورتیں جو نفقہ میں داخل نہیں ہیں وہ اس کا متحمل نہ ہوتا ہو، اور عورت خود اس کی تکمیل کرتی ہو تو پھر اس صورت میں شوہر کو کسب معاش سے روکنے کا حق نہیں ہے، بشرطیکہ بیوی کا یہ عمل اس کے حسن و جمال کو متاثر نہ کرتا ہو اور نہ ہی گھریلو ذمہ داریوں اور شوہر کے حقوق سے غافل کرتا ہو (حوالہ سابق)۔

کسب معاش کے لئے گھر سے باہر نکلنے میں ولی یا شوہر کی اجازت اور محرم کی معیت؟

یہ بات پہلے گزر چکی ہے کہ اگر عورت کی کفالت شوہر یا ولی کی جانب سے ہو رہی ہے تو پھر اس عورت کو کسب معاش کے لئے گھر سے باہر نکلنے کی شرعاً اجازت ہی نہیں ہے اور اندرون خانہ کسب معاش میں مصروف ہونے میں شوہر یا ولی کی اجازت ضروری ہے، تو مجبوری کی حالت میں بیرون خانہ مصروفیت کے لئے اجازت بدرجہ اولی لازم ہوگی، علامہ فخر الدین عثمان بن علی الزیلعی لکھتے ہیں: ''المرأة قبل أن تقبض مهرها لها أن تخرج في حوائجها وتزور الأقارب بغير إذن الزوج، فإن اعطاها المهر ليس لها الخروج إلا بإذن الزوج'' (تبیین الحقائق: باب النفقة)۔

(مہر پر قبضہ سے پہلے عورت کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنی ضرورتوں کے لئے اور اپنے رشتہ داروں سے ملاقات کے لئے شوہر کی اجازت کے بغیر گھر سے نکلے اور اگر شوہر نے مہر ادا کردیا تو پھر اس کو شوہر کی اجازت کے بغیر نکلنے کا حق نہیں ہے)۔

بہرحال کسب معاش کے لئے شوہر کی اجازت کے بغیر عورت گھر سے نہیں نکل سکتی اور بیرون خانہ کسب معاش کا مقام چاہے گھر سے مسافت سفر پر ہو یا مسافت سفر سے کم پر ہو، لیکن اس جگہ جانے آنے کو سفر سے تعبیر کیا جاتا ہو تو، دونوں ہی صورت میں ولی اور شوہر کی اجازت کے ساتھ یہ بھی لازم ہوگا کہ وہ کسی محرم کے ساتھ نکلے، چاہے دن ہو یا رات، کیونکہ عورت کے لئے بغیر محرم کے گھر سے نکلنا درست نہیں ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

''لا يحل لامرأة تؤمن بالله واليوم الآخر أن تسافر سفرا يكون ثلاثة أيام فصاعدا إلا ومعها أبوها أو ابنها أو زوجها أو اخوها أو ذو محرم منها'' (مسلم: ۲۳۹۰)۔

(اللہ پر اور آخرت پر ایمان رکھنے والی کسی خاتون کے لئے یہ حلال نہیں کہ وہ تین دن یا اس سے زائد کی مسافت کا سفر کرے مگر یہ کہ اس کے ہمراہ اس کا باپ یا اس کا بیٹا یا اس کا شوہر یا اس کا بھائی یا اسکا کوئی محرم ہو)۔

اس روایت میں تو مسافت سفر کا ذکر ہے، لیکن ایک روایت میں ایک دن کی مسافت سفر کے بارے میں بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی ارشاد فرمایا ہے، حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''لا يحل لامرأة تؤمن بالله واليوم الآخر تسافر مسيرة يوم إلا مع ذي محرم'' (مسلم: ۲۳۸۷)۔

(اللہ پر اور آخرت پر ایمان رکھنے والی کسی خاتون کے لئے یہ حلال نہیں ہے کہ ایک دن کی مسافت کا سفر کرے مگر یہ کہ اس کے ہمراہ کوئی محرم ہو)۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ دن میں گھر سے اس جگہ جانے کے لئے جس جگہ آنے جانے کو سفر سے تعبیر نہیں کیا جاتا محرم کا ساتھ ہونا ضروری نہیں ہے، بشرطیکہ وہاں تنہا آنے جانے میں کسی قسم کا کوئی فتنہ یا اندیشہ فتنہ نہ ہو، مثلاً عورت اپنے گاؤں یا محلہ ہی میں کسی جگہ جائے اور اس کا ثبوت متعدد صحابیات سے ہوتا ہے، مثلاً:

☆ایک مرتبہ صحابہ کرام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تدفین کے بعد قبرستان سے واپس ہو رہے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک خاتون کو آتے ہوئے دیکھا، جو کہ حضرت فاطمہؓ تھیں، قریب آنے کے بعد آپ نے انہیں پہچانا اور گھر سے نکلنے کے بارے میں پوچھا، تو حضرت فاطمہؓ نے فرمایا کہ میں فلاں گھر میں تعزیت کے لئے گئی تھی (سنن ابوداؤد: ۲۷۱۶)۔

اسی طرح صحابیات اپنے گھروں سے مسجد نبوی میں نماز کے لئے حاضر ہوتی تھیں اور ان کی حاضری کسی خاتون کے ساتھ بھی ہوتی تھی اور تنہا بھی، اس لئے ان واقعات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ عورت محرم کے بغیر اس جگہ جاسکتی ہے جس پر سفر کا اطلاق نہیں ہوتا ہے اور نہ ہی وہاں آنے جانے میں کسی فتنہ کا اندیشہ ہو۔

خواتین کے لئے ملازمت کے شرعی حدود:

خواتین کے لئے ملازمت کے سلسلہ میں چند ایسے شرعی حدود ہیں، جن کی پابندی کی صورت میں ان کے لئے ملازمت اور بیرون خانہ معاشی جدوجہد جائز ہوگی، بصورت دیگر ناجائز ہوگی، وہ شرعی حدود حسب ذیل ہیں:

۱۔ مردوں کے ساتھ خلوت واختلاط نہ ہو، اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''وإذا سألتموهن متاعا فاسألوهن من وراء حجاب'' (احزاب: ۵۳)۔

(جب تم لوگ ان (عورتوں) سے کوئی سامان مانگو تو پردہ کے پیچھے سے مانگو)۔

نیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: ''لا يخلون رجل بامرأة'' (بخاری: ۲۷۸۴)۔ (ہرگز کوئی مرد کسی عورت کے ساتھ خلوت میں نہ رہے)۔

۲۔ وہ ملازمت ایسے عمل کی نہ ہو جس میں معصیت ہو کیونکہ عمل معصیت کی ملازمت مردوں اور عورتوں دونوں ہی کے لئے ممنوع ہے، مثلاً ڈھول بجانے وغیرہ کے اجارہ کو فقہاء نے اسی لئے ناجائز قرار دیا ہے کہ وہ عمل معصیت ہے۔

۳۔ عمل ملازمت معیوب نہ ہو، چاہے وہ عمل مطلقا معیوب ہو یا لڑکیوں کے لئے وہ عمل معیوب ہو، یہی وجہ ہے کہ فقہاء نے ولی کو یہ حق دیا ہے کہ ایسے عمل سے وہ اس کو روک سکتا ہے، جیسا کہ فتاوی ہندیہ میں مذکور ہے:

''إذا آجرت المرأة نفسها بما يعاب به كان لأهلها أن يخرجوها من تلك الإجارة'' (فتاوی ہندیہ: الباب التاسع عشر فی فسخ الاجارہ)۔ (جب عورت نے کسی ایسے عمل پر خود کو اجرت پر رکھا جسے معیوب سمجھا جاتا ہے تو اس کے گھر کے لوگوں کو یہ حق حاصل ہوگا کہ وہ اس کو اس اجارہ سے نکال دے)۔

۴۔ گھر سے زیب وزینت اور خوشبو کے ساتھ نہ نکلے، علامہ ابن ہمامؒ لکھتے ہیں:

''جہاں بھی ہم (فقہاء) نے عورت کے لئے گھر سے نکلنا مباح قرار دیا ہے تو اس شرط کے ساتھ مباح ہے کہ زینت نہ ہو اور ہیئت اس قدر تبدیل ہو کہ اس کی ہیئت مردوں کی نظروں کی داعی اور مائل کرنے والی نہ ہوں'' (فتح القدیر باب النفقہ)۔

۵۔ شرعی حجاب کے ساتھ نکلے اور ملازمت کی جگہوں میں اگر مردوں سے سامنا ہوتا ہو تو مسلسل شرعی حجاب میں رہے اور اپنا چہرہ چھپائے رکھے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

''يا أيها النبي قل لأزواجك وبناتك ونساء المؤمنين يدنين عليهن من جلابيبهن'' (احزاب: ۵۹)۔

(اے نبی اپنی بیویوں، اپنی بیٹیوں اور مومن عورتوں سے کہہ دیجئے کہ وہ اپنے اوپر اپنی چادر لٹکا لیا کریں)۔

۶۔ مردوں سے بات چیت کی ضرورت درپیش ہو تو بات چیت میں لچک اور ہنسی مذاق کا لہجہ اور انداز نہ ہو، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

''فلا تخضعن بالقول فيطمع الذي في قلبه مرض وقلن قولا معروفا'' (احزاب: ۳۲)۔

(تو تم بولنے میں نزاکت مت کرو، کہ ایسا شخص کو خیال ہونے لگتا ہے جس کے قلب میں خرابی ہے اور قاعدہ کے موافق بات کرو)۔

۷۔ اگر گھر سے اتنی دور ملازمت ہو جہاں آنا جانا سفر کہلاتا ہو یا جہاں آنے جانے میں کسی فتنہ کا اندیشہ ہو تو کسی محرم کی معیت میں جائے، جیسا کہ اس کی تفصیل ذکر کی گئی ہے۔

ایسی جگہ ملازمت میں پردہ کے احکام جہاں شریک ملازمت افراد خواتین ہی ہوں، البتہ ذمہ دار نگراں مرد ہوں:

ملازمت کرنے والی خواتین اگر ایسے اداروں میں کام کریں جہاں خواتین ہی خدمت انجام دیتی ہوں اور مردوں کے ساتھ ان کا کسی قسم کا اختلاط نہ ہو اور نہ ہی مردوں سے سامنا ہو اور اس ادارے کے ذمہ دار مردوں کے سامنے بھی ان خواتین کو آنا جانا نہ پڑتا ہو تو اس صورت میں اس حد تک پردہ لازم ہوگا جتنا ایک عورت کو ایک عورت کے سامنے پردہ کرنے کا حکم شریعت نے دیا ہے، شریعت نے ایک عورت کے سامنے عورت کے لئے پردہ کا معیار یہ مقرر کیا ہے کہ ایک عورت کسی عورت کے ناف اور گھٹنے کے درمیان اعضاء کے سوا بدن کے تمام اعضاء کو دیکھ سکتی ہے، الموسوعۃ الفقہیہ میں مذکور ہے:

''فيحل لها أن تنظر من المراة إلى جميع بدنها ما عدا بين السرة والركبة وإلى هذا ذهب الحنفية في الراجح'' (الموسوعة الفقهيه: ماده نظر)۔ (عورت کے لئے حلال ہے کہ وہ عورت کے ناف اور گھٹنے کے درمیانی اعضاء کے سوا پورا بدن دیکھے، راجح قول کے مطابق حنفیہ کا مذہب یہی ہے)۔

البتہ کام کی جگہ پر مختلف مزاج کی خواتین آتی ہیں، جن میں ہوسکتا ہے کہ کوئی نیک ہوں تو کوئی بد بھی ہوں، اس لئے بہتر یہ ہے کہ بقدر ضرورت ہی نیک عورتیں اپنے اعضاء کو بے حجاب کریں، بلکہ اگر بری، بے حیاء اور بے پردہ مسلم یا غیر مسلم عورتیں بھی ساتھ کام کرتی ہوں تو اس صورت میں نیک عورت پر یہ ضروری ہے کہ وہ ایسی عورتوں کے سامنے خود کو پردہ کے حوالے سے محتاط رکھے اور اس کے سامنے اپنی اوڑھنی وغیرہ سر سے نہ ہٹائے، بلکہ اس کے سامنے اپنا کوئی عضو ظاہر نہ ہونے دے، حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں:

''لا يحل للمسلمة أن تراها يهودية أو نصرانية لئلا تصفها لزوجها'' (احکام القرآن: ۱۲،۲۲۲)۔

(کسی مسلم عورت کے لئے یہ حلال نہیں کہ اسے کوئی یہودیہ یا نصرانیہ دیکھے تاکہ وہ اس کے اوصاف اپنے شوہر کے سامنے بیان نہ کر سکے)۔

یہ ساری تفصیل اس وقت ہے جبکہ ملازمت سے وابستہ عورت صرف خواتین کے درمیان ہی اپنی مفوضہ ذمہ داریوں کی تکمیل کرتی ہو اور اس میں مردوں سے بالمشافہ بات چیت وغیرہ کی کوئی ضرورت نہ پڑتی ہو، لیکن اگر ذمہ دار یا نگراں مردوں سے سامنا کرنا پڑتا ہو تو پھر اس وقت عورت پر ''شرعی حجاب'' لازم ہوگا، اور اس کے بغیر مردوں کے سامنے آنا جائز نہیں ہوگا اور نہ ہی مرد ذمہ داروں کے لئے یہ جائز ہوگا کہ پردہ کے بغیر ان جگہوں پر جائیں جہاں عورتیں اپنی ذمہ داریوں کی تکمیل کرتی ہیں۔

سن رسیدہ خواتین اور پردہ:

ایسی خواتین جو حقیقی طور پر سن رسیدہ ہو چکی ہوں، ان کے اور جوان عورتوں کے مابین شرعی نصوص سے "لازمی پردہ" میں فرق معلوم ہوتا ہے، قرآن کریم میں جہاں عام عورتوں کے لئے یدنین علیھن من جلابیبھن اور لا یبدین زینتھن کا حکم ہے، وہیں سن رسیدہ خواتین کے لئے یہ حکم ہے:

"القواعد من النساء اللاتی لا یرجون نکاحا فلیس علیھن جناح أن یضعن ثیابھن غیر متبرجات بزینة وأن یستعففن خیر لھن" (النور:٦٠)۔

(بڑی بوڑھی عورتیں جن کو نکاح کی امید نہ رہی ہو، ان کو اس بات میں کوئی گناہ نہیں کہ وہ اپنے کپڑے (جس سے چہرہ وغیرہ چھپا رہتا ہے، غیر محرم کے روبرو بھی) اتاریں، بشرطیکہ زینت کا اظہار نہ کریں اور اس سے بھی احتیاط رکھیں تو ان کے لئے اور زیادہ بہتر ہے)۔

اس آیت کی مصداق اور حقیقی سن رسیدہ خواتین وہ ہیں جن کی عمر اتنی ہو چکی ہو کہ ان جیسی عورتوں سے شادی کی رغبت کسی مرد میں نہیں ہوتی۔

اس تفصیل کے مطابق اگر کوئی عورت واقع سن رسیدہ ہو چکی ہے تو اس کے لئے مقام ملازمت وخدمت میں اجنبی مردوں کے سامنے صرف اس بات کی اجازت ہوگی کہ اپنا چہرہ کھول لے اور برقعہ یا چادر ہٹائے، اس کے علاوہ دیگر اعضاء کو بے حجاب کرنا، یا اوڑھنی ہٹا کر سر کو ننگا کرنا اس کے لئے بھی جائز نہ ہوگا۔

ایسی ملازمتوں کے مابین فرق جن میں مردوں کا سامنا ہونے میں فرق ہو:

۱۔ ایسی ملازمت جس میں عورت یکسوئی کے ساتھ کسی گوشہ میں کام کرتی ہو اور وہاں زیادہ تر عورتوں کا ہی سامنا ہو، البتہ معدودے چند مرد بھی وہاں آتے جاتے ہوں، یہ ملازمت اس ملازمت سے بہتر ہوگی جس مین کسی گوشہ میں یکسوئی کے بجائے برسر عام اپنی خدمت انجام دینی پڑے اور چونکہ اس میں مردوں سے سامنا کرنا پڑتا ہے، اس لئے ایسی ملازمت میں مقام ملازمت پر مکمل "شرعی حجاب" عورت پر لازم ہوگا، ہاں اگر عورت کسی گوشہ میں یکسوئی کے ساتھ کام کرتی ہو اور عام اوقات میں تو مردوں سے سامنا نہ ہو بلکہ مردوں کے لئے اوقات مخصوص ہوں یا ان کی آمد سے قبل ان کی آمد کی اطلاع کا انتظام ہو تو اس صورت میں جب تک مردوں سے سامنا نہ ہو عورت اپنا چہرہ کھول کر اپنی ذمہ داریوں کی تکمیل میں مصروف رہ سکتی ہے، اور مردوں سے سامنا کرنے کے وقت اس پر شرعی حجاب لازم ہوگا، اس کے بغیر مردوں سے سامنا کرنا اس کے لئے جائز نہ ہوگا۔

۲۔ ایسی ملازمت جس میں یکساں طور پر مردوں اور عورتوں سے سامنا کرنا پڑتا ہو اور کسی گوشہ میں یکسوئی کے ساتھ کام کرنے کے بجائے کسی کھلے اور بے پردہ مقام پر ذمہ داریوں کی تکمیل کرنی پڑتی ہو، ایسی ملازمت اول الذکر قسم کے بالمقابل مرجوح ہوگی اور عورت جب تک اس مقام میں رہتی ہے، اس پر مکمل شرعی حجاب لازم ہوگا، اس کے بغیر اس کے لئے یہ ملازمت جائز نہیں ہوگی، نیز اگر اس جگہ پردہ کے اہتمام یا مردوں سے بات کرنے کے سلسلہ میں شرعی آداب کی رعایت میں کوئی چیز اگر جزوی طور پر بھی رکاوٹ بنتی ہو تو اس کے لئے یہ ملازمت جائز نہیں ہوگی۔

نیز دونوں قسموں میں عورت پر یہ بھی لازم ہوگا کہ مردوں سے کم سے کم بقدر ضرورت بات کرے اور اس کی بات میں ذرا بھی لچک نہ ہو، جس کا حکم اللہ نے عورتوں کو قرآن کریم میں "لا تخضعن بالقول" کے ذریعہ دیا ہے۔

گھر سے دور کسی مقام پر ملازمت کی غرض سے خواتین کا مستقل قیام؟

عورت جب محرم کے بغیر سفر نہیں کر سکتی تو اندرون ملک یا بیرون ملک ملازمت کی غرض سے کسی مقام پر تنہا قیام کرنا بھی اس کے لئے ناجائز ہے، کیونکہ محرم کے بغیر گھر سے دور کسی مقام پر اس کا تنہا قیام خطرناک اور پر فتن ہے اور عورت کے لئے ہر وہ عمل شریعت میں حرام ہے، جس میں اس کی عصمت کو خطرہ ہو اور موجودہ دور کے حقائق نے تو اس خطرہ کو حقیقت میں تبدیل کر دیا ہے، اس لئے کسی مقام پر ملازمت یا کسی اور غرض سے عورت کا تنہا قیام کرنا قطعاً ناجائز ہے۔

ہاں اگر عورت گھر سے دور کسی ایسے مقام پر قیام کرے جو مقام عورتوں کے لئے ہی مخصوص ہو اور وہاں کسی بھی مرحلہ میں (آنے جانے میں یا کسی ضروریات یا ذمہ داری کی تکمیل میں) بے حجابی یا خلوت میں مردوں سے سامنا نہ ہوتا ہو اور وہاں اس کے ساتھ متعدد عورتیں رہتی ہوں اور وہاں تک کوئی محرم لے جا کر اسے چھوڑ آئے، تو چونکہ مخلوط یا عام مقام پر تنہا قیام میں جو فتنے اور خطرات ہیں وہ اس صورت میں نہیں ہیں، اس لئے گھر سے دور ایسی جگہ پر محرم کے بغیر قیام کی گنجائش ہوگی۔

☆☆☆

عورتوں کی ملازمت

مولانا سید حسین احمد[1]

سوال کے جوابات سے پہلے چند باتیں بطور تمہید سمجھنا ضروری ہے:

۱۔ عورت کا گھر سے نکلنے کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ اس کے بارے میں مفسرین کرامؒ کے کلام میں اکثر یہ قید لگی ہے کہ عورت ''ضرورت یا حاجت'' کے وقت گھر سے نکل سکتی ہے، بشرطیکہ پردہ اور حجاب کے احکام کی پابندی کرے، عام حالات میں اس کو گھر میں قرار کا حکم دیا گیا ہے۔

چنانچہ تفسیر عثمانی میں ہے: باقی کسی شرعی یا طبعی ضرورت کی بناء پر بدون زیب وزینت کے متبذل اور ناقابل اعتناء لباس میں مستتر ہوکر احیاناً باہر نکلنا بشرطیکہ ماحول کے اعتبار سے فتنہ کا مظنہ نہ ہو، بلاشبہ اس کی اجازت نصوص سے نکلتی ہے (۳۵۲/۲)۔

تفسیر ابن کثیر میں ہے: '' وقرن فی بیوتکن: ای الزمن بیوتکن فلاتخرجن لغیر حاجة ومن الحوائج الشرعیة الصلاة فی المسجد بشرطه الخ'' (۳،۴۸۲)۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت شعیب علیہ السلام کی صاحبزادیوں کا ماءمدین پر جو قصہ پیش آیا ہے، اس میں حضرت شعیب علیہ السلام کی صاحبزادیوں نے باہر نکلنے اور چوپاؤں کو پانی پلانے کی ذمہ داری لینے کی وجہ اور عذر ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے: ''وأبونا شیخ کبیر''

یعنی باوجود ہمارے حیادار ہونے کے ہمارے گھر سے نکلنے اور مردوں کے سامنے آنے اور باہر کی ذمہ داری نمٹانے کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے والد صاحب ضعیف اور بوڑھے ہیں، وہ یہ کام خود نہیں کر سکتے۔

اس قصہ میں ان مسلمان خواتین کے لئے بہت بڑا سبق ہے جو محض چند ٹکوں کی خاطر گھروں کو چھوڑ کر اپنی شرم وحیا کو داؤ پر لگاتی ہیں، اور بلا ضرورت باہر کی الجھنوں میں اپنے آپ کو پھنساتی ہیں۔

تفسیر مظہری میں ہے: ''امر بالقرار فی البیوت وعدم الخروج بقصد المعصیة کما یدل علیه قوله تعالی: ''ولاتبرجن'' فإنه عطف تفسیری وتأکید معنی ولیس فی الآیة نهی عن الخروج من البیت مطلقاً الخ'' (۷،۳۳۸)۔

نیز حضرت اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے بارے میں بخاری شریف میں مفصل قصہ لکھا گیا ہے کہ وہ اپنے شوہر حضرت زبیر رضی اللہ تعالیٰ کے کھیتوں سے ایندھن وغیرہ لایا کرتی تھیں، حالانکہ اس وقت ان کے والد اور شوہر موجود تھے، اس صورت میں بظاہر کوئی ایسی ضرورت داعی نہیں تھی۔ اس کے تحت ''تکملہ فتح الملہم'' میں لکھا ہے کہ '' ویحتمل أن تکون أسماء رضی الله عنها تخرج مراعیة لأحکام الحجاب الخ'' (۲۸۶،۴)۔

بہرحال ضرورت یا حاجت شرعیہ یا طبعیہ کے وقت عورت کا حجاب کے احکام کو ملحوظ رکھتے ہوئے گھر سے نکلنا بلاشبہ جائز ہے، بلکہ اگر تبرج کے ساتھ نہ ہو تو ضرورت داعیہ کے بغیر بھی پردہ کے ساتھ نکلنے کی گنجائش نکلتی ہے، کیونکہ آیت کریمہ میں خروج سے منع کو تبرج جاہلیہ کے ساتھ مقید کیا ہے، البتہ گھر میں رہنا زیادہ بہتر اور شرعی احکام کے مطابق ہے۔

۲۔ کسب معاش عورت کے لئے اس وقت ضروری ہوجاتا ہے جبکہ اس کے نان ونفقہ کا کوئی انتظام نہ ہو، مثلاً شوہر کا انتقال ہوا، اور کوئی دوسرا اس کے نان ونفقہ کا انتظام کرنے والا نہیں ہے، تو اس صورت میں عورت کے لئے کسب معاش کے بغیر چارہ نہیں، چنانچہ اس صورت میں عورت کو عدت کے اندر بھی نکلنا جائز ہے۔ یا بعض صورتوں میں عورت کے اوپر کسی کا نان ونفقہ واجب ہوجاتا ہے جو بہت ہی نادر صورتیں ہیں، عام حالات میں نان ونفقہ کے وجوب کا تعلق مردوں سے ہے:

---

[1] دارالافتاء دارالعلوم کراچی (پاکستان)۔

البتہ بعض صورتوں میں آیت کریمہ: "وعلی الوارث مثل ذلک" (سورۂ بقرہ: ۲۳۳) کے تحت بعض خواتین پر بھی نان ونفقہ کا وجوب ہوجاتا ہے، مثلاً اگر کوئی معذور ہے، اور کسب سے عاجز ہے، اور اس کا اپنا مال بھی موجود نہیں، اور اس کی بیٹی یا بہن ہے، تو بیٹی پر اس کا نفقہ واجب ہے۔ وغیرہ۔ جیسا کہ بدائع وغیرہ میں ہے:

''ولو كان له بنت واخت فالنفقة على البنت، لأن الولادة لها الخ''

ایسی نادر صورتوں کے علاوہ عورت کے ذمہ کسب معاش کے وجوب کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، بلکہ اس کے ذمہ گھریلوں کام بھی واجب نہیں، شوہر کے ذمہ واجب ہے کہ گھریلو کام کے تکمیل کا انتظام کرے، بلکہ فقہاء کرام نے یہاں تک لکھا ہے کہ بیوی کے نوکر کا خرچہ بھی شوہر اٹھائے گا، چنانچہ ابن عابدین نے نقل کیا ہے: ''ويفرض عليه نفقة خادمها وان كانت من الاشراف فرض نفقة خادمين وعليه الفتوى الخ'' (درمختار)۔

''وقال الطحاوي: لم يختلفوا أن المرأة ليس عليها أن تخدم نفسها وأن على الزوج أن يكفيها ذلك''

(شرح ابن بطال ۱۴،۳۹)۔

۳۔ عورت کے لئے کسب معاش جہاں واجب نہ ہو، وہاں شرائط جواز (جس کی تفصیل آگے آرہی ہے) کو ملحوظ رکھتے ہوئے اگر عورت کسب معاش کرے، تو مباح سمجھا جائے گا، کیونکہ شریعت نے اس کا نان ونفقہ مردوں پر واجب کیا ہے، لیکن اس کو کسبِ معاش سے مکمل طور پر منع نہیں کیا، کسب معاش اس وقت ممنوع ہوگا جبکہ اس میں اور مفاسد موجود ہوں، جیسا کہ آج کل یہ مفاسد پائے جاتے ہیں۔

مذکورہ بالا تمہیدی امور کے بعد اب سوالات کے جوابات ملاحظہ ہوں:

۱۔ جیسا کہ تمہید میں مذکور ہوا کہ عورت کے لئے اصل حکم یہی ہے کہ وہ گھر میں رہے، اور ملازمت کے سلسلہ میں باہر نہ نکلے، نیز ضرورت کے وقت بھی حتی الامکان گھر میں رہتے ہوئے کوئی جائز ذریعہ معاش اختیار کرے، مثلاً سلائی وغیرہ، لیکن اگر کوئی خارجی مفسدہ نہ ہو، اور پردہ اور حجاب کی شرائط پوری ہوں، تو عورت کا کسبِ معاش عام حالات میں جائز ہے۔

۲۔ اصلاً تو خواتین پر نان ونفقہ واجب نہیں، لیکن تمہید کے امر ثانی میں ذکر کردہ تفصیل کے مطابق بہت کم صورتوں میں عورت پر کسی کا نان ونفقہ واجب ہوجاتا ہے، جیسا کہ اقارب کے نفقہ کے ضمن میں کتب فقہ میں مذکور ہے۔

۳۔ تنگی وترشی سے کام چلنے کی صورت میں عورت کے لئے کسبِ معاش کی گنجائش ہے، بشرطیکہ عورت درج ذیل شرائط کی مکمل پابندی کرے:

۱۔ مکمل شرعی پردہ کے ساتھ ہو۔

۲۔ بناؤ سنگھار نہ کیا ہو۔

۳۔ خوشبو نہ لگائی ہو۔

۴۔ راستے میں آتے جاتے وقت غیر محارم کے ساتھ بالکل اختلاط نہ ہو۔

۵۔ جہاں کام کرتی ہو، وہاں بھی غیر محارم مردوں کے ساتھ بالکل اختلاط نہ ہو۔

۶۔ اگر ولی موجود ہو تو اس کی اجازت کے ساتھ ہو، اگر شادی شدہ ہے، تو شوہر کی اجازت سے ہو۔

۷۔ نابالغ بچوں اور متعلقین کے حقوق پامال نہ ہوں۔

لیکن محض معیارِ زندگی کو بلند کرنے یا وقت گذاری اور سرمایہ واثاثہ پیدا کرنے کی غرض سے عورت کا ملازمت کے سلسلہ میں گھر سے نکلنا درج ذیل وجوہات کی بنا پر مناسب نہیں، اور احتیاط کے خلاف ہے:

۱۔ اکثر نصوص میں عورت کے لئے گھر سے نکلنے کو ضرورت یا حاجت کے ساتھ مقید کیا گیا ہے۔

۲۔ مذکورہ بالا شرائط کے مطابق عمل کرنا یا ان کی شرائط کی پابندی فی زمانہ عملاً مشکل ہے، اور ان شرائط کے مطابق عمل نہ کرنے کی صورت میں عورت کے گھر سے باہر نکلنے پر سخت وعیدیں آئی ہیں، چند بطور نمونہ ذیل میں ملاحظہ ہوں:

''عن أبي هريرة- في حديث طويل -قال: قال رسول الله ﷺ: صنفان من أهل النار لم أرهما: قوم معهم سياط كأذناب البقر يضربون بها الناس ونساء كاسيات عاريات مائلات مميلات رؤوسهن كأسنمة البخت لايدخلن الجنة ولايرحن ريحها، وأن ريحها ليوجد من مسيرة كذا وكذا'' (مسلم)۔

''عن أبي موسى رضي الله عنه قال: قال النبي ﷺ: كل عين زانية وأن المرأة إذا استعطرت ثم مرت بالمجلس فهي زانية'' (اخرجه اصحاب السنن)۔

۳۔ شریعت مطہرہ نے عورت کی فطرت اور ساخت کے لحاظ سے اور اس کو عزت وکرامت کا مقام دینے کی غرض سے اس کا نان ونفقہ مردوں پر واجب کردیا ہے، اور بڑی تاکید کے ساتھ اس کی ادائیگی کا حکم دیا ہے، اور ترغیبی انداز میں بھی اس پر ابھارا ہے، چنانچہ حدیث شریف میں ہے:

''إذا أنفق المسلم نفقة على أهله وهو يحتسبها كانت له صدقة'' (متفق عليه)

لھذا بلاضرورت گھر سے نکلنا اور محنت ومشقت اٹھانا اللہ جل شانہ کی اس نعمت کی ناشکری اور اپنے مقام کی ناقدری ہے۔

۴۔ گھر میں رہتے ہوئے کام کے لئے شوہر سے اجازت لینے یا نہ لینے کے بارے میں کوئی صراحت نہیں ملی، تاہم روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر عورت شوہر کے حقوق واجبہ کو پورا کرے، تو اس صورت میں وہ گھر میں کسی بھی مباح کام میں مشغول ہوسکتی ہے، چنانچہ احادیث مبارکہ میں ہے کہ عورت اگر تندور پر روٹی پکانے میں مشغول ہو، اور شوہر سے اس سے اپنی حاجت پوری کرنے کی خواہش کرے اور اس کو بلائے، اور کوئی عذر معقول موجود نہ ہو تو بیوی پر اس کی اطاعت واجب ہے۔

''إذا الرجل دعا زوجته لحاجته فتأته وإن كانت على التنور'' (ترمذی وغیرہ)۔

۵۔ عورت کے لئے شوہر یا ولی کی اجازت کے بغیر گھر سے نکلنا جائز نہیں، خواہ مسافت سفر پر جارہی ہو، یا نہیں، مسافت سفر میں صرف اجازت کافی نہیں، بلکہ محرم کا ساتھ ہونا بھی ضروری ہے، جس کی اجازت ضروری ہے اس میں دن یا رات یا کفالت وغیرہ کی قید نہیں، بلکہ مطلق ہے۔

''قال النووي تحت حديث استيذان المرأة في الخروج إلى المساجد: استدل به على أن المرأة لاتخرج من بيت زوجها إلا بإذنه لتوجه الأمر إلى الأزواج بالإذن الخ'' (۳،۲۶۶)۔

۶۔ عورت کے لئے ملازمت کے سلسلہ میں شرعی حدود وہی ہیں جن کی تفصیل اوپر مذکور ہوئی کہ اگر گھر سے باہر ملازمت کے لئے نکلتی ہے، تو حجاب اور پردہ کے سارے تقاضے کو پورا کرنا ضروری ہے، نیز یہ کہ کسی بھی مرحلہ پر فتنہ کا اندیشہ نہ ہو، نیز بہتر اور مناسب یہی ہے کہ اگر نان ونفقہ کی ضرورت نہ ہو، تو عورت ملازمت سے اجتناب کرے، کیونکہ عورت کے گھر سے نکلنے سے فتنہ کا دروازہ کھل سکتا ہے۔ جیسا کہ حدیث شریف میں ہے:

''عن ابن عمر رضي الله عنهما عن رسول الله ﷺ أنه قال: المرأة عورة وإنها إذا خرجت من بيتها إستشرفها الشيطان'' (الحديث رواه الطبراني في الأوسط)۔

۷۔ اس صورت میں جب بھی کسی غیر محرم سے واسطہ یا بات کرنے کی نوبت آئے، تو شرعی پردہ میں رہتے ہوئے باحجاب ہوکر سامنے آنا یا بات کرنا بقدر ضرورت اور بوقت ضرورت جائز ہوگا۔

۸۔ اس صورت میں جوان عورت کے لئے ان مردوں کے ساتھ اختلاط یا خلوت یا بے تکلفی یا بے حجابانہ سامنے آنا ہرگز جائز نہیں۔ دو۔ اس صورت میں اگر ان باتوں پر عمل کرنا ممکن ہو، تو ملازمت جائز ہے، ورنہ نہیں، البتہ ایسی سن رسیدہ خواتین جن کے بارے میں فتنہ کا اندیشہ نہ ہو، اور جو حد شہوت سے نکلی ہوئی ہو، ان کے لئے چہرہ کھولنے کی گنجائش ہے۔ ''أما العجوز التي لاتشتهى فلا بأس بمصافحتها ومس يدها إذا أمن ومتى جاز المس جاز سفره بها ويخلو إذا أمن عليه وعليها والإفلا'' (شامية وغيرها)۔

۹۔ نامحرم مرد ایک ہو، یا زیادہ، واسطہ زیادہ پڑتا ہو، یا کم، بہرحال نامحرم مردوں کے سامنے شرعی پردہ کا ہونا ضروری ہے، نیز اس کے ساتھ بے تکلف ہوکر بات کرنا یا لچکدار بات کرنا جائز نہیں، اسی طرح نامحرم کے ساتھ خلوت میں ملنا یا ٹھہرنا بھی جائز نہیں، بے پردگی کے زیادہ مواقع میں زیادہ گناہ ہوگا، اور کم مواقع میں کم گناہ ہوگا۔

۱۰۔ اوپر ذکر کردہ تمام شرائط کے نہ پائے جانے کی صورت میں اس کی اجازت نہیں، بالخصوص جبکہ محرم یا شوہر ہمراہ نہ ہو۔

☆☆☆

خواتین کی ملازمت

مولانا محمد مصطفی قاسمی آداپوری[1]

۱۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام نے خاندانی زندگی کے نظام کی بنیاد اسی پر رکھی ہے کہ مرد باہر کا کام کرے اور عورت امور خانہ داری کو انجام دے، یہ یقیناً فطری اصول ہے جو مرد کے لئے بھی رحمت ہے اور عورتوں کے لئے بھی نیز اس میں خاندانی نظام کی بقا واستحکام ہے۔

اسلام نے خواتین کو عزت وحرمت کا جو مقام بخشا ہے اور اس کے تقدس کی حفاظت کی جو تعلیمات دی ہیں وہ دنیا بھر کے مذاہب اور اقوام میں ایک منفرد حیثیت کی حامل ہیں، اسلام نے ایک طرف عورت کی حرمت اور دوسری طرف اس کے جائز تمدنی اور معاشرتی حقوق کا تحفظ کرنے کے لئے جو احکام عطا کئے ہیں ان کی حکمتوں کا تقاضا ہے کہ وہ کسب معاش کی فکر میں ماری ماری نہ پھرے، بلکہ چین وسکون سے اپنے گھروں میں قرار پکڑے۔

اسی لئے شریعت نے شادی سے پہلے معاش کی ذمہ داری باپ پر اور شادی کے بعد شوہر یا اولاد پر ڈالی ہے، لہٰذا ناگزیر ضرورت کو چھوڑ کر عام طور سے اسے معاش کے لئے باہر نکلنے کی ضرورت نہیں۔

اسی غرض کے لئے مرد اور عورت کے درمیان فطری تقسیم کار یہ رکھی گئی ہے کہ مرد کمائے اور عورت گھر کا انتظام کرے اور مرد کا کما کر لانا عورت پر اس کا کوئی احسان نہیں، بلکہ ذمہ داری ہے۔

اگر کوئی مرد اس میں کوتاہی کرے تو عورت بہ زور قانون اسے اس ذمہ داری کی ادائیگی پر مجبور کر سکتی ہے۔

''حضرت حکیم بن معاویہ قشیریؓ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ ہماری بیویوں کا ہم پر کیا حق ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جب تم کھاؤ تو انہیں بھی کھلاؤ اور جب تم پہنو تو انہیں بھی پہناؤ اور چہرے پر مت مارو، اور برا مت کہو اور نہ چھوڑو مگر گھر میں (یعنی اگر اس سے کسی بنا پر الگ رہنا چاہو تو صرف یہ کرو کہ اس کا بستر الگ کردو)'' (ابوداؤد ۱/۲۹۱ کتاب النکاح باب فی حق المرأۃ علی زوجہا)۔

۲۔ شریعت مطہرہ نے خواتین پر نہ ان کا اور نہ ہی ان کے بچوں کا نفقہ واجب کیا ہے، بلکہ اس کی کفالت کی ذمہ داری شادی سے پہلے اس کے والد پر ہے اور شادی کے بعد شوہر پر واجب ہے شوہر کے انتقال کے بعد اولاد پر۔

''النفقة واجبة للزوجة على زوجها مسلمة كانت أو كافرة إذا سلمت نفسها إلى منزله فعليه نفقتها وكسوتها وسكناها'' (فتح القدیر ۴،۳۷۸)۔ (بیوی کا نفقہ شوہر پر واجب ہے مسلمان ہو یا کافر جب کہ اس نے اپنے آپ کو اس کے حوالہ کر دیا اور اسی کے گھر میں محبوس ہو کر رہ گئی تو شوہر پر واجب ہو گیا کہ اس کے نان ونفقہ اور کپڑے اور مکان کا بندوبست کرے)۔

''ونفقة الأولاد الصغار على الأب لا يشاركها فيها أحد كما لا يشاركه في نفقة الزوجة'' (فتح القدیر ۴،۴۱۰ تا ۴۱۲)۔

(اور چھوٹے بچے کا بھی نان ونفقہ باپ پر واجب ہے، اس کی کفالت کی ذمہ داری کی ادائیگی میں کوئی دوسرا شخص ساتھ نہ دے گا، جس طرح بیوی کے نان ونفقہ کی کفالت کی ذمہ داری میں اس کا کوئی شخص ساتھ نہیں دیتا ہے)۔

اس پر اتفاق ہے کہ میاں بیوی دونوں امیر مالدار ہوں تو نفقہ امیرانہ واجب ہوگا اور دونوں غریب ہوں تو نفقہ غریبانہ واجب ہوگا، البتہ جب دونوں کے حالات مالی مختلف ہوں تو اس میں فقہاء کا اختلاف ہے، صاحب ہدایہ نے امام خصاف کے اس قول پر فتوی دیا ہے کہ اگر عورت غریب اور

[1] مدرسہ اسلامیہ شکرپور، بھروارہ، دربھنگہ۔

مرد مالدار ہو تو اس کا نفقہ درمیانہ حیثیت کا دیا جائے گا، کہ غریبوں سے زائد مال داروں سے کم، اور کرخیؒ و امام شافعیؒ کے نزدیک اعتبار شوہر کے حال کا ہوگا، فتح القدیر میں بہت سے فقہاء کا فتوی اسی پر نقل کیا ہے (فتح القدیر ۱/۸۷۳ تا ۴۰۲)۔

۳۔ محض معیار زندگی کو بلند کرنے اور مغربی تہذیب کو اپنانے کی غرض سے عورتوں کے لئے معاشی جدوجہد اختیار کرنا جب کہ گھر کی مالی حالت ایسی ہے کہ تنگی یا ترشی سے کام چل سکتا ہے تو اس صورت حال میں دنیا کمانے میں اس قدر منہمک ہو جانا کہ حقوق اللہ اور حقوق العباد میں خلل واقع ہونے لگے اور دماغی وجسمانی صحت پر برا اثر پڑے جائز نہیں۔

ارشاد باری تعالی ہے: "یا یہا الذین آمنوا لا تلهكم أموالكم ولا أولادكم عن ذكر الله ومن يفعل ذلك فاولئك هم الخاسرون" (سورۂ منافقون: ۹)۔

(اے ایمان والو غافل نہ کردیں تم کو تمہارے مال اور تمہاری اولاد اللہ کی یاد سے اور جو کوئی یہ کام کرے تو وہی لوگ ہیں گھاٹے میں)۔

اور محض وقت گذاری اور سیر و تفریح کی غرض سے عورتوں کے لئے معاشی جدوجہد اختیار کرنا جب کہ گھر کی مالی حالت ایسی ہے کہ تنگی و ترشی سے کام چل سکتا ہے تو اس صورت حال میں ایسی عورتوں کو شتر بے مہار کسب معاش کی اجازت ہرگز شرعی نقطہ نظر سے نہیں دی جائے گی اس میں مفاسد کثیرہ ہیں، جیسے زندگی اللہ تعالی کی دی ہوئی نعمت ہے اسی طرح اللہ تعالی کی دی ہوئی نعمت عظمی وقت بھی ہے، اس کی ہر ہر لمحہ کی قدر کرنے کی ضرورت ہے، لا یعنی چیزوں میں وقت کو برباد کرنا نہیں چاہئے، اس سلسلہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

''حضرت عمرو بن میمونؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو نصیحت کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: پانچ چیزوں کو پانچ چیزوں سے پہلے غنیمت شمار کرو، بڑھاپے سے پہلے جوانی، بیماری سے پہلے صحت و تندرستی کو، افلاس سے پہلے خوش حالی کو، مشاغل سے پہلے فراغت کو، موت سے پہلے زندگی کو''۔

غنیمت شمار کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ان کو لہو و لعب اور فضول، غیر مفید باتوں میں ضائع نہ کیا جائے یعنی اپنی جوانی، صحت، خوش حالی اور فراغ اور زندگی کی نعمت کو قبل اس کے کہ بڑھاپا یا بیماری، افلاس، مشاغل، موت ان نعمتوں کو ہم سے چھین لے ان لمحات میں اعمال صالحہ سے آخرت کا ذخیرہ کرلیا جائے۔

صورت مسئولہ میں اگر ان عورتوں کی ملازمت کرنے کا منشا اور سرمایہ و اثاثہ جمع کرنے کا مقصد پڑوسیوں اور دیگر رشتہ داروں پر شیخی جتانا، فخر و مباحات کرنا اور اترانا ہو تو شرعاً اس کی اجازت نہ ہوگی، اور اگر ان کی نیت ملازمت کرنے کی یہ ہو کہ اپنے تنگ دست اور مفلس و قلاش شوہر، والد، بھائی بہن کی امداد و تعاون کریں گی، مسلم معاشرہ کے بڑے مفاد کی تکمیل میں امداد و تعاون کریں گی، نیک کاموں میں خرچ کریں گی، اپنی اور اولاد کی فلاح بہبود مقصود ہو اور دوسروں کے سامنے ہاتھ پھیلانے سے گریز کی نیت ہو تو ان کے لئے شرعی پردہ اور شرعی حدود میں رہتے ہوئے شوہر، والد کی اجازت سے ملازمت کرنے کی شرعاً گنجائش ہے۔

۴۔ صورت مسئولہ میں اگر خواتین اندرون خانہ ہی اپنی معاشی پسماندگی دور کرنے کے لئے کوئی کسب معاش کا طریقہ اور ذریعہ اختیار کریں تو اس صورت میں بھی اپنے ولی یا شوہر سے اجازت لینی ضروری ہوگی، ارشاد باری ہے:

''اور ان سے مشورہ لے کام میں پھر جب قصد کر چکا اس کام کا تو پھر بھروسہ کر اللہ پر اللہ کو محبت ہے توکل والوں سے'' (سورۂ آل عمران: ۱۵۹)۔

۵۔ اگر عورت کو کسب معاش کے لئے گھر سے باہر نکلنا پڑے تو ایسی صورت میں بھی اس کے لئے ولی یا شوہر سے اجازت لینی پڑے گی، کیونکہ مرد خاندان کا ذمہ دار ہے، اسی لئے کسی پیشہ سے وابستگی کے لئے بیٹی یا بیوی کو مرد سے اجازت لینی ضروری ہے، ارشاد نبوی ہے:

''مرد اپنے گھر والوں کا ذمہ دار ہے اور ان کے بارے میں جواب دہ ہے'' (تفصیل کے لئے دیکھئے: بخاری ۱/۷۴۳، مسلم ۲/۱۲۲)۔

گھر سے نکلنا مسافت سفر یا اس سے زیادہ کے لئے ہو تو عورت کو بلا محرم کے کسب معاش کی جگہ جانا جائز نہیں، اگر کسب معاش کی جگہ مسافت سفر سے کم ہے تو بلا محرم اور شرعی پردے اور شرعی حدود کا لحاظ کرتے ہوئے یا اذن ولی یا شوہر سے کسب معاش کی اجازت ہے، دن کا وقت ہو یا رات کا وقت ہو، ولی اس خاتون کی کفالت کرتا ہو یا نہ کرتا ہو، عورت جوان ہو یا ادھیڑ عمر کی یا بوڑھی ہو شریعت مطہرہ کے جو احکام اوامر ونواہی کے ہیں سب ان کے اوپر نافذ ہوں گے۔

ان ضرورتوں میں حکم شرعی کے اعتبار سے کچھ فرق نہ ہوگا، غرض کہ صورت مسئولہ میں جتنی شقیں ہیں سب میں ولی یا شوہر کی اجازت مشروط رہے گی۔

مفتی تقی عثمانی صاحب کا موقف یہ ہے کہ: صحیح مسلم میں ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: کوئی عورت تین روز (یعنی شرعی مسافت ۴۸ میل) سے زیادہ سفر نہ کرے، الا یہ کہ اس کے ساتھ اس کا شوہر یا اس کا محرم ہو، اس حدیث میں صراحت کے ساتھ عورت کو تنہا سفر کرنے سے ممانعت فرمادی گئی ہے اور جمہور فقہاء نے اسی حدیث سے استدلال کرتے ہوئے فرض حج کے لئے بھی شرعی محرم کے بغیر سفر کو ناجائز کہا ہے، جب کہ اس کے مقابلے میں تعلیم اور کسب معاش تو بہت کم درجہ کا ہے، لہذا کسب معاش اور حصول تعلیم کے لئے اس طرح بغیر محرم کے سفر کرنا جائز نہیں۔

ہاں اگر کوئی عورت ایسی ہے جس کا نہ تو شوہر ہے نہ باپ ہے اور نہ ہی کوئی دوسرا ایسا رشتہ دار ہے جو اس کی معاشی کفالت کر سکے اور نہ خود اس عورت کے پاس اتنا مال ہے جس کے ذریعہ وہ اپنی ضروریات پوری کر سکے تو اس صورت میں اس عورت کے لئے بقدر ضرورت کسب معاش کے لئے شرعی پردہ کی پابندی کے ساتھ گھر سے نکلنا جائز ہے، اور جب یہ مقصد اپنے وطن اور اپنے شہر میں رہ کر بھی بہ آسانی پورا ہو سکتا ہے تو اس کے لئے کسی غیر مسلم ملک کی طرف سفر کرنے کی ضرورت نہیں (مغنی لابن قدامہ ۳؍۱۹۰، فقہی مقالات ۱؍۲۴۸ تا ۲۴۹)۔

خلاصہ: اگر عورت کو کسب معاش کے لئے گھر سے باہر نکلنا پڑے گھر سے نکلنا مسافت سفر یا اس سے زیادہ کے لئے ہو یا اس سے کم کے لئے دن کے وقت ہو یا رات کے وقت ولی اس خاتون کی کفالت کرتا ہو یا نہ کرتا ہو ولی یا شوہر سے اجازت لینی ضروری ہوگی، کسب معاش کے لئے گھر سے باہر نکلنا مسافت سفر یا اس سے زائد کا ہو تو شرعی پردہ اور شرعی حدود کی پابندی کے ساتھ اپنے شوہر یا بیٹا یا بھائی یا باپ یا اور کوئی ذی محرم رشتہ دار کے ساتھ نکلنا جائز ہے، اور اگر مسافت سفر سے کم کی دوری پر نکلنا ہے تو اس میں گنجائش ہے۔

۶۔ شرعی دائرے میں رہتے ہوئے ملازمت سے خواتین کی وابستگی کو موجودہ دور میں ایک اہم اور نازک ترقی شمار کیا جاتا ہے جس کے آثار اقتصادی اور سماجی زندگی کے بیشتر گوشوں میں دیکھنے کو ملتے ہیں۔

عورت کے لئے کسب معاش کرنا شرعی نقطہ نظر سے حرام نہیں ہے، اس لئے ضرورت پڑنے پر وہ کسب معاش کے جتنے ذرائع اور وسائل ہیں ان کو اپنا کر وہ اپنی کفالت آپ کر سکتی ہے، شریعت اسلامیہ کے قوانین وضوابط کی رعایت کرتے ہوئے بلاتردد تجارت وزراعت، حرفت وصنعت، ملازمت، گلہ بانی، دکانداری، گھریلو دستکاری، وغیرہ کا پیشہ اختیار کر کے کسب معاش کر سکتی ہے۔

مسلم معاشرہ کو ایسا ماحول واسباب فراہم کرنا چاہئے کہ کام کرنے والی خواتین اپنی ملازمت اور خاندان دونوں کی ذمہ داریوں کو بہ حسن وخوبی انجام دے سکیں۔

۷۔ عورتوں کا گھر سے نکلنا بہت بڑا فتنہ ہے، اس لئے فقہاء کرام نے مسجد کی جماعت، جمعہ اور وعظ سننے کے لئے عورتوں کے نکلنے کو ناجائز قرار دیا ہے، جب ایسی اہم عبادات وضروریات دین کی خاطر تھوڑے وقت کے لئے قریب تر مقامات تک نکلنے پر بھی اس قدر پابندی ہے تو ملازمت پر جانے کے لئے شتر بے مہار جانے کی کیسے اجازت ہوگی؟ یہاں تو ہر قسم کے آدمی ہوتے ہیں جن سے مسلم عورت کو پردہ کرنا ضروری ہے، شرعی پردہ کا مکمل اہتمام کرنا ہوگا، خوشبو سے پرہیز، ساتر لباس، خواتین کی جگہ سے ادارہ کے ذمہ دار مرد کی جگہ اتنی دور کہ ایک دوسرے کی آواز وہاں تک نہ پہنچ سکے، اور جب ذمہ دار ادارہ کا سامنا ہو تو پردہ کے ساتھ بہ قدر ضرورت بات چیت، وغیرہ۔

ملازمت کرنے والی خواتین اگر ایسے اداروں میں کام کریں (خواہ تعلیمی ادارے ہوں یا دوسرے) جہاں خواتین ہی خدمت انجام دیتی ہوں اور کام کی جگہوں میں مرد نہ ہوتے ہوں، البتہ ادارہ کے ذمہ دار مرد ہوں تو اس صورت میں بھی بھرپور پردہ کی ضرورت ہے، شریعت مطہرہ نے عورت کے درمیان جو امتیازی شان رکھی ہے اس کی رعایت ضروری ہے، میل جول کے آداب کی رعایت بھی ضروری ہے، نگاہیں نیچی رکھی جائیں، تنہائی اور اختلاط سے گریز کیا جائے، کسی نامحرم شخص سے تنہائی میں نہ ملے وغیرہ۔

۸۔ پردہ کے متعلق اسلام نے مرد و عورت کے لئے ایسے ایسے اصول بنائے ہیں جن کی پابندی سے ان کی عفت و عصمت پر حرف نہ آئے اور وہ بدی کے ارتکاب سے محفوظ رہیں، ازواج مطہرات کو خطاب کرتے ہوئے اللہ تعالی نے فرمایا: "وقرن في بيوتكن ولا تبرجن تبرج الجاهلية الاولى" (سورۂ احزاب: ۳۳) (اور اپنے گھروں میں بیٹھی رہو اور جاہلیت کی طرح زیب و زینت کا اظہار نہ کرتی پھرو)۔

خلاصہ: اگر عورت ایسی جگہ کام کرے جہاں مرد کارکن بھی ہوں تو اس وقت خاتون کارکنوں کے لئے پردہ کے وہی حدود ہوں گے جو شریعت مطہرہ نے متعین کئے ہیں، اس سلسلہ میں سن رسیدہ خواتین، ادھیڑ عمر اور جوان عورتون کے درمیان کوئی امتیازی فرق نہ ہوگا، شریعت مطہرہ کا قانون سب کے لئے یکساں ہے، عصر حاضر کی سن رسیدہ خواتین بھی جوان عورتوں کی طرح ہیں۔

اگر پیشہ ورانہ کام مردوں کے ساتھ عورتوں کی میل جول کے متقاضی ہوں تو مرد و زن دونوں کے لئے میل جول کے آداب کی رعایت ضروری ہے، مثلاً لباس ساتر ہو، نگاہ نیچی ہو، تنہائی اور اختلاط سے پرہیز کیا جائے، اسی طرح طویل اور بار بار میل جول سے پرہیز کیا جائے۔

۹۔ سماجی زندگی میں عورتوں کی شرکت اور مردوں کے ساتھ میل جول کے سلسلہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ آداب مقرر کئے ہیں، ان کی پاس داری سے اخلاق و آبرو کی حفاظت ہوتی ہے، سنجیدہ اور بامقصد زندگی کا قافلہ رواں دواں رہتا ہے، نیکی اور بھلائی کو فروغ ملتا ہے، برائی دور ہوتی ہے، اور غلط جذبات سرد پڑتے ہیں، لباس و آرائش، گفتار و رفتار کے اندر اگرچہ مرد کے مقابلہ عورت پر کچھ زائد پابندیاں رکھی گئی ہیں، لیکن زندگی کے مصالح اور جائز ضروریات کی تکمیل کے لئے خندہ جبیں کے ساتھ عورت انہیں قبول کرتی ہے، یہ مصالح اور ضروریات جس قدر زائد ہوں گی، مردوں سے ربط و ملاقات کی ضرورت اسی قدر زیادہ ہوگی، اور مصالح و ضروریات کی قلت کی صورت میں مردوں کے ساتھ میل جول بھی کم ہوں گے (ترمذی ۱/۱۴۰، بخاری ۲/۷۸۷، مسلم ۲/۲۱۶)۔

۱۰۔ مسلمان عورت کے لئے ملازمت کی غرض سے اپنے گھر اور اپنوں سے دور ہو کر بلا محرم تن تنہا اندرون ملک یا بیرون ملک خواہ مسلم ملک ہو یا غیر مسلم ملک کا سفر کرنا جائز نہیں ہے، اسی طرح تنہا بلا محرم کے خواہ مسلم ملک ہو یا غیر مسلم ملک وہاں مستقل قیام کرنا بھی جائز نہیں ہے (بخاری ۱/۲۵۰ تا ۲۵۱، مسلم ۱/۴۳۲ تا ۴۳۴، موطا امام مالک ص ۳۵۸)۔

"عن ابي معبد سمعت ابن عباس يقول سمعت النبي ﷺ يخطب يقول لايخلون رجل بامرأة إلا ومعها ذو محرم ولا تسافر المرأة إلا مع ذي محرم فقام رجل فقال يا رسول الله! إن امرأتي خرجت حاجة أواني اكتتبت في غزوة كذا وكذا! قال: انطلق فحج مع امرأتك" (مسلم ۱/۴۳۴، كتاب الحج باب سفر المرأة مع محرم الى الحج وغيره، ابوداود ۱/۲۴۱ تا ۲۴۲، كتاب المناسك باب في المرأة تحج بغير محرم، شرح معاني الآثار ۱/۲۵۶ تا ۲۵۹، كتاب مناسك الحج باب حج المرأة بغير محرم، بخاري ۱/۲۵۰ تا ۲۵۱، كتاب المناسك باب حج النساء، موطا امام مالك، ص ۳۸۵، واللفظ للمسلم)۔

مفتی تقی عثمانی صاحب کا موقف ہے کہ "ایک مسلمان عورت کا حصول معاش یا حصول تعلیم کے لئے محرم کے بغیر تنہا غیر مسلم ممالک کا سفر کرنا جائز نہیں، اسی طرح قیام کرنا بھی جائز نہیں، ہاں! اگر کسی عورت نے محرم کے ساتھ کسی غیر مسلم ممالک کا سفر کیا تھا اور وہاں رہائش پذیر ہو کر اس کو اپنا وطن بنالیا تھا پھر یا تو اس عورت کے محرم کا وہاں انتقال ہو گیا یا کسی وجہ سے وہ محرم وہاں سے سفر کر کے کسی دوسری جگہ چلا گیا اور وہ عورت وہاں تنہا رہ گئی اس صورت حال میں اس عورت کے لئے وہاں تنہا قیام کرنے میں کوئی حرج نہیں بشرطیکہ وہ عورت وہاں رہ کر شرعی پردہ کی پابندی کرے (فقہی مقالات ۱/۲۴۹)۔

☆☆☆

خواتین کی ملازمت کے چند شرعی اور غور طلب امور

مفتی احمد نادر القاسمی [1]

ایسے تو ہر دور میں خواتین زندگی کی ڈور کو آگے بڑھانے میں مردوں کے شانہ بشانہ رہی ہیں اور رہنا بھی چاہیے، مگر نظام خداوندی ایسا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مرد وعورت کی جسمانی ساخت، طاقت وقوت میں فرق اور مزاج میں سختی ونرمی کو ملحوظ رکھتے ہوئے دونوں کے درمیان کارہائے حیات کی معتدلانہ تقسیم کردی ہے اور یہ تقسیم بھی فطری ہے، کوئی قانونی نہیں ہے، قانونی اور شرعی طور پر صرف اور صرف بچوں کی پرورش وپرداخت کی ذمہ داری خواتین پر ڈالی گئی ہے اور وہ بھی اس وقت جب باپ اس کی حیثیت نہ رکھتا ہو، اگر آپ شریعت اسلامی اور فقہی نقطۂ نظر سے دیکھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ عورتوں پر صرف دو ذمہ داریاں ڈالی گئی ہیں ایک بچوں کی نگہ داشت اور حضانت وپرورش اور دوسرے شوہر کے گھر کی پاسبانی ونگہ بانی، ان کے علاوہ اور کوئی کام عورت کے ذمہ قانونی طور پر شریعت نے نہیں رکھا ہے۔ زندگی کے باقی امور میں اگر عورت از خود ہاتھ بٹاتی ہے، تو یہ اس کے اخلاقانہ کردار کے دائرے میں آتا ہے، اس سلسلہ میں نصوص سے بھی صرف اتنا ہی اشارہ ملتا ہے، جیسا کہ احادیث میں صراحت ہے۔

اس کے پیچھے شریعت کی صرف دو منشاء ہے: ایک عورتوں کی جسمانی نزاکت اور ضعف کا خیال، اور دوسرے اس کی عصمت کی حفاظت۔ لہذا جہاں کہیں بھی یہ دونوں چیزیں متاثر ہوں گی، اس سے صنف نازک اور آبگینوں کو انصاف کے تقاضے سے تحفظ فراہم کرنا مردوں پر قانوناً وشرعاً لازم ہوگا، اور اس کے خلاف کرنا خواتین کے ساتھ ناانصافی ہوگی۔

اس مختصر تمہید کے بعد خواتین سے متعلق چند حقوق کا اسلامی، قانونی اور سماجی نقطۂ نظر سے اور اسلامک فقہ اکیڈمی سے جاری کردہ سوالنامہ کے دائرہ میں رہتے ہوئے جائزہ لیا جارہا ہے۔

۱۔ عورت اور کسب معاش:

ذمہ دارانہ حیثیت سے کسب معاش کو عورتوں کے لیے شریعت امر مباح کے درجہ میں رکھتی ہے، اس لیے کہ کسب معاش انسان کے لیے اس وقت واجب ہوتا ہے، جب خود اس کا اور اس کے ماتحتوں کا نفقہ اور اس کی کفالت کی ذمہ داری خود اس پر ہو، اور عورتوں کو ہر مرحلہ میں شریعت نے اس سے آزاد رکھا ہے، اگر غیر شادی شدہ ہے تو اس کا نفقہ اس کے باپ پر، اور منکوحہ ہے تو اس کے شوہر پر اور ماں ہے اور شوہر نہیں ہے تو اس کی بالغ اولاد پر۔ اس لیے وجوبی طور پر کسب معاش کی ذمہ داری عورت پر شریعت نے ڈالی ہی نہیں ہے۔ البتہ اگر کسب معاش سے عورت از خود جڑنا چاہتی ہے تو ممنوع بھی نہیں ہے۔ بشرطیکہ کسی کی زوجیت میں نہ ہو اور ہر حال میں عزت وعصمت محفوظ و مامون ہو، اور اس سلسلہ میں قرآن وسنت کے وہ نصوص جن میں معاش ومعاد کے تعلق سے مردوں کو مخاطب کیا گیا ہے، خواتین بھی ان کی مخاطب ہیں، چنانچہ ارشاد باری ہے:

= "یأیها الذین اٰمنوا کلوا من طیبات ما رزقناکم واشکروا لله إن کنتم إیاه تعبدون" (سورہ بقرہ: ۱۷۲)۔

= "ومن عمل صالحاً من ذکر أو أنثى فلنحیینه حیاة طیبة الخ۔" (سورہ نحل: ۹۷)۔

= "وللرجال نصیب مما اکتسبوا وللنساء نصیب مما اکتسبن۔" (سورہ نساء: ۳۲)۔

= "یأیها الذین آمنوا أنفقوا من طیبات ما کسبتم ومما أخرجنا لکم من الأرض" (سورہ بقرہ: ۲۶۷)۔

جس طرح عبادات بدنیہ اور لسانیہ نیک اعمال ہیں، اسی طرح حلال روزی کمانا بھی عمل صالح ہے، اگر کوئی خاتون پورے آداب واخلاق اور شرعی پردے

---

[1] اسلامک فقہ اکیڈمی (انڈیا)۔

کے ساتھ جہاں عزت وآبرو بھی مکمل محفوظ و مامون ہو بزنس یا ملازمت کرتی ہے، تو شریعت نے اس سے منع نہیں کیا ہے۔ لہذا اگر کوئی خاتون شوہر کے انتقال یا ماں باپ کے کسب معاش سے معذور ہونے کی صورت میں سروس یا تجارت کرتی ہے اور اپنے بچوں اور والدین کی کفالت کرتی ہے، تو وہ دوہرے اجر کی مستحق ہوگی۔

۲۔ نان ونفقہ اور خواتین:

شریعت نے اور خود دنیا کے تمام ملکی قوانین نے بھی عورتوں کے نان ونفقہ کی ذمہ داری مردوں پر ڈالی ہے، اسے کسب معاش پر مجبور نہیں کیا ہے، بلکہ بعض حالات میں باپ پر اور بعض حالات یعنی شادی کے بعد شوہر پر واجب ہے۔ لہذا شرعی نقطہ نظر سے عورت اور بچوں کا نفقہ مرد پر واجب ہونے کی وجہ سے کسب معاش اور نفقہ کی ذمہ داری عورت پر نہیں ہے۔

- ''وعلى المولود له رزقهن وكسوتهن بالمعروف'' (سورہ بقرہ: ۲۳۳)۔

اور اگر بچے یتیم ہوجائیں تو بھی عورت پر اس کے نفقہ کی ذمہ داری شریعت نے نہیں ڈالی ہے، بلکہ اس کی کفالت کی ذمہ داری بیت المال پر رکھی گئی ہے اور اگر بیت المال نہ ہو، تو جماعت المسلمین کے ذمہ ہے، الا یہ کہ عورت خود اپنی مرضی سے کسب معاش کرے اور بچوں کی پرورش کا بوجھ برداشت کرے۔

۳۔ معیار زندگی کو بلند کرنے کے لیے عورتوں کا کسب معاش کرنا:

گھر کی مالی حالت اچھی ہو یا خراب اگر مرد زندہ ہے تو عورتوں کو کسب معاش کیلئے گھر سے باہر نہیں جانا چاہیے، لیکن اگر شوہر اجازت دے اور دوران ملازمت غیر محرموں کا سامنا نہ ہوتا ہو تو گھر سے باہر ملازمت یا تجارت میں کوئی مضائقہ نہیں ہے، کہ یہ امر مباح ہے، البتہ اگر اس سے کسی قسم کے فتنہ کا اندیشہ ہو یا بچوں کی نگہداشت اور پرورش میں خلل واقع ہوتا ہو تو چونکہ یہ شرعی ذمہ داری ہے، جو متاثر ہورہی ہے، ایسی صورت میں محض معیار زندگی کو بلند کرنے کیلئے معاشی جدوجہد کرنا عورتوں کیلئے ذمہ داریوں سے گریز یا لاپرواہی کی وجہ سے شرعاً درست نہیں ہوگا۔

اس کے علاوہ یہ بھی کہ موجودہ عہد میں خواتین کے لیے کسب معاش اتنا آسان نہیں ہے، بے شمار اندیشے اور خطرات درپیش رہتے ہیں، نیز یہ ممکن بھی نہیں ہے کہ کسی دفتر یا آفسز میں یہاں تک سیکولر تعلیمی اداروں میں بھی غیر محارم کے ساتھ اختلاط نہ ہو، اس لیے موجودہ حالات کو کسی بھی قیمت پر فتنہ سے مامون نہیں کہا جاسکتا اور نہ ہے۔

اس لیے مزید کی تلاش کے لیے گھر سے باہر جاکر خواتین کے ملازمت کو کسی بھی طرح جائز نہیں کہا جاسکتا، مجبوری کا حکم الگ ہے۔ ''وقد فصل لكم ما حرم عليكم الا ما اضطررتم إليه الخ'' (سورہ انعام: ۱۱۹) سے اس کا جواز ثابت ہوگا۔

۴۔ اندرون خانہ معاشی سرگرمیاں جاری رکھنا:

اگر بچوں کی نگہداشت اور ضروری امور انجام دینے میں کوئی رکاوٹ نہ ہو تو شوہر کی اجازت سے ہلکے پھلکے کام جیسے کشیدہ کاری، تکیہ وغیرہ کے غلاف اور موجودہ دور میں کمپیوٹر کے ذریعہ ٹریڈنگ، سلائی اور کاغذ کے تھیلے وغیرہ بنانے کا کام کرسکتی ہے، اس میں گرانباری بھی نہیں ہے اور کسی قسم کا کوئی فتنہ بھی نہیں ہے۔

البتہ ایسے کام جس سے اس کی جاذبیت اور مثلاً حسن متاثر ہوسکتا ہو یا صحت ڈھلتی اور گرتی ہو اور شوہر اس سے منع کرے تو پھر اس کا ترک لازم ہوگا، اس کی صراحت ہمارے قدیم فقہاء نے بھی کی ہے کہ اگر سوت کاتنے سے عورت کا حسن متاثر ہوتا ہو اور شوہر چاہے تو منع کرسکتا ہے اور جبر بھی کرسکتا ہے، خلاصہ یہ کہ اس صورت میں بھی ولی یا شوہر کی اجازت ضروری ہوگی (تفصیل کے لئے فتح القدیر، بدائع اور البحر الرائق وغیرہ کے باب النفقات دیکھے جاسکتے ہیں، نیز الفقہ الاسلامی وأدلتہ ۱۰/۷۸۰۳)۔

۵۔ کسب معاش کے لیے عورت کا گھر سے باہر جانا:

فی زمانہ بہت سی خواتین شادی سے پہلے ہی ملازمت سے وابستہ ہوجاتی ہیں، ایسی صورت میں دو باتیں قابل توجہ ہیں: ملازمت پیشہ خواتین نکاح کے وقت ہی اگر یہ شرط لگادیتی ہیں کہ وہ ملازمت سے دستبردار نہیں ہوں گی اور مرد اس شرط کو قبول کرلیتا ہے تو پھر عورت کے لیے اپنی ملازمت جاری رکھنا جائز ہوگا اور شوہر اگر بعد میں منع کرنا چاہے تو منع نہیں کرسکتا۔

''لو تزوجها واشترطت عليه أن لايمنعها من الاشتغال خارج البيت، أولا يمنعها من الاستمرار في وظيفتها في الدولة، فهذا الشرط ـ كما يبدو لي ملزم للزوج، فإذا أراد منعها فلم تمتنع، فلاتكون ناشزة بخروجها لأعالها خارج البيت بناء على ما اشترطه عليه في عقد النكاح۔'' (المفصل في أحكام المرأة للدكتور عبدالكريم زيدان: ۱۶۶/۷)۔

البتہ اگر نکاح کے وقت ایسی کوئی شرط عورت کی جانب سے نہیں لگائی گئی تھی اور مرد کو اس کی ملازمت کا بھی علم تھا، پھر بھی ملازمت سے منع کرنا چاہے تو کرسکتا ہے (دیکھئے: حوالہ مذکور: ۱۶۶/۷)۔

اور اگر شوہر کے منع کرنے کے باوجود وہ ملازمت کو جاری رکھتی ہے تو ناشزہ شمار ہوگی اور شوہر سے نفقہ کی مستحق نہیں ہوگی، اگرچہ دن میں آفس میں اور رات کو شوہر کے گھر میں رہتی ہو، اس لیے کہ اس صورت میں ناقص سپردگی ہے۔

''فلانفقة لها لنقص التسليم وبه عرف جواب واقعة في زماننا أنه لو تزوج من المحترفات التي تكون بالنهار فيمصالحها وبالليل عنده فلا نفقة لها۔'' (المفصل في أحكام المرأة: ۱۶۶/۷، بحواله الدر المختار: ۳/۵۷۷)۔

اور اگر ایسی جگہ ملازمت کرتی ہو، جہاں غیر محرموں کا سامنا ہوتا ہو یا راستہ میں مردوں کے ساتھ جانا پڑتا ہو، جیسا کہ فی زمانہ ہو رہا ہے۔ ظاہر ہے ایسی صورت میں عورتوں کی عصمتیں محفوظ نہیں ہیں، اس پہلو کو بھی مدنظر رکھنا ہوگا اور اس کے نتیجہ میں جو خرابیاں پیدا ہو رہی ہیں اور خواتین کے فتنہ میں پڑنے، یہاں تک کہ شادی شدہ خواتین کے غیر مردوں کے ساتھ شوہر اور بچوں کو چھوڑ کر فرار تک ہوجانے کے واقعات جو رونما ہو رہے ہیں، وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہیں، عمومی اجازت دینے میں ہمیں ان پہلوؤں کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔

تاہم وہ خواتین جن کے شوہر یا اولیاء اپنی بدبختی یا معذوری کی وجہ سے خواتین کی واجبی ضروریات کی تکمیل نہیں کرتے ان کے ساتھ مجبوری ہے اور مجبوری کی صورت میں خواتین کا ملازمت کے لیے گھر سے باہر جانا پورے آداب شرعی کے ساتھ مباح ہوگا اور وہ مضطر کے درجہ میں ہوگی اور ایسی صورت میں شوہر یا اولیاء کی اجازت بھی ضروری نہیں ہوگی، اس کی نظیر ماہرین قانون اور فقہاء کے یہاں بھی ملتی ہے، قرآن نے خود مضطر کے سلسلہ میں امر ممنوع کے بھی ارتکاب کی اجازت دی ہے:

=''فمن اضطر غير باغ ولاعاد'' (سورہ انعام: ۱۴۵)۔

=''والحق على أن المفتي أن ينظر في خصوص الوقائع، فإن علم في واقعة عجز هذه المختلعة عن المعيشة إن لم تخرج، أفتاها بالحل، وإن علم قدرتها أفتاها بالحرمة۔'' (كما في فتح القدير، درمختار مع الرد)۔

اور حنابلہ کے یہاں بھی اس کی صراحت ملتی ہے: =''وإن لم يقم بحوائجها فلا بدلها من الخروج۔'' (كشاف القناع)۔

اجازت کے بعد ملازمت سے روکنا:

ساتھ ہی اس بات کو بھی ملحوظ رکھنا ضروری ہے کہ نکاح کے وقت اگر شوہر نے ملازمت کی اجازت دیدی، مگر زمانہ اور حالات کی وجہ سے اس سے عار محسوس کرتا ہے، یا وہ اس بات کو محسوس کرتا ہے کہ ملازمت کرنے میں کسی بھی ناحیہ سے اور اجانب سے اختلاط کی وجہ سے عصمت محفوظ نہیں رہ سکتی تو نکاح کے وقت اجازت کے باوجود منع کرنے کا مجاز ہے اور عورت ملازمت کے سلسلہ میں اپنے شوہر کے حکم کی پابند ہوگی۔

''ولهن مثل الذي عليهن بالمعروف وللرجال عليهن درجة'' (سورۂ بقرہ: ۲۲۸)۔

''الرجال قوامون على النساء بما فضل الله بعضهم على بعض'' (سورۂ نساء: ۳۴)۔

''ألا كلكم راع وكلكم مسؤل عن رعيته'' (متفق علیہ)۔

موجودہ زمانہ کا فتنہ:

دور جدید میں یہ رجحان بڑی تیزی سے بڑھا ہے کہ عورتوں کو اپنے پاؤں پہ کھڑا کیا جائے، یہ دراصل ایک فتنہ ہے اور خواتین کے استحصالی ذہنیت کی پیداوار

ہے، اس بات سے انکار کیا جاسکتا ہے کہ خواتین کو باصلاحیت اور معاشرہ کی تعمیر میں پائیدار کردار نبھانے کے لائق بنانا چاہیے، مگر معاشرہ کی تعمیر و ترقی اور انہیں اپنے پاؤں پہ کھڑا کرنے کے بہانے ان کو کارخانوں اور آفسز میں ملازمت کے لیے تیار کیا جائے اور انہیں سکے ڈھالنے کی مشین بنایا جائے یہ ان کی ذات اور شخصیات کے ساتھ ناانصافی اور ان کا غلط استعمال اور استحصالی فتنہ ہے۔ کیونکہ ان کی ضروریات کی تکمیل کی ذمہ داری ان پر نہیں، بلکہ ان کے اولیاء اور ذمہ داروں پر ہے، اس لئے اپنے پاؤں پہ کھڑا کرنے کا کوئی مطلب ہی خواتین کے ساتھ نہیں بنتا، یہ ایک لغو اور استحصالی نظریہ ہے۔ ڈاکٹر مصطفی سباعی نے لکھا ہے:

''فلسفة الاسلام أن البنت والمرأة بوجه عام لايصح أن يكلف بالعمل تنفق على نفسها، بل على أبيها أو زوجها أو أخيها مثلاً أن يقوم بالانفاق عليها لتتفرغ لحياة الزوجية والأمومة'' (المرأة بين النفقة والقانون:۱۵)۔

(اسلام کا فلسفہ خواتین کے بارے میں یہ ہے کہ ایک لڑکی اور عورت کے لیے عام حالات میں یہ بات درست نہیں ہے کہ اس کو کسب معاش کے لیے کام کاج کرنے کا مکلف بنایا جائے کہ وہ خود کمائے اور اپنی ذات پر خرچ کرے، بلکہ ان کے اخراجات کی ذمہ داری ان کے باپ، شوہر اور بھائی پر ڈالی گئی ہے، تاکہ وہ اپنے آپ کو مکمل طور پر ازدواجی زندگی کے تقاضے اور مکمل طریقہ سے ایک باصلاحیت ماں کا کردار ادا کرنے کے لیے فارغ کرسکے)۔

اسی طرح حدیث شریف میں ہے: ''ولهن عليكم رزقهن وكسوتهن بالمعروف'' (صحیح مسلم)۔

اس لیے عورتوں کو اپنے پاؤں پہ کھڑے ہونے کا فتنہ کھڑا کرنا، ان کو غلط راستہ پر ڈالنے کے لیے ورغلانا ہے، جس کی کسی بھی قیمت پر حوصلہ افزائی نہیں کی جاسکتی، نیز معاشرے کی تعمیر و ترقی کے خواتین کو لائق بنانے کا مفہوم یہ نہیں ہے کہ وہ ایک سوشل ورکر بن جائے، بلکہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ وہ ایک باصلاحیت ماں کا کردار ادا کرنے کے لائق ہو اور بچوں کی ایسی تربیت کرے کہ آنے والے وقت میں وہ اچھے سماج کا بہترین اور لائق مند انسان اور حصہ بن سکے۔

تحفظ عصمت کا جامع اصول:

یہ بات بھی ذہن نشیں رہے کہ خواتین کی عزت و آبرو کے تحفظ میں اسلام کا دوٹوک اصول ہے کہ: ''تنہائی میں ایک مرد اور عورت کے درمیان تیسرا شیطان ہوتا ہے'' (مشکوۃ ۲/۲۶۹) یعنی وہ اس کو گناہ پر آمادہ کرتا ہے۔ اس کو کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ یہ دراصل خواتین کے تحفظ کا اعلیٰ درجہ کا اصول ہے، جسے پوری دنیا کو اختیار کرنا چاہیے۔

اسلام یہ نہیں کہتا کہ عورت کچھ نہیں کرسکتی، بلکہ وہ سب کچھ کرسکتی ہے جو مرد کرتا اور کرسکتا ہے، مگر ہر کام خواتین سے لینا یا اس پر اکسانا، یا اس کے لئے تیار کرنا یہ نہ تو کسی طرح کی دانشمندی ہے اور نہ ضروری، بلکہ ہر کام ان سے کروانا اور اور اس کی طاقت و بساط سے زیادہ ان پر ذہنی اور جسمانی بوجھ ڈالنا یہ ظلم ہے، اور اسلام اس کی اجازت نہیں دے سکتا۔

خلاصہ کلام یہ کہ:

۱۔ جہاں خواتین کی عصمت خطرات اور اندیشے لاحق ہوں وہاں ملازمت جائز نہیں ہے۔

۲۔ ایسی جگہ ملازمت جائز نہیں جہاں صرف ایک مرد اور ایک عورت ہی رہتی ہو۔

۳۔ ان شعبوں میں ملازمت جائز نہیں، جن میں مردوں کے ساتھ اختلاط ہو اور مل کر کام کرنا پڑے۔

۴۔ اگر شادی کے وقت شوہر نے ملازمت کی شرط قبول کرلی ہو، مگر شوہر محسوس کرتا ہے کہ ملازمت میں عصمت محفوظ نہیں ہے، بچوں کی پرورش و پرداخت میں اور اس کی ذات سے متعلق وظائف کی ادائیگی میں خلل واقع ہوتا ہے تو شوہر اس سے منع کرسکتا ہے۔

۵۔ جہاں صرف خواتین ملازمت کرتی ہیں، غیر محرم مرد نہیں، ہوتے وہاں آداب شرعی کے ساتھ ملازمت کرنے کی اولیاء اور خاوند کی اجازت سے جائز ہے۔

۶۔ غیر شادی شدہ بچیوں کو والدین کی طرف سے، یا شدی شدہ خواتین کو خاوند کی طرف سے ملازمت پر مجبور کیا جانا قطعاً جائز نہیں ہے۔

۷۔ موجودہ حالات میں جب تک ضرورت شدیدہ نہ ہو، محض معیار زندگی بلند کرنے کے لئے، ملازمت مامون ماحول نہ ہونے کی وجہ سے جائز نہیں ہے۔

☆☆☆

خواتین کی ملازمت اور عدل

مولانا عبداللہ خالد[1]

اسلام نے بندوں پر جو احسانات کئے ہیں، ان میں ایک یہ بھی ہے کہ اس نے ہر ایک کو اس کی صلاحیت کے مطابق احکام کا پابند بنایا، اس کی طاقت سے زیادہ اس کو مکلف نہیں بنایا، قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''لا یکلف اللہ نفسا إلا وسعہا'' (بقرہ: ۲۸۶) (یعنی اللہ تعالیٰ ہر نفس کو اس کی طاقت کے مطابق ہی مکلف بناتے ہیں)۔

مرد وعورت کی صلاحیت میں فرق پایا جاتا ہے، اس لئے اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کو ان کی صلاحیت کے مطابق احکام کا مکلف بنایا ہے۔

اسلام مساوات کا قائل نہیں، بلکہ عدل کا قائل ہے، عدل کے معنی برابری، برتاؤ کے نہیں، بلکہ عدل سے مراد یہ ہے کہ جو جس صلاحیت کا مالک ہو اس کو اسی کے مطابق اس کی ذمہ داری مقرر کی جائے، مرد وعورت کی صلاحیتوں میں فطری طور پر فرق پایا جاتا ہے، بعض صلاحیتیں مردوں میں زیادہ ہے، جیسے جسمانی مشقت، دوڑ دھوپ، شجاعت وبہادری، جرأت و بیباکی، قوت فیصلہ، اقدامی صلاحیت اور مدافعت کی طاقت عورتیں جسمانی اعتبار سے کمزور ہیں، ان میں قوت فیصلہ کی بھی کمی ہوتی ہے، یہ بات طبی اعتبار سے بھی تسلیم شدہ ہے۔

اسلام نے عورتوں کی عفت وعصمت اور فطرت کا لحاظ کرتے ہوئے اسے گھر میں رہنے کا حکم دیا، اور باہر نکلنے کو سخت ناپسند کیا اور اس کی تمام سرگرمیوں کو گھر تک محدود رکھنے کی تاکید فرمائی، اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں ازواج مطہرات کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا ہے:

''وقرن في بیوتکن ولا تبرجن تبرج الجاهلية'' (احزاب: ۳۳)۔

لیکن اس آیت کا حکم ازواج مطہرات کے ساتھ خاص نہیں ہے، بلکہ تمام مسلمان عورتوں کو یہ حکم شامل ہے، علامہ قرطبی اس کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

''وما معنى هذه الآية الأمر بلزوم البيت وإن كان الخطاب لنساء النبي ﷺ فقد دخل غيرهن فيه بالمعنى، هذا لولم يرد دليل يخص جميع النساء كيف والشريعة طافحة بلزوم النساء بيوتهن والانكفاف عن الخروج منها الا بضرورة'' (القرطبي ۱۱۶،۷)۔

اسی طرح دوسری جگہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ''لا تخرجوهن من بيوتهن ولا يخرجن'' (سورۂ طلاق: ۱) (ان عورتوں کو ان کے گھروں سے نہ نکالو اور نہ وہ عورتیں خود نکلیں)۔

حدیث میں ہے: حضرت عبداللہ بن مسعودؓ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت بیان کرتے ہیں:

''إن المرأة عورة فإذا خرجت من بيتها استشرفها الشيطان واقرب ما تكون من رحمة ربها وهي في قعر بيتها'' (ترمذی حدیث نمبر ۱۱۷۳)۔

اسلام میں جماعت اور جمعہ کی بہت فضیلت ہے اور اس کو چھوڑنے پر سخت وعید میں آئی ہیں، لیکن عورت کو گھر میں نماز پڑھنے کا حکم فرمایا، حدیث شریف میں ہے:

''عن أم سلمة ﷺ عن رسول الله و قال: خير مساجد النساء قعر بيتهن'' (رواہ احمد: ۶،۲۹۷)۔

اور ان کے گھروں میں رہنے کو جہاد قرار دیا گیا، مسند احمد کی روایت ہے:

---

[1] دار العلوم لونا واڑا، گجرات۔

''عن عائشة رضی اللہ عنہا عن النبی ﷺ أنه قال عليكن بالبيت فإنه جهادكن'' (مسند احمد ۶۰۶۸)۔

ایک دوسری روایت میں ہے: ''ليس للنساء نصيب فی الخروج إلا مضطرة'' (رواہ طبرانی کذا فی الکنز ۸،۲۶۳)۔

ان قرآنی آیات اور احادیث شریفہ سے معلوم ہوتا ہے کہ عورتوں کو بلاضرورت گھر سے باہر نکلنا جائز نہیں ہے، اس لئے عورت کو باہر نکل کر معیار زندگی کو بلند کرنے کے لئے ملازمت یا تجارت کرنا ضرورت کے بغیر جائز نہ ہوگا، اور اس لئے بھی کہ عورتوں کا نفقہ اور سکنی مردوں کے ذمہ واجب ہے، بیوی کا نفقہ شوہر پر مطلقاً واجب ہے۔

اللہ تعالی کا ارشاد ہے: ''وعلى المولود له رزقهن وكسوتهن بالمعروف'' (سورۂ بقرہ: ۲۳۳)۔

دوسری جگہ فرماتے ہیں: ''لينفق ذوسعة من سعته'' (سورۂ طلاق: ۷)۔

ترمذی شریف میں ہے: ''ألا حقهن عليكم أن تحسنوا إليهن فی كسوتهن و طعامهن''۔

اور فقہاء کرام کا اس بات پر اتفاق ہے کہ بیوی کا نفقہ شوہر پر لازم ہوگا۔

علامہ ابن قدامہ حنبلی فرماتے ہیں: ''وأما الإجماع فاتفق أهل العلم على وجوب نفقات زوجات على أزواجهن إذا كانوا بالغين'' (المغنی ۷،۵۶۴)۔

ان عبارتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ عورتوں کے نفقہ اور سکنی کی ذمہ داری مردوں پر لازم ہے، اس لئے عورت کو بلاضرورت باہر نکل کر معاشی جدوجہد کرنا جائز نہ ہوگا۔

لیکن یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس طرح کی معاشی جدوجہد محض معیار زندگی بلند کرنے کے لئے گھر تک محدود ہو تو اس کا کیا حکم ہوگا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اسلام کی طرف سے عورت پر عائد ذمہ داریاں اور فرائض کی انجام دہی میں خلل واقع نہ ہو، اس کی عزت وآبرو پر آنچ آنے کا اندیشہ نہ ہو تو اس صورت میں اس کی اجازت ہوگی، اس لئے کہ حدیث میں اس کی مثالیں ملتی ہیں۔

سوت کاتنے کی آپ ﷺ نے خود ترغیب دی، چنانچہ حضرت عائشہؓ سے ارشاد نبوی مروی ہے:

''علموهن الغزل'' (یعنی عورتوں کو سوت کاتنا سکھاؤ) (درمنثور ۵/۳۶)۔

حضرت ابن مسعودؓ کی زوجہ ذاتی صنعت وکاریگری سے اپنے شوہر اور بال بچوں کی کفالت کرتی تھیں۔

اور حضرت اسماء بنت مخرمہ عطر فروخت کرتی تھیں (طبقات ابن سعد ۸/ ۲۱۲)۔

اس کے لئے شوہر کے علاوہ دوسرے ولی کی اجازت ضروری نہیں ہوگی، اور اگر شوہر کے حقوق میں کوتاہی نہیں ہو رہی ہے تو اجازت ضروری نہ ہوگی، لیکن اگر کوتاہی ہو رہی ہے تو اجازت ضروری ہوگی، اور شوہر اس کو روک سکتا ہے۔

علامہ ابن قدامہ فرماتے ہیں: ''أن المرأة محبوسة على الزوج يمنعها من التصرف والاكتساب'' (المغنی ۷،۵۶۴)۔

اگر عورت کے نفقہ کی ذمہ داری ادا کرنے والا کوئی نہ ہو، یعنی شوہر مر گیا ہو یا مطلقہ ہو اور اس کا کوئی ولی نہ ہو جو اس کی کفالت کرے یا شوہر موجود ہے، لیکن کمانے سے عاجز ہے یا اس کی آمدنی گھر کے لئے کافی نہیں ہے، اور گھر میں رہ کر تجارت کرنے کی کوئی شکل نہیں ہے تو اس کے لئے ایک ضرورت ہے اور ضرورت کے وقت شریعت نے باہر نکلنے کی اجازت دی ہے۔

''وقرن فی بيوتكن'' کی تفسیر میں مفسرین نے ضرورت کے وقت باہر نکلنے کو مستثنی قرار دیا ہے۔

علامہ قرطبی فرماتے ہیں: ''والإنكفاف عن الخروج إلا بضرورة'' (القرطبی ۱۱۶۱۷)۔

علامہ آلوسی فرماتے ہیں: ''وما يجوز من الخروج للحج وزيارة الوالدين وعيادة المرضى و تعزية الأقارب و نحو ذلك'' (روح المعانی ۲۳،۷)۔

فقہاء کرام نے بھی عورت میں متوفی عنہا زوجہا کو معاش کے لئے باہر نکلنے کی اجازت دی ہے۔

ابن نجیم مصری فرماتے ہیں: ''ومعتدة الموت تخرج يوما وبعض الليل لتكتسب لأجل قيام المعيشة لأنه لانفقة لها'' (البحر الرائق ۴،۲۵۸)۔

ڈاکٹر زحیلی فرماتے ہیں: ''أما المتوفى عنها ولا بأس أن تخرج نهارا في حوائجها؛ لأنها تحتاج إلى الخروج بالنهار لإكتساب ماتنفقه. لأنه لا نفقة لها من الزوج المتوفى بل نفقتها عليها وتحتاج للخروج لتحصل النفقة'' (الفقہ الاسلامی وادلتہ ۷،۶۵۴)۔

عورت کو معاش کے سلسلہ میں باہر نکلنے کے لئے کچھ شرائط وحدود ہیں:

۱۔ گھر سے باہر نکلتے وقت سر سے پاؤں تک نقاب یا لمبی چادر سے اپنے پورے جسم کو چھپالے، راستہ دیکھنے کے لئے صرف آنکھیں کھلی رکھے۔

خوشبو اور زینت کے بغیر نکلے۔

بجنے والے زیورنہ ہوں، راستہ کے کنارے پر چلے، بیچ راستہ پر نہ چلے، اسی طرح چلتے وقت مردوں کے ہجوم میں داخل نہ ہو، عام مجلس میں بھی مردوں کے ساتھ نہ بیٹھے۔

اگر عورت ایسی جگہ کام کررہی ہے جہاں مرد بھی کام کرتے ہوں تو پردہ کے حدود کیا ہوں گی؟

اجنبی عورت کیلئے اجنبی مرد کے سامنے چہرہ وہاتھ کے علاوہ پورا بدن ستر ہے، اس بات پر تمام علماء کا اتفاق ہے، حنفیہ اور کچھ مالکیہ کے نزدیک چہرہ وہاتھ ستر میں داخل نہیں ہے، اور دوسرے فقہاء کے نزدیک چہرہ وہاتھ بھی ستر میں داخل ہے، تاہم جن لوگوں نے (حنفیہ وغیرہ) چہرہ وہاتھ کو ستر نہیں مانا ہے ان کے نزدیک بھی اگر شہوت کا اندیشہ ہو تو چہرہ کو بھی چھپانا ضروری ہے۔

البتہ بوڑھی عورت کے سلسلہ میں کچھ تخفیف ہوگی، اللہ تعالی فرماتا ہے: (اور وہ بڑی بوڑھی عورتیں جن کو نکاح کی کچھ امید نہ رہی ہو ان کو اس بات میں گناہ نہیں کہ وہ اپنے ستر کے کپڑے کے علاوہ برقعہ وچادر کو اتار رکھیں بشرطیکہ زینت کا اظہار نہ کریں، اور اس سے بھی احتیاط رکھیں تو وہ ان کے لئے زیادہ بہتر ہے، اللہ سب کچھ سنتا ہے سب کچھ جانتا ہے) (سورۂ نور: ٦٠)۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ بوڑھی عورت کے لئے اجنبی مرد کے سامنے چہرہ اور ہاتھ وغیرہ کھولنے کی اجازت ہوگی، لیکن یہ اس صورت میں ہے جبکہ شہوت کا اندیشہ نہ ہو، اس لئے کہ اگر شہوت کا اندیشہ ہو تو فقہاء نے محرم سے بھی پردہ کا حکم دیا ہے۔

عورت کا کسی جگہ تنہا قیام فرمانا یعنی محارم کے بغیر فتنہ سے خالی نہیں، اسی لئے شریعت نے عورت کو بغیر محارم کے شرعی مسافت سفر کی اجازت نہیں دی ہے، اور حج جیسے مقدس فریضہ کو بغیر محارم کے اس پر فرض نہیں کیا ہے (دیکھئے: مسلم ۲ /۳۲۷، ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ)۔

علامہ شامی نے تو فساد زمانہ کی وجہ سے تین دن سے کم کے سفر میں بھی بغیر محرم کے اجازت نہیں دیا ہے (رد المحتار ۲ /۴۶۴)۔

علامہ تقی عثمانی ایک سوال کے جواب میں فرماتے ہیں:

''ایک مسلمان عورت کے لئے حصول معاش کے لئے یا حصول تعلیم کے لئے محرم کے بغیر مسلم وغیر مسلم ممالک کا سفر کرنا جائز نہیں، اسی طرح قیام کرنا بھی جائز نہیں''۔

☆☆☆

خواتین اور کسب معاش کا مسئلہ

مولانا محمد سلمان کھلی[1]

ا۔ اسلام نے خواتین کو عزت وحرمت کا جو مقام بخشا ہے اور اس کے تقدس اور جائز تمدنی ومعاشرتی حقوق کی حفاظت کے لئے جو تعلیمات دی ہیں وہ دنیا بھر کے مذاہب اور اقوام میں ایک منفرد حیثیت کی حامل ہیں، قرآنی تعلیمات اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات سے کسی ادنی شبہ کے بغیر یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ درحقیقت انسانی زندگی دو مختلف شعبوں پر منقسم ہے، ایک گھر کے اندر کا شعبہ اور ایک گھر کے باہر کا شعبہ، یہ دونوں شعبے ایسے ہیں کہ ان دونوں کو ساتھ لئے بغیر ایک متوازن اور معتدل زندگی نہیں گزاری جاسکتی، جب دونوں شعبے ایک ساتھ اپنی اپنی جگہ پر ٹھیک چلیں گے تب انسان کی زندگی استوار ہوگی اور اگر ان میں سے ایک ختم یا ناقص ہوگیا تو انسان کی زندگی میں توازن ختم ہوجائے گا، ان دونوں شعبوں میں شریعت نے یہ تقسیم فرمائی کہ مرد کے ذمہ گھر کے باہر کے کام لگائے مثلاً کسب معاش، سیاسی اور سماجی کام وغیرہ اور گھر کے اندر کا شعبہ عورت کے حوالہ کیا مثلاً شوہر کے مال سے گھر کا انتظام کرنا، بچوں کی پرورش وتربیت کرنا وغیرہ غرض یہ کہ عورت تلاش معاش کے لئے ماری ماری پھرنے کے لئے نہیں، بلکہ گھر کی ملکہ بننے کے لئے پیدا ہوئی ہے، چنانچہ حدیث میں فرمایا گیا:

''المرأة راعية على بيت زوجها وهي مسئولة'' (بخاری باب قوا انفسکم واھلیکم)۔

اور اس کو ایسے تمام فرائض سے سبکدوش کردیا گیا جو بیرون خانہ امور سے تعلق رکھنے والے ہیں مثلاً اس پر جمعہ واجب نہیں، اس پر جہاد بھی فرض نہیں، اس کے لئے جنازوں میں شرکت بھی ضروری نہیں، بلکہ اس سے روکا گیا ہے، اس پر نماز باجماعت اور مسجد کی حاضری بھی لازم نہیں کی گئی، بلکہ پسند نہیں کیا گیا، اس کو بغیر محرم کے سفر کی بھی اجازت نہیں دی گئی، عورتوں کی عصمت وعزت اور معاشرے کی اخلاقی پاکیزگی کے لئے سب سے اہم بات یہ ہے کہ عورتوں کا مردوں سے کم سے کم اختلاط ہو جس کی سب سے اچھی صورت یہ ہے کہ خود عورتیں بلاضرورت گھروں سے نہ نکلیں، کہ ان کا گھروں سے نکلنا نامحرموں سے اختلاط اور شدید فتنہ کا سبب بنتا ہے، یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے مسلمان عورتوں کو اپنے گھروں میں ٹکے رہنے کا خاص طور سے حکم دیا ہے، چنانچہ ارشاد باری تعالی ہے:

''وقرن في بيوتكن'' (سورۂ احزاب: ۳۳)۔

یہ مختصر ارشاد ہی یہ ثابت کرنے کے لئے کافی ہے کہ قرآن کریم کے نزدیک عورت کا اصل مقام اور اس کی خدمات کا اصل مرکز اس کا گھر ہے۔

یعنی عورتوں کا باہر نکلنے کے لئے کوئی حصہ نہیں بجز اس کے کہ باہر نکلنے کے لئے کوئی اضطراری صورت پیش آجائے، نیز بہت سی احادیث سے واضح طور پر یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ عورت کے لئے اصل یہ ہے کہ وہ اپنے گھر میں رہے، بلاضرورت گھر سے باہر نہ نکلے (تکملہ فتح الملہم ۴/ ۲۶۲)۔ لیکن اس باب میں زیادہ سختی اس لئے نہیں کی گئی کہ بعض حالات میں عورتوں کے لئے گھروں سے نکلنا ضروری ہوجاتا ہے، لہذا ایسی مجبوریوں کی وجہ سے قانون میں کافی گنجائش رکھی گئی ہے، چنانچہ حدیث میں ہے:

''قد أذن الله لكن أن تخرجن لحوائجكن'' (بخاری باب خروج النساء لحوائجھن)، اس حدیث سے معلوم ہوا کہ ''وقرن في بيوتكن'' کے حکم قرآنی کا منشا یہ نہیں ہے کہ عورتیں گھر کی حدود سے قدم کبھی باہر نکالیں ہی نہیں، حالات، حاجات وضروریات کے لئے ان کو نکلنے کی اجازت ہے، مگر یہ اجازت نہ غیر مشروط ہے نہ غیر محدود۔

خلاصہ کلام یہ کہ اسلام نے عورت کو دیگر حقوق کی طرح معاشی حقوق بھی دیئے ہیں، اسلام اس کی راہ میں مزاحم نہیں ہے، بشرطیکہ وہ ان حدود سے تجاوز نہ کرے جو شریعت نے عورتوں کے لئے مقرر کئے ہیں چنانچہ وہ کسی تجارت میں روپیہ لگا کر یا اندرون خانہ کوئی ہنر یا پیشہ اختیار کرکے کسب معاش کرسکتی ہے، یہ بات اپنی جگہ ایک حقیقت ہے کہ اسلام بلاضرورت گھر سے خواتین کے نکلنے کو پسند نہیں کرتا، ضرورت کے موقع پر اسلام خاتون کو روزی کمانے محنت مزدوری

[1] مدرسہ جامعہ خلیلیہ ماہی، پالن پور شمالی گجرات۔

کرنے کے لئے گھر سے باہر باپردہ نکلنے کی اجازت دیتا ہے، مگر اس قسم کی اجازت جو حالات وضروریات کی رعایت سے دی گئی ہے اسلامی نظام معاشرت کے اس قاعدے میں ترمیم نہیں کرتی کہ عورت کا دائرۂ عمل اس کا گھر ہے، یہ محض وسعت ورخصت ہے، اس کو اسی حیثیت پر رکھنا چاہئے، لہذا یہ استثنائی صورت ہوگی نہ کہ حکم عام، ورنہ عام حالات میں اسلام اس کے لئے بازار، کی بجائے گھر کی چار دیواری پسند کرتا ہے۔

۲۔ اسلام نے کسی زمانے میں کسب معاش اور نان ونفقہ کی ذمہ داری عورت پر نہیں ڈالی ہے، شادی سے پہلے اس کی مکمل کفالت باپ کے ذمہ ہے، اور شادی کے بعد اس کی تمام کفالت شوہر کے ذمہ ہے، اور اگر شوہر نہ رہے اور اس کی آمدنی کا کوئی ذریعہ نہ ہو تو اس کی مکمل کفالت اولاد کے ذمہ ہے، غرض یہ کہ اسلام نے اس کے معاش اور نان ونفقہ کا مسئلہ اس پر عائد نہیں کیا ہے، اسی طرح اسکے بچوں کا نفقہ وخرچہ بھی اس پر نہیں، بلکہ اس کے شوہر پر رکھا ہے ''النفقة واجبة للزوجة على زوجها'' (الهدايه۴۳۷)۔

''ونفقة الأولاد الصغار على الأب'' (الهدايه ص۴۴۴)۔

''وتجب نفقة الإبنة البالغة على الأب'' (هدايه ص۴۴۷)۔

اسلام نے عورت کو یہ امتیاز اس لئے عطا فرمایا ہے تاکہ وہ کسب معاش کی الجھنوں میں پڑکر معاشرتی برائیوں کا سبب بننے کی بجائے گھر میں رہ کر قوم کی تعمیر کی خدمت انجام دے، گھر کا ماحول معاشرے کی وہ بنیاد ہے جس پر تمدن کی پوری عمارت کھڑی ہوتی ہے، اگر یہ بنیاد خراب ہو تو اس کا فساد پورے معاشرے میں سرایت کرجاتا ہے۔

۳۔ مغربی تہذیب کی طرح مسلمان خواتین کا محض معیار زندگی کو بلند کرنے یا وقت گذاری اور سرمایہ واثاثہ پیدا کرنے کی غرض سے معاشی سرگرمی کو مستقل اختیار کرلینا اسلامی مذاق ومزاج سے ہم آہنگی نہیں رکھتا، اس کی مکمل تفصیل جزئیہ نمبر ا کے تحت گذر چکی ہے۔

''فالحاصل ان المرأة مامورة فى القرآن الكريم بان تستقر فى بيتها ولا تخرج إلا لحاجة'' (تكمله فتح الملهم ۴،۲۶۹)۔

۴۔ عورت کسب معاش کے لئے اندرون خانہ اپنے ولی یا شوہر کی اجازت کے بغیر بھی ایسا ہنر یا پیشہ اختیار کرسکتی ہے جو اس میں کمزوری پیدا نہ کرے اور اس کے جمال وخوبصورتی کو نقصان نہ پہنچائے اور شوہر کے حقوق کی ادائیگی میں خلل انداز نہ ہو۔

''وللزوجة أن تعمل فى البيت عملا لا يضعفها ولا ينقص جمالها، وللزوج أن يمنعها مما يضرها، ولكن لا تسقط نفقتها إذا خالفته بل له أن يؤدبها لعصيانها أمره'' (الفقه الاسلامى وادلته۷،۲۸۰، ۱۰)۔

تاہم شریعت اسلامی میں پسندیدہ یہی ہے کہ عورت ولی یا شوہر کی اجازت ہی سے کوئی ہنر یا پیشہ اختیار کرے، کیونکہ عورت کو ولی یا شوہر کی رضا وخوشی کا ہر جگہ اور ہر وقت خیال رکھنے کا حسن معاشرت کے لئے حکم ہے جبکہ اس سے اللہ تعالی اور اس کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی اور ناراضی لازم نہ آتی ہو۔

۵۔ اگر عورت کو کسب معاش کے لئے مجبوری کی وجہ سے گھر سے باہر نکلنا پڑے تو ولی یا شوہر کی اجازت (صراحۃ یا دلالۃ) ضروری ہے، چنانچہ حدیث میں ہے:

''عن معاذ قال قال رسول الله ﷺ لا يحل لا مرأة تؤمن بالله و اليوم الآخر أن تأذن فى بيت زوجها إلا بإذن ولا تخرج وهو كاره ولا تطيع فيه أحدا'' (مستدرك حاكم، طبرانى)۔

''ليس لها أن تخرج بلا إذنه أصلا'' (شامى باب المهر)۔

ہاں اگر ولی یا شوہر اس خاتون کی کفالت نہ کرتا ہو اور معاشی کفالت کا کوئی ذریعہ موجود ہو تو بھی عورت کے لئے بہتر تو یہی ہے کہ وہ ولی یا شوہر کی اجازت لے کر جائے لیکن اگر ولی یا شوہر اجازت نہ دے تو بلا اجازت بھی ایسی مجبوری میں کسب معاش کے لئے گھر سے نکل سکتی ہے۔

''فلا تخرج الا لحق لها أو عليها'' (درمختار باب المهر)۔

۶۔ عام حالات میں ایک مسلم خاتون کو کسب معاش کے لئے گھر سے نہیں نکلنا چاہئے، البتہ جس ضرورت کے موقع پر شریعت نے مسلم خاتون کو کسب معاش کے لئے گھر سے باہر نکلنے کی اجازت دی ہے اسکی شرعی حدود یہ ہیں:

عورت کے معاشی حالات کے تحت ملازمت ضروری ہو یا عام لوگوں کو اس کی ملازمت کی ضرورت ہو جیسے لیڈیز ٹیچرس اور لیڈیز ڈاکٹر، نرس وغیرہ۔

وہ زینت کے بغیر حجاب کے تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے گھر سے نکلے مثلاً بے پردگی نہ ہو، اجنبی مردوں کے ساتھ خلوت نہ ہو، اجنبی مردوں سے بلا ضرورت یا ضرورت سے زائد بات چیت نہ کرے، نرم دلکش لہجے میں بات نہ کرے، بسوں میں اجنبی مردوں سے لگ کر نہ بیٹھے وغیرہ۔

فتنہ کے مواقع سے بچنے کا اہتمام ہو۔

ایسی ملازمت نہ ہو جو عورت کی فطری صلاحیت اور دائرہ کار کے مغائر ہو۔

ملازمت کے لئے جانا اپنے ولی کی اجازت سے ہو یعنی شادی سے پہلے باپ کی اور شادی کے بعد شوہر کی اجازت ضروری ہے۔

لہذا جن شعبوں میں مردوں کے ساتھ اختلاط ناگزیر ہو، اور اسلامی حجاب کے تقاضوں کو پورا نہ کیا جاسکتا ہو، وہاں خواتین کی ملازمت شرعاً درست نہیں۔

۷۔ ایک مرد کے لئے دوسرے مرد کے جسم کے جن حصوں کو چھپانا ضروری ہے، یعنی ناف سے گھٹنوں تک کا حصہ، عورتوں کے لئے بھی اس حصہ کو دوسری عورتوں سے چھپانا ضروری ہے۔

''نظر المرأة إلى المرأة كنظر الرجل إلى الرجل هو الأصح'' (الفتاوى الهنديه ۵؍۳۲۷)۔

لہذا اگر ملازمت کرنے والی خواتین ایسے ادارے میں کام کریں جہاں خواتین ہی خدمت انجام دیتی ہوں اور کام کی جگہوں میں مرد نہ ہوتے ہوں تو بھی اس حصہ (ناف سے گھٹنے تک) کا چھپانا ضروری ہے، اور بقیہ حصوں کو بقدر ضرورت کھول سکتی ہیں، اور ادارہ کے ذمہ دار غیر محرم ہوں تو ان سے پردہ ضروری ہے، بلا ضرورت یا ضرورت سے زائد ان سے بات چیت کرنا یا ان کے ساتھ خلوت کرنا ہرگز جائز نہیں ہے۔

۸۔ خواتین کا ایسی جگہ کام کرنا جہاں مرد کارکن ہوں اور خواتین کا اختلاط مردوں کے ساتھ ہوتا ہو، شرعاً درست نہیں ہے، اور خصوصاً اس پرفتن دور اور بے حجابی کے ماحول میں فتنہ سے خالی نہیں ہے، لہذا خواتین کو ایسی ملازمت اختیار کرنے سے اجتناب ہی کرنا چاہئے، جوان عورتوں کو اجنبی مردوں کے سامنے اپنا چہرہ کھولنے کی بالکل اجازت نہیں ہے، البتہ سن رسیدہ خواتین کو اجنبی مردوں کے سامنے اپنا چہرہ کھولنے کی بعض فقہاء کرام نے اجازت دی ہے، لیکن دوسرے فقہاء کرام نے فساد زمانہ اور خوف فتنہ کی وجہ سے منع فرمایا ہے، اور فتوی بھی اسی قول پر ہے۔

۹۔ عام حالات میں ایک مسلمان خاتون کا بلا ضرورت کسب معاش کے لئے نکلنا شرعاً پسندیدہ نہیں، البتہ جس ضرورت کے موقع پر شریعت نے مسلمان خاتون کے لئے ملازمت کو جائز قرار دیا ہے، اس موقع پر بھی ضروری ہے کہ وہ ایسے شعبوں اور اداروں میں ملازمت اختیار کریں جس میں وہ اسلامی حجاب کے تقاضوں کو پورا کرسکتی ہیں، لہذا ایسے دو کاموں میں جن میں سے ایک کام کی انجام دہی میں عورت کا مردوں سے اختلاط خلوت ہوتا ہو، اور دوسرے کام کی انجام دہی میں اختلاط وخلوت نہ ہوتا ہو، بہت بڑا فرق ہے اول ناجائز ہے اور ثانی بوقت ضرورت جائز ہے۔

۱۰۔ محرم اور شوہر کے بغیر عورت کا اڑتالیس میل یا اس سے زیادہ کا سفر کرنا جائز نہیں، اور جب سفر ہی جائز نہیں تو اتنی دور تنہا قیام کرنا بدرجہ اولی جائز نہیں ہوگا، حضرت ابوسعید خدریؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو عورت اللہ تعالی اور آخرت پر ایمان رکھتی ہو اس کے لئے باپ یا بھائی، شوہر یا بیٹا یا کسی اور محرم کے بغیر تین دن یا اس سے زیادہ کا سفر جائز نہیں (صحیح مسلم)۔

اور حضرت ابوہریرہؓ کی ایک روایت میں تو ایک دن ایک رات بغیر محرم کے سفر کرنے سے منع فرمایا گیا ہے (صحیح مسلم)۔

روایات میں جو اختلاف مقدار سفر کی تعیین میں ہے وہ اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ دراصل ایک دن یا تین دن کا سوال اہمیت نہیں رکھتا، بلکہ اہمیت صرف اس امر کی ہے کہ عورت کو تنہا نقل وحرکت کرنے کی ایسی آزادی نہ دی جائے جو موجب فتنہ ہو، اسی لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مقدار سفر معین کرنے میں زیادہ اہتمام نہ فرمایا، اور مختلف حالات میں وقت اور موقع کی رعایت سے مختلف مقداریں ارشاد فرمائیں، اس لئے خواتین کا ملازمت لئے دور دراز علاقہ میں تنہا قیام جائز نہیں، تنہا قیام میں عورت کی عصمت وعفت کو خطرہ ہے، نیز اس کو جس نفسیاتی دباؤ کا سامنا کرنا پڑے گا وہ بھی محتاج اظہار نہیں۔

☆☆☆

خواتین کی ملازمت اور شرعی حدود

مولانا لطیف الرحمن فلاحی، ممبئی

۱۔ اللہ پاک نے مرد اور عورت کا دائرہ کار الگ الگ بنایا ہے، مرد کے ذمہ باہر کا کام اور عورت کے لئے کام کا میدان اس کا گھر متعین فرما دیا ہے، اسی وجہ سے ان کے لئے ''قرار فی البیوت'' کو واجب کیا گیا۔

قرآن پاک میں اللہ تعالی کا ارشاد ہے: ''وقرن فی بیوتکن ولا تبرجن تبرج الجاهلية اللأولى'' (سورۂ احزاب: ۳۳) (یعنی بیٹھو اپنے گھروں میں اور زمانہ قدیم کی جاہلیت والیوں کی طرح نہ پھرو)۔

اس آیت سے اولاً تو یہی مفہوم ثابت ہوتا ہے کہ عورتوں کا گھروں سے نکلنا مطلقاً ممنوع اور حرام ہے، لیکن ایسا نہیں کچھ صورتیں مستثنی ہیں، اس لئے کہ عہد نبوی میں حوائج ضروریہ کے لئے عورتوں کا خروج ثابت ہے، ازواج مطہرات کا آپ ﷺ کے ساتھ سفر حج اور غزوات میں جانا ثابت ہے، اور فقہاء کرام نے بھی چند مواقع ذکر فرما دیئے ہیں ان مواقع پر عورتیں نکل سکتی ہیں، مثلاً والدین یا دونوں میں سے ایک کی زیارت، تعزیت اور تیمارداری کے لئے اس طرح اپنے محارم رشتہ دار سے ملاقات کے لئے اور اسی طرح ایسی عورت جس کے پاس ضروریات زندگی کا کوئی سامان نہ ہو تو حدود شرعی میں رہ کر محنت اور مزدوری کے لئے بھی نکلنا ضروریات میں شمار ہو سکتا ہے، آپ ﷺ نے بھی عورتوں کو حوائج اصلیہ کے لئے خروج کی اجازت مرحمت فرمائی ہے، مسلم شریف کی حدیث ہے:

''فقال: إنه قد أذن لكن أن تخرجن لحاجتكن'' (مسلم کتاب السلام بحوالہ فتح الملهم ۴، ۲۵۸)۔

معلوم ہوا کہ عورت کو حاجت کے بغیر گھر کے اندر ہی محدود رہنا ہوگا، البتہ خروج کس طرح ہوگا اسلام نے اس کی بھی حد بندی فرمائی ہے عورت گھر سے نکلنے میں آزاد نہیں ہے بلکہ صاف فرمایا: "ولا تبرجن تبرج الجاهلية الأولى" کہ اگر ضرورتاً بھی نکلنا ہے تو بغیر اظہار زینت کے ساتھ نکلنا ہوگا، یہ پہلی شرط اور دوسری شرط یہ ہوگی آگے ارشاد ہے: "يدنين عليهن من جلابيبهن" (سورۂ احزاب: ۵۹) کہ برقع یا چادر اوڑھ پورے نقاب کے ساتھ نکلنا ہوگا، خلاصہ یہ کہ بلا ضرورت شدیدہ نکل نہیں سکتی اور نکلے گی تو مذکورہ دو شرطوں کے ساتھ، اب کسب معاش کے لئے نکلے یا نہیں نکلے؟ یہ اس کی ضروریات میں شامل ہے کہ نہیں اس میں کچھ تفصیل کرنا ہوگی، شریعت نے جب عورت کو گھر کی چہار دیواری میں بند کر دیا ہے تو اس کے نان ونفقہ کا ذمہ دار بھی دوسروں کو ٹھہرایا ہے، پیدائش سے لے کر شادی تک باپ پورے طور پر کفیل ہے، شادی کے بعد سے موت تک شوہر کو ذمہ دار بنایا اور عورتوں کو کسب معاش کی الجھنوں سے بالکل آزاد رکھا ہے، کبھی باپ کو ان مکلف بنایا، کبھی شوہر کو اور کبھی بیٹوں کو جب تینوں اپنی ذمہ داری مکمل طور پر ادا کر رہے ہوں مکمل طور پر تو پھر محض معیار زندگی کو بلند کرنے کے لئے بلا ضرورت شدیدہ وشرعیہ عورت کا کسب معاش کے لئے نکلنے کو شریعت نہایت ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھتی ہے، اور ان کو نکلنے کی بالکل اجازت نہیں دیتی، سب سے پہلے قرآن پاک کی یہ آیت ملاحظہ ہو کہ شوہر پر نفقہ واجب ہے اور وہ عورت کی کفالت کا ذمہ دار ہے، "لينفق ذو سعة من سعة"۔

دوسری آیت میں ارشاد باری ہے: ''وعلى المولود له رزقهن و كسوتهن بالمعروف'' (بقرہ: ۲۳۳)، اور حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''ولهن عليكم رزقهن وكسوتهن بالمعروف'' (مسلم بحوالہ اعلاء السنن ۱۱، ۲۷۳) کہ عورتوں کا نان ونفقہ اور رہنے کا گھر کا ذمہ دار شوہر ہے، عالمگیری کی عبارت ملاحظہ ہو: ''نفقة الأولاد الصغار على الأب لاشاركه فيها أحد كذا في الجوهرة النيره'' (۱، ۵۶۰)، آگے کی عبارت ہے: ''وأما الأنات فليس للأب أن يواجرهن في عمل أوخدمه كذا في

الخلاصة'' (۱،۵۶۲)''ونفقة الأنات واجبة مطلقاً على الأباء مالم يتزوجن إذا لم يكن لهن مال'' (۱،۵۶۳)''تجب على الرجل نفقة امرأته المسلمة والذمية والفقيرة والغنية دخل بها أولم يدخل كبيرة كانت المرأة أو صغيرة يجامع مثلها كذا في فتاوى قاضي خان'' (۱،۵۴۴)، مجمع الانہر کی عبارت ہے:''يجب النفقة والكسوة والسكنى للزوجة على زوجها'' (۲،۱۷۳)، فتاوی عالمگیری میں ہے:''المعتدة عن الطلاق تستحق النفقة والسكنى كان الطلاق رجعيا أو بائنا أو ثلاثا حاملا كانت المرأة أو لم تكن'' (۱،۵۵۷)۔

۲۔ دو صورتیں ہیں جہاں ہر عورت اپنا اور اپنے بچوں کے نفقہ کی ذمہ دار ہے، شوہر بد معاش، آوارہ اور کاہل ہے اور بچے چھوٹے چھوٹے ہیں ایسی صورت میں عورت کے نحیف کندھوں پر بدرجہ مجبوری نفقہ کا بوجھ عائد ہوتا ہے، دوسری صورت عورت متوفی عنہا زوجہا ہے اور بچے چھوٹے چھوٹے ہیں اور اعزہ واقرباء بوجھ اٹھانے کے لئے تیار نہیں ہیں تو اس صورت میں بھی عورت کے نحیف کندھوں پر نفقہ کا بوجھ عائد ہوتا ہے (دیکھئے: البحر الرائق ۴/۲۳)۔

۳۔ صرف معیار زندگی کو بلند کرنا یا وقت گذاری یا پھر سرمایہ کی کثرت مقصود ہو تو ان چیزوں کے حصول کے لئے کسب معاش کے لئے گھر سے نکلنے کو شریعت بہت زیادہ ناپسند کرتی ہے اور صرف اس غرض سے گھر سے نکلنے میں عورت کو گنہگار ٹھہراتی ہے، البتہ گھر میں رہ کر وقت گذاری کے خاطر کسب معاش کی کوئی ایسی صورت اختیار کرتی ہے جو اندرون خانہ محدود ہو تو اس کی اجازت ہے، مثلاً کپڑا سینا، چرخہ چلانا، لیکن اس بارے میں بھی شریعت کی نظر میں اولی وافضل یہ ہے کہ عورت اپنے خالی اوقات بچوں کی تعلیم وتربیت مثلاً تلاوت کلام پاک ذکر واذکار اس کے بعد ذاتی تربیت کے لئے اوقات کو صرف کریں (درمختار ۵/۲۵۹)۔

۴۔ اگر کوئی خاتون اندرون خانہ معاش کی کوئی صورت اختیار کرتی ہے تو اس صورت میں بھی شوہر اور ولی کے مابین اجازت میں فرق ہے، شوہر سے اجازت لینا شرط ہے، اس لئے کہ اندرون خانہ مصروف رہنے میں شوہر کی خدمت یا اس کا کوئی حق تلف ہوتا ہے یا عورت مصروفیت کی وجہ سے اپنی صحت بحال نہیں رکھ سکتی تو اس میں شوہر کی حق تلفی ہوگی، اس لئے اجازت شرط ہوگی، اور اگر عورت صحت بھی باقی رکھتی ہے اور خدمت میں بھی کوئی دقیقہ نہیں اٹھاتی اور ان دونوں شرطوں کے ساتھ گھر میں کسب معاش کی کوئی صورت اختیار کرتی ہے تب بھی شوہر کی اجازت کی محتاج ہوگی، اس لئے کہ شریعت نے اس کو کسب معاش سے آزاد رکھا ہے اور شوہر کو اس کا کفیل بنایا ہے اور ولی کی خدمت کو عورت کا ذمہ دار نہیں قرار دیا، اس لئے اگر اندرون خانہ کچھ کام کرتی ہے تو ولی کی اجازت شرط نہیں ہے (بحر الرائق ۵/۲۵۸، ۲۶۸)۔

۵۔ اگر عورت کسب معاش کے لئے بقدر مسافت سفر نکلتی ہے تو اس صورت میں ولی یا شوہر کی فقط اجازت شرط نہیں ہے، بلکہ معیت ضروری ہے، اس لئے کہ عورت کا گھر سے دینی یا دنیوی حاجات کی خاطر نکلنے کو شریعت بغیر محرم کے منع کرتی ہے (اعلاء السنن ۱۷/۳۵۸)۔

اور اگر عورت کا نکلنا بقدر مسافت سفر سے کم ہے اپنے محلہ اور علاقہ کے اندر ہی ہے عام طور پر جس طرح تھوڑی دور کی مقدار پر عورتیں نکلا کرتی ہیں اور شوہر اور ولی اچھی طرح کفالت بھی کرتا ہے تو اس صورت میں اس کے لئے اپنے گھر سے نکلنا ممنوع ہوگا، البتہ محلہ کے اندر ہی کچھ دوری پر نکلنا ہے اور ولی اور شوہر سست یا آوارہ ہے اور کفالت نہیں کرتا ہے تو حدود شرعی میں رہتے ہوئے بقدر ضرورت پورے پردے کے ساتھ بغیر اظہار زینت کے فقط دن میں نکل سکتی ہیں اور رات میں نکلنے کی اجازت نہیں ہوگی اور ایسی حالت میں شوہر او ولی کی اجازت شرط نہیں ہوگی (بحر الرائق ۴/۲۳، ۲۹۹)۔

۶۔ اگر کفیل باپ بیٹے یا شوہر کی صورت میں موجود ہے تو عورت کو کسب معاش کی کسی بھی صورت میں اپنے آپ کو جکڑنے کی ضرورت نہیں ہے، البتہ اگر کسی عورت کی ایسی صورت حال ہوجائے کہ اس کا اتنی بڑی زمین میں کوئی بھی کفیل اور ذمہ دار نہ ہو اور معاش کے میدان میں اترے بغیر چارہ کار ہی نہ ہو تو اولاً ایسی عورت معاش کی کوئی ایسی صورت اختیار کرے جو اس کو اندرون خانہ محدود کردے، اسی میں اس کے لئے عافیت اور بھلائی ہے، خواہ مخواہ اپنے آپ کو باہر کی مسموم فضا کے حوالہ نہ کرنے، اور گھر میں معاش کی بہت ساری صورتیں عافیت کے ساتھ اختیار کی جاسکتی

ہیں، اپنے گھر میں دینی یا دنیوی تعلیم کا محلہ کے بچوں کے لئے انتظام کرے، اور اس کی معقول فیس لینے کی اجازت ہے، یا کوئی ایسا ہنر اختیار کرے، مثلاً عورتوں کے کپڑے سینا، عورتوں کے کپڑوں کو فروخت کرنا، مہندی کی ڈیزائن کا کورس کرے عورتوں کو مہندی لگانے کا کام، گھریلو اشیاء فروخت کرنا اور اسی طرح اور بھی بہت طرح کے گھریلو کاروبار کی جدید جدید شکلیں اختیار کرسکتی ہے، بالفرض یہ تمام صورتیں اگر کسی عورت کے لئے ناممکن ہوجائے پھر وہ معاش کے لئے بقدر ضرورت حدود شرعی میں رہتے ہوئے قدم رکھ سکتی ہے اس میں کوئی ایسی صورت اختیار کرنی ہوگی جس میں مردوں سے اختلاط کم از کم ہو۔

۷۔ ایسے ادارے میں بھی خواتین کے لئے ضروری ہے کہ کام کے دوران اپنے ذمہ داروں سے پورا پورا پردہ کریں سوائے کفین اور قدمین کے اور ذراعین کے بھی بقول امام ابو یوسف کھولے رکھنے کی گنجائش ہے، ہاں البتہ اگر کوئی ایسی شدید ضرورت پیش آجائے جس میں اداروں کے ذمہ داروں سے تخاطب بغیر چہرہ کھولے ہوئے نہیں کیا جاسکتا تو اس صورت میں فقط چہرہ کھولنے کی اجازت ہوگی بشرط شہوت سے امن ہو، ورنہ بلا ضرورت شدیدہ ان کے ساتھ بھی پردہ کی وہی صورت اختیار کرنا ہوگی جو ایک اجنبی مرد کے ساتھ اختیار کی جاتی ہے (درمختار ۲/۱۷، ۹/ ۴۵۰/ ۴۵۱، ۵/ ۳۲۹)۔

۸۔ اگر عورت ملازمت کررہی ہو ایسی جگہ پر جہاں پر مرد بھی ملازم ہوں تو اس صورت میں بھی عورت کام کے دوران اپنے پورے بدن کا پردہ کرے گی سوائے کفین اور قدمین کے اور ہتھیلیوں کے کھلا رکھنے کی گنجائش اس وقت ہوگی جبکہ شہوت سے امن ہو ورنہ ان کا بھی ڈھانکنا ضروری ہوگا، البتہ اس بارے میں اگر کوئی سن رسیدہ ہو تو شریعت پردہ کے معاملہ میں اس کے ساتھ تخفیف کا معاملہ کرتی ہے، جو پردہ کا حکم جوان عورت کے ساتھ ہے وہ حکم بوڑھی عورت کے ساتھ نہیں ہے (سورۂ نور: ۵۹، فتاویٰ ہندیہ ۵/ ۳۲۳)۔

۹۔ یہ بات بالکل ظاہر اور عیاں ہے کہ پردہ کے حکم کے اعتبار سے دونوں کے درمیان فرق واضح ہے، اگر ایک عورت آفس میں بیٹھ کر یکسوئی سے کام کررہی ہے اور وہاں پر مردوں کی آمدورفت بالکل نہیں ہے تو ظاہر ہے کہ سر بھی کھلا رکھ سکتی ہے اور اگر آمدورفت کم ہے تو وجہ اور کفین اور قدمین کھلا رکھ سکتی ہے بشرطیکہ ان کی آمد پر چہرہ کو نقاب سے ڈھانکنا ضروری ہوگا، اور اگر سیلز گرل بن کر بیٹھی ہے تو اولاً سیلز گرل کی ملازمت اختیار کرنے سے پرہیز کرنے کی ضرورت ہے گرچہ پورے نقاب کے ساتھ ملازمت کررہی ہو (اولاً ایسا بہت مشکل ہے) اور لوگوں کی کثرت اور آمدورفت کی وجہ سے پورا شرعی نقاب اختیار کرنے کے باوجود بھی اس کا بیٹھنا فتنہ سے خالی نہیں، لیکن اگر بیٹھنا لازمی ہو تو پھر پورے چہرے کا نقاب کرے گی اور احتیاط یہ ہے کہ اس وقت ہاتھ میں بھی دستانے پہن لے، اس لئے کہ بقول علامہ شامی بعض حضرات کے نزدیک ہتھیلی بھی ستر ہے (شامی ۲/۱۷)۔

۱۰۔ ملازمت کی وجہ سے اگر بیرون ملک سفر کرتی ہے یا اندرون ملک بقدر مسافت سفر اپنے گھر سے دور جاتی ہے تو بغیر محرم کے سفر کرنے کی اجازت نہیں، البتہ اگر یہاں مستقل قیام کرکے روزانہ ملازمت کی غرض سے گھر سے نکلتی ہے تو جس طرح ایک عورت اپنے محلہ میں نکل سکتی ہے اسی طرح دوسرے ملک میں رہ کر بھی روزانہ آمدورفت کی گنجائش ہے، اس کے لئے بھی پردہ کی وہی شرطیں ملحوظ رکھنی ہوں گی جو ماقبل میں گذر چکی (اعلاء السنن ۱۷/ ۳۸۵، بدائع ۲/ ۲۰۰، فتاویٰ شامی ۵/ ۴۱۲)۔

☆☆☆

بے سہارا خواتین کا ملازمت کرنا

مفتی شیر علی گجراتی [1]

اسلام میں عورتوں کو کام کرنے کی، تعلیم حاصل کرنے کی، خرید وفروخت کی، اور تجارت کی اجازت ہے، بشرطیکہ شرعی حجاب کا پورا لحاظ رکھا جائے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں عورتیں شوہروں کے ساتھ غزوات میں جایا کرتی تھیں، اور وہاں کام بھی کرتی تھیں، مثلاً زخمیوں کی مرہم پٹی کرنا، ان کو پانی پلانا وغیرہ، جیسا کہ فقہاء کرام لکھتے ہیں: متوفی عنہا زوجہا عدت کے اندر دن میں کام کرنے کے لئے جا سکتی ہے، اس کو جانے کی اجازت ہے اور صحابہؓ کے دور میں بیوہ عورتیں اپنے بچوں کی پرورش کے لئے جو اس زمانہ کے حالات کے مطابق کام ہوتا تھا وہ کرتی تھیں، آج کل کمانے کے طریقے بدل گئے، آج کل اس کی جگہ ملازمت نے لے لی ہے، اسلام اس کی بھی اجازت دیتا ہے۔

۱۔ جواز کی نظر سے دیکھتا ہے۔

۲۔ مجبوری کی صورت میں مثلاً عورت بیوہ ہوجائے یا شوہر کی کمائی سے گزارا نہیں ہوسکتا تو شریعت اجازت دیتی ہے۔

۳۔ فی الحال تنگی اور ترشی کے ساتھ وقت گذر رہا ہے، لیکن مجبور ہونے کا خطرہ ہے، اس لئے شریعت پریشانی سے بچنے کی ترغیب دیتی ہے۔

۴۔ شوہر کی اجازت لینی چاہئے اور شوہر کو اجازت دینی چاہئے۔

۵۔ اپنے معیار زندگی کو بلند کرنے کے لئے تین دن سے کم سفر کرنے کی شریعت اجازت دیتی ہے۔

۶۔ عورتوں کو اعلی تعلیم دینی چاہئے، مثلاً لیڈیز ڈاکٹری وغیرہ اسی طرح صنعت کاری کپڑا بننا، زری کا کام اور ایسا کام جو عورت گھر میں رہ کر کر سکتی ہے، اس میں یہ فائدہ ہے کہ عورتیں اپنے بچوں کی صحیح تربیت کر سکتی ہیں۔

۷۔ چہرہ اور ہاتھ کھول سکتی ہے، کلام کر سکتی ہے، البتہ بال وغیرہ ستر نہ کھولے، جیسا کہ شامی میں ہے: ''وينظر من الأجنبية إلى وجهها وكفيها فقط للضرورة الخ'' (۹.۵۳۱ کتاب الحظر والاباحۃ)۔

۸، ۹، ۱۰۔ چہرہ اور ہاتھ کھولنے کی اجازت ہے، اس سے زائد عریانی کی ضرورت نہیں، البتہ اگر ضرورت ہو تو کہنی تک ہاتھ کھول سکتی ہے۔

☆☆☆

---

[1] مفتی جامعہ فلاح دارین ترکیشور، گجرات۔

خواتین کی ذمہ داریاں اور ملازمت

مفتی محبوب علی وجیہی[1]

۱۔ اللہ تعالیٰ نے مرد کے اندر ایسی صلاحیت پیدا کی ہے جو عورت کے اندر نہیں ہے، مثلاً مرد کے لئے یہ ہے کہ وہ گھر سے باہر کے کام انجام دے اور اپنی ذمہ داریوں کو پورا کرے اور اپنے اہل وعیال وجن لوگوں کا وہ کفیل ہے ان کی روزی روٹی کا انتظام کرے اور عورت کے اندر یہ صلاحیت پیدا کی ہے کہ وہ گھر کے امور انجام دے اور اس پر یہ ذمہ داری بھی عائد کی گئی ہے کہ وہ شوہر کے حقوق کا خیال رکھے اور بچوں کی تربیت وان کی دیکھ ریکھ کرے اور چونکہ عورت مرد کے مقابلہ کمزور ہے اور فتنہ کا سبب ہے، اس لئے شریعت مطہرہ نے اسے پردے میں رہنے کا حکم دیا ہے، چنانچہ حدیث شریف میں ہے کہ عورت جب گھر سے باہر نکلتی ہے تو شیطان کی صورت میں نکلتی ہے، لہذا شریعت مطہرہ نے عورت کے لئے کسب معاش کو انہیں فتنوں کی بنا پر درست نہیں سمجھا، البتہ انتہائی مجبوری میں جبکہ اس کے معاش کا کوئی دوسرا ذریعہ نہ ہو اور دیگر کوئی شخص اس پر خرچ بھی نہ کرے اور قرض بھی اسے نہ ملے، تو اس صورت میں وہ بدرجہ مجبوری کسب معاش شرعی تقاضوں کے ساتھ کر سکتی ہے۔

۲۔ لڑکی کا جب تک نکاح نہیں ہوا ہے، اس کا خرچ باپ کے ذمہ ہے اور نکاح ہونے کے بعد شوہر کے ذمہ ہو جاتا ہے اور لڑکے کا خرچ بلوغ تک باپ کے ذمہ ہوتا ہے۔

شامی (۲؍۹۲۳) میں ہے: ''وتجب النفقة لطفله يعم الأنثى والجمع الفقير أي إن لم يبلغ حد الكسب. فإن بلغه كان للأب أن يوجره أو يدفعه في حرفة ليكتسب وينفق عليه من كسبه لو كان ذكرا بخلاف الأنثى كما قدمه في الحضانة عن المؤيدة، قال الخير الرملي: لو استغنت الأنثى بنحو خياطة وغزل يجب أن تكون نفقتها في كسبها كما هو ظاهر''۔

عبارت بالا سے معلوم ہوا کہ لڑکی کا خرچ باپ کے ذمہ ہے، ہاں اگر وہ سلائی وغیرہ کا کام کرتی ہے تو اسے اپنی کمائی سے خرچ کرنا چاہئے اور نکاح کے بعد اس کا خرچ شوہر کے ذمہ ہوگا اور لڑکے کا خرچ بلوغ تک باپ کے ذمہ ہوتا ہے، الا یہ کہ لڑکا کمانے سے عاجز ہو تو بعد بلوغ بھی اس کا خرچ باپ پر عائد ہوگا۔

معلوم ہوا کہ شریعت نے خواتین کے نفقہ کی ذمہ داری ان کے باپ یا شوہروں پر ڈالی ہے اور اگر وہ کوئی کام کرتی ہیں تو باپ کے گھر انہیں اپنی کمائی سے خرچ کرنا چاہئے اور اگر کوئی ان کی کفالت کرنے والا نہ ہو تو بدرجہ مجبوری وہ روزی حاصل کرنے کے لئے شرعی حدود کے ساتھ گھر سے باہر جا سکتی ہیں۔

۳۔ عورت کو گھر میں رہ کر ہی تنگ وترشی سے کام چلا لینا چاہئے، سرمایہ واثاثہ جمع کرنے کی غرض سے یا معیار زندگی بلند کرنے کے لئے گھر سے باہر نکل کر جدوجہد نہیں کرنا چاہئے، کیونکہ زمانہ فتنوں سے خالی نہیں ہے، عورت کی آبرو وعزت محفوظ رہنا بہت دشوار ہے، اس لئے اسے اپنی عصمت وعزت کو محفوظ رکھ کر گھر میں ہی رہنا چاہئے۔

۴۔ اگر شوہر یا ولی کے امور میں کوئی خلل واقع نہ ہو، مثلاً کھانے پینے وسونے میں اس کے خلل واقع ہوتا ہے تو اس سے اجازت لینا ضروری ہوگا، اور اگر اس کے کاموں میں کوئی خلل واقع نہیں ہوتا اور شوہر یا ولی اس کے کام کرنے سے ناراض بھی نہیں ہیں، تو شرعی امور کا لحاظ رکھتے ہوئے گھر میں ان کی بغیر اجازت عورت کام کر سکتی ہے۔

۵۔ جب ولی یا شوہر موجود ہوں اور وہ اس کی کفالت کر رہے ہیں تو پھر عورت کو کسب معاش کے لئے گھر سے باہر نکلنا درست نہیں ہے اور اگر ولی موجود ہے، مگر کفالت نہیں کرتا تو اگر اسلامی حکومت ہو تو مسئلہ یہ ہے کہ ولی کو قاضی قید کرے گا اور اس سے لڑکی کا خرچ پورا کرائے گا، لیکن چونکہ ہمارے ملک میں اسلامی حکومت نہیں ہے، اس لئے عورت اپنے نفقہ کے لئے گھر سے باہر پردے کے ساتھ جا سکتی ہے۔

۶۔ ولی یا شوہر کی موجودگی میں عورت کو ملازمت کرنے کی ضرورت نہیں ہے، اگر یہ لوگ نہ ہوں اور کوئی دوسرا رشتہ دار بھی عورت پر خرچ نہ کرے اور

---

[1] دار العلوم فرقانیہ، انگوری باغ، رامپور (یوپی)۔

نہ کوئی قرض دے تو پھر بدرجہ مجبوری عورت ملازمت کرسکتی ہے، ایسی جگہ جہاں مردوں کا اختلاط نہ ہو اور اگر ایسی ملازمت نہ ملے تو باپردہ رہ کر مردوں میں بھی کام کرسکتی ہے، مگر یہ شق انتہائی مجبوری میں ہے، کیونکہ عام طور پر مردوں کا اختلاط فتنہ سے خالی نہیں ہوتا۔

۷۔ ادارے کے ذمہ داران سے ملاقات اور ان سے اختلاط کے وقت پردے کے وہی احکام ہوں گے جو شریعت نے بیان کئے ہیں۔

۸۔ خاتون ملازمہ ہو یا رکن پردے کے احکام دونوں کے لئے مردوں کے اختلاط کے ساتھ برابر ہیں، البتہ شریعت مطہرہ نے جوان خاتون کے مقابلہ سن رسیدہ خاتون کے لئے کچھ تخفیف فرمائی ہے، مثلاً اجنبی مرد کے لئے سن رسیدہ خاتون سے مصافحہ کرنا درست ہے، جوان سے درست نہیں ہے۔ ''وفی الأشباہ: الخلوۃ بالأجنبیۃ حرام لملازمۃ مدیونۃ ھربت ودخلت خربۃ أو کانت عجوزاً أو بحائل'' (شامی ۵٫۳۲۲)۔

۹، ۱۰۔ عورت کے لئے دوکان کے مقابلہ آفس میں بیٹھ کر کام کرنا زیادہ بہتر ہے اور گھر سے زیادہ دور رہ کر مستقل ملازمت کی غرض سے عورت کا باہر رہنا درست نہیں ہے، عورت کو گھر سے قریب رہ کر ہی پردہ کے ساتھ کام کرنا چاہئے. ''وأجمعوا علی أن العجوز لا تسافر بغیر محرم، فلا تخلو برجل شابا أو شیخا'' (شامی ۵٫۳۲۳)۔

خواتین کی ملازمت

مولانا مفتی فضیل الرحمن ہلال عثمانی [1]

اسلام نے مرد و زن میں عدل وانصاف کے ساتھ ان کی ذمہ داریوں کے دائرے کار متعین کردیئے ہیں، چنانچہ کسب معاش کی ذمہ داری مرد پر ڈالی گئی ہے، شادی سے پہلے باپ اپنی بیٹی کی ذمہ داریوں کو ادا کرتا ہے اور شادی کے بعد یہ ذمہ داری شوہر پر آجاتی ہے۔

لیکن حجاب اور حدود شریعت کا لحاظ رکھتے ہوئے شریعت اسلامی خواتین کو کسب معاش سے منع نہیں کرتی ہے، جیسا کہ حضرت خدیجہؓ دوسروں کے ذریعہ کاروبار کرتی تھی اور حضور ﷺ سے بھی آپؓ کے تعارف کا آغاز کاروباری معاملے ہی کی وجہ سے ہوا۔

شریعت اسلامی نے خواتین پر نان ونفقہ کی ذمہ داری خواہ اپنا ہو یا اپنے بچوں کا قانونی طور پر نہیں ڈالی ہے۔

معاشی جد وجہد اگر حجاب اور شریعت کے دائرے میں ہو تو خواہ معیار زندگی بلند کرنے کے لئے یا کسی اور وجہ سے شریعت اس کی ممانعت نہیں کرتی، بشرطیکہ بنیادی ذمہ داریوں میں حصول معاش کی وجہ سے کوئی فرق واقع نہ ہو۔

☆ عورت کے گھر سے باہر جانے کے لئے اس کے ولی یا شوہر کی اجازت ضروری ہے، اس میں مسافت سفر کا لحاظ نہ ہوگا۔

☆ خواتین کے لئے ملازمت میں شرعی حدود یہ ہیں کہ حجاب کا خیال رہے، مردوں کے ساتھ عام اختلاط نہ ہو، اگر کسی ادارے میں خواتین ہی ہوں اور وہ خواتین بھی قابل اعتماد ہوں تب ہی شرعاً عورت وہاں ملازمت کرسکتی ہے۔

☆ اگر کسی ادارے کے ذمہ دار مرد ہوں اور کام کرنے والی خواتین ہوں، تب بھی پردے کا لحاظ رکھنا ہوگا۔

☆ عورتوں کے لئے ایسی جگہ کام کرنا جہاں مرد بھی ہوں شرعاً درست نہ ہوگا، کیونکہ وہاں عملاً پردے کے حدود قائم نہیں ہوسکیں گے۔

☆ کسی کام میں مردوں کا سامنا جیسے سیلز گرل کا عورت ہونا اس کی شرعاً اجازت نہ ہوگی، آفس میں بھی اگر مینیجر وغیرہ مرد ہوں تو وہاں بھی عورت کا ملازمت کرنا شرعاً درست نہیں ہے۔

☆ ملازمت کی غرض سے عورت کا اپنے گھر اور اپنے وطن سے دور مستقل قیام کرنا درست نہ ہوگا، جہاں اس کا کوئی سرپرست اور ذمہ دار نہ ہو۔

---

[1] جامعہ دار السلام، مالیر کوٹلہ، پنجاب۔

خواتین کا حصول معاش میں حصہ لینا

مفتی جمیل احمد نذیری[1]

۱۔ عورتوں کو کسب معاش کی اجازت ہے، مگر کسب معاش عورتوں پر لازم نہیں۔ "للرجال نصیب مما اکتسبوا وللنساء نصیب مما اکتسبن" (نساء:۳۲)، اس آیت سے مراد اعمال کے ساتھ ساتھ کسب معاش بھی ہو سکتا ہے۔

۲۔ شریعت نے خواتین پر نان ونفقہ کی ذمہ داری نہیں رکھی ہے، نہ ان کا نفقہ ان کے ذمہ ہے نہ ان کے بچوں کا نفقہ ان کے ذمہ ہے، بلکہ شوہر کے ذمہ ہے۔

''خذ ما یکفیك وولدك بالمعروف'' (مشکوۃ المصابیح ۲ر۲۸۱، بحوالہ ابن ماجہ وابوداؤد)۔

(شوہر کے مال میں سے لے لو جو تمہیں اور تمہارے بچے کے لئے کافی ہو) (نیز دیکھئے: بدائع الصنائع ۴ر۱۶، المغنی لابن قدامہ ۷ر۵۶۴، فتح القدیر ۳ر۳۴۴، ہدایہ ۲ر۴۴۳)، شادی نہ ہوئی ہو یا مطلقہ ہوگئی ہو یا شوہر کا انتقال ہوگیا ہو تو نفقہ باپ پر ہوگا (فتح القدیر ۳ر۳۴۴)۔

۳۔ شوہر و بچوں کے حقوق کی ادائیگی کے ساتھ پردہ کا التزام اور اہتمام کرتے ہوئے معاشی جدوجہد شریعت سے متصادم نہیں، کیونکہ بعض صورتوں میں معاشی جدوجہد کی شریعت نے اجازت دی ہے، جبکہ شوہر کا انتقال ہوگیا ہو اور بیوی عدت کے اندر ہو۔

ہدایہ میں ہے: ''وأما المتوفی عنها زوجها فلأنه لا نفقة لها فیحتاج إلی الخروج نهاراً لطلب المعاش وقد یمتد إلی أن یهجم اللیل'' (۲،۴۲۸)۔

۴۔ بیوی چونکہ محبوس بحق الزوج ہے، اس لئے اجازت ضروری ہے، لیکن اگر شوہر نان ونفقہ کی ذمہ داری نہ نبھائے تو ایسی صورت میں اجازت کی ضرورت نہیں، کیونکہ ''کلوا من طیبات ما رزقناکم'' (بقرہ:۱۷۲)، اور حدیث نبوی: ''ما أکل أحد طعاما قط خیراً من أن یاکل من عمل ید یه'' (رواہ بخاری، مشکوۃ ۹،۲۲۱) پر وہ عمل کرنا چاہتی ہے، جب نفقہ کے ذمہ دار اپنی ذمہ داری نہیں نبھائیں گے تو ایسے غیر ذمہ دار کو اجازت دینے نہ دینے کا اختیار کہاں سے مل جائے گا۔

۵۔ شوہر وولی جن کے ذمہ نان ونفقہ کی ذمہ داری ہو، وہ اس کا انتظام نہ کریں تو بیوی کسب معاش کے لئے گھر سے نکل سکتی ہے، اجازت ضروری نہ ہوگی، مسافت سفر ہو تو محرم کو ساتھ رکھے، اور اگر یہ لوگ نان ونفقہ کا انتظام کرتے ہوں تو اجازت ضروری ہوگی۔

۶۔ پردہ کا اہتمام شوہر یا ولی کی اجازت اور مسافت سفر میں محرم کو ساتھ رکھنا ضروری ہے۔

۷۔ مردوں سے پورا پورا شرعی پردہ کرے، یہ سب شریعت کے بالکل عام مسائل ہیں۔ ان مسائل کو شریعت کا معمولی جانکار بھی جانتا ہے، اسی طرح ۸،۹،۱۰ بھی۔

۸۔ ایسی جگہ کام نہ کرے۔

۹۔ مردوں کا سامنا زیادہ ہو یا کم، کچھ فرق نہ ہوگا، ایسی جگہوں پر عورت کام نہ کرے۔

۱۰۔ ایسا کرنا بالکل حرام اور ناجائز ہے۔ ☆☆☆

---

[1] مہتمم جامعہ عربیہ عین الاسلام نواده مبارکپور، اعظم گڑھ۔

خواتین کی ملازمت اور شرعی اصول وضوابط

مولانا ابوسفیان مفتاحی [1]

۱۔ شریعت اسلامی نے خواتین کے لئے کسب معاش کو فرض نہیں کیا ہے، بلکہ کسب معاش اور خواتین کو کھلانا پلانا، ان کا لباس و پوشاک اور مکان مردوں کے ذمہ فرض کیا ہے، نکاح سے پہلے باپ کے ذمہ اور اس کے بعد شوہر کے ذمہ رکھا ہے۔

چنانچہ علماء کرام نے یہ صراحت کی ہے کہ بیویوں کا نفقہ شوہر کے ذمہ فرض ہے، کتاب وسنت اور اجماع امت کی روشنی میں، کتاب اللہ میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: "لینفق ذوسعة من سعته ومن قدر علیه رزقه فلینفق مما آتاه الله لا یکلف الله نفسا إلا ما آتاها" (سورۂ طلاق:۷) (چاہئے کہ خرچ کرے وسعت والا اپنی وسعت کے موافق اور جس کو نپی تلی ملتی ہے اس کی روزی تو خرچ کرے جیسا کہ دیا ہے اس کو اللہ نے اللہ کسی پر تکلیف نہیں رکھتا مگر اسی قدر جو اس کو دیا ہے)۔

دوسری آیت کریمہ میں فرمایا: "قد علمنا ما فرضنا علیهم في أزواجهم وما ملکت أیمانهم" (سورۂ احزاب:۵۰) (یعنی ہم کو معلوم ہے جو ہم نے شوہروں پر ان کی بیویوں کے بارے میں اور غلام ولونڈیوں کے بارے میں فرض کیا ہے اور مقدر کیا ہے)۔

ان آیتوں سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ کسب معاش کی ذمہ داری عورت پر نہیں ہے بلکہ مردوں پر ہے۔

سنت: حدیث میں ہے حضرت جابرؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو خطبہ دیا اور فرمایا کہ عورتوں کے سلسلہ میں اللہ تعالیٰ سے ڈرو کیونکہ یہ مددگار ہیں تمہارے نزدیک، تم نے ان کو اپنے نکاح میں لیا ہے اللہ تعالیٰ کی امانت وحکم سے اور تم نے ان کی شرمگاہوں کو حلال جانا ہے کلمہ ایجاب وقبول سے اور ان عورتوں کے لئے تمہارے ذمہ روٹی، کپڑا ہے دستور کے موافق (رواہ مسلم وابوداؤد)۔

اس حدیث میں واضح ہے کہ عورت کا نفقہ اس کے شوہر کے ذمہ فرض ہے۔

اجماع امت: اہل علم کا اتفاق ہے کہ بیویوں کا نفقہ ان کے شوہروں کے ذمہ فرض ہے، اس لئے کہ عورت شوہر پر مقید ہے کہ شوہر اس کو تصرف اور کمائی کرنے سے منع کرے تو ضروری ہے کہ اس کو نفقہ دے۔

خلاصہ یہ ہے کہ عورت نے جیسا کہ اپنے کو شوہر کے حوالہ کردیا واجب طریقہ پر تو شوہر کے ذمہ اس کی تمام ضروریات فرض ہے، دونوں کی مالداری کی صورت میں مالداری کا نفقہ اور غریبی کی صورت میں غریبی کا نفقہ اور متوسط ہونے کی صورت میں متوسط درجہ کا نفقہ اگر ایک مالدار ہو اور دوسرا غریب تو متوسط درجہ کا نفقہ فرض ہے (المغنی لابن قدامہ ۷ر۵۶۳، ۲ر۰۷، ہدایہ ۲ر۴۱۷)۔

پس شریعت اسلامی نے کسب معاش کو خواتین کے ذمہ نہیں رکھا ہے بنابریں کمائی کرنا ان پر فرض نہیں ہے۔

۲۔ شریعت نے عورتوں کے نان ونفقہ کی ذمہ داری ان کے شوہر پر رکھی ہے، اور نابالغ لڑکیوں کا شادی سے پہلے تک اور نابالغ بچوں اور اپاہج و معذور بالغ لڑکوں کا نان ونفقہ مکمل باپ کے ذمہ رکھا ہے، اس لئے کہ قرآن میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: "وعلی المولود له رزقهن و کسوتهن" (سورۂ بقرہ: ۲۳۳)۔

امام قدوری لکھتے ہیں کہ نابالغ اولاد کا نفقہ باپ کے ذمہ ہے، صاحب جوہرہؒ لکھتے ہیں: یہ نفقہ باپ پر فرض ہے اور مالدار ہو یا فقیر البتہ اگر بچے

---

[1] جامعہ مفتاح العلوم، شاہی کٹرہ، مئو۔

کے پاس مال ہے تو اس کا نفقہ اسی کے مال میں ہوگا، اس طرح باپ کے ذمہ اس کی لڑکیوں کا نفقہ واجب ہے جبکہ محتاج ہوں اور بالغ لڑکوں کا نفقہ باپ کے ذمہ ہے جبکہ وہ اپاہج ہوں یا نابینا یا پاگل ہوں کیونکہ وہ کمانے پر قادر نہیں ہیں (۳/ ۱۳۴)۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ''فإن أرضعن لكم فآتوهن أجورهن'' (سورۂ طلاق: ۶) (پس اگر دودھ پلائیں عورتیں تمہارے بچوں کو تو تم ان کو ان کی اجارت دے دو)، تو اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے دودھ پینے کی اجرت اس کے باپ کے ذمہ واجب کیا ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ''وعلى المولود له رزقهن وكسوتهن بالمعروف'' (سورۂ بقرہ: ۲۳۳)، اور فرمایا: ''وقضى ربك ألا تعبدوا إلا إياه وبالوالدين إحسانا'' (سورۂ اسراء: ۲۳) (والدین کے ساتھ احسان یہ ہے کہ ان کی محتاجگی کے وقت ان کو نفقہ دینا)۔

حدیث: حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا: پاکیزہ کھانا وہ ہے جو آدمی اپنی کمائی سے کھائے اور آدمی کی اولاد اس کی کمائی ہے (رواہ ابوداؤد)۔

اجماع امت: علامہ ابن المنذرؒ نے نقل کیا ہے کہ اہل علم کا اجماع اس پر ہے کہ ایسے محتاج والدین کا نفقہ جن کی کوئی کمائی نہیں ہے اور نہ مال ہی ہے اولاد کا مال ہی نفقہ ہے، کیونکہ وہ اپنے باپ کا جز ہے تو جس طرح انسان پر اپنا اور اپنی بیوی کا نفقہ واجب ہے اسی طرح اس پر اس کے جز کا بھی نفقہ واجب ہے، اور اگر باپ زندہ نہ ہو تو اس پر اس کی اولاد کا نفقہ واجب ہے (المغنی ۷/ ۵۸۲۔ ۵۸۳)۔

خلاصہ یہ ہے کہ خواتین کا اپنا اور نابالغ اولاد اور بالغ لڑکیوں اور معذور بالغ لڑکوں کا کل نفقہ خواتین کے شوہروں اور اولاد کے باپوں پر شرعاً واجب ہے، اور باپ کے نہ ہونے کی صورت میں ماں پر اولاد کا نفقہ واجب ہے۔

۳۔ محض معیار زندگی بلند کرنے یا وقت گذاری اور سرمایہ و اثاثہ پیدا کرنے کی غرض سے عورتوں کے لئے معاشی جدوجہد اختیار کرنا جائز ہے اس شرط کے ساتھ کہ وہ معاشی جدوجہد اندرون خانہ ممکن ہو دوسروں کے گھر نہ جانا پڑے، اس طرح کے ذرائع معاش میں عورت کی عزت و آبرو محفوظ رہتی ہے اور اپنے اور بچوں کے لئے خورد و نوش وغیرہ کا نظم ہو سکتا ہے، شوہر ہو تب بھی اور نہ ہو تب بھی بحسن وخوبی اپنی عفت کو باقی رکھتے ہوئے زندگی کی تمام ضروریات کو مہیا کر سکتی ہے۔

معاشی جدوجہد: مثلاً گھریلو صنعت وحرفت پاورلوم، سلائی کڑھائی وغیرہ اور آج کل تجربہ یہ ہے کہ بعض عورتیں اس طرح محنت کر کے مردوں سے آگے نکل جاتی ہیں اور زیادہ آمدنی کما لیتی ہیں۔

نیز عورت کے لئے فن کتابت سیکھنا جائز ہے تو وہ کتابت کو سیکھ کر گھر میں رہتے ہوئے اس کو ذریعہ معاش بنا سکتی ہے، جس سے روزی روٹی کا نظم ہو سکتا ہے، چنانچہ حدیث میں عورتوں کے لئے فن کتابت سیکھنے کو جائز کہا گیا ہے، مسند احمد میں ہے: حضرت شفاء بنت عبید اللہؓ کہتی ہیں کہ میرے پاس نبی ﷺ تشریف لائے اور میں حضرت حفصہؓ کے یہاں تھیں تو نبی ﷺ نے فرمایا: تم سکھاتی ہو اس کو ڈنک کا جھاڑ پھونک جیسا کہ تم نے اس کو کتابت سکھایا ہے (رواہ ابوداؤد، النسائی وہو حدیث صحیح)۔

امام اثرمؒ کہتے ہیں کہ میں نے یہ حدیث امام احمدؒ سے بیان کی تو انہوں نے فرمایا یہ اجازت ہے کہ عورتوں کو کتابت کی تعلیم دی جائے اور شیخ مجد الدین ؒمنتقی نے کہا کہ یہ دلیل ہے کہ عورتوں کو کتابت سیکھنا جائز ہے (کتاب الآداب الشرعیہ ۳/ ۳۰۹۔ ۳۱۰)۔

خلاصہ یہ ہے کہ عورتوں کے لئے معاشی جدوجہد اپنے گھروں میں رہتے ہوئے کہیں جائے بغیر اختیار کرنا شرعاً جائز ہے۔

۴۔ خواتین کے لئے کسب معاش کی کوئی صورت اپنے اندرون خانہ اپنی معاشی سرگرمیوں کو محدود رکھنے میں اپنے ولی یا شوہر سے اجازت لینا شرعاً ضروری ہوگا، اور واقعہ ایسا ہے کہ ولی یا شوہر ہی معاش کے لئے مشینوں یا سامانوں کا خود ہی نظم کر دیتا ہے۔

خلاصہ یہ کہ خواتین کے لئے کسب معاش کے لئے کسی بھی صورت میں اندرون خانہ ولی یا شوہر کی اجازت ضروری ہوگی۔

۵۔ اگر عورت کو کسب معاش کے لئے گھر سے باہر نکلنا پڑے جیسے عورت کا کسی ادارہ میں جو دینی ہو یا غیر دینی مثلاً اسکول، کالج میں معلمہ ہونا جس میں پردہ کا اہتمام ہو اور مردوں کی آمد ورفت نہ ہو اور عزت وآبرو پوری طرح محفوظ رہے اس کا یقین ہو اور اپنی آبادی میں ہو تو ولی یا شوہر کی اجازت ضروری ہے، اور اگر گھر سے نکلنے میں مسافت سفر یا اس سے زیادہ کے لئے یا اس سے کم کے لئے اور صرف دن کا وقت ہو نہ کہ رات کا، ولی اس کی کفالت کرتا ہو یا نہ کرتا ہو تو وہاں معلمہ ہو کر جانے کے لئے ولی یا شوہر یا کسی محرم کا ساتھ میں جانا اور واپس آنا ضروری ہے، اور اگر مقیم ہونا پڑے تو ولی یا شوہر یا محرم کے ساتھ مقیم ہونا ضروری ہے۔

اور ایسی ملازمت جہاں مردوں سے اختلاط ہو وہاں کسب معاش کے لئے عورت کی ملازمت شرعی اعتبار سے درست نہیں۔

۶۔ خواتین کے لئے ملازمت کے سلسلہ میں خیر القرون میں اس کی نظیر نہیں ملتی، بنابریں خیر القرون کے لوگوں نے اس کے حدود بیان نہیں کئے، خواتین کے لئے ملازمت کا سلسلہ تو خیر القرون کے بعد شروع ہوا ہے، جو شر وفساد اور فتنہ کا زمانہ رہا ہے، اور آج بھی ہے تو اس وقت کے علماء نے محسوس کیا کہ مسلمان غیروں سے مرعوب ہو رہے ہیں تو ان حالات کے پیش نظر خواتین کو ایسے اداروں میں ملازمت کرنے کی رخصت دی گئی ہے جیسے کہ دینی تعلیم کا ادارہ ہو یا ایسا ادارہ ہو جس میں مردوں سے اختلاط نہ ہو اور پورے اسلامی پردہ کا اہتمام ہو اور عورت کی عزت و آبرو محفوظ رہے، اور جہاں مردوں سے اختلاط ہو وہاں ملازمت کی اجازت نہیں دی جائے گی۔

۷۔ ملازمت کرنے والی خواتین اگر ایسے تعلیمی اداروں یا دوسرے اداروں میں ملازمت کریں جہاں صرف خواتین ہی خدمت انجام دیتی ہوں اور کام کی جگہوں میں مرد نہ آتے ہوں جیسے مسلم بچیوں کے لئے دینی مکاتب وادارے اور مدارس وجامعات جن میں صرف معلمات اور عورتیں ہی تعلیم دیتی ہیں اور ادارہ کے ذمہ داران مرد ہوں تو ایسی صورت میں شرعی پردہ کے دائرہ میں رہنا ضروری ہوگا اور بے پردگی جائز نہ ہوگی۔

خلاصہ یہ کہ ایسی صورت میں شرعی پردہ لازم وضروری ہوگا۔

۸۔ اگر عورت ایسی جگہ کام کرے جہاں مرد کارکن بھی ہوں تو اس وقت خاتون کارکن کا مردوں سے شرعی پردہ فرض رہے گا، اسی سلسلہ میں تو زیادہ بہتر ہے بوڑھی یا جوان عورت دونوں پردہ کے حکم میں برابر ہیں اس فتنہ کے زمانہ میں، لیکن ایسی جگہوں میں عورت کو ملازمت کی اجازت نہ دی جائے۔

۹۔ اگر ایک کام کی انجام دہی میں عورت کا مردوں سے سامنا بہت زیادہ ہے اور دوسرے کام کی انجام دہی میں کم ہے تو ان دونوں صورتوں میں شرعی پردہ کے لزوم میں کوئی فرق نہ ہوگا دونوں میں شرعی پردہ ضروری ہوگا، لیکن ان دونوں جگہوں میں سے کہیں بھی عورتوں کی ملازمت کی اجازت نہ دی جائے، غیروں سے مرعوب ہونا، مسلمان کی شان نہیں۔

۱۰۔ ملازمت کی غرض سے عورت کا اپنے گھر اور اپنوں سے دور مستقل قیام کرنے کے لئے شوہر کا ساتھ میں رہنا ضروری ہے، بدون شوہر یا محرم کے مستقل قیام کرنا جائز نہ ہوگا۔

☆☆☆

خواتین کی ملازمت اور موجودہ حالات کا تقاضا

مولانا سلطان احمد اصلاحی [1]

۱۔ شریعت اسلامی خواتین کے لئے کسب معاش کو استحسان کی نظر سے دیکھتی ہے، مسلمان معاشرے میں یہ بڑی خرابی پیدا ہوگئی ہے کہ شادی سے پہلے اور شادی کے بعد جو عورت کے نفقہ کی ذمہ داری باپ اور شوہر کی ہے تو اس کا مطلب یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ اب اسے کمائی کرنے اور اپنی آمدنی بڑھانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، حالانکہ معاملہ اس کے برعکس ہے، سورہ نساء (۳۲) میں جہاں مسلمان عورت کو اس کی الگ کمائی کا حق دیا گیا ہے، وہاں طرز بیان بالکل ایک جیسا ہے، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس معاملہ میں مرد اور عورت کا کوئی فرق نہیں ہے، جس طرح مرد اپنی کمائی کرتا ہے اسی طرح عورت کو اپنی کمائی کرنے کا حق حاصل ہے اور اس کو اپنے اس حق کا استعمال کرنا چاہئے، تاریخ سے بھی اس کے حق میں ثبوت فراہم ہوتا ہے، ام المومنین حضرت خدیجہؓ کپڑے کی بڑے پیمانے کی تاجر تھیں، ازواج مطہراتؓ میں دیگر خواتین بھی تھیں جن کی دوسرے ذرائع سے اپنی الگ آمدنی تھی اور اس کی وجہ سے وہ امور خیر میں ہاتھ کھول کر خرچ کرتی تھیں، موجودہ حالات میں خاص طور پر خواتین کے اس کردار کی طرف توجہ دینے کی ضرورت ہے، مسلمان مردوں کے ساتھ جب تک عام طور پر مسلمان خواتین کے ذریعہ گھر کی دوہری آمدنی نہیں ہوگی امت کی معاشی حالت مستحکم نہیں ہوسکتی اور وہ اپنی دین و دنیا کی ہم جہتی ذمہ داریوں کے ادا کرنے کے قابل نہیں ہوسکتی۔

۲۔ عام حالات میں خواتین پر اپنی اور اپنی اولاد کے نان ونفقہ کی ذمہ داری نہیں ہے، لیکن اگر کسی وجہ سے مرد تنگ حال ہوجائے یا کمائی کرنے کے قابل نہ رہے اور عورت خوش حال ہو اور اپنے اور اپنے بچوں کے نفقہ کی ذمہ داری اٹھا سکتی ہو تو اس طرح کی مخصوص صورت حال میں اس کے اوپر ان کے نفقہ کی ذمہ داری ہوگی، اور ہر حال میں یہ مرد کے اوپر قرض بھی باقی نہیں رہے گا۔ اسی طرح اگر عورت کے بھائی بیروزگار اور پریشان حال ہوں اور بہن برسرروزگار اور خوش حال ہو تو اس صورت میں بھی اسی کے ضرورت مند والدین کا نفقہ اس کے اوپر واجب ہوگا۔

۳۔ حدود کی رعایت سے آمدنی بڑھانے اور اپنی کمائی کرنے کا عورت کا حق مطلق ہے۔ اس لئے معیار زندگی کو بلند کرنے نہ کرنے یا دیگر مذکورہ وجوہ سے قطع نظر اسے اپنے اس حق کو استعمال کرنے کا حق ہے، ہر حال میں تنگی اور ترشی سے کام چلانا بھی کوئی کارنیک نہیں ہے، اور زندگی کے معیار کو بڑھانے کی خواہش بھی ہر حال میں قابل تعریف نہیں ہے، اس لئے ان قیدوں اور ان شرطوں کے بغیر عورت کو مطلق اپنی الگ کمائی کرنے اور اپنی آمدنی بڑھانے کا حق ہے اور اپنی حدوں میں رہتے ہوئے وہ اپنے اس حق کا استعمال کرسکتی ہے، بلکہ عام طور پر اسے ایسا کرنا چاہئے۔

۴۔ قانون سے زیادہ یہ مسئلہ اخلاق سے تعلق رکھتا ہے، اندرون خانہ بھی عورت کا اپنی معاشی سرگرمی میں اس طرح الجھنا مناسب نہیں ہے جس سے کہ اس کے اوپر شوہر کے واجب حقوق فوت ہوتے ہیں، شادی سے پہلے گھر کے اندر لڑکی / عورت کا ولی کو اعتماد میں لے کر ہی اپنی معاشی سرگرمی کو جاری رکھنا مناسب ہوگا۔

۵۔ اس مسئلہ کو بھی قانون سے زیادہ اخلاق سے حل کرنا چاہئے گھر سے باہر بدرجہ اولی عورت کو اپنے شوہر یا ولی کو اعتماد میں رکھتے ہوئے معاشی سرگرمی میں مصروف ہونا چاہئے، مسافت سفر میں تو عورت کسی حال میں محرم کے بغیر نہیں نکل سکتی، اس سے کم مسافت میں بھی حالات کو نگاہ میں رکھتے ہوئے ہی عورت کسب معاش کے لئے گھر سے باہر نکل سکتی ہے، دن اور رات کے وقت کے سلسلے میں بھی یہی بات صادق آتی ہے۔

---

[1] ادارہ علم وادب، دودھپور، علی گڑھ۔

حالت اور مصلحت کو مدنگاہ رکھا جائے ، ولی کی کفالت کرنے نہ کرنے سے اس مسئلہ میں کوئی فرق نہ ہوگا، موجودہ حالات میں یہ مسئلہ بہت نازک ہے اور اس کو لگے بندھے ضابطہ کی پابند نہیں بنایا جاسکتا۔ حاصل کلام کے طور پر اس مسئلہ میں جیسا کہ عام قاعدہ شرعیہ ہے، دفع مضرت کو جلب مصلحت پر مقدم رکھا جائے گا، درء المفاسد اولی من جلب المصالح۔ اس قاعدہ کلیہ کو اس مسئلہ میں معیار بنانا چاہئے۔

۶۔ خواتین کے لئے ملازمت کی سب سے محفوظ صورت یہ ہے کہ شوہر بیوی دفتر/کارخانے میں ایک ساتھ کام کریں، دوسری صورت میں عورت دفتر کارخانے کی ملازمت اسی صورت میں کرسکتی ہے جبکہ شوہر کا اس کو اعتماد حاصل ہو اور اس کے اوپر فی الجملہ اس کی نگرانی قائم رہے، اور کام کی جگہ اجنبی مردوں سے اس درجہ کا اختلاط نہ ہو، جو فتنہ کا موجب ہے۔

ملکی اور عالمی سطح اعداد وشمار ظاہر کرتے ہیں کہ کسی بھی سطح کی اور کسی بھی طرح کی ملازم قوانین کے معاملات قابل اطمینان نہیں ہیں، پولس اور فوج میں بھی ان کی عزت وآبرو محفوظ نہیں رہتی ہے، اس لئے عورت کسی دفتر اور کارخانے یا کسی اور سرکاری /غیر سرکاری محکمے میں شوہر کی باقاعدہ اجازت اور اس کے اعتماد اور نگرانی کی صورت میں ہی ملازمت کرسکتی ہے۔

۷۔ اجنبی مرد کے سامنے عورت کے لئے اپنا چہرہ اور ہتھیلی کھولنے کی جو اجازت ہے ادارہ کے ذمہ دار مرد کے سامنے بھی وہ انہیں اسی حد تک کھول سکتی ہے، ضرورت کے تقاضے سے اس سلسلے میں فقہ حنفی کی ان رخصت سے فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے کہ عورت اور مرد ایک دوسرے کو دیکھ سکتے ہیں، لیکن اسے بقدر ضرورت ہی گوارہ کیا جاسکتا ہے جیسا کہ ضرورت جو اصول ہے کہ: ''الضرورۃ تقدر بقدرہا'' البتہ اس سلسلے میں اس نکتہ کا لحاظ بہت ضروری ہے کہ اجنبی مرد وعورت کا اختلاط طویل نہ ہونے پائے۔ سارا فتنہ اسی سے پیدا ہوتا ہے، اس لئے ادارہ میں ملازم خاتون کا اجنبی مرد ذمہ دار سے واسطہ ضرورت کے بقدر مختصر سے مختصر ہونا چاہئے اور غیر ضروری بے تکلفی سے احتراز کیا جانا چاہئے۔

۸۔ جوان عورتوں کا اجنبی مردوں کے ساتھ کام کرنا انتہائی خطرناک ہے، اس لئے اس سے جہاں تک بچا جاسکے بچنا ضروری ہے، ضرورت کے شدید تقاضے سے اجنبی مرد کے سامنے چہرہ اور ہتھیلی ہی کھلی رکھی جاسکتی ہے، لیکن یہاں بھی اصل قابل توجہ چیز یہی ہے کہ اجنبی مردوں اور عورتوں کا اختلاط ناگزیر ضرورت کی حد تک اور کم سے کم وقفہ کیلئے ہونا چاہئے، سن رسیدہ خواتین کیلئے بھی اجنبی مردوں کے ساتھ لمبا اختلاط خطرے سے خالی نہیں ہے، اس لئے ان کو بھی اس معاملے میں اسی احتیاط سے کام لینا چاہئے۔

۹۔ ہاں دونوں میں فرق ہے، اجنبی مردوں سے مسلسل رابطہ کی ملازمت سے دور ہی رہنا مناسب ہے، اضطرار کی صورت میں اختلاط کے وقفہ کو کم سے کم رکھا جائے، خاتون کی آفس کی ملازمت میں بھی اجنبی مردوں سے غیر ضروری بے تکلفی سے پرہیز کیا جائے۔

۱۰۔ عورت گھر سے دور ملازمت استثنائی صورت میں ہی کرسکتی ہے، نیز یہ کہ اس کی اجازت سن رسیدہ خواتین کیلئے ہی دی جاسکتی ہے اور اس کیلئے بھی ولی اور شوہر کا اعتماد ضروری ہے۔

☆☆☆
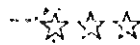
خواتین کی ملازمت شریعت کی نظر میں

مفتی عبدالرحیم قاسمی [1]

۱۔ اگر کوئی عورت ایسی ہے جس کا نہ تو شوہر ہے اور نہ باپ ہے اور نہ ہی کوئی دوسرا رشتہ دار ہے جو اس کی معاشی کفالت کر سکے اور نہ خود اس عورت کے پاس اتنا مال ہے جس کے ذریعہ وہ اپنی ضروریات پوری کر سکے اس صورت میں اس عورت کے لئے بقدر ضرورت کسب معاش کے لئے شرعی پردہ کی پابندی کے ساتھ گھر سے نکلنا جائز ہے (فقہی مقالات ۱/ ۲۴۹)۔

کسب معاش کے لئے مسلمان خاتون کا نکلنا جائز نہیں ہے، البتہ جس ضرورت کے موقع پر شریعت نے مسلمان خاتون کے لئے گھر سے باہر نکلنے کو جائز قرار دیا ہے اس موقع پر بھی اس خاتون پر یہ لازم ہے کہ وہ بغیر زیب و زینت کے حجاب کے تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے گھر سے نکلے (فقہی مقالات مفتی تقی عثمانی ۱/ ۲۴۹)۔

عورت کے ذمہ پردہ لازم ہے، تاہم بے پردگی کی وجہ سے اس کی حلال کمائی کو ناجائز نہیں کہا جائے گا (فتاوی محمودیہ ۱/ ۷۷ ۳)۔

بیوی کے اخراجات کی ذمہ داری شوہر اور بیٹی کے نفقہ کی ذمہ داری باپ پر ہے اور اپنے حق کو حاصل کرنے کے لئے وہ شوہر یا باپ سے مطالبہ بھی کر سکتی ہے، اس کو کمائی کے لئے مجبور کرنا درست نہیں، البتہ یہ حلال اور جائز طریقہ پر کمائیں تو یہ مال خود انہی کا ہے کوئی ان کے مال کو زبردستی لے تو یقیناً یہ ظلم ہے (کتاب الفتاوی ۵/ ۱۴۷)۔

علامہ یوسف قرضاوی کے فتاوی میں ہے کہ عورت اگر مطلقہ یا بیوہ ہے اور آمدنی کے سارے راستے اس پر بند ہوں تو عورت کے لئے نوکری صرف جائز ہی نہیں، بلکہ بعض حالات میں ضروری ہے، اگر وہ نوکری کر کے اپنی اور اپنے بچوں کی کفالت کر سکتی ہے تو اسے چاہئے کہ دوسروں کے سامنے ہاتھ پھیلانے دوسرے پر بوجھ بننے کے بجائے ملازمت کر لے۔

بعض حالات میں شوہر کی موجودگی میں بھی عورت کو نوکری کرنے کی ضرورت پڑ سکتی ہے، مثلاً شوہر کی آمدنی اخراجات کے لئے ناکافی ہو یا عورت کے بوڑھے ماں باپ ہوں اور چھوٹے بھائی بہن ہوں وغیرہ ان حالات میں اسے ملازمت کرنے کا اختیار ہے اس طرح کی صورت حال کا ذکر قرآن پاک میں موجود ہے (سورۂ قصص: ۲۳)۔

عورتیں بیمار ہوتی ہیں، لیڈی ڈاکٹر نہ ملنے کی وجہ سے مجبوراً مرد ڈاکٹروں کے پاس مسلمانوں کو جانا پڑتا ہے اسکولوں اور کالجوں میں مسلم لڑکیوں کی تعلیم و تربیت کے لئے غیر مسلم اساتذہ اور لیکچرر ہوتے ہیں جن سے یہ توقع فضول ہے کہ وہ مسلم لڑکیوں کی تربیت اسلامی انداز میں کریں گے، بہر کیف ضرورت اور حالات کے مطابق عورت کا نوکری کرنا جائز اور حلال ہے، لیکن اس سلسلہ میں مندرجہ ذیل باتوں کا لحاظ رکھنا ضروری ہے:

۱۔ یہ ضروری ہے کہ نوکری میں کوئی ایسا کام نہ ہو جو شرعاً ناجائز ہو، مثلاً کسی کنوارے لڑکے کے یہاں خادمہ کی نوکری کرنا یا کسی شخص کی پرسنل سکریٹری بننا، کیونکہ تنہائی میں کسی غیر مرد کے ساتھ وقت گذارنا شرعاً جائز نہیں، اسی طرح ڈانس اور گانے وغیرہ کی نوکری ہو، یا ایئر ہوسٹس کی نوکری کرنا، کیونکہ غیر شرعی لباس پہننا اور شراب پیش کرنا اور تنہائی میں غیر مردوں کے ساتھ رہنا اس نوکری کے لازمی اجزاء ہیں، اسی طرح ہر وہ نوکری جس میں کوئی غیر شرعی کام ہو جائز نہیں۔

---

[1] مرکز دعوت و ارشاد و افتاء، ناظم جامعہ خیر العلوم نور محل روڈ بھوپال۔

۲۔ یہ ضروری ہے کہ نوکری کرتے ہوئے عورت تمام اخلاقی اور اسلامی آداب کا خیال رکھے۔

۳۔ یہ ضروری ہے کہ نوکری کرنے سے عورت کی دوسری اولیں اور زیادہ اہم ذمہ داریاں متاثر نہ ہوں، مثلاً بچہ کی نگہداشت اور امور خانہ داری میں غفلت نہ ہو یا اس کی نوکری کی وجہ سے گھر کا سکون و آرام غارت نہ ہو، کیونکہ بچوں کی نگہداشت اور گھر کے ماحول کو پرسکون بنانا عورت کی اولین ذمہ داری ہے (فتاوی یوسف قرضاوی ۲ر ۱۲۴)۔

۲۔خواتین پر نان ونفقہ کی ذمہ داری:

کن صورتوں میں خواتین پر نفقہ واجب ہے، ''احسن الفتاوی'' میں ہے کہ کسب سے عاجز لوگوں کا نفقہ ان کے ذی رحم محارم رشتہ داروں کے ذمہ ہے (تفصیل کے لئے دیکھئے: ۵ر ۴۷۲)۔

۳۔ اگر گھر کی مالی حالت ایسی ہے کہ تنگی ترشی سے کام چل سکتا ہے تو محض معیار زندگی بلند کرنے، اثاثہ پیدا کرنے، سرمایہ جمع کرنے اور وقت گذاری کی غرض سے عورتوں کے لئے معاشی جدوجہد کی اجازت نہیں ہوگی۔ حضور ﷺ نے فرمایا: ''لیس للنساء نصیب فی الخروج إلا لمضطرة'' (طبرانی)۔

یعنی صرف مجبوری اور اضطرار کی صورت مستثنی ہے، مجبوری اور اضطرار نہ ہو تو عورتوں کو باہر نکلنے کا کوئی حق نہیں (فتاوی رحیمیہ ۳ر ۱۲۹)۔

۴۔ کسب معاش کی سرگرمیوں کو اندرون خانہ محدود رکھنے کی صورت میں بھی خواتین کو شوہر سے اجازت لینا ضروری ہے۔

درمختار میں ہے: ''وکذا لو آجرت نفسها لإرضاع صبی و زوجها شریف و لم تخرج. قیل: تکون ناشزة'' (درمختار)

(اگر عورت اجرت پر اپنے نفس کو مقرر کرے بچے کو دودھ پلانے کے لئے اور اس کا شوہر معزز ہے اور وہ گھر سے باہر نہیں نکلی تب بھی ایک قول کے مطابق نافرمان ہوگی)۔

شامی نے فرمایا: ''شوہر کے گھر میں رہتے ہوئے سوت کاتنے، نقش ونگار کرنے مہندی لگانے کی اجرت پر کام کرنے سے عورت ناشزہ تو نہیں ہوئی، ہاں شوہر کے لئے اس کام سے منع کرنے کا اختیار ہے، شوہر کے حق میں خلل واقع کرنے والے کاموں سے عورت کو روکنے کا حق حاصل ہے''

(شامی ۲ر ۶۴۷)۔

۵۔ عورت کو گھر سے باہر نکلنے کے لئے ولی یا شوہر سے اجازت لینا ضروری ہے۔

شامی نے فرمایا: ''إن له منعها من الغزل و كل عمل ولو قابلة و مغسلة'' (شامی ۲ر ۶۴۷)۔

(شوہر کو حق ہے کہ سوت کاتنے سے اور ہر کام سے بیوی کو منع کردے اگرچہ وہ دایہ ہو اور غسل دینے والی ہو)۔

اللہ تعالی نے کسب معاش کے لئے دن کا وقت مقرر فرمایا ہے: وجعلنا النهار معاشا (سورۂ نبا:۱۱)۔

احتیاط کا تقاضہ بھی یہ ہے کہ صرف دن میں شوہر کی اجازت سے کسب معاش کے لئے عورت کو باہر نکلنے کی گنجائش دی جائے۔

۶۔ گھر میں رہتے ہوئے کسب معاش کا ذریعہ میسر آجائے تو شوہر کی اجازت سے اس کو اختیار کرنا جائز ہے، اضطرار اور مجبوری میں گھر سے باہر نوکری کرنا پڑے تو شرعی پردے کی پابندی اور حجاب کے تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے سادگی کے ساتھ زیب و زینت کے بغیر شوہر کی اجازت سے یہ نوکری کی جاسکتی ہے، نوکری میں کوئی ایسا کام نہ ہو جو شرعاً ناجائز ہو، مثلاً مرد کی پرسنل سکریٹری بننا، کیونکہ تنہائی میں غیر محرم کے ساتھ وقت گذارنا جائز نہیں، اسی طرح ڈانس کرنے یا گانے بجانے کی نوکری کرنا یا ایرہوسٹس کی نوکری کرنا، کیونکہ غیر شرعی لباس پہننا، شراب پیش کرنا اور تنہائی میں غیر مردوں کے ساتھ رہنا اس نوکری کے لازمی اجزاء ہیں۔

نامحرم سے بات کرنے کی ضرورت پیش آئے تو آنکھ میں آنکھ ڈال کر بات نہ کی جائے نگاہ بچا کر بھی بات کی جاسکتی ہے (فتاوی محمودیہ ۲۷۸/۱)
نوکری کرتے وقت اسلامی اخلاقی آداب کا لحاظ رکھنا ضروری ہے، شوہر کے حقوق کی ادائیگی اور بچوں کی نگہداشت وتربیت عورت کی اولین ذمہ داری ہے، اس لئے اس کی اہمیت کے پیش نظر یہ ضروری ہے کہ نوکری سے اس میں کوئی خلل واقع نہ ہو، سفر شرعی اڑتالیس میل یا اس سے زیادہ بغیر محرم کے سفر جائز نہیں، لہذا اتنی یا اس سے زیادہ مسافت کے فاصلہ پر نوکری کرنا شرعا جائز نہیں۔

۷۔ جس ڈپارٹمنٹ میں عورتیں کام کرتی ہوں وہاں کی سپروائزر بھی عورت ہی ہو تو بوقت حاجت شرعی حدود کی رعایت رکھتے ہوئے اس فیکٹری میں نوکری کرنے کی اجازت ہے (فتاوی محمودیہ ۳۷۸/۱۲)۔

۸۔ مرد کارکنوں کے ساتھ عورتیں کارکن ہوں تو مردوں سے تنہائی میں نہ ملیں اور متعلقہ کام کے علاوہ لچک دار لہجہ میں نرمی سے کوئی بات نہ کریں اور رغبت ومیلان کا اظہار نہ کریں، درمختار میں ہے: ''وينظر من الأجنبية إلى وجهها وكفيها فقط للضرورة. قيل: والقدم والذراع إذا آجرت نفسها للخبز'' (درمختار على هامش شامي ۵،۲۳۶)۔

(اجنبی عورت کے چہرہ اور ہتھیلیوں کو ضرورت کی وجہ سے دیکھ سکتا ہے اور عورت روٹی پکانے کی ملازم ہو تو اس کے قدم اور بازوؤں کو بھی دیکھ سکتا ہے)۔

شامی نے کہا کہ سن رسیدہ خواتین بغیر محرم کے سفر نہیں کرسکتی مرد خواہ جوان ہو یا بوڑھا تنہائی میں اس کے ساتھ نہیں رہ سکتی، ہاں معمر مردوں سے مصافحہ کرسکتی ہیں۔

''إن العجوز لاتسافر بغير محرم فلا تخلو برجل شابا أو شيخا ولها أن تصافح الشيوخ'' (شامی ۲۳۵/۵)، (کسی نامحرم عورت سے تنہائی میں بے پردہ ملنا جائز نہیں خواہ وہ معمر ہی کیوں نہ ہو اس کے چہرہ کی طرف بھی نہ دیکھا جائے (فتاوی محمودیہ ۲۸۴/۱۷)۔

۹۔ عورتوں کے لئے جائز نہیں کہ بے حجاب دوکان پر بیٹھ کر غیر محرم کے ساتھ تجارت کریں مجبوری اور اضطرار نہ ہو تو عورتوں کو باہر نکلنے کا کوئی حق نہیں اگرچہ کمائی ہوئی رقم حرام نہ ہو، لیکن کمائی کا طریقہ ناجائز اور گناہ کا باعث ہے (فتاوی رحیمیہ ۱۶۹/۳)۔

البتہ آفس میں یکسوئی سے بیٹھ کر کام کرنے میں مردوں سے زیادہ سامنا نہیں ہونے کی بنا پر عورتوں کے لئے مجبوری کے وقت آفس کی ملازمت کی گنجائش ہوگی۔

۱۰۔ جمہور فقہاء نے فرض حج کے لئے بھی شرعی محرم کے بغیر عورت کے سفر کرنے کو ناجائز کہا ہے، جبکہ اس کے مقابلہ میں تعلیم اور معاش تو بہت کم درجہ کی چیزیں ہیں جن کی مسلمان عورت کو ضرورت ہی نہیں، شریعت اسلامیہ نے اس کی کفالت کی ذمہ داری شادی سے پہلے اس کے باپ پر اور شادی کے بعد شوہر پر ڈالی ہے اور عورت کو اس کی اجازت نہیں دی کہ وہ شدید ضرورت کے بغیر گھر سے نکلے لہذا کسب معاش اور حصول تعلیم کے لئے اس طرح بغیر محرم کے سفر کرنا جائز نہیں (فقہی مقالات ۲۴۹/۲)۔

مسلمان عورت کے لئے حصول معاش کے لئے یا حصول تعلیم کے لئے محرم کے بغیر تنہا غیر مسلم ممالک کا سفر کرنا جائز نہیں اسی طرح قیام کرنا بھی جائز نہیں (فقہی مقالات ۲۴۹/۲)۔

محرم اور شوہر کے بغیر عورت کے لئے اڑتالیس میل یا اس سے زیادہ کا سفر کرنا جائز نہیں اور جب سفر ہی جائز نہیں تو اتنی دور قیام کرنا بدرجہ اولی جائز نہیں، تین دن ورات سے مراد اتنی طویل مسافت کا سفر ہے جس کو حضور ﷺ کے زمانہ میں تین شب وروز میں طے کیا جاتا تھا اور وہ اڑتالیس میل کی مسافت ہے، یہاں تک کہ حج جیسی اہم عبادت کے لئے بھی محرم کے بغیر سفر کرنے سے منع فرمایا گیا، اس لئے اس طرح خواتین کا ملازمت کیلئے دور دراز علاقہ میں قیام جائز نہیں (کتاب الفتاوی ۳۹۷/۵)۔

☆☆☆

خواتین کی ملازمت

مولانا ریاض احمد قاسمی ؒ

شریعت اسلامی خواتین پر کسب معاش کی ذمہ داری نہیں ڈالتی ہے، البتہ اگر خواتین چاہیں، تو کسب معاش کا ایسا طریقہ اختیار کرسکتی ہیں، جس سے نہ تو اس کی فطری خصوصیات، شرعی ذمہ داریوں اور مقاصد نکاح میں سے کوئی ایک بھی متاثر ہو، نہ ہی کسی ممنوع مثلاً: عزت کا خطرہ، بے پردگی اور نامحرم کے ساتھ اختلاط وغیرہ کا ارتکاب لازم آئے، جس کی چند عملی صورتیں درج ذیل ہیں:

عورت اپنے گھر میں رہ کر خالی وقتوں میں سلائی، بنائی، کڑھائی وغیرہ پیشوں کے ذریعہ آمدنی کے مواقع پیدا کرسکتی ہے۔

اپنے گھر پر بچیوں یا چھوٹے بچوں کو پڑھا کر آمدنی حاصل کرسکتی ہے۔

عورت ''دایہ'' یا میت کو نہلانے والی ہو، تو اس پر بھی اجرت لے سکتی ہے۔

سرمایہ دار ہو، تو اپنا سرمایہ لگا کر گھر بیٹھے بیٹھے نوکروں، یا مضاربوں کے ذریعہ تجارت کرسکتی ہے۔

طبیبہ ہو تو اپنے گھر میں یا شہر میں عورتوں کے علاج کے لئے وقت کا ایک حصہ فارغ کرسکتی ہے۔

عالمہ فاضلہ ہو، تو کسی مدرسۃ البنات میں چند گھنٹوں کی عارضی ملازمت کرسکتی ہے، بشرطیکہ اپنے شہر میں ہو۔

دیہات کی رہنے والی ہو، تو کھیتوں وغیرہ میں مزدوری کرسکتی ہے، بشرطیکہ مرد مزدوروں کے ساتھ اختلاط نہ ہو۔

یہ امور اور اس طرح کی دیگر صورتیں وہ ہیں جن کے بارے میں فقہاء کرام کے نصوص موجود ہیں۔

(ردالمحتار ۵/ ۳۲۵، ردالمحتار ۵/ ۲۸۸، تنظیم الاسلام للمجتمع لابی زہرہ: ۷۸)۔

۲۔ اصولی طور پر شریعت نے خواتین پر نان ونفقہ کی ذمہ داری نہیں رکھی ہے، بلکہ خود اس کا نان ونفقہ شادی سے پہلے اس کے والد، وہ نہ ہوں تو دادا وہ نہ ہوں تو الاقرب فالاقرب کے مطابق ذی رحم محرم پر واجب ہے (حوالہ سابق)۔

شادی کے بعد شوہر پر واجب ہے (حوالہ سابق)، اسی طرح اولاد کا نان ونفقہ بھی صرف والد پر واجب ہے، والدہ اس میں شریک نہیں۔

البتہ اگر عورت مالدار ہو، تو تین صورتوں میں ''انفاق'' کا حکم اس کو دیا گیا ہے، جن میں سے بعض صورتوں میں وہ رجوع بھی کرسکتی ہے۔

شوہر کا انتقال ہوچکا ہو یا وہ لاپتہ ہو اور گھر پر مال بھی نہ چھوڑا ہو، یا وہ خود محتاج ہو، تو بیوی کو حکم دیا جائے گا کہ وہ محتاج اولاد پر خرچ کرے اور جب شوہر آجائے اور صاحب استطاعت ہوجائے تو اس سے واپس لے لے۔

۲۔ والدین محتاج ہوں تو ان کا نفقہ، یا اس کا ایک حصہ مالدار بیٹی پر واجب ہے اور اسے بعد میں واپس نہیں لے سکتی۔

کوئی ذی رحم محرم محتاج ہو تو اس کا نفقہ بھی وراثت کے حصے کے بقدر مالدار عورت پر واجب ہے (ردالمحتار ۵/ ۳۴۱، ۳۴۲)۔

ان عبارت سے واضح ہے کہ خود عورت کا یا اس کی اولاد کا نفقہ اس پر واجب نہیں، البتہ اگر وہ مالدار ہو، تو بعض صورتوں میں اس پر نفقہ واجب

ؒ ... مدرسہ رحمانی، مونگیر۔

ہوتا ہے، لیکن اگر وہ خود محتاج ہو یا مالدار نہ ہو تو کما کر نفقہ مہیا کرنا اپنا یا کسی اور کا اس پر واجب نہیں ہے، بلکہ ایسی حالت میں اس کی کفالت یا تو کوئی ذی رحم محرم رشتہ دار کرے، یا شوہر ہو تو اس پر واجب ہے۔

۳۔ خواتین کی فطری خصوصیات، ان کی شرعی ذمہ داریوں اور مقاصد نکاح نے، ان کے لئے جو دائرہ عمل مقرر کیا ہے، اس میں رہ کر، کسی گناہ کا ارتکاب کئے بغیر معاشی جدوجہد کرسکتی ہیں، خواہ معیار زندگی بلند کرنے اور سرمایہ واثاثہ پیدا کرنے ہی کی غرض سے ہو (جس کی چند عملی صورتیں پہلے سوال کے جواب میں گذر چکی ہیں)۔

۴۔ مذکورہ صورت میں شوہر کی اجازت بہر حال ضروری ہے، البتہ ولی کی اجازت اس وقت ضروری ہے، جب وہ کفالت کرتا ہو۔

۵۔ کسب معاش کے لئے خواتین کے باہر نکلنے کی جو جائز صورتیں سوال کے جواب میں آچکی ہیں ان کے دائرے میں رہ کر اگر باہر نکلنا چاہیں تو اس کے لئے شوہر کی اجازت ضروری ہوگی، خواہ گھر سے نکلنا مسافت سفر یا اس سے زیادہ کے لئے ہو یا اس سے کم کے لئے، دن کے وقت ہو یا رات کے وقت، البتہ ولی کی اجازت اسی وقت ضروری ہوگی جبکہ وہ کفالت کرتا ہو، ورنہ نہیں (ذیل جواب ۴، ۵ دونوں کا حوالہ درج کیا جاتا ہے)۔

شوہر کی اجازت بہر حال ضروری ہے، اس سلسلے میں فقہی عبارت گذر چکی۔ ''وفي البحر: له منعها من الغزل، وكل عمل، ولو تبرعا لأجنبي ولو قابلة أو مغسلة لتقدم حقه على فرض الكفاية'' (ردالمحتار ۵.۳۲۵)۔

ان عبارات کی رو سے جب شوہر کی حق تلفی، یا اس کو تکلیف ہوتی ہو، یا اس کے لئے گھر سے باہر نکلنا ضروری ہو، تو لازم ہے کہ عورت ایسی کسی سرگرمی کو شروع کرنے سے پہلے شوہر سے اجازت لے لے۔

ولی کی اجازت کے سلسلے میں قرآن مجید کی ایک آیت سے رہنمائی ملتی ہے۔

''فلا تعضلوهن أن ينكحن أزواجهن إذا تراضوا بينهم بالمعروف'' (سورۂ بقرہ: ۲۳۲)۔

اس آیت میں اللہ تعالی نے اولیاء کو منع فرمایا ہے کہ وہ اپنی زیر ولایت عورتوں کو اپنے سابق شوہر کے ساتھ نکاح کرنے سے نہ روکیں (ہاں اگر وہ خود کرنے کے لئے تیار ہوں یا عورتیں اس میں کسی صریح گناہ کا ارتکاب کریں تو روک سکتے ہیں)، اس پر قیاس کا تقاضہ یہ ہے کہ جن مصالح نفس کی بنا پر اولیاء کو نکاح سے روکنے کا حق نہیں، انہیں بلکہ ان سے اہم مصالح کی بنا پر جواز کے دائرے میں رہ کر کسب معاش سے روکنے کا بھی حق نہیں ہوگا۔

البتہ دو صورتوں میں روک سکتے ہیں:

خود اولیاء اس کے نان ونفقہ کا بندوبست کردیں، یا وہ عورتیں کسی صریح گناہ کا ارتکاب کرنے لگیں، تو جس طرح اصل میں ان دونوں صورتوں کے اندر روکنے کا حق ہے، اسی طرح یہاں بھی ہوگا۔

فقہاء کے ایک جزیئے سے بھی اس جانب اشارہ ملتا ہے:

''وتجب (النفقة أيضا لكل ذي رحم محرم صغيرا أو أنثى مطلقاً. وقال الشامي تحته: سواء كانت بالغة صغيرة صحيحة أو ... والمراد بالصحيح القادرة على الكسب لكن لو كانت مكتسبة بالفعل كالقابلة والمغسلة لانفقة لها'' (ردالمحتار ۵.۳۶۲)۔

وجہ اشارہ یہ ہے کہ اگر ذی رحم محرم عورت جواز کے دائرے میں رہ کر کام کرتی ہو، تو اس کا نفقہ ولی پر واجب نہیں، معلوم ہوا کہ وہ اس کو اس کام سے یا اس کے لئے باہر نکلنے سے روکنے کا تو مجاز نہیں، البتہ اب اس کی کفالت اس پر واجب نہیں۔

ولی کے سلسلے میں دلیل عقلی کا تقاضا بھی یہی ہے، کیونکہ جب اس کی زیر ولایت خاتون باہر کام کرے گی، تو اس کے لئے یہ باعث ننگ وعار

ہوگا، لہذا اس کو روکنے یا دور کرنے کے لئے اگر وہ خاتون کی کفالت کرتا ہو، تو اسے یہ حق ہونا چاہئے کہ وہ ایسے کام سے خاتون کو روکے، جیسا کہ اسی ننگ و عار کی بنا پر اولیاء کو اعتراض کا حق دیا گیا ہے۔

لیکن اگر وہ کفالت کے لئے تیار نہ ہو تو اب خاتون کی مصلحت نفس کو ترجیح دی جائے گی اور ولی کی اجازت کے بغیر بھی، جواز کے دائرہ میں کسب معاش اور اس کے لئے باہر نکلنا جائز ہوگا۔

۶۔ خواتین کے لئے وہ ملازمت درست نہیں ہے جس سے اس کی فطری خصوصیات، شرعی ذمہ داریاں اور مقاصد نکاح میں سے کوئی بھی متاثر ہو، جس کا نتیجہ نفاق و شقاق اور گھریلو نظام کے فساد کی شکل میں ظاہر ہو، البتہ ایک خاص دائرے میں کسب معاش کی اجازت ہے، جس میں ملازمت کی وہ چند صورتیں بھی داخل ہیں، جن میں یک گونہ حاجت بھی پائی جاتی ہے اور مذکورہ امور میں سے کوئی متاثر بھی نہیں ہوتا، نہ ہی کسی ممنوع کا ارتکاب لازم آتا ہے، مثلاً کسی مدرسۃ البنات، یا بچوں کے اسکول میں تدریس کی وقتی ملازمت، جہاں مردوں سے سامنا کالعدم ہو، یا مثلاً خالص لیڈیز نرسنگ ہوم یا اسپتال میں ڈاکٹر نرس کی ملازمت، جہاں مردوں کا اختلاط نہ ہو۔

۷۔ ایسے طبی یا تعلیمی اداروں میں وقتی ملازمت تو درست ہے، لیکن پردے کا اہتمام ہر حال میں ضروری ہے، البتہ کسی ضرورت کی بنا پر ہاتھ یا چہرہ کھولنا پڑے، یا بلا قصد و اختیار کھل جایا کرے اور عورت فوراً اس کو درست کر لے، تو اس میں کوئی حرج نہیں۔

۸۔ ایسی جگہ جہاں مردوں کے ساتھ اختلاط ہو عورتوں کے لئے کام کرنا ہی درست نہیں، خصوصاً اس فتنہ اور فساد کے زمانہ میں، تو پردہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، اور سن رسیدہ اور جوان عورتوں کے درمیان فرق کا سوال بھی نہیں سمجھ میں آتا، کیونکہ حضور جماعت کے سلسلے میں عجوز کا استثناء ہے، وہ بھی بعض فقہاء کے نزدیک اور صرف چند وقتوں میں، اب ظاہر ہے کہ عجوز عورتیں تو کام کرتی نہیں، جو کام کرتی ہیں، وہ بہر حال قابل شہوت ہوتی ہیں اور اپنے ہم عمروں کے لئے فتنہ کا سبب بن سکتی ہیں، اس لئے سن رسیدہ اور جوان میں کوئی فرق نہیں، حکم عام ہے۔

۹۔ مذکورہ دونوں صورتوں میں ملازمت ناجائز ہے۔

۱۰۔ بلا حاجت جب عورت کے لئے تنہا باہر جانا درست نہیں (جیسا کہ حضرت سودہ کی حدیث میں گزر چکا ہے) تو باہر جا کر مستقل قیام کرنا بدرجہ اولی درست نہیں ہوگا، چاہے ملازمت ہی کی غرض سے ہو۔

☆☆☆
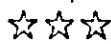
خواتین کی ملازمت

مفتی محمد ثناء الہدی قاسمی[1]

۱۔ اسلام میں انفرادی ملکیت کا جو تصور ہے اس میں عورت ومرد کی تفریق نہیں کی گئی ہے، اور اسی وجہ سے صدقۂ فطر، کفارہ وغیرہ کا مالی بوجھ مرد کے ساتھ عورتوں پر بھی ڈالا گیا ہے، یہ ملکیت کبھی تو ترکہ کے ذریعہ منتقل ہوتی ہے اور کبھی شوہر اور دوسرے اہل خانہ کی داد ودہش وعطیات وغیرہ سے، مال کی ملکیت میں آنے کی ایک شکل کسب بھی ہے، یہی وجہ ہے کہ شرعی حدود میں رہتے ہوئے شادی سے پہلے ولی اور شادی کے بعد شوہر کی اجازت سے عورتوں کے لئے کسب معاش کی اجازت دی گئی ہے، حتی کہ وہ اجرت پر دودھ پلانے کا کام بھی کرسکتی ہے، اللہ رب العزت کا ارشاد ہے:

''فان أرضعن لکم فآتوهن أجورهن'' (سورۂ طلاق: ٦)۔

(پھر اگر مطلقہ عورتیں تمہارے لئے بچوں کا دودھ پلائیں تو ان کو ان کی اجرت دے دو)۔

حضرت شعیب علیہ السلام کی بچیوں کا بکریوں کو پانی پلانے کے لئے کنویں تک جانا اور اختلاط اجانب سے احتراز کرتے ہوئے ایک طرف انتظار میں کھڑی رہنا اور حضرت موسی علیہ السلام کا تعاون کرنا قرآن کریم میں تفصیل سے مذکور ہے۔

اسی طرح کھیتی وغیرہ کے کام میں شوہر کی مدد کرنا، جانور کو چارہ وغیرہ دینا، کھیت سے لانا یہ سارے امور وہ ہیں جن کا ذکر احادیث میں مذکور ہے، حضرت اسماء بنت ابوبکرؓ کی شادی جب حضرت زبیرؓ سے ہوئی تو ان کے سارے کام کیا کرتی تھیں (بخاری ۷۸٦/۲)۔

جہاد کے موقع پر زخمیوں کی مرہم پٹی کرنا، پانی پلانا اور لاشوں کو محفوظ جگہ منتقل کرنے کا کام بھی خواتین عہد رسالت میں کرتی تھیں، کچھ یہ خدمات ان کی رضا کارانہ تھیں، لیکن جو کام رضا کارانہ کرنے میں قباحت نہیں اسے پیشہ ورانہ طور پر کرنے میں کیا قباحت ہوسکتی ہے۔

بخاری کی روایت ہے:

''عن الربیع بنت معوذ قالت: کنا مع النبی ﷺ نسقی الماء ونداوی المرضی ونرد القتلی'' (۱،۴۰۳)۔

۲۔ سوال یہ ہے کہ وہ اس قسم کی تگ ودو کیوں کریں؟ جب کہ ان کا نفقہ شادی سے قبل ان کے والدین پر اور شادی کے بعد شوہر کے ذمہ ہے۔ فتاوی ہندیہ میں ہے:

''ونفقة الأناث واجبة مطلقا علی الآباء مالم یتزوجن إذا لم یکن لهن مال'' (۵٦۳۱)۔

بعض صورتوں میں ان کے ذمہ بھی نفقہ کی ادائیگی آتی ہے، مثلاً لڑکی بالغ یا لڑکا اپاہج ہے تو اس صورت میں ترکہ پانے کے اعتبار سے نفقہ کی ذمہ داری ان پر ہوتی ہے، ارشاد ربانی ہے: "وعلی الوارث مثل ذلك" (سورۂ بقرہ: ۲۳۳)۔

قدوری میں ہے:

''وتجب نفقة الابنة البالغة والابن الزمن علی أبویه أثلاثاً علی الأب الثلثان، وعلی الأم الثلث''۔

اگر عورت کسب معاش نہ کرے اور اس کے پاس کسی اور ذریعہ سے مال منتقل نہ ہو تو وہ ذمہ داری کس طرح پوری کرے گی، اسی طرح جدید دور میں اس کی ضرورتیں نفقہ سے بہت آگے بڑھ گئی ہیں، جن کی تکمیل شوہر کی استطاعت سے باہر ہے، ایسے میں وہ چاہتی ہے کہ اس کے پاس اپنا کمایا ہوا مال ہوتا کہ وہ اپنی آرائشی ضرورتیں پوری کرسکیں، نت نئی فیشن کی چیزیں خرید سکیں، اسے ان چیزوں کے لئے شوہر کے سامنے گڑگڑانا نہ پڑے وہ بڑی حد تک اپنے اوپر منحصر ہوں نہ

---

[1] نائب ناظم، امارت شرعیہ بہار، اڑیسہ وجھارکھنڈ۔

کہ شوہر کے اوپر، یہ خواہشات کیسی بھی ہوں کم از کم غیر شرعی نہیں، ان کی تکمیل جب ہی ممکن ہے جب وہ کسب معاش کرے، گو سرمایہ واثاثہ جمع کرنے اور معیار زندگی بلند کرنے اور وقت گذاری کی خاطر عورتوں کا معاشی جدوجہد میں لگنا شریعت کی نظر میں پسندیدہ نہیں ہے ارشاد ربانی ہے:

''ولا تمدن عينيك إلى ما متعنا به أزواجا منهم'' (طه: ۱۳۱، الحجر: ۸۸)۔

(اور تم اس متاع دنیا کی طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھو جو ہم نے ان میں سے مختلف قسم کے لوگوں کو دے رکھی ہے)۔

اس کے علاوہ معاملہ کا ایک دوسرا رخ یہ بھی ہے کہ بعض شعبوں میں ان کی ضرورت محسوس کی جاتی ہے، جیسے نرسنگ اور قابلہ (دایہ) کے کام خواتین کی مخصوص اشیاء کی خرید وفروخت وغیرہ۔

۴۔ خواتین کا شوہر کی اطاعت اور بچوں کی دیکھ بھال کے ساتھ گھر کے اندر کسب معاش کے لئے مشغول ہونے میں کوئی حرج نہیں ہے، البتہ ولی یا شوہر کی اجازت ضروری ہوگی، کیونکہ بہت سارے خاندان میں عورتوں کا معاشی جدوجہد میں مشغول ہونا خواہ گھر کے باہر ہو یا اندر، عار سمجھا جاتا ہے اور بہت سارے شوہر اور ولی اسے کسر شان سمجھتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ بہت سارے گھروں میں خواتین کو چھوٹے موٹے کاموں کے لئے ملازمہ کے طور پر رکھا جاسکتا ہے، تاکہ گھر کی مالکہ کی حیثیت ملکہ کی باقی رہے، لیکن اگر ولی اس کا خیال نہیں رکھتا، کفالت نہیں کرتا اور عورت خود مختار ہے تو وہ اس کی اجازت کے بغیر بھی معاشی جدوجہد کے لئے شرعی حدود کی رعایت کرتے ہوئے باہر جاسکتی ہے۔

باہر جا کر روز آنا جانا ممکن ہو، یا رات کا قیام محفوظ جگہ ہو اور عصمت کو خطرہ لاحق نہ ہو تو اس صورت میں کسب معاش کے لئے گھر سے نکلنا بغیر ولی یا شوہر کے لئے بھی جائز ہوگا، لیکن اگر ملازمت کی جگہ مسافت سفر پر ہے تو ولی یا شوہر کو اس کے ساتھ جانا چاہئے۔

۶۔ خواتین کے لئے ملازمت کے سلسلہ میں شرعی حدود دو ہیں: اختلاط بالا جانب نہ ہو، حجاب کی رعایت رکھی جائے۔

ان دو امور پر اگر عمل ممکن ہو تو خواتین کی ملازمت شرعا درست ہوگی۔

۷۔ یہیں سے یہ بات صاف ہوگئی کہ ایسے کسی بھی ادارے میں عورتوں کا کام کرنا جہاں اجنبی مردوں سے عموماً اختلاط کی نوبت نہیں آتی اور پورے ادارہ کو خواتین ہی چلاتی ہیں ان میں ملازمت کی اجازت ہوگی، ادارہ کا ذمہ دار ہو تو حجاب شرعی کے ساتھ اس سے معاملاتی گفتگو کرسکتی ہے، اللہ رب العزت کا ارشاد ہے:

"إذا سئلتموهن متاعاً فاسئلوهن من وراء حجاب ذلكم أطهر لقلوبكم وقلوبهن..." (سورۂ احزاب ۵۳)۔

(ازواج مطہرات سے اگر کچھ مانگنا ہو تو پردے کے پیچھے سے مانگو یہ تمہارے اور ان کے دلوں کی پاکیزگی کے لئے زیادہ مناسب ہے)۔

ازواج مطہرات جو کائنات کی بہترین عورتیں تھیں، جن کی پاکیزگی تقوی اور طہارت کی قسمیں کھائی جاسکتی ہیں، ان کے لئے اللہ تعالی کا یہ ارشاد ہے تو بھلا عام عورتوں کے لئے پردہ کے بغیر گفت وشنید کس طرح درست ہوسکتی ہے۔

۸۔ کسی بھی ایسی جگہ جہاں مرد وعورت دونوں کام کرتے ہوں اور ان کی نشستیں الگ الگ نہ ہوں عورتوں کے لئے کام کرنا اختلاط بالا جانب کی وجہ سے درست نہیں ہوگا، البتہ کام کرنے کی جگہیں الگ الگ ہوں اور مردوں سے اختلاط نہ ہوتا ہو تو ایسے ادارے میں بھی کام کرنا خواتین کے لئے درست ہوگا۔

اس صورت میں احوط تو یہی ہے کہ سن رسیدہ اور جوان دونوں احتیاط کریں، البتہ سن رسیدہ میں فتنہ کا اندیشہ نسبتاً کم ہے، اس لئے حکم کے مدارج میں فرق ہوگا۔

۹۔ اسی طرح اگر عورت تنہائی میں اکاؤنٹ کا کام کر رہی ہے بچوں کو پڑھا رہی ہے، گھر میں سلائی بنائی کر رہی ہے اور ان کا مردوں سے سامنا نہیں ہوتا تو ایسے کام میں عورتیں کے مشغول ہونے میں حرج نہیں ہے، البتہ سیلز گرل، وکالت اور اس جیسے پیشوں میں مشغول ہونا اختلاط بالا جانب کی وجہ سے ممنوع ہوگا۔

۱۰۔ حدود شرعیہ کی رعایت اور ولی یا شوہر کی اجازت سے اگر عورت کا قیام بسلسلہ ملازمت ملک وبیرون ملک ہو تو اس میں حرج نہیں ہے۔

☆☆☆

خواتین کی ملازمت

مولانا خورشید احمد اعظمی[1]

عورت زندگی کا سوز وساز ہے اور اس کے وجود سے کائنات کی رنگارنگی ہے، صنف نازک، اسلام سے پہلے ہر دور میں بے وقعت ہونے کے باوجود بڑے بڑے زور آور، دانشور، اور سربراہان مملکت پر غالب اور ان کے ارادوں کی مالک رہی ہے، اس کو خالق کائنات نے اس لئے پیدا کیا ہے تاکہ مرد اس سے سکون حاصل کرسکے۔

اللہ تعالی کا ارشاد ہے: "وخلق لکم من أنفسکم أزواجا لتسکنوا إلیہا" (سورۂ روم:۲۱)۔

دن بھر کی جفاکشی اور بیرون خانہ الجھنوں کا مارا انسان جب شام کو اپنے گھر لوٹتا ہے تو اندرون خانہ کی ایک مسکان اس کی ساری تھکان اور غموں کا مداوا ہوتی ہے۔

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

"ما استفاد المؤمن بعد تقوی اللہ خیرا له من زوجة صالحة إن أمرها اطاعته وإن نظر إلیها سرته، وإن أقسم علیها ابرته وإن غاب عنها نصحته فی نفسها و ماله" (سنن ابن ماجه ۱۸۵۷، نحوه فی سنن النسائی باب ای النساء خیر ۶۰۶۸)

(مومن مرد نے اللہ کے تقوی کے بعد اپنے لئے نیک بیوی سے بہتر کسی چیز سے فائدہ نہیں اٹھایا، ایسی بیوی کہ اگر اس کو حکم کرے تو اس کی اطاعت کرے، اس کی جانب نظر کرے تو اسے خوش کردے، اس کے اوپر قسم کھالے تو اسے قسم سے بری کردے، اور وہ غائب ہو تو اپنے نفس اور اس کے مال کی حفاظت کرے)۔

بہرکیف خالق کائنات نے اس کو بڑے کام کیلئے پیدا کیا ہے، انسان کی عائلی زندگی میں اس کا اہم کردار ہے اور بڑی ذمہ داریاں ہے، اسی لئے کسب معاش کی ذمہ داری سے عام حالات میں اس کو سبکدوش رکھا گیا ہے۔

۱۔ پھر بھی اسلامی شریعت میں عورت کو کسب معاش کی ممانعت نہیں ہے، اپنے ولی یا شوہر کی اجازت سے حجاب میں رہتے ہوئے کسی اجنبی مرد کے ساتھ اختلاط کے بغیر وہ کسب معاش کرسکتی ہے، کسب معاش کی کچھ تو ایسی صورتیں ہیں جو اندرون خانہ بھی کی جاسکتی ہیں، جیسے سلائی کڑھائی وغیرہ اور کسب معاش کی وہ صورتیں جو بیرون سے متعلق ہیں انہیں اپنے وکیل کے ذریعہ ادا کرسکتی ہے، وکیل کے لئے اجنبی ہونا ضروری نہیں ہے، اس کا کوئی ذی رحم محرم بھی وکیل ہوسکتا ہے، اسلام نے عورت کو مالکانہ حقوق دیئے ہیں، وہ اشیاء منقولہ وغیرہ کی مالک ہوسکتی ہے، اس میں تصرف کا حق رکھتی ہے، اور اس کے نظم ونسق کی مجاز ہے، حضرت خدیجہؓ کی تجارت معروف ہے، ایک حدیث میں مذکور ہے:

"ایک عورت کے شوہر وفات پاگئے تھے وہ عدت میں تھی، تو آپ ﷺ نے انہیں اپنے باغ کے دیکھ بھال کی اجازت دی"

(سنن النسائی باب خروج المتوفی عنہا بالنہار)۔

۲۔ عورت اپنی خلقت کے اعتبار سے کچھ ایسی خصوصیات کی حامل ہے کہ عام حالات میں وہ کسب معاش سے مستغنی ہوتی ہے، اور وہ اپنے ہر دور میں کسی نہ کسی مرد کے زیر کفالت ہوتی ہے، اور کسب معاش کی مشقت اٹھائے بغیر اس کی ضروریات زندگی پوری ہوتی ہیں، اس کے نفقات

---

[1] محلہ رگھوناتھ پورہ، مئو۔

کی ذمہ داری احوال کے مطابق اس کے باپ، شوہر اور اولاد پر ہے، اور اس سلسلہ میں فقہی عبارات بہت واضح ہیں:

''تجب النفقة للزوجة علی زوجها'' (البحر الرائق ۴،۲۹۳)، ''وتجب النفقة بأنواعها علی الحر لطفله يعم الأنثی'' (درمختار ۵،۳۳۶)، ''ولأبويه واجداده وجداته لو فقراء ای تجب النفقة لهولاء'' (البحر الرائق ۴،۳۶۸)۔

لہٰذا عورت پر کسی غیر کے نان ونفقہ کی ذمہ داری نہیں ہے، حتی کہ اس کے بطن سے پیدا شدہ لڑکے کا نفقہ بھی اس پر نہیں ہے، جیسا کہ آیت کریمہ ''وعلی الوارث مثل ذلک'' کی تفسیر میں علماء کے اقوال سے معلوم ہوتا ہے۔

احکام القرآن میں مولانا ظفر احمد عثمانی (۱، ۵۶۷) میں مذکور ہے:

(بچے کے وارث پر اسی جیسے حقوق واجب ہیں جیسا کہ بچے کے باپ پر تھے یعنی بچہ کی ماں پر خرچ کرنا، اس کے حقوق کو پورا کرنا، اور اس کو ضرر نہ پہنچانا، اور یہی جمہور کا قول ہے)۔

عورت پر صرف اس صورت میں اپنا نفقہ ہے، جبکہ وہ بغیر شوہر کے ہو اور صاحب مال ہو، اور اگر وہ محتاج ہے تو اس کا نفقہ باپ یا اس کے لڑکے پر ہے، بیوی ہونے کی حالت میں اس کا نفقہ ہر حال میں اس کے شوہر پر ہے۔

۳۔ ایسی معاشی جدوجہد جو اندرون خانہ ہو یا کسی ایسی جگہ جہاں بے پردگی نہ ہو، اجنبی مرد کے ساتھ اختلاط نہ ہو، فتنہ کا اندیشہ نہ ہو تو باپ یا شوہر کی اجازت سے خواتین اس معاشی جدوجہد کو اختیار کر سکتی ہیں، خواہ وہ محض معیار زندگی بلند کرنے کے لئے ہی ہو۔

۴۔ ولی یا شوہر کی اجازت ہونا ضروری ہے، شوہر کو تو یہ حق حاصل ہے کہ بیوی کو نفلی روزہ سے روک دے۔

''وينبغی عدم تخصيص الغزل بل له أن يمنعها من الأعمال كلها المقتضية للكسب. لأنها مستغنية عنه لوجوب كفايتها عليه، وكذا فی العمل تبرعا لأجنبی بالأولی'' (البحر الرائق ۴،۳۳۲)۔

یعنی ممانعت کو دھاگہ کاتنے کے ساتھ خاص نہ کرنا مناسب ہے، بلکہ شوہر کے لئے جائز ہے کہ اس کو روک دے ہر ایسے عمل سے جو کسب معاش کے متقاضی ہیں، اس لئے کہ وہ عورت اس سے مستغنی ہے، اس کی کفایت مرد پر واجب ہونے کی وجہ سے۔

''اور وہ بات جس کا لکھنا مناسب ہے کہ شوہر کے لئے بیوی کو ہر ایسے عمل سے روکنا مناسب ہو جو اس شوہر کے حق میں تنقیص یا ضرر کا سبب ہو یا عورت کے گھر سے نکلنے کو مستلزم ہو، بہر حال ایسا عمل جس میں اس کا کوئی ضرر نہیں تو اس عمل سے اس کو روکنے کی کوئی وجہ نہیں ہے، خاص طور سے شوہر کی گھر میں عدم موجودگی کی حالت میں، اس لئے کہ عورت کو بغیر کام اور مشغولیت کے چھوڑنا نفسانی اور شیطانی وساوس تک پہنچا دے گا، یا ایسی مشغولیت میں لگا دینا جو مناسب نہیں، یعنی اجانب اور پڑوسیوں کے ساتھ (شامی ۵/۳۲۵)۔

۵۔ عورت کے گھر سے باہر نکلنے کے لئے ولی یا شوہر کی اجازت ضروری ہے، فتاویٰ میں قرأت کے باب میں ہے کہ عورت کے لئے مہر پر قبضہ کرنے سے پہلے جائز ہے کہ شوہر کی اجازت کے بغیر اپنی ضروریات اور اقارب کی زیارت کے لئے نکلے، اور اگر شوہر نے مہر دے دیا تو اس عورت کے لئے بغیر اجازت نکلنا جائز نہیں ہے، ظاہر ہے اس میں مسافت سفر یا دن رات کی کوئی قید نہیں ہے (فتح القدیر ۴/۲۰۸)۔

اگر ولی یا شوہر کی طرف سے گھر سے باہر کسب کی اجازت ہو اور موضع کسب مسافت سفر کی مقدار ہے تو حالت سفر میں کسی محرم کا ہونا ضروری ہے، چنانچہ حج کے باب میں مذکور ہے:

''لا تجوز لها أن تحج بغيرهما إذا كان بينها وبين مكة ثلاثة أيام'' (ہدایہ ۲۱۳)۔

حدیث میں وارد ہے: ''اگر شوہر کفالت نہ کرتا ہو تو عورت کو خفیہ طریقہ پر بقدر ضرورت اس کے مال سے لینا جائز ہوگا، ہند بنت عتبہ زوجہ ابوسفیان کی حدیث سے اس کی اجازت معلوم ہوتی ہے (سنن ترمذی ۳/۴۶۳)۔ ورنہ عدالت کے ذریعہ حاصل کر سکتی ہے۔

شوہر یا ولی کے عدم کفالت کی وجہ سے اگر عورت کو کسب معاش کے لئے نکلنا ہی ناگزیر ہو تو اس کو دن میں نکلنے کی اجازت ہوگی، جیسا کہ متوفی عنہا زوجہا جس کا نفقہ نہیں ہوتا ہے اس کے بارے میں مذکور ہے۔

''وأما المتوفی عنها زوجها فلانه لا نفقة لها فیحتاج إلی الخروج نهارا والطلب المعاش وقدیمتد إلی أن یهجم اللیل'' (هدایه ۴۰۴)۔

۶۔ خواتین کے لئے ملازمت کی اجازت کے لئے شرعی طور پر ضروری ہے کہ:

۱۔شوہر یا ولی کی اجازت ہو۔

۲۔عورت کسی ایسی ہیئت یا زینت کے ساتھ نہیں نکلے گی جس میں اجنبی مردوں کے لئے دعوت نظارہ ہو۔

۳۔ملازمت ایسی جگہ نہ ہو جہاں اجنبی مردوں کا سامنا ہو، یا ان سے سابقہ ہو۔

۴۔پردہ اور حجاب کا پورا التزام ہو۔

۵۔ملازمت کا کام شرعی طور پر ممنوع نہ ہو۔

۷۔ ملازمت کرنے والی خواتین اگر ایسے اداروں میں کام کریں جہاں خواتین ہی خدمت انجام دیتی ہوں، کام کی جگہوں پر اجنبی مرد نہ ہوں، البتہ ادارہ کے ذمہ دار مرد ہوں تو حسب ضرورت عورت پردہ کے پیچھے سے ان سے بات کرسکتی ہے، اور یہاں پر بھی پردہ کے احکام اور حدود ہوں گے، جو عام حالات میں عورت کے لئے ہیں۔

۸۔ اگر عورت ایسی جگہ کام کرے جہاں مرد کارکن بھی ہوں تو اس کیلئے یہ ملازمت درست نہیں ہوگی، اس کی وجہ سے عورت کا بے پردہ ہونا درست نہیں، کسب معاش کی دوسری بہت سی صورتیں ہیں، اگر اس بات کی اجازت دی جائے کہ پردہ کے ساتھ ان کے درمیان کام کرے تو اس کے لئے تکلف اور مشقت ہے، اور اس پر دوام بھی ناممکن ہے۔

سن رسیدہ اور جوان عورتوں کے درمیان کوئی فرق بھی کرنا مناسب معلوم نہیں ہوتا اس لئے کہ لکل ساقطۃ لاقطہ، سن رسیدہ خواتین اب تو ذریعہ بھی بنتی ہیں اور پھر ان کے قدردان بھی کم نہیں ہیں۔

۹۔ ایسا کام جس کی انجام دہی میں عورت کا سامنا مردوں سے بہت زیادہ ہوتا ہے، اور وہ کام جس کی انجام دہی میں مردوں کا سامنا یا ان سے سابقہ کم ہوتا ہے، دونوں صورتوں میں عورت کے لئے ایسی جگہ جہاں ایک بھی مرد یا تھوڑی دیر کے لئے بھی اجنبی مرد کے ساتھ اختلاط ہو درست نہیں، عورت کے لئے پردہ کے سخت احکام ہیں ان کے لئے تو حکم ہے کہ گھر کے اندر رہیں۔

۱۰۔ مذکورہ بالا شرائط کے ساتھ جائز ہوگا کہ ملازمت کے لئے شوہر یا ولی کی اجازت ہو، اگر مقام ملازمت مسافت شرعی یا اس سے زیادہ ہے تو سفر میں اس کے ساتھ کوئی محرم ہو، اور ملازمت کی جگہ عورتوں کے لئے مختص ہو، مردوں کا اس میں کام نہ ہو۔

☆☆☆

خواتین کی ملازمت

مولانا اشتیاق احمد اعظمی [1]

۱۔ یہ بات ظاہر ہے کہ اسلام نے خاندانی زندگی کے نظام کی بنیاد اس پر رکھی ہے کہ مرد باہر کا کام کریں اور خواتین امور خانہ داری کو انجام دیں، یہ یقیناً فطری اصول ہے، جو مردوں کے لئے بھی رحمت ہے، اور عورتوں کے لئے بھی نیز اس میں خاندانی نظام کی بقاء واستحکام ہے۔

یہ بھی واضح امر ہے کہ شرعی نظام کی روشنی میں عورت کے نان ونفقہ کی ذمہ داری اس کے باپ، بیٹا، شوہر اور بھائیوں پر ہے، یہ مذکورہ بالا اشخاص شرعاً عورتوں پر خرچ کرنے اور ان کی ضروریات کو پورا کرنے کے ذمہ دار ہیں، تاکہ ایک عورت پورے سکون واطمینان سے امور خانہ داری کو انجام دے سکے۔

قرآن پاک میں اللہ تعالی کا ارشاد ہے: ''الرجال قوامون علی النساء بما فضل اللہ بعضهم علی بعض'' (سورۂ نساء: ۳۴) اس آیت کی تفسیر میں حضرت مولانا شفیع صاحبؒ فرماتے ہیں: دوسرا اشارہ اہم اصول زندگی کی طرف یہ بھی ہے کہ عورت اپنی خلقت اور فطرت کے اعتبار سے نہ اس کی متحمل ہے کہ اپنے مصارف خود کما کر پیدا کرے، نہ اس کے حالات اس کے لئے سازگار ہیں کہ محنت ومزدوری اور دوسرے ذرائع کسب میں مردوں کی طرح بازاروں اور دفتروں میں پھرا کرے، اس لئے حق تعالی نے اس کی پوری ذمہ داری مردوں پر ڈال دی، شادی سے پہلے باپ اس کا متکفل ہے اور شادی کے بعد شوہر (معارف القرآن ۲؍۳۹۸)۔ علامہ بیضاوی نے مردوں کے عورتوں پر قوامیت کی دوصورتیں وہبی اور کسبی بیان کی ہیں، کسبی میں عورتوں پر انفاق کو شمار کرایا ہے کیونکہ مرد شادی کے نتیجہ میں بیوی کا مہر اور اس کے نان نفقہ کو ادا کرتا ہے۔

اس لئے عام حالات میں چونکہ مرد عورتوں کا متکفل ہوتا ہے عورت کے اس تکفل کی بنیاد پر شریعت نے اسے کسب معاش سے آزاد کیا ہے، اس لئے عمومی حالات میں عورتوں کو کسب معاش میں لگنا شرعاً امر مستحسن نہیں ہے۔

۲۔ شریعت نے خواتین پر بعض صورتوں میں یہ ذمہ داری رکھی ہے، مثلاً جبکہ شوہر ایسا تنگ دست ہو کہ خود اس کا نفقہ اس کے اصول یا فروع پر واجب ہو اور شوہر کمانے سے عاجز ہو تو ایسی صورت میں دوسرے کے نفقہ کی ذمہ داری شوہر پر نہیں رکھی گئی ہے کیونکہ جب وہ خود اپنا نفقہ دوسرے سے لے رہا ہے تو دوسرے کا نفقہ اس پر واجب کرنا، معقول امر نہیں ہے (الفقہ الاسلامی وأدلتہ ۷؍۸۲۳)۔

ڈاکٹر وہبہ زحیلی نے اس مسئلہ کی مزید تفصیل یہ کی ہے کہ جب باپ موجود نہ ہو یا فقیر ہو اور بیماری یا بڑھاپے کی وجہ سے کمانے سے عاجز ہو تو اولاد کا نفقہ حنفیہ کی رائے میں موجود اصول پر ہوگا چاہے وہ اصول مذکر ہوں یا مونث بشرطیکہ وہ خوشحال ہوں یا تنہا ماں پر ہوگا خوشحال ہونے کی شرط کے ساتھ ڈاکٹر وہبہ زحیلی کی عبارت ملاحظہ ہو:

''أما إذا لم يكن الأب موجودًا أو كان فقيرًا عاجزًا عن الكسب لمرض أو كبر سن أو نحو ذلك كانت نفقتهم في رأي الحنفية على الموجود من الأصول ذكراً كان أو أنثى إذا كان موسراً فتجب على الجد وحده إذا كان موسرا أو على الأم وحدها إذا كانت موسرة'' (الفقہ الاسلامی وادلتہ ۷؍۸۲۶)۔

مذکورہ بالا نصوص فقہی کی روشنی میں یہ معلوم ہوا کہ بعض صورتوں میں نان ونفقہ کی ذمہ داری عورتوں پر شریعت میں رکھی گئی ہے۔

---

[1] استاذ دار العلوم مئو، مئو۔

۳۔ محض معیار زندگی کو بلند کرنے یا وقت گذاری اور سرمایہ واثاثہ پیدا کرنے کی غرض سے عورتوں کے لئے معاشی جدو جہد اختیار کرنے کے سلسلے کے احکام میں تفصیل ہے، جبکہ مالی حالت گھر کی ایسی ہے کہ جس میں تنگی وترشی سے کام چل سکتا ہے اور چلتا ہے۔

اس کی ایک صورت تو یہ ہے کہ عورت باقاعدہ ملازمت اختیار کرے اور اس سلسلہ میں روزانہ اس کا گھر سے باہر آنا جانا ہو، اجنبی مردوں کے ساتھ اختلاط ہو، امور خانہ داری کی انجام دہی میں خلل واقع ہو شوہر کے حقوق کی ادائیگی اور بال بچوں کی نگہداشت متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے تو اس قسم کی معاشی جدو جہد محض معیار زندگی بلند کرنے اور سرمایہ واثاثہ کی بڑھوتری اور اضافہ کے لئے صحیح نہیں ہے، عورت کی فطرت گھر کی چہار دیواری میں رہ کر کاموں کو انجام دینے کی ہے نہ کہ بازاروں، آفسوں اور دفتروں کا چکر لگانے کی ہے۔

معاشی تنگی دور کرنے کے لئے اگر عورت گھر کے اندر کوئی کام کرسکتی ہو جیسے سلائی کڑھائی کا کام یا اس جیسا اور کوئی کام جو گھر کی چہار دیواری میں رہ کر انجام دیا جاسکتا ہو اور اس سے معاشی تنگی دور ہوسکتی ہو اور عورت کے اس کام کے اختیار کرنے پر شوہر یا باپ کو کوئی اعتراض نہ ہو تو اس میں کوئی قباحت نہیں، کیونکہ فی زمانہ بہت سے افراد کی کمائی اتنی نہیں ہوا کرتی جس سے پورے گھر کا تکفل ہو سکے، بالخصوص آج کل کی ہوشربا گرانی کے دور میں اس لئے اگر عورت گھر کے اندر کچھ کما سکتی ہو تو اس میں کوئی حرج نہیں عورت کے لئے گھریلو کام کی اجازت پر فقہاء نے تصریح فرمائی ہے (الفقہ الاسلامی وادلتہ ۸۸۳/۴)۔

۴۔ خواتین کسب معاش کے لئے اگر ایسی سرگرمی اختیار کرتی ہیں جو گھر کی چہار دیواری کے اندر محدود ہو تب بھی اسے شوہر یا ولی سے اجازت لینا ضروری ہوگا (شامی ۳۲۵/۵)۔

۵۔ اگر شوہر یا ولی عورت کی کفالت کرتا ہو تو اس صورت میں عورت کو کسب معاش کے لئے ان کی اجازت کے بغیر گھر سے باہر نکلنا درست نہیں، اس لئے نان ونفقہ کی ذمہ داری نبھانے کی صورت میں اگر عورت گھر کے اندر بھی کوئی پیشہ ورانہ کام کرتی ہے تو شوہر کو روکنے کا حق حاصل ہے (شامی مع الدر ۳۲۵/۵)۔

اور اگر ولی یا شوہر کی طرف سے نفقہ نہ ملتا ہو کیونکہ یہ لوگ خود تنگ دست ہوں جس کے باعث عورت کی بنیادی ضرورتیں کھانا پینا اور کپڑا وغیرہ نہ پوری ہوتی ہوں تو اس صورت میں عورت کے لئے اکتساب نفقہ کی اجازت ہے، اس صورت میں عورت کے لئے گھر سے باہر نکلنے کی چند صورتیں ہیں:

۱۔ عورت اکتساب نفقہ کے لئے گھر سے باہر دن میں اپنی بستی میں کام کرتی ہو تو ایسی صورت میں عورت بغیر شوہر یا ولی کی اجازت کے بھی گھر سے باہر جاسکتی ہے، جیسا کہ فقہاء نے اس کی تصریح فرمائی ہے (دیکھئے: الموسوعۃ الفقہیہ ۱۱۰/۱۹)۔

۲۔ عورت اکتساب نفقہ کے لئے اپنی بستی میں رات میں کام کرنا چاہتی ہو تو اس کی گنجائش نہیں کیونکہ رات شوہر کا حق ہے اور رات میں آنے جانے میں فساد کا زیادہ امکان ہے، اس لئے کہ فقہاء کے یہاں جب عورت کے لئے دن میں مسجد جانے کی اجازت نہ تھی تو اس کے لئے رات میں مسجد میں جانا ممنوع تھا۔

۳۔ عورت کا کسب معاش کیلئے اپنی بستی چھوڑ کر دوسرے مقام پر جانا، چاہے وہ مسافت سفر سے کم ہو، اس صورت میں اگر چہ امام ابوحنیفہؒ کے یہاں عورت کے ساتھ محرم کے ہونے کی قید نہیں ہے لیکن دوسرے فقہاء کے یہاں اس صورت میں بلا وجہ یا بغیر محرم کے نکلنا جائز نہیں (دیکھئے: نووی مع صحیح مسلم ۴۳۳/۱)۔

امام ابوحنیفہ کے یہاں مسافت سفر سے کم میں اگر چہ گنجائش ہے مگر اس پر فتن دور میں احتیاط اسی میں ہے کہ ایک جوان عورت بغیر شوہر یا محرم کے اپنی بستی سے دوسری بستی کا بھی سفر نہ کرے خواہ وہ ایک ہی منزل کی دوری پر کیوں نہ ہو۔

۶۔ ڈاکٹر مصطفی سباعیؒ کے نزدیک کسی عورت کے لئے اجنبی مرد کے سامنے اپنے زیب وزینت کے مقامات اور اسی طرح بدن کے کسی حصہ کو کھول کر

آنا یا رہنا ہرگز جائز نہیں، ہاں اپنا چہرہ اور دونوں ہتھیلیوں کو بلا بناؤ سنگار کے کھول کر سامنے آنے کی اجازت ہے۔

اسی طرح کسی عورت کا اجنبی مرد کے ساتھ تنہائی میں رہنا بھی جائز نہیں، خواہ عورت اپنے لباس میں کتنی ہی باوقار اور سنجیدہ کیوں نہ ہو، کیونکہ حدیث میں وارد ہے کہ جب کوئی مرد کسی عورت کے ساتھ تنہائی میں ہوتا ہے تو ان دونوں کے ساتھ تیسرا شیطان ہوا کرتا ہے (جو وساوس پیدا کر کے برائی تک پہنچا دیتا ہے)۔

ایسے ہی اسلام میں مرد وعورت کے اختلاط کی بھی ممانعت ہے۔

کسی بھی عورت کے ملازمت کا پیشہ اختیار کرنے کی صورت میں مذکورہ بالا امور کا خیال نہایت ضروری ہے، ساتھ ہی ساتھ شوہر یا ولی کی اجازت بھی ضروری ہے جبکہ وہ لوگ اس کے نان ونفقہ کو ادا کرتے ہوں، شوہر معسر نہیں بلکہ اس کی آمدنی پر میاں بیوی کا گذارہ ہو رہا ہے۔

۷۔ ملازمت کرنے والی عورتیں اگر ایسے اداروں میں کام کریں جہاں خواتین ہی خدمت انجام دیتی ہوں اور کام کی جگہوں میں مرد نہ ہوتے ہوں، البتہ ادارہ کے ذمہ دار مرد ہوں تو اس صورت میں پردہ کے احکام کے سلسلہ میں سب سے اہم بات تو یہ ہے کہ ادارہ کا کوئی ذمہ دار مرد کسی عورت سے تنہائی میں بات نہ کرے، ادارہ کی ضروریات کے سلسلہ میں اگر ذمہ دار مردوں اور خواتین کے درمیان تبادلہ خیال کی ضرورت ہو تو یہ کام پس پردہ انجام دیا جانا چاہئے، گفتگو کے دوران عورت ہنسی، مذاق، بے تکلفی اور آواز میں لچک سے اجتناب کرے، تاکہ مرد کو کسی قسم کا لالچ نہ ہو۔

۸۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلی گذارش تو یہ ہے کہ ایک مسلمان عورت کو ایسے ادارے یا آفس میں کام کرنے سے حتی الامکان گریز کرنا چاہئے جہاں مرد کارکن بھی ہوتے ہوں، مغربی معاشرے میں گرچہ یہ طرز ملازمت معیوب نہیں مگر شریعت اسلامیہ اس طرح کی ملازمت کی عمومی اجازت نہیں دیتی، اسپتال میں امراض نسواں کے علاج ومعالجہ کے لئے مسلمان عورت ڈاکٹر کا یا نرس کا پیشہ اختیار کرتی ہے تو یہاں مجبوری ہے، تعلیم نسواں کے لئے عورت، مدرسی کا فریضہ انجام دے، تو اس میں کوئی رکاوٹ نہیں، لیکن بوائز اسکول اور کالجز میں عورت پڑھائے اور وہ بھی بے پردہ ہو کر تو اس کی شریعت کبھی اجازت نہیں دے سکتی۔

اگر کسی جوان عورت کو ایسے مقام پر ملازمت کرنی ہی ہو جہاں مرد کارکن بھی ہوں، تو اس کے لئے اپنے آپ کو پردہ میں رکھنا ضروری ہوگا، ہاں سن رسیدہ عورت جو قابل شہوت نہ ہوں ان کے لئے چہرہ کھولنے کی اجازت ہو سکتی ہے (ہدایہ ۴/۴۵۹)۔

۹۔ کیا اس کا بھی فرق ہو سکتا ہے کہ ایک کام کی انجام دہی میں عورت کا سامنا مردوں سے بہت زیادہ اور دوسرے کام کی انجام دہی میں کم ہے مثلاً دوکان میں سیلز گرل اور آفس میں یکسوئی سے بیٹھ کر کام کرنے میں فرق ہو سکتا ہے؟

عورت خواہ سیلز گرل ہو یا آفس میں یکسوئی سے بیٹھ کر کام کرتی ہو، مردوں کا سامنا دونوں صورتوں میں ہوگا، خواہ ایک میں زیادہ ہو یا دوسرے میں کم ہو، اور عورت کا مردوں سے اختلاط شریعت میں کسی طرح درست نہیں، لہذا دونوں صورتوں میں ملازمت کے حکم میں کوئی فرق نہیں ہوگا۔

۱۰۔ ملازمت کی غرض سے عورت کا اپنے گھر اور اپنوں سے دور خواہ اندرون ملک ہو یا بیرون ملک تنہا مستقل قیام کرنا جائز نہیں، کیونکہ شریعت نے عورت کو حج جیسے مقدس فریضہ کے لئے بھی تنہا جانے کی اجازت نہیں دی ہے، اوپر یہ حدیث گذر چکی ہے:

"لا يحل لامرأة مسلمة تسافر مسيرة يوم إلا ومعها ذو حرمة"۔

☆☆☆

نفقہ کی ذمہ داری اور خواتین کی ملازمت

مولانا عبدالحئی مفتاحی[1]

شریعت اسلامیہ نے خواتین پر نان ونفقہ کی ذمہ داری نہیں رکھی ہے، ہاں بعض صورتوں میں ان پر ذی رحم محرم کا نفقہ واجب ہوتا ہے، کیونکہ عورت اگر بیٹی ہے تو جب تک اس کی شادی نہ ہوجائے اس وقت تک اس کا نان ونفقہ اور ضروریات زندگی کو پورا کرنا باپ کے ذمہ ہے، جیسا کہ مندرجہ ذیل فقہی عبارتیں اس کو واضح کرتی ہیں۔

''ونفقة الأولاد دالصغار على الأب لا يشاركه فيها أحد'' (هدايه ۲،۴۴۴)۔

فتاوی عالمگیری میں ہے: ''ونفقة الأناث واجبة مطلقا على الآباء مالم يتزوجن إذا لم يكن لهن مال'' (الفتاوى العالمگيريه ۱،۵۶۳)۔

اگر عورت کسی کی بیوی ہے تو اس کا نان ونفقہ شوہر کے ذمہ واجب ہے، جیسا کہ درج ذیل نصوص میں وضاحت ہوتی ہے:

''قال الله تعالى: وعلى المولود له رزقهن وكسوتهن بالمعروف'' (سورۂ بقرہ: ۲۳۳)۔

الف۔ امام جلال الدین سیوطی آیت بالا کی تفسیر میں لکھتے ہیں۔

''وعلى المولود له يعني الأب الذي له وله رزقهن يعني رزق الام'' (الدر المنثور ۱،۵۱۳)۔

ب۔ حافظ ابن کثیرؒ آیت مذکورہ کی تفسیر میں تحریر فرماتے ہیں: ''اى على والد الطفل نفقة الوالدات'' (تفسير ابن كثير ۱،۳۷۰)۔

۲۔ حجۃ الوداع کے موقع پر حضرت جابرؓ کی طویل حدیث کا ایک ٹکڑا ہے:

''ولهن عليكم رزقهن وكسوتهن بالمعروف'' (رواه مسلم اكمال المعلم بفوائد مسلم ۴،۲۷۷)۔

۳۔ ''النفقة واجبة للزوجة على زوجها مسلمة كانت أو كافرة'' (هدايه ۲،۴۳۷)۔

۴۔ ''تجب على الرجل نفقة امرأته المسلمة والذمية والفقيرة والغنية دخل بها أو لم يدخل كبيرة كانت المرأة أو صغيرة تجامع مثلها'' (فتاوى عالمگيرى ۵۴۴)۔

اگر عورت ماں ہے تو عدم استطاعت کی صورت میں اس کا نان ونفقہ اولاد پر واجب ہے، جیسا کہ درج ذیل عبارتیں بتاتی ہیں:

''وعلى الرجل أن ينفق على أبويه وأجداده وجداته إذا كانوا فقراء وإن خالفوه في دينه'' (هدايه ۲،۴۴۵)۔

''ويجبر الرجل الموسر على نفقة أبيه وعلى نفقة أمه إذا كانا محتاجين لقوله تعالى ووصينا الإنسان بوالديه إحسانا (عنكبوت). فقد أوجب على الولد الإحسان لوالديه ورأس الاحسان بوالديه إحيانهما وذلك بالانفاق عليهما'' (المحيط البرهانى ۲،۱۵۹)۔

---

[1] ناظم اعلی مدرسہ عربیہ منبع العلوم خیرآباد مئو۔

مذکورہ بالا نصوص قرآنی سے معلوم ہوا کہ عورت پر نان ونفقہ کی ذمہ داری نہیں ہے، بلکہ جس حالت میں بھی ہو اس کا نان ونفقہ کسی اور پر واجب ہے، قبل ازیں کہ عورت کے کسب معاش اور ملازمت کے بارے میں کچھ تحریر کیا جائے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ عورت کے پردہ، باہر نکلنے اور غیروں کو دیکھنے وغیرہ پر کچھ روشنی ڈالی جائے تاکہ زیر بحث موضوع پر حکم لگانا آسان اور سہل ہو۔

عورت کا گھر سے باہر جانا:

عورتوں کا بلا حاجت وضرورت گھروں سے باہر نکلنا ممنوع ہے، جیسا کہ مندرجہ ذیل نصوص میں صراحۃً ممانعت وارد ہوئی ہے۔

''قال تعالی: وقرن فی بیوتکن ولا تبرجن تبرج الجاهلیة الأولی'' (احزاب:۳۳)۔

حافظ ابن کثیرؒ آیت بالا کی تفسیر میں لکھتے ہیں: ''ای الزمن بیوتکن فلا تخرجن بغیر حاجة'' (تفسیر ابن کثیر ۳،۶۳۱)۔

''عن عبد الله قال: قال رسول الله ﷺ: المرأة عورة فإذا خرجت استشرفها الشیطان'' (رواه الترمذی عارضة الاحوذی ۳،۹۸)۔

امام سیوطی نے مصنف ابن ابی شیبہ کے حوالہ سے نقل کیا ہے: ''عن ابن مسعود قال: احبسوا النساء فی البیوت فإن النساء عورة'' (الدر المنثور ۵،۳۷۴)۔

حضور ﷺ کا ارشاد ہے: ''لیس للنساء نصیب فی الخروج إلا مضطرة'' (فتوی رحیمیه ۱،۳۲ بحواله طبرانی)۔

نصوص مذکورہ میں خروج مطلقاً ممنوع نہیں ہے، بلکہ حاجت کی وجہ سے جائز ہے، جیسا کہ ازواج مطہرات وغیرہ کا خروج اس پر شاہد ہے، عورتوں کو اگر حاجت وغیرہ کی وجہ سے نکلنا ہی پڑے تو بغیر حجاب کے جائز اور درست نہیں ہے، یعنی اجانب سے پردہ کرنا ضروری ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

''یا أیها النبی قل لإزواجك وبناتك ونساء المومنین یدنین علیهن من جلابیبهن'' (احزاب:۵۹)۔

اس آیت میں حجاب کے استعمال کا حکم دیا گیا ہے اور حجاب سے مراد وہ چادر ہے جو خمار پر پہنی جاتی ہے، اس آیت کی تفسیر میں حافظ ابن کثیر تحریر فرماتے ہیں:

''قال علی عن ابن عباس: أمر الله نساء المومنین إذا خرجن من بیوتهن فی حاجة أن یغطین وجوههن من فوق رؤوسهن بالجلابیب ویبدین عینا واحدة'' (ابن کثیر ۳،۶۷۹)۔

عورتوں کا اجنبی مردوں کو دیکھنا فتنہ وفساد کے وقت بالاتفاق حرام ہے، ہاں اگر فتنہ کا خوف نہ ہو تو اکثر کے نزدیک دیکھنا حرام ہے اور بعض کے نزدیک جائز ہے، جیسا کہ آنے والی عبارتیں دلالت کرتی ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''وقل للمومنات یغضضن من أبصارهن ویحفظن فروجهن ولا یبدین زینتهن إلا ماظهر منها'' (نور:۳۱)۔

حافظ ابن کثیر اس آیت کی تفسیر میں رقم طراز ہیں: ''فقوله تعالی: و قل للمومنات یغضضن من أبصارهن ای عما حرم الله علیهن من النظر إلی غیر أزواجهن ولهذا ذهب کثیر من العلماء إلی أنه لا یجوز للمرأة أن تنظر إلی الرجال الأجانب بشهوة ولا بغیر شهوة أصلا'' (ابن کثیر ۳،۲۷۵)۔

ام سلمہؓ کی حدیث سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ عورتوں کا اجنبی مردوں کو دیکھنا ممنوع ہے۔

''إن أم سلمة حدثته أنها كانت عند رسول الله ﷺ وميمونة قالت: فبينا نحن عنده أقبل ابن أم مكتوم فدخل عليه وذلك بعد ما أمرنا بالحجاب فقال رسول اللهﷺ: احتجبا منه. فقلت يا رسول الله أليس هو أعمى لا يبصرنا ولا يعرفنا. فقال رسول اللهﷺ، افعميا وان أنتما الستما تبصرانه؟'' (رواه الترمذی عارضۃ الاحوذی ۵،۱۷۰)۔

ہاں اگر عورتوں کا مردوں کو دیکھنا بغیر شہوت کے ہو تو حنفیہ کے نزدیک جائز ہے۔

''وإن كانت أجنبية عنه جاز لها عند الحنفية إن أمنت الشهوة أن تنظر إلى جميع بدنه إلا مابين سرته وركبته'' (الفقہ الاسلامی وادلتہ ۴،۲۶۵۴)۔

چونکہ ہمارے دور میں فتنہ وفساد کا خوف زیادہ ہے اس لئے عورتوں کا اجنبی مردوں کو دیکھنا مطلقا ممنوع ہے۔

ایسے ہی مردوں کا اجنبی عورتوں کو دیکھنا بھی ممنوع ہے، جیسا کہ ارشاد باری ہے:

''قل للمومنين يغضوا من أبصارهم ويحفظوا فروجهم'' (نور:۳۰)۔

حافظ ابن کثیر اس آیت کی تفسیر میں تحریر فرماتے ہیں: ''هذا أمر من الله تعالى لعباده المومنين أن يغضوا من أبصارهم عما حرم عليهم فلا ينظروا إلا إلى ما أباح لهم النظر إليه وإن يغضوا أبصارهم عن المحارم'' (ابن کثیر ۳،۲۸۲)۔

محمد علی الصابونی اس آیت کی تفسیر میں رقم طراز ہیں: ''وأما عورة المرأة بالنسبة للرجل: فجميع بدنها عورة على الصحيح وهو مذهب الشافعية والحنابلة: وذهب مالك وأبو حنيفة إلى أن بدن المرأة كله عورة ما عدا الوجه والكفين'' (روائع البیان ۲،۱۵۴)۔

موجودہ دور میں وجہ اور کفین بھی حنفیہ کے نزدیک پردہ میں داخل ہے، یعنی وجہ اور کفین کو بھی دیکھنا ممنوع ہے، جیسا کہ حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ ردالمحتار کے حوالہ سے نقل کرتے ہیں:

''فإن خاف الشهوة أو شك امتنع النظر إلى وجهها فحل النظر مقيدة بعدم الشهوة وإلا فحرام وهذا في زمانهم وأما في زماننا فمنع من الشابة إلا النظر لحاجة الخ'' (معارف القرآن ۶،۲۱۹)۔

عورت اگر کسی حاجت وغیرہ سے سفر شرعی کی مقدار کا قصد کرے تو اس کے ساتھ کوئی ذی رحم محرم ہونا ضروری ہے، جیسا کہ حدیث شریف سے معلوم ہوتا ہے۔

''عن أبي سعيد الخدري قال قال رسول الله ﷺ: لا يحل لامرة تومن بالله واليوم الآخر أن تسافر سفرا يكون ثلاثة أيام فصاعد إلا معها أبوها أو أبنها أو زوجها أو أخوها أو ذو محرم منها'' (رواہ مسلم ۱،۴۳۴)۔

مذکورہ بالا مقدمات کی روشنی میں ہم سوالنامہ کے تمام نمبروار سوالوں میں غور کریں تو ان کے احکام معلوم ہو جائیں گے کہ نصوص شرعی پر کاربند ہوتے ہوئے عورت کو کسب معاش اور ملازمت مباح اور جائز ہے ورنہ نہیں۔

☆☆☆

خواتین کی ملازمت

قاضی محمد ہارون مینگل[1]

۱۔ شریعت اسلامی خواتین کے لئے کسب معاش کو عموماً طور پر بہتر نہیں سمجھتی ہے، مجبوری کی صورتیں مستثنیٰ ہیں "الضرورات تبیح المحظورات" اسی لئے شریعت نے خواتین کی ضروریات اوران کے اخراجات دوسروں پر عائد کئے ہیں تا کہ وہ معاش کی فکر سے آزاد ہوکر خاندانی امورانجام دینے، بچوں کی نگہداشت، شوہر کی خدمت اور گھر کو جنت نظیر بنانے پر اپنی صلاحیت استعمال کریں۔

پیدائش سے لے کر بڑھاپے تک اسلام نے خواتین کے اخراجات مردوں پر عائد کئے ہیں، اولاً والد کی ذمہ داری ہے: "وعلی المولود له رزقهن و كسوتهن" (سورۂ بقرہ: ۲۳۳) نہ صرف اولاد کے اخراجات کو والد پر عائد کیا گیا ہے، بلکہ ان کی والدہ کے اخراجات کو بھی بوقت نگہداشت اولاد، والد پر عائد کیا گیا ہے اس کے بعد والے مرحلہ پر شوہر بیوی کے مصارف برداشت کرے گا یا بھائی برداشت کریں گے، بڑھاپے کی حالت میں بیٹے والدہ کے مصارف کے ذمہ دار ہوں گے۔

۲۔ جی ہاں "تجب نفقة الأصول على الولد لا يشاركه في نفقة أبويه أحد لأنه أقرب الناس إليهما فكان أولى باستحقاق نفقتهما عليه. وهي عند الحنفية على المذكور والإناث بالسوية؛ لأن المعنى يشملهما" (الفقه الاسلامی وادلته ۸۳۹، ۸۳۲، ۷)۔

عبارت بالا سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض حالات میں عورتوں پر بھی نان ونفقہ کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔

۳۔ جیسا کہ سوال بالا کے جواب میں ذکر کیا گیا کہ عورت کو فکر معاش سے آزاد کر کے انہیں اولاد کی پیدائش، ان کی پرورش ودیکھ بھال اور گھریلو نظم ونسق کا کام سونپا گیا ہے، جبکہ مردوں پر فکر معاش اور خاندان کی کفالت کا بوجھ ڈالا گیا ہے۔

علاوہ ازیں عورت کے فطری فرائض کا تقاضا ہے کہ اس کی سرگرمیوں کا مرکز اور محور اس کا گھر ہو، اولاد کے سلسلے میں نسب کی حفاظت اور اس میں شبہات سے بچنے اور اسلامی معاشرہ میں پاکیزہ اخلاق کے فروغ کے لئے ضروری ہے کہ عورت ایسی سرگرمیوں سے باز رہے اور ایسے مکانات اور مقامات پر نہ جائے جہاں مردوں کے ساتھ اختلاط اور میل جول کا اندیشہ ہو۔

اسی بنیاد پر حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی روایت کے مطابق رسول اللہ ﷺ نے مسجد نبوی کا ایک دروازہ عورتوں کے لئے مختص فرمایا تھا۔

(سنن ابی داؤد کتاب الصلوۃ باب اعتزال النساء فی المساجد)۔

لہٰذا بہتر ہے کہ عورتیں محض زندگی بلند کرنے کے لئے یا وقت گزارنے کے لئے معاشی جدوجہد سے اجتناب کریں۔

البتہ ان پر اس جدوجہد کو ممنوع قرار نہیں دیا جاسکتا، بشرطیکہ وہ شرعی ہدایات اور احکامات کی پابندی اور پردہ کے ساتھ ہوں۔

۴۔ اگر اپنے فرائض ادا کرنے کے ساتھ ساتھ عورت گھر میں کسب معاش کی کوئی صورت اختیار کرے، تو گو کہ اس کی اجازت لینا ضروری نہیں ہے تاہم زندگی کو خوشگوار بنانے اور اختلافات کے اندیشہ سے بچنے کے لئے خاوند اور ولی سے اجازت لینا بہتر ہے۔

---

[1] کوئٹہ بلوچستان، پاکستان۔

۵۔ اجازت لازمی ہے، ورنہ عورت ناشزہ ہوگی اور اس کا نان ونفقہ ساقط ہوجائے گا۔

مرد کے حقوق علی الزوجۃ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ''لا تخرج من بیته إلا بإذنه فإن فعلت لعنها الله تعالی وملائکة الغضب حتی تتوب أو ترجع، وإن کان ظالما'' (فقه السنة ۲،۱۸۲)۔

لہٰذا بغیر اجازت عورت کے لئے از روئے شرع باہر نکلنا درست نہیں ہے۔

۶۔ خواتین کے لئے ملازمت کرنا یا معاش کی خاطر کوئی محنت کرنا اس سے اسلام نہیں روکتا ہے، حضرت جابر بن عبد اللہؓ بیان کرتے ہیں کہ میری خالہ جنہیں طلاق ہوگئی تھی اپنے نخلستان میں کھجوروں کی دیکھ بھال کرنے کے لئے نکلی تو ایک شخص نے اسے باہر نکلنے پر ڈانٹ ڈپٹ کی، اس پر وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''بے شک تم اپنی کھجوروں کی دیکھ بھال کرلو، شاید کہ تم ان میں سے کچھ صدقہ کردو یا اور کوئی نیکی کا کام کرو''۔

اسلام نے مرد پر کسب معاش فرض کیا ہے، لیکن عورت کے لئے مباح ٹھہرایا ہے، عورت بے شک ملازمت کرسکتی ہے، مگر اسلام نے اس پر کچھ پابندیاں عائد کی ہیں اور کچھ شرائط مقرر کی ہیں جن میں سے چند ایک یہ ہیں:

۱۔ عورت اپنی بنیادی ذمہ داریوں میں کوتاہی نہ کرے، یعنی گھر کی دیکھ بھال، اولاد کی پرورش، خاوند کی خدمت وغیرہ، ان ذمہ داریوں کی ادائیگی کے ساتھ ساتھ اگر وہ ملازمت کے لئے وقت دے سکتی ہے تو بلاشک وہ ملازمت کرلے۔

۲۔ اپنی فطری تقاضوں اور خصوصیات سے تجاوز نہ کرے۔

۳۔ اپنے کام کو پورے وقار، سنجیدگی اور شرافت سے انجام دے، تا کہ بدگمانی اور فتنہ پروازی سے بچی رہے۔

قرآن کریم اور احادیث مبارکہ عورت کو پردہ کی پابندی اور فتنوں وشک وشبہ کے مقامات سے دور رہنے کا حکم دیتے ہیں، نرم ولچکدار آواز میں بات کرنے سے منع کرتے ہیں، یہ بھی حکم دیا گیا ہے کہ گھر سے باہر نکلتے وقت خوشبو لگا کر نہ نکلے، زیب وزینت کا اظہار نہ کرے۔

۴۔ مخلوط مجالس اور اجنبی لوگوں کے ساتھ تنہائی میں بات چیت سے پرہیز کرے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے شاہراہوں میں مردوں کے ساتھ خلط ملط ہوکر چلنے سے منع فرمایا:

''ویجب علی المرأة فی حال الخروج التزام الستر الشرعی، فلا تظهر شیئا من جسدها غیر الوجه والکفین، لأن فی کشف شیٔ مما وجب الله ستره تعریضاً للفتنة والتطلع إلیها'' (الفقه الاسلامی وادلتها ۷،۲۲۶)۔

''یا أیها النبی قل لأزواجك و بناتك ونساء المومنین یدنین علیهن من جلابیبهن ذلك أدنی أن یعرفن فلا یؤذین'' (احزاب:۵۹)۔

۷۔ ایسی جگہوں میں مندرجہ بالا شرائط کے ساتھ عورت کی ملازمت برداشت کی جاسکتی ہے، پردہ کے احکام میں فرق نہ ہوگا، البتہ چہرہ اور کفین کے کشف کی گنجائش بوقت ضرورت نکل سکتی ہے، مگر معاملہ اللہ کے ساتھ ہے بہانہ تلاش نہ کیا جائے، ذمہ داروں کے ساتھ ملتے وقت اکیلی نہ جائے، بلکہ کسی عورت کا ساتھ ہو تو اچھا ہے۔

۸۔ پردہ کی حدود ہر جگہ یکساں ہیں، سن رسیدہ خواتین اور نوعمر خواتین پردہ کے لحاظ سے برابر ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبد اللہ بن ام مکتوم سے امہات المومنین کو حجاب کا حکم جس تند لہجہ سے فرمایا اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اسلام میں پردہ کی کیا حیثیت ہے اور یہ کہ نوعمر اور معمر خواتین پردہ میں برابر ہیں۔

۹۔ یہ تو ظاہر بات ہے کہ جہاں زیادہ بے پردگی ہو وہاں کام کرنے سے جہاں نسبتاً کم بے پردگی ہو کام کرنا بہتر اگر نہیں تو بدتر نہیں ہے۔

"إذا ابتليت ببليتين فاختر أهونهما"۔

بہر حال یہ وہی صورتیں ہیں جن سے بچنے کی کوئی صورت پیدا نہ ہو، ورنہ پردہ کو چھوڑنا چاہے چند ایک سے ہو یا بہت ساروں سے، دونوں اسلامی احکامات کے خلاف ہیں، چند ایک کے سامنے بے پردہ ہونے سے بہت لوگوں کے سامنے بے پردہ ہونا زیادہ شنیع اور خلاف حیاء ہے، جبکہ عورت کا زیور حیاء اور پردہ ہے۔

"الحياء شعبة من الإيمان أو كما قال ﷺ"۔

۱۰۔ ملازمت کی غرض سے یا کوئی اور ضرورت سے عورت کا اپنے گھر اور اپنوں سے دور قیام مفاسد سے خالی نہیں، شرعاً عورت مسافت یعنی ۴۸ میل یا اس سے زائد مسافت کا سفر بدون محرم شرعی نہیں کرسکتی، لہذا عورت کا اندرون ملک یا بیرون ملک مسافت سفر یا اس سے زائد فاصلہ کی جگہ جانا اور رہنا شرعاً درست نہیں ہے، صحیح مسلم میں حدیث ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "جو عورت اللہ تعالیٰ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتی ہو، اس کے لئے جائز نہیں کہ وہ تین راتوں کی مسافت کا سفر محرم کے بغیر کرے"۔

لہذا مسلم عورتوں کا مستقل قیام ملک یا بیرون ملک بغیر محرم کے درست نہیں، فتاویٰ ہندیہ میں ہے:

"أقل مسافة تتغير فيها الأحكام مسيرة ثلاثة أيام... الأحكام التي تتغير بالسفر هي قصر الصلوة وإباحة الفطر وامتداد مدة المسح إلى ثلاثة أيام وسقوط وجوب الجمعة والعيدين و الأضحية وحرمة الخروج على الحرة بغير محرم الخ" (فتاویٰ عالمگیریہ ۱۳۸۱)۔

ماہنامہ "البلاغ" دار العلوم کراچی کے شمارہ ۴۳ بابت ماہ ذوالحجہ ۱۴۲۹ھ میں ایک سوال کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں:

"شوہر کی اجازت یا مرضی کے خلاف مذکورہ مقاصد میں سے کسی بھی مقصد کے لئے گھر سے باہر جانا بیوی کے لئے جائز نہیں"، اس جواب کے سوال کے الفاظ اس طرح ہیں:

کیا مسلمان عورت خاوند کو اطلاع کئے بغیر یا خاوند کی اجازت کے بغیر محلے میں قرآن خوانی یا میت میں یا قریبی رشتہ داران میں یا مارکیٹ میں کوئی سامان خریدنے جاسکتی ہے؟۔

☆☆☆

خواتین کی ملازمت

صورتیں اور احکام

مفتی محمد جعفر ملی رحمانی[1]

۱۔ اللہ رب العزت نے مرد وعورت دونوں کو ایک ہی جنس سے پیدا کیا، لیکن دونوں کی تخلیق کے اغراض و مقاصد، حقوق، واجبات و ذمہ داریاں الگ الگ بیان فرمائی ہے (نور الانوار: ۱۸)۔

کسب معاش کی ذمہ داری اللہ تعالی نے مرد کے ذمہ رکھا ہے، اور عورت کو کسب معاش کی ذمہ داری سے ہر حال میں بری رکھا، اگر وہ کسی کی لڑکی ہے تو اس کا نفقہ جب تک شادی نہیں ہوتی اس کے والد پر واجب ہے (ہندیہ ۱/ ۵۶۲۔ ۵۶۳)۔

اگر وہ کسی کی بیوی ہے تو اس کا نفقہ اس کے شوہر پر واجب ہے (التفسیر المنیر ۳/ ۵۷)۔

اگر وہ کسی کی ماں ہے اور شوہر نفقہ سے عاجز ہو تو اس کا نفقہ اس کے والد پر لازم ہے (ہندیہ ۱/ ۵۶۴)۔

اگر وہ کسی کی بہن ہے اور اس کا شوہر نہیں ہے، اور نہ والد تو اس کا نفقہ اس کے بھائی پر واجب ہے (ہندیہ ۱/ ۵۶۶)۔

معلوم ہوا کہ عورت پر کسی بھی حال میں نفقہ واجب نہیں ہے، کیونکہ اس کا کسب معاش میں مشغول ہونا بہت سے مفاسد کا سبب ہوسکتا ہے، اسی لئے شریعت عورت کے کسب معاش میں مشغول ہونے کو عام حالات میں ناجائز قرار دیتی ہے۔

۲۔ شریعت نے عام حالات میں خواتین پر نہ ان کے اپنے نفقہ کی ذمہ داری رکھی ہے اور نہ ہی ان کے بچوں کے نفقہ کی، نفقہ کا ذمہ دار صرف اور صرف مرد ہی کو قرار دیا گیا ہے، کیونکہ کوئی بھی خاتون یا تو کسی کی بیوی ہوگی، یا لڑکی ہوگی، یا ماں ہوگی، یا بہن ہوگی اور ان تمام صورتوں میں شریعت نے ان کا نفقہ شوہر، باپ، بیٹے، بھائی، وغیرہ پر لازم کیا ہے۔

۳۔ محض معیار زندگی بلند کرنے یا وقت گذاری اور اثاثہ پیدا کرنے کی غرض سے عورتوں کے لئے معاشی جدو جہد اختیار کرنا شرعاً جائز نہیں ہوگا، کیونکہ اس سے اوامر شرعیہ کی مخالفت اور نواہی کا ارتکاب لازم آتا ہے، مثلاً:

اگر عورت معاشی جدو جہد اختیار کرتی ہے تو اسے اپنے گھر کی چہار دیواری چھوڑنی ہوگی، جبکہ اسے یہ حکم ہے کہ وہ گھر میں قرار کے ساتھ رہے، تبرج اور زینت نہ اختیار کرے (احزاب: ۳۳، احکام القرآن للجصاص ۳/ ۴۷۱)۔

خانگی امور کی اصلاح اور اپنی اولاد کی تربیت عورت کے ذمہ ضروری ہے، جو در حقیقت پوری قوم اور معاشرہ کی بنیاد ہے اور معاشی جدو جہد اختیار کرنے سے اس کی یہ ذمہ داری متاثر ہوگی، اور یہ بھی مخالفت امر شرع ہے (البخاری ۲/ ۷۸۳)۔

بے پردگی ہوگی، غیر محرم مردوں سے اختلاط ہوگا، اور بعض موقعوں پر مردوں سے خلوت اور تنہائی کا موقعہ بھی آسکتا ہے، بعض مرتبہ ان کے ساتھ بے تکلفانہ بات چیت اور آمدورفت وغیرہ کے ہونے کا امکان ہے، یہ سب نواہی شرع کا ارتکاب ہے (الترمذی ۲/ ۲۴۰، مرقاۃ ۶/ ۲۵۷)۔

۴۔ اگر عورت اندرون خانہ ہی اپنی معاشی سرگرمیوں کو محدود رکھے، تو اس صورت میں بھی اسے اپنے ولی یا شوہر کی اجازت درکار ہوگی، اور ولی اور شوہر کو چاہئے کہ وہ اسے معاشی سرگرمیوں کی اجازت دے، جن سے کوئی دینی ضرر یا اپنے حق میں کوئی نقصان لازم نہ آتا ہو، خصوصاً جبکہ مرد گھر پر نہ ہو، کیونکہ بے کاری، وساوس نفس وشیطان کی طرف آمادہ کرتی ہے، اور غیروں اور پڑوسیوں کے ساتھ لایعنی کاموں میں اشتغال کا باعث ہے (رد المحتار ۱۰/ ۵۷۵)۔

---

[1] جامعہ اسلامیہ اشاعت العلوم اکل کوا، مہاراشٹر۔

۵۔ اگر عورت واقعتاً ایسے حالات سے دوچار ہو جن میں کسب معاش کے لئے گھر سے باہر نکلنا ہی پڑے، تو اس صورت میں اس کے لئے ولی یا شوہر کی اجازت ضروری ہوگی۔

اگر خروج مسافت سفر یا اس سے زیادہ کے لئے ہے تو محض ولی یا شوہر کی اجازت کافی نہیں ہوگی، بلکہ کسی محرم کا ساتھ میں ہونا بھی ضروری ہے اور اگر مسافت سفر سے کم کے لئے ہے تو محض اجازت کافی ہوگی (ابوداؤد: ۲۴۲، مسلم ار ۴۳۴، رد المحتار ۹ر ۵۷۴)۔

اور مجبوری کی اس صورت میں (جس میں کسب معاش کے لئے گھر سے باہر نکلنا ہی پڑے) صرف دن میں خروج کی اجازت ہوگی، رات میں نہیں، کیونکہ اس سے بہت سارے فتنے جنم لے سکتے ہیں (مائدہ: ۳)۔

۶۔ عام حالات میں عورت کے لئے کسب معاش کے لئے نکلنا جائز ہے ہی نہیں، لیکن اگر وہ مجبور ہو تو اس پر لازم ہے کہ بھرپور لباس اور پردہ کے ساتھ نکلے، نگاہیں نیچی رکھے، تنہائی اور اختلاط رجال سے گریز کرے، اگر کام کے دوران مردوں سے گفتگو اور تبادلہ خیال کی ضرورت پڑے تو گفتگو میں سختی و تلخی برقرار رکھے، نرم گفتاری سے پرہیز کرے، ایسی ملازمت اختیار نہ کرے جس میں کسی کے ساتھ تنہائی حاصل ہوتی ہو۔

۷۔ اگر عورت کسی ایسے ادارہ میں ملازمت کرتی ہو جہاں خواتین ہی اپنی خدمات انجام دیتی ہیں اور کام کی جگہوں میں مرد نہیں ہوتے ہیں، ایسے ادارہ میں عورت پر پردہ ضروری نہیں ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے عورت کو چند لوگوں سے پردہ نہ کرنے کی رخصت دی ہے، ان میں سے عورتیں بھی ہیں، مگر احتیاط یہی ہے کہ خواتین کے درمیان بھی بالکل بے پردہ نہ ہو جائے، خصوصاً جبکہ غیر مسلم خواتین بھی ہوں، کیونکہ بعض مفسرین نے (أو نسائهن) سے مسلم عورتوں کو مراد لیا ہے (درمختار ۹ر ۵۳۴)۔

شریعت اسلامیہ نے عورتوں کو اجنبی مرد سے پردہ کرنے کا حکم دیا ہے، اس لئے ادارہ کے ذمہ دار مردوں سے بہر حال پردہ کرنا ضروری ہے، البتہ بقدر ضرورت ان سے گفتگو کرسکتی ہیں، بایں شرط کہ آواز میں سختی برقرار رکھیں، تاکہ مخاطب کے دل میں کسی قسم کا کوئی وسوسہ پیدا نہ ہو، اسی طرح تنہائی میں ملاقات کرنے سے کلی اجتناب کریں۔

۸۔ اگر عورت ایسی جگہ کام کرے جہاں مرد بھی کارکن ہوں تو اس وقت خاتون کارکنوں کے لئے پردہ کی حدود یہ ہیں:

لباس بھرپور ہو، چہرہ دکھائی نہ دے، دونوں ہاتھ نظر نہ آئے، نگاہیں نیچی رکھی جائیں، تنہائی و اختلاط سے گریز کریں، محبت آمیز انداز میں گفتگو نہ کریں، کام کی نوعیت، تعاون، تبادلہ خیالات یا دیگر مصلحتیں مرد کے پاس آمد و رفت کے متقاضی ہوں تو ضرورت شدیدہ کی موجودگی میں بقدر ضرورت اس کی گنجائش ہوگی۔

مذکورہ بالا پردہ کی حدود جوان عورتوں کے لئے ہیں، اگر کوئی خاتون سن رسیدہ ہو، جوان عورتوں کی طرح فیشن نہ کرتی ہو، کوئی مرد اس کی طرف رغبت نہ کرتا ہو اور نہ اسے مرد کی رغبت ہو تو اس کے لئے پردہ میں تھوڑی سی رخصت ہے، وہ یہ کہ جو کپڑے اوپر سے رکھے جاتے ہیں، مثلاً نقاب وغیرہ اور اگر وہ نہ رکھنا چاہے تو اسے اس کی اجازت ہے، جبکہ اس کے لئے بھی بہتر ہے کہ وہ جوان عورتوں کی طرح مکمل پردہ کرے۔

۹۔ عورت کے لئے ملازمت کی اجازت بحالت مجبوری دی جائے گی، اس لئے وہ اپنے لئے ایسی ملازمت اختیار کرے جس میں کام کی انجام دہی میں عورت کا سامنا مردوں سے کم ہو، ایسی ملازمت اختیار نہ کرے جس میں کام کی انجام دہی میں عورت کا سامنا مردوں سے زیادہ ہوتا ہے۔

۱۰۔ اگر عورت کو کسب معاش کے لئے گھر سے باہر نکلنا ہی پڑے، اس کے بغیر اس کے پاس کوئی چارہ کار نہ ہو تو اس کے لئے خروج کی اجازت محض اتنی مسافت تک کے لئے ہی ہوگی جس سے اس کی ضرورت پوری ہو، اور ضرورت شہر میں ہلکا پھلکا کام کر کے پوری ہوسکتی ہے، محض ملازمت کی غرض سے اپنے گھر اور اپنوں سے دوری پر بلا محرم مستقل قیام کرنا جو مسافت شرعی کے برابر یا اس سے زیادہ ہو شرعاً جائز نہیں ہوگا۔

☆☆☆

خواتین کی ملازمت

مولانا افتخار احمد مفتاحی [1]

۱۔ اسلام نے انسانی معاشرے کو فساد سے بچانے کے لئے مرد و عورت دونوں کے دائرہ کار کو ان کی فطری صلاحیتوں کے مطابق متعین کر دیا ہے، مرد کا دائرہ کار گھر سے باہر ہے اور عورت کا اصل دائرہ گھر کی چہار دیواری جیسا کہ قرآن نے کہا:

"وقرن فی بیوتکن" (سورۂ احزاب: ۳۳) (کہ عورتیں گھروں میں رہیں)، کسب معاش کے سلسلہ میں اسلامی نقطۂ نظر یہ ہے کہ عام حالات میں عورت پر زندگی کے کسی بھی مرحلہ میں کسب معاش کا بوجھ نہیں ڈالا جاسکتا، بلکہ مرد ہی ذمہ دار ہوں گے، اللہ تعالی نے فرمایا:

''الرجال قوامون على النساء بما فضل الله بعضهم على بعض وبما انفقوا من أموالهم'' (سورۂ نساء: ۳۴) (مرد حاکم ہیں عورتوں پر اس سبب سے کہ اللہ نے بعضوں کو بعضوں پر فضیلت دی اور اس سبب سے کہ مردوں نے اپنے مال خرچ کئے ہیں)۔

مرد کی جس فضیلت کا یہاں ذکر کیا گیا، وہ یہی ہے کہ چونکہ وہ کفیل ہے اور کسب معاش کی ذمہ داری اس پر ہے اور وہی یہ بوجھ اٹھانے کے قابل ہے۔

جب تک عورت غیر شادی شدہ ہے ظاہر روایت کے مطابق مکمل کفالت باپ پر عائد ہوتی ہے، اسی پر فتوی بھی ہے، قرآن کی آیت "وعلی المولود له رزقهن" (سورۂ بقرہ: ۲۳۳) اس پر دلیل ہے۔

''وتجب نفقة الابنة البالغة والابن الزمن على أبويه اثلاثا على الأب الثلثان وعلى الأم الثلث هذا رواية الخصاف والحسن وفي ظاهر الرواية كل النفقة على الاب لقوله تعالى وعلى المولود له رزقهن'' (عینی)۔

اور شادی کے بعد ذمہ داری شوہر پر عائد ہوتی ہے، اللہ تعالی کا قول ہے:

''اسكنوهن من حيث سكنتم من وجدكم ولا تضاروهن لتضيقوا عليهن وإن كن اولات حمل فانفقوا عليهن حتى يضعن حملهن'' (سورۂ طلاق: ۶) (تم اپنی عورتوں کو وسعت کے مطابق رہنے کا مکان دو جہاں تم رہتے ہو اور سکنی کا حکم نفقہ کے حکم کو بھی شامل ہے، کیونکہ عورت بغیر باہر نکلے اور کمائے نفقہ حاصل نہیں کر سکتی) اور ابن مسعود کی قرأت میں ''انفقوا علیهن'' کا لفظ بھی آیا ہے اور ان کو تنگ کرنے کے لئے تکلیف مت پہنچاؤ، یعنی نفقہ میں تنگی مت کرو کہ وہ نفقہ حاصل کرنے کے لئے باہر نکلنے پر مجبور ہوں اور سکنی میں بھی تنگی مت پہنچاؤ۔

''وأما إذا كان الامتناع بحق بأن امتنعت تستوفي مهرها فلها النفقة''۔

ہاں اگر کسی عورت کا شوہر، رشتہ دار اور کفیل نہ ہو تو ایسی صورت میں وہ اپنی معاشی ضرورت کے لئے کام کاج کر سکتی ہے، بشرطیکہ اسلامی اخلاق و آداب کو کوئی ٹھیس نہ پہنچے۔

۲۔ شریعت نے بعض حالات میں خواتین پر بھی نان ونفقہ کی ذمہ داری رکھی ہے، مثلاً اگر کسی بچہ کا باپ نہیں ہے بلکہ ماں اور دادا ہیں تو اس کا ایک تہائی نفقہ ماں پر واجب ہوگا، اسی طرح ایک بھائی تنگ دست ہے اور اس کی تین بہنیں خوش حال ہیں ایک حقیقی بہن ہے اور ایک علاتی اور ایک اخیافی ہے تو ان پر بھائی کا نفقہ بقدر میراث پانچ حصہ کرکے واجب ہوگا، یعنی تین حصہ حقیقی بہن پر اور ایک حصہ علاتی پر اور ایک حصہ اخیافی پر

[1] استاذ جامعہ مفتاح العلوم، مئو۔

ہے (ہدایہ)۔

۳۔ معاشیات سے متعلق قرآن نے جن اصولوں کا تذکرہ کیا ہے ان کا خلاصہ یہ ہے کہ رزق اور معاش کا تعلق صرف ذات الٰہی سے ہے، اور وہی ہر فرد کا کفیل ہے، اور اگرچہ اس کی مصلحت عام اور حکمت تام کا تقاضہ یہ ہے کہ دنیا کے اس متنوع ماحول میں رزق کے اندر تفاوت درجات پایا جائے، لیکن اس کے باوجود یہاں ایک فرد بھی معیشت سے محروم نہ رہنے پائے، کیونکہ اس نے حق معیشت کو سب کے لئے چاہے مرد ہوں یا عورت مساوی اور برابر رکھا ہے اور کسی کو بھی اس میں دخل اندازی کا حق نہیں دیا۔

''وجعلنا لکم فیھا معایش'' (سورۂ الحجر:۲۰) (اور ہم نے تمہارے لئے زمین میں معیشت کے سامان بنادیئے)۔

''ھو الذی خلق لکم ما فی الارض جمیعا'' (سورۂ بقرہ:۲۹) (وہ ذات پاک ہے جس نے تمہارے لئے وہ سب کچھ پیدا کیا جو زمین میں ہے)۔

ان آیات میں بغیر کسی تخصیص کے ہر فرد بشر (چاہے مرد ہوں یا عورت) کو خطاب ہے اس لئے اگر عورتیں بھی انفرادی اور اجتماعی حاجات کی تکمیل کے لئے اسلامی احکام واخلاق کے دائرہ میں رہ کر معاشی جدوجہد کرنا چاہیں تو ضرورت کے تحت اجازت دینی چاہئے، لیکن فقط وقت گزاری اور سرمایہ جمع کرنے کی غرض سے معاشی جدوجہد کرنا جبکہ گھر کی مالی حالت ایسی ہے کہ جس میں تنگی وترشی سے کام چل سکتا ہے اور چلتا ہے تو اجازت دینے میں قباحت معلوم ہوتی ہے کیونکہ دولت وثروت جمع وذخیرہ کے لئے نہیں، بلکہ اجتماعی وانفرادی ضروریات کی کفالت کے لئے ہے۔

۴۔ چونکہ عورتوں کو اللہ نے معاش کی ذمہ داریوں سے فارغ رکھا ہے، یہی وجہ ہے کہ شادی سے پہلے باپ کے کندھے پر ان کے خرچ کا بوجھ ڈالا ہے، اور شادی کے بعد شوہر کو نان ونفقہ اور سکنی کا ذمہ دار بنایا ہے، اور بعد طلاق وانقضاء عدت پھر باپ پر ہی خرچ کا بوجھ لوٹ آتا ہے اور عورتوں کے کندھے پر خانگی امور میں نظم وضبط برقرار رکھنے اور اندرون خانہ بچوں کی صحیح تربیت وپرورش کا بوجھ ڈالا ہے، لیکن باوجود اس کے گھریلو صنعت اور دستکاری کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں کے لئے پسند فرمایا ہے، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دھاگے کاتنے کی ترغیب دی ہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی زوجہ حضرت زینبؓ اسی سے اپنی اور اپنے اہل خانہ کی ضروریات پوری کرتی تھیں، لیکن چونکہ عورتیں اپنے شوہروں کے ماتحت ہوا کرتی ہیں، اس لئے اگر اندرون خانہ معاشی سرگرمیاں اسلامی اخلاق وآداب کی روشنی میں جاری کرنا چاہیں اور ولی یا شوہر کی ناراضگی کا امکان نہ ہو تو کوئی قباحت نہیں معلوم ہوتی، لیکن اگر ولی یا شوہر کی ناراضگی کا امکان ہے تو اجازت ملنے ہی پر معاشی سرگرمیاں جاری کریں۔

۵۔ اسلام کی معاشرتی حکمت میں عورتوں کا فرض بچوں کی پرورش اور خانہ داری ہے اور اس کے بدلہ مردوں کا فرض عورتوں کی معاشی کفالت ہے تاکہ وہ بےفکر ہو کر اپنے دائرہ میں خاندان کی خدمت کرسکیں، اس لئے عورتوں کو کسب معاش کے لئے باہر نکلنے کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی لیکن اگر ضرورت کے باعث باہر نکلنا ہی پڑے تو بھی عفت وعصمت کی حفاظت لازمی ہے، جس کے سبب رات کے بجائے دن میں نکلیں اور شوہر، یا ولی سے اجازت لے لیں اور پردے کی پابندی کے ساتھ نکلیں اور جب دن میں شوہر یا ولی کی اجازت کی ضرورت ہے تو رات کو بدرجہ اولی ضرورت ہوگی۔

۶۔ اسلام اصولی طور پر اس بات کا قائل ہے کہ خواتین گھر میں رہیں اور کسب معاش کے بوجھ سے ان کو فارغ رکھا جائے اور مرد معاشی جدوجہد جاری رکھیں غیر شادی شدہ اولاً تو اپنے اولیاء سے اجازت لیں اگر شادی شدہ ہوں تو شوہر سے اور اس بات کا خیال رکھیں کہ دوسرے مردوں کے ساتھ اختلاط نہ ہو اور جسم کے جن حصوں کا پردہ ضروری ہے انہیں ظاہر کرنے کی ضرورت نہ آئے، اسلام نے عورتوں کو ایسے ماحول میں رہنے کی اجازت نہیں دی جہاں مردوں اور عورتوں کا اختلاط ہو، ایسا ماحول خود عورت کے لئے مضر ہے، ایسے ماحول میں خواتین کے لئے اپنی عزت وناموس کا تحفظ دشوار ہوتا ہے۔

۷۔ بلاشبہ اسلام میں عورتوں کو نامحرم مردوں سے پردہ کرنا ضروری قرار دیا گیا ہے، نامحرم استاذ ہوں یا ذمہ داران ادارہ ہوں سب سے پردہ کرنا واجب ہے۔

رسول اللہ ﷺ سے زیادہ مقدس کون ہوگا، لیکن باوجود اس کے صحابیات آپ ﷺ سے پردہ کیا کرتی تھیں، اس لئے اگر ایسے ادارہ میں ملازمت کرنا ہی پڑے جہاں ذمہ دار مرد ہوں تو اس صورت میں بھی شرعی پردہ کے ساتھ رہیں اور حتی الامکان کھلے منہ سامنے ہونے سے بچیں اور غیر ارادی طور پر اگر سامنا ہو جائے تو صفائی قلب کی حالت میں معافی کی امید ہے اور ذمہ داران کو بھی ہدایت دی جائے کہ شریعت کے حکم کا پاس ولحاظ رکھیں اور ذمہ داران کو اگر خواتین سے بات کرنے کی ضرورت پڑ ہی جائے تو پردہ کے پیچھے سے بات کریں۔

۸۔ اگر عورت ایسی جگہ کام کرے جہاں مرد کارکن بھی ہوں تو اس وقت خاتون کارکنوں کے لئے مکمل شرعی پردہ لازم ہونا چاہئے، اولاً تو عورتوں کا مردوں کے ساتھ اختلاط کسی طرح درست نہیں اور اگر ضرورت شدیدہ کے باعث درست بھی مانا جائے تو بھی عفت وعصمت کی حفاظت کی تدابیر بہر حال لازم ہوگی، اس لئے مکمل شرعی پردہ ہونا چاہئے اور اگر ایسی سن رسیدہ خواتین ہوں جن کی طرف مردوں کا میلان بالکل ہی نہ ہوتا ہو تو کچھ پردہ میں تخفیف کی گنجائش ہے، لیکن چونکہ فتنہ کا زمانہ ہے اس لئے احتیاط ہی پر عمل بہتر ہے۔

۹۔ اجنبی عورتوں اور مردوں کا سامنا بہر حال مضر ہے، کسی حال میں جائز نہیں، معاشی ضرورت کے پیش نظر ایسی شکل اختیار کی جائے کہ مردوں کا سامنا نہ ہو مثلاً جس مکان یا دکان میں عورتیں سیلز گرل ہوں اس میں پردہ لٹکا ہوا ہوتا کہ ان میں سامانوں کی خرید وفروخت کے لئے عورتیں ہی جائیں اور جن دکانوں میں مرد ہوں ان میں مرد ہی جائیں، تاکہ عفت عصمت محفوظ رہ سکے جیسا کہ ہمارے شہر میں عورتیں اپنے گھروں اور دوکانوں میں سیلز گرل کا کام انجام دیتی ہیں، لیکن عورتیں ہی ان دکانوں میں جاتی ہیں، مرد نہیں۔

اور آفس میں یکسوئی کے ساتھ بیٹھ کر کام کرنے میں بھی اگر مردوں کا سامنا نہ ہو تو بہتر ہے اور اگر مردوں کا سامنا ہو لیکن کم تو بھی عصمت، عزت کے بچانے کی شریعت نے جو شکل پیش کی ہے اس کی رعایت ضروری ہے، "إذا ابتليتم ببليتين فاختر ...اھونھما" پر عمل ضرورۃً کیا جاسکتا ہے۔

۱۰۔ اگر ضرورت کے تحت ملازمت کے لئے مجبور ہے تو خواہ اندرون ملک ہو یا بیرون ملک ذی رحم محرم، اولاد، شوہر جیسے لوگوں کے ساتھ مستقل قیام کرنا چاہے تو اجازت ملنی چاہئے۔

☆☆☆

خواتین کی ملازمت

مفتی عبدالاحد فلاحی[1]

۱۔ شریعت اسلامیہ نے عورتوں کو معاشی ذمہ داریوں کا مکلف نہیں بنایا البتہ ان کے لئے شرعی حدود میں رہ کر کسب معاش کی گنجائش بھی رکھی ہے، ابتداء اسلام میں خواتین ضروریات زندگی کے لئے جدوجہد کیا کرتی تھیں، گھر کی دیکھ بھال کے ساتھ باہر کے ضروری کام بھی کیا کرتی تھیں، گویا ذریعہ معاش کی فراہمی میں وہ مردوں کو ان کا تعاون حاصل تھا، حضرت سہل بن سعد ایک ایسی خاتون کا واقعہ بیان فرماتے ہیں جن کی اپنی کھیتی باڑی تھی اور وہ پانی کی نالیوں کے اطراف میں چقندر کی کاشت کیا کرتی تھیں، جمعہ کے دن سہل ابن سعد اور دیگر صحابہؓ ان سے ملنے کے لئے جایا کرتے تھے تو وہ چقندر اور آٹے سے تیار کیا ہوا حلوا ان حضرات کو پیش کرتیں (بخاری: ار ۲۲۳، حدیث: ۹۳۸، کتاب الجمعہ باب قول اللہ تعالی فاذا قضیت الصلوۃ الخ، طبع دار الکتب العلمیہ بیروت)۔

اسی طرح قیلہ نامی ایک صحابیہؓ نے نبی کریم ﷺ سے عرض کیا: "إني امرأة أبيع وأشتري" (میں ایک عورت ہوں جو مختلف چیزوں کو خریدتی اور بیچتی ہوں یہ کہہ کر آپ ﷺ سے تجارت کے مسائل دریافت کئے) (عورت اسلامی معاشرہ میں بحوالہ طبقات ابن سعد: ۸؍۲۲۸)۔

حضرت عمرؓ کے دور خلافت میں اسماء بنت مخرمہؓ کو ان کے لڑکے عبداللہ ابن ابی ربیعہؓ یمن سے عطر بھیجتے تھے اور وہ اس کا کاروبار کرتی تھیں (عورت اسلامی معاشرہ میں، بحوالہ طبقات ابن سعد: ۸؍۲۲۰، الاستیعاب فی اسماء الاصحاب تذکرہ ربیع ابن معوذ)۔

تجارت اور زراعت کے علاوہ کچھ عورتیں وہ بھی تھیں جو اپنے ہنر کے ذریعہ معاش کے مسئلہ کو حل کرتیں تھیں، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی بیوی صنعت و حرفت سے واقف تھیں، اس کے ذریعہ اپنے اور اپنے خاوند اور بچوں کے اخراجات بھی پورے کرتی تھیں، ایک دن حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا:

''اني امرأة ذات صنعة أبيع منها وليس لي ولا لزوجي ولا لولدي شيء'' (میں ایک کاریگر عورت ہوں، چیزیں تیار کر کے فروخت کرتی ہوں اور اس طرح اپنا بچوں کا اور شوہر کا پیٹ پالتی ہوں کہ اس کے علاوہ ہمارے گذارہ کا کوئی اور ذریعہ نہیں ہے اور سوال کیا کہ میں جو کچھ خرچ کرتی ہوں کیا مجھے اس کا ثواب ملے گا، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: کہ ہاں تم کو اس کا اجر ملے گا)،

(عورت اسلامی معاشرہ میں بحوالہ طبقات ابن سعد: ۸؍۲۱۲)۔

حاکم نے حضرت عائشہؓ سے روایت کی ہے کہ زینبؓ ایک ایسی خاتون تھیں جن کے پاس ہنر تھا چنانچہ وہ چمڑے سے مختلف چیزیں بنانے کے علاوہ موتیوں کا ہار بھی بناتی تھیں اور اس سے ہونے والی آمدنی کو راہ خدا میں صدقہ کر دیتی تھیں (عورت اور کاروان دعوت: ۵۵)۔

یہ چند واقعات ہیں جو ثابت کرتے ہیں کہ بوقت ضرورت شرعی حدود کی رعایت کرتے ہوئے عورت کمائی کے ذرائع اپنا سکتی ہے، البتہ شریعت عورتوں کے لئے یہ پسند کرتی ہے کہ وہ اپنے آپ کو گھریلو زندگی تک محدود رکھے، حضور ﷺ کے ساتھ مسجد نبوی میں نماز ادا کرنا کس قدر موجب اجر و ثواب ہے، لیکن ارشاد ہے:

---

[1] دار القضا آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ، خیر امت ٹرسٹ، بی آئی ٹی چال، امام باڑہ کمپاؤنڈ ممبئی۔

’’صلاة المرأة فی بیتها أفضل من صلاتها فی حجرتها وصلاتها فی مخدعها أفضل من صلاتها فی بیتها‘‘ (ابوداؤد ۱،۱۹۶، کتاب الصلوۃ، باب ما جاء فی خروج النساء الی المسجد طبع دار الکتب العلمیہ بیروت)۔

اسی وجہ سے شریعت نے نماز جیسی عظیم الشان عبادت کے بارے میں کہا کہ اللہ تعالی وہ نماز پسند فرماتے ہیں جو عورت گھر کی کسی ایسی کوٹھری میں ادا کرے جہاں اسے کوئی دیکھنے والا نہ ہو، اس سے شریعت کا مزاج معلوم ہوتا ہے کہ وہ بغیر ضرورت وحاجت عورت کے گھر سے باہر نکلنے کو پسند نہیں کرتی۔

۲۔ شریعت نے خواتین پر نان ونفقہ کی کوئی ذمہ داری نہیں ڈالی ہے، جب تک وہ بیٹی ہے اس کے والد اس کے نفقہ کے ذمہ دار ہیں، چنانچہ علامہ شامی نے اس مسئلہ کی صراحت ان الفاظ میں کی ہے۔

’’(بخلاف الإناث) فلیس له أن یؤجرهن فی عمل أو خدمة (تاتارخانیه)، لأن المستأجر یخلو بها وذلك سيء فی الشرع (ذخیره)‘‘ (ردالمحتار علی الدر المختار ۵،۲۷۲، کتاب الطلاق باب الحضانة طبع مکتبه زکریا دیوبند، نیز دیکھئے: ردالمحتار علی الدر المختار ۵،۳۳۷، کتاب الطلاق باب النفقة ط مکتبه زکریا دیوبند)۔

اور جب وہ بیاہ دی جائے تو اس کے نان ونفقہ کی ساری ذمہ داری شوہر پر ہے، حتی کہ اگر شوہر کسی وجہ سے نان ونفقہ نہ دے سکے تو بھی بیوی کو کما کر گذارہ کرنا ضروری نہیں ہے اور اگر بیوی نے ان دنوں قاضی کی اجازت سے کما کر اخراجات پورے کئے ہیں تو وہ شوہر پر قرض ہوگا جس کی ادائیگی شوہر پر لازم ہوگی۔

۳۔ شوہر کو دیئے ہوئے اخراجات سے گذارہ ممکن ہو یا آمدنی کے ذرائع ایسے ہوں جو اخراجات کے لئے کافی ہوں اس کے بعد بھی عورت کا معیار زندگی بلند کرنے یا وقت گذاری کے لئے یا سرمایہ واثاثہ پیدا کرنے کی غرض سے معاشی جدوجہد کرنا شریعت کی نگاہ میں ناپسندیدہ ہے، اس لئے کہ اس میں (مثلاً عورت کا نامحرموں سے میل جول وغیرہ) عورت کے گناہ میں مبتلا ہونے کا احتمال ہے، خاص کر جب گذارہ گھر کی آمدنی سے ممکن ہو تو سد ذرائع کے طور پر عورتوں کی معاشی سرگرمیوں پر قدغن لگانی چاہئے۔

۴۔ جب کہ شوہر یا ولی اخراجات برابر دے رہے ہوں اور عورت کی معاشی سرگرمیوں میں مبتلا ہونے کی وجہ سے شوہر کے حقوق میں کسی طرح کی کمی آنے کے امکانات ہوں (جیسا کہ عموماً ہوتا ہے) تو بیوی پر ضروری ہوگا کہ وہ شوہر کی اجازت طلب کرلے، چاہے وہ معاشی سرگرمیاں اندرون خانہ ہی تک کیوں نہ محدود ہوں، علامہ ابن نجیم نے تحریر فرمایا ہے:

’’شوہر کو یہ حق ہے کہ عورت کو بنائی سے روک دے، نفل عمل یا روزہ شوہر کی اجازت کے بغیر جائز نہیں ہے، جیسا کہ ظہیریہ میں لکھا ہے، مناسب تو یہ ہے کہ بنائی کو مخصوص نہ کیا جائے بلکہ شوہر کو یہ حق ہے کہ عورت کو کمائی کے تمام ذرائع سے روک سکتا ہے، اس لئے کہ اس کی ضروریات کو پورا کرنے کی ذمہ داری شوہر پر ہونے کی وجہ سے عورت کو کمائی کی کوئی ضرورت نہیں ہے، یہی حکم اس وقت بھی ہوگا جب وہ کسی اور کی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے بلا معاوضہ کام کرے‘‘ (البحر الرائق ۴؍۲۳۲)۔

علامہ شامی نے اس مسئلہ کو نہایت شرح وبسط کے ساتھ بیان کیا ہے (دیکھئے: ردالمحتار علی الدر المختار ۵؍۳۲۵، کتاب الطلاق باب النفقہ طبع مکتبہ زکریا دیوبند)۔

۵۔ شوہر اور ولی اگر عورت کی کفالت کرتے ہوں تو ان کی اجازت کے بغیر کسب معاش کے لئے عورت کا گھر سے باہر نکلنا جائز نہ ہوگا۔

’’وکما یجوز ضربها للخروج إذا کان الخروج بغیر حق‘‘ (البحر الرائق کتاب الحدود باب حد القذف فصل فی التعزیر ۵،۸۲ طبع زکریا دیوبند)۔

اگر عورت کے لئے گزارہ کا کوئی سامان نہ ہو یا ہو مگر اتنا نہ ہو جو ضروریات زندگی کے لئے ناکافی ہو تو وہ شوہر کی اجازت کے بغیر بھی کسب معاش

کے لئے جاسکتی ہے اور یہ بات ظاہر ہے کہ یہ اجازت اس کے لئے ضرورت اور حاجت کی بنا پر ہے اس لئے جس قدر نکلنے سے ضرورت پوری ہو جائے اس سے زیادہ نکلنا جائز نہ ہوگا، مثلاً ایک عورت کو دن کی ملازمت مل سکتی ہے تو اس کے لئے رات کو ملازمت اختیار کرنے کی اجازت نہ ہوگی اور اگر مسافت سفر میں ملازمت کے مواقع حاصل ہوں تو مسافت سفر سے زیادہ دور جانے کی اجازت نہ ہوگی، ہاں اگر حالات اس قدر خراب ہو جائیں کہ دن میں معاش کی کوئی راہ نہ نکل سکتی ہے تو ایسی عورت کے لئے رات کو بھی معاش کے لئے نکلنے کی گنجائش ہوگی، جیسا کہ ابن ہمام نے معتدہ کے بارے میں ذکر کیا ہے (دیکھئے: فتح القدیر ۴/۳۰۹، کتاب الطلاق فصل وعلی المبتوتۃ والمتوفی الخ طبع مکتبہ زکریا دیوبند)۔

۶۔ خواتین اگر ملازمت کریں:

خواتین اگر ملازمت کرتی ہیں تو لباس شرعی ہو، مردوں سے ملنے سے حتی الامکان احتراز کریں، بوقت ضرورت نامحرموں سے بات کرنے کی نوبت آئے تو لہجے میں کرختگی پیدا کریں، نگاہیں نیچی رکھیں، تنہائی اور خلوت سے بالکلیہ اجتناب برتا جائے۔

۷۔ اس صورت میں جب کہ کام کی جگہوں پر محض عورتیں ہوں اور ان کا ذمہ دار مرد ہو اور ایسی جگہ ہو جہاں سے ان عورتوں کو نہ دیکھ سکتا ہو تو عورتوں کے لئے پردے کا کوئی مسئلہ نہیں ہوگا، گھٹنہ سے ناف تک ڈھکا ہونا ضروری ہے۔

''وتنظر المرأة من المرأة إلى مايجوز للرجل أن ينظر إليه من الرجل'' (فتح القدير ۱۰/۲۶، كتاب الكراهية فصل في الوطء والنظر والمس، طبع مكتبة زكريا ديوبند)، ہاں اگر وہ ذمہ دار مرد عورتوں کے سامنے ہی ہو اور انہیں دیکھ سکتا ہو تو وہ اجنبیہ کے حکم میں ہی ہوگی اور انہیں مکمل پردہ کرنا ہوگا۔

۸۔ اگر مردوں کے درمیان رہ کر ہی زیادہ وقت تک کام کرنا پڑتا ہو تو اس صورت میں اس بات کی گنجائش ہے کہ چہرہ، ہاتھ اور قدم کھلے رکھے جائیں، ضرورت جہاں زیادہ ہو وہاں آستین کا اوپر ہو جانا گناہ میں شامل نہیں ہوگا، علامہ ابن ہمام تحریر فرماتے ہیں کہ بوقت ضرورت امام ابو یوسفؒ نے عورت کو آستین بھی کھلی رکھنے کی اجازت دی ہے (دیکھئے: فتح القدیر ۱۰/۲۸-۲۹، کتاب الکراہیۃ فصل فی الوطء والنظر والمس، طبع مکتبہ زکریا دیوبند، نیز دیکھئے: ہندیہ ۵/۳۲۹ کتاب الکراہیۃ الباب الثامن طبع دار الکتاب دیوبند)۔

ملازمت پیشہ خواتین سر اور ذراعین کھلی رکھ سکتی ہیں یا نہیں؟ اس سوال کے جواب میں حضرت مولانا اشرف علی تھانوی فرماتے ہیں: ''سر کھولنے کی تو کوئی ضرورت نہیں، البتہ ذراعین میں امام ابو یوسف اجازت دیتے ہیں (امداد الفتاوی ۴/۱۹۹، ۱۸۱، ۱۸۴ طبع زکریا دیوبند)۔

۹۔ عورت کے لئے بدرجہ مجبوری ملازمت کی گنجائش ہے جس قدر کم معاصی میں مبتلا ہوتے ہوئے ملازمت کر سکتی ہو تو ایسی جگہ قابل ترجیح ہوگی، ایسی جگہ کے ہوتے ہوئے جہاں کم محظورات کا ارتکاب کرتے ہوئے ملازمت کی جاسکتی ہے، اگر عورت کسی ایسی جگہ کا انتخاب کرے جہاں زیادہ محظورات کا ارتکاب لازم آتا ہو تو عورت کے لئے ایسی جگہ ملازمت کرنا جائز نہ ہوگا۔

۱۰۔ عام حالات میں محرم کے بغیر عورت کے لئے کہیں ادر قیام کرنا جائز نہیں ہے۔

☆☆☆

خواتین کے لئے معاشی جدوجہد کا مسئلہ

مولانا مبارک حسین ندوی، نیپال

۱۔ شریعت اسلامیہ اگرچہ عائلی اور معاشرتی زندگی کی جدوجہد میں خواتین کو مردوں سے الگ نہیں کرتی، لیکن کسب معاش کی جدوجہد عام حالات میں ان کے حق میں پسندیدہ نہیں، کیونکہ اس کی وجہ سے عورت گھر سے باہر رابطہ وتعلق پر مجبور ہوگی، جو اس کے لئے مفاسد سے خالی نہیں ہے، اسی لئے شریعت نے عمومی طور پر اس پر کسب معاش کی ذمہ داری نہیں ڈالی ہے۔

۲۔ جیسا کہ اوپر مذکور ہے کہ خواتین پر نان ونفقہ کی ذمہ داری نہیں رکھی گئی ہے، بلکہ ان کے نفقہ کی ذمہ داری اولیاء اور شوہر پر رکھی گئی ہے، رشتہ ازدواج کے ختم ہوجانے کے بعد حسب سابق اولیاء کی طرف اس کی ذمہ داری لوٹ جاتی ہے اور جب اس پر اپنے نفقہ کی ذمہ داری نہیں ہے تو بچوں کے نفقہ کی ذمہ داری کے کیا معنی؟ بہت مجبوری کے حالات میں ہی بچوں کے نفقہ کی ذمہ داری اس پر رکھی گئی ہے۔

۳۔ ایسی مجبوری کی صورت کہ جس میں عورت کے لئے گزر بسر کے نظم کی خاطر کچھ کرنا ضروری ہوجاتا ہو تو اس میں اس کے لئے معاش کی جدوجہد کی گنجائش ہوسکتی ہے، لیکن محض معیار زندگی کو بلند کرنے اور ضرورت سے آگے خواہشات کو پورا کرنے کی غرض سے معاش کی جدوجہد کی اجازت نہیں دی جاسکتی ہے۔

۴۔ عورت کسب معاش کے لئے کوئی ایسی شکل اختیار کرے، جس کو وہ اپنے گھر کے اندر گھریلو تقاضوں کو پورا کرنے کے ساتھ ساتھ کرسکتی ہو تو یہ جائز ہے، البتہ جب ولی اور شوہر کی طرف سے اس کے اخراجات بقدر ضرورت پورے کئے جارہے ہوں تو اس کے لئے ان سے اجازت لینا ضروری ہوگا۔

۵۔ کسب معاش کے لئے عورت کا گھر سے باہر نکلنا یہ بہرحال فتنوں کا دروازہ کھولنا ہے اس لئے ولی اور شوہر کی اجازت کے بغیر اس کو اس کی اجازت نہیں دی جاسکتی ہے۔

۶۔ عورت پر جب کسب معاش اور نفقہ کی ذمہ داری نہیں رکھی گئی تو ملازمت کی شکل جس میں اس کو گھر سے باہر نکلنا ہی پڑتا ہے درست نہیں، جن حالات میں یہ ذمہ داری اس پر آپڑتی ہے ان حالات میں شرعی حدود کی رعایت کے ساتھ ہی ملازمت کی اجازت ہوگی، ان حدود میں سب سے اہم عفت وعصمت کی حفاظت ہے، اس لئے ملازمت کی وہ ساری شکلیں جن میں اس کی آبرو خطرہ میں پڑسکتی ہو یا اس پر حرف آسکتا ہو وہ درست نہیں ہوگی، خواہ مردوں سے سابقہ کم ہو یا زیادہ اور مالکانہ وحاکمانہ ہو یا معاملہ کا، اس سے اگلے سوالات ۷، ۸، ۹ کا جواب واضح ہے۔

۱۰۔ جب عورت کا اپنے گھر سے نکلنا ہی اس کے حق میں ایک مسئلہ اور فتنہ ہے تو ملازمت وغیرہ کی غرض سے گھر سے باہر اور دور مستقل قیام! اس کے جواز کے کوئی معنی نہیں، اس صورت میں تو فساد کی راہیں اور زیادہ کھلی ہیں۔

☆☆☆

خواتین کی ملازمت

مفتی سراج احمد ملی[1]

۱،۲۔ شریعت اسلامی نے خواتین پر نہ ان کے اپنے نان ونفقہ کی ذمہ داری رکھی ہے، نہ ہی ان کے بچوں کی، اس لئے شریعت اسلامی خواتین کے کسب معاش کو جبکہ وہ گھر سے باہر جاکر ہو، مختلف مفاسد (پردہ کے اکثر احکامات کی خلاف ورزی) کی بناپر اور اگر کسب معاش گھر کے اندر رہ کر ہی ہو، مگر ولی یا شوہر کی اجازت کے بغیر ہو تو ولی یا شوہر کو شریعت نے جو قوام قرار دیا ہے، اس میں ان کی رضا کے بغیر دراندازی کی بناپر معیوب سمجھتی ہے۔

۳۔ محض معیار زندگی کو بلند کرنے، یا وقت گذاری اور سرمایہ واثاثہ پیدا کرنے کی غرض سے عورتوں کے لئے گھر سے باہر جاکر یا گھر میں رہتے ہوئے بغیر اجازت ولی یا شوہر معاشی جدوجہد اختیار کرنا جبکہ گھر کی معاشی حالت ایسی ہے کہ تنگی وترشی سے ہی سہی کام چل سکتا ہے، پھر وہ معاشی جدوجہد اختیار کریں تو ان کی یہ کوشش ناجائز ہے۔

۴۔ کسب معاش کی کوئی ایسی صورت جس میں خواتین اپنی معاشی سرگرمیوں کو اندرون خانہ ہی محدود رکھیں، اس کے لئے بھی انہیں اپنے ولی یا شوہر سے اجازت لینا ضروری ہوگا، تاکہ اوقات کسب میں وہ انہیں اپنے کسی حکم کی عدم پیروی کے باعث ان کی جانب ''نشوز'' کا انتساب نہ کریں۔

۵۔ جب تک کسی خاتون کا عقد نہ ہو تب تک اس کے نفقہ کی ذمہ داری اس کے ولی پر ہے، اور بعد عقد شوہر پر ہے، طلاق یا بیوگی کی صورت میں یہ ذمہ داری پھر اس کے ولی کی طرف لوٹ جاتی ہے، اولیاء کی عدم موجودگی میں یہ ذمہ داری ذی رحم محرم پر یا پھر اہل محلہ پنچ پر آجاتی ہے، اس لئے عورت کا کسب معاش کے لئے اوپر مذکور صورتوں کی موجودگی میں گھر سے نکلنا شرعاً بلا ضرورت اور نص "وقرن في بيوتكن ولا تبرجن تبرج الجاهلية الاولى" (احزاب: ۳۳) کے خلاف ہے، جو اللہ کی نافرمانی ہے، اگر اس کی اجازت ولی یا شوہر دے بھی دیں تو ان کی یہ اجازت معتبر نہیں ہوگی۔

مذکورہ صورتوں میں سے اگر کوئی صورت نفقہ کی موجود نہ ہو، اس لئے اگر کوئی خاتون گھر سے باہر کسب معاش کے لئے نکلنے پر مجبور ہو جائے تو قاعدہ "الضرورات تبيح المحظورات" کے تحت گنجائش ہوسکتی ہے، مگر احکام حجاب کی پابندیاں دوران کسب بھی اور آمدورفت میں بھی ملحوظ رکھنا ہوگا۔

اور بلا محرم کے ایک یوم کی مسافت (سولہ میل) تک بھی جانے کی اجازت نہیں ہوگی۔

۱۔ "ويكره استئجار الحرة أو الأمة للخدمة لأنه يؤدي إلى الخلوة بالأجنبية وأنه منهي عنه وتأويله ماذكر في النوازل أنها إذا اجرت نفسها من ذي عيال لايكره وإنما يكره إذا خلا بها وبه يفتى" (بزازیہ علی ہامش ہندیہ ۵، ۱۲۴)۔

"ولاتسافر المرأة بغير محرم ثلاثة أيام وما فوقها واختلفت الروايات فيما دون ذلك قال ابويوسف اكره لها أن تسافر يوما بغير محرم وهكذا روى عن أبي حنيفة وقال الفقيه أبو جعفر واتفقت الروايات في الثلاث وأما مادون الثلاث هو اهون من ذلك" (المحيط ۵،۳۶۶، هنديه)۔

[1] طیب نگر، مالی گاؤں (ناسک)، مہاراشٹر۔

ظاہر بات ہے کہ مسافت سفر سے کم ایک یوم کی مسافت بھی بلا محرم طے کرنے کی کراہت بوجہ خوف فتن و معاصی ہی ہے اور ان کے مقابلہ میں رات میں اس کا زیادہ امکان ہے، اس لئے اگر اجازت ہوگی تو دن کے لئے ہوگی، رات کے لئے نہیں ہوگی۔

۶۔ ضرورت شدیدہ پر اگر اجازت ہوگی تو خواتین کے لئے لازم ہوگا کہ جب گھر سے نکلیں تو برقع و نقاب یا چادریں اپنے جسم پر ڈال لیں، صرف آنکھیں کھلی ہوں، پورا جسم بلکہ لباس بھی برقع و نقاب میں چھپا ہو، خوشبو کا استعمال نہ کریں، بجنے والا زیور نہ پہنے ہوئے ہوں، آمد و رفت کے دوران مردوں کے درمیان گھسنے سے اجتناب کریں، دوران ملازمت غیر محرم مردوں سے نرم لہجہ میں گفتگو نہ کریں، غیر محرموں سے خلوت و تنہائی نہ ہونے پائے۔

۷۔ اگر ادارہ کے ذمہ دار مرد ہوں تو ان سے بھی پردہ ضروری ہوگا اور خلوت و تنہائی میں بات کرنے سے اجتناب ضروری ہوگا۔

۸۔ پردہ کے تمام امکانات کی رعایت کرنا ضروری ہوگا، البتہ اگر ایسی سن رسیدہ ہو کہ فتنہ کا اندیشہ نہ ہو تو گنجائش ہے، جوان عورتیں خواہ محتاط ہوں مگر ان کی وجہ سے مردوں کے ابتلاء کا اندیشہ ہو تو بھی ان کے لئے گنجائش نہیں ہوگی۔

۹۔ ملازمت میں وجہ ممانعت بے پردگی اور اجنبیوں سے خلوت ہے، خواہ دوکان میں سیلز کی حیثیت سے ہوں یا آفس میں کلرک، دونوں صورتوں میں وجہ موجود ہے، اس لئے دونوں جگہ ممنوع ہے۔

۱۰۔ ملازمت کی غرض سے عورت کا اپنے گھر اور اپنوں سے دور خواہ اندرون ملک ہو یا بیرون ملک مستقل قیام کرنا درست نہیں ہے۔

☆☆☆

خواتین کی ملازمت

مولانا عطاء اللہ قاسمی [1]

معاشرہ میں انسان کی قدر و منزلت معاشی استحکام سے وابستہ ہے، اسلام عورت کو معاشی اور مالی اعتبار سے استحکام عطا کرتا ہے، عورت کو وراثت کے وسیع حقوق دیتا ہے، باپ سے، شوہر سے اولاد سے اور دوسرے قریبی رشتہ داروں سے اس کو وراثت ملتی ہے، نیز شوہر سے اس کو مہر بھی ملتا ہے اور ان تمام ذرائع سے جو مال اس کو ملتا ہے اس میں تصرف وقبضہ کے پورے حقوق اسی کو دیئے گئے ہیں، اس میں مداخلت کا اختیار کسی کو نہیں ہے، مزید برآں اگر وہ تجارت میں روپیہ لگا کر یا خود محنت کر کے کچھ کمائے تو اس کی مالک کلیۃً وہی ہے، ان سب کے باوجود اسلامی قانون کی متفق علیہ شق ہے کہ ''باپ اپنی بیٹیوں کے بالغ ہوجانے تک اور بیٹیوں کے نکاح ہوجانے تک حسب استطاعت نفقہ دینے کا ذمہ دار ہوگا'' (مجموعہ قوانین اسلامی ۳/۹۱۰)۔

اور شادی ہونے کے بعد کسی کی بیوی بننے کی صورت میں وہ کتنی ہی مالدار ہو اس کا شوہر اس کے نفقہ سے بری الذمہ نہیں ہوسکتا ہے اسی طرح اسلام عورت کو معاشی استحکام کی مکمل ضمانت دیتا ہے۔

باپ اور شوہر کے معذور ہونے کی صورت میں اس کے نفقہ کی ذمہ داری اس کے ان رشتہ داروں پر ڈالی ہے جو اس کے وارث بن سکتے ہیں۔

اگر والد، شوہر نفقہ دینے سے عاجز ہوں یا ان دونوں کا انتقال ہوجائے اور اس کے نفقہ کے ذمہ دار دوسرے ورثاء اس لائق نہ ہوں تو ایسی عورتوں کے نفقہ کی ذمہ داری حکومت کے بیت المال پر عائد ہوگی۔

ان تصریحات سے معلوم ہوتا ہے کہ: الف۔ اسلامی شریعت عورت کو معاشی طور پر مستحکم رکھنا چاہتی ہے تا کہ عفت وعصمت، شرافت ونسوانیت کی حفاظت کرسکے، ب۔ عورت کے لئے کسب معاش کو بنظر جواز دیکھتی ہے مشروط طور پر مسلمان عورت کیلئے درج ذیل مقاصد کے تحت کسب معاش مستحب ہے۔

الف۔ تنگدست شوہر، باپ یا بھائی کی معاونت۔

ب۔ خیر کی راہوں میں خرچ کرنا۔

اگر کسی مسلمان عورت کے والد، شوہر، یا حکومت اس کی کفالت کرنے سے عاجز ہوں تو ایسی صورت میں عورت پر کسب معاش واجب ہوجاتا ہے۔

شریعت عورت کے لئے کسب معاش کو نہ صرف جائز کہتی ہے، بلکہ استحباب اور وجوب کی بھی قائل ہے تا کہ مسلمان عورت غیرت وخودداری اور عزت نفس کی حفاظت کے ساتھ خود کفیل رہے ساتھ ہی ناگزیر حالات میں اپنے متعلقین کی بھی کفالت کرسکے، چنانچہ شریعت نے مخصوص حالات میں عورت پر بھی نان ونفقہ کی ذمہ داری ڈالی ہے۔ مجموعہ قوانین اسلامی میں ہے:

باپ کے مفلس ہونے کی صورت میں اولاد کے نفقہ کی ذمہ داری بشرط قدرت ماں پر ہوگی (۳/۹۱۴)۔

سوال کا پس منظر:

یہ حقیقت ہے کہ موجودہ دور میں ملازمت کی کچھ ایسی شکلیں بھی وجود میں آئی ہیں جو سراسر غیر ضروری ہیں جن کا مقصد اس کے سوا کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ مردوں نے صنف نازک کو اپنی ہوسناک نگاہوں کی تسکین کا ذریعہ بنالیا ہے، جیسے عورتوں کا پرائیوٹ سکریٹری بننا، دوکانوں میں سیلز گرل بننا وغیرہ وغیرہ ظاہر ہے ایسی ملازمتیں اسلامی شریعت کی رو سے خارج از بحث ہیں، اسی طرح وہ ملازمتیں بھی خارج از بحث اور حرام ہیں جو معصیت اور گناہ ہیں

---

[1] جامعہ امداد العلوم، کوپا گنج، مئو۔

جیسے سینما اور اس کے متعلقات کی ملازمت، گانے بجانے کا کام، انشورنس کی ایجنسی، بینک اور انشورنس کی ایسی ملازمتیں جنہیں سودی کاروبار اور سودی لین دین کرنا پڑے کیونکہ معصیت ذریعہ معصیت اور تعاون علی المعصیۃ تینوں برابر درجہ میں حرام ہیں۔

اگر نفس ملازمت پر غور کیا جائے تو کچھ ناگزیر صورت حال ضرور سامنے آئے گی، تصویر کا ایک رخ یہ ہوگا کہ:

ملازمت گھر سے باہر ہوگی، جس کے سبب بچوں کی پرورش اور امور خانہ داری پر منفی اثرات مرتب ہوں گے، ملازمت شہر میں ہوگی کیونکہ دیہاتوں میں روزگار کے مواقع شاذ و نادر ہیں، جبکہ شہروں میں اس کے مواقع زیادہ ہیں، نامحرم اجنبی مردوں سے سابقہ پڑے گا، مالکان، افسران، نگران کار اسٹاف سے ربط ضبط لازمی ہوگا۔

دوسرا رخ یہ ہے کہ امور خانہ داری کی ادائیگی، بچوں کی پرورش اور پرداخت عورت کا لازمی اور منصبی فریضہ ہے۔

اس زاویہ سے دیکھا جائے تو ضعیف البنیان عورت سہ طرفہ دباؤ میں آرہی ہے، ظاہر ہے اسلامی شریعت کسب معاش کی اس نوع (ملازمت) کی حوصلہ افزائی نہیں کرسکتی، محض معیار زندگی کی بلندی، سرمایہ و اثاثہ پیدا کرنے اور وقت گذاری کے پیش نظر ایسی ملازمت کی اجازت نہیں دے سکتی کیونکہ عورت پیدائشی طور پر کمزور ہے اتنے سارے دباؤ کی متحمل نہیں ہے۔

البتہ "الضرورات تبیح المحظورات" کے تحت ناگزیر اضطراری حالات میں اجازت ہوسکتی ہے جبکہ ان شرطوں کی پابندی لازمی ہوگی۔

عورت پر خود اپنے یا متعلقین کے نفقہ کی ذمہ داری آپڑی ہو۔

ملازمت کے متبادل کوئی شریفانہ پیشہ دستیاب نہ ہو۔

دوران ملازمت، عفت و عصمت، شرافت و نسوانیت کا تحفظ یقینی ہو۔

پردہ کا مکمل لحاظ ہو بلحوائے حدیث "المرءۃ عورۃ"۔

ملازمت شرعی طور پر جائز ہو۔

یہ شرطیں لازمی ہیں، کسی ایک شرط کی عدم موجودگی ملازمت کے جواز کو معدوم کردے گی، چنانچہ حصول رزق کے لئے یا زیادہ سے زیادہ سرمایہ اکٹھا کرنے یا معیار زندگی بلند کرنے کے لئے عورتوں میں ملازمت کا جو رجحان بڑھ رہا ہے وہ کسی بھی زاویہ سے درست نہیں ہے، اور ایسی ملازمت کے لئے گھر بار چھوڑنا سراسر غیر اسلامی فعل ہے۔

بنیادی طور پر عورت کا فطری منصب اور شرعی فریضہ یہ ہے کہ اسے ماں بننا ہے اور بہترین ماں بننا ہے۔

اسی کے ساتھ عورت کی ایک اہم مسئولیت یہ بھی بتائی گئی ہے کہ: عورت اپنے شوہر کے گھر کی حکمراں ہے اور وہی اپنی حکومت کے دائرۂ عمل کے لئے جواب دہ ہے (بخاری)۔

عورت اگر بچوں کی پرورش و پرداخت، امور خانہ داری کی انجام دہی کے بعد جو وقت بچے اسے کسی مفید کام میں خرچ کرے مثلاً شوہر کی اجازت سے کوئی شریفانہ پیشہ اختیار کرے تو اس کی اجازت ہے۔

خلاصہ کلام یہ کہ اسلام نے بنیادی طور پر کسب معاش کا بوجھ مردوں کے کندھوں پر ڈالا ہے، اور خواتین کے اخراجات بھی ان کے ذمہ ڈالا ہے، خاص طور پر شادی کے بعد ان کے نان و نفقہ کی ذمہ داری شوہر پر ڈالی ہے، یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے جس پر دلیل پیش کرنا کارعبث ہے، ہاں بعض صورتوں میں بے چاری عورتوں کو مردوں کا یہ بوجھ اٹھانا پڑتا ہے، ایسی عورتوں کا کسب معاش پر مجبور ہونا ایک اضطراری حالت ہے چنانچہ وہ اپنی عفت و عصمت اور نسوانیت کی حفاظت کرتے ہوئے کوئی شریفانہ ذریعہ معاش اختیار کریں تو اس کی اجازت ہے۔

☆☆☆

خواتین کی ملازمت

مولانا محفوظ الرحمن [۱]

۱۔ اسلام نے کسب معاش کا بوجھ عورتوں کے کمزور کندھوں پر نہیں ڈالا ہے، بلکہ شادی سے پہلے جبکہ عورت بیٹی یا بہن ہوتی ہے اور خاص طور سے شادی کے بعد جب عورت کو بیوی اور ماں ہونے کی حیثیت حاصل ہوتی ہے اس کے نفقہ اور دیگر ضروری اخراجات کی ذمہ داری باپ بھائی شوہر اور بیٹا ہونے کے ناطے مردوں پر ڈالی گئی ہے، لہذا شریعت اسلامی خواتین کے لئے کسب معاش کو بنظر استحسان نہیں دیکھتی ہے۔

''له أن يمنعها من الأعمال كلها المقتضية للكسب، لأنها مستغنية عنه'' (شامی ۵،۲۵۸)۔

۲۔ شریعت نے نان ونفقہ کی ذمہ داری عورتوں پر نہیں رکھی ہے، خواہ اپنا نفقہ ہو یا اپنے بچوں کا۔

''فتجب على الرجل نفقة امرأته المسلمة والذمية والفقيرة دخل بها أو لم يدخل'' (خانیہ علی الهندیہ ۱،۵۵۴، ۱،۴۲۲)۔

اِلا یہ کہ عورت لاچار ہونے کی وجہ سے کسب معاش پر مجبور ہو، تو ایسی صورت میں اپنی عفت وعصمت اور نسوانیت کی حفاظت کرتے ہوئے کوئی شریفانہ ذریعہ معاش اختیار کرسکتی ہے۔

''والمتوفى عنها زوجها تخرج بالنهار لحاجتها إلى نفقتها'' (البحر الرائق باب العدة)۔

۳۔ محض معیار زندگی بلند کرنے کے لئے یا وقت گزاری اور اثاثہ پیدا کرنے کی غرض سے مغربی معاشرہ کی پیروی میں عورتوں کا معاشی جدوجہد کا غیر ضروری بوجھ اپنے سر لے لینا مسلم معاشرہ کے لئے قابل شرم ہے نہ کہ لائق تقلید، خصوصاً جب کہ صبر وشکر کے ساتھ گزر اوقات ہوجاتا ہو۔

۴۔ اندرون خانہ معاشی سرگرمیوں کے محدود رکھنے کی صورت میں بھی حق الزوج متأثر ہوسکتا ہے، اور حق الزوج کی بنا پر جب عورت کے لئے اندرون خانہ بھی نفلی نماز اور روزہ جیسی اہم عبادت میں اذن شوہر ضروری ہے تو معاشی سرگرمیوں میں اس کی اجازت بدرجہ اولی ضروری ہوگی۔

''ولا تطوع للصلوة والصوم بغير إذن الزوج'' (شامی ۵،۲۵۸)۔

نیز کاروباری سلسلہ میں عورت کو ایسے لوگوں سے (خواہ مرد ہوں یا عورت) واسطہ اور رابطہ کرنا پڑسکتا ہے جن سے واسطہ اور رابطہ شوہر کو پسند نہ ہو، اور عورت کو شوہر کی مرضی کے خلاف لوگوں سے رابطہ کرنے کی اجازت نہیں ہے۔

''لقوله عليه السلام ''ولا يأذن في بيوتكم لأحد تكرهونه'' (ابوداؤد)۔

اور شامی میں ہے: ''وفي البحر له منعها من الغزل وكل عمل ولو تبرعا لاجنبي ولو قابلة أو مغسلة لتقدم حقه على فرض الكفايه'' (۵،۲۵۸)۔

خلاصہ یہ کہ اندرون خانہ بھی معاشی سرگرمی کے جاری رکھنے کے لئے عورت کو شوہر یا ولی سے اجازت لینا لازم ہے۔

۵۔ شوہر اور ولی کے ہوتے ہوئے تو عورت کو کسب معاش کی نوبت ہی نہیں آنی چاہئے، ہاں اگر شوہر یا ولی کے معذور ہونے یا مفقود ہونے کی وجہ سے عورت کسب معاش پر مجبور ہوجائے اور اندرون خانہ کوئی نظم نہ ہوسکنے کی بنا پر اس کو گھر سے باہر نکلنے کی نوبت آجائے تو عورت کو شوہر یا ولی

---

[۱] جامعہ اسلامیہ جلالیہ، ہوجائی، نوگاؤں آسام۔

کی اجازت مطلقا لازم ہوگی، خواہ یہ نکلنا مسافت سفر سے زیادہ ہو یا کم کے لئے، دن کے وقت ہو یا رات کے وقت خواہ شوہر یا ولی اس کی کفالت نہ کرتا ہو، اس لئے کہ مسئلہ صرف کسب معاش کا نہیں بلکہ عورت کی عصمت کا بھی ہے، جو شوہر اور ولی کی نگرانی کے بغیر مشکل ہے۔

اور کسب معاش کے لئے نکلنا ان صورتوں میں کسی میں داخل نہیں لہذا عورت کو کسب معاش کے لئے نکلنا پڑے تو شوہر یا ولی کی اجازت مطلقا ضروری ہوگی، اور اگر یہ سفر ایک دن کی مسافت سے زیادہ کا ہو تو اجازت کے ساتھ ساتھ کسی معتمد محرم کا ساتھ ہونا بھی ضروری ہوگا (خانیہ علی الہندیہ ار ۴۴۳)۔

''روی عن أبي حنيفة وأبي يوسف كراهية الخروج بها مسيرة يوم بلا محرم فينبغي أن تكون الفتوى عليه لفساد الزمان'' (البحر الرائق ۲،۳۳۹)۔

۶۔ عورتوں کے لئے کسب معاش اور ملازمت کے سلسلہ میں شرعی حدود یہ ہیں گے: شوہر یا ولی سے نفقہ وغیرہ حاصل کرنا مقدمہ کے ذریعہ بھی ممکن نہ ہو، ذریعۂ معاش جائز اور حلال ہو، شوہر یا ولی سے اس کی اجازت حاصل ہو، حدود شرع میں رہتے ہوئے اس کو انجام دینا ممکن ہو، بوقت ضرورت بقدر ضرورت اسے حاصل کیا جائے۔

۷، ۸۔ ایک عورت کو غیر محرم مردوں سے جتنا پردہ لازم ہے اتنا پردہ یہاں بھی ضروری ہوگا، اس لئے کہ دیگر خواتین غیر مسلم بھی ہوسکتی ہیں جو کہ پردہ کے سلسلہ میں غیر محرم مردوں کے حکم میں ہیں۔

''لا يحل لا مرأة مومنة أن تنكشف عند امرأة مشركة أو كتابية إلا أن تكون أمة لها'' (هنديه)۔

خلاصہ یہ کہ دونوں صورتوں میں حتی الامکان پورا بدن ڈھکا ہو، چہرہ پر برقع یا گھونگھٹ ڈالا ہوا ہو۔

البتہ سن رسیدہ عورتیں چہرہ اور غیر ضروری کپڑے کھول کر کام کرسکتی ہیں۔

۹۔ بلاشبہ فرق ہوگا بایں طور کہ دکان میں سیلز گرل ہونا بے حیائی پر مشتمل ہونے کی بنا پر نا جائز اور حرام ہوگا، کیونکہ عورتوں کو سیلز گرل بنانے کا مقصد ہی اس کے حسن کی کشش اور دلفریب اداؤں کے ذریعہ زیادہ سے زیادہ گراہکوں کو مائل کرنا ہوتا ہے اور حسن کی نمائش حرام ہے۔

اور دوسری صورت یعنی یکسوئی سے آفس میں بیٹھ کر کام کرنا بشرائط مذکورہ بالا جائز ہوگا۔

۱۰۔ عورت کی نسوانیت کا تقاضہ ہے کہ عورت اپنوں میں رہ کر اپنی عفت کی حفاظت کرے، اپنوں سے دور غیروں کے رحم کرم پر اپنی عصمت کی حفاظت کا تصور فتنہ کے اس دور میں سنہرے خواب سے زیادہ کی حقیقت نہیں رکھتے، یہی وجہ ہے کہ شریعت نے عورت کو حج جیسے مبارک عمل میں بھی اپنوں سے الگ رہنے کی اجازت نہیں دی ہے، برخلاف کاروبار کے جس میں ملازمت اور پیسوں کا جھانسا دے کر صنف نازک کی عزت کا لوٹنا معمول بن چکا ہے، لہذا ملازمت کی غرض سے اپنوں سے دور کسی معتمد محرم کے بغیر رہنا ناجائز اور حرام ہوگا۔

اس سلسلہ میں ان تمام احادیث سے بھی استدلال کیا جاسکتا ہے جن میں عورتوں کو گھر سے نکلنے اور سفر کرنے سے روکا گیا ہے۔

اور یہ مخفی نہیں کہ ایک عورت کے لئے اپنی عزت کو خطرے میں ڈالنا اپنی جان کو خطرہ میں ڈال دینے سے بڑھ کر ہے، اور جب جان کو خطرہ میں ڈالنا درست نہیں تو عزت کو خطرہ میں ڈالنا کیونکر جائز ہوسکتا ہے۔

☆☆☆

خواتین کی ملازمت کا مسئلہ

اسلامی شریعت کے تناظر میں

مولانا محمد ابوبکر قاسمی[1]

۱۔ کسب معاش کے لئے خواتین کا کوشش کرنا اسی طرح مجبوری و پریشانی کے احوال میں اپنے صنفی تشخص کو برقرار رکھتے ہوئے اور شرعی پردہ کو ملحوظ رکھ کر اپنے گھریلو کام کو انجام دینا یا اجرت لے کر کام کرنا شرعاً درست ہے، چنانچہ سورۂ طلاق میں صاف صراحت ہے کہ ''فإن أرضعن لكم فآتوهن أجورهن'' (سورۂ طلاق ۶) پھر اگر (مطلقہ) عورتیں تمہارے لئے (بچوں کو) دودھ پلائیں تو ان کو ان کی اجرت دے دو۔

قرآن کریم کی یہ آیت عورت کے لئے کسب معاش کے جائز ہونے کی واضح دلیل ہے، حضرت حلیمہ سعدیہ نے عہد طفولیت میں حضور اکرم ﷺ کو جو دودھ پلایا تھا وہ معاش ہی کے سدھار کی خاطر تھا، چنانچہ آپ ﷺ کو دودھ پلانے کے سبب ان کی معاشی حالت کا سدھرنا اور ان کے گھر میں برکات کا ظہور پذیر ہونا تاریخ و سیر کا نہایت ہی مشہور و معروف واقعہ ہے۔

نیز حضور اکرم ﷺ نے اپنے لڑکے ابراہیم کو موالی مدینہ کے ابوسیف نامی لوہار کی بیوی ام سیف کا دودھ پلوایا تھا آپ ﷺ کبھی کبھی وہاں تشریف لے جایا کرتے تھے، جیسا کہ امام مسلم نے اپنی صحیح کے ''کتاب الفضائل باب رحمۃ الصبیان والعیال'' میں اس واقعہ کو ذکر کیا ہے (مسلم ۲/ ۲۵۲) یہ حدیث بھی عورت کے کسب معاش کے لئے کوشش کرنے کے جائز ہونے کو واضح دلیل ہے۔

اسی طرح عورت کا چادر بنا کر حضور پاک ﷺ کو پہنانا حدیث پاک سے ثابت ہے جیسا کہ امام بخاریؒ نے صحیح بخاری کتاب البیوع باب النساء کے تحت مفصل واقعہ نقل کیا ہے۔ ''عن سهل بن سعد قال: جائت امرأة ببردة قالت: يا رسول الله إني نسجت هذه بيدي اكسوكها فاخذها النبي ﷺ الخ'' (بخاری ۱،۱۸۲)۔

نیز جنگ کے موقع پر زخمیوں کا دوا علاج عورتوں سے کرانا حدیث پاک سے ثابت ہے، چنانچہ امام بخاریؒ نے صحیح البخاری کتاب الجہاد میں رواۃ النساء الجرحی فی الغزو کا باب قائم کر کے یہ حدیث نقل فرمائی ہے:

''عن الربيع بنت معوذ قالت: كنا مع النبي ﷺ نسقي الماء ونداوي الجرحى ونرد القتلى'' (ملاحظہ ہو بخاری جلد اول ۴۰۳)۔

مذکورہ تصریحات سے معلوم ہوا کہ کسب معاش کے لئے خواتین کا پیش رفت کرنا یا شوہر کی معاونت کرنا، اسی طرح خواتین کا رضا کارانہ طریقے سے کوئی کام کرنا یا معاوضہ لے کر کام کو انجام دینا شرعاً یہ تمام صورتیں جائز ہیں۔

۲۔ شریعت نے عام حالات میں خواتین کا اور نابالغ اولاد کا نفقہ مرد پر رکھا ہے، ''قال الله تعالى وعلى المولود له رزقهن وكسوتهن الآية'' (سورۂ البقرہ: ۲۳۳)، اسی طرح سورۂ طلاق میں ہے: ''فإن أرضعن لكم فآتوهن أجورهن'' (سورۂ طلاق: ۶)، لیکن بالغ لڑکی اور اپاہج لڑکے کا نفقہ ماں باپ دونوں پر ہوگا، ترکہ میں حصہ پانے کی حیثیت سے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ''وعلى الوارث مثل ذلك'' (سورۂ بقرہ ۲۳۳)۔

عورت بیٹی کی صورت میں ہو یا بیوی کی صورت میں ہو یا ماں کی صورت میں اس کا خرچہ باپ، شوہر اور اولاد پر واجب ہے، لیکن اگر کوئی خاتون بیوہ ہو جائے یا مطلقہ ہو جائے اور اس کا کوئی پرسان حال نہ ہو یا اس کے رشتہ دار غریب ہوں تو ایسی صورت میں اپنے کھانے پینے اور زندگی بسر کرنے کے لئے خود عورت ہی کو کسب معاش کرنا پڑتا ہے، خصوصاً اس وقت جبکہ انسان غیر مسلم حکومت کی نگرانی میں زندگی بسر کر رہا ہو۔

---

[1] مفتی مدرسہ اسلامیہ شکرپور بھرواڑہ، دربھنگہ۔

۳۔ اگر گھر کی مالی حالت ایسی ہو کہ قدرے تنگی وترشی کے ساتھ ہی سہی زندگی بسر ہو رہی ہو اور کچھ پریشانی کے ساتھ ہی سہی کام چل رہا ہو اور مرد باغیرت ہو کہ عورت کی ملازمت کو پسند نہ کرتا ہو تو ایسی صورت میں محض معیار زندگی کو بلند کرنے یا خوش عیشی کی خاطر سرمایہ واثاثہ جمع کرنے کی غرض سے عورتوں کا گھر سے باہر نکل کر معاشی جدوجہد کرنا اور شوہر کی رضامندی کے بغیر ملازمت کرنا شرعاً سخت ناپسندیدہ بلکہ حرام ہے۔

۴۔ اگر کوئی خاتون اپنے گھر کے اندر رہ کر کسب معاش کی جدوجہد کرے مثلاً کپڑے کی سلائی کرے، یا کوئی دستکاری کا کام کرے، یا بچوں کو پڑھائے تو ایسی صورت میں ولی یا شوہر سے باضابطہ اجازت حاصل کرنا ضروری نہیں اور نہ ہی ولی یا شوہر کو مفید کام کرنے سے (جبکہ گھر میں رہ کر پردہ کے ساتھ کام کو انجام دے) منع کرنا چاہئے، البتہ اگر کسی خاتون کا شوہر اس قدر خوش حال ہو کہ وہ بیوی کے تمام اخراجات کو پورا کرتا ہو اور گھریلو کام کرنے کے لئے یا بیرونی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے اس نے ملازم بھی رکھ رکھا ہو اور عورت کے کام کاج کرنے کو پسند نہ کرتا ہو تو ایسی صورت میں عورت کو کسب معاش کی جدوجہد کرنے کی ضرورت نہیں ہے، بلکہ اس کے لئے بہتر ہے کہ وہ کسب معاش سے رک جائے۔

۵۔ اگر کسی عورت کا ولی یا شوہر تنگ دست ہو جس کے سبب کسب معاش کے لئے گھر سے باہر جانا پڑے تو ایسی صورت میں بھی نیک وفرمانبردار عورت پر لازم ہے کہ شوہر یا ولی سے اجازت لے کر گھر سے باہر جائے البتہ اگر ملازمت کی جگہ سفر کے بقدر دور ہو تو پھر عورت کا تنہا ملازمت کی جگہ جانا ناجائز ہے۔

۶۔ چونکہ عورت کا نان ونفقہ مذہب اسلام نے اس کے سرپرست، شوہر پر رکھا ہے اس لئے مسلم معاشرہ کی اکثر وبیشتر خاتون کو ملازمت کرنے کی اور گھر سے باہر نکلنے کی ضرورت نہیں پڑتی، البتہ اگر کوئی عورت بیوہ ہو یا مطلقہ ہو اور اس کے نان ونفقہ کا کوئی بندوبست نہ ہو تو مجبوری کے تحت مذہب اسلام نے عورت کو کسب حلال کی اجازت دی ہے، لیکن اس حال میں کہ عورت کو اپنی شرعی حیثیت "المرأۃ عورۃ ستر چھپانے کی چیز ہے، کو ملحوظ رکھ کر پردہ کا اہتمام کرنا لازم ہے۔

رہا عورتوں کا کسی کمپنی میں جا کر ملازمت کرنا یا دوکان میں بیٹھ کر تجارت کرنا شرعاً درست ہے یا نہیں؟ تو اس سلسلہ میں حضرت مفتی عبدالرحیم لاجپوریؒ نے فتاوی رحیمیہ (۳۰۸/۱۰) میں لکھا ہے:

"عورت کمپنی میں ملازمت یا دوکان میں تجارت کرے گی تو کئی ممنوعات کا ارتکاب ہوگا، بے پردگی ہوگی نامحرم مردوں سے اختلاط ہوگا اور بعض موقعوں پر خلوت وتنہائی کا موقع بھی آ سکتا ہے، ان کے ساتھ بے تکلفانہ بات چیت اور نامحرم مردوں کے ساتھ آمد ورفت ہوگی وغیرہ وغیرہ، اس لئے شرعاً اجازت نہیں ہو سکتی"۔

۷۔ اگر کسی ادارہ کا ذمہ دار تو مرد ہے، لیکن اس ادارہ میں تنہا صرف عورتیں ہی کام کرتی ہوں تو ایسے ادارے خواہ تعلیمی ہوں یا صنعتی وہاں عورتوں کا ملازمت کرنا شرعاً جائز ہے اور ادارہ کے ذمہ دار مردوں کو چاہئے کہ عورتوں کو اگر کوئی ہدایت دینی ہو یا کوئی اور کام درپیش ہو بہر صورت عورتوں سے پردہ کے پیچھے رابطہ کریں ہو جیسا کہ سورۂ احزاب میں اللہ تعالی کا ارشاد ہے: "إذا سئلتموهن متاعاً فاسئلوهن من وراء حجاب..." (سورۂ احزاب: ۵۳)۔

اور اگر ادارہ کا ذمہ دار شخص اپنی کسی محرم عورت کے ذریعہ سے عورتوں سے رابطہ رکھے اور اسی محرم عورت کے ذریعہ ہی لین دین وغیرہ کا معاملہ رکھے تو شرعاً یہ صورت بھی بلا کسی قیل وقال کے اور بلا کسی نکیر کے درست ہے۔

۸۔ اگر کسی ادارہ میں عورتوں کے ساتھ مرد بھی کارکن ہوں تو ایسے ادارہ میں عورتوں کا کام کرنا اور خدمت انجام دینا شرعاً درست نہیں ہے، ہاں اگر مرد وعورت کے کام کرنے کی جگہ علاحدہ علاحدہ ہو اور مرد وعورت کا باہم اختلاط نہ ہوتا ہو تو ایسی صورت میں عورت دیگر عورتوں کے ساتھ مل کر کام کر سکتی ہے۔

عورت سن رسیدہ ہو یا جوان اسی طرح خوبصورت ہو یا بدصورت جب اس کا مردوں کے ساتھ اختلاط طویل ہوگا تو کوئی نہ کوئی بدکاری وبرائی کا واقعہ رونما ہو سکتا ہے۔

۹۔ جس کام کی انجام دہی میں مردوں سے سابقہ ہو جیسے کسی شاہراہ والی عام دوکان میں سیلز گرل ہونا جہاں مرد وعورت دونوں سے سابقہ پڑے وہاں کسی خاتون کا ملازمت کرنا شرعاً درست نہیں ہے، رہا کسی آفس میں یکسوئی کے ساتھ رہ کر کام کرنا جہاں کسی مرد سے سابقہ نہ پڑے تو ایسی عورت کا ملازمت کرنا درست ہے (ملاحظہ ہو: فتاوی رحیمیہ ۱۶۷/۳)۔

۱۰۔ ملازمت کی غرض سے عورت کا اپنے گھر اور اپنے عزیز واقارب سے دور رہ کر خواہ اندرون ملک ہو یا بیرون ملک مستقل قیام کرنا شرعاً جائز نہیں، اور مفاسد ومنکرات سے خالی نہیں ہے، ہاں شوہر وبیوی اگر ساتھ رہ کر اندرون ملک یا بیرون ملک کسی جگہ مستقل قیام کریں اور باعزت طریقے سے شرعی حدود کو ملحوظ رکھ کر ملازمت کریں تو شرعاً درست ہے۔ ☆☆☆

خواتین کی ملازمت

مفتی ظہیر احمد قاسمی[1]

۱۔ اسلام نے عمومی احوال میں عورت کو کسب معاش کا مکلف قرار نہیں دیا ہے اس کی خلقی پیدائش کے اعتبار سے اس کے کمزور ہونے کی وجہ سے اس کو مطلقا عاجز عن الکسب گردانا ہے، الفقہ الاسلامی وأدلتہ میں ہے: "العجز من الکسب أن یکون انثی مطلقا" (۱۰/ ۷۳۵۷، الدر مع الشامی ۲/ ۹۳۸)۔

اور اس کا نفقہ کبھی والدین پر کبھی شوہر پر اور کبھی قریبی رشتہ داروں پر رکھا ہے، اور اس پر کچھ دوسری ذمہ داریاں ڈالی ہیں تاکہ ان کی ادائیگی میں کوئی تقصیر نہ رہ جائے جس کی وجہ سے اس کی تخلیق ہوئی ہے (والغرض من المرأۃ کونہا مستفرشۃ آیۃ بالولد مدبرۃ لحوائج البیت، نور الانوار ۱۸)۔

اس وجہ سے بھی شریعت نے اس کو معذور اور عاجز عن الکسب شمار کیا ہے، جیسا کہ طالب علم کو بھی عاجز عن الکسب مانا جاتا ہے کہ وہ علمی تحقیق میں مشغول رہتا ہے، البتہ اگر عورت کا کوئی نفقہ اٹھانے والا نہ ہو تو پھر بدرجہ مجبوری اس کو کسب معاش کا مکلف قرار دیا جائے گا، اور اس کو اس کی اجازت دی جائے گی کہ شریعت کے دائرہ میں رہ کر اپنے کے شایان شان پیشوں اور ملازمتوں کو اختیار کرے۔

۲۔ اگر عورت کا کوئی بھی خرچ اٹھانے والا نہ ہو نہ شوہر ہو نہ والدین اور نہ ہی اس کی اولاد اور بھائی وغیرہ تو ایسی صورت میں اس پر خود اپنا خرچ اور اپنے بچوں کا خرچ اٹھانا لازم ہوگا (شامی ۲/ ۹۲۳)۔

۳۔ بغیر مجبوری اور ضرورت کے عورت کا کسب معاش میں لگنا اسلام میں پسندیدہ نہیں، کیونکہ عورت کے ذمہ اور دیگر ذمہ داریاں بھی ہیں، جیسے شوہر کی خدمت بچوں کی پرورش وغیرہ، البتہ اگر وہ تمام تر اپنی ذمہ داریوں کو ادا کرنے کے ساتھ ساتھ (اپنے شوہر یا ولی کی اجازت سے) کسب معاش میں لگتی ہے تو اس کی گنجائش ہے، لیکن کسب معاش محض وقت گذاری کے لئے لگنا ٹھیک نہیں، بلکہ اپنے آپ کو مشغول رکھنے اور اس کمائی کو اطاعت اور جائز کاموں میں خرچ کرنے کی نیت سے درست ہوگا۔ جیسا کہ حدیث پاک میں ہے:

"أخرجی فجدی نخلك لعلك أن تصدق منه أو تفعلی خیرا" (ابوداؤد باب فی المبتوتہ تخرج بالنہار)۔

معیار زندگی اس حد تک بلند کرنے کی اجازت ہوگی کہ زندگی گزارنے میں آسانی ہو محض تعیش کے لئے کسب معاش کی اجازت نہ ہوگی۔

"هذا مستفاد مثل هذه العبارة الفقهية و تفوض على الزوج إذا كان موسرا نفقة خادمها ووجهه أن كفايتها واجبة عليه، وهذا من تمامها اذلا بدلها منه" (الهدیہ ۲/ ۴۳۹، البدائع ۴/ ۲۴)۔

شیخ وہبہ زحیلی لکھتے ہیں: "اتفق الفقهاء على وجوب أجرة القابلة ... فقال الحنفية يجب على الزوج آلة طحن وخبز وآنية شراب وطبخ ككوز وجرة وقدر مغرفة وكذا سائر أدوات البيت" (الفقہ الاسلامی وادلتہ ۷۹۴)۔

معلوم ہوا ان اشیاء کی فراہمی ضروریات زندگی میں سے ہیں، یہ تعیش کے درجہ کی اشیاء نہیں ہیں (فتاوی محمودیہ ۱۸/ ۹۴، ۱۹/ ۳۸، الفقہ الاسلامی وادلتہ ۱۰/ ۷۳۸۰)۔

---

[1] مدرسہ اشاعت العلوم کانپور، (یوپی)۔

۴۔ اگر شوہر یا ولی نفقہ کی مکمل ادائیگی کر رہے ہیں تو اندرون خانہ بھی کسب معاش میں شوہر یا ولی کی اجازت لازم ہوگی۔

''له أن يمنعها من الأعمال كلها المقتضية للكسب، لأنها مستغنية عنه بوجوب كفايتها عليه وكذا من العمل تبرعا''

اگر کسب معاش سے عورت کے حسن و جمال میں کمی کا اندیشہ یا خاندان میں عار دلانے کا اندیشہ ہو تو بھی شوہر عورت کو کسب معاش سے منع کر سکتا ہے۔

البتہ اگر عورت اندرون خانہ کوئی ایسا کام اختیار کرے جس سے شوہر کو کسی قسم کا ضرر لاحق نہ ہو تو شوہر کی خدمت میں اور نہ بچوں کی پرورش میں تقصیر اور نہ ہی اس کے حسن و جمال میں کوئی کمی یا اور نہ ہی عار تو پھر اس صورت میں بغیر اجازت کے بھی ایسے امور انجام دے سکتی ہے۔

۵۔ اگر ولی یا شوہر عورت کے تمام شرعی اخراجات پورا کرتا ہے تو عورت کو اجازت لینا لازم ہوگا ورنہ نہیں۔

''ولها السفر والخروج من بيت زوجها للحاجة'' (الدر المختار باب المهر ۳،۱۴۵)۔

الف۔ اگر شوہر یا ولی نفقہ پورا ادا کرتا ہے تو اجازت کے بغیر خواہ ایک دن کی مسافت ہو یا تین دن کی مسافت دونوں صورتوں میں بغیر اجازت نکلنا درست نہ ہوگا، البتہ تین دن کی مسافت بغیر محرم یا شوہر کے ساتھ درست نہیں چاہے شوہر یا ولی کی اجازت ہی کیوں نہ حاصل ہو۔

البتہ تین دن کی مسافت سے کم میں ولی یا شوہر کی اجازت کے ساتھ بغیر محرم اور شوہر کے نکل سکتی ہے، لیکن بہتر نہیں۔

لقوله عليه الصلوة والسلام: ''عن ابي هريرةؓ قال قال النبي ﷺ لا يحل لامرأة تؤمن بالله واليوم الآخر أن تسافر مسيرة يوم وليلة ليس معها حرمة'' (بخاری ۱،۱۴۸)۔

ب۔ رات اور دن کی تفریق کا مدار خوف فتنہ پر ہے کیونکہ رات کا وقت عورت کے لئے زیادہ پرخطر ہوتا ہے، لیکن اگر کسی شہر میں یا ملک میں دن کی طرح رات میں بھی عورت کے لئے امن ہو اور کوئی خطرہ نہ ہو تو پھر کوئی فرق نہیں کیا جائے گا، اور کہیں دن میں بھی خطرہ ہے تو ایسی جگہ عورت کو دن میں بھی نکلنے کی اجازت نہ ہوگی، فقہی عبارات کا مدار اپنے زمانہ کے لحاظ سے حالات پر ہے۔

''المتوفى عنها زوجها تخرج نهارا وبعض الليل ولا تبيت في غير منزلها'' (ہدایہ ۲،۴۲۸)۔

''ومعتدة الموت تخرج يوماً و بعض الليل تكتسب لأجل قيام المعيشة، لانه لا نفقة لها'' (البحر الرائق ۴،۴۵۸)۔

ج۔ اگر ولی یا شوہر اس کے نفقہ کی ادائیگی یا کفالت نہیں کرتا ہے تو ایسی صورت میں عورت بغیر اجازت کے اپنی معاشی ضرورت پورا کرنے کے لئے محرم کے ساتھ تین دن یا اس سے زیادہ کی مسافت پر اور اس سے کم بغیر محرم کے بھی کسب معاش کے لئے جا سکتی ہے، آپ ﷺ نے فرمایا:

''أنه أذن لكن أن تخرجن لحاجتكن'' (مسند احمد ۶،۵۶) (بے شک اللہ تعالی نے تم کو اپنی ضرورت پورا کرنے کے لئے اجازت دی ہے)۔

''ولها السفر والخروج من بيت زوجها للحاجة'' (درمختار ۳،۱۴۵)۔

اور اس عبارت سے بھی استدلال کیا جا سکتا ہے کہ متوفی عنہا زوجہا کسب معاش کے لئے اس لئے نکل سکتی ہے چونکہ اس کا نفقہ نہیں ہے تو اس طرح جو شوہر یا ولی عورت کی کفالت اور نفقہ نہ دیتا ہو اس پر قیاس کیا جا سکتا ہے۔

''ومعتدة الموت تخرج يوما وبعض الليل تكتسب لأجل قيام المعيشة، لانه لا نفقة لها'' (البحر الرائق ۴،۲۵۸)۔

۶۔ عورت کا نفقہ یا کفالت کا نظم نہ ہو تو وہ عورت کسب معاش کر سکتی ہے، پردہ اور عدم اختلاط بالرجال کے ساتھ۔

اگر نفقہ یا کفالت کا نظم نہ ہو تو پھر اندرون خانہ کسب معاش بلا اجازت شوہر یا ولی اس وقت کر سکتی ہے جبکہ وہ اپنے مفوضہ امور کی ادائیگی میں کوتاہی کئے بغیر اپنے حسن و جمال کا خیال اور ساتھ ہی شوہر یا ولی کو کسی قسم کا عار نہ لاحق ہو، ورنہ اندرون خانہ ہو یا گھر سے باہر ہر جگہ شوہر یا ولی کی اجازت لازم ہوگی، خواہ تین دن یا اس سے زائد مسافت سفر ہو یا تین دن سے کم مسافت سفر ہو۔

کسب معاش میں اصل حدود پردہ کا التزام اور اختلاط بالرجال کا نہ ہونا ہے اور عورت کے شایان شان پیشہ کا انتخاب یہی اصل حدود اور قیود ہیں عورت کی ملازمت یا تجارت یا کسب معاش کی کسی بھی صورت کے لئے، ''لا یخلون رجل بامرأة إلا کان ثالثهما الشیطان'' (مشکوۃ ۲،۲۶۹)۔

۷۔ اگر ادارہ کے ذمہ داروں سے خلوت نہ ہوتی ہو تو ایسی صورت میں شوہر یا ولی کی اجازت سے یا ان کی کفالت یا نفقہ نہ برداشت کرنے کی صورت میں بلا اجازت بھی پردہ کے ساتھ ایسی ملازمت درست ہوگی۔

''ولها الخروج من بیت زوجها للحاجة'' (الدر المختار ۳،۱۴۵)، ادارہ کے اجنبی مردوں سے پردہ کے ساتھ گفتگو کرنے کی اجازت ہوگی۔

''ویجوز الکلام المباح مع امرأة أجنبیة'' (الرد المحتار مع الدر المختار ۹،۵۳۰)۔

۸۔ بغیر کسی شدید مجبوری کے ایسی جگہوں پر ملازمت کرنا شرعا درست نہیں، ایسی جگہوں اور ایسے پیشوں کو اختیار کرنے کی کوشش کرنا چاہئے جس میں کوئی شرعی محظور لازم نہ آئے، لیکن اگر ایسی صورت بن جاتی ہے کہ دوسرے جائز اور مناسب ذرائع آسانی سے اختیار نہیں کئے جا سکتے تو مجبوری میں حتی الوسع (چہرے کے ڈھانکنے کے ساتھ) مکمل پردہ کے ساتھ آپسی ملازمت کرنے کی بھی گنجائش ہوگی۔

''تمنع المرأة الشابة من کشف الوجه بین الرجال لا، لأنه عورة بل لخوف الفتنة أن یری الرجل وجهها فتقع الفتنة، لأنه قد یقع النظر إلیها بشهوة'' (شامی ۲،۷۹)۔

جوان عورت کے مقابلہ میں بوڑھی عورتوں کے احکام میں یقینا تخفیف ہے، کیونکہ ان کی مردوں کے ساتھ ملازمت کرنے میں فتنہ کا اندیشہ نہ کے برابر ہے، تاہم شرعی پردہ کا اہتمام حتی الوسع ان پر بھی لازم ہے۔

''أما العجوز التی لا تشتهی فلا بأس لمصافحتها ومس یدها إذا امن ومتی جاز المس جاز سفره بها ویخلو إذا أمن علیه وعلیها وإلا لا'' (الدر المختار مع الرد ۹،۵۲۹)۔

۹۔ اصلا تو عورتوں کا اختلاط مطلقا مردوں سے حرام ہے، مگر جب شدید مجبوری میں ملازمت کی اجازت دی جائے گی تو کم اور زیادہ اختلاط کی صورت میں یقینا فرق ہوگا، جہاں اختلاط کم ہو ایسی ہی جگہوں پر ملازمت کرنی چاہئے، جہاں اختلاط زیادہ ہوگا وہاں گناہ اشد درجہ کا ہوگا، بنسبت جہاں اختلاط کم ہے۔

اہون البلیتین کے قاعدے کے مطابق مجبور عورت کو اولاً کم اختلاط والی ملازمت اختیار کرنی چاہئے، الا یہ کہ ایسی کوئی ملازمت اس کو میسر نہ ہو اور وہ ملازمت کرنے پر مجبور ہو تو ضرورت کے موقع پر اس کی بھی گنجائش ہوگی۔ "الضرورة تبیح المحظورة"۔

۱۰۔ کسب معاش اور ملازمت کی خاطر عورت کو بغیر محرم یا شوہر کے مستقل باہر قیام کرنا درست نہیں، لیکن اگر شوہر یا محرم اس کے ساتھ ہو تو مجبوری کی حالت میں درست ہوگا (مزید دیکھئے: فقہی مقالات ۱/۲۴۹ از مولانا تقی عثمانی)۔

☆☆☆

خواتین کی ملازمت

مولانا حافظ شیخ کلیم اللہ عمری [1]

۱۔ ''للرجال نصیب مما اکتسبوا وللنساء نصیب مما اکتسبن'' (نساء:۳۲)۔

(مردوں کو ان کی کمائی کا حصہ ملتا ہے اور عورتوں کو ان کی کمائی کا حصہ ملتا ہے)۔

اسلامی شریعت میں کسب معاش کی ذمہ داری مرد حضرات پر عائد ہوتی ہے اور مرد عورت کا کفیل ہوتا ہے اور اس کا نگراں بنایا گیا ہے، مرد کو عورت پر فوقیت کا دارومدار بھی اس کی کفالت کی وجہ سے ہے، جیسا کہ ارشاد ربانی ہے:

''الرجال قوامون علی النساء بما فضل اللہ بعضهم علی بعض وبما أنفقوا من أموالهم'' (نساء:۳۴)۔

(مرد عورتوں پر حاکم ہیں اس برتری کی بدولت جو اللہ نے ان میں سے بعض کو بعض پر دے رکھی ہے اور اس لئے کہ مردوں نے اپنا مال خرچ کیا ہے)۔

۲۔ شریعت اسلامیہ نے عورتوں پر نان ونفقہ کی کوئی ذمہ داری عائد نہیں کی ہے، البتہ گھر کا سرپرست باپ، شوہر، بیٹا، بھائی یا چاچا وغیرہ یہی لوگ شرعاً واصولاً سرپرست اور ذمہ دار ہیں، اسلام نے عورتوں کے نازک کندھوں پر یہ ذمہ داری نہیں رکھی ہے، اسی وجہ سے مرد کے لئے عورت کے بالمقابل دوگنا حصہ (ترکہ میں) مقرر ہے اور اسے عصبہ بھی بنایا گیا ہے۔

۳۔ معیار زندگی کو بلند کرنے یا وقت گزاری اور سرمایہ واثاثہ پیدا کرنے کی غرض سے عورتوں کے لئے معاشی جدوجہد تاکہ شوہر کا ہاتھ بٹائے یا صدقہ وخیرات کرے ان نیک مقاصد کی تکمیل کے لئے عورتوں کا معاشی جدوجہد جائز ہے، جیسا کہ حدیث میں حضرت زینبؓ کے بارے میں آتا ہے کہ وہ اپنے ہاتھ کی کمائی سے صدقہ وخیرات کیا کرتی تھیں۔

''فکانت أطولنا یدا زینب، لأنها کانت تعمل بیدها وتصدق'' (مسلم:۴۴۹۰)۔

۴۔ جب عورت اندرون خانہ اپنی معاشی سرگرمیوں کو محدود رکھنا چاہے تو بہتر یہی ہے کہ اپنے ولی یا شوہر سے اجازت لے لے، نان ونفقہ کی کوئی ذمہ داری شرعاً عورتوں پر عائد نہیں ہوتی اور اسی طرح کسی شادی شدہ خاتون کو یہ حکم دیا گیا کہ نفل روزہ رکھنا چاہے تو شوہر کی موجودگی میں اس سے اجازت لے لے ورنہ نہیں، اسی طرح معاشی سرگرمیوں میں بھی اپنے شوہر کی اجازت اور رضامندی کو ملحوظ رکھنا ہی ضروری ہے۔

۵۔ اگر کوئی عورت کسب معاش کے لئے گھر سے باہر نکلے تو اس کے لئے ولی یا شوہر کی اجازت ضروری ہوگی، البتہ مسافت سفر سے کم پر عورتوں کا کسب معاش کے لئے نکلنا بہتر ہے اور رات کا سفر اور رات کے وقت کسب معاش کی ذمہ داریاں عورتوں کے لئے شرعاً واخلاقاً غیر مناسب ہیں، البتہ وہ عورت جس کی کفالت ولی یا شوہر کرتا ہو اس عورت کا کسب معاش کے نام سے گھر سے باہر نہ نکلنا بہتر ہے، البتہ شوہر کی اجازت سے بچوں کی تعلیم وتربیت کی ذمہ داری یا رفاہی خدمات کے لئے گھر سے باہر نکلنے میں شرعاً کوئی قباحت نہیں ہے۔

۶۔ ولی یا شوہر کی اجازت ہر حال میں ضروری ہے، باپردہ نکلنا، دن کے وقت جانا اور دن میں واپسی، بغیر زیب وزینت کے اور خوشبو کے استعمال

[1] جامعہ دارالسلام، عمرآباد، تامل ناڈو۔

سے احتراز کرتے ہوئے عورتوں کے ساتھ آنا جانا، شرم وحیا اور عصمت وعفت و پاکدامنی کو ملحوظ رکھنا ہر حال میں ضروری ہے، مقر عمل میں پردہ کا پورا خیال رکھنا ضروری ہے، عورت کا از سر تا پا مکمل ستر میں رہنا ضروری ہے، ارشاد نبوی ہے:

''المرأة عورة إذا خرجت استشرفها الشيطان ''(ترمذی)، اعضائے جسم کا پردہ میں رہنا ضروری ہے، اعضاء تو کیا ان پر موجود زینت کا بھی اظہار کسی حال میں نہ ہو، اپنے سروں کو اوڑھنیوں کو اپنی گردنوں سے اور سینوں پر لٹکانا بھی ضروری ہے، تاکہ سر کے بال، گردن اور کان کی بالیاں اور سینے سبھی چھپ جائیں، عورت جب خوشبو لگا کر کسی مجلس سے گذرتی ہے تو زانیہ ہوتی ہے (ترمذی)۔

۷۔ ملازمت کرنے والی خواتین اگر ایسے اداروں میں کام کریں، تعلیمی ادارے ہوں یا دوسرے ادارہ جات، جہاں خواتین ہی خدمت انجام دیتی ہوں، اگر ادارہ کے سربراہ اور ذمہ دار مرد ہوں تو اس صورت میں پردہ کے احکامات کا لحاظ رکھنا ضروری ہے، چاہے ذمہ دار ایک فرد ہو یا کئی افراد، حکم ایک ہی ہوگا۔

۸۔ مرد حضرات جہاں کارکن ہوں اور خواتین کارکنوں کے لئے پردہ کے تعلق سے ذیل کی باتوں کا لحاظ رکھنا ضروری ہے:

اختلاط سے اجتناب کیا جائے، اظہار زینت نہ ہو، خوشبو کے استعمال سے احتراز، اعضائے جسم کا پردہ میں رہنا ضروری ہے، سوائے آنکھوں اور ہاتھوں کے جسم کا کوئی حصہ ظاہر نہ ہو، البتہ سن رسیدہ خواتین کے لئے پردہ کے معاملہ میں حکم شرعی یہ ہے کہ "والقواعد من النساء اللاتی لا یرجون نکاحا" (نور:۶۰)، یعنی وہ بوڑھی عورتیں جنہیں نکاح کی خواہش نہ رہی ہو ان کے لئے گناہ کی بات نہیں کہ وہ اپنے دوپٹے وغیرہ اتار کر رہیں بشرطیکہ وہ اپنی زینت نہ دکھاتی پھریں اور اس سے بھی پرہیز کریں تو ان کے لئے بہتر ہے۔

قرآن کریم ان سن رسیدہ خواتین کے لئے یہ شرط لگاتا ہے کہ جسم کی پوشیدہ زینتوں کو ظاہر نہ کریں، جیسے ہاتھوں کا خضاب، کنگن اور پازیب وغیرہ اور ان سن رسیدہ خواتین کے لئے بھی بہتر قرار دیا گیا کہ وہ غیروں کے سامنے اپنے سروں سے اوڑھنی اور اپنے جسم سے برقعہ نہ اتاریں اسی میں ان کے لئے بھلائی ہے۔

۹۔ عورت کا آفس میں کام کرنا بہتر ہے، سیلز گرل یا استقبالیہ وغیرہ میں کام کرنے سے، جس کام میں مردوں کا سامنا زیادہ ہوتا ہو اس کام سے احتراز اولی ہے، البتہ وہ کام جس میں عورت کا مرد سے کم سامنا ہوتا ہو اس میں بھی شریعت کا پاس ولحاظ رکھنا ضروری ہے، مثلاً پردہ کا لحاظ اور شرع کی پابندی، آواز پست رکھنا، نگاہیں نیچی رکھنا، بلاضرورت مرد سے بات چیت سے احتراز کرنا، ہر حال میں ضروری ہے۔

۱۰۔ عورت کا ملازمت کی غرض سے اپنوں سے دور سفر کرنا (اندرون ملک یا بیرون ملک) اور مستقل قیام کرنا از روئے شرع درست نہیں ہے، بلکہ حرام ہے۔

جیسا کہ ارشاد نبوی ہے: جو عورت اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتی ہو اس کے لئے جائز نہیں ہے کہ ایک دن اور رات کا سفر بغیر کسی محرم مرد کے کرے، دوسری روایت میں تین دن کے الفاظ وارد ہیں (بخاری)۔

☆☆☆

خواتین کی ملازمت۔ اسلامی نقطہ نظر

مولانا محمد صادق مبارک پوری [1]

دور حاضر مردوں کے لئے اعلی تعلیم کا دور ہے اعلی سے اعلی تعلیم کا رواج عروج پر ہے ہمارے مسلم معاشرہ کی خواتین میں بھی اعلی تعلیم کا رواج دن بدن ترقی پر ہے، عصری تعلیم گاہوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں لڑکیوں کا سیلاب ہے، حصول تعلیم کے بعد بہت سی خواتین مختلف ملازمتوں سے وابستہ ہورہی ہیں، یا وابستہ ہونے کی جدوجہد میں لگی ہیں، اور حکومت بھی عورتوں کی ملازمت پر توجہ دے رہی ہے۔

ان حالات میں یہ مسئلہ سامنے آتا ہے کہ اسلامی نقطہ نظر سے خواتین کی ملازمت جائز ہے یا نہیں؟ حالات ومعاشرہ کا جائزہ لینے کے بعد یہ بات سامنے آتی ہے کہ خواتین کی ملازمت درست وجائز قرار دینے کی صورت میں بہت سارے مفاسد وفتنے کے دروازے کھلیں گے۔

قرآن وحدیث اور تصریحات فقہاء کی روشنی میں یہی کہا جائے گا کہ مفاسد وفتن کے سد باب کے لئے خواتین کی ملازمت ناجائز ہے، ہاں مجبوری اور ضرورت کی صورت میں شرعی حدود کے ساتھ ملازمت کی گنجائش ہے۔

سوالات کے جوابات:

۱۔ بلا ضرورت عورت کا گھر سے نکلنا، اجانب کو مائل کرنے کا سبب بننا، بے پردگی، زینت ومحاسن کا اظہار، مردوں سے اختلاط، بسا اوقات خلوت وتنہائی، شوہر کی خدمت، اولاد کی اصلاح وتربیت اور بنیادی ذمہ داریوں سے غفلت وغیرہ مفاسد ومضرات کے پیش نظر شریعت اسلامی عام حالات میں خواتین کے لئے کسب معاش کو جائز نہیں قرار دیتی۔

۲۔ شریعت اسلامیہ نے خواتین پر نان ونفقہ کی ذمہ داری نہیں رکھی ہے، نہ اپنی اور نہ اپنے بچوں کی، بلکہ شادی سے پہلے ان کے باپ پر اور شادی کے بعد شوہر پر رکھی ہے اور بچوں کے نفقہ کی ذمہ داری ان کے باپ پر رکھی ہے، قرآن کریم میں ہے:

''وللمولوده رزقهن'' (سورۂ بقرہ: ۲۳۳) (اور جس کی اولاد ہے اس کے ذمہ ماؤں کا کھانا ہے)۔

ہدایہ میں ہے: ''النفقة واجبة للزوجة علی زوجها'' (باب النفقة ۲، ۴۳۷) (بیوی کا نان ونفقہ شوہر پر واجب ہے)۔

فتاوی تاتارخانیہ میں ہے: "تجب علی الرجل نفقة امرأته" (۴، ۱۸۳) (آدمی پر اس کی بیوی کا نفقہ واجب ہے)۔

ہدایہ میں ہے:

''نفقة الأولاد الصغار علی الأب'' (۲،۴۴۴) (نابالغ اولاد کا نفقہ باپ پر ہے)۔

۳۔ محض معیار زندگی کو بلند کرنے یا وقت گذاری اور سرمایہ اور اثاثہ پیدا کرنے کی غرض سے عورتوں کو معاشی جدوجہد کرنا جائز نہیں ہے، اس لئے کہ عورتوں کے لئے معاشی جدوجہد اختیار کرنا ضرورت اور مجبوری میں شرعی حدود کے ساتھ جائز ہوتا ہے اور مذکورہ صورت مسئولہ میں مجبوری اور ضرورت نہیں ہے، اس لئے جائز نہیں کیا جاسکتا۔

۴۔ خواتین کسب معاش کے لئے اندرون خانہ معاشی سرگرمیاں محدود رکھیں تب بھی ولی یا شوہر سے اجازت لینا ضروری ہوگا۔

البحر الرائق (۲/۱۹۶) میں ہے:

---

[1] استاذ فقہ جامعہ عربیہ احیاء العلوم، مبارکپور، اعظم گڑھ۔

''أن يمنع امرأته من الغزل ولا تطوع للصلوة والصوم بغير إذن الزوج كذا فى الظهيرية ولا ينبغى تخصيص الغزل بل له أن يمنعها من الأعمال كلها المقتضية للكسب، لأنها مستغنية عنه لوجوب كفايتها'' (شوہر عورت کو سوت کاتنے سے روک سکتا ہے، عورت نفل نماز وروزہ بغیر شوہر کی اجازت نہیں ادا کرسکتی، صرف سوت کاتنے کی تخصیص نہیں ہے بلکہ شوہر ہر ایسے عمل سے روک سکتا ہے جو کسب کا مقتضی ہو، وجہ ممانعت یہ ہے کہ نفقہ کی طرف سے کفایت ہونے کی وجہ سے اسے کمانے کی کوئی ضرورت نہیں)۔

۵۔ اگر ولی اس خاتون کی کفالت کرتا ہو تو اس خاتون کو کسب معاش کے لئے نکلنا مطلقاً ممنوع اور ناجائز ہے، چاہے دن میں ہو یا رات میں، گھر سے نکلنا مسافت سفر پر ہو یا اس سے زیادہ کے لئے یا اس سے کم کے لئے ہو۔

اگر ولی اس خاتون کی کفالت نہ کرتا ہو، اور اس کے پاس ضروریات زندگی کا انتظام نہ ہو تو شرعی حدود کی رعایت کے ساتھ بلا اجازت ولی بھی کسب معاش کے لئے دن میں نکلنے کی گنجائش ہے۔

''نظیرہ الموسوعة الفقهیه ۱۹،۱۱۰: ويجوز للزوجة الخروج بغير إذن الزوج لما لاغناء لها عنه كاتيان بنحو ماكل والذهاب إلى القاضى لطلب الحق واكتساب النفقة إذا اعسر بها الزوج والاستفتاء إذا لم يكن زوجها فقيها'' (بحوالہ الإقناء ۲،۹۵)۔

۶۔ مجبوری اور ضرورت کی صورت میں مثلاً عورت کے نان ونفقہ اور ضروریات زندگی کا انتظام نہ ہو تو خواتین کو شرعی حدود کی پابندی کے ساتھ ملازمت کی گنجائش ہے۔

۷۔ ایسے ادارے میں بھی عام حالات میں کام کرنا جائز نہیں، کیونکہ اسمیں بھی بہت سارے مفاسد پائے جاتے ہیں، مثلاً بلاضرورت شرعی گھر سے نکلنا، عورت کا بن سنور کر نکلنا، ان کی طرف فساق وفجار کا میلان، مردوں کی نگاہوں کا ان کی طرف اٹھنا۔

ہاں اگر کوئی عورت ایسی ہے جس کا نہ شوہر ہے اور نہ باپ ہے اور نہ ہی کوئی دوسرا ایسا رشتہ دار ہے جو اس کی معاشی کفالت کرسکے اور خود اس عورت کے پاس نہ اتنا مال ہے جس کے ذریعہ اپنی ضروریات پوری کرسکے تو ایسی صورت میں شرعی حدود کی پابندی کے ساتھ ایسے ادارہ میں کام کرنے کی گنجائش ہے۔

۸۔ ایسے ادارہ میں کام کرنا جائز نہیں، خواہ سن رسیدہ ہو یا نوجوان، کیونکہ اس پرفتن دور میں جب کہ سبھی عورتوں کو چاہے وہ سن رسیدہ ہوں یا نوجوان، تمام نمازوں میں مسجد میں حاضری سے متاخرین فقہاء حنفیہ نے منع کردیا ہے۔ تو ایسے ادارے میں ملازمت کی کیوں کر گنجائش ہوسکتی ہے، علامہ سید طحطاویؒ لکھتے ہیں:

''وأما فى زماننا فالمفتى به منع الكل عن الكل حتى فى الوعظ ونحوه'' (حاشیہ طحطاوی علی الدر ۱،۲۴۵)۔

اور بہر حال مفتی بہ قول یہ ہے کہ سبھی عورتوں کو تمام نمازوں میں حاضر ہونا منع ہے، یہاں تک کہ مجلس وعظ وغیرہ میں بھی حاضر ہونا منع ہے۔

۹۔ مردوں کا سامنا کم ہو یا زیادہ دونوں قسم کی ملازمت بغیر شدید مجبوری جائز نہیں ہے کیونکہ مفاسد اور مضرات دونوں میں موجود ہیں، ایک میں کم اور دوسرے میں زیادہ ہوسکتے ہیں، بہر حال دونوں قسم کی ملازمت ناجائز ہے۔

۱۰۔ ملازمت کی غرض سے عورت کا اپنے گھر اور اپنوں سے دور مستقل قیام جائز نہیں ہے۔

☆☆☆

ضرورت شدیدہ میں عورتوں کا ملازمت کرنا

مفتی تنظیم عالم قاسمی [1]

فطری طور پر مرد اور عورتوں میں صلاحیتیں الگ الگ رکھی گئی ہیں، گھر سے باہر کا کام مردوں کے لئے اور گھر کے اندر کا کام عورت کے لئے زیب ہے، اور یہ دونوں خداداد صلاحیت کے اعتبار سے اپنے اپنے دائرہ کار میں بہتر، بحسن وخوبی کام انجام دے سکتے ہیں، عورتوں میں چونکہ جاذبیت اور میلان نفس کے عناصر موجود ہیں اس لئے ان کو گھر سے باہر نکلنے کی اجازت نہیں دی گئی ان کو نصیحت کی گئی کہ وہ اپنی سرگرمیاں گھر کے اندر تک محدود رکھیں، اور اگر نماز حج یا ضرورت شدیدہ کی بنیاد پر نکلنے کی اجازت بھی دی تو اتنے قیود اور شرائط کے ساتھ کہ فتنہ کا ادنی احتمال بھی باقی نہ رہے، چونکہ عورتوں کا دائرہ گھر تک محدود رکھا گیا ہے اس لئے کسب معاش کو ان سے وابستہ نہیں کیا گیا بلکہ ان کے ولی یا شوہر کے ذمہ ان کے معاش کی ذمہ داری ڈالی گئی ہے کہ وہ اپنے ماتحت عورتوں کے نان ونفقہ اور ضرورت کی تکمیل کا انتظام کریں، شادی سے پہلے، باپ، دادا اور دوسرے ولی کے ذمہ نان ونفقہ حسب ترتیب ہے، اور شادی کے بعد شوہر پر اس کو واجب کیا گیا ہے۔

''ففرضت لها النفقة على أوليائها إن لم تكن ذات زوج ثم على بعلها إذا نكحت'' (ماذا عن المرأة للدكتور نور الدين عتر ص۱۳۶ طبع دارالفكر بيروت)، ''ونفقة الإناث واجبة مطلقا على الآباء مالم يتزوجن اذا لم يكن لهن مال'' (فتاوى هنديه ۱٫۵۶۳ طبع بيروت)۔

ہاں البتہ شوہر نہ ہو یا اولیاء میں کوئی نہ ہو اور اگر ہو تو اس کا نفقہ برداشت کرنے کی قدرت اولیاء میں نہ ہو تو عورت کا نفقہ خود اس پر واجب ہوگا اس لئے شریعت کے مقاصد پنجگانہ میں حفظ نفس نسل شامل ہے، اپنی جان کی حفاظت خود انسان پر واجب ہے جب کوئی شکل نہ ہو تو میتہ اور حرام اشیاء بھی حلال کردی گئی ہیں، لیکن بہر حال نفس کی حفاظت ضروری ہے، اسی طرح عورت پر اس کے چھوٹے بچوں کا نفقہ بھی واجب ہے جبکہ بچوں کا باپ موجود نہ ہو یا تنگ دست ہو اور ماں کے پاس مال ہو۔

''الأم أولى بالتحمل من سائر الاقارب حتى لو كان الاب معسرا والأم موسرة والصغير جد مؤسر تومر الام بالانفاق من مال نفسها ثم ترجع على الاب'' (فتاوى هنديه ۱٫۵۶۳ طبع بيروت)۔

اس سے معلوم ہوا کہ بسا اوقات عورت کے ذمہ بھی نان ونفقہ رکھا گیا ہے اور ظاہر ہے کہ اس کے لئے اسے گھر سے باہر بھی نکلنا پڑیگا، یا اسی طرح اپنے ماں، باپ اقرباء سے ملاقات یا دوا، علاج ومعالجہ کی غرض سے کبھی گھر سے نکلنے پر مجبور ہونا پڑتا ہے شریعت نے اگرچہ عورتوں کو گھر میں رہنے کی سخت تاکید کی ہے، مگر ضرورت کے تحت یا نیک ارادے سے نکلنے میں شریعت نے لچک رکھی ہے اور انہیں گنجائش دی ہے کہ ضرورت کی تکمیل کے لئے گھر سے باہر نکلیں، خواہ وہ دینی ضرورت ہو یا طبعی، جیسے حج کے ارادے سے عورتوں کے لئے نکلنا جائز ہے، حدیث سے ثابت ہے کہ رسول اللہ ﷺ خود اپنی خواتین کو عیدین کے لئے لے جاتے تھے (ابن ماجہ باب ماجاء فی خروج النساء فی العیدین)۔

جنگ میں ازواج مطہرات اور خواتین اسلام حضور ﷺ کے ساتھ جاتیں اور مجاہدین کو پانی پلاتیں زخمیوں کی مرہم پٹی کرتیں، یہ طریقہ احکام حجاب نازل ہونے کے بعد بھی جاری رہا (تفصیل کے لئے دیکھئے: ترمذی باب ماجاء فی خروج النساء فی الغزو)۔

---

[1] دار العلوم سبیل السلام، حیدرآباد۔

رسول اکرم ﷺ نے ایک موقع پر صاف طور پر اس مسئلہ کو بیان فرمایا: "قد اذن الله لكن أن تخرجن لحوائجكن" (مسلم) (اللہ نے تم کو اپنی ضروریات کے لئے باہر نکلنے کی اجازت دی ہے)۔

عورتوں کو گھر سے نکلنے کی اجازت چند شرائط کے ساتھ دی گئی ہے جو حسب ذیل ہے:

۱۔ غیر جاذب نظر و کیفیت وہیئت کے ساتھ نکلے اس طرح کہ خوشبو کا استعمال نہ کیا گیا ہو، کپڑا، برقع وغیرہ ایسا ہو جس سے مردوں کے لئے اس میں کشش کا سامان نہ ہو (الموسوعۃ الفقہیہ ۱۹/۱۰۸)۔

۲۔ راستہ اور محل کسب پر امن ہو۔

۳۔ ملازمت اور کسب معاش کی جگہ مردوں سے خالی یعنی اختلاط رجال نہ پایا جائے (حوالہ مذکورہ)۔

۴۔ مسافت سفر کے برابر اگر ملازمت یا کسب معاش کے لئے جانا پڑے تو محرم کا ساتھ ہو۔

۵۔ اگر شادی شدہ ہو تو شوہر کی اجازت اور غیر شادی شدہ ہو تو والدین یا اولیاء کی اجازت ضروری ہے، خواہ مسافت قصر کے برابر دوری کے لئے نکلے یا اس سے کم اجازت ہر حال میں ضروری ہے (کتاب احکام النساء/۲۰۹)۔

مولانا محمد تقی عثمانی ابن قدامہ کے حوالے سے اپنی رائے یہی ظاہر کرتے ہیں:

"ہاں! اگر عورت ایسی ہے جس کا نہ تو شوہر ہے اور نہ باپ ہے اور نہ دوسرا کوئی ایسا رشتہ دار جو اس کی معاشی کفالت کر سکے اور نہ خود اس عورت کے پاس اتنا مال ہے جس کے ذریعہ وہ اپنی ضروریات پوری کر سکے اس صورت میں اس عورت کے لئے بقدر ضرورت کسب معاش کے لئے شرعی پردہ کی پابندی کے ساتھ گھر سے باہر نکلنا جائز ہے" (فقہی مقالات ۱/۲۴۹)۔

تقریباً تمام فقہاء کرام لزوم پردہ اور عدم اختلاط رجال کی شرط لگاتے ہیں، اگر ان چیزوں میں ذرا بھی کمی ہو تو پھر عورتوں کے لئے خروج درست نہ ہوگا (الموسوعۃ الفقہیہ ۳۴/۲۳۵)۔

پریشان حال عورتوں کے لئے سب سے بہتر یہ ہے کہ وہ گھر ہی میں کسب معاش کا کوئی طریقہ اختیار کریں، عورت اگر پڑھی ہوئی ہو تو بچوں کو ٹیوشن پڑھائے، ناخواندہ ہے یا ٹیوشن نہیں پڑھا سکتی تو کوئی چھوٹا کام کرے، اور اگر گھر میں گنجائش نہ ہو تو ایسے آفس، فیکٹری وغیرہ میں کام کرے جہاں کارندہ صرف عورتیں ہی ہوں، بلاشبہ عورتوں کے رہنے سے فتنہ کم ہو جاتا ہے۔ اور اگر دونوں ہوں تو فتنے کے سبب ملازمت جائز نہ ہوگی۔

ملازمت کی غرض سے عورت کا اپنے گھر اور اپنے وطن سے اور کسی ملک یا کسی ریاست میں مستقل قیام جبکہ اس کے ساتھ شوہر یا کوئی محرم نہ ہو جائز نہیں، جب مسافت سفر کے برابر تنہا ان کے لئے خروج جائز نہیں تو یہ بدرجہ اولی جائز نہیں ہوگا۔

"بخلاف ما اذا كان بينها و بين مكة اقل من ثلثة أيام، لأنه يباح لها الخروج إلى مادون السفر بغير محرم" (فتح القدير ۲/۴۲۷)۔

مولانا تقی عثمانی لکھتے ہیں:

ایک مسلمان عورت کے لئے حصول معاش کے لئے یا حصول تعلیم کے لئے محرم کے بغیر تنہا غیر مسلم ممالک کا سفر کرنا جائز نہیں، اسی طرح قیام کرنا بھی جائز نہیں، ہاں اگر کسی عورت نے محرم کے ساتھ کسی غیر مسلم ملک کا سفر کیا اور وہاں رہائش پذیر ہو کر اس کو اپنا وطن بنا لیا پھر یا تو اس عورت کے محرم کا وہاں انتقال ہو گیا یا کسی وجہ سے وہ محرم وہاں سے سفر کر کے کسی اور جگہ چلا گیا اور عورت وہاں تنہا رہ گئی اس صورت میں اس عورت کے لئے وہاں تنہا قیام کرنے میں کوئی حرج نہیں، بشرطیکہ وہ عورت وہاں رہ کر شرعی پردہ کی پابندی کرے (فقہی

مقالات ۱/ ۲۴۹)۔

واضح رہے کہ ملازمت کے باب میں یا بغیر محرم کے تنہا سفر کرنے یا کہیں مستقل قیام کرنے کے سلسلے میں سن رسیدہ خواتین اور جوان عورتیں برابر ہیں۔

''وأجمعوا علی أن العجوز لا تسافر بغیر محرم ولا تخلو برجل شابا کان أو شیخا'' (فتاوی قاضی خان ۱،۱۸۷)۔

ظاہری بات ہے کہ تنہا سفر، تنہا قیام یا ملازمت کے لئے آمد ورفت اور آفس میں کسب معاش کی کوشش ایسی عورتیں ہی کرسکتی ہیں جن میں نسوانیت ابھی موجود ہے، صحت وطاقت ہو اور ایسی عورتیں محل فتنہ ہیں اور اصل چیز حلت وحرمت میں فاصل فتنہ ہے ورنہ بالکل بوڑھی عورت جس کی طرف کسی کا میلان نہ ہوتا ہو اس کے لئے جواز معلوم ہوتا ہے۔

''أما العجوز التی لا تشتہی فلا بأس بمصافحتہا ومس یدہا إذا أمن ومتی جاز المس جاز سفرہ بہا ویخلو إذا أمن علیہ وعلیہا وإلالا'' (شامی ۵،۲۶۲)۔

خلاصہ بحث:

۱۔ شریعت اسلامی نے عورتوں کو بلاضرورت شدیدہ کسب معاش سے علاحدہ رہنے کی ہدایت دی ہے۔

۲۔ شوہر یا ولی نہ ہو یا نان ونفقہ کے انتظام کی کوئی شکل نہ ہو تو خود اپنا اور بچوں کا نفقہ عورت پر واجب ہے۔

۳۔ محض معیار زندگی کو بلند کرنے کی غرض سے سات شرائط کے ساتھ عورتوں کے لئے کسب معاش مباح ہے، اور اگر نیت صدقہ، خیرات، مواساۃ وغیرہ ہے تو احقر کی رائے میں مستحسن ہے۔

۴۔ اندرون خانہ معاشی سرگرمیوں سے اگر شوہر یا ولی کا کوئی حق مارا جاتا ہو یا وہ کام ان کے لئے عار کا سبب ہو تو اجازت ضروری ہوگی ورنہ نہیں۔

۵۔ عورت کا کسب معاش کے لئے خروج کی صورت میں شوہر یا ولی سے بہر حال اجازت ضروری ہوگی، ہاں اگر عورت کے نفقہ کی کوئی شکل نہیں اور ولی عناداً اجازت بھی نہ دے تو اجازت ضروری نہ ہوگی۔

۶۔ خواتین کے لئے ملازمت کے سلسلہ میں حدود بیان کردیئے گئے ہیں۔

۷۔ جہاں صرف خواتین ہی کام کریں، ادارہ کے ذمہ دار مرد ہوں مگر اس سے اختلاط نہ ہو تو ملازمت درست ہے، ذمہ دار سے پردہ یہاں بھی واجب ہوگا کہ فتنہ کی گنجائش برقرار ہے۔

۸۔ جہاں مرد حضرات بھی کارندہ ہوں وہاں عورتوں کے لئے ملازمت درست نہیں، مکمل حجاب ان سے ضروری ہوگا، جوان اور سن رسیدہ میں شدت اور عدم شدت کا فرق ہوگا اور بس۔

۹۔ اختلاط رجال حرمت کی اصل علت ہے، وہ آفس ہو یا عام دکان، تاہم جتنا زیادہ احتمال فتنے کا ہوگا اسی قدر انسداد لازم ہے کے اعتبار سے یہاں بھی شدت اور عدم شدت کا فرق ہوگا۔

۱۰۔ ملازمت کی غرض سے گھر سے دور کسی جگہ مستقل قیام تنہا جائز نہیں ہے۔

☆☆☆

خواتین کی ملازمت

مولانا شمس الدین مظاہری[1]

۱۔ اسلامی اصول وقواعد کی رو سے عورتوں کا نان ونفقہ اور جملہ ضروریات کی تکمیل مردوں پر ہے، گھر کی حفاظت، بچوں کی پرورش اور تربیت عورت کا دائرہ کار ہے، لہذا عورتوں کو نہ کسب معاش کی ضرورت ہے اور نہ ہی اس بوجھ کی وہ ذمہ دار ہے، تاہم اگر عورت کا شوہر یا ولی اپنی ذمہ داری کو نبھانے یا کسی بھی وجہ سے عورت کسب معاش پر مجبور ہو تو مجبوری اور اضطراری کی حالت میں حدود شرع میں رہ کر عورت کے لئے کسب معاش کی گنجائش ہے۔

''لا یکلف اللہ نفسا إلا وسعها''۔

۲۔ شریعت نے نان ونفقہ کی ذمہ داری مردوں پر رکھی ہے، عورت پر عام حالات میں نہ اپنے کی ذمہ داری ہے اور نہ دوسرے کے نفقہ کی۔

''نفقة أولاد الصغار والأناث المعسرات علی الأب'' (ھندیہ ۱،۵۶۰، خانیہ ۱،۴۲۵)۔

''فتجب علی الرجل نفقة امراته المسلمة والذمية والفقيرة والغنية دخل بها أولم يدخل'' (فتاوی قاضی خاں ۱،۴۲۴)۔

اگر عورت مستطیع ہے اور اس کا نفقہ کسی دوسرے پر شرعاً واجب نہیں تو اس صورت میں اس کا نفقہ خود اس کے ذمہ ہوگا۔

''لو استغنت الأنثی بنحو خیاطة وغزل فتجب أن تکون نفقتها فی کسبها کما هو ظاهر'' (ردالمحتار ۵،۲۶۸)

۳۔ محض معیار زندگی بلند کرنے اور اثاثہ پیدا کرنے کی غرض سے مغربی معاشرہ کی پیروی میں عورتوں کا معاشی جدوجہد اختیار کرنا اور شرعی حدود کو توڑ کر اپنی عفت وعصمت کو بھینٹ چڑھانا افسوس ناک اور نا قابل تلافی جرم ہے، خصوصاً جبکہ صبر وشکر کے ساتھ گزر اوقات ہو جاتا ہو تو اس پر اولیاء اور ازواج کو شرم آنی چاہئے۔

''له أن یمنعها فی الأعمال کلها المقتضیة للکسب، لأنها مستغنیة عنه'' (شامی ۵،۲۵۸)۔

۴۔ اندرون خانہ معاشی سرگرمیوں کے لئے بھی ولی یا شوہر سے اجازت لینا ضروری ہے، اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

''الرجال قوامون علی النساء بما فضل اللہ بعضهم علی بعض وبما أنفقوا من أموالهم'' (سورۂ نساء: ۳۴)۔

لہذا عورت کو ہر حال میں مرد کی نگہبانی میں رہنا ضروری ہے، نیز عورت ناقص العقل ہونے کی وجہ سے ہوسکتا ہے کہ غیر مناسب سرگرمیوں میں مشغول ہو جائے اور اس کو اس کا اندازہ تک نہ ہو اگر ولی یا شوہر سے اجازت لے گی تو وہ اس کا صحیح ادراک کر سکتا ہے، نیز شوہر کی اجازت کے بغیر معاشی جدوجہد خواہ اندرون خانہ ہی کیوں نہ ہو ممنوع اقتباس ہے اس سے حق الزوج متاثر ہوسکتا ہے، اسی وجہ سے فقہاء نے نفل روزہ، نفل نماز کے لئے بھی اذن زوج کو ضروری قرار دیا ہے۔

''لا تطوع للصلوة والصوم بغیر إذن الزوج'' (ردالمحتار ۵،۲۵۸)۔

---

[1] شیخ الحدیث جامعہ اسلامیہ جلالیہ، ہوجائی، نوگاؤں، آسام۔

نیز کاروباری سلسلہ میں ایسے لوگوں سے واسطہ یا رابطہ کرنا پڑ سکتا ہے جن سے رابطہ کو شوہر یا ولی پسند نہ کرتے ہوں اور یہ عورت کے لئے جائز نہیں۔

''قال النبی ﷺ ولا تأذن فی بیوتکم لاحد تکرھونہ'' (ابوداؤد شریف بحوالہ بدائع ۲،۳۱۷)۔

۵۔ شوہر اور ولی کے ہوتے ہوئے عورت کو کسب معاش کے لئے نکلنے کی نوبت ہی نہیں آنی چاہئے، ہاں اگر شوہر یا ولی کے معذور یا مفقود ہونے کی بنا پر عورت کسب معاش کے لئے مجبور ہو جائے اور اندرون خانہ کوئی نظم نہ ہونے کی وجہ سے عورت کو گھر سے نکلنا ہی پڑے تو اس کے لئے شوہر یا ولی کی اجازت مطلقاً لازم ہوگی، خواہ نکلنا مسافت سفر سے زیادہ کے لئے ہو یا کم کے لئے دن کے وقت ہو یا رات کے وقت۔

''قالوا لیس للمرأۃ أن تخرج بغیر إذن الزوج إلا بأسباب متعددۃ منھا إذا کانت فی منزل یخاف السقوط علیھا، ومنھا الخروج إلی مجلس العلم إذا وقعت لھا نازلۃ، ولم یکن الزوج فقیھاً، ومنھا الخروج إلی حج الفرض إذا وجدت محرما۔ومنھا الخروج إلی زیارۃ الوالدین'' (خانیہ ۱،۴۴۳)۔

البتہ اگر ایک دن یا اس سے زیادہ ہو تو شوہر کی اجازت کے ساتھ عورت کے ہمراہ کسی معتمد محرم کا ہونا ضروری ہے۔

''وروی عن أبی حنیفۃ وابی یوسف کراھیۃ الخروج لھا مسیرۃ یوم بلا محرم فینبغی أن تکون الفتوی علیہ لفساد الزمان'' (البحر الرائق ۲،۳۳۹)۔

۶۔ اگر کا بل شوہر سے مقدمہ کے ذریعہ بھی نفقہ حاصل کرنا عورت کے لئے ممکن نہ ہو یا شوہر کے معذور یا مفقود ہونے کی وجہ سے عورت کسب معاش کے لئے مجبور ہو تو اس کو کسب معاش کی شرط کے ساتھ اجازت ہوگی کہ ذریعہ معاش جائز اور حلال ہو بقدر ضرورت اسے حاصل کیا جائے۔

۷۔ غیر محرم مردوں سے پردہ لازم ہے اتنا پردہ یہاں بھی ضروری ہوگا، اس لئے کہ خواتین غیر مسلم بھی ہو سکتی ہیں، اور غیر مسلم عورتیں غیر محرم مردوں کے حکم میں ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ دونوں صورتوں میں حتی الامکان پورا بدن ڈھانکنا چہرہ پر گھونگھٹ یا برقع ہو اور آنکھوں میں شرم وحیا اور دل میں خوف خدا ہو، البتہ سن رسیدہ عورتیں چہرہ کھول سکتی ہیں، لیکن اظہار زینت کی اجازت کسی کو نہیں ہوگی۔

۸۔ یقیناً فرق ہوگا بایں طور کہ شکل اول یعنی دکان میں سیلز گرل ہو (متبادل موجود ہونے کی وجہ سے) ناجائز اور حرام ہوگا، کیونکہ عورت کو سیلز گرل بنانے کا مقصود ہی عموماً اس کی کشش اور اداؤں کے ذریعہ زیادہ سے زیادہ گراہکوں کو مائل کرنا ہوتا ہے۔اور صورت ثانی بدرجہ مجبوری جائز ہوگا بشرائط مذکورہ۔

۹۔ اگر یہ قیام شوہر یا کسی معتمد محرم کے بغیر ہو تو ناجائز اور حرام ہوگا۔ایک شریف عورت کا اپنے گھر سے مستقل دور رہنا ضرر ہے۔

☆☆☆

خواتین کی ملازمت

مولانا صبیح اختر[1]

اسلام سے قبل عورت معاشرہ میں ایک اچھوت شئ سمجھی جاتی تھی، بچیوں کا زندہ درگور کرنا، جوان عورتوں کی عصمت دری، بیواؤں کی عدت وغیرہ میں انسانیت اور اس کے علاوہ دیگر غیر انسانی برتاؤ عورتوں کے ساتھ ہوتے رہے، اہل ہنود میں قریب زمانہ تک ستی کا رواج، اسلام نے اس صنف نازک کے ساتھ احسان عظیم کیا، بچیوں کی پرورش پر جنت کی بشارت سنا کر ماں باپ کو خوش دلی کے ساتھ بچیوں کی پرورش پر آمادہ کیا، جوان ہونے پر ان کی شادی بیاہ کی پوری ذمہ داری اولیاء پر رکھی، بیوی بن جانے پر شوہر سے کہا گیا "خیر کم خیر کم لأھلہ" اور ان کا مکمل نان ونفقہ شوہر کے ذمہ کیا گیا، مزید برآں مہر کے ذریعہ ان کی عزت افزائی کی گئی، ماں بننے پر اولاد سے کہا گیا کہ ان کے پیروں کے تلے تمہاری جنت ہے۔

الغرض اسلام نے اس صنف نازک کی عصمت وعفت کی حفاظت سے لے کر نان ونفقہ تک کے جملہ امور کی انجام دہی کے لئے مردوں کو ذمہ دار بنایا، بلکہ مختلف انداز سے ترغیب دے کر خوشدلی کے ساتھ اس صنف نازک کے ہر مسئلہ کے انجام دہی کے لئے مردوں کو اس طرح امادہ اور تیار کر دیا کہ ہر مومن مرد، عورت کے نان ونفقہ سے لے کر جملہ امور کا خیال اپنی ذات پر آج بھی مقدم سمجھتا ہے۔

۱۔ خواتین کے لئے کسب معاش کی چنداں ضرورت ہی نہیں کہ اس کا نفقہ شوہر یا ولی کے ذمہ ہے۔

''فتجب علی الرجل نفقة امرأة المسلمة والذمية والفقيرة والغنية دخل بها أو لم يدخل'' (فتاوی قاضی خاں ۱،۴۲۲، العالمگیری ۱،۵۴۴)۔

تاہم اگر کبھی ایسی مجبوری اور اضطراری صورت حال بن جائے کہ عورت شوہر والی نہ ہو اور نہ ہی اس کا کوئی ولی یا کفیل ہو اور کسب معاش کے لئے مجبور ومضطر ہو جائے تو شرعی حدود میں رہ کر باعزت پیشہ اختیار کرنے کی گنجائش ہوگی۔

''لا یکلف اللہ نفسا إلا وسعها'' (بقرہ:۲۸۶)۔

۲۔ اگر عورت صاحب استطاعت ہے اور اس کا نفقہ شرعاً کسی دوسرے پر واجب بھی نہیں ہے تو ایسی صورت میں اس کا نفقہ خود اس کے ذمہ ہوگا، یہی حال بچوں کا ہے کہ اگر ماں غریب ہے اور ماں سے مقدم کوئی اہل قرابت نہیں ہے، جن کے ذمہ نان ونفقہ واجب ہو تو ماں پر نفقہ واجب ہوگا، بشرطیکہ وہ بچے غریب ہوں۔

''لو استغنت الأنثی بنحو خياطة وغزل فتجب أن تكون نفقتها في كسبها كما هو ظاهر'' (رد المحتار ۵،۳۶۸)۔

۳۔ اللہ تبارک وتعالی نے معاشی جدوجہد کی مکمل ذمہ داری مردوں پر رکھی ہے، عورت کا دائرہ کار اور جدوجہد کا میدان اس کا گھر ہے، اور یہ مسئلہ اتنا واضح اور فطری ہے کہ اس کے لئے کسی دلیل کی ضرورت نہیں، لہذا عورت کے نحیف کندھوں پر معیار زندگی کو بلند کرنے یا سرمایہ واثاثہ پیدا کرنے کی ذمہ داری رکھنا عورت پر بہت بڑا ظلم ہے اور شرعی حدود کو توڑ کر اور اپنی عفت کو قربان کر کے خود عورت کا اس میدان میں اترنا اپنی

---

[1] خادم حدیث جامعہ جلالیہ ہوجائی، آسام۔

ذات پر ظلم کرنا ہے۔

۴۔ ولی یا شوہر کی موجودگی میں خواتین کو کسب معاش کی اول تو ضرورت ہی نہیں، تاہم اگر حدود شرعی میں رہ کر اندرون خانہ ہی کوئی معاشی جدو جہد اختیار کرنا چاہتی ہے تو ولی یا شوہر سے اجازت لینا ضروری ہے، اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ عورت کا مرد کی نگہبانی میں رہنا ضروری ہے، اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

''الرجال قوامون على النساء بما فضل الله بعضهم على بعض وبما أنفقوا من أموالهم'' (سورۂ نساء: ۳۴)۔

دوسرا یہ کہ عورتیں ناقصات العقل ہوتی ہیں، جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

لہذا عورت نے جس معاشی جدو جہد کو اختیار کیا ہے وہ کس حد تک مناسب ہے اس کو شوہر اور ولی ہی صحیح سمجھ سکتا ہے، نیز شوہر پر نان ونفقہ احتباس کی وجہ سے ہے اور شوہر کی اجازت کے بغیر معاشی جدو جہد خواہ اندرون خانہ ہی کیوں نہ ہو مخل احتباس ہے۔

نیز حق الزوج کے متاثر ہونے کی وجہ سے جب اندرون خانہ عبادات نفلیہ کے لئے اجازت کی ضرورت ہے تو معاشی سرگرمیوں کے لئے اجازت بدرجہ اولی ضروری ہوگی۔

''ولا تطوع للصلاة والصوم بغير إذن الزوج'' (شامی ۵.۴۵۸)۔

۵۔ مذکورہ تمام صورتوں میں شوہر یا ولی سے اجازت لینا ضروری ہے، ''ليس للمرأة أن تخرج بغير إذن الزوج'' (خانیہ ۱.۴۴۳)۔

۶۔ اولاً خواتین کو ملازمت کی ضرورت نہیں ہے، تاہم اگر مجبوری کی وجہ سے ملازمت کرنی پڑے تو شوہر یا ولی کی اجازت اور نگرانی میں شرعی پردہ کے ساتھ کوئی باعزت ملازمت کرنے کی گنجائش ہوگی۔

۷،۸۔ پردہ تو ہر ایک کے لئے بہر صورت لازم ہے، البتہ سن رسیدہ خواتین چہرہ کھول سکتی ہیں، بشرطیکہ فتنہ کا اندیشہ نہ ہو۔

''والقواعد من النساء اللاتي لا يرجون نكاحا فليس عليهن جناح أن يضعن ثيابهن غير متبرجات بزينة'' (النور: ۶۰)۔

۹۔ دونوں میں فرق واضح ہے، پہلی صورت میں مقصود ہی عورتوں کی کشش اور اداؤں کے ذریعہ سے زیادہ سے زیادہ خریداروں کو مائل کرنا ہوتا ہے، جو سراسر بے حیائی اور بے شرمی کی بات ہے۔

''وقرن في بيوتكن ولا تبرجن تبرج الجاهلية الأولى'' (احزاب: ۳۳)۔

اور صورت ثانیہ میں بشرط مجبوری وحدود شرعی گنجائش ہوگی۔

۱۰۔ شوہر اور محرم کے بغیر عورت کا تنہا مستقل قیام خواہ اندرون ملک ہو یا بیرون ملک، حرام اور ناجائز ہے۔

☆☆☆

خواتین کی ملازمت

مولانا محمد ذکاء اللہ شبلی، اندور

۱،۲۔ اللہ تعالی نے عورتوں کے معاش کی ذمہ داری مردوں پر عائد فرمائی ہے، ارشاد باری ہے:

"وعلی المولود له رزقهن و کسوتهن بالمعروف" (سورۂ بقرہ: ۲۳۳)

اور فرمایا: "ولينفق ذو سعة من سعته ومن قدر عليه رزقه فليفق مما أتاه الله" (سورۂ طلاق: ۷)۔

اور عورتوں کو حکم دیا گیا: "وقرن في بيوتكن" (سورۂ احزاب: ۳۳) (کہ وہ اپنے گھروں میں رہیں)۔

البتہ خواتین شوہر کی اجازت وخوشی سے حیاء و پردہ کا لحاظ کر کے گھر یا محفوظ مقام پر کام کر سکتی ہیں، اس طرح کہ بیع مضاربت ہو، یا گھر میں سامان رکھ کر فروخت کریں بایں شرط کہ شوہر سے متعلق ذمہ داریوں کو پوار کرنے میں نہ نقص ہو اور نہ تسلیم نفس میں رکاوٹ۔

آج کل مردوزن کے اختلاط نے جن برائیوں اور فحاشیوں کو جنم دیا ہے، وہ اظہر من الشمس ہیں، ان حالات میں اگر شوہر کی اجازت ہو یا خود شوہر خواہش ظاہر کرے کہ ملازمت کرلو تو بھی ایک شریف مومنہ کے لئے ملازمت جائز نہ ہوگی، بلکہ ایسی عورت کو یہ حق ہوگا کہ وہ شوہر سے مناسب نفقہ وکسوہ کا مطالبہ کرے اور شوہر پر انتظام لازم ہوگا۔

۳۔ اپنی فانی شان وشوکت اور ٹھاٹ باٹ کے حفظ وبقا کا رجحان مغربی تہذیب کی دین ہے، العیاذ باللہ آج اس کو بھی معیار زندگی تصور کیا جانے لگا ہے، اس نظریہ وخیال سے معیشت کی راہ اختیار کرنا قطعاً درست نہیں۔

۴۔ گھر میں رہ کر بھی حصول زر کی کسی بھی نوعیت کے کام کو اختیار کرنے میں شوہر کی اجازت ضروری ہوگی۔

۵۔ اگر شوہر یا ولی کی جسمانی حالت اچھی نہ ہو یا وہ کفالت نہ کرتا ہو تو مجبوراً عورت معاش کے لئے نکل سکتی ہے، لیکن اس کے لئے اتنی دور جانا جائز نہ ہوگا کہ وہ حد مسافت میں آئے۔

۶۔ شوہر یا ولی کی اجازت سے جبکہ عسر کی حالت میں ہو شرعی حدود وقیود کا لحاظ رکھتے ہوئے ملازمت کر سکتی ہے۔

بایں شرط کہ:

مسافت سفر مسافت شرعی سے کم ہو۔

اگر مسافت شرعی کے برابر یا زیادہ ہو تو محرم کے ساتھ آنا جانا ضرورہ ہوگا۔

ڈیوٹی کے درمیان غیر محرم کے ساتھ تنہائی نہ ہو خواہ چند ہی منٹوں کے لئے ہو۔

چند خواتین کے درمیان ہو۔

البتہ اگر کوئی عورت انتہائی بوڑھی ہو یا جس کے چہرہ پر نظر پڑنے سے شر وفتنہ کا اندیشہ نہ ہو تو وہ بے حجاب بھی کام کر سکتی ہے۔

حسین قامت اور جوان عمر خواتین کا اپنوں سے دور رہ کر ملازمت کرنا خواہ اندرون ملک ہو یا بیرون ملک، سخت فتنہ ومعاصی میں مبتلا ہونے کے خطرہ کے تحت درست وجائز نہیں۔

☆☆☆

خواتین کی ملازمت

مفتی عبدالرشید قاسمی [1]

۱۔ شریعت اسلامی خواتین کے لئے کسب معاش کی حوصلہ افزائی نہیں کرتی اور گھر سے باہر نکل کر ملازمت کرنے کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتی، تا کہ وہ گھریلو ذمہ داریوں کو بہتر طور پر انجام دے سکیں، اور ان پر دوگنا بوجھ نہ ہو۔

۲۔ شریعت نے خواتین پر نان ونفقہ کی ذمہ داری نہیں رکھی، نہ اپنی اور نہ ہی اپنے بچوں کی، یعنی وہ کما کر نفقہ ادا کرنے کی مکلف نہیں ہیں، البتہ اگر ان کے پاس مال موجود ہو تو بعض شکلوں میں اپنا اور دوسرے اعزاء واقرباء کا نفقہ ان کے ذمہ ہوگا، جس کی تفصیل فقہ کی کتابوں میں مذکور ہے۔

۳۔ معیار زندگی بلند کرنے، یا سرمایہ اور اثاثہ پیدا کرنے کی غرض سے خواتین شرعی حدود میں رہ کر معاشی جدوجہد اختیار کرنے کی اجازت ہے۔

۴۔ اندرون خانہ کسب معاش کے لئے شوہر یا ولی کی اجازت لینا ضروری نہیں بشرطیکہ وہ کوئی ایسا کام نہ کریں جس سے ان کی جسمانی صحت، حسن و جمال متاثر ہو، شوہر اور ولی کے لئے باعث ننگ وعار ہو یا ان کے حقوق کی ادائیگی میں کوتاہی کا سبب بنے۔

۵۔ عورت کو کسب معاش کے لئے گھر سے باہر نکلنے میں بہرحال شوہر یا ولی کی اجازت ضروری ہوگی، اور اگر ولی کفالت کرتا ہے تب تو اسے روکنے کا پورا اختیار ہے اور اگر ولی کفالت نہیں کرتا اور عورت کے لئے بغیر باہر نکلے کوئی اور ذریعہ معاش بھی نہیں ہے تو جائز کسب معاش کے لئے بدون اجازت ولی مجبوراً عورت گھر سے باہر نکلے گی اور ایسی صورت میں ولی اسے باہر نکلنے سے روک نہیں سکتا، البتہ یہ نکلنا مسافت سفر سے کم کے لئے ہو کیونکہ مسافت سفر اور زیادہ کی صورت میں محرم یا شوہر کا ہونا ضروری ہے، اور اس صورت میں اس میں مسئلہ کا تعلق ''عورت کا تنہا سفر کے لئے نکلنے اور نہ نکلنے سے'' ہوگا۔

دن کی بنسبت رات فتنوں سے بھری ہوتی ہے، لہذا معتدۃ العرفات پر قیاس کرتے ہوئے رات کے کچھ حصے میں نکل سکتی ہے۔

۶۔ خواتین کے لئے ملازمت کے شرعی حدود یہ ہیں کہ وہ ملازمت کی جائز شکلوں میں پردہ میں رہ کر ملازمت کریں، نیز مردوں سے اختلاط بھی نہ ہو کیونکہ ملازمت کی کسی بھی صورت میں بے حجاب ہونا یا مردوں سے اختلاط کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

۷۔ خواتین کا ایسے اداروں میں کام کرنا جہاں کام کی جگہ پر صرف خواتین ہوں اور مرد ذمہ دار ہوں، ذمہ دار مردوں سے پردہ کے ساتھ ہی گفتگو ہوگی، اس موقع پر پردہ کے مسئلہ میں کوئی تخفیف نہ ہوگی، نیز خلوت بھی نہ ہونے پائے۔

۸۔ عورت کا ایسی جگہ کام کرنا جہاں مرد کارکن بھی ہوں، پردے کے ساتھ کام کرنا ممکن نہیں ہے، نیز اختلاط بھی ہوگا لہذا ایسی جگہ کام کرنا جائز نہ ہوگا البتہ بوڑھی عورت کے لئے گنجائش ہوگی۔

۹۔ ناجائز ملازمتوں میں قدر مشترک عدم جواز کے باوجود ان میں آپس میں فرق ہوسکتا ہے، لہذا جس ملازمت میں جتنی زیادہ بے پردگی اور شریعت کی خلاف ورزی ہوگی، قباحت اور حرمت اتنی ہی شدید ہوتی چلی جائے گی۔

۱۰۔ عورت کا ملازمت کے لئے گھر سے باہر نکلنے کی جو بھی حدود وشرائط بیان کی گئیں ہیں وہ درحقیقت مسافت سفر کے اندر اندر کے بارے میں تھیں، رہا مسافت سفر یا اس سے زیادہ کے لئے تنہا نکلنا اور مستقل تنہا قیام کرنا تو اس کی قطعاً گنجائش نہیں ہے (خواہ اندرون ملک ہو یا بیرون ملک) کیونکہ یہ ان تمام روایتوں کے خلاف عمل ہوگا جن میں عورت کو اتنی دور تنہا جانے سے روکا گیا ہے، اور سفر کی بنسبت تنہا قیام کرنے میں فتنے اور مفاسد زیادہ ہیں، لہذا یہ بطریق اولی ناجائز ہوگا۔ ☆☆☆

[1] مدرسہ جامع العلوم کانپور۔

خواتین کی ملازمت

مولانا عبید اللہ ندوی [1]

اسلام کا سب سے بڑا اور اہم کارنامہ یہ ہے کہ اس نے عورتوں اور مردوں کے حقوق متعین کئے اور کچھ فطری اصول وضوابط کئے جو مردوں کے لئے بھی رحمت ہیں اور عورتوں کے لئے بھی، اور اسی میں خاندانی نظام کی بقاء واستحکام بھی ہے، چنانچہ مرد کو خاندان میں قوام کی حیثیت دی اس کو حاکم، محافظ اور اخلاق ومعاملات کا نگراں بنایا، اور اس پر خاندان کے لئے روزی کمانے اور ضروریات زندگی کی فراہمی کی ذمہ داری رکھی اور عورت کو گھر کی ملکہ بنایا تا کہ وہ امور خانہ داری کو انجام دے اور شوہر کے کمائے ہوئے مال سے گھر کا انتظام کرے، چنانچہ ارشاد نبوی ہے: ''المرأة راعية على بيت زوجها'' (بخاری کتاب النکاح باب قوا أنفسکم وأہلیکم نارا)، نیز عورت کو ایسے تمام فرائض وذمہ داریوں سے سبکدوش رکھا گیا جو بیرون خانہ امور سے تعلق رکھتے ہیں، مثلاً:

اس پر نماز جمعہ واجب نہیں (ابو داؤد باب الجمعة للمملوك والمرأة)، اس پر جہاد بھی فرض نہیں، اگر چہ بوقت ضرورت وہ مجاہدین کی خدمت کے لئے جاسکتی ہے جیسا کہ صحابیات ؓ بعض غزوات میں شرکت کیں، پیاسوں کو پانی پلایا، زخمیوں کی خدمت کی، وغیرہ۔ اس کے لئے نماز جنازہ میں بھی شرکت ضروری نہیں، بلکہ اس سے روکا گیا ہے، اس پر نماز باجماعت اور مسجدوں کی حاضری بھی لازم نہیں قرار دی گئی، اس کو بغیر محرم سفر کی اجازت بھی نہیں دی گئی اگر چہ وہ سفر عبادت کی غرض سے ہی کیوں نہ ہو۔

غرض ہر طریقہ سے عورت کا گھر سے نکلنا ناپسند کیا گیا اور اس کے لئے قانون اسلامی میں پسندیدہ صورت یہی ہے کہ وہ گھر میں رہے جیسا کہ ''وقرن في بيوتكن ولا تبرجن تبرج الجاهلية الأولى'' (سورۂ احزاب: ۳۳) سے ظاہر ہے، لیکن اس باب میں زیادہ سختی اس لئے نہیں کی جاسکتی کہ بعض حالات میں عورتوں کے لئے گھر سے نکلنا ضروری ہو جاتا ہے، خاص کر جب کوئی عورت بیوہ ہو یا مطلقہ یا اس کا شوہر بے روزگار اور کاہل ہو، یا شوہر کی آمدنی اخراجات کے لئے ناکافی ہو یا عورت کے بوڑھے ماں باپ یا چھوٹے چھوٹے بھائی بہن وغیرہ ہوں، تو اس وقت آبرومندانہ زندگی گذارنے کے لئے عورت کسب معاش پر مجبور ہو جاتی ہے، ایسی تمام صورتوں میں قانون میں کافی گنجائش ہے جیسا کہ احادیث سے معلوم ہوتا ہے (بخاری باب خروج النساء لحوائجهن، مسلم باب اباحة الخروج للنساء)، رہا سوال عورتوں کی ملازمت کے جواز وعدم جواز کا تو اس سلسلہ میں یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ عورتوں کی ملازمت کی کئی شکلیں ہوسکتی ہیں:

۱۔ اندرون خانہ ملازمت: مثلاً سلائی، کڑھائی، بنائی، کشیدہ کاری، کم سن بچوں اور بچیوں کی تعلیم وغیرہ تو اس طرح کے کام بلاشبہ جائز ہیں۔

۲۔ بیرون خانہ ملازمت: پھر اس کی بھی کئی شکلیں ہوں گی، ایسی جگہ ملازمت جہاں عورتیں ہی عورتیں ہوں، مردوں سے اختلاط نہ ہو، مثلاً زنانہ اسکول، زنانہ اسپتال، زنانہ فوجی تربیت وغیرہ تو بلاشبہ عورتوں کی ملازمت ایسی جگہوں پر جائز ہوگی اور اس حکم میں بھی سن رسیدہ خواتین اور نوجوان عورتیں برابر ہوں گی۔

ایسی جگہوں پر ملازمت جہاں عورتوں اور مردوں میں اختلاط ہو، تو ایسی جگہوں پر سن رسیدہ خواتین جو پردہ کے احکام سے مستثنی ہیں، ملازمت کرسکتی ہیں کیونکہ اس میں فتنہ کا اندیشہ نہیں ہے، البتہ نوجوان عورتوں کے لئے اگر کوئی شدید مجبوری نہیں ہے تو ایسی جگہوں کی ملازمت اختیار کرنا ہرگز جائز نہیں ہوگا، درج ذیل وجوہات کی بنا پر۔

---

[1] استاذ مدرسہ فلاح المسلمین، تیندوا، رائے بریلی۔

۱۔ شریعت نے نان ونفقہ کی ذمہ داری مرد پر رکھی ہے نہ کہ عورت پر جیسا کہ ''وعلی المولود لہ رزقہن وکسوتہن'' (سورۂ بقرہ: ۲۳۳) سے واضح ہے۔

۲۔ قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: ''المرأة عورة فإذا خرجت استشرفها الشيطان'' (ترمذی)۔

۳۔ ''وفي الدر المختار ''تمنع المرأة الشابة من كشف الوجه بين الرجال لا لإنه عورة بل لخوف الفتنة''

ملازمت اختیار کرنے کی صورت میں چہرہ ہروقت بند رکھنا مشکل ہے اور کھولنا فتنہ سے خالی نہیں ہے، لہذا بہتر یہ ہے کہ ملازمت نہ کرے۔

۴۔ عورت اگر اپنی اصلی جگہ چھوڑ کر کمانے کی تدبیروں میں پڑ کر گھر سے نکلے گی ملازمت اختیار کرے گی تو اس کو روحانی و مادی دونوں طرح کے نقصانات کا سامنا کرنا پڑے گا۔

۵۔ عورتوں کے مخصوص ایام میں کئی یوم کے ناغہ کی وجہ سے کام میں بڑا نقصان ہوگا، نیز ہر دوسرے تیسرے سال کئی ماہ اس پر ایسے آئیں گی کہ وہ خود دوسرے کی محتاج ہوگی، یعنی زمانہ حمل سے لے کر ولادت کے بعد کئی ماہ تک۔

۶۔ عورتوں کے دل میں یہ احساس پیدا ہوسکتا ہے کہ اگر بچے نہ ہوں تو شاید وہ زیادہ کام کر سکے گی تو پھر اس کے لئے وہ بڑے بڑے اقدام کرے گی، جس کی اجازت شریعت میں کسی صورت میں نہیں ہے۔

۷۔ ملازمت کے نتیجہ میں مردوں کے اوپر حاکمانہ ذہنیت، شوہروں کی نافرمانی جیسی غیر شرعی باتیں پیدا ہوں گی، جس کی وجہ سے طلاق کی کثرت ہوگی جس کا مشاہدہ روزمرہ کی زندگی میں ہوتا رہتا ہے۔

۸۔ ملازمت اختیار کرنے کی صورت میں اولاد کی تعلیم وتربیت (جو عورت کی اہم ذمہ داری ہے) پر کافی اثر پڑتا ہے ان میں آوارگی، تعلیم سے بے روی، اخلاقی گراوٹ اور دوسری نامناسب اور خلاف شرعی عادتوں کے پڑنے کا خطرہ ہے اور عموماً دیکھنے میں آیا ہے جو والدین بچوں سے دور رہتے ہیں ان کی اولادیں نکمی ناکارہ ہی رہتی ہیں، اور دیگر اخلاقی جرائم کا شکار ہوتی ہیں۔

۹۔ عورتوں کی ملازمت گھریلو زندگی پر زہریلا اثر ڈالتی ہے۔

۱۰۔ آپسی اختلاط کی وجہ سے نظر کا فتنہ شروع ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ شریعت نے "قل للمومنين يغضوا من أبصارهم" (سورۂ نور: ۳۰) کا حکم دیا، اور حدیث پاک میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ سے فرمایا: "لا تتبع النظرة النظرة"۔

جن علماء نے عورتوں کی ملازمت اور خروج من البیت کو جائز قرار دیا ہے تو انہوں نے عہد نبوی اور عہد صحابہ کے ان واقعات کو دلیل میں پیش کیا ہے جن میں صحابیات کے غزوات میں شریک ہونے، نمازوں میں مسجدوں میں حاضری کا ذکر ہے لیکن ان میں سے بیشتر واقعات نزول حجاب سے پہلے کے ہیں، اور اگر بعد کے بھی ہوں تو ان میں صراحت سے ملازمت کا تذکرہ نہیں ہے۔

البتہ اگر واقعی ضرورت ہو کہ بغیر ملازمت کے کام نہ چل سکتا ہو تو پھر مندرجہ ذیل شرائط کے ساتھ اجازت ہوگی، کیونکہ ''الضرورات تبیح المحظورات''۔

شرائط جواز:

عورت اور مرد بصر سے کام لیں، ایک دوسرے کی طرف شہوت کی نظر سے نہ دیکھیں، عورت پر لازم ہے کہ وہ ساتر لباس میں ہو، معاملہ کرتے وقت اسلامی آداب کا بھرپور خیال رکھے مثلاً گفتگو کا انداز شریفانہ ہو، چال ڈھال میں حیا اور وقار ہو، ہر اس چیز سے اجتناب کرے جس میں مردوں کے لئے کشش ہو، تنہائی میں کسی مرد کے ساتھ نہ بیٹھے، بلا ضرورت مردوں سے اختلاط نہ ہو وغیرہ۔

خلاصہ بحث:

۱۔ خواتین کے لئے کسب معاش شریعت اسلامی کی نظر میں بہت زیادہ پسندیدہ عمل نہیں ہے، البتہ بوقت ضرورت اجازت اور گنجائش ہے، اس لئے کہ نان ونفقہ کی ساری ذمہ داری مردوں پر ہے۔

۲۔ نان ونفقہ کی ذمہ داری شریعت نے مردوں پر رکھی ہے، نہ کہ عورتوں پر خواہ اپنا نفقہ ہو یا بچوں وغیرہ کا جیسا کہ "وعلی المولود له رزقهن وكسوتهن" (سورۂ بقرہ: ۲۳۳) سے ظاہر ہے۔

۳۔ اگر گھر کی مالی حالت ایسی ہے کہ تنگی وترشی سے کام چل سکتا ہے تو محض معیار زندگی بلند کرنے کے لئے معاشی جدوجہد بالکل درست نہیں، بلکہ اس سلسلہ میں مسلمانوں کو صحابہ وصحابیات کی زندگیوں کے نمونہ کو دیکھنا چاہئے۔

۴۔ اجازت تو بہر حال لازم ہے خواہ اندرون خانہ یا بیرون خانہ، کیونکہ جب بیوی کو نفلی نماز پڑھنے یا نفلی روزہ رکھنے کے لئے شوہر کی اجازت ضروری ہے تو دوسرے کام میں اجازت بدرجہ اولی ضروری ہوگی، نیز اس لئے بھی کہ بہت سے شوہر اپنی بیوی کی معاشی سرگرمیوں کو عیب اور ذلت سمجھتے ہیں۔

۵۔ اجازت ہر صورت میں ضروری ہوگی، اور اگر گھر سے نکلنا مسافت سفر یا اس سے زیادہ کے لئے ہو یا رات میں ہو اور ولی اس کی کفالت کرتا ہو تب اجازت واجب ہوگی۔

۶۔ خواتین کی ملازمت کے شرعی حدود وہ ہیں جن کا تذکرہ اوپر گذر چکا ہے۔

۷۔ وہاں پردہ کا کوئی مسئلہ ہی نہیں چونکہ عورتیں ہی عورتیں ہیں ہاں اتنی بات ضرور ہے کہ بدن کے جن اعضاء کا چھپانا عورتوں سے بھی لازم ہے اس کا پردہ ضروری ہوگا۔

۸۔ اگر عورت اتنی سن رسیدہ ہے کہ اس کی طرف نظر کرنے سے فتنہ کا اندیشہ نہیں تو اس پر پردہ لازم نہیں ہے، اگر پردہ کرے تو بہتر ہے، لیکن جوان عورتوں کے لئے مکمل بدن کا ڈھکا ہونا لازم ہے۔

۹۔ جی ہاں دونوں میں فرق ہوگا، جس کام کی انجام دہی میں مردوں کا سامنا زیادہ ہو تو عورت کو مکمل بدن ہر وقت ڈھکنا ضروری ہوگا سوائے ہتھیلی کے الا یہ کہ کوئی معمر خاتون ہو، اور جس کام میں مردوں سے اختلاط کم ہو تو مثلاً آفس میں یکسوئی سے کام کرنا تو اس پر پردہ ضروری نہیں، الا یہ کہ کسی کے آنے کا امکان ہو۔

۱۰۔ ملازمت کی غرض سے عورت کا اپنے گھر اور اپنوں سے دور مستقل قیام بالکل درست نہیں ہے، فتنہ سے مامون نہ ہونے کی وجہ سے، البتہ اگر شوہر یا ولی بھی ساتھ میں ہو یا کوئی محرم ہو تو کوئی حرج نہیں۔

☆☆☆

خواتین کی ملازمت

مولانا محمد یاسر اعظمی قاسمی[1]

۱۔ شریعت اسلامی نے خواتین کے لئے بلا کسی حاجت شدیدہ کے کسب معاش کو ناجائز قرار دیا ہے، کیونکہ اگر عورت شادی شدہ ہے تو اس کا نفقہ اس کے شوہر پر واجب ہے، اور اگر غیر شادی شدہ ہے تو اس کے اولیاء کے ذمہ اس کی کفالت واجب ہے، چنانچہ فتاوی شامی میں ہے:

''إلا إذا كان لا يكفيها فتجب على الأب كفايتها بدفع القدر المعجوز عنه'' (ردالمحتار على الدر ۵،۳۳۶)،

حتی کہ اگر شوہر غلام ہے اور بیوی کے نفقہ کی ادائیگی پر قادر نہیں ہے تو اس غلام کو بیچ کر اس کی قیمت سے اس کی بیوی کا نفقہ ادا کیا جائے گا، چنانچہ در اور رد میں ہے:

''فتجب للزوجة بنكاح صحيح على زوجها؛ لأنها جزاء الاحتباس قوله: على زوجها أي ولو عبدا حتى يباع في نفقتها'' (درمع الشامي ۵،۲۷۸، الموسوعه الفقهيه ۲،۳۸۲)۔

بیوی کے لئے نکاح صحیح کی وجہ سے اس کے شوہر پر نفقہ واجب ہوجاتا ہے، اس لئے کہ نفقہ محبوس رکھنے کا بدلہ ہے، ان کا قول علی زوجہا یعنی خواہ غلام ہو یہاں تک کہ بیوی کے نفقہ میں اسے بیچ دیا جائے گا۔

موسوعہ فقہیہ میں ہے:

''لا تكلف المرأة الاكتساب للانفاق على نفسها أو على غيرها وكون نفقتها إن كانت فقيرة واجبة على غيرها سواء كانت متزوجة أم ليست بذات زوج'' (موسوعه فقهيه ۶،۹۶)۔

یعنی عورت کو اپنے یا دوسرے کے نفقہ کے لئے کمانے کا مکلف نہیں بنایا جائے گا، اگر وہ تنگدست ہے تو اس کا نفقہ دوسرے پر واجب ہوگا، خواہ شادی شدہ ہو یا غیر شادی شدہ (البتہ شادی شدہ خواہ کتنی ہی مالدار ہو اس کا نفقہ اس کے شوہر پر واجب ہے بخلاف غیر شادی شدہ کے)۔

الغرض اولاً عورت پر کسب معاش کی ذمہ داری نہیں ہے، ثانیاً اگر عورت کسب معاش کے لئے نکلے گی تو اسے مفاسد کا سامنا کرنا پڑے گا، لہذا عام حالات میں عورت کے لئے کسب معاش کے لئے نکلنے کی گنجائش نہیں۔

۲۔ شریعت اسلامی نے عورتوں پر نان ونفقہ کی ذمہ داری نہیں رکھی ہے نہ اپنا نہ بچوں کا، بلکہ عورتوں کے نان ونفقہ کی ذمہ داری شوہر پر واجب ہے، اسی طرح نابالغ بچہ کا نفقہ بھی باپ کے ذمہ ہے، غیر شادی شدہ لڑکی جس کے پاس مال نہیں اور معذور بالغ بیٹے کا نفقہ بھی باپ پر واجب ہے، نیز بچوں کی دینی تعلیم کے سارے اخراجات باپ پر واجب ہیں، اور اگر لڑکا بالغ ہے یا مالدار ہے تو پھر اس صورت میں نفقہ باپ پر واجب نہیں ہے سوائے طالب اور معذور کے (دیکھئے: ہندیہ ۱؍ ۵۶۳)۔

۳۔ محض معیار زندگی بلند کرنے کے لئے یا وقت گزاری اور سرمایہ واثاثہ پیدا کرنے کی غرض سے عورتوں کا معاشی جدوجہد اختیار کرنا جب کہ گھر کی مالی حالت ایسی ہے کہ تنگی سے کام چل سکتا ہے تو یہ تمام صورتیں حاجت وضرورت شدیدہ کے اندر داخل نہیں، لہذا اس غرض سے عورت کا نکلنا جائز نہیں ہے (ردالمحتار علی الدر ۴؍ ۲۹۳ طبع زکریا)۔

---

[1] استاذ بیت العلوم، سرائے میر اعظم گڑھ۔

۴۔ عورت کے لئے کسب معاش علی الاطلاق ناجائز وحرام نہیں ہے، بلکہ گھر میں رہتے ہوئے کسب معاش کی اجازت ہے، بلکہ پسندیدہ اور بہتر ہے، لیکن اگر عورت کے کسب معاش سے شوہر کے حقوق میں کوتاہی ہوتی ہو تو ایسی صورت میں وہ روکنے کا مجاز ہے (دیکھئے: ردالمحتار علی الدر ۳۲۵/۵)۔

۵۔ عورت خواہ کسب معاش یا کسی اور ضرورت کے لئے نکلے، نکلنا دن میں ہو یا رات میں ہو یا مسافت سفر ہو یا اس سے کم بہر صورت بغیر ولی یا شوہر کی اجازت کے نکلنا جائز نہیں (ردالمحتار علی الدر ۳۲۵/۵)۔

اگر عورت کا ولی یا اس کا شوہر اس کی کفالت کرتا ہو تو پھر اس کے لئے نکلنا جائز نہیں، اور اگر کوئی کفالت کرنے والا نہ ہو تو بھی اس کے لئے بہتر ہے کہ گھر میں رہ کر کسی قسم کے معاشی کام میں لگ جائے اور اس سے اخراجات کا انتظام کرے، اگر یہ صورتیں ممکن نہ ہوں تو پھر بدرجہ مجبوری اس کے اقرباء پر اس کی کفالت واجب ہے، اور اگر یہ بھی ممکن نہیں تو پردہ اور دیگر شرعی حدود کی رعایت کرتے ہوئے نکلے اور کام سے فارغ ہو کر حدود شرعیہ کی رعایت کرتے ہوئے گھر واپس آجائے۔

۶۔ خواتین کے لئے اصل حکم قرار فی البیت ہے، مگر بدرجہ مجبوری شرعی حدود کی رعایت کرتے ہوئے ملازمت اختیار کرسکتی ہیں، باہر نکلنے کے چند شرعی حدود یہ ہیں:

• اجنبی مردوں کے ساتھ خلوت کی نوبت نہ آئے، اس کے خرچ کا اور کوئی بندوبست کرنے والا نہ ہو، اس کی ملازمت اللہ کی نافرمانی والے کاموں میں نہ ہو، جیسے گانا، اور مردوں کے سامنے رقص کرنا وغیرہ، اگر ان شرائط کی رعایت نہ پائی جائے تو ملازمت جائز نہیں (الفتاوی الشرعیہ ۴۰۱/۱۰، ۴۰۲)۔

۷۔ اگر خواتین ایسے اداروں میں کام کریں جہاں خواتین ہی خدمت انجام دیتی ہوں کام کی جگہوں میں مرد نہ ہوں تو وہاں اگر غیر مسلم عورتیں پائی جائیں تو ان سے ایسے ہی پردہ کریں جیسے اجنبی مرد سے درمختار میں ہے:

''والذمية كالرجل الأجنبي في الأصح فلا تنظر إلى بدن المسلمة'' (ردالمحتار ۹/ ۵۳۴ طبع زکریا)۔

نیز اگر کام کرنے والی فاسقہ وفاجرہ عورتوں سے بھی سامنا ہوتا ہو تو ان سے بھی ایسا ہی پردہ کریں جیسے مردوں سے اس لئے کہ فاسق وفاجر عورتوں کا دیکھنا مسلمان نیک عورت کی باعث فتنہ ہے، اس لئے کہ وہ جاکر مردوں سے ان کی خوبصورتی بیان کریں گی۔

اور اگر کبھی مردوں سے سامنا کی نوبت آئے تو ان سے بقدر ضرورت ہی گفتگو کریں اور مزید شرائط کی بھی پابندی ضروری ہے۔

۸۔ اگر عورت ایسی جگہ کام کرے جہاں مرد کارکن بھی موجود ہوں تو کئی ممنوعات کا ارتکاب ہوگا، بے پردگی ہوگی، نامحرم مردوں کے ساتھ اختلاط اور بعض موقع پر خلوت وتنہائی کا موقع بھی آسکتا ہے، بے تکلفانہ بات چیت، اور نامحرم مردوں کے ساتھ آمدورفت کا دروازہ بھی کھل سکتا ہے، نیز اس جیسے بہت سے مفاسد رونما ہوسکتے ہیں، اس لئے شرعا ایسی ملازمت کی کوئی گنجائش نہیں ہے اس لئے کہ جب عورتوں کو مسجد میں آنے سے روک دیا گیا، بغیر محرم کے سفر حج سے روک دیا گیا تو مردوں کے ساتھ ملازمت کی کیسے اجازت دی جاسکتی ہے، جوان اور عمر رسیدہ عورتوں کے درمیان کوئی فرق نہیں۔

۹۔ دونوں صورتوں میں خواہ عورت دوکان میں سیلز گرل کی حیثیت سے کام کرے یا آفس میں یکسوئی سے بیٹھ کر کام کرے چونکہ دونوں صورتوں میں مردوں کے ساتھ اختلاط اور خلوت ناگزیر ہے اس لئے اسلامی شریعت میں اس کی کوئی گنجائش نہیں۔

۱۰۔ ملازمت کی غرض سے یا کسی اور غرض سے عورت کا اندرون ملک یا بیرون ملک تنہا بغیر محرم کے قیام بہت سے مفاسد کا داعی ہے، جیسے اجنبی مردوں کا تاک جھانک کرنا ان کے ساتھ خلوت وتنہائی سے دوچار ہونا وغیرہ شریعت میں اس کی کوئی گنجائش نہیں۔

☆☆☆

ملازمت خواتین

مولانا عبد التواب اناوی[1]

شریعت مطہرہ نے عورت کی کفالت کی ذمہ داری شادی سے قبل اس کے والد پر اور شادی کے بعد اس کے شوہر پر ڈالی ہے، اس لئے عورت کو کسب معاش کے لئے کوشاں ہونا چہ معنی دارد، ہاں اگر کوئی عورت ایسی ہے جس کا نہ تو شوہر ہے، نہ باپ اور نہ کوئی دوسرا ایسا رشتہ دار ہے جو اس کی معاشی کفالت کر سکے اور نہ خود اس کے پاس اتنا مال ہے جس سے وہ اپنی ضروریات پوری کر سکے تو اس کے لئے بقدر ضرورت کسب معاش کی شرعی پردہ کی پابندی کے ساتھ اجازت ہے، خواہ وہ بحیثیت ملازمت ہو یا کسی اور سبب سے۔

''وفي البحر- ومعتدة الموت تخرج يوما وبعض الليل لتكتسب لأجل قيام المعيشة، لانه لا نفقة لها، حتى لو كان كفايتها صارت كالمطلقة فلا يحل لها أن تخرج لزيارة ولا لغيرها ليلا أو نهارا - والحاصل ان مدار الحل كون خروجها سبب قيام شغل المعيشة فيقتدر بقدره فمتى انقضت حاجتها لا يحل لها بعد ذلك صرف الزمان خارج بيتها'' (۴، ۲۸۵)۔

حضرت مولانا تھانویؒ لڑکیوں کی تعلیم کے سلسلہ میں فرماتے ہیں:

اگر ایسی استانی مل جائے جو تنخواہ نہ لے تو تجربہ سے یہ تعلیم زیادہ بابرکت اور بااثر ثابت ہوئی ہے، ورنہ بدرجہ مجبوری تنخواہ کا بھی مضائقہ نہیں، جہاں کوئی بھی ایسی استانی نہ ملے گھر کے مرد پڑھا دیا کریں (تجدید تعلیم وتبلیغ ر ۱۴۳)۔

حضرت مولانا مفتی محمودؒ لندن میں اسکولی بچیوں کو فیکٹری میں کام کرنے کی بابت استفتاء کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں:

بوقت حاجت شرعی حدود کی رعایت رکھتے ہوئے اجازت ہے (فتاوی محمودیہ ۱۹ر ۱۸۴)۔

نیز بیوی کی کمائی کے استعمال کی بابت استفتاء کے جواب میں فرماتے ہیں:

جائز کمائی خوشی سے دے تو جائز ہے مگر بیوی کی کمائی پر نظر رکھنا خلاف غیرت ہے (وی محمودیہ ۱۸ر ۹۴)۔

بخاری شریف کی حدیث ہے:

''قال عليه الصلوة والسلام لزوجه سودةؓ قد أذن الله لكن أن تخرجن لحوائجكن - رواه البخاري كتاب النكاح باب الخروج النساء لحوائجهن من حديث عائشة''۔

''قال يوسف القرضاوي، ومن هنا نعلم أن الإسلام لو يفرض على المرأة كما يقال أن تظل حبيسة البيت لا تخرج منه إلا إلى القبر، بل أباح لها الخروج لصلوة وطلب العلم و قضاء الحاجات وكل غرض ديني أو دنيوي مشروع كما كان يفعل ذلك نساء الصحابة ومن بعدهم من خير القرون'' (الحلال والحرام ليوسف القرضاوي ۱۶۱)۔

مذکورہ روایات وجزئیات اور فتاوی کی روشنی میں مستفاد ہے کہ عورت اگر حدود شرعیہ کے دائرہ میں رہ کر کسب معاش میں حصہ لیتی ہے تو اسے باجازت شوہر وولی بلا کراہت اور بلا اجازت بکراہت درست ہونا چاہئے وہ کسب معاش بشکل ملازمت ہو یا کسی دوسری طرح، البتہ عورت کا تنہا بلا محرم بعید از سفر شرعی جانے اور قیام کرنے کی اجازت نہ ہونی چاہئے، بلکہ بہر صورت عورت کو اپنوں سے دور قیام نادرست ہی معلوم ہوتا ہے۔ ☆☆☆

---

[1] جامعہ عربیہ، ہتھورہ، باندہ۔

خواتین کی ملازمت

مولانا محمد فاروق بارڈولی [1]

۱۔ شریعت اسلامی نے خواتین کے جملہ حاجات کی ذمہ داری ان کے اقرباء ذی رحم محرم اور شوہر کے ذمہ رکھی ہے، بلاضرورت شدیدہ کسی کے پاس ملازمت کرنے کو ہرگز گوارہ نہیں کیا ہے، اس لئے کہ اسمیں جہاں ان کی غرض نسوانیت کو پامال کرنا اور غیر فطری طریقہ سے کسب پر آمادہ کرنا ہے وہیں غیر محرموں کے ساتھ خلوت و بے حیائی کرنے اور بے راہ روی کے مواقع بھی فراہم کرتے ہیں، ہاں اتنا ضرور ہے کہ باوثوق عورتوں کے پاس رہ کر خانگی امور کے ساتھ ساتھ خیاطت، تطریز اور غزل وغیرہ حرفت کی تعلیم حاصل کرلے اور اپنے گھروں میں رہ کر اپنے شوہر کی اجازت سے کچھ کرلے، تو اس کی گنجائش ہے۔

''فليس له أن يوجرهن في عمل أو خدمة؛ لأن المستأجر يخلوبها وذلك سيء في الشرع ومفاده أنه يد فعها إلى امرأة تعلمها حرفة كتطريز وخياطة إذلا محذور فيه'' (ردالمحتار ۵.۲۱۹)۔

۲۔ اللہ تعالی نے عورت کے ضعف و نازک ہونے اور عمل شاق کے غیر متحمل ہونے کی وجہ سے خود اس کا یا اس کی اولاد کا نان ونفقہ اس کے ذمہ عائد نہیں کیا، بلکہ والد و اقرباء یا شوہر کے ذمہ کیا، تاہم اگر کوئی غیر شادی شدہ مالدار ہو تو اس کا نفقہ خود اس کے مال میں واجب ہوگا، اسی طرح اگر شوہر ہو لیکن شوہر کسب سے نہایت عاجز ہو اور خود صاحب ثروت ہو، تو اس صورت میں اپنا، اور اپنے بچوں کے نفقہ کی خود ضامن ہوگی، جیسا کہ علامہ بدرالدین عینی عمدۃ القاری میں فرماتے ہیں:

''والأم لا يلزمها نفقة ولدها مع وجود أبيه قلت يلزم الأم نفقة ولدها إذا كان ابوه فقيرا عاجزا عن الكسب جدا، وذكر أصحابنا أن الأب إذا كان معسرا كسوبا وله ابن زمن وله أم موسرة هل تومر بالانفاق على الإبن اختلف المشائخ فيه قيل تؤمر، وقيل: لا ترجع الأم على الأب، وهو مروى عن ابى حنيفة ايضا'' (عمدة القارى ۶.۲۷۲)۔

۳۔ محض سرمایہ واثاثہ کی فراہمی اور وقت گذاری کے لئے معاشی جدوجہد کرنا، اور اس کے لئے گھر سے باہر جا کر بازاروں، کارخانوں اور دکانوں کی زینت بنا دینی عزت وناموس کو سربازار نیلام کرنا ہے، اس لئے اس کی قطعا گنجائش نہیں ہے۔

۴۔ اپنے گھروں میں اپنے شوہر کی اجازت سے حلال صنعت وحرفت اختیار کرسکتی ہے، اور اذن زوج اس لئے شرط ہے کہ شوہر کو ہر ایسے عمل سے روکنے کا حق ہے جو شوہر کے لئے تنقیص حق یا ضرر و بے حیائی کا باعث ہو، البتہ ایسا عمل جس میں کوئی ضرر (دینی و دنیوی نہ ہو تو اس سے روکنے کی کوئی وجہ نہیں) خاص طور سے جبکہ عورت تنہا ہو، اور شوہر غائب ہو، اس لئے کہ ایسے تنہائی کے وقت میں نفس وشیطان کے وساوس یا اجانب و پڑوسیوں کا اختلاط سم قاتل ہے، جن سے بچنے کے لئے عورت کو اپنے گھر میں کسی نہ کسی عمل میں مشغول رہنا چاہئے، حضرت علامہ شامیؒ نے بڑے اچھے اور صاف انداز میں اس مسئلہ کی وضاحت فرمائی ہے۔

''والذى ينبغى تحريره أن يكون له منعها عن كل عمل يؤدى إلى تنقيص حقه أو ضرره أو إلى خروجها من بيته. أما العمل الذى لا ضرر له فيه فلا وجه لمنعها منه خصوصا في حال غيبته من بيته. فإن ترك المرأة بلا عمل في بيتها يؤدى إلى وساوس النفس والشيطان، أوالاشتغال بما لا يعنى مع الأجانب والجيران'' (شامى ۵.۲۵۹)۔

اسی طرح غیر شادی شدہ کے لئے بھی اپنے ولی کی اجازت سے گھریلو صنعت انجام دینے کی گنجائش ہے، تاہم تدبیر منزل اور امور خانہ داری سیکھنے کے بعد ہی اس کی طرف توجہ دینی چاہئے، یا کچھ ایسی ترتیب ہونی چاہئے کہ امور خانہ کے تعلم کے ساتھ ساتھ یہ امور بھی انجام دیئے جائیں، کیونکہ عورت کو عورت ہونے کی حیثیت سے ان امور خانہ کا سیکھنا اولا ضروری ہے۔

---

[1] جامعہ دارالاحسان می مسجد بارڈولی، سورت، گجرات۔

''مفاده أنه يدفعها إلى امرأة تعلمها حرف كتطريز وخياطة إذلا محذور فيه'' (شامی ۵،۲۱۹)۔

۵۔ ایسی عورت جس کی کفالت کا انتظام ہو اس کا کسب معاش کے لئے نکلنا خواہ ولی یا شوہر کی اجازت ہی سے کیوں نہ ہو، بہر صورت ناجائز ہے، اس لئے کہ یہ خروج بلاضرورت شرعی ہے، البتہ کفالت کی کوئی صورت نہ ہو اور نہ گھر میں رہ کر کوئی صنعت کر سکتی ہو تو اسے دن کے وقت میں مسافت سفر کے اندر خصوصی طور سے گنجائش ہوگی، جیسا کہ فقہاء کرام نے مختلعہ اور متوفی عنہا زوجہا کو ضرورۃً کسب معاش کے لئے نکلنے کی اجازت دی ہے، علامہ شامی رقم طراز ہیں:

''والحق أن على المفتي أن ينظر في خصوص الوقائع. فإن علم في واقعة عجز هذه المختلعة عن المعيشة إن لم تخرج، افتاها بالحل، وإن علم قدرتها افتاها بالحرمة كما في فتح القدير'' (شامی ۵،۱۲۹)۔

۶۔ خواتین کی ملازمت سے متعلق حدود شرعیہ حسب ذیل ہیں:
کوئی متکفل نہ ہو، گھریلو صنعت وحرفت کی کوئی صورت نہ ہو، موقع ملازمت میں مرد وزن کا اختلاط نہ ہو، گھر سے تنہا نکلنا مسافت سفر کے اندر ہو، لباس فاخرہ اور زیب وزینت کے ساتھ نہ ہو، بلکہ شرعی پردہ کے ساتھ ہو، ضرورت پوری ہوتے ہی رات ڈھلنے سے پہلے واپسی یقینی ہو، اپنے اوقات پر نماز ادا کرنا متاثر نہ ہو، حلال اور مباح امور کے لئے ہو وغیرہ۔ ان جملہ شرائط کی موجودگی میں اس قسم کے خصوصی موقع پر ملازمت کی اجازت دی جاسکتی ہے۔

۷۔ اگر ایسا ادارہ ہو جہاں صرف خواتین ہی خدمت انجام دیتی ہوں، اور وہ متدین ہوں فاسقہ نہ ہوں نیز ذمہ دار ادارہ مرد ہوں لیکن اپنی بیوی، بیٹی یا ذی رحم محرم عورتوں کے ذریعہ نگرانی کا کام انجام دیتے ہوں خود ملازمہ عورتوں کے ساتھ اختلاط نہ رکھتے ہوں، یا کسی باوثوق عورت ہی کو نگراں مقرر کر رکھا ہو، اور شوہر یا ولی کی جانب سے خواتین کو اجازت حاصل ہو، مذکورہ حدود شرعیہ میں سے آخر الذکر ۵ شرطوں کے ساتھ ملازمت کی اجازت دی جائے گی ورنہ نہیں، اور اگر وہاں سبھی متدین عورتیں ہوں تو پردے کی ضرورت نہیں ہے، لیکن اگر وہاں فاسقہ غیر متدینہ عورتیں ہوں تو وہاں بھی پردہ ضروری ہوگا (دیکھئے: شامی ۹/ ۵۳ ۴)۔

۸۔ ایسی جگہ جہاں مرد وزن کا اختلاط ہو کسی تفصیل کے بغیر عورتوں کے لئے ملازمت کرنا جائز نہیں، اس لئے کہ یہاں بہت سی خرابیوں کے ساتھ ساتھ وقتاً فوقتاً اجنبی مرد سے خلوت کا ہونا یقینی چیز ہے، جو شرعاً ناجائز ہے۔

۹۔ مردوں سے کم وبیش اختلاط کا کوئی اعتبار نہیں، ضرورت شدیدہ کے بغیر نفس اختلاط حرام ہے۔

۱۰۔ عورت کا ملازمت کے ارادہ سے بے محرم مسافت سفر کی دوری تک جانا جائز نہیں، اور وہاں اسی طرح قیام کرنا یقیناً غلط ہے، البتہ جائے ملازمت میں صرف باوثوق عورتیں ہی ہوں اور ماقبل کی تمام شرطیں پائی جاتی ہوں، اور کوئی محرم وہاں تک آنے جانے کے وقت ساتھ ہو تو پھر گنجائش دی جاسکتی ہے، ورنہ نہیں۔

خواتین کا صنعت وحرفت سے وابستہ ہونا

مولانا محمد اشرف قاسمی [1]

۱۔ شریعت نے کسب معاش سے عورت کو آزاد رکھتے ہوئے اس کی تمام تر ذمہ داری والد، اقرباء، شوہر پر عائد کی ہے۔

۲۔ شریعت نے عورت اور اس کی اولاد کا نان ونفقہ والد، اقربا یا شوہر پر واجب کیا ہے، تاہم غیر شادی شدہ مالدار عورت خود اپنے نفقے کی ذمہ دار ہوگی، نیز اگر شوہر فقیر اور کسب سے نہایت عاجز ہو تو بھی وہ خود ضامن ہوگی۔

---

[1] جامعہ مظہر سعادت، ہانسوٹ، بھروچ گجرات۔

۳۔ محض معیار زندگی بلند کرنے، وقت گذاری یا سرمایہ و اثاثہ پیدا کرنے کی غرض سے معاشی جد و جہد اختیار کرنے کی اجازت نہیں ہوگی۔

۴۔ اندرون خانہ حلال صنعت و حرفت کے لئے شوہر کی اجازت ضروری ہے۔

۵۔ اگر کفالت کی کوئی صورت نہ ہو اور اندرون خانہ بھی صنعت و حرفت نہ کرسکتی ہو تو اسے دن میں مسافت سفر کے اندر رہتے ہوئے خصوصی طور سے نکلنے کی گنجائش ہوگی۔

حدود شرعیہ حسب ذیل ہیں:

۶۔ کوئی متکفل نہ ہو، اندرون خانہ صنعت و حرفت کی کوئی شکل نہ ہو، ملازمت کی جگہ مردوں کا اختلاط نہ ہو، مسافت سفر کے اندر اندر ہو، لباس فاخرہ اور زیب و زینت کے ساتھ نہ ہو۔

۷۔ مذکورہ بالا شرطوں کے ساتھ جائز ہے، البتہ اگر دوسری خواتین غیر مسلم ہوں تو ان سے بھی پردہ ضروری ہے۔

۸۔ ایسی جگہ ملازمت جائز نہیں۔

۹۔ دونوں ہی صورتیں ناجائز ہیں، البتہ دوسری صورت میں قباحت کم ہے۔

۱۰۔ محرم کے بغیر مسافت سفر کی دوری تک سفر بھی جائز نہیں، لہذا اگر عورت محرم کے ساتھ بہ غرض ملازمت کسی جگہ مقیم ہے اور دیگر تمام شرطیں موجود ہیں تو اجازت ہے، ورنہ نہیں۔

خواتین کو کسب معاش کا حق

مولانا محی الدین غازی [۱]

۱۔ خواتین کو کسب معاش کا حق حاصل ہی۔

۲۔ بیشتر صورتوں میں خواتین کے لئے شریعت کی جانب سے کوئی نہ کوئی مرد کفیل ہوتا ہے، جو ان کے نان و نفقہ کا ذمہ دار ہوتا ہے، لیکن یہ ذمہ داری محض اس نان و نفقہ کی ہوتی ہے جو قانونی طور پر لازم کیا جاتا ہے، اس سے ماوراء خواتین کے اخراجات کی ذمہ داری اصلا خود خواتین پر ہوتی ہے، بطور مثال اگر کوئی عورت حج کرنا چاہتی ہے تو اس کے اخراجات خود اس کو برداشت کرنا پڑیں گے۔

۳۔ اگر مردوں کو حق ہے کہ وہ جتنا چاہیں کمائیں تو عورتوں پر اس سلسلے میں کوئی پابندی نہیں ہونا چاہئے۔

۴۔ اگر شوہر کی حق تلفی نہیں ہو رہی ہے تو عورت اپنے موجود سرمایہ کی حفاظت کے لئے اس کی سرمایہ کاری کے لئے اور نیا سرمایہ وجود پذیر کرنے کے لئے شوہر یا ولی کی اجازت کی پابند نہیں ہے، البتہ اس طرح کی سرگرمیوں میں شوہر کو اعتماد میں لینا خوشگوار ازدواجی زندگی کے لئے مناسب ہوتا ہے، مثال کے طور پر ایک عورت کو وراثت میں کھیت ملتا ہے، یا باپ کے کاروبار کی وہ وارث ہوتی ہے، ایسی صورت میں اسے پورا اختیار ہے کہ وہ براہ راست یا بالواسطہ کھیت کی زراعت یا کاروبار کی سرگرمیوں کو جاری رکھے۔

ملازمت کے سلسلے میں صورت حال کچھ مختلف ہوسکتی ہے، کیونکہ وہاں عمومی طور پر شوہر کی قوامیت اور ملازمت کے شعبہ میں دیگر افراد کی قوامیت میں تعارض ہوسکتا ہے، ایسی صورت میں شوہر کی اجازت ضروری ہونی چاہئے۔

۵۔ ملازمت کی وجہ سے پردہ وغیرہ کے عمومی احکام میں کوئی فرق واقع نہیں ہوگا، لمبی مسافت کے سفر میں محرم کی رفاقت، اجنبی مرد کے ساتھ خلوت اور زینت کے اظہار وغیرہ سے متعلق تمام عمومی احکام کی پابندی ضروری ہوگی اور ملازمت یا کاروبار کسی بھی عام شرعی حکم میں رخصت کی وجہ جواز نہیں بنیں گے۔

☆☆☆

---

[۱] دار الشریعہ متحدہ عرب امارات۔